ڈاکٹر غلام جیلانی برق

نماز اور ہم

اللہ نے قرآنِ مقدس میں عبادت، تسبیح ذکر اور رکوع و سجود کا حکم ۹۰۸ مرتبہ دیا ہے۔ قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے عبادت کی اتنی تاکید کیوں کی ہے؟ اور انسان کی ذہنی و روحانی نشوونما سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ جواب میں گذارشاتِ ذیل حاضر ہیں۔

اوّل ــــ اپنے قول کی لاج کون نہیں رکھتا۔ جب ایک شخص دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کبھی جُھک کر اور کبھی سجدے میں گر کر کہتا ہے :-

"اے ارض و سما کے خالق، تیری ذات مقدّس، تیرا نام عظیم، تو ہی پرستش کے قابل ہے۔ ہمیں سیدھی راہ دکھا، برگزیدہ لوگوں کے پیچھے چلا، اور گمراہوں کی پیروی سے بچا، اے اللہ تو جلیل و جمیل ہے، تو رحمتِ مجسّم، اعلیٰ، ارفع اور مقدّس ہے، تو ہی میرا حصار اور میری پناہ ہے"۔

نماز کے بعد بھی اُسے اپنی باتوں کا خیال رہتا ہے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوم ــــ ممکن ہے۔ کہ آغاز میں نمازی کا سر اللہ کے سامنے رسماً جُھکتا ہو۔ لیکن بعد میں جُھکنا اُس کی فطرت بن کر تسلیم کہلانے لگتا ہے، اور اسلام کا مقصود یہی ہے۔

سوم ــــ انسانی رُوح سے دمبدم سُرور کی لہریں اُٹھتی رہتی ہیں۔ ان میں گہرائی پیدا ہوجائے تو یہ سوز و گداز کہلاتی ہیں۔ حکیم مشرق رحمتہ اللہ علیہ نے اسی سوز کی دُعا کی تھی۔

نہ خواہم این جہان و آں جہاں را
مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوزِ سرورش
بوجد آرم زمین و آسماں را

جب ایک عابد وقتِ سحر اللہ کے حسین تصوّر میں ڈوب جاتا ہے۔ تو وہ یوں محسوس کرتا ہے۔ گویا شاہدِ کائنات اس سے ہمکلام ہے۔ اس احساس سے اُس کی روح جھوم اُٹھتی ہے اور ساتھ کائنات بھی ناچنے لگتی ہے۔

عصرِ رواں کا انسان گریز پا لذاتِ جسمانی میں یوں دھنس چکا ہے۔ کہ وہ اس سوز و سرور کو فریب سمجھتا ہے۔ نتیجتاً وہ رُوح کی عظیم لذّات سے بے گانہ ہوگیا ہے۔

عبادت بصارت میں وہ گہرائی اور گیرائی پیدا کرتی ہے کہ رفتہ رفتہ زمان و مکان کے تمام حجاب اٹھ جاتے ہیں۔ اور ماضی و مستقبل کا امتیاز مٹ جاتا ہے یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مومن کی عارفانہ بصیرت کو ہر منظر میں جلوۂ حُسنِ ازل نظر آتا ہے۔ کتنی المناک ہے یہ بات۔ کہ نسلِ نو اِس بصارت سے محروم ہے۔

انسان کو دو چیزیں عظیم بناتی ہیں۔ جہانگیر علم اور یزداں شکار عشق۔ علم زندگی کا جلال ہے اور عشق جمال۔ یہ جمال اُس نیاز و گداز کا نام ہے جو عبادت سے پیدا ہوتا ہے۔ حکیمِ مشرق نے جلال و جمال پر رنگین اشعار کہے تھے۔ دو تین آپ بھی سن لیں

شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید، تیرا جمالِ بے حجاب

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

دمِ عارف نسیمِ صبحدم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اقبالؒ، عصرِ نو کے بے بصیرتوں کے متعلق فرماتے ہیں۔

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا؟

اقبال ان بے بصروں سے کہتے ہیں کہ خدا نے حیّ و قیوم زندوں کا خدا ہے۔ اور تم مرچکے ہو۔

ترا تن رُوح سے نا آشنا ہے
عجب کیا گر تری آہ نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

اقبال کے ہاں عشق ہی اساسِ حیات ہے، اس کی تقویم دوش و فردا سے نا آشنا ہے۔ گُل کو اسی سے حسن۔ سازِ حیات کو اسی سے نغمہ اور عمل کو اسی سے فروغ نصیب ہوتا ہے۔ نیز

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں، بدر و حنین بھی ہے عشق

اللہ کے سامنے جھکنے والا دوسروں کے سامنے نہیں جھکتا۔ یہ شانِ بے نیازی، جسے اقبالؒ فقر و قلندری سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ نماز ہی سے جنم لیتی ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی کے حالات میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ سلطانِ دہلی نے انہیں پیغام بھیجا کہ میں آپ کی زیارت کو آرہا ہوں۔ آپ نے شاہی قاصد سے فرمایا کہ اس حجرے کے دو دروازے ہیں۔ سلطان جس دروازے سے بھی داخل ہوگا۔ میں دوسرے سے نکل جاؤں گا۔

حضرت امام جعفر صادقؒ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ عباسی خلیفہ المنصور نے انہیں اپنے دربار میں طلب فرمایا۔ وہ آکر چُپ چاپ بیٹھ گئے خلیفہ نے کہا کہ آپ اُمّت کے برگزیدہ امام ہیں اور شب و روز عبادت و تلاوت میں محو رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کو روزی کمانے کے لئے وقت نہیں ملتا ہوگا۔ اگر آپ حکم دیں تو میں خزانۂ عامرہ سے آپ کا وظیفہ باندھ دوں۔ آپ جھٹکے سے اُٹھے۔ اور فرمایا۔ میری ایک ہی آرزو ہے کہ آئندہ مجھے یاد نہ فرمایئے۔ اور چلے گئے۔

اسی طرح جب ایک عباسی خلیفہ نے دراہم کی ایک تھیلی غوثِ اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں بھیجی تو آپ نے قاصد کے سامنے تھیلی کو مروڑا۔ اُس سے خون نکل کر زمین پر بہنے لگا پھر تھیلی کو حجرے سے باہر پھینک کر فرمایا۔ مجھے اللہ نے اجازت نہیں دی۔ ورنہ میں شاہی محل کو سیلِ خون میں بہا دیتا۔

آستانِ اقتدار پر سجدے کرنے والے مقامِ عشق کو نہیں پہچان سکتے ہیں۔

چہارم ــــ ساری دنیا عزت، عظمت اور شہرت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسے کون سمجھائے کہ یہ مقاماتِ حسین انسانی اقدار ــ (محبت، رحم، خدمت، علم، وغیرہ) کو اپنانے سے ملتے ہیں۔ بلا شک ہر قدر بہت عظیم ہے۔ لیکن اہلِ نظر کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ عبادت عظیم ترین ہے۔ دیکھئے نہیں کہ لاہور میں شہنشاہِ ہند یعنی جہانگیر بھی مدفون ہے۔ اور حضرت داتا گنج بخشؒ بھی ـ جہانگیر کے مدفن پر شاید ہی کوئی ہاتھ دعا کے لئے اُٹھتا ہو۔ لیکن حضرت داتا کی مقبولیت کا یہ عالم کہ ہر روز دس ہزار سے زائد زائرین دعا و عبادت کے لئے وہاں جاتے ہیں اور اِسی صداقت کا علانیہ مظاہرہ کرتے ہیں کہ

("اللہ کی نظر میں سب سے زیادہ مکرّم محترم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو") الحجرات ــ ۱۳

حضرت داتا ہوں یا اجمیری و شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ سب کی وجۂ عظمت اُن کی عبادت تھی۔ ان سے عبادت چھین لیجئے تو پیچھے کچھ بھی نہیں رہے گا۔

پنجم ــــ قرآن کے بعض مآخذ بڑے پُر اسرار ہوتے ہیں۔ مثلاً علم کو لیجئے۔ آپ الف۔ ب۔ ت کے بعد چند کتابیں پڑھتے ہیں۔ پھر چند اور، رفتہ رفتہ آپ کے نقطۂ نظر میں وسعت اور دل و دماغ میں روشنی پیدا ہوجاتی ہے۔ ساتھ ہی آپ کو ایک ایسی قوت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جو زمین سے اُس کے خزائن و دفائن چھین لے۔ اور ایک ٹھوکر سے پہاڑوں کے ٹکڑے اُڑائے

عبادت بھی ایک طرح کا پڑھنا ہی ہے۔ خدا
کے نام اور کلام کو بار بار پڑھنا۔ اس سے انسان
میں اتنی طاقت آجاتی ہے کہ وہ ایک ڈانٹ سے
سمندروں کو خشک۔ اور چٹانوں سے چشمے جاری
کر سکتا ہے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام کے اشارے
سے بحرِ احمر دو نیم اور عصا اژدہا بن گیا تھا۔ یا
حضرت مسیح کے حکم سے مردہ زندہ ہو گیا تھا۔ تو
اسے ان کی طاقتور روح کا کرشمہ سمجھئے۔ ؎

خودی کا سِرِّ نہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

ششم ــــ انسانی شخصیت اعمال کے سانچے
میں ہمیشہ ڈھلتی رہتی ہے۔ بلند اعمال اسے حسین
بناتے ہیں۔ اور پست اعمال قبیح۔ حُسن پہلے روح
میں پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر جسم میں۔ اہل نظر اس
بات پر متفق ہیں کہ علم کا سانچہ اعلیٰ ہے اور عبادت
کا اعلیٰ ترین۔ امت کے حسین ترین لوگ وہی
تھے۔ جو عبادت کے سانچے میں ڈھل کر نکلے
تھے۔ مثلاً جنید بایزید باہو وغیرہ۔ یہ لوگ زمینی
بھی تھے اور آسمانی بھی۔ ان کی ایک نگاہ سے لاکھوں
انسانوں کی تقدیریں بدل گئی تھیں اور ان کی بدولت
اسلام بحرالکاہل کے بعید ترین جزائر تک پھیل
گیا تھا۔ عظیم انسانوں کا یہ سلسلہ اسلام کے سوا
کہیں اور موجود نہیں۔ یہ لوگ یونیورسٹیوں کی نہیں
بلکہ عبادت گاہوں کی تخلیق تھے۔

ہفتم ــــ اب اس حقیقت کو اطبا نے تسلیم
کر لیا ہے کہ بیماری گناہ کی تخلیق ہے۔ یہ پہلے روح
کو لاحق ہوتی ہے اور پھر جسم کو۔ نیک اعمال سے
جسم میں رطوبتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور بدکاری
ان میں زہر گھول دیتی ہے۔ ایک امریکی ڈاکٹر کا
قول ہے:۔

"گناہ سے پہلے روح بیمار ہوتی ہے
اور وہاں سے بیماری جسم میں منتقل ہو
جاتی ہے۔ بغض، کینے، عداوت اور
غصے سے خون میں زہر بھر جاتا ہے۔
دوسری طرف محبت، رحم اور احسان
سے جسم میں ایسی صحت افزا تحریکیں
پیدا ہوتی ہیں جو گناہ کے زہر کو امرت
میں بدل دیتی ہیں۔"

(راڈلف ٹرائن: اِن ٹیون وِد دی اِنفانٹ) ص۲۹

ڈاکٹر کینٹ اپنی کتاب "فلاسفی آف ہومیوپیتھی"
میں لکھتا ہے:۔

"طبیب کا فرض علاج کرنا ہے اور اس
کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ مریض کی
روح کو پاک کرے۔ کیونکہ بیماری پہلے
روح کو لگتی ہے اور بعد میں بدن کو۔
روح کی پاکیزگی کا لازمی نتیجہ جسم کی سلامتی
ہے۔" (ملخص ص۱۸)

ہشتم ــــ تمام فلسفی خواہ ان کا تعلق
قدیم یونان سے تھا یا موجودہ یورپ سے، ایک
ہی بات بتاتے رہے کہ سکونِ قلب کیسے حاصل
ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے اس موضوع پر ہزاروں
صفحات لکھے۔ لیکن دنیا کا اضطراب بڑھتا ہی
گیا۔ اس سلسلے میں سرورِ دو عالم صلعم نے بھی ایک
اعلان کیا تھا۔

"یاد رکھو ــ کہ دلوں کو سکون اللہ کے
ذکر سے ملتا ہے) رعد ــ ۲۸

اس نسخے کو آزما کر دیکھئے آپ کا دل اطمینان
سے بھر جائے گا اور روح سرور و مستی سے جھومنے
لگے گی۔

آزمائش شرط ہے ــ

"ــ ازہ شمارا موصول ہوا۔ اس کے لئے آپ کی مساعی قابلِ مبارکباد ہیں کہ پرچے کی ادبی ساکھ
ماہ بماہ بڑھتی جا رہی ہے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ محترم کرار حسین دشتِ سخن کے بھی سیاح ہیں۔ آپ نے "کربلا"
شائع کر کے ان کے اس رُخ سے بھی قارئین کو روشناس کرایا ہے۔

ایک بات ــــ میری غزل کا پہلا مصرع ہی "نذرِ کتابت" ہو گیا ہے۔ مصرعہ اس طرح
چھپنا ہے"۔

تصویرِ دست ہیں یہ کمالِ ہنر بھی ہے

محسن بھوپالی ــــ کراچی

احمد ندیم قاسمی

پیر فضل کی نئی پنجابی غزل

ہر دور کا بڑا شاعر، اپنے زمانے کے فکری اور فنی معیاروں کو بلند تر کرنے کے علاوہ، بعض ایسے نئے معیار بھی قائم کر جاتا ہے۔ جو خود اس کے دور میں تو اجنبی اجنبی سے لگتے ہیں، مگر آنے والے زمانے کی نسلیں انہی معیاروں کی بنیادوں پر اپنی جدّتوں اور ندرتوں کے ایوان اٹھاتی ہیں۔ اُردو میں اس طرح کی دو بڑی مثالیں غالبؔ اور اقبالؔ کی ہیں کہ اگر آج کی جدید تر اُردو شاعری کا بھی جائزہ لیجئے تو اس کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں غالبؔ اور اقبالؔ کے فکر و فن سے جا ہی ملتے ہیں۔ روایتوں کو سرے سے توڑنے اور نابود کرنے کے بعد اپنی نئی روایتیں قائم کرنے کے دعویدار دراصل جھوٹ بولتے ہیں، اور اگر سچ کہتے ہیں تو سادہ لوحوں کا سا سچ کہتے ہیں۔ ہر نیا تجربہ بے شمار قدیم تجربوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہوتا ہے اور جب یہ تجربہ کامیاب ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں روایت بننے کی قوت پیدا ہو گئی ہے۔ پنجابی زبان میں پیر فضلؔ کی غزل کا جائزہ جدید پنجابی غزل کے حوالے سے لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی شاعر نے جو بظاہر قدیم رنگِ تغزّل کا رسیا دکھائی دیتا ہے، بعض ایسے نئے معیار تراشے جن پر آج جدید پنجابی غزل اپنے خوبصورت ایوانوں کی مضبوط دیواریں اٹھا رہی ہے۔

ماہِ نو

پیر فضلؔ جب روایتی غزل کہہ رہے ہوتے ہیں تو اس میں بھی ان کی جدّت طرازی اپنی جھلک دکھانا نہیں بھولتی۔ وہ ان پرانی راہوں کے کنارے کنارے بھی نئے نئے گل بوٹے اگاتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

بھلا کیہ سکندر نے تے کی رکھے میرے حسن دے بادشہ نال نسبت
گھوڑے زمین زمانی تے اوس پھیرے، اپنے دلاں دے شہر تسخیر کیتے

تخت نشینوں اور دل نشینوں کے کردار و مزاج کے اس طرح کے مقابلے ہماری قدیم فارسی اور اُردو غزل کا خاص موضوع رہے ہیں۔ مگر پیر فضل نے اس شعر میں، اسی روایت کی پابندی کرتے ہوئے، اس موضوع کی جن نئی سمتوں کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں، وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ بعینہٖ یہ اشعار دیکھئے جو سراسر روایتی تغزل کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں مگر جن میں پیر فضل نے اپنی انفرادیت کو جو واضح طور پر بیسویں صدی کی انفرادیت ہے، اتنے سلیقے سے شامل کیا ہے کہ اس روایت پر بھی جدّت کا گمان گزرتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

اوہ راتاں چنگیاں سن، دن بھلے سن
مرے دل نوں جدوں جھکھڑ ترے سن
نہ مکا عمر وچ زلفاں دا قصہ
بڑے لمیں سلمیں سلسلے سن

برہوں وچ نچنا پیندا اے، آ سائشاں نوں آراماں نوں
کنڈیاں تے ٹرنا پیندا اے، گلبدناں نوں، گلفاماں نوں

کیوں تکمیاں شوخ نگاہواں نوں سرمے دیاں چھٹاں دینا ایں
تیراں نے بوجھل ہو جانا ایں، تیراں تے چاہڑ نہ شاماں نوں

میں اپنی وستی وچ انجیں، دن سارا فضل گزار دیاں
جس طراں مسافر ہوندے نے کجھ اکٹرے پکھڑے شاماں نوں

سینہ بل دینا ایں، یا قائم نہیں رہنا دماغ
عشق فرمانی ایں اوڑک مہربانی کجھ نہ کجھ

جے آکھیں تے دیاں تکلیف تینوں
جے اڈے تے مری مٹی اُڈا ہور

رہندا اے واعظ نوں اُٹھتے پہرِ حوراں دا خیال
ایس دوزخ جوگے نوں اک پارسا جاتا سی میں

میں غم اپنے دا قصہ، ڈردیاں اوہنوں سنایا ناں
بجے اوہ کارے قضا، غم ناک ہو جاندا تے کی ہوندا

سدا نہ دن سو تے رونٹے، سدا نہ نویاں کوراں
سدا نہ گِٹیاں توڑی لاچہ، سدا نہ بانکیاں ٹوراں

مصحف رخ تیرے دے ورقے جلدی کویں اُتھلاں
اِک اِک حرف پڑھاں وِچ دل دے، لکھ لکھ واری ہلاں

فیر اک واری میں گلیں دیاں ہتھیں لاہیاں لیراں
فیر اک واری پیندے دھاگے ورتے سوزن کاراں

یہ باتیں وہی ہیں جو ہمارے بزرگانِ شعر و سخن سالہا سال تک کہتے رہے، مگر کہنے کے انداز میں جو نیا پن ہے، وہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ پیر فضل محض ایک عمدہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک ایسے شاعر بھی تھے جو آنے والی نسلوں کو اظہار کے نئے تیوروں سے آراستہ کرتے ہیں اور الفاظ پر سے مروجہ معانی کی پرتیں اتار کر انہیں اتنا اُجال دیتے ہیں کہ وہ نئے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

اس کمال کا ایک سبب تو پیر فضل کی وہ انفرادیت ہے جو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے اور دوسرا سبب ان کا وسیع مطالعہ اور انتہا درجے کی وسیع القلبی ہے۔ وہ قدیم اساتذہ سے استفادے کو گناہ نہیں سمجھتے مگر ساتھ ہی اس استفادے میں اپنی منفرد شخصیت کا کچھ اس خوبی سے اضافہ کرتے ہیں کہ پرانا موضوع بالکل نیا اور بعض صورتوں میں بہتر اور پیر فضل کا اپنا موضوع معلوم ہونے لگتا ہے۔ آپ نے میر تقی میر کا یہ مشہور شعر تو سنا ہی ہوگا۔

جی میں تھا کہ یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

اب دیکھئے، پیر فضل اسی جذبے کا اظہار کس طرح کرتے ہیں!

دل وچ آکھدا رہنا داں، ایس واری رکھ دیاں گا کھول کے حال دل دا
آسا منے جان اوہ جدوں میرے، کردا صرف حضور حضور رہناں

یہ صرف "حضور حضور" کرتے رہ جانے میں جو کیفیت ہے وہ کچھ بھی نہ کر سکنے کی بے بسی کے مقابلے میں کہیں زیادہ کربناک بے بسی ہے۔

فانی بدایونی کا ایک عمدہ شعر ہے:

بہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

پیر فضل کہتے ہیں۔

اوہ تماشہ ویکھن واہتے، نہ چھتاں تے چڑھیا
میں بھڑ مچے بال مکایاں چھت اپنے دیاں کڑیاں

پھر فارسی کا ایک مشہور شعر ہے:۔

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر
توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

پیر فضل کہتے ہیں:۔

اوہ غلط انداز تے چو میلی نظرے خاک نشیناں نوں ویکھدے نیں
دھوڑاں اُڈدیاں دے اوہلے، پتہ کی ہے، جے کوئی لگیا شہسوار آوے

مرزا غالب کا ارشاد ہے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

پیر فضل فرماتے ہیں:۔

وِس پے گئے اوہناں فرشتیاں دے، ساڈے ہرن تے سان مخل جھیڑے
ایتھے اوہناں ای بھرے اعمال نامے، اوتھے اوہناں کولوں ای گرزاں کھانیاں نے

علامہ اقبال کا شعر ہے:۔

گیسوئے تابدار کو، اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

پیر فضل کہتے ہیں۔

لشکیاں ہویاں زلفاں تائیں ہور ذرا لشکائی جا
دُکھاں گھُپ ہنیرا کیتا اے، چناں چانن لائی جا

یہی شاعر، جس نے اتنے بڑے بڑے اساتذہ کے خیالات میں اپنی انفرادیت کے اضافے کئے، پنجابی غزل کو جدت و ندرت سے مالا مال کر سکتا تھا اور اس نے یہی کیا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج اِکا دکا نوجوان پنجابی شعراء کی وجہ سے جدید پنجابی غزل امکانات کی ناقابلِ یقین وسعتوں کی طرف بڑھ رہی ہے، مگر میرا یقین ہے کہ ان وسعتوں کی نشان دہی پیر فضل نے کی تھی۔ جب وہ یہ کہہ رہے تھے تو نئی غزل ہی کہہ رہے تھے کہ:۔

عمر ساری غلطیاں تے غلطیاں کھاندا رہیا
سادگی وِچ، سادگی دی میں سزا پاندا رہیا
خاراں نوں گل جان کے، گل نال لٹکاندا رہیا
میں سمجھ کے لعل، انگیاراں نوں ہتھ پاندا رہیا
بجلیاں چمکن تے ماں سمجھاں تجلی طور دی
میں بھلاوے پانی دے، ریتاں دے دل جاندا رہیا
آبِ خنجر نوں رہیا میں آکھدا آبِ حیات
زہر نوں تریاق دی تھاں، اپنے موتہہ لاندا رہیا
میری بے سُرتی تے اوہناں آن کے کیتے تخول
مینوں فرقت وِچ جنہاں دی غش تے غش آندا رہیا
بے قراری تھیں نہ ایہہ مُڑیا تے نہ اوہ رون تھیں
میں کدی دل نوں، کدی اکھیاں نوں سمجھاندا رہیا

یا جب پیر فضل بات کو یوں کہتے ہیں تو کیا جدید تر غزل کی بنیاد نہیں رکھ رہے ہوتے ہیں۔

میں کیہڑی اپنے درداں دی دنیا وچ وسّاں کی دساں
کس گلّے پیّاں، رو رو کے چہرے تے لساں، کی دساں
رنگ کھلا میری وحشت دا، ہو کتھے کجھ ہمدرد گئے

اَوہ نہ دُر دیچھن حال میرا، میں کھڑ کھڑ ہساں، کی دساں
"کیوں فضل سودائی ہویائیں پلے دیاں لیراں لاہیاں نی"
پھڑ لوکی پلہ پچھدے نے، میں پلہ کھساں، کی دساں

اب پیر فضلؔ کے ہاں جدید بلکہ جدید تر پنجابی غزل کی بنیادیں پڑتے دیکھتے جائیے۔ میں ان کے چند اشعار لکھتا ہوں:۔

گل میری نسبت کیتی اے، اک نویں لباساں والے نے
ایہہ لیراں لتھا کدھرے دا، کی چیبڑ جانگوں لیر گیا

دل تے اکھدا اے فضلؔ، پٹ چیر دیتے، ہینوال دی کر دیئے مثال قائم
پکے گھڑے دے باجھ پر شلدے نیں، جن محبوب جو شہر گجرات دے نیں

سدا اوہا نویں، اوہ نہ دیئے
جو تیرے عشق وچ ہنڈھے ہوئے نے
نویں لگن تے مٹ جاون پرانے
غماں نے میرے غم ونڈے ہوئے نے

مینوں اوہ زمیوں جیہیاں لاہن لگے، جنہوں دُھر اسمان تے چاڑھیا ایں
گھٹ گل وچ جیہڑے نال میرے، باہواں کنج کے کرن تکرار آیا

توں دل تے چھا گیوں تے خوشی دل تے چھا گئی
تیری تے ساری دنیا تے چھانے دی لوڑ سی

میں سمجھناں واں، نئیں اُوہدے سوا کوئی بُرا
جو سمجھدا ئے، کوئی اوہدے سوا چنگا نئیں
چن دے دل تھکّے تے مونہہ اپنے تے چھٹاں پیندیاں
چھیاں نوں آکھنے والا بُرا، چنگا نئیں

دبیاں ہویاں دل وچ اگاں بھڑک پیاں اج فیر
یاد تیری دیاں مٹھیاں تاراں کھڑک پیاں اَج فیر
کدھرے ستی ہوئی نشتر لبھنی سپے گئی مینوں
ٹٹیاں سولاں پیراں دے وچ رڑک پیاں اج فیر

نویں سر سڑ بارشاں ہون گئیاں، نویں سر سڑ کستیاں وگنائیں
جیہڑے فضل دریا وچ جاوڑ گے، واپس نئیں آونا اوہناں ملاحاں تے

خبرے کی خدادی ہے مرضی، فصل گل اندر میرے جسم اُتے
تاراں پیاں رڑکن گریباں دیاں، تنداں پیاں چبھن آستین دیاں

دساں، اپنے آپ دی شرح کر کے، میں ظلوم دی آں تے جہول دی آں
اپنے پیر کہاڑیاں مار آپوں، آپے پیا تقدیر تقدیر کرناں

ثابت وی نہ کالے تُمیں، اوہناں نالوں لُتّے
میں جاتا سی جنہاں تائیں تربوزاں دیا ولّاں

میں اپنے زخم دکھا کے تے، لوکاں نوں ہتن دیندا نئیں
میں آپوں مرہم لا لیناں، میں آپ تروپے بھر لیناں

کر کے ظلم، عروج نوں پان والے، ایس گل دا ذرا خیال رکھیں
جا کے اُتلی ہوا وچہ پائے جاون جنہاں گڈیاں نوں کھلی ڈور لبھے

اوہ عکساں نوں غیر سمجھ کے، اُٹھ اُٹھ نسّے تے میں ڈکاں
ایہہ کندھاں دے ظالم شیشے وسدی جھوک اجاڑن لگے

اس مختصر مضمون میں مجھے پیر فضلؔ کی غزل میں جدتِ فکر اور ندرتِ فن کی محض نشان دہی کرنا تھی۔ سو وہ ان چند اشعار سے کر دی گئی۔ آخر میں صرف ایک شعر ملاحظہ ہو۔ دنیا کی بے ثباتی کے سے موضوع میں بھی پیر فضلؔ نے اپنی جودتِ فکر کا کیا اعجاز دکھایا ہے:۔

موقعہ خیر نصیب نئیں ہونا، جو کجھ چاہنا ایں، بنھ لے پلّے
ملک عدم وچ ٹُھریاں پھوں تینوں عرچ نئیں کھلدیاں رہناں

مجھے اُمید ہے کہ اربابِ نظر پنجابی غزل میں پیر فضلؔ کے اس گراں بہا اضافے کو نمایاں کریں گے اور کم سے کم پیر فضلؔ کے انتقال کے بعد تو ان کے اس شکوے کی عملاً نفی کر دیں گے کہ:۔

فضلؔ وچ شعراں دے، ڈونگھی سوچ دا کی فائدہ
لوک مونہہ وہندے نے، اَج کوئی ہنر وہندا نئیں

انور سدید

عزیز احمد[1] — ایک کثیر الجہت ادیب

اُردو ادب کے مطلع پر عزیز احمد ایک شہابِ ثاقب کی طرح نمودار ہوئے تھے۔ لیکن وہ دور تک روشنی کی لکیر چھوڑ کر غائب نہیں ہو گئے۔ بلکہ ایک ساکن ستارے کی طرح قطب پر آویزاں ہو گئے اور ادب میں نئے آنے والے ادیبوں کو زندگی بھر راستہ دکھاتے رہے چنانچہ آج جب ان کی وفات کی خبر آئی ہے تو بدن کا سارا خون سمٹ کر آنکھوں میں سما گیا ہے اور اب بے اختیار بہہ رہا ہے۔ لیکن جب ان کی تصنیفات پر نظر دوڑاتا ہوں اور ان کے ادبی آثاثے کا جائزہ لیتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ عزیز احمد اب بھی افق پر چمک رہے ہیں۔ اور ایک راہنما ستارے کی طرح روشنی کی لکیر کو ادب کے راستے پر بکھیرتے چلے جا رہے ہیں۔

ادب میں عزیز احمد کی نمود دو غیر معروف ناولوں سے ہوئی تھی۔ یہ ناول "مرمر اور خون" اور "ہوس" تھے۔ اور انہیں عزیز احمد نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں لکھا تھا۔ ہر چند عزیز احمد کے ناولوں میں ذہنی آزادی کا ایک خاص پرتو موجود تھا۔ ان کے ناموں میں ایک مخصوص قسم کی جاذبیت تھی اور ایک ناول کا خوبصورت دیباچہ مولوی عبدالحق نے لکھا تھا۔ لیکن اس دور میں ناول کی صنف پر کرشن چندر اور عصمت چغتائی کی حکمرانی تھی اور ادبی رسائل میں "شکست" اور "ٹیڑھی لکیر" پر جو خیال افروز تبصرے شائع ہو رہے تھے ان کی گونج میں عزیز احمد کے تجربوں کو اہمیت نہ مل سکی۔ یوں بھی عزیز احمد تعلقاتِ عامہ کے بل بوتے پر "من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو" قسم کی تنقید پر جسے ترقی پسند تحریک نے ابتدا میں ہی پروان چڑھانا شروع کر دیا تھا، یقین نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک طویل عرصے تک عزیز احمد ادب کی وادی میں یوں محوِ خرام رہے۔ جیسے اپنے گھر میں ہی اجنبی ہوں تاہم وہ اس سے دل برداشتہ ہرگز نہیں ہوئے اور راتوں رات شہرت سمیٹنے کے لئے انہوں نے کسی منفی حربے کو آزمانے کی سعی نہیں کی۔ ادب کا یہ واقعہ آج ہم سب کے لئے خاصہ سبق آموز ہے کہ وہ ادیب جس کے ساتھ ایک شام بھی نہیں منائی گئی، جس کی کسی کتاب کی تقریبِ رونمائی منعقد نہیں ہوئی اور جس کے اعزاز میں ادبی رسالے کی ایک اشاعت تک وقف نہیں کی گئی۔ آج بقائے دوام کی مسند پر متمکن ہے اور شہرتِ عام کی منزل کو بہت پیچھے چھوڑ کر عزیز احمد راہیِ ملکِ عدم ہو گئے ہیں۔

عزیز احمد ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں منظرِ عام پر آئے۔ وہ ذہنی اور فکری طور پر ترقی پسند تھے لیکن انہوں نے مارکسی نظریات کو محدود سیاسی معانی میں کبھی قبول نہیں کیا۔ ترقی پسند تحریک نے ایک عرصہ تک انہیں اپنا ہم سفر قرار دیا۔ اور ان کے ایسے افسانوں کو جن میں آگاہانہ فکری کا ایک مخصوص رجحان موجود تھا ترقی پسند ادب کی نمائندہ تحریروں میں شمار کیا گیا۔ عزیز احمد کا پہلا افسانہ "پگڈنڈی" ترقی پسند ادب کے ترجمان سویرا میں شائع ہوا تو اس کا استقبال ترقی پسندوں نے کھلے بازوؤں سے کیا کہ اس سے جنس کا جسمانی پہلو زندگی کی ضرورت بن کر سامنے آتا تھا اور یہ افسانہ اخلاقی قدروں اور جذباتی رابطوں کو شکستگی سے ہم کنار کر دیتا تھا۔ چنانچہ ترقی پسند ادبا نے عزیز احمد کو چونک کر دیکھا اور اس شخص کو جو کبھی حیدرآباد کی شہزادی دُرِّ شہوار کا سیکرٹری رہ چکا تھا اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک اعلیٰ تدریسی عہدے پر فائز تھا بغیر کسی تامّل کے اپنی صفوں میں شامل کر لیا۔ عزیز احمد کی کتاب "ترقی پسند ادب" دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ الحاق یک طرفہ تھا اور عزیز احمد کی ذہنی وابستگی اس میں شامل نہیں تھی۔ چنانچہ عزیز احمد انقلابی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنا ضروری نہ سمجھا عزیز احمد کا مؤقف تھا کہ حقیقت نگاری کسی ایک زمانے کی چیز نہیں بلکہ یہ ہر زمانے میں موجود ہوتی ہے۔ اور انقلاب زنگ آلودہ حقیقت میں اساسی تبدیلی

[1] عزیز احمد گزشتہ دنوں ٹورنٹو میں انتقال کر گئے۔

پیدا کرتا ہے۔ ترقی پسندی کے اس فکری پس منظر میں عزیز احمد نے سماجی ضرورتوں کی نئی توضیح کی جنسی حقیقت نگاری کا غیر مریضانہ رویہ واضح کیا۔ میر، مومن غالب اور اقبال کی شاعری سے ترقی پسند عناصر کا سراغ لگایا۔ اور عصمت چغتائی اور محمد حسن عسکری کے افسانوں سے ان عیوب کی نشاندہی کی جن سے اخلاقی قدروں کی شکستگی کا اندیشہ تھا۔ عزیز احمد کے خیالات کا یہ نوالہ ایسا تھا کہ ترقی پسندوں کے حلق سے آسانی سے اتر نہیں سکا۔ چنانچہ جب علی سردار جعفری نے ترقی پسندی کا تعارف ایک مخصوص نقطۂ نظر سے کرانے کے لئے کتاب لکھی تو اس میں عزیز احمد کے نظریات پر خاصہ شدید ردِ عمل موجود تھا۔ اور اس کے بعد عزیز احمد کی جدیدیت کو ترقی پسند حلقوں سے کبھی داد نہیں مل سکی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس ردِ عمل پر عزیز احمد نے کسی تیز ابی رویے کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے حقیقت نگاری کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر تخلیقات کے ذریعے پیش کرنا شروع کر دیا اور "گریز" جیسا معرکہ آرا ناول پیش کیا جو اب بھی جدید ناول کے پیش رووں میں شمار ہوتا ہے۔

"گریز" کا مرکزی کردار "نعیم" اپنے عہد کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے اور بیک وقت دو دنیاؤں میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ اس صنوبر کی طرح ہے جس کے پاؤں زمین کے گہرے پاتال میں گڑے ہوئے ہیں۔ لیکن جو بلند اور آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے کا آرزومند ہے۔ اور جب وہ اپنی دھرتی سے قطع تعلق کر کے لندن چلا جاتا ہے تو دوبارہ یہ دھرتی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اس ناول کی ہیروئن ملقیس اس ہندوستانی دھرتی کی ہی علامت ہے۔ چنانچہ جب وہ نعیم کی مراجعت کے بعد اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو اس ناول کا اساسی المیہ ابھرتا ہے۔ اور نعیم کے دل میں زیاں کا احساس بیدار ہو جاتا ہے "گریز" پیچیدہ ذہنی کیفیات کا ناول ہے اور ایک مخصوص اخلاقیات میں مصنف کے ایقان کو اجاگر کرتا ہے۔

عزیز احمد نے اجتماعی زندگی پر انسانی استحصال کو اپنے ناول "آگ" میں بڑی خوبی سے موضوع بنایا ہے۔ اور وہ آگ کو جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران ڈوگرہ راج میں کشمیر میں سلگ رہی تھی اسے بڑی فنکاری سے سماجی پس منظر میں پیش کیا۔ عزیز احمد نے اساسی طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا یہ آگ مہاجنی نظام اور جاگیرداری ماحول کو بھسم کرنے میں معاونت کر سکے گی؟ چنانچہ کشمیر میں اصل لڑائی طبقاتی سطح پر سامنے نہیں آئی بلکہ عزیز احمد نے سرمائے کو انسان کا دشمن قرار دیا وجہ یہ ہے کہ سرمایہ فرقہ واریت پیدا کرتا ہے۔ اور طبقاتی تضاد کو عمل میں لاتا ہے۔ ناول "آگ"، اشتراکی تصورات کا فکری زاویہ پیش کرتا ہے۔ اس سے ذہن میں شدید کشمکش بیدار ہو جاتی ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ترقی پسند ناقدین نے اس "ناول" کا سب سے زیادہ بائیکاٹ کیا اور اس کی انقلابی حقیقت کو پاسنگ کے برابر بھی اہمیت نہیں دی۔ حالانکہ ترقی پسند نظریئے کو جس مثبت انداز میں "آگ" میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی مثال تو ترقی پسند ناول نگاروں کے ہاں بھی نہیں ملتی۔

عزیز احمد نے زندگی کی تنقید زندگی کی عکاسی کے اندر کی ہے۔ انہوں نے حقیقت نگاری کو ہمیشہ فوٹوگرافی کے مماثل سمجھا اور اصلی اور حقیقی کے فرق کو ملحوظِ خاطر نہ رکھتے ہوئے مصنف کی غیر جانبداری کو فروغ دینے کی کوشش کی، عزیز احمد کے ناولوں میں واحد متکلم بے حد اہم ہوتا ہے۔ لیکن یہ انفرادیت صرف انہیں حاصل ہے کہ واحد متکلم عزیز احمد کے ذاتی پرتو کا شائبہ تک پیش نہیں کرتا۔ بلکہ وہ "میں" کے ذریعے ایک ایسے کردار کو سامنے لاتے ہیں۔ جو اپنی الگ شخصیت رکھتا ہے اور کہانی کے تانے بانے کو اپنے تأثرات کے تار و پود سے بُنتا ہے۔ عزیز احمد افراد میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ اور ان کے شخصی المیوں کو بڑی خوبی سے ابھارتے ہیں۔ تاہم خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے صرف شخصی المیوں میں ہی دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ ہیئتِ اجتماعیہ کی زوال پذیری کو بھی ناول کا موضوع بنایا۔ ان کا ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" اجتماعی زندگی کی چھوٹی چھوٹی تصویروں سے مرتب ہوا ہے اور ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جو روبہ زوال ہے۔ مرحوم حیدرآباد اب ہماری یادوں کا حصہ بن چکا ہے۔ لیکن عزیز احمد کے اس ناول میں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

عزیز احمد کا آخری ناول "شبنم" ایک اُلجھے ہوئے کردار کا نفسیاتی تجزیہ ہے لیکن اس کی اس خوبی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عزیز احمد نے اس ایک ناول میں تکنیک کے متعدد تجربے کئے ہیں اور یوں شبنم کے مرکزی کردار کو ابھارنے کے لئے اسے رنگا رنگ آئینوں سے منعکس کرنے کی سعی کی ہے۔ عزیز احمد نے اس ناول میں دھرتی کو متحرک، متلون اور تنوع پسند دکھایا ہے۔ اور شبنم کی ہنگامہ آرا شخصیت سے بے حس زندگی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ یہ تجربہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد تھا۔ جنس اور جذبات کا ایک واضح نظریہ اس کے بین السطور موجود ہے۔ اس ناول کا

بیانیہ خاصہ بیرنگ ہے۔ لیکن عزیز احمد نے مقصد یا نظریئے کو چیخنے چنگھاڑنے کا موقعہ نہیں دیا اور ناول کی دلچسپی میں کمی نہیں آنے دی۔

عزیز احمد کے ناول اور ان کی تنقید نے اہل ادب کو اس قدر متاثر کیا کہ اب وہ پہلے ناول نگار اور پھر نقاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی افسانہ نگاری اس شہرت میں کچھ دب سی گئی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جو تجربے اُردو افسانے میں کئے ہیں۔ ان کی قدر و قیمت کسی طرح بھی ان کے ناولوں سے کم نہیں۔ عزیز احمد کا موقف یہ ہے کہ وقت کبھی نہیں مرتا۔ انسان کا اور قوموں کا اور تہذیبوں کا ماضی زندہ رہتا ہے اور یہ حال کے لمحے میں باقاعدہ سانس لیتا ہے اس موقف کو انہوں نے "مدن سینا اور صدیاں" اور "آبِ حیات" میں بڑی خوبی سے پیش کیا ان افسانوں میں ایک زمانہ مرجاتا ہے۔ لیکن اسی کے بطن سے ایک اور زمانہ پیدا ہو جاتا ہے جو جذباتی اور واقعاتی طور پر پہلے زمانے سے مختلف نہیں ہوتا۔ چنانچہ "شیریں فرہاد" "مدن سینا" اور "ڈوری گن آرسے لیس" کی کہانیاں بدلے ہوئے ماحول کے باوجود ایک جیسا جذباتی تاثر پیدا کرتی ہیں اور زمانی اعتبار سے ایک بڑے دائرے کو مکمل کرتی ہیں۔ "رقصِ ناتمام" میں اس تصور کو ایک خیالیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ایک ننھی سی جان کی پیدائش کو باپ کی بے چینی اور پریشانی کے ساتھ یوں وابستہ کیا گیا ہے کہ پوری زندگی کا عرصہ اس ایک لمحے میں سماجاتا ہے۔ "سستا پیسہ" اور "زرخرید" میں عزیز احمد نے مادے کی فراوانی سے زندگی کا انتشار نمایاں کیا۔ عزیز احمد کے بیشتر افسانوں پر لیپ اور جنس دونوں چھائے ہوئے ہیں تاہم خوبی کی بات یہ ہے کہ عزیز احمد لیپ سے مرعوب نہیں ہوئے اور جنس کے بے باکانہ اظہار نے ان کے ہاں لذتیت کی کیفیت پیدا نہیں کی۔ "پگڈنڈی" کی ای ودن جنسی لحاظ سے برانگیختہ لڑکی ہے اور آزاد اس سے ن م راشد کی نظموں کے غلام کی طرح انتقام لینے پر آمادہ ہے۔ لیکن جس بے لاگ انداز میں عزیز احمد نے اس سارے عمل کو پیش کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مقصد کردار کے داخل سے قوت اور روشنی کے ماخذ کو بیدار کرنا ہے۔ اور انہوں نے ڈی ایچ لارنس کی طرح جنس کو مذہب کا درجہ دینے کی کوشش نہیں کی۔

مجموعی طور پر یہ کہنا کافی نہیں کہ عزیز احمد اُردو افسانے کا ایک اہم نام ہے بلکہ میں یہ باور کرلنے کا آرزومند ہوں کہ عزیز احمد نے اُردو افسانے کو نئے موضوعات اور نئے اسالیب سے روشناس کرایا۔ انہوں نے افسانہ نگار کو افسانے سے لذت حاصل کرنے کے بجائے غیر جانبداری سے حقیقت کی عکاسی کا سبق دیا۔ ان کے افسانوں کے پس پشت ایک ایسی شخصیت موجود نظر آتی ہے۔ جس کا مطالعہ ادب کئی زمانوں پر محیط ہے اور جو ان زمانوں کو ایک تخلیقی لڑی میں پرونے کا سلیقہ جانتا ہے۔ اس لحاظ سے عزیز احمد نہ صرف پرانے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ بلکہ وہ نئے لوگوں کے لئے نئے تجربوں کا محرک بھی ہے

تنقید، ناول اور افسانے کے علاوہ عزیز احمد کی ادبی شخصیت ایک مترجم کے طور پر بھی بے حد مستحکم ہے۔ شعریات پر ارسطو کی بوطیقا ادب کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور یہ اتنی ثقیل ہے کہ اس کا ترجمہ رواں دواں اُردو میں کرنا اور ارسطو کے اساسی نظریات کو نئے لبادے میں یوں پیش کرنا کہ اجنبی معلوم نہ ہوں بے حد مشکل کام تھا۔ لیکن اس مشکل کو عزیز احمد نے آسان کر دیا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک اس سے بہتر ترجمہ اُردو میں پیش نہیں کیا جاسکا۔ اور عزیز احمد کی اس عطا سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے دانش یونان کو اُردو میں منتقل کیا اور اہل ادب کو ارسطو سے بلا واسطہ متعارف کرا کے ان کے ذہنی افق کو بلند کرنے کی سعی کی۔ عزیز احمد کا ایک اور ترجمہ چارلس لیمب کا تاریخی ناول "چنگیز خان" ہے۔ اس ترجمے میں انہوں نے چارلس لیمب کے تخلیقی ذہن کو گرفت میں لیا ہے۔ اور اپنی روانی، شگفتگی اور رعنائی سے اسے ایک تخلیقی فن پارے کا درجہ دے دیا ہے۔

عزیز احمد کی کتاب "ترقی پسند ادب" میں اقبال ایک ایسے شاعر کے روپ میں ابھرا ہے جو انقلاب کا محرک اور انقلابی ادب کی انتہا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ نظریہ مبنی برحقیقت ہے کہ اقبال کے تخلیقی کارنامے ترقی پسند ادب کی تخلیق کے سب سے بڑے محرک بنے۔ اقبال کے بارے میں عزیز احمد کا یہ مثبت رویہ ان کے فکر کا ایک مخصوص زاویہ ہے۔ چنانچہ "اقبال ــــ ایک نئی تشکیل" میں انہوں نے اقبال پر بڑی ذمہ داری سے قلم اٹھایا اور تجزیہ و تحلیل سے فکر اقبال کے نادر گوشوں کو ابھارا۔ عزیز احمد کو اس بات کا احساس تو ہے کہ پاکستان کا تصور زیادہ تر اقبال کے ذہن کا ہی ایک نتیجہ ہے اور انہوں نے جمہوری اور اشتراکی تصورِ وطنیت کے بجائے ایک نئی طرح کی قومیت کا تصور پیش کیا۔ لیکن وہ اقبال سے مرعوب ہرگز نہیں ہوتے بلکہ انہیں ایک ایسا شاعر قرار دیتے ہیں۔ جن کی نئی تعبیر اور نئی تشکیل ضروری ہے۔ عزیز احمد کی یہ خوبی انہیں "اقبالیات" کے بہت سے

ماہرین پر فوقیت دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال پہ ان کی کتاب کو اب تک اہمیت حاصل ہے اور شاید یہ مقامِ افتخار انہیں ہمیشہ حاصل رہے گا کہ انہوں نے اقبال کو متوازن اور معتدل زاویئے سے پرکھا اور ان کے انفرادی زاویئے غیر جانبداری سے دریافت کئے۔

عزیز احمد زندگی کے آخری دور میں تحقیق کی وادی میں جا نکلے تھے۔ چنانچہ ٹورنٹو یونیورسٹی کینیڈا میں معارفِ اسلامیہ کے شعبے کے ساتھ وابستہ ہوئے تو انہوں نے برِصغیر میں مسلمانوں کی تہذیبی زندگی پر قابلِ قدر کام کیا ان کی کتابیں "مسلم کلچر ہندوستانی ماحول میں" اور "ہندوستان میں اسلام کی علمی تاریخ" لندن سے شائع ہوئیں اور اب حوالے کی کتب میں شمار ہوتی ہیں۔ عزیز احمد نے "سسلی میں فروغِ اسلام" پر بھی ایک کتاب لکھی تھی اور ایک مجموعہ ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ پر بھی مرتب کیا تھا۔ زندگی کے مختلف ادوار میں اگرچہ عزیز احمد کے اظہار کی اصناف میں تبدیلی آتی رہی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے حال کے بجائے ماضی کو زیادہ اہمیت دی، جدیدیت کی طرف قدم بڑھایا لیکن نقوشِ پارینہ سے روگردانی اختیار نہیں کی انہوں نے اپنی تہذیبی قدروں کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھا اور تکمیلِ حیات کے لئے زمان و مکان کی کروٹوں کو تخلیق، تنقید اور تحقیق میں اجاگر کرتے رہے۔

عزیز احمد ایک فاضل پاکستانی ادیب تھے۔ وہ شہرت سے بے نیاز ادبی کارنامے سرانجام دینے میں مصروف رہے اور آج جب وہ رخصت ہو گئے ہیں۔ تو ان کا جسدِ جسمانی تو واقعی ہم میں موجود نہیں لیکن وہ روشنی جو ان کے ادبی کارناموں سے چھَن چھَن کر آ رہی تھی۔ ابھی تک اُجالا پھیلا رہی ہے اور جب تک اُردو زندہ ہے اس کی تابانی قائم رہے گی۔

"ہم کچھ ایسے بے نشان نہ تھے کہ آپ اپنی ادارت کے اتنے دنوں بعد ہمارا پتہ پائیں۔ ویسے میں ماہِ نو سے بے خبر نہیں رہا! اور اس بات سے خوش ہوتا رہا کہ جس پرچے کو وقار عظیم مرحوم، اور محمد حسن عسکری مرحوم کی ادارت کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ اب پھر منزلیں پا رہا ہے۔
آپ نے جو شمارہ مجھے بھیجا، اُس میں حج کے سفرناموں پر جیلانی کامران صاحب کا مضمون بہت پسند آیا — موضوع کا سوجھنا خدا داد بات ہے۔

تا قیامت کھُلا ہے بابِ سخن

اور اس کا اطلاق آپ جیسے شاعروں (اب شاعر کی تانیث کون کرے) کے ساتھ ساتھ ہم جیسے نثر نگاروں پر بھی آتا ہے۔"

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی ——— کراچی

کارل یونگ
ترجمہ : سجاد رضوی

عرفانِ ذات

یہاں ہمیں یہ پوچھنا لازم ہے۔ کیا مجھے کوئی دینی واردات حاصل ہوئی ہے اور کیا خدا سے کوئی صلہ حاصل ہوا۔ اور اس کے نتیجے میں وہ ایقان ملا ہے۔ جو مجھے ایک فرد کے طور پر غرقِ انبوہ ہونے سے بچالے ؟

اس سوال کا کوئی مثبت جواب صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب فرد نہایت کڑے قسم کے امتحانِ ذات اور عرفانِ ذات کے تقاضوں کو پورا کرنے پر تیار ہو۔ اگر وہ اپنی نیت کو عملی جامہ پہنائے تو وہ نہ صرف اپنے بارے میں بعض اہم صداقتوں کا انکشاف کر پائے گا۔ بلکہ اسے ایک نفسیاتی برتری بھی حاصل ہو جائے گی۔ یعنی وہ اپنے آپ کو سنجیدہ توجہ اور ہمدردانہ دلچسپی کے قابل گردانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یوں کہئے کہ وہ اپنے انسانی وقار کا اعلان کرنے پر تیار ہو جائے گا اور اس طرح وہ اپنے شعور کی اساس یعنی لاشعور کی جانب پہلا قدم اٹھائے گا۔ یہ نفسِ لاشعور ہی دینی واردات کا وہ منبع ہے جس تک رسائی ممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں نفسِ لاشعور خدا کا مماثل ہے یا اس کا متبادل۔ یہ تو وہ واسطہ ہے جس کے ذریعے سے دینی واردات کا دھارا بہتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس واردات کا کوئی اور سبب کیا ہے ؟ اس سوال کا جواب انسانی علم کی حدود سے باہر ہے۔ معرفتِ خدا ایک ماورائی مسئلہ ہے۔

یہ اہم سوال جو ہمارے دور کی گردن پر ایک تلوار کے مانند لٹک رہا ہے۔ اس کا جواب دینے میں ایک دین دار شخص کو دوسروں پر برتری حاصل ہے۔ اس کا وجود داخلی جس طریقے پر اس کے اور "خدا" کے مابین تعلقات پر استوار ہے اس کا اسے واضح تصور ہوتا ہے۔ میں نے "لفظ خدا" کو واوین کے درمیان لکھا ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہم ایک ایسے مجسم بشکلِ انسانی تصور ONTHROMOPOLIC IDEA. سے بحث کر رہے ہیں۔ جس کی حرکیت اور رمزیت نفسِ لاشعور کے واسطے سے چھن کر ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی شخص بھی اس قسم کے واردات کے منبع سے قریب ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ قریب ہونا چاہے۔ خواہ وہ خدا پر ایمان لایا ہو یا نہیں۔ اس قسم کے تقرب کے بغیر صرف شاذ و نادر صورتوں ہی میں وہ معجزانہ تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ جس کی ایک مثال پال پر گذرنے والی وہ واردات ہے۔ جس سے وہ دمشق میں دوچار ہوا[1]۔ اس بات کے لئے کسی برہان کی ضرورت نہیں کہ دینی واردات کا وجود ہے۔ لیکن یہ بات ہمیشہ معرضِ شک میں رہے گی کہ ان تجربات و واردات کی اصل اساس وہ ہے جسے مابعد الطبیعیات اور دینیات میں خدا یا دیوتا کہتے ہیں۔ یہ سوال دراصل بیکار ہے اور اپنا جواب خود اس منطق کے وسیلے سے دے دیتا ہے جو واردات سے پیدا ہونے والی اس ہیبت سے ابھرتی ہے۔ جو انسان کو اپنے قبضے میں کر لیتی ہے۔ جس شخص پر یہ واردات ہو گزرے وہ اس میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور اس قابل نہیں رہتا کہ وہ مابعد الطبیعیات یا علمیات کی بے ثمر بحثوں میں حصہ لے سکے۔ یقینِ مطلق یا حق الیقین اپنے براہین و دلائل خود اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اور اسے اس امر کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ان براہین کی تلاش کرے جن کا تعلق بشری خصوصیات

---

[1] سینٹ جان پال عیسائی ہونے سے قبل عیسائیت کا شدید مخالف تھا۔ وہ دمشق گیا تاکہ عیسائیوں کو گرفتار کر لائے۔ جب وہ دمشق کے نزدیک پہنچا تو یک لخت اس کے ارد گرد ایک روشنی آسمان سے اتر کر چمکی۔ وہ فوراً زمین پر گر گیا۔ اس نے ایک آواز سنی جو اس سے کہہ رہی تھی۔ "پال، پال تم میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو۔" اس نے دریافت کیا تم کون ہو۔ آواز آئی میں عیسیٰ ہوں۔ جس کے پیچھے تم ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہو۔ لیکن اب اٹھو اور شہر میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں تمہیں بتایا جائے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔" اس کے ساتھی گم سم کھڑے تھے۔ وہ آواز تو سن رہے تھے۔ لیکن انہیں دکھائی کچھ نہ دے رہا تھا۔ جب وہ زمین سے اٹھا تو آنکھیں کھولنے پر اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس کے ساتھی اسے دمشق میں لے آئے جہاں تین دن وہ نہ کچھ دیکھ، نہ کچھ کھا پی سکا۔ (بائبل۔ عہدنامہ جدید۔ اعمال (۹))

سے ہو۔

نفسیات سے لاعلمی اور اس کے خلاف تعصب کے پیشِ نظر اس بات کو بدنصیبی گردانا چاہیئے کہ وہ ایک واردات جو وجودِ فرد میں کوئی معنی پیدا کرتی، ہو اس کا منبع اس واسطے سے تعلق رکھتا ہو جو ہر شخص کے تعصبات کا ہدف ہو۔ ایک بار پھر یہ ٹنک کانوں پر دستک دیتا "آخر ناصرہ سے کیا بھلائی مل سکتی ہے؟" اگر لاشعور کو شعور کے نیچے پڑی ہوئی کوڑا کرکٹ ڈالنے والی ٹوکری نہ بھی قرار دیا جائے۔ تو بھی اس کے بارے میں یہی فرض کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق محض فطرتِ حیوانی (یا نفسِ امّارہ) سے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی اپنی تعریف کے مطابق "لاشعور" کی حدود اور اس کی ترکیب غیر یقینی ہے۔ اس لحاظ سے اس کو ضرورت سے زیادہ یا ضرورت سے کم اہمیت دینا بالکل بے بنیاد بات ہے اور اسے تعصب کہہ کر رَدّ کیا جا سکتا ہے۔ بہر صورت اس قسم کی بات عیسائیوں کے منہ سے کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے جن کا اپنا آقا و مولا، گھریلو جانوروں کے درمیان ایک اصطبل میں پیدا ہوا تھا۔ اگر وہ اپنے آپ کو کسی عبادت خانے میں پیدا ہونے کا بندوبست کروا سکتا تو شاید یہ بات عوام کے زیادہ دل لگتی۔ اس طرح دنیا پرست انسان اس قسم کی روحانی واردات کو عوامی اجتماعات میں تلاش کرتا ہے۔ جو فردی روح کے مقابلے میں کہیں زیادہ مؤثر اور پرشکوہ پس منظر پیش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ گرجا میں جانے والے عیسائی بھی اس مہلک فریب میں شریک ہوتے ہیں۔

دینی واردات کے لئے لاشعوری طریقوں کی اہمیت پر نفسیات کا اصرار لوگوں میں مقبول نہیں ہوا ہے وہ دائیں بازو کی سیاست سے تعلق رکھتے ہوں یا بائیں بازو کی، دائیں بازو والوں کے لئے فیصلہ کن عامل تو وہ تاریخی الہام ہے جو انسان پر باہر سے وارد ہوا۔ اور بائیں بازو والوں کیلئے یہ سب کچھ محض خرافات ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا کوئی دینی عمل نہیں۔ سوائے اس کے کہ نہایت پر زور عقیدہ کہ ضرورت پڑنے پر پارٹی کے اصولوں پر ایمان لایا جائے۔ مزید برآں مختلف مذاہب، مختلف باتوں پر زور دیتے ہیں اور ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ صداقتِ مطلق اس کے پاس ہے۔ تاہم ان دنوں ایک ایسی دنیا میں بس رہے ہیں۔ جو ایک وحدت بن چکی ہے اور جس میں فاصلے اب ہفتوں اور مہینوں میں نہیں گھنٹوں میں طے کر لئے جاتے ہیں۔ ان دنوں اب عجیب و غریب انسانی نسلیں صرف علم نسلیات انسانی کے عجائب گھروں میں دکھائی نہیں دیتیں اب وہ ہماری ہمسایہ بن چکی ہیں۔ جو بات کل تک علم نسل ہائے انسانی کے عالموں تک محدود تھی وہ آج سیاسی، اجتماعی اور نفسیاتی مسئلہ بن چکی ہے۔ ابھی سے آئیڈیالوجیوں کے دائروں نے ایک دوسرے کو چھونا شروع کر دیا اور ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب اس میدان میں باہمی تفاہم کا مسئلہ بے حد اہم صورت اختیار کر لے گا۔ اپنی بات دوسرے کو سمجھانا اس وقت تک ناممکن ہو جاتا ہے۔ جب تک دوسرے کے مؤقف کا دور رس طریقے پر ادراک نہ کیا جائے۔ اس بات کے لئے جس بصیرت کی ضرورت ہے اس کا اثر دونوں طرفوں پر برابر پڑے گا۔ تاریخ یقینی طور پر ان لوگوں کو روند کر گزر جائے گی۔ جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ناگزیر تبدیلیوں کو روکنا ان کا پیشہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی روایات کی اساسی اور اچھی باتوں کو گلے سے لگائے رکھنا بہت پسندیدہ اور نفسیاتی طور پر ضروری ہے۔ تمام اختلافات کے باوصف نوعِ انسان کا اتحاد اپنا لوہا منوا کر رہے گا۔ یہی وہ پتھر ہے جس پر مارکسی اصولوں نے اپنی جان کی بازی لگا دی ہے جبکہ مغربی طاقتوں کو یہ امید ہے کہ اقتصادی امداد اور ٹیکنالوجی کے سہارے ان کی گاڑی چل سکتی ہے۔ کمیونزم نے بنیادی اصولوں کی آفاقیت اور آئیڈیالوجی کے عنصر کی بے پناہ اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ مشرقِ بعید کی قومیں اپنی آئیڈیالوجی کے کمزور ہونے میں ہماری شریک ہیں اور اسی طرح قابلِ شکست ہیں نفسیاتی عوامل کو ضرورت سے کم اہمیت دینا ایک تلخ انتقام کو دعوت دینے کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس لئے وقت آن پہنچا ہے کہ ہم اس سلسلے میں اپنی خبر لیں۔ سرِدست تو اس بات کا ایک مقدس خواہش کی حدود تک رہنا لازم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ معرفتِ ذات بے حد غیر مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ناخوشگوار حد تک مثالی ہدف ہے۔ اس میں سے اخلاقیت کی بو آتی ہے اور یہ اس نفسیاتی سائے میں گم ہے جس سے، اگر ممکن ہو تو عام طور پر انکار ہی کر دیا جاتا ہے یا کم از کم اس کا ذکر نہیں چھیڑا جاتا۔ ہمارے دور کو جس کام سے سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ حقیقتاً بے حد کٹھن ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داری کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لائیں اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ انہیں رہنماؤں کی سی غداری کے مرتکب نہ ہوں۔ یہ کام ان رہنما اور با اثر شخصیتوں کا طلب گار ہے۔ جن میں اتنی ضروری ذہانت ہو کہ وہ اس عالمی صورتِ حالات کا ادراک کر پائیں۔ جو آج کل ہمارے گرد و پیش میں برپا ہے۔ ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ضمیروں سے مشورہ لیں۔ مگر چونکہ یہ معاملہ صرف عقلی ادراک و فہم کا نہیں بلکہ اس کا تعلق اخلاقی نتائج سے بھی ہے اس لئے بدقسمتی سے رجائیت پسندی کے لئے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، فطرت اس قدر فراخدلی سے

داد و دہش نہیں کرتی کہ نہایت اعلیٰ درجہ کے ذہن کے ساتھ تحفۂ دل بھی عطا کر دے۔ عام قاعدے کے مطابق جہاں ایک موجود ہو۔ دوسرا غائب ہوتا ہے۔ اور جہاں ایک قابلیت درجۂ کمال تک پہنچتی ہے۔ وہاں تمام دوسری صلاحیتوں کا خون ہوتا ہے۔ ذہن اور جذبات میں یہ تناقض، جو ہمیشہ ایک دوسرے کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں، نفسِ انسان کی تاریخ کا ایک خاص طور پر دردناک باب ہے۔

ہمارے دور نے جو کام ہمارے اوپر لاد دیا ہے۔ اسے اخلاقی تقاضا قرار دینے میں کوئی معنی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ نفسیاتی عالمی صورتِ حالات اس قدر واضح کر دیں کہ کمزور سے کمزور نگاہ بھی اسے دیکھ پائے اور افکار و کلمات کو یوں جامۂ اظہار پہنائیں بھی کہ بہرے سے بہرا بھی انہیں سننے پر قادر ہو۔ ہمیں صاحبانِ فہم اور نیک نیت لوگوں سے اپنی توقعات وابستہ رکھنا چاہئیں اور اس لئے ان افکار اور خیالات پر جن کی ضرورت ہو بار بار زور دے کر اپنے آپ کو تھکانا نہیں چاہیے۔ اور آخر میں بات یہ ہے کہ صرف مقبولِ عام جھوٹ ہی نہیں پھلتا پھولتا۔ بلکہ سچائی بھی پروان چڑھا کرتی ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں پڑھنے والے کی توجہ اس مرکزی مشکل کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کا سامنا کرنا اس کے لئے لازم ہے۔ حال ہی میں آمری ریاستوں نے بنی نوعِ انسان پر جو مظالم ڈھائے ہیں وہ ان اعمالِ جور و ستم کے نتیجے کے سوا اور کچھ بھی نہیں جو ہمارے اسلاف نے ماضی قریب ہی میں روا رکھے تھے۔ یورپ کی تاریخ میں عیسائی اقوام جن وحشیانہ اعمال کی مرتکب ہوتی ہیں۔ اور خون کی جو ندیاں انہوں نے بہائی ہیں ان کا ذکر تو ایک طرف، اہلِ یورپ کو ان تمام جرائم کا جواب بھی دینا ہیں جو ان سے مستعمرات قائم کرنے کے دوران سیاہ فام اقوام کے خلاف سرزد ہوئے۔ اس اعتبار سے سفید انسان بہت بڑا بوجھ لادے پھر رہا ہے۔ یہ ہمیں عام انسانی سانحے کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جسے مزید سیاہ رنگ دینا ممکن ہی نہیں۔

وہ برائی اور وہ شر جو انسان میں ظاہر ہوتا ہے اور بے شک اس میں بستا ہے۔ اس قدر بڑا ہے کہ اس کے مقابلے میں اہلِ کلیسا کا اصل گناہ کی بات کرنا اور اسے آدم و حوا کی معمولی سی غلطی کے دامن سے باندھ دینا بات کا بتنگڑ بنانا لگتا ہے۔ یہ معاملہ کہیں زیادہ ہولناک ہے۔ اور اسے اس سے کہیں کم اہمیت دی گئی ہے۔

چونکہ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ انسان وہی کچھ ہے۔ جو اس کا شعور اپنے بارے میں جانتا ہے، اس لئے انسان اپنے آپ کو بے ضرر اور معصوم گردانتا ہے۔ اور یوں ناانصافی کے ساتھ حماقت کا ارتکاب بھی کرتا ہے۔ وہ اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ بڑی بڑی ہولناک باتیں ہو چکی ہیں۔ اور اب تک ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہمیشہ دوسرے کرتے ہیں۔ اور جب یہ وحشیانہ اعمال ماضی قریب یا بعید سے متعلق ہوں تو وہ بڑی جلدی دریائے نسیاں میں غرق ہو جاتے ہیں اور جلد ہی وہ حالت عود کر آتی ہے جسے عرفِ عام میں حالات کا معمول پر آنا کہتے ہیں۔ اس کے بالکل برخلاف بات یہ ہے کہ نہ تو کوئی شے بالکل غائب ہوتی ہے اور نہ کوئی نقصان پورا کیا گیا ہے۔ شر، جرم، ضمیر کی بے تابی اور نامعلوم قسم کے شکوک و شبہات سب کے سب ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم انہیں دیکھنے پر تیار ہوں۔ یہ سب کچھ انسانوں کا کیا دھرا ہے۔ میں بھی انسان ہوں۔ جس کا فطرتِ انسانی میں اپنا حصہ ہے۔ اس لئے میں بھی دوسرے کے مانند مجرم ہوں اور میرے اندر وہ قابلیت اور وہ رجحان بغیر کسی تبدیلی کے ویسے کے ویسا موجود ہے جو ان جرائم اور ان برائیوں کا سبب رہا ہے اور آئندہ بھی کسی وقت ہو سکتا ہے۔ اگر قانونی نقطۂ نظر سے ہم ان جرائم میں شریک اور معاون نہ بھی ہوں تو ہم امکانی طور پر اور بالقوۃ مجرم ہیں اور اس بات کے لئے ہم اپنی فطرتِ انسانی کے مرہونِ منت ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں وہ موقع ہی نہ مل پایا کہ ہم بھی آگ اور خون کی اس ہولی میں شریک ہوتے۔ ہم میں سے کوئی بھی انسانیت کے سیاہ اجتماعی سائے کی حدود سے باہر نہیں۔ جرم چاہے صدیوں پہلے ہوا یا آج ہو رہا، ہر صورت میں یہ ایک میلانِ طبیعت کا آئینہ دار ہے۔ جو ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم شر کی پہچان کے لئے اپنی قوتِ متخیلہ سے کام لیں کیونکہ صرف بے وقوف ہی اپنی فطرت کی کیفیتوں کو دائمی طور پر نظر انداز کر سکتا ہے۔ درحقیقت، یہ نظر اندازی اور بے پرواہی ہی اسے شر کا آلۂ کار بنانے کا بہترین وسیلہ ہیں۔ سب سے فردی یا سادہ لوحی اسی طرح کام نہیں دیتی جس طرح ہیضے کے مریض اور اس کے گرد و پیش کے لوگوں کو اس مرض کے جراثیم کے متعدی ہونے کی لاعلمی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کے برعکس، وہ اس انجانے شر کو "دوسروں" میں ظاہر ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ اس سے مخالفین کو بڑے مؤثر طریقے سے تقویت پہنچتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ یہ ظہورِ شر اپنے ساتھ اس خوف کو لے آتا ہے جو ہم غیر ارادی اور خفیہ طور پر اس شر کے بارے میں محسوس کرتے ہیں جو ہم نے اپنے مخالفوں کو دیا ہے اور یوں مخالفوں کی دھمکیاں ناقابلِ برداشت بنتی چلی

جاتی ہیں۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ ہمارے اندر بصیرت کی کمی ہمیں شر سے دو دو ہاتھ کرلینے کی صلاحیت سے محروم کردیتی ہے۔ اب یہاں ہمیں عیسائی روایات کے بڑے بڑے تعصبات کا سامنا کرنا ہے اور یہی تعصبات ہمارے طریق ہائے کار میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہمیں شر کو برداشت کرلینا چاہیے نہ تو اس کے نزدیک ہونا چاہیے اور نہ اس کا ذکر ہی کرنا چاہیے۔ کیونکہ شر بدشگونی کی بات بھی ہے۔ اس لئے اس کا ذکر بھی حرام ہے اور اس سے ڈرنا بھی لازم۔ شر کے بارے میں یہ رجحان اور بظاہر اس سے دور دور رہنے کے رویے نے ہمارے اندر اس برائی کے رجحان کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے۔ جس کے مطابق شر کو دیکھ کر ہمیں آنکھیں بند کر لینی چاہئیں اور کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اسے کسی اور جانب بھگا دیں۔ جس طرح عہد نامۂ عتیق یا توریت میں قربانی کے بکرے کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وہ شر کو اپنے اوپر لاد کر جنگلوں اور ویرانوں میں پھینک آتا ہے۔

لیکن اگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہرچند شر کو انسان نے کبھی اپنے ارادہ سے اختیار نہیں کیا تاہم یہ فطرتِ انسانی میں جاگزیں ہے اور نفسیات کی سٹیج پر خیر کے برابر اور اس کے مخالف شریک کار کی حیثیت سے کارفرما ہے۔ اس بات کو تسلیم کرنے سے ہم نفسیاتی، ثانویت (DUALISM) پر آپہنچتے ہیں جو پہلے ہی سے غیر شعوری طور پر سیاسی دنیا کی دھڑے بندیوں میں ظاہر ہو رہی ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ اور جدید دور کے انسان میں داخلی توڑ پھوڑ کی شکل میں اُبھرتی ہے۔ یہ ثانویت شر کی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ہم ابتدا ہی سے دو لخت صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ یہ خیال کرنا ناقابلِ برداشت بات ہوگی کہ اس قسم کی مجرمانہ ذہنیت کے لئے ہمیں ذاتی ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔ اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ ہم شر کو کسی ایک مجرم یا مجرموں کے ایک گروہ سے منسلک کردیں اور ارتکابِ جرم کے عام رجحان کو نظرانداز کرکے نہایت معصومی سے اپنے ہاتھ دھونا شروع کردیں۔ لیکن آخرکار یہ منافقت نبھائی نہیں جاسکتی۔ کیونکہ ہمارا تجربہ ہمیں اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ شر خود انسان کے اندر موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عیسائی تصورات کے مطابق کوئی شخص شر کے بارے میں کوئی البعدالطبیعاتی اصول وضع کرلے۔ اس نقطۂ نظر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یوں انسانی ضمیر کو اس قدر بڑی ذمہ داری سے بری قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور تمام الزام شیطان کے سر منڈھا جاسکتا ہے اور یہ بات اس امر کی درست نفسیاتی توجیہ ہے کہ انسان اپنی نفسیاتی ترکیب کا اس کے خالق کے مقابلے میں کہیں زیادہ شکار ہے۔

یہ بات مدِنظر رکھتے ہوئے کہ ہمارے دور کے شر نے انسان کو عذاب میں مبتلا کرنے والی ہر چیز کو گہری تاریکی میں چھپا رکھا ہے، یہ سوال کرنا لازم آتا ہے کہ عدل و انصاف مہیا کرنے کے تمام طریقوں، دواسازی، ٹیکنالوجی، انسانی زندگی اور صحت کے بارے میں ہمارے تمام غور و فکر اور ان تمام میدانوں میں ترقیوں کے باوصف ایسا کیوں ہے کہ تباہ کاری کے ہولناک ذریعے بھی ایجاد ہوتے ہیں۔ جو تمام نسلِ انسانی کو ملیامیٹ کرسکتے ہیں؟

کوئی شخص بھی اس بات کو تسلیم کرنے پر تیار نہ ہوگا کہ ایٹمی طبیعیات کے تمام ماہرین مجرموں کا ایک گروہ ہیں کیونکہ یہ انہیں کی کارگذاریوں کا نتیجہ ہے کہ ہمیں انسانی اپج اور قوتِ ایجاد کا وہ خاص ثمرہ حاصل ہوا ہے جسے ہائیڈروجن بم کہتے ہیں۔ نووی طبیعیات کو پروان چڑھانے میں جس قدر عظیم ذہنی کاوشوں کا دخل ہے وہ کاوشیں سب کی سب ان انسانوں نے کیں۔ جنہوں نے تن من دھن سے اپنے آپ کو اپنے کام کے لئے وقف کردیا اور ذاتی قربانیوں اور ایثار سے کام لیا۔ اور یہ بھی کہ ان کی اخلاقی تحصیلات اس قابل ہیں کہ انسانیت کے لئے بے حد مفید اشیا ایجاد کرنے کا سہرا اُن کے سر باندھا جائے۔ لیکن کسی عظیم ایجاد کے سلسلے میں پہلا قدم شاید کسی شعوری فیصلے کا نتیجہ ہو۔ تاہم یہاں بھی اور ایجادات کے مانند، جو بات اصل میں کارفرما ہے وہ ایک ارتجالی خیال، ایک وجدانی سوچ ہے۔ دوسرے لفظوں میں، لاشعور بھی اس سلسلے میں شریک ہوتا ہے اور بڑے فیصلہ کن انداز میں حصہ لیتا ہے۔ اس پر صرف شعوری کوشش ہی نہیں جو آخری نتیجہ مرتب کرتی ہے۔ بلکہ کسی نہ کسی صورت میں، لاشعور، اس کی مخفی نیتیں اور مبہم اہداف بھی دخل انداز ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص آپ کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار دے دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نہ کسی قسم کی جارحیت مقصود ہے۔ سائنس کا سب سے اہم ہدف صداقت کا علم حاصل کرنا ہے اور اگر روشنی کی تلاش کرتے کرتے ہم کسی شدید خطرے سے دوچار ہو جائیں تو خیال یہ ہوتا ہے کہ ایسا پہلے سے سوچ سمجھ کر نہیں کیا گیا بلکہ تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔ یہ بات درست نہیں کہ دورِ جدید کا انسان ہی زیادہ شر انگیز ہوسکتا ہے اور قدیم کے انسان کم تھے۔ انسانِ جدید کے پاس اپنے میلاناتِ شر کو تسکین دینے والے ذرائع مقابلتاً بہتر اور زیادہ مؤثر ہیں۔ جوں جوں اس کے شعور میں وسعت اور تنوع پیدا ہوتا ہے۔ توں توں اس کی فطرت کے اخلاقی پہلو دبنے لگتے ہیں۔ یہی وہ سب سے بڑا مسئلہ ہے جس سے ہم آج دوچار ہیں۔

محض عقل کافی نہیں۔

نظریاتی طور پر، یہ بات عقل کے بس میں ہے کہ وہ انسان

انتشاق نووی کو ایک ہولناک تجربے سے باز رکھے اور کسی
بنا پر نہیں تو محض اس لئے کہ یہ تجربے خطرناک ہیں۔ لیکن اس
شر کا خوف جو انسان اپنے اندر نہیں بلکہ کسی اور میں دیکھتا ہے'
عقل کو اپنی کارفرمائی سے ہر بار روکتا ہے۔ ہرچند کہ ہر شخص
یہ جانتا ہے کہ اس قسم کے ہتھیار کے استعمال کرنے کا مطلب
ہماری دنیا کا یقینی خاتمہ ہے۔ عالمی تباہی کا خوف شاید ہمیں
بدترین تباہی سے محفوظ رکھے تاہم اس کا امکان اس وقت
تک ہمارے سروں پر تاریک بادلوں کے مانند مسلط رہے
گا۔ جب تک اس عالمی نفسیاتی اور سیاسی انشقاق کو جوڑنے
کے لئے کوئی پل دریافت نہیں ہو جاتا۔ ایسا پل جس کا وجود اتنا
ہی حقیقی ہو۔ جس قدر ہائیڈروجن بم۔ اگر ایک عالمی شعور جاگ
اٹھے اور کہے کہ تمام دھڑے بندیاں اور تمام دشمنیاں اس
بنا پر ہیں کہ نفس کے متضاد عناصر الگ الگ ہو گئے ہیں
تب اس بات کا پتہ چل سکے گا کہ کہاں سے کام شروع کیا
جائے۔ لیکن اگر انسانی روح کی بالکل معمولی اور بالکل ذاتی
حرکات، جو بذات خود کچھ بھی نہیں، لاشعور ہی میں رہیں
اور پہچانی نہ جا سکیں۔ تو وہ اکٹھا ہوتی رہیں گی۔ اور ان کے
نتیجے میں اور گروہ بندیاں ظاہر ہوں گی اور مزید تحریکیں چلیں
گی۔ جن پر معقول طریقوں سے قابو نہ پایا جا سکے گا اور ان
سے کوئی مفید نتیجہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ وہ تمام براہ راست
کاوشیں جو اس مقصد کے حصول کے لئے صرف ہوتی ہیں
محض پادر ہوا باتیں ہیں گویا کوئی سائے سے جنگ آزما ہو
اور وہ لوگ جو سب سے زیادہ اس فریب نظر اور التباس
کا شکار ہوتے ہیں خود یہ کاوشیں کرنے والے ہیں۔

فیصلہ کن بات فرد کے ہاتھ میں ہے۔ جو اپنی نفسی
ثنویت کا کوئی جواب حاصل نہیں کر سکا۔ صدیوں تک اس
تسکین دہ اعتقاد رہا ہے کہ خدائے واحد نے انسان کو اپنا
شبیہ بنا کر پیدا کیا ہے اور وہ خود ایک نفسی مثنی وحدت
ہے۔ ــــــــ تاریخ عالم کے تازہ ترین واقعات
نے انسان کو ایک ہولناک گڑھے کے کنارے لا کھڑا کیا
ہے۔ آج بھی لوگ اس حقیقت سے زیادہ تر بے خبر ہیں
کہ ہر فرد مختلف بین الاقوامی تنظیمات کے ڈھانچے میں ایک
خلیہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لئے سبھی طور ان کے
باہمی تصادم میں پھنس جاتا ہے۔ انسانی فرد یہ جانتا ہے
کہ ایک فرد کی حیثیت سے وہ کم و بیش بے معنی وجود کا
مالک ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسی طاقتوں کے
چنگل میں ہے۔ جن پر قابو پانا ممکن نہیں۔ لیکن دوسری جانب
وہ اپنی ذات میں ایک خطرناک سائے کو بھی سینے سے
لگائے بیٹھا ہے جو اس کا مخالف بھی ہے اور جو سیاست
کے دیو کی سیاہ کاریوں میں اس کا ان دیکھا مددگار بھی۔
سیاسی جماعتوں کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ
ہمیشہ اپنے مخالف گروہ میں شر کا وجود دیکھتی ہیں بالکل اسی
طرح جیسے فرد میں یہ ناقابل ازالہ رجحان ہوتا ہے کہ وہ ہر اس
چیز سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے وہ واقف نہ ہو
اور اپنے بارے میں کچھ بھی جاننا نہیں چاہتا اور اسی لئے وہ
کسی اور پر ذمہ داری ڈال دیتا ہے۔

اخلاقی رضامندی اور ذمہ داری کے فقدان سے بڑھ
کر کوئی بات بھی معاشرے پر مغایرت کے اثرات نہیں
ڈالتی۔ اور کوئی بات بھی ایک دوسرے میں برائی تلاش
نہ کرنے کے رجحان سے زیادہ تفاہم اور ہم خیالی کی فضا
پیدا نہیں کرتی۔ یہ لازمی اصلاحی اقدام نقد ذات کا تقاضا کرتا
ہے کیونکہ کوئی شخص صرف دوسرے سے یہ بات نہیں کہہ
سکتا کہ وہ اس میں برائیاں تلاش نہ کرے۔

فرد دوسرے کو اس حیثیت میں تسلیم نہیں کرتا جو وہ
ہے چہ جائیکہ وہ اس کی اصل حیثیت سے زیادہ قبول کرے۔
ہم اپنے تعصبات اور اپنے التباسات صرف اسی وقت پہچان
سکتے ہیں جب ہم اپنے اور دوسروں کے بارے میں زیادہ
نفسیاتی معلومات کی بنا پر اپنے مفروضات اور دعووں کے
مطلق طور پر سچا ہونے پر شک کرنا شروع نہ کریں اور انہیں
احتیاط اور دیانت داری سے معروضی حقائق کے ساتھ ملا کر
نہ دیکھیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ نقد ذات کا تصور مارکسی ملکوں
میں بہت مقبول ہے۔ لیکن وہاں اس تصور کو اپنی آئیڈیالوجی
کی ضروریات کے ماتحت کر دیا گیا ہے اور اس کے لئے
لازم قرار دیا گیا ہے کہ نقد ذات انسانوں کے باہمی معاملات
میں انصاف و صداقت کے بجائے ریاست کی خدمت کرے۔
عوامی ریاست کی یہ نیت ہرگز نہیں کہ وہ افراد کے مابین تعلقات
اور تفاہم کو فروغ دے بلکہ اس کی کوشش یہ ہے کہ ہر فرد کو
نفسیاتی طور پر تنہا اور اکیلا کر دے۔ جس قدر افراد ایک دوسرے
سے غیر متعلق اور الگ تھلگ ہوں گے اسی قدر ریاست مضبوط
اور یکجان ہوگی اور اسی طرح جس قدر افراد ایک دوسرے کے
قریب ہوں گے۔ اسی قدر ریاست کمزور ہوگی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جمہوری ممالک میں
بھی افراد کے مابین جو فاصلہ اور خلا موجود ہے وہ اس سے
کہیں زیادہ ہے جو عوام کی بہبود اور ان کی نفسیاتی ضروریات
کا تقاضا ہے۔ یہ درست ہے کہ عوام کی مثالیت پسندی ان
کے جوش و خروش اور ان کے اخلاقی ضمیروں سے مدد لے کر
ہر قسم کی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ بڑے واضح معاشرتی اور
اجتماعی تضادات کو ختم کیا جائے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے
کہ اس سلسلے میں بنیادی نقد ذات سے کام لینا ہر شخص بھول
جاتا ہے اور اس سوال کا جواب نہیں دیتا کہ کوئی شخص مثالی

تقاضے کر رہا ہے؟ کیا یہ وہ شخص ہے جو اپنے ہی سائے پر سے اس لئے کود جاتا ہے کہ اپنے آپ کو ایک ایسے مثالی پروگرام میں زبردستی داخل کر لے جو اس کے لئے مناسب بہانہ مہیا کر سکتا ہو؟ داخل کی تاریک اور بالکل مختلف دنیا کو نظر فریب رنگوں میں چھپانے پر کسی قدر ظاہری التفاتیات اور احترام کی گنجائش نکل سکتی ہے؟ انسان سب سے پہلے اس بات کا یقین حاصل کرنا چاہتا ہے کہ جو شخص مثالی باتوں کا ذکر کر رہا ہے۔ وہ خود کس حد تک مثالی ہے تاکہ اس کے اقوال اور افعال اپنے ظاہر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوں۔ مکمل طور پر مثالی ہونا ناممکن ہے لہٰذا یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جس کو جامۂ عمل پہنانا ممکن نہیں۔ چونکہ ہم اس سلسلے میں بڑے حساس واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے زیادہ تر مثالیتیں جو ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں اور جن کے بارے میں ہمیں وعظ کئے جاتے ہیں، کھوکھلی دکھائی دیتی ہیں اور اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔ جب تک کہ ان کے برعکس باتوں کا اعتراف نہ کر لیا جائے۔ اس کے بغیر ہر مثالیت انسانی طاقت سے باہر ہو جاتی ہے۔ اور ناقابلِ اعتبار کیونکہ اس صورت میں وہ محض گیدڑ بھبکی بن جاتی ہے۔ اگرچہ یہ نیک نیتی سے ہی ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس میں خشکی اور یبوست بھی نظر آتی ہے۔

گیدڑ بھبکی دینا لوگوں کو مغلوب کرنے اور دبانے کا ناجائز طریقہ ہے اور اس کا اچھا نتیجہ کبھی نہیں نکلتا۔ دوسری طرف سائے کا اعتراف کرنا انکسار کی علامت بن جاتا ہے جو نقص کا اعتراف کرنے کے لئے ضروری ہے۔ جب کبھی کوئی انسانی رشتہ استوار کرنا مقصود ہو یہ شعوری اعتراف اور دوسروں کو مراعات دینا ضروری ہے۔ انسانی رشتہ کمال اور تمیز کی بنیادوں پر استوار نہیں ہوا کرتا۔ کیونکہ دونوں اختلافات کو روشن کرتے ہیں اور بالکل الٹا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انسانی رشتہ عدمِ کمال اور نقص پر مبنی ہوتا ہے اور اس چیز پر استوار ہوتا ہے۔ جو کمزور ہو، بے قدر ہو، ناچار ہو اور حمایت کی طالب ہو۔ یہی باتیں اعتماد کی بنیاد اور اس کی محرک ہیں۔ کامل کو دوسروں کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن نقص کو مدد درکار ہوتی ہے۔ اس لئے ناقص اور کمزور دوسروں کی حمایت کا طالب ہوتا ہے اور اپنے شریکِ کار کے سامنے کبھی کوئی ایسی چیز پیش نہیں کرتا جو اسے کمتر حیثیت دے یا اسے نیچا دکھائے۔ جہاں مثالیت کی کارفرمائی زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں احساسِ بیچارگی اور شرمندگی زیادہ جلدی اور اکثر ابھرتے ہیں۔

اس قسم کے افکار کو بے کار کی جذباتیت تصور نہیں کرنا چاہیے۔ انسانی رشتوں اور ہماری معاشرت کی داخلی یکجائی کا مسئلہ بہت اہم اور ضروری ہے اور وہ اس لئے کہ ایک عام آدمی بالکل تنہا اور الگ تھلگ کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے ذاتی تعلقات عام شک اور عدمِ اعتماد کی فضا سے کمزور کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں کہیں انصاف غیر یقینی ہو، پولیس تاک میں ہو اور خوف کا راج ہو۔ وہاں افراد اپنی تنہائیوں میں گرفتار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جو آمری ریاست کا مقصد اور ہدف ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد ہی ان معاشری وحدتوں کو یکجا کرنا ہے۔ جن میں سے امکانات نچوڑ لئے گئے ہوں۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے، آزاد معاشرے کو ایک ایسے صلے کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد جذبات و عواطف پر ہو یعنی ہمسائے کے ساتھ محبت و الفت کا رشتہ استوار کرنے کے عیسائی تصور کی طرح کے کسی اصول پر۔ لیکن دوسروں میں عیب جوئی کی بنا پر پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کی وجہ سے سب سے زیادہ زد پڑتی ہے تو دوسرے انسانوں سے محبت و الفت پر۔ اس لئے آزاد معاشرے کے حق میں یہ بات بے حد ضروری ہے کہ وہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسانی تعلقات کے مسئلے پر غور کرے۔ کیونکہ انہی تعلقات پر معاشرے کی وحدت، یکجائی اور طاقت کا انحصار ہے۔ جہاں محبت رک جاتی ہے وہاں اقتدار کے قدم بڑھتے ہیں۔ اور پھر خوف و تشدد کے۔

یہ افکار اس لئے پیش نہیں کئے گئے کہ مثالیت سے اپیل کی جائے بلکہ محض اس لئے کہ نفسیاتی صورتِ حال کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ مثالیت اور عوام کی بصیرت میں سے کون زیادہ کمزور ہے۔ مجھے تو صرف یہ معلوم ہے کہ دور رس اور دیرپا نفسیاتی تبدیلیاں لانے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ بصیرت جو آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس مثالیت کے مقابلے میں زیادہ دیرپا اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ جو جوش و خروش سے یک لخت ابھرے اس کا زیادہ دیر تک باقی رہنا ممکن نہیں ہوتا۔

سہیل احمد خاں

عزیز احمد کے ناول

عزیز احمد کے ناول جس شعور کی نمائندگی کرتے ہیں ہو سکتا ہے۔ آج وہ ہمارے لئے قابلِ قبول نہ ہو۔ لیکن اس شعور سے آنکھیں چار کئے بغیر ہم آج بھی اپنی ذات اور اپنی معاشرت میں کارفرما بہت سے عوامل کو حقیقی معنوں میں نہیں سمجھ سکیں گے۔ عزیز احمد نے اپنے زمانے کے متضاد اور متصادم فکری رجحانات کو اپنے شعور میں جگہ دی۔ اس تصادم کا تماشا اپنے کرداروں اور اپنی ذات میں دیکھا اور اپنے ناولوں کو اس طرزِ احساس کا ترجمان بنایا۔

عزیز احمد کے ابتدائی ناولوں "ہوس" اور "مرمر اور خون" کو دیکھیں تو اُن میں چند رجحانات واضح طور پر نظر آئیں گے پہلی بات تو یہ کہ ان میں جنس کے بارے میں فرائیڈ اور ہیولاک ایلس کے نظریات کا پَرتو دکھائی دیتا ہے۔ اس زمانے میں اِن نظریات کے حوالے سے یہ ایک "نیا برِاعظم" دریافت ہوا تھا اور جبلتوں کی "کھوئی ہوئی جنت" کی بازیافت کا امکان پیدا ہوا تھا عزیز احمد ان ناولوں میں انسانی جذبے اور جبلّت کا مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں جذبے اور جبلّت کی اس "جنت" میں احساسِ گناہ کا سانپ بھی ہے اور شر کا ابلیس بھی چنانچہ اس مطالعے میں بار بار گناہ اور شر کے تلازمات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

ان ناولوں کے کردار اپنی جبلّتوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بالآخر اس آگ میں جل جاتے ہیں اور پھر گناہ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں فاؤسٹ اور میکبتھ کے جو حوالے آتے ہیں۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ناول نگار کا بنیادی مسئلہ خیر و شر کے احساس کا تجزیہ کرنا ہے "مرمر اور خون" میں تو کہانی کو جن حصوں (چند عنوانات، عدن قصۂ ہمانِ ابلیس و حکیم، گناہِ رنگین، مرمر اور خون) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی سے اس چیز کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عزیز احمد نے اپنے لارنس اور ہکسلے سے متاثر ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ عزیز احمد کا موضوع یہی ہے کہ کیا عشق اور ہوس کی حدیں ملی ہوئی ہیں۔ اسی لئے وہ بار بار جنسی جذبے کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ البتہ اس تجزیے میں بے رحم معروضیت نہیں آپائی۔ کیونکہ ان کے ہاں ان ناول نگاروں، مثلاً تورگنیف کا اثر بھی ہے، جو جذبے کے اندر ہی اندر سلگنے کی افسردہ کیفیات کو شیریں انداز میں بیان کرتے ہیں۔ دوسری طرف ان ناولوں کی ایک جہت جمال پسند مصنفوں کے نظریات سے بھی مربوط ہے۔ دونوں ناولوں میں فنونِ لطیفہ کو ایک لازمی عنصر کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ ایک ناول میں مصوّری اور دوسرے میں سنگتراشی کا حوالہ مرکزی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کردار اپنے جذبے کا نمونہ ادبی اوضاع میں ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک انسانی نفسیات کے بیان کا تعلق ہے۔ عزیز احمد نے خاص طور پر کنوٹ ہمسون کے ناول "بھوک" سے متاثر ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ "عشق یا افلاطونی عشق" کے جذبے کا ایک اور تفصیلی مطالعہ عزیز احمد نے "شبنم" میں کیا ہے۔ جہاں وہ ابتدائی دور کے جمال پسند اور رومانی عناصر کی گرفت سے آزاد ہیں اور یہاں خطوں کی تکنیک کے حوالے سے کردار کی ذات کا تجزیہ بڑی حد تک "بے تعلقی" سے کیا گیا ہے۔ عزیز صاحب کے ابتدائی ناولوں میں جن نظریات کا پَرتو ہے۔ اُن کے حوالے سے فرد اور فرد کے بھی جذبے یا جبلّت کا تجزیہ انسانی شخصیت کی کلید سمجھا گیا تھا۔ معاشرے یا تہذیبی عوامل کا ذکر آتا تو ہے۔ لیکن زیادہ تر اس اعتبار سے کہ یہ چیزیں جبلّتوں اور حسیات کی جنت کے راستے کی دیوار ہیں۔ چنانچہ "ہوس" میں پردے کی مخالفت میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس میں یہ احساس نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ آگے چل کر بھی عزیز صاحب نے فرد کو اہمیت تو دی ہے۔ لیکن بعد کے ناولوں میں تہذیبی یا ہیئتِ اجتماعی کا حوالہ بے حد اہم ہو گیا ہے۔ اب عزیز صاحب یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے

ہیں کہ فرد کا المیہ محض جبلتوں کا شاخسانہ نہیں۔ ایک خاص تہذیبی سیاق و سباق میں پیدا ہونا بھی اس کی شخصیت میں ایسے عوامل کو پیدا کر دیتا ہے۔ جن سے نبرد آزمائی کرتے اس کی عمر بیت جاتی ہے۔ اسی مرحلے پر "وقت" بطور ایک موضوع کے اُن کے فن کا اہم عنصر بنتا ہے۔ انسانی المیے میں وقت کا کیا کردار ہے۔ ایک ہی چیز ایک ہی جذبہ وقت کا تناظر تبدیل ہونے سے کس طرح بدل جاتا ہے۔ وقت کس طرح ان جذبوں کو مضحکہ خیز بھی بنا دیتا ہے اور ان میں کوئی نئی معنویت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ "گریز" میں جنس کا موضوع ایک بڑے تہذیبی پس منظر میں ظاہر ہوتا ہے۔ ای۔ ایم۔ فورسٹر کا مشہور ناول اگر ہند کی طرف سفر ہے۔ تو عزیز احمد کا ناول اسی کے متوازی "مغرب کی طرف سفر" ہے۔ یوں بھی فورسٹر کے اثرات اس ناول پر گہرے ہیں۔ جس طرح فورسٹر، کپلنگ جیسے ناول نگاروں کی روایت کے برعکس ہندوستان کو ایک مہذب سطح پر سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی طرح عزیز احمد نے مغرب کی معاشرت کے مختلف عوامل اور اقدار کی آویزش کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، کیا اجنبی تہذیب کا کوئی فرد کسی دوسری تہذیب سے کسی گہری سطح پر کوئی ربط پیدا کر سکتا ہے؟ کیا تہذیبوں کے فرق کے باوجود دوستی کی قدر دو انسانوں کی زندگی میں کوئی گہری معنویت پیدا کر سکتی ہے؟ گویا اسپینگلر اور ٹائین بی کے فکری مسائل اس ناول کے کرداروں کی زندگی میں ایک مختلف سطح پر کارفرما نظر آتے ہیں۔ "گریز" دوسری جنگِ عظیم کی آگ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے مغرب کے تذکرے پر ختم ہوتا ہے اور اس میں عزیز صاحب کا رویہ رجائی نظر آتا ہے اور وہ نعیم اور ہیروشا اور گرا کیسلے کی دوستی کو "بدنصیب انسانیت اور "مائل بہ فنا دنیا" کے لئے "امید" قرار دیتے ہیں۔

"ایسی بلندی ایسی پستی" کو عزیز احمد نے خود شجریاتی (GENEALOGICAL) ناول کہا" اور محمد حسن عسکری نے اسے اُردو کا "پہلا اجتماعی ناول" کہا۔ اس ناول میں فرد کے المیے میں تہذیب کے کردار کا جائزہ برتر سطح پر لیا گیا ہے اور اس چیز کو عزیز صاحب نے ناول کی فنی ساخت میں مرکزی جگہ دی ہے۔ "ایسی بلندی ایسی پستی" میں گشن پلی کی پہاڑیوں، فرخندہ نگر کی تاریخ اور قابلِ جنگ کے ہم عصروں کا ذکر اسی لئے ہے کہ کسی فرد کے المیئے کو اس کے اجتماعی ماحول سے مربوط کر کے دیکھا جائے اور اس میں عزیز احمد اتنے کامیاب ہیں کہ عسکری صاحب نے کہا تھا کہ یوں لگتا ہے۔ جیسے نوجہاں کا المیہ اس کی پیدائش سے بھی پہلے شروع ہو چکا ہو، اس ناول میں ایک خاندان کا المیہ دراصل پورے طبقے کا زوال ہے۔ اور حیدر آباد کے امیر طبقے کا نقشہ بے حد مؤثر گالزوردی کے "فارسائٹ ساگا" اور ٹامس مان کے "بڈن بروکس" کی طرح اس میں ایک خاندان کا طربیہ اور المیہ ہے اور ایک طبقے کے اکھڑنے کی داستان ہے۔ اس ناول میں عورت کے سلسلے میں مرد کے "حقِ ملکیت" کے تصور سے وابستہ تضادات کو سمجھنے کی سعی کی گئی ہے۔ "آگ" میں بھی عزیز احمد نے جس طرح خواجہ غضنفر جو کے خاندان اور کشمیر میں قالین کی تجارت کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس سے بھی فرد اور اس کے تہذیبی ماحول کے تعلق کے کئی رُخ سامنے آتے ہیں۔ ہیئتِ اجتماعی کے انتشار کو سمجھنے کے لئے "خاندان" واقعی ایک بے حد اہم موضوع ہو سکتا ہے اور عزیز احمد نے اس موضوع کا تجزیہ اتنی وسعت کے ساتھ کیا ہے کہ اس موضوع کی اکثر اہم جہتیں روشن ہو جاتی ہیں۔ "ایسی بلندی ایسی پستی" میں سریندر کی خود کلامیاں اُردو ناول میں ایک نادر تجربہ ہیں اور ان سے ایک طبقے کے زوال کے بارے میں ایک معروضی تصور سامنے آ جاتا ہے۔ عزیز احمد نے خود ان خود کلامیوں کو یونانی ٹریجیڈی کے کورس سے تشبیہ دی ہے۔ اور عسکری صاحب نے اس تشبیہ کے علاوہ اسے ٹی ایس ایلیٹ کی "ویسٹ لینڈ" سے بھی ملایا ہے، ایک المیہ انجام واضح طور پر سامنے آ رہا ہے۔ لیکن اسے روکنا بس میں نہیں البتہ اس کی نشاندہی کر کے انسانی تقدیر کی پیچیدگیوں کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔

"آگ" کو ایک دوسرے رُخ سے دیکھئے اور اس کا تقابلی جائزہ کرشن چندر کے "شکست" کے حوالے سے لیں تو "رومانی اور نظریاتی حقیقت نگاری" اور حقیقت نگاری کی اصل نوعیت کے درمیان فرق واضح ہو جائے گا۔ عزیز احمد نے جس طرح ایک خاندان کے ماضی اور حال کے تقابل سے تہذیبی وسعت پیدا کی ہے۔ اُس کی حیثیت محض منظر نگاری یا نعرہ بازی سے کہیں بلند ہے۔ بالزاک اور زولا کی حقیقت نگاری کی روایت کے عزیز احمد اُردو ناول میں اہم ترین ترجمان ہیں چاہے درجے میں کیسا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ (اس روایت پر مفصل بات کرنے کا یہ موقع نہیں ورنہ ہم لوکاش کے کئی اقتباسات پیش کرتے)۔

ایسی بلندی ایسی پستی" میں حیدر آباد دکن کی معاشرت کے جو نقشے ہیں اُس کی مثال تو اردو ناول میں کمیاب ہے لیکن ہم یہاں عزیز صاحب

کی جزئی خصوصیات کا تفصیلی مطالعہ نہیں کر رہے اس لئے اس پر زیادہ بات نہیں کریں گے ورنہ ڈاکیولا کی نفسیات سے عزیز صاحب کی آگاہی ناولوں میں شعروں کا استعمال، تحریف، طنز اور اس طرح کے کئی مسائل سامنے آئیں گے، ہمیں عزیز صاحب کے ناولوں کی اجتماعی اور تہذیبی معنویت ڈھونڈنی ہے۔

حیدر آباد کی معاشرت سے عزیز صاحب کا جو تعلق تھا اُس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس سلسلے میں ممتاز شیریں کی بات بھی ذہن میں رکھنے وہ کہتی ہیں کہ عزیز احمد کے ہاں حیدر آباد کا بالائی طبقہ ہے اور قرۃ العین حیدر کے یہاں یو۔پی کا، لیکن دونوں کے رویّوں میں بڑا فرق ہے قرۃ العین حیدر اس طبقے سے جذباتی طور پر وابستہ ہیں جبکہ عزیز احمد نے اس طبقے کی پستی اور مضحکہ خیزی کو واضح کیا ہے یہ بات درست ہے البتہ اس کے ساتھ ایک دو باتوں کا اضافہ بھی ضروری ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ چاہے عزیز صاحب اس طبقے کو مضحکہ خیز ہی کیوں نہ سمجھتے ہوں یہی طبقہ اُن کے فن کے لئے طاقت کا منبع بھی تھا چنانچہ اس طبقے کے بکھرنے کے کچھ عرصے بعد ہی عزیز صاحب کی ناول نگاری ختم ہو کے رہ گئی اب چاہے آپ اس کے کتنے ہی ذاتی اور دوسرے اسباب تلاش کر لیں اس خاتمے کا کوئی تعلق اس چیز سے بھی نکلتا ہی ہوگا۔ چونکہ عزیز احمد اس طبقے سے جذباتی طور پر وابستہ نہیں تھے اس لئے اس طبقے اور معاشرت کے ساتھ مزید سفر شاید انکے لئے ممکن نہیں تھا یہ بار بھی قرۃ العین حیدر ہی نے اٹھایا "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں جس تہذیبی ماحول کے کرداروں کو ایک نئے تناظر میں رکھ کر ایک بڑا استعارہ تخلیق کیا گیا ہے کیا وہ عزیز احمد کے فن کا ایک امکان نہیں جسے عزیز صاحب خود تلاش نہ کر سکے یا وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اس کو موضوع بنا ہی نہیں سکتے تھے۔ عزیز احمد اور قرۃ العین حیدر جدید اُردو ناول کے دو ایسے نمائندے ہیں جنہوں نے ناول کی تکنیک کو سمجھ کر لکھنے کی کوشش کی ہے محض کوئی لمبا قصہ بیان نہیں کیا گیا (ضمناً یہ بھی دیکھ لیجئے کہ خاندان اور ہیئتِ اجتماعی کے انتشار کو جو عزیز احمد کا بھی موضوع تھا قرۃ العین نے کیسی کیسی نئی جہتوں سے بیان کیا ہے)۔

ابھی ہم نے عزیز احمد کی ناول نگاری کے خاتمے کی طرف اشارہ کیا تھا، عزیز صاحب نے روزمرہ کی زندگی کے دائرے سے نکل کر اب "تاریخی وقت" کی طرف سفر کیا یہ چیز پہلے بھی ان کے فن میں ایک امکان کے طور پر موجود تھی لیکن اب وہ اس چیز کو اپنے کرداروں کے تہذیبی ماحول کے بیان کے سلسلے میں استعمال نہیں کر رہے تھے بلکہ تاریخ سے کچھ استعارے لے رہے تھے "مدن سینا اور صدیاں" "زریں تاج" "خدنگِ جستہ" اور اس طرح کے دوسرے افسانے اُن کے فن کی اس جہت کے ترجمان ہیں (ان کا ذکر اس لئے بے جا نہیں کہ نئے فکشن سے ان چیزوں کا طرزِ احساس کی سطح پر رابطہ نکلتا ہے۔ نئے فکشن میں روزمرہ وقت کے دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش نمایاں ہے۔ البتہ نئے ادیبوں نے "تاریخی وقت" سے بھی آگے "اساطیری وقت" تک جانے کی کوشش کی ہے)۔ پھر عزیز احمد تاریخی کہانیوں سے براہ راست تاریخ کی طرف جا نکلے۔ ناول نگار اور افسانہ نگار عزیز احمد کے خاکستر سے جس محقق اور مورخ عزیز احمد نے جنم لیا اُس کا جو بھی رتبہ ہو اور غیر ممالک میں برصغیر کی تہذیب خصوصاً مسلم تہذیب پر کام کرنے والے طلبہ کو ان کتابوں سے جتنا بھی فائدہ پہنچا ہو۔ ناول نگار عزیز احمد کی آواز اس سے کہیں توانا تھی آج ہم جنس تہذیب اور انسانی شخصیت کے بارے میں عزیز صاحب کے نظریات سے متفق نہ بھی ہوں مگر اُن کے ناول ان کے عہد کے جذباتی اور فکری مسائل کے مطالعے کے لئے اہم دستاویز ہیں۔

انتخاب ماہِ نو

عزیز احمد

اقبال اور پاکستانی ادب

پاکستان کا تصور زیادہ تر اقبالؒ ہی کے ذہن کا ایک نتیجہ ہے۔ انہوں نے جمہوری اور اشتراکی تصورِ وطنیت کے بجائے ایک نئی طرح کی قومیت کا تصور پیش کیا۔ اس تصورِ قومیت کی بنیاد رفقان کے بعض تفکرات پر مبنی ہے۔ جن کا انہوں نے ۱۹۳۰ء والے مسلم لیگ کے خطبے میں حوالہ دیا ہے۔ ہندوستانی برّصغیر کی مسلم قومیت کا تصور، ایک ایسی انسانی ثقافت کی وحدت کا تصور ہے، جس سے ایسی انسانی قدریں وجود میں آئی ہیں۔ جو دوسرے تمدنوں کو یا تو نصیب نہیں ہوئیں۔ یا انہوں نے اسی تمدن سے ان کو حاصل کیا، یا اس تمدن سے انہیں بڑی تقویت پہنچی۔ اس برّصغیر کی اسلامی ثقافت بذاتِ خود ایک انسانی اقدار پیدا کرنے والی وحدت ہے اور اسی لیے اس کا تحفظ لازم آتا ہے۔ شروع شروع میں اقبالؒ نے جغرافیائی وطنیت کی جو مخالفت کی، وہ اس وجہ سے تھی کہ اس وقت تک انہوں نے "ملی وطنیت" کا تصور پوری طرح اپنے فلسفے سے اخذ نہیں کیا تھا۔ اور جب اپنی شاعری کے آخری زمانے، یعنی ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد انہوں نے "ملی وطنیت" کے تصور کو ملت کے استحکام اور بقا کے لئے ایک ضروری شرط کے طور پر قبول کر لیا تو پاکستانی تحریک کا آغاز ہوا، جس سے ہم سب سے پہلے اقبال ہی کی تحریروں، تقریروں، ان کے کلام اور ان کے خطوط میں روشناس ہوتے ہیں۔ پاکستان اقبال کی ملی اور اسلامی شاعری کا جغرافی ظہور ہے۔

ماہِ نو

اور اسی لئے وہ عینیت جو پاکستان کے حامی اور خادم آج اپنا مقصد قرار دیتے ہیں، دراصل ان تمام اقدار پر مشتمل ہے، جن پر اقبالؒ کی اسلامی انقلابی شاعری میں زور دیا گیا ہے۔

اگر پاکستان کی تحریک میں ثقافتی عنصر خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے تو اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا تحفظ کیا جائے اور اس کی نشو و نما کی جائے۔ اس ثقافتی عنصر کو زمانے کی ضروریات کے پیشِ نظر نئی سے نئی منزل کی طرف بڑھایا جائے۔ کیونکہ اقبال کی فکر میں "اور خیال، عمل اور ارادے کی دنیا میں" ہر جگہ حرکت ہی عینِ حیات ہے۔ لیکن بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ یہی ثقافتی قدریں یہی ماضی کا تحفظ اور مستقبل کی تعمیر کی قدریں۔ اب تک پاکستانی ادب میں اپنا صحیح مقام پوری طرح حاصل نہیں کر سکیں۔

پاکستانی ادب کی تحریک اسی لئے اقبالؒ سے وابستہ ہے، اس کا کام ایک ایسے تمدن کی قدروں کو زندہ رکھنا ہے۔ جس نے ادب میں ابوالفضل، خسرو اور غالب کو پیدا کیا۔ جس نے مختلف بولیوں سے ایک نئی زبان بنائی، ایسی زبان جس کا سرمایہ دنیا کی کسی زندہ زبان کے آگے شرما کے سر نہیں جھکا سکتا۔ جس نے مصوری اور موسیقی میں اپنی ایک خاص نہج اور خاص طرز کا آغاز کیا اور اسے اختتام کو پہنچایا۔ جس نے تاج محل تعمیر کیا اور کشمیر میں ایسے باغات لگائے جن کی نظیر شاید ہی کہیں اور ہو۔ اس قوم کا خاص ایک دستورِ اخلاق ہے۔ ایک خاص زاویۂ نظر ہے۔ جس سے وہ دنیا اور طبیعیات اور زندگی کو دیکھتی ہے۔ اس میں ایک خاص طرح کی انسانیت ہے ایک خاص طرح کی عالی ظرفی ہے۔ جس سے وہ رنج اور انبساط دونوں کو اسیر کر سکتی ہے۔ زندگی کی دوڑ میں اس قوم اور اس تمدن نے بھی بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اور سب سے بڑی قربانیاں تو اقبالؒ کے مرنے کے بعد تقسیم کے بعد کے قتلِ عام میں دی ہیں۔ اس قوم، اس تمدن اور اس کی ثقافت نے جو کچھ تخلیق کیا۔ وہ کوئی اتفاقی یا اضطراری عمل نہیں تھا، یہ ایک باشعور، مسلسل، باسلیقہ حرکت تھی جو اپنی تخلیق کے محرکات اور اس کے نتائج میں دوسری قوموں اور دوسرے محرکات سے ممتاز ہے، خواہ دوسری قومیں اس کی ہمسایہ ہی کیوں نہ ہوں اور اس کے اپنے گھر ہی میں کیوں نہ رہتی ہوں۔ اس نے دوسروں سے اثرات قبول کئے ہیں اور دوسروں کو متاثر کیا ہے لیکن صدیوں کے تاریخی میل جول یا مقابلے میں کبھی اس نے اپنی انفرادیت اپنی منفرد تخلیقی صلاحیت نہیں کھوئی۔ وہ کبھی کسی اور ثقافت کسی اور تمدنی تحریک میں جذب نہیں ہونے پائی اور اسی لئے وہ آج تک زندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اور فنونِ لطیفہ کی یہ پاکستانی تحریک کوئی علیحدہ نہیں۔ یہ وہی شے ہے جو کل کی ملی تحریک تھی۔ اب اسے وہ جغرافی ذرائع وہ معاشی وسائل حاصل ہو گئے ہیں جو پہلے تھے اور اسی لئے اس کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہونی چاہیئے۔

(اقتباس)

اداجعفری

حمد

وہ جو جلووں اوٹ چھپا ہے
بے ہمتا ہے بے پروا ہے
دور بسا اور ساتھ رہا ہے
اُجلی دھوپ — گھنا سایا ہے
یوں تو کس کو چاہ نہیں ہے
اس ساگر کی تھاہ نہیں ہے
میں تو بس اتنا ہی جانوں
جب بھی اس کا نام لیا ہے
اس نے بڑھ کر تھام لیا ہے

گیت مرے، آہنگ اس کا ہے
چنری میری، رنگ اس کا ہے
اَن جانی من مانی گلیوں
میرے سنگ تو سنگ اس کا ہے

ایک دیئے کی لَو سے میں نے
جگ مگ کالی راتیں کی ہیں
پچھلے پہر کے سناٹوں نے
آ کر اس کی باتیں کی ہیں
سورج کی پہلی کرنوں نے
آنکھ میں اس کی چھب دیکھی ہے
دل میں اس کی چاپ سُنی ہے

آس نراس کے سارے بندھن
آنکھ کا آنسو دھیان کا چندن
خوشیوں کے سب محل دو محلے
زخموں کے سب گہنے گجرے
میں نے اس کو سونپ دیئے ہیں

فروری ۱۹۷۹ء

اَدا جعفری

میرے گیت اُدھورے

آتی جاتی رُت کی
چاپ سنوں
اور سوچوں
آج کے دن بھی میرے گیت ادھورے
ریت ادھوری
پیت ادھوری
سارے میت ادھورے
آج کے دن بھی
دنیا مجھ کو جانے
خوشبو، روپ، سنگھار
میرا مول ابھی تک ٹھہرے
مہندی، کنگن، ہار

آس نراس کے سناٹوں میں
کس کی راہ تکوں
خوشبو خوشبو چہرے
شبنم شبنم لہجے
کن آئینوں ڈھونڈوں
اپنا ہاتھ نہ تھاما جس نے
وہ کیوں میرے سنگ چلے
کہنے والی سچ ہی کہوے
میں دیپک اور دیپک ساری رین جلے

کہ وہ اب تک نہیں پلٹا

اُجالا سسکیاں لیتا رہا گھر میں
دیا دہلیز پر جلتا رہا ـــــ جس کو
کسی جاں بخش ساعت میں
مقدّس آگ سے روشن کیا اُس نے
وہ انساں دیوتا تھا یا مسیحا تھا
وہ بھولا تو نہیں ہوگا
نہ جانے بے وفا دنیا کے
کتنے کام تھے اس کو نہ جانے کتنے دھندے تھے
کہ وہ اب تک نہیں پلٹا
دیا تو خیر بجھنے تک سدا جلتا ہی رہتا ہے
کوئی اتنا بتا دیتا
کہ وہ جن راستوں میں ہے
وہاں اس کو اندھیرا تو نہیں ملتا!

سرمد صہبائی

چَن تارہ

سب سے پہلے
کیٹرو نے شہتوت کے اونچے پیڑ سے دیکھا
آگے آگے بینڈ اور باجا
اس کے پیچھے
گھوڑے پر اک موٹا دولہا
سر پر پھولوں والی پگڑی
چہرے پر نوٹوں کا سہرا
پیچھے پیچھے
گوٹ کناری والے کپڑے
پہن کے چلتے لوگ براتی
"ماں جوانی جیوے بنرا
آئی آئی . . . . جیوے بنرا . . . . ."
"کیٹرو اب گھر واپس آجا"
کیٹرو کی ماں چوبارے سے
کیٹرو کو آوازیں دیتی
لیکن کیٹرو
اونچے پیڑ سے نیچے اترا
پہلے اس نے
ڈھول بجانے والے کی اک نقل اتاری
پھر پھولے گالوں والے کی مونچھ مروڑی
پھر گھوڑے کے پیچھے بھاگا
گھوڑے والی دم کو چھیڑا
گھوڑے نے دولتی ماری
گرا براتی اک بے چارہ
"بھاگ یہاں سے
چل منحوس تو بھاگ یہاں سے!"

کیٹرو کو دھتکاریں سارے
ننگم ننگا
کیٹرو ٹیڑھے دانت دکھا کر
ہنستا جائے
"کیٹرو اب گھر واپس آجا"
کیٹرو کی ماں چوبارے کی اوٹ سے بولے

یکدم کیٹرو نے کیا دیکھا
تیزی سے اک شخص برات سے آگے نکلا
اس کے ہاتھ میں تھا اک تھیلا
بھر بھر مٹھیاں
وہ تھیلے سے پیسے پھینکے
زن سے غول اڑیں پیسوں کے
اور پھر چھن سے واپس آئیں
کیٹرو نے جو اوپر دیکھا
اڑتا روپیہ اک چاندی کا
اس کی آنکھیں
مقناطیس کی مانند اس پر ٹھہر گئی تھیں
چلتے لوگوں سے ٹکراتا
کیٹرو اندھی دھن میں بھاگا
"کیٹرو! کیٹرو!
کیٹرو اب گھر واپس آجا!"
گندی نالی کے کیچڑ میں
چن تارے کا اصلی سکہ چمک رہا تھا
کیٹرو نے اپنی مٹھی میں

فوراً اس کو چھان لیا تھا
اِدھر اُدھر سے کیٹرو جیسے
کتنے بچے
کیٹرو کے ہاتھوں پر جھپٹے
لیکن اس نے بھینچی ہوئی مٹھی میں جیسے
روپے کو تالا مار لیا تھا

چشم زدن میں
گتھم گتھا
نوچتے بچوں سے ٹکراتا
کیٹرو اپنے گھر کو بھاگا
اس کے پیچھے بچے بھاگے
"پکڑو پکڑو
کیٹرو شیرو چور کو پکڑو!"
بھاگتے بھاگتے کیٹرو کا دم پھول گیا تھا
یکدم گلی کے موڑ پہ اس نے
ٹھوکر کھائی
سیڑھی کے اوپر سے لڑھکا
دیکھتے دیکھتے لہولہان تھا اس کا چہرہ

"کیٹرو اب گھر واپس آجا"
کیٹرو کی ماں کیٹرو کو آوازیں دیتی
چوبارے سے نیچے اتری
کیٹرو کی ننھی سی مٹھی کھلی ہوئی تھی
اس میں چن تارے کا سکہ چمک رہا تھا

فروری ۱۹۷۹ء

سرمد صہبائی

کافی

سُن سانول تُو سورج مُکھیا

تیری دید سنہری

تیری دید سنہری

تیرے دھیان کی صبحیں روشن

جسم کی پینڈیں گہری

تیری دید سنہری

دائیں بائیں موت اور جیون

اندر چوک کچہری

تیری دید سنہری

کس چادر دُہرے دکھ باندھوں

میری سانس اکہری

تیری دید سنہری

راکھ ہوا برہا کا راون

اتری رات دُسہری

تیری دید سنہری

تیری آنکھ فجر کا تارہ

پِنڈا شکر دوپہری

تیری دید سنہری

کافی

جیون ایک دھمال

جیون ایک دھمال

تن کا چولا لہر لہو کی آنکھیں مثل مشال

جیون ایک دھمال

سانولے مکھ کی شام میں چمکیں

دو ہونٹوں کے لعل

جیون ایک دھمال

سدھرائے جسموں کے اندر

جذبوں کا بھونچال

جیون ایک دھمال

وصل کی برکھا باندھ کے نکلی

ست رنگا رومال

جیون ایک دھمال

کس کے دھیان کی رُت میں ڈولے

مَن کی کچی ڈال

جیون ایک دھمال

تیری چال کی سنگت کرتی

دھڑکتے دل کی تال

جیون ایک دھمال

سانجھے دکھ سکھ، سانجھا اَن جَل

سانجھ مویشی مال

جیون ایک دھمال

کن گہری مُشکی راتوں کے

بھیدی کالے بال ؟

جیون ایک دھمال

جیون ایک دھمال

ایک دل

میں ہوا کا قافلہ
میرے لئے
اس دشتِ بے ساحل میں
اک ذرہ نہیں
ساعت نہیں
منزل نہیں

میرے گرد و پیش
دیواریں، قدیمی بت کدے
پتھروں کی مورتیں
بے جان اور بے رحم
جن میں دل نہیں
اِک ہجومِ بے کراں
جس کا کوئی ساحل نہیں
ایک تنہائی کہ جس میں ان گنت قرنیں نہاں
جس کی وسعت میں زمیں اور آسماں
ایک تنہائی مگر
جس کا کوئی حاصل نہیں۔

وقت میں ساعت نہیں
روز و شب میں، قربتوں میں فاصلوں میں
ایک بھی راحت نہیں
اس ہجومِ بے کراں میں ایک ہمدم بھی نہیں
ایک دل جس میں خوشی کیا
سایۂ غم بھی نہیں،
ایک دل
جرم گاہِ زیست میں جس کا کوئی قاتل نہیں

[1] شاعری کی جانب بیس برس بعد ظفر صدانی کا سفر

ظفر صدانی[1]

ایک نوحہ

پچھلے برس ہم اس موسم میں
یہیں ملے تھے
پس منظر میں اُودے، سبز پہاڑوں کی
بے اندازہ وسعت تھی
سامنے فصلوں کی لہراتی شادابی تھی
ندی کا پانی ایسے ہی روشن تھا
ندی کا یہ جیتا جاگتا، بہتا پانی
اُس کے پاؤں کو چھوتا آگے بڑھتا جاتا تھا
خنک ہوا ہم دونوں کو،
چھو کر چھیڑ کر آگے گذرتی جاتی تھی
پچھلے برس ہم
اس موسم میں
یہیں ملے تھے

تاوان

سر جو اٹھا کر دیکھا تو آئینے میں اپنا چہرہ تھا
رنگ وہی تھا، نقش وہی، پر بدلا بدلا لگتا تھا

ماتھا جانا پہچانا تھا، وسط میں لیکن گھاؤ تھا
آنکھوں کی گہرائی میں خواہش کا سرد الاؤ تھا

جسم کے پیچھے دور دور تک اک ویرانی وسعت تھی
لیکن اُس کے ہر ذرّے میں وہی پرانی چاہت تھی

میں نے اُس چاہت کے ڈھیلے چہرے کو پہچان لیا
گھاؤ الاؤ، درد کی وسعت، وقت نے یہ تاوان لیا

ترکی کے ہمعصر شعرا میں فاضل حسنو داغلرجہ سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء سے اب تک ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ داغلرجہ کا اسلوب ترکی شاعری کی روایت سے مختلف ہے۔ انہوں نے ترکی میں نئی نسل کے ادیبوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

درِ دانیال

یہ درِ دانیال
ایشیا نے جہاں
ہر زماں
یہ کہا
"اک قدم بھی نہ آگے بڑھاؤ، رُکو"
ایشیا نے یہ کس سے کہا
ترک بن کر کہا ایشیا نے یہ یورپ کی اقوام سے

یہ درِ دانیال
ایشیا نے جہاں
یہ کہا
"یہ نہیں راستہ"
اس نے کس سے کہا، توپ کے پاؤں سے اور سینے کے بڑھتے ہوئے پاؤں سے
کہ بڑھتے چلے آرہے تھے
وہ چٹیل پہاڑوں سے دریا کے ساحل کی جانب

یہ درِ دانیال
ایشیا نے جہاں
یہ کہا
"داخلہ منع ہے"
"کوئی آیا تو ہم راہ میں اس کی دیوار بن جائیں گے، عرش سے فرش تک"
"داخلہ منع ہے"
ایشیا نے یہ کس سے کہا
ان لٹیروں سے جن کے ہیں سونے کے دانت
اور تو

فاضل حسنو داغلرجہ
ترجمہ: احسن علی خان

افلاس

(شہادت سے پہلے ایک ویتنامی مجاہد کی سوچ)

یہ جنگ ہے، زمیں سے آسمان تک
مجھے جلاؤ
ہاں، مجھے جلاؤ تم
مگر یہ بَن کہ جس نے مجھ کو دی پناہ
اس کو مت جلاؤ تم

یہ جنگ ہے، تمہارے جی میں جو بھی آئے وہ کرو
مرے اس آسمان کو جلاؤ تم
یہ میری راتیں ہیں
انہیں بھی آگ دو جو چاہو تم
مگر یہ میری گائیں مت جلاؤ تم
میں جانتا ہوں یہ تو جنگ ہے
جلاؤ، میرا دل جلاؤ تم
مری محبتوں کو آگ دو جو چاہو تم
مگر یہ خوشے ہیں جو میری دھان کے
انہیں نہیں جلاؤ تم

سیلیہ میریلیز
ترجمہ:- صلاح الدین محمود

محرک

میں گاتی ہوں اس واسطے کہ یہ لمحہ موجود ہے
اور میری ہستی مکمل ہے
میں نہ تو خوش ہوں اور نہ ہی غمگسار
میں شاعر ہوں

گذرتی چیزوں کی رشتہ دار
میں نہ تو سرور محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی اذیت
اور میں رات اور دن
ہوا میں بسر کرتی ہوں

خواہ میں مسمار کروں یا بناؤں
خواہ میں قائم رکھوں یا گھل جاؤں
——— میں نہیں جانتی، میں نہیں جانتی، میں اتنا تک نہیں جانتی
کہ آیا میں قیام میں ہوں یا محض بیت رہی ہوں
میں اتنا جانتی ہوں کہ میں گاتی ہوں۔ اور گیت ہی اہم ہے
کہ اس کا ازلی لہو اور رواں پنکھ ہیں
اور میں جانتی ہوں کہ ایک یوم مجھ کو بے صوت کر دیا جائے گا
——— اور کچھ نہیں

خیرل انور
ترجمہ: زاھد ڈار

صبر

مجھے نیند نہیں آتی
لوگ بولے جاتے ہیں، کتے بھونک رہے ہیں
دنیا فاصلے پر جا کر دھندلا جاتی ہے
پتھر کی دیواروں میں گھری ہوئی تاریکی
متواتر
آوازوں کی زد میں ہے
قریب ہی آگ اور راکھ بھی موجود ہیں

میں بولنا چاہتا ہوں
میری آواز غائب ہو جاتی ہے
میری طاقت ختم ہو جاتی ہے
ٹھیک ہے! کیا فرق پڑتا ہے!
دنیا پسند نہیں کرتی کہ اس کے ساتھ بات کی جائے
میں بھی پروا نہیں کرتا

دریا کا پانی برف بن جاتا ہے
زندگی میں اب زندگی باقی نہیں رہی

میں ایک بار پھر کرتا ہوں جو پہلے بھی کر چکا ہوں
میں اپنے کان بند کر لیتا ہوں
میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں
اور انتظار کرتا ہوں سکون کا جسے آنا ہے

شان الحق حقی

پچکاری

"آج بھابی صاحبہ فضلو سے بہت ناراض معلوم ہوتی ہیں۔" اختر صاحب نے بیگم امین کی فضیحتیاں سُن کر امین صاحب سے زیرِلب کہا۔ بہت دیر سے کوئی بات کرنے کو نہیں مل رہی تھی۔ اور افطار میں ابھی دیر تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اور آج سب روزے سے تھے۔

"جی ہاں، بات یہ ہے کہ اس گھر میں تو فرشتے بھی کام کرنے آئیں تو گالیاں کھا کے جائیں گے۔" امین صاحب نے ذرا اونچی آواز میں جواب دیا۔ "وقت وہ آن لگا ہے کہ جو نوکر ہاتھ آجائے غنیمت جاننا چاہیئے۔ آئندہ آپ جانتے ہیں، نوکر تو ہوں گے نہیں۔ روبٹ ہوں تو ہوں۔ عرض کردوں کہ چیک زبان میں "روبوٹ نِک" بیگار بھرنے والے غلام ہی کو کہتے ہیں۔ مگر دعویٰ ہے میرا کہ آپ کوئی کمپیوٹرائزڈ نوکر ایسا نہیں بنا سکتے جو بیگم صاحبہ کی خوشنودی حاصل کر سکے یا ان کے تیور پہچان سکے۔ اُس غریب کی خیر منائی ہو تو ڈھٹائی کی بڑی مضبوط رگ اس میں رکھنی پڑے گی۔ غریب ہنس کے بھی نہیں ٹال سکے گا کہ یہ بدتمیزی شمار ہوگی جو کام چوری اور حرام خوری سے بدتر چیز ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کی تیزیٔ طبع کو ہمیز دینے کے لئے تھوڑا سا پاجی پن بھی اُس میں بھرنا ہوگا، اور نہیں ہوگا تو وہ خود رفتہ رفتہ بھر کے رہیں گی۔ اس کے لئے بھی گنجائش رکھنی ہوگی اُس روبیٹ میں۔"

اختر صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، پھر یہ جان کر کہ یہ گفتگو بیگم صاحبہ کے کانوں تک بھی پہنچ رہی ہے، اب کے ذرا آواز اونچی کر کے بولے "بھائی صاحب، ملازموں سے شکایت تو ہر گھر کا قصہ ہے، کچھ آپ ہی کے گھر سے مخصوص نہیں۔ دراصل ہوتے بھی بڑے بد ہیں۔ حرام خوری کرتے ہیں۔ جسے کام لینا پڑتا ہے وہی جان سکتا ہے۔ ویسے ہماری بھابی تو سچی بات ہے بلاوجہ کسی کو کچھ کہنے والی نہیں۔"

بھابی صاحبہ مُنہ سے کچھ نہ بولیں، بس روکھا سا منہ بنائے، برآمدے میں سے باورچی خانے کی طرف چلی گئیں، یہ برآمدہ ایک طرح کا لاؤنج یا بیٹھنے اٹھنے کا کمرہ تھا، یہیں امین صاحب شب خوابی کا سوٹ پہنے بیٹھے تھے۔ اُن کی عادت تھی کہ دفتر سے آتے ہی سوٹ اُتار نائٹ سوٹ پہن لیا کرتے تھے۔ اُن کا بیداری کا بیشتر وقت بھی سونے کے کپڑوں میں گزرتا تھا۔ کوئی آئے کوئی جائے، وہ نائٹ سوٹ ہی ڈانٹے رہتے۔

مسز امین کی جوانی اب اُتار پر تھی۔ خوش وضع خاتون تھیں، قد اچھا تھا۔ ڈیل اب جا کے کچھ گدرایا تھا ورنہ شادی کے وقت بہت دُبلی پتلی تھیں، اور شادی کو اب سولہ برس ہو چکے تھے۔ امین صاحب اُس وقت اُن سے عمر میں تقریباً دگنے تھے اور اب بھی بیس اکیس برس کا فرق تھا، بے چاری چھوٹے گھر کی تھیں۔ اُن کے والد مرحوم مولوی تھے، بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ خود بڑی کامی تھیں دن بھر پھرکی کی طرح پھرتی تھیں۔ گھر کے افراد میں بڑی عمر کے دو سوتیلے بیٹوں سے لے کر اپنی نوعمر لڑکی اور چھوٹے لڑکے تک کوئی ایسا نہ تھا جس پر ان کی زبان دراز ہو سکے۔ بڑے بیٹے دونوں بیویوں والے تھے۔ مگر صرف ایک بہو ساتھ رہتی تھی۔ دوسرے کی اپنی بیوی سے ناچاقی تھی اور معاملہ محض لٹکا ہوا تھا۔ ان دنوں بڑی بہو بھی اپنے بچوں سمیت میکے عید کرنے گئی ہوئی تھی۔ امین اور بیگم امین کی اپنی بیٹی ثریا کا چودھواں بھر کے پندرھواں برس لگا تھا وہ ایک الھڑ تنک مزاج لڑکی تھی۔ اماں کا بس اُس پر بھی نہ تھا، نہ ممتا اس کی اجازت دیتی تھی کہ اُسے زبان تو کیا انگلی کے اشارے

سے بھی کچھ کہیں. بلکہ وہ خود ہی کبھی کبھی چیخ اٹھتی تھی
اب لے دے کے فضلو ہی تھا، ۱۲ برس کا لونڈا
جس پر برس کر وہ اپنے دل کا بخار نکال لیتی تھیں
اور کچھ ہلکی پھلکی سی گالیاں سنا دیتی تھیں. کمبخت
موذی، موا، شیطان وغیرہ۔

اُدھر مکالمہ جاری تھا. ابن صاحب بولے
"بھئی ہم تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دنیا میں بدترین
پیشے دو ہی ہیں. ایک تو ڈاک خانے کی نوکری ـــ
(ابن صاحب پوسٹ آفس کے محکمے میں کسی عہدے
پر تھے اور اس کا شکوہ کرنا گویا ان کا منصبی حق تھا)
دوسرے کسی بیگم کے ہاتھ کے نیچے یا اوپر کا ٹہل
کر جوکھوں بھرو اور گالیاں سنو. گالیاں بھی کسی کام
کی نہیں جن میں کوئی لطافت ہو، کم از کم بولی ٹھولی
ہی کا مزا آئے. ایسی ہی پھیکی سیٹھی سی گالیاں ـــ
میاں گالی وہ جو کوئی گالی وہ جو یاد رہے، اور یہاں
پہنچ کر انہیں گالیوں پر ایک شعر یاد آگیا ؎

گالیوں کا ہم پر چلتا روز چھرا صاف ہے
واہ کیا لطفِ بیاں کیا روزمرہ صاف ہے

اور پھر شعر کے پیچھے شعر ؎

ہمیں ہر بات پر دیتے ہو صاحب گالیاں، اوہو!
تصدق اس زباں کے تم بھی یہ سیکھے زباں، اوہو!

مرا کہنا کہ کیا عالم ہے تجھ پر، واہ واصدقے
اور اُن کا ناز سے ہنس ہنس کے یہ کہنا کہ ہاں اوہو!

"ہائے کیا تیور ہیں". ابن صاحب نے شعر
پڑھ کر کہا: "اب حسینوں کو یہ انداز کہاں آتے ہیں
میں کہتا ہوں جس کی بولی میں مزا نہ ہو اُس پر دل
کیسے آسکتا ہے". بیگم اس جملے پر بھی خاصی کباب
ہوتی ہوں گی کہ بے چاری جس ضلع کی تھیں وہاں کی
بولی کو ابن صاحب نہیں مانتے تھے موصوف
نے تقریر جاری رکھی" اور تو اور گالیاں تک دینی
نہیں آتیں. خدا کی قسم کان ترس گئے اُن گالیوں کو
نگوڑا اور مونڈی کاٹا تک سننے کو نہیں ملتا. کوئی
اچھی سی گالی تصنیف کرنا، کوئی چبھتا سا فقرہ کسنا تو
ایک طرف رہا کہ آدمی اُس کی لذت ہی میں کھو جائے
بقول حافظ "بدم گفتی و خورسندم" اور غالب نے
بھی کیا خوب کہا ہے ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اب اختر صاحب کو بھی اپنا شعر یاد آگیا
وہ کبھی کبھار شعر کہتے رہتے تھے اور خاصا کہہ لیتے
تھے مگر یاد نہیں رکھ سکتے تھے. تمام وقت اپنے
ذہن کو ٹٹولتے رہے کہ گالیوں کے لذیذ موضوع
پر آخر میں نے بھی کچھ کہا ہی ہوگا. معذرت کے
سے انداز میں بولے. خاکسار نے بھی عرض کیا تھا.
"ہاں بھئی ضرور" ابن صاحب سنبھلے "ہو جائے
ارشاد" اختر نے عرض کیا ؎

اس کے دشنامِ شیریں کا کیا پوچھنا
ایک اپنی زباں سو زبانوں میں ہے

ابن کچھ مروتاً کچھ عادتاً پھڑک اٹھے ـــ
"بھئی کیا کہنا: ایک اپنی زبان سو زبانوں میں ہے
بھئی پوری غزل عنایت ہو جائے. یہ کب کا مال
گرہ میں باندھے پھر رہے ہو؟"
"جی گرہ ہی میں تو بندھا ہوا نہیں" اختر نے
نے جواب دیا. "بس ایک آدھ شعر اور یاد ہوگا

خوش اداؤں میں ہے خوش بیانوں میں ہے
دل گرفتار سو دل ستانوں میں ہے

اُس نے تان اس شعر پر توڑی ؎

ان دنوں اہلِ دل کی تو کیا مقدرت
پارسائی بڑے امتحانوں میں ہے

ابن نے حسب معمول جھوم کر داد دی، اختر
کو کوئی اور شعر بھی یاد آیا ہوگا تو شاید پھسپھسا سمجھ کر
چھوڑ دیا. یہ ساری باتیں دراصل روزہ بہلانے کے
لئے مزاح المومنین کے طور پر تھیں. اور یہ چھیڑ چھاڑ
درپردہ بیگم کے ساتھ ہو رہی تھی، ورنہ انہیں کیا
معلوم نہیں تھا کہ فضلو کی طرف داری ایک طرف، راتوں
کو اس سے پاؤں کون دبواتا ہے. روزہ دار کے
ہاتھوں سے پانی کون مانگ مانگ کر پیتا ہے.
بے وقت کھانا گرم کرنے کے لئے سوتے سے کون
اٹھاتا ہے. مقصد تو دراصل بیگم ہی کو اٹھانا ہوتا
ہے کہ جب تک وہ سامنے بیٹھ کر نہ کھلائیں،
ابن صاحب لقمہ نہیں توڑتے، مگر آوازیں فضلو
ہی پر پڑتی ہیں اور نیند اُس غریب کی بھی فوراً حرام
ہوتی ہے. آج رمضان کی ستائیسویں تھی، ماہ مبارک
کے دوسرے روزے تو انہوں نے فرض کفایہ گردان
کر چھوڑ دئے تھے کہ آخر گھر کے سبھی لوگ رکھ رہے
تھے. آج کا روزہ سنتِ دیرینہ کے طور پر رکھ لیا
تھا، اور اس کی خاطر چھٹی بھی لے لی تھی. اختر صاحب
یہی پوچھنے آئے تھے کہ خیر باشد، دفتر کیوں نہیں
آئے. انہیں افطار کے لئے ٹھہرا لیا گیا تھا.
اتنے میں ابن کی لڑکی ثریا کمرے سے باہر آئی
اور چچا کو سلام کر کے ابا سے بولی، "کہئے ابا آپ کا

روزہ کیا کہہ رہا ہے؟" امین بچوں کا سا لہجہ بنا کر بولے "بیٹے کچھ بھی نہیں، تم جانو ہم تو روز ایسے ہی رہتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا تو اختر صاحب! جانتے ہیں ہم ویسے ہی نہیں کھاتے، اور کل تو دن بھر کچھ بھی کھایا ہو تو حرام شے کھائی ہو۔"

ثریا نے کہا "واہ ابا، کچھ دوپہر کا کھانا ہی تو کھانے میں نہیں گنتا، کھانے کی اور چیزیں بھی تو ہیں۔"

امین بات کاٹتے ہوئے بولے "ہاں، ہاں، کھانے کی چیزیں اور بھی ضرور ہیں۔ آخر ہم عمر بھر غم کھاتے ہی رہے ہیں، بلکہ لخت دل بھی۔ اب تم کہو گی۔ بھولے چوکے ذرا سی ٹھوکر کھانے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ذرا پھیر کھا کے گھر آئے تو اُس سے بھی۔ آخر تمہاری اماں روز فضلو پہ تاؤ کھاتی ہیں یا نہیں؟ اور وہ گالیاں کھاتا ہے یا نہیں یہ ہمہ وقت ڈانٹنے پر اُدھار کھائے نہیں بیٹھی رہتیں؟ کھاؤ قسم! اس فضلو سے پہلے جو چھوکری تھی وہ تو چار چوٹ کی مار بھی کھاتی تھی۔ ان کی طبیعت تو کسی سے میل ہی نہیں کھاتی۔ بھئی یہ ہمارے محاورے بھی خوب ہیں، چکر کھانا، پلٹا کھانا، دھوکا کھانا، غم کھانا، بل کھانا، غوطہ کھانا، جھٹکا کھانا، کیا کیا چیزیں اشیائے خوردنی میں شامل ہو گئی ہیں۔ کسی کے جھٹکا لگا تو وہ معاذ اللہ حرام خور ٹھہرا۔

اختر صاحب نے افعال مرکبہ کی اس فہرست میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ ضروری خیال کیا۔ گُل کھانا جُل کھانا، جھوک کھانا، غوطہ کھانا، ڈبکی کھانا، زخم کھانا، خار کھانا وغیرہ وغیرہ۔ اور لوٹے کر لکھتے میں تو بھئی ایک آدھ تفظ ہم بھی کھا جاتے ہیں، اللہ معاف کرے۔

امین نے بیٹی سے کہا "تم ہمارا سر نہ کھاؤ۔ کبھی تمہیں چپت کھانا پڑے۔" ثریا ہنس دی۔ پھر بولی۔ "ابا، آپ بات کو اڑا رہے ہیں۔ کیا کل آپ نے پان بھی نہیں کھایا تھا؟ کیا آپ اسے روزے میں حلال شے ....؟

بیگم امین نے بیٹی کو ٹوک دیا "بس رہنے دو، چھوٹے بڑوں سے بحث نہیں کیا کرتے۔" پھر میاں کی طرف منہ کر کے بولیں "کل آپ خوش بہت تھے کیا لکھا تھا بینک نے چٹھی میں۔ کتنی رقم آپ کے کھاتے میں ڈالی ہے، ۴۰.۳ روپے یا ۳.۴۰ روپے پچاس پیسے سود کے؟"

بیگم نے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ دوشالے کا پلو ٹھیک کر کے سیدھی نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں کہ عصر کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ وہ امین کے بقول صاحب ایجاد و تصنیف نہیں تھیں، مگر انہوں نے دن بھر کی ٹوک جھوک کا بدلا۔ دوشالہ لپیٹتے لپیٹتے، میاں کی کئی پشتوں سے، ایک ہی ساتھ لے لیا تھا۔

گزشتہ دنوں (اکتوبر) لاہور جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ "انارکلی" کے بک سٹال پر سب سے پہلے 'ماہِ نو' پر نظر پڑی۔ معیاری پرچہ قیمت ۲ روپے فوراً خرید لیا۔ چند روز لاہور کے قیام کے دوران مطالعہ کرتا رہا مضامین کے حصے میں سلیم احمد، انور سدید، اور اظہر قادری کے مضامین خاصے بھلے لگے۔ افسانوں کا حصہ مختصر ہے۔ کوئی چونکا دینے والی تحریر نہیں تھی۔ غزلوں کا حصہ کافی خوبصورت ہے، جمیل ملک ظفر اقبال، شہزاد احمد، عبیداللہ علیم کی غزلیں کافی پسند آئیں۔ "آدھ کھلا دریچہ" پر سید ضمیر جعفری کا REVIEW کافی دلچسپ ہی نہیں تھا بلکہ شہزاد کی شاعری پہ کسی پروفیسر کے ۲۰ صفحے کے مقالے سے کسی طرح کم نہیں تھا۔"

حیات نظامی ــــ پشاور

مرتضیٰ برلاس، محمد خالد اختر، سید محمد کاظم، احمد ندیم قاسمی

احمد فراز۔ عظیم قریشی
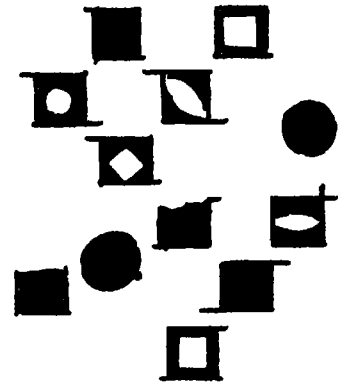
احمد ندیم قاسمی، اظہر جاوید، ذوالفقار احمد تابش
یوسف کامران، عطاالحق قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر

محمد علی صدیقی، زاہدہ حنا، جون ایلیا، سید محمد تقی
مرزا ظفر الحسن، پروفیسر کرار حسین، رئیس امروہوی
انصار عبد العلی، اکرام بریلوی، انور عنایت اللہ
انجم اعظمی، شاہد الوری، حسن عابدی
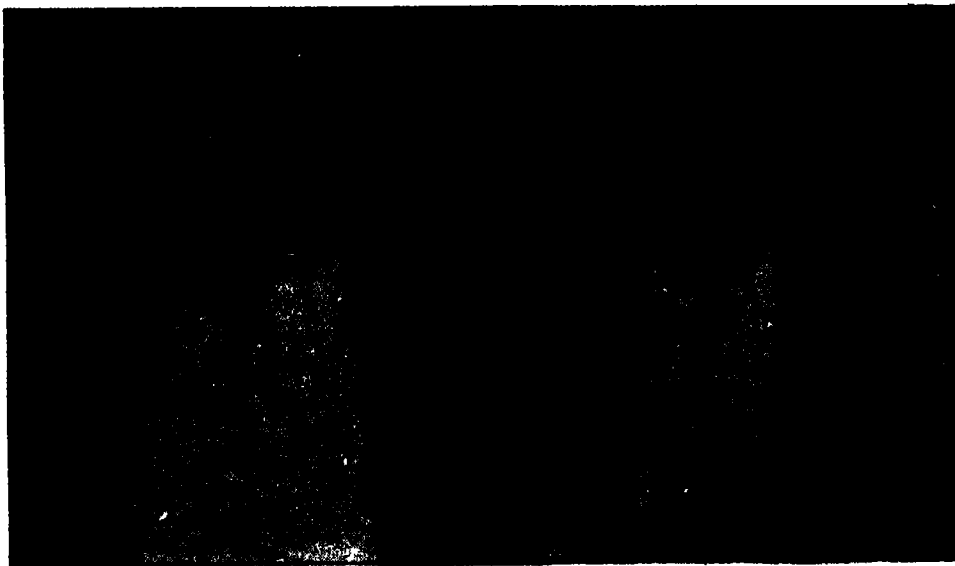
سید حسن ناصر، منیر نیازی

کھڑے ہوئے:۔ احسان اکبر، قائم نقوی، جلیل عالی
خالد اقبال یاسر
بیٹھے ہوئے:۔ حلیم قریشی، اختر حسین جعفری،
خاقان خاور

انور عنایت اللہ

ننانوے کا پھیر

سُنا ہے شیطان کے کئی روپ ہوتے ہیں. لیکن نانی جان کو تو بس اس کا ایک ہی روپ یاد تھا. وہ بھی دیو مالائی.

جس روز میں کراچی آیا اس رات کو خوب تیز بارش ہوئی. بادل زور سے غرّاتے لگے تو نانی جان نے آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی اور معاً مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا. تیس سال کے بعد وطن واپس آیا تھا. یہاں بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن نانی جان بالکل ویسے کی ویسی ہی تھیں. اپنی بیاسی سالہ عمر کے باوجود ہوش اور حواس میں تھیں اور اب بھی مزے مزے کی باتیں کرتی تھیں. میرے بچپن میں جب بھی راتوں کو بادل گرجتے تو وہ پہلے حسبِ عادت آیت الکرسی پڑھتیں اور پھر کہتیں "چُپ ہو جاؤ بچو — خدا ہر ایک کو مایا سے محفوظ رکھے"

ہم پوچھتے "مایا؟ — مایا کون نانی جان —؟ کوئی بھتنی؟"

اس پر وہ ہمیں ڈانٹتیں. ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹے —— یہ سمجھ لو. یہ ایک آسمانی بلا ہے. جو اِس کے چکر میں پھنس جائے سمجھ لو ننانوے کے پھیر میں پڑ گیا"

یہ باتیں بھی ہماری سمجھ سے باہر ہوتیں. اس لئے ہم میں سے کوئی پوچھتا.

"ننانوے کا پھیر کیا نانی جان؟"

اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ——

"ارے بیٹا —— خدا جانے آج کل سکولوں میں پڑھایا کیا جاتا ہے. روپئے بٹورنے کی فکریں پڑ جانا اور لالچ میں پھنسنے کو ننانوے کا پھیر کہتے ہیں. انسان بڑا کمزور ہوتا ہے اور شیطان کے کئی روپ ہوتے ہیں. مایا کو بھی اسی کا ایک روپ سمجھو اسے بچے بہت پسند ہیں"

یہ سُن کر ہم ڈر جاتے اور اپنے لحافوں میں دبک جاتے اس پر وہ خود ہی کہتیں.

"ارے ڈرو نہیں بچو! جب تک کوئی اپنا بچہ خود اس کے حوالے نہ کرے وہ نہیں لیتی. ہاں والدین کو لالچ دینے کے لئے طوفانی راتوں میں نکلتی ہے. گلیوں میں بڑے بڑے دیگ لڑھکاتی ہوئی اُن محلوں سے گذرتی ہے جہاں بہت بچے ہوں. ساتھ ہی آواز لگاتی جاتی ہے. دولت لے لو ہیرے لے لو. سونا لے لو. بچہ دے دو. یہ آواز صرف وہی لوگ سنتے ہیں جن کے من میں کھوٹ ہو، جو لالچی ہوں"

یہ باتیں دوسری جنگِ عظیم سے آٹھ دس سال پہلے کی ہیں. بڑی بے فکری کے دن تھے. نہایت سستے اور پُرسکون. جس کے گھر میں ہزار دو ہزار نقد ہوتے وہ اپنے آپ کو لکھپتی سمجھتا —— نانی جان بھی اپنے وقت کی رئیس تھیں. جنگِ عظیم ختم ہو گئی تو ملک آزاد ہو گئے. پاکستان قائم ہوا. ہجرت کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ خاندانوں کے خاندان بٹ گئے. پرانی بستیاں اُجڑ گئیں، نئی آباد ہوئیں. اسی ریلے میں ہمارا خاندان بھی کراچی آ کر آباد ہو گیا. ہجرت سے چند مہینے پہلے بڑے ماموں مجھے لندن لے گئے. اس وقت میری عمر سات سال تھی. اب تیس سال کے بعد گھر واپس آیا تو یہاں بہت کچھ بدلا ہوا ملا. اُس رات کو جب تیز بارش کے بعد بادل غرّانے لگے تو میں نے ستانے کے لئے نانی جان سے پوچھا.

"کیا مایا یہاں بھی اشرفیوں کی دیگیں لڑھکایا کرتی ہے نانی جان؟"

"ہاں ہاں — تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟" انہوں

نے پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ تو اسلامی ملک ہے ۔۔ مایا آوایا کی باتیں تو غیر مسلموں کی ہیں۔ مسلمان اس قسم کی باتیں نہیں مانتے" میں نے جواب دیا۔ یہ سننا تھا کہ وہ خفا ہو گئیں اور بولیں۔

"ارے واہ رے لڑکے واہ ۔۔ تو مجھے کیا سمجھتا ہے؟ اسلام کے بارے میں مجھے جتنی باتیں معلوم ہیں اتنی نہ تجھے معلوم ہوں گی اور نہ تیرے مرحوم باپ کو۔ مایا کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ ہی کسی اور مذہب سے۔ وہ تو ہر ملک میں، ہر جگہ ہوتی ہے اور وہی کرتی ہے جو ہمیشہ سے کرتی آئی ہے۔ اسے بچے واقعی بہت پسند ہیں۔ ہیرے جواہرات اور اشرفیوں کی اس کے پاس کمی نہیں۔ اس لئے وہ بچے لے لیتی ہے اور دینے والے کو دولت سے مالا مال کر دیتی ہے۔" انہوں نے مجھے سمجھایا۔ "بغیر کچھ لئے وہ کسی کو کچھ نہیں دیتی۔"

"پاکستان آنے کے بعد بھی آپ کو کبھی اس کی کوئی مثال ملی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک مثال؟ کمال کرتا ہے لڑکے ۔۔ جتنی چاہے بتادوں۔ اب یہاں رہنے آئے ہو تو خود ہی دیکھ لوگے۔ یہ ہمارا محلہ ہے نا ۔۔؟ اس میں داخل ہوتے ہی وہ جو بہت عالیشان کوٹھی ہے اس کے مالک کو میں ناگپور سے جانتی ہوں۔ ان لوگوں کی وہاں چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی یہاں آنے کے بعد ان لوگوں نے لالوکھیت میں دو کمروں کا گھر لیا اور دکان کھول لی۔ پھر ان کے دونوں بیٹے کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہو گئے۔ ایک کی نوکری ائیرپورٹ پر تھی اور دوسرے کی سمندر کے کنارے ایک دن ہم نے سنا کہ یکایک ان کا سب سے چھوٹا بھائی جو پاکستان میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بغیر کسی بیماری کے اچانک مر گیا۔ اسی زمانے میں محلے والوں نے اکثر راتوں کو لڑھکتے ہوئے دیگوں کی آوازیں سنی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان لوگوں نے یہ کوٹھی خریدی۔ اب ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ اب بتاؤ ۔۔ دیگیں لڑھکاتے کون آیا کرتا تھا۔؟ ان کا بچہ یکایک کیوں مرا اور یہ شاندار کوٹھی کیسے بنی"۔۔؟

انہوں نے بڑے پُراسرار انداز میں پوچھا۔

ان کے سوالات بہت معقول تھے۔ لیکن ان کے جواب مجھے نہیں معلوم تھے۔

دوسرے دن سے میں نے اپنے بچپن کے دوستوں کی تلاش شروع کر دی۔ میرا سب سے عزیز دوست اختر تھا جو میرا چچا زاد بھائی بھی تھا۔ مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آزادی کے وقت فسادات میں ان لوگوں کو بہت مالی نقصان ہوا تھا اور وہ لوگ پاکستان تباہ حال آئے تھے۔ اختر نے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ یہ بھی سنا کہ اس نے بڑی ترقی کی تھی اور اب وہ شہر کے چند لکھپتیوں میں سے ایک تھا۔ آزادی سے پہلے ابا اور چچا میں جائیداد کے سلسلے میں جھگڑا ہو گیا تھا اس لئے نانی جان اور امی وغیرہ نے پاکستان میں ان لوگوں سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تعلقات اب تک خراب تھے اس لئے میں نے اختر سے ملنے کا پروگرام کچھ دنوں کیلئے ملتوی کر دیا۔ ویسے ان لوگوں سے ملنے کے لئے جی بہت تڑپا کیونکہ اختر کی بیوی، شمسہ میری ماموں زاد بہن بھی تھی۔

میرا دوست زاہد تھا۔ وہ مقامی پولیس میں ایک بڑا افسر تھا۔ میں اس کی تلاش میں نکلا تو اچانک ہمارے ایک دوست ارشد سے ملاقات ہو گئی۔ اسی سے تمام دوستوں کی خیریت معلوم ہوئی۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ آج کل اختر عیش کرتا ہے ڈیفنس سوسائٹی میں اس کی ایک عالیشان کوٹھی تھی۔ گھر میں کئی موٹروں کے علاوہ تین رنگین ٹیلی ویژن تھے اور ایک وی سی آر تھا جس پر ہر جمعرات کی رات کو ہندوستانی فلمیں دیکھی جاتیں۔ اختر کو ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ صرف شادی کے بعد ایک طویل مدت تک وہ اولاد سے محروم رہا تھا۔ لیکن چند مہینے ہوئے بڑی بڑی درگاہوں اور پیروں فقیروں کی دعاؤں کے بعد اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا تھا۔ جس کے اختر اور شمسہ دونوں دیوانے تھے۔

میں نے گھر جاکر یہ باتیں نانی جان کو سنائیں تو انہوں نے پہلے تو کانوں کو ہاتھ لگایا اور پھر قرآنی آیات پڑھنے لگیں اور آہستہ سے کہا۔

"خدا اس بچے کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ تجھے معلوم نہیں کہ یہ دولت اس کمبخت کے پاس کیسے آئی ہے۔ پچھلے سال جب شمسہ امید سے تھی تو اکثر راتوں کو اسکے گھر کے آس پاس لڑھکتے ہوئے دیگوں کی ہیبت ناک آوازیں آیا کرتیں۔ سارے محلے نے سنا۔ پھر خدا جانے کیا ہوا کہ موسم خوشگوار ہو گیا۔ آپ ہی آپ بادلوں نے چُپ سادھ لی۔ پھر تو

راتیں پرسکون ہوگئیں۔ لیکن ساتھ ہی اختر کے گھر
پر دھن برسنے لگا۔ اُس زمانے میں یہ سوسائٹی میں
رہتا تھا۔ نئی کوٹھی تو اس نے اس کے بعد خریدی
پھر اللہ نے اسے چاند سا بیٹا دیا۔ دُعا کرو بیٹا
خدا اسے اپنی حفاظت میں رکھے۔ آخر وہ تمہارا
چچازاد بھائی ہے اور شمسہ تمہارے چھوٹے مرحوم
ماموں کی بیٹی ہے۔ ان لوگوں سے تعلقات خراب
ہیں تو کیا ہوا۔ آخر اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں؟"

نانی جان نے بے معنی سی باتیں شروع کر
دیں تو میں چپکے سے کھسک آیا۔

ایک دن سندھ کلب میں اچانک زاہد سے
ملاقات ہوگئی۔ پتہ چلا کہ اب وہ اُس ادارہ کا بڑا
افسر تھا جس کا کام ملک کو منشیات کی لعنت سے
سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس موضوع پر باتیں شروع
ہوئیں تو وہ خاصا سنجیدہ ہوگیا اور اس نے کہا۔

"تم اتنی مدّت کے بعد پاکستان آئے ہو تمہیں
اندازہ نہیں کہ ہماری زندگی پر منشیات کی لعنت
کس حد تک اثر انداز ہے۔ کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ
سپر ہائی وے پر چلنے والے ٹرک ڈرائیوروں کی
تقریباً نوے فیصد تعداد منشیات کی عادی ہے؟"

اس کی بات سُن کر حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا
کیا کہہ رہے ہو؟ نوّے فی صد؟ میرے منہ
سے نکلا۔

"جی ہاں ـــ اب اِس اطلاع کے بارے میں
تمہارا کیا خیال ہے کہ اس لعنت سے ہمارے اسکولوں
کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی
محفوظ نہیں ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً
آٹھ فیصد طلبا، اس کی لپیٹ میں آچکے ہیں"!

"یہ تو واقعی پریشان کن بات ہے زاہد" میں
نے کہا۔

"ہاں ـــ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارا عام آدمی
تو لاعلم ہے ہی، ہمارے پڑھے لکھے طبقے کو بھی
اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اسے نہ خطرہ کا احساس
ہے اور نہ اسے یہ معلوم ہے کہ اس خطرناک
لعنت کا مقابلہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے
اس ذلیل لعنت کو پروان چڑھانے میں ایک نہیں بیسیوں
بارسوخ پاکستانی ملوث ہیں۔ بعض کو تو تم بھی اچھی
طرح جانتے ہو" وہ رُک گیا اور بڑے معنی خیز انداز
میں مسکرانے لگا۔

"میں کیسے جان سکتا ہوں؟" میں نے حیرت
سے کہا۔ "میں تو ابھی ابھی آیا ہوں۔ میں تو بہت کم
لوگوں کو جانتا ہوں"

"کم از کم ایک کو تم ضرور جانتے ہو ـــ اختر سرفراز حسین
منشیات کا کاروبار کرنے والا یہاں کا سب سے
بڑا تاجر" اس نے ڈرامائی انداز میں خواب دیا۔

"کیا کہا ـــ؟ اختر!" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی ہاں ـــ آپ کا چچا زاد بھائی اور ہم دونوں
کا بچپن کا عزیز دوست۔ ابھی تھوڑی مدّت
پہلے وہ سوسائٹی میں رہتا تھا۔ اس کے پاس صرف
ایک سائیکل تھی اور اب ـــ!"

"میں جانتا ہوں اب اس کے پاس کیا کچھ ہے"
میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

"جی نہیں۔ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں
جانتے۔ اس کے دستِ راست کون ہیں کس
طرح یہ ذلیل کاروبار چل رہا ہے، کس طرح اس کی
ترقی کے لئے آئے دن بڑی چابکدستی سے ہمارے
نوجوانوں کو منشیات کا عادی بنایا جا رہا ہے، کس
طرح نئے گاہک پھانسے جاتے ہیں ـــ یہ ایک طویل
کہانی ہے دوست ـــ آج کل میں ان ہی رازوں
پر کام کر رہا ہوں۔ لیکن وہ لوگ اتنے طاقتور ہیں
اور اتنے منظّم کہ مجھے اب تک کچھ زیادہ کامیابی
نہیں ہوئی ـــ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے
گی ـــ آئیں گے ایک نہ ایک دن میرے جال میں"

اس کی باتیں سُن کر اختر کی حشمت اور ثروت
کا راز تو کھل گیا لیکن ذہن کا دھچکا سا لگا۔ آخر وہ
میرا قریبی رشتہ دار تھا اور بچپن کا دوست بھی تھا
اس کی بیوی سے بھی رشتہ داری تھی۔ اس لئے سخت
کوفت ہوئی۔ ہمارے معصوم نوجوانوں کو اس زہر کا
عادی بناتے ہوئے کیا ان لوگوں کو اس کا احساس
نہیں تھا کہ کبھی خود ان کے اپنے بچے اس میں ملوث
ہو سکتے تھے؟ اختر کو خدا نے اتنے برسوں کی دعاؤں
کے بعد بیٹا دیا تھا۔ کیا یہ بچہ بڑا ہو کر منشیات کا
شکار نہیں ہو سکتا تھا؟

اس دن کے بعد زاہد مجھے کئی دنوں تک نہیں
ملا۔ میں نے ایک آدھ بار فون بھی کیا تو پتہ چلا
وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے ایک رات کو بڑا عجیب
واقعہ پیش آیا۔ سردی اپنے شباب پر تھی۔ کوئٹہ کی سرد
ہواؤں کے ساتھ ساتھ بارش نے بھی کراچی کا رُخ
کیا تھا۔ آدھی رات کو صدر دروازہ کی گھنٹی نے
گھر بھر کو جگا دیا۔ میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے
بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ آج تو یہ کچھ زیادہ

ہی غرا رہے تھے ۔ ان کی آواز سن کر مجھے یکایک نانی جان کا خیال آگیا اور بستر سے اُٹھتے ہوئے میں نے سوچا۔ وہ یقیناً قرآنی آیات پڑھ رہی ہوں گی اور ماں آپا سے سب کو محفوظ رکھنے کی دعائیں مانگ رہی ہونگی ملازموں کا کمرہ خاصی دور تھا۔ اس لئے میں نے ہی اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ میرے سامنے برساتی میں لپٹی، ایک عورت کھڑی تھی جس کی گود میں بچہ تھا دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آگئی تو آپا نے اسے پہچان لیا۔ یہ شمسہ تھی، اختر کی بیوی۔

"ارے شمسہ؟ تم اور اس وقت؟" آپا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں آپا" یہ کہتے ہوئے وہ رونے لگی۔ باہر بارش تیز ہو رہی تھی اور برساتی کے باوجود اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے اور وہ کانپ رہی تھی۔ اس کا کمبل میں لپٹا بچہ گہری نیند سو رہا تھا لیکن غالباً کمبل بھی کسی قدر بھیگ گیا تھا۔ آپا نے جلدی سے بچہ اس سے لے لیا اور ہم سب اندر پہنچے آپا نے بچہ نانی جان کو دیا اور شمسہ کو اپنے بیڈروم میں لے گئیں تاکہ اپنے گیلے کپڑے اُتار کر، دوسرے کپڑے بدل لے۔

' میں وہیں بیٹھ کر پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

"مجھے تو لگتا ہے اسے بخار ہے"۔ نانی جان بولیں خدا جانے ان پر کیا بیتی کہ وہ آدھی رات کو تنہا یہاں آگئی"۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، آپا شمسہ کو لے آئیں۔ وہ بظاہر خاموش تھی لیکن اس کے چہرہ سے لگ رہا تھا جیسے وہ رو رہی ہو۔ نانی جان اس کے بچے کو سینے سے لگائے خدا جانے کون سا وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ جب کافی آگئی تو آپا نے یکایک پوچھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے؟"

"نہیں آپا — میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا۔ کوئی اختر سے فون پر کہہ رہا تھا فوراً روپوش ہو جاؤ۔ پولیس آج رات چھاپہ مارنے والی ہے!" اس نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔

"فون کی باتیں تم نے کیسے سنیں؟" میں نے پوچھا — !

جوں ہی فون آیا انہوں نے آہستہ سے کچھ کہا اور مجھے سوتا سمجھ کر ریسیور میز پر رکھتے ہوئے وہ بقیہ باتیں کرنے ڈرائینگ روم میں چلے گئے ان کے جاتے ہی میں نے اٹھ کر ریسیور اٹھا لیا اور تمام باتیں سنیں۔ اختر کہہ رہے تھے میں بزدل نہیں ہوں جو بھاگ جاؤں۔ ویسے میرے بھی بڑوں بڑوں سے اچھے تعلقات ہیں، میں اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔ اس کے بعد وہ چپکے سے کمرہ میں واپس آئے، تیزی سے کپڑے بدلے اور چلے گئے، جاتے ہوئے وہ اپنا پستول لے گئے جو وہ تکیہ کے نیچے رکھ کر سویا کرتے تھے — اب کیا ہوگا بھائی جان؟ خدا کے لئے بتائیے ہمارا کیا ہوگا؟ میرے بچے کا کیا ہوگا"؟

یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر یکایک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ دولت بٹورنے کی دُھن میں اختر کو کبھی یہ خیال کیوں نہ آیا کہ اُن سینکڑوں نوجوانوں کا کیا ہوگا جنہیں منشیات کے خطرناک راستے پر منظم طریقے سے لگایا جا رہا تھا؟ اُن لاکھوں معصوم انسانوں کا کیا ہوگا جو دنیا کے تقریباً ہر ملک میں پھیلے ہوئے تھے اور انجانے میں اس ذلیل عادت کا شکار ہو کر اب زندگی اور موت کے درمیان معلّق لٹک رہے تھے؟ بے اختیار میرا جی چاہا شمسہ سے کہوں — بی بی تمہیں صرف اپنے بچے کی فکر ہے۔ میں تو تمہارے بچے جیسے لاکھوں بچوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ان میں سے بعض تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود اپنے والدین کے ذریعہ منشیات کے بھیانک اثرات کا شکار ہو رہے ہیں۔ وہ اسی طرح بے بس تھے، بے دست و پا تھے لاچار تھے جسطرح منشیات کے عادی ان کے نوجوان والدین یا جس طرح آج تم ہو۔

وہ رات ہمارے لئے قیامت بن کر آئی، بقیہ رات کوئی بھی چین سے نہ سو سکا۔ نانی جان نے اختر کے بچے کو اپنے پاس رکھا تاکہ شمسہ کچھ دیر آرام کر سکے، صبح کو اخبار آئے تو اس میں پولیس کے کسی چھاپے کا ذکر نہیں تھا۔ دس بجے کے قریب آپا نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلایا کیونکہ بچے کا بخار تیز ہو گیا تھا۔ شمسہ کی حالت دیکھ کر میں زاہد کی تلاش میں نکلا، بڑی مشکل سے میں نے اسے ایک غیر ملکی سفارت خانے میں ڈھونڈ نکالا۔ اس سے پتہ چلا کہ رات پولیس نے ایک کروڑ روپے کی چرس پکڑی تھی — دو غیر ملکی سیاحوں کو ان کے ہوٹل سے گرفتار کیا گیا تھا اس لئے وہ یہاں آیا تھا۔ دفتر جاتے ہوئے زاہد نے تفصیلات

بتائیں۔ بدمعاش چرس ایک ٹرک میں چھپا کر ہاکس بے کی طرف لیجا رہے تھے اس کے بارے میں انہیں اطلاع ان ہی غیر ملکی سیاحوں سے ملی تھی۔

"پولیس کی ایک پارٹی نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو بدمعاشوں نے گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ پولیس نے جوابی کارروائی کی۔ اس میں ان کے تین جوان مارے گئے۔ کئی زخمی ہوئے۔ لیکن اسمگلروں کا جانی نقصان زیادہ ہوا۔ ان کے چھ آدمی مارے گئے۔ ان میں ان کا سرغنہ بھی تھا — شہر کا متمول، بارسوخ تاجر — اختر سرفراز حسین۔" زاہد نے آہستہ سے سرغنہ کا نام بتایا اور سگریٹ سُلگانے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں پریشان گھر پہنچا تو وہاں بھی ایک قیامت میری منتظر تھی۔ اختر کے بچے کو ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا اور اسے فوراً ہسپتال منتقل کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ شمسہ کو اختر کی ہلاکت کی اطلاع کیسے دوں۔ دوپہر تک یہ مسئلہ بھی خود بخود حل ہو گیا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ شمسہ تک نہ شام کے اخبار پہنچ سکیں اور نہ کوئی ریڈیو۔ لیکن وہ اپنے پرس میں چھوٹا سا ٹرانسسٹر رکھ کر ہسپتال لے گئی تھی۔ اس پر اس نے یہ ہولناک خبر سُن لی۔

وقت بڑا ظالم ہوتا ہے۔ وہ کسی کو نہیں بخشتا۔ تمام بدمعاش پکڑے گئے۔ ان پر مقدمہ چلا۔ بہت سے گہرے راز کھلے۔ بڑے بڑے پردہ داروں کے نام منظرِ عام پر آئے۔ اختر کی جائیداد ضبط کر لی گئی صرف اس کی کوٹھی بچ گئی کیونکہ اس نے یہ شمسہ کو بطور مہر دی تھی۔ شمسہ نے چند مہینوں کے بعد اسے بیچ دیا اور وہ ہمارے یہاں منتقل ہو گئی کیونکہ پاکستان میں صرف ہم ہی اس کے قریبی رشتہ دار تھے۔

اس دوران بہت سی تبدیلیاں آئیں لیکن نانی جان ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ لالچی لوگوں پر ہن برسانے والی پُراسرار مایا کے بارے میں بھی ان کے خیالات بالکل نہیں بدلے۔ ایک رات بارش شروع ہو گئی اور بادل گرجنے لگے تو انہوں نے زور زور سے قرآنی آیات پڑھنی شروع کر دیں اور مجھے اشارہ سے اپنے قریب بلا کر آہستہ سے کہا۔

"میں نے جو آیت بتائی تھی وہ پڑھو بیٹے۔ مایا اشرفیوں کی دیگیں لڑھکاتی آن پہنچی ہے یہ کمبخت ہوتی بڑی ظالم شے ہے پچھلے زمانے میں اسے بچے پسند تھے۔ اب لگتا ہے کڑیل جوانوں پر اس کی رال ٹپکنے لگی — خدا کرے اس آسمانی بلا کا ہمارے پاکستان سے جلد منہ کالا ہو اور ہمارے جوانوں کے تن اس سے ہمیشہ محفوظ رہیں — آمین!"

یکایک بجلی کڑکی اور بادل گرجا تو وہ فوراً رُک گئیں اور بے اختیار اختر مرحوم کے گول مٹول بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا کیونکہ وہ نیند میں ڈر کر رونے لگا تھا۔

بجلی چمکے جا رہی تھی اور بادل بھوکے شیروں کی طرح غرّا رہے تھے۔ ان کی ہیبت ناک آواز سُن کر مَیں نے سوچا — یہ بلا آسمانی ہے یا زمینی! کیا ہے ننانوے کے پھیر میں —؟ تن یا من؟

"حقیقت یہ ہے کہ 'ماہِ نو' "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کی بہترین مثال ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت ٹائیٹل، تصاویر، صورت، مواد، کس کس چیز کی تعریف کی جائے۔

مقالات، افسانے، غزلیں زیادہ پسند آئیں۔ میرزا ادیب نے "بابا لوکا" میں آپ بیتی بالکل نہیں لکھی۔ یہ کیسی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ افسانہ نگار کی کمزوری یہی ہے کہ وہ حقیقت کو افسانہ بنا دیتا ہے۔ "کھوئے ہوؤں کی جستجو" واقعی سوانح کا حصہ لگتا ہے۔

آزاد نظموں میں اطہر نفیس کی نظم "بیادِ قائد" اور رئیس احمد کی نظم "نئے دور کا مرثیہ" خوب ہے باقی چیزیں بھی قابلِ تعریف ہیں۔"

صابر آفاقی —— مظفر آباد (آزاد کشمیر)

مسعود اشعر

ایک بڑی کہانی کے لئے ورک نوٹس

۱ ۔ کمرہ پہلے ہی تنگ تھا اب ایڈگر ایلن پو اُسے تخلیق کر رہا ہے۔ ونسنٹ پرائس اس میں بند ہے؟ میں شمال کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اپنے دونوں ہاتھ مشرق اور مغرب کی سمت پھیلا دیتا ہوں۔ میری انگلیاں دیواریں چھو رہی ہیں۔ بیچ کی انگلی، پھر شہادت کی انگلی، پھر چھنگلی اور پھر انگوٹھا اب میں ہتھیلیوں سے دیواریں تھامے ہوئے ہوں ـــــ میں چھت کی طرف دیکھتا ہوں ـــــ میں لمبا ہوتا جا رہا ہوں یا چھت نیچی ہو رہی ہے! اوپر آسمان ہے ۔ (اوپر آسمان ہے؟!) پیروں کے نیچے سرسراہٹ سی ہے۔ مگر..... دیواریں بھی کوئی کھرچ رہا ہے۔ ناخنوں سے پہلے کِلکِلی سی ہوتی ہے۔ دانتوں کے نیچے ریت آجاتی ہے پھر کِلکِلی بھی نہیں ہوتی۔

ایڈگر ایلن پو۔ ونسنٹ پرائس یا پھر وہ چارلس لاٹن ہے؟

۲ ۔ راستے ہیں۔ بہت سے راستے ایک دوسرے کو کاٹتے۔ ایک دوسرے کے متوازی چلتے ـــــ سڑکیں ہیں۔ کئی سڑکیں۔ سامنے سے آتی سڑک۔ پیچھے سے آگے جاتی سڑک، دائیں سے آتی سڑک بائیں سے دائیں جانب جاتی سڑک۔ پھر ان کے درمیان، بیچوں بیچ سے نکلتی سڑک، بلکہ کئی سڑکیں۔ جو ہر دو سڑکوں کے درمیان سے نکلتی ہیں۔ سامنے سے آنے والی اور دائیں سے آنے والی کے درمیان بائیں والی اور سامنے والی کے بیچ۔ پھر پیچھے سے آنے والی اور دائیں والی کے اور بائیں والی اور پیچھے والی کے درمیان کتنی سڑکیں بن گئیں؟ شہر والوں کو ابھی یہ علم نہیں ہوا کہ سڑکیں اوپر نیچے بھی بنائی جاتی ہیں۔ جو کسی کو نہیں کاٹتیں اوپر سے گزر جاتی ہیں۔

وہ سڑک سیدھی ہے۔ جس پر آدمی کھڑا ہے کہ وہ اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا ہے۔ ہر سڑک پر آدمی کھڑا ہے ہر سڑک پر کھڑا آدمی ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہے ـــــ

۳ ۔ ڈائریکٹ ٹرانسمیشن۔ میری ذات سے۔ تیری ذات سے، اس کی ذات سے۔ گرمیوں کا کھلا صاف آسمان۔ اب میری ذات کو منہا کر دو۔

۴ ۔ بازار ہے۔ بھرا پُرا بازار۔ دوکانیں ہیں۔ چیزوں سے بھری ـــــ رنگ برنگی چیزوں سے۔ کھلونوں کی دوکان برتنوں کی دوکان۔ کپڑے کی دوکان۔ کھلونے۔ چابی سے چلنے والے۔ بیٹری سے چلنے والے۔ بغیر چابی اور بغیر بیٹری کے چلنے والے۔ کپڑے۔ نئے پرانے۔ چھوٹے بڑے برتن سب بے رنگ پانی ڈالو رنگین ہو جائے، رنگین پانی ڈالو۔ بے رنگ...... دواؤں کی دوکانیں ہیں۔

یہاں سے وہاں تک۔ پوری قطار۔ آدمی کھڑا ہے۔

۵ ۔ آدمی دوڑ رہا ہے۔ پوری رفتار سے۔ اپنے حواس اور اعضا کی ساری قوت کے ساتھ۔ لوگ دوڑ رہے ہیں، یہ دیکھنے کو کہ وہ کیوں دوڑ رہا ہے۔ اب آدمی دوڑ رہا ہے کہ لوگ دوڑ رہے ہیں۔

آدمی ٹھہر جاتا ہے۔ اچانک رُک جاتا ہے۔ لوگ دوڑ رہے ہیں۔ اس سے آگے نکلے جا رہے ہیں۔ مگر وہ ٹھہر گیا ہے دوڑنے والے لوگوں کے دھکوں سے بچنے کے لئے وہ کھمبے کا سہارا لیتا ہے۔ وہ پیچھے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اسے کچھ نظر نہیں آتا اس کے پیچھے آنے والوں کے قد اس سے بھی زیادہ بلند ہو گئے ہیں۔ پیچھے صرف سر ہیں۔ وہ پنجوں کے بل کھڑا ہوتا ہے۔

مگر پنجوں کے بل کتنی دیر کھڑا ہوا جا سکتا ہے؟

بھاگتے ہوئے لوگ پلٹ پڑتے ہیں۔ کھمبے کی طرف۔

۶ ۔ "یہ پسند ہے آپ کو؟"

"اچھا تو یہ دیکھئے؟"

"یہ تو آپ پر بہت سج رہا ہے۔"

"ماشاءاللہ جیسے آپ کے لئے ہی بنایا گیا ہو۔"

"یہ بھی پسند نہیں" ؟"

"اچھا.....!! مگر یہ تو وہی ہے جو آپ پہلے ہی پہنے ہوئے تھے ؟"

۷ ۔ ٹرانسپلانٹ ــــ!!

۸ ۔ جھٹ پٹے کا سماں ہے۔ سورج نکلتا ہے۔ مگر بہت اوپر۔ اس کی روشنی اوپر کی منزلوں میں کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں سے منعکس ہو کر نیچے آتی ہے براہ راست دھوپ پڑنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ سائے ہیں۔ چاروں طرف سائے۔ سہ پہر کے لمبے سائے دھوکہ دیتے رہیں رات کا۔ اور لوگ سو جاتے ہیں۔

ٹمپریچر بہت تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے اور اسی تیزی سے گھٹ جاتا ہے۔ ہوا تیز چلتی ہے۔ بہت تیز اور پھر مر جاتی ہے۔ ہوا بہت ہوتی ہے یا بالکل نہیں۔ سانس لینے کے لئے دوڑنا پڑتا ہے۔

۹ ۔ تاریخ کے بے جوڑ ٹکڑے جو مبہم جانب گھر کے ایک گوشے سے برآمد ہونے۔

۱۰ ۔ کوئی باتیں کر رہا ہے۔ کان کے قریب منہ رکھ کر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ مگر وہ بول رہا ہے۔ اس کی آواز میٹھی ہوتی ہے۔ چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا ہے میں کان کے پاس ہاتھ لے جا کر زور سے ہلاتا ہوں۔ !
وہ چپ ہیں جاری ہے۔ بات کرنے کے لئے تم سے لم
آواز تو اچھی ہونا چاہیے۔ وہ بول رہا ہے۔ بولے جا رہا ہے اس آواز کی وجہ سے میں کچھ دیکھ بھی نہیں سکتا۔ صرف آواز ہی سنائی دے رہی ہے۔ آواز ہی نظر آ رہی ہے۔

۱۱ ۔ کھلونوں کی دوکان خالی ہو گئی ہے۔ سارے کھلونے باہر آ گئے ہیں۔ سڑکوں پر۔ راستوں پر۔ سڑکوں کے درمیان۔ درمیانی راستوں پر۔

۱۲ ۔ گدھے کو کشتی پر سوار کرانے کی ترکیب ــــ
گدھے کو کھینچ کھانچ کر کشتی تک لے جانا چاہیے۔ اس تختے کے اوپر جو کشتی میں سوار ہونے کے لئے راستے کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ گدھے کو کشتی کے قریب لے جا کر اس کا رُخ موڑ دینا چاہیے۔ اس پر یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ اب کشتی سے باہر جا رہے ہیں۔ دوسری طرف گدھا پھر بھی الٹا ہی سمجھے گا۔ وہ مزاحمت کرے گا۔ پوری طاقت سے تختے پر پاؤں جما لے گا۔ وہ پچھلی ٹانگوں پر زور دے کر اپنے آپ کو پیچھے کھینچے گا۔ آپ اپنی طرف زور لگائیں گے وہ اپنی طرف آپ اپنی طرف کھینچیں گے وہ اپنی طرف۔ جب آپ کو یقین ہو جائے کہ گدھا صرف پچھلی ٹانگوں کے سہارے ہی زور لگا رہا ہے تو یکدم رسی چھوڑ دیجئے۔
گدھا کشتی کے اندر۔
یہ ہوئی گدھے کو کشتی میں سوار کرنے کی ترکیب۔
مگر گدھے کو کشتی سے اتارنے کی ترکیب ؟

۱۳ حضرت خضرؑ نے کہا۔ تم سوال بہت کرتے ہو۔
ہمارا تمہارا ساتھ نہیں رہ سکتا۔

۱۴ رات ہے۔ تاریک، اندھیری، کالی رات بارش ہے، بجلی ہے، طوفان ہے۔ ماں اور بچہ کمرے میں ہیں۔ تنہا ــــ کمرہ تاریک ہے۔ روشنی صرف اس بجلی کی ہے۔ جو باہر چمک رہی ہے اور پے در پے چمک رہی ہے دروازے بج رہے ہیں۔ ہوا کے زور سے کھڑکی کے پٹ کھلے جا رہے ہیں۔ بچہ ماں کے سینے کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ماں نے دونوں بازوؤں میں اسے دبوچ رکھا ہے۔ بھینچ رکھا ہے سینے کے ساتھ ماں خوف زدہ ہے۔ طوفان سے، تاریکی سے، تنہائی سے دونوں بازو بچے پر ہیں، بچے کے سر پر ــــ اور آنکھیں کھڑکی کے شیشوں پر۔

کھڑکی کا شیشہ ٹوٹتا ہے۔ بجلی، ہوا اور ٹوٹتے شیشے کی آواز کانوں کو پھاڑتی ہے۔ ماں کے منہ سے چیخ نہیں نکلتی۔ اس کے بازو بچے کے سر اور چہرے پر اور بھی سخت ہو جاتے ہیں۔

شیشہ ٹوٹا۔ طوفان تھم گیا۔ بجلی کڑکنا بند ہو گئی۔ دروازے خاموش ہو گئے۔ اب صرف کھڑکی کے ٹوٹے شیشے سے آنے والی ہوا کی آواز ہے۔

ماں لمبا سانس لیتی ہے جیسے وہ ایک زمانے سے سانس روکے بیٹھی تھی۔ بہت لمبا سانس۔
مگر ــــ بچے کی سانس رُک چکی ہے۔

۱۵ لوگوں کو ایسی باتیں نہیں لکھنا چاہئیں۔

(ناول کا ایک باب)

ولیم فاکنر
ترجمہ: اکرام اللہ

غروبِ آفتاب

مندرجۂ ذیل عبارت پہلی مرتبہ ایک خاکے کے طور پر نیو اورلینز کے اخبار ٹائمز۔ پکایون میں ۲۴ مئی ۱۹۲۵ء کو نمودار ہوئی۔

کالا انڈر مارا گیا

وہ حبشی جس نے دو روز سے اس علاقے میں خوف وہراس پھیلا رکھا تھا اور تین آدمیوں ایک کالے اور دو گوروں کو قتل کر چکا تھا گذشتہ شب اسٹیٹ نیشنل گارڈ کی رجمنٹ نمبر۔۔ کے دستے کے ہاتھوں مشین گن فائر سے مارا گیا۔ دستے کے جوانوں نے اپنی مشین گن درختوں کے جھنڈ کے سامنے نصب کر لی اور جب اُن کے فائر کا جواب آنا بند ہو گیا تو کیپٹن والس جھنڈ کے اندر داخل ہوا اور حبشی وہاں مرا پڑا تھا۔ حبشی کے دیوانہ وار فرار کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی تاہم خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پاگل تھا اور اُسے شناخت نہیں کیا جا سکا۔

اُس نے راستے کا کچھ حصہ اسباب کے ڈبوں کے اوپر نیچے اور اندر طے کیا لیکن زیادہ تر اُسے پیدل ہی چلنا پڑا۔ شاہراہِ کارلٹن سے کینال اسٹریٹ تک پہنچتے پہنچتے اُسے دو دن اس لئے لگ گئے کہ وہ ٹریفک سے ڈرتا تھا۔ بالآخر وہ کنال اسٹریٹ میں اپنی بندوق اور گٹھڑی اُٹھائے گھبرایا ہوا، اور خوف زدہ کھڑا تھا۔ دھکے کھانے اور اپنے ہی ہم نسلوں کی تضحیک اور پولیس والوں کی پھٹکار سُننے کے سبب اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ماسوائے اِس کے کہ اُسے اسٹریٹ تو بہرصورت عبور کرنا تھی۔

آخرش اس نے جرأت کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور اندھا دھند بلاک کے وسط میں چل پڑا جس کے اِرد گرد کاریں تھیں، ایک ٹیکسی ڈرائیور نے چیخ چیخ کر اُس پر خوفناک لعنتیں بھیجیں لیکن اپنی بندوق اور گٹھڑی مضبوطی سے پکڑے پار پہنچ گیا۔ اس کے پوچھنے پر ایک نرم دل سفید فام شخص نے اُسے دریا کی راہ پر ڈال دیا۔

یہاں ایک کشتی تھی، کنارے سے بندھی اس کی منتظر۔ اُس تک پہنچنے کے لئے لکڑیوں کے گٹھے سے اُترتے اور چھ فٹ گہرے پانی کو پھلانگتے ہوئے اس کی بندوق گم ہوتے ہوتے بچی۔ پھر ایک اور سفید فام شخص نے اُسے کوستے ہوئے کشتی سے پرے ہٹا دیا۔ "لیکن کپتان" اس نے احتجاج کیا "میں تو بڑا افریقہ جانا چاہتا ہوں۔ میرے پاس کرایہ ہے۔" "افریقہ بھاڑ" گورے آدمی نے کہا۔ "تم جہنم میں جاؤ مگر اس کشتی سے دور رہو۔ آئندہ کبھی یہاں اس طرح آنے کی کوشش کی تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ اگر تم سوار ہونا چاہتے ہو تو اُدھر پرلی طرف جاؤ اور ٹکٹ خریدو۔"

"ہاں، ہاں۔ پکی بات۔ غلطی ہو گئی کپتان"

"کیا۔؟" ٹکٹ فروش نے حیرانی سے دوہرایا۔

"مجھے افریقہ کا ایک ٹکٹ دے دو، مہربانی ہو گی حضور۔"

"تمہارا مطلب ہے الجزائر؟"

"نا۔ افریقہ"

نہیں اس گھاٹ کی ناؤ کا ٹکٹ چاہیئے"

"جی ہاں۔ میرا خیال ہے کہ پرے کھڑی اُس کشتی پر سوار ہو سکوں۔"

"چل بے چل اور سامنے والے" اُس کے پیچھے لگی قطار میں سے ایک آواز آئی۔ سو اس نے ٹکٹ لیا اور دروازے کے ہجوم کے دھکوں سے ایک

دفعہ پھر کشتی پر پہنچ گیا۔

اُسے دھندلا سا تصور تھا کہ افریقہ کہیں دریا کے بہاؤ کے رُخ ہے جب کشتی ندی کو چوڑائی کے رُخ عبور کرنے لگی تو وہ حیران رہ گیا اور پھر اسے ایک بھیڑ کی طرح ہانک کر کنارے پر کھڑا کر دیا گیا۔ بندوق سے چپکے ہوئے اس نے اپنے اردگرد نہایت بے کسی کے عالم میں دیکھا۔ آخر کار ڈرتے ڈرتے وہ ایک پولیس کے سپاہی کے پاس پہنچا۔

"کپتان حضور! کیا یہ افریقہ ہے؟"

"ہوہ — ؟" افسر نے چونکتے ہوئے کہا۔

میں افریقہ پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں — حضور کیا یہ ٹھیک راستہ ہے؟"

"افریقہ — بھاڑ" اس سفید فام شخص نے بھی بالکل اُسی طرح کہا جیسے اسٹیم بوٹ والے شخص نے کہا تھا۔

"یہ بتاؤ تمہاری نیت کیا ہے؟"

"میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ واعظ بتاتا تھا کہ ہم وہاں سے آئے ہیں۔"

"حبشی! تم رہتے کہاں ہو — ؟"

"پیچھے دور پرے "دیہات" میں"

"کس قصبے میں — ؟"

"حضور کوئی قصبہ نہیں — وہاں مسٹر بوب، اُس کے گھر والوں اور اُس کے کالوں کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔"

"مسیسپی یا لوسیانا؟"

"جی ہاں — میرا خیال کچھ ایسا ہی ہے۔"

"سنو میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ پہلی گاڑی جو تم پکڑ سکو اُس پر واپس چلے جاؤ۔ یہ جگہ تمہارے رہنے کی نہیں ہے۔

"لیکن کپتان میں افریقہ جانا چاہتا ہوں۔"

"تم افریقہ کو بھول جاؤ اور ٹرین کا جتنا لمبے سے لمبا ٹکٹ خرید سکتے ہو خرید لو۔ سُنا تم نے۔"

"لیکن کپتان ....."

"اب ختم کرو اس کو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں دھر لوں۔"

کینال اسٹریٹ کے کنارے ایک بار پھر کھڑا وہ اپنے اردگرد حیرانی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ کوئی افریقہ کیسے پہنچتا ہے؟ وہ دھکے کھاتا ہوا کبھی اِدھر نکل جاتا کبھی اُدھر پھر اُس نے اپنے آپ کو قسمت کے سپرد کر دیا جو اُسے دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ لئے پھرتی تھی۔ یہاں ایک اور کشتی گھاٹ سے بندھی تھی اور حبشی لکڑی کے تختے کی راہ سے اوپر جاتے ہوئے اُس کے فرش پہ سامان ڈھیر کر رہے تھے۔ وہاں ایک بغیر کوٹ کے گورا لگڈمی نمایاں تھا۔

کھڑکھڑاتے چھکڑوں کو دھکیلتے حبشی اس کے اردگرد گاتے پھر رہے تھے۔ وہ ابھی بھی اِدھر اُدھر دھکیلا جا رہا تھا۔ ایک چھکڑے کی راہ سے اُچھل کر ہٹتا تو پتہ چلتا کہ دوسرا چھکڑا اُس پر چڑھا آ رہا ہے۔ "او کالے آدمی، دھیان کرو۔"

دفعتاً آقا پلٹ کر اُس پہ آ رہا "لعنتی تم کیا کر رہے ہو؟ کوئی کام کرو نہیں تو دفع ہو جاؤ۔ مجھے یہاں تماشہ دیکھنے والوں کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ سن رہے ہو۔"

"جی ہاں کپتان" اُس نے طمانیت سے جواب دیا اور پھر جلد ہی وہ بھی ایک چھکڑے میں بورے لاد رہا تھا۔ کام کرنے سے ان کے خون میں حرارت آگئی، اُسے پسینہ آنے لگا اور اُس نے گانا شروع کر دیا۔ یہ تھی وہ جگہ جہاں اُسے گھر کا سا ماحول میسر آ گیا — لیکن اُسے یاد نہیں تھا کہ کتنے عرصے کے بعد پہلی مرتبہ۔ "افریقہ، تم کہاں ہو — ؟" اس کے ہونٹوں سے نکل گیا۔

کام ختم کرنے کا وقت: مغرب میں سرخ سورج لٹک رہا تھا اور مجھے ساکت سائے چت کئے اندھیرے کا انتظار کر رہے تھے۔ چکر کھاتے ہوئے سنہرے ذرّات سورج کی آخری روشنی میں نرمی سے چکر کھا رہے تھے۔ کام کرنے والے اب اپنے کوٹ اور دوپہر کے کھانے کے ڈبے اکٹھے کر رہے تھے اور بازار کی چمکدار روشنیوں اور رات کے کھانے کی جانب روانہ ہو رہے تھے، اُس نے اپنی بندوق اور گٹھڑی اُٹھائی اور کشتی پر جا چڑھا۔

نرم مگر بوجھل بوریوں کے درمیان وہ روٹی کھانے کے لئے لیٹ گیا جو اُس نے خریدی تھی اندھیرا مکمل طور پر اُتر آیا۔ جہاز سے ٹکراتے ہوئے پانی کی آواز اور بوریوں میں بند غلے کی تیز چبھتی ہوئی میٹھی بُو نے اُسے جلد سُلا دیا۔

حرکت سے اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ دھیمے دھیمے ہچکولے لگ رہے تھے اور انجنوں کی لگاتار باقاعدہ آواز آ رہی تھی۔ اُس کے اردگرد روشنی تھی اور وہ آسائش کے ایسے تساہل میں پڑا تھا کہ کچھ سوچ بھی نہیں رہا تھا پھر اُسے پتہ چلا کہ وہ بھوکا تھا

اور حیران سا ہوتا ہوا کہ وہ کس جگہ تھا، اُٹھ گیا۔

جیسے ہی وہ عرشے پر آیا تو ایک پاگل سفید آدمی اُسے پڑ گیا۔ "میں افریقہ جانا چاہتا ہوں کپتان" اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا "میں جب کل ان کالوں کی مال لدوانے میں مدد کر رہا تھا تو سمجھتا تھا کہ ہم سب اسی ناؤ پر اکٹھے جائیں گے۔"

گورے آدمی نے اُسے تحقیر اور بے عزتی کے پہلو تلے دبا لیا۔ "آسمانوں کے خدایا! تم کالے مجھے پاگل کردو گے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ یہ کشتی کہاں جا رہی ہے؟ یہ ناٹ شیز جا رہی ہے۔"

"یہ میرے لئے بالکل مناسب ہے۔ تب تو یہ افریقہ سے گزرتی ہے۔ ہم جب وہاں پہنچیں تو آپ مجھے ذرا بتا دینا اور اگر یہ وہاں نہیں بھی رُکتی تو بھی میں کود جاؤں گا اور تیر کر کنارے پہنچ جاؤں گا۔"

وہ شخص ایک انجانی کیفیت میں حیرانی سے اُسے دیکھتا رہا۔

"اور بھاڑے کا بھی فکر نہ کرنا، ہاں" اس کے مسافر نے یقین دلانے کے لئے فوراً کہا "میرے پلّے رقم ہے، میں بھاڑا دے سکتا ہوں۔"

"تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟"

"کپتان، بہت ہے۔" اُس نے جیبوں میں ہاتھ ٹھونستے ہوئے بڑی شان سے کہا۔ اُس کے سلتے پھیلے ہاتھ کی ہتھیلی پر چاندی کے چار ڈالر اور کچھ سکے تھے۔ گورے آدمی نے چار ڈالر اُٹھا لئے۔

"اچھا تو اس رقم کے عوض میں تمہیں افریقہ تک لے چلوں گا۔ جب تک ہم وہاں نہیں پہنچتے تم اُدھر اوپر جا کر دوسرے کالوں کی اسباب اٹھانے میں مدد کرو۔"

"جی جناب" اس نے نہایت شوق اور پھرتی سے کہا۔ وہ قدرے رُک کر پھر کہنے لگا۔ "دیکھیں ٹھیک جگہ پر مجھے بتا ضرور دینا۔ کیوں کپتان مجھے بتا دو گے نا؟"

"ہاں۔ یقیناً۔ اب چلو اور دوسرے لڑکوں کا ہاتھ بٹاؤ۔ چلو یہاں سے، فوراً۔"

وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ کام میں مصروف ہو گیا جبکہ ناؤ ایک عمدہ روشن دن میں چھپاتے دریا کے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف رواں تھی۔ پھر ایک مرتبہ اور سُرخ سورج مغرب میں جا لٹکا۔ کہیں سے گھنٹیاں بجنے کی آواز آ رہی تھی اور کشتی کنارے کی طرف مڑ گئی۔ پھر اور زیادہ گھنٹیوں کی آواز آنے لگی۔ کشتی کی رفتار بالکل مدھم ہو گئی اور وہ ڈرموں کی ایک قطار کے نیچے کیچڑ میں ناک دیئے آہستگی سے جا کر رُک گئی۔ سفید فام کپتان، وہی پاگل، اُس کے سر کے اوپر والے تختے سے جھکا چنگھاڑ رہا تھا۔

"ٹھیک لڑکو، کے ساتھ یہ ڈرم لدوا دو اور افریقہ اُن دور والے کھیتوں سے تقریباً ایک میل آگے ہے۔"

وہ کشتی کو کنارے سے پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھنے کے لئے کھڑا تھا۔ لمبی چمنیوں میں سے دھواں نکلنے [illegible] ہوا جا رہا تھا۔ اُس کے بعد اُس نے بندوق کاندھے پر ڈالی اور طویل سفر کے لئے چل پڑا۔ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اُسے شیروں اور ریچھوں کا خیال آگیا جن سے مڈبھیڑ ہونے کا امکان تھا۔ وہ رُکا اور اس نے بندوق میں گولی بھر لی۔

تمام روشنی ختم ہو جانے کے بعد تک چلتے رہنے کے سبب اس نے جانا کہ وہ افریقہ کے کافی اندر وحشی علاقے تک ہو گا اور یہ کہ وقت دوبارہ کھانے اور سونے کا ہو گیا تھا۔ چونکہ کھا تو وہ سکتا نہیں تھا اس لئے اسنے سونے کے لئے محفوظ مقام تلاش کرنے کی ٹھانی جہاں وہ اغلباً کوئی خرگوش مار سکے گا۔ دفعتاً اُسے اپنے نزدیک ایک باڑ محسوس ہوئی اور اُس سے پار کچھ دھندلا دھندلا سا سجھائی دے رہا تھا جو سوکھی گھاس کا ڈھیر ہو سکتا تھا۔ جب وہ باڑ کے پار اُترا تو تقریباً اُس کے قدموں سے کوئی چیز خوفناک انداز میں اٹھی۔ وہ مہیب اور دہشتناک خوف سے شل سا تھا۔ اُس کی بندوق کندھے کی طرف لپکی اور اندھیرے میں گرجی، چمکی اور شیر یا جو کچھ بھی وہ تھا چینختا ہوا رات میں کود گیا۔ تانبے کے ٹکڑوں کی طرح ٹھنڈا پسینہ وہ اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔ وہ گھاس کے ڈھیر کی طرف دوڑا اور اس پر چڑھنے کی کوشش میں دیوانہ وار اُس پر ہاتھ مارنے لگا۔ اُس کی ان فضول کوششوں کے ساتھ ساتھ اُس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر خوف آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ اُس پھسلن والے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ ایک مرتبہ چوٹی پر پہنچ گیا تو اُس نے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کیا۔ جب وہ پیٹ کے بل لیٹا رات میں گھور

رہا تھا تو اس نے احتیاطاً بندوق ہاتھ کے قریب
رکھ لی جس شے کو اُس نے گولی ماری تھی وہ تو اب
خاموش تھی مگر آواز رات پر ٹوٹی پڑتی تھی۔
زمین کے ساتھ ایک روشنی ٹمٹماتی آ رہی تھی
اور جلد ہی اُس نے دیکھا کہ ٹانگیں ضرب کے سے
نشانات بناتی چلی آ رہی تھیں۔ اُسے پھر آوازیں
ایک ایسی زبان میں آنے لگیں جسے وہ سمجھ نہیں
سکتا تھا۔ اُس نے سوچا وحشی ہوں گے، وہ
لوگ جو دوسروں کو کھا جاتے ہیں۔ وہ گھاس میں
اور نیچا ہو کر دبک گیا۔ روشنی اور آوازیں اُس رُخ
پر چل پڑیں جس رُخ وہ جانور گیا تھا جسے اُس نے
گولی ماری تھی۔ جلد روشنی ایک دھبے کے پاس رُک
گئی جو زمین سے اُبھرا سا آیا اور کوسنے کی آوازیں
بلند ہونے لگیں۔

"حضرات" اُس نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا
"میں نے ضرور ان لوگوں کے ذاتی شیر کو مار ڈالا
ہے۔"

غیر، شیر ہوتا ہے۔ وہ چھپ کر لیٹا رہا اور
روشنی پھر دور ہٹنی شروع ہو گئی اور آخر گم ہو گئی۔
ستارے اُس کے اوپر دھڑک رہے تھے اور وہ
سو گیا۔

ایک جھٹکے سے اُس کی نیند اچٹی اور اُس نے
بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہی اجنبی زبان پھر
اُس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ اُس نے آنکھیں
کھولیں تو ایک چھوٹا سا گہری رنگت کا آدمی
پستول تانے اُس پر جھکا تھا۔ زبان تو وہ نہیں
سمجھ سکتا تھا لیکن جو زبان پستول بول رہا تھا وہ
اُس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

اُس نے سوچا یہ لوگ تو مجھے کھا جائیں گے
اس کی ٹانگ اکٹھی ہوئی اور کھلی۔ گہری رنگت کا
آدمی پیچھے زمین کی طرف لڑھک گیا۔ اُس نے اپنے
آپ کو جس طرح کوئی جانور چھلانگتا ہے اس انداز
میں زمین کی طرف پھینکا۔ پستول چلنے کی آواز آئی
اور کسی چیز نے کند سی ضرب اُس کے کندھے کے
اوپر کے حصے میں لگائی۔ اس نے جواب دیا
ایک آدمی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ پھرتی سے اُٹھ
کر دوڑ پڑا اور گولیاں زائیں زائیں اس کے
پاس سے گزر رہی تھیں۔ سامنے باڑ تھی اور
وہ مڑ کر دروازے کی تلاش میں اُس کے ساتھ
ساتھ دوڑنے لگا۔

اُس کا بایاں بازو گرم اور گیلا تھا۔ وہاں باڑ
کے موڑ کے ساتھ ہی دروازہ تھا۔ اُس کے پیچھے
گولیاں بدستور چل رہی تھیں۔ جب اُس نے
ایک شخص کو دروازے پر راستہ روکنے کے لئے
دوڑے آتے دیکھا تو اُس نے بندوق پر اپنی
گرفت مضبوط کر لی۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے
کے قریب ہوئے تو اُس نے دیکھا کہ وہ شخص تو
اُس کی نسل کا تھا "یہ حبشی راہ سے ہٹ جاؤ۔"
اُس نے اُس شخص کے لہراتے ہوئے بازوؤں
کو دیکھ کر ہانپتے ہوئے کہا۔ جب اس کی بندوق
ایک بار پھر گونجی تو اُسے دوسرے آدمی کے چہرے
پر مضحکہ خیز حیرانی کے تاثرات دکھائی دیئے وہ
پھیپھڑے بھر بھر کر سانسوں کے گھونٹ نگل رہا تھا۔
رکنا ضروری ہو گیا تھا۔ یہاں ایک خندق تھی اور لمبا
بلند کانٹا تھا۔ ذرا آگے جہاں ایک ایسا ہی کانٹا
اُسے کاٹتا تھا۔ وہاں درختوں کا جھنڈ تھا۔ اُس
میں گھس کر وہ چھپ گیا۔ اور کمر کے بل لیٹ کر وہ
زور زور سے ہانپنے لگا۔ اُس کے ہانپتے ہوئے
پھیپھڑے آخر پھر آسانی سے سانس لینے لگے۔
اب اُسے کندھوں کا زخم بھی محسوس ہوا۔ اُس
نے تعجب سے اپنے خون پر نگاہ ڈالی۔ "اب تم سب
کچھ گھورتے دیکھتے رہے ہو؟" اُس نے خیال کیا۔
"عجیب بات ہے کہ یہ افریقی بھی حبشیوں کو گولی
مارتے ہیں جیسے گورے لوگ مارا کرتے ہیں"

اُس نے زخم کو بے ڈھنگے سے انداز میں باندھ
لیا۔ اُسے ایک چیز میسر تھی ـــ پناہ گاہ اور بس۔
اُس کے پاس اٹھارہ گولیاں باقی تھیں اور اُسے
اُن کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ "ابھی سے ایک آدمی
بندوق لئے کوئی دو سو گز کے فاصلے سے درختوں
کے اس جھنڈ کو تاک رہا تھا" معلوم ہوتا ہے۔
وہ فوری مجھے تنگ نہیں کرے گا" اُس نے فیصلہ
کیا۔ "میں اندھیرا ہونے تک یہاں آرام کروں
گا اور اس کے بعد میں مسٹر بوب کے پاس واپس
چلا جاؤں گا۔ افریقہ یقیناً مہذب انسانوں کے لئے
رہنے کی کوئی جگہ نہیں ہے ـــ شیروں پر پاؤں
جا پڑتا ہے۔ آپ پر گولیاں چلائی جاتی ہیں اور
پھر آدمی کو خود لوگوں پر گولی چلانی پڑتی ہے۔ لیکن
میرا اندازہ ہے کہ یہ افریقی اس طرح کی چیزوں کے
عادی ہیں"

اُس کے کندھے میں کند سی دھڑکن جاگ اُٹھی
تیز ہوتے ہوئے بخار میں اُس نے پہلو بدلا۔ وہ
کتنا پیاسا تھا! پہلے وہ بھوکا بھی تھا لیکن اب
صرف پیاسا تھا۔ اُسے گھر کی بھوری ٹھنڈی کھاڑی
کا اور پھر جنگل کے ٹھنڈے چشمے کا خیال آیا۔ اُس

نے پسینے میں بھیگا چہرہ اُٹھایا اور دیکھا کہ وہ چوڑا قریب کھسک آیا تھا۔ اس نے بندوق اٹھائی اور ایک ہاتھ سے جتنا اچھا نشانہ باندھ سکتا تھا باندھ کر گولی چلادی۔ پہرے دار پیچھے گرا اور پھر جلدی سے پاؤں پر سنبھلتے ہوئے، دائیں، بائیں ہوتے ہوئے دوڑ کر اُس کی زد سے باہر نکل گیا۔ "صرف تمہیں ذرا سا ڈرانے کے واسطے" وہ بڑبڑایا۔

چیزیں اب بہت عجیب و غریب دکھائی دینے لگی تھیں اور اُس کے کندھے میں خوفناک درد اُٹھ رہا تھا۔ لحظہ بھر کے لئے اُسے اُونگھ آگئی اور اُس نے یوں جانا جیسے وہ پھر اپنے گھر میں تھا۔ وہ درد کی شدت سے جاگا لیکن پھر اونگھ میں چلا گیا۔ اسی اُونگھنے اور جاگنے میں اُس نے لمبا دن صرف کر دیا ماسوائے اس کے کہ وہ وقفے وقفے سے رینگتا ہوا جا کر ایک گڑھے میں سے مٹیالا بدبودار پانی پیتا ہے۔ آخر جب وہ جاگا تو رات تھی۔ لالٹینیں تھیں اور آگ تھی۔ آگ کی روشنی میں لوگ چل پھر رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

وہ پانی کی خاطر اپنے آپ کو گھسیٹ کر کنارے پر لے گیا تھا اور جونہی وہ مڑا تو ایک گاڑی کی روشنیاں اس پہ مرکوز تھیں۔ ایک آواز اٹھی اور اُس کے اردگرد گولیاں برس رہی تھیں۔ وہ چھلانگ لگا کر واپس درختوں کے جھنڈ میں کود گیا اور روشنیوں کے رُخ پہ اندھا دھند گولیاں برسانے لگا۔ ایک آدمی کی آواز بلند ہوئی اور گولیاں جھنڈ کے درختوں کو چیرتی اور پھاڑتی ہوئی جا رہی تھیں۔ شاخیں اور ٹہنے اس طرح ہلتے جا رہے تھے جیسے کوئی تیز آندھی چل رہی ہو۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے گرم لوہے سے داغا جا رہا ہو۔ اس نے اپنا سر نیچا کیا اور کیچڑ پہ اپنا چہرہ رکھ دیا۔ دفعتاً گولی چلنا بند ہو گئی اور خاموشی اُسے لفظی معنوں میں فراموشی کے حلقوں سے گھسیٹ کر باہر لے آئی۔ اس نے انتظار میں اپنی بندوق آگے کو بڑھا دی۔ بالآخر اندھیرا اُچھلا اور دو چیزوں میں منقسم ہو گیا۔ سامنے کے دھماکے کے شعلے میں اُس نے دو آدمی پیٹ کے بل لیٹے دیکھے اُن میں سے ایک نے پستول تقریباً اُس کے چہرے کے اوپر چلا دیا اور بھاگ گیا۔

پھر صبح ہو رہی تھی۔ سورج اُبھرا، گرم ہُوا اور چلتا ہوا اس کے سر پہ آگیا۔ وہ اپنے گھر تھا، اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ وہ سو رہا تھا اور لڑتا ہوا بھیانک خواب سے باہر آ رہا تھا۔ وہ پھر ایک بچہ تھا —— نہیں، وہ ایک پرندہ تھا۔ ایک بڑا پرندہ باز کی طرح جو نیلے آسمان پہ اَن گنت سیاہ دائرے بناتے چلا جا رہا تھا۔

سورج پھر غروب ہو گیا۔ مغرب خون کی طرح تھی۔ یہ اُس کا اپنا ہی خون تھا جو دیوار پہ رنگ کر دیا گیا تھا۔ رات کا کھانا ہنڈیا میں تھا اور رات بھی ایسی تھی کہ جس میں نہ کوئی آگ تھی اور نہ اُس کے اردگرد گھومنے والے لوگ تھے۔ پھر سب رُک گئے تھے جیسے کچھ وقوع پذیر ہونے کے منتظر تھے۔

اُس نے کیچڑ سے چہرہ اُٹھایا اور اپنے اردگرد جلتی آگ کے حلقوں کو دیکھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے سب لوگ ہیں اس کے سامنے ایک جگہ پہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ سب کے سب کچھ دیکھ رہے تھے یا کسی چیز کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں منتظر رہنے دو۔ کل وہ اپنے گھر ہو گا اور مسٹر بوب اپنی دھیمی آواز میں اُسے کوس رہا ہو گا اور وہ معمول کے ساتھیوں کی ہمراہی میں کام کرے گا، ہنسے گا، باتیں کرے گا۔

ہوا تیز ہو رہی تھی۔ اس کے اردگرد شاخوں اور جھاڑیوں کو دفعتاً ایک ایسی تیز آندھی متھ رہی تھی کہ اس سے تیز ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اُس آندھی کے سامنے شاخیں اور جھاڑیاں چیخ اُٹھیں بکھر گئیں اور پگھل گئیں۔ وہ خود بھی ایک درخت تھا جو اُس آندھی کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ اُس نے اس کے تھپیڑے محسوس کئے اور اپنے آپ کو ٹوٹتے ہوئے، دھجی دھجی ہوتے ہوئے پتّے بن کر بکھرتے پایا۔

آندھی ختم ہو گئی اور تمام ٹوٹی ہوئی چیزیں بے حرکت تھیں۔ اُس کا کالا، شفیق، سادہ لوح اور کبھی خوش خوش رہنے والا چہرہ آسمان اور ٹھنڈے ٹھنڈے ستاروں کی طرف اُٹھا تھا۔ افریقہ ہو یا لوسیانا وہ پروا تھوڑا ہی کیا کرتے ہیں۔

محمد اسحاق شور

بھابی

نہ جانے وہ کون سی عمر ہوتی ہو گی جب بھابیاں اپنے دیوروں کو کھلونا سمجھتی ہیں اور ہیکل کی طرح گلے میں لٹکائے رہتی ہیں، وہ بھرے گھر میں مرغابیاں لئے صحن میں لئے لئے پھرا کرتی ہیں۔ مرغوں کی طرح گگڑوں گگڑوں اذانیں دیتی ہیں۔ گھر کا گھر قہقہوں سے گونجتا رہتا ہے اور بڑی بوڑھیاں ان پر لعنتیں بھیجتی رہتی ہیں، ہاتھ پکڑ کر پھرکی کی طرح گھمایا اور چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسی ہی میری بھی ایک بھابی تھی۔ دس بارہ خاندانوں میں پہلی دلہن، جیسے جھیل میں کنول۔ باغیچہ میں کیوڑے کا پھول، خوابوں میں آنے والی پری۔

گندم کا ڈھیر صحن میں پڑا ہے، مزدور عورتیں چھان پھٹک رہی ہیں، چاروں طرف پلنگ بچھے ہوئے ہیں، پاندان کھلا ہوا ہے۔ محلہ کی عورتیں تیرے میرے قصے کہانیاں مزے لے لے کر سنا رہی ہیں۔ ریشمی کپڑے کو دھوپ دینے کے لئے الگنیوں پر لٹکائے جا رہے ہیں، زیورات کو آزمودہ نسخوں سے دھو کر ان کی آب و تاب پر تبصرے ہو رہے ہیں۔ میری بھابی گندم کے ڈھیر پر مجھے ڈال کر چھاتی پر گھٹنا رکھ کر میرے پائنچوں کو ڈوریوں سے باندھ کر اپنی دو ہتڑوں سے میرے پائجامے میں دھڑیوں گندم بھر کر چھوڑ دیتی ہے۔ کمر کے پیچھے ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں، محلہ کی عورتیں قہقہے لگا رہی ہیں، بھابی کی ساس میری پھوپھی اپنے بھتیجے کو چیختے چلاتے روتے دھوتے دیکھ کر اپنی بہو کو برا بھلا کہہ رہی ہے۔ بھابی رہائی بخشتے ہوئے گلے لگا کر کمر کو پیار سے تھپتھپا کر سب کا مصنوعی غصہ ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ میری عمر کیا ہو گی کچھ یاد نہیں اور میں بتا بھی نہیں سکتا۔ شاید میری عمر میں اب تک کسی اور دن کا اضافہ نہیں ہوا۔

صبح ہونے سے پہلے بھابی دو تین بھینسوں کا دودھ دوہتی، دودھ بلوتے ہوئے چپکے سے مجھے اٹھاتی۔ چھاچھ سے مکھن نکال نکال کر مجھے کھلاتی۔ مٹکی کے گلے اندر شاید مکھن کا کوئی خاص جز ہوتا ہو گا۔ انگلیوں سے نکال نکال کر مجھے چٹاتی نہاتے وقت غسلخانے سے کپڑے اٹھا لیتی میرے رونے دھونے اور چیخوں کو وہ مرلی کے زمزمے سمجھ کر سرشار رہتی۔ مدرسہ جانے کے لئے کپڑے پہناتی پیار سے کنگھا کر کے مانگ نکالتی، ٹوپی اڑھاتے ہوئے خاص انداز میں ٹوپی کو ذرا کج کر کے ایسی خوش ہوتی جیسے اس کے سامنے کوئی شہزادہ کھڑا ہے، چھٹی کے بعد فوراً گھر آنے کی تاکید بلائیں لے لے کر کرتی۔

اس کے سسر خان بابا کے نام سے معروف تھے، ان کا نام خان محمد خان تھا۔ گاؤں کے بازار کے دکاندار فصل کی جو بھی جنس تایا، چچا، پھوپھا، ماموں رکھ کر نہیں دکھاتے۔ وہ کہتے سب گھر پہنچا دو۔ سفید داڑھی۔ سر بھی بگلے کی طرح سفید، کرتے میں گلے کے بٹن کبھی نہ لگاتے، تہبند ٹخنوں سے اوپر، پاؤں میں ادھوڑی کا جوتا۔ ہمیشہ سر جھکا کر چلتے، گاؤں کی لاوارث بچیوں کی شادیاں بیواؤں اور نادار لوگوں کی دیکھ بھال ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

گاؤں کے بڑے سے بڑے زمیندار اور نمبرداروں کو وہ حقیر جانتے اور دنیا کے ہر معاملات میں ان کے خلاف محاذ آرائی ان کی زندگی کا جزو تھا ان کی پہلی بیوی سے چار لڑکے تھے جو قریبی گاؤں میں آباد تھے۔ انہیں زمینیں اور مکانات دے کر وہ سب بچوں کے فرائض سے سبکدوش ہو چکے تھے ان کی اولاد کو قدرت نے وجاہت اور دلیری سے خوب دل کھول کر نوازا تھا۔ ان کی دلیری اور وجاہت بوڑھے باپ کے چہرے کو تر و تازہ رکھتی تھی، ان کا بڑھاپا نوجوانوں سے خراج لیتا تھا۔

فروری ۱۹۷۹ء

ان کی دوسری بیوی میری پھوپھی میری بھابی کی ساس تھیں، ان کے پہلے خاوند سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی ان دونوں کی شادیاں خان بازار نے بڑی دھوم دھام سے کی۔ لڑکے دلہن پر چاند تاروں کے سوا دنیا کی ہر چیز نچھاور تھی، یہی میری بھابی تھی میرا بھائی بے حد سادہ شریف مگر بے حد خاموش شاید اسے اس کا احساس تھا کہ یہ دوسرے باپ کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے، اپنے سوتیلے بھائیوں کے سامنے یہ اپنے آپ کو گدلائے سرراہ سمجھتا تھا۔ ہر وقت کھویا کھویا سا، عمر ۲۰ سال سے زیادہ نہ تھی اسے اپنی بیوی کے حسن وجمال اور بھرپور جوانی کا احساس ہی نہ تھا۔

اس خاندان کے کچھ لوگ سال میں ایک بار پردیس جایا کرتے تھے۔ پردیس سے مراد کاروبار کے لئے، دو چار چھ ماہ میں وطن لوٹتے لاکھ دو لاکھ روپیہ، سیروں سونا۔ دھڑوں چاندی ساتھ ہوتی نہ جانے کتنا سونا اور چاندی اور زیورات ان کے مکانوں کی موٹی موٹی دیواروں کے چور خانوں میں بھرا پڑا رہتا تھا۔ ان کی یہ پُراسرار زندگی لوگوں میں بہت پُرکشش تھی۔

بھابی کا شوہر بھی ان لوگوں کے ساتھ چلا گیا جو دھڑوں سونا چاندی چار چھ ماہ میں کما کر لے آتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکا بھی تھا، جس کی شادی خان بازار نے لاوارث اور یتیم ہونے کی وجہ سے اس گاؤں کی ایک لڑکی سے کرادی تھی۔ ان دونوں کو لاہور ہائی کورٹ سے سات سات سال کی جیل ہوگئی، اس لڑکے کی بیوی بھی خان بازار کے یہاں بلالی گئی۔ چونکہ اس لڑکی کا اب سہارا ہی نہ تھا میں اسے بھی بھابی ہی کہتا تھا اگرچہ اس کا کوئی رشتہ میرے ساتھ نہیں تھا۔ ان بھابیوں کے شوہروں کی سزائیں گھٹتی جا رہی تھیں اور میری عمر بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ دونوں مجھ سے گیند کی طرح کھیلتیں۔ اس نے اچھالی اس نے اُچک لیا۔ اُس نے پھینکی، اِس نے دبوچ لیا۔ اگر ہاتھوں سے نکل گئی تو دونوں دوڑیں اور واپس میں ٹکرا گئیں اور میں گڈھا کر کہیں کا کہیں جا نکلا۔

ہائی کورٹ کی نظر میں یہ ڈاکوؤں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کا تعلق ڈاکوؤں سے نہیں تھا۔ یہ تو اپنے گاؤں سے کھانے کمانے گئے تھے اپنے ضلع سے دور سے ضلع جا کر یہ لوگ فقیرانہ لباس زیب تن کر لیتے شکل وصورت بڑے بڑے بزرگوں اور خدا رسیدہ لوگوں کی بنالیتے، ہندوریاستوں میں دیہات کے دھرم شالاؤں، تالابوں، پڑاؤ اور دھونی رما کر بیٹھ جاتے، گلیوں میں چل پھر کر بھیک مانگتے، تعویز گنڈوں سے لوگوں کا علاج معالجہ کرتے اور اس معلومات کے لئے پورے گاؤں میں در در پھرتے کہ اس کی حیثیت کیا ہے، کونسا گھر کس وقت خالی ہوتا ہے، اس گھر کے مرد کب اپنے کھیتوں کو جاتے ہیں اور ان کے بیوی بچے ان کا کھانا وغیرہ لے کر کس وقت کھیتوں پر جایا کرتے ہیں۔

جب یہ کسی ایسے مکان میں داخل ہوتے کبھی خالی نہ لوٹتے۔ جھولیوں میں سونے چاندی کے زیورات اور نقدی لے کر لوٹتے۔ اپنے ٹھکانوں پر آکر اپنے قریبی تالابوں کے کنارے کیچڑ یا گز دو گز پانی میں کمایا ہوا مال و متاع دفن کر دیتے اور دو چار روز اپنے ٹھکانوں پر آ کر اپنے وطن واپس آجاتے۔

اس کارروائی کا طریقہ بالکل بے خطا ہوتا۔ ایک شخص ایسے مکان میں داخل ہوا — دوسرا مکان کے سامنے کھڑا ہوا تیسرا گلی کے آخری سرے پر۔ اندر والے روشن ضمیر بزرگ کے سامنے صندوق تجوریاں اور دفینے صدیوں کی جمع پونجی اُگل دیتے، قفل ہاتھ کے اشارے کھل جاتے دوسرے اشارے پر لگ جاتے حادثتاً اگر اس گھر کا کوئی فرد آنکلا۔ یہ غریب اس وقت تک گلی میں قدم نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اندر والا شخص حاصل کردہ مال ومتاع زروجواہر ان کی جگہ ٹھیک ٹھیک نگینہ کی طرح رکھ کر باہر نہ آجائے۔ گلی کے سرے والا درویش، درمیان والے کو اور درمیان والا اندر مکان والے کو اپنی زبان میں آگاہ کر دیتا۔ ان کی یہ زبان جنوں کی زبان کہئے جو دعائیہ جملوں، مرعوب کن فقروں، قرآنی آیات دیدوں کے اشلوک اور مختلف بانیوں اور بولیوں سے مرصع ہوتی۔ ان کی گردانیں آدمی کو قدم اٹھانے نہ دیتیں ان گردانوں میں لوگوں کی خوش بختیوں کی نوید ہوتیں، حادثات غُراتے اور موت انہیں کے سامنے دکھائی دینے لگتی۔

ان کی نظر میں یہ چوری نہیں تھی، بلکہ یہ غیر مسلموں اور اپنی ضرورت سے زیادہ زر و مال رکھنے والوں سے روپیہ پیسہ حاصل کرنا اور غرباء و مساکین میں تقسیم کر دینا اپنا فرض خیال کرتے تھے جس تالاب پر ان کا ڈیرہ تھا۔ ایک ڈاکوؤں کا گروہ ستانے کے لئے رکا اس گروہ کا تعاقب پولیس کی بھاری جمیعت کر رہی تھی۔ پولیس نے اس تالاب کو

گھیرے میں لے لیا۔ اس گھیرے میں یہ خدا ترس لوگوں کا محلہ بھی آگیا۔ اس میں میری ان دونوں بھابیوں کے شوہر بھی تھے۔ انہوں نے تو ابھی پر بھی نہیں توڑ تھے کہ گرفتار ہو گئے۔

میں ان بھابیوں کے درمیان اس طرح جکڑا گیا جیسے زمین و آسمان کے درمیان چاند تارے میں ان کی دنیا کا چاند تھا اور یہ زہرہ و مشتری جو اپنی اپنی تقویم میں جگ مگ کر رہی تھیں۔ میری پہلی بھابی کی نند سات میل کے فاصلے پر رہتی تھی۔ بھابی کو دل بہلانے کے لئے اس کی نند اور دیگر رشتہ دار دو دو چار چار ماہ کے لئے اپنے یہاں بلا لیتے تھے۔ تاکہ اس کا دل بہلا رہے۔ چھٹیوں کے زمانے میں یہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے آتی۔

یہ حویلی سات گھروں پر مشتمل تھی۔ ہر گھر علیٰحدہ علیٰحدہ ہر گھر کے بڑے بڑے صحن اور ان سب گھروں کا ایک وسیع صحن اس میں کنواں اور نیم کا درخت تھا۔ تمام عورتیں بچیاں، لڑکیاں اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر نیم کے نیچے جمع ہو جاتیں۔ یہ عورتیں ہونی انہونی باتیں اور قصے کہانیاں محفل گرم رکھنے کے لئے مشتاق رہتیں۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں اپنی لڑائی جھگڑے اور فسادات کے مقدمات لے کر پہنچ جاتیں ان کے فیصلے یہ کنوئیں والیاں ہی طے کیا کرتیں۔

بھائی کی وجہ سے رشتہ دار عورتیں محلے کے چھوٹے بڑے اس کی دلجوئی کے لئے آتے جاتے رہتے گاؤں کی لڑکیاں اس کے لباس کی وضع قطع اس کے زیورات کی چمک دمک دیکھنے آتی جاتی رہتیں یہ حویلی نوجوان لڑکیوں کی تربیت گاہ بھی تھی۔ جس لڑکی کو جس کسی نے جو حکم دے دیا اس کی انجام دہی اس پر لازم تھی، بھابی کو ہر شخص کوئی نہ کوئی کام بتا کر اپنائیت اور اس سے اپنی محبت اور قربت کا ثبوت دیتا۔ کوئی کہتی میری اچھی دو ڈول بھر دے، دوسری آواز آتی میرے بھی دو گھڑے بھر دینا۔ بھابی ڈول پکڑتی پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ ایک سانس میں نکال ڈالتی اور اُسے پرواہ بھی نہ ہوتی۔ روٹی پکاتے بیٹھتی دس آوازیں آتی ہم بھی کھائیں گے اور لڑکیاں بالیاں اسے نیچ کرنے کے لئے چولھے پر بیٹھ جاتیں۔ یہ روٹی پر روٹی ان خوش خوروں کے سامنے پھینکتی رہتی، مجال ہے کسی کے لقمہ کا سلسلہ ٹوٹنے پائے۔

گھر گھر اس کی جوانی، حسن اخلاق، کاموں میں جوش اور امنگوں کے اکثر تذکرے رہتے اور اس کے شوہر کے جیل میں ہونے کی وجہ سے اپنے پرائے سب ہی اس سے محبت سے پیش آتے اس کی نند کو شاید ہر دلعزیزی کھلتی تھی۔ نند بھاوج کا وہ مکروہ سلوک جو اس رشتہ سے معروف ہے کارفرما تھا۔ رشتہ داروں ہی میں سے ایک نوجوان یا ادھیڑ عمر کا ایک شخص ہمیشہ حویلی میں آتا جاتا تھا اس کی نند اکثر بات بے بات پر اس کو کہتی کہ جب یہ آتا ہے تیرے رنگ ڈھنگ عجیب ہو جاتے ہیں۔ تو اس کو چھپ کر دیکھتی ہے، اکثر گھر کی دیگر خواتین بھی اس کی ہم نوا ہو جاتی ہیں یہ اپنی نند کو ہر طرح سمجھانے کی کوشش کرتی، طرح طرح سے یقین دلاتی اکثر تو تو میں میں بھی ہو جاتی اس کی نند کے رویہ میں ذرا بھی کمی نہ آتی۔ بھابی مرکھنی گائے کی طرح پھنکارتی پھرتی، بپھرے ہوئے بچھڑے کی طرح اس کے سامنے جو بھی آتا آگے لگا لیتی۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے تنہائی میں مجھے گود میں لے کر ایسی پھوٹ پھوٹ کر روتی جیسے مجھے یہ آنسوؤں میں ڈبو کر سانس لے گی۔ راتوں کو میرے پلنگ پر آ کر میرے سینے پر سر رکھ کر ایسی گھٹ گھٹ کر روتی میرا سینہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا اگر میرے بس میں ہوتا میں آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلتا۔

ایک دن پھر اس کی نند نے ایسا تیر مارا جو اس کے سینے سے گذرتا ہو پورے خاندان کو زخمی کر گیا۔ میری بھابی زخمی ہرنی کی طرح دوڑی اور نیم کے نیچے بیٹھی ہوئی عورتوں کو للکارا کہ تم اپنی لگی سگی ۔۔۔ ہو یہ پھر مجھے کچوکے لگا رہی ہے کیا تم بھی انصاف نہیں کر سکتیں، کیا اس کے منہ میں لگام نہیں ڈالا جا سکتا۔

نہ جانے اس وقت کون سا نحس ستارہ اس خاندان پر اثر انداز تھا، یہ عورتیں نہایت سنجیدگی سے بولیں۔ کیا یہ غلط کہتی ہے۔ بس اس نے پلنگ پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا اور فضا میں تلوار کی طرح لہرایا اور للکارا، آؤ دیکھیں مجھے کون روکتا ہے۔ میں اب اسی کے پاس جا رہی ہوں جو آپ سب نے میرا آشنا تجویز کیا ہے، خدا حافظ، اور وہ کنوئیں والی حویلی کو ہمیشہ کے لئے کنوئیں میں ڈال کر بجلی کی طرح حویلی سے نکلی اور چوک سے گزرتی ہوئی اس شخص کے گھر میں زخمی ہرنی کی طرح چکرا کر گر پڑی۔ تمام گاؤں سوگ میں ڈوب گیا۔ بچہ بچہ سمٹ کر اس گھر کے سامنے جمع ہو گیا۔ حویلی چوک میں صف ماتم بچھ گئی۔ حیرت و استعجاب کا یہ عالم ہو گیا کہ ہر شخص

ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا جیسے ان کی قوت گویائی یکایک سلب ہوگئی ہے چند معزز اور معمر آدمی اس بپھری ہوئی شیرنی کے سامنے ہاتھ باندھ کر ایسے کھڑے ہو گئے جیسے کسی ظالم دیوتا کو اپنی جانوں کا صدقہ یا بھینٹ دینے آئے ہیں۔ انہوں نے دردناک انداز میں ان کے آباؤ اجداد کی عزت و آبرو کا واسطہ دیا۔ اس کی سسرال کی خودداریوں کے تاریخی حوالے دیئے اور کہا بیٹی ہم سب کی عزت تیرے ہاتھ میں ہے ہم سب کو معاف کر دے تیری نند ہی نے نہیں ہم سب نے تجھ پر ظلم کیا ہے۔

اس نے اپنا گھونگھٹ اُٹھایا، آگے ہاتھ بڑھائے اور دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کے چوڑیاں ٹھنڈی کر دیں۔ اور بولی وہ کہاں ہے جس کو میں اشارے کیا کرتی تھی اُسے پیدا کرو وہ جس رشتے سے بھی مجھے رکھے گا میں اس گھر میں رہوں گی۔ مجھے موت ہی اس گھر سے علیٰحدہ کر سکتی ہے۔ اگر وہ بھاگ گیا ہے تو میری نند سے کہو وہ اسے ڈھونڈ کر لائے۔ میری غیرت کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ مجھے میرے ضمیر کی لاش پر ماتم کرنے دو۔ جسے بُری طرح ہلاک کیا ہے۔

گاؤں کے یہی بزرگ و برتر لوگ کنوئیں والی حویلی کی ڈیوڑھی پر سر پھوڑ پھوڑ کر دہائیاں دے رہے تھے خدا را باہر آؤ اور اپنی عزت اور آبرو کو لے آؤ۔ تمام حویلی یک زبان ہو کر بولی، سورج مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے۔ اب اس کا قدم اس گھر میں نہیں آ سکتا۔ وہ شخص جو ہزاروں آدمیوں کا نشانہ بنا ہوا تھا لوگوں کی نگاہوں سے بچتا بچاتا باؤلو ہوا اس کے گاؤں پہنچا اور اس کے والدین کو اس حادثہ سے آگاہ کیا۔ اس کا بھائی شام کے جھٹپٹے میں کئی گھوڑوں کی حفاظت میں اسے اپنے گاؤں لے آیا۔ اور لوگ کفِ افسوس ملتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔

خان بازار کا خاندان اور ان کی پہلی بیوی کے لڑکوں کے لئے منہ دکھانے کی کوئی جگہ نہ رہی ان کی رگ و پے میں خون لاوا بن کر گردش کرنے لگا ان کے دلوں میں قتل و غارت کے منصوبے جڑ پکڑ گئے۔ اس کے اغوا کے لئے کئی منصوبے بُن لئے گئے۔ کتنے ہی ضمیر فروشوں نے اس کے خاندان سے ربط و ضبط میل جول براہِ راست عشق و عاشقی کے ریشمی جال قدم قدم پر پھیلا دیئے یہ زخمی شیرنی کی طرح اپنا خون چاٹ چاٹ کر جی رہی تھی۔

میری شادی اٹھارہ سال کی عمر میں ہوئی۔ میں آہوئے ختن کی طرح مست و سرشار کلانچیں بھرتا ہوا پھرتا تھا۔ بچپن کا یہ زخم مندمل ہو چکا تھا۔ تھا۔ ایک روز دور ایک مکان کی چھت سے مجھے بلانے کے اشارے محسوس ہوئے۔ فاصلے اور جگہ کے تعین پر میں اچھی طرح پہچان چکا تھا کہ یہ میری بھابی ہے۔ میں در و دیوار کی آنکھوں سے بچتا بچاتا ہوا بیتابانہ اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے بہن بھائیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک کوٹھری میں پہنچا دیا۔ میں داخل ہوا تو یہ نیم جان حالت میں دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی مجھے لپٹ گئی۔ ہم دونوں یہ گریہ زاری اور آہ و بکا کے ایسے طوفان میں پھنس گئے کبھی وہ مجھے ڈوبنے سے بچاتی کبھی میں اُسے بپھری ہوئی موجوں سے نکالتا۔

گھنٹوں کے بعد یہ طوفان رُکا۔ تیری شادی ہو گئی بھابی بولی۔ مجھے اس دن کی کتنی آرزو تھی کہ تجھے دولہا بنا دیکھوں۔ یہ جملے اس نے کس طرح ادا کئے جو قلم و بیان کی طاقت سے باہر ہے۔ اُس نے اپنے اُن پیار کے زخموں کو جو عرصہ ہوا مندمل ہو چکے تھے۔ میری پیشانی چوم چوم کر تازہ کر دیا۔ رخصت ہوتے ہوئے وہ بولی مجھے اپنے مکان کی چھت سے اپنی دلہن کو دکھا دے میں گلے لگا کر نہ سہی اپنی نگاہوں سے اس کی پیشانی پر پیار کی افشاں چن دوں گی۔

وائے حسرتا وہ میری بیوی کو نہ دیکھ سکی وہ اپنی نگاہوں سے میری اہلیہ کی پیشانی پر جو افشاں چُننا چاہتی تھی وہ آنسو بن کر اُسی کے رخساروں پر جھل مِل جھل مِل ہو کر اپنی آب و تاب ہی کھو بیٹھے ہوں گے۔

گاؤں میں یک منزلہ عمارتوں پر زینہ نہیں ہوتا پھر نئی دلہنیں سالہا سال تک اعلانیہ اپنے شوہروں سے ہم کلام بھی نہیں ہوتیں۔ گھونگھٹ تو بعض گھرانوں میں کفن کی چادر بن جاتا ہے محرم و نامحرم بالغوں، بالغوں نابالغوں کے زنان خانوں میں آنے جانے کے ادب و آداب ہر شخص کی سرشت میں داخل ہیں۔ ہزار جتن کے باوجود میں اپنی بیوی کو اپنے مکان کی چھت پر نہ لیجا سکا۔

ایک دن پھر اُس نے مجھے بلایا۔ میں چوروں کی طرح چھپتا چھپاتا اس کے گھر پہنچا۔ پہلے والی کوٹھری میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک مسرت کی لہر دوڑی اور چراغ کی لو کی طرح تھرتھرا کر

گل ہوگئی جب وہ کچھ کہنے لگتی تو الفاظ آنسوؤں میں ڈوب جاتے اس کی اس حالت سے میرا جگر پانی پانی ہوکر رہ گیا۔ ذرا قرار کے بعد اس نے کہا۔ تیرا بھائی کیسا ہے اور کہاں ہے۔ مجھے بھول چکا ہے یا کبھی یاد کر لیتا ہے یا وہ بھی اپنی بہن کی یاد گوئی پر ایمان لے آیا ہے۔ میں نے کہا وہ تو اپنے حواس ہی کھو بیٹھا۔ تمام دن مکان سے باہر چوک میں بیٹھا رہتا ہے کسی نے کھانے کو کہا کھا لیا۔ پانی کو پوچھا پی لیا۔ وہ تو مجھے بھی بلانے کے لئے دوسرے ناموں سے مخاطب کرتا ہے۔ گاؤں کے لوگوں کے نام بھول گیا ہے۔ ان کی صورتیں یاد نہیں رہیں سانس کے رشتے کے سوا ہر رشتہ اسکا اس دنیا سے قطع ہو چکا ہے۔

جہاں تک تمہیں یاد کرنے کا سوال ہے وہ تمہارے خیالوں میں ایسا گم ہے جیسے وہ تمہارے روبرو ہے اور ہمکلام بھی۔ میں نے یہ موضوع بدلتے ہوئے کہا بھابی کیا کروں اگر میں کسی قابل ہوتا تو تجھ پر اپنی جان نثار کر دیتا۔ وہ بولی میں نے سُنا ہے تو لاہور رہے وہاں کیا کرتا ہے وہ کتابت کو نہ سمجھ سکی میں نے کہا میں کتابیں لکھتا ہوں، کیا کما لیتا ہے۔ میں نے کہا مہینہ میں بیس پچیس روپے ماہوار، وہ میرے پیر پکڑ کر بولی مجھے یہاں سے جس طرح بھی ہو لاہور لے چل۔ نہ جانے میں کب قتل کر دی جاؤں موت میرے اور میرے بھائی کے سر پر ہمہ وقت منڈلاتی رہتی ہے، قتل کرنے اغوا کرانے عشق و عاشقی میل جول کے ہمہ رنگ زمین جال بچھائے ہوئے ہیں۔ میرا بھائی موت سے اسی طرح بچ سکتا ہے کہ میں کہیں روپوش ہو جاؤں ورنہ میرا بھائی مجھ سے پہلے قتل کر دیا جائے گا۔ میں یقین دلاتی ہوں میں تجھ پر بار نہیں بنوں گی۔ میں مزدوری کروں گی۔ سی پرو کر گذارا کر لوں گی۔ تیرا بچا کھچا کھا کر دن گذار لوں گی تو میرا کہیں نکاح کرا دینا جو بھی پہاڑ مجھ پر ٹوٹے تیرے سامنے اور تیرے ہی ہاتھوں سے میرے منہ پر مٹی آئے۔

نکاح کے ذکر سے مجھے خیال آیا، لاہور میں میرے مکان کے نیچے ایک صاحب اپنے لڑکے رشتہ کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں، کوئی عجب نہیں ان سے یہ ناطہ جڑ جائے۔ میں نے کہا اگر تم کسی طرح خود لاہور آجاؤ تو شاید نکاح کی صورت پیدا ہو سکتی وہ بولی زندگی کے دن تو پورے کرنے ہی ہیں — دھوئیں ہی میں سہی۔ موت تو مجھے بہت عزیز ہے مگر ان عزت داروں کے ہاتھوں قبول نہیں۔

میں اُسے عفریت کے جبڑوں میں چھوڑ کر لاہور پہنچ گیا۔ میری ذہنی کیفیت بھی اس کے شوہر کی سی ہوگئی، لاہور جیسا پر شکوہ شہر میرے گاؤں کی ٹیڑھی میڑھی اور کچے پکے گھروں کی آبادی نظر آنے لگا۔ میں کبھی اُسے خون میں نہلائے ہوئے دیکھتا کبھی اس کی لاش پر نظر جم جاتی، کبھی وہ ٹوپی اڑھاتے ہوئے نظر آتی، کبھی مکھن کھلاتی ہوئی کبھی کان اینٹھتی ہوئی۔ میں روتے لگتا تو میرا منہ چوم چوم کر خاموش کرتی جب تک میں مسکرا نہ پڑتا وہ مجھے نہ چھوڑتی۔

گاؤں کا ایک نوجوان اس کی سسرال کے شقی القلب لوگوں کے ایما پر اپنی دین دُنیا لٹا دینے کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھا اس شخص سے اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر تو مجھے لاہور پہنچا دے تو میں عمر بھر تیرا احسان نہیں بھولوں گی اور بقیہ سانسوں کو تیری بخشش خیال کروں گی۔ لاہور میں میرا ایک دیور ہے جو مجھے سنبھال لے گا۔ اس ڈولر نے اس شخص کو کہا کہ فوراً اسے لے کر روانہ ہو جاؤ۔

تمام گاؤں آسودۂ خواب تھا اس نے اپنی متاع درد و کرب اپنے خاندان کے لئے اپنے گھر ہی چھوڑی ——— جو کئی پشتوں کیلئے کافی تھی۔ ماں باپ بہن بھائیوں کے سرہانے کھڑے ہو کر ان کی روحوں سے رشتہ جوڑا اور چند بچے کھچے بے آب سے آنسو جو باقی رہ گئے تھے نذر کئے اور در و دیوار کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی اپنے راہبر کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی۔ یہ شخص بھیانک راستوں کے پُر پیچ نشیب و فراز کو اس کے شباب کی قندیل سے منور کرتا ہوا اسٹیشن پہنچا۔

ریل تاریکیوں کو روندتی ہوئی آئی۔ یہ دونوں اس میں سوار ہو گئے، مسافر اونگھ رہے تھے۔ ریل ظلمتوں سے کھیلتی ہوئی رواں تھی۔ دُور ایک قصبہ کی بتیاں تاریکیوں کے قلب میں چراغاں کر رہی تھی۔ اس کے ساتھی نے اسے آواز دی، ادھر آؤ دیکھو یہ کتنا حسین منظر ہے، یہ ریل کے ڈبے کے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی یہ ان میں ایسی محو ہوئی جیسے اس کے امیدوں کے محل میں چراغاں ہے یا اس کی تقدیر کے ستارے جگمگا رہے ہیں۔ وہ اپنے مستقبل کا ان سے کچھ رشتہ جوڑ ہی رہی تھی اس کے راہنما نے اسے دھکا دیا وہ ظلمتوں کے سمندر میں ڈوب گئی اور روح فلک کے ستاروں میں جا ملی اور ریل نوحہ خوانی کرتی ہوئی لاہور آگئی۔

فروری ۱۹۷۹ء

رحمن شریف

شہرِ خموشاں

وہ دونوں سفر میں تھے۔ زادِ راہ ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے اس جنگل بیاباں میں پڑاؤ ڈال دیا تھا اور اپنا سامان کھول رہے تھے۔ وہ جب گاؤں سے چلے تھے تو جمعہ کا دن تھا۔ سورج نصف النہار پر تھا۔ اور آج اتوار تھا۔ سورج کو مغرب کی کھولی میں گھسے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ رات کا مہیب سناٹا اپنے دامن کو پھیلا رہا تھا۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ ہوا کے یخ جھونکے ان کے جسموں سے ٹکرا رہے تھے۔ دونوں نے دستر خوان بچھایا اور اپنی اپنی پوٹلیوں سے کھانے کی چیزیں نکال کر رکھیں۔ پھر دونوں نے بسم اللہ کہہ کر اپنے آگے رکھی چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دونوں جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو انہیں سردی کے احساس نے ستایا۔

ان میں سے ایک نے کہ پستہ قد اور سیاہ ریش تھا دوسرے سے کہا "بھائی آج تو بہت سردی ہے۔ نہ اوڑھنے کو کوئی گرم چیز ہے نہ بچھانے کو۔"

دوسرے نے جو اس کی بات سنی تو تشویش ظاہر کرتے ہوئے بولا "کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ آج کی سردی ہمارے جسموں میں گھس کر ہمیں سرد کر دے گی۔"

"تو بھائی کچھ ترکیب تو کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم شہر پہنچنے سے پہلے ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔" پہلے نے دوسرے سے کہا۔

دوسرا بولا "لوگ کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ چلو آج ہم بھی سو کر دیکھیں۔"

"ہاں! نیند تو مجھے بھی آرہی ہے۔" پہلے نے جماہیاں لیتے ہوئے کہا۔

"تو لیٹ جاؤ۔ شاید نیند آ ہی جائے۔"

وہ دونوں لیٹ گئے۔ انہوں نے چادریں اپنے جسموں پر تان لیں۔ اور سردی کی شدت کو کم کرنے کیلئے اپنے جسموں کو سکیڑ لیا۔ لیکن سردی چادر کی سرحد پار کر کے ان کے جسموں میں اترنے لگی۔ دن بھر کی تپتی زمین بھی اب حرارت کھونے کے بعد برف بن چکی تھی۔ اوپر سے تو وہ پریشان تھے ہی زمین بھی اب انہیں پریشان کرنے لگی تھی۔ وہ کروٹ پر کروٹ بدلتے رہے۔ کبھی اس کروٹ تو کبھی اس کروٹ۔ جب انہیں کسی پل چین نہ آیا تو پہلے نے چادر سے منہ نکال کر کہا۔

"کیا سو گئے ہو؟"

دوسرا بھی شاید اسی انتظار میں تھا۔ اس نے جھٹ چادر منہ سے سرکا کر جواب دیا "نہیں۔ ابھی تو نہیں سویا۔ یہ سردی سونے نہیں دے گی۔"

"معلوم نہیں لوگوں کو سولی پر کیسے نیند آجاتی ہے میں نہیں مانتا۔" پہلے نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اس کے دانت بجنے لگے تھے۔

"ہاں بھائی۔ یہ بات تو اپنی سمجھ سے بھی بالا ہے۔" دوسرے نے اس کی بات کی تائید کی۔

پہلے نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "سردی کا کچھ علاج کرنا چاہیئے۔"

دوسرے نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا "ہاں بھائی کوئی ترکیب سوچو۔"

پہلے شخص نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اچھا تو یوں کرتے ہیں کہیں سے لکڑیاں لاتے ہیں۔ آگ جلے گی تو جسم میں حرارت پیدا ہوگی۔"

دوسرے نے اس کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ جاؤ جا کر لکڑیاں لے آؤ۔ میں لکڑیاں جلانے کے لیے جگہ بناتا ہوں۔"

"نہیں جنگل میں اکیلے نکلنا مناسب نہیں۔ دونوں چلتے ہیں۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی خطرہ ہوا تو نمٹ لیں گے۔" پہلے نے دوسرے کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا تمہیں ڈر لگتا ہے۔" پہلے نے سوال کیا۔

"نہیں میں ڈرتا نہیں ہوں۔ جنگل میں کوئی جانور بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"اچھا تو چلو میں بھی چلتا ہوں۔" پہلا اٹھتے ہوئے بولا اور دونوں لکڑیاں اکٹھی کرنے چل پڑے۔

دونوں واپس لوٹے تو ان کے کندھوں پر لکڑیوں کا ایک ایک گٹھا تھا۔ انہوں نے لکڑیاں ایک جگہ ڈھیر کر دیں۔ اور کچھ تیلیاں نکال کر ماچس کی تیلی سے سلگانے

لگے۔ شعلہ کبھی جلتا کبھی بجھتا رہا۔ لکڑیاں گیلی تھیں۔ آخر لکڑیوں نے آگ پکڑ لی اور وہ دونوں آگ کے قریب بیٹھ کر ہاتھ تاپنے لگے۔ جب ان کے جسم میں گرمی پیدا ہوئی اور سردی کا احساس زائل ہوا تو پہلے نے دوسرے سے کہا۔

"کیوں بھئی تمہارا کیا خیال ہے ہم نے پیدل سفر کر کے اچھا کیا نا؟"

دوسرا بولا "ہاں اگرچہ اس سفر میں مصائب بہت ہیں۔ لیکن یہ بہت محفوظ سفر ہے۔"

پہلا اس بات پر خوش ہو کر بولا "تم کیا میرے مشورے کی داد نہ دو گے۔ اگر ہم بس میں سفر کرتے تو ہو سکتا تھا یہ مرض ہم کو بھی لگ جاتا۔"

دوسرے نے اس کی بات کی تردید نہ کی "تم صحیح کہتے ہو۔ یہ مرض وبا کی طرح پھیلا ہے ہم کو بھی ضرور لگ جاتا۔"

پہلے نے کہا "ہاں اس بات کا سخت خطرہ تھا۔ لیکن اب یہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ ہم آبادی سے بہت دور نکل آئے ہیں۔"

"تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ تمہیں اس مرض کا پتہ کیسے چلا" دوسرے نے پہلے شخص سے دریافت کیا۔

پہلے نے جو یہ بات سنی تو تفصیل سے اپنی داستان سنانے لگا۔

"ہوا یوں کہ ایک دن صبح جب میں اٹھا تو تاریکی پوری طرح چھٹی نہ تھی۔ میں نے وضو کیا اور جب مسجد پہنچا تو مسجد میں کوئی نمازی نہ تھا۔ میں نے سوچا ابھی جماعت میں کچھ وقت باقی ہے۔ اس وقت تک لوگ آجائیں گے۔ جماعت کا وقت بھی آپہنچا لیکن کوئی نمازی نہ آیا مجھے حیرت تو بہت ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صفیں خالی تھیں۔"

"اچھا تو تم نے یہ کیسے جانا کہ لوگ اس مرض کا شکار ہو گئے ہیں" دوسرے نے کریدا "بھائی وہ اس طرح کہ جب میں نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو سورج نکل آیا تھا مجھے سڑکوں پر لوگ نظر آئے۔ ان کے چہروں پر سکون نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میں نے قیاس کیا شاید کوئی ایسی ویسی خبر آگئی ہوگی۔ اتنے میں مجھے ایک واقف کار نظر آیا۔ میں اسے آوازیں دیتا ہی رہ گیا۔ لیکن وہ میری آواز سنے بغیر گزر گیا۔ میں نے اسے ایک اتفاقیہ امر جانا۔ کچھ آگے جا کر مجھے چند اور شناسا نظر آئے۔ میں ان کے قریب جا پہنچا اور ان سے مسجد کا واقعہ بیان کرنے لگا۔ لیکن ان میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ وہ صرف میرا منہ ہی دیکھتے رہے۔ سو میں نے جانا کہ ان کی قوت گویائی سلب ہو چکی ہے اور وہ سماعت سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔" پہلے نے اپنا بیان ختم کر کے ٹھنڈی سانس لی۔

"اچھا تو تم بھی اسی لئے شہر جا رہے ہو۔ کیونکہ گاؤں میں کوئی بولنے سننے والا باقی نہ بچا تھا۔" دوسرے نے کہا۔

پہلا جو اپنی داستان ختم کر چکا تھا پھر گویا ہوا۔

"بس جب میں نے دیکھ لیا کہ تمام لوگ اس مرض کا شکار ہو گئے ہیں۔ تو مجھے خطرہ ہوا کہ میں جو اب تک اس مرض سے محفوظ ہوں کہیں اس کی لپیٹ میں نہ آجاؤں۔ سو میں نے زاد راہ لیا۔ کچھ سامان بٹورا اور نکل کھڑا ہوا۔"

"اچھا کیا تمہارا اس گاؤں میں کوئی عزیز رشتہ دار نہیں۔" دوسرے نے بات جاری رکھنے کے لئے پوچھا۔

"نہیں ایک بیوی تھی۔ وہ مر چکی۔ گاؤں میں اپنا ایک مکان تھا۔ وہیں پڑا رہتا تھا۔ رشتہ دار سب شہر میں ہیں وہیں جا رہا ہوں۔" پہلے نے بتایا۔

"کیا ان کو خبر کر دی۔"

"نہیں خبر کہاں سے کرتا۔ اتنی عجلت میں تو گاؤں چھوڑنا پڑا۔" پہلے نے آگ میں لکڑیاں ڈالتے ہوئے کہا۔ دوسرے نے زور سے جماہی لیتے ہوئے پوچھا۔

"صبح ہونے میں ابھی کتنی دیر ہے۔"

"معلوم نہیں صبح کب ہوگی۔ ہمارے پاس تو گھڑی بھی نہیں کہ اس سے وقت کا پتہ چلتا۔" پہلے نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے تو بتایا ہی نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔"

دوسرا اپنی بابت بتلانے لگا "بھائی میرا قصہ تو بہت مختصر ہے۔ میرے گھر کے تمام افراد اس مرض کا شکار ہیں صرف میں بچا ہوا ہوں۔ سو میں شہر جا رہا ہوں کہ کوئی دوا مل سکے تو لے آؤں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میں خود اس مرض سے بچنا چاہتا ہوں اور یہ صرف دور رہ کر ہی ممکن ہے۔"

"تمہارے ساتھ تو بڑی زیادتی ہوئی۔ کیا تمہارے علاوہ کوئی بھی اس مرض سے نہ بچا۔" پہلے نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" دوسرے نے آہ بھری "مرض کا حملہ اس قدر شدت سے ہوا کہ دو دن کے اندر تمام افراد کو اس مرض نے گھیر لیا۔ ممکن تھا میں بھی اس مرض میں مبتلا ہو جاتا لیکن میں نکل بھاگا۔"

دونوں نے اب خاموشی اختیار کر لی تھی۔ آگ سرد پڑ چکی تھی اور سورج مشرق سے جھانکنے لگا تھا۔ دونوں نے ناشتہ کیا۔ اپنا سامان سمیٹا اور سفر پر چل پڑے۔ اونچے نیچے پتھریلے دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے وہ شہر کی سمت چلے جا رہے تھے کچھ دوری پر انہیں ایک درخت کی چھاؤں میں ایک بڈھا نظر آیا۔ مرد زمین پر لیٹا ہوا تھا اور عورت درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ان تک جا پہنچے۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ اور سورج عین ان کے سروں پر تھا۔

فروری ۱۹۷۹ء

ان کو قریب دیکھ کر مرد اٹھ بیٹھا اور عورت جو اب تک پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی سمٹ گئی۔

پہلے نے مرد سے پوچھا "کیوں بھئی کدھر جا رہے ہو؟" لیکن وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

دوسرے نے جو اس کو یوں گم صم دیکھا تو پہلے کی بات دہرائی "یہ پوچھ رہے ہیں تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟" مرد کے لبوں میں جنبش کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر دونوں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور لب پھڑکنے لگے۔ لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ عورت اب تک خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے کوئی مداخلت نہ کی تھی۔

"اس کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی" پہلے نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اس پر وہ عورت جو دیر سے خاموش بیٹھی تھی کہنے لگی "میں اس کی بیوی ہوں۔ ہم بہت دور ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ گھر میں ہم دونوں سمیت نو افراد ہیں۔ نہ جانے ایک دن کیا ہوا کہ سب گونگے بہرے ہو گئے۔ اس دن سے یہ بھی کچھ بولتا سنتا نہیں۔ میں سخت پریشان ہوں اور اس کو علاج کے لئے شہر لے جا رہی ہوں" اس پر رقت طاری ہو گئی تھی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے" پہلے نے کہا "کیا یہ شہر جا کر ٹھیک ہو جائے گا؟"

"یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ ویسے میں نے اب تک کی جمع پونجی ساتھ لے لی ہے" اس نے پوٹلی دکھاتے ہوئے کہا "بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤں گی"

"خدا تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ میں بھی دوا لانے جا رہا ہوں" دوسرے نے کہا۔

"کیوں تمہیں کیا ہوا؟" عورت نے دوسرے سے پوچھا۔

"میرے سارے گھر والے بھی اس مرض کا شکار ہیں۔ صرف میں بچا ہوں اور اب شہر جا رہا ہوں" دوسرے نے آزردگی سے کہا۔

"اچھا میں تو سمجھی تھی صرف ہمارے گاؤں میں یہ قیامت آئی ہے۔ اگر اس کے بجائے مجھے یہ بیماری ہو جاتی تو اچھا تھا۔ گھر کا سارا نظام اس کے دم سے تو ہے مجھے یہ بیماری ہو جاتی تو کوئی فرق تو نہیں پیدا ہوتا" عورت کے لہجے میں بڑی افسردگی تھی۔

"ہم جو کچھ سوچتے ہیں۔ وہ ہوتا کب ہے" پہلے نے عورت سے کہا۔

"اچھا تو چلو ہم بھی شہر جا رہے ہیں" دوسرے نے عورت کو مخاطب کیا۔

اب وہ عورت اور اس کا شوہر دونوں ان کے ساتھ ہو لئے۔ وہ اب چار ہو گئے تھے۔ چاروں کے چہروں پر اطمینان کا کوئی سایہ نہ تھا۔ دور شہر کی بلند و بالا عمارتیں نظر آنے لگی تھیں۔ چاروں نے اب خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ان کے قدم اب تیز اٹھنے لگے۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کے کناروں کو چھو رہا تھا۔ آسمان پر کبوتروں کی ڈار اڑ رہی تھی جو ان کی نظروں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

وہ جب شہر میں داخل ہوئے تو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شہر کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ اب انہیں اپنے اپنے ٹھکانوں تک پہنچنا تھا۔ پہلے کو اپنے رشتہ داروں کا گھر تلاش کرنا تھا۔ دوسرے کو کسی دوست کی تلاش تھی۔ اور دونوں میاں بیوی کسی مسافر خانے کا پتہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ انہیں جو پہلا شخص ملا وہ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ اس کی مونچھیں کمان کی طرح تھیں اور حلیے سے پڑھا لکھا معقول آدمی نظر آ رہا تھا۔

"بھائی صاحب ذرا سنئے" پہلے نے آواز دی۔ وہ بالکل ان کے قریب سے گزر گیا۔ اس نے ان کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔

"عجیب اجڈ آدمی ہے" دوسرے نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"شاید شہر کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں" پہلے نے بھی اپنا لاوا اگلا۔

کچھ دور جا کر انہیں ایک شخص نظر آیا۔ دبلا پتلا اور چہرے کے نقش تیکھے۔

اب کے دوسرے نے اپنی قسمت آزمانے کا ارادہ کیا "بھائی صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں عزیز نگر کہاں ہے"

وہ ان کے قریب آ کر رک تو گیا۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

"بھائی صاحب کسی مسافر خانے کا پتہ معلوم ہو تو بتائیں" عورت نے بھی درخواست کی۔

وہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر شانے اچکاتا ہو گزر گیا۔ اب دونوں کے ذہن میں ایک وسوسہ جاگا۔ کہیں یہ شہر بھی تو اس مرض کی لپیٹ میں نہیں ہے۔ لیکن ابھی ان کے اس اندیشے کی تصدیق نہ ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک آدمی کے قریب پہنچے۔ پہلا اس کے بالکل قریب پہنچ کر چیخا "بھائی صاحب"

دوسرے نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ لیکن اس شخص پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف تشویش آمیز نظروں سے دیکھا۔ اور [illegible] چہروں پر مایوسی کا کہرا چھا گیا۔

سید ضمیر جعفری

بے نواؤں، بے پرانوں، بے پَروں کے ساتھ چل
اژدحامِ تیز رَو میں کم رَووں کے ساتھ چل

آپ اپنی روح کی آواز سُننی ہے اگر
جنگلوں میں گھوم، تنہا راستوں کے ساتھ چل

تن کے زخموں، دل کے پُرزوں کا تقاضا ہے کہ اب
دوستوں کے ساتھ بھی کچھ فاصلوں کے ساتھ چل

رات میں بھی روشنی ہے، دشت میں بھی آگہی
اے مسافرِ! راستے کی دھڑکنوں کے ساتھ چل

پسروؤں کے واسطے کچھ جاگتی سوغات چھوڑ
مشعلیں کانٹوں پہ رکھ، پا آبلوں کے ساتھ چل

ایک ہی رُخ سے کبھی چلتی نہیں بادِ صبا
دل میں بنیادِ حرم رکھ، بتکدوں کے ساتھ چل

زندگی کی اوڑھنی صد رنگ و صد پیوند ہے
اس کے سارے آنچلوں، سب دامنوں کے ساتھ چل

اک درندہ بَن ہے، انسانوں کی بستی بھی ضمیر
عافیت مطلوب ہے تو قافلوں کے ساتھ چل

سید ابوالخیر کشفی

وہ آشنا سی نگاہیں، وہ مسکراتے بدن
چمک رہے ہیں نظر میں وہ بام و در میرے

کسی کتاب کے اوراق سا وہ کھلتا بدن
کسی کے جسم کی راہوں میں وہ سفر میرے

فلک پہ چاند کی کشتی، زمیں پہ میرا رفیق
وہ خواب، اور وہ بیدار سے سفر میرے

(۲)

فسون و خواب کی دنیا مری علامت ہے
ہر ایک پچ ہے مرا، حرفِ معتبر میرے

(۳)

مرا وجود محمدؐ کے نام سے قائم
چراغِ کعبہ سے روشن ہیں سب شجر میرے

جہاں مسافتیں منزل، غبار نورِ سحر
خیال و خواب میں بستے ہیں وہ نگر[1] میرے

مرتضیٰ برلاس

آپ کے بعد بھی جو شخص ابھی زندہ ہے
اس کا پیمانِ وفا آپ سے شرمندہ ہے

اب تو سینے سے لگائے ہوں امانت تیری
مجمعِ غیر میں اندیشۂ آئندہ ہے

اے زمیں اب تو اُجالے کی ضمانت دیدے
"چاند" میرا تری آغوش میں تابندہ ہے

غم سے یہ حال ہوا ہے ترے شیدائی کا
عالمِ غیر کا جیسے کوئی باشندہ ہے

تھی یہ خواہش کہ مرا فن تجھے زندہ رکھے
اب حوالے سے ترے فن مرا پائندہ ہے

[1] مدینۂ منورہ، مکۂ معظمہ

افتخار عارف

یہ معجزہ بھی کسی کی دعا کا لگتا ہے
یہ شہر اب بھی اسی بے وفا کا لگتا ہے

یہ تیرے میرے چراغوں کی ضد جہاں سے چلی
وہیں کہیں سے علاقہ ہوا کا لگتا ہے

قلم رُکے تو سخن کر رہی ہیں دیواریں
کرشمہ یہ بھی اسی کی صدا کا لگتا ہے

سوادِ شب میں ہر اک سود ملئے نُور کی گونج
سفیرِ مہر پہ سایہ خدا کا لگتا ہے

ذرا سی دیر میں خوشبو ذرا سی دیر میں گرد
یہ سارا کھیل سموم و صبا کا لگتا ہے

جنوں کا رنگ بھی ہو شعلۂ نمو کا بھی ہو
سکوتِ شب میں اِک اندازہ گفتگو کا بھی ہو

میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ یہی آدمی عدو کا بھی ہو

یہ جس کے چاک گریباں پہ تہمتیں ہیں بہت
اسی کے ہاتھ میں شائد ہنر رفو کا بھی ہو

وفا کے باب میں کارِ سخن تمام ہوا
مرے وجود میں اک معرکہ لہو کا بھی ہو

وہ جس کے ڈوبتے ہی ناؤ ڈگمگانے لگی
کسے خبر وہی تارا ستارہ جو کا بھی ہو

ثبوتِ محکمیٔ جاں تھی جس کی برش ناز
اسی کی تیغ سے رشتہ رگِ گلو کا بھی ہو

راحت نسیم ملک

سوال اک ہی رہے اور جواب بدلے گئے
کہ ہم وہی ہیں، ہمارے عذاب بدلے گئے

تمام حرف وہی ہیں، کتاب اور ہوئی!
سنا ہے شہر میں اہلِ کتاب بدلے گئے

سفر کے ساتھ نئے راستے نکل آئے
ہماری پیاس بڑھی یا سراب بدلے گئے

ہوا بدلتے ہی پہچان چھن گئی سب سے
بس ایک آن میں سب کے نقاب بدلے گئے

نئے تقاضوں پہ ڈھالے گئے عہد نامے؛
وفا کی شرط گئی، دل کے باب بدلے گئے

ہمیں ہیں جو نئے محور پہ گھومتے ہیں نسیم
یا اس مدار میں سب ماہتاب بدلے گئے

شاہین

کر کے تخلیق ہمیں بھول گیا ہو جیسے
پالنے والا کوئی اور خدا ہو جیسے

شکر لازم ہے ترا یا کہ تجھے کر دوں معاف
بھید مجھ پر ترا اب تک نہ کھلا ہو جیسے

فیصلہ اس کا تھا اب ساری ندامت میری
یہ مرے جرمِ خموشی کی سزا ہو جیسے

اپنے انداز میں چاہا ہے تمہیں سب سے الگ
مجھ کو اصرار نہیں تم مجھے چاہو جیسے

اب تو ہستی کا مقدر ہیں تہی مانگیاں
ذہن اور جیب کا رشتہ بھی بڑا ہو جیسے

دن گزارے ہیں تری ہم سفری میں اتنے
میں ترے ساتھ ہوں تو بھول گیا ہو جیسے

میں نے چپکا دیئے اس طرح ورق کچھ باہم
جزو ہستی مرا ماضی نہ رہا ہو جیسے

نام یکساں ہے سمندر کو ترا ہو کہ مرا
سب پریشاں ہیں یہ طوفان نیا ہو جیسے

اپنے لب کھول کے مقتول وفا ہو جانا
حلِ عقدہ کوئی اس کے نہ سوا ہو جیسے

اب بھی شاہینؔ اسی سمت قدم اٹھتے ہیں
میری خاطر کوئی دروازہ کھلا ہو جیسے

مخمور شارب

ظاہر کسی پہ اپنے نہ حالات کیجئے
جیسے بھی ہو سکے بسر اوقات کیجئے

جو موجبِ بہار ہوں، جو وجہِ زندگی
پیدا وہ اپنے سینے میں جذبات کیجئے

خواہش ہے زندگی کی، تو فکرِ معاش میں
مصروف اپنے آپ کو دن رات کیجئے

جو آپ کو قبول ہوں، جو آپ کو پسند
تقسیم ہر کسی کو وہ سوغات کیجئے

لوگوں کی دسترس میں تو دنیا جہان ہے
جو اپنی دسترس میں ہے وہ بات کیجئے

ہوتے ہیں پُر خلوص یہ شعر و سخن کے لوگ
پھر تو ضرور ان سے ملاقات کیجئے

شاربؔ یہاں تو جیب میں دمڑی نہیں مگر
ردِ بلا یہی ہے کہ خیرات کیجئے

حزیں لدھیانوی

میری صدا کے امرت سے ہے جیون کی شادابی
میرے حصے میں ہے غم کا زہر، دکھوں کی تلخی

من کا پنچھی گرلایا، اور آنکھ کی گاگر چھلکی
بارش میں بھیگی چڑیا پر جب اک بلی جھپٹی

شہرِ ستمگر کی زینت ہیں، جگنو، چاند، ستارے
رہتی ہے شعلوں کی زد میں تیری میری نگری

تیری کتاب میں جذبے اک پر سا دیکھا، تو یاد آئی
پیاری پیاری، نازک نازک، پریوں جیسی تتلی

جانے لے گئی خوشبو کی شہزادی کو کس جانب
دستِ صبا نے چپکے سے کھولی تھی پھول کی کھڑکی

ایسے دل میں اتر جاتا ہے دھیما دھیما لہجہ
جیسے زمیں کی تہہ تک جائے بارش ہلکی ہلکی

سیلِ بلا ہے، تند ہوا ہے، ڈرنا کیا اب یارو
سوچ سمجھ کر وقت کے دریا میں ڈالی ہے کشتی

دوسرے ملکوں کے باشندے کر جاتے ہیں سیریں
اب تک دیکھ نہ پائے حزیںؔ ہم ہی کاغان کی وادی

نذیر قیصر

غبارِ عبرت کا سامنا ہے
سفر، قیامت کا سامنا ہے

ہواؤں کے ٹوٹے آئینوں میں
شکستِ صورت کا سامنا ہے

نشانیاں مانگتی ہیں آنکھیں
نبی کو امت کا سامنا ہے

الٹ رہا ہے ورق فلک کا
زمیں کو حیرت کا سامنا ہے

وہ بجھ رہا ہے قریب آ کر
وصال، ہجرت کا سامنا ہے

نگاہ سے غیب کے افق تک
کسی شباہت کا سامنا ہے

پرانے موسم کے جنگلوں میں
نئی روایت کا سامنا ہے

ترے خوابوں میں کھونا چاہتا ہوں
میں لمبی نیند سونا چاہتا ہوں

دیئے جلتے ہیں سانسے ڈولتے ہیں
ہوا چلتی ہے، رونا چاہتا ہوں

کوئی نغمہ کہیں کوئی پرندہ
کہ میں آزاد ہونا چاہتا ہوں

غبارِ ہجر تیرے موسموں میں
جو کاٹا ہے وہ بونا چاہتا ہوں

وہ خوشبو کا وہ کرنوں کا مسافر
میں اس کے پاؤں دھونا چاہتا ہوں

آسماں آسماں بھٹکتا ہوں
میں زمیں کا سوتیلا بیٹا ہوں

بے ہنر ہے صفات ہاتھوں سے
شمعیں بو کر اندھیرے کاٹتا ہوں

ہر طرف دشمنوں کے لشکر ہیں
میں بہادر ہوں پر اکیلا ہوں

تو شباہت اور میں نفی تیری
تو بھی سچا ہے میں بھی سچا ہوں

خوں میں بھیگی ہوئی فصیلوں پر
جو نہ لکھا گیا وہ نوحہ ہوں

کیا سمیٹو گے تم مجھے، کہ میں
ٹوٹتے آئنوں کا سایا ہوں

جمال احسانی

جب کبھی خواب کی امید بندھا کرتی ہے
نیند آنکھوں میں پریشان پھرا کرتی ہے

یاد رکھنا ہی محبت میں نہیں ہے سب کچھ
بھول جانا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے

دیکھ بے چارگیٔ کوئے محبت کوئی دم
سائے کے واسطے دیوار دعا کرتی ہے

ریگِ ساحل تجھے اندازہ نہیں ہو سکتا
تہہِ دریا بھی بڑی خاک اڑا کرتی ہے

خوش سفر تیرے اکیلے نہیں ہوتے ہیں کبھی
ہر نفس بے گھری ہمراہ پھرا کرتی ہے

دو اجالوں کو ملاتی ہوئی اک راہگزار
بے چراغی کے بڑے رنج سہا کرتی ہے

وحشتِ دل بڑے شہروں میں رہ یک طرفہ
جانے والوں کو بہت یاد کیا کرتی ہے

شمعِ امید سے غفلت نہ برتنا کہ جمالؔ
پسِ دیوار ہوا جال بُنا کرتی ہے

سخن سے چاہیے نہ رکھنا مطابقت کوئی
وہ آنکھ چپ ہو تو پھر بولنا بھی مت کوئی

اس آب و خاک سے اک ذات کے بنائے ہوئے
وہ ہم ہیں جن میں نہیں ہے مشابہت کوئی

بچھڑ نہ جائیں دوبارہ جو مل کے بیٹھے ہیں
چلا نہ دے کہیں پھر بادِ بے جہت کوئی

نہ خاکِ دشت تمنا ہوئے نہ رزقِ شہر
پڑی تھی پاؤں میں زنجیرِ مصلحت کوئی

یہ رہگزار ہی جاتے گی صرف منزل تک
مسافروں میں تو باقی نہیں سکت کوئی

عجب تھی مجھ سے مرے رنج کھینچنے کی ادا
سو مجھ کو بخش گیا غم کی سلطنت کوئی

میں کیا تمیز کروں دوست اور دشمن میں
کہ مجھ سے کرتا ہے مجھ میں منافقت کوئی

ہر اک چراغِ طاقِ جاں امشب اتارا جائے گا
جو اس فضا میں گھر سے نکلے گا وہ مارا جائے گا

اس بار بھی برباد کر دیں گے کھڑی فصلوں کو ہم
اس بار بھی موسم کے سر الزام سارا جائے گا

آنکھیں اگر موندیں تو جانے آسماں پر کیا بنے
مٹھی اگر کھولی تو ہاتھوں سے ستارہ جائے گا

جیلیں جہاں کے رہنے والوں نے بہت تاریکیاں
مہتاب اس بستی کی گلیوں سے گزارا جائے گا

چڑھتے ہوئے سورج کے دامن کی طرف بڑھتے ہیں ہاتھ
گرتی ہوئی دیوار کو کیسے سہارا جائے گا

پیاسے کے پاس آئے گا اپنے پاؤں پر چل کر کنواں
اب ناؤ تک بہتا ہوا خود ہی کنارا جائے گا

رابعہ نہاں

رُخ پہ شفق، پلکوں پہ تارے
دونوں وقت ملے وہ سدھارے

غم کچھ دل سے الگ تو نہیں ہیں
دل بھی تمہارا، غم بھی تمہارے

بیچ بھنور میں امن ہے کتنا
چھوڑ کے سب طوفان کنارے

کوئی تو شب کو راہ دکھائے
بجلی چمکے، ٹوٹیں تارے

خشک ہوئے آنکھوں میں آنسو
کب تک بہتے یہ انگارے

وقت کی گردش ناپی میں نے
اپنے دھڑکتے دل کے سہارے

پھول سے دن مہتابی راتیں
سب افسانے، خواب ہیں سارے

ہو یہ نہاںؔ تحریر کسی کی
بکھرے پڑے ہیں جتنے نظارے

صابر آفاقی

جو دُور ہو تو صدا دے کے میں بلاؤں تجھے
قریب رہتے ہوئے بھی اگر نہ پاؤں تجھے

ترے بدن کی لطافت کو دیکھ کر سوچوں
خیال بن کے ملوں اور نظر نہ آؤں تجھے

غمِ حیات! رواں ہو چکا تو نس نس میں
ہو بوجھ ہو تو اتاروں، کہیں گراؤں تجھے

کبھی تو یاد مجھے کر تو بھول کر ہی سہی
یہ کیا ظلم ہے اک دن نہ یاد آؤں تجھے

بیانِ غم نہیں سنتا، نہ سن، قریب تو آ
کہی ہے میں نے جو تازہ غزل سناؤں تجھے

مجھے سمجھنے کی کوشش سے فائدہ صابرؔ
قیام تجھ میں کروں اور نظر نہ آؤں تجھے

نصرت صدیقی

دل جھیل میں پھینکا ہے تیری یاد نے پتھر
اس سے نہ گذر جائے کہیں موج اُبھر کر

میں کون سی منزل کے لئے گرمِ سفر ہوں
چلتا نہیں کوئی بھی میرے نقشِ قدم پر

تو پاس بھی اتنا کہ تجھے دیکھ نہ پاؤں
تو دُور بھی اتنا کہ میری سوچ سے باہر

کچھ اور ستم اور ستم اے غمِ دوراں
کھلتے ہیں بڑی دیر میں انسان کے جوہر

اک تُو کہ تیرا ایک ہی رشتہ ہے جہاں سے
اک میں کہ مرے سینکڑوں رشتے ہیں زمیں پر

کب تک یوں کرائے کے مکانوں میں رہیں گے
نصرتؔ چلو تعمیر کریں اپنا کوئی گھر

غلام حسین ساجد

صبح مراد سی ہے شام اس کے دماغ کے لئے
کیوں نہ ابھی دعا کریں دکھ سے فراغ کے لئے

اب تو رہینِ عشق ہیں، میں بھی، مرا وجود بھی
میں نے بجھا دیا ہے چاند، تیرے چراغ کے لئے

کوئی عجیب شہر ہے اپنی ہی وسعتوں میں گم
کوئی عجیب رات ہے دل کے سُراغ کے لئے

مجھ سے گریز پا ہیں یوں تیرے کرم کی نکہتیں
جیسے مری طلب نہ ہو گل کے ایاغ کے لئے

اب بھی مرے لہو میں ہے شمعِ شباب کی سی آنچ
کاش ہو کچھ علاج بھی سینے کے داغ کے لئے

رات بھی شہر کی طرف دیر تلک ہوا چلی
رات بھی میں چل اُٹھا، تاروں کے باغ کے لئے

ضیاء شبنمی

ہم غزل خواں جسے ہر شب دیکھیں
اُس کو ہنستا ہوا یارب دیکھیں

آئینہ آئینہ ڈھونڈیں ہم کو
اپنا چہرہ کہ وہ کل جب دیکھیں

ہم کہ اس عہد کے آشوب ہیں
ہم کہ ہر بات میں مطلب دیکھیں

اپنے خوابوں سے بھی شرمندہ رہیں
صبحدم ہم نہ اُسے جب دیکھیں

جو کہ انجامِ وفا ٹھہرے ضیاؔ
ہم وہ تارا نہ کسی شب دیکھیں

نعیم اظہر

مری وفا پہ غضبناک کب سماج نہ تھا
یہ اور بات مرے لب پہ احتجاج نہ تھا

میں کیسے کہتا محبت کے راستوں سے گریز
میں تیرا سنگِ نظر تھا ترا مزاج نہ تھا

تھا اپنا ظرف وہاں بھی مروتیں بانٹیں
وہ شہر جس میں محبت کا کچھ رواج نہ تھا

تری نظر کو مسیحائی کی نہ تھی فرصت
وگرنہ میرا مرض اتنا لاعلاج نہ تھا

نہ جانے کیوں یہ اندھیرا نہیں چھٹا اظہرؔ
کچھ اتنا دور شبِ غم سے وہ سراج نہ تھا

سید مجتبیٰ حسین

غزل دریا[۱]

محشر بدایونی غزل کہتے ہیں اور غزل بڑی جان لیوا صنف ہے۔ دو مصرعوں میں پوری بات اس طرح کہہ دینا کہ وہ دو مصرعے غزل کے بھی معلوم ہوں۔ اور کہنے والے کی شعری شخصیت کے بھی ترجمان بن جائیں آسان بات نہیں ہے۔ غزل کی روایت کا تسلسل اس عہدِ انحراف و سرکشی میں بھی نہیں ٹوٹا ہے۔ جدید شعرائے اسے اپنے عہد میں سمو کر اپنی آواز دی ہے، اپنی زبان دی ہے، اپنے محاورے دیئے ہیں، اپنے تجربات اور اپنی دروں بینی دی ہے۔ مگر غزل کا روایتی مزاج ان تمام چیزوں کو اپنا کر بھی اپنی امتیازی خصوصیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہ مزاج ہے کیا؟ اس کی اپنی خصوصیت کیا ہے؟ یہ کوئی بہت مشکل سوال نہیں ہے۔ ادب اور شاعری کا عام قاری بھی اسے چند لفظوں میں بتا دے گا۔ اس کے سامنے غزل کو چھوڑ کر کسی بھی صنف کے اشعار پڑھئے۔ وہ بتا دے گا کہ یہ نظم کے اشعار ہیں۔ خواہ مسدس میں کہے گئے ہوں یا مثنوی میں، قصیدہ یا کسی اور صنف میں کہے گئے ہوں۔ ان تمام اصناف کے لئے ایک لفظ ہے "نظم"، مگر غزل کے اشعار کو لغوی معنی سے قطع نظر نظم کے اشعار کہنا ممکن ہی نہیں۔ غزل کے اشعار غزل کے ہی کہے جائیں گے۔ ان کا سایہ کسی اور صنف کے اشعار پر پڑے گا۔ تو بھی کہا جائے گا کہ ان اشعار میں تغزل پیدا ہو گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ غزل کا ایک ہی موضوع ہے "عشق کی خانہ بربادی"، دوسری اصناف کا کوئی متعین موضوع نہیں ہے۔ اسی لئے غزل میں تصوف، اخلاقیات، فلسفہ، سیاست سب کچھ لانے کے بعد بھی غزل کا مجموعی تاثر عاشقانہ فضا ہی لئے ہوتا ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

یہ تصوف کا شعر ہے مگر یہ عشقیہ شعر بھی ہے۔ عشق کی خانہ بربادی بڑی وسعت اور جامعیت رکھتی ہے۔ یہ لیلیٰ مجنوں کا قصہ نہیں ہے۔ حالانکہ لیلیٰ مجنوں کا قصہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اس قصے کے بنیادی تقاضوں کو اپنی زندگی میں محسوس کر لینا چھوٹے آدمی کا کام نہیں ہے۔ کامیابی اور ناکامیابی سے بلند ہو کر وفا کے احساس کو اپنے رگ و پے میں سرایت کرتا ہوا پا کر آدمی دنیا کی تمام تگ و دو کو بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے لئے صرف ایک ہی معنی رہ جاتے ہیں۔ اور وہ ہے "لیلیٰ"۔ لیلیٰ ایک آدرش کے حصول کا پکا اور سچا عہد ہے۔ بہرحال ان باتوں کو چھوڑیئے یہ خطرناک باتیں ہیں۔ زندگی تباہ کر دیتی ہیں۔ بات خانہ ویرانی کی تھی۔ غزل کا یہ موضوع، تنہائی، وحشت یادوں، حسرتوں، ناکامیوں اور درد کی بیکراں لذتوں سے بنتا ہے۔ یہ خانہ ویرانی وہ تاریخی حقیقت بن جاتی ہے جس نے عہد بہ عہد انسانی زندگی میں جیت کرنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے۔ انسانی زندگی کو رشتوں کی نزاکتوں سے آگاہ کیا ہے۔ مگر معاشرتی اور سیاسی حالات ان حوصلوں اور رشتوں کی نزاکتوں کو روندتے گئے۔ غزل اسی تاریخی حقیقت کو بیان کرتی چلی آئی ہے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ تمام شعراء نے اسی حقیقت کو اپنی اپنی زبان میں بیان کیا ہے۔ در و دیوار کا گر جانا۔ تنہائی کا ڈسنے لگنا۔ شہروں کا اجنبی بن جانا۔ دوستوں سے بچھڑ جانا۔ طوفانوں میں گھر جانا۔ کشتیوں کا ڈوب جانا۔ خوابوں کا ریزہ ریزہ ہو جانا۔ خوف و جنوں کے عالم میں در بدر پھرتے رہنا۔ یہ سب خانہ بربادی کی داستان ہے۔ یہ داستان غزل میں ہمیشہ سے بیان کی جاتی رہی ہے۔ اسے غزل کی روایت سمجھ لیجئے۔ مگر غزل اپنے داستان گو کا امتحان لیتی ہے۔ یہ بڑا کڑا امتحان ہے۔ ہر داستان گو اپنے لفظوں اور لہجے میں کس طرح اثر انگیزی، تحیر اور انتظار کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہی چیز اسے ممتاز بناتی ہے۔

محشر بدایونی اس داستان گوئی کے فن سے آگاہ

[۱] محشر بدایونی کا نیا شعری مجموعہ

ہیں۔ اس لئے ان کے اشعار غزل کی روایت اور کہنے والے کے انفرادی تجربے کا خوشگوار امتزاج لئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے مجموعہ "غزل دریا" کے دیباچے میں اس طرف کئی جگہ اشارے کئے ہیں۔ "سچا آرٹ قدیم و جدید کے امتزاج سے جنم لیتا ہے۔ یہ امتزاج میری شاعری میں بھی ہے۔ نئی اقدار کا دل سے گرویدہ ہوں۔ لیکن پرانی اقدار سے منحرف نہیں۔" ایک اور جگہ اسی دیباچے میں لکھتے ہیں "میرے نزدیک غزل ہماری تہذیبی روایت کا جزو ہے۔ اسی لئے غزل کو میں انسانی زندگی اور کائنات کے ادراک کا حسیاتی ذریعہ سمجھتا ہوں۔"

محشر کی غزلوں کا موضوع وہی ہے۔ جو غزل کا مخصوص موضوع ہے۔ آدمی کی بے توقیری کی المناک داستان حالانکہ آدمی ہی اس دنیا کی سب سے بڑی قدر ہے۔ اس کی بے قدری زندگی کو بے رنگ اور گھروں کو بیابان بنا دیتی ہے۔ درختوں سے سایہ اور پھولوں سے خوشبو چھین لیتی ہے۔

محشر بدایونی کی غزلیں خانہ ویرانی کی پرسوز لے رکھتی ہیں۔ شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو۔ جس میں دیواروں کے گرنے کی آواز ـــــ اور شہروں کے اجنبی ہونے کا احساس نہ پایا جائے۔ چند اشعار دیکھئے۔

شہر میں ایک عجب خاک بسر آیا ہے
کوئی افتاد پڑی ہے کہ اِدھر آیا ہے

کون جوگی ہے کہیں جس کا بسیرا نہ پڑاؤ
کیا مسافر ہے کہ بے شام و سحر آیا ہے

کیسا وحشی ہے کہ وحشت کی حدیں توڑ گیا
کوئی صحرا کی طرف جا کے بھی گھر آیا ہے

اور کیا بے کیفیِ موسم کا ممکن ہے علاج
بس تمناؤں کے گلدستے سنوارے جائیے

چلے ہیں یادِ رُخِ رفتگاں کی لَو میں بھی لوگ
ہواؤں میں دیئے ہیں اگر جلائے کوئی

اتنی نوازش بھی ہے کافی ہم پردیسی لوگوں کو
جن پر سر ٹیک جائے وہی پتھر زانو ہو جاتے ہیں

اب نہ سخن کا کاروبار، اب نہ جنوں کا روزگار
شب ہمیں چھوڑ سی گئی، دن ہمیں بھول سا گیا

ملا بس یہ مجھے ہمسائگی سے
نہیں میرے در و دیوار میرے

لوگ کس گھر کی ہوا میں ہوتے ہیں وارفتہ
نہ تو سائے کا بھروسہ ہے نہ دیوار کا ہے

تذکرے لوگوں کو دوری کے بُرے لگتے ہیں
کیا کروں میں کہ مجھے دشت بھلے لگتے ہیں

شہر لوٹا ہوں تو ہے ہم نفسوں کا وہ رنگ
میرے دیکھے ہوئے چہرے بھی نئے لگتے ہیں

اسی طرح تمام غزلوں میں ایک درد کی لکیر کھنچی ہوئی ہے۔ محشر بدایونی اس درد کو غزل بنانا جانتے ہیں۔ ان کے یہاں کچا پن نہیں ہے۔ تازگی کے معنی کچا پن نہیں ہوتے۔ وہ لفظوں کو صحت کے ساتھ برتنا بھی جانتے ہیں۔ اور یہ بڑی بات ہے۔

شاعر کا سارا سرمایہ لفظ ہی ہیں۔ اس سرمائے کو کیسے صرف کیا جائے، یہ ہر اچھا شاعر جانتا ہے۔ محشر بدایونی اپنے سرمائے کے بے جا صرف سے بچتے ہیں۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں فنکاری اور تخلیق کی آنچ دونوں ملتی ہیں۔ درد کا جو چراغ ان کی غزلوں کے دریچوں سے روشن نظر آتا ہے اُس کی روشنی دھیمی ہے۔ اس دھیمی روشنی میں چہروں کی دردناکی اور اُبھر آتی ہے۔ گلیاں چراغوں کی لَو کی طرح جھلملاتی ہیں اور شہر آسیب زدہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ "غزل دریا" کی غزلوں کی ایک مجموعی فضا ہے۔ اس فضا میں پہنچ کر آدمی آدمی سے محبت طلب کرتا ہے اور جب یہ نہیں ملتی تو وہ اپنے تاریکی سفر پر نکل پڑتا ہے۔ یہ سفر ویرانوں اور آبادی کا سفر ہے۔

"غزل دریا" کی غزلیں اس عہد کی غزلوں کی زندہ تاریخ ہیں۔

شیر افضل جعفری

برآب نیل

میں نلتے بسیار کے سدابہار پروردگار کی لہری کچہری میں وضو کی تازہ تری سے مخمور ہو کر "تختوں چنگی" چٹائی پہ شام کلیان میں مغرب کی اذان الاپنے کا "سالو" کر رہا تھا کہ بیٹھک کے بند کواڑوں پر کسی کی جیب تال دستک کے چٹکنے کی سریلی چھاپ سنائی دی۔ میں چونچال چپ چپاہٹ کی گنگناہٹ سے لپٹنے کے لئے دروازہ کی طرف لپکا۔ ایک جوان "اللہ دی امان" نے دستی چٹھی میرے ہاتھ میں تھمادی۔ لفافہ کا سینہ چاک کیا۔ علی اصغر عباس کی چہکتی ہوئی تحریر پہ نظر پڑی۔ خط پڑھا معلوم ہوا داتا کی نگری کے اریب و ادیب علی اکبر عباس کے اعزاز میں "برآب نیل"[1] کا البیلا میلہ منا رہے ہیں۔ اور مجھے ملنگ بابا کے رنگ میں شاباش کی نیاز تقسیم کرنی ہے۔ سانس بھرا کی نوید سے دل کی "تتری چتری" میں چنچل امنگیں مٹیار جوانی کے کلاکار سپلوں کی طرح تڑ گئیں۔ اللہ مولا کی سرکار میں حاضری دی۔ قیام و قنوت اور رکوع و سجود کے بعد سائیں محمد حسین آزاد کا واسطہ دے کر قرطاس و قلم کے پالنہار سے دعا مانگی کہ اسے صلاح احمدؔ کے رب والے رتن سرشار کے رام بھلے رلوی رہس کے ادب لاڑوں غزل بنبروں اور دانش و لعاڑوں کی بات برات میں سہانا بہاؤ عطا کرنا۔

میں مغز نویس نہیں۔ کچھ لکھنا لکیرنا چاہوں تو کئی کٹھور اور کڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ باوا ادب خسک کے تکے کے کان چھیدتا ہوں۔ کانوں میں سرسوں کی مندریں ڈلواتا ہوں۔ نظیر اکبر آبادی کا برن دھارتا ہوں۔ نظم و نثر کا رانجھا بنتا ہوں۔ تحریر کی ہیر کو پیر مانتا ہوں۔ اس کے دربار میں چوکی کرتا ہوں۔ دھمال کھیلتا ہوں۔ ناد بجاتا ہوں۔ ونجلی پھونکتا ہوں۔ نیت باندھتا ہوں۔ اور پھر قعود کے پوز میں کھب کر نگارش کو مجکوں کی طرح گھڑنا شروع کر دیتا ہوں۔

اسوج کے ایت کی خاموش، غم کوش اور اوس پوش رات کے پچھلے ادھواڑے میں علی اکبر عباس کی دیپک "آر"، شاعری کے اگن پیلے پی کر جو میں بجال سوئے مژگان سر نوک خار سویا۔ تو رین بھر مجھ کلے دلے رانول کے حواس سوگ، بھوگ، روگ، جوگ اور سنجوگ کی ملی جلی دکھ رانجھ رلیوں میں رچے رہے۔ اس پہ طرہ یہ کہ جاتے اتالے کی بے سری اور سُریلی شب میں گنگھور وقت کی دھول دھار سسکیوں نے طبیعت کی اڑن طشتری کو بلکتی ہوئی پرواز مہیا کر دی۔ اب مولائیوں کی مسجد کے مؤذن نے تہجد کی بانگ کو شرمیلے مغنی کی ٹوٹتی ہوئی تان کا نیم بخشا تو دل جھنگ، فیصل آباد اور لاہور کے سانجھے سخنوروں کی من کاری کے لئے مچل گیا۔

سن سینتالیس اڑتالیس کی بات ہے کہ میں ان دنوں جھنگ میں کسٹوڈین تھا۔ مہاجرین کو شہر میں لانا، رچانا، بسانا میرے ذمہ تھا۔ علی اکبر عباس کے ابا کو دیکھا تو ان کی سیرت کو دل دے بیٹھا۔ ان کے محترم کے من جیسے مغموم ماتھے کا دکھی سورج کچھ جتنا محراب میرے دل زار پہ نقش ہو گیا۔ پہلے جان پہچان ہوئی۔ پھر بیلی بنے۔ اور بعد میں بھائی بندی تک نوبت پہنچی۔ ناجی، اکبر، اصغر اپنے شب زندہ دار اور تہجد گزار والد بزرگوار کی اللہ یار دُعا کے شجرِ سایہ دار کے موتیوں بھرے انار ہیں۔

اکبر و اصغر کے ابو اس زمانے میں لٹ کر آنے کی وجہ سے حاتمِ تہی دست، غریب غنی اور فقیرِ شہ خرچ تھے۔ بے روزگاری اور وضع داری کے عالم میں وطنِ ثانی کو بھی داغ فراق دینا پڑا۔ مگر مہاجر ہو کر یہ وفادار کنبہ لائل پور میں جا کر چھپ گیا۔

میں جب کبھی کسی کالج کے مشاعرے میں جاتا تو ایک اُگھرتا ہوا، نوجوان طالب علم شاعر مجھے بڑے ادب سے ملتا۔ خیریت پوچھتا اور جھک جھک جاتا۔ میں بھی اس کی سعادت مندی کا قرض اپنے دستِ شفقت سے ادا کر دیتا۔ ایک موقع پر جو اس نے مشاعرہ لوٹا تو میں نے پوچھ ہی لیا کہ بھائی تم کون ہو۔ کیا نام ہے۔ کہاں رہتے ہو۔ کہنے لگا۔ جی میرا نام علی اکبر عباس ہے۔ میں نذیر ناجی کا چھوٹا بھائی ہوں۔ ابا جان اکثر آپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اسی لئے عقیدت ہو گئی ہے۔ میں نے اچھل کر سینے سے لگا لیا۔ ماتھا چوما۔ بلائیں لیں۔ پیار کیا۔ پاس بٹھایا۔ داد دی۔ اور ہمیشہ کے لئے وفا کا عہد کر لیا۔ وہ دن جا۔ یہ دن آ۔ میں اسے اپنا بھرا، بھائی جایا، پتر اور سگی سمجھتا ہوں۔

سلنے یتیم بچپن سے لے کر لشاپے کے آغاز تک خدا اور ماں کے سوا میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ ماں چل

حاشیہ: [1] علی اکبر عباس کا مجموعۂ کلام

بلیں تو اس دنیا میں میرے لیے صرف اللہ کی ذات ہی رہ گئی۔ اب آخری عمر میں آ کر ربِ رحیم کے علاوہ جو غم خوار میسر آئے ہیں۔ ان میں علی اکبر عباس ایک حسین و ذہین اضافہ ہے۔

چیت کے شریر و خوش خیر موسم میں جھنگ کے سرشار و شہ سوار زمینداروں کو جوانی مستانی کا نشہ چڑھا تو انہوں نے پری چال کونٹوں کا جھناں رنگ اکھاڑا جمایا۔ علی اکبر عباس سرکاری طور پر فلم بنانے کی غرض سے وہاں پہنچے اور جاتے ہی فرض کی ادائیگی میں کچھ اس دیوانگی سے جُتت گئے کہ ناشتہ کرنا بھی یاد نہ رہا۔ آخر کام سے فارغ ہونے پر دو بجے بعد دوپہر بھوک لگی تو ظہرانہ یاد آیا۔ میں ان کی فن پرستی اور فرض مستی پر عش عش کر اُٹھا۔

اسی روز میرے التماس پر رات کے آٹھ بجے اپنے چھ سات ساتھیوں سمیت بنگاہِ ملنگاں پہ عشائیہ تناول کرنے کے لئے آئے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اور پھر اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ہم سب نے ان کی غیر حاضری کو محسوس کیا۔ انتظار کی منزل ابھی کٹھن ہو رہی تھی کہ بچّی شہ کو ساتھ لئے واپس آ گئے۔ میں ان کے جانے اور آنے کا مطلب سمجھ گیا۔ بچّی میاں کے بڑے بھائی تہوّر مرحوم علی اکبر عباس کے ہم مکتب تھے۔ انہیں طالب علمی کے زمانے میں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اسی جواں مرگ سید کی غمیں یاد نے انہیں بشارت پیر کے گھر جا کر تہورِ بہشتی کے چھوٹے بھائی بچّی سے ملنے کی تحریک کی تھی۔ اس مرحلہ پر میں علی اکبر عباس کی وفاداری بشرطِ استواری کے جزوِ ایمان ہونے پہ بے اختیار ایمان لے آیا۔

مرغابی اور کنول دو متضاد آبی کردار ہیں۔ مرغابی صرف اس وقت تک جھیل میں رہتی ہے۔ جب تک وہ پانی سے بھری رہے۔ تالاب سوکھنے پہ آ جائے تو یہ پن پنچھی کسی اور شاداب ذخیرے کو اپنا بسیرا بنا لیتا ہے۔ لیکن کنول ایسا نہیں کرتا۔ یہ ایک وفادار پھول ہے کالالی خشکاب ہونے لگے۔ تو یہ بھی پانی کے ساتھ ساتھ سوکھتا چلا جاتا ہے۔ مگر جھیل کو داغِ فراق نہیں دیتا۔

علی اکبر عباس کی اُبھرتی ہوئی شخصیت میں کنول کی سرشت کا انداز ہے۔ شخصیت ہی کسی انسان کو مختص و منفرد کرتی ہے۔ شخصیت ہی شنگ و شاندار شاعری کو شروع دیتی ہے۔ شخصیت ہی کی دُھن دان اٹھان کے لوبان نے علی اکبر عباس کے فن کو جوان اور پھلر دان کیا ہے شخصیت ہی کی دلکشی نے اس کی کاوش کو گمبھیرتا اور سندرتا سے معمول و مرصع کر دیا ہے۔ اور شخصیت ہی اس کی نظم اور نثر کو معطر و منوّر مستقبل عطا کرنے کا تہیّہ کر چکی ہے۔

لڑکپن میں بڑے بوڑھوں سے سنا کرتے تھے کہ کنجری نمازن نہیں ہوتی۔ خوجہ شیعہ نہیں ہوتا اور حساب دان شاعر نہیں بن سکتا۔ اور اگر ان میں سے کوئی اس روایت کو توڑے تو پھر اس کے وجدان کی اونچان کو پگڑی پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا پڑتا ہے۔ علی اکبر عباس نے ریاضی کا رستم ہوتے ہوئے، شاعری کی پری سے بھی آنکھ لڑا رکھی ہے گویا مذکورہ مقولے کے برعکس تفریق و تقسیم کے سنسان صحرا میں چنار کی طرح چکاچوندہ انار کی طرح سرخرو اور دیودار کی طرح الآرو سردار ثابت ہو رہے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہندسۂ اقلیدس کے خدو زار خلیر ستان میں ایک سرو طوار اب نخلِ ثمردار ہو کر غزل بار ہو گیا ہے۔

کہتے ہیں چناب کا خنک و آتشیں پانی فن کار کو آگ لگا دیتا ہے۔ یہ رودِ سوزاں رومان و ایمان کے "پھاروں" کی تقدیروں کو "اگربتیوں" کے دھوئیں کے زلفیں پیچے مرحمت کرتا ہے۔ علی اکبر عباس نے اسی شرابی اور سیلابی دریا کے جوگیا برقاب سے اپنے دل کی دنیا کو سلگایا اور جلسایا ہے۔

علی اکبر عباس قلم کی ٹوٹی پہ موج کی پینگ چڑھا کر شعر کہتا ہے۔ علی اکبر عباس کی شاعری میں دیروز، امروز اور فردا کی دلداریاں دکھائی دیتی ہیں۔ علی اکبر عباس برسات بہار، خزاں، سیلے اور آنا لے پانچوں موسموں کا شاعر ہے۔ علی اکبر عباس، محبت، مذہب اور ماحول کا سخنور ہے۔ یہ اپنے موضوع اور مضمون کو شعور و گداز کی گرفت میں لے کر قلم کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کے شعور میں مرد، مستی میں ہستی اور بندگی میں زندگی لہراتی ہے۔ اس کے فن میں ماہیا اور غزل کی سنگت کے بھانورے نظر آتے ہیں اس کی سوچ میں پتنگ اور سپتنک کی پرواز کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس کی کراہ میں واہ کا سرگم سنائی دیتا ہے۔ اس کے ہاں شمشاد اور کماد، شفتل اور سنبل، کھجور اور انگور ایک ساتھ لٹکتے ہیں۔ یہ آس اور یاس دونو کا عکاس ہے آشیاں کو آگ لگ جائے تو یہ ناتوانوں کی طرح صرف دیکھتے رہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ تسلے میں پانی لے کر شعلوں پہ یلغار کرنا بھی جانتا ہے۔ اس کے مصرعوں میں کونجیں بھی کرلاتی ہیں اور دُرّاج و ہزار بھی ترانہ طراز ہوتے ہیں ہیں۔ اس کی تڑپ رقصِ بسمل کا نظارہ بن جایا کرتی ہے۔ علی اکبر عباس کی سوچ ڈونگھی اور اپرویچ بلند ہے۔ یہ غزل کا بلوچ اور نظم کا رانی خان ہے۔ میں نے اپنی سرشار تعریف و تحسین کا تاج اس کے آج کے سر پر رکھ دیا ہے۔ "برآب نیل" کے نفسیاتی اور فلسفیاتی جھنود اس کے خوب تر کل کی طرف کنکھیوں سے اشارے کرتے ہیں۔

حسن عسکری کاظمی

تیشۂ کرب[1]

گذشتہ دس بارہ برس کے عرصے میں نئی آوازوں اور لہجوں نے اُردو غزل میں اتنے بہت سے رنگ بکھیرے کہ ان آوازوں اور لہجوں کے خلط ملط ہوتے ہوئے رنگوں میں کسی مخصوص رنگ کو دوسرے رنگوں سے ممیز کرنا آسان نہ رہا۔ یہ الجھن آوازوں اور لہجوں کے متنوع ہونے کے باعث پیدا نہیں ہوئی بلکہ نئی دریافتوں اور نئی سمتوں کے سفر میں ہمارے فنکار اپنی انفرادیت کے ذوقِ جنوں سے یکسر روایت سے انحراف کو ضروری تصور کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اظہار میں فکری آنا کی بے جہتی کا احساس کم سے کم تر ہوتا گیا اور بہت سے فن کار آوازوں اور لہجوں کے ریلے میں بے دست و پا بہتے چلے گئے، لیکن حرفِ حق کہنے کا شعور رکھنے والے فنکاروں کا معاملہ پہلے بھی جدا تھا اور اب بھی مختلف رہا، انہیں لفظ کی قوت کا ادراک تو حاصل تھا، مگر نت نئی تراکیب اختراع کرنے میں وہ نفسِ مضمون کی صحت کا لحاظ رکھنا اس سے بھی زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں، ایسے فنکار جبر کے خلاف حرفِ حق زبان پر لانے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے لفظوں کے بے روح پیکر تراشنے کی بجائے کرب کے ابلاغ کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آوازوں اور لہجوں کے اَن گنت رنگوں میں سچائی کا رنگ آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ یہی وہ حقیقی رنگ ہے جو ہر دور میں اپنے لازوال ہونے کی سند پا چکا ہے — اور یہی وہ رنگ ہے جو مرتضیٰ برلاس کی کربناک آواز اور ان کی غزل کے لہجے میں چوکھا بھی ہے اور شوخ بھی۔ اسی رنگ کی بدولت ان کی غزل بہت سے رنگوں کے سیلاب میں ایک ایسی موجِ صد رنگ کی مثال ہے۔ جس میں کثرت اپنی اکائی سے رشتہ قائم کیے ہوئے ہے۔ جہاں کربِ مسلسل کی آغوش میں فکری صداقتیں پروان چڑھتی ہیں جہاں فنکار کے یقین کو اس کے دعوے کی روشنی میں نئی توانائیاں ملتی ہیں۔ اور جہاں فکری انا کی سچائی قاری کو حقیقت کے اس بیان پر اپنا ہمنوا بنا لیتی ہے کہ صداقتوں کے معیار فن کاروں، شاعروں اور فلسفیوں کی جگر کاوی کی بدولت قائم ہوتے ہیں۔

گر فلسفی و شاعر و فنکار نہ ہوتے
جو اب ہیں صداقت کے وہ معیار نہ ہوتے
کیسے کوئی پہچانتا پھر خیر کو شر سے
دنیا میں اگر ہم سے گنہگار نہ ہوتے

مرتضیٰ برلاس کی شاعری سچے اور کھرے جذبوں کے اظہار سے عبارت ہے، ان کے ہاں احساسِ آگہی کی معراج ایسے اظہار کو گردانا گیا ہے جس میں فکری صداقت غالب دکھائی دیتی ہے، اور حق یہ ہے کہ جو بات بھی کہی جائے پوری ذمہ داری سے کہی جائے، صداقت کے معیاروں میں سب سے بڑا معیار خود فنکار کا وہ نظریۂ فن ہے جس کا وجود اپنی ذات کے حوالے سے اور اپنی ذات کا حسن نظریۂ فن کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ مرتضیٰ برلاس کے ہاں ان کی ذات اور نظریۂ فن میں وہی رشتہ ہے جو آئینے کے مقابل آئینے کی طرح صاف دل کا ہوا کرتا ہے گویا ان کی شاعری میں نظریۂ فن اور ان کی ذات آئینۂ یک دگر ہیں، ان کے لہجے کی توانائی کا راز اسی ایک حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ شعری اظہار میں سچائی کے سوا کوئی دوسرا معیار سامنے نہیں رکھتے، وہ مصلحت کو دشمنِ فن قرار دیتے ہیں اور عافیت کوشی کو منافقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایسا قرینہ ملتا ہے جسے بے مصلحت اظہار کا نام دیا جا سکتا ہے وہ اس رویے میں اتنے واضح اور صاف ہیں کہ علامتی اظہار کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ ان کے حساس ذہن کی تہوں میں ایک کھلبلی مچی ہوئی ہے یا ان کے دماغ کے خلیوں میں بغاوت نے گھر کر لیا ہے ان کے مجموعی آہنگ میں للکار کا پیوند ان کی مستیٔ کردار اور نشۂ گفتار کا شاہد بن کر اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے، پھر چہ باوا بادگی یہ کیفیت اور اضطرار کی یہ جانگداز صورت ان کی آواز میں بجلیاں بھر دیتی ہے

ماخوذ [1] مرتضیٰ برلاس کا مجموعۂ کلام

جیسے انہیں اپنے دشمن کے مقابل اپنی مظلومیت اور استقامت کا امتحان مقصود ہو یا دشمن کو ظلم کی آخری حد چھو لینے پر اکسایا جا رہا ہو۔

ہر تیر جو ترکش میں ہے چل جائے تو اچھا
حسرت مرے دشمن کی نکل جائے تو اچھا

مجھے مغلوب کرنے کو مرے دشمن کی جانب سے
کبھی نفرت کے تیر آئے، کبھی چاہت کا دام آیا

برلاس کی شاعری جبر کے خلاف سینہ سپر ہونے اور ستم پیشہ قوتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے جس طرح وہ خود کسی اندیشے، وسوسے یا مصلحت کو دل میں جگہ دینا منافقت خیال کرتے ہیں اسی طرح ان کی شاعری میں یہ منفرد خصوصیت پائی جاتی ہے، جہاں "تیشۂ کرب" کی ہر غزل کے وجود سے ان کا خونِ جگر رِستا دکھائی دیتا ہے وہاں حقائق کے اظہار میں ہر قسم کی مصلحت سے بے نیاز ایسی شخصیت کے خدوخال ابھرتے نظر آتے ہیں جسے قومی شعور بیدار کرنے کا جنون ہو گیا ہے، اس کا یہ مقصد نہیں کہ برلاس کی شاعری میں پروپیگنڈا راہ پا گیا ہے، یا ان کی شاعری میں مقصدیت غالب آگئی ہے بلکہ ان کا اندرونی کرب اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ قومی وحدت کو نقصان پہنچانے والے مفاد پرستوں کی یلغار کو روکنے کی خاطر شاعری کو وسیلہ بناتے ہیں۔ جس کی وضاحت کرتے ہوئے ندیم قاسمی نے "تیشۂ کرب" کے پیش کلام میں لکھا ہے کہ "اتنی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تنقید کرنے والا برلاس اپنی ساری فنی قوتیں اور اظہار کی توانائیاں اپنے وطن کے عشق سے حاصل کرتا ہے" دیکھا جائے تو برلاس وطن کی محبت میں سرشار ایک ایسے فن کار ہیں۔ جنہیں عصبیت کی حد تک خاکِ وطن عزیز ہوتی ہے، وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے بعد بھی خوش ہوتے ہیں کہ اگر وطن سلامت ہے تو یہ قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔

اشک بن کر یہیں جذب ہو جائیں گے خاک ہو کر یہیں پر بکھر جائیں گے
وحشتِ غربت تری وسعتوں کی قسم اب تجھے چھوڑ کر کدھر جائیں گے

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ برلاس کی شاعری کا رشتہ مشرقی افق سے طلوع ہونے والے سورج کی توانائیوں سے ملتا ہے اور ان کی شاعری ایشیا کی سرزمین سے ابھرتی ہوئی انقلابی فکر سے غذا حاصل کرتی ہے۔ ان کی شاعری سرخ آنکھوں، سیاہ ہونٹوں اور زرد رنگ چہروں پر پھیلے ہوئے کرب کی ان گنت کہانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوتے ہے۔ جہاں ایشیا کے مختلف عقیدوں، مختلف نسلوں اور مختلف زبانوں میں بٹے ہوئے انسان درد کے مشترک رشتے میں منسلک دکھائی دیتے ہیں اس براعظم میں آباد سبھی قوموں کے دکھ ایک جیسے ہیں، ان کا ماضی، حال اور مستقبل ایک جیسا ہے۔ جو صدیوں سے ایک انداز میں زندگی بسر کر رہے ہیں یا یوں کہیئے کہ زندگی انہیں ایک ڈھب سے گزار رہی ہے۔ برلاس اپنے ایشیائی تشخص کے حوالے سے ان مسائل کا بھرپور جائزہ لے کر غزل میں نئے مضامین کا اضافہ کرتے ہیں۔ اور غزل کے افق پر ان کی آواز کا سورج اس طرح جگمگاتا ہے کہ تمام رنگ اپنی حقیقی صورت میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔

آنکھیں ہیں سرخ، ہونٹ سیہ رنگ زرد ہے
ہر شخص جیسے میرے قبیلے کا فرد ہے

نسلِ آدم کا تعلق خواہ مشرق سے ہو یا مغرب سے فنکار کی نگاہ ان تمام چہروں پر ایک ہی مشترک تحریر دیکھتی ہے اور یہ درد کی مشترک تحریر ہے جسے سادہ لوح عوام تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن یہی مشترک کرب لوگوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار گرا کر ان فاصلوں کو مٹا دیتا ہے۔ جو رنگ و نسل اور مشرق و مغرب کے نام پر کھڑی کی جاتی رہی — اور یہی وہ کرب ہے جو فنکار کو مائلِ اظہار کرتا ہے تو اجنبی چہروں سے وابستگی محسوس ہونے لگتی ہے۔

کرب کے رشتے سے سوچے آج کا انساں تو پھر
اجنبی چہروں سے بھی وابستگی محسوس ہو

اور جب "اپنا سا حال ہر طرف" دکھائی دے تو مشرق و مغرب کا فرق بھی مٹ جاتا ہے۔

آنکھیں اُداس چار سو چہرے نڈھال ہر طرف
مشرق ہو چاہے غرب ہو جینا محال ہر طرف

اور جوں جوں وقت گزرتا جائے گا "جینا محال ہر طرف" کا احساس ایک سچائی، ایک اجتماعی تجربہ اور ایک کڑوی کسیلی حقیقت بنتا چلا جائے گا، وہ وقت دور نہیں جب برلاس کی شاعری میں ایسے امکانات اور خدشات کا ظہور عمومی مشاہدے کی صورت اختیار کر لے گا جیسے،

حالات ہیں پھر زیر و زبر دیکھئے کیا ہو
اس دور میں انجامِ بشر دیکھئے کیا ہو

موسموں کی سازش سے کس کو باخبر کیجئے
اب ہمارے شہروں میں سارے لوگ پتھر ہیں

برلاس جیسے حساس شاعر کے گردوپیش کی دنیا میں حمانیت کا فقدان اور نفسانفسی کا عالم جہاں ان کی رُوح میں کہرام بپا کرنے کا موجب بنا وہاں مثالی معاشرہ قائم کرنے میں ہماری جدوجہد کی بے ثمری نے ان کو شکستہ خاطر کیا۔ لیکن اس سفر میں حقیقی منزل تک پہنچنے سے قبل اتنی بہت سی اذیتیں سہنے کے باوصف وہ حوصلہ نہیں ہارے بلکہ اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے — یہی نہیں بلکہ وہ سوچ

میں ہمت و جرأت پیدا کرنے اور ناسازگار حالات کے سامنے سینہ سپر رہنے کی تلقین کرتے رہنا ان کی شاعری کے مزاج کا حصہ ہے۔ ان کی مشفقانہ آواز میں ہر لفظ لہجے کی نرمی اور طبیعت کے استقلال کی علامت بن کر ہمارے لہو کی گردش میں شامل ہو جاتا ہے اور ہم خود اعتباری کی نئی قوت کے ساتھ آگے بڑھنے کا عزم کرتے ہیں، یہی وہ اندازِ اظہار ہے جو برلاس کی شعری قامت میں غیر معمولی امتیاز پیدا کرتا ہے

چلتے چلتے چور بدن ہے پیروں میں لاکھوں چھالے ہیں
ہم کو دیکھو کتنی تھکن ہے پھر بھی ہوش سنبھالے ہیں

صرف سحر کی آس میں جب تم آخرِ شب تک جاگے ہو
سو مت جانا جاگنے والو اس کے بعد اُجالے ہیں

اس کے برعکس جہاں کہیں برلاس کی شاعری میں اپنے عہد کے سماج دشمن یا مفاد پرست عناصر کی نفسیات کو موضوعِ سخن بنا کر ان کو ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے وہاں ان کا لہجہ خاصا تند ہو جاتا ہے۔ وہ 'ماہرانِ قوم' کو آلائشوں میں گم دیکھ کر چپ نہیں رہتے بلکہ ایسا تیکھا اور کٹیلا لہجہ اپناتے ہیں کہ ان کی غزل پڑھتے ہوئے یا ان کو غزل پڑھتے ہوئے دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ مرتضیٰ برلاس ساری دنیا سے خفا ہیں۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ حرفِ حق کہتے ہوئے بدلحاظ سے ہو گئے ہیں، وہ کم نظر، خود پسندوں کے نرغے میں گھرے، اس بے خوف شخص کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے گریبان میں کیوں نہیں جھانکتے، احتساب سے خائف ان خود پسندوں کے گھناؤنے کردار اور ان کے منفی اثرات کو شعری زبان میں پیش کرنا بڑے دل گردے کی بات ہے ——— وقت گزرتا رہتا ہے۔ یہ کردار بدلتے رہتے ہیں، ان کی نفسیات وہی رہتی ہے ان کی جگہ دوسرے کردار لیتے رہیں گے لیکن برلاس کی زبان سے نکلی ہوئی سچائیوں کا حسن اپنی اکائی کی حفاظت کرتا رہے گا۔

پہلے ہر شخص گریبان میں اپنے جھانکے
پھر بصد شوق کسی اور پہ تنقید کرے

"آٹو بایوگرافی شائع کرنے کے بھی کچھ مسلّمہ اصول و شرائط ہیں۔ جن میں سے پہلی اور لازمی شرط یہ ہے کہ آٹو بایوگرافر بین الاقوامی سطح کا نہیں تو کم از کم ملکی سطح کا معروف پبلک فگر ہو۔ (میں نے "پبلک فگر" کی بات کی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پورے ملک میں ہر شعبۂ زندگی سے متعلق لوگوں یعنی پورے ملک کے عوام میں معروف ہو)۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تک جن لوگوں کی سوانحِ حیات سے اقتباسات آپ نے چھاپے ہیں اُن میں سے کوئی بھی اس پہلے اور بنیادی معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ پاکستان کے کسی ادیب یا شاعر کو اگر اپنی خود نوشت سوانحِ حیات شائع کرنے یا کرانے کا اخلاقی حق پہنچتا ہے تو وہ فیض احمد فیض صاحب ہیں یا پھر سندھی شاعر شیخ ایاز اور بلوچی زبان کے شاعر گل خان نصیر تک رعایت کی جا سکتی ہے۔"

م۔ ی قیصرانی ——— بنوں

سراج منیر

شہر آشنا

یہ لینڈ سکیپ کچھ بہت اجنبی نہیں ہے۔ گھر اور گھر کے گرد پھیلتا جاتا ایک بڑا شہر —— اپنی گلیوں کی بھا بھی اور اپنی سڑکوں کے شور میں فرد کو فراموش کرتا ہوا۔ شہر کا استعارہ بیسویں صدی کی شاعری میں صرف ایک معاشرتی مظہر کی حیثیت سے داخل نہیں ہوا۔ بلکہ انسانی رشتوں کی جذباتی سطح کے گم ہو جانے سے وجود میں آیا ہے۔ آج تخلیقی آدمی کا بن باس شہر میں اس کا قیام ہے

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورتِ آدم بہت ہے یاں

صورتِ آدم میں آدم کی گمشدگی سرود مجاز کے لئے ایک بنیادی شے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات محض یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر شہر کے اس منظر نامے میں ہمیں صرف شاعر ایک آؤٹ سائیڈر کی طرح دکھائی دیتا تو قدروں کی نوحہ گری، معاشرے کی منافقت کا ذکر کر کے بات مکمل ہو جاتی۔ شاعر کو صداقتوں کا امین کہہ دیا جاتا۔ لیکن شہر آشنا میں منظروں کے جو ریزے بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں اس طرح کی کوئی رائے دیکر گزر جانا اس شاعری کے پیچھے کارفرما ایک تہہ بہ تہہ پیچیدہ جذباتی نظام کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہو گا یہ تہہ بہ تہہ نظام اس پوری کتاب میں ہمیں کہیں کہیں جھلکیاں دکھاتا ہے۔ کہیں کہیں سپاٹ شعر بھی ہیں۔ اور نظموں کا حصہ خاص طور پر کمزور ہے اس لئے کہ عموماً واقعاتی ہے۔ لیکن یہ جو اس خاک میں کہیں کہیں سونے کا رنگ ہے۔ وہ اپنی جگہ بڑا اہم ہے اور ایک سنجیدہ تجزیے کا تقاضا کرتا ہے۔

شہر کا استعارہ چونکہ محض ایک جغرافیائی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں ہوا۔ اس لئے اس کی مختلف جہتیں اور شکلیں ہیں۔ اس استعارے سے مرتب ہونے والے رویّے زمانے کا نام پاتے ہیں اور اس سے جنم لینے والا منظر کہیں کہیں دنیا بن جاتا ہے۔ اس طرح خارج کی وہ کائنات وجود میں آتی ہے کہ جس سے شاعر ایک حرکی رشتے میں زندہ رہتا ہے۔ ردّ و قبول کے ایک مسلسل عمل میں۔

آج اس شہرِ کس مپرساں میں
کوئی ہم سا بھی بے نوا ہو گا

———

پاؤں بھولے سے بھی دوبارہ نہ رکھا جائے
کوئی صورت ہو تو اس شہر سے نکلا جائے

———

وا دریچے ہیں، کھلے در ہیں مگر سب چپ ہیں
سونی گلیوں میں یہاں کس کو صدا دی جائے

شہر کے جتنے مظاہر سرود مجاز کے ہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں ایک بنیادی قدر مشترک نظر آتی ہے۔ یعنی ان سے منسلک معانی کی وسیع ہوتی ہوئی جہتیں ناپید ہو چکی ہیں اور اس لئے شاعر کا اس سے سابقہ ایسا ہی ہے جیسا ایک بنجر اور تھکا دینے والی کائنات سے ہو سکتا ہے۔

یہ کتاب پڑھتے ہوئے ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیے کہ سرود مجاز کا بنیادی ردِّ عمل مابعد الطبیعی یا فکری نہیں ہے۔ بلکہ جذبے سے عبارت ہے۔ اس لئے اس شاعری کے معنی کا تعین اسی مضطرب روح کے حوالے سے ہوتا ہے۔ جو اس کے پس منظر میں کارفرما ہے۔ انسانی رشتوں کے نازک نظام میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ اور ان رشتوں کی ریختگی پر آزردہ ہو کر اس اُداسی کا اظہار چھوٹے چھوٹے جذباتی تموجات کی شکل میں کرتی ہے۔

یہ مضطرب روح بھی ایک اصول ہے اور شہر کے خارجی منظر نامے کے بالمقابل اپنا الگ ایک لینڈ سکیپ رکھتی ہے۔ سرود مجاز نے اسے گاؤں کا نام دیا ہے۔ شہر اور گاؤں کو ہمیں محض خارجی کائنات کے دو مظاہر نہیں سمجھنا چاہیے اس لئے کہ ان دو متقابل منظروں کے سرود مجاز کے ہاں اپنے الگ معنی ہیں اور ان کے ذہن میں یہ تقسیم بالکل واضح ہے۔ شہر کا مطلب خارج کی وہ کائنات ہے جو اپنے معانی سے محروم ہو چکی ہے۔ اور

۱؎ سرود مجاز کا مجموعۂ کلام

تخلیقی صورت حال کے لئے جبر بن گئی۔ گاؤں انسانی باطن کی ازلی معصومیت سے عبارت ہے۔ اسی لئے سرود مجاز کے ہاں گاؤں کا استعارہ تمام مثبت قدروں کے لئے مرکز کا کام دیتا ہے

چرا لیا ہے روایت کا بانکپن کس نے
یہ آگ کس نے مرے گاؤں میں لگائی ہے

یہ سارے منظر دراصل جذبے سے تشکیل پانے والے ایک ایسے جغرافیے کے مختلف ٹکڑے ہیں۔ جو سرود مجاز کے ہاں قدروں کے قائم مقام بن گئے ہیں۔ یہ شعری کائنات اپنے انسانی مناسبات میں ایک طرح کا رومانی عنصر رکھتی ہے۔ یوں تو اُردو شاعری کے پورے لینڈ سکیپ کی تشکیل من و تو کے رشتے کی مختلف پرتوں کے ذریعے ہوتی ہے لیکن سرود مجاز کے ہاں من و تو کا یہ رشتہ بہت ہلکے رنگوں سے مرتب ہوتا ہے اور اُداسی کے ایک غبار میں ملفوف ہے "تو" کی یہ ضمیر اس شاعری میں ہمیشہ (OTHER) کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ میں نے یہاں انگریزی کے اس لفظ کو "غیر" کے طور پر ترجیح اس لئے دی ہے کہ اس پوری شعری فضا میں اگر کوئی بامعنی رشتہ نظر آتا ہے تو وہ اسی ضمیر کے ساتھ ہے۔

میں کب نہ چاہوں کہ تو پاس ہو تو باتیں ہوں
یہ زندگی مجھے فرصت ذرا سی دے تو سہی

کسی طرح کسی انداز سے وفا تو کر
تو مجھ سے ترکِ تعلق کی ابتدا تو کر

اگر کہے تو تجھے داستاں سناؤں میں
وہیں پہ ٹوک جہاں بات بھول جاؤں میں

میں چاہتوں میں کسی جبر کا نہیں قائل
اگر نہ چاہوں تجھے یاد بھی نہ آؤں میں

جیسا کہ میں نے عرض کیا رشتے کی اس تہہ پر ایک رومانی عنصر غالب ہے۔ اس کے لئے ہم عشق کی اصطلاح استعمال نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ کہیں شدید اور گہری اصطلاح ہے۔ جبکہ سرود مجاز کے ہاں شدید سے شدید جذبہ بھی بہت سنور کر ایک وضع اور ایک قرینے کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور یہی رکھ رکھاؤ اور شائستگی ہمیں اظہار کی ایک بالغ سطح سے روشناس کراتی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس پورے منظر میں حرکت کرتا ہوا کردار صرف ایک ہے یعنی شاعر کی اپنی ذات اور بقیہ تمام چیزوں اور رویوں کے مقام شاعر کی اپنی ذات کی مختلف کیفیتوں سے متعین ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ذات کی اصطلاح انا سے بالکل الگ معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ذات کا دکھ جس کا یہ شاعری اظہار کرتی ہے۔ انا کے کرب سے قطعاً الگ ایک چیز ہے اور اس سے کہیں زیادہ اہم اور متاثر کن۔

مجموعی طور پر اس شاعری کے بارے میں بڑے دعوے نہیں کئے جا سکتے اور کئے بھی نہیں جانے چاہئیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کے اپنے تیور ہیں، اپنا ایک ذائقہ ہے اور ایک ایسی فضا ہے۔ جو معاشرتی کرب اور زندگی کے بارے میں ایک تخلیقی اداسی سے مرتب ہوتی ہے۔ اور کیا یہ کوئی غیر اہم بات ہے؟

"ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا مضمون بہت علمی ہے۔ میرزا ادیب صاحب کا مضمون "بابا ڈوکرا" خالص انسانی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔ اور مذہب و ملت کی دیواروں میں محبوس انسانوں کے لئے آزادی کا پیغام۔ یہی اندازِ فکر عارف عبدالمتین صاحب کی غزل میں کارفرما ہے۔ غزلوں میں احسن زیدی یوسف حسن۔ ایوب خاور نے اچھے شعر نکالے ہیں۔ پروین شاکر کی پابند نظمیں ان کی آزاد نظموں سے بہتر ہیں۔ سلیم بیتاب کا دوسرا مجموعہ "ہوا کی دستک" شائع کر کے انکے احباب نے ایک اچھی طرح ڈالی ہے"

اکبر حمیدی ـــــ گوجرانوالہ

گفتگو

◎

تجریدی افسانے کا سفر

حرفِ سوال : لینڈا وینٹنگ

جواب : مستنصر حسین تارڑ

نوٹ : لینڈا، امریکی نژاد اردو ادب کی طالبہ ہیں، جو گزشتہ دنوں پاکستان میں تجریدی افسانے پر تحقیق کرنے آئی تھیں۔ یہ انٹرویو انہی دنوں مرتب کیا گیا۔

لنڈا ــــــــ آپ کا افسانہ "بادشاہ" پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ یہ ایک پیچیدہ اور مشکل پیرایۂ اظہار ہے جب کہ "فاختہ" آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

مستنصر ــــــــ اگر "بادشاہ" اور "فاختہ" میں پیرایۂ اظہار مختلف ہیں تو اس میں میری ذہنی کاوش کو دخل نہیں۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ کسی ایک پیرایۂ اظہار کو اختیار کر کے صرف اُس انداز میں لکھتے رہنا میرے نزدیک تخلیقی تنزل کی نشانی ہے۔ میں جب بھی افسانہ لکھتا ہوں تو میرے نزدیک گنے چنے چند لفظ اور ایک خاص شائل اہم نہیں ہوتا بلکہ اُس کا سبجیکٹ میٹر فوقیت رکھتا ہے ان چیزوں پر۔ یہ اُس افسانے کی بنیادی تھیم فیصلہ کرتی ہے کہ اُسے طاقتور طریقے سے قارئین تک پہنچانے کے لئے جدید علامتی انداز موزوں ہے یا جدید کلاسیکی طریقہ۔ ایک ہی شائل میں مقیّد افسانہ نگار صرف اُن تھیمز کو ہاتھ لگاتا ہے جنہیں وہ اپنے محدود ذخیرۂ الفاظ کی مدد سے بیان کر سکتا ہو۔ یعنی ایک ایسا بُت تراش جو صرف ایسی چٹانوں سے بُت تراشتا ہے۔ جنہیں وہ اپنے چند اوزاروں کی مدد سے زیر کر سکتا ہو۔

لنڈا ــــــــ شائد "فاختہ" اُردو کا واحد علامتی ناولٹ ہے....

مستنصر ــــــــ "فاختہ" کتابی صورت میں پہلی مرتبہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی تھی اور میرا خیال ہے اس سے پیشتر انوار غالب کا علامتی ناولٹ "رات کا سورج" طبع ہو چکا تھا اس لئے ایسا نہیں ہے۔ "فاختہ" میں علامت کی مختلف سطحیں ہیں۔ پہلی سطح پر جانوروں کے نقاب پہنے ہوئے مختلف کردار ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ جو ریچھ اور عقاب وغیرہ پر مشتمل ہے سُپر پاورز کی متکبرانہ دھونس کی نمائندگی کرتا ہے۔ دوسرا گروہ خرگوش، اونٹ اور بن مانس ترقی پذیر ممالک کی پسماندگی اور بے بسی کا مظہر ہے۔ اژدھا ایک ایسی اُبھرتی ہوئی طاقت ہے جس کے ابھی دانت نہیں نکلے۔ اور پھر فاختہ کا مرکزی کردار ہے جو جانوروں کے اس جنگل میں اکیلی ہے اور کوئی اُس کا ساتھ نہیں دیتا تاآنکہ خرگوش اس کی اُنگلی نہیں تھام لیتا۔ علامت کی دوسری سطح پر ہمارے پنجابی صوفی شاعر شاہ حسین کے اشعار ہیں جو مختلف کردار اپنی پہچان کروانے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ دراصل خرگوش تیسری دنیا کے ایک فرد کے پہلو بہ پہلو پنجاب کی نمائندگی بھی کر رہا ہے جو اپنی پہچان کروانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ دراصل خرگوش تیسری دنیا کے ایک فرد کے پہلو بہ پہلو پنجاب کی نمائندگی بھی کر رہا ہے جو اپنی پہچان برقرار رکھنے پر بضد ہے اور کسی قسم کا نقاب پہننے سے انکار کر دیتا ہے "فاختہ" ایک بین الاقوامی تھیم کی کہانی ہونے کے باوجود اپنی رُوح اور رویّے میں پنجاب سے متعلق ہے۔ خرگوش کا فلیش بیک جو اُسے ماسکو کے سُرخ چوک سے لاہور کے چراغاں میلے میں لے آتا ہے اسی جذبے کا مظہر ہے۔ چنانچہ علامتوں کے اس گنجلک ہجوم کو واضح کرنے کے لئے مجھے قاری سے ایک ایسی زبان میں گفتگو کرنا تھی کہ وہ علامت پر غور کر سکے اور زبان کی دشواری اس کے راستے میں حائل نہ ہو۔ اُدھر "بادشاہ" ایک پیچیدہ تھیم کی پیچیدہ کہانی ہے اور اس کے لئے آج کی صورتحال کے مطابق اس قسم کا پیرایۂ اظہار مناسب تھا۔

لنڈا ــــــــ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جدیدیت کا مطلب ہے کہ وہ افسانہ تجریدی یا علامتی ہوگا۔

آپ کی کیا رائے ہے !

مستنصر ــــــ میں پہلے عرض کر دوں کہ اس قسم کے تکنیکی سوالوں کا جواب میں تکنیکی الفاظ میں دینے سے قاصر ہوں، بہرحال .... جدیدیت کے لفظ سے میرے ذہن میں مختلف ممکنات آتے ہیں۔ یعنی موجودہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی افراتفری کی عکاسی جدید عصری تقاضوں کے حوالے سے۔ ذات کی اکائی کا اظہار اس طور کہ وہ معاشرے کے کل کا ایک حصہ بھی بنے اور اُس کا تشخص بھی ہو۔ جدیدیت لفظوں کے ایک مخصوص گروہ کا استعمال ہرگز نہیں ہے بلکہ ترقی پسندانہ سوچ اور عصری تقاضوں سے مطابقت کا نام ہے چنانچہ جدیدیت صرف ساخت نہیں ہے بلکہ اس کا منبع سوچ ہے۔ اب رہ گئی علامت تو یہ ایک قدیم روایت ہے جو ہمیں داستانوں کے حوالے سے بھی ملتی ہے البتہ اس کی گہرائی میں اضافہ موجودہ دور میں ہوا۔

لنڈا ــــــ آپ نے یورپی کلاسیکی ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ آپ کن ادیبوں سے متاثر ہوئے اور اُن کے مقابلے میں اپنے آپ کو کہاں پر جگہ دیتے ہیں ؟

مستنصر ــــــ میں روسی ادب سے بےپناہ متاثر ہوں بالخصوص ناول سے اور .... کہانی سے بھی۔ شاید اس لئے کہ روسی محسوسات اور عادات کے لحاظ سے نصف ایشیائی ہوتا ہے۔ اُس کی محبتوں اور نفرتوں میں شدت ہوتی ہے۔ روسی ادب نے مجھے انسپائر تو کیا ہے مگر اپنی تحریروں میں میں نے اُن کے انداز کو نہیں اپنایا۔ ایک تو ہمارے ہاں عظمت بے حد سستے داموں بکتی ہے۔ لوگ لکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے پتہ نہیں کیا کلاسیک تخلیق کر دیئے ہیں اور ہم بہت ہی عظیم قسم کے ادیب ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ پچھلے دنوں جب میں "وار اینڈ پیس" کو تیسری مرتبہ پڑھ رہا تھا تو ہر دس پندرہ صفحوں کے بعد ایک مقام ایسا آتا کہ میں بے حد دل برداشتہ ہو کر کتاب بند کر دیتا کہ مجھ پر تحریر کی قوت غالب آ کر میرے احساسِ کمتری کو شدید کر دیتی۔ میرا جی چاہتا کہ میں نے آج تک جو لکھا ہے اُسے جلا دوں کہ وہ تو ٹریش ہے۔ شاید لوگ مطالعہ نہیں کرتے اور اس لئے اپنے آپ کو عظیم سمجھتے ہیں۔ اب حال ہی میں ایلکس ہیلے کی "رُوٹس" پڑھی۔ یہ بڑی کتاب تو نہیں مگر زندہ ضرور رہے گی۔ اس میں سطح پر رہ کر تیرنے کی قوت ہے، یہ ڈوبے گی نہیں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ میں نے آج لکھا یا آئندہ لکھوں گا اُس کے حوالے سے میں تیروں گا تو سہی ادب کے وسیع سمندر پر مگر بیس پچیس برس تک اور اُس کے بعد ایک بھاری پتھر کی طرح ڈوب جاؤں گا۔ چنانچہ اپنی تخلیقات کے بارے میں کوئی بلند دعویٰ نہیں کر سکتا اور آپ کہہ رہی ہیں کہ اُن ماسٹرز کے مقابلے میں ..... یہ تو ادبی کفر ہوگا۔

لنڈا ــــــ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ ایک جدید لکھنے والے ہیں ؟

مستنصر ــــــ میں جدید زمانوں میں سانس لیتا ہوں اور بدلتے ہوئے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتا ہوں چنانچہ میں جو کچھ لکھتا ہوں۔ وہ جدید ہونا چاہیئے .... ہونا چاہیئے ہے یا نہیں اس کے بارے میں مجھے علم نہیں۔

لنڈا ــــــ کیا جدید افسانہ نگار مغرب سے متاثر ہوئے ؟

مستنصر ــــــ زیادہ تر ہوئے۔ کچھ تو جدیدیت کے جنون میں اپنی دھرتی سے رشتہ منقطع کر کے اُدھر ہی چلے گئے مگر بیشتر نے صرف اُن سے کچھ سیکھا اور اُسے اپنے چار چفیرے کے حوالے سے نئے رنگ میں رنگ دیا۔ اگر ہمارے لباس رہائش۔ عادات اور سائنسی علوم پر باہر کا رنگ غالب ہے تو ادب سے استفادہ کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ ارتقاء کا عمل تو جاری رہتا ہے۔ پکاسو مکمل کلاسیکی انداز میں شروع ہوتا ہے، "انٹی کے پورٹریٹ" بناتا ہے۔ پھر اُس کے ہاں قدرے بے ساختگی آتی ہے مثلاً سرکس کے مضمون کی سیریز اور بالآخر کیوبزم کی طرف مائل ہوتے ہوئے مکمل تجریہ پر آ جاتا ہے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر تخلیق کار کلاسیکی انداز سے شروع ہو کر مکمل تجرید پر ہی آئے۔ یہ منحصر ہے اس بات پر وہ کہنا کیا چاہتا ہے اور اُس کے اندر کہنے کے لئے کتنا کچھ ہے اور وہ اسے کس انداز میں کہنے سے مطمئن ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی کلاسیکی روایت میں اگر آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو آپ مکمل اظہار کر سکتے ہیں .... اگر آپ میں تخلیقی قوت ہے تو۔

لنڈا ——— کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تجریدی افسانہ علامتی سے مختلف ہے اور زیادہ تر جو افسانے سمجھ میں نہیں آتے وہ تجریدی ہوں گے۔

مستنصر ——— جی ہاں وہ لوگ ایک حد تک درست کہتے ہیں۔ عرض کر چکا ہوں کہ علامت ایک قدیم روایت ہے۔ تجریدی افسانے کے لئے اُن کا الف سے لے کر ی تک سمجھ میں آنا ضروری نہیں۔ تجریدی مصوّری کی طرح اس کا ایک تاثر ہوتا ہے جو ہر قاری اپنی فہم اور علم کے حساب سے مختلف سطحوں پر محسوس کرتا ہے۔ ذاتی طور پر میں مکمل تجرید کے حق میں نہیں ہوں۔ میرے نزدیک تجرید اور شعوری رو کا استعمال بے حد نپے تلے انداز میں کرنا چاہیئے۔

لنڈا ——— تجریدی افسانے کے کون سے مسائل ہیں؟

مستنصر ——— صرف جدید افسانہ کہہ لیجئے فی الحال۔ سب سے بڑا مسئلہ تو ظاہر ہے کہ قاری کا ہے۔ وہ اس کے نزدیک نہیں آتا اور قابلِ فہم طور پر۔ اگر آپ اُسے صرف لفظوں سے اسیر کرنا چاہتے ہیں یا تجرید کے شوق میں پٹری سے اُتر جاتے ہیں تو اُس میں اس غریب کا قصور ٹھیک ہے ہم یہ چاہتے ہیں کہ آج کی کہانی کے لئے قاری آرام دہ جھولنے والی کرسی پر بیٹھ کر اُسے وقت گذاری کا ایک ذریعہ نہ بنا لے! وہ کچھ فاصلہ ہماری جانب بھی طے کرے ٹھیک ہے لیکن ہمیں بھی تو کچھ فاصلہ اُس کی جانب طے کرنا چاہیئے۔ اگر ہم اپنے اپنے سنگھاسنوں پہ بیٹھ کر یہ خواہش کریں کہ ہمارے گرد پڑھنے والوں کا ہجوم جمع ہو جانے گا تو یہ ایک احمقانہ خواہش ہے۔ اگر ہم صرف اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اپنی کرسیوں اور میزوں کے لئے ادب تخلیق کرتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر آپ اُس خاموش اکثریت کو جیتنا چاہتے ہیں تو آپ کو کچھ راستہ اُن کی جانب بھی طے کرنا ہوگا۔

لنڈا ——— کون سے ایسے افسانے ہیں جن میں تجریدیت ہے؟

مستنصر ——— اچھا مجھ میں یہی خامی ہے کہ مکمل تجریدی افسانے ایک علیٰحدہ اکائی کے طور پر میرے ذہن میں جگہ نہیں پاتے بلکہ ان کا ایک مجموعی تجریدی تاثر مجھ پر وارد ہوتا ہے۔ رشید امجد میں مجھے ایک پُرخلوص تخلیقی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ مگر بے شمار ایسے افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں جو کھُلے فراڈ ہیں۔ میں خود لکھنے والا ہوں اچھا یا بُرا یہ الگ مسئلہ ہے اور مجھے تھوڑا بہت ادب سے لگاؤ بھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ بے شمار تجریدی تحریریں فراڈ ہیں کیونکہ یہ آسان ترین نقب ہے ادبی میدان میں داخل ہونے کے لئے (سفر نامے کے علاوہ) ایک شارٹ کٹ۔ مجھے پتہ ہے کہ کئی مرتبہ ایک ایڈیٹر کو کوئی تجریدی افسانہ موصول ہوا تو اُس نے صرف اس خوف سے شائع کر دیا کہ ہو سکتا ہے اس میں کوئی ایسا نکتہ پنہاں ہو جو میری سمجھ میں نہیں آرہا تو نہ چھاپنے سے میری کم علمی نہ ظاہر ہو جائے[1]

لنڈا ——— ایسا کیوں ہے کہ منٹو، بیدی، کرشن اور قاسمی کو جو لیڈر شپ ملی وہ جدید لکھنے والوں کو نہیں ملی۔

مستنصر ——— ایک تو یہ کہ ابھی ہمیں MATURE ہونے میں کچھ عرصہ لگے گا۔ دوسرے یہ دور اجتماعی تاثر کا دور ہے۔ اس کی ایک مثال ہمیں مغربی موسیقی میں ملتی ہے جہاں ایک زمانے میں لوئی اسٹرانگ کی ٹرسٹ۔ ایلا فٹز جیرلڈ کے بلوز اور ایلوس پریسلے کے راک بہت مقبول تھے اور یہ لوگ ذاتی حیثیت میں جانے جاتے تھے۔ بیٹلز کے آنے سے ذاتی حیثیت ختم ہوئی اور گروپ میں اجتماعی سلسلہ چل نکلا۔ اب جہاں صرف گروپ پوری موسیقی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی طور آج ادب میں اکائی اتنی اہم نہیں رہی۔

لنڈا ——— آپ کن لوگوں کو جدید افسانہ نگاروں میں شامل کرتے ہیں!

مستنصر ——— بہت سارے نام ہیں عبداللہ حسین، اکرام اللہ، انور سجاد، انتظار حسین مسعود اشعر، سلیم اختر، رشید امجد، احمد داؤد، مظہر الاسلام، احمد ہمیش، اعجاز راہی وغیرہ۔

لنڈا ——— خالدہ اصغر؟

مستنصر ——— میں نے انہیں زیادہ نہیں پڑھا۔ شاید اس لئے کہ میں نووارد ہوں ادب کے میدان میں۔ اور اُن کا کوئی مجموعہ بھی نہیں ہے۔ البتہ "ماہِ نو" اور "سویرا" میں اُن کی دو کہانیاں پڑھی تھیں جو مجھے اچھی لگیں۔

لنڈا ——— آپ تجرید کی طرف کب مائل ہوتے ہیں؟ اور کیسے؟

مستنصر ——— میں بنیادی طور پر چیزوں

---

[1] یہ نکتہ ماہِ نو کی ایڈیٹر کے بارے میں غلط ہے۔ (کشور ناہید)

کی شناخت قائم رکھنے پر یقین رکھتا ہوں۔ کچھ کچھ سوریلسٹک انداز میں۔ مثلاً اگر میں ایک گھڑی بناتا ہوں تو ہو سکتا ہے کہ اُس کے ہندسے جہازی سائز کے ہوں۔ اُس کی سوئیاں صرف دو اِنچ لمبی ہوں ڈائل اتنا چھوٹا ہو کہ ہندسے اُس سے باہر نکل کر ایک وسیع رقبے پر محیط ہوں۔ مگر بنیادی طور پر اُس کی شناخت ایک گھڑی کے حوالے سے ہوگی یہ نہیں کہ قاری اُسے گھوڑا سمجھنے لگے۔ میں قاری کا امتحان لینے پر یقین نہیں رکھتا اور اس لئے بعض اوقات اپنی علامتوں کو قدرے برہنہ کر دیتا ہوں، یعنی اتنا کہ ایک ملفوف ڈھکے ہوئے پیکر کے کسی حصے کو تھوڑا سا نظروں کے سامنے لے آتا ہوں تاکہ قاری کو اتنی آسانی ہو جائے کہ وہ جان جائے کہ یہ پیکر ایک عورت کا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اسے گھوڑا سمجھتا رہے۔ ایک اور بات صرف جدید کہلانے کے لئے تجریدیت کا بے دریغ استعمال بیحد اذیت ناک عمل ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہوتا۔ تجرید مجھے پسند ہے بہت، لیکن ایک مقصد کے ساتھ۔ مثلاً کئی سیاسی اور اقتصادی حوالے ایسے ہوتے ہیں جنہیں آپ کھلے لفظوں میں بیان کر دیں تو آپ پر گرفت لازم ہے۔ انہیں سامنے لانے کے لئے تجرید ایک خوبصورت طریقہ ہے۔ یا پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں کچھ محسوس کر رہا ہوں مگر وہ کسی سٹیٹ مینٹ کے ذریعے اظہار نہیں پا سکتا۔ نارمل الفاظ اُس کے لئے کافی ہیں تو میں تجرید پر اتر آتا ہوں اور ایک خاص تاثراتی موسم تخلیق کر کے اپنے محسوسات کا سایہ تحریر پر ثبت کر دیتا ہوں۔

لنڈا ——— مثلاً کون سے افسانوں میں .....؟

مستنصر ——— مثلاً "بادشاہ" کے کچھ حصے بادی النظر میں کہانی سے بالکل الگ نظر آتے ہیں۔ وھیل کا شکار اور پتنگ بازی کی تفصیل بالکل علیحدہ لگتے ہیں۔ مگر ان حصوں کا آپس میں ربط ہے اور پھر یہی ربط بقیہ کہانی کے ساتھ اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے۔ خوشبو اور بدبو والی سطریں بھی اُسی طور اثر انداز ہوتی ہیں۔

نمبرا "ماہ نو"، شمارۂ دسمبر میں جو حصۂ نظم محرم سے متعلق ہے۔ اس میں شک نہیں تینوں مرثیے یا نظمیں بہت اچھی کاوشیں ہیں۔

ابتدا میں پروفیسر کرار حسین صاحب کا مرثیہ نہ صرف اپنی جدیدیت کا احساس دلاتا ہے، بلکہ کرار صاحب کی علمیت اور بلندیٔ فکر کا عکاس ہے۔ کاش اس مرثیہ کے کچھ اور بند شائع ہو سکتے۔ حیرت کی بات ہے کہ جس کلام سے آپ نے رسالہ کا آغاز کیا ہے اس کا فہرستِ مضامین میں کوئی ذکر نہیں۔

نمبر۲ رئیس امروہوی صاحب کا نیا دور کا مرثیہ بھی ایک اچھی کاوش ہے اگرچہ نظم آزاد میں ہے مگر اس میں مرثیت اور مرثیہ کے ذریعے بیان اور روانی دونوں کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک نیا تجربہ ہے کہ امام اعلیٰ مقام کے استغاثہ کے الفاظ کو شاعرانہ نقطۂ نظر سے دیکھا گیا اور نئے دور کا ادبی یا انسانی المیہ کا اظہار کیا گیا۔ مگر اس کو مرثیہ کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک اچھی نظم ضرور ہے۔ اس لئے کہ مرثیے کے کچھ اور لوازمات بھی ہوتے ہیں اور اس کیلئے رئیس امروہوی صاحب کو ذرا کچھ اور کہنا چاہئے تھا۔

عفت کاظمی ——— واہ کینٹ

جمال احسانی

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

ڈاکٹر صابر آفاقی

مرتضیٰ برلاس

ماہِ نو

اس نگر اس کے سناٹوں میں
کس کی راہ تکوں
خوشبو خوشبو جھرنے
شبنم شبنم بھیجے
کن آنگنوں ڈھونڈوں
اپنا بادل دھارا ساحل سے
وہ کیوں میرے ساتھ چلے
کہنے والی بات ہی کہہ سکے
میں دیکھوں اور دیکھ ساری بہار چلے

ادا جعفری

ماہ نو

اوراقِ گذشتہ کی کتاب

سحاب قزلباش

[illegible] ی ۔ چراغ حسن حسرت

نامعلوم

ماہِ نو

مارچ ۱۹۷۹ء

صدر مجلسِ ادارت
افضال زیدی

چیف ایڈیٹر
کشور ناہید

ایڈیٹر:- علی محمد حسینی

جائنٹ ایڈیٹر:- قائم نقوی

ترتیب

اس ماہ کی کتابیں

نقش ہنر ...

گفتگو

مصورِ سرِورق کے بارے میں

ناہید علی ۱۹۴۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئیں، ۱۹۶۷ء میں سنٹرل انسٹیٹیوٹ آرٹس اینڈ کرافٹس کراچی میں داخلہ لیا۔

کراچی اور پاکستان کے دیگر شہروں میں انفرادی نمائشیں ہوئیں۔

ناہیدنے آئل پینٹنگ میں بھی انفرادی بہترین مصور کا ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

کراچی میں قیام ہے، گذشتہ دنوں ان کی ایک اور نمائش کراچی میں ہوئی۔

اپریل کے شمارے کی جھلکیاں

ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر محمد معروف، ڈاکٹر سلیم اختر، صادق حسین، آغا سہیل، شمیم احمد محمد سلیم الرحمان، ادیب سہیل، رئیس فروغ، لطیف کاشمیری، یحیٰی امجد، انور من رائے، فاروق حسن احسن زیدی، شاہدہ حسن، رشید کامل، عذرا عباس، حسن ناصر، صفدر شکیل۔ اور دیگر اہم ادیب

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۱۸

جلد نمبر ۳۲ ــــ شمارہ نمبر ۳

قیمت: ۲ روپے

طلباء کیلئے بمع رجسٹری فیس ۲۰ روپے

سالانہ چندہ مع رجسٹری فیس ۳۰ روپے

وزارتِ اطلاعات و نشریات کے ادارۂ مطبوعات حکومتِ پاکستان (پوسٹ بکس ۳۲۵ لاہور) نے

دین محمدی پریس ال روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہِ نو ۳۲ اے حبیب اللہ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

انجم رومانی

قائداعظم

طاغوتی قوتوں میں ایمان و دیں کا پیکر
تنہا ڈٹا ہوا تھا عزم و یقیں کا پیکر
حیراں تھے سامراجی تیری سیاست ایسی
لرزاں تھے رام راجی تیری فراست ایسی
باطل کی آندھیوں میں حق کا دیا جلایا
گمراہ کارواں کو منزل پہ لا بٹھایا
ممنون ہے زمانہ
اے قائدِ یگانہ

پیشِ نظر تھا تیرے اسوہ تمام اُس کا
دل سے درود نکلے جب لیجے نام اُس کا
ہر ہر قدم پہ تیرے رہبر دیانت اُس کی
جاں سے عزیز تر تھی تجھ کو امانت اُس کی
تاریکیٔ ریا میں سورج صفا کا لے کر
اُس دورِ بے خدا میں پرچم خدا کا لے کر
نکلا تو فاتحانہ
اے صاحبِ زمانہ

مظفر وارثی

قائدِ گرامی

تیری سوچیں ترا اسلوبِ نظر زندہ ہے ناطقہ مر گیا آواز مگر زندہ ہے

اپنی تخلیق کے لہجے میں ہے تو نغمہ سرا تیری دھرتی تری گلیاں ترا گھر زندہ ہے

جگمگاتے ہیں ترے نقشِ کفِ پا کے چراغ قافلے جاگتے ہیں راہ گذر زندہ ہے

تیری نظروں کو شعاعوں سے اترتے دیکھوں تیرا پیغام باندازِ سحر زندہ ہے

آبلے پھوڑ کے ہم پیاس بجھائیں اپنی راہ مشکل سہی احساسِ سفر زندہ ہے

خوشبوئیں پھوٹتی ہیں جلتے ہوئے موسم میں آگ ہے زیرِ زمیں پھر بھی شجر زندہ ہے

اب نہ ہو گا کوئی مردار خیالوں کی غذا حوصلہ مند ہیں فنکار ہنر زندہ ہے

پار اتارا ہمیں لہروں پہ بٹھا کر تو نے آج تک عــزم ترا پانیوں پر زندہ ہے

چھین سکتا نہیں اس قوم سے خوشیاں کوئی اس کے سینے میں ترا درد اگر زندہ ہے

حرّیت کو جو پلاتا ہے مظفرؔ شبنم

خانۂ رُوح میں ایسا بھی شرر زندہ ہے

محسن احسان

روشنی کا سفیر

سورج جب مشرق کے افق پر
روشنیوں کے پرچم کو لہراتا ہے
تو مغرب کے اندھیاروں میں
ظلمت کی یلغاروں میں
کرنوں کی آہٹ سے پیدا ہونے والا
خوف لرزنے لگتا ہے
میرے اُفق سے جس سورج نے
مغرب کی تاریکی کو للکارا تھا
جس نے اس مٹی کی خوشبو
اپنے لہو کی طوفانی بوندوں سے مہکائی تھی
جس نے اس دھرتی کے
پاؤں کی زنجیروں کو
کاٹ کے آزادی کی
ایک نئی پازیب انہیں پہنائی تھی
اس سورج کا اُجالا
میرے ہر آنگن کا سرمایہ ہے
میری ہر وادی پر
میرے ہر دریا پر
میرے ہر صحرا پر
اس محسن کے احسانوں کا
بڑا سہانا سایا ہے
بڑا سہانا سایا ہے

مارچ ۱۹۷۹ء

حفیظ تائب

یوم پاکستان

برسوں کی تگاپو کا صِلا آج کا دن ہے
ملت کے لئے لطفِ خدا آج کا دن ہے
اک باب درخشندہ ہے تاریخِ وطن کا
تہذیب کے چہرے کی ضیا آج کا دن ہے

جمہور کو سونپی گئی تھی آج کے دن ہی
تزئین چمن زار کی، تعمیر وطن کی
منزل کی طرف قافلۂ شوق چلا تھا
جاگ اُٹھی تھی سوئی ہوئی تقدیر وطن کی

چھلکائی گئی تھی مئے آزادیٔ اظہار
جذبات سے ملت مری سرشار ہوئی تھی
کہتے ہیں جسے لوگ حمیت بھی انا بھی
سینوں میں وہی آگ سی بیدار ہوئی تھی

وہ عہد کہ جو آج کے دن ہم نے کیا تھا
لازم ہے کہ اس عہد کی تجدید ہو ہر آن
اِک ولولۂ تازہ ہو بیدار دلوں میں
افسردگیٔ زیست کی تردید ہو ہر آن

میرزا ادیب

حالی ـــــــ ایک مصلح کی حیثیت سے

خواجہ الطاف حسین حالی کی تخلیقی شخصیت ایک ایسی فضا میں اُبھرتی ہے جس میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک آوازۂ اصلاح گونج رہا تھا۔ بنگال میں راجہ موہن رائے اور شمالی ہندوستان میں سرسید احمد خاں ایک منظّم اصلاحی پروگرام لے کر معروفِ جدّوجہد تھے۔ سرسید کی مستقل مصاحبت نے حالی کے دل و دماغ کو اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ اصلاحی اقدامات کے سلسلے میں وہ سرسید کے سب سے بڑے ساتھی بن گئے تھے یہ تو تھے خارجی موثرات، داخلی محرکات و عوامل میں حالی کی خاندانی روایات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، جو ورثہ ان کے حصے میں آئی تھیں، ان کے علاوہ گھر کا ماحول بھی انسانی محامد و محاسن کی نشوونما کے لئے خاصا سازگار تھا۔ ابتداءً انہوں نے مسجد میں بیٹھ کر دینی کتابوں کا درس لیا تھا۔ اس سے بھی ان کے اندر نیکی، انسانی ہمدردی اور حسنِ اخلاق کا جذبہ پرورش پا رہا تھا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حالی جو کچھ بنے۔ اس میں نمایاں ترین حصہ سرسید کا ہے بلکہ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر حالی کو سرسید کی صحبت میسّر نہ آتی تو حالی وہ کچھ قطعاً نہ ہوتے جو آج نظر آ رہے ہیں میرے خیال میں یہ رائے جزواً تو درست ہے مکمل صداقت کی تصویر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اگر حالی کی اپنی طبیعت میں قبولیتِ اثر کی صلاحیت نہ ہوتی تو سرسید ہزار کوشش کرتے شاعر حالی کو مصلح حالی نہیں بنا سکتے تھے۔ یہ حالی کی اپنی افتادِ طبع تھی کہ سرسید کا رنگ قبول کرنے میں اسے ذرہ برابر دیر نہ لگی۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے اپنی تالیف ارمغانِ حالی کے فاضلانہ مقدمے کی ابتدائی سطور میں اس طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ جوہرِ قابل کے ظہور کے اسباب اس کے معاشرتی و معاشی ماحول میں بھی ہوتے ہیں۔ اور اس کی اپنی ذات کے اندر بھی مشکل یہ ہے کہ ذاتی کمالات اور اثراتِ ماحول کی باہمی ترکیب کے لئے کوئی غیر متغیر اور مستقل نسبت مقرر نہیں ہوتی بعض مشاہیرِ ادب کے نسبتاً پُر اسرار کارناموں میں حالاتِ گرد و پیش اس طرح ملفوف ہو کر آتے ہیں کہ ان پر خواہ مخواہ فتوحاتِ غیب کا گمان ہوتا ہے۔"

اور حالی کے معاملے میں سرسید کے اثر و نفوذ کو بھی انہی فتوحاتِ غیب کا غالب عنصر سمجھا جاتا ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے یہ بات جزواً صحیح ہے کاملاً ہرگز نہیں۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں حالی نے خود لکھا ہے۔

"میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ اور میرے والد نے (۴۸ برس کی عمر میں) سنِ کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا ـــــ اس لئے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بہن بھائیوں کے سوا کسی کو نہ پایا ـــــ انہوں نے اوّل مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقعہ نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد تھے۔ اور بوجہ تعلقِ زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہوا۔ انہی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم جو لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے۔ ان سے صرف و نحو پڑھی۔"

جس شخص کی ابتدائی تعلیم و تربیت اس انداز سے ہوئی ہو کہ سب سے پہلے اسے قرآن مجید حفظ کرایا گیا ہو پھر اسے جیّد عالموں سے فارسی اور عربی کی کچھ کتابیں پڑھنے کا موقع ملا ہو اس کے ذہن و قلب کا حیاتیاتی تقاضے کے مطابق ایک خاص مذہبی سانچے میں ڈھل جانا کوئی غیر ممکن واقعہ نہیں ہے۔

یہ تعلیمی دَور پانی پت کا تھا۔ اور جب حالی گھر سے بھاگ کر دہلی آئے تو وہاں بھی انہوں نے مولوی نوازش علی سے، جو وہاں کے ایک مشہور واعظ و مدرس تھے، صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔

شاعری میں انہیں مرزا غالب سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا مگر ان کے نظریۂ شاعری پر غالب سے زیادہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اثر ڈالا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

"مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے۔ اور واقعات و حقائق کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا، اس کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔"

آگے چل کر جب انہیں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک ایسی اسامی مل گئی جس میں وہ تراجم کی زبان درست کرتے تھے۔ تو اس کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کرنل ہالرائڈ نے مولوی محمد حسین آزاد کے تعاون سے انجمنِ پنجاب کے زیرِ اہتمام ۱۸۷۴ء میں ایک ایسے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جہاں بجائے مصرعِ طرح کے کسی مضمون کا عنوان دیا جاتا تھا۔ اور شاعر اس مضمون پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ اس تحریک نے حالی کے اصلاحی رجحان کو مزید تقویت دی۔ نتیجتاً وہ اُردو ادب کی بعض روایات کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔

حالی نے جس ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی اس وقت قوم کی حالت کیا تھی۔ اس حالت کا ذکر انہوں نے اپنے 'مسدس' کے دیباچے میں یوں کیا ہے۔

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ غافل اور بے پروا ہیں۔ علماء جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے ع،
زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے۔"

اور حالی جو پہلو میں دلِ دردمند لے کر آئے تھے اور جن کا نظریہ تھا۔

چیست انسانی؟ تپیدن از تپِ ہمسائیگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن

کیونکر خاموش تماشائی بن کر بیٹھ سکتے تھے۔ ان سے جو کچھ بن آیا انہوں نے کیا۔ وہ ایک صاحبِ قلم تھے۔ جس چیز پر قدرت رکھتے تھے وہ ان کا قلم تھا اور اسی سے انہوں نے وہ کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔

حالی کی کارگاہِ تگ و تاز یا تو تقریر ہو سکتی تھی یا تحریر اور ان دونوں میدانوں میں ان کی جدوجہد تادمِ واپسیں جاری رہی۔ انہوں نے مختلف تقریبات میں گاہے بگاہے جو تقریریں کیں ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ اپنی ہر تقریر میں انہوں نے قوم کی زبوں حالی کا رونا رویا ہے اور اصلاحِ احوال پر زور دیا ہے۔ مثلاً ندوۃ العلماء کے اجلاسِ اوّل منعقدہ ۱۸۹۴ء کے لئے جو تقریر تیار کی تھی۔ اس میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا تھا۔

مدارسِ اسلامیہ جو ہندوستان کے اکثر قصبوں اور شہروں میں عالی ہمت مسلمانوں کی کوشش سے قائم ہوئے ہیں۔ جس طرح ان کا قائم کرنا ضروری تھا۔ اسی طرح یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ان کو جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید اور ان کی موجودہ حالت کے زیادہ مطابق بنانے کی کوشش کی جائے۔ اور سب سے مقدم ان کے سلسلۂ کتبِ درسیہ کی اصلاح اور ترمیم ہے۔"

یہ تھے ان کے خیالات درس گاہوں اور اس زمانے کے نصابِ مروّجہ کے بارے میں اور یہ تقریر انہوں نے آج سے کم و بیش ۸۲ برس پیشتر کی تھی۔ میں نے ابھی ابھی ان کی تقریر کا جو اقتباس دیا ہے وہ آج بھی ہماری قومی زندگی کے ایک نہایت ضروری پہلو کی اہمیت واضح کر رہا ہے۔ آج بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ نصابِ مدارس کو قومی نظریے اور قومی اُمنگوں کے مطابق بنایا

جائے ورنہ طالب علموں کی ذہنی و روحانی تربیت اس انداز سے نہیں ہو سکے گی، جس انداز سے اسے ہونا چاہیے۔

ایک تقریر انہوں نے اپنے قصبے یعنی پانی پت کے باشندوں کے اجتماع میں کی تھی اور اس تقریر میں انہوں نے معاشرتی خرابیوں کا تفصیلاً ذکر کرکے انہیں دور کرنے کی نصیحت کی ہے اور واضح طور پر بتایا ہے کہ جب تک ان خرابیوں سے قوم کو نجات نہیں ملے گی، قومی ادبار ختم نہیں ہوگا۔

۱۹۰۷ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اکیسواں اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ صدر حالی تھے۔ اپنے صدارتی خطبے میں انہوں نے بڑی طویل اور پُر مغز تقریر کی تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے اولاً تو کانفرنس کے تعلیمی مقاصد پر روشنی ڈالی تھی۔ مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے وجوہ بیان کئے تھے، سندھ کے اندر حصولِ تعلیم کے سلسلے میں مسلمانوں کو جو مشکلات پیش آتی رہتی تھیں، ان کو سلسلہ وار بیان کیا تھا اور صنعت و حرفت کی تعلیم پر بطورِ خاص زور دیا تھا اور آخر میں کہا تھا۔

"بہر حال مسلمانوں کی ترقی کے لئے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ وہ تعلیم کے ہر شعبے میں دست گاہ حاصل کریں۔ اور اس دوڑ میں جس میں ان کے ہم وطن ان سے بہت آگے نکل گئے ہیں جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں۔"

اور اس کے بعد ان الفاظ میں تنبیہہ کی ہے۔

"ورنہ وہ زمانہ قریب ہے کہ ان کو نہ صرف اپنی عزت اور توقیر سے بلکہ اپنی بقا اور اپنی ہستی سے بھی ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑے گا۔"

حالی نے اپنی ان تقریروں میں خود کو اصلاحِ احوال کے صرف ایک گوشے، ایک پہلو یا ایک جہت تک محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے اصلاحِ رسوم پر بھی زور دیا ہے، اصلاحِ اخلاق پر بھی، تعلیمی اصلاح پر بھی حصولِ علم پر بھی، تجارت پر بھی، صنعت و حرفت پر بھی، سائنسی علوم و فنون کے اکتساب پر بھی۔ ان کی ساری اصلاحی کوششوں کا مرکز یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان قومی سطح پر متحد ہو کر زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھیں اور اگر اپنے ہم وطنوں سے آگے نہیں بڑھ سکتے تو کم از کم ایسا تو ہو کہ ان کے قدم ان سے پیچھے نہ رہیں۔ ان تقریروں میں واعظانہ رنگ کا غالب رہنا ضروری امر ہے۔ لیکن حالی نے جہاں اپنے سامعین سے اصلاحِ احوال کے لئے دردمندانہ اپیلیں کی ہیں اور انہیں بار بار نصیحت کی ہے۔ وہاں شگفتگیِ گفتار کے بھی پھول کھلائے ہیں۔ کہیں کسی دلچسپ واقعے کا ذکر کر دیا ہے۔ کہیں خوبصورت الفاظ جڑ دیتے ہیں اور بیشتر مواقع پر اشعار سنا کر تقریر کی خشکی دور کی ہے۔

اُن کی اِن اصلاحی مساعی نے تقریروں کے علاوہ نظم کی صورت بھی اختیار کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جتنی اصلاحی نظمیں حالی کے کلام میں ہیں۔ اُردو کے کسی بھی شاعر کے ہاں نہیں مل سکتیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے نظر مولانا کی شہرۂ آفاق شعری تصنیف مسدس یا مدو جزرِ اسلام پر پڑتی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس کے متعلق ان کے دیرینہ سال پیر نے کہا تھا کہ "قیامت کے روز جب خدائے تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ ہمارے واسطے کیا لایا۔ تو میں کہوں گا مسدسِ حالی۔ مسدس کی معلمانہ شان سے نہ کبھی پہلے انکار ممکن ہوا ہے اور نہ اب ہو سکتا ہے۔ حریفوں نے گو میدانِ پانی پت کی طرح انہیں پامال کرنے کی کوشش کی مگر حالی کی یہ شان ہے کہ وہ مسدس کا آفتاب ہاتھ میں لے کر ہمارے ادب کے افق سے اس طرح طلوع ہوئے تھے کہ اس کی شعاعیں قوم کے دلوں کو آج بھی گرما رہی ہیں۔

ان کے مجموعے میں معاشرتی اور اصلاحی نظموں کی تعداد درجنوں کے حساب سے ملتی ہے۔ کچھ نظموں کے عنوانات یہ ہیں۔

پاسِ نیک نامی۔ خود ستائی، سچ کہاں ہے، بے اتفاقی نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام، سخن سازی، قرض لے کر حج کو جانے کی ضرورت، برکتِ اتفاق، علاجِ نفس ان کے ہاں رباعیات کی تعداد ستر کے لگ بھگ ہے۔ یہاں بھی ہر رباعی کا الگ الگ عنوان قائم کیا گیا ہے۔ مثلاً مردہ اور زندہ اقوام کا فرق، قدرِ نعمت، بعدِ زوال، انسان کی عظمت کا راز، قناعت مفقود ہے، قومی خدمت کا صلہ، موجودہ مصائب کی وجہ۔

مسلمانوں کے طبقۂ نسواں کی بے کسی اور بے بسی پر حالی کا دل بُری طرح کڑھتا رہا ہے۔ انہوں نے عورتوں کے دُکھوں کا حال بڑے کرب انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ اس باب میں ایک تو ان کی مکمل نثری تصنیف ہے مجالس النساء کے نام سے پھر دو نظمیں ہیں۔ "مناجاتِ بیوہ" اور "چپ کی داد"۔

اب آیئے ان کی تیسری اصلاحی جہت کی طرف اور یہ جہت مولوطہ ادب سے ہے۔

جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے حالی نے جو اصلاحی کوششیں کی ہیں۔ ان کے نقوش آج بھی روشن ہیں۔

یہ اصلاحی کوششیں نثر میں بھی کی گئی ہیں، اور شاعری میں بھی۔ حالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے نقدِ شعر سے بحث سائنٹفک بنیادوں پر کی ہے اور اس سلسلے میں کچھ ایسے اصول وضع کئے ہیں۔ جو آنے والے نقادانِ فن کے لئے سرچشمۂ فیضان بن گئے ہیں۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں انتقادی اصول کی تشکیل کی گئی ہے۔ شاعری کی اہم اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے شاعری کی افادی حیثیت پر زور دیا گیا ہے۔ مقدمے سے پہلے بیشتر تقاریظ لکھی جاتی تھیں۔ جن میں مبالغہ آرائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ حالی نے اس روش سے الگ ہٹ کر شاعری پر حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا۔ اور اسے وقت کی آواز بنانے کی ترغیب دی۔

حالی نے سوانح نگاری کو شخصیت کے حالاتِ زندگی تک محدود نہیں کیا بلکہ اُردو میں پہلی مرتبہ زیرِ نظر شخصیت کے کارناموں پر تنقید بھی کی۔ حیاتِ سعدی ہو یادگارِ غالب ہو یا حیاتِ جاوید ـــــ ان تینوں میں سیرت نگاری کے پہلو بہ پہلو نقد و نظر کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

حالی کی نثر اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں بڑی سادہ ہے اس نثر میں بے جا تکلفات و تصنعات کا شائبہ تک نہیں۔ حالی زورِ تخیل کی بجائے منطقیانہ دلائل اور سائنسی طبیعت سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے یہاں کسی قسم کی پیچیدہ بیانی نہیں ہے۔ یہاں اظہارِ رائے میں میانہ روی توازن اور اعتدال کو برقرار رکھا گیا ہے۔

یہی زبان آگے چل کر علوم و فنون کی زبان قرار پائی ہے۔ شاعری میں حالی نے بعض روایات سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کی ہے مثلاً ان کے یہاں متصوفانہ مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود کے چکر میں نہیں پڑے خمریات کا ذکر انہوں نے بہت کم کیا ہے۔ ابتذال گوئی سے بہت حد تک پرہیز کیا ہے۔

ان کی غزل کلاسیکی روایتِ تغزل سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود اس سے دامن کشاں ہی نظر آتی ہے۔ غالب اور مومن کے ہاں مسلسل غزل کے کچھ انداز مل جاتے ہیں۔ مگر حالی نے غزل میں خیال کے تسلسل کا خصوصی طور پر خیال رکھا ہے اور موجودہ دور میں یہ انداز خاصا مقبول ہے۔

شاعری میں ان کی ایک اور کوشش کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ کوشش ہے شاعری میں مقامی فضا۔ نظیر اکبرآبادی مقامیت کی جو روایات ساتھ لے کر چلے تھے۔ وہ حالی کے ہاں آکر کچھ اور گہری ہو گئی ہیں۔

آخر میں پھر اسی بات کا تذکرہ کروں گا۔ جس کی طرف اپنے اس مختصر سے مقالے کی ابتدائی سطروں میں اشارہ کیا ہے۔ حالی کو اصلاح کے میدان میں سرسید کا سب سے بڑا معتقد تصور کیا جاتا ہے۔ اور بالعموم کہا جاتا ہے کہ وہ سرسید کے محض ایک سایہ بن کر رہ گئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حالی سرسید سے بہت زیادہ متاثر تھے ـــــ چنانچہ ان کا یہ شعر اسی بات کی علامت ہے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبروجواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بہ یک نگاہے

یہ دل کا معاملہ ہے اور دل کے معاملے میں کون دخل دے سکتا ہے۔ مگر یہ رائے خلافِ حقیقت ہے کہ حالی ہر معاملے میں سرسید کی تقلید اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ حالی نے کئی معاملات میں سرسید سے اختلاف کیا ہے۔ خصوصاً مذہب اور سیاست میں، وہ سرسید کی تمام مذہبی اصلاحات کے قائل نہیں تھے۔ یہی حال ان کا سیاست میں بھی تھا۔ اس موضوع پر ڈاکٹر غلام مصطفٰے صاحب نے اپنی کتاب "حالی کا ذہنی ارتقا" اور ڈاکٹر معین احسن جذبی نے اپنی تصنیف "حالی کا سیاسی شعور" میں مفصل روشنی ڈالی ہے۔ حیاتِ جاوید میں حالی نے اپنے پیر و مرشد سے مذہبی اصلاحات کے معاملے میں جو اختلاف کیا ہے اس کا ذکر واضح طور پر نہیں کیا۔ دبے دبے لفظوں اور ملائمت کے ساتھ کیا ہے اور یہی شیوہ حالی تھا۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

امیر خسرو بحیثیت انسان

فضا میں ہلچل پیدا ہوئی اور حضرت امیر خسروؒ کی آواز آئی ؎

دلا گرت خبری ہست خویش را بشناس
بعشق رَو رہِ تحقیق، نی بعقل و قیاس

اس میں کلام نہیں کہ امیر خسروؒ ایک پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ دنیائے علم و ادب تصوف و معرفت اور موسیقی میں ایسے دیرپا اور عمیق نقوش چھوڑ گئے جو طرح طرح کے رنگ اور روپ میں خاص و عام کو اپنا گرویدہ بناتے رہیں گے۔ اُن کے حالاتِ زندگی اور کلام پر غور کریں تو ہمارے سامنے ایک ایسے انسان کی تصویر کھنچتی چلی جاتی ہے جو محاسن کا حامل ہونے کے باوصف اپنی بعض کمزوریوں سے بھی آگاہ ہے جبھی وہ گویا ہوتے ہیں ؎

گناہم ارچہ کہ فاضلتر از گناہ ِ ہمہ است
اُمیدِ فضلِ خدا ایست اناں ہم افضل

پھر آواز اُبھرتی ہے ؛

ہست چو گفتِ تو گناہی بزرگ
بر گنہِ خویشتن اقرار بہ
ہست بہان بر کرِ بگوئی بصدق
مغفرتِ ایزدِ غفّار بہ

یہی نہیں وہ اس وسیع و عریض کائنات کے خالق کا ذکر مختلف زاویوں سے کرتے ہوئے تھکتے نہیں جس کی عظمت اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے:

سپاس آں کردگاری را کہ شد زامرش جہان پیدا
نہاں از دیدۂ پیدا و درچشمِ نہاں پیدا
زابرِ رحمتِ یزدان پاک بنشیند
غبار ہا کہ درین خاک خاکسار بوَد

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کے بعد وہ سرورِ کائنات آنحضرت صلعم کے حضور گلہائے عقیدت پیش کرتے ہیں ؛

از نعتِ تو ذوق یافت خسرو
زان شد سخنش چنیں مُذوّق

جوہر شناسِ صدق، گوُ، تاراستی بنیدہمہ
کز جوہرِ قرآنست بر گنجینۂ گفتار

امیر خسرو دنیا کے بادشاہوں کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؛

ظِلِّ ملوک سوزدت از آفتابِ حشر
ظلّے طلب کہ بارگہِ مصطفیٰ دھد

آں سو کہ سایہ گیروت از پرِ جبرئیل
نی آنکہ بسایۂ پرِ ہُما دھد
آئینہ ایست شرعِ محمد بروشنی
کو زنگِ ہفت آئینہ را انجلا دھد
شرعِ عشق علاجِ ہر دلِ بیمار می کند
شیرین و تلخشاں کہ زخوف و رجا دھد

عالم کے بارے میں دیکھئے ؛

عالم کسی بوَد کہ بشرعِ عشق عمل کند
فعل از روانیش چو نوید روا دھد

دوسری جگہ عالمِ دین کے لئے خلعت پادشاہاں کو روا نہیں گردانتے ؎

عالمِ دین را از خلعتِ شاہاں چہ شرف
مُصحف آں نیست کہ تعظیم دی از لوحِ لَداست

دل کی بات اس طرح نکلتی ہے ؛

ہستم برین اُمید خوش امروز کان شفیع
فردا بہ بندہ مژدۂ عفوِ خدا دھد

اپنے مُرشد کا یوں ذکر کرتے ہیں جنہوں نے فرمایا تھا کہ اگر مجھ سے حشر کے روز پوچھا جائے گا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو میں خسرو کو پیش کر دوں گا؟ دوسرے موقع پر کہا تھا۔

مروزِ حشر امید دارم کہ مرا بسوزِ سینہ این ترک بچہ بخشند

زہے متابعِ شرعِ محمد آن پیرے

کہ بر محبتِ یزدان بنای فقر نہاد

زآنجا کہ ہست بذلِ تو درباب کہتران

مبذول دار ، درحقِ خسرو عنایتی

ویسے امیر خسروؒ نے ۶۷۱ھ بمطابق ۱۲۷۲ء میں حضرت نظام الدین اولیاؒ سے تجدیدِ بیعت کی ۔ بیعت کے بعد حضرت امیر نے سب نقد و اسباب لٹا دیا ۔ اور اپنے مُرشد کے پاؤں لگ کے بیٹھ گئے ۔ مُرشد نے بارانی اور کلاہِ چہار ترکی عطا کی ۔ اور اپنے مرید پر خاص توجہ دی جود بھی مرید کی شیفتگی اور سوزِ دروں کے معتقد ہوگئے اور یہ رباعی کہی ؎

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست

ملکیتِ ملکِ سخن آن خسرو ، راست

آن خسروِ ماست ناصرِ خسرو نیست

زیرا کہ خدای ناصرِ خسرو ماست

وہ خسرو کو ترک اللہ کہا کرتے تھے ۔ چنانچہ خسرو نے اس خطاب پر اس طرح فخر کیا ہے ؎

بر زبانت چون خطاب بندہ ترک اللہ رفت

دستِ ترک اللہ بگیر و ہم بہ اللہش سپار

زندگی کے آخری چھ ماہ امیر خسروؒ نے اپنے مرشد کے غم و فراق میں گھُل گھُل کر گذار دیئے اور وارفتگی کے عالم میں اپنے مرشد سے جا ملے ۔

خسرو فقر اپنانے کا انجام بتاتے ہیں ؛

آن را کہ فقر بہر صدق و صفا دہد

یزدان سعادتِ دو جہانش جزا دہد

ماہ نو

عشق کی حقیقت دیکھئے ؛

عشق بخت است ولی معرفت آموزِ دل است

سرمۂ سنگ است ولی نور فزای بصر است

سرِ الہٰی بہ تیغ گوئی

رمزِ انا الحق بسرِ دار بہ

روحِ مجنون آید و آموزد آئینہای عشق

شعرِ خسرو گر رقم بر تربتِ مجنون کنم

خسرو کہ ہست سوختہ خام سوزِ عشق

آتش زنش چو پختہ و بریان نمی شود

ضیاء الدین برنی امیر خسرو کے ہم عصر اور دوست تھے انہوں نے لکھا ہے کہ خسرو نے عمر کا بڑا حصہ قیام و صیام اور تعبد و قرآن خوانی میں گذارا ۔ مولانا جامی "نفحات الانس" میں رقم طراز ہیں "گویند کہ چہل سال صومِ دھر داشتہ و گویند کہ بہمراہی شیخ نظام الدینؒ بطریق طی ارض حج گذاردہ است و پنج بار حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم را در خواب دیدہ است" ۔ مولانا جامی مزید لکھتے ہیں "وی را از شرابِ عشق و محبت چاشنی تمام بودہ است چنانچہ در سخنانِ وی ظاہر است و صاحبِ سماع و وجد و حال بودہ است ۔"

امین احمد رازی نے تذکرۂ ہفت اقلیم میں لکھا ہے "امیر خسرو با شغلِ ملازمت و شاعری چہل سال را بصوم گذرانیدہ ، ہر شب یک ختمِ قرآن نمودہ" ۔ صاحب میخانہ (ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی) نے "عارفی صاحبِ رتبہ و عاشقی بلند مرتبہ" تحریر کیا ہے ۔

امیر خسرو بڑے خوش اخلاق اور خوش مزاج تھے ۔ کہتے ہیں ؎

بخلقِ خوب ، بشر از بشر شود ممتاز

ببو شناخت توان ، عنبرِ سیہ ز انفاس

خوش خوئی اور بدخوئی کا تقابل ملاحظہ ہو ؛

بدخو اگر حریر دھد بوریا شمر

خوشخو حریر میدھد ار بوریا دھد

آپ بڑے فیاض تھے مستحقوں کے علاوہ عزیزوں اور دوستوں کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے فرماتے ہیں ؎

شیرم و رنج از پی یاران برم

نی چو سگِ خانہ کہ تنہا خورم

اُن کی نظر میں قناعت کا درجہ یہ ہے ؛

در آفتابِ قناعت بسوز ، گاہِ طمع

گرست سایۂ یزدان زظلِّ او بہراس

انہیں اپنے خاندان سے بھی بڑا لگاؤ تھا ۔ دیباچۂ دیوانِ غرّۃ الکمال میں اپنے والدِ محترم اور نانا جان عماد الملک کا ذکر اثر پذیر انداز میں کرتے ہوئے کہتے ہیں ؛

بیعت از سرم برفت و دلِ من دو نیم ماند

دریای من روان شد و درِّ یتیم ماند

تو ہم آنجا رسیدہ ای بی پای

دیدہ یکدم بہ بند و باز کشای

حضرت امیر کو اپنی والدہ محترمہ سے بے انتہا محبت تھی بڑی عمر میں بھی وہ ماں سے اس والہانہ

انداز سے ملتے تھے جیسے چھوٹے بچے ماں سے
فرطِ محبت کے باعث لپٹ جاتے ہیں۔ اودھ
کی ملازمت صرف اسی وجہ سے چھوڑی کہ والدہ
دلّی میں تھیں اور اُن کو یاد کیا کرتی تھیں۔ اودھ
سے آنے کے بعد والدہ سے ملنے کا حال اس
سرگرمی سے تحریر کیا ہے کہ ایک ایک لفظ سے
محبت و احترام ٹپکتا ہے۔ ایک موقع پر تو یہاں
تک کہہ گئے ہیں کہ ماں کا سینہ بہشت ہے جس
میں دودھ کی دو نہریں جاری ہیں۔

مثنوی "مجنوں و لیلیٰ" کی تالیف کے وقت
یعنی ۶۹۸ھ مطابق ۱۲۹۸ء میں امیر خسروؒ کی
والدہ محترمہ اور اُن کے بھائی حسام الدین وفات
پا گئے۔ اس اندوہناک اور ناقابلِ فراموش
موقع پر آپ نے ایک نہایت پُر درد مرثیہ لکھا
جس کے اشعار خونِ جگر سے رنگین ہیں۔ فرماتے ہیں:

روزی کہ لبِ تو در سخن بود
پندِ تو صلاحِ کارِ من بود
امروز منم بہ مُہر پیوند
خاموشیٔ تو ہمی دہد پند

امیر خسرو کی زندگی میں اُن کے دو لختِ جگر
(محمد اور حاجی) اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کے
بھی سوز سے لبریز مرثیے لکھے۔ علاوہ ازیں امیر کو
اپنی بیٹی کے ساتھ بھی بہت زیادہ اُنسیت
تھی۔ اُس کی خاطر "ہشت بہشت" میں ایک باب
مخصوص کیا ہے۔ جس میں صاحبِ ثروت ہونے
کے باوجود سینے پرونے اور چرخہ کاتنے کی تلقین
کرتے ہیں۔ جس سے محنت و مشقت کی برتری
کا احساس ہوتا ہے۔ کہتے ہیں:

دوک و سوزن گذاشتن نہ فن است
کآلت پردہ پوششِ بدن است
پا بہ داماں، عافیت سر کن
رو بہ دیوار و پشت بر در کن
در تماشای روزنت ہوس است
روزنِ چشمِ سوزنِ تو بس است

دوسری جگہ محنت کی عظمت کو اس طرح
اُجاگر کرتے ہیں:

مرد ہمہ جا بسرِ کار بہ
شخصِ معطّل، خجل و خوار بہ
از تنِ کاہل کہ چو گل، نازکست
خار کشِ سوختہ صد بار بہ

حیا کی حقیقت ملاحظہ فرمائیے:

بشرم دیدہ فرو بند تا توانی دید
جمالِ نیز ایمان کہ در حجابِ حیا است

امیر خسرو تواضع کو اپنانے پر زور دیتے ہوئے
کہہ گئے ہیں:

گرچہ زرِ تو از عدد بود بیش
درویش نواز باش و درویش

تزکیۂ نفس کے بارے میں جسے امیر نے اپنایا
کہتے ہیں:

صفائی روح طلب بر تنِ شکستہ بلرز
کہ بر سفالِ شکستہ کسی ندارد پاس

آپ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ سلطان جلال الدین
فیروز خلجی بادشاہِ وقت نے بادشاہ بننے کے بعد
متعدد مرتبہ حضرت نظام الدینؒ اولیاء کی خدمت
میں حاضر ہونا چاہا مگر اجازت نہ ملی۔ ایک دن
بادشاہ نے امیر خسروؒ سے کہا کہ اب میں بغیر اجازت
ہی حاضر ہو جاؤں گا لیکن حضرت صاحب سے
اس کا ذکر نہ کرنا۔

اس پر امیر خسرو تذبذب کے عالم میں گھر
گئے۔ اگر اطلاع نہیں دیتے تو مرشد کی ناراضگی
کا ڈر ہے اگر سچی بات کہتے ہیں تو بادشاہِ وقت
سے جان کا خطرہ ہے۔ آپ نے اس صورتِ حال
میں سچی بات کہنے اور اُس کے بعد جو افتاد بھی آئے
اُسے برداشت کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت خواجہؒ
کو جب بادشاہ کے پروگرام کا علم ہوا تو فوراً
دہلی سے بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں
اجودھن (پاک پتن ضلع ساہیوال) چلے گئے۔
بادشاہ کو پتہ چلا تو امیر خسروؒ سے معاملہ دریافت
کیا۔ آپ نے صدق دل سے واقعہ بیان کیا اور
کہا کہ بادشاہ کی ناراضگی سے صرف جان کا خوف
تھا اور حضرت خواجہؒ کی ناراضگی میں ایمان کا خطرہ
لاحق تھا۔ اس لئے جان پر ایمان کو فوقیت دی۔
امیر خسروؒ کی زبان سے صدق دل کا اثر سنئے:

محکم از صدق شود باصو کانلا جہد است
قویِ از آب شود نامیہ کاندر شجر است

بصد کوشش کہ در خوابگاہِ تنہائی
ز صدق بہ نبود بہر اُنس، انیس و اناس

ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کے مزاج
کو سراہا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات"
میں چند واقعات درج کئے ہیں۔ جن میں سے ایک
میں مہمان کھانے کے بعد جانے کی بجائے دیر تک
باتوں میں مگن ہیں۔ امیر خسرو بھی موجود ہیں۔ آدھی
رات کی نوبت بجتی ہے تو صاحبِ خانہ پوچھتے

مارچ ۱۹۶۹ء

ہیں کہ خسرو یہ کیا بجا ہے ۔ عرض کی آدھی رات کی نوبت ہے ۔ پوچھا اس میں سے کیا آواز آتی ہے ۔ کہا مجھ میں تو ایسا آتا ہے :

نان کہ خوردی خانہ برو نان کہ خوردی خانہ برو
خانہ برو، خانہ برو، نان کہ خوردی خانہ برو
نہ کہ بدستِ تو کردم خانہ گرو، خانہ برو، خانہ گرو

امیر خسرو خوشیاں مناتے ہوئے شہزادوں کی محفلوں میں موجود رہے ۔ لیکن کیا مجال جو اپنے دامن کو تر ہونے دیا ہو یا صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوں ۔ انہیں طبعاً مدح سرائی بھاتی نہ تھی جس کا اظہار وہ بیٹے کے نام خط میں کرتے ہیں ۔ منظوم نصیحت میں بھی دہراتے ہیں اور اس رباعی میں اسی مضمون کو ادا کرتے ہیں :

از گفتنِ مدح ، دل بمیرد
شعر ار چہ تر و فصیح باشد
گردد ز نفس چراغ مردہ
گر خود نفسِ مسیح باشد

بسا اوقات وہ زندگی کی تلخیوں کے باعث غمناک ہوتے ہیں ۔ مگر بُردباری کے سبب وہ قنوطیت کو قریب آنے نہیں دیتے اور کہتے ہیں ؎

شبِ ہجراں دراز است ارچہ خسرو
مشو غمگین کہ اُمیدِ سحر ہست

وہ غیر مسلموں کی بعض رسوم اور بعض اعتقادات پر حرف گیری کرتے ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کی شکایات کو دور ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں جو اُن کی وسیع القلبی کا ثبوت ہے ۔

کبھی وہ اپنے کسی گروہ کا ذکر کرتے ہوئے اُسے ہدفِ تنقید بناتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے ، وقتی طور پر وہ گروہ انہیں ایذا رسانی کا باعث بنا ہو ۔ میں تو سات سو سال گزرنے کے بعد آج اُن کا یہ شعر اُن واقعات کے جواب میں پیش کرتا ہوں ؎

گرچہ کہ خسرو سخنت گوہر است
خاموشیت از ہمہ گفتار بہ

قاری کے ذہن کے اُفق پر اُن کا یہ شعر بھی اُبھرتا ہے جو انہوں نے 'دیباچۂ غرۃ الکمال' میں اپنے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

بدہم از انصافِ خویش، اینجا تمام
ناتمام ناتمام ناتمام

امیر خسرو کے بہت سے دوست تھے جو اُن کے دُکھ درد میں شریک ہوتے رہے اور وہ ہمیشہ اُن کے شکر گزار رہے ۔ برعکس اس کے اُن کے کئی مدِ مقابل بھی تھے ۔ بعض نے انہیں اچھا خاصا ستایا مگر انہوں نے پرواہ نہ کی اور اُن کے ساتھ اپنا رویہ بہتر ہی رکھا ؎

شیریِ خورد ولی از جانِ خویشتن
موسیٰ کہ بوسہ بردھنِ اژدہا دھد

عمل کی دُنیا میں وہ چمکتے جھکتے رہے اُس کا مقام اس طرح صفحۂ قرطاس پر رقم ہوا ہے ۔

بعلم کوش ولا آول آنگہی بعمل
کہ از برای عمل علم شد بلند محل
نمازِ صوفیِ بی دانش آنچنان باشد
کہ بی فتیلہ و روغن فروزشِ مشعل

الغرض حضرت امیر خسروؒ اللہ اور اُس کے رسول ہادئ برحق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت اور عقیدت اپنانے کے لئے ، فنا فی الشیخ ہوئے ۔ اپنے اندر اچھے انسان کی متعدد خوبیاں پیدا کیں جن کا اظہار کیا جا چکا اور پھر سات صدیاں گزرنے کے باوجود انہوں نے بنی نوعِ انسان کو ایک ایسا پیغام دیا جو موجودہ دور میں بھی دلوں کو سرگرمِ عمل رکھنے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے ۔ فرماتے ہیں ؎

کسی کہ از ازلش عونِ غیب ، یار بوَد
ہمیشہ کوششِ او در صلاحِ کار بوَد

شہزاد منظر

آئزک باشے وس سنگر

سویڈش اکیڈیمی نے ۱۹۷۸ء کا ادب کا نوبل انعام یہودی نژاد امریکی مصنف آئزک سنگر کو عطا کیا ہے۔ آئزک سنگر نواں امریکی مصنف ہے۔ جسے یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۷۶ء سال کے لئے بھی ادب کا نوبل انعام ایک امریکی مصنف سال بیلو کو حاصل ہوا تھا۔ ابھی تک جن امریکی ادیبوں کو ادب کا نوبل انعام حاصل ہونے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ ان میں پرل ایس بک، یوجین اونیل، ولیم فوکنر، جون اسٹین بیک اور آرنسٹ ہیمنگوے وغیرہ شامل ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جن امریکی مصنفوں کو ادب کا نوبل انعام حاصل ہوا ہے۔ ان میں بعض ایسے ادیب بھی ہیں۔ جنہیں ادبیاتِ عالم میں زیادہ نمایاں مقام حاصل نہیں ہے اور ان کی شہرت اور مقبولیت بہت حد تک مقامی ہے۔ اس کے باوجود انہیں ادب کا نوبل انعام حاصل ہوا۔ اور دوسرے کئی اہم، مقبول اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیبوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نوبل انعام کسی مصنف کی عظمت کو جانچنے کا معیار نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں بہت سے ایسے مصنف موجود ہیں۔ جو ادبیاتِ عالم میں یہ انعام حاصل کرنے والے مصنفوں سے کہیں زیادہ بلند مقام رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود سویڈش اکیڈیمی نے انہیں قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب دنیا میں نوبل انعام کی وہ وقعت اور اہمیت نہیں رہی جو آج سے ربع صدی قبل تھی۔ آج سے پچیس تیس سال قبل تک ادب کے اس بین الاقوامی انعام کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ اس وقت تک آج کی طرح اس انعام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوتے تھے۔ اس دَور میں بھی طالسطائی، چیخوف، جیمز جوئس گورکی اور گالزوردی وغیرہ مصنفوں کو نوبل انعام نہیں ملا۔ اس کے باوجود کسی کو سویڈش اکیڈیمی کی غیر جانب داری کے بارے میں شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے سویڈش اکیڈیمی نے یکے بعد دیگرے بعض ایسے لوگوں کو ادب اور امن کے انعامات دیئے کہ اس کی غیر جانب داری کے بارے میں شکوک پیدا ہوگئے۔

سویڈش اکیڈیمی کی افریشائی ادیبوں سے بے اعتنائی اور تعصب کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب سے نوبل انعامات کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا ہے آج تک صرف دو ایشیائی مصنفوں کو نوبل انعام کے قابل تصور کیا گیا۔ ان میں ایک رابندر ناتھ ٹیگور اور دوسرے جاپانی ناول نویس کاوا باتا ہیں۔ حالانکہ اس ایشیا میں خلیل جبران، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، لُو ہسون بھی تھے۔ اور علامہ اقبال اور لن یوتانگ بھی لیکن سویڈش اکیڈیمی کو یورپ کے چھوٹے سے چھوٹے ملک کی چھوٹی سے چھوٹی زبان کا قطعی غیر معروف مصنف تو نوبل انعام دیئے جانے کے قابل سمجھا گیا۔ لیکن ایشیا و افریقہ میں کوئی پائے کا مصنف نظر نہیں آیا۔ تاہم جب بھی ادب کے نوبل انعام دیئے جانے کا اعلان ہوتا ہے۔ تو لوگوں کی توجہ اس مصنف کی جانب مبذول ہو جاتی ہے۔ اور لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس سال ادب کا نوبل انعام جس مصنف کو ملا ہے، وہ کون ہے اور اس کا ادبیاتِ عالم میں کیا مقام ہے؟ چنانچہ اس سال جب امریکی مصنف آئزک سنگر کو انعام دیئے جانے کا اعلان ہوا تو لوگوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ آئزک سنگر کون ہے اور امریکی ادب میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

آئزک باشے وس سنگر ان امریکی مصنفوں میں سے نہیں جن کی شہرت امریکہ سے باہر بہت زیادہ ہو جیسا کہ اونیل، فوکنر، ہیمنگوے۔ اسٹین بیک، کیوستے اور اپڈائیک وغیرہ۔ وہ امریکہ کے باہر سال بیلو سے بھی کم معروف ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دنیا کے مشہور مصنفین کے بارے میں حوالے کی کتاب "ٹوینٹی ایتھ سنچری اوتھرز" میں اس کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی ہے۔ ان کی نیم گمنامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ انگریزی

کے ادیب کل معنف نہیں بلکہ (YIDDISH) زبان کا مصنف ہے جو مشرقی یورپ کے یہودیوں کے درمیان بولی جانے والی ایک محدود زبان ہے۔

اس سے قبل کہ میں قارئین سے آئزک سنگر کو متعارف کراؤں، اس زبان کے بارے میں مختصراً عرض کرتا چلوں، جس کا وہ ادیب کل معنف ہے اور جس کے بارے میں قارئین زیادہ معلومات نہیں رکھتے۔ یدش (YIDDISH) جرمن زبان کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب "یہودی" ہے۔ یہ اس زبان کا نام بھی ہے جو مشرقی یورپ کے یہودی بولتے ہیں۔ خصوصاً وہ یہودی جو مشرقی یورپ کے مختلف ملکوں سے ترکِ وطن کر کے امریکہ آگئے ہیں۔ یہ ان یہودیوں کی اولاد ہیں۔ جو قرونِ وسطیٰ کے جرمنی میں آباد تھے۔ اس زبان میں بہت سے عبرانی (HEBREW) اور آرامیک (ARAMAIC) کے الفاظ شامل ہیں۔ یہ زبان جدید جرمن زبان سے قطعی مختلف ہے۔ یدش زبان میں ان تمام زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ جہاں یہودی صدیوں سے آباد تھے۔ یدش زبان میں اس وقت سب سے زیادہ الفاظ، امریکہ میں عوام الناس کے درمیان بولی جانے والی زبان کے شامل ہیں۔ اس زبان کے لئے عبرانی رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے۔

عبرانی زبان، یہودیوں میں صرف عالم و فاضل طبقہ کی زبان ہے جبکہ یدش، عام یہودیوں کی زبان، چنانچہ یہودی ادیبوں نے اسی زبان کو ادبی اظہار کے لئے منتخب کیا ہے۔ یدش زبان میں پندرھویں صدی سے انیسویں صدی کے درمیان لوک ادب نے بڑی ترقی کی ہے۔ لیکن انیسویں صدی سے قبل اس زبان میں تحریری ادب کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ جدید یدش زبان و ادب کا "بابا" SHOLEM JAKOB ABRAMOVICH

مایو فر

ہے۔ جس کے بعد اس زبان میں کئی بڑے تخلیقی ادیب پیدا ہوئے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں سے ترکِ وطن کر کے امریکہ آنے والے یہودیوں نے یدش زبان و ادب کو بے حد ترقی دی ہے اور اس زبان میں ادب و صحافت نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ ۱۸۹۷ء میں ابراہام کاہن نے "ڈیلی فارورڈ" کے نام سے پہلے یدش روزنامہ کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد کئی یدش اخبارات و جرائد شائع ہوئے۔ پہلی جنگِ عظیم سے قبل یدش زبان و ثقافت کا سب سے بڑا مرکز مشرقی یورپ تھا۔ لیکن پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران یدش کلچر کا سب سے اہم مرکز امریکہ بن گیا۔ انقلابِ روس کے بعد یدش کلچر کو اشتراکی روس میں کافی فروغ ہوا اور وہاں اس زبان کے بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے۔ آج یدش زبان عبرانی کی طرح ایک ترقی یافتہ زبان بن چکی ہے اور اس وقت دنیا میں اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران مشرقی یورپ میں آباد یہودیوں کی بربادی اور روس میں یدش زبان کے چلن کے باعث اس کے بولنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے۔ اسی لئے بعض ماہرینِ لسانیات کا خیال ہے کہ یدش، ایک انحطاط پذیر زبان ہے۔ ایک وقت آئے گا، جب یہ زبان ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہودی اس زبان کو زندہ رکھنے اور اسے ترقی دینے کی حتی المقدور کوشش کر رہے ہیں۔ اور امریکہ، اسرائیل، جنوبی امریکہ (خصوصاً ارجنٹائن) جنوبی افریقہ، آسٹریلیا اور انگلینڈ میں اس زبان کے احیا کی زور و شور سے کوششیں جاری ہیں۔ یدش زبان کے تحفظ اور ترقی کے لئے ایک اکیڈمی اور انسٹیٹیوٹ آف جوئش ریسرچ بھی قائم کی گئی ہے۔

آئزک سنگر ۱۴ جولائی ۱۹۰۴ء کو پولینڈ کے قصبہ RAVHZYMIN میں پیدا ہوا۔ اس کے والد یہودی راہب (یعنی RABBI تھے) پولینڈ کا یہ حصہ روس کے زیرِ تسلط تھا۔ وہ جب چار سال کا تھا کہ اس کے والدین اپنا آبائی گاؤں ترک کر کے وارسا چلے گئے۔ جہاں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور یہیں سے اس نے عبرانی زبان میں ڈی لٹ کیا۔ وہ اپنے بڑے بھائی اسرائیل جوزیف سنگر کی شخصیت اور علمیت سے بہت متاثر تھا۔ جو خود یدش زبان کا بہت مشہور ادیب تھا۔ آئزک سنگر نے پولینڈ کے قیام کے دوران ہی افسانہ نگاری اور ناول نویسی شروع کی۔ ابتدا میں اس نے عبرانی میں اور پھر یدش زبان میں کئی کتابیں لکھیں جو پولینڈ میں ہی شائع ہوئیں۔ ۱۹۲۵ء میں وہ اپنے بھائی اسرائیل سنگر کے پاس امریکہ آگیا اور نیویارک میں قیام پذیر ہوا۔ اسرائیل سنگر پہلے ہی یدش روزنامہ جوئش ڈیلی فارورڈ" سے وابستہ تھا۔ آئزک بھی اسی اخبار سے وابستہ ہو گیا۔ اور اس میں آزادانہ طور پر افسانے مقالات اور ادبی کتابوں پر تبصرے لکھتا رہا۔ آج بہ سال گزر جانے کے بعد بھی آئزک اس اخبار کے لئے مضامین لکھ رہا ہے۔ اس کا پہلا ناول THE FAMILY MOSKAT اسی روزنامہ میں بالاقساط شائع ہوا۔ یہ ناول ہفتہ میں دو دن شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ ناول اس اخبار میں تین سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ وہ اس دور کے بارے میں لکھتا ہے۔ "اس زمانے میں اگر کوئی شخص مجھے فی ہفتہ ۱۵ ڈالر معاوضہ بھی دیتا تو میں کام کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ابتدا میں میں مالی طور پر بے حد پریشان تھا۔" تقریباً بیس سال تک اپنی دوسری بیوی آلما پر انحصار کرتا رہا۔ جو مین ہٹن کے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں سیلز کلرک تھی۔ ۱۹۴۴ء میں جب اس کے بھائی اسرائیل سنگر کا انتقال ہوا تو اس وقت تک آئزک سنگر ادیب کی حیثیت سے

تسلیم کیا جا چکا تھا۔ لیکن اس کی شہرت اور مقبولیت صرف یدش زبان تک محدود تھی۔

یہ بات بے حد دلچسپ ہے کہ آئزک سنگر کے پیش نظر شہرت کا حصول کبھی بھی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی ثابت قدمی کے ساتھ افسانے یا ناول نہیں لکھتا ہے۔ اس کے بہترین افسانے اور ناول بھی اتفاقیہ تخلیق ہیں اور پھر وہ ایک ایسی زبان کا مصنف ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ وہ ۴۶ سال تک اپنی کتاب کی اشاعت کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد اس ناول کا پہلا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ جس نے اسے دنیا کے ممتاز مصنفوں کی صف میں شامل کر دیا۔ آئزک سنگر بنیادی طور پر یدش زبان کا مصنف ہے اور وہ ہمیشہ یدش زبان میں ہی لکھتا رہا۔ البتہ اس کے دوست احباب اور عقیدت مند اس کے ناولوں اور افسانوں کے ترجمے کرتے رہے۔ اس دور میں جس نوجوان ناول نویس نے اس کے ناول "گمپیل دی فول" (GIMPEL THE FOOL) کا انگریزی ترجمہ لیا۔ وہ آج کا نوبل انعام یافتہ مصنف سال بیلو تھا۔

آئزک سنگر نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ "میں کبھی بھی اپنی کتاب کے ترجمہ کے لئے آمادہ نہ تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں یدش زبان کے بجائے انگریزی زبان کے ادیب کی حیثیت سے پہچانا جاؤں۔"

آئزک سنگر کو نوبل انعام ملنے سے قبل کئی دوسرے انعامات حاصل ہو چکے ہیں۔ مثلاً اسے ۱۹۵۰ء میں (LARAMED PRIZE) حاصل ہوا۔ ۶۳ء میں اسے (DAROFF PRIZE) ملا۔ ۱۹۰۰ء میں اسے "نیشنل بک ایوارڈز" حاصل ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں ہی اسے "جوئش اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنس" کا فیلو مقرر کیا گیا۔ انہیں جن دوسرے اداروں کا رکن منتخب کیا گیا۔ ان میں "نیشنل انسٹیٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرز" "پولش انسٹیٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سائنس اِن امریکہ" "امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنس" اور "نیویارک سٹی پی۔ای۔این" شامل ہیں۔

آئزک سنگر نے ۱۹۶۱ء میں مرتی ہوئی زبان کے دفاع میں کہا کہ "میں بھوت کے بارے میں افسانے لکھنا پسند کرتا ہوں اور بھوت کے بارے میں کہانیاں ایک مرتی ہوئی زبان میں ہی زیادہ بہتر طور پر لکھی جا سکتی ہیں۔ بھوت کو یدش زبان پسند ہے اور جہاں تک میرے خیال کا تعلق ہے۔ بھوت اسی زبان میں بات کرتا ہے مجھے یقین ہے کہ حشر کے روز جب لاکھوں کی تعداد میں یدش زبان بولنے والے اپنی قبروں سے اٹھیں گے۔ تو وہ سب سے پہلا سوال یہ کریں گے کہ کیا یدش زبان میں کوئی ایسی نئی کتاب شائع ہوئی ہے جو پڑھی جا سکے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آئزک سنگر کے ناولوں اور افسانوں کا زیادہ تر موضوع بھوت ہوتا ہے۔ سنگر کا تو یہاں تک دعویٰ ہے کہ وہ بھوت کے وجود کو ثابت کر سکتا ہے۔ سنگر ایک راسخ العقیدہ شخص ہے اور خدا کے وجود پر یقین رکھتا ہے۔ لیکن وہ قدیم روایات اور دقیانوسی خیالات اور کٹرپن کا سخت مخالف ہے۔ اس نے بھی اپنے بڑے بھائی اسرائیل سنگر کی طرح ریڈیکل راہ اختیار کی ہے۔ آئزک سنگر کے افسانے پلاٹ کے لحاظ سے بے حد پیچیدہ اور پُرلطف ہوتے ہیں۔ اور ان میں جنسی معاملات کا بہت کھل کر تذکرہ ہوتا ہے۔ آئزک سنگر کا کہنا ہے کہ مجھے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جنسی معاملات کا تذکرہ کرتے ہوئے کبھی شرم محسوس نہیں ہوئی۔

آئزک سنگر اگرچہ انگریزی بڑی روانی سے بولتا ہے لیکن وہ صرف اپنی مادری زبان یدش میں ہی لکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "لکھتے وقت اسے یدش زبان میں جو توانائی محسوس ہوتی ہے وہ کسی دوسری زبان میں محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی عمر جب پچاس سال تھی۔ اس وقت تک وہ آٹھ ناولوں، بچوں کے لئے دس کتابوں، چار یادداشتوں اور لاتعداد افسانوں کا مصنف بن چکا تھا۔ اس کے افسانوں اور ناولوں کے موضوعات زیادہ تر انجیلِ مقدس اور جوئش کبالا (JEWISH CABALA) کی پُراسرار تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ اور اس نے طالسطائی اور چیخوف سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہے۔ ان تمام باتوں نے مل کر آئزک سنگر کو "۲۰ویں صدی کا عظیم مصنف" بنا دیا ہے۔ وہ نوبل انعام پانے والا واحد ناول نویس ہے۔ جس نے اپنے بارے میں کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اسے جب ٹیلی فون پہ پہلی بار نوبل انعام ملنے کی اطلاع ملی تو اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے سمجھا کہ اس کے نام کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا کسی نے مذاق کیا ہے۔ لیکن اسے جب بتایا گیا کہ یہ حقیقت ہے کہ اسے ہی نوبل انعام ملا ہے تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

آج جبکہ وہ ادب کے نوبل انعام پانے کے بعد عالمگیر شہرت کا مالک بن چکا ہے۔ وہ نہ اپنی زندگی کے طرز کو بدلنے کے لئے آمادہ ہے اور نہ اپنی طرزِ نگارش کو۔ اس کا کہنا ہے کہ "ہر چیز حسبِ سابق رہے گی۔ وہی ٹائپ رائٹر، وہی بیوی، وہی گھر، وہی ٹیلی فون، وہی ٹیلیفون کا نمبر اور وہی زبان (یدش زبان)۔ میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے یہ اعزاز، یہ شہرت اور عزت بخشی۔ میں سویڈش اکیڈمی کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا۔ اس کے ساتھ میں ہر افسانہ، ہر خیال، "ہر لفظ" "مرہون کے لئے خدا کا شکر گزار ہوں۔"

مارچ ۱۹۷۹ء

حمید سندھی

سندھی صحافت کی کہانی

"حافظ خیر محمد صاحب سکھر سندھ کے ایک کہنہ مشق صحافی، عالم و فاضل، بلند پایہ شاعر اور عظیم نقاد ہیں۔ انہوں نے سندھ کی سیاست کے نشیب و فراز کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی یادداشت عطیۂ الٰہی سے کم نہیں۔ جو بھی واقعہ یا قابلِ غور مرحلہ ان کے سامنے ہوا، وکیمرہ کی طرح ان کے حافظے پر نقش ہو گیا۔ اس طرح اب یہ اپنے دور کا ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا ہیں۔

ان دنوں میں بھی جو دیانتدار قلمکار ملک میں موجود ہیں۔ ان میں سے بھی محترم اوحدی صاحب انتہائی دیانتدارانہ مقام رکھتے ہیں۔ لیکن اب پیرسنی کی اس حد کو پہنچ چکے ہیں۔ جہاں پہنچ کر، ہر انسان، لکھائی پڑھائی کے جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے آرام و سکون کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔

اس قدر ذہین، ایماندار، تجربہ کار اور اپنے دور کو عقابی نظر سے دیکھنے والے لوگ اب سندھ میں گنے چنے رہ گئے ہیں اس لئے یہ وقت ہے کہ ایسے لوگوں کی یادداشتوں کو کتابی صورت دی جائے۔ اور جس چیز میں مہارت رکھتے ہیں اس سے ادب میں اضافہ کیا جائے تاکہ ادب کا دائرہ وسیع ہو اور مستند و معیاری چیزیں تخلیق ہوں۔

اس خیال کے پیشِ نظر پہلے اوحدی صاحب کو عرض کیا۔ پھر اپیل کی اور آخرکار اصرار کیا گیا کہ وہ کچھ تحریر کریں۔ تاکہ سندھی صحافت کی ایک مستند اور جامع تاریخ مرتب کرنے میں آسانی ہو۔

اس سلسلہ میں اوحدی صاحب نے ایک مختصر مگر جامع مضمون، محترم میمن عبدالمجید سندھی صاحب کو ارسال کیا۔ جس کا اُردو ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔"

اس مختصر سے مضمون میں سندھی صحافت کی ابتدائی تاریخ اور ارتقاء کے ہر پہلو کو معہ مکمل تفصیلات کے علمی دنیا کے سامنے پیش کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ کیونکہ اس سلسلہ میں نہ کوئی مستند تاریخ موجود ہے، اور نہ کوئی مربوط اور مسلسل یادداشت، اور تو اور، صرف اپریل ۱۹۲۷ء سے لے کر اگست ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصہ کے اخبارات کا ریکارڈ بھی موجود نہیں ہے۔ جو کہ ملک کی خود مختاری کا دور تھا، اور سندھ کی سیاست کا ہنگامی اور طوفانی زمانہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ، ان تمام اخبارات کا ریکارڈ بھی ملنا مشکل ہے۔ جو کہ تقسیم ہند کے بعد زندہ رہے، اور کافی عرصہ بعد میں انقلاباتِ زمانہ کا شکار بنے، یا جن کا اجراء تقسیم ہند کے بعد ہوا اور مختصر سی عمر میں ہی بند کر دیئے گئے۔

تاریخ کا تسلسل برقرار رکھنے کی خاطر ابتدائی ادوار کے چند اخباروں کے صرف نام تو گنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کے اجراء اور بند ہونے کے اوقات اور اسباب، بتانا ممکن نہیں۔ اس طرح نہ ان کی پالیسی، پروگرام اور نصب العین کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کی جا سکتی ہے اور نہ ہی ان کا علمی، ادبی اور صحافتی معیار متعین کیا جا سکتا ہے۔ چند ایک اخباروں کے تو نام سن کر ہی، ان کے

اشاعتی مقاصد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور بعض اخباروں کے متعلق فقط قیاس آرائی کی جا سکتی ہے، لیکن مستند تحریر کی عدم موجودگی کے باعث، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

"انہوں نے اپنے اصولوں سے کہاں تک انصاف کیا ۔۔۔؟ اصولوں کا پاس کیا، یا محض، انتخابی اعلانات کی طرح، ان کو ردی کی ٹوکری کے سپرد کر دیا؟"

درمیانی دور کے اخباروں کو بھی تقریباً اسی قسم کی دشواریوں کا سامنا تھا۔ جو کہ ہماری پیدائش سے قبل شائع ہوئے تھے۔ اور ہمارے سن بلوغت کو پہنچنے سے قبل ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ ان حالات میں اس موضوع پر قلم اٹھانے والا شخص، یا تو ذاتی معلومات پر ہی بھروسہ کرے گا، یا پھر، صحافتی تاریخ کے نام پر کوئی افسانہ تراشے گا۔

اوّل الذکر نکتے کے پیش نظر، قلمکار کی معلومات محض اپنے دور تک محدود ہوں گی، جو کہ صحیح اور قابل اعتماد تو ہو سکتی ہیں، مگر وہ جامع نہیں کہی جا سکتیں اور آخر الذکر یعنی "تاریخی افسانہ"، جو کہ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہوگا۔ اس کو اگر افسانہ نہ گردانا جائے، تو بھی، معیاری مقام دینے کے قابل نہیں ہوگا۔

۱۹۵۴ء میں مسٹر کریم بخش خالد نے "سندھی صحافت" نامی ایک کتاب تصنیف کی تھی، جو کہ اس موضوع پر سندھی زبان کی اوّلین کتاب تھی۔ لیکن وہ بھی نامکمل اور غیر مستند ثابت ہوئی، میری ناقص رائے میں، اس کی وجوہات بھی وہی ہیں جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔

گذشتہ دور کے ریکارڈ کی غیر موجودگی کے سبب سندھ کو کئی نقصانات بھی برداشت کرنے پڑے ہیں۔

پہلا نقصان یہ کہ "آج تک سندھی صحافت کی کوئی جامع اور مستند تاریخ مرتب نہیں کی جا سکی۔ دوسرا نقصان یہ ہوا ہے کہ حقائق آنکھوں سے اوجھل ہونے کی وجہ سے گذشتہ زمانے کی غلطیوں کے مرتکب سیاستدان قیام پاکستان سے قبل کی تاریخ کو مسخ کر کے، سندھ کی نئی نسل اور باہر سے آئے ہوئے غیر سندھیوں کے سامنے اپنے آپ کو پاک دامن ثابت کرنے اور یہ باور کرانے کی کوششوں میں مصروف ہیں کہ "سندھ محض ان کی وجہ سے تحریک آزادی میں شریک ہوا تھا۔ اور حصول پاکستان کی جدوجہد میں ان کا ہی بہت بڑا ہاتھ تھا۔" حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ معلوم نہیں کہ گذشتہ دور کے صحافیوں نے اپنے ریکارڈ کی حفاظت میں کوتاہی برتنے کے باعث جس غفلت شعاری کا ثبوت دیا ہے، اس سے دیگر کیا نتائج نکلیں گے، لیکن اس کے باوجود اس سلسلہ میں جو تاریخی مواد ہم تک پہنچا ہے وہ بھی غنیمت ہے۔ کیونکہ "بالکل نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔"

صحافت کے لغوی معنی چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اصطلاحاً یہ لفظ موجودہ دور میں "اخبار نویسی" کے مفہوم میں مروّج ہو چکا ہے، اس لئے جب ہم صحافت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تو ہماری مراد، اخبار نویسی ہی ہوتی ہے، یہ لفظ زبان پر آتے ہی ہماری توجہ، ان اخبارات و رسائل کی طرف چلی جاتی ہے، جو کہ عوام کو تازہ خبروں اور کسی عقابی نظر رکھنے والے کہنہ مشق صحافی کی رائے سے، مطلع کرنے کا غیر سرکاری ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اخبار اور رسائل ان صلاحیتوں سے محروم ہوں اور بعض میں یہ خصائل بدرجۂ اتم موجود ہوں

لیکن تمام اخباروں وغیرہ کے لئے مجموعی تاثر یہی ہے۔

مطلق العنان حکومتوں کے دور میں، شاہی فرمانوں درباری حالات اور دار الخلافہ کے خاص خاص واقعات پر مشتمل "وقائع" سرکاری گزٹ کے طور پر بڑے بڑے لوگوں اور امیروں کو بھیجے جاتے تھے۔ ان سے قطع نظر سندھ میں اخبار نویسی کی ابتداء ۱۸۴۴ء میں، اس انگریزی اخبار سے ہوئی ہے، جو کہ سرکاری اخبار تھا مذکورہ "سندھ اینڈ ٹائیمز" نامی ہفتہ وار اخبار کی پالیسی زیادہ تر برطانوی شہنشاہیت کے مفادات کا تحفظ کرتا تھا۔

اس اخبار سے تقریباً دس سال بعد یعنی ۱۸۵۴ء میں کسی انگریزی صحافی نے جو "سندھین" (SINDHIAN) نامی اخبار جاری کیا تھا، اس کو بھی غیر جانبدار ہونے کے باوجود، نیم سرکاری اخبار کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ان ہی ایام میں یکے بعد دیگرے کراچی اور سکھر سندھ سے فارسی زبان میں دو ہفتہ وار اخبار "مفرح القلوب" اور "خورشید" نکلنے شروع ہوئے جو نہ صرف سندھ میں بلکہ ہندوستان، افغانستان اور ایران میں بھی لوگ، کثرت سے خرید کر بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ لیکن مواد کے لحاظ سے یہ اخبار، عوام کے ترجمان ہونے کی بجائے امیروں اور رئیسوں کے قصیدہ خوان اور فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والے چند علماء کے لئے ذریعۂ تسکین طبع تھے۔

مذکورہ اخباروں سے بارہ سال بعد، یعنی ۱۸۶۶ء میں سندھ گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم نے "سندھ سدھار" نامی ایک پندرہ روزہ رسالہ شائع کیا، جس کا مقصد لوگوں میں حصول تعلیم کے لئے دلچسپی پیدا کرنا تھا۔ لیکن اچھے اور قابل ایڈیٹر نصیب ہونے کی وجہ سے رسالے کا معیار

بہت اونچا ہوگیا۔ غالباً یہ سندھی زبان کا پہلا صحیفہ تھا، جو کہ سرزمین سندھ سے اشاعت پذیر ہوا۔

۱۸۸۱ء میں کراچی سے ایک ہی شخص کے زیر ادارت دو اخبار ایک سندھی زبان میں اور دوسرا فارسی زبان میں جاری ہوئے۔ فارسی زبان کے اخبار کا نام "اکلیل" اور سندھی زبان میں شائع ہونے والے اخبار کا نام "معین الاسلام" تھا۔

۱۸۸۹ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی کی طرف سے ہفتہ وار "معاون" کا اجراء ہوا۔ جس کا مقصد مسلمانانِ سندھ کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں ایک ہندو انجمن "سندھ سبھا" کی طرف سے "سرسوتی" نامی ماہوار رسالہ جاری کیا گیا، جس کے ایڈیٹر اُس دور کے نامور صحافی، سادھو ہیرانند تھے۔

۱۸۹۵ء میں سکھر سندھ سے "الحق" جاری ہوا، جو کہ ۱۹۰۱ء میں وہاں سے حیدرآباد منتقل ہوگیا۔ اس اخبار کو (مرحوم) محمد ہاشم مخلص اور (مرحوم) شمس الدین بلبل جیسے اپنے وقت کے بہت بڑے شعراء اور نثر نگار بطور ایڈیٹر کے نصیب ہوئے۔ یہ اخبار کافی عرصہ زندہ رہا اور خوب شہرت حاصل کی۔

اسی سال سکھر سے ایک اور اخبار "آفتابِ سندھ" نامی شائع ہونا شروع ہوا۔ جس کی ادارت کے فرائض بھی شمس الدین 'بلبل' ہی ادا کرتے تھے۔ انہی دنوں میں "الہلال" اخبار بھی نکلنا شروع ہوا، جس کا تذکرہ (مرحوم) شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کے فارسی دیوان میں موجود ہے اور مرحوم مرزا صاحب کے چند اشعار بھی موجود ہیں۔ جو کہ مذکورہ اخبار کی تعریف میں ہیں۔ لاڑکانہ بھی اس سلسلہ میں پیچھے نہیں رہا یہاں سے جن دنوں 'خیر خواہ' جاری تھا

ان ہی دنوں حیدرآباد سے 'مسافر' نامی اخبار بھی نکلتا تھا۔ پھر ۱۸۹۹ء میں "پربھات" کے نام سے بھی ایک اخبار جاری ہوا اور اسی زمانے میں ایک شخص نے عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں "جوت" نامی ہفتہ وار جاری کیا۔ یہ شخص ہندو مذہب چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہوا تھا۔ یہ ہفتہ وار ۱۹۴۲ء تک زندہ رہا۔

انہی ایام میں سکھر کے "ویرومل بیگراج" نے "سندھی" کے نام سے ایک ہفتہ وار شروع کیا۔ یہ اخبار کافی عرصہ بلاناغہ شائع ہوتا رہا اور ہندوؤں میں بہت ہی ہردلعزیز سمجھا جاتا تھا۔ اخبار کی پالیسی کے طفیل ہی "ویرومل" سندھ میں ہندوؤں کا لیڈر بنا، اور "سندھ ہندو مہاسبھا" کا صدر منتخب ہوا۔ اسی طرح ہندوؤں کے سناتنی طبقے نے بھی ۱۹۰۱ء میں کراچی سندھ سے ماہوار رسالہ بنام "سناتن دھرم پرچارک پتر" جاری کیا۔ جس کے دو سال بعد، یعنی ۱۹۰۲ء میں محکمہ تعلیم نے ماہوار "تعلیم" نکالنا شروع کیا۔

۱۹۰۴ء میں (مرحوم) محمد ہاشم مخلص نے ایک ماہوار رسالہ "تحفۂ احباب" شائع کیا، جس کے ایک سال بعد ایک ہندو صحافی نے ہفتہ وار "ماتا" شائع کیا۔ تقسیم بنگال کے متعلق آخر الذکر اخبار کی پالیسی، حکومت کے خلاف تھی، اس لئے یہ رسالہ حکومت پر زبردست قسم کی تنقید کرتا تھا اسی مخالفت کے باعث بند کر دیا گیا۔ لیکن اسی مدیر نے "صدائے سندھ" نامی ایک دوسرا اخبار شروع کیا۔ جو کہ سابقہ اخبار سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اس اخبار کا صرف ایک ہی پرچہ نکل سکا اور پھر سرکار کے زیرِ عتاب آگیا۔

۱۹۰۶ء میں تحصیل ٹنڈو محمد خان[1] کے نامور عالم، ادیب اور "حدیقۂ اسدیہ" کے مصنف سید اسد اللہ شاہ نے حیدرآباد سے ایک ماہوار رسالہ "بہارِ اخلاق" جاری کیا، ۱۹۰۹ء میں (مرحوم) محمد ہاشم مخلص نے حیدرآباد سے ہی "جعفر زٹلی" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ شائع کیا۔ پھر دوسرا رسالہ بھی (مرحوم) مخلص نے "پھکول" نامی شائع کیا۔ یہ دونوں رسائل مزاحیہ مواد مہیا کرتے تھے۔

۱۹۱۲ء میں (مرحوم) حکیم فتح محمد سیوہانی نے "الاسلام" کے نام سے ایک مذہبی رسالہ شائع کیا تو دوسرے سال کسی ہندو صحافی نے "سندھ واسی" نامی ایک روزنامہ نکالنا شروع کیا۔ اس اخبار سے کوئی دو سال بعد ایک اور ہندو صحافی نے حیدرآباد سندھ سے ایک ہفتہ وار اخبار "ہندو" نامی جاری کیا جو کہ بعد میں سہ روزہ اور پھر روزنامہ بنا اور ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد سے منتقل ہو کر کراچی سے نکلنا شروع ہوا۔ اس اخبار کا قیامِ پاکستان سے کوئی ایک سال پہلے نام بدل کر "ہندوستان" رکھ دیا گیا تھا۔ اسی نام سے آج تک زندہ ہے اور بمبئی سے شائع ہوتا رہتا ہے۔ مذکورہ ہندو اخبار ابتداء میں تو سندھ پراونشل کانگریس کمیٹی کا سرکاری ترجمان تھا، لیکن بعد میں فرقہ پرستی اور مسلم دشمنی میں مہاسبھائی اخباروں سے بھی دو قدم آگے نکل گیا۔ سندھ کے ہندو لیڈر، مسلمانانِ سندھ کے خلاف اسی اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر سازشیں تیار کرتے تھے۔

سندھ اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر کانگریس اسمبلی پارٹی اور ہندو انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ممبران آدھی آدھی رات تک اسی دفتر میں مل بیٹھتے، اور مسلم وزارتوں کے خلاف صلاح و مشورے میں مشغول رہتے تھے۔ اگر اگلے دن سندھ اسمبلی کے سامنے مسلم مفاد سے متعلق کوئی بل پیش ہونا ہوتا تو اس کے اہم ترین فقروں میں ایسی ترامیم

---

[1] تحصیل ٹنڈو محمد خان، ضلع حیدرآباد میں ہے اور سندھ کی

یہاں تیار کی جاتی تھیں کہ جن کی وجہ سے مذکورہ بل غیر مفید اور بے اثر ہو کر رہ جاتا تھا۔ مذکورہ اخبار کا ایڈیٹر تو ہیرانند کو چند تھا، لیکن زیادہ تر ادارئیے اس کی بیگم لکھا کرتی تھی۔

۱۹۱۷ء میں حیدرآباد سندھ سے بھی ایک اور ہندو صحافی جیٹھمل پرسرام "ہندواسی" کے نام سے ایک اخبار نکالتے تھے۔ جس کا نام کچھ عرصہ بعد بدل کر "بھارت واسی" رکھ دیا گیا۔ سندھ واسی، ہندواسی اور بھارت واسی کی طرف سے سرکار کی جابرانہ پالیسیوں پر زبردست تنقید ہوا کرتی تھی۔ اس طرح بے باک ہو کر رائے عامہ کی ترجمانی کے فرائض بجالانے کی وجہ سے سندھ میں اس اخبار کو بہت بڑی عزت و شہرت نصیب ہوئی اور دنیائے صحافت میں بھی ممتاز معیار مل گیا۔

اس اخبار کے شروع ہونے سے ایک سال بعد حیدرآباد سے تحریکِ آزادی کے مشہور رہنما اور سندھ کے بے باک سیاسی لیڈر (مرحوم و مغفور) غلام محمد خان بھرگڑی نے "الامین" اخبار جاری کیا۔ جس کے پہلے ایڈیٹر تو (مرحوم) محمد ہاشم مخلص تھے۔ لیکن بعد میں (مرحوم) شیخ عبدالمجید سندھی کو یہ فرائض منصبی سونپ دیئے گئے۔ اس اخبار نے جہادِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور عوام میں بے حد مقبولیت حاصل کی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ خوش قسمتی سے اس اخبار کے مالک اور ایڈیٹر، تحریکِ آزادی کے لئے سراپا خلوص اور سرفروش سپاہی تھے۔ اسی سال مولانا دین محمد وفائی نے محض تبلیغی مقاصد کے لئے ماہوار "الکاشف" شروع کیا اور چار پانچ سال بعد ایک اور رسالہ "توحید" بھی جاری کیا۔ جو ان کی وفات کے بعد بھی کچھ عرصہ تک چلتا رہا۔

ان ہی دنوں میں حیدرآباد سندھ کے ایک اور نامور شاعر، حافظ محمد حیات شاہ نے "الحافظ" نکالنا شروع کیا۔ یہ ایک بلند پائے کا ادبی رسالہ تھا۔ اس رسالہ کی پیدائش کے ایک سال بعد، سر عبداللہ ہارون اور شیخ عبدالمجید سندھی نے کراچی سندھ سے روزنامہ "الوحید" اخبار جاری کیا۔

اسی طرح گذشتہ ایک صدی کے اندر، سندھ سے بے شمار اخبار نکلے۔ جن میں سے بہت سوں نے اس ملک کی آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ مسلمانانِ سندھ میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی، اصلاحِ معاشرہ کے لئے دن رات کام کیا اور آخر کار گردشِ زمانہ کے شکار رہنے۔

آج یہ حال ہے کہ جس طرح پچھلے اخباروں اور رسائل کے کارنامے کسی کو یاد نہیں رہے اور نام بھی ہمارے صفحۂ یادداشت سے مٹ چکے ہیں۔ بالکل اسی طرح "الوحید" بھی آخر کار گردشِ زمانہ کی نذر تو ہوا مگر اس نے سندھ کے سیاسی اور صحافتی افق پر چند ایسے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ جن کو اگر ہم بھلانا چاہیں تو بھی آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے۔ جہاں تک "الوحید" کے نام کا تعلق ہے۔ تو وہ بظاہر مٹ جانے کے باوجود، سندھ کے آسمانِ صحافت پر روز روشن کی طرح ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

"الوحید" تحریکِ خلافت کا ترجمان تھا — اس دور میں اس اخبار نے جہادِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا رائے عامہ کی صحیح طور پر ترجمانی کی اور سیاسی شعور پیدا کرنے میں جو واضح کردار ادا کیا، وہ سندھ میں نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کسی اخبار نے ادا کیا۔

"الوحید" سندھ کے مسلمانوں کے ضمیر کی آواز اور دل کی دھڑکن تھا۔ اسی وجہ سے سندھ کے مسلمان "الوحید" کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور ہر قیمت پر اس کی حفاظت کو اپنا فرض گردانتے تھے۔ کبھی کبھی "الوحید" کو ایسے مشکل ترین مراحل سے گذرنا پڑا، جہاں سے بچ نکلنے کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن سندھیوں نے قومی امانت سمجھ کر اس کو وہاں سے بحفاظت بچا لیا۔

تحریکِ خلافت کے عروج کے ایام میں "الوحید" نے جو شہرت و مقبولیت حاصل کی، اسی کے سہارے پر آخری دنوں تک جیتا رہا۔ ورنہ وہ وقت گذر جانے کے بعد یہ اخبار شروع کا "الوحید" نہیں رہا تھا۔ بعض مرتبہ یہ بھی ہوا کہ اپنی غلط روش کی وجہ سے، سندھ کے لوگ اس سے بیزار ہو گئے، لیکن اس کے گذشتہ دور کی خدمتوں کو یاد کرتے ہوئے اس کا ساتھ نبھاتے رہے۔

"الوحید" کے روحِ رواں اور اوّلین ایڈیٹر سندھ کی مشہور سیاسی شخصیت اور لیڈر شیخ عبدالمجید سندھی تھے۔ لیکن رسمی طور پر اور مصلحتاً، وقتاً فوقتاً اس کی ادارت مختلف مدیروں کے ہاتھوں میں رہی، جن میں قاضی عبدالرحمٰن، قاضی خدا بخش، شیخ عبدالسلام، میر اللہ بخش، نبی بخش مرکی، مولانا دین محمد وفائی، مولانا عبدالغفور سیتائی اور مشتاق احمد انجم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ (آخری دنوں میں جو اس کا ایڈیٹر رہا اس کا نام اس وقت یاد نہیں) وہ شخص کراچی کا ایک نوجوان صحافی تھا اور جب "الوحید" بند ہوا تو اس نے "پی پی آئی" میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسی طرح کچھ اور اہلِ قلم بھی مختلف اوقات میں "الوحید" کے اداریئے لکھتے رہے ہیں، لیکن وہ اصولی طور پر اس کے ادارتی عملہ سے وابستہ نہیں تھے۔

"الوحید" کو ابتدائی دنوں میں ہی تحریکِ خلافت کی حمایت، مسلمانانِ سندھ سے جذباتی وابستگی اور شیخ سندھی،

قاضی عبدالرحمٰن اور بعد میں مولانا دین محمد وفائی جیسے قادر القلم اشخاص نے، اتنے ممتاز مقام تک پہنچایا تھا کہ بعد میں اس شہرت و مقبولیت کو برقرار رکھنے کے لئے کسی اللہ کے قلم کا مرہون منت نہیں رہا۔ بلکہ اس کے برعکس لوگ اس کی مشہوری اور ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ "الوحید" کے محتاج رہے "الوحید" مثل پارس تھا، جو بھی ہاتھ اس کو چھو جاتا، وہ سونا بن جاتا۔

لیکن یہ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ مقبول اور مشہور ہونے کے باوجود اس اخبار کو ۱۹۵۴ء میں زبردستی بند کر دیا گیا۔ ۱۹۴۰۔۴۱ء میں میں (حافظ اوحدی) "اصلاح" ایڈیٹ کرتا تھا۔ تو معلوم ہوا کہ انتظامیہ کی نااہلی اور لاپرواہی کے سبب "الوحید" کی مالی حالات اتنے کمزور ہو چکے ہیں کہ اس کو بند کیا جا رہا ہے، تب میں نے "اصلاح" میں یہ مؤقف اختیار کرتے ہوئے اس عمل کے خلاف احتجاج کیا کہ "الوحید" کسی کی ذاتی ملکیت نہیں، بلکہ اب یہ قوم کی امانت ہے۔ کوئی بھی اس کو بند کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے اس احتجاج اور مؤقف کو سندھ کے عوام نے پسند کیا اور بھرپور تعاون کیا۔ جس کی وجہ سے "الوحید" کی انتظامیہ کو مجبور ہو کر دوبارہ سر عبداللہ ہارون کا تعاون حاصل کرنا پڑا جو کہ "الوحید" کے بانیوں میں سے ایک تھے، مگر بعد میں ان کا تعلق "الوحید" سے باقی نہیں رہا تھا۔

آخرکار سر عبداللہ ہارون نے "الوحید" کی سرپرستی قبول کی اور اس کی ایک لمیٹڈ کمپنی بنائی خود اس کے منیجنگ ڈائریکٹر ہوئے اور شیخ عبدالمجید سندھی کو بورڈ آف ڈائریکٹرس کا چیئرمین بنایا۔ اس طرح "الوحید" مرنے سے بچ گیا۔

"الوحید" کے نئے مالکان نے ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۲ء کے درمیانی عرصہ میں تین بار مجھے (حافظ اوحدی کو) الوحید کے ایڈیٹر بننے کی پیش کش کی۔ لیکن ہر دفعہ "الوحید" کی "مصلحت سازی" میرے اور "الوحید" کے درمیان حائل رہی۔

۱۹۲۳ء میں سکھر سے سہ روزہ "سندھ زمیندار" شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ بڑے سائز کا اخبار تھا۔ اور صفحات کی تعداد بھی معقول تھی۔ ۲۵۔۳۰ سال تک بڑی خوش اسلوبی اور جذبۂ خلوص سے سندھ کے عوام کی سیاسی سماجی اور علمی و ادبی خدمت سرانجام دیتا رہا۔ اس نے بھی اپنے دور میں اچھی شہرت حاصل کی اور دنیائے صحافت میں ایک نمایاں مقام پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے مدیروں میں میرے علاوہ عبدالوہاب، پیر علی محمد راشدی، آغا نظر علی، عبدالغفور سیتاپی اور ڈاکٹر محمد اویس بھی شامل تھے۔

"جنوری کے ماہِ نو کا ٹائیٹل دیکھ کر از حد خوشی ہوئی کتنا اچھا ہوتا کہ اسے صفحہ آخر پر چھاپ دیا جاتا تاکہ محفوظ کرنے میں آسانی ہوتی موجودہ صورتِ حال میں رسالے کے نام کی طباعت نے اس کے صوری حسن کو قدرے ٹھیس پہنچائی ہے اسی طریقے سے آپ نے سابقہ شمارے میں بھی اُستاد اللہ بخش کی تصویر کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا تھا اس کی تلافی کیجئے۔ اس مرتبہ افسانوں کے حصے نے بھی مایوس کیا۔ انور سجاد صاحب کا مختصر ترین افسانہ اپنے دامن میں کسی بھی قسم کی افسانویت کو لئے ہوئے نہیں تھا۔ دیگر تین تراجم کو دیکھ کر یوں گمان ہوتا تھا کہ گویا اُردو میں افسانے لکھنے والوں کا شدید قحط ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اپنے رسالے کو ترجموں کا ذخیرہ بنانے سے گریز کیجئے۔ افسانوں کے ترجمے۔ نظموں کے بے تحاشہ ترجمے ایک مضمون کا ترجمہ۔ اتنے ڈھیر سارے ترجمے۔ خدارا طبعزاد مصنفین پر بھی نگاہ ڈال لیا کیجئے"

اسلم شیخ ——— ملتان

منظر امکانی

کتاب، قاری اور مصنف

آپ تو سب ہی جانتے ہیں کہ کتابیں پڑھنے کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ جس میں کسی حد تک صاحبِ کتاب کی ذاتی تسکین اور شہرت حاصل کرنے کا جذبہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی کتاب کی اشاعت کے بعد اس پر توجہ ہی نہ دی جائے یا اسے پسند نہ کیا جائے تو مصنف صرف ذاتی تسکین سے مطمئن ہو جاتا ہے؟؟ (واضح رہے میرے نزدیک ناپسندیدگی بھی پسندیدگی کا درجہ رکھتی ہے جبکہ عدم توجہ سے میری مراد یہ ہے کہ کسی کتاب کو پڑھ کر کوئی جذبہ نہ ابھرے یا پھر اسے سرسری پڑھا جائے) شاید آپ کو میرا یہ سوال مضحکہ خیز معلوم ہو چونکہ ہمارے سامنے ہر روز کتابیں آتی ہیں لوگ انہیں پڑھتے بھی ہیں۔ اور ان کے بارے میں کوئی رائے بھی قائم کرتے ہیں لہذا ایسی صورت میں اگر کوئی کتاب ناپسندیدگی اور عدم توجہ سے گزرتی ہے۔ تو اسے کل حیثیت تو نہیں دی جا سکتی۔ آخر ہر کتاب کو سب ہی لوگ تو نہیں پڑھتے اور اس کی پسندیدگی ہر حلقے میں بھی ضروری نہیں ہوتی۔ آپ کا یہ اعتراض درست ہی نہیں بلکہ سچائی پر مبنی ہوگا۔ اس کے باوجود میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ میرے خیال میں ایک اہم مسلئہ ہے۔ دراصل یہ سوال میرے ذہن میں اس لئے ابھرا کہ ہمارے یہاں پڑھا لکھا طبقہ گذشتہ پچاس ساٹھ سال پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا ہے اور موجودہ دور میں حصولِ علم میں دشواری بھی نہیں رہی مگر اس کے باوجود کتاب کی اہمیت اس قدر نہیں رہی جیسا کہ ہمیں گذشتہ دور میں محدود وسائل کے بعد بھی نظر آتی ہے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ ادب اور شاعری کسی بھی قوم کی زندگی کا ایک اہم جزو ہوتی ہے مگر ہمارے یہاں بڑے سے بڑے، ادیب اور شاعر کی کتاب بھی پہلی بار ایک ہزار سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر کتاب ان لوگوں کے لئے قابلِ قبول رہتی ہے جو کسی اعتبار سے مصنف کو جانتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اس پر توجہ ہی نہیں دی جاتی اور اگر خود پر قابو پا کر پڑھ بھی لیا جاتا ہے تو بنیادی جذبہ صرف اس کی مخالفت کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس انداز کا مطالعہ نہ پڑھنے کے عمل ہی کی ایک علامت ہے۔

سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ کسی کتاب پر عدم توجہ خود مصنف کے رویے کا نتیجہ ہے کہ وہ معاشرتی زندگی کی ضرورت سے الگ ہو کر سوچتا ہے یا پھر قاری کی بے حسی ہے کہ لکیر کا فقیر ہو کر نئی بات کو قبول ہی نہیں کرتا..... ؟ اس سلسلے میں کسی ایک فریق کو ذمہ دار ٹھہرانے سے قبل ایک حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ کسی بھی کتاب کے پس منظر میں نری ذاتی تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعہ شہرت حاصل کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیئے کہ جو لوگ اپنی تحریر کے بارے میں یہ دعوے کرتے ہیں کہ انہیں شہرت سے سروکار نہیں ہے۔ وہ آپ کو فریب ہی نہیں دیتے بلکہ خود بھی فریب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کسی بھی کتاب کی اشاعت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ اس کے برعکس قاری کا رویہ عجیب ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی تحریر کے انتخاب میں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔ اس کا مقصد تحریر سے آسودگی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ معروف ناموں تک محدود نہیں رہتا بلکہ اپنے ذاتی مذاق سے کسی بھی چیز کو اہم اور غیر اہم قرار دیتا ہے۔ اس صورتِ حال سے پسندیدگی کی مختلف اکائیاں بنی ہیں۔ جس کے کُلی ہونے کا عمل تین درجوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو خود بھی لکھتے ہیں اور ان کے پیشِ نظر دیگر لکھنے والوں کا تجزیہ بھی ہوتا ہے۔ گویا یہ لوگ پڑھنے والوں میں اس اعلیٰ سطح پر ہوتے ہیں۔ جن میں جوہری جیسی صلاحیت ہوتی ہے اور یہ لوگ کسی بھی تحریر میں ذاتی تعلقات اور دوستی کو معیار نہیں بناتے۔ دوسری قسم کے قاری وہ ہوتے ہیں۔ جو لکھتے ہیں مگر یہ صرف ان لوگوں کی تحریروں پر توجہ دیتے ہیں۔ جن سے تعلق اور دوستی ہو۔ اس انداز کے قاری گروہ بندی پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر کبھی انہیں کسی تحریر پر سونچنا بھی پڑتا ہے تو وہ

ان خطوط پر سوچتے ہیں کہ اپنے گروہ سے الگ فنکار کی خرابیاں کیا ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں مَیں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ انہیں کتاب پڑھنے والوں کی صف میں شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ آخری قسم کے قاری ایسے لوگ ہوتے ہیں جو گلوکار مہدی حسن کے حوالے سے فیض اور فراز کو اچھا شاعر سمجھ کر تعریف کرتے ہیں۔ اسی تیسری قسم کے قاری میں ان افراد کو بھی شامل کر لیجیئے جو فیشن پرستی میں پڑھا لکھا ثابت کرنے کے لئے کچھ نام یاد کر کے بقراطیت بگھارتے ہیں۔

اب آپ لکھنے والوں کو بھی تین درجوں میں تقسیم کر لیں۔ پہلی قسم کے فنکاروں میں انہیں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جو تخلیقی عمل کو مسرت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور اس کام میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے اس قسم کی مسرت کے بارے میں کہا تھا کہ یہ سوچنا غلط ہے کہ آسائش ہی مسرت کا سرچشمہ ہے بلکہ مسرت تو گہرے طور پر محسوس کرنے اور سادگی سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے بھی حاصل ہوتی ہے اس تجزیئے میں فرائیڈ کے بیان کو مزید شامل کر لیجئے کہ ذہنی صحت مندی کے لئے لاشعور سے آگاہی ضروری ہے اور تخلیقی عمل لاشعوری کرب کو شعوری سطح پر لانے کا عمل ہے۔ اس جان لیوا عمل سے گزرنا اسی قدر ضروری ہے جیسا کہ زندگی کے لئے ہوا، روشنی اور خوراک اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہے — مارسل پروست نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ لوگ خودکشی کر لیتے ہیں مگر اپنے لاشعور سے نظریں نہیں ملاتے۔ تخلیقی عمل اس قدر مشکل کیوں ہے ؟ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ جس کی یہاں ضرورت نہیں بس یا تنا عرض کرتا چلوں کہ معلوم سے نامعلوم اور نامعلوم سے ایک نئے معلوم کے سفر میں ثابت قدمی کے بعد یہ منزل آتی ہے کہ تسکین اور مسرت کے ساتھ شہرت ملتی ہے اور ایسے فنکار کسی ایک خطے تک محدود نہیں رہتے بلکہ ہر حلقے میں یاد رکھے جاتے ہیں۔ آپ فوراً غالب کا نام اس صف میں سرفہرست شامل کر لیں گے۔ حالانکہ میں ایک معمولی قاری ہونے کے رشتے سے ادب میں گروہ بندی کے عوامل تلاش کرتا ہوں تو غالب اس جذبے کا بنیادی محرک دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کو فراموش کر دیتا ہوں یا سرسید کی اصلاحی تحریک اور علی گڑھ کالج کو موجودہ حالات سے الگ سمجھتا ہوں۔ دراصل غالب کو پہلا آدمی میں نے ہمیشہ ان معنوں میں کہا ہے کہ اس نے ادب کے حوالے سے پانی پت کے حامی کو فتح کیا تھا۔ جبکہ سرسید تحریک نے اسی پانی پت کے میدان سے ایک تہذیب کو شکست دے کر ایک نئی حکومت قائم کی تھی جس سے سید احمد شہید کی تحریک بھی ناکام ہوئی اور شاہ ولی اللہ کے افکار کو فراموش کیا گیا۔

آپ مجھے اجازت دیں تو میں ایک چھوٹی سی مثال سے اپنی بات کی وضاحت کرتا چلوں۔ برصغیر میں لکھنؤ اور دہلی کو ادب میں جس قدر مرکزیت حاصل رہی ہے اس کا اعتراف تدریسی نقطۂ نظر سے تو اہم ہے۔ مگر کیا پروفیسر محمود شیرانی کے علاوہ پنجاب کے جذبۂ علم و عمل پر کہیں لکھا گیا ہے ؟ ! اسی میں یہ سوال مزید شامل کر لیجئے کہ برصغیر کی تہذیب کو ایک نئی صورت دینے میں کون شامل رہا ہے آپ کچھ دیر کیلئے پانی پت کو تاریخی حوالے سے دیکھیں۔ بابر کی کامیابی، مغل اثرات اسی شہر سے داخل ہوئے لیکن اسی مغل بادشاہ نے جس حکمران کے خلاف جنگ کی وہ کون تھا ؛ انسانوں کے سروں کا مینار بنانے والے یہ وحشی لوگ کیا سقوطِ بغداد کرنے والوں کی نسل نہیں تھے ؟ ؟ پانی پت کا دوسرا رُخ بو علی شاہ قلندر سے روشن ہے۔ جن سے تصوف کا سلسلہ چلا۔ مَیں اس لئے تصوف پر گفتگو کر کے اس کے حامیوں سے الجھنا نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ امام ابن تیمیہؒ کی تحریک کو اسی راستے سے نہیں روکا گیا ؟ ؟ ادب اور شاعری کے سلسلے میں اسی پانی پت کے مولانا حالی نے پہلی بار اسے غیر اہم قرار نہیں دیا۔ اور اسی حالی کا رشتہ بیک وقت غالب اور سرسید سے قائم نہیں رہا ؟ ؟ آپ مزید تلاش کرنا ضروری سمجھیں تو بہت کچھ مل سکتا ہے۔ آخر مولوی وحیدالدین سلیم بھی تو اسی پانی پت کے رہنے والے تھے اس اعتبار سے برصغیر کی مکمل تبدیلی اور اس میں نئے شعور کی پیداوار اسی علاقے سے ہوئی۔ مَیں اپنی گواہی میں اس صدی کے معتبر شخص علامہ اقبال کو پیش کر سکتا ہوں جنہوں نے شیخ الاکبر ابن عربی سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور اس خطے کی تہذیب و تمدن کو ختم کرنے والوں میں انگریزوں سے زیادہ پانی پت مزاج کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

معاف کیجئے گا۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ تخلیقی عمل جان لیوا کام ہے اور اس مشکل کام کو کرنے والے آفاقیت کا اعزاز پاتے ہیں۔ جبکہ اس طریقۂ کار سے ذاتی تسکین اور مسرت کا رشتہ ختم نہیں ہوتا بلکہ اسی ذریعہ سے اعلیٰ اقدار قائم ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں دیانتداری سے تجزیہ کرنے کے بعد یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ اپنی تہذیب سے الگ ہو کر ہمارے یہاں اس قد و قامت کے لوگ پیدا نہیں ہوئے۔ البتہ لکھنے والوں کی ایسی نسل ضرور سامنے آئی جنہوں نے کامیابی کے لئے اپنے ناموں میں اپنے علاقوں کا اضافہ کیا اور مختلف حلقوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کی ہمنوائی کی۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کو پہلانگتے ہوئے موجودہ دور تک آئیں تو ہمیں ادب میں کہیں بھی اس قد و قامت کا شخص نہیں ملے گا۔ جس کے سہارے ہم اپنی ہا

اور پہچان کا دعویٰ کرسکیں۔ ادب سے وابستگی رکھنے والوں میں مسلسل اضافہ جاری رہا۔ مگر ان میں نظریہ پرست اور گروہ بندی کے علمبردار ہی ملتے ہیں۔ میں ان اِکّا دُکّا مخلص لوگوں کی کوشش کا منکر نہیں ہوں۔ جنہوں نے اس فضا کے خلاف آواز بلند کی مگر مجموعی شکل میں ہمیں یہی جذبہ ملتا ہے۔ اسی کو میں لکھنے والوں کی اس دوسری صنف میں شمار کرتا ہوں جن کے نزدیک لکھنے کا عمل شہرت کا حصول بھی ہے اور گھُٹے ہوئے جنسی جذبوں کے علاوہ مختلف مسائل جن کی تکمیل پر آخری شکل جمیل الدین عالی بن جاتا ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ادب تسکین اور مسرت کا ذریعہ بھی ہے۔ لہٰذا اس دوسری صف کے لکھنے والے تسکین اور مسرت اسی وقت پاتے ہیں جب انہیں مقصدیت میں کامیابی ہوجاتی ہے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ ان کے نزدیک تسکین اور مسرت نظریۂ حیات کے لگے بندھے خواب کی تکمیل سے ہوتی ہے۔ آپ فتح محمد ملک کی کاوش "تعصبات" پڑھیں یا انور سدید کی "اختلافات" دیکھیں۔ بات ایک ہی ہے بس ناک پکڑنے کا فرق ہے۔ جسے عارف عبدالمتین نے "امکانات" میں پورا کردیا ہے۔ فلسفۂ حیات کے ان علمبرداروں کے بارے میں جیفرسن نے بڑی مزیدار بات کہی ہے کہ " اگر یہ لوگ فلسفۂ حیات کی تبدیلی پر شب و روز کڑھنے کے بجائے روزانہ چھ میل پیدل چل لیا کریں تو انہیں مسرت حاصل ہوسکتی ہے" مگر اس مشورے میں بھی دشوار طلب پہلو یہ ہے کہ محنت کرنا پڑے گی جبکہ ہمارے یہاں ہر شعبۂ زندگی میں آسانی اور راحت کی خواہش محنت کرے بغیر کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں ادب اور شاعری کو بھی معاف نہیں کیا گیا ہے۔ نثری نظم کا چکر بھی اسی جذبے کی پیداوار تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کراچی آکر افتخار جالب بھی اس سے دستبردار ہوگئے۔ جبکہ قمر جمیل کے بارے میں سنا ہے کہ آج کل وہ نثری نظم کے تذکرے پر چڑھ جاتے ہیں۔

خیر چھوڑیئے میں عرض یہ کر رہا تھا کہ لکھنے والوں میں دوسرے فنکار خواہش اور مقصدیت کی تکمیل کے لئے اس طرف آتے ہیں۔ ان میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے اور شہرت حاصل کرنے کا مرض اسی قدر عروج پر ہوتا ہے۔ جیسے "کائنات اور [illegible]" کے مصنف کو فلسفی کہلانے کا عارضہ ہے۔ اس مزاج کے فنکاروں کی خاص پہچان یہ ہے کہ وہ اوّل تو اپنے حلقۂ خاص کے لوگوں پر گفتگو کرتے ہیں اور کبھی کبھار انہیں کسی کی بات سننی پڑے بھی تو دو لفظوں میں فیصلہ کرکے تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ ان کی پسندیدگی دوستی اور تعلق سے گزرتی ہوئی خواہش کی تکمیل تک پہنچ جاتی ہے اور اس کی آخری شکل حاشیہ برداری ہوتی ہے۔ میں کوئی مثال بھی نہ دوں تو آپ خود اندازہ کریں گے کہ ہمارے یہاں ریڈیو اور ٹی وی کے پروڈیوسروں سے لے کر بڑے عہدے داروں تک کے فنکار کتنے معتبر اور شہرت یافتہ تصوّر کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ ایسا بھی ہوا کہ ملازمت سے الگ ہوکر انہیں زیڈ اے بخاری مرحوم سے بھی زیادہ پریشان ہونا پڑا ہے۔ آپ اس مزاج کے فنکاروں کو کچھ دیر کے لئے بھول کر تیسری قسم کے لکھنے والوں کی طرف آیئے تو یہاں آپ کو عجیب و غریب احساس ہوگا۔ یعنی اگر کسی کے خاندان میں کوئی شخص مشہور ہوگیا ہو تو اس کے وارثوں میں اس کے بعد اپنے حق کو استعمال کرنے کا جذبہ شدت سے پائیں گے جبکہ تصوّراتی سطح پر آفاقی فنکار بننے کا مرض بھی اسی انداز کے لوگوں میں ملے گا۔ اسی کے ساتھ برسوں پہلے کی تحریروں کے حوالے سے خود کو فنکار ثابت کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اسی صنف میں ان فیشن پرست لوگوں کو مزید شامل کرلیجئے جو نہ تو کچھ لکھتے ہیں اور نہ آرام سے روٹی کھاتے ہیں بلکہ ادبی انجمن بنا کر نئے لکھنے والوں کو مکڑی کی طرح جال میں جکڑنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایرانی ہوٹلوں سے لے کر کافی ہاؤس تک میں بیٹھ کر فنکار ہونے والے بھی اسی فہرست میں شامل ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک نظر اپنے سفر پر ڈال لیں۔ تاکہ کوئی الجھن نہ پیدا ہو۔

۱۔ تخلیقی عمل کو پرکھنے والے قاری کی حیثیت جوہری جیسی ہوتی ہے۔ وہ تخلیقی عمل میں فنکار کی طرح مسرت اور کرب برداشت کرتا ہے۔

۲۔ دوسری قسم کے قاری تعلق اور دوستی کے حوالے سے پڑھتے اور سوچتے ہیں۔

۳۔ پڑھنے والوں میں آخری قسم کے لوگ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور فیشن پرستی کی بدولت پسندیدگی میں ذاتی سوچ کو استعمال میں نہیں لاتے۔

۴۔ فنکار کے لئے تخلیقی عمل ذاتی تسکین کے حوالے سے اپنی تلاش ہے۔ جس میں انسان، کائنات اور خدا سے رشتے استوار کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔

۵۔ خواہش کی تکمیل کے لئے ہم خیال لوگوں کا گروہ بندی تک پہنچ جانا۔ ان فنکاروں میں تعلق اور دوستی نبھانے کا جذبہ بھی اپنی خواہش کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔

۶۔ فنکار کہلانے کی خواہش اور فیشن پرستی۔ اس صنف کے فنکاروں کے لئے لکھنا ضروری نہیں ہوتا۔

لیجئے مسئلہ حل ہوگیا کہ ہمارے یہاں ادب اور شاعری سے وابستگی رکھنے والے کس قدر ہیں۔ یعنی صرف ایک فی صد افراد سنجیدگی سے پڑھتے ہیں۔ اسی لئے ہر کتاب ابتدا میں ایک ہزار شائع ہوتی ہے۔ دوسرے ایڈیشن کا معاملہ اس گفتگو کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس ڈائجسٹ ہر ماہ

لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں اور ان میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اس کھوکھلے پن کا ذمہ دار کون ہے، فنکار یا قاری....؟؟ میں انتہائی افسوس سے یہ کہوں گا کہ اس گھر کو آگ گھر کے چراغ سے لگی ہے۔ ہمارے فنکار ہی اس کیفیت کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے گروہ بندیاں اور خواہش کی تکمیل کیلئے اس ماحول کو پیدا کیا ہے۔ آپ ذرا ایمانداری سے سوچئے کہ ایک کتاب کی اشاعت پر اس میں کسی پیشہ ور ناقد کا دیباچہ پیش لفظ ہونے کے علاوہ دو چار دوستوں کی سند شامل ہوتی ہے۔ اس کے بعد تبصرے ہوتے ہیں۔ جن میں ہر تبصرہ نگار سرکاری کلرک کی طرح پرانے فائل دیکھ کر لکھتا ہے۔ اب رونمائی کی رسم چلی ہے۔ جس میں ہر مقرر موجودہ کتاب کو آخری کتاب ثابت کرتا ہے۔ اس کے بعد سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب پر کسی دوسری جانب سے لکھا جاتا ہے۔ تو کوشش یہی کی جاتی ہے کہ ہر خرابی اس سے نکالی جائے۔ دیباچہ، تبصرے اور تعریفی مضامین کسی کتاب کے سمجھنے میں آسانی تو ضرور پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کا رویہ دوستی نبھانے اور ذاتی خواہش کی تکمیل سے ملا ہو۔ تو قاری کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ درد سر مول لے۔ وہ ڈائجسٹ پڑھ کر تسکین حاصل کر لیتا ہے۔ قاری کے رویے کی شکایت کرنے والے اگر خود دیانتداری سے کچھ دیر سوچ لیں۔ تو انہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ نرے فنکار ہونے کے علاوہ بھی تخلیقی عمل ممکن ہے اور اس کا زندہ ثبوت مشتاق احمد یوسفی مختار مسعود اور کرنل محمد خاں ہیں۔ جنہوں نے پیشہ ور ادیب نہ ہونے کے باوجود اس منزل کو پا لیا ہے۔ جس کے لئے فرائض زندگی سے غافل کافی ہاؤس میں رات بھر بیٹھنے والے گذشتہ دس سال میں نہیں پا سکے ہیں۔ اگر ہم نے اس سلسلے میں سنجیدگی سے فیصلہ کر لیا تو مجھے امید ہے کہ آئندہ ہمارے یہاں ادب اور شاعری میں اسی قدر وسعت آ جائے گی۔ اور پھر ہم خدا، کائنات اور انسان کے رشتوں کو نظریاتی بن کر حل کرنے کے عذاب سے بچ جائیں گے۔

مجھے آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے ایک عام قاری بن کر جو کچھ محسوس کیا ہے اسے بیان کر دیا ہے اگر آپ تخلیقی عمل کے جان لیوا کام کی صلاحیت نہیں رکھتے تو کم از کم ایک اعلیٰ قاری کے رشتے سے اس مسئلے پر سوچئے آخر قاری ہونا بھی تو بہت بڑی بات ہے۔

"تازہ، ماہِ نو، دیکھا.... رسا چغتائی کا نام آپ کی فہرست میں اتنے پیچھے نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ وہ شخص اپنی بے نیازیوں میں رہتا ہے اس لئے بات یہاں آپ کے سب قارئین کے محسوس کرنے کی ہے.... میرا مقصد آپ کی ادارتی ذمہ داریوں میں کسی کوتاہی کی نشاندہی نہیں ہے بس ایک بات محسوس کی تھی لہٰذا لکھ رہا ہوں۔"

جمال احسانی ——— کراچی

منیر نیازی

غزل

دشت باراں کی ہوا سے پھر ہرا سا ہو گیا
میں فقط خوشبو سے اس کی تازہ دم سا ہو گیا

اس کے ہونے سے ہوا پیدا خیالِ جاں فزا
جیسے اک مردہ زمیں میں باغ پیدا ہو گیا

پھر ہوائے عشق سے آشفتگی خوباں میں ہے
ان دنوں میں حسن بھی آزار جیسا ہو گیا

ہے کہیں محصور شاید وہ حقیقت عہد کی
جس کا رستہ دیکھتے اتنا زمانہ ہو گیا

غم رُبا ہے حال کہنا دل کا اس بت سے منیرؔ
جس کے غم میں اپنے دل کا حال ایسا ہو گیا

ایک منظر

سات کلیاں سنگترے کے پیڑ سے جھڑ کر گریں
صاف، چٹیل گوشۂ گلشن کی ویراں راہ پر

کہنے والی بات میں دیر کی وجہ

یہی اصلِ حقیقت ہے
کہ میری بے رُخی چاہت
ہوئی مثلِ قفس مجھ کو
"مجھے تم سے محبت ہے"
بس اتنی بات کہنے میں
لگے بارہ برس مجھ کو

ایک اُمت کے گزرنے کے بعد کا موسم

وہ عہد جو دُھندلا گیا
اِک چاند جو گہنا گیا
وہ ساتھ اپنے لے گیا
اپنی ردائے دل کشا
رستے دکھاتی روشنی
گہری کشش موجود کی
ہونے کی مستی سے بھرے
رشتے گمان و لمس کے
اب اصل تو باقی نہیں
اس کا یقیں باقی نہیں
اک نقل جیسے اس کی ہے
بے رُوح جیسی کوئی شے
یہ درمیاں کے سلسلے
اُلجھے ہوئے حیرت کدے
ٹوٹی ہوئیں رنگینیاں
بگڑی ہوئیں رعنائیاں
آنے سے پہلے خواب کے
کُھلنے سے پہلے باب کے
بڑھتی ہوئیں بے چینیاں
بڑھتی ہوئیں تنہائیاں

نبّاض

ڈاکٹر وزیر آغا

روگ
باہر کی طرف آئے
تو چہرے پہ لکیریں اس کی
یوں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ ابھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں
میں نے نبّاض سے پوچھا کہ مرے روگ کی صورت کیا ہے؟
(کیسا نبّاض ہے وہ ـــــ بات تو کرتا ہی نہیں
اس کے ہونٹوں پہ ہمکتی ہوئی آیات مگر
اس کے اندر کی کسی شے کا پتہ دیتی ہیں)
انگلیاں اس نے مری نبض پہ رکھ دیں تو معاً
اس کے ہونٹوں پہ ہمکتی ہوئی آیات کا کہرام اُٹھا
اور چہرے کی لکیروں نے دہن کھول دیئے
اس نے کاغذ پہ لکھا: روگ تمہارا یہ ہے!
میں نے کاغذ پہ لکھا: روگ تمہارا بھی تو میرے ہی ازلی روگ کا آئینہ ہے
اور پھر آئینے اک دوسرے کو دیکھ کے حیران ہوئے
اپنے روگوں کے نگہبان ہوئے!

روگ، باہر کی طرف آئے تو چہرے پہ لکیریں اس کی
یوں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ ابھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں
گرم شہروں کی ادھڑتی ہوئی سڑکوں کی طرح
سُرخ مخمل میں چھپے بھُر بھُرے جسموں ایسی
اور ان کھیتوں کے مانند جو اپنے ہی پسینے میں شرابور ـــــ
مکانوں کی غلاظت میں دھنسے اُجلے مکینوں ایسے
نبض پر انگلیاں رکھے میں کھڑا ہوں کب سے
جانتا ہوں کہ اگر میں نے کسی پرزے پہ کچھ لکھا تو وہ
اُسی کاغذ پہ اگل دے گا وہ سب کچھ
جو مرے دکھتے ہوئے جسم کے ہر انگ میں ہے
میرے سینے کے نہاں خانۂ صد رنگ میں ہے
روگ
آواز نہیں ہے کہ اسے گہری لکیروں میں کوئی بند کرے
اور پھر نبض پہ انگلی رکھ کر
اک گھمے نغمے کی میٹھی ہوئی جھنکار سنے
روگ آئینے کی صورت ہے ـــــ اسے کوئی اگر
رو برو لائے تو سو رنگ میں لو دیتا ہے
ورنہ پتھر ہے کہ صدیوں سے پڑا ہے بے حس
زنگ اور دھول کی چادر میں چھپائے خود کو
اپنے اندر کی غلاظت سے سجائے خود کو

حادثہ

بے آواز تھے آنسو اُس کے
چھوٹے چھوٹے پیر تھے اُس کے
تن جیسے روئی کا گالا
رنگ تھا کالا

ندی کنارے تک پیروں کے
سارے نشان سلامت تھے
پار ندی کے کچھ بھی نہیں تھا

پار ندی کے کچھ بھی نہیں ہے
ساری راہیں ندیا کے اندر جاتی ہیں
اور پھر وہیں کی ہو جاتی ہیں
پیر برہنہ ریت کے اوپر پھول کھلا کر
ندی کنارے تک جاتے ہیں
اور پھر پار کہاں جاتے ہیں!

ہر بچے کو
اُڑتی تتلی سرگوشی میں بتلاتی ہے
ماں تیری، ندیا کے اندر
دودھ کا اک مشکیزہ لے کر
تیرا رستہ دیکھ رہی ہے!

کون بتلائے ان بچوں کو
ماں ندی کے اندر کب ہے!
ماں تو خود اک تیز ندی ہے
ماں ـــــ اک دودھ بھری ندی ہے!!

یوسف کامران ۔ انتظار حسین

احمد ندیم قاسمی ۔ قتیل شفائی
اظہر جاوید ۔ محسن احسان ۔ رؤف شیخ

منصور حسین، احسن شاہ
، صفدر، شکیل احمد جاوید

احمد ہمدانی۔ حبیب جالب۔ احمد فراز جمال احسانی۔ فہمیدہ ریاض

صادقین۔ ڈاکٹر شمل۔ الصاد عبدالعلی
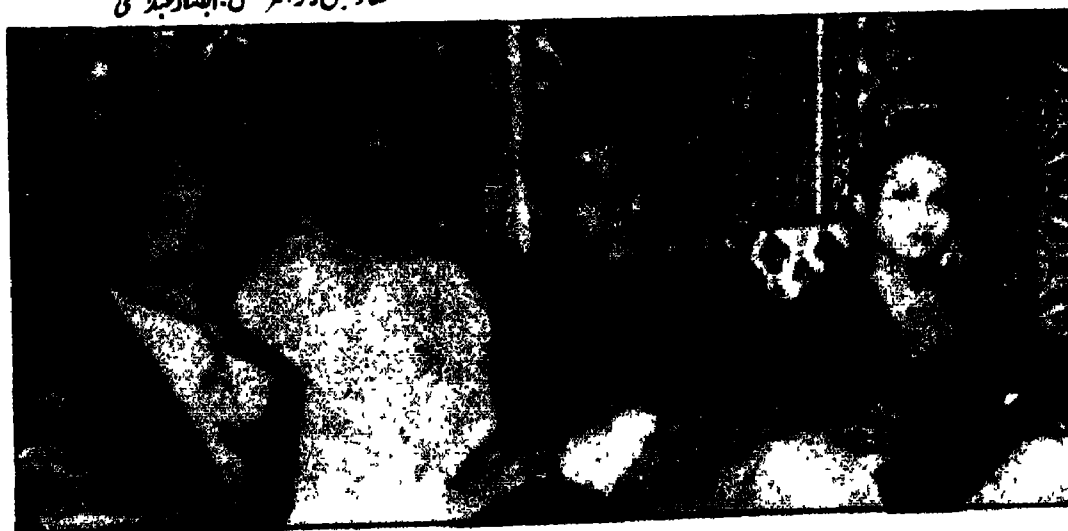
پروین شاکر۔ انیس ناگی
مستنصر تارڑ۔ حسن رضوی
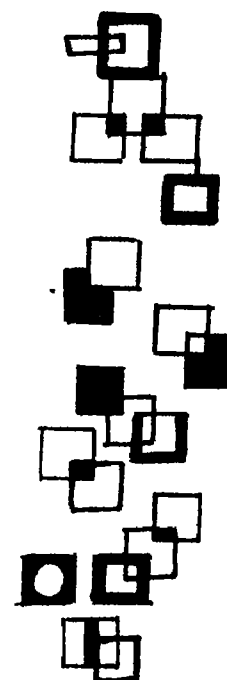
ڈاکٹر وزیر آغا

ازل سے ابد تک!

پرندہ ہوا ہے
ہوا سانس ہے
سانس چھاتی کے پنجرے میں آنے کا
اور لوٹ جانے کا ایک سلسلہ ہے
میں اس سلسلے کے پراسرار سے زیر و بم میں رواں ہوں
مسافت کے دریا میں، موجوں کی زد پر
ہواؤں کی ٹھوکر پہ آیا ہوا ابر کا ایک بجرا ہوں
بجرے کا تنہا مسافر ہوں
دریا کے دونوں کناروں میں سیّال سا رابطہ ہوں
ازل سے ابد کی طرف
اور ابد سے ازل کی طرف بہہ رہا ہوں

زمانوں کے اُجلے مکاتیب پر میرے ہونے کی مہریں لگی ہیں
میں ہر نامۂ معتبر کی جبیں پر کھدا ہوں
دلوں کے کڑے فاصلے میری سچی گواہی نہ ہو تو کبھی ختم ہوتے نہیں ہیں
میں تارِ نظر ہوں، میں یادوں کی برکھا ہوں
بہتے ہوئے چاند کی روشنی ہوں کہ جس میں
سبھی غسل کرنے پہ مجبور ہیں
دوستوں دشمنوں میں مرے دم قدم ہی سے ترسیل کا سلسلہ ہے

میں تارِ نظر ہوں
میں سیّال سا رابطہ ہوں
مقدر میں میرے لکھا ہے کہ میں سانس بن کر
اِک اک تن میں اتروں، اِک اک تن سے باہر کو آؤں
زمانوں کو تازہ لہو کی حرارت مہیا کروں
ہست کو نیست ہونے سے ہر دم بچاؤں
مگر اپنی خاطر کوئی جسم ہرگز نہ مانگوں
کسی ایک منزل پہ رکنے نہ پاؤں

عجب فیصلہ ہے
عجب یہ سزا ہے
ازل اور ابد کی مسافت میں جھونکے کی صورت میں اُڑتا پھروں
اپنی صورت کو ترسا کروں
اپنی تجرید میں خوش رہوں
اور زندہ رہوں
اور زندہ رہوں!!

ایک سیّال سونے کا ساگر

کس نے دیکھا
اک سیّال سونے کا ــــ ساگر!
پتھر دل ساحل سے اپنا پنڈ چھڑاتا
مچل مچل کر گرتا، اٹھتا اور غراتا

کس نے دیکھا
اک سیّال سونے کا ــــ ساگر
تن کی بوڑھی دیواروں سے باہر آتا
بجھے ہوئے تاریک بدن کو
کندن روپ کی شوبھا دے کر
پلکوں کی نوکوں پر رُکتا
گالوں پر سرخی پھیلاتا

کس نے دیکھا
اک سیّال سونے کا ــــ ساگر
سورج کی اکلوتی آنکھ سے ٹپ ٹپ گرتا
سارے جگ پر کرنوں کی برکھا برساتا
جھلمل کرتے پیلے پیلے پھول ہزاروں
ہر پھیلے دامن میں گراتا
ہنستا، روتا، شور مچاتا!!

اصغر ندیم سید

مَیں پوچھوں گا

جو بھی مری تاریخ کی وردی پہن کے اب آئے گا
میں تو اُس سے اس کا پیشہ پوچھوں گا
میں تو اُس سے اپنی زمین پہ اُگنے والے پھلوں کی قیمیں پوچھوں گا
میں تو اس سے پوچھوں گا
کہ کون سے گیت ہماری فصل پکاتے ہیں
اور اُن میں کس کے خون کا سورج اُونچے شعر میں بولتا ہے
جو بھی میرے لفظ کو اپنا غلام بنانے آئے گا
میں اُس کو اپنی کھال اُتار کے دے دوں گا
اور اپنے سارے لفظ ہوا میں اُڑا دوں گا
اور اپنی آنکھیں شہر کے اونچے میناروں پہ نصب کروں گا
جو بھی میرے نام کے لفظ بگاڑے گا
میں اس کی یاد میں رہنے والے سارے اسم بھلا دوں گا
جو بھی دریاؤں کا پانی گدلا کرنے آئے گا
میں اس کے دل میں پھیلاؤ کے سارے رستے تاریکی سے بھر دوں گا
میں اس کے سارے رتبے داغی کر دوں گا

شہر بدر

شام کا پنجرہ میرے جسم پہ گر جاتا ہے
اور میں درجہ دوم کا شہری
دشمن کے اخبار سے پوری دنیا کے لوگوں کی بگڑتی شکلیں دیکھنے لگتا ہوں
اور سورج کی آزادی
میرے جینے کی خواہش کو اپنا دوست بنانے آجاتی ہے
میرے ناشتے کے برتن میں میری محبت کے برسوں کا
سارا ذائقہ بھر جاتا ہے
سگریٹ کے ہر کش میں دریا کھنچ آتے ہیں
اور پرندے اپنی اولادوں کو میرے گیت کا چوگا دیتے ہیں
جب میرے پاؤں ان کے بنائے ضابطوں کی دلدل میں دھنس جاتے ہیں
میری آنکھیں لاکھوں میل مسافت طے کرتی ہیں
میرے بازو ریل کی پٹڑیاں بن کر پھیلتے ہیں
جب میری رگوں میں شاعری خون بناتی ہے
میں شام کا پنجرہ توڑ کے باہر آجاتا ہوں
میرے پاؤں کے سب رشتے اِک دوجے سے جڑ جاتے ہیں
میرے لفظ درختوں کے گنبد میں کبوتر بن کے گھلتے ہیں
میں اپنے سرہانے بیٹھے نرقعا سے کچھ باتیں پوچھنے لگتا ہوں

میرے دن سیراب ہوگئے ہیں

اصغر ندیم سید

میرے دن سیراب ہوئے ہیں
نیندیں گھور سمندر جیسی میری آنکھ سے لپٹی ہیں
صبح کی ساعت آزادوں کا گیت بنی ہے
ساتھ چلی ہے سیاحوں کے رستے پر
میں ایک سوارِ صدا کے رتھ پر بیٹھ کے جاؤں
سورج مکھی کے جلسے میں
بات کروں تہواروں کی
جو میرے وصل کے دروازوں تک آ پہنچے ہیں
میری عمر کے کھلیانوں میں جن کی فصلیں نئے نصاب سے اتری ہیں
بات کروں اس نسبت کی
جو پھول اترتے موسم کی پوشاک میں آئی
تیرے دل میں ۔ میرے دل میں
کیسے اپنی بھاشا سے میں شہد بناؤں
کیسے دودھ کشید کروں ان باتوں سے
جو سب کی جانی بوجھی ہیں
میرے دن سیراب ہوئے ہیں
جیسے سورج اور کبوتر اُچھلتے ہیں اپنے اپنے ڈربوں سے
جیسے پانی بہہ جاتا ہے دریاؤں کے آنگن سے
ایسے ہی میرے دن کیا معلوم
کہاں تک جائیں
کن رشتوں میں جاگنا چاہیں

اَدھوری لڑکی کیلئے ایک نظم

تیرے میرے درمیاں انکار کا پھیلاؤ ہے
انکار بھی اظہار ہی کا آخری چہرہ ہے
جو ذاتوں کا بٹوارہ کرے
یہ آخری مہرہ ہے جو پسپا کرے الفاظ
میرے اور تیرے درمیاں بولے گئے
انکار اِک صحرا ہے جو ہر گمشدہ کا گھونٹ بھر لیتا ہے
اور پھر دھوپ میں ہنستا ہے پاگل کی ہنسی
آواز میں بے صوت ہے
انکار میری موت ہے
ٹھہرو ابھی تو آخری ہچکی میں ہیں وعدے ملن کی ساعتوں کے
شام کی خوشبو ابھی تو آ رہی ہے ڈوبتی ناؤ سے اور ٹوٹے ہوئے پتوار سے
ٹھہرو مرے الفاظ اپنے الوداعی سانس میں کچھ کہہ رہے ہیں
تیرے میرے درمیاں انکار کا پھیلاؤ ہے
اور خامشی کی گونج ہے
اُترے ہوئے دریا ہماری واپسی کے منتظر ہیں
اُن کے اِس جانب مسافت خوف کا پھیلاؤ ہے

شگفتہ پروین

رنگے ہوئے مکان

رنگے ہوئے مکانوں کے لوگ کہاں رہتے ہیں
راہ میں تو کئی راہیں رنگی ہوئی ہیں!
بلکہ کسی اَن دیکھے نے اپنی چالاکی سے بعض جگہ ایک ہی رنگ رنگا ہوا ہے،
آؤ میں تمہیں پہلے بوجھ لوں
بتاؤ تمہارا کونسا رنگ ہے؟
مجھے بھی اَن دیکھے نے کئی رنگوں سے رنگا ہوا ہے ——
اب ذرا کائنات اٹھا کر دیکھ
میں کیسا ہوں ——
میں تو تمہیں بھی کئی رنگوں میں دیکھ رہا ہوں
پھر کیوں تم رنگے ہوئے مکانوں کے لوگوں کا پتہ پوچھ رہے ہو ——
دراصل میں چور ہوں اور میرا کام رنگ چوری کرنا ہے،
تم بھی مجھے خوب ملے! میں رنگ ہوں
اور لوگوں کی کینچلی چوری کرتا ہوں ——
اُن لوگوں کی تلاش میں نکلا اور غاروں کے رنگ چوری کرتا ہوں
تم بتاؤ یار رنگا — میں غاروں کے رنگ چوری کر سکتا ہوں؟
"مجھ سے سچ پوچھو تو سب سے بڑا رنگ چور سورج ہے"
رنگے ہوئے مکانوں تک پہنچتے پہنچتے یہ تمہیں کئی رنگ دکھا جائے گا،
تم نے کتنے رنگ چوری کئے ہیں؟
لو!
شام ہو رہی ہے اور اس نے ہمارے چہرے چوری کرنے شروع کر دیئے ہیں،
تم چھوٹے چور ہو ——
. میں چھوٹا چور نہیں ہوں، ابھی ابھی نیلا رنگ چوری کر کے
آیا ہوں، سمندر میں غوطہ لگایا تو سمندر نے
میرے کپڑوں کا کوئی رنگ نہ چرایا مگر میرے
تھوڑے سے سانس اس نے چوری کر لئے تھے
معلوم ہوتا ہے یہ بھی چور ہے
تم نے کبھی مٹی میں غوطہ لگایا ہے؟
نہ بھلے آدمی ——
مٹی چوری کرنا بڑا مشکل کام ہے ——
مٹی میں اگر میں نے غوطہ لگایا!
اس نے میرے سارے سانس چوری کر لئے ہیں،
پھر یہ بندہ چور چور نہیں رہے گا ——

یار رنگا! تم کینچلی کس طرح چوری کرتے ہو؟

میں ہر وقت دوپہروں میں رہتا ہوں،
تو تمہیں معلوم ہے کہ دوپہروں کی کینچلی کس طرح تبدیل کرتا ہوں
زمینوں پہ میری زرد دھوپ نہ پھیلے تو زمین خود کینچلی بدل لیتی ہے
اور دریا پھر اس زمین سے بھاگتے نظر آتے ہیں
تم رنگ چور ہو اور میں رنگ:
رنگ چور! ہاں رنگ ——
دیکھنا آئینے میں ہماری آنکھیں ایک سی تو نہیں لگ رہیں
تمہارا بیڑہ غرق کبھی ہوا کو بھی شیشہ کہتے ہیں:
دیکھ!!
ہوا تیرے کپڑے بھی پکڑ رہی ہے اور میرے بھی!
کہیں یہ بھی تو چور نہیں؟؟

رنگ چوری کرنے نکلے ہو کہ رنگ ہونے ــــ
دیکھو!
جب سمندر پتھر کی سطح پر آتا ہے سفید ہو جاتا ہے
اور ہوا جب پیڑوں پہ چڑھ ناچتی ہے ہری ہو جاتی ہے
اور آدمی جب روتا ہے نا! آنسوؤں میں ڈوب جاتا ہے ناں ــــ اس وقت
تم آدمی کا کوئی رنگ چوری نہیں کر سکتے ــــ
پوروں کے رنگ چوری کرنے کا کوئی گر بتاؤ؟

جب زور کی ہوائیں چل رہی ہوں اور پوریں سفید ہوں
ناخن پوروں کو کرید رہے ہوں
تم پوروں کے رنگ چوری کر سکتے ہو

آسمان کا رنگ سمندر میں کیسے اترا ــــ
میں رنگ ہوں اور تم رنگ چور:

اتنی باریکیاں میں تمہیں بتا دوں تو خود چوری ہو جاؤں ــــ

اس وقت ہم ایک ہی پتھر پہ بیٹھے ہیں ــــ
تو دیکھو ذرا پتھر کا رنگ دیکھو ــــ
چوری کرو پہلے اس پتھر کا رنگ بھی

اس کو جتنا توڑتا ہوں
ایک ہی رنگ کی آواز دیتا ہے یہ پتھر ــــ
اور رنگ چورہ چورہ ہو جاتا ہے
بلکہ میرا رنگ یہ پتھر چوری کر لیتے ہیں

چلو پانیوں کی طرف چلتے ہیں ــــ
پانی میں خنجر کی تیز دھار چلاتا ہوں
پانی پھر بھی اپنا رنگ نہیں نکالتا ــــ
کہیں یہ بھی روتا ہوا آدمی تو نہیں؟ ــــ

چلو پھولوں کے پاس چلتے ہیں ــ ہاں میں رنگ کہہ رہا ہوں ــــ
پھول توڑتے توڑتے شام پڑ جاتی ہے ــــ
دیکھا!
جو پھول ہم نے دوپہر میں توڑا تھا وہ زرد پڑ گیا ہے!
ٹوٹے پھول کی گفتگو بھی خنجر ہو گئی ہے
مگر جو پھول ہم نے شام میں توڑے تھے
انہیں رات کے اندھیروں نے کالا کر دیا ہے

چلو اب سرنگوں کے رنگ چوری کرتے ہیں
دونوں غار میں چلے جاتے ہیں ــــ

آہستہ آہستہ چلو ہماری آہٹ پا کر کوئی رنگ چھپ نہ جائے
میں رنگ جو تمہارے ساتھ ہوں
غار میں پتھر ٹکراتے ہیں اور آگ لگ جاتی ہے
یہ کیا ہوا ــــ
میں رنگ خود پتھر ہوا کھڑا ہوں

یہ آگ بجھ نہیں سکتی ــــ
آگ بجھ گئی تو تم چور نہیں رہو گے
غار کے اندھیرے روشنیاں چوری کرتے ہیں
یہ خود چور ہوتے ہیں ــــ

مارچ ۱۹۶۹ء

میں نے چوری نہ کی تو میرا گھر بے انگارہ رہ جائے گا!
میری روٹی کا رنگ سفید پڑ جائے گا ——
اور میری بھوک رنگ رنگ پکارے گی ——
مجھے ٹوٹے پھولوں کے پاس لے جائے گی ——
اور پھول جانتے ہیں کہ میں چور ہوں ——

تم کہاں سے چلے تھے ؟
اپنے گھر سے ——
تمہارے مکان کا رنگ کیسا ہے ——

میں نے سمندر کا رنگ چوری کیا تھا تو فرش بنایا تھا ——

آنکھوں کے رنگ چرائے تھے تو دیواریں بنائیں تھیں!
سورج کا رنگ چرایا تھا تو روشندان بنایا تھا ——
بھوک کا رنگ چرایا تھا تو چولہا بنایا تھا ——
چنلی کا رنگ چرایا تھا تو کپڑے سلوائے تھے

جب آگ کا رنگ چوری کیا
تو میری روٹی کچی رہ گئی
تو میں رنگ چوری کرنے گھر سے نکل کھڑا ہوا ——
تو راہ میں تم مجھے مل گئے

یہ تو اپنی کینچلی،
جب تم چاند کا رنگ چوری کر رہے تھے اس وقت چرائی تھی!
یہ لو اپنی کینچلی اور یاد رکھنا
جب آنکھوں کی کینچلی چوری ہو جاتی ہے
تو انساں ایسے ہی رنگ چوری کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے

آج سے نہ تم رنگ چوری کرنا
اور
نہ میں کینچلی چوری کروں گا
نہیں تو پیڑ سانپ بن جائیں گے اور سمندر اُن کی کینچلی
دونوں غار میں سے نکل جاتے ہیں
اور پتھر خاموش ہو جاتے ہیں
دیئے کی لو پھر خلا کو جلانا شروع کر دیتی ہے ——

تخلیق و ترجمہ : پریشان خٹک

گیارہویں برس بعد ـــــ ایک ہل سٹیشن کی رات

یہ وہی کمرہ ہے جہاں گیارہ سال پہلے تو مقیم تھی
اس کمرے میں تیرے ہونٹوں کی سرخی کی تپش آج بھی محسوس ہوتی ہے
یہ وہی دروازہ ہے جہاں میں رات کی تاریکیوں میں آیا کرتا تھا
تمہاری مسکراہٹ مجھ پر اک کیف بےخودی طاری کر دیا کرتی تھی
لوگ چھپے چوری ہماری تاڑ میں لگے رہتے لیکن
میں نشۂ عشق میں چور ان سے بے خبر رہتا
تیری دوسری ہم جنس حسینائیں ہمارے میل ملاپ سے ناخوش تھیں
ان کی گرم آہوں سے شبنم کے موتی پانی بن بن کر پگھلتے
اور جتنی وہ آزردہ خاطر ہوتیں اتنی ہی تو فخر سے بےخود ہو جاتی
ان اُونچے اُونچے پہاڑوں خوبصورت کوہساروں اور بلند و بالا سرو صنوبر
کے درختوں کے جھنڈ میں ـــــ میں تیرے لئے تڑپتا اور بادلوں
کا دل میری حالت پہ بھر آتا۔ میری جوانی تیرے حسن سے قسم لیتی
آہ ! کیا خمار تھا کیا کیفیت تھی
نہ کسی کا ڈر نہ کسی کا کھٹکا
اپنی مرضی اپنی خوشی
لیکن آج ـــ گیارہ سال بعد ـــ جب میں دوبارہ یہاں آیا
تو ماحول اگرچہ وہی ہے پہاڑ وہی ہیں درخت اتنے ہی خوبصورت ہیں
لیکن تو نہیں تو نہ وہ کیف ہے نہ مزہ
نہ وہ رونق ہے نہ دلکشی
نہ میں وہ "میں" ہوں جو تھا نہ تو وہ "تو"

یہ پہاڑ یہ وادی یہ کوہسار یہ درختوں کے جھنڈ یہ حسین نظارے
سب کے سب ـــ ہماری محبت کے قبرستان لگ رہے ہیں
وہ بوڑھا بیرا جو ہمارے رازوں کا امین تھا
وہ بھی آج منوں مٹی کے نیچے آرام کر رہا ہے
جب کبھی تو اپنے مسکراتے سرخ ہونٹوں سے اس کو پیغام دیتی
میں اس کو اپنے سینے سے بےاختیار چمٹا لیتا
آج یہاں دوسرے بیرے بھی ہیں ان سے میری باتیں ہوئیں
ان سب کو تو آج بھی یاد ہے میری اور تیری داستان
آج بھی اُن کے لبوں پر ہے
تو جب تو آج تک ان بیروں کو یاد ہے تو میں بھلا
تجھے کیسے بھلا سکتا ہوں
آج گیارہ برس بعد
تیری یادوں کی بادلت نے مجھے مغموم کر دیا
تجھ سے بچھڑنے کے بعد میں تیرے نقش پا پر
چلتا رہا۔ ہر ہر قدم پر طوفانوں کا
سامنا ہوا۔ مگر ـــ تو نہ ملی !

مسعود ریاض

نامکمل کہانی

"میرا خیال تھا جب یہ کہانی مکمل ہو جائے گی، تب اُسے لکھوں گا، کہانی تو ابھی مکمل نہیں ہوئی، اور جانے کب مکمل ہوگی، ہوگی بھی یا نہیں؟ البتہ مجھ پہ اعصابی حملہ ہو چکا ہے، اور میں ہسپتال میں زیرِ علاج ہوں، ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، میرا بھی یہی خیال ہے، یہ کوئی مہلک مرض بھی تو نہیں ہے، ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ کہانی کو اپنے منطقی انجام تک پہنچنے تک میں ضرور زندہ رہوں گا۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے مجھے پریشان نہیں رہنا چاہئیے یہی میرا علاج ہے، اتنی اہم بات تو میں بھی جانتا ہوں جو گذر چکا ہے، وہ مر چکا ہے، کاش ایسا ہی ہوتا، ماضی کے گھناؤنے واقعات سے پیچھا چھڑانا اگر اتنا ہی آسان ہوتا تو دنیا میں ستر فیصد لوگ پُر سکون ہوتے، ڈاکٹروں کے مشورے بجا ہیں۔ نفسیات کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی درست ہے، ڈیل کارنیگی کی کتاب "پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا سیکھئے" کروڑوں دُکھی انسانوں نے پڑھ رکھی ہے، مگر انسانوں کے دُکھوں میں کہاں کمی ہوئی ہے؟ کسی شاعر نے کہا ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اتنے پٹے ہوئے شعر کی شدت کا احساس کم ہوا ہے، صرف ان لوگوں کو ہو سکتا ہے، جن کے لئے ماضی ایک Night Mare بن گیا ہو، ایک ڈراؤنا خواب، سنتے آئے تھے کہ خواب ہمیشہ سہانے ہوتے ہیں۔

میرے سرہانے لبریم اور ولیم پلز رکھی رہتی ہیں، ان نشہ آور ادویات کے استعمال سے سو جاتا ہوں، عارضی سکون مل جاتا ہے، ورنہ جاگتی زندگی میں پھر سے وہی اذیت دل و دماغ پہ مسلط ہو جاتی ہے اور واقعات جونکیں بن کر میرا خون چوسنے لگتے ہیں۔

میرے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں اور اسی لئے جذبات اور محسوسات میں شدّت پیدا ہو گئی ہے میں نے سوچا مجھے وہ سب کچھ اب کہہ ہی دینا چاہئیے جو ایک عرصے سے بوجھ بنا ہوا ہے، کہانی کے اختتام کا میں آخر کب تک انتظار کر سکتا ہوں؟ میں یہ کہانی اس لئے نہیں لکھ رہا کہ خود رحمی کا شکار ہوں یا کسی شاہکار کہانی کو جنم دینا چاہتا ہوں — میں تو صرف اپنے ذہنی تناؤ اور جذباتی کھچاؤ کو کم کرنا چاہتا ہوں۔

اتنی لمبی تمہید پڑھنے کے بعد عین ممکن ہے کہ آپ اس سے حد درجہ مایوس ہوں، اس لئے کہ یہ نہ تو روایتی محبت کی کہانی ہے اور نہ نصابی اخلاقیات کی — مگر شاید ایسی بات بھی نہیں ہے، میں کوئی نقاد نہیں جو فیصلہ دوں!

ناصر میرا ماتحت تھا، وہ دراز قد، خوش لباس اور مؤثر شخصیت رکھتا تھا، دفتری آداب سے واقف، بات کرنے کا شعور، اور دوسروں پر اثر ڈالنے کا ڈھنگ اسے آتا تھا، اس کا باپ پولیس میں تھانے دار تھا اور دادا، پولیس ہی میں ہیڈ کانسٹیبل ریٹائر ہوا تھا، پہلی نظر میں ناصر نہایت خوشگوار اثر ڈالتا تھا، میں نے ناصر کے اپنے دفتر میں تبدیل ہو کر آنے کی مخالفت کی تھی، ایک تو اس لئے کہ جہاں وہ ملازمت کرتا تھا وہاں اس کی شہرت اچھی نہ تھی، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ جس شخص کو اس کی جگہ تبدیل ہو کر جانا تھا، وہ ایک شریف النفس تجربہ کار اور بڑی لگن سے کام کرنے والا تھا، اور دو سال بعد ریٹائر ہونے والا تھا، اس نے بڑے جتنوں سے تنگیاں ترشیاں، کاٹ کر دو کمروں کا

ایک مکان بنوا لیا تھا، اس کی دو بڑی بیٹیاں بیاہنے کے لائق ہو گئی تھیں۔ اور ان کے رشتے بھی اسی شہر میں طے ہو چکے تھے، باقی تین لڑکے ابھی زیر تعلیم تھے .بیوی ذیابیطس کی مریضہ تھی، ان لوگوں کو جہاں تبادلے کے بعد جانا تھا، وہ ایک دور افتادہ علاقہ تھا، جہاں قابل ڈاکٹر تو در کنار، کوئی چھوٹا سا ہسپتال بھی نہ تھا، ایک معمولی سی ڈسپنسری ضرور تھی، جہاں زکام، معدہ اور ملیریا کے مکسچروں کے علاوہ کوئی دوا نہ ملتی تھی۔

ناصر کو ملازمت کرتے ہوئے ابھی چار برس سے زیادہ نہیں ہوئے تھے اور جس سیٹ پر اسے کام کرنا تھا، وہ ایک نہایت اہم اور Sensitive سیٹ تھی، اسے بطریق احسن چلانے کے لئے بڑے فہم و فراست اور دفتری سوجھ بوجھ کی ضرورت تھی، دفتر میں یہ پوسٹ کلیدی اہمیت رکھتی تھی اور اسے حاصل کرنے کے لئے لوگ بڑی تگ و دو کرتے اور بڑے اونچے لوگوں کی سفارشیں لے کر آتے تھے، یہاں تک کہ حکام بالا بھی اس میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ جتنی یہ پوسٹ کلیدی تھی اتنے ہی اس میں بدنام ہونے کے مواقع بھی تھے، اس بات کا خیال کرتے ہوئے میں نے ناصر کو اس سیٹ پر نہ لگایا، وہ ایک ایسا نوجوان تھا جس کے سامنے روشن مستقبل کے وسیع امکانات موجود تھے، جسے ابھی ترقی کی منازل بڑی احتیاط سے طے کرنا تھیں، اس کا ایک بھی عاجلانہ اور غلط قدم اس پر ترقی کی ساری راہیں مسدود کر سکتا تھا، ایک دو ملاقاتوں میں ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے عزائم بلند ہیں اور مقاصد عظیم، وہ اپنی ساری صلاحیتیں کلرک رہ کر تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے وہ دفتر کے دوسرے لوگوں سے اپنے آپ کو الگ رکھتا تھا، روایتی کلرکوں سے اسے نفرت تھی، اور وہ Amottious تھا، زندگی میں کوئی اعلیٰ منصب حاصل کرنے کی آرزو رکھتا تھا، اس کی یہ خواہش قابل قدر تھی، اور اس کا جذبہ قابل تحسین، چنانچہ میں اسے دفتری غلاظتوں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

مگر ناصر کو میرا یہ فیصلہ پسند نہ آیا، اس سیٹ سے وہ الگ ہونا نہ چاہتا تھا، اس کے جذبۂ انا کو کس قدر ٹھیس لگی تھی، میں نہیں کہہ سکتا، بہر حال وہ میرے پاس احتجاج کرتے آیا، اس کے چہرے پر بے چینی تھی۔ میں نے مشفقانہ انداز میں اسے سمجھانا چاہا، دفتری اونچ نیچ، اور کیریئر کو نقصانات پہنچنے کے احتمالات، مگر وہ میری باتوں سے مطمئن نہ ہوا، بلکہ ایک دو موقعوں پر تو تلخ کلامی پر اتر آیا تھا جو میرے لئے حیران کن بلکہ ناقابل یقین تھی، میرا خیال نہیں تھا کہ وہ اس سیٹ پر کام کرنے کے لئے اتنا بیتاب ہوگا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے فیصلے کے بارے میں بہت غور کیا۔ بالکل غیر جانبداری اور کسی بھی تعصب کے بغیر، اور مجھے اپنے اس اقدام کے بارے میں کسی قسم کے شک کا احساس نہ ہوا، بات استحقاق کی تھی، موزونیت کی تھی، حالانکہ میں اسے نہ صرف پسند کرنے لگا تھا، بلکہ دوسروں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بہتر سمجھتا تھا۔

سرکاری ملازمت کا میرا چھبیسواں سال تھا اور اسے کرشمہ سمجھیں، میری فہم و فراست کا اعجاز یا پھر اللہ کا کرم کہ کبھی کسی پریشان کن صورت حالات سے دو چار نہ ہوا تھا، چھوٹی موٹی شکایات تو دفتر میں ہوتی رہتی ہیں، عملے کے دلوں میں رنجشیں بھی ہوتی ہیں، جن کا کبھی وہ اظہار کر بھی دیتے ہیں اور نہیں بھی کرتے۔ آپس میں چشمکیں بھی چلتی ہیں جنہیں نظر انداز کر دینا ہی اچھا ہوتا ہے، اور فراخدلی سے معاف کر دینا بھی مفید رہتا ہے، ویسے بھی میں کوئی ایسا سخت گیر اور محتسب قسم کا افسر بھی نہیں ہوں، بلکہ خطاؤں سے درگزر کرنا میرا عام وطیرہ رہا ہے۔

شاید اس لئے میرے دفتر میں آج تک کوئی ایسی سنگین situation پیدا نہیں ہوئی تھی جو دوسرے دفتروں میں عام طور سے ہوتی رہتی ہیں، میرے درجے کے افسر، جو دوسرے شعبوں کے سربراہ ہیں ایسے موقعوں پر مجھ سے مشورے طلب کرتے، اور ان پر عمل کر کے سرخرو ہوتے تھے اور از راہ مذاق Tribute پیش کرتے کہ بھئی تمہارا دفتر تو تمہاری سلطنت ہے، تم اس کے بے تاج مگر با اختیار بادشاہ بلکہ شہنشاہ ہو، باقی رہا تمہارا عملہ۔ تو وہ ہے تمہاری وفادار فوج، وفادار اور قابل اعتماد! نہ صرف یہ کہ میرے عملے کے لوگ میرا حد درجہ احترام کرتے تھے بلکہ میرے سینئر افسران بھی مجھ پر بھروسہ کرتے تھے۔

اور ملازمت کا سارا فخر یہی ہے کہ عزت و

مارچ ۱۹۷۹ء

آبرو قائم رہے، جو مجھے حاصل تھی، میرا ماتحت مطمئن تھا اور میرے دفتر کا کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا، خودستائی کی بات اب چل ہی نکلی ہے تو ایک دو باتیں اور بھی کرتا چلوں، خوشامد، افسروں کی کمزوری ہوتی ہے، کم از کم ہمارے ملک میں، بدقسمتی سے میں ایک افسر بھی ہوں اور انسان بھی، لہٰذا اسی کمزوری میں مبتلا ہوں، مگر بحیثیت انسان ریاکاری سے نفرت کرتا ہوں، زندگی کے ہر شعبے میں ——— خوشامد، ریاکاری کے بغیر جنم نہیں لے سکتی۔ اور ریاکاری سے میری نفرت اتنی شدید ہے کہ میں نے کسی حد تک خوشامد پر قابو پالیا ہے۔ جب کبھی کوئی میرا ماتحت، یا کوئی سائل اور ضرورت مند میری خوشامد کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میرے کان مروڑ رہا ہو۔ اور کان مروڑے جانے کا عمل بظاہر پُرلطف مگر اصل میں تکلیف دہ ہوتا ہے میرے ایک سکول ماسٹر یوں کان مروڑتے تھے جیسے نسیں مروڑ رہے ہیں۔

ناصر اس واقعہ سے پہلے ایک دفعہ میرے گھر پر آچکا تھا، اس کی خوبرو اور کمسن بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ مٹھائی ساتھ لے کر آئے تھے، میں نے پس و پیش کی تھی تو اس نے بڑی خوش گفتاری سے مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ میں اس کا افسر بھی ہوں اور بزرگ بھی اور دونوں ناطوں سے قابلِ احترام اس سے پہلے کبھی میرے کسی ماتحت نے ایسے جذبات کا اظہار نہ کیا تھا، مجھے اس بات کی بہت خوشی ہوئی تھی، اس لمحے جانے کیوں مجھے اور میری بیوی کو بیٹے کی کمی کا شدید احساس ہوا تھا۔

ماوتو

ناصر، میرے کمرے سے رخصت ہوتے وقت مجھے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے کہہ گیا تھا، مگر میں اس پر قائم رہا، مجھے پتہ چلا کہ ناصر نے دفتر میں چند لوگوں کی موجودگی میں مجھے گالیاں دی ہیں، مجھے اس کا رنج ہوا تھا گالیوں کا کوئی جواز نہ تھا اور اگر جواز ہوتا بھی تو بھی گالیاں دینا تہذیب و شائستگی کے منافی بات تھی، افہام و تفہیم کے لئے میں نے اسے اپنے پاس بُلایا مگر وہ ملنے سے کتراتا رہا پھر ایک دن میرا اس کا سامنا ہوگیا، میں نے اس بارے میں اس سے پوچھا، تو وہ صاف مُکر گیا، بلکہ مجھے ہدایت کرنے لگا کہ افسر کو اتنا کانوں کا کچا نہیں ہونا چاہیئے اور پھر اس نے بتایا کہ آفس میں شرپسند لوگ موجود ہیں، جو ہمارے قریبی تعلقات کو پسند نہیں کرتے، اور یہ گروہ لوگ میرے خلاف بڑی باتیں کرتے ہیں غلیظ باتیں، لہٰذا مجھے ان سے ہوشیار رہنا چاہیئے میں اس کی باتیں سُن کر بھونچکا سا رہ گیا۔

میرے دفتر میں میرے کئی معتقدین تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جنہیں کبھی دانستہ یا نادانستہ طور پر میں نے تنگ کیا ہو، ان کی خلافِ قاعدہ باتوں پر سرزنش بھی کی ہوگی، بس یہی ایک بات ہے جو میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے، یعنی دفتری بے ضابطگی کو برداشت نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ میرا نجی معاملہ نہیں ہوتا، قوم اور ملک کا معاملہ ہوتا ہے، عزت و آبرو کے مٹ جانے کا معاملہ ہوتا ہے، ایسے موقعوں پر میرا رویہ سخت سے سخت تر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے عناصر میرے دفتر میں ضرور موجود ہوں گے، مگر بیشتر لوگ ایسے تھے جن پر میرے احسانات تھے، اور وہ ایسے لوگ تھے جو احسان فراموش نہیں ہو سکتے، اور یہ کہ آج تک کسی فرد نے میرے خلاف کوئی شکایت نہ کی تھی اس لئے ناصر کا یہ بات کہہ دینا میرے لئے انتہائی حیرت کا باعث بنی تھی۔

پہلے میں نے اس کے کام پر نظر رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی، مگر اس کی باتوں پر مجھے شک گذرا، اس نے میرے جاں نثاروں پر الزام لگایا تھا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ ہم میں آویزش پیدا کرنا چاہتا ہو، اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے مجھے ذلیل کرنا چاہتا ہو ——— اس خیال نے مجھے چونکا کر دیا، اور تھوڑے سے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہوگیا کہ ناصر دفتری فرائض میں مسلسل غفلت اور لاپرواہی برت رہا ہے، اور چھوٹی موٹی بے ضابطگیاں کرتا رہتا ہے۔ کبھی وقت پر نہیں آتا۔ اور دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے چلا جاتا ہے۔ جتنا وقت دفتر میں گذارتا ہے زیادہ تر باہر کے دوستوں کے ساتھ کینٹین میں چائے پینے اور گپ شپ میں گذارتا ہے، بغیر چھٹی کی درخواست کے غیر حاضر ہو جاتا ہے، سینئر سٹاف کی پروا نہیں کرتا، اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لیتا ہے، البتہ اسی سیٹ کے متعلقہ کلرک کے ساتھ ساز باز کرتا رہتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق اس سے کام لیتا رہتا ہے۔ اس نے یہ بات آج تک مجھے اس لئے دبائی تھی کہ ناصر، میرے ساتھ اپنے نہایت قریبی تعلقات کا چرچا ہر وقت کرتا رہتا تھا، یہاں تک کہ رشتے داری کا ڈھونگ بھی رچا رکھا تھا، یعنی

میری بیوی اس کی حقیقی خالہ تھی، اور پھر جب کبھی یہ حربہ کام نہ آتا تو دھمکی دیتا، دھمکیاں دینا تو اس کی عام عادت تھی، کسی سیاسی شخصیت کا حوالہ دیتا اور کبھی کسی غنڈے سے ذلیل کروانے کا خوف دلاتا، غرض یہ کہ دفتر کے لوگ اس سے اچھے خاصے خوفزدہ تھے، اور اسی خوف اور عزیز داری کے ناطے میرے تک اس کی شکایات نہ لاتے تھے، بلکہ یہ سب کچھ بتانے کے بعد منّت کرتے تھے کہ ناصر کو کچھ نہ بتایا جائے۔

کبھی میرے دفتر میں محبت اور بھائی چارے کا ماحول تھا اور اب خوف و ہراس کی فضا دفتر کی ہم آہنگی بری طرح سے متاثر بلکہ مکدر ہو رہی تھی ناصر کو سمجھنے میں مجھ سے کس قدر غلطی ہوئی تھی بہرحال کوئی قدم اٹھانے سے پہلے پھر میں نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ اس سے بالمشافہ بات کروں، جب وہ مجھ سے ملا، تو اپنے ہر قول اور فعل سے منحرف ہو گیا، اس کے چہرے پر نہ کوئی گھبراہٹ تھی اور نہ کوئی فکر البتہ اس نے مجھے فکرمند کر دیا تھا، اس سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی، وہ کوئی معمولی شخص نہ تھا۔

ایک بات کا مجھے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ ناصر خود ایک بے چین نوجوان ہے، اور مجھے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دے گا خود بے سکون ہے اور دوسروں کو بھی سکون سے رہنے نہیں دے گا، اس کی بے سکونی کی وجہ یہ تھی کہ وہ زندگی میں چھوٹا اور کہتر بن کے رہنا نہ چاہتا تھا، اس کے باپ کی آمدن اگرچہ خاصی تھی مگر کنبہ زیادہ تھا، چار بھائی اور تین بہنیں، ان میں سے دو بھائی تو باقاعدہ لفنگے تھے اور باپ کی حیثیت کو اپنی لوٹ کھسوٹ کے لئے استعمال کرتے تھے۔ باپ اگرچہ شریف شخص تھا، مگر گھر کے اخراجات بہرحال پورے کرتا اس کے فرائض میں تھا، ناصر نے ایک امیر گھرانے میں شادی کر لی تھی، یہ شادی کیسے ہوئی تھی، اس کے پیچھے جھوٹ اور فریب کی ایک لمبی داستان تھی، سسرال والوں نے ایک کار بھی جہیز میں دی تھی، جسے استعمال کر کے ناصر دوسروں پر اپنی برتری ظاہر کرتا تھا، یہی نہیں بلکہ اسے برقرار رکھنے کے لئے اس نے لاء کی کلاسز میں داخلہ لے رکھا تھا، اس کا خیال تھا کہ قانون کے میدان میں وہ اپنے جینئس کا پوری طرح اظہار کر سکتا ہے، اس کی شخصیت کے یہ روشن پہلو تھے، قناعت کر کے بیٹھ جانا، زندگی اور اس کی جدوجہد کی توہین کرنا ہے مگر اس کے کردار کا دوسرا رُخ اتنا ہی تاریک تھا، حد درجہ مغرور تھا، دوسروں کو اپنے سے حقیر جانتا تھا، خودغرض تھا اور اپنی اغراض کے حصول کے لئے انتہا تک پہنچنے کے لئے تیار ہوتا، بزدل تھا، سامنے ہوتا تو آنکھیں ملا کے بات نہ کر پاتا، باہر جا کر کھلم کھلا گالیاں دیتا، مگر پوچھنے پر صاف مکر جاتا، اس لئے کہ ریاکار تھا، مجھے اپنی وفاداریوں اور اخلاص کا یقین دلاتا، مگر میرے خلاف سازشیں کرتا، میرے ماتحتوں کو اُکساتا، منافق تھا، اس لئے خود پیچھے رہتا دوسروں کو آلۂ کار بناتا، کمزوروں کا اپنی طاقت کا نشانہ بناتا، اور اپنی کامیابی کے لئے ہر قسم کے جائز اور ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتا، دولت کی ہوس، اس کے کردار میں نمایاں تھی، اور غالباً اسی لئے وہ اس سیٹ، کے لئے اس قدر خواہش رکھتا تھا کہ جس کے نہ ملنے پر وہ میرا دشمن ہو گیا تھا، اور اب اسی دشمنی کو بڑھا رہا تھا۔

دفتر میں میرے خلاف پروپیگنڈہ مہم شروع کر رکھی تھی، اپنے رفیقانِ کار جن سے ملتا جلنا بھی پسند نہ کرتا تھا، ان میں بیٹھ کے تقریریں کیا کرتا، کہتا کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ نہیں، کسی نے پہلے سروس حاصل کر لی، کوئی بعد میں آ گیا، کسی کو تنخواہ چند "چلڑ" (روپئے) زیادہ مل گئی، اور کسی کو کم، کسی نے رزقِ حرام کمایا اور کسی نے رزقِ حلال، لوگوں کی نظروں میں بڑا کون ہے۔ اور خدا کی نظروں میں چھوٹا کون؟

اس کی باتیں مدلّل تھیں، منطقی تھیں، سچی تھیں مگر وہ ان باتوں سے مجھے نشانہ بنانا چاہتا تھا حالانکہ میرے پہ منطبق نہ ہو سکتی تھیں، میری زندگی ان آلودگیوں سے پاک تھی، بے داغ تھی، اور زمانہ اس بات کا گواہ تھا! مگر وہ مایوس ہونے والا نہ تھا۔ اپنی دُھن کا پکّا تھا، اور اپنے لئے جو راہ اس نے اختیار کر لی تھی، بڑی ثابت قدمی سے اس پر چل رہا تھا۔ سچ کو سچ تو سارا زمانہ کہہ لیتا ہے مگر سچ کو جھوٹ میں بدل دینا، اور لوگوں کو اس جھوٹ کا یقین بھی دلا دینا، اسے پروپیگنڈہ کہتے ہیں، اور اسی کا نام ذہانت ہے آج اگر دنیا یقین نہیں کرتی تو کل کرے گی اور کہے گی کہ عزیز اللہ بیگ فراڈ نکلا۔"

اس کی عیاری جسے وہ ذہانت کہتا تھا، کا زہر

آہستہ آہستہ کام کر رہا تھا، میں نے محسوس کر لیا تھا کہ دفتر کے کچھ لوگ مجھ سے کھچے کھچے رہنے لگے ہیں، میرے احکامات کو ٹالنے لگے ہیں اور میرے بارے میں مختلف قسم کی افواہیں پھیلاتے ہیں اور یہ کہ ان کے دلوں میں میرے لئے جو عزت و احترام کے جذبات تھے، ان کی شدّت میں کمی آتی جا رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خلیج کو پاٹنے کے لئے کون سی تدابیر اختیار کروں، جو میرے اور میرے ساتھیوں کے درمیان نامر نے پیدا کر دی ہے، اپنی پریشانیوں کو ساتھ لے کر میں اپنے گھر میں داخل ہوتا، بیویاں تو نجومی ہوتی ہیں، ان سے کب کوئی بات چھپائی جا سکتی ہے، کیسے چھپائی جا سکتی ہے، وہ تو باطن کا علم رکھتی ہیں، باطن کا صحیح علم۔

سو میں نے اس بھاگوان کو سب کچھ کہہ سنایا وہ تو جیسے پہلے ہی غالباً جانتی تھی، بھڑک اٹھی، نامر کا نام لے کر اسے بے نقط سنائیں، اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے، اس نے مجھے کوئی سخت قدم اٹھانے کا مشورہ بھی دیا۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی نامر سے میری براہِ راست کوئی لڑائی نہ ہوئی تھی، کم سے کم میری طرف سے کچھ نہ ہوا تھا یہاں تک کہ اس نے اپنی سالانہ ترقی کے لئے درخواست دی تو میں نے اس کی پُر زور سفارش کر دی، قانون کے امتحان کے لئے ایک مہینے کی رخصت طلب کی۔ میں رکاوٹ نہ بنا، اور اس کے کسی بھی خلافِ قاعدہ بات پر آج تک اس کی جواب طلبی نہ کی تھی، جس سے وہ اور بھی خیرہ ہو گیا تھا، دفتر کے لوگوں نے میرے کمزور روّیے کے طعنے بھی دیئے اور کہا کہ جب "کلہ" ہی مضبوط نہ ہو، تو ڈسپلن کیسے قائم رکھا جا سکتا ہے؟ مجھے نا اہل کے خطابات بھی ملے، میرے اس روّیے سے باقی سٹاف کے دلوں میں بد دلی بھی پیدا ہوئی، طرح طرح کی باتیں میرے بارے میں سوچی گئیں مگر میں نامر کے کیریئر کی راہ میں حائل ہونا نہ چاہتا تھا، اسے میری فیاضی کہیئے یا بزدلی؟

میرا یہی خیال تھا کہ وہ میرے مستحسن سلوک سے ضرور متاثر ہو گا اور اپنی اصلاح کرے گا مگر اس نے مجھے بہت مایوس کیا، اور معاذ آرائی کو طول دیتا چلا گیا، یہاں تک کہ میرے دفتر کا سارا ڈسپلن ختم ہو کے رہ گیا، اور افسرانِ بالا تک بھی یہ بات جا پہنچی۔

ان ہی دنوں سالانہ رپورٹیں بھیجنے کا وقت آگیا، وہ فوراً خبردار ہوا اور کئی دفعہ میرے گھر پر اپنی بیوی سمیت آیا۔ تحائف بھی لایا جو ہم نے قبول نہ کئے۔ اس نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا، اور ملاقاتوں میں وہ پہلے جیسا مؤدب اور پہلے سے بڑھ کر سعادت مند اور تابعِ فرمان نظر آیا، میرے جذبات سے بھی کھیلا، اور میری خوشامدیں بھی کیں، مجھے محسن گردانا اور اپنے آپ کو خطاکار اور یوں معافی کا خواستگار ہوا، مگر وہ مجھے قائل نہ کر سکا اس دفعہ مجھ پر اس کا جادو نہ چل سکا، اور پھر معاملہ میرا تو نہ تھا، دفتر کا تھا، حکومت کا تھا اور اس معاملے پر کسی قسم کی سودے بازی، مفاہمت اور درگذر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا! اس کی باتوں میں آ کر بفرضِ محال اگر میں اس کے حق میں رپورٹ بھی دے دیتا۔ تو میں بے ضابطگی کا مرتکب ہوتا جس کے لئے میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کر پاتا۔

کچھ عرصے تک تو وہ پُرامن رہا۔ اور ایک مثالی خادمِ سرکار بنا رہا، مگر جوں ہی خراب رپورٹ اسے ملی تو وہ ایک دم مشتعل ہو گیا اور بڑے ہی زبردست طریقے سے ردِّ عمل کا اظہار کیا، یہ رپورٹ اس کے لئے غیر متوقع تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ مجھ پر اپنی بے گناہی ثابت کر چکا ہے۔ مگر یہ رپورٹ تو اس کی الٹی سوچوں اور مکروہ عزائم پر بم بن کے گری، تھوڑی دیر کے لئے تو اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ کیا ہو گیا ہے، اور اسے اب کیا کرنا ہو گا، میں نے رپورٹ بہت سوچ سمجھ کر اور پوری ذمہ داری سے لکھی تھی اور لکھنے سے پہلے اس کی سابقہ رپورٹیں بھی دیکھ چکا تھا ان میں بھی "سرخ اندراجات" کہیں کہیں تھے جن کا اسے علم نہ تھا کیونکہ وہ اسے آج تک Convey نہیں ہوئے تھے، اس نے ایسا چکّر چلا لیا تھا، چکّر چلانے کا وہ ماہر تھا اور اگر اسے معمولی سا شک بھی ہوتا تو وہ اتنا ہوشیار تھا کہ میری رپورٹ کو بھی دفتری غلام گردشوں میں گم کرا دیتا، وہ اپنی معمولی سی غفلت کی مار کھا گیا، ایسے غیر محتاط لمحات Unguarded Moments انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں، میں اپنی جگہ مطمئن تھا، مگر وہ یوں مار کھانے والا نہ تھا، ان چند دنوں میں وہ کوئی strategy تیار کرتا رہا تھا۔

ایک دن دفتر پہنچا تو سیکرٹری صاحب کا چپڑاسی
میرا منتظر تھا، مجھے بہت جلد بلایا گیا تھا۔
کیا چھسوڑی ہے؟ میں نے راستے میں اس
سے دریافت کیا،
"معلوم نشتہ" پٹھان چپراسی نے جواب دیا۔
سیکرٹری صاحب کا موڈ بدلا ہوا تھا کرسی
پر بیٹھنے کی مہلت بھی نہ دی اور ایک کاغذ میرے
ہاتھ میں تھما دیا، جسے پڑھ کر میرا رنگ فق ہو گیا اور
زمین میرے پاؤں تلے سے کھسک گئی ——،
اختلاج قلب ہونے لگا، میری حالت دیکھ کر انہوں
نے بیٹھنے کے لئے کہا۔
یہ سب کیا ہے؟
انہوں نے بڑے افسوس سے پوچھا۔
"سازش"!
میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
مگر اس پر تمہارے عملے کے تقریباً سارے
لوگوں نے دستخط کئے ہیں، ایسے لوگ بھی ہیں جو
برسوں سے تمہارے ساتھ کام کر رہے ہیں، اور
جن کی خدمات کی تم ہمیشہ تعریف کرتے رہتے ہو،
ان میں سے بعض کو تم نے ترقیاں بھی دلوائی ہیں،
میں کچھ نہ کہہ سکا، کہہ بھی کیا سکتا تھا؟
آپ اس وقت "نروس" ہیں پھر کسی وقت
بات کریں گے، آپ اس کا تحریری جواب تیار
رکھیں ۔"
واپس آیا تو میرے رفیقانِ دفتر مجھے یوں گھور
رہے تھے جیسے میں کسی سنگین جرم کا ارتکاب کرتے
ہوئے رنگوں ہاتھوں پکڑا گیا ہوں، ان میں سے
کچھ ایسے چہرے بھی دکھائی دیئے، جن پر ایک
دردمندانہ کرب تھا۔
میں نے اپنی کرسی پر اپنے آپ کو گرا دیا، مجھے
یوں لگ رہا تھا جیسے زندہ درگور ہو گیا ہوں، میرے
کمرے کی ہر شے گویا میرا تمسخر اڑا رہی تھی، میرے
حواس معطل ہوتے جا رہے تھے ایک عجیب سی
نیم دیوانگی کا عالم تھا، کبھی دھاڑیں مار کر رونے
کو جی چاہتا، اور کبھی بے اختیار قہقہے لگانے کو۔
دفتر کا وقت ختم ہو گیا تھا، تمام لوگ چلے گئے
تھے، میرے پاس کوئی بھی شخص کسی کام کے لئے
نہیں آیا تھا چپڑاسی دور ہی رہا تھا یا الٰہی ——میں
سوچ رہا تھا، یہ کیا ہو گیا ہے؟ ایک دم سے
سب کے سب لوگ نظریں بدل گئے ہیں، کیا میں
واقعی مجرم ہوں؟
میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اختر کمرے میں
داخل ہوا، دفتر بند ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے،
اور وہ ان دو گھنٹوں میں دو دفعہ میرے گھر ہو آیا تھا،
وہ بہت خوفزدہ سا نظر آ رہا تھا، اس نے جلدی
جلدی یہ بتایا کہ درخواست پر زبردستی سب سے
دستخط لئے گئے ہیں، گھروں پر جا کر جن نے انکار
کیا، ان کی کنپٹیوں پر ریوالور رکھے گئے، ناصر کے
دونوں بھائی بھی اس کے ساتھ تھے،
اختر نے کہا کہ باقی تفصیلات وہ رات کو گھر پر
آکے بتائے گا، اگر کہیں اسے ناصر نے یہاں دیکھ
لیا تو اس کی خیر نہیں۔
کئی دوسرے رفیقوں نے اس بات کی بعد
میں توثیق کر دی، مگر وہ لوگ اس درخواست کے
خلاف زبانی یا تحریری کسی قسم کا بیان دینے کے
لئے تیار نہ تھے، ناصر نے انہیں کچھ طرح سے
ڈرایا دھمکایا ہوا تھا، اور یہ لوگ مفلوک الحال،
بے سہارا اور بے وسیلہ تھے، ان کا خوف جائز
تھا۔
میں نے من وعن پوری تفصیلات سیکرٹری صاحب
کو سنا دیں، ایسے شخص کو یہاں کیسے رکھا گیا ہے؟ انہوں
نے پوچھا، اور مجھے حوصلہ دے کر رخصت کیا میرا
خیال تھا اب سیکرٹری صاحب اس کے خلاف
کوئی عملی قدم اٹھائیں گے اور بہت دن گذر جانے
کے بعد بھی کچھ نہ ہوا، اس عرصے میں ویسے بھی حالات
پُرسکون رہے، ناصر نے دو مہینوں کی رخصت
لے رکھی تھی، اسے مقابلے کا امتحان دینا تھا۔
قانون کا امتحان وہ پاس کر چکا تھا، چھٹی پر جانے
سے پہلے اس نے اپنی سالانہ رپورٹ میں "خراب
ریمارکس" کے حذف کئے جانے کے سلسلہ میں ایک
درخواست دی تھی، یہ درخواست میرے توسط سے
نہیں دی گئی تھی، بلکہ بالا بالا —— میرے خلاف کئی
جھوٹے الزامات عائد کئے گئے تھے، اس کی یہ
درخواست مختلف دفتری مراحل طے کرتے کرتے میرے
پاس Comments کے لئے پہنچ گئی تھی۔
امتحان سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ اپنی ڈیوٹی
پر حاضر ہو گیا تھا وہ باخبر تھا کہ آج کل میں ہی اپنے
Comments لکھنے والا ہوں مگر اس ضمن میں
وہ مجھ سے نہیں ملا۔ اس لئے کہ اب وہ دوسری راہ
پر چل نکلا تھا، محاذ آرائی کو چھوڑ کے "اوپن وار"
کا اعلان کر چکا تھا، اس کی یہ کھلی جنگ ایک نتیجے

اور کسی ایسے شخص کے ساتھ تھی جس کے پاس کوئی قوت نہ تھی، نہ خاندانی اثاثات، نہ سیاسی اثر و رسوخ اور نہ سرکاری اعانت، ایک محلے کے لوگ جن سے اولاد کی طرح محبت کی تھی، وہ بھی مددگار نہ بن سکتے تھے. اس لئے کہ ناصر کے ہتھکنڈوں سے دہشت زدہ تھے.

پہلے صدمے سے ابھی پورے طور پر سنبھلنے نہ پایا تھا کہ ایک درخواست میرے دفتر میں متعلقہ وزیر کے خصوصی احکامات کے ساتھ پہنچی! اس درخواست میں میرے خلاف ایک کیس میں پانچ ہزار روپے رشوت کے طور پر لینے کا الزام تھا، اس کیس کا تعلق اسی بیٹ سے تھا، جس کے لئے ناصر اب تک پریشان تھا، یہ درخواست ایک ٹھیکیدار کی طرف سے دی گئی تھی. یہ ٹھیکیدار وہی تھا، جو ناصر کا بے حد قریبی دوست تھا، اور جس کے لئے ناصر اکثر متعلقہ کلرک سے سفارشیں کیا کرتا تھا، اس ٹھیکیدار نے ناصر کے بیشتر اخراجات اپنے ذمے لے رکھے تھے، یہ ضرب پہلی ضرب سے زیادہ کاری تھی، پہلی کارروائی نے مجھے ذہنی دھکا پہنچایا تھا اور قلبی سکون برباد کیا تھا اور موجودہ فعل نے مجھے زمانے بھر میں ذلیل و رسوا بھی کر دیا تھا. اس لئے کہ یہ خبر، اخباروں میں بھی چھپ گئی تھی.

مجھے میری بیوی نے باز رکھنا چاہا، دوستوں نے بھی سمجھایا، میرے محلے کے چند ایک مخلص رفیقوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کے بارے میں اب جو Comments لکھنے والا ہوں، وہ اُس کے حق میں لکھوں، ورنہ انہوں نے بتایا، کہ اس نے قسم کھا رکھی ہے، کہ وہ میرا جینا محال کر دے گا، مجھے صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا، میں نے بھی بہت سوچا، مگر اس کے حق میں اپنی رائے نہ بدل سکا.

مگر پھر ایک دم خاموشی چھا گئی، وہ دفتر میں تھوڑی دیر کے لئے آتا، casually تھوڑا بہت کام کرتا، اور چلا جاتا، اس کی مصروفیات اپنے کیریر کے لئے مجتمع ہو رہی تھیں. اور اس عرصے میں بھی وہ میرے خیال سے غافل نہیں رہا، اپنے نئے کیریر کے لئے اس سالانہ رپورٹ کا ٹھیک ہونا اس کے لئے نہایت اہم اور از بس ضروری تھا لہٰذا اس نے فوجداری عدالت میں میرے خلاف ایک مقدمہ دائر کر دیا تھا، جس کی ضمانت کے لئے مجھے کچہریوں کے چکر کاٹنے پڑے تھے، میری بیوی کہتی تھی جانے اس کے انتقام کی آگ کب ختم ہو گی! اور میں سوچتا تھا، کیسا انتقام، کس سے انتقام، کس جرم کا انتقام؟

مقابلے کے امتحان میں بھی وہ کامیاب ہو گیا، اس نے دوسری پوزیشن حاصل کی تھی جسے حاصل کرنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہ کیا تھا، میں اس کی قابلیت کے بارے میں جانتا تھا، اس میں اتنی اہلیت اور استعداد ہرگز نہ تھی. مگر اس کا مقابلہ قابلیت کا مقابلہ نہ تھا، اور وہ کامیاب ہوا تھا. کیسے نہ ہوتا؟ امتحانی مرکز میں مددگار اس کے ساتھ باقاعدگی سے جاتے تھے. پھر وہ ممتحن کے پیچھے بھاگتا رہا، کسی کو سفارش پہنچائی. باپ کو ساتھ لے کر اسے ایک مفلوک الحال شخص ظاہر کر کے کہیں منّت سماجت کی، کسی جگہ رشوت دی اور کسی کو ڈرایا دھمکایا،

بہرحال اس کا سفینہ کنارے سے لگ چکا ہے جب کہ میرا سفینہ بیچ منجدھار ہے، اس نے جاتے وقت کہا تھا کہ وہ ساری زندگی مجھے آرام و سکون سے نہ بیٹھنے دے گا، سو اب جانے کتنا عرصہ مجھے کچہریوں کی خاک چھاننا ہو گی، کامیابی کے بعد کئی دنوں تک وہ میرا تمسخر اڑاتا رہا تھا، اور اس کے خلاف لکھی گئی رپورٹ جانے کہاں گم ہو چکی تھی.

وہ ایک اہم مقام پر تعینات ہے ملازمت کرتے ہوئے اسے اب چار سال ہو چکے ہیں اور میں اسی سال ریٹائر ہو رہا ہوں دن رات لوگ اسے سلامیں کرتے ہیں، اور اس کی اَنا کو تسکین ملتی ہے اس کی ساری خواہشات ایک ایک کر کے پوری ہو رہی تھیں. خستہ حال موٹر کی بجائے اب اس کے پاس ایک نئی قیمتی موٹر کار ہے اور میں ابھی تک سہراب سائیکل پر دفتر آتا جاتا ہوں، وہ سترھویں گریڈ کا افسر ہے اور میں بائیسویں گریڈ میں کام کر رہا ہوں، اس کی ایک شاندار کوٹھی لاہور میں زیرِ تعمیر ہے، اور میں چند مہینوں بعد سرکاری رہائش گاہ چھوڑ کر جانے کہاں کرایے کا مکان ڈھونڈتا پھروں گا ــــ؟

میرا خیال تھا یہ کہانی مکمل ہو جاتی تو اسے لکھتا میرے ادیب دوست کہتے ہیں کہ اوّل تو یہ کہانی ہی نہیں ہے اور اگر مان ہی لیا جائے کہ یہ کہانی ہے تو پھر مکمل بھی ہے.

مگر میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ یہ کہانی ادھوری ہے. کب مکمل ہو گی؟

شاید ــــ

مگر کون جانے ــــ مکمل ہو گی بھی یا نہیں!

احمد جاوید

کہانی کی گرہ

اب کہاں سے آغاز کروں ــــــ کہ دیر ہوئی جب میں سرنیوڑائے اپنے خوابوں سے لفظ لفظ چنتا، ورق ورق جوڑتا کہانی لکھتا تھا ــ اور میری بچی مجھے تلاش کرتی پھرتی تھی۔

میں لکھتا تھا اُن دنوں کی داستان جو میری آنکھوں پر حیرت بن کر اُترے ــ جو شاید سب کی آنکھوں پر اسی صورت اُترتے ہیں ــــ عجیب دن ہوتے ہیں وہ جو ذہن کے اندر ایسی تصویریں تخلیق کرتے ہیں جو آواز کی صورت آپ ہی آپ گونجتی رہتی ہیں ــ ساری عمر ــ آپ ہی آپ ــــ

مجھے دن یاد آتے ہیں۔

وہی دن کہ جن کی بابت مجھے لکھنا تھا ــ یا شاید لکھا تھا ــــ

کہ ــــ

مجھے گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر لوگوں کو بڑبڑ دیکھنا اچھا لگتا تھا ــ یا تعجب خیز ــ حیران کُن ــــــ

میں کہنی اپنے گھٹنے پر ٹیکتا اور چہرہ اپنی کھلی ہتھیلی پر پھیلا دیتا اور لوگوں کو جاتے دیکھتا ــ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ــ ٹیکسیوں، رکشوں، تانگوں کے پیچھے لپکتے ــ بسوں اور سائیکلوں کے ساتھ لٹکتے سڑک کا موڑ مُڑ جاتے ــــ

میں بیٹھا رہتا ــــ

میں بیٹھا رہتا اور انہیں آتے دیکھتا کہ وہ شام پڑے لوٹتے ــــ خوشامدی کمریں جھکی ہوئیں ــ نادم چہرے اُترے ہوئے ــ یوں چلتے جیسے چلتے رہنوں کا پنا آپ گھسیٹے ہوں ــــ

ہر شے سے کتراتے ہوئے، آتے ہوئے یہ لوگ۔ میں سوچتا آخر جاتے کیوں ہیں ــ جو جاتے ہیں تو آتے کیوں ہیں اس صورت لوٹنا کتنا تکلیف دہ ہے۔ (شکست خوردہ سپاہی ــــ سارا دن خود سے لڑتے ہیں اور ہار جاتے ہیں ــــ میرا باپ کہتا اور اُن ہارے سپاہیوں میں ایک وہ بھی تھا۔

میرا باپ ــــ

ڈیوڑھی کی سیلن زدہ دیوار کے ساتھ اپنی بوسیدہ سائیکل ایک جھٹکے سے ٹکا دیتا ــــ اور کھانستا ــ یہ شام کی آمد کا اعلان ہوتا تھا۔

تنگ گلیوں کے تنگ مکانوں میں شامیں اسی طرح اُترتی ہیں ــــ وہ کہتا۔

صبحیں یوں ہی طلوع ہوتی ہیں شام کی صورت ــــ وہ سمجھاتا۔

تو شام کی صورت دیکھ کر میری ماں زور زور سے چولہے میں پھونکیں مارنے لگتی ــــ میرا باپ جیب کے کسی کونے کھدرے سے تلاش کر کے کوئی مُڑی تُڑی سگریٹ نکالتا اور مٹھی میں بھینچ کر سُلگاتا ــ دھواں اُڑاتا اور کھانستا ــ کھانستا ہی چلا جاتا ــ پھر رات ڈھلتی اور چارپائیاں صحن میں بچھ جاتیں۔ بتّی گُل کر دی جاتی ــــ اور ہم اپنے مکان کی تنگ چار دیواری میں محبوس ہو جاتے ــــ ہمارا رابطہ دنیا سے منقطع ہو جاتا۔

تب میری ماں اپنی آنکھوں کی چادر اُس کے سامنے پھیلا دیتی جس پر خوشنما رنگین پھول کڑھے ہوتے جنہیں وہ دن بھر بڑے ارمان سے کاڑھتی رہتی تھی خواہشوں کے پھول۔

خواہشوں کے پھول ــــ میرا باپ دیکھتا۔ مسکراتا ــ لوٹا دیتا اور کہتا ــ

بی بی تجھے یہ دنیا اچھی لگتی ہے اور مجھے وہ ــ وہ کہ جس کے دروازے اندر کو کُھلتے ہیں ــ خواب دیکھا کرو میری طرح کہ خواہشوں کا کوئی انت نہیں ــــ اسی لئے تو مجھے کہانیاں کہنے والے اچھے لگتے ہیں کہ وہ خواب دکھاتے اور جاگتے میں سلا دیتے ہیں ــ اور

کھیتوں میں لوریاں ـــــ

مجھے خواب اچھے لگتے ہیں، خواہشیں نہیں،
خواہشیں تو لوگوں کا، بسوں، موٹروں کا اژدھام
ہے ـــ ایک دوسرے سے دھکم پیل کرتا، آگے
بڑھتا، ٹکراتا، پاش پاش ہوتا ہوا ـــــ
سنو ـــ جب سفر میں میری سائیکل کا چین اُترتا
ہے تو مجھے یہ طمانیت ہوتی ہے (وہ مجھ سے
مخاطب ہوتا) ـــ میں رُک جاتا ہوں ـــ الگ
ہو بیٹھتا ہوں، اور ہجوم کو دیکھتا ہوں ـــ پھر خود
کو ـــ تنہا ـــ مگر تناور ـــ صدا لگاتا ہوں
ہاں اے لوگو ـــ اگراہ رہو ـــ میں تم میں شامل نہیں۔
ـــ سو الگ رہا کرو ہجوم سے ـــ (وہ ہم
دونوں سے کہتا)۔

تم ہم الگ الگ ہو کر اپنی راہ لیتے ـــ اپنی اپنی
دنیا کی طرف ـــ اپنے اپنے خوابوں کی طرف ـــ
ـــ تو اُن دنوں سے میں خواب دیکھتا ہوں ـــ جب
وہ دونوں چین کی نیند سو جاتے تو میں جاگتا رہتا
ـــ تب ہمارے گھر کی تنگ و تاریک چار دیواری اور
تنگ ہو جاتی ـــ لگتا جیسے ہمیں کسی اندھے کنوئیں میں
دھکیل دیا ہے ـــ بس باہر کی دنیا سے اگر رشتہ
ہوتا تو اتنا کہ آسمان پہ چمکنے والے ستارے نظر آتے ہیں
جیسے کنوئیں میں جھانک کر اپنی صورت دیکھتے ہوں۔
وہ ستارے مجھے دیکھتے تھے کہ میں اُن کی صورت تھا۔
اور میں انہیں دیکھتا کہ ان کے ہمراہ آسمانوں کے سفر
پہ روانہ ہو جاتا ـــ پھر خواب ہی خواب ـــ جل پریوں
کے خواب ـــ پھولوں کے خواب ـــ گیتوں کے خواب۔
وہ دن ایسے ہوتے تھے جب روز صبح میری ماں
میرے گلے میں خواہشوں کی مالا پہنا دیتی ـ اور جو
شام پڑتے ہی میرا باپ میرے گلے سے نوچ دیتا
اُتار پھینکتا ـــــ

وہ کہا کرتا ـــ کتنا آگے جاؤ گے ـ کتنا ـ ؟"
تو میں تصوّر کرتا اُن حدوں کا جہاں شہر ختم ہوتے
جہاں ملک ختم ہوتے ـــ جہاں دریا، صحرا، جنگل،
پہاڑ، سمندر، فضا، خلاء، کچھ بھی نہیں رہتا اور دھند
کا آغاز ہوتا ہے ـــ دھند ـــ اندھیرے کے خلاء
میں بدلتی ہوئی دھند ـــ مگر خواب ـــ وہ ختم نہیں
ہوتے ـــــ

آہ وہ خواب سے دن جب اُس نے مجھے
موسموں کے سپرد کیا اور پرندوں کے ـــ اور کہا کہ
خود کو ان میں تلاش کر لیا کرو پالو گے جاؤ گے ـ ہجوم
میں نکلو گے تو کھو جاؤ گے ـــ تو میں نے خود کو دونوں
سے جدا کر لیا اپنے باپ کی طرح۔

اپنے باپ کی طرح کہ جب لوگوں نے میری ماں کو
زمین کے سپرد کیا اُس کی آنکھیں اشکبار نہ ہوئیں۔

اُس دن ـــــ

"میں کسے روؤں ـــــ" اس نے کہا ـــــ

میرے لئے وہ کل بھی خواب تھی اور آج بھی۔
وہ زندہ کب تھی کہ میں تو اُسے صرف خوابوں میں دیکھتا
رہا کہ باہر تو وہ خواہشوں کی مالا تھی ـــ"

تو میں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا ـــ
پی لیا ـــ اور خیال کیا کہ میں تو موسموں کے سپرد ہوں
اور پرندوں کے اور خوابوں کے ـــــ

آہ وہ خواب سی راتیں ـــ کہ میں نے اپنی ماں
کو اپنے باپ کو فراموش کر دیا ـــ کہ میں ستاروں کا
ہمسفر ہواؤں کے ساتھ نکلتا تھا اور شاخ شاخ
پرندوں سے ہمکلام ہو کر لوٹتا تھا کہ باہر تو کچھ بھی
نہ تھا مگر خواہشوں کی مالا ـــ

میں اُن دنوں کو یاد کرتا ہوں تو مجھے صدائیں
آتی ہیں اَن دیکھے جہانوں کی، سمندروں کی، دریاؤں
کی، درخت سرگوشی کرتے ہیں ـــ ہوا گنگناتی ہے ـ
وہ ایسے ہی دن تھے ـــ وہ شاید ایسے ہی دن
ہوتے ہیں ـــ جب قدم رُک جاتے اور آنکھیں
بیقرار ہو کر چڑیوں کی چہکار پر رقص کرنے لگیں ـــ
حیرت کا رقص ـــ"

تو میں رقص میں تھا ـــ مگر میری بچی صدائیں دیتی
تھی میں اُسے کمروں میں برآمدے میں صحن میں ادھر
اُدھر تلاش کرتے تصوّر کر رہا تھا ـــ اُس کی آواز
میرے قدموں سے اُلجھتی، میرے جسم سے لپٹتی، ذہن
کو اپنی گرفت میں لیتی تھی ـــ مگر آج جنون نے گھیرا
تھا ـــ میں لفظوں کے موتی رولتا اور کہانی کی گرہ
کھولتا رہا ـــــ

لکھتا رہا ـ مگر اب کسے یاد کہ کیا لکھا تھا ـ ؟
مجھے کہانی لکھنا تھی ـــ اور میں نے کئی راتیں
جاگ گزاریں ـــ پھر لفظ چھپنے اور ورق جڑنے ـ
میری بیوی رات دن مجھ سے الجھتی رہی کہ یہ کیا
لکھتے ہو ـــ ؟ میں اُسے سمجھاتا ـــ بی بی ـ ! میں
کہانی لکھتا ہوں اور یوں خود کو کبھی کبھی ہجوم سے جدا
کر لیتا ہوں ـ تم اس لذت کو کیا جانو ـ جب میں
اپنی ذات سے الگ انجانی دنیاؤں کے سفر پہ ہوتا
ہوں تو طلسم پر میری جھولی خوشبوؤں سے بھری ہوتی
ہے ـــ پھر میں دنوں جھکتا رہتا ہوں ـ تم اس جگہ

کو کیا سمجھو ——

ہاں وہ نہیں سمجھتی —— وہ خواہشوں کی اسیراس
کا مفہوم نہیں سمجھتی ——

—— اور کہانی لکھتے ہوئے بھی میں نے کہا ——
کہ ——

"وہ خواہشوں کی اسیراس کا مفہوم نہیں سمجھتی ——
وہ کہ جواب میری بیوی ہے —— مگر میں رقص کرتا ہوں
اُن دنوں میں کہ جو حیرت کے دن تھے —— (تنہائی کے
دن) —— اور اُسے بھول جاتا ہوں ——

مگر وہ مجھے نہیں بھولتی —— میری بیوی —— میری
ماں کے ہاتھوں میرے گلے میں پہنائی گئی خواہشوں
کی مالا۔

میں اُس سے کہتا ہوں ——

تم مجھے ہجوم میں مت دھکیلو —— میں لوگوں جیسا
نہیں، میں اُن میں شامل نہیں —— مجھے ان دنوں میں اپنے
دو جیسے حصار سے تم مجھے کھینچ لاتی ہو —— مت دھکیلو
—— مجھے الگ رہنے دو۔

تو وہ سُن کر ہنس دیتی ہے اور کہتی ہے کہ تم
الگ کب ہو —— ہجوم تو تمہارے اُوپر سے گذر رہا
ہے —— تمہیں کچلتا ہوا، روندتا ہوا —— ہم سب
خواہشوں کی بھیڑ بھاڑ میں شامل ہیں —— مگر تم خوابوں کے
اسیر اس کا مفہوم نہیں سمجھتے کہ ہم نے خواہشوں سے تجسیم پائی
ہے —— جب ہم خواہش کو چھوڑتے ہیں جسم کو چھوڑتے
ہیں —— سنو! جس کی جھولی خواہشوں سے خالی
ہے وہ خوابوں سے خالی ہے —— اور دیکھو میں تمہارا
خواب نہیں خواہش ہوں ——"

مگر وہ نہیں جانتی، وہ نہیں سمجھتی —— وہ بھی
لوگوں جیسی ہے اُسی انداز میں سوچتی ہے۔ اسی لئے
میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں کہ کہیں خواہشوں کا
گدلا پانی میرے اندر سرایت نہ کر جائے —— پھر
صدائیں دیتا ہوں پرندوں اور پھولوں کو اور تاروں
کو —— اور وہ آتے ہیں ہاتھ بڑھاتے ہیں، کھینچ
لے جاتے ہیں —— میں بھول جاتا ہوں اپنے باہر کو،
اپنے ظاہر کو —— اور خوابوں کے سفر پر روانہ ہوتا ہوں"
—— تو میں خوابوں کے سفر پہ تھا جب مجھے اپنی بچی
کے قدموں کی چاپ اپنی طرف آتی محسوس ہوئی ——
بالآخر اُس نے میرا پتہ پا لیا تھا۔

مجھے اپنی بچی اُسی طرح پیاری ہے جیسے اپنا بچپن
—— بچوں کی آنکھوں میں تو حیرتوں کا سمندر موجیں مارتا
ہے —— اور میں اُن پانیوں کا مسافر تھا۔

مگر اب جوں جوں وہ بڑی ہوتی جاتی ہے اُس
کی آنکھوں سے حیرت غائب ہوتی جاتی ہے (جواب
بھی میری آنکھوں میں جاگتی ہے) —— جیسے راز افشا
ہو رہے ہوں —— جیسے ایک ایک کر کے حیرتوں کے
دروازے بند ہو رہے ہوں —— جیسے سوالوں کے
جواب آ رہے ہوں ——

میں اُسے دوسروں سے مختلف دیکھنا چاہتا
تھا —— مگر وہ ابھی سے دوسروں جیسی ہوتی جا رہی
ہے —— جب میں سوچتا ہوں —— اپنے خوابوں سے
لفظ چنتا ہوں —— ورق ورق جوڑتا ہوں تو وہ آ کر
اپنے ننھے منّے ہاتھوں سے میرا منہ نوچ ڈالتی ہے۔
جب میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو وہ کاغذوں کو پھاڑ
ڈالتی ہے اُن پر سیاہی انڈیل دیتی ہے —— وہ
مجھے کھینچ کر باہر لے جاتی ہے۔ مگر اُسے چپ چاپ
درختوں —— روز ایک ہی طرح سے چہچہاتے پرندوں
سے کوئی سروکار نہیں —— وہ بسوں، موٹروں اور لوگوں
کی بھیڑ میں شامل ہو جانا چاہتی ہے۔ وہ مجھ جیسی
نہیں ——

تو میں نے لکھا ——

کہ ——

"—— وہ مجھ جیسی نہیں —— اور مجھے اپنے لکھے
ہوئے لفظ عزیز ہیں کہ وہ میرے خواب ہیں ——
خواب جو مجھے میرے باپ نے عطا کئے —— اسی لئے
اب سوچتا ہوں کہ اپنے گھر، اپنی بیوی، اپنی بچی سب
کو فراموش کر دوں۔ ناطہ توڑ لوں —— لوٹ جاؤں پرندوں
کی طرف اور موسموں کی طرف —— کہ گئے دن خواب دکھاتے ہیں،
اپنی طرف بلاتے ہیں —— تنہائی صدائیں دیتی ہے"

تو وہ مجھے صدائیں دیتی ہوئی کمرے میں داخل
ہوئی ——

میں نے لکھنا ترک کیا۔

لکھنا ترک کیا تاکہ وہ میری گن سن نہ پائے اور
لوٹ جائے۔ اسی خاطر میں نے بستر کی چادر یوں
اپنے اردگرد لپیٹی کہ وہ مجھے دیکھ نہ سکے —— پہچان نہ
سکے ——

تو دیر تک میں دم سادھے پڑا رہا ——

جب محسوس کیا کہ وہ صحن کی طرف لوٹ گئی ہے
تو چادر سرکائی اور لکھنے کو دوبارہ مستعد ہوا مگر حیرت
ہوئی کہ میرے لکھے ہوئے اوراق وہاں نہیں تھے —— یقیناً
وہ جاتے ہوئے ساتھ لے گئی تھی —— میں ہڑبڑا
کر اُٹھا اور اُسے صدائیں دیتا ہوا گلی میں آیا کہ وہ
گلی میں تھی ——

وہ دوڑ رہی تھی اور میں اُس کے تعاقب میں
تھا۔ کاغذ اُس کے ہاتھوں سے پھسل پھسل کر ادھر
اُدھر اُڑ رہے تھے — میں لفظوں کو پھڑپھڑاتے ہوئے
سُن رہا تھا — وہ اُڑتے ہوئے آتے اور میرے
قریب سے ہو کر نکل جاتے —۔ مگر مجھے فکر تھی کہ اگلے
موڑ پر سڑک ہے —
تو وہ گلی کا موڑ مڑ کر سڑک پہ نکل گئی
تو سڑک پہ ہم سب تھے اور سبھی بدحواس تھے۔
وہ — میں — ہجوم —۔ اور وہ لفظ کہ جنہیں میں نے
پہروں ورق ورق جوڑا —
— وہ لمحہ تو بیت گیا اب دیر ہو چکی کہ جب
سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا بدحواسی میں، میں دوڑتی
بھاگتی زندگی کو روکنے میں معروف تھا —
پھر وہ واپسی پہ جب وہ میرے کندھے سے
لگی بے طرح مچل رہی تھی میں نے وہ اوراق (جو
مل سکے) چُنے — جو سڑک اور گلی میں جا بجا بکھر گئے
تھے — اب جبکہ وہ سو چکی ہے —۔ میں پھر سے
انہیں جوڑ رہا ہوں۔
انہیں جوڑ رہا ہوں کہ جن پہ جگہ جگہ لوگوں کے
قدموں کے، سائیکلوں کے پہیوں کے، موٹروں کے
ٹائروں کے نشان ثبت ہو چکے ہیں — اور میں
دیر سے اس سوچ میں گم ہوں کہ کہاں سے آغاز کروں
— سوچتا ہوں اِن پھٹے ہوئے بے کار کاغذوں سے
اپنا ہر لفظ کہاں کہاں سے چنوں کہ جنہیں میں نے بڑے
جتن سے لکھا تھا کہ اب تو ان پر سے اک ہجوم گذر
گیا ہے انہیں روندتا ہوا — مجھے کچلتا ہوا —

"۱۹۷۹ء کے پہلے ماہ کا 'ماہِ نو' ملا۔
شہباز ملک صاحب نے "اُردو اور پنجابی کے لسانی رابطے" میں تحقیق کا ایک سچا رُخ پیش کیا۔ ان دونوں زبانوں سے ان کی سچی لگن ٹپکتی ہے۔
فیض صاحب اپنے رنگ میں فکر کرتے تو ہمیں زیادہ روشن ملتے ان کے علاوہ غزلوں میں سے

اگر افلاطون ہوتا تو یہ دماغ دانشور | اپنے کاندھوں پر رکھ لیتے سر اتار کر اس کا

قتیل شفائی

کچھ آگہی کی سبیلیں ہیں انتشار میں بھی | کبھی کبھی نکل آیا کرو غبار میں بھی

محشر بدایونی

دھندلے حروف سرد معانی نہ بو نہ باس | لفظوں نے جیسے اوڑھ لیا برف کا لباس

راشد متین

بہت خوب ہیں اور اقبال ساجد کا یہ شعر بھی خوب ہے ؎

دوست یہ بھی غنیمت ہے اس شہر میں، ڈیڑھ مرلے کا گھر ہے میسر مجھے
خیر مانگوں نہ اس سرزمین کی میں کیوں، سر چھپانے کو جس نے ٹھکانہ دیا

سیف زلفی — لاہور

علی تنہا

دور کی دیواریں

شہتیر اژدھا کی طرح بَل کھاتا رہا۔ اور آٹھوں آدمی پسینے میں نہائے ہوئے دریا کے ساتھ گھسٹتے گئے۔ ریت میں ان کے پاؤں اور اکھڑے سانس ہی گہرے نہیں تھے۔ اب دھوپ بھی ان کے برابر آگئی تھی۔ قیامت ان کے کندھوں سے اُتر کر ٹخنوں تک دندناتی پھری۔ وہ بے بسی سے پاؤں گھسیٹتے مگر سب سے پچھلا تو مرا ہی جاتا تھا اس نے پہلے تو دایاں کندھا بدلا اور پھر پوچھا۔

"کون کون جائے گا؟"

ایک غصیل آواز تھکاوٹ کی وجہ سے پٹی پٹی ہوکر چلائی۔

"کون کے بچے۔ یہ پوچھ کون نہیں جائے گا؟"

"ہاں بھئی۔ یہ کوئی پوچھنے کی بات ہوئی بھلا"

"اچھا" اس منحنی شخص نے حیا کر کہا۔

"ایک بات اور ہے"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"مولا تو جائے گا نہیں"

"باپ جی جائے گا اس کا"

"سُنیے تو"

"سُن لیا بھائی بہت سُن لیا"۔ ۔ ازیں چیخم چیخا شور کی صورت میں بلند ہوئیں۔

"پر اس کی بیوی کے تو ماتا نکلی ہے"

"سچ رے مولا"

مولانے نیچے ہو کر کندھا مروڑا

"باپ رے باپ گیا میں تو"

سب رُک گئے۔

"دیکھو بیٹا اب رُکنا نہیں ـــ سنا" مولانے سر ہلا کر ساتوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ان کے متوازی پانچ دوسرے آدمی نسبتاً چھوٹے شہتیر کو اٹھائے جا رہے تھے۔ ان کے سامنے آکر سب نے نعرہ بلند کیا۔

"خیر مولا کی خیر۔ ۔ ۔"

ایک اور لڑ ان کے آگے تھا۔ لیکن ان میں اکثر لوگ خاموش تھے۔ کچھ دیر کو وہ بھی چپ سادھ گئے۔ یہاں تک کہ دریا بھی سر نہوڑا کر چلتا رہا۔ البتہ پانی میں کوئی مچھلی ابھرتی تو وہاں ہلکا سا تموّج پیدا ہوتا۔ لیکن پھر وہی ساکن پانی اور اس کے کناروں پر دور تک بَل کھاتی کھیتیوں کی نیلاہٹیں۔ دریا کے ہلکے نیلے رنگ میں بادلوں کی بھوری اور سفید کترنیں جھانکتی جا رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے تعاقب میں اور ہر بار ایک نیا بہروپ بھرنے کے شوق میں باؤلی۔ ایک ارغوانی بدلی پہلے ہرن بن کر دریا کے اوپر بہت ہی اوپر دوڑاکی۔ اس سے اکتائی تو گھوڑے کی شکل میں قلعے کے اوپر جھانکنے لگی۔ معاً اس گھوڑے کا سوار قلعے میں گم ہوگیا۔ گھوڑے کے بے چین کان پھڑپھڑائے اپنے مالک کو پیٹھ پر نہ پاکر وہ ہاتھی کے کینڈے میں بدل گیا۔ اب وہ یقیناً قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ یہاں تک کہ بدلی کا یہ ہاتھی سورج کے متوازی دریا کے عمیق جنگلوں میں چھپ گیا۔ اس بڑی بدلی کے پیچھے سرمئی اور ارغوانی بدلیوں کا جتھہ بھی بھاگ رہا تھا۔ ان کے سروں پر جیب سایا فگن ہوا تو کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سب لوگ ایک طرف بھاگ رہے تھے۔

نرم اور لجیلی ریت پر مولا سسکیاں بھر رہا تھا۔

"آج تو دن ہی ایسا نکلا ہے" سرطانی ہاتھوں والا شخص اس پر جھکا۔

"چوٹ زیادہ تو نہیں لگی"

مونڈھا اتر گیا ہے کاکا"

"سلطو بھائی" اس نے آواز لگائی۔

موالی دانتوں میں گنے کی چھل پھنسا کر سلو بولا ___!

"مونڈھا اتر گیا ہے نا"

"ہاں بھائی ہاں"

جب مولا کو سہارا دے کر لے جانے لگے تو ان کے چہروں پر بدحواسی کھنڈ گئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مطعون کر رہے تھے۔ شہر میں آج پیر کا وعظ تھا۔ لوگ بڑی حویلی کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے لباسوں کی تراش خراش اور کانوں میں خوشبو کے پھریرے یہ سب کچھ اس دن سے خاص تھا۔ مولا کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے وہ جھنجھلاہٹ کے عالم میں تھے۔ اس بابرکت دن ہی مولا پر پھٹکار پڑنا تھی۔ وہ دونوں لمبے لمبے قدم اٹھاتے لیکن مولا ان کے ہاتھوں میں ریشمی تھان کی طرح پھسلتا۔ ایک بار تو مولا بس رک ہی گیا۔

"دیکھ مولا قدم نہیں اٹھاؤ گے تو پھر ہم رہے ہیں۔"

"میں مر رہا ہوں"۔ مولا کی گھیرے دار قمیض نے پھیری لی۔ اپنے جسیم کاٹھ اور گراںڈیل آواز میں شاید پہلی بار منت سماجت پر اتر آیا تھا۔

"لیٹنے نہیں دو گے" ذری کی ذرا۔

دونوں نے سن کر مولا کے گرتے جسم کو تھام لیا۔

"ہمت باندھو۔ گھر آیا ہی تو کھڑا ہے"۔ مولا نے عزا کر میلی آنکھوں سے دیکھا اب ہو بھی کیا سکتا تھا، پٹرول پمپ کی نیلی عمارت سے گزر کر وہ پرانی گلی میں آ گئے۔ تنگ گلی میں جھبرے کتے کے سوا کوئی نہیں تھا ایک پرانے دروازے کی چولیں چرمرائیں اور کسی نے جھانک کر دیکھا۔ بوڑھی عورت تھی۔ پوپلے منہ میں کچھ بھنبھنا رہی تھی۔ اس کے پیچھے دیوار پر چڑھی ہوئی انگور کی ہری بیل تھی۔ مولا نے پوچھا۔
مائی تو

"میں پانی نہ پی لوں؟"

"پانی گھر چل کر ہی پیئیں گے اب فاصلہ ہی کیا رہ گیا ہے"۔

بائیں طرف والے بلند قامت شخص نے لاپروائی سے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

"مولا سردیوں میں غضب ہی ہوتا ہوگا یہاں تو...؟"

"اور نہیں تو"

"پھر یار" اس نے اپنی اٹنگی شلوار اوپر کھینچ کر کہا" یہ لوگ دھوپ کیسے سینکتے ہوں گے؟"

"سینک لیتے ہیں بھئی؟" دوسرے نے از خود جواب دیا۔

مولا نے نئے اودے رنگ کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس سے آگے والا چوتھا مکان اپنا ہے"۔

ایک عورت نے بنا دیکھے لسی بھری بالٹی بیچ راستے میں انڈیل دی۔ لسی کی اچھاند سے مولا کو ابکائی آتے آتے رہ گئی۔

"ببرو میری کمر میں اینٹھن ہو رہی بہت زوروں کی ___!"

"سب ٹھیک ہو جائے گا مولا۔ فکر نہ کرو"

"فکر نہ کروں تو پھر..." مولا نے اپنی لمبی اور مضبوط ہتھیلی کو پھیلا کر بازو کو حرکت دینا چاہی۔ مگر اس کی ستواں ناک سے پانی بہنے لگا۔

"خلا مو" مولا چلایا۔ ایک بچے نے تیتری کی سی اڑان بھرتے بھرتے مڑ کر دیکھا۔ اور پھر وہیں کا وہیں رہ گیا۔ مولا نے رک کر بڑی ملائم آواز میں کہا، "یہ میرا بچہ ہے"۔ پھر اس نے ادھ گودڑ کپڑوں میں ملبوس بچے کو اشارہ کیا۔ لیکن وہ مولا کے بولنے سے پہلے ہی وہ نپٹ مڑ کر پوچھنے لگا۔

"بابو یہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں بیٹا۔ تم کہاں جا رہے تھے؟"

"نبیٹے لینے بابو"

"نبیٹے کے بچے۔ ماں اکیلی نہیں تمہاری؟"

"کہتی ہے بابو" بچے نے روہانسا ہو کر اجنبیوں کو تاکا" کہتی ہے میرے پاس نہ آؤ ___ مانا... ن...؟"

وہ تو کہے گی مگر تم..." بچے نے قمیص میں منہ چھپا کر ہولے ہولے رونا شروع کیا۔

"چل ہٹ یہاں سے"

ہوا سنکنے لگی۔ بدن سے چپکے ہوئے کپڑوں کے اندر گویا برف کے گالے گرنے آ رہے ہوں۔ دلوں میں ایک کاہش اور بے پروائی کے جشن منانے۔

"سلامتے اس سال مکان تو نہ بنا سکو گے؟"

اس نے مولا کا ہاتھ چوم کر بتیسی نکالی۔ "ہاں یار" "مکان تو بن ہی جائے گا کبھی" اس نے تتلا کر راں کھجائی "مگر یار پہلے شادی تو ہو لے اپنی"۔

"شادی" مولا نے مکان میں داخل ہونے کا اشارہ کیا "ہاں یار شادی تمہاری پہلے ہوئے پھر"

مکان میں داخل ہونے پر لگا کہ ایک قبرستان ہے۔ جہاں سناٹے کے سوا یہاں کچھ رہا ہے، ہی نہیں۔ اس کی بیوی گودڑ بستر میں چھپی تھی بچے نے دیوار پر انگلی پھیر کر مولا کو خشمگیں نظروں سے تولا اسکی آنکھوں میں پژمردگی کا سایا ابھر آیا تھا۔ دیوار سے پیٹھ جا کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ دونوں اجنبیوں کو نکلتے دیکھتا رہا۔

"بابو کون تھے یہ" عورت نے کھانس کر رعنائی

یں سے سر نکالا اور یہی سوال دُہرایا
"مجھے لائے تھے؟"
"نہیں" عورت نے حیرانگی سے پوچھا۔
"مونڈھا جو اتر گیا میرا"
عورت نے تقریباً رو کر دہرایا "مونڈھا اتر گیا ہے"۔
بچے نے خوفزدہ ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔ سرخی مائل ننھے ننھے دانے اس کے رخساروں پر یوں ہی کی طرح چمک رہے تھے۔ ماں نے پاس بلا کر چمکارا۔
"ڈر گئے تم"
"نہیں"
مولا نے بچے کے گال کلّے پر چپت مار کر کہا ــــ!
"سب ٹھیک ہے بیٹا" درد کی ایک ٹیس اس کندھے سے اتر کر پیٹھ تک آئی مولا نے کراہ کر پوچھا۔ "کسی کو بلاؤ تو"
"اللہ بڑا غفور الرحیم ہے مولا" اس کی بیوی نے سر نکال کر ہونٹ کاٹے، دیکھتے نہیں ہمارے سب دلدر چپت ہو گئے ہیں"
مولا نے بچے کو پٹ کھولنے کو کہا۔ باہر صحن میں گدرائی دھوپ اسی طرح تھی۔ کائی جمی منڈیروں پر سائے بڑھ آئے تھے۔
"سنتے ہو کیا کہا میں نے"
"سُن رہا ہوں"
"اب ستّے کی کڑھی ہو۔۔ چپل خرید لینا۔۔ اور"
"اور ـــ اور یہ تم کیا بکے جا رہی ہو"

بیوی نے لحاف کے اندر ہی سے جواب دیا
"ہم گھر ہیں تو کیا ہوا۔ پانچ ہزار ملیں گے۔ پورے پانچ ہزار"
"ارے ارے"
"باہر دیوار پر نہیں پڑھا تم نے، بس چیچک کی خبر کر دو تم ہسپتال والوں کو"
"ارے ہاں یہ تو سچ ہے" مولا اٹھ بیٹھا۔ مولا نے سوچا۔ اس طرح وہ چیلا سا لگے گا۔ پہلے کاندھا چڑھا لے۔ پھر دیکھا جائے گا۔ اُٹھ کر آئینہ اٹھا لایا۔ اور اپنے اترے ہوئے چہرے پر سوئی ہوئی بھلی خباثت کو جگا کر اس نے غلیظ گالی بکی۔ مگر کچھ غائب تھا۔
"کہاں گیا وہ کمینہ"
"جانے دو اُسے۔ میری بُو اچھی نہیں"
"ہاں یہ بھی سچ ہے" مولا کے سامنے پانچ ہزار روپوں کی گڈی ناچی۔ اُس نے اترا کر بیوی پر جھک کر کہا۔
"بلو۔۔۔۔"
مولا نے چارپائی پر چت لیٹ کر گانا چاہا لیکن گانے کی جگہ آناً فاناً پانچ ہزار روپوں نے لے لی اور پھر گویا مکان کی چھت تبدیل ہو گئی۔ نئی کھڑکیاں اور دروازے لگ گئے۔ تازہ برادے کی مہک اُسے بچپن سے پسند تھی۔ شہتیر آرے سے چیرے جاتے۔ مولا گھنٹوں بیٹھا انہیں بڑی شکتی سے تکتا رہتا برادہ جھڑ جھڑ کر ڈھیری کی شکل میں زمین پر جمع ہوتا رہتا ایک بار سردیوں میں بہت ہی بڑا اور نئی شہتیر چیرا جا رہا تھا۔ وہ آرا چلانے والے کے بالکل پہلو میں بیٹھا تھا کہ آرا اٹک گیا۔ آراکش بڈھے نے کھانس کر دریا کی طرف اشارہ کیا۔ ماہی گیر کشتی میں ایک بڑی ڈولفن مچھلی کو آنکڑے میں پھنسانے کے بعد کشتی پر رکھنے کے جتن کر رہے تھے۔ ڈولفن بپھری شیرنی کی طرح دریا کے پانی کو پھاڑ رہی تھی۔ پانی میں کئی بار شگاف پڑے اور لمبے چمکتے گلیھڑوں کے ساتھ ہی بوڑھا ماہی گیر کشتی کے دنبالہ سے بندر کی طرح چمٹا ہوا زور لگا رہا تھا۔ کشتی دیر تک ڈولتی رہی۔ آخر کار مچھلی سرد ہو کر رہ گئی۔ آرا پھر چلنے لگا کالی لکیر کو تیزی سے چیرتا ہوا آرا اپنے دندانوں سمیت جھکاؤ کی طرف کھسکتا آ رہا تھا۔
مولا نے پھسکڑا مار کر ان جیدی آراکشوں سے نظر اٹھائی۔ وہ تو ازل سے آرے پر جھکے ہیں اور لکڑیوں کے ساتھ اپنے مقسوم سے ہوئے دنوں کو بھی کاٹتے جا رہے ہیں۔ آرا ایک بار پھر رُک گیا۔ نیچے والے آراکش نے پاؤں پسار کر انگلی کے گرد پٹی مضبوطی سے باندھی۔ اور کلہاڑا اٹھا کر لکڑی کی گانٹھ پھاڑنے لگا۔ دوسرا بڈھا آراکش ریت میں پاؤں دھنسائے گل مچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔
"شیر دیکھا ہے کبھی" بڈھے نے خلافِ توقع پوچھا
مولا نے نرگسی آنکھوں میں موتی بھر کر سر ہلا دیا۔
"کہاں"
"سرکس میں"
"لو جناب ہم نے کہاں دیکھے شیر ــ پتہ ہے؟" بوڑھے نے اپنی ٹوپی کا پھندنا کھینچا۔
"چڑیا گھر میں ایک سے ایک بڑا شیر۔ کیوں بھائی گئے ہو تم بھی تھے نا"

گاسپے نے آرے کے دندانوں پر پھاہے سے تیل چپڑتے ہوئے جواب دیا۔

"بالکل جی"

"او جناب — یہ بڑا سر۔ اور دم میں یہ گول پھندنا کیوں جی گاسپے تم نے بھی دیکھا تھا نا"

گاما تیل کی بوتل کے پیندے کو اٹھا کر کے تیل کا آخری قطرہ نکال لینا چاہتا تھا۔ بوتل خالی تھی اور دھوپ میں اس کی شعاعیں سیدھی مولا کی آنکھوں میں گڑ رہی تھیں۔ اتنی تیز دھوپ — مولا نے اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اب واقعی دھوپ دریا سے اتر کر کمرے میں ہانپتے سانس بھرتی جا رہی تھی۔ مولا نے اٹھ کر میاں جی کے دروازے پر آواز دی۔

"میاں جی ہیں کیا"

"ہسپتال گئے ہیں"

"خیریت تو تھی"

عورت نے رسان سے جواب دیا "مولا کی بیوی کے چیچک نکلی ہے نا — اس کی اطلاع دینے"

مولا نے اگلا فقرہ پورا کرایا۔ "پانچ ہزار کا انعام لینے"

"جی" عورت نے آواز پہچان کر پشیمانی اور کچھ بے خبر بن کر کہا۔

"دیر کتنی ہوئی بھلا"

عورت نے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا "آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا"

"آدھ گھنٹہ" مولا کو اپنا دل دھڑکتا نہیں مل رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کی قطار گریبان میں سوراخ کرتی جا رہی تھی۔ دو قدم چلا ہی تھا کہ اس کا سر چکرانے لگا۔ سر میں چراچراتا ہوا آرا گذرنے لگا۔ اُسے لگا آج پھر وہی بڈھا آراکش اس کے سر پر آرے کے دندانے رکھے پوچھتا ہے۔

"شیر دیکھا ہے کبھی"

آرا تیز چلنا شروع ہوا۔ دیوار کا سہارا لے کر اس نے بے چارگی سے اپنے دروازے کی طرف دیکھا۔ ڈیوڑھی کی پرانی محراب پر نیل کنٹھ اپنی چونچ سے اینٹ بجا رہا تھا جونہی ایمبولینس کا شور بلند ہوا۔ نیل کنٹھ اڑ گیا۔ مولا نے دیدے پھاڑ پھاڑ کر پہلے تو یقین کرنا چاہا کہ سفید نقطہ ہے یا ایمبولینس اسی شش و پنج میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر بے بسی سے دیوار کا سہارا لینا چاہا — لیکن دیوار بہت دور تھی۔

"ماہِ نو کے سابقہ چند ماہ کے شمارے طالب قریشی صاحب کے بک سٹال پر نظر سے گذرے اس ہیجانک دور میں ادب کا اس قدر ضخیم اور بلند معیار رسالہ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ آپ کی ترتیب اور درخشاں دماغ نے 'ماہِ نو' کا معیار ایک قابلِ تحسین سطح پر لا کھڑا کیا ہے"

شاہد لطیف فیروز پوری —— جہلم

عذرا اصغر

آخری لڑکی

"میری زندگی میں آنے والی وہ اٹھارویں لڑکی تھی۔

"ارے! آپ چونکتے کیوں ہیں؟ کیا عشق کرنا گناہ ہے؟"

"جی ہاں! میں عشق کو عبادت کا درجہ دیتا ہوں اور یوں بھی عشق میں تسلسل قائم رہے تو انسان جوان رہتا ہے۔ جوانی کیا ہے؟ جذبات میں اُمنگ اور طبیعت میں ترنگ ہو تو انسان کبھی بوڑھا نہیں کہلا سکتا۔ اور صاحب ایک اُمنگ بھرے دل میں عشق کا ہونا لازمی ہے۔ شادی وادی تو محض زندگی کو روگ لگا لینے کا نام ہے۔

اب ایک لڑکی تو ساری زندگی ساتھ چل نہیں سکتی۔ کسی کی اچانک سگائی ہو جاتی ہے تو اسے چھوڑنا پڑتا ہے اور کوئی خود اپنا گھر اپنے والدین کی مرضی کے مطابق بسا لیتی ہے۔ کوئی ساتھ چلتے چلتے اچانک معاشرے کی قید و بند کا شکار ہو جاتی ہے اور کسی کے آڑے خاندان کی لاج آ جاتی ہے۔ اب آپ ہی کہیئے! انسان کو جذبات کی بقا کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا نا ——؟ اور یہ تو ویسے بھی پرانا فارمولا ہے کہ عشق زندگی میں صرف ایکبار ہوتا ہے۔ اس ترقی یافتہ دنیا میں یہ فرسودہ باتیں ہرگز نہیں جچتیں۔ انسان فطری طور پر تنوع پسند واقع ہوا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی چیز پر تکیہ کر کے عمر گزار دی جائے؟ تازہ پھولوں جیسی شگفتگی باسی پھول میں بھلا ممکن ہے۔ خوبصورتی انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اس سے دل بہلانا حضرتِ انسان کا حق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے نظریئے سے متفق ہوں گے۔

ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ میری زندگی میں داخل ہونے والی اٹھارویں لڑکی تھی۔ اس کا نام مہ جبیں تھا۔ مگر وہ مہ جبیں تھی نہیں۔ چلئے چھوڑئیے! ناموں کا کیا ہے نام تو کچھ بھی رکھے جا سکتے ہیں —— اور مجھے رنگ روپ یا نام سے لینا بھی کیا تھا۔ عشق تو اندھا ہوتا ہے۔ آپ نے کیوپڈ والا قصہ تو ضرور سنا ہوگا —— اگر ایسا نہ ہوتا تو مجنوں صاحب لیلیٰ پر نہ مر مٹے ہوتے۔ سنا ہے لیلیٰ صاحبہ دل بھر کر سیاہ تھیں۔ مگر مجنوں میاں نے ان کے عشق میں کیا کچھ پاپڑ نہ بیلے —— مہ جبیں تو بس ذرا سانولی سلونی سی خاصی دلکش لڑکی تھی۔ جو کھلکھلا کر ہنستی تو یوں لگتا جیسے تاریک رات میں اچانک بہت سے جگنو چمک اٹھے ہوں یا یکایک موتیا کی بندکلیاں چٹک گئی ہوں۔ اس کی ہنسی بڑی دلفریب تھی۔ اور سچ پوچھئے تو میں اس کی ہنسی پر ہی دل ہارا تھا۔ یوں بھی اس کا سراپا توجہ جذب کرتا تھا۔ وہ عجیب ہی لڑکی تھی —— اس سے پہلے جو سترہ لڑکیاں میری زندگی میں آئیں۔ کوئی دشواری مجھے ان کے ساتھ پیش نہ آئی تھی سوائے ایک لڑکی کے مگر مہ جبیں عجیب لڑکی تھی —— اس سے میری ملاقات —— جی ہاں! پہلی ملاقات ایک مقامی اخبار کے دفتر میں ہوئی۔ اس سے پہلے میں اخباروں میں اس کے مضامین پڑھ چکا تھا اور اس کی شاعری بھی میری نظر سے گذری بالمشافہ اس سے یہ پہلی ملاقات تھی —— حسن رضا نے ملوایا۔

"یہ مہ جبیں ہیں۔"

"آپ سے ملاقات میری خوش نصیبی ہے۔" میں تعظیماً کھڑا ہو گیا۔

"ارے آپ بیٹھئے نا۔ پلیز!" اس کی سیاہ آنکھیں بےحد پرکشش تھیں۔

"آپ اتنے دن بھلا کہاں روپوش رہیں؟" میں نے اپنے مخصوص انداز میں گویا شکوہ کیا۔

"مطلب!" وہ حیرت زدہ سی مجھے تکنے لگی۔ "میں تو کبھی روپوش نہیں ہوئی۔"

"اب جو بے نقاب ہو گئیں۔ تو کافی نہیں اور اس سے پہلے تمہیں فرصت ہی بھلا کہاں تھی" یاسین رضا نے میری بات کو انجوائے کیا۔

وہ میرا لنگوٹیا دوست تھا اور قریب قریب میری ہر محبوبہ سے واقف تھا —— میں نے اس کی بات

کا لطف لیتے ہوئے کہا۔

"دوست! فرصت تو انسان کو خود نکالنا پڑتی ہے"

"تو کیا پتہ اس سے پہلے تم فرصت نکال پاتے بھی یا نہیں" حسن رضا ہنسا۔ اس کا اشارہ صاف سعیدہ کی جانب تھا، جس کے پچھلے دنوں میں ناز اٹھانے میں ہمہ وقت مشغول رہتا تھا۔ مگر شاید حسن رضا کو علم نہ تھا کہ ان دنوں میں سعیدہ سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ میں نے اسے مطلع کئے بنا کہا۔

"بھائی یہ تو ملنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کتنا اہم یا غیر اہم ثابت ہوتا ہے۔ جب تک ہم کسی سے ملے نہ ہوں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں"

مہ جبیں اس دوران دلچسپی سے کبھی مجھے اور کبھی حسن رضا کو دیکھتی رہی۔

میں نے اس کو مخاطب کر کے کہا۔

"کچھ آپ بھی بولئے نا۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں" وہ بولی۔

"آپ خاصی دلچسپ گفتگو کرتے ہیں"

"تشکر" میں آداب بجالایا۔ حسن رضا نے کہا۔

"ارے جناب یہ حضرت خود بھی بہت دلچسپ شخصیت ہیں آپ ذرا نظر کرم تو کیجئے۔ بہت گنوں کے مالک ہیں"

"اب نہیں تو میں آداب کرنے سے رہا" میں نے کہا "مہ جبیں صاحبہ کی بات دوسری ہے"

"جی ہاں! میں سمجھتا ہوں" وہ ہنسا

"اچھا اب میں چلتی ہوں" مہ جبیں ہاتھ پہ بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے اتنی جلدی" میں بھی کھڑا ہو گیا۔

"جی! بہت دیر ہو گئی" وہ بولی

"لمحے کتنی تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا وقت کا" میں نے کہا۔

"اکثر لمحے یہ ستم ظریفی کر جاتے ہیں" حسن رضا بولا۔

مہ جبیں نے گہری گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور جانے لگی۔ میں نے کہا۔

"سنئے!" وہ ٹھہر گئی۔

"پھر کب اور کہاں ملاقات ہو گی" میں نے بیتابی سے پوچھا۔

"جہاں قسمت ہو گی" وہ ہنسی اور موتیا کی بہت سی ان کھلی کلیاں فضا میں بکھر گئیں۔ وہ بے نیازی سے پرس جھلاتی کمرے سے نکل گئی۔

میری نظریں اس کا تعاقب کر کے واپس پلٹیں تو میں نے دیکھا۔ حسن رضا ہنس رہا تھا۔ بولا

"یار تم بھی عجیب شے ہو"

"کیوں" میں نے پوچھا

"ہر لڑکی کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنے کے تم عادی ہو مگر یاد رکھو، یہ تمہیں سبق سکھائے گی۔ بڑی تیز چیز ہے" اس نے کہا۔

"تم فکر ہی نہ کرو دوست۔ اپنے پٹارے میں سب گر موجود ہیں" میں نے اسے یقین دلایا۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں۔ میں ان دنوں سعیدہ کو رخصت کر کے فارغ تھا۔ بے کار اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے زندگی بدمزہ ہو گئی ہو۔ بیتے اچھے دنوں کی پرچھائیاں میرے ساتھ ساتھ تھیں۔ اس مختصر زندگی میں کئی خوبصورت گھڑیاں آئی تھیں۔ جو تنہائیوں کی رفیق تھیں۔ انہی خوبصورت گھڑیوں میں ایک پل عارفہ کی رفاقت کا بھی تھا جو مجھے بھولتا ہی نہ تھا۔ عارفہ میری مرجھائی ہوئی زندگی میں بہار کا ایک جھونکا تھی۔ خوشبو کا ریلہ، جو میری باقی ماندہ زندگی کو معطر کر گیا تھا۔ عارفہ سے بچھڑ کر میں گویا دیدہ رہ گیا۔ اس جیسی لڑکی نہ مجھے اس سے پہلے کہیں ملی تھی اور نہ اس کے بعد ملی۔ اگر آپ مجھ سے سچ پوچھیں تو میں کہوں گا کہ عارفہ درحقیقت میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ وہ بھگوان تھی اور میں اس کا پجاری۔ وہ میرے دل کی شاخ پر پہلی کونپل تھی۔ آپ نے کبھی دیکھا! جب کسی ننھے منے پودے پر پہلے پہلے پتے پھوٹتے ہیں تو ان کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟

کچا کچا ہرا یا کومل کومل سرخی مائل سبز۔ بس عارفہ میرے دل کی شاخ پر پھوٹنے والی محبت کی پہلی کونپل تھی۔ نرم نرم نازک سی۔

عارفہ سے مل کر پہلی بار میں عورت کی ذہانت کا قائل ہوا۔ وہ قدرت کی صناعی کا ایک مکمل اور بھرپور شاہکار تھی۔ اور میں قدرت کے اس شاہکار کی پرستش کرتا تھا ــــ "خدا کی وحدانیت کے اقرار کا یہ بھی تو ایک انداز ہے نا؟"

عارفہ سے مل کر میری بے ربط زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ مگر دیکھئے نا۔ زندگی جمود کا نام نہیں ــــ زندگی تو تحریک ہے ــــ مسلسل حرکت۔ ٹھہراؤ کہیں بھی نہیں ــــ عارفہ تو پاگل ہے کہ میرے نام کی مالا جپ رہی ہے۔ مگر میں بھی اسے بھولا تو نہیں ــــ بھول سکتا ہی نہیں ــــ زندگی کی بقا کے لئے ــــ اپنی سلامتی کی خاطر ــــ جذبات کی رَو کو آگے بڑھانا پڑا۔ میں حرکت کا قائل ہوں، ٹھہراؤ کا نہیں جمود سے مجھے خوف آتا ہے۔ اور عارفہ سے مل کر میری

بے ربط زندگی میں ایک ٹھہراؤ آگیا تھا ـــــ ترتیب پیدا ہو گئی تھی۔ اسی لئے ...... اسی لئے میری زندگی میں سعیدہ در آئی ـــــ شگفتہ، ساجدہ اور ...... اور یہ اٹھارہ برس کی لڑکی مہ جبیں تھی، جو چپکے سے میرے دل پر پاؤں دھرتی ہوئی گذر گئی تھی۔ میں ہفتہ بھر دل کی چوٹیں سہلاتا رہا۔

وہ حلقے میں مضمون پڑھ کر اسٹیج سے نیچے اتر رہی تھی۔

"ہیلو" میں نے اشتیاق سے اسے دیکھا۔

"ہیلو" وہ بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ اور میں خفیف سا بیٹھا رہ گیا۔ دل کی چوٹیں درد کرنے لگیں۔ حسن رضا نے کہا۔

"یار چھوڑو کس کے چکر میں پڑ گئے۔ کوئی اور لونڈیا دیکھو"

مگر اس کی بے رخی نے میرے جذبات کو مشتعل کر دیا تھا۔ میں اس طرح نظر انداز کئے جانے کا ہرگز عادی نہ تھا۔

"میں اسے رام کر کے ہی دم لوں گا" میں نے فیصلہ کیا۔

جانے کیوں وہ میری انا کا مسئلہ بن گئی تھی۔ میں نے اسے خط لکھا اور ایک غزل کی فرمائش کی ـــــ چند روز بعد اس کا جوابی خط مجھے مل گیا۔ اگرچہ غزل کے لئے اس نے معذرت کر لی تھی مگر سلسلۂ خط و کتابت جاری ہو چکا تھا۔ دو چار خطوں کے تبادلے کے بعد وہ لمحہ بھی آگیا۔ جب وہ میرے مقابل بیٹھی اپنی سیاہ و پرکشش آنکھوں سے میری تمام تر توجہ جذب کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"تم سب لڑکیاں ایک جیسی بے وفا ہوتی ہو اور ہم ـــــ احمق مرد۔ ہر بار بہکاوے میں آجاتے ہیں۔ اب دیکھو سعیدہ، شگفتہ اور ......"

میں ہر نئی لڑکی سے پہلی والی لڑکی کا تعارف ضرور کراتا ہوں۔ سب لڑکیاں خود کو ہر پہلی لڑکی پر سبقت لینے کی کوشش کرتی ہیں۔ خود کو پہلی والی لڑکی سے زیادہ اچھا، زیادہ شفیق اور زیادہ مہربان ثابت کرنے کی جدوجہد کرتی ہیں۔ ہر دوسری لڑکی، پہلی لڑکی کی باتیں دلچسپی سے سنتی تو یوں لگتا۔ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو اور اس جیسی بے وفائی کی مرتکب یہ نہیں ہو گی۔

"اُف! کیسی ظالم تھی وہ نامراد لڑکی۔ اچھا تم فکر نہ کرو میں تمہارے سب غم اپنی جھولی میں سمیٹ لوں گی" ان کی آنکھوں کے پیغام میں پڑھتا اور محظوظ ہوتا۔ "بیچاری لڑکیاں" میں سوچتا۔

"ہر لڑکی آخر محبت کے چند رٹے رٹائے، جھوٹے سچے لفظوں کی اس قدر بھوکی کیوں ہوتی ہے۔ ذرا آپ ان کے ہونٹوں کی، رنگ روپ یا آنکھوں کی تعریف کیجئے اور وہ ہوئیں ریشہ خطمی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟"

اکثر میں نے اُلجھ کر سوچا۔ "یہ بھی تو کچھ مدافعت کریں۔ مگر نہیں۔ ہر لڑکی ایک ہی جیسی ہوتی ہے اور عارفہ کی تو بات ہی اور تھی۔ عارفہ تو نام ہی انفرادیت کا ہے۔ مگر سب لڑکیاں تو عارفہ نہیں بن سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ میں صنفِ نازک کے معاملے میں خاصا لاپرواہ بن چکا ہوں۔ بہت مدت بعد مہ جبیں سے فضا اچھی ہوئی۔ اس کی آنکھوں کی ذہانت نے مجھے اکسایا اور اس کی حاضر جوابی نے گدگدایا تو دل خواہ مخواہ اس کے قرب کے لئے مچل اٹھا۔ مگر وہ کمبخت خاصی گھاگ نکلی۔

اس روز حسن رضا کے کمرے سے وہ اس طرح مجھے نظر انداز کر کے اُٹھی جیسے اس کی نگاہ میں میری کوئی وقعت ہی نہ ہو ـــــ پھر کیا ہوا؟

یہی نا کہ میرے چند رقت آمیز جملے اسے پگھلا گئے۔

میں کہہ رہا تھا۔ اور وہ سامنے بیٹھی تھی۔

"سب لڑکیاں ایک جیسی نامہربان ہوتی ہیں سعیدہ کو دیکھو ......"

"گھر میں جب نئی نوکرانی آتی تھی تو اماں بی ہمیشہ اسے پہلی والی نوکرانی کی خامیاں اور خوبیاں بتایا کرتی تھیں۔ اور نئی نوکرانی پوری سمجھداری سے ان باتوں کو اپنے ذہن نشین کر لیتی تھی۔ کچھ یہی کیفیت میری تھی ـــــ میں جب اپنی کسی نئی محبوبہ کو پہلی محبوبہ کا قصہ سنا رہا ہوتا تو جانے کہاں سے میرے ذہن کے پردے پر گھر کی فضا ابھر آتی۔ اور سامنے بیٹھی میری دلربا سی محبوبہ گھر کی نوکرانی کا روپ دھارن کر لیتی اور میں گویا اماں بی بن جاتا۔

یہ گُر میں نے شاید انہی سے سیکھا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اپنی اس کیفیت پر میں ہنسی ضبط نہ کر سکا اور بے ساختہ ہنسنے لگا۔ مہ جبیں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بھی یہی ہوا۔ وہ حیرانی سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔

"عجیب آدمی ہو! لوگوں کی بے وفائی پہ ہنستے ہو"

میں نے بمشکل ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"جانِ من! یہ دنیا عجائب خانہ ہی تو ہے۔ میں خود پر قہقہے لگا رہا ہوں کہ کیسا پاگل ہوں۔ بار بار فریب کھاتا ہوں اور پھر دامِ فریب میں گرفتار ہو جاتا ہوں"

لڑکیوں کے لئے میرا یہ رقت آمیز، حقیقت پہ مبنی کلمہ بہت موثر ہے۔

اکثر لڑکیاں اسی لمحے پکے ہوئے پھل کی مانند ٹوٹ کر میری جھولی میں آگرتی ہیں اور جب تک میں چاہتا ہوں لذتِ قلب و نظر حاصل کرتا رہتا ہوں۔ پھر وہی ہوتا ہے۔ جو ہر پکے پھل کا مقدر ہے۔ کوڑے کا ڈھیر ـــــ بے مقصد ـــــ بے معنی ـــــ"

مہ جبیں کے سامنے میں نے لڑکیوں کی بے وفائی پر (طلعت) خوب خوب تنقید کی۔ وہ بے حد جوش سے لڑکیوں کی طرفداری کرتی رہی۔ میں نے بے حد شائستگی اور خوابصورتی کے ساتھ اسے نظر انداز کیا۔

"یہ ٹھیک گر ہے۔ عورت نظر انداز ہونا کبھی پسند نہیں کرتی۔ آپ اس کی طرف بڑھئے، وہ پیچھے ہٹ جائے گی ـــــ آپ آگے بڑھ جائیے وہ آپ کے تعاقب میں دوڑے گی۔ یہ حربہ بڑا کامیاب ہے۔"

مہ جبیں پر میں نے یہ حربہ آزمایا اور پھر اسے ہموار پا کر بولا۔

"مہ جبیں! تم چاہو تو بُرا بھی مان سکتی ہو اور مجھ سے روٹھ بھی سکتی ہو کہ یہ حق میں تمہیں دے چکا ہوں مگر وہ بات جسے کہنے کے لئے میں مدتوں سے مچل رہا ہوں آج کہہ کر ہی دم لوں گا۔"

"تو کہہ ڈالیے نا۔ منع کون کرتا ہے۔" وہ بولی۔

"ڈر سا لگتا ہے بس تمہیں سنا یکٹنگ کی"

"کس سے؟" وہ بولی "کیا مجھ سے۔"

"نہیں اپنی قسمت سے۔"

"تو کیا ایسی کوئی خوفناک بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں! بات تو خوبصورت ہے۔"

"پھر کہئے کہ مجھے خوبصورت باتیں سننا پسند ہے"

وہ بولی۔

"میری زندگی میں اب تک جتنی بھی لڑکیاں آئیں وہ سب تو تمہارے قدموں کی دھول تھیں۔ تم ان سب میں منفرد ہو۔"

میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ اٹھا دیں بار بولا۔

"بس! اتنی سی بات تھی۔" وہ بظاہر بے نیازی سے بولی۔ مغرور کا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔

"پتہ نہیں کیوں پہلی بار تم سے مل کر اس قدر بے چین رہا۔ پہلی ہی نگاہ میں تم میری زندگی کا حاصل بن بیٹھی تھیں۔ کیا جادو ہے تمہارے پاس؟" میں نے پوچھا

"اپنے بارے میں کبھی تم نے سوچا ہے۔" وہ بولی۔

"تم بتا دو نا۔"

"تم خود کتنے بڑے جادوگر ہو۔ تمہیں پتہ ہے؟"

اس نے جیسے شکوہ کیا۔

"اس جادوگر کا تم پر تو کوئی جادو چلا نہیں۔"

میں نے کہا۔

"تم کیا جانو۔"

"اچھا تو ایسی بات ہے؟" میں اس کے قریب کھسک آیا۔ اس نے قطعی بھی مزاحمت نہیں کی۔ بولی۔

"میں بہت اٹل ـــــ سنگلاخ چٹان تھی۔"

"اب ٹوٹ گئی ہو؟" میں نے پوچھا

"ہاں! ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہوں۔"

میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ یکدم جھٹکا کھا کر صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ کیا کرتے ہو۔" اس نے خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا۔

"کیا کوئی غلطی ہو گئی؟" میں نادم سا ہو گیا۔

"جانتے ہو یہ ہاتھ ـــــ جس پر تم مہر محبت ثبت کرنے چلے تھے، میرے دائرۂ اختیار سے باہر ہے اور میں خیانت کی عادی نہیں ہوں۔" وہ بولی۔

"مطلب ـــــ میں سمجھا نہیں۔"

"میں سمجھائے دیتی ہوں مطلب۔" وہ بولی "ان ہاتھوں کو چومنے کا حق صرف میرے بچوں کو ہوگا۔"

"کہاں ہیں وہ؟" میں حیران ہو کر بولا

"جب ہوں گے۔" اس نے کہا

"اوہ ـــــ" میں جیسے اس کی بات کا قائل ہو گیا۔ اور بے خود ہو کر اسے اپنی آغوش میں کھینچا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالوں میں چھپائے زار زار رو رہی تھی۔ میں گھبرا گیا۔

"مہ جبیں؟" میں نے پکارا

"ڈارلنگ پلیز بتاؤ نا کیا ہوا؟"

"خدارا بولو تو سہی۔"

وہ مسلسل سسکتی رہی ـــــ ہچکیوں سے اس کا گداز بدن لرز رہا تھا۔ میں دیر تک گم سم بیٹھا۔ اس کے ہلکورے لیتے وجود کو تکتا رہا۔ پھر اس کی پسینے سے بھیگی کمر میں ہاتھ ڈال کر بولا۔

"سنو پیاری۔"

"پرے ہٹو۔" وہ غرائی

میں واقعی لمحہ بھر کو سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ایک دم اُٹھی۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں پرس اُٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گئی ـــــ میں دیر تک اس عجیب و غریب لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ جو ایک بوسہ لے لینے پر ایسے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی جیسے میں نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہو۔ طبیعت پل بھر میں مکدر ہو کر رہ گئی تھی۔ میری شگفتہ دلی پر خزاں کی دھند چھا گئی تھی ـــــ تمام محنت اکارت گئی تھی۔

وہ عجیب سی لڑکی تھی اور اس کا عجیب و غریب تخیّل میری سمجھ سے بالاتر تھا ـــــ میں ہر آنے والی صبح اس کا رستہ تکتا۔ مشرق سے سورج انگڑائیاں لیتا ہوا اٹھتا اور دنیا کو اپنی منور کرنوں سے جگمگاتا پھر مغرب کے آغوش میں جا سوتا۔ پل پل کر کے سمے گزرتا گیا۔ دو دل کا رشتہ خاصا کبیدگی میں گزرا۔ تیسرے روز اس کا خط ملا۔

"میں نہیں جانتی تمہیں کن الفاظ سے مخاطب کروں۔ پھر بھی میں تم ہی سے مخاطب ہوں ـــــ جب میں تم سے ملی تو دل کو عجیب سی ادھیڑ بن میں مبتلا پایا۔ تم یقیناً ساحر ہو۔ اگرچہ جلد ہی تمہارا یہ ظاہری سحر ٹوٹ گیا اور میں اپنے آپ میں لوٹ آئی ۔ اگرچہ مجھے ان چند حسین لمحات کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ میری زندگی کا پہلا بوسہ، جو تم نے لیا اور جس کا حق میں نے تمہیں ہرگز نہیں دیا تھا۔ مجھے شدید ترین احساسِ ندامت میں مبتلا کر گیا۔ میں نے تم سے کہا تھا نا۔ میں خیانت کی عادی نہیں ہوں۔ میرا وجود آنے والے لوگوں کی امانت ہے۔ جسے تم نے چھو کر گناہ کیا۔ شاید تم پوچھو وہ آنے والے لوگ کون ہیں ؟

تو سنو ! وہ لوگ ہیں میرے بچے اور میرا شوہر۔ تم میرے محبوب ضرور ہو۔ میری روح پر ہمیشہ تمہارا حق رہے گا۔ تم صرف میری محبت کے حقدار تھے۔ میرے جسم کے نہیں۔ میں چاہتی تھی۔ میرے چہرے پر پڑنے والی اوّلین نگاہیں میرے بچوں کے باپ کی ہوں۔ مگر تم نے اس چہرے کو اپنی محبت بانٹنا ہوں سے دیکھا۔ وہ لب جو کسی اور کے منتظر تھے۔ تم نے انہیں آلودہ کیا۔ جس نے تمہاری محبوبیت کا بھرم کھول دیا اور مجھے ہمیشہ کے لئے تم سے دور کر دیا۔ مجھ سے ملنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔ میں اب تمہارا سامنا نہ کر پاؤں گی۔ خدا حافظ

مہ جبیں

اور اس کے بعد میں مہ جبیں سے کبھی نہیں ملا۔ بلکہ یوں کہوں تو زیادہ صحیح ہوگا کہ مہ جبیں کے بعد کوئی لڑکی میری زندگی میں نہیں آئی۔ وہ اٹھارویں لڑکی آخری لڑکی تھی۔ جو میری زندگی میں شگوفے کھلاتی آئی تھی اور پل کے پل ٹھہر کر جیون بھر کے لئے مجھے اکیلا کر گئی۔ اور اب تو میں نے عمر قید قبول کر لی ہے۔ جی ہاں ! میں جو شادی کا قائل نہ تھا شادی کر چکا ہوں۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟

تفصیلات میں جائے بغیر عرض کروں کہ اقبال ساجد جہاں زبان پر کڑی گرفت یا دیگر لوازماتِ شاعری پر زور دے رہے ہیں وہیں شاعری کے اس جزوِ لاینفک سے بے توجہی برت رہے ہیں اقبال ساجد کی شاعری کا مستقبل دھندلاتا دکھائی دے رہا ہے ـــ شہزاد احمد کا یہ شعر ـــ

میں کہ خوش ہوتا تھا دریا کی روانی دیکھ کر
کانپ اٹھا ہوں گلی کوچوں میں پانی دیکھ کر

اپنے موضوع اور جذبے کے بہاؤ کے اعتبار سے لاثانی ہے، رمان کنجاہی کی غزل اور بطورِ خاص ـــ

ہائے جن لوگوں نے بارش کی دعا مانگی تھی کل
بستیوں میں ڈر گئے وہ اُجڑ پانی دیکھ کر

مکھی پر مکھی مارنے کے کریہہ اور غیر شاعرانہ فعل کی آئینہ دار ہے، جانے لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

ماہِ نو، کا حصّۂ تراجم اُردو ادب کے قاری کا اُس دیگر شعری کائنات سے رشتہ قائم کر رہا ہے جہاں رنگ نسل، مذہب اور زبان کا تفاوت بے معنی قرار پاتا ہے جہاں صرف اور صرف شاعری ہوتی ہے شاعری وہ ایک خالص جو ہر خطے اور ہر عہد میں اپنی پہچان قائم رکھتا ہے ۔ انیس ناگیؔ اور محمد اسحاق میر کے تراجم تخلیقِ مکرّر کے مراحل سے گزرے ہیں ؟

صفدر شکیل ـــــ حیدر آباد

نوشابہ نرگس

پُل صراط

"پتہ نہیں چیزوں نے معنی و مفہوم تبدیل کرنے کا عمل کب شروع کیا تھا۔ بس اچانک ہی محسوس ہوا تھا کہ لفظوں کے معنی وہ نہیں رہے۔ درمیان سے لفظ غائب ہوجائیں تو خاموشی ایک نیا مفہوم اختیار کرلیتی ہے۔

"یہ بات تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ وہ مفہوم نیا ہے — ؟"

"ہاں میں یقین سے کہہ سکتی ہوں — یہ جھوٹ بولنے کے لئے مجھے بڑی طاقت صرف کرنی پڑی۔ پھر بھی میرا اعلان ان کانوں تک نہیں پہنچا۔"

"ضرور پہنچا ہوگا — !"

"نہیں یہ بات بھی میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ اور اس سچ کے لئے مجھے طاقت صرف نہیں کرنی پڑی۔ اگر اس نے یہ بات سنی ہوتی تو میرے جھوٹ کا رنگ اس کے چہرے پر ضرور نظر آجاتا — اس کے چہرے میں یہی تو خوبی ہے کہ ہر جذبہ بالکل الگ ہوجاتا ہے۔"

"تم اسے خوبی سمجھتی ہو۔ میں تو اس بات سے سخت پریشان ہوجاتا ہوں۔"

"تمہاری پریشانی کی اصل وجہ یہ نہیں ہے بلکہ تمہاری پریشانی یہ ہے کہ ..... ان رنگوں میں وہ رنگ نہیں ہوتا جو تمہیں شرمندگی سے بچالے۔"

"بکواس ہے تم کیا جانو — تم میرے بارے میں کیسے رائے دے سکتی ہو ؟"

"سچ کہتے ہو — میں تمہیں واقعی نہیں جانتی۔ مگر اتنا جان لو پھر تمہیں کوئی نہیں جانتا۔"

"دعویٰ کر رہی ہو — !"

"یہی سمجھ لو — !"

"بہت نامعقول ہو — غلط باتیں اتنے یقین سے کہہ دیتی ہو۔"

اتنی حیرتوں کے بعد تو آدمی کو پاگل ہوجانا چاہیئے۔

سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ وہ شخص اسے ایسی جگہ لے آیا تھا جہاں بھانت بھانت کے لوگوں کا ہجوم تھا مگر وہ خود وہاں نہیں تھا — پریشانی تو یہی تھی کہ وہ کبھی وہاں نہیں ہوتا — پھر وہ اسے وہاں کیوں لے آیا — ؟ اسے اس بھیڑ میں چھوڑ کر آخر وہ خود کہاں چلا جاتا ہے۔؟ اسے سخت غصہ آتا ہے اس کی عادت پر — کتنی بار اس کا جی چاہا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر — بس بھاگتی چلی جائے — عجیب بات یہ ہے کہ وہ جب بھی قدم بڑھانے کا ارادہ کرتی ہے وہ ایک دم آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیتا ہے۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو اس کے قریب ہی کھڑا تھا — کہیں بھی نہیں گیا تھا۔ وہ شرمندہ ہوجاتی ہے — ویسے اسے اس بات پر بھی غصہ آتا ہے کہ اتنے بہت سے لوگوں میں وہ اتنی تنہا کیوں ہوجاتی ہے۔ اس کے سامنے سے ہٹتے ہی جیسے سارا منظر بھائیں بھائیں کرتے سناٹے میں تبدیل ہوجاتا ہے ———

ایک دم اکیلے ہوجانے کا احساس بچوں کی طرح خوفزدہ کر دیتا ہے — وہ فیصلہ کرلیتی ہے، اب کبھی اس کے ساتھ نہیں آئے گی — پھر نہ جانے کیا ہوجاتا ہے — یاد ہی نہیں رہتا کہ قوسِ قزح کے یہ سارے رنگ جو اس کی مٹھی میں نظر آرہے ہیں محض کیمرہ ٹرک ہے۔

"جب میں چھوٹی تھی تو سوچا کرتی تھی اگر ہم پاؤں پلنگ سے نیچے نہ اتاریں تو ہمیں چوٹ نہیں لگ سکتی۔"

"پھر کیا ہوا ــــ؟" اس نے مذاق اڑانے والے
انداز میں آگے جھک کر کہا۔
"پھر کچھ بھی نہیں ہوا ــــ اب سوچتی ہوں کہ اس
یقین کے بعد میرا پلنگ پر ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔
پاؤں نیچے اتارتے ہی میں نے برسوں کا فاصلہ طے
کر لیا تھا۔" یہ بات اُس نے زور سے نہیں
کہی تھی۔
"تو تم دنیا دیکھنے کے لئے پلنگ سے نیچے اُتر
گئیں ــــ" اس کی آنکھوں میں ابھی تک مذاق اُڑانے
والی مسکراہٹ تھی۔
"نہیں ــــ دنیا کو اگر پلنگ پر میرے چاروں
طرف ڈھیر کر دیا جاتا تو بھی میں نیچے ضرور اترتی۔
میری طبیعت ہی ایسی تھی۔ مجھ سے نچلا بیٹھا ہی
نہیں جاتا تھا۔ اماں کا خیال تھا۔ اسی لئے مجھے
چوٹیں زیادہ لگتی تھیں۔"
"اچھا پھر تم بڑی ہو گئیں؟"
"ہاں ــــ پھر میں نے کبھی اپنے آپ کو چھوٹا
نہیں دیکھا۔"
"کیا عمر تھی اس وقت تمہاری ــــ؟"
"عمر ــــ عمر کا اندازہ مہینوں اور برسوں سے
تو نہیں لگایا جا سکتا۔"
"تم نے انگڑائی لی اور میز کے نیچے اپنے آپ کو
پھیلا لیا۔"
"و بہت تھک گئے تھے ــــ ہاں تم کیا کہہ رہی
تھیں ــــ؟"
"کچھ نہیں ــــ!" تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم
RISK لئے بغیر زندگی کو محسوس کرنا چاہتے ہو۔
دودھ پی کر بڑے ہونے میں بہت دن لگتے ہیں۔
تم نے دشوار راستہ چُنا ہے ــ پگڈنڈیاں ہمیشہ
شارٹ کٹ نہیں بنتیں ــ
یہ باتیں مجھے اس سے کہہ دینی چاہئیں۔
میں ایک نئے ارادے سے تمہاری طرف بڑھتی
ہوں۔ مگر تم اطمینان سے وہ گیت گنگنا رہے ہو
جسے تم نے اس دن یونہی ٹیپ کر لیا تھا ــ لوگ
شاید اسی لئے تم پر رشک کرتے ہیں۔ مگر میں کہتی
ہوں کہ اپنے آپ کو نارمل رکھنے میں بڑی محنت
کرنی پڑتی ہے۔
"یہ تم اس کی زبان بولنے کی کوشش کیوں کرنے لگی
ہو ــ کچھ اپنے بارے میں بھی تو کہا کرو۔"
"اپنے بارے میں ــ!" اس نے حیران ہو کر
دیکھا ــــ اپنے بارے میں جس زبان کی ضرورت
ہے وہ مجھے کبھی نہیں ملے گی۔"
"کیا آنکھیں بھی زبان کی طرح گنگ ہو جاتی ہیں؟"
میں نے اس سے سوال کیا۔
"پتہ نہیں ــ" تم نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی
کوشش کی اور ہمیشہ کی طرح ناکام ہو گئے۔ بس یہی تو
ایک چیز ہے جس پر قابو پانا تمہیں اب تک نہیں
آیا۔
میں پھر وہیں کھڑی ہوں اور وہ غائب ہے
حسبِ عادت ــــ ارادے کے بغیر میں پھر یہاں
کیسے آگئی ــ شاید مجھے بھی سوتے میں چلنے کا مرض ہو
گیا ہے۔
"لوگ کہتے ہیں نیند میں چلنے والوں کا کچھ نہیں
بگڑتا ــ بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن اگر ایسے
وقت انہیں کوئی ٹوک دے تو ــ؟"
"بڑی خطرناک بات ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں
کرنا چاہیئے ــ مذاق میں بھی نہیں۔"
"اتنا سنگین مذاق ــ کون کسی کا راستہ روکتا
ہے۔ اسی لئے تو وہ بہت مطمئن ہے۔ اسے
پریشان ہونے کی ضرورت بھی کیا ہے وہ کون
سا نیند میں چل رہا ہے۔ اس کی تو عادت ہی عجیب
ہے۔ آنکھیں کھول کر سوتا ہے اور آنکھیں بند
کر کے جاگتا ہے۔""
دیوار نے پھر میرا راستہ روک دیا۔
یہ دیوار پہلے سے یہاں تھی یا ــ"
""کوئی جن لا کر رکھ گیا ــ" اس نے قہقہہ
لگایا ــ
"دیکھو نا اگر پہلے سے یہ دیوار یہاں ہوتی
تو میں اس طرف کیوں آتی۔"
پھر وہ سوچ میں پڑ گئی ــــ ہر راستہ کا اختتام
اس دیوار پر ہوتا ہے۔ ہمیشہ وہ نئے ارادے
سے سفر کا آغاز کرتی ہے اور ہمیشہ اسی دیوار
کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے ــ کہیں ایسا تو نہیں
نئے راستے کے دھوکے میں وہ بار بار اسی
راہ پر آ جاتی ہو ــ ضرور یہی ہوگا۔ صاف ظاہر
ہے جن بھوت تو یہ سب کرنے سے رہے۔
"تو تم جنوں اور بھوتوں کی قائل بھی ہو۔" اس نے
پھر قہقہہ لگایا وہ یونہی اس کا مذاق اڑاتا ہے۔
اب اسے بھی غصہ آگیا۔ ٹھیک ہے وہ اس سے
آئندہ کوئی بات نہیں کرے گی۔ اس کے سامنے
بیٹھ کر کچھ سوچے گی بھی نہیں کہ وہ اس کی سوچ میں

آتی ہے ساتی سے پڑھ لیتا ہے ــــ اچھا ہوا اس نے اب تک اس سے کچھ نہیں کہا ــ مگر وہ کب کا سے وہ جان گیا ہو کہ وہ یہ کہنے آئی ہے کہ اس دیوار نے اس کے خوابوں کا راستہ روک لیا ہے۔ یہی بات ہے اسی لئے وہ مسلسل اتنی دیر سے اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔

"سنو تم نے اس دیوار کے بارے میں پڑھا ہے جسے یاجوج ماجوج چاٹتے رہتے ہیں. اگلی صبح جب وہ اس دیوار کو توڑ کر دوسری طرف نکل جانے کا یقین لے کر بیدار ہوتے ہیں تو دیوار پہلے ہی کی طرح ہموار نظر آتی ہے۔ تو شہزادی تم اس دیوار کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔ کہ تم تو یاجوج ماجوج کی سی استقامت بھی نہیں رکھتیں۔ سُنا تم نے ــ تم تو قدم بڑھائے بغیر پورے ایک جنم کا فاصلہ طے کر لینا چاہتی ہو۔

"فاصلے ذہنوں کی قربتوں سے مٹتے ہیں ــ" ایک عجیب سے لمحے میں تم نے کہا تھا اور میں نے یقین کر لیا تھا۔

غلط باتوں پر یقین کر لینے کی بُری عادت ہمیشہ میری نیندیں ضرور خراب کرتی ہے۔

"اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ باتیں صحیح نہیں ہیں؟"

اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کہنا چاہتی تھی میرا المیہ یہی تو ہے کہ مجھے ہر بات کا پتہ چل جاتا ہے ــــ میں جانتی ہوں کہ یہ جو کچھ مجھے نظر آتا ہے صحیح نہیں ہے ــ اور وہ جو اس لمحہ میں نے دیکھا تھا۔ خواب تھا ــــ ہمیشہ کی طرح صرف خواب۔

میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا تو ایک عجیب سی ٹھنڈک نے مجھے جکڑ لیا ــ قبر میں بھی ایسی ہی بے جان سی ٹھنڈک ہوگی! میں نے گھبرا کر باہر چھلانگ لگائی۔ مگر چوکھٹ نے پاؤں پکڑ لئے۔

باہر گہرا اندھیرا تھا ــــ اور راستہ گم تھا۔

چاہے کچھ ہو میں اس دیوار کے دوسری طرف ضرور دیکھوں گی ــ میری طبیعت ہی ایسی ہے مجھ سے اب بھی نچلا نہیں بیٹھا جاتا ــ اور اسی لئے شاید مجھے اب بھی چوٹیں لگتی ہیں۔

بوسیدہ دیوار میں اینٹیں جگہ جگہ سے اُکھڑی ہوئی ہیں۔ اس پر چڑھنا کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں، اُکھڑی ہوئی اینٹوں کے سوراخوں میں پاؤں رکھ کر میں دیوار پر چڑھنا شروع کر دیتی ہوں بعض اینٹیں اپنی جگہ سے کھسک رہی ہیں۔ بعض ایک دوسرے کے سہارے سے اٹکی ہوئی ہیں ــــ ذرا سی غلطی جان لیوا بن سکتی ہے بہت احتیاط کی ضرورت ہے ــ خوف سے میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ــ خستہ دیوار ــــ جا بجا اُکھڑا ہوا پلستر اور لٹکتی ہوئی اینٹیں جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ پُل یاد رہ گیا ــــ

"پُل ــ؟" اس نے حیرت سے سوال کیا ــ

"ہاں ــ بچپن میں ایک ہی تو پسندیدہ کھیل تھا۔ چھوٹے چھوٹے دریا کھود کر پُل بنانا ــ پُل بنانے کے شوق میں ہم باغ کی کچی زمین پر ندیاں کھودا کرتے تھے ــ"

سوچتی ہوں ہم ساری زندگی پُلِ صراط پر رہتے ہیں ــ زور زور سے تالیاں بجتی ہیں۔

"BRAVO" ــــــ کوئی میرے قریب سے چیختا ہے۔ میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی ہوں۔ دیوار ختم ہو گئی۔ اب میں دوسری طرف دیکھ سکوں گی ــ "ہوشیاری سے ــــ سنبھل کر" بہت سی آوازیں سنائی دیتی ہیں ــــ دوسری طرف دیکھنے کے بجائے میری آنکھیں میرے قدم پکڑ لیتی ہیں۔ خوف سے میری گھگھی بندھ جاتی ہے ــــــ

تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے باریک سرے پر پاؤں جما کر کوئی کتنی دیر کھڑا رہ سکتا ہے ــ؟ میں دوسری طرف کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔

طاہر مسعود

تعاقب

"تمہاری کافی کی پیالی ٹھنڈی ہو رہی ہے"
میں نے لڑکی سے کہا ہے اور اوپن ایئر کافی ہاؤس
کے لان پر بیٹھے ہوئے لوگ ہمیں پلٹ پلٹ کر
دیکھنے لگے ہیں۔

"دیکھو یہ ہمارے چاروں طرف بیٹھے ہوئے
لوگ ہمیں کتنی خونخوار نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔
کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ ہم جہنم کی فنا کرتی ہوئی آگ
میں گھر گئے ہیں۔ اور یہ اپنی رال ٹپکاتی ہوئی زبانیں
لٹکائے منتظر ہیں کہ یہ آگ کبھی بجھے تو ہمارے جلے
ہوئے بدن کو نوچ کھائیں ___ مگر.... مگر کیا تم کافی
نہیں پیو گی؟"

"بیرا ___"

"یس سر ___" اُس کی آنکھیں بڑی گھبرائی ہوئی
ہیں اور آنکھیں نفرت اور بیزاری کی دُھول سے
آلودہ۔ طنزیہ ہنسی ہنستی ہوئی ہمیں اپنے گھیرے
میں لئے ہیں۔ بیرا اُلٹے قدموں سے گیا ہے اور لان
پر ایک سفید رنگ کی بلی آزادی سے گھومتی پھر رہی
ہے۔ میں نے بلی کو گود میں اٹھا لیا ہے ___ اور اب
کرسیوں کے پیچھے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے
ہوئے بچوں کے قہقہوں کی آوازیں نہیں آ رہیں۔

لڑکی نے اپنے سرد ہاتھ بلی کے روئیں بھرے پشت
پر آہستہ آہستہ پھیرتی ہے ___ اس کی لانبی لانبی انگلیاں
موت کی برفیلی انگلیوں جیسی ہیں اور وہ کسی ایسی
وادی کی دوشیزہ لگتی ہے جس کے اونچے پہاڑوں
پر برفیں چمکتی رہتی ہیں۔

گہرائیوں سے برفانی کتوں کے بھونکنے کی صدائیں
آنے لگتی ہیں۔

"نیلاب" وہ کہتی ہے "مجھے مت چھوڑیں"
اس کے سفید لباس کی خوشبو سے اپنا خالی سینہ
بھر لینا چاہتا ہوں ___ وہ دوڑنا شروع کر دیتی
ہے، میں اس کے تعاقب میں ہوں ___ اونچے
کوہساروں اور اجنبی وادیوں میں تیزی سے برف
کی پھوار برس رہی ہے، قدموں کے نشانات بنتے
ہیں، برف انہیں مٹا دیتی ہے، وہ مجھ سے بہت
دور نکل گئی ہے ___ اب وادی میں صرف اس کے
کھوکھلے قہقہے گونج رہے ہیں۔

"نیلاب"

"نیلاب"

آوازیں بلند چوٹیوں سے ٹکرا کر گونج کے ساتھ
ڈوب جاتی ہیں۔ میں تھک کر گر پڑتا ہوں، پہاڑوں
سے برف کے وزنی گلیشیر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے
ہیں۔ برفانی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب آتی
جا رہی ہیں ___ اب تھوڑی دیر میں وہ مجھ پر
ٹوٹ پڑیں گے۔

"مگر وہ سرگوشیاں کر رہے ہیں ___؟" میں نے
پلٹ کر دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پہ کتنی تمسخر آمیز
مسکراہٹ ہے۔

"ایسے خوابناک ماحول میں جب نیم روشنی
نیم تاریکی میں میز کی شفاف سطحوں پہ ہمارے چہرے
پراسراریت سے چمکتے ہیں ___ کیا تمہیں کوئی کہانی
یاد آتی ہے؟"

"ہاں مجھے کچھ یاد آ رہا ہے ___ شاید کوئی
بات، کوئی واقعہ، آہستہ آہستہ ذہن میں روشن
ہوتا ہوا ___ اس رات طوفانی بارش ہو رہی
تھی، میرے بھاری دروازے پہ کوئی پاگلوں کی طرح
دستک دیئے جا رہا تھا۔ دروازہ کھلا تو پانی کی
تیز بوچھار کے ساتھ وہ اندر آ گیا۔ اوورکوٹ کے
دونوں کالروں نے اس کے چہرے کو گہرے راز کی
طرح چھپایا ہوا تھا اور پیشانی پر سیاہ ہیٹ جھکا
ہوا ___"

میں نے کہا "تم بھیگ گئے ہو، تمہیں لباس تبدیل کر لینا چاہیئے۔"

"تاہم بارش بڑھتی جا رہی تھی۔۔۔ تب میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہیٹ گرا دیا اور اوورکوٹ کے بٹن کھول دیئے۔۔۔ اس کا چہرہ چیچک اور جھاسوں کے بدنما داغوں سے سیاہ تھا۔۔۔ آنکھوں کی جگہ صرف دو گڑھے تھے اور کوٹ کی آستینیں بے جان طریقے سے جھول رہی تھیں۔"

لڑکی یہاں تک کہنے کے بعد اب دھند میں ڈوبنے لگی۔ خوف سے اس کے لب سفید ہو گئے ہیں۔۔۔ آنکھیں بدستور ہیں اپنے گھیرے میں لئے ہیں۔ میں اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں:

"وہ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں، زندگی میری روح میں قید پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی ہے۔۔۔"

جھاڑیوں کے کنارے بھاری لباس پہننے والی بوڑھی عورت مسکرانے لگی ہے۔

"سر آپ کا ٹیلی فون!"

میں بیرے کو حیرانگی سے تکتا ہوں، وہ سراسیمہ ہے، ریسیور پر اجنبی آواز سے آواز کہہ رہی ہے۔

"تم جہاں بھی جاؤ گے میں پیچھے پیچھے آؤں گا۔"

"مگر تم کون ہو؟"

کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا منیجر طنز سے منہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا ہے۔ شاید وہ کھلکھلا کر ہنسنا چاہ رہا ہو۔ اُدھر وہ اپنی میز پہ دونوں کلائیاں رکھے کسی سوچ میں گم ہے، پلکیں گہری نیند سے بوجھل ہیں،

"نیلاب۔۔۔ وہ کوئی اجنبی تھا، اس کی آواز میں بھیڑیوں کی غراہٹ تھی، مگر تم ڈرو نہیں، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ مجھے یہ بتلاؤ کہ بارش کی طوفانی رات میں جب پرندے اپنے بھیگے پروں میں اپنا سر چھپائے گھونسلوں اور درو تعلاق میں ٹھٹھر رہے تھے۔ تمہارے بھاری دروازے پر دستک دینے والا اجنبی کون تھا؟"

فضا میں گوشت کے جلنے کی بو پھیل رہی ہے، گدھ منڈلانے لگے ہیں اور اس کی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی پلکیں بیدار ہونے لگی ہیں۔

"وہ کسی برفانی علاقے سے آیا ہوا لگتا تھا۔ اس کے اوورکوٹ کے شانوں پہ برف کے گالے پڑے تھے۔۔۔ اس کی آنکھیں اٹھالی گئیں، جسم پر بچے ہوئے گوشت کی ہڈیاں تھیں، اس کے سینے پر گلاب کا کوئی پھول کھلا تھا۔ اور مکڑیوں نے لباس پر جالے تان دیئے تھے۔۔۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔"

روشنیاں گھٹتے گھٹتے بالکل ختم ہو گئیں ہیں۔ ناگہانی حادثے کی طرح اچانک آنے والی مہیب تاریکیوں میں سب کچھ ڈوب رہا ہے۔۔۔ کیفے کی میزیں، کرسیاں، لوگ۔ مگر وہ کتنے مطمئن ہیں جیسے اب تک وہ اسی لمحے کے منتظر ہوں کہ کب یہ سیلاب آئے، اور کب وہ بہتے ہوئے تنکے کی طرح دور نکل جائیں۔ ایسے میں وہ مجھے دکھائی دیا ہے جس نے مجھے ابھی ابھی ٹیلی فون پر پیغام بھی بھیجا تھا کہ میں سدا تمہارا تعاقب کرتا رہوں گا۔ بہت طویل القامت شخص سنہرے دانت اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا۔۔۔ وہ ڈھونڈ رہا ہے۔ میں کہیں چھپ جاؤں اس میز کے نیچے۔۔۔ مگر وہاں لڑکی نے پاؤں پھیلائے ہیں۔ اس نے آدھا کیفے عبور کر لیا ہے تھوڑی دیر میں وہ اپنے لمبے ہاتھ بڑھا کر مجھے اٹھا لے گا جیسے میں کوئی کھلونا ہوں یا بے بس زخمی پرندہ۔

"نیلاب" میں نے لڑکی کے گھٹنے جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔

"تم اس سے کہنا کہ مجھے کچھ نہ کہے۔۔۔ میں بڑا کمزور اور بیمار رہنے والا آدمی ہوں۔۔۔ ہر دم بخار میں جلتے رہنے والا یہ آدمی آج نہیں تو کل ویسے ہی خاموشی سے مر جائے گا۔ تم سُن رہی ہو نا میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

وہ تمسخر سے ہنستی ہے۔ بے تحاشہ ہنسنے لگی ہے۔۔۔ اور میں اپنی یرقان زدہ آنکھوں سے اس کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھ رہا ہوں!"

فارغ بخاری

کھلا ہے، اُلفت کا باب اب تک
وہی ہے اس کا نصاب اب تک

بیاضِ دل پر لکھے ہوئے ہیں
محبتوں کے وہ خواب اب تک

ترے تصوّر کی بارگہ میں
ہیں روز و شب باریاب اب تک

چمن چمن تیری انکھڑیوں کے
کھلے ہوئے ہیں گلاب اب تک

قدم قدم پر ہے سایا فرما
پلک پلک کا سحاب اب تک

تمہاری چاہت سے لمحے لمحے
کا دے رہے ہیں حساب اب تک

نظر میں ہیں وہ جوانیوں کے
گناہ اب تک، ثواب اب تک

نگاہ میں جلوہ ریز تیرے
ہیں لطف کے آفتاب اب تک

ہیں اپنے جسموں کے یاد فارغ
سوال اب تک، جواب اب تک

اپنے خوابوں کی جو خوشبو سے بکھر جاتے ہیں
رتجگے ان کو منانے کے لئے آتے ہیں

کبھی دل میں جو چراغاں تو مرے کانوں میں
کسی ان دیکھی سی دنیا کے پیام آتے ہیں

کتنے ایسے ہی خیالات ہیں جو ذہنوں میں
پیدا ہونے سے بہت پہلے ہی مر جاتے ہیں

کب تلک تہمتِ حق گوئی کی بھگتوگے سزا
مصلحت کوش یہ اکثر مجھے سمجھاتے ہیں

دیکھتا ہوں ترے زخموں کو جو محبوبِ وطن
غم مجھے درد کی دیوار میں چن جاتے ہیں

ایسے پتھر ہوئے احباب کے چہرے فارغ
اب مروت کی ہنسی کو بھی ترس جاتے ہیں

دیواروں سے راہ مانگتے ہیں
نیکی سے گناہ مانگتے ہیں

ہم کھولتی دھوپ کے مسافر
سائے سے پناہ مانگتے ہیں

نے قصرو کلاہ کی طلب ہے
نے حشمت و جاہ مانگتے ہیں

نے حور و قصور سے غرض ہے
نے رفعتِ ماہ مانگتے ہیں

ہم کعبۂ جسم کے پجاری
تقدیسِ گناہ مانگتے ہیں

اک ساعتِ امن چاہتے ہیں
اک لمحہ پناہ مانگتے ہیں

اب کوئی طلب نہیں ہے دل میں
بس ظرفِ نگاہ مانگتے ہیں

وہ شعلہ نفس بھڑک نہ اٹھیں
جو فرصتِ آہ مانگتے ہیں

بس اتنا قصور ہے کہ فارغ
انساں کی فلاح مانگتے ہیں

مارچ ۱۹۷۹ء

سلیم شاھد

شہرِ خیال اِک منظر ہو گا
جس کا حسن معطر ہو گا

سوچیں صاف مقدّس پانی
سینہ پاک سمندر ہو گا

باتیں رم جھم اُجلی بُوندیں
لہجہ چھم چھم جھانجر ہو گا

رنگ مجسم گل متکلم
خوشبو نام کا پیکر ہو گا

قاصد آنکھ سنہرا گنبد
جس پر سبز کبوتر ہو گا

من کا باطن مشکِ مُعنبر
تن کا روپ صنوبر ہو گا

لب میٹھے انگور کے خوشے
قصہ خواں کوزہ گر ہو گا

جسم صراحی شوق شرابی
پیاسے لب اور ساغر ہو گا

درد اتھاہ میں گوہر ہو گا
میرا روگ شناور ہو گا

ماتھے پر محراب حرم کا
دل کعبے کا پتھر ہو گا

ننگے پیر طواف میں موسم
گل احرام بدن پر ہو گا

پانچوں وقت نمازی آنکھیں
شغلِ عبادت دن بھر ہو گا

تیرے حضور دو زانو رہنا
صبح و شام میسّر ہو گا

آنکھیں کنول کے دیکھ سہاگن
دستک میں تیرا بر ہو گا

بادل چادر تان کے برسا
اشکوں سے بستر تر ہو گا

میرا شوق گداگر ہو گا
تیرا حسن تونگر ہو گا

خواب سجائیں دلہن آنکھیں
روز نیا اک زیور ہو گا

قد بالغ اور سوجھ اناڑی
سن چودہ سے اوپر ہو گا

تیرے ہاتھ انصاف ترازو
کب یہ بوجھ برابر ہو گا

گیتوں میں مہندی کی خوشبو
ڈھولک تال میں کیسر ہو گا

سنکھ بجے اور گھنگھرو چھنکے
دم دم مست قلندر ہو گا

خواب سرا میں پری مسافر
اندر سبھا میں اندر ہو گا

سلیم شاہد

اُجلا روپ کا ساگر ہو گا
پگھلا سنگِ مرمر ہو گا

دودھ کٹورا چھلکے چندن
تن کپڑوں سے باہر ہو گا

جاگیں بند کتاب میں نظمیں
خواب میں خواب سخنور ہو گا

سر پر چھتر بدن پر چھایا
سورج من کے بھیتر ہو گا

چاندہ گیا کے گھر اُترا
پونم رات سوئمبر ہو گا

جل سے نکلا جلتا دیپک
کیا موہن کیا سندر ہو گا

بدلی بال بکھیر کر نکلی
یہ جل تھل کس کے گھر ہو گا

تو ندیا میں کالک دھوتی
ایسا موہ پوتر ہو گا

رُخ یٰسین مدّثر ہو گا
لب قاری دل ناظر ہو گا

نیل کنٹھ بُراق سواری
رستہ لولاک مسافر ہو گا

تشت طعام بھرے ثمروں کا
خدمتِ پاک میں حاضر ہو گا

تن دیوان مرقّع صورت
باغِ بہشت میں شاعر ہو گا

لب عاجز اس لب کے آگے
فہم اس فہم سے قاصر ہو گا

سینہ پاک مدینہ حسن میں
علم کا شہر مہاجر ہو گا

ہر ڈالی ہر شاخ پہ بیٹھا
تیرے اسم کا طائر ہو گا

رات کے پچھلے پہر زباں پہ
ذکر ستارہ ظاہر ہو گا

پرتو روہیلہ

گہری رات چمکتے جگنو بکھری یادیں ٹوٹے سپنے
سناٹوں کی گونجتی چیخیں تنہائی کے ہانپتے سائے

بوجھل پاؤں اوجھل منزل بجھتے دیپک ڈوبتی نبضیں
چپ دروازے بند دریچے سونی گلیاں ویراں رستے

بھیگی بھیگی نیلی سڑکیں کالے کھمبے کا ہی منڈیریں
پیلے طبوں پر پروانے بے حس روپ وفا کے لاشے

رات کے راکھی ماتھے ماتھے جوت کی چوکی اجڑی اجڑی
سونے کی تھالی میلی میلی روشن چہرے دھندلے دھندلے

گرتا پتہ پاؤں کی آہٹ دور کی ڈھولک دل کی دھڑکن
چھاتی میں اک سانس کی سولی کانوں میں آواز کے برچھے

بسری راتیں بھولی باتیں رہ رہ سلگیں پل پل بھڑکیں
سناٹا دل کو برماتے ریل کی سیٹی سینہ چیرے

لمحوں کے جنگل میں یوں پھرتے پرتو مجھ کو صدیاں بیتیں
آنکھوں میں آنسو ہونٹوں پر پڑی، پاؤں میں کانٹے پاؤں میں چھالے

علی اکبر عباس

کوئی سانجھ سویر تو سانجھی ہو
کچھ پل کچھ دیر تو سانجھی ہو

پھر کھیلیں روٹھ مناؤں بھی
کوئی آنگن پیڑ تو سانجھی ہو

کچھ بانٹیں، بخشیں، جوڑ بھی لیں
یہ تیر اور میر تو سانجھی ہو

آٹے میں نمک کی جاگ بڑی
اک رتی سیر تو سانجھی ہو

کبھی جھانک گریباں دیکھ ذرا
کوئی چار پھیر تو سانجھی ہو

بجھے گھر میں دیا ہو مٹی کا
پڑ جائے اندھیر تو سانجھی ہو

آنے کو اکیلے آ تو گئے
کوئی جاتے پھیر تو سانجھی ہو

جلیل عالی

جب بھی بادل بارش لائے شوق جزیروں سے
خوشہ خوشہ لفظ کی شاخیں بھر گئیں ہیروں سے

تم سے ملے تو شہرِ تمنا کتنا پھیل گیا
کیا کیا خواب نئے تعبیر ہوئے تعبیروں سے

آنکھیں رنگوں کی برساتیں تک تک جھیل ہوئیں
دل نے کیا کیا نقش کشید کیے تصویروں سے

اُس کو چھُونے کی خواہش نے ہاتھ بڑھائے تو
پھن پھیلائے نکلے کتنے سانپ لکیروں سے

عالیؔ دانش کی بستی میں اب سردار وہی
ڈھونڈ نکالے کچھ اندھیارے جو تنویروں سے

صابر ظفر

سب سے پہلے جینے والا آدم ایک مثال ہوا
اس کو بھوکا مرتے دیکھا جس پہ رزق حلال ہوا

منفی اور مثبت کا حاصل جز لاحاصل کچھ بھی نہ تھا
بھول گئے پھر قاعدے سارے جب یہ عشق سوال ہوا

ہجر کی پہلی سالگرہ ہے وصل کی پہلی برسی ہے
یاد بھی اس کی آئی بہت اور دکھ بھی بہت اِرسال ہوا

کون و مکاں میں کوئی نہیں ہے اپنے درد کا پیمانہ
ماضی حال اور مستقبل میں دل کا زخم بحال ہوا

سرسبز و شاداب کیا پھر میں نے ظفرؔ اِس دھرتی کو
مجھ سے پہلے اُگنے والا سبزہ جب پامال ہوا

نجیب احمد

لمحہ صدی سے برسرِ پیکار بھی نہ تھا
قیدی رہائی کے لئے تیار بھی نہ تھا

خورشید رو بہ رو سرِ کہسار بھی نہ تھا
جس کی تلاش تھی پسِ دیوار بھی نہ تھا

بولی اسی نے دے کے بھرم رکھ لیا مرا
وہ شخص جو کہ اپنا خریدار بھی نہ تھا

تصویر اس کی آنکھ کی پتلی میں نقش ہے
میں جس کو دیکھنے کا گنہگار بھی نہ تھا

میں تو نبھا رہا ہوں فقط اپنی بات کو
ورنہ کسی کو بھولنا دشوار بھی نہ تھا

جھنکار دل کی سنتے رہے عمر بھر نجیبؔ
دیکھا تو اس میں ٹوٹتا ہوا تار بھی نہ تھا

کب تلک خاک سے رشتہ یہ سہارے کب تک
میرے ہمراہ چلیں گے یہ کنارے کب تک

لوٹنا ہو تو فقط ایک صدا کافی ہے
کوئی بچھڑوں کو سرِ راہ پکارے کب تک

ہم سمجھتے ہیں زمانے کی پرانی چالیں
جانتے بوجھتے بازی کوئی ہارے کب تک

ایک دن حدتِ غم سے بھڑک اٹھیں گے بدن
خشک پتوں میں چھپائیں گے شرارے کب تک

ایک دن مجھ پہ دل و جاں سے نچھاور ہوں گے
مجھ سے مخلص نہ رہیں گے مرے پیارے کب تک

دیکھنا یہ ہے کہ اس شہرِ شکستہ میں نجیبؔ
لوگ جیتے ہیں امیدوں کے سہارے کب تک

نشاں کسی کو ملے گا بھلا کہاں میرا
کہ ایک روح تھا میں جسم تھا مکاں میرا

ہر ایک سانس نیا سال بن کے آتا ہے
قدم قدم ابھی باقی ہے امتحاں میرا

تجھے بھی میری طرح دھوپ چاٹ جائے گی
اگر رہا نہ ترے سر پہ سائباں میرا

مری زمیں مجھے آغوش میں سمیٹ بھی لے
نہ آسماں کا رہوں میں نہ آسماں میرا

کئی نجیبؔ اسی آگ سے جنم لیں گے
کہ میری راکھ سے بنتا ہے آشیاں میرا

مارچ ۱۹۶۹ء

سیّد انور

نقشِ قدم[1]

موجودہ اُردو ادب میں خاتون فنکاروں کی کامیابیاں حیرت انگیز ہیں۔

ایوانِ ادب کے بڑے بڑے ستونوں کے پاس سے خاموش گذر جائیے۔ ایوانِ ادب کے بڑے بڑے ستون — عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ادا جعفری، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں، رضیہ فصیح احمد، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، بیگم اختر جمال، اِن پُرشکوہ ستونوں کے بعد اُردو ادب کا ایک وسیع کینوس نظر آئے گا — جس پر خواتین کی نازک انگلیوں نے بڑے حسین و جمیل نقش و نگار بنائے ہیں۔

فہمیدہ ریاض ایوانِ ادب کی خلوتوں میں گیٹ کریشنگ کے دھماکوں کے ساتھ داخل ہوئی اور قدامتوں کے جسموں میں شگاف پڑ گئے۔ کشور ناہید ایک آتش بازی کی طرح آنکھوں کو خیرہ کرتی ہوئی بلندیوں کی طرف روانہ ہوئی اور کشورِ ادب پر ناہید بن کر چمکنے لگی۔ پروین شاکر بادِ صبا کے خوشگوار جھونکوں کی طرح آہستہ آہستہ سرسراتی ہوئی آئی اور گلستانِ ادب میں خوشبو پھیل گئی اور پھر سعیدہ گزدر، اور زاہدہ حنا اور بہت سی اور۔

اور اب افق کے دھندلکوں میں فردوس حیدر کا چاند طلوع ہو رہا ہے کیا معلوم ہے یہ ننھا سا چاند کبھی ادب کی دنیا پر چودھویں رات کا چاند بن کر روشنی پھیلائے؟

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ فردوس حیدر — قرۃ العین حیدر کی رشتے دار نہیں ہے۔

اور یہ بھی ایک قسم کی بدقسمتی ہے کہ اپنا ناول نقشِ قدم، اردو ادب کے پنڈتوں کے سامنے اُس زمانے میں پیش کر رہی ہے جب یہاں لیڈیز فرسٹ کا اصول بڑے زور و شور سے کام کر رہا ہے۔ عورتوں کو مردوں پر ترجیح دینے کے اصول کے ماتحت عورتوں کی تصانیف کو مردوں کی تصانیف سے پہلے پڑھا جاتا ہے بلکہ مردوں کی تصانیف کو پڑھا ہی نہیں جاتا صرف عورتوں کی تصانیف کو پڑھا جاتا ہے۔ اس طرح خاتون ادیبوں کی اتنی حوصلہ افزائی ہوئی ہے کہ انہوں نے مارکیٹ کو ایسے ناولوں سے فلڈ کر دیا ہے جن کے خوبصورت گرد پوشوں کے درمیان گرد و غبار بھرا ہوتا ہے۔ لیکن فلم پروڈیوسر اُن سے رنگین پکچریں بنا کر گرد و غبار کو رنگین کر دیتے ہیں۔

عورتوں کی کامیابی سے متاثر ہو کر مردوں نے بھی عورتیں بن کر لکھنا شروع کر دیا۔ اس کا سب سے پہلا تجربہ مشہور افسانہ نگار فضلِ حق قریشی نے کیا۔ فضلِ حق قریشی کے نام سے اُن کے افسانے کوئی نہیں پڑھتا تھا۔ انہوں نے طاہرہ دیوی شیرازی کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ ان کے افسانے بہت پڑھے جانے لگے۔ تعریفوں کے خطوط آنے لگے۔ انہوں نے وہ افسانے جو فضلِ حق قریشی کے نام سے لکھے تھے اور جن کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، دوبارہ طاہرہ دیوی شیرازی کے نام سے لکھے تو اُن کی دھوم مچ گئی۔ فلم ایکٹریس دیبا کے نام سے اس کے ماموں نے کئی ناول لکھے اور ہزاروں روپے کمائے۔ اب عرصے سے دیبا کا کوئی ناول نہیں آیا۔ شاید اُس کے ماموں کو کوئی بڑی ملازمت مل گئی ہے۔ مشہور افسانہ نگار — انور عنایت اللہ اور ڈرامہ نویس اصغر بٹ نے مل کر ایک خاتون کے نام سے ناول لکھا تھا — لیکن وہ ناول کامیاب نہیں ہوا کیونکہ اس کے خوبصورت گرد و پوش کے اندر گرد و غبار نہیں تھا۔

فردوس حیدر کے ناول نقشِ قدم کا گرد پوش بھی خوبصورت ہے۔ لیکن اُس کے پیچھے گرد و غبار

[1] فردوس حیدر کا ناول

نہیں ہے۔ ادب ہے۔ اور یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ معنفہ نے اس زمانے میں عورت ذات ہوتے ہوئے ادبی ناول تخلیق کیا ہے۔ رنگین گرد و غبار پیدا نہیں کیا۔

فردوس حیدر کا ایک ناول "پیار کا ساگر" پہلے چھپ چکا ہے۔ اس وقت ان کا تیسرا ناول۔ "تنہا مسافر" اور ایک افسانوں کا مجموعہ "مجازی خدا" زیر طبع ہیں۔ پیار کا ساگر میں انہوں نے پاکستانی کالج اور ہوسٹل کی لڑکیوں کے مسائل ڈسکس کئے ہیں۔ تیسرے ناول "تنہا مسافر" میں بنکاک کے ایک خاندان کی کہانی لکھی ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے میں سے میں نے دو مسودے پڑھے ہیں۔ ایک مسودہ مجازی خدا کا۔ دوسرا بھوک کا۔ مجازی خدا میں انہوں نے امریکہ کی ایک گری ہوئی لڑکی کے حالات لکھے ہیں جن میں ایڈیپس کو مپلکس اور لیزبینزم (عورتوں کی ہم جنس پرستی) پر بھی تیز روشنی پڑتی ہے بھوک میں انہوں نے بنکاک کے نچلے درجے کے خاندان کی عورتوں کے معاشرتی حالات بیان کئے ہیں —

نقشِ قدم فردوس حیدر کا دوسرا ناول ہے جس کو مکتبۂ شعر و ادب، لاہور، نے نہایت نفاست سے چھاپا ہے۔ لاہور کی طباعت جس نے اردو ادب میں ایک بلند پایہ آرٹ کی حیثیت اختیار کرلی ہے ——— اس کتاب میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔

ایک ترکی لڑکی "حلیہ" استنبول یونیورسٹی کے ایک ہم جماعت لڑکے علمان میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ اور اُن کی شادی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ شادی ترکی کی ایک قبائلی رسم بنج کے باعث المیے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ پاکستان واپس آجاتا ہے۔ اُس کا باپ مرنے سے قبل اُس کی شادی کر دیتا ہے لیکن یہ شادی بھی ہمارے جاگیرداری دور کی تباہ کاریوں کا نشانہ بن جاتی ہے۔

فردوس حیدر کا سٹائل بڑا سادہ اور موثر ہے آسان الفاظ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے معنی خیز انداز میں متحرک نظر آتے ہیں۔ وہ بڑی حساس ہیں اور اپنے احساسات کو پوری دیانتداری سے قاری کے دل تک پہنچا دیتی ہیں وہ مسائل سے متاثر ہو کر اُن کے تجزیوں پر تیز روشنی ڈالتی ہیں اور ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

"اس ماہ کا ماہِ نو پچھلے دو ماہ کے پرچوں کی معیت میں ملا۔ بے صبری سے لیا اور مطالعہ کیا حرفِ اوّل سے حرفِ آخر تک پڑھ گیا۔ ایک کیک کے بارے میں ایک اشتہار پڑھا تھا جس میں لکھا تھا۔ آخری نوالے تک لذیذ۔ آپ کو اگر اشتہاری زبان ناپسند نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ یہ رسالہ آخری حرف تک لذیذ تھا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ تو اس منزل پر ہیں جہاں مستند ہے میرا فرمایا ہوا کچھ ماہ سے اردو روزناموں کے ادبی ایڈیشنوں میں قومی ادب پر بحث چل رہی ہے ڈاکٹر صاحب کا مضمون ان پر محاکمہ کی حیثیت رکھتا ہے بہرحال ایک سوال تو اب بھی باقی ہے کہ جب عوامی زندگی میں قومی تشخص اُجاگر نہ ہوا ہو تو ادب میں کیسے ہو؟

شہباز ملک کا مضمون بھی اچھا تھا۔ مگر میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ تنقیدی مقالات میں ایسے مضامین بھی شائع کریں جن میں ادب کے بارے میں بنیادی نوعیت کی تحقیق کی گئی ہو۔ اور بنیادی نوعیت کے سوال اُٹھائے گئے ہوں۔

امجد علی شاکر ایم اے ——— ساہیوال

اسلم رانا

فتویٰ[1]

اسلام شاہ نے زندگی کے اس بھرے ہوئے میلے کا بڑی عمیق نظروں سے مطالعہ کیا ہے اور جہاں کہیں بھی اسے سماج کی مروّجہ اقدار اور رویوں میں تضاد اور جھول نظر آیا ہے۔ اس نے اس کا بھی بڑا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ پھر اس مشاہدے اور تجزیے کو اپنے ذہن اور دل کی کسوٹی پر پرکھا اور جانچا ہے۔ بعد ازاں اسے اپنے جگر کا لہو پلا کر اور خوبصورت لیکن چبھن سے بھرپور الفاظ کا جامہ پہنا کر شعر کے روپ میں ڈھالا اور اسی سماج کی لامتناہی وسعتوں میں جن میں کدورتیں نفرتیں۔ قباحتیں اور جھوٹ و فریب نے اپنے جال تان رکھے ہیں۔ سچ۔ خلوص اور پیار کے نغمے بکھیرے ہیں۔ لیکن اس انوکھے کام کے لئے اسلام شاہ نے کسی منطقی حجت بازی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی کسی مانگے تانگے کے نظریے کی بیساکھیوں کا سہارا ڈھونڈا ہے۔ وہ تضادات کو آمنے سامنے رکھ دیتے ہیں اور خود دور کھڑے تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔ جب قاری اپنے سامنے برہنہ حقیقتوں کو وحشی رقص کرتے ہوئے دیکھے گا تو پھر بھلا وہ کس ردِّ عمل کا مظاہرہ کرے گا اور اس وقت اس کے تاثرات و جذبات کس طرح کے رنگوں میں رنگے ہوں گے۔ اسلام شاہ نے طنز کے تیز نشتر چلائے ہیں۔ اپنے اردگرد کے معاشرے کا جو بظاہر بڑا چمکدار اور بھڑکیلا ہے۔ لیکن اندر سے اتنا ہی کھوکھلا۔ بودا اور بے رنگ ہے۔ سینہ چھلنی چھلنی کر دیا ہے۔ ان کے طنز کے نشتر کا وار کتنا کاری اور کتنا گہرا ہے اس کو جاننے کے لئے ان کی ایک نظم "روٹی۔ کپڑا۔ مکان" پڑھ کر دیکھیں۔ جس میں شاہ صاحب نے روٹی کپڑا اور مکان کے حصول کا بڑا "آسان" حل ڈھونڈا ہے اور اس بین الاقوامی مسئلے کو حل کرنے کے لئے جس کلیّے کو دریافت کیا ہے ہمارے خیال میں اگر ان کی یہ نظم ترقی پذیر ممالک کے بجٹوں میں ان ممالک کی زبانوں میں تراجم کرا کر ایک ضمیمے کے طور پر شامل کر لی جائے تو وہ مختلف ممالک اپنے اپنے عوام کیلئے ان نہایت ہی اہم بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کا بڑی آسانی سے بندوبست کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں یہ بھی ممکن ہے کہ شاید آنے والے چند سالوں میں جب دنیا میں غلے کی کمی میں شدت آجائے گی۔ آبادی تیزی سے بڑھ کر مکانات کی قلّت کا باعث بن جائے گی اور کپڑا بہت زیادہ مہنگا ہو جائے گا۔ تو اسلام شاہ کی یہ نظم اقوامِ متحدہ کے چارٹر کا ایک نہایت ہی اہم حصہ قرار پائے گی۔ لیکن ہم چاہے جو کچھ بھی کہیں اس سے نہ تو وہ ننگی حقیقت ہمارے سامنے سے ہٹے گی اور نہ ہی اس زہر بھری طنز کے تیروں کے وار سہنے سے ہم اپنا دل ذہن اور دماغ بچا سکتے ہیں جو اس نظم میں موجود ہے۔ جب انسان یہ نظم پڑھتا ہے تو اس کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ ذہن کے کئی گوشے کچھ دیر کے لئے سُن ہو جاتے ہیں اور دل ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ سلائس کھانے والوں کے لئے روٹی کوئی مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ برہنہ رقص کرنے والوں کے لئے کپڑا کوئی مسئلہ نہیں اور جو آج اس ہوٹل میں کل اُس ہوٹل اور پرسوں کسی اور شہر کے کسی ہوٹل میں یا کلب میں کبھی کسی کے ساتھ اور کبھی کسی کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں۔ مکان ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں رہ جاتا، شاہ صاحب کی یہ نظم پڑھتے ہوئے اور پڑھ چکنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے چاروں طرف اس نام نہاد مہذب دنیا میں لوگ منہ میں توسوں کے ٹکڑے لئے سراپا ننگے وحشیوں کی طرح ناچ گلیوں۔ سڑکوں۔ باغوں پارکوں، کلبوں اور ہوٹلوں میں ناچتے دکھائی دیتے ہیں قاری اس وقت اپنے آپ کو اس طرح محسوس کر رہا ہوتا ہے گویا وہ بھی اِن کی طرح ننگا ہو کر اِن کے اس رقص میں شریک ہو گیا ہے۔

"فتویٰ" میں ان کی نظموں مثلاً "پردہ"، "اعجاز دے نائیک"، "مردم شماری"، "کفرانِ نعمت"، "پکے تنا نچی"، "دلیس دا سچا غم خوار" اور "یقینِ محکم" میں اسی قسم کا اندازِ فکر نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ شاہ صاحب کسی ایک اسلوب کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے ہاں بڑی گہری سوچ اور بلند فکر اور منفرد خیال بڑے سلیقے سے سجائے ہوئے ملتے ہیں۔ اور جن نظموں میں ایسی سوچ اور فکر و خیال کے چشمے پھوٹتے ہیں ان نظموں میں برہنہ طنز کے تیز نشتر چلانے کی بجائے وہ ایک ڈرامائی کیفیت سے کام لیتے ہیں۔

"فتویٰ" میں موجود نظموں کو پڑھ کر کتاب کے اس نام کی معنویت پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ہر نظم میں اسلام شاہ نے اپنے اردگرد کے سماج میں ہر سمت بکھری ہوئیں ناانصافیوں کا منہ

ملحوظہ [1] اسلام شاہ کا مجموعۂ کلام

پچھاڑے عوام کو نگلتے ہوئے معاشی دکھوں اور نیچے گرے ہوئے لوگوں کا ان قباحتوں کے خلاف جو ردِعمل اور اس کا اظہار ہے ان سب کے بارے میں "فتوے" جاری کئے ہیں۔ اور کہیں کہیں اپنے ان فتوؤں پر عمل درآمد ہونے کے عمل کی نشان دہی بھی کی ہے۔

ایک اور اسلوب جو شاہ صاحب کی شاعری میں بڑا نمایاں ہو کر آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی سوچ کو ایک سیدھے اور منطقی انداز میں پیش کرتے ہیں جن نظموں میں یہ انداز اختیار کیا گیا ہے اُن میں کچھ تو سیاسی ہیں اور کچھ وطنیت اور قومیت کے جذبوں سے بھری ہوتی ہیں۔ مثلاً "قائدِاعظم دا فرمان" "ماتڑے تنگ" "احسان فراموش" "لانگ مارچ" اور "تیرا لٹیا شہر بھنبھور" وغیرہ ان نظموں میں طنز کے تیکھے چرکوں کی ایک پوشیدہ لیکن سلگتے ہوئے دکھ اور درد کی ٹیسیں ابھرتی ہیں۔ مثلاً "تیرا لٹیا شہر بھنبھور" میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے پاکستان کی مقدّس سرزمین کا دولخت ہو جانے کا پورا المیہ ایک ایسا کرب اور نوحہ بن جاتا ہے۔ جس کے ہر لفظ سے اسلام شاہ کے جگر کا لہو۔ آنکھوں کا پانی اور دل سے آہیں نکلتی دکھائی دیتی ہیں۔

"بڑی محنت، جسارت، ذہانت اور چالاکی یعنی اپنی بیشتر کشورانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تم نے 'ماہِ نو' کو اربابِ بست و کشاد کی "گڈ بک" کی بجائے قابلِ توجہ اور لائقِ ذکر میگزین بنا دیا ہے۔ اس کی "ترتیب" میں اکثر ایسے نام دکھائی دے جاتے ہیں جن کی تلاش میں نگاہیں نیک مثالوں کا طواف کرتی ہیں۔ خدا تمہیں اس کی قرار واقعی سزا دے!

'اوراقِ گذشتہ کی کتاب' میں اپنی اور شفقت تنویر مرزا کی تصویر دیکھی۔ بہت ہنسی آئی۔ یہ اٹھائیس سال پرانی تصویر ہے۔ میں نے کسی رسالے میں احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کی تصویر دیکھی تھی، اُس میں قتیل قاسمی صاحب کو اپنی کوئی غزل دکھا رہے تھے۔ میں ایسی ہی تصویر بنوانے کے لئے شفقت کو کیمبل پور کے نسیم فوٹو سٹوڈیو میں لے گیا۔ میں اُن زمانے میں اداکاری، افسانہ نگاری اور مصوری کیا کرتا تھا۔ شاعری، ڈرامہ نگاری اور کالم نویسی کا بہروپ تو بہت بعد کا ہے۔ اس تصویر کے لئے میرے پاس کوئی غزل نہیں تھی۔ فوٹو سٹوڈیو کے پیڈ کا ایک ورق اٹھایا اور تصویر بنوالی۔ اس تصویر میں میں نے جو کوٹ پہن رکھا ہے وہ میرا اپنا نہیں ہے ایک ایسے ہی ہم جماعت کا ہے جو آج کل جج صاحب ہیں اور لاہور میں عدالت لگاتے ہیں۔ نام اُن کا اسلئے نہیں بتاتا کہ پتہ چل جائے گا میں تصویر میں اتنا موٹا کیوں نظر آ رہا ہوں۔

بیس سال قبل ریڈیو کے پروگرام میگزین 'آہنگ' میں چھپنے والی ایک اور تصویر کا بہروپ بھی مجھے بہت یاد آتا ہے کہ جس روز یہ تصویر کھینچی گئی تھی میں تین دن کا بھوکا تھا۔ میری بے روزگاری سے پسیج کر مختار صدیقی نے مجھے ایک پروگرام دیا تھا۔ ریڈیو سٹیشن تک جانے کیلئے کرایہ نہیں تھا۔ پیدل ہی چل پڑا۔ راستے میں میرے بوٹ کا تلا بوٹ سے الگ ہو گیا میں نے کوڑے کے ڈھیر سے کسی کی اتری ہوئی پٹی ڈھونڈی اور پیر کو بوٹ کے اوپر رکھ کر باندھ دیا۔ پٹی کا ایک ٹکڑا انگوٹھے پر بھی باندھ لیا اور اسی "عذرِ لنگ" کے ساتھ لنگڑاتا ہوا ریڈیو اسٹیشن پہنچا یاد آتا ہے کہ مغنّیہ اقبال بانو نے پوچھا تھا 'کیا ہوا'؟ بتایا چوٹ آئی ہے انگوٹھے کا ناخن اتر گیا ہے: ریڈیو کے سٹوڈیو میں جب ضیغم زیدی تصویر اُتارنے لگے تو میں نے کہا تھا تصویر میں میرے پاؤں ــ جھوٹ کے پاؤں ــ نہ آئیں۔

ان باتوں سے سمجھ گئی ہو گی کہ جھوٹ میرے لئے اور میں جھوٹ کے لئے نیا نہیں ہوں۔"

(منو بھائی)

شریف کنجاہی جدید پنجابی ادب کی بنیاد رکھنے والے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ قیامِ پاکستان کے نزدیکی برسوں میں اپنی شہرتوں کے کمال کو پہنچ چکے تھے۔ شریف کنجاہی تنقید اور تحقیق کے بھی مردِ میدان ہونے کے ناطے ایک بالکل منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ادارہ ماہِ نو نے شریف کنجاہی کی دونوں حیثیتوں کے پہلوؤں کو زیرِ بحث لانے کے لئے مجھے اورینٹل کالج بھیجا۔ شریف کنجاہی، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی کے پنجابی شعبہ کے طلباء اور طالبات کی جانب سے حفیظ تائب کے اعزاز میں ترتیب دی گئی ایک تقریب سے فارغ ہو کر نکل ہی رہے تھے کہ میں نے انہیں جالیا۔

شریف کنجاہی نے میرا پہلا سوال بہت تحمل سے سنا۔

"کچھ پنجابی پریمیوں نے کچھ سال اُدھر پنجابی کے لئے گورمکھی لپی کی سفارش کی تھی، میں اُن کی نیک خواہشات پر آپ کا تبصرہ سننا پسند کروں گا اور شاید میرے قارئین قدیم پنجابی مخطوطات کے حوالے سے یہ جاننا بھی پسند کریں کہ تاریخ کے کس حصے میں گورمکھی لپی پنجابی رسم الخط کے طور پر مقبول رہی ہے یوں یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ ہمارا کلاسیکی پنجابی رسم الخط کون سا ہے؟"

اگر ہمارے سے مراد پاکستانی اور پاکستانی پنجابیوں کا کلاسیکی رسم الخط مراد لیا جائے تو یہ فارسی یا اُردو رسم الخط ہی بنتا ہے، مغربی پنجاب یعنی پاکستانی پنجاب کے قدیم ترین نسخے اسی رسم الخط یا لپی میں ملتے ہیں۔ دراصل ہمارے پنجابی ادب کو جو تہذیبی "جاگ" لگی ہے وہ شرقِ اوسط کے تہذیبی تناظر سے متعلق ہے یوں بھی ہمارا دیس چڑھتے جانب سے متاثر نہیں ہوا بلکہ اُترتے جانب سے اثر انداز ہوتا رہا مشرق سے ہم پر جو کچھ اثرات اُترے وہ بھی دہلی کی مرکزیت کے حوالے سے آئے۔ مگر وہ عربی، پارسی افغانی، اور ترکی اثرات کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

کچھ پنجابی پریمیوں کی جانب سے گورمکھی رسم الخط اپنانے کی تحریک درحقیقت پنجاب کی تاریخی رَو سے متضاد تحریک تھی۔ ہمیں پاکستان کو شرقِ اوسط کے ممالک سے تہذیبی طور پر ہم آہنگ رکھنا ہوگا، یہ سیاسی ضرورت بھی ہے اور تہذیبی ضرورت بھی۔ گورمکھی لپی میں ایک اور خرابی یہ در آئے گی کہ ہمیں ث، س، اور ص کی الگ الگ کیفیات اور مفاہیم سے دست بردار ہونا ہوگا۔ بے شمار الفاظ کے مفاہیم کے بارے میں خلط پیدا ہوگا۔

"مگر الفاظ کے مادّوں اور باریک تفریقات سے عوام کا کیا تعلق، انہیں تو صرف بولنا اور پڑھنا ہوتا ہے ــ یہ دلیل تو آپ نے گورمکھی لپی کے حامیوں سے سُنی ہی ہوگی۔"

ہاں، سُنی ہے مگر جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے وہ صرف عوام کو ہی نہیں پڑھنا ہوتا اسے وہ لوگ بھی پڑھتے ہیں جنہیں سب کچھ درست رکھنا ہوتا ہے۔ ترکی کی مثال سامنے رکھیں جو نہ مشرقِ وسطیٰ کا حصہ رہا اور نہ یورپ کا حصہ بن پایا۔

"یوں بھی اگر گورمکھی رسم الخط اپنا لیا جائے تو پنجابی پڑھ سکنے والوں کی تعداد اعشاریہ صفر صفر صفر ایک تک گر جائے۔"

بالکل ــ نہ صرف یہ کہ پوری پنجابی برادری کو دوبارہ پڑھانا پڑے گا بلکہ یہ لپی پنجابی کو سندھیوں، پشتونوں، بلوچوں، براہویوں اور کشمیریوں کی رسائی سے باہر کر دے گی۔ اور اگر یہ سانجھ ٹوٹ گئی تو وہ سانجھ بھی ٹوٹ جائے گی۔ جس نے ہمیں شرقِ اوسط سے مُنسلک کر رکھا ہے۔

گفتگو
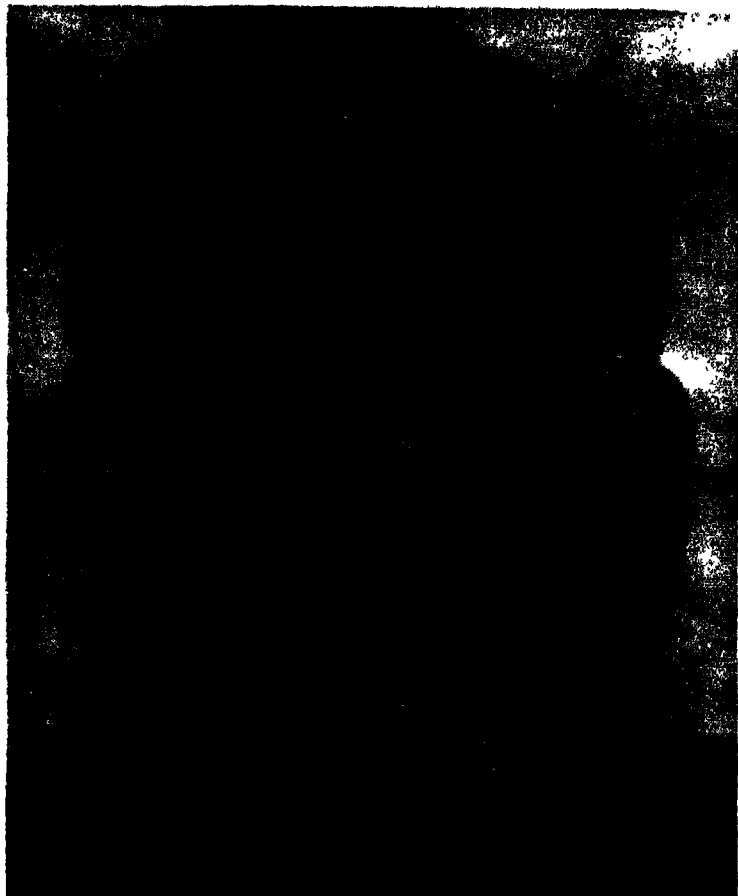
پنجابی زبان کا رسم الخط

حرفِ سوال : خالد احمد

حرفِ جواب : شریف کنجاہی

"ویسے ایم۔ اے پنجابی کرنے والوں کے لئے یہ رسم الخط جاننا ضروری ہونا چاہیئے؟"

پنجابی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے گورمکھی لپی جاننا یوں بھی ضروری ہے کہ مشرقی پنجاب میں ہمارے صوفیاء پر بہت کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور ہمیں اس کام سے آگاہ ہونے کے لئے یہ رسم الخط جاننا ہی ہوگا۔ بہرطور یہ تحقیقی نوعیت کا کام ہے اور یہ کام اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی پہنچ میں ہونا چاہیئے تاکہ کوئی ایسی بات آجائے جسے جاننا سب کے لئے ضروری ہو تو وہ اسے جلد از جلد پنجابی کی فارسی لپی میں عوام تک پہنچا سکیں۔ اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ ۱۹۲۷ء میں قرآنِ کریم کا ترجمہ گورمکھی لپی میں چھپ چکا تھا جبکہ فارسی رسم الخط میں ایسا ترجمہ بہت بعد میں ہوا۔

"آپ علاقائی زبانوں کی قومی افادیت کے قائل بزرگوں میں سے ہیں۔ قومی تحاریک میں علاقائی تخلیقات کے حصے پر کچھ روشنی ڈالیں۔"

قومی سطح پر ابھرنے والے اثرات اگر علاقائی حوالوں کی جڑوں سے پھوٹے ہوں تو وہ صحیح معنوں میں قومی اور قوی ہوتے ہیں۔ قومی تشخص علاقائی جذباتی حوالوں کے نوپرور مجموعے کے طور پر ابھرے تو یہ بٹی ہوئی اکائیوں کے مربوط تر اور ناقابلِ تقسیم مرکب کی صورت اختیار کر جاتا ہے، میں قومی تشخص کو "مرکب" گردانتا ہوں۔ "آمیزہ" نہیں۔

"پاکستانی ترقی پسند تحریک کے پنجابی ادیبوں میں احمد راہی اور شریف کنجاہی کے سوا کوئی تیسرا نابغہ نظر نہیں پڑتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"نابغہ تو خیر تمہاری خالد احمدیت ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک میں علاقائی زبانوں کے ادیب زیادہ دلچسپی لیتے تو نتائج زیادہ دوررس اور دیرپا ہوتے، خیر یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایسے تمام منصوبے جو پوری قوم کے مستقبل سے تعلق رکھتے ہوں علاقائی زبانوں کے ذریعے آگے بڑھائے جائیں تو بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً تعلیم بالغاں کے تمام پروگرام اس وقت تک بار آور نہیں ہوں گے۔ جب تک ذریعۂ تعلیم و ذریعۂ اظہار ان پڑھ "طلبا" کی مادری زبانیں قرار پائیں گی۔ ٹی وی پر تعلیم بالغاں کے بہت سے پروگرام پیش کئے گئے مگر کتنے ان پڑھ لکھنا پڑھنا سیکھ سکے؟ اس کے برعکس ریڈیو پاکستان لاہور کے دیہاتی اور زراعتی پروگرام ہمارے دیہات میں پوری توجہ سے سُنے جاتے ہیں توجہ تو خیر غیر مناسب لفظ ہے یہ پروگرام انتہائی دلچسپی سے سنے جاتے ہیں اگر ان پروگراموں کی طرز پر تعلیم بالغاں کے چھوٹے چھوٹے کتابچے مادری زبانوں میں چھاپے جائیں اور مساجد کے اماموں کے ذریعے غیر تعلیم یافتہ لوگوں میں مروج کئے جائیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک سال اندر اندر ایک وسیع پیمانے کی قابلِ محسوس تبدیلی آسکتی ہے۔

"رابطے کی زبان کے طور پر اردو کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

رابطے کی زبان "اردو" کو ہی رہنا چاہیئے، یہ کسی صوبے کی زبان نہیں لہٰذا کسی صوبے کے لئے تفاخر یا احساسِ محرومی کی باعث نہیں۔ البتہ ایک بات ہے اور وہ یہ کہ اُردو میں پنجابی الفاظ کی کثرت ہے۔ پاکستانی اُردو میں، بلوچی، بروہی، پشتو اور سندھی کے ہم مزاج الفاظ کا ذخیرہ کھپنا چاہیئے۔ اور یہ ان علاقوں کے اُردو ادیبوں کا کام ہے۔

"شریف کنجاہی صاحب آپ یہ بتائیں کہ آپ ہم عصر اُردو اور ہم عصر پنجابی ادب میں سانجھے رابطوں کی تلاش کریں تو آپ کن روابط کی نشاندہی کریں گے اور اختلافی پہلو تلاش کریں تو کس پہلو پر زور دیں گے؟"

شہری زندگی کے مسائل کے اظہار میں دونوں ادب سانجھی حدود میں عمل فرما ہیں جبکہ دیہاتی زندگی کی تمثال کاری میں اُردو شاعری کا دامن تہی دکھائی دیتا ہے۔

"اگر کوئی اُردو شاعر محبوب کا سراپا کھینچتا یا محبوب کے ہجر میں تڑپتا دکھائی دیتا ہے تو کیا وہ دیہاتی زندگی کے "مسائل" سے اغماض برت رہا ہوتا ہے، آپ ہی کچھ کہیں؟"

"اب ہمارے دیہات اور جنگل "دن" سے بھی محروم ہو چکے ہیں، لوگوں نے کاٹ پیٹ کر چولہوں میں جھونک دیئے ہیں۔"

چھوڑو بھی، اب شہروں میں کیسا ہجر، کیسا فراق؟ یہ تو دیہاتی مسائل ہیں، شہر میں یہ "مسائل" ختم ہو چکے ہیں۔

"اچھا آپ یہ بتائیں کہ ہمارا لوک ورثہ ہماری اُردو شاعری میں کیوں راہ نہ پا سکا؟"

ہمارے اردو ادیبوں نے ہماری لوک علامات و روایات سے پہلو تہی کی اور اپنا ناتہ فارسی روایات

سے جوڑنا ضروری گردانا اُردو ادیب ہماری لوک روایات کی علامتی حیثیت کو پا ہی نہ سکا اور سبب اس کا یہ ہوا کہ طرزِ اظہار کے اختلاف نے اُردو شاعروں کو لوک ورثے کی روح میں اترنے ہی نہ دیا۔

"شریف صاحب، وارث شاہؒ، باہوؒ، میاں محمدؒ، مولوی غلام رسولؒ، خواجہ غلام فریدؒ، وغیرہ میں خود سپردگی کی انتہا میں پگھلتی محسوس ہوتی ہیں جبکہ ہمارے جدید پنجابی شعراء اس آنچ کو اپنا دل کیا اپنا بدن بھی نہیں چھونے دیتے! یہ کیا وجہ ہے؟ کیا یہ لوگ بھی ہمارے لوک ورثے کی روح میں نہ اتر پائے"؟

ہم لوگ اپنا بنیادی شرف کھو رہے ہیں۔ برگد کی ٹھنڈی چھاؤں کو ایئرکنڈیشنرز کی سرد تر ہوا نے ہماری زندگی سے نکال پھینکا ہے۔ ہم ہر شے کو اُس کی افادیت کے حوالے سے ناپنے لگے ہیں — خود سپردگی کی جگہ خود غرضی در آئی ہے، خیر چھوڑو اس قصے کو۔

"اس قصے کو میں کیسے چھوڑ دوں مجھے آپ کی نظم "وَن دا بوٹا" یاد آ رہی ہے"

"وہی افادی پہلو"

ہاں وہی افادی پہلو، کوئی شہری سا تجھ وا اپنا کرو۔

"مگر شریف صاحب میرے نزدیک تو ہم عصر پنجابی کا کمزور ترین پہلو یہی شہری مسائل والا شعری پہلو ہے۔ میں کسی خاص شاعر کا نام نہیں لیتا کسی شاعر کے کسی خاص شعر کا ذکر نہیں کرتا ——، میں تو مجموعی طور پر اس سارے ٹکڑے کو لایعنی سمجھتا ہوں۔"

میں بھی کسی کا نام لئے بغیر کہہ رہا ہوں کہ یہ علامتیں، جن کا ذکر تم ہمارے صوفی شعرا کے حوالے سے کر رہے ہو، یہ علامتی دلچسپیاں بھی ایک مخصوص مزاج رکھتی ہیں۔ وہ مزاج بھی نہیں رہا صوفیوں کے دیئے ہوئے سبق کو کون یاد رکھتا ہے — بابا فریدؒ کے مزار پر حاضری دینے والے کب یاد رکھتے ہیں کہ بابا فریدؒ نے اپنی ابیات میں پیغام دیا تھا۔ وہ تو منتیں مانتے ہیں اور انہیں پوری ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں، وہ خود سپردگی جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے، ان خود غرضوں کے پاس کہاں سے آئے، اچھا چلو چائے پئیں۔

شریف کنجاہی اب تک بابا فریدؒ کی ابیات کا اُردو ترجمہ، اقبالؒ کے جاوید نامہ کا پنجابی ترجمہ اور علامہ اقبال کی پہلی نثری تحریر "علم الاقتصاد" کا پنجابی ترجمہ کر چکے ہیں اور آج کل شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سچل سرمستؒ کا براہِ راست سندھی زبان سے منظوم پنجابی ترجمہ کر رہے ہیں۔

شریف کنجاہی نے چائے کی پیالی پر بہت سی باتیں کیں مگر یہ سب آف دی ریکارڈ تھیں، مگر تھیں پنجابی شاعری کے شعری پہلو سے متعلق۔

"میرے خیال میں ماہِ نو ایک روشنی ہے جو ادب کے متوالوں کے دلوں کو منوّر کر رہی ہے
ایک خوشبو ہے جو سانسوں میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔
خدا سے دُعا گو ہوں کہ ماہِ نو قیامت تک سلامت رہے"

طارق حسین طارق —— حیدرآباد سندھ

شگفتہ پروین

پرتو روہیلہ

پریشان خٹک

جلیل عالی

ماہ نو

اوراقِ گذشتہ کی کتاب

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان

قتیل شفائی۔ حمایت علی شاعر۔ نامعلوم۔ ابراہیم جلیس۔ ممتاز مفتی۔ شوکت صدیقی۔ اشفاق احمد۔ حمید کاشمیری۔ منیر نیازی

اپریل ۱۹۷۹ء

صدر مجلسِ ادارت
سید امجد علی

چیف ایڈیٹر
کشور ناہید

ایڈیٹر:- علی محمد حسینی
جائنٹ ایڈیٹر:- قائم نقوی

ترتیب

مضامین

منتخب شاعر

افسانے

غزلیں

بارے مصورِ سرورق

گل جی ۱۹۲۷ء میں پشاور میں پیدا ہوئے سب کی بات یہ ہے کہ ایک اعلیٰ اور مستند انجینئر ہونے کے باوجود، عشقِ مصوری نے ان کا پیشہ چھڑوا دیا۔ پورٹریٹ پینٹنگ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہ پاکستان کے واحد مصور ہیں کہ جن کے سامنے پاکستان کے صدر، آغا خان، شہنشاہِ افغانستان اور فرح دیبا تک، اپنے پورٹریٹ بنوانے کے لئے بیٹھے، ۱۹۵۷ء میں افغان حکومت نے سرکاری طور پر گل جی کو شہنشاہِ افغانستان اور دیگر زعما کے پورٹریٹ بنانے کے لئے طلب کیا۔ کانسی اور دیگر دھاتوں کے ذریعہ بھی پورٹریٹ بنانا گل جی کے فن کا وہ انداز ہے کہ دنیا بھر میں کوئی ان کی طرح کے پورٹریٹ نہیں بنا سکتا۔
۱۹۶۰ء میں گل جی کے فن میں ایک نیا موڑ آیا۔ تجرید ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گئی اور ان کی ساری توجہ پورٹریٹ سے ہٹ کر میورل بنانے اور تجریدی مصوری کے تجربے کرنے پر صرف ہونے لگی۔ البتہ اپنے بنیادی اور لاثانی فن کی بقا کے اعتبار کے لئے انہوں نے قائد اعظم اور اقبال کے پورٹریٹ جشنِ صد سالہ کے دوران بنائے تھے۔
گل جی کراچی میں مقیم ہیں اور پاکستان کو ان کے فن پر فخر ہے۔

آئندہ شمارے کی جھلکیاں

احسان دانش، جسٹس عطاء اللہ سجاد، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، انتظار حسین، حمایت علی شاعر، ڈاکٹر اسلم فرخی، شہرت بخاری، محشر بدایونی، جابر علی سید، انور سدید، مشتاق قمر، مسعود ہاشمی، یحییٰ امجد، محمد خالد، افضال سید، انور سن رائے، سلیم خان گمی، حیدر سندھی۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۱۸ — جلد نمبر ۳۲ ——— شمارہ نمبر ۴ — طلبہ کیلئے بمع رجسٹری فیس ۲۰ روپے

قیمت: ۲ روپے — سالانہ چندہ مع رجسٹری فیس ۳۰ روپے

وزارتِ اطلاعات و نشریات کے ادارۂ مطبوعات حکومت پاکستان (پوسٹ بکس ۲۲۵ لاہور) نے
دین محمدی پریس ال روڈ لاہور سے چھپا کر دفتر ماہِ نو ۳۰ اے حبیب اللہ روڈ ... سے شائع کیا۔

ماہِ نو

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال

ترجمہ: علی محمد حسینی

اقبال اور تصوّف

اقبال ایک انتہائی دیندار خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے برہمنی جدِ طول بج جو چودھویں صدی عیسوی میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے، کشمیر میں سلطان زین العابدین کے عہدِ سلطنت میں طریقۂ ریشیان کے معروف شیخ تھے۔ ان کے اجداد میں بعض مشتاق صوفی بھی گزرے ہیں۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک نے تصوف پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ خود اقبال کے والدِ ماجد روایتی تصوف سے گہرا شغف رکھتے تھے اور غالباً انہیں کے زیرِ اثر اقبال اپنے زمانۂ طفولیت ہی سے طریقۂ قادریہ سے منسلک تھے۔

اقبال کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ وہ تصوف کے خلاف تھے لیکن تصوف کے متعلق اقبال کے افکار کی صحیح تشخیص و تعیین کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان کے کلام میں تصوف کی تشریح و تعبیر کس انداز میں کی گئی ہے۔

"اسرارِ خودی" کی اشاعت سے قبل ۱۹۱۵ء تک اقبال وجودی تصوف سے وابستہ ہے۔ اور اپنے افکار کی اساس نظریۂ وحدت الوجود پر رکھی۔ حتیٰ کہ ایک طالب العلم کی حیثیت سے قیامِ یورپ کے دوران بھی وہ مولانا جلال الدین رومی اور منصور حلاج کے روایتی نظریۂ وحدت الوجود کا اتباع کرتے نظر آتے ہیں لیکن یورپ سے واپسی پر انہوں نے محسوس کیا کہ وحدت الوجود فکرِ رومی کا ایک رُخ ہے، اور پھر انہوں نے رومی کو پرتپاک طور پر عقیدۂ وحدت الوجود کے نمائندے کی حیثیت میں پیش نہ کیا۔ بلکہ ذاتِ خداوند اور انسان کے درمیان والہانہ عشق کے پرجوش نقیب کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کر دیا۔ حلاج کے بارے میں بھی اُن کے نظریے میں تبدیلی آچکی تھی کہا جاتا ہے کہ حلاج نے "انا الحق" کا آوازہ بلند کیا تھا۔ ابن عربی کے اصولِ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کی اصطلاح میں اُس کی مسلّمہ توضیح لفظ "الحق" کی "حق" سے تبدیلی ہے تاکہ اس کا مطلب یہ لیا جا سکے "میں حق ہوں، (یعنی میں تخلیقِ حق ہوں)، میں ظاہری شکل میں اللہ تعالیٰ کی حقیقت کا راز ہوں" خود حلاج کی نگاہ میں ذاتِ ایزدی کے ساتھ اتحاد، صوفی کی شخصیت کی فنا پر منتج نہیں ہوتی بلکہ یہ واردات اُسے اور زیادہ کامل بنا دیتی ہے۔ رومی اس صوفیانہ اتحاد (UNIOMYSTICA) کو لوہے اور آگ کی علامت سے بیان کرتے ہیں کہ جب لوہا آگ میں پھینک دیا جاتا ہے تو اس کا رنگ بھی آگ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور لوہا آواز بلند کرتا ہے کہ "میں آگ ہوں تم مجھے چھو سکتے ہو اور احساس کر سکتے ہو کہ میں آگ ہوں" لیکن اس کا مطلب صرف وصفی اتحاد ہے نہ کہ حقیقی اتحاد، کیونکہ لوہا مادی اور حقیقی طور پر لوہا ہی رہتا ہے۔ اگرچہ وہ آگ کی حرارت اور رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اقبال لکھتے ہیں کہ حلاج کے ہم عصروں اور جانشینوں نے حلاج کے الفاظ کی وجودی تشریح کی، لیکن خود شہید صوفی کا مقصد یہ نہ تھا کہ خدا کے ورا اور وراء ہونے کا انکار کیا جائے تھا اس لئے حلاج کے تجربے کی صحیح تعبیر یہ نہیں کہ قطرہ سمندر میں واصل ہو جائے بلکہ ایک لافانی اندازِ بیان میں ایک عمیق شخصیت میں انسانی خودی کی حقیقت اور استحکام کا احساس اور جرأتمندانہ اقرار ہے۔ (دی کنسٹرکشن آف ریلیجیئس تھاٹ اِن اسلام صفحہ ۹۶)

یہ خیال کہ اقبال تصوف کے مخالف تھے، ۱۹۱۵ء میں "اسرارِ خودی" کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد نشو و نما پایا، جس میں ایسے اشعار بھی تھے۔ جن میں فارسی زبان کے مشہور و معروف شاعر حافظ کے پیش کردہ تصورِ حیات پر شدید تنقید تھی، اقبال نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ اگر ادبی معیارِ حُسن بدلنے ممکن ہے تو خواہ اس کا نتیجہ مفید ہو یا مضر، حافظ دنیا کے عظیم شعراء میں سے ہیں۔ ڈاکٹر این میری شمل حافظ کے

بارے میں اقبال کی اس رائے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتی ہیں (اقبال کے) اس حملے میں ان کی تنقید کی اصل وجہ بھی شامل ہے۔ "اسرار" ازمنۂ وسطیٰ بلکہ بڑی حد تک ماڈرن اسلام کے فلسفہ پر فلاطونی اور عجمی رنگ چڑھا دینے کے خلاف عربی اسلام کے احتجاج اور عقیدۂ وحدت الوجود کے خلاف چیلنج کے طور پر لکھی گئی ہے۔ جو فارسی شاعری میں سرایت کر چکا تھا"
(GABRIEL'S WING PP 339 – 340)

اقبال ابن عربی اور ان کے تصورِ وحدت الوجود پر بھی معترض تھے۔ اقبال نے ۱۹۱۹ء میں اپنے ایک خط میں اظہارِ نظر کیا تھا کہ اگر تصوف سے مراد مذہبی واردات کے ذریعے صفائے روح ہے (جیسا کہ تصوف کے ابتدائی مراحلِ پیشرفت میں مقصود تھا) تو اس پر کسی بھی مسلمان کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب خارجی اثرات کے تحت تصوف نے فلسفہ کا رنگ اختیار کر لیا اور خداوندِ تعالیٰ کے جوہرِ ذات اور کُنہِ تخلیقِ عالم کے لئے بے ساختہ کشفی نظریہ پیش کرنا شروع کر دیا، تو اقبال کی روح نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔
(IBD. P. 364)

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اقبال نے وجودی تصوف کو خاص طور پر اس لئے رَد کر دیا تھا کہ یہ ترکِ دنیا اور نفس کشی کی تاکید کرتا تھا۔ اور اس نے اسلام کے خدا کو ایک غیر معین جنس کی حد تک گھٹا دیا تھا۔ اقبال کا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی تکمیل کی جائے اس لئے وہ ایک خاص الخاص ذات پر تمیا اصل قرآنی خدا کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اللہ انسان اور خدا کے درمیان "من و تو" کے رشتہ کی بازیابی کر لیتے ہیں۔ قدیم تصوف کی بنیاد اسی ذاتی رشتے پر استوار تھی اور وہ اس کی توثیق کرتا تھا، لیکن بعد میں ابن عربی کے پیروکاروں نے بیشتر ممتاز صوفیاء کے اقوال اور تحریروں کی وجودی اصطلاح میں تشریح کی اور عام مسلمان توحید کے وجودی تصور کو اسلام کا مستند مفہوم سمجھنے لگے۔

اقبال نے پیغمبرانہ اور صوفیانہ نوعیت کے شعور میں نفسیاتی اختلاف کو درک کر لیا تھا۔ وہ تحریر کرتے ہیں۔ "صوفی نہیں چاہتا کہ وہ وارداتِ اتحاد (UNITARY EXPERIENCE) کے سکون کو چھوڑ کر واپس آئے۔ اور اگر کبھی واپس آئے۔ جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے تو اس کی یہ واپسی من حیث المجموع بنی نوعِ انسان کیلئے نہ ہوگی۔ لیکن پیغمبر کی باز آمد تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ اس واردات سے اس لئے واپس آتا ہے کہ وقت کے رواں دھارے میں اپنے آپ کو اس مقصد سے داخل کر دے کہ وہ تاریخ کی قوتوں پر تصرف حاصل کرے۔ اور اس کے ذریعے آئیڈیلز کی ایک نئی دنیا تخلیق کرے۔"
(ری کنسٹرکشن آف ریلیجیئس تھاٹ اِن اسلام، صفحہ ۱۲۴)
اقبال کے نزدیک پیغمبرانہ نوعیت کے شعور نے ایک نیا تہذیبی سلسلۂ نظم ایجاد کر کے دنیا کو منقلب کر دیا۔ جو صوفیانہ شعور کے مقابلے میں انسانیت کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اس مرحلے پر اقبال کے مابعد الطبیعاتی افکار کا ایک مختصر بیان سودمند ہوگا۔ وہ اللہ تعالیٰ کو پوری قوتِ حیات کے ساتھ حق اور مستقلاً مرید (صاحبِ ارادہ) شخصیت سمجھتے ہیں وہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اُسے اُس کے اِسمِ ذات "اللہ" سے پکارا جائے۔ خدا ہی انتہائی خودی (ULTIMATE EGO) ہے۔ جس کی لامحدودیت داخلی ہے نہ کہ خارجی اور اس کا وجود وجدان کے ذریعے تسلیم کیا جا سکتا ہے نہ کہ عقل کے ذریعے۔ وہ تسلسل کے ساتھ تخلیق کرنے والا ہے اور اپنی تخلیق میں اضافہ جاری رکھتا ہے اور اپنے ارادے کی تبدیلی پر قدرت رکھتا ہے۔ خدا کو انتہائی خودی متصور کرنے سے صرف انائیں یا خودیاں آگے بڑھتی ہیں۔ اس لئے کائنات مادی ذرے کی میکانی حرکت سے لیکر انسانی انا یا خودی میں فکر کی آزادانہ حرکت تک "انا الاکبر" کا خود انکشاف ہے۔ اس طرح کائنات خدا کا ایک مسلسل فعل ہے۔ یہ ایک جامد کائنات یا تکمیل یافتہ مصنوع نہیں ہے۔ جو غیر متحرک یا ناقابلِ تغیر ہو۔ قوائے ذہنی اور مادے کے درمیان انائیت (EGOHOOD) کی ڈگری کے علاوہ اور کوئی امتیاز نہیں ہے۔ انسان کائنات سے اس لئے ممیز ہے کہ وہ مرحلۂ تخلیق میں خدا کے ایک عمل کی حیثیت سے خودشناس ہے۔ وہ اپنی محدود انا اور شخصیت کے اعتبار سے خدا سے علیحدہ اور منفرد ہے۔ وہ آزاد ہے۔ اس کی خواہشات اور آرزوئیں، نفرتیں اور محبتیں فیصلے اور ارادے بلا شرکتِ غیرے خود اس کے اپنے ہیں۔ حتیٰ کہ خدا بھی اُسے نہ کچھ احساس کرنے فیصلہ یا انتخاب کرنے پر مجبور کر سکتا ہے، جبکہ انسان کے لئے ایک سے زیادہ عمل کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ وہ بالقوہ ایک تخلیقی فعالیت ہے۔ اگر وہ آغازِ عمل کرتا ہے تو اس میں یہ استعداد ہے کہ وہ ارتقائی تغیر کے مرحلے میں خدا کا شریکِ کار اور شریکِ تخلیق بن سکے۔
انسان حیات بعد الممات کا حق کے طور پر مطالبہ

نہیں کر سکتا۔ وہ اسے اپنی خودی یا شخصیت کے استحکام کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ جہنم کوئی دائمی عذاب کا غار نہیں اور نہ جنت راحت کی جگہ۔ یہ تو محض اصلاحی تجربے ہیں۔ انسانی فعالیت کی کوئی انتہا نہیں، وہ ہمیشہ انتہائی خودی سے کسبِ نور کے لئے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ انسان کا ہر عمل ایک نئی صورتِ حال کو پیدا کرتا ہے اور اس طرح تخلیقی انکشاف کے مزید مواقع پیش کرتا ہے۔ انسان اور خدا بدرجۂ اتم حر کی شخصیتیں ہیں۔ جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور ہم آہنگ بھی۔ قطرے کے سمندر میں جذب ہو جانے کی مثال اُن لوگوں پر صادق آتی ہے جو اپنی شخصیتوں کے استحکام میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اور موت کے صدمات کو سہنے سے قاصر ہیں۔ لیکن وہ خودیاں جو اپنے آپ کو استحکام دے سکتی ہیں۔ وہ حرکت کرتی رہتی ہیں۔ اور اپنے وجود کو بحرِ تقدیس کی سدا روانی میں موتی کی طرح برقرار رکھتی ہیں۔ اُن کا علیحٰدہ وجود کبھی فنا نہیں ہوتا بلکہ ہمہ گیر انتہائی خودی اپنے آپ میں ان کا وجود برقرار رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شمع کی لَو سورج کی تیز روشنی میں اپنا جداگانہ اور ممتاز وجود باقی رکھتی ہے۔ لہٰذا قطرے کے لئے زندگی ایک جہدِ مسلسل ہے کہ وہ صدف کا رنگ اختیار کرے۔ انسان کی منزلِ مقصود انفرادیت کی محدودیت سے آزادی نہیں بلکہ اس کی باضابطہ تصریح ہے۔

خدا کا تخلیقی عمل تسلسلِ زمان میں تحول و تغیر کے مرحلے پر خارجی طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ لیکن دراصل تحول استدام (معیتِ زمانی) کا ایک مسلسل عمل ہے۔ اس طرح کائنات ایک مستقل معرضِ تحول کی صورت میں جاری رہتی ہے۔ ایٹمی دور کی اضافیت اور معروضیت، خدا کی جانب سے انسانی تخلیقی فعالیت کی آزمائش اور پیمائش کے لئے اراداً کسوٹی کے طور پر وجود میں لائی گئی ہے۔ انسانی افعال اگر ایک استحکام یافتہ شخصیت کی جانب سے انجام پذیر ہوں تو وہ تخلیقی ہوتے ہیں اور ایک مستقل قوت کی شکل میں امتدادِ زمانہ سے غیر متاثر رہتے ہوئے زندہ رہتے ہیں۔ دوسری تمام انسانی کوششیں انجام کار بے درد گردشِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع جاتی ہیں۔ نتیجتاً انسان لازمی طور پر ایک روحانی وجود ہے۔ جو اپنے آپ کو زمانِ مکانی (SPACE TIME) میں برسرِ پیکار رکھتا ہے۔ اس کا شایانِ شان طور پر ایک نظمِ اجتماعی میں حقوق و فرائض رکھنے والی ایک زندہ قوت کی حیثیت سے احساس کیا جا سکتا ہے۔ بے مثال افراد ہی کو ایک بے نظیر سوسائٹی کی تشکیل کرنی چاہئیے ایک ایسی سوسائٹی جو بہت ہی واضح عقیدہ کی حامل ہو اور اس بات کی صلاحیت رکھتی ہو کہ اپنے حدود کو مثالی نمونہ اور تشویق سے وسعت دے سکے۔ اقبال کی رائے میں اسلام نے اس قسم کی سوسائٹی کی تاسیس میں قوم اور قوم کو تشکیل دینے والے افراد کو اہمیت دے کر کامیابی حاصل کی ہے۔ لہٰذا انفرادی اور اجتماعی خودی کے موضوع پر اقبال کے افکار کی بنیاد ایک کامل مسلمان اور اسلامی سوسائٹی کے قرآنی تصور پر رکھی گئی ہے۔

اقبال کے مابعد الطبیعات سے جو اخلاقی قدر اخذ کی جا سکتی ہے۔ وہ اس قسم کے اوصاف پر مشتمل ہے۔ عشق، حریت، شجاعت اور فقر یعنی مادی آسائشات یا دولت کے حصول میں انتہائی بے لوثی۔ اس قسم کے اوصاف کی تربیت، انسانی شخصیت کے استحکام کا باعث بنتی ہے۔ اور ایسے انسان کے افعال تخلیقی اور لازوال ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کا شریکِ کار در تخلیق ہوتا ہے۔

اقبال کے بموجب عشق بنیادی باطنی وصف ہے جو ایمان کو سہارا دیتا ہے اور اس طرح وہ انسانی فکر اور فعالیت میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ وہ خواہش کی شدت کو شدید تر کرتا ہے اور اپنی روح کے لحاظ سے آزاد ہے۔ اقبال عشق کی تعریف کرتے ہوئے پُر ذوق انداز میں کہتے ہیں "عشق کا لفظ بہت ہی وسیع معنی میں استعمال میں آتا ہے اور اس سے جذب اور ضم ہو جانے کی خواہش مراد ہے۔ اس کی عالی ترین شکل، اقدار اور آئیڈیلز کی تخلیق اور انہیں مؤثر بنانے کی کوشش ہے۔ عشق، عاشق و نیز معشوق کو منفرد بنا دیتا ہے۔ اعلیٰ منفرد انفرادیت کے ادراک کی کوشش متجسس کو بھی منفرد بنا دیتی ہے۔ اور مطلوب کی انفرادیت پر بھی دلالت کرتی ہے، کیونکہ متجسس کی فطرت کو اس کے علاوہ اور کوئی چیز مطمئن نہ کر پائے گی۔" (آئیڈیالوجی آف پاکستان، جاوید اقبال صفحہ ۱۱۱) اس لئے اقبال کے فلسفۂ عشق میں فراق کی روحانی تکلیف انبساطِ تمیز میں متغیر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر یہ واضح ہے کہ عشق آزاد، متحرک اور تخلیقی ہے۔

اقبال کے قول کے مطابق وہ عناصر جو انسانی خودی یا شخصیت کو فنا کر دیتے ہیں۔ وہ جمود سے پیدا ہوتے ہیں۔ جو تخلیقی فعالیت کی ضد ہیں۔ جمود انفعالی کیفیت کو پیدا کرتا ہے۔ جیسے ذلت تسلیم، فرمانبرداری، نیز خوف، بداخلاقی، بزدلی اور بھیک مانگنا، نہ صرف ذرائع معاش کے لئے بلکہ دوسروں سے افکار کی بھی بھیک مانگنا، نقالی اور آخر الامر غلامی۔

فکرِ اقبال کے اس تجزیے سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ صرف ایسے تصوف کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔ جس کی بنیاد قرآنی عقیدۂ توحید پر استوار ہو۔ وہ صرف اسلام کے مخصوص خدا پر یقین رکھتے تھے انہوں نے خدا اور بندے کے درمیان روحانی ارتقاء کے ہر موقع پر ایک بنیادی تمیز (فراق) کی تائید کی، انسانی ارادہ و اختیار کا احترام کیا، انسانی خودی کے استحکام اور بقا کی تلقین کی، عشق کو ایک قوتِ محرکہ اور تخلیقی قوت قرار دیا، زندگی کے حقائق کو تسلیم کیا اور دنیا کی اصلاح کی کوشش کی۔ بنابریں انہوں نے ایسے تصوف کو رد کر دیا تھا جو جماعت سے کنارہ کشی اور عزلت نشینی کی تاکید کرتا، ترکِ دنیا کی تلقین کرتا، حیات و کائنات کو غیر حقیقی تصور کرتا۔ زندگی سے فرار کے رجحان کی ترغیب دیتا۔ جس نے ایسے تصورِ عشق کو پیش کیا جس کی بنیاد مطالعۂ باطن، اُسکر اور بے نفسی پرستی اور جو فنا یا وصال جیسے تباہ کن آئیڈیلز پر یقین رکھتا تھا۔ زندگی کو پہلے سے مقسوم سمجھتا اور خیر و شر کے مسائل سے لاتعلق تھا۔ قانونِ شریعت کو ثانوی اہمیت دیتا اور بے عملی یا توکل کا قائل تھا۔

اقبال مذہبی مشاہدے کی تاریخ کی روشنی میں استدلال پیش کرتے ہیں کہ اعلیٰ تصوف انسان میں خدائی اوصاف پیدا کرنے پر مشتمل ہے اور واردات وحدت کا مفہوم یہ نہیں کہ متناہی خودی، لامتناہی خودی میں کسی قسم کے جذب و تحلیل کے ذریعے اپنی ہستی کو فنا کر دے بلکہ یہ کہ متناہی، لامتناہی کو آغوشِ محبت سے ہم کنار کر لیتی ہے۔ اسی پس منظر میں اقبال مدعی ہیں کہ صوفی ازم کے حقیقی سلسلوں نے اسلام میں مذہبی واردات کے ارتقاء کی تشکیل و تنظیم میں کارِ نمایاں انجام دیا ہے۔ لیکن موجودہ دور کے روایتی صوفیا، جدید فہم و ادراک سے ناواقفیت کے باعث جدید مشاہدہ اور تجربے سے تروتازہ فیضان حاصل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔

اقبال کے بموجب عقل اور وجدان ایک ہی سرچشمے سے پھوٹے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کا تکملہ کرتے ہیں نہ کہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان میں سے ایک حقیقت کو جزواً جزواً اخذ کرتا ہے۔ اور دوسرا من حیث الکل۔ ان کے نزدیک وجدان عقل سے بلند تر ہے۔ ادراکِ حسی و نیز تعقل یا استدلال کو اس چیز سے تقویت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسے قرآن نے "قلب" کے نام سے بیان کیا ہے۔ اقبال وضاحت کرتے ہیں کہ قلب کوئی پُراسرار قوت نہیں ہے بلکہ یہ "حقیقت" کے ساتھ تدبیر کا ایک "طریقۂ کار" ہے۔ جس میں احساساتِ قلبی اپنے نفسیاتی مفہوم میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ اسے نفسیاتی، عارفانہ یا مافوق الفطرت کی حیثیت میں بیان کرنے سے اپنی قدر اور واردات میں کوئی کمی پیدا نہیں کرتا۔ اقبال کی رائے ہے کہ جدید نفسیات تاحال کسی واقعی موثر سائنٹیفک طریقۂ کار سے آراستہ نہیں ہے کہ غیر عقلی یا صوفیانہ شعور کے محتویات کا تجزیہ کر سکے۔ اقبال کے خیال میں صوفیانہ شعور کی اہم خصوصیات یہ ہیں:۔ خدا کی معرفت کا بدیہی تجربہ، اس طرح جیسے کوئی شخص دوسری اشیاء کا علم رکھتا ہے۔ واردات کی ناقابلِ تجزیہ کاملیت۔ واردات اُس ذاتِ یکتا کے ساتھ قریبی اتحاد کا ایک لمحہ ہے جو واردات میں معروف شخصیت پر چھا جاتا ہے اس کا احاطہ کر لیتا ہے اور اُس پر قابو پا لیتا ہے۔ واردات کا ابلاغ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ خیال (یا مشاہدہ) کے مقابلے میں حسی کیفیت سے زیادہ مشابہ ہے۔ واردات کے محتویات قضیاتی شکل میں دوسروں تک نہیں پہنچائے جا سکتے کیونکہ یہ بذاتِ خود ایک غیر ناطق احساس کا ماجرا ہے۔ واردات ایک مدتِ زمانی میں وقوع پذیر ہوتی ہے اس لئے تسلسلِ زمان کے غیر حقیقی پن کا احساس دیتی ہے لیکن اس کا مطلب تسلسلِ زمان میں مکمل رخنہ نہیں ہے کیونکہ یہ ایک کیفیت ہے جو اعتبار کا ایک عمیق تاثر چھوڑنے کے بعد زائل ہو جاتی ہے۔ جس طرح کوئی شخص حسی ادراک یا تعقل کے ذریعے حاصل کئے جانے والے علم میں فروگذاشت یا غلطیوں سے دوچار ہو سکتا ہے، اسی طرح شیطان اپنی عداوت کے باعث مصنوعی واردات کا افترا کر سکتا ہے جو صوفیانہ کیفیت میں آہستہ سے در آ کر واردات کی گمراہی کا باعث بن سکتا ہے۔" (ری کنسٹرکشن آف ریلیجیئس تھاٹ اِن اسلام، صفحات ۱۔۲۸)۔

اقبال بعض عظیم صوفیاء کی تحریروں یا دیگر اقوال سے بہت زیادہ متاثر تھے اور اپنے افکار کی تائید میں بار بار سند کے طور پر پیش کرتے تھے رومی اُن کے روحانی مرشد تھے۔ وہ اقبال کی نگاہ میں میرِ کاروانِ عشق تھے۔ اقبال توحید کی شہودی تعبیر سے اتفاق رکھتے تھے جسے طریقۂ نقشبندیۂ مجددیہ نے پیش کیا تھا۔ عام طور پر کوئی بھی شخص

خود ان کے ارتقائے افکار میں شہودی تصوّف کی تاثیر کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ یقینی طور پر وجودی تصوّف کے اس کی تمام اشکال سمیت مخالف تھے۔ ان کے خیال میں وہ درویش جو اپنی قوم یا جماعت کے مقدر سے لاپرواہ ہو اور جس کی بصیرت اس کے مسائل کا حل مہیا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو، وہ کسی بھی قدر و قیمت کا حامل نہیں ہے۔ اگر "حق" TRUTH نے قلب پر کوئی نقش چھوڑا ہے تو اس کی شعاعوں کو خارجی ماحول کو بھی منوّر کرنا چاہیئے تاکہ کسی بھی انسان کا حقیقتِ الٰہیہ کے متعلق ذاتی کشف مجموعی طور پر انسانیت کی فلاح و بہبود کی تکمیل کے لئے مجموعی کشف بن سکے۔ لیکن اقبال کے خیال میں فکر کے ایک پیچیدہ ڈھانچے کا ارتقاء، تر بہ تر قدموں والی روحانی سیڑھی چڑھنے کے لئے ترکِ دنیا، یا ریاضت کے ایک نہایت ہی محتاط نظام کی تشکیل، تزکیہ و مراقبہ جس کا انجام انفرادی شخصیت کی فنا ہو، زندگی کا نہیں موت کا پیغام ہوتا ہے۔

اقبال انسان کے ایک منفرد شخصیت کے اعتبار سے احیائے جدید، اور اس میں اللہ تعالٰی کی ذاتِ برتر سے براہ راست راز و نیاز کی آرزو کی بیداری کی جدوجہد کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے آپ میں اللہ تعالٰی کی خوبیوں اور اوصاف کو جذب کر سکے اور اس طرح ایک بہترین کائنات اور ایک زیادہ مکمل نظمِ دنیاوی کی تعمیر میں اس کا شریککار اور شریکِ تخلیق بن سکے۔

(ایک طویل مضمون کا اقتباس)

"ماہِ نو اب پھر پابندی سے ملنے لگا ہے۔ مضمون جلد پیش کروں گا۔ فروری کے شمارہ میں عزیز احمد پر انور سدید کا مضمون پڑھا۔ اچھا تعزیتی نوٹ ہے مگر صفحہ ۱۱ پر وہ ایک حیرت انگیز غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"عزیز احمد کا ایک اور ترجمہ چارلس لیمب کا تاریخی ناول "چنگیز خان" ہے۔ اس ترجمے میں انہوں نے چارلس لیمب کے تاریخی ذہن کو گرفت میں لے لیا ہے۔ اور روانی، شگفتگو اور رعنائی سے اسے ایک تخلیقی فن پارے کا درجہ دے دیا ہے" یہ بات غلط ہے کتاب "چنگیز خان" کا ترجمہ عزیز احمد نے ضرور کیا ہے مگر یہ کتاب نہ تو ناول ہے اور نہ چارلس لیمب کی تصنیف ہے یہ چنگیز خان کی شہرۂ آفاق سوانحعمری ہے اور اس کے مصنف نامور سوانح نگار ہیرلڈ لیم ہیں۔ یہ کتاب مکتبۂ جدید لاہور نے شائع کی ہے اور شاید انور سدید صاحب کی نظر سے بچ نکلی ہے۔"

فتح محمد ملک ——— اسلام آباد

ڈاکٹر سلیم اختر

اقبال کا لسانی شعور

"زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہارِ مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے[1]"

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے آشنا میں
کوئی دلکشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

علامہ اقبالؒ نے اس نثر پارے اور شعر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کئی لحاظ سے قابلِ توجہ ہیں اس لئے کہ یہ اقبالؒ کے خیالات ہیں اور اس لئے بھی کہ ان خیالات کی روشنی میں اگر ایک طرف علامہ کا لسانی شعور عیاں ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف یہ وہ کسوٹی بھی مہیا کرتے ہیں۔ جس پر خود علامہ کے اپنے کلام کی پرکھ ہو سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اقبالؒ کے شعری محاسن کی تحسین کے لئے ایک داخلی معیار بھی مل جاتا ہے۔ داخلی ان معنوں میں کہ خود اقبالؒ کے شعری وجدان کا عکس لطیف ہے۔ جس کی اساس اس شعورِ نقد پر استوار ہے جس میں اقبال کا لسانی شعور بھی رنگ آمیزی کرتا ملتا ہے

اقبال نے گذشتہ صدی کی آخری دو دہائیوں میں شاعری کا آغاز کیا اور موجودہ صدی کے آغاز تک وہ برصغیر کے اہم شعراء میں شمار ہونے لگے تھے۔ گذشتہ صدی کے آخری پچاس برس اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کے سقوط کی صورت میں برصغیر سے مسلم سلطنت کا خاتمہ ہی نہ ہوا بلکہ اس سے ردِ عمل کی جس زنجیر نے جنم لیا۔ اور اس کے نتیجہ میں مسلم تہذیب کی مسلّم اقدار میں دراڑیں پڑنے کے جس سلسلہ کا آغاز ہوا وہ آئندہ نصف صدی تک محیط نظر آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد سے مسلم تہذیب و تمدن کی تاریخ گہرے پانیوں میں ڈوبتے چاند کا منظر پیش کرتی ہے۔ برصغیر میں مسلم تہذیب کی کچھ زندہ علامات تھیں۔ جیسے مغل سلطنت، اُردو زبان، اُردو شاعری (بالخصوص غزل) اور عمارات (جیسے تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی، اور بادشاہی مسجد لاہور) مگر وقت اور تاریخ نے ان میں سے اول الذکر کو اگر گردِ راہ بنا دیا تو موخر الذکر زندہ علامات کے برعکس محض تاریخی عمارات بن کر رہ گئیں۔ لہٰذا اب تمام انحصار اُردو زبان اور اس کے شعری سرمائے پر تھا۔ اور اس کی واقعی جی جان سے حفاظت کی گئی۔

اُردو زبان وادب کے دہلی اور لکھنؤ کی صورت میں دو بڑے مراکز تھے۔ ایسے مراکز جن کے اثرات برصغیر پر محیط تھے۔ زبان وادب کے یہ مراکز کیونکہ دار السلطنت تھے، اس لئے ان شہروں نے تہذیب و تمدن، زبان و ادب اور سیاست کے ضمن میں علامات کی صورت اختیار کر لی تھی۔ کبھی یہ علامات روشنی کے میناروں کی مانند راہنمائی کا فریضہ ادا کرتی تھیں اور اپنے عصر میں زندگی کی زندہ لہروں کے مترادف تھیں۔ زندگی کی وہ زندہ لہریں جو اقدار سے عبارت ہوتی ہیں۔ مگر ۱۸۵۷ء نے یہ سب خاک میں ملا دیا۔ دہلی دہلی نہ رہی اور لکھنؤ لکھنؤ نہ رہا جبکہ حالی اسیوں کے مقدر میں دہلیٔ مرحوم کی مرثیہ خوانی رہ گئی۔ سرسید کی تحریک کا مرکز علی گڑھ بنتا ہے۔ جبکہ سرسید کے اہم رفیق اور تحریک کے سرگرم کارکن دہلی یا لکھنؤ کے نہ تھے یا اگر تھے تو ان کی علمی زندگی اور ادبی کارناموں میں دہلی یا لکھنؤ نے اساسی کردار ادا نہ کیا تھا۔

اس عہد کے ادبی اور لسانی تناظر کو سمجھنے میں یہ نکتہ بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدلتے حالات میں زبان وادب کے قدیم مراکز اپنی اہمیت گنوا بیٹھے تھے۔ جس کے نتیجہ میں علی گڑھ جدید تعلیم کا اور لاہور جدید ادبی تحریک کا مرکز قرار پائے تھے۔

---

[1] "اقبال نامہ" مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، صفحہ ۸۵ لاہور

محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے مشاعروں کی صورت میں نظم نگاری کی جس تحریک کی داغ بیل ڈالی اور دہلی اور لکھنؤ میں اس کی جو شدید مخالفت ہوئی تو اس کا اہم ترین سبب یہ تھا کہ وہ لوگ نظم کو غزل کی دشمنی تصور کر رہے تھے۔ غزل دہلی اور لکھنؤ کی تہذیبی اقدار کی علامت تھی۔ جبکہ آزاد کی نظمیں اور حالی کی نیچرل شاعری اس آخری قلعہ کو منہدم کرنے کی کوشش تھی۔

علامہ اقبال کی شاعری کے آغاز تک اگرچہ زبان و ادب کے بارے میں وہ شدید جذبات نہ رہے تھے۔ لیکن اہلِ زبان میں اُردو کو صرف اپنی زبان اور خود کو اس کا جائز وارث سمجھنے کے رجحان میں ابتداءً کسی طرح کی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ جس کے نتیجہ میں انہوں نے عصمتِ لسانی کی محافظت کا فریضہ اپنا لیا ——— ایسا فریضہ جس نے انتہاپسندی کی صورت میں لسانی عصبیت کی صورت اختیار کر لی!

زبان سے شدید جذباتی وابستگی کی کچھ نفسیاتی وجوہات ہوتی ہیں۔ جن میں سرِفہرست زبان کا زمین سے گہرا رابطہ ہے۔ دھرتی ماتا اور مادرِ وطن ایسے الفاظ پر غور کریں جو انسانی سائیکی سے ان کا گہرا نفسی تعلق واضح ہو جاتا ہے اس حد تک کہ فرد انہیں اپنی ماں ہی کی مانند عزیز جان کر ان کی عصمت اور طہارت کی حفاظت کرتا ہے، ماں اور مادرِ وطن میں جو نفسی رابطہ ملتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں اور انسانی شخصیت میں یہ کئی طرح کے رنگ گھول سکتا ہے۔ لیکن یہ سب موجودہ مضمون کی حدود سے خارج ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو اس کی اس شد و مد سے حفاظت کی جاتی ہے۔ جیسے وہ ماں کا آنچل ہو۔ دھرتی ماں ہے، زبان اس کا آنچل ہے، وہ اس کا بیٹا ہے۔ اسی طرح باقی افراد بھی اس ماں کے بیٹے ہیں۔ اور ہم سب زبان کی عصمت کے نگہبان ہیں۔ لیکن یہ باہر والے زبان کے معاملہ میں کیوں دخل اندازی کرتے ہیں، یہ کون ہوتے ہیں، ماں بیٹوں کے بیچ میں بولنے والے؟

یہ ہے مختصر ترین الفاظ میں وہ نفسیاتی رویہ جو اہلِ زبان اپنی زبان کی حفاظت کے لئے اپناتے ہیں اور اسی لئے وہ "باہر والوں" کی لسانی اختراعات اور تجربات کو کبھی بھی پسند نہیں کرتے۔ اہلِ زبان ہمیشہ زبان کو جیسی کہ وہ ہے اسی صورت میں محفوظ رکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس لئے صرف اہلِ زبان کا روزمرہ ہی درست تسلیم کیا جاتا ہے (خواہ وہ زبان کے مزاج کے برعکس ہی کیوں نہ ہو) اور اسی لئے غلطی کے جواز میں بزرگوں کی سند لائی جاتی ہے۔ بزرگوں کی سند لانا بذاتِ خود نفسیاتی اہمیت کا حامل ہے یہ بالکل ایسے ہے۔ جیسے بچہ نے غلطی تو کی لیکن دادا ابا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کوئی بات نہیں ہم بھی ایسی ہی غلطیاں کرتے تھے۔ اہلِ زبان بالعموم زبان کے قواعد کا احترام کرتے ہیں اور انہیں توڑنے کی کوشش نہیں کرتے کہ یہ ایک طرح کی (INCEST) ہو جاتی ہے۔ اس نکتہ کی تشریح اس وقت ہو جاتی ہے جب میر امن دلی والے کی "باغ و بہار" کی سادہ نگارش کے جواب میں مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے "فسانۂ عجائب" لکھی۔ سرور کا میر امن پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس نے "محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں"۔

علامہ اقبال کی شاعرانہ شہرت کے آغاز سے ہی ان کی زبان پر اعتراضات کا آغاز بھی ہو گیا تھا تو اس کی بھی وہی نفسیاتی وجہ تھی۔ یعنی اہلِ زبان کے نزدیک اقبال "باہر والا" تھا۔ ایک طرح کا بیرونی حملہ آور جو مادرِ وطن کے آنچل کے درپے تھا۔ وہ آنچل میں ستارے ٹانک رہا تھا۔ مگر ان کی ماں کے آنچل میں ستارے ٹانکنے والا وہ کون ہوتا تھا؟ اس لئے یہ بھی آنچل اتارنے کے مترادف تھا اور ظاہر ہے کہ یہ بے ادبی تھی۔ گستاخی تھی! لہٰذا اقبال کے خلاف اہلِ زبان کے غیظ و غضب کو لسانی تعصب سمجھنے کے برعکس اس نفسیاتی نکتہ کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے کہ ان کے بموجب اُردو میں پنجابی الفاظ و محاورات استعمال کر کے اقبال زبان کی نہ حرمت کو مجروح اور اس کی طہارت کو آلودہ کر رہا تھا نفسیاتی لحاظ سے یہ بالکل ایسے ہے۔ جیسے ماں کا غیر آدمی کے ساتھ ملاپ کرایا جا رہا ہو اور یہ (INCEST) سے بھی بدتر تھا۔ اس لئے علامہ اقبال کے الفاظ میں اہلِ زبان" اس بات پر مُصر ہیں۔ پنجاب میں غلط اُردو کے مروج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہوتا ——— حالانکہ زبان کا فروغ تہذیبی برتری کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ (جیسا کہ انگریزی کی مثال سے عیاں ہے)

برصغیر کے مخصوص سیاسی حالات نے جب دہلی اور لکھنؤ کی مرکزی حیثیت ختم کر دی تو لاہور کی صورت میں ایک نیا ادبی مرکز جنم لے رہا تھا۔ اس وقت کسی کو یہ اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ آنے والے زمانے میں لاہور برصغیر میں نئی ادبی تحریکوں اور تصوراتِ نو کا سب سے اہم مرکز بننے والا تھا۔ یہ انجمن پنجاب کے مشاعرے ہوں یا "مخزن" ایسے ادبی مجلے علامہ

اقبال کی شاعری ہو یا ترقی پسند مصنفین — الغرض لاہور نے پوری ایک صدی تک برصغیر میں اُردو ادب میں نئے خیالات اور تصورات کے فروغ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اہم اور فعّال کردار ادا کیا ہے۔ اب یہ ناممکن تھا کہ لاتعداد پنجابی ادبی تخلیقات کر رہے ہوں اور وہ سند صرف اہلِ زبان کو مانیں اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ زبان کو ایک بت بنا کر اہلِ زبان اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ افراد اور اقوام کے ملاپ سے زبانیں بدلتی ہیں۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور محاورات و حرکات کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ تبدیلی کا یہ عمل ایک فطری امر ہے۔ اگرچہ اس کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان اثرات کی جڑیں گہری ہوتی جاتی ہیں۔ اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ یہ ایک اہم حقیقت کے طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کھپانے کی جو صلاحیت ہے۔ وہ اس کی ساخت میں مُضمر ہے اس لئے کسی دقّت اور شعوری کاوش کے بغیر اُردو میں نئے نئے الفاظ شامل ہو کر اسے متحرک اور فعّال رکھتے ہیں۔

۱۸۵۰ء کے بعد زبان میں نئے الفاظ کی شمولیت کا مطالعہ دو جہات پر کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف سرسید اور ان کے ساتھی شعوری طور پر اُردو میں انگریزی الفاظ شامل کر رہے تھے۔ جو بسا اوقات اپنے بھونڈے پن سے عبارت کا مزاج خراب کر دیتے تھے۔ دوسری طرف پنجاب کے اہلِ قلم تھے جو کسی مقصد یا منصوبہ بندی کے بغیر صرف تخلیقی سطح پر اُردو میں پنجابی الفاظ، محاورات اور لہجہ شامل کر رہے تھے۔ واضح رہے کہ یہ انداز سرسید اور ان کے ساتھیوں کی مانند نہ تھا۔ جو قومی سطح پر پہلے احساسِ کمتری کو دور کرنے کے لئے انگریزی الفاظ اپنی اُردو میں شامل کر رہے تھے۔ جبکہ پنجابی اہلِ قلم تخلیقی تقاضوں کی بنا پر ایسا کر رہے تھے۔ علامہ اقبال اس کی نمایاں ترین مثال قرار پاتے ہیں۔ اور ان ہی پر سب سے زیادہ اعتراضات بھی کئے جاتے رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس نوع کے اعتراضات کا جواب اپنے ایک مضمون "اُردو زبان پنجاب میں" دیا ہے۔ علامہ نے اس مضمون میں خود کو "ایک منعصف مزاج پنجابی" قرار دیتے ہوئے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اہلِ زبان اُردو زبان میں تبدیلیوں کے عمل کو روکنے کے کیوں در پے ہیں۔ علامہ اقبال علم اللسان کے ماہر نہ تھے (بلکہ مخالفین کے بموجب تو وہ اُردو کے بھی ماہر نہ تھے) لیکن اس کے باوجود علامہ نے زبان میں تغیرات کی منطق کو جس طرح سے سمجھا ہے اس کی اساس ان کی اپنی تخلیقی حسیات ہی میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

علامہ اقبال رقم طراز ہیں:۔

"......اس بات پر مُصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اُردو کے مروّج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے۔ جو زبان باہمہ وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطلب پر قادر ہو اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کا معیار خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن جو زبان ابھی بن رہی ہو اور جس کے محاورات و الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً اختراع کئے جا رہے ہوں۔ اس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدمِ صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ اُردو جامع مسجد کی سیڑھیوں تک محدود تھی۔ مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا۔ اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب کہ کبھی تمام ملکِ ہندوستان اس کے زیرِ نگیں ہو جائے ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریقِ معاشرت ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرزِ بیان اس پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلّم اصول ہے۔ جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے۔ اور یہ بات کسی لکھنوی یا دھلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔"[1]

اس اقتباس کی آخری سطریں بے حد اہم ہیں۔ اور اس امر کی غماز کہ علامہ اقبال کا لسانی شعور کسی لسانی عصبیت کا پروردہ ہونے کے برعکس لسانیات کے مسلّمات پر استوار تھا۔ زبان انسانوں کی تہذیبی ضروریات کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے اور دیگر تہذیبی امور کی طرح یہ بھی مختلف تہذیبوں کے اختلاط اور ان کے نتائج سے مبرا نہیں اور نہ ہی زبان کو تہذیبی دھارے سے الگ کر کے کسی ہوا بند ڈبے میں "محفوظ" کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] مقالاتِ اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معین، ص: ۲۰

سنسکرت کے پنڈتوں نے یہی غلطی کی اور زبان کو "دیو بانی" بنانے کے چکر میں زبان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ علامہ اقبال کا طرزِ استدلال بھی یہی ہے وہ پنجابی ہونے کی بنا پر اُردو میں پنجابی الفاظ ٹھونسنے کی کوشش نہ کر رہے تھے بلکہ تہذیبی اختلاط کے نتیجہ میں زبان میں تبدیلیوں کے فطری امر اور اٹل قانون کی پیروی کر رہے تھے۔ اس لئے جب وہ متذکرہ مضمون میں یہ لکھتے ہیں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

"تعجب ہے کہ میز، کمرہ، کچہری، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے کو بلا تکلف استعمال کرو۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی اُردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پُرمعنی پنجابی لفظ استعمال کر دے۔ تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو، اور باقی باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصور ہے کہ اُردو کی چھوٹی بہن پنجابی کا کوئی لفظ اُردو میں گھسنے نہ پائے یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح خلاف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فردِ بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے۔ جس سے اُردو الفاظ و محاورات اخذ کئے جائیں تو آپ کا عذر بے جا ہوگا۔ اُردو ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے۔ جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ بدمعاش، بازار لوٹ، چالان وغیرہ لے لئے ہیں اور ابھی روز بروز لے رہی ہے۔"

علامہ اقبال نے اسی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار اپنے ایک اور مضمون "قومی زندگی" میں بھی کیا تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے قومی زندگی میں قانونِ ارتقا کے حوالے سے زبانوں کی نشوونما اور موت کے اصول کی تشریح کی ہے۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

".....ایک زمانہ تھا جب یونانی یا لاطینی اور سنسکرت وغیرہ زندہ زبانیں تھیں۔ مگر ایک عرصے سے اب یہ زبانیں بے جان ہو چکی ہیں، ان کی موت کا راز اس قانون کا عمل ہے۔ اور خود پنجابی زبان جس کو ہم روز مرہ استعمال کرتے ہیں اس سے روز بروز متاثر ہو رہی ہے۔ سینکڑوں الفاظ ہیں جو تعلیم یافتہ لوگوں کے روز مرہ استعمال میں ہیں۔ مگر اس زبان میں موجود نہیں۔ یہ زبان ان کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ایسے حالات میں یہ لازم ہے کہ اس زبان کا حشر وہی ہو جو دیگر قدیم کی زبانوں کا ہوا ہے۔"[1]

ان اقتباسات سے علامہ اقبال کے لسانی شعور کا اندازہ ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اُردو میں پنجابی الفاظ کی شمولیت کو جائز اور درست سمجھتے تھے۔ لیکن ان خیالات کی روشنی میں علامہ اقبال کے کلام کا جائزہ لینے پر وہاں کا لسانی منظر ان نظریات کے برعکس نظر آتا ہے۔ علامہ نے جیسی مفرّس اور معرّب شاعری کی اُردو کے اور کسی شاعر نے نہ کی ہوگی۔ حتیٰ کہ غالب نے بھی نہیں۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فارسی رنگ آمیزی کے جس مقام پر غالب نے شاعری کو چھوڑا تھا۔ اقبال نے وہاں سے آغاز کیا اور ابیات کی تضمین کی صورت میں اسے اس کی منطقی انتہا تک لے گئے۔ ابتدا میں شاید پنجابی انداز ہو لیکن بعد میں اقبال اس سے بتدریج دور ہوتے گئے یوں دیکھیں تو علامہ کے لسانی شعور اور شاعری میں اس کے عملاً اظہار میں بُعد نظر آتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی بنیادی وجہ پیغام کی گراں باری تھی۔ اقبال جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کے لئے اُردو زبان کا مروّج سانچہ ناکافی تھا۔ اسی لئے وہ عربی فارسی کے مانوس اور غیر مانوس ہر طرح کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ یہی نہیں بلکہ جیسے جیسے اسلام کی طرف ان کا رجحان بڑھتا گیا ویسے ویسے ہی اسلامی تاریخ، شخصیات اور تلمیحات اور قرآن مجید کے حوالوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

اس کے برعکس فارسی کلام میں علامہ کی سادہ بیانی سہلِ ممتنع کی حدود چھوتی نظر آتی ہے حالانکہ اقبال کیلئے وہ غیر زبان تھی۔ مگر اس میں اقبال نے اہلِ زبان کا سا انداز پیدا کر دکھایا۔ اس حد تک کہ اب فارسی تنقید میں "سبکِ اقبال" نے ایک جداگانہ اصطلاح کی صورت اختیار کر لی ہے لیکن اُردو میں علامہ عاجز سے نظر آتے ہیں۔ اس لئے وہ اظہارِ مطالب کے لئے فارسی اور عربی پر انحصار کرتے نظر آتے ہیں۔ اب یہ اقبال کی فنی ریاضت کا اعجاز ہے کہ انہوں نے غیر مانوس الفاظ کو اس سلیقہ اور فن کاری سے برتا کہ وہ بھی اردو کا جزو بن گئے۔

---

[1] "مقالاتِ اقبال" ص ۴۳

صادق نسیم

اقبال منفرد نعت گو

نعت اُن اشعار کو کہتے ہیں جو حضورِ سرورِ کائنات کی شان میں کہے جائیں. کتنا سادہ سا فقرہ ہے. لیکن ذرا غور کیا جائے تو عقیدت و احترام اور خوف کے ملے جلے جذبے سے بدن میں ایک تھرتھری سی دوڑ جاتی ہے اور جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی کانپ کانپ اُٹھتی ہے کہاں حضورؐ کی ذاتِ گرامی اور کہاں انسانی فکر کی کم مائیگی ذرا اونچے اُڑے تو کافر ذرا نیچے رہے تو بے ادب نقلِ کفر کفر نہ باشد دونوں کی ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں مصرع ہے. ع

نبیؐ پردے میں ہے لیکن خدا معلوم ہوتا ہے

یا پھر بے ادبی کے سلسلے میں ایک شعر اور ایک مصرع.

کملیا تو رُخ سے ہٹانی پڑے گی
نبی جی صورتیا دکھانی پڑے گی

ع رسولوں میں محمد مصطفیٰؐ کا پہلا نمبر ہے

باتیں عقیدت و محبت. عشق اور وارفتگی کی ہو رہی ہوں تو اس توازن کا قائم رکھنا بھی کارے دارد احترام کے اس جذبے کی ترجمانی کرتے ہوئے دو شعر پرانے اساتذہ کے پیشِ خدمت ہیں.

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی است

اس سلسلے میں جناب عزت بخاری کا مندرجہ ذیل شعر تو معراج پر ہے کہ جس کے آگے بڑے بڑوں کے سر جھکتے ہیں اور بڑے بڑوں کو وجد میں آتے تو خود ان گنہگار آنکھوں نے بھی دیکھا ہے.

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

یہ تو احترامِ رسالت مآبؐ کا ایک پہلو تھا ایک اور مشکل ملاحظہ فرمائیے۔ جب کسی کی تعریف کی جاتی ہے تو ہر چند مشاہدۂ حق کی گفتگو ہی کیوں نہ ہو باتیں بادہ و ساغر بلکہ لب و رخسار و کاکل کی ہو ہی جاتی ہیں۔ نعت کے اس پہلو پر اگر غور کیا جائے تو اکثر شعرا رستے سے بھٹکتے اور ان کے قدم ڈگمگاتے نظر آتے ہیں عظیم سے عظیم نعت گو بھی غزل کے انداز میں نعت کہتا نظر آئے گا ۔ اس میں خاکم بدہن کسی بزرگ کی تحقیر مقصود نہیں ایک فرق واضح کرنا ہے جو غزل اور نعت میں ہوتا ہے۔ شاعر اپنی طرف سے نعت کہتا ہے اشعار غزل کے ہو جاتے ہیں. اس فرق کو واضح کرنے میں بھی معدودے چند شعرا ہی بچے ہیں مثلاً مولانا جامی جیسے عظیم نعت گو کی نعت کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

گل از رخت آموختہ نازک بدنی را
بلبل ز تو آموختہ شیریں سخنی را
ہر کس کہ لبِ لعل ترا دید بدل گفت
حکاک چہ خوش کندہ عقیقِ یمنی را

مندرجہ بالا اشعار مولانا کی ایک مشہور نعت کے ہیں. یہ پھول سے زیادہ نازک بدن۔ بلبل سے زیادہ شیریں سخن اور ترشے ہوئے عقیقِ یمنی جیسے لبِ لعلیں رکھنے والا محبوب تو لگتا ہے. محبوبِ سبحانی نہیں لگتا۔ یہ اور بات ہے کہ اشعار کو قبولیت کا درجہ مل گیا ہے۔ آخر قبول کرنے والا بھی تو رحمۃ للعالمین ہے۔ لیکن اشعار غزل ہی کے لگتے ہیں.

اب ہم نعت کے اس مقام سے ذرا اور آگے بڑھتے ہیں ۔ جہاں غزل کہتے کہتے کسی ایک شعر میں غزل کے مزاج سے ہٹ کر شاعر ایک ایسی ہستی کی زیارت کروا گیا کہ شعر نعت کا ہو گیا مثلاً ؎

حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہاں پورے پہلے مصرع کو دوسرے مصرع
کے ایک لفظ خوباں میں لپیٹا گیا ہے ، لیکن ان
"خوباں" میں جن ہستیوں کو جمع کیا گیا ہے ۔۔۔ وہ
حضرت یوسفؑ ، حضرت عیسیٰؑ ، حضرت موسیٰؑ
جیسے عظیم انبیاء ہیں ۔ لہٰذا "تو تنہا داری" میں یقیناً
اشارہ سردارِ انبیاء محمد مصطفیٰؐ کی طرف ہے ۔

نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرّس شد

حافظ شیرازی کے اس شعر میں نگار اور غمزہ
کے الفاظ خالص غزل کے ہیں لیکن وہ محبوب جو
بغیر پڑھے لکھے سینکڑوں اساتذہ کا استادِ مسئلہ آموز
بن گیا وہ نبیِ امی کے بغیر کون ہو سکتا ہے ۔
مولانا گرامی کی ایک نعتیہ رباعی ہے جو غزل
کے الفاظ اور نعت کے معنی کا حسین ترین امتزاج
ہے ؎

احمدؐ نامے کہ عرشیست پایۂ اوست
امی لقبے کہ نقدِ جاں مایۂ اوست
گویند کہ آں سروِ رواں سایہ نداشت
زیں طرفہ کہ عالم ہمہ در سایۂ اوست

اس رباعی میں سروِ رواں کا لفظ خالصتاً غزل
کا ہے ، اور اُسے بے سایہ کہہ کر نعتیہ بنا دیا گیا ہے
اور حسن کی انتہا چوتھا مصرع ہے ۔ جس میں تمام
عالم کو حضورؐ پُرنور کے سایہ میں دکھایا گیا ہے ۔
اب دو شعر اور ملاحظہ فرمائیے پہلا خسرو کی
غزل کا ہے اور دوسرا ابوالمعانی مرزا بیدل کی ایک
غزل کا ۔

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتہ ای
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

بحر ہر شور و نہد امواج گرد راہ اوست

ہر دو عالم در رکابت می دود تنہا بپا

یہ اشعار غزل کے سہی لیکن اپنے معانی کے
لحاظ سے نعتیہ اشعار دکھائی دیتے ہیں پہلے شعر کا مجموعہ
"ہر دو عالم" سے گراں تر ہے اور دوسرے شعر میں
محبوب کے جلو میں ہر دو عالم ایسے دوڑتے ہیں ،
جس طرح سمندر کے آگے اُس کی موجیں اُس کی
گردِ راہ ہوتی ہیں ۔
آئیے غزل اور نعت کے امتزاج کی اس بحث
کو مولانا گرامی کی اُس نعت کے ایک شعر پر ختم
کریں ۔ جس کے متعلق اُن کی وصیت تھی کہ اسے
میرے کفن میں باندھ کر مجھے دفنایا جائے ۔۔۔
صرف ایک شعر ہی یاد رہ گیا ہے ؎

ازل گیرد ، ابد گیرد ، قضا گیرد ، قدر گیرد
رکابش را ، عنانش را ، عنانش را ، رکابش را

اِس تمہید کی روشنی میں ہم نعتِ اقبال کو ،
اقبال کے عشقِ رسول اور محبتوں کی نورانی منزل سے
گزر کر دیکھتے ہیں ، جہاں لعلیں لب ، شیریں سخن ،
غنچہ دہن ، نازک بدن تو کوئی نظر نہیں آتا ۔۔۔
بس نور ہی نور کا دریا ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے
آنکھوں کو ایسے نورانی مناظر نظر آتے ہیں کہ چشم خیرہ ہو کر
رہ جاتی ہے ۔ چشمِ تصور عظمتِ مصطفیٰؐ کی ایسی
تابندہ ترین تجلیات دیکھتی ہے کہ ظاہری آنکھیں
اشکبار اور باطنی آنکھیں ضیا بار ہو جاتی ہیں ۔۔۔
اقبال ہر دو عالم کو حضورؐ کی قیمت نہیں بلکہ حضورؐ ہی
کو ہر دو عالم کہتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ اُن عظمتوں کا
صرف تصور کر سکتے ہیں ۔ لیکن تصور کی وسعتوں کو
سمیٹ نہیں سکتے ۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

نیلگوں آسماں ترے سمندر کا ایک بلبلہ ہے ۔
اس مصرع میں عظمتِ خیال بھی ہے اور شاعرانہ
کمال بھی یہاں حضورؐ کا مرتبہ اتنا عظیم نظر آتا ہے کہ
غالب کا ایک غیر مطبوعہ مصرع یاد آ گیا ؎

غالب ہے رتبہ فہم تصور سے بھی پرے

اسی نعت کا ایک شعر ہے

آئینۂ کائنات کا معنیٔ دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

کوئی اس شعر کا مطلب کچھ بھی سمجھے میں تو
"قافلہ ہائے رنگ و بو" کو ایک لاکھ چوبیس ہزار
پیغمبرؑ کا اشارہ سمجھتا ہوں جو ازل سے حضورؐ کی
تلاش میں نکلے اور کائنات کی آیت کا معنیٔ دیریاب
یعنی نبی آخر الزماںؐ ظاہر ہوا تو کائنات کی تکمیل
ہوئی اُس وقت پتہ چلا کہ کائنات کیوں بنائی گئی
تھی ۔ کیونکہ ایک آنے والے کو آنا تھا جو وجہِ تخلیقِ
کائنات ہے ، دیکھئے اقبال کے ایک ہی شعر نے
ہمیں کہاں پہنچا دیا ۔ اقبالؒ اسی خیال کی زیادہ
وضاحت فرماتے ہوئے جاوید نامہ میں یوں
رقمطراز ہیں ۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینے ہم بود

اگر حضورؐ نہ ہوتے تو ہر دو عالم وجود ہی میں

نہ اُسے یہ ہنگامۂ عالم صرف حضورؐ ہی کی خاطر چلایا گیا ہے۔ اقبال اپنے اس خیال کو انتہا تک یوں پہنچاتا ہے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

کائنات جسم ہے اُس کی روح حضورؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید
وز رسالت روح اندر آں دمید

خردِ خام حضورِ پاکؐ کو خاکم بدہن ایک عام انسان سمجھتی ہے اور دلیل دینے والے قرآنِ حکیم سے "عبدہٗ و رسولہٗ" کے الفاظ پیش کرتے ہیں۔ اقبال ہمیں شک کی اس دلدل سے نکالتا ہے اور عبد اور عبدہ کے فرق کو یوں واضح کرتا ہے۔

عبد دیگر، عبدہٗ چیزے دیگر
ما سراپا انتظار اُو منتظر
عبدہٗ از فہمِ تو بالاتر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ او نے عرب نے اعجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است

یہاں علامہ نے حضورؐ کو "ہم آدم و ہم جوہر" فرمایا ہے۔ اس جوہر کی مزید ترجمانی کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا ہے اور جبریلؑ جیسے عظیم فرشتے کے بلند مقام کو ایک عجیب زاویے سے پیش کیا ہے جبریل بھی اسی نور کے آئینے سے نکلی ہوئی کرن ہے:

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست
سرورش از مئے دیرینۂ تست
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل
کہ او یک جوہر از آئینہ تست

اقبال اپنے بزرگ شعرا سے اپنا تقابل نہیں کرتے۔ نہ اُن پر کسی طرح کی فوقیت کا کوئی پہلو نمایاں کرتے ہیں۔ بلکہ عراقی اور جامی کی تعریف فرماتے ہوئے اپنے مقام کا تعین بھی نہایت عجز سے کرتے ہیں ؎

گہے شعرِ عراقی را بخوانم
گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را
شریکِ نغمہ ہائے سار بانم

یہاں اقبال خود اعتراف کرتے ہیں کہ میں، "آہنگِ عرب" نہیں جانتا آئیے اقبال ہی کے کلام میں دیکھیں کہ شاہِ عرب جو شہنشاہِ کائنات بھی ہیں اسی اقبال کو کیا خطاب عطا فرماتے ہیں۔

کہا حضورؐ نے "اے عندلیبِ باغِ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا"

اقبال کی اداسی سے فرشتے اتنے متاثر ہوئے کہ اُسے زمین سے اُڑا کر جنت میں لے گئے اور سیدھا بارگاہِ سرورِ کائناتؐ میں پہنچا دیا۔ وہاں حضورؐ نے اُسے نہ صرف خطابات سے نوازا بلکہ تحفہ بھی طلب فرمایا۔ آئیے دیکھتے ہیں۔ کائنات کی عظیم ترین ہستی کے لئے جنت میں اقبال کیا لے کر جاتے ہیں۔

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزار لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

۱۹۱۲ء میں جنگِ طرابلس ہوئی مسلمان نہایت بے جگری سے لڑے۔ علامہ نے مندرجۂ بالا نظم لاہور کی شاہی مسجد میں منعقد ہونے والے جلسے میں پڑھی۔ اس نظم کی قبولیت کا یہ عالم تھا کہ بار بار شورِ گریہ میں دُہرائی گئی اور جلسے میں کہرام مچ گیا۔ قیامت کا سماں تھا۔ گویا حضورِ پاکؐ نے خانۂ خدا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں آنسوؤں کی جھلملاتی شمعوں کی گواہی میں اقبال کا تحفہ قبول فرمایا۔

اقبال نے عاشقانِ رسول کے لئے زیارتِ رسولؐ کے ایک نرالے راستے کی نشان دہی کی ہے فنا و بقا۔ ازل و ابد اور حاضر و غائب کی حدود کو توڑتے ہوئے سیدھا بارگاہِ رسولؐ میں پہنچنے کا راستہ۔ جنگِ یرموک کے سپہ سالار کے پاس ایک نوجوان حاضر ہوا یوں اذنِ مبارزت کرتا ہے ؎

اے بوعبیدہ رخصتِ پیکار دے مجھے
لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام
بیتاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام

ماو نو

جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام

اقبال کی تمام کتابوں میں شاید ہی کوئی باقاعدہ نعت نہیں ملے غزل، نظم یا قطعے کے اشعار کہتے کہتے علامہ نہایت خوبصورت طریقے سے گریز کرتے ہوئے نعت کی طرف آتے ہیں۔ اور ایک دو شعر میں ہی ایسی بے تابی اور خوبصورتی سے حضورؐ کا ذکر فرماتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ پوری کی پوری نظم یا غزل کا معیار اپنی جگہ قائم رکھتے ہوئے نعتیہ اشعار میں ایک شاعرانہ اعجاز بھر دیتے ہیں، کہ یہی نعتیہ اشعار زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے ہیں۔ بلکہ دلوں پر کندہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بادل برستے برستے اپنے سینے سے چند لمحوں کے لئے برقِ درخشاں کا ایک "لشکارا" دے کر ماحول کو پُرنور کر جاتا ہے ۔

علامہ حکیم سنائی کی یاد میں غزل کہہ رہے ہیں اور اپنے مخصوص رنگ اور انداز میں کہہ رہے ہیں۔ اُسی بحر میں میرزا صاحب کا ایک مصرع معاً یاد آجاتا ہے۔ جس پر علامہ گرہ لگاتے ہیں۔ وہ مصرع یہ ہے ع

کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را

گرہ اتنی عظیم لگاتے ہیں کہ شعر نعتیہ ہو جاتا ہے ۔

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را

اب علامہ کی بے قراری ان کی عنانِ قلم کو محبتوں کی منزل کی طرف کھینچتی ہے وہ مہ و پرویں کو اپنا نخچیر بنانے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ۔ "صاحب دولتے" کا مزید تعارف کرانا ضروری سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

بقول علامہ رشید ترابی مرحوم یہ اشعار نہ صرف الہامی نظر آتے ہیں بلکہ مقامِ رسالت کے تعین کے بہت سے مسائل اِس خوبی سے حل کر جاتے ہیں کہ اگر اسلام کے سب فرقے یہ اشعار اپنے ایمان کی بنیاد بنا لیں تو تمام عالمِ اسلام ایک جان ہو جائے ۔ اقبال نے زندگی بھر فرقہ بندی کو اپنا شعار نہیں بنایا بلکہ اس کی پُرزور مخالفت کرتے رہے ۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہ حجاز ہو جا

اقبال نے بعض شرعی اور سماجی مسائل پر بھی اپنے نعتیہ اشعار میں بحث فرمائی ہے اور ان میں ایک ایسا حُسن پیدا کر دیا ہے کہ نعت بھی ہو گئی اور ایک دو مصرعوں میں ایک بہت بڑا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ اور پھر شاعرانہ عظمت حضورِ پاکؐ کی مدحت اور اپنی عقیدت کا مقام بھی اپنی جگہ رکھا۔ ملوکیت پر ایک قطعہ ہے۔

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

جب ۱۹۲۵ء میں سعودی عرب میں نظامِ شریعت نافذ ہوا تو روضۂ اطہر پر سر جھکانے کی سزا دی جانے لگی۔ اس لئے کہ خدا کے سوا کسی کے آگے سر جھکانا جائز نہیں۔ یہ ایک ایسا نازک مسئلہ تھا کہ قلم اٹھانا تو کجا کچھ سوچتے ہوئے بھی انسان کو خوف آنے لگتا ہے۔ علامہ نے شاہ عبدالعزیز بن سعود کو مخاطب کرتے ہوئے چند قطعات کہے۔ تین قطعات پیش کرتا ہوں جن میں سے علامہ نے پہلے قطعے میں سجدۂ تعظیمیہ کا مسئلہ حل کیا، دوسرے میں شاہ سے اپنا تعارف کروایا۔ اور تیسرے میں "حریم کوچۂ دوست" میں آنکھوں سے عقیدت کے رنگین پھول برساتے ہوئے شاہ کو وارفتگی اور رقص والہانہ کی دعوت دی۔

تو ہم آں مے بگیر از ساغرِ دوست
کہ باشی تا ابد اندر برِ دوست
سجدہ نیست اے عبدالعزیز ایں
بروبم از مژہ خاکِ درِ دوست

تو سلطانِ حجازی من فقیرم
ولے در کشورِ معنی امیرم
جہانے کو ز تخمِ لا الٰہ رست
بیا بنگر بآغوشِ ضمیرم

بیا باہم در آویزیم و رقصیم
ز گیتی دل بر انگیزیم و رقصیم
یکے اندر حریمِ کوچۂ دوست
ز چشماں اشکِ خوں ریزیم و رقصیم

علامہ نے حضور کو اپنی منزل قرار دیا ہے۔
انہیں نہ جنت کی آرزو ہے نہ کسی مقامِ اعلیٰ و ارفع کی۔
وہ حضورؐ ہی کو اپنا اول و آخر گردانتے ہوئے یوں
خطاب کرتے ہیں ؎

درآں دریا کہ او را ساحلے نیست
دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

علامہ مسلمانوں کے زار و خوار ہونے کا
سبب بھی حضورؐ ہی سے دوری قرار دیتے
ہوئے فرماتے ہیں۔

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے نہ دارند

اور پھر خدا ہی کے احکام پر ایک طویل نظم
جوابِ شکوہ کا اختتام یوں فرماتے ہیں۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ نے ابلیس سے بھی حضورؐ کی تعریف ایک
عجیب انداز سے کروائی۔ شیطان اگر براہِ راست
حضورؐ کی تعریف کرے تو کارِ ثواب ہے اور کارِ ثواب
یا کارِ خیر کی اس سے توقع نہیں کیونکہ وہ شیطان
ہے۔ یہاں ابلیس اپنے سیاسی فرزندوں سے خطاب کرتے
ہوئے دکھایا گیا ہے ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
(اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو)

اقبال خالق و مخلوق کے رشتے سے کبھی کبھی
خدا سے قدرے بے تکلف ہو جاتے ہیں ایسے کہ
شاید یہ ادا بھی اللہ تعالیٰ کو بھا جاتی ہے۔ کیونکہ
اس بے تکلفی کی بنیاد اور اساس عشقِ رسالت مآبؐ
پر ہی رکھتے ہیں۔

بکوئے تو گدازِ یک نفس بس
مرا ایں ابتدا ۔ ایں انتہا بس
خرابِ جرأت آں رندِ پاکم
خدا را گفت مارا مصطفیٰؐ بس

اسی خیال کو کبھی کبھی جلیل القدر صحابہ کی زبان
سے یوں کہلواتے ہیں۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

اگر آپ اقبال کو اللہ تعالیٰ کے حضور دیکھیں تو وہ
کچھ شوخ سا نظر آتا ہے آخر خالق و مخلوق کا رشتہ ہے
جس سے یہ شوخی در آتی ہے، مثلاً ع

ع یا دامنِ یزداں چاک یا اپنا گریباں چاک
ع بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے
ع ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں
ع کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

آئیے اس اقبال کو بحضورِ سرورِ کونینؐ بھی دیکھیں
کہ اس کا رویہ کتنا عاجزانہ، والہانہ، عاشقانہ،
اور غلامانہ ہے۔ وہاں پہنچ کر حضور سے ہمکلامی
کی جرأت نہیں ہوتی تو رفیقانِ راہ سے فرماتے ہیں

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم
بپائے خواجہؐ چشماں را بمالیم

یوم الحساب کا ذکر آتا ہے تو وہاں درخواست
بخشش کی نہیں بلکہ ایک اور بات کی پیشکش کی ہے۔
ایک ایسی بات کی کہ شاید رحمتِ باری تعالیٰ
جوش میں آکر حساب ہی نہ لے۔

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ مارا
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر
تو اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

خدا کے سامنے اپنے نامۂ اعمال کو حضورِ پاکؐ
کے ڈر سے، شرم سے، ندامت سے پیش کرنے
میں پس و پیش کرنے والا اقبال بحضورِ رسالت مآبؐ
خود بخود اپنے حسابات پیش کرتا ہے۔ یہاں کوئی
شرط نہیں۔ پس و پیش نہیں۔ سراسر اعتراف اور
عجز بن کر عرض کرتا ہے۔

جبیں را پیشِ غیر اللہ سودیم
چو گبراں در حضورِ او سرودیم
نالم از کسے می نالم از خویش
کہ ما شایانِ شانِ تو نہ بودیم

علامہ کو دیارِ حبیب سے کتنی محبت ہے
اس کو ایک بہت نازک زاویے سے بیان فرماتے
ہیں جہاں مختلف قسم کے جذباتِ محبت کی روشنیاں
ایک مرکز پر مل رہی ہیں۔ ایک بچہ تنہا ہو جائے
تو اُسے معاً ماں یاد آجاتی ہے۔ مسافر کو غربت میں

گھر یاد آتا ہے۔ اندھیرا، تنہائی، تھکن اور خوف انسانی ذہن میں ہی نہیں جملہ حیوانات کی جبلت میں بھی جذبۂ تحفظ کو اجاگر کر دیتا ہے۔ علامہ نے اس جذبے کی کارفرمائی کو صرف ایک قطعہ میں سمو کر رکھ دیا ہے۔

با این پیری رہِ یثرب گرفتم
نواخواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

بچے کی نفسیات اور جبلت کا ذکر آنے سے علامہ کا ایک اور نعتیہ شعر یاد آگیا

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زنّاری

پہلے مصرع پر غور فرمائیے تو بات یہاں ختم ہو جاتی ہے "اے مولائے یثرب میری چارہ سازی کر" "تو" اور "آپ" کے الفاظ زائد ہیں لیکن "تو" اور "آپ" کی شمولیت سے مصرع زوردار ہو کر کہیں سے کہیں جا پہنچا ہے۔ جیسے ایک بچہ ماں سے کہتا ہے کوئی اور نہ کرے تو خود میرا یہ کام کر یا پھر ایک مظلوم شہنشاہ کا دامن تھام کر کہتا ہے کوئی اور تو یہ کام کر ہی نہیں سکتا میری حاجت روائی صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔ اس مصرع میں اقبال حضور کا دامن تھامے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اور بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بھی، اور یہی اس مصرع کا کمال اور اقبال کے عشقِ رسول کا اعجاز ہے۔ ایک اور قطعہ میں کہا کہ سوئے یثرب جاتے ہوئے کسی زادِ راہ کی ضرورت نہیں رہتی ؎

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ
سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب کجا مے خانۂ شوق
تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ

علامہ دنیا کی ہر محرومی، بے اطمینانی، ہر بے راہ روی، ہر جہل کا علاج، ہر زمانے اور ہر فرد کے لئے حضورؐ کی پیروی اور قربِ رسولِ مقبولؐ گردانتے ہیں۔

بمنزل کوش مانندِ مہِ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفےٰ رو

کشودم پردہ را از روئے تقدیر
مشو نومید و راہِ مصطفےٰ گیر
اگر باور نہ داری آنچہ گفتم
ز دیں بگریز و مرگِ کافرے میر

اس قطعے میں علامہ نے اپنی بات نہ ماننے والے کا انجام بڑے تیقن سے بتا دیا ہے۔ اس کے برعکس وہ حضورؐ سے قربت کا انجام بھی اتنے ہی وثوق سے بتاتے ہیں۔ ان قربتوں سے انسان نئی دنیا کا موجد ہو سکتا ہے۔

بر عیارِ مصطفےٰ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

اس جہاں کی تمام روشنیاں حضورؐ ہی کے نام سے وابستہ ہیں ؎

دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

آیئے اب ایک سیاسی مسئلے پر اقبال کا نقطۂ نظر دیکھتے ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمد حسین احمد مدنی کا خیال ہے کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ یہ واقعہ اوائل ۱۹۳۸ء کا ہے یعنی علامہ کی وفات سے چند ہفتے پہلے کا ہے۔ علامہ نے جواباً ایک نہایت مدلل طویل مضمون لکھا تھا۔ جو فروری ۱۹۳۸ء میں روزنامہ "احسان" میں چھپا تھا۔ اس موضوع پر علامہ کی ایک نظم بعنوان 'وطنیت' ۱۹۰۸ء میں چھپی تھی جسمیں علامہ نے نظریۂ وطنیت پر سیر حاصل بحث فرمائی تھی، جس کے صرف چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

مذکورہ بالا موقع پر علامہ نے محترم مولانا کو ان اشعار میں مخاطب فرمایا ؎

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربیؐ است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

"مقامِ محمدِ عربیؐ" سے باخبر ہونا اور "دیں ہمہ اوست" ایمان رکھنا، یہ وہ انقلاب آفریں نکتے ہیں جو علامہ کے علم و فضل کا نچوڑ ہیں اور جن کی

بدولت انہوں نے عشق و محبت کے تمام مراحل طے کیے یہی نہیں بلکہ خیر و شر کی ہر آویزش میں اقبال خیر کا حضورؐ ہی کو قرار دیتے ہیں اور ازل سے تا ابد قرار دیتے ہیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

علامہ نے اپنے آپ کو کبھی شاعر نہیں کہا، بلکہ اپنی کم مائیگی کا یوں اعتراف کیا ہے۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

لیکن اِس شعر کے باوصف اپنی شاعری کی داد بھی مانگی ہے۔ کس سے مانگی ہے۔ آیئے ملاحظہ فرمایئے۔

بر آں رازے کہ گفتم پے نبردند
ز نخلِ شاخِ من خرمانہ خوردند
من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم
مرا یاران غزل خوانے شمردند

ایک اور قطعے میں فرماتے ہیں کہ میں تو صرف وہی کہتا ہوں جو میرا رسولؐ حکم دیتا ہے گویا وہ شاعری حضورؐ ہی کے حکم سے فرماتے ہیں۔

ز گفتی از حیاتِ جاوداں گو
بگوشِ مردۂ پیغامِ جاں گو
ولی گوید ایں ناحق شناساں
کہ تاریخِ وفاتِ ایں و آں گو

اکثر نقادوں اور احباب سے نعتِ اقبال پر گفتگو ہوئی۔ برادرم محب عارفی کا خیال ہے کہ علامہ نے ملّت کے غم میں یوں تو سارا کلام روشنائی سے نہیں اپنے خونِ جگر سے لکھا ہے لیکن جہاں جہاں حضورؐ کا ذکر آیا ہے ایسی وارفتگی۔ بیتابی۔ اور والہانہ پن کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ بات خونِ جگر سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ روح کی صدائے مستانہ ہے۔ جناب شفیع منصور فرماتے ہیں۔ علامہ فلسفے کی دلیل کی عقل کی باتیں کرتے کرتے جب حضورؐ کے ذکر پر پہنچتے ہیں۔ تو اپنے آپ سے گزر جاتے ہیں جنون کی اس کیفیت میں وہ عقل اور دلیل کی سب باتیں بالائے طاق رکھ کر "ز چشماں اشک خون ریزیم در رقصیم" کی حالت میں نہ صرف نظر آتے ہیں بلکہ ہم خود بھی جنون کی یہ برقی رو اپنے رگ و پے میں محسوس کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بھی اقبال کے ساتھ ساتھ عشقِ رسولؐ میں رقص کناں ہیں۔ ملک کے ممتاز نقّاد پروفیسر نظیر صدیقی صاحب فرماتے ہیں یہ سب باتیں اتنے عجیب و غریب انداز میں صرف اقبال ہی کہہ سکتا ہے کہ اُس کے پاس قوتِ ابلاغ ہے اور بہت سے عشّاقِ رسالت مآبؐ یہ سب کچھ محسوس تو کرتے ہوں گے لیکن کہہ نہیں سکتے، کیونکہ ان کے پاس اقبال کا سا اعجازِ نطق نہیں لہٰذا یہ اقبال ہی کا حصہ ہے۔

میں ان صاحبانِ کمال سے آگے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ صرف ایک گذارش ضرور کروں گا کہ اقبال جو کچھ کہہ سکے وہ تو ہمارے سامنے آیا ہے۔ وہ جو کچھ نہ کہہ سکے اس تشنگی کو بھی ذرا محسوس کرتے چلیں تو اقبال کے ساتھ انصاف ہوگا۔ ہم اُس کے عشقِ رسولؐ سے سیراب تو ہو جاتے ہیں۔ اُس تشنگی کو محسوس نہیں کرتے۔ اقبال ایک عظیم انسان ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

اُس کی دید اگر عظیم تر ہے تو اس کی قوتِ تصوّر عظیم ترین ہے۔ بجاکہ مقاماتِ رسالت کے اتنے عظیم پہلو اقبال ہی اجاگر کر سکتا ہے۔ اللہ نے اُسے اظہار کی عظیم قوت عطا فرمائی ہے وہ زبان و بیان دونوں پر قادر ہے۔ ایک ایک نشست میں سینکڑوں معیاری اشعار کہہ سکتا ہے لیکن حضورِ پاکؐ وہ عظیم ہستی ہیں، کہ انہیں تصور میں سمیٹا ہی نہیں جا سکتا۔ غالب جیسا عظیم شاعر یہ کہہ کر اپنی معذرت کا اظہار کر لیتا ہے۔

غالب ثنائے خواجہؐ بہ یزداں گذاشتم
کیں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

جس کا تصور جہاں تک پہنچتا ہے۔ حضورِ پاکؐ اُسے اُس سے عظیم تر نظر آتے ہیں ہر بلندی ایک اور بلندی کی نقیب ہوتی ہے جس حد پر بھی نظر پہنچتی ہے حدِ نظر آگے بڑھ جاتی ہے، بجاکہ اقبال بلا کا قادر الکلام ہے وہ اپنے ابلاغ کے زور کے بل بوتے پر لفظِ خودی اور لفظِ عشق کے لغوی معنی تک بدل کر رکھ دیتا ہے۔ وہ لفظوں کے معانی بدلنے پر قادر ہونے کے باوجود ہمیں "گنبدِ آبگینہ رنگ" کے "حباب" تک ہی پہنچاتا ہے۔ اس حدِّ تصوّر سے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہی ہمارے تصوّر کا عجز ہے۔ لیکن خود اقبال کے تصور کی حدیں ہمارے تصوّر سے کہیں آگے ہیں۔ وہ ہمیں "حباب" تک پہنچا کر خود "محیط" تک پہنچ

جاتا ہوگا حضورؐ کی شان کا احاطہ تو "محیط" سے بھی
آگے ہے لہٰذا ہمیں "حباب" تک پہنچا کر بے قرار
کرنے والا اقبال خود "محیط" تک پہنچ کر ہم سے
ہزار گنا زیادہ بے قرار ہو جاتا ہوگا۔ کیونکہ حضورؐ
کے قدر کی حدیں اُس محیط سے بھی کہیں آگے ہیں۔
بلکہ لامحدود ہیں۔ اقبال کا تصور جتنا بلند ہے اُس
کا نطق اُسے بیان کرنے میں اتنا ہی عجز۔ اور تشنگی محسوس
کرتا ہوگا۔

آئیے اب میں ابلاغ پر عبور کامل رکھنے والے
اقبال کے اعترافِ عجز کی ایک مثال اقبال کی زبانی
پیش کرتا ہوں۔

زخم از دردِ پنہاں زعفرانی
ترا و د خوں ز چشم ارغوانی
سخن اندر گلوئے من گرہ بست
تو احوالِ مرا ناگفتہ دانی

میری باتیں طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ اس طوالت
میں بھی میں نے اقبال ہی کا تتبع کیا ہے انہیں کا
ایک شعر ہے۔

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

یوں بھی علامہ کا ایک ہی مصرع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
"بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست"
پیش کر کے کہہ سکتا تھا کہ اس میں کیا کچھ نہیں کہا گیا
ہے۔ اقبال نے اگر ذوقِ حضوری میں داستان کو
طول دیا ہے تو اس داستان کے نورانی گوشے
سمیٹنے میں بھی تو دیر لگتی ہے۔ آپ نے کلامِ اقبال
سے نعتِ رسول مقبولؐ کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں
الفاظ کی بندش۔ فکر کی گہرائی۔ نطق کی گہرائی لہجے کی
بے تابی میں عشقِ رسولؐ کا جو جذبہ کار فرما ہے وہ
وہ معجزے سے کم نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔
کہ شاعر کے دماغ سے یہ شعر ہمارے دماغ تک
نہیں آرہے سیدھے دل کو چیرتے ہوئے عشقِ رسولؐ
کی روشنیاں بکھیرتے ہوئے ہمارے افقِ دل پر
طلوع ہو رہے ہیں اور مقامِ رسالت اور نورِ نبوت
کی عظیم بلندیاں ہم پر اجاگر کرتے جا رہے ہیں
جنہیں محسوس تو کیا جا سکتا ہے۔ قیدِ الفاظ میں لاکر
بیان نہیں کیا جا سکتا۔ شعرِ اقبال میں تاریخ، زندگی،
معاشرت، فلسفہ، مذہب، اور سیاست کا ایسا
حسین امتزاج ملتا ہے کہ دائرۂ کائنات کا مرکز
حضورؐ کی ذاتِ بابرکات نظر آتی ہے اور اقبال
ہمیں شاہی مسجد کے دروازے سے پکارتا نظر
آتا ہے۔

حضورِ ملّتِ بیضا تپیدم
نوائے دلگدازے آفریدم
ادب گوید سخن را مختصر گو
تپیدم، آفریدم، آرمیدم

علامہ نے بحضورِ رسالت مآبؐ نہایت
پُر سوز دعائیں بلکہ فریادیں کیں ہیں۔ اُن کا ذکر نہ کرنا
بھی اس عاشقِ رسولؐ سے انصاف نہیں ہوگا۔ یہ
فریادیں بھی ایسے ایسے عجیب پیرائے اور ایسے ایسے
انوکھے انداز سے کیں ہیں کہ فریادی ہونے کا
ڈھب بھی کوئی اقبال سے سیکھے ۔

تب و تابِ دل از سوزِ غم تست
نوائے من ز تاثیرِ غم تست
بنالم زاں کہ اندر کشورِ ہند
ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

آخر دعا قبول ہوئی اور علامہ کو کہنا پڑا ہے

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

علامہ نے ایک اور فریاد کی ہے

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتابے راگذر نیست
بما کُن گوشۂ چشمے کہ در شرق
مسلمانے ز ما بے چارہ تر نیست

دعا قبول ہوئی اور ہندی مسلمانوں نے ایک
ملت بن کر اپنے آپ کو پالیا۔
علامہ کے دیدۂ دل کے اشکوں نے پھر
گذارش کی ہے

مسلماں آں فقیرِ کج کلا ہے
رمید از سینۂ او سوزِ آہے
دلش نالد چرا نالد نہ داند
نگاہے یا رسول اللہؐ نگاہے

آخری مصرع کی تڑپ بتاتی ہے کہ یہ
دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے بے ساختہ نکلا ہے
اور مجھے یقین ہے کہ علامہ نے اتنے صدقِ دل سے
"نگاہے یا رسول اللہ نگاہے" فرمایا ہے کہ ابرِ کرم
کھل کر اتنا برسا کہ بت کدۂ ہند کا ایک قطعہ سرسبز
شاداب ہو گیا۔
یہاں میں قبولیتِ دعا اور اندازِ دعا پر
کچھ عرض کرتا چلوں۔ قبولیتِ دعائیں تو اللہ تعالیٰ
کے ہاتھ میں اور ذاتِ باری تعالیٰ کی مرضی پر منحصر

ہے لیکن بظاہر اس کا سبب قبولیت صدقِ طلب ، جذبہ اور اندازِ ہوتا ہے ۔ اقبال کی دعاؤں کے جذبۂ صادق اور اندازِ بیان کو دیکھیں تو قبولیت اس انتظار میں رہتی ہوگی ۔ کہ اس عاشقِ رسولِ مقبول کے لب اور کس دُعا کے لئے ہلتے ہیں ۔ علامہ دعاؤں میں ہر بار محبتوں کے نئے نئے گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے حضورؐ کی عظمتوں کے نئے نئے زاویے سامنے لاتے ہیں ۔ جن سے آنکھیں پُرنور اور سینہ سراپا طور نظر آتا ہے ۔ صدقِ دعا ، سوزِ دُعا اور اندازِ دعا پر میری تمہید اس لئے ہے کہ علامہ کی ایک آخری دعا آپ کے سامنے پیش کروں ۔ یہ دعا علامہ نے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے فرمائی ہے ۔ یہاں علامہ اپنے فرزند جاوید اقبال کو نئی نسل کی علامت بنا کر فرماتے ہیں ۔

ز شوق آموختم آں ہاؤ ہوئے
کہ از سنگے کشاید آبجوئے
ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید
ز عشقِ تو بگیرد رنگ و بوئے

"ماہِ نو . کا فروری کا شمارہ پڑھا ۔ سجاد رضوی صاحب کا "کارل یونگ" کا ترجمہ اور قاسمی صاحب کا مضمون — پیر فضل کی شاعری پر — عمدہ تھے ۔ سجاد رضوی اگر زبان کچھ سہل اختیار کر دیتے تو مضمون غالباً مزید دلچسپ ہوتا ۔ شیر افضل جعفری صاحب نے بہت عمدہ انداز میں "ابر آبِ نیل" کا تعارف کروایا ہے ۔

غزلوں میں کوئی نئی اور چونکا دینے والی بات نہ تھی ۔ اگر ہر شمارے میں فیض ، قاسمی ، فراز اور دوسرے اساتذہ کا غیر مطبوعہ کلام شائع کیا جائے تو یقیناً پرچے کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا ۔

ایک بات جو پسند آئی وہ نئی کتابوں کا تعارف ہے اور ہر ماہ کسی ایک ادیب یا شاعر کا تعارف بھی ایک اچھا اضافہ ہوگا ۔"

سید تنویر الدین احمد ——— لاہور

شمیم احمد

ایوانِ ادب میں ایک مقدمہ

ایک مدیر نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ شاعری کیا ہے؟ شاعری کیا ہے اس سوال کا جواب شاعری کی ۵ ہزار سالہ تاریخ ابھی تک نہیں دے سکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سوال کے اتنے ہی جواب ہیں جتنے دنیا میں شاعر ہیں۔ گویا ہر تخلیق شاعر کی ہر تخلیق اسی سوال کا جواب ہے اور یہ جواب اَن گنت اور بے شمار ہیں۔ اس لئے خلطِ مبحث سے بچنے کے لئے آئیے یہ سوچیں کہ شاعری کی پہچان کیا ہے؟

بنیادی نکات

۱۔ شاعری کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ اولاً مادری زبان میں ہوتی ہے یا پھر ایسی زبان یا زبانوں میں جو

(الف) ایک مشترک لسانی، تاریخ، خاندان اور پس منظر رکھتی ہوں۔

(ب) ایک مشترک تہذیبی پس منظر اور سماجی روابط رکھتی ہوں۔

(ج) ایک کائناتی تصور یا اصولِ حقیقت رکھتی ہوں۔

(د) مابعد الطبیعاتی تصور میں ایک اکائی سے جڑی ہوئی ہوں۔

اس دائرے سے باہر کوئی حقیقی شاعری نہ وجود میں آتی ہے۔ نہ ممکن ہے، نہ آج تک ظہور میں آئی ہے

۲۔ ہر مابعد الطبیعاتی تصور، ہر اصولِ حقیقت، ہر تہذیب ہر زبان اور ہر شاعری کا ایک بنیادی نیج ایک بنیادی اسم اور ایک بنیادی اساس ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ اپنی پہچان حاصل کرتی ہے۔ یہ تہذیب مرجا سکتی ہے، مردہ ہو سکتی ہے۔ مٹ سکتی ہے۔ مگر دوسری تہذیب کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اس میں سے بالآخر ایک باقی نہیں رہے گی۔ دنیا کی ہر تہذیب دوسری سے اثر قبول کرتی ہے، دوسری کے سامنے پسپا ہو سکتی ہے۔ مگر نقال نہیں بن سکتی۔ جن تہذیبوں کے ساتھ یہ عمل ہوا ہے، وہ اپنی معنویت پہلے کھوتی ہیں اور پھر بے نشان ہو جاتی ہیں۔

۳۔ ہر مذہب کا ایک اصولِ حقیقت، ایک تصورِ کائنات ہوتا ہے۔ وہ مذہب اسی وقت تک اپنے ماننے والوں کے لئے ایک حقیقت ہے، جب تک وہ اس کو اصلِ حقیقت تسلیم کر رہے ہوں؛ اگر وہ اس کے منکر ہو گئے ہوں تو وہ حقیقت ان کے لئے باقی نہیں رہتی — ایک مذہب اگر دوسرے مذہب کے اصول اپنا لے تو پھر وہ اپنے خدوخال کھو دیتا ہے۔ اگر ایک مسلمان عیسائی مذہب کے اصولوں کو ماننے لگے تو وہ مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح دیگر نظامِ حیات کے بھی اپنے اصولِ شناخت ہیں۔ جو اگر بدل دیئے جائیں یا وہ کسی اور نظام کو قبول کر لیں، تو پھر وہ اپنی پہچان اور شناخت کھو دیتے ہیں!

موجودہ صورتِ حال:۔

۱۔ ہماری موجودہ شاعری نے اپنی شناخت گم کر دی ہے۔

(الف) اس نے اپنے تہذیبی پس منظر سے رشتے توڑ لیے ہیں۔

(ب) وہ اپنے کائناتی تصور یا اصولِ حقیقت سے بیگانہ ہو چکی ہے۔

(ج) وہ اپنے مابعد الطبیعاتی تصورِ حقیقت کا کوئی شعور نہیں رکھتی۔

۲۔ ہماری موجودہ شاعری اپنی شناخت، اپنے بنیادی نیج، اپنے بنیادی اسم اور اپنی بنیادی اساس کے بجائے مغرب کی شاعری کی اساس پر مقرر کرتی ہے۔

(الف) وہ تصورات اور خیالات میں، اسلوب اور ہیئت میں، طرزِ فکر اور طرزِ احساس میں مغرب کی نقالِ محض ہے اور اپنی شناخت صرف انگریزی شاعری کے پس منظر، مواد اور ہیئت و تجربات سے مقرر کر رہی ہے۔

(ب) اس عمل کے لئے وہ بین الاقوامیت کا ایک ڈھکوسلا قائم کرتی ہے اور اپنی غلامانہ ذہنیت اور احساسِ کمتری کی آسودگی اسی زبان میں تلاش کرتی ہے

جواسے غلامی سے ورثے میں ملی ہے اور اس پر اکتفا کرتی ہے۔

(ج) وہ اس عمل کو جدید شعوری ترقی اور بین الاقوامیت کے نام پر بطور فیشن اختیار کئے ہوئے اور مغرب سے سرقہ کرکے اور مستعار لئے ہوئے موضوعات پر جدیدیت کی دوکان سجائے ہوئے ہے۔ جسے وہ "تازہ" اور "زندہ" تجربہ کہتی ہے۔

(۳) اس نے اپنی شاعری اور اپنی معنویت سے اس لئے رشتے توڑ لئے ہیں کہ اس سے فرسودگی پژمردگی تکرار اور مردنی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اب وہ ۳۰ سال میں مستعار شدہ روایت کی تکرار، مردنی، پژمردگی کی اتنی اسیر ہو چکی ہے کہ جس مردے سے بھاگ کر آئی تھی اس کی جگہ اب اس نے اپنی اختیار کردہ جہت کے مردہ بچے کو سینے سے چمٹا لیا ہے۔

(الف) وہ اپنی اصل کی، جہاں اس کا پورا وجود معنویت اور اساس موجود ہے، پہچان سے عاری ہو چکی ہے۔ اور ایک ایسے حصار میں مقید ہو چکی ہے جو اس کے وجود کا کسی طرح بھی حصہ نہیں۔ جو اس کی شناخت نہیں بن سکتا۔ وہ ایک بہت بڑے دائرے اور اپنی اصل شناخت کے جوہر سے قطعی طور آزاد ہو کر ایک محدود اور بے پہچان حصار میں مقید ہو گئی ہے۔ جہاں سے نجات کا کوئی راستہ نہیں نکلتا۔

(ب) وہ وسائل کی ترقی کو پوری صورتِ حال پر فوقیت دیتی ہے۔ اور اپنی ۹۰ فیصد آبادی سے ناآشنا ہو کر اس طبقہ کی ترجمان ہو گئی ہے، جس کا وجود ۱۰ فیصد ہے اور جو وسائل کی ترقی کی علامت ہے۔ جس کی شناخت گم ہو چکی ہے۔

(ج) چنانچہ موجودہ شاعری ایک بے چہرہ، بے سماعت بے پہچان اور بے اصل شئے نامعلوم کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جو بانجھ اور بنجر ہے اور اپنی اصل کی طرف بھی واپس نہیں جا سکتی۔

اپنی ذات کے حوالے سے:۔

۱۔ میں نے ساری زندگی کوٹ پتلون یا کوئی مغربی لباس نہیں پہنا، لباس میرے لئے صرف لباس تھا، کرتا پاجامہ، کرتا، شلوار اور شیروانی اور مجھے کبھی اسے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

۲۔ میں نے ایم۔ اے کیا، بی اے تک انگریزی تعلیم حاصل کی۔ لیکن کبھی نہ انگریزی لکھی اور نہ بولی اور نہ انگریزی ادب کے حوالے سے کوئی بات کی۔ اور خود کو شعوری طور پر بے شناخت ہونے سے بچانے کی پوری کوشش کی۔ میں نے اپنے سے مختلف، ان ہی ادیبوں کو ادیب تسلیم کیا جو اپنی شناخت قائم رکھتے ہیں۔

۳۔ میں نے اپنی سرزمین ترک کرکے اپنی پہچان "پاکستانی" مقرر کی اور ہر اس قدر سے نبرد آزما ہوں جو اس پہچان کو مجھ سے چھین لے۔

۴۔ میں نے خود کو اسلام کے حوالے سے شناخت کیا اور ہر اس اساس سے جنگ کی جو میری اس شناخت کو گم کر سکتی ہے۔

میں اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں کہ شناخت اور پہچان کے معنی انسان کا شعور ہے۔ جو کچھ میں سوچتا ہوں۔ وہ میں ہوں۔ عمل اس وقت تک عمل نہیں جب تک اس کی جہت مقرر نہ ہو۔ میں اسی وقت تک آدمی مسلمان اور پاکستانی ہوں جب تک میں اپنی اصل سے شعوری طور پر جڑا ہوا ہوں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ ہماری شاعری کی شناخت کیا ہے؟؟

"میں ماہِ نو کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ ہمارے یہاں ادبِ لطیف کے بعد ایک اچھے ادبی ماہنامے کی جو شدید کمی تھی وہ ماہِ نو نے پوری کر دی ہے۔ کم از کم مجھے جو فائدہ ہوا ہے وہ یہ کہ میرا ادبی مطالعہ پرچوں کی حد تک جو پہلے سہ ماہی پرچوں کی طرح بے قاعدہ تھا، اب اس میں باقاعدگی آگئی ہے۔"

مصطفیٰ کمال ——— راولپنڈی

ادیب سہیل

تال کے ساز اور اُستاد جہانگیر خاں

جس طرح عورت اور سنگار لازم و ملزوم ہیں اُسی طرح راگ اور تال بھی شانہ بشانہ ہی چلے گئے ہیں۔ دونوں الگ رہ کر ادھورے معلوم ہوتے ہیں، دونوں ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھے تو جا سکتے ہیں ۔ لیکن حُسنِ کمال کا احساس پیدا نہیں کرسکتے۔ شاید اِسی لئے تال کو راگ کا زیور بھی کہا گیا ہے۔

گرنتھوں میں ۲۷ اقسام کے تالوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جو اس دور میں مستعمل تھیں۔ موجودہ دور میں صرف تیرہ چودہ تالوں کا رواج ہے۔ (روپک، تیورا، سول فاختہ، جھپ تال، چوتال، اڑا چوتالہ، جھومرا، فرودست، تلواڑہ، سواری، تیتالہ، چانچر، دھمار، اکتالہ وغیرہ) تال کے چند مخصوص ساز جو ہمارے موسیقار برتتے ہیں، اُن میں، پکھاوج، طبلہ، ڈھولک اور نقارہ ہیں۔ کلاسیکی راگوں میں پکھاوج اور طبلے کا چلن عام ہے دُھرپد کو پکھاوج زیب دیتا ہے، خیال اور ٹھمری میں طبلے سے چار چاند لگ جاتے ہیں ۔ البتہ شہنائی کے لئے نقارہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

دنیائے موسیقی میں یہ تصوّر عام ہے کہ اس کے موجد حضرت امیر خسروؒ ہیں ۔ جو درست معلوم نہیں ہوتا ۔ اس سلسلے میں گرامی رشید ملک نے اپنی کتاب "حضرت امیر خسرو کا علمِ موسیقی" میں بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔

ایک طبقے میں یہ خیال بھی عام ہے کہ طبلے کے موجد دہلی گھرانے کے ایک بزرگ خاں صاحب جان نثار خاں عرف سُدھار خاں تھے۔ ان کے بیٹوں یا ابتدائی وارثوں میں خاں صاحب مکھو خاں اور بخشو جی کا نام آتا ہے ۔ اس خاندان کے ایک طبلہ نواز واجد حسین خاں (مقیم کراچی) کی اطلاع کے مطابق دونوں بزرگ سُدھار خاں کے صاحبزادے تھے پھر یہ سلسلۂ نسب مشہورِ زمانہ ننھے خاں طبلہ نواز، خاں صاحب اللہ دیئے خاں پکھاوجی نہروالے، اور استاد ننھو خاں طبلہ نواز (رامپور) سے ہوتا ہوا خاں صاحب گامی خاں کے بھائی متو خاں طبلہ نواز (بھارت) اور داماد واجد حسین خاں طبلہ نواز، کراچی تک پہنچا۔

معدن الموسیقی میں بھی بخشو اور مکھو خاں نامی دو مشہور طبلہ نوازوں کی خبر فراہم کی گئی ہے اور یہ دونوں بزرگ مذکورہ کتاب کے مصنف کے سامنے فوت ہوئے تھے ۔ مصنف کا زمانہ وہی ہے جو واجد علی شاہ کے لکھنؤ میں قیام کا زمانہ تھا۔

طبلہ میں اول بخشو دھاڑی اس طور کے باج کا استاد ہوا ۔ اُس کے بیٹے ممّو اور سلاری خاں، گت پرن میں لاجواب تھے ۔ اس زمانے میں قدیم باج کا ایک طبلہ نواز مکھّو خاں ساکن دہلی بڑا اُستاد تھا ۔ اور مجّو شاگردِ بخشو سب پر سبقت لے گیا . . . "

معدن الموسیقی میں ایک بہت اچھے طبلہ نواز خلیفہ تاج خاں کا نام بھی آتا ہے۔ اس کے متعلق یہ اطلاع پہنچائی گئی ہے کہ وہ کداؤ سنگھ (رستمِ ہند) پکھاوجی سے علم موسیقی میں بڑھ کر تھا ۔ اس کا بیٹا ناصر خاں طبلہ نواز رامپور دربار سے منسلک رہا ۔ اسی کتاب میں راگ درپن ۔ (مصنف فقیر اللہ) کے حوالے سے سنگیت کے جن ماہرین کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اُس میں تال کے ساز کے اہم بجانے والوں میں پکھاوجیوں (امان اللہ پکھاوجی اور فیروز ڈھاری پکھاوجی لاہور والے) کا ذکر تو ملتا ہے۔ لیکن کسی طبلہ نواز کا تذکرہ نظر نہیں آتا ۔ اگر اُس زمانے میں طبلے کا چلن ہوتا

ہاں راگ درپن کے حوالے سے معدن الموسیقی
۔ مصنف نے پکھاوجیوں کا ذکر کیا ہے وہاں
لہ نوازوں کا ذکر بھی ضرور کرتے۔ان باتوں سے
نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ طبلے کا رواج مغل شہنشاہ
شاہجہاں کے دور کے بعد کسی وقت ہوا ہوگا۔

تال ساز طبلے کا سرسری تعارف کرانے کے بعد
میں اس طبلہ نواز کے بارے میں بات کرنا چاہوں
گا جو میرا آج کا موضوع ہیں اور جنہیں برِصغیر
پاکستان و ہند کے شائقین استاد جہانگیر خاں کے
نام سے جانتے ہوں گے۔

اُستاد جہانگیر خاں صاحب (مقام بنارس سال پیدائش ۱۸۷۴ء) نے ایک سو تیرہ برس کی عمر پائی اور ساٹھ برس تک سامعین کے سامنے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ناقدینِ فن کا کہنا ہے کہ اُن کے باج میں جلادت معیار اور مٹھاس یکجا ہو گئے ہیں ۔ بنارس وطن اور لکھنؤ میں تعلیم کرنے کے ناتے ان کا تعلق یوں تو پورب باج سے تھا لیکن یہ تینوں باج پر مکمل دسترس رکھتے تھے ۔ اور تنہا طبلہ بجانے میں "لگی اور چر باغ" میں لاثانی تھے (یہ طرز عنقا ہے اور کم لوگوں کے علم میں ہے)۔

اُستاد جہانگیر خاں صاحب نے ابتداً طبلہ نوازی کی تعلیم اپنے والد احمد خاں سے حاصل کی۔ پھر آگے کی تعلیم کے لئے وہ کئی اُستادوں کے آستانے تک گئے۔ اُن کے استادوں میں دو بزرگ طبلہ نوازوں کے نام آتے ہیں۔ ایک عظیم آباد کے، اُستاد مبارک خاں اور دوسرے لکھنؤ کے خلیفہ عابد حسین تھے۔ خلیفہ عابد حسین کے متعلق موسیقی کے ایک مشہور ناقد ڈی۔ پی مکھرجی کا یہ جملہ اُن کی بڑائی پر صاد ہے۔ "جہاں تک ضبط کا تعلق ہے۔ خلیفہ عابد حسین کے ہم عصروں میں کوئی بھی ان سے بہتر نہیں تھا۔"

آگرہ گھرانے کے ایک نامور فرزند اُستاد ولایت حسین شفق نے اپنے پسندیدہ اور ماہر طبلہ نوازوں میں خلیفہ عابد حسین کا ذکر کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اِن دونوں صاحبانِ فن نے خلیفہ کے علاوہ اور بھی دوسرے، نامور طبلہ نوازوں بالخصوص، احمد جان خاں تھرکوا اور کنٹھے مہاراج، بیرو مصرا۔ انوکھے لال حبیب، کرامت، ہیرو گنگولی، مظفر خاں وغیرہ کے بارے میں تو لکھا ہے۔ لیکن استاد جہانگیر خاں اُن سے نظر انداز ہو گئے۔

اُستاد جہانگیر خاں کے ورثے میں خلیفہ عابد حسین کا فن آیا تھا۔ اس میں مزید رنگ آمیزی عظیم آباد کے اُستاد مبارک خاں کے باج سے ہوئی تھی۔ ایک سنگم میں دو دھاروں کے اس ملاپ نے جہانگیر خاں صاحب کے فن میں ایک تیسری صورت پیدا کر دی تھی۔ جو دوسرے طبلہ نوازوں سے باج کے معاملے میں مشترک ہوتے ہوئے بھی اپنی پہچان الگ کراتی تھی۔

اُستاد جہانگیر خاں کے باج کی یہی وہ صفات تھیں، جن کی وجہ سے اُن کے فن کے خوشہ چینوں میں بلاتفریقِ مذہب و ملت سینکڑوں کی تعداد نظر آتی ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق ان کے شاگردوں کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے۔ ان کے مشہور شاگردوں میں استاد عبدالحفیظ، اُستاد محبوب خاں، تارانی، مہادیو اندرکر، حافظ خاں، چتر لال، وجے اندرکر، دین خاں اور مجمدار وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

اُستاد جہانگیر خاں کی فنی عظمت کا اُن کے وطن بھارت میں دل کھول کر اعتراف کیا گیا۔ یہ پہلے طبلہ نواز تھے جنہیں ۱۹۵۹ء میں صدارتی انعام سے نوازا گیا۔ اُسی سال انہیں گراں قدر خدمات کے صلے میں سنگیت ناٹک اکادمی کی طرف سے "پرامکھ واد ک" کا اعزاز دیا گیا فن کے اعتراف و احترام کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا، اندرا سنگیت یونیورسٹی، خیر گڑھ کی طرف سے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی۔ یہ اعزاز و احترام کی جانب یقینی بہت اہم قدم ہے۔ پڑوسی ملک میں اعترافِ فن کی یہ بہت اچھی مثال ہے۔ میں یہاں یورپ کی مثال اسلئے نہیں دیتا کہ یورپی ممالک عزت و احترام کی منزل سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ وہاں موسیقی اور موسیقار فنونِ لطیفہ کے دوسرے شعبہ جات کے ماہرین کے شانہ بشانہ ہیں اور معاشرہ میں بہت باوقار ہیں۔

پاکستان کا تیس سالہ دور ماہرینِ فن سے خالی نہیں رہا، پکھاوج اور طبلہ کے عظیم استاد میاں قادر بخش اور استاد اللہ دتہ، تان رس خاں کے پوتے سردار خاں، صاحبِ عصر سارنگی نواز اُستاد بندو خاں یہیں تھے۔ استاد کریم بخش پیرنا (طبلہ نواز) فیروز نظامی اور استاد امانت علی اور ان کے والد اختر حسین خاں کا انتقال چند برسوں کی بات ہے ۔ ملکۂ موسیقی روشن آرا، اُستاد

رمضان خاں، خورشید انور، قاضی ظہور الحق، شوکت حسین (طبلہ نواز) استاد ملنگ خاں کے بیٹے استاد فیاض (طبلہ نواز) اور میاں قادر بخش کے صاحبزادے طالب حسین (طبلہ نواز) اور شام چوراسی والے سلامت علی، نزاکت علی خیالئے استاد کبیر خان (ستار نواز)، استاد شریف خاں پونچھ والے (ستار نواز) استاد فتح علی خاں (استاد نواز) اور استاد چھوٹو خاں (ستار نواز) ہم میں موجود ہیں۔

احترام واعترافِ فن کے لئے، اور چراغ سے چراغ جلتے رہنے کے عمل کو بہ حسن و خوبی جاری رکھنے کی خاطر معاشرے میں اس فنِ لطیف و شریف کے اصل مقام کو بحال کرنا ہوگا، یہ کام ادبی انجمنیں بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ انہیں چاہئے کہ اپنی ماہانہ، پندرہ روزہ، ہفتہ وار نشستوں کو صرف شعر و شاعری، افسانہ اور تنقید تک محدود نہ رکھیں۔ اس کے سٹیج پر صرف شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ شام نہ منائی جائے بلکہ ان کے دروازے موسیقاروں، مصوروں اور رقاصوں پر کھولے جائیں۔ کبھی ان کے ساتھ بھی شام منانے کا اہتمام کیا جائے۔ موسیقی، مصوری، اور رقص کے موضوع پر بھی مضامین پڑھے جائیں۔ اس طرح ان کے اندر یہ اعتماد بحال کیا جائے کہ شاعر اور ادیب ان سے کوئی بہت اونچی یا مختلف شے نہیں اِن ہیں اور اُن میں اگر کوئی فرق ہے تو بس فنونِ لطیفہ کے شعبوں کے انتخاب کا ہے جنگ ہو یا امن دونوں صورتوں میں بندوق، قلم اور ساز یکساں احترام کے طالب ہیں۔

اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے، تو تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں میں اتحاد و اشتراک پیدا ہوگا۔ آپس میں تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم ہوں گے۔ کسی موضوع پر سر جوڑ کر سوچنے کی عادت کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس اشتراکِ عمل کے نتیجے میں ہم تہذیبی سطح پر ایک "ہشاش بشاش" معاشرے کے قیام میں مدد دے سکیں گے۔ ہشاش بشاش معاشرے پر اِس وقت مجھے بنگال کے عالمی شہرت رکھنے والے مصور زین العابدین کی باتیں یاد آتی جا رہی ہیں۔ وہ جب میکسیکو اور دیگر غیر ممالک کے دورے سے واپس لوٹے تو انہوں نے اپنی فضا میں ایک عجیب حبس محسوس کیا اور کہنے لگے میکسیکو وغیرہ میں جہاں کہیں گیا ـــ مجھے ایک ہشاش بشاش معاشرے کا احساس ہوا، مزدور ہو یا دفتری، ہر طبقے کے مطابق وہاں تفریحی وسائل و مشاغل موجود ہیں ـــ ہر آدمی اپنے اپنے کام سے فارغ ہو جانے کے بعد من پسند تفریح کے لئے آزاد ہے۔ ہم عجیب دورُخی کا شکار ہیں۔ اس بارے میں حکماء کے اقوال کے مطالعہ سے مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس ملک، جس قوم اور جس معاشرے میں فنونِ لطیفہ کا متوازن فروغ رُک جائے یا وہاں سے ان کا دیس نکالا کر دیا جائے تو وہ ملک، وہ قوم اور وہ معاشرہ آخر کار بنجر ہو جاتا ہے وہاں درندگی، اور شقاوت کے خصائل فروغ پانے لگتے ہیں۔ اور حلم، آشتی، اور نرمی پر تو لنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

"ماہِ نو، نئی آن بان کے ساتھ سامنے آیا ہے اور سب کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے" کہیں نظر نہ لگے اس کے زورِ بازو کو" مجھے یقین ہے کہ آپ کی نگرانی میں یہ چمکے گا اور ماہِ نو سے ماہِ کامل بن جائے گا۔"

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ـــــــ کراچی

محمد سلیم الرحمٰن

نظم

رات دن چاروں طرف یہ پانی بہنے کی آواز
دریاؤں اور نہروں کی بک بک کہانی
فہم سے بالاتر مگر اُداس کرتی ہوئی
اور پانی بہتا ہوا دل سے آنکھوں میں
خواب کے پلوں کے نیچے سے اُوپر سے
اور صبح کے دروازوں میں اور آخر
کھڑکی کے باہر آنکھوں کے سامنے سے
دھوپ میں چمکتا ہوا کسی دعا کی طرح
جو ہمیشہ صبح کو یاد آئے

ایک فرخار فراق
جس کے اس طرف سمندر ہی سمندر
اور ادھر بالکل آخر میں
دل و جان کے تار و پود جیسی
بال سے باریک شریانوں میں
ڈوبی ہوئی چاند سورج گھڑیاں
یا پھر رات کے پردیس پار
چھرنگ بیابانوں میں
کھبے ہوئے تیر اور ٹوٹی ہتھکڑیاں

اوس پی کر جینے والے بھی
کبھی سمندروں میں نہاتے ہیں

فاروق حسن

زندگی جینے کی کوشش میں

ہے ملاقات کا امکان
نہ سورج کی شعاعوں نے بجھائے گلے
روشنی میں نہ حرارت
نہ کہیں جسم کی خواہش کا جواب
زندگی جینے کی کوشش میں کٹی

جسم کے گرد بُنا جال عزیزوں کا
اقارب کا، نئے رشتوں کا
نیکیاں کتنی کمائیں، اچھے
بخت در باب بنے
کام کے ہمسائے ہوئے
بوٹیاں بوٹیاں تقسیم کئے
جسم کے بہتر لیے
جانتے بوجھتے آنکھوں پہ گرائے پردے
زندگی جینے کی خواہش میں کٹی

کیا بنی بات؟
بنی بات ہی کیا جینے سے اس طور کے
جب آنکھوں سے
دیکھتی جاگتی آنکھوں سے وہ جھرنا ڈھانپا
اس کے رستے میں لگائے پتھر
اور اُن قطروں کو معدوم کیا
جا کے ملنا تھا جنہیں دوڑتے دریاؤں سے
جن کے پاؤں میں سمندر تھا رواں

اے میرے جسم کے مکیں

اے میرے جسم کے مکیں
مجھ کو سجھا وہ راستہ
جس سے جہان میں مرا
دن کا سفر طویل ہو

سلسلہ ہائے روز و شب
میرے لئے وہ خوف ہے
جس کی نہ ابتدا کوئی
جس کی نہ انتہا کوئی

وقت کے بعد وقت کا
کوئی خیال دے مجھے
میرے لئے سنوار نقش
ایسا کوئی کہ اب مرے
جسم کی راہ کٹ سکے

جسم کے اس حصار سے
جاؤں نکل کے میں کہاں
دے میری قید کو ثبات
اے میرے جسم کے مکیں
مجھ سے وفا کا عہد کر

اعجاز احمد

مہاجر

یہاں
کبھی کبھی دھوپ بھی
زینہ زینہ یوں اتری ہے
جیسے اجنبی ہو
اور مجھے وہ لوگ یاد آئے ہیں
جو اپنے وطن سے بچھڑ گئے
مہاجر جلا وطن
جنہوں نے سمجھا تھا کہ اجنبی شہر میں موت
کم لوگوں کو آتی ہے
جو یہاں اس گمان میں آئے تھے
کہ عافیت دائم رہے گی

تم نے ڈھلتے سایوں کی سیاست سے گریز کیا ہے
تم دھوپ سے ڈرے ہو
تم نے آنکھیں یوں بند کر لی ہے جیسے پکی اینٹ ہے
میرے تمہارے درمیان اب روزمرہ
ہمدردیوں کے لفظ بھی نہیں

چاند

چاند !
قریب آؤ ، بیٹھو میرے پاس
میرے چُپ دوست
مجھے دو
چیتے کا نقرئی داغدار بدن
برفیلی رات میں دبا ہوا
جو تمہاری گود میں ہے
مجھے سکھاؤ وہ لفظ
ہسپانوی چینی پرتگالی
اخلاص کے وہ سبز لفظ
جو تم نے سُنے ہیں
اپنی چاندنی میں خوف پا گزرے ہوؤں کی
امانت کی طرح
جذب کر لئے ہیں
مجھے دو
عورتوں اور نظموں کے بدن
کہ جوان ہوتے ڈھلتے رہے ہیں
تمہارے چرخے کے سوت کی طرح جو تم
میرے اور میری دنیا کے بچپن سے
آج تک
کاتتے رہے ہو
آئندہ بھی کاتو گے

ستاروں کا مزاج

مجھے یہ گستاخ ہوا سخت ناپسند ہے

تم کچھ کہو تو لفظ اُڑا لے جائے گی
اپنی انگلیوں کی غلیظ کنگھی
ہر دم تمہارے بالوں میں پھیرتی ہے
بلا اجازت
غیروں کے سامنے تمہیں چومتی ہے
اور میں کہوں کہ تمہارے آنگن سے ہو کے جب گزرے
تمیز سے گزرے
تو بچوں کی طرح مچلتی ہے
اور جوتے تک نہیں اتارتی

مجھے ستاروں کا مزاج پسند ہے
تمہیں دیکھتے ضرور ہیں
مگر ادب اور احترام کے ساتھ

دُور دُور سے

ابن الحسن

حمد

یہ سیلِ آب، یہ آئینہ کاریِ مہتاب
بھنور پہ رقص ہوا کا، ہوا کے ساتھ سحاب
زمانہ دیکھ رہا ہے نگر نگر کے خواب

قدم قدم پہ اندھیروں میں روشنی کے خواب
اُمید و بیم کے حلقوں میں زندگی کے خواب
سراب زار پہ بےداغ چاندنی کے خواب

بکھر گئے ہیں یہی خواب موتیوں کی طرح
گلوں پہ اوس کی مانند آنسوؤں کی طرح
سیاہ رات میں تاروں کے جھرمٹوں کی طرح

یہ ایک عالمِ امکاں سکوتِ صحرا میں
گہر ہے بند صدف میں صدف ہے دریا میں
کہیں کہیں پہ جھلکتا ہے چشمِ بینا میں

نقوشِ جوششِ نمو کے اُبھرتے جاتے ہیں
رکاوٹوں پہ بپھرتے سنبھلتے جاتے ہیں
ہوائے شوق چلی ہے سنورتے جاتے ہیں

وصال

وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے یہاں
ہات کو ہات سجھائی نہیں دیتا لیکن
جسم کی قید سے آزاد ہوئے ہیں گویا
جسم کی قید سے آزاد حواسِ خمسہ
انگلیاں رقص میں آئیں، جن سے
سازو مضراب میں جادو اُمڈا
نغمہ و رنگ کا چشمہ پھوٹا
یا کوئی نور کا فوارہ ہے
جس کے محراب نے ڈھانپا ہے ہمیں
وصل کی رات یہ باہر تو اندھیری ہے بہت

آدمی کہاں جائے

صبح مسکراتی ہے
طنزیہ جگاتی ہے
سخت جان لوگوں کو

منجمد ہواؤں میں
روشنی کی شریانیں
دوڑتی ہیں درد آگیں

آدمی بلاؤں میں
بے نشان جالوں میں
بند بند اُلجھا ہے

تنگ سرد چوکھٹ پر
روشنی میں سائے میں
ڈوبتی ہیں اُمیدیں

قافلے ارادوں کے
بیکراں زمانے میں
منزلوں سے بچھڑے ہیں

راستوں کی دشواری
آبلوں کی پُرکاری
پا بپا نمایاں ہے

صبح کے سرابوں میں
دور تک خیالوں میں
آدمی کہاں جائے

ثروت حسین

ایک نظم کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے

ایک نظم کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے
جوتوں کی جوڑی سے
یا قبرسے جو بارشوں میں بیٹھ گئی
یا اُس پھول سے جو قبر کی پائنتی پر کھلا
ہر ایک کو کہیں نہ کہیں پناہ مل گئی
چیونٹیوں کو جاء نماز کے نیچے
اور لڑکیوں کو میری آواز میں
مردہ بیل کی کھوپڑی میں گلہری نے گھر بنالیا ہے
نظم کا بھی ایک گھر ہوگا
کسی جلا وطن کا دل یا انتظار کرتی ہوئی آنکھیں
ایک پہیہ ہے جو بنانے والے سے اُدھورا رہ گیا ہے
اسے ایک نظم مکمل کر سکتی ہے،
ایک گونجتا ہوا آسمان نظم کے لئے کافی نہیں
لیکن یہ ایک ناشتے دان میں باآسانی سما سکتی ہے
پھول، آنسو اور گھنٹیاں اس میں پروئی جا سکتی ہیں
اسے اندھیرے میں گایا جا سکتا ہے
تہواروں کی دھوپ میں سکھایا جا سکتا ہے
تم اسے دیکھ سکتی ہو
خالی برتنوں، خالی گہواروں اور خالی قمیضوں میں
تم اسے سُن سکتی ہو
ہاتھ گاڑیوں اور جنازوں کے ساتھ چلتے ہوئے
تم اسے چوم سکتی ہو
بندرگاہوں کی بھیڑ میں
تم اسے گوندھ سکتی ہو
پتھر کی ناند میں
تم اسے اُگا سکتی ہو
پودینے کی کیاریوں میں
ایک نظم ——
کسی بھی رات سے تاریک نہیں کی جا سکتی
کسی تلوار سے کاٹی نہیں جا سکتی
کسی دیوار میں قید نہیں کی جا سکتی
ایک نظم ——
کہیں بھی ساتھ چھوڑ سکتی ہے
بادل کی طرح
ہوا کی طرح
راستے کی طرح
باپ کے ہاتھ کی طرح ——

ثروت حسین

لفظوں کے درمیان

دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سیارے کو لفظوں سے بھر دیا
فیصلوں اور فاصلوں کو طول دینے کا فن انہیں خوب آتا ہے
جہاز بندرگاہوں میں کھڑے ہیں
اور گھروں، دوکانوں، گوداموں میں
کسی لفظ کے لئے جگہ نہیں رہی
اتنے بہت سے لفظ ــــ اُف خدایا!
مجھے اس زمین پر چلتے ہوئے اٹھائیس برس ہو گئے
باپ، ماں، بہنوں، بھائیوں اور محبوباؤں کے درمیان
انسانوں کے درمیان
میں نے دیکھا
تعریفوں، تعارفوں اور تعزیتوں کے لئے
اُن کے پاس لرزتے ہوئے ہونٹ ہیں
ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ہیں
گرم ہتھیلیاں ہیں
انہیں کسی ابلاغ کی ضرورت نہیں

نانبائی گنگناتا ہے
اسے لفظ نہیں چاہئیے
ایک ناند ــــ آٹا گوندھنے کے لئے
ایک تختہ ــــ پیڑے بنانے کے لئے
ایک سلاخ تنور سے روٹی نکالنے کے لئے
نانبائی کام ختم کر لو تو میرے پاس آنا
یہاں کنارے پر سرکنڈوں کا جنگل آپ ہی آپ اُگ آیا ہے
کچھ قلم میں نے تراشے ہیں
اور ایک بانسری ــــ
باقی سرکنڈوں سے ایک کشتی بنائی ہے
گڈریا، کسان، دستکار، موسیقار، آہن گر
سب تیار ہیں
کچھ آوازیں کشتی میں رکھ لی ہیں
مدرسے کی گھنٹی ــــ
ایک لوری
اور ایک دعا
ایک نئی زمین پر زندہ رہنے کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئیے

ثروت حسین

ایک انسان کی موت

رک کیوں گئے تمہارے ہاتھ موجدار!
گنا پیلنے کی مشین کا پہیہ رک گیا
زمین رک گئی
آدھے سیارے پر ہمیشہ کے لئے رات آگئی
لالٹین کون جلائے گا
ہوائیں گزرتی ہیں پتوں کو گراتی ہوئی
میلاد کی کتاب کے ورق اڑ رہے ہیں
باہر الگنی پر بنیان سوکھ رہا ہے
ٹنکی کی ٹونٹی سے پانی گر رہا ہے
یہ اتنے بہت سے کام کون کرے گا موجدار!
رک کیوں گئے تمہارے ہاتھ
دیکھو رانگاماٹی پر دن نکل آیا ہے
بانس کے درختوں پر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں
ہتیا اور بھولا کو نمودار ہوتے ہوئے نہیں دیکھو گے کیا
تمہارے بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ
گھاٹ سے کشتی کھول رہے ہیں
ان سے نہیں ملو گے کیا
وہاں کرشنا چورا کے سائے میں
تمہاری بیوی کی قبر
انسانوں اور بادلوں کو گزرتے دیکھتی ہے
کیا فاتحہ نہیں پڑھو گے
اگر بتی نہیں جلاؤ گے موجدار!
تم میری زبان جانتے تھے
مجھے تمہاری زبان نہیں آتی لیکن آج تمہارے سرہانے
میں ایک گیت کے بول دہراتا ہوں

گاؤ موجدار ــــ
جیسے بچے گاتے ہیں
جیسے بوڑھی گنگا گاتی ہے
"شو کو لے اٹھیا
امی مونے مونے بولی
شارا دن امی جانے
بھالو ہوئے چولی
آدیش کورے جہان
مورگرو جانے
امی جانے شتی کاج
کوری بھالو مانے ــــ
رک کیوں گئے ــــ بولتے کیوں نہیں موجدار!
تمہیں کیلے کے باغوں اور پانی سے پیار تھا نا
ہم تمہیں کیلے کے پتوں میں کفنائیں گے
تمہاری قبر پانی میں بنائیں گے
موجدار ــــ!
جنگی بوٹ دھان کی پنیری سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے
دھان کی پنیری جنگی بوٹ سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے
اس بوٹ میں میرا پاؤں تھا موجدار
وہ یہ گنا چھیلنے کی کٹار
کاٹ دو یہ پاؤں
الگ کر دو اسے
مجھے اپنے پاؤں سے خوف آتا ہے
مجھے مردہ آدمی کی ہنسی سے خوف آتا ہے
مجھے رکی ہوئی زمین سے خوف آتا ہے
رک کیوں گئے تمہارے ہاتھ موجدار ــــ

اپریل ۱۹۷۹ء

حسن ناصر

لایعنی سفر

آسماں، بادل، کڑکتی دھوپ میں
ایک دیوارِ شکستہ اور میں
آسماں! گردش کا محور گھومتی گولائیاں
تہہ بہ تہہ آشوب (جن میں کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں)
سینکڑوں پاگل درندے
ایک ہی جانب رواں

اور بادل ــــ اِک دھواں سا
چمنیوں کی آگ سے اُٹھتا ہوا
آسماں کی وسعتوں میں پھیل کر چھنے لگا
ایک ٹکراؤ ہوا کا، آگ کا، پھر روشنی
سینکڑوں وحشی تلاشِ خون میں نکلے ہوئے

اور پھر آسماں کی آنکھ
جس سے آگ کا چشمہ اُبل کر
اس زمیں پر دور تک پھیلا ہوا

اور میں ــــ ایک دیوارِ شکستہ کے قریں
لاکھ صدیوں سے کھڑا ہوں
ایک پتھر کی طرح
سوچتا ہوں
آسمان۔ بادل۔ کڑکتی دھوپ میں
بھاگتے لمحوں کے پیچھے دور تک دوڑا تو تھا
جانے کیسے راستے تھے
جس جگہ پہنچا یہی دیکھا
کہ منزل دور پیچھے رہ گئی
اور پھر ــــ ایک دن
وہ میرا نام لے کر زور سے چیخا
تو میں نے مڑ کے دیکھا
جب سے میں پتھر بنا ہوں
اس جگہ پر گڑ گیا ہوں

حسن ناصر

کراہت کا حملہ

اُٹھو کوڑھیو ـــــ

موت کی ڈولتی۔ ناچتی۔

اور تیزابیت کا عمل تیز کرتی ہوئی ساری پرچھائیاں

ان ہواؤں کے چلتے ہوئے دائروں سے

پرے جا چکی ہیں

مگر کوڑھیو ـــــ

درد کے پیڑ سے لاکھوں سر سوکھ کر، ٹوٹ کر

اب گرے ہیں تو ان کو

ہواؤں کے چلتے ہوئے دائرے

جانے کن کن مقاموں پر لے جائیں گے

ان سروں کی کراہیں

گھروں کی چھتوں اور منڈیروں پہ منڈلا رہی ہیں

کئی کاروانوں کے گھر کھو چکے ہیں

سنو کوڑھیو ـــــ

موت تو جا چکی خطۂ مرگ کو چھوڑ کر

اب کراہوں کے لاانتہا سلسلے رہ گئے

ہر قدم پر دھویں

دوبدو جنگ کرتے ہوئے نفرتوں کے دھویں

ہر شکن ریزہ ریزہ

ہر اک سمت پھیلے ہوئے گرد آلود لمحے

ماں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں

سکوتِ جہاں سہما سہما ہوا ہے

اُٹھو کوڑھیو ـــــ

تشنۂ تکمیل

منہ میں گوشت کا ٹکڑا لے کر

یہ جو چیل اُڑی ہے

جانے کس ٹیلے پر بیٹھے گی؟

گیروے رنگ کے کپڑوں والا

اس ٹیلے کے پیروں پر

چند لکیریں کھینچے گا

اور پھر ہم سب

اک انجانے شہر کی بنیادوں میں

اپنا لہو نچوڑیں گے

جب شہر مکمل ہو جائے گا

گیروے رنگ کے کپڑوں والا

شہر کی سب سے اونچی ممٹی پر بیٹھی

چیل کی چونچ میں

گوشت کا دوسرا ٹکڑا دے دے گا

ڈاٹیڈ لائن

اُداس چہرہ، اُجاڑ مرقد کی صاف سِل پر

سیاہ نقطوں میں اپنی چاندی سی انگلیوں سے

نہ جانے کیا بات لکھ رہا تھا

کہ میں نے دیکھا

اُجاڑ مرقد میں اک بڑا سا شگاف پھوٹا

جہاں سے پھر ایک ہاتھ نکلا

اُداس چہرے نے ہاتھ پکڑا

تو ایک پیکر وہاں کھڑا تھا

ہر ایک لمحہ سکڑ چلا تھا

کہ سرد گیلی ہوا کا جھونکا چہار جانب بکھر رہا تھا

چہار جانب دھواں دھواں تھا

اور اس میں وحشت کے استعارے لٹک رہے تھے

تمام ماحول خوف بن کر ٹھٹھک چکا تھا

اسی کشاکش میں

میرے کانوں میں دور سے اِک صدا یہ آئی

اُداس چہرے کو وہ ہیولا یہ کہہ رہا تھا

"اے زرد چہرے۔ ذرا ٹھہر جا

تمہاری بھی روح کا تسلسل تمہارے مرکز سے

کٹ چکا ہے ـــــ!"

شاهد محسن

نمو

تاروں کی طرح ابراتی ہے
آنکھوں میں مری بل کھاتی ہے
اک بہتی ہوئی خاموش ندی
اس ندی کے ٹھنڈے جل سے ہے

کلپنا

ہر شاخ مرے جوبن کی
ہر سندرتا میرے تن کی
ہر کونپل میرے روپ کی
پیاسی تیرے درشن کی

دوستی

اس شاخ پہ مدتوں رہے تھے
چڑیوں کے ہرے بھرے بسیرے
اب شام نہ بدلیوں کے ڈیرے
یہ اڑتا ہوا سپید تارا
تھا دوست بچھڑ گئے دنوں کا

یاد

مجھ سے بھولا نہیں جاتا تجھ کو
ان ہواؤں میں ہے ناسود مرے زخم کا پھول

کرگیا مس نسیم گزراں
میری آنکھوں کو خزاں
شام، اس پیرھن زرد پہ ٹھہری ہوئی دھوپ
میری تنہائی کا روپ
میں سرِ راہ گذر ایسی ہوا جس کے لئے
تو سرِ شاخ تھا

نہ لب بام رکا

صدائے عندلیب شاخ شب

بہت اداس ہے صدائے عندلیب شاخ شب
کہیں کہیں سکوتِ خواب گاہ میں
بھٹک رہی ہے یوں چراغ کی نمی
خیال رفتگاں میں ہو کوئی امید سی عجب

زمین ماہ و سال پر
ہر اک امید، ہر خیال، ہر خبر
عجب سی تشنگی میں تر
ہوائے غم! مگر
کسی کا انتظار ہے کسی کو کب؟

جہان بے ثبات میں
لبوں کو ادھ کھلے گلاب کی چمک سے پیار کیوں
گھٹا کا اعتبار کیوں
اڑان پر ہے یہ ستارۂ جہان بے سبب

عذرا عباس

موت کے سائبانوں میں ایک نیند

ہم رات کی چاہتوں کو بھلا کر
اُجلے دنوں میں بھٹکتے رہے
اب کس خواب میں ہیں
جب نیند ہمارے تلوؤں سے گذر جائے گی
تو موت اپنے پروں کا سایہ کرے گی
نیند میں کیسے چلیں؟
شہر کی ساری راتیں بھیگی ہوئی ہیں
راستہ دینے والی سڑکیں پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں
وقت سیاہ پرندے کی طرح ہمارے سروں سے گزر رہا ہے
اور اب تو اس کی چونچ ہماری شہ رگ میں اترنے لگی ہے
جو کچھ بھی ہے
اور جو کچھ بھی تھا
وہ کچھ بھی نہیں ہے
ہم سے آگے اور پیچھے
واہمہ ہمارا مقدر ہے
حقیقت سفید لباس میں ہم سے بہت دور ہے
محبت ہمیں ڈس چکی ہے
اب زہر پھیلے گا، تو اس دوپہر
ہم سے پیچھے جو قبریں بنی تھیں
ان میں اضافہ ہی ہوگا

ہانس میگنس برنس برگر
(ترجمہ)

رات اور سورج

تھوڑی دیر کے لئے
صرف تھوڑی دیر کے لئے میں تمہارے ساتھ رہا
اور پھر
سب کچھ ایک خواب میں تبدیل ہوگیا
شاید ہم منجمد تھے
اور تھوڑی دیر کے لئے
صرف تھوڑی دیر سورج کے سامنے ملے تھے

ہمیں سورج سے گریز کرنا چاہیئے
اور صرف رات میں ملنا چاہیئے
رات ہمیں اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے
شاید ہم رات کے کھوئے ہوئے بچے ہیں
اور رات ہماری بچھڑی ہوئی ماں ہے
شاید ہمیشہ، اسی لئے
اس کا سایہ ہمارے دلوں پر
اپنے پر پھیلائے رہتا ہے
اگر ہماری ماں اپنے پر ہمارے دلوں پر نہ پھیلاتی
تو ہمارے دل دن کی روشنی میں پگھل جاتے
تم صرف تم رہتیں
اور میں تم سے کبھی نہ مل سکتا

NO—EXIT

ہواؤں کے ٹھنڈے کورے کفن اوڑھے
ہم کس جشن میں شریک ہیں ـــــ
ہماری آنکھیں کس سمت کو دیکھ رہی ہیں کہ پتھریلا غبار برف کی طرح
آہستہ آہستہ ہماری پلکوں پر جمتا جا رہا ہے ـــــ
ہماری زبانوں پہ یہ سنہرے تالے کس نے لگا دیئے
کہ اب اشارے ہمارے معانی بن گئے ـــــ
دردناک آوازوں کے آگے یہ کیسے بند باندھے گئے کہ شور اور خاموشی کانوں
میں کڑوے دھوئیں کی طرح یکجا ہو رہے ہیں ـــــ
کس بلا کا ہجوم ہے اور کیسی بے آس تنہائی ہے ـــــ
کوئی کسی سے کچھ نہیں کہتا
پھر بھی دامن میں سکّوں کی جھنکار کی شکتی کیوں نہیں ؟
کتنے رحمدل اور ہمدرد قاتل ہیں ـــــ
ہم کو اک دوجے کے سامنے مارنے سے گریز کرتے ہیں ـــــ
وضع دار جو ہوئے ـــــ
انٹرویو کے لئے ایک ایک کو کمرے میں بلاتے ہیں ـــــ
اندر داخل ہونے کے لئے ایک دروازہ
باہر جانے والوں کی آنکھوں کے سامنے ـــــ NO EXIT
باپردہ لوگ ہیں ـــــ
حیا آنکھوں میں ہونی چاہئیے ـــــ اک دوجے کی آنکھوں سے آنکھیں نہ ملاؤ ـــــ
خوشحالی کے گیت گاؤ
کفرانِ نعمت نہ کرو ـــــ مراعات ہماری صلاحیتوں کے حساب سے ہیں ۔
حساب میں اچھے رہو ـــــ بازار میں GOOD BOOKS دھڑا دھڑ چھپ
رہی ہیں
اپنی سوچ کو مالکوں کی تجوری میں ڈال کر چین کی بنسری بجاؤ ـــــ
موسیقی روح کی غذا ہے ـــــ

نعمت کدے بھی آباد رہیں ـــــ
پس رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرو اور کندھے سے کندھا جوڑے
ہر ابھرتے سورج کی طرف نظر رکھو ـــــ
اور جشن میں شریک رہو ـــــ
فرشتے ہماری حاضری کا رجسٹر لئے دائیں بائیں کھڑے ہیں

ماوز

شائستہ حبیب

مرنے کی مشق

سات سو دنوں کا لمبا خاموشی کا وقفہ
مرنے والے کی سانس سے بھی دھیمی آواز میں میرے کانوں کے قریب سے
گزر گیا ہے
یہ تم تھے ـــــ
کہ اتنے وقفے کے بعد بھی تمہارے جذبوں میں نفرت کا اوپرا جذبہ شریک تھا
تمہیں اجنبیوں کی طرح پاس بیٹھے دیکھ کر
میری روح چھن چھن ناچ رہی ہے اپنے ہی لہو کی گردش کے ساتھ ساتھ
خون میرے سینے سے اُٹھا اور میرے ہی ہونٹوں پہ اپنی بے بسی تحریر کرتا ہوا
نالیوں میں بہنے لگا ـــــ
آہستہ کھانسو ـــــ لوگ جاگ پڑیں گے ـــــ
راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنے آپ سے یہ سوال کرتے وقت میرے ہونٹوں کی
ہنسی تم نے نہیں دیکھی ـــــ ورنہ رونا آجاتا ـــــ
ہاں ٹی ۔ بی سے مرنا اب اولڈ فیشن ہے ـــــ
اب کینسر سے مرو ـــــ نہیں کینسر بھی وبا کی طرح ہر جگہ پھیل رہا ہے ـــــ
وبا میں مرنا کوئی اچھا کام نہیں ـــــ
پس زندہ رہو اور مرنے کی مشق کرتے کرتے کبھی نہ کبھی تو مر جاؤ گے
مگر بغیر محبت کے نہ مرنا ـــــ ورنہ حساب دینا پڑے گا

پروین شاکر۔ سائرہ ہاشمی
مسعود اشعر، شہرت بخاری
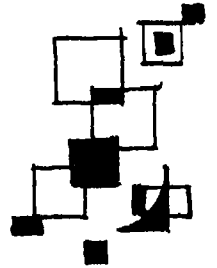
دائیں سے۔ طاہر صدیقی، ڈاکٹر امداد حسین امداد
احمد ندیم قاسمی، حزیں لدھیانوی، نامعلوم
حمید آرٹسٹ

جمیل ملک اور لطیف کاشمیری معہ دیگر احباب

ریاض صدیقی۔ ڈاکٹر صابر آفاقی۔ حکیم سعید اور دیگر احباب
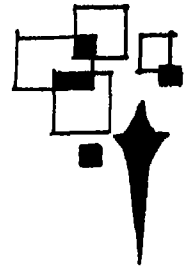
محمد علی صدیقی۔ ڈاکٹر وزیر آغا
ذوالفقار تابش ۔ اظہر جاوید
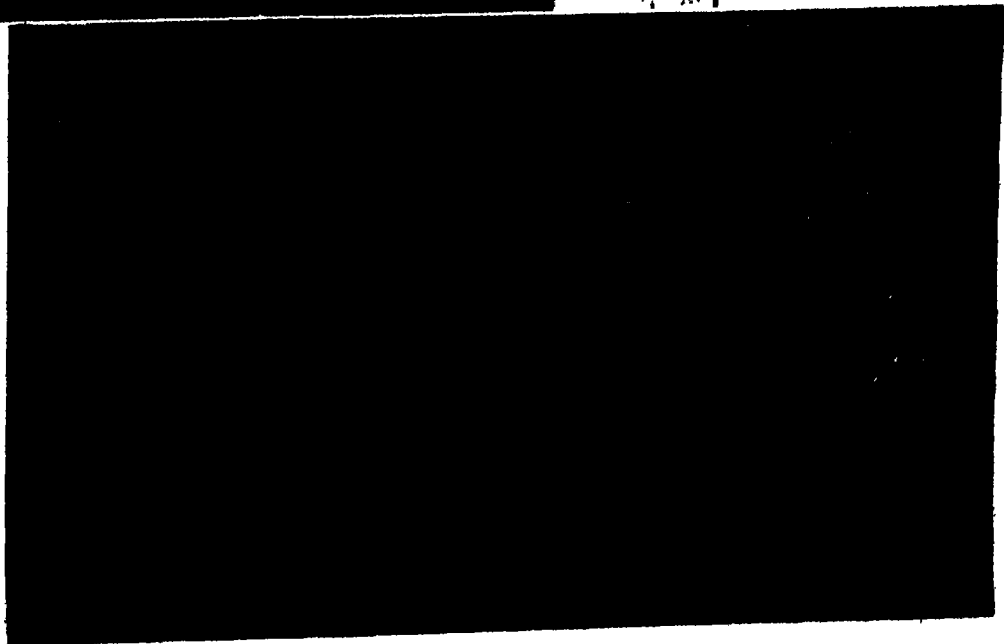
عطا الحق قاسمی۔ محسن احسان
امجد اسلام امجد

صادق حسین

جھولی

اُس شہر میں اُستاد مودی کی بیکری کے کیک مشہور تھے۔

ساکھ برقرار رکھنے والے قیمتی کیک بنانے اور سجانے کا باریک کام، اُستاد مُودی، ایک خاص کمرے میں اپنے ہاتھوں سے کرتا۔ اُس خاص کمرے کی کھڑکی ایک کشادہ گلی میں کھُلتی تھی۔ سامنے ایک ہوٹل تھا ـــــ بیرے بچا کھچا سالن، نان اور روٹی کے ٹکڑے کھڑکی کے نیچے، بیکری کی دیوار کے پاس پھینک دیتے۔ بھکاری، بھکارنیں، ان کے بچے اور کُتّے اُس جھوٹن کے ڈھیر سے ہڈیاں اُٹھا کر چچوڑتے تو کِرکِر کی آوازیں اُدھم مچا دیتیں: بچے پتھر پر نلیاں مار مار، گودا نکالنے کی ناکام کوشش کرتے کوئی ہڈی متنازعہ ہو جاتی تو کتے بھونکنا شروع کر دیتے، بعض اوقات وہ ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے۔ اگر کوئی بھکارن اُمید سے ہوتی تو دوسری بھکارنیں اچھی اچھی ہڈیاں چُن چُن، اُس کی جھولی میں ڈال دیتیں۔ اپاہج بھکاری، روٹی کے مرطوب ٹکڑے حلق سے اُتار، آزادی کی کھُلی فضا میں سانس لیتے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے۔

میدے میں حُسن پیدا کرنا، اُستاد مودی کا آبائی پیشہ تھا۔ انگریزوں کے راج میں اس کے باپ نے بڑے بڑے، خوبصورت کیک بنا کر نام پیدا کیا۔ توصیفی اسناد حاصل کیں۔ ڈھیروں روپیہ کمایا ـــــ

چند برس پہلے اُستاد مودی نے پچاس پاؤنڈ وزن کا کیک بنا کر لوگوں کو متحیّر کر دیا تھا۔ اُس نے خاص کمرے میں گھنٹوں کام کرکے، مینارِ پاکستان کی ہو بہو شکل، میدے، شکر، مکھن، انڈوں کی زردی اور سفیدی، چاکلیٹ کریم اور میٹھے رنگوں میں ڈھال کر رکھ دی تھی، ایک دُنیا اُس کیک کی زیارت کرنے آئی تھی۔

بیکری کے طریقِ کار کے مطابق، مبتدی انڈوں کی زردی اور سفیدی پھینٹتے، میدہ گوندھتے اور سانچوں میں روغن چُپڑتے۔

دوسری صف کے ملازمین، خمیر اُٹھاتے، پیسٹری اور بسکٹ کے ماوا تیار کرتے۔ تربیت یافتہ افراد، سادہ اور دودھ کی ڈبل روٹی، باقرخانی، شیرمال اور دوسری چیزیں بناتے۔ ایک پرانا کاریگر آمیزہ کی تیاری پر نگاہ رکھتا، سادہ اور میوہ دار کیک بناتا اور تنور کی آنچ کی نگرانی کرتا۔ یہی کاریگر ساکھ برقرار رکھنے والے قیمتی کیک کی تہ ہموار کرتا اور پرت پرت سنوارنے کا کام استاد مودی کرتا فن کے راز استاد مُودی کے سینے میں محفوظ تھے۔ اُن رازوں کی امانت اُس کے باپ نے اُسے سونپی تھی اور اُس کے دادا نے اس کے باپ کو۔ یہ سا ... اُس زمانے تک پہنچتا تھا جس میں لوگوں نے پہلی بار کیک کی صورت دیکھی تھی۔

اُستاد مودی کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنے ہُنر کے گُر، حق دار کو پہنچا دے۔ وہ جانتا تھا، زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان پہلے بیمار پڑے اور پھر انتقال کرے۔ اُس نے اپنے دو جوان بیٹوں کی اچانک موت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا "میرا سینہ چاک کرکے دیکھو تو میرے دل میں دو سوراخ پاؤ گے۔" اس جذبے کی ترجمانی کے لئے اُس نے اپنے فن کا سہارا لیا تھا اُس نے ایک ایسا کیک تیار کیا جس پر انسان کا دل رکھا ہوا تھا۔ اُس دل میں دو سوراخ تھے۔ دیکھنے والوں کو یوں معلوم ہوتا جیسے اُس دل سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں ـــــ وہ کیک دیکھ کر ایک سرجری کے پروفیسر نے کہا "میں اسے

امتحان گاہ میں لے جا کر طلبہ اور طالبات کو دکھانا چاہتا ہوں"۔ ایک مصور پکار اُٹھا: "مجھے یہ کیک دے دو تاکہ میری بنائی ہوئی ساری تصویریں لے لو ۔۔۔"

اُستاد مودی نے وہ کیک کسی کو نہ دیا۔ وہ کیک جوں کا توں، شوکیس میں پڑا رہا۔ کیک کی جوانی ڈھلنے لگی ترو تازگی سمٹ کر جھرّیوں میں تبدیل ہوگئی ہے وہ باسی ہو کر ایک دن مر گیا۔ اُستاد مودی سوچنے لگا کہ اب اُس کی اپنی جوانی بھی تو ڈھل گئی ہے ترو تازگی سمٹ کر جھرّیوں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ وہ باسی ہوگیا ہے۔ اب وہ مر جائے گا۔ کوچ سے پہلے وہ اپنے پیشے کے راز، فخری کے سینے میں منتقل کر دینا چاہتا تھا۔ اُس کے اکلوتے بیٹے کا اصلی نام فخرالدین تھا۔ مگر اپنے پرائے ۔۔۔۔۔ سب اُسے پیار سے فخری کہہ کر پکارتے۔ فخری بی اے پاس کر چکا تھا۔ وہ ملازمت کے خلاف تھا۔ چنانچہ اس نے بیکری میں باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کم گو تھا مگر جب بات کرتا، اُستاد مودی کے مزاج کا نقشہ بگڑ جاتا۔ فخری کی باتیں اجنبی اجنبی معلوم ہوتیں۔ اُستاد مودی تو صرف یہ جانتا تھا کہ بزرگوں کے سامنے آنکھیں نیچی رکھنا چاہئیں۔ باپ کا حق ہے نصیحت کرنا اور بیٹے کا فرض ہے، سر جھکائے سنتے رہنا۔ بعض اوقات فخری کا رویہ اس کے برعکس ہوتا۔ وہ اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتا۔ بیکری میں کام کرنے والوں کی تنخواہوں میں اضافہ ہونا چاہیئے۔ منافع کا کچھ حصہ انہیں بھی ملنا چاہیئے۔ وہ تو یہاں تک کہہ دیتا کہ اپنے لئے جینا بھی کوئی جینا ہے۔ استاد مودی کے دل میں یہ خیال جڑیں پکڑنے لگا کہ اُس کی موت کے بعد فخری ساری دولت برباد کر دے گا۔ اُس نے فخری کو سمجھایا کہ روپیہ بہت بڑی طاقت ہے۔ اگر وہ مال دار نہ ہوتا تو اُس کا نام معززینِ شہر کی فہرست میں نہ ہوتا۔ پڑھے لکھے لوگ چل کر ایک ان پڑھ کے پاس نہ آتے۔

اُستاد مودی اپنے فن کے رازوں کی پہلی قسط فخری کے سپرد کر چکا تھا۔ ابھی دو قسطیں باقی تھیں۔ وہ حالات کا جائزہ لیتا رہتا۔ اُسے ایک کھٹکا لگا رہتا کہ اگر فخری نے پیشے کی باریکیاں کسی کو بتا دیں تو کاروبار کا ستیاناس ہو جائے گا۔ اُس نے اپنے باپ سے سنا تھا کہ بیوپار میں ساکھ ریڑھ کی ہڈی ہے اور پیشے کے راز اس کا دل۔ تھوڑے دنوں میں اس نے اندازہ کر لیا کہ فخری اتنا کچا نہیں۔ پیٹ میں بات رکھ سکتا ہے۔ وہ اپنے باپ کی طرح خاص کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے دل لگا کر کام کرتا۔ کاریگروں سے مطلب کی بات کرتا مگر دن تہوار پر انہیں اپنی جیب سے انعام دیتا اور یہ بات اُستاد مودی کو ناگوار گزرتی۔

ایک دن اُستاد مودی عملے کی اجتماعی قوت کے سامنے بے بس ہوگیا۔

بیکری، ایک بارونق سڑک کے کنارے دکانوں کی ایک لمبی قطار کے وسط میں واقع تھی۔ اُس کے اوپر کئی کمروں پر مشتمل ایک عالیشان مکان تھا جس میں استاد مودی اور اس کے مختصر کنبے کے افراد رہتے تھے ۔۔۔ یہ ساری جائیداد اُستاد مودی کی تھی۔ بالائی منزل کو جانے کے لئے دو علیحدہ علیحدہ راستے تھے۔ ایک پکی سیڑھی، جو بیکری کے تھڑے سے شروع ہو کر دیوان خانے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ دوسری لکڑی کی سیڑھی جو بیکری کے اندر سے بل کھاتی اوپر نکل گئی تھی ۔۔۔۔۔ آوازیں، بیکری کے اندر سے اُٹھ کر اُن کی اُن میں بالائی منزل تک پہنچ جاتی تھیں۔ آج بیکری میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کاریگر کام چھوڑ چھاڑ باہر نکل گئے تھے۔ کوئی برابر کی دکان کے تھڑے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ کسی نے چائے والے کے پاس اڈا جما رکھا تھا۔ کوئی دھوپ کھا رہا تھا۔

اُستاد مودی نے دیوان خانے کی کھڑکی میں پڑی چق کی اوٹ سے باہر جھانکا۔ لوگ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے چاک لے کر ایک دیوار پر لکھ دیا: "ہماری تنخواہوں میں اضافہ کرو"۔ استاد مودی نے چٹخنی چڑھا لی، اس خیال سے کہ اگر فخری کی ماں اندر آ گئی تو وہ اسے کیا جواب دے گا۔ آج اُس کا دبدبہ متزلزل ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے تو بیکری اور گھر میں اس کی بات قانون کی حیثیت رکھتی تھی۔ آج کایا پلٹ ہوگئی۔ اُس کے دل میں پہلی بار خواہش پیدا ہوئی کہ ان حالات میں کسی سے رائے لینی چاہیئے۔ فخری باہر گیا ہوا تھا۔ مگر اُس کا موجود ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا۔ اس لئے کہ استاد مودی اپنے بیٹے سے مشورہ لینے میں اپنی ہتک سمجھتا۔ اس کی انا بولی "میں نے ہمیشہ مشورہ دیا ہے، لیا نہیں"۔ اُس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سر کے بال سفید۔ گالوں پر جھرّیاں ٹھوڑی

کے نیچے لٹکتا گوشت۔ اب تو اُٹھتے بیٹھتے وقت
اس کے گھٹنوں میں درد ہوتا تھا۔ کام کرتے وقت
ہاتھوں کی انگلیاں تھرتھرانے لگتی تھیں۔ ڈاکٹر نے
تو کہہ دیا تھا کہ یہ رعشہ کے آثار ہیں۔

دفعتاً بیکری سے آوازیں سنائی دیں۔ اُستاد
مودی، دروازہ کھول کر لکڑی کی بل کھاتی سیڑھی
سے نیچے اُتر گیا۔ فجری، کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے
کھڑا تھا۔ کاریگر اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ جوش و
خروش سے میدے کو ٹکیاں لگائی جا رہی تھیں۔
انڈے پھینٹے جا رہے تھے۔ سانچوں میں روغن
چپڑا جا رہا تھا۔ تنور کے اندر آگ کے شعلے تیز تیز
سانس لے رہے تھے۔

اُستاد مودی، بیٹے کو بازو سے پکڑ، کمرے
میں لے گیا۔

"فجری بیٹا! یہ لوگ کام پر واپس کیسے آئے؟"
باپ نے سرگوشی کی۔

"میرے حکم سے" بیٹے نے متانت سے جواب
دیا۔

اُستاد مودی، یکلخت کمرے سے باہر نکل گیا۔
اُسے دکھ ہوا۔ کل تک بیکری میں صرف اُس کا حکم
چلتا تھا۔

فجری نے خاص کمرے کا دروازہ اندر سے بند
کر کے آستینیں چڑھا لیں۔ وہ صابن سے ہاتھ
دھو کر میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں
کی انگلیاں حرکت کرنے لگیں کبھی آہستہ، کبھی جلدی جب
اُسکے ہاتھ رُک جاتے تو خیالات کی چنگاریاں اُسکی آنکھوں کے
دریچوں سے جھانکنے لگتیں۔ یکایک اسے یوں محسوس
ہوا جیسے وہ بوڑھا ہو گیا ہو۔ کمر دوہری ہو گئی ہو
اور سر کے بال سفید۔ سردیوں کی رات میں وہ ایک
دُکان کے تھڑے پر پڑا تھر تھر کانپ رہا ہو۔
کھانستے کھانستے اُس کا بُرا حال ہو گیا ہو، پچھلی سردیوں
میں اُس نے ایک بوڑھا بھکاری عین اُس حالت
میں دیکھا تھا۔ ایک دردناک منظر دیکھ کر وہ دوڑتا
ہوا اپنے گھر چلا گیا۔ اُس کی سانس پھول رہی تھی۔

"فجری بیٹا! کیا بات ہے؟" ماں نے پوچھا

"ماں! مجھے ایک دھسا چاہیئے"

"تم پریشان نظر آ رہے ہو"

"ماں! ماں!! وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے ایک
دُھسا فوراً چاہیئے"

ماں نے بڑے صندوق سے ایک دُھسا نکال
کر بیٹے کو دے دیا۔

فجری باہر جانے لگا تو اُستاد مودی کی آواز آئی

"کہاں جا رہے ہو؟"

"اُس بھکاری کے پاس"

"کس بھکاری کے پاس؟"

"وہ جو سردی سے کانپ رہا ہے"

"اور یہ دُھسا؟"

"اُسے دینے جا رہا ہوں"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اِس دُھسے پر اس بھکاری کا حق ہے"

اُستاد مودی، بیٹے کی بات سُن کر سوچ میں
پڑ گیا۔

آج کیک بناتے ہوئے، ماضی کے واقعات
ایک ایک کر کے فجری کی آنکھوں میں پھرنے لگے
وہ اپنے خیالوں کی دھوپ چھاؤں، کیک کے
انگ انگ میں منتقل کرتا رہا۔ دن کے کھانے کا وقت
ہو گیا۔ وہ چار مرتبہ اُوپر سے بلاوا آیا مگر وہ اپنے
کام میں بدستور مگن رہا۔

یکایک کسی نے دروازے پر دستک دی۔

فجری نے دروازہ کھولا۔

سامنے استاد مودی کھڑا تھا۔

"شاباش! میرے بیٹے میں خوش ہوں کہ تم جی
لگا کر کام کرتے ہو"

"شکریہ"

ٹھائیں ٹھائیں!! ایکا ایکی استاد مودی کو
یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے سینے پر
گولیوں کی بوچھار کر دی۔ وہ قہر آلود نگاہوں سے
میز پر رکھے کیک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیک پر
ایک بوڑھے بھکاری کا بُت کھڑا تھا۔ ہڈیوں کا
ڈھانچہ جسم پر چیتھڑے، ننگے پاؤں۔ دھول میں
اَٹے سر کے بال۔ گلے میں کشکول۔ وہ بُت، سوالیہ
نشانوں کا ایک قافلہ لئے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

"کون خریدے گا یہ کیک؟" اُستاد مودی نے
تُند لہجے میں کہا۔

"ہر چیز بیچی نہیں جاتی"

"اُستاد مودی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، کیک اُٹھا
کر کھڑکی میں سے باہر پھینک دیا۔

"صاحبزادے! لوگ ہماری دُکان پر دُکھ درد کی
تصویریں خریدنے نہیں آتے۔ وہ خوشی کی تلاش میں
آتے ہیں" اُستاد مودی یہ کہہ کر اوپر چلا گیا۔

فجری نے بڑھ کر کھڑکی کے دروازے سے باہر جھانکا

جھوٹن کے ڈھیر کے پاس، بھکارنیں اور بھکاری ایک ننگ دھڑنگ بچے کے سر اور جسم پر بکھرے کیک کے ریزے اور پھنکیاں، ہاتھوں سے سمیٹ سمیٹ، چپڑ چپڑ کھا رہے تھے۔ ایک بھکارن بچے کا سر زبان سے چاٹنے لگی۔ دوسری بھکارن، فخری کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"خدا تمہارا بھلا کرے تھوڑا سا اور پھینک دو۔"

عموماً، جب ضرورت پڑتی۔ استاد مودی، فخری کو اپنے پاس بلوا کر بات کرتا۔ ایک دن وہ خود چل کر بیٹے کے پاس گیا۔

"فخری بیٹا!"

"جی، اباجی"

"یہ دیکھو، رعشہ"

استاد مودی نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلا دیئے۔

انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ پت جھڑ میں گرنے سے پہلے زرد پتوں کی طرح۔ اس لرزش کی کوکھ سے کسی بوڑھے پیڑ کے ٹوٹنے کی آواز سن کر فخری کو دکھ ہوا۔

"بیٹا! یہ میری عزت کا سوال ہے"

"فرمایئے، کیا حکم ہے؟"

"میں نے اپنے ایک پرانے دوست سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کے پہلوٹھی کے بیٹے کی پہلی سالگرہ پر ایک ایسا کیک بناؤں گا جسے دیکھ کر دنیا عش عش کر اٹھے گی۔ میرے ہاتھ کام کی باریکیوں کا ساتھ نہیں دے رہے۔"

"سالگرہ کب ہے؟"

"پرسوں"

"آپ مطمئن رہیں"

"استاد مودی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے کیک کا خاکہ اپنے ذہن سے نکال کر فخری کے حوالے کر دیا۔

فخری نے بڑی محنت سے سالگرہ کا کیک تیار کیا۔

جب استاد مودی خاص کمرے میں داخل ہوا تو کیک کے تیور دیکھ کر اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا "سبحان اللہ!"

"جمالیاتی پہلو اجاگر ـــ بھینی بھینی خوشبو کی پکار تقریب کی مناسبت سے رنگ برنگے زرق کا نادر نمونہ سانس لے رہا تھا۔ کیک کا ہر زاویہ، خط اور محراب، پیندے سے لے کر چوٹی تک ہر چیز فنی مہارت کا ثبوت دے رہی تھی۔

استاد مودی کی تجربہ کار آنکھیں، کیک کے ظاہر اور باطن کی تشخیص کر کے خوشی سے نمناک ہو گئیں۔

جب استاد مودی نے کیک سے نگاہیں ہٹائیں تو فخری کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔

"فخری!" استاد مودی بولا۔ اس کے لہجے میں تحسین، شفقت اور اعتماد کے ملے جلے جذبات تھے۔

فخری نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

فخری نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

استاد مودی نے بڑھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔

بھکارنیں، جھولیاں پھیلائے، جھوٹن کے ڈھیر کے پاس کھڑی تھیں۔

ایک بھکارن، ننگ دھڑنگ بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی "خدا تمہارا بھلا کرے، اس دفعہ جھولی میں پھینکنا۔"

"فکر و فن کا کمال نکھرا کچھ اور — حسنِ مہِ بے مثال نکھرا کچھ اور
کشور ناہید کی ادارت کے طفیل — "ماہِ نو" کا جمال نکھرا کچھ اور

راغب مرادآبادی ـــ کراچی

آغا سہیل

تسمہ پا

مشکل یہ تھی کہ وہ نظر نہیں آتا تھا، لیکن میرے اعصاب پر سوار تھا، اور جو نظر آتا تھا وہ صرف مجھے نظر آتا تھا اور جو سب کو نظر آتا تھا وہ، وہ نہ تھا جو مجھے نظر آتا تھا، میں نے بہتیری کوشش کی کہ جو مجھے نظر آتا ہے۔ سب کو نظر آئے لیکن لوگ تھے کہ کچھ دیکھتے ہی نہ تھے یا دیکھتے تھے تو دیکھنے کے باوجود نہیں دیکھتے تھے مجھے تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ سچ مچ کچھ دیکھتے بھی ہیں۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دیکھنے والے صرف مجھ کو دیکھتے ہیں۔ یا میرے کندھوں کو بھی دیکھتے ہیں۔

کندھے جو بوجھ سے شل تھے اور ان پر وہ سوار تھا، کندھے جو اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار نہ تھے۔ بوجھ سے سارا جسم ڈانواں ڈول تھا، چلنا دوبھر تھا، چلتا تھا تو گر گر پڑتا تھا، اٹھتا تھا، لڑکھڑاتا تھا اور دو چار قدم چل کر پھر زمین پر ڈھیر ہو جاتا تھا، آسمان کی طرف دیکھتا تھا، انگلی اٹھا کر کہتا تھا کہ کوئی نہیں دیکھتا مگر اے اللہ تو سب کچھ دیکھتا ہے کہ حاضر و ناظر ہے تو سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے کہ سمیع و بصیر ہے، جو مجھ پر بیت رہی ہے، تجھے خبر ہے کہ تو خبیر ہے، مگر شاید ابھی وقت نہیں آیا تھا کہ آسمان کی طرف سے کچھ اشارہ ملتا، زمین کی طرف دیکھتا اور حسرت سے کہتا، کیا تجھے بھی کچھ پتہ نہیں کہ جو مجھ پر بیت رہی ہے تو تو مجھ سے قریب ہے میرے قدموں تلے تیری دھڑکتی ہوئی چھاتی ہے۔ تیرے تنفس کی رفتار کو میں محسوس کر رہا ہوں۔ جو بوجھ مجھ پر لدا ہے کیا اس کا بار تجھے محسوس نہیں ہوتا؟

وہ جو ابلیس نے کندھوں کو چوما تھا کہ دو مار سیاہ پھنپھنا کر پیدا ہو گئے تھے اور انسانی مغز چاٹ کر اپنی اشتہا پوری کرتے تھے ان کا بھی توڑ پیدا ہوا، اور وہ جو روز اول سے میرے کندھوں پر سوار فرد حساب لکھنے میں مصروف ہیں۔ ان کا بھی کچھ بوجھ نہیں مگر جو بوجھ اب میرے کندھوں پر دھرا تھا اس نے تو میری شخصیت ہی کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا، آئینہ دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ میں کیا سے کیا ہو گیا ہوں؟ چہرے کے خد و خال بگڑتے جا رہے تھے۔ رخسار کیسے کریہہ المنظر ہو گئے تھے۔ آنکھیں زندگی کی چمک سے عاری تھیں اور اندر کو دھنستی چلی جا رہی تھیں اور وہ جو میری باطنی وجاہت تھی اسے اندر ہی اندر گھن چاٹ رہا تھا۔ نہ وہ اگلی سی امنگ نہ حوصلہ نہ وہ شجاعت نہ وہ تہور نہ وہ نہیب نہ وہ دبدبہ نہ وہ سطوت نہ وہ صولت گویا میں میں نہ رہا تھا، کوئی اور ہی بنتا جا رہا تھا، لیکن لوگ کچھ نہیں دیکھتے، یہ کیا غضب ہے کہ لوگ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتے اور جو دیکھتے ہیں وہ اپنی نظر سے نہیں دیکھتے، آخر ان کے چہروں پر یہ کس کی آنکھیں لگا دی گئی ہیں جو انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا؛ اور جو نظر آتا ہے وہ، وہ نہیں ہے جو حقیقتاً موجود ہے، طرفہ تماشا یہ ہے کہ انہیں کچھ سنائی بھی نہیں دیتا ہے میں حلق پھاڑ پھاڑ کر چیختا ہوں، فریاد کرتا ہوں لیکن کوئی سنتا ہی نہیں۔ جیسے میرے چاروں طرف شیشے کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہوں۔ شیشے کے زمین و آسمان بنا دیئے گئے ہوں اور میں ان میں محبوس ہوں کہ میری آواز انہیں دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر رہ رہ جاتی ہو۔ باہر جاتی ہی نہ ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بوجھ جو میں لاکھ سہارتا ہوں مگر سہارے نہیں سہارا جاتا، اسے کوئی محسوس نہیں کرتا، کوئی متوجہ نہیں ہوتا، کوئی دھیان ہی نہیں دیتا کوئی مطلقاً میرا نوٹس ہی نہیں لیتا، یہ کیسی نفسی نفسی ہے۔

اس معذبہ کو یاد کرتا ہوں اور دل ہی دل میں کڑھتا ہوں کہ اس جھاڑ جھنکاڑ میں میں نے قدم ہی کیوں رکھا کہ آسیب کی طرح وہ کسی رخ سے آنکلا اور مجھے دبوچ کر میرے کندھوں پر سوار ہو گیا، میں نے بہترا چاہا کہ اسے الٹ دوں مگر اس نے تو میری گردن ہی کو جکڑ لیا، میں تو جنبش بھی نہ کر سکا، میں نے چاہا کہ

خدا گواہ، شاکر! سے دیکھ ہی لوں کہ وہ ہے کیا بلا مگر اس نے تو مجھے بیٹھنے بھی نہ دیا۔ میں نے چاہا کہ اس کی آواز ہی سن لوں کہ کراہ کراہ کر کئی کئی بار دادفریاد کی مگر ہر بار میرے کراہنے پر اس نے زور کا دھکا دیا کہ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ ناچار اس سوار کا راہوار بننا پڑا۔ جدھر چاہتا چلاتا اور میں چارو ناچار چلتا۔ گر گر کر سنبھلتا، سنبھل سنبھل کر چلتا مگر نہ چال میں استواری نہ رفتار میں صبا رفتاری زبردستی کی تابعداری میں مبتلا تھا اور مبتلا ہوں۔ کسی طور اس مردم آزار کا بھید نہیں کھلتا کہ کیا ہے اور میرے سر کو سنگھ کیا ہے، مجھے کدھر لے کر جانا چاہتا ہے۔ کس رستے پر چلنا اور چلانا منظور ہے اللہ اللہ یہ آزاد دنیا کا کیا دستور ہے کہ میری مرضی کے خلاف کوئی میرے اوپر سوار ہے۔ میری خوشی اور خواہش کے خلاف مجھے چلاتا ہے۔ میں بیٹھنا چاہتا ہوں تو وہ دوڑاتا ہے۔ میں چلنا چاہوں تو وہ بٹھاتا ہے۔ میں کھانا چاہتا ہوں تو وہ سوکھا رکھتا ہے اور یہ کوئی صحرا بھی نہیں ہے کہ جہاں وہ اکیلا ہو اور اس کی مرضی ہی اس کا قانون ہو۔ لوگوں کے انبوہ میں میں کھوتا بنا ہوا ہوں۔ خچر بنا دیا گیا ہوں۔ اور میری گردن پر وہ سوار ہے ---- وہ جو نظر نہیں آتا مگر موجود ہے۔ وہ جو اپنی لمبی ٹانگوں سے میری گردن کو جکڑے ہوئے ہے کہ میں سر بھی نہیں اٹھا سکتا کہ اسے دیکھ ہی سکوں مگر چلتے رہنے پر مجبور ہوں۔

لہٰذا اس حالت پر قانع رہنے کی سوچتا ہوں تو اندر سے نفرت کا ایک زبردست ریلا آتا ہے۔ جو مجھے تقریریں کرتا ہوا کہیں سے کہیں بہا لے جاتا ہے کبھی کبھی تو میں نے یہ بھی سوچا کہ مجھے چوپایوں کی جبلت پر غور کرکے اسی صورتِ حال سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے مجھے انسانی سرشت کو فراموش کر دینا چاہیے اور اس بات پر صبر کر لینا چاہیے کہ شاید میں روزِ ازل ہی سے خچر بنایا گیا تھا۔ جس پر باربرداری کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ بس مجھے چارے پانی سے غرض رکھنا چاہیے پھر خیال آتا ہے کہ خچر بھی اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنے کے بعد تھان پر جا کر بندھ جاتا ہے پیٹھ کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے، دو چار لوٹنیاں لگاتا ہے خاک دھول جھاڑ کر تھوڑی سی دولتیاں جھاڑ لیتا ہے۔ پونچھ ہلا کر مکھیاں بھگا دیتا ہے۔ کسی ہم جنس کو دیکھ کر تھوڑا سا ہنہنا لیتا ہے، میں تو اس سے بھی گیا گزرا ہوں مجھے تو اس نے جب سے جکڑا ہے۔ بس سوتے جاگتے گردن پر سوار ہے۔

ایک بات اور بھی ہے کہ میں نے جب بھی آئینہ دیکھا یہ سوچ کر دیکھا کہ شاید اس طرح اپنے سوار کو دیکھ لوں مگر وہ بہت چالاک ہے، بوجھ تو مجھ پر جوں کا توں لدا رہتا ہے لیکن آئینے میں وہ مطلقاً نظر نہیں آتا معلوم نہیں کیونکر وہ خود کو غائب کر لیتا ہے اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہوں۔ البتہ یہ دیکھ کر قدرے تسکین ضرور ہوتی ہے کہ ہر چند میں خچر بنا ہوا ہوں تاہم میرا چہرہ بہت کچھ مسخ ہو جانے کے باوجود ہے انسانی چہرہ میری دونوں آنکھوں کے بیچ میں ناک واقع ہے پیشانی سے ملحق ابرو موجود ہے منہ اور ٹھوڑی کا فاصلہ ویسا ہی ہے جیسا انسانوں کا ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں جسم سب کچھ جوں کا توں ہے یعنی ڈھانچے کے اعتبار سے میں ویسا کا ویسا ہی انسان ہوں کہ جیسا معرضِ وجود میں آیا تھا، مگر میرا احساس؟

تو یہ سارا کہیں احساس کا تو جھگڑا نہیں کہ دراصل کچھ بھی نہ ہو مگر مجھے وہم ہو گیا ہو کہ جیسے میری گردن پر کوئی سوار ہے۔ کہتے ہیں کہ آماس جو مغز سر میں ہوتا ہے مریض کو لگتا ہے کہ سر پہ پہاڑ دھرا ہے، کہیں مجھے یہی مرض تو نہیں لاحق ہو گیا، اس وہم کو سمجھنے کے لئے میں نے اور کئی کئی جتن کئے سرد اور گرم ہوا کے جھونکوں کی زد پر سر کو رکھا اور اپنی حسیات کا امتحان لیا تو کھلا کہ میں بقید ہوش و حواس صحیح اور سالم انسان ہوں مگر بوجھ جوں کا توں دھرا ہوا ہے گردن جکڑی ہوئی ہے۔ پیٹھ پر وہ بدستور سوار ہے۔

بعض اوقات انسانی انبوہ میں میں گھستا چلا گیا کہ شاید اس طرح وہ میری گردن چھوڑ کر کسی اور کی گردن پر جا کر سوار ہو جائے۔ شاید مجھ سے زیادہ قوی ہیکل کوئی اور انسان اس کو بھا جائے اور وہ اس پر جا کر سوار ہو جائے مگر اس کو بھی قسم تھی کہ اس نے پھر بھی مجھے نہ چھوڑا پر نہ چھوڑا، میں نے بعض اوقات جان بوجھ کر خود کو گرا گرا دیا کہ شاید اس کو ترس آ جائے اور میرا پنڈ چھوٹ جائے مگر اس کی گرفت کسی طرح بھی ڈھیلی نہ ہوئی۔ ایک بار چلتے چلتے ایک درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور کسی اڑیل ٹٹو کی طرح اڑ گیا اس نے بہتیرا مجھے چلانے کے لئے لاتوں ٹھڈوں چابکوں سے تواضع کی مگر میں نے ہل کے نہ دیا بلکہ درخت کے تنے سے پیٹھ کو زور زور سے رگڑنا شروع کیا کہ ساری پیٹھ لہولہان ہو گئی مگر وہ بھی ایسی بلا تھا کہ ذرا بھی نہ پسیجا گرفت اور بھی مضبوط کر کے جم گیا۔ اس واقعے کے بعد مجھے بالکل یقین ہو گیا کہ اسے جیتے جی گردن سے اتار پھینکنا ممکن نہیں رہا اب کوئی اور تدبیر کرنا چاہیے شورہ پشتی فضول ہے۔ نرمی اور حلیمی سے کچھ کیا چاہیے اور اس بوجھ کو معمولی سمجھ کر وقتی سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔ مگر

تدبیر سے غافل نہیں رہنا چاہیے ؛ چنانچہ میں نے بظاہر
اس کی مرضی کا خود کو تابع بنا لیا اور تدبیر کی سبیل میں لگ گیا۔
نامعلوم منزل کی طرف انسانوں کے ہجوم میں چلتے چلتے
میں نے کسی سے پوچھا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ میری پیٹھ
پر کون لدا ہے ؟"
اس نے کہا "نہیں ——— مگر کیا تم کو معلوم ہے کہ
میری پیٹھ پر کون لدا ہے ؟"
میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پوچھا کہ
"کیا تمہاری پیٹھ پر بھی کوئی لدا ہے ؟"
اس نے کراہ کر کہا "ہاں جھاڑ جھنکاڑ میں ایک روز"

میں نے بات کو کاٹ کر کہا "ہاں ہاں بالکل یہی قصہ
تو میرے ساتھ بھی گذرا ———"
کچھ لوگ اور بھی متوجہ ہوئے اور بولے "بالکل یہی
بات ہمارے ساتھ بھی ہوئی ———"
کسی نے کہا "تو کیا ہم سب کے سب ...."
میں نے کہا : "بالکل خچر بن گئے ہیں ہماری پیٹھیں
ہموار ہیں"
ایک شخص بولا "ذرا سامنے تو دیکھو"
اب جو دیکھا تو ایک بڑے سے آئینے میں ہماری
گردنوں پر خچر سوار نظر آ رہے تھے۔ ہم حیرت سے

بلبلے۔
"ارے خچر ہم پر سوار ہیں"
کسی خچر نے مسکرا کر کہا،
"خچر کے بچے، خچر ہم نہیں تم ہو، ہم تم پر سوار ہیں"
تمام انسان پیچ پیچ ہنہنانے لگے اور ایک دوسرے
کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگے اور اسی لمحے میں نے
انگشتِ شہادت آسمان کی طرف بلند کر کے کچھ کہنا
چاہا تو دیکھا کہ میرا ہاتھ سُم بن چکا تھا۔

"میں نے ماہِ نو ایک عرصے کے بعد دیکھا۔ عجیب فرحت پہنچی۔ اسے دیکھ کر یہ بات کہ گویا رگِ جاں ہو گئیں۔ یہ پرچہ اب وہ سکّہ بند قسم کا (STEREO TYPED) پرچہ نہیں ہے جو کبھی تھا۔ اس نے کئی جونیں بدلی ہیں اور یہ جون سب سے سہانی ہے۔ حسنِ ترتیب کی ایک نئی روایت، نہ صرف اپنے پہلے جنم سے، بلکہ سب سے الگ۔ تمہارا سلیقہ اور اُپج دونوں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اس پر لازماً کچھ بندشیں بھی ہیں کہ یہ بہرحال ویسے تو حدود میں کچھ روایات کا پابند ہے۔ ان سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ (میرا ذاتی گلہ ایک طرح جو کچھ نوعیت کا ہے) میں نے دیکھا کہ اب دفتری کارروائی بھی زیادہ تیز ہے۔ خطوں کے جواب اس طرح جھٹ پٹ کہاں دیئے جاتے تھے۔

پندرہ سولہ سال کی وابستگی کے سبب ماہِ نو کی تقدیر سے میرا دھیان برابر لگا رہا۔ اس کا بند ہونا مجھے گوارا نہیں تھا لیکن سسکنا اور بھی بدتر تھا۔ اب اس میں زندگی کے بھرپور آثار ہیں۔ اور یہ ایک خوشگوار، معتدل روش پر قائم ہے۔"

شاہد الحق حقی ——— کراچی

لطیف کاشمیری

دوسرا سبق

کچھ دیر جب وہ سڑکوں کے بہت سے چکر کاٹ کر تھک گیا تو اپنے محلہ دار ہیڈ کلرک کے دفتر میں آکر ٹوٹی ہوئی ایک کرسی پر ستانے لگا۔ ڈھیلی چولوں والی اس کرسی کی طرح اس کا انگ انگ شکستہ تھا، اور کسی قدر دل بھی۔ کیونکہ وہ میٹرک کے بعد اپنی تعلیم جاری ہی نہیں رکھ سکا تھا اور کتنے ہی عرصے سے تلاشِ روزگار کے لئے سرگردان تھا۔

جب بھی نوکری کی تلاش میں مایوسی کا شکار ہوجاتا تو چند ساعتوں کے لئے ہیڈ کلرک کے پاس آ بیٹھتا جہاں ہمدردی کے دو میٹھے بولوں کے ساتھ کڑوی کسیلی چائے کا ایک پیالہ اُس کا منتظر ہوتا۔

کچہری سے ملحقہ خزانے کے اس دفتر میں مہینے کی اوّلیں تاریخوں میں بڑا ارش رہتا تھا۔ ان دنوں پنشنروں، ڈپو ہولڈروں، اور ٹھیکیداروں کے ہجوم میں ہیڈ کلرک کے گھِس گھِس کرتے قلم کے ساتھ ساتھ، بڑے بڑے رجسٹروں پر جھکی اُس کی چندیا بھی روپوش ہوجاتی۔ تب وہ اپنے روایتی سکون بخش قہقہوں اور چٹکلوں کو قطعی بھول جاتا اور اپنی عینک کے محدب شیشوں میں سے سامنے بیٹھے ہوئے اُمیدوار کی طرف، اُچٹتی ہوئی ایک آدھ ہمدردنظر ڈالنے کا بھی ہوش نہ رہتا۔

ایک روز یہی امیدوار جب ناامیدیوں اور مایوسیوں میں گھِرا اپنی سوچوں میں گم سُم سا چلا جارہا تھا تو معاً ایک بارُعب اور پُراعتماد آواز نے اسے چونکا دیا۔

"اے لڑکے! نوکری کرے گا؟"

اس کا رواں رواں مسرت سے لہراگیا۔

"جی کروں گا" اُس نے ایک ممنون نظر اپنے گمنام محسن پر ڈالی اور سلام کے انداز میں تعظیماً سر کو ذرا سا خم بھی کرلیا۔

"گھر سے بھاگے ہوئے تو نہیں؟" اجنبی کی تشویش قدرتی تھی۔

"جی، جی نہیں ـــ" اُس نے اپنی میلی سی شلوار قمیص اور اپنی زندگی ہی کی طرح اُدھڑی ہوئی چپل پر خجالت بھری نگاہ دوڑائی اور سوچا، اور اجنبی کا اگلا سوال شاید یہ ہو ـــ

"کہاں تک پڑھے ہوئے ہو؟"

لیکن اس کی بجائے، اُس نے کہا۔ "تنخواہ تیس روپے اور روٹی کپڑا ہوگا، اگر منظور ہو تو میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

وہ اس کے پیچھے پیچھے تو کیا جاتا، البتہ دیر تک حیرت زدہ کھڑا، بڑی دیانتداری سے یہ سوچتا رہا کہ شاید وہ اپنی وضع قطع سے کلرکی کا امیدوار کم اور گھریلو ملازم زیادہ لگتا ہے۔ اُس کے چہرے پر مصیبت زدگی اور شکست وریخت کی شاید گہری چھاپ ہے، جبھی تو اُسے کسی دفتر کی بجائے، گھریلو نوکری کی پیشکش ہوئی ہے۔ وہ یہ سوچ کر مسکرا دیا مگر اس کی مسکراہٹ میں، جبین سے ایک کرب کی جھلک بہت نمایاں تھی۔

گھر پہنچا تو اُس کی نوکری کے لئے منتیں مانگنے والی ضعیف ماں نے حسبِ دستور اس کی بلائیں لیں اور اُسے ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازنے لگی ـــ اُسے ڈر تھا کہ کہیں مسلسل بیکاری سے تنگ آکر وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا ہی نہ جائے۔ مگر بڑے بھائی کی نظر میں وہ اب کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا تھا۔ جو اُسے بارہا آوارہ گردی کرنے اور مفت کی روٹیاں توڑنے کے طعنے بھی دے چکا تھا۔ اُس نے سوچا

بھوک اور احتیاج میں نزدیکی رشتے بھی کتنے دور کے رشتے بن جاتے ہیں ــــ اپنائیت اور بھائی چارگی کے خوشنما محل، کھسکتی ہوئی زمین کی زد میں آجاتے ہیں اور اُن کی مضبوط دیواروں میں کس قدر جلد دراڑیں نمودار ہونے لگتی ہیں۔

مسلسل محرومی اور شکستوں سے ایک بار تو اس کے ذہن میں انتقامی سوچ کی ایک بے مہر سی لہر اٹھی۔ اگر مالی آسودگی اسی طور آسکتی ہے تو کیوں نہ وہ کوئی کالا دھندا یا سمگلنگ شروع کردے۔ لیکن گھر سے عملی صورت میں ملے ہوئے سبق نے ایسے راستے پر چلنے نہیں دیا۔ اُسے خیال آیا کہ ایمانداری کی قدر کھو کر وہ ڈھیر ساری دولت تو یقیناً سمیٹ لے گا۔ مگر وہ اُس سکون اور طمانیت کی دولت سے یکسر محروم ہو جائے گا، جس سے اس کا دل بچپن ہی سے مالا مال تھا ــــ اُس وقت اُسے بچپن کا ایک واقعہ بھی بے اختیار یاد آگیا جس کے اثرات ابھی تک اس کے دل و دماغ پر تازہ تھے ــــ اُسے یاد آیا کہ ایک روز اس کے ابا گھر آئے تو انہوں نے بتایا کہ جب بس پر سے سارے مسافر یکے بعد دیگرے اتر گئے تو ایک سیٹ پر میلی سی پوٹلی پڑی ملی ــــ دیکھا تو اس میں کچھ نقدی اور طلائی زیورات کا ڈبہ بھی تھا ــــ انہوں نے یہ پوٹلی اٹھا کر، ڈرائیوروں کی خواب گاہ میں دھرے اپنے چوبی بکس میں مقفل کر کے رکھ دی۔

دوسرے روز ایک خوش پوشاک عورت اور اس کی نوجوان لڑکی قافلے کے لٹے ہوئے مسافروں کی طرح پریشان حالت میں آئیں تو ابا نے چوبی بکس کھول کر پوٹلی، بلا تامل اُن کے حوالے کر دی۔ یہ بات اُن کے لئے بڑی غیر متوقع تھی۔ اپنی گم شدہ پونجی کی دستیابی سے دونوں ماں بیٹیوں کی آنکھوں میں حیرت و مسرت کے ملے جلے احساسات آنسوؤں کی موہوم سی نمی بن کر تیرنے لگے۔

وہ عورت کوئی بیوہ نرس تھی، جس نے عمر بھر کی کمائی کو اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے بنائے گئے گہنوں کی صورت میں محفوظ رکھا تھا ــــ ان گہنوں کو کھو کر وہ یوں محسوس کرنے لگی تھی جیسے اس کی بیٹی کا سہاگ ہمیشہ کے لئے اُجڑ گیا ہو۔ اور وہ خود موت کے ہولناک اندھیاروں میں محصور ہو کر رہ گئی ہو۔ زیورات کی پوٹلی پا کر وہ پھر سے ــــ دھڑکتے دل کے ساتھ زندگی کے مسکراتے اُجالوں کی سمت لوٹ آئی تھی۔

نرس اس واقعہ سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اُس نے عمر بھر اپنے محسن کے قدموں میں رہ کر اس کی خدمت کرنے کا فیصلہ کر لیا ــــ مگر ابا نے اس کا یہ جذباتی فیصلہ قبول نہیں کیا کہ وہ دیانت کو خیر کی ایک ایسی بے بہا قدر سمجھتے تھے، جسے انعام و اکرام کے ترازو میں تولا نہیں جا سکتا۔

یہ سبق درسی کتابوں کے ذریعے اس تک بھی بارہا پہنچا تھا مگر اس واقعہ کا اثر زندگی کا اوّلین سبق بن کر اُس کے دل و دماغ کے غرفوں میں برابر نورانی اُجلے بکھیرتا رہا اور وہ اپنے مایوسیوں میں گھرے وجود میں ہر لمحے ایک نیا عزم اور نئی امنگ محسوس کرتا رہا ــــ وہ گھر کو ایک خندق کی طرح محفوظ پناہ گاہ سمجھتا تھا مگر باہر خوفناک آندھی اور اندھیرا گھنیرا ہو تو اس کے آسیبی سائے بارہا گھر کے اندر بھی دوڑتے ہیں ــــ'

گھر میں بھائی کے سخت سُست کہنے یا بلا واسطہ طعن و تشنیع سے اس کے احساسات پر برابر چرکے لگا کرتے اور وہ خود اپنی نظر میں ہیٹا اور سبکسار محسوس کرنے لگتا ــــ پھر کوئی جائے اماں نہ ملتی تو ہیڈ کلرک کی شگفتہ گفتگو اور مستقبل قریب کے خوش آئند خواب سُننے اس کے دفتر چلا جاتا لیکن وہاں یہ دیکھ کر اُسے بارہا حیرت ہوتی کہ انصاف کی ترازو اور قومی زعماء کی قد آور تصاویر کے سائے میں بیٹھے سرکاری عمّال صبح سے شام تک غرض مندوں کی گھات میں رہتے اور مکڑیوں کے جالوں کی طرح حرص کے تار تار بُن کر انہیں پھانستے رہتے ــــ پیسے کی لالچ آدمی کو اس کے مقام سے کس قدر گرا دیتی ہے، اس کا اندازہ اُسے دفتروں کے ماحول کا گہرا مشاہدہ کرنے سے ہی ہوا تھا۔

ایک روز وہ اپنے ہمدرد کے پاس سے دل برداشتہ ہو کر اٹھا تو اُس کا گلا بُری طرح خشک ہو رہا تھا اور اس میں پھانس سی چبھ رہی تھی۔ وہ سڑک پر دیر تک سر گرائے یوں چلتا رہا جیسے اس کے شانوں پر کئی من وزنی بوجھ آن گرا ہو۔ مسلسل شکستوں اور ندامتوں کا نامعلوم سا بوجھ۔ اس بوجھ کے شدید احساس سے یکایک اس کا سر چکرانے لگا اور مضمحل سوچوں کے نرم و نازک تار جیسے برفیلے طوفان کی زد میں آئے ہوئے جالے کی طرح کپکپانے لگے۔

اپریل ۱۹۷۹ء

وہ گم سم سا برابر چلتا رہا ۔ بازار سے گزرتے ہوئے انواع واقسام کی چیزیں، شوکیسوں سے دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں ۔ اُس وقت وہ نقاہت کے ساتھ ساتھ تھکن بھی محسوس کر رہا تھا اور بھوک بھی ۔ سامنے کی دوکان پر ٹوکروں میں سجی ناشپاتیوں اور سرخ سرخ سیبوں کی مہک اُس کے نتھنوں میں گھسنے لگی اور اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر جیب میں چلا گیا ۔ لیکن جیب کو بہت سا ٹٹولنے کے باوجود بھی ایک روپے سے زیادہ رقم دستیاب نہیں ہوئی ۔ اس کے پیٹ سے ٹیسوں کی صورت میں اُبھرتی بھوک اُس وقت یکایک پھل کھا لینے کی خواہش میں ڈھل گئی ۔ وہ اس عیاشی کا متحمل تو نہیں ہو سکتا تھا مگر اس کی جیب میں جو رقم تھی ، اس کا شاید ایک آدھ سیب تو آ ہی سکتا تھا ۔ لذیذ میٹھا خوشبودار سیب ! دوکان کی سمت بڑھتے ہوئے وہ تصور ہی تصور میں سیب کی شیریں قاشیں اپنے دانتوں تلے چباتے اُن کا شہد آگیں رس حلق سے اتارنے لگا ۔ پھر معاً وہ دکان کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا اور اپنی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرنے لگا ۔ غیر معمولی طور پر بڑھی شیو بنوانے کی ضرورت اُس کے پھل کھانے کی احتیاج پر محیط ہو گئی اور وہ باربر شاپ کی طرف جانے والے راستے پر ہو لیا ۔ اسی راستے پر کھڑا ایک معذور بھکاری بھی مجسّم طلب بنا گڑگڑا گڑگڑا کر دستِ سوال دراز کر رہا تھا ۔

اس کے قدم یکایک رُک گئے ۔ اُس نے جیب میں پڑے نوٹ کو ٹٹولتے ہوئے اور اس پر بے دھیانی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے باہر نکالا اور اُسے غور سے دیکھنے لگا ۔ پھر نہ جانے اس کے جی میں کیا سمائی کہ اُس نے وہی نوٹ واپس جیب میں رکھنے کی بجائے بھکاری کی کپکپاتی ہتھیلی پر رکھ دیا ۔

بھکاری اس کی طرف ممنونیت بھری نظروں سے تکنے لگا ۔ مسکین صورت ، بڑھی ہوئی شیو ، شکستہ چپل اور میلے سے لباس میں وہ پتہ نہیں خود بھی کسی بھکاری سے کم نہیں لگتا تھا ۔ اُس کی پریشان خاطری دیکھ دیکھ کر ماں تو اکثر کُڑھا ہی کرتی تھی مگر بھائی تو اکثر سوچا کرتا تھا کہ بیکار آدمی کی زندگی بھی کس قدر بیکار ہوتی ہے ۔ وہ دنیا کو سوتیلی ماں کہہ کر اس کی سرد مہری اور کھردرے پن کا تذکرہ کرتا اور اسے اکثر مشورہ دیا کرتا کہ جیسے بھی دھندا طے کر لو ۔ دیانت ایک اچھی صفت ضرور سہی مگر غریب کی ایمانداری "عصمتِ بی بی از بے چادری" قرار پا کر بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہے ۔

جس صبح بھائی سے اس کی یہ باتیں ہوئی تھیں اُسی شام کو پارک میں گھومتے ہوئے اُسے بنچ پر پڑا ایک بٹوہ مل گیا ۔ ایک تنومند شخص جیب سے کاغذات نکالتے ہوئے اُسے بنچ پر بھول گیا تھا ۔ اُس نے جلدی سے نوٹوں بھرے بٹوہ کو اٹھایا اور تیز تیز قدموں سے اس شخص کا تعاقب کرنے لگا ۔ وہ آدمی ایک وسیع و عریض کیفے ہاؤس کی بالکنی میں بیٹھا بڑے اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا ۔ "یہ غالباً آپ کا ہے ؟" اُس نے بٹوہ اس کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا ۔

"اوہ مہربانی ۔ !" اس کے چہرے پر حیات افروز چمک مسکراہٹ کے روپ میں نمودار ہوئی ۔ بٹوہ لوٹانے والے لڑکے کی سمت ایک نگاہِ غلط انداز سے دیکھا اور پھر سگریٹ کے طویل کش لینے میں مصروف ہو گیا ۔

اس شخص کی یہ بے نیازی اُسے بڑی انوکھی بلکہ حیران کن لگی ۔ جیسے اُس کے نزدیک ایمانداری کی قدر کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو ۔ وہ جب بٹوے کے مالک کو اس کی امانت لوٹانے آ رہا تھا تو اُسے راستے میں بارہا یہ خیال آیا تھا کہ وہ اس احسان پر مجسّم ممنونیت بن جائے گا اور اس کا بدلہ کسی نہ کسی انعام سے چُکانے کی کوشش ضرور کرے گا ۔ مگر وہ کوئی انعام قطعاً قبول نہیں کرے گا کیونکہ کسی انعام کی لالچ میں تو اُس نے ایسا ہرگز نہیں کیا تھا ۔ ہاں اگر وہ اس کی نوکری کا وسیلہ بن جائے تو دوسری بات ہے ۔

لیکن وہ تو بظاہر اس کی دیانت سے ذرّہ برابر متاثر نہیں لگتا تھا اور سر کی خفیف سی جنبش کے ساتھ "اوہ مہربانی" کہہ کر اپنا فرض پورا بھی کر دیا تھا اور باقی سب کچھ جیسے بھول سا گیا تھا ۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے اُسی بٹوے سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر اُس کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا ۔

"لڑکے یہ تم رکھ لو ۔ !" تنومند شخص کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھوں کے عقب سے ایک ممنونیت بھری مسکان جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی ۔

"نہیں جناب ! شکریہ" وہ نوٹوں کی طرف دیکھے

بغیر مڑا اور جلدی جلدی کیفے ہاؤس کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

روز و شب یونہی اپنے روایتی رُوکھے پھیکے مشینی انداز سے گذرتے رہے اور یونہی کتنے ہی عرصے تک تلاشِ معاش میں متواتر بھٹکتا رہا۔ بالآخر تنگ آکر اُس نے ہیڈ کلرک کی میز پر دھری از کار رفتہ سی ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلانا شروع کر دیں۔ کبھی اس کی لمبی میز پر بکھری فائیلوں کو ترتیب سے رکھ دیتا۔ کبھی حسابات کے ٹوٹل چیک کر دیتا اور کبھی کسی سائل کو درخواست لکھ دیتا۔ یوں اُسے کسی دفتر میں باقاعدہ کام کرنے سے قبل ضروری ٹریننگ بھی ملنے لگی اور وہ بیکاری کے احساس اور اس کے کچوکوں سے کسی حد تک محفوظ بھی ہو گیا۔

ہیڈ کلرک کے ایک کمزور سے سہارے کی بنیاد پر اور مستقبل میں کوئی اسامی ملنے کی اُمید میں وہ ایک زیرِ تربیت اور رضاکار کلرک کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وہ مزاجاً بیوقونی کی حد تک سادہ لوح تھا، شاید اسی لئے نوکری کی ذرا سی آس پر کچھ زیادہ ہی مطمئن بھی ہو گیا اور پُرسکون بھی۔

ایک روز حسبِ معمول ہیڈ کلرک کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا رضاکارانہ خدمت کا منتظر تھا کہ یکایک کمرے میں سرکاری رقوم جمع کرانے والوں کا رش بڑھ گیا۔ ایک گورنمنٹ کنٹریکٹر نے اپنے بریف کیس سے نوٹوں کے دو بڑے بڑے بنڈل نکال کر، چالان کے ساتھ کیشیئر کی سمت بڑھا دیئے؛

"دیکھ لیں جناب! پورے ہیں، بندھے بندھائے ہیں۔"

کیشیئر نے کنٹریکٹر کو واقف کار جان کر اور مزید رش سے بچنے کے لئے پہلے تو چالان پر مہریں ثبت کیں اور حسبِ معمول رقم اٹھا کر اپنے کیش بکس میں رکھنا چاہی، پھر اُسے جانے کیا خیال گذرا کہ دونوں بنڈل رضاکار کلرک کے آگے سرکا دیئے۔

"یار تم ذرا انہیں گن دینا۔"

وہ جیسے اُن کے ہر حکم یا دفتری بیگار کا منتظر رہتا تھا۔ اس نے دس دس اور سو سو کے ان بھاری بھرکم بنڈلوں کو یکے بعد دیگرے گننا شروع کر دیا۔ وہ سر جھکائے بڑے انہماک اور عاجزانہ یکسوئی سے گنتی میں محو رہا۔ نوٹوں کی کڑکڑاہٹ اور ٹھیکیدار کے قہقہوں کی کھنک کمرے میں برابر گونجتی رہی۔ وہ اپنے کسی ہم مشرب سے کسی کاروباری مسئلہ پر گفتگو کے دوران یکایک کھلکھلا اٹھتا تھا۔ اُس کے لہجے کی کھنک اُس کی آسودہ حالی اور فطری مستعدی کی غماز تھی اور شگفتگی اُس کے مطمئن ہونے کا پتہ دیتی تھی۔

نوٹوں کی گنتی ختم ہونے پر رضاکار کلرک کے جیسے اوسان خطا ہو گئے۔ کیشیئر کو مخاطب کر کے وہ پژمردہ لہجے میں بولا۔

"یار اِن بنڈلوں میں تو دو سو روپے کم ہیں!"

یہ سنتے ہی ٹھیکیدار کے چہرے کی شگفتگی ایکدم زرد رنگت میں ڈوب گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے تامل کیا اور اپنے بازو کو لہرا کر ایک زوردار تھپیڑ رضاکار کلرک کے منہ پر جڑ دیا۔ جس سے اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا سا پھیل گیا۔ اور کمرے میں کھڑے لوگ اور فائیلوں سے لدی میز پھرکی کی طرح گھوم گئی۔

ٹھیکیدار نے جیب سے سو سو کے دو نوٹ نکال کر حقارت آمیز رعونت کے ساتھ رضاکار کلرک کی طرف پھینک دیئے۔ تب رضاکار کلرک نے سوجے ہوئے گال کو سہلاتے ہوئے متوحش انداز میں سر اٹھا کر دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں کیفے ہاؤس کی بالکنی سے ابھرتے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے سے لہرانے لگے، جن میں بڑی بڑی مونچھیں خلط ملط ہو رہی تھیں۔

آج تنومند شخص کے چہرے پر حیات افروز مسکراہٹ کی بجائے ایک مصنوعی غیظ آلود کیفیت تھی، جس کے عقب میں خجالت کا دبا دبا احساس بھی کسمسا رہا تھا۔

تقی حسین خسرو

کاغذ کے پُرزے

عارف نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا،

"کوئی خط آیا؟"

ناہید نے جواب دیا،

"نہیں۔ نہیں آیا۔"

مگر ناہید کچھ پھیکی پھیکی سی نظر آنے لگی جیسے اُس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ اس نے عارف کے ہاتھ سے بریف کیس لینا چاہا۔ لیکن عارف نے اس کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا،

"رہنے دو۔ میں رکھ دوں گا۔"

وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے میز پر بریف کیس کو تقریباً پٹخ دیا۔ اور کُرسی پر بیٹھ کر اپنے گرد آلود جوتوں کے فیتے کھولنے لگا۔ لیکن پھر رک کر اپنے لڑکے کو آواز دی۔

"ارے مشتاق کہاں ہو تم؟"

مشتاق پاس ہی تھا۔

"جی بابا!"

لیکن عارف کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے انتہائی سخت لہجے میں پوچھا،

"تم کہاں رہتے ہو؟ کبھی فوراً جواب نہیں دیتے۔"

مشتاق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس اس کے آگے مؤدب کھڑا رہا۔

"بجلی کا بل جمع کر دیا؟" لہجے کی سختی ہنوز برقرار تھی۔

"جی نہیں۔"

"کیوں نہیں کیا؟ نالائق، پاجی۔ نامعقول" وہ اُٹھ کر اس کو ایک آدھ چپت بھی رسید کر دیتا۔

مشتاق نے آہستہ مگر تیزی سے جواب دیا۔

"آپ نے پیسے نہیں دیئے تھے۔ کہا تھا کل جمع کر دینا۔"

تب عارف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لیکن اس کی خفگی کم نہ ہوئی۔

"تم سخت غیر ذمّے دار آدمی ہو۔ وہ لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ جو شخص لاپروائی کی بنا پر بل دیر سے جمع کرتے ہیں۔ اور اس طرح بل کے ساتھ سرچارج بھی ادا کرتے ہیں۔ لیکن ــــــ تم کب سمجھو گے؟" اس نے مشتاق کو گھورتے ہوئے کہا۔

پھر جُھک کر اپنے گرد آلود جوتوں کے فیتے کھولنے لگا۔ لیکن اس بار بھی اس کا کام اُدھورا ہی رہ گیا تھا۔ کیونکہ اس نے رک کر اپنے دوسرے لڑکے کو آواز دی تھی۔

اکبر جھپٹ کر پہنچا تھا۔

"جی بابا!"

"تم آج ٹیوشن پڑھنے کے لئے دیر سے تو نہیں گئے تھے؟"

"نہیں بابا میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا تھا۔"

مگر عارف اپنے لڑکے کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا،

"میں جانتا ہوں تم سخت لاپرواہ ہو۔ اگر لاپرواہ نہ ہوتے تو بیمار کیوں ہوتے؟ اور تمہارا ایک سال ضائع کیوں جاتا؟ ــــــ اگر تم نے اس سال بھی لاپروائی کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

پھر عارف نے اپنی لڑکی کو ڈانٹا۔ اور اپنے سب سے چھوٹے بچے کو جو ابھی بمشکل ڈھائی تین سال کا تھا اور اپنے چھوٹے سے بسکٹ کے پیکٹ کے لئے جو عارف اس کے لئے روز دفتر سے لوٹتے ہوئے لاتا تھا، اس کے پاس پہنچ گیا تھا، جھڑک دیا۔

"دیکھ نہیں رہے ہو ہم نے ابھی اپنے جوتے بھی نہیں اتارے۔"

چھوٹا بچہ بسورتا ہوا اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے اپنی امّی کے پاس چلا گیا۔

ناہید سے رہا نہ گیا۔ آخر وہ دو مہینے سے یہ سب کچھ برداشت کرتی آئی تھی۔ عارف گھر پہنچتے ہی

پوچھنا "خط آیا" اور جب ناہید نفی میں جواب دیتی تو اس کا موڈ بگڑ جاتا۔ اور وہ باری باری بچوں کو ڈانٹتا ناہید سے جھگڑا کرتا۔ گویا اس کے نام خط کے نہ آنے کی وجہ اس کے بیوی اور بچے تھے۔ شروع شروع میں ناہید اس کے مزاج کی بدمزگی کی وجہ سمجھ نہیں پائی تھی۔۔ اور جب وہ سمجھ گئی تو سوچنے لگی۔ کوئی خط کیوں آ بھی نہیں چکتا کہ اس روز روز کی بدمزگی سے نجات ملے؛ مگر خط کے لئے عارف کی اس حد تک بے چینی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اب وہ اور عارف عمر کی جس منزل میں پہنچ چکے تھے وہاں کسی ایسے خط کے امکان کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ جس کو "چند حسینوں کے خطوط" میں شمار کیا جا سکے۔ پھر وہ عارف کے مزاج سے بھی تو واقف تھی۔ عارف کو کوئی ایسی ویسی لڑکی خط لکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ کسی قدر مشکل شخصیت کا مالک تھا۔ چنانچہ زندگی کے بارے میں اس کے رویّے بھی مشکل تھے۔ وہ لباس کی تراش خراش، بالوں کی سٹنگ اور چہرے کی آرائش پر زور دینے والی لڑکیوں کی جانب بھول کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ چنانچہ خود ناہید کے ساتھ بھی اس نے یہی کچھ کیا تھا۔ ناہید بھی سب ہی لڑکیوں کی طرح اپنے لباس کی تراش خراش کا، بالوں کے سنگھار کا اور چہرے کی آرائش کا خاص طور پر خیال رکھتی تھی کہ اس کے خیال میں یہی کچھ مرد کے راضی رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ اس نے اپنی بہنوں کو، عزیز رشتے دار خواتین کو ہم محلہ عورتوں اور سہیلیوں کو یہی کچھ کرتے دیکھا تھا۔ اور یہی کچھ ہماری فلموں، ڈراموں اور ناولوں میں پیش کیا جاتا ہے کہ فلم کی یا ڈرامے کی ہیروئین نہ صرف خوبصورت ہوتی ہے۔ بلکہ بہترین لباس زیب تن کئے

ہوتی ہے اور چہرہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی آرائش کا منت کش ہوتا ہے۔ اور سر کے بال تو جیسے بکھرنا جانتے ہی نہ ہوں۔ ناہید نے لاشعوری طور ان باتوں کا اثر قبول کیا تھا اور جب وہ عارف کی بیوی بنی تو اس نے بھی ان باتوں پر عمل کرنے کو عارف کے راضی رکھنے کے لئے ضروری سمجھا تھا۔ لیکن اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ عارف کا مزاج عام لوگوں سے کتنا مختلف تھا! وہ جب دفتر سے لوٹتا تو ناہید اپنے بہترین لباس میں صد آرائش کے ساتھ اس کی منتظر ہوتی۔ لیکن وہ محسوس کرتی کہ عارف نہ تو اس کے لباس کی تعریف کرتا اور نہ اس کی آرائش کو تحسین کی نظروں سے دیکھتا۔ الٹا وہ اس سے سرد مہری سے پیش آتا۔ اس سرد مہری کا اندازہ بھی ناہید کو اس وقت ہوا تھا۔ جب وہ رفتہ رفتہ اپنے لباس اور اپنی آرائش سے لاپرواہ ہوتی گئی تھی۔ پھر تو وہ بھول ہی گئی تھی کہ اس کو عارف کے راضی رکھنے کے لئے اپنی آرائش اور اپنے لباس کا کسی حد تک تو ضرور خیال رکھنا ہی چاہئیے کہ عورت کے معاملے میں یہ ہر مرد کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اور پھر وہ اس وقت حیران ہوئی تھی جب اس نے اپنے لئے عارف کے رویّے میں بے پناہ گرمجوشی محسوس کی تھی۔ ایسی گرمجوشی جس سے وہ اس سے پہلے واقف نہیں تھی۔ تب اس نے محسوس کیا تھا کہ عارف دراصل قلعی یا ملمع کا قائل نہیں تھا۔ یوں بھی اسٹین لیس اسٹیل (STAIN LEES STEEL) کی ایجاد کے بعد تانبے کے ان برتنوں کا دور ختم ہو گیا تھا۔ جن کو ہر دوسرے مہینے قلعی کروانا پڑتا تھا۔ ورنہ وہ اپنی اصلیت پر اتر آتے ــــ عارف کو ناہید کے دن بھر کے کام سے

میلے ہوتے کپڑے، اس کے کسی قدر بکھرے بکھرے بال اور قدرتی چہرہ پسند تھا۔ وہ ناہید کو اس حالت میں دیکھ کر کھل اٹھتا، وہ کہتا "ناہید تم مجھے وہ عورت لگ رہی ہو۔ جس کو میں نے ہمیشہ ہی عظیم انسانوں کی پُشت پر ایستادہ دیکھا ہے۔ کبھی ماں کے روپ میں کبھی بیوی کے روپ میں، کبھی بیٹی اور بہن کے روپ میں! عورت کا یہ روپ کتنا خوبصورت ہے ناہید! کاش میں عظیم انسان ہوتا! لیکن ــــ ہمارا بیٹا تو عظیم ہو سکتا ہے۔ عظیم انسان! ہمارا ہونے والا بیٹا!" ناہید اس وقت شرما جاتی۔ چنانچہ عارف کے مزاج کے اس پہلو سے واقفیت کے بعد اس کو اس کا یقین تھا کہ عارف کو کوئی لڑکی کبھی خط لکھ ہی نہیں سکتی کیونکہ خط تو وہی لڑکیاں لکھتی ہیں۔ جن کا حسن لباس، آرائش اور بالوں کے سنگھار کا منت کش ہوتا ہے۔ اور وہ لڑکیاں جو اس سے بے نیاز ہوتی ہیں انہیں خط لکھنے کی فرصت کبھی نہیں مل سکتی۔ چنانچہ اس سلسلے میں اس کو کوئی فکر نہیں ہونی چاہئیے تھی اور نہ تھی۔ ویسے بھی ان کی شادی کو پندرہ، سولہ برس گزر چکے تھے۔ اور وہ دونوں چھ بچوں کے ماں باپ تھے۔ بڑا لڑکا میٹرک میں پہنچ چکا تھا۔ دوسرا سخت بیمار ہو جانے کی وجہ سے پچھلے سال امتحان نہ دے سکا تھا۔ باقی بچے بھی سوائے سب سے چھوٹے کے اسکول جاتے تھے۔ بہر حال وہ اور عارف عمر کی اس منزل سے عرصہ ہوا گزر چکے تھے جہاں ذہن و دل پر جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ لیکن پھر عارف کو خط کا اتنا زیادہ انتظار کیوں رہتا تھا؟ اور آج تو عارف نے انتہا ہی کر دی تھی۔ اس نے منّے کو بھی جھڑک دیا تھا۔ ناہید سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھ

بسورتے ہوئے منے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بولی۔

"اب بس بھی کیجئے۔ آپ نے تو انتہا کر دی۔ خط آخر کاغذ کا پرزہ ہی تو ہوتا ہے۔ مگر اس کے لئے آپ نے معصوم کا دل توڑ دیا!"

خط ـــ کاغذ کا پرزہ! ـــ عارف کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اور پھر اس نے ایک عجیب شرمندگی بھی محسوس کی۔ کیا وہ محض خط کے لئے اپنے گھر والوں کو پریشان کر رہا تھا؟ کیا خط محض ایک کاغذ کا پرزہ ہوتا ہے! کاغذ کے پرزے! اس کو بات پھر بہت دور جاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا ناہید منے کو سینے سے لگائے کمرے سے چلی گئی

کاغذ کے پرزے ـــ! اس کو لگا کاغذ کے پرزوں نے تو ہمیشہ ہی اس کا پیچھا کیا تھا۔ اور اب اس کے گھر آ پہنچے تھے۔ اب اس کو اپنی اس اکتاہٹ کی وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی۔ کاغذ کے پرزے ـــ! اکتاہٹ جو ایک وقت کراہیت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کاغذ کے پرزے ـــ! ایک لمحے کے لئے اس کو لگا۔ جیسے اس کی اس اکتاہٹ نے ایک بار پھر اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

عارف پیشے کے اعتبار سے جرنلسٹ تھا لیکن نوکری یا سروس عارف کے لئے محض روزگار کے حصول کا ذریعہ نہ تھی۔ ایسا ہوتا تو وہ بنک منیجری یا آفیسری کبھی نہ چھوڑتا۔ اس نے بنک منیجری بھی کی تھی اور آفیسری بھی اور ان دونوں میں نام بھی پیدا کیا تھا لیکن وہ بہت جلد اُن نوکریوں سے اکتا بھی گیا تھا۔ اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ اب جب کہ اس کو اپنی اس اکتاہٹ کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ اپنے اس وقت کے رویے کا تجزیہ نسبتاً بہتر کر سکتا تھا۔ وہ کاغذ کے پرزے ہی تھے جو اس میں ایک عجیب اکتاہٹ کو جنم دیتے۔ صبح سے شام تک دفتر کی فائلیں اس کے گرد گردش کرتی رہتیں۔ بے چہرہ فائلیں جن کے پیٹ بے جان کاغذ کے پرزوں سے بھرتے چلے جاتے کاغذ کے پرزے جو اپنی یکسانیت میں روز و شب کے اس سلسلے سے زیادہ گراں بار تھے۔ جس کے بوجھ تلے انسان صدیوں سے کراہتا آیا ہے۔ وہی چمکدار صبح! وہی ملگجی شام! وہی درجن دو درجن الفاظ جن کو جملوں کی ساخت بدل بدل کر نیلی، کالی، سرخ اور سبز روشنائی سے لکھا جاتا۔ گویا ہر لکھنے والے نے روشنائی کے رنگ کی تبدیلی سے اس ہر لحظہ بڑھتی ہوئی یکسانیت کو توڑنے کی اپنی بساط بھر کوشش کی ہو۔ یکسانیت جو اس میں اکتاہٹ کو جنم دیتی تھی! اس نے بھی روشنائی کے رنگ بدل بدل کر لکھا تھا۔ کچھ دنوں تک کاغذ کے پرزوں کی سطح پر ابھرے ہوئے حروف ان لوگوں کی طرح اُجلے اُجلے اور نئے نئے لگتے جنہیں ان کے کثرتِ استعمال سے میلے کپڑے اتار کر صاف دُھلے ہوئے کپڑے پہنا دیئے گئے ہوں۔ وہ کچھ دنوں تک روشنائی کے سحر میں مبتلا رہتا۔ لیکن پھر کپڑے میلے ہونے لگتے اور روشنائی کا سحر رفتہ رفتہ ٹوٹنے لگتا۔ اور پھر وہی کاغذ کے پرزے! وہی اکتاہٹ وہی درجن دو درجن الفاظ جن کو جملوں کی ساخت بدل بدل کر لکھا جاتا۔ وہ جب روشنائی کے تمام رنگ استعمال کر چکا تو پھر اس میں کرائسس پیدا ہوا تھا۔ اب اکتاہٹ میں کراہیت بھی شامل ہو چکی تھی۔ اب وہ ان کاغذ کے پرزوں کو چھوتے ہوئے بھی کراہیت محسوس کرتا۔ آخر ایک دن شام کو اس نے دفتر سے باہر نکلنے سے پہلے باتھ روم میں جا کر واش بیسن میں خوب اچھی طرح ہاتھ دھوئے۔ وہ اپنی اس اکتاہٹ، اپنی اس کراہیت کو اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اور منہ بھر بھر کے کلیاں کیں۔ کنکھار کنکھار کے تھوکا۔ پھر جب وہ دفتر کی سیڑھیاں اتر کر صدر دروازے سے باہر نکل گیا تو کتنا مختلف آدمی تھا!

بنک کی نوکری اس کو خوشگوار معلوم ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یقیناً یہ تھی کہ وہاں وہ کاغذ کے پرزے نہیں تھے۔ اور نہ وہ بے چہرہ فائلیں ہی تھیں جن کے خالی پیٹ بے جان کاغذ کے پرزوں سے بھرے جاتے اور نہ وہ درجن دو درجن الفاظ تھے۔ جن کو جملوں کی ساخت بدل بدل کر لکھا جاتا۔ اس نے ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کی تھی۔ پھر اس کی عزت بھی تھی۔ وہ ایک برانچ منیجر تھا۔ اس کو لوگوں کی مدد کر کے خوشی ہوتی۔ اس کو کچھ اختیارات حاصل تھے۔ اور وہ اپنے اختیارات کے حدود میں رہتے ہوئے لوگوں کی مدد کے لئے ہمیشہ تیار رہتا۔ کوئی چھوٹے قرضوں کی اسکیم کے تحت قرض حاصل کرنے کے لئے چلا آ رہا ہے تو کسی کو اوور ڈرافٹ چاہیے۔ کسی کو فوراً بنک ڈرافٹ بنوانا ہوتا تو کسی کو باہر سے آئی ہوئی رقم نکالنی ہوتی۔ وہ سب کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ اس کو اپنا کام پسند تھا۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ اُس کو اُن کاغذ کے پرزوں سے نجات مل گئی تھی۔ کاغذ کے پرزے جو اس میں اکتاہٹ کو جنم دیتے تھے یہاں بنک میں یا تو بڑے بڑے رجسٹر تھے یا چیک بکس

اور قرض کی درخواستیں جو مقررہ فارموں میں ہوتیں۔ بنک میں اکاؤنٹ رکھنے والے لوگ اس کی عزت کرتے اور کبھی اس کے لئے تحفے بھی لاتے۔ اور اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس کو ان تحفوں کے قبول کرنے پر مجبور کر دیتے۔ وہ سوچتا یہ لوگ ان لوگوں سے کتنے مختلف تھے۔ جن سے اس کو دفتر میں سابقہ پڑتا تھا! اور یہ اختلاف کتنا خوشگوار تھا! لیکن ایک دن ایک ایسے ہی موقع پر اس نے نہیں معلوم کیسے محسوس کیا کہ اس کو تحفے دینے والے تو وہ لوگ تھے جن کو اکثر اس سے کام پڑتا رہتا تھا۔ حالانکہ بنک کا کام کچھ اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ اس کے نکالنے کے لئے تحفے دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن انسان کی فطرت کو کیا کریں کہ وہ اپنے ساتھ خصوصی سلوک چاہتا ہے اور اس کے حصول کے لئے بہت کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ مگر وہ تو یہ کوشش کرتا تھا کہ ہر ایک کے ساتھ خصوصی توجہ سے پیش آئے۔ لیکن اس کو تحفے دینے والے تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ یہ سب کچھ ان کے تحفوں کی برکت ہے۔ تحفوں کی برکت؟ اس کو ایک عجیب ذلت محسوس ہوتی تھی! پھر جیسے اس کی اپنے کام سے دلچسپی دفعتاً ختم ہو گئی تھی۔ سارے ماحول میں اس کو ایک عجیب پستی کا احساس ہوا تھا! اس کو اپنی کرسی، میز اور میز پر رکھی ہوئی ہر شے پست معلوم ہوتی تھی۔ ایسی ہی پست جیسے زمین کے اندر دھنستی جا رہی ہو۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا تھا۔ لیکن پھر وہی اکتاہٹ اس کا پیچھا کرنے لگی تھی۔ وہی بڑے بڑے وزنی رجسٹر، وہی چیک بکس، وہی کاؤنٹرز وہی فارموں کے بنڈل ___ وہی گن مین اور اس کی وردی وہی وزنی بندوق جس کو وہ اپنے کندھے کے ساتھ لٹکائے تمام وقت ٹہلتا رہتا۔ اور جب تھک جاتا تو اسٹول پر بیٹھ کر سستانے لگتا۔ اور پھر چونک کر کھڑا ہو جاتا اور جمائیاں لیتا کندھے سے وزنی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی لگائے دوبارہ ٹہلنے لگتا۔ یہ سب کچھ کسی قدر تھکا دینے والا تھا! اور وہ نوٹوں کے بنڈل جن میں نئے نوٹ کم ہی آتے اور پرانے، میلے اور گندے نوٹ زیادہ۔ بنک کے کلرک ان نوٹوں کو گن گن کر لوگوں کو دیتے جاتے۔ اس طرح ان میلے اور گندے نوٹوں پر کچھ اور دھبوں کا اضافہ ہو جاتا۔ اور اس دن تو اس کی اکتاہٹ جیسے اچانک ہی کراہت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ دو کلرکوں نے چھٹی کر لی تھی۔ بنک منیجر کی حیثیت سے اس کو کام چلانا تھا۔ اس نے دن بھر نوٹ گنے تھے۔ میلے میلے گندے نوٹ جن کے کنارے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ پان کی پیک، اور نہیں معلوم کن کن چیزوں کے دھبے تھے ان پر! اور پھر اپنی یکسانیت میں کاغذ کے پرزوں ہی کی طرح اکتا دینے والے ان سے کہیں زیادہ میلے اور گندے۔ اس کی کراہت بڑھتی ہی گئی تھی۔ مگر منیجر کی حیثیت سے اس کو اپنی ذمے داری کا احساس تھا۔ اس نے خود کو قابو میں رکھا تھا۔ جب بنک کا وقت ختم ہوا تو وہ جھپٹ کر باتھ روم میں جا گھسا تھا۔ وہاں اس نے خوب اچھی طرح ہاتھ دھوئے تھے۔ منہ بھر بھر کے کلیاں کی تھیں۔ کھنکار کھنکار کے تھوکا تھا۔ اور جب وہ بنک سے باہر نکل گیا تو ایک بار پھر وہ ایک مختلف آدمی تھا۔

اور اب وہ ایک جرنلسٹ تھا۔ ایک مشہور اخبار سے متعلق تھا۔ وہ اس اخبار میں ہفتہ وار کالم بھی لکھتا تھا۔ اس کو اپنا یہ کام اپنے مزاج سے مطابقت رکھنے والا محسوس ہوا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اس نے بہت جلد اس پیشے میں بھی نام پیدا کر لیا تھا۔ جبکہ لوگوں کو قلم گھِستے مدتیں گزر گئی تھیں اور اس مدت نے نہ صرف ان کی آنکھوں سے بینائی کم کر دی تھی، ان کی کمر میں بھی خم پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اُن بے چاروں کا قلمی سفر جہاں سے شروع ہوا تھا۔ وہاں سے بہت کم آگے بڑھا تھا۔ اس کے ساتھ معاملہ اور تھا۔ اس کا قلم کاغذ پر صرف چلتا نہ تھا۔ وہ تو کبھی ہیک رفتار موٹر پر سوار شہر کی شاہراہوں پر دوڑتا پھرتا اور کبھی سپرسانک جیٹ پر سوار چشم زدن میں ہزاروں میل کا سفر طے کر جاتا تو کبھی راکٹ کے دوش پر سوار چاند پر جا پہنچتا تو کبھی مریخ اور زہرہ کی سطح پر۔ اس کے کالم میں موجودہ دور کے مسائل پر بہت دلچسپ گفتگو ہوتی جن کو اخبار پڑھنے والے بہت پسند کرتے۔ وہ اخبار کے دفتر میں مسلسل مصروف رہنے کے باوجود کوئی تھکن نہ محسوس کرتا۔ خبریں مسلسل آ رہی ہوتیں۔ تازہ تازہ خبریں جنہیں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر چیک کرتا جاتا۔ اور یہ دیکھتا کہ خبریں اپنی اہمیت کے اعتبار سے، اپنے علاقائی اور غیر علاقائی پس منظر کے اعتبار سے صحیح صفحے اور صحیح کالم میں لگائی جا رہی ہیں۔ اخبار کی انتظامیہ اس کی کارکردگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی۔ ہفتے میں دو دن اس کو ایڈیٹوریل بھی لکھنا ہوتا۔ چنانچہ وہ مسلسل مصروف رہتا۔ اس کو اپنے کالم کے لئے ضروری مواد بھی جمع کرنا ہوتا۔

اپریل ۱۹۷۹ء

جس کے لئے وہ رات کو دیر تک مطالعہ کرتا۔ اور
شام کو دفتر سے اٹھ کر شہر کی سب سے معروف سڑک
سے گزرتا۔ ان سب سے وہ یقیناً تھک جاتا لیکن
اس تھکن میں وہ بے زاری اور اکتاہٹ نہیں تھی۔
جس سے وہ بنک اور دفتر میں دوچار رہا تھا۔ اس کی
وجہ شاید یہی تھی کہ اس کو کاغذ کے پرزوں سے
نجات مل گئی تھی۔ کاغذ کے پرزے جو اس میں اکتاہٹ
اور کراہیت کو جنم دیتے۔ حالانکہ اخبار کا کام بہت
تھکا دینے والا تھا۔ کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ اس کو چائے
پینے کی فرصت تک نہیں ملتی۔ کاتب جو اس کے سر
پر سوار رہتا۔ مگر وہ ہادی صاحب کی عزت بھی تو
کرتا تھا۔ ہادی صاحب نہیں معلوم کیوں اس کو ایک
معزز آدمی لگتے۔ ایک ایسے معزز آدمی جنہوں نے اپنی
زندگی کے راستے کا تعین کر لیا تھا۔ اور پھر بڑے اعتماد
سے اس پر چل پڑے تھے۔ اور آج بھی جبکہ ان کو اس
راستے پر چلتے ہوتے چالیس برس گزر چکے تھے۔
ان کے چہرے پر نہ تو تھکن کے آثار تھے اور نہ
پشیمانی کے کہ میں نے اپنا تمام وقت ضائع کیا۔
کوئی اور پیشہ اختیار کیا ہوتا تو آج اپنی بھی جائیداد
ہوتی اور بڑھاپے میں بیٹھ کر کھاتے۔" ان کا چوڑا
ماتھا لیے لیے کھچڑی بال جو اکثر الجھے الجھے رہتے۔ دھنسے
ہوئے گال، پتلی اونچی ناک جس پر ان کی باریک فریم
والی عینک ایسے ٹکی ہوتی جیسے اپنا تمام بوجھ خود ہی
اٹھائے ہوئے ہو۔ بظاہر تھکی ہوئی۔ مگر ایسی آنکھیں جن
سے ارادے کی پختگی کا اظہار ہوتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی
دیر سے جیب سے بٹوہ نکال کر پان یا چھالیہ کھاتے
جاتے۔ ایسے کردار اس کو بنک یا دفتر کے کاروباری
ماحول میں کہاں مل سکتے تھے۔ وقت کی بھٹی میں
پکے ہوئے کردار! بھٹی میں پکے ہوئے لوہے
ہی کی طرح سخت اور اپنا لوہا منوانے والے۔ ہادی صاحب
اس کو بھی اپنی ہی طرح سمجھتے تھے۔ وہاں سے کہتا
"ہادی صاحب آپ نے مجھے مشین سمجھ رکھا
ہے۔ خدا کے لئے رحم کیجئے اور پہلے مجھے ایک پیالی
چائے تو پی لینے دیجئے۔"

مگر ہادی صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ وہ
اپنی باریک فریم والی عینک کے دبیز شیشوں میں
سے اس کو مسکرا کر دیکھتے اور اپنے مخصوص لہجے
میں جواب دیتے۔

"چائے تو آپ پی ہی لیں۔ مگر ذرا ایسے پڑھ لیں
غلطیاں جو لگائی ہیں"۔

اس کا اپنا لکھا ہوا اداریہ یا کالم ہوتا جس کی
پروف ریڈنگ بھی وہ خود ہی کرتا تھا۔

پھر چائے کے گھونٹوں کے درمیان اس کو پڑھنا
ہی پڑتا۔ مگر یہ سب کچھ اس کے مزاج سے کس قدر
مطابقت رکھتا تھا اور وہ خطوط جو کالم پڑھنے والے
اس کو اپنی زندگی کا انعام معلوم ہوتے۔ اور وہ ان
خطوط کو بہت دلچسپی سے پڑھتا۔ اس طرح اس
کی زندگی اب ایک ایسے راستے پر گامزن تھی جس کا
گرد و پیش اس کیلئے دلچسپ تھا۔ اور یہی دلچسپی اس
کے تھکے ہوئے قدموں کو وہ طاقت عطا کرتی جو
زندگی کے راستے پر چلنے کے لئے آگے بڑھنے کے لئے
ناگزیر ہوتی ہے۔

لیکن اس نے کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا کہ
خط بھی تو کاغذ کے پرزے ہی ہوتے ہیں۔ در اصل
وہ خود بھی آج سے پہلے کاغذ کے پرزوں کے بارے
میں ماضی میں اپنے ردِ عمل سے شاید شعوری طور پر واقف
نہیں تھا۔ اور ویسے بھی خطوط نے اس کی زندگی میں
کبھی وہ اہمیت حاصل نہیں کی تھی جو زندگی کے کسی موڑ
پر اس کے لئے کوئی کرائسس پیدا کر سکے۔ لیکن
—— پھر اس کو وہ خط ملا تھا۔

وہ خط اس کے گھر کے پتے پر آیا تھا۔ اس نے
میز پر پڑے ہوئے اس خط کو دیکھ کر سوچا تھا،
شاید اس کے دوست نصیر کا خط ہے۔ لیکن لفافہ
غیر ملکی نہ تھا۔ نصیر اس کا لنگوٹیا یار تھا۔ جو پچھلے تین
برسوں سے کینیڈا میں تھا اور وہاں سے اس کی
پرواہ کئے بغیر کہ وہ اس کے خطوں کا جواب شائد
ہی دیتا تھا، مہینے دو مہینے میں اس کو ایک آدھ خط
ضرور لکھتا تھا۔ مگر یہ خط تو یہیں اس کے ملک سے
پوسٹ کیا گیا تھا۔ اس کے لئے وہ ہینڈ رائٹنگ
بھی نئی تھی۔ جس میں لفافے کی پیشانی پر اس کا نام
لکھا ہوا تھا۔ جب اس نے لفافے کو چاک کر کے
اس میں سے خط نکال کر پڑھا تو اس کو ایک عجیب
خوشی محسوس ہوئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس سے پہلے
اس کے پڑھنے والوں نے اس کو خط نہ لکھے تھے۔
خط تو بہت آتے تھے۔ لیکن سب اخبار کی معرفت
جن پر اکثر اس کا نام بھی نہ ہوتا۔ یہ پہلا خط تھا۔ جو
اخبار کی معرفت نہیں آیا تھا۔ کسی پڑھنے والے کو نہیں معلوم کیسے
اس کے گھر کا پتہ حاصل کیا تھا! لفافے پر معرفت
..... اخبار، نہیں لکھا تھا۔ صرف اس کا نام لکھا تھا
کتنا فرق پڑ گیا تھا۔ اس سے! اس کو لگتا تھا جیسے
وہ وسیع و بے کراں سمندر کا حصہ نہ ہو! بارش کے

پانی کی وہ ننھی سی بوند ہو جو کسی پیڑ کے پتے پر رُک گئی تھی۔ اور پھر اپنے اندر تمام کائنات کو منعکس کر رہی تھی۔ گویا وہ خط اس کے ہونے کا اعلان تھا۔ کروڑوں انسانوں کے بیچ اس کے ہونے کا اعلان!

پھر تو وہ اپنے نام آئے ہوئے خطوں کا ضرور جواب دیتا۔ اور اپنے خط کی پیشانی پر گھر کا پتہ لکھ دیتا۔ اس طرح اس کے اکثر خط اب اس کے گھر کے پتے پر آنے لگے تھے۔ اور وہ ان خطوں کو بار بار پڑھتا اور پھر اُن کو ایک اٹیچی میں ایسے محفوظ کر لیتا جیسے لوگ روپے پیسے، انعامی بانڈز یا ڈیفنس سرٹیفکیٹ وغیرہ محفوظ کر لیتے ہیں۔

لیکن پھر اس کے پڑھنے والوں نے جیسے اس کو فراموش کر دیا تھا۔ پچھلے دو تین مہینوں سے اس کے نام کوئی خط نہیں آیا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ خالی میز دیکھ کر چپ ہو رہتا۔ آخر اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اب وہ گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھتا، "کوئی خط آیا؟" اور جب ناہید نفی میں جواب دیتی تو وہ غیر ارادی طور پر جھنجلا جاتا۔ بچوں کو ڈانٹتا ناہید سے جھگڑا کرتا۔ اور آج تو اس نے مُنّے کو بھی جھڑک دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ناہید نے......

عارف نے کرسی میں پہلو بدلا۔ اس کے گرد آلود جوتوں کے فیتے اسی طرح اُدھ کھلے تھے۔ اس کے چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ خط ـــــ کاغذ کا پُرزہ! ایک بار پھر اس کو اکتاہٹ نے گھیر لیا تھا اکتاہٹ جو اس کے مکان کے صحن سے در آئی شام کی طرح ہر لحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن نہیں معلوم یہ کیا شے تھی جو اس کے پہلو میں چبھ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ پہلو بدل کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور اس پر چبھنے والی شے کو باہر نکالا۔ بسکٹ کا پیکٹ! وہ چونکا چھوٹا سا بسکٹ کا پیکٹ جو وہ منے کے لئے لایا تھا اس نے غیر ارادی طور پر مُنّے کو آواز دی۔ مُنّا جو اس دوران میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ دوڑتا ہوا آیا۔ عارف نے ایک نظر منّے کے تازہ تازہ چہرے کو دیکھا۔ اس نے محسوس کیا مُنّے کا ناک نقشہ اس سے کتنا مشابہہ تھا۔ گویا اس کا نام لکھا تھا مُنّے کی پیشانی پر! اس نے مُنّے کی روشن آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ اس کو منّے کی روشن آنکھوں میں اپنی ہی تصویر نظر آئی وہ کھل اٹھا۔ اس نے بے اختیار مُنّے کو گود میں اُٹھا لیا اور ناہید کو آواز دی۔ "ناہید تم بھول گئیں۔ خط تو آیا ہے۔" ناہید جو باورچی خانے میں دوبارہ چائے گرم کر رہی تھی، ساڑھی کے پلّو سے ہاتھ پونچھتی تیزی سے آئی اور پوچھنے لگی۔ "کہاں ہے خط؟ ایں کہاں ہے خط؟" عارف نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے باقی بچوں کو آوازیں دے رہا تھا۔ "مشتاق، اکبر، ثمینہ، فرخندہ، ناصر۔ جب بچے دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گئے تو اس نے ناہید سے کہا۔ "ناہید دیکھو انہیں غور سے دیکھو۔ کیا یہ سب میرے نام آئے ہوئے خط نہیں ؟" ناہید کچھ بھی کچھ نہیں سمجھی۔ عارف اس سے پوچھ رہا تھا، "یہ تو کاغذ کے پُرزے نہیں ہیں۔ کیا تم ان کو بھی کاغذ کے پُرزے کہوگی؟ بولو ناہید کیا یہ بھی کاغذ کے پُرزے ہیں؟" ناہید حیرت سے عارف کو دیکھ رہی تھی۔ اور عارف باری باری اپنے بچوں کے تازہ تازہ چہروں کو ایسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ اُن پر لکھی عبارت کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں سے بے پناہ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ وسیع و عریض سمندر کا حصہ نہ ہو، بارش کے پانی کی وہ ننھی سی بوند ہو جو کسی پیڑ کے پتے پر رُک گئی تھی اور پھر اپنے اندر تمام کائنات کو منعکس کر رہی تھی۔ گویا ان میں سے ہر بچہ اس کے ہونے کا اعلان تھا۔ کروڑوں انسانوں کے بیچ اس کے ہونے کا اعلان! ـــــ مگر اس کے ذہن کے کسی دور اُفتادہ گوشے میں کاغذ کے پُرزے اپنی ایک نئی معنویت کے ساتھ اُبھر رہے تھے۔

"ماہِ نو برابر ملتا رہتا ہے، ممنون ہوں کہ پاکستانی ادب پر یہی ایک کھڑکی کھلی رہ گئی ہے۔ سویرا فنون، سیپ اور نئے پرچے تو یہاں کے دن بھی نظر نہیں آتے۔ اوراق ضرور کبھی کبھی آ جاتا ہے۔ آپ کے یہاں شاعری عام طور پر بہت عمدہ چھپتی ہے اور مصوری پر مضامین اور کتابوں پر اظہارِ خیال دلچسپ ہوتا ہے۔ مگر بعض تنقیدی مضامین بیشتر ریڈیو ٹاک یا اس سے بھی کم تر درجے کے ہوتے ہیں۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ حتیٰ کہ سلیم احمد صاحب کا مضمون (یعنی عسکری صاحب پر ان کی کتاب کا ایک باب) بھی مجھے سرسری معلوم ہوا۔" شمس الرحمٰن فاروقی ـــــ (بھارت) اپریل ۱۹۷۹ء

آشم میرزا

آئینے کا جھوٹ

آئینہ کے سامنے وہ کتنی ہی دیر سے کھڑی تھی اس کی نظریں اپنے ہی سراپا کے آرپار ہو رہی تھیں. ہر نقش ہوشربا دکھائی دے رہا تھا —— ہر زاویہ دیدہ زیب بن گیا تھا۔ اپنی اہمیت کا احساس اس کی روح کی گہرائیوں میں مدہوش کُن نغمے کی تخلیق کر رہا تھا۔ اپنے وہم کو یقین میں بدلنے کی خاطر اس کا جی آئینہ کے سامنے سے ہٹنے کو نہ چاہ رہا تھا، بیگم ریحانہ اشفاق کی آواز دور دھندلکوں میں روشنی کی کرن بن کر اُبھری. اور وہ خود کو سمیٹتے ہوئے جواد کے کمرے سے نکل کر بیگم ریحانہ کے پاس آ گئی .... بیگم ریحانہ نے اس کا بھرپور جائزہ لیا اور معنی خیز تبسّم اس کے ہونٹوں پر اُبھر آیا۔ اس نے ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے کہا.

"شاذی کھانے کی میز پر تمہارا انتظار ہو رہا ہے — میں مسز احسان کے پاس جا رہی ہوں۔ کھانا وہیں کھاؤں گی۔"

اس کا جی چاہا۔ کہ وفورِ مسّرت سے ناچنے لگے۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا. جذبات کی تند لہریں شعور کی سرحدوں کو ڈھانپ رہی تھیں۔ نظریں جھکائے وہ ڈرائینگ روم کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ "تو۔ اس کا یہ مطلب ہوا۔ کہ میری حیثیت اب ایک ملازمہ کی نہیں رہی۔ ایک ہی ہفتہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوں — بیگم صاحبہ کی چاہت ہر روز نیا رنگ اختیار کرتی جا رہی ہے — میں تو ان کی برابری کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔"

جواد کے سامنے کھانوں کی ڈشیں پڑی تھیں اور وہ دروازہ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ شاذی کو دیکھ کر وہ کھِل اٹھا۔ "میں نے کہا تھا کہ کھانا سب ایک ساتھ کھایا کریں گے۔ مگر۔ تم نے اسے مذاق ہی سمجھا ہے؟" اس کے لہجہ میں نسوانیت کا رچاؤ تھا — شاذی اس کے قریب آ کر حیرت اور خوشی کے ملے جلے لہجہ میں بولی "چھوٹے صاحب. میں ایک ملازمہ ہوں — آپ کے برابر کیسے بیٹھ سکتی ہوں" "بھلا — یہ کیا بات ہوئی۔ اُس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔ "ممی کی طرف سے جب اجازت مِل چکی ہے۔ تو پھر...."

شاذی نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کھانا تناول فرمائیں۔ میں خدمت کروں گی —" جواد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ہم اکیلے نہیں کھائیں گے۔ شاذی اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی — "چھوٹے صاحب! میں اپنی حیثیت کو پہچانتی ہوں۔" جواد نے مچلتے ہوئے بازو اس کے شانے پر رکھ دیئے۔ "ہم ناراض ہو جائیں گے۔" "جیسے آپ کی مرضی — ملازم کا کام تو حکم ماننا ہے۔" کھانے سے فارغ ہو کر جواد نے کہا۔ "ہم۔ تمہارے ساتھ فلم دیکھنے جائیں گے۔ ممی دیر سے آئیں گی۔"

شاذی کی آنکھوں میں اپنی آمد کے پہلے دن کی کارروائی ستاروں کی طرح اُبھرنے لگی۔ "میں اس وقت تو یہی سمجھی تھی، کہ جواد کوئی ننھا مُنّا لڑکا ہوگا. کیونکہ اس کی نگہداشت کے لئے ہی تو مجھے ملازم رکھا گیا تھا — اور جب جواد پر پہلی نظر پڑی، تو استعجاب کے دائرے حواس کے گرد اپنا حلقہ تنگ کرنے لگے۔ یقین نہ آتا تھا کہ جواد میں کون سی کمی ہے۔ جس کو دور کرنے کی خاطر مجھے پانچ سو روپے ماہوار پر ملازم رکھا گیا تھا — میں تو اس سے بات کرتے ہوئے جھینپ جاتی تھی۔ کوئی کام بھی میرے سپرد نہ کیا گیا تھا — بیگم صاحبہ کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ میں زیادہ دیر تک جواد کے قریب ہی رہوں۔ اسے اُداس نہ ہونے دوں۔ یہ منطق

تو میری سمجھ سے بعید تھی۔ اور اب تو بات یہاں تک آگئی ہے کہ بغیر میرے وہ اب لقمہ تک نہیں اٹھاتا۔"

جواد نے نخریلے انداز میں حکم دیا۔ "نیا لباس پہن لو۔ وقت کم ہے۔ میک اپ پر زیادہ وقت مت صرف کرنا۔" استعجاب کے دائرے شاذی کی آنکھوں میں اور گہرے ہو گئے۔ اس کے لہجہ میں عجیب سی چاشنی پیدا ہو گئی ہے۔ جیسے تنگ گلی میں گذرتے ہوئے مسحور کن خوشبو کی شریر لہر ایک ہی لمحہ میں زندگی کے ہر گوشہ میں پھیل جائے۔ کیا میری ملازمت کا مقصد یہ تو نہیں کہ... اور ان جانی لذت لگا نباری سے اس کی ذ ن کے خول پر خود بخود سنہری بیل بوٹے بننے لگے تھے۔ لباس تبدیل کرتے ہوئے وہ پھر ماضی کے دھندلکوں میں رنگین تتلیوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ خالہ صوفیہ بیگم ہی نے مجھے اس ملازمت کا مژدہ سنایا تھا۔ بیگم ریحانہ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ انہوں ہی نے اس ملازمت پر اکسایا تھا۔ درمیانے طبقہ کی بیوہ عورت کے نزدیک پانچ سو روپوں کی بڑی وقعت تھی۔ خالہ صوفیہ سے پہلے تو بڑے قریبی تعلقات تھے۔ پھر ان کے شوہر درآمد برآمد کے کاروبار میں اتنا منافع کمانے لگے کہ خالہ ہم سے دور ہونے لگیں۔ کاروبار میں وسعت پیدا ہوئی۔ تو انہوں نے اپنے سے کم تر رشتہ داروں کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ابا جان کی وفات پر بھی وہ تعزیت کے لئے نہ آ سکی تھیں۔ کئی سال گذر گئے۔ ابا جان کی انشورنس کی جو رقم ملی تھی۔ اسی پر گذارا چل رہا تھا

میں نے ایف لے کا امتحان پاس کیا، تو ایک دن اچانک امی سے خالہ صوفیہ کی ملاقات ہو گئی۔ ایک تقریب میں خالہ مہمانِ خصوصی تھیں۔ ایک رفاہی ادارے کا افتتاح ہو رہا تھا۔ خالہ اب بہت بڑی سوشل لیڈر بن چکی تھیں۔ اس اجلاس کے اختتام پر امی سے نہ رہا گیا۔ وہ خود ان کے سامنے آگئی تھیں۔ میں بھی قریب ہی کھڑی تھی۔ خالہ پہلے تو بغور ہمارا مطالعہ کرتی رہیں۔ پھر وہ کھکھلا کر ہنس پڑیں۔ "ارے! نعیمہ یہ تم ہو۔ خدا کی قسم۔ آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔" امی نے میرا تعارف کرایا۔ تو وہ حیران کن لہجہ میں بولیں۔ "اچھا! یہ وہی ننھی شاذیہ ہے جو خود بخود میری گود میں آ جایا کرتی تھی۔" مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اپنی کوٹھی پر آنے کی دعوت دی۔ اس وقت تک مجھے قطعی طور پر خیال نہ گذرا تھا کہ میں واقعی بہت حسین ہوں۔ دو چار ملاقاتوں ہی میں خالہ یوں پیش آتی رہی تھیں۔ جیسے ان سے بڑھ کر اس دنیا میں ہمارا اور کوئی ہمدرد نہ ہو۔ اور پھر جب انہوں نے ملازمت کا مژدہ سنایا۔ تو امی کا رواں رواں جھوم اٹھا تھا۔ مجھے اگرچہ اکلاس ہمدردی نے متاثر نہ کیا تھا۔ مگر امی تو ہر حال میں مجھے بیگم ریحانہ کی کوٹھی میں بھیجنے پر بضد تھیں۔ خالہ کی سفارش تھی۔ اس لئے بیگم ریحانہ بڑے تپاک سے ملیں تھیں۔ ان کا برتاؤ مشفقانہ تھا۔ اور اب۔ وہ ایسا کردار ادا کر رہی ہیں۔ جیسے انہوں نے جواد کے لئے میرا انتخاب کر لیا ہو۔ لیکن۔ ! یہ کیسے ممکن ہے! خالہ صوفیہ سے بھی زیادہ بیگم ریحانہ مالدار ہے۔ شوہر کی وفات کے بعد کاروبار اس کے کنٹرول میں ہے۔ جواد اس معاملہ میں نا اہل ثابت ہوا ہے۔" جواد نے دروازہ کا ایک پٹ زور سے کھول کر کہا۔ "ذرا جلدی کرو۔ فلم انٹرول کے بعد شروع ہوگی۔ وقت بہت کم ہے۔"

نیلے رنگ کے فلیپر اور زرد رنگ کی جرسی میں اس کا حسن تابناک بن گیا تھا۔ جواد تو اسے دیکھ کر ساکت ہو کر رہ گیا تھا... شاذی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ چونک سا پڑا۔ اس رات شاذی کے خوابوں میں خوشبوؤں اور رنگوں کا میلا لگا رہا تھا۔ سب مناظر اس کی توقع کے برعکس سامنے آ رہے تھے.... خالہ صوفیہ جب بھی بیگم ریحانہ سے ملاقات کے لئے آتیں۔ شاذی کی کاردگی کی یوں تعریف کیا کرتیں۔ جیسے اس نے جان جوکھوں میں ڈال کر خالہ کو کسی خفیہ خزانے کے دروازہ تک پہنچا دیا ہو۔ شاذی کے یقین میں پختگی پیدا ہوتی جا رہی تھی کہ ملازمت کا تو صرف بہانہ ہی ہے۔ ورنہ انہوں نے تو یقینا اسے جواد کے لئے منتخب کر لیا ہے... وہ نیاؤ لگن اور محبت کے ساتھ جواد کو زندگی گزارنے کے گر سکھانے لگی تھی پہلے وہ بے حد شرمیلا اور ڈرپوک تھا۔ اور اب وہ خود اعتمادی کے ساتھ قدم اٹھانے لگا تھا... اپنی دونوں ملوں کا چکر بھی لگا لیتا تھا... شاذی اس کا سایہ بن چکی تھی۔ دل فریب۔ مسحور کن سایہ۔

تین ماہ بعد جواد کی بڑی بہن طلعت سسرال سے آگئی۔ شاذی سے مل کر اس نے اسے یوں

سینے سے لگایا تھا۔ جیسے دو بہت ہی پیاری سہیلیاں طویل جدائی کے بعد مل رہی ہوں۔ جواد کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے کر اس نے شاذیہ کے فنکارانہ رویّہ کی بے حد تعریف کی تھی۔ اس کا تین سال کا بیٹا تحسین تو دو ہی دن میں اس سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ گھر کے سب افراد شاذیہ کے اور زیادہ گرویدہ ہو گئے تھے۔ جواد کی سالگرہ کے موقع پر کوٹھی کو دلہن کی مانند سجایا گیا۔ ہال کمرہ میں پلاسٹک کی بیلیں اور پھول چھت کو ڈھانپ رہے تھے۔ ان کے ساتھ رنگین کاغذی فانوس اور غبارے بندھے ہوئے جھوم رہے تھے۔ شاذیہ نے بڑا شوخ لباس پہن رکھا تھا۔ ہر ایک کی نظریں اس کا طواف کر رہی تھیں۔ خالہ صوفیہ کی سج دھج بھی فتنہ پرور تھی۔ بڑے کیک پر روشن موم بتیوں کو پھونکیں مار کر سبھی "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" گانے لگے۔ تالیاں بجنے لگیں۔ شاذیہ اپنے اندر خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے یہ جواد کی سالگرہ کی تقریب نہ ہو۔ بلکہ اس کی سگائی کا اعلان ہوا ہو۔ بہت دیر تک ہنگامہ بپا رہا۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ جواد شاذیہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر جھومتا ہوا باہر لان میں آ گیا۔ جواد نے بید کی کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "میں تو بہت تھک گیا ہوں۔ کچھ کھا بھی نہیں سکا۔ پیاس محسوس ہو رہی ہے۔"

"میں ابھی مٹھائی اور کوک لے آتی ہوں۔" "مجھے یقین ہے تم نے بھی کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ اپنے لئے بھی لیتی آؤ۔"

شاذیہ کوٹھی میں داخل ہوئی۔ ڈرائنگ روم میں خالہ صوفیہ کا قہقہہ اچھلا۔ اور شاذیہ کے قدم رُک گئے۔ بیگم ریحانہ نے مسرورانہ لہجہ میں کہا۔ "صوفیہ۔ ڈارلنگ، میں تمہاری بے حد ممنون ہوں۔ شاذیہ درواذہ پر آ گئی۔ طلعت نے کہا "میں نے ہی ممی کو مجبور کیا تھا۔ جواد بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے اس قابل نہ رہا تھا کہ کاروبار پر توجہ دے سکے شادی کے فرائض نبھا سکے۔" خالہ صوفیہ بولی۔

"میرا انتخاب کیسا رہا۔ میں شاذیہ کی صلاحیتوں کی معترف تھی۔ میرا کام تو اب ختم ہوا۔"

بیگم ریحانہ نے کہا۔ "میں شاذیہ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ انعام کے طور پر پانچ ہزار روپے اسے دیئے جائیں گے۔" طلعت بولی۔ "اب سیٹھ ایاز کی بیٹی کا رشتہ منظور کر لینا چاہیے۔"

شاذیہ کی ٹانگوں میں لرزش پیدا ہوئی۔ اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ تو۔ کیا! میں صرف کھلونا تھی؟! چیخ کو حلق میں دبا کر وہ باہر نکلی اور آنسو رخساروں پر لکیریں بنانے لگے۔ سارے جذبے منجمد ہو گئے تھے۔ "نہیں۔! مجھے انعام کی ضرورت نہیں۔" اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے چاروں طرف سے پتھر برسنے لگے ہوں۔ بازوؤں سے سر کو ڈھانپ کر وہ دوسری طرف سے بڑے گیٹ کی طرف بھاگنے لگی۔ جواد ستاروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"چونکہ آپ پرچے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے طباعت کے نگران بھی ہیں۔ اس لئے اُمید ہے کہ آپ ان معروضات پر توجہ کریں گے مجھے اُمید ہے کہ اس طرح پرچے کی ظاہری شان بھی دوبالا ہوگی (باطنی شان تو ماشاء اللہ پہلے ہی دلکش ہے)۔

۱۔ حاشیہ کم ہوتا ہے، جس سے اکثر دفعہ کٹائی میں سطریں اُڑ جاتی ہیں۔ حاشیہ زیادہ ہونا چاہیئے۔

۲۔ مختلف پرچوں کی تقطیع (سائز) مختلف ہوتی ہے چنانچہ جلد بندی کے وقت کٹائی میں وہی دقت ہوتی ہے جو اُوپر بیان کی گئی ہے۔

۳۔ کتابت کی غلطیاں کافی ہوتی ہیں۔ تصحیح (پروف ریڈنگ) ذمہ داری کے ساتھ نہیں کی جاتی (جس کے لئے آپ کو وضاحتیں بھی کرنی پڑتی ہیں)۔

۴۔ شاعری کے لئے جلی قلم استعمال کیا جائے تو زیادہ بہتر ہو۔"

علیم بھٹی ——— اٹک شہر

کمال مصطفیٰ

بیل، پھول اور پتے

شام تھی، اینٹوں کے پکّے صحن کی اونچی، سفید پُتی ہوئی دیوار کی اوپری کناری سُرخی میں ڈوبی ہوئی تھی — ہلکی سی خنکی ہوچلی تھی مگر صحن کے ایک کونے میں اینٹوں اور مٹی اور بھوسے سے بنا ہوا چولہا ٹھنڈا تھا۔ ادھ جلی لکڑیاں راکھ میں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔

باہر کھٹکا ہوا — کسی نے دروازہ کھولا — تیز قدموں کی چاپ سنائی دی — نانی اماں اور چھوٹی خالہ دوباری میں سے صحن میں داخل ہوئیں اور امی جان سے لپٹ گئیں۔

کیسی طبیعت ہے بیٹے کی؟ نانی اماں نے کہا — مگر امی کچھ نہ بولیں، ان کے ماتھے پر فکر کی شکنیں تھیں۔

مجھے اطلاع مل گئی تھی اور میں فوراً ہی چل پڑی، نانی اماں نے کہا — یہ کہہ کر نانی اماں نے اپنا سفید برقعہ اُتار کر صحن میں بچھے پلنگ پر پھینک دیا اور چھوٹی خالہ کے ساتھ کمرے کے اندر چلی گئیں۔ امی بھی تھکے قدموں سے ان کے پیچھے تھیں۔

اندر سے دھیمے لہجے میں باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔

بہت دیر بعد نانی اماں اور چھوٹی خالہ کمرے سے باہر آئیں — امی بھی تھکے قدموں سے ان کے پیچھے تھیں۔

چھوٹی خالہ نے کہا، کامی راکھ سے کیوں کھیل رہے ہو؟

اور نانی اماں نے کہا ارے ہے! دیکھو تو سہی اس نے سارے ہاتھ کالے کر لئے — اِدھر آ — پیار تو کروا لے — آ بھی جا۔

چھدرے دانت اور سُرخ زبان، جھری دار منہ اور ہونٹ قریب آئے۔ پان کی بُو اور چٹاخ کی آواز آئی — اور امی نے مڑی، بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھا۔

اور چھوٹی خالہ پلنگ پر بیٹھ گئیں — کامی تم راکھ سے کیوں کھیل رہے ہو؟ آؤ میں تمہارے ہاتھ دھلا دوں۔

اور چھوٹی خالہ نے کہا، کامی شور نہ کرو۔ تمہارا بھائی بیمار ہے۔ مگر فکر نہ کرو وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر تم اس سے کھیلا کرنا۔ ٹھیک ہے نا؟ اچھا وعدہ کرو کہ اب تم اس سے لڑو گے نہیں۔

امی جان پھر کمرے سے باہر آگئیں، چھوٹی خالہ نے ان کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ نہ بولیں، ان کے ماتھے پر شکنیں تھیں اور ان کی تھکی پھٹی آنکھیں جیسے دور خلا میں کھو گئی ہوں۔ دروازے پر دستک ہوئی اور امی جان دروازے کی طرف لپکیں!

نانی اماں نے کہا، کیا ڈاکٹر آیا ہے؟

چھوٹی خالہ نے کہا، کامی! کدھر جا رہے ہو۔ شام کو بچے باہر نہیں جاتے۔

اور چھوٹی خالہ نے کہا، کامی واپس آجاؤ۔

باہر نیم کے گھنے درخت کے نیچے اندھیرا بھی گھنا تھا — جھینگر بول رہے تھے اور تنہائی تھی۔ نہ کنویں سے کوئی پانی بھر رہا تھا، نہ کوئی بچہ احاطے میں کھیل رہا تھا، نہ ٹلّو کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ البتہ اس کے گھر کے باہر والا بڑا بلب روشن تھا۔ نفیس چچا کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ دروازہ کھلا اور بیگ ہاتھ میں پکڑے ڈاکٹر باہر آیا۔

اچھا یہ آپ کا بڑا بچہ ہے — ماشاءاللہ بہت پیارا ہے — ادھر آؤ — کیا نام ہے تمہارا؟ تم اپنا نام نہیں بتاؤ گے — اچھا اب تم اندر جاؤ۔ اتنی رات گئے اچھے بچے باہر نہیں رہتے۔ شاباش

گھر کا دروازہ بند ہو گیا۔ دروازہ ۔۔۔ دوبارہ نہیں۔

اور چھوٹی خالہ نے کہا، کامی کھانا کھالو، کیوں منہ کیوں بنا رہے ہو؟ کیا بھوک نہیں لگ رہی۔

اور نانی امی نے کہا، اس سے کہو اب سو جائے۔ چھوٹی، تو ذرا اسے اپنے ساتھ سُلالے۔

اور چھوٹی خالہ نے کہا، کامی، تم میرے ساتھ سوؤ گے نا! میں تمہیں مزے دار کہانیاں سناؤں گی۔۔ اور پھر گھر میں رات ہو گئی اور چھوٹی خالہ کی آواز سرگوشی میں بدل کر خاموش ہو گئی، کہیں دور سے مدھم آوازیں آتی رہیں۔۔ کراہنے کی آواز اور نسوانی آوازیں۔

پانی، نحیف سی آواز آئی۔

اسے پانی دے، نانی اماں کی آواز آئی۔

پانی، نحیف سی آواز آئی۔

اے ہے، اس سے تو پانی بھی نہیں پیا جا رہا

پانی، نحیف سی آواز آئی۔

پھندا لگ گیا، نانی اماں کی آواز آئی۔

اور پھر سارے جہان میں اندھیرا چھا گیا، اندھیرا اور سناٹا۔

ایک بڑی سی چمگادڑ اوپر منڈلانے لگی، پھر وہ ہوا میں معلق ہو گئی اور آہستہ آہستہ اپنے پروں کو جھپکتی نیچے آنے لگی۔ بڑی ہوتی گئی۔۔۔۔۔

بےحد بڑی، بےحد تاریک اور پھر اس کے پروں نے سارے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور سارے مکان میں، سارے جہان میں اندھیرا چھا گیا، بلکہ جہان و مکان سب تحلیل ہو گئے اور ایک خلا باقی رہ گیا ۔۔ ایسا خلا جس کی کوئی حد نہیں، جس میں گرنے کو جی چاہے اور اگر کوئی گر جائے تو گرتا ہی چلا جائے۔

پھر چڑیاں چہچہانے لگیں اور چھوٹی خالہ نے کہا، کامی اتنے سویرے کیوں اٹھ بیٹھے ۔۔ اور نانی اماں نے کہا، بےچارا اکیلا رہ گیا۔

اور چھوٹی خالہ نے کہا، کامی میری گود میں آجاؤ۔ اور وہ رونے لگیں۔

اور نانی اماں نے کہا، پگلی اسے کیوں تنگ کرتی ہے۔

نانی اماں اندر کمرے میں گئیں اور چادر اٹھا کر دیکھنے لگیں۔

اور نانی اماں نے کہا، اری دیکھ تو سہی، کیا پھول جیسا چہرہ ہے! یوں لگ رہا ہے جیسے سچ مچ مسکرا رہا ہو۔

پر امی کچھ نہ بولیں۔ انہوں نے اپنی خشک پھٹی آنکھوں سے نانی اماں کو دیکھا۔ یا شاید ان کو بھی نہ دیکھا۔

اور نانی اماں نے کہا، فکر نہ کر۔ اللہ اور دے گا۔ بیل چڑھے گی، خوب پھل پھولے گی۔

پر امی کچھ نہ بولیں۔ ان کی آنکھوں میں تو آنسو بھی نہ تھے۔

تھوڑی دیر بعد لوگ آنے لگے، عورتیں اور مرد ۔۔ مگر چولہا ٹھنڈا تھا۔

چھوٹی خالہ نے کہا، کامی تم باہر جا کر کھیلو۔ نیم کا سایہ ابھی دراز تھا اور سنہری کرنیں چھن چھن کر احاطے کی دیواروں پر پڑ رہی تھیں۔

ظلّو کے گھر کا دروازہ بند تھا۔

بواجی نے دروازہ کھولا۔

آؤ بیٹے اندر آ جاؤ، بواجی نے چمکارتے ہوئے کہا۔

ظلّو کمرے میں اپنی اماں کے پاس ہے، بواجی نے کہا۔

وہ ناشتہ کر رہا تھا۔ اور ظلّو کی ماں نے کہا کامی، لو یہ بسکٹ کھالو۔

ظلّو تم کامی کے ساتھ کھیلو اور اس کا دل بہلاؤ۔

اور ظلّو کی اماں نے کہا، دیکھو کامی کتنا ہشیار ہے وہ تم سے عمر میں چھوٹا ہے مگر سکول میں تم سے آگے ہے۔ وہ محنتی ہے اسی لئے تیسری جماعت میں ہے اور تم ابھی دوسری ہی میں ہو ۔۔ تم اپنے دوست سے ہی سبق سیکھو۔

اور ظلّو کی اماں نے کہا، تم اس کو بھی اپنا جیسا ہوشیار بنا دو ۔۔ دو گھڑی اس کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ لیا کرو۔ یہ ہر وقت کھیلتا رہتا ہے اور اس کا دل پڑھنے میں نہیں لگتا۔

اور امی جان نے کہا، تم ظلّو کے ساتھ وقت ضائع نہ کیا کرو ۔۔ وہ تمہیں ہر وقت کھیل میں لگائے رکھتا ہے۔ اس کا کیا ہے ۔۔ اس کا دادا بہت امیر ہے۔

اور ظلّو نے کہا، کامی آؤ کھیلتے ہیں

وکیل تم بھی آجاؤ، ظلّو نے آواز دی

گیند بلا کھیلتے ہیں، ظلّو نے کہا

نہیں میں کامی کے ساتھ گیند بلا نہیں کھیلوں

گا، وکیل نے کہا۔

اور وکیل نے کہا، اب میں اس کے ساتھ کبھی گیند بلا نہیں کھیلوں گا۔

اور وہ رو رہا تھا اور اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

میں ابواجی سے اس کی شکایت لگانے جا رہا ہوں، وکیل نے روتے ہوئے کہا۔

اور ظلّو نے کہا، کامی نے دانستہ تو گیند نہیں ماری

اور وکیل نے کہا، میں اس کی شکایت لگاؤں گا

اور ظلّو نے کہا، کامی اسے سمجھانا فضول ہے۔ یہ تمہاری ضرور شکایت کرے گا۔

ابواجی! کامی نے میری ناک پر اتنی زور سے گیند ماری ہے، وکیل نے روتے ہوئے کہا۔

اور ابواجی نے کہا، کامی اس طرح کے کھیل اچھے نہیں ہوتے ۔۔ یہ بے ماں باپ کا بچہ ہے، اس کا خیال رکھا کرو، اور یہ تم سے چھوٹا بھی ہے۔

اور ظلّو نے کہا، ابواجی، اس نے دانستہ گیند تھوڑا ہی ماری ہے۔ کامی، آئندہ تم اس گدھے کے ساتھ نہ کھیلا کرو ۔۔ یہ ہر وقت روتا ہی رہتا ہے۔

تو وہ شاہد بھی آگیا۔

شاہد تم گیند بلا کھیلو گے؟ ظلّو نے کہا۔

میں گیند بلا نہیں کھیلوں گا، وکیل نے کہا، میں تو ہاکی کھیلوں گا۔

اچھا اب پتہ چلا کہ تم گیند بلا کیوں نہیں کھیل رہے ۔۔ تم اپنی نئی ہاکی کی شو مارنا چاہتے ہو، ظلّو نے کہا۔

نہیں، وکیل نے کہا، ایسی کوئی بات نہیں، گیند احاطے سے باہر نیچے والے گھروں میں چلی جاتی ہے اور پھر سب مجھ سے ہی لانے کو کہتے ہیں۔

تو کیا ہوا؟ تم سب سے چھوٹے ہو۔ ویسے بھی ہر گھر میں گھس جاتے ہو، ظلّو نے کہا۔

مگر رنڈی کے گھر سے تو میں بھی گیند نہیں لا سکتا۔

اور امی نے کہا، احاطے سے باہر نیچے اتر کر جو بڑا سا گھر ہے، وہاں نہ جانا ۔۔ وہ اچھی عورت نہیں ہے، امی نے سوچ کر کہا۔

اور ظلّو نے کہا، اوہو، رنڈی کے گھر میں گیند چلی گئی ۔۔ کامی تم وہاں سے گیند لے آؤ۔

اور شاہد نے کہا، ظلّو تم خود کیوں نہیں چلے جاتے

مجھے اباجی ماریں گے، ظلّو نے کہا۔

مگر انہیں پتہ کیسے چلے گا؟

وکیل ابواجی سے جا کر جڑ دے گا۔ ظلّو نے کہا۔

جاؤ کامی چلے جاؤ ۔۔ وہ کچھ نہیں کہے گی ۔۔ دروازہ کھٹکھٹانا اور کہنا، ہماری گیند دے دیجئے وہ غلطی سے اندر آگئی ہے۔

دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت عورت نے جھانک کر دیکھا۔ اس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ سامنے آگئی۔

ارے آج یہ کون میرے گھر آیا ہے، اس نے حیرت سے اور پیار سے کہا

باہر کیوں کھڑے ہو۔ اندر آجاؤ ۔ شاباش کتنا اچھا بچہ ہے!

تم گیند لینے آئے ہو نا؟ وہ رہی تمہاری گیند ۔۔ اس کیاری میں پڑی ہے ۔۔ مگر آؤ بیٹھو تو سہی ۔۔ تم اپنا نام نہیں بتاؤ گے ۔۔ اچھا میں بتاتی ہوں۔ تمہیں کامی کہتے ہیں، اور اس کی لمبی پلکوں والی سرمگیں آنکھوں میں شرارت تھی اور مسکراہٹ تھی۔

ذرا ٹھہرو ۔۔ میں تمہارے لئے شربت لاتی ہوں۔

اور اس کی گوری، لمبی، لال لمبے ناخنوں والی اور انگوٹھیوں سے بھری انگلیاں شیشے کا گلاس تھامے قریب آئیں ۔۔ اور خوشبو کا ایک جھونکا آیا ۔۔ لو یہ شربت پی لو، اس نے کہا۔

اور کبھی کبھار میرے گھر آجایا کرو ۔۔ مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں، اس نے کہا۔

تم نے بہت دیر لگا دی ۔۔ یار اتنی دیر کیا کرتے رہے! ظلّو نے کہا۔

تو پھر تم گیند بلا نہیں کھیلو گے؟ ظلّو نے کہا

اور وکیل نے کہا، نہیں ۔۔ میں تو ہاکی کھیلوں گا۔

شاہد تم ہاکی کھیلو گے، ظلّو نے کہا۔

اور شاہد نے کہا، اباجی تو نہیں آجائیں گے؟

نہیں وہ اپنے کمرے میں لیٹے ہیں، ظلّو نے کہا

مجھے ابّاجی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں ان کی داڑھی سے ڈرتا ہوں، شاہد نے کہا۔

اور ظلّو نے کہا، ڈرتا تو میں بھی ہوں ۔۔ وہ میرے کان کھینچتے ہیں۔

اور شاہد نے کہا، تم کیوں ڈرتے ہو ۔۔ وہ تو تمہارے نانا ہیں۔

اور ظلو نے کہا، بس میں ڈرتا ہوں — مگر ابّاجی سے میں نہیں ڈرتا۔

اور شاہد نے کہا، ابّاجی سے تو کوئی بھی نہیں ڈرتا — بلکہ وہ بھی ابّاجی سے ڈرتی ہیں۔

اور ظلو نے کہا، نہیں! ابّاجی تو ان سے نہیں ڈرتیں لیکن وہ ان سے زیادہ بات نہیں کرتیں۔

اس کا مطلب ہے کہ وہ ڈرتی ہیں، شاہد نے کہا۔

اور ظلو نے کہا، شاید — ! اور وہ سوچنے لگا

اور وکیل نے کہا، کامی، میری نئی ہاکی لے لو۔ میں تمہاری ٹوٹی ہاکی سے کھیل لوں گا۔

کامی، تم آگے کھیلو گے یا گول بنو گے — گول بنو گے؟

ایک گول — دو گول ہوئے

کامی تو صرف کھڑا منہ تک رہا ہے۔ اس سے گیند رک ہی نہیں رہی، وکیل نے دوسرے گول سے کہا — !

لو یہ تیسرا گول بھی ہوا، ظہیر نے گیند کو گول میں پھینکتے ہوئے کہا۔

اُف مجھے چوٹ لگ گئی، ظہیر نے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا، اس نے مجھے ہاکی کیوں ماری — گدھا کہیں کا۔

اور ظلو نے کہا، اسے آج کچھ مت کہو — بیچارے کا بھائی مر گیا ہے۔

ظہیر نے کہا، میں کچھ نہیں جانتا۔ بس میں گھر جا رہا ہوں۔ اس نے مجھے اتنی زور سے ہاکی کیوں ماری ہے۔

اس بیوقوف کو کھیلنا نہیں آتا۔

ظلو نے کہا، کامی کو کچھ مت کہو۔

اور وکیل نے کہا، ظہیر تھوڑا سا اور کھیل لو۔ اس کا دل بہل جائے گا۔

پھر ظلو، وکیل، ظہیر سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ نیم کا سایہ سکڑ کر چھوٹا ہو گیا۔ میدان تھا، دھوپ تھی اور بس۔

اور نفیس چچا نے اپنے کمرے سے نکل کر کہا، کامی!

کامی، حامی، نامی، شامی . . .

حامی، نامی کتنے ہونہار بچے ہیں، امی نے کہا رات نامی نے تقریروں کے مقابلے میں ٹرافی جیتی ہے پورے اسکول میں فرسٹ آیا ہے، امی نے کہا۔

کامی! کیا تم بھی اسکول میں جا کر ایسے ہی انعام جیتو گے؟ امی نے کہا۔

کامی — تم اسکول میں جا کر مجھ سے بہتر مقرر بنو گے؟ نامی نے حیرت سے کہا۔ وہ احاطے میں اپنے مکان کے باہر مونڈھے پر بیٹھا تھا۔

واقعی! نامی نے مذاق اڑاتے ہوئے۔

پتہ ہے میں کتنی ٹرافیاں جیتی ہیں؟ ادھر آؤ۔ میں کپ دکھاؤں، نامی نے اترا کر کہا۔

یہ رہے میرے کپ! نامی نے بیٹھک کی الماری کھولتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

اگر تم یہ چھوٹا سا کپ بھی جیت کر دکھا دو تو میں تمہیں مان جاؤں۔ نامی نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

حامی، ہنو یہ کیا کہہ رہا ہے، نامی نے حامی کو آواز دے کر کہا۔

اور نامی نے کہا، اسے تو ٹھیک سے بولنا نہیں آتا — یہ کیا تقریر کرے گا، اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

دیکھا، اس کے کان کیسے سرخ ہو رہے ہیں — اب اپنی جھینپ مٹانے کے لئے کچھ کو لاتیں مار رہا ہے، نامی نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

پھر نامی کا ہنستا، طنزیہ چہرہ بڑا ہوتا گیا۔

کامی مجھے کیوں مار رہے ہو، اور طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے سے غائب ہو گئی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا اور اس کا منہ کھلا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو بچانا چاہا۔ چھڑی کو پکڑ لیا۔

نفیس چچا اپنے کمرے سے باہر آئے اور دیکھنے لگے۔

اور نامی نے کہا، میں نے تو کامی کو کچھ بھی نہیں کہا۔ پتہ نہیں اسے جنون کیوں چڑھ گیا ہے!

اور نفیس چچا نے کہا، کامی یہ چھڑی مجھے دے دو۔ بڑوں کو نہیں مارتے — بہت بری بات ہے۔

اور کامی تم کیوں رو رہے ہو؟

اور نفیس چچا نے اپنے کمرے سے آواز دی، کامی ادھر آؤ — اور تم رو کیوں رہے ہو —؟ بہادر بچے روتے نہیں۔ میرا بھی بھائی مر گیا تھا۔ چلو اپنے آنسو پونچھو۔

اور نفیس چچا نے کہا، لو یہ پتنگ دیکھو — کتنا بڑا اور خوبصورت ہے۔ یہ میں نے تمہارے لئے بنایا ہے، اب تو خوش ہو؟ کیا تمہیں ڈور بھی چاہیئے اور چرخی بھی؟ لو یہ بھی لے لو۔

اور نفیس چچا نے کہا، میں تمہارے لئے
کئی بڑے بڑے پتنگ بناؤں گا اور مانجھا بھی
سونت کر دوں گا۔
تاکہ تم بڑے بڑے پیچ لڑا سکو اور دوسروں
کے پتنگ کاٹ سکو۔
نیم کا سایہ مشرق کی سمت پھیلنے لگا، پھیل
گیا۔ اور لوگ باہر نکلنے لگے۔ اپنے کندھوں پر
بوجھ لئے۔
اور نفیس چچا نے کہا، ظلو، کامی کا ہاتھ پکڑ
کر اپنے گھر لے جاؤ، اس کے ساتھ کیرم کھیلو
اور ظلو نے کہا، کامی میرے ساتھ آؤ۔ آتے
کیوں نہیں۔
اور لوگوں کا جلوس باہر نکل گیا۔ پڑھنے اور
ورد کرنے کی آوازیں آنے لگیں، بلند ہو کر عروج
پر آئیں اور پھر دھیمی ہوتی گئیں اور ہوا میں تحلیل
ہو کر مکمل خاموشی میں تبدیل ہو گئیں۔
ظلو نے کہا، کامی، آؤ میرے ساتھ آؤ۔۔۔
کیرم کھیلیں گے۔۔۔ نہیں؟
اور ظلو نے کہا، یہ دیکھو، یہ ہوائی جہاز میرے
چچا نے بھیجا ہے۔ اس میں یوں چابی بھرتے ہیں
اور پھر یہ چلنے لگتا ہے، بہت قیمتی ہے۔ دیکھو!
دیوار سے ٹکرا جائے گا۔ توڑ مت دینا۔

اور ظلو نے کہا، لو یہ ہوائی جہاز لے لو۔۔۔
ہاں رکھ لو مگر کل واپس دے دینا۔ چلو اب تمہیں
گھر چھوڑ آؤں۔۔۔ شام ہو گئی ہے۔
نیم کا سایہ مشرق کی طرف بے حد طول پکڑ گیا
تھا اور ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی تھی۔
اور نانی اماں نے کہا، لے بیٹا، اسے کسی نے
کھانا بھی دیا، بے چارے نے سارا دن کچھ کھایا
بھی نہیں۔
اور چھوٹی خالہ نے پوچھا، کامی تم نے کھانا
کھایا؟
اور نانی اماں نے کہا، اسے ہے۔۔ بے چارہ
اکیلا رہ گیا۔۔ اور امی کچھ نہ بولیں۔۔ وہ پھٹی پھٹی
آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔۔ یا شاید انہوں نے کچھ دیکھا
نہ تھا۔
اور نانی اماں نے کہا لے بیٹا، تو اب تو کچھ
کھالے۔۔ اتنا غم سینے کو نہ لگا
اور چھوٹی خالہ نے کہا، آپ باجی کچھ کھا لیجئے۔
اور نانی اماں نے کہا، کیوں فکر کرتی ہے پگلی۔
اللہ اور دے گا۔۔ بیل چڑھے گی، پھل پھولے گی۔
پر امی کچھ نہ بولیں اور ان کی آنکھوں میں تو آنسو
بھی نہ تھے۔۔ وہ پلنگ پر بیٹھی رہیں ایک غمگین
تاریکی گھر میں چھا گئی اور سرخ، مدھم، منحوس،

روشنی بلب سے ٹپکنے لگی۔
اور چھوٹی خالہ نے کہا، کامی اب سو جاؤ۔
اس جہاز کو اب رکھ دو۔۔ کل کھیلنا۔۔ نیند نہیں
آ رہی کیا؟ آؤں میں تمہیں کہانی سنا دوں۔
اور نانی اماں نے کہا، یہ اتنا شور کیوں مچا رہا
ہے۔ اسے پتہ نہیں کہ گھر میں کیا ہوا ہے؟
اور چھوٹی خالہ نے کہا، کامی، کدھر جا رہے
ہو! کیوں رو رہے ہو۔
اور پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے امی نے مڑ
کر دیکھا۔ نحیف سی آواز سے کہا، کامی!
اور دو ٹانگوں کے نقوش قریب آتے گئے،
بڑے ہوتے ہو گئے۔۔ بہت بڑے۔۔ دو گرم،
نرم، ملائم اور مضبوط گول ستون۔۔ اور پھر تاریکی،
مزے دار پر سکون تاریکی۔۔ امی کے کپڑوں کی خوشبو
اچانک مضبوط ستون لرزنے لگے۔ سر پر بالوں
میں محبت کی سرسراہٹ۔ کمر پر لرزتے ہاتھوں
کا پیار۔
امی نے کہا، کامی، میرے بیٹے۔۔ چپ
ہو جاؤ۔
خود ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ
پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

"ماہِ نو، ہر طرح سے خوبصورت ہے فرقِ اس کے پرچے میں "غالب" پر کوئی مقالہ شامل نہیں۔
شاید آپ کو یاد ہو کہ ماہِ نو کی یہ ایک روایت رہی ہے کہ فروری کے پرچے میں غالب کے
لئے ایک حصہ مختص کیا جاتا رہا ہے"

محمد حیات خان سیال ۔۔۔ جھنگ

رئیس فروغ

پیاسے آئے صحرا سے
پانی لاؤں دریا سے

پنچھی شور مچاتے ہیں
سورج نکلے کٹیا سے

تو مجھے اپنی آنکھیں دے
بالک بولا بابا سے

بوڑھی ہے تو ہونے دو
پیار کروں گا دنیا سے

اپنی قمیضیں سلوائیں
میں نے ایک زلیخا سے

میں جھوٹے ملہار سنوں
ایک سیانی مینا سے

رکتی ٹھہرتی لہریں لوں
چلتی پھرتی ندیا سے

دم جم کا بیوپار کروں
شہروں والی برکھا سے

کچی آگ چرائی ہے
میں نے ایک سراپا سے

جیون بھر کی بات نہ کر
ہم جیسے بے پروا سے

جب تک آ کے جائے نہیں
آس لگاؤں فردا سے

موسم سے ٹکراؤ میں ہے
اپنا حال ہمیشہ سے

شہروں کے چہرہ گر جنہیں مرنا تھا مر گئے
پیڑوں کو کاٹنے کی دبا عام کر گئے

اُونچی مسہریوں کے دُھلے بستروں پہ لوگ
خوابوں کے انتظار میں تھے اور مر گئے

دریا تھے اور ان کی گزرگاہ تھی مگر
اب کے بجے سجائے گھروں سے گزر گئے

ہم اپنی فصل کاٹ رہے تھے تو کھیت میں
اک اور فصل کے نئے دانے بکھر گئے

کیا پوچھتے ہو جان کہ سیدھی سی بات ہے
جو لوگوں راستوں میں نہیں ہیں وہ گھر گئے

ناصر شہزاد

ثروتوں کی ثمر کاریوں پر
دیکھ بل کی فدا باریوں پر

جگنوؤں کے جگت جوت موتی
گندموں کی جھکی ڈاریوں پر

تیری چت چین اکھیاں نسکھیاں
نین ون رین دو آریوں پر

جھول نیوں کے بندرا بن میں
بول بنسی کے بنواریوں پر

کھڑکیوں میں کھلے چاند چہرے
لاجونتی چڑھی جاریوں پر

آن کر بیٹھیں ، اب بھی کبوتر
اک حویلی کی راہداریوں پر

چتر، بھیدوں کے بیتر جھنود میں
پتر، دیدوں کے پنہاریوں پر

چاند کاٹے گئے پرکٹوں میں
پھول، کاٹے گئے ساڑھیوں پر

کشٹ کایا یہاں بھرشٹ مایا
دان شاہوں کے درباریوں پر

حسن اکبر کمال

غزل میں حسن کا اس کے بیان رکھتا ہے
کمال آنکھوں میں گویا زبان رکھتا ہے

جہاز راں، ہنر و حوصلہ نہ لے جا ساتھ
ہوا کے رُخ پہ اگر بادبان رکھتا ہے

ہیں خندہ زن مرے اس فیصلے پہ سایہ نشیں
کہ سر پہ دھوپ کا اب سائبان رکھتا ہے

بچھڑ کے تجھ سے اک آنسو مجھے نہیں رونا
الگ زمانے سے اپنا نشان رکھنا ہے

بھرا تو ہے مرا ترکش، مگر یہ دل ہے گداز
سو عمر بھر مجھے خالی کمان رکھنا ہے

دیئے بجھاتی رہی، دل بجھا سکے تو بجھائے
ہوا کے سامنے یہ امتحان رکھنا ہے

ہو انتظارِ بہاراں جہاں، نہ رنجِ خزاں
کمالؔ ایسا بیاباں مکان رکھنا ہے

یوسف علی لائق

دیارِ دل میں نہیں وادیٔ نظر میں نہیں
کہ ایک عمر سے ہم لوگ اپنے گھر میں نہیں

تلاشِ سایۂ گل میں کہاں نکل آئے
یہاں تو ایک بھی پتا کسی شجر میں نہیں

مرے ہی نام سے لوگوں نے کر دیئے منسوب
وہ راستے جو ابھی تک مرے سفر میں نہیں

یہ شہر ہے تو بیاباں ہی لے چلو ہم کو
ہزاروں گھر ہیں یہاں اور کوئی گھر میں نہیں

نہ کوئی عکس نہ آہٹ نہ کوئی رنگ نہ روپ
مری نظر کے سوا کچھ بھی بام و در میں نہیں

تری نگہ سے میں زہر پی کے جی لوں گا
مرا علاج اگر دستِ چارہ گر میں نہیں

سنا تھا پہلے بھی ہم نے تجھے مگر لائقؔ
وہ بانکپن ترے اشعارِ تازہ تر میں نہیں

زھیر کنجاہی

کب آئے گا یہ فرق کسی کے بھی دھیان میں
جتنا ہے فرق آپ کے، میرے بیان میں

اپنا کہوں میں جس کو کبھی اعتماد سے
ایسا ملا نہ کوئی مجھے اس جہان میں

پتھر سمجھ کے پھینک دیا تم نے دوستو!
میں گوہرِ خیال تھا لفظوں کی کان میں

وہ اِک نگاہِ شرم جھکی، جھک کے رہ گئی
اِک تیر تھا کہ ٹوٹ گیا ہے کمان میں

آیا ہے میرے شیشۂ دل میں کچھ ایسے بال
جیسے دراڑ آئی ہو پکے مکان میں

جو نکتہ چیں تھے سر بہ گریباں ہوئے زھیر
کتنا تھا سحر آپ کے حُسنِ بیان میں

اعجاز کنور راجہ

کوئی دریچہ ہوا کے رُخ پر نہیں بنایا
مرے بزرگوں نے سوچ کر گھر نہیں بنایا

چہار جانب کھڑی ہے دیوار سینہ تانے
مری بغاوت کے خوف سے در نہیں بنایا

ہماری پہچان اُلجھنوں میں بھٹک گئی ہے
مصوری کا کمال ہے سر نہیں بنایا

تمام قوسیں ہماری سرحد سے دُور رکھیں
ہمیں کسی رُت نے اپنا محور نہیں بنایا

صدف صدف ہم سمندروں میں چھپے رہے ہیں
کنور کسی معجزے نے گوہر نہیں بنایا

حسن عباس رضا

کیا رکھا ہے وصل کی لمبی راتاں وچ عباس رضا
دھرا ہے کیا اب گئے دنوں کی باتاں میں عباس رضا

لد گئی وہ رُت جب شہنائیاں گیت ملن کے گاتی تھیں
اب تو نوحے سنتے ہیں باراتاں میں عباس رضا

کس کو اپنا یار سمجھتے، کس کو زخم دکھاتے ہم
پیار کے دشمن بیٹھے ہوں جب گھاتاں میں عباس رضا

اس دروازے پر جا تم نے دی ہے دستک جس کے مکیں
زہر ملا کر دیتے ہیں خیراتاں میں عباس رضا

خوش قسمت وہ لوگ ہیں جن کو تپتی رُت راس آتی ہے
تم تو جل کر راکھ ہوئے برساتاں میں عباس رضا

کیسے پیار سے گلے لگایا، کیسے پوچھا تھا احوال
نفرت لپٹی تھی جن کی سوغاتاں میں عباس رضا

مان لے اب بھی حسن کا کہنا، چھوڑ حنا کی خوشبو کو
دشنۂ سم ہے مہندی والے ہاتاں میں عباس رضا

صفدر شکیل

جسموں سے دیواروں سے گزرا، ایک اکیلا شخص
حسن کو ریزہ ریزہ چُنتا، ایک اکیلا شخص

جیسے یہ ساری خوشبوئیں، سارے لوگ ہمارے نہیں
برس ہوئے کہیں بچھڑ گیا تھا، ایک اکیلا شخص

سب ملنے والوں سے مِلا اور یوں، کہ ملا ہی نہیں
جنم جنم تنہائی سے کھیلا، ایک اکیلا شخص

شب بھر جاگتے رستو، کہو کیا تمہیں بھی یاد نہیں
خوابوں کے دائرے توڑتا، بُنتا ایک اکیلا شخص

کہیں وہ چبھتی آنکھیں، کہیں وہ ہونٹ کہیں وہ جسم
کیسے کیسے، کہاں کہاں تھا، ایک اکیلا شخص

کھُلوں تو لیکن سب پر کھُلنا اچھا نہیں لگتا
ملے کبھی کوئی مجھ سا ہی تنہا، ایک اکیلا شخص

عشرت آفریں

کسم کے پھول مرے گھر میں وہ لگا ہی گیا
یہ رنگ میرے دوپٹے کو راس آ ہی گیا

تمام عمر جو زخموں پہ ہاتھ رکھتا رہا
ذرا سی بات پہ وہ دل مرا دکھا ہی گیا

ذرا سا صبر جو آیا تھا وحشتِ دل کو
وہ جاتے جاتے پھر اک حشر سا اُٹھا ہی گیا

میں گل بدست مگر سارا شہر سنگ بدست
بھلا ہوا مری بستی سے وہ چلا ہی گیا

وہ اتنی ساری نگاہوں کی بھیڑ سے بچ کر
میں جب اُداس ہوئی میرے پاس آ ہی گیا

اب ایک رشتہ ہے نام سے اسے پوجوں
کہ پور پور وہ پتھر مجھے بنا ہی گیا

محمودہ سازیہ

ذرا جو آنکھ لگے کیسے خواب دیکھتی ہوں
میں اپنے چہرے کو زخمی گلاب دیکھتی ہوں

عجیب سہم مسلط ہے میرے شہروں پر
اتر رہے ہیں فلک سے عذاب دیکھتی ہوں

جھکائے سر کو چلی جا رہی ہے خلقتِ شہر
کھُلا ہے ایک قیامت کا باب دیکھتی ہوں

فقیہہ شہر کی نظروں میں میں بھی ہوں معتوب
مرا قصور یہی ہے کہ خواب دیکھتی ہوں

میں اپنے شہر کے سب کم نگاہ لوگوں کو
تمہارے حکم پہ عزت مآب دیکھتی ہوں

کسی کو راس جو آ ہی گئی ہے مسندِ شاہ
جلے جلائے گھروں کو خراب دیکھتی ہوں

لکھو نہ خوابوں کو شہروں میں غازیہ لبلبی
میں سچے چہروں پہ ڈر کا حجاب دیکھتی ہوں

ڈاکٹر محمد معروف

اقبال کا نفسیاتی مطالعہ[۱]

ڈاکٹر سلیم اختر اُردو کے ان ناقدین میں سے ہیں۔ جو محض سطحی تنقید کے قائل نہیں۔ اور نہ ہی تنقید برائے تنقید اُن کا مسلک ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" میں اقبال کا بحیثیت نقاد ذکر کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں کہ تنقید کی دو اقسام یا مدارج ہیں۔ ایک وہ تنقید جو تخلیق سے قبل وجود پذیر ہوتی ہے۔ جسے وہ تنقیدِ حیات کا نام دیتے ہیں۔ اور دوسری وہ تنقید جو تخلیق کے بعد جنم لیتی ہے۔ جسے وہ ادبی تنقید کا نام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم خود مؤخر الذکر یعنی ادبی تنقید کے قائل ہیں۔ لیکن ادبی تنقید کا ایک بہت اہم پہلو وہ ہے جس کا تعلق ادیب کی شخصیت اور اس کی نفسیاتی زندگی سے ہوتا ہے اور جس کا اُردو ادب میں فقدان ہے۔ بلکہ انہیں جائز طور پر شکایت ہے کہ ہمارے شخصیت نگار کیوں ۱۸۹۲ء سے آگے نہ بڑھ سکے؟ یہ وہ سال ہے۔ جب حالی نے سرسید احمد خاں کی سوانح حیات لکھی۔ درحقیقت اُردو ادب میں سوانح کو بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اور مصنف یا ادیب کے نفسیاتی پہلو اور اس کی نجی زندگی کو تو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اس مغربی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں ولیم جیمز۔ ڈاکٹر ماذلے۔ ڈاکٹر شیلڈان ایسے عظیم مرتبت ناقدین کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں کسی تخلیق کار کے تخلیقی کارناموں کو پرکھنے کیلئے اس کی نجی اور نفسیاتی زندگی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یعنی یہ جاننا کہ وہ کون سے محرکات ہیں۔ جنہوں نے اسے وہ تخلیقی خصوصیت بخشی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہی کمی محسوس کرتے ہوئے کہ علامہ اقبال جیسے عظیم تخلیق کار کی نجی اور نفسیاتی زندگی پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ زیرِ بحث کتاب "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" لکھی ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے علامہ کے شعور اور تحت الشعور میں کارفرما ان محرکات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو ان کی تخلیق پر روشنی ڈال سکیں اور بتا سکیں کہ وہ ایسے کون سے حالات تھے جنہوں نے اقبال کو ایک عظیم فن کار بنا ڈالا۔ ڈاکٹر سلیم صاحب نے ایسے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ جو بظاہر غیر ضروری اور فروعی معلوم دیتے ہیں۔ مثلاً اقبال کی پہلی شادی۔ ان کا یورپ جانے سے پہلے شادی کے متعلق نظریہ اور واپسی پر خیالات۔ اس مطالعہ کے لئے سلیم صاحب نے اقبال کی عطیہ بیگم سے خط و کتابت پر دار و مدار کیا ہے۔ جن سے بعض بہت اہم نقاط پر روشنی پڑتی ہے۔

اقبال کی اپنی ازدواجی زندگی سے بے اطمینانی۔ ان کے عورت اور شادی کے بارے میں خیالات عطیہ بیگم سے ملاقاتیں، لندن سے واپسی اور پہلی بیوی سے علیحدگی وغیرہ کے بارے میں متذکرہ خطوط اور کچھ نوٹ بک کے اوراق سے پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سلیم نے لکھا ہے "اس زمانے کے عطیہ کے نام لکھے گئے خطوط شدید مایوسی، پریشان خیالی، دنیا اور دنیا والوں سے بیزاری کے غماز ہیں۔ شادی ایک وجہ ہو گی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" (ص۔ ۴۵) بہرحال وہ ذہنی ناآسودگی جو اقبال کو اپنے ذاتی حالات سے حاصل تھی۔ اس کی بڑی حد تک تلافی (COMPENSATION) عطیہ بیگم کی رفاقت اور جرمن معلمات فراؤ دیکے ناست فراؤ سینے شال کے ساتھ کی بدولت ہو گئی۔ اقبال کی ذہنی اور جذباتی ناآسودگی کی ایک وجہ اس کی طبع میں تضاد کی موجودگی بھی تھی۔ جو اقبال کے اپنے الفاظ میں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہے "ایک ظاہری شخصیت جو عملی ہے۔ اور دوسری وہ باطنی شخصیت جو خواب دیکھنے والے فلاسفر اور صوفی کی سی ہے۔"

(ص۔ ۵۳)

[۱] ڈاکٹر سلیم اختر کی تازہ تصنیف ماوذ

۱۹۰۷ء میں اقبال نے خود اپنے بارے میں لکھا "میری اپنی بدنصیب ذات مصیبت انگیز خیالات کی کھان بنی ہوئی ہے۔ جو سانپ کی طرح میری روح کے عمیق اور تاریک سوراخوں سے باہر نکلتے ہیں۔"
(ص۔ ۵۷)

پھر آگے چل کر اسی اقتباس میں لکھا ہے "تکلیف ایک نہایت ہی لذیذ چیز ہے اور میں اپنی بدقسمتی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔" (ایضاً) ڈاکٹر سلیم نے اس اقتباس میں لذت آزاری (MASOCHISM) کا پہلو تخیص کیا ہے۔ اگرچہ یہ نتیجہ ذرا سخت ہے۔ تاہم اس سے اقبال کی ذہنی ساخت اور جذبات سے واقفیت ملتی ہے۔ اور قاری کو ان کے ذہن میں مضمر کشمکش کی نشاندہی ہوتی ہے۔

علامہ کو یہ بھی شکایت تھی کہ لوگ ان سے واقف نہیں ہیں۔ بلکہ انہیں تکلیف اس بات کی تھی کہ خود عطیہ بیگم بھی ان کی فطرت سے ناواقف ہے۔ چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ دل کھول کر عطیہ کے سامنے رکھ دیں تاکہ وہ ان کی روح کا بہتر طریقہ سے مشاہدہ کر سکے۔ (ص۔ ۶۵) یہ خیالات ہی انتہائی مایوسی اور ذہنی کشمکش کے مظاہر ہیں۔ اور پھر اقبال کا یہ عقیدہ کہ عطیہ بیگم سے کوئی بات چھپانا گناہ ہے۔ (ص ۶۴)۔ ان سے ہمیں علامہ کے عطیہ بیگم پر اعتماد اور اس پر اپنا دل کھولنے کی خواہش کا پتہ چلتا ہے پھر اقبال کا یہ دعویٰ کہ مجھ میں خامیاں ضرور ہیں لیکن ریاکاری اور بے اعتنائی مجھ میں نہیں ہے (ص ۶۶) پھر اقبال خود کو فطری طور پر ایک پرستش کنندہ قرار دیتے ہیں۔ (ص ۶۸) ان مختلف اقتباسات سے جو کہ ڈاکٹر سلیم نے زیرِ تبصرہ کتاب کے آغاز میں نوٹ کئے ہیں۔ ہمیں مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

۱۔ اقبال ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھے۔ اور انہیں ایک ایسے ساتھی کی تلاش تھی۔ جو انہیں سکون مہیا کر سکے۔

۲۔ یہ سکون انہیں ازدواجی زندگی میں حاصل نہ ہو سکا کیونکہ انہیں کسی بیوی میں محرمِ راز نہ مل سکا۔

۳۔ عطیہ بیگم نے انہیں کچھ ذہنی آسودگی مہیا کی لیکن ان کی طبع میں اندرونی خلفشار وہ بھی دور نہ کر سکی۔

اقبال کی اسی ذہنی کشمکش اور ناآسودگی میں ڈاکٹر سلیم کو ان کی تخلیقی جنبش کا راز مضمر ملتا ہے۔ اگر اقبال بھی اکثریت کی طرح اپنی نجی اور ازدواجی زندگی میں مطمئن ہوتے تو وہ کوئی تخلیقی کام نہ کر پاتے۔ کتاب کے پہلے اور تیسرے مضامین "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" اور "اقبال کی پہلی شادی اور خانگی زندگی" میں بطورِ خاص ڈاکٹر سلیم اختر نے علامہ کے ان نفسیاتی اور نجی عوامل اور محرکات کا مطالعہ کیا ہے جن سے ان کی تخلیقی کارفرمائی پر روشنی پڑتی ہے۔

دوسرا مضمون "کیا اقبال نرگسی تھے" ایک سوالیہ ہے۔ یہ مضمون انہوں نے ڈاکٹر سلام سندیلوی کی تالیف "اُردو شاعری میں نرگسیت" سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ متذکرہ کتاب میں سندیلوی صاحب نے درجنوں اُردو شعرا کو نرگسی ثابت کیا ہے۔ جن میں اقبال کا نام بھی آتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ شاید ہی کوئی اُردو شاعر ان کی کسوٹی سے بچ پایا ہو۔ ڈاکٹر سندیلوی نے نرگسیت کے نفسیاتی مفہوم کے لئے کیرن ہارنی پر تمام تر دارومدار کیا ہے۔ جس کے نزدیک نرگسیت میں خودستائی۔ غرور۔ طلبِ جاہ۔ جذبۂ محبوبیت۔ کنارہ کشی خودداری۔ تصوریت۔ تخلیقی خواہشات۔ شدید فکرِ صحت شکل و شباہت اور ذہنی صلاحیت ایسے عناصر شامل کئے گئے ہیں (ص ۷۵) یہ بلاشک و شبہ نرگسیت کی بہت وسیع تعریف ہے۔ ڈاکٹر سلیم صاحب نے ایک ماہرِ نفسیات کی طرح پہلے نرگسیت کی مناسب حدود متعین کر کے ان کے بنیادی مقالہ پر مندرجہ ذیل اعتراضات کئے ہیں۔

۱۔ کیرن ہارنی اور ڈاکٹر سندیلوی دونوں نے اس اساسی حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ انسانی شخصیت میں مختلف النوع بلکہ بعض اوقات تو باہم متصادم اور متناقض میلانات بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض میلانات قوت پا کر باقاعدہ رجحانات کی صورت بھی اختیار کر جاتے ہیں جبکہ بعض نشوونما یافتہ رہتے ہیں۔ لیکن (اور یہ لیکن بہت اہم ہے) یہ سبھی کسی ایک مرکزی جذبہ کے تابع ہوتے ہیں۔" (ص۔ ۷۶) اور ڈاکٹر سلام نے نرگسیت کے ان منتشر عناصر کو جزو سمجھنے کے برعکس کُل کو اتنی اہمیت دے ڈالی۔ جس کے نتیجہ میں ان سب کی کسی ایک جذبہ میں شیرازہ بندی کی بجائے انہیں آزاد اور خودکار سمجھا۔ اور ان کی ظاہری حیثیت کا تجزیہ کئے بغیر انہیں حقیقی اور بنیادی جان کر فکری مغالطے میں مبتلا ہو گئے۔" (ایضاً) ڈاکٹر سلیم صاحب کے یہ دلائل خالص منطقی ہیں۔ اور نہایت پرزور ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے بہت محنت سے نرگسیت کا حقیقی اور نفسیاتی مفہوم یونانی کہاوت سے اخذ کر کے بیان کیا ہے۔ یہ کسی ماہرِ نفسیات کی تحریر سے کم نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جس اعتماد اور پُرزور انداز میں کیرن ہارنی جیسی ماہرِ نفسیات کا تجزیہ کیا ہے اور اس پر اعتراضات کئے ہیں۔ اس سے ان کی تنقیدی

بصیرت اور مقام کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ آگے چل کر اُردو غزل گو شعرا کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم صاحب رقم طراز ہیں کہ ڈاکٹر سندیلوی نے "اس اساسی حقیقت کو فراموش کر دیا کہ اُردو غزل گو شعرا کی اکثریت کیلئے اکثر مضامین و موضوعات برائے شعر گفتن تھے" (ص ۸۶) یہاں ڈاکٹر سلیم صاحب کچھ اپنے نفسیاتی مؤقف سے ہٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اگر فن کی جڑ فنکار کی نفسیات میں موجود ہیں۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔ تو پھر "برائے شعر گفتن" بے معنی سی چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ بہرحال اس میں کلام نہیں کہ ڈاکٹر سندیلوی نے نرگسیت کا بہت وسیع مفہوم پیش کیا ہے۔ اور اس مفہوم کے لحاظ سے شاید ہی کوئی اُردو غزل گو شاعر اس کی زد سے بچ سکتا ہے۔ اقبال میں نرگسیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سندیلوی نے خودداری، خود پسندی، نصوریت تخلیقی خواہش۔ وغیرہ ایسے عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ اور خاص طور پر اقبال کی تخلیقی خواہش ان کے نرگسی رجحان پر ترتیب دی ہے۔ لیکن مندرجہ بالا عناصر کے بغیر کوئی تخلیق ممکن نہیں۔ قرآنِ مجید کے نزدیک جب خدا کو بھی خود نمائی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے دنیا تخلیق کر دی۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر سلیم صاحب نے کہا ہے "تخلیق فن کے کئی محرکات میں سے نرگسیت بھی ایک ہے" لیکن یہ واحد یا کُلی محرک نہیں ہے۔ ڈاکٹر سندیلوی کے وسیع معنوں میں تو کوئی فنکار نرگسیت کے طعنے سے نہیں بچ سکتا۔ اور پھر جب اقبال فلسفۂ خودی سے قومی فلسفہ اور بعد میں پین اسلامزم کی طرف جاتے ہیں۔ تو اس بارے میں سندیلوی صاحب کیا کہیں گے۔ کم و بیش یہی اعتراضات مصنف نے سید شبیہ الحسن کی کتاب "تنقید اور تحلیل" میں مقالہ "غزل میں نرگسیت" پر کئے ہیں۔ اور ان تمام کوششوں کو مضحکہ خیز اور گمراہ کن قرار دیا ہے۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کو نرگسیت کے باعث قرار دینا محلِ نظر اور انتہا پسندی ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ "فکر و فن" کے زیرِ عنوان ہے اس حصہ کے پہلے دو مضامین "اقبال کا تنقیدی شعور" اور "تو شب آفریدی چراغ آفریدم" علامہ اقبال کے نظریۂ فن پر تنقیدی روشنی ڈالتے ہیں۔ پہلا مضمون اس اہم حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ اقبال ایک "پیشہ ور نقاد" نہیں تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے۔ بقول ڈاکٹر سلیم "انہوں نے زندگی اور اس کے مظاہر پر تو تنقید کی لیکن اس کے باوجود خصوصیت سے ادب کے ناقد نہ تھے۔ مشرق و مغرب کے افکار و تصورات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے باوجود وہ ادبیات کے ناقد نہ تھے" (ص ۱۰۴-۱۰۵) بہرحال تنقید کی دو اقسام ہیں۔ ایک تنقیدِ حیات اور دوسری ادبی تنقید۔ اور تخلیقی تنقید کے ان دو قوموں متضاد یوں کے درمیان معلق ہوتی ہے (ص ۱۰۵-۱۰۶) اور "اعلیٰ تخلیق کار اور بلند پایہ تخلیقات کے پیچھے دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تنقیدی شعور بھی کارفرما ہوتا ہے" (ص ۱۰۷) اور یہ اعلیٰ تنقیدی شعور یقیناً اقبال کو حاصل تھا اور ان کی اعلیٰ تخلیقات کی تہ میں موجود تھا۔ تاہم اقبال ادبی ناقد نہیں تھے یا کم از کم پیشہ ور نقاد نہیں تھے۔ اگرچہ ان کی ادبی تنقید کی کچھ بلند پایہ مثالیں ان کے بعض دیباچہ جات میں موجود ہیں خاص طور پر "پیامِ مشرق" کا دیباچہ اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے۔ اپنے دوسرے مضمون "تو شب آفریدی۔ چراغ آفریدم" میں ڈاکٹر سلیم نے اقبال کے تصورِ فن کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کے ان محرکات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ جن کے تحت علامہ نے حافظ کی فنی معراج کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی شاعری کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اقبال کے نزدیک اچھے شاعر کا معیار یوں ہے "اگر کسی شاعر کے اشعار اغراضِ زندگی میں ممد ہیں۔ تو وہ اچھا شاعر ہے اور اگر اس کے اشعار زندگی کے منافی ہیں یا زندگی کی قوت کو کمزور اور پست کرنے کا میلان رکھتے ہیں تو وہ شاعر خصوصاً قومی اعتبار سے مضرت رساں ہے" (ص ۱۳۸) اقبال کے اپنے الفاظ میں میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے۔ اسی بنا پر میں آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلۂ تفریح" (ص ۱۵۲) اور چونکہ حافظ کی شاعری اس معیار پر پوری نہ اترتی تھی۔ پس اقبال نے اس پر شدید تنقید کی۔ یہ تنقید حافظ کے فن پر نہ تھی۔ جس کے اقبال بہت قائل تھے۔ بلکہ اس کی مقصدیت کے پہلو پر۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون "غزل میں نئی جہت اقبال" بھی قابلِ توجہ ہے۔ کیونکہ اس میں مصنف نے بطورِ خاص علامہ کی غزل کا تجزیہ کیا ہے۔ اسے اگر اقبال کے فلسفۂ ادب کے مکمل تناظر (PERSPECTIVE) میں دیکھیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے غزل کیوں لکھی؟ اور ان کی غزل کی خصوصیات کیا ہیں؟ بالفاظِ دیگر غزل ان کے بنیادی مقصد کو کیونکر پورا کرتی ہے؟ اقبال کی غزل میں تمام لوازمات موجود ہیں۔ خاص طور پر تغزل بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ڈاکٹر سلیم صاحب نے

طور

غزل کی جہت۔ اس کی ابتدا اُردو زبان میں اور پھر ارتقا کے مدارج پر بہت جامع بحث کی ہے۔ اقبال کی غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اقبال کے مزاج میں نظم رچی ہوئی تھی۔ بلکہ ان کی بیشتر غزلیں بھی مسلسل ہو کر نظم ایسی صورت اختیار کر گئیں۔ اقبال کی "نظموں اور غزلوں کو ساتھ ساتھ پڑھیں تو دونوں کی معانی اور اسلوب کی کسی طرح سے بھی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ کسی بھی غزل کا عنوان مقرر کر کے اسے نظموں میں شامل کیا جا سکتا ہے" (ص ۱۹۸) ان کی غزلیں اس حد تک "منظوم ہیں کہ ۱۶ غزلوں میں سے صرف ۷ کے مقطعوں میں تخلص استعمال کیا ہے۔ روایت کے اعتبار سے اُردو غزل چند مخصوص مضامین میں بند تھی۔ اقبال نے اسے روایتی مضامین سے آزاد کر کے اس میں نئے اور فلسفیانہ مضامین متعارف کرائے۔ اور انہیں "نظم" کی طرح استعمال کیا۔ سلیم صاحب انہیں چھوٹی (MINIATURE) نظمیں قرار دیتے ہیں۔ پس اقبال نے غزل کو نظم کی طرح بامقصد بنایا۔ بلکہ سرد فلسفیانہ افکار کو گرم غزل کے رنگ میں پیش کیا۔ بقول سلیم صاحب "یہ اقبال کے جینئس کا کمال ہے کہ اس نے سرد اور گرم کو خوبصورتی سے آمیز کر کے ایک نیا شعری آہنگ اور نیا اسلوب بنا لیا" (ص ۲۰۳) انہوں نے فکر کی یخ سطح کو احساس کی آنچ سے پگھلا کر اسے ایک طرح کے جذبہ میں تبدیل کرنے کی کاوش کی۔ اور اس میں بہت کامیاب ہے۔ ان کی غزل میں نظم کی طرح وحدتِ فکر موجود ہے ان کی "بانگِ درا" کی غزلیں اقبال کے ایوانِ غزل کیلئے اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے "بالِ جبریل" کی غزلوں کا مطالعہ بھی ان ہی کے تناظر میں ہونا چاہیئے ڈاکٹر سلیم نے ایک مشاق ناقد کا تجزیہ کرتے ہوئے مندرجۂ ذیل آرا کا اظہار کیا ہے "جہاں تک غزلوں کا مفرّس ہونا اور خوشنما تراکیب کا تعلق ہے۔ تو اس معاملے میں اقبال سے قبل صرف غالب ہی ایسا شاعر نظر آتا ہے جو اقبال کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ورنہ اقبال کی غزل اپنے تمام پیشروؤں سے اس بنا پر ممتاز سمجھی جا سکتی ہے" (ص ۱۹۹) یعنی تکنیک کے اعتبار سے اقبال کی غزل کسی سے کم نہیں۔ بلکہ غالب کی ہم مقابلہ ہے۔ اقبال نے غزل میں انقلاب ضرور برپا کیا۔ لیکن "غزل کی تکنیک میں کسی طرح کی انقلابی تبدیلی نہ کی۔ لیکن مضامین کے لحاظ سے واقعی اس میں ایک انقلاب برپا کر دیا" (ص ۲۰۵) آگے چل کر ڈاکٹر سلیم رقمطراز ہیں "ہمیں اندازہ ہے اقبال نے غزل میں شعورِ زیست کی فلسفیانہ اساس اجاگر کی اُردو غزل کے ایوان میں ایک نئی گونج تھی۔ بحیثیت ایک شاعر یہ اقبال کا کمال ہے کہ انہوں نے غالب کی مانند "تنگنائے غزل" کی شکایت بھی نہ کی۔ نہ ہی اسے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن اس قدیم ترین صنف میں اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں سے وہ دم پھونکا کہ اس کے تنِ مردہ میں جان پڑ گئی" (ص ۲۱۱)

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" محض ایک نفسیاتی مطالعہ ہی نہیں بلکہ ادبی تنقید کے اعتبار سے بھی ایک مکمل اور جامع تجزیہ ہے۔ اس میں جہاں انہوں نے ان نفسیاتی عوامل کی نشاندہی کی ہے جن کی بدولت اقبال ایک بلند مرتبت تخلیق کار بنے بلکہ ان کی تخلیقات کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ وہاں انہوں نے اقبال کا مطالعہ بحیثیت ایک غزل گو شاعر کے بھی لیا ہے۔ اقبال کی نظم کی نمایاں خصوصیات پر بحث کی ہے۔ ان کا نظریہ فن اور تنقیدی شعور بھی زیرِ بحث آیا ہے۔ اور ان کی نثر کا مزاج بھی پرکھا ہے۔ اقبال کے اقتصادی نظریات۔ ان کا نظریۂ پاکستان کی تشکیل میں اہم کردار۔ اور ملی نشاۃ الثانیہ کے نقیب کے طور پر بھی مطالعہ کیا ہے۔ کتاب اس لحاظ سے جامع اور مکمل ہے کہ اقبال لٹریچر کے نفسیاتی اور ادبی ہر دو پہلوؤں پر مختلف انواع سے بحث کی گئی ہے اگرچہ ڈاکٹر سلیم صاحب ادبی تنقید میں اپنا نام پیدا کر چکے ہیں۔ لیکن میں ان کی اہمیت ان کی نفسیاتی تنقید و تجزیہ میں مضمر سمجھتا ہوں۔ اور اس میدان میں وہ ابھی تک اُردو ادب میں یکتا مقام رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

تصوّرات[1]

جدید تنقید بحران کا شکار ہے کہ آج کا نقاد اپنے عہد کے تہذیبی تجربے سے نئی بصیرت اور تنقیدی شعور حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔ آج کے نقاد کی تنقیدی بصیرت ابھی تک اُس کے ماضی کے سرمایہ میں الجھی ہوئی ہے۔ ماضی کی یہ روایت اُسے نئے تنقیدی شعور کی طرف بڑھنے سے روک رہی ہے۔ یہ صورتِ حال اُردو کے بیشتر نقادوں کی تحریروں میں ملتی ہے۔ جبکہ کچھ نقاد ایسے بھی ہیں کہ جو ماضی کی اس روایت سے آگے اپنے سفر کی منزلوں کی تلاش میں مصروف ہیں۔

تنقید محض ایک میکانکی عمل نہیں ہے۔ تنقید کے اصول تو ضرور ہوتے ہیں مگر ان اصولوں کو میکانکی طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ آج ہمارے تنقیدی افق پر ایسے نقادوں کی کثرت ہے جو کتابوں سے اخذ کردہ اصولوں کے حوالوں سے اپنا تنقیدی کاروبار چلانے میں مگن ہیں۔ ان کے تنقیدی سرمائے کی ساری بنیاد گھسے پٹے اصولوں پر مبنی ہے اس لئے اپنے عہد کی بصیرت ان کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ اچھا نقاد وہی ہے جو ان مقررہ اصولوں سے بغاوت کرکے اپنے تہذیبی تجربے سے اپنا تنقیدی نظام اخذ کرتا ہے۔ اور اس کی تنقید اپنے اندر ایک تخلیقی بصیرت کا احساس دلاتی ہے۔ اچھی تنقید، تخلیقی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں ہے خاص طور پر جب نقاد کوئی تنقیدی نظریہ پیش کر رہا ہو تو اس کے لئے یہ بصیرت ازبس ضروری ہے کیونکہ کسی نئے تنقیدی تصوّر کی دریافت تخلیقی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ہمارے آج کے نقادوں میں انیسؔ ناگی ایسے نقاد ہیں جو تنقیدی تجربہ میں ہمیشہ تخلیقی بصیرت کا ثبوت دیتے ہیں اور آج ان کی کتاب "تصوّرات" ہمارے پیشِ نظر ہے جو اُن کے اس رجحان کی ایک نمائندہ دستاویز ہے۔

"تصوّرات" حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ہے۔ جسے دانیال لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ کتاب ۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے اور نہایت دیدہ زیب سرورق اور کتابت و طباعت کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کی گئی ہے۔

"تصورات" میں کل بیس مقالے شامل ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے کتاب میں خوبصورت تنوع موجود ہے جو مصنف کے تجزیے، مطالعے اور اُس کے تنقیدی افق کے پھیلاؤ کو ظاہر کرتا ہے کتاب کے موضوعات میں پہلا موضوع نظریاتی تنقید کا ہے اور یہ کتاب کا سب سے جاندار حصہ ہے اور مصنّف کی تخلیقی افتادِ طبع کا مظہر ہے۔ مضامین کے اس حصّے میں "نثری نظم یا شاعری"، "نثری نظم اور بے ہیئتی"، "نئی تنقید کی خواہش"، "ادب اور تہذیبی جمود"، "دانشور کون؟"، "نیا افسانہ" اور "ترجمے کی ضرورت" شامل ہیں۔ یہ سارے مضامین اپنے عہد کے تہذیبی تجربے کی پیداوار ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس ناگی اپنے عہد کے مسائل کے ساتھ کس حد تک شریک ہوتا ہے وہ ان مسائل کی تنقیدی تعبیر کس طرح تیار کرتا ہے وہ اس عہد کی تنقیدی ضروریات میں کن عناصر کو اوّلیت کا درجہ دیتا ہے اور کن عناصر کو آج کی تنقید سے خارج کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ یہ مضامین ظاہر کرتے ہیں کہ انیسؔ اپنے عہد کے تخلیقی ادب کو متحرک کرنے اور اسے آگے بڑھانے میں کون سے روّیے فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انیسؔ کے مضمون "نئی تنقید کی خواہش" کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ انیسؔ نئی تنقید میں ایک

---

[1] انیس ناگی کی تازہ تصنیف

واضح شعور رکھتا ہے۔ اُس کا کہنا یہ ہے کہ

"جو تنقید معاشرے میں نئے خیالات کی تولید نہیں کرتی، جو تخلیقی رجحانات میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، جو منتشر تہذیبی دور میں ترتیب کی نشاندہی نہیں کرتی، جو پسماندہ معاشرے میں استحصالی قوتوں کے خلاف صف آرائی نہیں کرتی۔ اُسے نہایت ہی احترام کے ساتھ درگور کر دینا چاہیئے۔"

اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ انیس ناگی تنقید کی حدوں کو محض تجربہ یا تشریح و تعبیر تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ تنقید کے بارے میں وہ ایک تخلیقی تصور پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا تصور جو انتشار کو ترتیب میں بدل دے، اسے ربط میں لے آئے اور تخلیقی سطح پر ایک ایسا اُفق فراہم کرے جس سے نئے افکار و خیالات کی پرورش ہو۔ اس کے بغیر تنقید کا تصور بے معنی ہے۔ اس کے نزدیک تنقیدی تجربہ حقیقت میں وہ ہے جو تخلیقی تجربے کو بھی ایک نئی دنیا کا رستہ دکھلائے۔ جس سے تخلیق اپنے عہد کا شعور حاصل کر کے نئی خود آگاہی کے سفر سے گذرے۔ انیس کے ان تمام مضامین کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کو پڑھتے ہوئے ہم ایک نئی خود آگاہی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ انیس کے تنقیدی شعور میں ایک ہمہ گیر آواز ملتی ہے اُس کے ہاں مکمل طور پر ایک نئی تبدیلی کا احساس ملتا ہے مثلاً اُس کا کہنا ہے۔

"میں اپنے معاشرتی حوالے سے ہر شعبۂ حیات میں تجربے کا خواہش مند ہوں میں لباس سے لے کر ذہن اور باطن کی گہرائیوں تک ہر ایک شے میں تغیر چاہتا ہوں۔"

انیس کے اس نئے تنقیدی مجموعے میں ایک مضمون ہے "دانشور کون؟" یہ مضمون بھی تخلیقی بصیرت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس مضمون میں انیس نے دانشور کی وضاحت اور تشریح اپنے تہذیبی بحران کے حوالے سے کی ہے۔ اُس نے دانشوری کے قدیم یا مغربی خیالات کو یکسر طور پر رد کرتے ہوئے اپنے مخصوص سیاسی و تہذیبی حوالوں سے دانشور کا تعیّن کیا ہے اُس کا خیال یہ ہے کہ دانشور وہ ہے جو تصورات کی تخلیق کرتا ہے۔ یا وہ تصورات جو معاشرے کی فکری زندگی میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کی تشریح کے ذریعے نئے تصورات کی تولید کے لئے فضا تیار کرتا ہے۔ نئے استفسارات پیدا کرتا ہے۔ لیکن ہر صورت میں اپنی طرفداری کا اعلان کرتا ہے۔ گویا دانشور وہ ہے جو ہر لمحے اپنے عہد کے تہذیبی شعور سے تخلیقی سطح پر زندگی کا نیا شعور حاصل کرے اور اس شعور کو دریافت کر کے وہ معاشرے میں جانبداری قبول کرے، اور خود کو اعلانیہ طور پر تخلیقی قوتوں کے ساتھ ظاہر کرے۔

"تصورات" کے دو مضامین ہمارے عہد کے ایک اہم ادبی مسئلے یعنی نثری نظم کے بارے میں ہیں۔ نثری نظم کی ہیئت اور اس کے فن پر اب تک کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کی موافقت اور مخالفت کے مسئلے پر گذشتہ چار یا پانچ برس سے ہمارے نقّاد مسلسل بحث مباحثے میں مصروف رہے ہیں۔ اور اس صنف کے امکانات اور اس کے ردّ و قبول پر ایک طوفان اٹھایا گیا ہے اس سارے ادبی مناظرہ میں علمی و تنقیدی عنصر اور جذباتی ردِّعمل زیادہ اُبھرا ہے۔ اپنے دلائل کے لئے اصولی یا منطقی انداز اختیار کرنے کی جگہ ذاتی سطح پر اس مسئلہ کو لیا گیا ہے۔ جس سے عجیب پراگندگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ نقّاد فنی طور پر اس صنف کے امکانات کا جائزہ لے اور اس کی تاریخی ضرورت کے مسئلے پر روشنی ڈالے تاکہ معلوم ہو سکے کہ نثری نظم کن بنیادوں پر نمودار ہوئی ہے؟ اس صنف کے اس عہد میں پھیلنے کے محرکات کیا ہیں؟ نئی شاعری کی تحریک کے بعد اس کی کوئی ضرورت ہے۔ یا نہیں؟ یا نئی شاعری ہی کی ایک توسیعی شکل ہے؟ کیا نثری نظم کو نئی شاعری کی اعصابی تھکن نے فروغ دیا ہے؟ نثر اور نظم کے دائرۂ کار میں کیا فرق ہے؟ شعری آہنگ کا عمل اور اس کے امکانات نثری نظم میں کیا ہیں۔؟ یہ وہ بہت سارے سوال ہیں جنکے جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں "تصورات" کی طرف رُخ کرنا پڑتا ہے۔

انیس ناگی کے نزدیک نثری نظم کا مسئلہ ایک نئی شعری اسلوبیات کی دریافت کا مسئلہ ہے۔ نثری نظم پر اب تک ایک اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ یہ سہل انگاری یا کج روی کی پیداوار ہے۔ اس اعتراض کو بھی انیس نے رَد کیا ہے اُس کی رائے یہ ہے کہ نثری نظم کی تحریک سہل انگاری کی پیداوار نہیں ہے بلکہ نثری نظم تو نئی شاعری کے تخلیقی سفر کی ایک منزل ہے اور یہ مروجہ شاعری اور نئی شاعری میں پیدا ہونے والے

بعض "کلیشیز" سے نجات حاصل کرنے کی تحریک کا نام ہے جو نئی شعری اسلوبیات کو دریافت کر رہی ہے اور یہ تحریک لفظ کے مابعد کی دریافت کے ذریعے شاعری میں لفظ کی نئی افتا لوجی پیدا کرتی ہے انیس کے خیال میں اسی عمل کا مقصد صوت و معانی کے الحاق کے ذریعے ایک نیا عالم صوت و معانی تعمیر کرنا ہے، جو اس عہد کے شور و غوغا کو اپنے اندر سمو کر تجربے اور شعری اظہار کے فاصلوں کو کم کر سکے ان لہجوں، علوم اور مادی معروضات کو جو ہماری آج کی دنیا میں در آئے ہیں۔ انہیں اپنے اندر سمو سکے انیس ناگی نے نثری نظم کو نئی شاعری کی روایت سے منسلک کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ

"نئے شعرا کی نثری نظم کی طرف رجحان ایک طرح کی خود احتسابی کا نتیجہ ہے کیونکہ جس طرح نئی شاعری کے اسلوب کو برتا جا رہا ہے وہ ایک لحاظ سے "کلیشے" کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ ایک ہی طرح کے تجربات اور استعاروں کی تکرار سے نئی شاعری کا پھیلاؤ کسی قدر رک گیا ہے۔ نئے شعراء کے فوری بعد کی نسل ابھی تک نئی شاعری کے اسلوبِ شعر سے باہر نہیں نکل پائی۔"

انیس ناگی نے نثری نظم کو مخالفِ شعر بھی کہا ہے اور مخالفِ نثر بھی کہ یہ ہر قسم کی رسمی ہیئت کو توڑ دیتی ہے۔ یہ دراصل بے ہیئتی ایک ہیئت ہے جو ہر طرح کے ماقبل وجود تصورات و تلازمات سے آزاد ہو کر تخلیق کے دوران اپنا فنی اور تصوراتی اہتمام غیر مروّجہ طریقے سے خود کرتی ہے۔ انیس نے نثری نظم کی جن فنی خصوصیات کا تعین کیا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ یہ مروّجہ شاعری کے عروضی پیرائے کو قبول نہیں کرتی۔

۲۔ یہ مروّجہ شاعری کے قافیوں اور ردیفوں کو بروئے کار نہیں لاتی۔

۳۔ یہ کسی خارجی رسمی شعری ہیئت کی متابعت نہیں کرتی۔

۴۔ اس میں مصرعوں کی تقسیم غزل، نظم یا نظمِ آزاد یا کسی اور مروجہ صنفِ شعر کے مطابق نہیں ہوتی۔

۵۔ یہ بے ہیئتی کی ہیئت ہے۔

۶۔ یہ منطقی بیانیہ اور تجزیاتی نثر کے اسلوب سے گریز کرتی ہے۔

۷۔ اس میں مصرعوں کی "مارفولوجی" افادی نثر سے مختلف ہوتی ہے۔

۸۔ اس میں نثر کا غیر استعاراتی پیرایہ نہیں ہوتا۔

۹۔ یہ نثر کے تفصیلی انداز سے گریز کرتی ہے۔

۱۰۔ یہ زبان کے بہاؤ کی ایک شکل ہے۔

"تصورات" میں تین مضمون اقبال کے بارے میں ہیں۔ ان میں اقبال کا جائزہ غیر روایتی طور پر لیا گیا ہے۔ "اقبال انحراف کا شاعر" اس جائزہ کا ایک عمدہ مضمون ہے، جس میں اقبال کے پانچ رویوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ان کے انحراف کا فلسفہ واضح ہوتا ہے۔

۱۔ اقبال نے اردو شاعری کے مجموعی اسلوب میں سب سے واضح انحراف کیا ہے

۲۔ اقبال نے سب سے پہلے اردو شاعری میں مربوط نظری شاعری کے ذریعے فلسفیانہ استفسارات کا اسلوب تیار کیا ہے

۳۔ اقبال نے نہ صرف مروّجہ شعری علامتوں کے سیاق و سباق میں معنوی تغیرات کئے ہیں بلکہ نئی فلسفیانہ علامتوں کی تشکیل کی ہے۔

۴۔ لسانی سطح پر اردو شاعری کا لسانی اسلوب جو محدودیت کا شکار تھا اُس میں ہر طرح کی معنویت سے اظہار کی سکت پیدا کی ہے۔

۵۔ سب سے بڑھ کر اقبال نے شعر اور عدم شعر کے تمام فروعی اختلافات کو ختم کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ شاعری کسی خاص موضوع سے وابستہ نہیں ہے۔ تمام زندگی کو شعر کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔

"تصورات" کا آخری حصہ غیر ملکی ادیبوں اور فنکاروں کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں ایرپکا یونگ، سینگور، ایذرا پاؤنڈ، پابلو نرودا، اور پکاسو پر مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ مغربی نقادوں کی آراء کو پڑھ کر نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ یہ انیس کے براہِ راست تجربے اور مطالعے کا نتیجہ ہیں ان مضامین سے انیس کی وہ دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے جو اُسے گذشتہ کئی سالوں سے عالمی ادب سے وابستہ کئے ہوئے ہے اور بالخصوص فرانسیسی ادب سے کہ جس کے نہایت شاندار تراجم اُس نے پیش کئے ہیں۔ جن سے درحقیقت اردو ادب میں تخلیق و تجربے کی ایک نئی دنیا کا ظہور ہوا ہے۔

ثروت حسین

رئیس فروغ

عذرا عباس

ابن الحسن

ماہِ نو
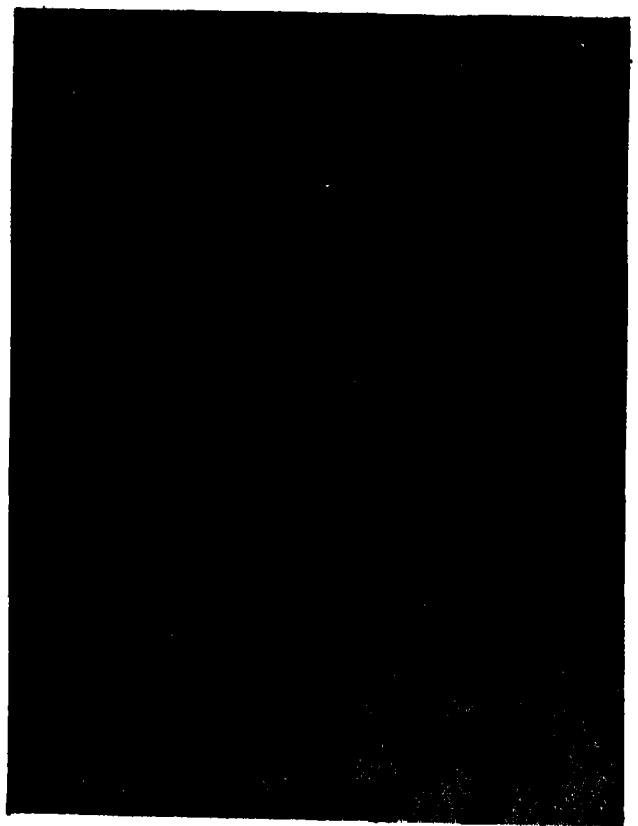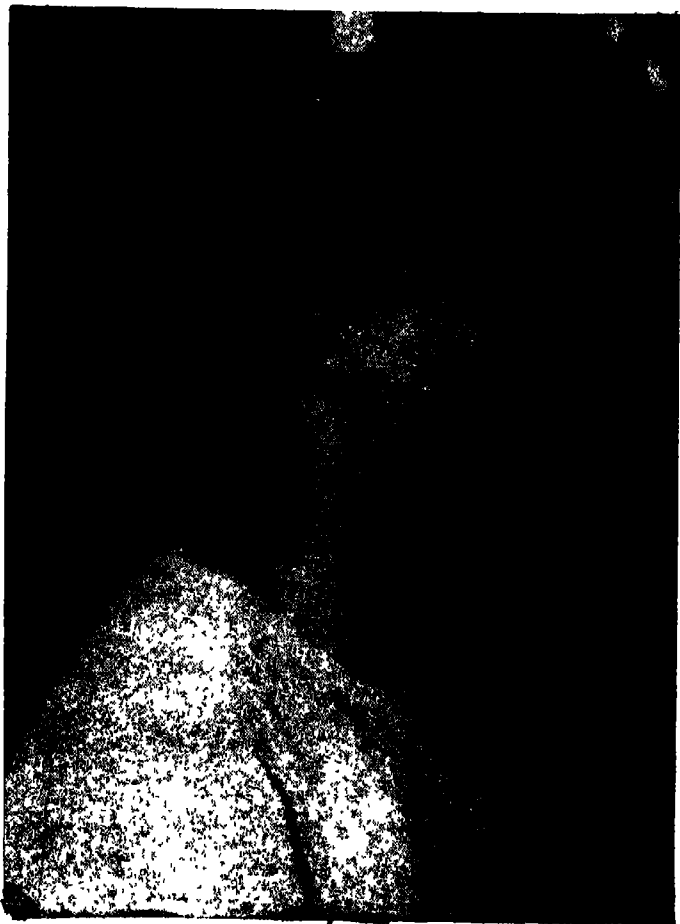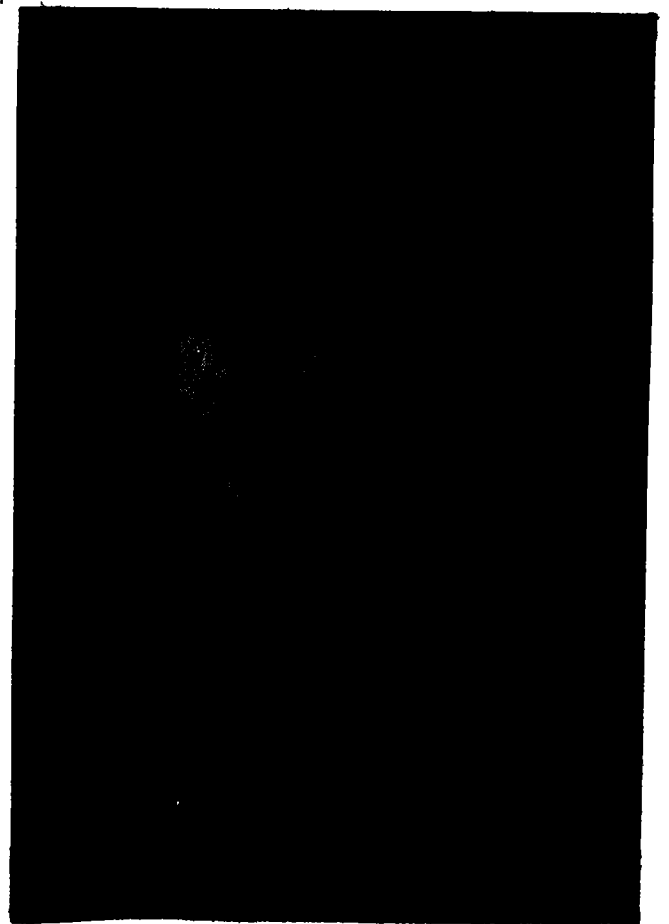
جاوید سے

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ
ہے اس کی نہاد کافرانہ

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو
ہے اس کا مذاق عارفانہ

"غافل منشیں نہ وقتِ بازی ست
وقتِ ہنر است و کارسازی ست"

محمد اقبال
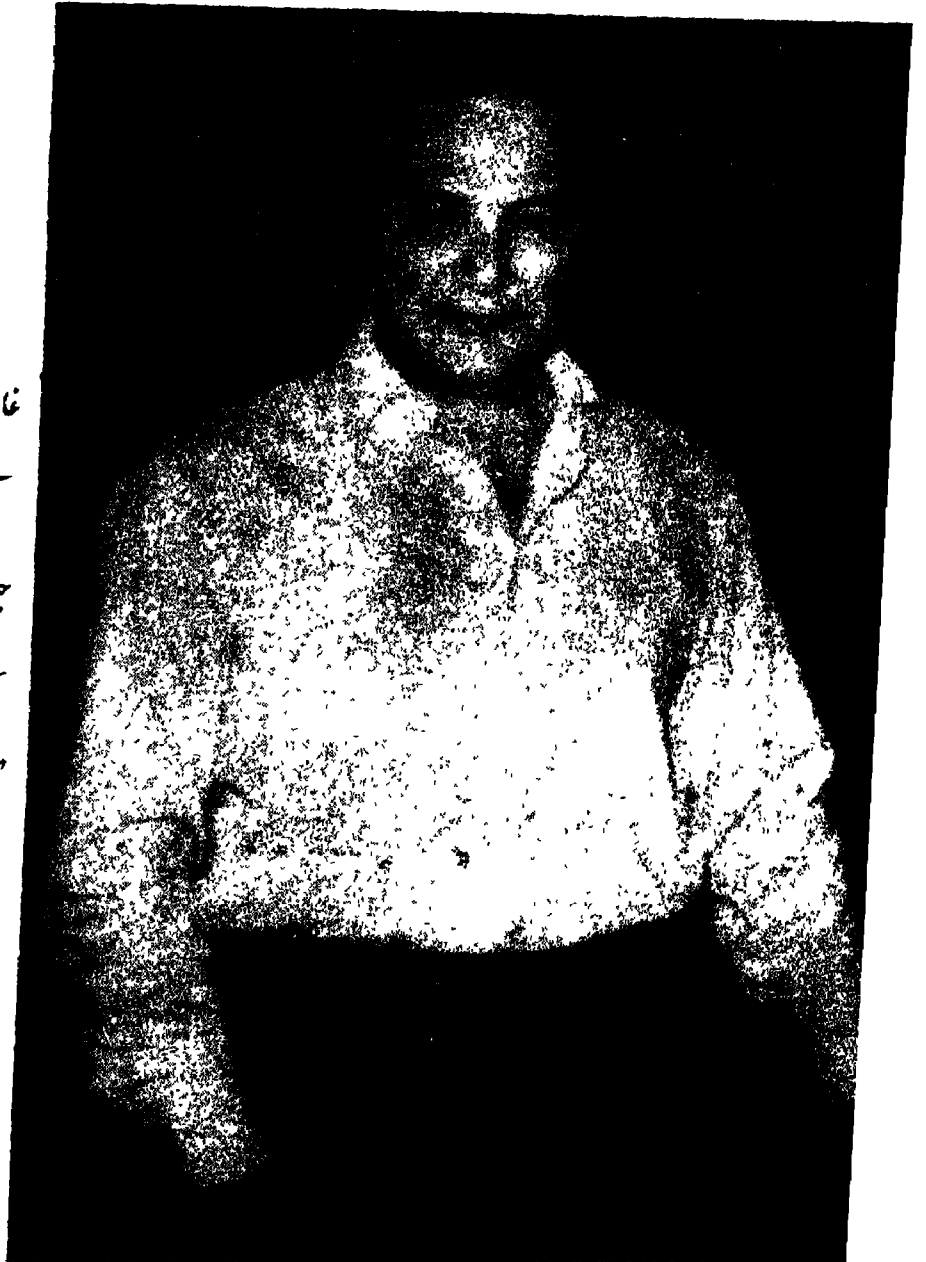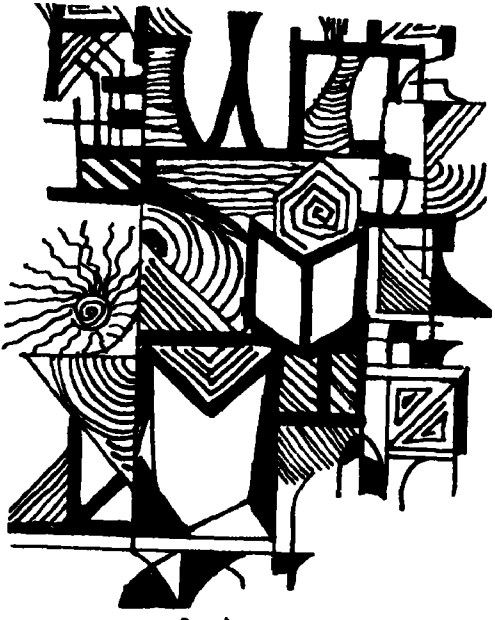
اوراقِ گذشتہ کی کتاب

مجید امجد
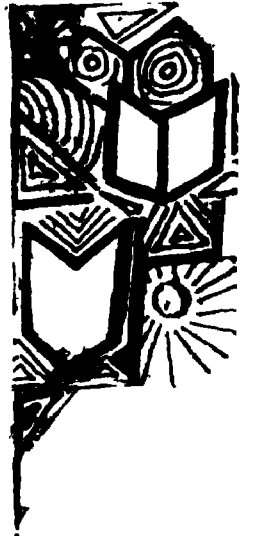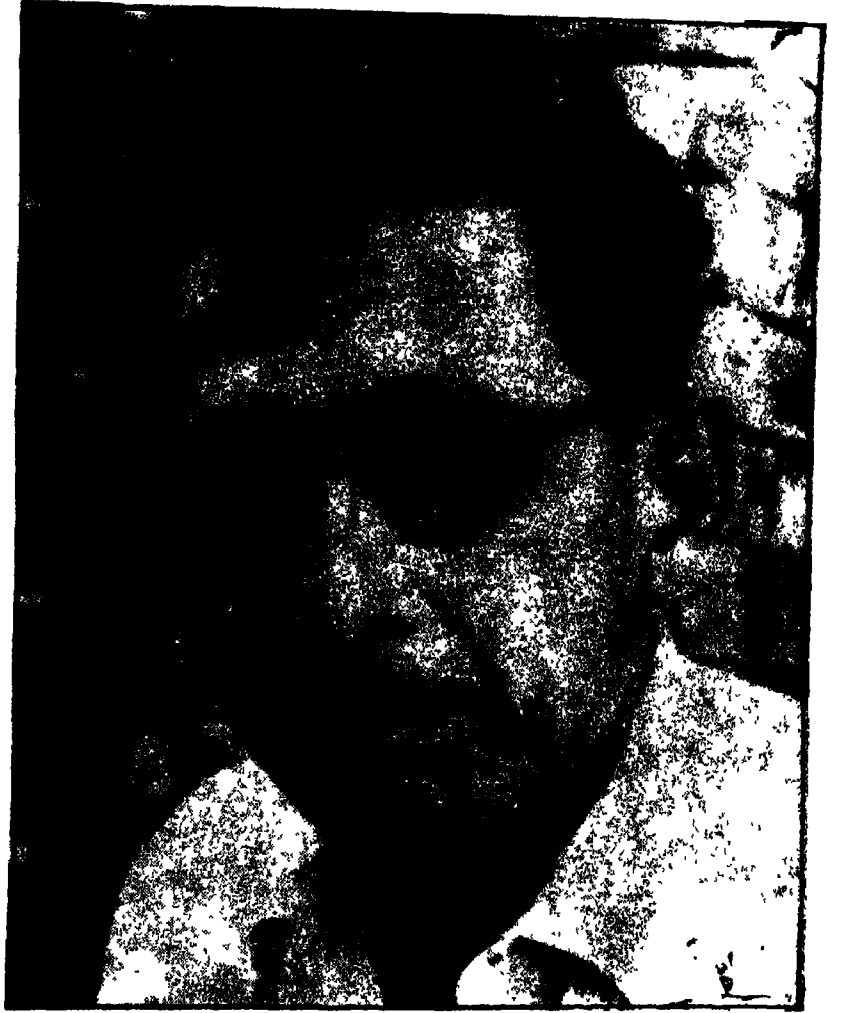
یادگار شاعر :۔ راغب مرادآبادی (کھڑے ہوؤں میں پہلے نمبر پر)
جناب قائداعظم اور لیاقت علی خاں نشستہ ہیں

مئی ۱۹۷۹ء

صدر مجلسِ ادارت
سیّد امجد علی

چیف ایڈیٹر
کشور ناہید

ایڈیٹر: علی محمد حسینی
جائنٹ ایڈیٹر: قائم نقوی

ترتیب

مضامین

نعتیہ نظم

نظمیں

افسانے

غزلیں

سرورق ـــــــــ موجد

آئندہ شمارے کی جھلکیاں

ڈاکٹر وحید قریشی، انتظار حسین، قتیل شفائی، شان الحق حقی، جیلانی کامران، ڈاکٹر لیئق بابری، نظیر صدیقی، ساقی فاروقی، جمیل ملک، رشید امجد، نجم الحسن رضوی انجم اعظمی، ریاض صدیقی، توصیف تبسم، اے۔ بی۔ اشرف، شجاعت علی راہی۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۱۸ — جلد نمبر ۳۲ ـــــــ شمارہ نمبر ۵ — طلباء کیلئے مع رجسٹری فیس ۲۰ روپے

قیمت: ۲/ روپے — سالانہ چندہ مع رجسٹری فیس ۳۰ روپے

مطبوعات پاکستان نے دین محمدی پریس مل روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہ نو ۳۲ اے حبیب اللہ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

تحریکِ خلافت کا اثر بلوچستان پر

تحریکِ خلافت سے برِّصغیر کے مسلمانوں کی جذباتی وابستگی تھی۔ اسی لئے اُس دور میں وہ مشہور نظم "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" جس میں بی اماں کی جانب سے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی سے خطاب کیا گیا ہے بچے بچے کی زبان پر تھی۔ اُس نظم کا پہلا اور آخری بند یہ ہے:

اے مرے لاڈلو مرے پیارو
اے مرے دل جگر کے سہارو
اے مرے چاند اے مرے تارو
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

حشر میں حشر برپا کروں گی
پیشِ حق تجھ کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اس زمانے میں بلوچستان کے اندرونی حصوں میں سفر کرنے کی سہولتوں کی کمی، تعلیم کے زیور سے بے بہرہ ہونا، عوام کی پسماندگی، آبادی کا کم ہونا اور دور دور تک پھیلاؤ تو ایک جانب تھا، دوسری طرف حکومتِ وقت کی سخت سے سخت پابندیوں کے شکنجے تھے۔ انہی پابندیوں کے پیشِ نظر انگریزی حکومت نے سیاسی اور مذہبی تحریکوں کی نشر و اشاعت پر بھی پابندی عائد کر رکھی تھی۔ حکومت اوّل تو اس بات کی خواہاں تھی کہ اس خطّے میں کوئی اخبار جاری ہی نہ ہو اور اگر جاری ہو بھی تو صرف حکومت کا نقیب اور اس کی پالیسی کا علمبردار رہے۔

برِّصغیر کے دوسرے شہروں سے جو اخبار بلوچستان میں آتے تھے اُن کے پڑھنے والے سی۔ آئی۔ ڈی کی نظروں میں رہتے تھے۔ اُن دنوں یہاں سیاسی گفتگو کی بھی اجازت نہ تھی۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کانگریس، مسلم لیگ، خلافت، خاکسار وغیرہ سے متعلق اگر کوئی شخص کوئٹہ میں آجاتا یا تو اُسے فی الفور واپس جانے کا حکم ملتا یا پھر اُس کی زبان بندی ہو جاتی ــــ ان حالات میں بلوچستان کا ماحول اگرچہ اس قبیل کی تحریکات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی اہلِ ہمت سے یہ خطہ سراسر محروم نہیں رہا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد برِّصغیر کے مسلمانوں کے ردِّعمل کی دو صورتیں سامنے آگئیں یعنی مشترکہ جدوجہد یا الگ الگ کوششیں۔ انگریزوں کے خلاف ہماری مجاہدانہ سرگرمیاں انہی دو صورتوں میں اُجاگر ہوئیں۔

انگریزوں کے آخری مفتوحہ علاقوں میں سے ایک بلوچستان تھا جس پر وہ ۲۱ فروری ۱۸۷۷ء کو قابض ہوئے اور یہ متذکرۂ بالا ردِّعمل سے مستثنیٰ نہ تھا۔

بلوچستان میں انگریزوں کے خلاف عوامی سطح پر مسلح روک تھام کی گئی وہ ایک عوامی فرد غلام حسین مسوری بگٹی کی قیادت میں تھی لیکن اس کے نتائج بھی وہی برآمد ہوئے جو ہندوستان میں دوسرے مقامات پر ظاہر ہو چکے تھے۔ غلام حسین کی تحریک کی ناکامی اور اس کی اپنی موت نے جو ۲۶ جنوری ۱۸۶۷ء کو وقوع پذیر ہوئی، بلوچستانیوں پر عیاں کر دیا کہ انگریزوں کے خلاف ایسی جنگیں بے فائدہ اور گراں ہیں۔ اس لئے دوسرے ردِّعمل کی پیروی کی گئی ــــ!

چنانچہ دوسرے ردِّعمل کی رہنمائی یوسف علی خان عزیز مگسی نے کی جو سرسید کے خیالات اور ان کی اصلاحات، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریروں اور سیاسی نظریات

سے اثر پذیر ہوئے تھے۔ یوسف عزیز بچپن ہی سے محنتی اور غور و خوض کرنے والے تھے۔ وہ مگسی علاقے کے بڑے شہر جھل میں جنوری ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نواب قیصر خاں سوم کے دوسرے فرزند تھے جو مگسیوں کے سولہویں تمن دار ("تمن" ترکی لفظ ہے، یعنی دس ہزار، کوئی منظم قبیلہ جس کے افراد دس ہزار ہوں اور وہ کسی ایک سردار کے ماتحت ہوں، تمن کہلاتا ہے اور سردار کو "تمندار" کہتے ہیں) تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ آپ مختلف اساتذہ کرام سے فیضیاب ہوئے، آپ نے عربی، فارسی اور اردو پر عبور حاصل کرنے کے علاوہ انگریزی بھی پڑھی۔ یوں نواب نے اپنے بیٹے کی ذہنی اور شخصی تربیت کی بنیاد مذہب سے اٹھا کر علومِ جدید پر رکھی۔

یوسف عزیز بلوچستان میں سیاسی بیداری کے علمبردار اور قائد تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ علامہ اقبالؒ، مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر کے خاص عقیدت مند بھی تھے۔ آپ کے متعلق مولانا ظفر علی خان فرماتے ہیں:

تم کو خفی عزیز ہے، ہم کو جلی عزیز
عارض کا گل تمہیں ہمیں دل کی کلی عزیز
لفظِ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے
معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

۱۹۲۳ء میں نواب قیصر خاں نے ملتان ہجرت کی اور وہیں ۱۹۲۷ء میں عالمِ فانی سے کوچ کیا۔ نواب زادہ یوسف علی خاں عزیز نے بھی والد کی معیت میں ہجرت کی۔ انہوں نے چار سال تک ملتان میں قیام کیا اور پنجاب کی انقلابی فضا میں سانس لیا۔ یہاں نوابزادہ نے انگریزوں کے خلاف ملک کی ہمہ گیر جدوجہد سے آگاہی حاصل کی اور آزادی کے دوسرے کارکنوں کی طرح ریاست قلات کے وزیر اعظم سر شمس شاہ کے مظالم پر سوچنا شروع کیا — میر محمد امین کھوسو اپنے مضمون "بلوچستان کے اوّلین انقلابی رہنما" میں لکھتے ہیں: "بلوچستان کا اوّلین اولوالعزم نوجوان صاحبِ دل راہنما یوسف اعظم بلوچوں کے ایک سردار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یہ نوجوان دُنیا کی سب رعنائیوں سے واقف ہیں۔ سندھ، بلوچستان اور پنجاب کی مختلف بڑی بڑی سوسائٹیوں کی اسرارِ زندگی سے واقفیت حاصل کرنے میں یکایک گہرائیوں سے ایک سوال اٹھتا ہے کہ ان کی مادرِ وطن، صوبہ بلوچستان اور ان کی قوم بظاہر ذلیل و خوار ہے۔ ان کی جہالت کیوں اُن کی باہمی جنگ و جدل کا باعث بنی ہوئی ہے...

انہی سوالات کے جوابات پر جب غور و فکر کر رہے تھے تو انہیں علامہ اقبالؒ کا کلام دستیاب ہوا۔ اقبال کے کلام میں ایک صحیح آدمی کے صحیح جذبات کے اُبھارنے کی پوری طاقت موجود ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ آدمی بھی صحیح ہو اور جذبات بھی صحیح ہوں۔ شکوہ اور جوابِ شکوہ اور اقبالؒ کی دیگر نظمیں اس نوجوان سردار کی سیاسی راہنما بنیں اور آنا فاناً یہ ناز و نعم میں پلا ہوا نواب زادہ اپنی قوم میں سے جہالت اور مفلسی دُور کرنے کے خیال سے بلوچستان کے استبدادی حلقہ پر یلغار کرتا ہے۔

نواب زادہ یوسف علی خاں عزیز نے ایک مضمون نومبر ۱۹۲۹ء کے "مساوات" لاہور میں لکھا تھا جس میں قلات کے اس وقت کے وزیر اعظم کے کارناموں پر کڑی نکتہ چینی کی اور اس کی غیر آئینی پالیسیوں کو رد کیا۔ چنانچہ نوابزادہ ۱۹۳۰ء میں سبی آئے تو انہیں چار ماہ قید کی سزا دی گئی، ایک سال تک زیر نگرانی رکھا گیا اور ان پر ملک میں "تخریبی سرگرمیوں" کا بے بنیاد الزام لگا کر دس ہزار روپے جرمانہ کیا گیا۔ ان واقعات پر مگسی قبیلے کے لوگ بھڑک اُٹھے اور سندھ کی جانب جوق در جوق ہجرت کرنے لگے یہ افغانستان کی جانب برصغیر کے مسلمانوں کی ہجرت کی صدائے بازگشت تھی۔

ان تمام واقعات کا ذکر چونسٹھ صفحات پر مشتمل ایک پمفلٹ بعنوان "شمس گردی" میں ملتا ہے جو ۱۹۳۱ء میں لاہور سے چھپوایا گیا تھا۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں میر محمود خان دوم نے طویل بیماری کے بعد وفات پائی۔ میر محمد اعظم خان (۱۹۳۱ء — ۱۹۳۳ء) اس کا جانشین بنا، جس نے سر شمس شاہ کی پالیسی کے تباہ کن نتائج کو بھانپ لیا اور موصوف کو معطل کر دیا۔ اس کے بعد خان بہادر گل محمد، ضاد، کو وزارت عظمیٰ سونپی گئی، قبائلی مسائل حل کرنے کے [illegible] طریق اختیار کیا گیا اور ہجرت کر جانے والے مگسیوں کو واپس بلا لیا گیا۔ یوں یوسف عزیز نے کامیابی کے ساتھ ایک ڈکٹیٹر کا مقابلہ کیا۔ ان مصائب سے نجات پانے کے بعد انہوں نے مسلمانوں بالخصوص بلوچستان کے مسائل کے مختلف سماجی، سیاسی، اور معاشی پہلوؤں کا مطالعہ شروع کیا اور اپنی زندگی اُن کو سلجھانے کے لئے وقف کر دی، یہاں تک کہ

آپ مختلف بلوچ قبیلوں اور سرداروں کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوگئے چنانچہ آپ ہی کی تجویز پر پہلی "کل ہند بلوچ کانفرنس" ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کو جیکب آباد میں منعقد ہوئی۔

عبدالصمد دُرّانی اپنے مضمون "ہماری جدوجہد کا ایک باب" میں لکھتے ہیں: "بلوچ کانفرنس کی تجویز نے سب سے پہلے علیگڑھ یونیورسٹی میں جنم لیا، جہاں مرحوم نواب یوسف علی خان اپنے دیرینہ رفیق میر محمد امین خان کھوسہ سے ملنے گئے تھے۔ محمد امین خان اُن دنوں یونیورسٹی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ علیگڑھ کے اس تصوّر نے سندھ اور بلوچستان کے مقامِ اتصال یعنی خان گڑھ، (جیکب آباد) میں عملی جامہ پہنا۔"

کانفرنس کی صدارت کے فرائض خیرپور کے والی میر علی نواز خان تالپور کو سرانجام دینے تھے۔ لیکن وہ بیماری کے باعث نہ پہنچ سکے۔ اس لئے ان کا خطبۂ صدارت ان کے پرائیویٹ سیکرٹری نے پیش کیا۔ خان عبدالصمد خان نے صدارت کی۔ اُن کی تجویز پر کانفرنس کا نام "بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس" رکھا گیا۔ کانفرنس میں سندھ، کراچی، پنجاب اور بلوچستان کے دو سو مندوبین نے شرکت فرمائی۔

اس کانفرنس میں روزنامہ "زمیندار" لاہور کے مولانا اختر علی خان، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مبلغِ اسلام مولانا غلام فرید بھی شریک ہوئے تھے اور انہوں نے تقریریں بھی کی تھیں۔ پہلے دن بلبلانِ خلافت نے قومی ترانہ پڑھا تھا، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

وقت آگیا کہ باغ میں بلبل ہو نغمہ سنج
اور شاخِ گل کو مژدۂ فصلِ بہار دے

میر محمد امین کھوسہ اپنے مضمون "بلوچستان میں دینی سیاست کی بنیاد رکھنے کے لئے تاریخ کا ایک مبارک ورق" میں لکھتے ہیں کہ وہ کانفرنس کے زمانے (۱۹۳۲ء) میں علیگڑھ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہاں سے جیکب آباد آئے، پھر یوسف عزیز کے ہمراہ حضرت پیر صاحب برچونڈی شریف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ٹرین سے ڈھرکی اترے اور تانگہ میں برچونڈی شریف گئے۔ اسی راستے پر مولانا عبیداللہ سندھی پاپیادہ حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے ــــــــ برچونڈی شریف میں حضرت صاحب کی امامت میں یوسف عزیز اور امین کھوسہ نے نماز پڑھی۔ یوسف نے امین سے پوچھا کہ "کیا یہاں نماز ہمیشہ اسی طریقے سے ہوتی ہے؟" پھر کہا کہ "یہ تو جہاد پیدا کرنے والی نماز ہے۔" واپس ہوئے تو یوسف کا چہرہ متغیّر تھا۔ اس سے عیاں تھا کہ ان کا دل اس مقدس فضا سے بہت زیادہ متأثر ہوچکا تھا۔ برچونڈی شریف سے سٹیشن تک انہوں نے یہ مشہور قومی نظم لکھی جو کانفرنس کے آخری اجلاس میں بلبلانِ خلافت نے پڑھی، جس سے حاضرین متأثر ہوئے، اکثر صاحبان آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ہر طرف سے "اللہ اکبر" کے نعرے بلند ہوئے اور ملّی اور قومی جذبے کے جوش نے ہر شخص میں نئی روح پھونک دی۔

یہ ارادہ ہے کہ اسلام کا خادم بن کر
ساری دنیا کو نئے سر سے مسلماں کر دوں
پھر وہی بھولا سبق یاد دلاؤں سب کو
ہر بلوچ کو غرض عاملِ قرآں کر دوں
جی میں آتا ہے پھر طور کو آباد کروں
آتشِ دل سے پہاڑوں میں چراغاں کر دوں
گاندھی و مالوی کے وعظ دھرے رہ جائیں
میں اگر قولِ محمدؐ کو نمایاں کر دوں
جوش میں آکے اگر نعرۂ اللہ ماروں
حق و باطل کے تفاوت کو نمایاں کر دوں
میں وہ مجنوں ہوں اگر چاہوں جہاں کو یکسر
طرۂ یار کی مانند پریشاں کر دوں
اس قدر شعلہ فشاں بزمِ جہاں میں ہو جاؤں
ذرّے ذرّے میں بپا حشر کا ساماں کر دوں
میں وہ مالی ہوں کہ گر کھول دوں دل کی سوتیں
خشک صحراؤں میں پیدا گل و ریحاں کر دوں
اسی ایقانِ براہیم کا وارث ہوں عزیزؔ
اب بھی آتش کو اگر چاہوں گلستاں کر دوں

یوسف عزیز نے اہلِ بلوچستان کو اُبھارنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ کراچی سے مختلف اخبارات (البلوچ، بلوچستان، بلوچستانِ جدید اور ینگ بلوچستان) جاری کرائے جو یکے بعد دیگرے ضبط ہوتے رہے۔ مئی ۱۹۳۲ء میں آپ نے "بلوچستان کی آواز" کے نام سے ایک پمفلٹ طبع کرا کے برطانوی پارلیمان لندن کو بھجوایا۔ اپنے احباب کو اُردو میں بے شمار خطوط تحریر کئے جو نہ صرف ان کی اپنی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کے بارے

میں اصلاحی تقاضوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کے سماجی فلسفے کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی، یہ روح اُن کے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان ہو سکتی ہے۔

"خدائے قدوس کے نزدیک انفرادی زندگی کی صلاحیت جماعتی منفعت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں ہمیں طریقِ استدعا بتایا گیا، وہ جماعت کی طرف سے ہے فرد کی طرف سے نہیں۔ سورۂ فاتحہ کو دیکھئے:

"اِھدنا الصّراطَ المستقیم" ہے "اِھدِنِی الصّراطَ المُستَقِیم" نہیں "اَنعَمتَ عَلَیْھِم" اور غیرِ المغضوبِ عَلَیْھِم" یہ سب جمع کے صیغہ جات ہیں۔" گویا یوسف عزیز کے خیالات کے مطابق اسلام کا سماجی فلسفہ یہ ہے کہ انفرادی مفاد اجتماعی مفاد کے تابع ہو۔

۱۹۳۳ء میں نوابزادہ یوسف عزیز کو جھل مگسی کا نواب اور سردار بنا دیا گیا۔ آپ نے اپنے علاقے میں فلاح و بہبود کے متعدد کام کئے مثلاً کھیرتر نہر بنوائی جس سے سندھ کی سرحد کے قریب علاقہ مگسی کا خاصا رقبہ سیراب ہوا۔ کوٹ یوسف علی خان کے نام سے ایک قصبے کی بنیاد ڈالی اور وہاں اسکول قائم کیا۔ اس زمانے میں پچاس ہزار روپے کے ذاتی عطیے سے "جامعہ یوسفیہ عزیزیہ" دینی درسگاہ قائم کی مزید برآں غریبوں کے لئے شفاخانہ کا انتظام کیا۔

"میزان" کوئٹہ میں مندرج ہے:

"آپ فروری ۱۹۳۴ء میں قومی تحریکِ آزادی کے سلسلے میں انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ جبکہ سر نارمن کیٹر جیسا قدامت پسند انگریز بلوچستان میں اے جی جی تھا۔ بمبئی مالا بار ہل میں حضرت قائدِ اعظم کی خدمت میں مرحوم یوسف کئی بار حاضر ہوئے اور انگلستان سے واپس آ کر ۱۳ جنوری ۱۹۳۵ء کے دن بھی مرحوم نواب یوسف علی خان قائدِ اعظم سے ملے۔"

یوسف عزیز نے انگلینڈ کے تعلیمی اور سماجی اداروں کا مطالعہ کیا اور لندن میں اپنے قیام کے دوران ایک دارالاقامہ بنانے کی تجویز پیش کی تاکہ جب بلوچستان کے طلبہ وہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے جائیں تو وہاں قیام پذیر ہو سکیں۔

لندن سے واپسی پر اُن کے ساتھی محمد حسین عنقا نے مولانا ظفر علی خان سے ایک نظم حاصل کر کے اپنے اخبار کے صفحۂ اوّل پر شائع کی۔ اُس کے دو شعر یہ ہیں:

مبارک ہو یوسف علی خان کی آمد
گلستاں میں فصلِ بہاراں کی آمد
گل و لالہ و ارغواں کو مبارک
برستے ہوئے ابرِ نیساں کی آمد

آپ کے دوستوں اور عقیدت مندوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ آپ نے واپسی پر "سیاسیات مقدم ہے یا اقتصادیات" کے عنوان سے ایک زوردار مضمون لکھا جس میں اپنے خیالات اس طرح پیش کئے۔

"وہ اشخاص جو دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کر کھانے کی استطاعت رکھتے ہیں، کیا انگلیوں پر نہیں گنے جا سکتے؟ ہمارے دیہات کی منتشر آبادی، جن کو نہ سونے کا ڈھنگ ہے، نہ کھانے کی تمیز اور پھر سردار پرستی، بیماریوں سے بھرے ہوئے غلیظ گھروں اور سالہا سال کے پرانے کپڑوں کا، جو جراثیم کا آشیاں بنے ہوئے ہیں، استعمال دردناک نہیں؟"

لندن سے واپسی پر آپ حسبِ سابق پھر قومی سرگرمیوں میں منہمک ہو گئے مگر افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اور آپ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کی رات کوئٹہ کے خوفناک زلزلے کا شکار ہو گئے۔

عزیز! موت کا جب ایک دن معین ہے
مجاہدوں میں کرائیں نہ کیوں شمار اپنا

یوسف عزیز کی شاعری کے واسطے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیسے بلوچستان کے سیاسی شعور کی کڑیاں اُس وقت کے ہندوستان کے اُس بھرپور سیاسی شعور سے جا ملتی ہیں جس کا اُردو میں علامہ اقبالؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ظفر علی خان اور دیگر کئی چھوٹے بڑے شاعروں کے ذریعہ سے اظہار ہو رہا تھا اور جس کے باعث پہلے اُردو ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی اور پھر تحریکِ پاکستان کی زبان بنی۔

پختونوں کی ایک روایت کے مطابق قیس عبدالرشید جو کسے غر (کوہِ سلیمان، ژوب، بلوچستان) کے رہنے والے تھے ہادیِ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔ اس قبیلے نے اسلام کو اس انداز سے اپنایا کہ پھر اسے کفر و ضلالت کا کوئی بھی حملہ مغلوب نہ کر سکا۔ چنانچہ اسلام پختون ثقافت کا ایک غیر فانی جزو بن کر رہ گیا۔ پختونوں نے نہ صرف یہ کہ جہاد کی خاطر ہزاروں سپاہی متعدد نامور جرنیل فراہم کئے بلکہ تبلیغِ اسلام کے لئے بہت سے

علماء و صوفیا بھی پیدا کئے۔ انہی عظیم پختون بزرگوں میں ایک اہم شخصیت شیخ البلوچستان علامہ محمد فاضل درخانی رئیسانی (۱۸۳۰ء — ۱۸۹۶ء) تھے، جنہوں نے نہ صرف براہوئیوں کے دلوں کو ایک بار پھر نورِ اسلام سے تابندہ کیا بلکہ عالموں، فاضلوں، مفسّروں اور مبلّغوں کا ایک ایسا نامور گروہ پیدا کر دیا جس نے بلوچستان پر عیسائیت کی یلغار کو کسی طرح بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے دیا۔ اس گروہ میں علامہ محمد عمر دین پوری کا نامِ نامی سرِفہرست تھا۔

مولانا محمد فاضل درخانی کے ایک مایۂ ناز شاگرد مولانا عبدالحی تھے۔ انہوں نے تبلیغ و تلقین کے علاوہ سلسلۂ مطبوعات بھی جاری رکھا۔ ویسے تو اُن سے بہت سے لوگوں کو بہرہ ور ہونے کا موقع ملا۔ مگر ان کے عظیم ترین شاگرد مولانا محمد دین پوریؒ تھے۔

وہ مستونگ (قلات ڈویژن) کے قبیلہ بندرانی میں پیدا ہوئے اور مدرسۂ درخان سے مستفید ہوئے —— آپ بیک وقت مصنّف، مبلّغ مترجم، مفسر، مؤلف اور فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک علمی سیاسی کارکن بھی تھے اور نظم و نثر دونوں پر یکساں طور پر حاوی تھے۔ آپ نے اڑتالیس کتب براہوئی زبان میں تصنیف و تالیف کیں اور اس اعتبار سے وہ براہوئی کے سب سے بڑے مصنف ہیں، بہت سے مسودات و مخطوطات بھی محفوظ و موجود ہیں جو ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن پاک کا براہوئی زبان میں ترجمہ ہے جس کی شستگی کی تعریف کی گئی ہے۔ اُس وقت تک یورپی مشنری بلوچستانی میں نگ و دو کے ساتھ مصروفِ تبلیغ تھے۔ اور انہوں نے ۱۹۰۷ء میں انجیل کا براہوئی ترجمہ شائع کر دیا تھا۔ مولانا کا ترجمۂ قرآن حکیم ۱۹۱۵ء (۱۳۳۴ھ) میں طبع ہو کر براہوئیوں کے لئے ڈھال بن گیا۔

ادبی لحاظ سے ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب "سودائے خام" ہے جو ۱۳۵۵ھ میں چھپی، کُل صفحات ۱۳۶ ہیں۔ یہ کتاب عشقیہ غزلیات، کافی مولود شریف، مناجات سی حرفی ابیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ براہوئی نثر میں اُن کی کتاب "آئینۂ قیامت" بہت اہم ہے۔ یہ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئٹہ کے ۱۹۳۵ء کے زلزلہ کی حشر سامانیوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور نیک اعمال کی تلقین کی ہے کتاب تاریخی دستاویز کی حیثیت کی مالک ہے اور کوئٹہ کے بارے میں خاصا تاریخی مواد دستیاب ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں آپ کا نعتیہ کلام بھی پُرکشش ہے۔

انگریزوں کے خلاف مُلک بھر میں جو جد و جہد جاری تھی مولانا محمد عمر اس سے لاتعلق نہ رہے۔ اور مولانا عبیداللہ سندھی سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے آپ کو دعوتِ عمل دی۔ یہ دور ہنگامہ خیزیوں کا تھا۔ سارا ملک انقلابی نعروں سے گونج رہا تھا۔ انگریز خلافتِ اسلامیہ کے خاتمہ کے درپے تھے۔ ترکی "مردِ بیمار" مشہور ہو چکا تھا۔ اس پُر آشوب موقع پر علی برادران نے تحریکِ خلافت کا نعرہ بلند کیا۔ ترکِ موالات کی تحریک سے مولانا محمد عمر دین پوری نے صرفِ نظر نہ کیا۔ وہ مردِ میدان ثابت ہوئے اور مولانا عبیداللہ سندھی تحریک کو لبیک کہتے ہوئے افغانستان جا پہنچے — جب تحریکِ خلافت ختم ہوئی تو واپس لوٹے۔

واپسی پر جیکب آباد کے قریب ایک بستی، "دین پور" بسائی اور وہیں تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں مصروف رہے۔ مگر آخری عمر میں —— "نٹر بینٹ" علاقہ جھالاوان آگئے اور آخری دم تک مصروفِ تبلیغ و تلقین رہے۔ آپ کے درجنوں رفیقِ کار تھے اور ارادتمندوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ آپ نے ۱۹۳۸ء میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی۔ آپ کے ایک لختِ جگر مولانا عبداللطیف آپ کے سامنے اللہ کو پیارے [illegible] دوسرے فرزند مولانا محمد شریف بھی زیادہ عرصہ [illegible] نہ رہ سکے۔ البتہ آپ کی صاحبزادی مائی تاج بانو نے تصنیف و تالیف کے ذریعے آپ کا مشن جاری رکھا۔

علامہ محمد عمر کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

پنتیاں خنخے تینو نفیس،
بینگ کننگان فارغ کرنیس

یعنی جب سے تجھے دیکھا ہے تو تو نے میری آنکھیں دوسروں کی طرف سے بند کر دی ہیں اور مجھے کھانے پینے سے بے نیاز کر دیا ہے گویا میں فنا فی المحبوب ہو گیا ہوں۔

مولانا ممتاز علی مرحوم قصبہ انبیٹہ ضلع سہارنپور (یوپی) سے ۱۸۸۵ء میں کوئٹہ تشریف لائے تھے۔ آپ عالم دین اور سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ میں السنۂ شرقیہ کے مدرس تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے گھر پر بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ کے اندوہناک زلزلہ کے بعد وہ فارغ

وقت میں تعلیم یافتہ لوگوں کی محفل میں شامل ہوتے اور وہاں تحریکِ خلافت، جنگِ طرابلس اور سلطنتِ عثمانیہ کے بکھرنے کے حالات ایسے دلپذیر انداز میں بیان فرماتے کہ سامعین نہ صرف متأثر ہوتے بلکہ اُن کے دلوں میں اسلام کی عظمت راسخ ہوتی اور قومی آزادی کی لہر دوڑ جاتی۔ انہی ایام میں تعلیم یافتہ افراد حاجی فضل الٰہی مرحوم کے "دتو ہوٹل" واقع قندھاری بازار میں جمع ہوتے اور انگریزوں کی طرف سے مامور مخبر پولیس کے باوجود "زمیندار" "سیاست" "احسان" اور "انقلاب" کا مطالعہ کرتے اور قومی معاملات پر تبادلۂ خیالات کا سلسلہ جاری رکھتے۔

بلوچستان میں تحریکِ خلافت سے متأثر ہونے والی اہم شخصیتیں گویا نواب زادہ یوسف علی خان عزیز، علامہ محمد عمر دین پوری اور مولانا محمد امتیاز علی فقط تین انسان ہی نہیں تھے بلکہ وہ اپنے جلو میں ایک ایک انجمن لئے ہوئے تھے، جن کے حلقۂ اثر کی تعداد سینکڑوں ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ یہ سب کچھ اُس ماحول میں تھا جہاں انگریز کی عائد کردہ ان گنت پابندیاں ہی پابندیاں تھیں جن کا مختصر سا ذکر بھی اس مقالے میں کیا گیا ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے کیا درست کہا تھا:

کیا لائیں گے خاطر میں خمِ خانۂ لندن کو
مستِ مئے یثرب ہیں رندانِ بلوچستان
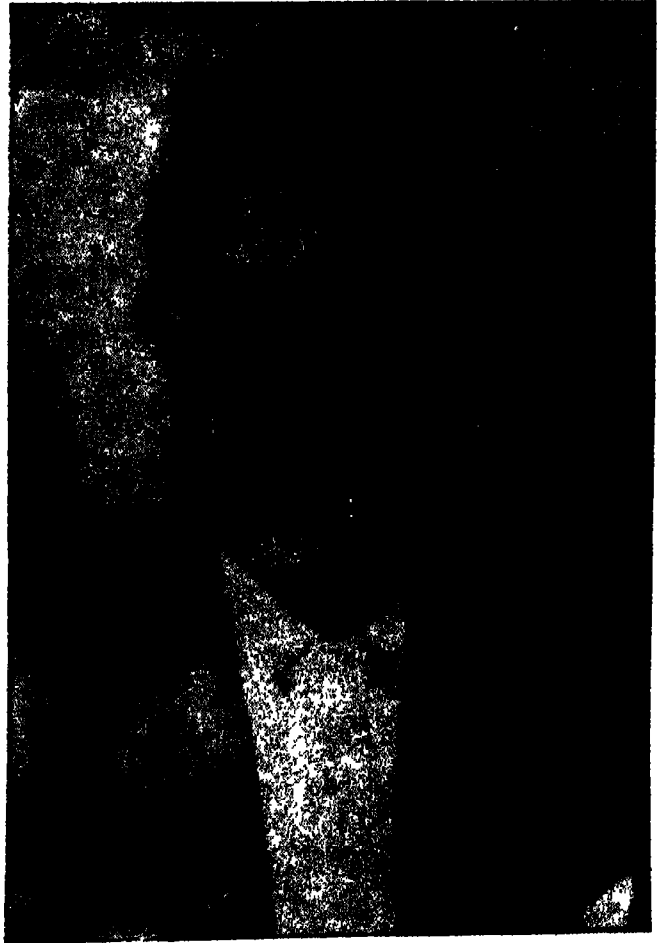
محشر بدایونی

کوئی موسم ہو مرے چھب مرا رنگ اپنا ہے
میری یہ وضع کہ بے وضع ہیں منظر میرے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

جدید اردو غزل اور تہذیبی سائے

غزل، اردو شاعری کی سب سے جاندار اور معتبر روایت ہے۔ اس روایت میں اور بھی خوبیاں ہیں لیکن جاندار اور معتبر میں نے پورے سوچ بچار کے بعد کہا ہے۔ جاندار اس لئے کہ امیر خسرو سے لے کر آج تک کی لمبی مسافت میں اس پر تھکن کے آثار اب تک نمودار نہیں ہوئے۔ اگرچہ اس کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، رکاوٹیں کھڑی کی گئیں، ہر طرح طرح سے ہدفِ ملامت بنایا گیا۔ کسی نے نئے تجربوں کی آڑ میں اسے لکیر کا فقیر گردانا، کسی نے اس کی دنیائے تنگ و تاز کو محدود بتایا۔ کسی نے اسے محض سفلی جذبات اور عاشقانہ چونچلوں کا ترجمان ٹھہرایا، کسی نے درباری شعرا کی ذہنی عیاشیوں اور خوش فعلیوں کا مظہر قرار دیا۔ کسی نے اُسے وحشی آوارہ مزاج بتایا کسی نے اس کے وجود کو زندگی اور شاعری دونوں کے لئے سمِ قاتل ٹھہرایا۔ آخر آخر یہ ہوا کہ دو پٹھان شاعروں شبیر حسن خاں جوش اور عظمت خاں نے اسے گردن زدنی قرار دے دیا۔ امکان تھا کہ جان سے ماری جاتی مگر بچ نکلی، نہ صرف بچ نکلی بلکہ یگانہ کے لفظوں میں زہر خندِ مردانہ کے ساتھ حاسدوں کو ڈستی اور احمقوں پر ہنستی ہوئی حریفوں کی نظر اور حدِ قیاس سے بہت آگے نکل گئی۔ غزل کی روایت کو میں نے معتبر اس لئے کہا ہے کہ اس نے کبھی اور کسی حال میں بھی اپنے ماحول اور ماحول کے تقاضوں کو فراموش نہیں کیا۔ زندگی کی تزئین و تعمیر سے آنکھ نہیں چرائی۔ دکھ سکھ اور عروج و زوال ہر زمانے میں وہ تہذیبِ انسانی کی نقیب و حلیف رہی ہے۔ ترقی ترقی کے دنوں میں بھی اپنی وضعداری، رکھ رکھاؤ اور آن بان پر حرف نہیں آنے دیا کسی شاعر نے اپنی کم مائیگی سے اُسے خراب کیا ہو تو اور بات ہے، اس نے اپنی ذات سے کسی کو خراب نہیں کیا۔ ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میر، سودا، مصحفی، آتش، مومن، غالب، حالی، شاد، امیر، داغ، اقبال، حسرت موہانی، اصغر، فانی، جگر، یگانہ، فراق اور فیض سے لے کر، ندیم، شاد عارفی، مجید امجد، وزیر آغا، جذبی، مجروح، ناصر کاظمی، قابل اجمیری، شکیب جلالی، شہزاد احمد، منیر نیازی، ظفر اقبال، سلیم احمد، شاعر لکھنوی، کشور ناہید، ادا جعفری، سجاد باقر رضوی، حمایت علی شاعر، عزیز حامد مدنی، مصطفےٰ زیدی، اقبال عظیم، محسن احسان، احمد فراز، اطہر نفیس، ناصر زیدی، سلیم کوثر، فہمیدہ ریاض، سحر انصاری، ثروت حسین اور پروین شاکر تک ایک دو نہیں سیکڑوں شعرا کی گواہیاں غزل کے رتبۂ اعتبار پر ثبت ہیں۔

اس رتبۂ اعتبار کو پہنچنے تک اردو غزل کئی تہذیبی منزلوں سے گزری ہے۔ ابتداً ایک مدت تک وہ محبت اور تصوف کے سائے میں رہی۔ کبھی مجاز کے نام سے کبھی حقیقت کے نام سے۔ لیکن ہر حال میں یہ سایہ اتنا گھنا تھا کہ اس کے تلے رومانی جذبے اور بعض لطیف محسوسات تو پروان چڑھے، تفکر و تامل کے انکھوے نہ پھوٹ سکے۔ البتہ انیسویں صدی عیسوی کے نصفِ اول میں، مغربی اقوام و افکار کی یورش نے اس سایہ دار درخت کو جڑ سے ہلا دیا۔ ایسا پت جھڑ لگا کہ پھر اس کی شاخوں میں دورِ اول کی سی ہریالی و شادابی نہ پیدا ہو سکی۔ نتیجتاً واماندگیٔ شوق نے دوسری پناہیں تلاش کیں۔ جا بجا دل عزیز تھے اس لئے لوگ اپنی ذات کے خول سے نکلنے، خارجی حقائق سے آنکھ ملانے اور زندگی کے بارے میں غور و فکر سے کام لینے پر مجبور ہو گئے۔ غالب نے اس سلسلے میں پہل کی۔ کلکتے کے حوالے سے تامل و تفکر اور جدیدیت و انفرادیت کا وہ تیر مارا کہ ہائے ہائے اب غزل کا کینوس ہنگامۂ آرائش خم کاکل اور سبادہ و ساغر تک محدود نہ رہا بلکہ مشاہدۂ حق کی گفتگو اور اندیشہ ہا سے

دور دراز تک پہنچ گیا۔ امیر و داغ نے راستہ روکنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ حالی آگے بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے غالب کی ایجاد کردہ اندازِ غزل سرائی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اقبال نے غزل کو خیال و خواب کی دنیا سے نکال کر کلی طور پر حقیقت اور سچائی کی کشادہ فضا میں داخل کر دیا۔ مولانا حسرت موہانی نے اسے تہذیبِ عاشقی کی نئی آن بان عطا کی۔ فانی نے غمِ روزگار و غمِ جاناں میں حکیمانہ رنگ بھرا۔ اصغر نے بے جان تصوف کو سرودِ زندگی اور نشاطِ روح سے ہم کنار کیا۔ جگر نے غزل کو تازہ سرمستی اور جوشِ زندگی بخشا۔ یگانہ نے بے باک اور مردانہ لہجہ دیا۔ فراق و فیض نے غزل کے جمال و جلال کو آفاقی سطحوں سے متعارف کرایا اس طرح جذبہ و احساس میں لپٹی ہوئی فکر و نظر کی یہ لکیر جسے فرد کے حوالے سے اجتماعیت کی نمائندہ کہنا چاہیے اور جس پر اصلاحی و تعمیری رجحان کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اردو غزل میں ترقی پسند تحریک اور اس کے کچھ دنوں بعد تک بہت صاف نظر آتی ہے۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد اس لکیر کا رنگ بہت مدھم پڑ گیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اصلاحی نقطۂ نظر سے سوسائٹی کے اجتماعی تقاضوں کا احساس اور اس احساس کی تبلیغ و ترسیل کی اہمیت گھٹ گئی اور فرد کے ذاتی احساس کی قدر و قیمت روز بروز بڑھتی گئی۔ سوچ اور طرزِ احساس کی یہ تبدیلی بے سبب نہیں، اس کا جواز اور پس منظر ہے۔

برصغیر میں مسلمانوں کے فاتحانہ داخل ہونے کے بعد، یہاں کی تہذیبی زندگی پر دو خاص حادثے گزرے ہیں۔ ایک ۱۸۵۷ء میں دوسرا ۱۹۴۷ء میں ہر چند کہ پہلا حادثہ طوقِ اسیری لے کر آیا تھا۔ اور دوسرا پیغامِ آزادی۔ لیکن بعض وجوہ سے جتنا جانکاہ اور تباہ کن دوسرا حادثہ تھا پہلا نہ تھا۔ گھربار، جان مال اور عصمت و عفت کی جتنی قربانیاں حصولِ آزادی کے وقت دی گئیں، شاید قبولِ غلامی کے وقت نہیں دی گئیں اور تہذیبی زندگی کا شیرازہ جیسا ۱۹۴۷ء میں منتشر ہوا، ۱۸۵۷ء میں نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کے مصداق ہمارے عہد نے اس کے اثرات کو پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ اس کے برعکس ۱۹۴۷ء کی جدوجہدِ آزادی، چونکہ براہ راست ہمارے عہد سے متعلق تھی۔ اس لئے اس کی تباہ کاریوں کا احساس بھی ہمیں براہِ راست اور شدید ہوا۔ اس شدتِ احساس کا بھی خاص سبب تھا۔

آزادی سے جو توقعات، ہم نے کی تھیں۔ وہ پوری نہ ہوئیں۔ عام طور پر یہ سمجھا گیا تھا کہ آزادی کی خاطر، معاشرے کو خاک و خون کے جس سیلاب سے گزرنا پڑا ہے اور اس کے جسم و جان پر جو زخم آئے ہیں آزادی کے بعد ان پر مرہم رکھا جائے گا۔ اور بہت جلد مندمل ہو جائیں گے۔ افلاس و غربت بیماری و جہالت، تعصب و نفرت، خیانت و رشوت اور ذخیرہ اندوزی و چور بازاری کی وہ ساری لعنتیں جنہیں بدیسی حاکموں کی آوردہ بتایا جاتا ہے، ختم ہو جائیں گی یا کم از کم انہیں ختم کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بلکہ آزادی اگر، واقعی کسی کو راس آئی تو اسی طبقے کو راس آئی جو لوٹ کھسوٹ اور بے ایمانی و بددیانتی میں مہارت رکھتا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ کچھ تو وقت کے تقاضوں اور بیشتر ہماری ناعاقبت اندیشی کے سبب اقتصادی ڈھانچے میں ایسی تبدیلی آئی کہ معیشت کی باگ ڈور، زراعت و تجارت کے ہاتھ سے نکل کر مشینوں کی گرفت میں آگئی، پیداوار کے وسیلے کچھ سے کچھ ہو گئے۔ مشینوں کی مانگ بڑھ گئی آدمیوں کی ضرورت کم ہو گئی صنعت کاری کے نام سے دولت اور دولت کمانے کے سارے ذرائع شہر کے چند خاندانوں کے ہاتھ میں آگئے اور ملک کے بیشتر باشندے بلکہ راجہ پرجا سبھی ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے لگے۔ آخر کار، امیر و غریب کے دو نئے طبقے، صنعت کار اور مزدور کے نام سے سامنے آگئے اور پھر ان کے درمیانی فاصلے، حکمرانوں کی نااہلی، سیاسی رہنماؤں کی بے بصری، سرمایہ داروں کی زرپرستی اور اہلِ دانش کی بے بسی کے سبب روز بروز بڑھتے گئے۔

جب صورتِ حال یہ ہو، تمدنی زندگی میں کوئی اجتماعی نقطۂ نظر کہاں سے پیدا ہوتا؟ کوئی تہذیبی روایت یا تہذیبی قدر کیسے جنم لیتی اور کیوں کر پروان چڑھتی؟ بچا کچھا جو پرانا تہذیبی سرمایہ تھا وہ بھی نئی نسل تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو گیا۔ آدمی سے آدمی دور بھاگنے لگا۔ نہ معاشرے نے فرد کی تادیب و تنظیم کی ذمہ داری قبول کی اور نہ فرد نے معاشرے یا معاشرتی قدروں کے تحفظ کی جانب توجہ دی۔ نتیجتاً دونوں کا رشتہ ایک دوسرے سے یکسر منقطع ہو گیا۔ چار و ناچار فرد نے اپنی ذات کو اپنا مطمحِ نظر اور اپنے احساس کو اپنی زندگی کی پناہ گاہ بنا لیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی

روز افزوں ترقی اور اس کے مہلک اثرات و خطرناک عزائم نے اس پناہ گاہ کی فصیلوں کو کچھ اور بلند کر دیا۔ دیہی آبادی شہر کی طرف کھنچنے لگی اور صنعتی کارخانوں کی کثرت نے معاشرے کے چہرے سے تازگی، معصومیت اور شادابی چھین کر اس پر دھوئیں، گیس اور مکاری کی کالک لگا دی۔ رفتہ رفتہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضر اثرات کے خلاف، مغرب کے بعض مفکرین کے خیالات نے، شہریوں میں اپنے عہد سے ایک طرح کی بیزاری کا رجحان پیدا کر دیا۔ ادیبوں، شاعروں، مفکروں اور دانشوروں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے ان کی اپنی انفرادیت، بھیڑ بھاڑ میں گم ہو گئی ہے فرد مجمع میں کھو گیا ہے۔ وہ جو کچھ اپنی ذات سے ہے نہ تو اس کا اظہار کر سکتا ہے اور نہ اسے کارآمد بنا سکتا ہے۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع نے اسے اپنا غلام بنا لیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا ہونا نہ ہونا، اس کی اپنی ذات پر نہیں، ابلاغ عامہ کے وسائل پر منحصر ہے۔ ریڈیو ٹی وی، اخبار اور رسائل جس کا اشتہار دیتے رہیں وہ معتبر و موجود اور جسے نظرانداز کر دیں۔ وہ بے حقیقت معدوم۔ انتظامی اداروں، درس گاہوں، بنکوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے لوگ بھی انفرادی حیثیت سے مہمل ہیں۔ ان اداروں کا منتظم اعلیٰ اور ان کے چلانے والے چند نفوس ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ اور عوام الناس کی تقدیر، عملاً انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ انسان سے انسان کی لاتعلقی اور بے حسی کا عالم یہ ہے کہ سڑکوں پر حادثوں کے شکار زخمی تڑپتے اور مرتے رہتے ہیں، لیکن کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ کسی کا دل، ان پر نہیں پسیجتا۔

ایٹمی توانائی اور اس کی زائیدہ خودکار مشینیں بھی اب انسان کی خوشحالی اور مسرت کی ضمانت نہیں رہیں بلکہ ان کا وجود خوف و ہراس اور عدمِ تحفظ کی علامت بن گیا ہے۔ آدمی کو یہ خطرہ کھائے جا رہا ہے کہ کل کیا ہوگا؟ اس حقیقت کو تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ بجلی کے جس ایک بٹن کو دبانے سے دنیا روشن ہو سکتی ہے اسی بٹن سے پل بھر میں خاک کا ڈھیر بن سکتی ہے۔ زندگی کے بارے میں اس خوف زدہ اور مایوس کن رویے کے نتیجے میں، تمدنی زندگی سے آدمی کی بیزاری عام ہوتی جا رہی ہے

مانا کہ اس صورتِ حال سے سارا زمانہ دوچار ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے سیاسی و سماجی حالات نے اس صورتِ حال کو زیادہ تشویش ناک بنا دیا ہے ہم پچھلے تیس سال سے اسی تشویش ناک فضا میں جی رہے ہیں شاعر، ادیب، دانشور، استاد، طالب علم اور سارے باشعور لوگ بے یقینی کے کرب میں مبتلا ہیں۔ زمینی رشتوں سے ان کا ایمان اٹھتا جا رہا ہے۔ یہی کرب، یہی اضطراب اور یہی بے یقینی جسے دوسرے لفظوں میں آشوبِ ذات یا آشوبِ آگہی کہہ لیجئے، آج کی غزل اور اس کے فن کی اساس ہے۔ اس اساس کی تین خاص سمتیں ہیں۔

ایک سمت وہ ہے جو زمینی رشتوں سے یکسر مایوس ہو کر، ابہام، اشکال اور بے معنویت کا استعارہ بن گئی ہے۔ اس سمت کے شعرا، اپنے گردوپیش سے زیادہ بعض مغربی فلسفیوں کے خیالات سے متاثر ہیں۔ ان کے نزدیک تہذیب، تمدن، اخلاقی اقدار اور سیاسی و تہذیبی نظریئے، سب کے سب زندگی کے حق میں بے اثر ہو چکے ہیں۔ یہ ایسے الفاظ ہیں، جو اپنے معنی کھو چکے ہیں اور اگر ان کے کوئی معنی ہیں تو صرف وہ، جو مادی وسائل کے اجارہ داروں نے انہیں پہنا دیئے ہیں ________ فرد کے ذاتی تجربوں، خوابوں، آرزوؤں، جذبوں جبلی خواہشوں اور محسوسات کو آئینہ دکھانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لئے ان الفاظ پر یا ان الفاظ کے معنی پر تکیہ کرنا، نہ زندگی کے حق میں مفید ہے نہ فرد کے البتہ فرد کا ایک لمحۂ محسوس، قابلِ قدر ہے کہ وہی زندگی کی بنیادی سچائی ہے۔ اس کا فرد کو ذاتی تجربہ ہے اور وہی فرد کو آشوبِ ذات سے ذرا دیر کیلئے نجات دلا سکتا ہے۔ اُردو غزل کی یہ سمت پچھلے پندرہ برسوں میں بڑی تیزی سے ابھر کر ایک واضح شکل کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ غزل کی ہیئت میں خیالات کی شدید ترسیل اور جذبے کے لمحاتی ارتعاشات کو گرفت میں لینے کی طبعی صلاحیت ہے۔

آشوبِ ذات کے حوالے سے اُردو غزل کی دوسری سمت وہ ہے۔ جس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، اس ترقی سے پیدا شدہ معاشی و سیاسی مسائل، شہری زندگی پر ان مسائل کے اثرات، اور ان اثرات کے ضرر رساں پہلوؤں کو اگرچہ پوری طرح محسوس کیا ہے لیکن بے یقینی اور مایوسی کا شکار نہیں ہوتی۔ غزل کی یہ سمت دراصل اب تک ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہے اور زندگی و شاعری دونوں میں فرد سے زیادہ سوسائٹی کو اہمیت دیتی ہے۔ اس سمت کے شعرا کے نزدیک، سماجی زندگی میں جس رشتے کو بنیادی

اہمیت حاصل ہے۔ وہ فرد اور معاشرے یا افراد کے درمیان اقتصادی و معاشی رشتہ ہے اور اسی رشتے کی استواری اور ہمواری ان کے فکر و فن کا مقصد ہے۔ ان کا یقین ہے کہ اس مقصد کے حصول کے بعد ہی زندگی کی آبیاری اور لالہ کاری کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ اس سمت کے شاعروں کے یہاں، زمینی یا مادی رشتے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور زندگی کی ساری آویزشوں جملہ ناہمواریوں، تمام نظریاتی اور طبقاتی جنگوں میں یہ لوگ اسی رشتے کے حلیف ہیں۔ یہ زمینی رشتے اوروں کی نظر میں کتنے ہی ناکارہ اور کمزور کیوں نہ ہو گئے ہوں، ان کے نزدیک یہ رشتے آج بھی سب سے زیادہ طاقتور اور قابلِ احترام ہیں۔ اس لئے ان رشتوں کے تحفظ و تحفظ سے غافل رہنا، یا فکر و نظر کے آدرشوں میں ان کو نظر انداز کرنا، ایک اہم اور بڑے سماجی فریضے سے غفلت برتنا ہے۔ گویا، اس سمت کے شعراء زندگی کے حقائق سے آنکھ چرا کر اپنے خول میں سمٹ جانے اور سماج کے مقابلے میں فرد کی ذات کو، اہمیت دینے کو مستحسن خیال نہیں کرتے۔ زندگی کے باب میں ان کا نقطۂ نظر ادب برائے زندگی کے مقولے کے ساتھ ہے اور بہت واضح ہے۔ وہ اپنے اس نقطۂ نظر کو اپنی تخلیقات میں بہرحال جگہ دینے اور اندیشہ ہائے افلاکی کو دور رکھ کر، زمین کے ہنگاموں کو سہل بنانے کے قائل ہیں۔

جدید غزل کی تیسری سمت، پہلی سمت سے یکسر مخالف اور دوسری سمت سے یگونہ متشابہ ہونے کے وصف، اپنا جداگانہ مزاج رکھتی ہے۔ تیسری سمت کے شعرا، دوسری سمت کے شعرا کی طرح زمینی رشتوں کو پوری اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی یہ رشتے مقدس و معتبر ہیں اور اگر نہیں ہیں تو ان رشتوں کا تقدس اور اعتبار بحال کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ شرط یہ ہے کہ زمین کے ہنگاموں کو اندیشہ ہائے افلاکی کے ساتھ ساتھ سہل بنانے کی کوشش کی جائے۔ ان کے خیال میں زمین کے ہنگامے آسمانی رشتوں کی از سر نو دریافت کے بغیر سہل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ زمین کو آسمان سے یا آسمان کو زمین سے الگ کر کے دیکھنے دکھانے کا قائل نہیں۔ ان کے مطابق زمین و آسمان میں ازلی و ابدی رشتہ ہے۔ اور اس گم شدہ رشتے کی بازیابی ہی زندگی کیلئے پیغام بشارت بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس سمت کے شعر کی غزلیں بہ حیثیت مجموعی اس رشتے کی بازآفرینی اور استواری کے احساس میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ اس احساس نے ان شعرا کو ایک طرف تشکیک و بے اعتباری کی تاریک وادیوں میں بھٹکنے سے بچایا ہے۔ دوسری طرف اعتبار و یقین کی منزلوں کی طرف رہنمائی کر کے مایوسی کے اندھیروں میں امید کا چراغ روشن کیا ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ تیسری سمت کے شعرا کی نظر، صرف جسمانی تقاضوں کی تکمیل یا مادی آسودگی پر نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر آدمی کی نظریاتی اور روحانی مسرتوں پر بھی ہے۔

رشید کامل

ایسی روش تو باعثِ تشہیر ہے رشید
اُس کو خیال ہوگا کہ شہرت نہ کم ہوئی

جسٹس عطاء اللہ سجاد
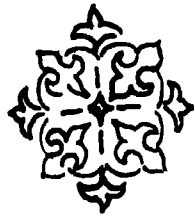
اُستاد جی

صوفی غلام مصطفٰے تبسم کے نام سے ایک ایسے شخص کا تصور ابھرتا ہے جو اپنی ذات میں گرانبہا جوہر اور بے شمار صفات سمیٹے ہوئے تھا۔ شاید سمیٹنے کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا کیونکہ اُن کا فیضانِ نظر اتنا عام تھا کہ ملک کے گوشے گوشے میں ان کے شاگرد اور اُن کے علم و فن سے استفادہ کرنے والے دیگر بے شمار لوگ موجود ہیں۔ ابھی ایک سال قبل صوفی صاحب ہمارے درمیان موجود تھے۔ اُن کے وجود سے دلوں میں تسلّی و تسکین کا ایک احساس جاگزیں رہتا تھا۔ اُن کے دروازے ہر شخص کیلئے کھلے تھے۔ ان کے ادب و فن سے لاتعداد لوگوں نے کسبِ فیض کیا اور جو شخص بھی ان کے پاس ادب و شعر کے سلسلہ میں اصلاح و ہدایت کے لئے حاضر ہوا اس کی پذیرائی انہوں نے ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی سے کی۔

لاہور کو بجا طور پر معمورۂ ادب و شعر کہا گیا ہے، بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے وسط میں پنجاب سے اُردو ادب کے مختلف اصناف میں انقلاب بپا کرنے کے لئے جو جاندار تحریک اُٹھی اُس کے سالارانِ قافلہ میں صوفی صاحب بھی شامل تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی موت تک بھرپور کردار ادا کیا۔ اُس زمانے میں لاہور کی ادبی محفلوں کی رونق سید احمد شاہ بخاری، محمد دین تاثیر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، اختر شیرانی، صوفی تبسم صاحب اور دیگر صاحبانِ علم و فن کے دم سے تھی۔ ان محفلوں میں شعر و ادب کے چرچے ہوتے، تلمیحات و تشبیہات کو قرینے سے استعمال کرنے کا ذکر ہوتا، فنِ تنقید کے بنیادی اصولوں پر بحث ہوتی اور اردو، انگریزی اور فارسی کے جدید رجحانات پر تبصرے ہوتے۔ یہ محفلیں نوجوان ادیبوں کے لئے تربیت گاہیں تھیں اور انہی تربیت گاہوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے۔ جنہوں نے بعد میں اُردو شعر اور اُردو افسانے کو نئی صورت، اور نیا اسلوب عطا کیا۔

صوفی صاحب کی زندگی درس و تدریس کے نجیب و شریف پیشہ میں گزر گئی۔ اُن کے ہم جلیس اپنے وقت کے بڑے اساتذہ مانے جاتے تھے لیکن صوفی صاحب کی عظمت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ انہیں فارسی، اُردو اور پنجابی تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے تینوں زبانوں میں شعر کہے اور اپنا سکہ منوایا۔ نقد و نظر میں بھی وہ استادانِ فن میں سے تھے اور صحیح مقام پر صحیح لفظ کے استعمال کے فن میں انہیں خدا نے خاص مہارت عطا کی تھی۔ انہوں نے تینوں زبانوں کے ادب کو آگے بڑھایا اور اس کی اس طرح ترویج کی کہ اُن کے شاگرد صرف درسی کتب پر ہی عبور حاصل نہیں کر پاتے تھے بلکہ اُن کا تخیّل ایک وسیع تر اُفق پر حاوی ہوتا۔

صوفی صاحب نے بچوں کے لئے دل پذیر نظمیں لکھیں۔ وہ ٹوٹ بٹوٹ کے خالق تھے۔ آج ہر گھر کے بچے اُن سے پہلا تعارف ٹوٹ بٹوٹ کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے فارسی اور اُردو میں بھی غزلیں کہیں اور اقبال اور غالب کے فارسی کلام کا پنجابی میں ترجمہ بھی کیا۔ ان مختلف امور میں ان کا کلام اُن کے نابغہ کی وسعت کا شاہد ہے، ۱۹۶۵ء کی جنگ میں انہوں نے وطنیت سے بھرپور نظمیں لکھیں۔ اور ایک عام سپاہی سے لے کر ایک عام شہری کے خون کو گرمایا۔ صوفی صاحب کی شاعری عام طور پر قافیہ اور ردیف کی شاعری ہے لیکن ان کے نزدیک کسی شعر یا کسی ادب پارے میں اصل چیز جذبے کی صداقت اور اظہار کا خلوص تھا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جدید تحریکات

مئی ۱۹۷۹ء

سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھا بلکہ حتی الامکان
جہاں بھی جوہرِ قابل دیکھا اُس کی حوصلہ افزائی فرمائی۔
صوفی صاحب کا ماحول ایسا پرتپاک ہوتا کہ
کوئی شخص وہاں اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا
تھا۔ مجھے صوفی صاحب سے شرفِ تلمذ نہیں رہا لیکن اُن
سے اور سید احمد شاہ بخاری سے پہلی دفعہ ۱۹۳۶ء
میں نیاز حاصل ہوا جب میں نے گورنمنٹ کالج
کے ایک مشاعرہ میں نظم پڑھی۔ اُس کے بعد زندگی
بھر اُن سے مراسم استوار رہے۔ صوفی صاحب
ان دنوں داتا صاحب کے عقب میں رہتے تھے
اور وہاں تاثیر، حسرت اور دیگر اصحاب علم و فن
کا اجتماع ہوتا تھا جن میں مجھے بھی شرکت کا فخر
کئی بار حاصل ہوا۔ باتوں باتوں میں کئی بار کھانے کا
وقت ہو جاتا تو صوفی صاحب تھوڑے بہت
اہتمام کے ساتھ جو گھر میں پکا ہوتا پیش کر دیتے
اور اُس کے بعد پھر کشمیری نمکین چائے کے دور پر
ادبی گفتگو شروع ہو جاتی۔ صوفی صاحب کا دل
اُن کی پیشانی کی طرح کھلا تھا، جب محفل بپا کرنے
کو جی چاہتا، ٹیلیفون کر دیتے کہ آج میرے
ہاں ہی بیٹھ جائیں گے۔ میں خود پائے پکا رہا
ہوں۔ فیض اور اعجاز بٹالوی بھی آ رہے ہیں کئی بار
ایسا ہوتا کہ کچھ بن بلائے مہمان بھی وارد ہو جاتے
لیکن ان کے چہرے سے کسی قسم کی ناراضگی ظاہر نہ ہوتی
ان کے ہاں کھانے میں اتنی برکت تھی کہ خواندہ و
ناخواندہ مہمان سبھی بھگت جاتے۔ اُن کی زندگی
ہی میں اُن کے بہت سے ساتھی بچھڑ گئے تھے۔ وہ فراقِ صحبت
شب میں جلنے والی شمع تھے۔ وہ شمع بھی خاموش
ہو گئی۔ اُنکی موت سے دیار ادب و شعر کی ویرانی زیادہ
گھمبیر اور محرومیوں کا دھواں اور گہرا ہو گیا ہے۔ انہوں
نے غالب کے ایک فارسی مصرعہ کا پنجابی ترجمہ یوں
کیا تھا۔

بھاویں ہجر تے بھاویں وصال ہووے
وکھو وکھ دوہاں دیاں لذتاں نیں

اب صوفی صاحب اگر یہاں موجود ہوتے تو
میں اُن سے کہتا کہ فراق جب شبِ درازِ عدم
کی صورت اختیار کرتا ہے تو لذت کی بجائے دل
ایک مسلسل غم اور نہ ختم ہونے والی اذیت سے
ہمکنار ہو جاتا ہے۔ صوفی صاحب فارسی کے
استاد تھے۔ میں اُسی زبان میں ان سے عرض کرتا ہوں۔

اے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونہ ای
ما بے تو در جحیم تو بے ما چگونہ ای

اختر ہوشیار پوری

میں چپ رہا تو ایک زمانے سے تھا خطاب
جب لب کھلے تو طاقتِ گویائی چھوٹ گئی

جابر علی سید

میراجی اور عملی تنقید

بغیر کسی خوف کے میراجی کو اُردو میں عملی تنقید کا پیشرو کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ قافلہ سالار عملی تنقید کی اصطلاح سے بھی واقف نہیں تھا "اُس نظم میں" کا لکھنے والا نظم کے تجزیاتی مطالعوں میں عملی تنقید ہی کے قابلِ قدر نمونے پیش کر رہا تھا۔ یہ مطالعے ادبی دنیا میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۳ء تک ایک ایک کر کے شائع ہوتے رہے اور ۱۹۴۴ء میں ایک مختصر مگر دلچسپ پیش لفظ کے ساتھ "اُس نظم میں"... کے پُرکشش نام سے جمع کر دیئے گئے۔ ہماری عملی تنقید عملی طور پر آج بھی انہی خطوط پر چل رہی ہے جو "اُس نظم میں" کے مطالعوں میں بروئے کار نظر آتے ہیں۔

یہ محض حسنِ اتفاق ہے کہ انگریزی میں عملی تنقید کے بانی ڈاکٹر رچرڈز کے دو اہم تنقیدی کارنامے "ادبی تنقید کے اصول" اور "عملی تنقید" بالترتیب ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئے اور میراجی کی عملی تنقیدیں جو عملی تنقید سے دس بارہ سال بعد معرضِ وجود میں آئیں غیر شعوری طور پر رچرڈز کی تنقیدی تعلیمات سے متاثر نظر آتی ہیں۔ میراجی کو ڈاکٹر رچرڈز سے واقفیت تک نہیں تھی۔ لیکن رچرڈز کے اصولِ تنقید بنیادی طور پر میراجی کے مطالعوں میں اپنے خدوخال دکھاتے نظر آتے ہیں۔ رچرڈز کے تنقیدی دبستان کو کئی سال آگے چل کر اس کے شاگرد کلیم الدین احمد نے اُردو میں رواج دیا اور عملی تنقید کے بعض قابلِ رشک نمونے پیش کئے۔ میراجی کو کلیم الدین احمد کا پیشرو بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ خود میراجی نے اعتراف کیا ہے وہ میلارمے کے شارح چارلس موروں کا شاگرد ہے، جبکہ کلیم الدین احمد نے اپنے اُستاد رچرڈز سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان دو شاگردوں کی عملی تنقیدوں سے اُردو تنقید نفسیاتی، سائنسی معروضی بنیادوں پر استوار ہونے لگی ہے۔ پھر میراجی اور کلیم الدین احمد کی سی معروضیت، غیر جانبداری اور دیانت بھی اُردو تنقید میں بہت کم نظر آتی ہے۔

میراجی کے تجزیے رچرڈز کی عملی تنقید کا سا طریقِ کار نہیں رکھتے۔ رچرڈز کسی نظم کا تجزیہ گمنام طور پر کئی طالبعلموں سے کراتا تھا اور پھر ان مطالعوں کے تقابلی مطالعہ کی روشنی میں اپنے اصولِ تنقید کی عملی صورت کا جائزہ لیتا تھا۔ اس کے برخلاف میراجی نظموں کے شاعروں کے ناموں ہی سے واقف نہیں ان میں سے اکثر کو ذاتی طور پر بھی جانتا ہے، لیکن اس کی غیر جانبداری کبھی شکست نہیں کھاتی۔

"اُس نظم میں" میں شامل پچاس نظموں کے تجزیے ہیں جو متعدد اور مختلف ہیئتوں میں لکھی گئی ہیں۔ آزاد، معرّا، پابند، مثنوی نما، ان میں رباعیاں بھی ہیں اور ایک ساقی نامہ بھی شامل ہے۔ لیکن تجزیہ نگار ہیئت کے اس تنوع کو قابلِ اعتنا نہیں جانتا، تمام نظموں کے ابہام کو کھولنا چاہتا ہے اگرچہ متعدد نظمیں ایسی بھی ہیں لیکن غیر مبہم نظموں کے وانشگاف کرنے کا مقصد بعض نظموں کے سیاسی، عمرانی نفسیاتی اور جنسی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ہے جہاں بعض نظمیں مبہم بھی ہیں اور عمرانی اشارے بھی اپنے اندر رکھتی ہیں وہاں ان نظموں کا تجزیہ مفصّل اور سیر حاصل ہو گیا ہے۔ مبہم ترین نظمیں راشدؔ، قیوم نظرؔ، یوسف ظفر و ضیا متر عادل کی ہیں۔ کم مبہم نظموں کے شاعروں میں، احمد ندیم قاسمی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، فضل حسین کیفؔ شریف کنجاہی۔ عبدالمجید عدم اور شاد عارفی کے نام نمایاں ہیں۔ غیر مبہم یا کم مبہم نظموں کے تجزیے میں میراجی نے زیادہ سے زیادہ جمالیاتی اصولِ تخلیق (شعری موسیقی، دلکشی، نظام قوافی، بحر وغیرہ) کو ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی میراجی کا تجزیہ جامع

اور METHODICAL نہیں پھر اس کی حیثیت
CRITICAL APPRECIATION کی سی ہے
شاذ و نادر ہی کسی نظم کی خامیوں کی طرف اشارہ
کیا گیا ہے۔ شاید جدید نظم کی حوصلہ افزائی پیشِ نظر
تھی ورنہ میراجی کا تنقیدی شعور تخلیق کی خامیوں سے
ناواقف نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح میراجی کی حیثیت
جدید نظم کے مشفق مربی کی سی ہو جاتی ہے۔
میراجی کی عملی تنقید میں اس کے شعری جمالیات کا
سراغ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ وہ آزاد جمالیات
FREE AESTHETICS کا حامی اور تربیت کنندہ
ہے اور شاعری کو دبستانوں، لیبلوں، نعروں اور
گروہ بندیوں سے کلی حد تک آزاد دیکھنا چاہتا
ہے۔ نظم ترقی پسندانہ نوعیت کی ہو یا کسی اور قسم
کی میراجی کا اصول جمالیات آزاد رہتا ہے اور ہمیشہ
موضوع کے فنکارانہ پہلوؤں سے تعرض کرتا ہے۔
ترقی پسندانہ شاعری پر البتہ میراجی کے ریمارک کافی
سخت ہیں اور اس کی آزاد جمالیات کو SUPPORT
کرتے نظر آتے ہیں۔
"ایک گروہ اپنے کو ترقی پسند سمجھتا ہے، حالانکہ
دوسرا گروہ بھی ترقی پسند ہی ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے
کہ پہلے گروہ میں تالاب کو گندا کرنے والی مچھلیاں زیادہ
ہیں اس گروہ میں ایسے شعرا کی کثرت ہے جن کے جذبات و
خیالات کلیتہً اپنے نہیں ہیں، جبکہ اپنے پاس کوئی ایسا
خیال نہیں تھا جسے وہ شعر کے ذریعے پیش کرتے
اور اس لئے انہوں نے چند تبلیغی باتوں کو جو نثر میں بہتر طور
پر ادا ہو سکتی تھیں ایک سطحی اور کم و بیش غیر موثر انداز
میں ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے۔ دوسرے گروہ
کے کلام میں زندگی محدود ہو کر نہیں رہ گئی ہے۔ یہ جو
کچھ کہتے ہیں فطری تحریکِ شعری کی بنا پر کہتے ہیں،
اس لئے ان کے کلام میں زندگی کے حقیقت نما پہلو
کی بے ساختگی ہے۔" (پیش لفظ)
میراجی نے جدید نظم کے عمرانی پہلوؤں اور عصرِ رواں
کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔
"ادب زندگی کا ترجمان ہے اور ظاہر ہے کہ
ہماری زندگی ماہ بماہ نہیں تو سال بہ سال ضرور بدل
جاتی ہے (یہ ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے) اور یوں نہ صرف
سماجی اور اقتصادی حالات ادب پر اثر انداز ہو
رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر بھی،
خصوصاً مغرب سے آئے ہوئے خیالات ادب اور آرٹ
میں بھی ایک جدید اندازِ نظر قائم ہوتا جا رہا ہے۔"
آگے چل کر میراجی نے شعر و ادب کے قارئین
کی تین قسمیں بتائی ہیں ایک وہ جو بالکل کاہل اور
سست ہے دوسرا ذہین اور حساس گروہ اور تیسرا
قدامت پرست گروہ۔ دوسرا گروہ جو ذہین اور
حساس ہے، صحیح معنوں میں، ترقی پسند ہے اس
میں روحِ حیات ہے، اور فطری طرزِ زندگی، تیسرا
گروہ قابلِ رحم ہے اور اس کی زندگی ناخوشگوار
اور غیر فطری ہے، کیونکہ وہ ہر نئی چیز سے گھبراتا ہے
میراجی کے اس ریمارک میں لارنس کی روح کی آواز
سنائی دیتی ہے۔ لارنس جو جبلت کی آزاد زندگی کا
علمبردار ہے۔ میراجی نے لارنس کو انگلستان کا پیامی
شاعر کہا ہے یہ پیام LIFE OF FREE
PASSION ہی کا پیغام ہے۔
ابہام کے بارے میں میراجی کے خیالات کچھ اس
قسم کے ہیں۔
"اردو شاعری میں اگرچہ پرانے شعرا میں سے مومن
اور غالب ابہام کے لحاظ سے نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔
لیکن موجودہ اور جدید شاعری کی آمد اور مغربی تعلیم
تہذیب کے اثرات سے شاعری میں ابہام کے بعض
نئے پہلو بھی نکل آئے ہیں اور ان پر غور و خوض کی اس
لئے اور بھی ضرورت ہے کہ شاعری کی ذہنی اور نفسی
حرکات کو بھی تخلیقِ فن میں پہلے سے اب بہت
زیادہ دخل ہوتا جا رہا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں
یوں کہہ لیجئے کہ اب شاعری پہلے کی بہ نسبت بہت
زیادہ انفرادی اور ذاتی ہوتی جا رہی ہے۔ شاعر
کے ذہن میں ایک خیال یا ایک تصور پیدا ہوتا ہے
اور وہ اس کے اظہار کے لئے عام زبان سے ہٹ
کر خاص اور مناسب الفاظ کی تلاش کرتا ہے جو اس
کے خیال یا تصور کے لئے پورے طور پر مناسب
اور ہم آہنگ ہوں اور اس اجنبیت کو دور کرنے
کے لئے ضروری ہے کہ ہم بھی شاعر کے نقطۂ خیال
سے اپنے ذہن کی حرکت کو شروع کریں ورنہ ہمیں اُن
کی تخلیق میں ابہام اور اغلاق نظر آنے لگا اور اگرچہ
وہ ابہام ہمارے سمجھنے میں ہوگا لیکن ہم اپنی بے خبری
میں شاعر کے نام منڈھ دیں گے۔"
صاف نظر آ رہا ہے کہ میراجی جدیدیت پسندی
کی زبان میں ابلاغ کو قاری کا سر درد سمجھتا ہے
اور شاعر کو ہر قسم کے الزام سے بری کر دیتا ہے اس
میں خود شاعر میراجی کی برأت کا پہلو بھی نکلتا ہے اور
میراجی کے بعض پسندیدہ شعرا بھی دفاع کا سامان
پاتے ہیں تاہم اہم بات صرف یہ ہے کہ میراجی کے

بغیر راشد، فیض، قیوم نظر اور یوسف ظفر اور مختار صدیقی کی بعض اچھی نظمیں معمہ ہی رہ جاتیں یا پھر خود ان شاعروں کو اپنی وضاحت میں مضامین لکھنے پڑتے یا کم از کم کافی ہاؤسوں میں زبانی تشریح کرنی پڑتی۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ حلقۂ اربابِ ذوق کی تشکیل کا اوّلین مقصد شعری ابہام کے مسئلے ہی کو حل کرنا تھا اور یہ مسئلہ اچھی طرح حل ہو گیا۔ "ذہنی شاعری" "جدید شاعری" سے زیادہ واضح اور غیر مبہم ہے۔

(ح، ع، س)

ہم شاید یہ دعویٰ بھی کر سکتے ہیں کہ مبہم میراجیؔ نے اپنا ابہام دور کرنے کے لئے گیت لکھنے شروع کر دیئے تھے، یہ وجہ نہ بھی ہو تو بھی واضح ہے کہ شاعر میراجیؔ کے دو حصے ہیں ایک نظم لکھنے والا اور دوسرا گیت لکھنے والا، خود ایک جگہ (مشرق و مغرب کے نغمے میں) میراجیؔ نے ابہام پسندی کے الزام کا شریفانہ جواب دے دیا ہے۔

میراجیؔ کے منطقی، نفسیاتی، سائنسی، جمالیاتی تجزیے اچھے اور دلکش نثریں لکھے گئے ہیں۔ نثر باآہنگ ہے اور مختلف بحروں میں تقسیم نہ ہونے کے باوجود زیر و بم رکھتی ہے، منطقی ارتقا اور نفسیاتی تحلیل قابلِ رشک ہے۔ میراجیؔ کا تنقیدی اپریٹس مکمل اور کارآمد ہے۔ جیسے کسی کامیاب نقّاد شاعر کا ہونا چاہیئے۔ شاید میراجی کی نثر ایک اور ذریعہ ابہام جیسے پریشان کن الزام سے بری ہونے کا۔

'اس نظم میں' کا اسلوب پُرکشش ہے اور آج تک اس کی تقلید کی جا رہی ہے یہ اس کے غیر فانی ہونے کا ثبوت ہے۔ میراجیؔ کے تجزیوں سے بآسانی اس کے جمالیاتی اصولوں کا استنباط کیا جا سکتا ہے اور ان میں نظریے اور عمل کی وحدت صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔

'اس نظم میں' کی تنقیدی نثر کے بعض اہم اجزا ٹکنیکل اصطلاحوں کی صورت میں نمایاں نظر آتے ہیں، یہ سب کے سب انگریزی تنقید سے لی گئی ہیں۔ یہ فہرست شاید نامکمل سی ہے۔

تخلیقِ فن	Creation of Art
ہم آہنگی	Concord ' Harmony
نقطۂ خیال	Point of view
تحریکِ شعری	Motivation
ردِّ عمل	Reaction
جائزہ	Study Estimate
خیال یا تصوّر	Idea
تصوّر	Image
فنکار	Artist
صنعت کار	Craftsman
فطری تسلسل	Natural Flow
خوشگوار اثر	Pleasant Effect
مفہوم سے بریت	Emancipation from Sense

(یہ تصوّر فرانسیسی علامت پسندوں اور لغویت نگاروں کے ہاں بار بار نظر آتا ہے)۔

	Absurdism
اشارتی کیفیت	Suggestive Effect
خارجی	Objective
داخلی	Subjective
تحت الشعور	Sub-conscious
نفسی حرکت	Psychic Movement
اندازِ نظر	Attitude
تأثر	Impression ' Effect
خوشگوار تصوّرات	Pleasant Fancies
اذیت پرستی	Sadism
الم پسندی	Masochism
احساس	Feeling
خیال کی پرواز	Flight of Imagination
تمثیل	Symbol
بیزاری	Disgust
پھیکا پن	Insipidity
خیال افروز	Illuminating
عصبیت	* Nervous Activity
ہیئت	Form
موضوع	Theme
تنوع	Variety
تلازمِ خیال	Association of Ideas.
فنی لحاظ سے	Technicalley
خود ساختہ	Self Imposed

ان جدید اصطلاحات کے پہلو بہ پہلو ہمیں بعض قدیم تنقیدی اصطلاحیں بھی نظر آتی ہیں، کلام، بیان، لطف، خوبی، ادا، تشبیہ، استعارہ معنوی تزئین، لفظی و معنوی مناسبت، ان اصطلاحات کی موجودگی ہمیں بتاتی ہے کہ میراجیؔ نے ابھی قدیم کلاسیکی تنقید کا دامن نہیں چھوڑا اور جدت پسند ہونے کے باوجود روایت کا احساس قائم ہے۔

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ فرانسیسی علامت پسندوں سے گہری وابستگی رکھنے والا ایک شاعر نقّاد علامتوں

کا نعرہ لگانا پسند نہیں کرتا۔ میراجی نے پوری کتاب
میں دو ایک جگہ سے زیادہ علامت کا لفظ استعمال
نہیں کیا۔ ایک جگہ علامت SYMPTOM OF IDEA
کے لئے استعمال ہوا ہے دوسری جگہ SYMBOL
کے معنوں میں جو امیر مسعود علی ذوقی کی نظم "جھیل کے
کنارے" کے تجزیے میں یہ جملہ نظر آتا ہے۔
"طیور کی پرواز دبی ہوئی جنسی خواہش کی علامت
ہے۔"

میراجی نے SYMBOL کا مفہوم
ادا کرنے کے لئے کبھی کبھی اشارہ اور کبھی تمثیل کی
اصطلاح بھی استعمال کی ہے اور تمثیل کا استعمال مختار صدیقی
کی نظم 'ایک تمثیل' کا جائزہ لیتے ہوئے ظاہر ہے
کہ یہ سب SYMBOL کے منطقی بدل ہیں جو
جو کسی تنقیدی جائزے میں مترادفاً استعمال ہو سکتے
ہیں اور INDICATION یا GESTURE
REPRESENTATIVE WORD یا
SUGGESTIVE WORD کا مترادف ہے۔
یہ بات حوصلہ افزا اور خوش آئند ہے کہ ایک علامت
پسند شاعر علامتوں کو ساری شاعری کے برابر
SYNONYM قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہے
دبستانی نعرہ لگانا اسے پسند نہیں۔ وہ علامت کو
صرف اس کی جائز اہمیت دیتا ہے اور شعری
کائنات کی وسعت کو کسی نعرے کی تنگنائے میں
بدلنے کے لئے تیار نہیں۔ آج ہم میراجی کو علامت پسند
شاعر کہتے ہیں لیکن اس طرح بادلیئر نے میلارمے
کو علامت پسند شاعر کہا تھا اور خود میلارمے کو اس
بات کا شعوری احساس نہیں تھا۔

میراجی کے تجزیاتی مطالعے کو تخلیقی تنقید کہنا تخلیق
سے زیادتی ہوگی۔ کسی نظم کا تجزیہ محض اس کی نثری
باز آفرینی ہے وہ کتنی ہی اچھی منطقی، سائنسی جمالیاتی
نثر کیوں نہ ہو تجزیہ تجزیہ ہی ہے اس کی قدر و قیمت
تنقیدی اور سائنسی ہے، وہ تخلیق کا بدل نہیں ہو سکتا
آب حیات، اور اردو شاعری پر ایک نظر کے مصنفوں
کو اس بات پر قناعت کر لینی چاہئے کہ ان کی
نثر خوبصورت با آہنگ اور دلکش ہے اور ان کی
پھیکی اور بے کیف شاعری کی اچھی طرح تلافی کرتی ہے
کسی مفرد شعر یا نظم میں ایک سے زیادہ پہلو تلاش
کرنا اس شعر یا نظم کے تجزیہ نگار کو ذہانت کا
CREDIT تو دے دیا جاتا ہے لیکن ایک
خلاق ذہن کی خلاقی اس کا فطری حصہ نہیں بن سکتی۔
فیض احمد 'انتباہ' میں للکار کر کہہ رہا ہے۔
'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے' کس کے لب؟ شاعر کا
مخاطب کون ہے؟ نظم کو سمجھنے کے لئے اس کی
جستجو ضروری ہے وہ سمجھاتا ہے کہ شاعر کا مخاطب
کوئی قیدی ہے لیکن زنجیر کو تو ابھی تیار ہونا ہے
وہ مخاطب قیدی نہیں ہو سکتا وہ شخص آزاد ہے
لیکن اس کی آزادی شاید خطرے میں ہے جسم و
زبان کی موت سے پہلے یہ مصرع ظاہر کرتا ہے کہ
عنقریب اس شخص کی نقل و حرکت پر پابندی لگ
جائے گی۔ اور اس خطرے سے شاعر اسے آگاہ
کر رہا ہے لیکن کیا نظم کا موضوع وہ شخص ہے کہیں
آہن گر کی دکان ہی تو اس کا موضوع نہیں۔ اس
صورت میں قصہ یوں ہو جائے گا۔ شاعر دکان پر
بنتی ہوئی زنجیروں کو دیکھتا ہے ایک نہایت

معمولی سا واقعہ! لیکن شاعر محبِ وطن بھی ہے
اُن بنتی ہوئی زنجیروں کو دیکھ کر اس کا تخیل اس
سے کہتا ہے کہ یہ پابستہ کر دینے
والی چیزیں وطن کے کسی مجاہد کے لئے تیار ہو
رہی ہیں اور تصور میں اس کے سامنے وہ مجاہد
آجاتا ہے وہ مجاہد کو للکار کر کہتا ہے جب تک تو
آزاد ہے سچ زندہ ہے تیری گرفتاری تیری نقل و حرکت
اور تقریر پر پابندی لگ جائے گی اور وہ سچ کی موت
ہوگی۔ اس لئے بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے۔ بول کہ
لب آزاد ہیں تیرے۔

اس بات کا اعتراف کرنے کے بعد کہ میراجی
کا تجزیہ قابلِ قدر اور انکشافات انگیز ہے اس حقیقت
کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ میراجی کو
بعض نامعلوم وجوہات سے 'انتباہ' کے شاعر کے
سیاسی نظریات سے واقفیت نہیں تھی یا اگر تھی
بھی تو اس کے مخصوص تنقیدی نظریے کے منافی تھا
کہ انتباہ کا مخاطب شاعر خود ہے جو 'محبِ وطن'
اور انقلابی ہے اور اسے اپنی گرفتاری کا خدشہ ہے
لیکن ہماری حیرت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب
ہم دیکھتے ہیں کہ اسی شاعر کی نظم چند روز اور ....
کا تجزیہ کرتے ہوئے تجزیہ نگار اس شاعر کی شاعری کا
لب لباب، ان چند لفظوں کو قرار دے چکا تھا۔

"ہائے میری جانِ انقلاب"

لیکن شاید میراجی کی معروضیت اور غیر جانبداری کا
یہی مفہوم ہے کہ وہ کسی نظم کا جائزہ لیتے وقت شاعر
کی ذات سے یکسر قطع نظر کر لے اور صرف اس کی
نظم پر توجہ مرکوز رکھے بلکہ اگر کوئی شائبہ شاعر سے

ذاتی شناسائی کا ہو بھی تو اسے دانستہ بھلا دے۔

نظم 'التباہ'، کی جو تعبیر ہم آج کرتے ہیں، وہ میراجی کے شعری نظریے کا دفاع کرتی ہے۔ یہ دفاع اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے جب ہم تجزیہ نگار کا ملیح آبادی جیسے انقلابی کی مشہور نظم 'تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے'، کا 'مطالعہ' پڑھتے ہیں۔ میراجی کے یہ الفاظ خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔

یہ نظم بھی اگرچہ اپنے ایسے ادب کی طرح بین الاقوامی سیاست ہی کی پیداوار ہے لیکن فنی لحاظ سے اس میں ایک دو باتیں ایسی ہیں جو اسے محض پروپیگنڈے سے کہیں بلند کر دیتی ہیں عام طور پر — نثر کی تو بات ہی جدا ہے — نظم میں اشتراکی شعرا کبھی مزدور یا کسان یا مزدور اور کسان کے سر پر سوار ہو کر اور کبھی اسے اپنے سر پر سوار کر کے نہایت منجھی ہوئی صاف ستھری زبان (اور گاہے گاہے بہتر زبان میں) ان خیالات کی وکالت کرتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ محض سوچ بچار کا نتیجہ ہو سکتے ہیں جن میں انفرادی احساسات کو کم ہی دخل ہوتا ہے اس وجہ سے ابتدا ہی میں اس ادبی تخلیق سے ایک ایسا تکلف نمایاں ہو جاتا ہے جو کامیاب ترجمانی اور تاثر کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ بن جاتا ہے اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے یہ نظم خود ساختہ اثرات سے مبرا معلوم ہوتی ہے ...

ان سب باتوں کے علاوہ ایک نکتہ اور بھی ہے نیا یا ترقی پسند ادب کم سے کم اِس ملک کے اردو کے حامی مصنف اور شعراء اکثر ایسا مواد مختلف ادبی صورتوں میں ڈھالتے ہیں جو اُردو ہی کی پرانی دورِ انحطاط کی شاعری اور راشد الخیری اور نذر سجاد حیدر کے بعض ناولوں کی طرح محض اذیت پرستانہ ادب بن کر رہ جاتا ہے اور ایک صالح ذہانت اسے ایک نفسی مرض کی علامت تصور کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔"

جوش ملیح آبادی کی نظم 'حاجن'، کے تجزیے میں میراجی کے یہ الفاظ بھی اس کے شعری نظریے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

"نظم صرف ایک بیانیہ چیز معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں سرمایہ داری کے خلاف اس سے خاطر خواہ تاثر پیدا ہوتا ہے اور ہم غور کرنے لگتے ہیں کہ جس نظام میں اس قسم کے ناپسندیدہ اشخاص نشو و نما پا سکتے ہیں اور قائم رہ سکتے ہیں اسے بدلنا چاہیئے۔"

جو شخص صاف لفظوں میں سرمایہ دارانہ مہاجنی نظام کو بدل دینا چاہتا ہو اس کی خواہش اگرچہ شاذ و نادر ہی ابھرتی ہو اور بیشتر اخلاقی یا جذباتی کیفیت پر مبنی ہو ادبی تنقید میں اسے آزاد و جمالیات کا حامی ہی کہا جا سکتا ہے۔ میراجی کا کوئی دبستانی نعرہ نہیں اگر کوئی نعرہ ہے تو اسے وسعت پسندی، اخلاص، رواداری اور معروضیت پسندی کی آواز کہا جائے گا۔

جابر علی سید

"میراجی کا کوئی دبستانی نعرہ نہیں اگر کوئی نعرہ ہے تو اسے وسعت پسندی، اخلاص، رواداری اور معروضیت پسندی کی آواز کہا جائے گا۔"

اقتباس: میراجی اور عملی تنقید

طاہرہ نصرت جعفری

حسرت کی غزل

سیدؑ فضل الحسن حسرت اُس زمانے کی پیداوار ہیں جب انگریزی اقتدار کے زیرِ اثر مشرق کے ادب پر مغربی ادب کا سایہ پڑ رہا تھا اور دیدہ ور ادیبوں نے یہ حقیقت محسوس کر لی تھی کہ انگریزی ادب کی تقلید اور استفادے سے ہماری زبان کو ہر طرح وسعت و ثروت حاصل ہوگی۔ سر سید، آزاد، حالی نذیر احمد، محمد اسماعیل میرٹھی، نادرِ کاکوروی وغیرہ کا نقطۂ نگاہ یہی تھا۔ یہ بزرگ انگریزی ادب کے مضامین و خیالات کو اُردو زبان میں منتقل کرنے پر مائل تھے۔ چنانچہ اس دور کے مُناظموں اور مشاعروں میں یہ سرگرمیاں روز افزوں ہو رہی تھیں۔ اس کے دوش بدوش شعراء کا ایک گروہِ کثیر پُرانی روایات کا دامن تھامے ہوئے تھا۔ یہ لوگ اس موقف پر قائم تھے کہ ہماری شاعری کا انداز مغربی ادب کے اثر سے بالکل مبرا ہونا چاہیے اور اصنافِ شعر میں سب سے زیادہ توجہ غزل پر کرنی چاہیئے کہ قُدما کا بیشتر ورثہ اسی صنف میں ہے ——

حسرت موہانی کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ علی گڑھ کالج میں تعلیم پانے کے باوجود[1] وہ شعر و شاعری کے معاملے میں خالص مشرقی ہیں آلِ احمد سرورؔ نے اسی لئے انہیں "کلاسیکی شاعری کا آخری پاسبان" قرار دیا ہے[2]۔

کلاسیکی غزل سے حسرت کا یہ شغف کچھ تو اس سبب سے ہے کہ ان کا تعلق اودھ کی سرزمین سے ہے جہاں قدیم روایات کی پاسبانی کو وضعداری کا لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہ ایک قدیم وضع کے، جاگیر داری نظام سے وابستہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن زیادہ تر اس کا باعث یہ ہے کہ وہ افتادِ طبع کے زیرِ اثر اُس اندازِ سخن کے عاشق تھے۔ جسے میر تقی میرؔ، شاہ نصیرؔ اور مومنؔ غالبؔ نے رائج کیا تھا۔ وہ باقاعدہ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد تھے۔ خود تسلیمؔ، نواب اصغر علی خان نسیم دہلوی کے شاگرد تھے جنہیں مومنؔ سے تلمذ تھا۔ استادی شاگردی کا یہ سلسلہ مومنؔ سے شاہ نصیرؔ تک اور نصیرؔ سے قائمؔ اور ظہور الدین حاتمؔ تک پہنچتا ہے۔ اس سلسلے کو اگرچہ میرؔ سے براہِ راست تعلق نہیں لیکن میرؔ کی عظیم شخصیت غزل پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ہر دل باختہ، دردمند شاعر اُن سے اپنی نسبت قائم رکھنا فخر سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسرتؔ کے کلام میں ان تمام اساتذہ کی خصوصیات جا بجا جھلکتی ہیں۔ مصحفیؔ کی طرح حسرتؔ کی طبیعت میں بھی اخذ و استفادہ کا ملکہ بہت زیادہ تھا اسی لئے وہ ان تمام اساتذہ کی خوبیوں سے اپنے کلام کو آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہی کیا اور اسی لئے ان کے اشعار میں اندازِ سخن کے لحاظ سے بڑا تنوع، بہت رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ اس کا اعتراف انہوں نے اکثر غزلوں کے مقطعوں میں کیا بھی ہے :-

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ
طبعِ حسرتؔ نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

حسرتؔ تری شگفتہ کلامی پہ آفریں
یاد آگئیں نسیمؔ کی رنگیں بیانیاں

مرحبا حسرتؔ بنائی خوب تصویرِ سخن
رنگِ مومنؔ خوشنما کس درجہ اس پیکر میں ہے

طرزِ مومنؔ میں مرحبا حسرتؔ
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

اسی تاثر پذیری اور قوتِ اخذ کے سبب اُن کے کلام میں وہ خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں جو

ماونو [1] ۱۹۰۳ء میں بی اے پاس کیا جو بقول اکبر الہ آبادی اُن دنوں بہت بڑے مہم کا سر کرنا تھا۔ [2] سنئے اور پڑھنے چراغ ص ۱۳۱

صاحبِ طرز اساتذہ سے منسوب ہیں۔ اُن کے اشعار میں غالب کی جدّتِ ترکیب اور تلذذ پسندی، مومن کی معاملہ بندی، میر کا سوز و گداز، مصحفی کی طرح حواسِ خمسہ کو محظوظ کرنے کی صلاحیت اور نسیم دہلوی کی رنگیں بیانی یک جا نظر آتی ہے۔ شاہ نصیر مشکل زمینوں کے بادشاہ تھے۔ اُس کا اثر بھی حسرت پر پڑا چنانچہ کلیات میں کئی غزلیں ایسی زمینوں میں ہیں جن سے شاہ نصیر، ذوق اور ناسخ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے تاہم وہ دو خصوصیات جو اُن کے کلیات میں قدم قدم پر نظر آتی ہیں — معاملہ بندی اور حواسِ خمسہ کا تلذذ ہے۔

شبلی نعمانی کے بقول معاملہ بندی یا وقوعہ گوئی کا مفہوم یہ ہے کہ محب اور محبوب کے درمیان شکوہ شکایت، حرف و حکایت، الفت و نفرت اور گفت و شنید کے جو جو مرحلے پیش آتے ہیں یا جن واقعات سے وہ دوچار ہوتے ہیں اُن کا بیان صداقت کے ساتھ کر دیا جائے[۳]۔ اُردو میں جراتؔ، داغؔ اور مومنؔ اس فن کے ماہر ہیں، لیکن اوّل الذکر دونوں باکمالوں کے متعلق اربابِ ذوق کا فیصلہ یہی ہے کہ ان کی معاملہ بندی بالعموم رکاکت و ابتذال کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ جراتؔ کو تو ایک مرتبہ برسرِ مشاعرہ میرؔ کی زبان سے یہ سرٹیفکیٹ بھی ملا تھا کہ "کیفیت اس کی یہ ہے کہ شعر تو تم کہہ نہیں جانتے، اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔"[۴] داغؔ کو بھی رامپور اور حیدرآباد میں تحسین و آفرین کے نعروں کے درمیان کبھی کبھی اسی قسم کے فقرے سننا پڑتے تھے۔ البتہ مومنؔ نے اس وضع کو خوب نباہا، انہوں نے معاملاتِ عشق و الفت کو اس متانت کے ساتھ بیان کیا کہ شرافت اور تہذیب کے دامن پر کہیں داغ نہ لگنے دیا[۵]۔ مومنؔ کے متعلق مشہور ہے کہ بہت عاشق مزاج تھے اور اپنا شوق پورا کرنے کے لئے انہیں دہلی جیسا شہر ملا تھا جہاں ان کی محبت کے افسانے مشہور تھے۔ خود مومنؔ نے اپنی مثنویوں میں اپنے چھ معاشقوں کا حال بیان کیا ہے۔ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بقول ایسے معاشقے انہوں نے نہ جانے کتنی مرتبہ کئے تھے اگرچہ اس آوارگی سے مومنؔ رسوائے دہر ہوئے لیکن اس نقصان میں اتنا فائدہ ضرور کمایا کہ 'طبیعتوں کے چالاک' ہو گئے۔ اُن کی غزلوں میں معاملہ بندی اور مخصوص ذاتی رنگ کی جو جھلک نظر آتی ہے وہ انہی معاشقوں کی کرامات ہے۔

حسرت موہانی نے طرزِ مومنؔ کو ایک سچے فنکار کی طرح نباہا۔ لیکن فن سے شغف رکھنے کے علاوہ وہ عشق و الفت کی منزلوں سے بھی گذرے تھے اور وارداتِ شوق سے اچھی طرح واقف تھے۔ جہاں اُن کی کسی داستانِ الفت کا دستاویزی ثبوت تو نہیں ملتا لیکن کلیات کے اشعار گواہی دیتے ہیں کہ کسی زمانے میں اُنہیں فرصتِ کاروبارِ شوق، میسر تھی۔ اُن کی ایک غزل نے جس کا مطلع ہے ؎

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

اور جو ایک مرتبہ ریڈیو پر گائی گئی تھی، انہیں مشہور کیا لیکن بدنام اس سے زیادہ ہی کیا۔ اس کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی محبوب کے ساتھ گلے شکوے، وصل و فراق، حرف و حکایت شکوہ شکایت تمام مرحلوں سے گذرے تھے پھر جب پختہ عمری کے زمانے میں وہ سیاسی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تب بھی حُسن سے ان کا تعلق قائم رہا اور وہ حُسن و جمال کو ہر حال میں، ہر آن میں دیکھنے کے خوگر رہے۔ اس کے علاوہ انسان کا قلب ایک مرتبہ جن جذبات کی آماجگاہ بن جاتا ہے اُن کی یاد آخرِ عمر تک محو نہیں ہوتی۔ غالباً انہی تاثرات کے زیرِ اثر حسرتؔ کی غزلوں میں معاملہ بندی کے رنگین اور نازک نقوش اُبھرتے ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجئے جن سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان میں بیان کردہ احساسات و واقعات رسمی یا فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ حسرتؔ نے ان میں وہی بیان کیا ہے جو کبھی اُن کے دل پر گزر چکا ہے:-

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

اک رنگِ التفات بھی اُس بے رُخی میں تھا
اک سادگی بھی اس نگہِ سحر فن میں تھی

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

---

[۳] شعر العجم جلد سوم ص۱۵۷ [۴] آبِ حیات ص۴۴۱ [۵] عبد الحمید۔ گلِ رعنا ص۳۹۸ [۶] رام بابو سکسینہ تاریخِ ادبِ اردو ص۱۴۲

حُسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

حسرتؔ کو جوانی میں عیشِ با فراغت نصیب ہوا ہے۔ پھر جب اپنی سیاسی مصروفیت کے تحت وہ اس میدان سے نکل گئے تب بھی اس کی یاد اُن کے دل کے گوشوں میں متاعِ عزیز کی طرح محفوظ رہی اسی لئے معاملہ بندی کا انداز ان کے اشعار میں آخر دم تک موجود رہا۔ وارداتِ الفت کے بیان میں جو متانت و شائستگی ان کی غزلوں میں ہے اُسے کچھ خاندانی تہذیب کا نتیجہ سمجھئے اور کچھ طرزِ مومنؔ کا فیضان تصور کیجئے۔ لیکن کہیں کہیں وفورِ گوئی کے شوق میں حسرتؔ سے یہ لغزش بھی ہوئی ہے کہ ان کا بیان رکاکت و عریانی کی حدود تک پہنچ گیا ہے۔ اب اسے ہوسناکی سمجھئے یا جذبات نگاری کی معصوم صداقت برمحل نہیج یہ اُن کی معاملہ بندی کا قابلِ اعتراض پہلو ہے اسکی مثالیں کلیات میں کم سہی لیکن ہیں ضرور۔ ان میں کہیں عریاں نگاری نے تہذیب و متانت کی فضا کو مجروح کیا ہے اور کہیں اسلوبِ بیان کی ناموزونی نے مثلاً

جس میں دو حرف کبھی اس نے لکھے تھے حسرتؔ
ہم نے سو بار وہ آنکھوں سے لگایا کاغذ

بعض مثالیں ان سے بھی پست ہیں اس لئے قلم انداز کی جاتی ہیں۔ تاہم اس معاملے میں حسرتؔ کو الزام دینے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ نازک جذبات و معاملات کا بیان کرتے وقت اس قسم کی لغزشیں بالعموم سرزد ہو جاتی ہیں۔ مرزا جعفر علی خان اثرؔ کا یہ قول بہت ہی پُر لطف ہے کہ "معاملہ بندی کو اس کوچے سے تشبیہہ دیجئے جو کیچڑ سے اَٹا ہوا ہو۔ ذرا قدم پھسلا اور آدمی کیچڑ میں لت پت"۔ چنانچہ اس کوچے میں اگر حسرتؔ بھی پھسل پڑے تو تعجب کا محل نہیں۔ مومنؔ جیسے مہذب نگار سے بھی ایسی لغزشیں ہوئی ہیں۔

معاملہ بندی کے علاوہ عشق و الفت کی حقیقی روح بھی حسرت کی غزلوں میں موجود ہے۔ وہ جس دور کی یادگار تھے اس میں عشق کے ساتھ بہت پاکبازانہ تصورات وابستہ تھے جن کا اظہار حسرتؔ کے قلم سے از خود ہوا ہے۔ یہ وہ سطح ہے جہاں جذباتیت اور ہوسناکی کی آلائش دل سے نکل جاتی ہے اور انسان عشق کو متاعِ عزیز سمجھنے لگتا ہے۔ معشوق کے بجائے فقط عشق ہی مطلوب اور مقصود بن جاتا ہے۔ اس کیفیت کا افلاطونی عشق سے التباس نہ کیجئے۔ یہ بالکل مختلف کیفیت ہے جس میں احساسِ جمال برابر قائم رہتا ہے اور ذوقِ جمال کے تحت آدمی حسن کی اداؤں کو بڑی پاکبازی سے دیکھتا اور معصومیت سے بیان کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں انگلستان کی رومانی تحریک کے علمبردار شیلےؔ اور کیٹسؔ کے کلام میں حُسن کا بیان اتنی معصومیت کے ساتھ ہوا ہے کہ ہوس کا شائبہ تک نہیں۔ بدنامِ زمانہ بائرنؔ بھی جسے فسق و فجور کی کثرت کے سبب ملک بدر ہونا پڑا، حُسنِ نسوانی کا بیان کرتے وقت شائستگی کا وہی معیار قائم رکھتا ہے جو اُس کے ہمعصر رفقا کے ہاں موجود ہے۔ ذیل کے اشعار حسرت کے اسی معصوم ذوقِ جمال اور جذبۂ الفت کے آئینہ دار ہیں:—

آہ اُس نگاہِ مست کی شوخی جو بے خبر
خوبی پہ روئے یار کی پہلے پہل گئی

رنگینیوں کی جان ہے وہ پائے نازنیں
میری نگاہِ شوق جہاں سر کے بل گئی

غمِ دوراں نے کشاکش تو بہت کی لیکن
یاد اُن کی دلِ حسرت سے بھلائی نہ گئی

یہ وہ خلوص ہے جو فنکار کے فن میں انفرادیت پیدا کر دیتا ہے حسرت کے کلیات میں شاید ہی کوئی شعر ایسا ہو جسے آپ رسمی یا روایتی کہہ سکیں۔ مومنؔ کی غزل کی طرح حسرتؔ کے کلام میں بھی وہی رچاؤ موجود ہے جو صداقت و خلوصِ جذبات سے پیدا ہوتا ہے۔ اس منزل میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ شاعر کے سازِ سخن سے جو صدا نکلتی ہے اس میں دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ جرأت پر میر تقی میرؔ اور دوسرے نقاد جو چاہیں فتویٰ لگائیں لیکن اُس کی صداقت بیان سے انکار نہیں ہو سکتا یہی حالت داغؔ کی بھی ہے. جس کے دواوین میں سراسر چھیڑ چھاڑ، لاگ ڈانٹ، جلی کٹی، فقرہ بازی، طنز و تشنیع کی بھرمار سہی لیکن سب کی سب صداقت پر مبنی ہے اس لئے مزے سے خالی نہیں۔ حسرتؔ موہانی کے اشعار میں یہی صداقتِ بیان ہے۔ اس معاملے میں جہاں جذبات کا وفور ہو گیا ہے۔ وہاں ان کے کلام میں وجد آفریں کیفیت پیدا ہو گئی ہے:—

ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے
محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو ازراہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

وارداتِ شوق کے بیان میں صداقت کے دوش بدوش ایک اور خصوصیت جو حسرت کے کلام

میں جابجا نمایاں ہے وہ اُن کی رنگیں بیانی ہے۔ انہوں نے عہدِ ہوس کے فسانے، بڑی رنگین رسیلی زبان میں سنائے ہیں۔ مضمونِ الفت بیان کرتے وقت وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ شگفتہ و رنگین الفاظ میں مطلب ادا کریں۔ وہ اس رنگین بیانی پر خود بھی نازاں ہیں اور بعض مقطعوں میں اسے اپنے استاد کے استاد تسیم دہلوی اور مومن کا فیضان بتاتے ہیں۔ بعض غزلیں سراسر انہی رنگین جواہرت سے مرصع ہیں:۔

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ رے حُسنِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا
ساغر کو رنگِ بادہ نے پُر نور کر دیا

یہ واقعہ ہے کہ شاعر اور دوسرے فنکار شدتِ احساس کے سبب کیفیتوں کا ادراک عوام الناس سے زیادہ کرتے ہیں۔ ہمارے تمام حواس اپنی مرغوب چیزوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ آنکھیں اچھے مناظر اور حسین صورتوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ قوتِ شامہ خوشبو سے محظوظ ہوتی ہے جسم نرم اور شفاف چیز کو مَس کر کے حظ اٹھاتا ہے۔ کان سُریلی آواز سے خوش ہوتے ہیں۔ حواسِ خمسہ میں جو قوت سب سے زیادہ کام کرتی ہے وہ قوتِ باصرہ ہے۔ توصیفی اشعار میں بیشتر وہی ہیں جو آنکھوں سے دیکھے ہوئے مناظر کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ حسرت نے حواسِ خمسہ سے تلذذ کا بیان اکثر غزلوں میں کیا ہے اس معاملے میں وہ مصحفی کے ہمقدم ہیں جنہیں فراق گورکھپوری نے حواسِ خمسہ کا شاعر، قرار دیا ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ حسرت نے شاید مصحفی ہی سے سیکھی ہے جس کا اقرار انہوں نے ایک مقطع میں کیا بھی ہے یہاں بالترتیب ان تمام حواسوں سے تلذذ کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے قوتِ باصرہ کو لیجئے کہ حسرت نے اسی سے حسنِ مجازی کا جائزہ اکثر لیا ہے۔ انہوں نے حُسن کو بیداری کے عالم میں، عالمِ خواب میں ہنستے بولتے، عتاب میں، خطاب میں، غرض ہر عالم میں دیکھا ہے اور اُس کا نقشہ بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے:۔

قابلِ دید تھی گرمی میں پسینے کی بہار
تر ہوا ہے عرقِ حُسن سے بستر کیا خوب

پیراہن اُس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

کافی ہے ان کے پائے حنابستہ کا خیال
ہاتھ آئی خوب سوزِ جگر کی دوا مجھے

قوتِ باصرہ سے بڑھکر قوتِ شامہ سے حسرت نے کام لیا ہے وہ اپنے مشام سے جس جس طرح محظوظ ہوئے ہیں اُس کا تذکرہ انہوں نے بڑی رنگیں بیانی سے کیا ہے، جسمِ معطر کی خوشبو ہو یا زلفِ معنبر کی، وہ اُس کا تذکرہ بہت وجد آور الفاظ سے کرتے ہیں ان کی یہ حِس اتنی قوی ہے کہ فاصلے درمیان میں حائل نہیں ہو سکتے۔ ایک عربی شاعر کی طرح جو لکھتا ہے، "مجھے اُس کی خوشبو آجاتی ہے۔ حالانکہ وہ بڑے فاصلے پر طائف میں رہتی ہے" حسرت کو بھی زلیخا اور جسمِ یار کی خوشبو طولانی فاصلوں سے آجاتی ہے وہ لباس کو سونگھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ کس گل اندام نازنین کی خوشبو سے معطر ہے۔ انہیں خط سے خوشبوئے یارِ دلنواز آتی ہے۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ کیجئے کہ حسرت نے اس معاملے میں اُردو زبان کو کتنا قیمتی سرمایہ بخشا ہے:۔

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں
شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

کیا کیجئے بیاں اُس تنِ نازک کی حقیقت
خوشبو میں ہے گل بو تو لطافت میں ہے سب رنگ

یہی صورت قوتِ لامسہ اور ذائقہ کی ہے جس سے تلذذ کے متعلق حسرت نے بہت سے اشارے کئے ہیں۔ فراق نے مصحفی کو حواسِ خمسہ کا شاعر کہا ہے۔ یہی بات زیادہ صداقت کے ساتھ حسرت کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ غالباً مصحفی کے آٹھ ضخیم دیوانوں میں حواسِ خمسہ سے تلذذ کے لئے اشعار انتخاب نہیں کئے جا سکتے جتنے حسرت کے کلام سے منتخب ہو سکتے ہیں۔

حسرت نے بقول خود ہر اُستاد سے فیض اُٹھایا ہے۔ انہوں نے میر سے سوز و گداز اور سادگی و سلاست کا، غالب سے تنوعِ مضامین اور جدتِ ادا کا، نسیم اور مومن سے رنگین معاملہ بندی کا، قائم اور حاتم سے صداقت و خلوصِ جذبات کا سبق سیکھا ہے اس کے کلام سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے

ان اساتذہ کی زمینوں کو اختیار کرنے کے علاوہ
اُن سے مضامین و خیالات اخذ کرنے میں بھی بڑی
دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔ بعض مضامین کا
تقابلی مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے
ان کا مشہور شعر ہے ؎

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

مضمون اور الفاظ کے اعتبار سے میر کے شعر
کا چربہ معلوم ہوتا ہے ؎

کیا تنِ نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے

اُن کے دواوین میں بے شمار غزلیں ہیں جو
مومن اور غالب کی تقلید میں کہی گئی ہیں۔ انہیں
ذوق سے طبعی مناسبت نہیں لیکن ایک غزل ذوق
کی زمین میں بھی کہی ہے ؎

میری طینت میں ہے داخل ہوسِ جامِ شراب
بندۂ پیرِ مغاں ہوں مَیں خسِ جامِ شراب

زبان کے معاملے میں حسرت نے کہیں غالب
کی پیروی کی ہے اور کہیں میر کی۔ اُلجھے ہوئے مضامین
کو اگر مختصر الفاظ میں ادا کرنا ہو تو عربی فارسی کی تراکیب
سے کام لینا پڑتا ہے۔ مرزا غالب اور بیدل اس
فن کے امام ہیں حسرت نے بھی غالب کے تتبع
میں فارسی تراکیب استعمال کر کے وسیع مفہوم کو چند
لفظوں میں ادا کر دیا ہے۔ کشتِ خیال، شرمسارِ انتظار
کاروبارِ انتظار، نوازش ہائے پنہاں، اُبشارِ آرزو،
حسنِ کرشمہ ساز، کشاکش ہائے شوق وغیرہ سینکڑوں
ترکیبیں ہیں جن سے حسرت نے بہ سہولت اظہارِ مطلب
کیا ہے۔ ذیل کے اشعار میں فارسی تراکیب کی برجستگی
نمایاں ہے ؎

اُس عشوۂ نازنین کے جلوے
ہیں دشمنِ عقل مصلحت کوش

آوارۂ دشتِ جستجو ہیں
ہم خانہ بدوشِ آرزو ہیں

تاہم عربی فارسی الفاظ کی گراں باری کے
دوش بدوش حسرت کی اکثر غزلیں صاف اور سلیس
زبان میں ہیں۔ انہیں پڑھ کر میر اور مصحفی کی سادہ و
پُرکار زبان یاد آتی ہے چھوٹی بحروں میں حسرت کی
سلاست و فصاحت دیکھنے کی چیز ہے ؎

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اُٹھو سلام کرو

جامہ زیبی نہ پوچھئے ان کی
جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں

المختصر حسرت کی غزل کے یہ اجزائے ترکیبی ہیں
جس سے وہ اپنی غزل کو آراستہ کرتے ہیں اور اپنے
اساتذہ کے سلسلے کا نام لے کر استفادے کا اعتراف
کرتے ہیں ؎

مرحبا حسرت بنائی خوب تصویرِ سخن
رنگِ مومن خوشنما کس درجہ اس پیکر میں ہے

حسرت تری شگفتہ بیانی پہ آفریں
یاد آگئیں نسیم کی رنگیں بیانیاں

حسرت کے کلام میں جا بجا سیاسی اشارے
بھی ملتے ہیں۔ احرار کا یہ رئیس ساری عمر انگریزی سامراج
سے الجھا رہا۔ اس کی عمر کا خاصا حصہ لکھنؤ، فیض آباد
الہ آباد، احمد آباد، پونا، جھانسی، للت پور کی جیلوں
میں بسر ہوا جہاں وہ سہولتیں ہرگز میسر نہ تھیں جو آج
کل سیاسی قیدیوں کو حاصل ہیں۔ زندانِ جفا میں اس
جواں ہمت شاعر کی مشقِ سخن بھی جاری رہی اور چکّی کی
مشقت بھی۔ بعض دفعہ اس بے چارگی کے عالم میں
رمضان اور عید بھی گزری ؎

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

سیاست کے علاوہ حسرت کے کلام سے
ان کے مذہبی عقائد کا حال بھی کھلتا ہے۔ عقیدتاً
وہ وسیع المشرب سُنّی تھے تصوف کے طبعی میلان نے
اُن کی نظر میں اور وسعت پیدا کر دی تھی۔ وہ چشتی
قادری سلسلے میں شاہ عبدالوہاب فرنگی محل کے مرید
تھے اور اسی نسبت سے شاہ عبدالرزاق سے
ارادت رکھتے تھے۔ انبیاء اولیا اور فقرا کے معتقد
ہونے کے علاوہ وسعتِ مشرب کے زیرِ اثر کرشن
کی روحانی عظمت کے بھی قائل تھے۔ اپنے کلام میں
انہوں نے سب سے زیادہ خراجِ عقیدت جنابِ
سرورِ کونین کی بارگاہِ اقدس میں پیش کیا ہے انہوں نے اپنی
عمر میں گیارہ حج کئے اور ہر بار حرمین شریفین کی زیارت
سے مشرف ہوئے۔ خشکی کے راستے سفر کرنے کی
صورت میں وہ بغداد سے ہوتے ہوئے کاظمین،
کربلا، نجفِ اشرف پہنچے۔ وہاں سے مدینے اور اُس
کے بعد مکہ معظمہ۔ بعض غزلوں میں سراسر ان بزرگوں
کی بارگاہ میں جواہرِ عقیدت نثار کئے ہیں۔ مثلاً بغداد

میں حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے اشتیاق میں
جو غزل کہی ہے، سر بسر بادۂ شوق میں ڈوبی ہوئی
ہے۔ مطلع اور مقطع یہاں لکھا جاتا ہے:۔

دستگیری کا طلبگار ہوں شیئاً للہ
میرِ بغداد میں ناچار ہوں شیئاً للہ
غوثِ اعظمؒ سے جو مانگو گے ملے گا حسرتؔ
بس کہو حاضرِ دربار ہوں شیئاً للہ

غالباً اس سفر میں ۱۸ر اپریل ۱۹۲۵ء کو وہ
مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے اور دیارِ محبوب کی
فضا میں اپنے جذبۂ شوق کی تسکین کی۔ ذیل کے
اشعار اسی جوشِ عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں:۔

مدنی صبح کا عجب ہے ظہور
قابلِ دید ہے یہ بارشِ نور
نظر آتا ہے پیشِ روئے حضور
اہلِ بینش کو نورِ جلوۂ طور
مستنیرانِ حبِّ آلِ رسول
پاک ہیں باوجودِ فسق و فجور
ذات اُن کی ہے مصدر البرکات
اس سے انکار دین کا ہے فتور
طعنِ اغیار پر ہے ناز مجھے
کہ میں حسرتؔ ہوں مستفیضِ قبور

۱۹۴۶ء میں جب سعادتِ حج کے لئے
روانہ ہوئے تو بغداد، کاظمین، نجف اور کربلا کی
راہ سے مدینہ منورہ پہنچنے کا حال تفصیل سے
ان اشعار میں قلمبند کیا ہے

اے شہِ شاہانِ رسل السلام
حاضرِ دربار ہے پھر یہ غلام
بحر کی آسانیٔ رہ چھوڑ کر
خواہشِ آرام سے منہ موڑ کر
بصرہ و بغداد سے تا کاظمین
ہو کر چلا سوئے مزارِ حسین

نجف اشرف میں حضرت علی ابنِ ابی طالب
کے مزارِ پُرانوار پر حاضری کے وقت یہ زمزمہ
ادا کیا ہے

میسر ہے شاہِ نجف کی غلامی
زہے کامرانی زہے شاد کامی
ملے مجھ کو بھی مثلِ سلمانؓ و بوذرؓ
وہی خواجہ تاشی وہی نیکنامی
پہنچ کر درِ شاہِ مرداں پہ اکثر
خصوصی شرف پا گئے ہم سے عامی

حج اور زیارت کے ان سفروں کے علاوہ
بھی سفر حضر میں حسرتؔ نے جناب سرورِ کونینؐ اور
اُن کے اہلبیتِ اطہار کو عقیدت کا خراج ادا کیا۔
بالخصوص سیاسی قید میں اُن کی نوا انہی ارواحِ طیبہ
سے لگی رہتی تھی۔ سابرمتی جیل احمد آباد کی تنہائی
میں اسی جذبے کے زیرِ اثر ۲۶ر ستمبر ۱۹۲۳ء کو
انہوں نے ان اشعار میں دلی جذبات کا اظہار کیا:

بھیجئے تحفۂ درود و سلام
بہ جنابِ رسول و آلِ رسولؐ

خاصہ بر روحِ پُر فتوحِ حسین
نورِ چشمِ علی و جانِ بتول

نونہالانِ خلد کے سردار
گلبنِ روضۂ رسولؐ کے پھول
جن کے روزے پہ رحمتِ حق کا
روز ہوتا ہے کربلا میں نزول
جملہ اربابِ صبر و فقر و فنا
جن سے سیکھے ہیں عاشقی کے اصول

تصوف کے اس میلان نے نیز اُن کی سیادت
نے انہیں "نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز"
کا مصداق بنایا تھا۔ وہ سیاست کے جلسوں میں
صادق البیان، راست باز مقرر تھے جن کے جذبۂ
ایمان سے پٹیل جیسے متعصب کانگریسی بھی خائف
رہتے تھے۔ اُن کے بیعت کے شجرے نے جس کا
سلسلہ امام رضا علیہ السلام سے مولا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ
تک پہنچتا ہے انہیں جرأتِ گفتار عطا کی تھی جس
کا گاندھی اور جواہر لال پورا احترام کرتے تھے۔ وہ
عمر بھر فقرِ محمدی کا نمونہ بنے رہے۔ سفر میں ایک
مختصر بستر، تھیلا اور لوٹا اُن کا سامان ہوتا تھا۔
ساری عمر سادہ لباس میں تھرڈ کلاس میں سفر کرتے
رہے۔ علیگڑھ یونیورسٹی میں ممتحن کی حیثیت سے
جاتے تھے تو فسٹ کلاس کے کرائے کے مستحق ہونے
کے باوجود وہی تیسرے درجے کا کرایہ قبول کرتے
تھے۔ ۱۳ر مئی ۱۹۵۱ء کو جب اِس مردِ مومن نے
خلد کی راہ لی تو یہ کہیئے کہ ہند میں فقر و توکل، صدق و صفا
جرأت و صداقت کا چراغ بے نور ہو گیا اور شعر و
شاعری کی شمع بجھ گئی ہے

دیارِ حسن میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرتؔ کا
وہ وضعِ پارسا اس کی وہ عشقِ پاکباز اس کا

حمایت علی شاعر

محاسبہ

سرکارِ دو عالمؐ کے حضور

حضور آپؐ کی اُمت کا ایک فرد ہوں میں
مگر خود اپنی نگاہوں میں آج گرد ہوں میں
میں کس زباں سے کروں ذکرِ اسوۂ حسنہ
کہ اہلِ درک و بصیرت نہ اہلِ درد ہوں میں
میں کس قلم سے لکھوں سرخیِ حکایتِ دل
کہ رنگ دیکھ کے اپنے لہو کا، زرد ہوں میں
سمجھ سکوں گا میں کیا سرِّ نکتۂ معراج
شکست خوردۂ دنیائے گرم و سرد ہوں میں
بزعمِ خود تو بہت منزل آشنا ہوں مگر
جو راستوں ہی میں اُڑتی پھرے وہ گرد ہوں میں
عجیب ذوقِ سفر ہے کہ صورتِ پرکار
جو اپنے گرد ہی گھومے، وہ رہ نورد ہوں میں
وہ اکائیوں سے نچوڑا تھا جس اکائی کو
اب اس اکائی سے آمادۂ نبرد ہوں میں
بچھا رکھی ہے جو اک دستِ مکر نے ہر سو
اسی بساطِ سیاست پہ ایک نرد ہوں میں
میں اپنی ذات میں ہوں اپنی قوم کی تصویر
کہ بے عمل ہی نہیں، بھیڑ میں بھی فرد ہوں میں
حضور آپ نے چاہا تھا کیا، ہوا کیا ہے
مگر میں سوچ رہا ہوں، مری خطا کیا ہے
فقط تلاوتِ الفاظ میرا سرمایہ
پسِ حروف ہے کیا، کب مجھے نظر آیا

کہی تھی آپ نے جو بات استعاروں میں
مرا شعور کب اس کا سفیر بن پایا
نہ میں نے سوچا کہ شق القمر میں رمز ہے کیا
مری گرفت میں کس طرح آفتاب آیا
سوادِ غیب سے جبریل کی صدا نے مجھے
سماعتوں کے کس ادراک پر ہے اکسایا
نہ میں نے جانا کہ اک عکسِ لاشعور بھی ہے
جو حرف و صوت کی صورت ہے میرا ہم سایہ
نہ میرا عشق ہے میرے یقین کا حاصل
نہ میری عقل ہے میرے جنوں کی ہم پایہ
میں اپنی ذات میں کس طرح ایک عالم ہوں
سمجھ سکی نہ کبھی میری فکرِ کم مایہ
وہی عقائدِ افسوں زدہ، وہی اسطور
بدل کے شکل مری عقل کے ہیں ہمسایہ
کھُلے تو کیسے کھُلے مجھ پہ معنیِ اقرا
کہ میرے علم پہ ہے میرے جہل کا سایہ
نہ میں نے سوچا کہ قرآں کا مدعا کیا ہے
عروجِ آدمِ خاکی کی انتہا کیا ہے
میں بت پرست نہیں ہوں، پہ بت شکن بھی نہیں
وہ مردِ تیشہ بکف ہوں جو کوہکن بھی نہیں

میں کس کے نام لکھوں یہ ستم کہ اہلِ کرم
فقیہہ و صوفی و مُلّا ہیں، برہمن بھی نہیں
میں ایک چہرہ تھا اور اب ہزار چہرہ ہوں
اب اعتبار کے قابل مرا سخن بھی نہیں
میں فکرِ بوذر و صبرِ حسین کا ورثہ
گنوا چکا ہوں تو ماتھے پہ اک شکن بھی نہیں
میں روشنی کے بہت خواب دیکھتا ہوں مگر
اس انجمن میں جہاں شمعِ انجمن بھی نہیں
میں چل رہا ہوں کسی پیرِ تسمہ پا کی طرح
اگرچہ پاؤں میں میرے کوئی رسن بھی نہیں
مرا وجود ہے سنگِ مزار کے مانند
کہ میرے ساتھ مری روح کیا، بدن بھی نہیں
میں شہرِ علم سے منسوب کیا کروں خود کو
کسی کتاب کا سایہ مرا کفن بھی نہیں
کہا گیا جسے قرآں میں بندۂ مومن
وہ میں نہیں ہوں مرا کوئی ہم وطن بھی نہیں
ہر اُمتی کی یہ فردِ عمل ہے کیا کیجئے
حضور آپ ہی میرا محاسبہ کیجئے

ڈاکٹر اینا ماری شمل
ترجمہ منیر احمد شیخ

بُلھے شاہ کا مزار

وہ اُسے اپنا "سب سے بڑا شاعر" کہتے ہیں
'فخرِ پنجاب' بھی اسی کا لقب ہے
اس کے گیت "میٹھے اور لافانی ہیں"
جوتی - وہی اور
عوام کی زبان پر دن رات
گونجتے ہیں

مگر
اس کا مزار
جیسے اک پرانے خستہ شہر میں
ایک دل ــــ جو پتھر بن چکا ہو
ہاں اس میں
کچھ ملنگ
ڈیرا لگائے نظر آتے ہیں

بھنگ کے نشے میں ڈوبی ہوئی
خوابوں کے درمیان
خواب ــــ جنت کے خواب - ہرے بھرے، جن میں
دودھ اور شہد کی نہریں چلتی ہیں اور اک باغ ــــ جو
باغِ محبت ہے - جس کے اندر ہر شے اک دوسرے
سے محبت اور پیار کے رشتے میں بندھی ہوئی ہے)
بھنگ کے نشے میں ڈوبی ہوئی

خوابوں کے درمیان
وہ لڑکھڑاتے ہوئے
مزار کی طرف بڑھتے ہیں
اپنے سوکھے ہوئے مریل ہاتھوں میں
مزار کی چادر کو تھامے ہوئے
پناہ اور پیار کے طلبگار
اپنے ہاتھوں کو خاک پہ رگڑتے ہیں

گونگی اور بہری خاک
جسے پیر کے قدموں کو چھونے کا فخر ہے
بے شک ان سب سے زیادہ
سینے میں درد رکھتی ہے
جو پیر کے
مدح سرا اور
دعوے دار بنے پھرتے ہیں

ہمارا شہر

ہمارا شہر
ابھی اسرار کی جھلمل میں جیتا ہے
ابھی الفاظ پاکیزہ ہیں
اور مفہوم اک سفاک خود غرضی کا طوفاں ہے!

یحییٰ امجد

حیات بعد الممات

یہ زندگی کی رَو، یہ مناظر، یہ کائنات
فطرت کا اک تغیرِ پیہم کا کارواں
صدیاں مثالِ گرد ہیں
میں ایک مُشتِ خاک!
یہ زندگی، یہ لذتِ ہستی، یہ ذوق و شوق
جد و جہد کا نشۂ پُر جوش و پُر خروش
اور آنکھ کھولنے کی یہ مہلت کہ جس کے پاس
فردا ہے اور نہ دوش!
موت اور اک عظیم خلا ــــ
جس کا سوچ کر دلِ غمدیدہ ہے خروش

اُمید کا چراغ
منور ہے جس سے آج مرا وقفۂ شعور
کہتا ہے بار بار
مر جائے گا بدن تو عمل کو فنا نہیں
اور اک بہشت اس کے لئے ناخلل پذیر

اس پاک سرزمین کے روشن دنوں میں مَیں
زندہ رہوں گا صبح کی اِک اِک کرن کے ساتھ!

حق الیقین

اگر آپ کی بات حق الیقیں ہے
تو پھر اہلِ انکار کے جھوٹ کو بولنے دیجئے
بحث کا خوف سچ کو نہیں
جھوٹ کو چاہیئے!

مئی ۱۹۶۹ء

خورشید رضوی

چل اے دل

چل اے دل آسماں پر چل
وہاں سے چل کے اس پرشور بزمِ ہست کو دیکھیں
بلند و پست کو دیکھیں

زمیں کی سرگوشی آسماں سے کیسی لگتی ہے
پہاڑوں کی سرافرازی وہاں سے کیسی لگتی ہے
کفِ دستِ جہاں کی خم بہ خم ریکھائیں کیسی ہیں
جو تیری راہ کا پتھر ہیں وہ کٹھنائیں کیسی ہیں
چل اے دل، آسماں پر چل

پاگل دل

دل تو اب یہ چاہتا ہے
رشتہ سب سے توڑ کے
دنیا سے منہ موڑ کے
جا نکلے اس اور
جہاں چلے نہ کوئی زور

کوئی نفی ہو اور نہ کوئی اثبات
دُور دُور تک دیئے جلائیں
کھلتے پھول ـــــ اور راس رچائیں
جھومتے جھونکے، دفیں بجاتے پات

اور مرے شنشے شانے پر
خوشبو ایسا اک نادیدہ ہات
پاگل دل تو اب یہ چاہتا ہے

ملیدہ

درختو

درختو! تم سے ملنے کی گھڑی جانے کب آئے گی
پلٹ کر پھر وہ فصلِ دوستی جانے کب آئے گی

درختو! میں جہاں کے جال میں الجھا ہوا طائر
الجھتا جا رہا ہوں اور، جتنا پھڑ پھڑاتا ہوں
وہ اک بوڑھا شکاری جس کے ہاتھوں میں درانتی ہے
وہ جس کی مٹھیوں میں بند قسمت کے نوشتے ہیں
اسی کی چاپ سے اُمید بھی ہے وسوسے بھی ہیں
درختو! جانے میرے حق میں اس کا فیصلہ کیا ہو

درختو! روزنوں سے جال کے اکثر نظر میری
تمہارے سبز لرزاں ہاتھ کی جنبش پہ پڑتی ہے
خدا جانے یہ شوقِ وصل ہے یا رمزِ رُخصت ہے
وداعِ واپسیں ہے یا گلے لگنے کی حسرت ہے
پلٹ کر آ سکوں گا پھر کبھی میں آشیانے میں
کہ مر جاؤں گا بوڑھی مٹھیوں کے قیدخانے میں
درختو! تم سے ملنے کی گھڑی جانے کب آئے گی

ڈوبتے سورج کا خودکلامیہ

چلو خورشید اتر جائیں پسِ کہسارِ گمنامی
ڈبو دیں جھیل کے پانی میں اپنی نسعرِ پیشانی
مَلیں مٹی بدن پر جھیل کے پاتال سے لے کر
کہ جس کی سوندھ سے بیتے دنوں کا واہمہ پلٹے
درختوں کی جڑوں میں رکھ کے سر سبزے میں کھو جائیں
سنیں چڑیوں کا پیہم شور کہ کناشاخساروں میں
چراگاہوں میں ننھی تتلیوں کی خوشدلی دیکھیں
پسِ مژگاں پھلتے آنسوؤں کی بے کلی دیکھیں
جو بے اذنِ روانی آنکھ سے دامن تک آ جائیں
اور اُن کے آئینوں میں حافظہ کھویا ہوا پلٹے
ہوا کی زد پہ لائیں جسم اپنا پیرہن اپنا
بسی ہے جس میں بُو نے ناگوارِ عہدِ جاہت کی
چلو خورشید اتر جائیں پسِ کہسارِ گمنامی
کہ ہم کو خوش نہیں آتی فضا افلاکِ شہرت کی

پہچان

کہیں تم مِلو تو
مسائل کو الجھا ہوا چھوڑ کر ہم
علائق کی زنجیر کو توڑ کر ہم
چلیں اور کنجِ چمن میں کہیں
سایۂ تاک میں بیٹھ کر
بھولے بسرے زمانوں کی باتیں کریں
اور اِک دوسرے کے خد و خال میں
اپنے کھوئے ہوئے نقش پہچان کر
محوِ حیرت رہیں
اور نرگس کی صورت
وہیں جڑ پکڑ لیں

ستار سید

سوال

چشم در چشم آنسوؤں کے چراغ
دل کے آنگن کی سمت جلتے ہوئے

ساعتِ ہجر کے مناظر میں
زرد رُو دوریاں ہیں عکس افگن
زندگی کے ہزار راہے پر
ختم ہوتی ہوئی مسافتِ جاں

پرت در پرت ایک پچھتاوا
سانس در سانس اک پشیمانی
کس کی تائید میں قبول کیا؟
ہم نے بے سمت راستوں کا سفر

کس کے سچ کا یقین کرتے ہوئے
خواہشیں ردِ کذب کی لے کر
قریۂ بے اماں سے نکلے تھے

کیا خبر تھی کہ جسم اُدھڑیں گے
اور پہلے کی طرح اب کے بھی
ابر مانگے تو آگ برسے گی

جم رہی ہے دلوں پہ گردِ ملال
سب ہیں نظر میں سوال

دشتِ ہجر میں یاد کے منظر

خواب خواب آنکھوں کو
دودھ رنگ جسموں کے
ذائقے نہیں بھولے

کس کو میں نے چاہا تھا
کون مجھ سے بچھڑا تھا
کون سے وہ موسم تھے
جب یہ خواب دیکھے تھے

یاد کے دریچے میں
دشتِ ہجر کے منظر
یوں اُبھر کے آتے ہیں

جس طرح ہواؤں میں
قافلے پرندوں کے
ڈوب ڈوب جاتے ہیں

جیسے لوگ ساحل کے
ڈوبتے مسافر کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں

پھر شام مراد ڈھل رہی ہے

پھر شام مراد ڈھل رہی ہے
دن بھر کا تھکا ہوا اُجالا
شمعوں کے قریب ہانپتا ہے
اور ــــ
رزق کے کھوج میں بھٹکتے
بے زار پرند لوٹتے ہیں
ٹوٹے ہوئے پر، جلی زبانیں
وہ کس کو دکھائیں، کون سمجھے!
بے سود سفر کی داستانیں

تاریک ہوئے راکھ رنگ منظر
جم سے گئے روزنوں میں چہرے
بجھتے ہوئے نیلگوں لبوں پر
ابھرے ہیں کسی سوال کے عکس
آنکھوں کے اجاڑ پن میں لرزاں
بے انت جواب کے ہیولے
پھر شام مراد ڈھل رہی ہے

افضال احمد سید

مٹی کی کان

میں مٹی کی کان کا مزدور ہوں
کام ختم ہو جانے کے بعد ہماری تلاشی لی جاتی ہے
ہمارے نگراں ہمارے بند بند الگ کر دیتے ہیں
پھر ہمیں جوڑ دیا جاتا ہے

پہلے دن میرے کسی حصّے کی جگہ
کسی اور کا حصّہ جوڑ دیا گیا تھا
ہوتے ہوتے
ایک ایک روز کسی نہ کسی دن کا ہو جاتا ہے
خبر نہیں میرے مختلف حصّوں سے جڑے ہوئے مزدوروں میں سے کتنے
کان بیٹھنے سے مر گئے ہوں گے
مٹی چرانے کے عوض
زندہ جلا دیئے گئے ہوں گے

مٹی کی کان میں کئی چیزوں پہ پابندی ہے
پانی مٹی کی حاکمیت کو ختم کر کے اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے
اگر نگرانوں کو معلوم ہو جائے
ہم نے مٹی کی کان میں آنے سے پہلے پانی پی لیا تھا
تو ہمیں شکنجے میں ڈال کر
سارا پانی نچوڑ لیا جاتا ہے
اور پانی کے جتنے قطرے برآمد ہوتے ہیں
اتنے دنوں کی مزدوری کاٹ لی جاتی ہے

مٹی کی کان میں آگ پر پابندی نہیں ہے
کوئی بھی نگراں آگ پر پابندی نہیں لگاتا
آگ کان کے مختلف حصوں کے درمیاں دیوار کا کام کرتی ہے
میں بھی آگ کی چار دیواریوں کے درمیاں کام کرتا ہوں
کوئی بھی مزدوری آگ کی چار دیواریوں کے بغیر نہیں ہو سکتی

مٹی کی کان میں آگ کا ایک اور کام بھی ہے
کبھی کبھی نگراں اچانک ساری کان کو خالی کرانا چاہتے ہیں
اس وقت کان میں آگ پھیلا دی جاتی ہے
اس دن اگر کوئی سلامت نکل جائے تو اس کی تلاشی نہیں لی جاتی
مٹی اسی دن چرائی جا سکتی ہے

میں نے ایک ایسے ہی دن مٹی چرائی تھی

وہ مٹی میں نے ایک جگہ رکھ دی ہے
اور ایک ایسے ہی آگ بھڑکنے کے دن میں نے بیکار اعضا کے انبار سے
اپنے ناخن اور اپنے دل کی لکیر چرائی تھی
اور انہیں بھی ایک جگہ رکھ دیا ہے
مجھے کسی نہ کسی طرح آگ لگنے کی خبر ہو جاتی ہے
میں چوری کے لئے تیار ہو جاتا ہوں

میں نے کوڑے کے ڈھیر پر ایک پاؤں دیکھ رکھا ہے
جو میرا نہیں ہے
مگر بہت خوبصورت ہے
اگلی آگ لگنے کے وقت اُسے اُٹھا لے جاؤں گا
اور اس کے بعد کچھ اور اور کچھ اور کچھ اور

ایک دن میں اپنی مرضی کا
ایک پورا آدمی بناؤں گا

مجھے اس پورے آدمی کی فکر ہے
جو ایک دن بن جائے گا
اور مٹی کی کان میں مزدوری نہیں کرے گا

میں اس کے لئے مٹی چراؤں گا
اور تحقیق کروں گا
کان میں آگ کس طرح لگتی ہے
اور کان میں آگ لگاؤں گا
اور مٹی چراؤں گا

اتنی مٹی کہ اس آدمی کے لئے ایک مکان، ایک پانی انبار کرنے کا کوزہ اور ایک چراغ بنا دوں

اور
چراغ کے لئے آگ چراؤں گا
آگ چوری کرنے کی چیز نہیں ہے
مگر ایک نہ ایک ضرورت کے لئے ہر چیز چوری کی جا سکتی ہے
پھر اس آدمی کو میرے ساتھ رہنا گوارا ہو جائے گا
آدمی کے لئے اگر مکان ہو، پینے کے پانی کا انبار ہو اور چراغ میں آگ ہو
تو اسے کسی کے ساتھ بھی رہنا گوارا ہو سکتا ہے

میں اسے اپنی روٹی میں شریک کروں گا
اور اگر روٹیاں کم پڑیں
تو روٹیاں چراؤں گا
ویسے بھی نگران ان مزدوروں کو جو کان میں شور نہیں مچاتے
بچی کچی روٹیاں دیتے رہتے ہیں

میں نے مٹی کی کان میں کبھی کوئی لفظ نہیں بولا
اور اس سے باہر بھی نہیں
میں اپنے بنائے ہوئے آدمی کو اپنی زبان سکھاؤں گا
اور اس سے باتیں کروں گا
میں اس سے مٹی کی کان کی باتیں نہیں کروں گا
مجھے وہ لوگ پسند نہیں جو اپنے کام کاج کی باتیں گھر جا کر بھی کرتے ہیں
میں اس سے باتیں کروں گا
گہرے پانیوں کے سفر کی
اور اگر میں اس کے سینے میں کوئی اکھڑنے والا دل چرا کر لگا سکا
تو
اس سے محبت کی باتیں کروں گا
اس لڑکی کی جسے میں نے چاہا ہے
اور اس لڑکی کی جسے وہ چاہے گا

میں اس آدمی کو ہمیشہ اپنے ساتھ نہیں رکھوں گا
کسی بھی آدمی کو کوئی ہمیشہ اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا

میں اس میں سفر کا حوصلہ پیدا کروں گا
اور اُسے اس خطے میں بھیجوں گا
جہاں درخت مٹی میں پانی ڈالے بغیر نکل آتے ہیں

مئی ۱۹۷۹ء

اور وہ ان بیجوں کو میرے لئے لے آئے گا
جن کے اُگنے کے لئے
پانی کی ضرورت نہیں ہوتی
میں روزانہ ایک ایک بیج
مٹی کی کان میں بوتا جاؤں گا
بوتا جاؤں گا
ایک دن کسی بھی بیج کے پھوٹنے کا موسم آجاتا ہے
مٹی کی کان میں بھی
مٹی کی کان میں میرا لگایا ہوا بیج پھوٹے گا
اور پودا نکلنا شروع ہوگا
میرے نگراں بہت پریشان ہوں گے
انہوں نے کبھی کوئی درخت نہیں دیکھا ہے
وہ بہت وحشت زدہ ہوں گے اور بھاگیں گے
میں کسی بھی نگراں کو بھاگتے دیکھ کر
اس کے ساتھ کان کے دوسرے دہانے کا پتہ لگا لوں گا
کسی بھی کان کا دوسرا دہانہ معلوم ہو جائے تو اس کی دہشت نکل جاتی ہے

جب میری دہشت نکل جائے گی
میں آگ کی دیوار سے گذر کر
مٹی کی کان کو دور دور جا کر دیکھوں گا
اور ایک ویران گوشے میں
اوپر کی طرف ایک سرنگ بناؤں گا
سرنگ ایسی جگہ بناؤں گا
جس کے اوپر
ایک دریا بہہ رہا ہو
مجھے ایک دریا چاہیے
میں وہ آدمی ہوں جس نے اپنا دریا بیچ کر
ایک پل خریدا تھا
اور چاہا تھا کہ اپنی گذر اوقات
پل کے محصول پر کرے
مگر بے دریا کے پل سے کوئی گذرنے نہیں آیا

پھر میں نے پل بیچ دیا
اور ایک ناؤ خرید لی
مگر بے دریا کی ناؤ کو کوئی سواری نہیں ملی

پھر میں نے ناؤ بیچ دی
اور مضبوط ڈوریوں والا جال خرید لیا
مگر بے دریا کے جال میں کوئی مچھلی نہیں پھنسی

پھر میں نے جال بیچ دیا
اور ایک چھتری خرید لی
اور بے دریا کی زمین پر مسافروں کو سایہ فراہم کر کے گذر بسر کرتا
مگر دھیرے دھیرے مسافر آنے بند ہوتے گئے
اور ایک دن جب
سورج کا سایہ میری چھتری سے چھوٹا ہو گیا
میں نے چھتری بیچ دی
اور ایک روٹی خرید لی
کسی بھی تجارت میں یہ آخری سودا ہوتا ہے
ایک رات یا کئی راتوں کے بعد
جب وہ روٹی ختم ہو گئی
میں نے مزدوری کر لی

مزدوری مٹی کی کان میں ملی

مشتاق قمر

بیرومیٹر

اُس نے پہلے ایک، پھر دوسرے اور آخر میں تیسرے آدمی کو بھی اُٹھا کر زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ پھر وہ سارے ایک ساتھ ہی اُس پر پل پڑے لیکن وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر، اردگرد تنگ ہوتے گھیرے کے ہاتھ سے باہر نکل آیا — اب اس کے حملہ آور ہونے کی باری تھی مگر وہ تینوں ہجوم کا سہارا لیتے ہوئے، فقط فقط ہجوم میں گم ہو گئے۔

وہ وہیں کھڑے کھڑے غرانے لگا۔

منڈی میں موجود تمام لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔

چودھری ڈرتے ڈرتے اس کے قریب آیا اور انتہائی نرمی سے اپنا ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔

اُس نے چوہدری کے لمبے سے طرّے کو دیکھا۔ پھر اُس کے سر کی ہڈیاں تڑخیں۔ عین تالو کے اوپر دماغ سے زبان کی سوئی برآمد ہوئی اور چوہدری کے سامنے بوند بوند لفظ گرنے لگے — "یہ لوگ مجھے بوری نہیں اُٹھانے دیتے تھے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔"

وہ جو کچھ بھی تھا چوہدری کے لئے بڑے کام کا آدمی تھا — اُس نے خونخوار کتوں سے لے کر مزدوروں تک کی فوج پال رکھی تھی لیکن اسے بالکل ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو چوہدری کی گردن میں ذمہ داری کا پھندا ڈالے بغیر اکبرے کو اس کے راستے سے ہٹا سکے۔

"تمہارا کوئی قصور نہیں۔" چوہدری آنکھوں کی پتلیوں سے بات کرتے ہوئے بولا — "تم میرے ساتھ چلو — تمہیں بوری اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں۔"

وہ وہیں چُپ چاپ کھڑا رہا۔

"اچھا — اچھا" چوہدری نے کہا — "میں تمہیں بوری اٹھانے دوں گا۔ بہت سی بوریاں۔"

اور پھر چوہدری اس کی نکیل پکڑ کر منڈی سے باہر، اپنی قلعہ نما حویلی میں لے آیا۔

وہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

چوہدری اُس کے قریب صوفے میں دھنستے ہوئے بولا — "تم نے بتایا نہیں۔ تم کہاں سے آئے ہو؟"

اُس کی زبان کا پارہ تیزی سے گرتے ہوئے عین معدے پر آ کر اٹک گیا۔ گڑگڑاہٹ سی پیدا ہوئی۔ اور زبان کی سوئی تیزی سے حرکت کرنے لگی — "مجھے یہاں اس معدے میں قید کر دیا گیا ہے۔"

"اچھا — اچھا" چوہدری نے اُسے پچکارتے ہوئے کال بیل بجائی۔

کوئی ایک گھنٹے بعد چوہدری کو بتایا گیا کہ وہ ابھی کھانا کھا رہا تھا۔

شام کو چوہدری ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ عین کمرے کے درمیان لیٹا خراٹے بھر رہا تھا اور اُس کے دانت معدے سے باہر نکلے ہوئے تھے۔

رات وہ تھوڑی دیر کے لئے جاگا اور لُڑھکتی آنکھوں سے تین چار ڈکاریں صاف کرتے ہوئے وہیں اوندھے منہ گر کر لیٹ گیا۔

دوسرے دن صبح سویرے اُسے جگا کر رات کی بچی کھچی باسی روٹی اور سالن دیا گیا — وہ ناشتہ کر کے ایک بار پھر سو گیا — دوپہر کے وقت اس میں تھوڑی سی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ اُس نے کھانا کھایا اور کھاتے ہی سو پڑنے کی بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔

تیسرے دن وہ خاصا نارمل لگ رہا تھا۔ جی بھر کر کھانا کھانے کے باوجود اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور معدے کے دانت بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

چوہدری اُس کا کمرہ دکھاتے ہوئے بولا "تم

نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا؟"

جواب میں وہ نعرہ زور سے ہنسنے لگا۔

"ہاں — ہاں — تمہارا نام کیا ہے؟ نام — نام"
چوہدری نعرہ دیتے ہوئے بولا۔

اُس نے اچانک ہنسنا بند کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس کی زبان کا پارہ بڑی سرعت کے ساتھ سر سے پاؤں تک گردش کرنے لگا۔ اس کے اندر اس نئی تبدیلی کو دیکھ کر چوہدری کی آنکھیں اُبل کر ناک پر آگئیں۔ زبان کا پارہ بڑی دیر تک جسم کی دیواروں سے باہر نکلنے کی کوشش میں گردش کرتا رہا۔ لیکن کوئی جھروکہ نہ پاکر اپنی اصل حالت میں لوٹ کر رُک گیا۔

وہ ایک اَن جان بچے کی طرح غوں غوں کرنے لگا۔

چوہدری قدرے مایوس سا ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ آدمی اگر واقعی آدمی تھا تو اس میں تکنیک کی کوئی خامی رہ گئی تھی۔ وہ کچھ بھی بتا نہیں سکتا تھا۔ اور جو کچھ بتا نہ سکتا ہو اُسے کچھ بتایا بھی نہیں جا سکتا۔

چوہدری نے اکبرے کے معاملے کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دینا ہی مناسب سمجھا۔

آئندہ چند دنوں میں وہ کچھ اپنا نارمل ہو گیا۔ اب اس میں اور کھونٹے پر بندھے ہوئے جانوروں میں کچھ کچھ فرق بھی محسوس ہونے لگا۔ وہ عام آدمیوں کی طرح کھاتا پیتا اور جب بھوک لگتی تو کسی ملازم کو اُٹھا کر فرش پر پٹخ دینے کی بجائے، زبان کی سُوئی کو عین معدے پہ سے جا کر چلا دیتا — سوئی بار بار حلق اور معدے سے ڈاں سی ایک جیسی ہی آواز بلند ہونے لگتی ہے — "مجھے بوری دو — میں بوری اٹھاؤں گا۔"

وہ اب کھانا کھانے کے بعد بھی بڑی دیر تک جاگتا رہتا۔ کبھی کبھار "بوری" اٹھانے میں دوسرے ملازموں کا ہاتھ بھی بٹا دیتا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ غور سے بات سنتا اور بات سُننے کے بعد اس کی زبان سے چند بے سایہ الفاظ بھی برآمد ہوتے۔ کبھی کبھی کسی لفظ کے ساتھ کوئی سایہ بھی منسلک ہوتا مگر لفظ اور سائے کے مابین کسی قسم کا کوئی تعلق نظر نہ آتا — لگتا ایک لفظ کے ساتھ کسی دوسرے لفظ کا مفہوم پن لگا کر نتھی کر دیا گیا ہو۔

چوہدری زیادہ عرصے تک اکبرے کے معاملے کو التوا میں نہیں ڈال سکتا تھا — وہ اکبرے کی کرم خوردہ فائل کو ایک بار پھر اُس کے سامنے کھولتے ہوئے بولا۔ "تم جانتے ہو اکبرے میرا سب سے بڑا دشمن ہے۔"

جواب میں اُس نے کوئی ردِ عمل نہ دکھایا۔

چوہدری لفظوں کی گوندنی بناتے ہوئے بولا۔

"وہ میرا دشمن ہے — سب سے بڑا دشمن۔"

وہ بدستور خاموش، لاتعلق سا بیٹھا رہا —

لفظوں کی گوند نتھرے ہوئے پانی کی طرح اُس کے کانوں سے باہر بہہ نکلی — پھر چوہدری نے ساری بات کو اچھی طرح کھرل میں کوٹا اور شربت بناتے ہوئے اس کے کان میں انڈیل دیا۔

"دشمن" چوہدری بولا۔ "چند دن قبل تمہیں یاد ہے تم بھوکے تھے اور کچھ لوگ تمہیں بوری اُٹھانے نہیں دیتے تھے۔"

اُس نے بڑی سُرعت کے ساتھ مُڑ کر چوہدری کی طرف دیکھا۔

چوہدری نے شربت کے چند قطرے اس کے کان میں نچوڑ دیئے۔ "وہ تمہارے دشمن تھے اکبرے میرا دشمن ہے — جب تک وہ زندہ ہے میں چین سے سو نہیں سکتا۔"

وہ غرّایا اور اُس کے اندر جو ردِ عمل پیدا ہوا تھا۔ اُس کی گرد بھی بیٹھ گئی۔

لیکن چوہدری نے کھرل کوٹنے کا عمل جاری رکھا۔

"اکبرے میرا دشمن ہے — وہ مجھے بوری اُٹھانے نہیں دیتا۔"

اُس کے اندر آگ کی چرخی تیزی سے گھومی۔ آنکھوں کی پتلیاں تڑخیں اور کمرے میں چاروں طرف چنگاریاں پھیل گئیں۔

چوہدری اس کی نکیل پکڑ کر باہر نکل گیا اور اکبرے کی نشاندہی کرتے ہوئے اُسے وہیں چٹان کے نقطے کے عقب میں چھوڑ کر واپس آگیا۔

وہ رات بھر واپس نہ لوٹا — نہ ہی اکبرے کی ڈھوک سے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ دوسرے دن وہ صبح صبح واپس آگیا — مگر اس کے تن بدن پر خون کا ایک دھبہ بھی نہیں تھا۔

چوہدری ڈرتے ڈرتے بولا۔ "اکبرے — میرا دشمن۔"

لیکن بات ختم ہونے سے قبل ہی زبان کی سوئی میں اُس کے سینے سے باہر نکل آئی — میں رات بھر بوریاں ڈھوتا رہا — وہاں بہت سی

ملوث

بوریاں تھیں ؟

اور زبان کی سوئی سے نکلے ہوئے لفظوں کے قطرے ایک ایک کرکے اس کے چہرے کے فریم میں ایک خوبصورت تصویر میں ڈھل گئے ۔ پہلی بار اس کے معدے سے ایک بھرپور قہقہہ بلند ہوا۔

تھوڑی دیر بعد ابرے کا آدمی بھی چوہدری کا شکریہ ادا کرنے آگیا اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی دیا کہ اگر چوہدری اپنے آدمی کو ایک دن کیلئے اور بھیج دے تو ان کا باقی کام بھی آسانی سے نبٹ سکتا ہے۔

چوہدری نے ابرے کے طنز کو ایک ہی گھونٹ میں پیا اور اُسے منشی کے حوالے کر دیا۔

منشی کو اس کی تربیت میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اس کے ذہن میں بوئی جانے والی بات کا بیج کئی کئی دنوں بعد پھوٹتا۔ کبھی کبھی تو کسی ایک بات کا ردِّ عمل مہینوں بعد سامنے آتا۔ پھر وہ باتیں تو کرلیتا تھا۔ لیکن اس کی ساری باتوں کو پوری طرح نچوڑنے کے باوجود بوند بھر عرق بھی دستیاب نہ ہو پاتا۔ اس کی زبان سے خزاں کی خشک گھاس کی طرح الفاظ جھڑتے اور فرش پر گرتے ہی ریزہ ریزہ ہو جاتے صرف اپنی باتوں میں مفہوم کی تھوڑی سی نمی محسوس ہوتی جو زبان کی سوئی کو جسم کے مختلف حصوں پر گھمانے سے برآمد ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی جب اس کی زبان تالو میں سوراخ کرتے ہوئے دماغ سے باہر نکل آتی تو وہ بے حد خوفناک بن جاتا۔ وہ اپنے پنجوں میں زمین کو جکڑ کر آسمان تک لے جاتا اور پھر انتہائی غفلت کے عالم میں نیچے پھینک دیتا۔ زوردار دھماکہ ہوتا اور ہر چیز لڑکھڑا کر گھوم جاتی۔

ایک نوزائیدہ بچے کی طرح اس کا نام رکھنے کی رسم ازسرِنو ادا کی گئی۔ چوہدری نے اس کا نام طفیل رکھ دیا اور منشی نے اسے چوہدری کا طفیلی بنانے کے لئے ہڈیوں کا گودا تک نچوڑ ڈالا۔

منشی اسے واپس چوہدری کے پاس لایا تو اس کی ناک میں نکیل کی بجائے گلے میں خوبصورت سا پٹہ تھا۔ منشی نے بڑی چابکدستی سے اس کے جسم سے لٹکتی ہوئی موہوم رشتوں کی ساری ڈوریاں کھرچ ڈالی تھیں۔ اب صرف ایک ہی ڈوری تھی جس کا ایک سرا پٹے میں اور دوسرا چوہدری کے ہاتھ میں تھا۔ زندگی کے ساتھ اس نئی ـــــ RELATIONSHIP میں اُسے اب اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے زبان کی سوئی کو جسم کے مختلف حصوں کے چلانے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اسے بھوک اب بھی لگتی تھی مگر اب اس کا جسم بات کرنے سے قاصر تھا۔ صرف اس کی زبان ہی اظہار کا واحد ذریعہ رہ گئی تھی اور اس پر بھی نمک کی ایک بڑی سی ڈلی لاد دی گئی تھی۔ چوہدری اُسے اپنے پاس بلاتا تو وہ پالتو جانور کی طرح اُس کے قریب آکر کھڑا ہو جاتا اور اُس کے اندر کی دُم زور زور سے ہلنے لگتی۔

اس میں اور کھونٹے پر بندھے چوہدری کے دوسرے جانوروں میں رہا سہا فرق بھی مٹ گیا۔ اُس کے اندر ایک مضبوط کھونٹا اور اس سے بھی زیادہ مضبوط رسّہ اُگ آیا تھا۔

اور پھر آہستہ آہستہ اُس کا جسم سُن ہونے لگا، بالکل سُن ہو گیا۔ وہ سارا کا سارا نمک کی لمبی تڑنگی سِل میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے اندر داخل ہونے والا ہر احساس سیدھا معدے میں جا پہنچتا اور وہاں پر لگی ہوئی پتھر کی چکی میں پس کر نمک کے باریک برادے میں تبدیل ہو جاتا۔

طفیل ہی چوہدری کا نمک خوار نہیں تھا۔ اس کے بدن کی نمکین سِل کو کئی طرح سے چاٹنے والے لوگ بھی تھے۔ چوہدری اُسے چاٹ چکتا تو اس کی جوان بیٹی ریشماں کی باری آتی۔ پھر صفیہ اور آخر میں اسلم اس کے بدن کو چاٹنے بیٹھ جاتا اور جب چوہدری اور اُس کے بچوں کی زبانیں چاٹتے چاٹتے موم بن جاتیں تو اُسے گولا سا بنا کر منشی کے آنگن میں پھینک دیا جاتا ـــ جہاں گھر بھر کی زبانیں اُس پر چاٹنے کا عمل دُہرانے لگتیں اور وہ چپ چاپ اپنے جسم کو بھوکی زبانوں کے حوالے کر دیتا۔

ساری بستی میں چوہدری کی بیگم ہی تھی جو کبھی مصلّے پر بیٹھے بیٹھے اور کبھی تسبیح رولتے ہوئے اُس کے چاٹے ہوئے بدن کو ہموار کرنے کی کوشش کرتی۔ ایسے لمحوں میں ایک انوکھے احساس کی تند لہر بجلی کی طرح اس کے تن بدن سے کوندتی ہوئی گذر جاتی اور اُس کے جسم پر رشتوں کی مرجھائی ہوئی کونپلیں ازسرِنو پھوٹ نکلتیں ـــ اور وہ خواب کی رتھ پر ڈولتے قدموں چلتے چلتے رشتوں کے بھاگتے سائے پکڑنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔

اب چوہدری ہر روز اُسے چابی دے کر چھوڑ دیتا ـــ اور وہ کبھی کسی کے کھلیان کو آگ لگا دیتا۔

مئی ۱۹۷۹ء

کبھی کسی کا سر پھوڑ کر واپس آتا۔ چوہدری اُس کے آگے بہت سا نمک ڈال دیتا۔ وہ جی بھر کر کھاتا اور خرّاٹے بھرنے لگتا۔ وہ اُسے بہت سا نمک کھلاتے اور پھر بیٹھ کر کئی طرح سے اُس کے جسم کی سِل سے بہت سا نمک چاٹ بھی لیتے۔

ایک دن اُس نے بوری اٹھانے سے بھی انکار کر دیا۔ وہ بڑی دیر تک چپ چاپ ننگے گوشت پر چوہدری کے لچک دار بید کی ضربیں کھاتا رہا۔ پھر چوہدری نے غصّے میں دانت پیستے ہوئے اُسے بوری اٹھانے کا حکم دیا تو وہ بوری اُٹھانے کی بجائے اُس کے ہاتھ چاٹنے لگا۔ منشی نے آگے بڑھ کر چوہدری کو مبارکباد دیتے ہوئے اُس کے ہاتھ میں شاپ واچ تھما دی۔ چوہدری نے طفیل کو چابی دی اور اُسے اکبرے کے گھر کی طرف چھوڑ دیا۔ لیکن عین اسی وقت اس کی بیگم سانس کی کسی گرہ کی اوٹ سے نکل کر اُس کے سامنے آگئی اور تسبیح رولتے ہوئے اُس کے ذہن میں سوچ کی ایک نئی پھونک ماردی۔

اس دن وہ شام کو لوٹا تو اس کے جسم پر چھوٹے چھوٹے بے شمار زینے سبنے ہوئے تھے اور ان زینوں پر ننھّے ننھّے پنجوں کے نشان تھے جیسے کوئی انجانی مخلوق ان زینوں کے ذریعے اُسے سَر کرنے کی کوشش کرتی رہی ہو۔ اُس نے چوہدری کے ہاتھ چاٹنے کی بجائے اُسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔

چوہدری نے ایک بار پھر اپنے لچکدار بید کی نوک سے اس کے جسم پر بنے ہوئے زینوں میں بہت سا نمک بھر کر انہیں ہموار کیا اور چابی بھرتے ہوئے اکبرے کے گھر کی طرف چھوڑ دیا۔ چوہدری کی بیگم پہلے ہی کی طرح جانی پہچانی سانس کی گرہ کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔ اور تسبیح رولتے ہوئے اس کے ذہن میں نئی سوچ کی پھونک مار دی۔

وہ شام کو لوٹا تو اس کے بدن پر پہلے سے کہیں زیادہ بڑے زینے بنے ہوئے تھے اور ان کی بلندی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

اور پھر ہر روز اس پر یہ دوہرا عمل دہرایا جانے لگا۔ چوہدری چابی بھر کر اسے اکبرے کے گھر کی طرف چھوڑ دیتا۔ اس کی بیگم سانس کی گرہ کی اوٹ سے نکل کر اُس کے سامنے آجاتی اور تسبیح کے دانوں سے نکلنے والی سوچ کی پھونک اس کے ذہن میں مار دیتیں ـــــ شام وہ گھر لوٹتا تو اس کے بدن پر بنے ہوئے زینوں کی جسامت اور بلندی میں کہیں زیادہ اضافہ دکھائی دیتا۔

پہلی بار طفیل نے اکبرے کی گردن پر اپنا پنجہ گاڑا تو اس کی اُبلتی آنکھوں سے پھوٹ نکلنے والی شعاع نے طفیل کے ذہن میں سوچ کے سفوف کو گوندھ کر رکھ دیا۔ پھر ہر روز اس گندھے ہوئے سفوف کی چکناہٹ اور ملائمت میں اضافہ ہونے لگا اور رفتہ رفتہ گندھی ہوئی سوچ کا سفوف ایک شبیہہ میں ڈھلنے لگا۔ یہ شبیہہ روز بروز واضح شکل اختیار کرتی گئی۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا جب ذہن میں پڑاؤ ڈالے ہوئے اس نئے انسان کے ساتھ اس کا باقاعدہ رابطہ بھی قائم ہو گیا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا مسکراتا۔ اس کے ہونٹ ہلتے لیکن ہونٹوں سے نکلے ہوئے لفظ اُس کے کانوں تک پہنچنے سے قبل ہی خشک ہو جاتے۔ وہ خود بھی ذہن میں بیٹھے ہوئے شخص کو پہروں دیکھتا رہتا۔ اسے یہ انسان اچھا لگتا۔ بہت ہی اچھا ـــ یہ انسان باہر کے ہر انسان سے الگ تھا اور مختلف تھا وہ نہ تو اس کا بدن چاٹتا۔ نہ چابی بھرتا۔ بس دیکھتے ہی مسکرا دیتا۔ کبھی کبھی صبح یا شام کے جھٹپٹے میں اُسے اس نئے انسان اور چوہدری کی بیگم کے مابین بے حد مشابہت نظر آنے لگتی۔ ایسے لمحات جن میں اسے یہ انسان باہر کے کسی وجود میں دکھائی دیتا، بڑے دھماکہ خیز ثابت ہوتے۔ اس کے چاروں طرف اندر، باہر دھماکوں کا ایک طویل سلسلہ جاری ہو جاتا اور پھر ساری کائنات جھٹپٹے کا نقاب اُلٹ کر اپنے دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ اُس کے سامنے آن کھڑی ہوتی۔ لیکن پھر رابطہ منقطع ہو جاتا اور وہ ایک بار پھر ڈرا سہما سانسوں کی ڈولتی رسّی پر چلنے لگتا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے وقت کا یہ عجیب لمحہ، دور دراز سے لوٹے ہوئے مسافر کی طرح اس کے تن بدن میں ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ سامنے مصلّے پر بیٹھی ہوئی چوہدری کی بیگم کے قدموں سے دودھ کی ایک لکیر پھوٹی اور تیزی سے اُس کی جانب بڑھتے ہوئے پوری طرح اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ دودھ میں نہا کر رہ گیا۔ پھر کوئی زور زور سے اُسے ملنے لگا اور اس کے ساتھ ہی نمک کی سِل بھی پگھلنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ نمک کی سِل سے جھانکتے

جھانکتے سارا کا سارا مکھن کا پیڑا سا بنا باہر نکل آیا۔
اُس نے نوزائیدہ بچے کی طرح گردوپیش کو حیرت سے دیکھا اور جیسے گونگے انسان کو اچانک زبان مل گئی ہو خوشی سے چلاتے ہوئے بولا — میں زندہ ہوں — میں بھی زندہ ہوں —"
پھر اُس نے دونوں ہتھیلیاں چوہدری کی بیگم کے سامنے پھیلا دیں — "یہ دیکھو ماں — ان لکیروں کے سارے راستے میرے گھر کی جانب جاتے ہیں —"
اور اُس دن چاٹنے والی ساری زبانیں اُس کے قریب پہنچ کر رُک گئیں!
وہ سکڑتی زبانوں سے اوپر نقطہ نقطہ آنکھوں میں اُبھرنے والے سوالوں پر سیاہی کا برش پھیرتے ہوئے چوہدری سے بولا — میں نمک کی سِل سے آزاد ہو گیا ہوں اچوہدری! مجھے دیکھو! میں زندہ ہوں — تم سے زیادہ زندہ ہوں"
اور پھر چوہدری نے اور سب نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا — اُس کے تن بدن پر گھومتی ہوئی ساری رنگ برنگی ڈوریاں ایک خوشگوار جھونکے کی طرح برآمد ہو کر بڑی تیزی کے ساتھ کائنات کی رگوں میں پھیلنے لگیں!
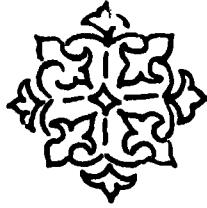
ستار سید

کس کو میں نے چاہا تھا
کون مجھ سے بچھڑا تھا
کون سے وہ موسم تھے
جب یہ خواب دیکھے تھے

توصیف افضل
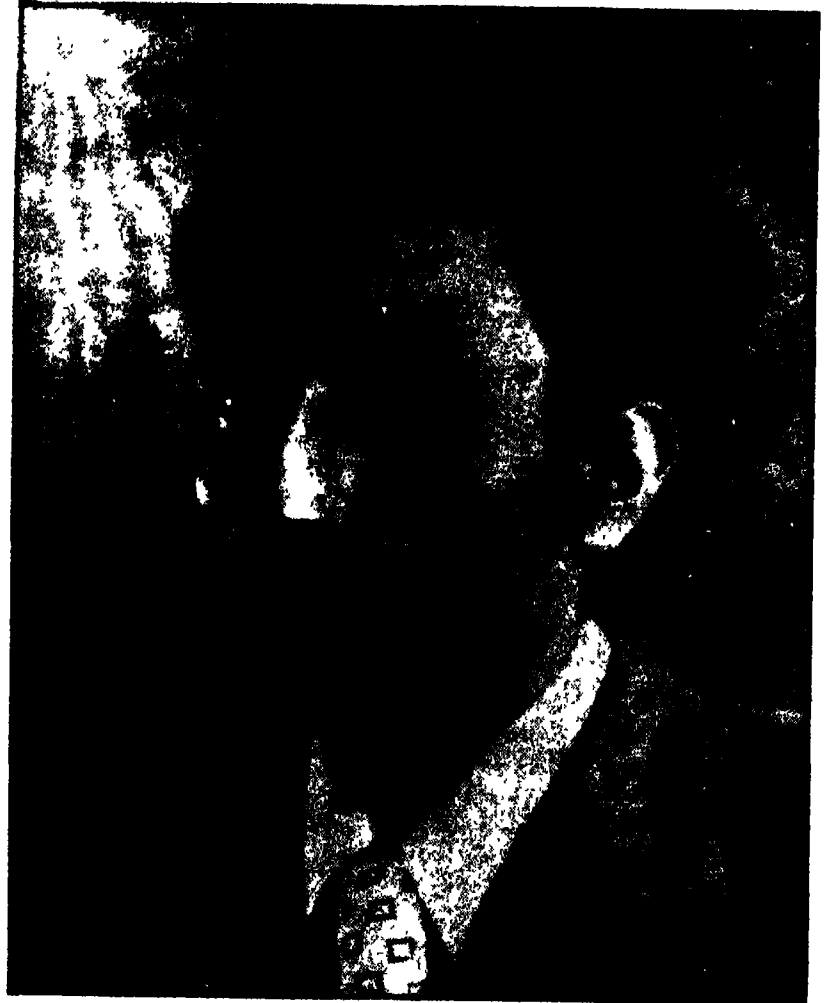
گمراہی کا لمحہ

زندگی بہت اچھی ہے۔ مگر زندگی کو کاٹتے
چلے جانا کتنا بے معنی ہے۔
اس بے معنی سفر میں میں اکثر تھک جاتی ہوں
تو رُک جاتی ہوں۔ ذرا سانس لینے کو اپنا آپ سنبھالنے
کو اور تھوڑا سا سوچ لینے کو۔ بس ایک لمحے کے لئے
یہی ایک لمحہ میری بیداری کا لمحہ ہے۔ یہی خود
کلامی کا اور گمراہی کا بھی تو
آدمی کبھی کبھی اپنی پڑتال بھی کر لیتا ہے۔
آؤ گزرے برسوں کا حساب کریں۔ کئی بدذات
لمے زندگی بھر کا حساب مانگنے چلے آتے ہیں۔
میرے گزرے برس جن کی گنتی اب میرے
دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی پوروں سے اوپر
نکل گئی ہے۔ اتنے برسوں میں مَیں نے کیا کیا؟ مگر وہ
اتنے بھی کہاں تھے۔ سب مل کر شاید ایک برس کے
برابر ہوں گے کہ ان سب کی شکلیں ایک جیسی تھیں
بنجر ٹیلوں کی طرح سے جن کا رنگ بدلتے موسموں
سے نہیں بدلتا۔ اور اُن برسوں میں جتنے آشوب
میں نے جھیلے وہ بھی سب ایک ہی طرح کے تھے۔
ہاں یہ سچ ہے کہ بچپن کی ہریالی کے بعد جتنے
موسم میرے سامنے سے گزرے وہ اپنے جنم سے
پہلے ہی مر چکے تھے ــــــ ان کی کوکھ میں ایک پھول
کھلانے کے لائق بیج نہ تھا۔

میں نے ان مردہ زمانوں کا کلنڈر نہیں جوڑا۔ وہ
سب بے جان لمحوں کی دھول بن کر ماضی میں گم ہو چکے
ہیں۔ مگر میں اس پر بھی خوش نہیں ہو سکتی کہ بُری زندگی
کٹ چکی ہے۔

میں نے گزرے دکھوں کو ڈِس اون (DIS OWN)
کیا ہے۔ مگر مُردوں سے کٹ کر جینے کا ڈھنگ نہیں
سیکھ سکی۔ پچھلی یادوں کے خوف کا تابوت میرے
ذہن کے ایک گوشے میں ابھی تک گڑا ہے!

یہ خوف ہے جو بدصورت ماضی سے رشتہ توڑنے
نہیں دیتا۔ یہ خوف ہے۔ جو سکوت کے معبدوں میں
در آتا ہے۔ میری سوچ بولنے لگتی ہے۔ اور بولتے
ہوئے خوف کا کوئی ایک لمحہ میرے ساتھ ساتھ چلنے
لگتا ہے۔ میں چپ ہو جاؤں تو اس کی آواز میرے
کانوں میں بجنے لگتی ہے۔

ایک بار نہیں، کئی بار نہیں، ہر بار جب میں نے
آگے کی طرف دیکھنا چاہا تو خوف سامنے آ گیا۔ اور
مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے دائیں بائیں آگے پیچھے
اور قدموں کے نیچے ریت کا سمندر ہے۔ میرے سر
کے اُوپر بادل کا سایہ نہیں، پیاسی زمین کے منہ سے
اُڑتی دھول کے دَل ہیں۔ تو کیا میں سرابوں میں گھر گئی
ہوں؟ سرابوں سے آگے دریا نہیں ہوتا۔ کچھ بھی نہیں ہوتا
شاید بے یقینی کا خوف بھی کیسا خوفناک ہے!
آخر کیوں مجھے لوگوں کی باتیں سچی نہیں لگتیں یہ
کیوں صبح شام ایک ہی جیسے دِکھتے ہیں؟ دن بھر کی
سرسراتی ہواؤں میں کسی جاگتی بستی کا سندیسہ کیوں
نہیں آتا؟

کتنے دن گزرے میں نے اپنے کھیتوں کی
خوشبو نہیں سونگھی۔ دل کو نگھ دینے والے ماہیے
نہیں سنے۔ زمانے ہوئے کہ میں گھر سے نکلی
تھی اور رستہ بھول گئی!

اور اب یہ زندگی ــــــ یہ بھی اچھی ہے۔ مگر وہ
تنہائی کا دوزخ جو تپ جائے تو جسم جلاتا ہے۔ یخ
ہو جائے تو روح کے اندر جم جاتا ہے۔
کس نے کہا تھا کہ سورج کے آگے جو چادر تنی ہے
وہ بادلوں کی چھایا نہیں۔ اس کے اندر تو رحمت کی
جوت للانے والی گھٹاوں کا ایک انگ بھی نہیں۔
سنا ہے ایسے غبار زندگی پہ چھائے ہی رہیں،
تو نیستی بن جاتے ہیں۔ نیستی در و دیوار چاٹ لیتی

ہے تو چھتیں آپ بیٹھ جاتی ہیں۔

کیا اچھے زمانے میرے سامنے نہیں آئیں گے؟ میرا یقین ٹوٹنے کیوں لگا ہے؟ شاید اس غبار کی وجہ سے جس نے سورج کا رستہ روک رکھا ہے۔ کہتے ہیں روشنی میں اندھیرا بھر جائے تو کینسر جیسی بیماریاں پھیلنے لگتی ہیں۔

ممتا کے سمندروں کے نیچے ریت کی لہر کیوں چلتی ہے؟ آخر جنتوں کے دروازے کہاں کھلتے ہیں جا کر؟

میرا سفر تمام ہونا باقی ہے ۔ اپنے آپ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، یہ خوش فہمی مگر کتنی لبالب بھری ہے۔ سرابوں میں گھر جانے والوں کی خوش فہمیاں تک تازہ نہیں رہتیں۔

میرا سفر شاداب زمینوں کی دریافت کا سفر نہیں ہے، تو کیا یہ محض ایک فرد کی تنہائیوں کے صحرا کا سفر ہے؟ میں نے تنہائی کو پسند نہیں کیا۔ مگر میرے حصے میں اور کچھ نہیں آیا۔ میں خوف کی گرفت کو توڑ نہیں سکتی۔ میرے کتنے ہی سوال تشنہ ہیں

آدھی عمر گزر گئی مگر میں نے کسی رواں قافلے کی گزرگاہ نہیں دیکھی۔

جانے کہاں ہوں گے وہ کارواں جو مسافروں کو گھر تک لے جاتے ہیں؟

مجھے گم ہوئے سالہا سال بیتے مگر ابھی تک میرے گھر سے کوئی ڈھونڈنے نہیں آیا۔ حیران ہوں۔ کیا اب بھی میرے گاؤں کے گھروں میں بیاہ کے بینے نئی دلہنیں اور نئی فصلیں ایک ساتھ آتی ہوں گی؟ کیا اب بھی ہلکی دھوپ کے موسم میں گڑ پکنے کی خوشبو پھیل کر جوان بچھڑوں کو مست کر دیتی ہوگی۔ السی کے پھولوں کا کھیت کاسنی ہوتا ہے۔ اور سرسوں کے پھولوں کی چادر پیلی زرد مگر پکی کنک کا کھیت تو اصلی سونے کے رنگ کا ہوتا ہے۔ گاؤں کی شاموں میں بس ایک ہی خوشبو بستی ہے۔ بھُنے دانوں کی جھولیاں بھر کر جب بچے گھروں کو جاتے ہیں تو گلیوں میں چلنے والی ہوا کو بھی بھوک لگ جاتی ہے اور نرم دوپہروں کو تندور سے نکلتی مستی روٹیوں کی مہک ابھی تک ٹھہری ملکاؤں کے نصیب میں نہیں آئی۔ سنا ہے کاسنی دوپٹے والیاں اب چرخے کے گیت نہیں گاتیں مگر سسرال جاتے ہوئے روتی ضرور ہوں گی۔ میں ان کے بارے میں کتنا کچھ جانتی ہوں۔ کتنا کچھ لکھنا چاہتی ہوں پر نہیں لکھتی۔ آخر کس لئے لکھوں؟

سرابوں میں کھو جانے والوں کے سفرنامے کون پڑھ سکتا ہے بھلا۔

سرابوں کا تاوان ہی نہیں اور زندگی ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کا دوسرا نصف کاٹتے کاٹتے تیز روی کی خوش فہمیوں کا راشن تمام نہیں ہوتا؟ یہ باتیں دکھ دیتی ہیں۔ جب آرزوئیں پرانی ہو جائیں تو بہت سی باتیں دکھ دیتی ہیں۔ میری آرزوئیں پرانی ہو چکی ہیں ـــــ ریت کے ٹیلوں کی طرح ایک جیسی ایک رنگ۔ جلی ہوئی ریت میں پھول کھلانے کا خواب میں نہیں دیکھتی۔ بہت دنوں سے میں نے وہ خواب بھی نہیں دیکھا۔ جس کی آواز مجھے جگا کر میرے ہونے کا پتہ دیتی تھی۔ اپنے گھر میں ہونے کا۔ وہ خواب میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس آواز کو سننا چاہتی ہوں جو مجھے بتائے کہ میں گھر میں ہوں اور گھر امن کے نغمے سے بھرا ہوا ہے۔ صبح سویرے جاگ کھلنے پر مدھانی پھرنے کی آواز ان کے دن کا پتہ دیتی تھی اور دادی ماں کے ہاتھوں میں مکھن کا پیڑا زندگی کے خوشحال ہونے کا۔

مگر یہ تصور ٹوٹ جاتا ہے جب ایک لمحہ ـــــ خشک ٹھنڈی ریت میں دھنسا ہوا بد صورت حقیقت کا لمحہ ابرق کے ٹکڑے کی طرح آنکھ جھپکتا ہے اور اڑ کر میری آنکھوں میں پڑ جاتا ہے۔ تب میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ کڑوے آنسو حلق میں اتر جاتے ہیں۔ میں پکارتی ہوں۔

کہاں ہے خوشگوار زندگی؟ کہاں ہے امن کی صبح اور میرا گھر؟

خواب زندگی سے الگ کچھ بھی نہیں ہوتے۔

خوابوں کی آوازیں تمناؤں کے رنگین لبادوں کی سرسراہٹ کے سوا کچھ اور نہیں۔

تمناؤں کو چپ لگ جائے تو خواب بولنا بند کر دیتے ہیں۔

آرزوئیں ساکت ہوں تو بے رنگ بھوری ریت کے ٹیلوں کی مانند ہیں۔

ریت کے ٹیلوں کا کیا ہے، وہ تو راتوں رات جگہ بدل لیتے ہیں۔

پھر میں کہاں نشان ڈھونڈوں گی کھوئی جنتوں کے؟

آج کے دن کا سورج بہت روشن ہے۔ مگر میری آنکھیں دکھتی ہیں۔

کس جگہ تختی لگاؤں اپنے ناکام سفر کی منزل پر؟

انور سن رائے

مُبہم

الف اور بے میں سے کسی کو ضروری پیغام کے لئے رابطہ قائم کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔

وہ جس دکان میں ہوتے ہیں اس کے کاؤنٹر پر، ایک لڑکا رنگ برنگ دھبّوں والا لباس پہنے بیٹھا ہے۔ سوجی ہوئی آنکھوں میں میلی پیلاہٹ اور گید کا جال سا بُنا ہوا ہے۔

اُس کی طرف دیکھتے ہی، ایک عجیب سی سرد لہر اُن کے لہو کے ساتھ دوڑتی ہوئی، پاؤں کے راستے زمین میں جذب ہو جاتی ہے

اُن میں سے ایک لڑکے سے مخاطب ہوتا ہے "ہمیں فون کرنا ہے"۔

لڑکا بیزاری سے ان کی طرف دیکھتا ہے اور انتہائی سرد لہجے میں چند لمحوں بعد جو انہیں بہت طویل محسوس ہوتے ہیں جواب دیتا ہے: "میں کہہ چکا ہوں، فون خراب ہے۔"

دونوں سڑک پر سے نظریں ہٹا کر، ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، پھر پہچان لئے گئے وہ سچے ہیں۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی وہ اس دکان پر نہیں آئے تھے، پھر بھی وہ شرمندہ تھے، لڑکے کا لہجہ اس قدر پُر یقین تھا کہ انہیں اپنی سوچ حقیق اور یقین بے معنی محسوس ہونے لگے۔

"لیکن کیا تم بتا سکتے ہو فون کب سے خراب ہے"؟ غالباً بے، الف کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھتا ہے۔ اُس کی آواز کھوکھلی اور دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

"مجھے معلوم نہیں، مجھے تو بس اتنا ہی کہنا تھا کہ فون خراب ہے، میرا کام تو جھوٹی پلیٹیں صاف کرنا ہے"؟ اُس کا لہجہ بہت زیادہ بے زاری لئے ہوئے تھا۔ اس نے بات مکمل کی اور کاؤنٹر کے نیچے کچھ تلاش کرنے لگا۔

الف اور بے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے دکان سے باہر نکل گئے۔

"دراصل پیغام بہت ضروری ہے"؟ بہت آہستگی سے الف نے خود کلامی کی۔

"مجھے معلوم ہے": بے نے جواب دیا۔

"کیا" الف نے سوال کیا۔

"یہی کہ پیغام بہت ضروری ہے": بے نے لاپرواہی سے کہا۔

"تمہیں بھی معلوم ہے، تمہیں کیسے معلوم ہوا"؟ الف نے حیرت خوف اور بے یقینی سے کہا اور بے کا راستہ روک لیا اُس کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ اگر اُس نے الف کے سوال کا جواب نہ دیا تو وہ اُسے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔

"کیا بات ہے": بے نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "راستہ کیوں روک رہے ہو"؟

"تمہیں بتانا ہوگا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ پیغام بہت ضروری ہے"؟ الف نے غصّے سے کہا۔

میں نے یہ کب کہا ہے۔ اُس کی آواز میں خوف تھا اور اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"تم نے ابھی کہا تھا" الف نے اُسی انداز میں کہا۔

"حالانکہ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ کیا ضروری ہے اور کیا نہیں اور تمہیں مجھ پر یقین کرنا چاہیئے، تم مجھ پر یقین کر سکتے ہو، ممکن ہے، میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ رہا ہو اور میں نے یونہی کہہ دیا ہو کہ — تم سمجھ رہے ہو نا"؟ اس نے رُک رُک کر معذرت طلب لہجے میں کہا — لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے الف آگے بڑھ چکا تھا۔

جب وہ پیٹرول پمپ کے کمرے میں داخل ہوئے، تو وہاں صرف ایک بوڑھا تھا، مضطرب اور خوف زدہ، اُن کے داخل ہوتے ہی وہ میز کی طرف پیٹھ کرکے اس طرح کھڑا ہو گیا تھا جیسے کسی اچانک حملے سے بچنے کی تیاری کر رہا ہو۔

"سنو ہمیں بہت ضروری فون کرنا ہے۔" بے نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ٹیلی فون — کرلیں — لیکن میرے پاس ڈائیل نہیں ہے، میرا کام پیغام وصول کرنا ہے۔" بوڑھے نے مشینی انداز میں جواب دیا۔ ابھی وہ دونوں اس کے جواب پر غور ہی کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور بوڑھا انہیں نظر انداز کرکے ریسیور کی طرف جھپٹا اُس نے ریسیور کان سے لگایا اور کچھ دیر بعد بولا، الف کی کال ہے۔ اُس بار اُس کی آواز میں خوف نہیں تھا۔

الف نے ریسور لیا اور کچھ دیر تک کمرے میں اُس کی ہوں ہوں، گونجتی رہی۔ وہ انتہائی مؤدب تھا پھر اُس نے ریسیور بوڑھے کے ہاتھ میں تھمایا اور بے کو ساتھ لیتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔

بے الف سے پوچھتا ہے: تم نے مجھے بات نہیں کرنے دی — ؟

"بوڑھا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، یہاں صرف پیغامات وصول ہوتے ہیں، ہمیں کہیں اور جانا ہے" الف نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

اب وہ ایک ایسے کلینک میں داخل ہوئے تھے، جس میں ایک ڈاکٹر پہلے ہی ریسیور کان سے لگائے بیٹھا تھا، جوں ہی وہ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے ڈاکٹر نے بیزاری سے پوچھا: "کیا بات ہے! میں بہت معروف ہوں"

"ڈاکٹر ہمیں فون کرنا ہے، بہت ضروری پیغام ہے" الف نے جواب دیا۔

"یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے، خود میرے لئے پیغام آنے والا ہے" ڈاکٹر نے لاتعلق لہجے میں کہا

"ڈاکٹر، پلیز، ہم زیادہ دیر نہیں لگائیں گے ٹھیک ہے نا" اُس نے بے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ جواب بھی سڑک دیکھ رہا تھا۔

"ہاں ہاں — ڈاکٹر، بالکل ہاں" بے نے کھوکھلی آواز میں چیخ کر کہا۔

"نہیں — میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ ایک بار میرے باپ سے یہ غلطی ہوئی تھی — میں اب تک اُس گم شدہ پیغام کا انتظار کر رہا ہوں" ڈاکٹر نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

لیکن ڈاکٹر میں نے کہا ہے نا کہ ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے اور پھر پیغام بہت ضروری ہے" الف کی ٹھٹھری ہوئی مدھم سی چیخ بہت دور سے آ رہی تھی۔

"ہاں ڈاکٹر — پیغام بہت ضروری ہے" بے کی کھوکھلی چیخ بھی الف کی چیخ میں مل گئی۔

اس دوران ایک لمحے کے لئے بھی ڈاکٹر نے ریسیور کو اپنے کان سے الگ نہیں کیا تھا۔ بہت دیر تک خاموشی ان کے درمیان چکراتی رہی — آخر ڈاکٹر کو اُن پر رحم آگیا اور اُس نے مجبوری بھرے لہجے میں کہا "اچھا لو — مگر زیادہ دیر مت لگانا — مگر نہیں — نمبر بتاؤ میں خود ملا کر دوں گا"

"نمبر — !" دونوں نے ایک ساتھ کہا، دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے اور پھر بے نے الف سے کہا: "تمہیں نمبر معلوم ہے"

"نہیں مجھے تو مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ پیغام بہت ضروری ہے" الف نے جواب دیا۔

"اگر تمہیں یہ معلوم ہے تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ نمبر کیا ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ نمبر بتائے ہی نہ گئے ہوں"

"شاید — مجھے اس کے بارے میں علم نہیں" الف نے بے کی تحقیقات کا جواب دیا۔

"تو ہمیں پہلے نمبر تلاش کرنا چاہیئے" بے نے کہا اور باہر کی طرف مڑ گیا۔

دونوں مخالف سمتوں میں چل پڑے اور ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

کلینک میں ڈاکٹر حیرت سے ٹیلی فون کو دیکھ رہا تھا، اُس پر نہ تو ڈائل تھا اور نہ ہی نمبر — !

شمس نعمان

میل پتھر

وقت کا سبز پروں اور سُرخ چونچ والا پرندہ آسمان کی وسعتوں میں اُڑتا ہی چلا جاتا ہے — جبکہ موسم کونجوں کی مانند پلٹ پلٹ کر آتا ہے۔

وہ الگ بات ہے کہ موسموں کے سینوں پر منقش تصویریں کبھی کبھار تیکھے ناخنوں سے بھی کُھرچی نہیں جاتیں۔

تیکھے ناخنوں کے ساتھ وہ سبز پروں اور سُرخ چونچ والے پرندوں کے چہروں میں چھپے ہوئے موسموں اور موسموں سے منسوب یادوں کو کُریدتے کُریدتے بے تحاشا تھک چکا تھا۔

ایک تو ہزاروں میلوں کا سفر عجیب و غریب ان دیکھے موڑ اور انجانی راہیں اوپر سے تنہائی کا سفر اُس کی گاڑی سڑک پر اُڑتی جا رہی تھی — وہ سوچ رہا تھا کہ —

وہی موسم ہے — سرسوں کچور رنگی پہاڑیوں کی گود میں کھڑ کھڑ ہنس رہی تھی اور ہنس ہنس کھڑ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ موسم کی کونج اگلے پتنوں کو اُڑ جائے — وہ گھر پہنچنا چاہتا تھا۔

اب تو سفر بھی کیا رہ گیا تھا — ساری سرحدیں تو وہ پار کر آیا تھا۔ اس نے پیچھے کی جانب اپنے سفر کو دیکھا تو وہ حیران سا رہ گیا۔

کہاں ولائت کا شہر برمنگھم اور کہاں نچلے کشمیر کی سبز سبز پہاڑیاں اور اُن میں چُھپا ہوا اس کا چھوٹا سا گاؤں —

پنڈ ملکاں —

پنڈ ملکاں کے مٹی اور پتھروں سے چُنے ہوئے گھر۔ اور گھر بھی ایسے جیسے پناہ گاہ کی چاہ کرنے والے چند بچوں نے گھروندے سے بنا رکھے ہوں۔

موسم کوئی سا بھی ہو۔ وقت بے شک چھلاوے بھرے یا پھر پہاڑی ندی کے پانی کی مانند پتھروں سے ٹکریں مارتا آگے بڑھے — پنڈ ملکاں کی لڑکیاں تین کوس دور کنوئیں سے پانی بھرتے بھرتے بوڑھی ہوتی جا رہی تھیں۔ اُس کے گاؤں میں لڑکیوں کی عمر اُن کی بغلوں اور سروں پر رکھے ہوئے گھڑوں سے پہچانی جاتی تھیں۔

"نور جان تو اب ان عذابوں اور پینڈوں سے بچ گئی ہوگی — اب تو ملک گلاب خان کی حویلی کی تیسری ملکانی بن چکی ہوگی۔"

ایک کالی بھیڑ کو بچاتے بچاتے ایک اندھے موڑ پر اُس کی کار ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ اور بریکوں کی چیخیں فضا میں یوں ابھریں جیسے سوتے میں کوئی بچہ بھیانک خواب دیکھ لے۔

یہی وہ مقام تھا — یہی وہ سماں تھا۔ آٹھ برس پہلے اس کی آنکھوں میں ایک آنسوؤں کا سیلاب تھا جو اُمڈتا چلا آ رہا تھا — ہو سکتا تھا — وہ اس سیلاب میں بہہ جاتا — اور اس کا نشان بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن وہ حیرت انگیز طریقے سے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

یہی وہ سڑک تھی جو اُن دنوں پکّی کی جا رہی تھی۔ اور وہ اس کے کنارے بیٹھا انگلیوں پر ربڑ کی تھیلیاں چڑھائے دن بھر پتھر کوٹتا رہتا تھا۔ اس کی انگلیاں اندر اندر سے گل سڑ رہی تھیں لیکن وہ خوش تھا۔ کہ پکّی سڑک تو اس کے گاؤں تک جائے گی —

اُسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس سڑک کا ٹھیکہ ملک گلاب خان کے پاس تھا اور گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا کہ ملک گلاب خان اپنی سفید گاڑی کو گاؤں تک لے جانے کے لئے یہ سڑک بنوا رہا تھا۔

لوگوں کا کیا ہے وہ تو کوؤں کی طرح کائیں کائیں

کرتے رہتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں۔
لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ کالے شاہ کے عرس
پر چاند کی ساتویں کو ملک گلاب خان نذیر خان کی
بیٹی نور جان سے شادی کرے گا اور یوں اس کی پکی
حویلی میں نور جان تیسری ملکانی بن کر قید ہو جانے
گی۔

اُسے ان سب باتوں سے کبھی اُلجھن نہ ہوئی
تھی۔ بس کبھی کبھار یونہی نور جان کے نام سے اس
کے دل میں اک انجانا سا درد بیٹھ جاتا تھا۔ مگر پتھر
توڑتے توڑتے وہ مزدور سوچا کرتا کہ سڑک تو پکی ہو جانے
گی۔ لیکن گاؤں میں پانی کب آئے گا۔

اور گاؤں کی لڑکیاں کب کنوئیں پر جانے والا
راستہ جو ملک گلاب خان کی حویلی کے آگے سے ہو کر
گزرتا تھا۔ بدلیں گی۔ بس اس بات پر
اسی سوچ پر اس کا باپ اُسے جھاڑ بھی دیا کرتا
تھا۔ کہ اس کی عمر اتنی گہری سوچوں کے لئے نہ
تھی۔ تب اُسے خیال آتا۔ اس کی عمر کی لمبی
لکیر جو اُس کی ہتھیلی پہ کھنچی ہوئی تھی کس لئے اس قدر
گہری تھی۔

یہی وہ رُت تھی۔ جو موسموں کی کوکھ گاؤں کی
لہلہاتی سرسوں پر منڈلا رہی تھی۔ ملک گلاب خان
کی سفید گاڑی سڑک کنارے کھڑی تھی۔ گو اس کے
لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن نہ جانے اس روز
اس کے جی میں کیا آئی۔ وہ آناً فاناً گاڑی میں جا
بیٹھا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ جیسے سفید سفید
بادلوں میں اُڑن کھٹولے میں سفر کرنے لگا تھا۔
"ہماری بھی کیا زندگی ہے۔ جیسے ماتھوں پر
اُٹے ہوں۔" اُس نے سوچا اور سبز سبز پہاڑ سفید
سفید بادلوں میں چھپ گئے۔ لیکن بادلوں میں
اُڑنے والے ان میں چھپی بجلی سے بھی ٹکرا جاتے۔
ایک گڑگڑاہٹ۔ ایک زبردست دھماکہ۔

"اوئے۔ تیرے باپ کی گاڑی ہے۔ چل
دفع ہو یہاں سے۔"

ملک گلاب خان کی آواز آسمانی بجلی سے بھی
کہیں زیادہ خوفناک تھی۔ تبھی۔ ایک آنسوؤں
کا سیلاب تھا کہ اُمڈ آیا تھا۔ جو شاید اسے بہا
لے جاتا۔

وقت کا سبز پروں اور سرخ چونچ والا پرندہ
آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔ لیکن سماں رُک گیا۔ جیسے
سمے کہ اُس کے پاؤں کے ساتھ ہزاروں گرہیں
لگ گئی ہوں۔

"بابا ہمارے گھر کی دیواریں کب تک کچی رہیں گی؟"
اس رات وہ سو نہ سکا تھا۔ اور وہ چاہتا
بھی یہی تھا کہ اُس کی ماں اور اس کا باپ بھی نہ
سوئیں۔

"بابا۔! ہمارے گھر کی دیواریں ملک گلاب خان
کی حویلی سے بھی اونچی ہونگی۔"

تب وہ ٹوٹی پھوٹی کھاٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا
اور کھلے آسمان تلے کھڑا ہو کر اوپر کی جانب تکنے لگا۔
اس کا باپ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔
پھر گردن گھما کر اس کے باپ نے سوتر کی اٹیاں اٹیرنے
والی اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔ اُس کی ماں نے
گھر کی چار دیواری کو بھیگی بھیگی آنکھوں سے گھورا اور
پھر سوتر کی اٹی اٹیرنے والی چکری کو تیزی سے گھمایا۔

"میرے لعل سوچا اُنہونے خواب نہ دیکھا کر۔"
لیکن چمکتے ستاروں میں جو کچھ اس نے دیکھا تھا۔
وہ سب کچھ خواب نہ تھا اور اس سے پہلے کہ وہ
سمے کے پروں سے پھسل جاتا اور تاریکیوں میں
لُڑھک جاتا۔

اس کی ماں نے اپنی ماں کی دی ہوئی نتھ، کڑے
لچھیاں اور بُندے رہن رکھ دیئے۔ اور وہ
وقت کے بیڑے پر چڑھ کر رنگم جا اُترا۔

آٹھ برس پہلے کی بات تھی۔ جو اس اندھے
موڑ پر یادوں کا جلوس بن کر اس کے سامنے سے
گزر رہی تھی۔ اور پھر ہوا یوں تھا کہ۔

پنڈ ملکاں کا ڈاکیہ ولائت سے منی آرڈر اُس
کے باپ کے ہاتھ میں تھماتے تھماتے سوچا کرتا
کاش میرا بھی کوئی ایسا بیٹا ہوتا۔

موسموں کی کونجیں لوٹ آئی تھیں۔ اور اپنے ساتھ
اُس کی ماں کے نتھ، کڑے۔ لچھیاں اور بُندے
پھر سے ماں کے صندوق میں مُقفل ہو گئے تھے۔
وہ سوچا کرتا۔

"اب تو میرے باپ کی حویلی ملک گلاب خان کی
حویلی سے بھی زیادہ اونچی ہو گی اب تو میرا باپ بھی
ملک عزیز خان ہو گا۔"

یہی آس تھی۔ یہی چاہ تھی کہ وہ جلد از جلد
گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ تب اس نے گاؤں کے
ایک میل پتھر کے پاس گاڑی کھڑی کر دی۔ جس پر
لکھا تھا۔

پنڈ ملکاں۔

اُس کی آنکھوں میں پتھر پر لکھے ہوئے دو حرف

موتیوں کی مانند چمکنے لگے۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ ان دو حروف کو ۔۔۔ اُن دو آبگینوں کو اپنے ترستے ہوئے ہونٹوں سے چوم لے۔

میل پتھر کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے اس نے اپنے گاؤں کی جانب نگاہ دوڑائی ۔۔۔ وہاں پر ابھی تک صرف ایک پکی حویلی سر نکالے کھڑی تھی۔ ملک گلاب خان کی حویلی ۔۔۔ وہ سن ہو کر رہ گیا۔

"میری حویلی کہاں ہے؟" جیسے کہیں وہ کسی راہ میں گم ہو چکا ہو۔ جیسے اس کا وجود سانس لینے کی طاقت کھو بیٹھا ہو۔

"میری حویلی کہاں ہے؟"

اس نے گھر کی دہلیز میں قدم رکھتے ہی پہلا سوال کیا۔ اس کی اچانک آمد پر اُس کی ماں اور باپ دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے وہ کوئی سہانا خواب دیکھ رہی تھیں۔

"میری حویلی کہاں ہے؟" وہ تقریباً چلا اُٹھا۔ اور یوں اُس کے باپ کو یقین آ گیا کہ جان محمد واپس آ گیا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس کی اچانک آمد پر صحن میں اکٹھے ہو گئے تھے ۔۔۔ اور حسرت بھری اور خوشی کی ملی جلی نظروں سے جان محمد کو دیکھے جا رہے تھے۔

اس کا باپ مسکراتے ہوئے موڑھے پر سے اُٹھا۔ اور اس کا کندھا تھام کر کہنے لگا۔

"چل آ ۔۔۔ میں تجھے تیری حویلی دکھلاؤں!"

وہ دونوں باپ بیٹا گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے ۔۔۔ لہلہاتی سرسوں کے عین درمیان برگد کے ایک بوڑھے درخت کے پاس ایک کنوئیں کی منڈیر پر رُک گئے۔ اس کے باپ نے کہا۔

اس کنوئیں میں جھانک کر دیکھو ۔۔۔ تجھے تیری حویلی کی دیواریں کس قدر اونچی نظر آئیں گی۔"

وہ ایسی بجھارتوں کے لئے کبھی نہ تیار تھا۔

پھر بھی اُس نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا۔

اُسے کنوئیں کے اندر چاندی کے تھال میں سجا ہوا ایک چہرہ نظر آیا ۔۔۔ جو چودھویں کے چاند کی مانند چمک رہا تھا۔

یہ چہرہ ۔۔۔ اس کے باپ صوبیدار عزیز خان کا تھا ۔۔۔ جو اُس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا

"چل اب نور جان کے باپ سے تیری بات پکی کر دوں؟"

شمس نغمان

"یہی وہ سڑک تھی۔ جو اُن دنوں پکی کی جا رہی تھی اور وہ اسکے کنارے بیٹھا انگلیوں پر ربڑ کی تھیلیاں چڑھائے دن بھر پتھر کوٹتا رہتا تھا اس کی انگلیاں اندر اندر سے گل سڑ رہی تھیں۔ لیکن وہ خوش تھا۔ کہ پکی سڑک تو اس کے گاؤں تک جائے گی"

اقتباس : میل پتھر

ضیاء بٹ

لخت لخت

"دِتّو کلیاں کیوں چٹختی ہیں اور پھول کیوں کھلتے ہیں؟ اور ــــــ اور پھر اپنے ہی ہاتھ انہیں توڑ کر گلدستوں میں کیوں سجا دیتے ہیں؟ نہ جانے ان پودوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ جن کی رگ و پے سے پھول نکلتے ہیں" صلاح الدین نے اپنی جھکی گردن اوپر اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

کوٹھی کے لان میں تین چار خالی کرسیوں کے پاس زمین پر بیٹھا دِتّو گھاس سے برابر کھیلتا رہا۔ اس نے صلاح الدین کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

"دِتّو تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ گلاب کے کِھلے پھولوں کی طرف دیکھو"

"ہاں بھائی جان خوب پکے ہوئے پھول ہیں ان کی گلقند بڑی اچھی رہے"

"دست تیرے کی ــــــ نہ جانے تم نے زندگی کہاں گزار دی۔ زندگی کے لطیف پہلوؤں سے یکسر بے بہرہ ہو ــــــ تم کرسی پر کیوں نہیں بیٹھتے۔ تمہیں کئی دفعہ کہا ہے کہ کرسی پر بیٹھا کرو ــــــ سنو آج سے تمہیں میرے ہی بیڈ روم میں سونا ہوگا۔ میری طبیعت اب زیادہ مضمحل ہے۔ ایسا نہ ہو پاس ہوتے ہوئے بھی تمہیں پکارتا رہوں اور پھر...." صلاح الدین کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے ــــــ دِتّو کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

"تمہیں کیا غم ہے۔ تم کیا سوچ رہے ہو"

"یہی سوچ رہا ہوں کہ میں نے کن حالات میں زندگی کہاں اور کیسے گزار دی ــــــ زندگی کے لطیف اور کثیف پہلو کون کون سے ہیں" دِتّو نے جواب دیا

"ایسی باتیں کر کے میرے دکھوں میں اضافہ مت کرو۔ میں نے تمہیں ڈاکٹر کی نصیحت کے مطابق اپنے پاس صرف اس لئے بلایا ہوا ہے کہ تم اچھی اچھی باتیں سنا کر میرے اُداس دل کو بہلاؤ۔ دیکھو اگر گذشتہ زندگی میں مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہے تو مجھے معاف کر دو۔ اب اس کوٹھی اور میری جائیداد کے تم مالک ہو۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ صبح تمہارے نام رجسٹری کر دوں گا۔ باقی ماندہ زندگی آرام سے گزار دــــــ اٹھو کرسی پر بیٹھو۔ تمہیں قسم ہے اٹھو اور اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات سناؤ ــــــ ہاں کوئٹہ میں جو تم نے چودہ سال گزارے تو کیا بڑا بھونچال تمہاری موجودگی میں آیا تھا"

دِتّو اٹھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ شاید پہلی بار کرسی پر بیٹھا تھا اور اپنے آپ کو باعزت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے قدرے اعتماد سے بولنا شروع کیا

"میں نے زیادہ وقت چمن میں ایک سنیاسی کے پاس گذارا۔ اس نے جڑی بوٹیوں سے بڑے بڑے مجرب نسخے میری موجودگی میں تیار کئے۔ میرا ارادہ ہے کہ آپ کے لئے ایک نسخہ تیار کروں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ شہر میں تو جڑی بوٹیوں میں بھی ملاوٹ ہے۔ وہ بڑا کامل سنیاسی تھا۔ میں نے اس کی بڑی خدمت کی۔ جب وہ بیمار پڑا تو کہنے لگا میرے دن پورے ہوگئے ہیں۔ بس ایک آدھ دن کا مہمان ہوں۔ تم جلدی سے فلاں فلاں بوٹی لا کر ان کا تیل نکالو گائے کے اُپلے اکٹھے کرو۔ باقی نسخہ میرے پاس ہے۔ اور میری زندگی میں تانبے کو سونا بنانا سیکھ لو۔ مگر شومئ قسمت جب میں واپس آیا تو سنیاسی مر چکا تھا۔ اس کے بعد میرا دل اچاٹ ہوگیا اور میں کوئٹہ چلا آیا۔ کوئٹہ کے قبرستان میں میری ملاقات ایک درویش سے ہوگئی۔ بڑا خدا رسیدہ بزرگ تھا۔ جن بھوت نکالنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ بے شمار مرد اور عورتیں اس کے ہاں حاضری دے کر اپنی مرادیں پاتے تھے۔ لیکن وہ تنہائی میں اکثر کہا کرتا تھا کہ اس بستی پر خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ کیونکہ

دن بدن بہروپیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور گناہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ میں نے کئی سال اس کی خدمت کی۔ اس نے خوش ہو کر مجھے "وظیفۂ خوشیہ" بتلا دیا۔ "وظیفۂ خوشیہ" کی ریاضت چالیس سال ہوتی ہے۔ اس کے بعد صاحبِ وظیفہ پر ایک ایسا "حال" طاری ہوتا ہے۔ جس میں وہ اپنے دست و بازو تک سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم کے اعضاء علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کوئی اسے دیکھ لے تو مختلف اعضاء پھر اس کے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ صاحبِ وظیفہ کو اس حال میں دیکھنے والا "وظیفۂ خوشیہ" کا وارث ٹھہرتا ہے۔ میں نے اسے اس کیفیت میں کئی دفعہ دیکھا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگلی صبح وظیفہ کا آغاز کروا دے گا۔ ایسے وظائف کرنے کے لئے کسی بزرگ کی پشت پناہی ضروری ہوتی ہے لیکن کوئٹہ میں ایسا زلزلہ آیا کہ خدا کی پناہ۔ میں نے بیویوں کو شوہروں سے۔ باپ کو اولاد سے اور بہنوں کو بھائیوں سے بچھڑتے دیکھا۔ وہ بزرگ بھی قبرستان میں بنے مکان کی چھت کے نیچے آ کر دم توڑ گیا۔

"بس کرو۔ دِتّو بس کرو۔ مجھ میں مزید کچھ سننے کی سکت نہیں۔ اٹھو مجھے میرے بیڈ روم میں لے چلو۔"

دونوں بھائی بیڈ روم میں تھے اور صلاح الدین کہہ رہا تھا "میں نے بھی ایک وظیفہ چالیس سال پڑھا ہے اور نتیجتاً اپنے آپ سے بچھڑ چکا ہوں۔ یہ میری بیوی ہے۔ جو مجھے داغِ مفارقت دے چکی ہے۔ میرا جگر اس وقت کینیڈا میں ہے۔" اس نے اپنی لڑکی کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میرا ایک بازو جرمنی اور دوسرا انگلینڈ میں ہے۔"

اب وہ اپنے دونوں بیٹوں کی تصویریں دکھلا رہا تھا۔ "میرے اعضاء علیحدہ علیحدہ ہو چکے ہیں۔ تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ بتلاؤ میرے جسم کے اعضا یکجا کیوں نہیں ہو جاتے ——— کیوں نہیں ہو جاتے۔ میں نے انہیں بذریعہ تار ......" صلاح الدین پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

دِتّو نے صلاح الدین کا جوتا اتارنے کے بعد اس کے پاؤں کو چادر سے جلدی جلدی اور زور زور سے رگڑنا شروع کیا۔ اتنے میں ایک مرد اور عورت کمرہ میں داخل ہوئے۔ عورت کی شکل صلاح الدین کی بیٹی سے ملتی جلتی تھی ——— دِتّو کو کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔ چند منٹوں کے بعد ایک ڈاکٹر کوٹھی میں داخل ہوا۔ شام تک صلاح الدین کے دونوں بیٹے بھی پہنچ گئے۔

لان میں گھاس پر بیٹھے دِتّو کو صلاح الدین کی حالت بہتر ہونے کی اطلاع مل چکی تھی۔ مگر وہ لاشعوری طور پر گھاس کی پتیاں توڑ رہا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ایک ایسے جسم کا مالک ہے جس کا کوئی عضو نہیں اور جو اندر سے لخت لخت ہوا چاہتا ہے۔
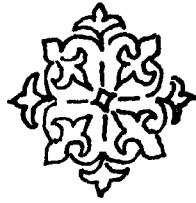
ضیا بٹ

"جب وہ بیمار پڑا تو کہنے لگا میرے دن پورے ہو گئے ہیں۔ بس ایک آدھ دن کا مہمان ہوں۔ تم جلدی سے فلاں فلاں بوٹی لاکر ان کا تیل نکالو۔ گائے کے اُپلے اکٹھے کرو۔۔ باقی نسخہ میرے پاس ہے اور میری زندگی میں تانبے کو سونا بنانا سیکھ لو۔"

اقتباس: لخت لخت

فردوس حیدر

کھیتیاں

مجاھد نے فائلوں کے ڈھیر سے نظر اٹھا کے دیکھا۔ مینا کی مخروطی انگلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں ٹِک ٹِک کی آواز کے ساتھ لے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ہال پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی جس کی چاروں دیواروں کے ساتھ ساتھ کلرکوں اور ٹائپسٹوں کی میزیں یوں لگی ہوئی تھیں کہ ہر کوئی ایک دوسرے کو آمنے سامنے دائیں بائیں بآسانی دیکھ سکتا تھا۔ ہال کا وسطی حصہ مستطیل شکل بنائے اپنے ننگ دھڑنگ ٹوٹے پھوٹے وجود کا رونا رو رہا تھا اور دیواروں کا اُترا ہوا پلستر اس میں اضافہ کر رہا تھا۔ مجاہد نے گبھرا کے چھت کی طرف دیکھا۔ بوسیدہ لکڑی کی کڑیاں برسوں کی کالونچ لئے اس کا منہ چڑانے لگیں اور مکڑی کے کئی لٹکے ہوئے جالے ویرانی کا احساس دلانے لگے۔

"غربت اور افلاس کی تقدیر میں صرف رونا لکھا ہے" اس نے بیزاری سے سوچا دیواروں کا مٹیالا رنگ جو کبھی سفید براق ہوگا اسے اپنی زندگی کی طرح بجھا بجھا سا محسوس ہوا۔ ایسے میں مینا ایک روشنی بن کے پورے ہال کو جگمگا رہی تھی۔ اس کے سلیقے سے ایک چٹیا میں سمیٹے ہوئے بال۔ ہلکے رنگ کا سوٹ اور جھکی جھکی لمبی پلکیں دیکھ کر وہ مسکرایا "سادگی اور پاکیزگی کا مرقع ہے" دل میں سوچتے ہی جیسے اس کی ساری تھکاوٹ دور ہو گئی ـــــ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ مینا سے بات کرے مگر گفتگو کا آغاز کرنے کے لئے اسے کوئی مناسب موضوع نہ ملتا۔ وہ عام مردوں کا سا تاثر دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اپنی شخصیت سے مرعوب کرنے کے لئے وہ انفرادیت پیدا کرنا چاہتا تھا۔

اس دفتر میں مینا کی تقرری اسی ماہ ہوئی تھی لیکن یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ برسوں سے یہیں کام کرتی رہی ہو۔ دفتر کے چھوٹے بڑے کلرک اس سے بہت جلد مانوس ہو گئے بلکہ مرعوب ہو گئے۔ اس سے پہلے جب بھی کوئی لڑکی دفتر میں آئی تو اپنے ساتھ افواہوں کی گٹھڑی بھی لیتی آئی۔ جسے کھول کر چٹخارے لئے جاتے۔ لیکن مینا کے بارے میں کوئی سکینڈل سننے میں نہ آیا۔ بلکہ اس کے آتے ہی ہر کام دفتر کی روایت سے ہٹ کے ہونے لگا۔ کئی کلرک لباس پر خاص توجہ دینے لگے ایک دوسرے کے ساتھ دھیمے اور نرم لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔ جیسے مینا کو متاثر کرنے کے لئے شائستگی میں سبقت لینے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اور تو اور خان چوکیدار نے نسوار کھا کے تھوکنا چھوڑ دیا۔ صدیقی صاحب نے پان کی پیک کے لئے اگالدان کا بندوبست کر لیا۔ یوں لگتا تھا۔ مینا نے پورے دفتر کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ چوکیدار کی بیٹی کی شادی پر اس نے تمام دفتر والوں سے چندہ جمع کر کے اسے نیا جوڑا سلوا دیا تھا۔ فاروقی صاحب کی برسوں کی رکی ہوئی ترقی مینا کی سفارش پر ہی ہوئی کئی کلرکوں نے دفتر سے ایڈوانس لینا چاہا تو بھی مینا ہی کام آئی۔ یوں لگتا تھا۔ مینا کے علاوہ کسی اور کی باس تک رسائی ممکن نہیں۔ اور مینا کو خوش کرنے کے لئے ہر کوئی اپنا کام مستعدی سے کرنے لگا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک دوسرے کی میز پر جا کر چائے پینے کے بہانے گپ شپ کی رسم بھی ختم ہو گئی۔ اب کھانا چائے اور تبادلۂ خیالات سب لنچ بریک کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئے۔

"ماں نے اگلے ماہ میری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے" مجاہد نے سوچا اور افسردہ ہو گیا اُسے ایڈوانس لینے کے لئے مینا کا دستِ نگر ہونا پسند نہ تھا اس نے بے بسی سے مینا کی طرف دیکھا۔ ٹائپ مشین کی آواز کے ساتھ اس کی انگلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔

"بیٹا میں نے فاروقی صاحب کو کہہ دیا ہے۔ وہ ایڈوانس دلانے میں تمہاری مدد کریں گے" اُسے کہیں

دور سے ماں کی آواز آئی تو اسے یاد آیا کہ وہ آج ماں سے پیسوں کا بندوبست کرنے کا وعدہ کر چکا ہے ۔

"مجاہد صاحب آپ لنچ بریک میں مجھے ملیں "۔ مینا نے ٹائپ مشین سے ہاتھ روک کے کہا۔

"جی کیوں" وہ چونک گیا۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ فاروقی صاحب نے ایڈوانس کے سلسلے میں مینا سے مدد طلب کی ہو گی۔ اسے مینا کے سامنے اپنی ذات بے حد معمولی سی لگی۔ ایک مرد کی حیثیت سے کسی عورت کی مراعات قبول کرنا اسے گوارا نہ تھا۔

"سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی لائی ہوں۔ آپ کھائیں گے تو مجھے خوشی ہو گی "۔ مینا نے ٹفن کی طرف اشارے کرتے ہوئے کہا۔ اور دوبارہ ٹائپ مشین پر جھک گئی۔

مجاہد کے لئے لنچ بریک تک وقت گزارنا دوبھر ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا مینا اسے پسند کرنے لگی ہے۔ "مینا نے اپنے ہاتھوں سے سرسوں کا ساگ پکایا ہو گا"۔ یہ سوچ کے اسے خوشی ہوئی ـــــ

مینا کا خوبصورت چہرہ ٹائپ مشین پر جھکا ہوا عین اس کے قریب آ گیا ـــــ جھکی جھکی نظریں ـــــ اور اس کے وجود کی سوندی سوندی خوشبو ـــــ فائلوں کی تحریر کبھی خوشبو اور کبھی رنگ بکھیرنے لگی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے بیٹھ گیا۔ کام پر توجہ دینا ناممکن ہو گیا۔ "مجاہد صاحب طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" مینا کی آواز پر وہ چونک اٹھا۔ وہ واقعی اس کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ اس نے گھبرا کے اپنے چاروں طرف دیکھا خالی میز۔ خالی کرسیاں۔ پورے ہال میں وہ دونوں تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ویرانے میں بہار آ گئی ہو۔ ایک لمبی گہری سانس لیتے ہوئے اس نے بہار کی خوشبو کو اپنے اندر بھر لینا چاہا ـــــ مینا ایک خوبصورت پھول کی طرح تر و تازہ نظر آ رہی تھی "لنچ بریک ہو چکی ہے "۔ مینا نے ناشتہ دان اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ طلسم ٹوٹ گیا اور وہ ہال سے متصل کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں سے کلرکوں کا شور اب اسے صاف سنائی دے رہا تھا۔ کوئی چپڑاسی سے پانی منگوا رہا تھا اور کوئی چائے۔ سب کھانا کھا رہے تھے۔ سستے گھٹیا سگرٹوں کی خالی ڈبیاں، کمرے ہوئے فرش پر جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں اور ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی کرسیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایسے میں اسے اپنا وجود بھی ٹوٹے ہوئے فرنیچر کا ایک حصہ لگا جسے نہ تو وہ پھینک سکتا تھا نہ مرمت کرانے کی استطاعت رکھتا تھا۔

"ہم سب ناقابلِ استعمال ہیں"۔ سگرٹوں کے دھوئیں میں سے کلرکوں کے لاغر، کمزور اور زرد چہروں کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے نہایت دکھ سے سوچا۔ غربت و ناداری کرب اور اذیت بن کے اس کی رگوں میں دوڑنے لگی۔

"مجاہد صاحب اُدھر بہت گھٹن ہے۔ آئیے ہم یہیں بیٹھ جاتے ہیں"۔ مینا نے اپنی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ

کھانے کے دوران خاموشی رہی۔ وہ مکئی کی روٹی اور ساگ کی تعریف کرنا چاہ رہا تھا۔ چہرے پر شگفتگی لانے کی کوشش کے باوجود اس کے اندر کا کرب خاموش رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہال کی دوسری جانب ایک کاریڈور کے اختتام پر سیٹھ رحمان کا ایر کنڈیشن کمرہ تھا ایر کنڈیشن کی گرگراتی آواز نے ایک دفعہ پھر اس کے اندر ابال پیدا کر دیا۔

"پیسے کے بغیر میری کوئی پہچان نہیں۔ کوئی عزت نہیں۔ کوئی وقار نہیں۔ میں دوبئی جا کر پیسہ کماؤں گا۔ اور اپنے گھر میں ایسا ہی ایر کنڈیشن لگاؤں گا"۔ کاریڈور کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دل میں فیصلہ کر لیا۔

اُسے اپنی غربت کا احساس کوئی پہلی دفعہ نہ ہوا تھا وہ تو بچپن سے ہی اس اذیت سے دوچار تھا۔ وہ غربت کو بدنما داغ سمجھتا تھا اور اس داغ کو دھونے کے لئے اس نے تعلیم حاصل کی مگر گریجویٹ ہونے کے باوجود بھی ناکامی اور محرومی اس کو ورثے میں ملی۔ اس کے والد اسی دفتر میں کلرک تھے۔ ان کی موت کے بعد اسی کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ملازمت کی ان تھک کوششوں کے باوجود جب وہ نڈھال ہو گیا تو باپ کی خالی کرسی نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب ملازمت ملنے پر لوگ اسے مبارک باد دیتے رہے اور وہ خون کے آنسو روتا رہا ـــــ لوگ اسے خوشی کے آنسو سمجھتے رہے۔ ملازمت ملنے کی خوشی، بیکاری سے نجات ملنے کی خوشی۔ کسی نے اس کے آنسوؤں کی نوعیت کو نہ سمجھا۔ وہ آنسو جو سرخی سے سیاہی مائل ہوتے ہوئے ایک سیاہ دھبہ بن کے اس کی تقدیر کا اعلان کرتے رہے۔ وہ تقدیر جو نسل در نسل غربت تقسیم کرتی رہی۔

"فاروقی صاحب نے بتایا تھا کہ آپ کو شادی کے لئے کچھ پیسے چاہئیں "۔ مینا کی آواز کہیں دور سے سنائی دی۔

"ہوں "۔ وہ چونکا۔

"آپ مجھے درخواست لکھ دیں میں باس سے کہہ کے ایڈوانس دلا دوں گی "۔ مینا کے لہجے میں خوشی تھی

اسے یوں محسوس ہوا جیسے مینا باس کے پاس جانے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ مینا کا خوبصورت چہرہ ایک بدنما دھبہ بن گیا۔ اس نے مشکوک نظروں سے مینا کی طرف دیکھا۔

"یقین کیجئے باس میری بات نہیں ٹالیں گے۔" مینا نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

"باس آپ کے کیا لگتے ہیں؟" مجاہد نے غصے سے مینا کی طرف دیکھا۔

مینا کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا اور ہونٹ کپکپانے لگے ـــــ اس نے خالی خالی نظروں سے مجاہد کی طرف دیکھا۔ پھر نظریں جھکالیں۔

"میرے والد سیٹھ رحمان کے ڈرائیور تھے۔ نوکری چھوڑ کے وہ دوبئی چلے گئے ہیں۔ چھ ماہ سے ان کی کوئی اطلاع نہیں۔ رحمان صاحب مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔ میرے والد نے قرضہ لے کر ریکروٹنگ ایجنٹ کو دیا تھا وہ بھی رحمان صاحب نے ادا کیا ہے۔" مینا نے آنسو روکتے ہوئے کہا۔ مجاہد شرمسار سا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"جب سے میرے ابا دوبئی گئے ہیں ان کا نہ تو کوئی خط آیا ہے اور نہ ہی انہوں نے خرچہ بھیجا ہے۔ میری اماں اسی غم میں بیمار رہنے لگی ہیں۔ یہ بھی اچھا ہوا میں نے اسی سال میٹرک کر لیا تھا۔ رحمان صاحب کے مشورے سے میں نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھ کر یہاں ملازمت کر لی"۔ یہ کہتے ہوئے مینا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

وہ مینا کو تسلی دینے کے لئے الفاظ کی تلاش میں پریشان ہوتا رہا۔

"عورتیں تمہاری کیتیاں ہیں ...." وہ کہتے کہتے رک گئی اور مجاہد کی طرف دیکھے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے کسی بھی مرد کا یوں اپنی عورت کو تنہا چھوڑ کر جانا بالکل بھی پسند نہیں۔" اس نے آنسو پونچھے اور پانی کا گلاس منہ کو لگا لیا۔

"مس مینا رنجیدہ نہ ہوں آپ کے والد جب ڈھیر سارا روپیہ کما کر لائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے اپنے خیالوں مینا کو خوش کرنا چاہا۔

"اس پیسے کا کیا فائدہ جو ہری بھری کھیتی کو ہمیشہ کے لئے خشک کر دے۔ میری ماں شاید انتظار نہ کر سکے" ـــــ مینا کی آنکھوں سے ایک دفعہ پھر آنسو بہنے لگے۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر ہال سے باہر نکل آیا۔ وہ مینا کے دکھ میں برابر کا شریک تھا۔ لیکن اس کی رائے سے متفق نہ تھا۔ مرد کا کام کمانا ہے خواہ اس مقصد کیلئے اسے اپنا ملک۔ اپنا خاندان ہی چھوڑنا پڑے۔" اس نے دل میں سوچا اور اپنے مضبوط بازوؤں کو غور سے دیکھا۔

"میں شادی کرنے سے پہلے دوبئی پیسہ کمانے جاؤں گا۔" اس نے فیصلہ کر لیا۔

اس نے کئی ریکروٹنگ ایجنٹوں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پیسے کے بغیر کوئی بھی ویزا دلانے کو رضامند نہ ہوا۔ اور پیسہ بھی نقد طلب کیا جاتا۔ کوئی قرض دینے کو تیار نہ تھا۔ دوست رشتہ دار سبھی اسی کی طرح کنگال تھے ایسے میں مینا امید کی ایک کرن بن کے اس کے سامنے آئی ـــــ اسے یاد آیا شادی کے سلسلے میں مینا قرض دلانے کیلئے تیار تھی۔ چنانچہ لنچ بریک ہوتے ہی اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"آپ کب شادی کرنا چاہتے ہیں؟" مینا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور وہ حیران سوچتا رہا میری شادی سے مینا کو کیوں اتنی خوشی ہے۔

"یہ قرض مجھے شادی کے لئے نہیں چاہیئے۔" مجاہد نے جلدی سے کہا۔ مینا کی آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی۔ اور اس نے نظریں جھکالیں۔

"میں اپنی بیوی کو زندگی کی تمام سہولتیں اور آسائشیں دینا چاہتا ہوں۔" اس نے زور دے کر کہا۔ اور اسے قائل کرنے کے لئے مزید الفاظ سوچنے لگا۔

"کیا یہ آپ کی منگیتر کا مطالبہ یا تقاضا ہے۔" مینا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں میں نے تو اپنی منگیتر کو دیکھا تک نہیں میری ساس کا تو صرف ایک ہی تقاضا ہے کہ جلد از جلد شادی کی تاریخ مقرر کریں۔ بے چاری میری ساس بہت بیمار رہنے لگی ہیں۔" اس نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔ اور پھر ذرا رک کر مسکرایا اور درخواست کا کاغذ ہاتھ میں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ جیسے وہ قرض لینے کی درخواست نہیں بلکہ بہت بڑی رقم کا چیک ہو۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنے دو منزلہ مکان کا نقشہ کھینچ لیا اور چھوٹے سے باغیچے میں ننھے منے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھ لیا ـــــ

"میں یہ قرض دوبئی جانے کے لئے لینا چاہتا ہوں آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ ریکروٹنگ ایجنٹ اور کرائے کا خرچہ ملا کے اچھی خاصی رقم درکار ہوگی۔" مجاہد نے درخواست والا ہاتھ مینا کے سامنے کر دیا ـــــ

مینا نے ایک نظر کاغذ کی طرف دیکھا اور کرسی

کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا اور آنکھیں دور خلا میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔

"مس مینا" مجاہد نے گھبرا کے آواز دی۔

کرسیوں کے گھسیٹنے سے ہال میں عجیب گھڑگھڑاہٹ سی پیدا ہوئی ـــــ تمام کلرک مینا کے اردگرد جمع ہو گئے۔

"کیا ہوا" سب کی سوالیہ نظریں اس کی طرف تھیں

"مہ ناز بیٹی کیا ہوا" فاروقی صاحب نے شفقت سے مینا کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـــــ

"انکل سب مردوں کو یہ سمجھائیے ہم ان کی زمینیں ہیں۔ کھیتیاں ہیں جنہیں چھوڑ کے نہ جائیں۔"

اس کی آواز ہچکیوں میں دب کے رہ گئی ـــــ

مہ ناز ..... اس کے ذہن پر بجلی سی کوندی جانا پہچانا سا نام تھا۔ میری منگیتر کا نام ہے۔ "اسے یاد آ گیا۔

"کیا مینا ہی میری منگیتر ہے؟"

"نہیں کئی نام ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے؟"

"نہیں یہ ممکن نہیں۔"

وہ خود ہی اپنے اوپر جرح کر کے مطمئن ہو گیا۔ کئی اور ٹائپسٹ لڑکیاں بھی مینا کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔

"یہ نائلہ ہے اس کا خاوند ریکروٹنگ ایجنسی کے نرغے میں پھنس گیا تھا جو جعلی پاسپورٹ بنا کر معصوم لوگوں کو باہر بھیجتی ہے۔ دوبئی پہنچتے ہی پکڑ لیا گیا اور قید ہو گیا ـــــ پھر قید سے بھاگنے کی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔" مینا نے نائلہ کا ہاتھ پکڑ کر سب کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"اور یہ صغرا ہے اس کے والد کے ساتھ بھی اسی قسم کا حادثہ پیش آیا تھا۔" پھر مینا نے صغرا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ وہ دونوں ہچکیوں سے رونے لگیں۔

"فاروقی انکل آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ مجاہد صاحب سے میرا رشتہ طے کرتے وقت آپ نے مکمل ذمہ داری قبول کی تھی کہ وہ دوبئی نہیں جائیں گے" مینا بھی ہچکیوں سے رونے لگیں۔ اسے یوں محسوس ہوا بنجر زمینیں بین کر رہی ہیں۔ کھیتیاں رو رہی ہیں۔ اور سب کی بے بس آنکھیں اسی کو دیکھ رہی ہیں۔

جیسے وہ سرسبزی و شادابی کی علامت ہو۔

زمین سیراب ہونے کو ترس رہی ہو۔

کھیتیاں لہلہانے کو مچل رہی ہوں

سوکھے درخت ننھی کونپلوں کے لئے بے چین ہوں

اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے اور کاغذ کے پرزے ہوا میں لہرانے لگے ـــــ

ہال کا اکھڑا ہوا فرش۔ دیواروں کی بجھی بجھی رنگت اور چھت کی کالی بوسیدہ کڑیاں آج اسے بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں۔

فردوس حیدر

"پیسے کے بغیر میری کوئی پہچان۔

کوئی عزت نہیں۔ کوئی وقار نہیں میں دوبئی جا کر پیسہ کماؤں اور اپنے گھر میں ایسا ہی ایئرکنڈیشنر لگاؤں گا" کاریڈور کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دل میں فیصلہ کر لیا؟

اقتباس: کھیتیاں

ماہِ نو
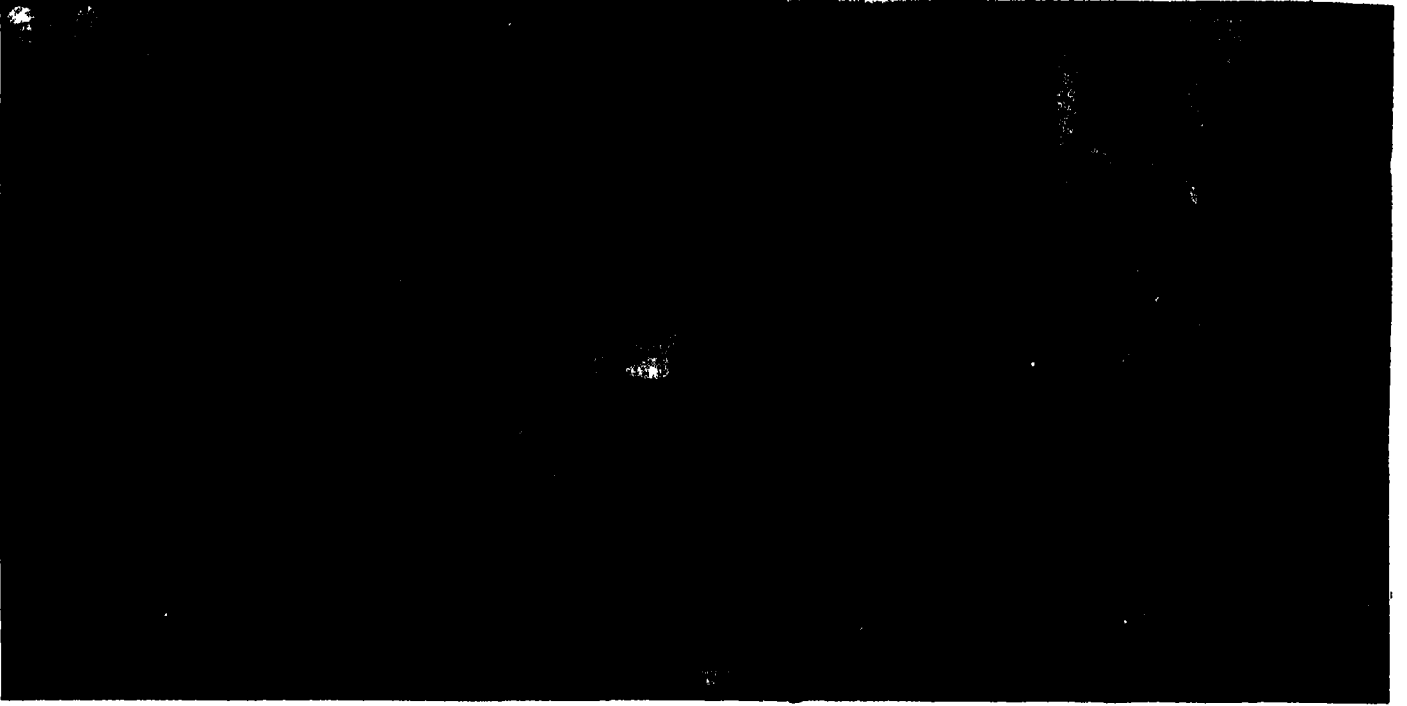
اکادمی ادبیات کی تاسیس، صدرِ مملکت خطاب کر رہے ہیں

تاسیسی ممبران کو اسناد، صدرِ مملکت پیش کر رہے ہیں۔

حمید کاشمیری، عرش صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا، میرزا ادیب اور دیگر احباب
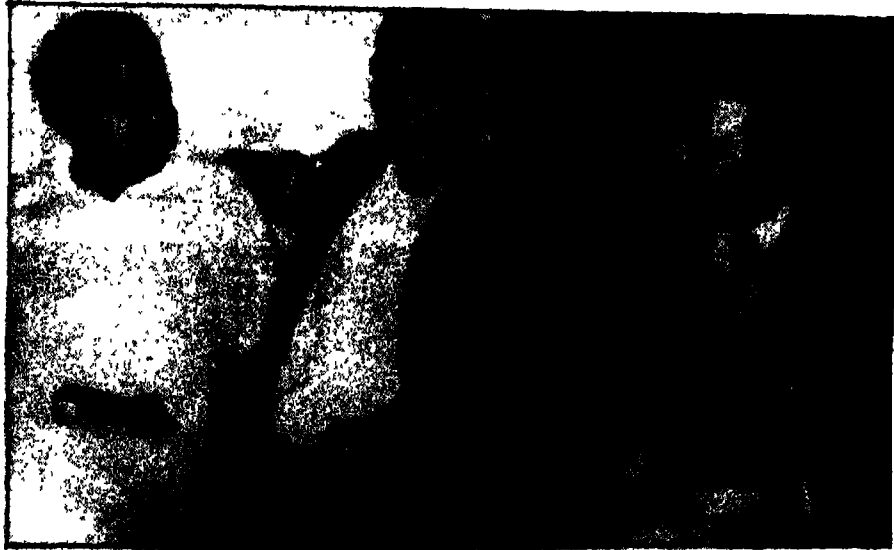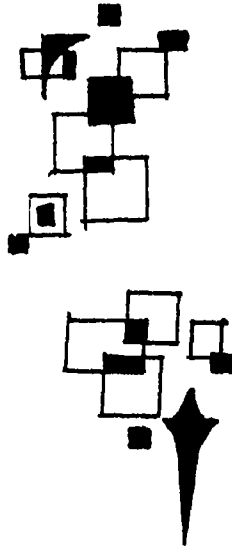
انتظار حسین، مبارک احمد، خالد احمد

ناصر زیدی، عطاء الحق قاسمی،
انتظار حسین، ابصار عبدالعلی،
سراج منیر، شفیق فاروقی

سائرہ ہاشمی

ادارۂ ادبیات کا تاسیسی مذاکرہ

ادب ــــــ اسلام آباد کے کوچے میں

لاہور سے چلتے ہوئے میں بہت سی باتوں کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ جب میں آپی کے ساتھ اسلام آباد ائرپورٹ پر اتروں گی تو دوپہر کی تیز دھوپ وہاں پر بھی ہوگی۔ اسلام آباد اور مری کا تصور میرے ذہن میں ایک دوسرے سے اتنا مختلف نہیں تھا۔ جب ہم اپنے اپنے اٹیچی پکڑے ریسپشن ہال میں آئے تو وہاں پر اختر جمال آپا پون گھنٹے سے ہماری منتظر کھڑی تھیں۔ ریسپشن ہال بے شمار کرسیوں کے باوجود خالی تھا۔ حفاظتی اقدامات کے تحت لوگ ہال کے بڑے دروازے کے باہر ہی کھڑے تھے۔ میں نے اختر آپا کو دیکھا۔ آج سے چار سال پہلے کا دیکھا ہوا چہرہ اب بھی وہی تھا۔ لیکن ان کے اندر کی سوچیں اس پر اپنا عکس ڈالے ہوئے تھیں۔ زندگی ہمیشہ ہموار نہیں رہتی۔ زندگی ہماری ہمتوں سے اپنا خراج وصول کرتی رہتی ہے۔ اور ہم مفتوح انسانوں کی مانند اس کی بے رحمیوں کے آگے جھک جاتے ہیں۔ ہمیں جھکنا پڑتا ہے۔ اختر آپا کے میاں یعنی احسن بھائی کی موٹر کا حادثہ جس میں ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اور پھر مشکلوں کے نو۔ دس ماہ۔ لیکن پھر بھی اختر آپا مسکرانا جانتی ہیں۔ دوسروں سے محبت کرنا جانتی ہیں۔ ان تین دنوں میں مجھے ان کا یہی روپ نظر آیا۔ ہاں قسمت کی گھناؤنیوں پر قہقہہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنے اندر بڑی تقویت محسوس کی۔

"یہ بھی تو اچھے نصیبوں کی بات ہے کہ آپ کی دوست اتنی اچھی ہیں۔" میں نے ان کے ڈرائنگ روم میں آپی کو اکیلے پا کر کہا۔

"ہاں میں دوستوں کے معاملے میں ہمیشہ خوش قسمت رہی ہوں۔ میں تم کو بھی ایسے ہی تو یہاں نہیں لائی تھی۔ بھلا اختر کے ہوتے ہوئے ہم گورنمنٹ ہوسٹل کیوں رہتے۔" آپی کے چہرے پر اختر آپا پر فخر کی روشنی سی چھا گئی۔ کیا میرے چہرے پر بھی کبھی ایسی روشنی چھا سکے گی۔ ..... عمر گزر گئی۔ کیا پتہ کتنی راہ باقی ہے۔ میں سوچوں میں کھو گئی اور جب اختر آپا نے پیار سے کہا "عنبر آؤ چائے پی لو" تو میرے اندر زمانوں پہلے کی لڑکی بیدار ہو گئی۔ جس کو گھر کے ہر کونے سے آواز آیا کرتی تھی۔ عنبر یہ کرو ــــ عنبر وہ کرو ــــ یہ لاؤ ــــ وہ لاؤ ــــ اختر آپا کی آواز میں ممتا تھی اور پھر میں اپنی امی جان کی یاد کی کو سہارنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ چپ چاپ چائے پینے لگی۔ محبت کا ایک بول کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اور ہم سب پاکستانی ادیب وہاں اسلام آباد میں اسی وسیع محبت کا مفہوم واضح کرنے کے لئے ہی تو اکٹھے ہو رہے تھے ــــ ہم سب جو ایک ہی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں رضیہ فصیح احمد صاحبہ گورنمنٹ ہوسٹل میں تھیں۔ فون پر معلوم ہوا کہ ابھی تک ان کے علاوہ اور کوئی خاتون ادیب نہیں آئیں۔ "کیوں جمیلہ رضیہ کو بھی یہاں نہ لے آئیں۔ وہاں اکیلی کیا کرے گی۔" اختر آپا فکرمند سی ہو کر بولیں۔ "ہاں ــــ ہاں کیوں نہیں ــــ رات کو خوب گپ شپ رہے گی۔ وہ مشترکہ طور پر رضیہ بہن کے لئے فکرمند ہو رہی تھیں۔

جب ہم اختر آپا کی موٹر میں لد کر ہوسٹل کی طرف روانہ ہوئے تو سڑکوں کی سرمئی طوالت۔ سبزے کی نرماہٹ، پھولوں کے رنگ اور اوپر آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے پہاڑوں کی بلندی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کسی خیالی بستی میں جادو کے زور سے چلی آئی ہوں۔ کیا میں نے آج تک اسلام آباد کو پوری طرح نہ دیکھ کر اپنے احساسِ جمال پر ظلم نہیں کیا۔ میں سوچ رہی تھی۔ میں اپنے چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھی۔ او خدا ــــ اوہ خدا۔ مجھے خدا پر ایک دم ڈھیروں پیار آ گیا۔ اگر خدا میرے پاس بیٹھا ہوتا تو میں اس کے ہاتھ چوم لیتی۔ لیکن شاید

خدا کو یہ بات پسند نہیں، ماسی لئے تو وہ بلندی پر رہتا
ہے۔ لیکن میرے تصور کو تو نہیں روک سکتا تھا۔

گورنمنٹ ہوسٹل کے دروازے سے اندر
داخل ہو کر میں ایک بار پھر خوش ہوا تھی۔
سرو کے ایستادہ درختوں کے ـــــ
پر چاند کا پورا چہرہ جھانک رہا تھا۔ نیچے تالابوں کی
گہری فیروزی سطح اگرچہ بے آب تھی لیکن لگتا تھا کہ
جیسے ان درختوں کے گرد بنی ہوئی مرمری چوکیوں پر
ابھی خوش رو شہزادے اور حسین شہزادیاں آہستہ خرامی
سے چہل قدمی کرتے ہوئے آکر بیٹھ جائیں گے اور پھر
دف بجاتی ہوئی نرتکیاں بے آواز قدموں سے رقص
کرنے لگیں گی۔ شاید انسانوں کو خریدنے کے لئے فسوں
کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید یہ اس جگہ کا فسوں تھا کہ
بعض لوگوں نے شہزادے اور شہزادیاں نہ ہو کر ان کی
طرح برتاؤ کیا۔

رضیہ بہن کی شدید خواہش تھی کہ وہ ان مرمری کی
چوکیوں پر بیٹھیں۔ یقیناً ان کے اندر بھی وہی شہزادیوں
والا احساس پیدا ہو رہا ہو۔ خدا کرے انہوں نے اس
خواہش کو پورا کر لیا ہو۔ میرے وہاں ہونے تک تو وہ
وقت کی کمی کی وجہ سے پورا نہیں کر سکی تھیں۔

جب ان کا بڑا سا سفری بیگ پکڑے ہم نیچے
اُترے تو ایک بار اکٹھا ہونے کے خیال سے خوش تھے۔
اور میں ان تین سینئر ادیبوں کے بیچ جونیئر ہونے
کے باوجود دل میں خوش تھی۔

ہم یہاں اسلام آباد کی خوبصورت فضا میں اس
لئے اکٹھے ہو رہے تھے کہ ایک دوسرے سے مل بیٹھیں۔
زندگی کی مصروفیات اور حائل فاصلوں کو عبور کرتے
ایک دوسرے کو سمجھیں۔ کیا ہجوم میں انسانوں کو سمجھا جا
سکتا ہے۔ کیا ادب کوئی مشترکہ احساس ہے جو سب
ایک دوسرے کے ساتھ بانٹ سکتے ہیں۔ ادیب جو پارے
کی طرح بے چین اور مقناطیس کی مانند حالات کو اپنی
طرح کھینچتا ہے ایک اجتماعی پلیٹ فارم پر ایک دوسرے
کے بارے میں اور ادب کے بارے میں اپنے خیالات کھل
کر بیان کر سکتا ہے۔ یہ مقصد بہت خوش کن اور دلپذیر
ہے۔ میں کیمبری کلم کمیٹی کے ہوسٹل کے ویٹنگ روم میں
بیٹھی سوچ رہی تھی۔ جہاں میں، رضیہ فصیح احمد، اختر جمال
اور جمیلہ ہاشمی دوسرے لوگوں سے ملنے آئے تھے۔ ادیب
برادری میں ہونے کا تصور ہی دوری کی خلیج کو پاٹ
دیتا ہے۔ وہاں ظفر الحسن اور نصر اللہ خاں صاحب
صہبا صاحب کو تختۂ مشق بنائے کمرے کی فضا کو
گہری سنجیدگی سے باہر کھینچ لائے اور پھر خوشگوار باتوں کی
پھوار سے ایک دوسرے کو تر بتر کرنے لگے۔ میں تو
عمر اور بالوں کی سفیدی کو سنجیدگی کی علامت سمجھے
ہوئے تھی۔ لیکن اس روز پہلی بار احساس ہوا کہ یہ دونوں
باتیں خوشگوار اور ہلکے پھلکے مزاج میں کسی طور حائل
نہیں ہوتیں۔ زندگی کرنے کا قرینہ چاہیئے۔ ہر عمر میں
قہقہہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور میں جو اپنے آپ کو عمر کے
سنجیدہ دور میں پلتے ہوئے بچپنے کو بہت پیچھے چھوڑ
آئی تھی سب کے ساتھ مل کر ان کی باتوں سے خوش
ہو کر قہقہے لگا رہی تھی۔۔۔۔۔ میں یہاں آکر خوش
تھی۔ بہت خوش۔

جب ہم واپس جانے کے لئے باہر نکلے تو دور
اسلام آباد کی روشنیاں اپنی آنکھیں جھپک رہی تھیں۔
خاموشی اور گمبھیرتا۔۔۔۔ یقیناً خدا بھی آسمانوں پر
بیٹھا اپنی تخلیق پر خوش ہوگا۔ اپریل کی نم نم ہوا میرے
بالوں کو اڑا رہی تھی۔۔۔ میرے پلو کو اڑا رہی تھی
میں سیڑھیوں پر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ اور نہ
جانے کیوں میرا دل چاہا کہ اس وسیع خاموشی اور
خوبصورتی کو خراج پیش کرنے کے لئے رو دوں۔۔۔۔
نہ جانے کیوں۔

گیارہ اپریل کی صبح اختر آپا کی ڈائننگ ٹیبل کے
گرد بیٹھے ہوئے باتیں مختلف دھاروں میں بہہ رہی تھیں
سیاست کی باتیں۔۔۔۔۔ ادب کی باتیں۔۔۔۔ مشترکہ
دوستوں کی باتیں۔۔۔۔ غلط فہمیاں جو دور ہونی چاہئیں
غلط فہمیاں جو بیج کا روپ دھار گئیں۔ میں پھر ایک بار
جونیئر تھی۔ جو برابری کی سطح پر ان باتوں میں حصہ نہیں
بٹا سکتی تھی۔ کیونکہ میری کوئی مشترکہ یادوں سے وابستہ نہیں
تھی۔ میں ان سے جونیئر جو تھی۔۔۔ کیا ایسے اجتماعات
ہونے چاہئیں اور۔۔۔ اور ان کا فائدہ کیا ہے۔۔
کیا ادب انسانی محرومیوں کا حل تلاش کر سکتا ہے۔۔۔
ہاں انسانی محرومیوں کا حل تلاش کر سکتا ہے۔ لیکن ایک
ادیب اور ایک مصلح میں بہت فرق ہے۔۔۔ ادیب
انسانی رشتوں کے ٹوٹنے کا ماتم تو کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی
عملی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ کیونکہ انسانی رشتوں کی اساس
صرف خوش آئند خیالات اور الفاظ پر نہیں ہوتی اس
کے لئے روحانی اور مادی دونوں اسباب کی ضرورت
ہوتی ہے۔ جو ادیب کے اختیار میں نہیں۔ ادیب تو صرف
ملہم ہے۔ منزل نہیں۔۔۔

تو کیا مجھ پر بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ میں سوچ رہی
تھی۔۔۔۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ صرف انسانوں سے محبت

کر سکتی ہوں۔ ان کی محرومیوں پر رنجیدہ ہو سکتی ہوں ان کو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کر سکتی ہوں۔ لیکن کوئی عملی حل نہیں دے سکتی۔ میرا دل جو ہر مصیبت پر دکھ جاتا ہے۔ لیکن کیا مجھے اس بات پر شکر گزار ہونا چاہیئے۔ میں اُلجھ رہی تھی۔ شاید آنے والا وقت میری کوئی خاص راہ متعین کر دے... خاطر غزنوی نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ۔

"ادیب کسی معاشرے کا ایک اہم اور فعّال فرد ہوتا ہے اور اپنے قلم سے معاشرے کی منفی قدروں کا قلع قمع کرتا ہے اور مثبت قدروں کے فروغ کے لئے کوشاں رہتا ہے اس کا قلم معاشرے قوم اور اس کے اپنے وطن کی مقدس امانت ہوتا ہے۔"

کیا صرف الفاظ ہی قدروں کی حفاظت اور فروغ کے ضامن ہیں۔ لیکن اس کے لئے ایک ایسا معاشرہ چاہیئے۔ جس میں انصاف کو اوّلیت دی جائے۔ اور انصاف کا ترازو ادیب کے ہاتھ میں نہیں۔ اس کو پکڑنے والے ہاتھ ادیب نہیں ہوتے۔ ادیب تو مملکت کے ذہن کا لاشعور ہوتا ہے۔ جو موجود ہو کر بھی نظر نہیں آتا... ہاں میں ایک انسان ہونے کے ناطے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی کوشش کروں گی۔ ایسے بازی گر کی مانند جو زمین سے بلندی پر تنے رسے پر لمبے بانس کی مدد سے اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے بھی سچائی اور ایمانداری کا بانس پکڑے، زندگی کے اس رسے پر بازی گر کی طرح ہی ڈگمگاتے ہوئے چلنا اور پار اترنا ہے لوگ صرف میرے منتظر نہیں۔ ان کی اپنی دوستیاں اور دشمنیاں ہیں۔ ان کے اپنے نظریں اور رواتیں ہیں وہ اس لئے پڑھتے ہیں۔ کہ وہ اپنے جذبات کی تسکین چاہتے ہیں۔ چاہئے وہ کیسے بھی ہوں...... ہاں مجھے ایک کھرے سے انسان کی مانند ساری سچائیوں اور بلند قدروں پر یقین کرنا ہے۔ لیکن کھرا بننا کتنا مشکل ہے۔ انسان کی اپنی وابستگیاں ہیں، سیاسی۔ معاشرتی۔ معاشی۔ خاندانی اور اخلاقی... اور میں بھی انہیں بندھنوں میں بندھی ہوئی ہوں۔

میں نے قومی ادبی مذاکرے کی افتتاحی تقریب میں اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی ہے۔ اجنبی چہرے..... شنا سا چہرے.... بزرگ چہرے... خوبصورت چہرے اپنے اندر کی دنیاؤں کی بھول بھلیوں میں بھٹکے ہوئے چہرے آپی کسی کی تلاش میں تھیں..... انہیں ایسے لگ رہا ہے کہ جیسے لاہور سے کوئی بھی نہیں آیا۔ میں پوچھنا چاہتی تھی۔ "آپی کیا میں بھی نہیں آئی۔" لیکن میں نہیں پوچھتی۔ کیا کوئی شخصیت پورا لاہور ہو سکتی ہے۔ کمال ہے بھئی۔ کمال ہے آپی لاہور سے آئے ہوئے لوگوں کے چہرے ہی نہیں پہچانتیں.... کہ وہ سامنے کی قطاروں میں جہاں "اساسی ممبرز کا سیاہ لفظوں والا سفید بورڈ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہے ان قطاروں میں کتنے بزرگ اور کہنہ مشق ادیب بیٹھے ہیں۔ جو یقیناً لاہور میں رہتے ہیں۔ میں نے آپی کی توجہ ان کی طرف مبذول کروانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آپی سنجیدہ ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ وہ اتنی سنجیدہ نہ بنیں۔ باہر اسلام آباد کی پہاڑیوں کی خوبصورتی ہے...... اور وہاں پر دُھلا ہوا سبزہ اور ہوا کی نم آلود نرمی ہے.... میرا جی چاہتا ہے۔ بس اپنے بازو پھیلائے سڑکوں پر بھاگتی جاؤں۔

شام چھ بجے ادبی مذاکرے کی پہلی نشست ہے میرا دل دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح اندر جانے کو نہیں چاہتا۔ سنجیدہ باتیں۔ کیا یہ خوبصورت ماحول مذاکرے کی نظر ہو جائے گا.... لاہور کی اپنی خوبصورتی ہے.... لیکن....

"میرا دل تو خوب پھرنے کو چاہتا ہے۔" میں نے یونہی بے خیالی میں اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی ادا آپا کے کان میں سرگوشی کی.... "ارے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا..... وہ گڑیا جیسی خاتون پریشان ہو کر بولیں۔ ایسا کرتے ہیں...... چُپکے سے ہم سب یعنی پانچوں خواتین یہاں سے کھسک جاتے ہیں۔" "مضامین کی کاپیاں تو ہمارے پاس ہیں ہی پھر کبھی پڑھ لیں گے"... "اور نہ بھی پڑھیں گے تو کیا ہے.... ہم پہلے سے ہی بڑے باخبر ہیں...." میں خوش ہو کر بولی۔ "شاید میری گاڑی آگئی ہو... چلیں دیکھ آتے ہیں" ادا آپا اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہم دونوں چُپکے سے اُٹھیں.... بہت سی سیٹیں خالی تھیں۔ نہ آنے والے لوگ عقلمند تھے.... میں نے سوچا اور باہر آگئیں.... سامنے ہی منیر نیازی صاحب مسیح الدین احمد صدیقی کے پاس کھڑے تھے۔ صدیقی صاحب جلدی سے دیوار سے جہاں وہ کاغذ پھیلائے فکرمندی سے معروف تھے۔ ہماری طرف آئے.... "صدیقی صاحب کتنا اچھا ہو کہ آپ اسلام آباد میں تمام ادیبوں کو گھومنے پھرنے کے لئے چھوڑ دیں۔ میں نے سامنے فیروزی ٹائلوں والے تالاب کو دیکھا جہاں پانی کے فوارے ہولے ہولے چل رہے تھے اور تاحدِ نظر پہاڑیوں کا سبزہ کسی عظیم مصور کے

شاہکار کی طرح آویزاں تھا..... واقعی .....
منیر نیازی صاحب بولے .....صدیقی صاحب
مسکرا کر خاموش ہو گئے..... یقیناً ان کے انتظام
میں ادیبوں کو اتنی کھلی چھٹی دینے کا کہیں ذکر نہیں
تھا.... میں اور ادا آپا مایوس باہر کھڑے تھے
....گاڑی ابھی تک نہیں آئی تھی ۔..." ارے پھر
اندر جانا پڑے گا"... میں رہی تھی.... اور ادا آپا
پھر پریشان اور پشیمان ہو رہی تھیں .... تب
مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا.... میں
نے اس حسّاس شاعرہ کو پریشان کر دیا تھا...
اور وہ جو پہاڑ کے اوپر ہیں "دامن کوہ" دکھانا
چاہتی تھیں التوا میں پڑ رہا تھا... ادا آپا کے
چہرے پر دوسرے دن تک وہی معصوم سی
پشیمانی رہی۔ یہاں تک کہ ہم رات پڑے سنسان
سڑکوں کو عبور کرتے ہوئے 'دامن کوہ' میں نہ پہنچ گئے۔

اسلام آباد ہوٹل میں رات کے کھانے کے
لئے لوگ جمع تھے۔ بڑے سے ہال میں روشنیاں
چھت سے منعکس ہو رہی تھیں ۔ دیواروں پر
چسپاں رنگین کاغذ چمک رہا تھا... لوگ آپس
میں باتیں کر رہے تھے.... بعض اوقات
عورت ہونا بھی کتنا گھاٹے کا سودا ہے میں
اُن لوگوں کے درمیان تھی... جن سے ادیب
ہونے کے ناطے میرا ذہنی رشتہ تھا.... لیکن
میں پھر بھی اُن کو نہیں جانتی تھی.... کیا کوئی ایسا
انتظام نہیں ہو سکتا کہ ہم سب جو پاکستان کے
مختلف کونوں سے یہاں ایک دوسرے کو ملنے کے
لئے جمع ہوتے ہیں، حقیقی معنوں میں مل سکیں؟

ماونو

میں نے مایوسی سے سوچا اور چپ بیٹھی لوگوں کو
باتیں کرتے دیکھتی رہی ..... مرد لوگ ایک دوسرے
بغل گیر ہو رہے تھے .... باتیں کر رہے تھے۔
باتیں جو ادب سے متعلق ہوں گی ۔ جو ایک
دوسرے کی صحت سے متعلق ہوں گی .... مسکراہٹیں
.... قہقہے.... خاموش چہرے ۔ سب لوگ مجھے
نہیں پہچانتے .... میں ان کو نہیں پہچانتی ....
بہت سے ناموں کے چہرے نہیں تھے۔ اور
بہت سے چہروں کے نام نہیں تھے.... لیکن پھر
بھی اندر ایک طمانیت سی تھی .... میں بھی اُن
لوگوں کے درمیان موجود تو تھی ..... اسلام آباد
کی صحافی لڑکیاں خاموش بیٹھی لوگوں کا جائزہ لے
رہی تھیں ۔ پتہ نہیں صحافی ہونا کیسا لگتا ہے۔
میں اپنی خاموشی کو توڑنا چاہتی تھی، لیکن مجھ میں
اتنا حوصلہ نہیں ہوا کہ میں لوگوں سے خود بڑھ
کر ملوں.... باقی لوگ بھی اس بات کو محسوس
کر رہے ہوں .... ہاں ۔ ادیبوں کا حسّاس طبقہ
اس دوری کو جو ایک جگہ اکٹھے ہو کر بھی ہمارے
درمیان تھی دور نہیں کر سکا تھا.... فاصلے پر
ایک سفید ریش بزرگ کھڑے تھے.... میں نے
زیتون بانو سے ان کے بارے میں پوچھا...
لیکن وہ بھی نہیں جانتی تھیں.... اور بھی
چہرے ... جو اپنی شناخت رکھنے کے باوجود
میرے ذہن سے دور رہے .... لوگ گروپوں
میں بٹے ہوئے باتیں کر رہے تھے .... انسان
اور اُس کا تنگ دائرہ .... ہم اپنی شناخت
کھونا نہیں چاہتے.... پھر مسیح الدین صدیقی نے

بڑے بڑے لفافے بانٹنے شروع کئے اور اُن
کی یہ بانٹ جلد ہی ختم ہو گئی.... میں نے اپنا
کا لفافہ کھول کر دیکھا۔ صدر صاحب کی طرف
سے چائے کا دعوت نامہ تھا..... میرا دل
بوجھل ہو گیا.... اسلام آباد بُلا کر بھی انہوں نے
سب کو ایک جیسا نہ جانا ... یا شاید یہ بھی
کفایت شعاری کا ایک انداز تھا.... جب
آپی اور اختر آپا راولپنڈی روانہ ہوئیں تو میں
نے اختر آپا کی بیٹی تزئین کو ساتھ لیا اور سپر مارکیٹ
جا کر کفایت شعاری کے جذبے کی خوب دھجیاں
اُڑائیں ــــ مجھے بھی خوش ہونے کا حق تھا...
وہ اس اجنبی شہر میں مجھے اکیلا چھوڑ گئیں
تھیں ـــ

اوپن اقبال یونیورسٹی کی طرف سے رات
کے کھانے پر اُسی ہال میں بیٹھے۔ ویسے ہی
حالات سے دوچار ہوتے، میں نے اپنے
ساتھ بیٹھی ایک خوبصورت خاتون کی طرف
بڑی محبت سے دیکھا ــ وہ تھیں ہمارے
میزبانوں میں سے ایک میزبان..
اقبال یونیورسٹی
کی رجسٹرار مظفری صاحبہ میزبان کے طور پر ہمارے
پاس آ بیٹھیں.... اور پھر موضوع خود بخود بدل
گیا.... پاکستان کی پہلی جغرافیہ دان خاتون سے
مل کر میں بہت متاثر ہوئی .... سادگی اور اپنائیت
ہم ان سے سوال کئے جا رہی تھیں اور وہ اپنی
پلیٹ میں چمچ رکھے جواب دے رہی تھیں...
"آپ کھانا تو کھائیے۔

ہلکے قہوے کے گھونٹ پیتے میں نے ایک بار
پھر اپنے چاروں طرف دیکھا .... لوگوں کے اور
میرے درمیان اب بھی پہلے جیسی اجنبیت
حائل تھی .... اور مذاکرے کی آخری نشست
بھی ختم ہو چکی تھی .... لوگ پرندوں کی طرح اپنے
اپنے گھونسلوں کی طرف پرواز کرنے کے لئے
پر تول رہے تھے .... الوداع میرے ساتھیو
.... شاید میں کسی دوسرے وقت اتنی ہمت
کر سکوں کہ آگے بڑھ کر تم کو جان سکوں .... ہمیں
خوشگوار یادیں لئے اپنے اپنے مسکن کی طرف
لوٹنا ہے ۔ لوگ خوش ہیں .... الوداعی الفاظ
بولے جا رہے ہیں ــــ صدر ضیاء الحق صاحب
نے کہا کہ جو ادیب پاکستانی نہیں ہیں اُن پر اس
وطن کی چاندنی ۔ ہوا اور پانی حرام ہے ....!
ہماری ذمہ داریاں ہیں .... ہمیں پاکستانی ہونے
کے ناطے اُن ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے ۔
ہمیں اس سرزمین کی ہر چیز کے اہل بننا ہے
یہ زمین جو ہماری شناخت ہے ۔

آپ اوپر جا کر اپنی پیمنٹ لے لیں ۔ مسیح الدین احمد
صدیقی نے ہمارے پاس آ کر ہولے سے کہا ....
میں نے ہال میں روشنیوں کو دیکھا .... دیواروں
پر چپکے کاغذوں کو دیکھا .... لوگوں کی طرف ایک
نظر ڈالی اور دوسروں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتی
اوپر ہال میں آ گئی .... کاؤنٹر پر کھڑے
کلرک نے ہماری رہنمائی کی .... کاؤنٹر کی دیوار
کے پیچھے کمرے میں بہت سے ادیب جمع تھے ۔ ایک
میز کے گرد جمگھٹا تھا .... میں اور آپی دروازے
میں ہی حیران کھڑے ہو گئے .... امجد اسلام امجد
پسینہ پسینہ جمگھٹے سے باہر نکل رہے تھے ....
کمال ہے بھئی .... ایسا لگتا ہے جیسے ادیبوں کو
آنے جانے کا کرایہ نہیں دیا جا رہا بلکہ بچوں میں ریوڑیاں
بٹ رہی ہیں ....! کیوں کیا ہوا؟ .... میں اور
آپی گھبرا کر باہر نکل آئیں .... ہم اس ہجوم میں کیسے
گھس سکتے تھے ۔ ہم کمرے سے باہر آ گئے ....
اتنے اچھے انتظام کا ایسا ہلکا پھلکا انجام .....
مسیح الدین احمد صدیقی آخر کو انسان ہیں ۔ ذمہ داریوں
کے بوجھ سے لدے ہوئے .... لیکن جب وہ
اچانک اُوپر آتے ہوئے نظر آئے تو میں ایک
بار پھر اُن تک پہنچی .... کیا آپ ادیبوں کو کرایہ
دینے کا اور کوئی بہتر انتظام نہیں کر سکتے تھے ۔
آپ اُن کو روپے لفافوں میں بند کر کے اوپر
ان کے نام لکھ کر دے سکتے تھے .... اس طرح
روپے وصول کرنا دوسروں کی انا مجروح کرنے
کے مترادف ہے .... ایک دم سرخ ہو گئے ....
دیکھئے ادیب حضرات کو اپنے اندر کچھ
ڈسپلن پیدا کرنا چاہیئے .... میں ہی تو ہر چیز کا
ذمہ دار نہیں ۔ یہ سارے لوگ باشعور ہیں ....!
وہ لہجے کو دبا کر بولے ....

شاید میں نے بات کہنے میں جلدی کی تھی
یقیناً یہاں آئے سارے لوگ باشعور ہیں پھر
میں جلدی سے پلٹ آئی .... غلطی میں ہم بھی
تو شریک ہیں ۔ ہم اُوپر آ کر اپنی باری کے انتظار
میں بیٹھ گئے .... لیکن ادا آپا کو یاد تھا کہ ہمیں
اسلام آباد کی پہاڑی پہ دامنِ کوہ جانا ہے ....

رات دبے پاؤں اسلام آباد ہوٹل کی
جگمگاہٹوں کے جلو میں اُتر آئی تھی .... رات
جو خنک اور خوشگوار تھی .... جو اسلام آباد کے
ہوٹل کے بڑے بڑے شیشوں کے پار ہماری
منتظر تھی .... ہمارا سواگت کر رہی تھی ۔

یہ روپے صبح بھی تو لئے جا سکتے ہیں ۔ کسی
نے پوچھا مسیح الدین احمد صدیقی نے اثبات
میں سر ہلایا .... ہم سب باہر آ گئے .... دور
پہاڑیوں کے اوپر سیاہی کی چادر تنی ہوئی تھی
لیکن ہمارے سروں پر تنا آسمان روشن تھا ۔
چاند نیون سائن کے ساتھ ساتھ بہت اوپر
روشن تھا .... خدا تو ازل سے روشنیوں سے
پیار کرتا ہے .... انسانوں نے بہت بعد
میں سیکھا ہے ۔ خدا سب روشن باتوں سے
پیار کرتا ہے ۔ اور سب سے پیار کرتا ہے
اور سب سے زیادہ انسان کے اندر کی روشنی
میں میں نے "دامنِ کوہ" میں کھڑے ہو کر تاحدِ نظر
نیچے پھیلی ہوئی روشنیوں کو دیکھا .... دیپ ملا
.... دُور تک روشنیاں ہی روشنیاں تھیں ....
ہم سب جو یہاں پہنچے تھے مسحور اور دم بخود
تھے .... اتنی خوبصورتی کو دیکھ کر پوری طمانیت سے
مرا جا سکتا ہے .... ادا آپا نے اپنی چہکتی ہوئی
آواز میں کہا تھا ۔ نہیں .... یہ روشنیاں تو زندگی
سے محبت کرنا سکھاتی ہیں ....! میں نے دل میں
سوچا .... پھر سب لوگ آپس میں باتیں کرنے
لگے ہلکی پھلکی باتیں .... مزے دار باتیں ....
ادا آپا لوگوں کو اگلے روز کے لئے اپنے ہاں رات

کے کھانے پر بُلا رہی تھیں ..... لیکن کئی لوگ مری کی سیر کرنا چاہتے تھے .... بھئی میں تو جا نہ سکوں گی۔ مجھے تو بہت سے کام کرنا ہیں میں نے لوگوں کو جانے سے روک رکھا ہے ... "کیا تم بھی رُک رہی ہو؟" وہ میری طرف دیکھ کر بولیں ... نہیں .... میں صبح ساڑھے دس بجے کے جہاز سے جا رہی ہوں .... بہت مشکل سے ٹکٹ ملا ہے۔ میں دل میں ٹکٹ ملنے پر پچھتا رہی تھی .... میرے پاس رُکنے کا کوئی بہانہ نہیں تھا ... ایسی صحبتیں .... نہ جانے کب نصیب ہوں

"ارے تو میں تمہیں روکنے میں ناکام رہی ..." ادا آپا پیار سے مسکرا کر بولیں .... ہم سب اسلام آباد کی روشنیوں کو دیکھتے جا رہے تھے .... روشنیاں اندھیرا ..... روشنیاں جو اندھیرے کو جنم دیتی ہیں .... اندھیرے، جو روشنیوں کی شکل کہتے ہیں فطرت کے دو واضح اشارے .... لیکن نہیں حیات میں اور بھی کچھ ہے ... لیکن اس سب کچھ کو پانے کے لئے انسان کو اپنی سطح سے بلند اُٹھنا پڑتا ہے۔ دامنِ کوہ میں رات روشنیوں کی پائل پہنے ناچ رہی ہے۔ اُسے ناچنا چاہیئے .... ہمیں لُبھانا چاہیئے ... ہم اُس کے مہمان ہیں .... رات وقت کے باجبروت حکم سے خود ناچتی جا رہی ہے۔ مجھے واپس جاتے ہوئے بھی اُس کی پائل کی جھنکار سُنائی دے رہی ہے۔ یہ جھنکار — میری یادوں کے ایوان میں اکثر گونجا کرے گی — اور پھر سب طرف روشنیاں ہی روشنیاں جَل اٹھا کریں گی ....

تیرہ اپریل کی صبح اسلام آباد کے شہر نے مجھے الوداع کیا .... اکیڈمی آف لیٹرز کے دفتر میں آکر میں نے جلدی جلدی تین فارموں پر اپنے دستخط کئے۔ اسلام آباد ائیرپورٹ پر پہنچنے کے لئے ہمیں بڑا لمبا راستہ طے کرنا ہے .... رضیہ فصیح احمد اور آپی وہیں رُک گئیں ہیں۔ انہیں بھی فارموں پر دستخط کرنے ہیں صرف اختر آپا ائیرپورٹ تک میرے ساتھ ہیں .... انہوں نے پیار سے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے .... "تمہیں مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی .... اچھا ہوا تم آگئیں۔ تم اگر جمیلہ ہاشمی کی چھوٹی بہن ہو تو میری بھی تو ہو ..." انہیں ہندوستان میں اپنی چھوٹی بہن بے طرح یاد آ رہی ہیں — دوریاں اور فاصلے .... لیکن یہ ہمارے دل کے اُبھرتا محبت کا اتھاہ سمندر ... پھر کیا ہے فاصلے خون کے رشتوں کو کمزور نہیں کر سکتے ... لیکن یہ اپنے اندر کی بات ہے .... محبتیں بھی انسانی فطرت کے تابع ہیں۔

میں نے ائیرپورٹ کے شیشے کے دروازے پر ہجوم میں گھُستے ہوئے اختر آپا کو خدا حافظ کہا ہے وہ اندر نہیں جا سکتیں ..... میں پہلی بار بالکل اکیلی کھڑی ہوں ..... اسلام آباد پیچھے رہ گیا ہے — سب لوگ جو پچھلے تین دنوں سے میرے ساتھ تھے پیچھے رہ گئے ہیں ...... میں ویٹنگ روم میں اکیلی بیٹھ گئی ہوں ...... مجھے اپنا آپ اس گم شدہ بچے کی مانند لگ رہا ہے جو پہلی بار بڑوں کی حفاظت کے حصار سے نکلا ہو۔ لیکن پھر بھی میں اکیلی نہیں .... خوشگوار یادیں، ننھی ننھی پریوں کی مانند میرے وجود کے چاروں طرف پھڑپھڑا رہی ہیں۔ میں مسکرا رہی ہوں مجھے مسکرانا ہی چاہیئے ...... اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے دیئے گئے چھوٹے سے سیاہ بریف کیس میں وہ ساری عقل کی باتیں بند ہیں۔ جنہیں میں نے گھر جا کر غور سے پڑھنا ہے۔ اور میرے دل کے اندر لوگوں کی مہربانیوں کا اجالا ہے ..... میرے چھوٹے سے جہاز کے پروں تلے وہ دھرتی ہے۔ جس پر ہم سب بستے ہیں۔ جو ہماری شناخت ہے .....

میں نے اسلام آباد سے آتے ہوئے اپنا سر فوکر کی ننھی سی کھڑکی کے ساتھ ٹکا دیا ہے۔ لوگ خاموش بیٹھے ہیں۔ فوکر کے انجن کی تیز آواز۔ اخبار کے پلٹتے ہوئے ورقوں کی آواز۔ ائیر ہوسٹس کی مسکراہٹ کی آواز اور تنگ سیٹوں میں لوگوں کی کسمساہٹ کی آواز کے ساتھ مل کر دبے قدموں میرے ذہن میں اتر رہی ہے لیکن پھر بھی مجھے سنائی نہیں دیتی۔ کیونکہ میں تین سو فٹ نیچے پھیلی اپنی دھرتی کے نقش و نگار دیکھ رہی ہوں۔ دھرتی جو آہستہ روی سے اوجھل ہو رہی ہے۔ لیکن میں نے اپنی نظریں شیشے سے اوجھل ہوتی دھرتی کو ڈھونڈنے کے لئے ڈالی ہیں۔

زمین کے ایک دوسرے کے ساتھ لگے اینٹوں کی مانند کے ٹکڑے سبز اور خاکستری، ندی مائل اور بنجر، پگڈنڈیاں جن پر نہ جانے کن قدموں نے نشان بنائے ہیں۔ ایسے لوگ جن کو میں نہیں جانتی۔ لیکن پھر بھی ایک ہی ناطے سے اس دھرتی پر بستے ہیں یہ سب۔ ایک وحدت میں پروئے ہوئے اس دھرتی سے اُبھرے ہیں — اور میں جو خدا اور قدرت کی طاقت و جبروت سے خوفزدہ ہو رہی ہوں۔ پچھلے گزرے تین خوشگوار دنوں کی یاد میں کھو گئی ہوں

محشر بدایونی

ایک رسن خوردہ سی دیوار ہے باہر میرے
کون جانے جو نیا شہر ہے اندر میرے

کوئی موسم ہو مری چھب مرا رنگ اپنا ہے
میری یہ وضع کہ بے وضع ہیں منظر میرے

میرے ہی رُخ کا عرق جوہرِ گلہائے ہنر
زرگری کام مرا ۔ زخم مقدر میرے

اب کے بھی چشمِ نمو جاگی تو کیا فرق پڑا
وہی صورت کہ ثمر آوروں کے پتھر میرے

تجربہ کر لے مرے شہر کی سرحد پہ غنیم
لوح میدان مرا ۔ حرف ہیں لشکر میرے

آنے والوں سے کہو یوں نہ کریں شور بلند
کئی گھر اور بھی ہیں گھر کے برابر میرے

بھر گیا جی ۔ نئی لہر ابتو لہو میں چھلکے
کوئی لے تیز سی ۔ اے ذائقہ پرور میرے

شہرت بخاری

تمہیں تو عہد کا اپنے کچھ احترام نہیں
بہت دنوں سے کوئی نامہ و پیام نہیں

عجیب مرحلے درپیش ہیں محبت کو
چراغِ صبح نہیں، تیرگیٔ شام نہیں

تم اپنے آپ سے شرمندہ ہو تو کیا کیجئے
مری جفا طلبی میں تو کچھ کلام نہیں

خفا ہو مجھ سے کہ میں اک غریب و بے کس ہوں
تمہارے چاہنے والوں میں کس کا نام نہیں

خرید سکتے ہو چاہو تو اک تبسم میں
یہ دل کہ نعمتِ کونین جس کے دام نہیں

سبھوں کی مرنے سوا تجھ تلک رسائی ہے
ترے سوا مرے لب پر کسی کا نام نہیں

یہ مال و دولتِ دنیا فریب ہے شہرت
سوائے عشق کسی چیز کو دوام نہیں

گلوں کے عہد پہ مت جا کہ استوار نہیں
علاجِ تنگیٔ داماں سوائے خار نہیں

نہ وشت باغ بنا ہے نہ ابر برسا ہے
تو پھر یہ کیا کہ پسِ کارواں غبار نہیں

کس اعتماد پہ اس دور میں گلہ ان سے
مجھے خود اپنی محبت پہ اعتبار نہیں

چمن میں آئے نہ آئے رضا پہ ہے اس کی
کسی کو موجِ صبا پر تو اختیار نہیں

اسیرِ پنجۂ غارت گرانِ خواب ہے وہ
علاوہ جس کے کوئی ضامنِ بہار نہیں

یہی تو موسمِ دیوانہ گر ہے دل والو!
ہزار حیف وہ دامن کہ تار تار نہیں

جو نالہ کش نہیں اس کو نہ دل کہا جائے
وہ آنکھ آنکھ نہیں ہے جو اشکبار نہیں

ہر ایک قدر کا معیار مختلف ہے آج
ذلیل و خوار ہے وہ جو ذلیل و خوار نہیں

کوئی لطیفہ کوئی چٹکلہ سنا شہرت
غزل نہ چھیڑ کہ ماحول سازگار نہیں
مئی ۱۹۶۹ء

شیر افضل جعفری

حدودِ کسوتِ وقت کا گھونگھٹ اُٹھائیں جہات کریں
فرازِ طور پہ سینے کو آج مات کریں

کچھ اس فروغ سے گائیں مرغِ عرب کی غزل
شبِ سیہ کو مدینے کی چاندرات کریں

گلاب پی کے جو سرمستِ کبریا ناچے
تو رقصِ حضرتِ جبریلؑ سات سات کریں

ولا میں ڈوب کے مولاؑ کی موج میں آکے
خمیں جلوس کو سادنت کی برات کریں

حسینیوں کو پلائیں گلاس بھر بھر کے
سخی چناب کو یوں غیرتِ فرات کریں

فقیر ہو کے تبسم کی بھیک لیں اُس سے
چمن میں جس سے مناجات پھول پات کریں

اذان و حمد و قنوت و قیام و سجدہ کو
ابوذرانہ اداؤں سے غمریات کریں

ہرے سروں میں الاپیں نمازِ پچھلی رات
سدا بہار دعاؤں کو غزلیات کریں

اکیلے گوشۂ مسجد میں بیٹھ کر افضلؔ
خدا کے کان میں چپکے سے دل کی بات کریں

ڈاکٹر اسلم فرخی

وہ ستم کیش کہاں دل کا خزانہ مانگے
جب بھی مانگے تو کوئی تازہ فسانہ مانگے

منزلیں دور بھی ہیں سخت بھی دشوار بھی ہیں
دل وہ بدخو کہ ہر اک گام بہانہ مانگے

ذوقِ گفتار سرِ وادیٔ ایمن سرگرم
شوقِ دیدار ترا آئینہ خانہ مانگے

اُس خود آرا سے کہاں عرضِ تمنّا ممکن
جو کبھی آئینہ ڈھونڈے کبھی شانہ مانگے

دلِ خوں گشتہ کوئی منزلِ آخر تو نہیں
جانے کیا کیا نہ ابھی اور زمانہ مانگے

جس کے انوار سے روشن ہوا ظلماتِ وجود
لمحہ لمحہ وہی دوری کا بہانہ مانگے

شمع خاموش، نگوں جام، فسردہ محفل
چشمِ ساقی سے کوئی کیفِ شبانہ مانگے

سادہ الفاظ میں ابہام سجا رکھتا ہے
وہ سخن ساز جو حیلہ نہ بہانہ مانگے

فاصلے اس نے بڑھا رکھے ہیں کیا کیا اسلمؔ
شوق ہر لمحہ جسے شانہ بشانہ مانگے

میں سوچتا ہوں کہیں تو خفا نہ ہو جائے
تری انا مری زنجیرِ پا نہ ہو جائے

یہ جیتی جاگتی آنکھیں یہ خواب سی دنیا
وفورِ شوق خود اپنی جزا نہ ہو جائے

قدم قدم پہ بپا جشنِ امتحانِ وفا
تری طرح کوئی درد آشنا نہ ہو جائے

نہ دیکھ مجھ کو محبت کی آنکھ سے اے دوست
مرا وجود مرا مدّعا نہ ہو جائے

میں جس کو ڈھونڈ رہا ہوں نشاطِ قربت میں
مرے خیال سے بھی ماورا نہ ہو جائے

زمیں کی گود سے سورج نکالنے والو
ستارۂ سحری رہنما نہ ہو جائے

اب اور تابکجا یہ حصارِ موسمِ درد
اب اس طرف بھی ورودِ صبا نہ ہو جائے

حریمِ جاں میں ہے ارزاں غبارِ تیرہ شبی
یہ اس دیار کی آب و ہوا نہ ہو جائے

غمِ فراق میں لذّت سہی مگر اسلمؔ
مری حیات مرا خوں بہا نہ ہو جائے

احسن علی خاں

صبر سے تو نے کڑا وقت گزارا احسن
درد و غم نے تری ہستی کو سنوارا احسن

تجھے گرداب کا کیا ڈر کہ جہاں تو ڈوبا
وہیں ابھرا ہے امیدوں کا کنارا احسن

دوستوں نے بھی جہاں تجھ کو نہیں پہچانا
اسی محفل میں چلا آج دوبارا احسن

بازگشت اپنی ہی سنتا رہا تنہائی میں
آج صحرا میں کسے تو نے پکارا احسن

تو اندھیروں میں چلا اور کہیں جا نکلا
کوئی تارا نہ بنا رہ کا اشارا احسن

یوں بھی پیارا تھا تجھے زیست کا اک اک لمحہ
کر دیا عشق نے کچھ اور بھی پیارا احسن

موت کے سامنے میں جینا ہو مبارک لیکن
موت سے ڈر کے نہ کر زیست گوارا احسن

زندگانی نہ گزرتی جو نہ ہوتی اختر[1]
تیری ساتھی، تری خوشیوں کا سہارا احسن

---

[1] میری شریکِ حیات، اختر جمال

جعفر شیرازی

گل تو جا پہنچے ہیں بکھرنے تک
تم نہیں آتے رُت گزرنے تک

دیکھنا اضطراب فُرقت کا
رات جب آئی صبح کرنے تک

اب کہاں اعتبار کی لذّت
بات تو تھی ترے مکرنے تک

کیسے عالم گزر گئے ہوں گے
پھول پر شاخ سے اترنے تک

ہم تو ایسے ہیں جس طرح جعفرؔ
کارواں سے گرد کے ابھرنے تک

اختر ہوشیارپوری

اک عمر کی ہوا سے شناسائی چھن گئی
ٹوٹی جو شاخ لمس کی دارائی چھن گئی

ساری تمازتوں کا بھرم دھوپ سے تھا
سورج جو بجھ گیا تو توانائی چھن گئی

بجھتے دیے کی لَو میں خود اپنا ہی پرتو تھا
شب کیا کٹی کہ انجمن آرائی چھن گئی

دنیا سمندروں کی تہوں میں اتر گئی
مجھ سے مرے خیال کی گہرائی چھن گئی

میں چپ رہا تو ایک زمانے سے تھا خطاب
جب لب کھلے تو طاقتِ گویائی چھن گئی

یوں گفتگو کے زاویے اس نے بدل دیے
سوچوں کا حسن فکر کی رعنائی چھن گئی

میں گزرے موسموں کے حوالے سے زندہ ہوں
ورنہ مرے تو چہرے کی زیبائی چھن گئی

خوابوں میں رتجگوں کی کڑی دھوپ جھیل کر
بیداریوں کی دولتِ یکتائی چھن گئی

دیدہ وروں پہ کور نگاہی کی مہر تھی
اختر میں دیکھتا تھا کہ بینائی چھن گئی

مئی ۱۹۷۹ء

قمر ہاشمی

خبر نہیں کہ وہ اک شخص کون ہے کیا ہے
جو میرے ذہن کو اکثر جھنجھوڑ جاتا ہے

ہزار چاہا کہ میں اس سے کھل کے بات کروں
زبان کیسے کھلے دل میں چور بیٹھا ہے

سکوت جھیل کا دیکھا گیا ان آنکھوں میں
ادھر ذرا سی خلش پر بھی شور برپا ہے

میانِ عشق و ہوس امتیاز کچھ نہ رہا
اب اعتبار ادائے وفا بھی رسوا ہے

یہ زندگی ہے کہ پت جھڑ کی اک اداس سی شام
بہار سے جو تعلق تھا یاد آتا ہے

مری نگاہ میں تم بھی جمالِ فردا ہو
مجھے تمہارا نہیں انتظارِ فردا ہے

یہ کیسی شمعِ وفا ہے یہ کیسی راہِ حیات
نہ آگ ہے نہ دھواں دھوپ ہے نہ سایہ ہے

ہم ان کے واسطے روتے رہے لہو برسوں
جدا ان سے قرنوں کا بھی رشتہ ہے

افضل منہاس

تہِ سراب نمی کو تلاش کرنے دے
وگرنہ پیاس کے دریا میں ڈوب مرنے دے

طلب کا ہاتھ بضد ہے مہک چرانے پر
میں کہہ رہا ہوں اسے، فصلِ گل گزرنے دے

بیاں چھوٹا سا تبسم تو ایک مرہم ہے
شکن نہ ڈال جبیں پر کہ زخم بھرنے دے

زباں کو ذائقہ چکھنے کی مہلتیں نہ ملیں
بدلتی رُت سے کہا تھا کہ پَر کترنے دے

وہ چکنا چور نہ ہو جائے تو بھے مجھے کہنا
ہوا کے تخت سے اس شخص کو اترنے دے

یہ ایک لمحے کا احساس مر نہ جائے کہیں
خدا کے واسطے کچھ تو خدا سے ڈرنے دے

مری گرفت میں آجائے گا ترا وہ جمال
ذرا سفینہ مری نیند کا ابھرنے دے

تجھے یہ رنگ چرائے ہوئے سے لگتے ہیں
ہوا کی زد پہ چلا آ، انہیں بکھرنے دے

زمیں اس کی جڑوں کا ثبوت ہے افضل
کُرنے والوں کو سچائی سے مکرنے دے

خاقان خاور

پھول چُن چُن کر سجاؤں گا میں سب گلدان میں
شعر سارے منتخب ہوں گے مرے دیوان میں

کر گیا مجھ کو اکیلا وہ بھرے میلے میں آج
بہہ گیا ساتھی مرا لوگوں کے اک طوفان میں

شہر کے سب لوگ کرتے ہیں اسی سے مشورے
سارے کمرے جا کے کھلتے ہیں اسی دالان میں

وہ بھی دن تھے، سب مجھے آتے تھے ملنے کے لئے
کرسیاں خالی پڑی رہتی ہیں اب تو لان میں

ڈوبتے کو ایک تنکے کا سہارا ہی ملے
آس کی کوئی کرن اُترے کبھی زندان میں

اس کا سارا حُسن ہے چہرے کے خدوخال تک
جیسے کرنیں رک گئی ہیں آ کے روشن دان میں

رشید کامل

تجھ سے بھی کچھ سفر کی اذیت نہ کم ہوئی
تو ساتھ بھی چلا تو مسافت نہ کم ہوئی

برسوں گزر گئے ہیں یہاں انتظار میں
اک وقفۂ قلیل کی مدت نہ کم ہوئی

یہ بھی تو سوچ عدہ خلافی گناہ ہے
کیا اس لحاظ سے تری چاہت نہ کم ہوئی

پہلے ترا وجود تھا ہمراہ، اب خیال
کیسے کہوں کہ تیری رفاقت نہ کم ہوئی

آنسو بھی دل کی آگ کو ٹھنڈا نہ کر سکے
بارش میں بھیگ کر بھی حرارت نہ کم ہوئی

عجزِ سخن سے ذات کا معیار کیا رہا؟
جب وزن گھٹ گیا ہے تو قیمت نہ کم ہوئی؟

ایسی روش تو باعثِ تشہیر ہے رشید
اس کو خیال ہوگا کہ شہرت نہ کم ہوئی

صدیق افغانی

کیسی تصویر دکھا دی تو نے
نیند راتوں کی اُڑا دی تو نے

چل پڑے شہر بیاباں کی طرف
کیسے لہجے میں صدا دی تو نے

کتنے سرسبز تھے خواہش کے شجر
آگ جنگل میں لگا دی تو نے

آشنائی کا بھرم قائم تھا
یہ بھی دیوار گرا دی تو نے

میں ہی کیوں تشنۂ گویائی ہوں
بے نواؤں کو نوا دی تو نے

اک نظر میری بھی عریانی پر
پیڑ کو سبز قبا دی تو نے

خار و خس کیوں رہیں ظلمت کا شکار
چہرۂ گل کو ضیا دی تو نے

زلفِ جاناں سے اُلجھ کر صدیق
عمر بیکار گنوا دی تو نے

حیدر قریشی

وہ خود فریبی کے لمحے گزر چکے ہوں گے
کہ خواب سوکھ کے اب تک بکھر چکے ہوں گے

تمہارے جسم کی خوشبو میں جو دہکتے تھے
وہ رنگ سارے دھنک کے اتر چکے ہوں گے

گئے جو روشنیاں لے کے سرد ہاتھوں پہ
اس اندھے شہر میں اب تک تو مر چکے ہوں گے

وہ اپنی سوچ پہ گہری اُداسیاں لکھ کر
پھر اپنے آپ سے سمجھوتہ کر چکے ہوں گے

سمندروں کی طرح جو ازل سے پیاسے ہیں
خود اپنی پیاس میں جل کر بکھر چکے ہوں گے

غلط ہے سوچ مگر پھر بھی سوچتا ہوں میں
تمہاری یاد کے سب زخم بھر چکے ہوں گے

ایوب خاور

اب تو آتے نظر میں جو بھی ہو
نیند کے بام و در میں جو بھی ہو

جسم و جاں کا مکاں ہوا خالی
ایسے تنہا سفر میں جو بھی ہو

گونجتے ہیں فضا میں سناٹے
ٹوٹنے کے اثر میں جو بھی ہو

دھوپ ہو، ابر ہو کہ سایۂ گل
اب تو اس رہگذر میں جو بھی ہو

ہجرتیں اس طرح نہیں ہوتیں
تیاگ دیتے ہیں گھر میں جو بھی ہو

خاورؔ اُس سبز خیمۂ گل تک
اس کڑی دوپہر میں جو بھی ہو

فاطمہ حسن

اب خوف نہیں کوئی مجھے راہ گزر سے
میں دور نکل آئی ہوں پتھر کے نگر سے

دیوار اُٹھاتے ہو تو مضبوط اُٹھاؤ
ایسا نہ ہو ڈر جاؤ کبھی اپنے ہی گھر سے

یہ لوگ بھی اچھے ہیں مکاں بھی بہت اچھے
بس میں ہی ہوں بیزار ان اچھوں کے نگر سے

اک موڑ پہ ہم اجنبی بن کے بھی ملیں گے
یہ بات تو معلوم تھی آغازِ سفر سے

جیسی بھی ہوں اچھی یا بُری اپنے لئے ہوں
میں خود کو نہیں دیکھتی اوروں کی نظر سے

لطیف ساحل

الفاظ اس کے پاس، زباں اس کے پاس ہے
میں کیا کہوں کہ زورِ بیان اس کے پاس ہے

تشنہ دکھائی دیتا ہے سب کی طرح جو شخص
کس کو خبر کہ آبِ رواں اس کے پاس ہے

یہ سانحہ بھی گذرے گا، سوچا نہ تھا کبھی
میں بے اماں ہوں اور اماں اس کے پاس ہے

جو زخم مشترک تھا وہ تقسیم ہو چکا
اب درد میرے پاس، نشاں اُس کے پاس ہے

منزل پہ بھی پہنچ کے بھٹکتا ہے گا وہ
اندھی مسافتوں کا زیاں اس کے پاس ہے

وہ لمس ناشناس، یہ سوچے کہ کس لئے
اب تک مرا خزینۂ جاں اس کے پاس ہے!

ساحلؔ اُس اختلاف میں، ممتا نہیں ہے جو
تنہا ہوں میں کہ سارا جہاں اس کے پاس ہے

محمد خالد

حذر کے طالب نہیں ہم ازیست کرنے کے لئے
عشق زندہ ہے رگوں میں رنگ بھرنے کے لئے

تجھ کو کھونے کے لئے ہم بھی تری خواہش میں ہیں
جی رہے ہیں لوگ بھی دنیا میں مرنے کے لئے

آتی جاتی بارشوں کو بھیجتا رہتا ہے کون
جو نہ ہم سے ہو سکے وہ کام کرنے کے لئے

تو ہمیشہ نشہ ہائے وصل میں مدہوش رہ
ہم جو بیٹھے ہیں شبِ فرقت سے ڈرنے کے لئے

خاک ہیں لیکن زمیں سے وصل کی خواہش نہیں
ہم تو ہیں خالد ہواؤں میں بکھرنے کے لئے

بات اب پہلی سی دریا کی روانی میں نہیں
ڈھونڈتا ہوں وہ ذائقے ایسے جو پانی میں نہیں

یہ گھڑی ہے فصلِ خواہش کی زمیں نہ کاڑھو
اب نوشتہ کوئی دستِ آسمانی میں نہیں

بے طلب ہم کو ملا ہے جو لئے پھرتے ہیں ہم
ہم نے جو مانگا تھا وہ اپنی کہانی میں نہیں

اس طرح چلتی تھی پہلے کب ہوائے اعتبار
جو مزا ہوتا تھا عمرِ ناگہانی میں، نہیں

خواہشیں کیا تھیں حصارِ لفظ میں بیٹھے رہے
دیکھ لیں اس کو بھی جو بابِ معانی میں نہیں

ہو چکی تلقینِ ہجر اب تو خبر رکھتے ہیں ہم
جو مکاں میں دستیں ہیں، لامکانی میں نہیں

محفلِ یاراں میں کچھ کسبِ ہنر ہوتا ہے
اُس کا ذکرِ خیر، میرا ذکرِ شر ہوتا ہے

دیکھتی رہ جائیں آنکھیں خوابِ تکمیلِ طلب
جو درونِ در نہیں بیرونِ در ہوتا رہے

نارسی کے پھول ہی چنتی رہے بے مائیگی
شغل ہو کوئی بھی لیکن رات بھر ہوتا رہے

چاہتوں کے موسموں میں اب کے جدت ہے کہ
آرزو کی بارشوں میں جسم تر ہوتا رہے

کام دکھلائے کبھی یہ بھی فریبِ رہگذار
دل میں خواہش ہو پڑاؤ کی، سفر ہوتا رہے

مئی ۱۹۷۹ء

زاہد فخری

کسی بھی شخص کو منظر نہ یہ دکھائے کوئی
وہ دیکھتا ہی رہے اور ڈوب جائے کوئی

دعا پہ روشنی کی آگ بھیج دیتا ہے
اندھیرا مانگنے پہ چھاؤں لے کے آئے کوئی

اب ایک عمر سے میں نے بھی سچ نہیں بولا
نہ میری سمت بھی اب انگلیاں اٹھائے کوئی

پرندے اڑتے ہوئے ساحلوں تک آ پہنچے
سفینے ڈوب رہے ہیں انہیں بچائے کوئی

میں جانتا ہوں کہ تنہا سفر پہ جانا ہے
فصیلِ شہر سے باہر تو چھوڑ آئے کوئی

میں جاگ کر بھی کسی خواب کی گرفت میں ہوں
یہ کیسا خوف ہے اس خوف سے چھڑائے کوئی

میں فخری آگ سے بس آنکھ ہی بچا لایا
اب آنکھ سے نہ میری آنکھ بھی ملائے کوئی

لہو میں پھڑپھڑاتی ہیں صدائیں لب نہیں ہلتے
میں چلنا چاہتا ہوں پر مجھے رستے نہیں ملتے

یہ کیسے موسموں کی سرزمیں پر آ گئے ہم تم
ہوا چلتی ہے لیکن شاخ پر پتے نہیں ملتے

فقط باتوں سے مت بہلا مجھے اے چارہ گر میرے
کہ اپنے زخم ایسے ہیں رفوگر سے نہیں سلتے

تجھے مل کر مجھے کچھ اور بھی الجھن سی ہوتی ہے
تری قربت کے لمحے پھول بن کر کیوں نہیں کھلتے

تو کس کو ڈھونڈتا پھرتا ہے اس شہر خرابی میں
یہاں جو صبح کو بچھڑیں وہ آخر شب نہیں ملتے

کاش ایسا ہو کہ اپنی دوستی قائم رہے
روز ہم ملتے رہیں اور تشنگی قائم رہے

لفظ خوشبو ہی رہیں تیری سماعت کیلئے
میری باتوں میں ہمیشہ تازگی قائم رہے

دھوپ نکلے اور اس کے ساتھ چلتی ہو ہوا
موسموں کے درمیاں یہ دوستی قائم رہے

جان لے مطلب یونہی تو ان کہے الفاظ کا
میری خواہش ہے کہ تیری سادگی قائم رہے

اس لئے میں شام ہوتے ہی جلاتا ہوں چراغ
بعد سورج کے زمیں پر روشنی قائم رہے

اس لئے چوکس رہیں لشکر فصیلِ شہر پر
بستیوں میں گنگناتی زندگی قائم رہے

پھول شاخوں سے جدا ہو کر نہ مرجھائیں کبھی
یوں بچھڑ جائیں مگر وابستگی قائم رہے

جنگ جاری ہی رہے فخری طلوعِ صبح تک
رات کے پچھلے پہر سے دشمنی قائم رہے

منصور قیصر

خوشبو کا سفر[1]

"خوشبو کا سفر" فارغ بخاری کے پچھلے مجموعۂ کلام "شیشے کے پیراہن" کے سات سال بعد شائع ہوا ہے یہ سات سال یعنی ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۸ء تک پاکستان کی قومی زندگی کے اہم ترین سال ہیں اس عرصے میں سماجی تہذیبی اور سیاسی سطح پر جو تبدیلیاں آئیں انہوں نے ہر اہلِ قلم کو متاثر کیا کہ لا ادیب ہر اہلِ قلم اپنے گرد و پیش کی صورتِ حال کو نہ صرف تیسری آنکھ سے دیکھتا ہے بلکہ خود اُس صورتِ حال کا ایک حصہ بھی ہوتا ہے فارغ نے بھی اسی صورتحال اور تبدیلیوں کو اپنے تخلیقی اظہار کے لئے خام مواد کے طور پر اپنے مخصوص طرزِ فکر سے استعمال کیا ہے۔ چونکہ وہ داخلیت پسند ہے نہ ہی مصلحت کوش ہے اسی لئے اس نے قلم کو خواہ وہ کسی بھی روپ یا کسی بھی سانچے میں ہو شعری حوالے سے بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول محمد علی صدیقی "فارغ بخاری کی شاعری ہماری صورتِ حال کی بے ضمیری اور دگرگونی کے خلاف سراپا احتجاج ہے۔ فارغ بخاری ہمارا ہمعصر ہے جدید عہد کے منطقی تقاضوں کا وکیل ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کے ساتھ مخلص ہے۔"

اپنے مسلک سے اخلاص اور جدید عہد کے منطقی تقاضوں کی وکالت یقیناً ادب میں ایک مثبت رویہ ہے اور یہ رویہ نہ تو فرد کو زندگی سے مایوس کرتا ہے اور نہ ہی اُس کی اجتماعی شناخت کو مسخ کرتا ہے لیکن اگر یہ رویّہ بڑھ کر پروپیگنڈہ کی حدوں کو چھونے لگے تو ادب پارہ میں زندہ رہنے کی قوت مجروح ہو جاتی ہے۔ ادیب اور شاعر کا یقیناً یہ فرض ہے کہ وہ خیر اور شر میں تمیز کرے اور سماج کی رگوں میں پھیلنے والے فاسد خون کی نشاندہی کرے مگر اس کا منصب مصلح اور مبلّغ بننا نہیں۔ فارغ بخاری اپنے اس مجموعے میں اسی افراط و تفریط کا اسیر نظر آتا ہے۔

"خوشبو کا سفر" میں فارغ بخاری "نظم گو" کی بجائے "غزل گو" کی بڑی بھرپور توانا حیثیت سے سامنے آتا ہے اگرچہ نظموں کے موضوعات اس کے فکری مسلک سے یقیناً ہم آہنگ ہیں اور گذشتہ سات سال کی قومی صورتِ حال کی نشاندہی بھی کرتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ نظمیں قاری کے دماغ و دل پر کوئی گہرا تاثر نہیں چھوڑتیں بلکہ ان میں ایک سپاٹ پن سا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ فارغ کی نظموں کا اسلوب اور ہیئت ابھی تک وہی ہے جو چوتھی اور پانچویں دھائی میں مستعمل تھا۔ اسی سبب فارغ کی نظموں میں خیال زندہ اور لفظ مجرد نظر آتے ہیں مثلاً ایک مختصر نظم بعنوان "جھوٹ" ملاحظہ فرمائیے۔

اگر زندگانی میں
ایک بار بھی
مجھے سچ کے اظہار کا حوصلہ ہو
تو میں صرف یہ بات تم سے کہوں
کہ الفت کے اور پیار کے نام پر
آج تک جو بھی میں نے کہا ہے
وہ سب جھوٹ ہے

اسی طرح ان کی ایک اور مختصر نظم ہے —

"گیا سال"

گیا سال کیا تھا
بُرا تھا کہ اچھا تھا
اب کیا بتائیں
کہ اپنی تو ہے یہ روایت
کہ مرحوم کا
جب کبھی نام لو

مئی ۱۹۷۹ء

---

[1] فارغ بخاری کا تازہ مجموعۂ کلام

وہ جو کچھ بھی ہو
اس کو اچھا کہو
اور بس اچھا کہو

نظموں کے برعکس اس مجموعے کی غزلیں نہ صرف اپنے جلو میں روحِ عصر لئے ہوئے ہیں بلکہ تغزل کی نئی دلکشی کے ساتھ ہمقدم بھی ہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے فارغ جس نے اپنے آپ کو ایک نظم گو کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا اب اپنا تخلیقی سفر غزل کے راستے پہ طے کر رہا ہے اور ایسے موضوعات جو اُن کی نظم میں آکر اپنی حیثیت اور تاثر کم کر بیٹھتے ہیں غزل کے پیکر میں ایک نئی شدت اور تہہ در تہہ کیفیت لے کر سامنے آئے ہیں مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

جو آج دودھ کے ڈبوں نے کردیا غارت
وہ پیار مانگتے ہیں بچے اپنی ماؤں سے

قبائے رسم و رہِ عاشقی بدل ڈالو
لباس اچھا ہے لیکن بہت پرانا ہے

کافی نہیں تنہائی کا ملبوس بدن پر
کمرے کے در و بام میں آئینے جڑے ہیں
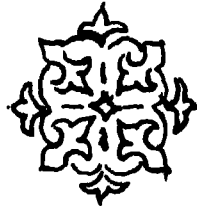
اب زبان کاٹنے کی رسم نہ ڈال
کہ یہاں لب سلے ہوئے پہلے ہی

فارغ بخاری کی غزلوں میں کہیں کہیں کڑوا اور کسیلا لہجہ بھی ہے مگر مجتبیٰ حسین کے بقول "فارغ کے کے لہجے کی یہ کڑواہٹیں دراصل زندگی کی کڑواہٹیں ہیں انہوں نے شاعری برائے شاعری نہیں کی ہے۔ زندگی نے ان سے شعر کہلوایا ہے ایسا شعر جس میں محبت ہو، امن ہو، انسانیت ہو اور ہماری زمین کی خوشبو ہو۔"

منصور قیصر

"اپنے مسلک سے اخلاص اور جدید عہد کے منطقی تقاضوں کی وکالت یقیناً ادب میں ایک مثبت رویہ ہے۔"

اقتباس، خوشبو کا سفر

رشید امجد

وال کینو[1]

شاعری کی دوسری اصناف کے مقابلہ میں نظم نے زیادہ گرم جوشی سے تازہ ہواؤں کو خوش آمدید کہا ہے۔ نظم تکنیک، موضوع اور اسلوب کی سطح پر بہت سے نئے ذائقوں سے روشناس ہوئی ہے۔ میں اسلوب کو نئے رجحانات میں بنیادی اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن اس سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ میں موضوع کی نفی کر رہا ہوں۔ موضوع اپنی جگہ اہم ہے، مگر کسی فن پارے کو نیا یا پرانا اس کا اظہار بناتا ہے۔ ایک ہی موضوع پر لکھی ہوئی دو نظمیں نئی یا پرانی ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ویت نام پر لکھی گئی جوش اور آفتاب اقبال شمیم کی نظمیں۔ ویت نام انسانی جدوجہد اور آزادی کا ایک زندہ استعارہ ہے۔ اگر آپ نے یہ دونوں نظمیں پڑھی ہیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کس طرح ایک شاعر زندہ موضوع کو مردہ اور دوسرا اسے زندۂ جاوید بنا دیتا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم کی نظم کو جو چیز تازگی اور ابدیت بخشتی ہے۔ وہ ان کا اظہار ہے۔ اظہار میں بنت، تکنیک اور اسلوب سبھی آ جاتے ہیں۔ لفظوں کا شعور، نیا لسانی پیرایۂ اظہار پیکر تراشی یہ سب اظہار کی سطحیں ہیں اور یہی کسی موضوع کو نئے یا پرانے کی حدوں میں لے جاتی ہیں۔

نظم کے نئے دور کا آغاز وزیر آغا (شام اور سائے) جیلانی کامران (استانزے) اور افتخار جالب (ماخذ) سے ہوتا ہے۔ یہ تینوں مجموعے نئے اسلوب اور نئی لسانی تشکیلات کی تین مختلف فکری، فنی اور اسلوبی سطحیں قائم کرتے ہیں۔ وزیر آغا اور جیلانی کامران کے یہاں تجربہ ایک وحدت کے طور پر اترتا ہے اور فکری سطح پر وزیر آغا جیلانی کامران کے مقابلہ میں اپنی زمین سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ چنانچہ نئی نظم میں وہ ایک مثبت رَو کے طور پر رواں ہیں۔ افتخار جالب کے یہاں تجربہ وحدت نہیں بنتا اور فن پارہ جب اس فنی وحدت سے محروم ہوگا تو ابلاغ کے بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ ایک زمانہ میں افتخار جالب کی پیروی نئے پن کی دلیل ٹھہری، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ نظم کے اسلوب میں نکھار آتا گیا اور افتخار جالب کے تجرباتی کھردرے پن کی جگہ وزیر آغا اور جیلانی کامران کی معتدل مگر ملائم روش نئی نظم کی ایک واضح شکل بنتی چلی گئی۔ محمود کنور اسی نئی صورت کا ایک نمائندہ ہے۔ وال کینو محمود کنور کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ میں غزل پر مختصر سی بات کروں گا کہ ان میں تازگی اور ندرت کے بہت سے پہلو ہیں اور مجھے یہ غزلیں اچھی لگی ہیں۔ نظم پر البتہ میں تفصیل سے بات کرنا چاہوں گا۔ دو حوالوں سے ایک ان کا اظہار اور دوسرے ان کا موضوع۔

وزیر آغا اور جیلانی کامران اظہار کے ان نئے رویوں کے بانی ہیں۔ جن میں ابلاغ یا غیر ضروری ابہام کا کوئی مسئلہ نہیں، مگر افتخار جالب نے ابلاغ اور ابہام کے بہت سے معاملوں کو الجھا کر "ترسیل کی ناکامی کا المیہ" جیسے مسائل کو جنم دیا ہے۔ اس دور کی ساری نظم کسی حد تک الجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک طرف تو افتخار جالب اور ان کے پیروکاروں نے الجھاؤ اور دانستہ ابہام کے ذریعے نظم کو تجربہ کی سطح سے اوپر نہیں اٹھنے دیا تو دوسری طرف رہا سہی - اور پابند شاعروں نے نظم کو تخلیقی اظہار کا پابند کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ نئی نظم کا چہرہ اتنا دھندلا محسوس ہونے لگا کہ جو نظم سمجھ میں نہ آئے اسے نئی کا نام مل گیا۔ محمود کنور تک کے سفر میں نئی نظم نے اس عذاب سے اپنی جان چھڑا لی ہے۔ اب اس کا اظہار واضح ہے اور تجربہ تجربے کی سطح سے اٹھ کر تخلیق کے درجے پر جا پہنچا ہے۔ محمود کنور کے یہاں بھی اس تخلیقی سطح کا احساس

[1] محمود کنور کا تازہ مجموعۂ کلام

ہوتا ہے۔ اس کا اظہار واضح اور صاف ہے۔ اور وہ نیا بھی ہے۔ نیا یوں کہ لفظوں کے ساتھ اس کا برتاؤ، اس کے امیج، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چیزوں تک اس کی شاعرانہ رسائی اپنے عہد کی چھاپ لئے ہوئے ہے۔ وہ دوسروں کی عینک سے چیزوں کو نہیں دیکھتا اور نہ دوسروں کی زبان سے بیان کرتا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں
اگر سفر میں شام نہ ہو جاتی
میں آسمان بجھنے سے پہلے لوٹ آتا

یہ تین لائنیں بظاہر سیدھے سادے لفظوں سے اپنے معنی متعین کرتی ہیں۔ لیکن شام اور آسمان بجھنے کی معنویت کو سامنے رکھا جائے تو ابلاغ کی کئی سطحیں سامنے آتی ہیں اور سلیم احمد کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔

"محمود کنور کی علامتیں اور امیجز جہاں ایک طرف بھرپور معنویت کے حامل ہیں، وہاں ان میں احساس و شعور کی وہ مخصوص زندگی پوری طرح نمایاں ہوتی ہے جو محمود کنور کی انفرادیت کا حصہ ہے۔"

لے پیاسے پرندے
بادل ہیں بہت دور
لہریں ہیں بہت پاس
جنگل ہیں بہت دور
راتیں ہیں بہت پاس
لے بھیگے پرندے

اس نظم کا عنوان ہے ـــــ "آسمان گم ہونے سے پہلے" اس نظم کو ایک مکمل اکائی کی صورت میں گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو معنوں کی ایک پھوار کا سامنا ہوتا ہے۔ یہی انداز محمود کنور کو ایک منفرد شاعر بناتا ہے کہ وہ نہایت سادہ لفظوں میں ایک بڑی بات ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب بھی ہوتا ہے۔

ضمیر علی نے فلیپ میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ محمود کنور کی شاعری ہم پر ایسی دنیا منکشف کرتی ہے جو خواب پر قائم ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر بڑا شاعر ایک دنیا کی خبر دیتا ہے بلکہ اس پرانی دنیا میں ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے۔ اگر شاعری یہ نئی دنیا پیدا نہ کر سکے تو اس کا رنگ ہلکا ہو جاتا ہے۔ محمود کنور کی اکثر نظموں میں دنیا تخلیق ہوتی ہے اور یہ گہرائی شاعر کو اسی وقت نصیب ہوتی ہے۔ جب وہ دکھ اور خوشی کے لمحوں میں ایک تسلسل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ احمد ہمیش نے محمود کنور کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ایک پرانی کہانی کا حوالہ دیا ہے جس میں ایک شکاری پرندوں کے ایک جوڑے کو اس وقت نشانہ بناتا ہے۔ جب وہ وصال کے لمحے سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ وصال کا یہ لمحہ ایک پل میں ہجر میں تبدیل ہو جاتا ہے، بلکہ ایک ہی لمحہ ہجر اور وصال کا امتزاج بن جاتا ہے۔ یہ شعور شاعر کو نئی دنیا سے متعارف کراتا ہے۔ محمود کنور کی بہت سے نظموں میں یہ لمحہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ایک سوال دے کر چلا جاتا ہے۔ یہ سوال انسان کے ہونے اور نہ ہونے، چیزوں سے اس کے رشتوں اور کائنات میں اس کے وجود کے جواز کے راستے کھولتا ہے اس راستے سے کئی تلخ حقیقتیں بھی اندر گھس آتی ہیں۔ اور ہمارے مروجہ عقیدوں پر ضربیں لگاتی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ محمود کنور اپنی نئی اخلاقیات بنانے کے عمل سے ہی گزر رہا ہے۔ ایک نئے سماج میں پرانی اخلاقیات کا عمل زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا۔ اس سماجی سیاسی صورتِ حال میں ہم محض روایتوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتے محمود کنور کا بھی یہ المیہ ہے کہ وہ بہت ساری باتوں سے اپنا رشتہ برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے وہ جھنجھلا جاتا ہے اور پھر توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ یقین اور بے یقینی کی فضا جنم لیتی ہے۔

کہیں اے خدا
تو جو خود خواب ہے
اگر جاگ جائے
تو ہم جو تیرے خواب ہیں
کہاں جائیں گے

اچھا شاعر خواب اور حقیقت کے درمیان ایک توازن قائم کرتا ہے اور پھسلتے قدموں کو نئی زمین عطا کرتا ہے۔ محمود کنور اس بات کو سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔

افتخار جالب کے حوالے سے نظم نے جو شکل بنائی تھی۔ اس میں فیشن بہت آ گیا تھا۔ اس فیشن کی تقلید نے یکسانیت کی ایک عجیب جمود زدہ فضا کو جنم دیا تھا۔ محمود کنور کے وال کینو نے اس جمود کو توڑا ہے۔ لاوا اُبلتا ہے۔ تو ہر شے کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے اور پھر نئے سرے سے انہیں جنم دیتا اور صورتیں عطا کرتا ہے۔ مجھے یہ مجموعہ تازہ جھونکوں اور نئی خوشبوؤں کا آغاز محسوس ہوتا ہے۔

جمال احسانی

راداز[لہ]

سنتے ہیں آج سے بیس برس قبل جب ساقی فاروقی کو شاعری کا نیا نیا شناختی کارڈ ملا تھا تو اس نے اپنے شناختی کارڈ کا اعلان اُردو شاعری کی مروجہ اقدار سے بغاوت کرکے کیا۔ یہاں اُردو شاعری سے بغاوت ان معنوں میں نہیں ہے جس کا عملی مظاہرہ آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ کراچی کی فضا میں پروان چڑھنے والے اس شاعر نے اپنے اظہار کے لئے نظم کو منتخب کیا اور اسے نئے نئے سانچے میں ڈھالنے کی تگ و دو میں مصروف رہا۔ "راداز" میں شامل نظموں کے ذریعہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے باوجود اب بھی یہ شاعر اپنے تجربوں کے انوکھے پن سے غیر مطمئن نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری کے ابتدائی دنوں میں جب چاروں طرف سے اس کی آواز پر لوگوں نے چونک کر دیکھا تو یہ اپنے طرزِ شعر کے وہ نقش و نگار بنانے میں لگا ہوا تھا۔ جس سے اُردو شاعری عبارت ہے۔ مگر یہ بات ساقی کی اوّلین شاعری ہی سے واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو شاعری کی روایت کے برعکس جس کا تمام مواد ہند و پاک کی زمین کی سوندھی خوشبوؤں سے مہک رہا ہے۔ ساقی کے یہاں اس زمین کی نہیں بلکہ اس فضا کی باس ہے۔ ساقی فاروقی مزاجاً نہ تو مشرقی بود و باش سے مطمئن ہو سکا اور نہ ہی غالباً یہاں کی طرزِ زندگی سے ہم آہنگ، اسی بے اطمینانی نے اسے مشرق سے لے جا کر مغرب میں آباد کر دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے وہیں کا ہو رہا۔ ساقی فاروقی کے اس عملی اقدام پر نہ تو ہمیں اس کی حب الوطنی پر شبہ ہے اور نہ ہی یورپ میں سکونت اختیار کرنے پر تشویش۔ ہماری ساری دلچسپی ساقی فاروقی کے اس سیماب صفت شعری سفر سے ہے جو اسے کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اپنی ایک نظم میں اس نے لکھا . . . . .

اک آواز تعاقب کرتی رہتی ہے
باہر آنے دو
اس زنداں سے باہر آنے دو
دو جنوں ڈاکٹروں اور سرجنوں کے
ایکسرے کی خنک شعاعوں سے
جل کر دیکھ لیا
شہر بدل کر
ملک بدل کر دیکھ لیا
مگر لہو میں
وہی صدا ہلکورے لیتی ہے
باہر آنے دو
اس زنداں سے باہر آنے دو

آخر یہ کونسا زنداں ہے جس سے باہر آنے کی خواہش میں شاعر نے شہر اور ملک بدلے ہیں . . . . یہ کیسی اسیری ہے۔ جس کی رہائی کی تمنا میں شاعر پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیریں کاٹتا جاتا ہے اور اپنے آپ کو مزید جکڑتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ممکن ہو یہ زنداں اس کے اپنے آپ کا زنداں ہو اور یہ اسیری اس کی اپنی اسیری ہو۔ مگر جسم و جان سے فرار کی آرزو جتنے جان جوکھوں کا کام ہے۔ ساقی فاروقی بار بار اس کا اظہار کرتا رہتا ہے اور کہتا ہے۔

میں اپنے تابوت کی تنہائی سے لپٹ کر
سو جاؤں گا
پانی پانی ہو جاؤں گا
اور تمہیں آگے جانا ہے
اک گہری نیند میں چلتے جانا ہے
اور تمہیں اس نظر نہ آنے والے بورے سے
اپنے خالی بورے کی پہچان نہیں
جان محمد خان
سفر آسان نہیں

اپنے تابوت کی تنہائی سے لپٹ کر عالمِ جانکنی میں اپنے پانی پانی ہونے کے اندیشے کو سینے سے لگائے شاعر کسی گمشدگی کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے اپنی ذات کی چٹان سے ٹکرا کر خود کو ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے ___ ذات کی اس چٹان کے سو دروازے اسے خوش آمدید کہنے کے لئے وا ہیں مگر وہ اس سے بے نیاز بے حرکت نیم معطل پڑے رہنے کو ترجیح دیتا ہے . . . وہ ایسی کون سی آگاہی ہے۔ جس کا خمیازہ بھگتنے کی جستجو میں ساقی فاروقی ساحل ساحل اور جزیرے جزیرے

مئی ۱۹۷۹ء

لہ ساقی فاروقی کا تازہ مجموعہ کلام

میں گھومتا پھر رہا ہے۔ یہ جزیرے نہ تو کسی سمندر بیچ دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی یہ ساحل کسی سمندر کے کنارے واقع ہیں ..... یہ سب کچھ ساقی فاروقی کی اپنی ذات میں اور ذات کے ادھر اُدھر موجود ہیں۔ جن سے رابطے کی سعی میں اس کی سانس پھولی جا رہی ہے .... کبھی کبھی اُسے یہ رابطہ بحال ہوتا دکھائی دیتا ہے اور کہیں کہیں اُسے اپنی آواز کسی دوسرے تک پہنچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ غالباً یہ رابطہ اور یہ آواز اس کے داخل و خارج میں ہم آہنگی کا احساس ہے جس کے ابلاغ کا احساس ہی۔

اتنا جاں پرور ہے کہ آنکھیں،
بند ہوئی جاتی ہیں خوشی سے
بھیگی جاتی ہیں.

واقعی مسرت کا یہ احساس کسی تخلیقی لمحے سے سلامت گزر جانے کے بعد کا احساس ہے اور ساقی فاروقی اپنی شاعری میں اس کامیاب لمحے سے بار بار گذرا ہے۔ اور خوش ہوا ہے۔ مگر مسرت حاصل کرنے کے بعد وہ پھر اس گہرے غم کی لپیٹ میں آجاتا ہے جو شروع دن سے اس پر مسلط ہے۔ جس سے کبھی وہ رہائی پانا چاہتا ہے اور کبھی اس کا اسیر رہنا پسند کرتا ہے۔ شب و روز کارِ نفس میں مشغول رہنے کے باوجود وہ کسی فضا سے مانوس نہیں ہو پایا مگر اس کے ساتھ ساتھ کوئی خطۂ زمیں اس کے پاؤں بھی نہیں جکڑ سکا۔ اداس کر دینے والی مسلسل ہجرت کے عمل نے اُسے ملنے اور بچھڑنے کے اتنے زخم دیئے ہیں کہ اس کے ہونٹوں پر نیل اور دل میں پیچ پڑتے چلے گئے ہیں۔ وہ اپنی نظم "موت کی خوشبو" میں کہتا ہے!

ہمیں موت کی تیز خوشبو نے پاگل کیا ہے

اُمیدوں کی سرخ آبدوزوں میں بیٹھے
تباہی کے کالے سمندر میں بہتے جا رہے ہیں
کراں تا کراں
ایک گاڑھا کسیلا دھواں ہے
زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے

شاعر اُمیدوں کی آبدوز میں تباہی کے سمندر میں رواں دواں ہے۔ اور مٹی کے جادو کی محرومی کا شکار ہے یہ وہی مٹی ہے۔ جس نے اپنے جادو سے آج تک انسان کو مسحور رکھا اور اپنی دسترس سے نکلنے نہیں دیا۔ یہ زمین کی وہی صداقت ہے۔ جس نے خود پر پیدا ہونے والوں اور پھر خود پر بسنے والوں کے ناز اٹھائے اور اپنے حوالے سے اپنے باسیوں کی شناخت کرائی۔ مگر شاید ساقی فاروقی کسی نامعلوم شناخت کی تگ و دو میں تھا۔ جو پہلے دن سے اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہی نامعلوم شناخت اسے شہر شہر اور ملک ملک لئے پھر رہی ہے بلکہ اب تو وہ ایک دوسرے ملک کا باقاعدہ شہری بھی بن چکا ہے پھر بھی اب تک نہ تو اس کی روح کو چین آیا ہے اور نہ ہی اس کے جسم کو ..... وہ جگہ جگہ شعروں میں اس کا اظہار کرتا ہے۔

زندگی ایک گزرتی ہوئی ــــــ پرچھائیں ہے
آئینہ دیکھتا رہتا ہے تماشا اپنا
تیرے انفاس سے خوشبوئے مسیحا آئی
ورنہ مٹی نے کوئی لعل نہ اُگلا اپنا

عمر طوفان سے عبارت تھی
ڈوب جانا مرا مقدر تھا

میں کہیں اور کا ٹوٹا ہوا تارہ ہوں کوئی
تو مجھے اپنے ستاروں سے الجھا نہ بجھا

ہر نئے درد کی پوشاک پہن لی میں نے
جاں مہذب نہ ہوئی میں تھا برہنہ ایسا

دامن میں آنسوؤں کا ذخیرہ نہ کر ابھی
یہ صبر کا مقام ہے گریہ نہ کر ابھی

میں نے ساقی فاروقی کے شعری سفر کو اس کے سفرِ زیست سے سمجھنے کی کوشش میں اس کی شاعری کو بار بار پڑھا ہے۔ اپنے سفرِ زیست کی طرح اس کا شعری اظہار بھی مختلف سطحوں پر مختلف انداز سے نشو و نما پاتا رہا ہے زندگی کے تمام احساسات جو اس کے تجربے کی آمیزش سے شاعری میں ڈھلے ہیں ان میں ساقی فاروقی کی اپنی شباہت اور اپنے خدوخال موجود ہیں۔ میں ساقی فاروقی کو صرف یہیں تک سمجھنا چاہتا ہوں اور صرف یہیں تک اسے سمجھ سکا ہوں۔ وہ کتنے شاعروں سے زیادہ اچھا اور کتنے شاعروں سے کم اچھا ہے یا وہ نظم اچھی لکھتا ہے کہ غزل۔ میرے لئے ان باتوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ حتیٰ کہ میں اس کی شعری حیثیت کا تعین بھی ان ناقدین کے سپرد کرتا ہوں جو تنقید کی ایک ہی لاٹھی سے سارے شاعروں کو ہانکتے پھرتے ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ ان ناقدین کی خدمت میں ایک عرض بھی کرتا چلوں کہ ساقی فاروقی اپنی غلط تفہیم پر اور اپنے ساتھ ہونے والی کسی بھی زیادتی کا جواب ہمیشہ خود دیتا رہا ہے۔ بلکہ اس کے کئی ایک جواب خاصی شہرت بھی حاصل کر چکے ہیں۔

گفتگو

موضوع:۔ ترجمے اور تہذیبی منطقے

حرفِ سوال: جیلانی کامران

حرفِ جواب: خالد احمد

○

جیلانی کامران، انگریزی ادب کے استاد ہیں اُردو تنقید میں، اپنے اندازِ فکر اور اسلوب کی انفرادیت کے باعث، مروجہ اذہان اور ادیان سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔

جیلانی کامران زمین سے رشتے، مذہب سے ذہن کا استواری اور تہذیبوں میں مماثلت اور امتیاز کے مسئلے پر، بہت واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ کسی دانشور کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کا رویہ، ذہن کو جلا بخشنے اور آگے بڑھنے کا راستہ بنانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ سوال اسی ضمن میں ہیں۔

خالد ——— علاقائی نسبتوں، عربی عجمی، روایات اور تصوّف کے پس منظر سے ابھرتی ہوئی آپ کی تحریریں آپ کی آمد کے دنوں میں "موجودیت کے تعارف" کا درجہ رکھتی ہیں۔

جیلانی کامران ——— ہم لوگوں نے جب لکھنا شروع کیا تو پاکستانی ادب میں "سماجی" حوالہ بہت زیادہ آ رہا تھا، ہم لوگوں نے سوچا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ سو ہم نے "سماجی حوالے" سے "مابعد الطبیعاتی حوالے" کی طرف سفر کیا، ہمارا لائحۂ عمل یہ تھا کہ ہم نے پہلے سماجی ادب میں آنے والے "سماجی مسائل" کا موجودہ نقطۂ نظر" سے "جائزہ" لیا اور پھر اس "مسئلے" کو موجودہ نقطۂ نظر سے سمجھ کر "مابعد الطبیعاتی طریق" سے اس مسئلے کا "حل" پیش کرنا شروع کیا۔

"ابن العربی کی ترجمان الاشواق اور امراؤ القیس کے قصیدے کا ترجمہ اُس مابعد الطبیعاتی فضا کو بحال کرنے کی کوشش ہوگی جس فضا میں یہ "حل" قابلِ قبول نظر آ سکیں"

جیلانی کامران ——— ہزار ڈیڑھ ہزار برس اُدھر کے قصیدے اور سات آٹھ سو برس کے فاصلے سے ابن العربی، ہمیں تازگی، نفسیاتی بے ساختگی اور ماضی پرستی دے رہے تھے۔

——— امراؤ القیس کی ماضی پرستی انسانی بدن درخت اور مقامات "چھن جانے کا خوف" سحر انگیز تھا۔ قیس نے انسانی بدن کو "درخت اور مقامات چھن جانے کے خوف" کے حوالے سے شعر میں ڈھالا، یہ خوبصورت منظر جسے دنیا کہتے ہیں، قیس کے ہاں یہ شناخت اُسے اطمینان بخشتی ہے، دنیا میں اپنے "قیام" کے لئے ایک "دعائیے" نے جنم لیا، "شکر گزاری کا لہجہ" پیدا ہوا، خدا سے ایک تعلق، ایک انسانی رشتہ قائم ہوتا دکھائی دیا۔ میں نے یہ ترجمے اپنے آپ کو واضح کرنے کے لئے کیے۔ "ابن العربی میں کیا ہوں ——؟ کیہ جاناں میں کون —؟ خدا کیا ہے؟ یہ سوال "فصوص الحکم" میں جواب نشان ہوتی دکھائی دیتی ہے، محبوب کی صورت دوسری جہت کی حامل "خودی" یا "فوق الانا" سے چھوٹ پاتی محسوس ہوتی ہے۔ ابن العربی ہمیں ایک "قابلِ فہم حقیقت" تک پہنچا دیتا ہے۔ ہمیں "حیرت" سے "مقامِ حیرت" پر لا کھڑا کرتا ہے"

خالد ——— "لمحۂ موجود" سے رہائی دلا کر "مقامِ حیرت" پر فائز کر دینا تو آپ کا منتہا ہوگا

جیلانی کامران ——— موجود صورتِ حال سے آزاد کرنا شاعر کا کام ہے ——"

خالد: "ایک وقت میں "مقامِ حیرت" بھی "لمحۂ موجود" ہو سکتا ہے، شاعر کا فریضہ اُس وقت بھی وہی ہوگا؟ خیر چھوڑیں یہ بحث تو ہوتی ہی رہے گی آپ یہ بتائیں کہ تحریروں میں "مابعد الطبیعاتی" "خالص اسلامی رویّہ" بنتا دکھائی دیتا ہے، کیا یہ شروع سے آپ کا مطمحِ نظر تھا؟"

جیلانی کامران ـ ۱۹۷۱ء کے بعد شاید یہ "فریم آف ورک" اور "رویّہ" ہو گیا ہو۔

"یوں بھی "مسائل" کی نوعیت خالص مادی طریقہ پر دریافت کرنا اور اُن کا صحیح حل غیر مادی اطوار میں ڈھونڈنے کا کام آپ زیادہ عرصہ جاری نہ رکھ سکتے ہوں گے۔ شاید اسی لئے آپ کے ہاں وہ رویّہ ابھرا جسے میں "جیلانی کامران سے مخصوص اسلامی رویّہ" کہوں تو بے جا نہ ہوگا"

جیلانی کامران ———

یہ ایک لمبی بات ہے، دراصل میں نے شروع میں "راگ مالا تصاویر" پر کام کیا تھا ان تصاویر میں کرشن اور اُن کی گوپیوں کا حوالہ موجود ہوتا ہے میں نے اس سلسلے میں کافی کام کیا ..."

خالد مجھے علم ہے مگر پھر آپ نے یہ کام یک لخت ترک کیوں کر دیا۔

جیلانی کامران ———

میں نے سوچا کہ میں تو اُن کا کام کروں اور اپنا

کام اُن پر چھوڑ دوں، اور پھر میں نے ۵۸-۱۹۵۴ء
کے عرصے میں اپنے قیامِ انگلستان کے دوران محسوس
کیا کہ دنیا مختلف تہذیبی منطقوں میں بٹی ہوئی ہے
مغربی مسیحی تہذیبی منطقہ، چینی اشتمال منطقہ اور
ہندو آریائی منطقہ ان منطقوں میں مسلم تہذیبی منطقہ
مجھے خطرے میں نظر میں آیا، اپنی تہذیبی شناخت
کھو جانے کے خطرے کو ہم لوگوں نے اسلامی تہذیب و
تمدن سے ہم شناخت ہو کر ٹالنے کی کوشش کی۔"
خالد۔ مگر اسلامی تہذیب و تمدن کا منطقہ ایک جغرافیائی
وحدت نہیں یہ تو افریقہ اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے۔
باقی عام منطقوں میں اقلیتی جزیروں کے طور پر
موجود ہے۔"

جیلانی کامران ——

"میں کہہ رہا تھا کہ اسلامی تہذیبی منطقہ مجھے دو
منطقوں میں تقسیم نظر آیا، عربی بولنے والا اسلامی تہذیبی
منطقہ اور عربی نہ بولنے والا اسلامی تہذیبی منطقہ،
اس کا احساس مجھے اس وقت اور بھی شدید ہوا جب
میں نے افریقی ملک "گیمبیا" کے ایک "مسلمان کلاس فیلو"
ابراہیم کجانے کو شیخ عبدالقادر جیلانی کی بابت بتایا
تو وہ ان کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا تھا، یوں
مجھے احساس ہوا کہ "مسلم اولیاء" بھی دو حصّوں
میں تقسیم ہیں، درحقیقت عجمی اسلامی تہذیب مشرقی
اسلامی تہذیب ہے۔
خالد۔ ضرورت تو یہ ہوئی کہ عرب حکما غیر عرب حکما کی
دریافتِ نو کریں؟

جیلانی کامران ——

"اگر اس تہذیبی منطقے کی حفاظت لازمی ہے،
تو یہ دریافتِ نو بھی لازمی ہے اور اس تہذیبی منطقے
کی تہذیبی یک جہتی اسی "دریافتِ نو" میں مضمر ہے۔"
خالد۔ خواجہ غلام فرید کی کافیوں کا انگریزی میں ترجمہ
اس مابعد الطبیعاتی مسئلے کے طبیعاتی حل کی طرف آپ
کا مادّی قدم سمجھا جائے:

جیلانی کامران ——

"یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں لاہور سے
باہر پوسٹ ہوا تھا اور میں نے سرائیکی بولنے والے
دوستوں کو "خواجہ غلام فرید" کی طرف متوجہ کیا تھا۔
اور اپنے کالج میں "یومِ فرید" منایا تھا، اس موقع پر
احمد ندیم قاسمی صاحب نے پیغام بھی بھیجا تھا جو ہم
نے وہاں پڑھ کر سنایا تھا، خواجہ غلام فرید کو میں
نے وہیں پڑھا تھا اور اتنا متاثر ہوا تھا کہ اُس
کا ترجمہ نہ کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔
خالد۔ "یومِ فرید" تو اب بہت سے شہروں میں منایا
جاتا ہے مگر مرکزی اجلاس ابھی تک اسی کالج میں
ہوتا ہے؟

جیلانی کامران ——

"فرید" کی طرف توجہ دلانا ضروری تھا، یہ کام
میں نے کیا اور جب تک میں وہاں رہا یہ یوم
بڑی پابندی سے منایا جاتا رہا، بعد میں اس روایت
کی پاسداری ہوئی، مگر اب یہ بات اتنی پھیل چکی ہے
کہ یہ یاد رکھنا کہ یہ سلسلہ کس نے شروع کروایا
اب غیر اہم ہو چکا ہوگا؟
جیلانی کامران سے ہماری گفتگو کی چند جھلکیاں
آپ تک پہنچ گئیں ہم نے اُن سے قیامِ انگلستان
کے بارے میں بہت سے سوال کئے جن کے جواب
میں انہوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ انہوں نے
امریکہ کے دورے کا حال بھی سنایا اور یہ ایسی باتیں
ہیں جن کا ذکر تفصیل طلب ہے میں نے اُن سے
ایک ایسا سوال بھی پوچھا جس کا جواب اقبال کانگرس
کے فاضل مندوبین میں سے کسی نے نہ دیا تھا،
ملائشیا کے العطاس سے یہ سوال یوں نہ ہو
پایا کہ وہ اُردو نہ جانتے تھے اور وہ صرف اقبال
کے خطبات کے حوالے سے بات کرنے پر قادر
تھے، ہم یہاں بھی اس سوال کا صرف ذکر کر رہے
ہیں کیونکہ ہمیں گفتگو کو تراجم کے حوالے سے جیلانی کامران
کی طرف سے پاکستانی ادب کی فضا میں مابعد الطبیعاتی
رچاؤ پیدا کرنے کی کوششوں تک محدود رہنا تھا۔
ایک سوال کا جواب کیوں کہ مختصر اور دلچسپ
تھا آپ تک پہنچا کر میں اجازت چاہوں گا۔
خالد۔ آپ نے انگریزوں کے عیسائی ہونے پر
بہت زور دیا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ نے
انگریز ہم جماعتوں میں سے کن کو زیادہ مسیحی پایا!
لڑکوں کو یا لڑکیوں کو؟"

جیلانی کامران —— لڑکیوں کو؟

مجھے تمام تہذیبی منطقوں میں واحد قدرِ مشترک
یہی ایک امر ہونے کا خوف ہے اور جیلانی کامران
نے مجھے اسی گڑھے میں دھکیل دیا، جس سے میں
خوفزدہ تھا۔
میرا خیال تھا کہ جیلانی کامران نے تراجم کا کارِ خیر
محض اس فضا کو ہموار کرنے خاطر سرانجام دیا۔
جو کہ وہ اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے پیدا
کرنا چاہتے ہیں، اور میرا خیال ایک حد تک
درست بھی ثابت ہوا، یہ تبلیغی روح بہت کم
لوگوں کو نصیب ہوتی ہے،

افضال سید

محمد خالد

زاہد فخری

ہوائے تازہ

ماہِ نو
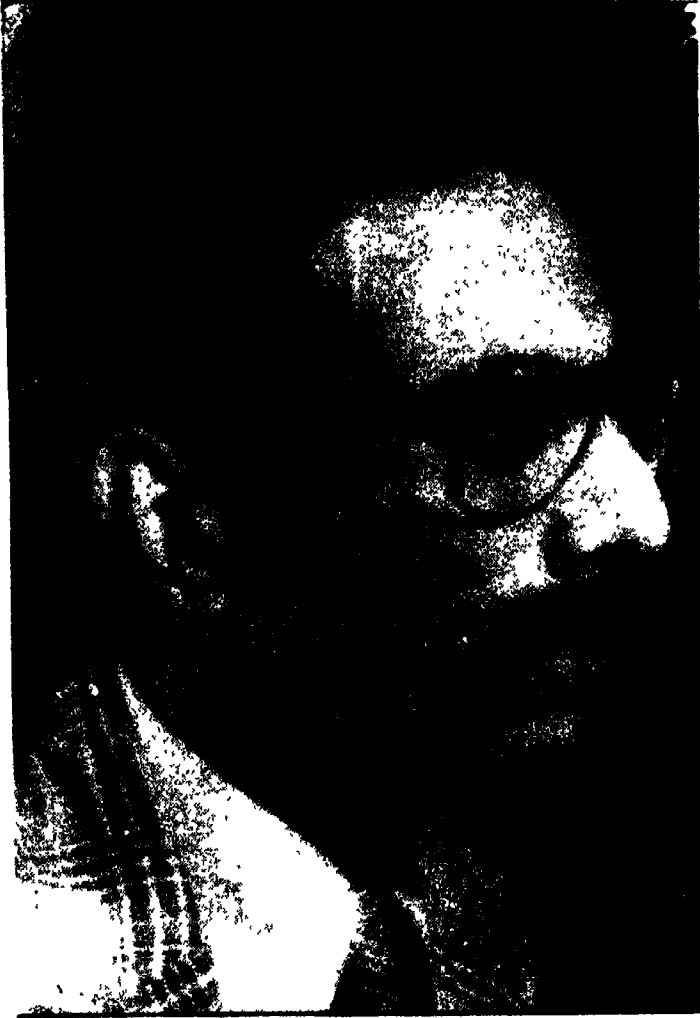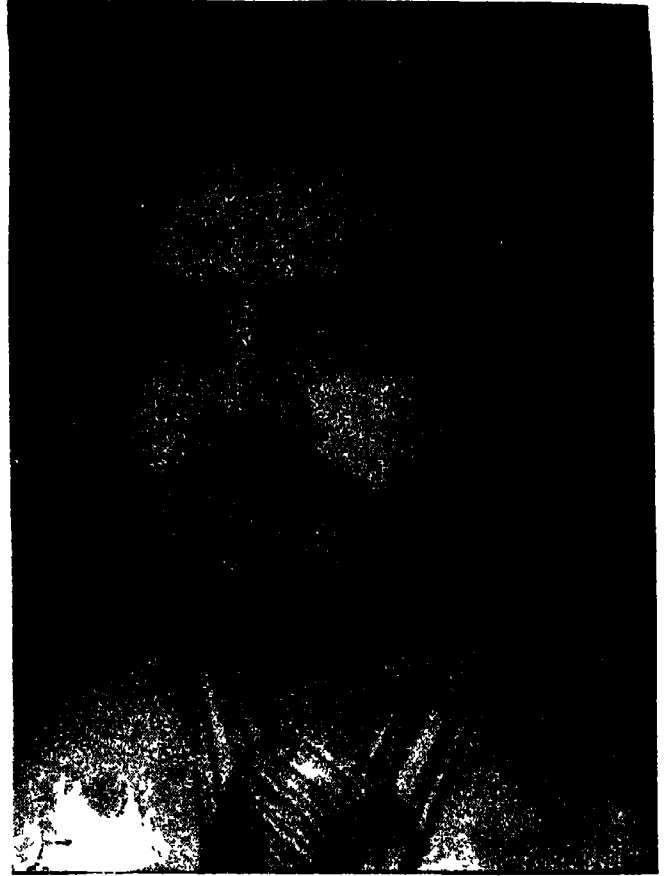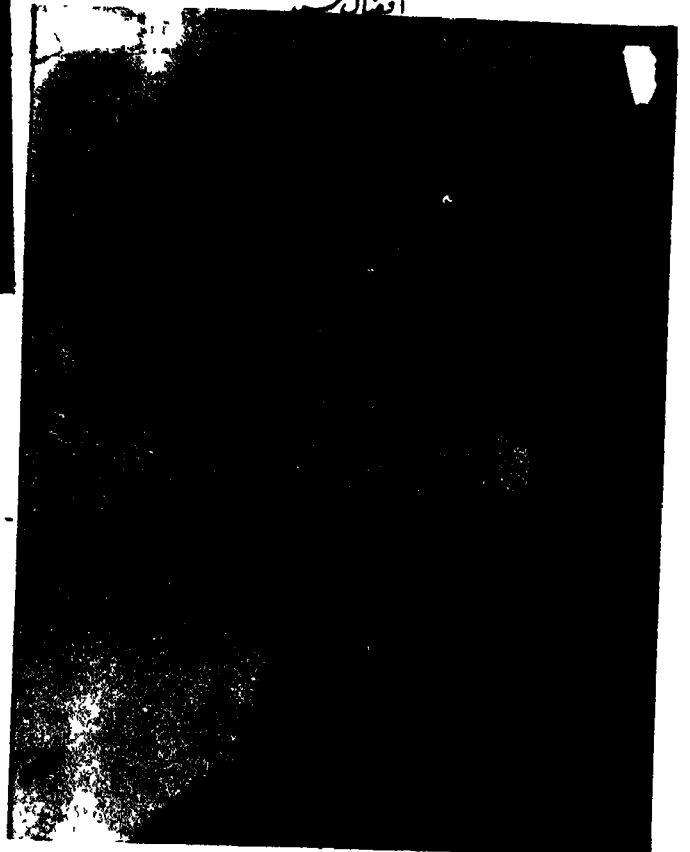
اک شہرِ صدا سینوں میں آباد ہے لیکن
اک عالمِ خاموش ہے جس سمت نظر جائے

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اُڑ کے ترے دل میں اتر جائے

اوراقِ گذشتہ کی کتاب

نشاط امروہوی

شہرت بخاری

ماہِ نو

جون ۱۹۷۹ء

صدر مجلسِ ادارت — سید امجد علی

چیف ایڈیٹر — کشور ناہید

ایڈیٹر:۔ علی محمد حسینی

جائنٹ ایڈیٹر:۔ قائم نقوی

ترتیب

سرورق ——————— جمیل احمد

جولائی کے شمارے کی جھلکیاں

احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، عبدالعزیز خالد، راغب مراد آبادی، اختر انصاری اکبر آبادی، منیر نیازی، عطا شاد، تبسم کاشمیری، توصیف تبسم افتخار عارف، محمود کنور، ڈاکٹر محمد معروف، ڈاکٹر وقار رضوی، حیدر سندھی سلیم کوثر، جمال احسانی، صابر ظفر، صابر وسیم۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۸۸۱۸ — جلد نمبر ۳۲ ——— شمارہ نمبر ۶ — طلبا کیلئے مع رجسٹری فیس ۲۰ روپے
قیمت ۲ روپے — سالانہ چندہ مع رجسٹری فیس ۳۰ روپے
مطبوعات پاکستان نے دین محمدی پریس بل روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہِ نو ۳۲ اے حبیب اللہ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

ماہِ نو

۳

فیض احمد فیض

نظم

ٹھہر گئی آسماں کی ندیا
وہ جا لگی ہے افق کنارے
اداس رنگوں کی چاند ندیا
اتر گئے ساحلِ زمیں پر
سبھی کھویا
تمام تارے
اکھڑ گئی سانس پتیوں کی
چلی گئیں اونگھ میں ہوائیں
گجر بجا حکمِ خامشی کا
تو چپ میں گم ہو گئیں صدائیں
سحر کی گوری کی چھاتیوں سے
ڈھلک گئی تیرگی کی چادر
اور اس بجائے
بکھر گئے اس کے تن بدن پر
نراس تنہائیوں کے سائے
اور اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کہ دن ڈھلے، شہر سے نکل کر
کدھر کو جانے کا رُخ کیا تھا
نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو اب دماغِ سفر نہیں ہے

یہ وقت، زنجیرِ روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

یہ وقت آئے تو بے ارادہ
میں اجنبی بن کے دیکھتا ہوں
کبھی کبھی اپنے تن بدن سے
اتار کر ذات کا لبادہ
کہیں سیاہی ملامتوں کی
کہیں پہ گل بوٹے الفتوں کے
کہیں لکیریں ہیں آنسوؤں کی
کہیں پہ خونِ جگر کے دھبے
یہ چاک ہے پنجۂ عدو کا
یہ مہر ہے یارِ مہرباں کی
یہ لعل، لب ہائے مہوشاں کے
یہ تھوک ہے شیخ کی زباں کی
یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہنِ دریدہ
پسند بھی ناپسند بھی ہے
کبھی یہ فرمانِ جوشِ وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو
کبھی یہ سرگوشیٔ محبت
کہ چوم کر پھر گلے لگا لو!

نظم

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں

لکھا گیا ہے بہت لطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں

یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدمِ مہ و سال

اس عشقِ خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
"گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے"

جون ۱۹۷۹ء

قتیل شفائی

رتجگے

سوچ کے حرف حرف عالم میں
قطرہ قطرہ خیال کی شبنم
ذہن کے پھول پھول منظر پر
پو پھٹے تک برستی رہتی ہے

تخلیق

خیالوں کے اُفق پر اک ستارا ٹمٹماتا ہے
ستارا جو کبھی موتی کبھی جگنو نظر آئے
اگر میں غور سے دیکھوں
تو اپنی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو نظر آئے

درد کا چاند

بجھی بجھی سی غموں کی اداس راتوں میں
نکھر نکھر کے اُبھرتا ہے میرے درد کا چاند
وہ چاند جس کا تبسم
ہر ایک زخم تمنا سے لپٹے آتا ہے
گئے دنوں کا حساب
وہ چاند جس کی چمک سے
دہکنے لگتے ہیں کچھ اور
حسرتوں کے گلاب
بجھی بجھی سی غموں کی اداس راتوں میں

جیلانی کامران

محبت کے سات گیت

پہلا گیت

تصوّف کے پودے پہ نیلا سا اک پھول خوابِ جدائی ہے
حلاّج لکھتا ہے اُس بے وفا سے ہمیشہ جدائی ہے
اک بے وفائی کا رشتہ ہے جس سے سلامت
زمیں آسماں کی خدائی ہے

خدنگ افگنی سے کہیں درجہ بہتر تری پارسائی ہے

محبت کا اک تیر کل دل میں اترا تھا، اک تیر
اب میرے پہلو میں تازہ ہے، خونِ کبوتر سے نذریں
مری روشنائی ہے

تجھے کون سا لفظ لکھوں؟ تجھے کس زباں میں
محبت کا مکتوب بھیجوں؟

دوسرا گیت

کہتے ہیں اک باغ دنیا ہے جس کے پرندے
درختوں میں بستے ہیں، ایسے درختوں کو ملکِ عدم کے مسافر
کئی نام دیتے ہیں، اک نام تیرا ہے
اک نام میرا ہے

ان دو اشاروں سے وہ لفظ بنتا ہے جو اپنا رشتہ ہے
میں تم سے زندہ ہوں، تم مجھ سے زندہ ہو
ہم ایک سے دو، کبھی دو سے ہم ایک ہوتے ہیں
نابود کے آستانے پہ رہتے ہیں

محبت ترے اور میرے چمن کی پری ہے
جو شبنم کے شیشے سے دن کو گزرتے ہوئے دیکھتی ہے
کبھی عرش پر اسمِ اعظم کے پہلو میں باہم کھڑی ہے!

عرش سے فرش تک ایک تم ہی ہی
آئینے کے سوا اور کیا ایسا رشتہ ہے تم مجھ کو دیکھو
نگاہوں کی قربت سے اک نقش ہی آسماں سے زمیں تک اُبھرتا ہے

وہ نقش ظاہر ہے، میرا نہیں ہے
وہ نقش ظاہر ہے، تم جانتے ہو تمہارا نہیں ہے
وہ اس کا نہیں ہے!

تیسرا گیت

کبھی تم اِدھر سے بھی آ ذ کہ · ت ہتے پر
کئی سال سے میں نے کانٹے بچھائے ہیں۔ رہِ محبت پر
عرصے سے پھر آبلہ پا کی حاجت ہے!

وحشت کی وادی سے باہر نکل کر زمانہ حراست کی دنیا میں
گم ہو چکا ہے، وہ آنکھیں
جو نرگس کے پردے میں شام و سحر ڈھونڈتی تھیں
وہ آنکھیں تمہاری نگاہوں میں گم ہو چکی ہیں

زمانے نے راہوں سے کانٹے ہٹا کر بہت دکھ دیا ہے

زمانے کو آنکھوں کی
راہوں کو اک بار پھر آبلہ پا کی حاجت ہے
وحشت کو انسان کے خوفِ غم کی ضرورت ہے۔

کئی سال کے بعد کانٹوں کو انسان کے نرم قدموں کی خواہش ہے!

چوتھا گیت

تم آگئے ہو، تو ٹھہرو
تمہارے ہاتھ میں کلیاں نہیں ہیں، کانٹے ہیں
تمہاری پیاس میں پانی نہیں ہے شبنم ہے
تمہارے پاؤں کی مٹی میں دل کی گرمی ہے
سفر کی رات کہاں تم تھے؟

ہمارے باغ میں، تم سے کئی برس پہلے
تمہارا سایہ یہاں آچکا تھا، ہم کب سے
تمہارے آنے کو نیندوں سے بے تعلق تھے!

تمہارا عشق درختوں میں پھول ہے
تمہارا نام دریچوں پہ لکھ رکھا ہے کہ تم
جب آؤ نام پکارو، دریچے وا کردو،
ہوا کو لمس سے محرم کرو، دعا کردو!

قفس میں ایک ہی بلبل تھی، ہر نئے موسم
جو سوتے جاگتے پھولوں کا ساتھ دیتی تھی،
تمہارے نام کی بلبل وہاں ہے! پہچانو!

ذرا سی دیر میں اترے گا عرش کا مالک،
تمہیں پکار کے پوچھے گا، کون آیا ہے؟
ذرا سی دیر میں لیلیٰ یہاں سے گزرے گی

تم آگئے ہو، تو ٹھہرو!

پانچواں گیت

میری کم عمر بہن
دیکھ اس جھونکے میں جو شہر ہے کوفہ ہے
دیکھ اس آگ کے شعلے میں جو لَے ہے غم ہے،
دیکھ اس وقت کے لمحے میں جو تو ہے
تو ہے : .
دیکھ اور عرش کے مالک سے دعا کر ــــ!

راستہ بھول گئے ہم،
صبح کو یثرب سے آئے تھے خراساں ٹھہرے
شہر لاہور سے ہوتے ہوئے ملتاں ٹھہرے
گنبدِ نیل سے گزرے تو صفاہاں ٹھہرے

آنکھ کے کھلتے ہی کیا دیکھا

خار کی نوک پہ جو گزرے وہ یثرب کو گئے
قافلے شرق سے ہوتے ہوئے مغرب کو گئے
ہم یہاں رک سے گئے

عشق کی شاخ پہ کل پھول ضرور آئے گا

دیکھ اور عرش کے مالک سے دعا کر
میری کم عمر بہن!

چھٹا گیت

مجھے اپنا چہرہ دکھا ——
اشتہاسا اور الفاظ کی سلطنت سے بچا،
اپنی پوشاک کا سال خوردہ لبادہ ہٹا
کون دیکھے تجھے؟
لوگ اپنے رنگ و پے میں ایسے گئے، عہدِ رفتہ ہوئے
اب تو ہر شاخِ گل پر قفس ہے
زمیں پر فقط ایک موسم ہوس ہے

تجھے دیکھنے کو وہ بامِ فلک تک گئے،
دور تک دوربینوں نے تیرے نشانات ڈھونڈے
پکارا —— مگر چاند، تارے، ہوا، ابر، بارش
زمیں آسماں چپ رہے!

کہا اہلِ حکمت نے
خاموشیوں کے جہاں میں صدا ہی صدا ہے۔
انسان کی خود کلامی صدا ہے
وہ خود اپنا حاجت روا ہے!

گئے وقت کی داستاں سے گزر، باغِ دنیا میں آ،
مجھے اپنا چہرہ دکھا ——

ساتواں گیت

اے اہلِ بصرہ ——
میرا وطن شہرِ لاہور میرا فلک بُرجِ زہرہ ہے
میں ابرِ وحشت کا ٹوٹا ہوا ایک قطرہ ہوں
میری زمیں دشتِ ملکِ عجم ہے جہاں عہدِ رفتہ میں
بادِ سحر شہرِ یثرب میں تسلیمِ عہدِ وفا بن کے آئی تھی!

دستک سنو، اور آواز دو!
جس نے پانی پہ چادر بچھائی تھی، جو تیغِ آبِ فنا پر
ترجیحِ وفا تھا کہاں ہے؟ جو پھولوں کی خوشبو، ہواؤں کی
شادابیوں پر نمازِ محبت کی محرم تھی کس آستانے کی رونق ہے؟
کون سے گھر کی زینت ہے؟

ہوا، جو خلیج اور صحرا سے آتی ہے اُن کے گزرنے کی باتیں
بتاتی ہے!

اے اہلِ بصرہ ——
پرندے تمہارے درختوں کے میرے وطن کے درختوں میں
نغمہ سرا ہیں، تمہیں دل کی دنیا میں واپس بلاتے ہیں ——
باغِ جہاں کیا ہے خوابِ دروں دیدہ جاں ہے۔
وگرنہ وہ کیا ہے جو سوتے میں ہر شے عیاں دیکھتا ہے!

ہوا میری چادر، زمیں میرا رختِ سفر ہے
وفا کے درختوں میں جو ارغوانی نشاں ہے
مری بیگمِ ہے!

انجم [illegible]

ستارۂ شام

ہوا کا جھونکا
کبھی ملا تھا جو راہ میں اور گزر گیا تھا
اس ایک لمحے میں
تیز نشتر کی طرح دل میں اتر گیا تھا

"وہ دیکھ چمکا ہے آسماں پر کوئی ستارہ
ہے کتنا روشن"
صدا کا فسوں وجود پر چھا گیا تھا، ہنس کر
کہا جو اس نے
"اسی ستارے کی طرح منزل ہے دور تیری"
گھنیری پلکوں کی چھاؤں میں دو کنول کھلے تھے
وہ بولتی آنکھیں
مانگتی تھیں جواب مجھ سے
جواب میں نے کہ میرے دل نے دیا تھا
— منزل قریب تر ہے
تری ہنسی سے ہے رمز قربت کا آشکارا"
مجھ سے مری بات
تھی دکھاوے کی ایسی خفگی
عجب خموشی تھی جیسے طوفان آ رہا ہو
وجود اپنے تھے منتظر کیفیتوں کی زد پہ
نہ جانے کیا ہو گیا اچانک
کہ تھا جو طوفان آنے والا
وہ رک گیا تھا
میں رہ گیا دل کو تھام کر، کیا گھٹا اٹھی تھی
برسنے والی تھی اور برسے بغیر گزری

ماہ نو

بازگشت

پروا کا لہرا بہتا تھا
— جھلمل جھلمل رات
گوری آنگن میں سوئی تھی
— ہوئی پرانی بات
تیسری منزل شور سڑک کا
— آنکھیں ہیں بے خواب
کس کا بدن ہے چہرہ غائب
— دریا ہے پایاب
شہر میں آکر اعظمی صاحب
— کیا کھویا کیا پایا
یاد کرو تم اس گوری نے
— تم کو بہت سمجھایا

وہ چشم آہو
نہ جانے کس حال میں کہاں ہو
ہرا ہے برسوں سے یاد کا زخم، شام ہوتے ہی
— آسماں کا وہی ستارہ
مرے دریچے سے جھانکتا ہے
اور آج تک رو برو رہا ہے
وہ ہنستا چہرہ
وہی ہنسی اور وہی خموشی

محشر جمال نیازی

ایک نعتیہ نظم

لہو کی ہمراز و ہمسفر سب جمیل یادوں کی آنکھ میں نور جل رہا ہے
تو اس زمانے سے اُس زمانے کی سمت جاتے تمام رستوں پہ چل رہا ہے

ازل سے پہلے ابد سے آگے بھی جہانوں کا درد قلب کریم میں ہے
وہ درد جیسے شعورِ عصرِ سلیم میں ہے، سرودِ عہدِ عظیم میں ہے

یہ منزلیں منزلوں کی جانب رواں رہیں گی کہ راہیں بھی رہنما بنیں گی
بچھڑتے منظر تری نگاہوں میں آ بسیں گے، صدائیں تیری صدا سنیں گی

تری تمنا ہی قلب در قلب خواہشوں کو دوام رشتے سکھا رہی ہے
یہ سچے خوابوں کے آئینے جاگتے ارادوں میں ریزہ ریزہ نجا رہی ہے

دمکتے لفظوں میں نسلِ آئندہ تیرے نقشِ حروف دیکھے گی پھر لکھے گی
ہوائے سادہ جنوں کی بستی میں تیرے نقشِ قدم دیکھے گی پھر چلے گی

میں سوچتا ہوں تری محبت دلوں میں محسوس کر کے بھی ہم یہ پوچھتے ہیں
تمہارے جذبوں میں کرچی کرچی جو جی رہے ہیں تو تم یہ بیکار جی رہے ہیں

ادھر نظر کر زندگی کے اک ایک لمحے میں تیری آنکھیں چمک رہی ہیں
غموں سے لبریز اس نگر میں جو تجھ سے منسوب ہیں وہ آنسو چھلک رہی ہیں

شجاعت علی راہی

جنگل میں ایک رات

اُوپر ستاروں کی جلتی بجھتی آبشار نرم پروں کی طرح بہہ رہی ہے
اس درخت کی شاخیں ——— جس کی جڑیں میرا تکیہ ہیں ——— کہیں آسمانوں میں کھلتی ہیں
میں سیاہ پتوں کے درمیان عنکبوت کے جالے کے واسطے سے اس ہوا کے رنگ گن رہا ہوں جو
دھنک میں بٹی جا رہی ہے
چمگادڑوں کے ریلے سرمئی ہوا میں ٹوٹی پھوٹی لکیروں کی طرح تیر رہے ہیں اور ان کی نوکیلی آوازوں
کا ارتعاش میرے جسم میں سوئیاں چبھو رہا ہے
مگر نیم گرم شاخوں میں بسیرا کرنے والے ننھے منے ریشمی پرندوں کی گرمی میرے نتھنوں میں گھس کر
مجھے ٹھٹھرنے کی اذیت سے بچا رہی ہے
(شکر ہے میرے ننھے منے پرندو، ورنہ میں تو برف اور پالے کی طرح ہوا کی ساری ٹھنڈک اپنے
اندر جذب کرنے کی عادت سے مجبور ہوں)
ننگے درخت کے اوپر ہوا، گرد، سیاہی، آسمان اور تاروں کا بوجھ ہے
میں بھی ننگے سر ہوں ——— میرے اوپر بھی اور سب سانس لینے والی چیزوں کی زندگی کا
بوجھ ہے
دور اس پہاڑی پر کوئی آگ روشن کئے مجھے کہہ رہا ہے کہ تم اکیلے نہیں ہو
سب کہتے ہیں میں بے چشم ہوں
لیکن کیا خواب دیکھنے اور حقیقت کو چھونے کے لئے آنکھوں کی بیساکھی ضروری ہے؟

نرگس

جب اس نے اپنی زرد آنکھیں کھولیں
تو چاروں اور یرقان کی حکمرانی تھی
اور لہو نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی
اس نے اپنے سرسراتے، چقماق بدن کو ہوا سے رگڑا تو بے جسم شعلے اسے کھانے لپکے
وہ کیا کر سکتی تھی
کچھ بھی تو نہیں
سو اس نے اپنے اندر کے ایندھن سے کمک مانگی
اور اپنے ہاتھوں کے قبائلی جذبے کو بیدار کیا
اور جب ہانپتے ہوئے سرخ گھوڑے سفید پانیوں میں بہہ گئے
تو وہ اپنی بے چارگی پر روئی
وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی

دریافت کا خوف

خون کی شورش مجھے تینوں سمتوں کا شعور بخشتی ہے
مگر میں لمبائی اور چوڑائی سے آگے دیکھنا ہی نہیں چاہتا
دریافت کی شاہراہیں کھلی پڑی ہیں
مگر کھلی ہوا میں سانس لوں تو مجھے متلی ہونے لگتی ہے

ڈاکٹر لئیق بابری

بودلیئر کی نثری نظم

فرانسیسی روایت کی روشنی میں

نثر کو بعض فرانسیسی نقادوں نے عام انسانی چال اور شعر کو رقص سے تعبیر کیا ہے، ان کے نزدیک نثری نظم ایک درمیانی صنف ہے۔ جس کی چال گو رقص نہیں مگر اس میں رقص کی سب دلفریب ادائیں شامل ہیں۔ نثری نظم فرانسیسی ادبی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ فرانسیسی ادبی عالم نے انیسویں صدی میں نثری نظم کی صورت میں جنم لینے والی نئی صنف کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا،

(۱) موریس ڈگیریں MAURICE DEGUERIN
(۲) الفونس ربے ALPHONSE RABBE
(۳) لوتریاموں LAUTRÉAMONT
(۴) بودلیئر BAUDELAIRE
(۵) ریں بو RIMBAUD
(۶) اور ملارمے MALLARME

ایسے عظیم اہلِ قلم نے اپنی کاوشوں سے اسے پروان چڑھایا البتہ یہ ضرور ہے کہ اس وقت کے ایک محدود حلقے نے نثر اور نظم کے باہم اختلاط کو بری نگاہ سے دیکھا، کیونکہ ان کے نزدیک نثری نظم میں قواعد و رسوم کی خلاف ورزی از حد تشویشناک تھی۔ اس سے نظم کے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض نقادوں کی بدگمانی اور بدظنی کے باوجود فرانسیسی ادب میں نثری نظم ایک جاندار صنف کے طور پر زندہ ہے، اور اسے اصنافِ سخن میں ایک مستند اور باعزت مقام حاصل ہے۔

نثری نظم کی آمد پر پریشانی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نثری نظم اپنے اندر باغیانہ عناصر سمیٹے ہوئی تھی، یہ قافیہ ردیف سے بغاوت کے طور پر پیدا ہوئی تھی، کیونکہ یہ زبان کے روایتی اصولوں کو بھی روندتی ہوئی چلی جا رہی تھی، فرانسیسی ادب میں نثری نظم دفعتاً نمودار نہیں ہوئی۔ شعری نثر کی صورت میں اس کے لئے زرخیز زمین پہلے سے موجود تھی، اور شعری نثر یعنی POETIC PROSE اصل میں بغاوت کا پہلا روپ ہے، اٹھارہویں صدی تک فرانس میں نثری نظم کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اس وقت یہ بات مسلّم تھی، کہ شاعر وہ ہے جو شعر میں لکھتا ہے۔ RHYME اور میٹر ضروری لوازمات میں سے ہیں۔ شعر اور موسیقی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور شعر گایا جاتا ہے۔ پڑھا نہیں جاتا۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں تنگ ادبی حدبندیوں کے خلاف بغاوت کے رجحان نے زور پکڑا اور یہ مانا گیا کہ شاعری پہلے سے طے شدہ کسی بھی ہیئت کی پابند نہیں، اہلِ قلم اس بات کو تسلیم کرنے لگے کہ قافیہ ردیف جوڑنے سے کوئی شاعر نہیں بن جاتا، شعری نثر موجود تھی، اور یہ سوچا گیا کہ جب نثر میں بذاتِ خود شعر بننے کی صلاحیت ہے تو پھر کیوں نہ نثر کی راہوں پر شعر کی تلاش ہو، ویسے بھی جب شاعر کو نظم کی کلاسیکی ہیئت منجمد ہوتی نظر آئی، سانچے زنگ آلود ہوتے دکھائی دینے لگے، تو پھر یہ ضروری ٹھہرا کہ آزاد راہوں کی جستجو ہو، تاکہ انسان کو نئی زبان ملے جو انسانی زندگی کے اندر اور باہر تلاطم کا ساتھ دے سکے، چنانچہ اسی شعری نثر POETIC PROSE سے نثری نظم POEM IN PROSE کی طرف بڑھنے کے امکان کی طرف بودلیئر یوں اشارہ کرتا ہے:

"ہم میں سے کون ایسا ہے، جس نے اپنی اُمنگوں کے زمانے میں ایک شعری نثر کے معجزے کا خواب نہ دیکھا ہو، ایک ایسی شعری نثر جو موسیقیت سے لبریز ہو، بغیر وزن کے، بغیر قافیے کے، لیکن اتنی لچکدار، اتنی منجھی ہوئی کہ روح کے اتار چڑھاؤ، تصور کے مدوجزر اور شعور کی شورشوں کا ساتھ دے سکے، خاص طور پر بڑے شہروں کی سیاحت اور ان کے ساتھ بے شمار روابط

ماہِ نو

کے بعد بہ نصب العین دل پر مسلط ہوتا ہے!!
"محبِ گرامی! آپ نے بھی تو ایک شیشہ گر کی نوائے جگر خراش کو ایک نغمے میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان سوگوار اور اداس خیالات کو جو یہ صدا گلی کی گہری دھند میں سے کوٹھوں تک بھیجتی ہے، ایک شعری نثر میں بیان کیا ہے"

ان سطور میں تخاطب فرانسیسی مصنف آرسن حتے (ARSENE HOUSSEY) سے ہے، جس کے سامنے بودلیئر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ نثری نظم کا موجد نہیں۔ اور یہ کہ اس کے پیشِ نظر الوئے سیوس برتراں (ALOYSIUS BERTRAND) کی مشہور کتاب GAS PARD DE LA NUIT. تھی، جس کی ورق گردانی کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ جدید تجریدی زندگی کی کہانی بیان کرنے میں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے، جو اس نے زندگیِ قدیم کی دلربا مصوری میں برتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ فرانسیسی ادبی تاریخ میں بودلیئر پہلا شخص ہے۔ جس نے نثر کے شعری امکانات کا پورا احساس کر کے اسے جدید شاعری کی ہیئت کے طور پر استعمال کیا ہے، تاکہ اس میں جدید زندگی کے تمام تضاد سموئے جا سکیں، اس نے محسوس کیا کہ یہ نئی صنف نئے ضوابط کی متقاضی ہے۔ شعری تراکیب چسپاں کرنے یا شعری لے اختیار کرنے سے، نثری نظم جنم نہیں لیتی، بودلیئر اس معاملے میں غلط نہیں کہتا، جب وہ اس میں "طرزِ احساس" اور اظہارِ بیان کے لحاظ سے بالکل نئی بات دیکھتا ہے۔

بودلیئر کے ہاں تضاد اور تنوع کی خواہش اصل میں لہجے کی وحدت کے قدیم اصول کی خلاف ورزی ہے، مگر یہ بات جدید زندگی کی وحدت کی بجائے اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی شہادت دیتی ہے، رومانوی شاعری نے بلاشبہ شعری ہیئت کے سانچے میں تبدیلی پیدا کی۔ وکٹر ہیوگو VICTOR HUGO نے اس کا عملی اظہار کیا۔ سینٹ بو (SAINTE BEUVE) نے نثری اور شعری سرحدوں کو قریب لانے کی کوشش کی خود بودلیئر نے اپنی پابند نظموں کے مجموعہ "شگوفہائے شر" یعنی (FLEURS DU MAL) میں RHYMIC REGULARITY. کو توڑا ہے، اور نثر کا آہنگ پیدا کیا ہے، جیسا کہ اس نے اپنی نظم "سفر" LE VOYAGE میں مکالمے کا انداز پیدا کیا ہے، مگر یہ ماننا پڑے گا کہ پابند نظم کی پُرسکون رفتار جدید زندگی کی پُرہیجان کیفیتوں کا ساتھ نہیں دے سکتی، اور پابند نظم کے CLICHE'S جدید صنعتی زندگی کی ترجمانی سے قاصر تھے۔

بودلیئر نثری نظم کی کٹھن وادی میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے ادبی عقائد کا اظہار پابند نظموں میں کر چکا تھا، اس نئی صنف میں وہ نہ صرف کامیاب ہوا، بلکہ اس کی اس کاوش نے جو اس کی موت کے بعد ایک مجموعے "چھوٹی نثری نظمیں" (LES PETITS POEMS EN PROSE) کے نام سے شائع ہوئی فرانسیسی ادب میں ایک شاہکار کا رتبہ پایا، اور جسے بعض نقادوں نے اس کی پابند نظموں کے مجموعہ "شگوفہائے شر" سے بھی اونچی تخلیق گردانا، بودلیئر نے نثری نظموں کا مجموعہ تیار کرنے کا ارادہ ۱۸۵۷ء میں کیا، جبکہ وہ کئی نثری نظمیں بعض رسالوں میں شائع کر چکا تھا، اس کے نزدیک یہ تخلیق اتنی اہم تھی کہ زندگی کے آخری ایام تک اس کے لئے کام کرتا رہا۔ حالانکہ اس کی صحت اور اس کی قوتِ ارادی اس کا ساتھ چھوڑ بیٹھی تھی، بودلیئر نے اپنی نثری نظموں کے مجموعہ کا دوسرا نام SPLEEN DE PARIS یعنی "پیرس کا کرب" رکھا، سپلین فرانسیسی میں ایک مابعد الطبیعاتی کرب۔۔۔ METAPHYSICAL DISTRESS یا خلش کو کہتے ہیں،

بودلیئر نے نثری نظموں کے اس مجموعے میں زیادہ سے زیادہ تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تنوع کا یہ عالم ہے کہ بعض اوقات ایک ہی نظم کے اندر لہجہ دفعتاً بدل جاتا ہے۔ مثلاً فن کار کی مناجات

LE CONFITEOR DE L' ARTISTE.

قدرتی مناظر پر غور و فکر سے گذرتی ہوئی فنی مبادیات کے بیان پر جا ختم ہوتی ہے، درحقیقت بودلیئر پابند نظمیں لکھنے کے بعد اب زیادہ سے زیادہ لچک کے ساتھ "تصور کی جولانیوں" اور "ضمیر کی شورشوں" کا ساتھ دینا چاہتا ہے، پابند نظم اس کا راستہ روکتی ہے اور وہ اپنے بیان کے لئے اور وسعت چاہتا ہے، اور غالباً اسی وجہ سے وہ آخری عمر میں نثری نظم کو اظہار کا ذریعہ بناتا ہے۔

بودلیئر کی نثری نظموں کا مجموعہ "پیرس کا کرب" شہر کی تلخیوں، المناکیوں، اداس مشاہدات اور حسین خوابوں کی پیوند شدہ رنگین چادر ہے، یہاں ایک موضوع دوسرے موضوع کے ساتھ جڑا ہوا ہے، پہلی نثری نظم "پردیسی" میں جہاں بادلوں کی محبت کا بیان ملتا ہے، خواب کی دنیا سے متعلق ہے، یہ حقیقت میں زمین پر شاعر کا المیہ ہے، "بوڑھی عورت کی مایوسی"

یا بڑھاپے کی غمگین، اداس منظر ہے۔" فن کار کی منافقانہ فنی تخلیق کے اعلیٰ درجے سے آشنا کرتی ہے، اور جو آخر میں خواب کے رستے پر ڈال دیتی ہے، "ایک مسخرہ" "جدید انسانی حماقت کا ایک منظر ہے" ایک ایسی ذہنیت کا جسے بودلیئر پیرس کی ذہنیت کہنا پسند کرتا ہے، "ڈبل کمرہ" خواب اور حقیقی زندگی کے منظر کا امتزاج ہے اور جس سے بڑا ہی پُر درد پہلو نکلتا ہے، اسی طرح ایک نثری نظم کے بعد دوسری نثری نظم خواب اور حقیقت کے دھاگوں سے ایک خوبصورت جال بنتی چلی جاتی ہے،

بودلیئر کی اس کتاب میں بڑھاپے کے پُر درد مناظر اور مشاہدات بھی ہیں "بوڑھی عورت کی مایوسی" "غریب کھلونا" "بوڑھا مداری" پھر غربت اور شاعر کی مفلسی بھی جن کے ساتھ وہ ہمدردی کا ذاتی گہرا رشتہ استوار کرتا ہے۔ اور جب وہ اپنے اس رشتے کی توسیع ہجوم اور جانوروں تک کرتا ہے، جیسے "ڈبل کمرہ" "غریب کا کھلونا" "اناڑی شیشہ گر" "غریبوں کی آنکھیں" "اچھے کتے" "ایک اور ہجوم"۔ تو درمیان میں ہی ایک HYSTERICAL ردِ عمل انسانیت پسندی کے خلاف پیدا ہو جاتا ہے جیسے "غریبوں کی پٹائی" بودلیئر کی اس کتاب میں محبت اور اس کی بے مہریوں کے بھی مناظر ہیں۔ جیسے "دیوانہ اور محبت کی دیوی" پھر اس کی پُر اسرار دنیا "گھڑیاں" اور "مصوری کی خواہش" آج کے صنعتی دور کا جدید شہری بودلیئر کی نثری نظموں کے اس مجموعہ "پیرس کا کرب" میں اپنے مسائل کی تصویر دیکھتا ہے۔ ان نظموں کا ایک بنیادی موضوع وقت کا المیہ ہے۔ ہم سب "خود شعور قیدی"

ہیں، وقت کی قید سے رہائی ناممکن ہے۔ ان نظموں میں زمان و مکان کا دوہرا تالا انسانی ہستی کو مقید کیے نظر آتا ہے، اور اگر کبھی انسان اس قید خانے سے باہر نکل سکتا ہے۔ تو وہ خواب کے دروازے سے، جیسے "ڈبل کمرے" میں وقت غائب ہو گیا ہے، جیسے ریں برد (RIMBAUD) کے ہاں "ابد پھر مل گیا ہے" یا پھر بودلیئر کے ہی ہاں بلیوں کی آنکھوں میں "ابد کی گھڑی ہے" اور جسے ابد مل گیا تو یہ اس کی نجات ہے۔

فرانسیسی شاعری کی تاریخ میں وکٹر ہیوگو سے قطع نظر بودلیئر پہلا فرانسیسی شاعر ہے جس نے شہر اور شہر کے بسنے والوں کے دکھ درد کو موضوعِ سخن بنایا ہے، وہ خود پیرس کا شہری تھا، اور اسے پیرس کے بُرے بھلے سے محبت تھی، فطری نظاروں کی دلکشی بودلیئر کے ہاں اہمیت نہیں رکھتی، انسان، آج کا مہذب شاعر اور اس کی شخصیت میں خیر و شر کے درمیان ایک ابدی کشمکش، بودلیئر کے ہاں یہی سب سے اہم مسئلہ ہے، بودلیئر کی نثری نظم اسی ستم زدہ انسان کی تلاش میں رہتی ہے، وہ جب بھی فطرت کے چہرے سے نقاب اٹھا دیکھتا ہے، تو اس کا رشتہ کسی انسانی کیفیت کے ساتھ جوڑ لیتا ہے، جسے وہ اپنی زبان میں CORRESPONDANCE یعنی مطابقت کہتا ہے، وہ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانکتا ہے تو اس کے کڑوے پن سے اسے انسانی زندگی کی تلخیاں یاد آتی ہیں، "شگوفہ ہائے شر" میں اپنی نظم "انسان اور سمندر" کا آغاز اس طرح کرتا ہے،

"آزاد انسان تو سمندر سے محبت کرے گا
سمندر تمہارا آئینہ ہے
تو اس کی لہروں کے لازوال اتار چڑھاؤ میں غور
کرتا ہے
اور تمہارا نفس بھی تو اس سے کم گہرا اور کم کڑوا
نہیں"

فرانسیسی مصنف دانیل روپس DANIEL ROPS کہتا ہے کہ بودلیئر اپنی نثری نظموں کی کتاب کو پیرس کی زندگی پر غور و فکر سے شروع کرتا ہے، خود تو بادلوں کے خواب میں کھو جاتا ہے، مگر ہمیں شدید کرب میں مبتلا چھوڑ جاتا ہے۔

مگر اس میں بودلیئر کا کیا قصور؟ انیسویں صدی نے صنعتی دور کے آغاز پر نثری نظم سے جو تقاضا کیا وہ یہی تھا کہ اسے بتایا جائے کہ نسلِ انسانی کے مقدر میں کیا لکھا ہے، بودلیئر کی نثری نظموں کا مجموعہ "پیرس کا کرب" اسی سوال کا جواب ہے، بودلیئر کی نثری نظمیں جدید دور کی انسانی زندگی کی المناک مگر بڑی ہی موثر تصویریں ہیں،

بودلیئر کی ان کاوشوں سے ایک بات جو عیاں ہے وہ یہ ہے کہ نثری نظم کی تہہ میں ایک نئی زبان کی تلاش کا مسئلہ ہے۔ زبان کی نئی قوتوں کی جستجو ہے۔ زبان کی قید سے رہائی کا جتن ہے۔ پرانی ہیئت کے سانچے کو توڑ کر ایک نئی ہیئت کی تشکیل کر کے ادب کی حد بندیوں سے دور نکل کر نثری نظم زبان کی سرحدوں سے بھی پار جانا چاہتی ہے اس لئے کہ شاعری کی موت زبان کی سرحد کے پرے ہے۔

ماہ نو

انور سدید

یورپی ادب میں رومانویت کی تحریکیں

یورپ میں رومانویت کی پہلی تحریک چوتھی صدی قبل مسیح کے لگ بھگ یونان سے شروع ہوئی۔ قدیم یونانی دیومالا میں جو تخلیقی لپک ہے۔ اسے بجا طور پر رومانوی کہا جا سکتا ہے[1]۔ دیوتاؤں کے خلاف بغاوت، آبا سے سرکشی اور جنسی آوارگی کے جو افسانے زیوس اور ہیرا کے اسطور میں ملتے ہیں۔ ان سے قدیم روایات کو توڑنے کا واضح سراغ ملتا ہے۔ نفسیات کی اصطلاح ایڈی پس کمپلیکس جس میں بیٹا باپ کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ یونانی دیومالا سے ہی ماخوذ ہے رومانویت کے ابتدائی نقوش یوریپیڈیز کے المیوں TRAGEDIES میں بھی ملتے ہیں۔ المیہ چونکہ شخصیت کے جمود کو توڑتا اور فرد کو ذہنی طور پر متحرک کرتا ہے اس لئے ارسطو نے اسے تزکیہ نفس (کتھارسس) کا ایک عمدہ وسیلہ قرار دیا ہے۔ اس زاویئے سے دیکھئے تو المیہ میں جو داخلی لپک موجود ہے یہ بالواسطہ طور پر رومانویت کا ہی اہم عنصر ہے۔ یوریپیڈیز کے المیے نے اسی اہم عنصر کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے تاہم یوریپیڈیز کو تاریخ ادب کا اولین رومانی اس لئے قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس کے المیوں میں رومانوی عناصر منتشر صورت میں ہی ملتے ہیں۔ تاریخ ادب کا یہ واقعہ حیرت انگیز ہے کہ افلاطون نے اپنی مثالی ریاست سے شعرا کو یکسر خارج کر دیا تھا۔ لیکن اس نے جو نثر لکھی وہ شعر سے زیادہ دلآویز تھی[2]۔ اور اس نے مثالی ریاست کا جو تصور پیش کیا۔ اس میں یوٹوپیا کے تمام رومانوی عناصر موجود تھے۔ مکالمات افلاطون بظاہر نثر کی کتاب ہے۔ لیکن اس میں جذباتی تموج موجود ہے۔ اور یہ روح کو جسم کی حدود سے پرواز کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ عہد یونان کا اولین رومانی افلاطون ہے بقول ہربرٹ گریرسن افلاطون کی انفرادی عطا یہ ہے کہ اس نے رومانویت کو فلسفیانہ بنیاد عطا کی[3] اور سپنسر، ورڈز ورتھ، شیلے، شیلنگ اور نٹشے نے اسے اپنے نظریات کی وضاحت کے لئے سند کے طور پر استعمال کیا۔ چنانچہ شیلے لکھتا ہے کہ

"افلاطون کے فلسفے میں دو چیزوں کا عدیم النظیر اجتماع ملتا ہے۔ ایک صحیح اور دقیق منطق دوسرے شاعری جس میں وہ خروش ہے۔ جو اپالو کے ہاتف غیبی کے ساتھ مخصوص ہے یہ دونوں شوکتِ الفاظ اور نغمگی سے مل کر غنائی تاثرات کی ایک تیز و تند ندی بن جاتے ہیں۔ جس کی لہروں پر دلائل دائما گرم رفتار نظر آتے ہیں"

چنانچہ افلاطون کی دوسری بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے فلسفہ اور شاعری کا حسین امتزاج پیش کیا۔ گہرے مسائل کے اظہار کے لئے شگفتہ و شیریں تخلیقی زبان استعمال کی اور کلاسیکی تحریک کے فروغ کے زمانے میں رومانویت کے عناصر کی نشان دہی کی افلاطون کی نثر کلاسیکیت کے معیار نقد پر بھی پوری اترتی ہے۔ لیکن فائیڈرس (PHAEDRUS) میں اس کا تخلیقی جذبہ زیادہ تر روحانی جزیروں کی سیاحت کرتا ہے۔ اور صاف نظر آتا ہے کہ وہ کلاسیکی کم اور رومانی زیادہ ہے

افلاطون کی تیسری بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے فرد کو اپنے داخل کی طرف متوجہ ہونے اور چھٹی حس پیدا کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کا قول ہے کہ فرد بذاتِ خود کائنات ہے یا عشر آئینہ چنانچہ افلاطون کے ان رومانوی خیالات نے اتنی کشش پیدا کی کہ بقول ول ڈیورنٹ ازمنہ وسطیٰ میں خلد، اعراف اور دوزخ کے جو تصورات رائج ہوئے وہ افلاطون کی تصنیف "جمہوریہ" کے آخری جزو پر مبنی تھے[4]۔ اور ایک ہزار سال تک یورپ پر اس قسم کے محافظ حکمران رہے جنہیں افلاطون کی چشم تصور دیکھ چکی تھی۔ رواقیوں اور نو افلاطونیوں نے جو فلسفہ مرتب کیا اس کی اساس افلاطون کے نظریات پر قائم تھی اور سینٹ کی تحریک نو قے کی عیسائیت بھی افلاطون کے "شاہانہ افسانوں" سے ہی

---

1. H.L. Lucas—The Decline and Fall of Romantic Ideal—P. 57.
2. Will Durant—The Story of philoosophy—P. 9.
3. Herbert Grierson—The background of English Literature. P. 235.
4. Will Durant—The story of Philosophy—P. 40.

قوت کشید کرتی رہی۔ پس افلاطون کی رومانوی تحریک نے صرف اپنے عہد کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ اس کے اثرات زمان و مکان کی حدود سے بھی ماورا ہو گئے اور اس کے نظریات آج بھی ادب کی دنیا میں ایک محشر تنقید بپا کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ رومانوی تحریک کو جب بھی فروغ حاصل ہوتا ہے اس کے ماخذات افلاطون کی فکر میں تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

رومانویت کی دوسری بڑی تحریک پہلی صدی قبل مسیح کے لگ بھگ رونما ہوئی۔ اس وقت تک افلاطون کے نظریات کی رومانوی یلغار کو پہلے ارسطو اور پھر ہوریس مائل بہ اعتدال کر چکے تھے۔ بعض ناقدین نے رومانویت کے کچھ آثار ہوریس میں بھی تلاش کئے ہیں۔ تاہم ہوریس نے چونکہ ارسطو سے زیادہ استفادہ کیا تھا اور وہ ادب میں رومی دربارداری، نفاست اور تصنع کو پروان چڑھانے کا داعی تھا اس لئے تخلیق کی وہ بے ساختگی جو صرف عرفانی لمحے میں حاصل ہوتی ہے ہوریس کے ہاں مفقود ہے۔ چنانچہ وہ جذبے کے ترفع کے بجائے تخلیق کو بار بار مانجھ کر بہتر سے بہتر بنانے پر زور دیتا ہے[5]۔ اور اسی وجہ سے ہوریس کو نوکلاسیکیت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔

ہوریس کے برعکس لونجائنس نے ادب کو غیر ارضی چیز قرار دیا[6] اور اس سے جو لطف و سرور حاصل ہوتا ہے اسے ایک ایسی علوی کیفیت قرار دیا جو ضابطوں اور اصولوں سے بلند ہے۔ لونجائنس کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس نے ارسطو کی خشک منطق کو تازگی اور رفعت عطا کرنے کے لئے ایک نیا لفظ (HYPSOS) استعمال کیا جو ان تمام صفات کا احاطہ کرتا ہے۔ جو خروش جذبہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور انسان پر وجد کا عالم طاری کر دیتی ہیں۔ لونجائنس لکھتا ہے۔

"اعلیٰ زبان و بیان کا اثر یہ نہیں کہ وہ سامعین کو ترغیب دے بلکہ انہیں محو کر دے اور ہر دور میں اور ہر طرح سے جو چیز ہمیں وجد میں لا کر استعجاب میں ڈال دے، بمقابلہ اس بیان کے جو ہمیں ترغیب یا تسکین دے زیادہ مؤثر اور پر زور ہوتی ہے۔ یہاں جس حد تک ترغیب دی جا سکتی ہے۔ یہ بات عام طور پر ہمارے قابو میں ہوتی ہے۔ لیکن یہ علوی حصے زبردست قوت، دلربائی و کمال فن سے اپنا گہرا اثر چھوڑتے ہیں اور سامعین کو اپنی مٹھی میں لے لیتے ہیں"[7]

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے سامع کے تقاضوں کو زیادہ ملحوظ نظر رکھا ہے اور تخلیق یا ادیب کا تذکرہ نہیں کیا۔ تاہم اس اقتباس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں لونجائنس نے رومانویت کے بعض ضروری عناصر کی واضح نشان دہی کر دی ہے۔ اور یوں فن کا تخلیقی رشتہ علوی دلربائی کے ساتھ قائم کر دیا ہے جو خارج کے مقابلے میں سحر انگیز اثرات مرتب کرتی ہے۔

لونجائنس کا زمانہ زیادہ تر تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق وہ یونان کا رہنے والا تھا[8]۔ ایچ۔ ایل۔ لوکس نے رومۃ الکبریٰ کی پہلی صدی کو لونجائنس کا عہد قرار دیا ہے[9]۔ اس لحاظ سے پہلی صدی قبل مسیح میں جب روم میں نوکلاسیکی تحریک عروج حاصل کر رہی تھی۔ یونان ایک مرتبہ پھر رومانویت کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ اور لونجائنس کے نظریات کلاسیکی تصورات کے ساتھ نبرد آزما ہو چکے تھے۔ لونجائنس کو حیات نو سترھویں صدی عیسوی میں ملی جب فرانسیسی مصنف بوآلو نے اس کا ترجمہ کیا اور یوں رومانوی ادیبوں کو اپنے نظریات کی ایک مضبوط سند حاصل ہو گئی۔ چنانچہ لونجائنس کو رومانویت کی دوسری بڑی تحریک کا بانی قرار دیا گیا ہے تو اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

رومانویت کی تیسری بڑی تحریک کے پس منظر میں روسو کے نظریات متحرک قوت کے طور پر سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ اور وہ بجا طور پر رومانویت کی اس سب سے بڑی تحریک کا نقطہ آغاز قرار پاتا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ روسو نے رومانویت کی جو مشعل روشن کی تھی ادب میں اس کی اوّلین کرنیں پرسی نے قدیم انگریزی شاعری کی باقیات RELIQUES OF ANCIENT ENGLISH POETRY. اور جرمن شاعر ہرڈر HERDER نے "قوموں کی آوازیں" VOICES OF NATIONS[11] میں عوامی گیت اور شاعری کے نمونے جمع کر کے بکھیریں[12]۔ مرصع کلاسیکی شاعری کے مقابلے میں نامعلوم شعراء کے یہ گیت اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان میں فطرت کی سادگی، تازگی اور تنوع ہے۔ انسانی جذبے پر تہذیب کا مصنوعی غازہ موجود نہیں اور یہ فطرت کے حسن کو معصومیت کی زبان میں ادا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کشش نے گوئٹے، برنز BURNS بلیک، کالرج اور ورڈزورتھ کو یکساں طور پر متاثر کیا اور ان گیتوں کے بیشتر عناصر فطری طور پر ان کی شاعری کا جزو بن گئے۔

رومانویت کی اس تحریک کو اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں یورپ میں شیکسپیئر کی بے پناہ مقبولیت نے بھی فروغ دیا۔ شیکسپیئر جسے ہمیشہ کلاسیکی تحریک نے اپنانے

ماخذ

۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ ارسطو سے ایلیٹ تک ص ۱۹

۶۔ H.L. Lucas—The Decinne and Fa.. of the Romantic Ideal— F. 58

۷۔ لونجائنس On great writing. ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ ارسطو سے ایلیٹ تک ص ۱۵۱

۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ ارسطو سے ایلیٹ تک ص ۱۵۱

۹۔ H.L. Lucas—The Decline and Fall of Romantic Ideal P. 57.

۱۰۔ Janko Lavrin—Studies in European Literature P. 10.

ماخذ

کی کوشش کی ہے اس دور میں والٹر کی شدید تنقید کا ہدف بنا۔ لیکن ابھرتی ہوئی نوجوان نسل نے شیکسپیئر کے فن میں اپنے خوابوں کی تعبیر پالی۔ چنانچہ وہ خیالی جنت جس کا خواب عہدِ وسطیٰ کے یونان میں دیکھا جاتا تھا شیکسپیئر کے ڈراموں میں حقیقت بن کر سامنے آگیا۔ بیشتر کلاسیکی شعرا کے مقابلے میں شیکسپیئر چونکہ کسی بڑی یونیورسٹی کا سند یافتہ نہیں تھا۔ اس لئے نوجوانوں نے ادب کی تخلیق کے لئے تعلیمی معیار کو سند ماننے سے انکار کر دیا اور تخلیق کا رشتہ کسی ایسی طاقت سے قائم کر لیا جو پس پردہ رہ کر نسبتاً کم تعلیم کے شاعر پر بھی اپنی لطافتیں نچھاور کر سکتی ہے۔

یورپ کی رومانوی تحریک کو ناول کی صنفِ ادب نے بھی کروٹ دینے کی کوشش کی۔ ماضیِ بعید میں مسز ریڈکلف اور ہوریس والپول وغیرہ نے رومانوی ناول لکھ کر عوام کی رگوں میں خونِ گرم دوڑا دیا تھا۔ لیکن اب وقت نے ان ناولوں پر گرد کی دبیز تہہ چڑھا دی تھی۔ نئے عہد میں رچرڈسن[11] نے پامیلا اور جذباتی سفر لکھ کر اس گرمی کو تیز تر کر دیا تھا۔ فکری سطح پر لوک اور ہیوم کی عقلیت اور سمتھ اور بنتھم کی اجتماعیت سے بلیک کی وجدانی قوت برسرِ پیکار تھی۔ چنانچہ جب برنز[12] نے مدھم سریلی آواز میں لکھوتی "نظمیں" لکھیں، بلیک[13] نے "معصومیت کے نغمے" اور ورڈزورتھ اور کالرج[14] نے "لیریکل بیلڈ" تصنیف کئے تو عقلی فلسفہ جو جذبے پر مشین کو مسلط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس یلغارِ حسن کا سامنا نہ کر سکا اور نئی نسل نے رومانوی شعرا کو اپنے احساسات سے قریب تر محسوس کرنا شروع کر دیا۔

یورپ کی رومانوی تحریک کا اہم ترین محرک انقلابِ فرانس تھا۔ نپولین سے پہلے فرد نے عالمی مساوات کا جو خواب دیکھا تھا۔ فتح کے بعد اسے فوجی آمریت نے یکسر شکستہ کر دیا۔ صنعتی ترقی نے متوسط طبقے کو اہمیت تفویض کی لیکن امرا اسے تسلیم کرنے سے گریزاں تھے اور حکام اسے فوجی طاقت سے دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب نے جن ولولوں کو پروان چڑھایا اب انقلاب کی کامیابی انہیں سرد کرنے کے درپے تھی۔ یوں بھی انقلاب رستاخیز کو تو خوب ہوا دیتا ہے اور پرانے نظام کو منہدم کرنے کے لئے فاضل قوت کا بے پناہ ذخیرہ جمع کر لیتا ہے لیکن یہ قوت تعمیر کے لئے کم اور تخریب کیلئے زیادہ صرف ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامیابی کے بعد جب عوام اپنی فاضل قوت ضائع کر دیتے ہیں۔ تو ان پر نقاہت بے بسی اور ضعف کے آثار طاری ہونے لگتے ہیں۔ انقلاب کے فوراً بعد اگر کسی نئی تخلیقی سرگرمی کا آغاز ہو جائے تو عوام دوبارہ نئی قوت سے سرشار ہو جاتے ہیں اور قوم انتشار کا شکار نہیں ہوتی۔ انقلابِ فرانس نے صرف حاکمیت کے مہروں کو تبدیل کیا تھا۔ نئے حکام نے کسی نئی تعمیر کو عمل میں لانے کے بجائے پرانے جاگیرداری نظام کو ہی مستحکم کرنے کی کوشش کی اور فرد کے اعصاب کو مضبوط فولادی شکنجوں میں جکڑنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرد نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا شروع کر دیئے اور اس آئیوری ٹاور میں پناہ لینے کی کوشش کی جو اس کی تخیلی آرزوؤں کو آسودگی اور اس کے خوابوں کو تسکین دے سکتا تھا۔ یہ آئیوری ٹاور حقیقت کی دنیا میں محض ایک سراب تھا۔ اس لئے فرد نے اسے اپنے داخل میں تعمیر کیا۔ چنانچہ اسے ان تخلیقات میں زیادہ لذت محسوس ہونے لگی۔ جن کا نغمہ اس مرمریں محل کی غلام گردشوں میں سے سرسراتا ہوا گزرتا اور غم زدہ دل پر شبنم کی پھوار بن کر برسنے لگتا۔ انقلابِ فرانس نے جن لوگوں کی امیدوں کو شکستہ کیا تھا ان میں ورڈزورتھ اور شیلے بھی شامل تھے۔ اوّل الذکر نے اپنے دکھ کو فطرت کی گود میں سر رکھ کر مٹانے کی کوشش کی اور مؤخر الذکر نے انقلاب کی روح کو اپنی ذات میں سمیٹ لیا اور وارفتہ خیالی سے انسان کو جسم کی زندانی پابندیوں سے بالاتر کر دیا۔

مغرب میں رومانویت کی اس تحریک کا اپنا اثر ردِ عمل سب سے پہلے جرمنی میں ہرڈر نے نافذ کیا۔ روسو اس وقت زندہ تھا اور اس کی کتابیں (CONTRACT SOCIAL) اور EMILE حال ہی میں شائع ہوئی تھیں۔ فرانس انقلاب کے دہانے پر کھڑا تھا اور جرمنی میں ایک نئی تحریک اس کے اثرات کو تیزی سے قبول کر رہی تھی۔ اس تحریک کی ابتدا کا سہرا ایک لاابالی نوجوان ہرڈر (HERDER) کے سر ہے۔ اس نے شیکسپیئر کا ڈرامہ ہملٹ بلا استیعاب پڑھا تھا اور اس کے ذہن پر اس نے گہرے اثرات ثبت کئے تھے۔ ہرڈر شاعری کو انسانیت کی زبان تصور کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا قول ہے کہ "اس پیغمبرانہ آواز کی نقل نہیں ہو سکتی"۔ اس نے جرمنی کی قدیم شاعری کے ترجمے کئے اور ان سے اپنے وطن کی روح دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ہرڈر کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے جرمنی کے شعرا کو روم اور یونان کے پرانے کارناموں سے نجات دلا کر اپنے قومی مزاج کے مطابق شاعری تخلیق کرنے کی دعوت دی اور یوں رومانویت کی اس فضا کو جو قدیم شاعری میں موجود تھی اپنے زمانے سے متعارف کرا دیا۔

اس عہد کا دوسرا اہم نام جیمز میکفرسن (JAMES

-۱۱ Richardson—Pamela 1740
Sentimental Journey 1768.

-۱۲ Burns—Poems 1786.

-۱۳ Blake—Songs of Innocence 1789.

4. Wordsworth and Coleridge—-۱۴
Lyrical Ballads—1796.

سے [15] میکفرسن MACPHERSON) نے قدیم جنگجو بہادروں کی نظمیں جمع کیں۔ اور انہیں انگریزی زبان کے فطری لہجے میں ڈھال دیا۔ ان نظموں کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں جانسن نے ہدفِ تنقید بنایا اور میکفرسن پر دھوکا بازی اور دروغ گوئی کا الزام بھی عائد کر دیا۔ جانسن کی اس پر زور منفی تنقید نے میکفرسن کو مزید شہرت دی اور وہ اپنے عہد کا پہلا نثری شاعر تسلیم کیا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ میکفرسن کو اپنے ملک میں تو کوئی اہمیت نہ ملی لیکن اس کی تراجم شدہ نظموں کے رومانوی جذبات نے جرمنی کے نوجوانوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ چنانچہ کلینگر (KALINGER) لینز (LENZ) مُلر (MULLER) اور ویگنر WAGNER جیسے نوجوان منظر پر ابھرے جن کی رگوں میں خون کے بجائے سیماب موجزن تھا۔ اور وہ اپنے شوقِ بےتاب کی لپیٹ میں پورے ملک کو لینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انہیں میں جرمنی کا عظیم شاعر گوئٹے بھی تھا جس کی تصنیفات "ورتھر" رومانویت کے جذباتی زاویے کی اور "فاؤسٹ" فکری زاویے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جرمنی میں رومانویت کا آخری نمائندہ شلر (SCHILLER) تھا [17] جس کا ڈرامہ THE ROBBERS اس تحریک کا نقطۂ انجام تصور ہوتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ گوئٹے اور شلر کی رومانویت ان کی اضافی خوبی ہے۔ چنانچہ جونہی ان کی جوانی کا ابال ختم ہوا اور ریاست کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ ان دونوں کے نظریات میں کلاسیکیت کا اعتدال و توازن آ گیا اور گوئٹے نے فن کا رشتہ عقیدے کے ساتھ قائم کر دیا۔ اور آخری عمر میں وہ اس مصلح کی صورت میں سامنے آیا جو اپنے مقلدین کو رشد و ہدایت سے فلاح کا راستہ دکھانے پر مامور ہوتا ہے۔ تاہم ان کی اس خوبی سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے تخلیق کی آفاقیت کو ابھارنے کی کوشش کی [16] اور یونان کے مثالی حسن کو عبادت کا درجہ دے دیا۔

جرمنی کی رومانوی تحریک کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فرد کو شعر و نغمہ کی ملکوتی فضا میں اڑنے پر مائل نہیں کیا۔ بلکہ رومانویت کا رابطہ مابعدالطبیعیات کے ساتھ قائم کیا۔ اور یوں عظیم تر لامعلوم کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام توضیحات کا تعلق اگرچہ فلسفے سے ہے تاہم کانٹ، فشٹے شیلنگ اور ہیگل نے ذہنِ انسانی کو جو عروج عطا کیا ہے اس سے ادب بھی براہِ راست متاثر ہوا اور بیسویں صدی نے اگلا قدم انہیں کے وسیلے سے اٹھایا۔ ان سب میں شیلنگ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے نظریات میں فطرت کا حسن ایک جداگانہ انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے [18] اور وہ فطرت کو غیر ذات تصور نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کا قول ہے کہ:۔

"فطرت ذہنِ انسانی کو تجلی عطا کرتی ہے لیکن ذہنِ انسانی فطرت پر سرپردے ڈال دیتا ہے"

بالفاظِ دیگر وہ فطرت کو مادرِ مشفق کا درجہ دیتا ہے اور عقل نے اس کے درمیان جو بُعد پیدا کر دیا ہے اسے یکسر ختم کر دینا چاہتا ہے۔ شیلنگ کی دوسری بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے فطرت کے تخلیقی عمل کو واضح کرنے کی کوشش کی اور انسانی سطح پر فن کی تخلیق کو تسخیرِ فطرت کا وسیلہ قرار دیا۔ شیلنگ کے ان نظریات نے رومانویت کا مزاج متعین کرنے میں بڑی مدد دی اور اسے فلسفے کا استدلال اور معنویت عطا کر دی۔ چنانچہ انگلستان کے عظیم رومانوی شاعر کالرج نے شیلنگ کے نظریات کو سب سے زیادہ قبول کیا [19] اور ان کے اثرات کی بازگشت "لٹریریا بیاگرافیکا" میں بھی نظر آتی ہے اور یوں رومانویت کی تحریک جرمنی سے انگلستان کی طرف مراجعت کر گئی۔

جرمنی میں رومانوی تحریک نے معاشرے کے مجموعی اندازِ فکر و عمل کو بدل ڈالا تھا۔ انگلستان میں یہ تحریک زندگی کے عملی دھارے پر تو کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہو سکی۔ لیکن شعرا اور ادبا کو اس نے شدت سے متاثر کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے رومانوی اندازِ نظر کی تخلیقات کا ایک سیلاب سا آ گیا۔ انگریز قوم چونکہ قدامت پسند ہے اس لئے اس ملک میں ادب اور جمالیات کی کوئی نئی تحریک خود بخود نہیں ابھری۔ انگریز کے تحفظِ ماضی کے رجحان نے زیادہ تر کلاسیکی روایات کو ہی مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان میں رومانوی تحریک کا فروغ پانا اور اس کے زیرِ اثر اتنی بڑی تعداد میں اعلیٰ درجے کی تخلیقات کا معرضِ وجود میں آ جانا ایک معجزے سے کم نہیں سمجھا جاتا۔

رومانوی شعرا میں اوّلین اہمیت ولیم بلیک کو حاصل ہے وہ اپنے عہد کا عظیم باغی تھا۔ اٹھارہویں صدی میں پیدا ہونے کے باوصف اسے اٹھارہویں صدی کی ہر شے سے نفرت تھی حتیٰ کہ روسو کے نظریات جنہوں نے پورے یورپ کو فکری انقلاب سے دوچار کر دیا تھا۔ بلیک کے نزدیک کچھ وقعت نہیں رکھتے تھے۔ وہ اتنا جدید تھا کہ طویل عرصے تک معاشرے نے اسے قبول نہ کیا اور اس کی شاعری کو اقلیمِ سخن سے خارج قرار دیا جاتا رہا [20]۔ درحقیقت بلیک نے اپنے لاشعور میں جو گہرا غوطہ لگایا تھا۔ اور حقیقتِ اولیٰ کو صوفیانہ انداز میں دریافت کرنے کی جو کوشش کی تھی۔ زمانہ اسے سمجھنے سے قاصر تھا

---

[15] J.B. Priestley—Literature and Western Man—P. 123.

[17] Honstan—Main currents of English Literature—P. 191.

[16] Warner-p-Friedrich-History of German Literature P. 114.

[18] J.B. Priestley—Literature and Western Man—P. 126.

[19] Peter Westland-English Literature P. 27.

[20] Emile Legouis— short History of English Literature P. 262.

ماونو

اس نے مذہب کو ذاتی تجربہ بنا کر پیش کیا اور تخلیق کو وہبی عمل قرار دیا چنانچہ ہاؤسٹن[21] نے لکھا ہے کہ "بلیک اپنے زمانۂ طفولیت میں ہر روز حضرت یسوع مسیح سے ہم کلام ہونے کا دعویٰ بھی کرتا ہے۔ بلیک کی شاعری میں جمالِ فطرت حیرتوں کو جگاتا اور معصومیتوں کی تجدید کرتا ہے۔ بلیک نے اپنی نظموں میں جانوروں اور بچوں کے معصوم جذبے کو پوری طہارتِ نظر سے پیش کیا ہے۔ اس کی نقاشی نامعلوم کو دریافت کرنے کی سعی پیہم ہے۔ بیشتر ناقدین نے بلیک کو رومانوی شعرا کے زمرے میں شامل نہیں کیا تاہم وہ اپنے معاصر رابرٹ برنز (ROBERT BURNS) کی طرح اپنے عہد کا مجدد اور جدیدیت کا پیمبر تھا۔ اس کی شاعری اور نقاشی دونوں میں رومانوی اجتہاد موجود ہے اور اس کا تخلیقی عمل خارجی جبر کو قبول کرنے کے بجائے صرف داخل کی پراسرار آواز پر ہی جاگتا ہے۔ چنانچہ گزامیاں نے بلیک کی آواز کو پیغمبرانہ قرار دیا ہے[22]۔ اور اسے رومانوی شاعر تسلیم کرنے سے گریز نہیں کیا۔ بلیک کی اہم عطایہ بھی ہے کہ اس نے انفرادی شعور کو اجتماعی لاشعور کا حصہ قرار دیا۔ چنانچہ بقول جے۔ بی پریسٹلے ینگ کی نفسیات[23] کے ابتدائی نظریات بلیک کی شاعری سے ماخوذ نظر آتے ہیں۔

انگلستان کی رومانوی تحریک کا اہم شاعر ولیم ورڈزورتھ انقلابِ فرانس کا پرداختہ تھا۔ اس کے ذہن کو اس وقت شدید صدمہ پہنچا جب انگلستان نے اتحادیوں کا ساتھ دے کر فرد کی آزادی کے بنیادی حق کو مجروح کر ڈالا۔

اس کا دل غم زدہ ہو گیا، انسانی زندگی اور فطرت کے منضبط پروگرام سے اس کا اعتماد متزلزل ہو گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ورڈزورتھ اپنے داخل کی طرف متوجہ ہوا۔ اور روح کے ساتھ ایسا تعلق قائم کیا جو پھر کبھی ٹوٹ نہ سکا[24]۔ ورڈزورتھ نے فطرت کے حسن میں اپنے دکھ کا مداوا تلاش کیا۔ شاعری کے لئے دیہات کی سادہ زبان اختیار کی اور اسے وہ طلسم عطا کر دیا۔ جو قاری کے ذہن میں اچانک اجالا بکھیر دیتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ورڈزورتھ نے فطرت کے حسن کو صرف مظہرِ جمال قرار دیا ہے اسے خدا تصور نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ وہ فطرت کی عبادت کرنے کے بجائے فطرت کو اپنی ذات میں جذب کر لینا اور خود فطرت کی طرح جاوداں ہو جانا چاہتا ہے۔

کالرج ورڈزورتھ کا دوست اور اس کا مداح تھا۔ اس کی ذات میں ایک ایسا شاعر اور نقاد پرورش پا رہا تھا۔ جس نے رومانویت کو تازگی، تنوع اور ابدی درخشنی عطا کر دی۔ قبلائی خان، کرسٹابل اور THE RIME OF THE ANCIENT MARINER. میں کالرج نے ایک محیر العقول رومانوی فضا کو جس تخلیقی ساحری سے زندگی دی ہے۔ اس کی مثال انگریزی شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔ کالرج مافوق الفطرت عناصر کو اہمیت ہی نہیں دیتا بلکہ انہیں صرف وجدان کے لمحاتِ گریزاں میں گرفت میں لینے کا دعویٰ بھی کرتا ہے[25]۔ آمد کا یہ لمحہ جب مسدود ہو جاتا ہے تو شاعری پیغمبری نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مشہور نظم قبلائی خان تکمیل کی منزل کو نہ پہنچ سکی۔ رومانوی تحریک میں کالرج کی اہم عطا یہ ہے کہ اس نے لٹریریا بیاگرافیکا لکھ کر اس تحریک کو نظریاتی بنیاد مہیا کی اور ورڈزورتھ کی شاعری کو موضوع بنا کر عملی تنقید کی ایک عمدہ مثال فراہم کی۔ لیک شعرا (LAKE POETS) کا تیسرا اہم نام ساؤتھے SOUTHEY ہے۔ لیکن اس کی شہرت ورڈزورتھ اور کالرج کی عظمت کے نیچے دفن ہو گئی ہے۔ اور اب اسے رومانوی تحریک کا ایک ایسا کردار قرار دیا جاتا ہے جو اپنی تاریخی اہمیت کے باوجود تخلیقی ذہانت سے محروم ہے۔ رومانوی تحریک کا ایک اور اہم زاویہ والٹر سکاٹ ہے اور اس کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ اس نے عہدِ ماضی کے روشن نقوش کو تخیل کی تابندگی دی، فطرت کے لئے محبت کا جذبہ پیدا کیا اور حیرتوں کے دبے ہوئے خزینوں کو دوبارہ زندگی دے دی۔

رومانوی تحریک میں ورڈزورتھ فطرت کی طرف مراجعت کا، کالرج فطرت کے اسرار اور تحیر کا اور والٹر سکاٹ تجدیدِ ماضی کا زاویہ ہے۔ بائرن اس بغاوت کا علمبردار ہے جو قدامت کے بطن سے ابھرتا ہے اور جس میں جدیدیت احتجاج کی صدا بن جاتی ہے۔ بائرن کی ابتدائی نظموں میں نغمہ آگ کی طرح تپاں ہے۔ چائلڈ ہیرلڈ لکھ کر وہ ایک ہی جست میں شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا[26]۔ وہ منکر نہیں تھا۔ اس کی شاعری میں تعمیری جذبے کا فقدان ہے تاہم اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تدوس کے نعرۂ بغاوت کو شعر کی قوت عطا کر دی اور وہ سیاسی جبر کے خلاف حزبِ اختلاف کی آواز بن گیا۔

رومانوی تحریک میں بغاوت کی دوسری فعال آواز شیلے کی شاعری میں ابھری۔ شیلے کی نظر میں انقلابِ فرانس صرف سیاسی قلابازی نہیں تھی بلکہ یہ فرد کی روحانی افزائش کا وسیلہ اور ایک نئے عہد کا نقطۂ آغاز تھا[27]۔ چنانچہ اس کی شاعری میں انقلابی زاویہ آزادی کے تحفظ کا آئینہ دار ہے

---

۲۱ Honstan—Main Currents of English Literature—P. 227.

۲۲ Louis Kazamian—A History of English Literature P. 954.

۲۳ J.B. Priestley—Literature and Western Man—P. 140.

۲۴ Louis Kazamian—A History of English Literature P. 1003.

۲۵ Honstan—Main Currents of English Literature P. 300.

۲۶ G.H. Mair—English Literature—P. 127.

۲۷ Peter Westland. The Romantic Revival—P. 127.

اور روحانی زاویہ انسانی محبت کی صورت میں نمودار ہوا ہے شیلے کی آزادی خارج کی جبریت کے خلاف ایک مسلسل احتجاج ہے اور وہ محبت کو ایک ایسی قوت قرار دیتا ہے جو تخریب کی تباہ کاری کو تعمیر میں بدل سکتی ہے۔ اس کی نظم (PROMETHEUS UNBOUND) کی حریتِ فکر کی آئینہ دار ہے۔

انگلستان کی رومانوی تحریک کا آخری اہم زاویہ کیٹس ہے۔ کیٹس نے اپنے داخل کو حواسِ خمسہ سے دریافت کرنے کی کوشش کی اور ان سب حسیات کے امتزاج سے ایک ایسی طلسماتی فضا کو جنم دیا۔ جس میں ارضی رعنائیاں مختلف رنگوں میں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیٹس فطرت کا لاڈلا بیٹا اور حسن کا عبادت گزار تھا۔ چنانچہ وہ کسی گہرے فلسفے میں اُلجھے بغیر خوشبوؤں، رنگوں اور سروں کو گرفت میں لیتا۔ اور تخیل کو ایک مکمل تصویر کی صورت میں منتقل کر دیتا ہے۔ کیٹس کی خوبی یہ ہے کہ وہ ما فوق الفطرت کو ماورائی استعاروں میں بیان کرنے کے بجائے شارحی زبان میں پیش کرتا ہے۔ اس کی نظم LA-BELLE SONS MERCI. اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

رومانویت کی ایک اساسی خصوصیت فرد کی انفرادیت کا اثبات ہے۔ اور اس کا اظہار صرف انگریزی شاعری میں ہی نہیں ہوا۔ بلکہ انگریزی نثر میں والپول، این ریڈ کلف، ولیم بیکفرڈ، اور جیمز واٹسن وغیرہ متعدد ایسے ادیب سامنے آئے جنہوں نے پرانے طرزِ فکر کو بدل کر انفرادیت اور شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس دور میں انشائیہ کی صنف نسبتاً زیادہ صحت مند انداز میں پروان چڑھی اور اس نے فرد کی داخلی شگفتگی کو بیدار کر کے اسے اپنی ذات سے بلند ہونے کا موقع عطا کیا۔ چارلس لیمب اور ولیم ہیزلٹ کا شمار ایسے ہی انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے[۲۸] جنہوں نے نثر کو تخلیقی اسلوب عطا کیا اور اس میں محاکاتی انداز اور فلکی کا عنصر شامل کر دیا۔ ڈی کوئنسی کی شاعرانہ نثر نے خود نوشت کو اعصابی تناؤ سے نجات دلائی اور اسے انکشافِ ذات کا وسیلہ بنا دیا۔

انگریزی ادب کا یہ رومانوی دور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس نے فن کی کلاسیکی قدروں کو توڑ دیا۔ اور تخلیق کو لاشعور کی آزاد فضا سے دریافت کرنے کے وہبی طریق کو فروغ دیا۔ تاہم یہ حقیقت بے حد دلچسپ ہے کہ انگریز قوم اس ساری تحریک کو محض تفننِ طبع کے طور پر شرارت بھری آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے اثرات کو فوری طور پر قبول کرنے سے گریزاں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں توازن اور اعتدال کا دور آیا۔ تو رومانوی تحریک پر زوال آ گیا اور ایک مرتبہ پھر کلاسیکی تحریک کو عروج حاصل ہو گیا۔ فرانس میں صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ اور یہاں رومانوی تحریک صرف ادب تک محدود نہ رہی بلکہ دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی اس کے اثرات نفوذ کر گئے[۲۹]۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جرمنی اور انگلستان میں رومانویت کی تحریک کے فروغ کو روسو کے خیالات اور انقلابِ فرانس کے اثرات کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن فرانس میں یہ تحریک اس وقت مقبول ہوئی۔ جب انقلاب کی گرد بیٹھ چکی تھی، روسو مر چکا تھا اور جرمنی اور انگلستان میں رومانویت اپنا تمام لاوا اگل چکی تھی۔ چنانچہ پیرس جو ہر تحریک کا رخ سب سے پہلے قبول کرتا ہے۔ رومانوی تحریک میں سب سے آخر میں نمایاں ہوا۔ اور اس کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ اس کی اوّلین لہر موسیقی میں چاپن (CHOPIN) کے وسیلے سے اور مصوری میں برلیوز (BERLIOZ) کی وساطت سے ابھری۔

چیتیو بریانڈ (CHATEABRIAND) فرانسیسی ادب میں رومانویت کی تحریک کا نقطۂ آغاز شمار کیا جاتا ہے۔ بریانڈ نے بچپن ایک خواب گوں ماحول میں گزارا تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس نے روسو کے اثرات ضرور قبول کئے ہوں گے۔ اس کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ اس نے فرد کو ذات کی گہرائی سے دریافت کرنے کی کوشش کی اور افسانے کو خود نوشت کا درجہ دے دیا۔ چنانچہ اناطول فرانس نے طنزاً کہا کہ "براشنڈ دنیا کو نظر انداز کر رہا ہے"۔ فرانس کی رومانوی تحریک میں دوسرا اہم نام مادام ڈی سٹیل کا ہے۔ نپولین سے اختلاف کی بنا پر مادام ڈی سٹیل نے اپنی زندگی اگرچہ فرانس سے باہر گزاری تاہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ مادام ڈی سٹیل نے فرانس کو جرمنی کے روحانی شاہکاروں سے متعارف کرایا اور روسو کا ایک دلکش مطالعہ پیش کیا۔ یوں اسے رومانوی تحریک کو پروان چڑھانے والوں میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ اس تحریک کا ایک اور اہم نام ہنری بائیلے HENERY BEVLE ہے جس نے سٹینڈ ہل (STAND HAL) کے نام سے دو طویل ناول (THE RED AND BLACK) اور (THE CHASTREAUSE OF PERMA) لکھے۔ سٹینڈ ہل کے ناول معاشرے کی غیر صحت مند فضا میں شدید جذباتی ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں اور فرد کو ان

---

[۲۸] J.B Priestley—Literature and Western Man—P. 160.

[۲۹] Warner-P-Friedrich—German Literature—P. 120.

آلائشوں سے ترفع حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

سینڈہل کے فن کی خارجی سطح نسبتاً سخت ہے لیکن سطح کے نیچے تند و تیز لاوا ابل رہا ہے جو اپنے ساتھ فرد کو بھی بہا کر لے جاتا ہے اور یہی سینڈہل کو رومانویت سے قریب تر کر دیتا ہے۔

فرانس میں رومانوی تحریک کی ابتدا کسی ایک واقعے سے منسوب کی جائے تو بلا شبہ یہ واقعہ وکٹر ہیوگو کے ڈرامے ہرنانی کی نمائش کی اولین شب کو رونما ہوا[۳۰]۔ اس شب ڈرامے کے ناظرین میں سینڈہل، بالزاک، سینٹ بیو، الیگزنڈر ڈیوما، پراسپر میری جیسے سربرآوردہ لوگ موجود تھے۔ چنانچہ جب اس منظوم ڈرامے کا پہلا مصرعہ ہوا میں اڑا تو تحسین کا طوفان اٹھا جسے بعد میں روکنا ممکن نہ رہا۔ فرانس کے رگ و ریشے میں رومانوی تحریک سرایت کر چکی تھی۔ اور وکٹر ہیوگو اس تحریک کا قافلہ سالار تھا۔ وکٹر ہیوگو فرانسیسی مزاج کا وہ زاویہ ہے جو عرصے سے کلاسیکی رجحانات طبع کے نیچے دبا پڑا تھا۔ لیکن جب باہر نکلا تو دھرتی کا بدن کانپنے لگا۔ وکٹر ہیوگو امرا نہیں فرانس کے عوام کا نمائندہ اور ان کے جذباتی سرگرمیوں کا صادق ترین مظہر تھا۔ ہیوگو نے رومانویت کا رشتہ بدہئیتی اور بدصورتی کے ساتھ قائم کیا اور احساسِ حسن کو ایک ایسی قدر قرار دیا۔ جو تخلیق کی غرابت میں بھی پرورش پا سکتی تھی۔ ہیوگو کا ناول "نوٹرے ڈیم کا کبڑا" اس کی کامیاب ترین مثال ہے۔

فرانس کی رومانوی تحریک کا جائزہ جارج سینڈ اور الیگزنڈر ڈیوما کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ جارج سینڈ میں نسوانی محبت کا جارحانہ زاویہ نمایاں ہے اور یہ درحقیقت اس کے اپنے معاشقوں سے ہی ماخوذ ہے۔ جارج سینڈ اس رومانی عورت کی نمائندہ ہے جسے معاشرے نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور رسم و روایات کے شکنجوں میں پابند کر دیا ہے۔ جارج سینڈ نے اس کے خلاف عملی سطح پر بغاوت کی اور بیک وقت کئی اہم لوگوں کو اپنی زلفِ گرہ گیر کا اسیر بنائے رکھا۔ الیگزنڈر ڈیوما، ناول کا مواد تاریخی واقعات کی سنہری کڑیوں سے ماخوذ کرتا ہے اور انہیں جذبات کے نسبتاً ڈھیلے تاگے میں یوں پیٹتا ہے کہ رومانوی حیرتیں جادو جگانے لگتی ہیں۔ ڈیوما کے ناول "تھری میکیٹیئرز" میں تحیر سے جمالیاتی کیفیت بڑی عمدگی سے پیدا کی گئی ہے۔

الفریڈ ڈی مسے (ALFRED-DE-MUSSET) وکٹر ہیوگو کے حلقے کا سب سے نوجوان رکن اور رومانوی تحریک کے دور آخر کا نمائندہ تھا[۳۱]۔ مسے کی شاعری میں روشنی اور سایوں کا جو حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہ درحقیقت جارج سینڈ کے ساتھ معاشقوں کی یادگار ہے۔ اس کے داخل میں بے پناہ تخلیقی توانائی تھی لیکن یہ ساری قوت اس کی بے راہ روی نے چوس لی اور وہ بائرن کی طرح نو عمری میں ہی مر گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی فرانس کی رومانوی تحریک بالآخر زوال پرآمادہ ہو گئی۔ انگریزی رومانویت میں لپکنے اور حسن کے تخیلی ہیولے کو گرفت میں لینے کا جذبہ نمایاں ہے۔ اس کے برعکس فرانسیسی ادب میں آرزوئیں تو جنم لیتی ہیں لیکن تخیل زمین کی کھردری سطح کے ساتھ چمٹ جاتا ہے اور وژن قاری تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ فرانسیسی رومانویت حقیقت نگاری کی دبیز تہہ کے نیچے دبی ہوئی سی نظر آتی ہے۔

رومانویت کی چوتھی تحریک انیسویں صدی کے ربع آخر میں رونما ہوئی اور یہ بلا شبہ مشینی زندگی کے خلاف فرد کی انفرادیت کی صدائے احتجاج تھی۔ انیسویں صدی میں سائنس کی ایجادات اور نو آبادیاتی نظام کے فروغ نے یورپی معاشرے کو جو استحکام اور توازن عطا کیا تھا۔ اب اس میں انتشار کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ اقتصادی سطح پر برطانوی صنعت کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے ممالک کی صنعتیں فروغ حاصل کر رہی تھیں اور بیرونی منڈیوں میں انگریزی مصنوعات کی کھپت کم ہو رہی تھی اور خام مال کی عدم دستیابی کی وجہ سے بے روزگاری روز افزوں بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ بے قراری اور کسمساہٹ کی وہ فضا ایک مرتبہ پھر پیدا ہو گئی۔ جس میں رومانوی تحریک کے ابھرنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں چنانچہ فلسفہ اور ادب نے کئی زاویوں سے فرد کے داخل کو بیدار کیا۔ سائنس جو فرد کو جسمانی راحتوں کے حصول کی راہ دکھا رہی تھی اس دور میں بیکاری کے فروغ کی معاون بن چکی تھی۔ چنانچہ ردِعمل کے طور پر ایسی تحریکیں ابھر آئیں جو فرد سے داخلی کرب کا فن کے پُراسرار عمل سے ازالہ کرتی تھیں۔ ان میں سوائن برن کی تحریک ان تمام خصوصیات سے بہرہ ور تھی۔ جن سے رومانویت کا مایۂ خمیر تیار ہوتا ہے چنانچہ اسے نو رومانوی تحریک کا عنوان دیا گیا۔

سوائن برن کی رومانویت میں قبل رافیل برادری کے علاوہ وکٹر ہیوگو اور مزینی (MIZZINI.) کے اثرات نمایاں حیثیت رکھتے ہیں[۳۲]۔ اس کی طویل نظموں میں جذبے کی تمام تر افتادگی موجود ہے۔ اس کی مختصر نظمیں جنس کی ہیجانی چاشنی سے معمور ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ سوائن برن نے

---

۳۰ J.B. Priestley—Literature and Western Man—P. 165.

۳۱ J.B. Priestley—Literature and Western Man—P. 171.

۳۲ George Sampson-Cambridge History of English Literature P. 716.

خیال کی روانی کو فطری انداز میں یوں پیش کیا ہے کہ اس میں سمندر کی موجوں جیسا تحرک پیدا ہو گیا ہے۔ اور لفظوں کے خوبصورت انتخاب نے جذبے کو حسین نکھار عطا کر دیا ہے۔ رومانویت کے اس عنصر میں فٹز جیرالڈ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس نے رباعیات عمر خیام کا دلکش ترجمہ پوری تخلیقی رعنائی سے کیا اور مغرب کو ان پُراسرار گوشوں سے متعارف کرایا۔ جنہیں صرف عمر خیام کی چشمِ تخلیق ہی دیکھ سکتی تھی۔ رومانویت کی اس تحریک میں ناول کی صنف نے مہم جوئی کی صورت اختیار کی اور اس صنف میں سٹیونسن اس عہد کا نمائندہ ناول نگار شمار ہوا۔ سٹیونسن اپنے ناولوں میں عہد قدیم کو اس خوبی سے پیش کرتا ہے کہ لوگ اپنی دنیا کے غموں کو بھول کر سٹیونسن کی دنیا میں عافیت اور سکون محسوس کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ "نئی الف لیلیٰ" میں اس نے ان دیکھی سرزمینوں کی سیاحت کرائی۔ پرنس اوٹو (PRINCE OTTO) میں خواب کی کہانی رومانوی انداز میں لکھی۔ ڈاکٹر جیکال اور مسٹر ہائڈ اور مارخیم میں علامتی انداز اختیار کیا اور لاشعور کے واہموں سے حیرت کی خوفناک فضا تخلیق کر دی۔

مغرب کی رومانوی تحریک کے اثرات کسی ایک جہت تک محدود نہیں۔ اس کی اوّلیں عطا یہ ہے کہ اس نے شاعر اور قاری دونوں کو ادراک کی ایک معلوم سطح سے لاشعور کی دوسری نامعلوم سطح تک سفر کرنے کے لئے فن کا راستہ دکھایا اور یوں انسان کے غیر مطمئن نفس کو معاشرتی اقدار کی شکست و ریخت سے بچنے اور نئی مطلق صورتوں کو تخلیق کرنے کی تحریک کی۔ رومانوی شعرا نے خیال، ہیئت اور زبان کا پرانا ڈھانچہ یکسر بدلنے کی کوشش کی۔ لفظ کی جامد صورت کو تصور کی سیال کیفیت عطا کی اور اس کی ظاہری پرت کے نیچے سے معنی کی ایک نئی دنیا کو دریافت کیا۔ لفظ کی یہ نئی معنویت خواب کی طرح پُراسرار اور ماضی کی طرح خوبصورت تھی۔ چنانچہ رومانوی تحریک کی ایک عطا یہ ہے کہ اس نے علامت نگاری کو فروغ دیا۔ اور یوں لفظ میں پوشیدہ قوت کو نئے انداز میں ظاہر کر دیا۔

رومانوی ادب کی زبان میں یکسانیت کا کوئی عنصر موجود نہیں۔ رومانوی زبان جذبے کے جزر و مد کو تخلیقی رعنائی سے گرفت میں لینے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ کبھی اس کا لہجہ اتنا دھیما ہوتا ہے کہ لفظ سرگوشی بن جاتا ہے اور کبھی اس کی صدا اتنی اونچی ہوتی ہے کہ شاعر اپنا جادو آواز کے بجائے بازگشت سے پیدا کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ رومانوی شعرا نے زبان کو تقلیدی انداز میں استعمال کرنے کے بجائے اس میں تخلیقی رعنائی پیدا کی ہے اور اسے اپنی شخصیت کے مطابق ترتیب دیا ہے۔ مثال کے طور پر کالرج اور کیٹس نے کائی زدہ لفظوں کو جادو کی چھڑی سے نئی زندگی دے دی۔ ورڈزورتھ نے اپنی زبان دیہات کے جھونپڑیوں سے تلاش کی اور وکٹر ہیوگو نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے اکادمی فرانس کی لغت پر آزادی کا سرخ پرچم نصب کر دیا ہے۔[۲۳]

موضوعات کے اعتبار سے رومانی شاعر نسبتاً زیادہ آزاد ہے۔ وہ کسی موضوع کو شجرِ ممنوعہ تصور نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رومانویت کی تحریک نے تخلیقی عمل کے اسرار کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ چنانچہ شاعر شعوری سطح پر تخلیق کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ داخل کی سرگوشی کا منتظر رہتا ہے شاعری کی دیوی جونہی اس کے کندھے پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھتی ہے شعر کی جوالا شاعر کے لبوں پر بکھرنے لگتی ہے۔ اور جونہی یہ لمحہ ختم ہوتا ہے۔ افکار کی بارش بھی رک جاتی ہے اہم بات یہ ہے کہ موضوع کی دریافت بھی تخلیقِ شعر کے بعد اس وقت سامنے آتا ہے۔ جب شاعر خود قاری کا منصب سنبھالتا ہے اور تخلیقِ مکرر کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ موضوعات کے اس تنوع کے ساتھ وزن، بحر، قافیہ، ردیف اور مصرعوں کے اختصار اور طوالت پر بھی رومانوی تحریک نے براہِ راست ضرب لگائی ہے۔ ان سب کو بلاشبہ تخلیقِ شعر کا ضروری جزو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن رومانوی تحریک نے ان سب کو بھی سیال صورت عطا کر دی ہے اور انہیں داخلی طور پر شعر میں حسن کی تخلیق کا وسیلہ بنا لیا ہے۔ چنانچہ جذبے کا زیر و بم جب ہیئت کی طرف متوجہ ہوا تو اختصار و طوالت سے حسن و نکھار پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور ردیف اور قافیہ صوتی آہنگ کو پیدا کرنے میں بے اندازہ معاونت میں شریک ہو گئے۔ رومانوی تحریک کے یہ اثرات اتنے اہم ہیں کہ ان سے بیسویں صدی میں لفظ اور خیال کی کئی تحریکیں ابھریں اور ان پر بحث و نظر کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

---

۲۳ H.L. Lucas—The Dec'ire ard Fall of Romantic Ideal P. 47.

سعادت سعید

داخلی تجزیاتی بصیرت اور ادبی خیانت

تجربہ اور خصوصاً تجزیاتی تجربہ خیال اور وژن کا سرچشمہ بھی ہے اور بصارتوں کو بصیرتیں بھی عطا کرتا ہے۔ ادب اور فن کی اقلیم سے تجربات کو جلاوطن کرنے کا مطلب خشک علمی اور تحقیقی موضوعات کے سیلِ بے اماں کو انسانی جوہر کی بربادی کی اجازت دینا ہے منطق، استدلال اور شماریاتی ادب کو فروغ بخشنا ہے۔ جو ادب نقالی، تقلید اور روایت کی لاٹھیوں کے سہارے اپنا فاصلہ طے کرتا ہے، وہ انسان دشمنی اور سماج کشی کا مرتکب ہے۔ تجربہ، ادبی تجربہ اور خصوصاً تجزیاتی تجربہ نہ صرف ذات کے داخلی جدل کا انکشاف ہے بلکہ اس جدل کے بطن میں موجود خارجی جدل کا نقاب کشا بھی ہے۔ تجزیاتی تجربہ کہ جو فی الاصل حواس اور شعور کی باہمی آویزش سے جنم لیتا ہے جذبے کی اَن گنت صورتوں کا نقیب بھی ہے اور شعور کی پیچیدگیوں کا مظہر بھی۔ منطق مفروضہ استدلالی موشگافیاں اور شماریاتی تقسیمات کو غیر حقیقی بنیادوں، غیر جذباتی دلیلوں اور غیر تخیلاتی اعداد و شمار کے عکاس تو ہیں اس کی حقیقی، جذباتی اور تخیلاتی بنیادوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ دنیا کا تمام عظیم ادب تجربے، خصوصاً تجزیاتی تجربے کے ویرانوں سے خزانے ڈھونڈ کے لایا ہے۔ تجربہ مبصر، عکاس، تماشائی، مداری، صناع، نگینہ ساز، حروف کار، مؤلف اور معلّم وغیرہ کے بس کی بات نہیں۔ اصلِ شہود و شاہد و مشہود کے ایک ہو جانے کا معاملہ ہے۔ مبصر جو کچھ سامنے ہے یا یاد کا حصہ ہے اس کو کسی زاویے سے بیان فرماتا ہے۔ عکاس ظاہری تصویریں کھینچتا ہے تماشائی کسی منظر کو الگ تھلگ رہ کر دیکھتا ہے۔ مداری اعادے کے ہنر سے آشنا ہے اور کرتب باز ہے صناع کاریگری دکھاتا ہے نگینہ ساز موجود چیزوں کی تراش خراش کا ماہر ہے۔ حروف کار لفظوں کو مخصوص ترتیب میں جوڑتا ہے۔ مؤلف مختلف افکار کا جامع ہے۔ اور معلّم علم سکھاتا ہے ادبی تجربہ خصوصاً تجزیاتی تجربہ یاد، زاویے، ظاہری صور، علیحدگی، اعادے، کرتب، کاریگری، مخصوص ترتیب، جمع اور معلوماتی ترسیل کا مکتفی نہیں ہے۔ وجود کی صورتحال میں ذمہ شمولیت ہے، احساس، جذبہ اور شعور تجربے کی کٹھالی میں گھل کر نئے رنگوں اور نئے ذائقوں کا ماخذ بنتے ہیں۔ اسی عمل سے تخلیقیت کے سوتے پھوٹتے ہیں اس آئینہ خانے کے در کھلتے ہیں جس میں محدود اور منتہا ایک وحدت کی صورت مدغم ہوتے ہیں۔ ادبی تجربے میں فرد اجتماع میں اور اجتماع فرد میں جلوہ گر ہے۔ فردیتی اجتماع اور اجتماعی فردیت ایک دوسرے میں پیوست جذبوں اور خیالوں کے نئے باب کھولتے ہیں۔ یوں زندگی اظہار بھی پاتی ہے اور اپنے نئے سفر کی راہیں بھی دریافت کرتی ہے!

تجربے سے حاصل شدہ انفرادی بصیرت خیال اور عقیدے میں تبدیل ہو کر نشوونما کی نئی حدود کے تعین کا باعث ہے۔ نئے مفاہیم کی تنظیم کا وسیلہ ہے۔ یہ بصیرت فرد کی داخلیت کے امکانی لازموں کو فکری فلک پر طلوع کرواتی ہے شخصیت اور ذات کے رنگوں کی نئی تحلیلی ترکیب نئے طرزِ احساس کی جگمگاہٹیں گرفت میں لیتی ہے۔ داخلیت کا جوہر بھی روشن ہوتا ہے اور خارج کی فضاؤں میں بھی دھنک نمودار ہوتی ہے۔ سی۔ایچ ویڈنگٹن نے اپنے مضمون "سائنسی ترجیح" میں لکھا ہے:

"فنکار خالق ہیں جو اردگرد کی زندگی کی عکاسی سے بھی زیادہ کچھ کرتے ہیں۔

کسی فنکار کے فن پارے کی تشریح اتنی ہی مشکل ہے جتنا کہ انسانی چہرے کا اظہار یا کسی پرندے کے نغمے کا بیان! روزمرّہ نثر کے الفاظ اتنے کھردرے ہیں کہ وہ "وہ کچھ" بیان نہیں کر سکتے جو فنکار یا شاعر کی مراد ہے ورنہ وہ انہیں ضرور استعمال کرتا۔ فنکار خود بھی جانتے ہیں کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو عمومی ذوق میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔"

یعنی فنکار کی داخلیت خارجی منطقیت سے زیادہ کچھ ہے۔ منطق اور کاروباری زبان شاعروں اور ادیبوں کے اظہار کے لئے ناکافی ہے وہ اس میں نئے مرکبات اور نئی تشکیلات کی صورت ردّوبدل سرانجام دیتے ہیں۔ عمومی ذوق کی تبدیلی زبان اور فکر کی عمومی منطقیت کی منہائیت کے بغیر ممکن نہیں! فنکاروں کی تجرباتی بصیرتیں ترکیبی طرزِ تحقیق اور فکری کُلیت آشنائی کا نتیجہ ہیں۔ ہر حقیقی اور انفرادی وحدت فی الحقیقت داخلی بامعنی وحدت ہے!

داخلی بامعنی وحدت اور داخلی عینیت پرستی میں بُعدالقطبین ہے داخلی عینیت پرستی انجمادِ فکری اور حبسِ جذبات کو فروغ بخشتی ہے۔ تجربے کی آزادانہ نشوونما پر قدغن لگاتی ہے۔ تجرباتی بصیرتوں کو تصوراتی ہیولوں کے تابع جانتی ہے۔ روح اور جسم کی حدود کو منفک سمجھتی ہے خیال اور مادے کو خانوں میں بانٹتی ہے ـــــ داخلی بامعنی وحدت فکری محرک جذبے کی آزادی ـــــ تجربے کے پھیلاؤ اور حقیقی صورتِ حال کی ظروفیت پر ایمانِ کامل رکھتی ہے۔ وہ روح کو جسم میں اور خیال کو مادے میں پیوست قرار دیتی ہے۔ پھول میں بیج اور بیج میں پھول کی شاہد ہے ـــ داخلی عینیت پرستی سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ معروضی صورتِ حال کی حقیقت کو تسلیم کیا جائے۔ عینیت پرست ادب میں شعوری تجربے سے لاتعلق رہتا ہے۔ داخلی بامعنی وحدت میں تجربے کی کثرتی حقیقتوں کا بطورِ اکائی مشاہدہ ہوتا ہے۔ فطری اور معاشرتی حقائق سے درست تخلیقی نقطۂ نظر حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں مکمل ترکیبی کُل میں پہچانا جائے۔ اشیاء فطرت اور معاشرے کا ترکیبی مطالعہ ادبی تخلیق کو منطقیت کی مفروضیاتی شکلوں سے نجات دلانے کا باعث ہے۔ منطقی ترتیبوں میں اشیاء انسان اور فطرت ٹکڑوں میں بانٹے جاتے ہیں۔ شخصیت کو سماج سے ماورا جاننا اور سماج کو شخصیت سے جدا کہنا ان گروہوں کی قزاقیت کو چھپانا ہے جو معاشرے میں انسانوں کو محض باربرداری کے جانور سمجھتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کا منشا اور مقصد صرف اور صرف یہی ہے کہ انسان تجرباتی بصیرت حاصل کرنے کی بجائے فطرت یا معاشرے کے کسی ایک حصے خانے یا ٹکڑے پر رائے زنی کرتے رہیں اور "کُل" نظروں سے اوجھل رہے تاکہ "باربرداری کے جانور" کہیں انسانی حق نہ طلب کر لیں۔ داخلی عینیت پرستی اور منطقی ترتیب کا ادب اپنی بنیادوں میں ایک ہی "خلائی عمل" کے دو ناموں کا امین ہے۔ داخلی عینیت پرست تصوراتی اور خیالی 'حقیقتوں' کا سہارا لے کر فطرت، شئے اور انسان کو ایک دوسرے سے غیر متعلق قرار دیتا ہے اس کا ناگزیر نتیجہ حقیقت کی کلی بنیادوں کا دھندلانا ہے۔ منطقی ترتیب میں موضوعاتی تحقیق کے سبب زندگی اور علم دو جدا جدا شعبوں میں منقسم ٹھہرتے ہیں۔ داخلی تجرباتی بصیرت صورتِ حال کے ترکیبی مطالعے سے جنم لیتی ہے اور نئی تخلیقی انواع کو وجود ملتا ہے۔ حقیقی شاعر اور ادیب داخلی تجرباتی بصیرت اور اس کے امکانات کے سُراغ رساں ہیں۔ وہ حقیقت اور امکان کے فاصلے طے کر کے نئی فنی اور فکری حقیقتوں کی تخلیق سرانجام دیتے ہیں۔ انسان کی فطری انفرادیت کو بالائے طاق رکھ کر درآمد شدہ نظریات کے حوالے سے سماجی صورتِ حال کا مطالعہ ان کی اخلاقیات میں جائز نہیں۔ وہ کھوکھلے مابعدالطبیعاتی معیارات، بے مغز نعروں، بے بنیاد خوابوں اور منطقی ترتیبوں سے محترز رہتے ہیں کہ ایسا نہ کرنے سے ان کی فطری انفرادیت کے کچلے جانے کا اندیشہ ہے۔

تجرباتی بصیرت کے حامل شاعر اور ادیب معاشرے اور اقتداری نظام کو میکانکی علمیت اور بے روح تصورات کی عینکوں سے نہیں دیکھتے۔ ان کی یہ تخلیقی مجبوری ہے کہ وہ فرد یا اپنی ذات کی حقیقی فطری اور جبلّی تمناؤں کی نشوونما کے رستے میں حائل بھاری پتھروں کے پاش پاش کرنے کا فریضہ سنبھالیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرتی جبر، معاشی بے انصافی اور سیاسی آمریت کے خلاف آواز بلند کرنا ان کی داخلی دیانتداری ہے۔ وہ محض موجود اقداری

نظام کی تشکیل یافتہ ذات کے بلند آہنگ نوحے رقم نہیں کرتے۔ بلکہ انسان کی فطری نشوونما کے مسائل پر مثبت اور حوصلہ خیز طریق سے نظر ڈالتے ہیں موجود معاشرتی نظام کی ساختہ ہوس پرستانہ، حیوانی اور منفعل ذات کے نرغے سے نکل کر معاشرتی بے اطمینانی، بے انصافی اور جبریت کی نہ صرف بڑے زور و شور سے مذمت کرتے ہیں بلکہ مغلوب فطری انفرادیت کی آزادی کے لئے ٹھوس راہِ عمل بھی سجھاتے ہیں۔ مصلحت پسندی اور خود غرضی کے لات و منات ریزہ ریزہ کرنا ان کے تخلیقی تیشے کا فریضۂ اول ہے ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لئے یا عیش کوشی کے لئے ادب میں غصے، جھنجھلاہٹ، بے چینی اور ناراضگی کے رویوں کا اظہار ان کے لئے شجرِ ممنوعہ ہے۔ وہ منصبوں اور عہدوں کی تحصیل کی دوڑ میں بھی مبتلا نہیں ہوتے ان کی تجرباتی بصیرت کا نصب العین فقط اور فقط یہی ہے کہ سماج میں فطری انسانی معصومیت اور حقیقی تمناؤں کی تکمیل و ترقی ہو اور جبریت کی صورتِ حال سے نجات ملے!

جبریت کی منہائیت اور معدومیت داخلی تجرباتی بصیرت کا خصوصی لازمہ ہے۔ جبریت کی منہائیت اور معدومیت کے ضمن میں دو قسم کے ادبی تجربات سے ہمارا سابقہ ہے اول وہ جبریت اور منہائیت کا ادب جو ذاتی مفادات کی عدمِ تکمیل کے پس منظر میں ابھا گر ہوا ہے دوم وہ جس میں ذاتی مفادات کی بجائے اجتماعی مفادات کی عدمِ تکمیل پر احتجاج کیا گیا ہے پہلی قسم کا ادب اگرچہ سماجی تضادات کی جانب اشارہ تو کرتا ہے لیکن اسمیں بھی بدنیتی کارفرما ہوتی ہے طمع کے خواب اظہار پاتے ہیں۔ یہ ادب ان ادیبوں اور شاعروں کی دین ہے جو مروجہ اقداری نظام اور معاشی ریلے رس میں کسی مقام تک پہنچنے کی یا تو اہلیت نہیں رکھتے یا چند دیگر مجبوریوں کی بنا پر اعلیٰ مناصب تک نہیں پہنچتے۔ چنانچہ وہ اپنی تخلیقات میں سماج اور اس کے آقاؤں کو کوستے ہیں۔ طعنہ زنی کرتے ہیں۔ اور اقدار اور روایات پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ خود تو کھیل نہیں پاتے دوسروں کے کھیل میں 'خلل' ڈالتے ہیں۔ ان کا ادب منفی رویوں کے زیور سے آراستہ ہوتا ہے۔ اگر مروجہ اقداری نظام میں ان کی نجی خواہشوں اور ہوس پرستانہ سوچوں کی شنوائی ہو جائے تو وہ اپنی تحریروں میں سے غصے 'الم' بے معنویت، تنہائی، اذیت، منہائیت اور آزادی کے رجحانات کے اخراج میں کوئی دقت محسوس نہیں کریں گے۔ ایسے شاعر اور ادیب مرتبے کی تحصیل کو تبدیلیِ سماج کے رجحانات پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کے ادب میں اقدار اور معاشرتی نظام کو تبدیل کرنے کے تصورات ایمانیت پر مبنی نہیں ہوتے۔ اس قسم کے ادب میں تجرباتی بصیرت، کا گمان تو گزرتا ہے اس کی موجودگی امکانی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہ ادیب بہر صورت موجود اقداری نظام کے اندر رہتے ہوئے اپنی نجی خواہشوں کی تکمیل چاہتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جبریت کی منہائیت اور معدومیت کے تأثرات خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں اور دوسری قسم "منہائیت اور معدومیت" کا ادب سماجی تضادات کی مکمل شکلیں سامنے لاتا ہے تجرباتی بصیرت کی دیانت کا حامل ہے، نجی قناعت اور اجتماعی تمناؤں کی تکمیل کا علم بلند کرتا ہے۔ یہ ادیب اور شاعر مروجہ اقداری نظام اور معاشی ریلے رس کو قومی اور اجتماعی امنگوں کے منافی سمجھتے ہیں۔ اعلیٰ مناصب کے حصول کی کوشش کرنے کی بجائے منصب داری نظام کی جبریت پر کاری ضربیں لگاتے ہیں۔ آقاؤں اور ان کے نظام کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ اقدار اور روایات کے زہر کو حقیقتاً [illegible] تے ہیں ان کا غصہ اور احتجاج صدق پر استوار ہوتا ہے۔ وہ انسانی عظمتوں کے لئے حیوانی پستیوں کی منہائیت اور معدومیت کو ازبس ضروری مانتے ہیں ایسا ادب جبر کی فکری منہائیت سے تجربے کی آزاد بصیرتوں کو استحکام بخشتا ہے! ای۔ ایل۔ ایلن نے اپنی کتاب "وجودیت کا باطن" میں درست لکھا ہے۔

> "کسی صورتِ حال کی صداقت اسی وقت گرفت میں آتی ہے جب اس کے اندر شامل ہو کر اسے دیکھا جائے اور وہی اسے پاتے ہیں جو حواس کے وسیلے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ صداقت داخلی ہے اور اپنے ساتھ ذمہ داری لاتی ہے۔ یہ وابستگی کا تقاضا کرتی ہے"۔

حقیقی ادیب انسان دوست ہے اس کا آئیڈیل انسانی اقدار کی تخم پاشی، بالیدگی اور

ارتقا ہے۔ انسانی اقدار تجرباتی بصیرت سے ہاتھ لگتی ہیں۔ ادیب کی وابستگی انسان اور انسانی قدروں سے ہے۔ مجبور، پسماندہ اور محکوم آبادیوں سے بے اعتنائی، ترقی اور آزادی سے ہے۔ وہ مجبوروں پسماندگیوں اور محکومیوں کی صورتِ حال میں اپنے حواس سمیت داخل ہوتا ہے۔ داخلی تجرباتی بصیرت حاصل کرتا ہے۔ خالص انسانیت کی جگہ ارضی شکلیں غائب ہوں اور آفاقی صداقت جس سے صورتِ حال جلاوطن ہو اس کے لئے بے معنی علمی قاموس ہیں۔ جو ادیب غیر ارضی خالص انسانیت اور لا صورتِ حال آفاقی صداقت کے قصیدہ نویس ہیں وہ سماج میں انسانی عروج و زوال کی داستان کو دانستہ نظر انداز کرتے ہیں۔ ارضیت اور صورتحال سے کنارہ کشی ادبی نصب العین کی دشمن ہے۔ بجی مقاصد، جذبات اور سیاست کے تضادات کو فراموش کرکے خالص انسانیت اور آفاقی صداقتوں تک پہنچنے والے آزاد خیال ادیبوں میں غیر انسانی اقدار اور معاشرتی نظام کو تبدیل کرنے کی تمنا معدوم ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ ایسی انسانیت اور ایسی صداقتوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں جن کا معاشی اور معاشرتی مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا انسانی مظلومیت اور محکومیت سے منکر ہونا اور سیاسی، معاشی اور بین الاقوامی صورتِ حال کا تجزیہ سرانجام نہ دینا فی الحقیقت انسان دوستی کی قدروں سے علیحدہ ہونا ہے۔

مظلومیت اور محکومیت کے معاشروں میں منتشر اور متضاد ملکی اور غیر ملکی نظریات کا فروغ پاتا فرد اور اجتماع کے فکری زیروبم کا عکاس ہے ادب و شعر میں رنگا رنگ اور متنوع نظریات کی موجودگی سے مترشح ہے کہ سماجی سفر کی کوئی متعین جہت نہیں ہے۔ خیالات و افکار کے عنکبوتی جال پھیلے ہیں۔ اس صورتِ حال میں داخلی تجرباتی بصیرت کے حامل فنکاروں کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ محکومیت اور مظلومیت سے ماوراء کر حقیقت کو گرفت میں لا سکیں۔ ادیب بھی دیگر انسانوں کی مانند دنیا میں تہی دست آتا ہے۔ دنیا میں شامل ہو کر اپنے اور دنیا کے معانی پانے کا کشٹ کھینچتا ہے۔ خاندان، ماحول اور معاشرہ اس کے ویژن کی ساخت میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کی مخصوص انفرادیت کے پس منظر میں اس کے مخصوص حسی اور شعوری تجربات ہوتے ہیں۔

انفرادیت پر مسلّط معاشرتی جبریت سے محفوظ رہنے کے لئے وہ زندگی اور معاشرے کی کلی بنیادوں کو یکجا کرتا ہے۔ اشیاء اور فطرت کو خانوں میں بانٹنے کا مطلب جزو اس کے اور کچھ نہیں کہ اپنی بصارت اور بصیرت کو دھندلا دیا جائے۔ ادب میں خانے بنانے والے ادیب ادب، اخلاق معاشرت اور بین الاقوامی صورتِ حال علیحدہ علیحدہ مطالعہ کرنے کے قائل ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق ادب اخلاق سے غیر متعلق ہوتا ہے۔ اخلاق معاشرت سے، معاشرت سیاست سے اور سیاست بین الاقوامی صورتِ حال سے ——— ! یوں تجرباتی بصیرت کا ادب تو منصۂ شہود پر نہیں آتا لفظوں کے مرکبات اور تشبیہوں، استعاروں اور مبالغوں کی نیرنگی ظاہر ہوتی ہے!

داخلی تجرباتی بصیرت کی عدم موجودگی میں لکھا جانے والا ادب محکومیت اور مظلومیت کے نظامِ اقدار کی توسیع و ترقی کا باعث ہے۔ اس عمل میں ماضی پرست ادیبوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ادیب ماضی کی رومانی، ماورائی، تصوراتی، اور مافوق الانسانی داستانوں کے طرزِ استدلال و فکر کے تابع ہو کر حال کی برہنہ حقیقتوں میں شمولیت کے منکر ہیں۔ حیاتِ انسانی کے موجود مسائل پر غور و فکر کرکے داخلی انسانی مسائل کی تفتیش اور ان کا حل سوچنے کی بجائے کتابی اور قاموسی علوم کی مدد سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس رویے کے مغلوب شاعر اور ادیب تخلیق کی بجائے دریافت کے عمل کو، صورتِ حال سے وابستہ ہونے کی بجائے اس میں حصہ لینے کے مشغلے کو اور علامتوں کی بجائے تلاشِ تشبیہہ کی کاوش کو زیادہ اہم گردانتے ہیں۔ وہ ٹھوس معاشرتی اور انسانی تقاضوں کو پسِ پشت ڈالنے کے لئے روح اور جسم کی ثنویت کے تصورات پھیلاتے ہیں۔ جسم کے معاملات اور احتیاجات کو ترک کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ بے عملی کو انسانی جوہر کا نام دیتے ہیں۔ فرد کی فطری انفرادیت کچلنے پر آمادہ ہیں۔ قدیم اساطیر کی غیر تخلیقی روح کو جدید انسانی شخصیت پر مسلط کرکے اسے شعور اور اجتماعی لاشعور کی بھول بھلیوں میں لے جانا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا کب تک؟ داخلی تجرباتی بصیرت روکے سے کب رکتی ہیں!

عبدالکریم خالد

غزل کا بانی عمرو بن ابی ربیعہ

عبدالملک بن مروان، بنو امیہ کا ایک نامور خلیفہ تھا۔ وجاہت، شان و شوکت اور رعب داب اس قدر تھا کہ بڑے بڑوں کا پتّا پانی ہوتا تھا۔ اس کی چہیتی بیٹی فاطمہ جیسے آفتاب، جیسے ماہتاب، حسن و خوبصورتی اور ناز و ادا میں کوئی اس کا ثانی نہ تھا۔ عرب کے سرپھرے نوجوان اس کا نام لے کر آہیں بھرتے تھے۔ لیکن باپ کے خوف سے کسی کو راہ و رسم بڑھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ انہی نوجوانوں میں ایک عمرو بن ابی ربیعہ تھا کہ شاعری جس کا مشغلہ اور عشق پیشہ تھا۔ کوچۂ عشق میں خاصا بدنام غزلیہ شاعری میں شہرت کی بلندیوں پر ــــ عورتوں سے راہ و رسم بڑھانا اور ان کے حسن کے قصیدے لکھنا عمرو کا وطیرہ تھا۔ بڑے بزرگ اپنی بہو بیٹیوں کے سامنے عمرو کا نام لینا گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ اچھے اچھے گھرانوں کی لڑکیوں کو اس کے اشعار زبانی یاد تھے۔ وہ جب بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل بیٹھتیں تو عمرو کا ذکر چھڑ جاتا اور پھر خوبصورت لحن میں اس کے عشقیہ اشعار گائے جاتے۔ عمرو کا طریق تھا کہ جس عورت پر اس کی نگاہ التفات پڑتی، اس کے بارے میں وہ یکبارگی درجنوں اشعار کہہ ڈالتا۔ جن میں اس عورت کا نام اور اس سے ملاقات کا تفصیلی ذکر ہوتا۔ یہ اشعار جنگل کی آگ کی طرح پورے عرب میں پھیل جاتے اور گھر گھر اس عورت کے حُسن کے تذکرے ہونے لگتے۔

عبدالملک بن مروان کو اس بات کا علم تھا۔ چنانچہ جب اس کی بیٹی فاطمہ نے حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے کے لئے مکہ کا رخ کیا تو اس نے وہاں کے حاکم حجاج بن یوسف کو اس کے بارے میں بڑے سخت احکامات بھیجے۔ عمرو نے اگر خلیفہ کی بیٹی پر کوئی شعر کہہ دیا تو اس کی ناک کٹ جائے گی۔ حجاج نے خلیفہ کے احکامات وصول کئے اور عمرو کو کہلا بھیجا۔

"خبردار! اگر تم نے خلیفہ کی بیٹی کے متعلق کوئی شعر کہا تو تمہیں سخت سے سخت ترین سزا دی جائے گی۔"

عمرو کے پاس حجاج کا یہ حکم پہنچا تو وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر عورت شہرت پسند واقع ہوئی ہے اور اس کے اشعار عورتوں کے لئے ایک نشانِ مرتبہ (STATUS SYMBOL) کی حیثیت رکھتے ہیں ہر عورت فطری طور پر یہ خواہش رکھتی ہے کہ اس کے بارے میں شعر کہے جائیں تاکہ اسے لوگوں میں مقبولیت حاصل ہو اور اس کے حسن کے پرستاروں میں اضافہ ہو۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے خود کبھی شعر نہیں کہا بلکہ عورت کے تحریک دلانے پر شعر اس کی زبان پر آجاتے ہیں۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ حجاج کی حکم عدولی کی صورت میں اس کا کیا حشر ہوگا لیکن وہ ایک بے پرواہ شاعر تھا۔ جسے عواقب کا کوئی ڈر نہ تھا۔

فاطمہ بنت عبدالملک حج کی ادائیگی کے بعد واپس جانے لگی تو اچانک اسے عمرو کا خیال آیا۔ اس نے ایک شخص کو پاس بلایا اور پوچھا "تم کون ہو؟" اس نے کہا "میں مکہ میں رہتا ہوں۔" اس پر فاطمہ نے کہا "تجھ پر اور ــــ پر لعنت۔" وہ شخص حیران ہو کر بولا "بی بی! اس لعنت ملامت کا آخر جواز کیا ہے؟" فاطمہ بولی "تو دیکھو، میں حج کرنے آئی اور میرے ساتھ ایسی خوبصورت لونڈیاں تھیں جن کی ایک جھلک دیکھنے کو لوگ ترستے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عمرو بن ابی ربیعہ نے ہمیں اپنے اشعار کا کوئی ایسا تحفہ نہیں دیا جس سے ہم راستے میں لطف اندوز ہوتی جائیں۔"

اس پر اس شخص نے کہا "تمہیں شاید علم نہیں عمرو نے تمہارے بارے میں ضرور شعر کہے ہوں گے۔ لیکن حجاج کے خوف سے اس نے ان اشعار کو شہرت نہیں دی۔"

"اچھا،" فاطمہ خوشی سے اُچھل پڑی۔

"اگر ایسی بات ہے تو ابھی جاؤ اور اس سے وہ اشعار لے کر آؤ۔ میں تمہیں ہر شعر کے عوض دس دینار دوں گی۔"

وہ شخص بھاگا بھاگا عمرو کے پاس آیا اور اسے سارا

تک سنایا۔ عمرو ہنس پڑا اور کہنے لگا "تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ میں حسین عورت کو دیکھوں اور پھر شعر نہ کہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن خدا کے لئے تم ان اشعار کو مشتہر نہ کرنا ورنہ حجاج میرا ناک میں دم کر دے گا۔" پھر اس نے وہ شعر سنائے جو فاطمہ کے متعلق کہے گئے تھے۔

فاطمہ نے یہ اشعار سنے تو شرم و حیا سے سُرخ ہو گئی۔ اپنے حُسن کی تعریف سن کر اس کا انگ انگ خوشی سے پھوٹنے لگا۔ اور اس نے پیغام رساں کو انعام و اکرام سے مالامال کر دیا۔

اگلے برس فاطمہ حج کے لئے آئی تو حج سے زیادہ عمرو بن ابی ربیعہ سے ملاقات کی خواہش دل میں لے کر مکہ وارد ہوئی۔ طوافِ کعبہ کے بعد وہ عمرو کا سراغ لگا کر اس کے پاس چلی آئی اور دیر تک اس کے ساتھ بیٹھ کر عشق و محبت کی باتیں کرتی رہی۔ وقتِ رخصت آیا تو عمرو نے ازراہِ تکلف اس سے کہا "فاطمہ! میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان گیا ہوں کہ تو کون ہے۔ اور کہاں رہتی ہے؟" عمرو کے یہ الفاظ سن کر فاطمہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ مبادا عمرو اسے اپنے اشعار میں بدنام کر دے۔ چنانچہ اس نے ہاتھ جوڑ کر عمرو سے کہا کہ میں تجھے خدا کا واسطہ دیتی ہوں مجھے اپنے اشعار میں بدنام نہ کرنا۔ اس کے ساتھ اس نے عمرو کو ایک ہزار دینار پیش کئے تاکہ وہ اس کے بارے میں عشقیہ اشعار کہنے سے باز رہے۔ عمرو نے ایک ہزار دینار قبول کر لئے اور اسی رقم سے خوبصورت تحائف خرید کر فاطمہ کو بھجوا دیئے۔ فاطمہ نے یہ تحائف قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عمرو کو جب یہ معلوم ہوا کہ فاطمہ نے اس کے بھیجے ہوئے تحائف قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ تو اسے سخت غصہ آیا اور اس نے فاطمہ کو کہلا بھیجا کہ اگر تم یہ تحائف قبول نہیں کرو گی۔ میں انہیں پورے شہر میں لٹا دوں گا اور یوں ہمارے عشق کی داستان گھر گھر پہنچ جائے گی۔ ناچار فاطمہ کو تحائف قبول کرنا پڑے۔ اس کے بعد عمرو نے فاطمہ کے متعلق جو اشعار کہے ان میں کہیں بھی اس کا نام نہیں لیا۔

"کوچ کے دن احباب کی جدائی نے میرے دل
کو خوفزدہ کر دیا اور میری خوشیوں کو ایک طوفانی
کیفیت سے دوچار کر دیا۔"

"اے شہسوار! تو نے تہامہ سے اپنے مقصود کو
حاصل کر لیا۔ اے کاش، ہم پر ساری عمر روزانہ
ہی حج فرض ہو جائے۔"

عمرو بن ابی ربیعہ کا پورا نام ابوالخطاب عمرو بن عبداللہ بن ابی ربیعہ ہے۔ باپ زمانۂ جاہلیت میں بُجیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قبولِ اسلام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نام بدل کر عبداللہ رکھ دیا۔ قریش اسے "العدل" کے لقب سے پکارتے تھے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ایک سال سارے قریش مل کر خانۂ کعبہ پر غلاف چڑھاتے تھے اور ایک سال وہ اکیلا ہی غلافِ کعبہ تیار کرتا تھا۔ یوں اسے تمام قریش کے برابر قرار دیا جاتا تھا۔ عبداللہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے ایک علاقے "جند" کا والی بھی مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت تک وہ اس علاقے میں ولایت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ عمرو کی والدہ کا مجد نام تھا اور امِّ ولد کنیت۔ حمیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ یمن میں اقامت گزیں تھی جو غزلیہ شاعری کے لئے پورے عرب میں مشہور تھا۔ عمرو کو غزل کا ملکہ اپنی ماں ہی سے ورثے میں ملا۔

عمرو بن ابی ربیعہ ۲۳ھ (۶۴۴ء) میں پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جس روز حضرت عمرؓ بن الخطاب شہید ہوئے، اس روز اس کی ولادت ہوئی اور کسی نے کہا "کیسا حق اُٹھ گیا اور کیسا باطل آگیا۔" عمرو سے پہلے عرب کے لوگ تمام شعبہ ہائے زندگی میں قریش کی برتری کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن شعر و شاعری میں ان کے کسی مرتبہ کے قائل نہ تھے۔ جب عمرو نے شعر کہنے شروع کئے تو عربوں نے شاعری میں قریش کی برتری تسلیم کر لی۔ آغاز میں کسی نے بھی اس کے اشعار کو قابلِ التفات نہ سمجھا بلکہ اس زمانے کا مشہور شاعر جریر جب بھی اس کا کوئی شعر پڑھتا تو کہتا "یہ شعر تہامہ کی سرزمین سے نکلا ہے۔ اگر یہ بہت اچھا بھی ہو تب بھی یہ جذبات سے عاری ہے۔" لیکن جب عمرو نے "ر" کی ردیف والا مشہور قصیدہ لکھا تو اس پر جریر نے یہ تبصرہ کیا کہ "یہ قریشی ایک عرصہ تک تو محض بکواس ہی کرتا رہا ہے اور اب اس نے شعر کہنے شروع کئے ہیں۔

اپنے دور کے مشہور شاعر فرزدق نے عمرو کے غزلیہ اشعار سنے تو کہا۔

"اس چیز کو شعراء تلاش کرتے پھرتے تھے مگر انہیں یہ ہاتھ نہ آ رہی تھی لیکن اس نوجوان نے اسے پا لیا ہے۔"

عمرو بن ابی ربیعہ کے زمانے میں کچھ ایسی رَوش چل نکلی تھی کہ کوئی شاعر اس وقت تک شہرت حاصل نہیں کر سکتا تھا جب تک وہ کسی کی مدح یا ہجو میں اشعار نہ کہہ لیتا تھا۔ چنانچہ اس کی ہجو و مدح کے اعتبار ہی سے اس کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا جاتا تھا۔ لیکن عمرو نے یہ طریق اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے لئے ایک منفرد اور جداگانہ راستہ متعین کیا۔ اس راستے میں عمرو کو خاصی مشکلات پیش آئیں بہت

سے شاعروں نے مل کر اس کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کر دیئے اور اسے حد درجہ ملعون کرنے کی کوشش کی لیکن عمرو نے ان رکاوٹوں اور مشکلوں کی چنداں پرواہ نہ کی اور غزل گوئی کو ایک مستقل فن کے طور پر لوگوں سے تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

اس دور میں جبکہ بہت سے شعرا سیاست میں بھی ہاتھ پاؤں مارنے لگ گئے تھے، عمرو سیاست سے بالکل الگ تھلگ رہا اور غزلیہ شاعری ہی میں پروان چڑھا اس نے اپنے آپ کو کسی گروہ سے منسلک نہیں کیا اور نہ ہی اپنے اشعار کو سیاسی اختلافات کا وسیلہ بنایا۔ ایک قریشی شاعر ابن القیس الرقیات اپنے اشعار میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"وہ (عمرو) قریشی عورتوں کے بارے میں بھی
شعر کہتا تھا اور غیر قریشی عورتوں کے بارے
میں بھی اس نے غزلیں کہیں۔ اسے کسی گروہ
سے واسطہ نہ تھا۔ وہ تو صرف حسن و جمال کا
دلدادہ تھا"

عمرو بڑا عاشق مزاج شاعر تھا۔ ایام حج میں جبکہ عورتیں پردہ نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ خوبصورت عورتوں کو دیکھ کر ان کے متعلق عشقیہ اشعار کہتا۔ ایک حج کے موقع پر اس نے عائشہ بنت طلحہ کو دیکھ لیا۔ عائشہ بہت خوبصورت اور حسین و جمیل عورت تھی۔ عمرو دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ عائشہ نے بھی اس کی نظر کو بھانپ لیا۔ اور اپنی لونڈی کے ذریعے اسے پیغام بھجوایا کہ خدا سے ڈرو اور میرے متعلق کچھ نہ کہو، کیونکہ اس مقام پر پردہ نہیں ہو سکتا۔ عمرو نے اسی لونڈی کے ذریعے عائشہ کو کہلا بھیجا کہ تمہارا چچیرا بھائی تمہارے متعلق کوئی بری بات نہیں کہے گا اور پھر یہ شعر کہا۔

"عائشہ کے لئے میرے دل میں ایسی چراگاہ
ہے جہاں کسی اور کو چرنے کی اجازت نہیں ہے"

اسی طرح ایک حسین اور خوبصورت عورت مکہ آئی۔ اس وقت عمرو خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ جب اس کی نظر آوارہ اس عورت پر پڑی تو دل ہار بیٹھا۔ لیکن اس عورت نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ عورت لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی۔ اور عمرو کو سلسلۂ مواصلت قائم کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ رات کو اس عورت کے عشق نے اسے بے چین کر دیا اور وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ تلاشِ بسیار کے بعد آخر وہ اس عورت تک جا پہنچا اور حالِ دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس عورت نے کہا، اے شریف آدمی جاؤ اپنا کام کرو، میرے پیچھے کیوں دیوانے بنے پھرتے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس وقت تم خدا کے حرم میں کھڑے ہو۔ یہاں اس قسم کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ لیکن عمرو پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بلند آواز میں اس سے کلام کرنے لگا۔ اس پر وہ عورت اس سے پیچھا چھڑا کر بھاگ گئی کہ کہیں اس واقعہ کی تشہیر نہ ہو جائے۔

اگلے روز وہ عمرو کے ڈر سے طواف کے لئے اپنے بھائی کو ساتھ لے آئی۔ عمرو نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن جب دیکھا کہ اس کا بھائی ساتھ ہے تو کنی کترا کر نکل گیا۔ اس وقت اس عورت نے جریر کا یہ شعر پڑھا۔

"بھیڑیئے اس شخص پر حملہ آور ہوتے ہیں۔
جس کے پاس کتے نہ ہوں اور ان جانوروں
کے حملے سے بچتے ہیں۔ جو شیر کی طرح
شکار کرنے والے ہوں"

عمرو نے جب یہ شعر سنا تو کہا میری خواہش ہے کہ قریش کی لڑکیوں میں سے کوئی بھی اپنے پردے میں ایسی نہ رہے۔ جس نے یہ واقعہ نہ سنا ہو۔

عمرو بن ابی ربیعہ نے اپنی غزلوں میں حسن و خوبصورتی اور محبت کو اجاگر کیا ہے۔ اس کی محبت کی کیفیت کیا تھی؟ اس سلسلے میں اس کے اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عقل اور دل کے بل بوتے پر ہی محبت کا اظہار نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی ایک خاص جمالیاتی حس بھی ساتھ ساتھ کام کر رہی ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر اس کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

"کیا اس گھر کے آثار پر تیری آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئی ہیں۔ یہ جہالت کی بات ہے۔ جو بات نہیں کرتا اس سے بات پوچھنے میں کوئی فائدہ نہیں"

"جمع اور محسّر ایسے مقامات ہیں، جنہیں زمانے کی طوالت نے بوسیدہ کر دیا ہے۔ میں نے یہاں پہنچ کر عمر رفتہ کو بہت یاد کیا۔ میں نے اس جگہ کو یاد کیا۔ جہاں ہم رات کے وقت بیٹھا کرتے تھے۔ اور ہماری اس تنہائی میں کوئی مخل نہ ہو سکتا تھا"

"میں نے اس نوجوان لڑکی کی چال کو یاد کیا۔ جو چادر اوڑھے ہوتی تھی۔ چادر کے اندر ایک ایسی آنکھ پوشیدہ تھی۔ جس کی روشنی اور چمک نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے"

"پھر جب بارش کے قطرات اس کے کپڑوں کو گیلا کر دیتے تھے تو ان کے نیچے سے اس کے بدن کی ایسی روشن اور چمکدار شعاع نمودار ہوتی تھی۔ جو آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے"

"رات کے ابتدائی حصے میں وہ دنیا کی حسین ترین شے تھی۔ لیکن آخر شب حزن و ملال کے سوا کچھ بھی نہ تھا"

عمرو بن ابی ربیعہ کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ بیک وقت کئی کئی عورتوں سے محبت کرتا تھا۔ اور اس محبت کی داستان کو کمال خوبصورتی سے شعروں میں بیان کر دیتا تھا۔ ابن ماجہ کی ایک لونڈی حمیدہ سے بھی اس نے تعلقات محبت استوار کئے۔ اور اس پر سینکڑوں اشعار کہہ ڈالے۔ حمیدہ کے بدن کا کوئی عضو ایسا نہ تھا۔ جس کا ذکر اس نے اپنے اشعار میں نہ کیا ہو۔ بعد میں ان دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے اور حمیدہ نے عمرو سے تعلقات منقطع کر لئے ۔ چنانچہ اس جدائی کے نتیجے میں عمرو پر جو جاں گسل لمحات وارد ہوئے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

"میرے دل پر حمیدہ کے باعث ایک بوجھ ہے
لیکن دل کے اندر دلچسپی کا سامان بھی ہے"

"اے دل، تجھے حمیدہ کے معاملے میں کوئی سرزنش
ہوئی ہے یا وہ یاد آگئی ہے کہ تو صابر بن گیا ہے"

"حمیدہ کی یاد میں میرا دل خون کے آنسو روتا ہے
لیکن اب ان آنسوؤں میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا ہے"

"میری محبوب حمیدہ کی جانب سے جدائی ظاہر
ہو گئی۔ اور میں جدائی ہی سے ڈرتا تھا"

عمرو کے دیوان کا مطالعہ کرنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اس نے عورت کے معنوی جمال کا ذکر بہت کم کیا ہے بلکہ اس کے اشعار میں زیادہ تر عورت کے مادی حسن و جمال کا مضمون ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ عورت کے میلانات، رجحانات اور اس کی خواہشات کا ذکر بھی کرتا ہے۔ عورت سے اس کا تعلق اس کی ادبی زندگی کی اساس ہے۔ وہ عورت کو مرد کے لئے زندگی کی تکمیل کا ذریعہ خیال کرتا ہے۔ جس کے بغیر مرد کی زندگی نامکمل ہے۔ اسی طرح عورت کی زندگی مرد کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

عمرو، مرد اور عورت کے اس تعلق کو صرف مادی معنوں تک ہی محدود نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے نزدیک یہ تعلق زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ وہ عورت کا سچا خیر خواہ اور دوست ہے اور ان کے لئے بھی ویسی ہی عزت اور آزادی کا خواہش مند ہے۔ جیسی مرد کیلئے وہ چاہتا ہے کہ جس طرح مرد اپنی مردانگی اور شجاعت پر فخر کرتا ہے۔ اسی طرح عورت بھی اپنے آپ پر فخر کرے اور اپنے حسن و جمال کو ظاہر کرے۔ وہ دونوں صنفوں کے درمیان امتیاز ختم کر کے پردۂ حجاب اٹھانے کا آرزومند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قریش اور انصار کے روشن خیال نوجوانوں میں عمرو کے اشعار بہت مقبول تھے اور ان کے لئے سامان طرب فراہم کرتے تھے۔ عمرو کی دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے شعراء نے بھی یہ روش اختیار کی۔ عورتیں غزل کی اس تحریک سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ وہ شعراء کو خوش کرنے کے لئے حسن اور خوبصورتی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگیں۔

بعض لوگوں کی یہ رائے ہے کہ عمرو انتہائی پاک دامن اور صاحب عفت شاعر تھا اور دوسرے شعراء کی طرح وہ جو باتیں کہتا تھا ان پر عمل نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس بارے میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ اسے نہ تو ہم پاکباز قرار دے سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کر سکتے ہیں کہ عورتوں کے معاملے میں وہ انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

سرزمین عرب اگرچہ ایسے شعراء سے خالی نہیں ہے جنہوں نے اپنے اشعار کو عورت کے حصول کا ذریعہ بنایا تاہم ایسے شعرا جلد یا بدیر اپنی وقعت کھو بیٹھے اور انہیں شدید رسوائی اور ذلت نصیب ہوئی۔ لیکن عمرو بن ابی ربیعہ نے اپنی عظمت اور مقام کو قائم رکھا اور اسے کبھی بھی ایسی ذلت سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ تاریخ سے ہمیں ایسا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ لوگوں نے اسے ملعون ٹھہرایا ہو۔ البتہ بعض راوی بیان کرتے ہیں کہ عمرو کے بھائی نے ایک دفعہ اس پر انگشت ملامت اٹھایا تھا۔ جس سے عمرو کے حساس دل پر اس قدر چوٹ لگی کہ وہ مکہ چھوڑ کر یمن چلا گیا اور وہاں جا کر رہنے لگا۔

اس کے ساتھ ہی اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ عمرو پر کبھی سیاسی حاکم یا گورنر نے گرفت نہیں کی۔ حالانکہ اس نے بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں کے متعلق عشقیہ اشعار کہے ہیں۔ مثال کے طور پر عبدالملک بن مروان کی بہن اور بیٹی کے بارے میں اس کے عشقیہ اشعار ملتے ہیں۔ اسی طرح سہیل بن عبدالعزیز بن مروان کی بیوی عائشہ بنت طلحہ، امامہ بنت عبداللہ، زینب بنت موسیٰ الجمحی حفصہ بنت حارث المرّی، اور محمد بن اشعث الکندی کی بیٹیوں کے بارے میں عشقیہ اشعار سے اس کا دیوان بھرا پڑا ہے۔ اس طرح مکہ، مدینہ اور شام کے اشراف کی عورتوں کے ساتھ بھی اس نے اظہار تغزل کیا ہے۔ یہ اظہار تغزل بغیر کسی اختصار کے ہوتا تھا۔ اگر عمرو کے ان عورتوں کے ساتھ ناجائز تعلقات ہوتے تو اسے فوراً سنگسار کر دیا جاتا۔

بہر کیف عمرو بن ابی ربیعہ ایک بہت بڑا غزل گو اور قریش کا پہلا مسلمہ شاعر تھا۔ اس نے ۷۱۱ء میں ولید بن عبدالملک کے عہد میں وفات پائی۔

سلیم خاں گمی

سیف الملوک کی آفاقیت

قصہ سیف الملوک پنجابی کے علاوہ کئی دوسری زبانوں میں دستیاب ہے ۔میاں صاحب کے فارسی حاشیہ کے مطابق قصہ سیف الملوک پنجابی میں ہے ۔

ڈاکٹر سی شیکل کے خیال میں سیف الملوک مصنفہ میاں محمد بخش ایک دلچسپ لسانی نقشہ پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر سی شیکل کا خیال درست ہے ۔میاں محمد بخش کی اس تصنیف میں پنجابی کی مختلف بولیوں پوٹھوہاری گوجری ڈوگری ۔پہاڑی اور ماجھی کے علاوہ عربی اور فارسی کے الفاظ و تراکیب بھی ملتے ہیں ۔اس کے علاوہ یہ قصہ عربی اور فارسی میں بھی دستیاب ہے ۔اسے غواصی دکنی نے مثنوی بدیع الجمال کے عنوان سے نظم کیا ۔ ولیم لین نے اس قصے کا انگریزی ترجمہ کیا ۔مزے کی بات یہ ہے قصہ سیف الملوک ہمیں کشمیری میں بھی ملتا ہے ۔ مقبول شاہ کرالہ واری کا قصہ گلریز نام و مقام کے اختلاف کے باوجود بنیادی طور پر قصہ سیف الملوک ہے قصہ سیف الملوک کا سیف الملوک گلریز میں عجیب ملک کہلاتا ہے ۔بدیع الجمال نوش لب ہے ۔قصہ سیف الملوک کا ساعد گلریز میں معصوم شاہ ہے قصہ سیف الملوک میں دو سگی بہنیں ملتی ہیں ان کے نام ہیں ملکہ خاتون اور بد.. خاتون گلریز میں دو سگی بہنوں کے نام ہیں .. مست ناز اور ناز مست قصہ سیف الملوک میں ملکہ خاتون دیو کی قید میں ہے ۔قصہ گلریز میں بھی مست ناز دیو کی قید میں ہے ۔ملکہ خاتون قصہ سیف الملوک کی خاتون اوّل بدیع الجمال کی سہیلی ہے ۔اسی طرح مست ناز بھی قصہ گلریز کی خاتونِ اوّل نوش لب کی سہیلی ہے ۔ دونوں سہیلیوں کو سیف الملوک اور عجیب ملک دیو کے ساتھ سخت لڑائی کے بعد رہا کرتے ہیں ۔دونوں قصوں میں واقعات کی بُنت اور مماثلت کی کئی دوسری مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں ۔لیکن یہ موقع دونوں قصوں کے تقابلی یا مماثلی مطالعے کا نہیں ۔ مقصود ان سطور کا یہ تھا کہ قصہ سیف الملوک کی آفاقیت لسانی طور پر بھی مسلمہ ہے ۔

پنجابی زبان میں قصہ سیف الملوک میاں محمد بخش نے تصنیف کیا ۔اور سب سے پہلے ۱۸۹۸ء میں یونیورسل پریس جہلم میں مصنف کی نگرانی میں چھپا ۔ لطف علی کا قصہ سیف الملوک سیفل نامہ بھی کہلاتا ہے انڈیا آفس لائبریری لندن میں اس کا جو نسخہ ملتا ہے وہ ۱۹۲۳ء میں چھپا اور اس کے بیاسی صفحات ہیں پنجابی میں یہ قصہ دائم اقبال اور منظور بٹ نے بھی منظوم کیا ہے ۔امام بخش پسیاں والا نے بھی قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال نظم کیا ہے جو فقہ شریف کے مسائل اور ان کے حل پر مبنی ہے ۔یہ قصہ اسلامیہ پریس لاہور سے چھپا ۔

پروفیسر شریف کنجاہی دو ماہی جریدہ فنون شمارہ اپریل ۱۹۷۵ء میں لکھتے ہیں "سیف الملوک کا اصل قصہ "ہزار داستان" میں سے لیا گیا ہے ۔تاہم میاں محمد بخش نے اس حقیقت کو گول مول رکھا ہے " اگر پروفیسر شریف کنجاہی کی بات تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ امر بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ پنجابی کے اس قصے کا مآخذ فارسی ادب ہے ۔کچھ اور محققین کا خیال ہے کہ عربی فارسی اور اُردو کے اکثر حصوں کا مآخذ سنسکرت زبان ہے ۔ وہ لوگ کہ کسی زمانے میں کوئی راجہ تھا ۔اس نے اپنے برہمن وزیر سے کہا کہ کہانیاں فراہم کرو ۔ بعد ازاں ان کہانیوں کو سنسکرت زبان میں پنچ تنتر کے نام پر شائع کیا گیا ۔

ایران کے شہنشاہ نوشیرواں نے اپنے وزیر بزرجمہر سے کہا کہ ان کہانیوں کو یعنی پنچ تنتر کی کہانیوں کو پہلوی زبان میں ترجمہ کرو ۔بزرجمہر نے ترجمہ کیا ۔ پہلے پانچ باب تھے (تنتر فارسی میں باب کو کہا جاتا ہے) بزرجمہر نے ایک اور باب کا اضافہ کیا ۔ابنِ مقفع نے ان کہانیوں کو عربی زبان کا لباس پہنایا اور نام رکھا "کلیلہ و دمنہ" ملا حسین واعظ

کاشفی نے کلیلہ و دمنہ کا فارسی میں ترجمہ کیا اور نام رکھا انوارِ سہیلی۔ نواب فقیر محمد گویا نے فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا اور اسے بستانِ حکمت کا نام دیا۔ ان سب کہانیوں میں قصۂ سیف الملوک کے ٹکڑے ملتے ہیں۔ گویا مشرقی ادب میں قصۂ سیف الملوک کی اہمیت اور آفاقیت عہدِ قدیم سے طے ہے۔

ایک روسی محقق اور نقّاد آئی۔ سیری بریکوف اپنی کتاب "پنجابی ادب" میں لکھتے ہیں کہ سنسکرت اور پراکرت کے چند ادبی آثار و علائم کی جڑوں کی نشاندہی سرزمینِ پنجاب میں کی جاسکتی ہے۔ ان ادبی آثار و علائم میں سب سے زیادہ دلچسپ ادبی کاوش محیّر العقول رزمیہ نظم برہت کتھا ہے جسے عظیم داستان کہا جائے گا۔ بنیادی طور پر یہ پشاچی پراکرت میں لکھی گئی تھی۔ پشاچی پراکرت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ زبان جدید پنجابی کو تشکیل دینے والی پیش رو زبانوں میں سے ایک تھی۔

دوسری محقق برہت کتھا یا عظیم داستان کے مصنف کا نام نہیں بتلاتے اور نہ ہی انہوں نے اس کتاب کا عہد طے کیا۔ چنانچہ ہمیں کسی دوسری جانب رجوع کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی اپنی تصنیف "کشمیر" جلد اوّل صفحہ ۹۰ پر لکھتے ہیں "کشمندرا کشمیر کے شعرا کا زبدہ تصور ہوتا ہے وہ اننت کے عہد میں پیدا ہوا۔ اس نے کئی اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ اس کا ادبی شغل ۱۰۲۷ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۰۶۶ پر ختم ہوتا ہے۔

اس نے کئی کتابیں تصنیف کیں ان میں سے چونتیس کتابیں نرنیایا ساگر پریس بمبئی سے چھپی ہیں۔ کیتھ (KEETH) نے کشمندرا کی کتاب برہت کتھا منجری اور دوسری تصنیفات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ گویا طے ہوا کہ برہت کتھا یا عظیم داستان (بڑی کہانی) سنسکرت زبان کی تصنیف ہے۔ اور وہ گیارہویں صدی عیسوی میں تصنیف ہوئی۔

نہیں یہ بات نہیں برہت کتھا منجری طبع زاد کتاب نہیں ہے۔ اس کتاب کا اصل مصنف گوناڈیہ ہے۔ جو پشاچ نسل سے تھا اور پشاچی کا عظیم شاعر تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا۔ وڈھ کتھا یہ منظوم کہانیوں پر مشتمل کتاب تھی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ البتہ اس کے حوالے پالی زبان کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں۔ پالی بدھ مت کی مذہبی کتابوں کی زبان تھی۔ وڈھ کتھا غالباً دوسری صدی قبل از مسیح میں پنجاب میں تصنیف ہوئی۔ یہ عہد پنجاب کشمیر اور گلگت میں بدھ مت کی اشاعت کا عہد ہے۔ کشمندر کی برہت کتھا منجری گوناڈیہ کی وڈھ کتھا یا بڑی کہانی کے ایک حصّے کا ترجمہ ہے اور دوسرے حصّے کا ترجمہ ایک کشمیری پنڈت سوم دیو نے کیا اور اس کا نام رکھا کتھا سرت ساگر۔ ایک خیال یہ ہے کہ قصۂ سیف الملوک کے کچھ افسانوی واقعات نام مقام کی تبدیلی کے بعد پشاچی زبان کی وڈھ کتھا کا پرتو ہیں۔ اگر یہ مفروضہ درست ہے تو میاں محمد بخش کا قصہ سیف الملوک دو ہزار دو سو سال پرانا طے پاتا ہے۔ یعنی صحیح معنوں میں قصۂ پارینہ بن جاتا ہے۔ اور قدامت میں راجہ سلوان، پورن بھگت اور راجہ سالو کے ہم پلّہ ٹھہرتا ہے کیونکہ ان تینوں کرداروں کا قصہ پشاچی زبان کی اوّلین اور عظیم ترین رزمیہ داستان وڈھ کہانی میں ملتا ہے۔ یوں قصۂ سیف الملوک کی آفاقیت بائیس صدیوں پر محیط ہے۔

کسی ادب پارہ کی آفاقیت ناپنے کے لئے کسی نقّاد نے تا حال کوئی آلہ ایجاد نہیں کیا کیونکہ ادب ایک تو جذبہ و احساس کی جولاں گاہ کا شہسوار ہے اور دوسرے آخری تجزیہ میں اخلاقی ادراک و شعور کا نقیب ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ دائمی ادب برٹرنڈ رسل کے "الفاظ" میں ہماری ملکیتی امنگوں کے بجائے تخلیقی اُمنگوں کا نقیب وسیلہ ہے۔ اگر اس معیار پر قصۂ سیف الملوک کو پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پنجابی زبان کے بہت کم ادبی شہ پارے سیف الملوک کی جذباتی شدت اور رفعت کو پا سکتے ہیں۔ طوفان میں سیف الملوک سے ساعد جدا ہو گیا۔ جدائی کا احساس یوں آتشِ فروزاں بن کر اس ایک مصرع میں آتا ہے ؎

ہائے ہائے ربا یار پیارا دکھ وِنڈاون ہارا
اوہ بھی میتھوں کھس لیوئی جبارا قہارا

سیف الملوک میں جذباتی شدت اور اذیت کی ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں کہ ہومر فردوسی ڈانٹے، شیکسپیئر اور میر انیس یاد آتے ہیں۔ قصہ سیف الملوک کے اخلاقی شعور پر اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ہمیں میاں محمد بخش کے کلام میں مولانا روم اور شیخ سعدی شیرازی کے اخلاقی سلیقے ہر ہر صفحہ پر ملتے ہیں۔ جو ہمارے ذہن کی دیواروں کو اخلاق کی عالمی سچائیوں سے منور کر دیتے ہیں۔ مثلاً مولانا روم فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

میاں محمد بخش کے الفاظ میں :۔

درد ہووے تاں آہ نکل دی کوئی نہ رہندا جھکے
دلبر اپنے دی گل کریئے ہوراں نوں رکھ دھر کے

شیخ سعدی شیرازی نے فرمایا :۔

اگر بمرد عدو جائے شادمانی نیست
کہ زندگانیٔ ما نیز جاودانی نیست

میاں محمد بخش سے

دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے سجناں دی مرجانا
ڈیگر نے دن گیا محمد اوڑک نوں ڈھل جانا

شیخ سعدی شیرازی کا ایک اور شعر ہے

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

میاں محمد بخش اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں ہے

اوکھے ویلے کاری آوے بھلیاں دی اشنائی
اُڑیا آکھن دی لج پالن جو انسان وفائی

سچی بات یہ ہے کہ سفر العشق یعنی قصہ سیف الملوک اخلاق و تصوف و سلوک کا ہفت رنگ گلدستہ ہے۔ آفاقیت کی آخری قدر جو طے ہوئی تھی یہ تھی کہ ادب پارہ انسان کی تخلیقی اُمنگوں کا خلاق وسیلہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس قصے کا سورما سیف الملوک اپنے کوہ وقار حوصلے سے درندے کے دریاؤں، آفات کی آندھیوں اور غم کے پہاڑوں کو مات دے کر گوہرِ مقصود پاتا ہے اور اس صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ جہاں ایکلیس، پیرس، رستم، سہراب، سندباد جہازی اور راجہ رسالو کھڑے ہیں۔
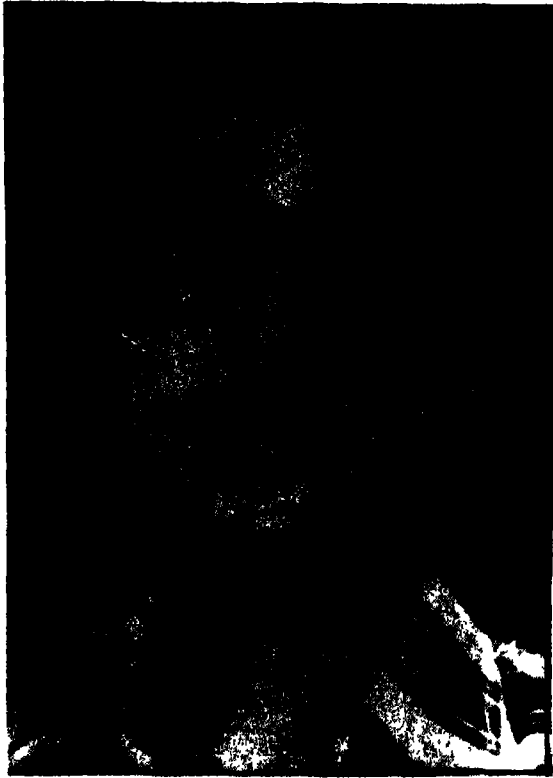
ڈاکٹر لئیق بابری

،ایک ایسی شعری نثر جو موسیقیت سے بریز ہو' بغیر وزن کے، بغیر قافیے کے، لیکن اتنی لچکدار، اتنی منجھی ہوئی کہ روح کے اتار چڑھاؤ، تصور کے مدوجزر اور شعور کی شورشوں کا ساتھ دے سکے":

اقتباس : بودلیئر کی نثری نظم
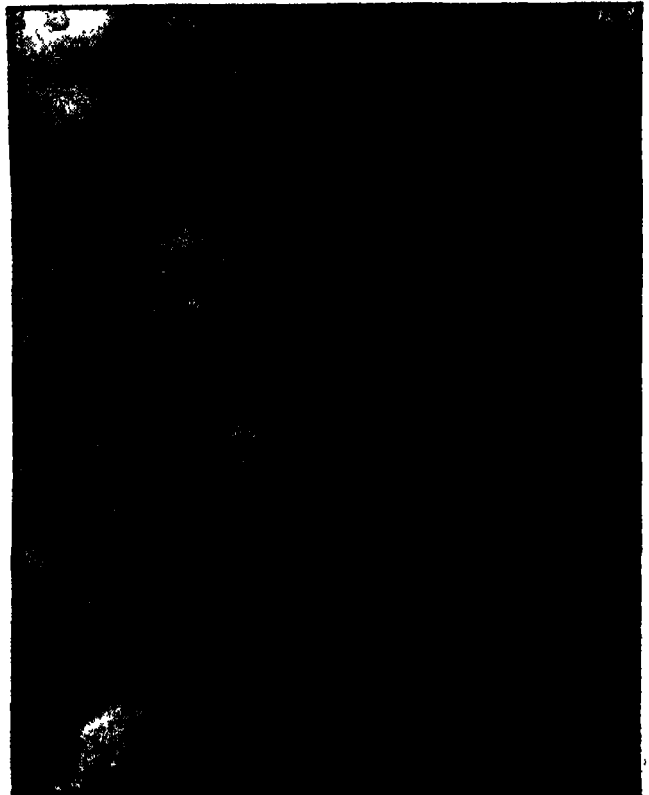
نجم الحسن رضوی

"اس نے کھلے دریچے سے باہر جھانکا۔ بارش اُسے بلا رہی تھی۔ سبزہ زار کے کنارے سرخ روشوں پہ گاتے پرندوں کا ناچ اُسے بہت اچھا لگا۔ وہ کھلے دریچے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ باہر نکال کے پانی کے جھلملاتے قطروں کو اپنی مٹھی میں گرفتار کرنا چاہا

اقتباس : آخری بارشوں کی سمفنی

تراجم:- نظیر صدیقی

موریس مترلنک

آخری الفاظ

اور اگر وہ کبھی واپس آجائیں
تو میں کیا کہوں گی ؟
ان سے کہنا کہ میں نے تمام عمر
ان کا انتظار کیا

اگر وہ کچھ اور پوچھیں
اور مجھے دیکھنے کی حسرت کا اظہار کریں
تو ان سے نرمی سے بات کرنا ایک بہن کی طرح
شاید وہ دکھی ہوں

اگر وہ مجھ سے پوچھیں کہ تم کہاں ہو
تو میں کیا کہوں گی
اس وقت انہیں میری سونے کی انگوٹھی دے دینا
چپکے سے

اگر وہ یہ جاننا چاہیں
کہ دالان کیوں سونا پڑا ہے
تو انہیں بجھا ہوا چراغ دکھلا دینا
اور کھلا ہوا دروازہ

اور اگر وہ اس کے بعد مجھ سے پوچھیں
کہ تمہیں نیند کیسے آگئی ؟
ان سے کہنا کہ میں نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں
انہیں رونے نہ دینا

ہنری ہائنے

جدائی کے وقت

جب دو چاہنے والے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں
تو اسی طرح باتیں کرتے ہیں جیسے ایک دوست
دوسرے دوست سے باتیں کرتا ہے
دونوں گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہیں کچھ روتے ہیں
اور بار بار آہیں بھرتے ہیں

جانِ آرزو، ہم لوگ نہیں روئے
نہ ہم نے آہیں بھریں، آخر اس کی کیا ضرورت ؟
آنسو، آہیں اور اذیت
بعد میں یہ چیزیں آئیں ـــــ لیکن صرف میرے حصے میں

جارج ویدھر

عزمِ عاشق

کیا میں مایوسیاں سہہ سہہ کر مر جاؤں گا
اس لئے کہ ایک عورت خوبصورت ہے
یا غموں سے اپنے رخسار کو زرد کر لوں گا
اس لئے کہ کسی کے رخسار گلرنگ ہیں
اگر وہ روزِ روشن سے زیادہ شفاف
یا مئی کے پھولوں سے بھرے ہوئے سبزہ زار سے زیادہ حسین ہے تو ہوا کرے
اگر وہ مجھے کچھ نہیں سمجھتی
تو مجھے اس کی کیا پروا کہ وہ کتنی حسین ہے

کیا میرا نادان دل حسرتوں کے بوجھ سے مضمحل ہو جائے گا
اس لئے کہ ایک عورت مجھ پر مہربان ہے
یا اس لئے کہ کسی کی ذات میں خوش مزاجی
اور دل کش رنگ و روپ دونوں کا امتزاج ہے
اگر وہ جنگلی فاختہ یا ماہی خور سے زیادہ نرم مزاج اور مہربان ہے تو ہوا کرے
اگر وہ مجھ پر مہربان نہیں
تو مجھے اس کی کیا پروا کہ وہ کتنی مہربان ہے

کیا ایک عورت کی خوبیاں مجھے اس قدر متاثر کریں گی کہ
میں اس کی محبت میں جان دے دوں گا
یا اس کی خوبیاں
مجھے اس پر مجبور کر دیں گی کہ میں اپنی خوبیوں کو بھول جاؤں
اگر اس میں وہ خوبیاں ہیں جن کی بنا پر وہ سب سے اچھی کہلانے کی مستحق ہے تو ہوا کرے
اگر وہ میرے لئے سب سے اچھی نہیں
تو مجھے اس کی کیا پروا کہ وہ کتنی اچھی ہے

کیا میں ایک احمق کی طرح جان دے دوں گا
اس لئے کہ اس عورت کی قسمت بہت اچھی معلوم ہوتی ہے
وہ عورت جو شریفانہ دماغ کی مالک ہے
جب اسے خارجی سہارے نہیں ملتے تو
وہ سوچتی ہے کہ وہ شخص سہاروں کی بدولت کیا کچھ کر سکتا ہے
جو سہاروں کے بغیر اس سے محبت کرنے کی ہمت رکھتا ہے
جب تک میں اس دماغ کو دیکھ نہ لوں
مجھے اس کی کیا پروا کہ وہ کتنی عظیم ہے

وہ اچھی ہو یا عظیم، مہربان ہو یا حسین
اب میں مزید مایوسی کو راہ نہیں دوں گا
اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے
تو قبل اس کے کہ اس کا دل دکھے میں مر جاؤں گا
اگر میں اس سے محبت کروں اور وہ مجھے حقیر سمجھے
تو میں اس سے نفرت کر سکتا ہوں اور اسے چھوڑ سکتا ہوں
اگر وہ میرے لئے نہیں ہے
تو مجھے اس کی کیا پروا کہ وہ کس کے لئے ہے

جون ۱۹۶۹ء

اے۔ ایس۔ جے ٹیسی موئڈ

مہذب آدمی

وہ دیکھتا ہے کہ موسیقی، کتاب اور آرٹ سے متعلق گفتگو
تمام اہم ترین صحبتوں میں مفید ہوتی ہے
وہ اپنے اندر یہ جاننے کی رغبت پیدا کرتا ہے
کہ آج کل جمالیاتی ہوا کا رُخ کیا ہے
اس میں کسی قسم کا شدید جذبہ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر نہ محبت کا احساس ہوتا ہے نہ نفرت کا
وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ کونسی چیز مروّج ہے اور کون سی متروک
جب تک وہ کوئی لطیف فقرہ سر کر سکتا ہے
وہ کسی چیز کی مدح یا مذمت کے لئے یکساں طور پر آمادہ رہتا ہے
اُبھرتے ہوئے آدمی کے اُبھرنے سے پہلے
وہ اس کا ڈھنڈورا پیٹ دیتا ہے
یہ جان کر کہ کس کی شہرت دم توڑ رہی ہے
وہ ایک سال پہلے ہی تعزیتی تقریر تیار کر لیتا ہے
اس کی زلزلہ نگار سوئی
کسی فیشن کی گرتی ہوئی عمارت کی غمازی کر دیتی ہے
بہر حال آرٹ میں کوئی چیز اچھی ہو یا بُری اس کے نزدیک دونوں برابر ہیں
وہ عام رواج کا آئینہ اور زمانے کی ترنگ کا مرغ باد نما ہوتا ہے

اس کے مذاق کی برتری مسلّم ہوتی ہے
اس بونے کے پاس ضائع کرنے کے لئے کوئی وقت نہیں ہوتا
اس لئے وہ صرف انہیں کتابوں کو پڑھتا ہے
جو کتابوں کے بارے میں ہوتی ہیں یا جو کتابوں کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کے بارے میں ہوتی ہیں
وہ چمکتا ہے لیکن اس کی چمک ٹھنڈی منعکس روشنی کا نتیجہ ہوتی ہے
وہ ایک ایسا دلیر ہے جو خطرے میں نہیں پڑتا۔ اس کی رائیں اس لئے صحیح ہوتی ہیں کہ وہ ماخوذ ہیں
وہ جیسا کہ کسی کے بغیر لنگڑا ہے اور لقمہ دینے والے کے بغیر گونگا

وہ دوسروں کا نمائندہ ہے ہر خلاصے کا خلاصہ
رہزنی کے باعث اور استعمال کئے ہوئے کپڑوں کی بدولت خوش لباس
پھسلتی ہوئی ریت پر مانگے کی اینٹوں سے عمارت بنانے والا معمار
دوسروں کے پھاوڑوں سے گھرے کھدے ہوئے کھیتوں کی فصل کاٹنے والا
صدائے بازگشت کی صدائے بازگشت سایوں کا سایہ دار

سائمن آرٹز

ترجمہ: امجد اسلام امجد

نظم

میرا بچہ رو رہا ہے
میں اس کے پاس جاتا ہوں اور اُس سے باتیں کرتا ہوں
میں اس کے لئے ایک شکاری کا گیت گاتا ہوں
وہ میری طرف دیکھتا ہے
اور اس کی آنکھوں کی روشنی میرے چہرے کا احاطہ کر لیتی ہے
جتنے الفاظ میں سوچتا ہوں اس کے وسیلے سے ہیں
ان کی موسیقی میں ایک شکاری، جنگجو اور مغنی کا آہنگ ہے
میرا بچہ خاموش ہو جاتا ہے
میں اس کے سر کو تھپکتا ہوں
اور میری انگلیاں اس کے سر کے ایک نرم گوشے
کو چھوتی ہیں جس کے نیچے دمکتا ہوا خون موجزن ہے
میرا نغمہ میرے بچے کے لہو میں گونج رہا ہے
اب وہ سو گیا ہے
اب میں جاؤں گا اور اپنی انہی انگلیوں سے
پتھروں اور ایک درخت کو چھوؤں گا
اور اس کے بعد میں اپنے ہاتھ سورج
کی طرف پھیلاؤں گا
اور اس کا شکریہ ادا کروں گا

رشید امجد

بھنور اندھیر

بڑی غیر متوقع اور عجیب رات تھی۔
یوں لگتا تھا جیسے بھری دوپہر میں رات نے گھات
لگا کر حملہ کیا ہے اور آناً فاناً سارے شہر کو اندھیرے
کی بُکل میں لپیٹ لیا ہے۔
آسمان پر گھنے سیاہ بادلوں نے شب خون مارا
تھا ۔۔!
بادلوں کے آگے آگے دوڑتے ستارے جان
بچانے کی کوشش میں دور گہرائیوں میں ڈوب ڈوب
گئے تھے۔
بڑی سڑک پر دکانیں بند ہو رہی تھیں۔
شٹروں کے گرنے، شوکیس کے کھینچنے کی اِکا دُکا
آوازوں کے درمیان، ہوا کی سرسراہٹ کا مسلسل
احساس اور ایک عجیب بے یقینی کی کیفیت میں ڈوبا
تیز تیز چلتا وہ، تعاقب کرتی آہٹ کا ایک ہی ردم۔
دو شخص اُس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔
ہوا میں سرسراہٹ، بوند بوند گرتی بے یقینی۔
اسکے قدموں میں تیزی آجاتی ہے۔
تعاقب کرتی آہٹ کا ردم وہی،
وہ دونوں اس کی رفتار کا برابر ساتھ دے رہے
ہیں ۔۔!

"تعاقب" خوف پہلو سے بل کھاتا نکل جاتا ہے
وہ تیز ہو جاتا اور مُڑ مُڑ کر پیچھے دیکھتا ہے۔
وہ بھی تیز ہو جاتے ہیں
سامنے چوک ۔ سمت کا انتخاب۔
پیدل کراسنگ کی بتی سُرخ ہے، لیکن وہ ٹریفک
کی پروا کئے بغیر دوڑ پڑتا ہے اور گاڑیوں سے بچتا بچاتا
ہانپتا کانپتا دوسری طرف نکل جاتا ہے۔
پیچھے آتے وہ دونوں سڑک کے درمیان پہنچ
چکے ہیں۔
"تو تعاقب" ۔۔ وہ دوڑ پڑتا ہے ۔۔ دوڑتا
رہتا ہے۔
دکانیں کب کی بند ہو چکی ہیں، لوگ گھروں کو
جا چکے ہیں اور وہ اس تنہا اکیلی سڑک پر، ہانپتی ہوا
کے ساتھ قدم قدم چل رہا ہے۔
وہ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟
"کیوں؟"
فضا میں شعلہ لپکتا ہے، ہوا بجلی کے تاروں کو
جھولے کی رسی کی طرح گھما رہی ہے۔
تار سے تار ٹکراتی ہے تو شعلہ لپکتا ہے اور پھر
گھور اندھیرا ۔۔

اگر تار ٹوٹ کر مجھ پر آگریں؟
وہ جست لگا کر سڑک کے بیچ بیچ آجاتا ہے
یہ انتہائی تاریک رات ہے۔
یوں لگتا تھا جیسے اندھیرے نے روشنی کی ایک
ایک کرن کو چُن چُن کر نگل لیا۔
وہ سڑک کے بیچوں بیچ چل رہا ہے۔
اُڑتی مٹی سے آنکھوں کو بچاتے، اسے خیال آتا
ہے اگر اچانک کوئی تیز رفتار گاڑی آجائے تو ۔۔
تو ۔۔
وہ سمٹ کر دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر آجاتا
ہے۔
ہوا تیز ہاتھوں سے سائن بورڈوں کو ڈھول
کی طرح بجا رہی ہے۔
اس کے سر پر سائن بورڈوں کی قطار ہے۔
ہوا پھنکارتی ہے، خوف کا کتا اس کے گرد چکر
لگاتا، بھوں بھوں کر رہا ہے۔
اگر کوئی سائن بورڈ مجھ پر آن گرے تو ۔۔
تو ۔۔
وہ اچھل کر سڑک کے بیچوں بیچ آجاتا ہے۔
یہ بڑی ڈراؤنی سرد رات تھی۔

کھمبوں پر لگے ہوئے بلب تھک کر پیلے پڑ گئے
تھے اور ٹمٹماتے ہوئے آخری ہچکیاں لے رہے تھے۔
وہ رُک جاتا ہے، جیب سے سگریٹ کا پیکٹ
نکالتا ہے اور سڑک پر تقریباً اوندھا ہو کر سگریٹ سلگانے
کی کوشش کرتا ہے۔ مگر ہوا ہاتھوں میں تیر کمان لئے
نشانے لگا رہی ہے۔
وہ سڑک کے درمیان بیٹھ جاتا ہے اور گھٹنوں
میں سر دے کر ماچس جلاتا ہے۔ دفعتاً اسے خیال
آتا ہے اگر ایسے میں کوئی گاڑی اُس کے اُوپر سے
گذر گئی تو ـــــ
تو ـــــ
وہ اتنی تیزی سے اُچھلتا ہے کہ سگریٹ منہ سے
نکل کر دور جا گرتی ہے۔
یہ رات ٹوٹ ٹوٹ کر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی
ہے۔
گھر اگا ڈا اندھیرا تارکول کی طرح چیزوں کے منہ
پر بہہ رہا تھا۔
ایک طرف کی فٹ پاتھ پر بجلی کی تاریں اور تیز
طوفانی ہوا۔
دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر سائن بورڈ اور
ہانپتی کانپتی پاگل ہوا۔
سڑک کے بیچ بیچ شاں شاں کرتی تیز گاڑیاں
گھر ـــ
کہیں دور تاریکی میں ڈوبا ہوا گھر عکس کی طرح
ہلتا جھلاتا ہے۔
تیز ہوا، ڈراؤنی شکلیں بناتے بادل
نہ ختم ہونے والی ہیبت ناک رات اس
کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔
چیزیں اندھیرا
آواز اندھیرا
پہچان اندھیرا
رنگ اندھیرا ـــــ اندھیرا ہی اندھیرا
وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا کبھی مڑ کر دیکھتا
ہے کہ کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا۔ کبھی ایک طرف کی
فٹ پاتھ پر نظر ڈالتا ہے جس کے اوپر بجلی کی تاریں
ہوا کے زور سے پھڑ پھڑا رہی ہیں۔ ان کے ٹکرانے
سے بجلی کا شعلہ لمحہ بھر کے لئے اندھیرے میں چمکتا ہے
پھر تیز رگڑ اور موت کی سیٹی کا مسلسل شور۔ دوسری طرف
کی فٹ پاتھ پر بڑے بڑے سائن بورڈ ہل ہل کر اپنی
اپنی میخوں میں ڈھیلے ہو کر جھول رہے ہیں۔
سر پر گھرے گھنے اُمڈتے بادل اور دل ہلانے
والی گڑگڑاہٹ۔
سڑک کے بیچ بیچ تیز گاڑیوں کے نیچے آکر
کچلے جانے کا خوف۔ آگے گھور اندھیرا جس میں
ڈوبے ہوئے گھر کا تصور ـــ ایک خواب محض
ایک خواب۔
اس خواب کے پیچھے قدم قدم چلتا وہ کبھی رُک
جاتا ہے، چل پڑتا ہے پھر رُک جاتا ہے۔ آگے
پیچھے دائیں بائیں دیکھتا ہے پھر چل پڑتا ہے۔
بادل پورا زور لگا کر چیختے ہیں اور بارش کا ایک بھرپور
تھپیڑا اس کے منہ پر آکر لگتا ہے۔ کھمبے کے اوپر
زوردار دھماکہ ہوتا ہے۔ شعلہ چمکتا ہے تو سڑک
دور دور تک روشن ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسرے
لمحے بتاشے کی طرح اندھیرے میں بیٹھ جاتی ہے۔
ایک سائن بورڈ چرچراتا ہے۔ اور دھماکے سے
نیچے آن گرتا ہے۔
وہ کبھی دائیں، کبھی بائیں اور کبھی درمیان میں ٹھٹکا
کوششیں سر سے پاؤں تک بھیگ جاتا ہے۔
عمریں بیت جاتی ہیں
برف سر اور برف بھنوؤں کے ساتھ گھر کے
دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے لگ رہا
ہے، جیسے ٹھنڈک اس کے بدن پر ننگی انگلیاں
پھیر رہی ہے۔
دروازہ کھلتا ہے اس کی بیوی لپک کر کہتی ہے
"شکر ہے آپ آ گئے"
پھر فوراً گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہے ـــ "کون
ہیں آپ؟"
"میں ـــ میں" وہ ہکلا کر رہ جاتا ہے۔
اندر سے اس کی بیٹی کی آواز آتی ہے ـــ "امی
کون ہے؟"
"پتہ نہیں کون ہے؟" اس کی بیوی خوفزدہ
سی آواز میں کہتی ہے اور جلدی سے دروازہ بند
کر لیتی ہے۔
یہ بڑی غیر متوقع اور عجیب رات ہے۔
یوں لگتا ہے جیسے بھری دوپہر میں رات نے گھات
لگا کر حملہ کیا ہے اور آناً فاناً سارے شہر کو اندھیرے
کی ٹکیل میں لپیٹ لیا ہے۔
یہ بڑی غیر متوقع اور عجیب ـــ!

صہبا اختر، اختر انصاری اکبر آبادی
حمایت علی شاعر

دریچہ
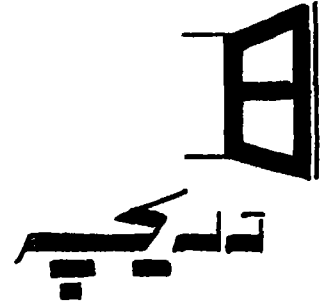
جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین، فہمیدہ ریاض، اظہر جاوید، عطاالحق قاسمی، سائرہ ہاشمی

حیدر قریشی اور دوسرے احباب (خانپور
میں ایک ادبی اجلاس کے موقع پر)

روحی کنجاہی، حمیدہ جبیں، ایس ایم اختر
اظہر جاوید، ذوالفقار احمد تابش
سیّد حسن ناصر

قیوم نظر ۔ شریف کنجاہی، منیر نیازی، امجد اسلام امجد، اختر کاشمیری، جانباز جتوئی ڈاکٹر رشید انور، مرتضیٰ برلاس،

سرور مجاز، اعجاز فاروقی
بیدار ملک

نجم الحسن رضوی

آخری بارشوں کی سمفنی

کوڑے کا ڈھیر۔
ہاتھ پاؤں مارتا پیار کے مس کو ڈھونڈتا بچہ!
اور اندھیرا ـــ

آواز کا ایک قطرہ چھن سے اس کے کان میں گرا۔ اس نے بوجھل آنکھیں کھولیں اور دیکھا۔ سُرخ پھولوں کے پیچھے وہی دھندلا سا چہرہ تھا۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اُسی لمحے بارش چاندی کے سکّے لٹاتی اندر داخل ہوئی۔

اس نے سنا، بارش اس کے سرہانے کھڑی تھی اور اپنی گیلی انگلیوں سے کھڑکی کے شیشوں پر اپنا نام لکھ رہی تھی۔ میں ہوں، میں ہوں، میں ہوں!

نم آلود انگلیوں نے اس کی پیشانی کو چھوا، ساتھ ہی کھلے دریچے سے جھکتی ہوا کا ایک جھونکا گنگناتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اُس نے سُرخ کمبل سرکایا تو سرا جست بھر کے باہر نکل گیا۔

اُس نے کھلے دریچے سے باہر جھانکا۔ بارش اُسے بُلا رہی تھی۔ سبزہ زار کے کنارے سُرخ روشوں پر جگمگاتی بوندوں کا ناچ اسے اچھا لگا۔ وہ کھلے دریچے کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اس نے ہاتھ باہر نکال کے پانی کے جھلملاتے قطروں کو اپنی مٹھی میں گرفتار کرنا چاہا، پانی کے جگنو اس کے ہاتھوں کو چوم کر اُڑ گئے۔ اس نے سُنا، بارش گیت گا رہی تھی، میں ہوں، میں ہوں!

اس نے دروازہ کھولا اور برآمدے میں اتر گیا۔ برآمدے کی سیڑھیاں سفید تھیں اور ان کے نیچے سُرخ پھولوں کے تختے تھے۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اُس کے پیچھے کھڑکیوں میں لوگوں کے سر سجے ہوئے تھے۔ دور کسی دھندلے دریچے میں ایک مانوس نقش اسے نظر آئی مگر وہ صاف دکھائی نہ دیتی تھی اس کے آدھے چہرے پر سُرخ پھول تھے جن کے اُوپر گوری پیشانی کا حاشیہ اور چمکتی آنکھیں!

ـــ گلدان میں سجی ہوئی آنکھیں اُسے دیکھ رہی تھیں۔ بارش پیانو بجا رہی تھی اور فرش پر گرتی بوندوں سے سُروں کا کھیت اُگا ہوا تھا۔ درختوں کے پتے ہوا کی قبا میں تمغوں کی طرح سجے ہوئے تھے۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نوعمر پتہ درخت کی گود سے محروم ہو کے سسکیاں بھرتا اس کے پاس سے گذرا اور اس نے آخری سیڑھی پر جا کے خودکشی کرلی اور دھندلے دریچے میں چمکتی آنکھیں ـــ

کاش وہ انہیں قریب سے دیکھ سکتا۔ مگر روشنی کے یہ نقطے کب سے اس کے ذہن پر سوار تھے، دھندلے دریچے میں دو ستارے ا یہ ستارے صرف اس کے قریب آتے تھے۔ جب اس کے لبوں پر ماں کے دودھ کا ذائقہ باقی تھا۔ مگر ماں تو بچپن ہی میں بجھ گئی تھی ـــ روشنیاں کتنی کم ہوتی ہیں اور اندھیرا کتنا زیادہ ہوتا ہے۔

اور اندھیرا ـــ
کوڑے کا ڈھیر!
اور ہاتھ پاؤں مارتا پیار کے لمس کو ڈھونڈتا بچہ!

درخت کی مٹھی سے ایک اور پتہ گرا۔ ایک لمحہ یا شاید مکمل عرصۂ حیات! پتہ بھٹکے ہوئے کبوتر کی طرح اس کے کندھے پر آ بیٹھا۔ اس نے پتے کو اٹھایا۔ سوکھا پتہ، جس پر گذرے ہوئے لمحے کی زندگی جمی ہوئی تھی۔ جھلسا ہوا دھوپ کی شدت سے تڑخا ہوا پتہ! اسے موسم بدلنے کا احساس ہوا جیسے لو چلنے لگی ہو، جیسے دھوپ چٹخنے لگی ہو، جیسے ہوا میں سانپوں کی پھنکاریں گھلی ہوئی ہوں۔

اگر راستہ دکھانے کو وہ دونوں ستارے نہ ہوتے تو اندھیری رات میں آگے بڑھنا کتنا دشوار تھا، وقت کا سرکش سمندر اور زندگی کی ڈولتی کشتی۔

جن آنکھوں کا تعاقب کرتے کرتے وہ جوان ہوا، وہ آنکھیں، وہ چمکدار آنکھیں، وہ چمکدار پیشانی ہمیشہ اس کی دسترس سے باہر رہی۔ کیسی عجیب بدنصیبی تھی۔ اس کی شادی ہوئی اور وہ کئی بچوں کا باپ بنا اور اس کے کئی بچے اپنے بچوں کے باپ بنے لیکن وہ آدھا چہرہ، وہ پیشانی اور وہ آنکھیں، وہ بچپن سے دکھتی ہوئی محبوب آنکھیں! وہ آنکھیں کہاں تھیں؟ آنکھیں تو بہت تھیں لیکن

ان میں روشنی نہیں تھی، یہ آنکھیں نہیں تھیں، یہ
آنکھیں جن چہروں پر آویزاں تھیں، وہ چہرے نہیں
تھے۔ وہ سوکھے پتے تھے۔ زرد اور پریشان زدہ!
یہ چہرے اس کے بیٹوں کے تھے اور اس کی
بیٹیوں کے — !

کبھی کبھی وہ دعا کرتا۔ اے بارشوں کے خدا!
تو کبھی ایسی بارش کر کہ جس میں روشنی برسے تاکہ
بنجر آنکھوں میں محبت کا سویرا طلوع ہو!

اے بہار کے خدا! دلوں کی خشک کھیتیوں
میں ایسے پھول کھلا جن سے وجود کی سیاہ فصلوں
میں دھوپ کا شہر جاگ اٹھے!

اے دھوپ اور گرمی کے خدا! سرد روحوں
کے بدن میں محبت کی گرمی پیدا کر اور لوگوں کے باطن
میں خلوص کی دوپہر کو جگا!

اس کے بیٹے اور بہوئیں اس سے بہت خوش
تھے۔ وہ اس کے سامنے کھڑے ہوتے تو وہ دیکھتا
ان کے ہونٹوں پہ اس کے ترانے ہیں۔ مگر ان کی آنکھوں
میں روشنی نہیں تھی۔ ایک دن جب وہ آنکھیں بند
کئے لیٹا تھا، اس کا بیٹا اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا، دیکھو
ابا کتنے کمزور ہو گئے ہیں، اب مجھے یقین نہیں کہ
یہ زیادہ عرصے ہمارا ساتھ دے سکیں!

اس کی بیوی بولی — جب یہ حال ہے تو پھر
انہیں اپنا کاروبار اور تمام ضروری معاملات فوراً
تمہارے سپرد کر دینے چاہئیں آخر تم بڑے بیٹے
ہو — !

پھر ایک دن اس نے چھوٹے کو یہ کہتے سنا۔
پیسے کی ہوس آدمی کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتی
ہے، ابا کو سوچنا چاہیئے کہ اب ہم جوان ہو [illegible] ہم
ذمے داریاں اٹھا سکتے ہیں!

اسکی بیوی بھی ساری زندگی اس کے لئے اجنبی
رہی اور وہ دونوں گزرتی رُتوں کے سمندر میں مخالف
سمتوں میں تیرتے رہے۔ اُسے بچپن ہی سے تیرنے کا بہت
شوق تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ تیرنے سے بدن
قابو میں رہتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب وہ ایک دن
تیرنے گئی تو پھر پانی نے اُسے واپس نہ آنے دیا۔

اس کے بیٹے اور بیٹیاں چاہتے تھے کہ وہ ہر
فکر سے آزاد رہے کبھی کبھی بڑا بیٹا اسے سمجھاتا —
جب بچے جوان ہو جائیں تو باپ کو تمام پریشانیوں
سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے، میرے پیارے
ابا آپ آرام کریں اور تمام کاروباری الجھنوں کی چابیاں
ہمارے حوالے کریں!

چھوٹا بیٹا کہتا، آپ اپنے اعصاب کو ضرورت
سے زیادہ نہ تھکائیں ابا!

پھر بڑی بہو کہتی! اصل میں جب ماں بچھڑی
تھیں اُسی وقت ابا کو دوسری شادی کر لینی چاہیئے
تھی۔ بڑھاپے کی تنہائی بھی عذاب ہوتی ہے اب
کوئی تو ان کا دکھ درد بٹانے والا ہوتا!

چھوٹی بہو اظہار خیال کرتی ہے — ابا ہم
سب سے کٹ کے رہ گئے ہیں اس لئے کہ ان کی
دنیا ہماری دنیا سے مختلف ہے، وہ ہماری سوچ
کا ساتھ نہیں دے سکتے!

ہوا نے سوکھے پتوں پر لکھے ہوئے گزرتے
لمحوں کے کئی پیغام اس تک پہنچائے۔ پھر ایک دن
بڑے بیٹے نے کہا — میں نے ابا کے لئے ایک
نئی دنیا تلاش کی ہے وہاں ابا کی طرح بہت سے
لوگ ہیں۔ ان کی عمر کے شکنوں میں تجربے کا سمندر
بند ہے اور آنکھوں میں زندگی کی طویل دھوپ
چھاؤں! وہاں ابا خوش رہیں گے کیونکہ وہ جگہ ان
کے چھپنے کے لئے ہے! وہاں سب ایک ہی کشتی کے
سوار ہیں، ہم نوالہ اور ہم پیالہ — وہ تو اتنے آرام
کی جگہ ہے کہ ابا گھر کی آسائشوں کو بھول جائیں گے!

سو یہاں آ کے پتہ چلا کہ واقعی یہ جگہ کتنی اچھی
تھی۔ یہاں ہر فرد اپنی ذات کا ہمسایہ تھا۔ یہاں
آنے سے پہلے اسے کبھی اپنے آپ سے اتنی زیادہ
محبت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہاں دوست نہیں
تھے اور یہاں رقیب بھی نہیں تھے اور ہر شخص
کو اپنے آپ سے محبت کرنے کی پوری آزادی
تھی۔ ظاہر ہے کہ تنہائی اپنی ذات کی طرف متوجہ ہونے
کے لئے بہترین چیز ہے۔ باہر کی دنیا پر اس
فردوس بریں کے دروازے ہفتے میں صرف ایک
بار کھلتے۔ آنے والے کچھ دیر بیٹھ کر چلے جاتے۔ یہ
بات نہیں تھی کہ اس کے بیٹوں اور بہوؤں کو اس
کا خیال نہیں تھا۔ ہر ہفتے باری باری اُن میں سے کوئی
نہ کوئی ضرور اس کے پاس ہوتا۔ ان کے دئیے ہوئے
تحفوں کی فہرست طویل ہوتی جا رہی تھی۔ کرم خوردہ
کتابوں کی ورق گردانی کے لئے موٹے شیشوں کی عینک
اور اپنے شب و روز پر ہنسنے کیلئے نئی مصنوعی بتیسی!
اس کے پاس کیا کچھ نہیں تھا لیکن اس کے بیٹے تھے
کہ پلٹ پلٹ کے یہی سوال کرتے تھے ابا کسی اور
چیز کی ضرورت تو نہیں؟

ابا کو بھلا اب کس چیز کی ضرورت تھی، سب
ضرورتیں ختم ہو گئی تھیں اور آنکھوں نے خواب دیکھنے
چھوڑ دیئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ادھورا
چہرہ بار بار اس کے سامنے آتا، سفید پیشانی،

محبت آمیز روشن آنکھیں اور گلاب ۔۔ اور اسے
دور سے آتی بارش کا مدھر ساز مینہ سنائی دیتا۔
تو اس جنت میں رہتے اسے شاید ایک صدی
یا شاید کئی صدیاں بیت گئی تھیں۔ اس کے بچے
ٹھیک کہتے تھے، یہاں اسکے بہت سے ہمشکل موجود تھے
پھر ایک دن دریچے کے پیچھے سے اچانک کسی کے
رونے اور چیخنے کی آواز آئی۔ برابر والے کمرے میں
کوئی لڑکی رو رہی تھی۔ فریاد کر رہی تھی۔ اس نے
گھبرا کے پکارا ۔۔ کیا بات ہے یہ کون رو رہا ہے؟
ایک شخص کھڑکی پر آیا، جناب اس کمرے میں ایک
بچی ہے جو ٹانگوں سے محروم ہے کبھی کبھی اس پر گردے
کے درد کا دورہ بھی پڑتا ہے تو یہ اپنی تکلیف پر
قابو نہیں پا سکتی، آپ معاف فرمائیں!
پھر جب ایک اور مرتبہ دریچے کے پیچھے سے
چیخوں کے شعلے اُبھرے تو اس نے پکار کے کہا۔
بیٹی میری بات سنو!
پردے کے پیچھے لڑکی نے سسکی بھری۔
وہ بولا ۔۔ میں تمہارے باپ کے برابر ہوں
اگر میں کچھ کہوں تو میری بات مانو گی؟
جواب میں خاموشی طاری رہی۔ اس نے کہا ۔۔
ہر دکھ جھیلنے کے لئے ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی امانت ہے
میری بچی، یہ وہ راز ہے جسے انسان کے سپرد اس
لئے کیا جاتا ہے کہ وہی اسے چھپائے رکھنے کا اہل
ہوتا ہے، میری گڑیا، ہر دکھ چھوٹا اور انسان بڑا
ہے!
اس دن کے بعد اس دریچے سے چیخنے کی آوازیں
نہیں آئیں البتہ کبھی کبھی وہ لڑکی اس سے باتیں ضرور
کرتی ۔۔ پاپا ۔۔!

جی بیٹی!
پاپا آپ یہاں رہتے رہتے اب تک اُکتائے
نہیں؟
وہ ہنستا ۔۔ بی بی مجھ میں اکتانے کی ہمت نہیں
ویسے سنو جب ہم کسی اور کی مرضی سے زندہ ہیں تو
پھر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جب تک زندگی
کی ایک سانس بھی باقی ہے تب تک ہمیں اس
زندگی سے لطف اٹھانا چاہیئے، میری بچی تم نے
برآمدے کی سمت والی کھڑکیاں نہیں کھولیں، دیکھو
صبح سے کیسی اچھی بارش ہو رہی ہے اور کھڑکیوں
میں سُرخ گلاب کھلے ہیں۔ پتہ ہے جب بارش ہوتی
ہے تو میں گھنٹوں بارش میں بھیگتی سیڑھیوں کو دیکھتا
رہتا ہوں۔ یہ سیڑھیاں نہیں ہماری عمر کی منزلیں
ہیں اور بارش خوشیوں کا سلسلہ جو ان سیڑھیوں
سے دُکھوں کی گرد صاف کرتا رہتا ہے!
برستے پانی کا ساز اسے سچ مچ ایسی انمول خوشی
بخشتا تھا جو اندھیرے میں روشنی کو دیکھ کر ہوتی ہے
اس کے کان دور سے بارش کے تھرکتے قدموں
کی آہٹ سُن لیتے اور اس کے بدن کی سب
کھڑکیاں آپ ہی آپ کھل جاتیں اور ہر کھڑکی میں
وہی چہرہ سجا ہوتا، ادھورا چہرہ، روشن آنکھیں
اور سفید پیشانی! پھر وہ اپنے آپ سے کہتا۔
تمہیں صحراؤں میں ساون کا آنا مبارک ہو!
بارش نے اسکے لرزتے ہاتھوں سے مصافحہ
کیا اس نے اپنے ہاتھوں میں پانی کے جگمگاتے
نگینے جڑے ہوئے دیکھے۔ بارش اُسے جُھک
جُھک کے پیار کر رہی تھی اور برستا پانی اس کے
بالوں، اس کے ابرؤں اور اس کے گالوں کو

چوم رہا تھا۔ ساون اس کے گھر میں تھا اور
کھڑکیاں تھیں وہ سفید سیڑھیوں پر بیٹھا تھا
'پاپا ۔۔!' اچانک آواز کا ایک قطرہ چھن سے
اس کے کان میں گرا ۔۔ اس نے نظریں اٹھائیں
اس کے سامنے ڈاکٹر تھا۔ ایک نرس اور سُرخ پھول
اور ان کے پیچھے گوری پیشانی اور چمکتی آنکھیں!
وہ مسکرایا، اس کے اندر ایک انجانی ٹھنڈک
اپنے بازو پھیلانے لگی۔ پھر اس نے سوالیہ نگاہوں
سے ادھر اُدھر دیکھا، یقیناً یہ ملنے کے لئے آنے
والوں کا دن نہیں تھا معاً اسے احساس ہوا کہ اس
کے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں اور اس کے
بالوں سے پانی ٹپک رہا ہے اس نے سوچا کہ نرس
کو آواز دے مگر اس کی آواز ۔۔؟ وہ اٹھنا چاہتا تھا
مگر اس نے دیکھا کہ سُرخ کمبل نے اس کے پاؤں سختی
سے جکڑ رکھے تھے۔ اور اسی وقت اُسے زور کا
جھٹکا لگا۔ پھر نرس نے اس کی عرق آلود پیشانی کی طرف
ہاتھ بڑھایا تو اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ڈاکٹر
نے جلدی سے نبض ٹٹولی اور کہا ۔۔ پہلے فالج سے آدھا
دھڑ گیا تھا اور اب دل کا ۔۔!
بیساکھیوں پر سے سُرخ پھول گر گئے اور لڑکی
پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ پاپا ۔۔! پاپا ۔۔!
ڈاکٹر نے کمبل سرکایا تو ایک اخبار نیچے جا گرا

اندھیرا،
کوڑے کا ڈھیر،
اور ہاتھ پاؤں مارتا، پیار کے لمس کو ڈھونڈتا
بچہ ۔۔!

باہر سیڑھیوں پر سوکھے پتوں میں دھوپ ٹھٹک
رہی تھی۔

جون ١٩٧٩ء

پنجابی کہانی : انور علی

ترجمہ : شاہد ریاض

طوطے

اگر آج فرائیڈ زندہ ہوتا تو پتا نہیں اس سلسلے میں کیا کہتا لیکن مجھے طوطے زہر لگتے ہیں۔ پہلا طوطا سلیم تھا پتا نہیں کس نے اس کا نام طوطا رکھا تھا۔ پر اس کی ناک بالکل طوطے کی چونچ جیسی تھی۔ وہ پڑھنے لکھنے میں بہت ہوشیار تھا۔ لڑکے کہتے تھے کہ وہ آدھی آدھی رات تک پڑھتا رہتا ہے۔ لیکن جب ماسٹر نے اسے مانیٹر بنا دیا تو اس کی باقی ماندہ آدھی رات کا بھی ستیاناس ہو گیا۔ رات بھر وہ اس غم میں جاگتا رہتا کہ جس دن اس نے پینتیس سے کم شکایتیں لگائیں تو اسی دن ماسٹر اس کی مانیٹری چھین لے گا — اور اختیار کی خاطر آدمی کیا کچھ نہیں کرتا ہمیری اس نے کوئی دس ہزار سے زیادہ شکایتیں کی ہوں گی۔ میرا بس چلتا تو میں اس کو بڈھے دریا کی سب سے ڈونگی جگہ میں دھکا دے دیتا۔ آج کل وہ ولایت میں ہے۔ اور انگریزوں کے بچوں کو انگریزی پڑھاتا ہے۔ وہ جب کبھی لاہور آتا ہے تو مجھ سے ملنے ضرور آتا ہے۔ یوں جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ سلیم خود تو ولایت چلا گیا۔ لیکن میرے پیچھے طوطے لگا گیا۔ طوطوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے سکھ سے نہیں جینے دیں گے۔ اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد انہوں نے میری قبر پر گھونسلے بنا لینے ہیں

مجھ سے پہلے میرے فلیٹ میں ایک پارسی رہتا تھا۔ جب میں کرائے پر لینے کے لئے یہ فلیٹ دیکھنے گیا تو اس نے اپنا ٹیک ووڈ کا فرنیچر میرے سر منڈھنے کی کوشش کی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب پاکستان ابھی ابھی بنا تھا اور میں اپنی تمام چارپائیاں اور پیڑھیاں لدھیانے چھوڑ آیا تھا۔ میں ہرمزجی کا فرنیچر ضرور خرید لیتا لیکن جب اس نے مجھے بتایا کہ فرنیچر کے ساتھ ایک طوطا مفت ملے گا تو میں موسے کی چال سمجھ گیا۔ وہ طوطا اس وقت بوڑھا اور آنکھوں سے معذور تھا۔ ہرمزجی جب اسے کہتا: "آؤ" تو وہ آواز کی سیدھ پر آ کر اپنی چونچ پنجرے سے باہر نکال لیتا۔ ہرمزجی اس کی چونچ کو پیار کرتا اور وہ دوبارہ اپنی ٹیک پر جا بیٹھتا۔ اندھے فقیروں کی طرح اسے اپنے پنجرے کا جغرافیہ اچھی طرح حفظ تھا۔ اس کی یہ باتیں دیکھ کر شاید کوئی چھوٹی موٹی عقل کا آدمی دھوکا کھا جاتا پر میں طوطوں سے واقف تھا، فوراً سمجھ گیا کہ مجھے پھانسنے کی کوشش ہو رہی ہے سو حافظ جی کی چال نہ چلی۔

دراصل اس سے تھوڑا عرصہ قبل ایک طوطے نے مجھے بہت خراب کیا تھا اور وہ زخم ابھی ہرا تھا۔ میں لدھیانے سے پاکستان آ رہا تھا، گاڑی کی چھت پر بیٹھ کر۔ گاڑی جگہ جگہ رکتی اور میں ہر جگہ اتر کر اپنی بیوی سے اپنا بیمار بیٹا لے کر اسے تازہ ہوا کھلاتا۔ اسی گاڑی کے ایک دوسرے ڈبے میں ایک طوطا تھا، ایک بوڑھی مائی کے پاس پنجرے میں بند۔ جہاں بھی گاڑی رکتی اور میں اپنے بیمار بیٹے کو ہوا کھلانے کے لئے اترتا۔ وہ مائی مجھے پنجرا پکڑا دیتی اور کہتی: "بیٹا، اس بے زبان کو بھی ہوا کھلا دے۔" بڑی مائی کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے میں ایک کندھے پر گگو کو بٹھاتے اور ایک ہاتھ میں طوطے کا پنجرا پکڑے ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ پھرتا اور طوطا اس طرح پھڑپھڑاتا اور ٹیں ٹیں کرتا جیسے کوئی پہلوان کشتی جیت کر 'یا علی' کے نعرے لگا رہا ہو اور بلوچ سپاہی اپنی رائفلوں کے کندے دکھا کر کہتے "اوئے طوطے بابو، گاڑی پہ چڑھ جا اگر جان کی خیر چاہتا ہے۔" اب آپ خود ہی بتائیں کہ اگر کوئی آپ کا اور آپ کے سب سے بڑے دشمن کا نام ایک ہی سانس میں لے تو آپ پر کیا بیتے گی؟

اولاد بڑی ٹیڑھی شے ہے اور اس کی خاطر انسان کو طرح طرح کے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ ایک دفعہ گگو کہیں سے دو طوطے لے آیا۔ ان طوطوں نے جو میرے ساتھ کیا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ ان دونوں کا ایک

ایک کندھا ٹوٹا ہوا تھا۔ دن بھر وہ کھلے پھرتے رہتے
اور رات کو گگو ان کو ایک پنجرے میں بند کر کے موسم
کے مطابق، کمرے کے اندر یا باہر صحن میں رکھ دیتا۔
ٹیں ٹیں کرتے اور جگہ جگہ بیٹیں کرتے ہوئے وہ اس
طرح اندر باہر پھرتے جیسے وہی گھر کے مالک ہوں
اور جب میں مزدوری کر کے گھر لوٹتا تو میرے پیروں
کے نیچے آنے کی کوشش کرتے۔ ان میں شہادت کا
جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اور وہ بھی میرے
پیروں تلے آ کے شہید ہونے کا۔ میرا جی چاہتا کہ ان کو
اٹھا کر ساحلے میں پھینک دوں لیکن پھر گگو کا خیال
آجاتا کہ وہ طوطوں بنا کیا کرے گا۔ دوسرے یہ طوطے
بڑی چالاکی سے گھر کے دیگر افراد سے یوں گھل مل
گئے تھے۔ جیسے سبھی ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔
صرف راشن کارڈ میں ان کے نام درج نہیں تھے۔
آدمی اپنے گھر والوں کو تو گھر سے نکالنے سے رہا، بال
میں خود گھر کے ان نئے جیوں سے تنگ آ کر زیادہ
وقت باہر گزارتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔

ایک دن میں رات گئے گھر لوٹا تو گگو نے دروازہ
کھولتے ہی برا سا منہ بنا کر کہا: "ڈیڈی طوطے گم ہو گئے۔"
میرا جی چاہا کہ ابھی جا کے دکانیں کھلواؤں اور محلے کے
لڑکوں کو جگا جگا کر شیرینی بانٹوں لیکن ___ اولاد اولاد
ہے۔ میں نے یہ تو نہ کیا لیکن منہ سے اتنا ضرور نکل گیا
"بیٹے بلی کھا گئی ہوگی۔" اور گگو نے اور بھی رونی شکل
بنالی۔ اگلے دن سویرے سویرے گگو آیا اور کہنے لگا:
ڈیڈی ایک طوطا مل گیا ہے۔ وہ کھانے کے کمرے کے
دروازے کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔" اس دن گگو بہانہ
بنا کر گھر ہی بیٹھا رہا۔ سکول نہ گیا۔ اور میرے جانے کے
بعد دوسرے طوطے کو ڈھونڈنے لگا۔ اس نے یہ
کھوج لگایا کہ دوسرا طوطا سامنے کی بالکنی کے
پرنالے میں گر گیا ہے۔ اس کا سراغ
ٹھیک نکلا۔ جب اس نے ایک چھوٹا سا روڑا پرنالے
میں پھینکا تو طوطے نے نیچے سے ٹیں ٹیں کر کے جواب
دیا۔ یہ دیکھی لوہے کا پرنالہ دیوار کے ساتھ کوئی بیس فٹ
نیچے جا کے دکانوں کے تھڑے میں چلا جاتا ہے۔ اور
تھڑے کے اندر ایل کی شکل بنا کے سڑک کے نالے کے
اوپر جا نکلتا ہے۔ طوطا اسی ایل کی کہنی میں پھنسا بیٹھا
تھا۔ تھڑا توڑنے کے لئے گگو راج مزدور بلا لایا۔
مزدوروں کو دیکھ کر دکاندار اکٹھے ہو گئے۔ پھر راستہ چلتے
لوگ بھی رک گئے۔ طوطے نے بڑا مجمع لگا لیا۔ اور اس
مجمع کے سارے لوگوں نے دو ٹولیاں بنالیں۔ آدھے
آدمی گگو کی طرف ہو گئے۔ اور آدھے دکانداروں کی طرف
دکانداروں کی ایک ہی ضد تھی کہ ایک دوسرے کے
پاس آنے جانے کے لئے یہ تھڑا ان کی گزرگاہ ہے۔
اور وہ ایک اپاہج طوطے کی خاطر یہ تھڑا نہیں توڑنے دیں
گے۔ گگو کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ گھڑی دو گھڑی کی
تکلیف سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آخر چھوٹا بابو یہ بھی
تو کہتا ہے کہ وہ تھڑا پھر سے بنوا دے گا۔ اب جالے پہلوان
کے آدمی بھی مجمع میں آ شامل ہوئے۔ انہوں نے سوچا
تھا کہ شاید اس جھگڑے میں آمدن کی کوئی صورت نکل
آئے۔ وہ تو تھانہ دور تھا ورنہ پولیس والے بھی نقصِ
امن کی دفعہ لے کر پہنچ جاتے۔ راج مزدوروں نے
بیچ بچاؤ کروا دیا۔ انہوں نے گگو کو سمجھایا کہ تھڑا
توڑنے سے طوطا بھی مر جائے گا۔ اب گگو اور ترکیبیں
سوچنے لگا۔ اس نے میری مچھلیاں پکڑنے والی ڈوری
کے ساتھ ایک روڑا باندھا اور اسے پرنالے میں
اتار دیا۔ جب روڑا طوطے کے لگا تو اس نے ٹیں ٹیں
کرتے ہوئے ڈوری پکڑ لی۔ اب ڈوری کو پرنالے کی
سیدھ میں رکھ کے آہستہ آہستہ کھینچتے اور کلمہ پڑھتے
ہوئے گگو نے بالآخر طوطے کو باہر نکال لیا۔ اس کے
کندھے لہولہان ہو گئے تھے اور وہ پرنالے سے
نکلتے ہی گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ گگو جلدی سے
اپنی ماں کو چائے بنانے کے لئے کہہ کر میری الماری
میں سے دوائی ڈھونڈنے لگا۔ اس پاگل کو یہ اچھا
بھلا پتا تھا کہ میں اور میرا ہمسایہ ایک دوسرے کی
الماری میں کوئی پینے والی چیز باقی نہیں رہنے دیتے کہ
کہیں باسی نہ ہو جائے۔ اس رات میں پھر دیر سے
گھر پہنچا اور پھر گگو نے دروازہ کھولا اور میرے پوچھے
بنا ہی کہنے لگا: "ڈیڈی۔ دوسرا طوطا بھی مل گیا ہے۔"
مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن اس کا جی رکھنے کی خاطر یونہی
پوچھ بیٹھا: "کہاں سے؟" اور اس نے طوطے، پرنالے
اور تھڑے کی کل کہانی سنا دی۔ مجھے اس وقت یقین
آگیا کہ گگو بڑا ہو کے ایک بہت بڑا لکھاری بنے گا
اور اپنی آنسو بھری کہانیوں کی وجہ سے دنیا کے سب بڑے
لکھاریوں میں سب سے بڑا لکھاری مانا جانے گا۔ اور
اپنے ماں باپ کا نام روشن کرے گا۔ میں یہ اس لئے
کہہ رہا ہوں کہ میرے اور طوطوں کے درمیان برسوں
پرانے بیر کے باوجود میری آنکھیں بھر آئیں۔ گگو نے
طوطے کے اوپر کمبل ڈال کے اس کو ہیٹر کے پاس رکھا
ہوا تھا۔ میں کمبل اٹھانے کے لئے آگے بڑھا تو اس نے
میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا: "نہیں ڈیڈی۔ ابھی چائے
پی کر سویا ہے۔ صبح دیکھ لینا۔" میری آنکھیں دوبارہ

خشک ہو گئیں۔ گھگو کے بارے میں میری متحرک سوچ اچانک رک گئی اور یہ آٹھ فٹ او نچا لکھاری مجھے ایک ناٹا سا بونا لگنے لگا۔ گھگو جیسا گھٹیا آدمی کبھی بھی لکھاری یا فن کار نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد طوطے پھر اندر باہر ٹیں ٹیں اور ٹیں ٹیں کرتے پھرتے اور پھر مرے پیروں تلے آ کے شہید ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ ایک دن رحمی کے ہاتھوں سے چارپائی گر گئی۔ اس کا ایک پایہ سیدھا ایک طوطے کی پیٹھ پر لگا اور وہ وہیں شہید ہو گیا۔ دوسرے دن دوسرے طوطے نے سامنے والی بالکنی سے گر کر خودکشی کر لی۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے ساتھی کے جانے کے بعد بن باسی بننے کے لئے اس نے بالکنی سے پرواز کی ہو ــــ لیکن وہ ایک بات بھول گیا تھا اور وہ یہ کہ اس کا ایک کندھا ٹوٹا ہوا ہے ـــــ اور وہ سڑک کے عین درمیان میں جا گرا۔ ادھر لاہور لاؤنج بس والوں نے ایک تین نمبر چلا دی تھی۔ جس کی ٹائمنگ انہوں نے کچھ اس طرح رکھی تھی کہ وہ سب سٹاپوں پر رکتی، سواریاں لیتی، سائیکل سواروں، موٹروں اور رکشوں سے بچتی ہوئی عین اس وقت نکلسن روڈ کی اس جگہ پر پہنچے جہاں آدھ سیکنڈ پہلے ایک طوطا گرا ہو۔ یہ طوطا آدھا تو بس کے اگلے دائیں ٹائر کے ساتھ چلا گیا اور بقیہ آدھے میں سے تقریباً آدھا گھگو سڑک سے کھرچ کر لے آیا اور اس کی قبر احاطے میں پہلے طوطے کی قبر کے بالکل ساتھ بنا دی۔

وقت گزرتا گیا اور میں طوطوں کو بھول سا گیا۔ کبھی کبھی میں یہ بھی سمجھتا کہ طوطے مجھے بھول گئے۔ لیکن ایک دن میں غسل خانے میں نہانے سے پہلے زور زور سے گا کے بے خبر مسی کو جگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پھر وہی ٹیں ٹیں کی آواز میرے کانوں میں پڑی میں کانپنے لگا۔ نہائے بغیر ہی میں باہر نکل آیا۔ نوراں نے تولئے سے ایک طوطا پکڑا ہوا تھا اور چھوٹی مانے رو رو کے کہتی تھی: "چھوڑ دے، چھوڑ دے" لیکن نوراں بڑے غور سے طوطے کی چونچ اور کنٹھی کو دیکھتی رہی۔ جب میں نے طوطے سے بھی زیادہ زوردار آواز سے نوراں کو ٹیں ٹیں کیا تو نوراں نے اپنی نوکری چھوٹ جانے کے ڈر سے طوطے کو چھوڑ دیا۔ اس نے جانا کہاں تھا؟ اس نے تو بمشکل میرا گھر ڈھونڈا تھا۔ وہ مڑ کے گھونے کے کمرے میں جا گھسا اور اس کی چارپائی کے سرہانے جا بیٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ طوطا تو مجھے بیمار لگتا ہے اور اس کے مرنے کا ہمیں خواہ مخواہ رنج ہو گا۔ اس کو پکڑ کر باہر اڑا دو۔ گھونا اپنے کرکٹ کے دستانے پہن، سیٹیاں مارتا اس کو پکڑنے کیلئے آگے بڑھا لیکن طوطا اس سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اس نے سیٹیوں کا جواب سیٹیوں سے دیا اور تین سیکنڈ تک کر دو دفعہ اپنا نام بھی بتایا: "میاں مٹھو!" اب نوراں نے شور مچا دیا کہ بے بی یہ طوطا تو بولتا بھی ہے۔ اس کو رکھنا چاہیئے۔ طوطے کو کھلانے کے لئے مانے اپنا ماش اٹھا لائی اور مانے کی ماں اپنی روٹی ہانڈی چھوڑ طوطے کو دیکھنے کے لئے آ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں پانی پت کے میدان میں لیٹا ہوا ہوں اور بابر کے سپاہی میرے اردگرد کھڑے ہنس رہے ہیں۔ مجھے کچھ ہوش آیا تو پنجرے کے بارے میں گفتگو میرے کانوں میں پڑی۔ گھونا غائب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی میری گاڑی بھی تھوڑی دیر بعد وہ لنڈے سے ایک پنجرہ لے آیا اور مہینے کی چھبیس تاریخ کو مجھ سے پانچ روپے مانگے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے پانچ روپوں میں سے کم از کم دو روپے ضرور اڑا لئے ہوں گے۔ اب اس طوطے کو میری صبح کی چائے سے پہلے چوری ملتی ہے اور وہ کاکے اور مانے کو پاس بٹھا کے "میں میاں مٹھو۔ چوری کھانی اے" اور اسی طرح کی دوسری بکواس کرتا ہے۔ میں پاس سے گزرتا ہوں تو وہ کھانستا اور سیٹیاں مارتا ہے: کوئی سلیم سے پوچھے کہ کسی کی اولاد کو ساتھ ملا کر اسے یوں تنگ کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ کمینگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے!

نیپالی کہانی : بی۔پی کیوئرالہ
ترجمہ: اظہر جاوید

سوال

کنک بہادر نے ایک چودہ سالہ لڑکی سے شادی کی اور اسے اپنے گھر لے آیا۔

جو لوگ کنک بہادر سے واقف نہیں، میں نے انہیں بس یہی بتانا ہے۔ یہ شادی میرے لئے ایک دھچکا ہے اور میں خود اس کے بارے میں اور بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں۔

صوبے دار کنک بہادر ایک معمر آدمی ہے۔ میں نے کسی صوبے دار کو کم عمر نہیں دیکھا۔ یہ شاید اس کی دوسری شادی ہے۔ یونہی میرا خیال ہے، پہلی بیوی سے اس کے دو بچے ہوں گے اور اس بیوی کی وفات کے بعد ہی اس نے اس چودہ سالہ لڑکی کو اپنی دوسری بیوی بنانے کا سوچا ہوگا

صوبے دار کے سرکاری مسائل اتنے ہوں گے کہ ان کی بوریت ختم کرنے کے لئے چودہ سالہ لڑکی سے شادی کر لینا کوئی اچنبھا نہیں مگر اس بھولی بھالی لڑکی کے لئے جو ابھی شادی کا مطلب بھی نہیں سمجھتی ہوگی، یہ سب کچھ ضرور نیا ہوگا۔

میں نے پہلے بھی ایک ایسی شادی دیکھی ہے۔ میں دولہا کی طرف سے آیا تھا۔ بارات کی روانگی کا وقت چار بجے تھا۔ مگر آٹھ بجے تک برات دلہن کے گھر پہنچ نہیں پائی تھی۔ ہم سب بہت شور مچاتے رہے لیکن دولہا میاں پر جاتری غسل خانہ ہی سے نہ نکلا۔ اس کا میک اپ مکمل نہیں ہو رہا تھا۔ آخر انسان ایک ہی مرتبہ تو اپنے آپ کو جی بھر کے سجاتا ہے ـــــ بیاہ والے دن ـــــ!

میں نے دولہا کو نہیں دیکھا ہوا تھا۔ گاؤں کی سینکڑوں عورتیں دولہا میاں کو ایک نظر دیکھنے کیلئے جمع تھیں۔ نہ جانے ان کے من میں کیسے کیسے خیالات ہوں گے....؟ دولہا کے ذکر کے ساتھ ہی ذہن میں ایک بیس بائیس سالہ جوان کا چہرہ ابھر آتا ہے۔ شاید سب گاؤں والیاں بھی یہی سمجھ رہی تھیں۔ کافی دیر بعد شور مچا ـــ "دولہا آرہا ہے ـــ دولہا آرہا ہے ـــ!" سب دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

آنے والے سبھی عمر رسیدہ تھے۔ میں اندازہ نہ کر سکا کہ ان سب میں دولہا کون ہو سکتا ہے؟ کالا کوٹ پہنے ہوئے ایک صاحب سب سے الگ معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا یہی دولہا ہوگا اور ـــ واقعی وہ دولہا ہی تھا۔ وہ اپنی حرکات و سکنات سے بظاہر اپنے جذبات کو چھپانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کا چہرہ چغلی کھائے دے رہا تھا۔ کہ وہ آج دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی ہے۔

آٹھ بجے دولہا اپنی برات لے کر چلا۔ وہ تو ہاتھی پر سوار تھا۔ اور براتی پیدل تھے۔ دولہا کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں دلہن کا ایک روایتی سا تصور ابھرا میں نے ساتھ والے سے پوچھا "یہ ان کی پہلی شادی ہے؟"

"نہیں" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اس کی پہلی بیوی کہاں ہے؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"وہ مر گئی ـــ اسی سے اس کے دو بچے ہیں" وہ شخص بتا رہا تھا ـــ "مجبوراً اس کو دوسری شادی کرنا پڑی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کوئی بھی مرد نہ گھر کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ نہ بچوں کی پرورش ہو سکتی ہے!"

اس شخص کی باتیں سنتے سنتے میں نے سوچا یقیناً نئی دلہن بھی سن رسیدہ ہوگی، جبھی تو وہ گھر گرہستی بھی کرے گی اور بچوں کو بھی سنبھال سکے گی۔

برات پہنچی تو میں جلدی سے منڈپ میں داخل ہوا۔ پھر پتہ چلا دلہن آگئی ہے بچے اور عورتیں دلہن کو دیکھنے کے لئے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ میرا خیال ہے وہ بھی یہی سمجھ رہے ہوں گی کہ آج کی دلہن کم سے کم پچیس تیس برس کی ہوگی جو امور خانہ داری کی ماہر اور بچوں کی پرورش میں طاق ہوگی۔ جلد ہی دو عورتیں سرخ ریشمی چادر میں لپٹی ہوئی ایک نو عمر سی لڑکی کو منڈپ میں لائیں۔ یہ بمشکل چودہ سال کی تھی جسے چالیس برس کے مرد کے ساتھ بیاہا جا رہا تھا۔ اور جس کے پہلے ہی سے دو بچے بھی تھے۔

صوبے دار کنک بہادر کے بارے میں بھی جب میں نے سنا کہ اس نے چودہ سالہ لڑکی کو بیوی بنا لیا ہے تو مجھے اسی پرانی شادی کی یاد تازہ ہو گئی۔ اس لڑکی ہری منی کے لئے میرا دل دکھی ہوا۔ نہ جانے وہ خوش

ہو گی یا پریشان اور ویران ـــــ میں خواہ مخواہ اس سے
ہمدردی محسوس کرنے لگا اور یونہی اس کے بارے
میں سوچتا چلا گیا۔ اس چھوٹی سی لڑکی نے جب اپنی
شادی کے بارے میں سوچا ہوگا تو کیسے اس کے
دل و جان میں پھلجھڑیاں سی چھوٹی ہوں گی۔ سکھیاں
سہیلیاں اسے چھیڑتی ہوں گی تو وہ شرما کر، لجا کر دوہری
ہو جاتی ہوگی۔ اس کے ذہن میں شوہر کا تصور کیا ہوگا
ایک نوجوان بانکا چھیلا سا شہزادہ یا پوپلا سن خوردہ
انسان ـــــ یقیناً اس کے خواب کچھ اور ہوں گے۔
اس نے محبتوں کے، زندگی کی تازگی اور تابندگی کے
خواب دیکھے ہوں گے۔

میں نے ہری منی کے بارے میں سوچا۔ وہ اپنے
حجلہ عروسی میں جب اپنے دولہا کو دیکھے گی تو اس
پر کیا کچھ گزرے گی۔؟ کنک بہادر اور ہری منی کیا
باتیں کریں گے؟ میں نے اپنے آپ ہی ہری منی کے
سپنوں کی تعبیر ڈھونڈنا شروع کی۔ اپنے دولہا کو دیکھ
کر اس نے کیا تاثر لیا ہوگا، یہ جاننا بہت مشکل ہے
تصور میں بھی میں نے صوبے دار کنک بہادر کو اپنی دلہن
سے باتیں کرتے سنا ـــــ

کنک بہادر نے کتنے رسان سے کہا "میری رانی"
اور ہری منی کے من میں بچپن کی یادیں کوند گئیں
ریت کے گھروندے بناتے اور بچپن کے کھیل کھیلتے
کھیلتے اسے پڑوسی کے لڑکے نے رانی کہا تھا اور
وہ خود راجہ بنا تھا۔ وہ کتنا سندر کھیل اور کتنا کومل
لہجہ تھا مگر اس وقت ایک بڈھے کا یوں بچپن کا
کھیل کھیلنا اسے قطعی اچھا نہ لگا۔

کنک بہادر نے ہری منی کو اور قریب گھسیٹتے
ہوئے پوچھا۔
"میری رانی۔ کیا تم بھی مجھے چاہتی ہو؟"
"ہاں میں تم سے پیار کرتی ہوں" ہری منی نے
یوں مشینی انداز میں جواب دیا، جیسے شاید وہ یہ سن
کر خوش ہو جائے۔

"مجھے پیار کرنے دو ـــــ" صوبے دار نے
منت کرنے کے انداز میں کہا۔ ہری منی حیران رہ
گئی۔ (اور میں تصور ہی تصور میں اس سے زیادہ
حیرت ہوا کہ اس نے جو پیار کرنے کی خواہش کی ہے۔
یہ ایک بچے کے لئے ہے یا اسے بیوی سمجھ کر!!)
ہری منی نے بازوؤں کے حصار کو توڑتے ہوئے
کہا۔ "مجھے نیند آرہی ہے۔ سونے دو"
"اتنی جلدی" ـــــ کنک بہادر نے لجاجت
سے کہا اور اس کے چہرے پر مایوسی اور کرب کے
سائے متحرک گئے۔ مگر اس نے پھر کوشش کر کے
کہا۔

"آؤ باتیں کریں۔ سونے کے لئے تو عمر پڑی ہے"
ہری منی پر نیند کا غلبہ تھا مگر وہ سو نہ سکی۔ وہ
کچھ بھی بولے بغیر ایک ٹک اپنے شوہر کا منہ تکتی رہی۔
اس طرح جیسے یہ جان نہ پا رہی ہو کہ کنک بہادر کہنا
کیا چاہتا ہے اور پھر جو کچھ وہ سمجھ بھی سکی ہے، اس
سے اسے کیا دلچسپی ہے۔
میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ساری تصویریں کیوں میری
آنکھوں میں پھر گئیں۔ ہو سکتا ہے ہری منی اور کنک بہادر
میں ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہوئی ہو، جن کے بارے
میں میں نے تصورات کے اتنے محل تعمیر کر لئے ہیں۔
ممکن ہے اس نے صرف اتنا پوچھا ہو۔
"میری بچی۔ تمہارا نام کیا ہے؟"
اتنی شفیق اور محبت بھری آواز سن کر اس نے
جواب دیا ہو۔
"ہری منی"
"تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"
"کا۔ کھا ختم کر کے میں نے ابھی پہلی کتاب ہی
شروع کی تھی۔"
"اچھا، اب میں تمہیں مزید پڑھاؤں گا۔ تمہیں
نیند آرہی ہے۔ شاباش، جاؤ سو جاؤ۔"
ایک باپ جس طرح اپنی بیٹی کا خیال رکھتا ہے،
شاید اس نے ایسا ہی کیا ہو اور پھر اپنے گھر کے اور
حکومت کے کام کاج میں لگ گیا ہو۔ صبح اسے جگایا
ہو..... ناشتہ کرایا ہو اور تیار کروا کر سکول بھیجا ہو۔
مگر ـــــ ایک سوال مجھے پریشان کئے ہوئے ہے
کہ اگر ایسا ہی ہونا تھا تو صوبے دار کنک بہادر کو اس
کے ساتھ دوسری شادی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا اس نے
اس کے ساتھ شادی کی تھی کہ اس کی کوئی بیٹی نہیں تھی
اور وہ دو بیٹوں کے ساتھ ایک بیٹی کو بھی پالنا چاہتا
تھا۔ اور اگر ایسا ہی ہوگا تو پھر اسے اپنی اس بیٹی کی
شادی کرنا ہوگی اور اسے کسی اور کے گھر بھیجنا ہوگا۔
نہ جانے کیوں ایسے سب سوال مجھے پریشان کئے
ہوئے ہیں؟

ایرانی کہانی : صادق ھدایت
ترجمہ: محمد حیات خان سیال

بھنور

ہمایوں زیرِ لب اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔
"کیا یہ سچ ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا کڑیل نوجوان اور شاہ عبدالعظیم کے قبرستان میں ہزاروں مُردوں کے بیچ سرد اور گیلی مٹی میں سویا ہوا ہے۔ آہ! اس کے جسم پر چپکا ہوا کفن۔ کیا اس کی آنکھوں کی روشنی اور آواز کا ترنم بالکل جاتا رہا ___ وہ کتنا ہنس مکھ تھا اور کیسی پُرلطف باتیں کرتا تھا!"

مطلع ابر آلود تھا اور دریچے کے شیشے دھندلے ہو رہے تھے جس کے پیچھے ہمسائے کے گھر کی چاردیواری چھت پر برف کی ہلکی تہ جمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ برف کے گالے آہستہ آہستہ چھت پر گر رہے تھے۔ چھت کی چمنی سے سیاہ دھواں نکل کر خاکستری فضا میں پیچ و خم کھاتا ہوا آسمان کی بلندیوں میں کھو جاتا تھا۔

ہمایوں اپنی جوان بیوی اور چھوٹی بچی ہما کے ساتھ آتشدان کے پاس بیٹھا تھا۔ جمعہ کے روز یہاں چہل پہل ہوتی تھی مگر آج خلافِ معمول سب اداس اور خاموش تھے یہاں تک کہ ننھی ہما جو گھر کے ماحول کو ہمیشہ ایک نئی زندگی بخشتی تھی آج اپنی گڑیا کو بغل میں لئے خاموش اور اُداس تھی۔ اس کی حیرت زدہ نگاہیں دروازے کی طرف لگی تھیں۔ گویا وہ بھی جان گئی تھی کہ کوئی بات ضرور ہے اور وہ بات ہے بھی چچا جان بہرام کے متعلق جو خلافِ عادت نہیں آئے۔ اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ اس کے ماں باپ کی افسردگی بہرام چچا کے نہ آنے کی وجہ سے ہے سیاہ لباس، نیند کی ماتی سُرخ آنکھیں، سگریٹ کا دھواں، سب اس اُداسی کی تصدیق کر رہے تھے۔

ہمایوں کی نظریں آتشدان کے انگاروں پر جمی تھیں لیکن اس کے خیالات اَن جانی وادیوں میں بھٹک رہے تھے۔ غیر شعوری طور پر اسے مدرسہ کے وہ دن یاد آئے جب آج کی طرح ایک ایک بالشت برف زمین پر جم جاتی تھی۔ چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی وہ کھیل شروع کر دیتے۔ دونوں زمین کے اوپر برف کا ڈھیر لگا دیتے۔ اس کے بعد بچوں کی دو ٹولیاں بن جاتیں۔ وہ سب ڈھیر کے پیچھے چھُپ جاتے اور برف کی گولہ باری شروع کر دیتے۔ وہ ذرا بھی سردی محسوس نہ کرتے۔ ان کے ہاتھ برف سے کھیلتے کھیلتے شل اور سُرخ ہو جاتے۔

ایک دن جب وہ کھیل میں مصروف تھے اُس نے مُٹھی بھر برف کو اٹھایا، گولہ بنایا اور بہرام کو دے مارا ___ اس کی پیشانی بُری طرح زخمی ہو گئی ہیڈ ماسٹر صاحب نے خوب کَس کَس کر اُس کے ہاتھ پر بید لگانے اور شاید اسی بات سے ان کی دوستی کا آغاز ہوا۔ وہ جب بھی پیشانی کے زخم کا داغ دیکھتا اُسے اپنی ہتھیلی کا خیال آ جاتا۔ اس اٹھارہ سال کے عرصے میں وہ ایک جان دو قالب ہو چکے تھے۔ اب تک ان کے درمیان کسی قسم کا اختلاف یا معمولی رنجش بھی پیدا نہیں ہوئی تھی حتیٰ کہ پرسوں دوسرے دفتر سے کسی نے ہمایوں کو ٹیلیفون کیا کہ بہرام نے خودکشی کر لی ہے۔

ہمایوں نے فوراً گاڑی لی اور آن کی آن میں جنازے پر پہنچ گیا۔ سفید کپڑا جو اُس کے چہرے پر ڈال رکھا تھا خون میں لتھڑا ہوا تھا، آہستہ سے اُٹھایا، خون آلود بھویں اور تکیئے پر ٹپکا ہوا خون قالین پر جابجا دھبّے، عزیزوں کی گریہ و زاری۔ اُف کتنا دردناک منظر تھا۔

مغرب کے وقت تک ہمایوں وہیں رہا غسل و کفن اور اس کے بعد جنازے کے ساتھ ساتھ قبرستان تک گیا۔ تابوت کو کاندھا دیا اور اس کی قبر پر پھول چڑھانے پھر فاتحہ پڑھ کر سوگوار واپس آ گیا لیکن اس روز سے آج تک ایک لمحہ بھی اسے آرام میسّر

گیا۔ آنکھوں کی نیند اُڑ گئی۔ وہ خیالات میں گم بیٹھا
تھا۔ سگریٹ کا ڈبہ سامنے رکھا تھا۔ وہ سگریٹ پر
سگریٹ سُلگا رہا تھا۔ اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اس
نے حیات و موت کے فلسفے پر غور کیا۔ بہت دیر
تک سوچتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ وہ بالکل
مبہوت تھا، اسے اپنی تکلیف کا بالکل اندازہ نہ تھا
کبھی اس کی حالت پاگلوں کی سی ہو جاتی۔ ہر چند
بھلانے کی کوشش کرتا مگر بے سود۔ مدرسے سے
ان کی دوستی شروع ہوئی تھی اور ایک دوسرے
کے رنج و خوشی میں برابر کے شریک تھے۔ جب بھی
وہ گھر واپس آتا اور اس کی نگاہ بہرام کے فوٹو پر
پڑتی تو زخم پھر سے ہرا ہو جاتا۔ گذری ہوئی باتیں
ایک ایک کر کے اس کے سامنے آکھڑی ہوتیں وہ
فوٹو کو تکا رہتا۔ بھوری مونچھیں، کرنجی آنکھیں، چھوٹا
سا منہ، پتلی ٹھوڑی، اس کے بلند قہقہے۔ ہر بات
ہر ادا اس کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ اُسے
یقین ہی نہیں آتا تھا کہ بہرام مرگیا ہے اور وہ بھی
اس طرح ۔۔ ناگہانی موت ۔۔

بہرام نے اس کے لئے کیا کیا مشکلات نہ اٹھائی
تھیں۔ جب وہ تین سال کے لئے ملک سے
باہر چلا گیا تھا تو اس نے گھر اور گھر والوں کی جانفشانی
سے دیکھ بھال کی بلکہ اس کی بیوی بدری کے اس
نے پالنے کے لئے پلنگ پر سے بھی نہیں اٹھنے دیا۔
ہمایوں کو اب زندگی بوجھل محسوس ہونے لگی۔
بیتی ہوئی یادیں تازہ ہو جاتیں کتنے اچھے دن
تھے جب پورا کنبہ ایک جگہ جمع ہوتا تھا۔ ہنستے
خوش ہوتے شطرنج کھیلتے کئی کئی گھنٹے گذر جاتے
اور انہیں احساس تک نہ ہوتا۔

لیکن وہ بات جو اس کے دل میں ہمیشہ کھٹکتی تھی
یہ تھی کہ اتنے گہرے مراسم کے باوجود بہرام نے خودکشی
کے بارے میں اس سے بات تک نہیں کی۔ اس کا
کیا سبب تھا؟ وہ پاگل ہو گیا تھا یا کوئی گھریلو بات
تھی جس کی وجہ سے اُس نے ایسا کیا۔ وہ بار بار اپنے
آپ سے یہی سوال کرتا۔ آخر ایک بات اس کی
سمجھ میں آئی۔ وہ اپنی بیوی کے پاس پہنچا اور
دریافت کیا۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟ بہرام نے خودکشی کیوں کی؟"
بدری نے جو بظاہر کشیدہ کاری میں مشغول تھی
سر اٹھایا گویا وہ اس قسم کے سوال کے لئے بالکل تیار
نہ تھی، بے رخی سے جواب دیا۔

"میں کیا جانوں۔ کیا تمہیں اس نے نہیں بتلایا تھا؟"
"نہیں ۔۔ یہی تو میں پوچھتا ہوں ۔۔ میں خود اس
بات پر حیران ہوں ۔۔ میں سفر سے لوٹا تو میں نے
محسوس کیا کہ وہ کچھ بدل سا گیا ہے۔ لیکن اس نے
مجھے کچھ نہیں بتایا ۔۔ میں یہی سمجھا کہ اسکی پریشانی دفتری
جھنجھٹ کی وجہ سے ہے۔ وہ اپنے کاروبار سے
بہت ہی دل برداشتہ سا رہتا تھا ۔۔ بارہا اس
نے یہ بات مجھ سے کی تھی ۔۔ وہ تو کوئی چیز بھی مجھ
سے پوشیدہ نہ رکھتا تھا؟"

"خدا مغفرت کرے وہ کس قدر ہنس مکھ اور
خوش مزاج تھا۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا؟"
"نہیں ۔۔ یہ بات نہیں ۔۔ بظاہر وہ ایسا معلوم
ہوتا تھا اور کبھی کبھی تو وہ بالکل بدل جاتا تھا خاص
طور پر تنہائی میں ۔۔ ایک دن جو میں اس کے کمرے
میں داخل ہوا، میں اُسے پہچان بھی نہ سکا۔ وہ اپنا سر
ہاتھوں سے پکڑے سوچ رہا تھا۔ دیکھتے ہی میں
گھبرا سا گیا۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ ہنس پڑا
کہ اچھے مغالطے میں ڈالا۔ اچھا خاصا بازیگر تھا۔"
شاید کوئی ایسی بات ہو جسے تم سے کہتے ہوئے
ڈرتا تھا کہ تمہیں سُن کر رنج ہوگا۔ ویسے تمہارا بہت خیال
رکھتا تھا۔ آخر کچھ بھی ہو تم بیوی بچے والے ہو تمہیں
اپنی زندگی کی فکر کرنی چاہیئے لیکن وہ ۔۔"

اس نے اپنے سر کو ایک خاص اور پُرمعنی انداز
میں جھٹک دیا۔ گویا اس کی نظر میں بہرام کی خودکشی معمولی
بات تھی۔ خاموشی نے انہیں دوبارہ سوچنے پر
مجبور کر دیا۔ لیکن ہمایوں نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی
کی باتیں بناوٹی اور دنیاوارانہ ہیں۔ یہی بیوی آٹھ
سال پہلے اس کی پرستش کرتی تھی اور عشق و محبت
کے بارے میں لطیف خیالات رکھتی تھی۔ اس وقت
تو جیسے اس کی آنکھوں پر پردہ سا پڑ گیا ہو۔ بہرام کی
یاد کے مقابلہ میں اس کی بیوی کی باتوں نے اسے
متنفر سا کر دیا۔ وہ اس سے بیزار سا ہو گیا، جو
مادہ پرست، پست خیال اور دنیوی زندگی اور
مال و منال کی آرزومند تھی اور یہ چاہتی تھی کہ ہمایوں
اس پر اثر انداز ہوں۔ دلیل کیا لائق ہے کہ بہرام کے
بیوی بچے نہ تھے ۔۔ چونکہ بہرام نے خود کو اس لذت
محروم کر دیا تھا لہٰذا اس کی موت کا افسوس نہیں کرنا
چاہیئے۔ کتنا پست خیال ہے!

اس نے سوچا کیا اسے دنیا میں بہرام جیسا
دوست مل سکے گا ۔۔؟ افسوس ایسا جوان
تو مر جائے اور یہ نوّے سال کی بڑھیا یہ خانم زندہ ہے
جو اتنی سردی اور برف باری میں اٹھی کانپتی لٹھیا ٹیکتی
یہاں بہرام کے گھر کا پتہ پوچھتی پھرتی ہے تاکہ اس کے
مرنے کا صدمہ کھائے۔ یہ خدا کی مصلحت ہے اس کی

بیوی کے نزدیک یہ بھی قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے۔ اس کی اپنی بیوی بھی ایک دن سیدہ خانم کا روپ دھار لے گی۔ اب بھی میک اپ کے بغیر اس کی شکل وصورت میں وہ جاذبیت نہیں رہی۔ آنکھوں کی رعنائی اور آواز کا ترنم جاتا رہا ہے — صبح سویرے دفتر کو جاتا ہوں۔ تو وہ ابھی خوابِ خرگوش میں مدہوش ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے ہیں۔ پہلا سا حسن نہیں رہا، یقیناً اس کی بیوی بھی اس کے بارے میں یہی سوچتی ہوگی۔ کون جانتا ہے کیا وہ خود نہیں بدل گیا؟ کیا وہ ویسا ہی مہربان، غمخوار اور خوبصورت ہمایوں ہے؟ کیا اس نے اپنی بیوی کو دھوکا نہیں دیا؟ لیکن اسے ایسے خیال کیوں آرہے ہیں، یہ بے خوابی کا اثر تھا یا دوست کی یاد نے تڑپا دیا تھا۔

اس وقت دروازہ کھلا اور ایک خادمہ جو اپنی چادر کے کونے کو دانتوں میں دبائے ہوئے تھی، داخل ہوئی اور ہمایوں کو ایک سر بمہر لفافہ دے کر چلی گئی۔

ہمایوں نے بہرام کی تحریر کو پہچان لیا۔ جلدی سے لفافہ کھولا۔ اس میں سے ایک کاغذ نکالا اور پڑھنے لگا۔

رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے آج بتاریخ ۳ مہر ماہ ۱۳۱۱ ملک بہرام مرزا ساکن ارژن پور برضا و رغبت اپنی کل دولت و املاک ہما خانم ماہ آفرید کو سونپتا ہوں۔

بہرام — ارژن پور

ہمایوں نے بڑے تعجب کے ساتھ اس خط کو دوبارہ پڑھا۔ وہ بالکل مبہوت ہو چکا تھا اور اسی حالت میں خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا پڑا۔

بیوی جو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی، پوچھنے لگی۔

"کس کا خط ہے؟"

"بہرام کا!"

"کیا لکھا ہے؟"

"اپنی کل جائیداد ہما خانم کو بخش دی؟"

"کتنا اچھا آدمی تھا!"

اس با معنی تعجب نے ہمایوں کو اپنی بیوی سے اور بدظن کر دیا۔ بغیر کسی ارادے کے اس کی نگاہ ہما کی تصویر پر پڑ گئی اور فوراً ہی پلٹ کر اس نے ہما کو دیکھا۔ پھر اسے کوئی ایسی چیز نظر آئی کہ وہ بے اختیار کانپنے لگا۔ جیسے ایک دوسرا پردہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گیا ہو۔ ہما بہت کچھ بہرام کی ہمشکل تھی۔ اس کا ناک نقشہ نہ تو اس جیسا تھا نہ ماں جیسا۔ ان دونوں میں کسی کی آنکھیں کرنجی نہ تھیں۔ چھوٹا سا منہ، پتلی ٹھوڑی، اس کی شکل بہرام سے ملتی تھی۔ اب ہمایوں کو خیال آیا کہ بہرام ہما کو کیوں اتنا چاہتا تھا اور کیوں اس نے مرنے کے بعد اپنی ساری دولت ہما کے نام کر دی تھی۔

کہیں یہ بھی ان دونوں کی چوری چھپے کی ملاقاتوں کا نتیجہ تو نہیں۔ وہ دوست جس کو وہ جان سے عزیز رکھتا تھا جس پہ اسے پورا بھروسہ تھا اور اس کی بیوی — دونوں اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے — اور یہ وصیت نامہ مرنے کے بعد گالی کی طرح بھیجی ہے۔

یہ خیالات اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی کی طرح کوند گئے۔ سر میں درد ہونے لگا۔ رخسار تمتما اٹھے اس نے شعلہ بار نگاہیں بیوی پر ڈالتے ہوئے پوچھا

"تمہارا کیا خیال ہے، بہرام نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اس کے بہن بھائی نہ تھے؟"

"وہ بچی سے بہت پیار کرتا تھا۔ جب تم بندرگاہ میں تھے۔ ہما کو خسرہ نکل آیا یہ شخص مسلسل دو رات اس بچی کے سرہانے بیٹھا تیمارداری کرتا رہا ہے خدا بخشے!"

ہمایوں نے غضبناک ہو کر کہا

"اوہو کیسی بھولی بن رہی ہو —؟"

"اس میں کیا بات ہے۔ سب تیری طرح بے مروّت تو نہیں۔ تین سال کے لئے بیوی بچے کو چھوڑ کر چلے گئے۔ جس وقت حضور لوٹے تو خالی ہاتھ منہ لٹکائے چلے آئے۔ میرے لئے ایک جوڑا جراب کا بھی نہ لے کر آئے — تمہارے بچے سے اگر کوئی محبت کرے تو گویا تم سے محبت کی — تم نہیں جانتے وہ ہما کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔"

"مجھ سے سچی بات نہیں کہہ رہی ہو!"

"آخر چاہتے کیا ہو، کیا بتاؤں۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا!"

"زیادہ بھولی بننے کی کوشش نہ کرو۔"

"یعنی کیا مطلب ہے تمہارا؟ اس نے خودکشی کر لی اور دولت ہما کے نام لکھ دی اور پوچھ گچھ کے لئے رہ گئی ہیں۔ آخر میں کیا بتاؤں؟"

"شاید تو سمجھتی ہے میں کچھ نہیں جانتا!"

"تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

ہمایوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ چیختے ہوئے کہا —!

"بس بس — زیادہ بے وقوف نہ بناؤ!"

اس کے بعد بہرام کے وصیت نامہ کی پرچیاں بنا کر آتشدان میں پھونک دیا۔ جو فوراً جل کر خاکستر

ہوگیا۔ بدری کے ہاتھ میں ایک بنفشی رنگ کا کپڑا
تھا، پھینکتے ہوئے اٹھی اور بولی۔
"مجھ سے اگر ضد تھی تو اپنے بچے ہی کا خیال کیا ہوتا"
ہمایوں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور میز سے ٹیک لگاکر
طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔
"میرا بچہ — میرا بچہ — اس کی شکل بہرام جیسی
کیوں ہے؟"
اس نے بہرام کی تصویر والے فریم کو ہاتھ مارکر
نیچے گرادیا۔ ہما جو کافی خوفزدہ ہوگئی تھی، رونے
لگی۔ بدری کا چہرہ فق ہوگیا اور تہدید آمیز لہجے میں
بولی۔
"آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"میرا مطلب یہ ہے کہ تم نے آٹھ سال تک مجھے
بے وقوف بنایا۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکی —
آٹھ سال ہوگئے آٹھ سال تم عورت نہیں فاحشہ
تھیں۔"
"میں؟ الزام لگاتے ہو — میری بچی؟"
ہمایوں پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ اس نے
تصویر کے فریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں — تمہاری بچی — تمہاری بچی — تصویر اٹھاؤ
اور دیکھو — اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں اب میں سمجھا
کہ کیوں اس طرح بخشش کی ہے۔ کیوں نہ ہو بڑا مہربان
باپ تھا۔ بڑی محبت کرتا تھا اور تیرے بقول آٹھ
سال ہوگئے کہ —"
"— کہ تیرے گھر میں ذلت اٹھا رہی ہوں غربت
میں ساتھ دیا۔ تین سال تیرے گھر کی نگہبانی کی۔ اس
پر بھی مجھے خبر ملی کہ ایک روسی عورت کے جال میں
پھنس گئے ہو۔ میں نے پھر بھی آہ تک نہ کی اور اس

پر مجھے یہ صلہ مل رہا ہے — جب کوئی دوسرا بہانہ
نہ ملا تو کہتے ہو کہ بچی بہرام کی شکل کی ہے۔ میں یہ برداشت
نہیں کرسکتی — اب یہاں ایک لمحہ نہیں ٹھہر سکتی —
چلو بیٹا چلیں۔"
ہما دہشت زدہ ہو رہی تھی۔ اس کا رنگ اُڑا
ہوا تھا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ ماں باپ کے اس
بے ہنگم جھگڑے کو دیکھ کر رونے لگی۔ ماں کے دامن
سے لپٹ گئی اور پھر دونوں دروازے کی طرف چل
گئیں۔ بدری نے دروازے کے قریب سے چابیوں
کا گچھا اس زور سے پھینکا کہ وہ گھومتا ہوا ہمایوں
کے قریب آگرا۔ قدموں کی چاپ اور ہما کے رونے
کی آوازیں دور ہوتی گئیں۔ دس منٹ بعد گاڑی
کے پہیوں کی آواز آئی جو اس کڑکڑاتی سردی اور
برفباری میں دونوں کو کہیں لے گئی۔
ہمایوں شکست خوردہ اور ساکت وہیں کھڑا رہ
گیا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ جو ہوا
وہ صحیح ہے — وہ بڑبڑانے لگا۔
"میں دیوانہ ہوگیا ہوں یا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ
رہا ہوں" لیکن اب جو بات ظاہر ہوچکی تھی اس
کے بعد تو ایسی زندگی جہنم تھی۔ گھر کاٹنے کو دوڑتا
تھا۔ اس کے لئے اپنی بچی کو دیکھنا بھی ناممکن تھا
وہ اب اسے پیار بھی نہ کرسکے گا اپنے عزیز دوست
کی طرف سے اس کا دل میلا ہوچکا تھا — اور سب سے
زیادہ تو وہ اپنی بیوی سے متنفر تھا کہ مستقل آٹھ سال
تک وہ اس کے دوست سے چھپ چھپ کر ملتی
رہی اور خاندانی عزت کو بٹہ لگایا اور اس کے فرشتوں
کو بھی پتہ نہ چلنے دیا۔ دونوں بڑے چالباز نکلے۔ وہ
تو بے وقوف بنا رہا۔ سب اس کا مذاق اڑاتے

رہے۔ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہوگیا۔ اس کا دل
بجھ گیا۔ وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگا۔ اس
کیلئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ کسی
دور دراز شہر یا بندرگاہ پر ملازمت کرلے اور
اپنی باقی زندگی وہاں گزار لے یا خودکشی کرلے۔
ایسی جگہ چلا جائے جہاں کوئی نہ ہو۔ کسی کی آواز نہ
سُنے۔ وہ کسی غار میں سو جائے اور پھر بیدار نہ ہو۔
اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے اور دوسرے
لوگوں کے درمیان ایک خوفناک گرداب پیدا ہوگیا
ہے جس سے نکلنا دشوار ہے۔
اُس نے سگریٹ سُلگایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا
ہوا کمرے میں داخل ہوا اور دوبارہ میز کے سہارے
کھڑا ہوگیا۔ دریچے کے شیشے میں سے اس نے دیکھا
کہ برف کے گولے آہستہ آہستہ آسمان کی بلندیوں سے
منڈلاتے ہوئے زمین پر گر رہے ہیں جیسے پُراسرار
راگوں کی لَے پر فضا میں رقص کر رہے ہوں۔ بے اختیار
اسے اچھے دنوں کی یاد آئی جب وہ اپنے ماں باپ
کے ساتھ عراق میں اپنے گاؤں گیا تھا۔ بڑے سہانے
دن تھے۔ دن بھر ہرے بھرے درختوں کے خنک
سائے میں لیٹا رہتا۔ اس جگہ جہاں شیر علی اپنی چلم
میں سُلفہ بھر کر پیا کرتا تھا — اور اس کی لڑکی سُرخ
چادر اوڑھے گھنٹوں اپنے باپ کا انتظار کرتی تھی۔
بیلوں کے پیچھے بندھی ہوئی گاڑی جس پر شیر علی بیٹھ
کر سُلفہ پیا کرتا تھا — اس گاڑی کے پہیوں کی درد
بھری آواز فضا میں بکھرتی رہتی تھی۔ چوڑی پیشانیوں
اور لمبے لمبے سینگوں والے بیل جن کے گھٹنے پھٹے پھٹے
زخمی ہوگئے تھے۔ شام تک چکر لگاتے رہتے۔ وہ
بھی انہی بیلوں کی طرح ہوگیا تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ

وہ جانور کیا محسوس کرتے ہوں گے وہ بھی تمام عمر یونہی آنکھیں بند کئے کولہو کے بیل کی طرح گھومتا رہا۔ بالکل ان بیلوں کی طرح جو گیہوں کے انبار پر گھومتے ہوں

چُنگی دفتر کے چھوٹے سے کمرے میں دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اُسے یاد آیا کہ وہ ہمیشہ کاغذ سیاہ کرتا رہتا تھا کبھی گھڑی کو دیکھتا جمائیاں لیتا، دوبارہ قلم اُٹھاتا اور رجسٹروں کی خانہ پُری، جمع تفریق، ضرب تقسیم، اور یونہی کاغذات کو اُلٹ پلٹ کرتا رہتا، لیکن اس وقت دل میں ایک اُمنگ تھی۔ ترنگ تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی بینائی، قوّتِ فکر اور جوانی کو گھُن لگ چکا ہے۔ قویٰ مضمحل ہو رہے ہیں۔ رات کو جب گھر پہنچا تو بہرام تھا اور اپنی بیوی کی مسکراہٹ سے اس کی تھکن دور ہو جاتی جیسے اس کے مردہ جسم میں کسی نے نئی روح پھونک دی ہو لیکن آج وہ ان تینوں سے بیزار ہو چکا تھا۔ انہی کی وجہ سے اُسے یہ روزِ سیاہ دیکھنا پڑا تھا۔

اُسے اچانک کوئی خیال آیا وہ لکھنے والی میز کے قریب گیا۔ دراز کو کھینچا۔ چھوٹا پستول جسے وہ سفر میں ساتھ رکھتا، باہر نکالا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا بھالا کارتوس اپنی جگہ پر تھے۔ ٹھنڈی اور سیاہ نلکی کو دیکھا اور آہستہ آہستہ پستول کا منہ کنپٹی پر لگا دیا۔

لیکن جب بہرام کی خون بھری شکل اس کی آنکھوں کے سامنے آئی تو اس نے پستول کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔

دوبارہ اُٹھا، دالان میں پہنچا، اوورکوٹ پہنا لمبے جوتے پہنے، چھتری اُٹھائی اور گھر سے باہر نکل گیا گلی میں سناٹا تھا۔ برف کے گولے آہستہ آہستہ فضا میں ناچ رہے تھے وہ بغیر سوچے چل پڑا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُسے کہاں جانا ہے اور وہ کہاں جا رہا ہے۔ بس یہی چاہتا تھا کہ اس گھر اور ان ڈراؤنے اور بھیانک حالات سے بچ کر دور چلا جائے۔

چلتے چلتے وہ ایک ایسی سڑک پر آنکلا جو سرد اور غم انگیز تھی۔ گاڑی کے پہیوں کے نشان۔ برف میں دُور دور تک نظر آتے تھے۔ وہ ان لکیروں کے درمیان برف کے اونچے اونچے ڈھیر۔۔ وہ ان پر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک موٹر کار اس کے قریب آئی اور چمکدار برف اور سڑک کی مٹی اس کے سر اور منہ پر پھینکتی ہوئی تیزی سے نکل گئی۔۔ وہیں رُک گیا۔ لباس کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ راستے میں ماچس بیچنے والا ایک لڑکا ملا۔۔ ایک ڈبیہ خریدی۔۔ لیکن جیسے ہی اس کے چہرے پر نظر ڈالی بہرام کی یاد سے تڑپ اُٹھا۔ وہی کرنجی آنکھیں۔ چھوٹا سا منہ، بھورے بال، وہ تھر تھر کانپنے لگا پھر آگے بڑھ گیا۔ بغیر کچھ سوچے ایک دکان کے آگے رُکا اور دکان کے سرد شیشوں سے اپنی پیشانی لگا دی۔۔ شیشے کے شوکیس میں طرح طرح کے کھلونے چنے ہوئے تھے۔ آستین سے شیشے کو صاف کیا بھاپ سے دھندلا ہو رہا تھا لیکن دھندلے شیشے کو باہر سے صاف کرنا کتنی بے وقوفی تھی۔۔ ایک بڑی سی گڑیا سامنے رکھی تھی۔ سُرخ منہ اور کرنجی آنکھیں، مُسکراتا اور اسے دیر تک گھورتا رہا۔ سوچا یہ گڑیا ہما کے پاس ہوتی تو وہ کتنی خوش ہوتی۔ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔ گلی کے نکڑ پر ایک مرغ فروش مرغیوں کے چھابے کے قریب بیٹھا تھا۔ اس میں تین مرغیاں اور ایک مرغ تھا۔ جس کے پیر رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے سُرخ سُرخ پنجے سردی میں کانپ رہے تھے نزدیک ہی برف پر خون کے دھبے پڑے تھے۔ ذرا آگے چلا، دیکھا کہ مکان کی دہلیز پر ایک چھوٹا بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ پھٹے پُرانے کُرتے میں سے اس کے بازو جھانک رہے تھے۔ ہمایوں کھویا کھویا آگے بڑھتا گیا۔ اُسے یہ بھی دھیان نہ تھا کہ وہ کس محلے یا گلی سے گذر رہا ہے

برف باری ہو رہی تھی لیکن بند چھتری جو اپنے ساتھ لایا تھا اسی طرح اس کے ہاتھ میں تھی۔۔ اب وہ ایک سنسان سڑک پر آنکلا اور تھک کر ایک مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ برف بہت تیزی کے ساتھ گر رہی تھی۔ اُس نے چھتری کھولی۔ اس کے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ سر بوجھل ہو رہا تھا۔

کسی راہ گیر کی آواز سُن کر وہ چونک پڑا، فضا تاریک ہو چکی تھی۔ اسے دن بھر کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ چھوٹا بچہ جو ایک مکان کی دہلیز پر بیٹھا تھا اور اس کے بازو پھٹے ہوئے کُرتے میں سے نظر آ رہے تھے۔ مرغیوں کے سُرخ پنجے جو چھابے میں سردی سے کانپ رہے تھے، خون جو برف کے اوپر بکھرا پڑا تھا۔

اب اسے بھوک محسوس ہونے لگی۔ حلوائی کی دکان سے پوریاں خریدیں یونہی چلتے چلتے کھاتا گیا اور بغیر کسی ارادے کے گلیوں میں سائے کی طرح گھومتا رہا۔

جب گھر پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ آرام کے لئے کرسی پر گر پڑا۔ ایک گھنٹے بعد سردی

ی شدت سے بیدار ہوگیا۔ لباس تبدیل کئے بغیر
پلنگ پر لحاف اوڑھ کر سوگیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے
کہ وہی ماچس والا سیاہ لباس میں ملبوس میز کے نزدیک
بیٹھا ہے، اس کا چہرہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی بڑی
گڑیا۔ نیلی کرنجی آنکھیں، چہرے پر مسکراہٹ۔
اس کے آگے تین آدمی دست بستہ کھڑے ہیں اُس
کی لڑکی ہما داخل ہوتی ہے اور اس کے ہاتھ میں شمع
ہے اُس کے پیچھے ایک اور آدمی داخل ہوتا ہے۔
اس کے چہرے پر خون میں بھری ایک سفید نقاب ہے
وہ آگے بڑھا ماچس بیچنے والے لڑکے اور ہما کا ہاتھ
پکڑ کر چاہتا ہی تھا کہ دروازے سے باہر نکل جائے
کہ پردے سے باہر دو نکلے ہوئے ہاتھ دکھائی دیئے
جو پستول سے اُسے نشانہ بنائے ہوئے ہیں، ہمایوں
ہراساں اور پریشان خواب سے چونکا۔

اس کی زندگی کے دو ہفتے اسی طرح خواب دیکھتے
سوچتے اور پریشان ہوتے گذر گئے، دن کو دفتر
جاتا، رات گئے گھر لوٹنا فقط سونے کے لئے،
ہی عصر کے بعد لڑکیوں کے سکول کی طرف نکل جاتا
جہاں اس کی بچی ہما پڑھتی تھی، چھٹی کے وقت گلی کے
موڑ پر دیوار کے پیچھے چھپ کر کھڑا رہ جاتا۔ وہ
ڈرتا تھا کہ کہیں اس کے سسرال کا نوکر مشدی علی
سے دیکھ نہ لے۔ ایک ایک بچے کو دیکھتا لیکن ہما
ان بچوں میں نظر نہ آتی۔

یہاں تک کہ ایک روز اس کی درخواست منظور
ہوئی۔ دفتر سے حکم ملا کہ اس کا تبادلہ چیکوسلواکیا
ہوگیا ہے۔ چلنے سے ایک دن پہلے ہمایوں نے
تمام کام ختم کئے، ٹکٹ بھی خرید لیا۔ ڈرائیور

کو تاکید کی۔ تاکید کے باوجود وہ اپنا سامان نہ باندھ
سکا تھا۔ اس لئے طے پایا کہ وہ دوسری صبح سفر کرے
گھر میں داخل ہوا تو پہلے اس کمرے میں پہنچا جہاں
لکھنے کی میز پڑی تھی۔ تمام چیزیں بکھری پڑی تھیں، ہر
طرف کوڑا کرکٹ نظر آتا تھا۔ آتشدان کے آگے ٹھنڈی
راکھ بکھری پڑی تھی بنفشی رنگ کا کپڑا اور وہ لفافہ
جس میں سے بہرام کا وصیت نامہ نکلا تھا وہیں
پڑا تھا۔ لفافہ کو اُٹھایا اور غصے میں پھاڑ ڈالا۔ کیا
دیکھتا ہے کہ ایک چھوٹا سا پرچہ اس لفافہ میں اور
موجود ہے جس کو وہ جلدی اور غصہ میں اس دن نہ
دیکھ پایا تھا۔ جلدی جلدی پھٹے ہوئے ٹکڑے جوڑ
کر جب اس نے پڑھا تو لکھا تھا۔

"یقیناً میرے مرنے کے بعد تمہیں یہ خط ملے گا۔
میں جانتا ہوں کہ میرے اس ارادے سے تم یقیناً حیران
ہوگے کیونکہ میں نے کبھی کوئی کام تمہارے مشورے
کے بغیر نہیں کیا لیکن اس خیال سے کہ راز راز نہ
رہے گا۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھے تمہاری بیوی ہما
سے محبت ہے چار سال تک مستقل میں خود سے
جنگ کرتا رہا۔ آخر میں میری جیت ہوئی اور شیطنت
کا وہ وجود جو میرے اندر بیدار ہوگیا تھا۔ میں نے
اُسے مار ڈالا۔ چونکہ میں اپنے پیارے دوست کی
امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے
میں نے اپنے جذبات کو کچل دیا۔ یہ ناچیز پیشکش
ہما خانم کے لئے ہے۔ اُمید ہے قبول کرو گے"

تمہارا بہرام

ہمایوں دیر تک ہکا بکا چاروں طرف دیکھتا
رہا۔ اب اس کا شک دور ہو چکا تھا۔ ہما اس کی

کی بچی تھی۔ کیا وہ ہما کو دیکھے بغیر پردیس چلا جائے!
خط کو دو تین بار پڑھا پھر جیب میں ڈال کر باہر چلا
گیا۔ راستے میں کھلونوں کی دکان سے سُرخ منہ اور نیلی
آنکھوں والی گڑیا خریدی اور سُسرال کی طرف چلا
گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کے نوکر مشدی علی نے
جب ہمایوں کو دیکھا تو روتے ہوئے کہا۔

"آقا ہم تو لُٹ گئے۔ ہما خانم۔"

"کیا ہوا ؟"

"جناب! کیا آپ نہیں جانتے۔ ہما خانم آپ
کی جُدائی میں کتنی بے قرار تھی۔ میں اسے ہر روز مدرسے
لے جاتا۔ اتوار کا دن۔ آج پانچ روز ہوئے۔
عصر کے وقت وہ مدرسے سے نہ جانے کہاں چلی
گئی۔ کہتی تھی آقا جان کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ ہم لوگ
بہت پریشان ہوئے اِدھر اُدھر تلاش کرتے رہے کیا
طلعت نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟ پولیس کو اطلاع دی۔
دو دفعہ آپ کی تلاش میں آپ کے گھر گیا"

کیا کہہ رہے ہو مشدی! کیا ہوا؟"

"کیا بتاؤں آقا! شام کے وقت ہما کو ہمارے گھر
لائے۔ راستہ بھول گئی تھی۔ سردی کی شدت کی وجہ سے
نمونیہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ جان دے دی۔ آپ کو
بار بار پکارتی تھی۔ کل اسے شاہ عبدالعظیم لے گئے
اور بہرام مرزا کی قبر کے پہلو میں دفن کر دیا"

ہمایوں آنکھیں پھاڑے مشدی علی کا منہ تکنے
لگا اور سُرخ منہ اور نیلی آنکھوں والی گڑیا اس کے
ہاتھ سے زمین پر گر پڑی۔

ہوئی

شمع خالد

پتھریلے چہرے

روبی کے بدن سے درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ اُس کارواں رواں دکھ رہا تھا۔ وہ جانے کب سے چل رہی تھی۔ شاید صبح سے یا شاید کل شام سے... نہیں اس سے بھی زیادہ وہ اُن لمحوں کو گننا چاہتی تھی۔ مگر وہ لمحے تو اُس کی زندگی پر محیط تھے تھکن کے باوجود اُس کے قدم میکانکی انداز میں اُٹھ رہے تھے۔ دل و دماغ پر ایک غبار سا چھایا ہوا تھا۔ اور اس غبار میں صرف ایک اُمید کی کرن تھی۔ کہ اُس نے منزل کو پانا ہے لیکن منزل کہاں ہے۔ منزل کا نشان پانے کیلئے وہ چل رہی تھی۔ چلتے چلتے زندگی بیت چلی تھی۔ لیکن قدم تھے کہ رُکنے کا نام نہ لیتے۔ اُسے اپنے اردگرد پھیلی تنہائی سے ڈر لگ رہا تھا۔ خوف کا ناگ اُسے ڈسنے کے لئے اپنی لمبی زبان نکالتا تو روبی اور تیز چلنے لگتی — دور بہت دور چمنی سے اُٹھتے دھوئیں نے احساس دلایا کہ وہ انسانوں میں پہنچ گئی ہے۔ دھوئیں کو بل کھاتے لہراتے دیکھ کر اُس کے بکھرے حواس مجتمع ہونے لگے۔ دور بہت دور بھاگتے قدموں کی چاپ نے یہ نوید سنائی کہ وہ اب تنہا نہیں — بہت سے انسانوں کے درمیان ہے۔ یہ احساس بے حد خوش آئند تھا — وہ ان انسانوں کی بھیڑ میں خود کو گم کر دینا چاہتی تھی۔ مگر... یہ کیا..... وہ لوگ گروہ در گروہ اس کے پاس سے گذرنے لگے۔ وہ ایک ایک کا دامن تھام کر پوچھتی تم کون ہو — کہاں جا رہے ہو — مگر وہ سب اپنے ساکت چہرے لئے کندھوں پر بڑی بڑی گٹھریاں اُٹھائے اُسے نظر انداز کئے بھاگے جا رہے تھے۔ روبی مایوسی سے پیچھے ہٹنے لگی۔ اُسے اپنے زخموں کا احساس ستانے لگا۔ خشک ہونٹ جو چند لمحے پہلے اپنی پیاس کو بھول چکے تھے۔ دوبارہ سوکھنے لگے۔

دفعتاً اُس گروہ میں سے کوئی گرا۔ روبی نے سوچا یہ لوگ تو اُسے کچل کر گزر جائیں گے۔ کیونکہ جلدی میں ہیں — یہ سوچکر روبی نے آگے بڑھ کر گرتے ہوئے کو تھام لیا۔ وہ ایک عورت تھی۔ جس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہونٹوں پر جمی پپڑیاں اُسے بھیانک بنا رہے تھے — اس نے خوف سے ڈوبتی آواز میں کہا... میری بستی کے لوگ عجیب بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں — ان کے چہرے پتھر کے ہو گئے ہیں۔ انہیں بچا لو — روبی نے سوچا پتھر مگر کیسے اور یہ انہوں نے کندھوں پر کیا اٹھایا ہوا ہے — تم جانتی ہو نا ہمارے وجود میں سختی اور نرمی دونوں کا راج ہے۔ جب ان کے چہرے اور جسم سختی کی لپیٹ میں آ گئے تو انہوں نے اپنے من کی نرمی نکال دی — تاکہ ان کے وجود میں تیڑیں نہ پڑیں — انہوں نے اپنی نرمی اپنے وجود سے کاٹ کر باہر نکالی ہے۔ اُسے پھینکنے جا رہے ہیں۔ یہ کہتے کہتے اُس عورت کی آواز ڈوبنے لگی — روبی کو جب یہ احساس ہوا کہ اس نے ایک مردہ جسم کو تھام رکھا ہے۔ تو اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ اُبھری — اور پھر وہ مسلسل بغیر سوچے چیختی ہی گئی — عارف کے جھنجوڑنے پر روبی نے آنکھیں کھولیں — اوہ تو یہ خواب تھا — اس احساس نے اُسے بہت سکون بخشا — لیکن آنکھوں کے سامنے اُس عورت کا ویران چہرہ گھومنے لگتا۔ اس کے چہرے پر ناچتی ویرانیاں اُس کے حواس پر چھائی جا رہی تھیں — وہ سہمی چڑیا کی مانند عارف کے سینے میں سما جانا چاہتی تھی۔ عارف

کی بانہوں کے حصار میں اپنے آپ کو محفوظ کر
لینا چاہتی تھی مگر عارف اُس کے جذبوں سے
بے نیاز دوبارہ نیند کی وادیوں میں کھو چکا تھا۔
عارف کے چہرے پر پکتی آسودگی اُسے جلا رہی
تھی۔ اس کا دل عارف کی خود غرضی پر خون خون
ہو رہا تھا۔ یہ کیا عارف کو جب میرے وجود
کی ضرورت ہو تو نہ دن دیکھتا ہے نہ رات
مگر آج مجھے اُس کی ۔۔۔ اُس کی محبت میں پناہ کی
ضرورت ہے تو وہ منہ موڑے بے خبر سو رہا
ہے۔ آخر ہمت کر کے اُس نے عارف کو
آواز دی ۔۔۔ عارف اٹھو مجھے ڈر لگ رہا ہے
عارف اُس عورت کی آنکھوں میں اتنی ویرانی کیوں
تھی ۔۔۔ جواب کا انتظار کئے بغیر دوبارہ بولی اور
عارف اگر میرا یہ خواب سچ ہو جائے تو ۔۔۔ عارف
نے غنودگی میں کہا ۔ اگر ایسا ہو جائے تو تم ساحری
جادوگر سے اُس کی چھڑی چھین کر تمام لوگوں کا مس
کر نا وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اب سو جاؤ میں
نے صبح دفتر جانا ہے۔ عارف کروٹ موڑ کر
دوبارہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا۔ بعض لوگوں
پر نیند کی دیوی کتنی مہربان ہوتی ہے۔ مگر عارف
کی اس ننھی سی بات نے روبی کو بے حد حوصلہ
دیا۔ اور روبی سوچنے لگی ہاں میں ساحری جادوگر
سے چھڑی لے لوں گی ۔۔۔ مگر وہ اس زمانے میں
کہاں ۔۔۔ مایوسیوں کے اتھاہ سمندر میں وہ پھر
ڈوبنے لگی ۔۔۔ نیند سے آنکھیں جلنے لگیں۔ لیکن
وہ اس ڈر سے پلکیں نہیں موند رہی تھی ۔ کہ کہیں
دوبارہ وہ خواب نہ نظر آئے ۔ مسلسل جاگنے سے
اُس کی آنکھیں جلنے لگیں ۔۔۔ ایک دم اُس کے
ذہن میں خوف کا ناگ لہرایا ۔۔۔ اگر یہ خواب
حقیقت بن گیا تو .... اگر اس خواب کی یہی تعبیر ہوئی
تو ۔۔۔ خوف کا ناگ بار بار اپنی لمبی زبان نکالے
اُس کے ذہن میں سوال بن کر ڈنگ مارتا ۔۔۔
لیکن وہ اس کی جلن اور کسک سہنے کیلئے مجبور تھی۔
کیونکہ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔
بالآخر سورج کی مہربان کرنوں نے روشندان
کے راستے اُس کی جلتی آنکھوں کو چوما تو اُسے ان کی
ٹھنڈی ٹھنڈی گرمائش نے بے حد سکون دیا۔

ناشتے کی میز پر عارف نے حسب معمول اپنے
اور روبی کے درمیان اخبار کی فصیل کھڑی کر لی
روبی، ایسے میں ہمیشہ اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا
محسوس کیا کرتی تھی ۔ آج یہ فصیل کچھ اور اونچی
لگ رہی تھی ۔ روبی یہ فصیل یہ دیوار گرانا چاہتی
تھی ۔ توس پر مکھن لگاتے ہوئے روبی کہنے لگی
عارف اگر میرا خواب سچا ہو جائے اگر لوگ
پتھر کے ہو جائیں تو پھر ۔۔۔ پھر کیا ہوگا ۔۔۔
روبی کی بات سن کر عارف نے اخبار پڑھتے ہوئے
کہا کیا مصیبت ہے ۔ رات کو بھی نیند خراب کی
اور اب پھر سے سر وہی باتیں ۔ میرا خیال ہے۔
کسی مینٹل سپیشلسٹ سے جا کر ملو ۔ یہ کہتے ہوئے
عارف کے چہرے پر اتنی کرختگی اور آنکھوں میں
چٹانوں کی سی سختی تھی ۔ روبی کو لگا جیسے عارف کا
چہرہ پتھر بن رہا ہے ۔ اُس نے ڈوبتے دل
کے ساتھ سوچا تو اُس کا خواب سچ نکلا ۔ وہ
اپنے اندر خوف کی جمتی برف سے گھبرا گئی ۔ اُس
کے بدن میں خون خوف کی برف سے جمنے لگا ۔ عارف
کب کا جا چکا تھا۔

روبی برف کی سل بن کرسی پر بیٹھی تھی کہ عامر کے
چیخنے کی آواز آئی ممی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مگر ابھی
تک ناشتہ نہیں آیا کہاں ہے خانساماں ۔ عامر کے
چہرے پر چھائی کرختگی کو دیکھ کر روبی نے آنکھیں
موند لیں وہ اپنے لخت جگر کو پتھر میں بدلتے
نہیں دیکھ سکتی تھی ۔ وہ تو اُس کے جگر اُس کے
جسم کا ایک حصہ تھا ۔ اگر وہ پتھر بن جائے ۔
نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ۔۔۔ اس کے دل و
دماغ میں یہی تکرار ہو رہی تھی ۔ خانساماں نے
غصے سے انڈے کی پلیٹ پٹختے ہوئے کہا لیجئے
ناشتہ میں اس گھر میں ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔
روبی نے نظر اٹھائی خانساماں کے چہرے پر چٹانوں
کی سختی تھی ۔۔۔ روبی ان سب سے دور بھاگ
جانا چاہتی تھی ۔ وہ جلدی سے اٹھی جلدی
جلدی لباس تبدیل کیا اور گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔
ٹیکسی روکنے کی تمام کوششیں بیکار گئیں۔ وہ انسانوں
کے اس جنگل میں تنہا تھی ۔ سب اپنے اپنے
کندھوں پر اپنی اپنی مرادوں کے لاشے اٹھائے
بھاگے جا رہے تھے ۔ تو خواب بھی یوں سچ
ہوتے ہیں ۔ میرے شہر کے لوگ میری بستی پتھروں
کی بستی ہے۔

دور سے اُسے لگا اُس کا بھائی اُس کا دیر سکوٹر پر
چلا آ رہا ہے۔ کسی اپنے کو سامنے پا کر اُسے
ایک انجانی خوشی کا احساس ہوا ۔۔۔ کہاں جانا
ہے باجی؟ ... ! میں کہیں بھی نہیں مگر تم کدھر جا

رہے ہو — سنو ہمارے شہر میں ایک بیماری پھیل رہی ہے۔ لوگ پتھر کے بنتے جا رہے ہیں آؤ کہیں بھاگ چلیں چلو بھیا کہیں ہم — مگر وہ تو سکوٹر اڑاتے ہوئے کب کا جا چکا تھا۔ کاش مجھے سامری جادوگر کا پتہ مل جائے میں اپنے شہر میں چھانے والے طلسم کو توڑ ڈالوں — ورنہ اپنے بیٹے اپنے خونِ جگر کو تو اس بیماری سے بچا لوں۔

وہ بس ایک ایک کا دامن پکڑتی رہی — مگر اُس کی بات کسی نے نہ سنی چلتے چلتے اُس کے پاؤں تھک گئے — وہ ڈوبتے دل سے واپس گھر کی جانب چل دی.... گھر پہنچی عامر گیٹ کے پاس مل گیا۔

امی آپ کہاں چلی گئیں تھی — میری ٹائی کدھر ہے آپ کو پتہ ہے میرا میچ ہے — بیٹے تم کہیں نہ جاؤ، دیکھو میری طبیعت خراب ہے۔ میرا دل ڈوب رہا ہے — مجھے سہارا دو — عامر کا بازو تھام کر اُس کے ڈوبتے وجود کو سہارے کا احساس ہوا — عامر نے اُسے آہستگی بستر پر لٹا دیا — امی آپ آرام کیجئے میں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے۔ وہ آتا ہی ہوگا — اُس کی آنکھیں عامر کو روکتی رہیں مگر جلتے ہوئے پردے نے اُس کی آنکھوں میں امنڈنے والے سوالوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

دوائیوں کی ملی جلی 'بو' نے احساس دلا دیا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ آنکھیں کھولیں تو سفید سفید یونیفارم میں ملبوس نرسیں اُسے جنت کی حوروں کی طرح مہربان لگیں — سفید یونیفارم میں ملبوس نرسیں اُسے ہمیشہ بڑی مقدس لگتیں۔ عامر کی پیدائش کے وقت جب وہ موت و زیست کے درمیان درد کی زنجیر سے لٹکی ہوئی تھی۔ تو ان مہربان ہاتھوں نے اُسے درد کی دہلیز سے کھینچ نکالا تھا۔ جب وہ درد سے بے حال تھی۔ تو دو لب اس کی پیشانی پر اس طرح جھکے تھے کہ محبت اور خلوص کی ایک مہر اس کی پیشانی پر ثبت کر دی تھی — اُس نے آہستہ سے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور اُس جگہ کو چھو کر محسوس کرنے کی کوشش کی — اس جگہ ہاتھ لگاتے ہوئے بے تحاشہ ٹھنڈک اور سکون کا احساس ہوا — ایسا ہی سکون اور ٹھنڈک وہ آج بھی پانا چاہتی تھی — اس نے سوچا شکر ہے میں ان مسیحاؤں کے درمیان آگئی ہوں — یہاں کوئی خوف نہیں

وہ بہت سی اچھی باتیں سوچنا چاہ رہی تھی کہ ایک آواز سن کر چونکی ڈاکٹر آپ جا کر سو کیوں نہیں جاتیں — ڈاکٹر مگر یہ مریض.... نرس میں پاس ہی بیٹھی ہوں — ڈاکٹر ٹھیک ہے یہ DRIP آہستہ کر دو — تاکہ تھوڑی دیر سکون سے سو جائیں کم بخت مریض بھی رات کو ہی زیادہ آتے ہیں — یہ فقرہ روبی کے حواس پر بم بن کر گرا گھبرا کر آنکھ کھولی تو ڈاکٹر کی پتھرائی آنکھیں اور پتھرائے چہرے سے اُسے دیکھ رہی تھی — پتھر کے مسیحا نے اُس کی تمام اُمیدیں توڑ دیں — اُسے اپنے وجود کے ٹوٹنے کا احساس ہوا — جیسے وہ لمحہ بہ لمحہ بکھرتی جا رہی ہے — اُس کا سانس آہستہ ڈوبنے لگا — وہ اتنے بہت سے پتھریلے چہروں کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

<u>انور سدید</u>

"رومانوی ادب کی زبان میں یکسانیت کا کوئی عنصر موجود نہیں۔ رومانوی زبان جذبے کے جزر و مد کو تخلیقی رعنائی سے گرفت میں لینے کی کوشش کرتی ہے چنانچہ کبھی اس کا لہجہ اتنا دھیما ہوتا ہے کہ لفظ سرگوشی بن جاتا ہے اور کبھی اس کی صدا اتنی اونچی ہوتی ہے کہ شاعر اپنا جادو آواز کے بجائے بازگشت سے پیدا کرتا ہے"

اقتباس، یورپی ادب میں رومانیت کی تحریک

ا

آصف عمران

بے سمت سفر کی خوشبو

اور خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی۔ تب روشنی کو تاریکی سے جدا کیا اور خدا نے روشنی کو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی......

اور شام کے ساتھ ہی میرے قدموں کی چاپ اپنے کمرے کی دہلیز کے ساتھ چپک جاتی ہے۔ اور میرے سانسوں کی آواز بازگشت کا بدن پہن کر کمرے میں گونجتی رہتی ہے۔ ابھرتی ہے۔ ڈوب جاتی ہے۔ نہ جانے کہاں ــــ کہاں گم ہو جاتی ہے ــــ میں جاگتا رہتا ہوں اور اس آواز کے ساتھ ڈوبتا رہتا ہوں اور ابھرتا ہوں۔ تب رات میرے سارے دکھ اور کرب اور بے کیفی کی جان لیوا فضا کو اپنی بانہوں میں لے لیتی ہے۔ اور میں سوچتا ہوں۔

کہ اب تو مجھے خودکشی کر ہی لینی چاہیے۔

آخر کیوں ــــ

اس "کیوں" کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔

تم بزدل ہو ــــ

نہیں ــــ بات صرف اتنی سی ہے کہ یہ ایک لمحہ ہے۔ جو میری زندگی میں اکثر آتا ہے۔ میں نہیں جانتا اس کی حقیقت کیا ہے۔ مگر اس لمحے میں اپنے چاروں اور کے ماحول کو کسی اجنبی کی طرح بے معنی اور خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگتا ہوں۔ اور اپنے وجود کی موجودگی کو فراموش کر کے نامعلوم سمتوں کی طرف اڑنا شروع کر دیتا ہوں۔ اور یہ خوابناک سی فراموشی۔ ناموجودگی کا دائرہ بن کر میرے گرد خوف اور تنہائی کا سائبان تان دیتی ہے۔ تب ایک صدا میری روح کی گہرائیوں میں سے جنم لیتی ہے۔ اور میری انگلی پکڑ کر احساس کی بیکراں وسعتوں میں لے جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ صدا مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہے۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ جو کوئی اس صدا کو جاننے کے عذاب میں مبتلا ہے۔ وہ گفتگو کے ذریعے اس کا اظہار نہیں کر سکتا اور جو کوئی نہیں جانتا۔ وہ قیامت تک اس راز کو نہیں پا سکتا۔ اور بھٹکتا رہتا ہے۔ اور فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے۔ جب میرا دل چاہتا ہے کہ میں خودکشی کر لوں کیونکہ خود کو بیدار کرنے کی یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے۔ موت سامنے ہو تو انسان کی ساری بے حسی پہلے ہی جھٹکے میں مر جاتی ہے۔ اور ناموجود کی فراموشی کا خواب بکھر جاتا ہے۔ تب انسان خود کو ہلکا ہلکا محسوس کرتا ہے۔

تم یہاں کب سے ہو۔

تب سے ــــ جب ابھی کائنات اور آدم کا کوئی تصور بھی نہ تھا۔ تخلیق سے قبل جب ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ زمین سنسان اور ویران پڑی تھی۔ اور ہر وقت کہر اور دھند اڑتی رہتی تھی۔ چاروں طرف سمندروں پر تاریکی چھائی ہوئی تھی اور سطح آب پر خدا متمکن تھا۔ زمین پر جسموں کے بیچ بوریا تھا تو میں نے جسم کی اس خانقاہ میں پناہ لی۔ یہاں آنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ جو کہ معدوم ہو چکا ہے۔ اس کے چاروں طرف دلدل اور گھنا جنگل ہے۔ جس میں ہر طرف جسموں کے بلند و بالا اور بوڑھے درخت ہیں ان کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں۔ اور شاخیں بازوؤں کی مانند آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ ان درختوں کے پھول لالچ ہوس جرم و گناہ ہیں۔ اور پھل آفت مکر و غم اور بوسیدگی ــــ میں اپنے مثبت ہاتھوں سے جب ان منفی پھلوں کو کھاتا ہوں تو اپنی برہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ تب میں خوش فہمی کے پتوں کی لنگیاں سی کر پہن لیتا ہوں۔ اور مطمئن ہو جاتا ہوں۔ حالانکہ یہ برہنگی پورے وجود میں سرایت کر جاتی ہے اور پھر ایک ناسور بن جاتی ہے۔ میں کیڑوں کا نشتر پکڑتا ہوں۔ مگر کچھ

حاصل نہیں ہوتا۔

ایک طویل ساعت ملک کی سرگوشیوں سے ہمکلام ہوتی ہوئی گزر رہی ہے۔ میں ——— زمانہ ——— اور سمندر ——— ہمارے علاوہ کمرے میں کوئی بھی نہیں ہے۔ میں بولتا ہوں۔ اور زمانہ سنتا ہے مگر سمندر خاموش ہے۔

پھر میں خاموش رہتا ہوں۔ زمانہ اور سمندر بولتے ہیں۔

میں وجود کے زرد پہاڑ پر بیٹھا ان دونوں کی باتیں سنتا رہتا ہوں۔

اونچی دیواروں میں گھرا ہوا یہ کمرہ جو کہ جیل کی ایک کوٹھری کی طرح ہے۔ یہ ہی میری ساری دنیا ہے۔ میں امید کا لحاف اوڑھ کر اپنی بے گناہی کے فرش پہ سوجاتا ہوں کہ شاید میرے خواب میں سورج کی کوئی کرن آجائے۔ اور مجھے دن اور رات کے امتیاز کا احساس ہو جائے۔ میں ازل سے قبل کی سی تاریکی میں گھرا اس جسم کی کوٹھری میں بند ہوں۔ مگر نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے اور اسی لئے میرے اندر کا سمندر مجھے خودکشی کی طرف راغب کرتا ہے۔ مگر وہ کہ جو کمرے کی چھت سے الٹا لٹکا ہوا ہے۔ اور اس کی آنکھیں روشندان کے گملے میں بھی ہوتی ہیں۔ وہ ایک نظر میری طرف دیکھتا ہے اور پھر باہر دیکھنا شروع کردیتا ہے۔ ہمیشہ ہی کہ مجھے زندہ رہنے کی تلقین کرتا ہے

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور میں ان دونوں کی آنکھوں کے درمیان تنی ہوئی عہد کی رسی پر چل رہا ہوں۔ میرے ہاتھوں میں میرے جسم کا چھج ہے۔ جس کی مدد سے میں اپنا توازن قائم رکھے ہوئے ہوں۔ ان دونوں میں کوئی بھی رسی کا سرا چھوڑ کر اس عہد کی شمع گل نہیں کرنا چاہتا جس کی روشنی میں زندگی کا وجود نئے چراغ روشن کرتا ہے۔ میں تو صرف جینے کی خاطر زندگی کے زہر پیالے کو پی رہا ہوں اور اسی لئے بدن کا کبوتر وقت کے آنگنے پر غٹرغوں غٹرغوں کرتا رہتا ہے۔ ماضی حال اور مستقبل کے نامعلوم لمحوں میں آگہی کا تصور اچانک خوابِ فراموشی کی حالت میں میرے احساسات کے مورچے پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اور چشم بصیرت کو نئے جہانوں کی بشارت دیتا ہے۔ تب زندگی اُن گنت گیتوں میں لپٹی ہوئی رنگین پوشاکوں میں سے محدود اور غیر محدود فضا کے درمیان ایک بادل کی مانند کھڑی نظر آتی ہے۔ میں آنکھیں کھولتا ہوں تو وہ کہ جو چھت سے پنکھے کی مانند الٹا لٹکا ہوا ہے۔ مجھے اس کوٹھری سے رہائی کا یقین دلاتا ہے۔ مگر یہاں سے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ تو میں سوچتا ہوں کہ یہ کالی کوٹھری جس میں میں صدیوں سے قید ہوں یہی میرا مقدر ہے۔ اس کے ایک کونے میں بہت سی پرانی کتابیں اور رسالے اور بہت سی مکمل اور نامکمل کہانیوں کے مسوّدے پڑے ہوتے ہیں اور اپنی تکمیل کو ترس رہے ہیں۔ میری طرح ہی اَن بولے اور اَن لکھے اس اندھیری کوٹھری میں بند پڑے ہیں۔ جس کے باہر ایک بہت بڑا عمر قید کا گونگا تالا لگا ہوا ہے اور اس کی زبان اس کے ہاتھ میں ہے۔ جس کو ایک جھلک دیکھنے کی خاطر میں آج تک سانسوں کی مالا پرو رہا ہوں

ان کتابوں اور رسالوں کے علاوہ ایک کونے میں پتھر کی ایک لوح بھی پڑی ہے۔ جسے میں نے اپنی قبر کے لئے منتخب کیا ہے۔ جس پر اَن لکھے ہوئے لفظوں کی عبارت لکھی ہوئی ہے۔ جو میں آج تک پڑھ نہیں سکا ——— اور یہ کوٹھری بھی تو پہلی نظر میں قبر ہی معلوم ہوتی ہے۔ جس کے باہر ایک بے نام نمبر کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ یہاں نام نہیں ہوتے صرف نمبر ہوتے ہیں۔ تیرہ (۱۳) نمبر کی یہ کوٹھری شاید ہمیشہ ہی بند رہے۔ ہر صبح دوسرے قیدیوں کی رہائی ہوتی ہے دروازے کھلتے ہیں اور بند ہوتے ہیں۔ اور میں حسرت سے ان کو دیکھتا رہتا ہوں۔ ایک۔ دو۔ تین ——— مگر سات کے بعد شاید وہ گنتی بھول جاتے ہیں۔ ساتویں کوٹھری اور تیرھویں کوٹھری کے درمیان فاصلے کا زرد پہاڑ کھڑا ہے۔ جو میری رہائی میں حائل ہے۔ اس پہاڑ کے اس پار رہائی کا کھلا میدان ہے۔ جسے میں صرف چشمِ تصوّر سے ہی دیکھ سکتا ہوں۔ میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوں مگر میرے ہاتھ سکڑ کر بدن سے چپک چکے ہیں۔ اور آج بھی کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے ہاتھ کی بریکیں فیل ہو گئیں تھیں اور دروازے کے دونوں پٹ پوری قوت سے چیخ کر گلے ملتے اور اس چیخ کو سن کر دیواروں کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے تھے۔ اور پھر یہ چہرے لٹکتے لٹکتے فرش تک آنے لگے تو کمرہ پھیلتا ہے۔ سکڑتا ہے۔ تب سب دیواریں زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ میں چاروں طرف دیکھتا ہوں کہ زندگی کی پکی سڑک پہ لمحوں کے درخت سالوں کے سنگِ میل بنے کھڑے ہیں۔ میں ان درختوں کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں مگر نارسائی کا طوفان ان درختوں پر جو مہاتما بدھ کی طرح خاموش کھڑے ہیں اپنی طاقت اور ہیبت کا

سائبان تان دیتا ہے تاکہ یہ درخت میری پناہ گاہ
نہ بن جائیں۔ تب یادوں کے مسافر سانسوں کی
انگلی پکڑ کر اس سڑک پر نکلتے ہیں تو ہر درخت
پر اپنی نظروں کی بارش کرتے ہیں۔ سوچوں کا تازہ
دھواں لمحوں کے درختوں پر جمتا چلا جاتا ہے۔ اور ان
کے خوبصورت چہروں کو گرد آلود کر رہا ہے۔ اور
سڑک ویران ہو جاتی ہے۔ اس پڑاؤ کی طرح جس پر
سے ابھی ابھی کوئی قافلہ کوچ کر گیا ہو۔ تب مجھے محسوس
ہوتا ہے کہ مہ و سال کے لمحہ لمحہ شب و روز اُداسی
کے سنسان اور بنجر نظاروں میں رقص کناں ہیں۔ اور
احساس تماشائی اور اداسی میں ڈوبے ہوئے ان دور خوشحال
کو جو میرے ماضی کی ساری امانتوں کو چھپائے ہوئے
ہیں۔ دیکھ کر میں خود بھی اُداسی کے بوجھ تلے دب
جاتا ہوں۔

اُداسی جو ہمہ گیر ہے
اداسی جو ماضی و حال پر ایک بیزار کن یکسانیت
سے مسلط ہے
اور ــــ نارسائی کے بھاری پتھر کا بوجھ میرے
ناتواں کندھوں پر ہے
اداسی اور نارسائی کا کوئی مداوا نہیں

میں اداسی کے سیال ملبے میں تیرتا ہوں۔ مگر
کنارہ نہیں ملتا۔ نارسائی کے دکھ کا درخت میرے دل
کی کھیتی میں اگ آتا ہے۔ جس پر ہری شاخوں کی بجائے
سوکھے پھول لگتے ہیں۔ اس کے چاروں طرف خوفناک
آندھیاں چلتی ہیں مگر یہ اپنے پنجے بڑی مضبوطی سے
دل کی زمین میں گاڑے رکھتا ہے۔ ہواؤں کا شدید
اور گہرا سمندر اس کے ارادے کو متزلزل نہیں کر سکتا
اور میرا جسم اس سمندر میں ایک ناتواں کشتی کی مانند
نظر آتا ہے۔ نارسائی اور اُداسی کی شدید لہریں زمانے
کی راہ میں پڑے ہوئے پتھر کی مانند اس کو اٹھا اٹھا
کر پھینکتی ہیں اور یہ اپنے آپ کو ان لہروں کے رحم و کرم
پر چھوڑ دیتا ہے۔ تب وہ نئے آنے والے لمحے میں
زندگی موت چاند ستارے ظلمت اور روشنی کسی کو
بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ اور صرف ایک بوجھ بن کر
رہ جاتا ہے۔ جو اس کا اپنا ہی بوجھ ہوتا ہے۔ زمانے
کی ٹھوکریں کھا کر وہ دوبارہ زندگی کی انگڑائی کا ادراک
کرتا ہے ــــ مگر تب صرف اپنی ذات میں ہی
الجھ جاتا ہے۔ اور یہی خود آگہی اس کے لئے اس کا
سب سے بڑا مسئلہ بن جاتی ہے اور اسی آشوب
میں وہ خلا اور تنہائی اور نفرت کے لامتناہی انتقام
کے امتحان کے پتھر کو ہضم کر کے زندہ رہنے کی
کوشش کرتا ہے اور یوں سانس لینے کی تگ و دو
کے پیٹ میں جنم لینے والی قوتوں کی قیمت سے آزاد
ہو جاتا ہے۔ اور نئی نئی بشارتوں کے حمل امیدوں
کے پیٹ میں ٹھہر جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ خالق بھی
ہے اور مخلوق بھی ہے۔ اور اپنی ہر تخلیق کے لمحے
کے ساتھ ہی ڈوب جاتا ہے۔ اُبھرتا ہے مگر جسم کا
پہاڑ احساس کے سمندر میں ڈوب کر ابھر نہیں سکتا
اور اسی لئے وہ ــــ جو کہ روشندان میں اٹکا
ہوا ہے۔ مجھے دوبارہ ابھرنے کے لئے کہتا ہے۔
مگر سمندر کی لہروں کے ناخن مجھے آزاد نہیں کرتے
وہ ہمیشہ کے لئے مجھے اپنی باہنوں کے راستوں میں
دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ایک مسلسل صدا مجھے اپنی
طرف کھینچتی ہے۔ میں ان دونوں قوتوں کے نقطۂ
اتصال پر کھڑا ہوں۔ اور یہ صدا مجھے کھلے میدانوں
میں جنگلوں میں پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر اُگے
ہوئے لمبے لمبے درختوں کی شاخوں میں سمندروں
کی گہرائیوں میں سے پھرتی ہے۔ گہری وادیوں میں
پتھروں کے ساتھ اور پانی کے تیز دھاروں کے
ساتھ میں اس صدا کی اصل کی کھوج میں رہتا ہوں
میں اندھیروں میں ہاتھوں کے چپو چلاتا ہوں۔ مگر
آگے نہیں بڑھ پاتا۔ بلکہ صرف ایک نقطے کے دائرے
میں گھومتا رہتا ہوں۔ میں اس بے سمت سفر کی
خوشبو کو پہن لیتا ہوں مگر نہیں جانتا کہ اس سفر کی
اصل کیا ہے اور یہ صدا مجھے کہاں لے جانا چاہتی
ہے۔ اور شاید اسی ناآگہی کی وجہ سے میں اس تیرہ قبر
کی کالی کوٹھڑی میں لیٹا اپنی رہائی کا منتظر ہوں اور
اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رہائی
کا خواب آئے اور میری آنکھیں بند پا کر دبے پاؤں
لوٹ نہ جائے اور آگہی کا وہ لمحہ جو آواز کے رتھوں
پر سوار ہو کر آتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے
میرے کانوں کی سرائے میں بھی رک جاتا ہے تاکہ
تازہ دم ہوئے۔ میں اس لمحے کو سوچ کی رسی میں
باندھنا چاہتا ہوں مگر ناکام رہتا ہوں۔

اور آج کی رات میں آسمان پہنے خود کو بہت ہلکا پھلکا
محسوس کر رہا ہوں اور میرے آگے پیچھے سمندر اور
زمانہ بانہیں کھولے کھڑا ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے
کہ میں ان دونوں کی نظروں کے درمیان تنی ہوئی
رسی پر چل رہا ہوں اور اپنا توازن قائم رکھنے کیلئے
ہاتھوں میں امید کا ایک لمبا بانس ہے۔ اور وہ
دونوں مجھے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مگر ان دونوں کی

نظروں کی کشش مجھ پر آکر ایک دوسرے کی قوت
کو سلب کر دیتی ہے۔ اور میں اسی نقطہ پر کشمکش کی
صلیب پر مصلوب رہتا ہوں۔

میں دائیں طرف گردن گھما کر دیوار پر لگے
ہوئے آئینے میں دیکھتا ہوں تو وہ میرے سامنے
آکھڑا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے حلقوں میں جستجو
کا لق و دق صحرا جھانکتا ہے۔ میں ایک ہی جست میں
اس صحرا میں پہنچ جاتا ہوں۔ میں چاروں طرف آنکھیں
کھول کھول کر دیکھتا ہوں۔ مگر وہاں صرف آندھی کے
ذرات ہیں۔ وہ ہوا کی مانند میرے حلق میں
اترنے لگتے ہیں۔ میں منہ کا دروازہ بند کر لیتا ہوں
مگر وہ کانوں کی کھڑکیوں کے ذریعے میرے اندر کے
صحن میں اترنے لگتے ہیں۔ میں جب سے کانوں کی کھڑکیوں میں
انگلیوں کی روک دے لیتا ہوں تو وہ آنکھوں کے
روشندان کے ذریعے میرے اندر جھانکنے کی
کوشش کرتے ہیں۔ میں اس روشندان کو بند کرنا
چاہتا ہوں۔ مگر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ روشندان
میں الٹا لٹکا ہوا ہے۔ اور میں اس کے ہاتھوں بے بس
ہوں اور ادھر ادھر دیکھتا ہوں اور راستہ بھول جاتا ہوں
میں اندھے ہاتھوں سے ہر راستے کے جسم کو پکڑتا ہوں۔
مگر وہ میرے ہاتھوں کے لمس کی تپش سے پگھل جاتا ہے
اور سیال مادے کی طرح بہہ کر فضا میں تحلیل ہو جاتا
ہے۔ میری فریاد اور مشقت پر کوئی منزل ترس نہیں کھاتی
میں چاروں اور نئے راستوں کی تلاش میں نگاہوں کے
قاصد روانہ کرتا ہوں مگر ہر راستے کی لکیر کا جسم تیز آندھیوں
کے تیروں سے چھلنی ہو چکا ہے اور میں مایوس ہو جاتا
ہوں اور اس صحرا میں بیٹھ جاتا ہوں۔ زمانے کی گردش
کے ذرات اڑا اڑا کر میرے نقوش کو مٹا دینا چاہتے ہیں
تب دور سے ایک سایہ میری طرف بڑھتا ہے۔ شاید
وہ بھی اس صحرا میں راستہ بھول چکا ہے۔

مگر نہیں ــــ وہ تو ابر کے ایک ٹکڑے کا سایہ
ہے۔ میرے قریب آکر ٹھہر جاتا ہے۔ میں اس کی طرف
دیکھتا ہوں۔ مگر میری آنکھیں اوپر نہیں اٹھ سکتیں۔ تب
ایک آواز میرے دل کے دروازے پر دستک دیتی ہے

میں تو صرف اس لئے آیا ہوں کہ تجھ کو جسم کی بامشقت
قید سے رہائی دلاؤں اور یہاں سے نکال کر تجھے ایک
وسیع اور کھلی جگہ پہ لے جاؤں جہاں دودھ اور شہد
بہتا ہے۔ جہاں حدود کا کوئی تصور نہیں بلکہ تیری کائنات
حدِ نظر تک لامحدود ہوگی۔ میں نے تیری اداسی اور نایافت
اور مشقت کو دیکھا اور اپنے اس عہد کو یاد کیا۔ جو میں
نے روزِ اوّل تیرے ساتھ باندھا تھا۔ اور اس عہد کا
صندوق تیرے سرہانے رکھا تھا۔

لیکن تو ہے کون ــــ

میں جو ہوں سو میں ہوں تیرے لئے اتنا ہی کافی
ہے کہ میں جو ہوں۔

تو کیا تیرا کوئی نام نہیں ــــ تو بھی میری طرح ہی
بے نام ہے۔

بات نام کی نہیں ــــ نام تو کوئی سا بھی ہو سکتا
ہے۔

تو پھر تمہاری پہچان کیا ہے ــــ

میری پہچان ــــ تم چہروں کے نام رکھ کر سمجھتے
ہو یہ ان کی پہچان ہے۔ حالانکہ بے چہرگی اور بے نام
ہونا اس کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ لفظوں کو نام
بنا کر تم ان کو نہایت ناموزوں چہروں کی صلیب پر
چڑھا دیتے ہو۔ جہاں وہ تمام عمر تشنہ رہتے ہیں۔ مگر
ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں۔ جو کوئی اس آواز کو
سنتا ہے۔ وہ میرے ساتھ چلتا ہے۔ زمینی رشتوں
کی فصل اس کے بدن سے کٹ جاتی ہے۔ اور وہ
صرف "میں" رہ جاتا ہے۔

مگر تم اسے لے کر کہاں جاتے ہو ــــ

وہاں جہاں دودھ اور شہد کی ندی بہتی ہے۔
جہاں ہر طرف خوشی اور رہائی اور سکون اور رسائی کا
سمندر جاگتا ہے۔

میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ میرے قریب ہی کسی
کے قدموں کی چاپ آواز کے گھڑے سروں پہ اٹھائے
تیرہ نمبر کی کوٹھری کے قریب آتی ہے۔ شاید میری
رہائی کا وقت آ پہنچا ہے۔ مگر ــــ میں تو کسی بھی
راستے سے واقف نہیں ہوں۔ ہر راستہ اپنا دامن بچا کر
دور نکل جاتا ہے۔ لیکن تو کیوں ڈرتا ہے۔ میں تیرے
ساتھ ساتھ چلوں گا۔ اور تیرے لئے یہ نشان ہوگا کہ
میں ابر کے اس ٹکڑے میں سے تیری رہنمائی کروں
گا۔ اور میرے اس عہد کی لوحیں شہادت کے صندوق
میں رکھی تیرے لئے راستہ بنائیں گی تو اپنے احساس
کے دروازے کھول۔ دیکھ یہ سب کچھ تیرے اندر
ہی ہے۔

مگر میں تو آج تک اس شہادت کے صندوق کو دیکھ
نہ سکا ــــ چھو نہ سکا۔

تو اس کو دیکھ کر چھو نہ پائے گا۔ کیونکہ اس کی
کنجی تو میں ہوں تیرے جسم کے عہد کا صندوق بھی مدتوں
سے بند پڑا ہے۔ تو تو اس کو بھی نہیں کھول سکا۔

تب تیرہ نمبر کی کوٹھری کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

میں باہر نکل کر دیکھتا ہوں تو وسیع صحرا اپنی باہوں میں لے لیتا ہے۔ اور میری آنکھیں کھل جاتی ہیں تو دیکھتا ہوں کہ ابر کا ایک ٹکڑا ایک خیمۂ اجتماع پر کھڑا ہے۔ جو روشنی کا مینار ہے۔ میں پہلی ہجرت کا علم ہاتھوں کے چہروں پر سجائے پہلے سال کے پہلے مہینے کی پہلی تاریخ کو اپنے نئے سفر پر نکلتا ہوں۔ اس مبارک سفر میں جب ابر کا سایہ اس خیمۂ اجتماع کے اوپر سے اٹھ جاتا ہے تو میں آگے بڑھتا ہوں۔ اور اگر یہ ابر اس مسکن پر سے نہ اٹھتا تو میرے لئے رُکے رہنے کا نشان ٹھہرتا۔ اور رات کے وقت یہی سایہ آگ کا ستون بن جاتا ہے۔ جس میں سے روشنی کی شعاعیں میرے لئے نئی راہ تیار کرتی ہیں۔ اور میں ان شعاعوں کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتا ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں میں کدھر جا رہا ہوں میری منزل کونسی ہے۔ آیا یہ سفر ختم بھی ہوگا یا نہیں یا میں انہی صحراؤں میں بھٹکتا رہوں گا۔ اور ایک دن خود بھی نامعلوم ذرہ بن جاؤں گا۔ اور میرا وجود ان ہواؤں کے ساتھ اڑتا رہے گا اور پھر سے اپنی تکمیل کو ترستا رہے گا۔

تب میرے خیالوں کے پیٹ میں شک کا حمل ٹھہر جاتا ہے کہ میں جو مسلسل اٹھائیس برس سے عرصے اس صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔ میں ادھر اُدھر دیکھتا ہوں اور اپنے عہد کے صندوق کو بے یقینی کی کنجی سے کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاکہ وہاں سے نئے سہارے کے وجود کا مجسمہ ڈھال لوں اور اس بے سمت سفر سے نجات حاصل کروں تب وہ جو آگہی کے پہاڑ پر سے جہاں آگ اور گھٹا اور ظلمت اور روشنی ہے مجھ سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ مجھ سے روٹھ جاتا ہے اور ابر کا سایہ کہیں بھی نہیں ہے شک کی تلوار سے میں نے اُسے آزمائش کے ترازو میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھنا چاہا تھا۔ اور اس عہد کی شمع گل کر دی ہے۔ جس کی روشنی میں خود کو سمندر سے دور رکھ رہا تھا۔ جو مجھے اپنی آغوش میں لے کر لوریاں دینے کو بے تاب ہے۔ میں چاروں طرف دیکھتا ہوں ہر طرف زمانے کی گردشوں کی ناہمواری کے ذرات اٹھتے پھرتے ہیں۔ تب وہ جو کہ میرے کمرے کی چھت سے الٹا لٹکا ہوا ہے۔ مجھ پر اپنی ہنسی کا فوارہ چھوڑتا ہے

اور اس کی ہنسی کی پھوار میں چھپی ہوئی طنز کے تیر میرے چہرے کو چھلنی کرتے رہتے ہیں۔ اور میرے اندر کا نمکین پانی کینسر کی مانند میرے بدن کو کھا رہا ہے۔ اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔ میں بھی زمانے کی گردشوں کا مارا ہوا کتنا بدقسمت مریض ہوں۔ میرا جسم اپنے پرانے زخموں سے مانوس ہو چکا ہے اور نہیں چاہتا کہ یہ زخم ٹھیک ہو جائیں۔ اسی لئے رات کی تاریکی میں اپنی میلی سی چادر سے ہاتھ کا شکنجہ باہر نکالتا ہے۔ اور پھر اس شخص کے گلے میں فٹ کر دیتا ہے۔ جو اس کے علاج یا تیمارداری کے لئے آتا ہے۔ شک اور گناہ اور ہوس اور مایوسی کی دلدل میں پھنستا ہوا پہلے تو ہر آنے والے طبیب کو قتل کر دیتا ہوں۔ اور پھر نادم ہوتا ہوں اور کہتا ہوں کہ واقعی یہ طبیب حاذق تھا اور اسی لئے جسم کی اس کالی کوٹھڑی میں مایوس بیٹھا اپنی رہائی کے لمحے کا منتظر ہوں۔ مگر وہ کہ جس کے ہاتھ میں میری رہائی کا پروانہ ہے۔ نئے موسموں کی تلاش میں مجھ سے بہت دور جا چکا ہے۔

آصف ثاقب

رہینِ خاک تھا یا رفعتوں کا بندہ تھا
یہ کس کا نام ترے آسماں پہ کندہ تھا
کدورتوں کو تری، دوستی سمجھ لینا
فراغتیں تھیں مجھے بس یہ ایک دھندا تھا

شان الحق حقی

رک سکے گا آنسوؤں کا تار کیا
چین دے گی حسرتِ اظہار کیا

شام ہونے آئی سورج ڈھل گیا
ڈھونڈیئے اب سایۂ دیوار کیا

دیکھ یکساں وقت کی ٹھوکر میں ہیں
سنگریزہ کیا دُرِ شہوار کیا

خاکِ صحرا نے لیا دامن سمیٹ
اب لٹا ہے ابرِ گوہر بار کیا

دیکھتا ہوں روئے ساحل پر شکن
راہِ طوفاں ہو گئی ہموار کیا

چشمِ نرگس ہی سے آخر پیار کیوں
اہلِ گلشن ہم نہیں بیمار کیا

بن گیا اک بات کا بتنگڑ حیف
لکھ رہے ہیں دیکھئے اخبار کیا

غیرِ طوفاں کا یہ ریلا تھم بھی جائے
تھم رہے گی وقت کی رفتار کیا

بے مزہ تر ہے نمک کافور سے
سل گیا وہ زخم دامن دار کیا

غم ہوا سازگار اپنے لئے
کام ہیں بے شمار اپنے لئے

گل کو کیا بلبلوں کو کیا مطلب
لالہ ہے داغدار اپنے لئے

مانگتے رہیئے آشیاں کی خیر
یہی تنکے ہیں چار اپنے لئے

خوب ہے یہ بھی رسمِ مے خانہ
کیف ان کا خمار اپنے لئے

کاش تیری نہ جستجو کرتے
مشغلے تھے ہزار اپنے لئے

بھینٹ پھر تیرے عارض و لب کی
مانگتی ہے بہار اپنے لئے

اور ہے عزمِ کارواں حقیؔ
کیجئے کچھ بچار اپنے لئے

گھٹ رہا ہے دیدۂ انجم کا نور
بس یہی ہیں صبح کے آثار کیا

لی جو کاغذ کے سفینوں میں پناہ
عشق کا بھی لٹ گیا گھر بار کیا

صمد انصاری

لمحہ لمحہ وقت کا گھائل لگا
درد میں بھیگا ہوا صندل لگا

رات جب کھیتوں میں اتری چاندنی
ابر کا ٹکڑا مجھے پاگل لگا

ظلمتِ شب گھل گئی تھی اوس میں
آنکھ میں دن کی وہی کاجل لگا

ڈھل گئی چہروں کی آخر دوپہر
زلف کا سایہ مجھے آنچل لگا

کس قدر دشوار تھا اپنا سفر
جسم میں پھیلا ہوا جنگل لگا

راستوں نے بانٹ لی ساری تھکن
ذرہ ذرہ رہگزر کا شل لگا

جب کھلی اپنے نفس کی نغمگی
حسن کا ہر زاویہ پائل لگا

دن بدن ہوتے گئے اپنے اسیر
زندگی کا ہر قدم دلدل لگا

تشنہ لب تھا رات کا صحرا مگر
خشک دریا کی طرح بادل لگا

جمیل ملک

سرخیٔ شام نے یوں پھول بکھیرے دل میں
جیسے چپکے سے اتر آئیں سویرے دل میں

ہم تو صدیوں سے یونہی گوش بر آواز رہے
جانے تو کون ہے کیا راز ہے تیرے دل میں

پاس شب بھر کوئی خورشید صفت رہتا ہے
دن کو تارے سے اتر آتے ہیں میرے دل میں

جسم اس لہرِ سیال میں گھلتا جاتا ہے
جب ترے حسن کے اٹھتے ہیں پھریرے دل میں

پیار کی لو سے منور ہے شبستانِ وصال
آج تو آن ملے شام سویرے دل میں

ہم مسافر ہیں محبت کی کٹھن راہوں کے
تھک بھی جاتے ہیں تو کرتے ہیں بسیرے دل میں

کیوں بھٹکتا ہے، ادھر آ کے ذرا سستا لے
اس طرف دھوپ ہے، بادل ہیں گھنیرے دل میں

جب کہیں چاند بجھا، سینۂ گیتی دھڑکا
ہم وہیں شمع جلا آئے، اندھیرے دل میں

اپنا سرمایۂ فن پھر بھی سلامت ہی رہا
کتنی ہی بار جمیل آئے لٹیرے دل میں

پلک پلک ترے آنسو، نفس نفس ترا غم
دیارِ جاں کے لئے سازگار بس ترا غم

میں ان سے بھاگ کے جاؤں تو دم نکل جائے
چمن چمن تری یادیں، قفس قفس ترا غم

تو خون بن کے رواں میرے ریشے ریشے میں
فروغِ دیدہ و دل، جان و تن کا رس، ترا غم

مری فغاں کا دھواں تا بہ حدِ کون و مکاں
رفیق و راہنما، نغمۂ جرس، ترا غم

کبھی ادھر بھی نگاہِ کرم خدائے بہار
اٹھائے پھرتے ہیں کب سے یہ خار و خس ترا غم

جلالِ مہر بھی تو اور جمالِ ماہ بھی تو
ابھرتا ڈوبتا رہتا ہے پیش و پس ترا غم

وجود پار کرے، روح میں اتر جائے
تو نے نوازِ ازل، سوزِ ہر نفس ترا غم

بھڑک اٹھے چمنستانِ زندگی جس سے
وہ برقِ نور، وہ عرفانِ دسترس ترا غم

خوشی کی کھوج میں صدیاں گزار دیں تو نے
جمیل بڑھتا رہا کیوں برس برس ترا غم

جمیل خواب میں لپٹا ہوا خیال ترا
مرے جلال کو بھی دے گیا جمال ترا

تو اتنی دور ہے تجھ کو پکار بھی نہ سکوں
میں اپنے دل ہی سے کیوں پوچھ لوں نہ حال ترا

بھٹک نہ جاؤں کہیں ان دمکتی راہوں میں
میں اجنبی ہوں مگر شہر بے مثال ترا

ہر ابتلا میں نکھر آئے گی تری صورت
نہ کچھ بگاڑ سکیں گے یہ ماہ و سال ترا

بہار پوچھنے آئی ہے اور تو چپ ہے!
یہ کس کے خون سے چہرہ ہوا گلال ترا!

رواں ہوں صورتِ دریا میں دو کناروں میں
کبھی فراق ترا ہے، کبھی وصال ترا

کھلا کہ ایک سی ہوتی ہے دھڑکنوں کی زباں
مرے سوال سے ٹکرا گیا سوال ترا

غروبِ ماہ کے بعد آفتاب ابھرے گا
ترے عروج کا ہے پیش رو، زوال ترا

جمیل اور مسیحا نفس نہیں کوئی
ترے ہی سوزِ نفس میں ہے اندمال ترا

ماہِ نو

ماجد صدیقی

نظر میں تازگی عہدِ یافتِ جمال کی تھی
لہو میں تلخیٔ شیریں دمِ وصال کی تھی

طلوع میں بھی مرے شوخیاں تو تھیں لیکن
مزہ تھا اس میں جو ساعت مرے زوال کی تھی

وگرنہ تجھ سا طرحدار مانتا کب تھا
جو تھی تو اس میں کرامت مرے سوال کی تھی

بدستِ شوق فقط میں ہی تیغِ تیز نہ تھا
حیا کے ہاتھ میں صورت تری بھی ڈھال کی تھی

فروغ نور تھا جس سے شبِ طلوعِ بدن
سرِ چراغ وہ سرخی ترے ہی گال کی تھی

کنارِ شوق تلک شغلِ کسبِ لطف گیا
کوئی بھی فکر نہ جیسے ہمیں مآل کی تھی

نہ جس سے تھی کبھی درکار مخلصی ماجدؔ
گرفت مجھ پہ وہ کرنوں کے نرم جال کی تھی

انور محمود خالد

اے شامِ وصال کیا بتائیں
کیں کتنی ترے لئے دعائیں

ڈھلتی ہوئی رات کہہ رہی ہے
جلتے ہوئے دن نہ لوٹ آئیں

کس نے یہ دھنک پہ پاؤں رکھے
کس کے لئے مہک اٹھیں فضائیں

پلکوں پہ چمک اٹھے ستارے
چہروں سے اتر گئیں ردائیں

ہر ناؤ نے رُخ بدل لیا ہے
کیسی یہ پلٹ پڑیں ہوائیں

تم نے تو ہمیں بھلا دیا ہے
اور ہم بھی اگر تمہیں بھلائیں

وہ لفظ، حاصلِ زندگی ہیں
جو تیرے حضور کہہ نہ پائیں

آصف ثاقب

رہینِ خاک تھا یا رفعتوں کا بندہ تھا
یہ کس کا نام ترے آسماں پہ کندہ تھا

کدورتوں کو تری دوستی سمجھ لینا
فراغتیں تھیں مجھے بس یہ ایک دھندا تھا

وہ سائبان جو پہلے سروں کا تاج رہا
گرا ہوا سے تو پھر گردنوں کا پھندا تھا

ہر ایک در پہ گیا دوسروں کا غم لینے
کہ جمع پاس مرے آنسوؤں کا چندا تھا

لکھا تھا ایک ہی مصرع مگر کمال ہوا
ورق ورق تھا لہو سامنے پلندہ تھا

کسی کی داد نے ثاقبؔ مجھے خرید لیا
جسے خلوص میں سمجھا وہ ایک پھندا تھا

محمد اظہار الحق

مرے ستارے ترے آسمان کیسے ہیں
تری جبیں پہ یہ کالے نشان کیسے ہیں

چھتیں ہیں جن کی نہ دیوار و در نہ بنیادیں
مکیں ہیں جن میں بہت خوش، مکان کیسے ہیں

ہر ایک خوان پہ بیٹھے ہو اے عناصر! تم
مگر بتاؤ مرے جسم و جان کیسے ہیں!

بنے گی اب تو کہیں پانیوں پہ ہی تربت
افق پہ آج یہ پھر بادبان کیسے ہیں

کھلا ہمیشہ مصیبت میں اک نہ اک در غیب
یہ اسم کچھ مرے وردِ زبان کیسے ہیں

زمیں تو تخت ہے فصلِ مراد کے حق میں
کوئی بتاؤ کہ ہفت آسمان کیسے ہیں

خمیر خاک ہے اور جسم آتشیں، اظہار
مرے ضمیر پہ یہ امتحان کیسے ہیں

مسعود انور شفقی

کاش پھر شکلِ زندگی دیکھوں
تجکو اک بار اور بھی دیکھوں

تو کہاں تک مجھے ستائے گا
میں کہاں تک یہ بے رُخی دیکھوں

میری آنکھوں میں تیرگی ہی سہی
تیرے چہرے پہ روشنی دیکھوں

تو مری جرأتِ نظر ڈھونڈے
اور میں اپنی بے بسی دیکھوں

دیکھ تُو اپنے جور کے انداز
اور میں دل کی سادگی دیکھوں

ان کا چہرہ طلوع تو ہو اَنْوَر
چاند نکلے تو چاندنی دیکھوں

یوسف حسن

دھوپ کملائی تو ہر دل میں دھواں رہ جائے گا
شام تک شہرِ یقیں دشتِ گماں رہ جائے گا

اپنے سارے خواب گلیوں میں کہیں کھو جائیں گے
ایک رسوائی کا رشتہ جاوداں رہ جائے گا

آہٹوں کے ساتھ سو جائیں گی پاگل دھڑکنیں
در سے دل تک ایک سناٹا رواں رہ جائے گا

روشنی کا ریزہ ریزہ چاٹ جائے گی ہوا
جنگلوں میں کوئی جگنو بھی کہاں رہ جائے گا

دشت کے سائے جو در آئے در و دیوار میں
شہر بھر میں کون اپنا مہرباں رہ جائے گا

آخرِ شب بجھ گئیں آنکھیں بھی شمعوں کی طرح
دن کہاں اب تو فقط دن کا گماں رہ جائے گا

یوسف اپنے بھائیوں کے ساتھ ہو گا الوداع
اور اپنے دشمنوں کے درمیاں رہ جائے گا

مسعود مختار

اسی لئے مرا دشمن بہت ملول ہوا
میں لٹ گیا بھی اگر تو نہ بے اصول ہوا

پگھل ہی جائے گا آخر وہ آدمی ہی تو ہے
کتابِ عشق کا اُس پر اگر نزول ہوا

تمام شہر جسے دل کا سخت کہتا تھا
ذرا سا پیار کیا تو وہ کھل کے پھول ہوا

لہولہان پڑا تھا گلی میں سایہ مرا
میں شب سے پوچھتا ہوں اس کو کیا حصول ہوا

جو شخص گھر سے دھنک کی تلاش میں نکلا
خبر نہیں کہ وہ کن راستوں کی دھول ہوا

شفیق سلیمی

میرا سایا قد سے بڑھتا ہی نہیں
سَر پہ سورج ہے کہ ڈھلتا ہی نہیں

اس لئے سڑکوں پہ آ جاتا ہوں میں
گھر میں بیٹھے وقت کٹتا ہی نہیں

کچھ نہ کرنے کی تھکن سے چُور ہوں
میں کبھی بے کار بیٹھا ہی نہیں

میں سجاؤں کس لئے دیوار و در
میرے گھر جب کوئی آتا ہی نہیں

ایک ہی گھر میں ہیں مدت سے مگر
وہ مجھے میں اُن کو سمجھا ہی نہیں

ہے مگن. ہر ایک اخبارات میں
میرا چہرہ کوئی پڑھتا ہی نہیں

سید یٰسین قدرت

سفر کے دشت میں یادوں کا سائبان بھی نہ تھا
پلٹ کے آئے تو سر پہ وہ آسماں بھی نہ تھا

ہوا نے کیں وہ ہنرکاریاں کہ مرغ تو کیا
درخت پر کوئی بوسیدہ آشیاں بھی نہ تھا

کوئی خیال اُبھرتا تھا نقش کی صورت
کہ خواب زارِ تمنا یوں بے نشاں بھی نہ تھا

گئے زمانوں کے پیکر بدن میں زندہ تھے
کہ قریۂ دل و جاں شہرِ رفتگاں بھی نہ تھا

وہی تھا داورشِ ہوا پہ وہی پسِ تصویر
میں بے نوا، مجھے حاصل پرِ فغاں بھی نہ تھا

خلش مظفر

کچھ رنگ اڑے کچھ رنگ، کہ شاخیں ہریالی سے خالی ہیں
پھر جنگ، مسلسل جنگ، کہ شاخیں ہریالی سے خالی ہیں

ہر موسم بھولا بھول گیا، خوابوں میں تنہائی سب آنکھیں
ہوں دنگ بہت ہی دنگ، کہ شاخیں ہریالی سے خالی ہیں

پہلے بھی برستے تھے بادل، بادل کے برسنے پر مٹی
اب تنگ ہے اتنی تنگ، کہ شاخیں ہریالی سے خالی ہیں

آواز، امیدیں، خوش فہمی، دیدار، مہک، رنگت طلبی
کیوں ملک پہ چلے یہ سنگ، کہ شاخیں ہریالی سے خالی ہیں

اس گہری نیلی چھتری سے، کوئی ہاتھ بڑھے، کوئی بوند گرے
ہر انگ ہے تیرا انگ، کہ شاخیں ہریالی سے خالی ہیں

آواز کے بہتے دریا سے، ہر ساز کا رشتہ ٹوٹ گیا
آہنگ، کوئی آہنگ، کہ شاخیں ہریالی سے خالی ہیں

جگ بیت چکے ہیں اور خلش اس بار تو ساری بستی میں
سب ڈھنگ ہیں تیرے ڈھنگ، کہ شاخیں ہریالی سے خالی ہیں

شہناز پروین سحر

گھونگھٹ میں اک چاند بڑا ہے
گھر پھر بھی تاریک پڑا ہے

داغ رہا ہے سونی کلائی
باہنہ میں سرخ انگار کڑا ہے

دلہن گھٹ کر مر جائے گی
مان لیا سسرال بڑا ہے

برف پہ اپنے نام کھدے ہیں
سر پر سورج آن کھڑا ہے

پنچھی پر جانے کیا بیتی
پنجرے میں اک پنکھ پڑا ہے

دھرتی مانگے بیج اور پانی
دہقاں خالی ہاتھ کھڑا ہے

ماں کے پیار سے مہنگی موٹر
بچہ اپنی ضد پہ اڑا ہے

رستے میں ہے آگ کا دریا
سحر ترا کاغذ کا گھڑا ہے

افضل آرش

پہلے سا تجھ سے ربط رہے گا نہیں کوئی
اب میرے لوٹنے کا ارادہ نہیں کوئی

شاید وہ شخص اب بھی انہی بستیوں میں ہے
کل رات سارے شہر میں سویا نہیں کوئی

ہم دشمنوں کی طرح رہیں اک مکان میں
یہ تو نباہ کرنے کا شیوہ نہیں کوئی

صدیاں گزر گئی ہیں اسی انتظار میں
دھرتی پہ آفتاب بھی اترا نہیں کوئی

کہتا ہے آج وہ بھی کہ چہرے فریب ہیں
جب یہ کہا تھا میں نے تو مانا نہیں کوئی

ہے کون معتبر کہ جسے سونپ دیں حیات
بستی میں سچی بات بھی کہتا نہیں کوئی

رضا کاظم

ابر بن کر کبھی برسا ہوتا
وہ مری پیاس کو دریا ہوتا

اس کی خاطر کبھی آنسو پیتا
وہ مرے واسطے تڑپا ہوتا

میں بھی دیوانہ پکارا جاتا
اس کی وحشت کا بھی چرچا ہوتا

رات اس کے لئے بھاری ہوتی
میں بھی اک آگ میں جلتا ہوتا

اس سے ملنے کی میں گھڑیاں گنتا
وہ مرے واسطے تنہا ہوتا

وہ مسافر کی طرح اس گھر میں
رات کی رات ہی ٹھہرا ہوتا

دیکھنا اس کو قیامت ہو گا
یہ سمجھتا تو نہ دیکھا ہوتا

اس جہانِ گزراں میں کاظم
کاش کوئی مرا اپنا ہوتا

طالب قریشی

کب سے شبِ فراق تلاشِ سحر میں ہے
سورج مرے نصیب کا لمبے سفر میں ہے

محرومیوں کی دھوپ سے تپتے ہیں بام و در
ماحول سازگار کہاں میرے گھر میں ہے

پھر تشنگی ہے قوسِ قزح کا سماں لئے
آبِ رواں ہے آنکھ میں صحرا نظر میں ہے

فانوس جگمگائے ہوئے ہیں مکان کے
کائی مگر جمی ہوئی دیوار و در میں ہے

سب ہی مری تلاش میں نکلے ہیں ہر طرف
طالب کہیں چھپا ہوا اپنی نظر میں ہے

اشرف یوسفی

دلِ مضطر کو سمجھایا کروں گا
تجھے ملنے نہیں آیا کروں گا

مجھے زلفِ پریشاں میں سجا لے
تیری راتوں کو مہکایا کروں گا

جلیں گے دھوپ میں جب تیرے پاؤں
میں اپنے جسم کا سایا کروں گا

چلیں گی جب بھی یخ بستہ ہوائیں
میں اپنے زخم دہکایا کروں گا

اگر تو اجنبی بھی بن کے آئے
تجھے آنکھوں میں ٹھہرایا کروں گا

عروسِ فن کو اپنا خون دوں گا
غزل کو پھول پہنایا کروں گا

فرحان پرویز اقبال

ماں کے دل کا گوہر تو اک کنکر ہے
وہ بچہ تو اس بچے کا نوکر ہے

کس سے لڑوں میں کس سے اپنا حق مانگوں
میری سوچ ہی میری راہ کا پتھر ہے!

رعشہ زدہ ہاتھوں والا وہ بوڑھا شخص
سولہ سال کی اک لڑکی کا شوہر ہے

کالج جاتے روز اس سے ٹکراتا ہوں
کوئی کھوئی لڑکی پھول سا پیکر ہے!

خوابوں میں بھی بند دریچے تکتا ہے
کیونکہ وہ اک بل والے کا شوفر ہے!

روز و شب کے جلتے بجھتے صحرا میں
ہر ٹیلے کے پیچھے گھات میں لشکر ہے

میرا سایہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے
تنہائی جو گھر میں تھی، اب باہر ہے

کس کو صدائیں دیتے ہو پگلے فرحان
ساری بستی ویرانی کا منظر ہے!

بشیر آذر

پھر اچانک سر پہ لہرانے لگے سائے کئی
ایک پتھر میں نے پھینکا تھا مگر آئے کئی

وہ کہ مجھ سے زیادہ بااثر لوگوں میں تھا
اس نے اپنے جرم میرے نام لکھوائے کئی

بات تو میں نے کہی تھی سیدھے سادے ڈھنگ میں
تو نے ہی الفاظ کو مفہوم پہنائے کئی

ظرف تو اس کا سمندر کی طرح تھا جانے کیوں
اس نے قطرے کے لئے ساحل پہ ترسائے کئی

ہم ہی غافل ہو گئے تھے جانے کس کے زعم میں
اجنبی سے لوگ آذر گھر میں در آئے کئی

لیاقت علی عاصم

ہجر کی شب جو ترے وصل کا منظر چمکا
سر بریدہ تھے دیئے پھر بھی مرا گھر چمکا

ڈوبتے دیکھا اندھیروں کو سکوتِ شب میں
چاند نکلا تری یادوں کا سمندر چمکا

تجھ کو احساس کہاں ہے کہ مرے پیار کا رنگ
کن اندھیروں سے گزر کر ترے رخ پر چمکا

سچ کی خاطر جو بہایا تھا وہی قطرۂ خون
شبِ ظلمات میں سورج کے برابر چمکا

لوگ جب خاک نہ ڈالیں مری رسوائی پر
میں نے دیکھا ہے ترے ہاتھوں میں پتھر چمکا

میرے ہمسایوں کو حیرت ہے کہ عاصم میں نے
گھر کا اسباب جلایا تو مرا گھر چمکا

ڈاکٹر وحید قریشی

ساتواں در[1]

"برزخ" سے لے کر "ساتواں در" تک امجد اسلام کا شعری سفر فکری رویوں کے لحاظ سے بھی اہم ہے۔ لیکن میرے پیشِ نظر اس وقت اس کے جذباتی رویوں کا مسئلہ ہے۔ یہ جذباتی رویے کن لسانی تشکیلات پر مشتمل ہیں اور الفاظ و تراکیب کے کون کون سے وہ محبوب جوڑے ہیں جن کی مدد سے امجد اپنے تصورات کی بستیاں آباد کرتا ہے۔ زبان کے خارجی تعمیری پیکر امجد کے ہاں دو مختلف اور باہم متضاد محبتوں سے ابھرے ہیں۔ اس کے رومانی تصورات اسے 'برزخ' میں بار بار فیض کی طرف لے جاتے ہیں۔ فیض کی محبت اور قاسمی کی شفقت نے امجد کی جذباتی زندگی میں دخل حاصل کیا ہے۔ اس لئے وہ زبان و بیان کے سانچوں کے لئے دونوں کی طرف التجائی موتی نظر سے دیکھتا ہے۔ "ساتواں در" تک آتے آتے یہ دونوں جذباتی و لسانی عناصر اس کے مزاج میں الگ الگ صورت پذیری کی بجائے کسی حد تک مربوط اور یک قالب عنصر بن جاتے ہیں۔ یہاں فیض کی گونج امجد کی داخلی جذباتی ضرورت بن جاتی ہے اس لئے یہ آواز الگ الگ اور امجد کے احساسات کی اپنی ساخت سے جدا نہیں رہتی۔ لیکن قاسمی کا اثر کسی قدر اوپرا ہی رہتا ہے۔ زبان و بیان کے ان سانچوں میں امجد کی پسند قاسمی اور فیض کے علاوہ اقبال، غالب، مجید امجد اور ساحر کی یاد بھی دلاتی ہے لیکن یہ اثرات الگ پہچان کی حدود سے نکل کر امجد کے مزاج سے ایک خاص حد تک گھل مل گئے ہیں۔

تم تو خوشبو ہو ستاروں کی گزرگاہ ہو تم
تم کہاں آؤ گے اس دشتِ پُراسرار کی پہنائی میں
وہ ایک لمحۂ براں بھی تتلیوں کی طرح
ہتھیلیوں پہ فقط رنگ چھوڑ جائے گا

اقبال، غالب، فیض، مجید امجد اور ساحر کی ترکیبوں کی یہ آمیزش ان کے فکری رویوں کو مستعار لینے پر منحصر نہیں بلکہ نظموں اور غزلوں کے تہ در تہ جذباتی سانچوں سے مربوط ہے اس لحاظ سے خود ان کی زندگی کا حصہ ہے اور یہی ایک حد تک ان کی زندگی کا المیہ بھی ہے۔

امجد کی جذباتی کیفیات فیض کی رومان پسندی سے خاص نسبت رکھتی ہیں اور جب وہ شعوری طور پر قاسمی کی تقلید میں حیات و کائنات کے مسائل اٹھانے اور مشیّت کے بارے میں اظہارِ رائے کی کوشش کرتا ہے تو اس وقت وہ قاسمی بننے کی بجائے بقراط بن جاتا ہے۔ فیض اور قاسمی سے اثر پذیری ایک لحاظ سے اس کے شعور اور لاشعور کے درمیان مسلسل جنگ قرار پاتی ہے۔ وہ ابھی تک جذباتی طور پر اس آویزش سے رہائی نہیں پا سکا۔ اس کشمکش سے نکلنے کے لئے شاعر بعض عصری رجحانات کا سہارا لیتا ہے۔ جو اسے اپنے ماحول سے قریب لاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ قرب بھی اسے ایک وحدت میں تبدیل نہیں کرتا۔ میراجی کے دور میں آنچل کی سرسراہٹ، ہوا کی کسمساہٹ اور بادل اور سایوں کے متعلقات، شعری تحریک کے خام مواد تھے۔ ہمارے زمانے میں شہر، گاؤں، دروازہ، روزن، تاریکی، سورج، سایہ اور سفر کے الفاظ شعری پیچ کا کام دے رہے ہیں۔ امجد اسلام امجد، فیض اور قاسمی کے اثر سے نکلنے کے لئے ان کا سہارا بھی اختیار کرتا ہے۔ اور انہیں علامتی حیثیت دے کر اپنے انفرادی جذباتی رویوں کا پتہ لگاتا ہے۔ 'برزخ' کے مقابلے میں 'ساتواں در' میں امجد انفرادی رنگ کو اجاگر کرنے میں زیادہ کامیاب ہے۔ اس لئے کہ مذکورہ الفاظ اس کے لئے محض فرار کا راستہ نہیں رہے بلکہ علامتی روپ میں اس کے ذاتی احساسات کو بیرونی سطح پر مشخص کرنے کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ امجد اسلام امجد کی محبوب تراکیب اس کے جذباتی رویوں کی وضاحت کا لسانی پیکر ہیں۔ شہر، دروازہ،

---

[1] امجد اسلام کا مجموعۂ کلام

سورج، سایہ، تاریکی، موج، سمندر، ہوا، سفر، خوشبو، آنسو، آجالے، خواب، ویرانی اور آئینہ الفاظ کے وہ رنگ ہیں۔ جن سے امجد کے جذباتی رویوں کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے اور انہیں کے حوالے سے اس کا انفرادی رجحان نمودار ہونے لگا ہے۔ وہ ان محدود الفاظ کی مدد سے بعض نئی امیجز وضع کرتا ہے۔ یہ امیجز اس کی ذات کے نا تمام حصوں کی تکمیل کرتی ہیں۔ داخلی ضرورتوں کو یہ الفاظ خارجی طور پر ہی معین نہیں کرتے بلکہ مادی زندگی کے بعض واضح حصوں سے بھی منسلک ہیں۔ زمین، مٹی اور رزق کے الفاظ شاعر کو اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کا باعث بھی ہیں۔ خارج سے ناطہ جوڑنے کی یہ کڑی کوشش اسے بار بار الفاظ کے مجازی استعمال کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ رزق کا لفظ امجد کیلئے ناگزیر ضرورت ہے اور اسے رسمی اور رواجی شاعری سے الگ کرتی ہے۔ افق کا رزق، رزقِ غبار، خاک کا رزق زمین کا رزق، آنسوؤں کا رزق، کائنات کو نگل جانے والے سمبل کے طور پر امجد کے جبلی رجحان کے مظہر ہیں۔

اپنی اپنی شام میں جو اس دشتِ افق کا رزق ہوئے پر
روشن ہیں، گہنائے نہیں

عمر اسی تضاد میں، رزقِ غبار ہو گئی
جسم تھا اور عذاب تھے، آنکھیں تھیں اور خواب تھے

رزق کے بعد دوسرا کلیدی لفظ "ہوا" ہے۔ ہوا امجد کے لئے ایک سے زیادہ علامتوں کی تخلیق کا باعث ہے۔ ہوا کی تیزی، ہوا کا لمس، ہوا کا رنگ، شاعر کیلئے نئی نئی کیفیتوں کا سبب ہے۔ اس کے ہاں ہوا کئی نئے تلازمات کو جنم دیتی ہے۔ ہوا اور تحریر کی مناسبت، ہوا اور سبز رنگ کی مناسبت، ہوا اور سمندر کا معنوی ربط شاعر کی استعاراتی دنیا کے لئے مہمیز ہے۔ آئینہ اور ہوا بھی ایک نئی دنیا بساتے ہیں۔ اور ان کا باہمی رشتہ امجد کی نفسیاتی زندگی سے قائم ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہوا کا لمس ہے پاؤں میں بیڑیوں کی طرح
شفق کی آنچ سے آنکھیں پگھل نہ جائیں کہیں

ہوا کا رنگ درختوں پہ حرف لکھتا ہے
سکوں کے حرف کہ جیسے سفر تمام ہوا

امجد کا خارجی تجربہ بظاہر تیز رو اشیا سے تشکیل پاتا ہے۔ اس کے ہاں ہوا کے روپ تین مختلف سمتوں سے زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک ہوا کی تحریری صورت دوسری اس کی تجسیمی حالت اور تیسری ہوا کی سفر والی متحرک شکل۔ یہ تینوں روپ اس کے ہاں تین جذباتی رویوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک میں شاعر متحرک زندگی سے خارج میں مفاہمت پیدا کرتا ہے۔ دوسری میں یا تو وہ سبز رنگ میں غوطہ زن ہو کر خاموش ہو جاتا ہے یا پھر خواب کی دنیا میں ڈوب جاتا ہے۔ تیسری صورت ایک اضطرابِ مسلسل کی حالت ہے جس کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں۔ دوسری صورت "ساتواں در" میں زیادہ سامنے آتی ہے۔ سبز رنگ سے دلچسپی کا نفسیاتی جواز تو معلوم نہیں لیکن اس سے جو نمونے وہ وضع کرتا ہے ان کی شکل کسی قدر پہچانی جا سکتی ہے۔

خشک زمینوں کے ہاتھوں پر سبز لکیریں کندہ کرتے
اور ان دیکھے سپنے بستے

عجب کشش تھی سمندر کی سبز آنکھوں میں
ہر ایک چشمہ اسی کی طرف رواں تھا

سبز رنگ امجد کے ہاں تخلیق اور نشو و نما کی علامت بھی ہے۔ اور اس کی جنسی زندگی سے ہم آہنگ بھی۔ ذاتی سطح پر اس کی تعبیر کچھ بھی ہو امجد نے خارجی مظاہر کے درمیان سبز رنگ کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس کی مدد سے بعض نئے نئے امیجز اختراع کئے ہیں۔ جذباتی طور پر امجد ہماری دنیا کا باشندہ نہیں ہے۔ وہ فیض کی طرح اپنے زمانے کے عذاب میں مبتلا ہونے کے باوجود طبعاً رومانی ہے۔ اس لئے اسے خواب کی دنیا حقائق کی دنیا سے زیادہ عزیز ہے۔ سائے اور خواب اس کی جذباتی زندگی کے اصل رجحانات ہیں۔ اس لئے اس کی شاعری میں خواب کا اثر، خواب کے متعلقات اور خواب سے جنم لینے والے اوہام زیادہ ہیں۔ عملی زندگی سے رہائی حاصل کرنے کی تمنا ان خوابوں کی تخلیق کا اہم جزو ہے۔ امجد اسلام عملی زندگی کی جد و جہد میں شریک ہوتے ہوئے خوابوں کی دنیا کا باسی ہے۔ خارجی زندگی اس کی ذات کا جعلی پرتو ہے اور اس کی شاعری میں زیادہ جگہ پانے کے باوجود اہم نہیں۔ کیونکہ اس کے کلام میں مادی زندگی حقائق کی بازیافت کا عمل نہیں بنتی اور اگر کہیں بنتی ہے تو وہی بے ترالیت جس سے اس کی زندگی کا کوئی رشتہ نہیں۔ خلا سفر بننے کی کوشش ناکام بار بار اسے خوابوں کی قلمرو میں واپس لے جاتی ہے۔ اور صرف مادی زندگی سے اخذ شدہ اشیاء کے حوالے قائم رہ جاتے ہیں۔ گویا حقائق خوابوں کے مخملیں لبادوں کے صرف حاشیے بن جاتے ہیں۔ اس کا یہ ذہنی سفر دراصل خارج سے داخل کی طرف واپسی کا عمل ہے اور یہی امجد اسلام کا المیہ ہے۔ جس کے مادی کنارے پر قاسمی اور جذباتی کنارے پر فیض احمد فیض دھرنا مار کر بیٹھے ہوتے ہیں۔

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی
(فیض)

لیکن وہ منزل بہت دور بھی نہیں جہاں امجد اسلام امجد کے اصل حقائق ہیں۔ اور یہیں سے اس کی ذات کے اندر داخل ہونے کا راستہ جاتا ہے۔ وہ جدائی، تنہائی غم، کائنات کی شکست و ریخت، حیات کی بے معنویت اور اقدار کی بے قدری کا نوحہ خواں ہے:

رواں دواں ہے سفر پیش و پس نہیں معلوم
قفس میں رہتے ہیں، حدِ قفس نہیں معلوم

بگولے رقص کو اٹھے ہوا نے تالی دی
سکون مل نہ سکا بستیوں سے جا کر بھی

اس نمائش گہہ ہستی کے سفر سے ہم تم
دوریاں پہنے ہوئے یونہی گزر جائیں گے

ذرۂ خاک ہیں چپ چاپ بکھر جائیں گے
ہم کہ اس خاک سے تخلیق ہوئے

امجد اسلام کی یہ روحانی دنیا خوابوں کے ہیولے بناتی ہے، جس میں سفر اور خواب سب نمایاں ہیں۔ ان خوابوں کی بُنت ذاتی اور شخصی ہے۔ ان کا سرچشمہ دکھ اور کسک کی وہ حالت ہے۔ جو معاشرے سے زیادہ فرد کی ذات اور اس کے طرزِ احساس کی رہینِ منت ہے۔ معاشرے کے مبصر کی حیثیت سے قاسمی امجد کا ہنر ہے لیکن مزاجاً وہ عوام دوست یا عوامی نہیں اس کے ہاں تو زمانے کا غم بھی عشق و محبت کا شخصی اظہار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کا سفر تو خارج سے داخل، ظاہر سے باطن کی طرف ہے۔ ضیا جالندھری نے اسے "پھول رُت" کا شاعر کہا ہے۔ یہ بات ان معنوں میں درست ہے کہ چھوٹے چھوٹے جذبوں، ننھے منے خیالوں اور احساساتی سطح پر نمودار ہونے والی برق رفتار کیفیتوں کو بیان کرنے میں امجد کو کمال حاصل ہے۔ "فرض کرو"، "رات کی سانسیں ٹوٹ رہی ہیں"، "چور دروازہ"، "میرے گھر میں روشن دکھنا یہ معصوم ہنسی"، "نئے سال کی پہلی نظم"، "زمستاں مرے جسم میں موجزن ہے" اور "سالگرہ"...... وہ نظمیں ہیں جو امجد اسلام کے اصل روپ کو ہم پر واضح کرتی ہیں سیمابی کیفیتوں کے بیان میں جو ذخیرۂ الفاظ کام آتا ہے اس کا وافر حصہ امجد کے پاس پہلے سے موجود ہے اور اس میں مزید وسعت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ان نظموں کے تلازمات جن لفظوں اور ترکیبوں کے مرہونِ احسان ہیں ان میں سفر، سایہ، تارے، چاند، تاریک خلا، سبز لکیریں، موجیں اور سمندر، اڑتے پرندے، تتلیاں، سورج اور کائنات کے نباتی اور جماداتی مظاہر اہم ہیں۔ ان مادی مظاہر کے پس منظر میں روحانی ردیہ ہے۔ جو اسے احساسِ تنہائی کا شکار کرتا رہتا ہے۔ یہی اس کی اصل دنیا ہے۔ خوابوں اور خواہشوں کی دنیا۔ شعوری طور پر وہ لاکھ چاہے کہ عوامی شاعر کہلا سکے۔

(میں ایسے لفظ لکھوں گا جو سب کے دل میں ہیں
فقط وہ بات کروں گا جو سب سمجھتے ہوں)

لیکن اس کی ذات کا اصلی اور پائیدار رنگ نعرے باز کا نہیں محوِ خواب فن کار کا ہے اور اس کی شناخت ان لسانی تشکیلات سے ہوتی ہے جو امجد نے تخلیق کی ہیں اور جو اس کے کلام کا حاصل بھی ہیں۔

نظیر صدیقی

اور اگر وہ اس کے بعد مجھ سے پوچھیں
کہ تمہیں نیند کیسے آگئی؟
اُن سے کہنا کہ میں نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں
اُنہیں رونے نہ دینا

سید امجد علی

جمیل احمد ـــــ قدامت پسند مصوّر

یاد کرو تو آنکھیں جون ۶۰ء کی ایک گرم دوپہر کی جانب جا کر ٹھہر جاتی ہیں۔ ایک نئے مصوّر کے نام سے اخبارات کے صفحات آشنا ہوئے تھے۔ یہ مصوّر وہ نہیں تھا کہ جس نے ایک بڑے ہوٹل میں عمائدینِ شہر کے جلو میں اپنے فن کو پیش کیا تھا۔ بلکہ کراچی کی ان نشیبی بستیوں کا مکین تھا کہ جہاں دن کی روشنی بھی نصیب والوں کا حصہ ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس مصوّر کو اپنے شوق کی برآوری کے لئے برش، رنگ اور کینوس کے نذرانے پیش کئے کہ یہ دیوانۂ فن، اپنے گھر کے چولہے کے کوئلے کو بطور رنگ استعمال نہ کرے، پتیوں کو مسل کر ان کا رنگ، اپنی تصویروں میں منتقل نہ کرے اور پھولوں کو مسل کر ان کے رنگ سے اپنے بنائے ہوئے پھولوں کو نہ سجائے۔

اخبارات کے حوالے سے تنگدستی "فنکار، سرمایہ دارانہ معاشرے میں، بڑی اچھالی جاتی ہے۔ جمیل صاحب کو بھی ان روز مرہ کی شہ سرخیوں سے بڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا کہ ان پیوندکاریوں کا ذکر تو اخبارات خوب کرتے کہ جو جمیل کے لباس پر نظر آتے مگر ان جواہر کو فراموش کر جاتے کہ جو ان کی تصویروں میں منتقل ہو کر، احساس کو دوام بخش رہے تھے۔

جمیل احمد نے اپنا استاد، فطرت کو مقرر کیا۔ فطرت کہ جو ہر روز صبح میں تحلیل ہو کر رات میں جاگزیں ہوتی ہے۔ مگر ہر صبح نئی اور ہر رات سحرکاریوں کی نئی ریکھائیں لئے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جمیل نے تو بہتے پانیوں کی لہروں کو اپنی لکیروں میں پابند کرنے کی سعی کی۔ ان کی نظر میں تالاب میں بہتے پانی کی لہریں وسط کی بجائے تالاب کے لنگر پہ زیادہ متحرک ہوتی ہیں۔ اسی لئے تالاب کے وسط میں چیزوں کا عکس زیادہ نمایاں اور لہروں کے تموج کی دستبرد سے محفوظ نظر آتا ہے۔ جمیل احمد نے پانی کے کنارے اُگے درختوں اور پودوں کی شاخوں کو پانی کی جانب جھکتے دیکھ کر ہی ان کی یکتائی اور دوبالا ہونے کے ہنر کو تصویروں میں منعکس کیا۔

ایک مصوّر عموماً کم گو ہوتا ہے۔ شاکر علی کے پاس گھنٹوں بیٹھو تو پھر ایک دو فقروں کی سوغات مل جاتی تھی۔ جمیل احمد شاکر کے بالکل متضاد، فطرت کے مطالعے کے بارے میں گھنٹوں اور اَن تھک بول سکتے ہیں۔ جمیل کی تصویر "ایک پنجابی گاؤں" ایک قطار میں تین کچے گھر۔ ان کے سامنے ایک لمبا مستطیل نما تالاب جس کے آخری بائیں کنارے پہ کچھ جھاڑیاں اور کچھ درخت یہ تصویر نیلے، گہرے اور سبز رنگوں کے امتزاج کے اس دھیمے پن کی قوس قزح ہے کہ جو جمیل کا مزاج ہے اسی تصویر میں، جمیل کی دیگر تصاویر کی طرح وہ سادگی ہے کہ عمومی مصوری کے زاویوں میں نہیں ملتی۔ جمیل کے یہاں نہ رنگوں کے تضاد سے آنکھ کو خیرہ کیا جاتا ہے، نہ جذباتی اور ڈرامائی انداز میں منعکس رنگوں سے تضاد کو ابھارا جاتا ہے۔ بلکہ سادہ اور پُرکار انداز میں براہِ راست مدعا کو ناظرین تک پہنچانے میں کمال، جمیل احمد کو حاصل ہے۔

ان تصاویر میں مکانات کی مصوری، نوکِ برش سے مٹی کے رنگ اور آہنگ کو واضح کرنے اور سطح پہ ساخت کے کھردرے پن کو نمایاں کرنے کا عمل، جمیل احمد کے اندازِ مصوری کی خصوصیت ہے، مذکورہ تصویر میں مکانات کے نیلے اور گہرے رنگ کے ہلکورے، بائیں جانب تالاب کے کنارے جھاڑی کہ جس کی ڈالیاں جھک کر پانی سے وصال چاہتی ہیں اور ہلکے نیلے رنگ میں کھل رہی ہیں۔ یہ سارے منظر، بالکل ایسے ہیں کہ جیسے ایک مصروف اور پُرشور کانفرنس ہال میں ایک خاموش گوشہ کہ جس کو ہنگامہ خیز ویران سمجھ کر فراموش کر دیتے ہیں۔ مگر خاموشی سے مطلب نکالنے والوں کے لئے اِسی گوشے میں معرفت کے لمحات بھی ہوتے ہیں۔

آیئے جمیل احمد کی دو اور تصاویر کا تعارف آپ سے کراتا چلوں، جنگل میں صبح کا منظر، موضوع قدیم ہے۔ مگر اسلوب جدید اور منفرد، غروبِ آفتاب کے پس منظر میں منظر کیا ہے؟ گہرے نیلے اور گہرے رنگ کے

لینڈ سکیپ

مصور زمیل احمد
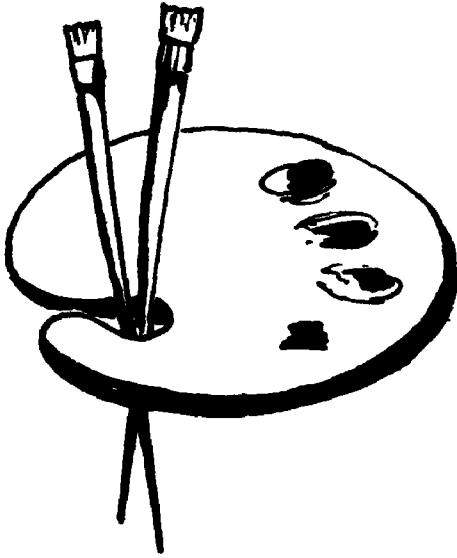
لینڈ سکیپ ؁

سرسوں کا کھیت ۔ ایک منظر

پنجاب کے دیہات کا ایک منظر
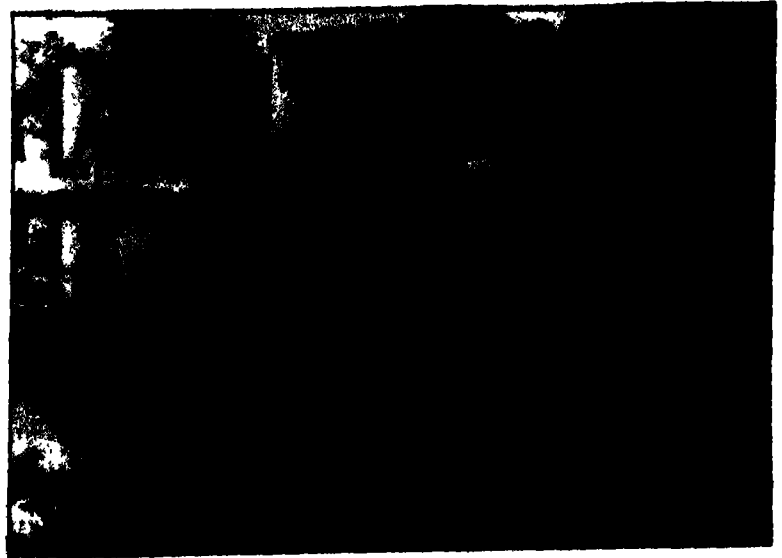
درختوں کے تنوں کو سرخی مائل زردی دیتی ہوئی شفیق
سورج کی کرنیں۔ جبکہ صبح کے پس منظر میں ابھرتے
سورج نے گہرے سبز درختوں کے تنوں کو ہلکے سرخ
رنگ میں سفیدی کی آمیزش کرکے، صبح میں شبنم کی
تازگی اور تابندگی دونوں کو مجسم کر دیا ہے۔

جمیل احمد کی بنائی ہوئی ایک اور لینڈ سکیپ ،
برساتی کھیت، کپاس پھول ہوا میں جھوم کر سمندر
کا سماں پیدا کرتے۔ پودوں کے سروں پر کھلے پھول
حدِ نظر تک گمراں کے ایستادہ ہونے کا انداز، ان کے
موجود بدن اور ان کے اپنے اپنے انفرادی وجود کا اعلان
وحدت الوجود کے اس فلسفے کا عکس بھی کہ معرفت کی
منزلوں میں اس اندازِ فکر نے من تو شدم، تو من شدی
کا نعرۂ مستانہ، قوتِ تسخیرِ فطرت کا کلیہ بنایا تھا۔

ان تمام مذکورہ تصاویر میں، رنگوں کے اشتباہ
میں، صرف ظاہری طلسم آرائی نہیں۔ بلکہ منظر کے وجود
کے ہر ہر ذرے کی تشکیل کہ ایک منظر مکمل بھی ان تمام
ذرّوں کی یکتائی سے ہوتا ہے۔

جمیل صاحب کو فطرت کی سحر کاری مشرقی حصے یعنی
بنگال کی جانب لے گئی۔ وہ سندر بن کے جنگلوں میں
اپنی طلب کی پیاس بجھاتے اور آنکھوں کو تصویرِ حیرت
بنائے، پاپیادہ گھومتے رہے۔ وہ ہلال نما بنگالی
کشتیوں کی ساخت سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں
نے تصویروں میں دریا کنارے قطار در قطار کشتیوں
کو ہلال کے اسلوب میں منقش بھی کیا ہے۔

بنگال کے قیام کے دوران بنائی گئی ان کی ایک
تصویر مجھے بہت یاد آتی ہے۔ بہت سے جھونپڑیوں
کی تصویر کہ جو اونچائی پہ کھڑے ہو کر نیچے کھائی کی سمت
دکھائی دیتی ہے۔ مخروطی شکل کی یہ نقاشی، دو طویل تر
زاویئے اور لکیریں ظاہر کرتی ہے۔ کعب شکل کی
تصویر کشی کا یہ انداز، جمیل احمد کی تصویر کشی کا ایک پہلو
بھی قرار پاتا ہے۔

بنگال کے موضوع پر بنائی گئی تصویروں کے سلسلے
کے علاوہ ملک اور سلسلہ ہائے تصاویر کو جو جمیل احمد کے
اندازِ فن کا ایک اہم موڑ بھی ہے۔ وہ ہے ایک یا دو
چہروں کی تصویر کشی۔ دو مرد یا دو عورتیں، سفیدی آمیز
نیلے یا سبز رنگ میں جس میں ابھرتا ہوا پیلا رنگ نمایاں
یہ سب چہرے واضح نقوش کے حامل ہیں کہ جن کی ستواں
ناک، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی بادامی آنکھیں کہ جن میں
سرمے کی دھار بہت واضح ہے۔ کبھی کبھی تو یہ آنکھیں
مغل مصوری کے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ان تصویروں
میں ہاتھ بہت نمایاں ہیں۔ اکثر تصویروں میں ہاتھ
چہرے کے قریب ہیں۔ انگلیاں، پھول کی پتیوں کی
طرح کشادہ ہیں۔ یہ تصویریں، جمیل احمد کے زاویۂ حسن و
محبت کی علمبردار ہیں۔ یہ سب چہرے ہماری اپنی
سرزمین کے خدوخال ہیں۔ یہ سب چہرے پاکستانی
ہیں۔ مگر پھر بھی ان چہروں میں اس قوت اور بھرپور
جذبے کی عکاسی ہمہ جہت انداز میں ظاہر ہوتی نظر
نہیں آتی کہ جو جمیل احمد کے اندازِ فکر کی نمایاں خوبی
ہے۔ سبب یہ ہے کہ چہرگی کا طریقِ مصوری،
قدیم طرزِ مصوری میں فکر کو کم ہی غالب آنے دیتا
تھا۔ مروجہ سے بغاوت اور قدیم کو جدید بناتے
ہوئے جمیل کو ان آزمائشوں سے تو گزرنا ہی پڑتا
مگر ایک تصویر کہ جس میں دف بجاتی ہوئی لڑکی
دکھائی گئی ہے۔ چہرے کی بے چہرگی کی جگہ، عکس
میں وجود سمٹ آیا ہے۔ مصور نے یہاں تو بادامی
آنکھیں بنائی ہیں نہ ستواں ناک، نہ کشادہ ماتھا
بلکہ تین چوتھائی چہرہ کہ جو دف میں چھپا اور سمٹا
ہوا ہے، یہ چہرے پر کسی قسم کا لائن ورک نہیں ہے
بس دف کی بیک گراؤنڈ میں یہ اکیلا چہرہ، بہت
سے زاویوں اور جذبات کو نمایاں کر رہا ہے۔

جمیل نے ہر اس لہر کو مقید کرنے کی کوشش
کی ہے کہ جو اس کے آنکھوں کے ٹرانسمیٹر سے ہو کر
اس کے ذہن میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔
بے آب و گیاہ زمین میں فولاد کا ایک لمبا ستون،
ٹھٹھہ میں مکانوں کے اوپر ہوائی روشندانوں کا
سلسلہ، کیماڑی میں لنگر انداز جہازوں کی قطار اور بیوہ
کے چہرے کے تاثرات کہ جو اپنے شہید شوہر
کا تعزیہ لے رہی ہے۔

یوں تو جمیل احمد ایک سادہ فنکار نظر آتا ہے
موجود کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے، اپنے ذہنی
تاثر کو قلم اور برش کی مدد سے قرطاس پر منتقل کرتا
ہے۔ مگر لکیروں میں چھپی لہریں، اس کے شعور کی
پناہوں کی وارفتگی کو ظاہر کرتی ہیں۔

غریب ملکوں میں فنکاروں کا مسئلہ بہت گمبھیر
ہوتا ہے۔ فن کے ذریعہ روٹی کمانے کا مسئلہ،
ناممکن اور ناقابلِ حصول، نتیجہ بدحالی اور غربت۔
جمیل احمد نے بھی غربت کی کھڑاؤں پہن کر فن کے
صحرا میں سفر جاری رکھا ہے۔ تصویریں بنا بنا
کر پلنگوں کے نیچے، کونوں کھدروں اور دیواروں
کے سہارے ڈھیر لگا کر، خود ہی اپنی فنکاری
کے سمندر میں غوطہ زن رہتا ہے ایک تصویر

فروخت ہوتی ہے تو وہ سارے سرمائے
سے فوراً نئی تصویروں کے لئے آب و دانہ،
رنگ کینوس اور برش خرید کر لے آتا ہے۔
روٹی کا مسئلہ پھر اسی طرح عفریت بن کر چھایا
رہتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جمیل کے
پاس رنگ نہیں ہوتے کینوس نہیں ہوتا تو
وہ آتشِ شوق سرد کرنے کو اپنی بنائی ہوئی گذشتہ
تصویروں کو پھر پینٹ کرتا ہے، ان کے رنگوں
کو بدلتا ہے۔ ان میں نئے زاویے شامل
کرتا ہے۔ اس کی بہت تصویروں میں ایک نہیں
چار چار تصویروں کے نقوش شامل ہیں، جمیل نے
تنہائی پسند ہونے کے باوجود اب تک ۲۲ قومی
اور بین الاقوامی انفرادی نمائشیں منعقد کی ہیں۔
چٹاگانگ پورٹ ٹرسٹ بلڈنگ میں ایک
میورل بنائی ہے۔ جس کا سائز ۷۰×۴۵ ہے
اسی سائز کا میورل کراچی پورٹ ٹرسٹ بلڈنگ
میں بھی بنایا ہے۔ کراچی قومی عجائب گھر میں قدیم
ماقبلِ تاریخ کوئٹہ اور ملتان کی تصاویر بھی بنائی
ہیں —!
اور اب درویشی اور گمنامی کی رفاقت ختم
ہونے کو ہے کہ جمیل نے موجود کے وجود کو اکیلے
میں محسوس کر کے دیکھ لیا کہ تنہائیوں کا ہم جلیس
کوئی نہیں اور اس دنیا میں جو شے ہتھیلی پہ
رکھے چراغ کی طرح دکھائی جائے اس کی ہی آبرو
ہے —!

جمیل اپنے فن کے چراغ کو کٹیا کی دیواروں
سے نکال کر وسیع فطرت سے آشنا کر رہا ہے۔
ماہِ نو کے ٹائیٹل پہ اس کی تصویر اس وصال کا
پہلا قدم ہے۔

جمیل ملک

روان ہوں صورتِ دریا میں دو کناروں میں
کبھی فراق ترا ہے، کبھی وصال ترا

کھلا کر ایک سی ہوتی ہے دھڑکنوں کی زبان
مرے سوال سے ٹکرا گیا سوال ترا

غروبِ ماہ کے بعد آفتاب ابھرے گا
ترے عروج کا پیش رو زوال ترا

اشرف یوسفی

شمع خالد

شجاعت علی راہی

ماہِ نو

بے مزہ تر ہے نمک کافور سے
سل گیا وہ زخم دامن دار کیا

گھٹ رہا ہے دیدۂ انجم کا نور
بس یہی ہیں صبح کے آثار کیا

لی جو کاغذ کے سفینوں میں پناہ
عشق کا بھی لٹ گیا گھر بار کیا

نُعمان الحق حقی

ضمیر جعفری

جولائی ۱۹۷۹ء

صدر مجلسِ ادارت
سید امجد علی

چیف ایڈیٹر
کشور ناہید

ایڈیٹر :- علی محمد حسینی
جائنٹ ایڈیٹر:- قائم نقوی

ترتیب

مضامین

نظمیں

تراجم نظمیں

افسانے

غزلیں

سرورق ـــــــ ایس۔ مقصد

اگلے شمارے کی جھلک

انجم رومانی۔ انتظار حسین، جمیل هاشمی، فارغ بخاری۔ منوبھائی، رضا ہمدانی، غالب احمد۔ شہباز ملک، کرم حیدری، محسن احسان، سرشار صدیقی، ظفر ہمدانی، آغا سہیل، عذرا اصغر، خالد احمد، محمود کنور، علی اکبر عباس، مظفر عباس، ساجد امجد، اکبر حمیدی، نسیم سحر، اعتبار ساجد، عتیق جیلانی، زمانہ کنجاہی، ممتاز کنول، رخسانہ صولت، نیاز حسین لکھویرا، حسن رضوی،

جلد نمبر ۳۲ ـــــــ شمارہ نمبر ۷

رجسٹرڈ نمبر ایل ۸۱۱۸

طلبا کے لئے بحثیت ممبرشپ فیس ۲۰ روپے

قیمت : ۲ روپے

سالانہ چندہ معہ رجسٹری فیس ۳۰ روپے

مطبوعات پاکستان نے دین محمدی پریس بل روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہ نو ۳۲ اے حبیب اللہ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

احمد نبی خاں

پاکستان میں فنِ تعمیر کا ارتقا

پاکستان دنیا کے سیاسی نقشے پر چند سال اوپر ربع صدی پہلے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کی حیثیت سے ابھرا۔ قوموں کی تاریخ میں تیس بتیس سال کا عرصہ اتنا زیادہ عرصہ نہیں ہوتا جس میں ان کی سماجی اور ثقافتی روایات کی امتیازی حیثیت صحیح معنوں میں تشکیل پا سکے۔ لیکن بعض حالات میں بعض قومیں اور بعض ملک یہ روایات و امتیازات ثقافتی ورثے کے طور پر بھی حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان سیاسی اعتبار سے ایک جدید ملک ہی اس کا ثقافتی ورثہ نہ صرف بہت قدیم ہے بلکہ بہت اہم بھی۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قدیم پاکستان نے دنیا کے قدیم ترین ملکوں کے شانہ بشانہ اس سماجی، ثقافتی، مذہبی اور سیاسی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ جس سے وہ صدیوں سے گزرتے چلے آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خطۂ زمین نے جسے آج ہم پاکستان کہتے ہیں اپنی تاریخ کا آغاز اس وقت کیا جب حضرت انسان نے جہد للبقا کی کوشش شروع کی۔ آج سے تقریباً پانچ لاکھ سال پہلے اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لئے۔ پتھر کے اوزار بنانا سیکھے اور ان کی مدد سے جانوروں کا شکار کیا۔ اور پودوں کی جڑیں کھود کھود کر نکالیں کہ ان سے اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکے۔ انہیں پتھروں کی شکست و ریخت کے نتیجے میں آگ کی ایجاد ہوئی۔ انسانی جدوجہد کے یہ مراحل ہمارے ہاں ان علاقوں میں ظہور پذیر ہوئے جنہیں آج وادئ سوات اور پوٹھوار کا علاقہ کہا جاتا ہے یہ انسان یا تو پہاڑوں کے قدرتی یا کھودے ہوئے غاروں میں رہتے تھے یا پھر درختوں کی شاخوں پر بسیرا کرتے تھے۔

آثارِ قدیمہ کی تحقیق و تفتیش کے آغاز سے پہلے اس صدی کے آغاز تک برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ کا آغاز آریاؤں کی آمد سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آریاؤں کی ابتدائی مذہبی کتابوں نے جو تفصیل یہاں کے اصل باشندوں کی پیش کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ غیر تہذیب یافتہ، جاہل اور بدصورت لوگ تھے۔ جن کی نہ کوئی تہذیب تھی نہ کوئی تمدن۔ اور تہذیب و تمدن کا یہاں چراغ روشن کرنے والے یہ بیرونی حملہ آور ہی تھے۔ لیکن ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے ہڑپہ اور موہن جو داڑو جیسے شہروں کی دریافت اور کھدائی کر کے اس تصور کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ ماہرین کی یہ دریافت اتنی اہم اور معرکہ آرا تھی کہ اس نے برصغیر کو قدیم دنیا کی صف میں لا کھڑا کیا اور مصر اور میسوپوٹامیہ کی قدیم تہذیبوں کے ساتھ وادئ سندھ کی تہذیب کا بھی شمار ہوا۔ عام اندازے کے مطابق پانچ ہزار سال پرانے بتائے جاتے ہیں۔ یہ تہذیب موجودہ پاکستان کے تقریباً تین چوتھائی حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کے بے شمار مراکز دیہات قصبات اور چھوٹے بڑے شہروں کی صورت میں موجود تھے۔ مدت ہوئی یہ شہر انسانی آبادیوں سے خالی ہو گئے اور ان کی بے شمار عمارتیں رفتہ رفتہ منوں مٹی میں دفن ہو گئیں۔ ان کھنڈرات کو ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے سائنسی انداز سے کھود کر نکالا۔ ان عمارتوں کے باقی حصوں کو دیکھ کر جو موہنجوداڑو سے برآمد ہوئے ہیں، ماہرین نہ صرف حیران بلکہ رطب اللسان ہیں کہ اس قدر مکمل نظامِ تعمیرات اور اس قدر ترقی یافتہ شہری منصوبہ بندی اس دور میں کیسے ممکن تھی۔ مکانات کی باقاعدہ مرتب قطاریں، دو منزلہ، سہ منزلہ مکانات و محلات۔ حمام اور غسل خانے حوض اور کنویں، ضرورت کے مطابق سیدھی اور مرتب چوڑی سڑکیں اور کشادہ گلیاں اور ان پر مستزاد اینٹوں سے ڈھکی ہوئی نالیاں اس شہری نظام کی خصوصیات ہیں۔ اس باقاعدگی اور ترتیب کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس دور میں غالباً میونسپل کارپوریشن جیسا فعال اور خود مختار کوئی ادارہ ہوگا جو اس قسم کی مدنی روایات کو پابند رکھنے کا خیال رکھتا ہوگا۔ یہ طرزِ تعمیر مکمل طور پر

اینٹوں کا طرزِ تعمیر کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میدانی علاقوں میں مٹی پانی اور جنگلات کی کثرت نے اس قسم کے طرزِ تعمیر کو جنم دیا۔ وادیٔ سندھ کے معمار نے پکی ہوئی اینٹ کے سارے امکانات کو استعمال کیا ہے کہ اینٹ ہر قسم کی ضرورت پورا کرتی ہے۔ اور جس سائز اور جس شکل میں ضرورت ہو بنائی جا سکتی ہے۔ ان لاکھوں، کروڑوں اینٹوں کو مٹی کے گارے سے چُنا گیا ہے اور مہارت کا عالم یہ ہے کہ گہری بنیادوں سے لے کر عمارت کی پوری اونچائی تک جو بعض حالتوں میں تیس چالیس فٹ تک ہے، ترتیب میں کوئی فرق یا نقص نہیں آیا۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بڑے بڑے شہر فصیلوں کے اندر آباد تھے اور فصیل پکی اینٹوں سے اور بعض حالتوں میں کچی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ جن کے ساتھ باقاعدہ بڑے دروازے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں آج بھی مکانات کی بیس سے تیس فٹ اونچی دیواریں اپنی بلندی کی وسعت اور اپنے مکینوں کی خوش حالی اور ذوق شوق کی داستانیں سنا رہی ہیں۔

گندھارا طرزِ تعمیر

ماورائے تاریخ عہد کے یہ عظیم عمارتی کارنامے کوئی دو ہزار سال تک قدیم دنیا کو محوِ حیرت کرتے رہے۔ اندازہ ہے کہ ۱۵۰۰ ق م سے ۱۲۰۰ ق م کے درمیانی عرصے میں فنِ تعمیر کے یہ بے بہا نمونے قدرتی آفات اور انسانی بے دردی کا شکار ہو گئے کہ نہ صرف آہستہ آہستہ موسم کی تبدیلی واقع ہوئی، دریاؤں کے رُخ بھی تبدیل ہونے لگے۔ اس پر مستزاد بیرونی حملوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اکثر محققین نے اس تہذیب کو صفحۂ ہستی سے مٹانے اور یہاں کی خوشحالی کو موت کی خاموشی میں تبدیل کرنے کی ذمہ داری آریائی حملہ آوروں پر عائد کی ہے۔ لیکن ایک بڑی تعجب کی بات یہ ہے کہ ان حملہ آوروں نے موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے اس عظیم الشان طرزِ تعمیر سے کچھ نہ سیکھا۔ کم از کم ان کے باقیات سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آریاؤں کے تعمیرات کے جو نمونے آج منظرِ عام پر آئے ہیں۔ وہ بس یوں ہی سے ہیں۔ اور بس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے آغاز میں سرزمینِ پاکستان پر بدھ مذہب کی عملداری کے آثار ملتے ہیں۔ بدھ مذہب کے ماننے والے اپنی روایاتی امن پسندی اور مذہبی اقدار کے التزام کے لئے مشہور ہیں۔ انہوں نے شہر بسائے تو اُن میں مخصوص عبادت گاہیں بھی تعمیر کیں۔ چنانچہ ٹیکسلا، سوات، چارسدہ، تخت باہی، وغیرہ کے کھنڈرات اس بات کی پوری نشاندہی کرتے ہیں۔ سکندرِ اعظم اور بعد کے آنے والے حملہ آور یونانی اور رومی طرزِ معاشرت کے بہت سے پہلوؤں کو اس سرزمین میں متعارف کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ بات پھر خرابات کی آتی ہے کہ یہ سارے شہر اور سارے مذہبی مقامات اپنی سخت جانی اور پامردی کے باوجود فطرت کے تقاضوں اور انسانی مظالم کی نذر ہو گئے۔

ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی مساعی سے سرزمینِ پاکستان کے بہت سے حصوں میں بدھ مذہب اور بدھ تہذیب کے آثار زیرِ زمین سے بالائے زمین لائے گئے ہیں۔ ان میں ٹیکسلا اور سوات سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ٹیکسلا پے بعد دیگرے تین دفعہ بسایا گیا۔ ایک شہر وہ ہے جو تقریباً پانچ سو قبل مسیح میں بسایا گیا تھا۔ یہ شہر قدیم ہندوستان کی مقامی روایات کے سارے عوامل کی عکاسی کرتا ہے۔ جہاں کی گلیاں تنگ و تاریک اور مکانات کی ساخت معمولی اور بے ترتیب ہے۔ مقامی پہاڑوں سے حاصل کئے گئے پتھروں کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں سے مٹی کے گارے سے یہ مکانات بنائے گئے ہیں۔ ان میں نہ وہ شان و شوکت ہے اور نہ وہ ترتیب جو ہمیں ایک ہزار سال پہلے کی عمارات میں موہنجوداڑو میں ملتی ہے۔ ٹیکسلا کا یہ قدیم شہر آج بھڑ ماؤنڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

باختری یونانیوں کا عہدِ حکمرانی اس خطۂ زمین پر پہلی صدی قبل مسیح اور پہلی صدی عیسوی کی بات ہے ٹیکسلا پہلے اس خاندان کی یورشوں کی آماجگاہ رہا۔ لیکن بعد میں اسے اپنا صدر مقام بنا لیا۔ بھڑ ماؤنڈ پہ قدیم شہر نئے فاتحین کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جو تمرا نالے کی دوسری جانب سرکپ کے مقام پر باقاعدہ فصیل کے اندر بنایا گیا تھا۔ سرکپ تمدنی زندگی کے بھرپور آثار کی عکاسی کرتا ہے۔ جہاں شہر کی منصوبہ بندی اور عمارات کی ساخت یونان و روم کے طرزِ تعمیر سے بڑی مماثلت رکھتی ہے۔ سیدھی سیدھی سڑکیں اور گلیاں متوازی اور ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرتی ہیں۔ سڑکوں اور گلیوں کے اس جال نے پورے شہر کو باقاعدہ مختلف حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جن میں تجارتی مرکز، بازار، دکانیں رہائشی مکانات، عبادت گاہیں، محلات، اور انتظامی امور سے متعلق عمارات ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں رہائشی عمارات سے زیادہ توجہ، محنت اور پیسہ مذہبی عمارات پر صرف کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ٹیکسلا میں بنے ہوئے اسٹوپہ اور خانقاہیں بدھ مذہب کے طرزِ تعمیر کی بہترین

نمائندگی کرتی ہیں۔ بدھ مذہب میں مُردوں کی راکھ کو دفن کر کے اس پر اسٹوپہ بنانے کا رواج تھا۔ جس کا آغاز مہاتما بدھ کی باقیات سے ہوتا ہے۔ ابتدا تو ظاہر ہے کہ سادہ اور معمولی تھی۔ لیکن جب بدھ مذہب کو شاہانہ سرپرستی حاصل ہوئی تو اس میں بہت سی باریکیاں آموجود ہوئیں اور ان کو فنِ تعمیر کا باقاعدہ ایک طرز بنایا گیا۔ جسے ہم گندھارا طرزِ تعمیر کہتے ہیں۔ جہاں اگر ایک طرف اسٹوپہ کی تعمیر اور تزئین و آرائش کے باقاعدہ اصول و ضوابط مرتب کئے گئے تو دوسری طرف خانقاہوں کو محلات کی شکل دی گئی۔ جن میں مذہبی زندگی کو خوش اسلوبی اور فراغت سے بسر کرنے کے سارے سامان موجود تھے۔ بدھ خانقاہوں میں بدھ عالم اور ان کے ساتھ بدھ مذہب کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے قیام کرتے تھے یا بدھ مذہب کے عقیدت مند یاترا کے لئے آیا کرتے تھے۔

یہ خانقاہیں بڑے اہتمام سے سرسبز و شاداب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنائی جاتی تھیں۔ جن میں رہائشی حجرے، غسل خانے، باورچی خانے، طعام خانے، حوض اور طہارت خانے بنائے جاتے تھے۔ مذہبی تعلیم و تربیت کے لئے بڑے بڑے ہال اور کمرے مخصوص ہوتے تھے۔ محنوں اور مناسب جگہوں پر محرابی طاق ہوتے تھے۔ جن میں مہاتما بدھ کی مورتیاں رکھی جاتی تھیں۔ یہ عمارتیں پتھر کے تراشے ہوئے بلاکوں سے بنائی جاتی تھیں۔ چنائی کا یہ تزئینی انداز گندھارا طرزِ تعمیر کا بڑا خوبصورت حصہ ہے اور اپنے اندر تدریجی ارتقا کی ایک داستان سموئے ہوئے ہے۔ ابتدا میں یہ طرز معمولی چھوٹے بڑے پتھروں کی بے ربط چنائی سے تعمیر تھا۔ جسے ماہرین نے "روبل" طرز کی بے ربط چنائی کہا ہے۔ لیکن بعد میں پتھر کے انہیں بلاکوں کو تراشش کر ان سے اس ترتیب اور عمدگی سے چنائی کی گئی کہ نئے ڈیزائن مرتب ہوئے ان نئے ڈیزائن کو "ایشلر نما" اور "ایشلر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان عمارتوں کی چھتیں لکڑی کی کڑیوں اور تختوں سے بنائی گئی تھیں۔ جو لکڑی ہی کے ستونوں پر ایستادہ تھیں۔

گندھارا معماروں نے اسٹوپہ کی تعمیر و تزئین پر خانقاہوں سے زیادہ توجہ صرف کی اور اس صنفِ معماری کے عروج و ارتقا کے مختلف مراحل کی تکمیل کیلئے یونانی اور رومی اسالیب سے بھی استفادہ کیا۔ اسٹوپہ کی عمارت کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ان سب حصوں میں پلیٹ فارم اور "ڈرم" اور قبہ بہت اہم تھے۔ قُبہ پر سات چھتریاں آویزاں تھیں جو سات آسمانوں سے تعبیر تھیں۔ پلیٹ فارم کے چاروں اطراف کو مختلف سائز کی مہاتما بدھ اور دوسرے بتوں کی مورتیوں سے بھی مزین کیا جاتا تھا۔ جسے آج گندھارا آرٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ بت پتھروں میں بھی بنے ہیں اور چونے اور مٹی میں بھی۔ جن کی ساخت پر بیرونی اثرات خاصے نمایاں ہیں۔ لیکن یہ اثرات جلد ہی مقامی اثرات و عوامل کے سامنے ماند پڑنے لگتے ہیں۔ اور آرٹ کے ان شاہپاروں میں مقامی حسن پوری طرح نمایاں ہونے لگتا ہے۔

اسلامی اسالیبِ تعمیر کا آغاز و ارتقاء

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس برصغیر میں مسلمان فاتحین کی آمد شروع ہوتی ہے۔ ۱۲-۷۱۱ عیسوی میں محمد بن قاسم نے دیبل سے لے کر ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اور یوں برصغیر میں اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑی۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی ضرورت ظاہر ہے کہ اہتمامِ صوم و صلوٰۃ تھی۔ اور اس کے لئے مساجد کا قیام ناگزیر۔ چنانچہ اس عہد اور بعد کے مسلمان مورخین اس بات کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں کہ محمد بن قاسم نے اپنے مفتوحہ شہروں میں سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کا اہتمام کیا۔ محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی کوئی مسجد اب موجود نہیں۔ لیکن جو آثار ہمیں بھنبور یعنی دیبل اور منصورہ میں مسجدوں کے ملے ہیں، ان سے اس دور کے طرزِ تعمیر پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ دونوں مسجدیں برصغیر ہند و پاکستان میں تعمیر شدہ اولیں مسجدوں میں سے ہیں۔ بھنبور کی مسجد ۱۰۹ ہجری یا ۷۲۷ء میں یعنی محمد بن قاسم کی فتوحات کے پندرہ سولہ برس بعد بنی۔ اس چھوٹی سی مسجد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محراب نہیں بنی تھی۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور اہم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد میں باقاعدہ محراب کی شکل بعد میں متعارف ہوئی۔ یہ مسجد پتھر سے بنائی گئی تھی۔ لیکن چھت لکڑی کی تھی اور لکڑی ہی کے ستونوں پر ایستادہ تھی۔ جبکہ فرش چوکور اینٹوں کا تھا۔ بعد کی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ عرب گورنر محمد بن ہارون کے عہد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔

منصورہ کی مسجد دیبل کی مسجد سے زیادہ وسیع و عریض تھی۔ اور اس کو زیادہ اہتمام سے بنایا گیا تھا۔ یہ مسجد گو اینٹوں سے بنی تھی ـــــ لیکن حسبِ دستور چھت اور ستون لکڑی کے تھے اور آثار میں لکڑی کا منقش کام تھا۔ منصورہ کی مسجد سے اب تک کے

دریافت شدہ کتبوں میں سے کوئی بھی تاریخی کتبہ نہیں لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ اس مسجد کے خرابات میں محراب کے آثار موجود ہیں۔ مؤرخین فنِ تعمیر کے بیانات کے مطابق چونکہ محراب کا آغاز اموی خلیفہ ولید اوّل کے عہدِ خلافت میں ہوا۔ خود منصورہ بلاذری کے مطابق ۷۲۵ء یا اس کے دو ایک سال بعد آباد ہوا تھا ہو سکتا ہے کہ عمرو بن القاسم نے شہر کے ساتھ مسجد بھی تعمیر کی ہوگی لیکن تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی مرمت و توسیع کا کام ۷۵۲ء میں موسیٰ بن کعب تیمی کے ہاتھوں انجام پایا۔ قیاس ہے کہ مسجد کے موجودہ کھنڈرات جو کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں اسی بعد کے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مسجد کے ساتھ اس زمانے کی روایات کے مطابق ماذنہ بھی منصورہ کی مسجد میں موجود تھا۔ کھدائی سے اس ماذنہ کے آثار بھی برآمد ہوئے ہیں۔

ان مساجد کے علاوہ عرب عہد کی چند اور عمارات کے نمونے بھی بھنبور اور منصورہ میں ملے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین بھنبور کی فصیل کے بعض حصے ہیں جن کا تعلق بنی اُمیہ اور بنی عباس کے عہدِ خلافت سے ہے بھنبور کا شہر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک وسیع و عریض قلعہ بند شہر جس کے چاروں طرف فصیل تھی، دوسرا میدانی شہر جہاں صنعت کار اور دوسرے طبقوں کے لوگ آباد تھے۔ آج بھی یہ فصیل ۱۹ فٹ تک کی بلندی پر موجود ہے۔ جس کے ساتھ مختلف فاصلوں پر بُرجیں بنائے گئے ہیں۔ بھنبور کے سارے شہر کی تعمیر میں پتھر کا استعمال ہوا ہے۔ شہر کے اندر مختلف قطعات میں رہائشی مکانات، محلات، بازار، مسجد اور دوسری عمارات ہیں۔ ایک مندر بھی ملا ہے۔ جو مسجد کے قریب ہی کسی دور میں بنایا گیا تھا۔ کھاری ندی کے کنارے کے ساتھ سیڑھیاں اور ایک پلیٹ فارم سمندری پانی تک بنائے گئے ہیں یہ مقام بندرگاہ کا وہ حصہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں جہاز اور کشتیاں لنگر انداز ہوتے تھے۔

منصورہ کا شہر خالصتاً اینٹوں کا شہر تھا اور بھنبور کی طرح قلعہ بند۔ جہاں بڑے بڑے بازار اور محلات تھے۔ دلچسپ ترین امر یہ ہے کہ مسجد کے آثار میں سے نسخ میں لکھے ہوئے قرآن پاک کے وہ نسخے بھی ملے جو آگ میں جلے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ منصورہ کی مسجد اتفاقاً آگ لگنے سے شہید ہوئی۔ اور مسجد میں تلاوت کے لئے یہ قرآن کے نسخے بھی اس آگ کی نذر ہو گئے۔ منصورہ اپنے زمانہ میں عرب دنیا کا اہم شہر تھا کہ اس عہد کے تقریباً تمام مؤرخین اور جغرافیہ نویس اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اس شہر کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی بعض سڑکیں دو سو فٹ تک چوڑی تھیں اور شہر میں آمد و رفت کے لئے فصیل میں آٹھ سے زیادہ دروازے تھے۔

وسطی ایشیائی طرزِ تعمیر کے اثرات

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد، فتوحات اور قیام یہاں کے معاشرے میں ایک زبردست مذہبی، معاشرتی اور سماجی تبدیلیوں کے محرک ہوئے نہ صرف یہ کہ مقامی لوگ کثرت سے مشرف بہ اسلام ہوئے بلکہ عرب مسلمانوں کی بستیاں اپنے ساتھ وہ جزئیات خصوصیات بھی لائیں جو یہاں کے پہلے رہنے والوں کے لئے نئی اور انوکھی تھیں۔ رفتہ رفتہ اسلام کے زیرِ اثر جو معاشرہ وجود میں آیا خاص طور پر ان علاقوں میں جو اب پاکستان کا حصہ ہیں، وہ اگر خالصتاً عربی یا وسطی ایشیائی نہیں تھا تو مقامی معاشرے سے ممیز ضرور تھا۔ چنانچہ اس خطے کا معاشرہ اپنی ترقی و بہبود کیلئے آریائی تہذیب سے متاثر ہونے کی بجائے اسلامی مرکزوں سے مستفیض و مستفید ہونے لگا اور ایک وقت وہ آیا کہ سرزمینِ حجاز کے علاوہ بغداد و سمرنا، سمرقند و بخارا اور دمشق و ترمذ کے علمی مراکز سے وابستگی کے بغیر مسلمانانِ برصغیر کے لئے تحصیلِ علم کی تکمیل ممکن تصور نہیں ہوتی تھی۔ پھر محمود غزنوی کے پے در پے سترہ حملوں نے اس افہام و تفہیم کو اور آگے بڑھا لیا۔ ایران، عرب اور وسطی ایشیا سے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت بھی روزانہ کا معمول بن گئی۔ ان مرکزوں کے تاجر تجارت کی خاطر ملتان، دیبال پور، اوچ اور لاہور آتے، اپنا مال فروخت کرتے اور یہاں کا مال لے کر واپس چلے جاتے۔ محمود غزنوی کے بعد شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات اور قطب الدین ایبک اور ناصر الدین قباچہ کی سلطنتیں ان روایات اور رشتوں کو مرتب اور استوار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ ناصر الدین قباچہ پورے بائیس برس ملتان اور اُوچ کے علاقوں میں علم و ادب کی سرپرستی کرتا رہا۔ اس کا دربار باہر سے آئے ہوئے بے شمار عالموں، ادیبوں، سیاسی شخصیتوں، معزول شہزادوں، اور فنکاروں کا ملجا و ماویٰ رہا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں منگولوں کی یورشیں اسلامی تہذیب و تمدن کی تباہی کا سبب بنیں تو برصغیر کی محفوظ و مامون فضا ان اجڑنے والوں کو پناہ دینے

گئی اور پھر صدیوں لاکھوں کی تعداد میں یہ تارکینِ وطن وسطی ایشیا اور ایران کے مختلف مرکزوں سے اُٹھ کر اوچ، دیپالپور، ملتان میں آبسے۔ اس دور میں عام طور سے درہ بولان ہندوستان میں داخلے کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ ان مقامات کو ایک قسم کی بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

پھر اس دور کے صوفیائے کرام بالخصوص سہروردیہ سلسلے کا وہ بزرگ خانوادہ جس کے سرخیل حضرت بہاؤ الدین ذکریاؒ ہیں۔ اس علاقے میں اسلام کی اشاعت کا موجب بنا۔ ان بزرگوں کی تعلیمات سے ایک منزہ معاشرہ وجود میں آیا۔ اسی معاشرے نے فنِ تعمیر کو ایک نیا اسلوب بھی دیا۔ جسے ملتان کا اسلوبِ تعمیر کہنا زیادہ مناسب ہوگا یہ اسلوب خالصتاً وسطی ایشیائی فنِ تعمیر سے مستعار اور متاثر تھا۔ اور اس کی ساری جزئیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ گو اس کے ابتدائی سوتے ہمیں بلوچستان کے شہر بیلا یا آج کے بہاولپور کے رحیم یار خان اور آدم واہان میں ملتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے کی مہتم بالشان ابتدا خود حضرت بہاؤ الحقؒ کے مزار سے ہوتی ہے۔ اور انتہا انہیں کے بزرگ پوتے حضرت رکن عالمؒ کے مزارِ ذیشان ہے۔ پاکستان کے اسلامی فنِ تعمیر کے اسلامی اسلوب میں بہاؤ الحق کے مزار کو وہی حیثیت حاصل ہے، جو وسطی ایشیا کی اسلوبِ تعمیر میں سامانیوں کے مقبرے کو حاصل ہے۔ اور مزار رکن عالمؒ کی حیثیت یہاں وہی ہے جو گورِ امیر اور تاج محل کو۔ یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ اس قسم کے مزارات کی تعمیر کی روایت برِصغیر میں اس عہد سے پہلے کہیں اور کبھی نہیں تھی۔ یہ مزارات ان بزرگ صوفیائے کرام نے اپنی زندگی میں اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر تعمیر کرائے تھے اور پختہ اینٹ سے بنے ہیں۔ ان کی تقسیم عام طور سے تین طبقوں میں ہے۔ ڈھلواں دیواریں، مہتم بالشان گنبد، لکڑی کے شہتیروں سے بنے ہوئے دیواروں کے قالب اور بیرونی اور اندرونی سطح پر مختلف سائز کی سادی یا روغنی رنگدار اینٹوں کی تزئین اس طرزِ تعمیر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ یہ تزئین و سجاوٹ بعض اوقات اقلیدسی شکلوں میں ہے۔ یا گل بوٹے ہیں۔ یا پھر قرآنی آیات، جو لکڑی پر کندہ بھی ہیں۔ مزار رکن عالمؒ اس طرز کا شاہکار ہے جہاں اس قسم کی تزئین کے نمونے اپنے انتہائے کمال پر ملتے ہیں۔

ملتان کے علاوہ اس فنِ تعمیر کے مراکز میں اُچھ، سہوان، دیپالپور، سیت پور، (مظفر گڑھ) شیر گڑھ دائرہ دین پناہ، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان جلال پور (جہلم) خاصے اہم ہیں کہ ان مقامات پر اس اسلوب کے بہت سے مزارات بنائے گئے۔ گویا پاکستان کے اور کچھ نہیں تو تین چوتھائی حصے پر اس طرزِ تعمیر کی حکمرانی تھی۔ حیران کن، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ رکن عالمؒ کے مزارِ ذیشان کا اسلوب اس قدر دیرپا اور ہمہ گیر ثابت ہوا کہ ماہ و سال کی تبدیلیاں اس کی مقبولیت کو کسی طرح بھی متاثر نہ کر سکیں حتیٰ کہ مغل دور کا طرزِ تعمیر بھی خاصے عرصے تک اپنی پوری باریکیوں اور رعنائیوں کے باوجود اس طرز پر حاوی نہ آسکا۔ اور مدتوں تک اس سرزمین پر ایسے مزارات بنتے رہے جو رکن عالم کے مزار سے متاثر ہی نہیں، اس کی سراسر نقل معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ ملتان ہی میں سلطان علی اکبر کا مقبرہ دائرہ دین پناہ میں حضرت عبدالوہابؒ کا مقبرہ جلالپور شریف میں پیر غلام حیدر شاہ کا مقبرہ اسی طرزِ تعمیر کی مقبولیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ موخر الذکر ۱۹۲۰ء کی تعمیر ہے۔ یعنی اب سے کوئی پچپن برس پہلے۔

سندھ کا اسلامی طرزِ تعمیر

سندھ باب الاسلام ہے اور سندھ ہی اسلامی تہذیب کا مرکزِ آغاز، بھنبور اور منصورہ کی عمارتوں کا ذکر ہو چکا۔ بعد کے عہد میں بھی سندھ میں واقع تہذیب و ثقافت کے مرکزوں نے اپنی دیرینہ روایت کو برقرار رکھا۔ اور ایک مخصوص و متمایز طرز کی ترویج یہاں ہوئی۔ ان مرکزوں میں اہم ترین ٹھٹھہ کا قدیم تاریخی شہر ہے۔ خاص طور پر اس کا وسیع ترین تاریخی قبرستان جسے مکلی کا قبرستان کہتے ہیں۔ یہاں مساجد و مقابر کی شکل میں اسلامی فنِ تعمیر کے بہت سے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ جن کا تعلق چودھویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک ہے۔ بیشتر مزارات مقامی حکمرانوں، امراء، شعراء وغیرہ کے ہیں۔ ان عمارات کو طرزِ تعمیر کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی خشتی عمارات اور سنگی عمارات، خشتی عمارات کی بنیادیں بھی اندازہ تک پتھر کی ہیں۔ یہ اینٹیں نہایت اہتمام اور عمدگی سے بنائی گئی ہیں۔ ان عمارات کی بیرونی اور اندرونی سطح کو روغنی ٹائلوں اور اینٹوں سے مزین کیا گیا ہے۔ خشتی عمارات میں دابگران مسجد (۱۵۸۸ء) شاہجہانی مسجد (۴۷-۱۶۴۴ء) مقبرہ جانی بیگ ترخان (۱۶۰۱ء) مقبرہ دیوان شرفا خان (۱۶۳۸ء) مقبرہ سلطان ابراہیم (۱۵۵۸ء) اس نوعیت کے بہترین نمونے ہیں۔ جانی بیگ سندھ کا آخری خود مختار حکمران تھا۔ اس کا مقبرہ خشتی مقابر میں خاصا اہم مقام

رکھتا ہے۔ خاص طور سے اس کا روغنی اینٹوں کا کام واقعی لاجواب ہے۔ اور سندھ کی صناعی کا عمدہ نمونہ ہے مقبرہ کو ایک چبوترے پہ بنایا گیا ہے۔ جسے زرد پتھر سے مزین کیا گیا ہے۔ مغربی جانب پتھر ہی کی بنائی ہوئی منقش محراب ہے۔ مقبرے کا پلان ہشت پہلو ہے بعض جگہوں پہ عربی کے کتبے بھی پتھر پر کندہ کر کے نصب کئے گئے ہیں۔ کچھ کتبے روغنی اینٹوں پہ بھی ہیں۔ اس کے علاوہ مکلی کے قبرستان کی بنی ہوئی عمارتوں میں شرفا خان کا مقبرہ (۱۶۳۸ء) سارے مقبروں میں سب سے زیادہ محفوظ رہا ہے۔ تعمیراتی اعتبار سے مربع شکل کی عمارت ہے۔ جس کو ایرانی طرز کے گنبد سے مزین کیا گیا ہے چاروں کونوں پر چار مینار ہیں۔ جن کے اندر سیڑھیاں بنائی ہیں۔ جو مقبرے کی چھت تک جاتی ہیں مقبرے کی دیواریں سرخ اینٹوں کی ہیں۔ اور اینٹوں کے درمیان مسالے کو روغنی اینٹوں سے لیس کیا گیا ہے جو مقبرے کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتا ہے۔ گنبد کے اندرونی سطح کو بھی روغنی اینٹوں سے سجایا گیا ہے۔ تیسرا قابل ذکر مقبرہ سلطان ابراہیم کا ہے۔ سلطان ابراہیم، عیسیٰ خان ترخان کا لڑکا تھا۔ اور ۱۵۵۸ء میں فوت ہوا۔ پلان اس مقبرے کا ہشت پہلو ہے۔ جس پہ مخروطی انداز کا گنبد بنایا گیا ہے۔ مقبرے کے آٹھوں پہلو محرابی طاقوں سے مزین ہیں۔ جنہیں سطح سے کچھ اندر کی طرف بنایا گیا ہے۔ شمالی اور جنوبی پہلوؤں میں دروازے ہیں۔ قرآنی آیات مناسب مقامات پر آویزاں ہیں۔

ٹھٹھہ کی سنگی عمارات اپنے نقش و نگار کی وجہ سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا ثانی اگر کہیں مل سکتا ہے تو صرف فتح پور سیکری کی عمارات ہی ہیں۔ جن کا عہد تعمیر اکبر کا زمانہ ہے۔ تکنیکی اعتبار سے یہ نقوش دو طرح کے ہیں۔ ایک طرز تو وہ ہے جسے فیلگری نمونہ کہا گیا ہے۔ جس میں نقوش خاصے ابھرے ہوتے ہیں اور ان کی زمین دبی ہوتی ہے۔ دوسری طرز اس کے برعکس ہے یعنی زمین ابھری ہوئی اور نقوش اس زمین میں جذب شدہ ان دونوں طرز کے بہترین نمونے ٹھٹھہ کی سنگی عمارات میں ملتے ہیں۔ یہ باقاعدہ مقابر میں بھی ہیں۔ اور علیحدہ علیحدہ قبروں کے تعویذ کی شکل میں بھی جن کو باقاعدہ چبوتروں پر بنایا گیا ہے۔ نقوش کی شکل بعض جگہ اقلیدسی ہے۔ اور بعض جگہ پھول پتیوں کی شکل میں۔ لیکن اکثر جگہ قرآنی آیات اور تاریخی تفصیلات بھی اسی تکنیک میں درج ہیں۔ یہ واقعی فن کی معراج ہیں۔ کہیں طغرا ہے اور کہیں نسخ و نستعلیق۔ جو نہ صرف فن کار کی فن کارانہ صلاحیتوں کی غماز ہیں بلکہ ان سرپرستوں اور قدر دانوں کی سرپرستی اور قدر دانی کی بھی عکاس ہیں۔ جنہوں نے ایسی بہترین مثال قائم کی۔ قبروں کے تعویذوں کے پتھروں کی سطح کو مختلف حصوں میں اس مقصد کے لئے تقسیم کیا گیا۔ بارڈر بیلوں سے آراستہ ہے اور اندرونی حصے کے مختلف سائز اور شکلوں کے پینل کتبوں کے لئے مخصوص ہیں۔ بعض میں تو فارسی کے کلاسیکی شعراء، سعدی، حافظ، نظامی، رومی کے اشعار درج کئے گئے ہیں۔ اور پھر ان شخصیتوں کے نام تاریخ وفات اور دوسری معلومات دی گئی ہیں۔ جو ان قبروں میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان قبروں میں سے بعض قبروں کو سائبان نما چھتریوں سے مزین کیا گیا ہے کہ مکلی کے قبرستان کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ جسے بعد میں چوکنڈی کے قبرستان میں بھی بعض قبروں کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ یہ چھتریاں پتھر کے منقش ستونوں پر قائم ہیں یہ ستون کہیں بارہ ہیں اور کہیں آٹھ۔ ان ستونوں پر چھتری ہے جس کی بیرونی شکل گنبد نما ہے جسے کار ہیگ انداز میں تعمیر کیا گیا ہے۔

سنگی عمارتوں میں نظام الدین کا عالی شان مقبرہ قابل ذکر ہے۔ جام خاندان کے اس حکمران نے جنوبی سندھ پر ۱۴۶۱ء سے لے کر ۱۵۰۹ء تک حکومت کی۔ اس کے مقبرے پر پتھر میں جو تزئینی کام کیا گیا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور رعنائی کا جواب نہیں۔ پھول پتیوں کی بیلیں ہیں۔ جو بڑی ترتیب سے ساری سطح پر مزین کی گئی ہیں۔ اس مقبرے کی ساخت اور تزئین میں ہمیں گجراتی طرز تعمیر کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ ان کے ساتھ ہی اس پر قرآنی آیات ثلث خط میں بڑی چابکدستی اور مہارت سے کندہ کی گئی ہیں۔

اس مقبرے کے علاوہ، مبارک خان کا مقبرہ (م ۱۴۹۰ء) طغرل بیگ کا مقبرہ (م ۱۶۷۹ء) آہنسہ بائی کا مقبرہ اور پھر ترخان حکمرانوں، شہزادوں اور امیروں کے مقبرے بھی طرز تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ ان میں جان بابا اور عیسیٰ خان ترخان کے مقبروں کی اٹھان اور طرز تزئین ہمیں فتح پور سیکری کی تعمیراتی زیب و زینت کی یاد دلاتی ہے، غرض کہ سندھ کا طرز تعمیر اپنی انفرادیت کے اعتبار سے پاکستان کے فن تعمیر کا ایک اہم حصہ ہے۔ (باقی آئندہ)

ترجمہ
حیدر سندھی

سندھی صحافت کی کہانی

۱۹۲۴ء میں مرحوم محمد ہاشم مخلص نے میرپور خاص (تھرپارکر سندھ) سے ایک ہفتہ وار 'مسلمان' شائع کرنا شروع کیا۔ مخلص مرحوم سندھی نثر خواہ نظم کے شہنشاہ تھے۔ وہ ہر شعر فی البدیہہ کہتے تھے، اور مضمون قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ ان کی طبیعت ہر وقت موزوں اور ہر حال میں مستعد رہتی تھی۔ وہ کہنہ مشق صحافی اور پختہ فکر شاعر تھے۔ شاعری تو ان کو ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد ماجد حافظ حامدؒ بھی اپنے دور کے بڑے شاعر گنے جاتے تھے۔

مخلص مرحوم کو شاعری پر اتنی قدرت حاصل تھی کہ اگر وہ چاہتے تو 'مسلمان' کے ۱۲ ـ ۱۴ صفحات کو اوّل سے آخر تک منظوم شائع کر سکتے تھے لیکن یہ بات دستورِ زمانہ کے خلاف ہوتی۔ اسی وجہ سے انہوں نے ایسا نہیں کیا، تاہم 'مسلمان' کا سرورق اور اندر کے دو چار صفحات ہر ہفتے ان کے تازہ ترین نظموں سے مزین و آراستہ ہوتے تھے۔

میری ملاقات مخلص مرحوم سے ۱۹۳۲ء میں پہلی "بلوچ کانفرنس" پر جیکب آباد سندھ میں ہوئی۔ ان دنوں وہ ستر بہتر سال کے لگ بھگ تھے، لیکن ہنوز ہمہ وقت زندہ دل اور ظریف تھے اب بھی ظرافت، شوخی، اور خوش مزاجی میں نوجوانوں سے زیادہ جوان نظر آتے تھے۔ یادداشت اتنی تیز تھی کہ اب بھی اپنے دور کی ایک زندہ تاریخ تھے اور ان کا سینہ بے پناہ معلومات کا گنجینہ تھا۔

مخلص مرحوم نے تحریکِ خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، اپنی نظم اور نثر سے سندھ میں آگ کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ ویسے بھی تحریکِ خلافت سے پہلے اور اس کے بعد برطانوی سامراج سے واشگاف انداز میں مخالفت کیا کرتے تھے۔ جذبۂ حریت ان کے رگ رگ اور خون کے ہر قطرے میں سمایا ہوا تھا۔ وہ غلامی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے ہمیشہ برطانوی سامراج کو للکارا کرتے تھے۔ اِسی جذبہ کی وجہ سے کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔

وہ اپنے تخلص کے مصداق اپنے نصب العین سے بالکل مخلص و وفادار تھے۔ جب تحریکِ خلافت کی سرگرمیاں کم ہو گئیں اور لوگوں میں پہلے جیسا جوش و خروش باقی نہ رہا تب بھی مخلص مرحوم نے مرتے دم تک قطع تعلقات، پر عمل کیا اور کھدر پہنتے رہے۔

مجھے (حافظ اوصدی کو) کچھ عرصہ مخلص سے مل کر 'مسلمان' میں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے ان کے قریب رہ کر یہ محسوس کیا کہ ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے بے انتہا محبت تھی۔ وہ عربوں کے مدح سرا تھے ـ ترکوں کے قصیدہ خواں تھے۔ افغانستان کے سابق شاہ امان اللہ خان سے دلی عقیدت تھی۔ مسلمانوں اور اسلام کا دوبارہ عروج دیکھنے کی خواہش تھی، جس کے لئے شب و روز دست بدعا رہتے تھے۔ میں نے جو مرحوم مخلص کے اوصاف بیان کئے ہیں مرحوم کا 'مسلمان' اخبار، ان کا آئینہ دار تھا۔

مخلص مرحوم نے ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۴ء میں وفات پائی، جس کے بعد 'مسلمان' کی ادارت کے فرائض، ان کے بھتیجے اور متبنیٰ، محمد خان غنی نے اپنے ذمے لے لئے، غنی مخلص کے صحیح جانشین ہوئے۔ کیونکہ ان میں بھی وہی اوصاف موجود تھے جن سے قدرت نے مرحوم مخلص کو نوازا تھا۔

مخلص مرحوم کی جن معاصر صحافیوں سے قلمی نوک جھونک رہتی تھی ان میں مولوی نور محمد نظامانی ایک اہم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سندھی کے عالم و فاضل ہونے

کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ اور ان کے قلم میں بڑی جان تھی اور مخلص کی طرح نظم اور نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف اوقات میں یکے بعد دیگرے، تین اخبار نکالے جن کے نام "نورِ اسلام" "مرغِ فلک" اور "طیر آ ابابیل" ہیں۔ مخلص کئی خوبیوں کے مالک ہونے کے باوجود طنز نگار اور ہجو گو تھے۔ ان کے قلم سے پورا سندھ سہما ہوا تھا اور تمام صحافی لرزہ براندام رہتے تھے۔ یہ شیخ عبدالمجید سندھی کے خلاف بھی بہت لکھتے تھے۔ بلکہ ان کے خلاف لکھنا ان کا وطیرہ تھا۔ شیخ صاحب کا "نفسِ ناطقہ" الوحید بھی ان کا جواب دینے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

آخر کار مرحوم نور محمد نظامانی سے مخلص کا ٹکراؤ ہو گیا، وہ بھی مخلص کی طرح طنز نگار اور ہجو گو تھے۔ انہوں نے مخلص کو شکست سے دوچار کر دیا۔ مخلص مرحوم آل انڈیا بلوچ کانفرنس کے موقع پر ـــ میرپور خاص سے چل کر جیکب آباد آئے اور ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر کر دیا، دنیائے صحافت میں کسی اخبار نویس کا اپنے حریف اخبار نویس کے خلاف اس قسم کا مقدمہ داخل کرنا، فریادی کی شکست کا واضح ثبوت تصور کیا جاتا ہے۔

مخلص اور نور محمد کی اس قلمی معرکہ آرائی کو میں چار پانچ سال سے دیکھ رہا تھا مگر ان کے درمیان زبانی معرکہ آرائی میں نے جیکب آباد کی بلوچ کانفرنس میں دیکھی، جس میں مخلص شکست کھا گئے۔

نور محمد نے ۱۹۴۴ء میں پیر علی محمد راشدی کے خلاف بھی ایک زبردست طنزیہ نظم لکھی تھی، جس کے خلاف راشدی صاحب نے جاکر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا لیکن نظامانی مرحوم اس دنیوی عدالت کے سامنے پیش ہونے سے قبل ہی احکم الحاکمین کی عدالت میں حاضر ہونے کے لئے چلے گئے۔

نور محمد مرحوم نے اپنی صحافیانہ صلاحیتوں کو زیادہ تر آریہ سماجی ہندوؤں کی شرارتوں کے خلاف استعمال کیا، جس کو وہ جہاد سمجھتے تھے۔ اس جذبہ کی بنا پر حیدر آباد سندھ اور میرپور خاص سے شائع ہونے والے آریہ سماجی اخبارات سے ہمیشہ لڑتے رہتے تھے۔ انہوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور دونوں اخباروں سے محاذِ جنگ کا کام لیا۔ اپنے اس نیک مقصد میں وہ کامیاب ہوئے اور اپنی بخشش کا مکمل بندوبست کر کے ہی اس دنیا سے دارالبقا روانہ ہوئے۔

مخلص مرحوم کے دوسرے قابلِ ذکر معاصر (جو کہ ان کے ہم عصر بھی تھے) "میرپور خاص گزٹ" کے ایڈیٹر "کاکا گرڈنہ مل" تھے۔ ان دونوں کے درمیان بھی اچھی خاصی نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

شمالی سندھ میں ہونے کی وجہ سے ہمیں "میرپور خاص گزٹ" دیکھنے کا موقع کم ملتا تھا، لیکن "مسلمان" کے مطالعے سے ہی گزٹ کے متعلق معلوم ہو جاتا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں جب میرا ـــ، میرپور خاص جانے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں قلمی دشمن دراصل ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے اور میں نے کئی مواقع پر دونوں کو بہت ہی گہرے دوستوں کی طرح ملتے اور گپ شپ اڑاتے دیکھا تھا حالانکہ کاکا گرڈنہ مل آریہ سماجی تھے اور اس کا اخبار ـــ آریہ سماجک پرچارک تھا۔

مخلص کے تیسرے معاصر، ہفتہ وار "تنظیم" کے ایڈیٹر نواب خالق داد خان "عاجز" تھے، جن کے ساتھ بھی ہمیشہ باہمی چشمک رہتی تھی۔ مخلص مرحوم نے جو کچھ "عاجز" کے خلاف لکھا تھا وہ حرف بحرف مجھے یاد ہے، لیکن جو جواب دیا گیا تھا ـ وہ پورا یاد نہیں ہے۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال جواں سال صحافی، گوٹھ جاگن۔ تعلقہ شکارپور کے باشندہ تھے۔ وہ ڈیرہ محمد صلاح خان بھیہ کے فرزند اور خان بہادر سردار کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود نہایت ہی مخلص اور دردمند دل رکھنے والے کارکن تھے۔ بچپن میں ان کو "نواب" کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن پورا نام خالق داد تھا، اسی وجہ سے جب، سنِ شعور کو پہنچے، تو اپنے لئے نواب خالق داد، "عاجز" کا نام تجویز کیا، وہ قد آور خوش پوش اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔

ان کا گوٹھ شاہل سدھایو میں اکثر آنا جانا ہوتا رہتا، جہاں مولانا عبدالحکیم صاحب کے ساتھ سیاسی اور سماجی موضوعات پر طویل بحث و مباحثے ہوتے رہتے۔ مولانا صاحب بھی بڑی دلچسپی سے خوش ہو کر ان کی باتیں سنتے تھے۔

مذکورہ صحافیوں کے علاوہ، مخلص مرحوم کی دیگر صحافیوں سے بھی قلمی نوک جھونک رہتی تھی۔ ویسے شیخ عبدالمجید سندھی کا بہت بڑا احترام کرتے

تھے۔ لیکن "الوحید" کی وجہ سے کبھی کبھی ان کو بھی نشانہ بنا لیتے تھے۔ باوجود اس کے، جو ایک عالم، ان کے تیر سے بچ رہا، وہ تھے مولانا دین محمد وفائی صاحب، جن کا بڑا خیال رکھتے تھے مولانا صاحب کے لئے چاہتے تھے کہ اگر وہ "الوحید" کو چھوڑ کر "تنظیم" میں آجائیں تو بہتر ہو۔

۱۹۲۴ء میں شکارپور سندھ سے ایک ہفتہ وار "الحنیف" جاری ہوا یہ جمعیت الاحناف کا ترجمان تھا اور اس کا مقصد محض تبلیغِ دین تھا۔ لیکن آگے چل کر سیاسی فضا نے اس کو اتنا مجبور کیا کہ یہ صرف سیاسی اخبار بن گیا۔ اس کے مدیروں میں مولوی محمد ابراہیم خلیل، کریم بخش ثالوری، مولوی محمد حسین کھاوڑ اور راقم الحروف کے نام شامل ہیں مولوی محمد حسین، اخبار کو جمعیت الاحناف کے صدر، خواجہ محمد حسین جان سرہندی سے اجازت لے کر شکارپور سے حیدرآباد لے آئے۔ جہاں سے مولوی صاحب کے انتقال (۱۹۵۴ء) تک شائع ہوتا رہا۔

جب مذکورہ اخبار، شکارپور سے حیدرآباد منتقل ہو کر آگیا، تو اس کا تعلق صرف سندھ کے مسائل تک نہیں تھا بلکہ رفتہ رفتہ بلوچستان کے سیاسی اور سماجی مسائل کو بھی اپنے دائرہ کار میں لے آیا۔ الحنیف نے بلوچستان کے چند جابر، قاہر اور مطلق العنان سرداروں کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ، مختصر سے عرصہ کے اندر پورے بلوچستان میں سیاسی بیداری آگئی۔ اور یہاں کے بے آب و گیاہ پہاڑوں کی طرح جن لوگوں میں سیاسی شعور کا فقدان تھا، وہ بھی سیاسی سوچ کے مالک ہو گئے۔ اور جس بلوچستان کو "سرزمینِ بے آئین" کہا جاتا تھا، وہاں کے ذرّہ ذرّہ سے آزادی کی آرزو ابھر آئی اس سلسلہ میں الحنیف کی آواز نے صورِ اسرافیل کا کام کیا اور صدیوں سے خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر کے، برطانوی سامراج کے خلاف میدانِ کارزار میں لا کھڑا کیا۔ پہلی بلوچ کانفرنس کا انعقاد، اس کی غیر معمولی کامیابی اور وہاں کئے گئے فیصلوں یا دور رس نتائج وغیرہ دراصل الحنیف کی جدوجہد کے خوشگوار نتائج ہی تھے۔ مولوی محمد حسین مرحوم بلوچستان کے حالات سے اس قدر باخبر تھے، جس قدر کوئی شخص اپنے گھریلو معاملات سے خبردار رہتا ہے، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مولوی صاحب کچھ عرصہ بلوچستان میں دینی علوم و فنون کی درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور وہاں کی شرعی عدالتوں میں جو وکالت اور دلائل بازی ہوتی تھی، وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے، مولوی صاحب بہت حسّاس طبع تھے۔ اس لئے اُن لوگوں کے دکھوں کو اپنا درد جان کر ان کے علاج کی تلاش میں رہتے تھے انہوں نے جو کچھ کیا، وہ سب بے طمع اور بے غرض ہو کر کیا۔۔۔ اور اس پر آخری دم تک کاربند رہے اتنے ثابت قدم تھے کہ کوئی بھی لالچ دباؤ یا دھمکی اُن کو مقصد سے ہٹا نہ سکی انہوں نے نہ صرف خود صحافت کے ذریعے ملک و ملّت کی گرانقدر خدمات سرانجام دیں بلکہ سندھ اور بلوچستان کے کئی نوجوانوں کو صحافت کے میدان میں قدم رکھنے کی ترغیب بھی دی۔ یہ اُن کی تربیت و ترغیب ہی کا اثر تھا کہ بعد میں کئی نامور صحافی بن کر فلکِ صحافت پر آفتاب کی مانند چمکے۔

جب میں (۱۹۳۲—۳۳ء) "الحنیف" ایڈٹ کرتا تھا تو ان دنوں جیکب آباد سے دو اخبار اور بھی ہندو مدیروں کی ادارت میں نکلتے تھے۔ ایک کا نام "فرنٹیئر گزٹ" اور دوسرے کا نام "تیج" تھا۔ ان دونوں میں سے "فرنٹیئر گزٹ" جو کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی زندہ رہا، ایک سنجیدہ قسم کا اخبار تھا اور اسی طبع کے قارئین کا دلچسپ اخبار تھا۔

انہی دنوں میں جیکب آباد کے "اتحاد" نامی ایک سندھی ہفتہ وار نبی بخش سرکی نے جاری کیا، جو کہ اب تک زندہ ہے اور پورے خلوص کے ساتھ قومی خدمت سرانجام دیتا آیا ہے۔

نبی بخش سرکی، وہی شخص ہیں، جنہوں نے تحریکِ خلافت کے دوران مشہور و معروف "الوحید" اخبار میں مدیر کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔ تحریکِ آزادی کے جہاد میں غیر معمولی سرگرمی سے حصہ لیا اور اس سلسلہ میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا اور آج کل ملکی تعمیر و استحکام کے لئے مصروفِ کار ہیں۔ ان اخبارات کے علاوہ بھی جو اخبار مذکورہ شہر سے شائع ہوئے تھے ان کے تذکرے کا یہ محل نہیں۔

دراصل ۱۹۳۴ء میں جو روزنامہ پیر علی محمد راشدی نے سکھر سے "ستارۂ سندھ" کے نام سے جاری کیا، وہ مع اپنے "سندھ گزٹ پرنٹنگ پریس"

کے سردار نبی بخش بھٹو کی ملکیت تھا، جنہوں نے اپنے بڑے بھائی سردار واحد بخش بھٹو کے انتقال کے بعد سرداری کا منصب سنبھالا تھا۔

انہوں نے سب سے پہلے سیاست میں قدم رکھنے کی ابتداء ڈسٹرکٹ اسکول بورڈ کی چیئرمین شپ جیتنے سے کی جس کے بعد مرکزی اسمبلی تک رسائی حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہوگئے۔ جس کا انتخاب بہت جلد ہونے والا تھا۔

ان دنوں مرکزی اسمبلی میں سندھ کے لئے تین نشستیں تھیں جن کی ایک تہائی ہندوؤں کے لئے مخصوص تھی باقی دو مسلمانوں کے لئے تھیں۔ ان دونوں نشستوں کیلئے سر عبداللہ ہارون شیخ عبدالمجید سندھی اور سردار نبی بخش خان بھٹو جیسی ہستیاں امیدوار تھیں، ان میں سے سر عبداللہ ہارون ایک نامور سیاستدان تھے۔ جن کے پاس ہر قسم کے وسیع ترین ذرائع موجود تھے دوسری جانب ان کے حریف، شیخ سندھی بھی ایک مانی ہوئی سیاسی شخصیت کے مالک تھے اور "الوحید اخبار" کے وسائل ان کی حمایت اور تائید میں موجود تھے۔ البتہ سردار بھٹو صاحب ان کے مقابلے میں تو گیا، سیاست میں ہی نووارد تھے۔ ان کی کسی سے اتنی شناسائی ہی نہیں تھی۔

اسی مقصد کی خاطر انہوں نے ایک اخبار کی ضرورت محسوس کی، ادھر انتخاب سے تھوڑا سا عرصہ پہلے ایڈیٹر "ستارۂ سندھ" پیر علی محمد راشدی کو خان بہادر محمد ایوب کھوڑو نے برطرف کر دیا تھا، یہاں ان دونوں (بھٹو اور کھوڑو) خاندانوں کے درمیان عرصہ سے ناراضگی کا سلسلہ تھا ـــ جس میں اس انتخابی ماحول نے مزید اضافہ کیا، جس کا فائدہ لے کر، راشدی، کھوڑو سے نکل کر، بھٹو صاحب کے پاس آئے، تو انہوں نے وہ پریس بھی خرید کر دیا اور اخبار کے لئے بھی معقول رقم فراہم کر دی۔

اب لاڑکانہ کی بجائے، حبیب سکھر سے، ستارۂ سندھ کا اجراء ہوا تو فوراً آسمانِ صحافت پر آفتابِ عالمتاب کی طرح روشن ہوگیا۔ اس کی تحریروں میں نہایت ہی شگفتگی، روانی اور ادبی لطافت موجود تھی۔ اخبار میں انتخابی پروپیگنڈہ پر مشتمل جو مضامین شائع ہوتے تھے، وہ لوگوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ جہاں تک سیاسی فہم و فہراست، شعور انتخابی مہم کو کامیابی سے چلانے کے رنگ ڈھنگ اور پروپیگنڈہ کے ہتھیاروں کو محل و موقع پر استعمال کرنے کا تعلق ہے، تو یہ اخبار اپنے تمام حریف اخباروں کو مقابلے میں بہت پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ سردار صاحب نے جو بے دریغ پیسہ اس اخبار پر صرف کیا وہ بارآور ثابت ہوا اور وہ الیکشن میں کامیاب قرار پائے۔

(انشائیہ)

مرزا ظفر الحسن

جب میں ٹمبکٹو کا گورنر تھا

جامعہ عثمانیہ میں ہمارے ایک انگریز پروفیسر تھے۔ ای ای سپیٹ۔ کسی زمانے میں آکسفرڈ ڈکشنری سے وابستہ تھے۔ جو بلا شبہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے بھی کافی بڑا اعزاز تھا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ اس کے ذکر سے گریز کرتے تھے۔ اس کی بجائے بار بار ایک ایسا تذکرہ کرتے جس پر ان کے شاگرد نہ صرف ہنس پڑتے بلکہ ان دنوں عام لوگوں کے نزدیک بھی وہ ایک مضحکہ خیز موضوع تھا۔

آج کی نئی نسل تو نہیں جانتی مگر ہمارے ہم عمروں کو معلوم ہے کہ جب کسی چیز کی توہین مقصود ہوتی تو کہتے "اچھا تو یہ میڈ اِن جاپان ہے" جاپانی مصنوعات کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا تھا جاپان کا ذکر بھی ایک برلاس صاحب کی تحریروں ہی میں ملتا تھا۔ جو شاہد احمد دہلوی "ساقی" میں شائع کرتے تھے۔ مگر اس سے بہت زیادہ اور نہایت التزام کے ساتھ ہمیں پروفیسر سپیٹ کی زبانی انگریزی کی کلاس میں جاپان کا تذکرہ سننا پڑتا تھا۔ ہر کہانی ہر مضمون ہر نظم بلکہ ہر بات کا ڈانڈا وہ جاپان سے ضرور ملا دیتے تھے بات کوئی شروع ہو وہ انگریزی میں کہیں نہیں جب جاپان میں تھا" اور ہم ہنس پڑیں۔ روز روز کی ہنسی کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ ذکرِ جاپان سے باز نہ آئے۔ یہ بھی نہیں تھا کہ استادِ محترم نے کسی جاپانی لڑکی سے شادی کی ہو۔ ان کی بیگم ایک اینگلو انڈین دوشیزہ تھی۔

شاگردوں کی ہنسی بلکہ پوری کلاس کا یک آواز قہقہہ جب پروفیسر سپیٹ کے منہ میں لگام نہ دے سکا تو اس بے تحاشا مقرر کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ جس کا ذکر آئندہ سطروں میں کروں گا۔

ذکر یہیں کر دیتا مگر یہ جو میں نے "بے تحاشا مقرر" لکھا ہے ڈر ہے کہ ناقدین کہیں بے مزہ نہ ہو جائیں شہرِ ادب میں آرام سے رہنا ہے تو ناقدین کا خیال کرنا ہی پڑے گا اس لئے ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اصطلاحِ بے تحاشا مقرر یہ ہو کہ غلط وہ نسلاً موجود ہیں اور وجہ یہ ہے کہ بے تحاشا انجمنیں اور ادارے بن رہے ہیں۔ ان کے پلیٹ فارم بے تحاشا مقررین کے پیدائش گھر کا کام دے رہے ہیں۔ ان کی ایک پہچان یہ ہے کہ آپ ان کی تقریر میں غوطے لگا لگا کر غرق ہو جائیں مجال ہے جو آپ کے ہاتھ مفہوم لگے۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ یہ لوگ تقریر کی تیاری کر کے گھر سے آتے ہوئے الفاظ سا تھ لے آتے ہیں معنی لانا بھول جاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کوئی یہ کہے کہ "بے تحاشا مقرر" لکھنے کی بجائے مجھے بے لگام مقرر لکھنا چاہیئے تھا۔ بات صحیح ہے مگر اس صورت میں بے لگام کی ایک کلاسیکی قسم کی تلمیح بیان کرنی پڑتی جو یہ ہے کہ حیدر آباد دکن میں ایک نواب تھے نہایت نیک، وضعدار، دیانت دار، شریف، نواب ناظر یار جنگ تقریر کرنے کا بہت شوق تھا، بس ذرا زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔ جو انہیں بلاتا تقریر کے لئے چلے جاتے۔ نواب بہادر یار جنگ کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ جس نے انہیں سنا کہا بس خطابت ان پر ختم ہے ان دونوں مقررین کے متعلق ایک مرتبہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے فرمایا "حیدر آباد دکن نے دو لاجواب مقرر پیدا کئے ہیں۔ ایک بہادر یار جنگ —— بے لگام مقرر دوسرے ناظر یار جنگ —— بے زبان مقرر"

اس تلمیح کے بیان سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ اس لئے بے لگام مقرر نہیں کہا۔ ہاں تو جن خاص مقرر کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان کی بیشتر تقریریں یا تو اس جملے سے شروع ہوتیں۔

"جب میں ٹمبکٹو کا گورنر تھا"

یا تقریر کے دوران کوئی واقعہ —— متعلق یا غیر متعلق —— اسی جملے سے شروع کرتے۔

"جب میں ٹمبکٹو کا گورنر تھا"

شیروانی پہنیں کہ سوٹ بڑے جامہ زیب۔ بات انگریزی میں کریں کہ اردو میں بڑے رواں۔ تقریریں کہ شعر سنائیں آواز بڑی گمبھیر۔ قصہ سال بھر پرانا ہو کہ

صدی چار صدی قدیم حافظہ بلا کا تیز۔ یوں معلوم ہو جیسے چار سو سال پہلے کے چشم دید احوال سنا رہے ہیں۔ ڈراما کبھی نہیں لکھا مگر سنا دیے ایسے سنائیں کہ خواجہ معین الدین کے ڈرامے یاد آ جائیں۔ خوش شکل مگر خشک مزاج، قسم لے لیجئے جو کبھی مصافحہ کریں۔ آپ اگر ہاتھ بڑھا دیں تو احتیاطاً کے ساتھ مصافحہ کریں تاکہ آپ ان کا دستِ مبارک چھُو نہ سکیں اور آپ کی زبردستی کے ساتھ آپ کی زبردستی بھی ثابت ہو جائے۔

یاد نہیں کس تاجدارِ دکن کے متعلق کہیں پڑھا تھا کہ جب انہیں کسی انگریز ریذیڈنٹ سے مصافحہ کرنا پڑا تو اسی وقت اور اس کے سامنے دربار میں طشت منگوا کر اپنا ہاتھ دھو لیا تھا۔ ہمارے ان بے تحاشا مقرر اور ان کی قبیل کے تمام پرانے اور نئے لوگ مصافحہ سے گریز کرتے ہیں۔ وہ تو کہیئے ہر جگہ طشت حاضر نہیں کیا جا سکتا۔ نہ کچہری میں نہ جلسے یا تقریب میں ورنہ تاجدارِ دکن کی طرح اس قبیل کے سارے لوگ اسی طرح ہاتھ دھوتے تاکہ مصافحہ کرنے والا خفیف ہو یا نہ ہو ان کا ہاتھ تو صاف ہو جائے گا۔

ٹمبکٹو کی گورنری کا ثبوت ان پر اتنا سوار ہے کہ ذکرِ اقبال ہو کہ بیانِ غالب، تعمیرِ کائنات ہو کہ تسخیرِ ماہتاب الاٹمنٹ کی کہانی ہو کہ پرمٹ کی داستان حضرت ٹمبکٹو کے گورنر ضرور ہوں گے۔ نمونتاً میں ان کی بے تحاشہ تقریروں کے کچھ اقتباسات ضرور دیتا مگر اپنے بدبہونے سے خوف کھاتا ہوں کیونکہ نمونے آپ کے لئے نئے ہی مگر "جب میں ٹمبکٹو کا گورنر تھا" سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔ اب خامہ خونچکاں اور انگلیاں فگار نہیں کر سکتا۔

"اقبال حیدر آباد میں" "اقبال بھوپال میں" "اقبال کشمیر میں" قسم کی کتابیں چھپنے لگیں تو ہمارے دوست مشفق خواجہ نے کہا "اب ایک کتاب لکھی جائے۔ "اقبال ٹنڈو آدم میں" کسی نے اعتراض کیا اقبال کبھی ٹنڈو آدم گئے ہی نہیں۔ مشفق نے جواب دیا۔ کمال کی بات تو یہی ہے۔ اس کتاب میں ثابت کیا جائے گا کہ اقبال ٹنڈو آدم کبھی نہیں گئے

ان بے تحاشہ مقرر کی تقریر سن کر مشفق خواجہ کہنے لگے کتاب "اقبال ٹنڈو آدم میں" کی طرح ان صاحب کو اپنی سوانح عمری لکھنا چاہیئے۔

"جب میں ٹمبکٹو کا گورنر نہیں تھا"

خموشیوں سے رچے جنوں میں
سکوت کے بیکراں فسوں میں
کمالِ گفتار چھپاتا ہوں

صہبا اختر

وقار احمد رضوی

ہندی زبان و ادب پر اسلامی تعلیمات کا اثر

عصرِ جدید میں ہندی زبان ایک ترقی یافتہ اور مضبوط زبان ہے۔ تقسیم ہند کے بعد سے، ہندی نے ارتقاء کے جو منازل طے کئے ہیں اور جس تیزی سے کئے ہیں۔ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اب ہندی میں ہر علم و فن اور سائنس کے ہر شعبے میں بیش بہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ نفسیات، معاشیات، فلسفہ، حساب تاریخ، طبعیات، کیمیا، ناول، افسانہ اور سیاسیات غرض ہر موضوع پر اب ہندی میں وافر ذخیرۂ کتب موجود ہے۔ جس کو کسی بھی لحاظ سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک ہندی زبان کی لسانی اہمیت کا سوال ہے، ہندوستان کی جدید زبانوں میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا تعلق ہند آریائی لغات کے گروپ سے ہے۔ جس طرح اُردو کھڑی بولی یا برج بھاشا سے نکلی، اسی طرح ہندی قدیم پراکرت کی اَپ بھرنش (بگڑی ہوئی) بھاشا ہے۔ دونوں کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے۔ تمام افعال، حروفِ جار، عطف، اسمائے اشارہ، ضمائر اور حروف استفہام دونوں زبانوں یعنی ہندی اُردو میں مشترک ہیں۔ اسماء زیادہ سنسکرت کے ہیں اور بعض فارسی اور اُردو سے بھی لئے گئے ہیں ہندی رسم الخط، دیوناگری ہے۔ ہندی رسم الخط کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے بنگلہ گجراتی اور مرہٹی زبانوں کے رسم الخط بنائے گئے ہیں۔

اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندی زبان و ادب کی ترقی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ چنانچہ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں امیر خسرو، ہندی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ انہوں نے ہندی میں دوہے، کہہ مکرنیاں اور فارسی ہندی سے ملی جلی شاعری کو رائج کیا۔ امیر خسرو ہی کے عہد میں مُلّا داؤد ہندی کے اچھے شاعر تھے۔

اسی طرح ملک محمد جائسی اور عبد الرحیم خان خاناں ہندی کے بڑے شاعر تھے۔ جائسی کی پدماوت ہندی ادب میں اہم مرتبہ رکھتی ہے۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں کتبن شیخ نے "مرگاوتی" نام کی ایک نظم لکھی تھی۔ اسے ہندی ادب کی تاریخ میں ہندی کی پہلی نظم یا مثنوی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس مثنوی میں چندر نگر کے راجکمار اور کنچن نگر کی شہزادی مرگاوتی کی داستانِ محبت ہے۔ اس کے بعد ہندی ادب کی ترقی میں صحیح معنوں میں مسلمانوں نے اکبر کے دور میں حصّہ لیا۔ یہ زمانہ ۱۵۵۶ء سے شروع ہو کر ۱۶۰۵ء پر ختم ہوتا ہے۔ مغلیہ بادشاہوں میں اکبر بادشاہ کو ہندی شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ خود بھی ہندی کا شاعر تھا اکبر رائے تخلص کرتا تھا۔ وہ فنکاروں، شاعروں اور کلاکاروں کی عزت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد میں فنونِ لطیفہ اور ادب و شعر کو عروج ہوا۔

اکبر کے عہد میں جن مسلمانوں نے ہندی کی ترقی میں حصّہ لیا ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) عبد الرحیم خان خاناں

(۲) تان سین

(۳) مُلّا فیضی

(۴) مبارک

تان سین کی موسیقی میں دو کتابیں ہیں۔ جن کے نام سنگت سار اور راگ مالا ہیں۔ فیضی نے ہندی کے دوہے لکھے۔ اور مبارک کے دوہے ہندی کے مشہور شاعر بہاری کے ٹکر کے ہیں۔ عبد الرحیم خان خاناں نے ہندی شاعری میں چار کتابیں لکھیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ رحیم ست سئی

۲۔ بروئے نائکہ بھید

۳۔ راس پنچا دھیا مئی

۴۔ سنگھار سورٹھ

خان خاناں کی ہندی شاعری کا نمونہ یہ ہے ؎

اب رحیم مشکل پڑی گاڑھے دوؤ کام
سانچے تو جگ نہیں، جھوٹے ملیں نہ رام

کیسی مشکل ہے۔ سچ بولنے میں دنیا ساتھ نہیں دیتی اور جھوٹ بولنے سے خدا نہیں ملتا۔

ایک اور شعر ہے ؎

جے سلگے تے بجھ گئے، بجھے تے سلگے ناہیں
رحیمن داہے پریم کے، بجھ بجھ کے سلگاہیں

جو چیز سلگتی ہے وہ بجھ جاتی ہے اور جو بجھ جاتی ہے وہ سلگتی نہیں۔ مگر محبت کی آگ بجھ بجھ کے سلگتی ہے۔

اکبر کے بعد شاہ جہان کا بیٹا، دارا شکوہ، ہندی کا

بڑا عالم تھا۔ اورنگ زیب بھی ہندی شاعروں کی عظمت کو مانتا ہے۔ چنانچہ ہندی کا مشہور شاعر بھوشن "اورنگ زیب" کا درباری شاعر تھا۔

عبدالرحیم خان خاناں کی طرح رسکھان بھی مسلمان ہندی شاعر تھا۔ ان کا پورا نام سید ابراہیم تھا۔ رسکھان کی زبان کو ہندی ادب میں کسوٹی مانا جاتا ہے۔ آج اس کے کبت (شعر) ہندو لوگ صبح کی عبادت میں بھجنوں کے طور پر گاتے ہیں۔ اس طرح اس مسلمان ہندی شاعر کے الفاظ مندروں کے در و بام پر گونجتے ہیں۔

اس کے علاوہ جن مسلمانوں نے ہندی شاعری میں کام کیا اس کی کچھ تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اسحاق ابراہیم سرہندی کا ترجمہ اتھروید
۲۔ عبدالقادر بدایونی کی رامائن و مہابھارت
۳۔ ملا فیضی کی لیلاوتی اور نل دمینتی
۴۔ شاہ محمد شاہ آبادی کی راج ترنگینی
۵۔ اور مولانا شبری کی ہر بنس

یہ سب ہندی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

سمت ۱۶۷۷ بکرمی میں شیخ حسین کے لڑکے عثمان نے ایک پریم کہانی لکھی، جس کا نام "چترادلی" ہے۔ اس میں نیپال کے ماہر اور روپ نگر کی شہزادی چترادلی کا افسانۂ عشق ہے۔

سمت ۱۷۲۵ بکرمی میں ایک مسلمان ہندی شاعر ہوئے ہیں ان کا نام عالم کوی ہے۔ انہوں نے سنگھاراس ہندی مثنوی لکھی۔ ان کی ایک تخلیق "عالم کیلی" ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں سید غلام مرسلین بلگرامی ہندی کے شاعر تھے۔ ان کی کتاب کا نام "رنگ درپن" ہے۔

سمت ۱۸۰۰ بکرمی میں نور محمد جائسی نے بھی ہندی میں ایک پریم کہانی لکھی تھی۔ اس کا نام "اندراوتی" ہے۔

اس کے علاوہ میر عبدالجلیل بلگرامی، اعظم خان (سنگھا ردرپنا)، کاظم علی خان (سنگھاسن بتیسی)، قاسم شاہ (ہنس جواہر)، آصف خان، ہاشم بیجاپوری، خان عالم اور انشا اللہ خان انشا (رانی کیتکی کی کہانی) ہندی کے عالم اور شاعر ہیں۔

غرض مسلمانوں نے نہ صرف ہندی شاعر اور عالم پیدا کئے۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندی ادب اور ہندی شاعروں کی اپنے زمانے میں سرپرستی بھی کی۔ چنانچہ اکبر کے زمانے میں راجہ ٹوڈرمل، راجہ بیربل، راجہ منوہر داس نے ہندی میں شاعری کی۔ ان میں راجہ بیربل کو اکبر بادشاہ نے ہندی شاعری میں کوی رائے کا درباری خطاب دیا۔

ہندی شاعر سور داس کے والد رام داس اکبر کے دربار میں گائک کلاکار تھے۔ اسی طرح کرن اور نرہری سہائے دونوں بھائی اکبر کے دربار میں ہندی شاعر تھے۔ جن کی سرپرستی اکبر نے کی۔ گنگا پرشاد، اکبر کا درباری شاعر تھا۔ جو گنگ کے نام سے زیادہ مشہور ہوا۔ یہ ۱۵۳۳ سے لے کر ۱۶۱۷ کے درمیان ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک چھند (شعر) پر کئی لاکھ روپے انعام ملے تھے۔

علاؤالدین خلجی کے زمانے میں ہندی کا ایک مشہور شاعر کیدار تھا۔ علاؤالدین خلجی اس کی بڑی قدر کرتا تھا اسی طرح ہمایوں بادشاہ "چھیم بندیجن" کی عزت کرتا تھا۔

شاہجہان کے زمانے میں کوی رائے کا خطاب، کوی سندر کو دیا گیا۔ جو ذات کا برہمن تھا۔ اس کے دیوان کا نام "سندر سنگار" ہے۔

اورنگ زیب کے زمانے میں اس کے بیٹے معظم شاہ کے زمانے میں عبدالرحمٰن، محمد شاہ کے زمانے میں گمان اور جگل کشور بھٹ ہندی کے شاعر تھے۔ جن کو شاہی دربار سے مدد ملا کرتی تھی۔

مغل بادشاہوں کے زمانے میں کیشو داس، بہاری لال، جسونت سنگھ، دیوکوی اور سکھ دیو مصر ہندی کے بڑے شاعروں کے نام ہیں۔ ان میں بہاری لال کی شہرت ان کی ست سئی کی وجہ سے ہے۔ جس میں لگ بھگ سات سو اشعار ہیں۔

جسونت سنگھ جودھ پور کا راجہ تھا اس کی شہرت "بھاشا بھوشن" سے ہوئی۔ اس نے ایک کتاب ویدانت (تصوف) پر بھی لکھی ہے۔ دیوکوی کا اصل نام دیودت ہے۔ اس کی پیدائش ۱۶۷۳ء میں اٹاوہ میں ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں شہزادہ اعظم کے سامنے ایک نظم پڑھی اور دربار میں عزت پائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ۷۲ کتابیں لکھیں۔ جن میں سے اب بہت کم باقی ہیں۔

اسی طرح مسلمان صوفیوں نے ہندی شاعری کو متاثر کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندی شاعری میں اسلامی تصوف کے اثرات ملتے ہیں۔ چنانچہ ویرگاتھا کال میں چند بردائی کی پرتھوی راج راسو کے بعد امیر خسرو کی ہندی شاعری میں تصوف کے رجحانات ملتے ہیں۔ اس کے بعد ہندی ادب میں ملک محمد جائسی نے صوفی مت کو آگے بڑھایا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جائسی نے اپنی کتاب پدماوت کا آغاز ہی حمد و نعت سے کیا ہے۔

بھگتی تحریک کی چار شاخوں میں ایک شاخ پریم مارگی یا صوفیوں کا سلسلہ کہلاتی ہے۔ کبیرداس اور جائسی کی تصانیف میں اس تصور کی جھلک ملتی ہے۔ ہندوؤں میں خدا ترسی کے رجحان کو فروغ دینے کے لئے جو تحریک پیدا ہوئی وہ بھگتی تحریک تھی۔ بھگتی تحریک عوامی تحریک

تھی۔ اور اس میں برہمنوں کے کٹر جذبات کو جگہ نہیں ملی اس تحریک کے بانی رامانند کا کہنا یہ تھا کہ جس کے دل میں خدا موجود ہو اس کو مندر میں بت پرستی کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر وہ کھل کر بت پرستی کی مخالفت بھی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس نے اپنے چیلوں کے ذریعہ ویدانت یعنی تصوف کی تبلیغ کی۔

بھگتی تحریک کا مقصد عوام میں روحانیت اور مذہب کے بارے میں اس سوئی ہوئی عقیدت کو جگانا تھا جو اس عہد میں کچھ بے رنگ اور مردہ ہوگئی تھی۔ ہندی میں بھگتی تحریک ایک ایسے خدا کا تصور پیش کرتی ہے۔ جو انسانوں سے دوری اور فاصلہ کے بجائے انہیں میں شامل ہوتا ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے۔ وہ عقیدت اور عشقِ خداوندی پر زور دیتی ہے۔ چنانچہ کبیر داس بابا فرید کے دوہوں میں اس تصور کی جھلک ملتی ہے۔

کبیر داس، بھگتی تحریک کے روحِ رواں تھے۔ انہوں نے اپنے وجد آور نغموں سے ہندی ادب کو مالا مال کیا۔ ان کی شاعری میں تصوف کا اثر صاف ظاہر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبیر کی تعلیم میں اسلامی اثر غالب تھا۔ ہندی ادب کی تاریخ میں بھگت کو یوں کو بہت اونچا مقام دیا گیا ہے۔ کبیر بھی بھگت تھے۔ انہوں نے مندر میں رہنے والے بھگوان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا دل میں رہتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے ذات پات کی بھی تردید کی۔ ان کی نگاہ میں سب انسان برابر تھے۔ وید پڑھ کر ایشور کو سمجھنا کبیر داس کو پسند نہیں تھا۔ وہ تو یہی مانتے تھے کہ جو آدمی سب سے محبت کرتا ہے۔ اور سچے دل سے خدا کی عبادت کرتا ہے وہی سب سے بڑا بھگت (عبادت کرنے والا) ہے۔ اس لحاظ سے کبیر کا مسلکِ حیات بالکل نیا تھا۔ ان کے نزدیک اللہ اور ایشور ایک ہی خدا کے نام ہیں۔ یہ لوگوں کے اوپر ہے کہ وہ اس کو کس نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

نہائے دھوئے کیا ہوا جو من میں میل سمائے

مین سدا جل میں رہے دھوئے باس نہ جائے

دل کا میل نہانے دھونے سے نہیں جاتا۔ جس طرح مچھلی ہمیشہ پانی میں رہتی ہے۔ مگر پانی سے دھونے پر بھی مچھلی کی بو نہیں جاتی۔

اسی طرح بابا فرید نے اپنے ہندی دوہوں میں قناعت کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ کہا ہے ؎

روکھی سوکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی

دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیں جی

اپنی محنت کی خشک روٹی کھا کر ٹھنڈا پانی پینا بڑی نعمت ہے۔ دوسرے کی گھی لگی روٹی یا لقمۂ تر کی حرص نہ کرو۔

یہی وجہ ہے کہ نرگن بھگتی کے فلسفہ پر تصوف اور اسلام کے وحدتِ خداوندی کی گہری چھاپ ہے۔ ہندو ناتھ پنتھیوں نے وحدت الوجود اور تصوف کی ایک خاص روایت کو رواج دیا۔ اسلامی تصوف اور رامانند کی ویشنوی تعلیمات سے مل کر، نرگن واد کا فکری تانا بانا بنا ہے۔ نرگن واد کا سلسلہ کبیر داس سے شروع ہوتا ہے۔

اس طرح شنکر اچاریہ نے دنیا کو مایہ قرار دیا۔ رامانج نے عالمِ ظاہر کو جسم اور ایشور کو روح بتایا۔ اس طرح کرشن بھگتوں نے خاص طور پر صوفیوں سے اثر قبول کیا۔ عشق و محبت کا جو تصور انہوں نے اختیار کیا۔ وہ تمام تر تصوف کے زیرِ اثر ہے۔ چنانچہ میرا بائی کے ہاں برہ (ہجر) کی جو آگ ہے۔ وہ صوفی مت کے اثر سے آئی ہے۔ گیروا کپڑے بھی صوفیوں کا لباس ہیں۔

اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خان خاناں کی شاعری میں بھی صوفی مت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

رحیمن چپ ہو بیٹھئے دیکھ دنن کے پھیر

جب نیکے دن آئیں گے بنت نہ لگئے دیر

کبیر کی طرح گرو نانک کا پیغام بھی ایک خدا کی عبادت کرنا اور انسانوں سے محبت کرنا ہے۔ وہ روحانی ہم آہنگی اور مذہب کی اصل روح پر زور دیتے ہیں۔ نانک نے ہندی شاعری میں وحدت الوجود کے گیت گائے ہیں ان کا ایک چھند (شعر) ہے ؎

جے کارن تٹ تیرتھ جائے

رتن پدارتھ گٹ ہی مانہے

جس کی خاطر لوگ تیرتھوں پر جاتے ہیں۔ وہ خدا تو تمہارے دل میں موجود ہے۔ وہیں تلاش کرو۔

غرض اس طرح ہندی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی شاعری فطری طور پر تصوف یا صوفی مت سے متاثر ہوئی ہے۔ اور اسلامی تصوف کے بنیادی عنصر کو ہندی شاعری نے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف انسان کو روحانی سکون اور ذہنی یکسوئی کا ماحول فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندی کے بھجنوں میں بھی وحدت الوجود اور اسلامی عقیدہ کا اثر ملتا ہے کیونکہ اسلام کے نزدیک خدا سے لو لگانا سب سے بڑی عبادت ہے۔

ریاض صدیقی

طبعیات کی مابعد الطبعیات اور اردو ادب

جدید طبعیات کی مابعد الطبعیات نے انسان کے لئے ہفت افلاک کی سیر کو ممکن بنا دیا۔ قدیم داستانوں نے صدیوں قبل انسانی ذہن میں بسنے والے جن جذبات کو گرفت میں لیا تھا، ہماری صدی نے ان کو سچ کر دکھایا گویا انسان کی فطرت اور اس کے ذہن سے سر اٹھانے والے بعض محسوسات معنویت اور افادیت کا آئینہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت بیسوی صدی کے عظیم ماہر ریاضی و طبعیات آئن اسٹائن کا واضح لفظوں میں اعتراف ہے کہ اضافیت کا خیال اولاً اس کے ذہن میں اچانک صورت پذیر ہوا۔ اور پھر بعد کے نہایت باریک پیچیدہ اور تھکا دینے والے تجربوں اور مساواتوں (EQUATIONS) نے اس صورت کی تصدیق کر دی۔ اس واقعہ کو ہمارے دور کے عظیم سائنسی مفکر نے وجدان[1] کے لئے دلیل بھی بنایا ہے۔ انسانیت کو اس سربلندی ارفعیت اور قدرت پر دسترس تک پہنچانے والی یہی سائنسی سوچ ہے۔ یہ سوچ بیسویں صدی کی سب سے بڑی دین ہے۔ جس نے شاید کہ سائنس کو اس منزل پر لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں ٹھہر کر کہا جا سکتا ہے کہ ہم کالے راز والے

آج ہم جس کائنات میں جی رہے ہیں خواب جیسی شے ہے جہاں صرف واقعات و حوادث ظہور پذیر ہوتے ہیں اور مادی اشکال توانائیوں کے سمندر میں تحلیل ہو رہی ہیں۔ نئی طبعیات اور ریاضی نے حقیقت اور معروضیت کو عینیت اور وجدان کے ساتھ ہم رشتہ کر لیا ہے۔ اس طرح تخیل آفرینی۔ ارتکازِ فکر۔ باطن کے پاتال میں اتر کر الفاظ کے ذریعہ خارج کی طرف واپسی اور وجدان وجمالیات کی جلاوطنی کے دو سو سال تمام ہوتے ہیں۔ ان حقائق کے باوجود بعض لوگوں کو نئی صورتِ حال قبول نہیں ہے۔ بہر حال ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ حقیقت اور مادیت کے گذرے ہوئے تصور میں کیا اور کس قسم کی تبدیلی واقع ہوئی ہے؟ اور ہمارے ادب نے پہلے کی طرح کھلے ذہن سے اس کا استقبال کیوں نہیں کیا ہے؟ دونوں سوال مختلف ہوتے ہوئے بھی باہم مربوط ہیں۔ اور ان کا احاطہ کرتے ہوئے ادب اور فکری تحریکات کے عہد بہ عہد ربط سے گزرنا ضروری ہے۔

سترھویں صدی میں جن دنوں اصل اردو زبان اور شاعری عربی و فارسی روایات میں ڈھل کر کلاسیکیت کا لباس پہن رہی تھی۔ اور اس کا وطن ہر قسم کی نئی فکر سے قطعاً لاعلم تھا اسی زمانے میں یورپ سائنسی تحریک کا سفر شروع کر رہا تھا۔ تیزی کے ساتھ تجرباتی سائنس نئی ایجادات اور تحقیقی علوم کے اس سرمائے پر مغرب شب خون مار رہا تھا۔ جو مسلمان چھوڑ گئے تھے۔ اسی دور میں جب زوال آمادہ علمائے اسلام غزالی سے روشنی حاصل کر رہے تھے۔ مغرب ابنِ رشد سے استفادہ کرنے میں منہمک تھا کوپرنیکس سے نیوٹن تک مسلمان سائنس دانوں ہی کے نتائج کو مستقبل کا لائحہ عمل بنایا گیا تھا۔ ڈیکارٹ[2] پہلا اہلِ دانش ہے۔ جس نے اپنے دور کی سائنسی تحریک کو فکری میلان میں ڈھالا اور کائنات کے مادی میکانکی تصور کا اثبات کرتے ہوئے کہا "کہ مجھے حرکت اور نشوو ارتقا پر مکمل اختیار مل جائے تو ایک نئی کائنات بنا دوں" البتہ اس نے ذہن کو مادے کا جز تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ نیوٹن[3] نے قوانینِ حرکت کششِ ارضی۔ نور میں اور روشنی کی ذراتی ماہیت[4] و مرکب ہیئت[5] اور خطِ مستقیم میں چلنے کے نتائج کو اپنی کتاب پرنسپیا میں قلمبند کیا۔ خالص مادیت اور میکانکیت ہی حتمی اور آخری سچائی قرار پائے۔ انسان

---

[1] آئن اسٹائن۔ وہائٹ ہیڈ۔ رسل اور ان دانشوروں کا اتباع کرتے ہوئے اقبال نے وجدان کو عقل ہی کا ایک لطیف تر عمل تسلیم کیا ہے۔

[2] ۱۵۹۶-۱۶۵۰ء

[3] ۱۶۴۲-۱۷۲۷ء

[4] CORPUSCULAR

خلا میں پھیلے ہوئے متحرک مادے کا جزو اور مشین بن گیا اور ذہن و مادے کی دوئی ختم ہو گئی۔ نیوٹن نے وجودِ باری کو تسلیم کیا مگر یہ کہہ کر کہ وہ مادی اور میکانکی کائنات میں ایک بے بس تماشائی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہابس[6] اور لاک[7] نے اپنے عہد کی سائنسی فکر ہی کو فروغ دیا۔ اسپائی نوزا[8] کا فلسفۂ وحدت الوجود ان حالات ہی کا ردِ عمل تھا۔ کلیسا اور سائنس کے مابین تصادم شروع ہوا۔ اور آخرکار جدید شعور کو ۱۷۸۹ء میں اس وقت پاؤں جمانے کا موقع ملا جب فرانس انقلاب کے عمل سے دوچار ہوا۔ مخالف سائنس کلیسا کا فکری جادو ٹوٹنے لگا۔ مزاحمتیں کمزور پڑنے لگیں اور مینی فلسفوں کے مکاتیب داغِ فراقِ صحبتِ شب کا سماں پیش کرنے لگے۔ نئی سائنس کے فکری نتائج معاشی مفادات کے لئے بھی ممد و معاون ثابت ہو رہے تھے۔ صدیوں سے ٹھہرے ہوئے معاشرے میں ہلچل پیدا ہو چکی تھی۔ اور تغیر رازِ حیات و کائنات تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ اٹھارویں صدی میں ڈارون[9] لامارک[10] اور فوسٹر[11] کے ارتقائی نظریات، طبیعیات و ریاضی کے لئے سہارا بنے۔ ڈالٹن[12] نے مادے کی ناقابلِ تقسیم اکائیت کو قانون کہا۔ یورپ میں اٹھارویں صدی مادیت کا سیلاب بن کر آئی اور مذاہب کی مابعد الطبیعیات[13] کا پورا ڈھانچہ منہدم ہو گیا۔ ہیگل، نیٹشے اور کانٹ کے فلسفیانہ افکار سے فروغ پانے والی جرمن عینیت پسندی کی تحریک بھی مادیت کے سیلاب کی راہ نہ روک سکی۔ انگلستان جیسے پسماندہ اور تاریک جزیرے کا ابھرتا ہوا تاجر اور نو دولتیا طبقہ دانشمند تھا۔ چنانچہ اس نے سائنسی فکر کے خلاف ابھرنے والی تحریکات کو نظر انداز کر کے صنعتی انقلاب کی طرح ڈالی۔ انگلستان میں مادیت کا دریا بہہ نکلا اور صنعت کاروں کے مفادات کو سہارنے والے سیاسی نظام نے مشرق کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ سوچنے والے تخلیقی ذہنوں کے لئے اچانک بدلتی ہوئی یہ فضا یکسر اجنبی تھی چنانچہ ایک مختصر سے گروہ نے کلاسیکی روایات اور مروجہ اخلاقی ضابطوں کو بچانے کی سعی کی تو ایک طبقے نے عقائد و اقدار کے بکھراؤ کو روکنے کے لئے سو جتن کئے اور تیسرا مکتبۂ فکر ادب کی رومانی تحریک لے کر اٹھا جس کی گونج انگلستان سے فرانس تک سنی گئی۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں صنعتی انقلاب کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ ان دنوں ہمارا برِصغیر بدستور کلاسیکیت کے خول میں بند تھا۔ یہاں کی تہذیبی معاشرتی اور سیاسی سطح کم و بیش چودھویں صدی کے یورپ جیسی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں مارکس کے افکار و نظریات کو قبولیت حاصل ہوئی، عینیت پسندی، خیال آفرینی اور کلاسیکیت و رومانیت کے اثرات کو مارکس اور میتھیو آرنلڈ کی حقیقت پسندی اور معروضیت نے کمزور کر دیا۔ انگلستان میں اصلاح کی تحریک درحقیقت سائنسی حقائق سے مفاہمت کی طرف ایک قدم تھا جس نے ادب میں مادیت اور حقیقت پسندی کے شعور کو عام کیا۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں اس شعور کے علمبردار روس، انگلستان اور فرانس تھے۔ اردو میں غالب ان اثرات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد برِصغیر کی سیاسی بساط الٹی تو سرسید، حالی اور شبلی نے حقیقت پسندی اور سماجی مقصدیت کو ادب کی تحریک بنا دیا۔ ان بزرگوں نے برِصغیر کی فکری تاریخ میں پہلی بار خیال کو مادے کی پیداوار اور ادب کو حیات و کائنات کا ترجمان تسلیم کیا۔ اس نے ادبی شعور کا ردِ عمل رومانی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ کیونکہ حالی کی تحریک کے بعد دیوبند کی فکریات اور مولانا محمد علی کی جد و جہد کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد حقیقت پسندی اور مادیت کا رجحان ادب اور معاشرے کی رگ و پے میں اتر گیا ——— برِصغیر میں واقعۂ تقسیم تک مادیت، معروضیت، حقیقت بینی اور خارجیت کا بخار جس تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ یورپ میں اس کے برعکس نیوٹن کی سائنسی فکر اور اس فکر کے سہارے تشکیل پانے والے مارکسی اصولوں کو نئے چیلنج کا سامنا تھا۔ آئن اسٹائن اور اس کے معاصر ماہرین نے ایسے انقلاب آفریں اور سابقہ حقائق کو ریزہ ریزہ کر دینے والے انکشافات کئے کہ مارکس جیسا معتبر فلسفی بھی لرزاں و ترساں نظر آنے لگا۔ حقیقت پسندی اور عینیت پسندی کے امتزاج، عقل و وجدان کے انبساط اور روح و مادے کی یکجائی پر مبنی نظامِ فکر نے اپنا جادو جگایا۔ وڈین جرم محققوں کے بعد یہ دعویٰ کہ ہمارے آبا و اجداد بندروں کی کسی نسل سے تعلق رکھتے تھے کچھ مشکوک سا ہو گیا ہے۔ سائنسی افق پر نئے انقلاب کی دھمک تو انیسویں صدی کے اواخر ہی سے سنائی دے رہی تھی۔ لیکن بڑا اور فوری انقلاب ۱۹۰۵ء کے بعد اس وقت نمودار ہوا

---

۵ سات رنگ

۶ ۱۵۸۸-۱۶۷۹

۷ ۱۶۳۲-۱۷۰۴ء

۸ ۱۶۳۲-۱۶۷۷ء

۹ ۱۸۰۹-۱۸۸۲ء

۱۰ ۱۷۴۴-۱۸۲۹ء

۱۱ ۱۸۴۸-۱۹۲۵ء

۱۲ ۱۷۶۶-۱۸۴۴ء

۱۳ مذاہب سے مراد قبل از اسلام کے مذاہب ہیں

جب آئن اسٹائن نے زمان ومکان کی اضافیت اور کوانٹم کی ریاضیات مکمل کرلی۔ ہائی زن برگ[18] نے امکانیت کے اصول کا اعلان کیا اور الکٹرانی جست[19] کا نظریہ وضع ہوا۔ ان انکشافات سے نیوٹن کی مادی طبیعات کے اکثر ضوابط ایک خاص سطح سے گذرنے کے بعد مجذوب کی بڑ ثابت ہوئے۔ آئن اسٹائن نے واضح طور پر کہا کہ مادہ معدوم ہو رہا ہے اور کائنات حوادث و واقعات کا ایک نظام ہے۔ مطلق اور خیالی جوہروں کو بعض مراحل پر حقیقت کا ماخذ تسلیم کرلینا ناگزیر بن جاتا ہے۔

اس فکری انقلاب اور تیکنکی سیلاب کا نتیجہ مغرب میں صنعتی۔ خلائی اور ایٹمی ترقی کا طوفان ہے۔ پچھلی دو دہائیوں نے معاشرتی تہذیبی اور معاشی سطح پر مغرب کے پورے چہرے اور اس کی کل شخصیت کو بدل ڈالا ہے ان حالات میں بھی اگر آپ ان بندر گوں کے جذباتی فیصلوں کو سچ تصور کرتے ہیں۔ جن کے مطابق جنگ عظیم اوّل کے بعد ہی سے مغربی تمدن اپنے ہاتھوں خودکشی کا آغاز کرچکا تھا۔ تو اس حادثۂ وقت کو کیا کہا جائے۔ کیا اس حقیقت میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے کہ آج ایشیا اور افریقہ جس طرح مغربی تہذیب۔ سیاست اور معاشی استحصال میں جکڑ گئے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی اور اقبال کے زمانے میں صورتِ حال ایسی شدید نہیں تھی۔ مغرب میں رفتار کی بے پناہ ترقی اور تسخیرِ قدرت کے عمل سے حاصل ہونے والی کامیابیاں نئی صنعتی و تکنیکی ایجاد کا سبب بنی ہیں فرانس اور امریکہ کے بعض حساس حلقوں میں خودکاری اور مشینیت (AUTOMATISATION MECHANISATION) کارِ ذہنِ عمل فرار خوف اور دنیا سے بیزاری کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ چنانچہ ایمجزم۔ نئی علامت نگاری۔ ابہام وجودیت۔ لاشعور۔ تحلیلِ نفسی۔ لسانی تشکیلات اور عینی جمالیات جیسے خود ساختہ فلسفوں نے سر اٹھایا ہے عالمی سطح پر سیاسی اور معاشی اثر و رسوخ قائم کرنے والی سیاسی قوتوں نے اپنے بعض مفادات کو تحفظ دینے کی خاطر ان رجحانات کو آگے بڑھ کر گلے لگایا۔ اس حکمتِ عملی نے ادب اور زندگی کے رشتوں، عالمی انسان دوستی۔ امن۔ محبت واخوت اور حقوقِ انسانی کے حصول کی جد و جہد کے شعور کا راستہ روکا ہے۔ اس پورے خود ساختہ فکری عمل کے لئے سائنس کی نئی حقیقت پسندی اور مادے کے تازہ تصور میں کوئی جگہ نہیں ہے!

یورپ میں پروفیسر وہائٹ ہیڈ اور رسل نے فکری سطح پر سائنسی انکشافات کی تعبیر و تشریح کا فرض ادا کیا ہے، اور اس طرح منطقی ایجابیت کو راہ ملی ہے۔ ادب میں وجدانی تخیل اور حسی تجربوں کی جلا وطنی کا دور ختم ہوا ہے۔ اور اہلِ تصوف کے طرزِ اظہار اور اندازِ نظر کو بھی اعتبار حاصل ہوا ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں طبیعات کی مابعد الطبیعات نے علوم و ادبیات کو حقیقت پسندی اور عینیت پر مبنی مادیت کا شعور دیا ہے اسی حقیقت کو آئن اسٹائن نے سائنسی عینیت (SCIENTIFIC IDEALISM) کا نام بھی دیا ہے۔ اس نئے فکری نظام نے انسانی فطرت اور اس کے ذہنی عوامل کو تیز کرکے انسان کو بہتر طریقے پر سمجھا ہے اور میکانکیت و مادیت کے اقدار میں خلوص و وفا اور برادری واخوت کا عالمگیر احساس دوبارہ سرایت کر رہا ہے[20]۔

اُردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ اس کے آئینہ خانے میں یہ شعور باقاعدگی اور نظم و آہنگ کے ساتھ نہیں ملتا ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل کے عرصے میں کسی فکری دھاعرے کے اثر کا مسئلہ یوں خارج از بحث ہے کہ ان دنوں جنگِ آزادی کے شعلے فروزاں تھے۔ لیکن، تقسیم کے بعد اس فقدان کے لئے کوئی جواز تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ شروع میں حقیقت پسندی، سماجی شعور زندگی کی ترجمانی اور مقصدیت کو ادب کے لئے شرط تصور کرنے والوں نے مقامی پس منظر اور عالمی سطح پر قبول کئے جانے والے زیرِ بحث فکری میلانات کو محسوس کرنے کے بجائے آنکھیں بند کرلیں اور اپنی بوطیقا کو بغیر کسی اضافوں کے رائج کرنے کی سعی بیکار میں اس حقیقت کو بھول گئے کہ نئی فکر نے حیات و کائنات کے پورے سسٹم کو نئے معنی دیئے ہیں۔ ادب کے ذریعہ نظریاتی لائحہ عمل کی تشہیر کرنے والے خطوں میں بھی ۱۹۶۰ء کے بعد فکری سطح پر نئے تغیرات کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ہمارے ادبی اساتذہ کی غلط روی نے ترقی پسند شعورِ ادب سے نشو و ارتقا اور تبدیلی کا وہ عمل بھی چھین لیا۔ جس کے فروغ کی سب سے نمایاں کوشش اسی شعور کا کارنامہ تھا۔ اس قسم کا سخت گیر رویہ بتاتا ہے کہ کچھ لوگ فن و ادب کی قدروں کے سہارے سیاسی مفادات کے حصول کی سعی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قوم۔ قومیتوں اور زبانوں جیسے مباحث

نہ کہ اسلام۔ یہ وضاحت یوں ضروری ہے کہ برصغیر کے جاہلِ ملک کا ایک فرقہ لفظوں اور جملوں کو من مانی معنی دے کر فتنہ و فساد اور نفرتوں اور فرقہ وارانہ پاگل پن کا مظاہرہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

[17] ۱۸۳۱-۱۸۷۰ء

[18] ۱۸۱۴-۱۸۹۲ء

[19] ۱۸۰۴-۱۸۷۲ء

[20] آئن اسٹائن، اسپائی نوزا کے وحدت الوجود سے بہت متاثر تھا۔ سب سے پہلے نامیاتی ارتقا کا تصور ابن مسکویہ نے پیش کیا تھا کہ ڈارون

ہماری ادبی و فکری دنیا میں عام ہوتے گئے اور کلچر کی بحث کا بخار بڑھنے لگا۔ علم و ادب اور فن و ثقافت کے لئے کم از کم ایک حقیقت تو طے شدہ ہے کہ وہ براہ راست سیاسی اور نظریاتی عزائم کے حصول کا وسیلہ نہیں ہو سکتا ہے اور اس کو حصول مقاصد کے لئے یوں استعمال کرنا بہرحال علمی و فکری اور ثقافتی و فنی شعبہ کو بے اثر بنا دینا ہے اس صورت حال کا اندازہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ ۵۲ء کے بعد اُردو میں تنقیدی روایت کی تکمیل کرنے والی زیر نظر تحریک نے اب تنقید سے بھی فرار اختیار کر لیا۔ تنقید کی فعال روایت ٹھہر گئی اور زوال آمادہ نقد و نظر کی فضا کسی وہائٹ ہیڈ اور کسی رسّل کا انتظار ہی کرتی رہ گئی۔ ادب میں تازہ ہوا کے جھونکوں کو اندر آنے کے لئے کُھلے ہوئے دریچے نہ ملے۔ نئی سچائیوں، عصری صداقتوں اور مقامی تقاضوں سے مفاہمت کر کے ترقی پسند شعور نیا نظام فکر نہ بنا سکا۔ نئی عینیت۔ روحانی ارفعیت داخلیت اور وجدان کو قبول کرنے کے بجائے مفادات کی خاطر ادب کی رہنما قوتوں نے فن و ادب کے عظیم مقاصد کو یکسر نظر انداز کر دیا اور وہ ادبی و علمی شعور جو غالب سے برصغیر کی تقسیم تک بڑھتا پھیلتا رہا اب ایک جگہ رک سا گیا نئی نسل کے سامنے کوئی فکری تحریک تھی۔ نہ تنقیدی مکالمے اور نہ کوئی نئی بوطیقا۔ اس ویران فضا میں ترقی پسند شعور سے استفادہ کرنے والے نئے ذہنوں نے انفرادی سطح پر رومانیت، قومی شعور، داخلیت۔ وجدان اور تہذیبی دینداروں کو اپنی تخلیقی دنیا میں جگہ دی لیکن یہ نو ترقی پسند (NEO - PROGRESSIVE) رویہ مستقل رجحان یا تحریک نہ بن سکا۔ سائنس کی تکنیکی باریکیوں اور ریاضی کے نتائج کی امکانیت اور اس کے ابہام نے تخلیقی ذہنوں کیلئے سائنسی فکر کی تفہیم کو بھی کم و بیش ناممکن بنا دیا[21]۔ ان حالات کا نتیجہ انتشار اور بکھراؤ کا سلسلہ تھا۔ سیاسی حالات اور تجارتی مفادات بھی اس عمل کے حق میں تھے۔ آخر ش خلا پیدا ہوا اور پھر اس خلا کو لایعنی نظریات کی درآمد کے طوفان اور نری پیروئ مغرب کے رجحان نے پُر کرنا چاہا قاری نے پوری قوت کے ساتھ اس رجحان کو ٹھکرا دیا۔ اور نام نہاد جدیدیت[22] کے پیرو اپنی ہی شکست کی آواز سن کر بحران کا شکار ہوئے۔ محرومی اور مایوسی سے بچنے اور سماج میں سر اونچا رکھنے کے لئے ان کا دعویٰ کہ فنکار فن اپنی ذات کی تسکین اور انا کی آسودگی کے لئے تخلیق کرتا ہے ایک ڈھال تھا۔

دنیا کی تمام بڑی زبانوں کے ادب میں انسانی اقدار اور روح و فطرت کی نغمگی دکھائی دیتی ہے۔ شاعری کل کے دھارے میں رہتے ہوئے حیات و کائنات کی ترجمانی کا فریضہ ادا کر رہی ہے۔ کل جس حقیقت پسندی، خلوص خارجیت اور معروضیت نے کلاسیکی طبیعات کے فیصلوں کو حرف آخر جان کر انسانی سماج سے اس کا باطنی حسن اور خلوص و انسانیت کے جذباتی رشتے چھین لئے تھے۔ نئی فکر نے ادب اور زندگی کے تمام رشتوں کی تقویت کے ساتھ اس کی واپسی کو راہ دی ہے[23]۔ اُردو ادب ابھی اس نئی بہار سے کچھ زیادہ مانوس نہیں ہے۔ یہاں روح و مادے کی وہ ثنویت جو نئی سائنسی فکر کی اساس ہے۔ ابھی ظہور پذیر ہو کر کسی تحریک کی صورت مقبول نہیں ہوئی ہے۔ تنقیدی شعور ناپید ہے اور تحسین آمیز تجزیات تبصروں اور تشریحی مضمون کو تنقید کا درجہ ملا ہے۔

وجود کو زندہ رکھنے اور منوانے کی شدید خواہش جو صحافت سے لو لگانے۔ پبلک ریلیشنگ تقاریب، صفائی تقریباتی مقالات کے اہتمام۔ سووینیر کی اشاعتیں جرائد اخبارات کے تبصرے۔ کالم نویسی کے سہارے اور "من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو" جیسی صورتوں میں عام ہو چکی ہے ان حالات ہی کا نتیجہ ہے۔ ہمارا ادب اس منزل پر رکا ہوا ہے۔ جہاں نہ کوئی سمت ہے اور نہ راستہ، نو حقیقت پسندی (NEO-REALISM) اور نو ترقی پسندیت (NEO-PROGRESSIVISM) کی ایک فعال اور منظم تحریک جو صرف اور صرف علم و ادب اور فن و ثقافت تک محدود ہو اس بے سمتی اور بے راہ روی کے زہر کا تریاق بن سکتی ہے[24]۔

---

[18] آئن اسٹائن اس اصول سے انکار کرتا ہے۔

[19] یہ نظریہ بھی سب سے پہلے النظّام (AL-NAZAM) نے پیش کیا ہے۔

[20] سائنس اور انسانی اقدار پر اظہار رائے خود آئن اسٹائن نے کیا تھا۔ برونوؤسکی نے اپنی کتاب SCIENCE AND THE HUMAN VALUE میں اس مسئلے کا جائزہ لیا ہے۔

[21] بریننگم کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں آئن اسٹائن کو سمجھنے والے کل بارہ آدمی ہیں۔

[22] "کارمی آتی نہیں گرجاتا ہے سگنل پہلے"۔۔۔ اور اس طرز کی شاعری کرنے والے بھی اسی گروہ میں شامل ہیں۔ جس کے روح رواں حسن عسکری مرحوم تھے۔

[23] الگزنڈر تریتیسن نے ۱۹۷۰ء کے خطبے میں بالتفصیل اسی موضوع پر اظہار رائے کیا ہے۔

[24] اس مقالے کی تیاری میں PHILOSOPHICAL ASPECT OF MODREN SCIENCE. مصنفہ سی ای ایم جوڈ "SCIENTIST BEHIND THE INVENTOR" مصنفہ آر بریننگم مطبوعہ بالترتیب ۱۹۳۲ - ۱۹۶۱ء آئن اسٹائن کے مضمون سائنس و مذہب ورلڈ ان سیریلائزیشن مصنفہ برنس ۱۹۴۱ء وغیرہ سے مدد لی گئی ہے۔

.. A.N.

منیر نیازی

تسلّی

ابھی اور کچھ دن اکیلے پھرو
ہواؤں سے دل کی کہانی کہو
سیہ بادلوں سنگ روتے رہو
کبھی چاند کو تک کے آہیں بھرو
بہت جلد وہ شام بھی آئے گی
نئی چھب نگاہوں کو بہلائے گی
مہک گزری باتوں کی مٹ جائے گی
کوئی یاد دل میں نہیں آئے گی

مَیں اور شہر

سڑکوں پہ بے شمار گلِ خوں پڑے ہوئے
پیڑوں کی ڈالیوں سے تماشے جھڑے ہوئے
کوٹھوں کی ممٹیوں پہ حسیں بت کھڑے ہوئے

سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستا نہیں
ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں

سپیرا

میں ہوں ایک عجیب سپیرا
ناگ پالنا کام ہے میرا
پیلے پیلے، کالے کالے
رنگ برنگے دھبوں والے
شعلوں سی پھنکاروں والے
زہریلی مہکاروں والے
ان کی آنکھیں تیز نشیلی
گہری جھیلوں ایسی نیلی
ننھے لہو سے لال زبانیں
جیسے موت کی رنگین تانیں
مخمل کے رومالوں جیسے
سرخ گلابی گالوں جیسے
مجھ کو تکتے رہتے ہیں یہ
مجھ کو ڈستے رہتے ہیں یہ
مجھ پر ہنستے رہتے ہیں یہ

اطہر نفیس

خوف

میری طرح سے
اپنے اندر چھپ کر بیٹھو
ذات کی تنہائی میں گوشہ گیر رہو
تم کو تم سے
چرانے والا
دُور کہیں لے جانے والا
حرص و ہوا کا بزدل جھونکا
تاک میں ہے
میری تمہاری خاک میں ہے!!

صہبا اختر

خواہشیں

میں اپنا اظہار چاہتا ہوں
غروبِ شامِ اجل سے پہلے
طلوعِ افکار چاہتا ہوں

عجب روش ہے غم و طرب کی
میں اس کہانی میں روز و شب کی
خود اپنا کردار چاہتا ہوں

خموشیوں سے بھرے جنوں میں
سکوت کے بیکراں فسوں میں
کمالِ گفتار چاہتا ہوں

جو میرے لہجے کو تازگی دیں
جو میرے شعروں کو روشنی دیں
وہ لب، وہ رخسار چاہتا ہوں

میں ڈوب کر شعر لکھنے والا
نہ کوئی مجھ سے ملنے والا
میں ٹوٹ کر پیار چاہتا ہوں

جو مجھ کو اسلوبِ فن سکھا دے
جو میرے دیوان جگمگا دے
وہ تابِ فنکار چاہتا ہوں

حیات بھی ہے ثبات بھی ہے
جو ذات بھی کائنات بھی ہے
وہ فن کا پندار چاہتا ہوں

میں اپنے ہونے کی جستجو میں
میں زندہ رہنے کی آرزو میں
اجل سے پیکار چاہتا ہوں

حجاب ادراک سے کٹے ہوں
میں کون ہوں اور کس لئے ہوں
کشودِ اسرار چاہتا ہوں

جو اہلِ فن کی شگفتگی ہیں
جو میرؔ و غالبؔ کی زندگی ہیں
کچھ ایسے اشعار چاہتا ہوں

خدائے برتر، میں تیرا بندہ
تجھی سے میرے ہنر کا رشتہ
تجھی سے اقرار چاہتا ہوں

جولائی ۱۹۷۹ء

نظم

درخت کی شاخیں سمندر میں ڈوب گئیں
آسمان پر شہر کا عکس نظر آیا
کسی نے مجھے آگ میں پھینک دیا
ہوا بند ہو گئی
زندگی کرب اور اذیت بن گئی
مرنے کے سوا آرام کی کوئی صورت نہیں
پرندے چیخ رہے تھے
پرندے سب کے سب کالے تھے
انسان دیواروں کی طرح بے جان ہو گئے
میں پاگل تو نہیں ہو گیا ؟
خودکشی کرنے کی خواہش نہیں ہوتی
مرنے کو جی چاہتا ہے
موت اپنے آپ نہیں آتی
کسی نے مجھے آواز دی
میرے اندر بارش ہوتی رہی
لیکن میں آگ میں جلتا رہا
ستارے خاموش تھے
سورج اور چاند نے کچھ نہیں سنا۔
پہاڑ اندھے ہیں
میں انسانوں کے درمیان زندگی کرتا ہوں
میرے ساتھ کوئی نہیں
کس نے مجھے ایسا کر دیا
میں خود کی تنہائی میں ڈوب چکا ہوں
اب کوئی راستہ نہیں
میرے خیالات اور خواب صرف میرے ہیں
میں ایک درخت ہوں
شہر پر آسمان گر رہا ہے

ماہنو

نظم

آسمان پھیلتا جائے گا
زمین ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی
اور زمین آنسوؤں میں بہہ جائیں گی
وہ دریا جو انسانوں کے درمیان بہتا تھا
پیاس کے ریگستان میں جذب ہو گیا
ہم اپنے شہر کے ساتھ زندہ ہیں
جب ہمارا شہر مر جائے گا
ہم بھی زندہ نہیں رہیں گے
وہ کہانی جو آج سے ہزاروں سال پہلے
انسان نے لکھنی شروع کی تھی
انسان کے خاتمے کے ساتھ
اپنے انجام کو پہنچ جائے گی
پانی میں ڈوب کر نہیں
آگ میں جل کر
زندگی کی ساری کثافتیں ختم ہو جائیں گی
جب انسان نہیں ہو گا
اور یہ زمین بھی نہیں ہو گی
تو یہ کائنات
پاکیزگی کا ایک عظیم خلاء بن جائے گی۔
اور آسمان ہمیشہ پھیلتا رہے گا

پھولوں سے دھواں اٹھ رہا ہے
مجھے جسموں سے ڈر لگتا ہے
میں اپنے اندر سمٹتا جا رہا ہوں
میں زمین میں اتر جاؤں گا
میں ختم ہو جاؤں گا
میں شور نہیں کروں گا
آہستگی سے
خاموشی سے

زاهد ڈار

نظم

گھاس کی کوئی آواز نہیں ہوتی
انسان پر ظلم کون کرتا ہے ؟
کیا انسان محبت کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے
کیا میری محبت کچھ بھی نہیں ؟
کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے ؟
کیا تمہیں انسانوں سے خوف آتا ہے ؟
کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اپنی خواہشوں سے خوفزدہ ہو ؟
رات کے وقت ستارے آج بھی دکھائی دیتے ہیں
تمہاری آنکھیں کہاں ہیں ؟
کبھی زمین پر چل کر دیکھو
کبھی اندر جھانک کر دیکھو
کبھی لوگوں سے دور جا کر دیکھو
کبھی بے کار اور بے مصرف ہو کر دیکھو
اور سوچو
دکھ اور اذیت اور بے بسی کہاں سے آتے ہیں ؟
انسان پر ظلم کون کرتا ہے ؟
پانی کا بہاؤ تیز ہے
لیکن پانی سوچ نہیں سکتا
ہوائیں اندھی ہیں
سورج بے نیاز ہے
ہمارا اس کائنات میں کوئی دوست نہیں ،
کوئی دشمن نہیں
ہمارے سوا

عطا شاد

نقد گاہِ خرید

اک وہی تو ایسا
متاعِ بے بہا تھا
اک وہی تھا
ابھی،
جو نہیں بکا تھا
تم نے تو اُسے بھی
روند ڈالا
تم نے تو اسے بھی،
بیچ کھایا
اس نقد گہِ خرید میں تو اے شادؔ
لے دے کے، ضمیر رہ گیا تھا

اے عاقبت اندیش بے صوت وصدا

بجھنے سے قبل
چراغ کی لَو
سکرات سے پہلے
چپ آنکھیں
طوفانِ طلاطم
ٹھہراؤ

وہ بندِ نظر کی دستک سے
جیسے کوئی سورج ٹکرائے
اے عاقبت بے صوت وصدا!
اے عاقبتو بے صوت وصدا!!

سفرِ کوتاہ

تم نے چاہا بھی،
ہم نے سمجھا بھی
تم نے سوچا بھی
ہم نے جانا بھی
مسئلہ ہی نہ تھا، بہم ہونا
مسئلہ ہے کہ ہم بہم نہ ہوئے
ہم بھی ایسے نہ تھے سفر کوتاہ
تم بھی ایسے نہیں تھے زود قدم
عام رفتار تھا، زمانہ بھی،

شاہین مفتی

اِک بات ٹھہر جائے

ترے ہونٹوں کی کونپل پر
ستارہ سا جو اک لمحہ
بڑی مدت سے ٹھہرا ہے
سماعت کے بیاباں میں
اُگ چکے
تو شاید اس کی حدت سے
مرے تن کے پرانے پیڑ پر روشن رتیں جاگیں
ثمر باری کی خواہش
نامرادی کے سیاہ موسم میں
سارے شاخوں کو سبدِ گل کر دے
اسے اذنِ رفاقت دے
ذرا ہونٹوں کو جنبش دے

کب آئے ہو

بے چراغ بستی میں
خواب لے کے آئے ہو
یہ بڑی سعادت تھی
قحط کے زمانے میں
لیکن اس کا کیا ہو گا
کم نصیب دیوانے
نامراد آنکھوں کو
رہن رکھ چکے شاید
ایسی نیند کے بدلے
جو کبھی نہ آئے گی
تم نے دیر کر دی ہے

ایوب خاور

یاترا ابھی ختم نہیں ہوئی

شام
سورج اور چاند کے درمیان ایک سازش ہے
تم اپنا سفر جاری رکھو
یہ نہ کہنا
کہ آنکھیں سفید سمندر دیکھتے دیکھتے
تھک گئی ہیں

جزیروں کی آواز
پرندوں کی پرواز تک ہے
تم اپنا سفر جاری رکھو
تم اپنا سفر جاری رکھو
کہ تم
سورج اور چاند کے درمیان
گھاس کی زرد پتّی کی طرح برف کے میدان میں
سبز درختوں سے جنگ کر رہے ہو

بلند ہو
کہ موسم زمین سے بلند ہو کر بہتے ہیں
ابھی تمہاری عمر کا آخری لمحہ باقی ہے
ابھی
آنکھوں کے بادبان
مت گراؤ
یاترا
ابھی
ختم
نہیں
ہوئی

آخری سپاہی

بیر بہوٹی
بچھوؤں کے جنگل کو
شہر کون کہے
تو پانیوں سے بھرے ہوئے بادل دیکھ کر جاگی تھی
تجھے کیا معلوم
چیمبر آف کامرس کی شاخیں
آدم خور جھاڑیوں کی طرح اُگ رہی ہیں
اور بچھو
ان جھاڑیوں میں بیٹھ کر
صفر کی قیمت صفر سے نکال رہے ہیں
بیر بہوٹی
تیرا سفر سبز راستوں پر شبنم کی نیند تک
اور تیرے سر پہ پانیوں سے بھرے ہوئے بادل بے ستون خواب
اے میری ذات کی مسافر
سورج ڈوبنے سے پہلے
یہاں رک جا
کہ محبت
بچھوؤں کے جنگل سے آنے والی نفرت کے لئے
ایک چیک پوسٹ ہے
اور میں
اس چیک پوسٹ کا آخری سپاہی ہوں

ایوب خاور

عمر بیت جانے کیلئے ہے

عمر بیت جانے کے لئے ہے
مگر اک بات
اپنا آپ بتانے سے پہلے
خوشبو
آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے پانیوں سے بہت دور
ساکت دعاؤں کی طرح اُداس،
اور لکڑی کے مجسموں جیسا سناٹا
سینے پر بوڑھے پادری کے ٹھنڈے ہاتھوں کی طرح لگتا ہے
ہر بار جھاگ اڑاتے ہوئے پانیوں میں
جب نیلے درختوں کے الاؤ جلتے ہیں
تو موسیقی اپنے سروں سے نکل کر
شمعدانوں میں پگھلنے لگتی ہے

تب میں کہتا ہوں
مگر لوگ نہیں مانتے
میں کہتا ہوں کہ ہمارے درختوں کی جڑوں میں
کیچوے اور سبز بوٹیاں گڈمڈ ہو گئے ہیں
اور ہم اپنے گھروں سے دور
دھولی فیل تے کے بستروں میں سرخ بادبان اوڑھے
کسی جزیرے کے منتظر ہیں
اور یہ کیسی خوفناک بات ہے
یعنی جزیروں کا اعلان کرنے والے پرندوں کو واپس بلا لیا گیا ہے
ابھی ایک لمحہ گزرے گا
یا شاید نہیں گزرے گا

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے بادبان "لیبروڈم" جیسی کہاوتوں میں بدل جائیں
اور سوکھالوں پر دندناتا ہوا پانی
ہمارے بالوں کی جڑوں میں گرہیں ڈال دے
عمر تو بیت جانے کے لئے ہے

جولائی ۱۹۷۹ء

مورانو
ترا جم : تبسم کاشمیری

پُل

رات کو شہر میں
ہزاروں زخموں میں سے
لہو پھوٹ پڑتا ہے

جہاں شہر کا پل ختم ہو جاتا ہے
وہاں سے یہ لہو بہتا ہوا آتا ہے
نہر جو جامد اور بھدی ہے
یہ پل جو نہ مستقبل کی طرف جا رہا ہے
اور جو نہ ہی ماضی کی طرف سے آ رہا ہے
اس کنارے سے اس کنارے تک
یہ پل ایک مردہ لہر پر لٹک رہا ہے
اور محض دو راتوں کو آپس میں جوڑ رہا ہے

جب رات بھیگ جاتی ہے
اس پل کی چوٹی پر
ایک بوڑھا مرد اور ایک دوشیزہ ظاہر ہوتے ہیں
اور وہ پُراعتماد نظر نہ آتے ہوئے
یونہی ایک دوسرے کو گلے لگاتے ہیں

تسوباسے

برف کا دریا

کمیاب پھولوں کو دیکھتے ہوئے
دن گہرا ہوتا ہے
پھولوں کے گرد
ہوا اور زیادہ سرد ہو جاتی ہے
حتیٰ کہ اب کوئی پتنگا بھی نمودار نہیں ہوتا ہے

کہیں سے کوئی خط نہیں آیا
خزاں کی راتیں
کیڑوں کی آواز
پانی کی طرح بہتی ہے

رات کے دوران میں کیڑوں کی چیختی ہوئی آواز
کیا چاہتی ہے؟
میرے اندر یہ بہتی ہوئی آواز داخل ہوتی ہے
اور بالآخر ایک برف کے دریا میں بدل جاتی ہے۔

تراجم: تبسم کاشمیری

سٔرو

ٹراؤٹ کے سائے

ٹراؤٹ مچھلیاں کہ جن کی پشت پر سیاہ تل ہیں
دریا کے کنارے، سورج کی روشنی میں تیر رہی ہیں
یہ مچھلیاں کئی قطاروں میں ہیں
اور ان کے ہلکے نرم جسم چمک رہے ہیں
سفید ریت پر ان کے سائے
عکسی تصویر کی طرح پڑ رہے ہیں
سائے جو کبھی لمبے ہوتے ہیں اور کبھی چھوٹے
اور کبھی مدہم
حتیٰ کہ موتیوں میں ڈھلتے ہوئے پانی کے سائے بھی
ریتلی تہہ کی طرف گرتے چلے جا رہے ہیں
کبھی ہلکے دھیمے شور سے ٹراؤٹ ششدر ہو کر
پھولوں کی طرح بکھر جاتی ہیں
اور کبھی دوبارہ جمع ہو جاتی ہیں
ایک ٹراؤٹ جو اپنی جماعت میں دوسروں سے زیادہ
خوبصورت اور بڑی ہے
اور جو شاندار جماعت کی رہنمائی کر رہی ہے
پانی کی لہروں پہ ذرا چڑھاؤ کی طرف ابھرتی ہے
یا غرور سے پانی کی سطح پر بلند ہوتی ہے
اور شانے چلاتی ہوئی مڑ جاتی ہے
پھر گہری پُر سکوت لہریں پیدا ہوتی ہیں
اور اس کے بعد ـــــ
دریا کے کنارے پر
صرف نوخیز پتوں کی خوشبو باقی رہ جاتی ہے

سٔرو

لوری

جب برف گرتی ہے
ایک لوری کی آواز سنائی دیتی ہے
اگلے زمانوں سے یہ آواز سنائی دے رہی ہے
کھڑکی سے، دروازے سے
آسمان سے
ایک لوری کی آواز سنائی دیتی ہے
لیکن مجھے ایسی کسی آواز کا تجربہ نہیں ہے
کہ میں بچپن میں ایسی کسی شخصیت کو نہ جانتا تھا
جسے میں ماں کہہ سکوں
کسی ایسی لوری کی یاد کیسے قائم رہ سکتی ہے؟
مگر یہ عجب ہے
کہ جس روز برف گرتی ہے
یہ آواز سنائی دیتی ہے
ایک ایسی لوری کی آواز
جس کا مجھے تجربہ نہیں
کہیں دور سے سنائی دیتی ہے

ترو با ئے

ایک ساکن رات

آج کی رات سرد، تاریک اور ساکن ہے
میری آنکھیں اور دھڑکتا ہوا دل
اور خوشنما پھول اور مسکراہٹیں
میرے لئے بے معنی ہیں
تاریک ہوا جسم میں حرکت کرتی ہے
نیند کیسے آئے؟
آدھی رات کو میز گھڑی رک جاتی ہے
میں اسے چابی دینے سے گریزاں ہوں
اس کھوکھلے کمرے میں
جہاں میں اکیلا ہوں
اور جہاں کسی معجزے کے رونما ہونے کی توقع نہیں
رات مسلسل گہری ہوتی چلی جا رہی ہے

ملک محمد رمضان، رضا ہمدانی،
قتیل شفائی، ایوب صابر
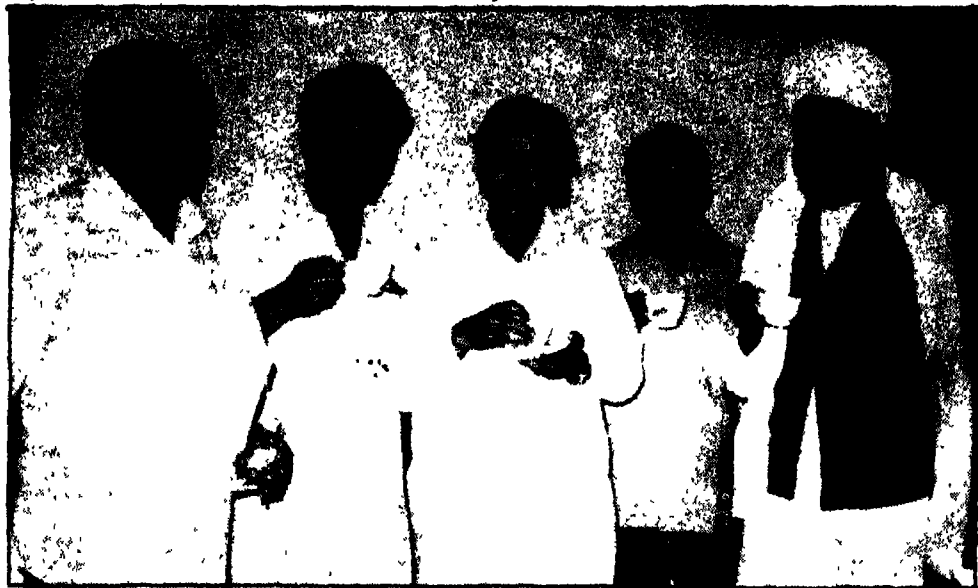
احمد ندیم قاسمی، احسان بٹالوی، قتیل شفائی،
ڈاکٹر کرسٹوفر شیکل، اسرار زیدی، حسن رضوی
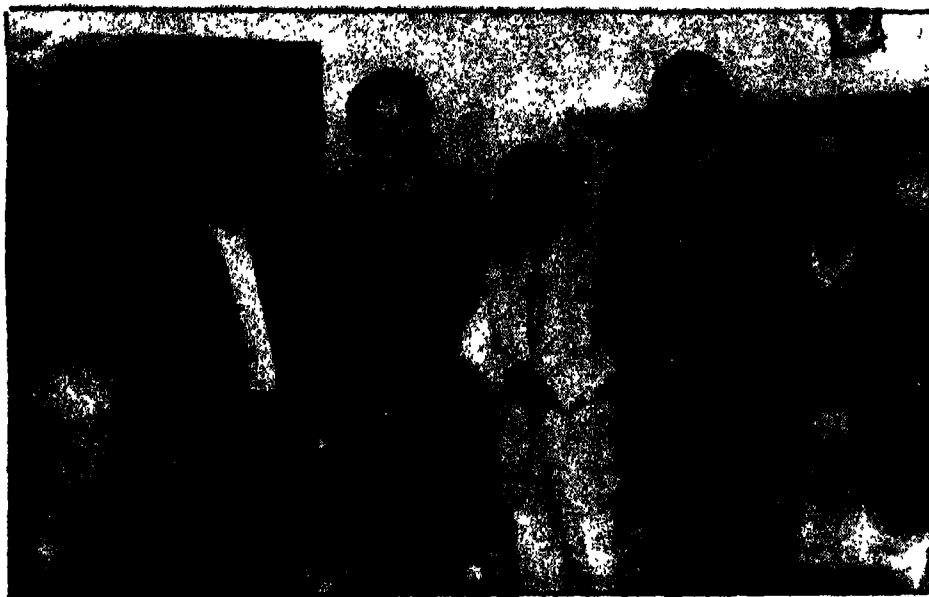
قائم نقوی، زمان کنجاہی، اختر محمود کا
پرویز بابر، مستنصر حسین تارڑ

حفیظ صدیقی، امداد ہمدانی
طالب قریشی، تنویر سپرا
اور دوسرے لوگ
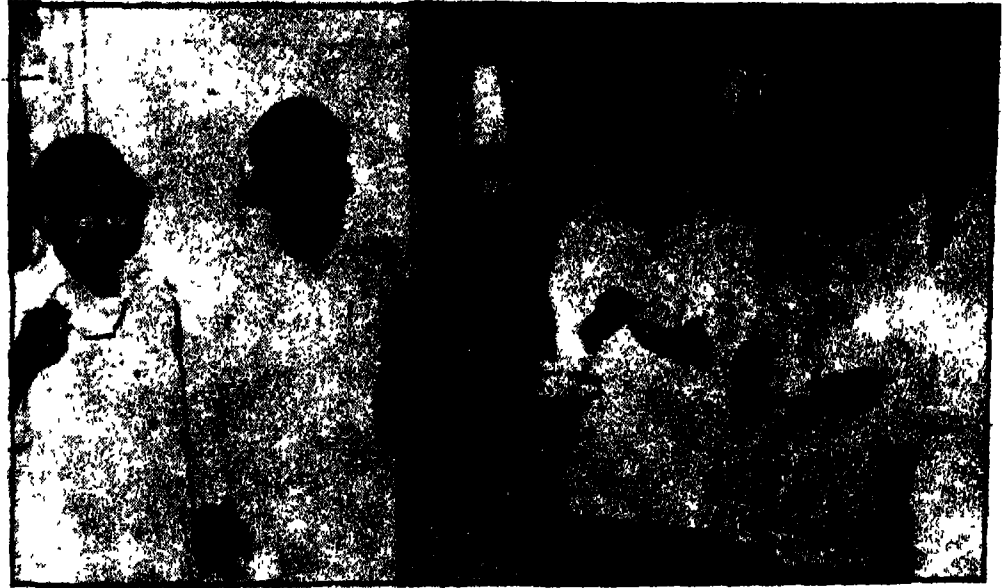
قائم نقوی، حفیظ صدیقی
صورت خاں مری،
اشراف حسین احمد
عبدالکافی ادیب

خالدہ حسین
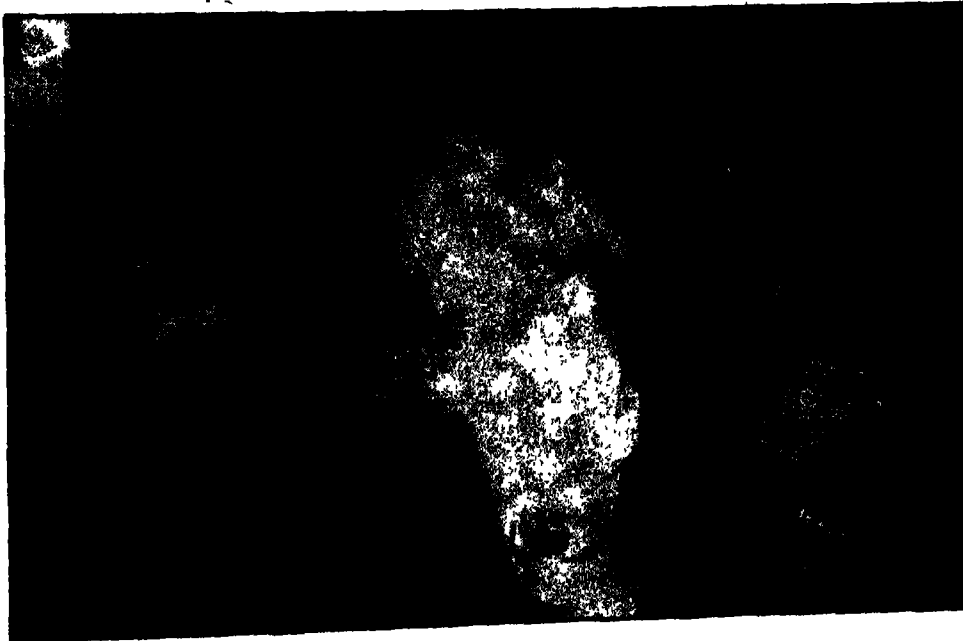
بایاں ہاتھ

جناب والا - میں سچ کہوں گی - بالکل سچ - پورا سچ اور کچھ نہیں مگر سچ، گو کہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے بھی میں نہیں جانتی کہ سچ کیا ہے - یہ تو ایک ایسی شبیہ ہے جو کوئی ایک دیکھے تو سیاہ - بالکل سیاہ نظر آتی ہے - کوئی دوسرا دیکھے تو روشن - چمکتی دھوپ ایسی روشن، تو کیا یہ کوئی آنکھ کا نقص ہے - دونوں میں سے کون آشوبِ چشم کا شکار ہے - بہرحال یہ تو بالکل غیر متعلق سی بات بیچ میں آن پڑی تھی۔

میں تو بات اس لمحے سے شروع کرنا چاہتی ہوں گی۔

جب اپنے حواس پر سے میرا ایمان اُٹھ گیا - وہ دن بڑا تباہی کا دن تھا - صد حیف اس دن پر کہ جب میں نے ایک دم یہ جانا کہ دنیا سے رنگوں - خوشبوؤں اور آوازوں کا تنوع مر گیا - ہر چیز کا ذائقہ ایک سا ثقیل تہہ میں زبان پہ جمنے لگا اور تمام لمس ایک سے لمس ہو گئے - بس ایک مٹیالا - زرد نیند میں ڈوبا دن ہر چیز پر محیط ہو گیا - میں نے جو چیز منہ میں ڈالی ایک مٹیالا ذائقہ چھوڑ گئی - چیزوں کے رنگ ان مٹی بھری ساعتوں میں ڈوب گئے اور اپنے پیاروں کے لمس دور دراز کے لاتعلق سایے بن گئے۔

کچھ دن تو میرے کنبے کے لوگ یہ سب کچھ دیکھتے اور برداشت کرتے رہے پھر سب کو میرے چہرے کی لاتعلقی اور آنکھوں کے خالی پن سے کوفت ہونے لگی - میرے زوج نے تنگ آ کر کہا - مجھے لگتا ہے میں کسی پتھر کے ساتھ عمر قید کاٹ رہا ہوں - مجھے اس کی یہ بات بہت پسند آئی - کیونکہ ایک عرصے سے مجھے اپنا آپ سڑک کے کنارے کھڑے، گرد میں اٹے حرف مٹے سنگِ میل کی طرح نظر آ رہا تھا - شاں شاں شاں قریب سے تیز رفتار - گاڑیاں گرد اُڑاتی چلی جا رہی تھیں اور اب ہر طرف صرف شاں شاں کی مسلسل دبی ہوئی کبھی ابھرتی ہوئی گونج تھی - شاید یہ سب باتیں آپ کو نہایت غیر ضروری اور لاتعلق نظر آئیں۔ خود مجھ کو بھی ایسی ہی نظر آتی ہیں۔ مگر پھر آخر آنکھ کو کچھ تو دیکھنا - کان کو کچھ تو سننا ہے - اگر یہ نہیں تو اس کے علاوہ بھی اور جو کچھ بھی ہے یہی ہے - شاید اب میں آپ کو الجھا رہی ہوں - میں اس تمہید کو ختم کر کے اب اصل واقعہ کی طرف آتی ہوں۔

جناب والا - جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ دن بڑا خرابی کا دن تھا - جب اپنے حواس پر سے میرا ایمان اُٹھ گیا - کچھ روز تو میں اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی - میں نے اپنے آپ کو خوب خوب کوسا کہ اے بنتِ حوا لعنت ہے تجھ پر جو تو نے اپنے آپ کو یوں نفس کے حوالے کر دیا - ہاں یہ نفس کے حوالے کرنا نہیں تو اور کیا ہے کہ انسان ہوتے ہوئے کوئی اپنے حواس کی نعمتوں سے فیض یاب نہ ہو - جی لبھانے والے رنگ دیکھے نہ میٹھی سریلی صدائیں اس کے کان میں پڑیں - انواع و اقسام کے ذائقوں کے لئے اس کی زبان مر جائے - چنانچہ میں نے اپنے آپ پر سو بار لعنت کی اور میں بہت روئی بہت گڑگڑائی اپنے خالق کے حضور کہ بس اب ایک مہیب اندیشہ منہ کھولے میرے سامنے چلا آتا تھا - وہ اندیشہ ایک عجب اٹل ساعت کا تھا - نہ ٹلنے والی ساعت۔

میں نے بہت چاہا کہ میں ایک بار پھر وہی وجود بن جاؤں جو در اصل میں تھی - وہ وجود دیکھنے والوں کو بہت بھاتا تھا - جو لطیف خوشبوؤں اور رنگوں کی شبیہ تھی - اور روح پرور موسیقی کی لہر تھی - لیکن ایسا نہ ہوا میں نے سب سے - ان سب سے جو میری ذات کے ساتھ کوئی تعلق رکھتے تھے کہا دیکھو سائیں سائیں کرتا ایک مہیب آسیب منہ کھولے میرے سامنے چلا آتا ہے - اگر اس آسیب نے مجھے نگل لیا تو تم کیا کرو گے؟ اور پھر مجھے اپنی اس بات پر خود ہی ہنسی

بھی آگئی۔ دراصل کہنا تو مجھے یہ تھا کہ اگر اس آسیب نے مجھے نگل لیا تو میں کیا کروں گی؟ آخر دوسروں کیلئے اس آنے والی واردات کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔ اور پھر کونسا تعلق ایسا ہے کہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ جب مجھے یہ احساس ہوا تو میں اپنے خالق کے حضور بہت روئی۔ گڑگڑائی کہ مجھے اس آنکھ کے عذاب سے پناہ میں رکھ کہ یہ وہ کچھ دیکھتی ہے جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے اور مجھے خود میری اپنی ذات سے پناہ میں رکھ کہ یہ بڑی سفاک ہے۔ جب اپنی جان پر ظلم کرنے پر آتی ہے تو رکتی نہیں۔ مگر جناب والا اب میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ اس وقت بھی دراصل یہ رونا۔ گڑگڑانا کچھ عجب تھا کہ اندر سے جیسے گہرے خالی کنوئیں میں سے کوئی برابر کہتا چلا جاتا تھا کہ ایسا نہ ہو تو اچھا اسی طرح ٹھیک ہے۔ ایک تاریک تجسس۔ پنجے کھولے مجھے جکڑنے کو پل پل بڑھ رہا تھا۔

جناب والا آپ ان باتوں سے یہ اندازہ نہ لگایئے کہ میں ان دنوں نارمل زندگی بسر نہیں کر رہی تھی۔ جی نہیں ابھی مجھ میں اتنی روحانی منافقت تھی کہ میں تمام دنیاوی معمولات کو پورا کر سکوں۔ اور دیکھنے والوں کو محض اتنا سا احساس ہوتا تھا کہ اس عورت کا چہرہ ایک دم سپاٹ اور خالی ہے۔ اور اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی ہے۔

بس یہ انہی دنوں کا ذکر ہے جب میں اپنے شہر کے اس بڑے اسٹور کے قریب سے گزری۔ ان دنوں اکیلے اکیلے سڑکوں پر پھرنا کچھ میرا معمول سا ہو گیا تھا۔ میں اس اسٹور کے باہر کھڑی ہو گئی اور اس کے بڑے بڑے شوکیسوں میں جھانکنے لگی۔ کچھ لیے میں نے تمام چیزیں ایک لاتعلق سے دیکھیں۔ وہی لاتعلق جو ایک عرصہ سے مجھ پر طاری تھی۔ مگر پھر وہ عجیب واقعہ ہوا۔

جناب والا مجھے یوں لگا۔ جیسے کسی نے بجلی کا تیز جھٹکا مجھے لگایا ہو۔ سن سے۔ بجلی کی تھرتھراہٹ سر سے لے کر میرے پاؤں کے ناخنوں تک پھیل گئی۔ پھر یکدم ایک عجیب طرح کی میٹھی آسودگی میرے تمام جسم میں بھر گئی اور مجھے اپنے گرد رنگ ہی رنگ۔ خوشبوئیں ہی خوشبوئیں سُر ہی سُر پھیلے نظر آئے۔ اتنی خوبصورت دنیا تو میں نے کبھی بھولے بسرے بچپن میں دیکھی ہوگی۔ جب کبھی میں ماں کا ہاتھ تھامے کھلونوں بھرے بازار سے گزرتی تھی۔ اب مجھے حیرت تھی کہ دنیا ایک دم اتنی خوبصورت اتنی رنگین کیونکر ہو گئی۔ شوکیس میں بھی خوبصورت بوتلیں اور ان پر لگے رنگا رنگ لیبل میری آنکھوں سے چپک گئے۔ وہاں ان شیشوں کے اندر رنگ و بو، حسن و موسیقی کی ایک دنیا آباد تھی۔ وہ دنیا جو میرے لئے مر چکی تھی۔ یہ دنیا خریدی تو جا سکتی تھی مگر اس کے بھاؤ تاؤ میں اس کے سراب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ میں مسحور نظروں سے وہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ مجھے وہ سات رنگا شیشہ یاد آگیا۔ جو کبھی بچپن میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر روشنی کے سامنے رکھ کر دیکھتی تھی۔ کس قدر خوبصورت چمکتے، شفاف اور شگفتہ رنگ نکلتے تھے اس میں سے۔ جی چاہتا تھا ان کو انگلیوں سے چھو کر دیکھو۔ مٹھیوں میں قید کر لو۔ وہ رنگ اکیلے اس سات رنگے شیشے میں سے نہ نکلتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی وہ ایک خوشبوئیں، سُروں اور مہکتے بھرے لمحوں کی لہریں تھیں کہ گنبد اگر دبینے لگتی تھیں۔ اور جاتے جاتے ایک نیم بے ہوش اداسی دل کو دے جاتی تھیں۔ تو آج وہ سب رنگ و بو۔ حسن و موسیقی کی دنیا اس شوکیس میں، اس سات رنگ شیشے میں بند تھی۔

میں نے شوکیس کے شیشے کے ساتھ ناک چپکا دی تھی۔ اتنی بہت سی خوبصورت چیزیں۔ گویا ایک جنتِ گم گشتہ تھی۔ اور اس جنتِ گم گشتہ کو پا لینے کا ایک جنون میٹھی میٹھی لہریں بن کر میرے دل و دماغ کو جکڑتا گیا۔ میں ایک دھڑکتے، لطیف جال میں لپٹ گئی کہ جس سے نکلنا اس خوبصورت دنیا کی موت تھی۔ دنیا جو برسوں بعد مجھے نظر آئی تھی۔ وہ ایک عجیب شوق انگیز لہر تھی کہ مجھے مست بناتی چلی گئی۔

"بیگم صاحبہ۔ اندر تشریف لے آئیے" اسٹور کے دروازے پر سے سیلز مین نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں چونکی۔ کوئی انجانا فیصلہ ابہام کی حدوں کو کاٹنے والی سوچ میرے ذہن میں داخل ہوئی۔ میں مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

جناب والا! میرا بیگ اس وقت بھی نقدی سے بوجھل تھا۔ مگر وہ آسیب منہ کھولے چلا آرہا تھا۔ وہ اٹل ساعت آچکی تھی۔ اور میں اس کے گھیرے میں تھی۔ میں نے بہت سی چیزیں نکلوا کے دیکھیں۔ پھر میں خود ہی اپنی اس فنکارانہ چابکدستی پر حیران رہ گئی۔ میرے بائیں ہاتھ نے خوبصورت رنگ برنگی چیزیں خاموشی سے یوں کہ دائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ بیگ میں انڈیل لیں۔ رنگوں۔ سُروں اور خوشبوؤں کی ایک دنیا میرے بیگ میں بند تھی۔ وہ ساتوں رنگ میری مٹھی میں اسیر تھے۔ لہٰذا پھر میں نے ایک معمولی سی بوتل پسند کر کے اس کی قیمت ادا

کی اور اٹھتے اٹھتے قدموں کے ساتھ دکان سے نکل آئی۔ میں زمین پر نہیں گویا بادلوں پر چل رہی تھی۔ ایک رنگین امنگ میری آنکھوں میں اتر آئی تھی ایک خالص وحشی جذبہ میرے اندر رقصاں تھا۔

جناب والا میرا جی چاہتا تھا۔ سڑکوں پر قہقہے لگاتی پھروں۔ آج پھر دنیا اتنے بہت سے رنگوں اور خوشبوؤں سمیت زندہ ہو گئی تھی۔ گھر کی دہلیز پار کر کے میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ بیگ کھولا اور رنگ و نور کی اس دنیا کو میز پر انڈیل دیا۔ ان سب چیزوں کو مختلف زاویوں سے الٹ پلٹ کر دیکھا ان کو سونگھا، ان کے رنگوں کو آنکھوں میں بسایا۔ اور تب مدتوں رکے آنسو بہہ نکلے۔

میرے کمرے نے مجھے کبھی روتے کبھی ہنستے دیکھا اور میز پر لگے اس رنگ و نور کے انبار کو بھی۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" اس نے خوف اور نفرت بھری آواز میں کہا۔ تب میں چونکی اور میں نے سوچا اور خود سے پوچھا ہاں واقعی یہ تم نے کیا کیا؟ اور اس سوچ کے ساتھ ہی وہ رنگ و نور کی دنیا پھر مر گئی۔ وہ سب کچھ مردہ لکڑی میں سے نکلا برادہ بن گیا۔ اور تمام دنیا پر وہ مٹیالا دن محیط ہو گیا۔ چنانچہ جناب والا میں نے وہ سب کچھ اٹھایا اور متعلقہ افسروں کو اس واردات کی اطلاع کی۔

مجھے اپنے بائیں ہاتھ کی جدائی کا دکھ نہیں۔ جب وہ ہاتھ مجھ سے الگ ہوا تو گویا سیاہ آسیب بھی میرا وجود چھوڑ گیا۔ تب میں نے شکر ادا کیا کہ مجھے اس بائیں ہاتھ سے نجات ملی۔ اور اب صرف وہ نور بھرا پاکیزہ دایاں ہاتھ میرا ساتھی تھا اور میں خوش تھی اور کہتی تھی۔ اے بنتِ حوّا۔ تو خوش قسمت ہے کہ آج تیرے وجود کا سیاہ سایہ مٹ گیا۔ اب تیرا یہ مبارک روشن دایاں ہاتھ تیری اچھی اچھی خبریں سب کو دے گا۔

مگر جناب والا اب میں اصل واقعہ کی طرف آتی ہوں۔ یہ کل رات ہی کا ذکر ہے میں اس مٹیالے دن اور مٹیالی رات کی عادی ہو چکی تھی۔ رنگ و نور حسن و موسیقی کی اس دنیا کی یاد بھی میرے ذہن سے مٹ چکی تھی۔ وہ میرا بایاں ہاتھ سب منحوس یادیں اپنے ساتھ لے جا چکا تھا۔ اور میں سکھ کی نیند سوتی تھی۔ سکھ کی گہری نیند مگر کل رات سکھ کی اس گہری نیند سے میں ایک سرسراہٹ سے جاگ اٹھی جیسے میرے بستر میں کوئی جاندار چل رہا ہو۔ میں نے بیڈ لیمپ روشن کیا۔ اور یہ دیکھ کر میری پیشانی عرقِ ندامت میں ڈوب گئی کہ وہ سرسراتی، کلبلاتی چیز۔ وہ میرا بایاں ہاتھ دوبارہ میرے بازو کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی اپنے آپ کو اس بائیں ہاتھ سے محفوظ رکھنے کی۔ مگر دیکھئے، اب میں آپ کے سامنے ہوں۔ یہ پھر اسی طرح میری کلائی سے جڑا ہے۔ میرے وجود کا حصہ ہے۔ جیسے کبھی کاٹا ہی نہ گیا ہو۔ جناب والا کیا آپ بھی یقین نہ کریں گے کہ یہ کٹا تھا مگر پھر زندہ ہو کر آن جڑا! صد حیف ہے میرے وجود پر کہ میں اپنے بائیں ہاتھ سے نجات نہ پا سکی۔

مختلف شہروں میں فروغِ ادب کے نمائندے

ریاض الحسن صاحب
اتحاد نیوز ایجنسی ایبٹ آباد

شمیم نیوز ایجنٹ
ڈیرہ غازیخان

میسرز ریاض نیوز ایجنٹ
نیو بلڈنگ۔ بنوں روڈ۔ کوہاٹ

سید اختر شاہ صاحب
اختر نیوز ایجنسی نوشہرہ۔ ضلع پشاور

فیصل جنرل سٹور اینڈ بک سٹال
ہاتی بازار۔ ٹنڈو محمد خان
ضلع حیدرآباد

وہاڑی نیوز ایجنٹ
مین بازار ـــــ وہاڑی

بزنس کمپنی
چوک یادگار۔ پشاور

سلطانی نیوز ایجنٹ
پرانا اڈا لاریاں۔ چکوال ضلع جہلم

ہمدرد بک سٹال
محمد علی جناح روڈ۔ سانگھڑ

کہکشاں ملک

جنگل میں راستہ

موسم ابر آلود تھا سکول میں چھٹی ہونے تک اچھی خاصی بارش ہونے لگی۔ میں تیز تیز قدموں سے بس شاپ کی طرف جا رہی تھی۔ ذہن پر اپنے بچوں کا خیال بری طرح چھایا ہوا تھا۔ جنہیں صبح ہمسائیوں کے گھر چھوڑ کر چلے آنا پڑا تھا۔ نوکر ہفتہ ہوا، راشن کی چینی لینے گیا اور بیس روپے، راشن کارڈ اور چینی کے تھیلے ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ نئے نوکر کی تلاش جاری تھی۔ ایک دو ملے بھی مگر ان کی تنخواہ اور روٹی کپڑے کو ملا کر اتنا ہی خرچ اُٹھنے کا اندیشہ تھا۔ جتنی کہ میری تنخواہ تھی اور اس سے بہتر تھا کہ سکول کی نوکری کے بجائے گھر کی نوکری اختیار کر لیتی۔ بڑی مشکل سے ہفتے میں تین دن مجھے اور تین دن میرے شوہر کو چھٹی لے کر گھر پر رہنا پڑا اور مجبوراً اس ساتویں دن ہم دونوں روٹی کے علاوہ مکان کے کرائے کی خاطر گھر سے کام کے لئے چل پڑے۔ اور بچیاں ہمسائیوں کے ہاں چھوڑنا پڑیں۔ سب سے بڑی بچی چار سال سے ایک ماہ کم ہی تھی اور وہ باقی بہنوں کو میری غیر موجودگی میں کس طور پر دیکھ بھال کر سکتی تھی۔ ہمسائیوں کے گھر کے باہر والے برآمدے میں ایک جگہ سوئچ بورڈ اکھڑا ہوا تھا اور ننگی تار نظر آتی تھی۔ جسے میری وہمی طبیعت نے بچیوں کو وہاں چھوڑتے وقت بری طرح محسوس کیا تھا۔ میری منجھلی بچی بڑی نڈر اور شریر واقع ہوئی تھی وہ اس تار کو چھونے سے ہرگز نہ ہچکچاتی اور چھو کر چھوڑتی۔ اوپر سے موسم کی غیر متوقع خرابی میرے لئے اور بھی پریشان کن تھی۔ لہٰذا میں بغیر آگے پیچھے دیکھے۔ بس شاپ کی طرف بھاگی جا رہی تھی کہ بس شاپ کے پاس میں نے ایک اچھے معقول قسم کے آدمی کا پاؤں کچل کر رکھ دیا۔ وہ صاحب بلبلا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ مجھے بھی چونکہ پاس ہی کھڑے ہونا تھا۔ اس لئے نہایت ہی خجالت محسوس کرتے ہوئے "معاف کیجئے گا! میرا دھیان نہیں تھا"، ان صاحب نے رومال سے جوتا صاف کر کے میری جانب غور سے دیکھا پھر ان کی آنکھوں میں عجب سی چمک پیدا ہوئی وہ بولے۔ جی نہیں کوئی بات نہیں! ایسا ہو ہی جاتا ہے "۔ اصولاً یہاں معاملہ ختم ہو جانا چاہیئے تھا لیکن چونکہ میں کچھ زیادہ شرمندہ تھی۔ دوسرے شاپ خالی تھے۔ اور اُن صاحب کا ارادہ مزید بات چیت کا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا تلافیٔ مافات کے لئے اس درگزر کا شکریہ ایک دفعہ اور ادا کر دوں میں نے کہا۔ جی ہاں پھر بھی جو آپ کو تکلیف ہوئی، میں انتہائی شرمندہ ہوں۔

ایسی کوئی بات نہیں۔ جس کے لئے آپ شرمندہ ہوں۔ میں آپ کو تقریباً روز ہی اسی پریشانی اور عجلت میں پاتا ہوں کیا آپ کے گھر میں کوئی بیمار وغیرہ تو نہیں ان صاحب نے بڑے اہتمام سے میرے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔ میں جواب میں اس شجرہ نما سوال پر چونک گئی۔ پھر میں نے اپنی افسانوی اور مبالغہ تراش طبیعت پر لعنت بھیجتے ہوئے ان صاحب کے سوال کو بڑا ہی بے ضرر پایا اور کہا

جی نہیں۔ دراصل گھر میں نوکر نہیں ہے نا۔ تو بڑا پرابلم سا بن گیا ہے۔ میری بچیاں اکیلی رہتی ہیں انہیں آج میں ہمسائیوں کے گھر چھوڑ آئی تھی۔

بچیاں! انہوں نے میری طرف دیکھا۔

جی ہاں! میری اتفاق سے تینوں بچیاں ہیں۔ سب سے چھوٹی کی عمر بھی ڈیڑھ برس کی ہو گی میں نے اس قحط الرجال پیدا کردہ، والے زمانے میں اس انکشاف کا جرم کر کے خفیف سی ہو کر کہا

عجب اتفاق ہے ان صاحب نے نیم فکا ہیہ انداز میں میرا جائزہ لیا۔

کیوں ۔ کیا آپ کی شادی نہیں ہوئی ۔ میں نے
پوچھا

جی ہوئی ہے اور اتفاق سے میرے تینوں بچے
ہیں ۔ سب سے چھوٹے کی عمر بھی غالباً ڈیڑھ برس
کی ہوگی ۔ وہ مسکرا کر بولے ۔

اور آپ کی بیوی (مجھے ان صاحب کی بیوی
پہ بے طرح رشک آگیا) آپ کی بیوی تو سروس
وغیرہ نہیں کرتی ہوں گی ۔ وہ گھر ہی پر رہتی ہوں گی ۔
میں نے بالکل عام انداز میں کہا ۔

گھر میں ۔ ان صاحب نے اپنی ڈوب جانے
والی نگاہوں سے دیکھا کر میں کانپ کر رہ گئی ۔ نگاہوں
میں محرومی ، بھوک ، تشنگی کے شعلے سے لپکے اور
میں ہڑبڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی ۔ آخر یہ کیا حماقت
تھی ۔ میں سرِراہ ایک نامحرم شخص سے یوں محوِ کلام تھی
گویا کوئی بات ہی نہ ہو ۔ مگر میں نے از راہ اخلاق بات
شروع کی تھی ۔ میرا مقصد ـــــ اس کے سوا ـــــ اور
اس کے بعد میں نے اس شاپ سے بس ٹھہرانا چھوڑ
دیا

لیکن ایک روز میں چھٹی ہونے پر سکول سے
باہر نکلی تو وہ صاحب گیٹ پر کھڑے تھے ۔ وہ
دیکھ کر وہ آگے بڑھے اور بڑے تپاک سے بولے
آپ نے چھٹی لے رکھی تھی ۔ میں روزانہ آپ
کا شاپ پر انتظار کرتا رہا ۔

جی میں گڑبڑا سی گئی ۔ اور حیران سی نظروں سے
انہیں دیکھنے لگی ۔ سچ پوچھئے تو یہ توقع ہی نہ تھی کہ وہ اتنے
بے ضابطہ قسم کے انسان ہیں ۔ مجھے غصہ سا آگیا اور
میں پہلے والے شاپ کی طرف چلنے لگی ۔ شاپ پر
کافی لوگ تھے ۔ میں ایک طرف کھڑی ہو گئی ۔ وہ
صاحب جو میرے ساتھ ہی آئے تھے ۔ میرے پاس
ہی کھڑے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے
لاحول ولا ۔ کیا واہیات ماحول بن گیا تھا ۔ مجھے
کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی وہ شخص ذرا بھی کم عقل
فلمی عاشق یا مسخرہ نہیں تھا ۔ انتہائی معقول انتہائی
شریف ، بے حد سنجیدہ اور دلکش شخصیت تھی چہرے
پر کسی قسم کے اخلاقی خون کے چھینٹے نہیں تھے بلکہ
عجیب قسم کا اناڑی پن اور معصومیت تھی ۔ بالکل
انجان بچے کی سی مگر نظریں نظروں میں قتل کرنے والی
ایک رو بہہ رہی تھی ۔ جسے دیکھ کر مجھے خوف سا آتا
تھا ۔ اور میں سمجھتی تھی کہ یہ جذبۂ قتل کسی محرومی خیال
کی بنا پر ہے ۔ اسی محرومی کی وجہ سے نگاہوں میں
بھوک پیدا ہو جاتی ہے ۔ خواہ یہ بھوک دیکھنے والے
کے دل میں نفرت بھر دے یا ہمدردی ۔ اس لئے
میں ذرا معقول قسم کی بات سوچ رہی تھی ۔ یکایک
میں نے مزاح کا سہارا لیا ۔ اور کہا ۔

معلوم ہوتا ہے آپ کو میری بدتمیزی ابھی تک
نہیں بھولی ۔

کیسی بدتمیزی ؟ حسن صاحب کھل اٹھے ۔

وہی جو میں نے آپ کا پاؤں کچل دیا ـــــ لیکن
اب ایسا نہیں ہوگا ۔

مگر میں نے یہ سوال تو نہیں کیا تھا ۔ ان صاحب
نے بڑا موڈ نہیں بدلا تھا ۔

" کیا سوال کیا تھا آپ نے ؟ میں نے پوچھا یہی
کہ آپ اتنے روز شاپ پر کیوں نہیں آئیں ؟ اس
لئے اس شاپ پر جو بس ملتی ہے ۔ وہ بڑی دیر سے
آتی ہے ۔ میں ذرا چل کر دوسرے شاپ پر چلی
جاتی ہوں تو بہت سی بسیں مل جاتی ہیں ۔ وہاں میں سٹاپ
ہے نا ۔

اچھا ! میں سمجھا ۔ آپ مجھ سے ناراض ہیں ۔

واہ صاحب ۔ ناراض ہونے کی کیا بات ہے
کہئے آپ کے بچوں کا کیا حال ہے ۔ نام بھی تو بتایئے
مجھے ناموں سے بڑی دلچسپی ہے ۔ اور پھر لڑکوں کے
میں نے ہنستے ہوئے کہا ۔

نام بتاؤں ۔ انہوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا ۔

پہلے آپ اپنی لڑکیوں کے نام بتایئے

میں بتاؤں ۔ بڑی والی کا نام ہے عامرہ ۔ چھوٹی کا
نام گل رخ اور تیسری کا شہلا ہیں ۔ نہ بڑے اہتمام
سے نام بتائے ۔

اچھا ۔ بڑے پیارے نام ہیں ۔ مگر قافیہ نہیں ملتا ۔
میں نے عامرہ کا سن کر سمجھا کہ دوسری کا نام ناصرہ
ہوگا اور تیسری شاکرہ ہوگی ۔ حسن صاحب ہنستے ہوئے
بولے ۔ جی نہیں مجھے اس انداز غزل سے ڈر آتا ہے
صاحب میں نے سوچا تھا کہ عامرہ سے ملتا جلتا نام
رکھا تو لاتعداد لگ جائے گی لڑکیوں کی اور پھر اس غزل
کا مقطع کبھی نہ ہوگا ۔ اس لئے بدل بدل کر رکھتی رہی ۔
مگر کوئی فائدہ نہ ہوا ۔ ہاں اب آپ بتایئے کیا نام رکھے گیا

نام ۔ ارے جی چھوڑیئے ۔ دراصل ابھی کوئی نام تجویز
نہیں کئے ۔ بچے بڑے ہو کر خود ہی رکھ لیں گے ۔

خود ہی رکھ لیں ۔

اتنی بے نیازی ـــــ اور پھر بس آگئی ۔

اب تو کرانی مل گئی تھی ۔ گھر پہنچی تو عامرہ اور گل رخ
اپنی اپنی گڑیا کو نہلا رہی تھیں ۔ شہلا پالنے میں پڑی

گہری نیند سو رہی تھی۔ میرے شوہر اپنے نئے باس کے لئے گھر تلاش کرنے اس جلتی ہوئی دوپہر میں سائیکل لئے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں وہی انمٹ پیار تھا۔ وہی کسک تھی۔ جو معاشی بے چینی کو دل میں چھپانے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن آنکھیں جس کا راز فاش کر دیتی ہیں۔ انہوں نے جو قمیص صبح پہنی تھی۔ اس پر ننھی شہلا نے مزے سے سالن سے بھرا پورا ہاتھ لگا دیا تھا اور وہ مٹی سی بنی دھونے کے باوجود نظر آ رہی تھی۔ مگر وہ اس سے بے نیاز میرے قریب کھڑے تھے۔ تفکرات نے ابھی سے کنپٹیوں کے بالوں کی سیاہی نگلنا شروع کر دی تھی۔ میں سکول کے بچوں کا ہوم ورک چیک کرنے کے لئے تیاری کرنا چاہتی تھی۔ وہ حسبِ عادت سگریٹوں کے لئے پیسے مانگ رہے تھے۔ پوری کی پوری تنخواہ میری ہتھیلی پر رکھنے کے بعد اس سات سالہ زندگی میں یونہی اپنی ضروریات کے لئے مجھ سے پیسے مانگا کرتے ہیں۔

میں نے پاس رکھے پرس سے پانچ روپے نکال کر دیئے اور وہ شکریہ کہہ کر چلے گئے۔

معاً میرے خیالات نے جھٹکا سا محسوس کیا۔ وہ اداس۔ بھوکی۔ دلکش سی نگاہیں میرے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ میرے ہاتھ سے انجانے میں قلم گر گیا اور میں کھو سی گئی۔

آخر وہ شخص اتنا اُداس کیوں ہے!! اس کی نگاہوں میں اطمینان کیوں نہیں۔

اسے مجھ سے کیا دلچسپی ہے۔ اور مجھے ہنسی آ گئی یوں محسوس ہوا جیسے دور شہنائی کی آواز قریب آتی جا رہی ہو۔ اور میری عامرہ کو اس کی سہیلیاں دلہن بنا رہی ہیں۔ اس کی گوری سی پیشانی پر ٹیکہ دمک رہا ہے۔ اور میں کتنی بوڑھی ہو گئی ہوں۔

بوڑھی۔ ایک نہیں۔ دو نہیں۔ تین بیٹیوں کی بوڑھی ماں۔ میرا چہرہ کتنا، جھریوں سے بھر گیا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے پیچ پیچ ان جھریوں کو چھوا۔ پھر میں نے زور سے عامرہ کو آواز دی۔ اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کتنی طمانیت تھی۔ کتنی فراغت تھی۔ میں نے اس کا منہ چوما اور پھر کاپیوں میں الجھ گئی۔

شام کے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ میری طبیعت پھر خراب تھی۔ تین بچیاں پہلے ہی کیا کم تھیں۔ اس پر سکول کی نوکری۔ میرے لئے ایک اور بچہ صحت اور مالی لحاظ سے کسی طور سے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا تھا مگر کیا کرتی۔ میں دوسروں کو کیا کہوں۔ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ ایک بیٹا مل جائے۔ صرف ایک بیٹا۔ جو اپنی بہنوں کی، ڈولیوں کو کندھا دے سکے۔ اس لئے اب چوتھی مہم شروع تھی۔ طبیعت بہت ہی گری گری رہتی تھی۔ سکول میں اکثر نہیں آ جا سکتی تھی۔ اور وہ صاحب بھی میرے ذہن سے اتر چکے تھے۔ لیکن اسی شام میں پیدل ہی کلینک کی جانب جا رہی تھی کہ میرے پیچھے سے آنے والا ایک سکوٹر رک گیا۔

آداب عرض۔ یہ وہی صاحب تھے۔

میں سٹپٹا سی گئی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

کہاں جا رہی ہیں۔ انہوں نے انتہائی بے تکلفی سے پوچھا۔

میں یہیں کسی سے ملنے جا رہی ہوں۔ میں نے دانستہ جھوٹ بولا۔

آپ کا رنگ اڑا اڑا سا لگتا ہے۔ خدانخواستہ کہیں بیمار تو نہیں تھیں۔ چلئے میں آپ کو سہیلی کے ہاں چھوڑ آؤں۔

جی نہیں۔ میں قریب ہی جا رہی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ

اجی تکلف نہ کیجئے۔ آیئے بیٹھئے نا۔ انہوں نے بڑے اصرار سے کہا۔

جی نہیں۔ مجھے اس پر بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا ہے میں نہیں بیٹھ سکوں گی۔ میں نے بہانہ تراشا یہیں دو قدم پر تو جانا ہے۔ آپ خواہ مخواہ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔

تو چلئے جب تک آپ چلتی ہیں۔ میں بھی چلتا ہوں۔ باتیں کرتے چلیں گے۔

مجبوراً مجھے پھر اُن کی نگاہوں سے دوچار ہونا پڑا اور نتیجے کے طور پر میں سہم سی گئی۔

اور ہم چلنے لگے۔

دیکھئے پہلے یہ بتایئے آپ اس طرح خوف زدہ کیوں ہو جاتی ہیں۔ خدانخواستہ آپ میرے بارے میں یہ رائے تو نہیں رکھتیں کہ میں کوئی کوئی عامیانہ حرکات ......

ان صاحب نے سنجیدہ ہونا شروع کیا اور مجھے اپنی کمزور طبیعت پر رونا آنے لگا۔

میں چپ ہی رہی۔

بتایئے نا۔ انہوں نے اصرار کیا۔

کیا بتاؤں۔ خوف زدہ ہونے کا کیا سوال پیدا کر دیا آپ نے دراصل ہمارا معاشرہ۔ میرا مطلب ہے۔ کم از کم جس طبقے سے میرا تعلق ہے وہاں اس قسم کی

بے تکلفی اچھی نظروں سے نہیں دیکھی جاتی۔

لیکن آپ کے اندازِ گفتگو سے تو یہ پابندی آپ پر عائد ہوتی نہیں دکھائی دیتی۔

کیوں کیا میں نے کوئی زیادہ ہی بے تکلفی کا اظہار کیا ہے۔

نہیں۔ نہیں۔ بس معلوم نہیں۔ آپ کی یہ بے تکلفی دوسرے کو سمجھ لینے کا ملکہ اور پُرخلوص انداز۔ میرا مطلب تھا۔ آپ کو یہ طبقاتی سوال نہیں اٹھانا چاہیئے

بس یہی تو کمزوری ہے کہ میں دوسرے کی شخصیت سے متاثر ہو جاتی ہوں۔ اور پھر جب تنہا ہوتی ہوں۔ تو خود کو اپنے اصلی مقام پر لے آتی ہوں

"لیکن شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کی شخصیت بھی دوسرے کو متاثر کرتی ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ مجھ سے اپنے آپ کو اپنے اصلی مقام پر لایا نہیں جا رہا۔"

ارے میری بچی! مجھے اس کے لئے دوائی بھی تو لینا تھی۔ یہ سامنے کلینک ہے۔ پہلے دوائی ہی لے لوں۔ میں نے ان صاحب کی بات کاٹ ڈالی اور جلدی سے کلینک میں گھس گئی۔

لیڈی ڈاکٹر میرے دل کی دھڑکن کا جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے طاقت کے انجکشن، پھلوں کا استعمال اور ٹانک لکھ کر دے رہی تھی۔ مگر میرے ذہن میں وہی فقرہ گردش کر رہا تھا۔

آپ کی شخصیت بھی دوسرے کو متاثر کرتی ہے

عفت تم ہر شخص کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہو۔ خلوص بانٹنے سے پہلے عورت مرد کی تخصیص بھی کر لیا کرو۔ تمہارا تکلم جو محض تمہاری عادت ہے کبھی کبھی ترغیب بھی بن جاتا ہے۔ یہ وہ جلے کٹے فقرے تھے جو برسوں پہلے میں نے کسی سے سنے تھے۔ یہ فقرے میرے تخیل کے ساز پہ زور زور سے بج رہے تھے۔ میں اس اجنبی انسان کی غلط فہمی کے بارے میں سوچتے ہوئے بڑا دکھ سا محسوس کر رہی تھی۔

اب تو عرصہ ہی گزر گیا تھا۔ کبھی ذہن ماحول کی موزونیت سے متاثر ہوتا تو میں سوچتی وہ شخص اتنا تنہا سا کیوں لگتا تھا۔ وہ سالوں کے پیچھے کیوں لپک رہا تھا۔ اس کی بیوی اور پھر اس کے تین بیٹے۔ مگر اس کے چہرے پر باپ کی شفقت کی کوئی کرن کیوں نہ پھوٹتی تھی۔ وہ نگاہوں میں اداسی اور ڈوبا ہوا حزن اور میں اس خیال کو جھٹک دیتی۔

پھر ایک دن عامرہ اور گل رُخ نے ضد کی کہ انہیں نئے کھلونے چاہئیں اور ننھی شہلا بغیر انتظار کئے مجھے شاپنگ کے موڈ میں دیکھ کر باہر سڑک پہ جا کھڑی ہوئی میں تینوں کے ساتھ لدی پھندی شہر کے بڑے بازار میں جا پہنچی۔ اور مختلف دکانوں سے کھلونے، فراک اور جوتے وغیرہ خرید کر جب ہم ٹیکسی پکڑنے کے لئے ایک مخصوص جگہ پر کھڑے تھے کہ میں نے اُن صاحب کو بے دھیانی میں دوسرے فٹ پاتھ پر دوسری سمت جاتے ہوئے دیکھا۔ جانے مجھے کیا خیال آیا۔ میں نے نوکر کو دوڑایا کہ ان صاحب کو بلا لائے۔ نوکر نے جب انہیں راستے میں پکڑ کر میری طرف اشارہ کیا۔ تو وہ بھاگے سے آ گئے۔ اور میرے ساتھ تین بچیوں کو دیکھ کر اور جوتے کے وجود کو محسوس کر کے ٹھٹھک کر رہ گئے۔

یہ رہیں میری بچیاں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر دھواں سا تیر گیا اور وہ ساکت ہو گئے۔

کیوں کیا بات ہے۔ آپ اس طرح حیران کیوں ہو گئے ——— میں گھبرا گئی۔

تو سچ مچ آپ کی تین بیٹیاں تھیں۔ وہ مردہ سی آواز میں بولے۔

کیوں ——— میں نے کوئی جھوٹ بولا تھا۔ میں نے کچھ دکھ سے کہا۔

جی نہیں آپ نے نہیں۔ میں نے جھوٹ کہا تھا کہ میرے تین بیٹے ہیں۔

انہوں نے نگاہیں نیچی کئے کئے کہا۔ میں سمجھا آپ مجھے بنا رہی ہیں۔

اور وہ چپ ہو گئے۔

تو کیا آپ کی شادی ——— میں نے ان کی عمر کا شاید بہت غلط اندازہ لگایا تھا۔

میرے اس ادھورے سوال کا جواب وہی اداس بھوری مگر دلکش نگاہیں تھیں۔ جو اُس روز کے بعد پھر کبھی نظر نہیں آئیں۔

سلاؤمیر زیک

ترجمہ: ستار طاہر

ایک اور ساٹھ

ناول نگار نے ملک بار میں جانے کا ارادہ اس لئے کیا تھا کہ وہ دودھ پینا چاہتا تھا۔ وہ ملک بار میں داخل ہوا تو اس کی نظر ایک نوجوان پر پڑی جو قطار میں کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک عام سا معمولی نوجوان تھا۔ مگر اس میں بعض ایسی نمایاں چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ جو اسے اس جیسے ہزاروں نوجوانوں سے ممتاز اور انوکھا بنا رہی تھیں۔ اس کے جسمانی اعضا اور چہرے پر تھکن جھلک رہی تھی۔ جلد بہت پتلی اور آنکھیں دھندآلود...... اس کا لباس صاف ستھرا تھا۔ مگر سلوٹوں سے اٹا ہوا، جیسے وہ ابھی ابھی کسی طویل اور تھکا دینے والے سفر سے لوٹا ہو۔ ناول نگار کوشش کے باوجود بھی اپنی نظروں کو اس کے چہرے سے نہ ہٹا سکا۔ جب اس نوجوان کی باری آئی تو اس نے دھیمے مگر شستہ اور واضح لہجے میں ویٹرس سے کہا۔

ساٹھ روٹیاں...... جنہیں میں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ دودھ کا ایک گلاس مجھے یہاں پینے کیلئے دے دیں"

بیک وقت ساٹھ ڈبل روٹیوں کا حکم! مگر اس علاقے میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ کیونکہ اس علاقے میں ملک بھر کے لوگ سال کے ان دنوں میں سیر و تفریح کے لئے ہجوم در ہجوم اور ٹولیوں کی صورت میں جمع ہوا کرتے تھے۔ مگر نوجوان کے اس آرڈر نے ناول نگار کو مجبور کر دیا کہ وہ اس انوکھے نوجوان پر پوری توجہ دے۔ نوجوان آرڈر دینے کے بعد ایک میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناول نگار نے اپنا دودھ کا گلاس اٹھایا اور ایک ایسی میز کو چنا، جہاں سے وہ اس نوجوان کی تمام حرکات کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

جب نوجوان نے پہلا گھونٹ پینے کے لئے دودھ کا گلاس اٹھایا تو اس کا ہاتھ لرزا۔ ایک لمحے میں، دودھ کا گھونٹ بھرتے ہی نوجوان کے پیلے چہرے پر سرخی جھلکنے لگی۔ اور پھر جیسے کسی بڑی خفیہ قوت نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو، اس نے اپنا قلم نکالا اور کاغذ کے ان نیپکنوں پر لکھنے لگا، جو میز پر رکھے ہوئے تھے۔

وہ رکے بغیر لکھتا چلا گیا۔ لکھتے لکھتے وہ کبھی ایک ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا منہ میں ڈال لیتا اور دودھ کا گھونٹ بھر لیتا، مگر اس کا لکھنے والا ہاتھ لکھتا رہا...... یوں نظر آتا تھا، جیسے دودھ کا ایک گھونٹ اور روٹی کا ایک ایک لقمہ اس کی توانائی میں اضافہ پیدا کر رہا ہے۔ کیونکہ اس کے لکھنے کی رفتار تیز سے تیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھر وہ یوں چونکا جیسے کوئی خواب ٹوٹ گیا ہو۔ اس نے قلم جیب میں رکھا ڈبل روٹیاں اٹھائیں اور بازار کی طرف بھاگ گیا۔

جونہی نوجوان ملک بار سے باہر نکلا۔ ناول نگار نے اٹھ کر وہ نیپکن اٹھا لیئے جن پر وہ نوجوان لکھ رہا تھا۔ اور جنہیں میز پر ہی چھوڑ گیا تھا۔ ناول نگار کی تجربہ کار مشتاق نظروں نے چند منٹوں میں وہ تحریر پڑھ لی۔ یہ ایک مکمل ناول کا خاکہ تھا۔ کہیں کہیں ادھورا مگر بلاشبہ یہ خاکہ کسی جینئس کے ذہن کی تخلیق تھا!

ناول نگار اس نوجوان کی تلاش میں باہر نکلا۔ وہ بھاگنے لگا۔ سڑک پر لوگوں کے ہجوم میں اس نوجوان کا ملنا خاصا مشکل تھا۔ مگر اس نے بھاگ کر اس نوجوان کو تیز تیز جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس سے پہلے کہ ناول نگار اور نوجوان کا درمیانی فاصلہ پاٹا جاتا، نوجوان اچانک رک گیا۔ اس کے چہرے پر اندرونی کرب اور کشمکش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ نوجوان بھاگ کر سڑک پار کر کے ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور تیزی سے لکھنے لگا...... جن کاغذ میں اُنسٹھ روٹیاں لپٹی ہوئی تھیں، وہ مڑا تڑا کاغذ، نوجوان کی تحریر سے سیاہ ہونے

لگا۔ ناول نگار دبے قدموں اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ نوجوان اپنے انہماک میں لکھتا رہا۔ اسے ناول نگار کی موجودگی کا علم تک نہ ہو سکا۔

ناول نگار ششدر رہ گیا۔ نوجوان نے ہوٹل میں ناول کا جو خاکہ لکھا تھا۔ یہ اس کی ارتقائی اور دوسری مکمل صورت تھی۔ جو کچھ اس خاکے میں رہ گیا تھا۔

ناول نگار نے جلدی سے اپنا تعارف کرایا۔ نوجوان کی دھند آلود آنکھوں سے ناول نگار کا سارا وجود ایک بار لرز گیا۔ ان دھند آلود آنکھوں میں وہ شعلہ روشن تھا، جو صرف کسی جینئس کی آنکھوں میں ہی دہک سکتا ہے۔ ناول نگار کا سارا وجود جل گیا۔ سالہا سال سے وہ تخلیق کے کرب ناک اور تھکا دینے والے کام سے منسلک رہا تھا۔ اور اب اس کے تخلیقی رتبے اور تخلیقی مقام کا خاتمہ قریب آ گیا تھا۔ اس نے ایک لمحے میں اپنے تخلیقی رتبے اور ادبی مقام کو بچانے کا راستہ سوچ لیا۔ کیونکہ وہ اس نوجوان کا سرپرست بن جائے ......

اور اسے اپنے ادبی مقام کا جانشین بنا کر ابدی شہرت حاصل کرے ......

"میرے ساتھ چلو، میرے گھر......"

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "یہ ڈبل روٹیاں یہیں رہنے دو"

نوجوان نے سر جھکا لیا۔ اپنے پاؤں زمین پر رگڑے اور اٹھ کر جانے لگا۔

اسے ناول نگار کی دعوت قبول نہ تھی۔ ناول نگار نے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ اور اسے زبردستی اپنے فلیٹ کی طرف گھسیٹنے لگا۔ وہ اس نوجوان کو اپنی سرپرستی اور مستقبل کی شہرت کی نوید سناتا گیا۔ نوجوان مجبوری اور کراہت کے ملے جلے احساس کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

سب کچھ سنتا رہا۔ مگر کچھ ایسے، جیسے اسے ان باتوں سے نفرت ہو۔ انسٹھ روٹیوں کا بنڈل اس کی بغل میں تھا...... اور اس کی پریشانی اور حرکات سے محسوس ہوتا تھا کہ اگر روٹیوں کا یہ بنڈل اسے اٹھانا نہ پڑتا تو وہ بھاگ گیا ہوتا۔

"غریب......وحشی.....مگر جینئس"

ناول نگار اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ اور کسی شیطانی مسرت کے احساس کے تحت اس کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں۔ جب وہ فلیٹ میں پہنچ گئے تو اس نے نوجوان کو ایک کمرے میں بٹھا کر باہر سے تالا لگا دیا۔ اس نے اپنی ملازمہ کو حکم دیا کہ دوپہر کے کھانے پر اچھی اچھی چیزیں پکائی جائیں اور کھانا انتہائی لذیذ ہونا چاہیے۔ کھانے کی تیاری کا حکم دینے کے بعد ناول نگار نے اپنے قریبی اور ہم عصر لکھنے والوں کو فون کر کے اپنی نئی اور حیران کن دریافت سے مطلع کرنا شروع کر دیا۔

نوجوان کمرے میں بند ناول نگار کے تمام احساسات اور مصروفیات سے بے خبر لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی لکھتے وقت کھایا۔ شام کو جب گھر قمقموں سے روشن ہوا تو بھی وہ نوجوان پہلے جیسی رفتار کے ساتھ لکھنے میں مصروف تھا۔

ناول نگار اس دن غیر معمولی واقعات سے ذہنی طور پر تھک چکا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ اس نے نوجوان کے کمرے کے تالے کی چابی کو اپنے سرہانے تلے رکھا اور سو گیا......

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنا چینی ریشم کا قیمتی ڈریسنگ گاؤن پہن کر نوجوان کے کمرے کی طرف بھاگا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے تالا کھولا، کمرہ چمکیلی دھوپ سے روشن ہو رہا تھا اس کے لکھنے کا قیمتی کاغذ ـــ ایک بڑی ڈھیری کی صورت میں کچھ کچھ بکھرا ہوا، میز پر جمع تھا اور کمرے میں کوئی نہ تھا۔

یہ ایک پورا ناول تھا۔ وہی ناول جس کا پہلا خاکہ ـــ سرملک بار میں اور ارتقائی صورت گرین پارک کے بنچ پر کی گئی تھی۔ ایک مکمل ـــ شاہکار تھا۔ بے عیب تضاد اور ہزار رنگ حقیقتوں کا جگمگاتا ہوا آئینہ....

بالکنی کا کھلا ہوا، دروازہ ـــ راہِ فرار کی نشاندہی کر رہا تھا۔ چند گھنٹوں میں ایک شاہکار اور بے عیب ناول لکھا جا چکا تھا۔ یقیناً دوپہر کے کھانے نے نوجوان کی توانائی میں اضافہ کیا تھا۔ غذائیت اور حیاتین کی وہ کمی جو اس کے پیلے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ وہ اس اچھی غذا سے ضرور متاثر ہوئی ہوگی......

ناول نگار ناول کا مسودہ لئے کھڑا رہا۔ صبح کی خوشگوار ہوا ریشمیں پردوں کی سرسراہٹ بن گئی۔ ...... وہ چونکا.....انسٹھ روٹیوں کا بنڈل غائب تھا۔ ناول نگار بھاگا، اس نے جلدی سے بلغاریہ کی بھیڑوں کی کھال کی بنی ہوئی جیکٹ زیب تن کی۔ اور بھاگتا ہوا سیڑھیاں اتر کر بازار میں پہنچ گیا۔ بازار کے سرے پر بیٹھنے والے اپاہج اخبار فروش سے اسے اپنے مفرور کے بارے میں پہلا سراغ

ملا ۔"ہاں .... میں نے ایسے نوجوان کو دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے فل سکیپ کاغذ خریدے ہیں!" خاکروب نے اسے ٹرام کے سٹاپ پر کھڑے لکھتے ہوئے دیکھا تھا" وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا" خاکروب نے اسے کہا اور اپنی جیب سے چند کاغذ نکال کر ناول نگار کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

پریشانی اور ذہنی اضطراب میں مبتلا ہونے کے باوجود ناول نگار کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ۔

"تو وہ سلگتے اور چلتے ہوئے بھی لکھنے سے باز نہیں رہا ..... اوہ ..... مجھے ایک جینیئس مل گیا تھا ایک جینیئس، جو صدیوں میں کہیں ایک بار پیدا ہوتا ہے گیا اب میں اُسے ہمیشہ کے لئے کھو چکا ہوں۔" اپنی توانائی کو مجتمع کر کے وہ اپنے مفرور کی کھوج میں چل پڑا۔

نوجوان ـــــ خاکروب کی اطلاع کے مطابق ٹرام پر بیٹھا تھا۔ ٹرام کا آخری شاپ سٹیشن تھا ـــــ

ریلوے سٹیشن، جہاں سے ہر وقت بیسیوں گاڑیاں بیسیوں اطراف کو جاتی ہیں۔ پریشانی سے بوجھل ناول نگار سٹیشن پر پہنچا۔ سٹیشن پر اس نے پہلا منظر یہ دیکھا کہ ٹکٹ چیکر ـــــ گیٹ پر کھڑا کچھ پڑھ رہا ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل بدل جاتے تھے۔ کبھی وہ مسکراتا، کبھی سنجیدہ ہو جاتا، اور پھر کبھی اپنی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں کو پونچھنے لگتا۔ وہ اپنے فرائض سے غافل ہو چکا تھا۔ مسافر آ جا رہے تھے مگر وہ کسی کا ٹکٹ چیک نہ کر رہا تھا۔ ناول نگار اس کی طرف لپکا۔ ٹکٹ چیکر کے ہاتھوں میں فل سکیپ کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔

"تم نے یہ کاغذ کہاں سے حاصل کئے ؟"

ٹکٹ چیکر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو تحریر میں جذب ہو چکا تھا۔ جب ناول نگار نے اپنا سوال دہرایا تو وہ چونکا .... ایک نوجوان تھا ..... واہ ...... واہ ..... کیا تحریر ہے ..... کیا بات ہے ..... ہاں ..... اس نے ردی شیٹوں کا ایک بنڈل اٹھایا ہوا تھا۔ وہ ادھر گیا تھا ..... پلیٹ فارم کے آخری سرے کی طرف ....." یہ کہہ کر پھر مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ ناول نگار پلیٹ فارم پر بھاگنے لگا۔

کچھ گاڑیاں خالی کھڑی تھیں۔ ان کے انجن مردہ تھے۔ دھواں تک نہ اُگل رہے تھے۔ وہ خالی ڈبوں میں جھانکنے لگا ..... ایک ایک ڈبہ چھان مارا۔ اس نے نشستوں کے نیچے بھی دیکھ لیا۔ مگر مفرور نوجوان کا نشان تک نظر نہ آیا۔ اس نے ٹائم ٹیبل کا معائنہ کیا۔ جب سے وہ نوجوان پلیٹ فارم پر آیا تھا۔ یہاں نہ تو کوئی گاڑی آئی تھی۔ اور نہ کوئی گاڑی یہاں سے روانہ ہوئی تھی ـــــ

تھکا ماندہ، پریشان حال، مضطرب ناول نگار ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر بھاگنے لگا۔ اب اسے بار بار یہ احساس ستا رہا تھا کہ اس نے اپنے ہم عصر ادیبوں اور ناول نگاروں کو اس نئی اور انوکھی، دریافت کی خبر دے کر اچھا نہ کیا تھا ..... نوجوان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ناول ناکافی ثبوت" تھا۔ اس کے ہم عصر اس پر شک کر سکتے تھے کہ یہ ناول اسی کا لکھا ہوا ہے اور اس نے لوگوں کی توجہ مبذول کرنے اور اپنی شہرت بڑھانے کے لئے یہ حربہ اختیار کیا ہے۔

ناول نگار، اب مال گاڑیوں کے یارڈ میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے دور سے ایک انوکھی، ناقابل فہم، سرسراہٹ نما بھنبھناہٹ کی آواز سنی، وہ ایک مال ڈبے کے سامنے رک گیا۔ ڈبے سے کوئلے، دھول کولتار، اور کئی چیزوں کی مہک اُٹھ رہی تھی۔ وہ انوکھی آواز ۔ اسی ڈبے سے آ رہی تھی۔ اس نے اپنے قدم اُوپر اٹھا کر اندر جھانک کر دیکھا ـــــ

سات نوجوان ـــــ سر جھکائے لکھنے میں مصروف تھے۔ ان کے قلم، یکساں، تیز رفتار سے ایک ساتھ کاغذ کے سینے پر دوڑ رہے تھے۔ سات قلم۔ ایک ساتھ چل رہے تھے، اور وہ مدھم سی سرسراہٹ نما بھنبھناہٹ، ان قلموں کے چلنے کی آواز تھی۔

"مفرور" نوجوان بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ سب ایک سے تھے ایک سے لباس میں، ایک سے چہرے رکھنے والے، وہی سستا سا صاف ستھرا شکنوں سے پُر لباس، سب کے چہروں پر ایک سا تاثر، ایک سا احساس، جینیئس ہونے کی علامتیں ـــــ

ناول نگار نے اپنے مفرور کی آستین کو کھینچا وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا ـــــ کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر نوجوان نے اسے یوں بیگانگی سے دیکھا جیسے وہ کبھی ایک دوسرے سے ملے ہی نہ ہوں جیسے وہ کسی دور دراز کے سیارے کا انسان ہو۔ اس کی آنکھوں میں اتنا کھردرا پن اور خشکی تھی کہ ناول نگار اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ آستین کو کھینچنے والا ہاتھ لرزنے لگا، اور وہ ریل کی بچھی ہوئی پٹڑیوں میں لڑکھڑاتا ہوا واپس لوٹ گیا، دور تک اس کے کانوں میں قلموں کے چلنے کی آواز آتی رہی اس کا پیچھا کرتی رہی ۔

سارا دن ناول نگار گھر نہ گیا۔ ایک گلی سے دوسری گلی، ایک بازار سے دوسرے بازار، اور ایک بلک بار سے دوسرے شراب خانے تک گھومتا رہا۔ وہ ذہنی بحران میں مبتلا تھا بانجھ ہوتی ہوئی تخلیقی صلاحیتوں کا مرثیہ خواں! وہ سارے نوجوان کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے۔ ان کی منزل کون سی ہے؟ یہ سوالات اس کے ذہن کو ڈستے رہے، پچوکے دیتے رہے۔ اور ناول نگار..... شتر بے مہار کی طرح...... گھومتا رہا، شراب پیتا رہا ـــــ اور ذہن کو پگھلاتا رہا

اس کے کچھ دوست اسے نشے میں دھت دیکھ کر اس کے گھر چھوڑ آئے! اگلی صبح وہ دیر تک بستر پر لیٹا رہا۔ وہ بیمار پڑ گیا تھا۔ اس کے ہم عصر اور ساتھی ناول نگاروں کے فون آتے رہے ـــــ اور پھر پہلا بم پھٹا ـــــ اس کو ایک ناول نگار نے اطلاع دی۔

"ناول چھاپنے والے سب سے بڑے اشاعتی ادارے کے سامنے آج صبح ایک ٹیکسی رکی۔ چار نوجوان ٹیکسی سے اترے، ان کے لباس صاف ستھرے مگر شکنوں سے پُر تھے۔ وہ اپنے ساتھ ایک سو بیس شاہکار ناولوں کے مسوّدے لائے تھے۔ ایک نوجوان کے پاس ڈھول تھا۔ وہ ڈھول بجانے لگا اور باقی نوجوان اس کے پیچھے پیچھے، اشاعتی ادارے میں داخل ہوئے۔ وہ گمنام لوگ تھے۔ حتیٰ کہ ان کے نام بھی بے معنی اور فضول تھے۔ اشاعتی ادارے کے ڈائرکٹر نے ان کے مسوّدے دیکھ کر ایک بڑی رقم پیشگی دینے کی پیش کش کی مگر نوجوانوں نے صرف کاغذ کی قیمت، اور ایک معمولی سی رقم پر اکتفا کیا۔

معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد وہ جس طرح آئے تھے، اشاعتی ادارے سے باہر نکل گئے۔ اشاعتی ادارے کے ملازموں نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر پھر لکھنے لگے۔ ان مسوّدوں کو پڑھنے والے ایڈیٹروں نے اعلان کیا ہے کہ آج تک ان کی نظروں سے ایسے شاہکار کبھی نہیں گزرے ـــــ

شہر کے اشاعتی اور ادبی حلقوں میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ ملک کے ادبی حلقے اور اشاعتی ادارے ایک نئے انقلاب سے دوچار ہو رہے تھے۔ پورا ملک اس انوکھی دہشت اور سنسنی کی گرفت میں تھا۔

ناول نگار کے دوست اسے فون کر رہے تھے اسے دھمکا رہے تھے، اس کی نئی دریافت کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اور جب وہ انہیں اس کے فرار کی اطلاع دیتا تو ان کی زبانیں اور تلخ ہو جاتیں، وہ اسے کوستے نہ تھکتے۔ اس نے تنگ آ کر ملک کے سب سے بڑے نقاد کو دعوت دی کہ وہ آ کر اس نوجوان کے لکھے ہوئے ناول کو دیکھے نقاد کو مدعو کرنے کے بعد وہ ناول کا مسوّدہ لینے کے لئے اپنے کمرے میں گیا

مسوّدہ غائب تھا۔

جب وہ اپنے کمرے اور لائبریری کا ایک ایک کونہ ایک ایک کاغذ چھان پھٹک چکا تو وہ مایوس ہو کر باورچی خانہ کی طرف گیا ـــــ تا کہ گھر کی ملازمہ سے پوچھ گچھ کر سکے۔ باورچی خانہ خالی تھا۔ وہ ملازم کے کمرے کی طرف لپکا۔ اور وہاں اس نے جو کچھ دیکھا۔ وہ ناقابلِ یقین تھا۔ بوڑھی دیہاتی ملازمہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی مسوّدہ پڑھ رہی تھی۔ یہ عورت کبھی ادب کے نزدیک تک نہ پھٹکی تھی اس نے کبھی اپنے آقا کے کاغذ کو چھونے تک کی جسارت نہ کی تھی۔ مگر اب وہ پورے انہماک اور استغراق سے نوجوان کا لکھا ہوا مسوّدہ پڑھ رہی تھی۔

اس نے ملازم سے مسوّدہ مانگا، وہ خاموش پڑھتی رہی۔ اس کی نظریں سطروں پر گھومتی رہیں۔ وہ ناول کے بکھرے ہوئے حروف میں سما چکی تھی۔ یہ کشش اور قوت سچے اور کھرے شہکار میں ہی ہوتی ہے۔ بوڑھی عورت کی روح تک تحریر میں سما چکی تھی۔ اس نے مسوّدہ چھیننا چاہا۔ بوڑھی عورت نے مزاحمت کی۔ کھینچا تانی میں بوڑھی عورت کا سر بستر کی لوہے کی پٹی سے ٹکرا گیا اور مسوّدہ ناول نگار کے ہاتھوں میں آ گیا۔ ہاں کاغذ کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا اس کے ہاتھوں میں رہ گیا جسے بوڑھی عورت نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ چوٹ کے درد سے بے خبر تھی۔ اس کے چہرے پر عقیدت کا نور بکھرا ہوا تھا۔

ملک کے سب سے بڑے نقاد نے ناول کا مسوّدہ پڑھ کر صرف چند جملے کہے۔ ایک شاہکار ایک مکمل فن پارہ ..... حسنِ مطلق کی طرح... ایک معجزہ ـــــ آفاقی قدروں کا حامل ـــــ اور ایسے ناول صدیوں میں جا کر لکھے جاتے ہیں!

اشاعتی ادارے نے نئے ناول "مُنا فٹ" چھاپ دیئے۔ پرانی کتابوں کو ایک طرف ڈھیر کر دیا گیا۔ نئے ناولوں کا ایک دن میں ایک ایک ایڈیشن نکل گیا۔ اس کے پڑھنے والوں میں سادہ لوح اور نیم خواندہ قاری بھی تھے اور اعلیٰ مخصوص ادبی ذوق رکھنے والے بھی ـــــ بے چارے ناقدروں کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ ان ناولوں میں کوئی فنی، موضوعی یا تخلیقی خامی نہ

تھی۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھے مگر کچھ تلاش نہ کر سکے۔ اور جو سالہا سال سے ــــ نقائص نکالنے کے عادی تھے اب مدح لکھنے کے لئے تیار نہ تھے اور یوں بے کار ہو کر بیٹھ گئے ــــ

کھیت، مزدور، دہقان، کلرک، طالب علم، افسر، ادیب، خواندہ اور نیم خواندہ، سب ان ناولوں کو پڑھ رہے تھے۔ چند دنوں میں پرانے ناول اور افسانہ نگاروں کو بھلا دیا گیا۔ ان کی کتابوں کو کوڑے کے ڈھیر کی طرح اِدھر اُدھر پھینکا جانے لگا۔ سارا ملک، پُراسرار۔ نوجوان مصنفوں کی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ ایک تیس ناولوں کے بعد ــــ ان کے ناولوں کی دوسری کھیپ مارکیٹ میں آئی۔ بیک وقت کئی سو نئے ناول ـ ملک کے تمام، اشاعتی ادارے شائع کر رہے تھے اور ان اشاعتی اداروں کے ایڈیٹروں نے متفقہ طور پر اعلان کیا تھا کہ ہر ناول مکمل اور بے عیب فن پارہ اور شاہکار ہے۔ ہر جملہ اتنا مکمل اور بے عیب ہے کہ اس میں ایک شوشے اور نقطے کی ترمیم یا اضافے کا خیال تک بھی محال ہے۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ناول نگار نے پچھلے چند دنوں میں کچھ نظمیں کہی تھیں جنہیں لے کر وہ ایک ایسے اشاعتی ادارے کی طرف جا رہا تھا۔ جو نظموں کے مجموعے شائع کرنے میں مشہور تھا۔ ناول نگار کو یقین تھا کہ وہ اس اشاعتی ادارے سے کچھ ایڈوانس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

ناول نگار نے اب نظمیں شروع کر دی تھیں۔ کیونکہ ناول کی دنیا میں اب اسے کوئی پوچھنے والا نہ رہا تھا۔ ابھی وہ اشاعتی ادارے سے کچھ دور ہی تھا۔ اسے ایک ممتاز شاعر مل گیا۔

"وہاں جانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا"

ممتاز شاعر نے اسے اطلاع دی۔ "وہ" شاعری کی دنیا میں بھی گھس آئے ہیں۔

میں اشاعتی ادارے سے ہی آ رہا ہوں۔" وہ کل نظموں کے مجموعے بھی دے گئے ہیں۔ اب ہماری مانگ ختم ہو چکی ہے۔

چند لمحوں تک وہ ایک دوسرے کے ساتھ خاموش سے چلتے رہے۔ ناول نگار نے دیکھا کہ آسمان پر گہرے بادل جمع ہو چکے ہیں اور بارش ہونے کے امکانات تھے۔

ذرا تیز تیز چلیں، میرے ذہن میں ایک ڈرامے کا پلاٹ کئی دنوں سے آیا ہوا ہے ــــ

وہ دیر سے پہنچے تھے۔ شاعری کی طرح۔ نوجوان لکھنے والوں نے ڈرامہ اور فلم کے منظر ناموں اور کہانیوں کی دنیا کو بھی فتح کر لیا تھا۔ اوپیرا، موسیقی آمیز طربیئے۔ بچوں کی کتابیں ــــ ادب کی جملہ اصناف پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اب ملک کے ادیبوں کے لئے سب دروازے بند ہو چکے تھے۔ اس دن کئی لوگ ہنستے ہنستے بے ہوش ہو گئے اور انہیں سٹریچروں پر ڈال کر ہسپتال پہنچانا پڑا۔

رات ہو چکی تھی۔ جب ملک کے ایک دور دراز کے قصبے میں ادیبوں، شاعروں، ناول نگاروں اور سب لکھنے والوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ یہ سب لوگ تازہ اور نازک ترین صورت حال کا جائزہ لینے، اور اس سے نبٹنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ یہ ایک خفیہ اجلاس تھا۔ اس لئے اجلاس کے مقام سے باہر ملک کے نامور نقاد چوکیداری کر رہے تھے کہ کوئی اجنبی یا غیر متعلق آدمی کے کان میں اس اجلاس کی بھنک نہ پڑ جائے۔ دیواروں کے پیچھے افراتفری اور ہڑبونگ کا فقید المثال مظاہرہ ہو رہا تھا۔ ہر ادیب، ہر شاعر اور ہر لکھنے والا اپنی اپنی ڈفلی بجا رہا تھا۔ ایک کی بات دوسرے کو سمجھ میں نہ آ سکتی تھی۔ جب بد نظمی حد سے بڑھی تو سپید بالوں والا ایک معمر انسان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر سب لوگ خاموش ہو گئے اور پھر اس خاموشی میں اس کی آواز تیرنے لگی۔

"یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہماری تخلیقات اجنبی نوجوانوں کی تخلیقات کے سامنے ہیچ اور بے مایہ ہیں ہم سب کا مستقبل تاریکی کی نذر ہونے والا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی بقا کے لئے کوئی مثبت حل اور راستہ اختیار کریں۔ ہم نے اپنے طور پر نئے لکھنے والوں کی مقبولیت کو کم کرنے کے تمام حربے اختیار کر لئے ہیں۔ مگر ہم ــــ ناکام رہے ہیں۔ اب ہمارے لئے ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے۔ نئے لکھنے والے زندگی سے قریب ہو کر۔ سچی لگن کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ان کا ذاتی مفاد ان کی تخلیقات کی روح ہے۔ آؤ، ہم سب ..... ایک کیمپ بنائیں اور وہاں ...... اجتماعی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں۔ دنیا کے دھندوں کو ترک کر کے، اپنی ذاتی اغراض کو موت کے گھاٹ اتار کر، سچی لگن کے ساتھ پھر سے تخلیق ادب کا چراغ اپنے خون سے جلائیں ــــ"

وہ سب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے ایک دوسرے کے گلے ملنے لگے وہ جو سالوں سے ایک دوسرے کے ساتھ صرف نفرت اور حقارت کے جذبات کے ساتھ ملتے تھے۔ اب ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔ ان کی آنسوؤں سے نم اور دھندلائی

ہوئی آنکھیں اپنے جھلملاتے ہوئے مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔

چند ہفتوں میں کیمپ لگ گیا۔ ملک بھر کے لکھنے والے وہاں جمع ہو گئے اور تخلیقِ فن میں جت گئے۔

ایک ماہ کے بعد جب تخلیقی رفتار کا جائزہ لینے کا وقت آیا۔ تو انفرادی اور اجتماعی طور پر نتیجہ صفر تھا ـــــ صفر کسی نے کچھ نہ لکھا تھا، کسی کو کچھ نہ سوجھا تھا۔ اپنے مقاصد اغراض نفرتیں، کینگیاں ابھر ابھر کر آتی تھیں۔

ہمارا ناول نگار ـــــ کسی طرح رات کے آخری پہر میں نقادوں کی سخت نگہبانی سے آنکھ بچا کر نکل آیا۔ وہ اس دنیا سے اکتا چکا تھا۔ وہ چلنے لگا۔ ایک چشمہ.... وہ چشمے کے کنارے رک گیا۔

تاروں بھرے آسمان کی روشنی کو صبحِ کاذب کے اندھیرے دھندلانے لگے تھے۔ ناول نگار کو اپنا گھر یاد آیا۔ اس کا وہ کمرہ، جہاں بیٹھ کر وہ کام کرتا تھا۔ اس کے خیال سے ہی اس کا دل تڑپنے لگا... وہ چلنے لگا ـــــ اپنے گھر کی طرف جو دور تھا.... بہت دور..... بادل چھٹ رہے تھے ـــــ تارے ڈوب رہے تھے۔ پورا چاند اپنی آخری کرنوں کو بکھیر رہا تھا۔ صبح کا حُسن ـــــ حُسنِ مطلق ـــــ مکمل حُسن ناول نگار مکمل حُسن کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ شاہ بلوط کے درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ بالآخر اب اسے ٹیک لگانے کے لئے کوئی مضبوط سہارا مل گیا تھا اس نے دل میں کہا میں شکست نہیں مانوں گا۔ میں لڑتا رہوں گا۔

اگرچہ فتح اور کامرانی کی بہت کم امید ہے۔ میں حسنِ مطلق اور فنی تکمیل کو پانے کے لئے سب سے، اپنے آپ سے، اپنی ذات سے اپنی روح اور جسم سے لڑتا رہوں گا۔ شاید..... کسی دن.... کسی لمحے وہ لمحہ اس کی انگلیوں کی پوروں کی گرفت میں آ جائے جو انسانی تخلیق کو لازوال بنا دیتا ہے.....

وہ چل پڑا..... درختوں کے پتے سرسرا رہے تھے، جیسے اَن گنت قلم کاغذ پہ چلنے لگے ہوں۔

بچوں کا ادب نمبر

ماہِ نو نے علامہ اقبال نمبر، ابنِ انشا نمبر، صوفی تبسم نمبر، محمد حسن عسکری نمبر، جیسے یکتا شماروں کے بعد اب "بچوں کا ادب نمبر" شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

بچوں کا ادب نمبر۔ ادبی دستاویز اور بچوں کے سال کے سلسلے میں ایک سنگِ میل ہو گا۔

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر بک کرالیں کہ تعلیمی اداروں میں اس نمبر کی بڑی مانگ ہے۔

علی تنہا

سوئی

سوئی پھر گم ہوگئی۔ ڈھیروں ادھڑے ہوئے پرانے کپڑوں کی قطار میں سوئی خدا معلوم کہاں کھو گئی۔ ایک تو ان چیتھڑوں کو سینے میں وقت بہت لگتا ہے۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں سے کوئی سیون اُن موجود رہتی ہے۔ پہلے تو سوئی یہیں کہیں پڑی مل پاتی تھی۔ مگر اب تو حد ہی ہوگئی ہے۔ ٹھیک کہا ہے کسی نے۔ ٹھیٹروں کے کام ٹھیٹروں کے لوٹے کریں تو بھلا لگتا ہے۔ سوئی کیا قارون کا خزانہ ہے جو اتنی اتراتی پھرتی ہے۔

"اے" وہ بولا۔

"سوئی ہی تو نہیں مل پا رہی۔ کسی بھی جگہ جاؤ ایک سوئی نہیں اور تو ہر شے حاضر۔"

پہلے تو ایسا ہوتا نہیں تھا لیکن اب تو ہر وہ چیز نابود ہوئی جاتی ہے، جسے ہونا چاہیئے۔ وہ عبدالکریم کو آواز دینے کی خاطر اٹھا۔ پر آلکس نے کچھ دیر اُسے گھٹری پر سلائے رکھا۔ کپڑوں کے اس پہاڑ میں لوگوں کی کیسی کیسی قبریں تھیں۔ پرانی اور نئی۔ ایک وقت میں تو یہاں لیٹنے کو عمر کم رہتی ہے اور جی اوب جائے تو یہاں رہنا اپنی ہی ہیٹی۔ "خیر" وہ بڑبڑا کر اُٹھا۔ دونوں بازوؤں میں ایک پشواز لے کر اُسے جھلاتا رہا۔ ناگاہ وہ بول پڑا بولنے کی اُسے عادت تھوڑی کم تھی۔ اس کمی کو دور کرنے کی ترکیب اس نے یہ نکالی کہ وہ کچھ نہ کچھ گم کرتا رہتا ہے تاکہ لوگ بس کچھ نہ کچھ ڈھونڈنے کی راہ پر پڑے رہیں۔ اور انہیں مہلت ہی نہ ملے بلانے کی۔ بولنے کی۔

اب جو اس نے آواز دی ہے۔ تو مردے میں جان پڑگئی۔ وہ اٹھا اور اطمینان کر لیا کہ عبدالکریم ہی ہے۔ سوئی تو پھر بھی ملی نہیں۔ البتہ اُسے یک گونہ حیرت ہوئی۔ کس لئے کہ عبدالکریم بولا تھا ایک مردہ سفید فراک جھاڑنے پر کھٹی سی بساند سارے میں پھیلی۔ اس کے ساتھ ہی ایک پیلی کوٹ پڑا تھا، اور الگ سے ایک بڑا چمکدار بکسوا۔ ہر شے اپنی اپنی جگہ پر صحیح سلامت تھی۔ نہیں تھی تو سوئی۔ اور سوئی بھی وہ پرانی کہ نام لیجیے اللہ کا لیکن تھی پھر بھی وہ نامراد سوئی۔ عبدالمنان تو کہتا تھا۔ ایسی سوئیاں تو بس چبھونے کے کام آتی تھیں، بخیئے ان سے سیئیں گے کیا۔ تو پائی کے کام سوئی نہیں آتی کیا۔؟ بس یہی سوچ کر وہ پینک میں آ رہتا۔ سوئی مل جاتی اب تک تو کتنے ہی کپڑے سل چکے ہوتے۔ اس خیال سے تاؤ میں آتے آتے وہ رہ گیا۔ سوئی نہ ہوئی حضرت کا اسمِ اعظم ہوا۔ دن بھاری ہوں تو سوئی کیا پہاڑ بن جاتی ہے۔ پہاڑ پر چڑھ کر چاہے کوئی کتنا ہی تاؤ کھائے۔ مگر ہوتا ہے وہی بچھیا والا تاؤ۔ وہ ایک پرانے اوور کوٹ پر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا اور کسی اور دن جس میں ایسے ہی دن کی سی کسالت مندی اور بھربھری سی خنکی ہو۔ پار کرتا گیا۔ دن جو گزر گئے تھے۔ سب کسی اور ہی طرح کے تھے یا وہ بھول رہا تھا۔ بھولنے پر عبدالمنان گھبراتا بہت تھا کہتا تھا۔ یہ بہت ہولناکی ہے۔

"اے" وہ کوٹ کے بٹن کھول کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

کوٹ کا سینہ چرا ہوا تھا۔ اور استر کا نرم سُرخ کپڑا الجھیلا تھا۔ کوٹ کے سرخا سرخ سینے میں بھی خون ہوتا ہے کیا۔؟ ایک جگہ استر میں بغار تھی۔ تاگے سُرخ رگوں کی طرح ذری کی ذرا بسرہلیں وہ مسکرا کر کوٹ کو بانہوں میں لے کر ایک پرانے پشمینے کے تھان پر مار مار کر بڑبڑایا۔

"سوئی اسی تھان میں ہوئی تو پھر؟"

اس میں کہاں ملے جی ــ سوئی"

"ہاں یار ــ کہتے ہیں تھان بڑا ہو تو پھر سوئی کہاں۔"

"کیا نام ہے بھائی اس تھان کا"

"نام تو ان کے بہت تگڑم سے ہوتے ہیں۔"

"وہ تھان سے دھر پڑی چادر پکڑ کر اس کے پاس لایا۔ کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھے بنا، چادر کو تکتے رہے۔ پھر عبدالکریم حق دق ہو کے کہنے لگا۔

"بابا کہتے تھے۔ چھ دن میں بنی ہے یہ دنیا ان چھ دنوں میں کوئی ایسا دن کیا ہوگا۔؟"

"تم بیچ میں کیا باتیں لے بیٹھتے ہو! ابھی تھان کی بات اور اب ....."

"ہاں یار سوئی جب بھی گم ہوتی ہے۔ میں بات ٹک کے کر نہیں سکتا"

"اچھا — ؟"

"ہاں جی سنو — سوئی جس وقت اڑی ہے نا۔ اس سے آیا تھا جہان؟"

"جہان — کون جہان" اس کی آنکھیں اُبل پڑیں "کون جہان"

"لوجی نام تو اس کا مجھے بھی یاد رہا نہیں بس شکل تھی اس کی۔ اشکلے بازوں جیسی۔"

"رنگت کیسی زرد تھی۔"

"ہاں جی — پتہ ہے کہتا کیا تھا؟"

"

"جی پھر کہنے لگا گھڑیاں ایسی بناتا ہوں مفت میں کر...."

"لوجی گھڑیاں تو سہارنپور کا وہ عبدل بناتا تھا"

"اچھا...."

وہ دوبارہ کوٹ کے استر میں ہاتھ دبا کر پیتل کے چمکیلے بکسوئے کو دیکھتا رہا

"تمہاری اس سے یاری کب گٹھی؟"

"پرانی — قصہ تو تم نے سنا ہوگا، اس کے بھائی کا، جوتوں کی دکان کرتا تھا۔"

وہ درمیان میں رکا۔ بسنتی رنگ کے سوئٹر کا سنہرا بٹن چاقو سے کاٹ کر پھر دوسرا اور تیسرا بٹن جدا کر کے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ وہ کام تو کرتا تھا جوتوں کا مگر آدمی بہت بھلا مانس تھا۔"

"جوتوں کے کاروبار میں لوگ عیب کرتے ہیں کیا۔؟"

"لوجی" عبدالمنان نے تین بٹن ایک دوسرے پر رکھے۔

"لوجی عیب لوگ کہاں نہیں کرتے۔"

"ہاں جی یہ تو ہے۔ پر وہ جہان تھا کون۔؟"

"گولی مارو اسے — یہ دیکھو دھوپ کتنی اُتر آئی ہے۔"

میں نے کوئی دھوپ کا ذکر کیا ہے۔ لوجی میں کہوں وہ تو تھے بڑے سخت گیر۔ وہی پہلے والا جہان ہے نا۔

بے چارا بہت نیک تھا۔ جب میں پڑا ہوں بستر — میری بہت سیوا کی ہے بے چارے نے۔"

"عبدالمنان" وہ چلایا۔

"پھٹکی پڑے تیرے جہانوں پر۔ جو بھی بات ہے۔ ادھوری میری تو سوئی کھوئی گئی ہے...."

سوئی کھوئی گئی ہے نا۔ سنتا تو"

وہ اٹھا — عبدالمنان کو کچھ کہے سُنے بغیر۔ پانی کے مٹکے سے پانی پی کر پھر سے سوئی ڈھونڈنے کپڑوں کے ساتھ اب وہ چومکھی لڑائی اتنی تیزی سے لڑتا جاتا کہ بس آنکھ جھپکتے میں تو وہ سوئی ڈھونڈ رہا ہے اور پھر کپڑوں میں موجزن جیسے دریا کی جھاگ کی لہر ایک دم سے دریا کے جسے سے نکل کے ریت پر پھیل کر آنسوؤں کی طرح دم توڑ دیتی ہے

سوئی کا کہیں دور تک پتہ نہیں تھا۔ کپڑوں کا انبار ہی انبار تھا۔ دو چار کپڑے تو سرے سے دیکھے ہی نہیں گئے تھے۔ ان میں شاید سوئی چھپنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ سوئی تو سوئی وہاں تو سانس بھی صاف نظر آجاتا۔ ایسے مہین اور شفاف زین کے کپڑے تھے۔ لیکن اس نے انہیں بھی پھیلا کر خوب رگیدا۔ یہ آخری کوشش کتنی پھیکی تھی۔ وہ تن بہ تقدیر ہو کے اٹھا اور پھر اسی بے دلی کی نسبت سے برساتی پر لیٹ گیا۔ کالے رنگ کی برساتی میں قبر کی سی آسودگی اور دیر تک ماتھے سے بل اُڑا نے والی خاموشی تھی۔ وہی آواز پھر آئی۔ شاید قبر میں منکر نکیر آئے ہوں۔ کیا منکر نکیر بھی اپنی سوئیاں کھوتے ہیں؟ کپڑے تیز ہوا میں جھونٹے کھاتے رہے۔ شاید آواز پھر سے آئی۔ وہ اُٹھا لیکن نہ تو برساتی والی قبر کی خنکی آمیز نرماہٹ تھی اور نہ منکر نکیر کے سوالوں کے تازیانے۔ سچ مچ کی کپڑوں کے ڈھیر سے چومکھی لڑائی کرنے کے بعد آواز آئی تھی۔ وہ بلبلا کر اٹھا۔ جیسے سوئی اس کی آنکھ میں چبھ کر ٹوٹ گئی ہو۔

"کیا کہا"

"سوئی نہیں ملی" وہ بے فکر اس طرف دیکھنے لگا۔ جہاں شمال کی کھونٹیوں پر قرمزی کپڑوں کی قطار تھی۔ اس قطار کو دیکھ کر لگتا تھا۔ جیسے بابل کے بادشاہ بھی سوئی کی تلاش میں یہاں تک آگئے ہوں۔ اس نے گِدھ کی طرح آنکھیں پھیلا کر آواز کی سمت دیکھا۔ اور پھر اسی تیزی کے ساتھ کپڑوں کے ڈھیر میں اس طرح بیٹھ گیا۔ جیسے ریشم کا کیڑا ہو اور اپنا کفن تیار کر چکا ہو۔

علی شریف

دلدل

بڑا ڈراؤنا خواب تھا. میری آنکھ کھل گئی تھی لیکن ابھی تک خواب کے اثرات میرے جسم پر عیاں تھے. میرا پورا جسم پسینے میں تر تھا. دل زور زور سے دھڑک رہا تھا. حالانکہ سردی شباب پر تھی. میری بیوی لحاف میں اپنے آپ کو پوری طرح لپیٹے بے خبر سوئی ہوئی تھی تینوں بچے بھی سردی میں سکڑے سمٹے ایک ہی لحاف میں گھسے ہوئے تھے. کسی کی ٹانگیں باہر تھیں تو کسی کا سر. کسی کو میری کیفیت کی خبر نہ تھی میں اٹھا. اپنے آپ کو چادر میں اچھی طرح سے لپیٹا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا. باہر نکلتے ہی سردی کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی اور کپکپاہٹ سی طاری ہو گئی.

میں نے صراحی سے پانی لیا. پہلا ہی گھونٹ بھرا تھا کہ دانتوں میں کٹکٹی دوڑ گئی پانی پی کر میں دوبارہ اپنے بستر پر آیا اور لیٹ گیا.

بستر پر پہنچتے ہی اس خواب نے میرا احاطہ کر لیا. عجیب خواب تھا. مرحلہ وار آگے بڑھ رہا تھا. اس سے پہلے بھی مجھے خواب نظر آتے رہے ہیں. لیکن وہ خواب بڑے دل خوش کن تھے جو کہ نوجوانوں کے خواب ہوتے ہیں جو کئی دنوں تک گدگداتے رہتے ہیں. مگر یہ خواب تو مجھے موت کی طرف لئے جا رہا تھا. آہستہ آہستہ. شب بہ شب موت! میں اس سے بہت ڈرتا ہوں. میں اس کے تصور سے کانپ جاتا ہوں. یہ صحیح ہے کہ ہر شخص کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے میں نے اپنے ایک عزیز دوست کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا ہے. اس کی روح بڑی جانکنی کے عالم میں نکلی تھی. مہینوں بستر مرگ پر پڑا رہا. پھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا. اس دن سے مجھے موت سے خوف آتا ہے ایسی اذیت ناک موت! مجھے تو ایسی موت پسند ہے. جیسے اچانک بجلی کا فیوز اُڑ جائے اور چاروں طرف گھُپ اندھیرا چھا جائے. یوں تو نہیں کہ وولٹیج بالکل گر جائے بلب موم بتی کی روشنی دینے لگے. ایسی روشنی کس کام کی؟

وہ خواب بھی کچھ ایسا ہی تھا جو آہستہ آہستہ میری روح کھینچ رہا تھا. بلاشبہ وہ خواب موت کا تھا. ایسی موت کا، جس کا میں نہ سوتے میں نہ جاگتے میں تصور کر سکتا ہوں. میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور شعوری طور پر اپنے آپ کو نیند سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا. مبادا مجھے پھر نیند آ جائے اور خواب نئے سرے سے شروع ہو جائے. خواب کبھی کبھی حقیقت کا روپ بھی تو دھار لیتے ہیں. میں آپ کو اسی خواب کی بات بتاتا ہوں. یہ خواب میں نے کب سے دیکھنا شروع کیا تو مجھے یاد نہیں. ہاں البتہ یہ کئی دنوں کی بات ہے. رات کا وقت تھا اور ایک اجنبی جگہ. معلوم نہیں میں کہاں سے نکلا تھا. ہاں اتنا یاد ہے کہ میں اپنے بیوی بچوں کو پیچھے چھوڑ آیا تھا. سب کی آنکھوں میں آنسو تھے. انہوں نے مجھے روکا تھا. بڑے واسطے دیئے تھے لیکن میرے جسم میں تو پارہ بھرا ہوا تھا. میں چلتا رہا. چلتا رہا حتیٰ کہ وہ تمام چہرے وہ تمام پیارے جو روشن تصویر کی طرح میرے ذہن پر نقش تھے. معدوم ہوتے گئے. بالکل آؤٹ آف فوکس. میں نے بڑی مسافتیں طے کیں. کن کن شہروں سے نہ گذرا. کن کن نگروں کی سیر نہ کی. پر کہیں ٹھکانہ نہ ملا. البتہ چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے جو پھوٹ کر زخم بن گئے تھے لیکن سفر ختم نہیں ہوا تھا. سفر کیسے ختم ہو جبکہ منزل ہی کی خبر نہ ہو. لوگ ملتے رہے لوگ بچھڑتے رہے. کچھ آشنا چہرے. کچھ ناآشنا کچھ مہربان کچھ نامہربان. ہاں البتہ ایک امید تھی جو مجھے آگے لئے جا رہی تھی.

میں اب ایسی جگہ آ پہنچا تھا جہاں دور باغات نظر آ رہے تھے. ہر طرف سبزہ پھیلا ہوا تھا. لوگ بھی چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے. یہ منظر اتنا دل خوش کن تھا کہ میں نے سوچا یہیں وہ پڑاؤ ہو گا. میں اپنے خیالوں میں مگن تھا اور کسی قدر خوش بھی. لیکن یہ خوشی عارضی تھی. یہاں تک کہ خواب

تکرار اتھا لیکن اس کے بعد کا خواب میرے لئے عذاب کی گھڑیاں لایا تھا۔ راہ میں ایک چھوٹا سا گڑھا پڑتا تھا۔ مجھے اس گڑھے کو پار کرنا تھا۔ جس میں کیچڑ بھرا ہوا تھا۔ میں گڑھے کو پھلانگ کر جانا چاہتا تھا میں نے چھلانگ لگائی میں کنارے تک پہنچ گیا تھا لیکن میرا پیر رپٹ گیا اور میں اس گڑھے کے اندر چلا گیا۔ میں نے سوچا نکل آؤں گا۔ اس گڑھے کی حیثیت ہی کیا تھی چھوٹا سا معمولی گڑھا تھا۔ لیکن میں جتنا پیر نکالنے کی کوشش کرتا پیر اندر جانے لگتا۔ میں جتنا زور لگاتا پیر اتنا ہی اندر ہونے لگتا۔ لحظہ بہ لحظہ میرا جسم اندر جارہا تھا۔ ٹخنہ ٹخنے سے گھٹنا، گھٹنے سے کمر۔ میں کسی کو مدد کے لئے پکارنا چاہتا تھا۔ لیکن میری آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ یہ کیسی بے بسی کا عالم تھا مجھے وہ لوگ یاد آرہے تھے جو مجھ سے دور تھے اور جنہوں نے میری زندگی کو خدا کی امان میں دیا ہوا تھا یقیناً وہ اب بھی میری سلامتی کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے

میں نے اب بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ اور برابر اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن دلدل میں میرا پاؤں برابر نیچے جا رہا تھا مجھے وہ وقت یاد آرہا تھا جب میرا دل امنگوں سے سرشار تھا خون میں حدت تھی۔ تازگی تھی کچھ کر دکھانے کا حوصلہ تھا اب یہ تمام حوصلے پست ہو چکے تھے۔ دلدل بھی پھیلتی جارہی تھی۔ پہلے یہ صرف ایک گڑھے کی شکل میں تھی لیکن اب اس کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا اس دلدل سے نکلنا محال تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ تمام دُعائیں جو مجھے یاد تھیں پڑھ ڈالیں۔ اب غیب سے ہی میری کوئی مدد ہو سکتی تھی۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو کچھ چہرے اس دلدل کے اردگرد جمع تھے ان کے چہرے سپاٹ اور جذبات سے عاری تھے۔ میں نے مدد کے لئے ہاتھ اٹھائے لیکن میرے ہاتھ فضا ہی میں تیرتے رہ گئے۔ ان میں سے کسی نے کوئی حرکت نہ کی یقیناً وہ تماشائی تھے اور میری موت کا منظر دیکھنا چاہتے تھے، بے چارگی اب پوری طرح مجھ پر مسلط ہو چکی تھی۔ آنسو میری آنکھوں سے ڈھلک رہے تھے اور ہونٹوں پر خود بخود میری بیوی بچوں کے نام آرہے تھے۔ کیسی گھڑی تھی کہ مرتے وقت میرے اپنے قریب نہ تھے۔ میں اس عالم میں بھی خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ اچانک میں دیکھتا ہوں کہ کوئی بھیڑ کو چیرتا ہوا آرہا ہے۔ میں نے سوچا کوئی ہمدرد ہے جو میری مدد کو آرہا ہے، رفتہ رفتہ جب وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے قریب آتے ہیں تو میں پہچان جاتا ہوں۔ یہ میرے اپنے بیوی بچے تھے۔ میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے میں انہیں منع کرتا ہوں کہ وہ قریب نہ آئیں۔ میں انہیں منع کرتا ہوں کہ وہ قریب نہ آئیں ابھی کچھ دیر پہلے میں ان کی صورتیں دیکھنے کیلئے ترس رہا تھا لیکن اب جبکہ وہ میرے قریب ہیں میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے دور چلے جائیں۔ یہ لوگ یہاں کہاں سے آگئے۔ میں تو انہیں عافیت میں چھوڑ کر نکلا تھا۔ یہ لوگ میرے پیچھے نکلے ہوں گے اور مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آپہنچے تھے۔ لیکن اس عالم میں کہ میں خود اپنی حفاظت کرنے سے قاصر تھا۔ میں ان کے کس کام آسکتا تھا! میں دیکھتا ہوں کہ میری بیوی زار و قطار رو رہی ہے بچے آہ و بکا کر رہے ہیں لیکن اس بھیڑ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میری بیوی آگے بڑھتے بڑھتے دلدل تک آپہنچی ہے۔ میں اسے منع کرتا ہوں چیخ چیخ کر کہتا ہوں وہ مجھ سے دور رہے۔ لیکن شاید وہ بہری ہو چکی ہے اس کے قدم آگے بڑھتے جارہے ہیں بچے اس کے پیچھے ہیں وہ دلدل میں اتر چکی ہے اور آہستہ آہستہ اندر جارہی ہے۔ بچے بھی اس دلدل کی تہہ میں جارہے ہیں۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ وہ سب میرے بازوؤں کے حلقے میں آچکے ہیں اب صرف ہماری گردنیں نظر آتی ہیں۔ دلدل کا کیچڑ ہمارے نتھنوں میں گھسنے لگتا ہے۔ سانس اٹک جاتی ہے اور چاروں طرف اندھیرا چھا جاتا ہے میں چیخ مار کر اٹھ جاتا ہوں میری سانس دھونکنی کی مانند چل رہی ہے اور دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ جیسے ابھی سینہ چیر کر باہر آجائے گا میری بیوی چیخ سن کے اٹھ گئی ہے۔ بچے بھی بیدار ہو گئے ہیں۔ وہ میری روز روز کی ان چیخوں سے عاجز آگئی ہے۔ وہ مجھے ہر وقت کہتی رہتی ہے کہ زیادہ نہ سوچا کرو۔ تمہاری سوچیں تمہارے لئے عذاب بن گئی ہیں لیکن میں اسے کیسے بتاؤں کہ ان ڈراؤنے خوابوں میں اب وہ اور بچے بھی شریک ہو گئے ہیں میں اب ان خوابوں سے بچنے کے لئے سکون آور دوائیں لیتا ہوں لیکن کب تک؟ یہ دلدل تو میرے چاروں طرف ہے۔

محمد ابدال بیلا

گیلی روشنی

وہ دونوں چوکیدار تھے۔
خیمے کے باہر آگ جل رہی تھی اور وہ اکیلا وہاں
بیٹھا اپنی ہڈیاں سینک رہا تھا۔ ایک پرانا بڑا سا اوورکوٹ
اس نے بہت سے کپڑوں کے اوپر چڑھا رکھا تھا۔
گلے میں ایک میلا گندا، پھٹا پرانا سا مفلر جس کا رنگ
صرف دن کو ہی نظر آتا تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ آسمان پر بادل تھے
اور چاروں طرف دھند۔ کھلے میدان میں وہ ——
سکڑ کے آگ سے لگا بیٹھا تھا —— جیسے باقی سب
جگہ پرائی ہو۔ اس کے ہاتھ کسی ٹنڈ منڈ درخت
کی —— دو بچی کھچی ٹہنیوں کی طرح چولہے سے اُبلتے
شعلوں کی چھت بنے ہوئے تھے —— اور لال لال
شعلے —— سانپ کی زبان بنے —— انہیں چاٹ
رہے تھے۔

بارش کے پہلے چند چھینٹوں نے ہی اُسے چونکا دیا۔
اس نے ہاتھ کھینچ کے —— بغلوں میں چھپا لئے
—— اور پانی کے چھینٹے چھروں کی طرح شعلوں کو
چیرنے لگے —— خیمے کے ساتھ ہی پورے دو ایکڑ
کی زمین میں —— مونجی بکھری پڑی تھی —— چھوٹی چھوٹی
ڈھیریاں —— جن پہ اُن سے پکی بڑی صفیں یوں
پڑی تھیں —— جیسے کسی نے کچی قبروں پر چکنی مٹی
سے پوچا کیا ہو —— ان ڈھیریوں کی طرف دیکھتے
ہوئے اسے خود پر گورکن کا گمان ہونے لگا۔ جس نے
سب قبروں پہ اپنے ہاتھ سے پوچا کیا ہو ——
اور اب بارش کے چھینٹے اُن پر اکٹھے ہو رہے تھے
وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا —— اور پریشانی سے
اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دُور دُور تک سناٹا تھا ——
دور فیکٹری کی دیوار کے ایک بڑے سے شگاف
سے شیلر کے قریب پھک کے اُونچے اُونچے ڈھیروں
کے پاس کئی سائے ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔
اتنے ڈھیروں کو کون سمیٹے گا اب —— اس کا
ساتھی اندر خیمے میں پڑا تھا۔ اُسے ٹی بی تھی ——
اس نے دائیں طرف مونجی کی بوریوں کے ایک اُونچے
ڈھیر کو دیکھا —— اور پھر پڑ کے اوپر گہرے ٹپکتے
آسمان کو —— جو کسی فقیر کی گیلی، میلی، بدرنگ سی جلی
بنا ہوا تھا ——
بارش تیز ہو گئی ——

چادلوں سے اُترے ہوئے سفید پوڈر سے
جلائی ہوئی آگ بجھنے لگی —— شُس شُس کر کے
چولہے کی گرم راکھ میں جذب ہوتے ہوئے ——
بارش کے قطرے —— اسے یوں لگتے۔ جیسے کنکر
ہوں جو کوئی چھپ کے بیٹھا ہوا۔ اُسے مار رہا ہو۔
اونچے اونچے بانس گاڑ کے کئی بلب لٹکائے
ہوئے تھے ——
مونجی کے پڑوں میں بھیگی بھیگی سی روشنی تیر
رہی تھی —— مایوس —— زرد —— بے جان ——
جس میں بارش کے قطرے الگ ہی چلتے نظر آتے۔
دور فیکٹری کی دیوار کے اسی شگاف سے کئی سائے
اس طرف بھاگتے ہوئے نظر آئے —— اس کا خون
خشک ہونے لگا —— جیسے بارش کا فوارہ اُسی نے
چھوڑا ہو —— اس نے مٹی میں دبے ٹین کے
کنستر والے چولہے میں بجھے پوڈر کو چھیڑا اور لوہے
کی پھکنی سے دو پھونکیں ماریں۔ چند چھوٹے کچے
سے شعلے اُبھرے اور وہ جلدی جلدی انہیں اپنے
ہاتھوں سے مسلنے لگا ——
اس کی نظریں آتے ہوئے لوگوں پر لگی تھیں۔
جواب اپنے سایوں سے زیادہ واضح ہو رہے تھے
آگ شُس شُس کر کے بلک رہی تھی —— اس
نے آخری بار مرتے ہوئے شعلوں پر ہاتھ پھیرا ——
جیسے کسی مردہ شخص کی آنکھیں بند کر رہا ہو۔ جس کی

آنکھوں میں وہ خود مدت سے چمکتا آیا ہو ——— اور
وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے کھڑا ہوا ———

وہ لوگ بہت قریب آ چکے تھے ——— ان کی باتیں
بھی اب کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ وہ تعداد
میں کئی تھے ——— مگر تھے سب ایک جیسے ———
سوکھے سوکھے ——— جیسے کسی جنگل کے بہت سارے
درخت ہوں۔ جو اپنے پتوں اور کٹی ٹہنیوں کو روندتے
ہوئے چلنے پھرنے لگے ہوں ———
سب نے مونجی کی خالی بوریوں کے چھوٹے چھوٹے
تمبو سے بنا کے ——— اپنے جسموں پر چڑھائے ہوئے
تھے ———

صرف ایک الگ تھا ——— جس کی برساتی گیلی گیلی
روشنی میں چمک رہی تھی ——— پانی سے نکلی ہوئی
تازہ شنگھاری مچھلی کی طرح ——— جو چھوٹی مچھلیوں کو
ہڑپ کر لیتی ہے ——— وہ زور زور سے پیر پٹختا
ہاتھ ملتا ——— بڑبڑاتا اور کبھی چیختا ہوا ——— مونجی کی
خالی بوریوں میں چھپے لوگوں کو اِدھر اُدھر بھگا رہا تھا۔
پھر وہ گرج کے بولا ——— "ترپال ڈال دو ———
جلدی جلدی ——— بوریوں پہ ———"
اور کئی لوگ اس کے خیمے میں گھس گئے ———
اور پھر ایک ترپال کھینچتے ہوئے۔ بوریوں کے ایک
بڑے ڈھیر پر چڑھ گئے ——— وہ پلے دار تھے ———
اور وہ چوکیدار ———

وہ بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی ——— ڈھیریوں کو
اچھی طرح ڈھانپ رہا تھا ———
برساتی کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے ——— وہ
اس کی طرف بڑھ آیا۔

"تم ——— " اس نے گالی دے کر کہا ——— "یہاں
مزے کر رہے ہو ؟"
وہ کانپ گیا ———
"جی میں ——— صاحب ———"
"اور تمہارا باپ ———" اس نے پھر گالی دیتے
ہوئے کہا ——— "حرام کی روزی کھاتے ہو ——— ساری
رات یہاں مزے سے بیٹھے رہتے ہو ———
آگ سینکتے ہو ———" تمہیں علم نہیں تھا کہ ———
بارش ہوگی ——— ؟"
"جی ——— بادل تو تھے ——— صاحب ———"
"پھر ———"
"مگر ——— بادل تو کئی دن سے تھے ———"
"کمبخت ——— میری لاکھوں کی مونجی ——— بکھری
پڑی ہے ——— سیزن کے دن ہیں ——— بارش تیز
ہوگئی ——— تو ——— کون ذمہ دار ہوگا ———"
اور بارش تیز ہونے لگی ——— شرررز ——— شرررڑ
"کدھر ہے تمہارا ساتھی ———"
"جی ——— وہ ——— اندر پڑا ہے ———"
"اندر پڑا ہے ——— وہ جانور ——— بیمار سمجھ
کے ترس کھا لیا ——— نوکری دی ——— خیمہ لگا کے دیا
ورنہ ——— مر جاتا کہیں فٹ پاتھ پر ———"
"اٹھاؤ اُسے ———"

اور وہ کانپتا ہوا ——— تمبو کا پلا اُٹھا کے ———
اندر سرک گیا ——— وہ اندر پڑا کراہ رہا تھا ———
اس کی آنکھیں لٹکتی ہوئی لالٹین کی میلی چمنی کی طرح
دھندلی تھیں ——— وہ پھر چپکے سے باہر آگیا ———
دوسرے نوکر اپنی اپنی بوریاں اتار کر ——— بکھری
ہوئی مونجی کی ڈھیریوں پہ ڈال رہے تھے ———
"صاحب ترپال چھوٹی ہے ——— پوری نہیں
آ رہی ———"
"کیوں ———" اس نے یک لخت برساتی کی
جیبوں سے ہاتھ نکال لئے ——— جیسے جیب پھٹ
گئی ہو اچانک ———
"چھوٹی ہے صاحب !"
"تم سب نالائق ہو ——— تمہیں پتہ تھا۔ بارش
ہوگی۔ بوریوں کو ٹھیک طرح رکھتے ——— نئی ترپال
کوٹھی میں پڑی ہے ——— وہی اٹھا لاتے ———
تم سب ———"
"اب کیا کرنا ہے ——— کچھ بولو" ———
بارش اور تیز ہوگئی ———
خاموش۔ خاموش بارش ——— نہ گرج نہ چمک
بس چھینٹے تیز ہوتے گئے جیسے کوئی چپکے چپکے سسک
رہا ہو ——— رو رہا ہو ———
"وہ کدھر ہے چوکیدار ؟"
"جی ! میں کھڑا ہوں ———" وہ سردی سے
کانپ رہا تھا۔
"اٹھایا نہیں اُسے ——— اندر سے ———"
"جی وہ بہت بیمار ہے ——— صاحب ———"
"یہ کوئی ہسپتال نہیں ——— تنخواہ دو ———
ساتھ علاج کراؤ ——— اور نواب زادہ اندر
لیٹا رہے ———"
"سیزن میرا تباہ ہو رہا ہے ——— نقصان میرا
ہو رہا ہے ——— تمہارا کیا ہے ——— تم کو کس بات
کی پروا ہے ؟"

"ایک عرض کروں صاحب ——" ایک نوکر قریب آکے بولا۔

"بولو ——"

"بات آئی ہے —— ایک ذہن میں ——!"

"کہو ——"

"یہ تمبو ہے نا —— چوکیدار کا —— یہ ڈھیر پہ پورا آجائے گا۔"

"واٹ!"

"صاحب —— اسے اکھاڑ کے —— اُدھر لے جاتے ہیں ——"

"اوہ —— گڈ —— ویری گڈ ——" اس کی باچھیں کھل گئیں۔

اور کئی نوکر —— اس کے اشارے سے پہلے ہی —— تمبو کے چاروں طرف بکھر گئے۔

وہ تمبو کے پاس سے ہٹ کے —— کانپتا ہوا —— آگے بڑھا۔

"صاحب وہ —— اندر پڑا ہے —— مرجائے گا وہ ——"

"مرجائے ——"

"ہمارا کچھ کپڑا، لتا بھی ہے اندر ——!"

"پھر کیا کروں ——"

"جی —— وہ ——"

"خاموش —— ایڈیٹ —— چلو —— جلدی کرو" جمان نے حکم دیا۔

اور اہل کاروں نے تمبو کے بانس گرادیے —— رسیاں کھول دیں —— اور تمبو کو سمیٹ کے ایک طرف کھینچنے لگے۔

"چلو تم بھی —— ایڈیٹ"۔ جمان نے اشارہ کیا ——

وہ چار قدم آگے بڑھا۔ کچھ دیر کھڑا اسے بارش میں ساکت اور خاموش پڑے دیکھتا رہا۔ پھر اپنا پھٹا، پرانا، گندا، گیلا اوور کوٹ اتار کے اس پر گرادیا —— اور اس کے پاس سے لالٹین اٹھا کے —— ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا ——!!
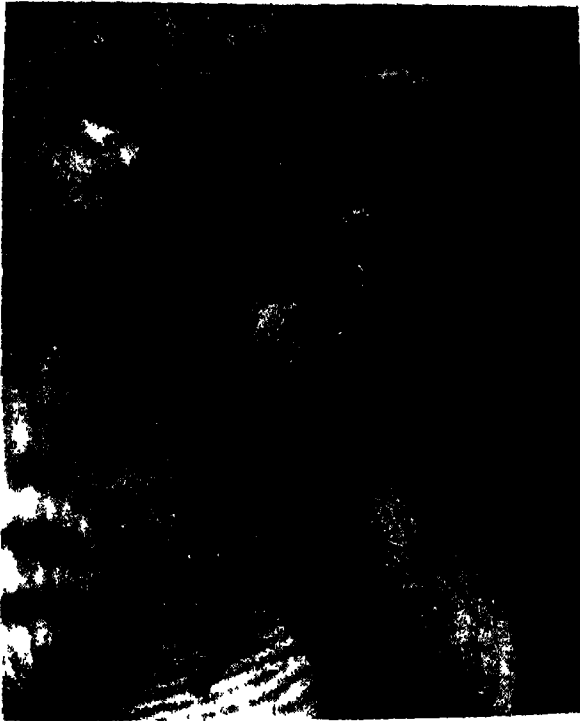
وہ کون لوگ ہیں جو تشنگی کی شدت سے
کنارِ آب پگھلتے دکھائی دیتے ہیں

اندھیری رات میں بھی شہر کے دریچوں سے
ہمیں تو چاند نکلتے دکھائی دیتے ہیں

صابر وسیم

اختر انصاری اکبرآبادی

عنوان بدلتے جاؤ فسانے کے ساتھ ساتھ
بدلو مزاج اپنا زمانے کے ساتھ ساتھ

اے دل ستم ظریفیٔ ناوک فگن تو دیکھ
ناوک بدل دیئے ہیں نشانے کے ساتھ ساتھ

لب پر ہے موجِ رنگ بھی ابرو پہ بل بھی ہیں
ہیں کچھ حقیقتیں بھی فسانے کے ساتھ ساتھ

منزل ملے ملے نہ ملے کوئی غم نہیں
چلتے رہیں گے ہم بھی زمانے کے ساتھ ساتھ

تزئینِ صبح و شام بھی کرتے رہیں گے ہم
ان مہوشوں کے ناز اُٹھانے کے ساتھ ساتھ

آواز دو سحر کو کہ اب جا رہی ہے رات
پھیلاؤ نورِ شمع بجھانے کے ساتھ ساتھ

رستہ کٹھن ہے گاؤ ترانے نئے نئے
ہر گام پر چراغ جلانے کے ساتھ ساتھ

رکھو شبابِ سرو سمن کو بھی برقرار
گلشن میں خوشبوؤں کو بسانے کے ساتھ ساتھ

اختر چمن کا رنگ نکھارو بہار میں
شعر و سخن کے پھول کھلانے کے ساتھ ساتھ

راغب مرادآبادی

موجِ نسیمِ صبح ، نہ جوشِ نمو سے تھا
جو پھول سرخرو تھا خزاں کے لہو سے تھا

تیرے سکوت نے اسے ویران کر دیا
دل باغ باغ تھا، تو تری گفتگو سے تھا

اب دل کے ریگزار میں وہ چاندنی کہاں
اپنا بھی ربط و ضبط کسی ماہ رُو سے تھا

مدت ہوئی کہ دل کا وہ گلشن اُجڑ گیا
شاداب جو ترے نفسِ مشکبو سے تھا

خواب و خیال ہیں وہ نشاط آفرینیاں
رقصِ بہار دل میں، تری آرزو سے تھا

سوئے ادب کہوں کہ اسے بے تکلفی
راغب بجائے آپ مخاطب وہ تو سے تھا

ڈاکٹر وزیر آغا

لازم کہاں کہ سارا جہاں خوش لباس ہو
میلا بدن پہن کے نہ اتنا اداس ہو

اتنا نہ پاس آ کہ تجھے ڈھونڈتے پھریں
اتنا نہ دور جا کہ ہمہ وقت پاس ہو

اک جوئے بے قرار ہو کیوں دلکشی تری
کیوں اتنی تشنہ لب میری آنکھوں کی پیاس ہو

پہنا دے چاندنی کو قبا اپنے جسم کی
اس کا بدن بھی تیری طرح بے لباس ہو

رنگوں کی قتل گہ میں کبھی تو بھی آ کے دیکھ
شاید کہ رنگِ زخم کوئی تجھ کو راس ہو

میں بھی ہوائے صبح کی صورت پھروں سدا
شامل گلوں کی باس میں گر تیری باس ہو

آئے وہ دن کہ کشتِ فلک ہو ہری بھری
بنجر زمیں پہ میلوں تلک سبز گھاس ہو

عبدالعزیز خالد

خوابیدہ نہ بیدار نہ پنہاں نہ پدیدار
محکوم نہ آزاد نہ مجبور نہ مختار

کس مے نے کیا مست اُویسِ قَرنی کو
اے جرعہ کشانِ قدحِ دُردیٔ خمار

درسِ ابدی ہے یہ تواریخِ اُمم کا
جو امن کا طالب ہے رہے جنگ کو تیار

یہ فرصتِ عمرِ دو نفس پھر نہ ملے گی
اے شوخِ فسوں پیشہ و اے لعبتِ عیار

کب تک ہمیں ترسائے گا تو اے بُتِ ترسا
نازندہ و زیبندہ، فریبندہ و غرار

دل قاتل آشوبِ قیامت نہ ہو کیونکر
کیا چہرہ ہے کیا شان ہے کیا قامت و رفتار

ہر عضوِ بدن شوخ کا سانچے میں ڈھلا ہے
مستغرقِ جلوہ ہوں مگر تشنۂ دیدار

اے غمزۂ غماز و نگاہِ غلط انداز
اقرار کا اقرار ہے انکار کا انکار

يَشتَرِقنَ وَ يَزْنِينَ وَ يَأتِينَ بِبُهتَانٍ
ہر دور میں ہوں ایسی زنِ نخوانِ طرحدار

لاتا ہے تہِ دام اسے جذبِ اسیری
ہو اپنی ہی مرضی سے ہر اک صید گرفتار

دل سینے میں پگھلے تو بنے شعلۂ ادراک
حاصل نہ ہو بے سوزِ دروں دولتِ بیدار

ہر علم سے ہو معرفتِ نفس نہ پیدا
ہوتا نہیں ہر اہلِ خبر صاحبِ اسرار

میں کون ہوں میں کیا ہوں اور آیا ہوں کہاں سے؟
وا مجھ سے تو ہوتا نہیں یہ عقدۂ دشوار

کس نے مجھے گمراہ کیا کس کا میں لوں نام؟
اے نفسِ ہوس کوش و بہانہ گر و مکار

انسان کی پرواز ہے پروانۂ اِکاروس
دے جائے دغا جانیے کب توسنِ طیار

ہے کون نگہبان بنی آدم کے شرف کا
ہر آدمی اپنی ہی غرض کا ہے وفادار

ہلچل بھی بہت امن و سکوں بھی نہیں لیکن
ہیں بے حسی و بے عملی کے وہی آثار

اندیشۂ حاضر نہ پریشانیٔ فردا
ہر حرف و حکایت ہے یہاں مہمل و بیکار

اس جہل کی مسموم گلو گیر فضا کا
ہے توڑ اگر کوئی تو آزادیٔ افکار

اَلمومِنُ لا یُلدَغُ مِن جُحرٍ مرارا
سو بار سنا ہم نے بھی دیکھا نہیں اک بار

خلاقِ جہاں یَأمُرُ بِالعَدلِ وَالاِحسان
اے زمرۂ اسلامیاں اے فرقۂ ابرار

گو جنگ مقدر سے نہیں بس میں ہمارے
اے دل مگر اک نعرۂ مستانۂ پیکار

ہر اہلِ وطن کے لیے ارضِ وطن اپنی
اک قطعہ ہے فردوس کا اک گوشۂ گلزار

گم دشتِ ہویدا میں ہوا قافلہ دل کا
بس کس سے پتہ، کس سے کریں حجت و تکرار

کیا جنس ہے یہ جنسِ تنک مایۂ ہستی
نرخ اس کا نہیں منحصرِ گرمیٔ بازار

ہر چند معانی ہی سے لفظوں میں پڑے جان
طے طرزِ بیاں سے ہو قد و قامتِ فنکار

گفتار میں مخمل ہوں میں کردار میں فولاد
مردِ متواضع ہوں مگر شاعرِ جبار

اقلام سے کرتے ہیں جو تسخیرِ اقالیم
ہوں میں انہی مردانِ اولوالعزم کا ہمکار

پرتو روہیلہ

ارمانوں کا سناٹا ہے سوچ کی ڈھیری بیٹھا ہوں
خاموشی کی بکل مارے وقت کا چہرہ تکتا ہوں

ہر گھر سکھ کا دیپ جلے ہے ہر گھر پیار کی مہکیں ہیں
دھیان چھتری میں پکڑے پکڑے کس کس نگری پہنچا ہوں

سونے کی اس دوڑ میں دیکھو، ساری بستی بھاگ رہی ہے
میں بھی اسی بستی کا باسی میں کیوں پگ پگ گرتا ہوں

چندا مکھ تارا آنکھیں بھی نیلے بچھونے سو جائیں
اس کے سارے دیپ بجھیں تو گھور اندھیارے سوتا ہوں

ممکن ہے تم تک تو سجنو میری بس آواز ہی آئے
میرا لوٹنا اب مشکل ہے ایسے موڑ آ پہنچا ہوں

میرے گھر کی انگنائی کا ایسا تو پہلے ڈول نہیں تھا
یا پھر آنکھ کا دھوکا ہوگا میں پردیس سے لوٹا ہوں

گزری کل کا جوالا ساگر ساری بستی بھول گئی
آنے والی کل کی چتا میں آج سے پرتو جلتا ہوں

مت پر مٹی پڑے تھے پتھر آنکھوں گھور اندھیرا تھا
جس کو کالے کوسوں ڈھونڈا گھر میں اس کا ڈیرا تھا

میری آنکھوں نے تو مجھ کو ادھم میں لا کر چھوڑ دیا
پار غرض ادجھل ہی رہا ہر منظر اتنا گھنیرا تھا

کالے ہرن کا پیچھا کرتے کتنے سورج ڈوب گئے
آنکھ کھلی تو دھوپ کھلی تھی پلکوں چھایا سویرا تھا

میں اُس گھائل پنکھی کی صورت آن گرے جو دھرتی پر
آج بھی اس آکاش کو دیکھوں جس پر رات بسیرا تھا

پرتو ان چالیس برس میں اتنی سی پند یا کاتی تھی
اس کو بھی مجھ پاس نہ چھوڑا ایسا کوئی لٹیرا تھا

افتخار عارف

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

پتھر پر سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

خاک اڑانے والے لوگوں کی بستی میں
کوئی صورت گر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

اہلِ جنوں کو زنداں شاید راس آ گیا
دیواروں میں در نہیں دیکھا بہت دنوں سے

قاتل جس کی زد سے خود محفوظ رہ سکے
ایسا کوئی خنجر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہؒ
بابا! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

تاب اسلم

موسموں کی زرد آنکھوں میں اترنا ہے مجھے
ریزہ ریزہ اپنے خوابوں سا بکھرنا ہے مجھے

حرفِ موجِ شہد و شبنم، جرعۂ آبِ حیات
حرف کا زہراب پی کر ہی تو مرنا ہے مجھے

کچھ نہیں کھلتا کہ زنجیرِ نفس کی تال پر
وحشیوں کی طرح کب تک رقص کرنا ہے مجھے

وہ میرے آنسو ہوں میرے زخم ہوں یا میرے خواب
آنے والی نسل کا دامن تو بھرنا ہے مجھے

چار سو پھیلی ہے دہشت ناک آوازوں کی گونج
اور تنہائی کے جنگل سے گزرنا ہے مجھے

میں سفر میں ہوں ازل سے صورتِ موجِ ہوا
کون سی منزل پہ تاب اسلم ٹھہرنا ہے مجھے

غلام محمد قاصر

گھر میں ویراں تھی نظر دشت میں دل روتا ہے
زندگی سے یہ مرا دوسرا سمجھوتہ ہے

جل اٹھا ہے اُسی شبنم کی حرارت سے بدن
آسماں جس سے مرے پھول کا منہ دھوتا ہے

بلبلاتے ہوئے خوابوں سے مری آنکھوں تک
رتجگے کاشت نہ کر لے تو وہ کب سوتا ہے

جس کو اس فصل میں ہونا ہے برابر کا شریک
مرے احساس میں تنہائیاں کیوں بوتا ہے

کیسے داغوں کو چراغوں سے بدل دوں کہ یہ دل
سو دیئے پاتا ہے جب ایک کرن کھوتا ہے

تیرے بخشے ہوئے اک غم کا کرشمہ ہے کہ اب
جو بھی غم ہو مرے معیار سے کم ہوتا ہے

اب کون مہرباں ہو شبِ غم کے حال پر
سورج خفا ہے ایک سحر کے سوال پر

بے چہرگی کے خوف سے ٹوٹا ہے آئینہ
اک عکس چھا گیا تھا مرے خدّ و خال پر

جھٹلا سکی نہ آبِ رواں کی گواہیاں
مچھلی جو محوِ رقص تھی لہروں کی تال پر

یہ کوئی تخت و تاج نہیں ہے کہ چھوڑ دیں
سانسوں کا انحصار ہے تیرے خیال پر

دو آشیاں بدوش پرندے تو اڑ گئے
پتے مگر بٹھا گئے ویران ڈال پر

محفوظ ہیں جو زرد رُتوں کی رسائی سے
وہ پھول میں نے دیکھے ہیں اک سبز شال پر

سلیم کوثر

دُور تک پھیلا ہوا اک واہمہ رہ جائے گا
تو نہیں ہو گا تو ان آنکھوں میں کیا رہ جائے گا

اپنے دروازے پہ دستک دوں گا تیرے نام کی
خود سے ملنے کا یہی اک راستہ رہ جائے گا

حرف پرچھائیں کی صورت نیند میں بہہ جائیں گے
اور کتابِ عمر کا صفحہ کھلا رہ جائے گا

رفتہ رفتہ تو بھی اک دن بھول جائے گا مجھے
ایک دن مجھ کو بھی تیرا دھیان سا رہ جائے گا

ٹوٹتے پتے گواہی دیں گے موسم کے خلاف
سوکھتی شاخوں پہ منشورِ ہوا رہ جائے گا

ہر زمانے کے لئے زندہ حوالہ ہوں سلیمؔ
میں چلا جاؤں گا میرا تذکرہ رہ جائے گا

ہم لوگ زمیں کے رہنے والے
پھرتے رہے آسماں سنبھالے

اے مجھ سے خطاب کرنے والے
چہرے سے نقاب تو ہٹا لے

ساحل سے بچھڑ گئے مسافر
دریا میں ہیں کشتیوں کے ہالے

اک بھیڑ ہے دوستوں کی لیکن
تنہائی نے بُن دیئے ہیں جالے

دنیا تجھے چھوڑتے ہیں ہم بھی
جا تو بھی اب اپنا راستہ لے

سورج ہے زمیں پہ گرنے والا
ممکن ہو تو سائے کو بچا لے

مشکل ہے سلیمؔ گھر بدانا
دیوار کا کیا ہے جو اُٹھا لے

بس اب کے اتنی تبدیلی ہوئی ہے
پرانے گھر میں تنہائی نئی ہے

پلٹ کر دیکھ لے تو ٹوٹ جائے
یہاں ہر شخص اتنا اجنبی ہے

بہت جاگا ہوں ان آنکھوں کے ہمراہ
مگر اب نیند آتی جا رہی ہے

وہ چہرہ ہٹ چکا ہے، کب کا لیکن
دریچے میں ابھی تک روشنی ہے

سوادِ ہجر میں اک پل وہ آیا
پکار اُٹھا تھا سناٹا کوئی ہے؟

ہم ایسے گمرہانِ نیم شب کا
تری آواز پہرہ دے رہی ہے

فقط اپنے حوالے سے ہوں زندہ
مجھے کیا شے وراثت میں ملی ہے

وہی رستے ہیں زیرِ پا ابھی تک
سلیمؔ اب تک وہی آوارگی ہے

جولائی ۱۹۷۹ء

غلام حسین ساجد

ستارۂ ہجر بھی ترے وصل کا نشاں تھا
مجھے تو ہر ایک پھول پر شمع کا گماں تھا

قدم کسی لہر کی روانی پہ رُک گئے تھے
مگر وہ دریا ابھی اسی شان سے رواں تھا

تمام بستی سکون کا سانس لے رہی تھی
یہ شام تھی یا تری محبت کا سائبار تھا

چراغ کی لو ذرا سی اونچی ہوئی تو دیکھا
میں اپنے گھر میں تھا اور اپنا ہی میہماں تھا

ستارے اپنے وجود میں راکھ ہو رہے تھے
مگر ابھی روشنی کا امکان ہی کہاں تھا

میں اپنی آنکھوں کو اپنے ہمراہ کیوں نہ لیتا
کہ اس اندھیری گلی سے باہر بھی آسماں تھا

اسے بُھلانے چَلا ہوں تو سوچتا ہوں ساجد
کبھی کبھی تو وہ شخص بھی کتنا مہرباں تھا

متاعِ ہجر میں کسی کا خواب کس لئے نہیں
لہو کے سیل میں کوئی گلاب کس لئے نہیں

یہ پھر زمین گھومنے لگی ہے کس مدار پر
کسی کے صبح و شام کا حساب کس لئے نہیں

یہ کیا کہ اپنے اپنے غم کی موج میں رواں رہیں
کتابِ عمر میں خوشی کا باب کس لئے نہیں

سمٹ رہے ہیں منظروں کے قافلے نگاہ میں
مگر کسی کو دیکھنے کی تاب کس لئے نہیں

ابھی رُکا نہیں اگرچہ گفتگو کا سلسلہ
مگر مرے سوال کا جواب کس لئے نہیں

نگاہ، شوقِ وصل کی لگن میں جل رہی ہے کیوں
اس آئینے کو عکس سے حجاب کس لئے نہیں

اِک روز مجھے مل جائیں گے، اس بستی کے آثار کہیں
ہر چند دکھائی دیتی نہیں، اس صحرا میں دیوار کہیں

یہ کون چراغِ عمر لئے اس وقت گلی میں پھرتا ہے
جب لمبی تان کے سو بھی گئے اس شہر کے پہریدار کہیں

ان اچھے پھولوں کی آنکھیں کس شخص کی لَو سے روشن ہیں
یہ کیسی شمع سی جلتی ہے، اِن پتوں میں ہر بار کہیں

کچھ کھوئی کھوئی آوازیں ساحل کی سمت بلاتی ہیں
اور اپنی موج میں بہہ بھی گئے اس کشتی کے پتوار کہیں

یہ کون چراغ جلاتا ہے، اس نینہ میں بہتے پانی پر
یہ کیسی شمع سی جلتی ہے اس ندی کے اس پار کہیں

ساجد میں اپنے بچپن کے سائے میں چلتا رہتا ہوں
اس طور مگر گھٹ سکتی ہے، ان لمحوں کی رفتار کہیں

جمال احسانی

وہ ہاتھ ہی تھا اور وہ پتھر ہی اور تھا
دیکھا پلک جھپک کے تو منظر ہی اور تھا

ترے بغیر جس میں گزاری تھی ساری عمر
تجھ سے جب آئے مل کے تو وہ گھر ہی اور تھا

سنتا وہ کیا کہ خوف بظاہر تھا بے سبب
کہتا میں اس سے کیا کہ مجھے ڈر ہی اور تھا

جاتی کہاں پہ بچ کے ہوائے چراغ گیر
مجھ جیسا ایک میرے برابر ہی اور تھا

کیا ہوتے ہم کلام بھلا ساحل و چراغ
وہ شب ہی اور تھی وہ سمندر ہی اور تھا

اس رات مہربان بہت چاند تھا جمالؔ
اس رات آنگنوں کا مقدر ہی اور تھا

میں جس شجر کے تلے کب اُسے خبر کی ہے
کہ ہم پہ چھاؤں کسی دوسرے شجر کی ہے

یہ لمحہ رائیگاں گزرے تو ساری عمر کا روگ
نہ رائیگاں ہو تو رسوائی عمر بھر کی ہے

غبار یاد ہے جس رہگذر کا ہے لیکن
تھکن کا علم نہیں ہے کہ کس سفر کی ہے

ہزار لوٹنا چاہیں ہم اس کے کوچے سے
ہمیں خبر ہے جو اوقات بال و پر کی ہے

اب اس سے کیجئے کیا شکوہ ہائے کم نگہی
بہت دنوں میں تو اس نے ادھر نظر کی ہے

یہ لوگ بھی مرے دیوار و در بھی میرے ہیں
مگر فضا یہ کسی اور ہی کے گھر کی ہے

یہاں سے دور بہت ہے جو سوچنے میں جمالؔ
زمین پاؤں کے نیچے اسی نگر کی ہے

ہر اعتبارِ نمو خاک و آب سے اُٹھا
یہ کون سایۂ شاخِ گلاب سے اُٹھا

یہ دیکھ تجھ کو فراموش کر کے زندہ ہیں
نہ پوچھ بوجھ یہ کتنے عذاب سے اُٹھا

بہت میں رو دیا ہوں بے طاقتیٔ چشم پہ رات
ترا خیال نہ جب میرے خواب سے اُٹھا

خموش ہو گئے پہلے تو اس کی بات پہ سب
پھر ایک شور سا میرے جواب سے اُٹھا

بٹھا دیا گیا گوہرِ شکستہ کی مانند
یہاں جو آدمی بھی پیچ و تاب سے اُٹھا

نہ بیٹھتے اسے دیکھا کہیں کسی نے جمالؔ
جو اس کی بزم سے اپنے حساب سے اُٹھا

شاہد اختر

سوچ کے ساحل پہ بھی داستانوں کے تلے
میں بہت گھوما پھرا ان آسمانوں کے تلے

دھول اڑاتی کچی سڑکوں کے کنارے بیٹھ کر
میں نے کتنے خواب دیکھے سائبانوں کے تلے

دور تک اک راستہ چلتا رہا قدموں کے ساتھ
زندگی روتی رہی پچھلے زمانوں کے تلے

یاد بھی کیسی کہانی ہے لگی ہے دم کے ساتھ
اک لڑکپن تھا ہمارا مہربانوں کے تلے

تتلیوں کے پیچھے پیچھے دوڑنے سے ہار کر
جا کھڑے ہوتے تھے چڑیوں کے مکانوں کے تلے

چوٹیوں پر برف گرتی جا رہی ہے رات دن
آدمی سہما ہوا ہے زرد بانوں کے تلے

راستے کی دھند میں جانے کہاں کھو جائے گی
شام جاگی ہے بہت تنہا مکانوں کے تلے

اب نتیجہ جو بھی آئے ہم تو شاہد تھک چکے
عمر ساری ہی کٹی ہے امتحانوں کے تلے

وہ رم جھم پیڑ گھر کے سامنے تھا
وہ سنّاٹا نظر کے سامنے تھا

وہ رستہ جا رہا تھا سر جھکائے
وہ منظر رہگذر کے سامنے تھا

چڑھائی تھی اندھیرے جنگلوں کی
وہ دریا عمر بھر کے سامنے تھا

ہری پگڈنڈیوں پر جھلملاتا
ستارا بال و پر کے سامنے تھا

وہ پاگل چاند کالے بادلوں کا
تماشا سا بھنور کے سامنے تھا

گھنا اونچا مہکتا باغ شاہد
ہمیشہ اس نگر کے سامنے تھا

حرف کا چاند تو ہم سے پرے نکلا تھا
سرمئی رنگ بہت دور تلک پھیلا تھا

اجنبی ہاتھوں کے لشکر تھے مری سمت رواں
اور میں درد کے سینے میں چھپا بیٹھا تھا

میں ترے چاہنے والوں سے ملا تھا شاید
ان کی آنکھوں میں کہیں اور کا بہلاوا تھا

خوف اک وحشت تھا میرے لئے اقدس تنہا
جب بھی چلتا تھا کسی اور طرف چلتا تھا

رات تھی اور شجر سوئے ہوئے تھے ہر سو
چاند سے میں نے ترے گھر کا پتہ پوچھا تھا

صبح کی سیر میں تابندہ گلوں کے ہمراہ
کون سوچے گا کہ اک شخص بہت رویا تھا

صابر وسیم

نہ کوئی چاند نہ تارے ہیں تاجداروں میں
بس اک چراغ بجھا سا ہے یادگاروں میں

اُداس میں ہی نہیں شہر میں کہ میری طرح
زمیں کی رات بھی شامل ہے سوگواروں میں

فصیلِ شہر کا دروازہ بند ہو نہ کہیں
چلے تو جاتے ہیں پر خوف ہے سواروں میں

عجب نہیں کہ کوئی خلق بس رہی ہو وہاں
عجب نہیں کہ دیئے جل رہے ہوں غاروں میں

گلاب شام اُتر آئی ساحلوں پہ مگر
کسی نے دکھ کا دھواں بھر دیا نظاروں میں

میں آج ایسا اکیلا نہ تھا پہ صابر
سفر کا شوق چلا آیا پاسداروں میں

اسیرِ شام ہیں ڈھلتے دکھائی دیتے ہیں
یہ لوگ نیند میں چلتے دکھائی دیتے ہیں

وہ اک مکان کہ اس میں کوئی نہیں رہتا
مگر چراغ سے جلتے دکھائی دیتے ہیں

یہ کیسا رنگ نظر آیا اس کی آنکھوں میں
کہ سارے رنگ بدلتے دکھائی دیتے ہیں

وہ کون لوگ ہیں جو تشنگی کی شدت سے
کنارِ آب پگھلتے دکھائی دیتے ہیں

اندھیری رات میں بھی شہر کے دریچوں سے
ہمیں تو چاند نکلتے دکھائی دیتے ہیں

بدن سمیٹ کے جو پستیوں میں تھے صابر
بکھر گئے تو سنبھلتے دکھائی دیتے ہیں

اس جنگل سے جب گزرو گے تو ایک شوالہ آئے گا
وہاں رک جانا وہاں رہ جانا وہاں سکھ کا اجالا آئے گا

یہ سوچ کے اٹھنا ہر دن تم اس دل کا پھول کھلے گا ضرور
اس آس پہ سونا اب کی شب کوئی خواب نرالا آئے گا

جب اس کے ہاتھ نیا ماضی اس صفحۂ ارض پہ لکھیں گے
جب سحر و شام رقم ہوں گے تب میرا حوالہ آئے گا

اس بے اندیشہ صحرا میں اس اونگھنے والی اُمت پر
کب جاگنے والا اترے گا کب سوچنے والا آئے گا

پھر روح میں زخمی زخمی ہیں پھر کوڑھ سے دکھنے لگے بدن
یوں لگتا ہے کہ شفاعت کو پھر کوئی گوالہ آئے گا

اے راہِ سخن کے راہ رو دلشاد رہو اس راہ میں بھی
خوشبو کی سواری ٹھہرے گی رنگوں کا پیالہ آئے گا

صابر ظفر

کہاں کوئی بدن کا بوجھ اُتارے
سمندر! کیا ہوتے تیرے کنارے

یہ پانی اب مقدّر ہو چکا ہے
مگر جو ساحلوں پر دن گزارے

یہاں تو دوسرا کوئی نہیں ہے
کوئی اپنے سوا کس کو پکارے

رواں ہیں آخرِ شب کے مسافر
گر اب ڈوبتے جاتے ہیں تارے

ظفرؔ یہ بادبان ہی جانتا ہے
ہواؤں نے کئے ہیں کیا اشارے

وہ عجیب منظرِ خواب ہے
نہ وہ آب ہے نہ سراب ہے

وہ ضیاء ہے بجھتے چراغ کی
وہی پس نوشتِ کتاب ہے

نہیں وہ کسی کی گرفت میں
نہ ہی اُس کا کوئی حساب ہے

وہی خود کہے وہی خود سُنے
وہی آپ اپنا جواب ہے

دوسروں کی طرح جینا اور ہے
زیست کرنے کا قرینہ اور ہے

میری قسمت کی لکیریں ہیں کچھ اور
اور انگوٹھی میں نگینہ اور ہے

رحمتوں والے مہینے میں کھُلا
رحمتوں والا مہینہ اور ہے

سیڑھیاں ہیں صرف گرنے کیلئے
اوج پر جانے کا زینہ اور ہے

مر چکا ہے جسم کا پانی ظفرؔ
ناتوانی کا پسینہ اور ہے

کوثر علی

رکا ہوا ہے جو جسم و جاں میں عذاب نکلے
یہ شاخ ہی سوکھ جائے یا پھر گلاب نکلے

ہماری نیندیں عذابِ شب سے بچائیں ہم کو
کھلیں جب آنکھیں تو سامنے آفتاب نکلے

ہماری آنکھوں میں اشک یہ کس کے واسطے ہیں
ہے جو بھی منظر چھپا ہوا زیرِ آب نکلے

میں گفتگو میں علامتیں ساری ترک کر دوں
مثالِ مہتاب وہ اگر بے نقاب نکلے

قریب ہیں اس کی قربتوں کے نہال موسم
پر اب ضروری نہیں ہے ہر بات خواب نکلے

دل میں ٹھہرا غم، مثالِ آب جو بہنے لگا
آنکھ میں آباد شہرِ آرزو بہنے لگا

وہ نظر آیا تو لاکھوں باتیں یاد آنے لگیں
ایک چشمہ تھا جو اپنے چار سو بہنے لگا

اتنی شدت سے اسے دیکھا کہ دھڑکن رک گئی
وہ ہوا اوجھل تو آنکھوں سے لہو بہنے لگا

پیاس اتنی تھی کہ میرے ہونٹ بھی کھلتے نہ تھے
دور تھا جو وہ سراب، اب رو برو بہنے لگا

آ رہا ہے یاد کوثرؔ پچھلے موسم کا وہ پھول
پیڑ کی بانہوں میں پھر سیلِ نمو بہنے لگا

جو نفرتوں سے بنے تھے اصول ختم ہوئے
تو دوستوں سے بھی وعدے فضول ختم ہوئے

سفر بھی جاری رہا، راہ بھی چمکنے لگی
اڑا رہے تھے جو راہوں میں دھول ختم ہوئے

نہ اس کے جانے کا دکھ ہے نہ لوٹ آنے کا وہم
زمینِ دل پہ رتوں کے نزول ختم ہوئے

عطا کیا تھا جو اس نے اسی نے چھین لیا
شجر شجر ہی رہے اور پھول ختم ہوئے

گئے دنوں میں سے ہم ایک پل کے قیدی تھے
وہ لمحے جن کو دیا ہم نے طول ختم ہوئے

جولائی ۱۹۷۹ء

منور عزیز

ان آنکھوں نے کیا کیا سرِ منظر نہیں دیکھا
اک نقشِ صدا لوحِ ہوا پر نہیں دیکھا

پھر دیکھ کے آیا ہے کرن بار دریچے
اس نے کسی دہلیز کے اندر نہیں دیکھا

پہچان بھرے خواب کے آباد نگر میں
سائے سے ابھرتا ہوا پیکر نہیں دیکھا

رونے کے لئے درد میں شدت بھی نہیں ہے
آئینہ پرستوں نے تو پتھر نہیں دیکھا

اے شہر کے مینار سے قد ناپنے والے
تجھ کو تری قامت کے برابر نہیں دیکھا

بے سمت ہواؤں میں گرفتار منورؔ
اس ابر کے ٹکڑے نے برس کر نہیں دیکھا

عشرت آفریں

عداوتیں نصیب ہو کے رہ گئیں
محبتیں رقیب ہو کے رہ گئیں

پرند ہیں نہ آنگنوں میں پیڑ ہیں
یہ بستیاں عجیب ہو کے رہ گئیں

ترس رہی ہیں یوں بہار کو رُتیں!
غریب کا نصیب ہو کے رہ گئیں

بس ایک پل دھنک کی ساری شوخیاں
مرے بہت قریب ہو کے رہ گئیں

میں خود سے جب بچھڑ گئی تو بس تری
دعائیں ہی حبیب ہو کے رہ گئیں

مرے دکھوں کا ذکر شہر شہر ہے
اداسیاں نقیب ہو کے رہ گئیں

روایتوں کی قتل گاہِ عشق میں
یہ لڑکیاں صلیب ہو کے رہ گئیں

ثمینہ راجہ

ہواؤں کی لگن آنچل میں اُتری
میں کل بستی سے جب جنگل میں اُتری

لگا، کوئی دلہن شرما رہی ہے
جب اک ننھی کرن بادل میں اتری

جو اپنی روح اکثر کھوجتی تھی
وہ لڑکی جسم کی دلدل میں اُتری

یہ کیا جانے مزا اس کے ملن کا
یہ کیسی بے خودی پائل میں اتری

تو پھر آنکھوں کو ہنسنا کیوں نہ آتا
تری شوخی مرے کاجل میں اتری

میں دنیا کا پتہ بھولی ہوں، جیسے
خود اپنی ذات کے جنگل میں اُتری

احمد ندیم قاسمی

ستون[1]

میرزا ادیب بیسویں صدی کے اردو ادب کی ایک ایسی شخصیت ہیں۔ جن کے بغیر ادب کی تاریخ مکمل قرار نہیں دی جا سکتی۔ میرزا صاحب کی ادبی شخصیت بہت متنوع ہے۔ اس شخصیت میں بیک وقت داستان گوئی، افسانہ نویسی، ڈرامہ نگاری تنقید اور ادبی جراید کی ادارت کے اعلیٰ معیار جمع ہیں۔ ساتھ ہی وہ ریڈیو پر بھی ڈرامے اور فیچر لکھتے رہے ہیں۔ کچھ عرصے سے وہ میدانِ صحافت میں بھی سرگرم نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان سرگرمیوں کی نوعیت بھی ادبی ہے انہوں نے بچوں کے لئے کتابیں لکھی ہیں اور ایک افواہ یہ بھی ہے کہ وہ کسی زمانے میں شعر بھی کہتے رہے ہیں ——!

میرزا صاحب کی شہرت کا آغاز "صحرا نورد کے خطوط" سے ہوا جو میری نظر میں سراسر رومان نہیں تھے۔ بلکہ رومان کے پردے میں میرزا صاحب نے زندگی کے بعض حقائق کی پردہ کشائی کی تھی۔ حقائق کے ساتھ اس وابستگی کا ثبوت ان کی بعد کی تحریریں ہیں جن میں ہمارے معاشرے کے کتنے ہی سربستہ راز منکشف ہوئے ہیں۔ خالص رومانٹک ذہن کا ادیب عمر بھر رومانٹک ہی رہتا ہے۔ مگر میرزا صاحب نے "صحرا نورد کے خطوط" کے بعد جو افسانے اور پھر خاص طور سے ڈرامے لکھے وہ اس حقیقت کے غماز ہیں کہ میرزا ادیب دراصل کٹر قسم کے حقیقت پسند ہیں، "صحرا نورد کے خطوط" میں انہوں نے خیالی سرزمینوں اور خیالی کرداروں کا سہارا اس وجہ سے لیا تھا کہ ادب کا اس دور کا قاری ابھی، سید سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کے اندازِ داستان سرائی کے طلسم سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا تھا اور منشی پریم چند کے سادہ مگر پرکار افسانے ابھی ان قارئین کے ذہنوں میں قدم نہیں جما پائے تھے۔ میرزا ادیب بھی اس طلسم میں لپٹے ہوئے میدانِ ادب میں اترے اور "صحرا نورد کے خطوط" میں انہوں رومان اور حقیقت کے درمیان ایک پُل تعمیر کیا۔ پھر اس پُل پر سے خود بھی گزرے اور اس طرح روزمرہ کی زندگی اور اس کی گہما گہمی اور اس کی آسائشوں اور آزمائشوں کی دنیا میں آ گئے۔

بہت کم اہلِ ادب کو اس امر کا احساس ہے کہ میرزا ادیب ایک بہت، اچھے اور متوازن نقاد بھی ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین پڑھیے تو ان کی اپنی داستانوں افسانوں اور ڈراموں میں برتا ہوا ان کا نظریہ واضح خطوط میں سامنے آ جائے گا۔ نقاد اگر تخلیق کار بھی ہو تو اس کی تخلیقات میں سے اس کا نظریۂ فن کھوجنے کی بجائے اس کی تنقید پڑھ لینی چاہیئے۔ کیونکہ جو نقاد تخلیق کے بعض اصول مرتب کرتا ہے یا بعض سوال اٹھاتا ہے یا کسی ادب پارے کی تحسین کرتا ہے یا کسی تخلیق کو رد کرتا ہے وہ بحیثیت تخلیق کار ان سب اصول و قواعد کی بھرپور پابندی کرتا ہے میرزا صاحب کی تنقیدیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ فن کو تطہیرِ حیات اور تعمیرِ حیات کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں عدل کی دہائی دیتے ہیں۔ حق تلفی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ ہر انسان کو آسودہ دیکھنا چاہتے ہیں اور خیر کا اثبات کرتے ہیں۔ میرزا ادیب کی تنقیدوں کا کینوس بہت وسیع ہے کہیں کہیں اگر یہ تاثر ہوتا ہے کہ تنقید کا پھیلاؤ کم ہو رہا ہے تو اس کا سبب ان کا مرنجاں مرنج مزاج ہے۔ چنانچہ وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تنقید سے کسی فرد کو تکلیف نہ پہنچے۔ اور اس احتیاط

[1] میرزا ادیب کے ڈراموں کا مجموعہ

کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان سے بے احتیاطی ہو جاتی ہے حالانکہ مقصد محض احتیاط ہوتا ہے۔ ورنہ بحیثیت مجموعی میرزا صاحب کی تنقیدی ادب کی ماہیت و مقصد کو سمجھنے سمجھانے اور ادیب کے ساتھ مساویانہ اور ہمدردانہ رہنے کی عمدہ مثالیں ہیں۔

میرزا صاحب نے افسانے بھی لکھے مگر ڈراموں کی طرف بطور خاص متوجہ ہوئے۔ میں کہتا ہوں یہ اردو ادب پر ان کا احسان ہے کہ باقاعدہ سٹیج کی غیر موجودگی میں بھی انہوں نے ڈرامہ نویسی میں اتنی استقامت اور لگن کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے بیشتر ڈرامے مختصر ہیں۔ تیکنیک پلاٹ کی بنت، مکالموں کی برجستگی اور سٹیج پر کرداروں کی آمد و رفت کا جو اسلوب انہوں نے ان مختصر ڈراموں میں اختیار کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کا شاہد ہے کہ میرزا ادیب اگر "فل لینگتھ سٹیج ڈرامہ" لکھنا چاہیں تو یقیناً لکھ سکتے ہیں۔ گمان ہے یہ مطالبہ کرنے سے پہلے انہیں کوئی سٹیج بھی تو مہیا کیجئے۔ سبھی ڈرامے "انارکلی" نہیں ہوتے کہ پڑھنے والے اسے اپنے ذہن ہی میں سٹیج ہوتا دیکھتے رہیں اور سٹیج کے محتاج ہی نہ رہیں۔ میرزا صاحب کے بعض ڈرامے بھی ایسے ہیں کہ اگر سٹیج ڈرامہ دیکھنا ہو تو انہیں صرف پڑھ لیجئے۔ سب کچھ آپ کے سامنے سٹیج ہونے لگے گا۔ مگر اس امر سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ ڈرامہ نویس جب ڈرامہ لکھتا ہے۔ تو اس اہتمام اور التزام سے لکھتا ہے کہ اسے سٹیج ہونا ہے۔ میرزا صاحب بھی اپنے ڈرامے اس اہتمام سے لکھتے ہیں مگر جو ٹوٹی پھوٹی سٹیج ہمیں مہیا ہے۔ اس پر تو صرف غیر ملکی ڈراموں کے تراجم اور لطائف و ظرائف اور ذومعنی مکالموں سے اٹے ہوئے وہ ڈرامے ہی چل سکتے ہیں۔ جنہیں دیکھتے ہوئے ہنس ہنس کر پسلیاں دکھنے لگیں اور جنہیں دیکھنے کے بعد یہ احساس باقی رہ جائے کہ پھیپھڑوں کی اچھی ورزش ہو گئی ہے۔

میرزا صاحب کے ڈرامے ہمارے متوسط طبقے کی امیدوں اور سوچوں اور نارسائیوں کے ڈرامے ہیں اور فی الحال ہمارے سٹیج ڈرامے دیکھنے والوں کو یہ مال نہیں چاہیئے کیونکہ ان ڈراموں کو دیکھ کر انسان ہنستا تو ہے نہیں بس کچھ سوچتا ہی رہ جاتا ہے جیسے منجمد ذہنوں میں سوچوں کے چراغ جلنا کوئی معمولی کام ہے۔

ستون میرزا ادیب کے چودہ ڈراموں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے ان کی ڈرامہ نگاری کا نقطۂ عروج کہنا چاہیئے۔ یہ بظاہر چھوٹے چھوٹے یک بابی ڈرامے ہیں مگر درحقیقت اپنے اندر ہمارے بے شمار معاشرتی مسائل کی دنیائیں آباد کئے ہوئے ہیں۔ میرزا ادیب کے فن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے بیشتر ڈراموں کا موضوع کوئی نہ کوئی معاشرتی مسئلہ ہوتا ہے بظاہر سیدھا سادا مگر اپنے مضمرات اور اثرات کے لحاظ سے دور رس اور ہمہ گیر۔ اس لئے میں پھر کہتا ہوں کہ اگر میرزا صاحب دو ڈھائی گھنٹے تک سٹیج پر پیش ہونے والا فل لینگتھ ڈرامہ لکھنا چاہیں تو بآسانی لکھ سکتے ہیں۔ اس مجموعے کا ایک ڈرامہ "حویلی" لے لیجئے۔ ایک کردار پرانے شاہی خاندان کے ایک بزرگ کا ہے جو اپنی سفید پوشی کو بہر قیمت برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ پرانی شاہی حویلی گویا قدیم ٹھاٹھ باٹھ کی ایک علامت ہے جس سے یہ بزرگ دست کش ہونے کو تیار نہیں ہیں اور اپنی اولاد کے مستقبل کو بھی داؤ پر لگا دینے سے باز نہیں آتے۔ ان کے مقابلے میں ان کا نوجوان بیٹا ہے جو حقیقت پسند ہے اور باپ کو حالات کے مردانہ وار مقابلے پر آمادہ اور پھر مجبور کرنے کی کوشش کرتا ہے، ان دو کرداروں کے درمیان کشمکش محض دو نسلوں کی کشمکش نہیں ہے۔ دو نقطہ ہائے نظر کا تصادم ہے۔ اب اگر میرزا ادیب چاہتے تو اس موضوع پر کسی جھول کے خطرے کے بغیر ایک طویل ڈرامہ تعمیر کر سکتے تھے کیونکہ اس میں صدہا گنجائشیں ہیں مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور سبب شاید وہی ہے کہ ہمارے ہاں سٹیج کا وجود اس کے عدم وجود کے برابر ہے۔

میرزا صاحب کبھی کبھی ڈراموں میں بھی صحرا نورد کے خطوط کی سی رومانس کی فضا میں چلے جاتے ہیں۔ مثلاً اس مجموعے کا ایک ڈرامہ "قندیل" ہے جس کا موضوع تو یقیناً بلیغ ہے مگر اس طرح کے مثالی کردار ہمارے معاشرے میں شاذ ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ممکن ہے یہ یورپ اور امریکہ کے ڈراموں کے مطالعے کے اثرات ہوں مگر مجھے یہ نہایت خوبصورتی سے لکھا ہوا ڈرامہ میرزا ادیب کے معروف اسلوبِ فن سے کچھ ہٹا ہوا اور

اچھا ہوا سا لگتا ہے۔ یقیناً ہر شخص کو اس کی
آئیڈیل زندگی یا آئیڈیل شخصیت نہیں مل سکتی
مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیوں نہیں مل سکتی
بات یہ ہے کہ زندگی کے بہت اونچے معیار
ہمارے نظامِ زندگی کی عام روش سے کوئی لگا نہیں
کھاتے اور ان کے اونچے معیاروں تک رسائی کے
لئے ہمیں اس نظامِ زندگی کو یوں بدلنا ہوگا کہ معاشرہ
خیر اور عدل اور صداقت اور ہمہ گیر آسودگی کی تصویر
بن جائے۔ یہ بات "قندیل" میں واضح نہیں ہو
پائی اور ڈرامے کے خاتمے پر مکمل انفعالیت اور
شکست خوردگی ہمارا احاطہ کر لیتی ہے۔ مگر شاید
اس صورتِ حال کا جواز بھی موجود ہے کہ انسانی
زندگی میں ٹوٹ پھوٹ کے لمحات و واقعات
بھی وارد ہوتے رہتے ہیں اور ان سے مفر
بحالاتِ موجودہ ممکن نہیں۔

میرزا ادیب کے ڈراموں کے مکالمے بے حد
سادہ اور حقیقی، نیز پلاٹ مکمل اور بے عیب
ہوتے ہیں۔ کردار نگاری یک بابی ڈرامے میں
مشکل ہے مگر اس کے باوجود میرزا صاحب
یاد رہنے والے چند کردار تخلیق کرنے میں کامیاب
ہوئے ہیں، بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ یہاں سے ڈراما نگار تیزی سے نکلا چلا گیا
حالانکہ اگر وہ ذرا سا رک جاتا اور سچویشن سے
فائدہ اٹھا کر کچھ اور پیاری پیاری باتیں کہہ دیتا تو
ڈراما اور مؤثر ثابت ہوتا مگر اس کا کیا کیا جائے
کہ یہ ڈرامے یک بابی ہیں اس لئے ان کا کینوس
محدود ہے اور اس محدود کینوس میں بھی مؤثر
ڈرامے تخلیق کرنا میرزا ادیب کا کمالِ فن ہے۔

ساجد میں اپنے بچپن کے سائے میں چلتا رہتا ہوں
اس طور مگر گھٹ سکتی ہے، ان لمحوں کی رفتار کہیں
غلام حسین ساجد

غلام جیلانی اصغر

نردبان[۱]

"نردبان" وزیر آغا کا چوتھا شعری مجموعہ ہے "شام اور سائے" ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ تھا جس میں انہوں نے اپنے شعری شعور کا بھرپور آغاز کیا تھا۔ اس کے بعد وہ بیک وقت نظم کی زیریں اور غزل کی بالائی منزل میں بٹ گئے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ وہ افقی سفر کی یکسانیت سے تھک کر فضائی مدار میں داخل ہو گئے۔

'ماورا' کے بعد نئی نظم کے جتنے مجموعے منظرِ عام پر آئے ان پر رومانیت غالب تھی کیونکہ ہمارا شاعر مکمل طور پر اپنے آپ کو غزل کے مزاج اور روایت سے آزاد نہیں کر پایا تھا۔ اس لئے ایک مخصوص قسم کی ماورائیت شعری ہیئت ترکیبی کا سب سے نمایاں عنصر رہی۔ میرے نزدیک شعر کی جملہ اصناف ایک مشترکہ اساس کے باوجود اپنا ایک جداگانہ مزاج بھی رکھتی ہیں اور اگر ان کے مزاج کا صحیح طور پر ادراک نہ ہو تو تمام اصناف اپنی داخلی MECHANISM کے اختلاف کے باوجود ایک ہی آواز کی بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ غزل کے تواتر کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر ایک خیال، فکر یا جذبہ کو آزاد یا پابند نظم کا پیرہن عطا کر دیا جائے تو محض اتنی سی احتیاط سے نئی نظم وجود میں نہیں آتی بلکہ ایک پرانی غزل نئی ہیئت میں نمودار ہوتی ہے۔ وزیر آغا نے نظم اور غزل کے مزاج سے صرف اپنے قاری کو ہی روشناس نہیں کرایا بلکہ خود اپنی شعری تخلیقات میں بھی اس فرق کو مدِّ نظر رکھا ہے۔ اس لئے وزیر آغا کے ہاں نظم میں غزل کی ECHO سنائی نہیں دیتی اور میرے نزدیک یہ ایک معرکہ ہے جس سے صرف ایک منجھا ہوا فن کار ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ روزیٹی اور رافیل دونوں بیک وقت شاعر بھی تھے اور مصوّر بھی۔ لیکن دونوں کے ہاں شاعری اور صورت گری میں ایک حد بندی نظر آتی ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ مصوّر نے لفظ کے پیکر کی صرف رنگوں میں تجسیم نہیں کی بلکہ احساسات کی سطح پر دونوں اصناف کے جداگانہ کردار کو برقرار رکھا ہے۔

وزیر آغا نے بھی غزل اور نظم کے مختلف اور منفرد ابعاد کو گڈمڈ نہیں ہونے دیا بلکہ ان کی داخلی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے وزیر آغا کی ایک ابتدائی نظم اور غزل کے تجزیے کی اجازت چاہتا ہوں۔ "شام اور سائے" کی پہلی نظم ہے 'نیا سال'، ملاحظہ ہو۔

سینگوں کلیوں کی ٹھنڈی سیج پر لیٹی ہوئی
صبح ــــ اک سیّال سونے کا طلسم
صبح ــــ جیسے تیرا جسم!

بادلوں کی گرم، بوجھل شال میں لپٹی ہوئی
شام گہری برف کی بے جان سِل
شام ــــ جیسے میرا دل!

شام، بجھتی شام تیرے سامنے
صبح، ہنستی صبح میرے روبرو!

یہ ساری نظم ایک مربوط استعارہ ہے جس میں آنے والی صبح اور گزرتی ہوئی شام کو دو واضح کرداروں کی صورت میں دیکھا گیا ہے۔ صبح سیّال سونے کی طرح ابھی کسی مرئی پیکر میں متشکل نہیں ہوئی کیونکہ اس کے اندر غیر واضح امکانات کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ شاعر اسے محض سونے کا طلسم کہہ سکتا تھا لیکن یہ صرف اس صبح کے ظاہری پیکر کا ایک آسان اور خوبصورت سا لیبل ہوتا لیکن وہ تمام امکانات جو سلسلۂ روز و شب میں

---

[۱] ڈاکٹر وزیر آغا کا شعری مجموعہ

پابلا ہیں قاری کے ذہن پر منجمد ہو سکتے۔ اس طرح آخری شام کو گہری برف کی سپید چادر بنا کر شاعر نے مرتے سال اور دسمبر کی یخ بستگی کا ہی ذکر نہیں کیا بلکہ اس کا رشتہ اپنے دل کی بجھتی ہوئی حرارت سے جوڑ کر بالکل دو نئے کرداروں کی تشکیل کی ہے صبح وہ جوان زرخیز جسم ہے جس میں خون سی حرارت اور قوتِ حیات پوشیدہ ہے، وہ محبوب کا جوان جسم بھی ہو سکتی ہے۔ وہ آنے والی رتوں کی جوان باس بھی ہو سکتی ہے اور نئے دور کی علامت بھی بن سکتی ہے شام اسی طرح بوجھل ہے جس طرح بڑھاپا جب خون میں برف کی سیل تحلیل ہو کر جسم کی ساری قوت اور حرارت ختم کر دیتی ہے اور آدمی زندگی کی اس سرحد پر کھڑا ہوتا ہے جہاں سے NO MAN'S LAND کا آغاز ہوتا ہے اس سے آگے بجھتی ہوئی شام کی دبیز تاریکی ہے جس کی پُراسراریت ہر لمحہ بڑھ رہی ہے۔ آخری دو سطروں میں تجریدیت کے عقب میں یہی دو زندہ کردار واضح طور پر نمودار ہوتے ہیں، جوانی اور بڑھاپا رو برو کھڑے ہیں یہ صرف آنے والے سال کی صبح نو اور جانے والے سال کی آخری شام نہیں بلکہ CONSCIOUSNESS کی دو متضاد اور متوازی سطحیں ایک دوسری کو نہایت سبک انداز سے مس کر رہی ہیں۔ اس ساری نظم سے ایک ایسا بھرپور اور بے نام سا تاثر پیدا ہوتا ہے جس کے لئے تنقید کی وضع شدہ زبان میں کوئی مناسب پیرایۂ اظہار نہیں۔ اس تاثر کو صرف ایک نظم میں ہی قلم بند کیا جا سکتا تھا۔ غزل کے بکھرے ہوئے اجزا اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ یا وزیر آغا کی زبان میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظم زیریں منزل ہی میں بیٹھ کر کہی جا سکتی تھی۔ کیونکہ یہاں زندگی کی قربت ہے۔ اور شاعر اپنے قریب سے گزرنے والے ماہ و سال کے قدموں کی غیر محسوس چاپ سن سکتا ہے

اور اب "غزلیں" کی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا بدن لہو کا رواں مشتِ پر میں تھا

حدِ افق پہ شام تھی خیمہ میں منتظر
آنسو کا اک پہاڑ سا حائل نظر میں تھا

جاتے کہاں کہ رات کی باہیں تھیں مشتعل
چھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا

لو وہ بھی خشک ریت کے ٹیلے میں ڈھل گیا
کل تک جو ایک کوہِ گراں رہگذر میں تھا

اترا تھا وحشی چڑیوں کا لشکر زمین پر
پھر اک بھی سبز پات نہ سارے نگر میں تھا

پاگل سی اک صدا کسی اجڑے مکان میں تھی
کھڑکی میں اک چراغ بھری دوپہر میں تھا

اس کا بدن تھا خون کی حدت سے شعلہ وش
سورج کا اک گلاب سا طشتِ سحر میں تھا

اس غزل میں سات شعر ہیں۔ اور غزل کی روایت کے مطابق یہ ایک تنہا فرد کے سات روپ ہیں۔ ان میں کوئی خارجی INTEGRITY نہیں ہے صرف موڈ کی اکائی تسلیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ مسئلہ بنیادی نوعیت کا نہیں ہے کیونکہ غزل میں اس کی سارے جزئیات اپنی ساری انفرادیت کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ اس غزل کا مزاج اور تکنیک تشکیل جسے گوئٹے نے ARCHITECTONIC کہا ہے، نظم کے اس تجرباتی عمل سے بالکل مختلف ہے۔ جیسے زیریں غزل کی واقعیت بالائی غزل کی حیرت سے مختلف ہوتی ہے قطع نظر اس امر کے کہ اس غزل میں بھی شام کا IMAGE موجود ہے آپ محسوس کریں گے کہ غزل کی صرف ہیئت ہی نظم سے مختلف نہیں بلکہ یہ اس تجریدی مزاج کی بھی ایک حد تک نفی کرتی ہے جو نظم کا مقسوم ہے ہر شعر محض ایک حسی تجربہ ہی نہیں بلکہ ایک CONCRETE IMAGE یا ٹھوس تمثیل بھی ہے۔ نظم میں تخلیقی عمل تو ایک GESTALT یا کُل کی تشکیل کی تھی اس کے تمام IMAGES اپنی انفرادیت تیاگنے کے عمل سے گذر رہے تھے یہ تحلیل کا عمل تھا۔ لیکن غزل میں ہر IMAGE اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے پر مُصر ہے۔ یہ تکمیل کا عمل ہے۔ غزل اور نظم کے مطالعہ کے بعد کوئی ذہین قاری یہ نہیں کہہ سکتا کہ شاعر نے جو بات نظم میں کہی وہ غزل میں بھی اسی خوبصورتی اور مکمل پن کے ساتھ کہی جا سکتی تھی۔ اب اس حوالے سے آپ "غزلیں" کے پیش لفظ کو ذرا غور سے پڑھیں۔ "مصیبت یہ ہے کہ اکثر شاعر ساری زندگی ایک ہی منزل میں بیٹھ کر گذار دیتے ہیں۔ قاری کا جی گھبراتا ہے۔ ترکیبِ مکرر آتا ہے، ممکن ہے یہ بات وفاداری بشرطِ استواری کے مقولے کے تابع ہو مگر وفاداری سے اکثر شخصیت اور کلام کے زنگ آلودہ ہونے

کا تقاضہ بھی احساس ہوتا ہے پھر شاعر کو لازم ہے کہ وہ چند روز کیلئے نقل مکانی منسوخ کر دے۔

وزیر آغا جب نظم سے دیارِ غزل میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنا چپڑا نا فرنیچر ساتھ نہیں لاتا بلکہ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ نئے مکان میں ہر چیز نئی ہو۔ غالباً وہ نظم کی محبوبہ اور اس کے ہجر و وصال کی فضا کو بھی وہیں چھوڑ آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی نظم اور غزل کا یہ فرق محض ایک ACADEMIC یا تدریسی قسم کا فرق نہیں بلکہ یہ ایک بنیادی فرق ہے جسے ہمارے وہ شعرا اور خصوصاً ترقی پسند شعرا نظر انداز کر دیتے ہیں جن کی نظم اور غزل میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا سوائے قافیہ کی قید یا قافیہ سے آزادی کے۔ آپ کسی ترقی پسند شاعر کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ دونوں کی بنت میں ایک قسم کا دھاگہ اور رنگ استعمال کیا گیا ہے فرق صرف کپڑے کے طول و عرض کا ہے۔ وہی باتیں جو تفصیل سے نظم میں کہی گئی ہیں وہی اجمال سے غزل کے پیکر میں ڈھل گئی ہیں۔

میں نے اب تک جو گزارشات کی ہیں ان کا مقصد ہیئت کے حوالے سے وزیر آغا کے فن کو سمجھانا نہیں تھا۔ بلکہ یہ خود کلامی میرے لئے اس لئے بھی ضروری ہو گئی تھی کہ مجھے اس طرح شعر کے فنی اور فکری سانچوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے وان گاگ اور گاگین کے ہاں رنگوں کا فرق محض حادثاتی نہیں بلکہ ان کی شخصیت کی انفرادیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر اظہار کے سانچوں کا انتخاب کرتا ہے تو یہ محض شعار، رسوم و قیود کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ یہ داخلی URGE کا ایک ایسا مسئلہ ہے جسے کوئی NEUROLOGIST ہی سمجھا سکتا ہے۔

"نردبان" وزیر آغا کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں انہوں نے نردبان کے ہی عنوان سے شاعری، شعری IMAGE نظم اور اس کے عقبی دیار، قاری اور شاعر کے باہمی رابطہ اور شعری تجربہ کی ترسیل پر کھُل کر اظہار کیا ہے یہ تنقیدی اشارے اس لئے ضروری تھے کہ وزیر آغا اپنے شعری سفر کے اس مرحلہ پر پہنچے ہیں جہاں شاعر زمین اور اس کے چند مراحل سے اوپر اٹھنا شروع ہوتا ہے وہ خود اپنے لئے ایک نئی میتھالوجی اور ایک جدید علم الکلام وضع کرتا ہے اور اس میتھالوجی کے سارے رموز اس پر واشگاف ہوتے ہیں لیکن اُسے یہ بھی خدشہ ہوتا ہے کہ شائد قاری اس کے حسی تجربہ میں برابر کا شریک نہیں ہو رہا۔ ٹی ایس ایلیٹ نے اس خدشہ کے پیشِ نظر WASTE LAND کے آخر میں کچھ حواشی کا اضافہ کر دیا تھا۔ یہ حواشی شاعر اور قاری دونوں کے لئے AIDS TO MEMORY کا کام دیتے ہیں کیونکہ شاعر ان کی مدد سے اُس جذبے کو جو اس کی گرفت سے نکل چکا ہے ایک حد تک واگزار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور قاری ان اشاروں کی مدد سے شاعر کے تجربے میں ایک حد تک شریک ہو جاتا ہے۔ وزیر آغا کو اپنے پہلے شعری مجموعوں میں اس قسم کی نثری تشریحات کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ان نظموں اور غزلوں کا پس منظر کائنات کے ان زندہ اور متحرک مظاہر سے مرتب ہو رہا تھا جو ایک سمجھدار قاری کے حلقۂ بصیرت و بصارت میں آسکتے تھے

وزیر آغا کے شعری مجموعوں کے نام اس ضمن میں ہماری ایک حد تک رہنمائی کرتے ہیں۔ نظموں کے پہلے مجموعے کا نام "شام اور سائے" تھا اس نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر دھندلکوں میں اپنے سفر کا آغاز کر رہا ہے۔ وہ سفر کے انجام سے تو آشنا نہیں لیکن اس کی جہت خالصتاً افقی ہے ایسے سفر میں مسافر اپنی پرچھائیں کے ساتھ آگے بڑھتا جاتا ہے اس کی بصارت اس کی رفیقِ سفر ہوتی ہے۔ اس لئے چیزوں کو دیکھنے کا عمل چیزوں کے تجریدی ادراک پر غالب آجاتا ہے چنانچہ بصارت کو دوسری حسیات پر فوقیت حاصل ہوتی ہے بادلوں کی گرم بوجھل شال، البیلی پگڈنڈی زرد پتے، جل کر نیلیں، ادھڑتی ہوئی عمارتیں نم آلود کھڑکیاں، منقش چھتیں، جگمگاتی شاہراہیں، کالے گنجان جنگل، کلس، منڈیریں، گنبد، چھجے دیواریں میدان، سب ایسے مظاہر ہیں جو آنکھ کی سکرین پر ٹھوس حقائق کی طرح دم بھر کے لئے منعکس ہوتے ہیں اور پھر ناظر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس سفر میں اُوپر اُٹھنے کی خواہشیں موجود تو ہوتی ہیں۔ لیکن مظاہرِ فطرت یا مایا کی گرفت اتنی سخت ہوتی ہے کہ مسافر عمودی سفر کی سکت نہیں پاتا۔ لیکن اصل چیز تو خواہش ہے۔ یہ اوپر اٹھنے

کی خواہش وزیر آغا کی شاعری میں کبھی بے نشان مسافت، اور کبھی "خدارا کوئی مجھ کو باہر نکلنے کا رستہ بتاؤ" کی کربناک التجا میں ظاہر ہوتی ہے۔
یہ میرا خیال ہے اور ممکن ہے یہ خیال غلط ہو کہ وزیر آغا ایک طویل عرصہ تک ین یانگ، خیر و شر، زمین و آسمان کے درمیان تقسیم رہا ہے۔ ہر وہ آدمی جو آگہی کے سفر پر نکلتا ہے حقیقت کی اس ثنویت سے دوچار ہوتا ہے، لیکن ایک ایسا ذہن جو برابر آگے بڑھ رہا ہو اس مرحلہ پر دیر تک رُک نہیں سکتا۔ وزیر آغا کے ابتدائی کلام میں مظاہرِ فطرت کا بصری روپ زیادہ نمایاں ہے وہ ٹھوس چیزوں کو بطور اشیاء دیکھتا ہے اور ناظر کا ان اشیاء سے جو رشتہ ہے وہ بھی زمینی سطح کی حد تک رہتا ہے۔

یہاں خشک ندیوں کی سوکھی زبانیں
بھی بانجھ دھرتی کی چھاتی سے چمٹی ہوئی ہیں
برہنہ درختوں کے نیچے
ہزاروں کی تعداد میں سوکھے پتّے
اندھیرے کی ننگی نگاہوں سے ڈر کر
عجب بے بسی سے
خنک ریت کی میلی چادر پہ اوندھے
پڑے ہیں

بانجھ دھرتی، برہنہ درخت، خنک ریت میلی چادر یہ محض اشیاء ہیں جن کو آپ چاہیں تو واضح تصویروں اور رنگوں میں منتقل کر سکتے ہیں۔ ایسی ہی دوسری نظموں میں ارضی یا معنوی سطح پر غالب نظر آتی ہے اور تمثالیں اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود قاری کو کسی غیر محسوس یا غیر مرئی کائنات کا بھرپور منظر نہیں دکھاتیں۔ لیکن جیسے میں نے عرض کیا ہے، وزیر آغا اپنے تمام شعری سفر میں اپنے ایک ایسے ہمزاد کے ساتھ چلتا رہا ہے جس کا سفر افقی نہیں بلکہ عمودی ہے۔ غزل میں وزیر آغا نے اپنے سے اوپر اٹھنے کی ایک بھرپور کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے اس خدشے کا بھی اظہار کیا تھا کہ

اب میں شاید زیادہ دیر اس منزل میں قیام پذیر نہ رہ سکوں، وہ اس غزل میں زیریں منزل کو لوٹ جانے کے لئے کچھ دیر کے لئے قیام پذیر نہیں ہوا تھا بلکہ وہ اپنی اگلی مسافت کے لئے کچھ دیر یہاں رُکا تھا وہ "شام اور سائے" اور "دن کا زرد پہاڑ" کے تخلیقی مراحل کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے "نردبان" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے محض لغوی مفہوم میں اوپر اٹھنے کا ایک ذریعہ نہیں بلکہ معنوی اور اصطلاحی طور پر شاعر زمین کی سطحیت کو ترک کر کے اوپر اٹھا ہے۔ اور اپنے نئے سفر پر روانہ ہوا ہے مجھے یہ سفر یولیس کے سفر کے مماثل نظر آتا ہے جب آنکھوں کے سامنے اَن دیکھی دنیاؤں کے دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ اور مرئی کائنات بیکراں وسعتوں میں تحلیل ہو جاتی ہے اس سے قبل وزیر آغا SPACE کے ایک معلوم نقطہ پر کھڑا تھا اور وہ اپنے چاروں اُور دیکھ رہا تھا۔ اب وہ بیکراں وسعتوں میں سُرخ روشنائی کے ایک حقیر قطرے کی طرح ہے۔ لیکن سُرخ روشنائی کا یہ قطرہ باہر کی MICROCOSM کو اندر کی MICROCOSM میں منتقل کر رہا ہے۔

میں سُرخ دھبّہ ہوں
لپکپاتے لطیف عکسوں کا سلسلہ ہوں
تمام چہرے جو تیرے اندر سے جھانکتے ہیں
مرے ہی چہرے کی جھلکیاں ہیں
میرے ہی سینے کی دھڑکنیں ہیں

وہ ایک قطرہ جو میرا دل ہے
جو میرے عکسوں کا سلسلہ ہے
جو میرے ہونے سے سرخرو ہے
جو میری پابستہ آرزو ہے
(بیکراں وسعتوں میں تنہا)

کائنات کی اکائی کے ساتھ ایک ہو جانے اور اس اکائی کو اپنے اندر منتقل کرنے کے اس عمل کو وزیر آغا نے ایک دوسری نظم "ازل سے ابد تک" میں بڑی ہی مابکدستی سے بیان کیا ہے۔

میں تارِ نظر ہوں،
میں سیّال سا رابطہ ہوں
مقدر میں مرے لکھا ہے کہ میں سانس بن کر
اک اک تن میں اتروں، اک، اک تن سے باہر کو آؤں
زمانوں کو تازہ لہو کی حرارت مہیا کروں
ہست کو نیست ہونے سے ہر دم بچاؤں
مگر اپنی خاطر کوئی جسم ہرگز نہ مانگوں
کسی ایک منزل پر رُکنے نہ پاؤں

جب تک وزیر آغا ثنویت کے ظاہری مرحلے پر رُکا تھا تو چیزوں کو دیکھنے کا انداز بھی

تھا اب جبکہ TWO DIMENSIONAL
اس کی آنکھ کھل گئی ہے تو اُسے حقیقت کو بہت
قریب سے دیکھنے کا ایک عجیب سا تجربہ ہوا ہے
جسے MYSTIC EXPERIENCE میں
بھی کہہ سکتا ہوں۔ کیونکہ اس کے شعری عالم تمثال اور
عالمِ تنزیہ اس طرح متصل نظر آتے ہیں کہ ناظر کو
وجودِ مطلق سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایک
خوبصورت نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

جب آنکھ کھلی میری
دیکھا کہ ہر اک جانب
زرتار سی کرنوں کا
اک زرد سمندر تھا
اور زرد سمندر میں
چاندی کی پہاڑی پر
میں پیڑ تھا سونے کا
شاخوں میں مری ہر سو
جھنکار تھی پتّوں کی
اڑتی ہوئی چڑیوں کی
یا آگ کی ڈلیوں کی
اک ڈار سی آئی تھی
اور مجھ میں سمائی تھی
قدموں کے تلے مرے
زنجیر تھی لمحوں کی
میرے زرہ بکتر سے
جو کوندا لپکتا تھا
تاروں کے جھروکوں تک
پل بھر میں پہنچتا تھا
میں جسم کے مرقد سے
باہر بھی تھا اندر بھی

میں خود ہی پہاڑی تھا
اور خود ہی سمندر بھی

اب اس نظم کے بعد لمعات عراقی سے یہ
اقتباس ملاحظہ ہو:

"اختلافِ ذات کی نفی سے وہ نور چمکتا
ہے جو روشنی کے اندر پوشیدہ روشنی کی
تہوں سے برآمد ہوتا ہے اور ظہور کی
تجلی سے تجلیات کا سلسلہ ظاہر ہوتا ہے
عاشق اور معشوق کی صورتیں مٹ جاتی
اور فقط ذاتِ حق ہی قائم و آشکار رہتی
ہے۔"

وزیر آغا کے ہاں ذاتِ حق کا ابھی الفاظ
میں کہیں ذکر نہیں ہوا ممکن ہے میری اس توجیہہ
سے اختلاف کیا جائے لیکن میں تو نظموں کی زیریں
لہروں سے وزیر آغا کے اصل SELF
کی دریافت کر رہا ہوں۔

اس ضمن میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں
وزیر آغا کی شاعری کی پرکھ کے سلسلے میں اس کی
تمثالوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے کیونکہ اس
کے IMAGES محض آرائش نہیں بلکہ یہ
اس کے حسّی تجربے کے خدوخال کو اجاگر کرتے ہیں
ایک امیج جو ۱۹۶۴ء سے لے کر اب تک وزیر آغا
کی شاعری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے وہ "ہوا"
ہے۔ یہ IMAGE ظاہر ہے غیر شعوری ہے
اس لئے اس کا مطالعہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے
"شام اور سائے" میں ہوا کا پیکر ایک بڑی حد
تک معروضی ہے معنوی سطح پر اس کی امکانی حیثیت
زیادہ واضح نہیں ہے۔ مثلاً

ابھی آسماں رتھال میں زرد کلیاں سجائے
ہوا کے یکسار جھونکے سے الجھا نہیں تھا

کبھی سرد جھونکے کو صحنِ چمن سے
بہکتے ہوئے لڑکھڑا کر گزرتے ہوئے تم نے
دیکھا؟
وہ اک سرد جھونکا کہ جس کے در آتے ہی
رستوں پہ بکھرے ہوئے زرد پتے
تھرکنے، مچلنے، تڑپنے لگے ہیں

یہ دلچسپ بات ہے کہ ۱۱۹ صفحات کے
اس شعری مجموعے یعنی "شام اور سائے" میں ہوا
کا ذکر صرف پانچ یا چھ بار ہوا ہے اور وہ بھی ہوا
کے ایک مخصوص روپ سے متعلق ہے۔
'غزلیں' میں 'ہوا' ایک زندہ کردار کی حیثیت
سے شعری سفر میں شریک ہوتی ہے۔

پھر ایک دن ہوا نے کہا، میں تو تھک گئی
خوشبو کا بوجھ مری کمر کو جھکا گیا

کسے خبر کہ کہاں چھوڑ کر چلی جائے
صبا کے چال چلن سے تو روشناس نہیں

ہوا "شام اور سائے" میں ایک مانوس،
رسمی سا OBJECT تھا لیکن آگے چل کر اس
نے اپنا ایک آزادانہ کردار اختیار کر لیا ہے اور
آہستہ آہستہ یوں محسوس ہوا ہے کہ شاعر اور ہوا
گہری شناسائی یا IDENTIFICATION
کے عمل سے گزر رہے ہیں۔
لیکن نردبان میں ہوا کا نقطۂ متعین ہو گیا ہے

وہ زندگی کی علامت بن گئی ہے۔ وہ زمان ومکاں
کے قابوس سے آزاد ہونے کی ایک دلیل ہے۔
وہ محدود سے لامحدود کی طرف بڑھنے کا ایک
زینہ ہے۔ وہ پامال سطحیت سے اوپر اٹھنے کا
استعارہ ہے وہ بے رنگ، بے نشان انتہا مسافت
سے عمودی سمت میں روانہ ہونے کا عہدنامہ
ہے، وزیر آغا نے "نردبان" کا آغاز دعا سے
کیا ہے اور اس میں سب سے جاندار تمثال
ہوا کی ہے:

ہوا — ایک باریک سے تیز چابک کی صورت
تیری بند مٹھی میں ذبکی رہے!
سدا مجھکو حیرت سے دیکھے زمانہ
تڑپتے ہوئے تیز دھاروں کی منزل بنے
بادباں سارے تیری ہی جانب کھلیں
اور افق کی منڈیروں پہ کونجوں کی لمبی قطاریں
تیری منتظر ہوں

"ازل سے ابد تک" میں جو اس مجموعہ کی
ایک نہایت خوبصورت اور فکر انگیز نظم ہے۔
ہوا زندگی کی علامت بن گئی ہے:

پرندہ ہوا ہے — ہوا سانس ہے
سانس چھاتی کے پنجرے میں آنے کا
اور لوٹ جانے کا ایک سلسلہ ہے

زندگی کا یہ تصور نظم کی آخری سطروں میں نیا؟
یک اور نمایاں ہو گیا ہے:

ازل اور ابد کی مسافت میں جھونکے کی صورت
میں اڑتا پھروں
اپنی صورت کو ترسا کروں
اپنے تجربے میں خوش رہوں
اور زندہ رہوں
اور زندہ رہوں

جیسے ہوا کا تسلسل زندگی کی دلیل ہے،
اس کا بند ہو جانا سکوتِ موت کی دلیل ہے۔

عجیب سے یہ سلسلہ، یہ سلسلہ عجیب ہے
ہوا چلے تو کھیتوں میں دھوم چمپوں کی ہے
ہوا رکے تو مردنی ہے
مردنی کی راکھ کا نزول ہے

"نردبان" میں "ہوا" اور زندگی کے امروپ
کا رشتہ اتنا شدت اختیار کر گیا ہے کہ شاعر اس
کی عدم موجودگی میں زندگی کے وجود کو بھی تسلیم نہیں
کرتا۔

سحر سے پہلے
نجانے کیسے کسی نے قفلِ جمود توڑا
ہوا کے جھونکے کو بند پنجرے سے دی رہائی
فضا میں چھوڑا
ہوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے
بدن کو تولا
چہک اٹھے شاخ شاخ پتے
چمکتا کانسی کا چاند بولا
پروں کا اجلا سا لمس
میرے بدن پر اترا تو میں بھی زندوں کی صف
میں آیا
مگر وہ جھونکا تو اک پرندہ تھا
اڑ گیا شب کے راستوں پر
کبھی نہ پھر لوٹ کر وہ آیا

ہوا کا یہ زندگی آمیز معجزہ ایک اور نظم، ہوا
کہتی رہی آؤ، میں اور بھی نمایاں ہوا ہے۔ یہ ایک
دلچسپ امر ہے کہ ہوا کے IMAGE کا
"نردبان" میں اتنی بار تکرار ہوا ہے کہ محسوس
ہوا ہے کہ شاعر ہوا کے حوالے سے زندگی اور موت
کی پراسراریت کو سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اگر میری ذات ایک زنداں ہے
جس کے در سے نکل کے پھر تم
کھلی فضاؤں میں پر فشاں ہو
تو مجھ کو تم سے گلہ نہیں ہے
ہوا کے جھونکے سے کب کسی نے گلہ کیا ہے

ہوا دراصل وزیر آغا کے لئے ایک ایسا عنصر
ہے ایک قوی عنصر ہے جو بیک وقت قریب بھی
ہے اور بسیط و ہمہ گیر بھی ہے۔ اس کا مسکن آسمان
ہے۔ اور اس کا منبع انسان کا دل ہے اور محبت
کی شکل میں اس کا دامن ہر ایک کے لئے پھیلتا
ہے، وزیر آغا نے اپنے عمودی سفر کے لئے
ہوا کو رفیقِ سفر منتخب کیا ہے۔ یہ سفر کہاں جاتا
ہے؟

سفر میں ہوں اور رکا کھڑا ہوں
میں چاروں سمتوں میں چل رہا ہوں
مگر کہاں ہوں
وہیں — جہاں سرخ روشنائی کا ایک قطرہ
کسی قلم کی کثیف نب سے ٹپک پڑا ہے

نظم کے سفر میں نردبان کو ایک سنگِ میل
کی حیثیت حاصل ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ
ایک طویل عرصہ تک ایرانی شعر میں اس کی گونج سنی
جائے گی۔ اور یہ کسی شعری مجموعہ کے لئے ایک
بہت بڑا اعزاز ہے۔

جولائی ۱۹۷۹ء

اے۔ بی۔ اشرف

باہر کفن سے پاؤں[1]

عرشِ صدیقی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں نو افسانے شامل ہیں۔ جو اٹھارہ سال کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تعداد کے لحاظ سے افسانے کم ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان افسانوں کا معیار اچھا ہے اور اُردو کے افسانوی ادب میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔ عرشِ صدیقی کے یہاں موضوع اور فن کے کچھ ایسے منفرد تجربے ملتے ہیں۔ جن کی بدولت یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ افسانے جدید اُردو افسانے میں صحت مند اور توانا رویوں کی تخلیق کا باعث بنیں گے۔ کیونکہ عرشِ صدیقی عدم تحفظ، لامرکزیت اور ٹوٹ پھوٹ کے اس دور میں زندگی کی نئی معنویت تلاش کر کے ارتقائے حیات میں ادیب کے نہایت اہم منصب سے باحسن طریق عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ عرشِ صدیقی کو ایک طرف تو کمپلیکس زندگی موضوع کے طور پر ملی ہے اور دوسری طرف فنی تجربات کی ایک وسیع روایت بھی ورثے میں حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے جہاں ان کے یہاں موضوع کا تنوع اور تلون موجود ہے۔ وہاں تکنیک کے تجربے بھی ملتے ہیں۔ ذات کی شکست و ریخت کا مسئلہ، آشوبِ زیست، معاشرتی رویوں کی تبدیلی، سماجی زندگی کا بکھراؤ، سیاسی انتشار، عدم تحفظ، یکسانیت، بے چینی شخصی و نفسی اُلجھنیں، اجتماعی لاشعور کے تصورات گویا عصری زندگی کے تمام روپ ان افسانوں میں موجود ہیں۔ پھر مختلف افسانوں میں مختلف تکنیک کا برتاؤ بھی ملتا ہے۔ "چوتھا مجوسی"، "بیٹری"، "مور کے پاؤں"، "باہر کفن سے پاؤں"، "ہم نشینی کا عذاب" وغیرہ علامتی افسانے ہیں۔ "ظلِ الٰہی" اور "کتے" میں فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی گئی ہے ان میں فینٹسی کی سی کیفیت بھی ملتی ہے۔ "ہم نشینی کا عذاب"، اور "کتے" نفسیاتی ٹریٹ منٹ کے افسانے ہیں۔ "تکمیل کا زخم" ڈرامائی عناصر کا حامل ہے۔ "فرشتہ"، طویل مختصر افسانہ ہے۔ جو پرانی تکنیک پر لکھا گیا ہے۔ لیکن تازگی اور جدت کا احساس اس افسانے میں بھی موجود ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ عرش صدیقی کو مختصر افسانے کی ایک وسیع روایت ورثے میں ملی ہے۔ پریم چند نے سیدھی سادی کہانی لکھنی شروع کی۔ اور جدید دور تک پہنچتے پہنچتے فنِ افسانہ نگاری نے کتنے انقلاب اور کتنی تحریکوں کے اثرات قبول کئے۔ ابھی پریم چند کی افسانہ نگاری کا آغاز ہی تھا۔ اور حقیقت نگاری کا چلن عام بھی نہ ہوا تھا کہ سجاد حیدر یلدرم نیاز فتحپوری، قاضی عبدالغفار اور حجاب وغیرہ نے رومانوی تحریک کے اثرات اپنی کہانیوں میں سمونے شروع کئے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت جلد ان کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اور پریم چند ہی کی قائم کردہ حقیقت پسندی کی روایت آگے بڑھنا شروع ہوئی اور آگے بڑھ کر ترقی پسند تحریک کی پیش رَو بن گئی۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر مختصر افسانے کی صنف نے خصوصی اہمیت حاصل کر لی۔ اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور کا افسانہ اُردو ادب کی دیگر اصناف کو پیچھے چھوڑ گیا۔

پھر جدید دور اپنے پیچ در پیچ مسائل، انڈسٹریل کمپلیکس اور ڈپارٹمنٹل سٹور کے ایشو لے کر اُبھرا۔ اور فرائڈ، ینگ اور ایڈلر کے نظریات نے شعور و لاشعور کے مباحث چھیڑے۔ معاشرتی اور ذہنی سلیقے اور انسانی روابط کی نوعیت بدل گئی۔ کمپلیکس زندگی نے سیدھے سادے بیانیہ افسانے کی بجائے علامتی اور تجریدی افسانے کو جنم دیا۔ شعور کی رو پر افسانے

---

[1] عرشِ صدیقی کے افسانوں کا مجموعہ

اور ناول لکھنے کے تجربے کئے جانے لگے۔ سرریلزم، ڈاڈا ازم، سمبلزم اور وجودیت کے واضح اثرات جالیہ جدید دور کے افسانہ نگاروں میں پائے جاتے ہیں۔ انتظار حسین، انور سجاد، مسعود اشعر، اسد محمد خان، مظہرالاسلام کی کہانیوں پر یہ اثرات واضح طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ عرش صدیقی کے یہاں بھی ان تحریکوں کے اثرات ملتے ہیں۔ خصوصاً وجودیت کا اثر ان کے یہاں بہت نمایاں ہے اور بھیڑیں، ہم نشینی کا عذاب، کتے اور چوتھا مجوسی میں یہ اثرات واضح طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

دراصل دو عالمگیر جنگوں اور مہلک ہتھیاروں کی ایجاد نے حیاتِ انسانی کو عدمِ تحفظ کا شکار کر کے رکھ دیا ہے۔ اقتصادی بحران اور خارج میں پھیلے ہوئے خوف اور وحشت کے ماحول نے انسان کو مائل بہ اندرون (INTROVERT) کر دیا۔

اپنے گلے میں اپنی ہی بانہوں کو ڈالئے
جینے کا اب تو ایک یہی ڈھنگ رہ گیا

آج کے ادیب کو یہ باور ہو گیا کہ ذات کا داخلی اور باطنی رویہ خارجی اشیاء کی ماہیت تک کو بدل دیتا ہے۔

"مگر یہ کیوں ہے کہ اپنے کمرے میں اکر مجھے اپنا رشتہ باہر کی دنیا سے استوار معلوم ہوتا ہے؟ مجھے تو اس رشتے کا احساس ہی کمرے میں داخل ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ میں باہر کی دنیا کو صرف اسی وقت دیکھ سکتا ہوں جب میں اپنے کمرے میں ہوتا ہوں۔"

"ہم نشینی کا عذاب"

داخل کے حوالے سے خارج کے امکانات کا یہ انکشاف وجودیت کا دیا ہوا تصور ہے۔ کشف اور عرفان کی اہمیت کا یہ تصور نطشے۔ ڈیکارٹ، دوستوفسکی کافکا، سارتر اور اقبال کے یہاں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ذات کی اہمیت اور انانیت کے اس تصور نے ہمارے یہاں کے جن ادیبوں کو متاثر کیا ہے ان میں عرش صدیقی بھی شامل ہیں۔ وجودیت کے فلسفے نے جہاں ایک طرف انسانی عظمت کو اجاگر کیا۔ فرد کو کائنات کا درجہ دیا وہاں انسان کی ہیئتِ اجتماعی کو بھی متاثر کیا۔ سماجی روابط کو منقطع کیا۔ فرد کو تنہا کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ ہجوم سے خوفزدہ ہو گیا۔ اس کا اجتماعی تشخص گم ہو کر رہ گیا۔

"میں بڑے اعتماد سے اپنی نشست کی جانب بڑھا لیکن میرا یہ اعتماد اس خوف کا غماز تھا جو میں اس ہجوم سے محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اکثر یوں لگتا ہے کہ ہجوم مجھے کھا جائے گا۔ میں ہجوم کی طرف بڑھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں۔ جیسے قطرہ سمندر میں دفن ہونے جا رہا ہے۔ زندہ دفن ہونے کا خوف یہ بڑا سخت خوف ہے۔"

(بھیڑیں)

دراصل یہ خوف ذات کا ہجوم میں گم ہو جانے کا خوف ہے۔ تشخص کے مٹنے کا خوف ہے۔ اور یہی آج کے انسان کا المیہ ہے۔ "بھیڑیں" کے علاوہ "ہم نشینی کا عذاب" بھی وجودیت کے بھرپور عناصر لئے ہوئے ہے۔

"موت کے پاؤں" نئی پیچیدہ انسانی صورتِ حال کا افسانہ ہے۔ معاشی مجبوریوں کے تحت نقل مکانی دنیاوی کے سفر — بلند معیاروں کو چھونے کی خواہشیں فیملی لائف کی بے آہنگی — اپنی مٹی کی خوشبو کی کشش۔ اپنے تہذیبی اور زمینی رشتوں سے وابستگی پھر خواہشوں کے سفر سے مزاحمت — اس افسانے کا موضوع ہے۔ "چوتھا مجوسی" امیجز اور تلمیحات کے ذریعے ایک ایسے تجسّم کو پیش کرتا ہے۔ جس میں آشوبِ زیست۔ انتشار اور بے آہنگی کے اس دور میں ایک نئے سماجی ڈھانچے اور نئے آدرش کی تلاش کی گئی ہے — وہ نیا نظام جو نئی صداقتوں کے تناظر میں نئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ عرش صدیقی موجودہ کربناک اندھیرے میں روشنیوں کی تلاش کا فریضہ انجام دینا نہیں بھولتے اس افسانے میں نئی دنیا کی تلاش کی سعی کی گئی ہے۔

"فرشتہ" بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں عرش صدیقی نے معاشرے کے ایک نہایت نازک مسئلے کو حقیقت کی پوری تلخی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عام طور پر ہمارے یہاں کے ادیب اس قسم کے موضوع کو پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتے جو معاشرے کی غلط اقدار، منافقانہ طرزِ عمل اور پیچیدہ سقولوں کی پیداوار ہوتا ہے۔ لیکن عرش صدیقی معاشرے میں پھیلی ہوئی خرابیوں کو پوری ذمہ داری سے پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہر گناہ اور ہر خرابی کا کوئی نہ کوئی جواز موجود ہوتا ہے۔ اسباب کے علل کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ گل رخ کا کردار سنگسار کرنے کے لائق اس لئے نہیں کہ اس کے گناہ ہو سکنے کے پیچھے کچھ محرکات بھی ہیں۔ محرکات ختم ہو جائیں

تو گناہ بھی مت سنا جائیں گے۔ عرش صدیقی جرم و تعزیر کے قوانین اور اخلاق کے نام پر کالفتہ آنکھیں بند کرکے کھیلنے کو اچھا نہیں سمجھتے۔ بلکہ جرم کو عام زندگی اور مجرم کے حالات سے ملا کر دیکھنا چاہتے ہیں۔

"باہر کفن سے پاؤں" وقت کے تسلسل، جوشِ حیات نمو پذیری اور ارتقا سے برودی (EMERGENT EVOLUTION) کی کہانی ہے۔ اس افسانے میں مادرائیت، وحشت اور خوف کے منطقے بار بار اُبھرتے ہیں۔ نامعلوم کا سفر ــــــ دراصل مستقبل کی بے یقینی، موجودہ دور کے سماجی انتشار اور تہذیبی تناظر کے مسخ ہونے کا استعارہ بنتا ہے۔ احساساتی سطح پر وحشت اور خوف کا پھیلاؤ، دشت میں تنہائی کا سفر، نامعلوم کرب کی کیفیت۔ موجودہ تہذیبی خلا اور جنریشن گیپ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ دورِ جدید کی بے سمتی لامرکزیت نے فرد کو ذہنی خلفشار کا شکار کیا ہے۔ اس خلفشار کو امیجز کے تسلسل اور تاثر اور روحانی اور تہذیبی تناظر کو فلیش بیک کے طور پر استعمال کرکے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دورِ جدید کے علامتی افسانے کے تناظر میں عرش صدیقی کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو ایک فرق واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ جہاں کئی ایک افسانہ نگاروں کے یہاں علامت یا استعارہ خیال کی ترسیل میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ وہاں عرش صدیقی کے افسانوں میں علامت، موضوع اور خیال کی وضاحت اور ترسیل کا وسیلہ بنتی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل کچھ لوگ تکنیکی تجربے اور جدت طرازی کے شوق میں نہ صرف افسانوں میں کہانی پن کو نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ افسانویت کے بنیادی تقاضوں کو بھی جھٹلا دیتے ہیں۔ محض تحیر انگیزی کی خاطر لوگوں سے ٹرک (TRICK) کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر علامتی افسانے عام لوگوں کی فہم سے بالا ہیں اور ابہام کی پیداوار دکھائی دینے لگتے ہیں۔

عرش صدیقی کے یہاں تکنیکی تجربے، موضوع اور طرزِ اظہار کی جدت کے باوجود افسانے کی بنیادی خوبی دلچسپی اور قصہ پن کے عناصر برقرار رہتے ہیں۔

"گھٹتے ہے" باہر کفن سے پاؤں" تک کا جتنا فنی سفر دکھائی دیتا ہے۔ اس میں نہ صرف تکنیک کا ارتقاء نمایاں نظر آتا ہے۔ بلکہ امیجز کے استعمال وہ تلازمۂ خیال میں گہرائی کا احساس بتدریج بڑھتا چلا گیا ہے اور بعد کے افسانوں کی تکنیک میں تمثال آفرینی اور تلازمۂ خیال کو خاص طور پر دخل حاصل ہے۔ اس لحاظ سے عرش صدیقی اور انتظار حسین میں ایک گہری مماثلت ہے کیونکہ ان دونوں افسانہ نگاروں کے یہاں استعارہ پورے افسانے میں پھیل کر معانی کی وضاحت کرتا ہے اور پورے نفسیاتی اور معاشرتی پس منظر کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عرش صدیقی کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "باہر کفن سے پاؤں" اُردو کے افسانوی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ کیونکہ ان افسانوں میں فن کی نئی جہتیں روشن ہوئی ہیں اور نئے رویے وجود میں آئے ہیں۔

ثمینہ راجہ

رحمٰن شریف

ہوائے تازہ

کوثر علی

محمد ابدال بیلا

ماہِ نو

رنگوں کی مقتل گہ میں کبھی تو بھی آ کے دیکھ
شاید کہ رنگِ زخم کوئی تجھ کو راس ہو

میں بھی ہوا کے جسم کی صورت ہوں بے صدا
شامل گلوں کی باس میں گر تیری باس ہو

آئے وہ دن کہ کشتِ فلک ہو ہری بھری
بنجر زمیں پہ میلوں تلک سبز گھاس ہو

وزیر آغا

احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی

اوراقِ گذشتہ کی کتاب

شہرت بخاری، انتظار حسین

ماہِ نو

اگست ۱۹۷۹ء

صدر مجلسِ ادارت
سیّد امجد علی

چیف ایڈیٹر
کشور ناہید

ایڈیٹر: علی محمد حسینی

جائنٹ ایڈیٹر: قائم نقوی

ترتیب

اِس ماہ کی کتابیں

اگلے شمارے کی جھلکیاں

غلام عباس - ممتاز مفتی - قتیل شفائی - شمیم احمد - عارف عبدالمتین
ظفر اقبال - کرم حیدری - انور عنایت اللہ - شہزاد منظر - مشتاق قمر
پریشان خٹک - سائرہ ہاشمی - آثم میرزا - آغا سہیل - مسعود قریشی
خالد احمد - اصغر ندیم سید - نذیر قیصر - سعادت سید

جلد نمبر ۳۲ ——— شمارہ نمبر ۸

رجسٹرڈ نمبر ایل ۸۱۱۸

طلباء کیلئے بمع رجسٹری فیس ۲۰ روپے

قیمت : ۲ روپے

سالانہ چندہ مع رجسٹری فیس ۳۰ روپے

مطبوعات پاکستان نے دین محمدی پریس مل روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہ نو ۳۲ اے حبیب اللہ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

نعت

بُتوں سے پھر گیا دل اب اُدھر دیکھا نہیں جاتا
درِ مولیٰ پہ ہوں اور سوئے در دیکھا نہیں جاتا

رُخِ خیر البشر تو پھر رُخِ خیر البشر ٹھہرا
ان آنکھوں سے درِ خیر البشر دیکھا نہیں جاتا

ہزاروں آئینے برتے ہزار آئینہ گر دیکھے
ترے جلووں سے کوئی بہرہ ور دیکھا نہیں جاتا

اسی کوچے میں بیٹھا ہوں یہیں سے مر کے اُٹھوں گا
گدا بے شک ہوں لیکن اور در دیکھا نہیں جاتا

کبھی مہتاب کی صورت اُتر بھی آؤ آنگن میں
ستاروں کو مسلسل رات بھر دیکھا نہیں جاتا

ہزاروں اہلِ ندا اس آستاں پہ سر بسجدہ ہیں
جہاں انسان کی قیمت ہے نہ دیکھا نہیں جاتا

دکھا بھی دے عطا کی بے نظر حسن کیلئے مجھ کو
اُٹھا بھی دے حجاباتِ نظر دیکھا نہیں جاتا

مسلسل ہو رہی ہے جانے کیوں امت کی رسوائی
دعاؤں میں یہ افلاسِ اثر دیکھا نہیں جاتا

کھڑا ہوں کب سے محرابِ حرم کے سامنے دانش
نظر رہ رہ کے اٹھتی ہے مگر دیکھا نہیں جاتا

گوہر ہوشیارپوری

نعت

○

اے دشتِ عرب، تجھ میں درودِ شہِ والا
اے قریۂ ظلمت تری گلیوں میں اجالا
بے رنگ چٹانوں میں نمودِ گلِ لالہ
باطل کے اُفق پہ عَلَمِ ربِّ تعالے
یہ حلقِ علیٰ بارشِ انعامِ الٰہی
ذرات کی تقدیر میں کونین کی شاہی

○

یہ بخت وری بادیہ گردانِ عرب کی
آفاق میں دھوم ان کے تمدن کی ادب کی
کیا بات کروں ان کے حسب، ان کے نسب کی
بس حمد کرو احمدِ مختار کے رب کی
جو کچھ بھی کہ یہ مرتبہ و جاہ و حشم ہے
حقا کہ اس آقائے دو عالم کا کرم ہے

○

اے میرِ اُمَمؐ فخرِ رُسلؐ، سیدِ اکرمؐ
اے ماہِ عرب، مہرِ عجم، ہادیٔ مُسلم
اے شمعِ حرا، نورِ سما، مخبرِ دَمْلَم
اے حسنِ یقیں، نقشِ گماں، شانِ دو عالم
دارین کے قوسین کے، حسنین کے مولا
صدیقؓ کے فاروقؓ کے، نورینؓ کے مولا

○

مولا ہو تو پھر اپنی ہی مولائی میں رکھیو
خلوت ہو کہ جلوت ہو پذیرائی میں رکھیو
بخشی ہیں جبینیں تو جبیں سائی میں رکھیو
خود سے نہ جدا پل کو بھی تنہائی میں رکھیو
قطرہ کوئی رحمت کے سمندر سے خدارا
ہو کوثر و تسنیم کی موجوں کو اشارہ

انتظار حسین

صبح کے خوش نصیب

ہم لوگ بیچ جنگل میں تھے اور گاڑی رکی کھڑی تھی۔ کتنی مرتبہ گمان ہوا کہ گاڑی اب چلی ــ مگر نہیں چلی ــــ کتنی مرتبہ گاڑی سے باہر بکھرے ہوئے مسافر سیٹی دیتے انجن سے اشارہ لے کر لپک جھپک واپس اپنی اپنی نشست پر آئے اور دم سادھ کر بیٹھ گئے کہ اب گاڑی چلے گی۔ دم سادھے بیٹھے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ کب گاڑی حرکت میں آتی ہے۔ گاڑی حرکت میں یا تو آئی ہی نہیں۔ آئی تو بس اس قدر کہ پہیئے مشکل سے تھوڑا گھومے اور ڈبوں کو تھوڑا جھٹکا لگا مگر پہیئے پورا چکر لینے سے پہلے ہی رک گئے اور گاڑی ایک تھرتھری کے بعد پھر ساکت ہو گئی مسافر بیٹھے رہے، بیٹھے رہے۔ پھر کسی نے بے اطمینان ہو کر پہلو بدلا۔ کوئی بے زار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا ایک ایک کر کے پھر گاڑی سے اترنے اور پٹڑی پر چہل قدمی کرنے لگے۔ کسی نے پٹڑی کو پار کیا اور درختوں کے سائے میں جا بیٹھا۔

"امی گاڑی کیوں نہیں چلتی؟" بچے نے بور ہو کر ماں سے سوال کیا۔

"چلے گی۔"

"کب چلے گی؟"

"بس ابھی چلے گی۔"

مگر وہ کمسن ماں سے یہ جواب پہلے بھی سن چکا تھا۔ بیدلی سے اس نے سنا اور باہر جھانکنے لگا۔

سامنے کی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے گود کے بچے کو پہلے خالی باتوں سے بہلانے کی کوشش کی۔ جب وہ نہ مانا اور سینے پہ دست درازی کرنے لگا تو اس نے قمیص کا دامن اٹھا کر بچے کا منہ اندر کیا اور دامن گرا لیا۔ قمیص کا دامن اس نے اتنی چابکدستی سے اٹھایا کہ پیٹ کے ایک بے معنی سے گوشے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ خیر اس سے اتنا پتہ تو چل ہی گیا کہ اس میلے لباس کے اندر کتنا روشن بدن چھپا ہوا ہے۔

میرے برابر کی نشست پر بیٹھے ہوئے بڑے میاں جو بڑی یکسوئی سے اخبار پڑھے چلے جا رہے تھے بالآخر اخبار پڑھتے پڑھتے تھک گئے۔ اخبار کو ایک طرف رکھا اور بڑبڑائے "بہت دیر ہو گئی ـ آخر گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟"

"کوئی کراسنگ ہونا ہے۔" قریب میں بیٹھا ہوا بریف کیس والا آدمی بولا۔

"میرے خیال میں تیز گام آ رہی ہے۔" دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔

"تیز گام؟" بریف کیس والے نے کلائی پر لگی خوبصورت گھڑی کو دیکھا۔ "تیز گام کا تو یہ وقت نہیں ہے۔"

"پھر اور کوئی گاڑی ہوگی۔"

"ہاں اور کوئی گاڑی ہوگی۔ مگر بڑی دیر لگائی۔"

"اصل میں پسنجر کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ چیونٹی کی چال چلتی ہے اور قدم قدم پر رکتی ہے۔"

پسنجر ٹرین کی خرابیاں اب ان پر کھل رہی تھیں سوار ہوتے وقت تو وہ انہیں کتنی نعمت نظر آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر کتنا ہجوم تھا ــ کتنی دھکم پیل کے ساتھ گاڑی میں گھس رہے تھے۔ اور سیٹ لینے کے لئے ایک دوسرے پر گر رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے، ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے جو اندر داخل ہو گئے تھے ان کی سر توڑ کوشش تھی کہ اب کوئی اندر نہ آئے۔ جو باہر رہ گئے تھے وہ سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں۔ اندر داخل

ہو جانے والوں نے کتنی پھرتی سے ڈبے
کے دروازے بند کئے تھے اور بعد میں
آنے والوں نے کتنے زور کے ساتھ دروازے
کھلوائے تھے اور سامنے آنے والوں کو دھکے
دیتے ہوئے، بستروں اور بکسوں کو پھلانگتے
ہوئے نشست کی تلاش میں بڑھتے چلے جا رہے
تھے کتنی دھینگا مشتی کے بعد کبھی بیٹھنے کی
اور کبھی محض کھڑا ہونے کی جگہ میسر آئی۔
پھر جب گاڑی چلی تو ہم سوار ہو جانے والوں
نے اپنے آپ کو کتنا خوش نصیب اور پیچھے
رہ جانے والوں کو کتنا بد نصیب جانا تھا۔
پھر یکایک پیچھے رہ جانے والوں کے لئے
ہمارے یہاں کتنی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا
تھا چلتی ہوئی گاڑی کے ساتھ دوڑتے
دوڑتے اگر کوئی ہینڈل پکڑ کے لٹک گیا تو
کسی نہ کسی نے جلدی سے اس کے لئے دروازہ
کھولا اور اسے اندر آنے کی راہ دے دی
پھر چلتی ہوئی گاڑی سے ہم نے یک گونہ اطمینان
کے ساتھ اپنی اپنی کھڑکی سے باہر جھانک
کے دیکھا پلیٹ فارم پر کھڑے رہ جانے
والے مسافر کتنے بے آسرا اور کتنے قابلِ رحم
نظر آ رہے تھے۔

اب پہیہ اُلٹا گھومنے لگا تھا۔ اس
گاڑی کے مسافر ہونے کی بنا پر ہم اپنے
آپ کو کتنا بے آسرا کتنا قابلِ رحم سمجھ رہے
— اور وہ جو اس گاڑی
میں سوار نہ ہو سکے؟ اچھے رہے وہ لوگ
جو اس گاڑی میں سوار ہوتے ہوتے رہ
گئے۔

"میری سیٹ تو جہاز میں بُک تھی" بریف کیس
والا بولا" لیکن پروگرام میں تبدیلی کی وجہ سے
مجھے اپنی سیٹ CANCEL کرانی
پڑی۔ اس کے بعد کسی فلائٹ میں کوئی سیٹ
نہیں ملی۔ سوچا کر ٹرین پکڑی جائے۔ تیزگام
سُپر کسی میں سیٹ نہیں ملی۔ آخر کو پسنجر
میں بیٹھنا پڑا۔"

ایک دفعہ پھر مسافر تیزی کے ساتھ اندر
آئے اور اپنی اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گئے۔
اصل میں ابھی انجن نے سیٹی دی تھی۔
"گاڑی اب چلنے لگی ہے" کہنے والے
کے لہجہ میں دبی دبی خوشی کا رنگ شامل تھا۔
"واقعی؟"
"ہاں بس چلنے والی ہے۔ انجن نے سیٹی
دے دی ہے۔"
"اللہ تیرا شکر ہے۔"
کمسن لڑکے نے باہر جھانک کر دیکھا —
"امی دیکھو"
"کیوں، کیا بات ہے؟"
"دھواں" اس نے انگلی سے اشارہ
کرتے ہوئے کہا۔

امی نے باہر جھانک کر دیکھا۔ میں نے
بھی باہر جھانکا۔ واقعی انجن نے اچانک
کتنے زور شور سے دھواں اگلنا شروع کر دیا
تھا۔ سیٹی ہی سے نہیں اس دھوئیں سے
بھی شاید مسافروں نے یہ اشارہ لیا تھا کہ
بس اب گاڑی چل پڑے گی۔ انجن کے منہ
سے ایسا کالا دھواں نکل رہا تھا کہ لگتا تھا کہ
کوئی دیر جاتی ہے کہ سارا جنگل کالا ہو جائے
گا۔ چلتی گاڑی کا انجن جب دھواں اُگلتا ہے
تو اس کی بات اور ہوتی ہے فضا میں کلونس
کی ایک لکیر کھنچتی اور مٹتی چلی جاتی ہے مگر
جب کھڑا ہوا انجن دھواں اگلتا ہے تو
فضا کی پاکیزگی کے لئے خطرہ بن جاتا ہے
انجن نے دھواں اُگلتے اُگلتے ایک دفعہ
پھر سیٹی دی اتنی تیز کہ پورے جنگل میں گونج
گئی جنگل میں بھی اور ہم مسافروں کے
دلوں میں۔ دل جیسے سیٹی کی آواز سے
گرما گئے ہوں —— وہ جو ایک بیزاری
چھائی ہوئی تھی وہ کافور ہو گئی — ہم سب
ہی مستعد اپنی نشست پہ بیٹھ گئے لگ
رہا تھا کہ گاڑی بس حرکت میں آنے والی
ہے۔

بیٹھے رہے، بیٹھے رہے، پہیوں نے
بالکل پہلے کی طرح ہلکی سی جنبش ضرور کی تھی اور
اس سے ایک تکلیف بھری آواز بھی پیدا ہوئی تھی
جیسے پہیوں کو گردش کرنے میں تکلیف
ہو رہی ہو۔ مگر پھر وہی سکتہ — اور اب تو
دھوئیں کا زور بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ کالے
سے بھورا ہوا اور پھر بالکل معدوم ہو گیا۔
جب گاڑی کسی طور حرکت میں نہ آئی
تو پھر وہی بیزاری — بڑے میاں نے بددل
ہو کر پھر اخبار اٹھایا اور پڑھی ہوئی خبروں
کو پھر پڑھنا شروع کر دیا۔ سامنے بیزار گود میں
بچہ پھر کلبلایا۔ اس نے اس مرتبہ اتنی

بیزاری اور لاپرواہی سے ٹھیکں اوپر اٹھائی کہ دم بھر کے لئے ٹوپ پیٹ سے اوپر کا ہرا بھرا منظر بھی نمایاں ہو گیا۔

"گاڑی آج نہیں چلے گی" کسی نے بیزار ہو کر کہا۔

"امی گاڑی نہیں چلے گی؟" کمسن لڑکے نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"چلے گی بیٹے"

"کب چلے گی؟"

"بس تھوڑی دیر میں چلے گی"

کمسن لڑکے نے بے اعتیاری سے ماں کا جواب سنا اور پھر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

"شام ہو رہی ہے" ایک مسافر نے باہر سے جھانکتے ہوئے کہا۔

ہاں واقعی ــ وہ وسیع و عریض میدان اور کھیت جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک دھوپ میں چمک رہے تھے اب چھاؤں میں آچکے تھے اور چھاؤں پھیلنے کے ساتھ ساتھ جیسے اداسی پھیلتی جا رہی ہو۔

"رات کہیں اسی جنگل میں نہ گذارنی پڑ جائے"

"اس جنگل کا راستہ تو دن میں بھی محفوظ نہیں۔ رات گذارنی پڑی تو ..." وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ مگر اس کے تشویش بھرے لہجہ نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

بڑے میاں نے اخبار سے نظریں اٹھا کر کہنے والی کی صورت دیکھی۔ پھر اخبار ایک طرف ڈال کر منہ ہی منہ میں کوئی آیت پڑھی لا الٰہ انت سبحانک ..... چپ ہوئے پھر انہوں نے بلا تعلق طرف سے منہ پھیر کر مجھے اپنے خطاب کے لئے چُنا۔

"بیٹے تم کہاں جا رہے ہو؟"

"یہ سوال بے محل ہے"

انہوں نے غور سے میری صورت دیکھی

"بے محل کیسے ہے"

"ہم میں سے کسے کہاں جانا ہے۔ یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہاں سے کب نکل رہے ہیں"

اور نکل بھی رہے ہیں یا نہیں؟ کسی قریب بیٹھے ہوئے نے ٹکڑا لگایا۔

اسی گھڑی گارڈ اپنی سفید وردی میں گذرتا نظر آیا۔ ایک مسافر اسے دیکھ کر پھرتی سے اٹھا اور گاڑی سے اتر گیا۔ تھوڑی دیر دیر بعد واپس آگیا۔ سب نے اسے متجسس نظروں سے دیکھا۔

"یہ گارڈ تھا؟"

"ہاں"

"کیا کہتا ہے۔ گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟"

"آگے گڑبڑ ہے"

"میرا خیال ہے" بریف کیس والا بولا۔ "آگے کوئی ACCIDENT ہوا ہے۔ نہیں تو گاڑی اتنی دیر تک نہیں رک سکتی تھی"

"ہوا تو نہیں ہے۔ ہو جاتا"

"اچھا؟"

"ہاں ــ اور اسی گاڑی کے ساتھ ہو جاتا۔ وہ تو بروقت پتہ چل گیا"

"اچھا؟ کیا بات تھی؟"

"آگے پٹڑی اکھڑی ہوئی ہے"

"پھر تو بچ گئے"

"ہاں یہاں سے نکل جائیں پھر جانیں"

ہاں واقعی میں نے سوچا، پہلے یہاں سے تو نکلیں۔ اور اس کے ساتھ مجھے پھر اس گھڑی کا خیال آیا جب ہم اس گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے لوگ کس طرح ایک احساسِ تحفظ کے ساتھ ان پر ترس کھا رہے تھے جو پیچھے رہ گئے تھے۔ اب وہ ہم پر ترس کھائیں گے۔ خوش نصیبی اور بدنصیبی کا کتنی جلدی آپس میں تبادلہ ہو گیا۔ صبح کے خوش نصیب شام ہوتے ہوتے بدنصیب بن چکے ہیں۔ اچھے رہے وہ لوگ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے اور ایک وقت بدقسمتی سے گذر کر خوش قسمت بن گئے...

اور ہم..... ہاں اور ہم، میں نے ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ شام کی چھاؤں باہر سے رینگ رینگ کر اندر آگئی تھی۔ ساتھ میں اداسی بھی جو شام کی چھاؤں کی ہمزاد ہے۔ ڈبے میں ابھی بتیاں نہیں جلی تھیں۔ اپنی اپنی نشست پر چپ چاپ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے سب لوگ سائے دکھائی پڑ رہے تھے۔

مسعود اشعر

خوابوں کے زندانی

WHAT HAPPENS TO A DREAM DEFERRED?

LONGSTON HUGHES

ان لوگوں میں سے جو گردنیں جھکائے، سر نیچے اور آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے، ایک شخص نے آہستہ سے جیب میں ہاتھ ڈالا، ایک کاغذ نکالا اور کچھ پڑھنا شروع کیا، جوں جوں اس کی آواز تیز ہوتی جاتی ارد گرد بیٹھے لوگوں کی گردنیں سیدھی اور سر اونچے ہوتے جاتے۔ ان کی آنکھوں میں روشنی سی دمکتی اور ناک سے دھونکنی کی طرح سانس لینے کی آواز آنے لگتی۔

آواز تھمتی، کاغذ بند ہوتا اور سارے سر نیچے ہوتے اور گردنیں جھک جاتیں۔ اب صرف ہانپنے کی آواز رہ جاتی۔ اگر اسے آواز کہا جا سکے۔

ایک بار کاغذ نکلا، آواز اونچی ہوئی۔ گردنیں سیدھی ہوئیں، سر بلند ہوئے۔ آنکھوں سے روشنی پھوٹی اور ناک سے دھونکنی کی طرح سانسوں کی آواز آنے لگی ـــــ کاغذ بند ہوا، سر نیچے ہوئے، گردنیں جھکیں اور صرف ہانپنے کی آواز رہ گئی۔

پھر ایک سرسراہٹ سی ہوئی۔ ایک اور جیب سے کاغذ نکلا۔ آواز تیز ہوئی، روشنیاں پھوٹیں، گردنوں کا خم دور ہوا۔ سروں کو بلندی ملی اور پھر دھونکنیاں چلنے لگیں۔

اب پھر صرف ہانپنے کی آواز

گردنیں سیدھی کئے اور سر اُٹھائے وہ تھک گئے تھے؛ ؛

"بہت دیر ہو گئی"

"ہاں۔ بہت دیر ہو گئی"

"مگر تم اس وقت کہاں تھے؟"

"تم کہاں تھے اُس وقت؟"

"میں ــــ؟"

کالی رات کے اندھے کنوئیں سے نکلنے والی سیاہ چیخ نے ان سب کے دلوں کو ایک ہی تار میں پرو دیا تھا۔ اور وہ سب جو اپنے آپ کو ایک ہجوم، ایک بھیڑ سمجھتے تھے۔ اپنے خالص ذاتی "آج" کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لئے تنہا رہ گئے تھے۔

اب ایک سر اٹھا، گردن تھوڑی سی سیدھی ہوئی اور رشک و غبطہ کی آگ سے دہکتی نظریں سامنے بیٹھے آدمی کی آنکھوں میں اتر گئیں۔

جس لمحے یہ سر اوپر اٹھ رہا تھا اور یہ گردن سیدھی ہو رہی تھی۔ اسی لمحے سامنے بھی بیٹھے سے اٹھنے والا طوفان آنکھوں کی طرف زور مار رہا تھا اور جس ثانیے میں ایک نظر والا کا شک، کوندا بن کر دوسری آنکھوں میں اتر رہا تھا، اسی ثانیے میں دوسری آنکھوں سے بھی شک کا کوندا دوسری جانب لپک رہا تھا۔

طوفان جکڑ دائرے میں گھومنے لگے تھے۔ اور تیز و تند بگولے نے ریت کے ذرّوں اور کاغذ کے پرزوں کے ساتھ روشن آنکھوں اور تاریک دلوں کو بھی ایک ہی چکر میں گھیر لیا تھا۔

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے"

"ہاں . . . ."

"ہم نے بہت دیر کر دی"

"بکواس بند کرو"

وہ شکاریوں کے گھیرے میں پھنسے چیتے کی طرح چند قدم پیچھے ہٹا اور آسمان کی طرف دیکھا۔ آگ میں تپتا تانبے کا تھال سر پر تنا ہوا تھا اور زمین گرم گرم بھوبل میں نہا رہی تھی۔ بسوں، کاروں، رکشاؤں اور موٹر سائیکلوں کے شور نے تنہائی اور ویرانی کو اور بھی گہرا سیاہ کر دیا تھا۔

اس روز صبح کا سورج کسی بہت پرانے فرش اور بوسیدہ سورج کی بازگشت معلوم ہوتا تھا۔

"اپنے خالص ذاتی آج کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔"

"آج کا مسئلہ"

اس نے میز کے گرد بیٹھے لوگوں کے چہرے ایک ایک کر کے دیکھے اور بیرے کو چائے کے لئے آواز دی۔

"تم کہاں تھے؟"

"کون؟"

"تم ۔ اور کون ــــ"

اس نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ وہ اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔ یہ شخص اس سے کیوں بات کر رہا ہے؟ اور ایسی ذاتی سی بات۔ اس نے سوچا وہ اس کا جواب دے۔ لیکن پھر سوچا کہ غصے میں ایسی ویسی بات منہ سے نکل گئی تو کیا فائدہ۔

"تم نے کچھ کہا ــــ؟"

شاید اس کے منہ سے کوئی آواز نکلی تھی جسے خود اس نے نہیں سنا تھا۔ مگر سامنے بیٹھے اس شخص نے سن لیا تھا جو اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے غصے میں گھور کر اس شخص کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔

اب وہ شخص مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ نظریں اس کی میز پر تھیں، مگر وہ مسکرا رہا تھا۔

"اُلّو ــــ" اس نے اپنے منہ میں کہا۔

"کیا کہا تم نے؟"

شاید لفظ اس کے کانوں تک نہیں پہنچے تھے صرف آواز پہنچی تھی کہ اپنے سوال کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اس شخص نے اپنی نظریں پھر میز پر گاڑ دی تھیں اور ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ پھر آگئی تھی۔

"کمبخت زہریلا آدمی"

اور وہ اُٹھ کر غسل خانے میں گھس گیا۔

نل سے آنے والا پانی ابھی ٹھنڈا تھا یا وہاں کی جلتی ہتھیلیوں اور تپتی آنکھوں کو ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا چُلّو بنایا ــــ اس میں پانی بھرا اور دونوں آنکھیں اس میں ڈبو دیں۔

اسے سکون ملا۔ مگر تھوڑی دیر کے لئے۔

جیسے ہی وہ چُلّو میں پانی بھر کر آنکھیں وہاں تک لے جاتا اور ٹھنڈے پانی کو اپنے گرم پپوٹوں پر محسوس کرنے کی کوشش کرتا، چُلّو خالی ہو جاتا۔

چُلّو اتنی جلدی خالی ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنی خالی ہتھیلیوں کو مایوسی کے ساتھ دیکھا۔ ہاتھ کی لکیریں اب زیادہ صاف ہو کر سامنے آگئی تھیں اسے جھرجھری سی آگئی اور وہ جلدی سے غسل خانے سے باہر آگیا۔

لوگ چائے کا آخری گھونٹ لے رہے تھے انہوں نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ کوئی اور شخص تھا اور کسی دوسرے آدمی سے بات کر رہا تھا۔

"ہاں۔ بس ایسا ہی ہے" ــــ یہ دوسرے آدمی کا جواب تھا۔

یہ بہتر جواب ہے۔ وہ دل ہی دل میں ہنسا یہی جواب ہونا چاہئیے ہر بات کا۔ آج کا سب سے بڑا جواب یہی ہے۔

"سب سے بڑا سوال یہی ہے"

وہ اس سے پہلے کی بات نہیں سن سکا تھا۔ البتہ اسے یہ یقین تھا کہ یہ بات اس سے نہیں کہی گئی۔ یہ کسی اور سے کہی گئی تھی مگر کسی اور سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

"یار ۔ چائے بہت خراب ہے"

"یہ ہمیں لوٹ رہے ہیں"

"ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں"

"ہاں ــــ وہ جانتے ہیں کہ ہم اور کہیں نہیں جا سکتے"

"عوام خود کہیں کے"

"اچھی بات کہی"

"جی ــــ!"

"ہاں۔ ہم اور کہاں جا سکتے ہیں"

"مگر یار ۔ ہمیں کچھ سوچنا تو چاہئیے ــــ"

"کیا سوچنا چاہئیے"

اب سب ساکت ہو گئے تھے۔ اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں چور تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر شخص چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے یہ بات اس کے منہ سے نکلی ہو۔

"یہاں سے چلو سب مجھے ڈر لگ رہا ہے"

"کہاں چلیں؟"

"یہی تو میں کہہ رہا تھا" اس شخص نے جواب تک صرف مسکرا رہا تھا۔ ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

"یار تم خاموش نہیں رہ سکتے"

"میں تو تھک گیا یار" ایک اور شخص نے جو اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ اور پیچھے سر لٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"ایک رات میں ہم نے کتنا لمبا سفر طے کر لیا ہے"

مگر اس شخص نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ اسی طرح سر پیچھے کئے پڑا رہا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا

"ہم نے بہت دیر کر دی"

"مگر تم تھے کہاں؟"

اس نے تلملا کر پیچھے دیکھا۔ اور اسے جو اس کے ساتھ چل رہا تھا ایک موٹی سی گندی گالی دینے کی کوشش کی مگر وہ کسی اور سے یہ سوال کر رہا تھا۔

"جی۔ میں آپ کو نہیں جانتا" اس راہگیر نے کہا۔

"جانتا تو میں بھی نہیں آپ کو مگر . . . . "

"مگر کیا . . . . ؟"

اب اس نے جلدی جلدی قدم بڑھائے۔ وہ اس جھگڑے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اور پھر اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ یہی سوال اس سے بھی کر دیا جائے گا۔ اور پھر ایک اجنبی۔ ایک اور اجنبی اس سے یہ یہ سوال کرے گا۔

"ہاں۔ واقعی تم تھے کہاں؟"

یہ سوال براہِ راست تھا۔

"مگر تم کہاں تھے؟"

"میں کہاں تھا؟" یار کیوں مذاق کرتے ہو"

"پھر تم نے ایسی بات کیوں کی۔ میرے ذاتی معاملات میں کسی کو دخل دینے کا کیا اختیار ہے"

"ذاتی معاملات ——؟"

وہ شخص ہنسا اور ہنستا ہی رہا جب تک خود اسے اپنی ہنسی پر غصہ نہیں آگیا۔

"تم سب بکواس کرتے ہو" . . .

اب اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔

اسی رات ان سب نے اپنے سارے خوابوں کو جمع کیا تھا اور ان کی ایک اونچی دیوار بنائی تھی ایک مضبوط فصیل، ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ اور سوچا تھا کہ خوابوں پر تو کسی کو اختیار نہیں ہے۔ اس چٹان کو تو کوئی طاقت پیچھے نہیں دھکیل سکتی اور پھر اسی مضبوط فصیل والے قلعہ کے اندر وہ خواب بھی تو محفوظ ہے جسے ہم آج تک ملتوی کرتے آئے ہیں۔

"تم ملتوی کرتے آئے ہیں؟"

اسے پھر ہنسی آگئی۔

"مگر دو اور دو تو چار ہی ہوتے ہیں نا؟"

وہ شخص اس طرح ہنس رہا تھا۔ آنکھوں میں پانی بھر آئے۔

اس رات کالی اندھیاری رات کے گہرے ہونے سے پہلے اُن سب نے ستاروں سے شگون لیا تھا۔ پھر اپنے دلوں کو ٹٹولا تھا۔ اور اپنے آپ سے کہا تھا کہ دل تو اوروں کے پاس بھی ہوتا ہے۔ اور پھر اطمینان سے سو گئے تھے

"دل تو سب کے پاس ہوتا ہے نا؟"

اسی رات یہ سوال اس نے پروین سلطانہ سے کیا تھا۔ مگر وہ رجنی کلیان گانے میں مگن تھی۔

پیارے موہن آؤ۔ آؤ۔

جھوم جھوم کر ان سب کی گردنیں جھک گئی تھیں، سر بوجھل ہو گئے تھے۔ مگر رجنی کلیان ختم نہیں ہوتا تھا۔ ریکارڈ پلیئر پر ساؤنڈ باکس کی سوئی اوپر اٹھتی اور پھر ابتدا سے راگ شروع ہو جاتا۔

پیارے موہن آؤ آؤ

پھر گنگا نیر جی نے درباری کا ترانہ شروع کر دیا۔

یار من بیا بیا —— یارِ من بیا

پیارے موہن آؤ

یارِ من بیا

ان کے خواب کن کن زبانوں سے ادا ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ان خوابوں کا انبار لگ رہا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے انہیں سمیٹ سمیٹ کر اپنے سینے کے ساتھ لگاتے جا رہے تھے۔

بہ لبم رسید جانم تو بیا کہ زندہ مانم

ہاں —— تو بیا کہ زندہ مانم

پیارے موہن آؤ آؤ . . . . . .

نینوں کی جنا میں نہاؤ

"یار دل تو سب کے پاس ہوتا ہے"

"ہاں ۔ ہونا تو چاہیے"

پھر ان میں سے ایک نے شیشے کا ایش ٹرے اٹھائی اور اپنے سامنے بیٹھے آدمی کے سر کا نشانہ بنایا۔

"تم اس وقت . . . . ۱۹۱"

"تم بکواس کرتے ہو"

"تم ——"

"تم ——"

"تم —— دم ہلاتے فاصلے۔ ہمیشہ ہر

وقت دم ہلانے والے ۔ کھلنے ——"

اور اس کے ساتھ ہی شیشے کی ایش ٹرے سامنے رکھی شیشے کی ٹاپ والی میز پر ایک دھماکے کے ساتھ گری۔ اور وہ سب بیدار ہو کر بیٹھ گئے

اب بلقیس خانم کی باری تھی۔

انوکھا لاڈلا ۔ کھیلن کو مانگے چاند

مگر اس میں انوکھی بات کونسی ہے!! انوکھا لاڈلا کھیلنے کو چاند ہی مانگتا ہے۔ وہ ہمیشہ چاند کی طرف ہمکتا ہے۔ کلکاریاں بھرتا ہوا بے چین ہو جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں اٹھا کر اچھلتا ہے۔ اسے پکڑنے کو قریب محسوس کر کے کھلکھلاتا ہے۔ پھر وہ ذرا پا کر سوتا ہے۔ چاند کو قریب لانے کے لئے پانی بھرے طشت کی ضرورت ہوتی ہے۔

مگر وہ تو طشت ہی اٹھا لیتے ہیں۔ اس کے پاس سے ان سب کے پاس سے۔ اور ایک چھناکے کے ساتھ شیشہ توڑ دیتے ہیں

"پس از ان کہ من نمانم ـــ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔

"جی ـــ ؟؟"

"تو پھر کار تو اہی اللہ ۔ ؟"

"کیا کہا تم نے ؟"

"یار۔ دیر ہو گئی"

"بہت دیر ہو گئی"

"مگر تم ..... ؟"

وہ لوگ جو ایک دائرے میں بیٹھے اپنے کاغذ اپنے آپ کو سنا رہے تھے۔ اب آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ ان کی سانسوں کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئی تھیں اور ان کے ہاتھوں کی کھلی ہتھیلیاں فرش پر بچھی تھیں۔

اس خواب کا کیا بنا جو ملتوی کر دیا گیا!!

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کالی رات کے اندھے کنویں سے نکلنے والی سیاہ چیخ نے ان سب کے دلوں کو ایک ہی بلیک تار میں پرو دیا تھا۔ اور وہ سب جو اپنے آپ کو ایک ہجوم ایک مجمع سمجھتے تھے۔ اپنے خالص ذاتی آنچ کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لئے تنہا رہ گئے تھے۔

اس خواب کا کیا بنا!

کیا وہ نازک کشمش کی طرح

دھوپ میں سوکھ گیا؟

یا وہ پھوڑے کی طرح پکا۔

اور کھرنڈ بن کر اُدھڑ گیا؟

"کیا وہ سڑے ہوئے گوشت کی طرح بُو دے گیا؟

یا میٹھے شربت کی سطح پر

شکر کی تہہ بن کر جم گیا؟

ممکن ہے بھاری بوجھ کی طرح پانی کی تہہ

میں بیٹھ گیا ہو۔

یا پھر ـــ وہ دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا!

زمان کنجاہی

ممتاز کنول

اگست ۱۹۹۰ء

احمد داؤد
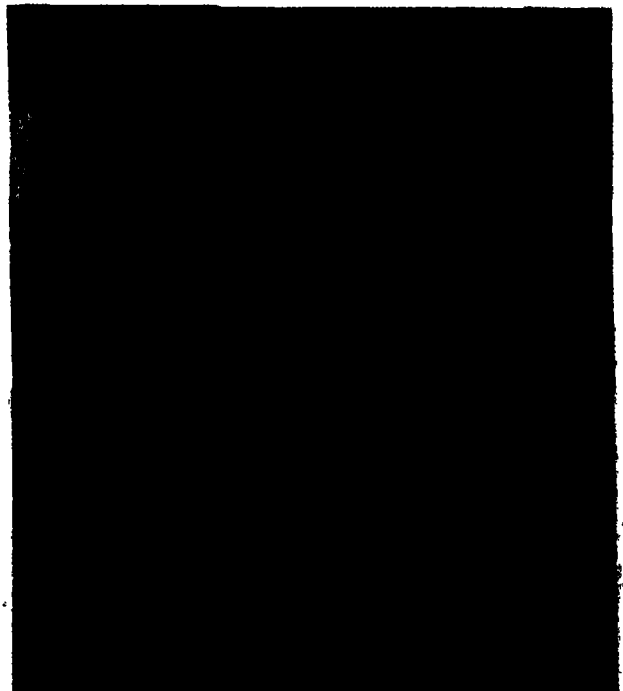
گم شدہ مسافروں کی گاڑی

کا انکے کسی وقت بھی اسٹیشن پر پہنچ سکتی ہے۔ تب مسافروں کا ہجوم منتظر لوگوں کی آنکھوں کو تسکین بخشے گا۔

منتظر آنکھیں سلاخوں سے باہر پھیل بے ترتیب چھتوں کو ٹٹولتی ہیں۔ اندھیری رات میں دودھیا دھواں تیز سیٹی اور کتوں کی پکار آنے والے مسافروں کا ہراول دستہ ہے۔

منتظر آنکھیں سلاخوں کی قیدی ہیں اور کھلی کھڑکی سے آتی ہوا انہیں سہلاتی ہے۔ امید بندھاتی ہے، گلیاں سنسان، چوروں سے بے نیاز کر چند زمانے بیتے قرونِ وسطیٰ کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے ہیں اب چوروں کا دور نہیں رگھر خالی ہیں دلوں کی طرح، اجاڑ کارنس اور لفظوں کی تاثیر سے بے نیاز کتابوں کی طرح۔ صرف انتظار کرتی آنکھیں ہیں جو اسٹیشن پر آنے والی گاڑیوں کی راہ میں پھیلی ہیں۔

وہ آنے والے مسافروں کا منتظر ہے۔

بدوضع بڑے بڑے بکسے اٹھائے چیکٹ والے، ریکھے بالوں میں گرد پھنسائے ڈبوں میں چلم پیتے، نسوار کھاتے مسافر — سوٹ میں ملبوس شہری، خوبصورت بریف کیس اٹھائے کلائی سے بندھی نفیس گھڑی سے وقت دیکھتے بے وقتے مسافر، ٹائی کی شکن درست کرتے ہوئے بالو نیند میں مندھی آنکھیں اور تھکے جسم والی عورتیں جگراتے سے چوز بچیاں ملاپ اور جدائی کے کردار آنے والے مسافر ہیں، جن کی راہ میں بچہ کھڑکی سے لگا ——، سلاخوں سے پرے دیکھ رہا ہے۔

وہ سب اس کے پُراسرار شہر کے باسی ہیں —!

اسٹیشن کافی دور ہے صرف اس کی نحیف بتیاں کسی بچھڑے ہوئے انجن کی چھک چھک یا کبھی کبھی سودا بیچنے والی کی آواز رات سیاہ گلیشیئر سے نمودار ہوتی ہے۔ تب منتظر آنکھوں کے سامنے جگنو چمکتے ہیں وہ انہیں پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے اور آگے سلاخیں ہیں، جن سے باہر اس کی کھلی ہتھیلیوں کے کناروں سے رات پھسل پھسل جاتی ہے۔

سنسان گلی میں ہوا کا ایک بھولا بھٹکا پھیرا آیا ہے، وہ آنے والے مسافروں سے توجہ ہٹا کر گلی میں جھانکتا ہے، دن بھر بچوں کے قدموں تلے رُوندھی گلی سسکیاں بھر رہی ہے چاروں طرف کباڑ بکھرے پڑے تھے پھٹا ہوا فٹ بال ٹوٹی ہاکیاں کانچ کی گولیاں پٹولے پلاسٹک کے ٹوٹے برتن اور اخبار کے تازہ ضمیمے ہوا کی رسی سے بندھے گلی میں کھڑکھڑاتے ہیں وہ ان کے دائرے میں جھومر ڈالتا، ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا ہے۔ سلاخوں سے جکڑی آنکھیں، ان باغوں کی تلاش میں ہیں جہاں اس کا بچپن گذرا —،

"کھلے میدان اور باغوں کے درخت کہاں گئے —؟ کس نے سوال کیا؟"

میدانوں میں پلازہ اور مارکیٹیں بن گئی ہیں۔
اور درخت فرنیچر کے کام ....؟

"بکومت صحیح جواب دو؟"

یہ تابکاری اثرات کا کیا دھرا ہے۔"

ہوا میں تابکار پھیل رہا ہے کھلی کھڑکی سے باہر نکلے ہاتھ کی کمزور ڈھلوانوں پر زیرو جھول رہا ہے، کسی لمحے بھی دھماکہ ہو سکتا ہے۔ اور مسافروں کو لانے والی گاڑی خالی

آئے گی۔

"سنا ہے کہ نیوٹرون بم سے آدمی ختم ہو جاتا ہے باقی ہر شے سلامت رہتی ہے۔"

"آدمی کے علاوہ باقی شے کیا ہے؟"

"باقی کانچ کی گولیاں پٹرسے، لڑٹی ہاکیاں اخباروں کے ایڈیشن؟"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں بھلا اتنی آسانی سے نیوٹرون کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے؟"

"اچھا ــ کوئی اور بات کرو۔"

اور بات تو آنے والے مسافر ہی کریں گے۔ اپنے گاؤں کی باتیں، گندم کی فصل کیسی رہی؟ دھتو لوہار کی کھوتی نے کس کا کھیت خراب کیا، گاؤں میں کوئی ہیر پیدا ہوئی کہ نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب کبھی کہیں ہیر کا ظہور ہوتا ہے تو ایک وارث شاہ جنم لیتا ہے۔

"ارے یار ــ اب تو ہیر جوانی سے پہلے ہی دفن کر دی جاتی ہے۔ اور وارث شاہ فلم کے گانے لکھتا ہے یا ہوٹلوں پر پکھیاں مار کے چائے بناتا ہے۔"

"واقعی؟"

"ہاں ہاں"

"تیری تو مت ماری گئی ہے کوئی اور بات کر۔"

"کوئی اور بات تو آنے والے مسافر کریں گے۔"

سوٹ میں ملبوس خوبصورت چمکیلے چہرے والے بریف کیس اٹھائے نفیس گفتار سے ٹائم دیکھتے بابو، کے فائلوں کے بوجھ تلے دبے بابو، پروموشن ڈیپوٹیشن کے قیدی پنشن خوردہ بوڑھے ہوتی بچیوں کے بابل، کون بھر کی خبروں سے خوفزدہ مسافر نیند سے موندھی آنکھوں والے بچے، لڑتی جھگڑتی عورتیں اپنے بچپن، اپنے پٹولوں کی باتیں سنائیں گی مگر کب ــ؟ گاڑی کب آئے گی۔

سلاخوں سے باہر پھیلی آنکھیں گاڑی کی تیز سیٹی پر اڈارہ کھاتیں دھوئیں کے نم ستونوں سے بغلگیر ہوتیں پٹڑیوں پر بکھر جاتی ہیں۔

"ارے یار یہ تو مال گاڑی کی سیٹی ہے چلو واپس۔"

آنکھیں واپس سلاخوں کے اندر کمرے میں بیٹھے منتظر بشر کی پیشانی تلے دبک جاتی ہیں۔

"اوہو ــ یہ مال گاڑی سارا مال کہاں لے جاتی ہے آج کل تو لوگ کم سفر کرتے ہیں اور مال زیادہ سفر کرتا ہے۔"

"سمجھو مال باہر ہی تو جاتا ہے تجارت بھی کرنی ہوتی ہے نا دوسرے ملکوں سے۔"

"واپسی پر ڈبے خالی آتے ہیں۔"

"نہیں یار ــ سوئیاں اور جہاز لاتے ہیں۔"

"گندم اور کپاس دے کر۔"

"بالکل ــ یار جمائیاں مت لو یہ سٹیشن ہے تمہارا گھر نہیں۔ پولیس والے شبہ میں دھر لیں گے۔"

"یار گاڑی کب آئے گی میں تو نیند سے چور ہو گیا ہوں۔"

"بس چپ چاپ بیٹھو ــ آجائے گی۔"

سیمنٹ کی کوریج اور اسٹیشن کے پتھریلے میلے فرش سے اٹھتی باتوں کی سیلن بوائلر کی بھاپ کے جلو میں اس تک آتی ہے۔ سلاخوں پر زنگ لگاتی ہے، وہ ہاتھ اندر کر کے ٹھنڈی کلائی کو سہلاتا ہے اور بڑبڑاتا ہے ــ لوگ یہ لوگ آہستہ آہستہ دبی زبان میں گفتگو کیوں نہیں کرتے ان کی باتوں کے شور سے آنے والے مسافر تنگ ہوں گے۔

اس نے گہری سانس لے کر اسٹیشن کی طرف گھورا۔

"یار گاڑی کب آئے گی؟"

"تمہارے کسی مہمان نے آنا ہے؟"

"مہمان سے بھی زیادہ۔ ماں اور بھابی آرہی ہیں۔ مگر تم؟"

"میرے بھی اپنے آرہے ہیں، مسافر سارے ہی اپنے ہوتے ہیں، ارے ساڑھے چار بج گئے چلو بابو سے پتہ کرتے ہیں گاڑی کا۔"

سلاخوں کے باہر پھیلی بے ترتیب آنکھیں دور پرے اسٹیشن کی بتیاں اور نیچے گلی میں ردی چیزوں کی بکھری ڈھیریاں نالیوں کے کنارے پڑی گندگی اور سحری کا ابھرتا ستارہ آنے والے مسافروں کا ہراول دستہ ہے، منڈیوں کی منڈیلد کے مزدور، ریڑھیوں اور دودھ والوں کی آوازیں اذان کی صدا اور کسی پرندے کی چہکار آنے والے وقت کا آئینہ ہیں۔

"اُف اللہ کتنی خاموشی ہے"
گاڑی جانے کے بعد اسٹیشن قبرستان کی
طرح خاموش ہو جاتا ہے۔
"لیکن گاڑی تو ابھی آئی ہی نہیں۔ بابو کیا کہتا
ہے"
"اسے خود پتہ نہیں اس کا اپنا بیٹا آ رہا
ہے"
"گاڑی تو کئی گھنٹے لیٹ ہے"
"مگر اب تو صبح ہو رہی ہے۔ انتظار کریں
یا چلیں"
"انتظار — میں تو کئی دن سے آ رہا
ہوں"
"کیا مطلب —؟"
"ہاں"
"میں خود۔ کئی دن — کئی رات — یار
کہیں ہم —؟"
"چپ رہو کل پھر آ جائیں گے"
سلاخوں سے باہر پھیلی چھتوں پر بے اثر زخمی
سحر کی دھیمی سرخی پر پھیلاتی ہے پرندوں کے
واویلے اور جاگتے شہر کے طشت پر لوگوں کی حرکتوں
کا شور، گلیاں آباد ہونے لگی ہیں آواز کا ریوڑ اس
کی جانب بڑھتا ہے۔ اسٹیشن پر گاڑی کھڑی
ہے اندر سے سامان باہر پھینکا جا رہا ہے بکسے
حقے جوتیاں ڈائجسٹ بستر بند اور پانی کی خالی
صراحیاں مگر پانی پینے والے کہاں ہیں؟
"پانی" پینے والے کہاں ہیں؟"
"یار سنا ہے کہ نیوٹرون کے استعمال سے آدمی
ختم ہو جاتا ہے باقی ہر شے سلامت!"
وہ سلاخوں کے خلا سے بانہیں نکال کر ہتھیلیاں
پھیلاتا ہے، منتظر آنکھیں کھلے بازو اور فریادی
ہتھیلیاں مسافروں کی تلاش میں ہیں۔

●

اسرار طارق

علی اکبر عباس

اسرار طارق

اکتارا

اِکتارا میرے ہاتھ میں تھا۔

سامنے چٹیل میدان کے دوسرے سرے پر ریت کے ٹیلوں سے دور ناریل کے دو متوازی درخت ساکت اور محوِ حیرت کھڑے ہوئے تھے سب کچھ اداس تھا۔ سارے میں مایوسی کا ایک لہر پھیلی ہوئی تھی اور اکتارا میرے ہاتھ میں تھا۔

رجمنٹ آج ایک سال کے بعد جزیرے سے واپس لوٹ رہی تھی۔ جوانوں کا سامان بندھا جا چکا تھا اور لکڑی کے مضبوط تختوں کی بنی ہوئی لمبی، کئی دروازوں اور چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والی بیرک میں جگہ جگہ رول کئے ہوئے بستر اور سیاہ ٹرنک بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ سگریٹوں کے خالی پیکٹ، پرانے اخبار اور خالی ڈبے اِدھر اُدھر لڑھک رہے تھے۔ دیواروں میں جوانوں کی لگائی ہوئی فلم ایکٹرسوں کی تصویریں، کیلنڈر اور انگریزی میگزینوں سے نکالے ہوئے مناظر کے صفحات ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ جوانوں کے بھاری بوٹوں کے نیچے بیرک کے کہنہ تختے چرچرا رہے تھے جو [illegible] کا انتظار کرتے ہوئے بے مقصد اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کچھ جزیرے کے ایک سال پرانے ملاقاتیوں اور دوستوں کو الوداع کہنے گئے تھے ایک سال کی رفاقت کے بعد ہمیشہ کی جدائی نے سب ہی کو ملول کر دیا تھا۔

میری پیکنگ ہو چکی تھی۔ میں سارا منظر دیکھتے ہوئے عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ میرے سامنے حدِّ نظر تک ریت کے چھوٹے بڑے ٹیلے پھیلے ہوئے تھے جن کے پیچھے خلیج بنگال کی تند تیز بپھری لہریں ساحلِ سمندر پر نرم و سفید جھاگ اُچھال رہی تھیں اور تیز نم ہوا بیرک کی کھڑکیوں میں سرسرا رہی تھی۔ لیکن ناریل کے متوازی درخت چپ چاپ محوِ حیرت کھڑے ہوئے تھے جن کے قدموں میں چھوٹی چھوٹی بے رنگ سی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور ہم کو چٹاگانگ لے جانے والا اسٹیمر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ بیرک سے صرف اسٹیمر کا اکلوتا جھنڈا نظر آ رہا تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ جس میں صرف چند تالاب، مچھلیاں ہیں ندیاں، ساحل اور چٹائیاں بُننے والی حسین اور کم گو لڑکیاں ہیں، چیخ چیخ کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر تیز تیز باتیں کرنے والی بوڑھی اور ادھیڑ عورتیں ہیں، مڈک اور لانبی بدبودار بیڑیاں پینے والے کمزور زرد رو مرد ہیں اور ننگ دھڑنگ گلیوں میں شور مچانے اور کیچڑ میں کھیلنے والے بچے ہیں جو لکڑیوں اور چٹائیوں کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ مرد صبح سے شام تک مچھلیاں پکڑتے ہیں اور رات کو کیلے یا کٹھل کے ساتھ چاول کھانے کے بعد حقہ، ہیڈ پائپ میں مڈک بھر کر اینٹ یا پتھر کا سرہانا بنا کر زمین پر لیٹ جاتے ہیں اور مڈک کے پھونک مارتے ہوئے سو جاتے ہیں۔ ان کا اس جزیرے کے باہر کی دنیا سے صرف اتنا تعلق ہے کہ اسٹیمر میں آنے والے تاجروں کو مچھلیاں، مرغیاں اور چٹائیاں دے کر اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لیتے ہیں۔ اس جزیرے سے باہر کوئی اور دنیا بھی ہے ان کو اس کا قطعی احساس نہیں ہے ان کی زندگی مچھلیوں اور مڈک تک محدود ہے۔ اس جزیرے سے باہر جانا ان کے نزدیک اپنے پرکھوں کی روح سے بغاوت ہے۔ جوان لڑکیاں تعلیم

ان گھروں میں لگی ہوئی کھڈیوں پر دریاں اور کپڑے بنتی ہیں اور رات میں کھلی ہوا میں نکل کر گاتی ہیں اور بوڑھی عورتیں چبوترے کی سیڑھیاں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو گانوں کے بول اور رقص کے انداز بتاتی رہتی ہیں۔ ان میں سے بعض جوش میں آکر لڑکیوں کے رقص میں شریک ہو جاتی ہیں۔

سب ہی گانے کے بول دہراتے رہتے ہیں:

یہ سمندر جس نے ہمیں جنم دیا
دھرتی جس نے ہمیں دانے دیئے
یہ آزاد ہوائیں جنہوں نے ہمیں صحت
اور حسن دیا

یہ سب ہمارے ہیں
اے سمندر تو ہمیں عزیز ہے
اس لئے کہ تو نے ہمیں جنم دیا
اے خدا ہمارے دلوں کو کبھی ویران نہ
ہونے دینا
ہم کو یقین ہے تو ہمارے دلوں کو بھر دے گا
ہمیں معلوم ہے

نوجوان لڑکیوں کے گیت، سریلی آوازوں کے دوش پر سارے جزیرے میں پھیل جاتے ہیں اور ساری فضا سحر زدہ ہو جاتی ہے۔ نغمہ جسموں میں حرارت اور دلوں میں اُمنگ بھر دیتا ہے۔ زندگی سے بھرپور قہقہے اس طرح سنائی دیتے ہیں جیسے مندر میں بے شمار گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ چاند ایک لمحے کے لئے رک جاتا ہے اور آسمان بے انتہا نیلا اور بہت دور محسوس ہونے لگتا ہے اور ناریل کے متوازی درخت ایک دوسرے پر جھک کر سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔ ان کے قدموں میں اُگی ہوئی بے رنگ جھاڑیاں سیاہی مائل سبز لگنے لگتی ہیں۔ اور اُن میں جنگلی پھولوں کی بے نام مہک بس جاتی ہے۔ ستارے آنکھیں موند کر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینے لگتے ہیں تب مہک کے نشے میں جھومتے ہوئے مرد اپنے اپنے بستروں کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

ہمارا کیمپ سمندر کے کنارے تھا اور شمال کی طرف چھالیہ کے درختوں سے گھرا ہوا لکڑیوں کے تختوں اور چٹائیوں سے بنے ہوئے مکانوں پر مشتمل خوبصورت گاؤں ہے۔ اس گاؤں کے رہنے والے ہمارے کیمپ تک دودھ اور مچھلیاں لاتے ہیں جب گاؤں کے مرد صبح اپنے کاندھوں پر جال اٹھا کر سمندر کی طرف چلے جاتے ہیں تو گاؤں کی سلونی لڑکیاں سروں پر دودھ کے مٹکے لئے ہمارے کیمپ کی طرف آتی ہیں۔ اُن کی نظریں ہمیشہ زمین پر گڑی ہوتی ہیں اور چہرے پر بلا کی سنجیدگی ہوتی ہے۔ وہ بہت کم بولتی ہیں اور بہت زیادہ سہمی اور سمٹی سی رہتی ہیں۔ معمر عورتیں زیادہ تر گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔

اس جزیرے میں بسنے والوں میں توہم پرستی عام ہے ان کی رسمیں عجیب ہیں یہ طوفانوں کو خدا کی ناراضگی تصور کرتے ہیں اور جانوروں اور اناج کو سمندر میں پھینک کر خدا کو بھینٹ دیتے ہیں۔

وبائی امراض کی صورت میں مچھلیاں دھاگے میں گوندھ کر گلے میں پہن لیتے ہیں۔ گیتوں کی دیوی کو رقص و سرود سے مناتے ہیں۔ پورنماشی کی رات کو شادیاں کرتے ہیں اور بہت سے چراغ روشن کر کے جھیل میں تیراتے ہیں اور پھولوں کی پتیاں گہرے پانی میں دور تک پھیلا دیتے ہیں موت کو پوشیدہ رکھتے ہیں مرنے والے کو چپ چاپ رات کے اندھیرے میں سمندر میں بہا دیتے ہیں اور نہ روتے ہیں نہ ایک دوسرے سے مرنے والے کا ذکر کرتے ہیں۔ جب کئی دنوں تک کوئی نظر نہ آئے تو خود ہی اُس کو مردہ تصور کر کے بھول جاتے ہیں اور کسی سے اُس کے بارے میں دریافت نہیں کرتے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ ڈاک آتی ہے اور ایک شکستہ سی عمارت میں سرکاری ہسپتال ہے جس میں نہ ڈاکٹر ہوتا ہے نہ دوائیں۔ یہاں کے لوگ علاج کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اپنے اصولوں، روائتوں اور رسموں پر ہمیشہ سے قائم ہیں اور ان میں کسی طرح کی کمی، تبدیلی یا ردوبدل کو پسند نہیں کرتے۔

مجھے یہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا میں چھالیہ کے درختوں کے بیچ میں گھرے ہوئے گاؤں کی طرف نکل گیا۔ بدبودار کیچڑ اور دھوئیں سے بھری ہوئی گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے آپس میں لڑ رہے تھے

شور مچا رہے تھے یا کھیل رہے تھے۔ مرد
کاندھوں پر جال ڈالے ٹوکریوں میں مچھلیاں
لئے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ عورتیں دن کا
کام ختم کر کے مکانوں کے سائبان یا گلیوں کے
کنارے سورج کی الوداعی کرنوں سے جسم سینک
رہی تھیں۔ گاؤں کی دوسری جانب آخر میں جا کر
چھالیہ کے درختوں کا سلسلہ اچانک ختم ہو گیا
تھا وہاں کے ایک خوشنما مکان کے سائبان میں
میں نے اُسے پہلی بار دیکھا۔ مکان کے دروازے
کی دونوں جانب گہرے سُرخ پھولوں والی بیل چڑھی
ہوئی تھی۔ وہ دروازے میں بیل کی بنی ہوئی
محراب کے درمیان خاموش کھڑی ہوئی تھی۔
چپ چپ، اداس اداس جیسے کسی کا انتظار کر رہی
ہو۔ طویل اور مسلسل انتظار نے جیسے اُسے
تھکا دیا ہو۔ اُس نے خالی خالی نظروں سے مجھے
دیکھا، اس کے چہرے پر پتھر کی مورتی جیسی
بے حسی اور بے تاثیری تھی۔ وہ اپنے سپاٹ
چہرے کو موڑے خالی خالی نظروں سے مجھے
مسلسل دیکھے گئی حتیٰ کہ میں گلی کے موڑ پر
مڑ گیا۔

پورنماشی کی رات کو میں لیٹا ہوا گاؤں کی
اُسی پُراسرار لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا
مجھے میں ہر لحظہ ہی پھولوں والی محراب کے
درمیان ڈوبتے سورج کی نرم خوشگوار دھوپ
میں پتھر کی مورتی کی طرح کھڑی ہوئی دیکھا کرتا تھا
کہ گاؤں سے گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ نیند
آنکھوں سے کوسوں دور تھی، بستر پر کروٹیں
بدلنا عذاب لگ رہا تھا۔ میں گاؤں کی طرف
چل دیا۔ گاؤں کے وسط میں ایک جھیل تھی
جس کے گرد گاؤں کے مرد، عورتیں سب ہی
جمع تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے
چھوٹے الاؤ جل رہے تھے جن سے خوشبو
کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ جھیل میں بے شمار
دیئے تیر رہے تھے اور پانی پر پھول کی
رنگ برنگی پنکھڑیاں ہچکولے لے رہی تھیں۔
جھیل کے اردگرد ٹولیوں میں لڑکیاں رقص کر رہی تھیں
کچھ لڑکیاں ایک جانب بیٹھی مل جل کر گا رہی
تھیں اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے جزیرے
میں رنگ و نور کی بارش ہو رہی ہے ——
گانے والی لڑکیوں میں وہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔
اسی طرح چپ چپ اُداس اُداس، کھوئی کھوئی
سی۔ اس نے سفید ساری پہن رکھی تھی گلے
میں سفید موتیوں کی ایک مالا پڑی ہوئی تھی اور
بائیں کلائی میں ایک پتلی سی چوڑی تھی کانوں میں ایک
سفید پھول اور جوڑے میں کلیوں کا گندھا ہوا
ہار لپٹا ہوا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ وہ نہیں
ہے کوئی آسمانی مخلوق ہے جو چند لمحوں کے
لئے برکتوں کی بارش کرنے گناہگار انسانوں میں
آگئی ہے اور یہ تمام انسان اس کے وجود سے نا آشنا
اس کی برکتیں سمیٹ رہے ہیں۔

گاؤں والوں نے از راہِ مہمان نوازی مجھے
بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا اور بتایا کہ پورنماشی کی
رات وہ اپنی کنواری لڑکیوں کے بیاہ کرتے
ہیں اور جب ایسا کوئی موقعہ نہ ہو تو بھی اس رات
کو وہ خوشیاں مناتے ہیں۔ بہاروں کے
گیت گاتے ہیں۔ یہ رات ان کے لئے خوشیوں
اور برکتوں کی رات ہوتی ہے میرے اردگرد
بیٹھے ہوئے لوگوں سے مچھلی اور تمباکو کی بُو
آ رہی تھی اور سامنے کنواریاں رقص کر رہی
تھیں گا رہی تھیں:

میرے ماہی گیر
نوکا کھیتے جاؤ کھیتے جاؤ
دور سمندر کی اونچی لہروں میں
اپنے کاندھوں پر جال اُٹھائے
جہاں لہریں آکاش سے مل جاتی ہیں
جب سورج سُرخ ہو جائے گا
جب دھوپ سنہری اور خوشگوار
ہو جائے گی
اپنے جال میں چاندی سی مچھلیاں اُٹھائے
تم گھر لوٹو گے
نوکا کھیتے جاؤ

جھیل کے چاروں طرف رقص ہو رہا
تھا۔ ٹولیاں الاؤ کے گرد بھی رقص کر رہی تھیں
لڑکیاں گا رہی تھیں۔ چاندنی اور الاؤ کی روشنی
میں سب کچھ خوابناک سا محسوس ہو رہا تھا۔
اس رات جب رقص ختم ہو گیا تو مجھے معلوم
ہوا کہ اُس لڑکی کا باپ گٹھیا کی وجہ سے چلنے پھرنے
سے معذور ہو گیا ہے۔ دوسری صبح میں بوڑھے
کو دیکھنے گیا ان لوگوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا
استقبال کیا اور خوشبودار کافی پلائی میں نے بڑی
مشکل سے اُسے علاج پر مجبور کیا اور غالباً میری

دل شکنی کے خیال سے اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ میں نے کیمپ کے ڈاکٹر سے اس کے لئے دوائیں حاصل کیں اور خود شام کو اپنے ہاتھوں سے اس کی مالش کرتا اور دوا پلاتا جسے وہ مسکراتا ہوا بے دلی سے پی لیتا۔ اس طرح وہ پُراسرار اور منتظر سی لڑکی میرے قریب تر ہوتی گئی۔

اُس کا نام یوجی تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گاؤں کے آخر میں لکڑی کے تختوں کے مکان کے علاوہ چھالیہ کے بہت سے درخت بھی ان کی ملکیت ہیں۔ اس کا باپ قبیلے کا سردار ہے۔ اس بیماری کے سلسلے میں اب تک انہوں نے کئی من چاول اور سینکڑوں جانور سمندر کی بھینٹ چڑھا دیئے ہیں۔ میں روزانہ شام کو مالش کرنے اور بوڑھے کو دوا پلانے جاتا اور خوشبودار تمباکو والے سگرٹ اُسے دے آتا وہ بہت ہی منکسر المزاج اور نرم گو تھا۔ اُس نے میرے یوجی سے ملنے پر بھی کبھی اعتراض نہ کیا۔ رات میں جب چاند بلند ہو کر ناریل کے درختوں میں اُلجھ جاتا تو ہم اُن درختوں کے قریب چلے جاتے۔ وہاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے۔ ایک دوسرے پر ریت اچھالتے، پھر ریت پر گھروندے بناتے اور توڑ دیتے حتیٰ کہ چاند ناریل کے درختوں پر سے کھسک جاتا اور رات بڑھ جاتی۔

ایک رات ہم ناریل کے متوازی درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کوئی گیت گا رہی تھی اس کے لہجے اور چہرے کے تأثرات سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی غمگین گیت ہے جس میں محبوب کی جدائی کا غم ہے۔ میں نے ناریل کے درختوں پر اپنا اور یوجی کا نام چاقو سے لکھ دیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا یہ کیا لکھا ہے میں نے اُسے بتا دیا وہ اداس ہو گئی۔

"یہاں رانو کا نام لکھ دو"

"رانو کون ہے"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے جس درخت پر یوجی کا نام لکھا تھا اُس پر رانو کا نام لکھ دیا وہ مسکرا دی

"رانو کون ہے" میں نے پھر پوچھا

"میرا منگیتر"

میرے سینے میں کچھ ٹوٹ سا گیا۔

"رانو کہاں رہتا ہے"

اُس نے سمندر کی طرف اشارہ کیا

"میں سمجھا نہیں" میں نے کہا

"رانو سمندر میں ڈوب گیا ہے۔ طوفان آیا تھا" وہ اُداس ہو گئی۔

"اُسے مرے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"دو سال"

"پھر تم نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"میں اُس کا انتظار کر رہی ہوں؟" وہ خاموش ہو گئی اُس کی آنکھوں کی افسردگی سارے ماحول میں پھیل گئی۔

اس رات چاند نہیں طلوع ہوا تھا میری یوجی سے پھر کئی روز تک ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ بھی ناریل کے درختوں کی طرف نہ آئی مجھے شبہ ہوا کہ کہیں یوجی ناراض نہ ہو گئی ہو مجھے اس سے شادی کے بارے میں کچھ نہ کہنا چاہیئے تھا شاید یہ بات اسے پسند نہ آئی ہو اُس نے مجھے ایک دو اس طرح کے واقعات بتائے تھے جن میں لڑکیوں کو اس سلسلے میں جان دے دینی پڑی تھی۔ میں یوجی کے گھر گیا سورج غروب ہو رہا تھا۔ یوجی حسبِ معمول سرخ پھولوں والی محراب کے وسط میں کھڑی رانو کا انتظار کر رہی تھی کہ اُس نے سورج غروب ہونے سے قبل گھر لوٹنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس کے چہرے پر سورج کی الوداعی کرنوں اور سرخ پھولوں نے شفق کی سُرخی مل دی تھی۔ یوجی کی ماں کے چاندی کے تاروں جیسے سفید بال چمک رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ جب میں بوڑھے سے مزاج پرسی کے بعد سائبان میں آیا تو یوجی سائبان میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُس سے ناریل کے درختوں تک نہ آنے کا سبب پوچھا تو مسکرا دی۔

"میں چاہتی تھی تم مجھے بلانے آؤ"

"میں آگیا"

"ہاں تم سے مل کر آج بہت خوش ہوئی ہوں"

"ایک بات کہوں؟"

"کہو"

"تمہارے بارے میں"

"صرف ایک بات"

"ہاں"

"میرے بارے میں بہت سی باتیں کہو"

"اچھا سنو"

"سن رہی ہوں"

"شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے"

وہ سنجیدہ ہو گئی اور چپ چاپ اندر چلی گئی۔

اُس رات جب ہم ناریل کے درختوں کے قریب ملے تو یوجی بہت خوش تھی۔ اُس نے اپنے قبیلے کا خاص لباس پہن رکھا تھا۔ جس میں وہ بے انتہا خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ سر پر موتیوں کی بنی ہوئی ٹوپی اور کلائی میں تازہ پھولوں کے کڑے اُسے اور بھی دلکش بنا رہے تھے۔ اُس شام اُس نے ریشم کے سُرخ رومال میں لپٹا ہوا ننھا سا اکتارا مجھے دیا اور کہا کہ درخت سے والٹر کا نام مٹا دو کیونکہ وہ مردہ ہو چکا ہے اور میں وہاں نہیں کھڑی رہ سکتی جہاں اس نے دو سال پہلے مجھے چھوڑا تھا اب سب کچھ بدل گیا ہے میں نے اکتارا اُس سے لے لیا۔ اُس شام ہم نے ریت پر گھروندے بنائے جنہیں یوجی نے توڑنے نہیں دیا۔ وہ بے انتہا خوش تھی اُس نے مجھ پر ریت بھی نہیں اُچھالی، گھروندے بھی نہیں توڑے۔ وہ مجھ سے شہروں کے بارے میں پوچھتی رہی جہاں راتوں کو رنگین روشنیاں بکھر جاتی ہیں۔ جہاں چمکتے ہوئے لباس ہیں۔ خوشیاں ہیں اور سکھ ہے۔ اُس نے مجھ سے میرے گھر والوں کے بارے میں بھی پوچھا اُس کا خیال تھا میری ماں بہت بوڑھی اور میری جدائی میں کمزور ہو گئی ہوگی۔ اس رات اُس نے چاند کے بلند ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ میں نے یوجی کو جاتے ہوئے بہت دور تک دیکھا وہ دور ہوتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔ اُس کی چال میں جانے کہاں سے دولہن کا بانکپن آ گیا تھا۔ اس کا گایا ہوا نیا گیت میرے کانوں میں گونجتا رہا جو کچھ یوں تھا۔

تم آ گئے
میرا ماہی گیر آ گیا
میں تنہا نہیں ہوں
آج رات جب تم پھولوں کا ہار پہن کر
میرے گھر آؤ گے
میں تمہارے قدموں کی دھول بن
جاؤں گی
کل کا سورج نکلنے سے پہلے تم مجھے اپنی
آغوش میں چھپا لینا
یہ ہی ریت ہے
میں تمہاری ہوں
میرا ماہی گیر آ گیا ہے

جب وہ گا رہی تھی مجھے ایسا لگا جیسے اس گیت میں کوئی پیغام ہے۔

دوسری صبح میرے لئے اپنے ساتھ راکھ اور ریت لائی۔ یہ صبح یوجی نے نہیں دیکھی۔ وہ سورج نکلنے سے قبل ہی مر چکی تھی۔ اُس دن گاؤں کا کوئی ماہی گیر جال لے کر سمندر کی طرف نہیں گیا۔ لڑکیاں بھی دودھ لے کر کیمپ کی طرف نہیں آئیں۔ سارا گاؤں جیسے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب میں گاؤں پہنچا تو یوجی کو جلانے والی چتا بجھتی جا رہی تھی۔ بوڑھی ماں نڈھال ہو چکی تھی اور باپ گٹھیا سے جکڑی ہوئی ٹانگوں کو پکڑے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے چتا کے سرد ہوتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ یوجی کے مکان کے سامنے کیلے کے مرجھائے ہوئے پتے لٹک رہے تھے اور زمین پر رنگین برادے سے بنائے ہوئے نقش و نگار مٹتے جا رہے تھے۔ پھولوں کے بے شمار ہار مسلے اور لٹے ہوئے پڑے تھے اور پھولوں کی پنکھڑیاں ہوا میں اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی جشن ہوتے ہوتے کوئی سانحہ پیش آ گیا ہو۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے دیکھا تو اُن کے چہرے پر تناؤ اور کشیدگی آ گئی۔ کچھ لوگوں نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ لڑکیاں گھروں میں گھس گئیں۔ گاؤں کا کوئی فرد مجھ سے مخاطب نہ ہوا سب لوگ چپ چاپ چتا کو دیکھتے رہے۔

یوجی کو مرے ہوئے آج دوسرا دن ہے آج بھی گاؤں کے لوگ جال لے کر سمندر کی طرف نہیں گئے نہ لڑکیاں دودھ اور مچھلیاں لے کر کیمپ کی طرف آئیں سارا گاؤں جیسے مر گیا ہو۔

رجمنٹ کے سارے جوان اب اسٹیمر پر آ چکے ہیں کیمپ خالی ہو چکا ہے۔ میرا سامان

بھی اسٹیمر کے کیبن میں پہنچ گیا ہے میں یوجی کا دیا ہوا یادگار ننھا سا اکتارا لئے ہوئے عرشے پر کھڑا ہوا چھالیہ کے درختوں کے پیچھے چھپا ہوا یوجی کا گاؤں اور ناریل کے دو متوازی درخت دیکھ رہا ہوں جن میں سے ایک پر میرا اور دوسرے پر یوجی کا نام اب بھی لکھا ہوا ہے۔ اسٹیمر روانہ ہونے میں اب چند منٹ باقی ہیں۔ اس کے بعد یوجی کا گاؤں اور یہ محوِ حیرت کھڑے ناریل کے متوازی درخت کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ اور یہ اکتارا۔

"بڑا خوبصورت اکتارا ہے" اسٹیمر کے بوڑھے ملاح نے اکتارا میرے ہاتھ سے لے کر کہا "آپ نے بنایا ہے؟"

"نہیں مجھے تحفہ ملا ہے۔"

"خوب — کس نے دیا" ملاح کچھ زیادہ ہی سراغ رسی پر اُتر آیا۔

"اس گاؤں کی ایک لڑکی نے" میں نے سچ سچ بتلا دیا۔

وہ مجھے تقریباً کھینچتا ہوا ایک کیبن میں لے گیا۔

"اب بتاؤ یہ اکتارا تمہیں کب اور کس نے دیا" وہ قطعی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے یوجی سے اپنی ملاقات سے اس کی موت تک کا واقعہ بیان کر دیا وہ رونے لگا

"میرا تعلق اسی جزیرے سے ہے" بوڑھے ملاح نے کہا "اس جزیرے کی ریت ہے کہ جب کوئی لڑکی اپنے شوہر کا انتخاب کر لیتی ہے تو اپنے ہونے والے شوہر کو پورنماشی کی رات سے قبل کسی وقت اپنے ہاتھوں کا بنا ہوا کوئی کھلونا پیش کرتی ہے۔ لڑکے کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اُسی پورنماشی کی رات کو لڑکی کو بیاہ لائے یا پھر تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دے لیکن اگر لڑکا پورنماشی کی رات لڑکی کو بیاہنے نہیں پہنچتا تو اسے سارے قبیلے کا اپمان سمجھا جاتا ہے اور سزا کے طور پر سورج نکلتے ہی لڑکی کو جلا دیا جاتا ہے اور گاؤں کا کوئی شخص لڑکے سے کبھی گفتگو نہیں کرتا۔"

"لڑکی کو جلا دیا جاتا ہے" میں چیخا۔

"ہاں جناب — جب لڑکی والدین کو اپنے شوہر کے انتخاب کی اطلاع دیتی ہے تو والدین خوشی سے اس کا فیصلہ قبول کر لیتے ہیں اور لڑکا جب تحفہ قبول کر لیتا ہے تو وہ لڑکی کو رخصت کرنے کا اعلان کر کے سارے قبیلے کو مدعو کر لیتے ہیں اور رخصتی کا جشن شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر لڑکا تحفہ لینے کے باوجود نہ پہنچے تو پھر لڑکی کو جل کر جان دینی پڑتی ہے۔"

بوڑھا ملاح نہ معلوم اور کیا کیا بتاتا رہا میں کیبن سے بھاگ کر دیوانوں کی طرح باہر نکلا۔ اسٹیمر چل رہا تھا۔ ناریل کے متوازی درخت آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ حدِ نظر تک پانی ہی پانی تھا۔ میرا سر چکرا گیا اور میں ریلنگ کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اسٹیمر کے ساتھ ساتھ اڑنے والے سفید پرندے اب جزیرے کی طرف لوٹ رہے تھے یوجی کے گاؤں کی طرف۔ یوجی جو ایک مدت تک راتوں کا انتظار کرتی رہی۔ پھر میں نے یوجی کی آنکھوں میں ساری زندگی کا انتظار ایک رات کا لمحہ بنا دیا۔ اکتارا دے کر اس نے میرا انتظار شروع کر دیا ہوگا۔ ایک ایک پل قدموں کی آہٹ پر کان لگائے گزرا ہوگا پھر اس انتظار میں سارا گاؤں شریک ہو گیا ہوگا۔ شعلوں کی طرف بڑھتے ہوئے یوجی نے کئی بار مڑ کر بڑے اعتماد سے دیکھا ہوگا۔ شعلوں نے یوجی کا انتظار چاٹ لیا۔ گیت جل گئے۔

ناریل کے چپ چاپ محوِ حیرت کھڑے ہوئے درخت اسی طرح ٹیلوں سے دو داب بھی کھڑے ہوں گے۔ ان پر میرا اور یوجی کا نام اب بھی لکھا ہوگا۔ ریت پر ہمارے بنائے ہوئے گھروندے جنہیں یوجی نے نہ توڑا تھا اب بھی بنے ہوں گے۔

لیکن یوجی کہیں نہیں۔

●

رخسانہ صولت

آؤ اک شہر بسائیں

زیادہ دنوں کی بات نہیں جب میں نے اسے کہا تھا: "اُو دوست! ہم اک شہر بسائیں" اور اس نے ہنس کر مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو!
"جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟"
میں نے کہا — "ہاں —! کیوں یقین نہیں آتا —!"
اس نے ایک بار پھر زور سے قہقہہ لگایا۔
ایک بار پھر کہو —! کیا —؟
"اُو ہم اک شہر بسائیں —!"
اب کی بار نہ تو وہ ہنسا اور نہ ہی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی — یکدم سنجیدگی کے خول نے اس کی شخصیت کو نگل لیا۔
میری پھٹی پھٹی آنکھیں فرش کے اس حصے کو ٹٹولنے لگیں — جہاں اس کے پیر تھے۔
وہ ابھی ابھی تو یہیں تھا — پھر کہاں گیا —؟
میں سوچنے لگی۔
وہ کہاں سے آیا تھا — اور کدھر چلا گیا۔
ہوا کا جھونکا تھا یا — پھر پلکوں کی جھپک —!
یا پھر واہمہ —!
تھک کر میں نے آنکھیں موند لیں اور دیوار سے سر ٹکا دیا۔
چند لمحے بھی نہ گذرے تھے — کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا — میں نے چونک کر آنکھوں کے جھروکے کھول دیئے۔
وہ میرے سامنے تھا — وہی گمبھیر چہرہ —! وہی شوخ شوخ مگر بولتی آنکھیں — وہ بالکل وہی تھا۔
اس کی فطرت میں سمندر کا غیظ و غضب تھا — اس کی سوچوں میں ندی کی لہروں کی سی سرکشی تھی۔ اور لہجے میں پہاڑوں کی سی سختی تھی — ہم جانے کتنے برسوں سے اسی طرح ملتے چلے آ رہے تھے — جیسے صدیوں سے ہمارا یہ ملن قائم ہو — میرا اور اس کا اگرچہ کوئی رشتہ نہ تھا — میں جب کبھی اس موضوع پر حیرت کے سمندر میں ہچکولے کھانے لگتی — تو فوراً بول اٹھتا — "حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے — تمہارا اور میرا جوگ لمحوں پر محیط نہیں ہے۔ یہ تو برسوں کا سفر ہے میں اور تم صرف انسان ہی تو نہیں۔ جو نام نہاد رشتوں کے ڈھکوسلے رچائیں — میں اور تم دو صدیوں کی علامت بھی تو بن سکتے ہیں — دو ثقافتی خطوں کے گلے ملتے کنارے بھی — اور دو سمندروں کے منہ زور دھارے بھی —!"
ایک بار ہم گھومتے پھرتے پہاڑی علاقوں میں نکل گئے — فطرت سے لطف اندوز ہونے کی خواہش میں یہ خیال بھی نہ رہا کہ ہم شہر سے کتنی دور آ گئے ہیں۔ میں نے اسے کہا —!
"نظر آگے کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ پیچھے بھی پلٹ کر دیکھو — شہر کتنا دور رہ گیا ہے —؟"
اس نے سامنے پہاڑی کی چوٹیوں پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا — آگے کی طرف سفر کرنے والے پیچھے پلٹ کر کبھی نہیں دیکھتے — پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھنے سے منزل کا فاصلہ بڑھتا جاتا ہے —!

میں جاتی ہوں شاموں کی گرد میں لپٹی ننگی بے معنی سی ہوتی ہے ——— مگر وہ شہر ——— ! اس نے پھر ایک کر میری زبان پکڑ لی ——— کس شہر کی بات کرتی ہو ——— جہاں تاریک قبروں میں زندہ لاشیں اپنے وجود کی پہچان تلاش کرتے کرتے بوڑھی ہو گئی ہیں ——— جہاں پھیپھڑوں کو بھی تازہ ہوا میسر نہیں ——— وہ جو زہر اگلتے ہیں اس کو دوبارہ اپنے اندر بھر لیتے ہیں ——— !

اس نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا، کبھی کبھی مجھے تو وہ شہر زندگی سے زیادہ بھرپور نظر آتا ہے۔ جہاں سرِ شام کوئی بڑھیا کسی لوٹی پھوٹی خاموش اور سوگوار قبر کے سرہانے کوئی دیا روشن کر دیتی ہے۔

اُف ——— اخدایا ——— ! تم نے کیسی باتیں چھیڑ دیں ——— ! میں نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا ——— مجھے اب تو شہر سے ڈر لگنے لگا ہے۔

اور ——— پھر وہ میری اس کیفیت سے محظوظ ہونے لگا۔

بہت خوب ——— !

ایک تو تمہاری الجھی الجھی فطرت میرے لئے ناقابلِ فہم ہے ——— میں نے اس کی بات اَن سُنی کرتے ہوئے کہا اور جھرنے کی طرف اپنا رُخ موڑ لیا ——— شلوار کے پائنچے اوپر کر کے میں نے اپنی ٹانگیں پانی میں پھیلا دیں جھرنے کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار نے میری جلتی پنڈلیوں کو سہلانا شروع کیا تو عجیب سا خمار میری نس نس میں انگڑائیاں لینے لگا۔ پیروں پر جمی گرد کی تہیں جھرنے کی رگوں میں گھلنے لگیں۔

وہ بھی میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ جھرنے کے کنارے نوکیلے پتھروں کے درمیان سے اُبھرتی ہری ہری ننھی ننھی گھاس کو اپنے پیروں سے مسلنے لگا ——— میرا ذہن اس کی باتوں کے گورکھ دھندے میں الجھا رہا ——— میں کچھ پریشان سی ہو گئی تھی ——— مجھے اچانک یاد آیا ——— اس کی ماں کافی عرصہ سے بیمار تھی!

"سنو ——— !"

تمہاری ماں کی کیا خیر خبر ہے ——— ! تم نے ہفتے بھر سے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ——— ؟"

ماں کے نام پر وہ اداس ہو گیا ——— تم آج پوچھ رہی ہو ——— وہ تو تمہارے شہر کے ویران اور خاموش حصے میں جا سوئی ہے۔

اور ———

"تم نے مجھے بتایا نہیں ——— ؟" میں نے دکھوں کے جنگل میں ننگے پیر چلتے ہوئے کہا آنسوؤں کی شبنم نے درد کے کانٹوں پر چمکنا شروع کر دیا تھا ——— !

اس نے تھکے تھکے لہجے میں مجھے تاکید کی ——— ماں کی نصیحت ہے ——— تمہارے لئے بھی اور میرے لئے بھی اور ہر اس سوچ کے لئے جو اپنی خود مختاری اور آزادی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہو۔ بیٹا ——— ! اپنی شخصیت کو اتنا پرکشش اور واضح رکھو ——— کہ تمہارا چہرہ تمہاری شناخت کی علامت بن کر تمہیں زندہ رکھ سکے۔ یاد رکھو اگر تم نے اپنی ذات کو بانٹ کے جالے میں جکڑ دیا تو تمہارے لئے موت سکون کی علامت بن جائے گی ——— !

ویسے درست ——— ماں ٹھیک ہی تو کہتی ہے ——— میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا ——— !

میں سوچتا ہوں ——— ماں کی نصیحت پر عمل بھی ضروری ہے ——— مگر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے ——— میری شخصیت کو تم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے ——— مگر کیا کروں ——— ! جس سمت رُخ کرتا ہوں ——— لوگ مجھے چہرے بدل بدل کر ملتے ہیں۔ اور مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے میں خود بھی کئی چہروں میں بٹ گیا ہوں۔ مجھے خود سمجھ نہیں آتا ——— جبھی تو میں گھبرا کر شہر سے دور ان پہاڑی چٹانوں، مدھر جھرنوں اور خاموش فطرت کے نغمہ ریز ماحول میں پناہ ڈھونڈ رہا ہوں ——— یہاں زندگی اگر کفن میں بھی لپٹی نظر آئے ——— تو میں اسے ایک نیا جیون دوں گا ——— !

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ——— خاموش بیٹھی رہی۔ جانے کتنے ایسے لمحے زندگی میں آئے اور گزر گئے ——— میں ان لمحوں کی پرچھائیوں میں آواز کے زیر و بم میں خاموشیوں اور اندھیروں میں ڈوبے شہر کی روشنیوں سے نہلانے کے خواب

ڈھونڈتی رہی۔

کافی ہاؤس میں بہت رش تھا۔ اس روز وہ اپنے بہت سے دوستوں کے درمیان بیٹھا تھا ــــ کافی کے کئی دور چل چکے تھے۔ میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے سارے ساتھی بھی اس کے ساتھ بہت خوش نظر آ رہے تھے ــ جیسے آج وہ اپنی کامیابی کا جشن منا رہے ہوں ــــ آج مجھے وہ بڑے اصرار سے یہاں لایا تھا ــ ورنہ وہ جانتا تھا کہ میں اس کے ان چند مخصوص دوستوں سے سخت نفرت کرتی تھی ــــ خاص طور سے اس لمبے کانوں والے کی شکل مجھے بُری کریہہ لگتی تھی ــ وہ ہمیشہ ہمیں کھانے کی دعوت دے کر آپس میں لڑانے کی کوشش کرتا تھا ــ اور وہ دوسرا چھوٹی چھوٹی سانپ جیسی آنکھوں والا سیاہ گینڈا مجھے زہر لگتا تھا، اس کا یہ تکیہ کلام تھا اور اس کی آڑ میں وہ اپنی رال ٹپکاتا رہتا تھا ــــ "زندگی جہاں کہیں نظر آئے لے جھپٹ لو ــــ کہ یہ چھین کر ہی ملتی ہے"۔ آج کی اس محفل کا رنگ مجھے سیاسی حادثے کی ڈرامائی صورتِ حال کے برابر لگا۔

میں نے گھبرا کر کافی پینے سے ہاتھ کھینچ لیا ــــ اور اُٹھ کھڑی ہوئی ــــ اس نے مجھے کھڑے دیکھا ــــ تو پیالی ہاتھ سے رکھ دی۔ اور میرے پیچھے باہر نکل آیا ہم دونوں کچھ دیر خاموش چلتے رہے۔

تب میں نے گھبرا کر اُنکھے لہجے میں کہا۔
"تمہیں ان زندہ لاشوں کے بدبودار اور تاریک دھند میں ڈوبے شہر سے نفرت تھی نا ــــ تمہیں یہ غریب اور مفلس دم توڑتے چہرے اچھے لگتے تھے نا ــــ تم ان کے منہ میں اپنے ہاتھ سے روٹی کے نوالے ڈالنا چاہتے تھے نا ــــ"

ہاں ــــ ہاں ــــ مگر تم جانتی ہو ــــ! یہ کام ایک اکیلا شخص کیسے کر سکتا ہے ــ اتنے بڑے ہجوم میں اس کے ہاتھ پیر توڑنے والے لوگ زیادہ ہیں ــــ ہمارا تو نظام ہی ایسا ہے ــ ایک ایسا نظام ــــ جس کی چکّی کے پاٹ تلے ہم جیسے جانے کتنے سرپھرے ایسی باتیں کرتے کرتے پس کر مر مٹ گئے ــ!

اس کے لہجے میں کرب کا زہر گھلا ہوا تھا۔
تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا ــ اس نے گھبرا کر میرے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے ــــ

"ہاں ــــ مگر ــــ میں تو اک شہر بسانا چاہتی ہوں ــــ نیا خوبصورت اور زندگی سے بھرپور شہر ــــ جہاں اندھیروں کا گزر نہیں ہوگا ــــ جہاں پانی کا رنگ سرخ نہیں نیلا ہوگا ــــ اس کا ذائقہ کڑوا نہیں میٹھا ہوگا۔ جس سے فصلیں ہری بھری ہوں گی ــــ پھر کوئی لمبے کانوں والا ہمیں کھانے کا لالچ نہیں دے سکے گا ــــ اور پھر اماں کی بھی تو خواہش پوری ہوگی نا ــــ صحت مند شناخت والا"

میں نے دیکھا ــــ میری دیوانگی نے اس کو بوکھلا دیا تھا ــــ وہ اس طرح میرے سامنے کھڑے کھڑے خاموش ہوگیا تھا ــ جیسے صدیوں سے گم ہو اور جیسے یہ کہہ رہا ہو ــــ ایک بار پھر کہو۔
کیا ــــ؟
"آؤ اک شہر بسائیں ــــ"

حمرا خلیق

دعا

صابر ابھی شعور کی عمر کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس کا باپ اس کی ماں اور سات بہن بھائیوں کو اس ظالم دنیا کے سپرد کر کے خاموشی سے چل بسا۔ اس کا باپ ایک معمولی مزدور تھا اس کی پوری زندگی بیٹھ ڈھوتے گزر گئی تھی۔ دن بھر اس کے بچے اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھے اپنے باپ کا انتظار کرتے رہتے اس کی بیوی خاموش اور اداس جھونپڑی کے ایک کونے میں پڑے ہوئے جھلنگے پلنگ پر بیٹھی رہتی۔ سات بچے جن کی بھوک، پیاس اور لباس کا مداوا ان کے مزدور باپ کی اس مزدوری میں پوشیدہ تھا جو اگر بھوک مٹا دیتی تھی تو جسم نہیں ڈھانک سکتی تھی اور اگر جسم ڈھانک دیتی تھی، تو پیٹ خالی رہتا تھا۔ لیکن ہر روز جب ان بچوں کا باپ گھر آتا تھا تو اس کے سارے بچے اور اس کی بیوی اسے اس امید سے دیکھتے تھے جیسے آج وہ ضرور ان کی ساری ضروریات اور خواہشات پوری کر دے گا۔

ان کی ضروریات اور خواہشات بھی کیا تھیں۔ بالکل چھوٹی چھوٹی بالکل معمولی معمولی۔ انہوں نے کب کسی بڑی بات کی خواہش کی تھی۔ انہوں نے کب زندگی کی آسائشیں کسی سے مانگی تھیں۔ اچھے کھانے۔ اچھے کپڑے کا مکان بستر، اچھا گھر، تعلیم، انہوں نے تو انسانوں سے یہ سب کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔ لیکن یہ معاشرہ تو انہیں دو وقت سوکھی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لئے پھٹے پرانے کپڑے بھی نہ دے سکا۔

صابر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب اس کا باپ اپنے گھر کے ایک فرد کی بھی تمام ضروریات پوری کرنے سے قاصر تھا تو اسے شادی کرنے اور پھر اتنے سارے بچوں کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کی ماں جو بچے پیدا کرتے کرتے ادھ موئی ہو چکی تھی۔ اس کا باپ جو ان حشرات الارض کی طرح کلبلاتے ہوئے بچوں کے پیٹ پالنے کے لئے کماتے کماتے خون تھوکنے لگا تھا ــــ اور پھر دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے تھے۔ شکل سے بیزار ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ مارتے مرتے تھے۔ گالم گلوچ کرتے تھے۔ بھوک۔ تھکن اور ساری نفرتوں اور مایوسیوں کا غصہ بچوں پر نکالتے تھے۔ پھر ایک سال بعد ایک نئی زندگی کو جنم دے دیتے تھے۔ اس جہنم میں ایک بھوکے ننگے انسان کا اضافہ کر دیتے تھے۔

کتنی عجیب بات تھی کہ جب ایک دن اس کا باپ بغیر دوا دارو کے خون تھوکتا تھوکتا اچانک چپ ہو گیا تو اس سے لڑنے مرنے والی اس کی شکل سے بیزار۔ اس سے شدید نفرت کرنے والی اس کی ماں تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ اس کی چیخیں زمین و آسمان ملائے دیتی تھیں۔ اس کے بین اور واویلا سن سن کر پڑوس کی جھونپڑیوں اور کچے پکے مکانوں کے باسی نکل پڑے۔ عورتیں، مرد، ان کی اس شکستہ جھونپڑی میں جمع ہونے لگے۔ غربت اور افلاس نے انہیں سب کو ایک دوسرے کے کتنے قریب کر رکھا تھا۔ مردوں نے اس مزدور کی آخری منزل کی تیاری کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور عورتیں اس لاوارث بیوہ اور اس کے یتیم بچوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

سارے بچے حیرت اور خوف سے سب کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ صابر جو سب سے بڑا تھا کھیسے کی آڑ میں چھپا سب تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ماں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھی اور بچوں اور اپنے نصیبوں کو کوس رہی تھی۔

میں تو ہوں نصیبوں جلی۔ یہ کمبخت۔ منحوس آدم خور کھا گئے۔ باپ کو۔ مر گیا وہ بدنصیب ان کے ایندھن بھرتے بھرتے۔ اب کہاں سے کھاؤ گے۔ کیا کرو گے۔ خون تھکوا دیا۔ کتوں نے اسے اب جیتیں

آگیا۔"

"اری بہن۔ چپ ہو جا۔ کیا ہو گیا تجھے۔ کیوں بچوں کے پیچھے پڑ گئی۔"

"پیچھے کیا پڑ گئی۔ میں کرموں پھوٹی۔ اب کیا کروں گی۔ کہاں جاؤں گی۔ نہ سسرال میں کوئی ہے نہ میکے میں۔ ہائے میری تو دنیا اجڑ گئی۔"

جھونپڑی والوں نے نہ جانے کہاں سے پیسہ پیسہ جمع کر کے اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کر دیا۔

"لو بہن اب آخری دیدار کر لو۔"

صابر کی ماں نے آخری دیدار کرتے کرتے ایک ہولناک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

صابر مختلف آوازیں سن رہا تھا۔

"بچوں کو بھی دکھا دو باپ کی شکل۔"

"ارے نہیں۔ ڈر جائیں گے کمبخت مارے۔"

"وہ صابر کہاں گیا۔ اُسے تو ضرور دکھا دینا چاہیے سمجھدار ہے۔"

"صابر۔ صابر۔ اس نے آواز سنی اور اور کونے میں دبک گیا۔"

جنازہ چلا گیا۔

صابر کو چاروں طرف سے رونے اور سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ حیران ہو ہو کر ادھر ادھر دیکھتا اور اس کا دم گھٹنے لگتا۔ رات سر پر آ پہنچی تھی۔ دیئے میں تو کئی روز سے تیل نہیں تھا۔ ایک خوفناک اندھیرا ماحول کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔ سارے گھر پر وحشت طاری تھی۔ باپ کی کھٹیا خالی پڑی تھی۔ زمین پر ماں بے سدھ پڑی تھی۔ سارے بچے سہمے ہوئے اس کے گرد بیٹھے تھے۔ اس نے تڑپ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور ایکدم سے بلبلا کر رونے لگا۔ آنسوؤں کی لڑیاں اس کے گالوں پر بہہ رہی تھیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

اور پھر ایک دم سے وہ چونک گیا۔ کہیں سے چاولوں کی خوشبو اس کے نتھنوں میں آنے لگی۔ اس نے آنسو کرتے کے دامن سے پونچھ کر ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک پڑوسن تھال میں بہت سی گرم گرم کھچڑی لئے ہوئے کھڑی تھی۔ وہ اس کی ماں کو اٹھا رہی تھی۔

"ارے اٹھ جا۔ دیکھ میں یہ کھچڑی لے آئی ہوں۔ بچے بھوکے ہیں۔ انہیں کھلا۔ اُٹھ۔ دیکھ تو یہ ننھے ننھے بچے کیسی حسرت سے دیکھ رہے ہیں تجھے۔ جنم جلی رونا تو اب ساری عمر کا ہے۔ انہیں تو نہ بھوکا مار۔ اری ان کا تو کوئی قصور نہیں۔"

صابر کی ناک میں وہ اشتہا انگیز خوشبو مسلسل آ رہی تھی۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اچانک اس کی بھوک اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔

چار پانچ دن سے کسی نے پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا تھا۔ باپ جب سے پلنگ سے لگا تھا۔ انہیں سوائے لاتوں۔ جوتوں اور کوسنوں کے اور کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ لیکن اس وقت کھچڑی کی یہ خوشبو — وہ اب کتنی دیر صبر کرے۔ کب تک برداشت کرے اسے ماں پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ وہ اٹھتی کیوں نہیں؟ اور پھر اسے اس پڑوسن پر غصہ آ رہا تھا۔ جو ماں کو اٹھائے جا رہی تھی اور انہیں کھانا نہیں دے رہی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ سرکتا ہوا کھمبے کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کے دوسرے بہن بھائی بھی پڑوسن کے قریب آتے جا رہے تھے —— سب بھوکے تھے باپ مر گیا تھا۔ لیکن ان کی بھوک اور پیٹ تو ساتھ نہیں لے گیا تھا۔

بڑی مشکل سے اس کی ماں اٹھی۔ پڑوسن نے کھچڑی کا تھال سب کے بیچ میں رکھ دیا۔ بچے ذرا سے ہچکچائے —— اور پھر سب کھچڑی پر ٹوٹ پڑے۔ صابر نے ماں کو اور پڑوسن کو کن انکھیوں سے دیکھا اور بڑے بڑے لقمے نگلنے لگا۔ اتنی لذیذ۔ اتنی مزے دار گھی میں تر تراتی ہوئی کھچڑی تو آج تک زندگی میں اسے نہیں ملی تھی۔ بھوک تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی نیت تھی کہ سیر ہی نہیں ہوتی تھی۔ سب بچے اس کوشش میں تھے کہ زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کر لیں۔

صابر نے سوچا۔ "اس سے پہلے یہ پڑوسن کہاں تھی؟ آج تک تو کبھی وہ ایسا کھانا نہیں لائی؟ کوئی بھی نہیں لایا۔ اس کا باپ جو دن دن بھر کماتا تھا ایسا کھانا کبھی نہ کھلا سکا۔ لیکن آج؟

آج جب اس کا باپ مر گیا تھا۔ ان کے گھر میں کوئی کمانے والا نہیں رہا تھا۔ اسے ایسا عمدہ کھانا ملا تھا کیا مرنے کے بعد ایسی ہی نعمتیں ملتی ہیں؟ وہ کھاتا جا رہا تھا۔ اور سوچتا جا رہا تھا۔

اور پھر اس نے تڑپ کر اللہ میاں سے دعا مانگی۔

"اللہ میاں۔ کل کو میری ماں مر جائے۔ پرسوں کو میری بہن مر جائے اور پھر میرا بھائی —— اور سب یونہی مرتے جائیں۔"

فارغ بخاری

پیاسے ہاتھ

میں پیاسے ہاتھوں کو کب تک ذائقے سکھاؤں
جنہیں سمندر کی تشنگی ہے
ندی سے سیراب ہوں وہ کیونکر
میں ان کی شکوہ گزار آنکھوں سے چھپتا پھرتا ہوں
سوچتا ہوں، انہیں یہ میں کس طرح بتاؤں
یہ زندگی میں کچھ اور ایسے بھی مسئلے ہیں
تمہاری انگشتری کے ہی جو نگیں نہیں ہیں
محبتوں میں اسیر رہ کر علاج ان کا میں کیسے پاؤں
وفا کا ہے جو عذاب ہم پر، کہیں نہیں ہے
میں پیاسے ہاتھوں کو کب تک ذائقے سکھاؤں

کچھ ایسے یہ تیری خوشبوؤں کے اسیر ہیں جو
کہیں بھی تسکین نہ پا سکیں گے
میں دل میں احساس جرم لے کر
تمام دنیا کے آنگنوں میں بھٹکتا پھرتا ہوں
اور میرا یہ المیہ ہے
کہ میرے پاؤں تلے مری اب زمیں نہیں ہے
یہ المیہ میں کسے سناؤں
میں کیسے ان دہرے حادثوں سے نجات پاؤں
میں پیاسے ہاتھوں کو کب تک ذائقے سکھاؤں

خود کردہ

بہت سی ایسی حماقتیں ہیں
خرد نے جن کو جنم دیا ہے
بہت سے ایسے ہیں روگ جن کو
ہماری دانائی پالتی ہے

کاغذ کی ناؤ

حد نظر تک گہرا پانی
لہریں ہیں طوفانی
دور کنارا
چلکے خونی دھارا
تند ہوائیں
تیرہ فضائیں
قدم قدم منجدھار
ہر سو ہاہاکار
کاغذ کی اک احمق ناؤ
چلی ہے دریا پار

فارغ بخاری

اجنبیت کا ذائقہ

نگر نگر گھومتا ہوں
مغرب کے بیکراں شہر مجھ کو حیرت سے دیکھتے ہیں
میں ان دیاروں کی اجنبی وسعتوں میں بہتا ہوا رواں ہوں
یہ اجنبیت کا ذائقہ ہی عجیب شے ہے

یہ ایسا ظالم ہے
رشتوں ناتوں کی پل میں زنجیریں توڑتا ہے
شکستہ خوابوں کو جوڑتا ہے
طلسم نام و نمود کے کوہ طور سے یہ اتارتا ہے
بھٹکتے ماحول کے دریچوں سے نام لے کر پکارتا ہے
جو سرا شاق ہے وحشتِ دل
تو سب فصیلوں کو توڑ کر چاہتا ہے انساں
اک اپنی دنیا الگ بسا لے
جہاں کوئی بھی نہ ہم زباں ہو، نہ آشنا ہو
کچھ ایسی ان جانی سی فضا ہو
کہ ہر بنِ مو میں رقصِ شعلہ کا ماجرا ہو
جو تجربہ بھی طلوع ہو دل پہ — کیمیا ہو
نہ کوئی جانے کہاں سے آیا ہوں — کون ہوں میں
نہ آشنا میرے فن سے کوئی
نہ میرے دل کی لگن سے کوئی
نہ میرے فکر و خیال کی انجمن سے کوئی
جو کوئی جانے
نہ مجھ کو سرخیلِ کارواں وہ سمجھ کے جانے
نہ علم و فن کا وہ مردِ میداں سمجھ کے جانے
نہ اہلِ ایماں سمجھ کے جانے
بس ایک انساں سمجھ کے جانے

سرشار صدیقی

تنسیخ

جو لمحہ گزرے
وہ نکہتوں کی طرح سے
پھر پھول کا کوئی پیرہن نہ پائے
جو گھر کو چھوڑے
وہ پھر خدا کی زمیں پہ
میری طرح سے کوئی وطن نہ پائے

یہ وقت کا ایسا فیصلہ ہے
جو گلستاں میں
سند ہوا ہے

مگر یہی فیصلہ
تو کل ایک پھول کے ہاتھ
رد ہوا ہے

وہ ایک لمحہ
جو اس کو چھو کر گزر گیا تھا
ابد ہوا ہے

غالب احمد

انتظار

سب، ستارے، چاند، سورج، پھول، پھل، گئے
کب کہاں اور کون کے سب سلسلے اب ختم ہیں
وقت پر موت آگئی۔ موسم بدل گئے
وقت کا لمحہ خالی لے گیا سب روشنی اور رنگ و بو
اب نہ پیادہ ہے نہ پانی
ایک کورا آسماں ہے
بے در و دیوار و روزن اور بے نام و نشاں
شکل اور شیشے کی آرائش کا منظر بھی نہیں
نور کی نظریں بھی پتھر ہو گئیں
اب رہو تم منتظر!

خاک و خوں کی چاشنی میں کون اب لائے گا ذہن و جگر کے مرہم بہاں
اب وہ گم گشتہ خزینوں کی خبر
پھول کی پتی میں لرزاں پھر نہ دیکھو گے کبھی
یہ خیال و خواب کی خاکستر خبروں کے دن
اور خوابیدہ سنسنے میں ٹوٹتی راتوں کی تتیاں گل ہو گئیں
خاک داں سب جل بجھے
خون کی ہولی کے کھیل

تیری میری ضد کے سارے میل جول
وصل کی سب قربتیں اور ہجر کے سب فاصلے
سب صدائیں اور صدیاں، موسموں کے قافلے
ڈھل ڈھلا کر رنگ کی آمیزشوں کے سائے میں
تیرے میرے سر سے سارے وار کر
چاندنی اور دھوپ کے ان نقرئی سکوں کا روپ
لے اُڑے ہیں کاغذی پیراہنوں کے دوش پر
تیری، میری کلفتوں اور الفتوں کی داستاں
قافلوں کا وقت اب باقی نہیں
چھوڑ دو پیمائش سود زیاں
دور اب ریگِ رواں کا ختم ہے
وقت کا وقفہ نیا آئے گا کبھی
پھر بساطِ دل بچھائیں گے نئی
پھر کھلے گا موسمِ گل بھی نیا
باندھ رکھو رختِ سفر
اے ہم سفر
میں وہی مشتِ غبارِ رہگذر
ہوں منتظر

کچھ تو کہو

ابھی ہے موسم جینے کا
کچھ تو کہو
کوئی بات سناؤ
پاس تمہارے بیٹھے ہیں
درد کی دشواری کے ہاتھوں بے شک تم مجبور سہی
لفظوں سے ہی راہ کھلے گی
لفظوں سے ہی پیار کے رشتے بنتے اور بگڑتے ہیں
بات کرو گے بات بنے گی
بگڑی بھی بن جائے گی
لفظ لبوں پر آ کر ہی موسم کا رنگ بدلتے ہیں
کچھ تو کہو کوئی بات سناؤ
دیکھتے دیکھتے بیت چلا ہے
سارا موسم جینے کا

غالب احمد

پل بھر کا مہمان

کون آیا ہے
یہ کس نے پھونک پھونک کر رکھے قدم
دہلیز پر چپ چاپ چوروں کی طرح
رات کی تاریکیوں میں سرسراہٹ سانپ کی
سانس کو سینے کے اندر روک لو
سن نہ لے قدموں کی آہٹ
دل کی دھڑکن کو کہو چپ سادھ لے
دل کا دروازہ نہ کھولو
وہ تو اندر آ گیا
اس نے دستک بھی نہ دی
ایک سائے کی طرح بے ساختہ ساختہ
کیا کریں، کس کو بلائیں
کیا کہیں یہ کون ہے
چپ چاپ، بے آواز
گم سم سامنے بیٹھا ہوا
یوں تو سب کچھ ہے
اگر سوچو تو پھر کچھ بھی نہیں
وہم و گماں
کون اب ڈھونڈنے اُسے
وہ تو آ کر رات کی تاریکیوں میں
اس طرح گھل مل گیا
جیسے میرا جسم ہو اُس کا لباس
میں نے دیکھا ہے اُسے
جو خود سے بھی روپوشی ہے
وہ ہماری روح کی گردش میں ہے

لفظ اور لوہا

لفظ تو موت کی کلیاں ہیں
پھر پھول چنیں گے
لمحہ لمحہ لاکھ جلاؤ سانس کی مشعل
شعر، شعور اور نغمہ چپ سادھے بیٹھے ہیں
تنہائی کی مدہوشیں لگن میں
نئی پرانی آوازوں کی لفظ سدل میں
دلوں کی آویزشں کے زہر بھرے رنگوں میں
ابھی تو ایک نئے نقطے نے جنم لینا ہے
ابھی تو لہر ہے لوہے کی اور آگ لگے گی
گھر کے اندر باہر پہرے دار بہت ہیں

خواب گرفتہ
چھپی چھپی پہنائیوں میں
ڈھونڈ سکا ہے کون کس کو
روح بھی مجرم، جسم بھی زندانی ہے
رنج کا رشتہ آوازوں سے ٹوٹ چکا ہے
درد کی دہلیزوں پہ مسافر
سونے کی خواہش میں پڑے ہیں
نیند نہ مانگو، نیند کے ماتو
نیند جہنم بن جائے گی

اندر ہمارے جسم سے سیراب ہے
اب اگر تم سو سکو تو سو رہو
اب وہ جائے گا کہاں
اب وہ شاید پھر نہ آئے گا کبھی

اب کے آنکھ لگی تو سمجھو
پھر نہ آنکھ لگی
ابھی تمہارا اور ہمارا
خون ٹپک کر
لہروں میں گھل مل کر
اندر کے طوفانوں کو بلانے والا ہے
شعر، شعور اور نغمہ
یہ رستے تو
نرل کومل ٹھنڈی شبنم کی آمیزش سے
کلیاں پھول کھلاتے ہیں
لفظ تو موت کی کلیاں ہیں
پھر پھول چنیں گے
پہلے مرنا پھر جینے کا جتن بھی کرنا
پھر تہذیب، تمدن، مذہب، عشق، محبت، انسانوں کی
آہیں بھرنا
ابھی تو اپنی بات کا لوہا منوانا ہے
ابھی تو لہر ہے لوہے کی اور آگ لگی ہے
ابھی تو فتنہ ناچ رہا ہے
نہ تابی رنگوں کی سبھائیں
جشن کے بعد جدائی ہو گی
خودی کے بعد خدائی ہو گی
لفظ اور لوہا میل ملاپ کی بات کریں گے
پھر شاید
تیری میری شنوائی ہو گی

اگست ۱۹۷۹ء

نظمیں : میکسم تانک
ترجمہ : منو بھائی

اکثر یوں ہوتا ہے

جب تم مجھے پکارو
اور میں فوراً جواب نہ دوں
تو مجھے کوسا نہ کرو

اکثر یوں ہوتا ہے کہ میرے کندھوں پر
تھکے ہوئے پرندے آرام کر رہے ہوتے ہیں
اور میں اُن کے آرام میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا

اکثر یوں ہوتا ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے
میرے مرحوم دوست آ بیٹھتے ہیں
اور میں ان سے باتیں کر رہا ہوتا ہوں

اس سے کیا فرق پڑتا ہے
کہ میرا کوٹ یہاں دھرا ہے
میں خود تو اکثر بہت دور
ناروک کے چیل کے جنگلوں میں
سارا سارا دن گھومتا رہتا ہوں
جہاں میرے تمام دکھ، میری تمام خوشیاں
خیالات اور یادیں آباد ہیں

اکثر یوں ہوتا ہے کہ میرے ہونٹ سوکھ جاتے ہیں
گیت کی پیاس کی شدت سے
اور میں گنگ ہو جاتا ہوں
تمہارا نام بھی نہیں لے سکتا

جب تم مجھے پکارو
اور میں فوراً جواب نہ دوں
تو مجھے کوسا نہ کرو

ناقابلِ فراموش سپنے

انتہائی ناقابلِ فراموش سپنے
میں نے اس وقت دیکھے
جب تمہارے محنت سے کھردرے ہاتھوں نے
مجھے سہلایا تھا
(محبت کے گیت کے ایسے فرسودہ آغاز پر معاف کر دینا)

تمہارے ہونٹ
میرے تمام زخموں کے لئے
صحت اور سکون دینے والی مرہم تھے
اگرچہ بعض اوقات تمہاری مدد حاصل کرتے وقت
میں انتہائی غیر مستحق بھی ہوتا تھا
(میرے اس جرم کو بھی معاف کر دینا
ہمیشہ کی طرح)
کوئی آگ بھی میری زندگی کا لطف بحال کرنے میں کامیاب
نہیں ہو سکتی تھی
تمہارے میٹھے، گداز نغموں کی گرمی کے سوا
اور میں ہمیشہ اپنا دکھتا ہوا
یا سردی میں ٹھٹھرا ہوا ہاتھ
تمہارے ان نغموں کی گود میں رکھ دیا کرتا تھا
(میری اس بک بک جھک جھک کو بھی معاف کر دینا
جس سے میں تمہیں اکثر پریشان کیا کرتا تھا)

ایک نئی آبادی میں

اپنا اپنا کام

کمہار بناتا ہے
مٹی سے نہایت خوبصورت مرتبان
رنگ ساز دیواروں کو
بہار کے پھولوں جیسی خوشنمائی دیتا ہے
موچی بناتا ہے گائے کی کھال سے
دیرپا اور آرام دہ جوتے
ہل زمین کی کوکھ کو
اناج کی جڑوں کی پرورش کے لئے
تیار کرتا ہے
لوہار اپنے ہتھوڑے سے
لوہے کی گرما گرم کڑی بناتا ہے
جبکہ میں
ان تمام حیرت انگیز کارناموں کے گیتوں کے لئے
الفاظ بناتا ہوں
کہ یہ گیت گائے جا سکیں

یہ بالکل نئی گلی ہے
گھر بھی نئے ہیں
بچوں کی ٹولیاں اور کبوتروں کے غول بھی نئے ہیں
نئی ٹرالی بسیں
اور ستون تعمیر کرنے والے ڈبے
نئے تفکرات، نئی خوشیاں
نئے پیمان محبتوں کے
اور اعلان جدائیوں کے
اور لیموں کے پودے جو ابھی ابھی لگائے گئے ہیں
وہ کھڑے تو ہو گئے ہیں مگر ابھی پوری طرح عادی نہیں ہوئے
بجلی کی روشنی کے اور مصنوعی سیاروں کے
آبیاری کرنے والی مشینوں کی بارش کے
اور ٹرانسسٹر پر بلبلوں کے نغمے سننے کے ....
ہر روز
لیموں کے یہ پودے
مجھے روک لیتے ہیں
اور مقامی رسوم و رواج کے بارے میں پوچھتے ہیں
ان لڑکیوں کی طرح
جو اپنے گھروں سے دور بیاہی گئی ہوں
اور خوابوں میں ابھی تک
شاہ بلوط کے وہ جھنڈ دیکھتی ہوں
جو وہ میکے چھوڑ آئی ہیں

یہ کیسے ہوا؟

یہ کیسے ہوا
کہ تم اتنی بہت ساری خوشیاں لے آئے
کہ میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا

یہ کیسے ہوا
کہ تم اتنے زیادہ غم لے آئے
کہ میری اپنی امیدیں پاش پاش ہو گئیں؟

یہ کیسے ہوا
کہ تم اتنی زیادہ روشنی لے آئے
کہ میں نے تمہیں اندھیرے میں بھی دیکھ لیا؟

یہ کیسے ہوا
کہ تم اتنی زیادہ تاریکی لے آئے
کہ میں دن کی روشنی میں اندھوں کی طرح بھٹکنے لگا؟

سنگریزہ میرے گاؤں کا

زرگر
کیا تم
کسی طریقے سے
اس سنگ ریزے کو
سونے میں جڑ کر محفوظ کر سکتے ہو؟
یہ میرا کوئی احمقانہ خیال نہیں ہے
یہ سنگ ریزہ
مجھے خوبصورت سے خوبصورت ہیرے سے بھی زیادہ
عزیز ہے

یہ ۶۵ء کی ناکہ بندی کا حصہ بنا تھا
۷۱ء کی بمباری میں اس نے میری حفاظت کی تھی
جب گھر اور کارخانے دوبارہ تعمیر ہونے لگے
تو یہ سنگ ریزہ اچھل کر میری میز پہ آ گرا
میں نے اسے سرہانے کے نیچے رکھ لیا
یہ کوئی پتھر کا عام سا ٹکڑا نہیں ہے
میں یہ پتھر اپنے گاؤں سے لایا ہوں
جس کی گلیوں کا فرش سنگ ریزوں کا ہے
جہاں مسکراتے ہوئے بچے
دائرے بنا کر ناچتے ہیں
اور جہاں اب آسمان کی جو گڑگڑاہٹ بھی سنائی دیتی ہے
موسمِ بہار کے بادلوں کی گھن گرج ہوتی ہے

چلنے سے پہلے

سفر میں کام آنے والی اک چوبی چھڑی
جسے کبھی کوئی خطرہ نہ ہو
اور جو یخ بستہ ہواؤں سے بھی نہ گھبرائے
جو کسی مدہوش شرابی سے نہ اُلجھے
مگر پیچھے لگے ہوئے کتے سے ڈر کر بھی نہ بھاگے
اور جسے کسی نامہرباں نگاہ، خالی مشکیزے
اور خاموش دروازے پر غصہ بھی نہ آئے

سفر میں کام آنے والا اک بڑا کوٹ
جو امیدوں سے بُنے ہوئے کپڑے کا ہو
جس کی جیبیں اتنی بڑی ہوں کہ اُن میں
اتواروں اور تہواروں کے علاوہ
روٹی کے سوکھے ہوئے کنارے بھی سما سکیں
اس کا رنگ ایسا ہونا چاہیے کہ
پہاڑوں پر پھسلتی ہوئی بارش سے
پہیوں کی لکیروں کی دھول سے
اور ہل کی کنگھی سے سنورے ہوئے میدانوں سے
الگ دکھائی نہ دے

سفر میں کام آنے والے مضبوط جوتے
جو تین سالہ بیل کے خوب کمائے ہوئے چمڑے سے تیار کئے گئے ہوں
جن کے کالے تلے تمام موسموں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوں
اور ان میں دونوں اطراف میخوں کی دو دو قطاریں ہوں
تاکہ سفر جاری رکھنے میں تھکاوٹ کا کوئی مقام نہ آئے
چاہے راستے کتنے ہی ناہموار اور دشوار کیوں نہ ہوں

سفر میں کام آنے والا اک گیت
جو سرسراتی ہواؤں اور چہچہاتے پرندوں
خوشی کی باتوں اور اُداس کر دینے والے خیالوں سے ترتیب دیا گیا ہو
اور جو اپنے اندر ایک ایسی طویل اور گمبھیر خاموشی بھی لئے ہوئے ہو
جس کی گہرائی میں الفاظ بھی نہ اتر سکیں

یہ سب چیزیں تمہیں پسند نہ ہوں
تو میرے ساتھ مت چلنا
جب میں لمبے سفر پہ نکلوں

جعفر رضا ترمذی، ذمان کنجاہی
عبدالکریم خالد، انتظار حسین
محمد خالد، منو بھائی
خالد احمد، اظہر عباس

زیتون بانو، زاہدہ صدیقی

اے رشید چغتائی سید محمد کاظم
معین قریشی، صلاح الدین محمود

خاطر غزنوی، عطاء الحق قاسمی
امجد اسلام امجد، صہبا لکھنوی
محسن احسان ، بیگم محسن احسان

ناصر زیدی، رضی اختر شوق،
ابواللیث صدیقی، حفیظ صدیقی

حفیظ اثر، منصور قیصر،
غضنفر مہدی، بیگی میرٹھی

برِّصغیر کی جدید مسلم فکر کا ایک مطالعہ

انیسویں صدی کے وسط میں برِّصغیر کے کسانوں اور دستکاروں نے بالائی طبقات کے ایک مختصر محبِ وطن گروہ کے تعاون سے آزادی کی ایک خودرَو تحریک شروع کی جو بالآخر بالائی طبقات کے غالب حصے کی غدّاری، موقع پرستی اور اخلاقی دیوالیے پن کی بنا پر بُری طرح کچل دی گئی۔ اس کے بعد برِّصغیر کو باقاعدہ نوآبادی کا درجہ دیا گیا اور کٹھ پتلی شہنشاہِ ہند کے تکلف کو ختم کر دیا گیا۔ آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے نے اپنے مفاد کی خاطر نچلے طبقات سے تعاون کیا تھا، کیونکہ ان کا وجود ہندوستان میں مسلم حکومت کی بقا سے وابستہ تھا۔ اس کے برعکس ابھرتے ہوئے ہندو متوسط طبقے نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا مفاد نہ صرف انگریزوں سے وابستہ تھا بلکہ زیادہ تر انگریزوں نے ہی اُسے جنم دیا تھا۔ ان حالات میں تحریکِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلم متوسط طبقے کو فطری طور پر ردِّعمل کا نشانہ بنانا پڑا۔

نئی صورتِ حال میں مسلم متوسط طبقے کے سامنے دو راہیں تھیں۔ یا تو وہ نچلے طبقات میں ضم ہو جائے یا پھر اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی خاطر نئے حکمرانوں سے تعلق استوار کرے۔ معاشی جبر نے اس طبقے کے ایک بڑے حصے کو کچل دیا۔ اُس زمانے کی بہت سی داستانوں اور تاریخوں میں اس عمل کے واقعات دردناک پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ بڑی بڑی حویلیوں میں رہنے والے کس طرح بھوک سے نڈھال ہو کر ساہوکاروں سے سودے کرتے اور بالآخر اپنا سب کچھ اُن کے حوالے کر کے رات کے اندھیروں میں اَن دیکھی راہوں پر چل نکلتے۔

بہت سے لوگوں نے شعوری طور پر دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ نئے حکمرانوں سے تعلقات استوار کرنے کے لئے نوآبادیاتی نظام کو دل و جاں سے قبول کرنا ضروری تھا۔ لیکن اس نظام میں آقا و غلام کے درمیان کوئی انسانی رشتہ محال تھا۔ نوآبادیاتی صورتِ حال میں کسی مقامی باشندے کو انسان تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظام مہذب ترین آقا کی شخصیت کو بھی مسخ کر دیتا ہے۔ اور سب سے زیادہ انسان دوست نوآبادکار بھی اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر مقامی باشندے کو جانور تصور کرنے لگتا ہے۔ بصورتِ دیگر اُن کے مابین موجود معروضی تعلق کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ لہٰذا وہ نہ صرف مقامی باشندے کو جانور تصور کرتا ہے بلکہ شعوری طور پر اسے جانور بنانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

دوسری راہ کا انتخاب کرنے والوں نے اس صورتِ حال کو قبول کر لیا۔ انہوں نے اپنے انسان ہونے کی صداقت کی نفی کر کے پناہ گاہ ڈھونڈ لی۔ اس گروہ کے ممتاز رہنما سرسیّد احمد خان اعلان کرتے ہیں کہ:

> "میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہلِ حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک، انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسے نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت

جیسے کچھ وحشی جانور کو۔ پس تم کسی جانور کو قابلِ تعلیم یا لائقِ ادب سمجھتے ہو کہ اس کے ساتھ اخلاق اور بداخلاقی کا خیال کرتے ہو؟ ہرگز نہیں کرتے پس بھلا کچھ حق نہیں ہے کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانور کی طرح سمجھیں۔"

اس غیر انسانی صورتِ حال کو جواز دینے کی خاطر ایک آئیڈیالوجی کی ضرورت تھی۔ اوّل اوّل سرسید احمد خان نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ انہوں نے اسلام کی ایک ایسی تعبیر پیش کی جو تغیر پذیر حالات سے ہم آہنگ اور اُن کے طبقے کے مفادات کے مطابق تھی۔ انہوں نے اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کے منہاجِ فکر سے رہنمائی حاصل کی ہے سرسید کا مقصد یہ تھا کہ ایسا علمِ کلام مرتب کیا جائے جو نئی صورتِ حال میں ہندی مسلمانوں کے نظریاتی تقاضے پورے کر سکے۔ شاہ ولی اللہ روایتی فقہ کی اہمیت پہلے ہی ختم کر چکے تھے۔ سرسید نے حدیث کو بھی پسِ پشت ڈال دیا اور قرآنِ حکیم کو اسلامی تعلیمات کا واحد منبع قرار دیا۔ اس طرح انہوں نے گویا اسلام کی پچھلی تعبیرات منسوخ کر کے قرآنی تعلیمات کی نئی تفسیر کا دروازہ کھول دیا۔ یہ ایک لحاظ سے قرونِ وسطیٰ کی الٰہیات کے خلاف بغاوت تھی۔ سرسید احمد خان نے مذہب کا ترقی پسندانہ اور اجتہادی تصور پیش کیا۔ اس میں علم کے مافوق الفطرت ذرائع کی بجائے عقل کی اہمیت پر اصرار کیا گیا ہے اور اس کا رویہ انسان دوستی کا ہے۔ اس میں رواداری، موقع شناسی اور آزادیٔ فکر کا درس دیا گیا ہے۔ حیاتِ جاوید میں سرسید کے وفادار ساتھی مولانا الطاف حسین حالی نے قرآنِ حکیم کی اُس نامکمل تفسیر کا خاکہ دیا ہے جسے سرسید نے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس سے مصنف کے مذہبی خیالات کی وضاحت ہوتی ہے سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اسلام اور فطرت میں کوئی تضاد نہیں۔ اسلام ورڈ آف گاڈ WORD OF GOD ہے اور فطرت ورک آف گاڈ WORK OF GOD۔ چونکہ خدا کے قول و فعل میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اسلام اور فطرت میں بھی کوئی تضاد نہیں، جہاں کہیں ایسا تضاد موجود ہو اُس کی حیثیت محض ظاہری اور غیر حقیقی ہوگی۔ اس نقطۂ نظر کے حوالے سے سرسید نے اسلام اور گزشتہ صدی کے سائنسی علوم میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی تگ و دو کی۔

نو آبادیاتی نظام کے ڈھانچے کے اندر جنم لینے والی افسر شاہی کے فروغ سے برِّصغیر کے متوسط طبقوں کے لئے بہت سے معاشی اور سماجی مواقع پیدا ہو گئے تھے۔ تاہم اُن سے مستفید ہونے کے لئے انگریزی تعلیم اور تہذیب سے بہرہ ور ہونا ضروری تھا۔ ہندو پہلے ہی یہ راہ اختیار کر چکے تھے۔ مسلمانوں کو اس راہ میں لگانے کی خاطر سرسید نے علی گڑھ کے مقام پر ایک جدید طرز کے تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی انہوں نے دعویٰ کیا کہ اس ادارے کے قیام کا مقصد مسلمانوں کو تاجِ برطانیہ کا قابل اور مفید رعایا بنانا ہے۔

سرسید کا اندازِ فکر اور طرزِ عمل بہت سے لوگوں کے لئے ناپسندیدہ تھا۔ چنانچہ مختلف محاذوں پر اُن کی بھرپور مخالفت کی گئی۔ خاص طور پر متوسط طبقے کے قدامت پسند عناصر نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ عناصر قرونِ وسطیٰ کے نظریاتی، ثقافتی اور سماجی نظام کو قائم رکھنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی اسی گروہ کے ترجمان ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر نئی تہذیب جدید تعلیم اور اس کے مفروضہ نتائج کو طنز و تنقید و ملامت کا ہدف بنایا۔ لیکن انہوں نے خود اپنے صاحبزادے سید عشرت حسین کو اعلیٰ تعلیم کی خاطر کیمبرج بھیجا۔ یہ دو رُخی ہمیں طنز کرنے پر نہیں اکساتی بلکہ ایک پورے طبقے کے اخلاقی دیوالیہ پن، موقع پرستی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی المناک بے بسی آشکار کرتی ہے۔

کئی معروضی اسباب نے مل کر جلد ہی سرسید کی تحریک کے خلاف ردِ عمل پیدا کر دیا۔ سرسید کا نقطۂ نظر بہر طور حقیقت پسندانہ تھا۔ ردِ عمل نے رومان پرستی کی صورت اختیار کی۔ اس ردِ عمل کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ علی گڑھ تحریک نے متوسط طبقے کو نو آبادیاتی نظام کے کل پرزے بننے کے لئے تیار کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن یہ نظام انہیں پوری طرح استعمال نہ کر سکا۔ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسل میں ہی بے کار ہو گئے۔ ڈگریاں موجود

تھیں اور نوکریاں غائب۔ یوں یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں رہا تھا کہ انگریزی تعلیم بھی باعزت زندگی کا وسیلہ نہیں۔ دوسری طرف برطانوی راج میں صنعتی اور تجارتی ترقی جاری تھی۔ جس نے رفتہ رفتہ مسلم پڑھا لکھا طبقہ پیدا کرنا شروع کر دیا تھا یہ طبقہ ترقی کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی استعمار کے ساتھ اُس کے تضادات واضح ہونے لگے اور تصادم کا آغاز ہوا۔ ردِ عمل کا تیسرا سبب یہ تھا کہ بہت سے مقامی دانشوروں نے سرسید کی تحریک کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ وہ "ترقی" اور "تہذیب" کے دیوانے ہوئے جا رہے تھے مگر جب اس کے ناگزیر انقلابی نتائج اُبھر کر آنے لگے تو وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے کو بھاگے اور اپنے ہی بنائے ہوئے بت کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ خود سر سید احمد خان بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ سے کوئی اچھا پھل ہاتھ نہیں لگا" کیونکہ تعلیم یافتہ لوگوں نے پہلے تو یہ مطالبہ کیا کہ حکومت مقامی باشندوں اور انگریزوں کے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھے پھر انہوں نے آزادی کے چرچے شروع کر دیئے اور "ایجی ٹیشن" کے نعرے لگانے لگے۔

سید سلیمان ندوی نے 'حیاتِ شبلی' میں مولانا شبلی کا ایک دلچسپ جملہ نقل کیا ہے جو ردِ عمل کے رجحان کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ شبلی کہتے ہیں کہ "دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ وہ آگے بڑھیں۔ اور آگے مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں: اور پیچھے ہٹتے جائیں۔" فطری طور پر ردِ عمل کے دور میں قدامت پسند حلقوں کی مقبولیت اور قوت میں اضافہ ہوا وہ جتلانے لگے کہ ہم نہ کہتے تھے ان باتوں کا یہی نتیجہ نکلے گا۔ ان میں سے انتہا پسندوں نے دیوبند کے دار العلوم کی بنیاد رکھی اور اعتدال پسندوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دار الندوہ تعمیر کئے۔ دار الندوہ نے قوم کو شبلی اور سید سلیمان ندوی جیسے دانشور دیئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے خطیبان مقرر فراہم کئے اور مشرقی و مغربی علوم میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شبلی نے ندوہ کو ایسا علمی مرکز بنانا چاہا جو علی گڑھ کی جدت پسندی اور دیوبند کی قدامت پرستی کے بین بین ہو۔ اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دینی و لادینی اور مغربی و مشرقی علوم کا مشترک مطالعہ محال نہیں۔ لیکن اُن کا تجربہ بری طرح ناکام رہا۔ بالآخر انہیں پرانے خیال کے علماء کے دباؤ کے تحت ندوۃ العلماء سے الگ ہونا پڑا۔

دیوبند کے مکتب نے پرانے خیال کے لوگوں میں بہت مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ یہ استعمار دشمن اور قوم پرست علماء کا شمالی ہند میں سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ انہوں نے مغربی علوم کو یکسر مسترد کر دیا اور ملی روایات کو فروغ دیا۔ ایک درس گاہ کے طور پر دار العلوم دیوبند ہندی مسلمانوں کے روایتی علوم اور تہذیبی ورثے کا امین تھا۔ اس کے اربابِ فکر و نظر نے استعمار دشمنی کی بنا پر جدید علوم و فنون کی نفی کی۔ اس فیصلے کے پس پردہ صرف منفی محرکات کارفرما نہیں تھے۔ جدید علوم محض جدید علوم نہیں۔ گزشتہ صدی کے ہندوستان میں انہیں قبول کرنا نو آبادیاتی صورت حال کو قبول کرنے پر دلالت کرتا تھا۔ لہٰذا علوم جدیدہ کی نفی اصل میں غیر ملکی حکمرانوں کی برتری کو ذہنی طور پر مسترد کرنے کے مترادف تھی۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن جیسی فعال اور ہمہ گیر شخصیت کی سرکردگی میں دیوبند کے دار العلوم اور تحریک نے نمایاں ترقی کی اور وہ مسلم ہند کی انقلابی تحریکوں کا مرکز بن گیا۔ تاہم مذہبی فکر کے حوالے سے اُس سے وابستہ علماء قرونِ وسطیٰ کی الہیات سے آگے نہ جا سکے۔ وہ سختی سے اس عقیدے پر کاربند رہے کہ اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ لہٰذا آزادیٔ فکر کا جواز موجود نہیں۔ یوں وہ فکری طور پر جامد ہو گئے۔ نئی صورتِ حال کے حوالے سے ان کا اندازِ فکر جامد اور غیر تخلیقی رہا۔ لہٰذا اُن کی تحریک سمٹتی چلی گئی اور علی گڑھ تحریک کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔ خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ اُس سے دور ہوتا گیا۔

ترقی پذیر مسلم پڑھا لکھا طبقے کے نمائندوں کے طور پر سر سید احمد خان اور مولوی چراغ علی کے بعد سید امیر علی صاحب نے شہرت پائی۔ انہوں نے علی گڑھ نقطۂ نظر کو ایک نیا رخ دیا۔ اگرچہ انہوں نے بہت سے خیالات سرسید سے حاصل

سکتے تھے مگر ان کا رویہ مدافعانہ نہیں تھا، جارحانہ تھا۔ سرسید نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ امیر علی نے یہ یقین دلایا کہ اسلام کے بغیر ترقی محال ہے۔ اس نئے نظریے نے بورژوا طبقے کو خود اعتمادی عطا کی۔ عوام نے سرسید کے مذہبی خیالات مسترد کر دیئے تھے لیکن وہ بھی اس نئے نظریے کی کشش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس طرح ایک ایسی آئیڈیالوجی مرتب کرنے کا اسباب فراہم ہو گئی جو ہندی مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی سماجی، ذہنی، جذباتی اور روحانی ضرورت پوری کر سکتی تھی۔ بورژوا طبقے نے نئے جذباتی انداز میں پرچار شروع کر دیا۔ ماضی کی رومانی تصویر کشی کی گئی۔ اُسے شوخ رنگوں سے سجایا گیا۔ خلافتِ راشدہ اور عباسی خاندان کی تاریخ کو افسانوی انداز میں پیش کیا گیا۔ تاریخی ناولوں کی بھرمار ہونے لگی۔ بزرگوں کے علمی کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا اور یورپ کی ہر قسم کی ترقی، جدید علوم اور سائنس کے مآخذ اسلامی تاریخ میں تلاش کئے گئے یہ گویا حکمرانوں سے انتقام لینے کے لئے ایک رومانوی صورت تھی۔

سرسید کے حامیوں نے 'عظیم الشان ماضی' کے علمبرداروں اور رومان پرستوں کو آڑے ہاتھ لیا۔ نواب عماد الملک بلگرامی نے علیگڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"ہم مسلمانوں میں آج کل ایک نیا مرض شائع ہو گیا ہے۔ جس کو اسلاف پرستی کہتے ہیں ۔۔۔ ان حضرات نے آفت برپا کر دی ہے۔ کوئی مسلمانوں کی علمی دولت کو شمار کرتا ہے۔ کوئی تمدنی خوبیاں گنتا ہے۔ کوئی ہمارے مدارس اور یونیورسٹیوں کی فہرست تیار کرتا ہے۔ کوئی ہماری یونانی کتابوں کے ترجموں کا حساب دیتا ہے۔ کوئی اندلس کی حکومت کا زور دکھاتا ہے۔ کوئی ہارون اور مامون کی شان بیان کرتا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ اسلاف پرستی بہت عمدہ شیوہ ہے۔ مگر اسی حد تک کہ ہم اپنے بزرگوں کی محنت، اُن کی یک رنگی، ان کی نفس کشی کی تقلید کریں اور اُن کا سا صبر و استقلال اُن کا سا انہماک طلبِ علم میں پیدا کریں ۔۔۔ نہ یہ کہ ہمارے بزرگوار جو کچھ اپنے وقت میں کر گئے تھے اُن پر غرہ کریں اور مثل زنِ بیوہ کے ان کے نام پر بیٹھ رہیں اور اُن کی علمی بزرگیوں کا تذکرہ دوسروں سے سن کر زمانۂ حال کی دولتِ علمی کو حقیر سمجھیں اور اُس کے دریافت سے اغماض کریں۔"

رومان پرستی کے اس دور میں بین الاقوامی اسلامی اتحاد کے بھی چرچے ہوئے یہ تصور شاہ ولی اللہ کے ہاں بھی ملتا ہے تاہم انیسویں صدی میں جمال الدین افغانی نے اُسے شد و مد سے پیش کیا۔ اتحادِ اسلامی کے اس جہاں گرد داعی نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ ہندوستان میں قیام کے دوران انہوں نے سرسید کی انگریز نواز حکمتِ عملی کی مذمت کی اور "الرد علی الدہریین" کے عنوان سے ایک رسالے میں سرسید کے مذہبی خیالات پر نکتہ چینی کی۔ بعد ازاں انہوں نے پیرس سے "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں سرسید کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا تھا۔

جمال الدین افغانی کی شخصیت اور افکار نے بہت سے ہندی مسلم دانشوروں کو متاثر کیا تھا۔ اس لئے ہم انہیں جائز طور پر زیرِ بحث لا سکتے ہیں۔ اصولی طور پر افغانی مغربی تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ اس کے برعکس وہ سمجھتے تھے کہ مغربی علوم پر عبور حاصل کئے بغیر مسلمان دنیائے جدید میں باعزت مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ سرسید کی مانند وہ بھی مذہب اور سائنس میں دوری ختم کرنا چاہتے تھے چنانچہ 'مقالاتِ جمالیہ' میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"قواعدِ طبیعیہ، دلائلِ ہندسیہ اور براہینِ فلسفہ ۔۔۔ یہ سب کے سب بدیہیات ہیں۔ اس لئے اگر کوئی یہ کہے کہ میرا دین بدیہیات کے منافی ہے تو گویا خود اس نے اپنے دین کا ابطال کر دیا۔"

علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں جمال الدین افغانی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"۔۔۔ ہم مسلمانوں کو ایک بہت بڑا

کام فیصلہ کن ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ فکر از سرِ نو غور کریں۔ یہ غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے ایک نئی روح کی بیداری محسوس کی۔ لیکن اس عظیم الشان فریضے کی حقیقی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا اندازہ تھا تو سیّد جمال الدین افغانی کو جو اسلام کی حیاتِ ملی اور حیاتِ ذہنی کی تاریخ میں بڑی گہری بصیرت کے ساتھ طرح طرح کے انسانوں اور ان کی عادات و خصائل کا خوب خوب تجربہ رکھتے تھے اُن کا مطمحِ نظر بڑا وسیع تھا اور اس لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ ان کی ذاتِ گرامی ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک جیتا جاگتا رشتہ بن جاتی "

گب نے علامہ اقبال کی اس رائے سے جائز طور پر اختلاف کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سیّد افغانی کا تدبّر غیر حقیقت پسندانہ تھا اور اُن کا اتحادِ اسلامی کا تصوّر محض رومان پرستی تھا۔ اسی لئے عام طور پر انہیں سیاسی شورش پسند قرار دیا جاتا تھا، انہوں نے مادّی، تہذیبی، اخلاقی اور سیاسی طور پر دیوالیہ خلافتِ عثمانیہ کو عالمِ اسلام کے اتحاد کی اساس بنانا چاہا تھا۔ بہر طور سید افغانی نے برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ تحریکِ خلافت اور بہت سے دانشوروں نے ان سے تخلیقی تحریک حاصل کی ہے۔

معاشرتی تحول کے سلسلے میں ابھی دو دانشوروں کا ذکر باقی ہے۔ ان میں سے ایک مرزا غلام احمد ہیں اور دوسرے مولانا شبلی نعمانی۔ ان دونوں نے سرسیّد احمد خان کے بہت سے اثرات قبول کئے ہیں۔ لیکن ان سے شدید اختلاف بھی کیا ہے۔ مرزا غلام احمد کا شمار پرانے انداز کے متکلمین میں کیا جانا چاہیئے، جنہوں نے قرونِ وسطیٰ کے طرز کو قائم رکھا تھا۔ نو آبادیاتی نظام محکوم قوموں کی روحانی زندگی کو جس بدترین حد تک مسخ کر دیتا ہے، مرزا غلام احمد کا فکری نظام اس کی ایک واضح مثال ہے۔ اس فکر کا سماجی اور سیاسی پہلو رجعت پسندانہ ہے اور اس نے قومی محکومیت کا مذہبی، الہامی اور الہیاتی جواز فراہم کیا ہے۔ یہ نہ صرف ہندی مسلمانوں کے روحانی افلاس کا مظہر ہے۔ بلکہ اس نے اس صورتِ حال کو برقرار رکھنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ تاہم مرزا غلام احمد کی تحریکِ احمدیہ کی مکمل طور پر اس حوالے سے توجیہہ کرنا حقائق کو مسخ کئے بغیر محال ہے۔ نفسیاتی۔ سماجی اور فکری مظاہر پیچیدہ اور کثیر الاسباب ہوتے ہیں۔ احمدیہ تحریک کی تشکیل میں بھی بہت سے عوامل نے حصہ لیا ہے۔ لہٰذا یہ ایک پیچیدہ تحریک ہے۔ یوں اس میں کئی ایک تضادات بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ ہندی مسلمانوں کی غلامی کو مذہبی جواز عطا کرتی ہے تو دوسری طرف اس تحریک کے بانی نے شعوری سطح پر یہ کوشش کی تھی کہ غیر ملکی آقاؤں پر مذہبی حوالے سے زبردست یلغار کی جائے اور صرف انہیں بلکہ تمام مغربی اقوام کو اسلام کی صداقت اور بالا دستی قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس لحاظ سے احمدیہ تحریک میں جارحانہ عنصر موجود تھا تاہم تاریخی عمل کے دوران اس تحریک کا پہلا رُخ غالب رہا ہے۔ لہٰذا اس منفی پہلو کو ہی فیصلہ کن قرار دینا ہوگا۔

جہاد کا نظریہ احمدیہ فکر میں ایک متنازعہ مسئلہ رہا ہے۔ مرزا غلام احمد کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جہاد بالسیف کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب جہاد بالقلم اور جہاد باللسان کا عہد ہے۔ سرسید احمد خان اور مولوی چراغ علی بارہا یہی تصور دہرا چکے تھے۔ لیکن مرزا غلام احمد نے اُن کی طرح یہ تصوّر عقلی انداز میں پیش نہیں کیا۔ بلکہ اسے الہام کا نتیجہ ٹھہرایا۔ اس سے وہ لوگ بھڑک اُٹھے جو سرسید اور چراغ علی کے نظریوں کو قبول کر چکے تھے۔ بعد ازاں مرزا غلام احمد نے اپنے روحانی مقام کے بارے میں عجیب و غریب دعوے کرنے شروع کر دیئے۔ ان میں مجدد اور نبوت کا ادعا بھی شامل تھا۔ اس سے مسلمانوں کی غالب اکثریت نے انہیں مسترد کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کے پیروؤں کو اب سرکاری طور پر غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔

مرزا غلام احمد نے سرسید کی عقلیت پرستی کو مکمل طور پر مسترد کرتے ہوئے از سرِ نو صالح تقلید

کو رواج دینے کی کوشش کی تھی۔ مولانا شبلی نے علامہ اقبال کی طرح دونوں کے درمیان راہ تلاش کی ہے۔ شبلی نے سرسید اور علی گڑھ سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ لیکن اُن میں زمین اور ماضی کے ساتھ رشتہ قائم رکھنے کی خواہش بہت شدید تھی۔ وہ مشرقیت اور اپنے شاندار قومی ماضی سے کنارہ کش نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ورثے کو قبول کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا درس دیا۔ ترقی یہ نہیں کہ پہلا قدم از سرِ نو اٹھایا جائے اور روایت سے قطعِ تعلق کر لیا جائے۔ ترقی یہ ہے کہ اپنی روایت کو جدید سانچے میں ڈھالا جائے۔ ہمارا ورثہ ہماری ملکیت ہے۔ ہم اُس سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ مؤرخ شبلی نے اس تہذیبی ورثے کو قابلِ فخر ثابت کیا۔ اب اُس سے منہ موڑنے کا جواز نہیں تھا۔ تاہم جدید تہذیبی حاصلات کو بھی نظر انداز کرنا محال ہے۔ اگر قدیم و جدید میں اختلاف ہے تو ہمارا کام یہ ہوگا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو رد کرنے کی بجائے ان میں ترکیب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ شبلی کا نصب العین یہی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"دولتِ عباسیہ کے وجود کے ساتھ جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو دفعتاً ایک انقلاب ہو گیا۔ پہلے علما نے یونانی سے ترجمہ کیا۔ پھر دوسرے گروہ نے ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم کے سادہ ایوانوں پر مینا کاریاں اور نقش آرائیاں کیں۔ ان باتوں کے ساتھ علومِ قدیمہ کی غلامی نہیں کی، بلکہ جو کچھ کیا آزاد و خود مختار بن کر ـــ، جو غلطیاں کیں اُن کی اصلاح کی ـــ جو فضول حصہ تھا، اُس کو الگ کر دیا۔ آج بھی بعینہٖ وہی حالت ہے۔ یورپ نے علوم و فنون کا قالب بدل دیا۔ آج اگر اسلاف ہوتے تو وہ علوم و فنونِ جدید کو پیشِ نظر رکھ کر وہی کرتے جو انہوں نے علومِ قدیم کے ساتھ کیا۔ علمِ کلام کو فلسفۂ جدیدہ کے مقابلہ میں مرتب کرتے، تاریخ اور واقعہ نگاری کا قالب بدلتے، مسائلِ جدیدہ کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام علوم و فنون کے متعلق قدیم و حال کی تحقیقات کا موازنہ کرتے اور دونوں کے عیب و ہنر دکھا کر فیصلہ کرتے کہ کیا چیزیں قابلِ قبول ہیں اور نئی تحقیقات کو علومِ قدیمہ کے ساتھ کیونکر پیوند دیا جا سکتا ہے یا ان کے بننے پر علومِ قدیمہ کی روش کیونکر بدل سکتی ہے؟ یہ سچ ہے کہ آج قوم میں غزالی اور رازی نہیں۔ لیکن ان کی تصانیف ہمارے لئے چراغِ راہ بن سکتی ہیں۔ ان کی روشنی میں ہم اس قدر معلوم کر سکتے ہیں کہ نئے راستے میں کیونکر قدم اٹھانا چاہیے اور قدیم و جدید راہیں کہاں جا کر ملیں گی۔"

علی گڑھ والوں نے تاریخ کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ حال اور مستقبل کو اہمیت دیتے تھے۔ شبلی کے ہاں ماضی کے ساتھ تعلق حیاتی اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا فطری طور پر انہوں نے اسلامی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر کئی گراں قدر کتب لکھی ہیں۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ عظمتِ رفتہ کو ایسے انداز میں پیش کیا جائے کہ مسلمان اُسے خود اعتمادی کے ساتھ قبول کر سکیں۔ ایک لحاظ سے یہ جد و جہد نوآبادیاتی منطق کی تردید بھی تھی۔ کیونکہ نوآبادکار محکوم قوموں کا ان کے ماضی اور تہذیب و تمدن کے ساتھ رشتہ ناطہ ختم کر کے انہیں اذیت ناک احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔

شبلی نے تاریخ نگاری کے جدید اصول بھی مرتب کئے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں جائز طور پر اُردو کا اوّلین فلسفی مؤرخ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر لبرل رجحانات کا حامل ہے۔ تاہم اُس میں جاگیردارانہ ذہنیت کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ کارلائل اور گبن ان کے رہنما ہیں۔ اُن کا رہنما اصول یہ ہے کہ تاریخِ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلے میں بندھا ہوا ہے۔

رضا ہمدانی

زخمِ شمشیر

پشتو ادب اپنی خیال افزا روایات کا امین، اور اپنے ماحول کے درخشاں ماضی کا بے باک ترجمان ہے۔

پشتون معاشرے کی عہدِ ماضی کی وہ درخشاں روایات جن کو دہرانا تحصیلِ حاصل ہے، تاریخ کے اوراق کی زینت تو ہیں۔ لیکن گویائی سے محروم اور اکنِ مصحف کی طرح ٹکر ٹکر، اپنے قاری کا منہ تک رہی ہیں، اب تک اسے کوئی ایسا قاری میسر نہیں آیا۔ جو اس کے اشاروں کنایوں کی زبان کو سمجھ سکے یا دوسروں کو سمجھا سکے

تاریخ سے ہٹ کر، پشتو ادب، بالخصوص پشتو کے لوک ادب پر نظر ڈال جائے۔ تو وہ اپنی زندہ دھڑکنوں کے ساتھ اپنے ہر قاری اور سامع کے ساتھ کلام کرتا نظر آتا ہے۔ وہ صدیوں کے واقعات کو ایک داستان گو کی طرح بیان کرتا ہے۔ اور گزرے ہوئے کل کی بات کو کچھ اس طرح دہراتا ہے کہ وہ آج کے ماحول کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

ادب کو چونکہ ماحول کا عکاس کہا جاتا ہے۔ اس لئے پشتو ادب میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے وہ اپنے ماحول کی طرح، اپنے ہر لفظ اور ہر شعر میں جرأت، ننگ و غیرت، مروت اور وفاداری کے عناصر رکھتا ہے۔

جغرافیائی حدود کے سبب، صوبہ سرحد پاکستان کا ایک اہم صوبہ وصعت و تجسیمِ عمل و قومی اور وطنِ عزیز کا بازوئے خارا شگاف ہے۔

ادبی تاریخ کے حوالے سے یہ بات ثابت ہے کہ "پختون خواہ" کے جیالے باسیوں نے ہمیشہ اجنبی سامراج کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور ظلم و تعدی کے لاؤ لشکر کو ناکوں چنے چبوائے۔ چونکہ پشتون معاشرہ ہمیشہ صاحب سیف و قلم رہا ہے۔ لہٰذا اگر یہاں تلوار کے دھنی محاذِ جنگ پر شمشیر بدست، سر ہتھیلی پہ لئے نظر آتے ہیں تو اہلِ قلم اور شاعر ایک وقائع نگار کی طرح، اپنے جیالوں کے کارنامے لوک گیتوں کی لڑیوں میں پروتے ہوئے ملتے ہیں۔ لوک گیتوں کی یہی مالائیں ہمیں ان سرفروشوں کی یاد دلاتی ہیں۔ جو وطن کی آن پر مر مٹنے کے بعد بھی، اپنا نام اور کام ترانوں اور گیتوں کی شکل میں، آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے لئے چھوڑ گئے۔

بقول خوشحال خان خٹک:۔

"کابل ہو یا کشمیر، فتح تلوار ہی کی ہے۔ وہ لوگ کتنے خوش بخت اور جیالے ہیں۔ جو گیتوں اور جن میں یاد کئے جاتے ہیں"

ماضی بعید سے قطع نظر، جب ہم ماضیٔ قریب کے پشتو لوک ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو اس میں وہ گیت سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ جو سکھا شاہی، اور انگریز سامراج کے خلاف تخلیق کئے گئے، طوالت کے خوف سے ہم صرف ان گیتوں کی جھلکیاں پیش کریں گے۔ جن کا تعلق انگریز سامراج کی عیاریوں اور ظلم و ستم اور ہوسِ ملک گیری کے ساتھ ہے۔

پشتو ادب مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل ہے۔ مثلاً ٹپہ، لوبہ نیمکئی، بدلہ اور چاربیتہ وغیرہ

ان اصناف میں ہر موضوع پر، اپنی اپنی پسندیدہ صنف میں شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔

قدیم مکتبۂ فکر کے شعرا، اپنے ماحول سے ہر لحظہ متاثر اور الرجک رہے ہیں۔ قبیلوں اور دیگر علاقوں کے علاوہ ہر اجنبی حکومت کے ساتھ سرحد کے جیالوں نے پنجہ آزمائی کی، جب انگریز سامراج نے اس دھرتی پہ قدم رکھا اور اس کی دست درازیاں انتہا کو پہنچ گئیں۔ تو دلوں کے اندر کا لاوا اشعار کی شکل میں ابھر آیا تو ماضی کی تابندہ تاریخ کے نقوش پہ ثبت کرتا چلا گیا۔ مثلاً جب انگریزی فوج نے چترال پر چڑھائی کی، تو شاعر نے کہا،

"کہاں لندن اور کہاں چترال سے حقیقت عام ہو گئی ہے۔ انگریز چترال پر دعا بول رہا ہے؟

"مرد میں آزادی بناؤ سنگار میں مصروف ہے۔ ہر جوان کے دل میں یہی آرزو ہے۔ کاش

اگست ۱۹۷۹ء

یہ میری ہو جاتے ؟

"اگر انگریز مجھے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دے، جب بھی، میں قومی حمیت و وقار پر آنچ نہ آنے دوں گا۔"

"اے محبوب اور دشمن کو آگ کی سرخ گولیوں میں دفن کر دے۔

اگر کارتوس ختم ہو گئے تو میں اپنے گلے کا ہار گروی رکھ کر کارتوس لا دوں گی۔

(اے لوگو) آؤ، تاکہ ہم سب شمشیر بدست ہو کر دشمن کے خون سے ملک کو سیراب کر دیں۔"

"عروسِ آزادی پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ یاد رکھو! میں غلامی کی فضا میں پلنے والے محبوب کو بوسہ نہیں دوں گی۔"

۱۸۹۵ء میں جب انگریز سامراج نے صوبہ سرحد کے زرخیز حسین و جمیل خطے چترال کو اپنی ہوسِ ملک گیری کا نشانہ بنایا تو "چترال کی لام" کے زیرِ عنوان ایک چاربیتہ گو شاعر نے ایک چاربیتہ کہا۔ جو جنگِ چترال کی ہو بہو تصویر ہے۔

"انگریزوں نے چترال پر لام بندی کا اعلان کر دیا ہے (دیکھیں) انہوں نے چترال میں کس طرح جنگ و جدل کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ درگئی ان کا ہیڈ کوارٹر ہے سوات پر قابض ہو چکے ہیں۔ اور اب بنیر پر قبضے کی فکر میں ہیں۔"

"انگریزوں نے لاؤ لشکر جمع کر لیا ہے۔ مالاکنڈ میں قتل و غارت ہو رہی ہے۔ غازیوں نے اپنا سر اور مال داؤ پر لگا دیے ہیں۔ پھول کملا رہے ہیں۔ بے رحم مالی کے دریا میں ڈوب رہے ہیں۔ ایک شہزادہ غالب کا دمِ غنیمت ہے۔ اس کا چہرہ مشعل کی طرح روشن ہے۔"

"شہیدوں کا چہرہ خون سے گلرنگ ہے۔ وہ عشق کی آگ میں ستی ہو رہے ہیں۔ خار اور بٹ خیلہ میں جنگ ہو رہی ہے۔ خوانین آپس میں مشورے کر رہے ہیں۔ سارا سوات، سراپا ماتم و ننگ بن گیا ہے۔ مگر یہ خوانین؟ انہوں نے دشمن کو اپنی پناہ میں لے رکھا ہے۔ بڑے کم عقل ہیں۔ یہ بھلا کب اپنی جان اور مال کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔"

۲۳ راپریل ۱۹۳۰ء کو جنگِ آزادی میں انگریز سامراج نے سرحد کے بہادروں اور جنگِ آزادی کے سپاہیوں کو جس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنایا تھا، وہ انگریز حکمران کی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ ان خونیں واقعات کی گونج سے انگلینڈ کی پارلیمنٹ بھی لرز اٹھی تھی۔ برصغیر میں انگریز نے آزادی خواہوں پر جو مظالم توڑے ان میں، امرت سر کا جلیانوالہ باغ اور قصہ خوانی بازار کی فائرنگ بڑی اہمیت رکھتی ہے ان واقعات نے انگریز کی سامراجیت پر بہت بڑی ضرب کاری لگائی تھی۔ ۲۳ راپریل ۱۹۳۰ء کے المیہ کو پشتو لوک گیت میں جس زاویئے سے دیکھا گیا، اس کی ایک جھلک:

انگریز کے خلاف ہر گھر میں نفرت موجود ہے ہر دل انتقام کے شعلوں سے معمور ہے۔ اس پس منظر میں ایک تن آسان اور انگریز پسند شوہر اور اس کی آزادی پسند بیوی کا مکالمہ:

"اے بھلے مانس۔ کفر و اسلام کے درمیان جنگ ہے۔ دوسرے لوگ تو آزاد ہیں ـــــ اور ہماری قوم اب تک غلامی میں جکڑی ہوئی ہے۔ بس اب بہت ہو چکی۔ اٹھ اور جلدی سے میدان میں کود کر اپنی جان حق کے حوالے کر، اور اپنے اجڑے ہوئے وطن کی آبادی کی فکر کر، میں اپنی جبیں پر ہاتھ رکھ کر تجھے سلام کرتی ہوں، بس اب جنگ پر جانے کے لئے تیار ہو جا!"

شوہر مصلحت کوش ہے۔ وہ مراعات یافتہ بھی ہے۔ انگریز کے ساتھ مقابلے کرنے کا قائل نہیں۔ اس کا خیال ہے:-

"اے ناسمجھ عورت، اس جنگ میں ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے پاس ڈھیروں دولت پڑی ہے۔ ورنہ میں لڑنے مرنے میں شیر سے کسی طرح کم نہیں۔ مگر اس تحریک میں حصہ لینا سراسر نقصان ہے۔ اگر میں شریکِ جنگ ہوتا ہوں تو میرا گھر بار برباد ہو جائے گا۔ اور (حکومت) کے ہاتھوں میرا مال و اسباب نیلام۔"

شوہر اور بیوی کے درمیان سوال و جواب کا یہ سلسلہ بڑا طویل بھی ہے۔ خیال انگیز بھی اور نتیجہ خیز بھی۔ تاہم بحث و تمحیص کے بعد، شوہر قائل ہو جاتا ہے اور آخرکار وہ جنگِ آزادی کے سپاہیوں میں شریک ہو کر، وطن کی خدمت کیلئے کمربستہ ہو کر کہتا ہے:-

"اے نازنین تو میری بیوی اور میں تیرا شوہر، مجھ سے رو ٹھ کر نہ جا۔ میں جنگِ آزادی میں شریک ہونے جا رہا ہوں۔ یاد رکھ، اگر میں شہید ہو جاؤں تو پھر تم میدانِ جنگ میں مقابلے کے لئے آجانا، اے میری شریکِ حیات مجھ سے بھول ہوئی، میرا سلام رخصت قبول کر۔"

شوہر کو آمادۂ جنگ دیکھ کر، وہ پھولی نہیں سماتی اور اپنے شوہر پر فخر کرنے لگتی ہے۔

"الحمد اللہ کہ تو نے سچے سے اسلام میں داخل

ہوا۔ اور تیرے خلوص نے تجھے پاک حضرتؒ کے دین کا راستہ دکھایا، اب مجھے رستمِ ثانی اور بہادر جوان لگ رہے ہو، اب میں اپنے سینے کا باغ تجھے انعام میں پیش کروں گی۔"

افغانستان کے خلاف انگریزوں کی سازشیں کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ امیر امان اللہ خان کی حکومت کے خلاف جو ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ اس کے نتیجے میں، ان کو ملک چھوڑنا پڑا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فرنگیوں نے کابل میں اپنے ڈھب کی ڈمی گورنمنٹ قائم کردی۔ اور کابل کے حکمران کو اپنی مکاریوں کے جال میں اس طرح اسیر کردیا کہ وہ بے بس ہوگیا۔ کابل کی غلام بندی کے سلسلے میں ملا مقصود نے جن حقائق کو نظم میں پرو دیا ہے۔ اس کا عکس کچھ اس طرح ہے:۔

"یعنی۔ انگریز نے تختِ کابل پر قبضہ کرلیا، اور امیر کابل کو بڑی عیاری اور مکاری سے گرفتار کرلیا، اور اس کا گھر بار غارت کردیا۔"

انگریز نے کابل کو فتح کرنے میں جس طرح کامیابی حاصل کی اس کے متعلق شاعر کا خیال ہے:۔

"زر و مال کے بل بوتے پر، فرنگی نے کامیابی حاصل کرلی۔ امیر کابل کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ وہ مجبور و کمزور تھا، اس کی سلطنت غارت ہوگئی تھی۔ وہ بے بسی کے عالم میں سب کچھ اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے نابینا اور بہرا۔ اس نے یعقوب خان کو گلے لگایا اور کہا، میری جان انگریز نے کابل میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں، سارا ملک طوفانی ہوگیا ہے۔"

انگریز کی مکاری کا جال کچھ اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ اس سے سرحد کا کوئی فرد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، ذیل کے لوک گیت میں اسی کیفیت کو قلم بند کیا گیا ہے:۔

"اے میرے شاگرد، ذرا مجھے یہ تو بتا کہ یہ لوگ کیوں کر عزاداری کر رہے ہیں۔ کہیں قیامت تو نہیں آگئی جو ہر شخص غم میں مبتلا ہے۔ نہ ہندو خوش ہے اور نہ مسلمان۔"

"اے استاد جواب سن لے اور اچھی طرح سمجھ لے کہ کافر اکٹھے ہوگئے ہیں۔ کفار کا ظلم و جور ہر طرف دندنا رہا ہے، اس لئے ہر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ سب لوگ رو رہے ہیں۔ اور مکہ معظمہ کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کفار مکے پر چڑھائی کے ارادے رکھتے ہیں۔ ہندو مسلمان دونوں پر لرزہ طاری ہے۔ فرنگی کے ہاتھوں ہر شخص عذاب میں مبتلا ہے۔ انگریز کی فوجیں آگئی ہیں۔ اللہ خیر کرے۔ نئے نئے احکام جاری ہو رہے ہیں۔ اب تو یہ کابل، پنجاب اور ہندوستان پر دھاوا بول رہی ہیں۔ ہندو مسلمان پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔"

درہ خیبر، کھلا بیا جوڑ اور وادیٔ پشاور انگریزوں کی گولیوں سے لالہ زار بن گئی تو ہر دل سے نفرت کا لاوا نکل کر دور دور تک پھیل گیا۔ یہ گیت انہیں ایام کی یادگار ہے:۔

"تاوا گئی، کے محاذ پر، ننھے ننھے سفید پھول مرجھا گئے۔ میدانوں میں جنگ جاری ہے۔ گورا فوج کا لشکر سارے کا سارا کٹ چکا ہے، اب ان کی لاشیں دامانِ کوہ کے گیدڑ نوچ رہے ہیں۔ دشمن کو خیبر سے بھگا دیا گیا ہے۔ میرے محبوب نے ڈکہ کا مورچہ سنبھالا ہے۔"

اجنبی سامراج کے خلاف نفرت کی یہ لہر اتنی شدید ہے کہ مشہور عوامی صنفِ 'لوری' میں بھی در آئی ہے۔ 'لوری' کو پشتو میں "اللہ ہو" کہتے ہیں۔ ممتا بھری گود جب اپنے لاڈلے کو نیند کی جھیلوں میں اتارنے لگتی ہے تو اللہ ہو کی ترنم ریزی سے اس کے انگ انگ میں سکون و آرام کا شہد بھر دیتی ہے۔

یوں تو پشتو لوری میں، برصغیر کی دوسری زبانوں کی طرح پیار محبت کے نغموں کی فراوانی بھی ہے۔ مگر پشتو زبان کی لوری میں، غیرت و حمیت کے جذبات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ پشتون ماں اپنے پشتون بچے کے کانوں میں رسیلے بولوں کے ساتھ ساتھ تلوار کی جھنکار اور آتشیں گولیوں کی شو کرتی ہوئی آوازوں کے شعلے بھی انڈیلنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایسی ہی ایک لوری میں، ماں، اپنے قبیلوی تفوق کے اظہار اور فرنگ دشمنی کی اونچ نیچ اپنے لاڈلے بچے کو کچھ اس طرح سمجھاتی ہے:۔

"سوجا، مری جان، سوجا۔ تیرا باپ جنگ پر گیا ہوا ہے۔ وہ اپنے پہلو میں شمشیرِ براں حمائل کئے ہوئے ہے۔ وہ اپنا سر وطن پہ قربان کردے گا وطن پر فرنگی نے حملہ کردیا ہے۔"

"تیرا باپ جہاد پر ہے۔ وہ غزا کرنے گیا ہے وہ دشمنوں کو فنا کردے گا اور رہتی دنیا تک اس کا نام زندہ رہ جائے گا۔"

غرض پٹھانوں کے لوک گیت، نہ صرف قبیلوی چپقلشوں کا آئینہ ہیں۔ بلکہ فرنگی سامراج کے مظالم اور مذموم ہتھکنڈوں کی بھی زندہ جاوید تصویر ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

بلوچستان میں ادب و صحافت

تحریکِ پاکستان کے دور میں

۱۹۲۸ء میں قائدِ اعظمؒ کے معروف چودہ نکات میں صوبہ سرحد اور بلوچستان کو صوبائی درجہ دینے کا مطالبہ کیا گیا جیسا کہ ہندوستان کے دیگر صوبوں کو حاصل تھا۔ بعد ازاں آل انڈیا مسلم لیگ کے تقریباً ہر اجلاس میں بلوچستان کے لئے اس مطالبہ کا اعادہ ہوتا رہا۔ ۱۹۳۶ء میں جب قائدِ اعظم سنٹرل اسمبلی کے ممبر تھے تو انہوں نے مسٹر غلام بھیک نیرنگ پر زور دیا کہ وہ بلوچستان کے لئے صوبائی خود مختاری کی قرارداد پیش کریں۔

۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی جس میں قائدِ اعظم محمد علی جناح، مسٹر فضل الحق، سر سکندر حیات خاں اور اسی پایہ کے دوسرے لیگی زعماء نے کانفرنس میں شرکت کی۔ بلوچستان میں گو اُس وقت اس جماعت کی کوئی باقاعدہ شاخ نہ تھی۔ تاہم لیگی نظریات رکھنے والے حضرات خاصی تعداد میں تھے۔ چنانچہ لکھنؤ کانفرنس میں بلوچستان کے ایک نمائندے نے بھی شرکت کی اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بلوچستان کی صوبائی خود مختاری کے سلسلے میں قرارداد منظور کی گئی۔ بلوچستان کے لوگ مسلم لیگ کی اس خیر سگالی سے بے حد متاثر ہوئے اور صوبے میں لیگ کی شاخ قائم کرنے کیلئے فضا سازگار ہوتی چلی گئی۔

قاضی محمد عیسٰی اپنی تقریر "تحریکِ آزادی بلوچستان میں" (مطبوعہ آہنگ، کراچی، ۸ ستمبر ۱۹۷۱ء) کہتے ہیں: "دسمبر ۱۹۳۸ء میں تحصیلِ تعلیم سے فارغ ہو کر میں انگلستان سے واپس اپنے وطن آیا، ارادہ تھا کہ کسی موزوں جگہ پر اپنی قانونی پریکٹس شروع کروں گا۔ لیکن پیشتر اس کے میں نے چاہا کہ کم از کم ہندوستان کو بھی دیکھا جائے جبکہ میں یورپ کو دیکھ چکا ہوں اس مقصد کے تحت میں ۱۹۳۹ء کے آغاز میں بمبئی پہنچا، جہاں میری ملاقات بابائے قوم حضرت قائدِ اعظمؒ سے ہوئی اور انہوں نے بلوچستان میں مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالنے کا کام میرے سپرد کیا۔ یہاں بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ میرے ہاتھوں پہلا شخص جس نے بلوچستان میں مسلم لیگ کی ممبری قبول کی وہ مرحوم اخوند زادہ عبدالعلی تھے علاوہ ازیں جدوجہد میں جو دورہ میں نے مسلم لیگ کے قیام کے لئے کیا مرحوم اخوند زادہ نے میرا ساتھ دیا۔"

علامہ عبدالعلی (۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء — ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء) ایک جید عالم تھے۔ ان کی ذہانت اور تبحرِ علمی کا چرچا بلوچستان کے علاوہ قندھار، کابل، سندھ اور ہندوستان میں بھی تھا۔ کابل، قندھار اور دہلی سے علماء، خانوزئی (ضلع پشین) آتے اور ہفتوں علامہ موصوف کے ساتھ علمی مباحث میں مصروف رہتے ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) کے لگ بھگ خانِ قلات نے آپ کو ریاست کا وزیرِ معارف اور قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ آپ نے دو تین سال تک اپنے فرائض بطریقِ احسن سرانجام دیئے۔ بعد میں خانگی امور کے پیشِ نظر مستعفی ہو کر طب اور زمینداری کی جانب متوجہ ہوئے۔ آپ پشتو اور فارسی کے عظیم شاعر تھے آپ کے ذاتی کتب خانہ میں بہت سے قلمی نوادرات تھے۔ آپ نے بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں نمایاں کام کیا۔ ۲۶ جون ۱۹۴۳ء کو قائدِ اعظم محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ اپنی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح اور بیگم ہارون کی معیت میں پہلی بار کراچی سے کوئٹہ تشریف لائے۔ آپ کا فقید المثال استقبال ہوا۔ روزنامہ انقلاب (لاہور، ۲ جولائی ۱۹۴۳ء) نے لکھا کہ کوئٹہ کے باشندوں نے قائدِ اعظم کا نہایت عظیم الشان استقبال کیا، جس کے متعلق خود قائدِ اعظم نے فرمایا

فرمایا کہ "بادشاہ بھی ہوتا تو اس جلوس پر فخر کرتا"

اس موقع پر سب سے پہلے، جس شخصیت نے قائداعظم کو محبت کے گہرے جذبات کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہوئے ہاتھ ملایا وہ کاکڑ اور بیٹ نیکہ کا مینا چکھوے بارون نیکہ اوسکا کڑوں کے دلولہ خیز جذبات کا ترجمان علامہ عبدالعلی اخوندزادہ تھے۔ علامہ موصوف نے اس موقع پر قائداعظم کی خدمت میں چند شعر بھی پیش کئے تھے۔ مگر افسوس کہ وہ اشعار دستیاب نہیں ہو سکے۔

جب قائداعظم نے میکموہن پارک کوئٹہ میں ایک بہت بڑے مجمع سے خطاب فرمایا تو علامہ عبدالعلی اللہ پڑھنے۔ ان کے ساتھی نے حیرت زدہ ہو کر وجہ پوچھی تو جواب ملا "اس شخص کی آواز سے اس کے دل کا درد عیاں ہے اور اس نے مجھے مضطرب کر دیا ہے"

علامہ عبدالعلی نے مسلم لیگ کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ "مسلم لیگ اتفاق و اتحاد کی علامت ہے اور اس لحاظ سے یہ جماعت ہمارا دین اور ہمارا ایمان ہے"

بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کے دو مائیناز ترجمان "الاسلام" اور "تنظیم" تھے۔

ہفت روزہ "الاسلام" ۱۹۳۹ء میں مولانا عبدالکریم کے زیرِ ادارت جاری ہوا۔ مولانا عبدالکریم (۱۹۰۶ء — ۱۹۶۹ء) ایک جید عالم، مخلص استاد اور بےباک سیاسی راہنما تھے۔ آپ نے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک حصولِ پاکستان کی تحریک میں بڑی سرگرمی محنت اور مجاہدانہ لگن سے حصہ لیا۔ ہفت روزہ "الاسلام" کے بانی قاضی محمد عیسیٰ خان صدر بلوچستان مسلم لیگ تھے۔ ان دنوں ہندوستان کے مسلمان غلامی کے ماحول میں زندگی گزار رہے تھے۔ اس پرچے کا منصب العین مسلمانانِ بلوچستان کو مسلم لیگ کے پیغام سے آگاہ کرنا تھا۔ اس کا راہنما اصول تھا۔

خدا و مصطفیٰ کا نام لے اور کام کرتا جا
مبارک ہے یہ خدمت، خدمتِ اسلام کرتا جا

مولانا عبدالکریم نے جب ۱۹۴۷ء میں اپنا علیحدہ پرچہ ہفتہ وار "میزان" جاری کر لیا تو ادیب مولوی صالح شاہ ہاشمی، شبیر الحسنین، فضل احمد غازی، سلیم جہانگیر (نائب مدیر) وغیرہ "الاسلام" کے ایڈیٹر رہے۔

۱۹۴۳ء میں قائداعظم بلوچستان کے دورے پر تشریف لائے۔ اس موقع پر فاروق صاحب رکن ادارہ الاسلام نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جو "الاسلام" میں چھپا ملاحظہ فرمایئے۔

مسلم کا ترجماں ہے محمد علی جناح
اسلام کا نشاں ہے محمد علی جناح
ملت کا ہم زباں ہے محمد علی جناح
قوم و وطن کی شاں ہے محمد علی جناح
ہیبت سے اس کی لرزہ براندم ہیں حریف
گو جاں میں ناتواں ہے محمد علی جناح
ہے تیغِ تیز قوت باطل کے واسطے
اک تیغِ خونفشاں ہے محمد علی جناح
اسلامیوں کو جس کی قیادت پہ ناز ہے
وہ میرِ کارواں ہے محمد علی جناح
کشتیٔ قوم کو ہو حوادث کا کیوں خطر
جب اس کا بادباں ہے محمد علی جناح
دورِ جدید کے خس و خاشاک کے لئے
طوفانِ بے اماں ہے محمد علی جناح
ہاں اس کی معرفت کو سمجھنا محال ہے
اک بحرِ بیکراں ہے محمد علی جناح
ہے دانش و سیاست و حکمت میں ایک فرد
بے شک نکتہ داں ہے محمد علی جناح

۱۹۴۳ء میں ہی برصغیر پاک و ہند کی ایک سرکردہ شخصیت (سر شیخ عبدالقادر) کوئٹہ گئے تھے۔ واپسی پر انہوں نے مولانا عبدالکریم کو ایک خط لکھا۔ جو من و عن یہاں درج کیا جاتا ہے۔

بہاولپور ۱۳۔ جولائی ۱۹۴۳ء

مکرم بندہ جناب مولوی عبدالکریم صاحب زاد لطفکم

السلام علیکم: میں کل شام یہاں پہنچا۔ ملتے میں تین چار روز کے لئے مچھ میں ٹھہر گیا تھا۔ آتے ہی آپ کا عنایت نامہ اور پروفیسر شجاع صاحب کا بھی ملا۔ یہ معلوم کر کے کہ آپ اور پروفیسر صاحب اور پروفیسر ظہیر الدین صاحب اور مراکش صاحب مجھے رخصت کرنے سٹیشن پر تشریف لائے اور میں آپ حضرات کی ملاقات سے اس وقت محروم رہا افسوس ہوا۔ بہر حال آپ نے تو حقِ مسافر نوازی ادا کیا۔ میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ باقی سب احباب کو بھی میرا اسلام شوق مع تشکر پہنچا دیجئے گا۔ کوئٹہ میں آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ گو اخبار "الاسلام" کے ذریعے آپ کے خیالات سے تو پہلے بھی ملاقات ہوتی تھی۔ آپ بہت خدمتِ اسلام اور اہلِ اسلام کر رہے ہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ جب وہ پرچہ شائع ہو جس میں بزمِ اقبال والے جلسے کے

تفصیلی حالات چھپ رہے ہیں تو اس کی ایک دو نقلیں کاپیاں بھی میرے پاس بھیج دیجئے۔ آپ نے جو میرے ساتھ انٹرویو کا ذکر کرتے ہوئے ۲۳ جولائی کے پرچے میں میرے متعلق چند سطور قلمبند فرمائی ہیں وہ آپ کی دوستانہ مہربانی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ کبھی کبھی "الاسلام" کے لئے کچھ لکھ بھیجوں۔ آپ کا ارشاد ملحوظ رہے گا مگر زیادہ امید نہیں کہ کچھ لکھ سکوں۔ مجھے یہاں کاروبارِ منصبی بکثرت ہے اور اس کے بعد خط و کتابت کا بارِ گراں "فرصت کارو بار ہوں" نہیں ملتی۔

میرے عزیز دوست قاضی محمد عیسیٰ صاحب جب سرحد کو سر کر کے واپس آئیں تو انہیں میرا سلام شوق کہہ دیجئے اور دعا ئے ترقی و برکت، قائداعظم کو خدا نے اپنی عنایت خاص سے بچا لیا الحمد للہ علیٰ ذالک۔ خدا انہیں تا دیر مسلمانوں کی خدمت کیلئے سلامت رکھے۔

اگر میرے کوئٹہ کے متعلق کوئی کام ہوا تو آپ کو اطلاع دوں گا۔

والسلام

آپ کا خیر طلب عبد القادر

خان عبد القیوم خان نے "الاسلام" کے بارے میں کہا تھا۔

۲۱ ستمبر ۱۹۴۵ء کے "الاسلام" کوئٹہ بلوچستان کا پرچہ میں نے بغور پڑھا۔ مجھے یہ دیکھ کر از حد خوشی ہوئی کہ بلوچستان میں ایسا اچھا پرچہ مسلمانانِ بلوچستان کی خدمت نہایت احسن طریقے سے انجام دے رہا ہے مجھے تعجب اور حیرت ہوئی جب میں نے اپنی تقریر اس اخبار میں پڑھی جو کوئٹہ اسٹیشن پر میں نے کی۔ میں بہت جلد جلد بولنے والا ہوں۔ لیکن "الاسلام" میں ساری تقریر حرف بہ حرف اور مکمل اور صحیح چھپی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب ایڈیٹر صاحب نہایت ہی تن دہی، جانفشانی اور محنت سے کام کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ مسلمانانِ ہند ایک نازک ترین مرحلہ میں سے گزر رہے ہیں۔ بلوچستان میں ایسے اخبار کی موجودگی مسلمانانِ بلوچستان کے لئے باعثِ رحمت ہے۔

کاش! کہ صوبہ سرحد کی مسلم لیگ کے پاس بھی ایسا ہی اخبار ہوتا!

کوئٹہ۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۵ء

فقط

عبد القیوم (ممبر سنٹرل اسمبلی) بیرسٹر ایٹ لا پشاور

ملک فیروز خان نون نے "الاسلام" سے متعلق اپنی رائے کا انگریزی میں اظہار کیا تھا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے

۲۔ لٹن روڈ کیمپ کوئٹہ، ۳۰ ستمبر ۱۹۴۵ء

میری رائے میں "الاسلام" کوئٹہ اسلام کی حیرت انگیز خدمات سر انجام دے رہا ہے۔ پرچے کے لئے یہ خوش بختی کی علامت ہے کہ مولوی عبد الکریم اس کی ادارت فرما رہے ہیں۔ یہ ہندوستان کے تمام پسندیدہ اور صفِ اوّل کے اخباروں کا مقابلہ کرتا ہے۔

دستخط

(سر فیروز خان نون)

کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، سی۔ آئی۔ اے

ان گرانقدر آراء سے پتہ چلتا ہے کہ "الاسلام" بلوچستان میں مسلمانوں کو بیدار کر رہا تھا۔ اور ان کے موقف (پاکستان) کا سچا ترجمان بھی تھا چند سال تک اس کے اخراجات قاضی محمد عیسیٰ صاحب برداشت کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۴۳ء سے کوشش کی گئی کہ اس کی اپنی آمدنی سے اخراجات پورے ہوں۔

"الاسلام" کا ایک اداریہ (۸ اپریل، ۴۳ء ۱۹)

ملاحظہ فرمایئے جو مسلمانانِ ہند کے اہم ترین مطالبے یعنی "مطالبۂ پاکستان" سے متعلق ہے۔ اس اداریہ سے اس امر کا بخوبی انکشاف ہوتا ہے کہ بلوچستان کے اخبارات اس عظیم مقصد کے حصول کی کوشش سے فروتر نہیں تھے۔

حکومتِ قلات کا پمفلٹ اور مسلمان پبلک:

ملالِ عالمیاں دم بدم دگرگوں است

منم کہ مدتے عمرم بیک ملال گزشت

اگر یہ حقیقت دوہرا دی جائے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی عمر ایک خاص مدت سے صرف اس ایک ہی ملال اور فکر (پاکستان) میں گزر رہی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ جب تک کہ مسلمانانِ ہند اپنے اس واحد محبوب نصب العین کو حاصل نہیں کر لیتے تب تک یہ ملال اور فکر مسلمانوں کی زیست کا ایک ایسا جز و لاینفک بن چکا ہے کہ اس سے یہ جدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہو سکے گا۔

پاکستان کے حصول کا جذبہ یا تڑپ آج ہندوستان کے ہر مسلمان بچے سے لے کر بوڑھے، مرد، عورت، مزدور، سوداگر غرضیکہ کون ہے جس کے یا ادنیٰ یا اعلیٰ سب کے سینے میں موجزن نہیں؟ پاکستان یا آزاد اسلامی مملکت کا حصول بچوں کا کھیل نہیں بیا منا انکا ابوالہ

نہیں کہ ادھر سے نام لیا یا مطالبہ کیا اور فوراً ہمیں مل گیا۔ یا کسی نے دے دیا۔ یہ خیرات نہیں جو بٹ رہی ہو۔ اور ہمارے مانگنے سے ہمیں بھی دے دی جائے۔"

یاد رکھئے جب تک کہ اس کے لئے صحیح معنی میں بقول علامہ اقبال :۔

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل از جل ترنگ

جان و مال کی قربانی نہ دی جائے جب تک کہ ہم اپنے منتشر قومی افراد اور ملی جسم کے پراگندہ اجزاء و اعضاء کو متحد کر کے آپس میں جوڑ نہیں لیتے تب تک کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس راہ میں جو ذمہ داری ہر غریب سے غریب مسلمان پر عائد ہوتی ہے ؛ میں کہوں گا کہ اس سے زیادہ یہ قومی ذمہ داری اُس مسلمان پر عائد ہوتی ہے ؛ جو نسبتاً کشادہ دست ذی استطاعت اور جانی و مالی قربانی دینے کے زیادہ اہل ہے ۔ جب تک ملت کے تمام بکھرے ہوئے عناصر و اجزاء خلوصِ دل سے متحد و منظم ہو کر پاکستان کے لئے قربانی دینے کا پورا اور پکا تہیہ نہیں کر لیتے۔ پاکستان ایسے قومی رفیع الشان مقصد کا حصول امرِ محال ہی نہیں ۔ بلکہ کہنے دیجئے کہ ناممکن بھی ہے۔ بقول قائدِ اعظم ہمیں اپنی تنظیم، ڈسپلن، عزم اور استقلال کو مضبوط تر بنانے ، اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہماری تنظیم جس قدر ٹھوس اور مضبوط ہو گی اسی قدر ہم اپنے مقصد سے زیادہ جلدی قریب ہوں گے۔ اور اغیار یا منافقین کے پروپیگنڈے کا شکار نہیں ہوں گے۔

مسلمانوں پر موجودہ نازک دور ایسا گزر رہا ہے۔ جو فیصلہ کن دور ہے۔ اور ہماری دس سالہ پاکستان سے متعلق تمام جد و جہد کا آخری دور ہے جنگ کے آخری دور اور آخری منزل میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر ذرا بھی اس میں غفلت ہو جائے یا انسان اغیار کے پروپیگنڈے کا شکار ہو جائے۔ تو تمام کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ اور سارا کیا کرایا دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے اس لئے پاکستان کی اس آخری لڑائی اور جنگ کی نازک گھڑیوں میں ہر مسلمان کا یہی فرض ہے کہ وہ زیادہ محتاط رہے۔ غلط پروپیگنڈے کا شکار نہ ہو ، منافقوں کی چالوں میں نہ آئے۔ اور سوچ بوجھ سے اپنے قائدِ اعظم کے ہر اشارے اور حکم کا پابند رہے ڈسپلن اور تنظیم میں زیادہ سخت بنے اور تمام تفرقہ انداز اثرات سے بالاتر رہ کر اپنے اسی ایک نصب العین (قومی آزادی) کے حصول کے ٹھوس امکانات اور ذرائع مضبوط بنا سکے۔

صوبہ بلوچستان کے سو فیصدی مسلمان، یہ حقیقت مسلم ہے کہ قائدِ اعظم کے ہر حکم کے پابند چلے آ رہے ہیں۔ اسی یقین اور حقیقت کے پیشِ نظر ہم مسلمانانِ بلوچستان اور بالخصوص مسلمانانِ کوئٹہ سے یہ التماس کریں گے کہ حکومتِ قلات کے تازہ ترین پمفلٹ (جس میں پاکستان کی پر زور حمایت و تائید کا یقین دلا کر جانی و مالی قربانی دینے کا غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے) سے مضطرب و پریشان نہ ہوں۔ اس اہم معاملے پر قائدِ اعظم کی ہدایات حاصل کرنے کے لئے قاضی محمد عیسیٰ خان صاحب صدر جناح مسلم لیگ، دہلی چلے گئے ہیں۔ جب تک کہ وہ واپس آکر اس کے متعلق ہدایات نہیں دیتے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خاموش رہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس پمفلٹ پر پبلک حلقوں میں عجیب قسم کی متضاد چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ پاکستان کے اہم قومی مقصد کے پیشِ نظر ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے طبقے کے مسلمانوں کا متحدہ محاذ پر جمع ہونا نہایت ہی ضروری امر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی آزاد اسلامی حکومت کے لئے صوبۂ بلوچستان اور اسلامی ریاست قلات ایک ایسا بہترین پارٹ لے کریں جو صوبے کے مسلمانوں اور صوبے کی اس اسلامی ریاست کے لئے صحیح معنوں میں مایۂ ناز اور وجہِ افتخار بن سکے۔ یا جو صحیح معنوں میں پاکستان کا بازوئے شمشیر زن کہلانے کے مستحق ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا یہ محاذ صرف مسلمانانِ ہند کے لئے ہی نہیں بلکہ اسلامیانِ عالم تک کے لئے ایک صحیح متحدہ اسلامی محاذ اور عالمِ اسلام کے جسم اطہر کی ریڑھ کی ہڈی بن سکے بعض تخریبی عناصر اس راہ میں عجیب قسم کی شورش ریزیوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔ جہاں ہمیں ان تخریبی عناصر کی شورش ریزیوں سے بالکل غیر متاثر رہنے کی ضرورت ہے ۔ وہاں ہم محتاط رہ کر اس معاملے میں قائدِ اعظم کے حکم کا انتظار کریں گے اور کسی قسم کی جارحانہ اقدامات نہ کرنے پائیں گے ۔ ہمیں اپنی مجموعی طاقت کو زیادہ مضبوط اور ٹھوس بنانے کی ضرورت ہے۔ اسے پراگندہ کرنے کی نہیں۔

اس قومی معاملے میں کسی کے ذاتی سود و بہبود

یا آمریت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ مسلمان پبلک بیدار ہے۔ جمہوری اسلامی نظام حکومت کے بغیر جو پاکستان میں ہو یا پاکستان سے متعلق تمام صوبوں یا ریاستوں میں، کوئی دوسرا انتظام چل ہی نہیں سکتا۔ اگر مذکورۂ بالا خیالات کی روشنی میں حکومت قلات کا یہ مذکورہ اعلان کانگریسی عناصر کے لئے پیامِ موت اور مسلمان قوم کے قومی مقصد (پاکستان) کے حصول کے لئے ایک مزید ذریعہ کہلایا جا سکتا ہے۔ تو اپنے قائدِ اعظم کے حکم کے منتظر رہ کر کیوں اس اعلان پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کریں۔

"وما علینا الا البلاغ ——— ایڈیٹر"

ہفت روزہ "تنظیم"

اس کے اجرا کے بارے میں معاصر پاسبان کوئٹہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۳ء نے لکھا تھا۔

میر جعفر خان جمالی کا اخبار

"میر جعفر خان کو اخبار نکالنے کی منظوری مل گئی ہے۔ چنانچہ میر صاحب نے ڈیکلریشن داخل کر دیا ہے۔ اخبار کا نام "تنظیم" ہوگا۔ مسٹر حجازی بی۔ اے اس اخبار کے ایڈیٹر ہوں گے۔ تنظیم ہفتہ وار ہوگا۔ اور جیسا کہ پاسبان میں پہلے خبر دی گئی تھی۔ بلوچستان پریس سے شائع ہوگا۔ دفتر کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ پہلا پرچہ غالباً عید کے بعد شائع ہوگا۔

"تنظیم" کے مدیر جناب نسیم حجازی (مشہور ناول نگار) کا قیام بلوچستان میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۸ء تک رہا۔ بلوچستان تشریف لانے سے قبل وہ کراچی میں ایک روزنامہ اخبار کے مدیر تھے۔ وہ میر جعفر خان جمالی کے ایماء پر بحیثیت ان کے مشیر کے یہاں تشریف لائے تھے۔

ہفت روزہ "تنظیم" کو بوقت ضرورت روزنامہ بنا دیا جاتا تھا۔ "تنظیم" "تحریک پاکستان کا بے باک ترجمان" تھا۔ اس کی سرپرستی کا شرف حضرت قائدِ اعظم کے مخلص رفیق جناب میر جعفر خان جمالی کو حاصل تھا۔

"تنظیم" کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اس اخبار کے اجراء نے مسلم لیگ کی تحریک کو مزید تقویت پہنچائی اور صحافتی محاذ پر ایک اہم دفاعی مورچہ قائم کر دیا۔ اس سے قبل کانگریس کا اخبار "استقلال" اور بعض دوسرے اخبارات عرصہ دراز سے یہاں کانگریسی مفادات کے لئے فضا ہموار کرنے اور تحریک پاکستان کو نقصان پہنچانے میں مصروف تھے۔

جناب نسیم حجازی فرماتے ہیں کہ مجھے میر جعفر خان جمالی نے بے حد اصرار کے تحت اس بات پر آمادہ کیا کہ تحریک پاکستان کے لئے کام کرنے کی غرض سے مجھے کوئٹہ کو بطور مرکز کے انتخاب کرنا چاہیئے۔ یہاں کسی حد تک مجھے گروہی اور علاقائی سازشوں سے پالا پڑا۔ اور میں نے اس دور میں (غالباً ۱۹۴۲ء میں) ایک ادارتی مقالے کے ذریعے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ بلوچستان کا فیصلہ صرف قبائل اور شاہی جرگہ کی مرضی اور مشوروں سے عمل میں لایا جائے گا۔ جو کہ بعد ازاں ظہورِ پاکستان کے وقت کے ہر لحاظ سے حرف بہ حرف پوری ہوئی۔"

نسیم حجازی ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ کوئٹہ میں اخبار تنظیم کی اشاعت کے سلسلہ میں جس کے کل مصارف سردار میر جعفر خان جمالی برداشت کرتے تھے۔ سردار صاحب نے ایک نشست میں پورے بلوچستان میں سے پانچ سو اہم اور سرکردہ اشخاص کی ایک فہرست مجھے ارسال کی جنہیں بغیر کسی چندہ کے یہ اخبار بھیجا جاتا تھا۔ مرحوم میر جعفر خان جمالی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر یہ پانچ سو افراد پاکستان کی تحریک سے ذہنی طور پر وابستہ ہو گئے۔ تو پورا بلوچستان پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھے گا۔ حقیقت حال یہی آگے چل کر بھی ثابت ہوئی۔

نسیم حجازی میر جعفر خان جمالی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ دن ہفتوں، ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ اور میں ان کی رفاقت میں تحریری کام کرتا رہا۔ انسان اور دیوتا محمد بن قاسم، آخری چٹان اور شاہین میری ان دنوں کی تصنیفات ہیں۔ خاک و خون کا نصف سے زائد مواد بھی انہی ایام میں لکھا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج جب میں اپنی زندگی کے پچھلے ایام کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں زندگی میں کبھی بھی اتنا مصروف نہ تھا جتنا کہ وہ دن مصروفیات کے گزرے۔

تحریک پاکستان کے سلسلے میں "الاسلام" اور "تنظیم" کے علاوہ مولانا عبیداللہ خان بلوچ نے بھی دو اخبار کلمۃ الحق اور الفاروق جاری کئے۔ مولانا عبیداللہ خان تحریک پاکستان سے وابستہ تھے اور اس کے لئے خاصا کام کیا۔ دہلی جا کر نوابزادہ لیاقت علی خان اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین سے ملاقات بھی کیں۔ "کلمۃ الحق" کی پیشانی پر یہ حدیث مبارک لکھی ہوئی ہوتی۔

"ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا جہادِ افضل ہے۔" یہ اخبار بالکل اسی کا مصداق تھا۔

الفاروق: یہ روزنامہ ۱۹۴۱ء میں جاری ہوا۔ اس کا ہفتہ وار ایڈیشن بھی منظرِ عام پہ آتا تھا۔ سرورق پر یہ شعر درج تھا۔

انجمن میں تری اے شوخ تغافل پیشہ
جاں نثاروں کا بڑی دیر میں نام آیا ہے

الفاروق دکو ئٹہ ۲۲ رجون ۱۹۴۱ء کے اداریے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے "اسلامیوں نے کبھی اپنے آپ کو نہ کسی نسل و لباس سے وابستہ کیا ہے، نہ کسی لسان و نژاد بوم سے، جب ان سے نسل پوچھی گئی۔ تو انہوں نے کہا انا ابن الاسلام" جب ان کا وطن پوچھا گیا کہہ دیا کہ

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

یہ وطنی اور غیر وطنی تفریق کا فتنہ مغرب کی پیداوار ہے جس کے خطرناک اثرات کا اندازہ کرتے ہوئے اقبال مرحوم فرماتے ہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب کا نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی"

(باقی آئندہ)

محمد اختر

حافظ بخاری

شہباز ملک
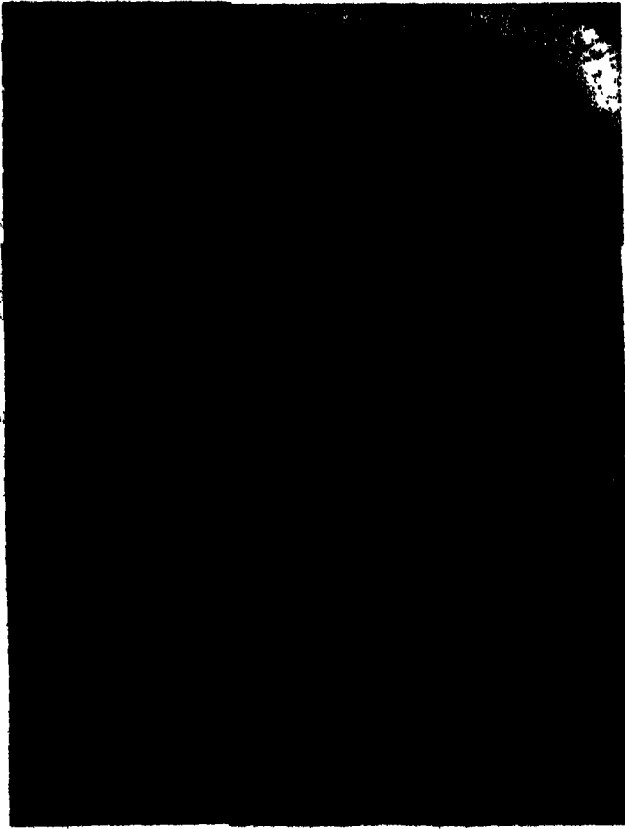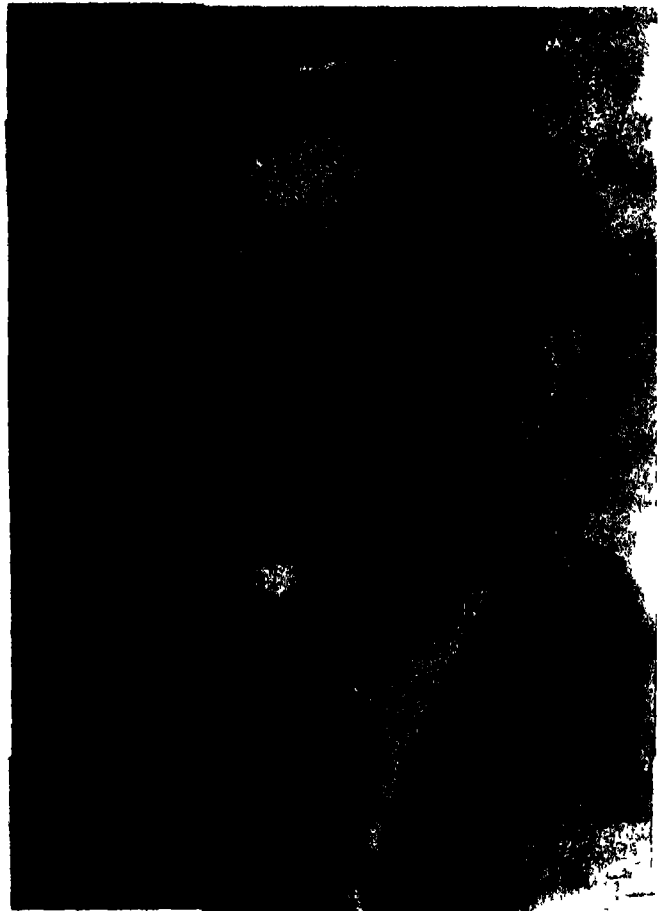
تحریکِ پاکستان اور پنجابی ادب

قیامِ پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے جو بات بہرحال میں مجموعی طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ آزادی کی تحریک میں دو قومی نظریئے کا ابھرنا ہے۔ اگرچہ ایک الگ آزاد ریاست کا تصور حضرت علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے ۱۹۳۰ء کے اجلاس الٰہ آباد میں پیش کیا۔ اور ۱۹۴۰ء میں یہی تصور ایک واضح اور مجموعی مطالبے کے طور پر قرارداد لاہور یا قراردادِ پاکستان کی شکل میں سامنے آیا لیکن دیکھا جائے تو یہ تصور برصغیر کے مسلمانوں میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے ایک جداگانہ قوم کا تصور یہی وجہ ہے کہ شروع میں مسلم لیگ نے بھی برصغیر کی دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر جب آزادی کا مطالبہ کیا تو جداگانہ انتخاب کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔ یہی تصور تھا۔ جس کو نگاہ میں رکھتے ہوئے حضرت قائداعظم نے فرمایا تھا۔

"پاکستان اسی دن قائم ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب اس سرزمین میں ابھی مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"

یہ بات حضرت قائداعظم نے دو قومی نظریئے ہی کی وضاحت میں کہی تھی اور یہ بات بالکل حقیقت ہے کہ مسلمان جب سے اس خطے میں وارد ہوئے ہیں انہوں نے اپنے الگ قومی تشخص کو کبھی ترک نہیں کیا کہ یہ قومی تشخص ان کو ان کے دین کی بدولت حاصل ہوتا ہے اور مسلمان اپنی روزمرہ زندگی کو اپنے دین سے الگ کر ہی نہیں سکتا۔ مسلمانوں کا یہاں پر ہزاروں برس کا قیام اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہاں کا ہندو معاشرہ جس نے ہر قوم کو اپنے اندر جذب کیا، مسلمانوں کو جذب نہ کر سکا۔ اس لئے پاکستان کے قیام کی اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے اگر کوئی حوالہ ہو سکتا ہے تو یہی الگ مسلم تشخص یا دو قومی نظریہ ہے جس کی بنیاد ظاہر ہے، اسلام ہے۔

آیئے اب اس کو ہم پنجابی ادب کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ پنجابی ادب کی کم و بیش آٹھ سو سالہ ادبی روایت ہے۔ جبکہ ایک ہزار سالہ لسانی روایت بھی ملتی ہے اس تمام ادب کو اگر طائرانہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو بھی اس کی لسانی اور ادبی روایت ہمیں مسلمانوں کی پنجابی ہی سے تلاش کرنا پڑے گی کہ انہی کا کام اس زبان میں زیادہ ہے۔ ظاہر ہے۔ جب مسلمانوں نے پنجابی ادب میں زیادہ کام کیا ہے اور پیچھے ہم اس بات کو ثابت کر آئے ہیں کہ کچھ بھی ہو مسلمان اپنے دین کو اپنی ذات سے الگ نہیں کرتا اور لکھنے والے کی ظاہر ہے ذات ادب کے حوالے سے PROJECT ہوتی ہے۔ اس لئے پنجابی ادب کا کوئی ۸۰ فیصد حصہ دین کے حوالے سے وجود میں آیا ہے۔ اس طرح اس کے لسانی نظام اور ادبی فکر پر اسلامی چھاپ ایک منطقی نتیجے کے طور پر ہوگی۔

اب آیئے برصغیر میں آزادی کی تحریک کی طرف۔ اس سارے عرصے میں بھی پنجابی ادب میں مسلمانوں کا کام مجموعی طور پر دوسرے پنجاب باسیوں سے زیادہ ہے سو اس لئے آزادی کی تحریک میں مسلمان پنجابی لکھاریوں نے اپنے قومی تشخص کے حوالے سے حصہ لیا۔ اگر ہم بات کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے شروع کریں کہ یہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کا پہلا بڑا اقدام ہے تو ہمارے سامنے پنجاب کے ساہیوال کے علاقہ گوگیرے کے سورماؤں کی بہادری اور اس کی تعریف کرنے والے جرگا نے والے شاعروں کے تحریر کردہ ڈھولے سامنے آتے ہیں۔ یہ ڈھولے "بر کی دے ڈھولے" کے نام سے عوامی شاعروں نے تحریر کئے۔ ان میں میرو اور میروانہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ انگریز اسسٹنٹ کمشنر برکلے یہ جنگ ۱۸۵۷ء کے ستمبر

تحریکِ پاکستان میں پنجاب کے شعراء

امام دین مجاہد
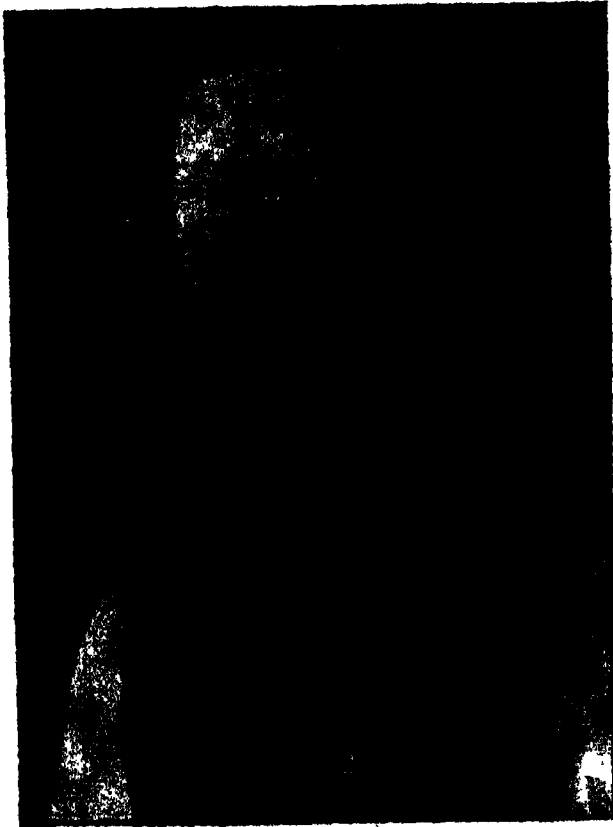
مصنف

شہباز ملک

عشق لہر

ظہیر نیازبیگی

صحرائی گورداسپوری

عبدالغفور اظہر

میں ہوئی جس میں کھرلوں وغیرہ نے بہ کلے اور ان کے
پچاس گھوڑ سواروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور
خود پھانسی چڑھ گئے۔ اس لڑائی کی وجہ بظاہر تو یہ بیان
کی جاتی ہے کہ انگریزوں نے اس علاقے کے لوگوں
سے اپنی فوج کے لئے گھوڑے اور دوسرا سامان طلب
کیا تھا۔ ان کے انکار پر ان پر ظلم کیا گیا۔ جس کے جواب
میں یہ جنگ ہوئی مگر بغور دیکھا جائے تو یہ جنگ بھی
۱۸۵۷ء کی بغاوت یا جنگِ آزادی کا ایک حصّہ قرار
پاتی ہے کہ انگریز کے خلاف مقامی طور پر ایک غصّہ
اور انتقام موجود ہے۔ اس جنگ کے بارے میں
بہت سے ڈھولے ملتے ہیں۔ لیکن ایک ڈھولا
ایسا بھی ملا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ جنگ میں حصّہ
لینے والے خدا تعالیٰ کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ گویا وہ
جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف ہیں۔ ان ڈھولوں میں
عام طور پر بہادروں کے بارے میں یہ بات بھی ملتی
ہے کہ فلاں بہادر "دین کا کلمہ پڑھ کر" حملہ آور ہوا
آئیے برکلی کے ڈھولے کا وہ حصّہ دیکھیں جس میں
جنگ کے بعد بہادروں کے پھانسی پانے اور پکڑے
جانے کا ذکر ہے ؎

ایہناں انگریزاں بلند بیگ دا ترہا نہ فتح پور گھیریا
پھاہے چاہڑیا
جیہڑا لاڑای ساندل بار دا
ایہناں انگریزاں بنھ لیا ملال غازی وا کھٹیا منڈ
چلے وا کاٹیا
ولی داد مردانہ موکھا پُتر دہنی وال دا
ایہناں انگریزاں بنھ لئے مراد بہادل وے نتیا سنے
جیہڑے راوی تے چکیندے مال چودھار دا،
پنڈ سکدے وچوں نادر قریشی بنھ ٹوریا نیں
پچھی نکھیڑیا مِنساں دی جوڑ دا
پیریں بیڑیاں، ہتھیں، ہتھکڑیاں، جیل کے قرض
نبھائی جاندے سب غدار دا

اس دور میں ایک شاعر نے یہ بھی کہا

ہس ہس کے چڑھے کائی پھانسیاں
کالے پانیاں ول کائی تیر ہوئے
اساں دیس آزاد ضرور کرنا
کرگشے انت نوں بھانویں سر ہوئے

انگریز سے نفرت کا سلسلہ یہاں سے آگے بڑھتا
ہے اور پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں
انگریز کی زیادتی اور غیر مسلموں خاص طور پر ہندوؤں
سکھوں سے ان کی ملی بھگت نے اس نفرت میں وقت
کے گزرنے کے ساتھ اضافہ ہی کیا ہے۔ ہندو نے
چونکہ مسلمان کو کبھی دل سے نہیں چاہا ہے۔ یہ ایک ایسی
قوم ہے جس کو یہ جذب نہیں کر سکا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء
کی جنگِ آزادی میں برابر کا شریک ہونے کے باوجود
اس نے انگریز سے معافی مانگ کر اپنا معاملہ درست
کر لیا۔ سکھوں نے تو اس جنگ میں سرے سے حصّہ
ہی نہیں لیا بلکہ سکھ ریاستوں پٹیالہ وغیرہ نے انگریزوں
کی اس بغاوت کو دبانے میں مدد کی اور اس کے
عوض بہت سی مراعات حاصل کیں ظاہر ہے اس
جنگ کی ناکامی کے بعد تمام نزلہ مسلمانوں پر گرا یہی
وجہ ہے کہ انگریز کے اس ظلم کی وجہ سے مسلم قوم
کی گری ہوئی حالت کو دیکھ کر سرسید جیسے جہاندیدہ
شخص کو "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھنا پڑی۔ لیکن انگریز
کی طرف سے معاملہ دل سے صاف نہ ہوا۔ ادھر مسلمان
اس پُر آشوب دور میں بھی اپنے قومی تشخص کو نہیں
بھولے چنانچہ اس کے بعد آزادی کے سلسلے میں جتنی
تحریکیں چلیں ان میں مسلمانوں نے اپنے الگ قومی تشخص
کے حوالے سے حصّہ لیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے
اس جذبے سے ہندو لیڈر گاندھی جی نے بھی فائدہ
اٹھایا اور جب خلافت کی تحریک ۱۹۱۹ء میں شروع
ہوئی تو اس نے مسلمانوں کے ساتھ اس کی حمایت
کر دی۔ حالانکہ اس تحریک سے ہندوؤں کا کسی
حوالے سے بھی کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ وجہ صرف
یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہندو لیڈر مسلمانوں کے جذبے
سے ایک طرف اپنی قوم کو روشناس کرانا چاہتا تھا۔
تو دوسری طرف اپنی لیڈری چمکانا چاہتا تھا۔ چنانچہ تاریخ
نے ثابت کیا کہ یہی کچھ ہوا اس کے فوراً بعد ہجرت
کی تحریک کی بھی گاندھی جی نے حمایت کی۔ جس میں سراسر
ہندوؤں کو فائدہ تھا کہ مسلمان جب ہندوستان چھوڑ
دیں گے تو ظاہر ہے۔ ہندوؤں کے لئے میدان صاف
ہو گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جب اچھے خاصے مسلمانوں نے
اونے پونے داموں اپنی جائیدادیں ہندوؤں کے ہاتھ
فروخت کیں اور افغانستان کی طرف ہجرت کی۔ تو افغانستان
نے اپنی ہندو قوں کے منہ ان کی طرف کر دیئے یہ لوگ
گھر سے پشتے خراب ہوتے، جب پریشان حال واپس
آئے تو کنگال ہو چکے تھے اور اپنی ہی جائیدادوں
میں کرائے پر رہے۔ اس طرح ہندو کی چالاکی کا جادو
چل چکا تھا۔

آئیے اب تحریکِ خلافت میں پنجابی ادب کے
حوالے سے لکھے جانے والے ادب کی بات کریں کہ
یہ بھی ایک لحاظ سے مسلم قومی تشخص کو ابھارنے کی

سی تھی اس دور میں منشی محمد اسمٰعیل، احمد اللہ بیگ
حافظ عالم خان، عبدالرحیم اور ملک لال دین قیصر نے
بہت سی نظمیں لکھیں اور یہ سب شائع بھی ہوئیں۔
ان سب میں سے ملک لال دین قیصر کی نظمیں بہت
مقبول ہوئیں خاص طور پر یہ نظم تو اب بھی بہت
سے لوگوں کو یاد ہے

ڈالیوں ٹٹ پئے کچے کچے
وات یتیماں دی کوئی نہ پچھے
اوندے سرنا دے بال وے
بیوہ ہو گیاں ماشیاں
کر بکرے یونانی حلال وے
بیبا وانگ قصائیاں
غازی مصطفیٰ پاشا کمال وے تیریاں دور بلائیاں

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ اس دور میں ہندو لیڈروں
کی طرف سے تعاون کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کی باتیں
ہوئیں۔ یہاں تک کہ جلیانوالہ باغ میں انگریز کی گولیاں
بھی سانجھے ہی کھائیں۔ لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔
بہانے ڈال کر دانستہ ایسا کیا گیا۔ ہندوؤں کی طرف
سے کچھ دوسرے لیڈروں کی طرف سے شدھی اور سنگھٹن
کی تحریکوں میں مسلمانوں کو زک پہنچائی گئی۔ جس کا گاندھی
جیسے لیڈروں نے بھی کوئی نوٹس نہ لیا۔ یہاں تک کہ
ایک وقت ایسا آیا کہ ہندوؤں کی طرف سے زبانی
اور تحریری طور پر مسلمانوں کے عقائد پر اور ان کی
دینی ہستیوں پر کیچڑ اچھالا جانے لگا۔ ایک گستاخ رسولؐ
نے کتاب شائع کی۔ اس پر بہت شور مچا۔ انگریز نے
کوئی نوٹس نہ لیا۔ چنانچہ علم دین نے اسے جہنم واصل
کر دیا۔ اور انگریز کے قانون کی وجہ سے پھانسی چڑھ
کر غازی علم دین شہید کہلایا اس زمانے میں بھی مسلمانوں
میں خاصا جوش پایا جاتا تھا۔ بہت سا لٹریچر اس بات
کی شہادت دیتا ہے۔ عشق لہر اگرچہ امید سے زیادہ
مشہور ہوئے۔ لیکن ان کا ایک جو مصرعہ پڑھ کر لوگ
دھاڑیں مار کر روتے تھے یہ چو مصرعہ ملاحظہ فرمائیں۔

ہویا چودھویں دے وچ روشن تیرا عشق اور عاشق مشہور دیا
جیونا دار دی ٹہنی داجیونہیاں شوق نال ساتھی منصور دیا
سب دریا اکھیاں وچ سی گیا ایں علم دین او ڈریا طور دیا
عشق لہر دی عرض دربار اندر پہلوں کریں مسافرا دور دیا

اس سلسلے میں استاد کرم امرتسری نے بھی بہت
کچھ لکھا۔ ان کا یہ کلام ان کی کتاب کرم پھلواری میں
شامل ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو تنگ کرنے کا
سلسلہ بند نہیں ہوا۔ کشمیر میں حکومت کی طرف سے
جمعہ کا خطبہ پڑھنے سے بند کرنے پر مسلمانوں نے
بیزاری کا اظہار کیا۔ چنانچہ وہاں ہندو مسلم فساد ہوا۔
حکومتِ وقت نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ انگریز نے راجہ
کی پیٹھ ٹھونکی۔ کشمیری مسلمانوں نے اپنے دینی حقوق
کے تحفظ کے لئے تحریک چلائی جس کا ساتھ برصغیر کے
مسلمانوں نے دیا۔ پنجاب نے تو اس میں عملاً حصہ لیا
اور رضاکار وہاں گئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کہا گیا ہے

چلو بھائیو کشمیر جنت ملدی اے

شاعروں نے اپنے جذبے کو تازہ کرنے کے لئے
بہت سا کلام لکھ کر مسلمانوں کی حمیت کو جگایا۔ ان
میں فقیر محمد فقیر اور استاد کرم امرتسری کے نام خاص طور
پر لئے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر فقیر نے لکھا۔

اجے باقی نیں پنجابی اجے پنجاب باقی اے
اجے باقی نیں تلواراں اینہاں دی آب باقی اے

گجرات کے رہنے والے مولوی عبداللطیف افضل نے لکھا

منبر علی راج نال آپے کردا قیل و قال
تینوں کیہڑے پھاسی آپے جان جنج نال
دور توں سنام تینوں گویا معاف کر
باندر والا ساڈے وچ توں نہ انصاف کر

ادھر مسلمانوں سے انگریز کے ظالمانہ سلوک کی وجہ
سے مسجد شہید گنج کا واقعہ پیش آ گیا۔ جس میں اب
مخالف پارٹی انگریز کے ساتھ ہندوؤں کی بجائے سکھ
تھے۔ انگریزوں نے اب ان کی پیٹھ ٹھونکی اور مسجد کو
نہ گرانے کے وعدے کے باوجود ایسا کر دیا۔ مسلمان اس
پر سیخ پا ہوئے۔ انگریز کی گولیوں کا نشانہ بنے سراپا
احتجاج تھے۔ اس طرح لٹریچر میں اس دور کی اس تحریک
کے مسلمانوں کے جذبات بھی ریکارڈ ہو گئے۔ یہ
۱۹۳۵ء کا دور ہے۔ استاد کرم نے لکھا

ویکھیا ای مسلم کم کفار دا
گھر ڈھا چھڈیا اے رب جبار دا
توں ایں محمود ایں، توں ای ایاز ایں
بندہ نواز ایں، بڑا جان باز ایں
محرم راز ایں، غنجر دہاز ایں
تینوں کیہ خوف ہے کسے مردار دا

یہ وہ زمانہ ہے جب انگریز اور اس کے گماشتوں
کی زیادتیوں کی انتہا ہو چکی تھی۔ اس کے دو سال بعد
یعنی ۱۹۳۷ء میں جب انتخابات ہوئے تو کانگرس
کو اس میں خاصی کامیابی ہوئی۔ جس نے اس کا دماغ
مزید خراب کر دیا۔ چنانچہ جب کانگرسی حکومت بنی
ہے۔ اس نے صاف صاف طور پر برصغیر میں
رام راج قائم کرنے کا آغاز کر دیا۔ اس کی واضح

شامل تعلیم کے شعبے میں ملتی ہے۔ جس میں انقلابی تبدیلیاں اس طرح کی گئیں کہ جس سے مسلمانوں کے اسلامی تشخص کو مٹایا جانا مقصود تھا۔ بدنام گیت "بندے ماترم" کو اسی دور میں سرکاری سطح پر قومی ترانے کا درجہ دیا گیا۔ جس کی ہر مسلمان نے مخالفت کی بلکہ خود انگریز پارلیمنٹ نے اس کی مخالفت کی جو ریکارڈ پر موجود ہے۔ مگر پنڈت نہرو اور دوسرے ہندو لیڈر کہتے رہے کہ یہ گیت اب تو ترانے کا درجہ حاصل کر چکا ہے اس لئے واپس نہیں لیا جا سکتا۔ یاد رہے۔ اس گیت میں کالی دیوی سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ مسلمانوں نے تم پر ظلم کیا ہے۔ ہم ان کو برصغیر سے نکال دیں گے۔ یہ ترانہ مسلمان طالب علموں کو بھی گانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ کانگریس کے دو سالہ دور حکومت میں ہر وہ کام کیا گیا۔ جو مسلمانوں کے قومی تشخص کو مٹاتا ہو۔ اور ہندو تشخص اُبھارتا ہو۔ چنانچہ جب ۱۹۳۹ء میں کانگرسی حکومت مستعفی ہوئی تو قائدِ اعظم کے کہنے پر مسلمانوں نے یومِ نجات منایا۔

اس دور میں حضرت قائدِ اعظم کانگرس چھوڑ کر مسلم لیگ کی تنظیم میں منہمک ہو چکے تھے۔ کانگرس کے اس دو سالہ اقتدار نے مسلمانوں میں قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کی طرف بڑھنے ہی میں عافیت سمجھی۔ ادھر ۱۹۳۰ء میں حضرت علامہ اقبال بڑے منطقی انداز میں مسلمانوں کے لئے الگ ریاست کا مطالبہ کر چکے تھے اور اسی زمانے میں چودھری رحمت علی نے اس کا باقاعدہ نام "پاکستان" تجویز کر دیا تھا۔ چنانچہ اب دراصل ہندوؤں نے اپنے رویے سے مسلمان قوم کو اس طرف رجوع کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ مختصر عرصے میں مسلم لیگ کا پلیٹ فارم اور قائدِ اعظم کی لیڈر شپ مضبوط ہو گئی اور اب مسلمانوں کی طرف سے آزادی کی بات جداگانہ انتخاب، دو قومی نظریے، الگ آزاد ریاست کے حوالے سے ہونے لگی۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ لاہور کے بعد تو مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا ہی یہ مطالبہ ہو گیا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان آزادی کی جنگ میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ اور واحد لیڈر حضرت قائدِ اعظم تسلیم کئے گئے۔ چنانچہ پنجابی ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو پنجابی لکھاریوں نے اس حوالے سے بہت سا ادب تخلیق کیا۔ ہمارے شعراء و ادبا خود عملی طور پر اس تحریک میں شامل ہوئے۔ نظر بند بھی ہوئے۔ ایک جذبہ تھا جو مسلمانوں میں پیدا ہو گیا تھا۔

آئیے پنجابی ادب سے اس کی مثالوں پر غور کریں اس سلسلے میں ہمارے سامنے سب سے نمایاں جو نام آتے ہیں۔ ان میں ظہیر نیاز بیگی، عشق لہر، سید فضل حسین مدنی، شہباز ملک ایسے نام ہیں۔ جن کی تحریریں باقاعدہ طور پر شائع بھی ہوئیں اور دستیاب بھی ہیں۔ باقی ایک کیمپ کی کیمپ تھی۔ کارکنوں کی شاعروں کی ادیبوں کی مقرروں کی جو دن رات مسلم لیگ کیلئے پرچار کا کام کرتی تھی۔

ظہیر نیاز بیگی نے ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ میں شمولیت کی اس سے قبل انہوں نے دوسری مسلم تحریکوں میں حصہ بھی لیا اور شاعری بھی کی۔ لیکن مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد انہوں نے قومی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

بہت جلد انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کی جنرل کونسل کا ممبر بنا لیا گیا اور "شاعرِ تحریکِ پاکستان" کہا گیا۔ انہیں قائدِ اعظم کے نزدیک رہ کر بھی کام کرنے کا موقعہ ملا انہوں نے سب سے زیادہ کام مسلم لیگ کے پیغام کو اپنی شاعری کے ذریعے عوام تک پہنچانے کے سلسلے میں کیا۔ ان کی اس قسم کی نظموں کا مجموعہ "لیگی نظموں" کے نام سے شائع ہوا جواب نا پید ہے۔ ظہیر نیاز بیگی کے تحریکِ پاکستان کے حوالے سے لکھے جانے والے ادب کی نوعیت یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جاگنے کے لئے کہا گیا ہے، مسلم لیگ میں شامل ہونے، پاکستان کا نعرہ لگانے، پاکستان کے مطالبے کے مخالفوں کی مخالفت کرنے اور ان سے بچنے کے لئے کہا گیا ہے۔ مسلم لیگ کی تحریک کے کامیاب ہونے اور مخالفین کا حال دگرگوں ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

مسلم لیگ دی اج تحریک کولوں ملک حاکماں دے دل دھڑکدے نیں
جھنڈے بازاں دی ٹوردے انگوں پیروں تھر کدے موڈھیاں پھڑکدے نیں
نعرے حق دے سن تے پٹ اٹھن بدلے اینہاں تے قہر دے کڑکدے نیں
لیڈر قوم دے جدوں بیان دیندے روح اینہاں دے تیر وچ پھڑکدے نیں

اس تحریک میں استاد عشق لہر نے بہت کام کیا۔ ان کی لیگی نظموں کا مجموعہ "نعرۂ پاکستان" دستیاب ہو گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عشق لہر نے بڑے جاندار انداز میں کام کیا۔ یہ اگرچہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے مگر ان کی معلومات بہت زیادہ تھیں۔ کلام بہت پختہ اور استادانہ اس پر یہ کہ یہ بڑے اچھے انداز میں شعر پڑھتے تھے۔ مسلم لیگ کے بیشتر جلسوں میں ان کو بلایا جاتا تھا ان کی تمام تر شاعری مسلم لیگ کے پیغام کو بڑے اچھے انداز

میں پیش کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے برِصغیر کے مسلمانوں کے جذبات کی بڑے فنکارانہ اور کامل انداز میں نمائندگی کی ان کے کلام میں مطالبۂ پاکستان، دو قومی نظریہ، مخالفِ پاکستان جماعتوں کی مخالفت، مسلم لیگ کے امیج کو بنانا اور اس کے لیڈروں سے عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ مطالبۂ پاکستان کس اچھے انداز میں قلمبند کیا گیا ہے۔

مولا کرم کر ہندوہے حال اُتے مسلمان اینہدا اسلمان ہوسے
دل دا کڈھ کے دستاں سایاں نوں اک دوسرے توں ٹر جائیے
سامنے فیصلے ہوون قرآن اُتے اگے وانگ اسلام دی شان ہوئے
عشق آبر کہیے نبی دا واسطہ ای ایس ہند اندر پاکستان ہوئے

عشق لہر نے علیحدہ وطن حاصل کرنے کے لئے "پاکستان" کے نام سے ایک نظم میں بڑے واضح الفاظ میں اپنے حصے کو علیحدہ کرنے کے لئے کہا ہے فرماتے ہیں۔

دل دریا سی دوستاں روشنی ہے سہایہ نہ سوچیا کجھ بچا لیئے
پانی وانگ جنہاں ساڈا مال پیتا ہن اوہ کہن غلام بنا لیئے
لئی جنگ حریفاں نے وچ گھاں بھانبڑ بھڑکیا کیویں بجھا لیئے
چڑھیا بحرِ نفاق دا مار ٹھاٹھاں لاوے ڈھانہ بند بنا لیئے
بیڑی قوم دی لے گھمن گھیر اندر چپرد نکے مہانیوں لا لیئے
غیراں نال نہ نبھدی لے بھاگی وال حصہ اپنا ونڈ ونڈا لیئے
ڈلھے بیراں دا اگے کجھ نا ہیں چن کے بے جھولی وچ پا لیئے
عشق لہر سبھ مشکلاں حل ہوون پاکستان بے کدے بنا لیئے

قائدِ اعظم محمد علی جناح، عشق آبر کے محبوب لیڈر ہیں۔ چنانچہ اپنی شاعری میں جا بجا وہ ان کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس لئے بھی کر رہے ہیں کہ جس تحریک کے لئے وہ کام کر رہے ہیں اس میں مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کے لئے لوگوں کے دلوں میں زیادہ سے زیادہ جگہ پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ ان کی ایک نظم کا نام ہی "قائدِ اعظم" ہے۔ اسی طرح ایک چومصرع کا عنوان انہوں نے "سالارِ کارواں" رکھا ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں۔

جیہڑے ملدے سن سانوں آپ مرگئے فیروی رنگ لگی اے سارساڈی
دکھی حالاں دا حال سنانے نوں ہدلی جیرے گئی پکار ساڈی
دیاں والاں دا آیا جوش اندر کشتی کس طرح لائی سُو پار ساڈی
عشق آبر پہنچا سے کامنزلاں تے محمد علی دسے ہتھ مہار ساڈی

عشق آبر کی شاعری میں ہمیں تقابل کا ڈھنگ عام طور پر نظر آتا ہے۔ جہاں کہیں وہ قائدِ اعظم کا ذکر کرتے ہیں۔ ساتھ ہی کسی کانگرسی احراری یا یونینسٹ ٹوڈی لیڈر کا ذکر بھی لے آتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں۔ یہ ٹوڈی لیڈر ہمارے لیڈر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان لیڈروں اور ان کی جماعتوں کو وہ کھری کھری سناتے نظر آتے ہیں خاص طور پر یونینسٹ جن میں خضر بطورِ خاص شامل ہے۔ عشق آبر کا ہدف ہے۔ خضر کے بارے میں ان کا ایک غیر مطبوعہ چومصرعہ ملاحظہ فرمائیں ؎

خضر دونیں ایس جہان آتے اک نار دیکھو دجا نور ہویا
اک دے متے بریاں لے کمی ہوئی اک نیکیاں نال بھرپور ہویا
اک جلیاں نوں راہ پان والا اک چھڈ رستہ کیڈا دور ہویا
عشق آبر اک ڈبیاں تار دا اے اک ڈبیے تے مشہور ہویا

پاکستان کے قیام کے سلسلے میں خود اعتمادی ملاحظہ فرمائیں۔

پاکستان بن کے رہے گا یاد رکھو کٹنے ہوئے حساب جیلیاں نیں
پہنچی قافلہ منزل تے پہنچاں ایس پکے لئے بن قدم پتھالیاں نیں
دبے جذبے دلاں تے کھول دسے گی میاں لیگ دے ہتھ چہیلیاں نیں
عشق آبر نہ ہوک حیران ہوسن پچھے قدم جد ولکھا بیلیاں نیں

عشق آبر ان خوش قسمت کارکنوں میں ہیں۔ جنہوں نے پاکستان بنتا دیکھا اس موقع پر بھی انہوں نے اشعار میں خوشی کا اظہار کیا۔

ان کے بعد تحریک کے حوالے سے شائع شدہ کلام سید فضل حسین مدنی شہباز ساکن باہروال ضلع گجرات کا دستیاب ہوا ہے "نغمۂ پاکستان المعروف لیگ کی شان" کی چھ نظموں میں ایک طویل نظم پنجابی کی ہے اُردو نظمیں بڑی جاندار ہیں ان میں مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کو بڑے بے باکانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے ایک اُردو نظم یوں شروع ہوتی ہے ؎

قائدِ اعظم کا فرمان
پاکستان، پاکستان

ان کی پنجابی نظم بڑی رواں دواں اور پُر مغز ہے اس کا آخری حصہ ملاحظہ فرمائیں :-

آجا پھڑ سائیں مسلم لیگ والی قائدِ اعظم جناح دے نال دل کے
ڈبی پئی ایں تر لے فیر اپنی بکھر گئیوں توں وچ غلطاں کتے
عاشق وانگ بلال دے بن پکا حیدر جیہا جذبہ فیر کر پیدا
حمزہ جیہا توں صدق صادق بن خالد جیہا کوئی بہادر کتے
دل قوم دے نال تے قوم نہ چھڈ قوم قوم دا بھلا اے چاہندے
ہو جا شمع تے پتنگ نثار اس تے آیا سر تے جھل طوفان کتے
پاکستان لینا ای ہر قیمت بھانویں دنیا دے وچ فنا ہوئیے
شہباز تیرے سارا ہوش ہے چمن فیر تولے کتے پاکستان کتے

اس حوالے سے کی جانے والی تمام شاعری میں ہمیں جو بات مشترک نظر آرہی ہے وہ مسلم تشخص کا حوالہ ہے۔

مسلم لیگ کے لئے باقاعدہ کارکن کے طور پر کام کرنے والوں میں محمد دین منیر (۱۹۰۰ء – ۱۹۷۰ء) کا نام

تحریک کو جاننے والے ابھی تک نہیں بھولے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی سٹیج سے بہت پڑھا گاؤں گاؤں پھر کر پاکستان کے پیغام کو پہنچایا۔ اس عرصے میں نظر بند بھی ہوئے۔ ان کا انداز بھی عشق تبرگالا ہے۔ مگر ان کا لہجہ خلاف پاکستان جماعتوں اور لیڈروں کے سلسلے میں قدرے سخت ہے۔ خضر کو تو یہ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ لائل پور کے ایک جلسے میں انہوں نے ٹرے والوں (یونینسٹوں) کی اپنے شعروں میں خوب درگت بنائی تھی۔ ان کا کلام شائع نہیں ہوا۔ وہ خود بھی اب ہم میں نہیں ایک شاگرد عمردین قصور بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ دوسرے شاگرد جن کے پاس ان کا زیادہ کلام نہیں تھا۔ محمد صدیق مہر بقید حیات ہیں۔ ان سے کچھ کلام حاصل ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو ایک چو مصرعہ جس میں انہوں نے مطالبۂ پاکستان کو کس طرح مسلمان کی زندگی اور موت کا مسئلہ قرار دیا ہے ؎

سر کٹا نا اے نبیؐ دی آن لئے ایہہ فرض ہویا مسلمان دے لئی
کائنات جیہڑی تسی دیکھدے او پیدا آئش رب نبیؐ دی شان دے لئی
مسلمان جہان دے لئی ہویا ایہہ جہان سارا مسلمان دے لئی
اے زندگی موت دی تیر کھیں مسلمان دی ہے پاکستان دے لئی

موجودہ پنجابی شاعروں میں طالب جالندھری بھلے خاصے سینئر شاعر ہیں۔ خاص طور پر گیت کے حوالے سے ان کا بہت نام ہے۔ مگر اصلاحی شاعری اور قومی شاعری میں بھی انہوں نے خاصا کام کیا یہ بھی عملی طور پر تحریک پاکستان میں حصہ لینے والے فنکاروں میں سے ہیں۔ ۱۹۴۰ء ہی میں تحریک کے ساتھ منسلک ہو گئے بطور آرگنائزر کام کیا۔ نظر بند بھی ہوئے۔ انہوں نے اس زمانے میں بھی اپنی قومی نظمیں شائع کیں۔ ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی ایک نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

پاکستان پاکستان، پاکستان پاکستان
پاکستان لینوں کیہڑا سانوں روک سکدا
ہر کوئی اپنے گھر آتے حق رکھدا
اسیں کر دیے اعلان ساڈی جند ساڈی جان
پاکستان پاکستان پاکستان پاکستان

اس حصے کے ایک اور شاعر صحرائی گورداسپوری بھی ایک کارکن کے طور پر اس تحریک کے ساتھ منسلک تھے انہوں نے خضر کے خلاف تحریک میں حصہ لیا چنانچہ فیروزپور جیل میں نظر بند رہے۔ اس نظر بندی کے دوران لوک گیت ماہیا کی طرز پر لکھے ہوئے کچھ بول ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ کرم کما دے گا
دیری بجانویں کجھ وی پاکستان مل جاوے گا
پاکستان لئی ساہ ساڈے
جیلاں انگریزدیاں ڈک سکن نہ راہ ساڈے
اساں مقصد پا لینا
کانگرس پٹ دی رہوے پاکستان بنا لینا

ملک عبدالقادر زرشتہ کنجاہی ویسے تو ایک لحاظ سے گمنام شاعر ہیں۔ لیکن جو کلام ان کا تحریک کے حوالے سے لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں خاصا زور ہے۔ انہوں نے جداگانہ انتخاب، دو قومی نظریہ اور مسلم لیگ میں شمولیت پر نظمیں لکھیں ۱۹۴۵ء کے انتخابات کے سلسلے میں لکھی گئی نظم میں انہوں نے لوگوں کو مسلم لیگ کی طرف بلایا ہے اور ایک نظم میں وہ ہندوستان میں سے مسلمانوں کے لئے کامل آزادی اور الگ خطۂ زمین "پاکستان" کا مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں۔

سن او سادہ مرادیا مسلمانا ں اجکل جنگ آزادی دی ہوندی ہے
جیہڑی قوم نوں بھن دی جاچ نہیں سی او بھی اپنی پیریں کھلوندی ہے
ککھوں تیجھ سکے جیہڑی گنتری وچ نئیں کنڈ شے اپنے لئی اوہ وی ہوندی ہے
خاکسار احرار نہ قوم بھیں ایہہ سبھے غیر دیاں جتیاں دھوندی ہے
جیکر کامل آزادی نوں چاہوندا ایں مسلم لیگ مل تیرا ایمان چاہیدا ئے
مکمل حکومت تے کانگرس نوں ساڈا او کر بنا پاکستان چاہیدا ئے

مسلم لیگ کے کارکنوں میں ملک عطا اللہ مرحوم اور ان کے شاعر بیٹے ملک ضیاء اللہ ضیاء کا نام بھی زندہ رہنا چاہیئے۔ ملک ضیاء اللہ ضیاء تو آج بھی جلوسوں میں ہونے والی پٹائی کے قصے بیان کرتے ہیں۔ ان کے والد زیادہ سرگرم تھے اور مسلم لیگ کی طرف سے تمام پنجاب کے طوفانی دورے کیا کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم کے بول ہیں ؎

لا لے مسلم لیگ دے نال پریت

ملک ضیاء اللہ ضیاء نے تحریک کے حوالے سے جو کچھ لکھا اس میں ایک نظم مکالمے کے انداز میں ہے۔ جس میں ایک ماں اپنے بیٹے سے کہتی ہے کہ کملے ڈر نوجوانوں کے عام شوق تاش، شطرنج، چوپٹ اور سینما بینی چھوڑ دے اور مسلم لیگ میں نام لکھوا کر پاکستان بنا ورنہ میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی۔ بیٹا جواب دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

تاش شطرنج تے کھیڈ چوپٹ میں تے دل توں ماں بھلا بیا ہویا ئے
ہن تے نال ہتھیاراں دے کھیڈ ناواں کیوں تقت نازک سر تے آیا ہویا ئے
نوک دار برچھی نی مت اکھی ست فٹ پچھے ڈانس لیا ہویا ئے
ضیاء بزدلاں دے ڈھنگ نہیں رہنا مسلم لیگ وچ نام لکھوایا ہویا ئے

عبدالغفور ازہر مرحوم کا نام اقبالیات کے مترجم کے

طور پر پنجابی ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا ان کو فکرِ اقبال
سے منتقل کرنے کا خیال بھی اس وجہ سے آیا کہ یہ شروع
ہی سے طاہر نظریئے کے مالک تھے ۔ انہوں نے
خود نوشت سوانح حیات میں لکھا ہے کہ وہ مسلم لیگ
کے سٹیجوں پر پاکستان کے لئے نظمیں لکھا کرتے تھے
ان کی ایک نظم ان کے بیٹے جاوید اطہر کی وساطت
سے دستیاب ہوئی ہے ۔ یہ پاکستان کا ترانہ ہے
جس میں ایک عزم ہے جذبہ ہے ۔ جوش ہے لکھتے ہیں

میں تلوار لے کے جدوں پیر پٹاں
میں جتھے دھرلاں پیر پچھے نہ ہٹاں
طوفاناں نوں ڈکاں پہاڑاں نوں کٹاں
اج تائیں خیبر نوں نیں یاد سٹاں
نشہ کانگرس دا میں سارا اتاراں
وطن اپنا لے کے تے پاواں پکاراں

امام دین مجاہد صاحب آزادی کی جنگ کے
مجاہدین میں سے شاید اکیلے ہوں جو اس وقت اللہ
کے فضل و کرم سے بقیدِ حیات ہیں ۔ انہوں نے بہت
بھرپور زندگی گذاری ہے ۔ پنجاب میں ہر قومی اور
اصلاحی تحریک کے ہراول دستے میں شامل رہے
ہیں ۔ تحریکِ خلافت ہو یا علم دین کی تحریک ، شہید گنج
کی تحریک ہو یا کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد کی تحریک
یا پھر تحریکِ پاکستان انہوں نے سرگرمی سے ہر تحریک
میں موثر کردار ادا کیا شہید گنج کی تحریک میں احرار سے
علیحدگی اختیار کی ۔ ۱۹۴۰ء مسلم لیگ کی تحریک میں
شامل ہوئے ۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی ہدایت پر
"خان صاحب" کا خطاب واپس کیا مسلم لیگ اور
قائداعظم کے لئے کام کیا ان کی ایک نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ
فرمائیں :-

مسلم لیگ جماعت پیاری کیتے قول نبھاوے گی
انشاءاللہ قوم دی بیڑی پار و بنے لاوے گی

اس زمانے میں لاہور میں تحریک کا بڑا زور تھا ۔
یہاں پر نوجوان شعرا میں محمد حنیف قدر ، حافظ امرتسری ،
آغا امداد علی خان غالب وغیرہ سرگرم نظر آتے ہیں ۔
ویسے ڈاکٹر فقیر ، چراغ دین جوسے والے ، حکیم ناصر
اور فیروز دین شرف جیسے منجھے ہوئے لکھاری بھی
کسی نہ کسی رنگ میں لکھتے نظر آتے ہیں ۔ محمد حنیف قدر
ڈاکٹر فقیر کے شاگرد ہیں ۔ آج بھی جب تحریکِ پاکستان
کے آخری دور کی باتیں کرتے ہیں ۔ تو ان کی آنکھوں
میں ایک عجیب سی چمک دکھائی دینے لگتی ہے ۔
اس زمانے میں ایک ہی نعرہ تھا ۔ ہندوستان
کو توڑ کر پاکستان بناؤ ۔ چنانچہ وہ اپنی ایک نظم میں
کہتے ہیں ۔

ہندوستان غلاماں دا ملک ٹھیوں اینگل گاندھی جی دی جان دے نیں
مسلمان آزاد نہ ہو جاوے وری ایسی کرکے پاکستان دے نیں
وچوں بھجدے نیں مسلمان تائیں ہنگے جان توں بول زبان دے نیں
کیونکہ وچ تاریخ دے ذکر ساڈے ہر میدان اندر فتح پان دے نیں
گاندھی نہرو پٹیل نوں کہو جا کے کتنا اپنا آپ کیوں چھان دے نیں
پاکستان بے قدر بنا لینا ٹوٹے کر دینے ہندوستان دے نیں

حافظ امرتسری آج کل پنجابی بہت کم لکھتے ہیں ۔
لیکن تحریک کے دور میں ان کے پنجابی کلام کا شہرہ تھا ۔
وہ اس دور کے لکھنے والے ہیں ۔ جب مسلمان پاکستان
کا مطالبہ اپنا حق سمجھ کر کر رہا تھا ایک اعتماد کے ساتھ
دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی نظم میں یہی
تمکنت ہے ملاحظہ فرمائیں ۔

مکتے نہیں جے مکئیے دان
لے کے رہواں گے پاکستان
ساڈا رہنا سہنا وکھرا
ساڈا اٹھنا بہنا وکھرا
وکھری آن تے اکھ اے وکھری
وکھرا دین ایمان
لے کے رہواں گے پاکستان

حکیم ناصر فیروز دین شرف اور اس قسم کے
دوسرے شعراء مسلم تشخص کے حوالے سے شاعری کرکے
اپنے رنگ میں آزادی کے لئے زمین ہموار کر رہے
تھے ۔ ڈاکٹر فقیر انجمن حمایتِ اسلام میں اس قسم کی
نظمیں پڑھا کرتے تھے ۔ علاوہ ازیں اس بات کی شہادتیں
موجود ہیں کہ انہوں نے پاکستان کے لئے مسلم لیگ کے
حوالے سے عملی کام بھی کیا ۔ ویسے ان شعرائے کرام نے
پاکستان کے قیام پر خوشی کے اظہار کے طور پر بھی لکھا جو
اِن کے مطبوعہ کلام میں محفوظ ہے ۔

آغا امداد علی خان غالب (شمیم ، کے بارے میں
بتایا جاتا ہے کہ لاہور کے نوجوانوں کی ایک پوری کھیپ
کے ساتھ انہوں نے پاکستان کے لئے کام کیا ۔ خود نظمیں
لکھیں جلسوں اور جلوسوں کا انتظام کیا ۔ ان کی اس دور
کی نظمیں محفوظ نہ ہو سکیں کیونکہ یہ ۱۹۴۸ء ہی میں قتل
کر دیئے گئے ۔ ایک جو مصرعہ جو انہوں نے غالباً
پاکستان کے قیام کے نزدیک کے زمانے میں کہا ۔
ان کے داماد سلیم کاشر کی وساطت سے دستیاب ہوا
ہے ۔ ملاحظہ فرمائیں سے

گاندھی نہرو پٹیل دی کم نظری مسلمان تائیں مسلمان کر گئی
میں تے بڑا مشکور ہاں کانگرس دا جیہدی تنگ نظری ایہہ سلوک کر گئی

آپہیا انگیندا مکند اوالا چھہے نال پیدا پاکستان کر گئی
قہر آلودی اوہدی نگاہ غالب پر تنا تے میری جوان کر گئی

اس دور میں پنجابی کی عوامی قسم کی شاعری میں جو اپنے گاؤں
چھوڑنے والے کا طوطی بولتا تھا۔ انہوں نے قیام پاکستان
سے پہلے بہت سے عوامی قصے لکھے۔ ان میں قصہ گنگی کا ں
بھی شامل ہے۔ جس میں انہوں نے علامتی ڈھنگ میں
ایک ظالم بیٹے کا ایک معصوم بچے پر ظلم بڑے فنکارانہ
ڈھنگ میں بیان کیا ہے۔ چونکہ ایسے شاعروں کا تعلق
براہ راست عوام سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ تحریک
پاکستان کے عوامی رنگ کو کیسے نظر انداز کر سکتے
تھے۔ انہوں نے جو زوردار نظم لکھی اس کا ایک بند
ملاحظہ کریں ؎

کوئی دن پا کے قائداعظم پاکستان بناوے گا
جدوجہد ہوندی رہے گی اپنے گلوں غلامی لہے گی
قوم رہے نہ نکیلناں رہے گی حصہ کرن ونڈاوے گا
کوئی دن پا کے قائداعظم پاکستان بناوے گا

چنانچہ جب پاکستان معرض وجود میں آگیا،
مسلمانوں کی صدیوں کی جدوجہد رنگ لائی تو ہر فرد و بشر
نے خوشی منائی۔ لٹے پٹے قافلوں نے خوشی منائی۔
شہداء کے وارثوں نے خوشی منائی، صوفی محمد واسپوری
کا لکھا ہوا ترانہ ۱۳-۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب
سب سے پہلے پاکستان کی نئی نئی فضاؤں میں عبدالعزیز
سیالکوٹی کی آواز میں پاکستان براڈکاسٹنگ سروس
لاہور کی وساطت سے گونجا۔

بسم اللہ بسم اللہ کہہ کے رب دا نام دھیاواں
فیر درود محمدؐ اُتے خوشیاں نال پڑھاواں
چار یار نبی سرور دے جنہاں توں جان نثاراں
پیراں ولیاں قطباں اُتے تن من اپنا واراں
قائداعظم توں میں اپنی جندڑی کھول گھماواں
جنھے ویہاڑے ملی آزادی دل وچ خوشی مناواں

انور شعور
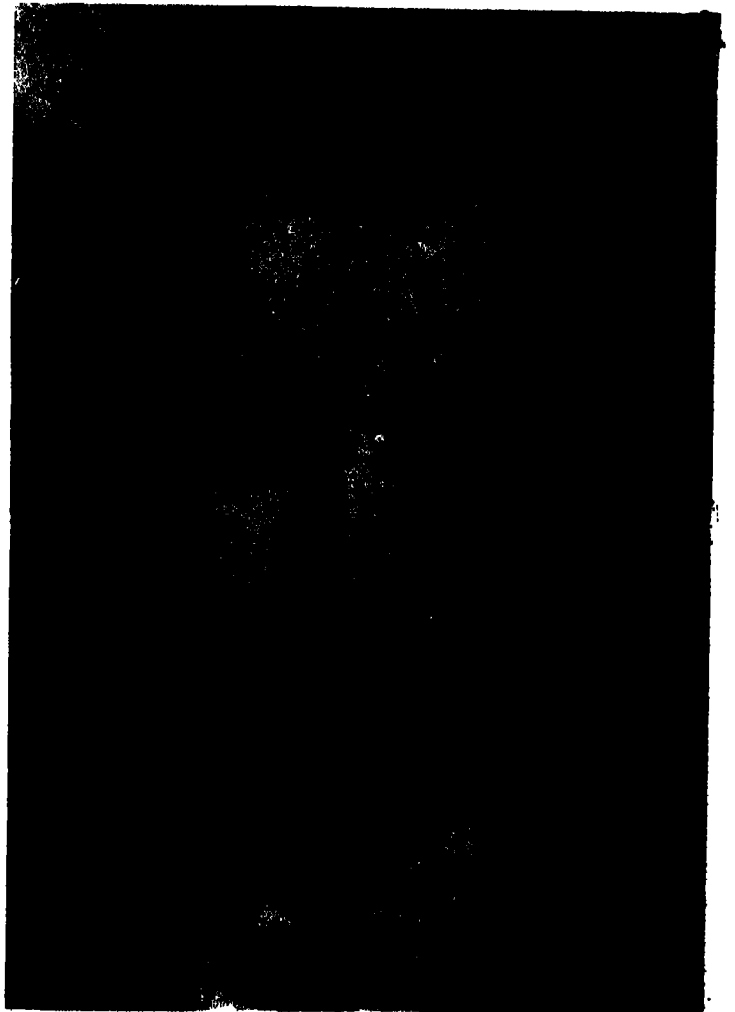
وحید تابش

چہرہ عظمت اور بزرگی والا

وہ دن بہت مختلف تھا۔ پہلے گذرے ہوئے سارے دنوں سے۔ اور شام اس دن کی بہت بوجھل تھی۔ پہلے گذری ہوئی ساری شاموں سے۔ جب آذر کے بیٹے ابراہیم نے توڑ پھوڑ دیئے تھے سارے بُت معبد کے اور ساری بستی ڈول رہی تھی۔ خوف کے سمندر میں بے خدا ہو کر اور میں دلگیر ایسا تھا جیسے گھِر گیا ہو جیسے ساری بستی کی تنہائیوں نے بے تعلق ہو گئی تھی زبان میرے تیشۂ ہنر کی اور میں نے دیکھا کہ جو بکھری ہوئی تھی۔ سیہ رات پر تنتے ہوئے آسمان میں وہ عبارت سمٹ رہی تھی۔ ایک ترتیب میں اور معدوم ہوتا جاتا تھا خوف حیرت کا زمین و آسمان کو محیط کرنے والا۔

پھر میں نے سُنا خداوند کہتا تھا۔

اے ابراہیم میں تجھ سے راضی ہوا

میں نے سوچا کہ ٹوٹ پھوٹ گئے تھے سارے بت تو اُسی ایک لمحہ میں جب توڑ لیا تھا ابراہیم نے ان سے اپنا ناطہ کہ خداوند چاہے کسی بے روح کو ذی روح کرتا تو بے روح کو دیتا ہے لمس اپنا اور ذی روح سے چھین کر لمس اپنا قادر ہے بے روح کر دینے پر ہر شے کو۔ اور خداوند کا لمس امانت ہے پاس آدم کے اور امانت غارت کرنے والوں کے لئے بڑی سخت ہے پکڑ خداوند کی جو لاشریک ہے۔

اس رات میں نے دیکھا خواب بڑی حیرت والا اور مجھ پر گھیرا تنگ کرتے تھے۔ معبود ٹوٹے پھوٹے سے اور مانگتے تھے مجھ سے اپنی بینائی اور اپنی گویائی اور مانگتے تھے مجھ سے اپنے دست و بازو اور مانگتے تھے مجھ سے اپنی خدائی۔ وہ بوسے دیتے تھے میرے تیشۂ ہنر کو۔ میں نے تراشے تھے جن سے پیکر اُن کے بڑے تقدس والے بڑی ہیبت اور بزرگی والے۔ میں جن سے بیان کرتا تھا اپنی حاجت اور پاتا تھا جن سے اپنی مرادیں

اُس رات کی صبح میں سوچتا تھا گذری شب کا خواب بیٹھ کر سنگِ سُرخ کی سِلوں پر بستی سے دور اور چومتا تھا اپنا تیشۂ ہنر جو کھول سکتا تھا قفلِ اسارت میرے معبودوں پر جو قید تھے سُرخ سفید اور سیہ پتھر کی سلوں میں۔ میں نے نگاہ اٹھائی بستی کی سمت جہاں ماتم ہوتا تھا معبودوں کا اور آتے دیکھا ابراہیم کو سلامت آگ کے شعلوں میں سے اور سنا خداوند کو جو کہتا تھا ابراہیم سے۔

اے ابراہیم میں تجھ سے راضی ہوا

تب میں نے سوچا کہ جو توڑے ابراہیم نے پیکر وہ رب کے نہ تھے تو پھر کیسا چہرہ ہے خداوند کا، بڑی عظمت بڑی بزرگی والا۔ اور جو ہر شب مانگتے ہیں مجھ سے اپنی خدائی اگر میرے خوابوں میں ان کا خداوند کون ہے۔

میں غور کرتا تھا بیٹھا پتھر کی سلوں پر کہ دیکھا آتے ابراہیم کو بستی سے ساتھ اپنے فرزند اسماعیل کے۔ چھری بڑی تیز دھار والی تھی ہاتھ میں ابراہیم کے اور سیج ذبح اسماعیل کی دیدنی تھی روشن تھی آنکھ ابراہیمؑ کی اور منور تھا چہرہ اسماعیلؑ کا۔ میں نے اٹھایا اپنا تیشۂ ہنر اور کہا ابراہیمؑ سے

اے ابراہیمؑ تو نے راضی کر لیا اپنے رب کو پر تیرے پروردگار کا چہرہ کیسا ہے!

اور میں کورے کر گیا ساتھ گواہی دینے والے

کے ۔۔۔ اجنبی راستوں پہ نادیدہ شہروں کو اور
ہم ڈھونڈنے والے اندھیروں میں جستجو کے
ہلاک ہوتے رہے اور نور میں کشف کے شعلوں
کے ساتھ اٹھائے جاتے رہے۔ ہم ذکر کرتے
کرتے اُن کے جو مٹ گئے فنا ہوئے ۔۔۔
مرثیے پڑھتے رہے ان کے جن کا حشر المناک
ہوا اور جو ہم میں سے تھے شکستہ ہمت والے
سناتے اُن کو رجز اور گاتے آگے بڑھتے ہوئے
رزمیے جری بہادروں کے اور پھر دیکھا ہم سب
نے کہ پانیوں کی عفریت نے لوٹا یا من و عن اس
امانت کو جو اس کے شکم میں رہی چالیس روز
تک اور دلوں کو گھیرے جو خوف تھا سمندروں
کا گہرے پھیلا ہوا کر دیں کہتا تھا۔

میرے رب کی حکمرانی بحر و بر پر ہے
اور اس کھوج میں میں اکیلا چلنے لگا ادھر
کو جدھر کو دریا بہتا تھا۔ اور تیرتا تھا بچہ اس
میں صندوقچہ۔ پھر میں نے دیکھا موسیٰ کلام کرتا
تھا اپنے رب سے اور دیکھنا چاہتا تھا
چہرہ اپنے رب کا۔ پر ریزہ ریزہ ہوئی ہیبت
طور کی اور بکھر گیا میرے دھیان میں بنتا ہوا
چہرہ خداوند کا۔ پھر موسیٰ کا عصا اژدھا بن کر نگل
گیا ساری بلائیں جادو والوں کی تو کھلا مجھ پر
حال کشتیٔ مسکین و جانِ پاک کا اور سامنے میں
دیوار یتیم کے کشف ہوا کہ لمس خداوند کا اجالا
ہے۔ جس میں تلاش کرتے ہیں رزقِ یقین کا اور
روشنی کرتے ہیں جس سے اندر اپنے گھروں
کے جب رات محصور کر لیتی ہے بستیوں کو۔

مثل اس چراغ کے پھیلتا ہے لمس خداوند کا
ہے روح کے اندر روح بکلا دیتا ہے جسم
اندر آگہی کے چراغ کو جب دلوں کو گھیر لیتی
ہے ظلمت چھا جانے والی۔ پس جو چراغ
جلتا ہے گھر میں یا روشن ہوتا ہے اندر
دلوں کے وہ خداوند کے لمس سے ہے خداوند
کا لمس نہیں۔ اور خداوند کا لمس ذی روح کرنے
والا ہے وہ لوگ گمراہ ہوئے جنہوں نے پایا لمس
خداوند کا اور رجوع نہ کیا خداوند کی طرف۔
بلکہ داخل کیا لمس خداوند کا اندر بتوں کے
پس انہوں نے حفاظت نہ کی اُس امانت
کی جو سونپی گئی اور خداوند سرکشوں کے لئے
بڑا قہر والا ہے۔

لیکن میرے رب کا جلال والا چہرہ
کیسا ہے!

میں نے دیکھے جنات حکم بجالاتے
سلیمان کا اور نظارہ کیا نیلی فضاؤں کے
پرندوں کا جو طواف کرتے تھے ہیکلِ سلیمانی کا
اور کرتا تھا سلیمان تمجید اپنے رب کی جس
نے بنایا آدم کو اشرف سب مخلوقات سے
اور قسم کھاتا ہے طور کی اور زیتون کی اور
بے شک بڑی بندگی والا ہے۔ پر اس کا
چہرہ کیسا ہے؟

میں نے دیکھا اُس کنواری کو کہ جس
کے نور کا ہالہ تھا اور سلگتی جاتی تھی لہر
اُس نور ہالے کے۔ اور فکر کرتی تھی دیکھ
دیکھ کر بیت اللحم سے بیت المقدس کو

تب خداوند نے کہا!

اے مریم تو دل چھوٹا نہ کر۔ میں نے
جاری کر دی نہر تیرے لئے اور بھر دیا تیرے
پاس کھجور کو پھل سے۔ اور پھر کھجور کا تنا
جھک کر بھرتا تھا دامن مریم کا پکی ہوئی
سنہری کھجوروں سے تو میں نے جانا یہ خداوند
کے لمس سے ہے۔ پر میرے رب کا چہرہ
کیسا ہے عظمت اور بندگی والا۔

اور میں نے دیکھا مریم کا بچہ شیر خوار
باتیں کرتا تھا حکمت والی اُن سے جو نہیں
جانتے تھے۔ وہ مٹی کے پرندے بناتا اور
کہتا اڑ جا تو وہ پرندے اڑ جاتے نیلی فضاؤں
میں اور جب بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑیں
تلاش کرتا ہوا مریم کا بیٹا اٹھا کر چلا صلیب
صلیب اپنے کاندھوں پہ آگے آگے
ہجوم کے۔ پیاس سے پھیرتا ہوا زبان اپنے
لبوں پر تو میں کوڑھیوں کو پلا کر پانی ہجرت کر
گیا اس شہر سے جہاں کے رہنے والے نہیں
جانتے تھے۔

اور جب دھوپ بہت تیز ہو گئی
اور آ گیا سورج بہت قریب زمین کے اور
آگ لگ گئی صحرا کی ریت کو تو میں نے دیکھا
تجار کے ایک قافلے میں ایک نوعمر کو جس
کے سر پہ چلتا تھا بادل سایہ کرتا ہوا ۔۔۔ تو
میرے دل میں کہا کسی نے کہ یہ شکلیں بدلنے
والا پھیلتا سمٹتا بادل خدا کے لمس سے ہے
خداوند نہیں۔ پھر ایک دن جس کے سر پہ

بادل سایہ کرتا تھا۔ پوچھنے لگا۔

اے لوگو! اگر میں کہوں کہ احد کے اس پار ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ تو کیا تم یقین کر لوگے؟ تو سب نے اقرار کیا کہ وہ سب میں امین کہلاتا تھا۔ حالانکہ وہ سب کے سب اس پر ایمان لانے والے نہ تھے پس ان کے اقرار سے ان سب کی رہنمائی مثل امانت کے اسے سپرد ہوئی۔ پھر ڈھانپا اپنی چادر سے اُس نے یہودی بچی کا سر اور لوٹایا سورج کو مشرق میں اور ٹکڑے کئے قمر کے اپنی انگشتِ شہادت سے۔ اُس نے دعا دی، طائف کو پھل پھولوں کی۔ اس نے سفر کیا ساعتوں میں زمین سے آسمانوں تک اور دیکھا اپنے خداوند کو۔ وہ واپس آیا ساعتوں میں اور کوائف بیان کئے مسجدِ اقصیٰ کے۔

وہ سوار ہوا قصوا پر اور اترا بطن وادی میں اور کہا لوگوں سے ـــــ اے لوگو! میں نے اونچ نیچ کے سب بت توڑ ڈالے آج کے بعد کسی کو کسی پر فوقیت نہیں مگر جو متقی ہے تم میں سے افضل ہے۔

تب میں نے اقرار کیا بطن وادی میں موجود اور غیر موجود سب چہروں میں کوئی چہرہ نہ تھا میرے خداوند کا۔ جو بلاتا ہے راتوں رات اپنے بندے کو آسمانوں پر اور دکھاتا ہے اپنا چہرہ ـــ تب پوچھتا ہے بطن وادی میں وہ قصوا کا سوار کالی کملی والا۔

اے لوگو کیا میں نے وہ امانت لوٹا دی جو مجھے سونپی گئی تھی اور لوگوں نے اقرار کیا تو اس نے اٹھائی اپنی انگشتِ شہادت آسمان کی سمت اور اشارہ کیا لوگوں کی طرف اور کہا۔

خدایا گواہ رہنا خدایا گواہ رہنا خدایا گواہ رہنا۔

تب اُتر گئے میرے دل میں کچھ نقش تیرتے ہوئے روشنی میں۔ جیسے میں نے دیکھ لیا تھا چہرہ اپنے رب کا۔ کہ جس نے دیکھا تھا میری سمت اور انگشتِ شہادت جس کی اٹھی تھی آسمان کی جانب۔ آنکھ اس کی روشن تھی سب سے بڑھ کر ـــ وہ واقف تھا سب رنگوں سے ـــ وہ آشنا تھا سب خوشبوؤں کا اور شاہد تھا سب مناظر کا اور امین کہلاتا سب میں۔ تب مجھے شعور ہوا ـــ میرے ہنر کا اور رہائی ملی مجھے میرے ہنر کے جبر سے جو عادی تھا خداوند کا چہرہ دیکھنے کا جو شجر اور بشر میں۔ پھر بیعت کی میرے ہاتھ میرے پر میرے ہنر نے اور حرف بہ حرف کھول دیا گیا وہ بوجھ جس سے دوہری ہو رہی تھی میری کمر ـــ میں نے اذبر کئے سحار سے اسباق اور نچھور کیا اپنا وجود مکہ کی مسجد کی محرابوں، طاقوں میں اور سجایا اُن کو پھول پتّوں سے اور جب یہ بس گئے یہ درس میری ذات میں اور روایت امانت کی ابراہیم سے حسین تک بن گئی انداز میری سوچ کا اور وسیلہ میرے ہنر کا۔ تو میں نے خطوط سے بنائیں اشکال چرند پرند درند اور انس کی ـــ جو میرا دانہ نہیں چگتے جو میری بھیڑوں کو چیرتے پھاڑتے نہیں۔ جن کا رزق میرے پاس میرے خداوند کے لمس کی برکت سے اور جن کا غرور میرے خداوند کے جلال سے ـــ جن کی خدائی میرے تابع اور میں عاجز بندہ تیرا میرے خدا ـــ مجھے اپنے لمس سے نوازنے والے۔ مجھے شامل رکھنا اُن میں جو تیرے لمس کی تکریم کرنے والے اور امانت کی پاسداری کرنے والے ہیں۔ جن پر تیرا انعام ہوا ـــ اور روک مجھے اُن میں شامل ہونے سے جو تیرا لمس ضائع کرنے والے ہیں۔ جن پر تیرا عتاب نازل ہوا ـــ،

بے شک تو نہایت مہربان اور بلند نوازنے والا ہے۔

انجم رومانی

پیار کے سودے میں نہ پڑنا کہ خسارا ہو گا
جو ہوا حال ہمارا سو تمہارا ہو گا

یونہی بدظن نہیں احباب ہمارے ہم سے
کچھ کسی اور طرف کا بھی اشارہ ہو گا

آخر انسان ہوں، مجبورِ سخن ہوں، یارب!
ہاں فرشتوں کو مگر ضبط کا یارا ہو گا

کیسے مانوں کہ کوئی درد کی تدبیر نہیں
کوئی صورت، کوئی حیلہ، کوئی چارہ ہو گا

پاسِ آئینِ وفا ٹھیک ہے، لیکن انجم
کچھ بھلا اس میں تمہارا نہ ہمارا ہو گا

انور شعور

کب غنا بار تری سحر خطابی نہ رہی
دید میں کب مری خاموش جوابی نہ رہی

خیر خواہوں کے نصائح پہ طبیعت جاتی
عمر بھر مجھ میں یہی ایک خرابی نہ رہی

دورِ تعلیم محبت میں ہمارے مابین
کون سی بات بھلا غیر نصابی نہ رہی

خانہ آباد ہوئے یوں کہ کسی محرم کو
ساتھ لانے کے لئے جیب میں چابی نہ رہی

تھیں مثالیں تو نہایت مگر اس کے آگے
حافظے میں کوئی تعریف کتابی نہ رہی

دل ترے خندۂ بے جا سے کبھی خوش نہ ہوا
گو وفاؤں پہ امیدِ صلہ یابی نہ رہی

جس نے پالا مجھے ماں بن کے وہی بعد طلاق
ایک لے میں مری ماں، مری بھابی نہ رہی

نامے پڑھ پڑھ کے جب آیا اسے نامے کہنا
اس کے نزدیک مری ڈاک، جوابی نہ رہی

میری توبہ تو کہاں، کال پڑا ہے ایسا
حضرتِ شیخ سی ہستی بھی شرابی نہ رہی

جو اسے آن کو لے آئی تھی، برسوں میں بھی
وہی حالت نہ رہی، اور شتابی نہ رہی

میری رنگت کا تغیر تو کوئی بات نہ تھی
جلد اس شیشہ بدن کی بھی شہابی نہ رہی

مے میں اب بھی ہے وہی آب، وہی آگ شعور
ایک میرے دلِ پُر خوں کی گلابی نہ رہی

افضل پرویز

ہزار گھاتیں، نشیب و فراز بہتیرے
"سفر ہے شرط۔ مسافر نواز بہتیرے"

یہ کیسا نغمہ ہے جو رس کی اک رتی بھی نہ دے
جلو میں بھاؤ ترت اور ساز بہتیرے

بہت نہال ہو ساحل سے سیپیاں چن کر
سمندروں کی تہوں میں ہیں راز بہتیرے

کبوترانِ حرم کو بھی بازگردانے
ستم کے حیلے کئی اور جواز بہتیرے

کسی طرف سے بقدرِ وفا نہ داد ملی
ستم گروں کے اٹھائے ہیں ناز بہتیرے

پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا روپ دھاروگے
بڑھے تو لیں گے قدم امتیاز بہتیرے

نکل کے گھر سے نگر میں صدا لگا تو سہی
سمجھ ہی لیں گے ترا حرفِ راز بہتیرے

وزیر پانی پتی

مرے خلوص کو کچھ دادِ آشنائی دے
تو اپنی اصل میں جیسا بھی ہے دکھائی دے

وہ شور ہے کہ سمجھ ہی میں کچھ نہیں آتا
مری صدا کبھی سب سے الگ سنائی دے

سب اپنے اپنے لہو میں نہائے بیٹھے ہیں
کوئی نہیں جو کسی کے لئے دہائی دے

ترا فقیر بھلا اور کیا سوال کرے
زمانے بھر کو مری شانِ بے نوائی دے

تری طلب کے لئے حوصلہ نہیں ہے مجھے
مجھے تو صرف مری ذات تک رسائی دے

تری تلاش میں صحرا نورد بھی ہیں کئی
ہوائے دشت کو خوشبوئے آشنائی دے

میں سوچتا ہوں وزیرؔ ان کیسے کہا جائے
جب آئینے میں کوئی دوسرا دکھائی دے

وحید تابش

یہ اور بات، کٹھن مرحلہ سفر کا ہے
زمین سے تا بہ فلک فاصلہ نظر کا ہے

حروف تیرتے پھرتے ہیں سادہ کاغذ پر
یہ معجزہ بھی عجب میری چشمِ تر کا ہے

جو بارشوں سے بچے، لے گیا انہیں سیلاب
پڑا ہوا ہے جو ملبہ، وہ میرے گھر کا ہے

سفر قضا کا، کوئی آخری سفر تو نہیں
کہ اس کے بعد بھی اک سلسلہ سفر کا ہے

زمین چھوڑ گئی ہیں، جڑیں درختوں کی
ستم تو یہ ہے گلہ شاخِ بے ثمر کا ہے

پہنچ گئی ہیں کنارے پہ کشتیاں لیکن
دلوں پہ خوف مسلط ابھی سفر کا ہے

وہ روشنی ہے کہ کچھ بھی نظر نہیں آتا
عجیب رنگ ابھرتی ہوئی سحر کا ہے

حدیثِ شعر لکھی ہے کچھ اس طرح تابشؔ
ہنر وروں میں بھی چرچا مرے ہنر کا ہے

حزیں لدھیانوی

جب سے لہو میں ڈوبے میری تحریروں کے رنگ
پیارے! اُجلے ہو گئے تیری تصویروں کے رنگ

مجھ کو تو لگتا ہے سونے جیسا ان کا روپ
مٹی میں ملتے رہتے ہیں جن ہیروں کے رنگ

میرے حصے میں ہیں آج بھی تحریروں کے کانٹے
تیرے لئے ہیں پھولوں جیسی تو قیروں کے رنگ

سیلِ حوادث کے ریلے کو کیسے روک سکیں گی
جسموں کی دیواروں پر ہیں تقدیروں کے رنگ

زنگ آلودہ لوہے پر اک ضرب کی ہے بس دیر
رُت کی ہواؤں نے بدلے ہیں زنجیروں کے رنگ

مزدوروں کے خون پسینے کی ہیں سب تنویریں
دیکھتے ہو، جو شہنشاہوں کی تعمیروں کے رنگ

اپنے رنگ میں اپنی بات کہو تو بات بنے
مانا، بہت پیارے ہیں مرزوں اور میروں کے رنگ

زہر کا ساغر ہاتھ میں لے کر کیوں چپ چاپ کھڑے ہو
دکھلاؤ حزیںؔ تم بھی کی تقصیروں کے رنگ

کاش امشب کرن کی سیڑھی سے
ایک چاند اترے، ایک چاند چڑھے

سرخیاں دیکھتا ہوں چہروں کی
ہر خبر کے متن کو کون پڑھے

کوٹھیاں بن گئیں گھروندوں پر
ساری چڑیاں ہیں آسمان تلے

دل کے دریا میں پھر نہ "کانگ" آئی
کتنے دریا اُتر اُتر کے چڑھے

یہ الگ بات کچھ خریدا نہیں
ہم بھی اُونچی دکان میں تو گئے

موت سے کیا ڈرے گا وہ، جس نے
زندگی کے سدا عذاب سہے

سوز دل میں، نہ شعلے ہاتھوں پر
برف سا بن چلے تو کیسے جلے

شب کا سنگِ سکوت ٹوٹے گا
جب بھی آواز کے چلے تیشے

پھنس گئی جال میں شکاری کے
کاش دو ہاتھ ہوتے مچھلی کے

توڑ دو ذات کے حصاروں کو
جھگڑے مٹ جائیں تیری میری کے

سیتاؔ، مریمؔ، زلیخاؔ، سوہنیؔ، ہیرؔ
نام کتنے ہیں ایک بیٹی کے

پہلے پت جھڑ کے ساتھ الجھو پھر
رقص دیکھو، بہار دیوی کے

آؤ! سوچیں کہ زندگی کیا ہے
شب کو جا کر کنارے ندی کے

بھوک، بیماری، رنج، الجھن
تحفے سب ہیں یہ تنگدستی کے

ملتے ہیں منزلِ ضیا سے حزیںؔ
سلسلے آگہی کی وادی کے

اکبر حمیدی

جسم کیا کیا قبائیں کیا کیا ہیں
مہ وشوں کی ہوائیں کیا کیا ہیں

ذہن میں دھوپ، روح میں جل تھل
موسموں کی ادائیں کیا کیا ہیں

شکر لب پر، شکایتیں دل میں
عاشقوں کی سزائیں کیا کیا ہیں

کیا بتائیں اسے کہ جانا ہے
خامشی میں صدائیں کیا کیا ہیں

پیڑ بے رنگ، پھول بے خوشبو
اس چمن کی خزائیں کیا کیا ہیں

کیا ترے حسن کو جادو آئے
ہر کسی سے تری خوشبو آئے

بیکراں شہر کے اس جنگل میں
تو نظر صورتِ آہو آئے

سورج اترا تو ستارے ابھرے
چھپ گیا چاند تو جگنو آئے

ہم ہی اب لوٹ نہ پائیں شاید
وقت لوٹ آئے اگر تو آئے

سانحے ایسے بھی گزرے اکبر
جب ہنسی آئی نہ آنسو آئے

کسی قابل تو شاید ہو گئی ہے
مگر اب عمر زائد ہو گئی ہے

بیاں جذبے سے عاری ہو گیا ہے
زباں حسبِ قواعد ہو گئی ہے

لکھی ہیں جس کی خاطر میں نے غزلیں
اسے خوشے قصائد ہو گئی ہے

زیاں یہ ہے کہ طرزِ فکر اپنی
زوائد ہی فوائد ہو گئی ہے

ملا اذنِ سخن اکبر کو لیکن
غزل کی شرط عائد ہو گئی ہے

اگست ۱۹۶۹ء

حسن رضوی

ہے عشق تو پھر عشق کا اظہار بھی ہو لے
پھر چاہے پرندہ کوئی بولے کہ نہ بولے

بس ایک ہی حسرت تری آنکھوں سے عیاں ہو
تو پلکیں جھکا کر جو کبھی ہنسنے سے کھولے

ہے تیری باتوں کے تصور سے معطر
خوشبو تیری سانسوں کی گلابوں کے جھکولے

دریا تو جوانی ہے سدا بہتے رہے گا
کشتی کوئی ساحل پہ ہو یا پانی میں ڈولے

وہ چاہے تو قدموں میں کئی چاند بچھا دوں
اک بار اشارہ تو کرے ہونٹ تو کھولے

بادل کی طرح سر پہ رہوں سایہ کناں میں
وہ دھوپ کے آنگن میں کبھی بال تو کھولے

خواہش کا پرندہ ہے ابھی لوٹنے والا
سورج کو کہو لوٹ تو لے شام تو ہو لے

کیوں اپنی ہی باتوں پہ پریشاں ہے رضوی
ہر بات کو سوچے کبھی ہر بات کو تولے

آدمی ہی آدمی کے سائے سے گھبرائے گا
ہم نہ کہتے تھے حسن ایسا زمانہ آئے گا

تذکرے کرتے ہیں طائر آج بھی اس شوخ کے
ہائے وہ اک پھول جو اب لوٹ کر نہ آئے گا

خون ساون کی طرح برسے گا تپتی ریت پہ
اور پھر یہ پیاس کا صحرا ہرا ہو جائے گا

وہ تو سورج ہے اگر چھپ بھی گیا تو کیا ہوا
یہ اندھیرا کب تلک یوں وقت کو بہلائے گا

ہم تو ساحل پر کھڑے بس دیکھتے رہ جائیں گے
اور وہ دریا سمندر بھی بہا لے جائے گا

شام ہوتے ہی فضائیں گنگنائیں گی حسن
صبح کا پہلا پرندہ لوٹ کر گھر آئے گا

دریا دریا جلتے دیکھوں
میں بھی برف پگھلتے دیکھوں

گیلی مٹی کی خوشبو سے
بدن گلاب چٹختے دیکھوں

ایک ہی صورت آنکھ میں کھٹکے
جب بھی سورج ڈھلتے دیکھوں

رات کے پچھلے پہر کو جاگوں
اور میں چاند پگھلتے دیکھوں

اس کی سانولی صورت کو میں
سرمئی شام میں ڈھلتے دیکھوں

جھیل سی آنکھوں کے ساون میں
اپنی آنکھیں جلتے دیکھوں

رضوی مدت سے خواہش ہے
میں بھی چاند نکلتے دیکھوں

ساجد امجد

(ندر عزیز حامد مدنی)

سرِ مژگاں خلوطِ غم رقم ہوتے ہی رہتے ہیں
بہ فیضِ یادِ یاراں یہ کرم ہوتے ہی رہتے ہیں

طلسمِ رنگ و بو موجِ نمو سیلِ سخن کاری
ترے ہونے سے یہ منظر بہم ہوتے ہی رہتے ہیں

جبیں پر منحصر کیا ہے کہ شہرِ کم نگاہاں میں
کلاہیں خم نہ ہوں تو سر قلم ہوتے ہی رہتے ہیں

محبت حادثہ کب ہے جو ہم کچھ دیر رو لیتے
وگرنہ حادثے تو بیش و کم ہوتے ہی رہتے ہیں

ہمیں اندیشۂ جاں بھی نشاطِ جاں سے بہتر ہے
تمام عمر تجلیاتِ غم ہوتے ہی رہتے ہیں

نہ جانے کس حصارِ مصلحت میں قید ہے دنیا
حروفِ حق سپردِ جامِ سم ہوتے ہی رہتے ہیں

دلوں سے فاصلے تنہا روی سے طے نہیں ہوتے
کہ ان سے بن غافل پیچ و خم ہوتے ہی رہتے ہیں

رہے وابستہ دنیا سے مگر یہ سوچ کر ساجد
چراغوں پر ہواؤں کے ستم ہوتے ہی رہتے ہیں

دلوں کی بستیاں آباد ہیں خیالوں سے
وہی قریب ہے یاں دور ہے جو آنکھوں سے

نہ ایک رنگ میں ظاہر نہ ایک نام ترا
میں تیرا ذکر کروں بھی تو کن حوالوں سے

عجیب موسمِ گل تھا کہ ایک جھونکا بھی
نہ آ سکا مرے گھر تک ترے گلابوں سے

وہ اک گھروندا جسے میں نے خود بنایا ہے
اسے بگاڑ بھی سکتا ہوں اپنے ہاتھوں سے

کہیں تو سلسلۂ شامِ ہجر ٹھہرے بھی
کہ اب تو دن بھی نظر آ رہے ہیں راتوں سے

یہ رات ہوتے ہی ساجد کہاں سے آتے ہو
کہ ہیں کہیں نہیں جاتا خمار آنکھوں سے

کاہشِ دنیا سے پریشان رہے
تجھ سے ملنے کے بھی ارمان رہے

دل عجب وحشت ہے جس میں سرِ شام
بوئے گل صورتِ مہمان رہے

رہبرِ راہِ وفا کی خاطر
پھیر کیا کیا نہ پشیمان رہے

آئینہ خانۂ دنیا دیکھا
یہ الگ بات کہ حیران رہے

اب کے ہے موسمِ گل بھی شاید
نہ سلامت یہ گریبان رہے

نہ رہا غم کا وہ موسم لیکن
سرِ مژگاں ترے احسان رہے

ایک زنجیر سی پیروں میں رہی
عمر بھر وعدہ و پیمان رہے

ذکرِ یارانِ گزشتہ ہی سہی
ہم نشیں کسی عنوان رہے

اگست ۱۹۶۹ء

زماں کنجاہی

خوشی کے سب ہیں کوئی تو دکھوں کا ساتھی ہو
رہِ طلب میں کٹھن مرحلوں کا ساتھی ہو

شبِ سیاہ میں تارے بھی ساتھ چھوڑ گئے
کسے کہوں کہ مرے رتجگوں کا ساتھی ہو

کہیں تو شاخِ تمنا پہ ایسا پھول کھلے
جو ہر لحاظ سے ویران شبوں کا ساتھی ہو

ہوا کا قافلہ دریائے تند و تیز پہ بیٹھ
جو بادبان کی طرح کشتیوں کا ساتھی ہو

تو میرا دوست ہے تو کھل کے ساتھ دے میرا
مرے مزاج مری خواہشوں کا ساتھی ہو

اسے تلاش کروں تو کہاں تلاش کروں
وہ راہرو جو کٹھن راستوں کا ساتھی ہو

زماںؔ ہاتھ بٹائے کوئی تو دفتر میں
کوئی قلم تو مری نالوں کا ساتھی ہو

عروج کیسا ہے ان کا زوال کیسا ہے
پرانے شہر کے لوگوں کا حال کیسا ہے

اتر کے آگیا خواہش کا عکس آنکھوں میں
میں جانتا ہوں کہ تیرا سوال کیسا ہے

اُجڑ کے رہ گئی بستی مرے تصور کی
میں کیا بتاؤں کہ شہرِ خیال کیسا ہے

جو میرے دل پہ حکومت نہیں تو چہرے پر
نشانِ عظمت، جاہ و جلال کیسا ہے

کوئی نہیں مرے زخموں کو دیکھنے والا
کسے بتاؤں مرے دل کا حال کیسا ہے

زماںؔ عمر گزاری ہے تم نے خوشیوں میں
تمہاری آنکھ میں رنگِ ملال کیسا ہے

برسوں سے قائم تھا ناطہ ٹوٹ گیا
میرا اس کا پل میں رشتہ ٹوٹ گیا

چشمِ فلک میں ایک اداسی پھیل گئی
شام ہوئی اور ایک ستارا ٹوٹ گیا

جو مجھ سے احوالِ شجر کے کہتا تھا
تیز ہوا میں آج وہ پتہ ٹوٹ گیا

کس نے دروازے پر آ کے دستک دی
سوچوں کا سب تانا بانا ٹوٹ گیا

پھول تھا لیکن مجھ کو یہ محسوس ہوا
شاخ سے جیسے کوئی شعلہ ٹوٹ گیا

آج کی شب بھی تارے گنتے گزری ہے
آج کی شب بھی اس کا وعدہ ٹوٹ گیا

کیسا طوفاں اٹھا آج کی ساعت زماںؔ
یادوں کے دریا کا کنارا ٹوٹ گیا

نیاز حسین لکھویرا

کتنے کتنے رنگ بدلتے بنتے ہیں
آدمی ورنہ سارے ایک ہی جیسے ہیں

سب ہی جھوٹ کی عینک پہنے پھرتے ہیں
شہر میں کتنے لوگ ہیں جو کہ سچے ہیں

آج کوئی بھی شخص تبسم ریز نہیں
کون ہے جس کے بیٹے راج دلارے ہیں

لمحہ لمحہ قتل ہوا جاتا ہوں میں
میں نے اپنے ٹکڑے آپ سمیٹے ہیں

اپنے گھر کے مستقبل کے خواب لئے
روزانہ چکی میں پستے رہتے ہیں

جینگر میری ذات سے کتنے شاکی ہیں
رات گئے آوازے کسنے لگتے ہیں

آج لہو ملبوس بنے گا جسموں کا
آج لبوں پہ زرد دنوں کے چرچے ہیں

کون نیاز سمیٹے تیری ذات کے دکھ
لوگ تو تیرے سائے سے بھی بچتے ہیں

جانے کب رات ڈھلے صبح کا آنچل پھیلے
کوئی تو لمحہ سویرے کی بشارت بھی دے

دھوپ اتنی ہے کہ جلتے ہیں گلابوں سے بدن
قہر اتنا ہے کہ ہونٹوں پہ اُگے ہیں کانٹے

جاں گسل وقت کی تلوار نے کاٹے ہیں وجود
کون آئے گا مرے شہر سے ٹکڑے چننے

اپنے ہاتھوں سے مقدر کی لکیریں نہ مٹا
شاید اس دشت میں پھر سے کوئی سورج اُبھرے

اے مرے جسم پہ پھیلے ہوئے صدیوں کے سراب
تو مری روح کے آنگن میں بسیرا کر لے

جس کی خوشبو سے سبھی ذہن نمو پاتے ہیں
آ اسی خاک پہ سو جائیں سپاہی لاشے

قلت خلوص کی ہے محبت کا کال ہے
اس شہرِ ناسپاس میں جینا محال ہے

پیڑوں پہ چاندنی کے ہیولے ہیں محوِ رقص
کمرے میں تیرگی کی لکیروں کا جال ہے

سانسوں کا ربط جیسے مسلسل عذاب ہو
وہ شخص کیا جئے جسے تیرا خیال ہے

لمحوں نے چھین لی ہے رُتوں سے شگفتگی
یہ سال موسموں کے تغیّر کا سال ہے

اب تو شکستِ جاں کے عمل سے نجات دے
یہ ناتواں وجود دکھوں سے نڈھال ہے

چڑیاں چہک چہک کے پریشان ہو گئیں
کوؤں کا شور گھر کی فضا کا وبال ہے

پھولوں کا لمس، چاند کی ٹھنڈک بھی ہیچ ہے
وہ خوش بدن تو آپ ہی اپنی مثال ہے

آ پھر سے میرے پیار کی تقدیس بن نیاز
آ کانپتے لبوں پہ ترا ہی سوال ہے

اگست ۱۹۸۹

ممتاز کنولؔ

کیا کیا جبر سہے ہیں جاں پہ کیسے عمر بتائی ہو
گاؤں گاؤں شہروں شہروں ساتھ رہی تنہائی ہو

دھوپ کی شدت میں چھاؤں کے لئے سلگتے پھریں
یہ بھلا کیا ہے ہم ماؤں کے لئے روتے پھریں

خود ہی جی بھر کر سرِ محفل جسے رسوا کیا
اس کے در پہ اب دعاؤں کے لئے سلگتے پھریں

اپنی تنہائی کا جب یہ دکھ سلامت ہے تو پھر
کیوں بھلا اس کی وفاؤں کے لئے روتے پھریں

اپنے اپنے جرم کی فردوں کو ہاتھوں میں لئے
شہر کے باسی سزاؤں کے لئے روتے پھریں

کس قدر سفاک موسم آئے ہیں اب کے برس
لوگ پھر تازہ ہواؤں کے لئے روتے پھریں

گاؤں میں جی کو جلاتی تھی کنولؔ شہروں کی یاد
شہر آئے ہیں تو گاؤں کے لئے روتے پھریں

جس کی خاطر دنیا تج کر ویرانوں میں آتے تھے
اس نے آنکھوں کے کاسے میں دید کی بھیک نہ پائی ہو

پاماتر جانے یا شبدے اس میں کس کا دوش ہی کیا
ہم نے تو اس شخص کی خاطر جان کی بازی لگائی ہو

چپ کی چادر اوڑھ چکے ہیں کیا آنگن کیا دیواریں
ایسی رت میں خاک بجے گی منشی کی شہنائی ہو

سارے رشتے ناطے کچے، ساری قسمیں جھوٹی ہیں
ہرجا ہرجائی کا عالم ہر کوئی ہرجائی ہو

جس کا تعاقب کرتے کرتے پاؤں لہولہان کئے
خواہش کی وہ بے حس تتلی اپنے ہاتھ نہ آئی ہو

پھر باغوں میں کوئل کوکی پھر مہکے گندم کے کھیت
پھر دل کے پہلو میں جاگی کوئی پیڑ پرائی ہو

اب تاریک گھروں کی جانب لوٹیں بھی تو کس منہ سے
روشنیوں کے شہر میں کھو دی آنکھوں کی بینائی ہو

رُتوں کے ساتھ ہی شہرتیں بدل جائیں
نہ جانے وقت کی کب نیتیں بدل جائیں

ترے سوا بھی کوئی خواب میں چلا آئے
کبھی تو ذہن کی کیفیتیں بدل جائیں

ہم ایک دوجے کو چاہیں تو بے غرض چاہیں
ہمارے پیار کی نوعیتیں بدل جائیں

ہم اشک بو کے ہی خوشیوں کی فصل کاٹ سکیں
میری زمیں تری خاصیتیں بدل جائیں

کنولؔ یہ گھر بھی نہ مجھ کو پناہ دے شاید
میرے وجود کی اہمیتیں بدل جائیں

محمد اختر

تو مرے سامنے ہو اور یہ منظر دیکھوں
تری آنکھوں میں محبت کے سمندر دیکھوں

تجھ کو بھی کھینچ کے لائے مری چاہت کی کشش
میں بھی ہاتھوں کی لکیروں میں مقدر دیکھوں

ٹوٹ جاتا ہے بہت جلد نظر کا رشتہ
تجھ کو دیکھوں تو تری سمت برابر دیکھوں

تو نے جو دل میں چھپا رکھی ہے اک دن کی بات
میں اسے اپنی نگاہوں سے بھی پڑھ کر دیکھوں

میرے انفاس میں گھل جائے گلابوں کی مہک
جسم و جاں کے سبھی رستوں پہ گزر کر دیکھوں

تو مرے پاس نہ جانے کے لئے آیا ہے
جاگتی آنکھوں سے یہ خواب بھی اکثر دیکھوں

جسم صحرا ہو چکے ہیں ذہن بنجر ہو گئے
ہم کہاں زندہ ہیں دیکھو ہم تو پتھر ہو گئے

آنکھیں قطرِ آب سے ویران ہوتی جاتی ہیں
یعنی موسم ہی دکھوں کے اب مقدر ہو گئے

شہر میں اک بے حسی کی زد چلی ہے ان دنوں
آشنا نا آشنا سب ہی برابر ہو گئے

بعد اک مدت کے جب دیکھا اُسے تو خود بخود
ذہن میں روشن گئے لمحوں کے منظر ہو گئے

ایسے ڈوبے ہیں کہ اب اپنا نشاں ملتا نہیں
آگہی کے زخم بھی گہرے سمندر ہو گئے

جو بھی کچھ ہو گا دلوں کے درمیاں رہ جائے گا
ہم نہیں ہوں گے تو یادوں کا نشاں رہ جائے گا

یہ مسافت عشق کی ہے اور ہم ہیں تیز رو
اس مسافت میں نہ جانے تو کہاں رہ جائے گا

ریزہ ریزہ ہو کے ہم بکھریں گے تیرے ہجر میں
آنکھ میں اک خوابِ وصلِ رائیگاں رہ جائے گا

یہ تو ہم کو ہے خبر تجھ سے بچھڑ ہی جائیں گے
لیکن آنکھوں میں جدائی کا سماں رہ جائے گا

ہاتھ خالی آئے تھے اور ہاتھ خالی جائیں گے
جو بھی کچھ ہے جیب و دامن میں یہاں رہ جائے گا

نفرتوں کی آگ میں یہ بستیاں جل جائیں گی
آدمی پہ آدمیت کا گماں رہ جائے گا

خاور احمد

پھر تیرے خد نے کھول دیا دروازہ بیتے موسم کا
پھر سونے گھر میں بکھرا ہے شیرازہ بیتے موسم کا

پھر بجنے کشتِ سماعت میں کچھ پھول تری سرگوشی کے
پھر پیلے جنگل میں گونجا آوازہ بیتے موسم کا

اب کے پھر پوری بہاروں میں کس کس سے گذرے پھول بدن
گدرائے ہوئے گالوں سے لگا اندازہ بیتے موسم کا

لکھے ہیں سرد ہواؤں نے کچھ زرد فسانے گالوں پر
باقی ہے خیالوں پر لیکن وہ غازہ بیتے موسم کا

جو چوم کے تو نے ہنستے ہنستے کچھ سوچ کے مجھ کو بخشا تھا
کانوں میں مری وہ پھول ابھی ہے تازہ بیتے موسم کا

اس نے تو مری خاطر خاور وہ راتیں نیند اجاڑی تھی
اب جیون بھر ہے جگتوں کا خمیازہ بیتے موسم کا

تری تلاش کا سودا جو سر سے نکلے گا
اندھیری رات میں پھر کون گھر سے نکلے گا

وہ جانتی ہے نہ پھر تتلی مر تو جائے گی
مگر وہ رنگ جو تتلی کے پر سے نکلے گا

غبار بن کے جو میرے لہو میں اترا ہے
وہ اشک اشک مری چشمِ تر سے نکلے گا

میں اک دریچے کو تکتا تھا، صبح ہونے تک
کہ چاند نکلے یا سورج، ادھر سے نکلے گا

لحاف اوڑھ کے بادل سا، سو گئی وہ بھی
مری امید کا تارا کدھر سے نکلے گا

بچھڑ کے تجھ سے بھی اب نہ مجھ کو رفاقتوں کا ملال ہوگا
کہ اتنے سارے شکستہ جانوں میں کوئی تو ہم خیال ہوگا

کسے پڑی ہے کہ ایسی ظلمت میں چاندنی کا پیام بانٹے
محبتوں میں یہ جلنے والا بڑا ہی روشن خیال ہوگا

میں حسرتوں کے اداس جنگل میں پہلے پوچھ کے ڈھونڈتا ہوں
سنا تھا میں نے کہ پہلی الفت کو بھول جانا محال ہوگا

میں تیرے آنچل کے ٹھنڈے سائے کو کس طرح لاجواب کہہ دوں
کہ دھوپ ڈھلتے ہی میرے دل میں نئے سفر کا سوال ہوگا

چھلکتی آنکھوں میں جھوٹ بھر کے بھی یہ جذبے کہاں چھپیں گے
کہ تپتے گالوں کی چلمنوں میں حقیقتوں کا گلال ہوگا

مرے یہ ناسور میرے اپنے ہیں تیرے مرہم سے کب بھریں گے
تو اپنے زخموں کی لاج رکھ لے تو یہ بھی تیرا کمال ہوگا

ڈاکٹر انور سدید

راغبؔ کی نعت گوئی

راغب مراد آبادی کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے تازہ لہجے کی غزلیں کہی ہیں انفرادیت پیدا کی لیکن جب نعت کہنے کا فریضہ سرانجام دیا تو نعت کے محبوبِ ربانی پر غزل کے خیال محبوب کا پرتو پڑنے نہیں دیا۔ یوں راغب کی نعت نگاری اُن کے فنی سفر کا پڑاؤ نہیں بلکہ یہ اُن کے جذبِ شوق اور عشق و مستی کی آخری منزل ہے اور اُن کے اظہارِ فن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسکے آگے ادب کی سب حدوں کو سرنگوں سمجھتے ہیں۔

نعت گوئی اس لحاظ سے بے حد مشکل صنفِ ادب ہے کہ اس میں خیال، محبت اور مودّت کے جن نازک آبگینوں کو مرتب کرنا ہے۔ انہیں صرف وہ شعراء ہی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ جن کے دل نورِ ایمان سے منور ہوں اور جن کی فطرت میں حباب کا سا جھکاؤ موجود ہو۔ شاعر کی فطرت جلب اسلام ہو تو آبگینۂ خیال، مثلِ سحاب بکھر جاتا ہے اور شعرِ نعت کے دائرہ ادب سے خارج ہو جاتا ہے۔

عرفی شتاب این رہ نعت است نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قلم را

— چنانچہ بعض شعراء نے تو "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کہہ کر اپنی عجزِ بیان کا اعتراف کر لیا اور چند ایک نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا کہ

"نعت کہنے کا خیال آئے تو چپ ہو جایئے"

ہر چند راغب مراد آبادی کو بھی اس راہ کی مشکلات کا احساس ہے اور وہ کہتے ہیں کہ

جو بہر انداز ہوں، شایانِ شانِ مصطفیٰؐ
لفظ ایسے ڈھونڈنا، لانا ہے جوئے شیر کا

لیکن وہ چونکہ اس راہ سے شتاب سے نہیں گزرے نیز اس جوئے شیر کو لانے کے لئے انہوں نے اپنے دلِ حزیں کو تیشے کے طور پر استعمال کیا ہے اس لئے ان کے ہاں وجد و کیف کی سرمستی بھی پیدا ہوئی ہے اور انہوں نے اس نہایت کو بھی پا لیا ہے جو صرف سوزِ دروں سے حاصل ہوتی ہے۔ راغب کی نعت میں عقیدت، خود سپردگی اور جاں سپاری کے جذبات میں لپٹی ہوئی ہے وہ محمدِ عربیؐ کی غلامی پر فخر ہی نہیں کرتے بلکہ اسے نجات کا وسیلہ بھی قرار دیتے ہیں اور اسے دین و دنیاوی نعمتوں کا سرچشمہ بھی تصور کرتے ہیں

میری قسمت میں بھی لکھا ہوا سا ہو جاتا
مٹ کے، خاکِ درِ محبوبِ خدا ہو جاتا

راغب مرو پوچھئے، بطفیلِ شہِ انامؐ
آئی ہیں نعتیں جو میسر، کہے بغیر

اگر ان کی شفاعت کا نہ راغب آسرا ہوتا
ٹھکانے حشر میں ہم عاصیوں کا حشر کیا ہوتا

عطا ہوتی حیاتِ جاوداں بھی اگر ہم کو
محمدؐ کی غلامی کا نہ پھر بھی حق ادا ہوتا

دل میں حُبِّ سرورِ کون و مکاںؐ کا در کھلا
زندگی کا رازِ سربستہ تو اب مجھ پر کھلا

میں کہ راغب انہیں کا ہوں غلام کہتا ہوں
اُن کے قدموں سے لپٹ جاؤں تو شکرانہ گیا

راغب اُن کی اک نظر جنت بداماں کر گئی
عرقِ ندامت تو مرے اعمال کا خمیازہ تھا

راغب مراد آبادی کی نعت کا دوسرا پہلو حضورؐ کی سیرت کے بیان میں سامنے آیا اس بیان میں راغب نے غیاب و حضور اور جذب و سپردگی کی ذاتی حدود سے نکل کر رسول اکرمؐ کی شفقتیں عنایات کو تینوں زمانوں کے ابعاد پر رحمت کناں دیکھا اور انہیں اسمیں قرآن ہی کا پرتو نظر آیا۔ چنانچہ نعت نگاری کے اس زاویے کو راغب نے قرآن کی تفسیر کا ایک انداز

؎ [illegible] راغب مراد آبادی کا مضمون

لا دیا ہے اور کہا ہے کہ

مدحتِ خیر البشر اعجاز ہے تحریر کا
یہ بھی اک انداز ہے قرآن کی تفسیر کا

وہ اک انسان تھا، انسان کی تقدیر بھی تھا
محفلِ فرش نشیں، عرش کی توقیر بھی تھا
عطا اُس نے دیا فقر و قناعت کا سبق
دو جہاں جس کے تھے جو صاحبِ اکسیر تھا
عرشِ کبریا بھی ہے جس کا فرشِ پا انداز
اس کے ساز و سامان میں اک بوریا پایا

اوّل اوّل تھے، رسول اللہ تنہا آشنا
رفتہ رفتہ ہوگئی وحدت سے دنیا آشنا

سیرتِ کردارِ پیغمبر کو جو سمجھا نہیں
ہو سکے گا عظمتِ اسلام سے کیا آشنا

راغب مراد آبادی کی نعت نگاری کا تیسرا زاویہ مدینۃ النبی کی مدحت و توصیف میں نمایاں ہوا ہے۔ خاکِ مدینہ اور سبز گنبد راغب کی چشمِ عقیدت کے لئے سُرمۂ بصیرت بھی ہے اور وہ اس شہر کی اُمنگ سے دل کا زنگ بھی اُتارتے ہیں اور جب خلدِ رسالت میں آجاتے ہیں تو کشتیٔ شوق کا لنگر سرِ ساحل باندھ دیتے ہیں تاکہ پابوسی کی حسرت کی تکمیل میں مزید تاخیر نہ ہو۔ وارفتگیٔ شوق کی یہ کیفیت راغب کے مندرجہ ذیل اشعار سے عیاں ہے ۔

دل کو دُوری کا مدینے سے جو اک افسوس تھا
میرے مولا، بر بنائے حسرتِ پابوس تھا

کھینچتا ہے میکدے میں جو نبی جام کے
راغب میں تشنہ ہوں اسی کے ایاغ کا

ادب سے دیکھ، نظروں کی یہی طہارت ہے
مدینے کے ہیں یہ اے بے خبر در و دیوار

مدینے مجھ کو لے آئی طبیعت کی اُمنگ آخر
ہوا دُور اس فضا میں دل کے آئینے کا زنگ آخر

راغب مراد آبادی کی نعت نگاری ان کی محبتِ نبوی کا صرف ایک فنی اظہار ہی نہیں بلکہ ان کی شاعری کی وہ شاخِ شاداب ہے جس کے سب اثمار شیریں ہیں۔ انہوں نے مدحتِ خیر البشر کا فریضہ غالب کی زمینوں میں سر انجام دیا ہے گویا غالب نے جن زمینوں سے انسانی زندگی کے رموز و نکات آشکار کئے تھے راغب مراد آبادی نے انہیں زمینوں سے شجرِ عقیدت پیدا کیا اور ہزاروں گم کردہ راہ لوگوں کو روحانی بالیدگی عطا کردی۔ اس میں کوئی شک نہیں مضامین تو غالب پر بھی غیب ہی سے آتے تھے اور اس کا مرتبہ نوائے سروش ہی تھا لیکن راغب مراد آبادی نے جس سرچشمۂ فیض سے مضامین کے ستارے حاصل کئے ہیں وہاں غالب کو رسائی کم کم حاصل ہوئی ہے۔ راغب کا زمزمۂ الفت صرف نوائے سروش نہیں بلکہ اس میں حضور نبی اکرمؐ کی مدحت سے تقدس کی نہایت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ غالب ہمیں دنیا کرنے کی دعوت دیتا ہے لیکن راغب، غالب کے راستوں پر چل کر ہماری روح کے تقاضے پورے کرتے ہیں غالب جس راہ پر چل کر ڈول گیا تھا راغب نے اس پر مضبوطی سے قدم رکھا ہے اور اس میں نئے گلشن پیدا کئے ہیں اور خوبی کی بات یہ ہے کہ وہ اس گلشن کی سیر تنہا نہیں کر رہے ہیں بلکہ نبی آخر الزماںؐ کے کروڑوں اُمتی بھی ان کے ہمرکاب ہیں اور کہہ رہے ہیں۔

جن کا اُمتی ہونا، زندگی کا حاصل ہے
اسکے اُن کے قدموں میں زیست کا مزا لیا

رہِ ختم الانبیا کا میں اگر غبار ہوتا
مرا سر بلند رہتا میں فلک وقار ہوتا

آگے خلدِ رسالت میں سفر ختم ہوا
کشتیٔ شوق کا لنگر سرِ ساحل باندھا

غالب کے ایاغ میں یہ نئی صہبا ہے چنانچہ راغب کی نعت سے راغب مراد آبادی کے لئے ہی توشۂ آخرت نہیں بلکہ اس پر مرزا غالب بھی فخر و امتنان کا اظہار کریں گے اور آخرت میں اپنی مغفرت کے واسطے راغب کی مدحتِ خیر البشر پیش کریں گے کہ اس کی تخلیق میں راغب نے بالواسطہ طور پر غالب ہی سے رہنمائی حاصل کی ہے

عابد نظامی

حفیظ تائب کی نعت [لہ]

میرے خیال میں اردو نعت کے دو مکاتب فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) ہیں۔ ایک کے امام حضرت امیر مینائی ہیں۔ اور دوسرے کے سرخیل مولانا محسن کاکوروی، بات کو مزید واضح کرنے کے لئے یوں کہنا چاہیئے کہ نعت گویان اُردو کا ایک گروہ تو وہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال و کمال کے بیان میں اپنی بھرپور قلمی صلاحیتوں سے کام لے کر عشقِ رسول ؐ کی دولت عام کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا گروہ ہے، جو حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تعلیماتِ مقدسہ کو نعتیہ اشعار میں پیش کر کے انہیں مشعلِ راہ بنانے کی دعوت دیتا ہے، گویا نعت سے تبلیغِ سیرت کا مبارک کام لینے کی سعیٔ مشکور کرتا ہے۔ ہمارے ہاں دونوں قسم کے نعت گو شاعر موجود ہیں۔ نعتیہ شاعری کی یہ دونوں قسمیں بڑی اہم، بڑی مبارک اور نفوذ علی نور ہیں عہدِ حاضر میں (میرے نزدیک) حافظ مظہر الدین پہلے اور عبدالعزیز خالد دوسرے مکتبِ نعت کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان دونوں باکمال نعت نگاروں نے اردو نعت میں جو قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کا کوئی نقاد اگر ان کی نعتوں کا تذکرہ کئے بغیر اردو نعت نگاری کی تاریخ مرتب کرے گا تو وہ نامکمل بھی جائے گی۔

سطورِ بالا میں میں نے جن دو مکاتبِ نعت کا ذکر کیا ہے، حفیظ تائب ان دونوں مکاتب کا سنگم ہیں۔ حفیظ کے ہاں حضور کے جمال و کمال کا حسین تذکرہ بھی ہے۔ اور سیرت و تعلیم کا پرنور بیان بھی۔ وہ عشقِ رسول ؐ کی دولت عام کرنے کے ساتھ ساتھ اطاعتِ رسول ؐ کی بھی تلقین کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اطاعت کے بغیر عشق نامکمل ہے ؎

جاں آبروئے دیں پہ فدا ہو تو بات ہے
حقِ عشقِ مصطفیٰ ؐ کا ادا ہو تو بات ہے

عشق کے ساتھ اطاعت اور عمل کی تلقین آپ کو دوسرے نعت گو شعراء میں بہت کم ملے گی، لیکن حفیظ کے ہاں اس کا ذکر ایک مقدس مشن کے طور پہ موجود ہے۔ یہی وہ خوبی ہے۔ جس نے انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کر دیا ہے۔ حفیظ کی نعتوں میں سیرتِ نبوی ؐ کے بیان کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے

ساحلِ بحرِ تمنا، حاصلِ کشتِ وفا
حاملِ قرآن و شمشیر و سپر خیر البشر ؐ
حدِ فاصل خیر و شر کے درمیاں ذاتِ نبی ؐ
شاہراہِ زندگی میں معتبر خیر البشر ؐ

صورتِ فاتح غالب ہو کر داخل ہو کر جب بستی میں
نکلے آپ گئے سر کو جھکائے حمد لبوں پر ماشاءاللہ

ہر بندۂ نادار کی قوت تری رحمت
ہر رہروِ درماندہ کی رہبر تری سیرت

حفیظ تائب نے حضورِ پرنور ؐ کے جمال و کمال کا تذکرہ نہایت مناسب اور دلپسند الفاظ میں کیا ہے۔

تجھ سا کوئی آیا ہے نہ آئے گا جہاں میں
دیتا ہے گواہی یہی عالم کا جریدہ

اہلِ جہاں کو ایسی نظر ہی نہیں ملی
دیکھے جو تیرا سایۂ قد سیدالوریٰ

عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے اس قسم کے اشعار حفیظ کے ہاں بکثرت موجود ہیں۔ یہ اشعار جس طرح دل سے نکلے ہیں، اسی طرح براہِ راست دلوں پر اثر کرتے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے۔ جن میں حفیظ نے "اختیارِ نبوت" کے بارے میں اپنے عقیدہ کا اظہار کیا ہے ؎

اللہ نے بخشی تجھے کونین کی شاہی
محکوم ترے چودہ طبق ہادیٔ برحق

لہ صلوا علیہ : حفیظ تائب کی نعتوں کا مجموعہ

عشق کی منزلوں میں بھی ہے گا وہ دستگیر
آسان جس کے فیض سے کارِ جہاں ہوا

حفیظ کی نعتیں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نعتیں لکھتے ہوئے اسے قرآن پاک، تفسیر حدیث، تاریخ، سیرت، ادب اور شاعری کے بیشمار دریچوں سے جھانکنا پڑتا ہے۔ اس بات کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ سیرت و شمائل کی کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ اس کے زیرِ مطالعہ رہتی ہے۔ اس کی نعتوں کے مضامین براہِ راست قرآن حکیم، حدیث نبوی اور سیرت و تاریخ کی کتابوں سے ماخوذ ہوتے ہیں صرف دو چار مثالیں ملاحظہ فرمایئے:۔

سورۂ آلِ عمران میں ہے:۔
اے محبوب تم فرما دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھے گا۔

حفیظ کا شعر ہے ؎

خدائے پاک کو مطلوب اتباعِ نبی
خدائے پاک کو محبوب برادرانِ حبیب

سورۂ احزاب میں ہے "اے نبی بے شک ہم نے تم کو شاہد اور مبشر اور نذیر اور اللہ کی طرف سے اس کے حکم سے بلانے والا اور چمکا دینے والا چراغ بنا کر بھیجا ہے (سراج کا لفظ قرآن حکیم میں آفتاب کے لئے بھی آیا ہے)

حفیظ کا شعر ہے ؎

مہ شمسِ جس کی مدھم نہ ہو گی کبھی
وہ ہدایت کا مہرِ منیر آپ ہیں

سورہ الم نشرح میں ہے "اور ہم نے تمہارے لئے تمہارا ذکر بلند کر دیا" مولانا احمد رضا خاںؒ کے اس شعر میں اسی آیت ربانی کی طرف اشارہ ہے ؎

فرش والے تری شوکت کا علو کیا جانیں
خسروا عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا

حفیظ کہتے ہیں ؎

ذکر آپ کا بلند کیا کردگار نے
چرچا ہے کائنات میں افزوں حضورؐ کا

اب ایک دو مثالیں احادیث سے استفادہ کی ملاحظہ فرمایئے:۔

شمائلِ ترمذی میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا تھا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سرخ جوڑا زیبِ تن فرمائے ہوئے تھے، میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی آپ کو، بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ حضورِ اکرمؐ چاند سے کہیں زیادہ جمیل و حسین اور منور ہیں۔

اس حدیث شریف کے پس منظر میں حفیظ کا یہ شعر دیکھئے ؎

ماہِ عرب کے آگے تری بات کیا بنے
اے ماہتاب ! روپ نہ ہر شب بدل کے آ

حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ربیعہ ابن کعب اسلمی سے فرمایا:۔
کچھ مانگو
عرض کی
حضور! میں آپ سے جنت میں آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضری مانگتا ہوں۔
فرمایا:۔
اور کچھ مانگو۔
عرض کیا:۔
آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضری ہی میرے لئے کافی ہے (مشکوٰۃ باب السجود بروایت مسلم)
اس حدیث کی شرح میں مُلّا علی قاری مرقات میں اور حضرت شیخ عبد الحق اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں حضور علیہ السلام کے قبضہ میں ہیں، جس کو جس قدر چاہیں عطا فرما دیں۔

حفیظ تائب نے کیا خوب کہا ہے ؎

مرے نبیؐ کی ریاست میں ہیں سبھی تائب
یہ بحر و بر، یہ خلاء و ملا، یہ چرخِ کبود

حفیظ تائب کے کلام میں اس قسم کے حقائق و معارف بکثرت ہیں۔ اس طرح نعت گوئی اس کے ہاں تبلیغِ دین کا ایک دلکش ذریعہ بن گئی ہے۔
مندرجۂ ذیل اشعار دیکھئے، ان میں بھی احادیث اور سیرت سے استفادہ صاف جھلکتا ہے ؎

جو چٹائی پہ بچھائے ہوئے سر بیٹھا ہے
دین و دنیا کا وہ سلطان ہے سبحان اللہ
یاد ہے بات مجھے حضرتِ صدیقہؓ کی
آپ کا خُلق بھی قرآن ہے سبحان اللہ

نبی نے ضربتِ خُلقِ عظیم سے توڑے
کدورتوں کے طلسمات، رنجشوں کے قیود

خُلقِ عظیم و اُسوۂ کامل حضور کا
آدابِ زیست سارے جہاں کو سکھا گیا
حفیظ سیرتِ طیبہ کو انسانیت کے بر کا اعلاؒ

سمجھتا ہے اور اسی کی تلقین کرتا ہے ؎

مضمر تری تقلید میں عالم کی بھلائی
میرا یہی ایمان ہے، یہی میرا عقیدہ

پیروی ان کی جو لازم ٹھہرے
حل ہوں انساں کے مسائل اے دل

رہ نما گر نہ ہو وہ سیرتِ پاک
ہر مسافر بھٹک بھٹک جائے
چشمِ سرکار گر نہ ہو نگراں
نسلِ آدم بہک بہک جائے

مرنے نبی کی ضرورت سے ہر جگہ ہر دم
ہو عرصہ گاہِ قیامت، عدم ہو یا موجود

حضور نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تشریف آوری سے کائنات میں جو انقلابِ عظیم آیا، حفیظ نے اس کا تذکرہ جا بجا کیا ہے۔ حضورِ والا نے نسل و رنگ و نسب کے امتیاز کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ کہتے ہیں ؎

شہِ دیں کے فکر و نگاہ سے مٹے نسل و رنگ کے تفرقے
نہ رہا تفاخرِ منصبی، نہ رعونتِ نسبی رہی

حضورؐ نے نظامِ زندگی نئے سرے سے مرتب کیا۔ کہنہ نظامِ حیات ختم کر دیا ؎

نظامِ دہر کہ فرسودہ و پریشاں تھا
مرے حضورؐ نے بخشی اسے نئی ترتیب

حضورؐ نے صرف تقویٰ کو فضیلت دی فضیلت کے باقی تمام نشانات رد کر دیئے ؎

سب نے سنا اعلانِ رسالت، تقویٰ ہے معیارِ فضیلت
یکساں ٹھہرے ابیض و اسود، اصفر و احمر ماشاءاللہ

حضورؐ نے اہلِ عالم کو مکمل نظامِ معیشت و تمدن عطا کیا ؎

تھا سفینۂ معیشت کا گرداب میں
پار اس کو لگانے حضورؐ آ گئے

حفیظؔ کی نعتیں پڑھتے ہوئے صرف ان کے وسعتِ مطالعہ ہی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ان کی ندرتِ اظہار پر بھی نگاہ پڑتی ہے اور قاری اس بات کا قائل ہو جاتا ہے کہ خیالات کی طرح ان کی زبان بھی پاکیزہ، شیریں، شستہ اور برجستہ ہے۔ مسلسل مشق نے ان کی نعت گوئی کو محض اظہارِ عقیدت سے اوپر اٹھا کر فن بنا دیا ہے۔ پھر موضوع کی گہری بصیرت اور مطالعہ کی وسعت نے ان کی نعت گوئی کا کینوس وسیع کر دیا ہے۔ حفیظ کی بعض چیزیں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعری ساحری بن گئی ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ آج وہ بے شمار نعت گو شعراء کا "آئیڈیل" ہے۔

حفیظ تائب ایک ممتاز نعت گو شاعر ہونے کے باوجود اپنے شعروں میں تعلّی سے کام نہیں لیتا بلکہ اپنی شعری صلاحیتوں اور خوبیوں کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض اور کرم سمجھتا ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

مدحتِ سرکار ہے سرمایۂ صد افتخار
کاسۂ فن میں ہے خیراتِ رسولِ ہاشمی

مدحِ نبی وہ چشمۂ نور و حضور ہے
جس سے ہے تابناک مرے خدوخالِ فن

حفیظؔ جس طرح نعت میں اپنے ممدوح کی دستگیری کا طالب ہے، اسی طرح زندگی کے ہر مرحلے میں ان سے کسبِ فیض اور امداد و استعانت کا متمنی ہے ؎

اے روحِ تخلیق، اے شاہِ لولاک
بھر جائے پُر نور کشکولِ ادراک
شاہا! بہا کر مجھ کو نہ لے جائے
یہ سیلِ الحاد، یہ موجِ بے باک

کہتے ہیں اچھے شاعر کا کلام اس کے ماحول کا عکاس ہوتا ہے، حفیظ کے ہاں بھی اس کے ماحول کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ گرد و پیش کے مسائل اور امتِ مسلمہ کے مصائب وہ بارگاہِ رسالت پناہ میں پیش کر کے حضور سے نظرِ کرم کی درخواست کرتا ہے۔

کرم کرم کہ نہیں ہے ترے کرم کے سوا
جہاں میں کوئی بھی غمخوار اے شہِ ابرار
طلے اماں کہ شب و روز بڑھتی جاتی ہے
سپاہِ کرب کی یلغار اے شہِ ابرار

اے نویدِ مسیحا تری قوم کا حال عیسیٰ کی بھیڑوں سے ابتر ہوا
اس کے کمزور اور بے ہنر ہاتھ سے چھین لیا چرخ نے برتری یانبی

حفیظ میں یہ ایک بڑی خوبی ہے کہ وہ اختلافی مسائل و مباحث میں نہیں پڑتا۔ اپنی نعتوں میں اس نے جو افکار و نظریات پیش کئے ہیں وہ بالکل وہی ہیں جو عامتہ المسلمین اور جمہور کے معتقدات و خیالات ہیں۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے۔ جس سے اس کی مقبولیت بڑھ گئی ہے اور حلقۂ قارئین وسیع تر ہو گیا ہے عام مسلمان جب ان کے نعتیہ اشعار پڑھتے ہیں تو ان کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حفیظ نے ان کے قلبی احساسات کو شعری قالب میں ڈھال دیا ہے۔ چند اشعار دہراؤں گا — یہ ہر عاشقِ رسول کے دل کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔

ہم بےنیاؤں کا سارا بھرم ہے تم سے
ہم بے بضاعتوں کا ایک آسرا ہو بس تم

آرزو منبرِ حرم ہے کب سے
روح کی بے پرو بالی آقا

ہجر و وصال کے مضامین ہماری شاعری کے خاص موضوع ہیں۔ عشاق ان دونوں کیفیتوں سے دوچار ہوتے ہیں، لیکن دیکھئے ایک عاشقِ رسولؐ ان مراحل میں اپنی کیفیات کیونکر قلم بند کرتا ہے۔ تاثراتِ فراق ملاحظہ ہوں ؎

یوں دور ہوں تائبؔ میں حریمِ نبوی سے
صحرا میں ہو جس طرح کوئی شاخِ بریدہ

اور جب شاعر پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرماتا ہے اور وہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد حضور پر نور شافعِ یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوتا ہے۔ اس کی مسرت و انبساط کی کوئی حد نہیں رہتی حضوری کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

قدموں میں شہنشاہِ دو عالم کے پڑا ہوں
میں ذرۂ ناچیز ہوں یا کہ جنتِ رسا ہوں

اے کاش ذرا دیر یہیں وقت ٹھہر جائے
میں پیشِ رسولِ عربی نعت سرا ہوں

حفیظ تائب کے دل میں عشقِ رسولؐ کی جو دولت ہے وہ اسے بڑی فیاضی کے ساتھ لوگوں میں عام کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد اور عشق ہے ؎

وقفِ ذکرِ شہِ حجاز رہوں
ایک ہی لے میں نغمہ نواز رہوں
عامِ عشقِ رسولؐ کرنا ہے
اسی دھن میں سخن طراز رہوں

وہ ادب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالی تک پہنچنے کا ذریعہ بتاتا ہے ؎

بار یابی کا مصطفیٰؐ کے حضور
کچھ ذریعہ نہیں ادب کے سوا

اور حقیقت یہ ہے کہ یہی ادب اس کی نعتیہ شاعری کا مابہ الامتیاز وصف ہے۔ اس کے نزدیک اللہ تبارک و تعالیٰ کے بعد اس کے پیارے اور آخری نبی ہی سب کچھ ہیں۔ وہ دین و دنیا کی ہر نعمت انہی کے وسیلے سے طلب کرتا ہے۔ حضور رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین کے لطف و کرم اور فضل و عطا پر اُسے اس قدر بھروسا ہے کہ وہ محشر میں حساب و کتاب کے وقت بھی حضور کا قرب طلب کرتا ہے۔

تائب کو آرزو کوئی اس کے سوا نہیں
محشر کے دن ہو تیرا ثنا گر ترے حضور

حفیظ کا یہ شعر پڑھتے ہی بے ساختہ حضرت علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آتے ہیں ؎

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر

مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

بادی النظر میں حفیظ تائب اور علامہ اقبال کے شعروں میں تضاد نظر آتا ہے، لیکن بغور دیکھا جائے تو حضور سے عشق و محبت اور تعلقِ خاطر کا جذبہ دونوں کے ہاں یکساں ہے۔ دونوں کی آرزوؤں کا محور حضور ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔

ثنا خوانِ رسولِ مقبولؐ حفیظ تائب نے اپنے لئے دعا کی تھی ؎

یا رب! ثنا میں کعب کی دلکش ادا ملے
نعتوں کی دوپہر میں سکوں کی ردا ملے
حسّان کا شکوہِ بیاں مجھ کو ہو عطا
تائیدِ جبرئیل بوقتِ ثنا ملے
جامیؔ کا جذب، لہجۂ قدسی نصیب ہو
سعدیؔ کا صدقہ شعر کو اذنِ بقا ملے
مجھ کو عطا ہو زورِ بیانِ ظفر علی
محسن کی ندرتوں سے مرا سلسلہ ملے
حالیؔ کے درد سے ہو مرا فکر استوار
ادراکِ خاصِ حضرتِ اقبالؔ کا ملے

اور سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل سے نکلی ہوئی دعا قبول فرمائی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حفیظ کی نعتوں میں حسان کا شکوہِ بیان، جامیؔ کا جذب، قدسی کا لہجہ، سعدی کی سادگی، ظفر علی خاں کا زورِ بیان، محسنؔ کی ندرتِ فکر، حالیؔ کا درد اور حضرت اقبالؔ کا ادراکِ خاص نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے (جو خود بھی حضور کا ثنا خواں ہے) اسے یہ سب کچھ عطا فرمایا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ،

خدا کرے اس کی یہ دعا بھی قبول ہو ؎

آئے قضا شہیدیؔ خوش بخت کی طرح
دوری میں بھی حضوریٔ احمد رضا ملے

خاور احمد

نزار خلیق

ہوائے تازہ

حسن رضوی

ساجد امجد

ماہِ نو
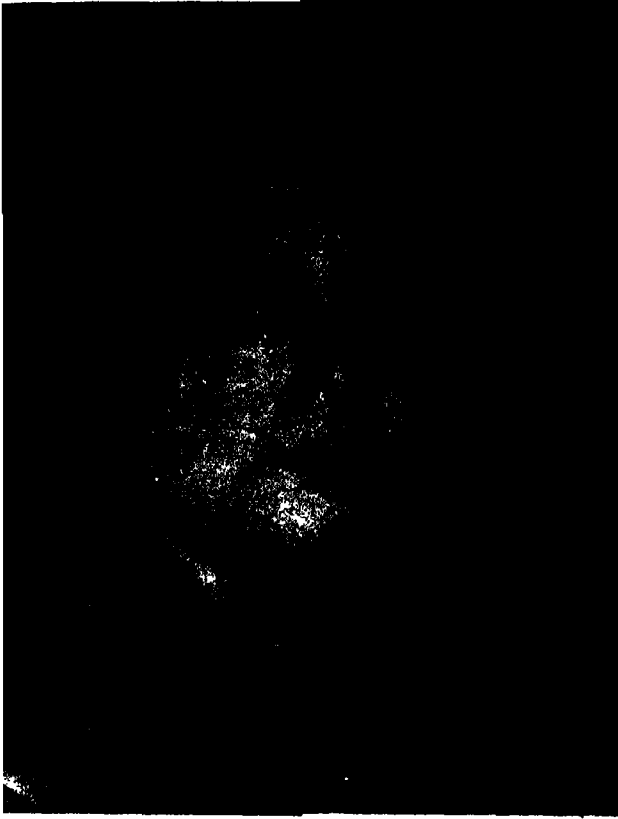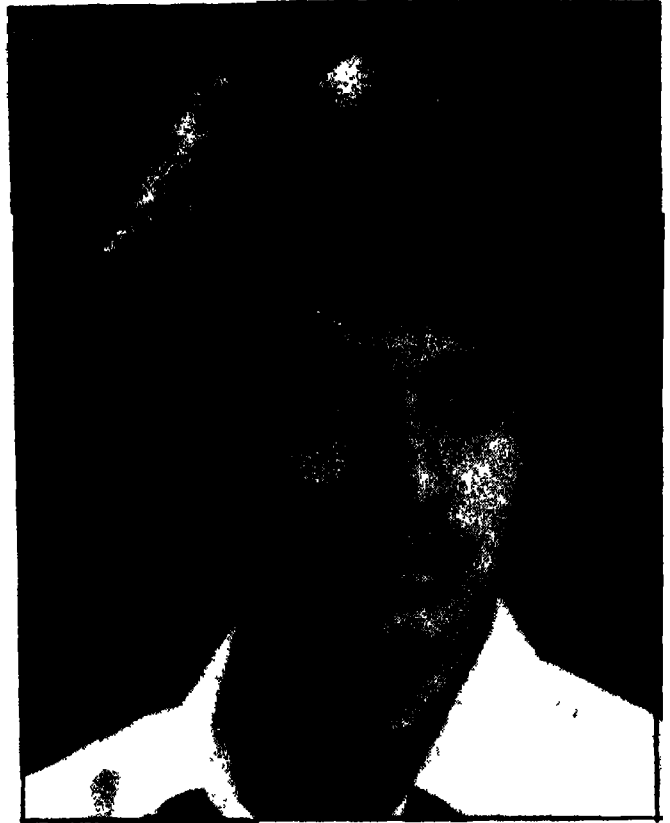
"مسعود اشعر کے افسانوں میں
دنیا کی ایک ذاتی تشریح پیش کی جاتی
ہے۔ ان کا مرکزی کردار جسم کی آنکھوں
سے دنیا کو دیکھتا ہے اور دنیا سے
جسم کے ذریعے تفاعل کرتا ہے اس
لئے ان کے افسانوں میں جسمانی
علامات بہت نمایاں ہیں۔"

لنڈا وینٹ انک

عارف عبدالمتین

حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی
ظہور نظر

صدر مجلس ادارت
سید امجد علی

چیف ایڈیٹر
کشور ناہید

ایڈیٹر۔ علی محمد حسینی
جائنٹ ایڈیٹر۔ قائم نقوی

ترتیب

مضامین۔

نظمیں

افسانے

غزلیں

اِس ماہ کی کتابیں

آئندہ شمارے کی جھلکیاں

سیّد ضمیر جعفری، ضیا جالندھری، جمیلہ ہاشمی، عطا شاد، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، محسن بھوپالی، شمس نغمان، صہبا اختر، توصیف افضل، رشید امجد، پروین شاکر، ضیا بٹ، ثروت حسین، انور سن رائے، سلمیٰ جبیں، ڈاکٹر معروف، شہزاد منظر، اصغر ندیم سیّد، اکثم مرزا، محمد منشا یاد، پروفیسر امین، رئیس احمر، شفق ہاشمی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۱۸
جلد نمبر ۳۲ ——— شمارہ نمبر ۹
طلبا کیلئے مع رجسٹری فیس ۲۰ روپے
قیمت: ۲ روپے
سالانہ چندہ مع رجسٹری فیس ۳۰ روپے

مطبوعات پاکستان نے دین محمدی پریس بل روڈ لاہور سے چھپا کر دفتر ماہِ نو ۳۲ ا رائے حبیب اللہ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

احمد نجم خان

(قسط نمبر ۲)

پاکستانی فنِ تعمیر کا ارتقا

شاہانِ مغلیہ کی شاہانہ عمارتیں

ملتان، سندھ اور بلوچستان میں اسلامی فنِ تعمیر کو بلاشبہ عروج حاصل ہوا لیکن اس عروج کو مزید تکمیل و ترقی کے مراحل سے مغل حکمرانوں کے دور میں روشناس کیا گیا اور جس کے بہترین نمونے پاکستان کی سرزمین پر پاکستان ثقافتی دارالسلطنت لاہور میں ملتے ہیں۔ لاہور مغل شہنشاہوں کا بھی دارالسلطنت تھا۔ ظہیرالدین محمد بابر نے اپنے لڑکے کامران مرزا کو ۱۵۲۶ء میں لاہور کی حکومت سونپی۔ کامران مرزا کم و بیش دس سال لاہور کے سیاہ و سفید کا مالک رہا۔ اس کے اس طویل دورِ اقتدار کی یادگار ایک بارہ دری ہے جو اس نے ایک وسیع و عریض باغ کے درمیان میں تعمیر کی تھی۔ یہ باغ دریا ئے راوی کے کنارے آباد تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ باغ ختم ہو گیا۔ اور بارہ دری دریا کے کنارے سے دریا کے درمیان آ گئی۔ اور پھر اس کا آدھا حصہ بھی دریا برد ہو گیا۔ مغلیہ طرزِ تعمیر کے ابتدائی دور کی آج یہ خستہ و شکستہ عمارت تاریخی اور تعمیری دونوں اعتبار سے اہم ہے۔ اسلام ہوئیں یہ وہ بارہ دری ہے جو ایک حوض کے درمیان میں بنائی گئی۔ یہ حوض بہت وسیع و عریض تھا اور جس کے چاروں طرف نہریں تھیں اور ان میں فوارے نصب تھے۔ اس طرز کی مزید دو عمارات آج ہمیں معلوم ہیں۔ ایک شیخوپورہ میں ہرن مینار کے ساتھ کی بارہ دری اور دوسرے لاہور کی وہ بارہ دری جس میں دارا شکوہ کی بیوی نادرہ بیگم مدفون ہے۔ موخرالذکر بارہ دری اغلباً دارا شکوہ کے عہد میں تعمیر ہوئی اور حضرت میاں میرؒ کے مزار کے قریب واقع تھی۔ بعد میں نادرہ بیگم کو اس بارہ دری میں دفن کیا گیا۔

فنِ تعمیر کی صحیح معنوں میں سرپرستی اکبر کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ شہنشاہ اکبر لاہور میں ۱۴ سال تک مقیم رہا یہی وہ عہد ہے جبکہ لاہور کو "دارالسلطنت" کا درجہ دیا گیا۔ بادشاہ نے قدیم نیم پختہ اور مٹی گارے سے بنے ہوئے قلعہ کی جگہ پختہ قلعہ تعمیر کیا اور ضرورت کے مطابق محلات تعمیر کرائے آج اکبری عہد کی عمارات قلعہ میں بہت کم رہ گئی ہیں۔ لیکن جو باقی ہیں ۔ ان سے اس عہد کے فنِ تعمیر کی بڑی حد تک نمائندگی ہوتی ہے خیال ہے کہ قلعہ کے دیوانِ عام و خاص کے علاوہ زنانہ محلات جسے عرفِ عام میں آج جہانگیری احاطہ کہتے ہیں اکبری عہد کی یادگار ہے یا زیادہ سے زیادہ اختتام کو جہانگیر کے عہد میں پہنچا۔

خود جہانگیر کے عہد کی عمارات بھی لاہور میں کچھ زیادہ نہیں قلعہ کے وہ حصے جنہیں مکاتیب خانہ اور دالان بلکوشیخو کہتے ہیں۔ اس دور کی یادگار ہیں۔ مکاتیب خانہ اصل میں جہانگیری محلات کی ڈیوڑھی تھی۔ جہاں محل میں داخل ہونے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ یہ محلات عہد شاہجہانی میں تعمیر ہونے والے محلات کے سلسلے میں شکست و ریخت کی نذر ہو گئے۔ جس کے زمانے میں دیوانِ خاص، شیش محل، شاہ برج، نولکھا۔ وغیرہ جیسی نفیس عمارتیں بنیں۔ فنِ تعمیر میں شاہجہان کا بے پناہ شغف ان عمارات کے خدوخال میں بہت نمایاں ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں سرخ پتھر کی جگہ شفاف سنگِ مرمر نے لے لی اور عام انداز کی محرابوں کی جگہ مرغولہ دار محرابیں بنائی گئیں۔ سنگِ مرمر کی شفاف سطح کو رنگ برنگ کے قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں کے ذریعے نت نئے ڈیزائنوں سے مرصع کیا گیا اور پچی کاری کے نفیس ترین نمونے پیدا کئے گئے۔ اس قسم کی تزئین و تذہیب کی اعلیٰ ترین مثال شیش محل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہجہان نے اپنی چہیتی بیگم ممتاز محل کے لئے یہ شاہی محل ۱۶۳۱ء میں بنانے کا حکم دیا کہ جب بھی ممتاز محل لاہور میں مقیم ہو تو اسی محل میں قیام کرے۔ وقت کے بہترین معمار و صناع اس کی تعمیر و تزئین کے لئے مقرر کئے گئے اور خود

آصف خان اور نواب وزیر خان اس اہم عمارت کی تعمیر کی نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے۔ اور جب یہ شاہی محل جسے شاہ برج کا نام دیا گیا تو دنیا نے دیکھا کہ مغل طرزِ تعمیر کا تیسرا عجوبہ معرضِ وجود میں آگیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ممتاز محل کو یہ عجوبۂ عالم دیکھنے کا موقع نصیب نہ ہوا کہ وہ خود ۱۶۳۱ء میں وفات پا چکی تھی۔ بہرحال پچی کاری کا نازک ترین اور قیمتی ترین نمونہ وہ پویلین ہے۔ جسے نولکھا کا نام یوں دیا گیا کہ اس کی تعمیر پر اس وقت ۹ لاکھ روپے کا خرچ آیا۔ پچی کاری کے علاوہ شاہجہانی محلات میں سنگِ مرمر کی جالیاں بھی استعمال کی گئی ہیں جو اپنا جواب آپ ہیں۔ پھر سنگِ مرمر کے فرش پر بھی اقلیدسی اور پھول پتیوں کا کام رنگین پتھروں سے کیا گیا ہے۔ اور باہر کی دیوار کا رُخ روغنی اینٹوں کو مختلف نمونوں اور حصوں میں کاٹ کر ترتیب سے جوڑا گیا ہے اور اس طریقے سے ان گنت ڈیزائن پیدا کئے گئے ہیں۔ تزئین و آرائش کا یہ اہتمام مغل طرزِ آرائش میں اور کہیں نہیں ملتا۔ جہاں انسانوں، جانوروں اور مافوق الفطرت حشرات کی شبیہیں بڑی چابکدستی سے بنائی گئی ہیں۔ شیش محل کے زیرِ زمین محلات بھی دیدنی ہیں۔ جنہیں سرد خانے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آبِ رواں کی بے شمار کارفرمائیاں اپنی پوری کاریگری سے ان محلات میں جلوہ گر ہیں۔ جو ماحول کو پُرسکون، خوشگوار اور تر و تازہ رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بنایا ہوا عالمگیری دروازہ قلعے کی عمارات کی آخری اہم عمارت ہے جو مغلیہ عہدِ حکومت میں تعمیر ہوئیں۔ قلعہ کی فصیل میں جو عہدِ اکبری کی یادگار ہے دو دروازے ہیں مشرقی اور مغربی۔ اورنگ زیب کے عہد میں جب بادشاہی مسجد تعمیر ہوئی تو بادشاہ نے قلعہ کے مغربی دروازے کو نہ صرف تبدیل کر دیا کہ بادشاہی مسجد کے عین مقابل ہو بلکہ اس کو مزید تزئین و آرائش اور دوسری ترمیمات سے بھی نوازا۔ چنانچہ یہ پُرشکوہ دروازہ مغلیہ طرزِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ دروازے کے دونوں طرف مینار ہیں جنہیں چونے کے پلاسٹر سے سجایا گیا ہے۔ دروازے کے اندر ایک ہال ہے۔ جس کے ساتھ تہ در تہ کمرے بنائے گئے ہیں۔

قلعہ سے باہر کی اہم ترین عمارات زیادہ تر عہدِ جہانگیری اور عہدِ شاہجہانی کی یادگار ہیں۔ بیگم شاہی مسجد ۱۶۱۴ء، انارکلی کا مقبرہ ۱۶۱۵ء، جہانگیر کا مقبرہ (۱۶۲۷-۱۶۳۷)، مسجد وزیر خان (۱۶۳۴)، دائی انگہ کی مسجد (۱۶۳۵)، شالیمار باغ (۱۶۴۳)، مقبرہ آصف خان (۱۶۴۱)، مقبرہ نور جہاں (۱۶۴۵)، چوبرجی (۱۶۴۶)، گلابی باغ (۱۶۵۵)، علی مردان خان کا مقبرہ (۱۶۵۷)۔

بیگم شاہی مسجد کو مریم زمانی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر شہنشاہ جہانگیر کی والدہ مریم زمانی بیگم کے حکم سے ۱۶۱۴ء میں ہوئی۔ مغلیہ عہد کی موجودہ مسجدوں میں سب سے پہلی تاریخی مسجد ہے۔ جو قلعہ شاہی کے مشرقی دروازے کے بالکل مقابل آج کی سڑک کے اس پار واقع ہے۔ اس مسجد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے تینوں گنبد دوہرے غلافی ہیں۔ دوسرے مسجد کے ایوان کی اندرونی سطح نایاب فریسکو کے کام سے مزین ہے۔ اتنا خوبصورت فریسکو کا کام اس سے پہلے کہیں اور نہیں ملتا۔ اسی طرح انارکلی کا مقبرہ مغلیہ عہد کی ایک دلچسپ رومانی داستان سے وابستہ ہے۔ گو اس داستان کا تاریخی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن مقبرے میں عمارت خود قابلِ ذکر اور اہم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر کے حکم سے یہ مقبرہ ۱۶۱۵ء میں بنایا گیا۔ قبر کے سنگِ مرمر کے تعویذ پر "مجنوں سلیم اکبر" اور تاریخ تعمیر درج ہے۔ فارسی کا شعر جو اس واقعے سے تعبیر بتایا جاتا ہے۔ بڑا دلچسپ ہے۔

> آہ اگر من باز بینم روی یارِ خویش را
> تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را

مورخوں کی باریک بین تحقیق نے اسے صاحب جمال کا مقبرہ بتایا ہے۔ جو جہانگیر کی بیگمات میں سے تھی اور جس کا انتقال لاہور میں ۱۰۰۸ ہجری میں ہوا۔ مقبروں کے اس ذکر میں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ تیموری عہد میں مقابر کو ایک نفیس اور خوشگوار شکل یہ دی گئی کہ انہیں باقاعدہ باغات میں بنایا گیا۔ اس طرز کی ابتدا تو ہمایوں کے مقبرے سے ہوتی ہے کہ اس کی ایرانی بیگم نے اس کا مقبرہ ایرانی طرزِ تعمیر سے مشابہ بنایا۔ یہ روایت بعد میں اس قدر مقبول ہوئی کہ مغل عہد کا ہر قابلِ ذکر مقبرہ اسی طرح بنایا گیا کہ مقبرے کی حیثیت کے ساتھ ساتھ باغ کی حیثیت بھی مسلّم ہو گئی جسے نہروں، فواروں وغیرہ سے مزین کیا گیا۔ اس مقبرے پر آفاتِ انسانی نے اپنا پورا غضب ڈھایا ہے۔ رنجیت سنگھ کے عہدِ پُرآشوب میں اسے ایک فرانسیسی جنرل کی رہائش گاہ بنایا گیا پھر کھڑک سنگھ جو رنجیت سنگھ کا لڑکا تھا۔ اس مقبرے میں مقیم رہا۔ اسی دوران زیرِ زمین ہال میں قبر کو کھود کر مدفون کی ہڈیاں کہیں باہر کسی گوشے میں دفن کر دی گئیں اور قبر کا تعویذ مقبرے کے ایک کونے میں رکھ دیا گیا۔ اس مقبرے کو انگریزوں کے عہد میں گرجا کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ آج اس بدقسمت مقبرے میں حکومتِ پنجاب کا ریکارڈ آفس ہے۔ اس مقبرے کی خوبی یہ ہے کہ اس کا گنبد دوہرا غلافی ہے۔

یہ مقبرہ ایک باغ کے اندر بنایا گیا تھا۔ جو اب ختم ہو چکا ہے
شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ تزئین و آرائش اور جاہ و جلال
کا مرقع ہے اور مغل دور کی عمارات میں خوبصورتی اور رعنائی
کے اعتبار سے تاج محل کے بعد اس کا شمار ہوتا ہے۔ بادشاہ
کی وصیت کے مطابق نورجہاں بیگم کے ذاتی باغ "باغ دلکشا"
میں دفن۔ اس شاندار اور پُرشکوہ مقبرے کی تعمیر میں پورے
دس سال کا عرصہ (۱۰۲۷ ہجری سے ۱۰۳۷ ہجری) صرف
ہوا اور مغلیہ عہد کے مقبول ترین طرزِ آرائش سے مزین
کیا گیا جن میں سنگِ مرمر میں پچی کاری، روغنی اینٹوں اور
ٹکڑوں کا کام، فریسکو مصوری، خشت کاری وغیرہ سب
کچھ موجود ہے۔ مقبرے پر گو گنبد نہیں ہے لیکن اس کمی کو
چار بلند و بالا میناروں سے پورا کیا گیا ہے۔ جو چاروں کونوں
پر بنائے گئے ہیں اور جن پر گنگا جمنی کا کام سنگِ بادل،
سنگِ موسیٰ اور سنگِ کھٹو سے کیا گیا ہے۔ میناروں کے
اندر سیڑھیاں ہیں جو آخری حد تک جاتی ہیں۔ چھت پہ
مربع شکل کا ایک چبوترہ ہے۔ سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ
اور سنگِ بادل سے آراستہ اس چبوترے کے چاروں
طرف کی جالی اور درمیان میں ایک تعویذ سنگِ مرمر کا تھا
جو سکھ اٹھا کر لے گئے اب صرف اس کا نشان درمیان
میں باقی ہے۔ مقبرہ مربع شکل کے چار فٹ اونچے چبوترے
پر چار دیواری کے اندر ایک وسیع و عریض باغ کے درمیان
ہے۔ باغ میں حوض اور نہریں ہیں۔ جو پورے باغ کو
بتیس مربع حصوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ اور جن میں انواع و
اقسام کے پھلوں اور پھولوں کے درخت اور پودے
لگائے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں اس
سے زیادہ خوبصورت و مرصع عمارت مغلوں کے دور
کی اور کوئی نہیں ہے۔ خاص طور سے جہانگیر کی قبر کا
سنگِ مرمر کا تعویذ جس پر مختلف رنگین قیمتی پتھروں سے
بیش قیمت کام کیا گیا ہے۔

مقبرۂ جہانگیر کے قرب میں اکبری سرائے، مسجد
آصف خان کا مقبرہ اور نور جہاں کا مقبرہ واقع ہیں۔ مذکورہ
دونوں مقابر مروجہ اسلوبِ تعمیر کے عمدہ نمونے تو ہیں ہی
سامانِ عبرت بھی ہیں۔ دونوں مقبرے سکھوں کی
دست برد سے نہ بچ سکے۔ جو ان مقبروں میں استعمال
پتھر اکھاڑ اکھاڑ کر لے گئے۔ آصف خان کا مقبرہ فنِ تعمیر
کا ایک اہم شاہکار ہے۔ ایرانی فنِ تعمیر سے بہت
مشابہ ہے۔ خاص طور پر اس کا گنبد جو دو خلائی ہے
اور ہشت پہلو پلان پر ایک اونچے پلیٹ فارم پر بنایا
گیا ہے۔ مقبرے کو حسبِ معمول چہار دیواری سے
آراستہ ایک باغ میں بنایا گیا ہے۔ اور
ہشت پہلو پلیٹ فارم کے ہر دوسرے
پہلو پر حوض اور فوارے بنائے گئے تھے۔ باغ میں
نہریں بھی ہیں۔ سطح کی تزئین میں پتھروں کی تزئین تو
سکھوں کی تاخت و تاراج کی نذر ہو گئی لیکن روغنی
اینٹوں اور پھول پتیوں کی آرائش اور گنبد کے اندرونی
سطح پر نایاب قسم کے آئینہ سازی کے نمونے قابلِ دید
ہیں۔ اس قسم کی زینت ہمیں صرف علی مردان خان کے
مقبرے میں ملتی ہے۔ جس کی حالت بھی سکھوں کے
ہاتھوں تباہی کے بعد زیادہ اچھی نہیں ہے۔

مغلیہ عہد کے چند موجودہ مقبروں کے اس مختصر
تعارف کے بعد مغلوں کے دور میں تعمیر شدہ چند اہم
باغات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ باغات سے شغف
اور دلچسپی تیموری بادشاہوں کا فطری خاصہ رہی ہے
بابر ہندوستان میں آمد کے موقع پر جس بات کی
خاص طور سے شکایت کرتا ہے۔ وہ یہاں باغات کی
کمی تھی۔ وہ فطرت کی رعنائیوں اور چشموں اور نہروں کا
بڑا دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے مختصر سے دورِ حکومت
میں کئی باغات کی بنیاد رکھی جن میں تختِ بابری کا ذکر
تاریخوں میں ملتا ہے۔ بابر کے بیٹے مرزا کامران کے
لاہور کے باغ کا ذکر ابھی ہوا۔ اکبر کے عہد میں فرودگاہ
شاہانِ مغلیہ کی بنیاد پڑی جو واہ اور حسن ابدال کے درمیان
واقع ہے اور جسے جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانوں میں
مزید وسعت دی گئی۔ راجہ مان سنگھ کی بنائی ہوئی
بارہ دری کے بارے میں جہانگیر اپنی تزک میں رطب اللسان
ہے کہ یہ ایک قدرتی چشمے کے اوپر بنائی گئی ہے۔
جس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں ہیں اور جہاں اس نے
ایک مرتبہ مچھلیوں کا شکار بھی کھیلا اور پھر پکڑی ہوئی
مچھلیوں کی ناک میں موتی پرو کر دوبارہ چشمے میں چھوڑ
دیں۔ یہ قدرتی چشمے میں ان مقامات پر اکثر رواں دواں
ہیں۔ چنانچہ غالباً جہانگیر یا پھر شاہجہاں کے عہد میں شالیمار
لاہور کے انداز میں اس جگہ چہار دیواری کے اندر ایک
باغ بنوایا گیا۔ مرکزی حیثیت ایک نئی بارہ دری کو دی
گئی۔ جس کے سامنے میں ایک وسیع تالاب تعمیر کیا گیا۔
پھر دوسرے تختے میں پھلدار درخت اگائے گئے۔
تیموری شہنشاہوں کی مناسبتِ ذوق نے یہاں بھی کرشمہ
دکھایا ہے۔ سارے حصوں کو تختوں میں تقسیم کیا گیا۔
نہریں بنوائیں۔ آبشار بنائے اور فواروں سے مزین کیا
گیا۔ افسوس کہ بعد کے آنے والوں نے مغل طرزِ تعمیر کے
اس بے نظیر نمونے کی حفاظت نہیں کی اور اپنے وقت
کا یہ نفیس و عالیشان شاہی باغ کھنڈرات میں تبدیل ہو
چکا ہے۔ نشانات و کھنڈرات بہرحال بتا رہے ہیں کہ

عمارت یقیناً عظیم تھی کہ جگہ جگہ چوبیاں اور بارہ دریاں
تھیں اور پھر مرکزی بارہ دری کے ساتھ جو غسل خانے
کا اہتمام ہے۔ اس کا جواب آج پاکستان میں کسی جگہ موجود
نہیں۔ بالائے زمین کی نفیس عمارتیں تو دست برد زمانہ کی
نذر ہو گئیں۔ لیکن زیر زمین کھود کر جو باقیات اُجاگر کئے
گئے ہیں۔ حوض نما غسل خانے، گرم و سرد حمام، لباس
تبدیل کرنے کے لئے کمرے اور پھر ان غسل خانوں کے
نیچے تہ خانے جن میں پانی گرم کرنے کا انتظام تھا۔ یہ ساری
عمارات نقش و نگار والے پتھروں اور فریسکو نقاشی سے
مزین تھیں۔ باغ کے جو چہار دیواری سے محفوظ تھی غالباً
مشرقی اور مغربی دو دروازے تھے۔ جن میں سے مغربی
دروازہ آج بھی زبانِ حال سے اپنی کھوئی ہوئی شان کی
داستان سنا رہا ہے۔

شاہ جہاں کی یادگار عمارات میں شالامار کا ذکر دلچسپ
بھی ہے اور اہم بھی۔ تین طبقوں پر منقسم یہ شاہی تفریح گاہ
۱۶۴۲ء میں تعمیر ہوئی۔ آب رواں کی نہروں فواروں اور
چشموں سے آراستہ اور سبزہ زاروں سے مزین اس باغ
کے درمیان بارہ دریاں، خواب گاہیں، حمام، غسل خانے
بنائے گئے تھے۔ باغ کی فصیل میں داخلہ مشرقی اور مغربی
دروازوں سے تھا۔ جو نچلے طبقے میں کھلتے تھے۔ موجودہ
دروازہ تو انگریزوں کے عہد میں شاہ جہانی خواب گاہ کو
کھول کر اس وقت نکالا گیا جبکہ موجودہ سڑک باغ کے
سامنے سے گزاری گئی۔ نچلے طبقے میں اہتمام یہ تھا کہ
عالم کے سارے پھلوں کے درخت یہاں لگائے
گئے تھے۔ جسے فیض بخش کا نام دیا گیا۔ جبکہ وسطی طبقے
میں پانی کا وسیع و عریض حوض، فوارے، بارہ دریاں،
شاہی حمام۔ ساون بھادوں کی عمارتیں ہیں۔ تیسرے
طبقے میں بارہ دریاں، شاہی خواب گاہیں وغیرہ ہیں۔
ان دونوں طبقوں کو ملا کر فرح بخش کا نام دیا گیا تھا کہ
یہاں خوشبودار پھولوں کے پودے اور تختے تھے۔
نہروں کے ساتھ ساتھ پکی اینٹوں سے بنے ہوئے
اقلیدسی شکل کے مرصع فرش ہیں۔ جبکہ عمارتوں
کو فریسکو نقاشی اور روغنی اینٹوں کی مرصع کاری
سے مزین کیا گیا تھا۔ سنگ مرمر کے ایک آبشار کو سب سے
بلند طبقے کے درمیان بنایا گیا ہے۔ روایت ہے کہ
اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء نے اس آبشار سے
آب رواں کو تسلسل سے بہتے ہوئے دیکھ کر یہ
قطعہ کہا۔

ای آبشار نوحہ گر از بہر چیستی
چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہ کیستی
دردت چہ درد بود کہ چوں من تمام شب
سر را بسنگ می زدی و می گریستی

شاہجہان کے عہد میں اس قسم کے تین منطقہ باغات
جنہیں شالامار کہا گیا بنائے گئے ایک لاہور میں دوسرا
کشمیر میں اور تیسرا دہلی میں، اتفاق اور خوش قسمتی سے
صرف لاہور کا باغ ہی اپنی اصلی حالت میں اب تک
موجود ہے۔ اور طرز تعمیر کے اعتبار سے خاص اہمیت کا
حامل۔ تفریح گاہوں میں شاہی شکار گاہوں میں ہرن
مینار اور بارہ دری عہد جہانگیری اور شاہجہانی دور کی یادگار
ہیں۔ یہ عمارات لاہور سے ۲۰ میل کے فاصلے پر شیخوپورہ
میں واقع ہیں۔ خود شیخوپورہ عہد اکبری میں آباد ہوا اور
اکبر بادشاہ نے اپنے چہیتے بیٹے سلیم کے نام پر اس کا نام
رکھا جسے وہ پیار سے شیخو بابا کہا کرتا تھا۔ شیخوپورے کی
یہ شکار گاہ جہانگیر کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ ہرن مینار
نو برس کے ایک پسندیدہ ہرن کی یادگار کے طور پر
بنایا گیا تھا اور بارہ دری ایک وسیع و عریض حوض کے
درمیان بنی ہے۔ تقریباً سو فٹ بلند و بالا مینار کے
اندر سے سیڑھیاں جاتی ہیں جو آخری منزل تک پہنچاتی
ہیں۔ یہاں سے گرد و نواح کا نظارہ جو آج بھی ایک
گنجان جنگل کی صورت میں ہے بڑی خوبی سے کیا جا سکتا
ہے اور شکار کیا جا سکتا ہے۔ حوض کے چاروں کونوں
پر چہار دریاں بنی ہیں اور چاروں طرف درمیان میں ایک
ڈھلوان ہے۔ جہاں جانور پانی پینے کے لئے آتے تھے
حوض میں پانی خاص نہروں کے ذریعے لایا جاتا تھا جو
تین حصوں میں تقسیم ہیں۔ اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ پانی کے
ساتھ ریت مٹی حوض کے اندر نہ آسکے لیکن یہ اہتمام
اب باقی نہیں رہا چنانچہ حوض کی خاصی سطح مٹی سے بھر
چکی ہے ایک کاز وے کے ذریعہ ہم بارہ دری تک پہنچتے
ہیں۔ جو تین منزلہ ہے۔ اور بڑی خوبصورت نقاشی سے
سجائی گئی ہے۔ نیچے کی منزل میں آٹھ دالان والا کمرہ درمیان
میں ہے اور اس کے اطراف میں ایک گیلری اس انداز
میں گھومتی ہے۔ جہانگیر کے بعد شاہجہان نے اس بارہ دری
میں اپنی پسند کی ترامیم کرائی ہیں۔ یہ شکارگاہ جہانگیر اور
شاہجہاں کے زمانوں میں بہت مقبول رہی اور جب بھی
مغل بادشاہ کشمیر کو جاتے ہوئے اس طرف سے گزرتے
تو اکثر یہاں سیر و تفریح اور شکار کے لئے قیام کیا کرتے
تھے۔

عہد شیر شاہی بھی اپنی تعمیرات کی خصوصیات کیلئے
قابل ذکر ہے۔ شیر شاہ نے جہلم میں ۹۴۹ ۱۵۴۲ء میں رہتاس
کا قلعہ تعمیر کیا۔ اس کی شکستہ عظیم اور اس پر سوائے اللہ
[illegible]

سے منسوب ہے۔ اس کے علاوہ اٹک کا قلعہ اکبری عہد میں (۱۵۸۱ء) بنا جس کے نواح میں بیگم کی سرائے نورجہاں سے منسوب ہے۔ یہاں اور بھی چند عمارات ہیں۔ جن کا تعلق عہدِ شاہجہانی سے ہے۔

پاکستان کے پانچ ہزار سالہ فنِ تعمیر کا یہ مختصر ترین جائزہ ہے۔ جو اوپر چند صفحات میں پیش کیا گیا عہد بعہد کی ترقی جوان نمونوں سے واضح ہوتی ہے۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میدان میں بھی انسان نے اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اینٹ اور گارے کے معمولی اور چھوٹے چھوٹے مکانات سے لے کر مشکل ترین اور بلند ترین محلات انہیں صلاحیتوں اور تجربوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ ماقبل تاریخ سے لے کر مغلیہ عہد تک فنِ تعمیر کے جتنے بھی اسالیب سرزمینِ پاکستان پر مروّج ہوئے ان کے تقریباً تمام خصوصیات و جزئیات ہندوستان سے کم اور وسطی ایشیائی اور ایرانی شاہکاروں سے زیادہ مستعار تھے۔ چنانچہ خواہ وہ موہن جودارو کی عمارت یا سرکپ کے بازار و محلات یا تخت باہی کے معابد اور خانقاہیں ہوں یا بھنبور (دیبل)، منصورہ کے فصیل و محلات ملتان، اچھ اور دیپال پور کے ذیشان مقابر یا ٹھٹھہ کی مساجد و شاہی محلات ہوں یا ٹھٹھہ کے مقابر، ان سب کے بنیادی تصورات انہیں خارجی اثرات و عوامل کے مرہونِ منت ہیں گویا پاکستانی فنِ تعمیر اسی ابہام و تفہیم کا مظہر ہے۔ جس کے سوتے وسطی ایشیا اور ایران سے نکلتے ہیں۔

حسن زیدی

زاهد مسعود

قاضی جاوید
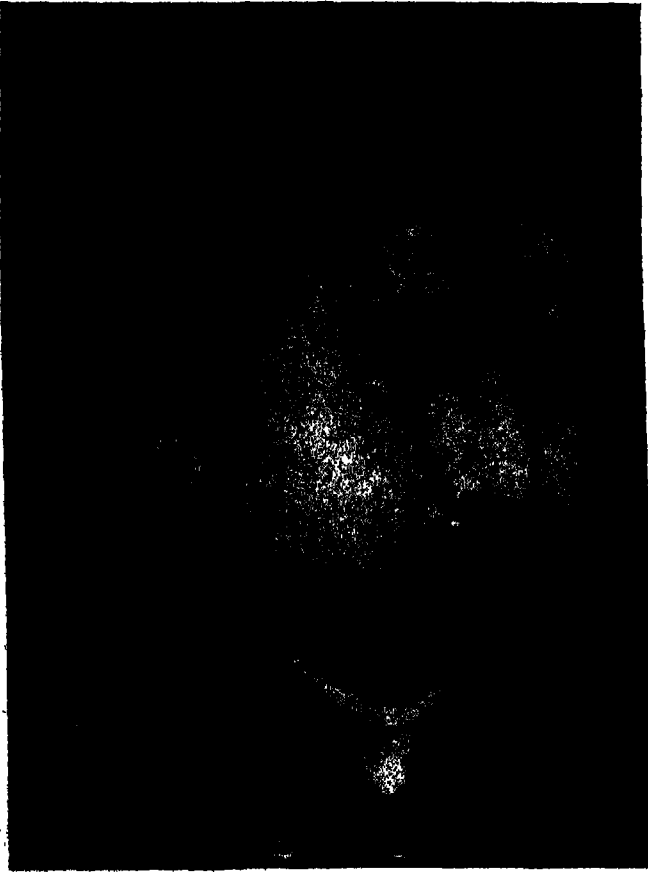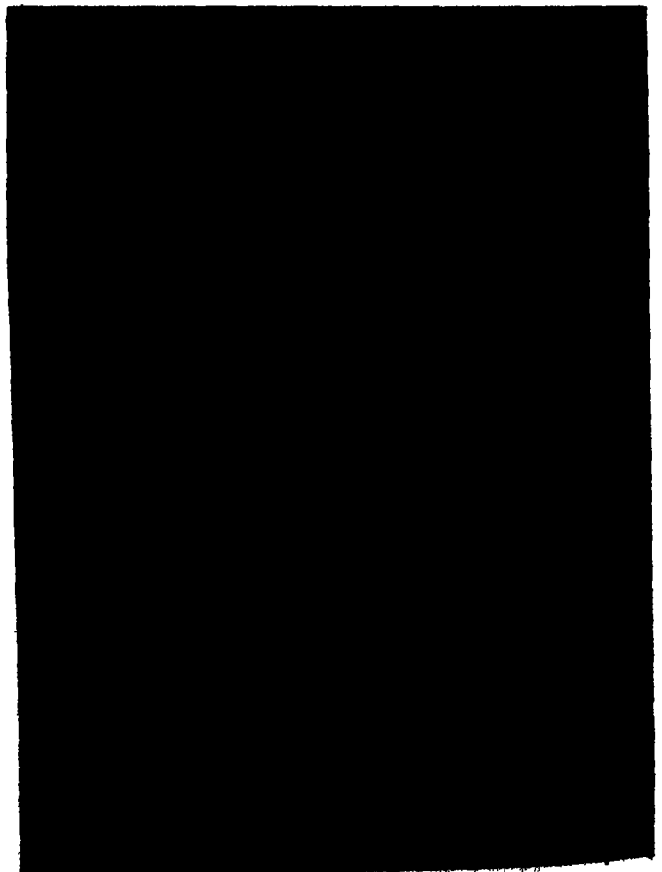
(قسط نمبر ۲)

برِّصغیر کی جدید مسلم فکر کا ایک مطالعہ

ان ہی ریشہ دوانیوں کا پتہ لگانا اور ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کے ساتھ تاریخی نتائج کا منضبط کرنا ہی علمِ تاریخ کی جان اور روح ہے۔ شبلی یہ بھی کہتے ہیں کہ تاریخ کے عمل کا فہم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال کا تجزیہ بھی کیا جائے۔ تاہم شبلی نے خود تاریخ اور سوانح نگاری میں امتیاز کو پیشِ نظر نہیں رکھا وہ مقصد کے تابع ہو کر لکھتے ہیں اور تاریخ کو اپنی اصلاح پسندی کے ماتحت لے آتے ہیں وہ تاریخ اور انشا پردازی کو جدا کرنے پر زور دیتے ہیں۔ لیکن خود کی تاریخی نگارشات میں شاعرانہ خطابت اکثر ملتی ہے۔

صدیٔ رواں کی دوسری دہائی میں نوآبادیاتی نظام کے پاؤں اکھڑنے لگے تھے۔ جنگِ عظیم اوّل نے اس عمل میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ تیسری دنیا میں آزادی کی تحریکیں شدت اختیار کرنے لگی تھیں اور برِّصغیر بھی اُن کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ اس زمانے تک ہندی مسلمانوں کا بالائی طبقہ نوآبادیاتی نظام کے ڈھانچے کے اندر حاصل ہونے والے مواقع سے فیض یاب ہو چکا تھا۔ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی خاطر اب اس کا نوآبادیاتی ڈھانچے سے تصادم ناگزیر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اوّل اوّل تو یہ طبقہ تذبذب کا شکار ہوا اور عام بے چینی کا اظہار کرنے لگا۔ لیکن بالآخر اسے صورتِ حال کے جبر سے متصادم ہونا پڑا۔ اس تصادم نے نظریاتی سطح پر سرسید کے الٹ نقطۂ نظر کو جنم دیا۔ سیاست میں اس کا اظہار آزادی پسند نظریات کی صورت میں ہوا اور مذہبی فکر کے میدان میں اس نے مذہبی عقائد کی حوصلہ مند اور ولولہ انگیز توجیہات کی صورت میں جلوہ نمائی کی۔

مذہبی تجربے کے نقطۂ نظر کا ابتدائی اظہار مولانا شبلی نعمانی کے یہاں ملتا ہے لیکن وہ ایک عبوری دور سے تعلق رکھتے تھے ـــــ ان کے بعد تبدیلی کا عمل تیز تر ہو گیا۔ آزادی کی تحریکیں پروان چڑھنے لگیں اور انقلابی خیالات گردش کرنے لگے تھے۔ ہندی مسلمان بھی آزادی کے جوش اور ولولے سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد اُن کے نمایاں ترین نظریہ ساز کے طور پر ابھرے۔ مولانا آزاد نے تخلیقی تحریک شبلی سے حاصل کی تھی۔ سرسید سے بھی متأثر تھے مگر انہوں نے علی گڑھ والوں کے برعکس ہندی مسلمانوں میں بغاوت کی آگ پیدا کرنا چاہی اور انہیں سیاسی عمل پر اکسایا۔ اُن کے نزدیک آزادی اور اسلام ہم معنی تھے۔ آزاد کے بارے میں شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ:

> "مذہبی نقطۂ نظر سے مولانا ابوالکلام آزاد کا سب سے اہم کام جو ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، جدید علمِ کلام کی تردید و اصلاح ہے۔ سرسید کے نومعتزلہ عقائد سے مسلمان کبھی خوش نہ تھے لیکن شاید اس کا سدِّ باب مولانا ہی نے کیا۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد علما نے اُن کے خیالات کی تردید میں کتابیں لکھیں، مولانا نذیر احمد نے بھی مذہبی معلومات

کی اشاعت کے لئے ایک مستقل سلسلۂ تصنیف جاری کر سکتا تھا لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کا کام ان سب سے اہم تھا۔ قدیم علماء کو خدا نے زوردار قلم نہ دیا تھا جو مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے علاوہ نئے مسائل کے متعلق ان کی معلومات نہایت کم تھیں اور استدلال کے طریقے رسمی اور بے جان تھے ۔۔۔ زوردار طرزِ تحریر کے علاوہ جس میں دلائل کی کمی ساحرانہ طرزِ تحریر سے پوری ہو جاتی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد جدید علم کلام کی اصلاح کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ وہ خود تشکک و الحاد کی منزل سے گزر چکے تھے۔ اور ذاتی تجربے سے جانتے تھے کہ ہر چیز کو تشکک و تردد کی نظر سے دیکھنا اور ہر عقیدے کو مادیت اور منطق کے ترازو میں تولنے کا نتیجہ شک، بے اطمینانی بے چینی اور بے اعتقادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، جن نام نہاد علوم کا ماحصل خود ظلمتِ ظن و شک اور کوریٔ فہم و رائے سے زیادہ نہیں وہ مریضانِ یقین و اعتقاد کے لئے کیونکر نسخۂ شفا ہو سکتے ہیں۔ دوسرے وہ اسلام کی تاریخ سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ جب قدیم علم کلام شک و شبہ کا ازالہ کرنے میں کس طرح کامیاب نہ ہوا تو نیا علم کلام کس کام آئے گا؟"

اپنی ذہنی زندگی کے ابتدائی دور میں مولانا آزاد دو قومی نظریے کے زبردست حامی تھے اور انہوں نے اپنے رسالہ 'الہلال' کے ذریعے مسلم قوم پرستی کے تصور کا چرچا کیا تھا۔ اس رسالے میں انہوں نے ایسے کئی خیالات پیش کئے تھے جو بعد ازاں مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی اساس بنے۔ لیکن بعد ازاں وہ متحدہ قومیت کے حامی ہوتے گئے۔ ہندو مسلم اتحاد کو انہوں نے زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ وہ اس اتحاد کو ہندوستان کی آزادی کے لئے ناگزیر تصور کرتے تھے۔ لیکن گزشتہ صدی کے وسط سے ہندی مسلمانوں میں جداگانہ قومیت کا احساس مضبوط جڑ پکڑ چکا تھا۔ آزاد کے علاوہ تمام قابلِ ذکر دانشوروں نے کسی نہ کسی صورت میں اس کی حمایت اور صورت گری کی تھی ۔ صدیٔ رواں کی تیسری دہائی کسی طرح بھی متحدہ قومیت کا راگ چھیڑنے کے لئے موزوں نہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا آزاد مرزا غلام احمد کی طرح ہندی مسلمانوں کی غالب اکثریت سے کٹ کر رہ گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی مقبولیت ختم ہونے لگی تو علامہ محمد اقبال ہندی مسلمانوں کے اہم ترین نظریہ ساز کے روپ میں سامنے آئے ۔ انہوں نے وہ آئیڈیالوجی مرتب کی جو قوم کو اس مقام سے آگے لے جا سکتی تھی جس پر وہ تیسری دہائی میں پہنچ چکی تھی۔ آزاد کے برعکس اقبال ابتدا میں متحدہ قومیت کے حامی رہ چکے تھے۔ لیکن آخرکار انہوں نے اس تصور کو مسترد کر دیا اور قومیت کی مذہبی اساس پر اصرار کرتے ہوئے دو قومی نظریے کی شدو مد سے حمایت کی۔ اس نظریے کے حوالے سے انہوں نے تقسیم ہند کا منصوبہ پیش کیا اور قیام پاکستان کے لئے نظریاتی اساس فراہم کی!

فکری سطح پر علامہ اقبال کا کارنامہ اسلام کی ایک ایسی جدید تعبیر کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ جس نے ہندی مسلمانوں کو غلامی کے خلاف اکسایا۔ یہ نئی تعبیر عصر حاضر کے تقاضوں اور علومِ جدیدہ سے ہم آہنگ بھی ہے۔ علامہ نے حیات و کائنات کے بارے میں ارتقائی اور حرکی نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے قرونِ وسطیٰ کے اس نظریے کی تردید کی کہ کائنات ایک ساکن اور جامع وجود ہے۔ قرآن حکیم حیات و کائنات کو متحرک، تخلیقی اور تغیر پذیر وجود قرار دیتا ہے۔ لہٰذا کوئی مسلم سماج تغیر و تبدل اور تخلیقی عمل کے تصور کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ جمود اور سکون کا دشمن ہے۔ زندگی تغیر اور انقلاب کا دوسرا نام ہے۔

ہماری ثقافتی و سیاسی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے علامہ اقبال اس نتیجہ پر پہنچے کہ ملوکیت اور جاگیرداری جیسے زندگی دشمن نظاموں اور

فلسفوں، رہبانیت، ملا کی تنگ نظری، ظواہر پرستی، روایت پسندی اور محکومی نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تخلیقی قوتیں سلب کر لیں اور آگے بڑھنے کی آرزو ختم کر دی۔ شاہین کرگس بنا دیا گیا۔ عشق، تصوف کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا ولولے مٹ گئے۔ میدانِ کارزار سرد اور خانقاہیں گرم ہو گئیں۔ تخلیق پر تقلید غالب آ گئی وہ مومن کہ جن کی افلاک سے حریصانہ کشاکش تھی، عنقا ہو گئے۔ خاک باقی رہ گئے۔ اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اس افسانے کا سبب روحانی تساہل تھا کہ روحانی زوال کے عالم میں قومیں اپنے اکابرین کو پوجنا شروع کر دیتی ہیں۔

پس علامہ اقبال کے نزدیک ترقی کے لئے آزادئ فکر اور کائنات کے حرکی نظریے کی ضرورت ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلامی فکر نے جو راستہ اختیار کیا اُس کی انتہا جس پہلو اور جس رنگ میں بھی دیکھئے کائنات کے حرکی تصور پر ہوئی اور پھر جیسے ابن مسکویہ کے اس نظریے سے کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے مزید تقویت پہنچی۔ علیٰ ہذا ابنِ خلدون کے نظریۂ تاریخ سے تہذیبِ اسلامیہ کے اس اساسی اصول کے حوالے سے علامہ اقبال نظری سطح پر اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت جتلاتے ہیں یا اجتہاد ہی ہے جس کے ذریعے اسلامی معاشرہ خود کو تغیر پذیر حالات سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ آج کی دنیا میں ہم اس اصول پر عمل کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

علامہ اقبال کے فکری نظام کی اساس خودی کے تصور پر ہے۔ فلسفیانہ اعتبار سے یہ تصور فلسفۂ وحدت الشہود کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس لئے شیخ احمد سرہندی اور سلطان باہو کے ہاں پیش بینی ملتی ہے۔ تاہم اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اقبال نے یہ تصور محض فلسفیانہ حوالے سے ہی اخذ نہیں کیا، بلکہ نوآبادیاتی نظام کے ذہنی اور نفسیاتی جبر کے خلاف ردِ عمل کے طور پر قبول کیا ہے۔ بالاخر خودی کا فہم حاصل کرنے کے لئے ہمیں علامہ کی شاعری کے اُس حصے کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جس میں محکومانہ نفسیات اور اس کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں 'نظم تصویرِ درد' بہت اہم ہے۔ 'ضربِ کلیم' میں بھی اس قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ ان نظموں میں علامہ کہتے ہیں کہ کوئی غلام بندۂ حر کے مشاہدات کا فہم حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ دونوں کے شب و روز اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے درمیان ابلاغ محال ہو جاتا ہے۔ آزاد کا ہر لمحہ پیغامِ ابدیت ہے۔ محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات ہے آزاد کا اندیشہ گرفتارِ خرافات ہوتا ہے۔ محکوم پیروں کی کرامتوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اور آزاد بذاتِ خود کرامت ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک غلامی غلاموں کی رضامندی کے بغیر ممکن نہیں۔ غلام آزادی کے لئے اٹھ کھڑے ہوں تو زنجیریں خود بخود ٹوٹ جاتی ہیں۔ 'بندگی نامہ' میں محکومانہ نفسیات کا گہرا تجزیہ کیا گیا ہے۔ نظم کے آغاز میں سورج خدا سے گلہ کرتا ہے کہ ایسی دنیا کا طواف کرنے میں اسے خجالت محسوس ہوتی ہے جس کے باشندے غلامی کی لعنت میں گرفتار ہوں۔ غلامی کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے اُن کے روحانی اور جمالیاتی اظہار کی صورتیں بگڑ جاتی ہیں۔ وہ بصیرت سے محروم ادب اور سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کے شاہکار فطرت کو مسخ کرنے کا جذبہ پیدا نہیں کرتے اداسی اور موت کا تأثر دیتے ہیں۔ محکومانہ نفسیات کے اس تجزیے پر ہی علامہ نے اپنے تصورِ خودی کی اساس رکھی ہے اور اس کے ذریعے ہندی مسلمانوں کو نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کے لئے تیار کیا۔

روسی اشتراکی انقلاب نے دنیا کے دیگر دانش وروں کی طرح اقبال کو بھی گہرے طور پر متأثر کیا تھا۔ تاہم اس انقلاب کے بارے میں ان کا رویہ رومانوی اور مذہبی تھا۔ سمتھ نے درست ہی کہا ہے کہ اقبال صرف جذباتی سطح پر اشتراکی تھے کیونکہ انہیں نسلِ انسانی سے محبت تھی۔ اوّلین روسی اشتراکی انقلاب سے بھی ایک سال قبل یعنی ۱۹۰۷ء میں علامہ نے لکھا تھا کہ:

"غریبی قوائے انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے، بلکہ بسا اوقات انسانی

دولت کے چند لوگوں کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود عدم کے برابر ہو جاتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چھپ چھپ کر اپنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو دہلا دینے والا افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔"

علامہ کے معاصرین میں سے مولانا عبیداللہ سندھی اس راہ میں زیادہ آگے بڑھے ہیں۔ انہوں نے دیوبند کے قوم پرست مرکز میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن جیسے انقلابی استاد سے درس حاصل کیا تھا اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ آزادی پسند تحریکوں میں حصہ لینے کی بنا پر جبری اور اختیاری جلاوطنی کی حالت میں بسر ہوا تھا۔ انہوں نے انقلاب کے بعد روس کی سیاحت بھی کی تھی اور کئی انقلابی رہنماؤں سے ملنے کا موقع حاصل کیا تھا۔ ان اسباب نے مل کر مولانا سندھی کو ایک بڑا انقلابی بنا دیا تھا جو ایک طرف تو نو آبادیاتی نظام ختم کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف ایک نئے ترقی پسند سماج کی تشکیل کرنا چاہتا تھا۔ مولانا سندھی کا فکر نظامِ حکمت ولی اللہی، اشتراکیت اور ترکی کے انقلابی تجربات کے امتزاج سے وجود پذیر ہوا تھا۔ انہوں نے اسلام کی انقلابی اور جماعتی توجیہہ پیش کی۔ مغربی علوم و فنون اور تہذیب کو جذب کرنے کا مشورہ دیا اور اشتراکی اصولوں پر سماج کی تشکیلِ نو کا درس دیا۔ خالص مادی بنیادوں پر استوار انقلابی فکر کی مذمت کی اور اس کے مقابلے میں اسلام کو پیش کیا۔

یہ خیال کہ اسلام اور اشتراکیت میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے، علامہ اقبال اور مولانا عبیداللہ سندھی کے بعد اکثر دانشوروں کو متاثر کرتا رہا ہے لیکن علمی سطح پر اس کی وضاحت بہت کم کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مظہر الدین صدیقی کی کتاب "اشتراکیت اور نظام اسلام" اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی "اسلام اور کمیونزم" کا خصوصی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں دانشور اسلام کے نئے روشن خیال نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انہوں نے اقبال سے رہنمائی حاصل کی ہے اور اقبال سمیت یہ تینوں دانشور اشتراکی فلسفے کو انیسویں صدی کے یورپی طبقاتی امتیازات کے خلاف ردِ عمل قرار دیتے ہیں۔ مارکس کو انسانی فلاح و بہبود کا طلبگار قرار دیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس نے اپنے زمانے کے غریبوں کے دکھ درد سے متاثر ہو کر ان کے حالات کی اصلاح کے لئے اپنا فلسفہ پیش کیا تھا۔ اس اخلاقی نقطۂ نظر کی مزید وضاحت ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتی ہے:

"اشتراکیت بنیادی طور پر دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے پیدا ہونے والی زندگی کے مواقع میں عدم مساوات کے خلاف بغاوت ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب مصلحین اور مبلغین انسانی معاشرے کو طبقات میں اس طرح منقسم دیکھتے ہیں کہ ایک کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں، جب کہ دوسرا کھانے کو روکھی سوکھی روٹی، تن ڈھانپنے کو کپڑے، علاج کی خاطر دوا اور رہنے کو جھونپڑی سے بھی محروم ہے تو ان کا اولین مطالبہ مساوات کے نعرے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ استفسار کرتے ہیں کہ جب انسان مساوی پیدا ہوئے ہیں تو پھر یہ اونچ نیچ اور امتیازات کیوں ہیں؟ اپنے جوش اور ولولے میں وہ فطری امتیازات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔"

اسلامی سوشلزم کے تصور کو فروغ دینے میں صفدر میر، پروفیسر محمد عثمان، محمد حنیف رامے اور بہت سے دوسرے لوگوں نے حصہ لیا ہے۔ غلام احمد پرویز نے یہ اصطلاح قبول کئے بغیر ایسے خیالات پیش کئے ہیں جو اسلامی سوشلزم سے مختلف نہیں۔ اس تصور کی مخالفت کرنے والوں میں سید ابوالاعلیٰ مودودی ممتاز ترین ہیں۔ وہ اشتراکیت کو انسانی فطرت کے خلاف جنگ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ افراد کو شخصی ملکیت سے محروم کر کے بالکل جماعت

کا خاتمہ بنا دینا نہ صرف معیشت کے لئے تباہ کن ہے۔ بلکہ زیادہ وسیع پیمانے پر انسا کی پوری تمدنی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ اشتراکیت معیشت اور نظامِ تمدن سے اس کی روحِ رواں ، اس کی اصل قوتِ محرکہ کو خارج کر دیتی ہے۔ تمدن و معیشت میں جو شے انسان کو انتہائی قوت کے ساتھ سعی و عمل کرنے پر ابھارتی ہے ، وہ دراصل اس کا ذاتی مفاد ہے۔ یہ انسان کی فطری خود غرضی ہے جس کو کوئی منطق اس کے دل و دماغ کے ریشوں سے نہیں نکال سکتی۔ یہی نقطۂ نظر اسلامی سوشلزم کی مخالفت کرنے والے اکثر دانشوروں نے پیش کیا ہے۔ ان میں مفتی محمد شفیع ، ڈاکٹر سید عبداللہ اور نعیم صدیقی قابلِ ذکر ہیں۔

پاکستان کے خالص فلسفیانہ حلقوں میں اسلامی سوشلزم کی بحث مقبولیت حاصل نہیں کر سکی یہ حلقے زیادہ تر جدید مغربی فلسفیانہ نظاموں کے زیرِ اثر رہے ہیں۔ ان میں منطقی ایجابیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے یہ اکثر انگریزی بولنے والی دنیا کا مقبول ترین فلسفہ ہے۔ سابق برطانوی نوآبادی ہونے کی حیثیت سے پاکستان میں اس کے وسیع اثرات بے سبب نہیں ہیں۔ یہاں اس فلسفے کے فروغ میں پاکستان فلاسفیکل کانگریس نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ کانگریس پروفیسر میاں محمد شریف اور خلیفہ عبدالحکیم کی کوششوں سے ۱۹۵۴ء میں معرضِ وجود میں آئی تھی ، ۱۹۷۱ء تک اس کے سالانہ اجلاس باقاعدگی سے ہوتے رہے۔ بعد ازاں پروفیسر خواجہ غلام صادق کی کاوشوں سے ۱۹۷۵ء میں اس کا احیاء ہوا۔[1]

پاکستان میں خالص فلسفیانہ مباحث کے سلسلے میں میں یہاں دو فلاسفوں کا خصوصی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر سی اے قادر ہیں اور دوسرے پروفیسر خواجہ غلام صادق۔ ڈاکٹر قادر نے پروفیسر صادق اور دیگر پاکستانی فلاسفہ کی طرح یہ تصور پیش کیا ہے کہ مذہب کی زبان بُعدِ کثیر کی زبان ہے۔ مذہب کی زبان کو کسی ایک حوالے سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید اقبال اور مولانا محمد حنیف ندوی کی طرح ڈاکٹر قادر کہتے ہیں کہ اکثر مذہبی جملے لفظی مفہوم کے حامل نہیں ہوتے لہٰذا اُن کی کئی سطحوں پر تعبیر ممکن ہے۔ مذہبی علم قربت اور شرکت سے عبارت ہے۔ خارجی دنیا کے بارے میں علم کی تصدیق کرنے کے واضح طریقے موجود ہیں لیکن جب دو صوفی اپنے مشاہدات بیان کرتے ہیں تو کئی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ہم کسی واضح نتیجے تک پہنچ نہیں پاتے۔ صوفی ایک منطقی مغالطے کا شکار ہوتا ہے۔ اپنے روحانی تجربے کی بنا پر وہ یہ تو کہہ سکتا ہے کہ " میں خدا میں یقین رکھتا ہوں " یہاں اُسے خود کو مطمئن کرنے کی خاطر کسی تصدیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جب وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ " میں یقین رکھتا ہوں کہ خدا موجود ہے " تو یہ دعویٰ منطقی طور پر پہلے دعویٰ سے قطعی مختلف ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے تصدیق کی حاجت بھی ہوتی ہے۔ تاہم اُس کی کوئی تصدیق ممکن نہیں۔

پروفیسر خواجہ غلام صادق نے اس نظریے کی تردید کرتے ہوئے مذہبی تجربے کے ابلاغ کی نفی کی ہے اس کا دائرہ کار محض بیانیہ جملوں تک محدود ہے۔ لہٰذا مذہبی جملوں کو اس بنا پر رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتے۔ مذہب کی زبان بُعدِ کثیر کی زبان ہے اور اُس کے بامعنی ہونے کے معیار بھی مختلف ہیں اس لئے مذہبی تجربے کے لئے پروفیسر غلام صادق اپنے نظریے کا استدلال کرتے ہوئے اور منطق بیان کرتے ہوئے اصرار کرتے ہیں حسی ادراک کی مانند شہادت طلب نہیں کی جا سکتی۔ پروفیسر خواجہ غلام صادق اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ ہر قسم کے ادراک کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ صوفی بھی اپنے تئیں مشاہدۂ حق کے لئے تیار کرتا ہے اور مرشد کی رہنمائی میں تجلی ذات کے لئے صیقلِ آئینۂ دل کا عمل مسلسل کرتا ہے اگر صوفیائے کرام کے بیانات میں مکمل مطابقت نہیں پائی جاتی تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے اُن کے بیانات کو رد کر دیا جائے۔

مذہبی ابلاغ کے امکان کو تسلیم کرنے کے باوجود پروفیسر خواجہ غلام صادق مذہبی

تجربات کی صداقت کو پرکھنے کے لئے کسی معیار کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں اسی مسئلے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے نتائجیتی نقطۂ نظر کی تائید کی تھی اور کہا تھا کہ مذہبی تجربے کے سماجی اور تاریخی اثرات اس کی صداقت پرکھنے پر زور دیتے ہیں چنانچہ مذہبی تجربات کی صداقت کا تعین کرنے کی خاطر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ مختلف مذہبی مشاہدات کس حد تک ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ یہ عمل اُن کی بالواسطہ توثیق پر دلالت کرے گا۔ اگر بیشتر مذہبی مشاہدات ذات و صفات باری تعالیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو یہ اُن کی صداقت اور وثوق کے حق میں ایک کارگر دلیل ہوگی۔

مذہبی تجربے کے ابلاغ کے امکان اور اُس کے قابل تصدیق ہونے کے بارے میں پروفیسر خواجہ غلام صادق کا یہ نظریہ فلسفیانہ اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے یہ نہ صرف مذہب پر منطقی ایجابیت اور لسانیاتی فلسفے کے حملے کو روک دیتا ہے۔ جو صدی رواں میں مذہب پر سب سے خطرناک فلسفیانہ حملہ ہے۔ بلکہ مذہبی فکر کی جدید تشکیل کے لئے مابعد الطبیعیاتی اساس بھی فراہم کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اُسے علامہ اقبال کے نظریہ خودی کے بعد برصغیر کے جدید مسلم فلسفیانہ فکر کا اہم ترین حاصل قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔

بچوں کا ادب نمبر

ماہِ نو نے علامہ اقبال نمبر، ابنِ انشا نمبر، صوفی تبسم نمبر، محمد حسن عسکری نمبر، جیسے یکتا شماروں کے بعد اب "بچوں کا ادب نمبر" شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

بچوں کا ادب نمبر — ادبی دستاویز اور بچوں کے ماں کے سلسلے میں ایک سنگِ میل ہوگا۔

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر بک کرالیں کہ تعلیمی اداروں میں اس نمبر کی بڑی مانگ ہے۔

نومبر کا ماہِ نو۔ بچوں کا ادب نمبر ہوگا۔

شمیم احمد

ادب کی عدالتِ عالیہ میں ریفرنس

تمہید! فدوی نے ادب کی عدالتِ خفیفہ میں پاکستان کی موجودہ شاعری کی شناخت کا تعین کرنے کے لئے ایک مقدمہ درج کرایا تھا۔ جس کی تمام تفصیل ماہِ نو کے اپریل ۱۹۷۹ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ چونکہ مقدمہ دائر کئے ہوئے تین ماہ گزر چکے ہیں۔ اور ہنوز کسی نے میرے دعوے کے سلسلے میں جوابِ دعویٰ داخل نہیں کیا ہے۔ اس لئے فدوی کو بجا طور پر اس کا حق حاصل ہے کہ ایوانِ ادب مندرجۂ ذیل حقائق تسلیم کرلے

(الف) ہماری شاعری اپنی شناخت سے محروم ہو چکی ہے۔

(ب) اس نے پاکستان کے دستور کی قومی شناخت کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔

(ج) اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ پاکستان کی خود مختار ریاست کی حدود میں اپنے غلط اور قوم و تہذیب کش عمل کو مزید جاری رکھ سکے۔

ہرگاہ فدوی کو حق حاصل ہے کہ ادب کی عدالتِ عالیہ میں یہ دعویٰ داخل کرے کہ مندرجۂ بالا حقائق کی بنیاد پر قانون کے اساسی اصولوں کا تعین کرے اور فیصلہ دے کہ فدوی کی اس درخواست کو قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔

ہرگاہ کہ عدالتِ عالیہ کے حتمی فیصلے اور قانون سازی میں بنیادی خطوط کے تعین کیلئے عدالتِ خفیفہ میں پیش کئے ہوئے دلائل کو بطور تمہید شامل کیا جائے گا۔ چونکہ مقدمہ اب عدالتِ عالیہ کے سامنے ہے لہٰذا فدوی بنیادی نکات کے علاوہ وہ تمام ممکنہ پہلو بھی سامنے لانا چاہتا ہے۔ جو جوابِ دعویٰ کی بنیاد بن سکتے تھے۔ مگر جن کو پیش کرنے کی جرأت کسی کو نہ ہو سکی۔ فدوی حصولِ انصاف کا پورا حق چاہتا ہے۔ لہٰذا مزید دلائل پیش کرتا ہے۔

بنیادی اختلافی نکات

۱۔ شاعری بنیادی طور پر نفسِ انسانی سے متعلق ہے۔ اور نفسِ آدمیت کی طرح نفسِ شاعری بھی انسان کا بنیادی جوہر ہے۔ اس لئے وہ آدم کی طرح ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔

چنانچہ (الف) شاعری کا موضوع بنیادی طور پر نفسِ انسانی ہے۔ جو ایک عالمی وحدت ہے (ب) شاعری باوجود زبانوں تہذیبی تناظر اور جغرافیائی اختلافات اور تضادات کے بحیثیت مجموعی ایک کُل سے وابستہ ہے اور یہ کُل انسان ہے۔

(ج) شاعری چونکہ اکتسابی چیز نہیں بلکہ اس کا تعلق انسان کے ایسے جوہر سے ہے جو مشترک نہیں۔ اس لئے جوہرِ قابل کسی خاص ماحول یا قومیت سے مخصوص نہیں اور ہر شاعر انسانیت کے مشترک پیمانے پر صرف انسانیت یا آدمیت کا ترجمان ہے

۲۔ شاعری کے ساتھ انسانیت اور آدمیت کا اصل موضوع تہذیبِ آدمیت ہے۔ جو ایک اکائی اور کُل کی صورت میں تہذیب کا بنیادی جوہر ہے اور یہی انسانیت کا مشترک تہذیبی ورثہ ہے۔ لہٰذا دنیا کی تمام تہذیبیں ایک کل کی صورت میں نوعِ انسانی کے مشترک سرمائے کی امین ہیں۔ چنانچہ شاعری کی طرح تہذیب بھی ایک

بین الاقوامی مرکزیت رکھتی ہے۔ یہ مرکزیت انسان ہے۔ جو رنگ و نسل کے فرق کے باوجود بحیثیت ایک نوع ساری دنیا میں مشترک ہے۔ چنانچہ

(الف) جب وسائل کی ترقی کی وجہ سے فاصلے سمٹ کر ہر آدمی کے لئے گھر آنگن بن گئے ہیں۔ تو انسان کی مرکزیت قائم ہو رہی ہے۔ اور ایک بین الاقوامی برادری قائم ہو رہی ہے جو مشترک مسائل اور مشترک وسائل سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہی ہے اور یہی انسانیت اور شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔

(ب) انسان کا سفر جن مراحل سے گزرا ہے۔ وہ تمام قیود اور حدود سے گزر کر ایک مشترک انسانی معاشرے اور تہذیب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ اس کی تمام ذہنی اور تخلیقی کاوشیں ایک محض انسانی سرگرمی کو پیش کرتی ہیں تجرید کا فلسفہ اور نقطۂ نظر در اصل اسی چیز کا نام ہے۔ جو نام، رنگ، نسل سے گزر کر ایک بے نام مگر اجتماعی اور مشترک انسانی ورثہ تک پہنچتا ہے۔ اور صرف نفسِ انسانی کو انسان کی تلاش کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

چنانچہ آج جب تمام دنیا اپنے وسائل اور فکر کی بنیاد پر ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہی ہے۔ تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعری جو فریضہ ابتدا سے انجام دے رہی تھی۔ وہی تمام دنیا میں انسانی اقدار اور ورثہ کا واحد نصب العین تھا۔ جس کی طرف آج تک ہم سفر کرتے رہے ہیں۔ موجودہ شاعری اسی معیار پر پرکھی جا سکتی ہے۔ جو تمام حدود اور قیود کو توڑ کر وحدتِ انسانیت کا وسیلہ بنی ہوئی ہے۔

بنیادی نکات کی وضاحت

مندرجہ بالا نکات بغیر کم و کاست پیش کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ شاعری کی بنیادی تعریفات اِن نکات کے بغیر نامکمل رہتیں۔ مگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ تمام نکات ایک بہت بڑے مغالطہ پر قائم ہیں۔ جس کو پرکھنا ضروری ہے۔

۱۔ وحدتِ انسانیت کا پیغام کوئی موجودہ عہد کی دریافت نہیں ہے بلکہ میلادِ آدم کے تصور سے آج تک تمام انقلاب انگیز تصورات تحریکات، مذاہب اور مکاتیبِ فکر ایک ہی پیغام کو پیش کرتے رہے ہیں کہ انسان بحیثیت نوع ایک کُل ہے۔ لیکن کیا ہم یہ پوری سچائی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم زیادہ بہتر حالات میں ہیں جبکہ ان تمام دعوؤں کے باوجود آج بھی دنیا رنگ و نسل کے امتیازات میں گرفتار ہے آج بھی انسان فکری اور نظری گروہوں میں تقسیم ہے۔ آج بھی انسان کی تکالیف اور درد مشترک ہیں۔ آج بھی وہ طبقاتی مفادات کا شکار ہے۔ آج بھی ان کے درمیان جنگ و جدال کا معرکہ درپیش ہے۔ اور پہلے سے بہت بڑے پیمانے پر انسانوں کی تباہی اور قتل کا سلسلہ جاری ہے۔ لہٰذا ان دعوؤں کی اصلیت میں کوئی ایسا فرق نہیں پڑا ہے جسے ہم موجودہ زمانے کی فتوحات خیال کریں۔ وسائل کی ترقی کے معنی انسانیت کی ترقی نہیں خیال کئے جا سکتے۔

۲۔ مشترک انسانی تہذیب اور ایک بین الاقوامی برادری کا تصور عملاً آج بھی بے معنی ہے کیونکہ بین الاقوامیت کے معنی بے رنگ بے خد و خال ہو جانا نہیں ہے۔ بلکہ ہر خطے، ہر نسل، ہر ملک اور ہر قوم کی شناخت اور پہچان کے بغیر وحدتِ انسانیت کا ہر تصور بے زمین، بے جڑ اور بے اسم ہو جاتا ہے۔ بین الاقوامی برادری میں ہر تہذیب اور ہر قوم اپنی پہچان اور شناخت کی بنیاد پر کھڑی ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ ایک گلدستہ کی مانند ہے۔ جس کا ہر پھول اپنی رنگت اور اپنی خوشبو کی بنا پر محسوس کیا جاتا ہے نہ کہ اپنی بے رنگی اور بے خوشبو وجود کی بنا پر؟

۳۔ شاعری کا بنیادی موضوع مشترک انسانی عوامل اور محرکات ہیں مگر وہ شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ جو اپنے معاشرے

اور ماحول کی روح کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو۔ یہ ایک سطح پر تمام انسانیت کی روح اپنے اندر رکھتی ہے۔ مگر دوسری سطح پر لازمی طور سے وہ اپنی شناخت اور پہچان سے اس کا وسیلہ بنتی ہے۔ اسی لئے دنیا کے تمام بڑے شاعر اپنی تہذیبی اور قومی اکائی کی نمایاں خصوصیات کی بنا پر عظیم بنتے ہیں۔ چنانچہ شکسپیئر، دانتے گوئٹے، ملٹن، حافظ، سعدی، کالیداس میر، غالب اور اقبال کی شاعری اپنی بنیادی تہذیب کے حوالے سے شناخت کی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت آپ کو جن چیزوں سے ملتا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

(الف) اگر ان شاعروں کا صرف ترجمہ کر دیا جائے تو وہ اپنے خیالات اور مشترک انسانی محسوسات کے باوجود اپنی عظمت کو کھو دیں گے۔ کیونکہ ان شعراء کی اپنی زبانوں اور ادبیات میں عظمت ان کے طرزِ احساس فنی گہرائی اور تہذیبی تناظر کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ اسی لئے گوئٹے کی جگہ جرمنی میں میر کی پیدائش اور شیکسپیئر کی پیدائش برِصغیر میں ہونا ممکن نہیں تھی۔

(ب) ہر بڑی شاعری اپنے وسیع انسانی تناظر کی بنیاد پر عظیم ہوتی ہے۔ مگر یہ عظمت اس کی اتنی ہی اپنی انفرادیت کی بنا پر بھی قائم ہوتی ہے جو اس کے اپنے وجود کی معنویت سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا ہر بڑی شاعری کا بنیادی طور پر پہلے اس تعریف پر پورا اترنا ضروری ہے۔ جس کا ذکر عدالتِ خفیفہ کے سامنے دائر کردہ مقدمہ میں موجود ہے پھر وہ عظمت کے انسانی معیار پر اپنا کوئی مقام حاصل کر سکے گی۔

(ج) یہ اسی طرح لازم و ملزوم ہے۔ جس طرح اگر کوئی چاہے کہ صرف عظیم شاعری تخلیق کر سکے تو نہیں کر سکتا کیونکہ

(الف) عظیم شاعری کی تمام تعریفات اور خصوصیات پر شعر کہنے کے باوجود عظیم شاعری تو چھوڑ دیجئے اس کا شاعری ہونا بھی معرضِ خطر میں رہتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق خالص انسان کے انفرادی جوہر سے ہے۔

(ب) عظیم شاعری کی تمام خصوصیات کو گنوانے کے باوجود یہ معلوم کرنا انتہائی دشوار مسئلہ ہے کہ شاعری کی وہ کون سی صفات ہیں جو اسے عظمت عطا کرتی ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ذوق، مومن اور غالب جیسے شاعروں کی بیک وقت ایک دور میں موجودگی کے باوجود غالب کی عظمت کا پیمانہ شعوری طور پر نہیں بنایا جا سکتا تھا بلکہ یہ غالب کے خالص انفرادی جوہر کی مرہونِ منت ہے جس کا اندازہ اس دور میں ممکن بھی نہیں تھا۔

(ج) شاعری کا یہ انفرادی جوہر اپنی شناخت اور پہچان کے بغیر، اپنی زمین، اپنے بیج کے بغیر صرف بین الاقوامیت اور انسانیت کے پیمانے پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ ہماری شاعری ہماری بنیادی تہذیبی روح کا مظہر ہو۔ اس کی شناخت اسی وقت ممکن ہے۔ جب وہ اپنی اجتماعی خصوصیات کی حامل ہوگی۔

(د) شاعری کا معاملہ فرد کی طرح ہونے سے ہے۔ میں موجود ہوں۔ اس لئے ہوں اور کائنات میرے لئے با معنی ہے۔ ورنہ اس کا وجود و عدم میرے لئے بے معنی رہتا۔

موجودہ صورتِ حال

ان دلائل کے بعد مجھے عدالت عالیہ کی توجہ اس طرف دلانی ہے کہ چونکہ موجودہ شاعری اور اس کا ہر پیمانہ اپنی بنیادی تہذیبی روح اپنی زمین اپنے اجتماعی شعور اور قومی وجود کے شعور سے اپنا رشتہ کاٹ کر مغربی تہذیب اور اس کے شعور سے اپنی پہچان مقرر کرتا ہے۔ اس لئے وہ اس پیمانے پر ایک متاعِ غیر ہے۔ ایک اکاس بیل ہے۔ جس کی جڑیں اپنی زمین اور اپنے وجود میں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ایسی شاعری نہ کبھی عظمت حاصل کر سکتی ہے۔ نہ اپنے وجود کی گواہی دے سکتی ہے۔ اور نہ خود کو شناخت کرا سکتی ہے۔ وہ ایک احساسِ کمتری، مغرب سے مرعوبیت اور اپنے وجود سے حقارت میں مبتلا مہلک عارضہ ہے۔ جو ایک روز اپنے وجود کو تحلیل کر

دے گی - اور یہ اصل ہو جائے گی - بالآخر اسی طرح جس طرح تہذیبیں اور قومیں مردہ ہوتی رہی ہیں - چنانچہ ہماری شاعری اسی فنا کی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے -

ہرگاہ

میں اس کو اپنی قوم، اپنی تہذیب اور اپنے ادبیات کے خلاف ایک سازش قرار دیتا ہوں اور دستورِ پاکستان کی رو سے یہ عمل ہر اس غداری اور ملک فروشی کے ذیل میں آتا ہے - جو سیاسی طور پر قابلِ تعزیر قرار دیا جاتا ہے - لہٰذا عدالتِ عالیہ سے التماس ہے کہ وہ اس مسئلہ پر اپنا ریفرنس دے - اور اس ذہنیت کو ملک اور قوم کے لئے مہلک قرار دیتے ہوئے ایسی قانون سازی کرے - جس کی رو سے پاکستانی ادبیات کے ہر ذی شعور اور محبِ وطن فرد کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ اس سازش اور ذہنیت کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر کے اپنی قومی اور تہذیبی زندگی کی سلامتی کو محفوظ کر سکے -

مسعود قریشی

مقبول عامر

ایوب صابر

پشتو کے درویش شاعر

رحمان بابا کے ادبی مقام کے بارے میں اختلاف رائے موجود ہے۔ قاضی میر احمد شاہ رضوانی، خوشحال خان خٹک کو پشتون شاعروں کا بادشاہ کہتے ہیں۔ ایک انگریز مستشرق الفنسٹن کے نزدیک بھی خوشحال خان خٹک کا مقام رحمان بابا سے بہت اونچا ہے۔ اسی طرح ایک اور مستشرق راورٹی بھی خوشحال خان خٹک کو پشتون شاعروں میں سب سے اونچا سمجھتے ہیں۔

البتہ جدید دور کے پشتون شعراء، ناقدین اور محققین رحمان بابا کے مقام کے بارے میں دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ اس قدر قدامت پسند ہے کہ خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے موازنے کے بارے میں سوچنا بھی گناہ تصور کرتا ہے جبکہ دوسرا گروہ مقابلتاً روشن خیال ہے۔ اور قاضی میر احمد شاہ رضوانی، الفنسٹن اور راورٹی کا ہمنوا ہے۔ یہ دوسرا گروہ خوشحال خان خٹک کو پشتو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہے۔ لیکن جہاں تک شہرت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ رحمان بابا اپنے زمانے سے لے کر اب تک پشتو کے سب سے زیادہ مقبول شاعر ہیں اور ان تمام علاقوں میں جہاں پشتون بستے ہیں، ایسے گھرانے خال خال ہوں گے جن میں دو کتابیں نہ ملتی ہوں۔ ایک قرآن پاک اور دوسری دیوان رحمان بابا۔

یہ میرے اپنے مشاہدے کی بات ہے کہ اکثر پشتون خواتین ناخواندہ ہونے کے باوجود جہاں گھروں میں قرآن پاک کی تلاوت کرتی ہیں، وہاں رحمان بابا کا دیوان بھی پڑھتی ہیں۔ اور ان کو رحمان بابا کے وہ اشعار ازبر ہیں۔ جو پشتو میں ضرب الامثال بن گئے ہیں اور بول چال میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ رحمان بابا کے دیوان سے فال نکالنا بھی پشتون خواتین کا ایک ایسا مشغلہ ہے، جس پر رحمان بابا سے ان کی عقیدت کی چھاپ بہت گہری ہے۔ صرف پشتون خواتین پر ہی موقوف نہیں ہے۔ رحمان بابا کے دیوان سے فالیں پشتون مشاہیر بھی نکالتے رہے ہیں۔ "پٹہ خزانہ" (سربستہ خزانہ) کے مؤلف آقائے عبدالحئی حبیبی کے بیان کے مطابق جب افغان سردار میرویس خان نے ۱۱۱۹ء ہجری کے اواخر میں ایرانیوں سے قندھار چھینا، تو حملہ کرنے سے ایک ماہ قبل دیوان رحمان بابا سے فال نکالی۔ جس میں ان کو صبر کی تلقین کی گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے حملہ ملتوی کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد دوسری بار فال نکالی، تو ان کو حملہ کرنے کی ترغیب دی گئی۔ اور انہوں نے فوج کشی کر کے ایرانیوں سے قندھار چھین لیا۔ میں یہاں یہ اعتراف کر کے اپنی ضعیف الاعتقادی کا ثبوت بہم پہنچانا نہیں چاہتا کہ رحمان بابا کے دیوان سے صحیح فالیں بھی نکالی جا سکتی ہیں، بلکہ میں نے تو یہ حکایت محض اس لئے بیان کی ہے کہ اس سے رحمان بابا کی شہرت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ لگتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ رحمان بابا کے وصال کے بعد جو شہرت پشتون عوام میں رحمان بابا کو ملی ہے، وہ اب تک پشتو کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی بلکہ ہمارے بعض محققین نے تو رحمان بابا کو پشتو کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ اور ان محققین میں قاضی میر احمد شاہ رضوانی بھی اس حد تک تو شامل ہیں کہ وہ جہاں خوشحال خان خٹک کو پشتون شاعروں کا بادشاہ مانتے ہیں، وہاں رحمان بابا کو بھی پشتو کے بہترین شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ معز اللہ مومند، عظیم رانی زئی، بارھویں صدی ہجری کے ایک مشہور اور بڑے شاعر پیر محمد کاکڑ، تیرھویں صدی ہجری کے ایک شاعر مرزا خان اور شمس الدین کاکڑ وغیرہ نے رحمان بابا کو جن الفاظ میں خراج تحسین

پیش کیا ہے۔ ان سے رحمان بابا کی مقبولیت کا
انداز بخوبی لگتا ہے۔

معز اللہ مومند اپنے ایک شعر میں رحمان بابا کی
عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں؟

(اے معز اللہ! پشتونوں کے علاقے کے تمام
شاعروں میں سے عبدالرحمان منتخب ہے)

پیر محمد کاکڑ فرماتے ہیں کہ

(معلوم ہوتا ہے کہ شعر گوئی میں رحمان غیب اللسان
ہے کیونکہ اس کے شعر کا مثیل کسی بھی انسان کا شعر
نہیں ہے۔)

شمس الدین کاکڑ نے تو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے
کہ شعر گوئی میں رحمان بابا کے مقام کو کوئی بھی نہیں
پہنچا۔ ملاحظہ ہو؟

(چاہے افغان شعر گوئی کی کتنی ہی ہوس کریں،
رحمان کے مقام کو نہیں چھو سکتے)

خوشحال خان خٹک کے ذہین فرزند اشرف خان
ہجری نے بھی، جن کی خداداد صلاحیت کی داد خود
خوشحال خان خٹک نے اپنے کئی اشعار میں دی
ہے۔ رحمان بابا کی عظمت کو یوں تسلیم کیا ہے کہ

(گفتۂ رحمان پر راستہ زنی کی گنجائش باقی نہیں
رہی، جب میں نے اس کے شعر کو منتخب کر لیا، تو
تو معتبر ہوگیا)

یہ ویسی ہی سند ہے، جیسی اردو کے عظیم شاعر
میر تقی میر کے بارے میں یہ سند ہے کہ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

جہاں ہر اچھے شاعر کے بارے میں اس کے ہم عصر
اور اس کے بعد آنے والے شعراء طعنہ زنی کرتے
ہیں، وہاں ہر شاعر اپنے بارے میں خود بھی اظہار خیال
کرتا ہے۔ اس نکتے سے رحمان بابا بھی مستثنیٰ نہیں
ہیں۔ انہوں نے اگر ایک طرف اپنے بارے میں اس
حسنِ ظن کا اظہار کیا ہے:۔

(خوشحال خان اور دوست خان میرے غلام ہیں
میں رحمان پشتو زبان کا عالمگیر ہوں)

تو دوسری طرف اپنی مقبولیت ان اشعار سے
بھی واضح کی ہے:۔

(پشاور کی دوشیزائیں رحمان کے نغمے الاپتی بھی
ہیں، ان پر رقص بھی کرتی ہیں اور اُن سے حظ بھی
اٹھاتی ہیں)

(رحمان کی بیاض میں اشعار یوں زیب دیتے ہیں
جیسے خوبرویوں کے رخساروں پر زلفیں)

(کوئی لعل و گوہر کو ترازو میں نہیں تولتا، رحمان
کے اشعار گوہر ہیں، اُن کو کیوں تولتے ہو)

(ہر وہ کلام جو رحمان کے منہ سے نکلے، یا تو
شہد ہوگا، یا قند ہوگا یا نبات ہوگا)

(غزل میں تو دو اشعار انتخاب ہوتے ہیں،
رحمان کی تمام غزل انتخاب ہے)

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے۔ اس میں
تو اختلاف ہو سکتا ہے کہ پشتو کا سب سے بڑا شاعر
کون ہے۔ مگر اس امر پر شرق و غرب کے پشتو کے
تمام عالم، ناقدین، محققین اور طلباء متفق ہیں کہ رحمان بابا
اپنے زمانے سے لے کر اب تک پشتو کے سب سے
مقبول اور ہر دلعزیز شاعر ہیں۔ نامناسب نہ ہوگا
کہ اس دعوے کی تائید میں یہاں مشرق و مغرب کے
چند ناقدین کی آراء پیش کر دی جائیں۔

مولانا عبدالمجید افغانی دیوان رحمان بابا کے مقدمہ
میں رقمطراز ہیں:۔

"رحمان بابا کی شاعری معمولی انسانی جذبات
کا اظہار نہیں ہے۔ بلکہ ان کی بیاض میں ٹوٹے
ہوئے دلوں کے ٹکڑے یا خون جگر کے قطرے
بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں ہر خیال کے
آدمی کے لئے دلچسپی کا سامان اور ہر ناسمجھ
کے لئے الماس کے ریزے پائے جاتے
ہیں۔ عبدالرحمن کی غزلوں کو پشتو رباعی کہتے
ہیں۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ پشتونوں کے
علاقے میں کوئی مرد یا عورت ایسی پیدا
ہوگی، جو رحمن بابا کو نہ پہچانتی ہوگی"۔

عبدالرحمن بینوا رحمان بابا کے دیوان پران کے
کلام کی مقبولیت کے بارے میں یوں تبصرہ کرتے
ہیں:۔

"رحمان بابا کے اشعار کی ایک بڑی عزت
یہ ہے کہ ان کے مطالب ہر ذوق کی پذیرائی
کرتے ہیں اور تنہائی میں ہر ایک کے ساتھی ہیں
پشتونوں میں ایسے گھرانے کم ہوں گے، جن میں
رحمان بابا کا دیوان نہ ہو۔

موجودہ دور کے ایک بڑے پشتون محقق عبدالحئی
حبیبی نے بھی یہ کہہ کر رحمان بابا کی مقبولیت کی نقاب کشائی
کی ہے:۔

"رحمان بابا کے اشعار بہت سادہ سلیس اور
رواں ہیں اور اشعار کے مضامین عموماً
عشقیہ، اخلاقی، دینی اور معاشرتی ہوتے
ہیں۔ اور ان میں تصوف کا ایک بہت

بڑا حصہ بھی موجود ہے۔ پشتونوں میں اس دیوان کو جو غیر معمولی شہرت حاصل ہے، وہ کسی دوسرے شاعر کے دیوان کو نصیب نہیں ہوئی۔ رحمان بابا کے دیوان کو پشتونوں کے ہر طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر طبقہ اس کا عقیدت مند ہے اور تمام پشتون ان کے شعر کے عاشق ہیں۔"

افغنستن کے بارے میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ان کے نزدیک خوشحال خان خٹک، رحمان بابا سے بہت اونچے شاعر ہیں، مگر رحمان بابا کی ہر دلعزیزی کے وہ بھی قائل ہیں۔ اور اپنی ایک کتاب "این اکاؤنٹ آف دی کنگڈم آف کابل" میں "پشتو زبان و ادب" کے عنوان کے تحت ایک باب میں کہتے ہیں:۔

"سب سے زیادہ ہر دلعزیز شاعر رحمان ہے۔ جن کی تخلیقات ایسی غزلوں پر مشتمل ہیں۔ جو ہو بہو ایرانیوں کی غزلوں کی طرح ہیں۔"

اسی طرح راورٹی بھی جہاں خوشحال خان خٹک کی عظمت کا پرچار کرتے ہیں، وہاں رحمان بابا کی مقبولیت کا اقرار یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ

"جہاں پشتو زبان بولی جاتی ہے وہاں رحمان بابا کے اشعار بھی پڑھے جاتے ہیں۔"

رحمان بابا کو پشتو کا سب سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز شاعر ثابت کرنے کے ضمن میں مستشرقین و ناقدین کی جو آراء اوپر پیش کی گئی ہیں، اگر ان میں قاضی میر احمد شاہ رضوانی کے یہ اشعار بھی شامل کر دیئے جائیں تو بات کسی حد تک مکمل ہو جائے گی:۔

دیوں لگتا ہے کہ شیراز کے خواجہ حافظ کو پشتون عوام میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ چاہے صوفی تھا، محتسب تھا یا قاضی تھا، میرے سوا اس نے سب کو سر میدان رقص کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

یہاں قاضی میر احمد شاہ رضوانی نے اپنے آپ کو ان لوگوں سے خارج کیا ہوا ہے، جو رحمان بابا کے اشعار سن کر عالم مستی میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ مگر ان کے اشعار کے بین السطور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کا رقص وہ خود بھی فرماتے رہے ہوں گے۔ پشتو اکیڈیمی کے بانی ڈائرکٹر اور پشتو زبان و ادب کے بہت بڑے عالم مولانا عبدالقادر مرحوم بھی رحمان بابا کے عقیدتمندوں میں شامل تھے۔ اپنے ایک مقدمہ میں وہ رحمان بابا کی شہرت اور ہر دلعزیزی کا اعتراف یوں کرتے ہیں:۔

"پشتو شاعری کی تاریخ میں رحمان بابا سے زیادہ شہرت اور ہر دلعزیزی آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی، ملک کے مرد و زن چھوٹے بڑے، عالم و جاہل، مختصر یہ کہ ہر کس و ناکس رحمان بابا کا نام جانتا ہے، ان کی پوری رباعی نہ سہی، ایک آدھ شعر اسے ضرور یاد ہوتا ہے۔ ہر محفل ان کے کلام سے منور ہوتی ہے۔ قوم کی زندگی کی ہر کیفیت کسی نہ کسی پیرائے میں ان کے کلام میں موجود ہوتی ہے۔ کتنے ہی مصرعے ضرب الامثال بن کر زبان زد خلائق ہیں۔"

یہ تو ہوئیں رحمان بابا کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے حوالے سے چند باتیں، اب آیئے ان کی درویشی اور قلندری کی طرف، اس ضمن میں سب سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ پشتون بحیثیت القوم مسلمان ہیں اور ان کی مذہب پرستی کی انتہا یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے سیاسی رہنماؤں بلکہ اپنے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو بھی مذہب ہی کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ محبت اس سیاسی رہنما، سماجی کارکن، شاعر، ادیب اور دانشور سے کرتے ہیں، جو مذہب پرستی کے ضمن میں ان کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس کسوٹی پر اگر رحمان بابا کو پرکھا جائے، تو وہ پرانے اور نئے تمام شاعروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور یہ رتبۂ بلند ان کو ان کی درویشی اور قلندری نے ہی عطا کیا ہے۔

جب ہم رحمن بابا کو درویش کہتے ہیں۔ تو اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوال ابھر آتا ہے کہ وہ کس قسم کے درویش تھے؟ پھر جب ہم ان کے دیوان کا مطالعہ کرتے ہیں، تو اس سوال کا جواب ان کے اشعار سے ہی مل جاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

(اگر کوئی قلندر سچے دل سے قلندری کو شعار بنا لے، تو خان، سلطان اور قلندر تینوں ایک ہیں)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

(ہر منعم جو قلندر کی دلجوئی کرتا ہے، قلندر ہے نہ کہ وہ قلندر جس کی دلجوئی کی جاتی ہے)

ان دو اشعار سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ درویشی اور قلندری کے بارے میں رحمان بابا کا تصور کیا تھا۔ یا پھر اس تصور کو حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے یوں ظاہر کیا ہے کہ:

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

علامہ اقبال اور رحمان بابا کے افکار کی رو سے

درویش وہ نہیں، جو بے عمل ہے۔ بھیک مانگتا ہے۔ گلے میں کشکول لٹکائے پھرتا ہے اور بات کو کسی خانقاہ یا درگاہ میں پڑا رہتا ہے، بلکہ حقیقی درویش وہ ہے۔ جو درد کی دولت لٹاتا ہے اور خلقِ خدا میں زر و جواہر تقسیم کرتا ہے۔ رحمان بابا نے جو شعر کہے ہیں، وہ زر و جواہر ہی تو ہیں، جو مخلوقِ خدا میں اب تک تقسیم ہو رہے ہیں۔

رحمان بابا کے عقیدتمندوں کے نزدیک رحمان بابا کے محبوب سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مجازی عشق کے ڈانڈے بھی لوگ حقیقی عشق سے ملاتے ہیں۔ ویسے صوفیاء کے نزدیک بھی مجاز ایک پل ہے، جس سے گزر کر انسان حقیقت تک پہنچتا ہے۔ رحمان بابا کے دیوان کے مطالعے سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ منزل انہوں نے طے کر لی تھی۔ اور حقیقی عشق کی روح کو پا لیا تھا، ورنہ یہ مراحت کیوں کرتے۔

(رحمان پر حلال عشق اترا ہے۔ حلال چیزیں ہمیشہ قابلِ احترام ہوتی ہیں۔)

رحمان بابا کا زمانہ مطلق الحکم بادشاہوں کا زمانہ تھا، لیکن ان کا دیوان بادشاہوں اور سرداروں کے قصائد سے پاک ہے۔ دنیاوی اعتبار سے عالی مرتبت لوگوں اور بادشاہوں سے ان کی کبھی بنی ہی نہیں۔ ان کا بس چلتا، تو شاہجہان اور اورنگ زیب جیسے اشراف کو منصور جیسے نداف پر قربان کر دیتے۔

(اورنگ زیب اور شاہجہان جیسے اشراف، منصور جیسے نداف کے صدقے جائیں)

رحمان بابا کے گاؤں "بہادر کلے" میں عزیز خان نامی ایک خان رہتا تھا۔ جس کے ساتھ ان کی نہ بن سکی، تو یہ کہہ کر "ہزار خوانی" میں جا بسے۔

(ملنگوں کی گزر اوقات خانوں کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ کہاں عزیز خان اور کہاں ملنگ عبدالرحمان)

رحمان بابا نے شاہجہان کا زمانہ بھی دیکھا اور اورنگ زیب کا زمانہ بھی، ان کا یہ شعر اورنگ زیب کے صوبیداروں کے ظلم کا ایک بھرپور عکس پیش کرتا ہے۔

(ظالم حکمرانوں کے سبب گھر، قبر اور پشاور تینوں ایک ہیں)

رحمان بابا نے قصیدہ نہ شاہجہان کا لکھا۔ نہ اورنگ زیب کا۔ سر نہ امیر خان خوانی کے دربار میں جھکایا، نہ مہابت خان یا کسی دوسرے مغل صوبیدار کے دربار میں البتہ درویشوں کی تعریف انہوں نے کئی اشعار میں کی ہے، اور اپنی اس غزل کو حاصلِ کلام کہا ہے۔ جس میں درویشوں کی شان بیان کی گئی ہے۔ غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں۔

(رحمان کا سارا دیوان اس ایک غزل کے قربان جائے، جس میں اس نے درویشوں کے کردار کا نقشہ کھینچا ہے)

اسی غزل کے ایک شعر میں رحمان بابا نے درویش کا مقام یوں متعین کیا ہے کہ

(ایک ہی جست میں عرش تک جا پہنچتے ہیں۔ میں درویشوں کی رفتار دیکھ چکا ہوں)

رحمان بابا کا زمانہ آج سے تین سو سال پہلے کا زمانہ ہے۔ اور اُن کے ساتھ لوگوں کی عقیدت کا آج بھی یہ عالم ہے کہ اُن کے مزار پر ہر سال دو روزہ عرس منعقد ہوتا ہے، جس کی چار نشستوں میں صوبہ سرحد کے دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے سینکڑوں شاعر، ادیب اور دانشور رحمان بابا کو خراجِ تحسین و عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو سوائے رحمان بابا کے پشتو کے کسی دیگر شاعر کو حاصل نہیں ہے۔ اگر رحمان بابا بھی دیگر بیشتر شعراء کی طرح دنیادار ہوتے اور درویشی کو اپنا شعار نہ بناتے، تو آج ان کا نام لینے والے بہت کم ہی ملتے۔ رحمان بابا کو معلوم تھا کہ زندگی میں اور موت کے بعد درویش کا مقام کیا ہوتا ہے۔ اور صوفیاء کے مزاروں پر کیسے کیسے میلے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس شعر کو ایک ایسی پیشین گوئی کا درجہ حاصل ہے۔ جو خود اُن کے مزار پر بھی صادق آتی ہے۔

(موت کے بعد اتنے لوگ ان کی زیارت کے لئے آتے ہیں کہ درویشوں کے مزار پر بازار لگ جاتا ہے)

رحمان بابا کی نظر میں درویشی ایک سدابہار منصب و مسلک ہے۔ فرماتے ہیں

(دنیا جہان کی ہر بہار کے لئے خزاں موجود ہے، لیکن درویشوں کی بہار خزاں سے ناآشنا ہے)

رحمان بابا ایک باعمل صوفی اور متوکل درویش تھے۔ اور اُن کے روحانی پیشوا سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے۔ جیسا کہ خود بتاتے ہیں۔

(عشق کی راہ پر رہبر کے بغیر چلنا مشکل ہے۔ یہاں ہر کسی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے لئے رہبر پیدا کرے)

گویا انہوں نے پہلے اپنے مرشدِ کامل کی رہبری میں رشد و ہدایت کی منزلیں طے کیں، پھر پیدا ہوئی

کیا کہ

(اگر کسی نے عاشق کی راہ گم کر دی ہو۔ تو میں
رحمان ایسے گرا ہوں کا رہنما ہوں)

یہ درست ہے کہ رحمان بابا فطرتاً درویش تھے
لیکن انہوں نے اپنے آپ کو فقیری میں بھی بادشاہ ہی
سمجھا اور اپنی فقیری کی آبرو بڑھانے کے لئے یہ نعرہ
لگایا:۔

(بادشاہی فقیروں کی دعا سے ملتی ہے۔ میں رحمان
اس لئے بادشاہ بن گیا ہوں کہ فقیر ہو گیا ہوں)

ایک چھوٹے سے مضمون میں رحمان باباؒ کی عظمت و
شان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ لہٰذا مناسب یہی ہے
کہ یہ کہہ کر بات ختم کر دی جائے کہ
"اگر عبدالرحمٰن بجنوری کے قول کے مطابق
ہندوستان کی مقدس کتابیں دو ہیں۔
ایک وید اور دوسری دیوانِ غالب، تو
پشتونوں کی مقدس کتابیں بھی دو ہیں۔ ایک
قرآن اور دوسری دیوانِ رحمان بابا"
اور اس دعویٰ کی تائید ماضی قریب کے ایک معانی
پیشوا حضرت عبدالغفور باباجی سوات کے اس قول
سے ہوتی ہے:۔
"اگر نماز میں قرآن کی آیتوں کے علاوہ کسی
دوسرے کلام کو پڑھنے کی اجازت ہوتی،
تو میں حضرت رحمان بابا کا منظوم کلام پڑھتا"
یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ سرحد کے
علمائے کرام اپنے خطبات میں رحمان بابا کا کلام
اکثر پڑھتے ہیں۔

شفیق سلیمی

علی شوکت خواجہ

مظفر عباس

اُردو میں سلام گوئی کی روایت

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصل کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
بھلا تردّدِ بیجا سے اس میں کیا حاصل
اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

میر انیسؔ کے سلام کے چند اشعار میں نے آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں اگر آپ کو اس بات کا علم نہ ہو کہ یہ میر انیسؔ کے سلام کے اشعار ہیں تو یقیناً آپ ان کو غزل کے اشعار ہی تصور کریں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل اور سلام میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں اصناف ایک ہی ہیئت رکھتی ہیں البتہ مضامین اور موضوعات مختلف ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے ان دونوں اصناف کے فرق کو بخوبی واضح کیا ہے، کہتے ہیں:

"اُردو شاعری کی اصل بنیاد غزل کی زمین پر قائم ہوئی اور اقسامِ سخن میں سے اسی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا، عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا، لیکن غزل کی لے اس قدر کانوں میں رچ چکی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا۔ اس بناء پر انہوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا۔ سلام کی بحریں وہی غزل کی ہوتی ہیں۔ غزل کی طرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرز شگفتہ اور تمیز، بندش سادہ اور صاف، مضمون درد انگیز اور پُر تاثیر ہو"[1]

سلام اور غزل کے موضوعات اور مضامین میں بُعدِ مشرقین ہے۔ امداد امام اثرؔ نے سلام کے موضوعات کا احاطہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم وارداتِ قلبیہ و معاملاتِ ذہنیہ باندھے ہیں مگر اُن میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے۔ سلام کی ترکیب کو رنگینی کے ساتھ بھی غزل سے علیحدہ ہونا چاہیئے۔ سلام گوئی کا لطف یہی ہے کہ شوخی رنگینی اور طبیعت داری کے ساتھ بھی غزل سرائی سے جدا نظر آتے ہوں۔ سلام میں واقعۂ کربلا و شہادت امیرالمومنینؑ و شہادت امام حسنؑ و مصائب خاتونِ جنت و رحلتِ حضرت رسالت مآب صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہم فی یوم القیام کے مضامین داخل رہتے ہیں۔ اور بھی دیگر امورِ الم انگیز و حسرت خیز جو خاندانِ پیغمبر خدا صلعم سے متعلق ہیں اندراج پاتے ہیں علاوہ اُن کے اخلاقی و تمدنی و مذہبی و دیگر امورِ جلیلہ جن سے شاعری کو زینت متصور ہے منظوم کئے جاتے ہیں"[2]

غزل اور سلام میں واضح فرق یہ ہے کہ سلام کی بنیادی جہت مذہب ہے جبکہ غزل "سخن گفتن با زنان" سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے مرثیہ نگاروں کے بارے میں لکھا ہے:

"اُردو کی ادبی دنیا غزل و قصیدہ کے نشہ میں چور تھی۔ ساری فضا میں حسن و عشق کی تصویر

---

[1] موازنۂ انیس و دبیر (مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور) ص: ۲۴۰ [2] کاشف الحقائق، جلد دوم (طبع لاہور ۱۹۵۶ء) ص: ۱۹۱

دکھائی دیتی تھی لیکن مرثیہ گویوں کا کمال تھا کہ ماحول سے متاثر ہوتے تھے مگر ایک دور اندیش و صاحبِ کمال فنکار کی حیثیت سے سماج و ادب کے محسوسات و دلچسپی کی جگہ مذہبی انداز سے مرثیہ میں نکال لیتے تھے۔ بہتے ہوئے دھارے کا رُخ دنیا سے عقبیٰ کی طرف پھیر دیتے تھے اور لطف یہ تھا کہ نہ زبان کی لطافت میں فرق آتا تھا اور نہ بیان کی دلکشی مجروح ہونے پاتی۔[3]

میری رائے یہ ہے کہ اگر مرثیے نے شاعری کے دھارے کا رُخ عقبیٰ کی طرف موڑا تو "سلام" وہ صنف ہے جس نے غزل کے دھارے کا رُخ دنیا سے عقبیٰ کی طرف پھیر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سلام ہی وہ واحد صنف ہے جو واقعاتِ کربلا کے مزاج کے عین مطابق ہے کیونکہ مرثیے کا انداز خطیبانہ ہوتا ہے اور اس کے لہجے کی گھن گرج امام حسینؑ کی شہادت اور مظلومیت سے پیدا ہونے والے حزن و ملال سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتی۔ اس کے برعکس سلام جو غزل کی ہیئت میں لکھے جاتے ہیں اور جس کا ہر شعر اپنی جگہ اکائی ہونے کے ساتھ ساتھ وحدتِ تاثر کی تشکیل بھی کرتا ہے، فضائل و مناقبِ اہلِ بیت اور شہدائے کربلا کی مظلومیت ہر دو موضوعات کو بڑے موثر انداز میں پیش کرنے پر قادر ہے۔ سلام کی دھیمی بحریں، مرثیے کے بلند آہنگ لہجے کے مقابلے میں بڑے متاثر کن انداز میں فضائل و مصائبِ اہلِ بیت پیش کرتی ہیں اور اس خاص حیثیت میں سلام کا مرتبہ مرثیے سے بڑھ جاتا ہے۔

اس تمہیدی بحث کو یہیں چھوڑتے ہوئے ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور اردو میں سلام گوئی کی روایت کو تلاش کرتے ہیں۔

اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات[4] میں کل پانچ مرثیے شامل ہیں۔ ان میں سے ایک مثنوی کی اور چار غزل کی ہیئت میں ہیں۔ ان مرثیوں میں ہیئت کے علاوہ مرثیے کے دیگر لوازم خطیبانہ لہجہ، گھن گرج، منظر نگاری رزم و بزم آرائی بھی موجود نہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں انہیں 'سلام' کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا قلی قطب کے ان سلاموں کو اردو مرثیے کا نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ 'سلام' کی صنف موجودہ معنوں میں مرثیے کی صنف کے آغاز سے پہلے موجود تھی۔ ان سلاموں ہی کی بنیاد پر بیلی نے محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا مرثیہ گو قرار دیا ہے۔ قلی قطب شاہ کے ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

محرم مہینے میں آیا اماماں کا سو غم پھر کر
زمین ہور آسماں میانے بھریا ہے تمام پھر کر
زمیں پر کیا بلا، کیا شور، کیا غوغا ہوا پیدا
یتا کہ دل میں دُکھ داد یتا نہ نکلے غم تھے دم پھر کر
اماماں تیں سورج جل جل ہوا ہے آگ کا شعلہ
جلایا ہے اپس کوں کُٹلے تمنے نیم پھر کر
مسلماناں تدیاں سارے بھر لوُ اپنا انجھواں تھے
کر آیا ہے اماماں کا بلا سر تھے ستم پھر کر[5]

ایک دوسرے سلام کے چند شعر:

ہور روتیاں ہیں بی بی فاطمہ اپنے حسیناں تیں
او لہو لال کا رنگ سات گگن اپر ال چھایا ہے
ظلم کیا ہور ہے آہ دنیا میں اونن پر
یتا ظلم و بلا سب فاطمہ خاطر ملایا ہے
خدایا قطب شہ کوں بخش تو حرمت اماماں کی
کہ اُن کی مدح کا صدقہ مرے کن میں سہایا ہے[6]

قلی قطب شاہ کے علاوہ دیگر دکنی شعرا وجہی غواصی، سیوا، لطیف، کاظم، شاہی، ہاشمی، اور نوری نے بھی مرثیے لکھے ہیں، دکنی دور کے اکثر مرثیے غزل کی ہیئت میں ہیں اور اس اعتبار سے سلام کی صنف کے قریب تر ہیں۔ دکن کے ایک معروف شاعر ولی دکنی۔ جنہیں ایک عرصے تک اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر سمجھا جاتا رہا ہے، کے ہاں بھی ایک نظم امام حسینؑ اور واقعاتِ کربلا کے بارے میں غزل کی ہیئت میں ملتی ہے اور میرے نزدیک یہ بھی ایک سلام ہے۔ ولی کے سلام کے اشعار دیکھئے:

جب سوں گئے وہ شہاں آہ دریغا دریغ
غم میں ہے دونوں جہاں آہ دریغا دریغ
جب سیں ہو نور العیان جگ سوں ہوئے ہیں نہاں
تب سوں پر غم ہے عیاں آہ دریغا دریغ
عابد و دیندار کوں واقفِ اسرار کوں
درد ہے آہ و فغاں، آہ دریغا دریغ
دین کے شہ پاک کوں صاحبِ ادراک کوں
دُکھ دئے دو مگر ہاں آہ دریغا دریغ

---

[3] مذہب و شاعری (طبع لاہور ۱۹۵۵ء) ص: ۲۸۰ [4] کلیات قلی قطب شاہ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مطبوعہ دکن (۱۹۴۰ء) [5] کلیات قطب شاہ، ص: ۱/۵۶ [6] کلیات قطب شاہ، ص

شاہ کے ماتم کا بار سب پہ ہوا ہشیار
تو ہوا غم آسماں آہ دریغا دریغ
دین کے گلزار میں گلشنِ اسرار میں
آئی کہاں سوز خواں آہ دریغا دریغ
غم میں قلق ہے مدام، شاہ کا کمتر غلام
نت کیا ورد زباں آہ دریغا دریغ

شمالی ہندوستان میں مرثیے کا آغاز اگرچہ سودا سے پہلے ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی ادبی و فنی حیثیت کا تعین نہیں ہوا تھا، سودا نے خود بھی مرثیے کہے اور مرثیے میں ادبیت و لطافت پیدا کرنے کی تحریک بھی شروع کی۔ میر و سودا کے زمانے سے مرثیے کی صنعت پر سنجیدگی سے توجہ دی جانے لگی۔ مرثیے کے لئے مسدس کی ہیئت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سودا کے کلیات[8] میں اکانوے مرثیے اور بارہ سلام موجود ہیں یہ سلام فن کے نادر نمونے ہیں اور شمالی ہندوستان میں سلام گوئی کی روایت کے نقشِ اوّل قرار دیئے جا سکتے ہیں سودا کے سلام کے چند اشعار سُنئے ؎

کہیں ہیں ساکنِ جنت بہ زیب و زین سلام
تری جناب میں یا حضرتِ حسینؑ سلام
علیؑ کے لختِ جگر اور نبیؐ کے نورِ نظر
ہمارا حضرتِ زہراؑ کے دل کے چین سلام
ہمیشہ مشرق و مغرب سے ماہ اور خورشید
رسوخِ دل سے کریں ہیں بہ زیب و زین سلام
امیدوار شفاعت کا تم سے ہے سودا
قبول ایک سے ہو اس کا تا بہ عین سلام

میر و سودا کے دور کے بعد بقول ڈاکٹر اعجاز حسین۔ "عرصۂ دراز کی ذہنی کاوشوں کے بعد میر ضمیر ایک بزرگ خضر صورت مل گئے جنہوں نے مرثیے کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیا، اور اتنی شد و مد کے ساتھ دنیائے ادب میں پیش کیا کہ اہلِ نظر کو ایک نئی چیز معلوم ہوئی۔ اس کے عنوانات قائم کئے مثلاً چہرہ، سراپا، رخصت آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین اور یہ مرثیے کے اجزائے ترکیبی ہو گئے، جس سے منظم ہو کر مرثیہ کو ہمیشہ سے زیادہ ادبی وقار حاصل ہوا۔"[9]

میر ضمیر نے نہ صرف فنی اعتبار سے مرثیے کو بلند کیا بلکہ اس کو منبر تک پہنچایا بقول شبلی۔

"اب سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے۔ اب تحت اللفظ کا بھی رواج ہوا اور غالباً پہلا شخص جس نے منبر پہ بیٹھ کر تحت اللفظ پڑھا میر ضمیر صاحب تھے۔"[10]

ضمیر نے مرثیے کے ساتھ نوحے اور سلام کی روایت کو بھی فنی طور پر مستحکم کیا۔ "مجموعۂ مرثیہ ضمیر" کی جلد اوّل میں ایک نوحہ اور گیارہ سلام موجود ہیں۔ ان سلاموں میں زورِ کلام، بندش، چستی اور صفائی کی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ایک سلام کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

مجرئی جس کو کہ سرور سے محبت ہوگی
وہ محبت تو کلیدِ درِ جنت ہوگی
جب میانِ مجرئی خاتونِ قیامت ہوگی
حشر میں حشر، قیامت میں قیامت ہوگی
رنگ اڑا جاتا تھا زینب کا شبِ عاشورا
تھا یہی خوف کہ اب صبحِ شہادت ہوگی
شہ نے عباس سے فرمایا شبِ عاشورا
پوچھو اعداء سے کہ اک رات کی مہلت ہوگی
صبح نزدیک جو پہنچی تو کہا سرور نے
جوں چراغِ سحری اب مری رخصت ہوگی
شہ نے سجدہ نہ دمِ ذبح فراموش کیا
کہیں آفاق میں ایسی بھی عبادت ہوگی
اے ضمیر اس لئے ہے مجھ کو تمنائے اجل
کہ علیؑ کی مجھے تربت میں زیارت ہوگی

ضمیر کے بعد اُن کے شاگرد میرزا دبیر اور اُن کے ہمعصر میر انیس کا دور آتا ہے۔ ان دونوں باکمال شعراء نے مرثیوں کے ساتھ سلام بھی کہے۔ میرزا دبیر نے مجموعی طور پر تین سو بیس سلام کہے ہیں۔[11] دبیر کے اکثر سلام بڑے معرکے کے ہیں۔ اور ان کی سلامتِ طبع کا اظہار کرتے ہیں، ایک سلام کے یہ اشعار سنئے ؎

غمِ آلِ عبا ہے اور میں ہوں
سلامی یہ غذا ہے اور میں ہوں
خیالِ کربلا ہے اور میں ہوں
بہشتِ جانفزا ہے اور میں ہوں
نبیؐ کہتے تھے اے حیدرؑ تمہارا
شناسا اک خدا ہے اور میں ہوں

مولانا شبلی نے سلام کی خوبی یہ بیان کی ہے۔ طرح شگفتہ اور تنی، بندش سادہ اور صاف، مضمون

---

۷ تذکرہ ارشاد اور اردو شعر، مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بعنوان اُردو میں مرثیہ، مذہب اور قوم [illegible]

۸ کلیاتِ ولی مرتبہ نور الحسن ہاشمی (طبع دہلی ۱۹۴۵ء) ضمیمہ، صفحہ ۸۰۴

۹ [illegible]

۱۰ مذہب و شاعری، صفحہ ۲۷۷

۱۱ موازنۂ انیس و دبیر، صفحہ ۲۱

درد انگیز اور پُر تاثیر ہو ــــ اس کے آگے لکھتے ہیں

"میر انیس کے سلاموں میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں"

میر انیس کے سلام کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

گذر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا
مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا
نمودِ و بودِ بشر کیا محیطِ عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا
نشارِ سجدہ جہاں ہوا زمیں کو عجب
صدا یہ قبر نے دی حکم بوتراب نہ تھا
نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا
حسینؑ اور طلبِ آب اے معاذ اللہ
تمام کرتے تھے حجت، سوالِ آب نہ تھا
انیس عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلامِ ابوتراب نہ تھا

میر انیس کے بعد خاندانِ انیس اور اس خاندان کے علاوہ دیگر شعراء خصوصاً مرزا تعشق، میر نفیس، سلیس، ماہر، مرزا جعفر اوج، پیارے صاحب رشید اور دولہا صاحب عروج نے سلام گوئی کو آگے بڑھایا اور پھر جدید دور میں جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، آغا شاعر دہلوی، سید آلِ رضا، ڈاکٹر صفدر حسین، ڈاکٹر یاور عباس، شاہد نقوی، قیصر بارہوی، آغا مسعود رضا خاکی، وحید الحسن ہاشمی، سہیل بنارسی اور سیف زلفی وغیرہ جدید مرثیہ گو آتے ہیں اور مرثیے کے ساتھ ساتھ سلام گوئی کی روایت کو بھی سنبھالا دیئے ہوئے ہیں اور اپنے فن کی بنیاد پر اسے آگے بڑھا رہے ہیں ــــ سید آلِ رضا کے اس "سلام آخر" پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ یہ سلام جدید دور کی سلام گوئی کی بخوبی نمائندگی کرتا ہے اگرچہ یہ سلام روایت کے برخلاف مثنوی کی ہیئت میں ہے۔

سلام خاک نشینوں پر سوگواروں کا
غریب دیتے ہیں پرسا تمہارے پیاروں کا
سلام اُس پہ جو زحمت کشِ سلاسل ہے
مصیبتوں میں امامت کی پہلی منزل ہے
سلام اُن پہ جنہیں شرم کھائے جاتی ہے
کھلے سروں پہ اسیری کی خاک آتی ہے
سلام بھیجتے ہیں اپنی شاہزادی پر
کہ جس کو سونپ گئے چلتے وقت گھر سرور
مسافرت نے جسے بے بسی یہ دکھلائی
فدا کر دیئے بچے نہ بچ سکا بھائی
اسیر ہو کے جسے شامیوں کے نرغے میں
حسینیت سے سکھانا، علیؑ کے لہجے میں
سکینہ بی بی تمہارے غلام حاضر ہیں
بجھے جو پیاس تو آنکھوں کے جام حاضر ہیں
سلام تم پہ رسولؐ و بتولؑ کے پیارو
سلام مہرِ رسالت کے گرد سیارو
سلام محسنِ اسلام خستہ تن لاشو
سلام تم پہ شہیدوں کے بے کفن لاشو
بچے تو اگلے برس ہم ہیں اور یہ غم پھر ہے
جو چل بسے تو یہ اپنا سلامِ آخر ہے

---

۱۲ مظفر حسن ملک، مقالہ پی ایچ ڈی (پنجاب یونیورسٹی) بعنوان "مذاویہ" ص ۷۷۵

۱۳ موازنۂ انیس و دبیر، ص ۲۴۰

احسن علی خان

اشارے

پھول، کانٹے اور بھونرا
موسم گل اور خزاں
زندگی کے کچھ اشارے
کچھ اشارے ہی تو ہیں

شمع، سورج
چاند، تارے، بجلیاں
روشنی کے کچھ اشارے
کچھ اشارے ہی تو ہیں

اور انساں
اِن اشاروں سے نگاہیں پھیر کر
خود اشارا بن گیا
اک تماشا بن گیا

وہ احساس

میرا وہ احساس ابھی تک تازہ ہے
بچپن میں اک چڑیا پکڑی تھی
گھبرا کے پھر مٹھی کھولی تھی
میری مٹھی کے اندر
اتنی چھوٹی چیز کا دل
اتنے زور سے دھڑکا تھا
میرا دل بھی لرزا تھا

عمودی فاصلہ

جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا
میرے اُس کے درمیاں
اک عمودی فاصلہ
بڑھتا گیا

دیکھتے ہی دیکھتے
وہ ہو گیا اتنا بڑا
ایک دن نظریں اٹھا کر
میں نے جو دیکھا اُسے
سامنے میرے کھڑی دیوار سی تھی
وہ نہ تھا

اور وہ مینار قد
اس نے شاید مجھ کو دیکھا ہی نہیں
اور اگر دیکھا بھی ہو تو
میں بلندی سے نظر آیا نہیں

اب کبھی بھی
میں بڑوں سے دوستی کرتا نہیں
آدمی رہتے نہیں عفریت ہو جاتے ہیں وہ
سامنے آنکھوں کے اِک دیوار بن جاتے ہیں وہ
اور میں ان کو نظر آتا نہیں

ستمبر ۱۹۶۹ء

سعید صہبائی

راجے کا بیٹا

جب میں باہر صحن میں نکلا
وہ دم سادھے
اپنی جگہوں پہ چھپے ہوئے تھے

لُک چھپ جانا
لُک چھپ جانا
راجے کا بیٹا آتا ہے! آتا ہے!
کوئی بولا
نہ کوئی اپنی جگہ سے بھاگا
میں نے پہلے
انہیں پرانی جگہوں پہ دیکھا
سیڑھی کے نیچے آلے میں، چھت کے اوپر
پانی کے مٹکوں کے پیچھے
لیکن وہاں پر کوئی نہیں تھا
دُور دُور تک خاموشی تھی

بکرم کوٹھے کی مٹی کی اوٹ۔ سے پورا چاند چڑھا
اس کے مقناطیسی نور سے ہر شے کی رنگت بدلی تھی
پیڑوں کی شاخوں میں جیسے
بھوت کی کوئی شکل بنی تھی
اسے دیکھ کے اک پل کو میں جیسے سب کچھ بھول گیا تھا
لیکن یکدم املتاس کا پیڑ ہلا

"راجے کا بیٹا! راجے کا بیٹا....."
شور مچاتا میں اس پیڑ کے پیچھے بھاگا
چاروں جانب گھوم کے دیکھا
کوئی نہیں تھا
ایک پرندہ شاید دیر سے گھر لوٹا تھا
اور پھر ویسی خاموشی تھی
"جانے یہ سب کہاں گئے ہیں؟"
میں نے دھڑکتے دل سے سوچا
لیکن پھر دیوار کے پیچھے جیسے کوئی چلتا ہو!
ہو نہ ہو کوئی یہاں چھپا ہے!
پنجوں کے بل سانس کو روکے
میں نے اپنے ہاتھوں کو دیوار پہ رکھ کر
نیچے جھانکا
پھٹے ہوئے کاغذ کا پرزہ
ہوا میں آہستہ آہستہ سرک رہا تھا
میں نے پورے زور سے کانپتے لہجے میں آواز لگائی
"لُک چھپ جانا! لُک چھپ جانا!
راجے کا بیٹا آتا ہے"
املتاس کے پیڑ کو چھوتی، ممٹی سے ٹکراتی،
گھومتی چکراتی آواز مری ہی جانب پلٹ کے آتی تھی
"لُک! لُک!
چھپ! چھپ! جانا! ....جانا!
راجے کا بیٹا، راجے کا بیٹا، بیٹا! آتا! آتا ہے!"

نذیر قیصر

میں ان کے ساتھ ہوں

میں اُن کے ساتھ ہوں
جو تیغ پر ہونٹوں کو رکھے
لفظ کی حرمت کا "ماتم" ہیں

میں اُن کے ساتھ ہوں
جو درد کی دہلیز پر شمعیں جلائے
جاگتی آنکھوں میں زندہ ہیں

میں ان کے ساتھ ہوں
جو کشتیوں میں جال
اور کھیتوں میں ہل کو چھوڑ کر
بے گھر ہوئے ہیں

ظفر ہمدانی

بازارِ مصر

صبح کو لوگ دکانوں پر
سچ، ہمدردی، رحم، محبت
کتنے ہی جذبوں کے روشن
کتنے لفظوں کے بامعنی
پھولوں میں لپٹے لپٹائے
صدہا رنگوں،
صدہا قسموں کے سامان سے
کاروبار سجا لیتے ہیں

دن چڑھتے ہی،
اس بازار میں
سارا شہر اُمڈ آتا ہے
کوئی سفارش کے فارم ہاتھوں میں تھامے
کوئی خوشامد کی اسناد گلے میں ڈالے
زادِ سفر رشوت کا لے کر
جھوٹ کی تختی کو چپکا کر
پیشانی پہ سجا کر
اُجلے، میلے، گورے کالے پیکر
چرب زبانی کے ماہر
جو بھی سودا
جیسے داموں چاہتے ہیں
نپٹا لیتے ہیں
جیسا بھی سامان ہو
اس کی منہ مانگی قیمت پاتے ہیں

اور میں ظفر ہمدانی سیّد
جس کی جیب میں دمڑی
گلے میں تختی
ہاتھ میں فارم، سند، نہ سودا
خاموشی سے اس بازار کو
ہر موسم میں
اس بازار کی گہما گہمی کو
بڑھتے پھولتے پھلتے دیکھا کرتا ہوں

میں کہ ظفر ہمدانی سیّد
جس نے جھوٹ کبھی نہیں بولا
جس نے سر کو
ان دکانوں میں نہ جھکایا
روز کسی نقصان کا سودا کر کے
خوش ہو جانے والا
جس کا ان سارے لوگوں میں
اس پُر رونق بازار میں
کوئی واقف، کوئی دوست نہیں ہے
میں بھی ـــــ کبھی کبھی
لوگوں کے سودے کو دیکھ لیا کرتا ہوں
کبھی کبھی۔
میرا ذہن بھی اس بازار میں اپنی ایک دکان سجانے کو
کہتا ہے

سعادت سعید

راکھ کے کتبے

درسگاہِ کورنش میں لفظ کے جھکنے سے نالاں
طفلِ نافرماں
مدرّس کو عطا کرنے لگا
خورشیدِ بے پروا کا نور
روشنی ناہید کی،
مہتاب کی کرنیں،
دھنک کی اوڑھنی میں
جھلملاتی لاجونتی حور!

وہ مدرّس جی حضور
شپرکِ خوابوں کا حاصل،
کالے چیتوں کے ہلاکت آفریں پنجوں کے بسمل
حرف ہائے ندمشاغل
کانچ کی خفاش صورت بوتلوں میں بند جگنو
خوگرِ گریہ؟ ——
خروشِ سنگ چور
بخشنے میں بے صبور!

وہ اسے معکوس جذبوں،
منتشر سوچوں کی کِل کِل
دق زدہ رنگوں کے نقشے
آخرِ شب کی سیاہی
دانشِ حاضر کا بُور
بھیک کی صورت عطا کرتا ہے
غافل
اپنی دریوزہ گری سے

الاماں!
نور ایسا نور جس کے سلسلے

ارتقا کی خواہشوں کا اسم ہیں
رنگ ایسے رنگ جن میں
موت کی وحشی ہنسی کا عکس ہے!

بے کیف مفہوموں کی بجھتی آگ
سرد و منجمد کٹڑیل کی زینت!
خونچکاں
ثاقب ثریا کے سبو
بے کراں.........
بے پایاں خوشبو؟
جھپکتی آنکھوں کے مدوّر منظروں سے دور
پھیلی لذتوں سے ہمکنار و رشتہ جُو
دسترس میں
خاکدان و کہکشاں!

کو بہ کو،
محکوم اپنی آرزؤں کے ترشختے
شیشہ خانوں کے مقابل
روشنی کے ثابت و سالم
نصابوں کی
خبر رکھتے نہیں
تنہائیوں کے پابہ گِل
ان گنت ٹوٹے، پچکتے، شاخچوں کے
سب عنادل
داستاں در داستاں
پھولوں کے کھلنے سے پریشاں؟
دل ستاں!

کس نے کس کے علم کے بابِ مقفل
روزنوں کے کالے پردوں کی تہوں میں
آنے والے دن کے سورج کی ضیا پائی؟
ہجومِ زندگی
صدیوں سے آتش زیرِ پا ہے
موم کے سارے مناظر.......
سارے انساں

آخری دم........
آخری سانسیں
ہوا کا صُور
ہر سو راکھ کے ذرّے اُڑے!
خاموش کب تک؟
نیم بسمل
نونہالوں کا شعور؟
موم کی صورت پگھلنے کا سرور
ہے دماغوں کا فتور!

لفظ روشن لفظ
بے بس فیلسوفوں کی قبور
راکھ کی تعلیم باطل
سانس کی قیطون پہ جس کا نشاں
وہ دھواں!
ان کے کتبے سارے رشتوں کی گواہی
سب زمانوں کا مکاں!
اے صدائے طور
چشمِ سُرمگیں کو بھی عطا کر
کچھ غرور!!

تحصیر

خالد احمد

لوگ ہوں یا اجرامِ خلائی
صرف اصولوں کو ہے دوام
ہر سیارے کا اِک محور
ہر تارے کا ایک مقام

بچے آہن گر کے

آگ کے تپ سے اور تپ اُٹھے
خون سے تپتے گال
پھولوں جیسے ہاتھوں میں ہے
لوہا لال گلال

لیس

ٹھوڑیوں تک ہیں گردنوں میں طوق
کس اکڑ میں جکڑ دیا تو نے
سر بلند اور سر بلند ہوئے
ان جبینوں میں کوئی سجدہ نہیں

یقین

چھتیں ٹپکتی رہیں
اپنا یہ عقیدہ ہے
ہر ایک بوند کے ہمراہ
اک فرشتہ ہے

پانچ پانی

بھیک کو ہم نے رزق جان لیا
رزق بانٹا کُھلے چُھپے ہاتھوں
دل نے جاں پر نگاہ کیا رکھی
درد میں دل کھپا دیا ہم نے
اس خسارے کو نفع گردانا
اے مسافت تکان لاحق ہے
اے مسافت! تکان لاحق ہے
خلق پر کفر کا وبال لئے
چل دیئے ہم غضب کے رستے پر
آگ سی روشنی کے پشتوں میں
زیر دستوں کا کون والی تھا
کوئی کس کو شریک ٹھہرائے
کوئی کس کو شریک ٹھہرائے؟
کس کی آنکھیں ہیں کس کی آنکھوں میں
تنِ مرمر میں سرخ ڈوروں کو
کون آنکھیں تلاش کرتی ہیں
اے زمیں آسماں نہ ٹل جائیں
ان طنابوں کو کون تھامے گا؟

ان طنابوں کو کون تھامے گا؟
کون صدیق تھا کتابوں میں
کس نے تصدیق کی کتابوں کی
آسماں ٹل چلے زمیں والو
پھر عالم تہیں دھڑکنے لگیں
لفظ کو دل بنا دیا کس نے
لفظ کو دل بنا دیا کس نے
چھاگلوں سے چھلک پڑا پانی
شاخچوں پر کھلی پھلوں کی دھنک
جنتوں کی ہمیشگی کی قسم
نیکیوں کا کوئی ازالہ نہیں
درد بانٹو کھلے چھپے ہاتھوں

شاہد حسن

ابرِ باراں سے کلام

جب ساون کی کوئی بات چلی
تن میں میرے بجلی چمکی
میں یوں ٹوٹی کر بکھر گئی

اے قطرۂ باراں میرے لئے
اب شام و شب سب ایک ہوئی

ہر بار ترے چھڑکاؤ سے
اس خوں میں شگوفے کھلتے تھے
اس بار تو میری آنکھوں میں
یہ ساون خود ہی ٹھہر گئے

عشرت آفریں

وجدان

ہجر و وصال کے بیچ بھی اک موسم ہوتا ہے
جیسے تمہاری گم سم آنکھیں
جیسے مری ادھوری نظمیں

جیسے چھاچھ کا خالی پیالہ
جیسے چاک پہ آدھا برتن
جیسے کسی سیارے پر چھ ماہ کی رات
جیسے کسی تخلیق کے لمحے
کرب کی لذت
جیسے لہو میں سرحدی گیتوں کی سرشاری
جیسے بنجر کورے زمیں کی پیاسی کوکھ میں
نمو کی خواہش
جیسے کوری نرم دمکتی پوروں کی شتیل آنکھوں میں
لمس کے پہلے خواب کی حیرت
کچھ نہ سمجھنے اور سمجھانے کے موسم کی
پکی باتیں
سوندھے جذبے
جیسے گوری کے سینوں میں
پہلی دید کا میٹھا خوف
اور جھکی لیتا دم دھڑکا

جیسے ماں کے جسم سے ہونٹ ہٹا کر
ہنسنے والے بچے کی آسودگی

جیسے جنگ کے بعد لٹے ہوئے گاؤں میں
تنہا بوڑھا
بیل کی جوڑی
نہر کا سن سن بہتا پانی
روندی فصلیں
سرکنڈوں کے بیچ پھٹے آنچل کی دھجی
گہرا آسیبی سناٹا
جیسے کسی بنسی کی دھن پر
پیر کبیر کا سادہ دوہا
جیسے بھری چوپال کی چپ کے بیچ
کہانی کار کے لمبے سانس کا وقفہ
ہجر و وصال کے بیچ بھی اک موسم ہوتا ہے

ابصار عبدالعلی ، انتظار حسین
محمد علی صدیقی

عارف عبدالمتین ، اقبال صلاح الدین
منظور وزیر آبادی ، شمع افروز زیدی
راجا رسالو ، علی ظہیر منہاس

مرتضیٰ برلاس ، حمایت علی شاعر ، اختر انصاری اکبر آبادی ، مجتبیٰ حسین ، ڈاکٹر نجم الاسلام ، الیاس عشقی

ممتاز مفتی

بش اور بشرہ

آج میں آپ کو ایک لو سٹوری سُناتا ہوں
اس کہانی میں تین کردار پیش پیش ہیں LOVE'S
TRIANGLE ایک لڑکی ایک لڑکا اور
ایک ۲۵۰ طاقت کا موٹر سائیکل۔
آپ کہیں گے کہ لڑکی لڑکا تو خیر ہوئے موٹر سائیکل
کو بیچ میں کیوں لے آئے ـــ جناب والا میں
مجبور ہوں۔ موٹر سائیکل کو بیچ میں نہیں لایا
وہ خود بخود آ گیا ہے۔ آج کل جدید گھرانوں
میں موٹر سائیکل بہت ہے۔ جہاں محبت کی
بات سُنی خرّاپ سے بیچ میں آ گھستا ہے
موٹر سائیکل۔ عصری تقاضا ہے۔ جس طرح پرانے
زمانے میں وفا ہوتی تھی، جہاں محبت کی بھنک
پاتی۔ یوں دھرنا مار کر بیٹھ جاتی۔ جس طرح
قرض خواہ کے دروازے پر مہاجن آ بیٹھا ہو۔
تو جناب اس کہانی میں محبت کو چلانے کی ساری
ذمہ داری موٹر سائیکل پر ہے بلکہ یوں کہیئے کہ اگر
موٹر سائیکل نہ ہوتا تو لڑکا لڑکی جتنا زور چاہے
لگا لیتے محبت پیدا ہی نہ ہوتی۔
آجکل محبت میں رفتار کو بڑی اہمیت حاصل
ہے پرانے زمانے میں بہل میں بیٹھ کر
ڈھینچوں ڈھینچوں چلتی تھی۔ آج کل موٹر میں
میں زناٹے سے نکل جاتی ہے۔ فٹافٹ
سے منزل کو جا لیتی ہے۔ بس ایک ہی مشکل ہے
کہ منزل پہ پہنچ کر بھی نہیں رُکتی۔
ہاں تو صاحبو کہانی یوں ہے کہ
ایک تھی لڑکی۔ بش اور ایک تھا لڑکا
ذولف۔ بش کو ذولف سے محبت تھی۔
معافی چاہتا ہوں محبت ایک پرانا لفظ
ہے یہاں بیٹھتا نہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کوئی
اور لفظ میسر نہیں مطلب ہے کہ بش کو ذولف
سے والہانہ لگاؤ تھا INFATUATION
تھی۔ بلکہ یوں کہیئے کہ یہ انفیچوایشن اپنی شدت
کی وجہ سے COMPULSION بن
چکی تھی۔ یہ مجبوری بش کے گلے میں خواہ مخواہ
پڑ گئی تھی۔ ساری شرارت موٹر سائیکل کی تھی
ہوا یوں کہ ایک دن جب وہ گھر کی ٹیرس
پر کھڑی تھی تو دفعتاً ایک شور اُٹھا۔ بھونچال سا آ گیا
الماریوں میں رکھے ہوئے برتن بجنے لگے۔
میزوں پر گلدان جھومے۔ ٹی وی کا ایریل تھرایا
اسلام آباد کی سڑک نامکمل گڑگڑاہٹ سے
بھر گئی اور آخر کوئی چیز زوں ـــ سے گلی سے
یوں گزر گئی جیسے ہوائی چل گئی ہو۔
یہ ہوائی ذولف کا موٹر سائیکل تھا۔
بش دیکھتی۔ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔
دل اچھل کر باہر نکل آیا جسم گویا سکتے
میں رہ گیا۔
ہائے اتنی تیزی ـــ اتنی تڑپ جیسے
بجلی گری ہو۔ پھر اسے پتہ چلا کہ یہ بجلی ہر روز
شام کے پانچ بجے گلی پر گرتی ہے اس لئے
وہ روز پانچ بجے اس کا انتظار کھینچنے لگی۔
جب ذولف گلی میں سے زوں سے
نکل جاتا تو بش کو دکھتا دکھاتا کچھ نہ تھا۔
صرف موٹر سائیکل کی ایک سُرخ سی لکیر اور ہلمٹ
کا ایک سلیٹی دھبہ۔
تو جناب بش کو اس سُرخ لکیر اور سلیٹی دھبے
سے محبت ہو گئی۔ جب بھی سُرخ لکیر اور سلیٹی
دھبہ زناٹے سے گزرتے۔ اس کا دل اچھل
کر باہر آ جاتا اور جسم میں سوئیاں چبھ جاتیں
دراصل بش کو رفتار سے عشق تھا۔ پتہ نہیں
کیوں شائد عصری تقاضہ ہو یا شائد ذہن میں کوئی نقص

ڈائمنگ گیا ہو۔ جیسے پائیلٹوں میں یا موٹر
ریسیوں میں ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے
بشی میں ایک بے نام اضطراب بھی تھا۔
جو اس کے بند بند کو جلاتا رہتا تھا۔

اول تو وہ ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتی تھی۔
ابھی یہاں بیٹھی تھی۔ اب وہاں کھڑی گنگنا رہی ہے
لو وہ تو ٹیرس پر ٹہلنے لگی۔ یہاں سے وہاں
جا بیٹھنے کے لئے اسے اڑانے کی چنداں
ضرورت نہ پڑتی تھی۔ بیٹھتی تو جسم کا رواں
رواں دھنکی کی طرح بجتا۔ اور کچھ نہیں تو زبان
چلتا چلے جاتا اتنی تیزی سے جیسے انڈا پھینٹے
ہوئے پچھے چلتا ہے مختصر یہ کہ بشی بڑی ہی
بے تاب روح تھی۔

جو کام ذہن میں آتا چاہتی کہ ابھی ہو
جائے۔ ابھی اسی وقت جھٹ پٹ، خیال
ذہن میں اس قدر تیزی سے آتے کہ ایک
دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے جیسے تصویر
ملٹی اکسپوژر کی وجہ سے BLUR ہو جائے۔

مثلاً نام ہی کو لیجئے۔

اس کا نام بشرہ تھا۔ جو اُسے پسند نہ
تھا۔

توبہ اتنا لمبا نام۔ بش۔ را۔ اونہوں
نام ایسا ہو جو چھوٹا ہو ترت ہو خستہ ہو
کرشنا کے وار ہو۔ اسی وجہ سے اس نے
اپنے نام کو کاٹ کر بشی رکھ لیا تھا۔ بشی کے
صوتی اثر میں تیزی تھی اور پھر جھٹکا بھی اور معنوی
طور پر بھی وہ۔ لیکن چھوڑیئے بشی کو معنوی
پہلو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اس نے ذوالفقار کو بھی ذولف کہنا
شروع کر دیا تھا اتنا لمبا نام ذوالفقار۔
توبہ ڈریگ کرتا ہے۔

اگرچہ بشی روز ذولف کا انتظار کرتی
تھی تاکہ گزرتے ہوئے اسے دیکھے۔ لیکن
اس نے ذولف کو کبھی نہیں دیکھا تھا کیسے
دیکھتی قیام کے عالم میں ہوتا تو دیکھتی۔ اور
اگر ذولف قیام کے عالم میں ہوتا تو وہ
ایک عام سالڈ کا بن کر رہ جاتا۔ سارا
رومینس تو سپیڈ نے پیدا کر رکھا تھا۔

بشی کو تو یہ بھی علم نہ تھا کہ ذولف کے
خدوخال کیسے ہیں۔ لیکن ہٹائیے جنت
میں آج کل خدوخال کون دیکھتا ہے

بشی کو ذولف سے اس لئے محبت
نہ تھی کہ وہ ذولف تھا بلکہ اس لئے کہ وہ
جدیدیت کا سمبل تھا۔ اور جدیدیت سے
اسے عشق تھا عشق۔ اس کی نظر میں ہر چیز
ہر بات جو دور جدید کی نشاندہی کرتی تھی۔
اس قابل تھی کہ خود کو اس پر نثار کر دیا جائے
اور ذولف میں جدیدیت کی ایک نہیں تین
باتیں تھیں۔ ایک تو وہ رفتار کا دیوانہ تھا۔
حرکت اس کے لئے زندگی تھی اور قیام
موت پھر وہ اضطراب کا بادشاہ تھا۔ اضطراب
بھی تو حرکت ہی ہوتی ہے۔ گرداب زدہ حرکت۔
بس ذرا رنگ مختلف ہوتا ہے تیسری
خصوصیت یہ تھی کہ وہ نتائج سے بے پروا
تھا۔ بے نیاز تھا۔ یوں کیا تو یہ ہو جائے گا کہیں
وہ نہ ہو جائے۔ پڑا ہو۔ جو ہو سو ہو۔
ٹو ہل وداٹ TO HELL WITH IT

ذولف ایک کھاتے پیتے بنے سجے
گھر کا فرزند تھا۔ باپ ایک اعلیٰ افسر تھا۔
ماں سوشل سرکلز کی جان تھی۔ گھر کی فضا
LIVE LET LIVE کے جذبے
سے اس حد تک بھری ہوئی تھی کہ کسی کو کسی کی
خبر نہ تھی۔ وہ گھر نہیں بلکہ بے تعلقی کی جنت
تھا۔

پھر بھی کبھی کبھار ماں باپ کی بچوں سے
ملاقات ہو ہی جاتی۔ اور انہیں احساس
ہوتا کہ وہ ان کے اپنے بچے ہیں۔ سوشل
ماں کے لئے یہ احساس بہت تکلیف دہ
ہوتا ہے خصوصاً جب بچے جوان ہو
جائیں ۔۔۔ تو وہ ماں کی عمر کی گواہی دینے
لگتے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ سوشل ماں کیلئے
عمر کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے، بہر صورت
ذولف کی ماں اس بات پر بہت خوش تھی
کہ بیٹے نے موٹر سائیکل رائیڈنگ کی ہابی کو اپنا
رکھا ہے اور شاید میں گھر میں نہیں بلکہ سڑک پر
گزارتا ہے باپ بھی خوش تھا کہ بیٹے میں
ڈیش ہے اور جب وہ کیریر کے سائیکل
پر چڑھے گا تو کچھ کر دکھائے گا۔

دراصل ماں باپ دونوں ہی آزاد خیال
تھے اور اپنے بریٹنڈ ہونے پہ فخر محسوس کیا
کرتے تھے ان کے دلوں میں صرف دو بندھن

باقی رہ گئے تھے: سیلیٹس اور کیریر۔ شاید
یہ بندھن لبریلیٹڈ ہونے کے لئے از بس
ضروری ہوتے ہیں۔

ذولف کو بچپن ہی سے رفتار سے
عشق تھا اور یہ عشق اتنا شدید کہ مزید کسی
عشق کی گنجائش نہ رہی تھی۔

وہ صبح انسٹیٹیوٹ میں حاضری دیتا تھا۔
وہ مینجمنٹ کورس کے آخری دور میں تھا۔
پھر شام کو پانچ بجے موٹر سائیکل رائیڈنگ پر
نکل جاتا۔ ایکسلریٹر دباتا اور دباتا حتیٰ کہ
سائیکل ہوا میں تیرنے لگتا۔ بس یہی اس کی
جنت تھی۔

سات آٹھ روز تو بش ٹیرس پر کھڑی
ہو کر ذولف کی زوں سنتی رہی، دیکھتی
رہی۔ سن سن کر نہال ہوتی رہی۔ پھر وہ مضطرب
ہوگئی۔ یوں جیسے شیر پنجرے میں ادھر سے
ادھر اور ادھر سے ادھر ٹہل لگاتا ہے۔
مقصد نہ ادھر آنا ہوتا ہے نہ ادھر جانا۔ ذولف
کی زوں ــ بش کے دل میں اک زوں چلا دیتی
وہ زوں اس کے بند بند میں گونجتی۔

بش کے دل میں وصال کے لئے تڑپ
پیدا نہ ہوتی تھی جس طرح پرانے زمانے کے
عشق میں پیدا ہوا کرتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ
بش کے ذہن میں وصال کا تخیل سرے سے
وجود ہی نہ رکھتا تھا اسے پتہ ہی نہ تھا کہ
وہ کیا ہوتا ہے۔ کوئی کیفیت ہے یا منزل۔
اس کے دل میں یہ آرزو بھی نہیں تھی کہ
ذولف آنکھوں کے سامنے رہے اور
میں اسے دیکھتی رہوں۔ نگاہوں کے سامنے
رہنے یا اسے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا
تھا چونکہ سامنے رہنا تو قیام کی صورت ہے
اور قیام تو اس کے نزدیک بوریت تھا۔ رہا
دیکھنے کا سوال تو اگر آپ کے سر پر ہیلمٹ
سوار ہو منہ پر پلاسٹک کا چھجا چڑھا ہو جسم
پر چمڑے کا جیکٹ ہو ہاتھوں پر دستانے
ہوں تو دیکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

ذولف کی زوں دیکھ کر بش کے دل
میں صرف ایک آرزو پیدا ہوتی تھی کہ اس
لال لکیر اور سلیٹی دھبے کے ساتھ اس کے
بال بھی ہوا میں لہراتے وہ بھی اس متحرک
تصویر کا ایک حصہ بن جائے اگر وہ پرانے دور
کی یا پابند گھرانے کی لڑکی ہوتی تو بیٹھ کر آہیں
بھرتی یا دل بہلانے کیلئے فلمی گانے سنتی لیکن
بش تو جدید گھرانے کی پیداوار تھی۔ گھر والے
لڑکی پر نظر رکھنے کے قائل نہ تھے اڑوس پڑوس
والے ذاتی معاملے کو کچھ زیادہ ہی ذاتی سمجھتے تھے
اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

ان حالات میں بات چھپانے کی کیا ضرورت
تھی اس لئے بش نے شام کے پانچ بجے کی
اس لذت میں چھوٹی بہن کو بھی شریک کر لیا۔
چھوٹی بہن سے بات ممی تک پہنچی۔ ممی نے بھلا
کیا کہنا تھا مسکرا کر چپ ہو رہی۔

لہٰذا ایک شام بش ٹیرس کی بجائے گلی
میں جا کھڑی ہوئی۔ ذولف آیا تو اس نے
انگڑائی کی صورت دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ رکنے کا
اشارہ کیا۔

ذولف نے سائیکل روک لیا۔

اے لفٹ پلیز وہ بولی۔

اوکے جمپ آن۔

وہ اچھل کر بیک سیٹ پر جا بیٹھی۔
سائیکل چل پڑا۔ اگر وہ روایتی ماحول میں پلی ہوئی
کسی نوجوان کے موٹر سائیکل کی بیک سیٹ پر
بیٹھ جاتی۔ تو مشکل پڑ جاتی۔ نوجوان کے لئے
سورج سوا نیزے پر آ لٹکتا۔ پھر پسینہ ہی پسینہ
کنفیوژن ہی کنفیوژن، ذہن میں بریک اور ایکسلریٹر
گڈمڈ ہو جاتے۔ لیکن ذولف کو کچھ بھی نہ ہوا۔
جیسے پیچھے بھُس کی بوری دھری ہو۔

البتہ اس نے سپیڈ سلو کر دی کہ بوری گر
نہ جائے۔

سلو کیوں ہو گئے، وہ چلائی۔

سڑک بمپی ہے وہ بولا۔

پڑی ہو۔

گر جاؤ گی۔

سو واٹ

ذولف کو بات سمجھ میں آ گئی کہ اسے
کہیں جانا پہنچنا نہیں ــ صرف JOY
RIDE ــ ذولف نے ایکسلریٹر کھولا اور
سائیکل ہوا میں تیرنے لگا۔

پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ ذولف آکر
رک جاتا ہوٹ بجاتا بش دوڑ کر آتی اچھل کر
بیک سیٹ پر چڑھ جاتی۔ ذولف ایکسلریٹر

کھوتا کھوتے جاتا اور موٹر سائیکل ہوا میں اٹھنے لگتا۔

ٹریفک پولیس ذولفٹ سے واقف تھی۔ جب ذولفٹ گذرتا تو چوک کا سپاہی منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ ہم نہیں دیکھ رہے کی صورت۔

ابتدائی ایام میں جب وہ ذولفٹ سے آشنا ہوئے تھے تو سپاہی لپک کر آگے بڑھا تھا۔ سیٹی بجا کر اسے روکا تھا پھر تحکمانہ شان سے جیب سے کاپی پنسل نکالے تھے۔ اور حسب دستور فرعونی لہجے میں پوچھا تھا کیا نام ہے تیرا۔ باپ کا نام۔ کیا کرتے ہیں وہ جواب سن کر سپاہی کا کلف اتر گیا تھا۔ گردن جھک گئی تھی۔ اور کاپی پنسل دوبارہ جیب میں جا چھپی تھی اس روز کے بعد وہ ذولف کو پہچاننے لگے تھے۔ یوں کہ جب بھی وہ گزرتا سپاہی منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ ہم نہیں دیکھ رہے کی صورت۔

چار ایک دن تو بش بیک سیٹ پر سٹریپ سے چمٹی رہی پھر جو ایک زوردار بمپ لگا تو اس نے چیخ مار کر اپنی باہیں ذولفٹ کے گرد حائل کر دیں ـــــ ذولفٹ کو پھر بھی کچھ نہ ہوا۔ البتہ بش کو ہوا ـ کچھ کچھ۔ اور اس کی باہیں ذولفٹ کا سہارا لینے کی عادی ہو گئیں۔

پھر وہ بایاں گھسیٹ کر اُسے اپنے گھر میں لے گئی۔ ممی ڈیڈی سے تعارف ہوا۔ یوں دونوں کھلے ایک دوسرے سے ملنے لگے۔

جدید گھرانوں میں یہ عیب ہے کہ وہاں لو سٹوری جنم لینے میں تو بڑی بے تاب ہوتی ہے مگر پلتی پھولتی نہیں یا شاید محبت میں یہ عیب ہے کہ پابندیاں نہ ہوں تو وہ چلتی نہیں لو یا تو ختم ہو جاتی ہے صرف سٹوری باقی رہ جاتی ہے اور یا وہ اچیتر میں بدل کر اپنی عظمت کھو دیتی ہے محبت میں انسان کے لئے محرومی لازم ہے محرومی شامل ہو جائے تو محبت عشق بن جاتی ہے عشق انسان کو مادی دنیا کی گرفت سے نکال کر نہ جانے کہاں لے اڑتا ہے۔

بش اور ذولفٹ کی دنیا میں پابندیاں نہیں تھیں رکاوٹوں کا وجود نہ تھا دونوں گھرانوں کے ہاں سٹیٹس بھی تھا اور کیریئر کے مواقع بھی۔ لہٰذا بش نے ممی کے ذریعے بات چلائی ذولفٹ کے گھر والوں نے پیغام بھجوا دیا جو منظور کر لیا گیا اور وہ ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے۔

منگنی سے ان کی زندگی میں کوئی فرق نہ پڑا۔ نہ خوشی کا احساس تھا نہ پا لینے کا۔ پا لینے کی خوشی تو جبھی ہوتی ہے جب پا لینے میں دشواریاں حائل ہوں، یہ عشق بھی عجیب عشق تھا۔ ذولفٹ حرکت کا دیوانہ تھا اور بش متحرک کی دلدادہ تھی۔ وہ تماشہ تھا یہ تماشائی تھی۔ تماشے کو تماشائی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔

اگر ان تینوں کرداروں تک محدود رہتی تو یہ کہانی شادی پر شہنائی کے ساتھ ختم ہو جاتی۔ اور اس کے بعد وہ لوگ روٹین۔ زندگی بسر کرنے لگتے۔ اور کہانی سننے والے ناک چڑھا کر کہتے یہ کہانی تو بالکل سطحی ہے۔ پھوکل بے لذت بے جان۔ اس میں تو زندگی کا زیر و بم ہی نہیں۔ صرف زیر ہی زیر ہے بم کا نشان نہیں ملتا۔

وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ چوتھے کردار نے غیر متوقع طور پر آ سر نکالا اور واقعہ کو کہانی بنا دیا ـــ!

ہوا یوں کہ ایک شام جب وہ گول چوک کے قریب پہنچے تو وہ رک گیا۔ بش اتر گئی ـ ذولفٹ نے سائیکل کو سٹینڈ پر کھڑا کر دیا۔ اور پھر گول چوک سے ملحقہ پارک کی طرف چل پڑا بش حیران تھی کہ بات کیا ہے۔

دفعتاً ذولفٹ بولا "بش وی آر ڈوئنگ اٹ"

"ڈوئنگ واٹ" وہ چلائی۔

کراچی گلگت نان سٹاپ ریس اس نے جواب دیا۔

جب بش کو بات سمجھ میں آئی تو خوشی سے اس کے تن [illegible] پر چیونٹے دوڑنے لگے۔

کیا میں بھی ساتھ ہوں گی بش نے پوچھا

سیکنڈ مین کے بغیر یہ ریس ہو ہی نہیں سکتی۔

بش کی باچھیں کھل گئیں۔

تمہیں پریکٹس کرنی پڑے گی۔

پریکٹس [illegible] کیسی پریکٹس

سیکنڈ مین بننے کی پریکٹس۔ سائیکل کی پوری مکینک سیکھنی پڑے گی۔ پہیہ بدلنا، پنکچر لگانا چلتے چلتے تیل بھرنا۔ الیکٹرک انرجی کو سمجھنا پلگ صاف کرنا بدلنا۔ سیکنڈ مین کا کام بہت رف ہوتا ہے۔

بش تھرتھرکانپ رہی ہوگئی۔ بولی "آن وِل شوڈیلس" نے پوچھا۔

"شو سائینز دی سن شائینز"

"اٹ از لسے چیلنج"

"آئی ٹیک اٹ"۔ وہ دانت بھینچ کر بولی۔

یہ سلک سٹف نہیں چلے گا ذولف نے اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے ورکنگ کٹ۔ سپکس ہیلمٹ گلوز۔"

سبھی کچھ

او کے

ٹھیک وہ اٹھ کھڑا ہوا کل سے ٹریننگ شروع۔

ابھی وہ موٹر سائیکل کے قریب پہنچے تھے کہ گول چوک سے ایک شور سنائی دیا۔

ایک ٹرک راہگیر کو کچل کر بھاگا آ رہا تھا۔ چوک کا سپاہی روکنے کیلئے سیٹیاں مار رہا تھا آس پاس کے لوگ چلا رہے تھے۔

روکو روکو۔ پکڑو

یہ منظر دیکھ کر ذولف پر وحشت سوار ہو گئی۔ ایک ہی جست میں وہ سائیکل پر سوار ہو گیا اور ٹرک کے پیچھے ہوا ہو گیا۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان ریس ہوتی رہی لیکن ذولف بجلی کی طرح آگے نکل گیا اور ٹرک کا رستہ روک کر کھڑا ہو گیا ـــ پھر ایک دھماکہ ہوا اور ٹرک درخت سے ٹکرا کے لڑھکتا ہوا نچان میں جا گرا ـــ بش نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دل ڈوب گیا۔

ذولف کو اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ دو دن امید و بیم کا کھیل چلتا رہا۔ آخر امید غالب آئی۔ ذولف بچ گیا لیکن اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں۔

اس پر چند ایک روز تو بش یوں ادھموئی پڑی رہی جیسے اس کی دنیا ہی لٹ گئی ہو۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے اندر کا سوواٹ بیدار ہوا ـــ!

سہیلیوں نے اسے سمجھایا۔

ایک بولی نِرول ـــ بے کن لگاؤ گی تو تماشا تو ہو گا۔

دوسری بولی، مری کیوں جاتی ہے ذولف ختم نہیں ہوا ـــ سڑک پر بڑا بڑا روں ـــ پڑا ہے ابھی۔

تیسری نے کہا ـــ منگیتر کا غم کھاتی ہے کیا۔ منگنی کر بھول جا۔ تیرے گھر والے اب کوئی اور منگیتر ڈھونڈیں گے۔

چوتھی بولی ـــ لعنت کا کیا ہے جس سے مرضی ہے مانگ لے جس سے مانگے گی وہ پھولے نہیں سمائے گا۔

ان باتوں کے باوجود وہ روز ہسپتال جاتی رہی دو مہینے گذر گئے۔ اس کی اس باقاعدگی کو دیکھ کر ممی ڈیڈی گھبرا گئے ایک روز جب وہ ہسپتال جانے کیلئے تیار ہو رہی تھی تو ممی نے اسے آواز دی ـــ بش ذرا ادھر آنا۔

جب وہ ممی کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ ڈیڈی بھی وہاں بیٹھے پائپ پی رہے ہیں۔

بش ممی نے کہا ـــ تو کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہے ـــ؟

میں نہیں سمجھی ممی وہ بولی۔

بش ہسپتال کی فضا بڑی ڈیپریسنگ ہوتی ہے۔ ذہن پر برا اثر کرتی ہے۔ ڈیڈی نے کہا۔

اگر جانا ضروری ہے تو ہفتے میں ایک دفعہ ہو آیا کر ممی بولی۔

بش ـــ ڈیڈی نے کہا۔ اب اس انگیجمنٹ کو ختم کر دینا چاہیئے۔ تو ایک سمجھدار لڑکی ہے ایک معذور کے ساتھ زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔

وہ تو اب، سوال ہی پیدا نہیں۔ ممی بولی۔

ہاں فارگٹ اٹ ـــ ڈیڈی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

تو کیا کہتی ہے بش

ٹھیک [illegible] وہ بولی ـــ ساری عمر میں وہیل چیئر سے تو بندھی نہیں رہ سکتی۔ بش کا حلق بند ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سمجھدار لڑکی ہے ڈیڈی نے بش کو تھپکتے ہوئے کہا۔

ڈیڈی آج تو مجھے جانا ہی ہو گا۔ الوداعی۔ بش رک گئی۔

ضرور ضرور ڈیڈی نے جواب دیا۔

بلکہ اچھا ہے ممی بولی۔ آج خدا حافظ کہہ آؤ۔

اس شام جب وہ ذولف کے پاس پہنچی تو وہ بڑی حسرت سے پورٹیکو میں کھڑے موٹر سائیکل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برآمدے

کے سامنے پلاسٹک کی وہیل چیئر پہ بیٹھا تھا،
ہیلو وہ بولی۔
ذولف چونکا اس نے نگاہ اٹھائی ___ اوہ بش
آج اکیلے بیٹھے ہو۔

ہوں۔
گھر والے نہیں آئے۔
کوئی انگیجمنٹ ہوگی ___ صرف تم ہی روزانہ
آتی ہو۔
اچھا اس نے حیرت سے کہا
کل سے شاید تم بھی نہ آؤ ___ وہ بولا
کیوں
کل میں گھر جا رہا ہوں
کیا واقعی
ہاں بیساکھیاں آگئی ہیں۔
کہاں ہیں
اندر پڑی ہیں
ہوں ___ وہ چپ ہوگئی۔ دیر تک وہ
دونوں چپ بیٹھے رہے۔
ذولف بش بولی ___ آرٹیفیشل لمبز نہیں
لگتے ہیں، اس نے جواب دیا۔ صرف دکھنے دکھانے
کے لئے لگتے ہیں۔ ویسے نہیں۔
اوہ ___ وہ آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔
کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولی۔
ٹانگیں تو ٹھیک ہوگئیں نا۔
ہاں۔ ٹانگیں تو ٹھیک ہیں لیکن ___
لیکن کیا اس نے پوچھا
وی گو ان آل رائٹ وہ بولا۔ بٹ ایوری

تھنگ اپارٹ شل نیور بی آل رائٹ۔
وہ پھر خاموش ہوگئی۔ دل پر بوجھ پڑ گیا۔
پھر اس نے خود کو جھنجھوڑا۔ مجھے اب جانا
چاہیئے۔
ہاں وہ بولا۔ تمہیں جانا ہی پڑے گا کب
تک اپاہج کے ساتھ بندھی رہوگی۔
بش کو ایک چکر سا آیا۔ لیکن اس نے خود
کو سنبھال لیا۔ خدا حافظ وہ بولی۔
راستے میں وہ سوچتی رہی۔ سچ کہتا تھا۔
اپاہج سے کون بندھا رہے۔ ڈیڈی ہی ٹھیک
کہتے ہیں۔ اس دلیل سے بچ نکلنا لازم ہے۔
میری سہیلیاں تو م۔ بیدہ۔ پولو سب میرا
مذاق اڑاتی ہیں۔
چلو اچھا ہوا۔ آج خدا حافظ کہہ دیا۔
جب وہ گھر پہنچی تو بہت خوش تھی۔
گھر والوں نے اسے دیکھ کر اطمینان کا سانس
لیا۔
اس رات بش بڑے اطمینان کی نیند سوئی
لیکن پتہ نہیں آدھی رات کو کیا ہوا۔ گویا کسی نے
اسے جگا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ کمرہ کسی موجودگی سے
بھرا ہوا تھا۔ اور وہ موجودگی گویا بہت ہی
مانوس موجودگی تھی۔
اس کے ذہن میں ایک احساس ابھرا ___
یوں جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یکلخت ذہن میں
ابھر آتی ہے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ذولف
کے پیچھے ہوا میں تیر رہی ہو۔ موٹر سائیکل گھاؤں
گھاؤں کر رہا تھا۔ پھر وہ غاؤں غاؤں مدھم پڑتی

گئی حتیٰ کہ خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ہوا میں
تیرتے ہوئے جا رہے تھے۔ موٹر سائیکل کا
نشان باقی نہ رہا تھا۔ رفتار جو پہلے موٹر سائیکل
سے وابستہ تھی اب ذولف کی ذات سے
وابستہ ہوگئی ذولف کی ذات ابھری ابھرتی
چلی گئی۔ سارا کمرہ۔ ذولف کے پسینے کی خوشبو
سے بھر گیا۔
بش گھبرا گئی۔ اس موجودگی کے احساس
سے گھبرا گئی۔ وہ موجودگی اس کے اندر سے ابلا
نکل رہی تھی جیسے چولہے سے دھواں نکلتا ہے
جیسے بوتل سے جن نکلتا ہے۔
وہ محسوس کر رہی تھی جیسے اس میں ایک
عظیم تبدیلی رونما ہو رہی ہو۔ جیسے سنڈی تتلی
بنی جا رہی ہو۔ جیسے لڑکی عورت میں بدل
رہی ہو۔
بش پھیل رہی تھی۔ بھاری درخت بنتی
جا رہی تھی اس کے دل میں وسعتیں ابھر رہی
تھیں۔ اتھاہ گہرائیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔
جسم حسیات سے لت پت ہوا جا رہا تھا۔
حسیات میں رشتوں کے بندھن ابھر رہے تھے
اس کی باہیں ذولف کے گرد لپٹ پیوست
ہوگئی تھیں جیسے بیل بوٹے کے ارد گرد بل کھا
کر لپٹ جاتی ہے۔ ذولف کا ہیلمٹ سر سے
گر گیا تھا جیکٹ تار تار ہوگیا تھا۔ آنکھوں پر
چڑھے ہوئے پلاسٹک کے چھجے ریزہ ریزہ ہوگئے
تھے۔ اس کی ذات ننگی ہوگئی تھی اور ذات کی
خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا تھا۔

اگلے روز وہ بے دھڑک ڈیڈی کے
کمرے میں داخل ہوئی بولی ڈیڈی میں نے فیصلہ
کیا ہے میں ذولف سے اپنی انگیجمنٹ نہیں
توڑوں گی۔
باپ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

میں ذولف سے شادی کروں گی۔ وہ بولی
لیکن بیٹی باپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"ہی نیڈز می ڈیڈ" وہ بولی۔
"بٹ ڈو یو نیڈ ہم" باپ نے پوچھا۔
اس نے جواب دیا "آئی ڈو آئی ایم ہر

تھرمامیٹر تھرو ات از اے لینڈ آف نوریٹرن"
ڈیڈی نے چونک کر بشی کی طرف دیکھا۔
اس کے سامنے بشی نہیں بشرہ کھڑی تھی۔

جان کاشمیری
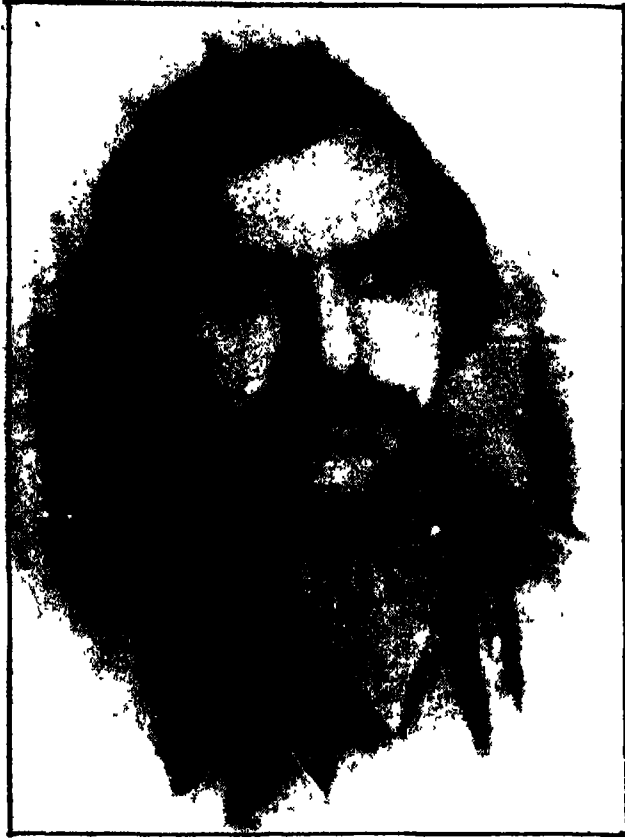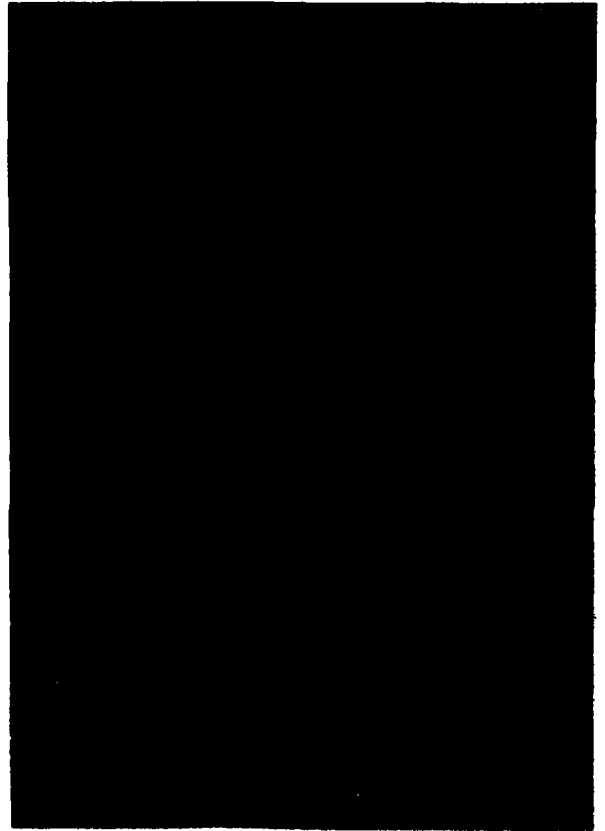
معین نجمی

درخت سے لٹکا ہوا آدمی

بس اس کا پاؤں پھسل گیا ——
لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ پاؤں پھسلتے ہی اس کے ہاتھ میں درخت کی شاخ آگئی۔

وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے نہ تو اس کا پاؤں پھسلا نہ ہی اتفاقیہ طور پر درخت کی شاخ اس کے ہاتھ میں آئی تھی۔ وہ ازل سے یوں ہی درخت کے ساتھ لٹکا ہوا تھا —— اس کا دادا پردادا اس کے قبیلے کا ہر آدمی اس طرح درخت کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ وہ سب یہیں درخت کے ساتھ لٹکے ہوئے پیدا ہوئے۔ یہیں انہوں نے اپنی زندگیاں تباہ کیں اور یہیں سے وہ.....

یہ ایک درخت تھا۔ جس کی شاخیں بوجھ کی معمولی سی زیادتی سے بھی چیخ جاتی ہیں۔ اور جو پہاڑی کے آخری کنارے پر اگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک چٹان تھی اور چٹان سے نیچے پاتال تک گہری کھائی! کھائی کے دونوں کنارے بے حد خطرناک تھے۔ لوگ آتے اور کناروں سے کترا کر گزر جاتے —— وہ پہلا شخص تھا۔ جس نے دور نیچے پاتال کی کسی گہرائی میں کھائی کی تاریک آنکھ کو دیکھا تھا ——

بدن کا سارا لہو اس کے بازوؤں میں سمٹ آیا ——

گرد و پیش میں دور دور تک کوئی بھی نہ تھا۔ بس چیڑھ کے درختوں سے لپٹی ہوئی سنسان ویرانی۔

چند جنگلی جانور جو اسے دیکھتے ہی بدک کر جنگل کی پھیلی باہنوں میں گم ہو گئے۔

وہ پھانسی پانے والے شخص کی طرح آسانی سے ٹوٹ جانے والے درخت کی شاخ سے لٹکا ہوا تھا ——

اس کے نیچے چٹان تھی —— اور چٹان سے نیچے —— بہت نیچے —— پاتال کی خوفناک آنکھ میں گم ہوتی کھائی کی گہرائی!

اچانک اسے شاخ چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ جیسے کسی نے ہولے سے سسکی بھری ہو۔ آواز کہیں اس کے اپنے اندر کی گہرائی سے بلند ہوئی تھی —— باریک —— موہوم سی آواز ——

لیکن اس نے اسے سنا نہیں دیکھا تھا۔ آواز کے گلے میں ایک بڑا سا ڈھول تھا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے ڈھول پیٹتی، اس کے اندر اندھی گہرائی کے زینے پھلانگتی، بڑی تیزی سے فراز کی جانب اٹھ رہی تھی ——

اندر سے وہ آثار قدیمہ کے کسی مینار کی طرح تھا۔ جس کی بل کھاتی سیڑھیوں کو عبور کر کے چوٹی تک پہنچنا ہر سیاح اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔

پاتال کی تاریک آنکھ میں گم ہوتی کھائی کی گہرائی کی طرح اس نے آج پہلی بار اپنے اندر جھانکا تھا ——

اس کا تن بدن لرز کر رہ گیا۔
گرد و پیش میں دور دور تک کوئی بھی نہ تھا۔ چیڑھ کے درختوں سے لپٹی ہوئی سنسان ویرانی میں ہتھیار ڈالنے سے قبل اس نے زندگی کے ہر لمحہ کھسکتے دامن کو آخری بار مضبوطی سے گرفت میں لینے کی کوشش کی ——

"کوئی ہے —— " وہ زور زور سے چیخا بچاؤ —— بچاؤ —— مجھے اندھی گہرائیوں میں ڈوبنے سے بچاؤ —— "

اس کے منہ سے نکلے ہوئے سارے

الفاظ ایک ایک کرکے ایک خوبصورت کونپل
کے جسم میں ڈھل گئے۔ اور کونپل کوکتی ہوئی
گھنے جنگل کی بھول بھلیوں سے باہر نکلنے کی
سرتوڑ کوشش کرنے لگی۔
پھر اندر کے ڈھول پیٹتی آواز کے ساتھ
چند باہر کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔
سارا گاؤں اس سے چند گز کے فاصلے پر جمع
ہو گیا۔
سارے چہرے جانے پہچانے تھے۔
ان کے ہاتھوں میں بجلی کے کوندے تھے
آنکھوں میں مایوسی کی برف!
اس کے بچنے کی انہیں بس ایک ہی صورت
دکھائی دی۔ کسی طرح وہ درخت کی جانب
کھسکتے ہوئے چٹان کے درمیان تک پہنچ کر
چٹان پر کود جائے۔ اس کا توازن نہ بگڑا تو
چٹان پر سے اسے اٹھانا مشکل نہ ہوگا۔
وہ آہستہ آہستہ چٹان کی طرف کھسکنے لگا۔
اس کے اندر شاخ کے چٹخنے کی ڈھول پیٹتی
آواز میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ اب پہلے سے
کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ زینے پھلانگتی
اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔
باہر کھڑے لوگ طرح طرح سے اس کی
ہمت بندھانے لگے۔
بابا رحیم سب سے پہلے بولا "میں تمہیں اپنے
قرض سے سبکدوش کرتا ہوں۔"
"میں نے تمہارے خلاف جو مقدمہ دائر کر
رکھا ہے۔ اس سے دستبردار ہوتا ہوں —"

ابرنے حوصلہ افزائی کے فنڈ میں اپنا چندہ ڈالا۔
"تم نے جس زمین کے بارے میں حق شفعہ
کر رکھا ہے وہ ساری زمین ہم تمہیں لوٹا دیں گے۔"
چند آوازیں ایک ساتھ گونجیں۔
"تمہارے سارے درخت میں نے کاٹے
تھے۔ میں ان کا پورا پورا معاوضہ ادا کر دوں گا۔"
"ہم آج شام تمہارے بچ جانے کی خوشی میں
ایک بہت بڑا جشن منعقد کریں گے —"
اور پھر باہر کی آوازیں بھی اندر کی آواز کی
طرح اسے صاف صاف سنائی دینے لگیں۔
سامنے کریم تھا۔ اس کا چچا۔ اس کے ساتھ
اس کے دو چچا زاد بھائی تھے۔ وہ ہمیشہ لڑائی
جھگڑے میں اس کے کندھے سے کندھا ملاکر
آن کھڑے ہوتے تھے۔ ان کی موجودگی میں
کسی کو اس کی جانب آنکھ اٹھاکر بھی دیکھنے کی
ہمت نہیں تھی۔
ان سے آگے اختر تھا۔ وہ دونوں ہم جماعت
تھے۔ بچپن سے ہی ان کا بڑا یارانہ تھا۔
اختر کے پاس اس کی ماں کھڑی تھی۔ ماں
کے چہرے پر بیٹھی مایوسی کی گدھ، اپنے خونخوار
پنجوں سے، آہستہ آہستہ اس کا منہ نوچ رہی
تھی۔ اس نے چیخ کر ماں کو گدھ کے خطرے
سے خبردار کرنے کی کوشش بھی کی مگر آواز اس
کے حلق سے باہر نہ نکل سکی۔
ماں کے ساتھ ہی چچی بھی تھی۔ وہ چچی کم اور
ان کی ماں زیادہ لگ رہی تھی۔
رانی اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے بڑی بے چین

نظر آ رہی تھی۔ رانی کی بے چینی نے اس کے اونگھتے
بازوؤں کو بھرپور جھٹکے کے ساتھ بیدار کر دیا۔
اسے رانی سے بے پناہ محبت تھی۔
وہ جب ملک سے باہر گیا تھا۔ تو رانی پیدا
بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بہت سا پیسہ کماکر گاؤں واپس
آیا تو سارے گاؤں میں بس رانی ہی رانی تھی۔
پھر آہستہ آہستہ، بالکل انجانے طور پر وہ
ساری کی ساری اس کے اندر سرایت کر گئی۔
باہر صرف اس کی پرچھائیں رہ گئی — پنگھٹ
پر۔ آنگن میں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر — ہر جگہ
اور ہر کہیں صرف اس کی پرچھائیں ہی تھی۔
لوگ اس کی پرچھائیں ہی دیکھتے۔ اس سے
بات کرتے — اس سے ملتے — وہ دونوں
خوش تھے کہ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ سب
کو دھوکہ دے رہے تھے —
پھر ایک دن گاؤں کے سب سے پرانے
درخت کی کنواری چھاؤں میں بیٹھے ہوئے
اس نے رانی سے شکوہ کیا —
"تم کہاں چلی گئی تھیں؟"
رانی ہنسی — "میں یہیں تھی۔ تم ہی کہیں
چلے گئے تھے —"
"پھر تم مجھے تلاش کرنے کیوں نہ آ گئیں؟"
وہ ہنسی —
وہ بھی ہنسا —
رانی اس کی تلاش میں نہیں آئی تو اس
نے اچھا ہی کیا تھا۔
"تم نے اچھا ہی کیا ہے —" وہ بولا۔

شہروں کی گلیاں بہت گندی ہیں۔ تم آتیں تو تمہارا بدن میلا ہو جاتا ــــ"

"ڈھول تو یہاں بھی اٹھتی ہے ــ"

رانی پھر ہنسی ــ

"لیکن گاؤں کی دھول اور شہر کی گرد میں بڑا فرق ہے ــــ گاؤں کی دھول صرف چہرے پر لگ جاتی ہے۔ شہروں کی گرد من میں اتر جاتی ہے ــــ"

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا تھا۔ آج صبح ہی ــــ لیکن اسے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا ــ

رانی کے ساتھ ہی تائی بیٹھے کھڑی تھی۔ مایوسی اس کے چہرے پر بھی بیٹھی اونگھ رہی تھی ــ

صبح کیا ہوا تھا؟ کچھ نہ کچھ ہوا تھا ــ ہاں اسے یک لخت یاد آ گیا ــــ

تائی بیلشے آئی تھی ــــ اس نے پتہ نہیں کیا کہا تھا۔ کوئی ایسی بات کہی تھی۔ جس سے بھونچال آ گیا تھا۔

اچھا ــــ اچھا ــــ اسے یاد آ گیا ــــ

وہ اسے اور اس کی ماں کو اپنے بیٹے کی منگنی پر دعوت دینے آئی تھی۔ کل اس کے بیٹے جہانگیر کی منگنی ہو رہی تھی۔ رانی کے ساتھ وہ یہ بات سن کر ہنس دیا تھا ــــ رانی تو اس کے اندر تھی۔ باہر تو صرف رانی کی پرچھائیں تھی۔ بھلا پرچھائیں کے ساتھ کیسے منگنی ہو سکتی ہے؟

تو وہ سارے گاؤں کی طرح تائی بیلشے کو بھی دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

پھر اس نے دیکھا۔

جہانگیر تائی بیلشے کے عقب میں کھسکتا ہوا بالکل رانی کے قریب آن کھڑا ہو گیا۔ اس نے چپکے سے دوسروں کی نگاہیں بچاتے ہوئے رانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ــــ وہ ایک بار پھر ہنسا ــــ "بے وقوف! اسے خبر ہی نہیں۔ رانی تو میرے اندر ہے۔ وہ رانی کی پرچھائیں پکڑنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ بھلا کوئی پرچھائیں کو بھی کبھی گرفت میں لے سکا ہے؟ بے وقوف!"

لیکن رانی کا ہاتھ پوری طرح اس کے ہاتھ میں تھا ــــ پرسکون نشے میں ڈوبا ہوا بے سدھ ــ

اندر کی ڈھول پیٹتی آواز اب نگاہوں سے اوجھل ہو چلی تھی۔ شاید اس نے اندر کے سارے زینے طے کر لئے تھے اور اب آنکھوں سے اوپر ذہن میں جا پہنچی تھی ــ

اس نے جلدی جلدی اپنے اندر جھانکا ــــ

وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

رانی نہیں تھی۔ اس کی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔ متروک معبد کے ٹوٹے ہوئے مینار کے سارے زینے سنسان پڑے تھے۔

وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔

رانی بھی نہیں تھی ــ

ذہن میں ڈھول پیٹنے کی آواز بڑی شدت کے ساتھ بلند ہونے لگی ــ

بہت سے لوگ مل کر دھمال ڈال رہے تھے۔ چٹاخ تڑاخ کی آوازیں تھیں۔ پتھر برس رہے تھے۔ بجھے ہوئے الاؤ کا دھواں تھا ــ

سارا پیش منظر دھندلا گیا تھا۔

زوردار چٹاخ کی آواز ــ

ڈھول پر سسکتی ہوئی آخری ضرب

اور وہ ٹوٹی ہوئی شاخ سمیت چٹان پر آن گرا۔

چند پتھر لڑھکے ــ

ٹوٹی ہوئی شاخ۔ پتھر اور وہ اپنے اندر کے ویران معبد سمیت پاتال کی ناراسی آنکھ میں گم ہوتی کھائی میں تیزی کے ساتھ لڑھکنے لگا۔

کنارے پر کھڑے لوگوں کو کچھ دیر تک ڈوبتی آوازوں کا ماتمی گیت سنائی دیتا رہا۔ پھر گیت کے بین ڈوبتے ڈوبتے بالکل ڈوب گئے ــــ

کنارے پر کھڑے لوگ چہرہ کے خدوخال سے لپٹی ہوئی۔ سنسان ویران کے سرنگ میں ایک ایک کر کے داخل ہو گئے ــــ

دور دن اور رات کی سرحد پر پھڑ پھڑاتی کوئل کوکتے کوکتے اچانک خاموش ہو گئی۔

گرد و پیش میں دور دور تک کچھ بھی نہ تھا!

انور عنایت اللہ

قوم کے غمگساران ـــــ ڈسکہ برادران

"گیدڑ و بندر ـــــ صرف گیدڑ و بندر" بڑے ڈاکٹر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اس پر بورڈ کے تمام ڈاکٹروں نے دائیں بائیں سر ہلایا جیسے میری صحتیابی کی اب کوئی اُمید نہ ہو۔ کل رات مجھے نرس نے ازراہِ ہمدردی بتا دیا تھا کہ مجھے جلد گیدڑ و بندر کے پاگل خانے بھجوانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹروں کو یقین تھا کہ میرا صحیح علاج وہیں ہو سکتا تھا۔

آدھی رات کو اُٹھ کر اپنی بپتا اس لئے لکھ رہا ہوں کہ شاید کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی کو یقین آ جائے کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ شاید اس طرح مجھے ملک کے اس مشہور پاگل خانے سے نجات ملے اور میری آخری رسوم میری ہی ہدایت کے مطابق ادا ہوں۔

ان لوگوں سے میری پہلی ملاقات بڑے عجیب حالات میں ہوئی۔ ان کا نام جس قدر چونکا دینے والا تھا، اتنا ہی ان کا اشتہار لکھا تھا ـــــ "ضرورت ہے ایک بڑی عمر کے نیک مسلمان کی جسے نہ مُردوں سے ڈر لگتا ہو اور نہ قبرستانوں سے وحشت۔ صحت اچھی ہو لیکن چہرہ مریضوں کا سا ہو۔ ایسے درخواست کنندہ کو ترجیح دی جائے گی جس نے حال ہی میں کم از کم تیس سال کی سرکاری ملازمت کے بعد وظیفہ لیا ہو ـــــ تنخواہ بہت معقول، دیگر سہولتیں حوصلہ افزا۔ شرح کمیشن پر بھی گفت و شنید ہو سکتی ہے۔ وغیرہ، وغیرہ"

چونتیس سال کی سرکاری ملازمت کے بعد میں پچھلے ہی ہفتے وظیفہ پا کر، بیکار ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آئندہ وقت کیسے کٹے گا۔ شادی کبھی نہیں کی تھی۔ کر کے بھی کیا کرتا؟ زیادہ وقت دفتر میں گذرتا۔ شام کو فائلوں کا پلندہ لے کر گھر آتا۔ کون سی بیوی، سرکار سے اتنی وفاداری برداشت کر سکتی۔ اسی لئے کبھی اس جھمیلے میں نہ پھنسا۔ لیکن اب زندگی میں پہلی بار تنہائی اور بیکاری کا احساس پریشان کرنے لگا۔ اس پریشانی میں، وہ کیا کہتے ہیں ـــ سیاہ بادلوں کے روشن اور سنہرے حاشیے کے روپ میں مجھے "اے ڈبلیو ڈسکہ برادران" کا اشتہار نظر آیا۔ میں نے فوراً درخواست بھیج دی۔ تیسرے دن ہی بلوا لیا گیا۔

ان کا دفتر شہر کے گنجان علاقے کی ایک نئی اور عالیشان عمارت میں تھا۔ اس کا نام ڈسکہ بلڈنگ تھا۔ اس کی گیارھویں منزل پر میں ان کے یہاں پہنچا تو دیکھا تین اور ادھیڑ عمر مومن اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر دل بیٹھ گیا۔ پھر اللہ پر بھروسہ کر کے میں نے چوتھی کرسی سنبھالی۔ جب تک میری باری آئی، ایک بج گیا۔ کمرہ کے اندر پہنچا تو تین حضرات نظر آئے جو ایک شاندار میز کی دوسری طرف بیٹھے تھے۔ درمیان میں ایک خوش شکل اور خوش پوش نوجوان بیٹھا تھا۔ اور اس کے دائیں بائیں دو بزرگ صورت حضرات بیٹھے تھے۔ نوجوان کا رنگ جتنا گورا تھا، ان دونوں کا اتنا ہی سیاہ۔ نوجوان نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور بزرگوں نے سفید شارک اسکن کی شیروانیاں،

میں نے کمرہ میں داخل ہو کر السلام علیکم کہا۔ اس پر کورس کے انداز میں جواب ملا ـــــ وعلیکم السلام۔ نوجوان نے مجھے بیٹھنے کیلئے کہا۔ میرے بیٹھتے ہی پہلا سوال داغا گیا "آپ کے یہاں سے آخری جنازہ کب اٹھا تھا؟"

اس عجیب سے سوال پر میں بُری طرح بوکھلا گیا "جی جی جی؟ جنازہ؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی ہاں ـــــ میت ـــــ معاف کیجیے۔ یہ سوال بہت اہم ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ انٹرویو آگے بڑھے اس کا جواب جاننا ضروری ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے سگریٹ کیس بڑھایا اور کہا۔ "سگریٹ؟"

"شکریہ ـــــ میں سگریٹ نہیں پیتا۔" میں نے جواب دیا۔ میرا یہ جواب غالباً انہیں پسند آیا اور تینوں نے تحسین کی نگاہوں سے پہلے مجھے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر نوجوان نے فرمایا۔

"بات یہ ہے اسلام صاحب ـــــ عوام کی خدمت کے لیے ہم جس قسم کے عظیم الشان ادارہ کی بنیاد، پاکستان میں پہلی بار رکھ رہے ہیں۔ اس کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں صرف تجربہ کار اور پُرخلوص مسلمان ساتھیوں کا تعاون حاصل ہو۔ ہم اپنے ساتھی اس وقت تک نہیں چن سکتے جب تک ہمیں ان کے بارے میں مکمل معلومات حاصل نہ ہوں۔ شکل اور صورت اور چال ڈھال سے آپ ہمارے ڈھب کے انسان لگتے ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ ہم نے اپنے اشتہار میں یہ شرط کیوں لگائی تھی کہ درخواست کنندہ کم از کم تیس سال سرکاری ملازمت کر چکا ہو ـــــ ہمیں معلوم ہے اتنی مدت میں سرکاری ملازم کا مکمل تیل نکل جاتا ہے اور چہرہ پر سنجیدگی اور حزن و ملال کے ساتھ ساتھ معاف کیجیے، وہ یتیمی برسنے لگتی ہے جسے ہمارے کاروبار میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جب تک گاہک کو تسلی نہ ہو جائے وہ کبھی مال نہیں خریدتا ـــــ ہاں اب آپ ہمارے پہلے سوال کا جواب دیجیے۔"

اس تمہید کے بعد اچھی خاصی دھند چھٹ گئی اور میں نے جواب دیا۔

"جی پچھلے سال میرے گھر سے آخری جنازہ اٹھا تھا ـــــ میری والدہ کا نوے سال کی عمر میں انتقال ہوا تھا۔"

"خوب ـــــ ہمیں سخت جان لوگوں کی ضرورت ہے ـــــ آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں۔ میں نے شادی ہی نہیں کی۔"

"بہت خوب۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ خاموش زندگی کے عادی ہیں۔ اچھا جس علاقے میں آپ رہتے ہیں۔ وہاں کتنے قبرستان ہیں؟"

"صرف ایک۔" میں نے جواب دیا۔ "میرا گھر اس کے عین مقابل ہے۔"

"بہت خوب ـــــ بلکہ بہت ہی خوب پھر تو آپ کو احساس ہوگا کہ جگہ کی ہر وقت تنگی رہتی ہوگی ـــــ کیا آپ کو معلوم ہے کراچی میں کُل کتنے قبرستان ہیں اور شہر کے کس محلے میں لوگ زیادہ مرتے ہیں؟" نوجوان نے پوچھا۔

میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو بولے "کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمارے ریسرچ ڈیویژن نے اس پر خاصا کام کیا ہے۔ ہمارے شہر میں کُل ۹۲ قبرستان ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ کس علاقے میں کتنا دباؤ ہے۔ ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ ہم شہر کے ہر علاقے میں یا اس سے قریب زمین خرید کر جدید طرز کے قبرستان بسائیں جس میں مرنے والوں کے علاوہ ان کے لواحقین کے لیے بھی ہر طرح کی سہولتیں مہیا ہوں۔ ہم نے پچھلے سال اس کی ابتدا کر دی تھی اور پائلٹ پروجیکٹ کے طور پر، شہر کے باہر، سوپر ہائی وے سے بہت قریب ایک جدید طرز کا قبرستان چالو کر دیا تھا۔ سپر ہائی وے پر آئے دن، بلکہ دن رات جس رفتار سے حادثات ہوتے ہیں۔ وہ بڑے حوصلہ افزا ہیں ـــــ ہمیں دراصل ایک قابلِ اعتماد، نیک اور شریف جنرل مینیجر کی عرصے سے تلاش تھی۔ چلیے اب یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔" ان حضرت نے اتنی لمبی تقریر کے بعد مجھے محبت سے دیکھا تو میرا دل اچھلنے لگا۔

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ ملازمت مل گئی؟" میں نے گلا صاف کر کے پوچھا۔

"جی ہاں ـــــ کیوں وحید بھائی؟" ان کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے بزرگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر انہوں نے اپنے بائیں طرف والے بزرگ سے پوچھا "آپ کی کیا رائے ہے۔ وزیر بھائی؟" انہوں نے بھی فرمانبرداری سے سر ہلا کر اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ اب نوجوان نے مسکرا کر گرمجوشی سے مجھے مبارک باد پیش کی۔ گھنٹی بجا کر اپنی پھلجھڑی جیسی سکریٹری کو بلا کر میری تقرری کے کاغذات فوراً تیار کرنے کا حکم دیا پھر فرمایا۔

"اسلام صاحب ـــــ آپ کام آج ہی سے شروع کر دیں گے۔ میرا نام ذبیح ہے۔ اور میں اسے ڈبلیو ڈسکو برادران کا چیئرمین ہوں۔ یہ وحید

بزنس میرے بڑے بھائی ہیں۔ ان کا اسلامی نام تو آپ نے سن ہی لیا۔ یہ بھی میری طرح ڈبلیو ہیں۔ دراصل یہ لوگ، میری پیدائش سے پہلے ہمارے والدین کی طرح عیسائی تھے۔ والدان کا خاندانی پیشہ تابوت فروخت کرنا تھا۔ جب ہمارے والدین کے دلوں میں اسلام کی شمع روشن ہوئی تو میرے بڑے بھائی بھی مسلمان ہو گئے۔ پہلے یہ ولیم اور ونسٹن تھے۔ اب یہ وحید اور وزیر ہیں۔ پہلے یہ لوگ ڈسکہ میں تجارت کیا کرتے تھے۔ اب کراچی میں کرتے ہیں۔ اسی لئے ڈسکہ کا نام ہماری کمپنی کے نام کا ایک اہم جزو ہے۔ پہلی ہی نظر میں آپ ہمیں قابلِ اعتماد لگے۔ آپ کی شخصیت کی سب سے اہم خصوصیت آپ کا چہرہ ہے۔ جس پر اتنی اداسی اور یتیمی برستی ہے کہ گاہک فوراً یہ سمجھتا ہے کہ آپ اس کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔"

انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرنے کے بعد اپنے دلچسپ کاروبار کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ وہ تمام اشتہار دکھائے جو اسی جمعہ کو شائع ہونے والے تھے۔ وہ اشتہاری فلم دکھائی جو ٹیلی ویژن پر چلنے والی تھی جسے دیکھتے ہی انہیں یقین تھا، بیمار چین سے مر سکیں گے۔ اور صحت مند آرزو کریں گے کہ جب ان کا آخری وقت آئے تو اس وقت وہ اسے ڈبلیو ڈسکہ برادران کو کفن دفن کے میدان میں پھلتا پھولتا دیکھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد میری تقرری کے کاغذات آگئے اور جب دستخط کے بعد میرے حوالے ہوئے تو میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ان فرشتوں نے جو تنخواہ مجھے دی تھی، اس کے تو میں نے خواب بھی نہیں دیکھے تھے۔ بہر حال میں نے گرمجوشی سے شکریہ ادا کیا تو انہوں نے دوبارہ گھنٹی بجا کر اپنی جوان سکریٹری کو بلایا اور کہا کہ وہ مجھے میرا کمرہ دکھا دے۔

وہ مجھے میرے کمرہ تک لے گئی اور کہا۔

"مسٹر اسلام۔ یہ آپ کا ادھر والا کمرہ ہے۔ اُدھر والا کمرہ کل صبح ڈرائیور آپ کو لے جا کر دکھائے گا۔"

"اُدھر والا کمرہ؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"جی ہاں مسٹر اسلام ——— کام چالو ہو گیا ہے آپ کا جاستی وقت اُدھر ہی کٹے گا۔ مہینہ میں دو چار دن ادھر آئیں گا تو یہ کمرہ استعمال کرے گا۔" اس نے اطمینان سے مجھے سمجھایا۔

"اُدھر کا مطلب قبرستان؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "جی ہاں مسٹر اسلام۔ آپ گھبرائیں نہیں وہ بہت کمفرٹیبل ہے۔"

اب تو مجھے قدرے گھبراہٹ ہوئی۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے مُردوں اور قبروں کے بیچ میں دفتر لگانا ہوگا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے قبرستانوں سے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی حالانکہ کراچی کے اکثر قبرستانوں میں بجلی کا بڑا عمدہ انتظام تھا غالباً ان میں بجلی کمپنی کے کسی نہ کسی بڑے افسر کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ضرور دفن تھا۔ جب گرمیوں میں شہر کے اکثر علاقوں میں بجلی آنکھ مچولی کھیلتی اور سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب جاتا تو بھی قبرستان ہمیشہ روشن رہتے تاکہ مُردوں کو گھبراہٹ نہ ہو۔

مجھے خاموش دیکھ کر سکریٹری مس نوران ولیمز کے ہونٹوں پر بڑی تباہ کن مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کہا۔

"آپ کا وہ دفتر تو بہت ہی شاندار ہے۔ مسٹر اسلام ——— سمر پرہائی موسم کے قریب آنے کی وجہ سے ادھر رات دن کام چلتا ہے۔ آپ کو اکثر راتیں بھی اُدھر کاٹنا ہوں گا ——— اس لئے آپ کو ہر چیز اُدھر ملیں گا ——— ائر کنڈیشنڈ کمرہ فرج، چھوٹا سا باورچی خانہ، ایک چپراسی جو بہترین باورچی بھی ہے اور ——— اور ایک ڈبل بیڈ۔" اس نے مجھے تسلی دی۔

بستر کے ذکر پر اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر تباہ کن مسکراہٹ آگئی۔ مرتا کیا نہ کرتا چپ چاپ حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ اور اللہ کا نام لے کر کام پر لگ گیا۔

میں دوسرے ہی دن اے ڈبلیو ڈسکہ کے قبرستان کو منتقل ہو گیا۔ دفتر دیکھا تو ایک بار پھر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جس پر میرے چپراسی نے فوراً مجھے بتایا کہ اس علاقے میں مچھروں اور مکھیوں کی حکومت ہے، اس لئے حیرت کے اظہار کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کروں ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔ میں نے فوراً منہ بند کر لیا اور دلچسپی سے اپنے دفتر کا جائزہ لیا۔ اس کی چھوٹی سی عمارت باہر سے بالکل ایک حسین مقبرہ کی سی تھی۔ میرے کمرہ کی تعمیر میں، روشن اور کشادہ قبر کا منصوبہ استعمال کیا گیا تھا۔ غالباً اس

لئے کہ جب لوگ کفن دفن کے سلسلے میں یہاں آئیں تو انہیں اس کی جھلک نظر آ جائے کہ ان کے لواحقین کیسے ماحول میں دفن کیا جائے گا۔ گرد و پیش کے ماحول سے مجھے وحشت تو ہوتی لیکن دیگر سہولتوں کو دیکھ کر صبر کرنا پڑا۔ بہر حال میرے مالکان کا جو بھی مقصد ہو مجھے تو اب یہیں کام کرنا تھا۔ سوچا ماحول اجنبی ہو تو اکثر کام کی نئی شیٹ میں بھی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ یہاں کا ماحول اجنبی بھی ہے اور پُراسرار بھی۔ دو چار دنوں میں عادی ہو جاؤں گا اور ساری وحشت دور ہو جائے گی اور پھر چین سے قبریں کھدواؤں گا اور مُردے دفن کراؤں گا۔ اور اطمینان سے ائیرکنڈیشنڈ کمرے سے شاہانہ حکومت چلاؤں گا۔ ایسے ہی خیالات آئے تو ہمت بندھی۔

چنانچہ ہوا بھی یہی ایک ہفتہ کے اندر اندر میں نے سارا کام اتنی خوش اسلوبی اور چابکدستی سے سنبھال لیا۔ جیسے میں کسی گورکن کی اولاد میں سے ہوں اور پچھلے سو سال سے خاندانی پیشہ ہی یہ ہو۔ اس قبرستان کا انتظام واقعی قابلِ تحسین تھا۔ پورے قبرستان کو جو کئی میل تک پھیلا ہوا تھا۔ تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا ــــ ایک غریب غربا کیلئے ایک متوسط طبقے کے لئے اور ایک رئیسوں اور امیروں کے لئے۔ یہ حصہ میرے دفتر سے تقریباً پانچ میل دور تھا۔ جب سے میں آیا تھا ـ کوئی امیر دفن ہونے کے لئے یہاں نہیں آیا تھا۔ اس لئے فی الحال مجھے وہاں تک جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن میرے چپراسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں بہت سے عالیشان مقبرے تھے، ان میں کچھ آباد تھے۔ اور باقی نئے نئے آباد کاری کے منتظر تھے۔ اے ڈبلیو ڈسکہ برادران کی کارگزاری کا عالم یہ تھا کہ ان کے اس قبرستان میں ہر سائز اور ہر قسم کی قبریں اور مقبرے تیار ملتے تاکہ فضولیات میں وقت ضائع نہ ہو۔

پہلی ملاقات کے بعد کمپنی کے مالکان سے میری بہت کم ملاقات ہوئی۔ اپنا کاروبار پورے ملک میں پھیلانے کے سلسلے میں وہ لوگ اکثر و بیشتر کراچی سے باہر رہتے۔ دفتر، مس نوران ولیمز چلاتیں اور سوپر ہائی وے والا قبرستان، ٹرک اور منی بسوں کے ڈرائیوروں کے علاوہ یہ خاکسار حقیر فقیر چلایا کرتا۔ مہینے کی آخری تاریخ کو جب میں دفتر اپنی کارگزاری کی رپورٹ دینے جاتا تو مالکان شہر میں ہوں یا باہر، مس ولیمز اپنی توبہ شکن مسکراہٹ کے ساتھ مجھے تنخواہ کا موٹا تگڑا لفافہ دیتیں۔ جس میں ہمیشہ نئے اور کرارے نوٹ ہوتے، یوں جیسے نوٹوں کا بھی اے ڈبلیو ڈسکہ برادران نے کارخانہ کھول رکھا ہو۔

ایک رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا اور شام سے کسی کا مُردہ نہیں آیا تھا۔ اس لئے میں بیٹھا بور ہو رہا تھا۔ میرا چپراسی سے اسی بوریت کے عالم میں ہست و نیست کے فلسفے پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا کہ یکایک چاروں طرف سے سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اور اس سے پہلے کہ ہم صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے اپنے قبر نما دفتر سے باہر نکلتے پولیس کے دو افسر دندناتے اندر آ گئے۔ انہیں دیکھ کر میں نے یہ سمجھا کہ غالباً شہر میں فساد ہو گیا ہے۔ جس میں ہمارے پولیس والے کام آ گئے ہیں۔ لیکن جب غور سے ان کے تیور دیکھے تو گھبراہٹ ہوئی۔ ایک افسر نے اندر آتے ہی بڑی درشتی سے پوچھا۔ "وحید، وزیر اور وسیع کہاں ہیں؟"

میرے سامنے میرے معزز مالکان کا نام کسی نے آج تک اتنی بدتمیزی سے نہیں لیا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے انہیں ڈانٹ کر کہا کہ وہ تمیز سے بات کریں۔ اس پر دوسرا افسر پستول نکال کر میری طرف بڑھا۔ لیکن پہلے نے اسے روک لیا اور کہا۔

"میاں صاحب ـــــ سارا قبرستان ہمارے گھیرے میں ہے۔ اور ہم یہاں تفریح کے لئے نہیں، تفتیش کے لئے آئے ہیں۔ ہمیں اے ڈبلیو ڈسکہ برادران کے ڈائرکٹرز کی تلاش ہے۔ آپ کو اگر علم ہے تو بتایئے۔"

"وہ یہاں کیوں ہونے لگے۔ آپ نے شہر میں کیوں نہیں تلاش کیا؟" میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"ہم سب جگہ تلاش کر چکے ہیں۔ ہم اس قبرستان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس پولیس افسر نے جیب سے تلاشی کا وارنٹ نکال کر تھما دیا۔ اب تو چھکے چھوٹ گئے۔ میں نے فوراً اجازت دے دی اور اپنے دفتر کی چابیوں کا گچھا بھی ان کے حوالے کیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب

ہو کیا رہا تھا اور کیوں ہو رہا تھا۔ میری گھبراہٹ کو دیکھ کر ایک نے پوچھا۔

"آپ کب سے ان کے ملازم ہیں؟"

"تقریباً نو مہینے سے۔" میں نے مریل آواز میں جواب دیا۔

"آپ کا زیادہ وقت یہیں گزرتا ہوگا؟"

"جی ہاں۔"

"اسی لئے آپ کو کچھ پتہ نہیں۔ یہاں کام کرنے سے پہلے آپ کیا کرتے تھے؟"

"سرکاری ملازم تھا — چونتیس سال کی سروس کے بعد سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے پنشن لی۔" میں نے فخر سے جواب دیا۔

"کون سا محکمہ تھا؟" پوچھا گیا۔ جب میں نے اپنے محکمہ کا نام بتایا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"پھر تو آپ بہت معصوم ہیں۔ کیا آپ کو کبھی شک بھی نہیں ہوا کہ آپ کے مالکان ملک کے بدنام ترین اسمگلر نہ ہیں؟

یہ قبرستان ویرستان کا چکر تو انہوں نے یوں ہی چلا رکھا ہے — ہمیں ان لوگوں پر عرصے سے شک تھا لیکن یہ لوگ اتنے چالاک اور بارسوخ ہیں کہ ہمیں ان کے خلاف کبھی کوئی ثبوت نہیں ملا۔ پرسوں کی تیز بارش کے بعد علی الصباح ایک شریف آدمی اپنے والد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے یہاں آیا۔ تو پتہ چلا کہ قبر بیٹھ گئی ہے۔ اب پریشان ہو کر اندر جھانکا تو اسے دور دور تک نہ والد مرحوم کی ہڈیاں نظر آئیں اور نہ کسی قسم کے دوسرے آثار جس سے پتہ چلتا کہ یہاں کبھی کوئی مردہ دفن تھا — تو جناب ہماری تفتیش کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوا کیونکہ اس شریف آدمی کا ایک بھتیجا پولیس سب انسپکٹر ہے — اب آپ یہ بتائیے۔ آپ کے یہاں ہر سائز کی قبریں پہلے ہی سے کھود کر تیار رکھی جاتی ہیں؟" یہ سننا تھا کہ میں سینہ پھلا کر شروع ہو گیا تفصیلات بتلانے

"جی بالکل — پہلے یہاں تو سارا کام بڑی منصوبہ بندی کے بعد ہوتا ہے۔ ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ گاہک کی پوری تسلی ہو جائے۔" چونتیس سال سرکاری ملازمت میں گزارنے کے بعد اپنے ان داتاؤں سے وفاداری میرے خون کا ایک اہم جزو بن چکی تھی

"کیا آپ نے یہ تمام قبریں دیکھی ہیں؟" افسر نے پوچھا۔

کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ جناب — یہ قبرستان چار میل چوڑا اور پانچ میل لمبا ہے جس میں کفن دفن کے علاوہ لواحقین کے لئے بھی تمام سہولتوں کا معقول انتظام ہے۔" میں نے رٹے رٹائے جملے دہرائے۔

"تو چلئے آج ہم آپ کو سیر کراتے ہیں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "گھبرائیے نہیں۔ ہمارے پاس سواری بھی ہے اور روشنی کا مناسب انتظام بھی۔"

میری سمجھ میں اب بھی نہیں آرہا تھا کہ اگر میرے مالکان بالفرض محال اسمگلر تھے تو آدھی رات کو قبرستان کی سیر کی آخر کیا تک تھی؟ اس کا جواب اس وقت ملا جب ہم پولیس کی جیپ میں سوار ہو رہے تھے۔ ایک سپاہی وہاں آیا اور اس نے بڑے ادب سے اپنے افسر کے کان میں کچھ کہا۔ یہ سنتے ہی افسر نے کہا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا — لیکن اسے گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں حوالدار — اس کی شکل دیکھو۔ بالکل یتیم لگ رہا ہے۔ فی الحال اسے ساتھ لئے چلتے ہیں۔ پوچھ گچھ کے لئے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف مڑا اور اس نے کہا۔

"ہمیں جس ثبوت کی تلاش تھی وہ مل گیا ہے۔ چل کر آپ بھی دیکھ لیجئے۔"

چنانچہ ہم جیپ میں روانہ ہوئے اور وہاں پہنچے جو خطہ امیر مُردوں کے لئے وقف تھا۔ نو مہینوں میں پہلی بار میں نے اس وسیع و عریض قبرستان کے معجزے دیکھے۔ اس پورے خطے میں روشنی ہو رہی تھی اور چاروں طرف پولیس والے حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور وہ قبروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میرے ساتھی افسر مجھے ایک بڑے مقبرے کے قریب لے گئے۔ کیونکہ وہاں سپاہی یہیں جمع تھے۔ اس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا اور اندر کی قبر کھودی جا چکی تھی۔ مردہ کی بے حرمتی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ اس لئے میں نے خوب واویلا مچایا لیکن ایک افسر نے مجھے بری

طرح سے ڈانٹ دیا۔ وہ مجھے اپنے اور اپنے کئی دوسرے افسروں کے ساتھ مقبرہ کے اندر لے گیا تو میں نے دیکھا قبر کے اندر بھی تیز روشنی تھی۔ میری کمزور آنکھیں اس تیز روشنی سے مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا یہ ایک اچھا خاصا گودام تھا۔ جس میں بڑے بڑے ملٹی چینل ویژن، وی سی آر، ہر طرح کی فلموں کے ڈبے، فریج، ریڈیو، گھڑیاں اور خدا جانے کیا کچھ تھا!

تھوڑی ہی دیر میں دوسرے مقبروں سے بھی اسمگل کیا ہوا ایسا ہی لاکھوں روپے کا سامان نکلا۔ اس رات ہمارے قبرستان میں بڑی رونق رہی کیونکہ رات بھر پولیس والوں نے تندہی سے کام کیا۔ صبح ہوتے ہوتے اطلاع آگئی کہ میرے سابق مالکان کی لانچ کو کوسٹ گارڈ نے کراچی سے بیس میل دور اس وقت پکڑ لیا جب وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ کسی پڑوسی ملک کی طرف بھاگ رہے تھے

اب آپ ہی بتائیے کسی بھی قبرستان کا نام سن کر مجھ پر دورے پڑتے ہیں۔ اور میں اپنے ڈاکٹروں سے درخواست کرتا ہوں کہ مرنے کے بعد مجھے ہرگز ہرگز کسی قبرستان میں دفن نہ کرنا بلکہ میری لاش کو سمندر میں بہا دینا تو کیا واقعی میں پاگل ہو گیا ہوں؟

سعادت سعید

نذیر قیصر

تفا سہیلی
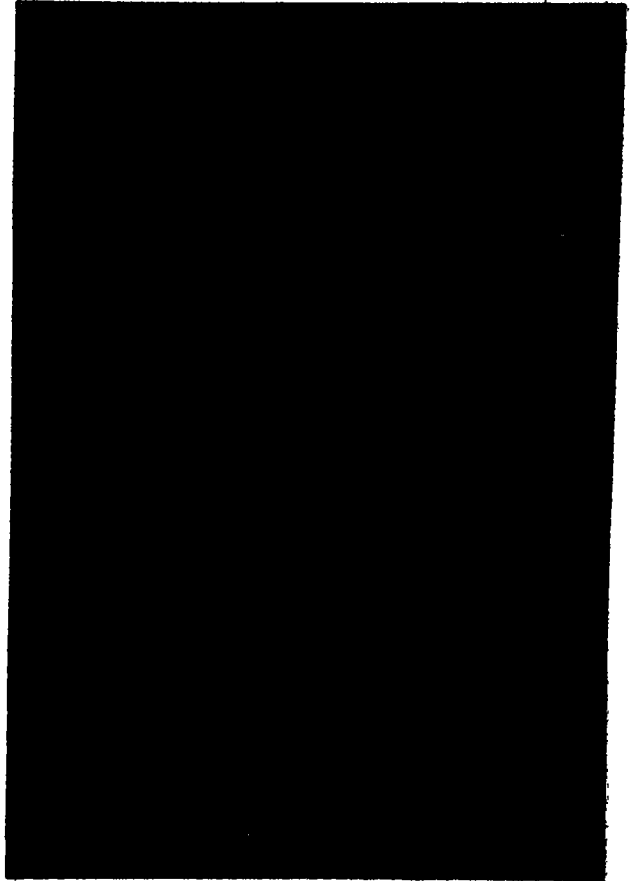
کرسٹوفر[1]

میں علم الانسان[2] کا طالب علم ہوں، ماضی کے انسانوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کے مختلف النوع مآخذ دریافت کر کر کے کتابیں لکھتا ہوں اور نت نئے شوشے چھوڑتا رہتا ہوں تاکہ دنیا کے دانشوروں کو حیران کرتا رہوں اور اپنی دکان چمکاتا رہوں، جس سے مجھے شہرت کی دولت بھی ملتی رہے اور پیچ پاچ کی دولت بھی بہم پہنچتی رہے۔ ساتھ ہی ساتھ میری تسکین نخوت کا سامان بھی مہیا ہوتا رہے۔ چنانچہ جب میں نے اس خیال سے ایک انسانی کھوپڑی کو دریافت کیا کہ اس کا قرون وسطیٰ کے زمانے سے تعلق ہوگا اور میں اس کے باب میں اہم انکشافات کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دوں گا تو معاً آنکھوں کے راستے پر ایک چیونٹی نمودار ہوئی، جونہی میں نے چاہا کہ چیونٹی کو پھونک مار کر گرادوں۔ وہ فوراً کھوپڑی کے اندر دبک گئی مشکل یہ تھی کہ کھوپڑی اس قدر خستہ تھی کہ ذرا سی جھاڑ پونچھ سے ہڈی کے ذرات ضائع ہو جانے کا احتمال تھا۔ نہ کپڑے سے اسے رگڑا جا سکتا تھا نہ برش پھیر کر صاف کیا جا سکتا تھا چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ چیونٹی کے دوبارہ نمودار ہونے کا انتظار کیا جائے چیونٹی کو جیسے میرے ارادے کی خبر ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ بھی مزے سے دبکی بیٹھی رہی۔ جیسے ہوائی حملے کا سائرن سنتے ہی لوگ پناہ گاہوں میں جاکر چھپ رہتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ اتنی سی چیونٹی میرے ارادے کے خطرناک پہلو کو کیوں کر بھانپ گئی اور ننھی سی چیونٹی کی مٹی سی جبلت نے اسے کیونکر اپنے تحفظ کا گر سکھادیا، پھر میں نے غور کیا کہ چیونٹی نے ضرور اس خاکدان استخوان میں کوئی نہ کوئی محفوظ سوراخ چن رکھا ہوگا رات زیادہ ہوتی جارہی تھی ایک دل نے کہا کہ چھوڑو بھی باقی تحقیقات کل پہ اٹھا رکھو مگر پھر اسی لمحے دوسرے دل نے کہا کہ اگر کل بھی زندگی میں نہ آسکا اور یہ تحقیق دریافت نہ ہو سکی، تو ممکن ہے کہ انسان کے ارتقا کی تاریخ

---

[1] سینٹ کرسٹوفر کے متعلق بہت سی روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو ایک بار دریا کے اس پار لے گئے تھے۔ چنانچہ ان کا یہی نام پڑ گیا (یونانی زبان میں کرسٹوفروس کا مطلب ہے کہ عیسیٰ کو لے جانے والا) بعض روایات کے مطابق کرسٹوفر کتے کی شکل کے ایک دیو تھے۔ بپتسمہ کے بعد ان کے خدوخال انسان کے ہو گئے۔ بعض روایات یوں ہیں کہ وہ غیر معمولی حسین، خوبصورت اور وجیہہ انسان تھے اور جنس مخالف کے لئے بڑی کشش رکھتے تھے۔ ترغیبات جنسی سے بچنے کے لئے انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ انہیں صنفلہ کیا جائے۔ دعا قبول ہوئی چنانچہ عورتوں کو ان کے وہ چہرے کے بجائے کتے کا سر نظر آتا تھا اور اس طرح وہ عورتوں سے محفوظ ہو گئے۔ یونانی گرجوں میں ان کی شبیہ اس طرح محفوظ کی گئی ہے (دیکھئے یونیسکو کا پیامی مارچ ۱۹۷۰ء سال ۱۱ شمارہ ۲ سرورق کا صفحہ ۲)

[2] ANTHROPLOGY

میں کچھ کمی نہ ہو جائے اور پھر ممکن ہے کہ مستقبل کا کوئی انسان میری کھوپڑی کو سامنے رکھ کر وہ باتیں دریافت کرنا چاہے جو اس وقت میرے ذہن میں رینگ رہی ہیں۔ اور دونوں دنیاؤں کے مابین زمان و مکان کا فاصلہ کئی صدیوں اور قرنوں پر محیط ہو اور وہ نکتہ آئندہ زمانے کے انسان کے لئے فرسودہ ہو چکا ہو، لہٰذا کل کے بجائے آج ہی سارا کام کیا جانا چاہیئے۔

سونا چاہیئے نیند آرہی ہے۔

نہیں جاگنا چاہیے اور اپنا فرض بجا لانا چاہیئے

سونا ہرگز مناسب نہیں۔

نہیں سونا چاہیئے، نیند کا غلبہ بڑھ رہا ہے پپوٹے بھاری ہو رہے ہیں۔ جماہیاں آرہی ہیں۔ مگر فرض ——— سونا ——— جاگنا ——— شاید میں سو گیا، یا شاید نہیں سویا، لیکن کچھ تو ہوا کہ ذہن میں ایک زوردار دھماکا سا ہوا اور معاً دھواں سا پھیل گیا اور میں دھند کے گہرے سمندر میں غوطے کھانے لگا، کبھی پاتال میں دھنستا چلا جاتا، کبھی اوپر کی طرف اٹھتا چلا جاتا۔ اسی اثناء میں میں نے دیکھا کہ ہزارہا چیونٹیاں سنہری پروں کو ہلا ہلا کر اُڑ رہی ہیں، ان کے پنکھ نہایت خوبصورت ہیں اور اُڑنے کی رفتار نہایت تیز ہے، پھر یوں ہوا کہ ایک خوبصورت پروں والی چیونٹی میری ناک پر آکر بیٹھ گئی اور باقاعدہ ہاتھ ہلا ہلا کر مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگی، اگرچہ اس کی نسائی آواز میں موسیقیت اور غنائیت کا جادو موجود تھا۔ جس میں سحر چھپا ہوا تھا۔ جس سے میں خود بخود مسحور اور مبہوت ہو رہا تھا۔ لیکن چیونٹی کی زبان مطلقاً میرے پلے نہ پڑی۔ میری کم فہمی کو دیکھ کر چیونٹی ہنسی اور معاً اس نے دستک دی، جسے سن کر آس پاس اُڑنے والی چیونٹیوں نے قطار بنا کر مجھ پر گرنا شروع کیا، جو چیونٹی بھی مجھ پر گرتی ایک حسین پری کا روپ دھار لیتی، دیکھتے دیکھتے میں حسینوں کے جھرمٹ میں پہنچ گیا۔ اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ تو میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت بارہ دری بنی ہے، سنگِ مرمر کے خوبصورت حوضوں میں فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ باریک پردے دروں پر پڑے زحمت نما ہوا سے ہلکورے لے رہے ہیں۔ مسندیں لگی ہیں۔ اور صدر نشین میرے ہمراہ ایک مہوش ہے۔ اور پریوں کا رقص ہو رہا ہے۔ پھر نہ معلوم کیا ہوا کہ وہ مہوش بھی اُٹھ کر رقص کرنے لگی۔ مجھے بھی دعوتِ رقص دی۔ میں جونہی اُٹھا کہ اُسے تھام کر محوِ رقص ہو جاؤں کہ کسی نے گرج کر کہا کہ خبردار اس پری کو ہاتھ نہ لگانا ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے۔ میں نے غور کیا تو تمام پریاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اور میرے جسم میں بھی رعشہ پڑا ہوا تھا، بارہ دری کے در و دیوار لرز رہے تھے، پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو میں بالکل کسی داستانی فضا میں پہنچ گیا ہوں۔ کہیں یہ سب فریبِ نظر تو نہیں لیکن فوراً ایک زوردار دھماکہ پھر ہوا اور آسمان سے ایک انسانی کھوپڑی اتر کر میرے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ اور اسی کی آنکھوں کے خلا سے ایک چیونٹی نمودار ہوئی اور لوٹ پوٹ کر ایک شہزادی بن گئی۔ اور اس شہزادی نے کہا کہ اے شخص میں زندگی ہوں۔ میں نے کہا کیا زندگی موت کے مدفن میں پناہ گزین تھی، کیا موت نے زندگی کو ختم نہیں کیا؟ ——— زندگی ہنسی اور بولی، میں وہ زندگی نہیں ہوں۔ جو تحلیل ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔ میں امر ہوں، میں کبھی نہیں مرتی، پھر میں نے کہا کہ مگر اس کھوپڑی کی ہڈیاں تو خشک ہو کر جھڑ رہی ہیں اور اس کے ذرات تک بکھرنے والے ہیں۔ میں تو ان کے بکھر جانے سے پہلے تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی مسکرائی اور بولی ذرا غور سے دیکھو میں نے کھوپڑی کو پھر غور سے دیکھا تو معاً اس پر گوشت پوست چڑھنے لگا، رنگ و روغن بھرنے لگا اور دیکھتے دیکھتے وہ کھوپڑی ایک حسین و جمیل خوش پوش نوجوان بن گئی۔ لیکن یہ نوجوان اپنے لباس کے لحاظ سے بالکل اجنبی تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے یونانی لباس میں وہ ایسا جاذبِ توجہ تھا کہ پریاں ٹوٹ ٹوٹ کر اس پر گرنے لگیں۔ اور وہ حواس باختہ ہو کر ادھر اُدھر چھپتا پھرتا تھا۔ مگر ان پری پیکروں اور مہوشوں نے کچھ اس طرح اسے چاہا کہ بیچارہ سجدے میں گر کر گڑگڑانے لگا۔ اے اللہ مجھے اس مصیبت سے بچا، میری حفاظت کر، فوراً اس کا چہرہ بدلا اور خوبصورتی مسخ ہوئی اور وہ کتے کی شکل اختیار کر

گیا، گو جسم انسان کا رہا مگر چہرہ کتے کا بن گیا ــــ میں نے کہا اے نوجوان یہ کیا، بولا "اے شخص اب میں وہ ہوں کہ جو میں ہوں مگر نظر وہ آرہا ہوں کہ جو نہیں ہوں"، میں نے پوچھا کہ تو کیا تم کتے نہیں ہو، وہ بولا نہیں میں انسان ہوں مگر طمع اور حرص کی نگاہ مجھ پر پڑتی ہے۔ تو میرے چہرے کے آئینے میں اپنا ہی چہرہ دیکھتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ یہ میں ہوں، گو میں نہیں ہوں اور فی الحقیقت یہی ہوا کہ پری وش اسے دیکھ دیکھ کر گھن کھاتیں اور اس کا پنڈ چھوڑ جاتیں، دیکھتے دیکھتے وہاں سناٹا ہو گیا۔ اور نوجوان بولا دیکھا کیسا غچّہ دیا کیسی جان بچائی، میں بولا بھئی یہ نقاب تو اچھی تمہارے ہاتھ آئی، جب چاہا چڑھائی اور اپنی صورت مسخ کر لی، نوجوان ہنسا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ٹہلنے لگا، پھر اس کے قدم خود بخود متحرک ہونے لگے اور ہم دونوں رقص کرنے لگے، زور زور سے ناچنے لگے اور دائرے بنا بنا کر خوب ناچنے لگے کہ اچانک میرا دماغ چکر گھنی بن گیا، لٹو کی طرح ناچنے لگا۔ اور پھر مجھے اتنے زور کا چکر آیا کہ ــــ میں دھم سے گر پڑا، اور کھوپڑی ــــ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی، میری آنکھ کھل گئی، کھوپڑی پک کر زمین کے فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ میں نے روشنی میں غور سے دیکھا تو زمین کے جس فرش پر کھوپڑی گری تھی۔ اس پر میری ہی سرزمین کا نقشہ کندہ تھا اور جابجا چیونٹیاں رینگ رہی تھیں، اتھاہ چیونٹیوں کا ریلا کہیں سے آگیا تھا۔ جس نے تمام نقشے کو سیاہ کر دیا تھا، ایسا سیاہ کہ کھوپڑی کے ذرات تک ان میں چھپ گئے۔

سرور کاشمیری

ظہیر پراچہ

اندھا فرشتہ

"میں اپنے دفتر کے کمرے میں اکیلا بیٹھا سوچوں میں گم ہوں۔"

فائلوں کا ڈھیر میری میز پر پڑا ہے مگر میرا کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ رات کا اتفاقی واقعہ میرے ذہنی سلامتیوں کو تاراج کئے ڈال رہا ہے۔

"کیا یہ سب سچ تھا!" میں سوچ رہا ہوں۔

آٹھ سال کی مدت کے بعد وہ اچانک پھر مجھے مل گئی۔ سامان چیک کرا کے میں اس مختصر سی انتظار گاہ میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہی مخصوص تمکنت اور معصومیت اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ میں لمحہ بھر کو دروازے پر ٹھٹھکا اور پھر اپنے حواس مجتمع کر کے اس کے عین مقابل پہنچ گیا۔

"ہیلو ——" میں نے پوری طرح خود پر قابو پا کر کہا۔

اس نے بے حد پھرتی سے چونک کر سر اٹھایا!

آپ!" وہ غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہو کیسی ہو!" میں نے نظریں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔ بہت اچھی —— تم سناؤ؟" اب وہ سنبھل چکی تھی۔

"کدھر کا قصد ہے۔" میں نے پھر اس کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔

"امریکہ جا رہی ہوں۔" وہ مسکرائی اور اس کے لب کپکپا کر رہ گئے۔

"ابھی ——؟" میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"ہاں ہاں سچ۔ میں امریکہ جا رہی ہوں۔ وہاں نوکری مل گئی ہے مجھے۔"

"تم اکیلی ہی جا رہی ہو۔"

"یہ بچے میرے ساتھ ہیں۔ اس نے دو چھوٹے پیارے پیارے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارے ہی ہیں نا۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"تو اور کیا —— جلد بازی میں وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ میں سمجھ گیا وہ کیا کہنے والی تھی۔ اس کی سدا سے یہی عادت تھی۔ جو منہ میں آیا فوراً بول گئی، جو دل چاہا فوراً کر گزری۔ اپنی کچھ اسی قسم کی خصوصیات سے وہ کالج کی مقبول ترین لڑکی تھی۔ کلاس کے سبھی لڑکے لڑکیوں سے اس کی یکساں طور پر دوستی تھی۔ اور اس کے مساوی رویے کی بنا پر ہم سب میں رقابت کی رسہ کشی تھی مگر کھل کر نہیں۔ بس اندرون خانہ سب ایک دوسرے پر طنز کے تیر چلاتے رہتے تھے۔ باری باری سبھی لوگ شاید اس سے اظہارِ عشق کر چکے تھے اور وہ سب کو چٹکیوں میں اڑا رہی تھی مگر ہر شخص اس کے سامنے سنجیدہ تھا۔ اس کے چہرے پر کھیلتی ہمہ وقت کی معصومیت سب کو غلط فہمی میں مبتلا رکھے ہوئے تھی۔ دو سال کی خاصی طویل رفاقت کے بعد ہم سب الگ الگ ہو گئے۔ گویا وہ سب کو رجیکٹ کر چکی تھی۔ ان ٹھکرائے جانے والوں میں میں بھی تھا۔ جو اس کے انکار کے باوجود اسے چاہے جا رہا تھا۔ مجھے بھی اس کی پرواہ نہیں تھی۔ چاہت کے بارے میں میرا نظریہ کچھ مختلف ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ محبت یک طرفہ نہیں ہو سکتی۔ مگر میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ چاہت تو ایک معطر پودا ہے جو زندگی کی بنجر زمین کو سدا شاداب رکھتا ہے محبت کی مہک سے انسان کا انگ انگ مہکتا رہتا ہے اور جینے کا حوصلہ ملتا رہتا ہے۔ میں نے یہ ضرور چاہا تھا کہ روتیہ کو علم ہو جائے میری والہانہ چاہت کا اور وہ بخوبی جانتی تھی کہ میں اس کا کس قدر پرستار ہوں پر میں اس کا رفیقِ سفر بننے کے لائق نہ تھا —— میں

بھی اس کے معیار پر پورا نہ اتر سکا۔"

مگر پھر کچھ وقت بیکاری کا کاٹنے کے بعد بہرطور مجھے نوکری کا پروانہ مل گیا اور میں پھر اس شہر میں آ گیا مگر خواہش کے باوجود روبیہ سے مل نہ سکا۔ میں نے سنا کہ وہ ایک ڈانسنگ کلب میں ناچ کی تربیت لے رہی ہے مجھے مطلق حیرت نہ ہوئی۔ وہ کسی بھی وقت کوئی بھی حیرت انگیز کام کر سکتی تھی۔ میں اس کے میلانِ طبع سے اچھی طرح واقف تھا اور وہ مجھے ہرحال اور ہر روپ میں پسند تھی پھر بھی میں چاہتا تھا۔ وہ تباہ ہونے سے بچ جائے۔ اُسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مگر وہ بغیر دیکھے چلنے کی عادی تھی۔ اس کے سامنے کھائی ہے یا ہموار راستہ، یہ اس نے کبھی نہ سوچا تھا پھر اچانک پتہ چلا کہ اس نے شادی کر لی ہے۔

میں بھونچکارہ گیا۔

"کون ہے وہ جو روبیہ کا رفیقِ زندگی بنا، کس پر اس کی نظرِ التفات پڑی؟" رشک کے شدید احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں۔

"کاش! وہ خوش نصیب میں ہی ہوتا۔ تب زندگی کتنی پُرمسرت گزرتی"

مگر بہرطور وہ خوش بختی میرے قریب سے ہو کر گزر گئی تھی۔ اور وقت کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ اور آج آٹھ سال کی طویل مدت کے بعد وہ وقتی طور پر میری ہمسفر تھی۔

"تم ——— اور آپ کدھر جا رہے ہیں؟ وہ ہکلائی "میں صرف کراچی تک تمہیں ہم سفر بننے کی زحمت دوں گا۔" میرے طنز کو اس نے مسکرا کر قبول کیا بولی "کمبا کرتے ہو"

"وہی جو تم امریکہ میں کرنے جا رہی ہو" وہ پھر ہنس پڑی۔

"شادی وادی تو کر لی ہو گی تم نے ———"

"ظاہر ہے۔ تمہاری طرف سے کچھ امید ہوتی تو انتظار بھی کرتا" میں نے اسی کٹیلے لہجے میں کہا۔

"ابھی تک بالکل ویسے ہی ہو" وہ جھینپ سی گئی۔

"اور تمہاری طرح بدتمیز ہوں کیا؟ تم خلافِ عادت شرمانا جو سیکھ گئی ہو"

"اوہ ———" اناؤنسر کی آواز سنائی دی اور ہم اپنے اپنے سفری بیگ سنبھال کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"لاؤ تمہاری بیٹی کو میں اٹھا لوں" میں نے پیش کش کی ———

"تمہیں بچے اٹھانا نہیں آتے ہوں گے۔ اس کی انگلی پکڑ لو" اس نے ساتھ چلتے ہوئے بیٹے کی انگلی مجھے تھما دی۔

"تمہیں کوئی چھوڑنے نہیں آیا؟ جہاز پر چڑھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

"کون آتا؟" وہ بے نیازی سے بولی۔

"تمہارا ———"

"اس سے تو بھاگ کر جا رہی ہوں" اس نے بیساختگی سے جملہ اچھالا۔

میں نے مذاق سمجھا مگر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر وہ بولی۔

"تمہیں پتہ ہے نا کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی"

"مذاق تو کر سکتی ہو نا"

"مگر یہ مذاق نہیں"

"پھر ———"

"یہ حقیقت ہے" وہ بولی۔ "میں اسی شخص سے بچ کر جا رہی ہوں۔ جس کو تم سب پر میں نے سبقت دی۔ اور دل کی گہرائیوں سے چاہا۔ اور آج جبکہ میں ملک چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ ہمیشہ کے لئے تو اچانک تم مل گئے ہو۔ اب میں سوچتی ہوں کہ اپنی شکست کا اعتراف کرتی چلوں۔ میں کوئی بوجھ یہاں سے لے کر جانا نہیں چاہتی۔ تم نہ ملتے تو شاید تمام زندگی یہ بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرتی"

"بوجھ نہیں روبیہ! میں تمہاری زندگی کا شریک نہ بن سکا، تمہارے دکھ تو بانٹ سکتا ہوں

میری آواز غیرارادی طور پر رندھ گئی۔

رات دس بجے ہمارے جہاز نے کراچی ایئرپورٹ پر لینڈ کیا۔ میرا سفر ختم ہو چکا تھا۔ مگر روبیہ کے سفر کا تو ابھی آغاز تھا۔ ڈیڑھ بجے رات اس نے کراچی کو پاکستان کو خدا حافظ کہنا تھا۔

"تم گھر نہیں جاؤ گے۔ تمہاری بیگم منتظر ہو گی" اپنے ساتھ رہنے پر مجھے آمادہ دیکھ کر وہ بولی۔

"تمام زندگی کے انتظار کے بعد جب مجھے چند لمحوں کی تمہاری رفاقت ملی ہے تو اس موقع کو کیسے گنوا دوں۔ اور پھر تم نے ———"

"اچھا تو تم مجھے شکست خوردہ دیکھنا چاہتے ہو" اس نے ہرنی جیسی چوکنی آنکھوں سے مجھے تاکا۔

"یہ بات ہے تو رہنے دو۔ روبیہ میں تمہیں شکست خوردہ دیکھنے کا کبھی بھی خواہشمند نہیں رہا۔ خدارا میری چاہت پر الزام تراشی نہ کرو" میں نے التجا کی۔

اس نے مختصر لفظوں میں اپنی طویل سانحہ

اندھا چھ زندگی کا حال یوں سنایا۔

"راحیل! میں نے زندگی میں بے شمار غلطیاں کی ہیں ہر ہر قدم پہ ٹھوکر کھائی۔ مگر اس آخری ٹھوکر کی چوٹ میں برداشت نہیں کر سکی۔ یہ بات اس قدر ناقابلِ یقین ہے۔ راحیل کہ ——— میں کیسے کہوں کیا تم سوچ سکتے ہو کہ کوئی سگی بھتیجی اپنے چچا کی محبوبہ ہو سکتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔ دیکھو کیا یہ ممکن ہے ——— یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا کہ ایک بالکل سگا چچا اپنی بھتیجی سے عشق کرتا ہو اور صرف عشق ہی نہیں ——— راحیل تم سن رہے ہو نا ——— میں نے ان کو ایسی کیفیات میں دیکھا کہ پتھر کا بت بن کر رہ گئی ——— مجھے اپنی آنکھوں پہ کبھی یقین نہ آیا اور وہ شخص، جس پر میں سب سے زیادہ بھروسہ کرتی تھی، میری سادگی کا فائدہ اٹھا کر مجھے بیوقوف بناتا رہا ——— سنو! ہر بار وہ مجھے جھٹلانے میں کامیاب ہو جاتا رہا ——— پھر وہ لمحہ بھی آگیا جب فریب کی ہر دیوار گر گئی اور حقیقت اپنی پوری سچائی کے ساتھ مجھ پر آشکارا ہو گئی ——— جانتے ہو پھر میں نے کیا کیا ——— میں چپ چاپ ان کی راہ سے ہٹ گئی ——— جن کے ضمیر مردہ ہو کر گل سڑ گئے ہوں۔ ان کو اچھائی یا برائی کی تمیز نہیں رہتی ——— جانے کب سے وہ لوگ یہ کھیل کھیل رہے تھے ——— میں اس ڈرامے کا کردار بہر حال نہیں بن سکتی تھی اور اب میں جا رہی ہوں ——— میں جانتی ہوں کہ میرے اس عمل سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، وہ لوگ اور بھی آزادی کے ساتھ یہ ڈرامہ رچاتے رہیں گے ——— مگر مجھے کیا ——— مجھے تو یہ افسوس ہے کہ میں نے آج تک ہر کام غلط کیا ——— تم شاید نہیں جانتے اپنی شادی پر میں نے پورے خاندان کی مخالفت مول لی تھی ——— وہ میرے اسٹینڈرڈ کا بھی نہیں تھا۔ پھر پتہ نہیں کیسے مجھے پسند آگیا ——— محبت تو اندھی ہوتی ہے نا راحیل ——— یہ بات پکی ہے ——— میں تمہیں بتاؤں راحیل آج بھی مجھے اس سے چھٹنے کا افسوس ہے۔ میں شاید ساری زندگی بھی اسے بھلا نہ سکوں گی مگر دیکھو نا اس نے غلط طریقے سے مجھے بلف کیا؟ محبت تو یکطرفہ ہو سکتی ہے مگر گزارہ کرنے کے لئے یہ فارمولا ناممکن ہے۔ تمہی بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں ——— ایسے حالات میں مجھے بھلا کیا کرنا چاہیئے تھا ——— میں نے یقیناً ٹھیک کیا ہے۔ یہاں رہتی تو مشرقی بیوی کی طرح کڑھ کڑھ کر مر جاتی ——— میں بہر حال جینا چاہتی ہوں ——— شاید زندگی میں کوئی اچھا کام مجھ سے ہو سکے ———"

روشنیوں کے شہر کی ڈوبتی، روشنیوں میں اس کے جہاز نے پرواز کی اور بھیگی بھیگی سی رات میں میں ائرپورٹ پر تنہا کھڑا اس کے طیارے کو دیکھتا رہا حتیٰ کہ جہاز کی سبز، سرخ جلتی بجھتی بتیاں میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ میں خود کو ٹوٹ پھوٹ کر بکھرتا ہوا سا محسوس کر رہا ہوں۔ رومیہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے جا چکی ہے۔ مجھے اس سے بچھڑنے کا شاید اتنا دکھ نہیں جتنا اس کے اجڑنے کا دکھ ہے۔ رومیہ یہ دکھ اٹھانے کے لئے تو نہ بنی تھی۔ ان دکھوں کا تو خود اس نے سودا کیا تھا۔"

میں اپنے دفتر کے کمرے میں اکیلا بیٹھا سوچوں میں گم ہوں۔ فائیلوں کا انبار میرے سامنے میز پر پڑا ہے۔ مگر میرا کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا ——— میں سوچتا ہوں ———

"رومیہ تم میرے اوپر ایسا بوجھ لاد گئیں جس کا وزن میں کبھی بھی کم نہ کر سکوں گا۔

تمہارے دیئے ہوئے دکھ بھی تو تمہاری محبت کی طرح امانت ہیں نا"

وقت پل پل کر کے کھسکتا جا رہا ہے۔ تم اب کہاں ہو گی، لندن، فرنکفرٹ، پیرس اور ابھی کچھ دیر بعد تم اس خوابوں کے جزیرے پر قدم رکھ چکی ہو گی۔ اور بھول کر بھی نہ سوچو گی کہ کوئی راحیل چند قدم تمہارے ساتھ چلا تھا۔ تم تو ہزاروں دھوکے کھانے کے بعد بھی اسی کی مالا جپتی رہو گی۔ جس نے تمہارے معصوم خیالوں کے محل کو بے دردی سے چکنا چور کر دیا ہے۔ ہاں رومی! محبت کا دیوتا اندھا ہوتا ہے ——— قطعی اندھا ———"

فریدہ حفیظ

چھوٹے قد کی قبر

ماں کہتی تھی سوتے بچے پر سے مت کودو اس کا قد چھوٹا رہ جائے گا۔

مگر قد تو بڑھتا رہتا ہے۔ میں جان بوجھ کر یہی دیکھنے کے لئے سوتے بچوں پر سے کود جایا کرتی تھی۔

مگر بچے بڑے ہو جاتے تھے پھر ماں کیوں یہ کہتی تھی۔

میں جب سوتے بچے پر سے چھلانگ لگاتی، تو دل میں ایک بے نام سا ڈر در آتا کہ اگر چھلانگ پوری نہ لگی تو ــــ تو میری سمجھ میں یہ بات بہت دنوں بعد آئی کہ قد چھوٹا کیوں رہ جائے گا۔

اور سونے والوں کی بستی میں ایک چبوترے پر بیٹھے بیٹھے مجھے اچانک احساس ہوا کہ وہ ایک بچے کی قبر ہے ــــ چھوٹے قد کی قبر۔

کوئی اس پر سے کود گیا ہوگا اور چھلانگ پوری نہیں لگی ہوگی۔ میرے سارے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔ جی متلانے لگا اور آنکھوں کے سامنے پیلے اور سیاہ رنگ گڈمڈ ہونے لگے اور جسم پر بہت سے بچھو چلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ کالے اور پیلے۔ اور یہ خیال آتے ہی کہ میں قبرستان میں ہوں میں خوف سے قبریں پھلانگتی بھاگ کھڑی ہوئی۔

اور اس گنجان سڑک پر آنکلی، جس کے چوراہے سے چار سے زیادہ سڑکیں کہیں جاتی تھیں اور گھوم پھر کر واپس آ جاتی تھیں۔ روشنیوں کے رنگ تھے۔ اور رنگ برنگی اشیا سے سجی دکانیں مگر دکانوں میں کوئی نہیں تھا۔ نہ خریدار نہ دکاندار ــــ اور تب ہی ایک جلتی بجھتی روشنیوں والی کار میرے پاس آ کر رکی اور اس لمبی سی کار میں سے وہ اتری تھی ــــ بال بکھرے ہوئے تھے ــــ قدموں میں ڈھلکا دوپٹہ اور ہاتھوں میں ایک مریل سا بچہ ــــ جیسے اس پر سے کوئی کود گیا ہو۔

پھر مجھے یوں لگا۔ جیسے میں اس بچے کو جانتی ہوں ــــ مگر یہ عورت کون تھی ــــ یہ بچہ اس کے ہاتھوں میں سجتا نہیں تھا ــــ یہ تو بالکل اس بچے جیسا تھا۔ جسے میں قبرستان آنے سے پہلے دور ان کھیتوں میں چھوڑ آئی تھی، جہاں پیلی سرسوں پھولی تھی اور میری جیسی بہت ساری سروں پر پھولدار چادریں ڈالے کھیتوں کی منڈیروں پر سے گزرتے ہوئے پچھلی بیساکھیوں اور بسنت رتوں کے گہواروں کو یاد کر کے غمناک ہو گئی تھیں

یوں لگتا تھا جیسے سرسوں کھیتوں میں نہیں ہمارے چہروں پر پھولی ہو۔ ہم نے گندم کی سنہری بالیوں کے گٹھے گٹھے مضبوط ہاتھوں میں تھمائے تھے اور خوش تھیں کہ ہماری کوٹھریاں دانوں سے بھر جائیں۔ ہم نے کتنے ہی گیت لہک لہک کر گائے تھے۔

اللہ میاں نے دانوں سے کوٹھری بھر دی تھیں مگر جب ہم کوٹھریوں کے دروازے کھولتے تو ان میں دانے نہ ہوتے اور سفید چوہے ناچتے نظر آتے ایسا ہر بار ہونے لگا تھا۔ ہر بار جب ہم گٹھے مضبوط ہاتھوں میں تھما دیتیں تو خوشی خوشی ان کوٹھریوں کو لیپ دیتیں جو دانوں سے بھر گئی تھیں مگر جب دروازے کھلتے تو سفید چوہے ادھر ادھر بھاگ جاتے اور دانے ہمارے بچوں کے چہروں پر نکل آتے۔ اس روز جب سرسوں پھولی تھی اور گندم کے پودے ابھی بالشت بھر زمین سے بلند ہوئے تھے آسمان بسنتی پتنگوں سے بھر گیا تھا۔ تو جانے مجھے کیوں سرسوں کے ہر پھول میں ایک مریل بچے کا چہرہ نظر آ رہا تھا اور میں گھبرا کر قبرستان میں جا بیٹھی تھی۔

اور میری ماں کہتی تھی۔ سوتے بچوں پر سے مت کودو ورنہ نہیں جن بچوں کے چہرے مجھے سرسوں میں نظر آئے تھے ان پر سے میں کودی تھی یا سفید چوہے۔

اس لئے میں نے اسے کہا کہ اس کے مریل بچے پر سے ضرور کوئی کودا ہوگا۔

تو اس کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی تھی ظاہر ہے اس کا بچہ تو اونچے جنگلے کے درمیان سوتا ہے۔ اُڑن کھٹولے جیسے — ہرے بچے کی طرح کھیت کی منڈیر پر نہیں سوتا کہ کوئی انجانے میں اس پر سے کوئی کود جائے۔

تو پھر اس بچے پر سے کون کودا تھا۔

مگر اُس نے مجھے بڑی حیرت میں ڈال دیا تھا وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا بچہ بھوکا ہے۔

کیا تمہاری کوٹھی میں بھی سفید چوہے ناچتے ہیں۔

کیا —؟ تم کیا کہہ رہی ہو میرا بچہ بھوکا ہے۔

میں نے حیران ہو کر اس لمبی کار کو دیکھا جس کی چکنی سطح پر گال رکھنے کو جی چاہتا تھا۔ میں نے اس کے ریشمیں ملائم کپڑوں کو چھونا چاہا جو گلاب کی پنکھڑی کی طرح ملائم تھے۔ میرا بچہ بھوکا ہے۔ میری چھاتیوں میں دودھ نہیں ہے۔ اس نے اپنا سینہ ننگا کر کے مجھے دکھایا۔

اف اللہ میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی — وہاں چھاتیوں کی بجائے دو گڑھے تھے اور ان میں ہزار پائے پنجے گاڑھے بیٹھے تھے۔ میں نے ڈر کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ تو بھری ہوئی چھاتیوں میں سے دودھ کے فوارے بہہ نکلے اتنا سارا دودھ لاؤ بچہ مجھے دو میں دودھ پلا دوں۔

نہیں نہیں — اس نے مجھے حقارت سے دیکھا۔

میں تم سے اس کے عوض کچھ نہ لوں گی میں تو بچے کو روز دودھ پلا دیا کروں گی۔

اوہ یہ دودھ نہیں وہ۔ اس نے ایک دکان کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں بے شمار ڈبے اوپر تلے ڈھیروں کی صورت میں رکھے تھے ان ڈبوں پر صحت مند گول مٹول بچوں کی تصویریں نہیں تھیں یہ دودھ — میں تو سمجھی تھی کہ یہ دودھ صرف اصلی دودھ ملانے میں کام آتا ہے۔ ہمارے گاؤں کا گوجر بھی دودھ شہر لے جا کر بیچتا ہے جب اس کی بھینس بھاگ جاتی ہے — اور دہی جمانے کے کام بھی آتا ہے۔ لیکن اس کا ذائقہ بڑا عجیب ہوتا ہے۔ پچھلے سال جب سیلاب آیا تھا۔ تو گاؤں میں انہوں نے بہت سارا دودھ تقسیم کیا تھا۔ جو ہم سے گوجر سارا خرید کر لے گیا۔

اوہ پاگل یہ دودھ تو بہت قیمتی ہے پھیلو والا خیراتی دودھ۔ اچھا میں نے حیرت سے اس دودھ کو دیکھا جو میری چھاتیوں سے بہہ بہہ کر زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔ اور مٹی میں سے سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھنے لگی تھی، خوشبو اس مریل سے بچے کے نتھنے میں گئی تو اس نے زبان نکال کر بلکنا شروع کر دیا۔ جانے اس میں اتنی جان کہاں سے آگئی تھی۔ وہ میری گود میں آنے کے لئے ہمکنے لگا۔ مگر اس عورت نے اسے بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اور اُسے چھوڑنے کے لئے بالکل ہی تیار نہ تھی۔

دیکھو دودھ بہہ رہا ہے۔ ضائع ہو رہا ہے لاؤ اسے میں دودھ پلا دوں۔ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں لوں گی۔

حیرت ہے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا لوگ تو دودھ پلانے والیاں ڈھونڈا کرتے تھے۔

تم جانے کیا بک رہی ہو۔ مجھے اپنے بچے کے لئے دودھ چاہیئے جو بہت دنوں سے بازار سے غائب ہو گیا ہے اور میرا بچہ دودھ کے لئے تڑپ رہا ہے۔

اچھا دودھ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ ہم نے تو آٹا غائب ہوتے دیکھا ہے۔ جب گاؤں میں کوٹھریوں میں سفید چوہے دوڑنے لگے تو بازار سے آٹا بھی غائب ہو گیا۔ بہت لمبی لائن لگتی ہے، صبح سے شام ہو جاتی ہے تب ملتا ہے آٹا مگر ویسا نہیں ہوتا۔ جیسا ہماری گندم کی سنہری بالیوں کا ہوتا ہے۔

اس نے ابھی کہا تھا نا کہ دودھ بازار سے غائب ہو گیا ہے۔ ابھی تو اس نے دکھایا تھا مجھے، ڈھیروں دودھ کے ڈبے، یہ عجیب عورت تھی — شاید اُسے نظر بھی نہیں آتا تھا — دکانوں میں ڈھیروں دودھ کے ڈبے تھے اور دودھ زمین پر بہے جا رہا تھا۔ بے چاری دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر پھر بھی مجھے نہیں دیتی تھی اسے تو کچھ نظر نہیں آتا میں خود ہی دکاندار سے ایک ڈبہ مانگ کر اسے دے دوں۔ میں دکان کی طرف بڑھی تو وہ بھی میرے ساتھ چل آئی اور ڈبوں کے ڈھیر کی طرف بڑھا

میں دکاندار کو دیکھنے لگی۔ مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ایک ڈبہ پاؤڈر ہی لوں، شاید وہ آجائے، میں نے ڈبہ اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے لپک کر میرا ہاتھ کھینچ لیا۔ عجیب عورت ہے اب اسے سب کچھ نظر آنے لگا ہے مجھے ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتی۔ مجھے تو صرف اس بچے کا خیال تھا۔

میں نے پھر ہاتھ آگے بڑھایا۔ تو وہ چیخ کر بولی اندھی ہو دیکھتی نہیں سانپ ہیں۔

سانپ ــــ کہاں ــــ میں خوف سے سہم گئی

وہ دیکھو!

ہاں سانپ تھے ہر ڈبے پر ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

اتنے ڈھیر سارے سانپ جتنے ڈبے اتنے سانپ۔

میرے اندر جیسے دودھ بننا بند ہوگیا۔ شاید خوف کے مارے سوکھ گیا تھا اور عجیب سا شور سنائی دینے لگا تھا۔

یہ کیسا شور ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا بازار میں سوکھے دودھ کے ڈبوں کی دکانوں کے سامنے چھیل کاروں، اسکوٹروں اور ٹیکسیوں کی قطاریں لگی تھیں اور مریل بچوں کو تھامے مائیں دودھ کے ڈبوں کی طرف بڑھتی تھیں مگر ڈبوں پر سانپوں کے پہرے دیکھ کر پلٹ جاتی تھیں۔ ان کے سینوں میں گڑھے تھے جن میں ہزار پائے پنجے گاڑے بیٹھے تھے۔ اور ماؤں کا سارا دودھ پی گئے تھے۔ اور بچے جس دودھ کے عادی تھے۔ اور ان پر سانپوں کا قبضہ تھا۔

وہ سانپ بھی عجیب تھے اور ان کی زبانیں بھی لمبی تھیں اور وہ بات بھی کر سکتے۔ اور ماں یہ بھی تو کہتی تھی کہ تہہ خانوں میں جہاں خزانے صدیوں تک ڈھیریوں کی صورت میں جمع ہوتے رہیں۔ ان پر سانپ آکر بیٹھ جایا کرتے ہیں۔ اور کسی کو خزانے کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ یہ سانپ بھی ڈبوں پر اسی طرح بیٹھے تھے جیسے خزانے پر بیٹھے ہوں اور وہ کہہ رہے ہیں کہ دودھ تمہاری کھالوں کے عوض ملے گا۔ ہاں ہماری کھالیں نوچ لو لیکن ہمیں دودھ دے دو ہمارے بچے بھوک سے مر رہے ہیں۔ بے شک ہمارا خون لے لو۔

خون نہیں چاہیے۔ خون کی بھری بوتلیں بڑی سستی مل جاتی ہیں۔ سُرخ یا سفید جیسا چاہو سستے داموں خرید لو۔ کھالیں نہیں ملتیں۔ جب تک ہم گاہکوں کی کھالیں نہ نوچ کھائیں۔ ہم ان ڈبوں سے نہیں ہٹ سکتے۔

اور وہ بڑا دہشت ناک منظر تھا۔ سانپ ان عورتوں کی کھالیں نوچ رہے تھے۔ کھالیں ایک چرچراہٹ کے ساتھ اپنے اپنے ادھڑتی چلی جا رہی تھیں۔ سفید اور گندمی بدنوں پہ چھوٹی شریانیں ابھر آئی تھیں۔ اور خون رس رس کر بڑے بڑے دھبوں میں پھیلتا جا رہا تھا اور سخت اذیت میں مبتلا مائیں دودھ کے ڈبوں پر جھپٹ رہی تھیں اور بچے بھوک سے چلا رہے تھے۔ لہولہان مائیں اپنے اپنے ادھڑنے کے بعد گوشت کے سُرخ تودوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اور ہاتھوں میں ڈبے تھامے یوں چل رہی تھیں جیسے قبروں میں سے ایسے مُردے نکل آئے ہوں جن کی کھالوں کو کیڑوں نے چاٹ لیا ہو اور ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ڈبے جو ان کے ہاتھوں میں تھے ان کے ڈھکنے کھول سکتیں۔

قتیل شفائی

دھوپ ہے، رنگ ہے یا صدا ہے
ذات کی بند مٹھی میں کیا ہے

چھپ گیا جب سے وہ پھول چہرہ
شہر کا شہر مُرجھا گیا ہے

کس نے دی یہ درِ دل پہ دستک؟
خود بخود گھر مرا سج رہا ہے

پوچھتا ہے وہ اپنے بدن سے
چاند کھڑکی سے کیوں جھانکتا ہے

کیوں بُرا میں کہوں دوسروں کو
وہ تو مجھ کو بھی اچھا لگا ہے

قحط بستی میں ہے نغمگی کا
مور جنگل میں جھنکارتا ہے

وہ جو گم سم سا اک شخص ہے نا
اُس کے کرب میں مُبتلا ہے

عاشقی پر لگی جب سے قدغن
درد کا ارتقاء رک گیا ہے

دن چڑھے دھوپ میں سونے والا
ہو نہ ہو رات بھر جاگتا ہے

اس قدر خوش ہوں میں اس سے مل کر
آج رونے کو جی چاہتا ہے

میرے چاروں طرف مسئلوں کا
ایک جنگل سا پھیلا ہوا ہے

دب کے بے رنگ جملوں کے نیچے
حرف کا بانکپن مر گیا ہے

بے سبب اس سے میں لڑ رہا ہوں
یہ محبت نہیں ہے تو کیا ہے

گنگنایا قتیلؔ اس کو میں نے
اس میں اب بھی غزل کا مزا ہے

لوگوں میں احتیاط کا پیکر بنا رہا
وہ میرا نام سن کے بھی پتھر بنا رہا

کھولی بیاضِ عمر تو آنکھوں میں دیر تک
یادوں کی چاند رات کا منظر بنا رہا

حالات بار بار مٹاتے نہیں کسے
میں ساری عمر حرفِ مکرّر بنا رہا

اوروں کا علم ڈال کے اپنے حساب میں
ہر آئینہ فروش، سکندر بنا رہا

جب تک درندگی کی ہوائیں چلی نہ تھیں
سنسان جنگلوں میں مرا گھر بنا رہا

جس سے ملی دلوں کو سہولت ملاپ کی
برسوں وہ ایک پل مرے اندر بنا رہا

مجھ میں بھی ایک پیاس کا دریا تھا موجزن
وہ بھی مروّتوں کا سمندر بنا رہا

کیسے نہ دوں قتیلؔ دعا اس کے فن کو
میں جس پہ شعر کہہ کے سخنور بنا رہا

عارف عبدالمتین

اپنے زخمِ نارسائی کو ہرا رکھتا ہوں میں
اک مسافر ہوں، سفر پیہم روا رکھتا ہوں میں!

دیکھتا ہوں میں بھی اوروں کی طرح اس دہر کو
دیکھنے کا زاویہ لیکن جُدا رکھتا ہوں میں

تو مجھے بیگانگی کے دشت میں تنہا نہ جان
اپنا سایہ ساتھ مثلِ آشنا رکھتا ہوں میں

ایک ذرّہ ہوں مگر اُڑتے بگولے کی طرح
وسعتِ صحرا میں ڈھلنے کی ہوا رکھتا ہوں میں

دوستوں کو گھر سے کیوں مایوس لوٹاؤں کہ جب
اپنا دروازہ عدو پر بھی کھلا رکھتا ہوں میں

سوہنی کی طرح مجھ کو پار کرنا ہے چناب
سوہنی ہی کی طرح کچا گھڑا رکھتا ہوں میں

کر مری پہچان خال و خد سے میری کے عدو خوش
عکس ہوں عارفؔ، وجودِ بے نوا رکھتا ہوں میں

احمد فراز

رتجگے ہوں کہ بھرپور نیندیں، مسلسل اُسے دیکھنا
وہ جو آنکھوں میں ہے اور آنکھوں سے اوجھل اُسے دیکھنا

اس کڑی دھوپ میں دل چٹکتے ہیں اور بام پر وہ نہیں
کل نئے موسموں میں جب آئیں گے بادل، اُسے دیکھنا

وہ جو خوشبو بھی ہے اور جگنو بھی ہے اور آنسو بھی ہے
جب ہوا گنگنائے گی، ناچیں گے جنگل، اُسے دیکھنا

جو ہواؤں میں ہے، اور صداؤں میں ہے اور دعاؤں میں ہے
کوئی پھیلائے دامن، کہ لہرائے آنچل، اُسے دیکھنا

اس طرح ایک ہی شخص، منصور و سقراط و عیسیٰ میں ہے
جس جگہ بھی جہاں بھی سجے بزمِ مقتل اُسے دیکھنا

شاعری میں بھی، اس جانِ جاں کا سراپا سماتا نہیں
اور آنکھوں کی دیرینہ خواہش کہ مکمل، اُسے دیکھنا

شام وعدہ سہی، دکھ زیادہ سہی، پھر بھی دیکھو فرازؔ
آج شب اس کی فرقت میں کہہ لو غزل، کل اُسے دیکھنا

مسعود قریشی

شہیدِ جلوہ کسی رہگزر کو کیا دیکھے
غریقِ نامہ کسی نامہ بر کو کیا دیکھے

سحر کے ساتھ ہی سر پہ چڑھا پہاڑ سا دن
سر خمیدہ جمالِ سحر کو کیا دیکھے

دبے ہوئے ہیں مکیں بارِ سنگ و آہن سے
غریبِ شہر یہاں بام و در کو کیا دیکھے

ہیں منزلیں بھی سفر میں یہ دورِ حرکت ہے
کدھر چلے کوئی راہی کدھر کو کیا دیکھے

مگن ہے سب کو سیاست کی دھن ہے دولت کی
اب اس جنوں میں کوئی خیر و شر کو کیا دیکھے

نئے نصاب میں تیرِ نظر کا باب نہیں
سو چارہ گر مرے زخمِ جگر کو کیا دیکھے

سکی ہوں گھر پہ لگا کر خلوص کی تختی
اب آئے کون ادھر میرے گھر کو کیا دیکھے

پھر ملاقات میں ہے عشق کے آغاز کا رنگ
وہی انداز کی نکہت وہی آواز کا رنگ

عام الفاظ میں پوشیدہ معانی کی تہیں
ہر نگاہِ غلط انداز لئے راز کا رنگ

آئے محفل میں تو لرزی ہیں چراغوں کی لویں
ان کی آواز سے ہے شوخ ہر اک ساز کا رنگ

سرنگوں ہیبتِ جلاد و شکوہِ سلطاں
دیدنی دار پہ تھا عشقِ سرافراز کا رنگ

حالِ دل چھپ نہ سکا پردۂ خاموشی میں
دل کی آواز بنا عارضِ غماز کا رنگ

ابن الحسن

عنوانِ سحر تھا جو گلِ تر کی زباں میں
وہ شعرِ شبِ ماہ ہوا فسطۂ بیاں میں

بجتی رہی اک کانچ کی زنجیر برابر
اک خواب سا ہم رقص رہا عمرِ رواں میں

ہنستی ہوئی آنکھوں کا تصور نہیں مٹتا
قائم ہے بہاروں کی فضا فصلِ خزاں میں

اُتری ہیں کبھی میرے دریچوں سے بھی کرنیں
اب ان کی تب و تاب ہے احساسِ زیاں میں

دن بھر تو کڑی دھوپ تھی سایہ تھا گریزاں
رات آئی ہے تنہائی ہے جان آئی ہے جاں میں

خوں نابہ فشاں خوابِ پریشاں ہے زمانہ
آرام ترے قرب سے ہے خلوتِ جاں میں

بجلی سی بہت دور کہیں کوند رہی ہے
لرزاں ہے مری جان یہاں چارہ گراں میں

ظلمت کے گراں خواب سے جاگے ہیں مگر کیا
اس دنیا سے نظر بند ہیں بے حد کے مکاں میں

کیا نعرہ بگولے پہ حق کا دشتِ خس کا
سرمایہ کے معدوم ہوا سیگ رواں میں

ناصر شہزاد

شبد میری شوبھا ہے، گیت تیرا گہنا ہے
رابطوں، رواجوں کو، ساتھ ساتھ رہنا ہے

پریت پران کی بھگتی، راں آن کی شکتی
دل بھی دے چکے تجھ کو، دکھ بھی تجھ سے کہنا ہے

نین رین سج ساگر، موج اوج رتنا گر
سر پہ چتر چندن کا، جل پری نے پہنا ہے

مدھ ملاپ کا قصہ، تیج تیاگ کا حصہ
دکھن سمان دامن میں، پریت کا اُلہنا ہے

موہنا سے ملنا ہے، پھول پھول کھلنا ہے
لہر لہر کا ہن کی، کامنا میں بہنا ہے

اب تو کاگ بھی چھت پر، بولتا نہیں آ کر
دکھ تری جدائی کا، اور کتنا سہنا ہے

محمد افضل

بنا ہے ریت پہ سب کچھ جہاں میں کیا رہ جائے
ہوا چلے تو یہاں کس کا نقش پا رہ جائے

جو چپ رہوں تو مرے دل میں کچھ گلا رہ جائے
اگر کہوں لبِ گویا پہ آبلا رہ جائے

مرے قریب نہ آ پل کی آشنائی میں
ذرا ٹھہر کہ قرابت میں فاصلا رہ جائے

میں رسم و راہ میں اب احتیاط کرتا ہوں
کہ نا تمام سا شاید یہ سلسلا رہ جائے

قدم قدم کسی صحرا کی دھول اٹھتی ہے
غبارِ راہ میں رک کر نہ قافلا رہ جائے

میں پا بہ گِل بھی ترے حسن کی تلاش میں ہوں
کہیں جگر میں نہ چاہت کا حوصلا رہ جائے

گئے دنوں کی ہواؤں سے بچ کے رہتا ہوں
یہ دل کا در کبھی افضل اگر کھلا رہ جائے

جاذب قریشی

وہ لوٹ آئے گا یہ بھی گماں نہیں مجھ میں
کہ مجھ میں دھوپ تو ہے سائباں نہیں مجھ میں

غبار سا تری پرچھائیوں میں اُڑتا ہوں
بہت دنوں سے مرے جسم و جاں نہیں مجھ میں

عداوتوں کا سفر ہے مگر اُداس نہ ہو
ترے بچھڑنے کا کوئی گماں نہیں مجھ میں

میں اپنے آپ میں اک بے کنار موسم ہوں
کوئی زمین کوئی آسماں نہیں مجھ میں

وہ عکس ہے نہ وہ آئینہ ہے نہ وہ چہرہ
یہ کیا ہوا مرا کوئی نشاں نہیں مجھ میں

میں آندھیوں میں بھی سورج کے رنگ پہنتا ہوں
ترے بدن کی مہک رائیگاں نہیں مجھ میں

مجھے تو اندھی ہواؤں میں پار اترنا ہے
کوئی ستارہ کوئی بادباں نہیں مجھ میں

نعیم اظہر

ہر گھڑی پیشِ نظر اک آئینہ رکھتا ہوں میں
خود شناسی کا جنوں حد سے سوا رکھتا ہوں میں

اس سے بڑھ کر اور کیا دکھ دوں میں اپنی ذات کو
تری یادوں کو بھی اب خود سے جدا رکھتا ہوں میں!

میں یونہی سروِ چراغاں کی طرح جلتا نہیں
دل میں خواہش کی جگہ سوزِ وفا رکھتا ہوں میں!

ہر قدم پر پھول کھلتے ہیں مری رفتار سے
سانس کے انمول پردے میں صبا رکھتا ہوں میں

مجھ کو دکھ دینے کا اپنے آپ کو مجرم نہ جان
اپنے سینے میں دلِ غم آشنا رکھتا ہوں میں!

مجھ کو تکمیلِ سفر سے کوئی نسبت ہی نہیں
نام ہر منزل کا اظہرؔ مرحلہ رکھتا ہوں میں!

شفیق سلیمی

عود کر آئی تھکن خشکی کا ٹکڑا دیکھ کر
رکھ دیئے پتوار ہاتھوں سے جزیرہ دیکھ کر

کوئی کیفیت نہ کوئی رنگ ہی ابھرے کہ لوگ
جان لیتے ہیں دلوں کا حال چہرہ دیکھ کر

میں چھپا پھرتا تھا لوگوں سے چلو اچھا ہوا
لوگ کتراتے ہیں اب میرا رویّہ دیکھ کر

آج کے انسان کی شاید یہ فطرت ہو گئی
ہر کوئی پتھر اٹھا لیتا ہے شیشہ دیکھ کر

نیند ہی آ جائے مجھ کو یا بدل جائے یہ سین
تھک چکا ہوں۔ ٹوٹ کر تاروں کا گرنا دیکھ کر

ہر کوئی اپنے میں گم اُلجھا ہوا چپ چاپ سا
ہول آتا ہے مجھے ماحول گھر کا دیکھ کر

پیاس کی شدت نے چھوڑا ہے ڈبو کر ہی مجھے
خود پہ قابو رہ سکا مجھ کو نہ دریا دیکھ کر

ظہیر پراچہ

سانس تک لینا ہو مشکل، اس قدر پانی نہ دیں
گھٹ کے مر جائیں گی ورنہ آپ ہی زندہ جڑیں

ذرّے ذرّے میں ہے قائم کچھ اتنا فاصلہ
روشنی، پانی، ہوا، آزادیوں گھومیں پھریں

یہ ضروری ہے کہ پھل آنے سے پہلے پیڑ سے
جو بھی ہوں بے فیض اور کمزور شاخیں کاٹ دیں

گرم خطّے کا شجر یوں سرد میں پھلتا نہیں
کانچ کے گھر میں نہ گر مطلوبہ گرمی دے سکیں

کیا تقاضا قرض لوٹانے کا لاغر پیڑ سے
بوجھ اترے گا اگر اثمار سے شاخیں جھکیں

کرم خوردہ بیج بوئیں گے تو فصلوں کی جگہ
کھیت میں ڈر ہے کہیں پرچھائیاں نہ آگ پڑیں

کاشت کے لیے ظہیرؔ اتنا رہے ، مدِّ نظر
بوٹے چاہے کس قدر کم ہوں مگر پھولیں پھلیں

عتیق جیلانی

موجود ہر قدم پہ وداشت ہے میرے ساتھ
زندہ مرے نسب کی شرافت ہے میرے ساتھ

جب تھا تمازتوں میں تو سائے کی فکر تھی
سائے میں ہوں تو دھوپ کی چاہت ہے میرے ساتھ

میرے لبوں پہ خواب کی خوشبو کا رنگ ہے
زندہ لہو کی ایک علامت ہے میرے ساتھ

مدت سے تیرے ہجر کی لذت کے باب میں
ہمزاد رتجگوں کی شراکت ہے میرے ساتھ

بیداریوں کی دھوپ میں محصور ہوں مگر
اپنے ہی ایک خواب کی حیرت ہے میرے ساتھ

منزدہ خواہشوں کے تعاقب کا قہر بھی
اپنے لہو کی ایک سیاست ہے میرے ساتھ

اب تک ترے سحر سے رہائی نہیں ملی
اب تک ترے بدن کی حرارت ہے میرے ساتھ

پھرتا ہے عتیق مجھے بارشوں کی بھیک
ہر گرد موسموں کی کثافت ہے میرے ساتھ

اعتبار ساجد

اندر سے کوئی گھنگرو چھنکے کوئی گیت سنیں تو لکھیں بھی
ہم دھیان کی آگ میں جلتے ہیں کچھ اور تپیں تو لکھیں بھی

یہ لوگ بچارے کیا جانیں کیوں ہم نے حرف کا جوگ لیا
اس راہ چلیں تو سمجھیں بھی، اس آگ جلیں تو لکھیں بھی

دن رات ہوئے ہم وقف رفو، اب کیا محفل، کیا فکر سخن
یہ بات رکیں تو سوچیں بھی یہ زخم سلیں تو لکھیں بھی

خالی ہے من کشکول اپنا کاغذ پہ اکٹھ کے سرمایہ
جو کشٹ کٹے سب لکھ ڈالے اب اور کریں تو لکھیں بھی

ان دیواروں سے کیا کہنا یہ پتھر کس کی سنتے ہیں
ہم جن کی خاطر لکھتے ہیں وہ لوگ ملیں تو لکھیں بھی

یہ میلانوں کے سوداگر یہ رجحانوں کے شعبدہ گر
جیبوں میں سجاتے ہیں چوٹیں کچھ دل پہ سہیں تو لکھیں بھی

ہم کس کی خاطر حرف بہ حرف کس لیے پر دل خون کریں
سب اپنی گنتی گنتے ہیں کوئی پڑھے ہیں تو لکھیں بھی۔

ناصر مسعود

دھواں اُٹھنے لگا ہے چمنیوں سے
ہوا آنے لگی ہے روزنوں سے

گھروں کی کھڑکیاں کھلنے لگی ہیں
کبوتر اڑ رہے ہیں آنگنوں سے

حصارِ سنگ جو ٹوٹا تو نکلیں!
شبیہیں پا برہنہ آئینوں سے

چلے آؤ تحرک کی زمیں پہ
پرے ان بے تموج پانیوں سے

حدِ سرسبزگی اُن کو مبارک
جو منظر لُٹ گئے تھے آندھیوں سے

ریاض ساغر

اُٹھ عشق میں یہ بھی ایک کام کر جائیں
شہر بھر کی تباہی ساتھ لے کے مر جائیں

میرے ہونٹ جل جائیں یہ دعا اگر مانگوں
آئینے اجڑ جائیں عکس سب بکھر جائیں

اپنی اپنی آنکھوں میں خاک بھر کے آئے ہو
کون چاند دیکھے گا آؤ سارے گھر جائیں

ربِّ ابر و باراں اب ایسی بارشیں برسیں
تن سے پچھلے موسم کی رنگتیں اتر جائیں

دور گر افق پر ہو تیرا چہرۂ عریاں
منزلیں نکھر جائیں راستے سنور جائیں

صبح کے اُجالے نے دربدر کیا ساغر
شام کے ستارے کو لے کے اب کدھر جائیں

مقبول عامر

بچھڑ رہا ہے کوئی شخص عمر بھر کے لئے
یہ وقت کاش ٹھہر جائے لمحہ بھر کے لئے

مرے دیار کی بیٹی ہے منتظر اس کی
جو دور دیس گیا ہے حصولِ زر کے لئے

ذرا ٹھہر کہ کسی گلفروش کے ہاں سے
میں چند ہار خریدوں اُداس گھر کے لئے

ستارۂ سحری کا ظہور کافی ہے!
طلوعِ مہر ضروری نہیں سحر کے لئے

میں شعر گوئی تمہارے لئے ہی کرتا ہوں
تمہاری داد ہے کافی میرے ہنر کے لئے

میں ایسے دیس کا دہقان ہوں جہاں عامر
زمین بھوک اُگاتی رہی بشر کے لئے

جاوید انور

بڑی ہوئی ہیں فضا میں اُداسیاں کب سے
پڑی ہیں لان میں دو خالی کرسیاں کب سے

کئی نگاہیں اسے گھیرنے کو دوڑی ہیں
پکڑ رہی ہے جو رنگین تتلیاں کب سے

زمانے بیت چلے اور کوئی نہیں آیا
گھری ہیں بوڑھی کتابوں میں لڑکیاں کب سے

مجھے بلاتے ہیں سب اس کا نام لے لے کر
ستا رہی ہیں اسے بھی سہیلیاں کب سے

حصارِ آب میں اِک بوند کے لئے جاوید
کھلی ہیں سطحِ سمندر پہ سیپیاں کب سے

معین نجمی

ایک بکھرا ہوا منظر ہوں اُٹھالے مجھ کو
چھپ کے خود اپنی ہی آنکھوں سے چرالے مجھ کو

خوبصورت سے مرے بھی کوئی معنی نکلیں
ان کہی بات ہوں ہونٹوں پہ سجالے مجھ کو

ڈھانپ لے اپنی قبا میں مری عریانی بھی
اپنے ہی جسم کا پیوند بنا لے مجھ کو

تیرے لہجے کی چُبھن سے تو میں بچ نکلا ہوں
اب ترا سنگِ نظر توڑ نہ ڈالے مجھ کو

عکس تو پل کی امانت ہیں بکھر جاتے ہیں
میں اگر رنگ ہوں آواز میں ڈھالے مجھ کو

ایک رت ایک ہی موسم کا میں شہکار نہیں
تُو بدلتے ہوئے خوابوں میں سجالے مجھ کو

ثمرِ تازہ ہوں معلوم نہیں اپنا مآل
کس کی جھولی میں گروں کون گنوالے مجھ کو

میں ہی لفظوں کے نہ گھیراؤ میں آیا نجمی
وہ تو دیتا تھا کتابوں کے حوالے مجھ کو

ذیشان ساحل

بستا جاتا ہے ترا چہرہ تیرے خواب ان آنکھوں میں
کُھلتے جاتے ہیں چاہت کے کتنے باب ان آنکھوں میں

ڈر جاتا ہوں رات گئے جب تارے ٹوٹ کے گرتے ہیں
تیز روشنی اور اندھیرا، دکھ اور عذاب ان آنکھوں میں

سامنے تیرے بیٹھا ہوں جو پڑھنا چاہے تو پڑھ لے
کُھلی ہے تیری تصویروں والی جو کتاب ان آنکھوں میں

راہ اندھیری، تنہائی، ویرانی لیکن سفر میں ہوں
تیرا تصور، تیری یاد اور تیری آب ان آنکھوں میں

سوچتا ہوں جو دل میں نہاں ہے وہ ہر اک پہ عیاں کر دوں
لیکن پھر چھا جاتا ہے وہ ترا حجاب ان آنکھوں میں

رات گئے جب ساحل کھو جاتا ہے اپنی یادوں میں
ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں چند حباب ان آنکھوں میں

علی شوکت خواجہ

لگیں جو ٹھوکریں تو کس طرح سنبھلنا ہے
یہ تجربہ بھی نہیں اور تنہا چلنا ہے

اکیلا سوچ رہا ہوں افق پہ ٹھہرا ہوا
کوئی نہیں ہے جسے میرے ساتھ ڈھلنا ہے

گرفت ہاتھوں کی ڈھیلی پڑی تو علم ہوا
یہ وہ جگہ ہے، جہاں راستہ بدلنا ہے

تری جدائی تو آنکھوں میں جگمگائے گی
بدن کے طاق میں ہر شب چراغ جلنا ہے

جو آگئی ہے رگوں تک بلائے نادیدہ
اب اس نے صدقۂ جاں لے کے سر سے ٹلنا ہے

اب اس کے زہر سے کیوں خوف سا ہے شوکت
یہ سانپ وہ ہے جسے آستیں میں پلنا ہے

ارشد جاوید

اُداسیوں کے یہ موسم گزر نہ جائیں کہیں
جو خواب ہم نے بُنے ہیں بکھر نہ جائیں کہیں

عجیب دن ہیں کہ تجھ کو بھلائے بیٹھا ہوں
محبتوں کے یہ دریا اتر نہ جائیں کہیں

تمہی کہو کہ بھلا کیا ہے زندگی میں یہاں
کہ تتلیوں کے بھی پیچھے اگر نہ جائیں کہیں

حصارِ ہجر سے نکلیں تو کس طرح نکلیں
یہ سوچ سوچ کے اے جان مر نہ جائیں کہیں

احمد ضیا

کچھ چہروں کو یاد رکھوں گا کچھ چہروں کو بھولوں گا
وہ لمحے جو بیت گئے میں اُن لمحوں کو بھولوں گا

وہ رستے سب یاد رہیں گے پہلے پہل جو میرے تھے
تو نے جو دکھلائے ہیں مجھ کو ان رستوں کو بھولوں گا

سارے حرف بکھر جاتے ہیں سارے خواب اجڑتے ہیں
اس موسم کے جاتے جاتے سب زخموں کو بھولوں گا

نئے نئے کچھ گیت لکھوں گا گیت مہکتی مٹی کے
ایک سہانی شام کے بدلے سارے غموں کو بھولوں گا

پھول چنوں گا خوشبو والے کانٹے سب رہ جائیں گے
نیک دلوں کو یاد رکھوں گا اور بدوں کو بھولوں گا

میں جب اپنے آپ ہی اپنی منزل ڈھونڈنے نکلا ہوں
راہزنوں کو بھولوں گا میں راہبروں کو بھولوں گا

جاذب کاشمیری

جھیل کی سطح پہ جب بھی کوئی ابھرا قطرہ
یاد آیا دلِ پُر خوں کے لہو کا قطرہ

چاہ کر تجھ کو بھلا کیسے ملے میرا نشاں
دل کے ساگر میں دکھائی نہیں دیتا قطرہ

قطرے قطرے ہی کا مرہونِ ہے دریا کا وجود
مجھ سے پوچھو تو حقیقت میں ہے دریا قطرہ

غم کے دوزخ میں یہ جل جل کے بنا ہے کندن
جب کہیں جا کے مری آنکھ سے ٹپکا قطرہ

منہدم کر ہی گیا شہرِ غریباں کے مکاں
برسا ہے ابر یہ اب کے جو قطرا قطرہ

پاس پہنچا تو کھلا مجھ پہ بھی یہ رازِ سراب
تھا وہ ذرہ میں جسے دور سے سمجھا قطرہ

اپنے دشمن سے بھلا خوف میں کھاؤں کیونکر
رو برو جاذِب کہاں آگ کے ٹھہرا قطرہ

احمد تنویر

آنکھوں کی بجھارت کیسی تھی
چہرے پہ عبارت کیسی تھی

سایوں کے اُدھر کیا لوگ ہوئے
چھپنے کی مہارت کیسی تھی

اس شہر کی کوئی بات کہو
سانپوں کی حقارت کیسی تھی

ہاتھوں میں اندھیرے کی چڑیا
اڑنے کی بشارت کیسی تھی

اک جھونکا اور اُداس سبھی
منظر کی شرارت کیسی تھی

کوئی بس کر اس میں خوش نہ ہوا
یہ جسم عمارت کیسی تھی

تنویرؔ شکستہ پلو رہی
خوابوں کی سفارت کیسی تھی

ایک جزیرہ ایسا جس پر کوئی نشان نہیں
جس کے اُوپر کوئی پرندہ کوئی اڑان نہیں

گیراؤ پیلے سانپوں کا اور دریا ہے دور
خیمے سے باہر جانا اتنا آسان نہیں

ہاتھ آئے گا بھید کبھی تو بند حویلی کا
وہ در بھی وا ہوں گے پھر جن کی پہچان نہیں

یہاں سے تو نہ ساتھ لگا تھا دعدے کا آسیب
یہ تو نیلی کھڑکی والا سبز مکان نہیں

تیز ہوائیں اور شکستہ بینائی تنویرؔ
آنکھ سلامت رہ جانے کا اب امکان نہیں

سرور کاشمیرانی

دل میں روشن ہو گئے ہیں میرے جذبوں کے چراغ
پھر ہوائے درد سے بھڑکے ہیں زخموں کے چراغ

منزلوں کی جستجو میں رات دن جلتے ہیں جو
ان کے نقشِ پا ہی کہلاتے ہیں رستوں کے چراغ

حادثہ ایسا ہوا کل رات دل کے شہر میں
میری پلکوں پر جلے ہیں میرے اشکوں کے چراغ

جتنی اس کی یاد آئی روشنی بڑھتی گئی
ظلمتِ دل میں ہوئے روشن اُمیدوں کے چراغ

قطرۂ شبنم بھی لَو دیتا ہے نوکِ خار پر
کون کہتا ہے کہ گل ہوتے ہیں شاخوں کے چراغ

راہ دکھلاتی ہے مجھ کو آنسوؤں کی روشنی
غم کی تاریکی میں لَو دیتے ہیں پلکوں کے چراغ

کس کی خاطر تیرگی میں ٹھوکریں کھاتا ہے تو
تو نے کس کو دے دیئے تحفے میں آنکھوں کے چراغ

آنے والے وقت کے طوفان کو روکے گا کون
کون آندھی میں جلائے گا اشکوں کے چراغ

زور چاہے لاکھ ہو سرکش ہوائے کرب کا
بجھ نہیں سکتے ہیں ہر گز میری سوچوں کے چراغ

ستمبر ۱۹۷۹ء

احسن زیدی

انتساب[۱]

'انتساب' ریاض مجید کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے. لیکن ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے اس کے شعری مجموعوں میں اس کا چوتھا نمبر ہے. اس کی پہلی شعری کاوشیں — پس منظر، گذرے وقتوں کی عبادت، اور ڈوبتے بدن کا ہاتھ۔ غزلوں پر مشتمل تھیں۔ 'انتساب' میں اس نے اپنے شعروں کا پیکر بدلا ہے۔ غزل کی بجائے نظم کو پیرایۂ اظہار بنایا ہے اور اسی لئے یہاں اس کی شخصیت کے خدوخال زیادہ واضح اور نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں۔ غزل اپنے تمام تر ارتقا کے باوجود اپنے نقطۂ نظر کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹنے کا عمل ہے۔ جب کہ نظم وسیع تر تناظر میں بات کہنے اور شخصیت کے بھرپور اظہار کا وسیلہ اور ذریعہ ہے.

چھپن نظموں پر مشتمل اس کتاب کی پہلی نظم کا عنوان 'انتساب' ہے اور اسی نام پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ اس مجموعے کی نظمیں — نوحہ بکھرتی ذات کا — نایافت کا سفر نامہ، پچھتاوے کا طلوع، غروبِ جاں کا نوحہ، تنہائی کا بن باس — بوڑھے لمحوں میں ملنے کی طلب — ویران ایئرپورٹ، دکھ کی بات، بدن کا مرثیہ۔ جدائی کی بیاض کا آخری صفحہ۔ ساکت روشنیوں کا عذاب وغیرہ۔ اپنے عنوانات کے دریچوں سے مفہوم و معانی کا منظر دکھاتی ہیں اور یوں شاعر کے احساسات کے نقوش قاری کے سامنے واضح ہونے لگتے ہیں. ان تمام نظموں میں ایک رشتہ موجود ہے۔ یہ انسان کی بکھرتی ذات کا نوحہ ہیں۔ شاعر ایک بے چین اور بیقرار روح ہے — یہ نظمیں اسی روح کا پرتو ہیں —

جس دور میں ریاض مجید کی شاعری کا آغاز ہوا۔ وہ نعرے بازی اور پروپیگنڈے کا دور تھا۔ مگر اس صورتِ حال میں بھی قلمکاروں کا ایک گروہ ایسا تھا جو وقتی اور ہنگامی موضوعات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے انسان کے ازلی اور ابدی مسائل کی ترجمانی کا فریضہ سر انجام دے رہا تھا۔ ریاض مجید اس گروہ کا ایک اہم فرد ہے۔ اس نے اپنے دور کے انسان کا روحانی سفر نامہ لکھا ہے۔ اس نے خارجی شکست و ریخت کی بجائے داخلی اکھاڑ پچھاڑ پر اپنی توجہ مرکوز کی اور اس طرح اس کی شاعری ان متنوع کیفیات کی داستان بن گئی جن سے آج کا انسان اپنی مادی آسائشوں اور ترقیوں کے باوجود دوچار ہے اور جس سے نجات کی صورت نہ زمانۂ حال میں ممکن نظر آتی ہے نہ زمانۂ آئندہ میں — آج کا انسان روحانی طور پر بانجھ ہے اور اس کے سارے مسائل کی بنیاد یہی بانجھ پن ہے۔ زندگی کی بے مقصدیت نے فکر و نظر کو محدود کر کے بیزاری کی فضا پیدا کر دی ہے۔ جدوجہد — سعیٔ رائگاں ہے۔ حال محرومیوں سے عبارت ہے. مستقبل کی ساعتیں بے شباہت ہیں۔ لہٰذا ماضی ہی سب سے بڑی حقیقت ہے یہی وہ سرزمین ہے جو صداقت آباد ہے۔ جو شرافت نگر ہے جہاں نیکیوں کی حکمرانی ہے اور جہاں اچھائیوں کا سکہ چلتا ہے۔ یہ صداقت، یہ شرافت، یہ نیکیاں، یہ اچھائیاں مذہب کی روشن اقدار کی عطا ہیں. مذہب — جو ریاض کا روحانی تجربہ بھی ہے. اور جس کی اصطلاحوں نے اس کی شاعری میں چاندنی بکھیری ہے:

صبحِ کاذب کی دھند میں ڈبڈباتی مسجد کے
نور مینار دعوتِ خیر دے رہے ہیں
مؤذنِ نیک جاں کی فردوس روح آواز
یخ ہواؤں کو چیرتی ہے
فلاح کے راستے کی جانب بلا رہی ہے

---

۱ ریاض مجید کا مجموعۂ کلام

حرائے جاں میں صداقتوں کا نزول
ہوتا ہے
اس دھندلکے میں سوچ ــ وہ تحفہ ہے
جو دربارِ ایزدی میں قبول ہوتا ہے
(کہ ہست کا کشف ہی تجسس کا ماحصل ہے)

بقا کا اسمِ اعظم لمحہ لمحہ لوٹتے مٹتے بکھرتے
جسم و جاں پر کس طرح پھونکوں کہوں کیسے؟
مری سوچوں کے جلتے کربلا میں پاک اور
معصوم لفظوں کی زباں سوکھی پڑی ہے

ہزلے سٹیفن کے نزدیک عظیم فن کار وہ ہے جس کے پیچھے اس کے قارئین کی بہت بڑی سپاہ کھڑی ہو۔ ڈینٹے۔ ملٹن۔ شیکسپیئر سعدی۔ اقبال اسی لئے عظیم ہیں کہ ان کے قارئین کی تعداد ہر دور میں بڑھتی رہی ہے۔ ان کے ہاں ایسے موضوعات کی کمی نہیں جو ہر دور کے انسان کے لئے یکساں کشش رکھتے ہیں۔ مذہب ایسے فنکاروں کو عظیم تخلیقات کے لئے بنیادی مواد فراہم کرتا ہے میری مراد یہ نہیں کہ یہ لوگ مذہب کے مبلغ ہوتے ہیں۔ مذہب انہیں وہ روحانی تجربے کرنے میں مدد دیتا ہے جو عظیم فن پاروں کی اساس ہوتے ہیں ٹینیسن TENNYSON نے کہا تھا کہ دعاؤں کی بدولت ایسے ایسے کام سرانجام پاتے ہیں کہ دنیا اُن کا تصور بھی نہیں کر سکتی ریاض مجید نے بھی دعائیں مانگی ہیں۔ جانے کس گھڑی کونسی دُعا شرفِ قبولیت حاصل کر لے۔

ہرے پیڑوں سے روشن آگ پیدا کرنے والے
مجھے تازہ جسوں۔ تازہ حرارت سے بکھرتے
خود کو مجتمع کر کے ہزاروں آتی نسلوں کے
تسلسل میں مسلسل زیست کی نعمت عطا کر

چلو گڑگڑائیں
کہ وہ جس نے ہم سے زیادہ گناہگار لوگوں
کے رستے میں
چھاؤں چھڑکتے درختوں کی رحمت اگائی۔
ہمارے ندامت میں جلتے جہنم کو شادابیوں
کے کرم سے نوازے"

خدایا!
مراس سے ملنا مرے حق میں بہتر ہے تو مجھ
کو اس سے ملا دے

آج کے دور میں جدید علوم (سیاسیات، اقتصادیات عمرانیات) شاعری پر بھی نظر انداز ہو رہے ہیں۔ لیکن ریاض مجید نے اپنی شاعری کو ان کی پرچھائیں سے بچائے رکھا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اس مکتبۂ فکر سے ہم آہنگ کر رکھا ہے جس کی آواز بظاہر کمزور ہے لیکن جس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمعصر شعراء میں سے دو شاعروں نے اسے متاثر کیا ہے اور اس کا اظہار کرنے میں ریاض نے بخل سے کام نہیں لیا۔ جیلانی کامران کی نظم کا ایک ٹکڑا 'انتساب' کا پہلا ورق ہے۔

"تذکرہ تیرا شب و روز کے دیباچے میں،
مرتسم کرتا ہوں
جتنے بھی دن رات جیئوں، تیرا اقرار کروں
رات کی برسی ہوئی اوس، دن کے چمکتے ہوئے
سورج سے تیرا ذکر کروں
جب فراموش کروں
مرجاؤں"

ریاض مجید کی نظم 'انتساب' کا ایک اقتباس یوں ہے۔

"راتیں مہرباں ہیں
تیرا ذکر کرنے کا موقع ملا ہے
تیرا نام لکھتا ہوں۔ فرطِ عقیدت سے اپنا
قلم چومتا ہوں"

ریاض مجید نے اپنے پہلے شعری مجموعے 'پیش منظر' کا آغاز بھی سرور کامران کی چند لائنوں سے کیا ہے جیلانی کامران کی مابعدالطبیعاتی شاعری اور سرور کامران کے شدید جذباتی رنگ نے ریاض مجید کے ذہن کو متاثر ضرور کیا ہے۔ لیکن اس کے ذہن میں جڑیں نہیں پکڑیں۔ وہ خود ایک توانا شاعر ہے اس کا اپنا ڈکشن ہے۔ اور وہ زندگی کے بارے میں ایک مخصوص رویہ رکھتا ہے۔ یہی اس کی عظمت ہے یہی وہ جادوگری ہے، جس میں اسیر ہو کر قاری آسانی سے باہر نہیں نکل سکتا۔

منظر امکانی

تعارف[1]

ابنِ خلدون نے کہا تھا کہ جس معاشرے میں علم اور عالم کی قدر نہ ہو وہ معاشرہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے بغور سوچیئے تو ہمارے معاشرے کی صورتِ حال عجیب لگتی ہے البتہ ان پریشان کن حالات کے درمیان جس بات سے کچھ ہمت بڑھتی ہے اسے چند مخلص لوگوں کا والہانہ پن کہہ لیجیئے جو فروغِ علم کے لئے معروفِ عمل ہیں۔ ان مخلص افراد کی اس کوشش اور والہانہ پن سے کیا ہمارے معاشرے میں کوئی تبدیلی ممکن ہے ...؟ یہ ایک مشکل سوال ہے جس پر تفصیلی انداز سے گفتگو کرنے کا حوصلہ نہ تو مجھ میں ہے اور نہ اس کی یہاں گنجائش ہے۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شریف منور بھی ان ہی لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے ناساعد حالات کے باوجود اپنا سفر "تعارف" سے شروع کیا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ شریف منور نے اپنی کتاب کے معاملے میں جلدبازی سے کام لیا ہے بلکہ جو لوگ مختلف رسائل پڑھتے ہیں وہ ان سے ضرور واقف ہوں گے۔ چونکہ وہ گذشتہ دس سال سے لکھ رہے ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے اپنا تعلق ان ناقدین سے بھی قائم کیا ہے جن کے علم اور بلند مقام کو مدتوں پہلے تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کا ثبوت "تعارف" کے فلیپ دیکھ کر مل جائے گا۔

شریف منور کے مجموعہ کلام "تعارف" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں غزل پسند ہی نہیں بلکہ عزیز ہے اور وہ آئندہ بھی اسی سے وابستگی رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ انہوں نے دیگر اصنافِ سخن پر عبور رکھنے کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ مگر قاری "موجود" ہی پر سوچے گا اور اس کا یہ رویہ غلط نہیں۔ شریف منور کی غزل سے وابستگی کوئی جرم نہیں ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے انتخاب میں یہ جذبہ پوری شدت سے کار فرما ہے اور یہ ان کی عقلمندی بھی ہے کہ وہ کسی بڑی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوئے۔ کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ شریف منور نے سیدھے سادھے لفظوں میں اپنے تجربات قلمبند کی ہے۔ وہ بقراطیت بگھارنے کے فن سے واقف ضرور ہوں گے مگر انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی شاعری گھر سے دفتر تک جانے والے مقررہ راستوں سے دست و گریباں رہتی ہے اور اسی محدود دائرے میں انہوں نے جو کچھ سمجھا اور دیکھا اسی کے اظہار کرنے کو کافی سمجھتے ہیں البتہ انہوں نے پیش لفظ میں جو نظریۂ شاعری بیان کیا ہے اسے پڑھنے کے بعد قاری انہیں دو حصوں میں تقسیم کر سکتا ہے ایک حصہ تو شریف منور کی شاعری کی شکل میں موجود ہے جو ان کی خواہش کی تکمیل ہے اور اسی پر کچھ کہنا ممکن ہے جبکہ دوسرے حصے میں شریف منور کی سوچ ہے۔ شاید خواہش اور سوچ کا یوں مختلف ہونا آپ کو عجیب لگے چونکہ سوچ ہی خواہش بنتی ہے لیکن یہاں صورتِ حال تھوڑی سی مختلف ملے گی۔ دراصل آدمی کا عمل اس کی خواہش کا نتیجہ ضرور ہوتا ہے مگر ہر خواہش کا عمل بن جانا ممکن نہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آدمی اپنے اطراف

[1] شریف منور کا مجموعۂ کلام

جن چیزوں کو پسند کرتا ہے اور ان کا حصول چاہتا ہے ۔ اس میں بیک وقت کئی مرحلے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ ایک آدمی بازار سے گذرتے ہوئے کتنی ہی چیزوں کو پسند کرتا ہے مگر اس کی پسندیدگی سرسری ہوتی ہے ۔ بعض اوقات پسند آنے والی چیزوں کو خریدنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بعض چیزوں کی پسندیدگی اور خریدنے کے لئے پیسوں کی موجودگی بھی اُسے روک دیتی ہے اس کے برعکس کچھ چیزوں کے معاملے میں آدمی کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پیسوں کی عدم موجودگی کے بعد بھی کوشاں رہتا ہے اور اس کے حصول کے بعد مطمئن نہیں ہوتا بلکہ مختلف زاویوں سے پسندیدہ چیز کے تذکرے کرتا ہے اس کے بارے میں مسلسل سوچتا ہے یہی پسندیدگی عمل بنتی ہے۔ شریف منور کا پیش لفظ ان ہی معنوں میں ان کی شاعری سے الگ ہے انہوں نے اس تضاد پر توجہ کیوں نہیں دی ..... ؟ اس کا تسلی جواب وہ خود دے سکیں گے۔ ایک قاری کی حیثیت سے میں اسے اپنے عہد کا سانحہ تصور کرتا ہوں جس کے نتیجے میں لوگ ان مسائل پر گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں جن سے ان کا تعلق تک نہیں ہوتا یہی کرتے شریف منور کے پیش لفظ میں ملے گی۔ اپنے آپ سے الگ ہو کر سوچنا کوئی منفی رویہ تو نہیں ہے مگر بلا سوچے سمجھے قبول کرنے کی عادت اچھی نفی اور ایک سنگین مذاق ہے جس سے بات خود فریبی تک پہنچ جاتی ہے اور آپ یہ تو بخوبی جانتے ہیں کہ خود فریبی کھوکھلا پن ہوتی ہے۔

شریف منور کے نزدیک شاعری کا نظریہ کیا ہے اس کا بیان ان کے الفاظ میں سن لیجئے "شاعری میرے نزدیک فقط میکانکی عمل کا نام نہیں۔ یہ شوقِ فضول یا غیر شعوری اظہار بھی نہیں ۔ شاعر معاشرے کے حساس ترین افراد میں سے ہوتا ہے لہٰذا زندگی کے مسائل مطالبات اور عصری تقاضوں کو دوسروں سے کہیں زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ وہ زندگی اور کائنات میں حسن و جمال کی جستجو کرتا ہے لیکن انہیں حسین تر دیکھنے کا آرزومند بھی ہوتا ہے۔ یہ آرزومندی احساس میں رچ بس کر جب لبوں کو متحرک کرتی ہے تو وہ آواز پیدا ہوتی ہے جو زندگی اور کائنات میں رشتہ قائم کرتی ہے۔" اس اقتباس میں متضاد باتوں کی موجودگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شریف منور نے انہیں لکھتے ہوئے گہری توجہ سے نہیں سوچا۔ اپنے لہجے میں اپنی بات کا کہنا مشکل ترین کام ہی نہیں بلکہ جان لیوا عمل بھی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر عہد میں اس بلند قد و قامت کے چند لوگ ہوتے ہیں۔ البتہ چراغ سے چراغ جلانے کی روایت کبھی ختم نہیں ہوئی اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہے، بس اصل مسئلہ یہ ہے کہ آدمی پہلے خود کو سمجھ لے اس کے بعد دیگر مراحل طے ہو جاتے ہیں شریف منور کے مزاج میں اس رویے کی بدولت جو بات پیدا ہوئی ہے اسے میں نیم خود فریبی سمجھتا ہوں۔ اس نیم خود فریبی کے حصار میں آجانے سے ان کی شاعری مختلف آوازوں کے زیر اثر لگتی ہے۔ دوسری طرف ان کے اشعار دیگر معاصرین کے حوالے سے اتنی واضح شکل اختیار کر گئے ہیں کہ ان کا ذاتی فکری سرمایہ بھی مشکوک لگتا ہے۔

شریف منور کے بارے میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ ان کی مختلف رسائل سے وابستگی کافی پرانی ہے۔ اس طویل عرصے کی مسافت کے دوران انہوں نے خود کو بھی اسی تک محدود کر دیا ہے۔ ان کی شاعری میں مشاہدہ اور تجربہ موجود ہے مگر رسائل کے مطالعہ کی چھاپ زیادہ واضح ہے۔ شریف منور میں اس رویے سے جو خطرناک صورت ابھری ہے اسے میں بڑی شکل میں سلیم کوثر میں دیکھتا ہوں۔ شریف منور پسندیدگی کے معاملے میں بہت جلد باز واقع ہوئے ہیں اور یہی جلد بازی ان میں دوسروں کے مال کو اپنا بنانے تک پہنچ گئی ہے "تعارف" میں اس قسم کے رنگوں کی آمیزش کثرت سے ملتی ہے شریف منور نے وارداتی نتیجے میں شاعری سے رشتہ قائم کیا تھا اور وقت کے ساتھ اس میں وسعت بھی آئی مگر یہ وسعت ذاتی شاعری ہے اور نہ اسے آفاقی شاعری کا

خام مواد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس وارداتی شاعری کا رشتہ احمد فراز اور عبید اللہ علیم سے بھی نہیں ملتا چونکہ شریف منور نے اپنے آپ کو تلاش کرنے کے بجائے زندگی اور کائنات کو ان سنے سنائے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے جس کو ان میں قبول کرنے کا جذبہ سرسری ہے البتہ شریف منور نے جہاں کہیں بھی اس سے الگ ہو کر سوچا ہے ان کی رنگت نکھر گئی ہے۔ خود کو چند لمحوں کے لئے ہی تلاش کرنا بڑی بات ہے اور میں اس اعتبار سے شریف منور سے مایوس نہیں ہوں۔

شریف منور کے اس پہلے شعری مجموعے کو پڑھتے ہوئے صنعتی زندگی کی بدولت آدمی کے یوں محدود ہونے کی کہانیاں ملتی ہیں اور ان کے درمیان شاعری سے رشتہ ایک لگن محسوس ہوتا ہے۔ اس حوالے سے "تعارف" ایک ضرورت تھی جس کو لانے میں شریف منور نے واقعی درست سوچا۔ ادب میں پیش گوئیاں کرنا حماقت ہوتا ہے اس یقین کے باوجود میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شریف منور میں جذبے کی صداقت کی یہی رفتار رہی تو وہ آئندہ ایک قابل ذکر نام بن سکتے ہیں البتہ انہیں اس صداقت کی تلاش میں خود کو فراموش ہونے سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے آپ کو تلاش کرنا ہوگا دوسروں کی بڑی باتوں کے سامنے اپنی چھوٹی بات اس اعتبار سے وزنی ہوتی ہے کہ اسے آپ نے اپنے حوالے سے سوچا ہے شریف منور میں یہ اعتماد پیدا ہو جائے تو ان کے شعری مجموعے فلیپ کے بغیر بھی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے اور ان کی قدر و قیمت ہوگی۔

"تعارف" کے بارے میں مجھے آخری بات یہ عرض کرنا ہے کہ شریف منور نے اس پُر آشوب دور میں بھی علم کو تجارت بنا کر پیش نہیں کیا۔ انہوں نے پیٹ کاٹ کر اپنا مجموعہ چھپوایا ہوگا مگر اس کی قیمت زیادہ نہیں رکھی۔ ان کا پر خلوص طباعت سے قیمت تک روشنی کی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے۔
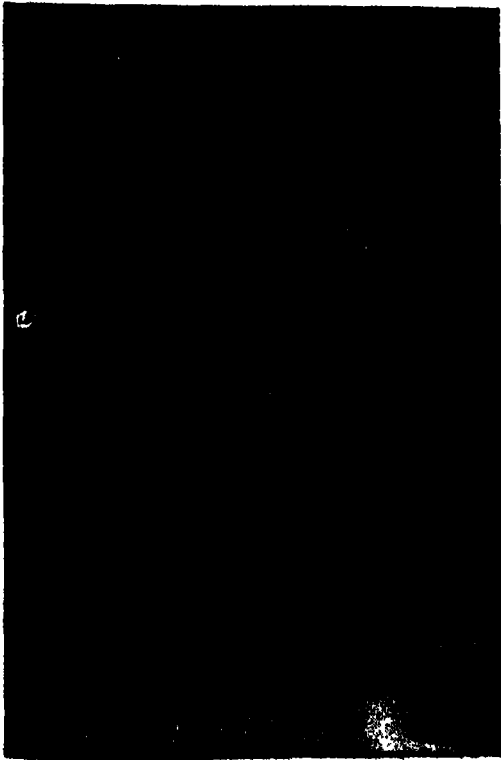
محمد افضل

احسن علی خاں

عشرت آفریں

جاوید انور

ہوائے تازہ
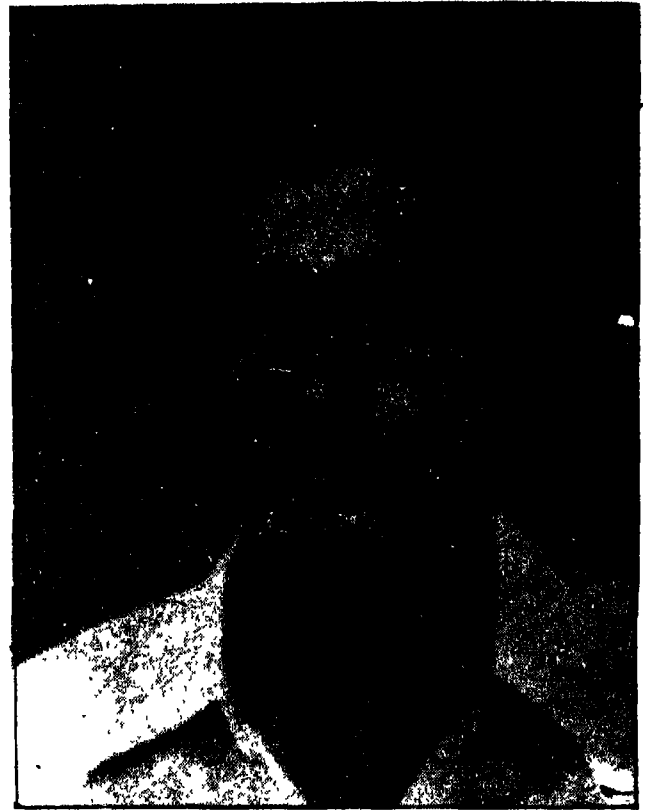
عتیق جیلانی

تنویر قاضی
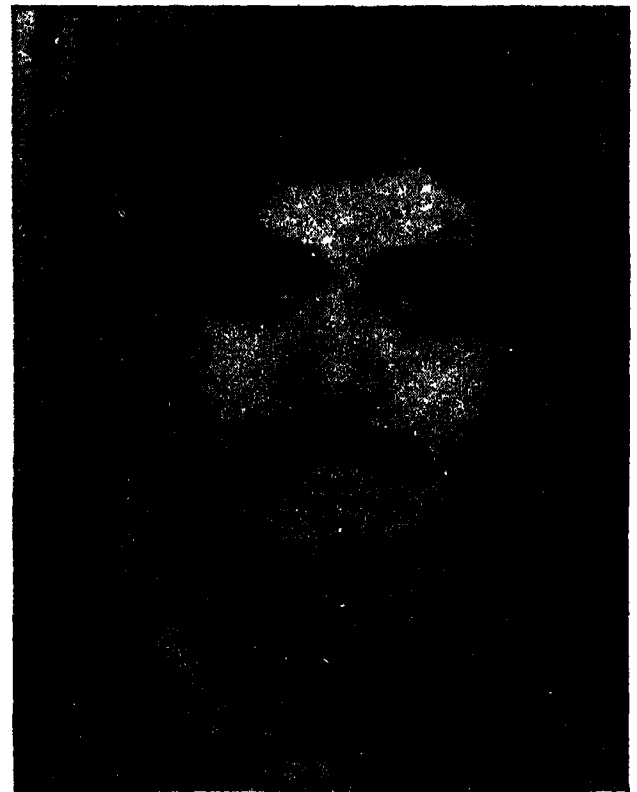
شعر کسی کے ہجر میں کہنا حرفِ وصال کسی سے
ہم بھی کیا ہیں دھیان کسی کا اور سوال کسی سے

اپنی متاعِ ہستی ساری خواب و خیال تو ہیں
وہ بھی خواب کسی سے مانگے اور خیال کسی سے

ایسے سادہ دل لوگوں کی چارہ گری کیسے ہو
درد کا درماں اور کوئی ہو کہنا حال کسی سے

ایک چراغ کی لو نے دل میں کیسی جوت جگا لی
کیسا سجا سجا لگتا ہے شہرِ ملال کسی سے

احمد فراز

ثاقب زیروی

سید جعفر طاہر

ماہِ نو

اکتوبر ۱۹۷۹ء

صدر مجلس ادارت
سید امجد علی

چیف ایڈیٹر
کشور ناہید

ایڈیٹر۔ علی محمد حسینی
جائنٹ ایڈیٹر۔ قائم نقوی

ترتیب

مقالات

حصہ غزل

افسانے

حصہ نظم

اس ماہ کی کتابیں

سرورق ——— ذوالفقار احمد تابش

آئندہ شمارے کی جھلکیاں

بچوں کا ادب نمبر

صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، اشفاق احمد، انتظار حسین، بانو قدسیہ
محمد کاظم، شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر سلیم اختر، خاطر غزنوی، محمد خالد اختر، عطا شاد،
ابصار عبدالعلی، رسا چغتائی، ریاض صدیقی، اسرار زیدی، حمید سندھی، تنویر قیصر
حسن اکبر کمال، رب نواز،

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۱۸ — جلد نمبر ۳۲ ——— شمارہ نمبر ۹ — طلباء کیلئے بشمول رجسٹری فیس ۲۰ روپے
قیمت: ۲ روپے — سالانہ چندہ بشمول رجسٹری فیس ۳۰ روپے

مطبوعات پاکستان نے دین محمدی پریس بل روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہ نو ۳۲ اے حبیب اللہ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

غلام عباس

صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم

صوفی صاحب کی ذات میں اللہ نے بہت سی خوبیاں بھر دی تھیں مگر میری رائے میں ان کی سب سے بڑی خوبی اُن کی محبوبیت تھی۔ ایک ایسی محبوبیت جو دلنوازی کرنا بھی جانتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے چاہنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ اُن میں وہ بھی تھے جو اُن سے عمر میں بڑے تھے اور وہ بھی جو عمر میں چھوٹے تھے۔ استاد بھی شاگرد بھی۔ افسر بھی ماتحت بھی۔ پڑھے لکھے بھی۔ ان پڑھ بھی۔ فن کار بھی۔ اربابِ نشاط بھی۔ اور دوستوں اور نیازمندوں کی شیفتگی کا تو پوچھنا ہی کیا!

اس مضمون میں میں نے نہ تو صوفی صاحب کے سوانح حیات قلمبند کئے ہیں۔ اور نہ ان کی دانش وری اور اعلیٰ علمی استعداد کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس میں تو فقط ایک زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت ایک درد مندانہ اور غم گسار دوست کی چند یادوں کو تازہ کیا گیا ہے۔

صوفی صاحب سے میری ملاقات آج سے پچاس پچپن سال پہلے لاہور میں ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے اپنی ادبی زندگی کا نیا نیا آغاز کیا تھا خوش قسمتی سے مجھے ابتدا ہی سے لاہور کے نوجوان ادیبوں کے ایک ایسے گروہ سے شرفِ نیازمندی حاصل ہوگیا تھا جن میں سے ہر شخص غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کا مالک تھا، ان میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر، عبدالرحمٰن چغتائی، مولانا عبدالمجید سالک، سید احمد شاہ بخاری پطرس، سید امتیاز علی تاج، ابوالاثر حفیظ جالندھری، مجید ملک خصوصیت سے قابل ذکر تھے۔ یہ سب مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ چنانچہ بڑی شفقت سے میری ادبی کاوشوں کو سنتے اور میرا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ یہ میری مزید خوش قسمتی تھی کہ جلد ہی ان میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا اور اضافہ ہو گیا۔

صوفی صاحب فارسی اُردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مگر اس زمانے میں ان کی زیادہ تر شہرت فارسی زبان کے شاعر کی حیثیت سے تھی اُن کی فارسی غزلوں میں زبان کی شستگی اور بندش کی چستی کے لحاظ سے فارسی کے کلاسیکی شعرا کا رنگ جھلکتا تھا۔

صوفی صاحب بڑے زندہ دل، خوش گفتار اور رنگین طبع تھے۔ کرکٹ سے لے کر گلی ڈنڈا تک کھیلنے کو مستعد۔ ہر اچھی صورت پر بے اختیار اُن کا دل آ جاتا تھا۔ مگر چند ہی لمحوں میں وہ صورت دل سے محو بھی ہو جاتی تھی۔ اُن دنوں وہ رہتے تو امرتسر میں تھے مگر پڑھاتے لاہور کے کالج میں تھے۔ چنانچہ اُن کا ایک قدم امرتسر میں ہوتا تھا تو دوسرا لاہور میں۔ سفر کی یہ مسلسل کیفیت یقیناً انہیں فکرِ سخن کی نئی نئی راہیں سُجھاتی ہوگی طالب آملی کا یہ شعر بڑی حد تک اُن پر صادق آتا تھا۔

کلیدِ گنجِ دو عالم بدست طبعِ من است
کدام در بکشائم کدام در بندم

احباب کی محفل میں صوفی صاحب محفل آرا ہی نہیں جانِ محفل سمجھے جاتے تھے، بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، بات سے بات پیدا کرنے اور پھبتی اُڑانے میں وہ اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کے بعض احباب خصوصاً مولانا چراغ حسن حسرت اور حضرت ابوالاثر حفیظ سے پیار اور اخلاص کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی نوک جھونک بھی ہوتی رہتی تھی۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا

ہے۔

ایک دفعہ صوفی صاحب اور حسرت صاحب میں کسی بات پر رنجش پیدا ہوگئی۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے آخر بخاری صاحب، تاثیر صاحب اور ان کے سب دوستوں نے سوچا کہ ان میں صلح صفائی کرا دینی چاہیئے۔ چنانچہ بخاری صاحب نے سب دوستوں کو اپنے ہاں کھانے پر بلوایا۔ اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ان دونوں سے اس شکر رنجی کی وجہ پوچھی۔

حسرت صاحب نے کہا: "انہوں نے مجھے بے عقل کہا تھا"

صوفی صاحب جھٹ بول اُٹھے: "میں نے بے عقل تو ہرگز نہیں کہا تھا"

"پھر کیا کہا تھا؟"

"میں نے تو کہا تھا، اُلّو"

اس پر سب لوگ بے اختیار ہنس پڑے۔

صوفی صاحب کے دوستوں میں پطرس بخاری کی شخصیت ہی ایک ایسی تھی جس کا وہ بہر صورت احترام ملحوظ رکھتے۔ اور اُن کے طنز و مزاح کے جواب میں اکثر مسکرا کر چُپ ہو رہتے یا اگر جواب بھی دیتے بھی تو دبی زبان سے ـــ ہرچند بخاری صاحب صوفی صاحب کو بے حد عزیز رکھتے تھے مگر ساتھ ہی وہ اپنی عادت کے ہاتھوں بھی مجبور تھے کہ انہیں جب کبھی اپنے عزیز سے عزیز دوست کے بارے میں بھی کوئی طنزیہ فقرہ یا پھبتی سوجھتی تو وہ کہے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

آج سے تقریباً چالیس سال قبل صوفی صاحب نے انگریزی کے نرسری رائم کے طرز پر اردو میں بچوں کے لئے نظمیں لکھیں۔ ان میں ایک نظم "اوٹ بٹوٹ" بھی تھی جسے بچوں نے بے حد پسند کیا۔ اور جو بعد میں ریڈیو پر بھی بڑی مشہور ہوئی اس کے علاوہ اور بھی کئی پیاری پیاری نظمیں تھیں۔ ان سب کو "مجموعے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ بخاری صاحب نے بڑی محبت اور خلوص سے اُس کا دیباچہ لکھا۔ اُس میں انہوں نے صوفی صاحب کی ذہانت اور جودتِ طبع کی تعریف کی وہاں یہ شعر بھی لکھ دیا:

چہل سال عمرِ عزیزت گزشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت

صوفی صاحب بڑے بلند حوصلہ اور وسیع القلب انسان تھے اُن کا تعلق کسی متمول گھرانے سے نہ تھا۔ محنت مشقت سے آبرومندانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جب تک سرکاری ملازمت میں رہے۔ درس و تدریس ہی سے تعلق رکھا۔ کالج بدلتے گئے مگر وہ پروفیسری سے آگے نہ بڑھ سکے۔ آمدنی محدود تھی۔ مگر ان کی فیاضانہ طبیعت اور مہمان نوازی نے ان کے غریب خانے کا دروازہ نیازمندوں اور شاگردوں کے لئے ہمیشہ کھُلا رکھا۔

وہ طبعاً بڑے سادہ مزاج تھے۔ ظاہری شان و شوکت اور نمود و نمائش کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کے عادی تھے یہاں تک کہ نوکر کی موجودگی کے باوجود گھر کی صفائی اور جھاڑ پونچھ اکثر خود ہی کیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں مجھے اکثر یہ واقعہ یاد آتا ہے یہ اُن دنوں کی بات ہے۔ جب وہ لاہور کے بھاٹی دروازے کے اندر ایک گلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ مکان کی نچلی منزل بیٹھک کا کام دیتی تھی جہاں وہ اپنے احباب اور ملنے والوں کو بٹھایا کرتے تھے۔ اُن کی کتابیں، میز کرسی اور لکھنے پڑھنے کا سامان بھی یہیں رہتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کے علم و فضل خصوصاً ان کی فارسی دانی کا چرچا اپنے ملک کی حدود سے نکل کر بیرونی ممالک میں پہنچنے لگا تھا چنانچہ کبھی کبھی کوئی مستشرق یا ایرانی سیر و سیاحت کرتا ہوا لاہور آنکلتا تو صوفی صاحب سے ملاقات بھی اُس کے پروگرام کا ایک جزو بن جاتی تھی۔

ایک دن علی الصبح ایک ایرانی ان کے مکان کا پتہ پوچھتا اور کھوج لگاتا ہوا ان کے مکان پر آ پہنچا۔ اور دروازے پر دستک دینے لگا

صوفی صاحب اُس وقت میلا سا تہمد باندھے، بنیان پہنے، منہ پر کپڑا لپیٹے تاکہ گرد ناک میں نہ جائے۔ بیٹھک کی صفائی میں مصروف تھے۔ ان کے ہاتھ میں جھاڑو تھی اور کمرے میں گرد اڑ رہی تھی۔ صوفی صاحب پہلے تو گھبرائے مگر پھر جلد ہی انہیں ایک ترکیب سوجھ گئی۔ چہرے کو کپڑے سے اور بھی اچھی طرح ڈھانک

لیا۔ کھڑکی کے قریب پہنچے۔ اور لہجہ بگاڑ کر بولے:

"صوفی صاحب گھر پر نہیں ہے۔ سیر کو گیا ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد آؤ۔"

چنانچہ گھنٹہ بھر کے بعد جب وہ ایرانی دوبارہ آیا۔ تو صوفی صاحب بڑے تپاک سے اُس سے ملے۔ اس وقت وہ انگریزی سوٹ میں ملبوس تھے۔ اور کمرہ بھی صاف ستھرا تھا جس میں ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ پر رکھی تھی۔ صوفی صاحب دو گھنٹے تک اُس ایرانی سے فارسی شعر و ادب پر گفتگو کرتے رہے۔ جب وہ رخصت ہوا تو بڑا مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ یہ بات اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ علی الصباح جس میلے کپڑوں والے شخص نے اُس سے بات کی تھی اور جسے وہ غلطی سے صوفی صاحب کا ملازم سمجھا ہوگا، خود حضرت صوفی صاحب ہی تھے۔

علم و فضل کے ساتھ ساتھ صوفی صاحب کے مزاج میں وہ جو ایک طفلانہ شوخی تھی آخری عمر میں بھی بدستور قائم رہی ـــ چند سال کا ذکر ہے وہ ایک اہم کانفرنس میں شرکت کے لیئے لاہور سے کراچی آئے تھے۔ جلسہ یہاں کے ایک بڑے ہال میں ہو رہا تھا۔ خاصا بڑا مجمع تھا۔ میں اور صوفی صاحب حاضرین کی درمیانی قطار میں ساتھ ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک عالم صاحب ایک لمبا اور فضول سا مقالہ پڑھ پڑھ رہے تھے، جس سے اہلِ جلسہ زچ آچکے تھے۔ اچانک صوفی صاحب نے دبی آواز میں مجھ سے کہا:

"عباس آؤ گنیں کہ اس جلسے میں کتنے لوگوں نے ٹوپیاں پہن رکھی ہیں، اور کتنے سر سے ننگے ہیں۔"

اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ جواب دیتا ـــ انہوں نے سچ مچ انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر گننا شروع کر دیا۔

صوفی صاحب کئی حیثیتوں سے ایک رفیع شخصیت کے مالک تھے۔ وہ فارسی اردو اور پنجابی کے ممتاز شاعر تھے۔ فارسی کے متبحر عالم، نکتہ داں، ہر دلعزیز استاد، ماہرِ اقبالیات، بچوں کے محبوب شاعر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے دانشور۔ ایسے مترجم جنہیں نظم کا نظم میں ترجمہ کرنے میں کمال حاصل تھا ـــ محبِ وطن جنہوں نے ۱۹۶۵ء میں پاک و ہند کی جنگ میں ایسے ولولہ انگیز نغمے لکھے تھے جنہوں نے ایک طرف عساکرِ پاکستان کے دلوں کو گرما دیا تھا تو دوسری طرف عام شہریوں کی ڈھارس بندھائی تھی ایک ایسے زندگان کی آزاد مشربی کے باوجود ہر شخص ان کا احترام کرتا اور دل میں جگہ دیتا تھا۔

صوفی صاحب نے ایک کم اسی برس کی عمر میں وفات پائی ـــ اس پر بھی اُن کی موت بڑی غیر متوقع تھی کیونکہ اس پیرانہ سالی میں بھی اُن کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ بڑے چاق و چوبند تھے۔ اور بڑی مستعدی کے ساتھ اپنی گوناں گوں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔ چنانچہ اُن کی وفات پر میں نے ٹیلی ویژن پر پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں دل میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ مجھے ابھی موت کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ابھی تو صوفی صاحب زندہ و سلامت ہیں۔

افسوس کہ اُن کی اچانک وفات سے میری زندگی کا یہ سہارا ٹوٹ گیا۔

فردوس حیدر، انجم عزیز حید، یوسف عزیز، اشفاق بخاری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری
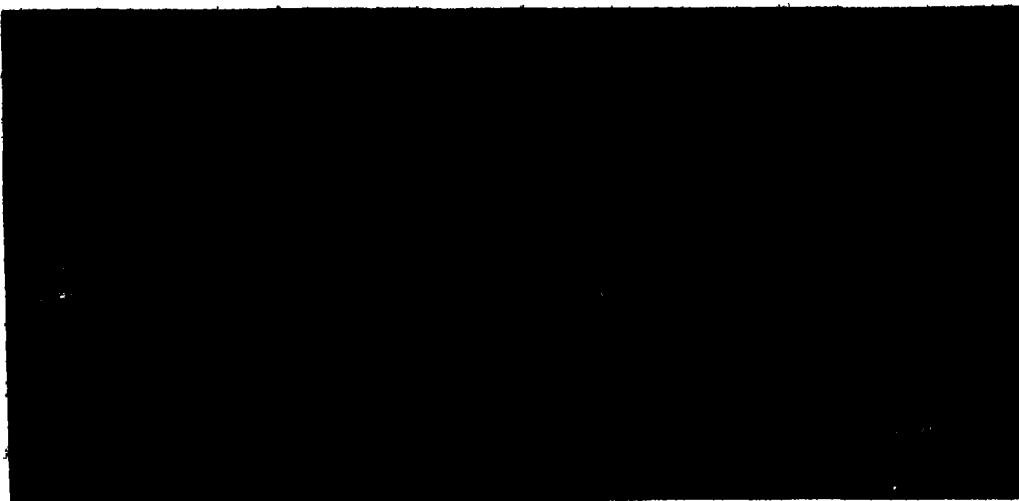
مولانا حسرت موہانی کے نام ایک خط

میرے مخدوم و محترم، سلام مسنون!

افسوس کہ مدت سے نامہ و پیام کا سلسلہ بند ہے۔ جب تک آپ ہندوستان میں رہے، ادھر اُدھر سے حال احوال مل جاتا تھا، آخری ملاقات ۱۹۵۱ء میں آپ سے اس وقت ہوئی تھی جب آپ حج بیت اللہ سے واپسی پر ادھر ایک دو دن ٹھہرے تھے، اس کے بعد آپ اتنی دور اور ایسی جگہ جا بسے کہ ملاقات تو درکنار، نصف ملاقات یعنی مراسلت کی صورت بھی مشکل ہوگئی، یہ خط ایک بزرگ کے ہاتھوں آپ تک پہنچ رہا ہے۔ جواب سے یاد فرمائیں تو احسان ہوگا۔

آپ کو علم ہے کہ مجھے سیاست سے براہ راست دلچسپی کبھی نہیں رہی۔ شعر و شاعری اور ادب و تنقید ہی سے اچھا برا لگاؤ رہا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ آپ نے فتح پور ہسوہ میں جو علمی و ادبی ماحول پیدا کر دیا تھا، اس سے الگ تھلگ رہنا آسان نہ تھا۔ کوڑا جہان آباد فتح پور ہسوہ کا مشہور قصبہ، آپ کا ننھیال ہے۔ میٹرک کا امتحان آپ نے فتح پور ہی سے پاس کیا ہے اور جیسا کہ آپ نے خود کئی جگہ اشارہ فرمایا ہے شعر و ادب کا ذوق و شوق بھی اوّل اوّل آپ میں وہیں پیدا ہوا۔ آپ اور علامہ نیاز فتح پوری دونوں مدرسۂ اسلامیہ فتح پور کے طالب علم رہ چکے ہیں، اور دونوں مدرسے کے بانی مولانا ظہور الاسلام کے خاص شاگردوں میں ہیں۔ آپ کو مولانا ظہور الاسلام سے خاص عقیدت تھی اور آپ نے ایک جگہ سودا کے شعر کے حوالے سے انہیں اس طرح یاد فرمایا ہے ؎

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

میں نے بھی مدرسۂ اسلامیہ فتح پور کے اساتذہ کی جوتیاں اٹھائی ہیں۔ ہر چند کہ میں نے مولانا ظہور الاسلام کو نہیں دیکھا لیکن آپ سے اور نیاز صاحب سے مختلف موقعوں پر، ان کے بارے میں جو کچھ سُنا، اس نے مجھے ان کا گرویدہ بنا لیا۔ یہی گرویدگی تھی کہ ان کے تلامذۂ ارشد میں آپ جیسے لوگ میری زندگی کا آئیڈیل قرار پائے چنانچہ جب مجھ سے کوئی شخص پوچھتا ہے کہ آپ کی زندگی کا اہم واقعہ کونسا ہے تو میں بڑے فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ میری زندگی کا سب سے اہم اور عظیم واقعہ یہ ہے کہ میں نے مولانا حسرت موہانی کو دیکھا ہے۔ ان سے کئی بار ملا ہوں۔ ان سے باتیں کی ہیں۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں ان کے ساتھ کچھ دنوں گھوما پھرا ہوں اور ان کے روبرو الٹی سیدھی تقریریں کی ہیں یہ باتیں میں آپ کو خوش کرنے یا بطور خوشامد نہیں لکھ رہا۔ خوب جانتا ہوں کہ آپ کا مزاج عام، دنیا داروں سے بالکل مختلف ہے۔ ایسی باتوں کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میں نے یہ ذکر صرف اس لئے چھیڑا کہ آپ سے ملے ہوئے تقریباً تیس سال ہو رہے ہیں اور کوئی ضروری نہیں کہ میرا نام یا میری صورت پوری طرح آپ کے ذہن میں ہو اپنی یاد دلانے کی یہی شکل سمجھ میں آئی کہ آپ کو ایک لمحے کے لئے فتح پور ہسوہ اور کوڑا جہان آباد کے اس ماحول میں لے جاؤں جس کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ ؎

اب تک موجود ہے کچھ کچھ گالائے تقسیم
وہ جو اک پل کا کبھی خاک جہان آباد سے

میرے ذہن کی تربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی یا پھر اس ماحول میں جو آپ کی شخصیت و سیرت

اور فکر و عمل کے زیر اثر پیدا ہوا تھا۔ میں نے شعر و ادب سے لے کر زندگی کے عام مسائل تک جو کچھ سیکھا اور سمجھا آپ کی تحریر و تقریر اور آپ کی ذاتی زندگی سے سیکھا سمجھا․․․․․ لیکن آج کی زندگی خواہ اس کا تعلق سیاست و معاشرت سے ہو یا شاعری اور ادب سے، اتنی بدلی ہوئی ہے کہ زندگی میں میرے لئے اور میں زندگی کے لئے اجنبی بن کے رہ گیا ہوں — ایک شعر و شاعری ہی کو لے لیجئے آپ نے شعر کی تعریف یوں کی تھی کہ ؎

شعر در اصل ہیں وہی حسرتؔ
دل میں سنتے ہی جو اُتر جائیں

لیکن اب یہ صورت ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح کا شعر کہے کہ وہ ذہن پر بوجھ ڈالے بغیر، سمجھ میں آجائے تو نئی نسل کے شاعر اور ادیب اسے کارِ طفلاں خیال کر کے، شاعر کا مذاق اڑاتے ہیں اور ایسی شاعری کو بے معنی اور بے وقعت سمجھتے ہیں۔ پہلے بھی تشبیہہ استعارہ اور علامات کنایات کا استعمال ہوتا تھا۔ ان سے بعض شاعر فکر انگیزی اور خیال افروزی کا کام لیتے تھے، اور بعض الفاظ کا کرتب دکھانے کے لئے بھی ایسا کرتے تھے۔ بہرحال اس سے شعر میں ایک طرح کا لطف پیدا ہو جاتا تھا۔ اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ استعارات و کنایات، شعر کے مفہوم کو قاری کے ذہن پر واضح اور روشن کرنے کے بجائے اس پر دبیز پردہ ڈال دیتے ہیں۔ یہی پردہ ان دنوں فن کاری کا معراج خیال کیا جاتا ہے اس طرح سخن گوئی کو کبھی خود کلامی کا نام دیا جاتا ہے، کبھی زندگی کی مہملیت اور بے معنویت کا ترجمان سمجھا جاتا ہے کبھی لمحے کو گرفت میں لینے کا وسیلہ خیال کیا جاتا ہے۔ کبھی سوچ کی پیچیدگی کا مظہر اور ذات کے حوالے سے بات کہنے کا ڈھب قرار دیا جاتا ہے اور کبھی نئے طرزِ احساس کی پیکر تراشی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس اندازِ سخن سرائی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کلاسیکل اردو شاعری کا سلسلہ آج کی شاعری سے تقریباً منقطع ہو گیا ہے۔ پرانے اساتذۂ فن، نئی نسل کی شاعری کو سمجھنے سے قاصر اور نوجوان شعرا کلاسیکی رنگ میں کہنے والوں سے عاجز ہیں — دونوں کے درمیان فاصلہ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ شعر میں وزن کو بھی غیر ضروری قرار دے دیا گیا ہے اور پیرا پوئم کے نام سے بغیر وزن و قافیہ کی شاعری ادبی پرچوں[له] میں چھپنے اور مشاعروں میں سنائی جانے لگی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اردو شاعری میں اس قسم کی بدعتوں کو آپ نے اور آپ کے بعض ہم عصروں نے ہوا دی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اردو کی مروجہ شاعری اور اس کی حقیقی ہستیوں کے برعکس آپ کی ایک عظیم نظم مئی ۱۹۰۱ء کے مخزن میں "برابطِ سلمیٰ" کے نام سے اور اسی طرح کی ایک اور نظم "ترانۂ محبت" کے نام سے اکتوبر ۱۹۰۷ء کے مخزن میں چھپی تھی۔ یہ نظمیں، روایت سے بغاوت کا پہلا نشان تھیں۔ اس کے ذریعے لوگوں کے لئے بغاوت کا راستہ ہموار ہو گیا تصدق حسین خالد میراجی اور ن م راشد کے ہاتھوں، اس راستے نے شاہراہ کی صورت اختیار کر لی۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات جوں جوں دھندلاتے گئے اس شاہراہ سے کئی پگڈنڈیاں اِدھر اُدھر نکل پڑیں۔ ردیف کے بعد قافیہ غائب ہوا۔ پھر تمام مصرعوں کا مساوی ایک بحر میں ہونا بھی لازمی نہ رہا — ایک ہی نظم میں چھوٹے بڑے مصرعے عام ہو گئے۔ مختلف بحروں کے ارکان سے کام لیا جانے لگا — پھر یہ تکلف بھی اُٹھ گیا، ردیف، قافیہ، وزن اور بحر سب غیر ضروری قرار پائے۔ صرف الفاظ کا ایک ڈھیر علامات و استعارات کے نام سے رہ گیا — اب اسی کا نام شاعری ہے اور نئی نسل کے شاعر اسی طرزِ خاص پر ریجھے ہوئے ہیں — خدارا بتائیے، یہ سب کیا ہے — اس اندازِ شعر گوئی کا جواز کیا ہے اور اس کا حشر کیا ہوگا اور اب آپ کی وہ تنقید کی اور اصلاحی کتابیں جو نکاتِ سخن اور محاسن و معائب کلام کے نام سے ہم نے بڑے ذوق و شوق سے پڑھی تھیں اور ان سے بہت کچھ سیکھا تھا وہ اب کس کام آئیں گی؟

شاعر کی ہیئت اور فارم سے قطع نظر، آج کی زندگی، جس میں مذہب، سیاست، معاشرت اور شعر و ادب سبھی کچھ شامل ہے، عجیب کی طرح یک رنگی اور بے رنگی کا شکار ہے۔ میں نے جو رنگا رنگی، آپ کی تنہا شخصیت میں دیکھی تھی۔ وہ اب افراد کے بڑے مجمعے میں بھی نظر نہیں آتی۔ آپ اوّل و آخر مسلمان رہے اور خالی مسلمان۔ لڑکپن اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک، نماز کے پابند رہے۔ درجنوں بار حج کرنے گئے۔ جیل گئے

له مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

وحق پرستی اور سادگی و خود پوشی کا یہ عالم تھا کہ علامہ سید سلیمان ندوی، آپ کو اپنے وقت کا ابوذر غفاریؓ کہتے تھے، طرّہ یہ کہ آپ خود کو اشتراکی مسلم کہتے تھے اور بالاعلان فرماتے تھے کہ اسلام کو اشتراکیت سے کوئی خطرہ نہیں۔ مثال میں آپ کو پیش کرتے تھے اور دوسروں کو کامریڈ بننے کی دعوت دیتے تھے ۔ سوویٹ یونین کا نام سوویت کے نام سے پہلے پہل، میں نے آپ ہی کی زبان سے سنا۔ آپ کا شعر ہے۔

لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سوویت
وہ ایک برس ہو کہ دس بیس برس میں

یا ہیں ہمہ برّصغیر میں شاید ہی کسی بزرگ کا مزار جس کی زیارت کو آپ نہ گئے ہوں ۔ عرس اور قوالی کی محفلوں میں شریک ہونا آپ کے نزدیک کارِ ثواب تھا۔ محرم میں تعزیوں کے جلوس میں دس دن تک برابر شریک رہتے تھے اور روتے روتے دامن تر کر لیتے تھے ۔ پتنگ بازی کا آپ کو بہت شوق تھا۔ کانپور میں پریڈ کے میدان میں جب پتنگ باز جمع ہوتے تھے تو آپ ان کی طرح طرح سے حوصلہ افزائی کرتے تھے، اور عینک اتار کر دیر تک آسمان کو تکتے رہتے تھے اس مشغلے سے آپ کو ایسی دلچسپی تھی کہ آپ نے اپنی بیٹی کو بھی پتنگ لڑانا سکھایا تھا۔ دوسری طرف شعر و ادب کی کون سی محفل تھی جس میں آپ شریک نہ ہوتے تھے اور کبھی کبھی ترنم سے پڑھنے کی کوشش میں، سامعین کو تالیاں بجانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ اس کے باوجود چہرے پر نفرت اور غصے کے آثار نہ ہوتے تھے ۔ سیاسی پلیٹ فارموں پر آپ کی سج دھج سب سے نرالی ہوتی تھی ۔ انگریز تو آپ کے نام سے کانپتا تھا اور برّصغیر کے لیڈروں میں کون تھا جو آپ کا احترام نہ کرتا تھا ۔ صحافی زندگی کا ذکر کیا چھیڑوں۔ اُردوئے معلّٰی کی جلدیں آپ کی بے باکی کا شاہکار ہیں ان مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ معمول کے ساتھ کتب خانے جانا، پابندی سے اخبار پڑھنا، اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھونا اور حسبِ ضرورت جوتے اور کپڑے اپنے ہاتھوں سے ٹانکنا، کنویں اور نلکوں سے پانی بھر کر لانا، بیوی بچوں کی ضرورتیں پوری کرنا، پڑوسیوں کی امداد کرنا، مظلوموں ناداروں کی ہر حال میں حمایت کرنا آپ کے معمولاتِ زندگی میں تھا۔ ایک آدمی اور اتنا رنگا رنگ، ایک شخصیت اور ایسی متنوع ایک ذات اور اتنی صفات ۔ یہ ہمہ جہتی اور ہمہ گیری اب کہاں ہمارے عہد کے سارے ادیب، سارے شاعر، سارے راہنما اور سارے صحافی مل کر بھی رنگوں کی یہ قوسِ قزح نہیں پیدا کر سکتے۔ سب کے سب یکسو ہیں اور جتنا ایک جانتا ہے اتنا ہی دوسرا جانتا ہے ۔ زندگی کا کوئی شعبہ ہو، بھیڑوں کی طرح، لوگ ایک ہی ڈگر چل رہے ہیں نتیجتاً، ہماری شاعری، ادب اور تمدن، ایک ہی ڈھرّے پر لگا ہوا ہے۔ تنوع اور رنگا رنگی دور تک نظر نہیں آتی ۔ اس میں نئی نسل اور پرانی نسل کا امتیاز نہیں ۔ نئی نسل کے سوچنے کے انداز اور طرزِ احساس میں کچھ ایسی یکسانگی و یک رنگی ہے کہ کسی ایک شاعر کے کلام کو پڑھ لینا گویا اس عصر کے سارے شاعروں کو پڑھ لینا ہے ۔ پرانے شاعروں کا ذکر ہی کیا۔ وہ شاہ نصیر کے اس شعر کو

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیرؔ پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

ابھی تک اس شعر کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اسی روش پر شعر کہہ رہے ہیں اور آس پاس کی زندگی سے بے خبر ہیں ۔ حقیقی ایجاد و اختراع کا دونوں کے یہاں فقدان ہے ۔ ممکن ہے سوچنے کی اور بے کیف یک رنگی کا سبب یہ ہو کہ ہماری زندگی نے میکانکی صورت اختیار کر لی ہے اور اس میں فرد کی حیثیت ایک بے جان پرزے کی ہو گئی ہے ۔ جاڑا گرمی برسات کسی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ کیا اس بے رنگی اور بے کیفی سے نجات پانے کی کوئی صورت ہے ۔؟ خدارا اس بارے میں کچھ لکھئے کہ اضطراب دور ہو اور راہ سکون کی نکلے ۔

عام سماجی زندگی کا حال کیا لکھوں ؟ سُنیں گے تو بڑا غم ہوگا۔ آپ نے مشورہ دیا تھا کہ

حق سے بے عذرِ مصلحتِ وقت پر جو کر سکے نہ
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر

لیکن یہاں تو دین و ملت کے پیشواؤں میں بیشتر، مصلحت کا شکار نظر آتے ہیں ۔ آج کچھ کہتے ہیں کل کچھ، پھر لطف یہ ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں۔ صرف اپنی ذات یا اپنے خاص حلقے کے مفادات کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں۔ سماج کا فائدہ ان کے

پیش نظر نہیں ہوتا ۔ عوام تو قربانی کے بکرے ہیں. جو ان کی پُرجوش اور پُرفریب باتوں کے جال میں پھنستے رہتے ہیں اور اپنے ہاتھوں آپ قتل ہوکر شہادت کا درجہ پاتے رہتے ہیں ۔ پیشوائی کا دعویٰ کرنے والے حضرات، مسلک، اپنا بیان، اپنا راستہ، اپنا مکان حتیٰ کہ اپنا مسلک تک آن کی آن میں بدل دیتے ہیں کچھ عرصے کے بعد نئے روپ سماجی خدمت کے لئے پھر سامنے آجاتے ہیں ۔ یقین فرمائیے یہ تماشا برسوں سے اس ملک میں ہو رہا ہے. کہاں کی پیشوائی اور کیسا اعتماد، مان نہ مان میں ترا مہمان کی صورت ہے ۔ لوگ، رہنماؤں سے بیزار ہیں لیکن رہنما ہیں کہ اپنے مفاد کی خاطر ان کی نیند حرام کئے ہوئے ہیں ۔ مشکل یہ ہے کہ عوام بھی سامنے کی زندگی سے یکسر قطع تعلق نہیں کر سکتے ۔ غریب کیا کریں، کسی نہ کسی کے دام میں آجاتے ہیں، مرزا غالب نے ہمارے عہد کے فرد کی بہت اچھی ترجمانی کر دی ہے ۔

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ان کی سیاست، آپ کے زمانے کی سیاست کی طرح حق گوئی و بے باکی یا کسی خاص نقطۂ نظر کی سیاست نہیں ہے، بلکہ ان دنوں سیاست نام ہے ایسے داؤ پیچ کا جن کے ذریعے عوام الناس کو چکمہ دے کر اپنا اُلّو سیدھا کیا جا سکے ۔ شاد عارفی نے بہت صحیح کہا ہے کہ

ہمارے یہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی طوائف تماش بینوں میں

اس طوائف نے عجب طرح کی طوائف الملوکی پھیلائی ہے ۔ چنانچہ ہمارے ہاں جمہوریت کے نام پر عوام پر جس قسم کے شدید مظالم ڈھائے گئے اور ڈھائے جا رہے ہیں بیرونی طاقتوں کے ہاتھوں کم ڈھائے گئے ہوں گے ـــــ ظلم کے ہاتھ بدل گئے ہیں لیکن مظلوم کا جسم وہی ہے ۔

آپ نے برطانوی سامراج کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے کہا تھا کہ

رسمِ جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حبِّ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے
پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کار
خلقِ خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر یہ زیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے

اب یہ اشعار ہمارے اپنی جمہوری حکومتوں پر صادق آتے ہیں اور میں انہی کو آج کل گنگناتا رہتا ہوں ـــ آپ کی نظر وسیع بھی بلیغ بھی اور آپ ان ساری باتوں کا ذاتی تجربہ بھی رکھتے ہیں اس لئے خدا کے واسطے کچھ بتائیے اور جلد بتائیے کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور کب تک ایسا ہوتا رہے گا والسلام دُعا کا طالب

خاکِ پائے حسرت
فرمان فتح پوری

عدیم ہاشمی، علی اکبر عباس
عطاء الحق قاسمی، مستنصر حسین تارڑ۔

جیلانی کامران

غالبؔ کے شعری شعور کی وضاحتیں

غالب کے بارے میں دو باتیں بے حد کھل کر سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ہمارا ایک عظیم کلاسیکی شاعر ہے اور دوسری یہ کہ وہ اپنے زمانے سے باہر نکل کر ہمارے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے اور اس اعتبار سے وہ ہمارا ہمعصر شاعر بھی ہے۔ کسی بھی زبان کے ادب میں ایسی حیثیت بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ یا تو کلاسیکی شاعر اپنے زمانے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لئے اس تک پہنچنے اور رسائی پانے کی کوشش کی جاتی ہے یا وہ جب زمانۂ حاضر میں وارد ہوتا ہے تو اس کے اور ہمعصر شاعری کے درمیان کئی طرح کے پردے اور فاصلے حائل ہوتے ہیں۔ اس کیفیت کے پیشِ نظر جب ہم غالب کو کلاسیکی اور ہمعصر صورت میں پہچانتے ہیں تو کم از کم اس نتیجے پر ضرور پہنچتے ہیں کہ ہمارے اور غالب کے درمیان زمانہ بدستور مشترک ہے۔ اور اُس کا شعری شعور ہمارے لئے کسی قسم کی اجنبیت پیدا نہیں کرتا۔

غالب کی سو سالہ برسی کے موقع پر جو ۱۹۶۹ء میں منائی گئی تھی غالب کی پہچان کے مختلف زاویے بتلائے گئے تھے اور غالب کے متعلق ان زاویوں کی روشنی میں وضاحت کی گئی تھی، جو بڑی حد تک خیال افروز تھی۔ تاہم یہ تمام زاویے زمانۂ غالب کو کاٹتے ہوئے گزرتے تھے۔ اور غالب کی زندگی کا محلِ وقوع ان زاویوں کے حلقۂ کار میں شامل نہیں ہوتا تھا کیونکہ علم و تنقید کے تمام زاویے فکری منظر و پس منظر سے مقابلتاً زیادہ متعلق تھے۔ اس لئے جب ہم دس برس گزرنے کے بعد مُڑ کر غالب کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک بے حد پیچیدہ صورت دکھائی دیتی ہے۔ شاعری کی زبان میں ہمیں اُس دور میں آندھیاں نظر آتی ہیں۔ تخت و تاج گرتے گم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ جنگ و جدل کی بے پناہ آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ اوائے تباہ نظر آتے ہیں۔ معاشرہ ڈوبتے تیرتے محسوس ہوتا ہے اور زمانۂ ماضی کی رفت و گزشت کو بیان کرتے دکھائی دیتا ہے مگر کیا آنے والا ہے؟ اس سوال کے سامنے خاموش دکھائی دیتا ہے ایسے ماحول اور محلِ وقوع میں غالب شاعری کی تخلیق کرتے نظر آتا ہے۔

بادی النظر میں یہ صورت بہت واضح اور آسان دکھائی دیتی ہے کہ حالات اور تخلیقی عمل کا رشتہ براہِ راست ہے۔ تخلیقی عمل کبھی نہیں رُکتا۔ لیکن کیا یہ بات واقعی درست ہے کہ تخلیقی عمل کبھی نہیں رُکتا۔ اور برابر جاری رہتا ہے۔ شاعری کی تخلیق کے عمل کو جاننے والے بخوبی واقف ہیں کہ شعری تخلیق ایک آسان کام نہیں ہے۔ اِس لئے جب ہم غالب کے زمانے کو مُڑ کر دیکھتے ہیں تو غالب کی شعری اور تخلیقی صلاحیت سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ حالات کا دباؤ شعری و تخلیقی صلاحیتوں کو پراگندہ بھی کر سکتا ہے، انہیں بکھیر سکتا ہے۔ اور تخلیقی شخصیت، شکست و ریخت کے آگے ٹکڑوں میں بٹ سکتی ہے۔ حالات کا عمل تخلیقی عمل کو اُبھرنے کے لئے مناسب موقعہ فراہم نہیں کرتا کیونکہ حالات کا عمل جمود کو محصور کرنے پر قادر بھی ہے تاہم غالب کی شعری زندگی کے جاننے سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ غالب کی شعریت میں ایسا اصول کون سا تھا جس نے اُسے حالات کے دباؤ کے باوجود تخلیق کے عمل میں معروف رکھا اور اُسے تخلیقی اعتبار سے کامیاب کیا!

ہماری مروجہ تنقیدی اصطلاحوں میں اس کیفیت کو کوشش یا مکمل وابستگی کا نام دیا جاتا

ہے اور جہاں تک اس اصطلاح کا تعلق ہے۔ اس کا رشتہ عموماً کسی معروضی نصب العین سے ہوتا ہے اور فن کا مقام کسی ایسے مقصد سے واضح ہوتا ہے جو فن کے اپنے حلقۂ تخلیق سے پیدا نہیں ہوتا۔ اگر اس نقطۂ نظر سے غالب کی شعری اور تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ کیا جائے تو ہمیں ایسی کوئی خارجی، غیر شخصی اور معروضی کومٹمنٹ دکھائی نہیں دیتی۔ اگر یہ بات درست ہے تو واضح ہوگا کہ تخلیقی عمل کے لئے شاید کومٹمنٹ ضروری نہیں ہے۔ تخلیقی عمل اپنے فن سے اپنی قوت اخذ کرتا ہے۔ تاہم یہ بات بھی اس امر کی وضاحت میں کوئی مدد نہیں دیتی کہ حالات کے شدید دباؤ کے سامنے غالب کی شعری اور تخلیقی صلاحیتوں کو کس اصول نے زندہ رکھا اور وہ قوت کہاں سے معرضِ وجود میں آئی جو اس اصول کو حالات کے دباؤ پر حاوی کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی۔

اس سوال کے کئی ایک جواب ہو سکتے ہیں مگر شاید کوئی بھی جواب اس کے لئے قطعی طور پر درست ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا بنیادی جواب یہی ہے کہ فن اپنے طور پر ایک سچائی ہے۔ اور اس سچائی کے ساتھ جتنا گہرا رشتہ ہوگا اُسی نسبت سے فن، تخلیقی عمل کا اظہار بنتا ہے گا۔ یہ امر فن اور سچائی کے رشتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بات کو یہاں تک پہنچا کر میں ایک دوسرے پہلو کا ذکر کرتا ہوں ....

کسی کلچر کے جامع ہونے کی واضح صورت عموماً یہ تسلیم کی گئی ہے کہ اس کلچر کے تمام مظاہر اسی اصل الاصول کی پیروی کرتے ہیں جو اس کلچر کی تہذیب میں جاری و ساری ہوتا ہے غالب کے زمانے میں جو سچائی نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ روح اصلِ حقیقت ہے اور جسم ادراک کا ذریعہ ہے۔ جن لوگوں نے غالب کے دیوان کا دیباچہ پڑھا ہے ان کی نظر سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ اس دیباچے میں غالب کا طرزِ احساس ایسا ہے جسے علمی زبان میں مذہبی طرزِ احساس کہا جاتا ہے۔ علم و حکمت میں مذہبی طرزِ احساس محدود سے غیر محدود کی جانب سفر کرتا ہے۔ کثرت کو جانتے ہوئے کثرتوں کو باہم مربوط کرتا ہے اور کثرتوں کے اندر کسی لازوال اور قائم رہنے والی سچائی کی تلاش کرتا ہے۔

در حقیقت یہی طرزِ احساس، جو اعلیٰ و ارفع معانی میں مذہبی احساس ہے تخلیقی عمل کو قوت فراہم کرتا ہے حالات کے دباؤ پر غلبہ پاتا ہے۔ اور فن کو پائیدار زندگی دیتا ہے۔ یہ طرزِ احساس شاید کسی ایسی صورتِ حال میں ظاہر نہیں ہو سکتا جہاں انسان نے اپنے آپ کو مخلوق ہونے کی صداقت سے محروم کر رکھا ہو۔ غالب کے زمانے میں انسان نے ابھی انسانی صورتِ حال کو مخلوق ہونے کی صورتِ حال سے جدا نہیں کیا تھا۔ انسان برابر مخلوق تھا اور اُس صورتِ حال کا باشندہ تھا جسے ہم آج کی زبان میں انسانی صورتِ حال کہہ کر پکارتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اور اس کلچر میں جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ انسان کے مذہبی طرزِ احساس نے اظہار کے جس رویے کو مرتب کیا اور اُسے اپنی اعلیٰ تر تخلیقی عمل میں جذب کیا اُسے ہم وسیع تر معانی میں اندازِ بندگی یا عبادت کہہ سکتے ہیں۔ مذہبی طرزِ احساس کا کلچر یا پھر تخلیقی عمل میں مخلوق ہونے کی سچائی کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کا علم، اُس کی حکمت، اُس کا فکر، اُس کا فن اور علم الشہ عبادت بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ اپنی شاعری میں غالب بھی اسی سلسلے میں شامل دکھائی دیتا ہے۔ غالب کی غزل مذہبی طرزِ احساس کے ساتھ تخلیقی طور پر ایسے ہی اندازِ عبادت کی نشاندہی کرتی ہے!

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

مذہبی طرزِ احساس، جس کلچر کی بنیاد بنتا ہے وہاں تخلیق کے تمام اظہار اُس بنیادی رشتے کی نشاندہی کرتے ہیں جسے اندازِ عبودیت کہا جاتا ہے۔ تخلیقی طور پر اس انداز کی صورتیں مختلف ہیں اور ان مختلف صورتوں سے وہ تہذیب ظاہر ہوتی ہے جسے ہم اپنی تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں انسان نے اپنے خالق کو کیسے اور کس انداز میں یاد کیا ہے اسے مجاز اور حقیقت کا فلسفہ کیونکر بیان کرتا ہے۔ مذہبی طرزِ احساس کے ساتھ جو شاعری تخلیق ہوتی ہے اُس میں لفظوں، ترکیبوں، استعاروں، جذبوں اور اشاروں کے پہلو ایک ایسی شے بھی شامل ہو جاتی ہے جو کبھی زائل نہیں ہوتی اور نہ ختم ہوتی ہے۔ ادبی تنقید نے ابھی تک اس نامعلوم شے کا جائزہ نہیں لیا تاہم یہی وہ شے ہے جو آنے والے زمانے میں ہمکلام ہوتی ہے اور شاعری کو زندہ، متحرک اور پائیدار مقام دیتی ہے۔ غالباً یہ نامعلوم خصوصیت، ہمارے ادب میں صرف غالب کی شاعری میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت فارسی شاعری میں

صرف [illegible]وں میں دکھائی دیتی ہے۔ اور شاید اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ذہنی طرزِ احساس، اپنی اعلیٰ تر کیفیت میں گویائی اختیار کر لیتا ہے؟ اس ضمن میں ذیل کا اقتباس غور طلب ہے جو مسعود مفتی کی کتاب "چہرے" سے لیا گیا ہے۔

مسعود مفتی ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لفٹ میں اوپر جاتے وقت مجھے خیال آتا ہے کہ اکیس نومبر کو جب ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تھا تو چند روز بعد ہم لوگوں نے فال نکالی تھی ... میں اپنے کمرے میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ایک دو دوستوں کی بیگمات بھی تھیں۔ اور غالباً یہ خواتین ہی کی وجہ سے تھا کہ بات قرآن سے فال نکالنے پر شروع ہو گئی۔ کسی نے کہا کہ کل صبح کی نماز کے بعد نکالیں گے۔ مگر میں نے کہا کہ لوگ تو دیوانِ حافظ سے فال نکال لیتے ہیں۔ وہ تو یہاں نہیں ہے، لیکن دیوانِ غالب ہے کیوں نہ اس سے فال لی جائے! سب ہنسے اور مذاق ہی مذاق میں کام شروع ہو گیا۔

"ایک خاتون نے کچھ آیات پڑھنے کے بعد دیوانِ غالب کھولا اور ساتویں لائن پر یہ شعر تھا۔

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

آج باہر کا منظر دیکھنے کے بعد مجھے وہ شعر بار بار یاد آ رہا ہے گو ابھی بھی یقین نہیں کہ آج یا کل ہتھیار ڈالے جائیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ شاید چھ سات روز مقابلہ کر سکیں گے۔"

اور چھ سات روز کے بعد ڈھاکہ باقی نہ رہا۔ یادداشت باقی رہ گئی اور وہ شعر باقی رہ گیا۔ جو مستقبل کی نشاندہی کرتا تھا۔ کیا غالب کے شعری شعور کی وضاحت محض ادبی تنقید سے ممکن ہے؟

منظر مفتی

محسن بھوپالی

بشارت فروغ

شاد عارفی کے کچھ غیر معروف خطوط

اُردو کے مشہور و معروف طنز نگار شاعر شاد عارفی مرحوم کی مختلف تحریریں ان کے شاگرد مظفر حنفی "نثر و غزل دستہ" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ اس سے قبل "ایک تھا شاعر" کے نام سے انہوں نے جو ایک اور کتاب شاد صاحب کے بارے میں ترتیب دی ہے اس میں متعدد اشخاص کے نام شاد صاحب کے خطوط بھی شائع کئے ہیں لیکن ابھی بہت سے خطوط یا تو شائع نہیں ہوئے یا "ایک تھا شاعر" میں شامل نہیں کئے گئے۔ بعض خطوط شامل کئے گئے تو ان میں مرتب نے خدا جانے کس جذبہ کے تحت حذف و اضافہ سے کام لیا ممکن ہے مرتب کی اپنی ذاتی مصلحتیں کارفرما رہی ہوں۔

تقریباً تین برس ہوئے حکیم مسیحا نظامی صاحب نے مجھے شاد مرحوم کے کچھ خطوط مرحمت فرمائے تھے۔ جو انہوں نے شاد صاحب پر مضمون لکھنے کی غرض سے جمع کئے تھے لیکن وہ اپنے ارادے کو اپنی دیگر مصروفیات کے باعث عمل میں نہ لا سکے۔ میں نے ان سے یہ خطوط اسی وعدے کے ساتھ حاصل کر لئے تھے کہ انہیں شائع کرا دیا جائے گا۔ مسیحا صاحب سے ایفائے وعدہ کے طور پر بعض خطوط شائع کئے جاتے ہیں۔

ان میں سب سے پہلا خط فضا کوثری صاحب کے نام ہے جو محلہ بیریاں سے لکھا گیا ہے اسے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۹ء تک کا ہونا چاہیئے اس لئے کہ اس زمانے میں جیسا کہ خط کے ایک جملے سے معلوم ہوتا ہے شاد صاحب اپنے بھتیجے ماسٹر فدا احمد خاں کے ساتھ اسی محلہ میں رہا کرتے تھے۔ یہ خط بمبئی سے نکلنے والے ایک "ہفت روزہ" "ورقِ حیات" میں شاد صاحب کے انتقال کے بعد شائع ہو چکا ہے اور مظفر حنفی نے اپنی کسی مصلحت سے اس کا بیشتر حصہ حذف کر کے محض چند جملے "ایک تھا شاعر" صفحہ ۲۱۴ میں شائع کئے ہیں لیکن یہ خط مکمل شائع ہونا چاہیئے تھا اس لئے کہ اس میں شاد صاحب نے اپنی مختصر سوانح درج کی تھی۔

دوسرا خط جناب ابوالمجاہد زاہد صاحب کے نام ہے جن کا اس زمانہ میں رسالہ "نئی نسلیں" لکھنؤ سے تعلق تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کسی بات پر خفا ہو کر شاد مرحوم نے یہ خط لکھ مارا۔ یہ شاد صاحب کے مزاج کا آئینہ دار ہے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ زاہد صاحب سے شاد صاحب کے تعلقات خوشگوار رہے ہیں۔ یہ خط غیر مطبوعہ

تیسرا خط جناب خیال رام پوری کے نام ہے اور یہ ان تمام خطوط میں سب سے زیادہ اہم ہے اس لئے کہ اس میں شاد صاحب نے اپنے ایک مربی منشی عبدالمجید قریشی رام پوری سے ملاقات کی اجازت چاہی ہے اور اس خط کا لب و لہجہ اس انداز سے بالکل مختلف ہے جس سے انہیں بھی یاد کیا جاتا رہا ہے۔ شاد صاحب برسوں منشی صاحب سے متعلق رہے ہیں اور منشی صاحب ان کی مالی امداد کرتے رہے ہیں۔ لیکن بیچ بیچ میں ایسے مواقع بھی آئے جب منشی صاحب شاد صاحب کے مطالبات کو ان کی مرضی کے مطابق پورا نہ کر سکے ایسے زمانے میں شاد صاحب طنزیہ نظموں اور غزلوں میں اپنے مزاج کے عین مطابق اپنے مربی منشی صاحب کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ چنانچہ ایک شعر میں خود شاد صاحب نے لکھا تھا۔

مدح و ذم کے بارے میں اس کے بعد سوچوں گا
دیکھ لوں میرے خط کا کیا جواب آتا ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تعریف ۔"
مگر اگر سے یا کسی اور نظم یا غزل میں شاد صاحب نے منشی صاحب کے خلاف کچھ لکھ دیا ہوگا۔ لیکن جب شاد صاحب کی ضرورتوں نے انہیں مجبور کیا تو انہوں نے گردن ڈال دینے ہی میں عافیت جانی اور منشی صاحب سے قریب رام پور کے ایک شاعر خیال رام پوری کو واسطہ بنانا چاہا تاکہ منشی صاحب سے دوبارہ رسم و راہ پیدا ہو جائے۔ اسی لئے شاد صاحب کا لہجہ نہایت مدحیہ عاجزانہ اور نیازمندانہ ہے۔ یہ خط تاحال غیر مطبوعہ ہے۔

چوتھا خط بھی خیال صاحب ہی کے نام ہے اور ان کی خیریت جوئی کے لئے لکھا گیا ہے۔

پانچواں خط شاد صاحب کے شاگرد اکبر علی خاں عرشی زادہ کے نام ہے اس خط کو بھی مظفر حنفی نے مصلحتاً "ایک تھا شاعر" میں شامل نہیں کیا، اس لئے کہ اس کے ایک پیراگراف میں شاد صاحب نے یہ اطلاع دی ہے کہ منشی عبدالمجید قریشی صاحب شاد صاحب کے مکان کی تعمیر کے لئے رقم دے رہے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مظفر صاحب کو یہ پسند نہ تھا کہ منشی عبدالمجید قریشی، شاد صاحب کی جو امداد کر رہے ہیں وہ کسی شخص کے علم میں آئے لیکن اس خط کا ایک جملہ انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں شائع کر دیا ہے۔

خط نمبر ۶، ۷، ۸ خود مظفر حنفی صاحب کے نام لکھے گئے ہیں اور مسیحا صاحب نے ان خطوط کی جو نقلیں مجھے دی تھیں۔ ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ مظفر حنفی صاحب کے اپنے قلم کی نقل کی ہوئی ہیں ان میں سے پہلے دو خط شائع نہ کرنے کی وجہ بھی اس کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہوتی کہ ان میں سے ایک میں شاد صاحب نے اپنی ملازمت کے دوران تبادلے کو روکنے کے لئے "صدبھر خوشامد" کرنے کا تذکرہ کیا ہے اور دوسرے خط میں مظفر صاحب کے کچھ کلام کو ردی کی نذر کر دینے کا مشورہ دیا ہے اور یہ دونوں باتیں اشاعت کے وقت مظفر صاحب کے لئے غیر پسندیدہ ٹھہری ہوں گی اس لئے کہ وہ اپنے استاد کو نواب رام پور سے برسرپیکار دکھانا چاہتے ہیں کجا ان کے استاد کا ایک معمولی نوکری کے لئے ایک اہلکار کی صدبھر خوشامد کرنا۔

اس خط میں شاد مرحوم نے اپنے معاصر مولانا ابراحسنی گنوری مرحوم کے سلسلے میں جو بعض الفاظ استعمال کئے ہیں ان کو محض ایک وقتی جوش اور غلط فہمی کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے ورنہ ان دونوں بزرگوں میں تعلقات خوشگوار تھے۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یہ بات، بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ میں ان الفاظ کو حذف کر دیتا لیکن خود مظفر حنفی صاحب جب نہیں انہیں شائع کر دیں اس لئے انہیں شامل رکھتا ہوں مگر بطور اظہارِ واقعہ دونوں استادوں کے تعلقات کی نوعیت واضح کر دینا مناسب جانتا ہوں۔

مولانا ابراحسنی گنوری مرحوم ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء تک رام پور کے مدرسہ عالیہ میں بحیثیت استاد ملازم رہے اس زمانے میں شاد صاحب نے مقامی مشاعروں میں جانا ترک کر دیا تھا۔ ابراحسنی گنوری مرحوم کو یہ بات محسوس ہوئی اور انہوں نے شاد مرحوم کو بہ اصرار مشاعروں میں شریک کرایا ۵۲ء میں ابر صاحب ریٹائرڈ ہوئے تو رام پور سے رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے اپنے شاگردوں کو یہ ہدایت کی کہ اگر وہ فوری طور پر ضرورت پیش آ جائے تو اپنا کلام شاد صاحب کو دکھا دیا کریں۔ چنانچہ ایک بار ظہیرالدین خاں اوج اپنی غزل شاد صاحب کو دکھانے کے لئے بھی گئے لیکن دوسرے دن شاد صاحب نے اوج صاحب کو ایک اور غزل خود کہہ کر دے دی اور اصرار کیا کہ مشاعرہ میں شاد صاحب کی کہی ہوئی غزل پڑھی جائے ان کی غزل بعد میں اصلاح کرکے دے دی جائے گی۔ شاد صاحب کا اپنے شاگردوں کے ساتھ یہی معاملہ تھا اس لئے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد کسی طور بھی ان کے معاصرین کے شاگردوں سے پیچھے رہ جائیں لیکن اوج صاحب کو یہ بات منظور نہ ہوئی۔ اس لئے شاد صاحب سے مشورہ کا سلسلہ ابر صاحب کے شاگرد جاری نہ رکھ سکے۔ ان واقعات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابر صاحب شاد کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ مظفر حنفی کی کتاب "ایک تھا شاعر" میں جو کچھ ابر صاحب نے شاد صاحب کے بارے میں لکھا ہے وہ میرے خیال کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔

آخری خط کا صرف پہلا جملہ غیر مطبوعہ ہے باقی حصہ "ایک تھا شاعر" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس محذوف جملہ کو حذف کرنے کی مصلحت بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ مظفر صاحب اپنے پڑھنے والوں کو یہ بتانا نہیں چاہتے ہوں گے کہ وہ

"حسن پر فرعون کی پھبتی کہی
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی"

یگانہ جیسے استاد کے مشہور کے پہلے مصرع کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

شاد عارفی کے خطوط ان کی سوانح اور مزاج دونوں کے مطالعے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور اس لئے ان کی اشاعت شاد صاحب کے مطالعہ کا ایک لازمی جزو ہے۔ ناظرین ان خطوط کو اس نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔

<u>بنام فضا کوثری۔ بنگلور</u>

عزیزم فضا دعائیں

رجسٹرڈ لفافہ ملا تکلیف ہوئی۔ ڈاکخانہ کی بے ایمانی کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کو اور زیادہ پیسوں سے نوازا جائے۔ میں اس سے پہلے کارڈ میں تمہیں لکھ چکا ہوں کہ آج کل میں بہت زیادہ ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہوں پھر بھی تمہارے اصرار پر اپنی سوانح حیات مختصراً لکھ رہا ہوں۔

میں نجیب الطرفین افغانی ہوں میرا خاندان آج بھی افغانستان کے آزاد قبائل میں ہے۔ سات چچا اور دوسرے عزیز وہیں ہیں۔ میرے والد حصول تعلیم کے لئے رام پور آگئے تھے میرے نانا سید ولی خاں (یہ سید نام کا جزو ہے قوم نہیں) پہلے رام پور آ چکے تھے، یہیں مدرسۃ العالیہ میں فارغ التحصیل ہوئے میرے والد نے بھی یہیں مذہبی تعلیم پائی اور مولوی کی دستارِ فضیلت حاصل کی۔ اس کے بعد میرے نانا صاحب کو نواب صاحب لوہارو اپنے ساتھ لوہارو اسٹیٹ لے گئے — میرے والد بھی ان کے ساتھ گئے اور وہاں جا کر تھانیدار ہو گئے۔ ڈاکوؤں وغیرہ کو پکڑنے دھکڑنے کے سلسلے میں انگریز نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی پھر ولیعہد بہادر کی پیش کاری سے پنشن پا کر مع نانا صاحب رام پور آ گئے۔ ہاں وہیں میرے نانا صاحب نے اپنی بڑی لڑکی کا عقد میرے والد محمد عارف اللہ خاں کے ساتھ کر دیا۔ میں وہیں لوہارو میں پیدا ہوا۔ آٹھ برس کا تھا کہ رام پور آ گیا۔ یہیں گھر پر عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر انگریزی سکول میں داخل ہو گیا۔ ابھی دسویں جماعت میں آیا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا پنشن بند ہو گئی مگر پولیٹکل ایجنٹ نے میرے والد صاحب کی خدمات کے تحت میری والدہ صاحبہ کی پنشن مقرر کر دی اور ہمارا مکان جو لوہارو میں تھا۔ اس میں پرائمری سکول کھول کر اس کا کرایہ بھی بجوانا شروع کر دیا میں نے ملازمت تو نہیں کی مگر ٹیوشن کر کے پڑھتا اور پڑھاتا رہا۔ رہا شاعری کا سلسلہ اسکول کی چھٹی جماعت سے شروع ہو گیا تھا پہلے مولانا محمود صاحب شفق کو غزلیں دکھائیں پھر فصاحت جنگ حضرت خلیل مانکپوری کا شاگرد ہوا چونکہ مینائی خاندان ہمارے محلہ میں تھا اس سلئے ان لوگوں سے خاص قرب رہا۔ رشتہ داری ایسی کیفیت تھی۔ پھر میں نے ریاست کے خلاف نظمیں لکھنی شروع کیں اس وجہ سے ملازمت برگز نہ مل سکی۔ کارخانوں میں سپروائزر وغیرہ کی ڈیوٹی انجام دیتا رہا اور حکامانِ ریاست اور نواب صاحب کے خلاف کھلم کھلا نظمیں لکھتا رہا آخر میں جب کہ ریاست قریب قریب ختم ہو چکی تھی تھوڑے دنوں کو اسٹیٹ پریس میں انگلش پروف ریڈر ہو گیا اور پریس کے خاتمہ پر بجٹ اکاؤنٹنٹ ہو گیا ریاست ختم ہو جانے کے بعد ہندی وغیرہ کے امتحانات میں کامیاب ہوا پھر بھارتی حکومت نے ڈیگریڈ کر کے ناظر تحصیل سوار بنا دیا۔ یہ تحصیل ایسی ہے۔ جیسے روس کا سائبیریا۔ چنانچہ وہاں جاتے ہی ملیریا میں مبتلا ہوا۔ ہر چند تبدیلی کی کوشش کی مگر سپرینٹنڈنٹ آفس (شرما صاحب) تین سو روپے رشوت مانگتا تھا — میں نے کہا نہ رشوت لینے کا عادی ہوں نہ اسے پسند کرتا ہوں کہ رشوت دوں ... نتیجہ یہ ہوا کہ مصرع پڑھتے ہوئے مستعفی ہو گیا۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔

وہاں سے بیمار آیا اور صحت اتنی گر گئی کہ ابھی تک کمزوری اور نزلہ اور گاہ گاہ سانس کا دورہ پڑ جاتا ہے اب اپنے بھانجے ماسٹر فدا احمد خاں (بی اے بی ٹی) کے یہاں رہتا ہوں۔

رہا تمہارے رام پور آنے کا سوال تو یہ بھی اچھا نہیں اس لئے کہ میرے اپنے سر چھپانے کا ٹھکانا نہیں ہے تمہیں کہاں ٹھہرا سکوں گا کھانا پینا تو

وزکنار ہاں[۵] لئے تمہارا میرے پاس آنا بھی میرے
مزاج کے خلاف ہوگا ہاں اگر میری غربت کی ہنسی
اُڑانا چاہو تو چلے آؤ۔

چنانچہ دس سال سے کرائے کے گھروں میں مارا مارا پھرتا
ہوں اپنا گھر بیچ کر والدہ صاحبہ کا کفن دفن کر دیا
جو آج تک سر چھپانے کو جگہ نہیں۔ ہاں میں نے
شادی اٹھائیس برس کی عمر میں کی تھی مگر بیوی نوکری
کے ساتھ ختم ہوگئی میرے ساتھ ڈیڑھ سال زندہ
رہی اچھا ہوا ورنہ آج میرے ساتھ مصیبت بھگتی
ہوتی۔ نوکری کسی مسلمان کو ہندوستان میں ملنا
اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ جوئے شیر لانا....
بہرحال گذر رہی ہے۔ یوں تو خدا مالک ہے
مگر بہت کٹھن ہے۔

(۲)

<u>بنام ابو المجاہد زاہد صاحب</u>

بتوسط ارباب ادب رام پور یو۔ پی

مخلصی مجاہد صاحب سلام علیکم

دونوں شمارے (ساتھی کا اور میرا) ملے بہت
بہت شکریہ لیکن آئندہ یہ تکلیف نہ فرمائیں اور
میرا خط اور غزل بذریعہ ڈاک ضرور واپس کر دیں۔ غزل
کی ضرورت نہیں اسے تو چاک فرما دیں کیونکہ اس کی
نقل میرے پاس ہے جسے آج ہی "نقوش" لاہور کو
بھیج رہا ہوں ہاں وہ خط بہت ضروری ہے
یوں نہیں تو بیرنگ ہی روانہ کر دیجئے اور فوراً
اس کے بعد نئی نسلوں کے سلسلے میں کوئی گفتگو
نہیں ہونی چاہیئے اس پر بھی اگر آپ نے کوئی
اخلاقی وار کیا تو میں مجبور ہوں گا کہ بد خلقی برتوں اس
لئے آپ بھی خط و کتابت بند ہی کر دیں تو بہتر ہوگا۔

نوٹ:۔ ساتھی کو بھی رسالہ مت بھیجئے۔

شاد عارفی

(۳)

<u>بنام خیال رام پوری</u>

بیریاں رام پور

۹ جون ۱۹۵۸ء

مکرمی و محترمی جناب خیال صاحب اسلام[۱] علیکم

اس کے بعد یہی بات باقی رہتی ہے کہ آخر میں
یہ دستی تحریر کیوں لکھ رہا ہوں اس کی تفصیل یہ ہے
کہ میں کئی دن سے سوچ رہا تھا بلکہ تحقیق کرنا چاہتا
تھا کہ منشی صاحب قبلہ رام پور میں ہیں یا نہیں
اگر ہیں تو کس وقت نیاز حاصل کیا جا سکتا ہے۔
کیا جا سکتا بھی ہے یا نہیں۔ جب کوئی ذریعہ اس
سلسلے میں ہاتھ نہ آیا تو مجبوراً آپ کو تکلیف دے
رہا ہوں کہ آپ اس بارے میں مفصل جواب دیں
کہ آیا منشی صاحب قبلہ رام پور میں ہیں یا نہیں
اگر ہیں تو موصوف سے معلوم کر لیں کہ وہ مجھے
پندرہ منٹ ملاقات کے لئے دے سکتے ہیں
یا نہیں۔ وقت دے سکتے ہیں تو کس دن اور کے
بجے۔ میں رکشا پر خود بھی جا سکتا تھا مگر جیسا کہ
آپ کو معلوم ہے میرا رکشا پر جانا ایک روپے
سے کم میں نہیں ہو سکتا اور پھر یہ بھی کہ اگر یقین ہو
کہ منشی صاحب مل سکیں گے تو میں یہ بار برداشت
کر سکتا تھا لیکن غیر یقینی حالت میں میرے لئے یہ
صرف ناقابل برداشت ہے اور پھر یہ بھی کہ
منشی صاحب ملنا پسند بھی کریں گے یا نہیں۔
یعنی میں رکشا پر جاؤں اور موصوف دولت خانہ
پر نہ ملیں یا یہ کہ موجود ہوں مگر ملنا نہ پسند کریں تو
یہ دوہری کوفت ہوتی اس لئے آپ سے رجوع
کیا ہے کہ آپ ان باتوں کا تفصیل سے جواب دیں
گے۔ مؤکل اگر آپ سے جواب معلوم کرے گا۔
اُمید ہے مزاج مع الخیر ہوگا۔

نیاز مند شاد عارفی

(۴)

بنام خیال رام پوری

گھیر حسن خاں ۔ پکا باغ روڈ رام پور۔ یوپی بھارت

۷ اگست ۱۹۶۲ء

مکرم و محترم السلام علیکم

آج عزیز نثار خاں نصرت سے معلوم ہوا کہ
تم کان کی پھوڑیا کے شدید حملہ سے دوچار ہو۔
خدا تمہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دے۔ میرا باز
تو روز تھوڑا بہت گوشت صدقہ میں اتارتے ہو
صدقہ بڑی ڈھال ہے۔ میں پوچھنے کو خود آتا مگر
ڈولی کے کرایہ کا سوال مانع آتا ہے اس لئے کارڈ
کے ذریعہ مزاج پرسی غنیمت سمجھ رہا ہوں خدا
تمہیں صحت دے (آمین)

دعا گو شاد عارفی

(۵)

بنام اکبر علی خاں عرشی زادہ

متصل مزار شاہ ولی اللہ صاحب رام پور یوپی بھارت

۱۹ جنوری ۱۹۶۳ء

عزیزم پُر خلوص دعائیں۔ کل پہلا شمارہ نگار
کا ملا خدا تمہیں کامیابی دے خوب اچھا پرچہ نکالا۔

ماہِ نو ۵ یہ کتابت کی غلطی ہے فدا احمد خاں بھتیجے ہیں

۱ شاد صاحب عربی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے جو قطعاً غلط ہے یہ غلطی ان ہر تحریر میں موجود

خشتِ اوّل ہی سیدھی ہو تو ثریا تک دیوار صحیح جائے گی۔ تکلیف ذرا سی یہ ہوئی کہ یہ شمارہ ڈاک سے ملا اگر تم خود مل کر یہ شمارہ دیتے تو دُہرا لطف آجاتا لیکن (معاف کرنا) د چھوٹے ہو تو کیا ہے غلطی کی معافی چھوٹے سے بری نہیں) تمہیں میرا پہلا ان لینڈ لیٹر ملا ہو گا۔ جس میں میں نے بے تکلفی کے ساتھ (جس پر بھروسہ ہو کی جاتی ہے) کے تحت بروم وٹیا کے استعمال اور فائدے سے متعلق ذکر کر کے ایک اور ڈبہ کی فرمائش کر دی تھی چنانچہ اب مجھے تمہارے نہ آنے اور یہ شمارہ ڈاک سے ملنے پر شبہ ہو رہا ہے کہ تم مجھ سے اور میری بیماری اور "بھیک منگے پن" سے بور ہو گئے یا یہ تو نہیں سوچ بیٹھے کہ اس سے بھی زائد کچھ نہ مانگ بیٹھے سو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے صرف باتیں کرنی ہیں۔ اور خدا کا شکر ادا کرنا ہے جس میں تم ایسے ہمدرد کی مدد سے میری بیماری میں معاونت کی۔ ڈبہ نہیں لا سکتے نہ لاؤ مگر ملو میری سنو تسکین دو اور چلے جاؤ۔ وہ جو کہا ہے کہ ہمدمِ دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے یہ اب مجھے درست معلوم ہو رہا ہے۔

مکان کی تعمیر کے بارے میں یہ ہے کہ منشی صاحب (عبدالمجید قریشی) کا خط آگیا ہے انشاء اللہ العزیز جلد ہی اس کی تعمیر شروع ہو جائے گی۔

نگار میں یا تو مذہبی بحث سرے ہی سے نہ ہو یا پھر یہی انداز رہے جو اس نمبر میں ہے باقی کیا رائے دوں تم خود سلیقہ شعور اور فن کے بارے میں محتاط ہو۔

دعاگو شاد عارفی

(۶)

بنام مظفر حنفی

مرزا شاہ ولی اللہ صاحب رام پور۔ یو پی

۲۴ مئی ۶۳ء

عزیزم مظفر حنفی دعائیں

کارڈ ملا مجھے قبلہ مت لکھا کرو میں بہت گنہگار قسم کا شاعر آدمی ہوں مجھے تو حضرت بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ باتیں تو اس مکار ابراحسنی کو ہی پسند ہیں بد تمیز اونچا بننے کی ترکیبیں سوچتا رہتا ہے میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہاری خیریت نہیں معلوم ہوئی ارادہ تھا کہ آج ڈاک دیکھ کر خط لکھوں گا کہ تمہارا خط پہنچ گیا۔

بدل کی لعنت سے میں بھی آگاہ ہوں اور یہاں تک آگاہ ہوں کہ بھارت کی حکومت میں حد بھر خوشامد کے بعد بھی جب بغیر رشوت دیئے بدلی نہ ہوئی تو استعفیٰ دے دیا چنانچہ آج تک بے نوکر ہوں۔ اور یہیں رام پور کے سائبیریا یعنی سوار میں ملیریا کا شکار ہو کر دس مہینے سے ایڑیاں رگڑتا رہا اور آخرکار استعفیٰ دے کر آج تک بیماری بھگت رہا ہوں پراویڈنٹ فنڈ جو تقریباً ۴۵۰ روپے تھا اکاؤنٹنٹ جنرل نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ تمہارے حسابات کھو گئے اس لئے خاموش ہو جاؤ دیکھا انصاف؟ تو ہاں۔ وہاں میں نے مکان نہ ملنے کے دوسرے تمام مصائب برداشت کئے اسی لئے تم سے کافی ہمدردی محسوس ہوئی۔ خدا تمہیں چین دے اور مجھے بھی بیماری سے نجات دے (آمین) خیریت لکھتے رہا کرو۔ میرے لئے ڈاک ٹکٹ بہت پریشان کن ہوتے ہیں۔ اس لئے میرے خط کا انتظار مت کیا کرو۔

شاد عارفی

(۷)

رام پور ۶ راکتوبر ۱۹۶۳ء

عزیزم حنفی اس مرتبہ غزلوں کی پوری کھیپ فضول جنس ثابت ہوئی ان میں شاید ہی کوئی شعر رکھنے کا رہا ہو انہیں سنبھالا نہیں جا سکتا۔ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے یہ سب غزلیں ردّی اور نومشقی کی دلیل لاتی ہیں یہ سب دریا برد کرو۔

شاد عارفی

نوٹ: اب میری حالت قدرے درست ہے۔ اللہ کرم فرمائے موسم بھی اچھا ہو گیا ہے اگر یہی رفتار رہی تو صحت کی اُمید ہے۔

شاد عارفی

(۸)

جنوری ۶۴ء

عزیزم حنفی دعائیں

فرعون کی پھبتی باعتبار غرور ٹھیک ہے سخت علیل رہا تمام جسم پر ورم آگیا تھا۔ خدا خدا کر کے اب ورم اُترا ہے۔ بہت کمزور ہوں۔ لکھنا پڑھنا بند ہے مفصل پھر لکھوں گا۔ انجکشن نو نو روپے والے لگ رہے ہیں۔ بارہ دن میں ۲۵۰ (دو سو پچاس روپے) اُٹھ چکے ہیں۔ خدا مالک ہے بچ گیا ہوں شکر ہے۔

دُعاگو

شاد عارفی

پروفیسر ایم۔ اشرف

قصہ سیف الملوک کے غیر ملکی تراجم

ڈاکٹر گیان چند نے اپنے تحقیقی مقالہ بعنوان "اُردو کی نثری داستانیں" میں درست تحریر کیا ہے کہ قصہ سیف الملوک ابتدا میں الف لیلہ کی داستانوں میں شامل نہیں تھا۔ لیکن بعد ازاں جب اس میں کئی دیگر داستانوں کا اضافہ کیا گیا تو اسے بھی شامل کر لیا گیا۔ سیف الملوک کے ترجمہ کے ذکر سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ الف لیلہ اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کا سرسری ذکر کر دیا جائے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے صفحہ ۳۶۰ پر مندرجہ انگریزی "THERE ARA TRANSLATIONS OF THE NIGHTS IN SPANISH, ENGLISH, POLISH, GERMAN DANISH, RUSSIAN AND STALIAN."

عبارت کا ترجمہ اُردو میں یوں ہوگا۔

"الف لیلہ کے تراجم ہسپانوی، انگریزی، پولش جرمن، ڈینش، روسی اور اطالوی میں موجود ہیں۔"

انسائیکلو پیڈیا میں دی ہوئی یہ فہرست میرے خیال کے مطابق نامکمل ہے۔ متعدد مزید بالو میں قصہ سیف الملوک میری نظر سے گذرا ہے۔ جس کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں کیا جائے گا۔

پہلی یورپی زبان جس میں الف لیلہ کا ترجمہ کیا گیا فرانسیسی ہے۔ ژین انتائنے گیلان نے یہ ترجمہ ۱۲ جلدوں میں "لے اے اونے نوائتس" کے نام سے ۱۷۰۴ء تا ۱۷۱۷ء میں کیا۔ اس ترجمہ کا مآخذ دو نامکمل مخطوطات اور شامی کہانیاں ہیں۔ گیلاں نے اپنے ایک فاضل دوست کی مدد سے ان کہانیوں کو عام ذوق کے مطابق ڈھالا اور اس ترجمہ سے الف لیلہ مینڈ ڈ سے ماسکو تک کی نشست گاہوں کی زینت بن گیا۔ اور بڑی دلچسپی سے پڑھا جانے لگا۔ گیلاں کو داستان گوئی کا قدرتی ملکہ حاصل تھا۔ وہ فرانسیسی سفیر کا اتاشی سکریٹری رہا تھا۔ اور عربی زبان میں کافی دسترس رکھتا تھا۔ اس نے ترجمہ براہِ راست عربی سے کیا ہے۔

فرانسیسی زبان کا دوسرا ترجمہ ڈاکٹر جے۔ جی مادروس کا ہے۔ جو سولہ جلدوں میں کیا گیا۔ اور پیرس سے ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر موصوف کے بیان کے مطابق اس ترجمہ کا آغاز ۱۸۳۵ء میں بولاق کے مطبوعہ عربی نسخہ سے براہِ راست کیا گیا۔

جرمن زبان میں عربی زبان سے پہلا ترجمہ براہِ راست ہامر پرگ شتال نے ۱۸۲۳-۲۴ء میں "DIE NOCH NICHT UBERSETZER ERZCIHLUNGER DER TAUSEND-UNDEINEN NACHT" کے نام سے کیا۔ دوسرا جرمن ترجمہ ہننگ کا ہے اور تیسرا ترجمہ ۱۸۲۵ء میں ہابخت نے کیا جو ۱۵ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کہانیاں مختلف ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں۔ ہننگ کا ترجمہ ۲۴ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مترجم نے یہ ترجمہ ۱۸۹۵-۹۷ء میں کیا۔ اس میں ابتذال کو کسی حد تک حذف کر دیا ہے۔ عبارت قدرے بے کیف اور پھیکی سی ہے اور اشعار کے صرف پہلے مصرعے درج کئے گئے ہیں۔ پہلی ۱۷ جلدوں کی داستانیں طبع بولاق کے عربی ایڈیشن سے لی گئی ہیں۔ جن میں قصہ سیف الملوک شامل ہے۔ اور جلد ۱۸ تا ۲۴ رچرڈ برٹن کے انگریزی ترجمہ سے لی گئی ہیں۔ جرمن زبان کا بہترین

ترجمہ ای۔ لٹمان کا ہے۔ جو لیپزک سے ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۸ء چھ جلدوں میں طبع ہوا۔ اس کی دوبارہ اشاعت ۱۹۵۳ء میں ویز باڈن سے اور سہ بارہ اشاعت ۱۹۵۴ء میں کلکتہ سے ہوئی۔ انگریزی زبان میں الف لیلہ کے تراجم مندرجہ ذیل مترجمین نے کئے ہیں۔

(ا) ہنری ٹارنز ۳۹-۱۸۳۸ء (اس ترجمہ میں قصہ سیف الملوک شامل نہیں)

(ب) ایڈورڈ ولیم لین ۴۰-۱۸۳۹ء

(ج) جان پین ۸۹-۱۸۸۲ء تیرہ جلدوں میں

(د) رچرڈ برٹن (۸۸-۱۸۸۵ء) لندن سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔

(ہ) ٹین لے پول ۱۹۰۶ء

(و) پواتسر میدرز نے بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

ہنری ٹارنز نے اپنے ترجمہ کا آغاز ۱۸۳۸ء میں کیا۔ اس کا ترجمہ نثر میں ہے۔ نو دس جلدوں میں اس کا ترجمہ لکھنے کا پروگرام تھا۔ مگر اگلے سال ایڈورڈ ولیم لین نے بھی ترجمہ شروع کر دیا جو اس کی نسبت زیادہ ہر دلعزیز ہو گیا۔ لہٰذا ہنری ٹارنز نے ترجمہ کا کام ترک کر دیا۔ اچانک اسی سال ٹارنز کی موت بھی واقع ہو گئی۔ غواصی دکنی کی سیف الملوک کا انگریزی ترجمہ متن سمیت بمبئی سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جان پین نے آٹھ سال کے عرصہ میں تیرہ جلدوں میں الف لیلہ کا ترجمہ مکمل کیا۔ پین کے ترجمہ کے آغاز سے تین سال بعد رچرڈ برٹن نے اپنے ترجمہ کا آغاز کیا۔

جناب علی اصغر حکمت وزیر معارف و اوقاف ایران نے رچرڈ برٹن کے ترجمہ کو ولیم لین کے ترجمہ سے کامل تر قرار دیتے ہوئے "جلد اول ہزار و یک شب" مطبوعہ ۱۳۱۵ شمسی ۱۹۳۶ء کے صفحہ 'لا' پر پیش لفظ کے چھٹے عنوان "نسخ خطی و ترجمہ و طبع" "الف لیلہ" میں لکھا ہے

"بعد از او (ولیام لین) سر ریچارد بورتن انگلیسی ۱۸۸۵ ترجمہ دیگری کامل تر از نسخہ ولیام لین منتشر ساخت۔"

وزیر موصوف نے عربی نسخوں کا سنہ اشاعت یوں تحریر کیا ہے۔

۱- اشاعت کلکتہ چہار جلد در (۱۸۴۲-۱۸۳۹م)

۲- طبع برسلو در دوازدہ جلد (۱۸۴۳-۱۸۲۵م)

۳- طبع بولاق مصر در چہار جلد (۱۲۵۱ھ ۱۸۶۳م)
(کہ ظاہراً ترجمہ فارسی اخیر از روی آن شدہ است)

۴- طبع قاہرہ

۵- طبع بیروت

قبل ازیں کلکتہ سے عربی کی دو جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔ کلکتہ کا نسخہ شیخ احمد بن محمود شیروانی الیمنی نے مرتب کیا ہے۔ پہلی جلد ۱۸۱۴ء میں اور دوسری ۱۸۱۸ء میں فورٹ ولیم کالج کے تعاون سے شائع ہوئی۔ پہلی جلد میں الف لیلہ کی دو سو کہانیاں شامل ہیں۔ نیز میرے مطالعہ سے مطبع بولاق کی چار جلدیں مطبوعہ ۱۸۳۵ء الف لیلۃ و لیلۃ کے نام سے گزری ہیں۔ قصہ سیف الملوک چوتھی جلد میں شامل ہے۔ انجمن ترقی اردو نے ان چار جلدوں کا ترجمہ چھ جلدوں میں طبع کر لیا ہے۔ ترجمہ میں قصہ سیف الملوک چھٹی جلد کی ابتدا میں موجود ہے۔

ہسپانوی میں ترجمہ وچانتے بلاسکو ابانیز نے کیا ہے۔ پولش ترجمہ نامکمل ہے۔ مترجم کا نام کسی انسائیکلوپیڈیا میں درج نہیں ہے۔ اطالوی میں ترجمہ الیفنے جبرلی نے کیا ہے۔ ڈینش میں ۱۸۲۴ میں راسموسین نے اور ۱۹۲۸ء میں اوسترپ نے کیا ہے۔ اوسترپ کا ترجمہ انتہائی عالمانہ اور بہت مقبول ہے۔ روسی ترجمہ سلیر اور جے کراچکوفسکی نے کیا ہے۔ ترکی زبان میں "گلشن عشق" کے نام سے عزت کیچا چی زادہ رومی ترجمہ نے کیا ہے "کشف الظنون" میں اس کا سنہ تحریر ۱۵۵۳ء درج ہے۔

بنگالی میں قصہ سیف الملوک کا ترجمہ چار شاعروں ڈونا غازی، کوی ابراہیم، مال محمد اور علاول نے کیا ہے۔ پہلا اور قدیم ترین ترجمہ ۱۵۵۰ء تا ۱۶۸۰ء ڈونا غازی کا ہے۔ اس نسخہ کے بیشتر صفحات غائب ہیں۔ اس میں پراکرت کے متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس نظم میں قوافی و بحور کی بے قاعدگیاں پائی جاتی ہیں تاہم ڈونا غازی نے اس صنف کو آگے بڑھایا۔ کوی ابراہیم یا ابراہیم کے بارے میں تلاش بسیار کے باوجود کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ کوی مال محمد کے بارے میں اتنا علم ہوا ہے کہ اس نے کہانی کے مرکزی خیال کو بنیاد بنا کر ۱۲۳۵ بنگلہ سال میں پوتھی مرتب کی۔ مہاکوی علاول نے اپنی مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال ۱۶۶۹ء میں

مکمل کی۔ یہ اس کی دوسری مثنوی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے اسے ایک فارسی مثنوی سامنے رکھ کر تحریر کیا۔ ملاول کو فارسی زبان میں بڑی دسترس حاصل تھی۔ اس نے نظامی کی ہفت پیکر اور سکندر نامہ کا بھی منظوم ترجمہ مثنوی کی بحر میں کیا ہے۔

پشتو زبان کے تاحال دو نسخے میری نظر سے گذرے ہیں ایک درمیانہ تقطیع کا نسخہ سید راحت زاخیلی مرحوم نے سپردِ قلم کیا ہے۔ یہ نسخہ دو دفعہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں جذبے کی شدت اور فراوانی موجود ہے۔ یہ نسخہ جو سیف الملوک افغانی کے نام سے موسوم ہے۔ دراصل ایک فارسی مثنوی "سیر السلوک" کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے سیر السلوک کی تفصیل فارسی نسخوں کے ضمن میں آئے گی۔ راحت کے اشعار ستر فی صد سے زائد سیر السلوک کا نثر پاروں میں منظوم ترجمہ ہیں۔

پشتو کا ایک مختصر سا نسخہ حال میں ہی محمود نے بھی لکھا ہے۔ یہ دو قصوں پر مشتمل ہے ایک قصہ ھاروت و ماروت اور دوسرا سیف الملوک اور بدری جمالہ ہے۔ اسے رحمان گل نے قصہ خوانی بازار پشاور سے شائع کروایا ہے یہ گیارہ ابواب پر مشتمل ہے اور شاعر نے باب کو داستان کا نام دیا ہے۔

سرائیکی زبان میں مولوی لطف علی بہاولپوری کا نسخہ قدیم ترین ہے یہ مولوی صاحب کے اپنے اس شعر

روز خمیس ختم تھیا اے دفتر سن تاریخ لکھیوسے
بارھویں سخت صدی تھوں اجہو پنجک چک لکھیوسے

کے مطابق ۱۱۹۵ھ میں مکمل ہوا۔ واقعات کے لحاظ سے یہ نسخہ فارسی نثری قلمی نسخہ سے اقرب ہے جو تمام نسخوں کا ماخذ ہے۔ اس نسخہ کا ترجمہ جناب بشیر احمد ظامی بہاولپوری نے بڑی کاوش سے اُردو میں کیا ہے۔ ہر باب میں سرائیکی زبان کے مشکل الفاظ کا اُردو میں فرہنگ بھی موجود ہے۔ یہ ترجمہ اُردو اکیڈمی بہاول پور نے سیفل نامہ کے عنوان سے ۱۹۶۴ء میں طبع کروایا ہے اور بڑی تقطیع کے ۲۷۴ صفحات پر مشتمل ہے اس کے کل ابواب ۲۷۴ ہیں۔

سندھی زبان میں سیف الملوک عرف سیفل نامہ کو مولوی محمد صادق رانیپوری نے ترتیب دیا ہے۔ اس کا عالمانہ مقدمہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے سپردِ قلم کیا ہے۔ اس نسخہ کو سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۰ء میں طبع کروایا ہے۔ یہ قصہ دراصل مولوی لطف علی کے قصے کا سندھی ترجمہ ہے۔ یہ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے یہ مقدمہ کا اختتام ۶۲ویں صفحے پر ہوتا ہے۔ فارسی زبان کا قدیم نسخہ جو محمود غزنوی کی فرمائش پر حسن میمندی نے دمشق سے منگوایا اور تمام نسخوں بالخصوص غواصی دکنی کی مثنوی کا ماخذ ہے نثر میں ہے یہ درمیانہ سائز کے ۶۲ اوراق پر مشتمل ہے ہر صفحہ پر ۱۱ سطریں ہیں کل الفاظ ۱۵ ہزار ہیں۔ سنہ کتابت، کاتب یا مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ عبارت صاف اور آسانی سے پڑھی جا سکنے والی ہے۔ کاتب عربی زبان سے قطعاً نابلد ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ربِ یسر.....

اور متعدد مقامات پر ناقلان آثار و راویان اخبار چنین گفتہ اند سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔

فارسی نثر میں ایک مختصر سا خوشخط قلمی نسخہ بعنوان "قصۂ لذت بخشائی مذاق عاشقان اعنی داستان شہزادہ سیف الملوک شجاعت نشان و بدیع الجمال شہزادی پریاں" ہے جو ۱۹۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ میرزا محمد غفران نے چترال کے شہزادے کے لئے سپردِ قلم کیا ہے۔ اور ۱۳۱۴ھ میں مکمل ہوا۔ نسخے کی عبارت مقفیٰ، مسجع اور بڑی فاضلانہ ہے۔ چند سطور ملاحظہ ہوں۔

"باوجود وفور ملک و دولت و خزائن و نعمت فرزندی کہ دیدہ امیدش بدو روشنی شدی نداشت و دائماً نہال آرزوی فرزند بزمین دل میکاشت تاکہ بعد از مردہ سالہا از بسیاری تضرع و زاری بدرگاہ حضرت باری حق تعالٰے اورا پسری داد بادشاہ شکر الطاف الہٰی گفتہ اورا سیف الملوک نام کرد۔

بقول جناب پروفیسر شریف کنجاہی فارسی زبان میں ایک مثنوی بعنوان گلشنِ عشق مرزا بدیع اصفہانی نے بھی سپردِ قلم کی ہے۔

فارسی کا چوتھا نسخہ بعنوان "سیر السلوک" ملا محمد عثمان فضل جلال آبادی نے لکھا ہے۔ یہ منظوم نسخہ بڑی تقطیع کے ۲۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور مطبع نولکشور لاہور سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ بعض اشعار وزن سے گرے ہوئے

ہیں ۔ اور یہ غالباً کاتب کی لاپرواہی سے ہے بیشتر مقامات پر اشعار کی زبان رواں دواں اور جزالت کی حامل ہے ۔ بحر آسان ہے ۔

فارسی زبان کے عمدہ قلمی نسخوں میں سے ایک مثنوی "جذب رسا" ہے ۔ جو دیوان سنگھ خلیق لاہوری نے کشمیر میں ۱۲ راکتوبر ۱۸۰۵ء میں مکمل کی ۔ اس مثنوی کے ساتھ خلیق لاہوری کا فارسی دیوان بھی شامل ہے ۔ الفاظ کا عمدہ انتخاب ، بحر کی روانی ۔ صوتی اثرات ، جزالتِ کلام اور انتہائی اعلیٰ اختصار اس نسخہ کی اعلیٰ ترین خصوصیات ہیں

دکنی اردو میں غواصی دکنی کی مثنوی سیف الملک بدیع الجمال مثالی حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ مثنوی سلطان محمد قطب شاہ کے آخری عہد میں فارسی مخطوطہ مذکورہ بالا کو سامنے رکھ کر دو ہزار پر مشتمل ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۸ء یا ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں سپردِ قلم کی گئی ۔ یہ دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اردو زبان کی سب سے پہلی مثنوی ہے ۔ اس مثنوی میں ہندی الفاظ بکثرت استعمال کئے گئے ہیں ۔ کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے ۔ بیان کی دلکشی اور قادر الکلامی غواصی کی تمام مثنویوں کے نمایاں خدوخال ہیں ۔ اسلوب کی سلاست شعری نزاکتیں اور اختصار اس مثنوی کی جان ہیں ۔ یہ مثنوی ۱۸۷۳ء میں بمبئی سے اور مولانا میر سعادت علی کی ترتیب و تصحیح کے ساتھ شائع ہو چکی ہے ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی گرانقدر کتاب تاریخ ادب اردو جلد اوّل مطبوعہ جولائی ۱۹۷۵ء میں اس مثنوی پر عالمانہ اور سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔ برٹش میوزیم کے مخطوطہ میں تاریخ تصنیف اس طرح لکھی گئی ہے ؎

برس یک ہزار ہو پنج بیس میں
کیا ختم یو نظم دن تیس میں

غواصی کے قصہ کی مختصر سی بحث پر میں اس مقالہ کا اختتام کرتا ہوں ۔
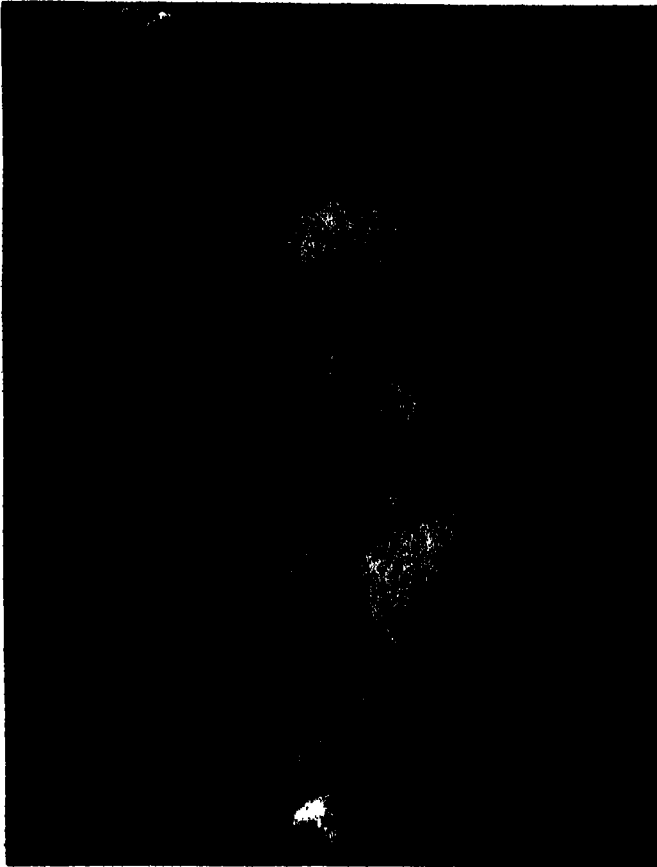
رشید نثار

احمد جاوید
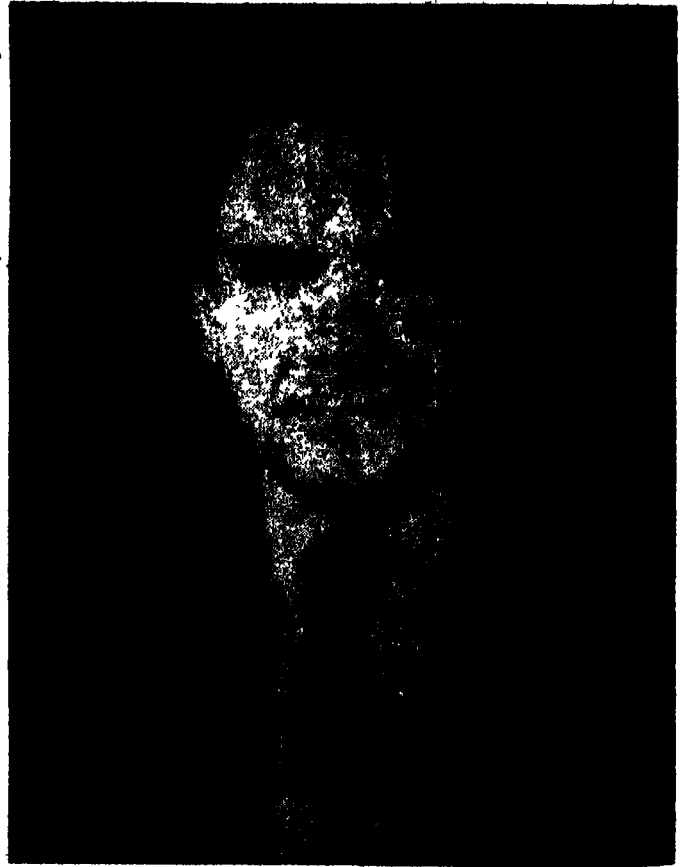
جعفر طاہر (مرحوم)

(غیر مطبوعہ غزلیں)

آنکھیں پتھر کی الٰہی یہ بدن پتھر کے
کیا پڑی ان پہ۔ گئے لوگ جو بن پتھر کے

کس کا یہ رعب ہے جو سرمۂ آواز ہوا
ہائے پتھر کی زبانیں یہ دہن پتھر کے

نہ کسی جور کا شکوہ نہ ستم کی فریاد
بت بنے بیٹھے ہیں سب اہلِ سخن پتھر کے

پاؤں میں گردشِ ایام کی زنجیریں ہیں
سر پہ انگاروں بھرے سات گگن پتھر کے

شور پانی کا ڈکاریں یہ جواں شیروں کی
وہ گرے ٹوٹ کے زندانِ کہن پتھر کے

قصرِ ایواں کو تم روتے ہو جعفر طاہر
اب تو مُردوں کو بھی دیتے ہیں کفن پتھر کے

کھو گئیں وقت کے صحرا میں سپاہیں کیا کیا
ڈھونڈتی پھرتی ہیں مایوس نگاہیں کیا کیا

زانوئے یار کی زرکار فصیلیں نہ حصار
لُٹ گئیں ہم نفسو شہر پناہیں کیا کیا

آج ہر دیدہ و دل میں ہے اُسی کی صورت
روک لیں شہر کی اِک شخص نے راہیں کیا کیا

برچھیاں کرنوں کی چبھنے لگیں اب جسموں میں
ڈھونڈتے پھرتے تھے بارش سے پناہیں کیا کیا

آوارۂ صد زلفِ سیہ فام رہا ہوں
یوسف کی طرح بندۂ بے دام رہا ہوں

فیضانِ لب و چشم کے سُن مجھ سے فسانے
اک عمر پرستارِ مے و جام رہا ہوں

اس ڈھلتے ہوئے حسن پہ لکھتا ہوں قصیدے
گرتی ہوئی دیوارِ حرم تھام رہا ہوں

گذرا ہوں تو ہجوم آئی ہیں اس شہر کی گلیاں
جس شہر میں طاہر کبھی بدنام رہا ہوں

ضیا جالندھری

افتادِ طبیعت سے اس حال کو ہم پہنچے
شدت کی محبت میں شدت ہی کے غم پہنچے

احوال بتائیں کیا رستے کی سنائیں کیا
باحالتِ زار آئے با دیدۂ نم پہنچے

کچھ لب پہ کچھ آنکھوں میں لے آئے سجا کر ہم
جو رنج کہ ہاتھ آئے جو غم کہ بہم پہنچے

جس چہرے کو دیکھا وہ آئینۂ دوری تھا
دیوار کی صورت تھا جس در پہ قدم پہنچے

جی اٹھتے ہیں خواب اُس کے گونج اٹھتے ہیں الفاظ کے
ستراط کے ہونٹوں تک جب ساغرِ سم پہنچے

قطعِ سرِ شاخِ نرم آغازِ نموئے نو
صدمے مری چاہت کو پہنچے تو بہ کم پہنچے

وہ شاخ بنے سنو سے وہ شاخ پھلے پھولے
جس شاخ پہ دھوپ آئے جس شاخ کو نم پہنچے

ظفر اقبال

افسردہ کیوں ہو، کچھ تو اِدھر چھوڑ جاؤں گا
میں خود چلا گیا تو خبر چھوڑ جاؤں گا

بیگانۂ سفر ہی رہا میں بھی عمر بھر
میں بھی کوئی کتابِ سفر چھوڑ جاؤں گا

اس کی جھلک بھی دیکھ نہ پاؤں گا میں کہیں
جس حسن کی تلاش میں گھر چھوڑ جاؤں گا

بھر جائے گی کچھ اس سے بھی نیت مری کبھی
اِک روز یہ بھی راہگزر چھوڑ جاؤں گا

تقسیم پر فضول ہی جھگڑیں گے اہلِ شہر
کیا اپنے پیچھے لعل و گہر چھوڑ جاؤں گا

اُمید تو یہی ہے کہ میں اس نواح میں
اچھا بُرا کچھ اپنا اثر چھوڑ جاؤں گا

اک حسرتِ سخن مرے ورثے میں ہے ظفرؔ
اِک آرزوئے خوابِ ہنر چھوڑ جاؤں گا

سلیم شاھد

ہونا بھی مگر اس سے سروکار نہ ہونا
گھر ہونا پر اس میں در و دیوار نہ ہونا

محسوس یہ ہونا کہ وہ خوشبو ہے مرے ساتھ
پر اس کا کسی رنگ سے اظہار نہ ہونا

دل ہونا نہ ہونا غم و آلام کا مسکن
سر ہونا مگر خانۂ پندار نہ ہونا

پابندیٔ اوقات میں گھڑیوں کا تناظر
اس میں سحر و شام کے آثار نہ ہونا

یک لحظہ توقف ہو تو کریں تازہ سفر ہم
اس جاگتے رہنے میں ہے بیدار نہ ہونا

ثاقب زیروی

صورت یہی تھی تلخیٔ غم سے نجات کی
لو، چھیڑا تو ہم نے بہاروں کی بات کی

دنیا کا اتنا ظرف کہاں ہے کہ سونپ دیں
وہ تجربات جو ہیں امانت حیات کی

ہر گام پر بکھیر کے پھولوں کی نکہتیں
رکھی ہے لاج کانٹوں بھری کائنات کی

محسوس یوں ہوا کہ ابھی جی رہا ہوں میں
جب بھی کسی نے اپنی طبیعت کی بات کی

یوں دیکھتے ہیں تیری جبیں کی حسیں شکن
جیسے ہو یہ بھی لہر ترے التفات کی

شام و سحر کے رُخ پہ شفق کا اداس رنگ
شاید یہی ہے سُرخی نئے واقعات کی

آنکھوں میں آ گئی مرے دل کی ہر آرزو
اس کم سخن نے جب بھی ادھوری سی بات کی

اب دل سلگ رہے ہیں ستاروں کی چھاؤں میں
اب کتنی مختلف ہے فضا چاندرات کی

رہنا پڑا ہے ہم کو شراروں کے درمیاں
ثاقب کہاں تھی اتنی ضرورت حیات کی

لذّت شناس شعلہ و شبنم نہ میں نہ تُو
آداب حسن و عشق کا محرم نہ میں نہ تُو

غم میں شریک ہوتے ہیں رسماً کبھی کبھی
ورنہ رہین جادۂ ماتم نہ میں نہ تو

خود اپنی خواہشات کے قاتل ضرور ہیں
خود اپنے زخم دل کا ہیں مرہم نہ میں نہ تو

تاریکیوں پہ میں بھی تو خوش ہوں تری طرح
اس شہر بے چراغ سے برہم نہ میں نہ تو

دونوں ہی جل رہے ہیں گلستاں کی آگ میں
آسودۂ طراوتِ شبنم نہ میں نہ تو

اُترے سمندروں میں اُڑے ہیں خلاؤں میں
پھر بھی ثبوت عظمتِ آدم نہ میں نہ تو

ہے رسم ضابطوں کا یہی احترام ہے
قائم وفا کی بات پہ پیہم نہ میں نہ تو

منزل بھی ایک راہ بھی کچھ مختلف نہیں
اس پر بھی اک مقام پہ باہم نہ میں نہ تو

ثاقب حسین شب کے ستاروں کی بزم میں
آشفتگیٔ زلف کا عالم نہ میں نہ تو

صہبا اختر

تو سنگدل ہے چھپا اور مہرباں کھلا
بہت دنوں میں ترا بھید میری جاں کھلا

اسی زمین پہ رہتے ہیں تنگدل انساں
اسی زمین پہ رہتا ہے آسماں کھلا

ہنوز اس کا نتیجہ ہے پردۂ شب میں
ہم اہلِ دل نے دیا تھا جو امتحاں کھلا

انہیں کسی بھی کنارے سے کوئی پیار نہیں
ہوا کے رُخ پہ جو رکھتے ہیں بادباں کھلا

نظر نہ آیا تو سب کچھ نظر نے دیکھ لیا
جو روشنی میں چھپا، تیرگی میں آن کھلا

کہاں چلے ہو مرے دل سے لوٹ بھی آؤ
مکین چھوڑ کے جاتے نہیں مکاں کھلا

چراغ حرف، شبستانِ فکر میں جاگے
کسی کتاب کی صورت کسی کا دھیان کھلا

کھلا فسانۂ ہستی کا راز تو صہبا
کشاکشِ غمِ ہستی کے درمیاں کھلا

محسن احسان

روان بدن سے ہر اک شب ہے خواب میں دریا
لہو کی لہر ہے محسنؔ شباب میں دریا

سمندروں کی طرح ٹھاٹھیں مارنے والا
تلاش کرنے چلا ہے سراب میں دریا

شکستِ و ریخت کے قصّے زبانِ موج پہ ہیں
بلا جواز نہیں پیچ و تاب میں دریا

عجب کہانی کناروں پہ کر گیا تحریر
جو پڑھ سکو تو ہے ہر نقشِ آب میں دریا

شراب، اوس کی مانند قطرہ قطرہ نہ پی
کہ کل کرے گا طلب وہ حساب میں دریا

نہیں ہے ہم میں بصیرت کہ ہم بھی دیکھ سکیں
درخت بیج میں پنہاں، حباب میں دریا

مجھے نہیں ہے تمنائے ابرِ اے محسنؔ
مرے لئے ہو بھلا کیوں عذاب میں دریا

عطا شاد

رَس اتار دیتا ہے، رُوح میں رسائی کا
سائباں سا لگتا ہے، حرف دلکشائی کا

آسماں پہ مہکا ہے، کوئی ابر کا چھینٹا
دشت میں سلگتا ہے، درد بے ردائی کا

روشنی سے ملتی ہیں، ظلمتوں کو تاویلیں
ہم گناہ گاروں سے، نام پارسائی کا

بے ہوا سی لگتی ہے، رُت بہار گاہوں کی
دے گیا وہ گل چہرہ، زخم آشنائی کا

وصل رقص ایسا تھا، اک دھنک لہے میں
یاد گنگناتی ہے، زاویہ جدائی کا

ہم سے عشق ملتے ہیں، ماہ لب صدف صورت
عجزِ حسن دیتا ہے، کفر خود نمائی کا

رشید نثار

بہت عجیب ہے لمحہ نہ رفت ہے نہ گزشت
یہ زندگی ہے کہ میدانِ زندگی میں شکست

میں اپنے جسم کے خانے میں چھپ کے بیٹھا ہوں
یہاں بلند ہے کوئی نہ کوئی ذات ہے پست

وہی ہیں درد کے رشتے وہی دکھوں کے سبب
مگر تو شہر میں گم ہے میں جنگلوں میں ہوں مست

مرا وجود ہے زخمی ہے میری روح اُداس
دکھی قبیلہ مرا ہے کہ میں ہوں زخم پرست

لہو لہو میری آنکھیں، سلی ہوئی ہے زباں
مگر رگوں میں رواں ہے شعورِ بود و ہست

میں کربلا میں اکیلا ہوں، سامنے ہے جلوس
میں خالی ہاتھ ہوں پھر بھی نہیں ہے ہمت پست

یہ عمر بھر کی مسافت ہے چیونٹیوں کا سفر
نثارؔ پل بھی صدی ہے جہاں فرار نہ جست

منظر مفتی

ہزار بار یہ پوچھا ہے برملا خود سے
کہو تو میں بھی کبھی ہوں گا آشنا خود سے

سفر میں تھا، تو مرے ساتھ تھے کئی چہرے
جو تھک کے بیٹھ گیا، تو ہوا جدا خود سے

بچھڑ بچھڑ کے ملا ہوں میں اپنے آپ سے یوں
کہ جیسے شب نہ ملے جیسے اک صدا خود سے

مری نماز، دعا، التجا کا کیا ہوگا
سنا ہے روٹھ رہا ہے مرا خدا خود سے

نکھر نکھر کے بکھرتے رہے گلاب کے پھول
سنور سنور کے الجھتی رہی صبا خود سے

تجھے یہ زعم کہ میں تجھ کو بھولنے کا نہیں
مجھے یہ فکر کہ رہنے لگا خفا خود سے

نئے غموں کا، نئے روگ کا امیں نکلا
وہی جو کرب میں منظر کہا سنا خود سے

کبھی جو آپ مل گئے، غزل کے پھول کھل گئے
نظر کے تار تار سے دلوں کے زخم سل گئے

شگفتہ آبشار سی، وہ زلف تار تار سی
فضا میں اٹھ کے یوں گری کہ چاند پھول کھل گئے

وصال یار کی گھڑی، فراق ذات کی گھڑی
کہ ماورائے ذات کو سبھی سراغ مل گئے

وہ ساعتیں اسی طرح ہیں یاد کی بیاض میں
بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ جب کسی کے مستقل گئے

گئے دنوں کا زہر تو بدن ہی کھا سکا مگر
نئی رتوں کے قہر سے تو جان و دل بھی ہل گئے

بھڑک اٹھے ہیں جسم و جاں، لرز اٹھے ہیں چشم و لب
پھر آ گئے وہ درد و غم جو راکھ کر کے دل گئے

ترے قریب رہ کے بھی تو دوریوں کا کرب تھا
سو منظر خراب حال دور مستقل گئے

میں اگلے سال جو پھر اپنے شہر آؤں گا
تو پوچھ پوچھ کے لوگوں سے گھر کو جاؤں گا

میں بارشوں کا مسافر، تو موسموں کی نوا
یقین جان تجھے ساتھ لے کے جاؤں گا

وہ ایک حرف جو ٹھہرا ہے لب پہ مثل گلاب
فضائے شہر ستم کوش کو سناؤں گا

تمہاری یاد کی خوشبو، غزل کے گجروں میں
سجا سجا کے نئے دور کو دکھاؤں گا

ترس گئے ہیں جو نغمات ساز کی لے کو
تمہاری دید کے آنگن میں رو کے گاؤں گا

میں ساحلوں پہ پڑی ریت ہوں کبھی نہ کبھی
تو پانیوں کے سفر پہ ضرور جاؤں گا

دیئے ہیں جتنے شگفتہ خیال تو نے مجھے
میں منظروں میں انہیں ڈھال کر دکھاؤں گا

ذوالفقار احمد تابش

(پانچ غزلیں)

○

الف اُوجل ادا آواز آنی
ابد اثبات آیت آسمانی

اناالحق ابتدا آہنگ الستی
ازل اقرار آبِ امتحانی

اجل ابہام اوّل آخر اُمید
اُفق افلاک آتش ارغوانی

اثر اکسیر آئینہ اُجالا
امانت امر آمد اطمینانی

ارادہ التجا اسرارِ ایام
اشارہ آنکھ انجم آشیانی

○

جہت جنگل جدائی جاودانی
جگن جوگن جتن جوبن جوانی

جبیں جلوہ جمالِ جو ہرجاں
جسدِ جبریل جانِ جاودانی

جنم جنجال جدت جود جبروت
جفا جیون جنوں جلوت جہانی

جسارت جسم جنبش جی جزیرہ
جگت جنجھٹ جدالِ جانِ جانی

○

بحر برہان باطن بے زبانی
بشر بیزار بس باتیں بنانی

بیاباں بھید بادل برق برہم
بدن بو باس بادِ بوستانی

بناوٹ بھید بستی بخت بن باس
بھنور باران بجرا بادبانی

برس برسات بھادوں بھور برہن
بدن بیمار بپتا برہا بانی

بقا برزخ بشارت بُعد باقی
بدر باعث بیاباں بیکرانی

بلاوا باغ بوسہ بات برسات
بہارِ باز بالیں بے دھیانی

○

صدائیں صوت سبزہ سرسرانی
سزائیں سوز سازش سرگرانی

سرابِ سر بہ سر صحرائے سم سم
سرِ ساحل صدف صادق سہانی

سحر سجدہ ستارہ صبح گاہی
سفر ساعت سماعت سمت ثانی

شباہت شرمگیں شعلہ شمائل
شفق شہرود شام شادمانی

شجر شاخیں شگوفے شوخ شبنم
شررِ شہناز شب شعلہ فشانی

○

گریزاں گردشِ گلشن گمانی
گماں گفتار گم گردوں گرانی

گگن گنبد گھٹا گھنگھور گمکار
گماں گمنام گلگوں گل فشانی

گجر گوپال گاؤں گھاٹ گاگر
گھنگھٹ گوری گلے گلنار گانی

گھمنڈ گرداب گردوں گونج گھنگھرو
گدائی گودڑی گھائل گیانی

اکتوبر ۱۹۷۹ء

جوہر سعیدی

فکرِ فردا، نہ غمِ دوش ہوں میں
ایک پھیلا ہوا، آغوش ہوں میں

کوئی جلوہ، بجوابِ حیرت
کوئی نغمہ ہمہ تن گوش ہوں میں

یوں، لپٹتی ہیں، اُمیدیں مجھ سے
جیسے صورت گرِ آغوش ہوں میں

مجھ میں بسنے کا تصوّر نہ کرو
دوستو، آتشِ خاموش ہوں میں

میرا ظاہر نہیں میرا ظاہر
سامنے رہ کے بھی، روپوش ہوں میں

مجھ میں جوہرؔ، نہیں کوئی جوہر
مستیٔ میکدۂ ہوش ہوں میں

رشید کاملی

دل میں رسوائی کا اندیشہ ذرا مت رکھنا
حوصلہ درد کی راہوں میں سلامت رکھنا

دشت پھر دشت ہے اور دشت بھی بے آب وگیاہ*
اپنے ہمراہ، جمالِ قد و قامت رکھنا

لفظ کچھ ہوتے ہیں لفظوں کے معانی کچھ اور
ہر نئے خواب کی دعووں پہ بنا مت رکھنا

کاٹنی ہیں ابھی رستے کی چٹانیں کالی
ہاتھ سے بُت شکنو، تیشہ جُدا مت رکھنا

سر پہ سورج ہو تو قدموں میں سمٹ جاتا ہے
اپنے سائے سے بھی اُمیدِ وفا مت رکھنا

حبس تو اُونچے درختوں نے کیا ہے پیدا
در و دیوار پہ الزامِ ہوا مت رکھنا

جس کو مہمان کیا اس نے ہی گھر لُوٹ لیا
اب کسی کے لئے دروازہ کھلا مت رکھنا

شعر ہی سے ہے ترے فکر کی پہچان رشیدؔ
اپنے ہر خواب کی مخصوص علامت رکھنا

اشرف عدیل

شاخوں سے پات پات جدا کر دیا گیا
جو قرض تھا خزاں کا ادا کر دیا گیا

اب کے تو عین موسمِ گل میں وہ لُو چلی
دستِ صبا کو دستِ دعا کر دیا گیا

مصلوب ہو گیا تو مجھے کھینچتے رہے
کیا ناروا تھا جس کو روا کر دیا گیا

میں بھی تو آگہی کے سمندر کی بوند تھا
مجھ کو بھی میری جاں سے جدا کر دیا گیا

ہاں ہاں! یہی ہیں منصفِ گیتی کے فیصلے
دل کا دیا بھی ہم کو بجھا کر دیا گیا

ہم بھی کھڑے تھے جیسے تناور درخت ہوں
ہم کو بھی وقفِ دوشِ ہوا کر دیا گیا

ایسا نہیں کہ شہر میں فرہاد تھا کوئی
یونہی پہاڑِ غم کا کھڑا کر دیا گیا

جذبات بھی ہمارے تفکّر بدوش تھے
صہبا میں ہم کو زہر ملا کر دیا گیا

ہم بھی بلندیوں سے تھے کچھ آشنا عدیلؔ
پَر کاٹ کر ہمیں بھی رہا کر دیا گیا

فردوس حیدر   فاطمہ حسن

انجم اعظمی ، ڈاکٹر سید اختر درانی ، صبا لکھنوی ، محمد علی صدیقی ، شبنم رومانی ، اخلاق اختر حمیدی
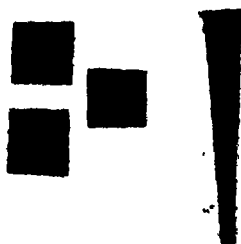
رخسانہ صولت ، اختر جمال
محمد منشا یاد
ادا جعفری ، ضیا جالندھری
ڈاکٹر وزیر آغا ،
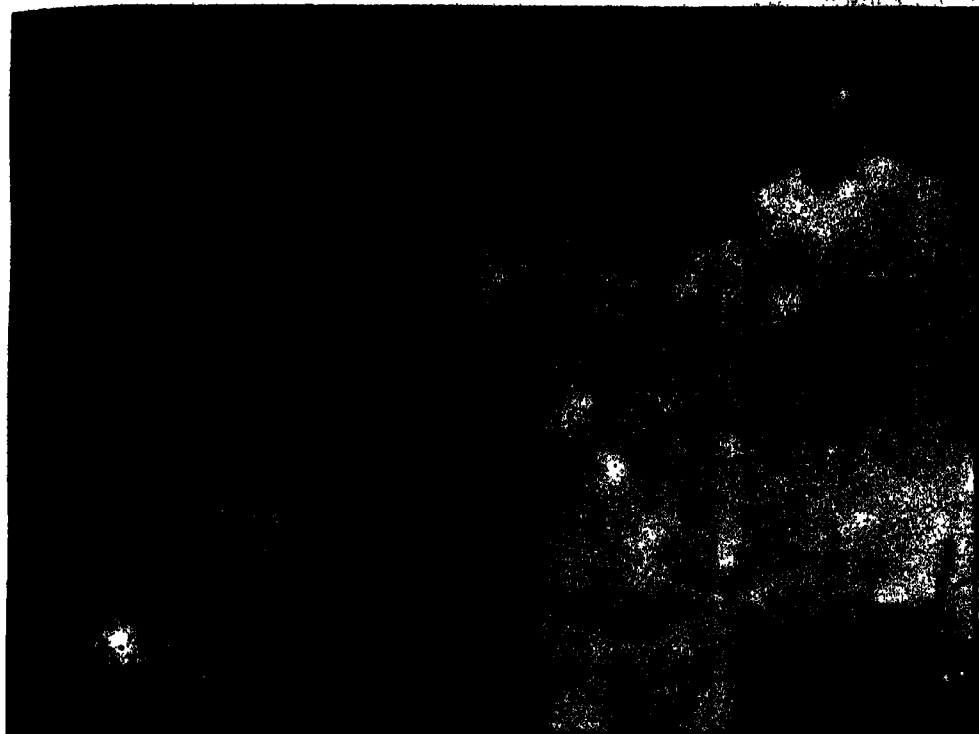
خالد یزدانی، یونس حسرت امرتسری
سلطان جیلانی، زُہیر کنجاہی
رشید نثار، راز کاشمیری
سید یزدانی جالندھری، ملک انور

عزیز انجم،
خواجہ زکریا، شبیر افضل جعفری
تقی انجم، یوسف عزیز اور
انور محمود خالد

احمد داؤد، کمال مصطفےٰ
رشید احمد، مرزا حامد بیگ۔

رئیس احمر

ہے حسنِ ظن کہ حسنِ گماں سوچتا ہوں میں
کیوں ان کی بزمِ ناز میں پوچھا گیا ہوں میں

فکرِ سخن کے وار سے لہجہ کی ضرب سے
مدت سے حرفِ گرفتنی میں ڈوبا ہوا ہوں میں

آواز دے رہا ہوں پھر اے وقت کچھ ٹھہر
چہرہ کی جھریوں سے اب اکتا چکا ہوں میں

وہ تیزیٔ نفس کہ توجہ ہے جام میں
تاریخ میکشی کی نئی لکھ رہا ہوں میں

اللہ رے یہ کیفِ تعلق کہ آج بھی
اکثر تری نگاہ میں پایا گیا ہوں میں

یہ اتفاقِ حسن ہے راس آگیا ہے عشق
اب چشمِ التفات سے اور پڑھ رہا ہوں میں

الفاظ کا عمیق سمندر نظر میں ہے
گو تشنۂ سخن ہوں مگر بولتا ہوں میں

پاؤ گے اب اماں نہ کہیں بھی بہار میں
اہلِ چمن، وہ خاک اٹھا کر اٹھا ہوں میں

حسنِ خیال، تجھ کو تراشا ہے مدتوں
اب تو مرا صنم ہے تو تیرا خدا ہوں میں

یحییٰ خالد

دل یہ کہتا ہے کہ آیا تو سنبھالا دے گا
میں سمجھتا ہوں وہی زہر کا پیالا دے گا

وہ تو ہر رنگ میں ہر بات میں لاثانی ہے
زخم بھی دے گا تو دنیا سے نرالا دے گا

آس کے بُت میرے سینے میں سجا جائے گا
پھر مجھے وعدوں کی گوندھی ہوئی مالا دے گا

ڈھونڈھ لاؤ کسی بن سے میرا گم گشتہ چراغ
ان اندھیروں میں ذرا سا تو اُجالا دے گا

کیا خبر تھی کہ چبھیں گی یہی کرنیں مجھ کو
چاند بھی آکے مرے سینے میں بھالا دے گا

کنول آنکھیں کہ پڑھوں میں بھی کتابی چہرہ
خود فریبی کو یہ دل کس کا حوالہ دے گا

سنسان سی فضا میں یہ بن بولتا ہوا
اس پر بھی مطمئن ہوں کہ تنہا کھڑا ہوں میں

سینہ میں ہے جو سات سمندر کی داستاں
احمر سخن کا شوق ہے اور لب کشا ہوں میں

اظہر نیاز

کروں کیا کہ دل نہیں مانتا کبھی اِس نگر کبھی اُس نگر
مجھے خواب بھی تو عزیز ہیں مجھے جاگنا بھی ہے رات بھر

کئی چہرے میری نگاہ میں کئی چاند میری رسائی میں
مگر اے مجسمِ کہکشاں کسی رات میری بھی رہ گزر

مرے دوستو مرے دشمنو کہ تمہیں تو دشمن جاں نہیں
ہیں منافقوں کے ہجوم میں کئی منتظر زن میرے ہمسفر

کھلے بادبانوں کی کشتیاں تجھے لے تو جائیں گی ہر طرف
مگر اس جزیرۂ خواب سے یہ ہوائے شام ہے بے خبر

سرِ راہ ملنا محال ہے میں کہ اتفاق جہاں نہیں
میرے گھر کے ہیں کئی راستے مرا راستوں میں نہیں ہے گھر

شفق ہاشمی

برگد کا وہ پیڑ سلامت جس کی گھنیری چھاؤں
سدا سلامت اس کے نیچے بسنے والا گاؤں

میرے ہنستے بستے میری آس بڑھائیں
تھک جائیں جب چلتے چلتے اپنے بوجھل پاؤں

جگ جگ میرے ساتھ چلے میرا جیون سنگیت
اطلس کی پاپوش ہے مجھ کو میری چندن کھڑاؤں

اندھیاروں میں جوت جگاتے کنول کٹورے نین
رخساروں کی دھوپ سہیلی اور زلفوں کی چھاؤں

یہی ہے میرا مان شفق اور یہی میری پہچان
جیوے میرے پیار کی دھرتی میرے سکھ کا گاؤں

ناہید فخری

میں کہ افسردہ مکانوں میں رہوں
آج بھی گذرے زمانوں میں رہوں

رات ہے سر پر کوئی سورج نہیں
کس لئے پھر سائبانوں میں رہوں

کیا وسیلہ ہو میرے اظہار کا
لفظ ہوں گونگی زبانوں میں رہوں

کون دیکھے گا یہاں طاقت میری
تیر ہوں ٹوٹی کمانوں میں رہوں

بھیڑئیے ہیں چار سو بپھرے ہوئے
بیچ اترو‌ں یا مچانوں میں رہوں

میرے ہونے کا کچھ تو فائدہ
ہوں ہوا تو بادبانوں میں رہوں

رابطہ رکھوں زمینوں سے مگر
آسمانوں کی اڑانوں میں رہوں

یہ بھی کیا فخری کہ پرندوں کی طرح
رات دن ہی کارخانوں میں رہوں

عباس تابش

ہے تمنا کہ ترے ساز میں گایا جاؤں
نغمۂ حلقِ بریدہ ہوں سنایا جاؤں

تیرے احساس کی دنیا میں بسایا جاؤں
میں بھی انساں ہوں سرِ عام تو لایا جاؤں

قتلِ طفلاں کی منادی ہے مری ماں سے کہو
مثلِ موسیٰ کسی پانی میں بہایا جاؤں

مطمئن ہوں کہ ہوں تنہائی کے کمرے کا مکیں
کیوں سرِ محفلِ احباب ستایا جاؤں

میری ہستی بھی تو ہے ہست کی شاہد تابش
میں کوئی حرفِ غلط ہوں کہ مٹایا جاؤں

نسیم نازش

گردِ صحرا میں اٹ گئی ہوں میں
اپنے رستے سے کٹ گئی ہوں میں

جستجو میں تری خبر ہے تجھے
کتنے حصوں میں بٹ گئی ہوں میں

کوئی مشکل پڑی ہے راہ میں جب
کوہ کی طرح ڈٹ گئی ہوں میں

دوستوں کا حساب باقی ہے
دشمنوں سے نپٹ گئی ہوں میں

جب کبھی آ گیا خیال ان کا
خود میں گویا سمٹ گئی ہوں میں

اس ستم گر سے التجا کر کے
اپنے سائے سے گھٹ گئی ہوں میں

ایک انساں سے جوڑ کر رشتہ
ساری دنیا سے کٹ گئی ہوں میں

آج دستک دیئے بنا نازش
ان کے در سے پلٹ گئی ہوں میں

منیب افغانی

اُداس پھرتا ہے بے چین تتلیوں کی طرح
وہ لوٹ آیا ہے اُجڑی ہوئی رتوں کی طرح

میں اس کے خواب کے منظر سے کس طرح نکلوں
وہ چاروں اور بسا ہے سمندروں کی طرح

عجیب کرب تھے، سب راحتِ حیات ایسے
عجیب خوشیاں تھیں، جھیلیں مصیبتوں کی طرح

ہوا محیط اُداسی کی شام سے پہلے
مرے حواس پہ وہ سبز موسموں کی طرح

کل اس کی شادی کی تصویر بھی رسالے میں
چھپی ہوئی تھی اذیت کی صداقتوں کی طرح

ہنسے تو پھوٹ کے روتا دکھائی دیتا ہے
عجیب شخص ہے ویل مسرتوں کی طرح

انجم ترازی

وہ اپنے آپ کو یا پھر مجھے بدل دے گا
کسی کے حق میں سہی فیصلہ اٹل دے گا

کٹے گی بارشوں کی فصل جب بھی دھرتی سے
زمیں کا پیٹ نئے سانپ اگل دے گا

سجا رہا ہوں میں کمرے کو بوڑھی شکلوں سے
مجھے جو روپ مرا آنے والا کل دے گا

شعاعیں قبر کی اس کو جلا کے رکھ دیں گی
وہ نفرتوں کا شجر چاہتوں کے پھل دے گا

تو لوحِ شب پہ اُجالے کی اک لکیر تو کھینچ
وہ بے ارادہ ترے ساتھ ساتھ چل دے گا

مرزا حامد بیگ

رات کا جادو

تاریکی کی بھاری چادر ایک تیز چیخ کے ساتھ دو حصوں میں چاک ہوتی جاتی تھی۔

نیم روشن مسافر گاڑی انتہائی برق رفتاری کے ساتھ خفیف انگڑائیاں توڑتی تیزی سے پٹڑیوں کو چاٹ رہی تھی۔ اس کی ایک پور کے بعد دوسری اور پھر تیسری کہیں آنکھ نہیں ٹھہرتی۔

تیسری پور کے اندر مسافروں کی نس نس میں رات اُتر رہی ہے۔ وقت کا تعین مشکل ہے۔ میں نے کہا نا کہ باہر تاریکی کی بھاری چادر ہے۔ اور اُسے کاٹتی ہوئی تیز چیخ۔

ابھی کچھ دیر پہلے برابر سے تیز گزرتی ہوئی بستی کے ایک مرغ نے اپنے سلیقے سے لپیٹے ہوئے پر کھولے تھے۔ جانے اب تک اس نے بانگ کا ارادہ ترک ہی کر دیا ہو۔ وقت کا تعین مشکل ہے۔

ہاں تو، تیسری پور کے اندر رات کا پھیلاؤ ہے اور اندر مرد ہی مرد بھرے ہیں۔ ابھی چند لمحے پہلے برابر کے زنانہ ڈبے سے بڑے سرخ پھولوں والی ایک گٹھڑی ادھر لڑھک آئی تھی۔ گٹھڑی جو ایک جوان خوبرو لڑکی کی صورت میں ادھر آ کر کھلی ہے۔ یہ لیش پیشانی لڑکی، دوپہر رات تک اپنی ڈولتی ہوئی سیٹ سے چمٹی رہی تھی لیکن اب تھکن سے بے حال ہے اور اس نے اپنے آپ کو مسافر گاڑی کی خفیف انگڑائیوں کے سپرد کر دیا ہے۔

اس کے اس طرف نکل آنے پر اونگھتے اور نیند میں سر مارتے، سب کے سب مرد پوری طرح جاگ گئے ہیں۔ بس ایک وہ ہے جو گہری نیند سو رہا ہے۔ یہ گہری نیند سویا ہوا جوان ہی دراصل اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ ایک ایسا مرکزی کردار جو اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہیں کر رہا۔ وہ سویا ہوا ہے۔ اور ہر طرف جاگتے مرد اور مردوں میں جاگتے ہوئے بھیڑیئے پورا منہ کھول کر جمائیاں لے رہے ہیں۔

بڑے سرخ پھول پہنے، وہ جب سے اِدھر آئی ہے۔ مسافروں کی سوچ دو مخالف سمتوں پر چلتی، رُکتی اور پلٹ آتی ہے۔ سوچ کی ایک جہت تو ہوئی اس غیر معمولی لڑکی کی غیر متوقع آمد اور دوسری وہ جو چڑچڑے مزاج کے بے ہنگم دروازے تک لے جاتی ہے۔ اس دروازے کو اب اپنی بک بک جھک جھک سے باز آ جانا چاہیئے۔

مردوں کے سوچنے کے لئے کسمساتے سرخ پھولوں اور بے ہنگم دروازے میں سے کسی اور کا چناؤ کچھ ایسا مشکل کام نہیں۔ اور اس نے تو آتے ہی حوصلے کا مظاہرہ یہ کیا ہے کہ مسافروں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتی اور لچکتی ہوئی اوپر کی خالی برتھ تک جا پہنچی ہے اب وہ اودھی کمبل میں ہے اس کا چہرہ اور شانے کھلے ہیں اور سب کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں اس کی قمیض کے سرخ پھول ٹھہر گئے ہیں۔

ہر طرف بھرے، ہر رنگ اور نسل کے مردوں میں ایک تو اس کہانی کا نا اہل ہیرو ہے جو ابھی تک نیند سے نہیں جاگا یا پھر چالیس سے اوپر کے دو کردار ایک سابق ٹکٹ چیکر اور دوسرا کراچی کا ایک میمن بیوپاری۔

اس قصے کا عجیب پہلو یہ ہے کہ کہانی کے نمایاں کردار کچھ زیادہ فعال نظر نہیں آتے۔ ہیرو سویا ہوا ہے اور بیچارے بیوپاری کو اپنی بے طرح ابھری ہوئی توند چھپانے کی فکر لاحق ہوئی ہے جس کے نتیجے میں اس نے دن بھر کے مسلے ہوئے اخبار کو کھول کر اپنے اوپر تان لیا۔ بس اس سے اتنا ہی ہو گیا۔ وہ

گیا ساتھ گھنٹے جبکہ جس نے ایک ہی گھونٹ میں پیتے پیتے ایک تسلسل کے ساتھ چار سگریٹ پھونک ڈالے ہیں ۔ ہاں اس اثناء میں اس کا دل کئی بار چاہا ہے کہ وہ اٹھ کھڑا ہو اور ٹکٹ نہ دکھا سکنے پر سب مسافروں کو اسٹیشن سے پہلے زنجیر دے کر نیچے دھکیل دے ۔ وہ انتہائی کرب میں سگریٹ کے لمبے کش لیتا ، اپنی نظروں کو نفرت کے زاویہ سے اوپر اٹھاتے ہوئے بائیں ہاتھ ساتھ پر گرا دیتا ہے۔

لڑکے نے جھکتے ہوئے ہر طرف نگاہ کی ، نیچے اوپر بھوکے مرد اور پورا منہ کھول کر جماہیاں لیتے بھیڑیے تاک میں تھے ۔ اور وہ جس نے ابھی ابھی پانچواں سگریٹ سلگایا تھا اپنی انگارہ آنکھوں کے ساتھ ہاتھوں کے پنجوں اور کھوکھلے گھٹنوں کے بل اوپر اچکنا چاہتا تھا ۔ لڑکے نے دھیرے دھیرے پہلو بدلا اور سب نے دیکھا کہ اس کی کھردری ہوئی قمیص کے بڑے بڑے سرخ پھول اونگھ رہے ہیں ۔

لڑکی کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے ۔ اس نے خیال کیا کہ برابر کے ڈبے میں جہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے دیہاتیوں کے چہروں پر کتنی رونق تھی ۔ وہ وقت گزاری میں مصروف تھے ۔ ایک نے کھنکار کر گلا صاف کیا تھا ۔

"میلہ جی ، اس سال مرغہ زیادہ ہے ۔ انہی دنوں میں نے پار سال بھی سفر کیا تھا ۔"

"مرغہ ۔۔۔ ہاہا ہا ۔" نئی نویلی دلہن سے جڑ کر بیٹھے ہوئے چھوٹے سر گھنی بھنووں والا نوجوان اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

کھڑکیوں میں چھوٹے چھوٹے ہاٹ سیٹیاں بجاتے گرد ہوتے گئے ۔ تعاقب کرتی مسلسل چیخ برابر ساتھ چلی آتی ہے ۔ ممکن ہے اب تک تیرتی ہوئی بستی کے متوحش مرغ نے اذان صبح ہی ڈالی ہو ۔ ایسے میں ہوا یہ کہ اس کہانی کا گہری نیند سویا ہوا مرکزی کردار یکایک اٹھ بیٹھا ۔ اس نے نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ اوپر دیکھا اور پریشان ہو کر ہر طرف گھوم گیا ، اندر ہر طرف مرد ہی مرد بھرے ہوئے تھے ۔ اونگھتے اور سر ٹکراتے ہوئے ۔ سب کے چہروں پر راکھ اڑ رہی تھی ۔ اور وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ برابر کے زنانہ ڈبے سے اس طرف واپس آنے کو کوئی راستہ ہی نہ تھا ۔

کیا اس نے کوئی خواب دیکھا ہے ۔ اس نے ماتھے تک ہاتھ لاتے اور سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا ۔ لیکن وہ جلدی میں تھا ، سامان سمیٹنے لگا ۔ اسے اگلے اسٹیشن پر اترجانا تھا ۔ برابر کے ڈبے میں دیہاتی وقت گزاری میں مصروف رہے ۔ گاڑی رکنے پر اس نے اونگھتے اور راکھ اڑاتے ہوئے چہروں کو اسی حالت میں چھوڑا اور پکایا ہوا سا نکل گیا ۔

اسٹیشن گہری دھند میں ڈوبا ہوا تھا ۔ وہ جب اترا ہے تو اس نے دیکھا بہت سی بکی نیند سے جاگے ہوئے مرد ، عورتیں اور بچے برابر کے ڈبے میں چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ اس طرف جہاں دیہاتی وقت گزاری میں مصروف تھے وہ خود جس دروازے سے ابھی ابھی اترا تھا اس کی طرف پلک جھپک کر بڑھتی ہوئی ایک لڑکی کو اس نے دیکھا ۔۔۔ اس کے دیکھتے دیکھتے وہ چلتی ہوئی پائیدان تک گئی ۔۔۔ اس کے کندھے جلدی میں چلنے کے سبب آگے کو جھکے ہوئے تھے اور اس کی کھردری ہوئی قمیص کے بڑے سرخ پھول ایسے لگ رہے تھے جیسے آنکھیں مل رہے ہوں ۔

وہ اپنی سرخ انگارہ آنکھوں تک ہاتھ لیا اور ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکا ۔۔۔ اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے ۔

اس نے ماتھے کو سہلاتے اور سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا ۔۔۔ وہ چند لمحوں کو رکا بھی ۔ لیکن وہ جلدی میں تھا اور اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا ۔ اور اسٹیشن پر دھند بہت گہری تھی اور لوگوں کا شور ۔

اکتوبر ۱۹۶۹ء

احمد جاوید

باہر والی آنکھ

باہر سے اندر جھانکنے والوں کو اتنا ہی دکھائی دیتا ہے جتنا کہ اُن کی آنکھ احاطہ کر سکتی ہے — مگر ہر آنکھ کے پیچھے ایک اور آنکھ ہوتی ہے جو اُس سے زیادہ دیکھتی ہے جتنا کہ نظر آتا ہے۔

یہ اندازہ کر لینے پر منحصر ہے اور یقین کر لینے پر۔ تو جو کچھ ہے اتنا نہیں ہے جتنا کہ وہ نظر آتا ہے —

تو یہ ایک کمرہ ہے —

اُس کی کھڑکیوں اور روشندانوں کا تو علم نہیں — ہو سکتا ہے ہوں، ہو سکتا ہے نہ ہوں۔ لیکن ہوں گے — عام طور پر کمروں میں ہوتے ہیں۔ البتہ یہاں سے اس وقت نظر نہیں آتے —

اس وقت اس کمرے میں دو دروازے ہیں کہ وہ تو نظر آتے ہیں۔

— تو نظر آنے والوں میں سے ایک اندر کو کھلتا ہے اور ایک باہر کو — جو باہر کو کھلتا ہے اس وقت بند ہے —

کمرے میں روشنی ہے — یہ روشنی سورج کی نہیں اس لئے کہ سورج رات کو طلوع نہیں ہوتا — یہ زرد پیلی بیمار سی روشنی کسی کم واٹ کے بلب کی ہے مگر بلب کہاں ہے — کمرے میں کہیں نہ کہیں تو ہوگا —

فرش پر پتنگوں کے جلے ہوئے پر پڑے ہیں اور پتنگے بھی — پتنگے حبس کے دنوں میں ہوتے ہیں — یا کہیں سے آ جاتے ہیں — یا بن جاتے ہیں — یا کہیں چھپے ہوتے ہیں، اور گھٹن سے وحشت زدہ ہو کر باہر نکل آتے ہیں — تو یہ حبس کے دن ہوں گے۔

فرش پر چمگادڑ کا سایہ لہراتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ چمگادڑ نہ ہو (نظر جو نہیں آتی) کچھ اور ہو — مگر سایہ تو چمگادڑ کا ہے — اور یہ آواز بھی اُسی کی ہے — سنسناتی ہوئی کراہت آمیز آواز۔

کمرے کی دیواریں آدھی ہیں — باقی آدھی کہاں ہیں — یقیناً ہوں گی — مگر نظر جو نہیں آتیں — ہو سکتا ہے اُن میں الماریاں بھی ہوں — الماریوں میں کیا ہو سکتا ہے — مگر کیا معلوم الماریاں ہیں بھی یا نہیں — خیر چھوڑو —

تو سامنے کی آدھی دیوار پر ایک چھپکلی ہے — آدھی چھپکلی — آدھی چھپکلی زندہ کیسے رہ سکتی ہے۔ پوری ہوگی — پوری ہی ہوگی — آدھی اوپر، آدھی نیچے — تو جو آدھی اوپر ہے وہ اس وقت نہیں ہے۔ اس لئے کہ نظر نہیں آتی — تو جو آدھی نیچے ہے وہ اس وقت ہے کہ نظر آتی ہے۔

اس کی کراہت آمیز آنکھیں نظر آ رہی ہیں کہ جو اپنے ہی محور پہ گھومتی ہیں، ان کی آنکھوں میں سانپ کی پھنکار ہے — فرش پر ابھی کچھ پتنگے رینگتے ہیں، وہی پتنگے کہ جو ابھی جل جانے سے بچ گئے ہیں — چھپکلی کا رُخ اُدھر ہی ہے۔

پتنگوں کا رُخ اُدھر نہیں ہے اسی لئے وہ بے خبر ہیں — چھپکلی نے بولنا بند کر دیا ہے۔ اب وہ مسلسل آنکھ ہے۔

چڑیا نے بولنا شروع کیا ہے — چڑیا نہیں ہے مگر بول رہی ہے — مگر وہ کیسے نہیں ہے — نہ ہوتی تو بولتی کیسے — بولتی ہے تو یقیناً ہوگی۔ (ہوگی صرف نظر نہیں آتی) — مگر کہاں ہے — اوپر گھونسلے میں ہوگی — اور گھونسلہ روشندان میں ہوگا — کہ عام طور پر کمروں میں روشندان ہوتے ہیں — اس میں بھی ہوگا اور چڑیا وہیں ہوگی۔

تو چڑیا بولتی ہے مگر چھپکلی نہیں بولتی — وہ نہیں بولتی کہ پتنگوں کو خبر نہ ہو کہ کیا ہونے والا ہے۔

پتنگوں اور چھپکلی میں بالشت بھر کا فاصلہ ہے — جو چھپکلی کی ایک ہی جست میں پلک جھپکتے طے ہو جاتا ہے۔ تو اب بالشت بھر کا فاصلہ بھی نہیں ہے دیوار سے چھپکلی فرش پر آ چکی ہے — تو آدھی چھپکلی اب پوری چھپکلی ہے۔

تو چھپکلی ہے اور پتنگے نہیں ہیں — آدھے بھی نہیں ہیں — ہیں ہی نہیں —

تو چڑیا بولتی ہے — کیوں بولتی ہے، اتنی رات گئے کیوں بولتی ہے — شاید وہ مضطرب ہے — گھونسلے میں کروٹیں بدلتی ہوگی — اسی لئے تنکا تنکا اس کا گھونسلہ نیچے گرتا جاتا ہے۔

اور اب اسکے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دینے لگی، شاید وہ اڑنے کو ہے یا اُڑ رہی ہے — اُڑ رہی ہوگی — اس لئے کہ اُس کا اڑتا ہوا سایہ فرش اور دیواروں پر دکھائی دینے لگا ہے —

اور اب رفتہ رفتہ وہ خود بھی دکھائی دینے لگی ہے وہ اُڑتے ہوئے آتی ہے اور دیواروں پر پنجے مارتی ہے — بیٹھنے کو پاؤں ٹکانے کی کوشش کرتی ہے — جب جب وہ ایسا کرتی ہے — اُس کے پر بُری طرح پھڑپھڑاتے ہیں —

تو اُس نے گھونسلہ کیوں چھوڑا — شاید وہ نڈھال ہو کر گر پڑی تھی، اور اب اُٹھنے کی کوششوں میں ہے — اس کے پر پھڑپھڑاتے ہیں مگر پورے طور پر کھل نہیں پاتے۔

تو جب اُسے اُڑنا نصیب نہیں ہوتا تو وہ تھک ہار کر دیواروں کا خیال ترک کرتی ہے اور فرش پر پاؤں ٹکا دیتی ہے — رفتہ رفتہ اس کے پر نیچے کو لٹکنا شروع ہوتے ہیں حتیٰ کہ فرش کو چھونے لگتے ہیں۔ منہ کھل جاتا ہے اور وہ ہانپنے لگتی ہے — شاید وہ بہت تھک چکی ہے اور اب سستا رہی ہے یا شاید گرمی اور حبس سے وحشت زدہ ہے۔

تو اب وہ نہ اڑتی ہے نہ بولتی ہے — البتہ چمگادڑ اب بھی بول رہی ہے اور اُڑ بھی رہی ہے۔

وہ اڑتی ہوئی آتی ہے اور دیواروں سے سر ٹکراتی ہے وہ تو وحشت میں ایسا کرتی ہے اور بالآخر کہیں نہ کہیں چمٹ کر رہ جاتی ہے۔

تو اب وہ بھی فرش پر ہے۔

تو اب ہر چیز فرش پر ہے سوائے چھت کے — کہیں چھت بھی فرش پر نہ آ جائے — ابھی تو مٹی گرتی ہے۔

مٹی گرنا کب بند ہوگا یا چھت کب گرے گی — !

مگر کیا معلوم چھت ہے بھی یا نہیں — ہوگی تبھی تو مٹی گرتی ہے۔

ابھی مٹی کے کچھ ذرے چمگادڑ پر بھی گرے تھے — وہ کچھ چونک کر پر پھیلا کر بیٹھی تھی اور اُس کا رُخ نالی کی طرف ہو گیا تھا۔

سامنے دیوار میں ایک نالی ہے — چمگادڑ اسی طرف جانے لگی تھی — مگر اچانک اس نالی میں سے کسی بلی کی نہایت مسکین آواز داخل ہوئی — چمگادڑ اپنے پر جھلاتے ہوئے کھسک کر ذرا دور ہٹ گئی — پھر نالی میں سے بلی کا سر داخل ہوا — اور رفتہ رفتہ آدھی، پونی، ساری — بلی فرش پر تھی — جب بلیاں نالی کے سوراخوں میں سے اندر داخل ہوتی ہیں تو عجیب طریق سے اپنی کمر جھکا لیتی ہیں اور پیٹ فرش سے لگا لیتی ہیں اور یوں گھسٹتی ہوئی اندر آتی ہیں کہ خراش تک نہیں آتی —

تو بلی نے فرش پر پہنچ کر جسم کو مسلسل جھٹکے دیئے — پھر تن کر کھڑی ہوئی ——— پھر اپنے کو آگے پیچھے یوں جھلایا جیسے پہلوان ڈنڈ پیلتے ہیں — ایسا کر چکنے کے بعد وہ سامنے کی دیوار کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ گئی اور سر پہلو میں چھپا لیا — یہ اس کے سونے کا وقت تھا لہٰذا آنکھیں موند لیں۔

— چھپکلی حجاب نہیں تھی (یا نظر آتی تھی) اچانک اس کی آواز سامنے آئی اور بلی نے آنکھیں کھول دیں مگر پہلو سے سر جُدا نہ کیا — کچھ دیر بٹر بٹر اپنا ہی پہلو دیکھتی رہی پھر رفتہ رفتہ خود ہی اُس کی آنکھیں مُندنے لگیں — چھپکلی بولتی رہی مگر اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔

پھر کچھ دیر بعد چمگادڑ نے بولنے کی کوشش کی اور اُس کے پر دیوار سے ٹکرائے تو بلی

اکتوبر ۱۹۶۹ء

نے اپنی دُم بہ آہستہ آہستہ فرش پہ ساری اور
پھر اُسے سمیٹ لیا ——
اور اب وہ ساکت تھی —— چھپکلی بولتی رہی
—— چگادڑ پھڑپھڑاتی رہی —— ہٹی گرتی رہی —— مگر
وہ ساکت تھی، ساکت رہی کہ اُسے ان سے کچھ
کام نہ تھا۔

پھر کچھ دیر بعد سب کچھ ساکت تھا ——
چڑیا نے بھی اپنے پر سمیٹ لئے تھے اور آنکھیں
موند لیں تھیں۔

تو کچھ دیر ایسا ہی رہا —— پھر کوئی جھینگر
اُڑتا ہوا آیا تو سب کسمسائے —— چڑیا کو ہڑا
گیا ہوا کہ وہ بول پڑی —— وہ کہ جو بہت دیر
سے چُپ تھی (شاید اُسے گھونسلے کی طرف
اُڑنے کا خیال آیا ہو)۔

چڑیا کی آواز بلّی کے جسم میں سوئی کی طرح
پیوست ہوئی اور وہ چونک اُٹھی —— پھر ایک
جھٹکے سے کھڑی ہوئی کانوں کو اِدھر اُدھر حرکت
دی —— جسم اکڑ گیا —— اور دُم اپنے آخری سرے
پر ہلکا سا خم کھا گئی —— وہ کچھ دیر ساکت کھڑی
رہی پھر نہایت تحمل سے آہستہ آہستہ چلنا شروع
کیا —— بلّی جب شکار کی سمت چلتی ہے تو اس
کی اور شیر کی چال میں سرِمو فرق نہیں ہوتا ——
تو وہ کچھ دیر چلتی رہی —— پھر اُس نے ہولے
ہولے غرّانا شروع کیا۔

تو جب وہ غرّائی تو چڑیا کے پر خود بخود
پھڑپھڑائے —— وہ پوری کی پوری پھڑپھڑاتی ہوئی اُٹھی
—— لڑکھڑائی، کرسی کے پایہ اور دیوار سے
ٹکرائی —— تو وہ گھونسلے کی طرف اُڑ کر نہیں گئی۔
کہ وہ اُڑنے کے قابل نہ تھی —— اگر وہ اُڑ سکتی
تو فرش پہ کیوں آتی —— تو وہ نڈھال ہو کر گری
تھی —— اور اب وہ اِدھر اُدھر پھڑپھڑاتی پھر رہی
تھی اور بلّی کی غرّاہٹیں اس پر جست لگا رہی
تھیں ——

چڑیا پھڑپھڑاتے ہوئے گری —— اور
تیزی سے کھسکتی ہوئی صوفے کے نیچے غائب
ہو گئی —— تو وہ اب وہ نہیں تھی۔

پھر بلّی نے بھی صوفے کے نیچے سر دیا،
کمر جھکائی، پیٹ زمین سے لگایا اور گھسنے
لگی —— پھر پونی ——، آدھی، ساری —— بلّی
بھی نہیں تھی۔

اور اُن کی آوازیں تھیں۔

(غرّاہٹیں اور سسکیاں)

پھر صرف بلّی کی آوازیں تھیں اور چڑیا کی
نہیں تھیں۔

پھر بلّی کی آواز بھی نہیں تھی —— اور چڑیا
کے پر تھے جو خود بخود لڑھکتے ہوئے صوفے کے
نیچے سے باہر آ رہے تھے۔

تو چڑیا کہاں رہ گئی —— جیسے وہ کبھی تھی ہی
نہیں ——

(ہلکی غراہٹیں اور پھر خاموشی)

کافی دیر بعد بلّی کی نہایت مسکین آواز
صوفے کی طرف سے باہر آئی پھر بلّی کا سر پھر
آدھی، پونی، ساری —— بلّی باہر تھی۔

باہر نکل کر اُس نے جسم کو مسلسل جھٹکے دیئے
جسم اکڑایا، ٹھنڈ چھٹائے اور سست کر آنکھیں بند
کیں اور سر پہلو میں چھپا لیا۔ (جیسے کچھ ہوا ہی
نہیں —— مکار کہیں کی!)

اب وہ باقاعدہ سو رہی تھی اور اُسے
چگادڑ کی آواز سے کوئی کام نہ تھا جو اب بھی
مسلسل دیواروں سے ٹکراتی پھر رہی تھی۔

پھر کچھ دیر بعد نہ جانے چگادڑ کو کیسے علم
ہوا کہ کمرے کا ایک دروازہ کھلا ہے۔

تو چگادڑ کھلے دروازے سے باہر نکل گئی

جب وہ چلی گئی تو اسی راستے پر دور سے
ایک جسم آتا دکھائی دیا —— اُس کا اُوپر کا دھڑ
نہیں تھا اور نچلا دھڑ تھا (کہ وہی دکھائی دیتا
تھا) —— تو اوپر کا دھڑ کہاں تھا —— یقیناً ہو گا کہ
وہ جسم چلتا کیسے —— تو اُس جسم کے پاؤں کے
ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا کتا اُچھلا کودتا اس
کے گرد چکر لگاتا دوڑا چلا آتا تھا —— تو
وہ دونوں آ رہے تھے —— آتے آتے وہ
جسم چھوٹا ہوتا چلا گیا —— رہتے رہتے اُس کی
پنڈلیوں سے پاؤں تک کا حصہ رہ گیا ——
(تو وہ دکھائی دیتا تھا) جو فرش پر تھا۔

تو کتے کی بھاگ دوڑ پر بلّی کی آنکھ کھل
گئی —— کتا اُس پر اُچھل اُچھل کر جست کرنے
کی کوشش کر رہا تھا —— بلّی نے نہایت بے اعتنائی سے
سر موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور نہایت مسکین
سی آواز نکالی —— جیسے وہ اس شرارت سے
خوش ہو رہی ہو ——

جسم سے مصنوعی غصے سے سر نکالا اور کتے

کو پکار کر پاس بلایا — کتا پلٹا اور پاؤں چاٹنے لگا — پھر جسم سے ہاتھ بر آمد ہوا جس نے پچکار کر بلّی کی طرف چھچھڑے پھینکے — مگر بلّی نے منہ موڑ لیا کہ اُسے حاجت ہی کب تھی۔

تو بلّی عاجزی سے اُسے دیکھتی تھی اور کتا اُس کے اردگرد جست کرتا تھا مگر غرّاتا نہ تھا۔

تو یوں جست کرتے اور پاؤں چاٹتے اچانک کتے نے محسوس کیا کہ اس کے کان کھڑے ہونے شروع ہوئے ہیں اور دُم اکڑنے لگی ہے — اور وہ بھونکنے لگا ہے۔

بلّی بھی چونک اُٹھی کھڑی ہو گئی — جسم اکڑ گیا — دُم بل کھا گئی — وہ غرّانے لگی —

وہ دونوں غرّانے لگے — غرّاتے رہے، بل کھاتے رہے مگر ایک دوسرے پر نہیں۔

اُن دونوں کا رُخ دیوار کی طرف تھا، اُس دیوار کی طرف کہ جو نہیں تھی — (نظر جو نہیں آتی تھی) — دیوار تو ہو گی ورنہ وہ کمرہ کیسے ہوتا۔ تو وہ کسی کی طرف دیکھ کر غرّا رہا ہے۔

وہ غرّاتے ہوئے دیوار سے دروازے کی طرف گھومے کہ جو بند تھا اور اُس بند دروازے کے نیچے بہت نیچے ایک سوراخ تھا، بہت ہی چھوٹا سا سوراخ — اور وہ اُس کی طرف گھوم گئے — کہ اُس سوراخ میں ایک آنکھ رکھی تھی۔

تو یہ آنکھ یہاں کیوں ہے —؟ بلّی نے جست کی اور کتے نے بھی —

اور پھر وہ جست کرتے رہے غرّاتے رہے مگر آنکھ جوں کی توں پڑی رہی —

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا — ہر چند کہ میلی میلی سی روشنی تو تھی — مگر کچھ نظر نہ آتا تھا (کہ دیکھنے والی آنکھ جو نہ تھی —) کمرے میں غرّاہٹیں بھی تھیں — مگر آواز نہ آتی تھی —

سب کچھ تھا — مگر ..... (نہیں تھا) روشنی تھی ..... مگر (نہیں تھی — ہر طرف تاریکی اور سناٹا تھا) — کہ کتے اور بلّی کے پنجوں سے بچ جانے والی وہ آنکھ کہ جو باہر جھانکتی تھی گشت پہ نکلا ہوا سپاہی اٹھا لے گیا تھا۔

محسن احسان

آثم میرزا
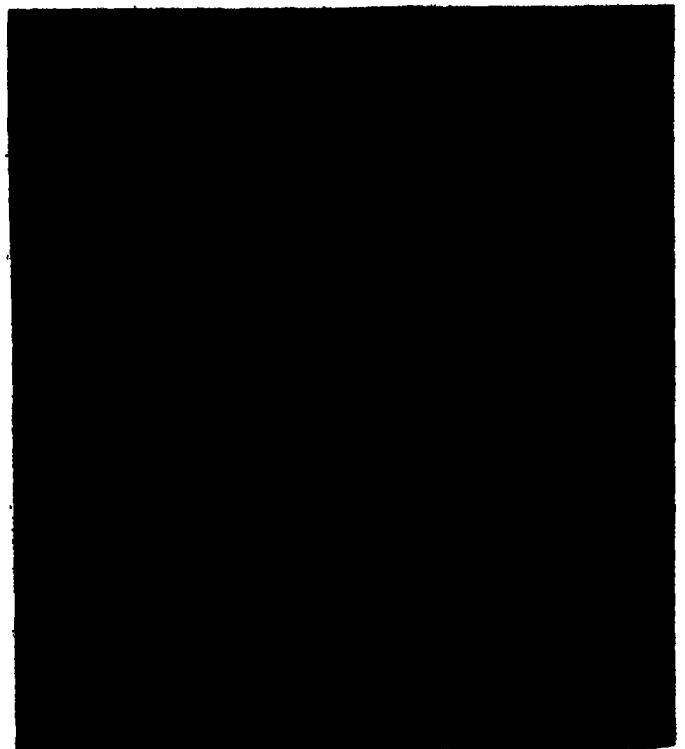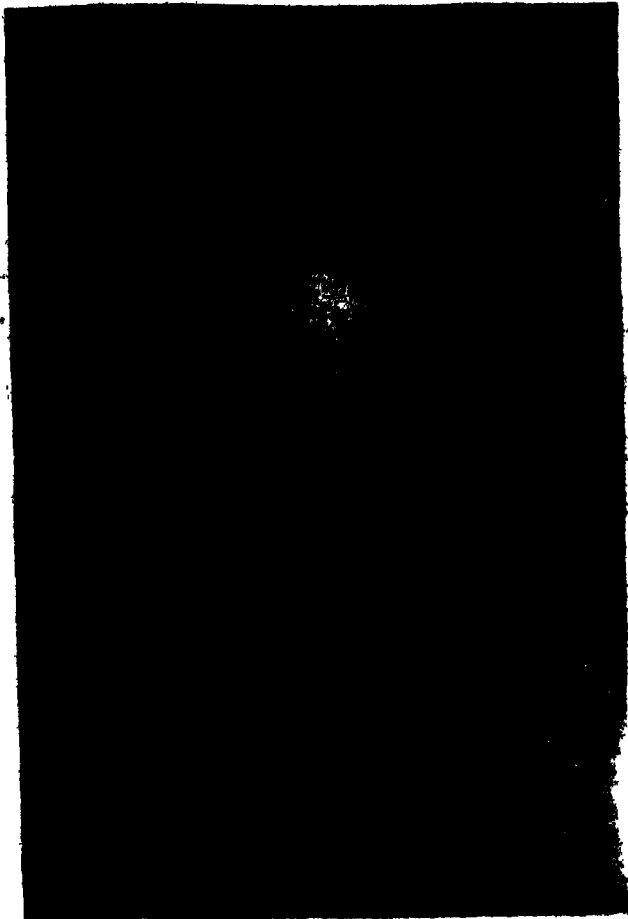
بے نام لمحوں کی شناخت

ایک خوبصورت بچی ریشمی پھولدار فراک پہنے رنگین تتلی کی مانند تیرتی ہوئی اس کے سامنے سے گزری۔ اور وہ اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ فلسفہ کی موٹی کتاب گھٹنوں پر رکھ کر اس نے کیاریوں میں کھلے ہوئے خوش رنگ۔۔۔ دیدہ زیب پھولوں پر نظریں گھمائیں۔ اور ہر جگہ اسے اس خوبصورت بچی کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ محویت کے عالم میں وہ اسے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی ذات کے خول میں گھٹتا ہوا نغمہ ہو۔ جو خول میں دراڑ پیدا ہونے سے کھلی فضا میں آ کر ماحول کو مسحور کن بنا رہا ہو۔ اس نے بے قرار سا ہو کر اپنے بھتیجے کو آواز دی۔" عارف۔ بیٹا۔ ذرا ادھر تو آنا۔ شاباش۔ ذرا جلدی سے" عارف اس کے قریب آیا۔ تو اس نے پوچھ لیا۔۔۔ "وہ بچی۔ جو ریشمی پھولدار فراک پہنے پھدک رہی ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟" "انکل۔ وہ حمیرا ہے" عارف جواب دے کے اپنے ہمجولیوں کی طرف بھاگ گیا "حمیرا۔۔۔ حمیرا کون؟ پہلے تو کبھی اسے کو ٹھی میں نہیں دیکھا! لیکن۔۔۔ یوں محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے یہ ہمیشہ سے میری نظروں کا مرکز بنی رہی ہو جیسے یہ میرے سانسوں کا توازن ہو۔ یہ کون ہو سکتی ہے؟" اس نے اندر پھیلتی ہوئی ان جانی خوشبو سے مغلوب ہو کر کرسی کی پشت پر کمر ٹکا دی۔ اور گہرا سانس بھر کر آنکھیں بند کر لیں۔ عجیب منظر دکھائی دینے لگا۔ وہ بچی اس کے بازوؤں کے حلقہ میں مچل رہی تھی۔ اس کی گود میں بیٹھی۔ اپنی ننھی نازک انگلی سے اس کے سینے پر لکیریں بنا رہی تھی۔ اس کی پشت پر سوار ہو کر اسے گھوڑا بنائے ہوئے تھی۔ وہ دیر تک ان مناظر میں بکھرے ہوئے رنگوں سے اپنی زندگی کے بے کراں خلا کو پُر کرتا رہا تھا "بھائی جان!"۔۔۔ وہ چونک سا پڑا۔ اس کی چھوٹی بہن عارفہ اس بچی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی "بھائی جان۔ سب مہمان آ چکے ہیں۔ کیا آپ اندر نہیں جائیں گے۔ بھابی جان آپ کی منتظر ہیں" اس کی نظریں حمیرا کا طواف کر رہی تھیں "بھائی جان۔ اٹھیے بھی آپ کے بغیر فوزیہ کی سالگرہ کا پروگرام شروع نہیں ہوگا" اس نے محویت کے عالم میں پوچھ لیا۔ "یہ بچی۔۔۔ کون ہے؟ ۔۔۔ یہ حمیرا۔۔۔ کس کی بیٹی ہے؟" ۔۔۔ عارفہ نے گہرا ٹوٹا ہوا سانس بھر کر کہا "آپ نے اسے پہچانا نہیں۔۔۔ یہ تو باجی نویدہ کی بیٹی ہے۔ ہو بہو اسی کا نقشہ۔ میں نے تو پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا تھا۔۔۔"

وہ دھک سا رہ گیا۔ اس کی روح کے ویرانے میں ایک چیخ گونجی اور اس کی ذات کا گنبد تڑخنے لگا "نویدہ!" اسے محسوس ہونے لگا کہ اگر یہ نام اس کی زبان پر آیا۔ تو ہونٹ جلنے لگیں گے عارفہ اس کے متغیر چہرہ پر نظریں جما کر بولی "کل اچانک شاپنگ سنٹر پر باجی نویدہ سے ملاقات ہو گئی تھی۔ بھابی جان نے انہیں فوزیہ کی سالگرہ پر مدعو کیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ رضامند ہوئی تھیں۔ بھائی جان دیر ہو رہی ہے۔ آپ کی وجہ سے پروگرام شروع نہیں ہو رہا ہے۔ اب اٹھیے نا" وہ یوں کھڑا ہوا۔ جیسے ماضی بارِ گراں کی مانند اس کے کندھوں پر جھکا ہوا ہو۔۔۔ نویدہ اس کی محبت کا مرکز تھی۔ اس نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ دونوں خاندانوں کے تعلقات خوشگوار تھے سب بے تکلفانہ طور پر ایک دوسرے سے ملا کرتے

ہوتی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا تھا۔ دل کی گہرائیوں میں محبت کو پروان چڑھایا تھا۔ اور اکائی بننے کی خاطر بزرگوں کی خوشنودی بھی حاصل کرلی تھی۔ اور پھر اچانک وہ آنے والے لمحوں میں چھپی ہوئی تلخیوں کے خیال سے یوں کپکپاہٹ سی محسوس کرنے لگا۔ جیسے شدید برف باری کے بعد یخ بستہ ہوا میں وہ ننگے بدن کھڑا ہو۔ اس کی زندگی میں یہ موڑ حادثاتی طور پر نمودار ہوا تھا۔ شہر کے تاجر نظام الدین کی بیٹی کی شادی کی تقریب میں اس کی دو ایسی ہستیوں سے ملاقات ہوگئی۔ جن کا حسن اس کی نظروں میں بے مثال تھا۔ کبھی جن کے چہروں پہ آنکھ نہ ٹکتی تھی ہر محفل میں انہی کے حسن پر گفتگو ہوتی تھی۔ ان کی دائمی رفاقت حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ اس وقت ایف اے میں تھا۔ نویدہ کی محبت کی قندیل اس کے دل کے طاقچے میں روشن ہو چکی تھی۔ وہ ان دونوں سے نویدہ کا موازنہ کرکے کوئی نتیجہ اخذ نہ کرسکتا تھا کہ ان تینوں میں سے حسن و جوانی کے معاملہ میں کون برتر ہے۔ اور پھر ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اور ناکام اُمیدوار آہیں بھرتے رہ گئے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ ازدواجی زندگی شروع کرنے کا پروگرام ہی بنا رہا تھا کہ وہ دونوں عجیب انداز میں اس کے سامنے آگئی تھیں فاخرہ کو بہت غور سے دیکھنے کے بعد اس نے اسے پہچان تو لیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ایک دھچکا بھی لگا تھا۔ پانچ سال کے عرصہ میں وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ جسم فربہ ہوگیا تھا۔ میک اپ کے سہارے اپنی جوانی کو خواب گوں بنانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ نہ وہ پہلی سی آتشیں مسکراہٹ تھی۔ نہ خمار آلود آنکھوں کی کشش تھی۔ اور نائلہ کو تو وہ بالکل نہ پہچان سکا تھا۔ موٹاپا اس کی ساری دلکشی اور رعنائی کو نگل چکا تھا۔ اب اسے دیکھ کر کسی کا دل دیوانہ وار رقص کرنے کو نہ چاہتا تھا۔ بیگمات بن کر انہوں نے ہر آسائش حاصل کرلی تھی۔ لیکن صبح کی اُجلی مسکراہٹ کی مانند ان کی جوانی میں جو نکھار اور سنگھار تھا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ حسن کا یہ انجام اس کے لئے بڑا دردناک بن گیا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ کہ وہ دونوں اس حسرت ناک انجام کے ساتھ اس کے سامنے آئیں گی۔ وہ فلسفیانہ انداز میں حسن کا تجزیہ کر رہا تھا۔ ہر لمحہ اس کی سوچ کیلئے ایک تازیانہ بنتا جا رہا تھا۔ دعوت میں اس کی دلچسپی ختم ہوگئی تھی۔ اس محفل میں اب دوسری دوشیزاؤں کے حسن کے تذکرے تھے۔ اور ان دونوں کی تعریف میں استعمال ہونے والے شہد آگیں الفاظ ماضی کی دلدل میں گم ہو چکے تھے۔ ان کی پہچان اب شوہروں کی امارت کی مرہون منت تھی۔ وہ سوگوار تصورات کے تحت زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہر سکا تھا۔ نویدہ کا سراپا اس کے تصورات میں عجیب عجیب سی شکلیں اختیار کر رہا تھا۔ ہر نئے منظر پہ وہ یوں اذیت سی محسوس کرتا۔ جیسے بے خیالی میں انگارہ بنے ہوئے لوہے کے ٹکڑے کو چھو لیا۔ ایک طرف اس کو محبت تھی۔ اس کی زندگی کی ساری مسرتوں کا محور تھا۔ اور دوسری طرف خزاں کے نوحے تھے۔ ننگی شاخوں سے چپکی ہوئی آرزوؤں کی رنگین تتلیوں کی لاشیں تھیں۔

"نہیں! ــــ" اس کے قدم یکدم فٹ پاتھ پر جم کر رہ گئے۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں یہ کیسے برداشت کرسکتا ہوں کہ نویدہ کو اس حالت میں دیکھوں۔ جبکہ اس کا بے مثال حسن ڈوبتے سورج کی بیمار زرد شعاعوں سے بغلگیر ہو کر میری بصارت کو مجروح کر دے ــــ" وہ بہت دیر تک بازاروں میں بے مقصد گھومتا رہا تھا۔ بہت دیر بعد کوٹھی میں داخل ہوا ــــ اپنے کمرہ میں آکر وہ کٹی ہوئی شاخ کی مانند مسہری پر گر پڑا۔ اس کے آنسو تکیہ کو بھگو رہے تھے۔ اور وہ نویدہ کے حسن کو سوگوار لمحوں سے محفوظ رکھنے کی تراکیب سوچ رہا تھا۔ صبح اس کی صحت پر شب بیداری نے جو اثرات ڈالے تھے۔ اس کی بھابی نے انہیں بھانپ لیا تھا۔ ناشتہ کی میز پر اس نے تشویش ناک لہجہ میں پوچھ لیا۔ "حسن! تم بیمار دکھائی دے رہے ہو۔ کیا تکلیف ہے۔ رات کو بھی تم کمرے سے باہر نہ نکلے تھے۔"

"کوئی خاص نہیں۔" اس نے مسکرانا چاہا۔ اور اس کی آواز رندھ گئی۔ بھابی کی بے چینی بڑھ گئی۔ یہ تم نے۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کچھ کھو دیا ہو۔ کیا مجھے اپنا راز داں نہ بناؤ گے؟" لقمہ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گیا۔

"بھابی جان ــــ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو علم ہو ہی جائے گا۔" سب نے ناشتہ اضطراری

حالت میں کیا تھا۔ احسن اپنے کمرہ میں آیا۔ تو بھابی بھی اس کے کمرے میں آ گئی۔ "دیکھو احسن تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تمہیں کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ اور میں یہ معلوم کئے بغیر واپس نہ جاؤں گی۔" احسن نے غمناک نظریں چھت پر جما دیں۔ اور اسے اپنی نبض ڈوبتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ مغموم لہجہ میں بولا۔ "یہ بات میرے لئے بہت اہم بن گئی ہے۔ میں نہیں بتا سکتا انجام کیا ہوگا۔ میں نے نویدہ سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" "کیا!" بھابی دھک سی گئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ "آخر کیوں؟ کیا اس کے کردار پر شک گزرتا ہے؟" "نہیں ——" احسن جلدی سے بول پڑا ہے۔ "وہ اپنے کردار کے لحاظ سے بھی ایک مثالی دوشیزہ ہے۔ بس یوں سمجھ لیں۔ میں خود کو اس کے قابل نہیں سمجھتا۔ آج مجھ پر عجیب انکشاف ہوا ہے۔ میں اسے سدا بہار دیکھنے کا متمنی ہوں۔ اور شادی کے بعد اس کا حسن ماند پڑ جائے گا۔ اس کے سراپا میں جو نشہ آور دلکشی ہے۔ وہ ختم ہو جائے گی۔ اور میں اسے دیکھ کر جن حسین سپنوں میں کھو گیا ہوں۔ ان کی تذلیل برداشت نہیں کر سکتا۔ شاید اب بھی میں اپنے جذبات کی وضاحت نہ کر سکا ہوں۔ مگر اسے ہمیشہ کے لئے اپنانا۔ میرے بس میں نہیں رہا۔" بھابی نے بہت کریدا۔ خاندان کے وقار کا واسطہ دے کر اسے اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن احسن اپنا فیصلہ بدلنے پر رضامند نہ ہو سکا تھا۔

گھر کے ہر فرد نے باری باری کوشش کر کے دیکھ لی۔ مگر کسی کو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اور جب نویدہ کو اس حادثہ کی اطلاع ملی۔ تو اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے زندگی کی آخری رمق تک سے وہ محروم ہو گئی ہو۔ روتے ہوئے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اگلے دن جب وہ احسن کے فیصلہ کی اصلیت معلوم کرنے کی خاطر اس کی تلاش میں نکلی۔ تو وہ اپنے ماموں کے پاس کراچی جانے کے لئے ٹرین پر سوار ہو چکا تھا۔ نویدہ کی رنگین تصویر ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی۔ یہی زندگی کے ویرانوں میں بہار کا معطر جھونکا بن کر پھیل جاتی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے اس پر خود فراموشی کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ اپنی دانست میں اس نے نویدہ کے حسن کو خزاں کے پرواز سے محفوظ کر لیا تھا —— جب دو سال بعد واپس آیا۔ تو نویدہ ایک میجر کی بیگم بن کر دوسری جگہ جا چکی تھی۔ اس نے اب کبھی اس سے ملنے کی آرزو نہ کی تھی۔ کبھی سراغ لگانے کی کوشش نہ کی تھی۔

—— اور اب ایک مدت بعد نویدہ کے روپ میں حمیرا اس کے سامنے تھی۔ اور وہ مبہوت انداز میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ دروازہ کے قریب آ کر وہ یکدم رک گیا۔ ماضی کے زنگ آلود کواڑ کھڑکھڑانے لگے۔ حال کی تشنگی نے پچھتاووں کی شکل اختیار کر لی۔ یکدم اس کے شعور کی سلوٹوں میں سے حقیقت ایک کاٹ دار طنز بن کر اُبھر آئی۔ "تو کیا۔ میں نے نویدہ کو ٹھکرا کر کسی سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا! ایک چیز کا زوال تو کسی دوسرے حسین منظر کے آغاز کا سبب بن جاتا ہے۔ حسن تو کبھی فنا نہیں ہوتا۔ نویدہ تو بیگم بن کر بھی حمیرا کے روپ میں رعنائیوں کا مرکز ہے۔ ہم تو حسن کی ہر کرن اپنی اولاد کو وراثت میں سونپ دیتے ہیں۔ اگر حمیرا میری بیٹی ہوتی۔ تو ......" اس کے اندر فلسفے کا ہر آئینہ کرچیاں بن کر بکھر گیا تھا...... ایک شدید جذبے کے تحت اس نے حمیرا کو اٹھا کر اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ آنسو اس کی پلکوں پر لرز رہے تھے ——"

ضیا بٹ

برزخ

میرے پاس سے گزرنے والا گھر کا ہر فرد میری خیریت پوچھتا ہے اور میں مسکراتا ہوا "سب اچھا ہے" کہہ دیتا ہوں ــ یہ لوگ میری کتنی عزت کرتے ہیں! شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مجھے بہت کم جانتے ہیں اور میں نے اپنی باطنی خباثتوں کو اپنے رکھ رکھاؤ سے چھپا رکھا ہے۔ میں رشتہ داروں کے چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا ہوں۔ غالباً ان لوگوں کے نزدیک کسی کے اچھا ہونے کا یہی معیار ہے۔ سادہ لوگ نہیں جانتے کہ زندگی کتنی پیچیدہ ہو چکی ہے، اور کسی کی ایک آدھ اچھائی یا برائی دیکھ کر اس سے متعلق اچھا یا برا ہونے کی حتمی رائے قائم کرنا درست نہیں۔ البتہ سب رشتہ داروں میں قدوس نہایت چالاک اور خبیث آدمی متصور ہوتا ہے۔ وہ ہر ایک کے معاملے میں محض اپنی چودھراہٹ کی خاطر ٹانگ اڑاتا ہے، اور خاص کر ایسے مواقع پر خواہ مخواہ بدمزگی پیدا کرتا ہے۔ میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔ وہ حدود سے تجاوز کرنے کا عادی ہے اور میں حدود کے قریب تک نہیں جاتا۔ دوسرے رشتہ دار بھی اسے دلی طور پر پسند نہیں کرتے لیکن اس سے قطع تعلق ان کے لئے ممکن نہیں۔ خیر اپنی اپنی پرورش۔ اپنا اپنا ماحول اور اپنی اپنی سوچ ہے۔

میں چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوں قناتیں تنی ہیں مگر ان کے احاطوں میں سامان بے ترتیبی سے پڑا ہے۔ بارات میں کوئی پچاس ساٹھ آدمی متوقع ہیں۔ لڑکے والوں نے گیارہ بجے کا وقت دے رکھا ہے، اور ساڑھے دس بج چکے ہیں۔ میزبانوں کی پچیس تیس افراد پر مشتمل ٹیم ٹکڑیوں میں گپ شپ میں مشغول ہے۔ غالباً وہ مطمئن ہیں کہ ابھی کافی وقت ہے کیونکہ باراتیں اکثر مقررہ وقت سے ڈیڑھ دو گھنٹے دیر ہی سے پہنچتی ہے۔ البتہ پھوپھا اور پھوپھی متفکر نظر آتے ہیں۔ ان کا فکرمند ہونا قدرتی بات ہے۔ کیونکہ ان کی بیٹی کی شادی ہے ــ رشتہ داروں میں قدوس کہیں نظر نہیں آتا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھتا ہوں اور تمام ورکرز کو آواز دیتا ہوں۔ وہ فوراً لبیک کہتے ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر کہ شاید بارات پورے گیارہ بجے ہی آ پہنچے میں انہیں مختلف گروپوں میں تقسیم کر کے ان کا دائرہ کار متعین کر دیتا ہوں۔ سب اپنی اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاتے ہیں۔ بوتلیں برف میں ڈالی جا رہی ہیں۔ کرسیاں سیدھی کی جا رہی ہیں ــ کھانے کے میز درست ہو رہے ہیں۔ میرے حکم کی تعمیل میں باورچی دیگیں چولہوں پر چڑھا دیتا ہے۔

میں علیحدگی میں پھوپھا کے ہاتھ پر دو ہزار روپے رکھتا ہوا کہتا ہوں "سب فکر ہمارے ہیں بس نکاح خواں ساڑھے گیارہ بجے یہاں ہونا چاہیئے" پھوپھا اتنی بڑی رقم دیکھ کر حیرانی اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رسمی طور پر انکار کرتا ہے اور پھر نوٹ تھامتے ہوئے فرطِ جذبات سے میرا ماتھا چومتا ہے ــ اپنے چھوٹے بیٹے کو آواز دیتا ہے اس کی آواز میں بڑی کڑک اور اعتماد پیدا ہو جاتا ہے ــ بیٹا نکاح خواں کو بلانے چلا جاتا ہے۔

باجوں کی آواز سب رشتہ داروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ میں انہیں کہتا ہوں کہ بارات کو بزرگ افراد خوش آمدید کہیں گے۔ باقی اپنے اپنے فرائض سنبھال لیں۔ میرے ہر حکم کی تعمیل ہوتی ہے میں خود کو اس چھوٹے سے اجتماع کا وقتی طور پر

بے تا[illegible] محسوس کرتا ہوں۔

باراتی بوتلیں پی چکے ہیں اور اب نکاح پڑھایا جا رہا ہے ۔ مبارک مبارک کی آواز سنتے ہی بارات کو کھانے پر باقاعدہ مدعو کرتا ہوں ہر چیز قرینے میں ہے۔ دوسری شفٹ میں عورتیں اور بچے بھی کھانا کھا کر فارغ ہو جاتے ہیں۔

اب بھانڈ باراتیوں کا دل بہلا رہے ہیں اور لڑکی والے رخصتی کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ میں نوجوان ورکرز کو شاباش اور پچاس روپے بطور انعام دیتا ہوں۔ وہ میرے "زندہ باد" کا نعرہ لگاتے ہیں ۔ میرا پھوپھا مسکرا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر اطمینان نمایاں ہے۔

"منور! تمہاری پھوپھی بلا رہی ہے۔" پھوپھا مجھ سے مخاطب ہے۔ میں سگریٹ کا باقی حصہ پھینکتے ہوئے گھر میں داخل ہوتا ہوں ۔ بچے لڑکیاں جوان اور بوڑھی عورتیں رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس نہ جانے کیا کیا باتیں کر رہی ہیں اور کدھر سے کدھر کو آ جا رہی ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سب کی سب کسی لمبی قیدِ تنہائی سے رہائی پانے کے بعد ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی کوشش کر رہی ہوں۔

میری پھوپھی مجھے دیکھتے ہی پیار سے اپنے دونوں ہاتھ میرے بالوں میں پیوست کر دیتی ہے اور کہتی ہے "منتری! تمہارے آنے اور اچھے انتظام کا بہت بہت شکریہ ۔" وہ مجھے ہمیشہ انجینئر کی بجائے منتری کہتی ہے اور میں بھی اس لفظ میں زیادہ خلوص ۔ محبت اور پیار محسوس کرتا ہوں۔

البتہ کچھ لڑکیاں منتری کا لفظ سن کر چونکتی ہیں اور میری طرف حیران سے دیکھتی ہیں۔

میری نگاہیں ایک جگہ رک جاتی ہیں۔ گھنی بھاؤں تلے دو چشمے اپنے اندر سمندر کی سی گہرائی لئے ہوئے ہیں۔ ان چشموں کی نکروں سے سنگِ مرمر سے بنی دو سڑکیں نکلتی ہیں اور ان کے پاس ہی مجھے یاقوتی سپل وے دکھائی دیتا ہے، جس کے چاروں طرف نور کی ایک چادر سی بچھی ہے۔ کہیں پاس ہی جنریٹر چلنا شروع ہو جاتا ہے جس کی آواز میرے کانوں میں صاف سنائی دے رہی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک ایسے ڈیم کے کنارے کھڑا ہوں جس کا آبی ذخیرہ آخری حد تک پہنچا ہی چاہتا ہے۔ میں ڈیم کی بنیادیں ہلتی نظر آتی ہیں اور مجھے ادھر بسنے والوں کی فکر کھانے لگتی ہے۔

"جاؤ تم آرام کرو میں نگہت کی تیاری مکمل کر لوں" پھوپھی کے ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ منظر میری نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔

میں سگریٹ پر سگریٹ پیئے جا رہا ہوں ۔ یہ لڑکی کون ہے وہ شاید نہیں جانتی کہ اس کی سادگی اور چہرے پر پھیلی سنجیدگی اور متانت نے اُس کے قدرتی حسن میں کس قدر اضافہ کر رکھا ہے یقیناً کوئی قریبی رشتہ دار ہے لیکن میں بہت کم لڑکیوں کے ناموں اور رشتوں سے واقف ہوں۔

کار مکان کے پاس رکتی ہے جس میں دولہا بیٹھا ہے ۔ مجھے پھر پکارا جا رہا ہے میں جلدی سے اٹھتا ہوں۔ نگہت دروازے تک آ چکی ہے۔ میں اس کے سر پر پیار دیتا ہوا۔ خدا حافظ کہتا ہوں ۔ دلہا اور دلہن جا چکے ہیں ۔ پھوپھا آنکھوں میں آنسو چھپائے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے پھوپھی باقاعدہ رو رہی ہے ۔ بوڑھی عورتیں اسے دلاسہ دے رہی ہیں ۔ چند نوجوان لڑکیاں خاموش کھڑی ہیں ۔ میں ان کی طرف دیکھتا ہوں ۔ وہ آپس میں چھیڑ خانی کرتی اور مسکراتی ساتھ والے کمرے میں چلی جاتی ہیں ۔ البتہ "وہ" کھڑی کسی گہری سوچ میں مستغرق ہے میں اس کے جسم کا جائزہ لیتا ہوں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عاملانِ قضا و قدر کہیں اب جا کر عورت کی تکمیل کر سکے ہیں۔ میرے اندر چھپا رب مجھے اس درخت کے قریب جانے سے منع کر رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک لغزش مجھے جنت سے نکال باہر پھینکے گی اور میرا شمار اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں ہونے لگے گا۔

باقی مانندہ عورتیں برقع پہننا شروع کر دیتی ہیں ۔ وہ بھی برقعہ پہن کر صحن میں واپس آ چکی ہے۔ اس کی چشمہ والی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں ۔ یہ کون ہے ؟ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں ؟ اور اب یہ کہاں جا رہی ہے ؟ " میرے دل و دماغ کے کسی گوشے میں بسا شیطان الفاظ کا روپ دھار کر اس سے براہِ راست سوال کرتا ہے۔

"اے لڑکی تم چچا طفیل کی بیٹی ہو؟"

نہایت دھیمے اور میٹھے سُر میں جواب ملتا "نہیں ـــ ہاں"

"نہیں ـــ ہاں" اب تک میرے کانوں میں

گونج رہی ہے۔ وہ میرے سامنے کھڑی ہے اور میں اسے برابر دیکھتا چلا جاتا ہوں۔ میرا ذہن اس کی آواز سے نکلے سروں کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور میرے پاؤں تلے زمین کھسک رہی ہے۔

"اس کا نام رفعت ہے۔ طفیل کی بہو ہے اور مرحوم قدوس کی بیٹی — تم بھی اب شادی کر لو" پھوپھی کہتی ہے۔

میں اب تک اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ نگاہیں نیچی کئے سر جھکا دیتی ہے میرے کانپتے ہاتھ اوپر اٹھتے ہیں اور اس کے سر پر پیار دیتے ہیں۔ صحن میں موجود بوڑھی عورتیں مجھے پیار اور عزت بھری نظروں سے دیکھتی ہیں۔

میری بند آنکھیں کھلتی ہیں اور چاروں طرف اسے تلاش کرنے لگتی ہیں۔ لیکن میری نگاہیں گرد و پیش میں بھٹک جاتی ہیں۔ بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہر طرف سے اٹھنے والا شور شرابا میرے کانوں کو ناگوار گزرتا ہے۔ میں کرسی پہ بیٹھا سگریٹ پہ سگریٹ پی رہا ہوں۔ گھر کے افراد افراتفری میں میری کرسی کے پاس سے ہوتے ہوتے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ انہیں میری طرف دیکھنے کی فرصت تک نہیں۔ میرے سامنے گھر کا صحن عورتوں اور بچوں کے شور و غل اور بھاگم بھاگ کی وجہ سے میدانِ حشر بنا ہوا ہے۔ میرا پھوپھا اور پھوپھی متفکر چہروں کے ساتھ اِدھر سے اُدھر آجا رہے ہیں۔ یکے بعد دیگرے تین بچیوں کی شادی نے انہیں مجھ سے بھی زیادہ بوڑھا کر دیا ہے۔ میری بائیں جانب بارات کھانا کھانے میں مشغول ہے۔ اور طوفانِ بدتمیزی برپا ہے۔ انتظام ایک نوجوان نے سنبھال رکھا ہے اور وہی سب کی توجہ کا مرکز بنا ہے میری پھوپھی کی آخری بیٹی کی شادی میں شامل ہونے والا ہر خاندان مجھے عذاب میں گرفتار نظر آتا ہے۔

اپنے پاس سے گذرنے والے ہر رفتہ دا مرد اور عورت کو میں بغور دیکھتا ہوں۔ اچانک ایک بچے کا پاؤں گندی نالی میں پڑتا ہے اور چھینٹے مجھ تک پہنچتے ہیں۔ اس کی ماں اسے ایک تھپیڑ مارتی ہے۔ بچہ رونا شروع کر دیتا ہے۔ ماں اسے وہیں چھوڑتی صحن میں داخل ہوتی ہوئی واپس نظروں سے بچے کو غصے سے دیکھتی ہے — میں ایک لمحہ کے لئے ایسے ڈیم کے کنارے پہنچ جاتا ہوں جو غالباً اپنی عمر پوری کر چکا ہے اور جس میں موجود آبی ذخیرہ سے ادھر بسنے والوں کو اب کوئی خطرہ نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں جنت کا کوئی گوشہ گم کر چکا ہوں اور اب عالمِ تلخ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوں۔

نسیم سحر

ڈاکٹر محمد معروف

عابدہ نرجس
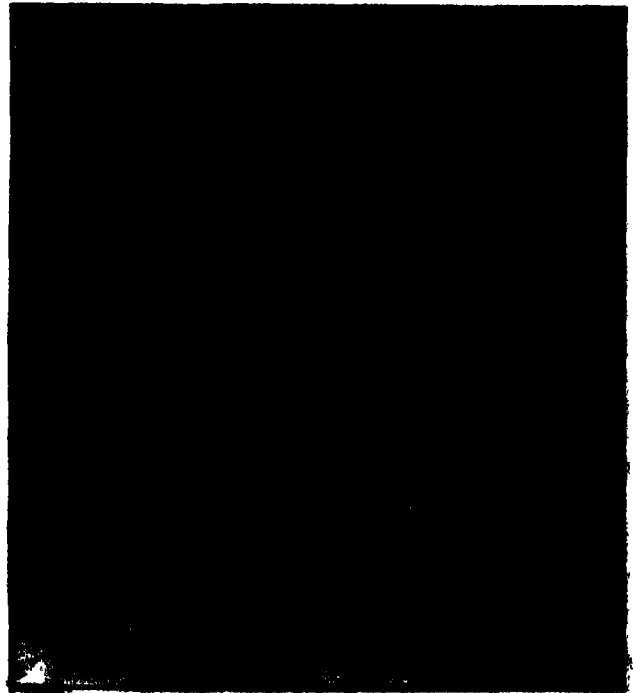
شاہکار

اسے کے ذہن میں لاوا سا پک رہا تھا اور وہ تیز قدموں سے بڑھتا چلا جاتا تھا اپنے گردوپیش متجسس نگاہ ڈالتا ہوا لیکن گوہر مقصود نہیں ملتا تھا۔ وہ چہروں کو غور سے دیکھتا تھا۔ وہ انسانوں کے بہت قریب سے ہوکر گذرتا تھا۔ وہ کہیں اچانک ٹھہر بھی جاتا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر آگے چل پڑتا تھا۔ وہ بار بار جیب میں رکھی ہوئی پنسل کو ٹٹولتا تھا۔ اور کاغذ کو محسوس کرتا تھا۔ کاغذ کا چہرہ سپاٹ تھا اور پنسل گونگی تھی۔ اس کے ذہن میں کوئی لفظ نہیں تھا۔ اس کی نگاہوں میں کوئی منظر نہیں تھا۔ کوئی انوکھی بات سماعت میں نہیں اترتی تھی۔ لمحے تیزی سے پھسلتے جاتے تھے۔

وہ الجھ گیا۔ اس کے قدم بوجھل ہونے لگے۔ لیکن اس کی جستجو اُسے چلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اُسے کوئی کہانی لکھنی تھی۔ اور وہ اس کہانی کو شاہکار بنانا چاہتا تھا ــــ وہ زندگی کو قریب سے دیکھنے کے لئے نکلا تھا۔ اور اس کے تعاقب میں وہ چلا جاتا تھا۔ زندگی اس کے انگ انگ میں تیزی سے بھر رہی تھی لیکن کوئی لمحہ گرفت میں نہیں آتا تھا کہ اُسے لفظوں میں مقید کر کے وہ قرطاس پر پھیلا سکے۔ وہ پوری زندگی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جب وہ دور تک نگاہ ڈالتا تھا۔ تو اُسے محسوس ہوتا تھا کہ زندگی تو اس کی بصارت کی پہنچ سے بہت آگے ہے۔ وہ کچھ دیکھنے کے اشتیاق میں اور آگے بڑھ جاتا۔ لیکن جب پیچھے نگاہ ڈالتا۔ تو وہ منظر جو وہ پہلے دیکھ چکا تھا ــ بہت پیچھے رہ جاتے۔ انہیں پھر دیکھنے کی خواہش ہوتی تو نگاہیں ناکام واپس آ جاتیں۔

اُسے محسوس ہوا کہ وہ چھوٹے سے اک لمحے میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ پیچھے دیکھتا تو رواں دواں زندگی ــ جس میں سے وہ سفر کر کے آیا ہے ــ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی اور وہ آگے دیکھتا تو زندگی آگے بہت آگے دوڑتی ہوئی نظر آتی۔ وہ ماضی حال اور مستقبل کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا ہر قدم مستقبل کو حال اور حال کو ماضی بناتا چلا جاتا تھا۔ وہ مڑ پلٹ کر ماضی میں دور تک جھانک سکتا تھا اور نہ مستقبل میں دور تک اس کی نگاہ جاتی تھی۔ اور حال جو اس کے چاروں طرف پھیلا تھا۔ اس میں کچھ بھی نگاہوں میں نہیں جچتا تھا۔

اُس نے سڑک پر پڑے ہوئے اُس خوبصورت نوجوان پر بھی توجہ نہیں دی ــــ جو اپنے ہی خون میں غلطاں تپتی سڑک پر پڑا تھا۔ اور اس کے سکوٹر سے ٹکرانے والے ٹرک کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ یہ تو اخبار کی خبر تھی اور روز کا معمول ــــ یہ تو کہانی کا موضوع نہیں بن سکتی ــ!

راستے میں اک نوجوان بھکارن نے اُسے روکا۔ اُس نے دامن چھڑا کر گزر جانا چاہا۔ لیکن اس کا خوبصورت چہرہ، پیاسی آنکھیں، ڈھلکی ہوئی اوڑھنی نے اس کے قدم باندھ لئے۔ اُس نے اشتیاق سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا وہ سادگی سے چند سکّوں کا سوال کر رہی تھی۔ اس کا ہاتھ جیب میں سکّے ٹٹولنے لگا اور اس کی نگاہیں ....

"اوئے بابُو ــ کچھ دینا ہے تو دے ــ

دیکھتا کیا ہے" اک مکروہ صورت بھکاری نے آگے بڑھ کر اکھڑتے پنے سے کہا۔

اُس نے چونک کر سکّہ اس کی پھیلی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ تو کہانی کی تلاش میں نکلا تھا۔ اک لمحے کو ٹھٹھک کر اُس نے سوچا۔ بھکارن کتنی خوبصورت ہے۔ اُس سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی بولتی ہوئی آنکھیں ان کہی کہہ رہی ہیں۔ کاش وہ تنہا ہوتی۔ اس کے ساتھ کھڑا ہوا مکروہ صورت بھکاری بڑا خوفناک تھا۔ اور اپنی سُرخ آنکھوں سے اُسے گھور رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اور دوسری طرف مڑ گیا۔

سامنے سے آتے ہوئے ننگ دھڑنگ خونخوار پاگل سے اُس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ جو راہ چلتوں کو پتھر مار رہا تھا۔ اس کا سانس پھول گیا۔ مُڑ مُڑ کر دیکھتا ہوا۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور دل ہی دل میں انتظامیہ کو کوسنے لگا۔ جو اس قسم کے خطرناک پاگلوں کو سڑک پر کھلا چھوڑ دیتی ہے۔

وہ ابھی پوری طرح سنبھلنے نہیں پایا تھا۔ کہ اُس نے سڑک پر کچھ آدمیوں کو اک لڑکی کو گھسیٹ کر زبردستی ٹیکسی میں ڈالتے ہوئے دیکھا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی بری طرح مزاحمت کر رہی تھی۔ وہ زور زور سے چلّا کر مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ اس کا اُجلا دوپٹہ سڑک پر اس کے ساتھ ساتھ گھسٹتا چلا آ رہا تھا رواں دواں شاہراہ اور بھرے ہوئے بازار میں لوگ چپ چاپ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ کوئی آگے بڑھ کر اُسے نہیں چھڑاتا تھا۔ وہ بھی آگے نہیں بڑھا اور تیز قدموں سے اس جگہ سے دور نکل گیا۔ نہ جانے کیا معاملہ تھا۔ وہ اس میں ٹانگ اڑا کر بے موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ گواہوں میں شامل کر لیا جاتا۔ تو مفت میں پولیس کے ہاتھوں خراب ہوتا۔ اسے ابھی اک شاہکار کہانی تخلیق کرنی تھی۔ اُسے اخبار کی خبروں سے دلچسپی نہیں تھی۔

تیز چلنے اور اس مقام سے دور نکل جانے کی کوشش میں وہ ہانپ گیا۔ اُسے اک خوش پوش آدمی نے روکنے کی کوشش بھی کی۔ جس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

وہ شاید اپنی درد بھری داستان سنا کر اس سے مدد لینا چاہتا تھا۔ غالبًا اس کی جیب کٹ گئی تھی۔ یا اس کی ماں بہن بیمار تھی اور اس کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ اُس نے اس قسم کے فراڈ لوگوں کا ذکر بہت دفعہ سنا تھا۔ وہ اس کی جھوٹی دردناک کہانی سن کر اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے تو اپنی کہانی مکمل کرنی تھی۔ انوکھی اور اُچھوتی۔ جو اُسے زندہ جاوید کر دے۔

یہی سوچ کر وہ قدم دھرتا۔ ایک بلند مقام پہ پہنچ گیا۔ اس نے بمشکل سانس ہموار کی اور گرد و پیش نگاہ ڈالی۔ یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی کہ یہاں سے سارا شہر نظر آتا تھا۔ زندگی چاروں طرف رواں دواں تھی۔ نگاہ دور دور تک جاتی تھی۔ وہ مسرور ہوا۔ اب اُسے کہانی کیلئے کوئی اچھوتا موضوع مل جائے گا۔

وہ مشتاق نگاہوں سے یوں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ جیسے ابھی اور اسی لمحے اس کی تخلیق ہوئی ہو اور وہ پہلی بار اس نرالی دنیا میں چلا آیا ہو۔ وہ بہت اونچا کھڑا تھا۔ اور زندگی بہت نیچے بہہ رہی تھی۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ انسان بونے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے چہرے پہچانے نہیں جاتے تھے آوازیں بہت پیچھے رہ گئیں تھیں۔ کچھ نامانوس شور اور ہوا کی سیٹیاں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کے دل پر عجیب سی ہیبت طاری ہو گئی۔ خوف سے خون اس کی رگوں میں منجمد ہونے لگا۔

اردگرد تو منظر ہی بدل گیا تھا۔ انسانوں کی بستی۔ بونوں کا شہر معلوم ہونے لگی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں ملیں اور گھبرا کر اپنے سراپے پر نگاہ ڈالی۔ کہیں وہ خود بھی تو بونا نہیں بن گیا۔ لیکن وہ خود کو دیکھ کر کس طرح اندازہ لگا سکتا تھا۔ اور گرد و پیش کوئی نہیں تھا جو اُسے بتاتا کہ وہ بونا نہیں بنا۔

وہ چکرا کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے۔ اس کی کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ وہ الٹے قدموں واپس ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن بونوں کے شہر میں جاتے ہوئے اُسے خوف آتا تھا۔

اکتوبر ۱۹۶۹ء

اچانک اس نے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ دیوانوں کی طرح اسکی طرف لپکا۔ یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ کہ وہ بونا نہیں تھا۔ وہ بیقراری سے اُس سے پوچھنے لگا۔

"کیا میں تمہیں بونا معلوم ہوتا ہوں۔"

"یہ تم ۔ مجھ سے بہتر جانتے ہو۔" اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ اُس پر ڈال کر بے نیازی سے جواب دیا اور آگے بڑھ جانا چاہا۔ اُس نے لپک کر اس کا دامن پکڑ لیا اور اسے پورے شہر کے بونوں کے شہر میں بدل جانے کی روداد سنانے لگا۔ وہ یوں اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔ پھر ہنس کر بولا۔ "یہ بونوں کا شہر کب نہیں تھا!؟"

اس کی ہنسی اتنی تمسخر آمیز تھی کہ وہ بھی خود کو پاگل سمجھنے لگا۔ وہ اُسے ہکا بکا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے ہونقوں کی طرح گرد و پیش دیکھا۔ وہ اچھا بھلا آدمی بونوں کی بستی کی طرف جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ وہ شخص بھی بونا بن چکا تھا۔

وہ خوف سے سرتا پا لرز گیا۔ خون اس کی رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ اس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ گرد و پیش کوئی اس کے جیسا نہیں تھا۔ اور نیچے بونوں کی بستی تھی۔ جس کی طرف جانے والا بھی بونا بن جاتا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے سراپے پر نگاہ ڈالتا تھا۔ کہیں وہ بونا تو نہیں بن گیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ خوف اس پر آسیب کی طرح مسلط ہو گیا تھا کہ کہیں وہ بونا تو نہیں بن گیا۔ کوئی اُسے یقین دلانے والا، تسلی دینے والا، شناخت کرنے والا نہیں تھا۔

ہار کر وہ وہیں بیٹھ گیا۔ وہ یہ بھول گیا تھا۔ کہ وہ کس غرض سے یہاں آیا تھا۔ اس نے گرد و پیش سے آنکھیں بند کر لیں اور جیب سے کاغذ اور پنسل نکال کر لکھتا چلا گیا۔

میں بونا نہیں ہوں ۔ میں بونا نہیں ہوں ۔ میں بونا نہیں ہوں !

پروفیسر ایم۔ اشرف

ادیب سہیل

سلیم انور

ایک پتھر سڑک کا
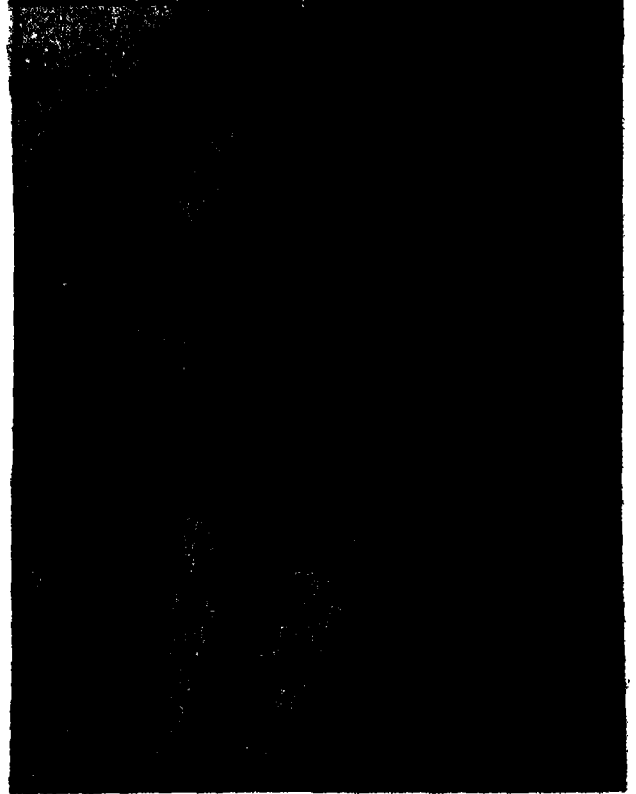
سورج اپنا تمام سونا سمیٹ کر مغرب میں غروب ہو چکا ہے۔

میری کوٹھری میں ایک بلب زرد زرد روشنی بکھیر رہا ہے۔ آج میں ایک ایسی کہانی تخلیق کرنا چاہتا ہوں جو صرف خیال ہو۔ جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ تاہم میرے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ یہ واقعہ غم و آلام کی ماری ہوئی اس دنیا میں کسی بھی بڑے شہر میں عید کے پرمسرت موقع پر وقوع پذیر ہوا ہوگا۔

میری چشم تصور میں ایک لڑکے کا وجود اُبھرتا ہے ایک معصوم سے لڑکے کا جس کی عمر شکل سے ۶ سال ہوگی۔ وہ موسم سرما کی ایک سرد صبح کو بیدار ہوتا ہے۔ اس کے جسم پر پلید سی میلی کچیلی شلوار قمیض جھول رہی ہے اس کے منہ سے شدید سردی کی وجہ سے سانس بھاپ بن کر باہر آ رہی ہے۔ وہ کونے میں پڑے ہوئے ایک صندوق پر بیٹھا ہے۔ وہ منہ سے نکلنے والے اس دھوئیں سے کھیلنا چاہتا ہے لیکن وہ بے حد بھوکا ہے۔ وہ متعدد بار اس طرح بھوک کے پیٹ ہسپتال کے اس سفید اجلے بستر کی طرف گیا ہے جس پر اس کی بیمار ماں لیٹی ہے۔ وہ بیماری کی وجہ سے بہت لاغر ہو چکی ہے۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ لیکن وہ اس عظیم الشان شہر میں کیونکر آئی ہے۔ وہ اپنے اس بیٹے کے ساتھ کسی ناگزیر کام کے لئے آئی ہوگی۔ شاید ریزا کے لئے اور اچانک بیمار پڑ گئی۔

ہسپتال کا اصل مالک ایک مارواڑی سیٹھ ہے جو ہسپتال کا گوشہ گوشہ کرایہ پر دینا ہے وہ ہسپتال کے منتظم کے ساتھ کارپوریشن آفس گیا تھا ۱۲ گھنٹے سے ایک لاوارث لاش نے ہسپتال کا بستر گھیر رکھا ہے۔ اس بستر کو خالی کیا جائے تاکہ عید کے اس پُرمسرت موقع پر کسی مستحق مریض کو جگہ مل سکے۔ لیکن اس مرنے والی نے تو عید کی صبح کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ دوسرے گوشے میں ایک سیاہ موٹی سی بے ہنگم عورت لیٹی ہے۔

لڑکا صبح کے جھٹپٹے میں آگے بڑھا اس نے اپنی ماں کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اسے حیرت ہوئی کہ اس کی ماں نے حرکت تک نہیں کی۔ وہ اس قدر ٹھنڈی تھی جیسے دیوار!

"یہاں تو بے حد سردی ہے"! لڑکے نے سوچا چند ثانیے وہ اپنی ماں کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا رہا۔ موٹی سیاہ عورت نے اسے ہمدردی سے دیکھا اور اسے پچکار کر اپنی سمت بلایا۔ معصوم لڑکا خوفزدہ ہو کر باہر آ جاتا ہے۔ یہ تو بالکل سڑک کوٹنے والے اس انجن کی مانند ہے جو سامنے سڑک پر کھڑا ہے۔

وہ مین گیٹ سے باہر آ جاتا ہے ——

واہ! واہ!! یہ تو عجیب شہر ہے! اس نے اس سے قبل اس شہر جیسی چیزیں نہیں دیکھی تھیں۔ جس گاؤں سے وہ آیا تھا۔ وہاں تو رات ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ گاؤں میں پوری گلی کے لئے ایک بلب جلتا ہے۔ مغرب کے بعد گاؤں کے، کچے مکانات کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، اور پھر کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آتا۔ ہاں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں وہ مزید سنتا تھا۔ درجنوں نہیں سینکڑوں کتے رات بھر بھونکتے اور روتے رہتے ہیں۔ لیکن وہاں کے لوگ کتنے خوش اخلاق ہیں کہ وہ کبھی بھوکا نہیں

سویا اور یہاں [illegible]
کاش اس وقت مجھے کہیں سے تھوڑی سی روٹی میسر آجائے۔ کس قدر شور و غل ہے۔ یہاں کس قدر گہما گہمی ہے۔ دن کی روشنی پھیل رہی ہے لیکن فلیٹوں میں اب تک بتیاں جل رہی ہیں۔ کیسی رنگ برنگی گاڑیاں اور کیسے صاف ستھرے لوگ ہیں۔ لیکن ہر شخص جیسے دوڑ رہا ہے۔ ایک دوسرے کو دھکے دے رہے ہیں خدا کرے مجھے کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا مل جائے۔ وہ سہم سا گیا۔ موڑ پر ایک پولیس کانسٹیبل۔ اسے نظرانداز کر کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ لڑکے کے سامنے ایک اور سڑک دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ کس قدر چوڑی اور لمبی سڑک ہے۔ وہ اس پر اچھی خاصی دوڑ لگا سکتا ہے۔ واہ! کتنی بڑی مسجد ہے۔ لوگ مسجد کے باہر قطار در قطار کھڑے ہیں۔

سورج کی روشنی پوری طرح پھیل چکی ہے۔ بلند و بالا عمارات کے تنگ و تاریک فلیٹس میں میں روشنی ابھی تک جل رہی ہے۔ اور یہ کیا ہے؟ کھڑکی کے بہت بڑے شیشے کے اس پار لڑکے لڑکیاں خوبصورت اور بہترین لباس پہنے ادھر اُدھر کھیل کود رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ وہ لڑکی سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ لڑکا پنجوں کے بل کھڑا شیشے کے اس طرف اس لڑکی کو دیکھتا رہا ہنستا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے پنجے درد کرنے لگے۔ اور پیروں کی انگلیاں دکھنے لگیں۔ تب اسے یاد آیا کہ سردی کی وجہ سے اس کے پنجے کئی جگہ سے پھٹ گئے ہیں۔ معاً اس نے دیکھا کہ شیشے کے اس پار کمرے میں میز کے گرد کچھ مرد اور عورتیں بیٹھی ہیں۔ ان کے سامنے چمکدار برتنوں میں سویاں تھیں، چاول تھے بھنا ہوا گوشت تھا اور گول گول لذیذ روٹیاں تھیں۔ اسی لمحہ مکان کا دروازہ کھلا کچھ مرد اور عورتیں گھر میں داخل ہوئے۔ لڑکا بھی آہستہ سے ان کے پیچھے مکان میں گھس گیا۔ وہ سب اسے دیکھ کر کس قدر حقارت سے چلائے تھے۔ ایک عورت نے جلدی سے اٹھ کر ایک ٹکا اس کے ہاتھ میں تھمایا اور دروازہ کھول کر اسے باہر نکال دیا وہ خوفزدہ ہو کر آگے بڑھتا گیا ___ بڑھتا گیا۔ شاید وہ اپنی ماں کو تلاش کرلے۔

اس کی حالت قابلِ رحم تھی وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا اور خود کو تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے دیکھا ایک اور کھڑکی کے اس طرف دو بڑی خوبصورت گڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک عورت کرسی پر بیٹھی کچھ بُن رہی تھی اور کبھی ان گڑیوں کی طرف مسکرا کر دیکھ لیتی تھی۔ ارے ان کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ یہ تو زندہ ہیں بالکل میری مانند! وہ اپنے گڑیوں والے خیال پر ہنسنے لگا۔ معاً اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کی گردن پیچھے سے پکڑ لی ہے۔ ایک بڑا سا لوفر لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا اچانک اس لوفر نے اس کے سر پر ایک بھرپور گھونسا مارا اور اس کے ہاتھ سے ٹکا چھین کر بھاگ گیا۔ لڑکا چکرا کر زمین پر گرا۔ اسی ثانیہ اس نے کسی کے ڈانٹنے کی آواز سنی۔ وہ بے حد خوفزدہ ہو کر اٹھا اور ایک طرف بھاگ نکلا۔ وہ بھاگتا رہا بھاگتا رہا۔ سڑک سے دور جہاں جھاڑیاں تھیں اور جہاں سڑک تعمیر کرنے کے لئے پتھروں کا ڈھیر تھا وہ ان جھاڑیوں میں جا چھپا۔

اب وہ مجھے تلاش نہیں کر سکیں گے یہاں روشنی بھی کم ہے۔ وہ سہما ہوا دم سادھے چھپا رہا اسے محسوس ہوا جیسے اس کا بدن گرم ہونے لگا ہے وہ اتنا گرم ہوتا گیا۔ اتنا گرم جیسے اس کے جسم میں بھٹی جلنے لگی ہے۔ مجھے یہاں سو جانا چاہیئے یہاں مجھے بڑی میٹھی نیند آئے گی کچھ دیر سونے کے بعد میں ان کو تلاش کروں گا۔

ماں! وہ مسکرانے لگا۔ اچانک اس نے ماں کی آواز سنی۔

"یہاں آؤ بیٹے۔ آج تو عید ہے نا"

ایک ملائم سا شفیق آواز اس کے قریب سے ابھری وہ سمجھا یہ اس کی ماں کی آواز ہے لیکن یہ اس کی ماں کی آواز نہیں تھی، پھر کون ہے یہ ۔ ا جو اسے آواز دے رہی ہے۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تاریکی میں کوئی اس پر جھکا اور اسے سینہ سے لگا لیا۔ اس نے بھی اپنے ننھے ننھے بازو اس کے گرد پھیلا دیئے۔ اور پھر اچانک چاروں طرف روشنی ہو گئی۔ اب وہ کہاں آگیا ہے؟ یہاں پر ہر چیز روشن تھی۔ اس کے گرد گڑیاں جمع ہو گئی تھیں۔ لیکن یہ گڑیاں نہیں تھیں معصوم معصوم بچے تھے وہ سب اسکے اطراف پرواز کر رہے تھے اسے پیار کر رہے تھے اُسے لئے جا رہے تھے۔ اوپر اور اوپر۔ بلندی پر ۔ ! پھر اس نے دیکھا کہ اس کی

ماں اسے دیکھ کر قہقہے لگا رہی ہے۔ وہ بھی ہنسنے لگا قہقہے لگانے لگا اس نے پوچھا اے لڑکو! تم کون ہو۔ اے لڑکیو! تم کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا جو بچے عید نہیں منا سکے۔ ہم ان کو اپنے ساتھ یہاں لے گئے ہیں۔ لڑکے نے محسوس کیا کہ یہ سب اس کی طرح انسان ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے۔ جن کے والدین جنگ میں کام آ گئے تھے۔ کچھ ایسے تھے جن کی مائیں بیماری کا شکار ہو گئی تھیں اور کچھ ایسے تھے جن کی ماؤں کے سینے کا دودھ خشک ہو گیا تھا اور وہ چل بسی تھیں اور یہ سب فرشتوں کی مانند یہاں جمع ہو گئے۔ وہ ان سب میں خوش دکھائی دیتا تھا۔ اور وہ سب اپنے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اپنی ماؤں کو عید کی مبارک باد دے رہے تھے، جو ایک طرف کھڑی رو رہی تھیں۔ بچے اپنی ماؤں کے آنسو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ وہ روئیں نہیں وہ آج بے حد خوش ہیں۔

دوسری صبح جب سڑک بنانے والے مزدور پتھر اٹھانے وہاں پہنچے تو انہوں نے جھاڑیوں میں ایک لڑکے کی لاش دیکھی۔ ٹھیکیدار نے اس لڑکے کی ماں کا بھی پتہ چلایا جو لڑکے سے پہلے ہی چل بسی تھی۔

لیکن میں نے ایک خیالی کہانی کیوں تحریر کی ہے اور اس میں سڑک کے پتھروں کا کیوں ذکر کیا ہے مجھے آئندہ ایک حقیقت پسندانہ کہانی لکھنا چاہیئے ایسی ٹھوس حقیقت جیسے پتھر کوٹنے والا آہنی بے ڈھول انجن!

مرزا حامد بیگ

اصغر ندیم سید

نجم اکبر

باقی لوگوں کے نام

مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ ہم میں سے کوئی باقی بچے گا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں ہے کہ میں اُن لوگوں میں شامل ہوں گا بھی یا نہیں۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ میرے بغیر جینے والے لوگ میری زبان سمجھ سکیں گے یا نہیں مجھے اس بات کی بھی خبر ہے کہ جب انسانوں کو تفریق کر دیا جائے تو باقی کچھ بچتا بھی ہے یا نہیں۔

میں ہمیشہ اپنی ذات کے پنجروں میں بند رہا ہوں میں نے کبھی ان مسئلوں پر سوچنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اور آج اگر میں اپنی چونچ باہر نکال کر کائنات کی طرف دیکھ رہا ہوں تو دوسروں کے لئے نہیں صرف اپنے لئے۔ اس لئے کہ یہ واضح نہیں ہے کہ کل تک میرا وجود اثبات قائم رکھ سکے گا یا نہیں۔ ہر طرف ایک بے یقینی کا عالم ہے ایک بدحواسی ہے۔ ہم جو چاہتے ہیں، کبھی نہیں ملتا۔ ہمارے راستے دھندلا چکے ہیں۔ نصب العین معدوم ہو چکا ہے۔ منزل اندھیروں میں کھو گئی ہے وہ کہتے ہیں فکر کی کوئی بات نہیں اربوں میں سے ایک آدمی مرے گا......! لیکن میرے لئے فکر کی بات یہ ہے کہ وہ آدمی میں بھی تو ہو سکتا ہوں۔ میں اپنی ذات کا اثبات چاہتا ہوں۔

مجھے اپنی فکر ہے....

اور میں اکیلا بھی تو نہیں ہوں۔ وہ کتنے لوگ ہیں جو میری طرح اپنی اپنی فکر میں اپنے دفاع مضبوط بنا رہے ہیں۔ ٹوٹے بیز سے مرمت کر دیئے گئے ہیں۔ دماغ سے خالی سروں کی حفاظت کے لئے خود[1] خریدے گئے ہیں.... دوربینیں نصب کی گئی ہیں..... خیرات کی گئی ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ آج بڑی شدت سے یاد آ رہا ہے۔ وہ جسے میں کبھی کبھی یاد کرتا ہوں۔ وہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہمارا خالق ہے آج تخلیق بکھرنے والی ہے۔ تو خالق کے سامنے۔ بھگوان کے سامنے گاڈ (GOD) کے سامنے سر جھکانے والوں میں مَیں بھی شامل ہوں۔ آج تقدیر بننے کی رات ہے۔ کل اُجڑنے کا دن طلوع ہوگا ہم آج کی رات اپنے خالق سے اُس کی تخلیق کا اثبات مانگیں گے.... ہم ابھی اُس کے پاس جانا نہیں چاہتے کارِ جہاں[2] دراز ہے۔

ابھی اُسے انتظار کرنا ہوگا — ہم باقی رہنا چاہتے ہیں.... لیکن کسے خبر ہے کہ کون کون باقی بچے گا مجھے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ ہم میں سے کون کون باقی بچے گا میں اُن لوگوں میں شامل ہونگا بھی یا نہیں۔ میرے بغیر جینے والے لوگ میری زبان سمجھ سکیں گے یا نہیں! جب انسانوں کو انسانوں سے تفریق کر دیا جائے تو کچھ باقی بھی بچتا ہے کہ نہیں —!

لیکن شاید بچتا ہے! کچھ نہ کچھ بچتا ہے —!

جب فضاؤں سے آگ برستی ہے جب پہلوؤں سے تیر چلائے جاتے ہیں — جب ہیروشیما ناگاساکی جل اٹھتے ہیں۔ جب گھن گرج سے کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ بھائی مر جاتے ہیں۔ بچے یتیم ہو جاتے ہیں۔ مائیں بے اولاد ہو جاتی ہیں۔ سہاگنیں بیوہ ہو جاتی ہیں بہنوں کے ہاتھ حنا کے لئے ترس جاتے ہیں مکان مکینوں کی راہ تکتے ہیں اُس وقت بھی تو کچھ نہ کچھ بچ جاتا ہے۔

جب دھماکوں سے بازار لرز جاتے ہیں۔ بے مزہ سامانِ فروخت دن دھاڑے سیکڑوں لوگوں کی جانیں ہضم کر جاتا ہے۔ ملاوٹ جسم کو چاٹ جاتی ہے۔ سیلاب بہا کر لے جاتے ہیں

---

[1] HALMET سکائی لیب کے گرنے کے خطرے کے پیش نظر امریکہ میں وسیع پیمانے پر فروخت ہوئے!

[2] باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر (اقبالؒ)

دلیا اپنا خراج وصول کرتے ہیں۔ پازیب کی جھنکار۔ نفس کی پکار پر عزت۔ دولت شہرت قربان کر دی جاتی ہے غریبوں کے بچے جھگیوں میں بھوک سے سوتے ہیں روتے روتے اُٹھ بیٹھتے ہیں ماؤں کے تھپڑ کھا کھا کر گھروں سے بھاگ جاتے ہیں تو اُس وقت ہاں ہاں اُس وقت بھی تو کچھ نہ کچھ بچ جاتا ہے۔ اور میں بھی تو اُن باقی لوگوں میں سے ہوں۔

میں تو اُس وقت بھی باقی بچ گیا تھا جب انسانیت ایشر سنگھ کے کندھوں پر دم توڑ گئی تھی۔ جب نیزوں کی نوکیں معصومیت کے خون کی غذا کھا کر جوان ہو رہی تھیں۔ جب شاہراہوں پُلوں، راستوں، گلیوں میں تعصب اپنا سر بکھیر چکا تھا۔ اور جب باقی بچا اپنے حواس کے ساتھ ستم کرتا تھا۔ میں تو اُس وقت بھی باقی بچ گیا تھا۔

ہم سب تفریق شدہ لوگ ہیں ہم باقی بچے ہوئے لوگ ہیں۔ اور باقی ہیں۔ خون کی ندی کے آر پار — وہ لوگ بھی جنہوں نے خون بہایا اور وہ بھی جن کا خون بہا، وہ بھی جو خون بہانے کے ذمہ دار تھے، وہ بھی جو خون کے بہتے سیلاب کو روکنے کی کوششیں نہ کر سکے۔ ہم قسم قسم کے لوگ ہیں — ہم سب باقی ہیں۔

..... اور جب باقی باقیوں میں تفریق ہوئی تھی — میں اُس وقت بھی باقی رہا جب سنہرے ریشے کی سرزمین میرے اپنے خون میں رنگی گئی۔ جب میں اپنا دشمن آپ بنا۔ جب میرے بوئے ہوئے نفرت کے بیج برسوں بعد جوان ہوئے جب میں نے دوسروں کو ان پودوں کی پرورش کا ذمہ دار ٹھہرا کر اپنا دامن بچانا چاہا جب میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹا..... جب میں اپنی ماں سے جانتے بوجھتے اَنڈی پس کا کھیل کھیلتا رہا — میں اُس وقت بھی باقی رہا — جب میری ماں زمانے کے جبر و تشدد کے بوٹ کے نیچے اپنی دودھ بھری چھاتیوں کے کچلے جانے کا ماتم کرتی رہی جب اس کا سہاگ چھین کر اُس کے داغ داغ سینے میں اُتار دیا گیا۔ میں باقی رہا — میں اُس وقت بھی باقی رہا...

.... میں باقی رہنے والوں میں شامل رہا — میں تفریق شدہ لوگوں میں باقی رہا۔

.... طوفان اُمڈ آیا تھا — سب ڈوب رہے تھے، ہم ایک ایک جوڑا لے کر ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ وہ پہاڑ پر جا پڑھا۔ اور طوفان اُس کا تعاقب کرتا رہا پھیلتا رہا بڑھتا رہا کشتی اوپر اُٹھتی رہی — میں باقی رہا۔ لوگ تفریق ہو گئے — میں باقی رہا — میں باقیوں میں شامل رہا — لیکن آج۔ کشتی ڈول رہی ہے — اب طوفان نیچے سے نہیں اُوپر سے اُٹھے گا — باہر سے نہیں اندر سے اُٹھے گا — غیروں کے نہیں اپنوں کے ہاتھوں سے اُٹھے گا — پرائے نہیں بلکہ اپنے ذہن کے تنور سے نکلے گا — وہ اس کا رُخ اِدھر — ہماری طرف کچلے کچلے لوگوں کی طرف — رِندے ہوئے لوگوں طرف ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی طرف سے ..... انسانوں کی طرف — تعمیر ہوتی ہوئی بستیوں کی طرف موڑ رہے ہیں — صرف ایک آدمی مرے گا — فکر کی کوئی ضرورت نہیں اربوں میں ایک انسان — دُنیا کی آبادی ابھی اُس حد تک پہنچی ہی کہاں ہے جہاں پہنچ کر تناسب کے اعتبار سے ایک آدمی کی موت کا خدشہ ہے — لیکن خدشہ ہے تو سہی — ایک آدمی مرے گا — اور وہ آدمی میں ہوں گا۔ اور وہ آدمی ہم سب ہوں گے — دماغ سے خالی سروں پر خود پہنے — مرمت شدہ بنیروں کی اوٹ میں بیٹھے — دوربین لگا کر خیرات کرنے والے — مسجد، مندر، مصلے پر کھڑے لوگ — ہم سب وہ آدمی ہیں — جسے اربوں میں ایک کے تناسب کے اعتبار سے مرنا ہے۔ فوت ہو جاتا ہے — زندگی کی ہنستی کھیلتی — قلانچ کرتی لہر سے کٹ کر بھنور کی نہر میں غرق ہو جاتا ہے — اور پھر بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ وہ باقی لوگ کون ہوں گے — میں نے کہا نا مجھے اس کا علم نہیں — ممکن ہے میں بھی اُن میں شامل ہوں گا — لیکن مرنے سے پہلے — یا جینے سے پہلے تفریق ہونے سے — یا باقی بچنے سے پہلے — میں اُن باقی لوگوں سے جو کل اک نئے جنم کے سے احساس کے ساتھ شاہراہوں پر نکلیں گے — کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں — وہ احساس جو ہمیں اپنی ذات کے بند پنجرے سے نکال کر کائنات تک لے آیا ہے۔ رنگ رنگ کے نسل نسل کے باقی لوگو — اس احساس سے پوچھو — ہم مسلسل تفریق کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟

اس احساس کو زندہ رکھ کر پوچھو کہ ہم کون ہیں — ؟ ہم ایک دوسرے کی زبان سمجھ سکتے

ہیں یا نہیں — ؟ ہم ایک دوسرے میں شامل
ہیں یا نہیں — ؟
باقی لوگو — اپنے آپ سے پوچھنا جب
انسان انسانوں سے تفریق کر دیا جائے تو کچھ
باقی بچتا بھی ہے یا نہیں ۔
باقی لوگو — اپنے احساس سے سوال کرنا کہ
انسانوں سے تفریق ہو کر جو کچھ بچتا ہے وہ انسان
ہوتا ہے نہیں یا نہیں ۔
اور وہ انسان تفریق ہونے — تفریق کرنے
اور تفریق کرانے والے ہاتھوں کو روک سکتا ہے
یا نہیں ۔
یہ پوچھنا — ضرور پوچھنا

"بہت دنوں کے بعد حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں ۔ اس خط میں ہائنریش بیل کا ایک افسانہ "فوجی راشن کے تھیلے کی داستان" انیسنز برگر کی ایک طویل نظم "ٹائی ٹینک کی تباہی" (۱۱۵ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے) میں سے کڑی بعنوان "مزید اسباب ۔ اس امریکہ کے شاعر جھوٹ بولنے پر مجبور ہیں" اور داریو فو کی ایک نظم "کون مجبور کرتا ہے ۔ ہمیں چپو چلانے پر" بھیج رہا ہوں ۔

داریو فو اس وقت یورپ کا اہم ترین ڈرامہ نگار ہے اس کا عوامی تھیٹر اٹلی میں ایک ادارے کی حیثیت حاصل کر چکا ہے ۔ تھیٹر سے لوگوں کو بیزاری پیدا ہوتی جا رہی تھی اور میری طرح بہت سے دوسرے لوگوں نے اُسے تقریباً خیرباد کہہ دیا تھا ۔ مئی کے مہینے میں ہمبرگ میں بین الاقوامی تھیٹر کا میلہ تھا جس میں داریو فو بھی آیا ۔ لوگوں نے اطالوی زبان نہ جاننے کے باوجود اس کا کھیل بے حد شوق سے دیکھا ۔ سارے ڈرامے میں وہ اکیلا ایکٹر تھا ۔ ٹیلی ویژن نے اب تک اس گروپ کے دو طویل ڈرامے نشر کئے ہیں ۔ چند ماہ کے اس کی آٹھ کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں اور آج کل اس کے گیتوں کے ریکارڈ ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں ۔

میری خوش قسمتی ہے کہ میری بیوی نے اپنا بچپن اٹلی میں گزارا ہے اور اطالوی زبان ان کی مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے ۔ ان کی مدد سے مجھے داریو فو کو سمجھنے میں بہت مدد ملی ہے ۔

سفارت خانے والے ہم سے ان دنوں ناراض ہیں اس وجہ سے ماوِنو کی ترسیل رکی ہوئی ہے

منیر احمد شیخ —— مغربی جرمنی

محمد علی خاں اثر

تبدیلی

اترتی شام کے زینے پہ
رُک کر
نئے دن کا کوئی منظر تو دیکھیں
ذرا یکساں فضا کا کرب ٹوٹے

زوال

مشینی زندگی جینا
بٹن کے ساتھ حرکت اور حرارت
لمس کا احساس کر جانا
تقاضہ تو نہیں لیکن
ہنر ٹھہرے تو کیا کیجئے

فاصلہ

نئی تاریخ کے صفحات کیا لکھیں
کیسے سوچیں؟
سبھی کچھ یوں ہے
جیسے زندگی مقتل میں لرزاں ہو
حکایت سے شکایت تک
وہی اک فاصلہ قائم

سید ضمیر جعفری

ولنگٹن نپولین کی لاش پر

(لندن میں مادام تساؤ کے مومی مجسموں
کے عجائب گھر میں ایک تصویر دیکھ کر)

عبرت اور پندار کا سنگم یہ بوجھل تصویر
خونی کاجل ڈال کے نکلی ہر خوناب لکیر
چپ راہوں کی چاپ
لمحوں کی زنجیر
یہ بوجھل تصویر

لوبھی آشاؤں کے اندھے گدلے مرکز، سونے مرگھٹ میں
جلتے بجھتے رنگ
ڈوبتے سورج کے پیلے، پھکی ییلتے ارمان
آنے والی صبح کے رقص میں خوابوں کا اڑنگ
ایک نیا منصوبۂ غارت
ایک نیا ہنگامۂ قتال و جدال و دار و گیر
موت کی تیز کٹار پہ جینے مرنے کی تدبیر
آدم کی تذلیل
آدم کی توقیر
ہر فاتح مغلوب، ہر قاتل مصلوب
چمک چمک کر آخر ٹوٹی ہر قاہر شمشیر
قوموں کی تقدیر
یہ بوجھل تصویر

ادیب سہیل

لفظوں کا سفر

اِک ہم ہیں کہ لفظوں کے انبار پہ بیٹھ گئے
اور سمجھا ہمالہ کی چوٹی سر ہو بھی گئی
جب چاہا بیاں کی شاخ جھکا کر
کچّے پکّے پھل سے اپنی جھولی بھری
سرشار ہوئے،
کچھ ایسے کہ پھر جامے کے اندر جا نہ سکے
اِک وہ کہ جسے اس عصر نے صاحبِ عصر کہا
جب عمر کے آخری لمحوں میں
کسی دوست نے اس سے یہ پوچھا
"اک عمر تو اتنا کچھ لکھا
لفظوں کے سفر میں
رختِ سفر کیا ہاتھ لگا؟
تو اُس نے کہا
یہ میرے لئے کچھ کم تو نہیں۔ مجھے بڑھ چڑھ کر
مری تحریروں نے شہرت دی
مرے لوگوں میں مرے فکر و نظر
مرے طرزِ ہنر کو چاہا گیا
اس کے باوصف اِک غم بھی ملا
جو میرے ابد کے سرمائے میں رکھا گیا
غم یہ ہے کہ لفظوں کو میں نے اک عمر بہر صورت برتا
پر لفظوں کی پہچان پہ کیوں قدرت نہ ہوئی

اکتوبر ۱۹۷۹ء

منیر نیازی

موسمِ سرما کی بارش کا یہ پہلا روز ہے

موسمِ سرما کی بارش کا یہ پہلا روز ہے
دھند ہے اطراف میں سوچ کے خوابِ گرم پر

میں کہ جو محصور ہوں آرامِ حسنِ یار میں
اک حفاظت سی ہے مجھ کو جسم کی مہکار میں

یاد اور موجود دونوں کی حقیقت اس میں ہے
غم کی طاقت کو غلط کرنے کی ہمت اس میں ہے

سحر اتنے ہیں جمالِ مہربانِ یار میں
جتنے اس سرما کی بارش کے حسیں اسرار میں

طلسماتِ صبحِ کاذب

کچھ اندھیرے کی خبر تھی کچھ اُجالے کی خبر
صبحِ صادق سے سوا تھا صبحِ کاذب کا اثر
اک سیہ دیوار پر آثارِ روشن کی رمق
ظاہرِ باطل کے آگے نور کا چہرہ تھا فق

صبحِ صادق کا پھیلاؤ

اذاں مسجدوں سے اُٹھی جس گھڑی
ہواؤں کے دل اور گہرے ہوئے
کنارے فلک کے گلابی ہوئے
گلابی سے پھر وہ سنہرے ہوئے

جبرائیلہ مسترال
ترجمہ: صلاح الدین محمود

بدلیس

ایک انجان تلفظ کے ساتھ وہ
اپنے وحشیانہ سمندروں کی بات کرتی ہے،
کہ جن کا نہ جانے کیسا ریتا
اور جن میں نہ جانے کیسے نرسل ہیں
وہ سِن رسیدہ لگتی، خدا کے نام، بن پیکر اور بن جسم کی
ایک دعا بلند کرتی ہے
(تو) یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ مقام پا جائے ـــــ
وہ ہمارا باغ کہ جس کو اس نے اجنبی بنایا تھا
ناگ پھن اور زخمی کرنے والی جھاڑیوں کو جنم دیتا ہے
وہ ریگ زار کے دم سے پنپ پاتی ہے
اور اس انہماک سے محبت کر چکی ہے کہ اب سنسان ہے
اس ضمن میں وہ کبھی بھی گویا نہ ہوئی،
پر اگر کبھی وہ گویائی پائے تو پھر
(اس کی گفتگو) کسی غیر سیارے کے نقوش کی طرح ہوگی
وہ ہمارے درمیان اسّی برس زندہ رہے گی
ہمیشہ یوں لگے گا کہ جیسے ابھی پہنچی ہو
ایک ایسی زبان بولتی کہ جو ہانپتی اور آہیں بھرتی ہے
کہ جس کو صرف ننھے جانور ہی سمجھ پاتے ہیں ـــــ
اور وہ ہمارے درمیان ہی مر جائے گی
ایسی رات میں کہ جس کے دوران اس کو مزید اذیت ہوگی
بس اس کا مقدر اس کا تکیہ ہوگا
اور ایک خاموش و بدیسی موت اس کو آن لے گی۔

نظمانے
محسن بھوپالی

مکالمہ

مصلحتوں کے شاپنگ سنٹر
جگہ جگہ جب کھلے ہوئے ہوں
بیچ کے چھوٹے چھوٹے "کیبن"
کیسے زندہ بچ جاتے!
ـــــ اسمگلنگ اور کالے دھن سے
حاصل ہونے والے ٹرکوں اور کاروں کی خاطر،
سڑکوں کو چوڑا کرنا تھا
اسی بہانے سارے "کیبن" اٹھا دیئے ہیں

ـــــ افسردہ کیوں ہو؟
تم نے خود ہی سبب جاننا چاہا تھا،
ـــــ میں نادم ہوں
آؤ عصری سچائی کی بات کریں!

قطعہ

تصنّع کی ملمع کاریوں سے
کہاں تک زخمِ پنہاں کو بھروگے
انا سازی بہت مہلک عمل ہے
کوئی دن آئے گا خود سے ڈروگے

جنریشن گیپ

زرین بیٹی
چلو بھی ـــــ شاپنگ کرتے کرتے
چراغ بتی کا وقت آیا!

یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟
عجیب باتیں ہیں آپ کی بھی
ابھی تو بازار جگمگائے گا
اور سڑکوں پہ نور و نکہت کا سیل ہوگا
"نیون سائن" کی روشنیاں دھنک بکھریں گی
اب تو اصلی صحیح معنوں میں دن چڑھا ہے

ارتقائے زوال

برائی سے نفرت ہی کرتا تھا پہلے
کہ اپنے بزرگوں سے میں نے یہی کچھ سنا تھا
پھر اک وقت آیا ـــــ کہ اوروں کی خاطر
بُری چیز کو بھی بُری چیز کہتے ہوئے
میں جھجکنے لگا!

اب بُرائی کو اچھا سمجھنے لگا ہوں
یہی "ارتقا" کی وہ دلدل ہے جس سے بچانا
کسی اور کے کیا،
یہ میرے خدا کے بھی بس میں نہیں ہے
ـــــ اگر میں نہ چاہوں

کارل وینڈل ہانز

ترجمہ:۔ اصغر ندیم سید

مرے ہوئے کا خواب

اب جبکہ وہ آرام سے مر چکا ہے
آؤ اس کی شان بیان کریں
اس کے نام کی یادگاریں تعمیر کریں
اس کا مرثیہ پڑھیں
مرنے والوں نے ہمارے لئے سہولت پیدا کر دی ہے
کہ ہم انہیں اپنا ہیرو بنا لیں
وہ واپس آ کر اس کی تردید نہیں کر سکتے
اس کے علاوہ
یادگاریں تعمیر کرنا بہتر دنیا تعمیر کرنے سے آسان ہے
پس اب جبکہ وہ آرام سے مر چکا ہے
ہم بڑی آسانی سے بچوں کو بتا سکتے ہیں
کہ وہ بہت عظیم قومی سپوت تھا
یہ جانتے ہوئے کہ
جس مقصد کے لئے وہ جیا
وہ اب بھی مقصد ہی ہے
اور جس خواب کے لئے اس نے جان دی
ابھی تک خواب ہی ہے
ایک مردہ آدمی کا خواب

گلیون رینیوڈ

ترجمہ:۔ اصغر ندیم سید

عام سے عاشق کا گیت

میرے میٹھے گلاب
مجھ سے ایسی محبت نہ کرو
جیسی اپنے ساغر سے کرتی ہو
کہ ساغر شام کو فنا ہو جاتے ہیں
اور میں تمہیں صبحِ صادق تک لے جانا چاہتا ہوں
اور نہ ہی کالی مرچوں جیسی محبت کرو
جو پیٹ میں آگ لگا دیتی ہیں
اس طرح میں بھوکا رہا
تو تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکوں گا
تکیے جیسی محبت بھی نہیں
جس میں ہم گھنٹوں ایک ساتھ رات کو سو تو سکتے ہیں
لیکن صبح کو ایک دوسرے سے ملنے کی حاجت کم ہو جاتی ہے
چاول کی طرح بھی نہیں
جنہیں ایک دفعہ کھانے سے جی اوب جاتا ہے
طلائم تقریروں کی طرح بھی نہ چاہو
کہ وہ جلدی ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں
شہد کی طرح بھی نہیں
کہ میٹھا ضروری تو ہے لیکن بہت عام سا ہے
مجھے خوبصورت خواب کی طرح چاہو
تمہاری زندگی رات میں
میری امید دن میں
ہمیشہ میرے ساتھ زمین پر رہے
جیسے غریب کے پاس تھوڑے سے روپے
اور عظیم سفر کے لئے
ایک وفادار کامریڈ
کالا باش دریا کی طرح
جو پانی گراتے وقت گھٹا ہوا ہوتا ہے
میرے کنارے کے لئے مہمیز بن جاتا ہے

فرانز کافکا
ترجمہ: انور سن رائے

پُل

میں، سردی اکڑا، درّے پر پڑا ہوا ایک پُل تھا۔ میرے پیر درّے کے اس طرف اور ہاتھوں کی انگلیاں دوسری طرف جمی ہوئی تھیں۔ بُھر بُھری مٹی کے درمیان میں نے خود کو مضبوطی سے بھینچ رکھا تھا، دونوں پہلوؤں پر میرے کوٹ کے دامن پھڑپھڑا رہے تھے اور بہت نیچے مچھلیوں سے بھرا ہوا برفیلا چشمہ غرّا رہا تھا۔

کوئی مسافر اس ناقابلِ گذر بلندی تک بھٹک کر بھی نہیں آتا تھا، اسی لئے میں کسی نقشے پر بھی نہیں تھا۔ میں پڑا تھا اور انتظار کر رہا تھا، میں انتظار ہی کر سکتا تھا۔ ایک بار بن جانے کے بعد کسی پُل کے پاس بنے رہنے کے سوا گر جانے تک کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

یہ ایک شام کا ذکر ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ پہلی شام تھی یا ہزارویں، میرے خیالات ہمیشہ پراگندہ اور ایک دائرے میں گھومتے رہتے تھے۔ گرمیاں تھیں اور شام ہی سے چشمے کی گونج بڑھ گئی تھی کہ میں نے اپنی سمت آتی ہوئی انسانی قدموں کی آہٹ سُنی: پُل! اس مسافر کو سنبھالنے کے لئے جو تمہارے حوالے کیا جا رہا ہے، مضبوط ہو جاؤ، بے جنگلہ منڈیر پر تیار رہو، اگر اس کے قدم لڑکھڑائیں تو خاموشی سے انہیں ہموار کر دینا، اگر وہ گرنے لگے تو دکھا دینا کہ تم کیا ہو اور کسی کوہستانی دیوتا کی طرح اُسے زمین پر اُچھال دینا۔

وہ آیا، عصا کی آہنی نوک سے اُس نے مجھے کھٹکھٹایا اور اُسی عصا سے میرے کوٹ کے دامن اُٹھا کر درست کر دیئے، اس نے اپنے عصا کی نوک میرے گھنیرے بالوں میں ڈال دی اور دیر تک اُسے وہیں چھوڑ دیا۔ وحشت زدہ ہو کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے یقیناً وہ مجھے فراموش کر چکا تھا۔ لیکن جب میں اس کے پہاڑ اور وادی میں بھٹکتے ہوئے خیال کا پیچھا کر رہا تھا تو اچانک وہ دونوں پیروں کے بل کودا میرے جسم پر بیچوں بیچ آن پڑا، درد کی ٹیس اتنی شدید تھی کہ میں تھرا گیا، وہ کون ہے؟ کوئی بچہ، کوئی خواب، کوئی راہ رو، کوئی خودکشی کرنے والا، کوئی فریبی یا کوئی تخریب کار؟ میں اسے دیکھنے کے لئے پلٹا، پُل کا پلٹنا! ابھی میں پوری طرح پلٹ بھی نہ پایا تھا کہ گرنے لگا۔ میں گر گیا، اور صرف ایک لمحے میں یا شاید اس سے بھی کم وقفے میں، اُن نکیلی چٹانوں نے میرے چیتھڑے اُڑا دیئے، جو غراتے ہوئے پانی سے منہ نکالے، ہر وقت چُپ چاپ، مجھے دیکھتی رہتی تھیں۔

ولیس ر[illegible]یکیس

ترجمہ :- احمد سلیم

نظم

ایک جھیل کی گہرائی سے
میں نے ایک تارا ڈھونڈا
اور اُسے آسمان کی طرف اچھالا
کہ رات کا جادو پھیلے
تو اکیلا وہ چمک اُٹھے
اور اس کا نام ہے ــــ تم!

میں نے نئے سمندر کو عبور کیا
جہاں کہ لہریں، محبت کی کپکپی
اور ترسے ہوئے ہونٹ ــــ جڑتی کشتیاں
ایک دوسری کو تلاش کرتی
حقیقت کے کناروں سے بہت پرے
اور اس کا نام ہے ــــ تم!

صحراؤں کی ریت میں ــــ
میں نے پھولوں کا جنگل لیا
اور رنگ، جو کسی نے نہ دیکھے کبھی
کسی ست رنگی پینگھ سے لئے
اور پتیاں کچھ ایسی ملائم
جیسے کسی دیوتا کے پر ہوتے ہیں
اور مہک ــــ بہت بھینی
جیسے پت جھڑ کی پہلی بارش میں
دھرتی کی سانس.....
اور اس کا نام ہے ــــ تم!

میں ایک لہر پہ سوار ہوا
اور چاند کی طرف چلا
میں ایک بادل پہ سوار ہوا
چاند ــــ بہت اُونچا تھا
اور سورج بہت تپتا تھا
لیکن میں نے ایک کرن کو تھام لیا
اور اس کا نام ہے ــــ تم!

ماہِ نو

کوستس کوکوعودتس

ترجمہ :- احمد سلیم

گھوڑے

گھوڑے کچھ یوں آتے ہیں
بادلوں کو چھوتے
پربتوں سے اُترتے
شاہ کالے
دودھ چٹے
اور بھورے
آہستہ سے چلتے ہیں
نہ دُلکی چال
نہ ہنہناتے ہیں
ماپ ماپ کر پاؤں دھرتے
سورج میں ڈوبے
گہری گمبھیر چال
اور سوگواری
جیسے شاہی جنازے کے ساتھ چل رہے ہوں

جیسے جنگ میں ہارے
اب واپس جا رہے ہوں
نہ دکھائی دینے والے سورماؤں کے
بین کرتے ہوئے
وقت کے شاہ سوار ــــ
جو عشق میں مارے گئے
اور گھوڑے چرخی پر چڑھے
وقت کے ہاتھوں بھلا دیئے گئے
زمانوں سے کھوئے گئے
سُنسان اور قبرستان دھرتی پر
وہ تنہا گم ہوئے

۲

گھوڑے ــــ
بادلوں پر اُبھرتے
پربتوں میں ظاہر ہوتے
اور سواروں سے محروم
آتے اور جاتے......
لیکن رات اترتی ہے
تو سب کھو جاتے ہیں
پلٹ کر نہیں آتے
کوئی کچھ نہیں جانتا
نہ پوچھتا ہے ــــ کیوں ؟

علی میر فطروس

ترجمہ: انور ناہری

شمالی دیہات کی صبح

مرغ کی اذان کے ساتھ گاؤں جاگتا ہے
مرد، افسردہ، پژمردہ
عورتیں، تھکی، ٹوٹی
سب دھان کے کھیتوں میں بکھر جاتے ہیں
سب آنے والے کل کے لئے محنت میں جُت جاتے ہیں

گاؤں کی لڑکیاں
چائے کے باغات میں
رنگین کپڑے پہنے ہوئے
مہندی لگے بالوں کو لہراتی
بے کار بہار کے قصیدے پڑھتی ہیں
کسان کی جھونپڑی کے چاروں طرف
اسکول کے بچے
اپنا سبق یاد کرتے ہیں۔
باپ کام کرتا ہے
ماں، کام کرتی ہے
باپ کے پاس روٹی نہیں ہے
اس آدمی کے پاس محل ہے
گاؤں میں سہ پہر کو
تھکن، چائے اور سگرٹوں کے دھوؤں میں
فیصلے، مردوں کی بحث جاری ہے
بارش گیت گا رہی ہے
گاؤں کے تمام راستوں پر
بارش برس رہی ہے

جنوب کے بچے کی آواز

کل رات میری ماں کو بخار ہو گیا
اور میرے دل کے تمام پھول مرجھا گئے
میرے باپ نے آج اپنے بیلوں کو بیچ دیا
تاکہ دوائی خرید سکے
مری چھوٹی بہن گلنار نے
اپنے سبق کو یاد کرتے ہوئے لکھا
"باپ نے پانی دیا
کل رات باپ نے روٹی نہیں دی
دارا کا گھر بہت خوبصورت ہے"
میرا دل چاہتا ہے
کہ میں پرچم بنوں
پرچم بنوں اور پہاڑ کی چوٹی پر رہوں
لیکن میرے باپ کا ہاتھ چھوٹا ہے
آج دوپہر اسکول سے واپس آتے ہوئے
میرے ہم جماعت نے مجھ سے پوچھا
کیا سبق اچھی طرح یاد ہے؟
کل صبح تاریخ کا امتحان ہے
سخت امتحان
ہمیں اپنے سبق کو اچھی طرح یاد کرنا ہے

خورشید رضوی

جمعہ کے دن دفتر میں پھول

چھ دن کاغذ کا پیراہن پہنے گزرے
بہری اندھی فریادوں کی بھیڑ میں گھنے گھنے گزرے

آج تو اپنے آپ میں آئیں
پھول بنیں، مہکیں مسکائیں
ہرے بھرے پیڑوں میں سُن کر مست ہوا کی تھاپ
دُور دُور تک کہیں نہیں ہے کاغذ کے چلنے کی چاپ

سات دنوں میں ایک یہ دن ہے اپنے آپ میں آنے کا
ہنسنے کا مُسکانے کا
بھونروں سے نین ملانے کا

کل پھر کاغذ ہو جائیں گے
کاغذ کے پیراہن پہنے
بہری اور اندھی فریادوں کی اک بھیڑ میں کھو جائیں گے
آج تو اپنے آپ میں آئیں

آ[illegible] گریگولس

ترجمہ:۔ نیم محسر

جب ستارے گرتے ہیں

رات بھر ایک ایک کر کے
درجنوں ستارے گرتے رہے
ایسا لگتا تھا کہ جنت کا کوئی مکین
اپنا نقرئی کلہاڑا سان پر لگا رہا ہے
اور اس وجہ سے چنگاریاں اُڑ اُڑ کر
بارش کے قطروں کی طرح زمین پر گر رہی ہیں
بھنسے اٹی زمین پر
میں ان گرتے ہوئے ستاروں کی تلاش میں سرگرداں تھا
تاکہ انہیں ایک ٹوکری میں جمع کر دوں
جیسے کہ عورتیں لگر مٹے جمع کیا کرتی ہیں
میں چاہتا تھا کہ یہ ستارے
تحفے میں تمہیں پیش کر دوں
لیکن مجھے کہیں کوئی ستارہ نہ مل سکا
سالِ گذشتہ کی مُردہ گھاس میں سرسراتی ہوا
میری ناکامی پر
سائیں سائیں کر کے میرا مذاق اڑانے لگی
میں نے (تم سے) کہا:
"جان۔ معاف کرنا ـــــ
میں خزاں آلود تاریکی کی وجہ سے
تمہارے لئے ایک ستارہ بھی تلاش نہیں کر پایا
یا ممکن ہے مجھ میں اتنی پھرتی ہی نہ ہو!"

میری معذرت کے جواب میں
تم نے آتشدان کے پاس (بڑی بے نیازی سے)
اپنے ہاتھوں کو گرم کرتے ہوئے جواب دیا
"کسی گلہری کو تو ایک لقمۂ تر کا لالچ
دے کر پھانسا جا سکتا ہے
لیکن شادمانی کسی لالچ میں آکر
دسترس میں نہیں آیا کرتی ـــــ"
مگر میں جانتا ہوں
کہ اگر اس تیرہ و تار شب میں
میں نے ایک ستارہ بھی حاصل کر لیا ہوتا
تو پھر تم نے بالکل مختلف الفاظ استعمال کئے ہوتے
جو کہ اب تم نے کسی ایسے شخص کے لئے محفوظ کر لئے ہیں
جس کی آغوش میں ستارے بڑی خودسپردگی سے جا گرتے ہیں
اور اُسے اُن کی تلاش میں برف زدہ زمین پر مارا مارا نہیں
پھرنا پڑتا
دنیا میں ایسے خوش قسمت لوگ بھی تو ہیں
جو ستاروں کی مانند خود اپنی کھلی ہوئی ہتھیلی میں گرتے
رہتے ہیں!

ڈانتا اوونینا

ترجمہ:۔ نیم محسر

ایک لمحہ

آج کل معجزے کہاں رونما ہوتے ہیں!
دنیا ایک خشک، ناپسندیدہ جگہ ہے
جہاں یا تو بارش ہوتی ہے، یا برف گرتی ہے
بھلا خشک، بے کیف کام کے دنوں کے بارے میں
کیا شاعری ہو سکتی ہے!

صبح اپنے دامن میں بے داغ دھوپ لے کر ہم تک آتی ہے
لیکن شام گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں ہوتی ہے
دل سڑک کے کنارے قبر میں دفن ہوتا ہے
شام کو معلوم ہے اسے کس چیز سے نفرت اور کس سے محبت تھی

ماہ و سال ہمارے خوابوں کی فاختاؤں کو
پنجروں میں اسیر کر دیتے ہیں
اور پھر ایک لمحہ انہیں رہائی دے دیتا ہے!
زندگی کی چمک
ہمارے لئے روزانہ مُٹھی بھر آتی ہے

کہتے ہیں کہ آج کل معجزے رونما نہیں ہوتے!
لیکن ـــ جان ـــ تمہارے بارے میں یہ معجزہ نہیں تو کیا ہے؟
کہ میں نے (تمہیں دیکھ کر) انگلی کا اشارہ تک نہیں کیا تھا
کہ تم سیدھے میرے بازوؤں میں چلے آئے

عذرا عباس

دروازے

زندگی کے شروع ہوتے ہی دروازے: کھلتے اور بند
ہوتے ہیں
ہماری پہلی یا شاید آخری آواز پہ، دروازوں سے گزرتے
گزرتے زندگی اپاہج کر دیتی ہے، انہیں بند نہیں ہونا
چاہیئے
ہم اپنے گھروں میں کہاں سے داخل ہوں گے
بچوں کو جگانے کے لئے
اپنا انتظار کرتے کرتے، سو جائیں گے
ہم چپکے سے گھروں میں داخل ہوں، انہیں حیران کرنے
کے لئے دروازوں کو بند مت کرنا
شاید، اس کا گزر ہو جائے، جس کے ہونے کا ہمیں
دکھ ہے
زندگی کے شروع ہوتے ہی

ممتاز اطہر

اُسے تم کچھ نہیں کہنا

اُسے کہنا! سمندر بھاپ بن کر اڑنے والا ہے
ہوا کے ہاتھ میں چنگاریوں کے گرز پنہاں ہیں
اُسے کہنا! کہ بادل حبس کی بوندیں گراتے ہیں
مری سانسوں کے پاؤں ریشمی دھاگوں میں اُلجھے ہیں
مگر میں دور ہوں تم سے،
وگرنہ تم یہ سارے تار سلجھاتے گھڑی پل میں

اُسے کہنا! مرے ہر سمت پھیلا ہے مسافت کا یہ جنگل
اُسے کہنا! کہ سورج راستوں سے سخت نالاں ہے
اُسے کہنا! کہ تم کس حال میں رہتے ہو؟
کچھ بولو!
اُسے کہنا تمہارے بعد سارے موسموں پر زردیاں چھائیں
فضاؤں کو تمہارے ہی تنفس کی ضرورت ہے
ہمارے درمیاں یہ فاصلہ صحرا کی صورت ہے
نسوں میں تشنگی کی ریت رقصاں ہے مگر پھر بھی
بس اک موہوم سی اُمید سوچوں میں جھلکتی ہے
کہ مجھ کو زندگی کی انگلیوں سے تم چھڑا لو گے
اُسے کہنا! تمہیں وہ رابطے، وہ سلسلے، وہ عہد تو بھولے
نہیں ہوں گے؟
اُسے کہنا! کہ زندگی تو تمہیں آواز دیتی ہے
اُسے کہنا! کہ تم ..... اسے کہنا
اُسے تم کچھ نہیں کہنا ——؟

رؤف امیر خانوی

لکیریں

اُس خدائے بزرگ و برتر نے
جو کہ سارے جہاں پہ قادر ہے
جو خداوند خالقِ کُل ہے
جو مکاں، لامکاں پہ قادر ہے

اُس خدائے بزرگ و برتر نے

میری قسمت کی میرے ہاتھوں پر
اس طرح کی لکیریں کھینچی ہیں
جیسے بچّے نے صاف کاغذ پر
ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچی ہیں

شگفتہ پروین

فاصلہ

جنگل کا وہ واحد پیڑ اپنے پروں سے بندھا پیڑ
کسی پرندے کی رات اس پیڑ پہ پھڑپھڑاتی ہے

رات، پیڑ اور پرندہ!
جن پہ اندھیروں کا راج ہو جاتا ہے اور رات اُسی
وقت سے اندھیرے میں پھنس جاتی ہے

اندھیروں پہ یہ تینوں راہی
ایک ہی سیدھ میں جب آکھڑے ہوتے ہیں
رات! انہوں نے میری چھاؤں کیا کی؟
جنگل چھوٹا ہے، اس لئے تمہیں گہری لگ رہی ہوں
گہرا تو میں پرندے کے سو جانے سے ہوا تھا
اور سمجھ گیا تھا کہ تو آگئی ہے

تیرے پیچھے پڑے اندھیرے کب سے ــــ
اندھیر ہے کہ تم اندھیروں کو ملوث کرو میرے ساتھ!
یہ تیرا سلوک اچھا نہیں سویا پرندہ دیکھ اپنی اُڑان بھول
بیٹھتا ہے

میں روز اس پرندے کو دلاسہ دینے کے بعد اپنی
کمان کی طرف لوٹ جاتی ہوں
تیری کمان کیا صبح ہے؟
نہیں میں نے جب جنم لیا تھا تو صبح تھی اور جب
مَری تو میرا نام رات رکھ دیا گیا۔ یہ تیور جو تم دیکھ
رہے ہو۔ مرنے کے بعد کے تیور ہیں
کمال ہے جب صبح کا انتقال ہونے والا تھا تو مجھے
خبر نہ ہوئی ــــ

تم!
اٹل راہ کے اٹل مسافر:

نہ ایک قدم چل سکو نہ سو سکو نہ خاموش رہ سکو!

جب یہ سویا پرندہ کروٹ لیتا ہے میری شاخ مجھ
سے جُدا ہو جاتی ہے
کیا کروٹ دوسری شاخ پہ مکمل ہوتی ہے؟
نہیں میری اور پرندے کی ہر کروٹ مکمل ہوتی ہے
یہ مکمل کروٹ کا نیم مبہم مفہوم میرے جنم سے بھی تعلق
رکھتا ہے
تمہارے جنم کے تو کتنے جھولے تمہاری شاخوں پہ جھول
رہے ہیں
یہ تو جوان آدمی کو اس کا جھولا دکھا کر رلانے والی بات ہے
مجھے خبر نہ تھی میں فاصلہ کی موت میں پھنس جاؤں گا
شاخیں پھلانگ کے تو تم نے مجھے اور بھی
مادی کر دیا ہے
مجھے آج اپنے مرنے کا دراصل احساس ہوا جاتا ہے۔

تم مردہ دن کی مردہ رات ہو!

نہیں میں مردہ دن ہوں ــــ
اور صرف آنکھوں سے ماری گئی ہوں

تمہیں اب صبح کہوں یا رات؟
اب میرا نام "فاصلہ" ہے
وہ صبح جسے رات کہہ کر موت دے دی گئی ہو
تیرا دوسرا جنم کیا ہوگا؟
جب یہ پرندہ بیدار ہوگا!
اس کی اُڑان میں میری روح قید کر دی گئی ہے
فاصلہ! پرندے کی روح بھلا کس میں قید ہو سکتی ہے
یہ بات پرندے کا چہچہانا ہی بتا سکتا ہے ــــ
تم جانتی ہو اس کا چہچہانا میرا جنم دن ہے
تم بھی جانتے ہو اس کی اُڑان میرا جنم دن ہے

پرندہ کوئی کروٹ نہیں لے رہا
ہمارے جنم کی اب کوئی کروٹ نہیں رہ گئی
مجھے یاد ہے
یاد آ ہی گیا ہے تو آؤ ہاتھ ملاؤ

فاصلہ اور پیڑ ہاتھ ملاتے ہیں
پرندے کی آنکھ کھل جاتی ہے

ڈاکٹر محمد معروف

نظرِ ثانی شدہ "انا الحق"[۱]

حسین بن منصور الحلاج (۸۵۷ء-۹۲۲ء) اسلامی تصوف کی دنیا میں ایک متنازعہ شخصیت ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں یہ صوفی اپنے غیر رجعی افکار کی بدولت راسخ العقیدہ علماء کے فتوے پر جام شہادت نوش کر گیا اور اس کی اپنی پیش گوئی کے مطابق اگرچہ اس کی راکھ ہوا میں اڑ گئی اور دریا میں بہا دی گئی تاہم زمانۂ وسطیٰ میں اس کے الفاظ انگاروں کی طرح سلگتے رہے اور بار ہا شعلے بن کر ابھرتے رہے الفرڈوان کریمر کے مطابق حلاج اپنے عہد کی مقبول ترین شخصیتوں میں سے ایک تھا اور اس کے حلقے میں ہزاروں مداحین جمع ہو چکے تھے۔ اور حکومتِ وقت اور علماء نے اس کی مقبولیت سے خائف ہو کر اسے ملحد قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور صدیوں تک اس کے خیالات و افکار کو خارج از اسلام اور ملحدانہ قرار دیا جاتا رہا۔ در اصل حلاج ان تخلیقی فنکاروں میں سے تھا جن کے خیالات راسخ العقیدہ علماء کے لئے کسی بھی زمانے میں قابلِ قبول نہ تھے حالانکہ ان لوگوں کا مذہبی افکار کے ارتقا میں بہت اہم کردار ہے۔ کیونکہ ایسے فنکاروں کے بغیر مذہبی افکار ایک تنگ دائرے میں محدود ہو کر رہ جاتے اور گھٹ کر ختم ہو جاتے۔

حلاج کی تصانیف میں "کتاب الطواسین" (جسے فرانسیسی ادیب و مترجم ایل میسی گنان نے ۱۹۱۳ء میں مرتب کیا اور پیرس میں طبع ہوئی) سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ کتاب چھوٹے چھوٹے گیارہ حصص میں منقسم ہے اور ہر حصہ مختلف "طاسین" کے نام سے مشہور ہے۔ کتاب کا انگریزی ترجمہ TAWASIN کے زیرِ عنوان ہو چکا ہے۔ اور پروفیسر جیلان کامران کی کتاب ANAL HAQQ RECONCIDERED (جسے ۱۹۷۸ء میں نقشِ اوّل کتاب گھر، لاہور نے طبع کیا ہے) کا دوسرا حصہ اسی ترجمہ پر مشتمل ہے۔ پروفیسر کامران نے مذکورہ کتاب کے حصۂ اوّل میں منصور حلاج کی کتاب "الطواسین" پر ایک شرح پیش کی ہے۔ جو موجودہ صدی میں اس عظیم صوفی مفکر کے افکار کو جدید تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی ایک کوشش کے مترادف ہے۔ حلاج کا جملہ "انا الحق" آج بھی زبان زدِ عام ہے۔ کامران صاحب نے اس جملے کا لسانی اور فلسفیانہ تجزیہ کیا ہے۔ اور آج کی دنیا میں اس کی اہمیت اور معنویت پر زور دیا ہے۔ در حقیقت آج کی مادہ پرست اور مذہبی جنونیت کی دنیا میں حلاج ایسے مصلح کے افکار کو رائج کرنے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ رجعت پسند عناصر مذہبی تقاضوں کی اوٹ میں دنیا کے تمام ارتقا اور ترقی کو کالعدم قرار دینا چاہتے ہیں — اور دسویں صدی عیسوی کی طرح آج بھی وہ کسی قسم کی تخلیق اور وسعتِ فکر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ آج پھر رجعت پسند عناصر ایسے ان حلاجوں کی کھوج میں ہیں جو دنیا کو ترو تازہ افکار دے سکیں تاکہ انہیں پھر سولی چڑھایا جائے، اور ان کی راکھ کو پھر ایک بار ہوا میں اور پانی میں بہا دیا جائے۔ حلاج دسویں صدی میں بھی تغیر نو اور فکرِ نو کی علامت تھا اور آج بھی ہے۔ ازل تک رہے گا۔ جب تک

---

[۱] جیلانی کامران کی تازہ تحقیق

دنیا میں افکار کی تعبیر نو کے داعی باقی ہیں اور رجعت پسند عناصر موجود ہیں۔ حلاج تختۂ دار پر چڑھتے رہیں گے اور مر کر اپنے افکار مذہب اسلام اور سچائی کو جلا دیتے رہیں گے ضرورت اس بات کی ہے کہ حلاج کے افکار کی نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق تعبیر نو کی جائے۔ اور انہیں عوام تک پہنچایا جائے۔

جیلانی کامران کی مذکورہ کتاب پڑھنے سے پہلے میرے ذہن میں حلاج کا تصور محض ایک صوفی کا ابھرتا تھا۔ لیکن اس مطالعے کے بعد حلاج میری نظر میں ایک صوفی ہی نہیں بلکہ ایک فلسفی کی حیثیت سے سامنے آتا ہے کتاب کا حصۂ اول اس کے دیباچہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور تشریح نو بھی، اسے چاہیں تو آپ دیباچہ کہہ دیں یا اسے "کتاب الطواسین" کی تشریح نو کی حیثیت دے دیں۔ بہر حال اس میں مصنف کی تصوف میں گہری دلچسپی اور اس کی فلسفیانہ سوجھ بوجھ کا احساس ہوتا ہے۔ کتاب بنیادی طور پر "انا الحق" کا ایک تجزیہ ہے اس میں اس جملے کا تاریخی پس منظر۔ اس کی صوفیانہ اور فلسفیانہ اہمیت پر غور کیا گیا ہے۔ ابتدا ہی میں مصنف نے "انا الحق" میں بطور ایک قضیہ کے اور بطور ایک تجربہ یا وارده کے فرق کیا ہے۔ تاہم مذکورہ تصنیف میں انہوں نے زیادہ توجہ "انا الحق بطور ایک وارده" پر مرکوز کی ہے۔ اور بطور ایک قضیہ کے اسے نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ قاری کتاب کے پہلے فقرے ہی سے امید وابستہ کر لیتا ہے کہ مصنف ابھی اس قضیہ کا تجزیہ اور اس کی تصدیق کے امکانات کے بارے میں کچھ کہے گا۔ بہر حال اس جملے کا بطور تجربہ تجزیہ بھی بہت اہم اور مفید ہے کیونکہ نتائج قضایا تجربات ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور توثیق حاصل کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مصنف منطقِ جدید کے طالب علم نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا تعلق ادب اور مابعد الطبیعیات سے زیادہ نظر آتا ہے۔

حلاج کے افکار پر سب سے پہلا موافق تبصرہ غالباً حضرت علی ہجویریؒ نے اپنی مشہور کتاب "کشف المحجوب" میں کیا ہے آپ نے "انا الحق" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے "بعض راسخ العقیدہ ماہرِ الٰہیات حلاج کے افکار کو اس لئے رد کرتے ہیں کہ یہ وحدت الوجودی ہیں۔ حالانکہ قابلِ اعتراض پہلو "انا الحق" کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کے اندازِ بیان میں ہے" (ص ۲ اردو ترجمہ) یعنی کشف المحجوب میں اس جملہ کو اس کے تجرباتی پس منظر سے نکال کر صرف اس کے اندازِ بیان پر زور دیا گیا ہے۔ اور یوں یہ ایک لسانی مسئلہ ہو کر رہ گیا ہے۔ دراصل یہ اندازِ بیان ہی کا قصور تھا کہ "انا الحق" "میں حقیقت ہوں" ـــــ سے بعض ذہنوں میں "میں ذاتِ باری ہوں" میں تبدیل ہو گیا۔ اور یوں یہ جملہ شرک کا مرتکب ہو گیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ فقہا نے اس جملہ کو اس کے تجرباتی پس منظر سے نکال کر اور اصل سیاق و سباق CONTENT سے علیحدہ رکھ کر پیش کیا ہے۔ جس کی بدولت ساری غلط فہمی پیدا ہوئی ہے، جملہ "انا الحق" دو حصوں "انا" یعنی "میں" اور "الحق" یعنی "حقیقتِ واحدہ" پر مشتمل ہے۔ حلاج نے طاسین ۹ : ۴ میں "الحق" کی توجیہہ یوں کی ہے کہ "الحق" ذاتِ حق نہیں ہے، بلکہ ذاتِ حق کی جانب واپسی ہے (ص ۲۱) لیکن اکثر فقہا کے نزدیک "الحق" سے مراد ذاتِ حق تھی۔ جس کی وجہ سے انہوں نے حلاج کو مشرک قرار دیا۔

دراصل "انا الحق" میں من و تو (I – THOU) کی نسبت یعنی انسان اور اس کے خالق کے مابین رابطہ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اکثریت نے اسے فنا اور حلول کے معنوں میں سمجھا۔ 'من و تو' کی نسبت پر تبصرہ کرتے ہوئے جیلانی کامران پروفیسر نکلسن سے متفق ہیں کہ چونکہ حلاج دیگر صوفیا کی طرح اللہ تعالیٰ کی ماورائیت کا قائل ہے لہٰذا حلول یا فنا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پروفیسر نکلسن کے الفاظ ہیں۔

"SO LONG AS TRASCENDENCE IS RECOGNISED, THE MOST EMPHA- TIC ASSERTION OF IMMANENCE IS NOT PANTHEISM BUT PANENTH- EISM —— NOT THE DOCTRINE

ماوتو

THAT IS GOD, BUT THE DOCTRINE THAT ALL IS IN GOD, WHO IS ALSO ABOVE ALL."

(THE IDEA OF PERSONALITY IN SUFISM, P. 37.)

جیلانی کامران نے اسکی توجیہہ یوں پیش کی ہے کہ چونکہ "انا" اور "الحق" حقیقت کی دو مختلف سطوح پر ہیں تو "من و تو" کی نسبت میں "من" اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے — مصنف نے اس ضمن میں لفظ SUSTAINED کا نہایت موزوں استعمال کیا ہے (ص ۱۲۱) حلاج کے اپنے الفاظ میں (طاسین ۲ : ۸)

"THUS REALITY REMAINS REALITY AND THE CREATED THINGS AS THINGS CREATED."

حلاج نے طاسین ۶ : ۲۱ — ۲۳ میں "انا" کو "آیت اللہ" کہا ہے۔ اس کے الفاظ میں

"AND I SAID, 'IF YOU RECOGNISE 'HIM' NOT, THEN JUST SEE AND RECOGNISE 'HIS' EVERLASTING SIGN, THE EVER-ADURING SIGN, AND THAT SIGN I AM, AND I AM, THE TRUTH (ANA AL-HAQQ) AND WITHIN THE REALITY I AM FOR EVER WITH THE TRUTH."

پس انسان کی "انا" اللہ تعالیٰ کی نشانی یا علامت ہے اور یوں "انا" اور "الحق" کے مابین گہرا تعلق یا رابطہ موجود ہے۔ حلاج کے نزدیک "حق" ناقابلِ فہم UNKNOWABLE ہے اور "انالحق" اجنبی انسانی روح کی اپنے ناقابلِ فہم خالق کے لئے ایک پکار ہے۔

حلاج نے "حق" اور "الحق" میں واضح طور پر تمیز کی ہے۔ "الحق" زمان و مکان کے فریم ورک میں وہ نقطہ ہے جس کی جانب "حق" ناقابل فہم UNKNOWABLE ہے اور "انا الحق" اجنبی انسانی روح کی اپنے ناقابلِ فہم خالق کے لئے ایک پکار ہے۔

حلاج نے "حق" اور "الحق" میں واضح طور پر تمیز کی ہے "الحق" زمان و مکان کے فریم ورک میں وہ نقطہ ہے جس کی جانب "حق" لوٹتا ہے اور جس کی وجہ سے "الحق" حقیقت بنتا ہے اور جس کی عدم موجودگی میں "الحق" کی کوئی حیثیت اور وجود نہیں۔ (ص ۱۳۱)۔ اس اسیاق میں "حق" میسٹر ایکہارٹ کے GOODHOOD اور "الحق" اس کے GOD IMAGE کی حیثیت میں ہیں "الحق" انسانی وارده میں سما سکتا ہے لیکن "حق" اس سے ماورا ہے بعض شرح نگاروں نے اسی فرق کو نظر انداز کر کے "الحق" کو ہی "حق" سے تعبیر کیا ہے۔ جس کی بدولت تمام غلط فہمیاں پیدا ہوئیں ہیں اور حلاج پر شرک کا فتویٰ لاگو ہوا ہے۔ لیکن اگر اس کے افکار کو صحیح تناظر میں رکھ کر پرکھا جائے تو ان میں کوئی خارج از اسلام بات نہیں رہ جاتی "حق" اور "انا" یعنی "من و تو" میں جو رابطہ قائم ہوتا ہے وہ "الحق" کی بدولت ہوتا ہے۔ اور ان تینوں میں واضح فرق سمجھنا حلاج کے خیالات کو جاننے کے لئے نہایت ضروری ہے "حق" بذاتِ خود ماورا ہے اور ناقابلِ فہم لیکن حلاج نے اس ناقابلِ فہم حقیقت کو منفی یا سلبی معنوں میں نہیں بلکہ مثبت معنوں میں پیش کیا ہے۔ یعنی "حق" کسی شے کی نفی کا نام نہیں ہے بلکہ کائنات کی ہر شے کے وجود کا اقرار ہے اور اس کی حقیقت کا اثبات ہے "انا" کی حقیقت بھی "حق" کی وجہ سے ہے، لیکن چونکہ "انا" "حق" تک نہیں پہنچ سکتی کیونکہ "حق" ناقابل فہم ہے۔ لہٰذا "انا" کی حقیقت "الحق" کی بدولت ہے۔ اور اسی میں "انالحق" کی حقیقت اور معنی بند ہیں "الحق" کے بغیر "انا" کچھ بھی نہیں۔

دوسری جانب "الحق" محض تجرید ہے۔ جو انسانی "انا" کے نفسیاتی ڈھانچے میں داخل ہو کر ہی کوئی ٹھوس صورت اختیار کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے وحی ایک حقیقت بنتی ہے "الحق" حضرت محمدؐ کی وجہ سے موجود ہے آپ ازل سے نور کی شکل میں موجود ہیں اور نبوت آپ کی بدولت ہے۔ حلاج کی مابعد الطبیعات میں "انا" ابدی طور پر "الحق" کی تلاش میں ہے۔ اور اسی سے وحی کے راز آشکارا ہوتے ہیں حلاج کے نزدیک "الحق" فکرِ انسانی کی ایک مخصوص جہت

ہے جسے ہم اکندی کی "عقلِ فعّال"
AGENT INTLLECT سے تعبیر کر سکتے ہیں۔
حلاج کا "انا الحق" کا نظریہ درحقیقت
توحیدِ ربانی DIVINE UNITY کا نظریہ
ہے۔ حلاج کے اپنے الفاظ میں

"THY SPIRIT IS MINGLED IN
MY SPIRIT EVEN AS WINE IS
MINGLED WITH PURE WATER.
WHEN ANYTHING TOUCHES
THEE, IT TOUCHES ME. LO, IN
EVERY CASE THOU ART I."

حلاج کی تصانیف میں ایسے بیشمار حوالے پائے
جاتے ہیں۔ جنہیں وجودی تصوّف اور حلول پر
تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم جا بجا ہر شے کے
ذاتی تشخص اور غیر مختاج حقیقت پر زور پایا
جاتا ہے۔ گیارھویں اور بارھویں اور آخری
طاسین BOOK OF DISCOVERY کا
آخری بند ملاحظہ ہو

"THE TRUE REMAINS THE
TRUE, THE CREATOR AS CREATOR,
AND WHAT BELONGS TO THINGS
CREATED, REMAINS AS THINGS
CREATED, THIS ALWAYS IS, IT
BRINGS NO HARM;"

(PAG 108)

حلاج کے نزدیک ابلیس وحدتِ ربانی کا سب سے
زیادہ پرچارک ہے۔ اس نے اپنی توجہ محض
خدا کی وحدت پر مرکوز کی اور اس کی باقی صفات
کو نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ چھٹی طاسین
BOOK OF ADAM میں ابلیس اور فرعون
کا کیس پیش کیا گیا ہے۔ جب ابلیس کو آدم
کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر
انکار کر دیا، کہ میں نے خدا کی ذات کے علاوہ کسی
اور کو سجدہ کرنا نہیں سیکھا۔ اس نے کہا میرے
اور خدا کے درمیان اور کوئی نہیں۔ ابلیس کی راہ
میں اس کا یہ عقیدہ حائل تھا کہ
قل ھو اللہ احد ۰ اللہ الصمد ۰ ابلیس شرک کے لئے
تیار نہ تھا۔ چنانچہ خدا نے اسے "ابلیس" سے
بدل کر "عزازیل" کا نام دے دیا۔ ابلیس
اور فرعون ہر دو نے اس لئے انکار کیا کہ انہیں
SELF-ALIENATION کا خوف تھا۔
جب ابلیس سے کہا گیا کہ اس نے خدا کے حکم
کی نافرمانی کی تو اس نے جواب دیا کہ یہ اس کا
حکم نہیں تھا بلکہ میرا امتحان تھا (ص، ۸۴)۔
ابلیس نے خدا کو جواب دیا۔ کہ اے میرے
خالق! تو نے چاہا ہی نہیں کہ میں سجدہ کروں
اگر تو نے چاہا ہوتا تو میں نے سجدہ کیا ہوتا۔"
(ص، ۹) یعنی یہاں ابلیس نے اپنی مجبوری کی
کی دلیل پیش کی ہے۔ یہاں حلاج کا اثر ہمیں
علامہ اقبال پر نمایاں نظر آتا ہے جب ضربِ کلیم
میں "تقدیر" کے زیرِ عنوان ابلیس و یزداں کے مکالمات
میں اوّل الذکر کہتا ہے (یہ تصور ابن العربی سے
ماخوذ ہے)۔

حسرت اشکبار، تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود!

(ص ۔ ۴۳)

حلاج کے نزدیک، ابلیس اور عزازیل
دو مختلف حالات کے نام ہیں۔ ابلیس قبل از
انکار حالت کا نام ہے اور عزازیل بعد از انکار،
اس کے معنی ہیں حالت ناوابستگی۔
STATE OF DETACHMENT
BOOK OF ساتویں طاسین
DIVINE WILL میں ابلیس پشیمان ہے کہ اگر
اسے معلوم ہوتا کہ سجدہ اسے حرّیت اور قدرت
بخشے گا تو وہ آدم کو ضرور سجدہ کرتا۔ لیکن وہ
دائرہ اوّل ہی پھنس کے رہ گیا۔ اور خدا کی
وحدت کے علاوہ باقی تمام صفات کو نظر انداز
کر دیا۔ یوں خدا کی وحدت کا سب سے بڑا
پرچارک ہونے کے باوجود خدا کی نظر میں
مطعون اور ذلیل ہوا ــــ جیلانی کامران نے
ابلیس اور فرعون پر صفحات ۴۳ سے ۵۱ تک
بحث کی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو
"انا الحق" اس انسانی خواہش اور کوشش کا نام
جس سے وہ اپنے معبودِ حقیقی کی طرف لوٹنا
چاہتا ہے۔ اور اپنی محدود 'انا' سے ماورا
ہو کر 'الحق' یعنی GOD IMAGE
سے تعلق قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ حالت
ہے۔ جب انسان اپنی حدود سے انکار کر
کے لا محدود تک پہنچنے کی تمنا رکھتا ہے اور
جیلانی کامران کے الفاظ میں "انا الحق" انسانی

حدود کو چھوڑ کر حرّیت کے حصول کے لئے   ہمیشہ اس مقصد کے لئے کوشاں ہے آدم   جو سنگین سماجی، سیاسی، اقتصادی اور مادی
پکار کا نام ہے۔ اور انسانی روح اور 'انا'   اور ابلیس سے لے کر آج کے انسان تک   قید و بند میں محبوس ہے ـــــ

"پرچہ نہ ہوا "گُنڈھ کی پڑیں" ہوگئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتا ہے۔ سفارت خانے سے پتہ کرو تو خبر ملتی ہے کہ صاحب دو کاپیاں آئیں تھیں ایک سفیر صاحب لے گئے اور دوسری سکریٹری صاحب۔ (ویسے یہ ایک نیک شگون ہے کہ سفیر وزیر قسم کے لوگ بھی ادب میں دلچسپی لینے لگے) کسی دوست کو فون کرو تو معلوم ہوتا ہے اُن سے کوئی اور دوست لے اُڑے۔ آخر آپ اشاعت بڑھا کیوں نہیں دیتیں! وہ تو بھلا ہو میرا رے نیّر صاحب کا کہ گذشتہ ویک اینڈ پر معہ فیملی، بون سے میرے ہاں آئے اور آتے ہوئے 'ماہِ نو' کا ایک تازہ شمارہ بطور سوغات لیتے آئے کہ لو میاں پڑھو اور آئندہ کے لئے مزید ترسو کہ وطن سے دوری کی یہی سزا ہے۔

پرچہ نہ پانے کی سزا محض میں ہی نہیں بھگت رہا۔ ہیرلین سے حسین شاہد کے فون پر فون آتے ہیں کہ یار 'ماہِ نو' آیا؟ ولایت سے شاہد محمود ندیم اور ہمراز احسن کی کالیں آتیں ہیں کہ ماہِ نو آیا ہو تو بھجوا دینا۔ کالون میں علی اصغر بے چارہ ماہِ نو کے لئے ترس گیا ہے۔ مشرقی برلن سے اسد اللہ جب بھی فون کرتے ہیں یا خط لکھتے ہیں تو تان ماہِ نو پہ آکر ٹوٹتی ہے ـــ اور ابھی گذشتہ بُدھ کو سٹاک ہوم سے ولید میر اور باسط میر نے فون پر یہی فرمائش کی کہ یار نیا ماہِ نو اور ایک آدھ کلو کسیلے تو بجوا دو کہ وہاں کر یلے اور ماہِ نو دیکھنے کو نہیں ملتے"

اسد مفتی ـــــ ایمسٹرڈیم

توصیف تبسم

چہرہ بہ چہرہ [1]

بہار اور خزاں کے تسلسل میں دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے ذہن کے لئے بڑے سبق موجود ہیں۔ درختوں پر تالیاں بجاتے ہوئے سبز پتے ہوں یا ہوا کی جھولی میں بھرے ہوئے سوکھے تنکے۔ سب کے سب فطرت کے صحیفے ہیں جن میں بظاہر ایک لفظ بھی نہیں مگر پڑھنے والوں کے لئے ان سب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ جب دیکھتے دیکھتے سوکھی اور ننگی شاخیں ہرے پتوں سے لد جاتی ہیں تو یہ منظر دیکھنے والے کے اپنے داخلی نمو کا استعارہ بن جاتا ہے اور وہ لمحہ بھر کے لئے باہر کے مناظر سے آنکھیں بند کر کے اپنی ذات کے بے پایاں سمندر میں جب غوطہ زن ہوتا ہے یہی وہ لمحہ تخلیقی فن کا لمحہ ہے۔ ... اور نعیم اظہر کی غزلیں "چہرہ بہ چہرہ" اس فن کا ایک بلیغ اشارہ ہے ... نعیم اظہر کہتے ہیں۔

مری پہچان مری شاعری ہے
مرا ہر حرف مرا آئینہ ہے

یہ دعویٰ صرف وہی شاعر کر سکتا ہے جس نے فن کو زندگی سمجھ کر قبول کیا ہو اور حقیقت بھی یہی ہے کہ چاہے فنِ شعر ہو یا کوئی اور فن اس کیلئے ہر فنکار سے زندگی کا مطالبہ کرتا ہے ... اس سے کم قیمت اگر اس کی لگائی جائے تو وہ فنکار کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ اسی خلوص کی بدولت شعر میں وہ جوہر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے جس کو صداقت احساس کا نام دیا گیا ہے ... نعیم اظہر کی یہ غزلیں اپنے قاری کو متاثر بھی کرتی ہیں اور ہم مطالعہ کرتے ہوئے اُس تخلیقی مسرت سے بھی دوچار ہوتے ہیں جو پہلے پہل شاعر نے محسوس کی ہوگی ...

نعیم اظہر کے شعری سفر کا اپنی ذات کے نقطے سے آغاز ہوتا ہے جو محبوب اور پھر محبوب سے بڑھ کر حیات و کائنات کے اسرار کو کھولنے کا موجب بنتا ہے ... بلاشبہ شعر ایک صداقت ہے اور صداقتِ حُسن ــــ جب تک حُسن کا ادراک حیات کے احساس و توازن کو برقرار رکھنے کا ذریعہ نہیں بنتا صداقت مبہم رہتی ہے ... غزل کا فن ایمائیت کا حامل ہوتا ہے اور ایک غزل گو شاعر رمز و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ کے استعمال کے لئے مجبور ہے۔ لیکن اگر علمِ بیان کے ان وسیلوں کو محض رسمی طور پر استعمال کیا جائے تو صداقت اپنے خد و خال سے محروم ہو جاتی ہے ــ نعیم اظہر نے رمز و اشارہ کو بہ سلیقہ سے استعمال کیا ہے اس طرح کہ اس کا ذاتی تجربہ اپنی کیفیت کے لحاظ سے ہمہ گیر اور لامحدود ہو گیا ہے۔

شعر پڑھتے ہوئے اکثر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے ایک شمع روشن کر کے آئینوں کے درمیان رکھ دی ہو اور اس کی چھوٹ دور تک پڑ رہی ہو۔

وہ سراپا حسن بھی ہے عشق کا جلوہ بھی ہے
پھول سا لگتا ہے لیکن روح میں چبھتا بھی ہے

مسخ کر دے گا تو اظہر کیا دکھائے گا اُسے
اس جہانِ آرزو میں دیکھ اک چہرہ بھی ہے

اقبال کے بعد سے اُردو غزل کے موضوعات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ آج ہمارے دور میں جو غزل لکھی جا رہی ہے اس میں داخلیت کم اور خارجیت زیادہ ہے ... نعیم اظہر کا شمار بھی شاعروں کے اسی گروہ سے ہے۔ لیکن اس نے خارجی حقائق کو اپنے لہو میں ڈبو کر اس طرح پیش کیا ہے کہ داخلیت اور خارجیت کی حدود ملتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہیں ؎

ہیں تو زیست کے لمحوں نے یوں نوازا ہے
حقیقتوں میں رہے اور خواب ہوتے گئے

شاعر کے یہاں کچھ غزلوں میں اپنے آپ سے

---

[1] نعیم اظہر کی غزلوں کا مجموعہ

محبت کا رجحان اس قدر موجود ہے کہ اس کی یہ غزلیں نرگسیت کی حامل محسوس ہوتی ہیں. ہمارے اس خیال کی تائید صیغۂ واحد متکلم سے بھی ہوتی ہے جو شاعر اکثر استعمال کرتا ہے۔ نعیم اظہر کی عظمت اس میں ہے کہ وہ اپنی اَنا کے اس حصار کو توڑنے میں بالآخر کامیاب ہوا ہے۔

محبوب کی ذات اس شکستِ ذات کے عمل میں بڑی ممد ثابت ہوئی ورنہ اس بات کا امکان تھا کہ اس کی بڑھتی ہوئی نرگسیت ہی اس کے فن کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی۔ اس آشوب زدہ کا رنگ ذرا ان شعروں میں دیکھئے ؎

دوڑ آیا ہوں تمنا سے چُرا کر نظریں
جیسے آہو کسی آواز سے ڈر جاتا ہے
یوں اُترتا ہے کوئی روح کی گہرائی میں
جس طرح جھیل میں ماہتاب اُتر جاتا ہے

گماں ہوتا ہے تیری آرزو ہوں
تجھے اے حُسن جب بھی سوچتا ہوں
ابھی تک ڈھونڈتا ہوں اس شجر کو
میں جس کی شاخ سے ٹوٹا ہوا ہوں
ہواؤ میری خوشبو کو بکھیرو
کہ میں بھی صحنِ گلشن میں کھلا ہوں

یہ سفر ذات کے نقطہ سے شروع ہو کر مسلسل جاری رہتا ہے۔ غمِ ذات، غمِ محبت اور غمِ دوراں تو راستے کے تین پتھر ہیں، یہ سفر کہاں پہنچ کر ختم ہوگا اس بارے میں کچھ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔

تھک کے جب بھی میں راستے میں ستانے لگا
وہ کسی کہسار سے پھر ہاتھ لہرانے لگا

اسی شعورِ محبت ہی نے شاعر کو حیات و کائنات میں بکھرے ہوئے دُکھ کو سمیٹنے اور اس کو ہنستی گاتی مسرتوں میں ڈھال دینے کا حوصلہ بھی عطا کیا ہے

وہ اپنی خیالی دنیا کی تلاش میں نکلا تو قدم قدم پر اس کے آبلے چور بھی ہوئے۔ وہ وقتی طور پر اُداس اور مایوس بھی ہوا لیکن اُس نے اُمید کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

ترے لئے نئی دنیا بسائے بیٹھا ہوں
جہاں چراغ نہیں دل جلائے بیٹھا ہوں
مجھے بتاؤ کہاں جوئے شیر لانی ہے
کہ میں بھی ہاتھ میں تیشہ اُٹھائے بیٹھا ہوں

اور پھر وہ خود سے سوال کرتا ہے۔

بہت لائے گئے ہیں چاند تارے آسمانوں پر
مگر پھر روشنی میری زمیں تک کیوں نہیں آئی

نعیم اظہر کا مجموعۂ غزلیات "چہرہ بہ چہرہ" اس کے وجدانی سفر کی ایک دلکش داستان ہے، جس میں حسن کی ایک تہہ کے نیچے ایک سے زیادہ رنگ جھلکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

توصیف تبسم

عذرا عباس

جمال احسانی

ادب اور حقیقت[1]

جس ماحول میں ہم زندہ ہیں اس میں ہر چیز کو ناپنے کا پیمانہ ہر شخص نے مختلف بنایا ہوا ہے یہ جملہ اس صورتِ حال کے مثبت اور منفی، دونوں پہلو لئے ہوئے ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس کا مثبت پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم سب ایک سے ہونے کے باوجود اپنے الگ الگ خد و خال رکھتے ہیں، اور اپنے افکار و نظریات میں کسی دوسرے کے پابند نہیں ہیں، جو بہر حال زندگی گزارنے کا ایک متحرک عمل ہے۔ اس بات سے متفق ہونے کے باوجود اس وقت اپنی اس تحریر کا آغاز اس جملے سے کرنے کا مقصد اس کے منفی پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ادب و فن کی تمام سطحوں پر ہمارے ایک دوسرے سے اختلافات ہماری فکر اور فن پارے پر صحت مند اظہارِ رائے کا مظہر سمجھے جاتے ہیں۔ کسی بھی فنکار اور اس کے فن پر ہم میں سے اکثریت کا اتفاقِ رائے کر جانا اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف سمجھا جاتا ہے یہ بات عام طور سے درست بھی ہوتی ہے مگر ذرا [illegible] کہ آج ہے جس کا ایک سیدھا سادہ مطلب تو یہ بھی نکلتا ہے کہ ایسی چیزیں تخلیق ہی کم ہو رہی ہیں، لیکن پھر اس کو کیا کہا جائے کہ ادب کے ایک حلقے میں معتبر اور مستند گردانا جانے والا ادیب دوسرے حلقوں میں قابلِ مطالعہ تک تصور نہیں کیا جاتا۔ اب اگر آپ اس بات کی کوئی مثال مجھ سے چاہیں تو میں آپ کی باتوں میں آنے والا نہیں کہ میرا سوال ابھی جوں کا توں ہے مگر میں ہمیشہ اس سوال پر سوچتے ہوئے اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ اس زمانے میں ہم سب اجتماعی طور پر UNITY OF TASTE سے محروم ہو چکے ہیں یا کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے اسباب بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں اور ان اسباب کی ذمہ داری کسی کے سر تھوپ کر اپنی جان بھی بچائی جا سکتی ہے، مگر یہ طریقۂ کار اپنا کر شاید ہم اس کمی کو دور نہیں کر سکتے جو رفتہ رفتہ موجودہ ادب میں ایک خلا کی صورت اپنی جگہ بناتی جا رہی ہے۔ لہٰذا [illegible] سب سے زیادہ قابلِ قبول بات یہی ہے کہ اس خرابی کو قبول کر لیا جائے جو ادب کے ادراک میں حائل ہو سکتی ہے ـــ اب چاہے وہ بڑا ادب ہو، اچھا ادب ہو یا کم اچھا ـــ اگر وہ برا نہیں ہے تو پھر ہم اسے ادب ہی کہیں گے۔ ادب کے درجات پر اختلافِ رائے پہلا خانگی جھگڑا ہے، لہٰذا وہ کبھی اور کسی وقت بھی طے ہو سکتا ہے۔

اس مضمون کے عنوان کے پیشِ نظر آپ مجھ سے اس جملے کی توقع کر رہے ہوں گے کہ اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آؤں گا، مگر مجھے اس کی ضرورت شاید اس لئے نہیں ہے کہ میں نے ہر مضمون شروع ہی اپنے اصل موضوع سے کیا ہے، مگر چونکہ انجم اعظمی کی کتاب "ادب اور حقیقت" پڑھنے سے مجھ پر اپنے سوال کے کچھ دوسرے گوشے بھی ظاہر ہوئے، اور پھر واضح انداز میں اس سوال کے اسباب پر تفصیلی بحث بھی سامنے آئی اور جس بات نے مجھے اس کتاب کو موضوع بنانے کی دعوت دی [illegible] انجم اعظمی کا [illegible] جس نے اس سوال کو نہ صرف قبول کیا، بلکہ اس کے جواب کی تلاش میں اپنا سفر جاری رکھا ہوا ہے۔ انجم اعظمی ہمارے ان ناقدین میں سے ہیں

---

[1] انجم اعظمی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ

جنہوں نے شاعر ہونے کی تہمت گوارا کر کے اپنا اظہار شاعری میں بھی کیا ہے۔ وہ زندگی کے جن مسائل سے گزرے ہیں، اور حالات و مسائل کے جو اثرات ان کی شاعری میں نمایاں ہیں، ان کے تنقیدی مضامین صرف انہیں سمجھنے میں مدد دیتے ہیں بلکہ انجم اعظمی کے ادبی نقطۂ نگاہ کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں ادب کی بکھرتی اور ٹوٹتی ہوئی اقدار اور بحران بدلتے ہوئے حالات پر جس انداز سے انہوں نے اپنے پہلے ہی مضمون "میرا عہد" میں سوال اٹھائے ہیں، وہی ایک زندہ آدمی کی حیثیت سے ادب سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت ہیں، مگر انجم اعظمی صرف اس گہری وابستگی کا اظہار کر کے ہی مطمئن نہیں ہو جاتے، بلکہ ادیب کی ذمہ داریوں سے خود کو اور دوسروں کو آگاہ کرتے ہوئے اس صنعتی معاشرے میں اس کی اہمیت اور اعلیٰ مقام کے تعین پر اصرار بھی کرتے ہیں۔

جس ماحول میں وہ رہتے ہیں اس سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں اور اس ادب کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں جو ہمیشہ اپنے آپ سے باہر چلا وطن رہا ہے، مگر اس صحت مند معاشرے کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے، جس میں تعصبات سے بالا ہو کر آدمی آدمی کا اقرار کرے۔

انجم اعظمی کا ایمان شاعری کے اس علم پر ہے جسے اس عالیشان عمارتوں کے عہد میں ثانوی حیثیت دی جا رہی ہے۔ وہ اپنے مضامین میں بار بار اپنے اس خیال کا اعادہ کرتے ہیں۔ کہ جو لوگ میر و غالب کے زمانے کو ادبار کا زمانہ کہتے ہیں، وہ یہ بات کیوں نہیں سوچتے کہ اس وقت لوگ کم از کم اتنے مہذب تو ضرور تھے کہ وہ شاعری کو ایک سنجیدہ علم کی حیثیت سے قبول کرتے تھے، کیوں کہ یہی بات دو ادوار میں سچ اور جھوٹ کے فرق کو نمایاں کرتی ہے۔

اسی طرح انجم اعظمی دورِ حاضر میں سانس لیتے ہوئے انسان کی شخصیت کا مطالعہ بھی ایسے متوازن انداز میں کرتے ہیں کہ قوی ڈیل ڈول رکھنے والے اور بھاری بھر کم شخصیت کے مالک میں تمیز ہو سکے وہ اس بات سے بھی بے حد اختلاف کرتے ہیں کہ ایک لفظ کے صرف ایک ہی معنی کیوں متعین ہوتے جا رہے ہیں۔ بظاہر یہ بات ایسی غیر معمولی نہیں لگتی مگر غور کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ ادیب کو ادب کی تفہیم میں کیسے کیسے خطرات مول لینے پڑتے ہیں۔ یہی بے خوفی فن اور فن کار کی یکجائی کی علامت ہے۔ فن اور فن کار کی غیر مشروط یکجائی کا عظیم ترین مظہر اردو ادب میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کو سمجھا جاتا ہے۔ ان تینوں شاعروں سے زیادہ غالباً کسی دوسرے شاعر پر اتنا نہیں لکھا گیا۔ ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد اب تک اردو ادب ان شعرا کی تخلیقی سنسناہٹوں سے [illegible] کسی بھی نقد و نظر کا مالک نقاد یا شاعر [illegible] ان کا تجزیہ کرنے [illegible] ہے کہ [illegible] تینوں شاعر [illegible] تک [illegible] ادب [illegible] سبب ہے کہ ان [illegible] کوئی بھی اردو کے ناقد کے ہاتھ پورا نہیں لگا۔

ان تینوں پر مضمون لکھتے ہوئے یقیناً انجم اعظمی اس بات سے آگاہ تھے۔ لہٰذا، میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ کو سمجھنے کے لئے انہوں نے ان تینوں کی شاعری کی جوہری خصوصیات کو اپنے مضامین کی بنیاد بنایا۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان تینوں کی جوہری خصوصیات انجم اعظمی نے منتخب کیں ان کے بغیر میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ وہ نہ ہوتے جو ہیں۔ مثلاً میرؔ کی شاعری کا نمایاں ترین حصہ اس کا لہجہ ہے، جس کے سبب آج بھی وہ اردو شاعری کا باوا آدم ہے۔ میرؔ کے لہجے پر لکھتے ہوئے انجم اعظمی نے میرؔ کے لہجے کی خصوصیات ہی پر تکیہ نہیں کیا، بلکہ انہوں نے دوسرے شاعروں کے لہجے اور ان کے آہنگ کا بھی بہت تفصیلی جائزہ لیا ہے، اور اس طرح انہوں نے میرؔ کے لہجے کی بے شمار جہتیں تلاش کیں اور انہیں میرؔ کی شاعری کا جوہر قرار دیا۔ میرؔ کو اس کے کُل میں دیکھنے میں یہ ایک مشکل اور دشوار طریقہ تھا جسے انجم اعظمی نے آسانی سے طے کیا ہے۔ اسی طرح غالبؔ کو مغل تہذیب کے تناظر میں رکھتے ہوئے اس کے شعری سفر کو سمجھنے کی سعی بھی انجم اعظمی نے کی ہے۔ جہاں تک غالبؔ اور مغل عہد کا تعلق ہے۔ وہ لازم ملزوم ہیں ـــ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر مکمل طور پر سمجھے نہیں جا سکتے تھے۔ اپنے مضمون "مغل تہذیب اور غالب" میں انجم اعظمی نے [illegible] کے عہد کے بحران کے ان مراحل کا تذکرہ بھی کیا جو غدر سے ہمارے ہاں کم کم ہی ہوتا ہے

اور پھر اسی طرح اقبال کی شاعری میں تغزّل کے غالب اثرات کے ذریعے اقبال تک رسائی کی کوششیں کی ہیں۔ وہ اقبال کے کلام میں فلسفۂ حرکت، فلسفۂ عشق اور فلسفۂ خودی کے تمام سلسلوں کو ایک ہی لڑی میں پرونے کی جدوجہد سے بھی گزرے ہیں۔ انجم اعظمی نے اقبال کی شاعری کے تینوں ادوار میں تغزّل کے عمل دخل کی جانب اشارے کئے ہیں۔

غالب اور اقبال پر دوسرے اہم ناقدین اور شعرا کے مضامین کی موجودگی کے باوجود انجم اعظمی کے یہ تینوں مضمون اپنی الگ اہمیت رکھتے ہیں۔

اب ذرا اس مضمون کی طرف آئیے جس کا عنوان اس کتاب کا نام بھی بنا اور موضوع بھی، میری مراد انجم اعظمی کے مضمون "ادب اور حقیقت" سے ہے۔ انجم اعظمی نے اپنے اس مضمون میں ادب اور حقیقت دونوں کو تقریباً ہم معنی قرار دیا ہے، کیونکہ ان کے خیال میں کوئی بھی ادب حقیقت سے گریز نہیں کر سکتا، اور اسی طرح کوئی بھی حقیقت کسی وقت بھی ادب بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ادب اور حقیقت میں جس فرق کو انہوں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے وہ اشیاء کو دیکھنے میں شاعر اور سائنسداں کی آنکھ اور طریقۂ نظارگی کا فرق ہے۔ سائنس داں ذرّے کو چیر کر زندگی کی ماہیت کا پتہ دیتا ہے۔ جب کہ اس کی یہ دریافت شاعر کے لئے خام مواد فراہم کرتی ہے۔ یہ خام مواد جب شاعر کے ہاں تخلیقی شکل اختیار کر لیتا ہے تو سائنس داں کا ادراکِ حقیقت شاعر کے شعری اظہار سے ادب کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور اس طرح یہ دونوں لفظ ایک ہی استعارے کا پرتو بن جاتے ہیں۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ میں انجم اعظمی کی کتاب کے مطالعے کے چکر میں غالباً اپنے سوال سے ذرا دور ہو گیا ہوں۔ آپ ٹھیک ہی سوچ رہے ہیں، کیونکہ میں اپنے سوال سے دور اور جواب کے نزدیک ہو رہا ہوں، مگر جواب سے میری قربت اسی صورت میں بامعنی ہو سکتی ہے جب ہم میں سے اکثر لوگ اس بات سے اتفاق یا اختلاف کریں کہ انجم اعظمی کی یہ کتاب ہمارے دور میں اُس کھوئے ہوئے UNITY OF TASTE کی تلاش ہے جس کے سفر کے دوران انہوں نے دو مختلف نقطہ ہائے نظر کو ایک کر کے تیسرا راستہ اختیار کیا ہے اور وہ بلا تعصب نہایت متانت اور سنجیدگی سے ادب و فن کا مطالعہ ہے۔ ورنہ یوں تو میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ اس بات کے منتظر ہوں گے کہ میں انجم اعظمی کو ترقی پسند کہوں۔
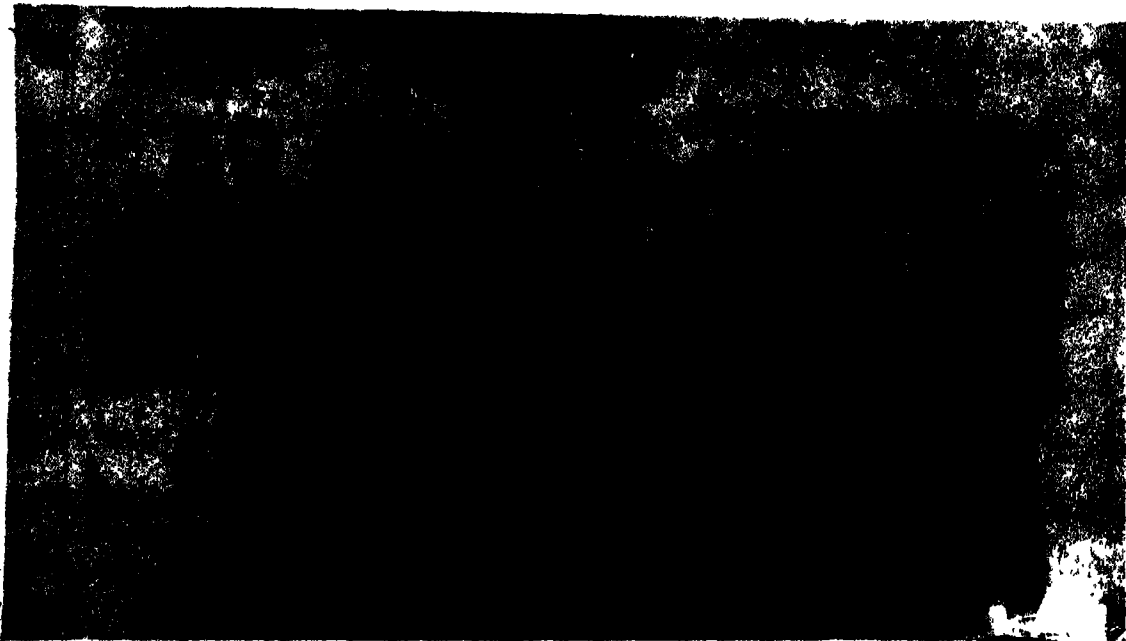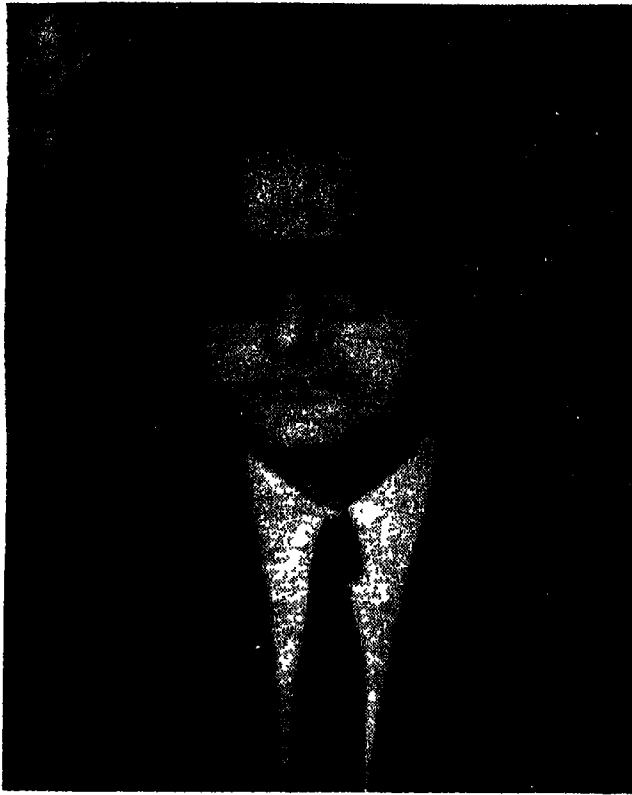
یوسف کامران، علی سردار جعفری، نجیب احمد، جگن ناتھ آزاد، محمد عبداللہ قریشی، قائم نقوی، قتیل شفائی، مرتضیٰ برلاس، حسن رضوی، ستار سید، اقبال ساجد

اظہر نیاز

شفقت ہاشمی

ہوائے تازہ

منیب افغانی

انجم ترازی

ماہِ نو
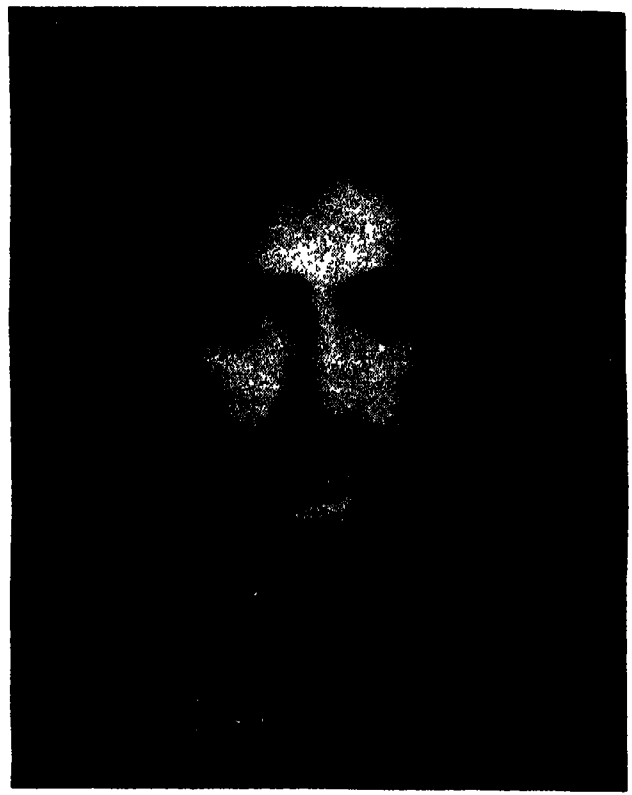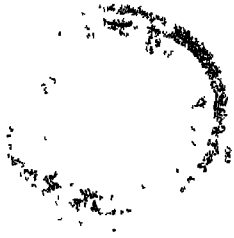
جو سامنے ہوتا ہے کوئی اور ہے شاید
جو دل میں ہے اک خوابِ ملاقات وہ تم ہو
ہاں مجھ پہ ستم بھی ہیں بہت وقت کے لیکن
کچھ وقت کی ہیں مجھ پہ عنایات وہ تم ہو

صہبا لکھنوی

بچوں کے ادب نمبر کا آغاز بچوں کی بنائی ہوئی تصویروں سے ہوتا ہے مصوّر اور تصویریں سکھ خیالی اور شوق کی بلندی کے ساتھ فضا کے حسن اور آزاد ہواؤں کے ساتھ پرواز کی خواہش کو رنگوں میں منتقل کر رہی ہے۔

اوپر کی تصویر کو گذشتہ برس کا اوّل انعام پنجاب کونسل آف آرٹس نے دیا تھا۔ اور منسلکہ صفحات پر نئے اُبھرتے ہوئے مصور سعدی کی تصاویر ہیں۔

بقول علامہ اقبالؒ یہ شاہین بچے ہمارا مستقبل ہیں۔
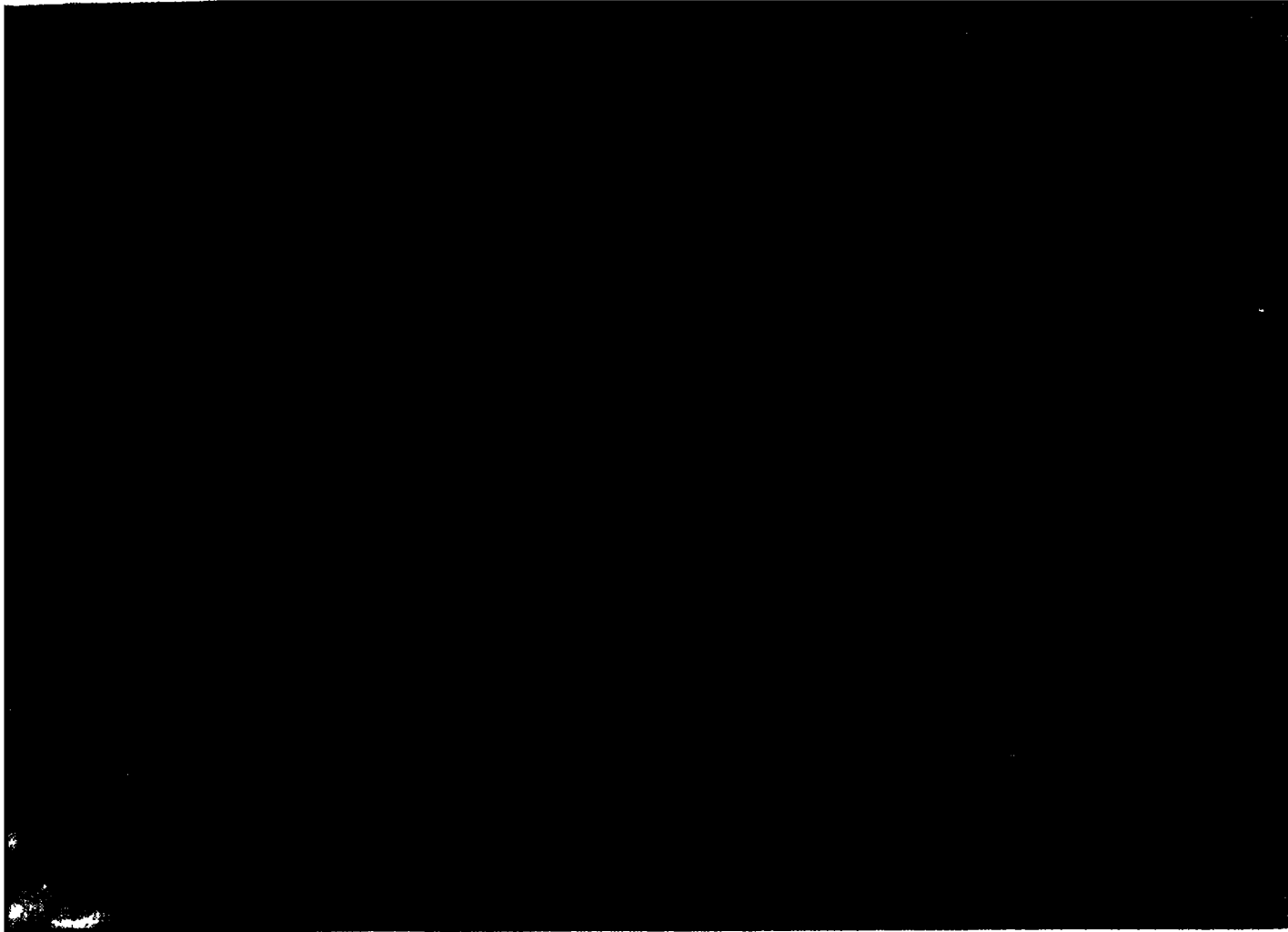
آج کا مصوّر

سعدی

آندھیوں میں چراغ روشن ہیں

جذبۂ تعمیر
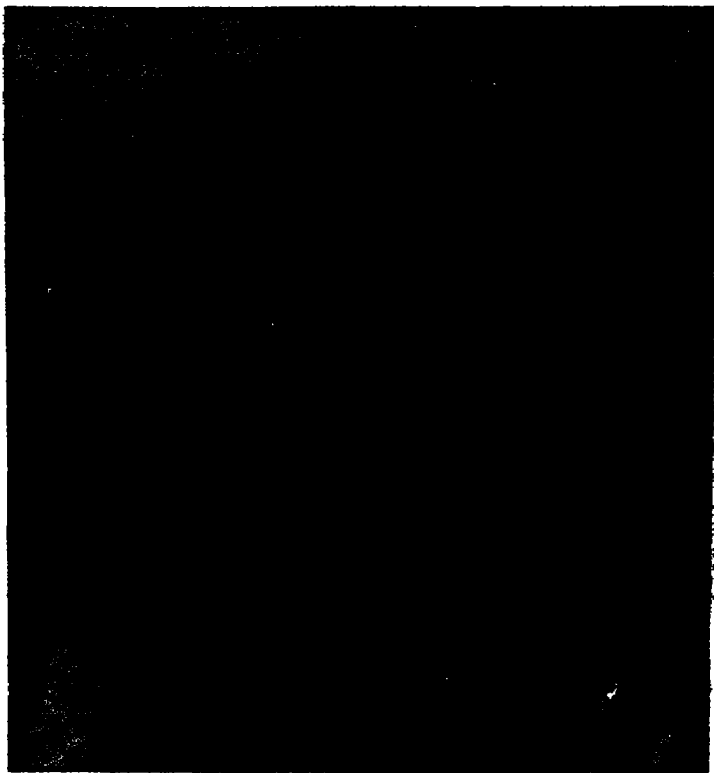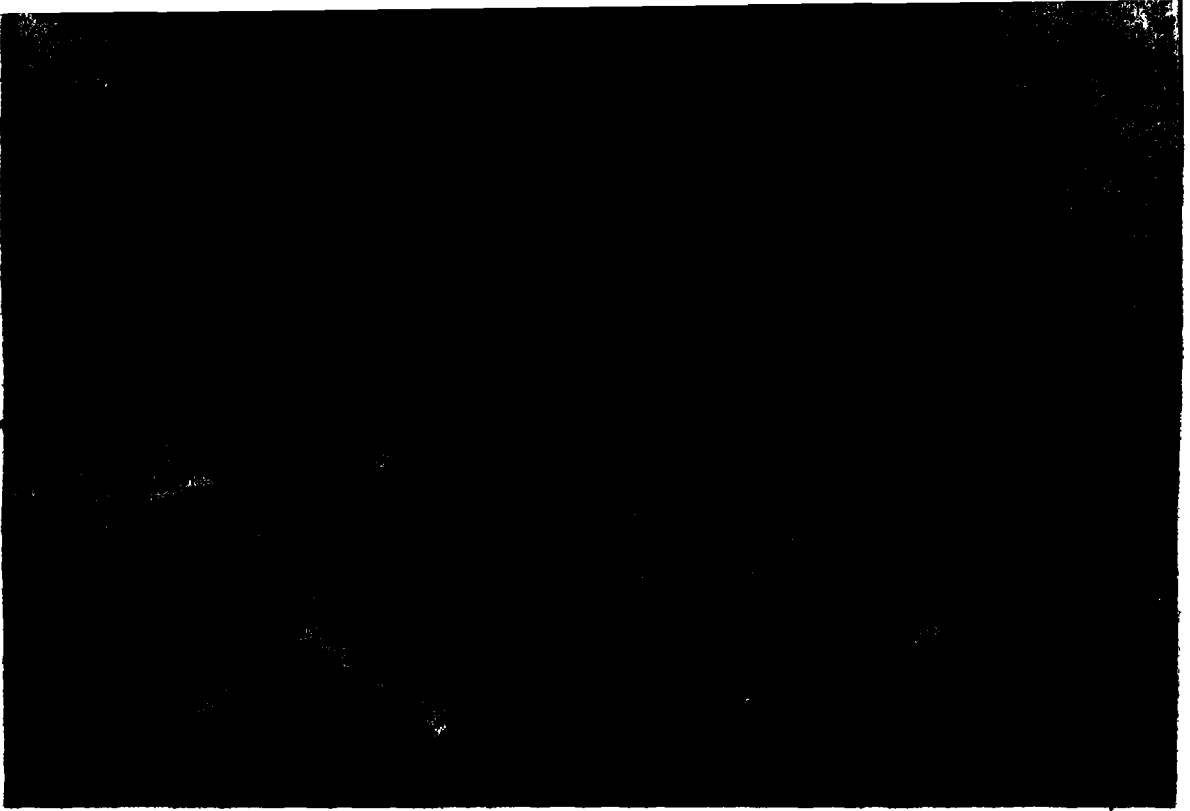
نومبر ۱۹۷۹ء

خصوصی شمارہ
بچوں کا ادب نمبر

قیمت خاص ۲ روپے

"بچے خدا کے خوشبودار پھول اور اس کی رحمت اور بخشش ہیں"
(حدیث نبوی)

ترتیب

نظمیں

کہانیاں

مضامین

سرورق —— زبیدہ آغا

آئندہ شمارے کی جھلکیاں

امیر حمزہ شنواری، رئیس امروہوی، ڈاکٹر وزیر آغا، شبنم رومانی، جمیل ملک، ڈاکٹر معروف، عالمتاب تشنہ، روشن نگینوی، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، روشن نگینوی، کامل القادری، احسن زیدی، نشاط نرگس، شائستہ حبیب، سعید احمد اختر، خلش مظفر، ریحان خاور، اسد مفتی۔

صدر مجلس ادارت
سید امجد علی

چیف ایڈیٹر
کشور ناہید

ایڈیٹر — علی محمود حسینی
جائنٹ ایڈیٹر — قائم نقوی

رجسٹرڈ نمبر ۸۱۱۱

جلد نمبر ۳۲ —— شمارہ نمبر ۱۱

طلباء کیلئے بلا رجسٹری فیس ۲۰ روپے
سالانہ چندہ مع رجسٹری فیس ۳۰ روپے

مطبوعات پاکستان نے دین محمدی پریس بل روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہِ نو ۳۲ اے حبیب اللہ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

چندا ماموں دور کے
بچوں کے لئے بڑے شاعروں کی نظمیں

صوفی تبسم

نعت
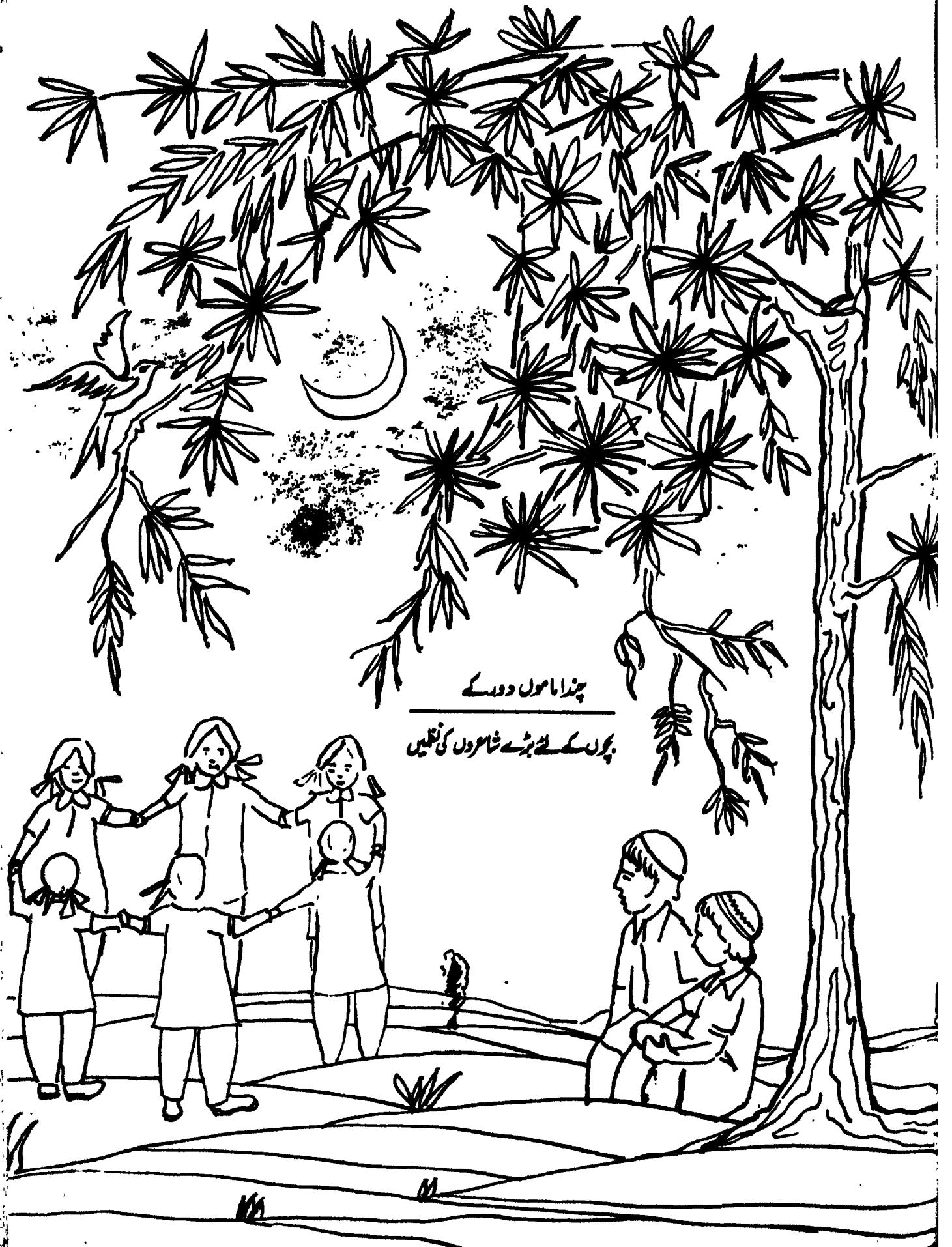
دل آرا محمدؐ ، ہمارا محمدؐ
ہے ہم سب کی آنکھوں کا تارا محمدؐ

ہمارا محمدؐ ، تمہارا محمدؐ
جہاں میں ہر اک کا سہارا محمدؐ

فقط ہم کو ہی سب سے پیارا نہیں ہے
خدا کو بھی ہے سب سے پیارا محمدؐ

اگرچہ ہیں سارے نبی ہم کو پیارے
مگر سب سے بڑھ کر ہے پیارا محمدؐ

ادھر آؤ بچو ، کہیں مل کے سارے
ہمارا محمدؐ ، ہمارا محمدؐ

قائداعظم

تیرے خیال سے ہے دل شادماں ہمارا
تازہ ہے جان ہر دم دل ہے جواں ہمارا

تیرے ہی کوششوں سے آزاد ہم ہوئے ہیں
خوشیاں ملی ہیں ہم کو دل شاد ہم ہوئے ہیں
آباد ہے تجھی سے یہ گلستاں ہمارا

ہم سو رہے تھے تو نے آکر ہمیں جگایا
پھرتے تھے ہم بھٹکتے رستہ ہمیں بتایا
تو رہنما ہمارا ، تو پاسباں ہمارا

تیرے ہی حوصلے سے ہم کو ملی ہے قوت
تیرے ہی آبرو سے قائم ہے اپنی عزت
چمکا ہے تیرے دم سے قومی نشاں ہمارا

ہم جو قدم اٹھائیں ، آتی ہے یاد تیری
ہم جس طرف بھی جائیں ، آتی ہے یاد تیری
تجھ سے رواں دواں ہے یہ کارواں ہمارا

غیر مطبوعہ کلام خود صوفی صاحب کی تحریر کا عکس

نومبر ۱۹۸۰

وکیس خوزنغ

اے اللہ

آئیے دعا مانگیں

اے خدا تیری رحمت ہمیں چاہیئے
ایک تیری عنایت ہمیں چاہیئے

یاد رکھیں سبھی تیرے فرمان ہم
ساری دنیا میں ہوں تیری پہچان ہم

اے خدا ایسی قسمت ہمیں چاہیئے

پھر ہدایت ترے در سے پایا کریں
سر کو تیرے ہی آگے جھکایا کریں

اے خدا اتنی عظمت ہمیں چاہیئے

علم جیسی کوئی اور نعمت نہیں
علم سے بڑھ کے دنیا میں دولت نہیں

اے خدا بس یہ دولت ہمیں چاہیئے

اے اللہ

اس دل کو چمکا دے اللہ
سیدھی راہ دکھا دے اللہ
محنت ہو پہچان ہماری
دنیا دیکھے شان ہماری
دیکھیں ہم کو چاند اور تارے
اپنے کرم سے دل میں ہمارے
سب کا پیار بسا دے اللہ

خدمت کو ہم عظمت جانیں
جتنے فرض ہیں ان کو مانیں
عادت سب سے اعلیٰ دیدے
نیکی کا اجیالا دے دے
یوں تقدیر بنا دے اللہ

سب کے لئے دن آئیں خوشی کے
پورے ہوں ارمان سبھی کے
بیکا اپنی رحمت کی گھٹائیں
ہر آنگن میں بہاریں آئیں
سارے پھول کھلا دے اللہ

وطن کا نغمہ

دنیا میں ہمیشہ پاک وطن آزاد رہے
—— اللہ کرے
اس پاک وطن میں جو کچھ ہے وہ شاد رہے
—— اللہ کرے

ہیں اپنے وطن کے سارے جواں
محنت کے لئے مشہور جہاں
ان لوگوں سے ہر ایک نگر آباد رہے
—— اللہ کرے

یہ دل نہ بھٹکنے پائے ذرا
ہر راہ گزر میں راہ نما
سرکار دو عالم کا کوئی ارشاد رہے
—— اللہ کرے

ہم سب ہیں برابر آپس میں
ہم سب ہیں برادر آپس میں
اللہ کے ہم سب بندے ہیں یہ یاد رہے
—— اللہ کرے

نئی آنکھیں نئے خواب

آنکھیں ہماری نئی نئی ہیں
خواب ہمارے نئے نئے
ہم دیکھیں تو ہو جاتے ہیں
سبھی نظارے نئے نئے

چڑیا چوں چوں کوئل کو کو
بادل برکھا جگنو خوشبو
پودے پنچھی پھول پھیرو
سارے کے سارے نئے نئے

ہوا سنائے نئی کہانی
نئی نئی سی فضا سہانی
نیا نیا سا بہتا پانی
ندی کنارے نئے نئے

خوشی کے دن ہیں خوشی منائیں
ہنسی کے دن ہیں ہنسیں ہنسائیں
انکل ہم کو گیت سکھائیں
پیارے پیارے نئے نئے

بچپن کے دن

یہ بچپن کے دن
یہ بچپن کے دن
گلوں کی طرح مسکرانے کے دن ہیں
دیوں کی طرح جگمگانے کے دن ہیں
یہ بچپن کے دن
یہ بچپن کے دن
ڈبیٹوں میں انعام پانا ہے ہم کو
کونٹسز میں بھی کپ جیت لانا ہے ہم کو
پڑھائی میں بھی فرسٹ آنے کے دن ہیں

ہنر سیکھتے ہیں، ادب سیکھتے ہیں
ذہانت بڑھانے کے ڈھب سیکھتے ہیں
یہی زندگی کو بنانے کے دن ہیں

بہت ہیں ہمیں علم ہی کے خزانے
جو دنیا کی باتیں وہ دنیا ہی جانے
ہمارے تو پڑھنے پڑھانے کے دن ہیں

موسم کا حال

سردی بھی اچھی
گرمی بھی اچھی
اچھی ہے برسات بھی
دن بھی اچھا رات بھی

سردی کیسی دھوم مچائے
ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے لائے
برف پہاڑوں پر برسائے

جب دنیا میں گرمی آئے
جس کو دیکھو ڈھونڈے سائے
چڑیا بھی تو چھپ چھپ جائے

شان عجب برسات دکھائے
اودے کالے بادل چھائے
رم جھم رم جھم رنگ جمائے

خاطر غزنوی

چند پہیلیاں

(۱)

سینے میں ہیں سب الفاظ
منہ پر ٹک ٹک کی آواز
انگلیوں کو پہچان کے یہ
کاغذ پر پھیلا دے راز
(ٹائپ رائٹر)

(۲)

دل نشیں گھنٹیاں بجاتی ہے
روز یہ وقت پر جگاتی ہے
وقت ہاتھوں سے یوں نکلتا ہے
دونوں ہاتھوں سے یہ دکھاتی ہے
(ٹائم پیس)

(۳)

اک گاڑی دو پہیوں والی
خود نہ چلے اور دوڑیں پہیے
پہیوں پر جادو کا فیتہ
جیسا سنے ویسا ہی بولے
(ٹیپ ریکارڈر)

(۴)

اک ننھا سا ساتھی ایسا
ہاتھ پکڑ کر ساتھ ہی جائے
ٹلے، جیسے دل کی دھڑکن
پل پل کا احساس دلائے
(ہاتھ کی گھڑی)

لوریاں

(۱)

مرے چاند
مُنّے
مرے دل کے ارمان آنکھوں کے تارے، نظر کے اُجالے
مرے لال
مُنّے
ـــ تو جلدی بڑا ہو کے تلوار اُٹھا لے
میں دل کو سنبھالے
اُسی دن کی ہوں منتظر
ـــ باپ کے خون کا بدلہ حریفوں سے لے
باپ دادا کی قبروں کو روشن کرے
ہائے مرے پیارے
میرے دل کے سہارے
مرے چاند
مُنّے

(۲)

مرے لال
مُنّے
اگر جنگ میں تو بھی کام آگیا
میں دلہن کی طرح سج کے عالم ترے نام پر گاؤں گی
ایک تجھ سا جیالا سپوت اور دوں گی جنم
(مجھ کو موت سے کیا واسطہ)
لے مرے لاڈلے
میرے دل کے سہارے
نظر کے اُجالے
مرے چاند مُنّے

بلوچی سے ترجمہ
عطا شاد ۔ ع سلام

(۳)

علم دین میرا مُنّا ہے
مرا مُنا بڑا ہو گا
کٹار اور ڈھال، بندوق اور ترکش سے سجا ہو گا
مرا مُنّا بڑا ہو گا
مرے مُنّے سا کوئی بھی نہ ہو گا شہسواری میں
وہ جب میدان میں آئے گا تو دشمن منہ کی کھائے گا
جواب اس کا نہ ڈھونڈے سے ملے گا رزم کاری میں
علم دین میرا مُنّا ہے
مرا مُنّا بڑا ہو گا
مرے بیٹے کی محبوبہ جو ہو گی پھول شہزادی
مرے بیٹے کی جرأت سے
مرے بیٹے کی عظمت سے
بہت ہی شادماں ہو گی
مرا مُنّا بڑا ہو گا

۱؎ شادی بیاہ میں گایا جانے والا گیت۔ ۲؎ موت کے سوگ میں گایا جانے والا گیت

شمس الرحمان فاروقی

مور نامہ

اس جنگل میں مور بہت ہیں
نیلے پیلے چھد ربہت ہیں
دن بھر موروں کی جھنکار
اونچے نیچے پیچ پکار
شیر میاں کو نیند نہ آئی
لے کر اک لمبی سی جمائی
لومڑی بی سے کہلایا
موروں کو کس نے بلوایا؟
مور تو کرتے شور بہت ہیں
اس جنگل میں مور بہت ہیں
نیلے پیلے چھد ربہت ہیں

رات کا آنگن چاندی جیسا
دن کا چہرہ تھالی جیسا
رات کے گھر میں کتنے گھوڑے
دن کے کپڑے کتنے جوڑے
مور کے کپڑے کیسے انوکھے
نیلے سرخ سنہرے سے
مور کی دم میں سونے کے چھلے
اس سے کہنا ہم سے بدل لے
بھورے سنہرے پروں کو کھولے
مور اُڑا تو سب یہ بولے
اس کے پر کمزور بہت ہیں
اس جنگل میں مور بہت ہیں
نیلے پیلے چھد ربہت ہیں

مُنّے کو جب مُنّا کہو

مُنّے کو جب مُنّا کہو
مُنّا کہے
سارس کہو چڑیا کہو
بھالو کہو، چیتا کہو
چیل کہو زیبرا کہو
ریشم سے بالوں سے ڈھکا
لاما کہو۔ اچھا چلو
جیراف بھی کہو لو مگر
مُنّے کو مُنّا مت کہو
مُنّا بڑا سا مرد ہے
دشمن تو بالکل زرد ہے

کتّا بلّی دلّی دور

ایک تھا کتّا ایک تھی بلّی
بلّی تھی وہ بڑی چبلی
نہ تھا وہ کتّا کم چالاک
سیدھی دم تھی بھیگی ناک
بچپن ہی سے دوست تھے دونوں
کھاتے پیتے لڑتے غوں غوں
بلّی نے دو چوہے پکڑے
کتّے نے دو چوزے رگڑے
کتّے کے تھے لمبے کان
بلّی سب کی خالہ جان
اک دن یوں ہی بولی بلّی
چلو جی ہم تم چلیں گے دلّی
کتّا بولا اچھا اچھا
دلّی جانا کام ہے میرا
ہیٹ لگایا پہنا کوٹ
چلے وہ لے کر دو اخروٹ
چلتے چلتے شام ہوئی ہے تو
کتّا بولا بس جی ٹھہرو
رات کو جنگل میں سوئے وہ
سوئے بھی کیا بس کھوئے وہ
صبح کو رستہ اور تھا لمبا
اُونچا چکنا جیسے کھمبا
ہلکے ہو کر وہ مسرور
ابھی ہے پیارے دلّی دور

مساچغتائی

نظم

میرے پیروں میں ننھے منے پیار کی اک زنجیر پڑی ہے

گویا اک تصویر کھڑی ہے

گھر سے باہر جاؤں تو محسوس کروں میں۔ کہ زنجیر پڑی ہے

گھر میں لوٹ کے آؤں تو محسوس کروں میں کہ زنجیر کڑی ہے

مُنّے! تیرا پیار بڑا ہے

پیار کا ہر اظہار بڑا ہے

اور میں تیرے پیار کے آگے ننھا مُنّا سا لگتا ہوں

تیرا منہ تکتا ہوں

دل ہی دل میں کہتا ہوں

میرے مولا پیار کی اس زنجیر کو میرے خوابوں کی تعبیر بنا دے

فردا کی توقیر بنا دے

دنیا کی تقدیر بنا دے

نذیر قیصر

بچوں کا بین الاقوامی گیت

عظیم لوگو!
ہمیں کھلونوں سے کھیلنے دو
ہماری ماؤں کو کارخانوں کی
چمنیوں کے دھوئیں میں، تحلیل ہوتے
کھانسی کی سیڑھیوں سے
قدم، قدم ــــ نیچے آتے دیکھو
کہیں سلگتے ہوئے دنوں میں
پگھلتی سڑکوں کی چھاتیوں پر
سیاہ بجری بچھاتے دیکھو
کہیں اندھیروں کی سلوٹوں میں
لرزتے ہاتھوں سے
جسم عریاں چھپاتے دیکھو
عظیم لوگو!
ہمیں کھلونوں سے کھیلنے دو
ہمارے ابّو کو جنگ کی آگ کے جہنم میں
بھیج کر، تالیاں بجاؤ
ترانے گاؤ
موت کا اجر جنت گم شدہ بتاؤ
ہماری ماؤں کے سر کی چادر
اداس قبروں پہ ڈال آؤ
عظیم لوگو!
ہمیں کھلونوں سے کھیلنے دو
ہمیں کھلونوں سے کھیلنے دو

ثروت حسین

تختی پر تختی

تختی پر تختی
تختی پر سایا
کس نے گرایا
ہم نے نہیں
تختی پر تختی
تختی پر لکھی
کس نے ہے رکھی
ہم نے نہیں
تختی پر تختی
تختی پر تارا
کس نے اُتارا
ہم نے اُتارا
تختی پر تارا
پھولوں سے پیارا
چندا سے پیارا

علی اکبر عباس

ہوا کی سیر

دانی نے اک دن سوچا
میرے بھی جو پر ہوتے
میں بھی ہواؤں میں اڑتا

اتنے میں امی لے آئیں
اک غبارہ بہت بڑا
اور غبارہ لیتے ہی
دانی کو محسوس ہوا
بنا پروں کے ہی جیسے
اوپر اوپر اڑنے لگا
ہوا میں ایسے اڑنے کا
اب آئے گا خوب مزا

اوپر تھے بادل پھیلے
نیچے منظر شہروں کا
اور زمیں پر لگتا تھا
جال بچھا تھا رنگوں کا
یوں ہی بنا اڑتے اڑتے
دانی ساتھی چڑیوں کا
اک چڑیا نے دانی کو
گچھا دیا انگوروں کا

دانی کو جو پیاس لگی
توڑا بادل کا ٹکڑا
کیسا اچھا بادل تھا
اتنا ٹھنڈا اور میٹھا
اتنے میں ہی شام ہوئی
اب سورج بھی ڈوب گیا
نکل پڑے اِک اِک کرکے
سارے تارے اور چندا

اب تو چاند ستاروں سے
دانی خوش ہوکر کھیلا
جی بھر کے جب کھیل چکا
یاد نہ تھا گھر کا رستہ
کیسے اب گھر جاؤں گا
یہ سوچا تو رونے لگا
روتے دیکھ کے اک تارا
دانی کو گھر لے آیا

پاس جو پہنچا امی کے
پھر خوش ہو کر بولا
میرے بھی جو پر ہوتے
میں بھی ہواؤں میں اڑتا

پودے

جو پودے ہم لگائیں گے
بڑھیں پھولیں گے اپنے ساتھ
اور پھل پھول لائیں گے

یہ اپنے پھول جیسے ہاتھ اُٹھا کر
دعائیں دیں گے خوشبو کی زباں سے
ہر اک موسم لئے تحفہ پھلوں کا
سدا اترے گا ان پر آسماں سے

یہ شاخیں جب ہیں جھولا جھلائیں
تو پتے زور سے تالی بجائیں
اور ان پر بیٹھنے والے پرندے
ہمارے ساتھ مل کر گیت گائیں

یہ رنگا رنگ تحفے ہیں زمیں کے
انہیں ہم سب حفاظت سے ہی رکھیں
انہیں کے دم سے ہر وادی حسیں ہے
سدا سارا وطن شاداب رکھیں

بچوں کے لئے تابلو

ابصار عبدالعلی

چندا ماما پیارے ماما

چندا ماما، پیارے ماما، صدیوں سے ہمیں بلاتے تھے
ہم گھر سے تو چل دیتے تھے، پر رستے میں کھو جاتے تھے
پھر چڑھ کر ایک پہاڑی پر
کہتے تھے: "او چندا ماما!
کیسے ہم تجھ تک آئیں بھلا
خود تو ہی دنیا میں آ جا"
چندا ماما، ہنس دیتے تھے اور بادل میں چھپ جاتے تھے
تھک تھک کے خود ہی گھر میں پڑ رہتے، تھالی میں رکھ کر کھاتے تھے
ہم کہتے تھے چندا ماما!
"ہم کو بھی دینا تھالی میں"
چندا ماما ہنس دیتے تھے
کہتے تھے: "لینا پیالی میں"
پھر کہتے تھے چندا ماما "جب پاس ہمارے آؤ گے
جو مانگو گے مل جائے گا، جو چاہو گے سو پاؤ گے
محنت سے لگا لو اپنے پر
اُوپر کی طرف اُڑتے آؤ!
اے دنیا میں بسنے والو
ہمت کر لو رستہ پاؤ!

ہم نے سوچا شاید پریاں دے دیں گی ہم کو اپنے پر!
جادوگر پر چپکا دے گا ہم اُڑتے جائیں گے سر سر
رستے میں بھوک ستائے گی
جن آئے گا، دیو آئیں گے
حلوا، پوری، برفی، لڈو
وہ ہم کو خوب کھلائیں گے
یہ باتیں ساری خوابوں کی اب سوچ سوچ کر ہنستے ہیں
جب راکٹ روسی امریکی چندا کی جانب چلتے ہیں
ہم کو جو خدا نے ذہن دیا
ہم اس کو کام میں لائے ہیں
سوچا، سمجھا، ایجادیں کیں
پھر راکٹ ہم نے بنائے ہیں
چھوڑے مصنوعی سیّارے، کُتیا کو خلا میں بھجوایا
ان سیّاروں نے تصویروں سے رازِ خلا کا سمجھایا
پھر ہمت کی انسانوں نے
چندا ماما کی طرف چلے
تھا نام اپالو آٹھ اُس کا
جس میں چندا تک جا پہنچے

ہم سب نے اتنا جان لیا، گو زیادہ دن ٹھہر سکتا نہیں.
چندا پہ کوئی رہتا ہی نہیں خالی ہی پڑی ہے اس کی زمین
بڑھیا اور چرخا دھوکا ہے
واں ایسی کوئی بات نہیں
بس دور تلک چٹیل میداں
اُونچی نیچی ہے جن کی زمیں
چندا کی زمین بھی چھو لی ہے وہ لمحہ آخر آ ہی گیا
صدیوں سے سفر یہ جاری تھا منزل کو آخر پا ہی لیا
نیکی، اُلفت اور حق گوئی
سب کچھ ہم کو پھیلانا ہے
چندا پہ ابھی کچھ بھی تو نہیں
سب ہم کو ہی لے جانا ہے
مکاری، جھگڑا، جھوٹ تو بس دنیا پر ایسے چھائے ہیں
ہم دنیا والے اسی لئے اس دنیا سے اُکتائے ہیں
اللہ ہمیں توفیق یہ دے
ہم چندا کو بھی سر کر لیں
اور اللہ کے ہر بندے کے
دل میں بھی اپنا گھر کر لیں

ایک تھا بادشاہ
بچوں کے لئے بڑے ادیبوں کی کہانیاں

فیض احمد فیض

اسکول میں پہلا دن

میری عمر تو جب آٹھ نو برس کی ہو گی لیکن اسکول میں میرا پہلا دن تھا، پہلے تین درجوں کی کتابیں گھر ہی پر پڑھ چکا تھا اور اس دن پہلے درجے میں نہیں چوتھے درجے میں داخلے کی تیاری تھی. شاید اسی سبب سے گھر کے لوگ مجھے اسکول بھجوانے کا ضرورت سے زیادہ اہتمام کر رہے تھے. سکول ہمارے گھر سے ذرا فاصلے پر تھا. اس لیئے اصطبل سے دو گھوڑوں والی فٹن نکلوائی گئی. جو ہمارے ابا سال میں صرف دو بار عیدگاہ جانے کے لیے استعمال کرتے تھے. پھر بڑی بہنوں نے لاڈ میں آکر مجھے بہت ہی بھڑکیلے اور پر تکلف کپڑے پہنائے جو عام طور سے شادی بیاہ کے موقعوں پر پہنائے جاتے تھے سرخ مخمل کا کوٹ اور نیکر، پیازی رنگ کے موزے، سفید جوتے ـــ یہ مجھے اس لیے یاد ہے کہ اس دن جو کچھ مجھ پر گذری اس میں زیادہ ہاتھ اسی لباس کا تھا ـــ

تو خیر اس باراتیوں کی سی وضع قطع میں ہم گاڑی میں بیٹھے ایک ملازم کتابیں اٹھائے ساتھ ہوا اور ہماری سواری اسلامیہ پرائمری سکول کی پرانی یک منزلہ عمارت کے سامنے جا کھڑی ہوئی. کچھ لڑکے جو اسکول کے باہر کھڑے تھے غل مچاتے ہوئے اندر کو بھاگے، ایک دو ماسٹر صاحبان ہڑبڑا کر باہر نکل آئے. میرا پہلے ہی کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا اس ہنگامے سے اور بھی اوسان خطا ہوئے ملازم کے پیچھے پیچھے بہت مری ہوئی چال میں سکول کے اندر قدم رکھا اور ہر طرف سے بے شمار آنکھیں یوں گھورتی ہوئی نظر آئیں جیسے کوئی چڑیا گھر کا جانور سکول میں آگھسا ہو. چوتھے درجے کے ماسٹر صاحب مجھے کمرے میں ساتھ لے گئے اور کہا ـ جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ. ہمارا شہر بھی غریب تھا اور یہ سکول بھی غریب، پڑھنے والے بھی غریب تھے، پڑھانے والے بھی. مٹی کے فرش پر کٹا پھٹا ٹاٹ بچھا تھا، اور اس پر ویسے ہی کٹے پھٹے کپڑوں والے بہت سے لڑکے بیٹھے تھے میں ان میں جا کر بیٹھا تو میرا جی چاہا کہ کوئی جن پری چپکے سے میرے سب کپڑے لے جائے اور مجھے اپنے ساتھیوں کا سا پھٹا پرانا پاجامہ لا دے، اور سارا دن میں فقرے اور پھبتیاں سنتا رہا اور میرے ہم جماعتوں کی آنکھوں سے طنز اور حقارت ٹپکتی رہی. جب مجھے محسوس ہوا کہ زرق برق لباس اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ سے اپنے یا اپنے گھر والوں کے مال و دولت کی نمائش کرنا بہت ہی گھٹیا اور ذلیل بات ہے اور جب سے مجھے ان چیزوں سے نفرت ہو گئی. مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ آدمی ٹھیک سے جبھی رہ سکتا ہے کہ اپنے ساتھیوں، ہمجولیوں، ہم وطنوں سے مل جل کر اور ان سا بن کر رہے. دوسروں سے الگ اور بڑھیا نظر آنے کا چاؤ ناپسندیدہ اور تکلیف دہ بات ہے.

احمد ندیم قاسمی

جلیبیاں

یہ آج سے کوئی ۴۰ سال پہلے کی بات ہے ہم گورنمنٹ سکول کیمبل پور میں جماعت پنجم کے طالب علم تھے۔ ایک دن گھر سے فیس اور فنڈ کے چار روپے لے کر سکول پہنچے تو پتہ چلا کہ آج فیس لینے والے ماسٹر غلام محمد چھٹی پر ہیں اور اور فیس کل لی جائے گی۔ دن بھر تو یہ چار روپے ہماری جیب میں چپ چاپ پڑے رہے۔ مگر جب ہم چھٹی کے بعد سکول سے نکلے تو یہ روپے بولنے لگے۔

ٹھیک ہے۔ روپے بولتے نہیں ہیں۔ بجتے ہیں یا کھنکتے ہیں مگر بھائی اس روز تو وہ بولے۔

ایک روپیہ کہنے لگا۔ "سوچتے کیا ہو؟ سامنے کی دکان پر کڑھاؤ میں سے جو تازہ تازہ جلیبیاں نکل رہی ہیں تو یہ یونہی تو نہیں نکل رہی ہیں۔ جلیبی کھانے کی چیز ہے اور اسے وہی لوگ کھاتے ہیں جن کی جیب میں روپے ہوتے ہیں اور روپے یونہی تو نہیں ہوتے روپیہ تو خرچ کرنے کی چیز ہے اور اسے وہی لوگ خرچ کرتے ہیں جنہیں جلیبیاں اچھی لگتی ہیں"

ہم نے کہا۔ "دیکھو بھائی چار روپو۔ ہم بڑے اچھے لڑکے ہیں۔ ہمیں گمراہ نہ کرو ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ گھر میں ہمیں اتنا کچھ کھانے کو مل جاتا ہے کہ بازار کی چیزوں کی طرف ہم دیکھنا تک گناہ سمجھتے ہیں۔ پھر تم ہماری فیس اور فنڈ کے روپے ہو۔ آج ہم تمہیں خرچ کر بیٹھیں گے تو کل سکول میں ماسٹر غلام محمد اور اس کے بعد قیامت میں اللہ میاں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ تم شاید نہیں جانتے کہ ماسٹر غلام محمد غصّہ ہو کر کسی کو بنچ پر کھڑا کرتے ہیں تو چھٹی کی گھنٹی تک اسے بٹھانا بھول جاتے ہیں۔ بہتر یہ کہ تم ہمارے کان نہ کھاؤ اور ہمیں سیدھا گھر جانے دو۔"

روپوں کو ہماری یہ بات اتنی بری لگی کہ سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ ایک دم اتنا شور مچا کہ بازار میں سے گزرنے والے لوگ ہماری طرف اور ہماری جیب کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ ان دنوں کا روپیہ کم بجتا بھی بہت زیادہ تھا۔ آخر گھبرا کر ہم نے چاروں روپوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا تو وہ چپ ہو گئے۔

چند قدم چلنے کے بعد ہم نے اپنی انگلیوں کو ڈھیلا کیا تو سب سے پرانا روپیہ بولا۔ "ہم تو تمہارے بھلے کی بات کر رہے ہیں۔ مگر تم ہو کہ ہمارا ٹینٹوا دبائے بیٹھے ہو۔ سچ سچ بتاؤ کیا تازہ تازہ گرم گرم جلیبیاں کھانے کو تمہارا اپنا جی نہیں چاہ رہا ہے؟ پھر اگر آج تم ہمیں خرچ کر بیٹھو گے تو کیا کل تمہیں وظیفے کی رقم نہیں ملے گی؟ فیس کے روپوں کی مٹھائی کھا لو۔ وظیفے کے روپوں کی فیس ادا کر دینا۔ قصہ ختم پیسہ ہضم۔"

ہم نے کہا۔ "تم جو بات کہہ رہے ہو وہ ٹھیک بات نہیں ہے مگر کچھ ایسی غلط بات بھی نہیں ہے۔ ایک بات مانو۔ تم اپنی بک بک بند کرو اور ہمیں ذرا دیر تک سوچنے دو۔ ہم کوئی ایسے ویسے لڑکے نہیں ہیں۔"

پرانا روپیہ بولا۔ "ٹھیک ہے۔ تم ایسے ویسے لڑکے نہیں ہو مگر یہ مت سمجھو کہ یہ جلیبیاں بھی کوئی ایسی ویسی جلیبیاں نہیں ہیں۔ تازہ ہیں اور میٹھے میٹھے رس سے بھری ہوئی ہیں۔"

منہ میں پانی تو بھر آیا مگر ہم اس سیلاب میں آسانی سے بہہ جانے والے نہیں تھے۔ سکول میں ہم بڑے ہونہار بچوں میں گنے جاتے تھے۔ چوتھی جماعت کے امتحان میں ہم نے چار روپے مہینے کا وظیفہ بھی جیتا تھا۔ پھر ہم ایک خاصے کھاتے پیتے گھر سے سکول آتے تھے۔ اس لیے ہمارے بڑے ٹھاٹ تھے۔ اب تک کبھی پٹے نہیں تھے بلکہ ماسٹر جی نے کئی لڑکوں کو ہم سے پٹوایا تھا۔ اتنے رعب داب والا بچہ بازار میں کھڑے ہو کر جلیبیاں کھانے لگے؟ نہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ روپوں کو ہم نے مٹھی میں دبایا اور گھر آ گئے۔

اس روز روپوں کو خرچ ہونے کا ایسا شوق تھا کہ باتیں کرتے کرتے ان کی آوازیں بھرّا گئیں۔ ہم گھر جا کر پلنگ پر بیٹھے تو وہ بلبلانے لگے۔ ہم کھانا کھانے چلے تو وہ چیخنے لگے۔ ہم نے بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلنا شروع کیں تو وہ رونے لگے۔ تنگ آ کر ہم اٹھے اور ننگے پاؤں بازار کی طرف بھاگ نکلے۔ گھبرائے ہوئے تو تھے ہی۔ حلوائی کو اکٹھی ایک روپے کی جلیبیاں تولنے کو کہہ دیا۔ حلوائی نے حیران ہو کر ہماری طرف یوں دیکھا جیسے وہ پوچھ رہا ہے کہ اتنی جلیبیاں لادنے کے لیے ریڑھی کہاں ہے؟ وہ بڑا استاد نادر تھا۔

ایک روپے کی آٹھ جلیبیاں ملتی تھیں، جو اب دس روپے
میں بھی نہ ملیں۔ اس نے ایک پرانا اخبار رکھ دیا اور اس پر
جلیبیوں کا ایک ڈھیر لگا دیا۔

ابھی ہم یہ ڈھیر سمیٹ ہی رہے تھے کہ دور سے ہمیں
اپنا تانگہ آتا دکھائی دیا۔ چچا جان کچہری سے واپس آ رہے
تھے۔ ہم جلیبیوں کے ڈھیر کو سینے سے چمٹائے ایک گلی
میں بھاگ نکلے۔ ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر ہم نے جلیبیاں کھانا
شروع کیں تو اتنی کھائیں، اتنی کھائیں کہ اگر اس وقت کوئی
ہمارے پیٹ کو ذرا سا دبا دیتا تو جلیبیاں ہمارے کانوں
اور نتھنوں میں سے نکل پڑتیں۔

گلی میں محلے بھر کے لڑکے جمع ہو گئے اور آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ہم سیر تو ہو ہی چکے تھے، اس لیے
موج میں آ گئے اور ایک ایک جلیبی ان کو بھی تھما دی وہ خوش
ہو کر دعا دیتے اور چیختے ہوئے ادھر ادھر گلیوں میں بھاگ
گئے، مگر شاید انہوں سے یہ خوشخبری سن کر نئے بچے آ نکلے ہم
نے لپک کر حلوائی کی دکان سے ایک اور روپے کی جلیبیاں خریدیں
اور واپس آ کر ایک مکان کے چبوترے پر کھڑے ہو کر بچوں
میں یوں بانٹ دیں جیسے یوم آزادی پر گورنر صاحب غریبوں
مسکینوں میں چاول بانٹا کرتے تھے۔ اب تک ہمارے ارد گرد
بچوں کا ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا اور گداگروں نے
بھی ہلہ بول دیا تھا۔ اگر بچے بھی اسمبلی کے ممبر بن سکتے تو
اس دن ہماری کامیابی یقینی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ ہجوم ہمارے
جلیبی والے ہاتھ کے ایک ذرا سے اشارے پر مرنے مارنے
کو تیار ہو جاتا کہ ہم نے باقی دو روپوں کی بھی جلیبیاں خرید کر
بانٹ دیں۔ اس کے بعد نل پر آ کر ہاتھ منہ دھوئے اور یوں
معصوم صورت بنائے گھر واپس آ گئے جیسے ہم نے جلیبی کی
صورت عمر بھر نہیں دیکھی۔

جلیبیاں تو ہم نے کھا لیں مگر انہیں ہضم کرنا مشکل ہو گیا
ہر سانس کے ساتھ ڈکار رہا تھا اور ہر ڈکار کے ساتھ
ایک آدھ جلیبی کے باہر نکل پڑنے کا ڈر سا لگا رہتا تھا
کے بعد مارے باندھے کھانا بھی کھانا پڑ گیا۔ اگر نہ کھاتے تو نہ
کھانے کی وجہ پوچھی جاتی اور اگر بیماری کا بہانہ کرتے تو ڈاکٹر
بلا لیا جاتا اور اگر ڈاکٹر ہماری نبض دیکھ کر کہہ دیتا کہ مثلاً
جلیبیوں کا ایک ڈھیر ڈکارے پڑا ہے تو جان پر بن آتی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ساری رات پیٹ کے درد کے مارے
جلیبی بنے پڑے رہے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ چار روپوں
کی جلیبیاں ہمیں کو نہیں کھانا پڑی تھیں، ورنہ دوسرے بچے
تو جب باتیں کرتے ہیں تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں
ہم دنیا کے پہلے بچے ہوتے جس کی ہر بات پر اس کے منہ
میں سے ایک تلی تلائی جلیبی ٹپک پڑتی۔

بچوں کے معدے نہیں ہوتے، ہاضمے کی مشینیں ہوتی
ہیں سو صبح تک ہماری مشین بھی چالو رہی اور ہم روز کی
طرح منہ دھو کر ایک چاق و چوبند طالب علم کی طرح اسکول کی
طرف چلے۔ ہمیں معلوم تھا کہ آج پچھلے مہینے کا وظیفہ مل
جائے گا اور اس رقم سے فیس ادا کر کے ہم جلیبیوں کو پوری
طرح ہضم کر لیں گے۔ مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ اس مہینے کا
وظیفہ تو اگلے مہینے کے پہلے آئیگا۔ ایسا لگا جیسے ہم سر کے بل
کھڑے ہیں اور اب چاہیں بھی تو پاؤں کے بل کھڑے نہیں
ہو سکتے۔

ماسٹر غلام محمد نے بتایا کہ تفریح کے گھنٹے میں فیس لی جائے
گی۔ تفریح کی گھنٹی بجی تو ہم بستہ بغل میں دبائے اسکول سے
نکلے اور ناک کی سیدھ میں یوں چلنے لگے جیسے اگر ہماری راہ
میں کوئی پہاڑ یا دریا نہ آیا تو ہم ہمیشہ چلتے رہیں گے اور جب ہم
وہاں پہنچیں گے جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے اور آسمان شروع
ہو جاتا ہے تو وہاں اپنے اللہ میاں سے کہیں گے کہ اللہ میاں
اب سے ہماری توبہ، ہمیں اپنے پاس بلا لیجئے اور کسی فرشتے
کو حکم دیجئے کہ وہ ہماری جیب میں صرف چار روپے ڈال
جائے۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ان چار روپوں سے
فیس ہی ادا کریں گے، جلیبیاں نہیں اڑائیں گے۔

ہم وہاں تو نہ پہنچ سکے جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے
ہاں وہاں ضرور پہنچ گئے جہاں سے کیمبل پور ریلوے اسٹیشن
شروع ہو جاتا ہے۔ بزرگوں نے ہمیں بتا رکھا تھا کہ ریل کی
پٹڑی پر سے نہیں گزرنا چاہیے اس لیے ہم وہیں پٹڑی کے
پاس رک گئے، ٹھیک ہے۔ بزرگوں نے ہمیں یہ بھی بتا رکھا تھا
کہ فیس کے روپوں سے مٹھائی نہیں کھا لینی چاہیے مگر نہ
جانے اس دن یہ بات ہمارے ذہن سے کیوں نکل گئی تھی۔

ریل کی پٹڑی کے پاس ایک سایہ دار درخت تھا۔ ہم وہاں
بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ کیا اس دنیا میں ہم سے زیادہ
بدنصیب بچہ بھی کوئی ہو سکتا ہے! شروع شروع میں جب
معدے نے ہماری جیب میں شور مچایا تھا تو ساری بات
کتنی سیدھی سادی لگتی تھی۔ یہی کہ فیس کے روپوں کی مٹھائی
کھا جاؤ اور کل سکول سے وظیفہ لے کر سکول ہی میں
فیس ادا کر ڈالو۔ ہم نے سوچا تھا کہ دو اور دو ہمیشہ
چار ہوتے ہیں، پانچ کبھی نہیں ہو سکتے۔ ہمیں کیا پتہ تھا
کہ کبھی کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمیں پتہ ہوتا کہ وظیفہ
اگلے مہینے ملے گا تو جلیبیاں کھانے کا پروگرام بھی اگلے
مہینے پر ٹال دیتے۔ اب ذرا سی جلیبیاں کھا لینے کے جرم
میں ہم زندگی میں سکول سے پہلی بار غیر حاضر ہوئے تھے۔
اور یہاں ریلوے اسٹیشن کے ایک سنسان گوشے میں ایک
درخت کے نیچے سکڑے بیٹھے تھے۔

درخت کے نیچے بیٹھنے کے بعد پہلے تو ہمیں تھوڑا سا
رونا آیا۔ پھر یہ سوچ کر ہمیں ہنسی آ گئی کہ یہ جو ہم آنسو
بہا رہے ہیں تو یہ آنسو نہیں ہیں جلیبیوں کے رس
کے قطرے ہیں۔ جلیبیوں سے ہمیں فیس اور فیس سے

ماسٹر غلام محمد کا ڈنڈا اور ماسٹر غلام محمد کے ڈنڈے سے خدا یاد آ گیا۔ ہم نے آنکھیں بند کر لیں اور بڑی رقت کے ساتھ دعا مانگنے لگے۔

"اے اللہ میاں، ہم بڑے نیک لڑکے ہیں۔ ہمیں پورا نماز یاد ہے۔ قرآن مجید کی آخری دس سورتیں بھی ازبر ہیں آپ چاہیں تو ہم سے پوری آیۃ الکرسی ابھی ابھی سن لیجئے عرض فدوی کی یہ ہے کہ یہ جو ہم نے فیس کے روپوں کی جلیبیاں کھا لی ہیں تو چلیے، ہم مانے لیتے ہیں کہ ہم سے غلطی ہو گئی۔ ویسے ہم نے یہ جلیبیاں اکیلے نہیں کھائیں۔ اتنے بہت سے بچوں کو کھلائی ہیں لیکن خیر۔ ہو گئی غلطی اگر ہمیں یہ پتہ ہوتا کہ وظیفہ اگلے مہینے ملے گا تو ہم جلیبیاں نہ کھاتے نہ کھلاتے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب آپ یوں کیجئے کہ ہمارے بستے میں چار روپے رکھ دیجئے۔ چار روپوں سے ایک پیسہ بھی زیادہ ہوا تو ہم روٹھ جائیں گے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ہم نے فیس کی رقم سے پھر کبھی مٹھائی کھائی تو جو چور کی سزا وہ ہماری سزا۔ سو اللہ میاں بس آج ہماری مدد فرما دیجئے۔ آپ کے خزانے میں کس چیز کی کمی نہیں۔ ہمارا چپڑاسی تک ہر مہینے پندرہ بیس روپے لے جاتا ہے تو اللہ جی۔ ہم تو آخر ایک بڑے افسر کے بھتیجے ہیں کیا آپ ہمیں چار روپے بھی نہیں دیں گے؟"

دعا کے بعد ہم نے نماز، آخری دس سورتیں، آیۃ الکرسی کلمہ طیبہ، غرض وہ سب کچھ پڑھ ڈالا جو ہمیں یاد تھا پھر ہم نے اپنے بستے پر "چھو" کی اور جب بسم اللہ کہہ کر بستہ کھولا تو سچ ہی کہا تھا کسی نے۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ بستے میں چار روپے چھوڑ چار پیسے بھی نہیں تھے۔ بس چند کتابیں اور چند کاپیاں تھیں۔ ایک پنسل تھی۔ ایک پنسل تراش تھا اور ایک پرانا عید کارڈ تھا جو ہمارے ماموں نے ہمیں پچھلی عید پر بھیجا تھا۔

زور زور سے رو دینے کو جی چاہتا مگر پھر خیال آیا کہ سکول میں چھٹی ہو گئی ہو گی اور بچے گھر جا رہے ہوں گے۔ ہم تھکے ہارے وہاں سے اٹھے اور بازار میں آ کر سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجنے کا انتظار کرنے لگے تاکہ بچے نکلیں تو ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گھر یوں پہنچیں جیسے سیدھے سکول سے آ رہے ہیں۔

ہمیں یہ خیال بھی آیا کہ ہم جلیبیوں والے حلوائی کی دکان کے پاس کھڑے ہیں۔ اچانک حلوائی کی آواز آئی "کیوں بھئی، تو لوں ایک روپے کی؟ کیا آج جلیبیاں نہیں کھاؤ گے؟"

جی میں آئی اس سے کہہ دیں کہ جلیبیاں تو خیر نہیں کھائیں گے۔ ہاں آج ہم تمہارا کلیجہ بھون کر کھانا چاہتے ہیں۔ مگر اس روز ہماری طبیعت کچھ میلی سی ہو رہی تھی۔ اس لیے آگے بڑھ گئے۔

دوسرے دن بھی ہم نے یہی کیا گھر سے تیار ہو کر نکلے سکول کے گیٹ تک آئے اور وہاں سے ریلوے سٹیشن پر آ نکلے اسی درخت کے نیچے بیٹھ کر وہی دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ بار بار عرض کیا "اللہ میاں۔ آج تو دے دیجئے۔ آج تو دوسرا دن ہے۔"

پھر کہا۔ "اچھا تو آئیے ایک مزے کا کھیل کھیلیں ہم یہاں سے اس سگنل کی طرف چلے جاتے ہیں۔ آپ چپکے سے اس بڑے سے پتھر کے نیچے چار روپے رکھ جائیے۔ ہم سگنل کو چھو کر واپس آئیں گے اور یہ پتھر اٹھا کر دیکھیں گے تو نیچے چار روپے پڑے پا کر لطف آ جائے گا تو پھر تیار ہو جائیے ہم چلے سگنل کی طرف۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔"

ہم سگنل تک گئے، مسکراتے ہوئے واپس آئے مگر وہ پتھر اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اگر نیچے سے "۔۔۔ نکلے تو" پھر سوچا اگر نکل پڑے تو ؟ ———

آخر ہم نے بسم اللہ کہہ کر پتھر کو ذرا اٹھایا کہ نیچے سے ایک یہ لمبا کالا بھجنگا بل کھاتا ہوا اٹھا اور ہماری طرف لپکا۔ ہم چیخ مار کر بھاگے اور ایک بار پھر سگنل کو چھو کر پھر کچھ دیر کے بعد پنجوں کے بل چلتے ہم درخت کے نیچے پہنچے۔ پوری کوشش کی کہ ہماری نظریں اس پتھر کی طرف نہ اٹھیں مگر جب ہم وہاں سے بستہ اٹھا کر چلے تو پتھر کی طرف ایک بار دیکھنا ہی پڑ گیا اور پتہ ہے۔ وہاں ہم نے کیا دیکھا؟ ہم نے دیکھا کہ کیڑا صاحب پتھر کے اوپر کنڈلی مارے بیٹھے ہیں اور ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس کے بعد ہم وہاں سے یہ سوچ کر چلے کہ کل وضو کر کے اور صاف کپڑے پہن کر یہاں آئیں گے اور صبح سے دوپہر تک نمازیں ہی پڑھتے رہیں گے۔ اس پر بھی خدا نے ہمیں چار روپے نہ دیئے تو کسی سے جیب کاٹنے کا طریقہ سیکھیں گے۔ آخر ہمیں چار روپے ہمارا خدا نہیں دے گا تو اور کون دیگا چچا جان کو چار روپے دینے تھے وہ تو ہمیں دے چکے اب خدا کے سوا ہمارا کون ہے۔

مگر اس دن ہم ظاہر میں سکول سے اور اصل میں ریلوے سٹیشن سے گھر واپس پہنچے تو کچھ اور ہی دیکھنے لگے۔ سکول سے ہماری غیر حاضری کی رپورٹ پہنچ چکی تھی۔ یہ بتانا فضول ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ اس کے بعد وہی ہوا جو ہوتا ہے یعنی ایک کے دو دو دکھائی دیتے ہیں اور دن کو تارے نظر آنے لگتے ہیں۔

وہ تو جو ہوا سو ہوا لیکن ساتویں آٹھویں جماعت تک ہم یہی سوچتے رہے کہ اگر اس روز اللہ میاں ہمیں چار روپے بھجوا دیتے تو کسی کا کیا بگڑ جاتا۔ اس کے بعد ہی ہم اس نتیجے تک پہنچے کہ اگر اللہ میاں یونہی مانگنے پر دے دیا کرتے تو انسان آج بھی چیل کوؤں کی طرح درختوں میں گھونسلے بنائے بیٹھے ہوتے اور اب تک انھوں نے جلیبی بنانے کا فن بھی نہ سیکھا ہوتا۔

خدیجہ مستور

ضد کا انجام

بچو یہ یقین کرو کہ کبھی میں بھی تمہاری طرح ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت شریف بچے ہو گے — مگر میں اب تمہیں کیا بتاؤں مجھے تو اپنے بچپن کی شرافت پر شبہ ہے۔ ہاں تو میں اسی بچپن کا قصہ سناتی ہوں۔ پر وعدہ کرو کہ یہ کہانی پڑھنے کے بعد اگر تم مجھ سے ملو تو ہنسو گے نہیں۔ رہی نا پکی بات؟ اچھا تو اب سنو۔

ہم اس جگہ پر نئے نئے آئے تھے۔ میں سخت اداس تھی۔ طبیعت اوبھی اوبھی ہو رہی تھی۔ بس یہی جی چاہ رہا تھا کہ کس طرح اپنی پرانی جگہ پر واپس چلے جائیں۔ مجھے اپنے ساتھ کھیلنے والے بے طرح یاد یاد آ رہے تھے۔ بھلا یہ بھی کوئی جگہ تھی جہاں اونچے اونچے درخت اپنے پتوں کی چھتریاں تانے کھڑے تھے اور گھر کی دیواروں پر موٹے موٹے بندر چھلانگیں مارتے پھرتے۔ پہلی جگہ پر بندر بھی تھے مگر کبھی کبھار دکھائی دے جاتا یہاں تو سڑکوں پر انسانوں کے ساتھ گھومتے پھرتے اتنے بہت سے بندر دیکھ کر میرا تو خوف سے برا حال ہو گیا تھا ابا میاں اور امی میرا خوف دور کرنے کی کوشش کرتے میں بھی خود کو بہت بہادر بنانا چاہتی مگر جیسے ہی بندر آنکھیں اور پیشانی مٹکاتے آتے میں دوڑ کر کمرے میں چھپ جاتی اور پھر کئی کئی گھنٹے گزر جاتے اور میں باہر نہ نکلتی۔

آخر ایک دن بڑی جدوجہد کے بعد ابا میاں نے ایک چھوٹا سا بندر پکڑ لیا اور اس کے گلے میں رسی باندھ کر گھر میں لے آئے۔ ابا میاں نے منہ دیکھنے کو اسے آئینے کا ایک ٹکڑا دیا۔ بندر نے ایسے مزے میں آنکھیں مٹکا مٹکا کر آئینہ دیکھا ہے کہ میں ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ اس کے بعد ابا میاں نے بندر کو چھونے کی دعوت دی۔ میری دوسری بہنوں اور بھائی نے جھٹ سے بندر کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ سب سے آخر میں ابا میاں کی ضد پر میں نے بندر کے سر پر انگلی چھوائی اور اس طرح ہاتھ کھینچا جیسے بھڑ نے اسے ڈنگ مار دیا ہو۔ میری بہنیں مجھے ڈرپوک کہہ کر مذاق اڑانے لگیں۔ تم لوگ ہو گی ڈرپوک میں نے دل کڑا کر کے بندر کے پورے سر پہ ہاتھ پھیر دیا۔ ابا میاں نے زور سے شاباش دی۔ میری بہنیں مجھ سے بازی لے جانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ اس بندر کو پال لیا جائے۔ اپنی بہنوں کے خلاف میرا دل نفرت سے بھر گیا۔ میں کچھ کہتی کہ اماں بول پڑیں۔

"توبہ میں اس کو ہرگز نہ پالوں گی، صبح صبح منحوس صورت دکھائی دے گی تو دن کیا خاک اچھا گزرے گا، اور پھر اس کے یار دوست بھی اس سے ملنے آئیں گے، تو بندروں کا گھر ہو جائے گا!"

میرا خیال ہے کہ اس طرح بچوں کے دل سے یہ بیکار خوف دور ہو جائے گا۔ ابا میاں نے بندر کے گلے کی رسّی کھول دی اور وہ چھلانگیں مارتا دروازے پر چڑھ گیا پھر کود کر سائبان پر پہنچا اور ذرا ہی دیر میں چھت پر غائب ہو گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔!

میرے بھائی بہنوں کو بندر خاصے دلچسپ لگے وہ اب ان سے ڈرتے بھی نہ تھے۔ جہاں کوئی بندر صحن میں کودتا سب اس کے پیچھے دوڑتے۔ وہ بڑے زور سے خوخیاتا اور سب اس کی نقل کرتے۔ سارا دن شور مچتا رہتا۔ بندر کی حرکتیں اب مجھے بھی اچھی لگی تھیں مگر خوف دور نہ ہوا تھا۔ بندر دیکھتے ہی کمرے کا رخ کرتی۔ اس وقت اپنی پرانی جگہ کی یاد ستاتی۔ کتنے بہت سے بچے جمع ہو جاتے تھے۔ مزے سے گلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلتے۔ کبڈی میں نئی نئی ترکیبیں

گھر میں ایک ڈانٹ پڑتی کہ کیوں نیچے بچوں سے کھیلتی ہے۔ اماں ہمیشہ ناراض رہتیں۔ ابامیاں مجھے جلانے کے لئے میری دوسری بہنوں کو پیار کرتے ان کی تعریفیں ہوتیں مگر میرے کان پر جوں نہ رینگتی۔ جس بات سے منع کیا جاتا وہ بڑا کر کرتی۔

نئی جگہ پر کئی بار ہمت کر کے باہر نکلی۔ کھیلنے والے بچوں کا دور دور پتہ نہ تھا۔ بس جدھر دیکھو بندر حضرات انکلیں پیلے تشریف لے چلا رہے ہیں۔ مارے ڈر کے پھر گھر میں بھاگنا پڑتا۔

نیچے رہتے تو تھک کر بندروں سے ہی سمجھوتہ کر لیا اب میں بھی سب کے ساتھ شور مچاتی۔ بندر کو سلام کرتی تو وہ بھی سلام کرتا۔ ہاتھ اٹھاتی تو وہ بھی ہاتھ اٹھاتا۔ منہ چڑاتی تو وہ بھی پیچھے نہ رہتا۔ ہنستی تو وہ بھی دانت نکال دیتا۔ کتنی دیر وہ ہماری دیواروں اور صحن میں بیٹھے اپنے جسم کھجایا کرتے، بندریا اپنے پیٹ سے چپکے ہوئے بچے کو اپنے آگے رکھ کر اس کی جوئیں دیکھتی اور جب دھوپ میں اس کا جسم جلتا تو بڑے مزے سے بچے کو مونڈھے کی طرح اپنے نیچے رکھ کر بیٹھ جاتی۔ بچہ اس زور سے چیں چیں کرتا کہ توبہ۔ بندریا پھر اسے پیٹ سے چپکا لیتی۔ اور چھلانگیں مارتی غائب ہو جاتی۔ میں سمجھ جاتی کہ اب یہ کسی سایہ دار درخت کی تلاش میں گئی ہے۔

بندروں نے جہاں مجھے اور سب بچوں کو بہلا دیا تھا وہاں اماں کے لئے دردِ سر بھی بنے ہوئے تھے۔ ذرا دیر کو باورچی خانے کا دروازہ کھلا رہ جاتا تو بندر حضرات ہر چیز اٹھا کر دیواروں پر جا بیٹھتے۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی ہم لوگ کمرے کا دروازہ بند کر لیتے ورنہ خطرہ تھا کہ وہ ہمیں کرسیوں سے اٹھا کر خود بیٹھ جائیں گے۔

امی اور ابا نے پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔ ابا نے بتایا تھا کہ یہاں سے کچھ دور ایک بڑا خوبصورت تالاب ہے جس کے آس پاس اتنے خوبصورت اور گھنے درخت ہیں کہ آسمان نہیں دکھائی دیتا۔ وہاں ہرن کا شکار بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ نئی جگہ آنے کے بعد یہ پہلا پروگرام تھا جو مجھے باہر لے جا سکتا تھا۔ میں خوشی میں دیوانی ہو رہی تھی۔ کبھی ایک فراک نکالتی کہ اسے پہن کر جاؤں گی، اور کبھی دوسری۔ اور آخر مجھے وہ فراک پسند آئی جو خاص عید کے لئے بنی تھی جس دن سب تیار ہوئے تو میں نے بھی وہی فراک پہن لی۔ اماں نے سمجھایا کہ یہ تو عید کے لئے بنی ہے میں بھلا اعتراض کس طرح برداشت کرتی فوراً منہ بنا لیا۔ فراک اتار دی اور اس طرح بیٹھ گئی جیسے اب نہیں جاؤں گی۔ پہلے تو اماں نے سمجھایا پھر تنگ آ کر ایک ہاتھ رسید کر دیا۔

رونا تو خیر تھا ہی میں تو ان دنوں اتنی ضدی تھی کہ ذرا سی بات پر گھنٹوں روتی۔ آخر ابا نے میرے لئے سزا تجویز کی کہ اسے ساتھ نہیں لے جایا جائے گا۔ یہ یہیں گھر پر رہے گی۔

میں تو خود نہیں جاؤں گی۔ میں نے گھٹی ہوئی آوازمیں جواب دیا اور سب نے مجھے اسی طرح نظر انداز کر دیا جیسے سنا ہی نہیں۔

سب تیار ہو گئے۔ خانساماں نے کھانے پینے کا ڈھیر سا سامان ٹوکریوں میں بھر دیا۔ اور چپراسی نے سارا سامان تانگوں میں رکھ دیا۔

میں اپنے پلنگ پر اوندھی پڑی سسک رہی تھی ویسے مجھے یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح اماں مجھے چھوڑ کر نہ جائیں گی اور ابھی منا لیں گی مگر اب تو سب بالکل تیار ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے بھیگی ہوئی انگلیوں کی درازوں سے جھانک کر سب کی طرف دیکھا۔ اماں اور ابا میاں کے چہرے سخت ہو رہے تھے۔

"چلو سب بچو تانگے پر بیٹھو" اماں نے حکم دیا میرے سارے بھائی بہن دوڑ گئے۔

"جلدی چلو بیگم" ابا میاں نے کہا اور وہ بھی کھڑی ہو گئیں۔ اب تو میرا دل تڑپ اٹھا۔ ہائے کوئی تو مجھے منا لے، اب کبھی ضد نہ کروں گی۔ مگر یہ تو دل میں سوچ رہی تھی۔ اس سے ہوتا کیا۔ اماں اور ابا آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چل دیئے۔ اماں نے خانساماں سے چپکے چپکے کچھ کہا اور دروازے سے باہر نکل گئیں میری ہچکیاں تیز ہو گئیں۔ باہر تانگے کے پہیوں کی کھڑکھڑ ہوئی تو میں نے بڑی کراری آوازیں رونا شروع کر دیا۔ مایوسی اور غصے نے مجھے ایک دم بوکھلا دیا۔ خانساماں مجھے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے سمجھا رہی تھی کہ ضد کرنا بُرے بچوں کا کام ہے جھلاہٹ نے مجبور کر دیا کہ میں خانساماں سے بھڑ جاؤں۔ میں نے اس کے بال نوچ ڈالے اور دوپٹہ بھی پھاڑ ڈالا۔ وہ غریب ہنستی رہی۔

اب تو سب جا ہی چکے تھے۔ میں تھک کر چپ ہو رہی۔ خانساماں یہ سمجھ کر باورچی خانے میں چلی گئی کہ اب میں بہل گئی ہوں مگر میرا دل تو اسی طرح کھول رہا تھا۔ سنسان ویران گھر میں عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس وقت تو بندر بھی جانے کہاں غائب

ہو گئے تھے۔ ہائے وہ سب وہاں تالاب میں پاؤں
دھونے لگے۔ ہرن کے پیچھے بھاگیں گے اور مٹھائی
کھائیں گے۔ مٹھائی کا خیال آتے ہی کلیجہ منہ کو
آنے لگا اور میں نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔
خانساماں جھوٹے برتن چھوڑ کر بھاگی ہوئی آئی
اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی۔

"لو میں اپنی بیٹیا کو مٹھائی کھلاؤں گی، چپکے سے
نکالی تھی میں نے، بی بی سے چرا کر۔" وہ میرے پاس
بیٹھ کر آنسو پونچھنے لگی۔ میں سمجھ گئی کہ مٹھائی اماں
چھوڑ گئی ہوں گی، جب میں ضد کرتی تو وہ مجھے
اپنے ہاتھ سے کوئی چیز نہ دیتیں۔

مٹھائی دیکھ کر ایک دم صبر آ گیا مگر ویسے ہی
منہ بنائے رہی۔ "ہم نہیں کھاتے، ہٹاؤ یہاں سے۔"

"کھا لو بیٹیا کیسی اچھی، میں صدقے قربان!" میں
جلدی سے اس کا کہا مان گئی۔ بھلا صبر بھی کیسے ہوتا
میں نے جلدی سے ایک لڈو اٹھا لیا۔ خانساماں
مطمئن ہو کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

ابھی میں نے آدھا لڈو کھایا تھا کہ دیوار سے
ایک موٹا بندر پھاند کر میرے پاس پلنگ پر آ بیٹھا
اور زور سے خوخیا کر پلیٹ میرے ہاتھ سے چھیننے
لگا۔ میں نے پلیٹ بچانا چاہی تو وہ اور زور
سے خوخیایا اور پلیٹ اپنی طرف کھینچنے لگا۔ میں ڈر کر
پلیٹ چھوڑ دی اور وہ مع پلیٹ کے دیوار پر
جا بیٹھا۔

مٹھائی کھا کر اس نے پلیٹ صحن میں پھینک دی
جو کرچی کرچی ہو گئی پھر سارے دانت اس طرح نکال
دیئے جیسے مجھ پر ہنس رہا ہو۔ میں زور سے چیخی
اور خانساماں بھاگی "خدا غارت کرے ان کو" انھوں
نے کوسا۔ وہ سب کچھ سمجھ گئی تقریب کے ساتھ ساتھ
مٹھائی گئی۔ میں روتے روتے نڈھال ہو گئی۔

سوتے سوتے جب میری آنکھ کھلی تو اماں
سرہانے بیٹھی تھیں اور شام ہو چکی تھی۔ میں ان
کے سینے سے لپٹ گئی۔

"اب تو ضد نہ کرو گی؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں!"

"میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ یہاں بندر ہیں۔"
میں نے فوراً ہی دوسری ضد شروع کر دی۔ مٹھائی
کا غم تو کو۔ یسا ویسا تو ہوتا نہیں۔

ہاجرہ مسرور

چاند بی بی کا گھوڑا

جیسے ایک لڑکی تھی۔ چھوٹی سی گول مٹول سی۔ بڑی چپ چاپ سی۔ اُس کی پھوپھی جان اُسے کاہل مٹھس کہتیں اور اُس کی بڑی بہنیں اُسے بدھو سمجھتیں حد تو یہ ہے کہ اس کے ماسٹر صاحب اور مولوی صاحب دونوں ہی اسے کند ذہن سمجھتے اور اکثر اُس کے کان بھی گرم کرتے رہتے۔ پھر کھیل میں بھی وہ پھسڈی رہتی۔ سب بچے کھیلتے اور یہ کھڑی کھڑی ان کا منہ تکتی۔ اُسے تو بس ایک ہی شوق تھا۔ وہ اکثر کھانا پکانے والی بڑی بی کے پاس پیڑھے پر بیٹھی کبھی انہیں چمٹا پکڑاتی اور کبھی دیگچی اُٹھا کر دیتی۔ پر اس لئے نہیں کہ وہ نوکرانی بننے کی ٹریننگ لے رہی تھی اور جو وہ اپنے نوکر کمال کے پیچھے لگی پھرتی تھی تو یوں ہی نہیں، کبھی اس کے لئے باورچی خانے سے چمٹے میں انگارہ پکڑے لے جا رہی ہے کہ وہ بیڑی سلگا لے اور کبھی اس کے سر میں جھوٹ موٹ کی جوئیں پکڑ رہی ہے۔ بات یہ تھی کہ اُسے کہانیاں سننے کا شوق تھا اور یہ دونوں اسے کہانیاں سناتے تھے۔ بڑی بی کی کہانیوں میں ایک شہزادہ ہوتا۔ ایک شہزادی اور ایک دو دیو۔ جانے وہ بڑی بی بھولے سے کہانیاں ایک دوسرے میں الجھا دیتیں یا کیا کرتیں۔ ساری کہانیاں ایک ہی جیسی کہانیاں سننے کی شوقین لڑکی کو بڑی بی کے لئے سارے کام اور خوشامدیں کر کے کوئی نئی بات سننے کا ارمان ہی رہ جاتا۔ کمال کی کہانیاں دوسرے قسم کی ہوتیں وہ ڈاکوؤں اور بھوتوں کے قصے سناتا تھا، جنہیں سنتے ہوئے وہ ڈر کے مارے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی تھی کہ کہیں سے کوئی ڈاکو یا بھوت تو نہیں آ رہا ہے

پھر چھٹیوں میں اس کے ماموں آگئے۔ وہ پانچویں درجے کا امتحان دے کر آئے تھے اس چھوٹی سی لڑکی پر اور اس کی بڑی بہنوں پر ماموں کا بے حد رُعب پڑا۔ اور کیوں نہ پڑتا۔ جناب وہ گندے بچوں کے ساتھ باہر کھیلنے کے سخت خلاف تھے اور پھر انہیں مٹی اور اینٹوں سے گڑیا کا ایسا عمدہ گھر بنانا آتا تھا جس کی حد نہیں یہی نہیں بلکہ وہ گڑیوں کے منہ بھی صابون سے دُھلا کر صاف کر لیتے تھے۔

پھر ایک دن تو انہوں نے کمال کر دیا۔ جب دوپہر کو سارے بچوں کو اپنے کمرے میں سو جانے کا آرڈر ملا تو انہوں نے بغیر خوشامد کرائے آپ سے آپ کہا۔ آؤ تم سب کو کہانی سنائیں۔ چاند بی بی کی کہانی اس چھوٹی سی لڑکی کی بہنیں یوں جھپٹ کر ماموں کے پلنگ پر جا بیٹھیں جیسے انہیں کہانی سننے کے سوا کوئی شوق ہی نہ ہو۔ چھوٹی سی لڑکی دل میں خوب جلی، مگر وہ بھی چپکے سے جان کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ماموں نے اپنی کتاب سے چاند بی بی کی کہانی پڑھ کر سنائی۔ "دیکھا کتنی بہادر تھی چاند بی بی!" ماموں نے کتاب بند کر کے بڑے جوش سے کہا۔

"میں چاند بی بی بنوں گی" سب سے چھوٹی لڑکی کے منہ سے نکل ہی گیا۔

"ہنہ! تم خاک بنو گی" سب سے بڑی بہن نے منہ بنا کر کہا۔

"میں تو گھوڑے پر بیٹھی تھی ایک دن چاند بی بی کی طرح" منجھلی بہن نے اپنا حق پکا کر لیا۔

"اور میں تو ابا کی تلوار تک اٹھا لیتی ہوں" بڑی بہن نے یہ کہہ کر کسی اور کے لئے چاند بی بی بننے کی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔

اور دیکھو تلوار سے دشمن کو یوں مارتے ہیں، مجھے معلوم ہے" ماموں کو بھی جوش آ چکا تھا۔ انہوں نے کونے سے اپنی ہاکی اسٹک اٹھا کر اپنی بھانجیوں پر جھوٹ موٹ کا حملہ کرنا شروع کر دیا۔ اب کیا تھا۔ کمرہ میدانِ جنگ بن گیا تختی منجھلی نے سنبھالی، تکیہ بڑی نے۔ اور وہ چھوٹی سی لڑکی کونے میں کھڑی ہو کر ان تینوں چاند بیبیوں کو تلوار کے جوہر دکھاتے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس وقت جو دوسرے کمرے سے ابا میاں کی ڈانٹ سنائی دی تو میدانِ جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ سب اپنے اپنے بستروں پر دراز۔

مگر اس چھوٹی سی لڑکی کو تو کتاب والی اصل چاند بی بی بھا گئی تھی۔ ایک طرف کمال کی کہانیوں کے ڈاکو اور بھوت اور دوسری طرف بڑی بی کی کہانیوں والی دیو کے چنگل میں گرفتار شہزادی، سب چاند بی بی پر سے قربان ہو گئے۔

ہائے کیا مزے دار بات تھی کہ شان سے مردانہ لباس پہنے، سر پر تاج رکھے، ہاتھ میں ننگی تلوار

لے، گھوڑے پر سوار، کچاکچ دشمنوں پر چوکرنگ
سے ہیں. سارے دُم دبائے بھاگے جا رہے ہیں
اور چاندبی بی ہیں کہ جیتی ہوئی سامنے کھڑی ہیں۔

اس نے طے کر لیا کہ وہ چاندبی بی بنے بغیر ہرگز
نہیں مانے گی. یوں تو کئی بار اس نے بڑی بی کی کہانی
والی شہزادی بننے کی بھی کوشش کی تھی اور سلطانہ ڈاکو
بن کر تو کئی بار آئینے کے سامنے جھوٹ موٹ کے
روپے نکال کر غریبوں پر نچھاور کئے تھے. مگر اب
بھلا گھوڑے پر سوار، تاج پہنے اور تلوار اٹھائے
چاندبی بی کے آگے گڑیا جیسی بے جان شہزادی
اور پولس سے بھاگتے ہوئے ڈاکو میں کیا کشش
ہو سکتی ہے۔

اب چاندبی بی بننے کے سلسلے میں اس نے
سوچنا شروع کیا کہ اس کے دشمن کون کون سے ہیں.
بھئی بغیر دشمن سے لڑے چاندبی بی کیسے بن سکتی
تھی؟ دماغ پر زور ڈالا لیکن کوئی دشمن اس کی
سمجھ میں نہ آیا. بڑی الجھن ہوئی اس بیچاری کو.
خیر! اس نے فیصلہ کیا جب چاندبی بی بن کر نکلوں گی
تو جو دشمن ہوگا آپ ہی سامنے آجائے گا.
دشمنوں کی بات پکی کر کے اب چاندبی بی بننے
کے دوسرے سامان کی فکر پڑی. سب سے پہلے
تاج کی ضرورت تھی.

"ارے تاج تو ٹرنک میں ہے" اسے ایک
دم یاد آیا. تھوڑے دن پہلے اس کی سہیلی سونا
نے دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر "رام لیلا" کھیلنے
کا انتظام کیا تھا تو سگریٹ کی پنیاں منڈھ کر بڑے
شاندار تاج بنائے گئے تھے. وہ تاج ابھی تک
سونا کی الماری میں رکھے تھے. بس اس کو یقین
تھا کہ سونا کی مجال نہیں جو چاندبی بی کو تاج پیش
کرنے سے انکار کرے. ویسے وہ دونوں پکی دوست
تھیں۔

رہی تلوار. سو وہ ابا کے کمرے میں بندوق
کے ساتھ دیوار پر لٹکی ہی رہتی. مگر مشکل یہ تھی کہ
وہ تلوار ابا کی کمر تک اونچی تھی، بہرحال بادشاہ خان
کا بڑا چھرا کیا بُرا رہے گا. لڑکی نے سوچا چلو یہ
مشکل بھی آسان ہوئی.

"اور گھوڑا؟" یہاں آکر وہ رکی. گھوڑا تو ابا میاں
کی سواری کا اصطبل میں ہی موجود تھا. مگر اس پر
بیٹھنا بڑی ٹیڑھی کھیر تھی. دراصل اسے گھوڑے
کا ٹاپیں مارنا اور ہنہنانا بہت بُرا لگتا تھا. ایک
دفعہ اس کی منجھلی بہن نے گھوڑے پر بیٹھنے کی شیخی
بگھاری تو چھوٹی لڑکی بھی سائیس کے پاس پہنچی. سائیس نے
اسے گود میں اُٹھا کر گھوڑے پر بٹھانا چاہا. لڑکی
نے بیٹھنے سے پہلے ڈرتے ڈرتے جو گھوڑے کی پیٹھ
پر ہاتھ رکھا تو اس نے بڑے زور کی جھرجھری لی.
اس کا ہاتھ تو کیا گال تک لرز گئے.

"اب کل بیٹھیں گے. اس وقت پیاس لگی
ہے." چھوٹی سی لڑکی سائیس سے وعدہ کر کے
جھٹ گود سے اُتر گئی. پھر وہ وعدہ کبھی پورا
نہ ہوا.

اور آج وہ چھوٹی سی لڑکی دل ہی دل میں
چاندبی بی پر بڑی خفا ہوئی. آخر وہ گھوڑے کے
بجائے ٹرائیسکل پر بیٹھ کر دشمنوں کو مار بھگا دیتی
تو ان کا کیا بگڑ جاتا.

اس دن وہ بڑی دیر تک اپنے گھر کے باہر
کھڑی حسرت سے ان دیہاتی لڑکوں لڑکیوں کو دیکھتی
رہی جو اپنے مویشیوں کو تالاب سے پانی پلا کر لوٹتے
تو اُن پر سواری بھی کر لیتے. ہائے وہ شمبھو گومے
کی لڑکی رینا آج اُسے کس قدر بہادر نظر آ رہی تھی
جو دونوں ٹانگیں ایک طرف کئے مزے سے اپنی
بھینس پر بیٹھی آم چوستی چلی آ رہی تھی. چھوٹی سی
لڑکی نے مرعوب ہو کر رینا کو ہاتھ سے اشارہ
کیا مگر رینا نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں. ہاں
کلو جو اپنے ابا کے یکے کا ٹٹو لئے آ رہا تھا. رینا
جیسا بدتمیز نہیں تھا. اور تھا بھی زبردست سوار
ٹٹو کے منہ پر لگام کے بجائے رسی کا پھندا،
جس کے دوسرے سرے سے وہ ٹٹو کو سڑا سڑ مار رہا
تھا اور ٹٹو تھا کہ کدکڑے مار رہا تھا.

"کلو رے کلو" چھوٹی لڑکی مارے خوشی کے اوپر
بھاگی.

"کا بات ہے بیٹیا؟" کلو ٹٹو کی ننگی پیٹھ سے پیٹ
کے بل پھسل کر اتر گیا.

"ہائے کلو تم کیسے بیٹھتے ہو گھوڑے پر؟" لڑکی
نے للچا کر کہا.

"یہ کوئی مشکل بات تو ناہیں" کلو نے فرمانبرداری
سے جواب دیا. اور وہ بندر کی طرح اُچھل کر ٹٹو کی
پیٹھ سے لپٹ گیا. ٹٹو بھاگا، چھوٹی لڑکی چیخی کہ اب کلو
گرا. مگر کلو تو ہوا میں دو چار بار لاتیں چلا کر ٹٹو کی
پیٹھ پر بیٹھا نظر آنے لگا.

چھوٹی سی لڑکی کو یہ سب تماشہ معلوم ہوا وہ
بھاگ کر اپنے ماموں کے پاس پہنچی. اسے گھوڑے
جیسی بدتمیز سواری کا بدل سوجھ گیا ہے.

"ماموں جان چاندبی بی گھوڑے پر تو نہیں بیٹھتی
ہوں گی. اتنا بدتمیز ہوتا ہے" اس نے جا کر ماموں

سے کہا۔

"اور کس پر بیٹھتی [illegible]؟" ماموں جان جھلا کر بولے۔ وہ اکیلے بیٹھے کیرم بورڈ پر مشق کر رہے تھے۔ "گدھے پر، وہ چھوٹا ہوتا ہے نا ماموں!" چھوٹی لڑکی نے بڑی عاجزی سے انہیں سمجھانا چاہا۔

"ہشت، گدھے پر دھوبی بیٹھتے ہیں" ماموں جان ہنسنے لگے۔

چھوٹی لڑکی سمجھ گئی کہ بغیر گھوڑے کے کام نہیں چلے گا۔ چاند بی بی بننا تھا دھوبی تھوڑی۔ اس کے سامنے کلو کی خر سواری کی مثال تھی۔

موقع دیکھ کر وہ اس کوٹھڑی میں گھس گئی۔ جہاں جاڑے کے بستر ایک زبردست بنڈل کی شکل میں ایک پلنگ پر رکھے ہوئے تھے۔ دانت بھینچ کر وہ [illegible] چڑھی اور پھر کلو والے انداز سے [illegible] سوار ہو گئی۔ مشق تو کسی چیز پر بھی ہو سکتی ہے۔ گھوڑا نہ سہی بستر ہی سہی۔

رات کو چھوٹی سی لڑکی نے بڑی بی سے کہانی سنانے کی فرمائش نہ کی اور نہ، اب اسے پروا کیا تھی جب وہ چاند بی بی بن جائے گی تو یہ بڑی بی کیا ان جیسی ہزار بڑھیاں اسے خوشامد کر کے کہانیاں سنانے دوڑی آئیں گی۔ منٹوں میں تین تین لمبی کہانیاں ختم۔ اپنی بڑی بی کی طرح تھوڑی کہ بادشاہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اس کے آگے گھنٹہ بھر اس خوشی میں دیئے جانے والے انعامات کا ذکر "پھر کیا ہوا؟" کہہ کہہ کر تھک جاتا۔ اس کے بعد کہانی دوسرے دن پر ملتوی۔

رات کو خواب میں وہ گھوڑے کو خوب اڑاتی رہی کہ اتنی زور سے جھرجھری لینے کی کیا تک ہے

پھر اس نے خواب میں دیکھا کہ بستروں کا بنڈل ایک فرمانبردار گھوڑا بن گیا ہے، ننھا سا گھوڑا، بالکل اپنے جیکی کتے کے برابر، جس پر وہ مزے سے بار بار سوار ہوتی ہے اترتی ہے اور جب وہ اس ننھے سے گھوڑے پر سوار دشمنوں سے جنگ کر رہی تھی تو پھوپھی اماں نے اسے جگا دیا ننھا سا گھوڑا بھاگ گیا۔

"ہم سوئیں گے ابھی" چھوٹی لڑکی نے مچل کر آنکھیں بند کر لیں اور ننھا گھوڑا پھر اس کی سواری میں آ گیا۔ مگر پھوپھی نے اب کے اس کو جھنجھوڑ کر بستر سے کھڑا کر دیا۔

چھوٹی سی لڑکی کو جاگ کر اتنا غصہ آیا جس کی حد نہیں۔ اب تو اسے جلد سے جلد چاند بی بی بن جانا چاہیئے۔ تاکہ پھوپھی اماں کو ذرا پتہ تو لگے۔ پھر وہ کیسی شرمندہ ہوں گی اپنی حرکتوں پر۔

ناشتے پر اس نے خوب جی لگا کر پیالی بھر دودھ پیا اور جلدی سے پچھلی ڈیوڑھی میں جا کر اپنی منجھلی بہن کی طرح دیواروں پر گھونسے مارنے لگی۔ اس کی منجھلی بہن کہا کرتی تھی کہ اس طرح خوب طاقت آ جاتی ہے یہ ترکیب منجھلی بہن کو ستو نا کے ذکر مہاراج پہلوان نے بتائی تھی۔ خوب دودھ پیو اور خوب لڑو۔

دکھتے ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر اسے یوں لگا جیسے طاقت اس کے اندر اُبل رہی ہے۔

"آج تو میں ضرور گھوڑے پر بیٹھوں گی چاہے گھوڑے صاحب کتنی بدتمیزی کریں" وہ سائیس کے پاس پہنچی۔

"بچولی، ہمیں فوراً گھوڑے پر بٹھاؤ"

"دیکھتا نہیں ہو۔ تنک دیر بعد آیو"

سائیس گھوڑے پر برش پھیرتے ہوئے بولا۔

چھوٹی لڑکی کو سائیس پر بھی غصہ آ گیا۔ آج صبح سے دشمنوں کی فہرست تیار ہو رہی تھی۔ ایک نام اور بڑھ گیا۔

"تمہاری بھی خیر نہیں بچولی۔ ابھی خوب انتظار کرا لو" چھوٹی لڑکی نے دل میں کہا اور غصے میں ٹہلنے لگی۔ بالکل تھانیداروں کی طرح اکڑ کر۔

احاطے کے پھاٹک کے پاس وکیل صاحب کی بکری بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔

"میں۔ ایں۔ ایں" بکری نے اس لڑکی کو دیکھ کر بڑی حقارت سے فرمایا، گویا اسے سب پتہ ہے۔

چھوٹی سی لڑکی کو بکری کی یہ حرکت بہت بری لگی۔

"اچھا تو یہ سمجھتی کیا ہے مجھے۔ میں ابھی ٹھیک بتاتی ہوں" چھوٹی لڑکی تن تنا کر بڑھی اور بکری کے لمبے لمبے کان پکڑ کر دھم سے اس پر بیٹھ گئی بکری نے چونک کر اپنی اگلی ٹانگیں کھڑی کیں تو چھوٹی لڑکی بکری کے کانوں سے لٹکی نظر آئی۔ پھر جو اس نے اپنی پچھلی ٹانگیں کھڑی کیں تو لڑکی بکری کے مڑے ہوئے سینگوں پر جا کر اٹکی۔ پھر جو بکری اپنا سر جھٹکتی گھبرا کر مع سوار کے بھاگی ہے تو بھاگتی ہی چلی گئی۔

"پکڑیو۔ پکڑیو۔ بکری بھی بٹیا کر لے سبحان ہے۔" پیچھے پیچھے سائیں چلاتا بھاگ رہا تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا۔ بس یہ سمجھ لو۔ کہ
گرتے ہیں شہسوار ہی ....

اور آج تک کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ پیاری چھوٹی سی لڑکی دراصل کیا بننا چاہ رہی تھی اور قصے میں بن کر رہ گئی محض بکری سوار۔

بانو قدسیہ

رنگروٹ

سامنے گٹھلیوں کا ڈھیر تھا اور سب عورتیں پہلا کلمہ پڑھنے میں مشغول تھیں۔ سفید چادر پر جابجا چکنی کھجور کی گٹھلیوں کی پاؤ آدھ پاؤ سیر سوا سیر کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ شیخ وجاہت کی موت کا تو کسی کو یقین نہ آرہا تھا لیکن اتنی بات پر سارا محلہ متفق تھا کہ ایسا راسخ العقیدہ سچا اور پکا مسلمان جب سے پاکستان بنا، محلے والوں نے نہ دیکھا تھا۔ سنتے ہیں کہ پاکستان بننے سے پہلے دو گلیاں چھوڑ کر بابا ولیا کھیس بیچنے والا رہا کرتا تھا۔ قصور سے کھیس خرید کر لاتا۔ اُسی قدر کھیس بیچتا جس سے دن بھر کی روٹی چلتی اور باقی وقت اللہ اللہ کرنے میں گزار دیتا ــــــ

بابا ولیا کے متعلق تو شاید کسی کو شبہ بھی ہو لیکن شیخ وجاہت کے متعلق اندر باہر کسی کو خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ وہ اللہ کا نیک پسندیدہ چنیدہ آدمی نہیں۔ بلکہ جس وقت جنازہ گھر سے رخصت ہوا کئی رقیق القلب میل ملاقاتی یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ان ستر ابدالوں میں سے ایک تھا جن کے سہارے دنیا کا نظام قائم رہتا تھا۔

پتہ نہیں گٹھلیاں زیادہ تھیں کہ بی بیاں پڑھ پڑھ کر تھک چکی تھیں۔ پتہ نہیں کس طرف سے آواز آئی

"کیوں بیوی جی تم نے تو کئی بچوں کو قرآن پڑھایا ہے بتائیے کیا قبر کا عذاب ہوتا ہے کہ نہیں؟ ــــ"

"ہوتا کیوں نہیں منکر نکیر جو آتے ہیں قبر میں" بوا جی نے سفید دوپٹہ کانوں کے دونوں طرف اڑس کر کہا۔

"لیکن جی ــــ حساب کا دن تو مقرر ہے۔ اس دن سے پہلے حساب کیا؟"

کونوٹ کی پڑھی ہوئی بڑی بہو نے پوچھا۔

اب مصالحت کے انداز میں بیوی جی بولیں۔

"اے بھئی اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے۔ بریلیوں کا کچھ عقیدہ ہے ــــ دیوبندی کچھ اور سمجھتے ہیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں۔ اپنا عقیدہ چھوڑو نہیں۔ کسی اور کا عقیدہ چھیڑو نہیں ــــ"

منی جو دیر سے اپنی ماں کی بغل میں گھسی آئس کریم کے لئے روپیہ مانگ رہی تھی۔ جھٹ دوپٹے سے منہ نکال کر بولی ــــ "آنٹی کیا شیخ صاحب کو بھی قبر کا عذاب ہوگا؟ ــــ"

ساری محفل پر جیسے گٹھلیوں کی بارش ہو گئی۔

عورتوں کے دلوں پہ گومڑ پڑ گئے۔

"یہ لو روپیہ اور بھاگو یہاں سے!"

"ان کو بھی منکر نکیر پوچھنے آئیں گے؟ ــــ"

منی نے ایک اور حملہ کیا۔

بوا جی نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا اور سر دائیں بائیں ہلا کر بولیں ــــ "لو ــــ شیخ صاحب کو عذاب کیا ــــ وہ تو پھولوں میں گئے ہیں۔ خوشبوؤں میں بسے ہوئے ان کا حساب کیا؟ حساب تو ہم جیسوں کا ہوتا ہے ہم جیسوں کا ــــ"

اس وقت کوئی بی بی موقع کی نزاکت سمجھ کر اونچے اونچے رونے لگی۔ سارے میں سسکیاں آنسو اور ہچکیاں ٹرانسمٹ ہو گئیں ــــ

لو بھلا شیخ صاحب کو عذاب کیا؟

لو بھلا شیخ صاحب کا حساب کیا؟

جب میں پہلے پہل شیخ صاحب سے متعارف ہوا وہ محلے کے تین معتبر لوگوں کے ساتھ میرے گھر عصر اور مغرب کے دوران آئے تھے۔ میں محلے میں نو وارد تھا۔ لیکن شیخ صاحب کی آواز، نشست و برخاست ان کا پاس ہاتھ رکھنے اور اٹھانے کا طریقہ غرضیکہ ان کی تمام شخصیت کا پھیلاؤ دیکھ کر ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ شیخ صاحب بڑے نیک متقی اور پرہیزگار آدمی ہیں۔

نومبر ۱۹۷۹ء

وہ چاروں حضرات میرے پاس مسجد کی تعمیر کیلئے چندہ لینے آئے تھے۔ کم از کم اس وقت میں یہی سمجھا تھا میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالتے وقت اپنے آپ کو حاتم وقت سمجھا تو شیخ صاحب نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔"

"نہیں حضرت مسئلہ یہ نہیں ——— ہے۔ مسئلہ ذرا دقیق ہے ——"

میں ان کا منہ تکنے لگا۔ باقی تین حضرات جیسے جمرات کی مانند صرف کنکریاں کھانے آئے تھے چپ رہے۔

"دیکھئے مسجد تو قریب قریب مکمل ہو چکی ہے۔ میں نے اس کی تعمیر خود کھڑے ہو کر کروائی۔ آپ خود چل کر ملاحظہ کر لیجئے کہ میری محنت کا کیا صلہ ملا ہے ——— بس اب پنکھے لگنے ہیں۔ اور فرش پڑنا ہے ——"

"میری تو اس سے زیادہ پہنچ نہیں ہے ——" میں نے لجاجت سے کہا۔

"نہیں نہیں ہم آپ سے چندہ لینے نہیں آئے" شیخ صاحب نے محبت سے میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا ——— یہ جو آپ کے گھر کے سامنے سرخ مکان ہے یہاں سے سنگ مرمر کا فرش بنانے کے لئے بیس ہزار کا چیک ملا ہے ——— رقم اتنی بڑی ہے کہ فرش بھی لگ جائے گا اور پنکھوں کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن"

"لیکن ——— کیا۔ شیخ صاحب ——— چیک بھنوائیے اور کام چالو کیجئے"

"مشکل یہ ہے صاحب ——— یہ جو لال مکان والے ہیں۔ ان کا رزق مشتبہ ہے ——— آپ تو اس محلے میں نئے ہیں۔ لیکن ہم سے تو کچھ چھپا نہیں ——" "کیا کہتے ہیں۔ شیخ صاحب۔ بیچارہ سیدھا سادا ٹھیکیدار ہے۔ موٹر سائیکل پر آتا جاتا ہے۔ بڑا شریف آدمی ہے ——"

"لیکن بدقسمتی سے اس کی گھر والی کی ماں کا رزق حلال نہیں تھا ——— وہ اُدھر کی تھی بازار کی ——— کون جانے اس رقم میں اس کا کتنا حصہ ہو؟ ——— آپ کو طریقے طریقے سے یہ بات ان تک پہنچانا ہے۔ یعنی اگر ہم کہیں گے تو پڑوسی ہونے کی رعایت سے ان کی دل شکنی ہونے کے امکانات ہیں۔

لیکن آپ اجنبی ہیں اس محلے میں۔ آپ مناسب الفاظ میں انہیں ہمارا اعتراض پہنچا دیجئے"

میں حیرانی سے شیخ صاحب کا چہرہ دیکھتا رہا۔

جمرات خاموش رہے۔

"ہماری آرزو ہے کہ یہ پیسہ پہلے آپ ٹھیکیدار صاحب سے ادھار لے لیں۔ وہ بھلے آدمی ہیں ضرور اُدھار دے دیں گے۔ پھر اپنی طرف سے ہمیں چندے میں دیں۔ قرضِ حسنہ ہو گا آپ کو لوٹانا نہیں پڑے گا۔ دیکھئے اللہ کے گھر کی تعمیر کا سوال ہے ——— شبہ والی بات نہیں ہونی چاہیئے۔ آپ کو ثواب ملے گا ——" میں ثواب کے چکر میں پڑ گیا۔

"لیکن ——— لیکن شیخ صاحب میں اس گھر میں نیا ہوں۔ محلے میں نووارد ہوں۔ یہ ٹھیکیدار مجھے کیونکر بیس ہزار ادھار دے گا ——"

"دیکھئے ہم ان کی دلآزاری نہیں کر سکتے۔ ہم محلے میں پرانے ہیں۔ آپ کو اُن کے پاس جا کر جھوٹ بولنا ہو گا کہ ..... کہ آپ کو بیس ہزار درکار ہے اور شیخ صاحب آپ کو وہ چیک دے سکتے ہیں۔ کچھ دنوں کے لئے جو انہوں نے مسجد کی تعمیر کے لئے بھجوایا ہے۔ پھر آپ وہ چیک ہمیں دے دیں ——— بس اتنی سی بات ہے ——— ساتھ ہی باتوں باتوں میں یہ بھی بتا دیں کہ شیخ صاحب کیوں چیک نہیں لے سکتے"

گو بات میرے پلے نہ پڑی۔ لیکن وہی کچھ ہوا جو شیخ صاحب نے فرمایا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جو تین جمرات شیخ صاحب کے ساتھ آئے تھے انہوں نے بات LEAK کر دی اور ٹھیکیدار کی بیوی کئی راتیں روتی رہی ——— اور اپنے شوہر سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی مسجد میں نماز پڑھنے نہیں جائیں گے۔ کچھ عرصہ ٹھیکیدار صاحب مسجد میں تشریف نہ لائے۔ پھر یہ خاندان خدا جانے کہاں جا بسا اور ان ہی کے گھر میں ایک انجنیئر آ بسے۔

انجنیئر سے مجھے یاد آیا کہ انجنیئر اکرام اللہ سے بھی میری پرانی یاد اللہ ہے۔ اس نوجوان نے ابھی پانچ سال پہلے ساہیوال میں سروس شروع کی تھی۔ وہاں اس انجنیئر سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔ ہر نوجوان آدمی کی طرح جو سروس شروع کرتا ہے ان کے بھی بہت سے اصول تھے آدرش تھے۔ یہ رشوت کے نام پر بدکتا تھا۔ اس کا تکیہ کلام تھا کہ اگر حکومت کی چوری ہی کرنا ہے۔ تو اس کے خزانے سے چراؤ اس کا وقت نہ چراؤ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ ماں فوت ہو گئی۔ تو پورا دفتر ATTEND کرنے کے بعد لاہور گیا۔ اکرام اللہ کے دفتر میں کبھی میں نے انبوہِ دوستان، گروہِ سفارشاں جماعت خوشامد پسنداں نہ دیکھی۔ اس کی میز پہ کبھی کوئی فائیل بھی جمع ہو کر کالی صندوقچی میں پڑی نہ رہتی تھی۔ دوست ملنے آ جاتا تو خود اٹھ کر پوچھتا۔

"فرمائیے! کوئی کام کہ گپ شپ؟ ——"

دوست جہاں گنیا کر عندیہ بیان کرتا تو فرماتے "جناب آج شام پانچ بجے میرے گھر۔ میرا خانساماں پکوڑے بہت اچھے بناتا ہے ——"

اکرام اللہ کے خلاف رفتہ رفتہ کافی بغض جمع ہو گیا۔ گیڈ ڈصفت ٹھیکیداروں، رشوت خور ایس ڈی او۔ پبلک کے متعلقہ غرض مند لوگوں نے مل ملا کر اکرام اللہ کی تبدیلی کروا دی۔

جس روز نئے محلے کی مسجد میں سنگِ مرمر کا فرش دھو دھلا کر پہلا جمعہ پڑھایا گیا۔ تو خطبے کے وقت میری نظر سامنے والی صف پر گئی۔ پشت سے تو آدمی انجینئر اکرام اللہ ہی لگتا تھا۔ لیکن گردن اور کندھوں پر وافر چربی دیکھ کر مجھے کچھ شبہ سا بھی پڑ گیا کہ شاید پانچ سال میں اکرام اللہ اتنا موٹا نہ ہو گیا ہو۔

نماز ختم ہونے کے بعد جب میں باہر نکل رہا تھا۔ تو کسی نے پیچھے سے مجھے پکڑ لیا۔ پلٹ کر دیکھا تو اکرام اللہ تھا۔ وہ اب پہلے اکرام اللہ کا جمبو سائز تھا۔ بہت تپاک کے بعد اس نے مجھے اپنے دفتر کا پتہ دیا۔ "یار تم میرے پاس کل دفتر آنا —— بالکل پبلک لائبریری کے سامنے —— ساتھ ہی سموسے ملتے ہیں۔ خوب مزے دار —— ضرور آنا ——"

دوسرے دن میں اکرام اللہ کے دفتر پہنچا۔ اس کی کرسی کے سامنے چھ آدمی بیٹھے تھے۔ تمام میں جو آدمی سب سے ممتاز تھا۔ وہ شیخ صاحب تھے۔ سامنے ایک پلیٹ میں سموسے تھے۔ ایش ٹرے سگریٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ حضرات کافی عرصے سے یہاں بیٹھے ہوں گے۔

میں کوئی آدھ پون گھنٹہ بیٹھا رہا۔ پہلی ٹکڑی میں سے کوئی شخص بھی نہ اٹھا بلکہ دو چار اور اشخاص کا اضافہ ہو گیا۔ بالآخر جب میں چلنے لگا تو اکرام اللہ بولا —— "یاد ہے یار میں ساہیوال میں کس قدر احمق اور کسٹر آدمی ہوا کرتا تھا۔ مجھے تو شیخ صاحب نے انسان بنایا۔

شیخ صاحب بھینی بھینی مسکراہٹ مسکرائے۔ "بس جی آپ کانٹوں میں نہ گھسیٹئے۔ آپ کا دفتر راستے میں پڑتا ہے۔ میں یہاں ٹولنگٹن مارکیٹ گوشت خریدنے آ رہا ہوں۔ ساتھ ہی آپ کو بھی مل لیتا ہوں ایک پنتھ دو کاج ——"

اکرام اللہ نے آواز گرا کر کہا —— "بخدا پہلے پہلے جب یہ آتے تھے تو مجھے غصہ چڑھ جاتا تھا —— لیکن اب ان کی وجہ سے میرا نکتہ نظر تبدیل ہو گیا ہے۔ میں اب اپنے JOB کو اپنے لئے وبال نہیں بناتا —— آخر پچیس سال کام کرنا ہے۔ RELAX کر کے کرنا چاہیئے —— "شیخ صاحب کی مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے اپنے پیشے میں نارمل بنایا ——"

پتہ نہیں کیا بات ہے کہ اس روز کے بعد میں نے اکرام اللہ سے ملنے کی کوشش نہیں کی بلکہ مسجد میں بھی جب وہ جمعہ پڑھنے آتے۔ تو میں اُن سے نظریں چار کرنے سے گھبرا جاتا ——

شیخ صاحب سے البتہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ واقعی بہت پہنچے، معاملے کے پکے، صوم و صلوٰۃ کے پابند، حساب کتاب کے کھرے آدمی تھے۔ محلے میں جو اہمیت ان کی رائے کو تھی کسی اور کو نہ تھی۔ امانتیں ان کے پاس آ کئیں بند کر کے رکھوائی جاتیں

لوگوں کی مدد وہ بے دریغ کرتے۔ غرضیکہ شیخ صاحب محلے کے ماڈل آدمی تھے ——

میری بیوی میری عادتوں سے نالاں ہو کر کہا کرتی۔ "ایک شیخ صاحب بھی تو ہیں۔ ان کی مثال سے آدھا محلہ مسلمان ہو گیا۔ ایک آپ ہیں۔ آدھی آدھی رات تک آپ برج کھیلتے ہیں نہیں تھکتے کم از کم یہ تو دیکھ لیجئے کہ اولاد پر کیا اثر پڑ رہا ہے ——"

میں چڑ کر کہا کرتا —— "تم اثر پڑوانے وہاں لے جایا کرو۔ شیخ صاحب کے گھر کوئٹے کے گھوڑے بچے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ بچے کو ہی جنم دیتا ہے ——"

یہ رمضان سے دو دن پہلے کی بات ہے کہ میں نجم صاحب کے گھر گیا۔ ان کا گھر ہمارے محلے میں نہیں لیکن محلے سے متصل گلی میں موجود ہے۔ عصر اور مغرب کے درمیانی وقفے کا ذکر ہے۔ تمازت بہت تھی۔ اور بس گلی میں یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی شخص گرم بھاپ میں کمبل بھگو کر آپ کو اس میں دم پخت کرنے کے لئے بیٹھا ہو۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ نجم صاحب سے پھر ملاقات کی جا سکتی ہے لیکن مجھے کیمرہ درکار تھا۔ اس لئے میں نے بادلِ نخواستہ دروازے پر دستک دی۔ شیخ صاحب نے میرے لئے دروازہ کھولا۔

اب باتیں شروع ہوئیں۔ شیخ صاحب میرے سامنے اپنا مطلب بیان کرنے سے قاصر تھے۔ میں شیخ صاحب کے سامنے کیمرہ مانگنے سے قاصر تھا۔ بالآخر مغرب کی نماز جیت گئی۔

شیخ صاحب کو فکر تھی کہ کہیں وہ مسجد نہ پہنچ سکیں۔ اس لئے میری موجودگی کے باوجود انہیں اپنا عندیہ

بیان کرنا پڑا۔

"سعیدہ کا کچھ سامان دبئی سے آ رہا ہے۔ دو ایک دن میں کراچی پورٹ پر پہنچ جائے گا۔"

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ سعیدہ شیخ صاحب کی منجھلی بیٹی ہے اور اس کا شوہر دبئی میں ایک امریکی فرم کا منیجر ہے۔

"دو ایئر کنڈیشنر ہیں۔ ایک فریج ہے باقی کچھ چھوٹا موٹا بجلی کا سامان بھی ہوگا ــــ اگر تم انتظام کر دو تو مہربانی ہوگی۔ سعیدہ کو تو اس میں کچھ دلچسپی نہیں بچوں کی چیزیں ہیں۔"

نجم کراچی پورٹ پر بڑی توپ چیز تھا۔ لیکن اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اپنا سامان بھی مکمل ڈیوٹی ادا کیے بغیر کبھی نہیں نکالتا۔ اس وقت اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"بات یہ ہے شیخ صاحب کہ آپ ہفتے کے روز میرے پاس پہنچ جائیں۔ میں آپ کو سہولت کے ساتھ گودام میں سے سامان نکلوا دوں گا ــــ وہاں عموماً تین تین مہینے سامان پھنسا رہتا ہے۔ بس میں تو اسی قدر کر سکتا ہوں۔ باقی ڈیوٹی وغیرہ تو جس قدر مقرر ہے آپ کو ادا کرنی ہی ہوگی ــــ"

اب شیخ صاحب نجم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے کمرے کے آخری صوفے پر لے گئے۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے دیکھ لیتا۔ نجم کبھی سر کھجلاتا نظر آتا کبھی ٹھوڑی ــــ کبھی بار بار کھینچتا کبھی بالوں میں انگلی پھیرتا۔ شیخ صاحب بڑے استقلال سے بیٹھے تھے جیسے لکڑی کے بنے ہوں۔ ان کا ایک ہاتھ نجم کے کندھے پر تھا اور دوسرا اپنی جھولی میں پڑا تھا۔ ایک بار بھی ان کی جیبھ زبان میں تلملاہٹ گھبراہٹ یا شرمندگی کا اظہار نہ ہوا۔

جس وقت مسجد سے عشاء کی نماز شروع ہوئی۔ نجم صاحب رام ہو چکے تھے۔ وہ شیخ صاحب کے ساتھ میرے پاس سے گزرے اور مدھم آواز میں بولے۔

"بس اب آپ فکر نہ کریں شیخ صاحب کہہ جو دیا۔ سعیدہ میری بہن ہے۔ آپ کو فکر کی ضرورت نہیں۔"

پتہ نہیں سعیدہ کا سامان بغیر ڈیوٹی کے گھر پہنچ گیا کہ نہیں صرف نجم نے مجھے کیمرہ ادھار دینے سے انکار کر دیا ــــ"

یہ مت سمجھئے شیخ صاحب بگلا بھگت آدمی تھے۔

ان کی سلیٹ مکمل طور پر صاف تھی۔

ان کی آمدنی میں کبھی ایک کوڑی بھی حرام کی شامل نہ ہوتی۔

وہ کبھی رشوت دینے یا لینے کے مرتکب نہ ہوئے وعدے کے پابند ــــ حقوق العباد پر سختی سے کاربند۔

سارا محلہ گواہ ہے۔ شیخ صاحب بڑے سچے آدمی تھے۔

یہ اور بات ہے کہ ان کی وجہ سے کئی ایسے سچے آدمی جھوٹ پر آمادہ ہوئے جو ابھی شیخ صاحب کی طرح پکے نہ بنے تھے؛ جو ابھی اپنے راستے پر مکمل یقین نہ رکھتے تھے ــــ راسخ العقیدہ نہ تھے۔

میں ابھی ابھی شیخ صاحب کے گھر سے آیا ہوں۔

وہ پلنگ پر لیٹے پڑے ہیں۔ جیسے کاٹھ اخروٹ کی لکڑی سے بنے ہوں۔ ناک آنکھیں ٹھوڑی پیشانی سب میں موسموں کو جھیل لینے کی سختی ہے۔ اپنے مسلک پر جمے رہنے کا پختہ یقین ہے۔ عورتیں تو ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ خواہ مخواہ سوچتی ہیں کہ شیخ صاحب جیسے آدمی سے بھی منکر نکیر حساب لیں گے۔

حساب کتاب سے شیخ صاحب کا تعلق؟

اور پھر یہ بھی اعتقادات کی بات ہے۔

بھلا ایسے آدمی کا حساب کیا جس کی اپنی سلیٹ بالکل صاف ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ شیخ صاحب کی وجہ سے کئی لوگ بھٹک گئے۔ لیکن شاید ان لوگوں کو بہرکیف شاہراہ سے پگڈنڈیوں پر اترنا ہی اترنا تھا!

ایسے رنگروٹ تو ہر وقت برائی کی تعلیم لینے کو تیار بیٹھے ہیں۔ اس میں بھلا شیخ صاحب کا حساب کتاب کیا؟

رضیہ نعیم احمد

پیٹو بلّی

ارشد کو بلیاں بہت پسند تھیں مگر وہ انہیں پالنے سے کتراتا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ اس نے دو مرتبہ یہ تجربہ کیا تھا اور دونوں دفعہ بُری طرح ناکام ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سفید جھاگ جیسا بلی کا بچہ پالا تھا۔ ان دنوں وہ اپنی امی ابو کے ساتھ مری پہاڑ پر رہتا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی اور بچہ بھی بہت ہی چھوٹا تھا اتنا ننھا کہ ابھی اس کی آنکھیں بھی نہیں کھلی تھیں۔ یہ بچہ ارشد کا نوکر کہیں سے لے کر آیا تھا اور ارشد کو دے دیا تھا۔ ارشد اسے پاکر بے حد خوش ہوا تھا۔ وہ اتنا نرم و ملائم تھا جیسے روئی کا گالا اور اتنا سفید تھا جیسے مری کی برف۔ مگر جلد ہی ارشد کی فکریں شروع ہو گئیں، کہیں یہ ننھی سی جان ٹھنڈ سے نہ مر جائے۔ امی سے اس نے اس کیلئے ننھا مگر موٹا سا گدا بنوایا۔ ایک ٹوکری میں وہ گدا بچھایا۔ گرم کپڑے کی ایک جیکٹ سلوائی جسے اس کی کمر پہ ڈال کر ڈوریوں سے باندھ دیا۔ دھوپ کے ساتھ وہ اس کی ٹوکری لئے لئے پھرتا۔ چیڑ کے درختوں کے لمبے لمبے سائے بڑھتے جاتے اور ارشد جہاں تک ممکن ہوتا اس کی ٹوکری دھوپ میں رکھتا جاتا پھر اٹھا کر اندر آتش دان کے پاس لے جاتا۔ مگر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ بچہ دودھ نہ پیتا تھا۔ دودھ اس کے آگے رکھا، اس نے نہ پیا تو اس کے منہ سے لگایا مگر وہ کسی طرح دودھ پینے پر راضی نہ ہوا۔ آخر ارشد کو روئی کے پھوئے سے اسے دودھ پلانا پڑا۔ مگر شاید وہ ناکافی تھا۔ بچہ دن بدن کمزور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ارشد کی امی نے جب یہ حال دیکھا تو نوکر سے کہا کہ بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے فی الحال وہ اسے اسکی ماں کے پاس چھوڑ دے تاکہ اس کا دودھ پی کر وہ موٹا تازہ ہو جائے۔ نوکر نے کہا کہ اس نے تو صرف یہی بچہ ایک درخت کے نیچے ٹھٹھرتے دیکھا تھا اور اسے اُٹھا لایا تھا۔ شاید وہ اپنی ماں اور بہن بھائیوں سے بچھڑ گیا تھا۔

صبح سکول جانے سے پہلے ارشد بلّی کے بچے کو دودھ پلا کر جاتا۔ برف باری میں ابھی دیر تھی مگر بارش میں اولے پڑتے رہتے تھے۔ سکول کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ سکول میں کھیل اور ڈراموں کی تیاری ہو رہی تھی ایسے میں پڑھائی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی تھی ارشد کی کلاس اونچائی پر تھی اور وہاں سے پگڈنڈیوں کے پار اسے اپنے گھر کے سامنے کا حصہ نظر آتا تھا جہاں امی کرسی ڈالے سلائی کرتی ہوتی تھیں اور ننھی سی ٹوکری میں بلی کا بچہ پاس بیٹھا ہوتا تھا۔ ارشد کھڑکی میں سے یہ دیکھتا اور اس کا جی چاہتا کہ بھاگ کر اس کے پیچھے چلا جائے۔ سکول سے واپس آکر وہ خود کھانا کھانے سے پہلے بلی کے بچے کو روئی کے پھوئے سے دودھ پلاتا مگر وہ ذرا بھی رغبت سے نہ پیتا۔ قطرہ قطرہ دودھ سے ہوتا بھی کیا۔ بچہ لاغر ہوتا چلا گیا۔ اس دوران برف باری بھی شروع ہو گئی۔ ایک صبح جب ارشد برف میں دبائی ہوئی ملائی کی قلفی نکالنے کے بعد اسے دیکھنے گیا تو وہ مرا پڑا تھا۔

ارشد کو بے حد صدمہ ہوا۔ آنکھوں میں آنسو لئے اس نے یہ خبر امی کو سنائی۔ امی نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں، نوکر بہت چھوٹا بچہ لے آیا تھا۔ اتنا چھوٹا بچہ جو خود سے دودھ بھی نہ پی پاتا بہت مشکل سے... اس کے بعد ارشد بلی کے بچوں سے پیار تو کرتا رہا مگر اس نے بلی کا بچہ پالنے کا خیال چھوڑ دیا۔ دو سال بعد اسے پھر ایک بلی کا بچہ تحفے میں دیا گیا یہ بچہ زیادہ چھوٹا نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں کھل ہوئی

تھیں اور وہ خوب چنچل تھا۔ اپنی ننھی منی ٹانگوں سے گیند کی طرح لڑھکتا پھرتا تھا۔ وہ مرغی کے تازہ پیدا ہوئے چوزے کی طرح گول مٹول تھا اور اس کا رنگ سیاہ اور چمکدار تھا۔ اس وقت ارشد اپنے ابو کے ساتھ ملتان میں رہتا تھا۔ ملتان ریگستانی علاقہ ہے۔ یہاں بہت گرمی پڑتی ہے۔ آئے دن سرخ اور پیلی آندھیاں آتی رہتی ہیں۔ درختوں پر گرد جم جاتی ہے اور اس وقت تک جمی رہتی ہے جب تک بارش کا پانی اسے دھو نہ دے۔ بارش بھی یہاں کم ہی ہوتی ہے۔ ارشد کو فکر تھی کہ کہیں یہ ننھا سا ماؤ گرمی سے نہ مر جائے۔ وہ اسے برف کا پانی پلاتا اور دودھ میں برف ڈال کر دیتا۔ اس کے چھوٹے سے گھروندے میں جو اس نے باغ میں بنایا تھا روز تازہ مٹی کھود کر ڈالتا تاکہ ٹھنڈی ریت میں بیٹھ کر وہ گرمی سے بچ سکے۔ دوپہر کو جس وقت زیادہ گرمی ہوتی وہ اسے کمرے میں پنکھے کے نیچے رکھتا اور ہر روز شام کو نہلاتا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ گول مٹول بچہ بھی سرکنے لگا۔ کالا کلوٹا بھاگنے اور درختوں پر چڑھنے کے بجائے وہ کونے کھدرے ڈھونڈتا پھرتا، کبھی کسی الماری کے نیچے تو کبھی کسی میز کے پیچھے۔ ایک دن ارشد جب گول گول گھومتے بگولوں کا تماشہ دیکھ کر لوٹا اور اس نے ماؤ کو ڈھونڈا تو وہ کہیں نظر نہ آیا۔ بڑی تلاش کے بعد پتہ چلا کہ وہ ارشد کے پلنگ کے نیچے مرا پڑا ہے۔ اس کی موت کا بھی ارشد کو بے حد صدمہ ہوا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی دیکھ بھال کے باوجود ارشد کے پالے ہوئے بچے مر کیوں جاتے ہیں۔ ارشد نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ ہرگز بلی کے بچے نہیں پالے گا۔

اب ارشد بلیوں کے بارے میں کتابیں پڑھتا اور ان کی پیاری پیاری تصویریں اپنے کمرے میں لگا لیتا۔ کسی گھر میں جاتا اور وہاں پلی ہوئی بلی دیکھتا تو اُسے خوب پیار کرتا مگر پھر کبھی اس نے گھر میں بلی نہ پالی۔ تھوڑے دن بعد ارشد کے والد کا تبادلہ کراچی کا ہو گیا۔ امی نے اس کا شوق دیکھ کر پھر اسے بلی پالنے پر اکسایا۔ امی نے کہا ممکن ہے ان بچوں کی موت کی وجہ مری کی شدید سردی یا ملتان کی شدت کی گرمی ہو۔ کراچی کا موسم نرم گرم ہے۔ نہ زیادہ سردی پڑتی ہے نہ گرمی، یہاں ایسا مسئلہ نہ ہوگا مگر ارشد راضی نہ ہوا۔

ایک دن صبح صبح اٹھ کر ارشد باغ میں آیا تو اس نے دیکھا کہ باہر لان میں ایک بلی کے ساتھ دو بچے غافل سو رہے ہیں۔ ایک بچہ برف کی طرح سفید تھا اور دوسرا رات کی طرح سیاہ۔ وہ دونوں گولائی S کی شکل میں سوتے ہوئے بڑے ہی خوبصورت لگ رہے تھے۔ ارشد انہیں بہت دیر تک حیرت سے دیکھتا رہا۔ مگر اسے اسکول جانا تھا اس لئے اندر چلا آیا۔ وہ سکول جانے کی تھوڑی سی تیاری کرتا اور پھر آن کر جھانک کر دیکھتا۔ ایک مرتبہ اس نے جھانک کر دیکھا تو ماں غائب تھی اور بچے کیاریوں میں کچھ سونگھتے پھر رہے تھے جیسے انہیں کھانے کی تلاش ہو۔ ارشد بھاگا ہوا آیا۔ ایک برتن میں دودھ نکالا اور ایک درخت کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر بچوں کو جتنا نزدیک رکھ سکتا تھا رکھ دیا اور واپس آ گیا۔ جب بالکل تیار ہونے کے بعد اس نے باہر جھانکا تو بلی اور دونوں بچے مزے سے دودھ پی رہے تھے اور خوش ہو کر مونچھ چاٹ رہے تھے۔

ارشد کو بے حد خوشی ہوئی۔ اب اس نے یہی طریقہ اختیار کر لیا کہ بلی کے بچے پالنے کے بجائے دودھ پلا کر دوست بنا لیتا۔ شروع میں تو وہ اس سے ڈرتے۔ اس کی موجودگی میں برتن کے پاس بھی نہ آتے مگر رفتہ رفتہ وہ اس کے دوست بن جاتے۔ وہ ان سے کچھ دیر کھیلتا یا ان کو آپس میں کھیلتے دیکھتا۔ اور بڑے تماشے کرتے۔ ایک دوسرے کے اوپر لڑھکتے۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے۔ درختوں پر چڑھ کر آنکھ مچولی کھیلتے۔ کبھی ایک دوسرے سے روٹھ جاتے۔ ایک بچہ دیوار پر چڑھ کر یوں دور دیکھنے لگتا جیسے دوربین سے ستاروں کو تلاش کر رہا ہو۔ دوسرا دیوار کے پیچھے خاموش روٹھا ہوا سا بیٹھا رہتا۔ پھر ایکا ایکی چھلانگ لگا کر وہ دیوار پر چڑھ جاتا اور دونوں کلیلیں کرتے دیوار کے دوسری طرف کود جاتے اور ارشد اندر آ جاتا۔ کبھی وہ تین چار ہوتے اور سب ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے۔ لڑھکتے، دیوار اور درختوں پر چڑھتے اور ارشد کے ہاتھ سے دودھ اور بسکٹ کھاتے۔ ارشد ان کے عجیب عجیب نام رکھ دیتا۔ اب اس نے کامکس پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ کسی کا نام اسپیس مین SPACE MAN کسی کا بیٹ مین BAT MAN کسی کا سپرمین اور کسی کا بیاٹک والے رکھ دیتا۔ پھر وہ سب بڑے ہو کر ادھر اُدھر چلے جاتے اور ان کی جگہ کچھ اور بچے آ جاتے۔

اس دوران میں ارشد نے محسوس کیا کہ بلی کے بچوں کی پیدائش کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے جب ہر کہیں ننھے منے بچے نظر آتے ہیں۔ بازار میں جاؤ تو گلیوں میں، نالیوں میں اور کاروں کے نیچے دبکے ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں اس کے گھر میں بھی بچوں کی ریل پیل ہوتی پھر کچھ مہینے میں وہ بڑے ہو جاتے اور کچھ عرصہ بالکل سناٹا رہتا۔ ان خاموشی کے دنوں میں ارشد کا دل گھبرایا کرتا۔ اس لئے ایک دن اس نے اپنے باورچی خانے کے پیچھے یوں ہی ایک برتن میں دودھ ڈال کر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد آ کر دیکھا تو ایک چتکبری جنگلی بلی وہ دودھ پی رہی تھی۔ تھی تو چتکبری اور جنگلی مگر صورت کی بُری نہ تھی۔ اس کے بدن پر بھورے اور سلیٹی بڑے خوشنما نقش و نگار بنے ہوئے تھے، جنہیں دیکھنے میں ارشد کو بڑا مزا آ رہا تھا۔ ارشد نے فی الحال اسی بلی کو دوست بنانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ بڑی چوکنی بلی تھی۔ دودھ پیتے ہوئے پتہ بھی کھڑکتا تو وہ بھڑک کر دور ہٹ جاتی۔ آخر کنکھیوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اس نے سارا دودھ پی لیا اور پھر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ ارشد نے دیکھا وہ بلی پھر وہاں منڈلا رہی ہے۔ جیسے کھانے کی تلاش میں ہو۔ اب کے وہ ذرا دور گئی تو ارشد نے گوشت کے چند ٹکڑے پلیٹ میں ڈال کر رکھ دیئے۔ بڑی بلی ہے اتنے سے دودھ سے اس کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ ارشد نے سوچا۔ جیسے ہی وہ اندر گیا اس نے جھٹ موٹ باورچی خانے کا دروازہ بند کیا، گوشت پر ٹوٹ پڑی اور منٹوں میں اسے صاف کر کے غائب ہو گئی۔

ابھی دو گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ وہ پھر آن موجود ہوئی۔ اس دفعہ وہ ہلکی ہلکی میاؤں میاؤں بھی کر رہی تھی جیسے چپکے چپکے کسی سے کچھ مانگ رہی ہو۔ ارشد کو بڑا تعجب ہوا، پھر اسے خیال آیا کہ بڑی بلیوں کی خوراک ضرور زیادہ ہوتی ہو گی۔ وہ بھی تو سارا دن کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا ہے۔ اس دفعہ اس نے دودھ میں ڈبل روٹی کا ٹکڑا بھگو کر بلی کو دیا اور خود دروازے میں کھڑا رہا۔ بلی چند فٹ کے فاصلے پر دودھ ڈبل روٹی کھاتی رہی۔ پلیٹ صاف کر کے وہ زبان سے منہ دھوتی خاموشی سے درخت پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔

اور شام کو وہ گھر والوں کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ دروازے کے باہر میاؤں میاؤں کی آواز آئی۔ یہ آواز پہلے سے ذرا اونچی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ "ارشد میاں، ارشد میاں — سن رہے ہو ہے کچھ کھانے کو؟" ارشد نے امی سے پوچھ کر ایک کیک کا ٹکڑا بلی کو دے دیا۔ رات کے کھانے پر بلی کی آواز پہلے سے بھی تیز تھی، جیسے کہہ رہی ہو۔ "ارشد میاں! کیوں بھئی اکیلے ہی اکیلے۔ میں بھی تو ہوں، میں بھی تو ہوں۔" اور ارشد نے سالن میں سے کچھ بوٹیاں نکال کر روٹی کے ٹکڑوں کے ساتھ بلی کے آگے رکھ دیں مگر اب وہ کچھ پریشان سا تھا۔ یہ کیسی بھوکی بلی ہے کہ کسی طرح اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔

رات کو اس نے یہ قصہ امی کو سنایا۔ امی نے کہا۔ بیٹے کئی دن کی بھوکی ہو گی۔ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی یا جانور کئی وقت کا بھوکا ہو تو پیٹ سے زیادہ کھا لیتا ہے مگر رفتہ رفتہ اپنی نارمل خوراک پر آ جاتا ہے۔ آج تم نے اسے اچھی طرح کھلا دیا ہے کل سے وہ اتنا کھانا نہیں کھائے گی۔ اور دیکھو کل وہ آئے تو صبح ہی اسے خوب پیٹ بھر کر کھلا دینا۔

دوسرے دن ناشتے پر باہر سے بلی کی آواز آئی۔ اس وقت اس کی آواز ایسی تھی، جیسے وہ باقاعدہ مطالبہ کر رہی ہو۔ "ارشد میاں! کہاں ہے میرا ناشتہ؟" ارشد جلدی سے اُٹھا۔ پلیٹ بھر کے دودھ کا دن نمبک اور ایک بڑا سا توس مکھن لگا کر بلی کو دے آیا۔ اس کا خیال تھا دوپہر کے کھانے تک کے لئے یہ اچھا خاصا ناشتہ ہے ایک بلی کیلئے۔ بلی نے وہ سب کھا کر مونچھوں پر تاؤ دیا اور احاطے کی دیوار سے لگے ہوئے ایک درخت پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔ ارشد سکول چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد کی امی ناشتہ کرنے آئیں تو انہیں باہر سے بلی کی میاؤں کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے سوچا ہو نہ ہو یہ وہی ارشد والی بلی ہے ارشد بے چارے نے اسے جلدی میں کیا ناشتہ دیا ہو گا۔ لاؤ میں ہی دے دوں۔ انہوں نے پلیٹ بھر کے دودھ اور ریفریجریٹر میں سے گوشت کی چند بوٹیاں نکال کر بلی کے آگے رکھ دیں بلی نے سب کچھ صفاچٹ کر لیا اور مونچھوں پر زبان پھیرتی ہوئی درخت پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔ دوپہر کو وہ پھر موجود تھی۔ امی نے ارشد کو بتایا کہ انہوں نے اس کی بلی کو خوب پیٹ بھر کے ناشتہ کرایا تھا۔ ارشد نے حیران ہو کر کہا۔ "ارے امی میں تو خود بلی کو ناشتہ دے کر گیا تھا!"

"واہ عجیب پیٹو بلی ہے!" امی کے منہ سے نکلا اور اس دن کے بعد سے اس کا نام پیٹو بلی پڑ گیا۔ اور وہ واقعی تھی بھی پیٹو کچھ نہیں کچھ نہیں تو دو بلیوں

کا کھانا تو ضرور کھاتی تھی۔ رفتہ رفتہ سیاہی پیٹو بلی کے عادی ہو گئے۔ ارشد کی امی کا یہ خیال کہ رفتہ رفتہ اس کی خوراک میں کمی ہو جائے گی صحیح نہ نکلا۔ وہ ایک مرتبہ کھانا کھا کر جاتی اور تھوڑی دیر بعد پھر آجاتی۔ ایک دفعہ ارشد اسے کھانا ڈالتا اور دوسری دفعہ امی، کبھی کبھی وہ نوکر سے کہہ دیتیں تو وہ بہت چڑتا۔

"اس پیٹو بلی کو اتنا کھانا کھلانے کی کیا ضرورت ہے بیگم صاحبہ... پھر یہ کوئی پالتو بلی تو ہے نہیں، ہر جگہ سے کھا سکتی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر وہ ہمارے ہاں آس لگا کر آتی ہے۔ دیکھو وہ کس انداز میں میاؤں میاؤں کرتی ہے جیسے اسے معلوم ہے کہ اس کا کھانا یہاں موجود ہے۔"

"یہ بھی خوب رہی۔ نہ گھر کی رکھوالی کرے۔ نہ چوہے پکڑے، نہ ارشد بھائی کے ساتھ کھیلے اور خوب ڈٹ کر کھانا کھا جائے۔ اللہ کرے مجھے بھی کوئی ایسا گھر مل جائے جہاں کوئی کام نہ کرنا پڑے بس تینوں وقت جاؤں اور پیٹ بھر کر روٹی کھا آؤں۔" نوکر کہتا!

"آدمی اور جانور میں فرق ہوتا ہے شکور۔" امی اسے سمجھاتیں۔ "جانور تو جانور ہی ہے کسی نے رحم کھا کر دے دیا تو کھا لے گا ورنہ گرا پڑا کھائے گا۔ وہ بھی نہ ملا تو چوری کرے گا مگر انسان کو تو ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ مانگ کر کھانا یا چوری کر کے کھانا انسان کے لئے مناسب نہیں.... اب بلی بے چاری محنت مزدوری تو نہیں کر سکتی نا۔"

"مزدوری کیا۔ بلی کسی کے ہاں خانساماں تو نہیں بن سکتی۔" ارشد ہنستا۔

"مگر بلی تمہارے ہاں کی رکھوالی تو کر سکتی ہے بھلا دن گھر میں رہ کر تمہارے ساتھ کھیل تو سکتی ہے۔"

"وہ تو میں خود نہیں چاہتا۔" ارشد کہتا۔ "بس میں چاہتا ہوں وہ آزاد رہے۔ میں تھوڑی دیر اس سے کھیلوں اسے پیار کروں۔ پھر وہ اپنی راہ، میں اپنی راہ۔"

کئی ہفتوں تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ ایک دن ارشد کے ہاں ایک بڑی دعوت تھی۔ دعوت میں امی، ابو اور ارشد سبھی کے دوست شامل تھے۔ سب لوگ بے حد مصروف تھے۔ کھانا کھاتے کھاتے دیر ہو گئی اور کھانا کھا یا بھی لان میں گیا۔ اس کے بعد گانے اور لطیفوں کی محفل جم گئی۔ رات کو خوب دیر سے محفل ختم ہوئی۔ مہمان سدھارے گھر والے تھکے ہوئے تھے۔ کپڑے تبدیل کر کے جلدی سے سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ارشد بھی سو گیا تھا کہ اچانک کھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی، یوں لگا جیسے کسی نے باہر کے دروازے پر ہاتھ مارا ہو۔ گھبرا کر ارشد نے پوچھا "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "میاؤں۔" جیسے بلی نے کہا ہو "میں ہوں۔" اور پھر بہت دیر تک ہلکی ہلکی میاؤں میاؤں کی آواز آتی رہی جیسے پیٹو بلی اس سے روٹھی ہوئی ہو اور شکایت بھرے لہجے میں کہہ رہی ہو۔ "تم مجھے بھول گئے نا۔ خوب مزے سے اچھے اچھے کھانے کھا کر اور لطیفے سن کر سو گئے۔ تمہیں یہ خیال تک نہ آیا کہ پیٹو بے چاری بھوکی ہوگی۔ اس شکایت بھرے لہجے میں میاؤں میاؤں سن کر ارشد کو اٹھنا پڑا اٹھ کر جیسے ہی کھانے کے کمرے میں پہنچا بلی کی آواز اس طرف سنائی دی۔ "کیسی ہوشیار بلی ہے۔" ارشد نے سوچا میرے اٹھنے کا اسے پتہ چل گیا اور یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اب میں ریفریجریٹر کھولوں گا۔ خدا کا شکر کہ ریفریجریٹر میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں موجود تھیں۔ ارشد نے سوچا آج بلی کے لئے بھی ضیافت کا انتظام کر دوں یہ بھی کیا یاد کرے گی۔ اس نے مرغی کی ٹانگ بھی پلیٹ میں رکھی۔ پلاؤ بھی رکھ دیا، کباب بھی رکھ دیئے۔ ایک طرف کھیر اور میٹھے ٹکڑے بھی سجا دیئے اور پلیٹ باورچی خانے کے باہر رکھ کر جس وقت وہ دروازہ بند کرنے لگا تو اسے یوں لگا جیسے بلی کہہ رہی ہو "شکریہ، ارشد میاں، بہت بہت شکریہ۔" مگر یہ کیا۔ یہ تو ایک بلی کی آواز نہیں ہو سکتی۔ وہ اتنی تیزی سے کیسے بول سکتی ہے۔ ابھی تک وہ سارا کام برآمدے سے آنے والی روشنی میں کر رہا تھا اب اس نے باہر کی روشنی جلا کر غور سے دیکھا، وہ ایک نہیں دو بلیاں تھیں۔ بالکل ایک سی۔ دونوں چتکبری تھیں اور ان کے رنگوں یا جلد پر بنے ہوئے نقش نگار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں کی جسامت ایک تھی، شکل ایک تھی اور آواز بھی یکساں تھی۔ شاید وہ جڑواں بہنیں تھیں۔ ارشد کو بے حد ہنسی آئی۔ جسے وہ سب پیٹو بلی سمجھ رہے تھے۔ وہ ایک بلی نہیں تھی دو بلیاں تھیں اور کتنی چالاک تھیں کہ باری باری کھانا کھانے آتی تھیں۔ انہوں نے سب لوگوں کو خوب بے وقوف بنایا۔ صبح جب وہ امی ابو کو یہ بات بتائے گا تو وہ بھی بہت حیران ہوں گے اور ضرور ہنسیں گے۔

ڈاکٹر اعزاز نقوی

فرنگی عجوبے

اُن دنوں کی بات ہے کہ جب پورے ہندوستان پر مسلمان حکومت کیا کرتے تھے۔ دہلی کے لال قلعے پر پرچم لہرایا کرتا تھا۔ اور ہندوستان کے کروڑوں انسان مسلمان بادشاہوں کے سامنے سر جھکایا کرتے تھے۔ پھر ہوا یہ کہ مسلمانوں کا آپس میں اتحاد کمزور ہو گیا۔ ملک پر اُن کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ دشمن تاک میں بیٹھے تھے۔ انہیں موقع ملا خصوصاً انگریزوں نے ایسے میں بہت فائدہ اٹھایا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنی حکمتِ عملی سے ہندوستان پر اپنا قبضہ جمانا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ وہ انگریز جو ہمارے ملک میں صرف تجارت کی غرض سے آئے تھے وہ ہمارے حکمران بن بیٹھے اور ہم بدنصیب ان کے غلام ہو گئے۔

انگریز کیا آئے کہ اپنی ہر بات میں من مانی کرنے لگے۔ جو دل چاہتا وہی کرتے چاہے اس طرح ان کے کرنے سے ملک کے اصل رہنے والوں کو نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

اتنی بات ضرور ہے کہ انگریز بہت ذہین قوم ہے ان کے بچے دل لگا کر پڑھتے ہیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں خوب چھا جاتے ہیں۔ اسی لئے تو سات سمندر پار کر کے مٹھی بھر آدمی آئے اور ہم کروڑوں انسانوں پر حکومت کرنے لگے۔

جس زمانے میں وہ ہم پر حکومت کر رہے تھے۔ ٹھیک اسی زمانے وہ اپنے وطن میں سائنس میں خاصی ترقی کر چکے تھے۔ وہ ہم پر اپنا رُعب ڈالنے کے لئے اپنی طاقت سے چالاکی سے اپنے علم اور سائنسی کارناموں سے طرح طرح کے کھیل، کھیل رہے تھے، جن کا واقعی پاکستان اور ہندوستان کے رہنے والوں پر خوب رُعب پڑا۔ سائنس کے میدان میں انہوں نے ایسی چیزیں ایجاد کرنا شروع کر دیں کہ ہماری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہماری زندگی میں اس سے بڑی آسانیاں پیدا ہو گئیں اور یہ بھی کچھ جھوٹ نہیں کہ انہیں تمام چیزوں سے ان کو بھی ہم پر حکومت کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی اور اصل مقصد تو ان کا یہی تھا۔

ہم اس مضمون میں صرف چند وہ سائنس کے کارناموں کی روداد بتائیں گے جو انہوں نے ہمارے ملک میں رائج کیں۔ کب کیں؟ اور کیسے کیں؟ اور اس کو ہم نے قبول کس طرح کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام معلومات ہم نے اس زمانے کے اخبارات سے حاصل کی ہیں۔ اس لئے ہم ان تمام اخبارات کی خبریں جوں کی توں نقل کر رہے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ اس زمانے کی اُردو اور آج کی اُردو میں تھوڑا سا فرق پیدا ہو گیا ہے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اب کچھ سمجھ میں نہ آئے۔

ریل گاڑی۔

انگریزوں کی لائی ہوئی سب سے عجوبہ چیز ریل گاڑی تھی۔ ریل گاڑی کے ڈبے اور انجن تو انہوں نے انگلستان سے پانی کے جہازوں کے ذریعے منگوا لئے مگر اب بات پٹری بچھانے کی تھی، جس کو اخباروں نے اس وقت آہنی سڑک (یعنی لوہے کی سڑک) لکھا ہے۔ آہنی سڑک کا ذکر غالب نے اپنے خطوں میں بھی کیا ہے کہ۔ دلّی میں آج کل آہنی سڑک بچھائی جا رہی ہے اس خبر کو کوہِ نور اخبار جو لاہور سے نکلتا تھا اس میں ۱۲ جنوری ۱۸۶۲ء کو اس طرح چھاپا۔

عنوان ــــ آہنی سڑکیں

کوہِ نور اخبار ــــ ۱۲ جنوری ۱۸۶۲ء

آخر ۱۸۶۱ء میں کل ۲۹۳۳ میل کے جو کہ تمام ہندوستان میں زیر تیاری ہیں ۱۳۹۰

میل پر ریل جاری ہو گئی مشرقی ریل چند
روز میں چار سو میل تا مقام منگیر رواں ہو گی
اور دریائے سون پر عالی شان پل جون تک تیار
ہو جاوے گا ایک سڑک آہنی دہلی سے آگرہ
تک بنائی جاوے گی اس کی پیمائش ہو چکی ہے
۱۸۶۳ء کے موسم برسات تک کلکتے سے تا
دہلی برابر سلسلہ آمد و رفت کا بسواری ریل
جاری ہوگا۔ مدراس میں ناگپور کی لائن
(LINE) بھی اختتام کو پہنچی لیکن بالفعل جلد
نہیں ہے کلکتے سے جنوب و مشرق والی ریل
۱۲۱ میل تمام ہو چکی ہے۔ صرف ایک پل باقی
ہے وہ بھی چند ہفتوں میں کھل جائے گا اور
ہوڑا میں کارخانہ تجارت کی ترقی پکڑنے سے
گورنمنٹ کی تجویز یہ ہے کہ ایک پل بنا دیا
جاوے (ہگلی پر) کہ وہاں سے مال کی آمد و رفت
کلکتے ہونے لگے اس پل کا صرف پندرہ لاکھ
روپیا ہوگا۔

ریل گاڑی لاہور سے امرتسر تک

اخبار کوہِ نور ۸ر مارچ ۱۸۶۲ء

آخر بقول کوہِ نور ۸ر مارچ ۱۸۶۲ء یکم
مارچ سنیچر کے دن لاہور سے امرتسر تک
ریل بڑی دھوم دھام سے جاری ہوئی۔

کرایہ — لاہور سے امرتسر تک

درجہ اوّل کی گاڑی کا تین روپے
درجہ دوم کا دو روپے
درجہ سوم کا چار آنے

ایک گھنٹہ چالیس منٹ میں یہ ۳۲ میل
کا فاصلہ طے ہوگا۔

لاہور ریل آنے سے پہلے

اخبار کوہِ نور ۸ فروری ۱۸۶۲ء

۲ تاریخ کو سامانِ ریل بڑے تجمل اور شان
سے یہاں پہنچ گیا جملہ صاحبانِ عالی شان ولا
اور میم صاحبان اور رئیسانِ لاہور اس
کو لینے کے واسطے تین کوس (یعنی ۹ میل)
کے فاصلے پر تشریف لے گئے تھے ہزارہا
باشندگانِ شہر کا ہجوم تھا سیاہ گورا (انگریز)
اور پولیس کی چاروں طرف ریل کی حفاظت
تھی کئی سو میل بامداد پانچ ہاتھیوں کے
اس کو نہایت آہستگی سے کھینچ لاتے تھے
قریب شام سب سامان بیرون دروازہ
دہلی متصل کارخانہ ریلوے آکر ٹھہرا ہونڈ
وہاں میلہ لگا رہتا ہے اسی دن رات کو
صاحبانِ عالی شان نے بتقریب ورود
(داخل) ریل جلسہ عیش و طرب کا ترتیب
فرما کر باہم شغل اکل و شرب فرمایا ۳ مارچ
کو لاہور سے امرتسر تک ریلوے جاری
ہو جائے گی۔

ریل اور گھوڑے کا مقابلہ

۲۰ر جولائی ۱۸۷۰ء اکمل الاخبار

ساداتِ بارہ میں سے ایک صاحب کے
پاس عجیب گھوڑا "حر حر تنگ" ہے چنانچہ
ایک صاحب ملازم ریل سے یہ شرط ٹھہری
کہ اسٹیشن کھتولی سے مظفر نگر تک جو چودہ
میل کا فاصلہ ہے گھوڑا ہمراہ ریل دوڑایا
جاوے گا اگر گھوڑا پیچھے رہا تو مالک گھوڑا
ایک ہزار روپیا دیوے اگر گھوڑا بڑھ
گیا تو ہزار روپے ملازم ریل سے پایا جاوے
گا اس شنبہ کو گھوڑا ریل کے ہمراہ دوڑا،
ریل سے گھوڑا سوا میل آگے تھا صاحب
ملازم ریل نے شرط ہار کر ہزار روپے صاحب
کے نذر کیئے۔

موٹر کا حال (یعنی روڈ اسٹیمر کا بیان)

اخبار عام — ۳۰ر اگست ۱۸۷۱ء

یعنی اس قسم کی ریل گاڑی جو کنکر کی پکی
سڑک پر چلے، بنی ہے یہ ہندوستان
میں یہ روڈ اسٹیمر راولپنڈی سے جہلم تک
واسطے روانگی ڈاک اور مسافروں کے
جاری ہوگی۔

ریل میں زنانہ اور مردانہ کمرے

اکمل الاخبار ۱۵ دسمبر ۱۸۶۹ء

۱۵ر دسمبر ۱۸۶۹ء کا اخبار ایسٹ انڈیا
ریلوے سے متعلق یہ خبر دیتا ہے کہ
اس کمپنی کا "ایجنسی بورڈ" اس قسم کی گاڑی
بنوا رہا ہے جن میں بیچ میں گلی ہوگی
جس کے ایک طرف زنانہ کمرے اور دوسری
طرف ان مردوں کے مردانہ کمرے ہوں گے
جن کی عورتیں زنانہ کمرے میں سفر کر رہی
ہوں۔ اخبار اس انتظام کو نہایت پسند کرتا
ہے۔

تار برقی

اکمل الاخبار — یکم جنوری ۱۸۷۰ء

نیا طریقہ جو خبر تار برقی کے بھیجنے کے لئے
مقرر ہوا ہے اگر سو میل سے زیادہ فاصلہ
پر ہوا۔ آٹھ آنے اگر سو میل سے فاصلہ
زیادہ ہو اور ۲۰۰ میل سے کم ہو، ایک
روپیا اسی طرح اگر ۱۰۰۰ سے فاصلہ زیادہ
ہو مگر ۲۰۰۰ سے کم پانچ روپے ماسوا
اس کے آٹھ آنے فی پیغام۔

تار برقی۔ کراچی سے سکندریہ تک

اخبار کوہ نور ۔ ۲۵ فروری ۱۸۶۰ء

۲۵ فروری ۱۸۶۰ء معلوم ہوا کراچی سے
سکندریہ تک بحری تار برقی کا اجرا ہوا۔

ایک پیسے کا پوسٹ کارڈ

اکمل الاخبار ۔ ۱۱ جولائی ۱۸۷۹ء

پوسٹ کارڈ کا خیر مقدم
ہے لفافہ بھی اور زرِ محصول
اور فضول کو کام دیتا ہے
خط بھی ہے اور نامہ بر بھی ہے
یہ ٹکٹ پانچ کام دیتا ہے

دو پیسے کا لفافہ

کوہ نور ۔ اخبار ۱۲ ستمبر ۱۸۶۲ء

۱۸۵۴ء سے یہ حکم جاری ہوا ہے کہ لفافہ
پر ٹکٹ صرف نصف آنے لگانے کا دستور
ہوا۔

پانچ روپے کا نوٹ

اخبار عام ۔ ۸ جون ۱۸۷۱ء

۸ جون ۱۸۷۱ء کا اخبار خبر دیتا ہے کہ
پانچ روپے کا کرنسی نوٹ عنقریب جاری
ہو جائے گا۔

لاہور کا پہلا سرکاری اسکول

کوہ نور اخبار ۔ ۵ مئی ۱۸۶۰ء

مسٹر میڈی صاحب بریلی سے طلب ہو
کر لاہور مدرس ہوئے یہاں ایک مدرس
(ماسٹر) فارسی بھی مقرر ہوگا ایک پنڈت
شاستری (ہندی اور سنسکرت زبان کا
استاد) بھی مقرر ہوگا۔

درجہ اوّل ۔ میں فرزندان (بیٹے) راجگان و رئیسان
و سرداران ۔ کمرہ علاحدہ میں پڑھائے جاتے
ہیں۔

درجہ دوم ۔ اکثر فرزندان عہدہ داران سرکاری
اور مہاجناں وغیرہ کمرہ جداگانہ میں۔

درجہ سوم ۔ میں عام بھلے مانسوں کے لڑکے درس
پاتے ہیں۔ الگ کمرے میں۔

فیس

درجہ اوّل ۔ تین روپے ماہوار
باقیوں سے ۔ ایک روپیا ماہوار
حق التعلیم والے ۔ ۸ آنے ماہوار

تعلیم کے نئے مکان ۔ حویلی راجہ دھیان سنگھ
صاحب تجویز ہوئی۔

اب تو ہم بہت آگے بڑھ گئے ہیں پلٹ کر پیچھے
ہوئے پرانے زمانے کی طرف جب ہم دیکھتے ہیں،
تو بعض جگہوں پر ہمیں حیرانی ہوتی ہے کبھی ہنسی بھی
آتی ہے بہر حال جو کچھ بھی ہو، یہ ہمارے اپنے زمانے
کی بات ہے۔ یہ تو اب اپنی کہانی ہے۔ ان سب
باتوں کو ہمیں یاد رکھنا چاہیئے۔ اور اللہ کا شکر ادا
کرنا چاہیئے کہ اب ہم آزاد ہیں۔ ملک آزاد ہے
اور وہ تمام چیزیں جو ہم کو انگریزوں نے ایک سازش
کے طور پر دی تھیں آج وہ اور اس سے بھی کہیں
آگے بڑھ کر تمام چیزیں ہمارے پاس بغیر سازش
کے ہیں اور ان سے ہماری زندگی میں خیر و برکت
ہے۔ انشاء اللہ وہ دن بھی تو اب دور نہیں کہ
جب ایٹمی ری ایکٹر ہمارے اپنے ملک میں کام
کرنا شروع کر دے گا اور اس طرح ہمارا اپنا ملک
بھی ایٹمی ورلڈ میں شامل ہو جائے گا اور ایٹمی طاقت
کی نعمتوں سے فیضیاب ہوں گے۔ ہمارا ملک ترقی
کرے گا۔ اس انقلاب سے صنعتی دنیا میں بھی خوب
جھوم کر بہاریں آئیں گی۔ ہماری صنعتی ترقی بھی
جھومے گی، ناچے گی اور گائے گی۔

ڈاکٹر میمونہ انصاری

منجھو

ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک غریب آدمی رہا کرتا تھا۔ اُس کی بیوی مر چکی تھی بس ایک پیاری سی بیٹی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں باپ بیٹی بہت خوش خوش زندگی گزار رہے تھے۔ یہ لڑکی بہت رحمدل اور خوش مزاج تھی۔ اپنے ابّو کا حکم مانتی اور چھوٹے موٹے کام کر کے ان کو آرام پہونچانے کی کوشش کرتی۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک دن ایک جوان عورت ان کی جھونپڑی میں آئی۔ بھوکی تھی۔ لڑکی نے جس کا نام بانو تھا۔ رحم کھا کر گھر میں شام کے لئے جو چاول رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس کو کھلائے۔ ابّو نے اسے پانی پینے کو دیا۔ وہ عورت جھونپڑی میں رہنے لگی۔ کیوں کہ اس نے کہا تھا کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے، اور میں دنیا میں اکیلی بھی ہوں۔ پھر ابّو نے اس عورت کے ساتھ شادی کر لی اور بانو سے کہا کہ یہ تمہاری ماں ہے۔

شروع شروع میں تو بانو بہت خوش تھی۔ کیونکہ اس کی نئی ماں اس کے بال بناتی اس کے کپڑے سیتی اور اسے محبت سے کہانیاں سناتی۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلے اور بانو کی جھونپڑی پر اس عورت کا پورا قبضہ ہو گیا۔ جب بانو اکیلی ہوتی اس کی سوتیلی ماں اسے مارتی اور کھانا بھی نہ دیتی۔ بس سوکھے سوکھے ٹکڑے اسے کھانے کو دیئے جاتے۔ اور جب بے چاری بانو ابّو سے شکایت کرتی تو ابّو اس پر اُلٹے خفا ہوتے۔ وہ بھی اب بالکل بدل گئے تھے۔ بانو بے چاری کی بڑی مشکل تھی، اس کا کوئی دوست اس دنیا میں نہ تھا۔

ایک دن ابّو کسی دُور کے گاؤں چلے گئے اور بانو اپنی سوتیلی ماں کے پاس اکیلی رہ گئی۔ تو اُسے سوکھی روٹی دی گئی کہ یہ صبح کا ناشتہ ہے۔ بے چاری بانو جھونپڑی کے باہر کھیت میں چلی گئی۔ جہاں بیٹھ کر وہ رونے لگی۔ اتنے میں اُس کی نظر ایک چھوٹی سی چوہیا پر پڑی جو للچائی نظروں سے سوکھی روٹی کو دیکھ رہی تھی۔ بانو سمجھی کہ وہ غریب بھوکی ہے۔ اُس نے ایک ٹکڑا توڑ کر چوہیا کو دے دیا۔ چوہیا اُس کو کُتر کُتر کر کھا گئی۔ پھر بانو نے ایک اور ٹکڑا دیا چوہیا وہ بھی کھا گئی۔

بانو نے سوچا یہ تو بے چاری بہت بھوکی معلوم ہوتی ہے وہ خود بھی بہت بھوکی تھی بس یہی سوکھا ٹکڑا اس کا پیٹ بھرتا لیکن چوہیا کے دُکھ کے سامنے وہ اپنے دُکھ کو بھول گئی اور پوری روٹی اسے کھلا دی۔ روٹی کھانے کے بعد چوہیا بولی!

بانو تم بہت رحمدل ہو۔ تم نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ میں بھی تمہیں اس کا بدلہ دینا چاہتی ہوں۔

بانو چوہیا کو بولتا سن کر بہت حیران ہوئی لیکن وہ خوش بھی تھی کہ اللہ نے اُس کو ایک سہیلی دے دی۔ کم از کم وہ چوہیا سے باتیں تو کر سکے گی۔

چوہیا نے کہا۔

بانو تمہاری ماں منجھو مائی کی بہن ہے۔

بانو نے پوچھا۔

منجھو مائی کون ہے؟

"اچھا تم نہیں جانتی۔ وہی چڑیل جو بچوں کو ہڑپ کر جاتی ہے۔"

بانو سہم گئی۔

پھر چوہیا نے بتایا۔

"آج تمہاری سوتیلی ماں تمہیں منجھو مائی کے پاس سوئی دھاگہ لینے کے بہانے بھیجے گی۔ تم ہوشیار رہنا اگر ایسا ہو تو مجھے بتا دینا۔" پھر چوہیا خدا حافظ کہہ کر غائب ہو گئی۔

جب بانو جھونپڑی میں گئی تو سوتیلی ماں بولی۔

"اری بانو ذرا جا اور اپنی خالہ منجھو سے سوئی دھاگہ تو لے آ۔"

بانو گھبرا گئی۔ اُسے چوہیا کی بات یاد آ گئی تھی۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"سوئی دھاگہ تو گھر میں ہے۔"

پھر ماں نے ڈانٹا۔

"لیکن امی ابھی تو میں بہت چھوٹی ہوں۔ میں تو راستہ ہی نہیں جانتی۔"

ماں نے اُسے دو تھپڑ لگائے اور کہا۔

"ناک کی سیدھ میں چلی جا اور لے یہ راستہ میں کھا لینا۔" ماں نے کاغذ کا ایک بھاری پیکٹ اُسے تھما دیا۔

بے چاری بانو نے بہت چاہا کہ کسی بہانے سے وہ چوہیا کو اطلاع دے لیکن ماں اُسے گھسیٹتی ہوئی بہت دُور تک پہنچا آئی۔

بے بس ہو کر بانو نے چلنا شروع کر دیا۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اس کی اپنی پیاری ماں آج اُسے بہت یاد آ رہی تھی۔ ایک جگہ اُسے ٹھوکر لگی۔ اب اُس نے جو زمین پر نظر ڈالی تو اُسے چوہیا کی چمکدار آنکھیں اور ہلتی ہوئی مونچھیں نظر آئیں۔

"بانو دیکھا میری بات ٹھیک تھی نا۔" چوہیا نے کہا۔

چوہیا کو دیکھ کر بانو بہت خوش ہوئی، وہ وہیں بیٹھ گئی، اور کہنے لگی۔

"رحمدل چوہیا مجھے کوئی ترکیب بتاؤ۔ تاکہ منجو چڑیل مجھے ہڑپ نہ کر سکے۔ اور میری جان بچ جائے۔"

چوہیا بولی۔ تم فکر نہ کرو۔ راستہ میں جو چیز تمہیں پڑی ملے اپنے تھیلے میں ڈال لو۔ پھر اللہ مالک ہے۔ بے فکر ہو کر منجو کے پاس چلی جاؤ۔

"شکریہ چوہیا بی!" لڑکی نے کہا۔ اور ہاں کیا تم بھوکی ہو دیکھو میری سوتیلی ماں نے یہ ناشتہ دیا ہے۔ تم کچھ کھا لو۔

لڑکی نے تھیلے میں سے پیکٹ نکالا اب جو کھولتی ہے تو اُس میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ بیچاری لڑکی شرمندہ ہو گئی۔

"تت ... تت .... تم پرواہ نہ کرو۔" چوہیا نے کہا۔

"ذرا آنکھیں تو بند کرو۔"

لڑکی نے آنکھیں بند کر لیں۔

"اب کھولو۔"

اب آنکھیں جو کھولیں تو بانو کیا دیکھتی ہے کہ پتھروں کی جگہ پیکٹ میں حلوہ اور پراٹھے رکھے تھے۔ دونوں نے خوشی خوشی کھانا کھایا۔

"اچھا خدا حافظ۔" چوہیا نے کہا۔

خدا حافظ بی چوہی اور بانو اپنے سفر پہ بہادری سے روانہ ہو گئی۔

سب سے پہلے اُسے راستے میں ایک رنگین رومال پڑا نظر آیا۔ اُسے چوہیا کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے اُٹھا کر تھیلے میں ڈال لیا۔ پھر اُسے ایک شیشی تیل کی پڑی ملی۔ اُس نے وہ بھی اُٹھا لی۔ پھر کچھ گوشت کے ٹکڑے نظر آئے۔ وہ بھی تھیلے میں ڈال لئے۔ کچھ اور آگے بڑھی تو نیلے رنگ کا ایک فیتہ اور کنگھا ملا۔

"لاؤ ان کو بھی لیتی چلوں۔" اس نے سوچا اور ان کو بھی تھیلے میں رکھ لیا۔

اب ایک روٹی کا ٹکڑا پڑا دیکھا۔ بانو نے چوہیا کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اُسے بھی احتیاط سے اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔ پھر اُس نے ایک تولیہ بھی زمین سے اُٹھا لیا۔ اب وہ منجو کے گھر کے سامنے تھی۔ ایک بڑا سا پھاٹک اُسے نظر آیا۔ اُس نے جیسے ہی اندر جانے کے لئے اُسے ہاتھ لگایا۔ وہ بڑے زور سے بولا۔

چوں ..... چوں ..... چوں۔ لڑکی کو بڑا رحم آیا۔

"بے چارہ پھاٹک کب سے اس کی چولوں میں تیل نہیں ڈالا گیا ہے۔" اور اس نے وہ سارا شیشی والا تیل چولوں میں ڈال دیا۔

جب اُس نے صحن میں قدم رکھا۔ تو چڑیل کی ایک باندی روتی ہوئی نظر آئی۔ جو اس کے ظلموں سے تنگ آ چکی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ اپنی آستین سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"کتنا اچھا ہوا!" بانو نے دل میں سوچا کہ میں نے یہ رومال اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیا تھا۔ اور رومال اس باندی کو دے دیا۔ اس نے بانو کا شکریہ ادا کیا۔ اور رومال سے آنسو پونچھنے لگی۔ برآمدے کے سرے پہ ایک بڑا سا توانا کتا ایک سوکھی لکڑی کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیوں کہ وہ بہت بھوکا تھا۔

"یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ میں نے روٹی کا ٹکڑا اُٹھا لیا تھا۔" بانو دل ہی دل میں خوش ہوئی، اور ٹکڑا کتے کے سامنے ڈال دیا۔ کتا بڑے شوق سے کھانے لگا۔

پھر لڑکی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"اندر آ جاؤ" منجو مائی کی آواز آئی۔

اور جب بانو اندر پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ پتلی پتلی ٹانگوں والی مائی منجو بڑی خوفناک لگ رہی تھی۔ اُس کے دانت بڑے بڑے تھے۔ اور کالے کالے جیسے پیڑ پتے کے ہوں اور اس کے ناخن لمبے لمبے نوکیلے سے تھے۔ اور وہ چرخہ کات رہی تھی۔ اور ایک کالی بلی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں چوہے کے بِل پر لگی تھیں۔ بلی

سوکھی سڑی سی تھی۔

"آداب خالہ جان" بانو نے جھک کر سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی" مجّھو نے جواب دیا۔ ۔ ۔

"میری امّی نے مجھے آپ کے پاس سوئی دھاگہ لینے بھیجا ہے۔" بانو نے ادب سے کہا۔

"اچھا اچھا سوئی دھاگہ!" اور وہ چڑیل ہنسنے لگی۔ اس کے لوہے کے دانت آپس میں بج رہے تھے۔ بانو کو وہ بہت بُری لگی۔

"تم چرخہ کاتو میں تمہارے لئے سوئی دھاگہ لاتی ہوں۔" چڑیل نے بانو سے کہا اور بانو بیٹھ کر چرخہ کاتنے لگی۔

جب چڑیل اندر گئی تو بانو نے سُنا وہ اپنی باندی سے کہہ رہی تھی۔

"لڑکی کو مل مل کر نہلاؤ میں آج اس کا مزیدار قورمہ پکاؤں گی کچھ بوٹیاں تمہیں بھی کھانے کو ملیں گی۔"

جب باندی جگ تلاش کرنے اندر آئی تو لڑکی نے خوشامد کی مجھے نہلانے میں جلدی نہ کرنا۔

"باندی نے اشارے سے کہا اچھا!" وہ خود چڑیل سے بہت خوفزدہ تھی۔

چڑیل نے کھڑکی سے آکر کہا۔

"پیاری بانو، تم چرخہ کات رہی ہو؟"

"جی ہاں خالہ جان!"

جب مجّھو چلی گئی تو لڑکی نے بلّی سے پوچھا۔ پیاری بلّی تم بل کی طرف کیا تک رہی ہو اور تم اتنی سوکھی ہوئی کیوں ہو۔

"میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ چوہے کی تاک میں بیٹھی ہوں۔"

بانو نے سوچا یہ بھی میں نے اچھا کیا کہ گوشت کا ٹکڑا اُٹھا لیا تھا۔

"لو پیاری بلّی یہ گوشت کھاؤ۔"

بلّی بے حد خوش ہوئی اور گوشت کھا کے بولی۔

"مائی مجّھو تمہیں کھا جائے گی۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"میں بھاگنا چاہتی ہوں لیکن کس طرح بھاگوں؟"

"میں تمہاری مدد کردوں گی۔" کالی بلّی نے کہا۔ اسی وقت مجّھو مائی کھڑکی کے قریب آئی اور پوچھا۔

"پیاری بیٹی چرخہ کات رہی ہو؟"

"جی ہاں خالہ جان بانو نے جواب دیا۔ چرچوں ۔ ۔ ۔ چرچوں۔ چرخہ تیزی سے چل رہا تھا۔

پھر آہستہ سے بلّی نے کہا۔ بانو اب تم بھاگنے کی کوشش کرو، لیکن یاد رکھو کہ تمہارے پاس ایک تولیہ ہے۔ جب مجّھو تمہارے بالکل قریب آئے تو وہ پھینک دینا۔ ایک بہت بڑا تالاب تمہارے اور چڑیل کے درمیان آجائیگا۔ اور اس تالاب کو خشک کرنے میں اُسے کچھ دیر لگ جائے گی۔ تم بھاگتی رہنا۔ جب وہ پھر تمہارے قریب پہنچے تو وہ کنگھا پھینک دینا جس سے ایک گھنا جنگل بن جائے گا۔ اور تم بچ نکلو گی۔

"لیکن پیاری بلّی! اگر چرخے کی آواز بند ہوگئی۔ تو چڑیل کو معلوم ہو جائے گا۔" بانو نے کہا۔

"وہ میں دیکھ لوں گی۔" بلّی نے کہا۔ اور لڑکی کی جگہ لے لی۔

چرچوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چرچوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چرچوں۔ برابر چرخے کی آواز نکل رہی تھی۔ بانو نے کھڑکی میں سے جھانک کے دیکھا۔ مجّھو غسل خانہ میں تھی۔ اُس نے بھاگنا شروع کر دیا۔

وہ خوفناک کتّا اس پر جھپٹا کہ اُس کی بوٹیاں بوٹیاں کر دے لیکن جب اُس نے پہچانا کہ یہ تو وہی مہربان لڑکی ہے۔ جس نے اُسے صبح روٹی کا ٹکڑا دیا تھا۔ تو راستے سے ہٹ گیا۔

دروازے پر ایک بیری کا درخت تھا، جس کے کانٹے انسان کی آنکھیں پھوڑ دیا کرتے تھے۔ بانو نے سوچا۔ میں نے کتنا اچھا کیا کہ فیتہ اُٹھا لیا تھا۔ اس نے بیری کی شاخوں میں فیتہ باندھ دیا۔ پیڑ بہت شکرگزار ہوا۔ اور اُس کی آنکھیں صحیح سلامت رہیں۔

جب بانو دروازے کے پاس پہنچی۔ تو دروازہ اُسے پہچان کر خود کھل گیا۔ کیوں کہ اُس نے اس کی چولوں میں صبح تیل ڈالا تھا۔ اس کی چولوں میں اب کوئی آواز بھی نہیں ہوتی تھی۔

لڑکی بھاگتی رہی ـــ بھاگتی رہی۔ کافی دُور چلی گئی۔

جب مجّھو غسل خانے سے نکلی تو کھڑکی کے پاس آکر بولی۔

"بانو میری جان! میرا قورمہ! کیا تم چرخہ کات رہی ہو؟" اور منمناتی ہوئی آواز میں اُس نے جواب دیا۔

"جی ہاں، خالہ جان"

"ارے یہ تو میرے قورمے کی آواز نہیں ہے"

مجّھو کمرے میں جھپٹی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھا تو کالی بلّی بیٹھی چرخہ کات رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نمک حرام ـــ بتا کہاں ہے بانو ـــ تم نے اُسے کیوں جانے دیا؟ کیوں نہیں پکڑا ۔ ۔ ۔ ۔ مجّھو نے غصّہ میں چیختے ہوئے بلّی سے سوال کیا۔

"برسوں سے میں تمہاری خدمت کر رہی ہوں مائی مجّھو۔ لیکن تم نے مجھے گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دیا۔ اور لڑکی نے مجھے گوشت کا ٹکڑا دے کر میرا پیٹ بھرا تھا۔"

مٹھو نے بلّی کو لات ماری اور باہر بھاگی۔

"تم نے اُسے چیر پھاڑ کر کیوں نہ کھایا؟" اُس نے کُتّے سے پوچھا۔ تم نے اُس کی آنکھیں کیوں نہ پھوڑیں۔۔ بیری سے پوچھا۔

تم نے اُسے بند کیوں نہ کیا؟ دروازے سے پوچھا — وہ بالکل پاگل ہو گئی تھی۔

کُتّے نے جواب دیا کہ اتنے برس تمہاری خدمت کی، لیکن تم نے مجھے کبھی روٹی کا ٹکڑا نہیں دیا اور بانو نے مہربانی کر کے مجھے روٹی کھلائی۔

بیری کے درخت نے کہا۔ اتنے سال میں نے تمہاری خدمت کی لیکن ہائے تم نے ایک دفعہ بھی میری جڑوں میں پانی نہیں ڈالا۔ اور بانو نے میری شاخوں میں نیلا فیتہ باندھا۔

دروازوں نے کہا۔ تم نے ایک دفعہ بھی ہماری چولوں میں تیل نہیں ڈالا۔ اور بانو نے تیل ڈالا —— وہ کتنی مہربان ہے۔

اور جب مٹھو باندی پر جھپٹی تو اُس نے بھی روتے ہوئے کہا۔

"اتنے برس تمہاری خدمت کی لیکن تم نے میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔" بانو نے مجھے اتنا خوبصورت رومال دیا ہے —— اس کے ہاتھ میں وہ خوبصورت رومال اب بھی تھا۔

مٹھو نے غصّے میں اپنے لوہے کے دانت کٹکٹائے اور اپنی گاڑی لے کر لڑکی کے پیچھے بھاگی۔

بانو تیز بھاگ رہی تھی۔ لیکن اس کے کان گاڑی کی گھر گھر پر لگے ہوئے تھے۔ جب گاڑی کو قریب آتے دیکھا۔ تو اُس نے تولیہ میدان میں پھینکا جس سے تالاب بن گیا۔

اب مٹھو کو بہت غصّہ آیا۔ اور واپس جا کر وہ اپنے سارے جانور بیل، بکری، اونٹ لے آئی۔ انہوں نے پانی پینا شروع کر دیا۔ اور کچھ دیر بعد پورا تالاب خشک ہو گیا۔ تو اُس نے پھر گاڑی لے کر اُس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ بانو کے کان گاڑی کی گھر گھر پر لگے ہوئے تھے۔ جب دیکھا کہ گاڑی سامنے آگئی ہے۔ تو اس نے کنگھا پھینک دیا۔

اب کیا تھا۔ فوراً ایک گھنا جنگل لڑکی اور مٹھو کے درمیان آ گیا۔ اب تو وہ بہت خوش ہوئی۔

تت۔ تت۔ قریب ہی چڑیا کی آواز آئی۔ وہ ایک گرے ہوئے درخت کی شاخوں کو بیٹھی کُتر رہی تھی۔ اور ہنس رہی تھی۔

بانو اس کے پاس آ کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ پھر وہ اپنے گھر کی طرف بھاگی۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ جب دروازے میں داخل ہوئی تو ابّو صحن میں کھڑے تھے۔ انہوں نے بانو سے پوچھا۔ تم کہاں سے آ رہی ہو؟ بانو نے پورا قصّہ سُنا دیا کہ سوتیلی ماں نے بانو کو مٹھو کا نوکر بنانے کے لئے بھیجا تھا۔

جب ابّو کو معلوم ہوا تو انہیں غصّہ آیا۔ انہوں نے اس عورت کو گھر سے نکال باہر کیا۔ پھر وہ دونوں اپنی جھونپڑی میں پہلے کی طرح آرام سے رہنے لگے۔

روز چڑیا [illegible] دانے کھانے کی مزے مزے کی چیزیں دیا کرتی تھی۔ پھر وہ دونوں — بہت دیر تک باتیں کرتیں۔ کہیں دُور گاؤں کے دوسرے سرے پر ایک عورت پھٹے حالوں بھیک مانگا کرتی۔ اور لوگ سوکھے ٹکڑے اس کے پیالے میں ڈال دیا کرتے۔

یہ وہی سوتیلی ماں تھی۔

سچ ہے۔ ناشکروں کا یہی انجام ہے۔

عطا شاد

میاں بیوی ۔ شیر اور گیدڑ

ایک کسان تھا۔ اس نے جوار بوئی۔ جب فصل پک گئی ایک شیر آیا اور کھیت میں گھس گیا۔ کسان ایک چھپر پر بیٹھا ہوا تھا۔ شیر نے اسے کہا نیچے اترو میں تمہیں کھا جاؤں گا۔

کسان نے کہا کہ ابھی تو میں دبلا پتلا ہوں۔ میں جوار کھا پی کر موٹا ہو جاؤں تو مجھے کھا لینا۔

شیر روزانہ آتا اور کہتا میں تمہیں کھا جاؤں گا۔ کسان اس کے خوف سے لاغر ہوتا گیا۔ اس کی بیوی نے اس سے دریافت کیا کہ خوب کھاتے پیتے ہو مگر دبلے ہوتے جا رہے ہو۔

کسان نے کہا ایک شیر روزانہ آتا ہے۔ مجھے ڈراتا ہے کہ میں تمہیں کھا جاؤں گا۔ میں اس لئے دبلا ہو رہا ہوں۔ کسی نہ کسی دن شیر مجھے کھا ہی جائے گا۔ بیوی نے پوچھا شیر کس وقت آتا ہے۔

کسان نے کہا دوپہر کو۔

پھر اس کی بیوی نے مردانہ کپڑے پہنے گھوڑے پر سوار ہوئی ہتھیار بھی اٹھا لئے۔ جوار کے کھیت میں آئی اس نے دیکھا کہ شیر اس چھپر کے نیچے کھڑا ہے بیوی نے آواز لگائی۔ اے کسان!

کسان نے کہا جی مالک!

بیوی نے کہا بادشاہ نکلا ہے شیروں کے شکار کے لئے تم نے اس پاس شیر کے پاؤں کے نشان دیکھے ہیں۔ پچھلے سال کے یا اس سے بھی پہلے کے۔

کسان نے شیر سے پوچھا اب بتاؤ کیا کروں تمہارے بارے میں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔

شیر نے کہا ہاں یہ بادشاہ کا وزیر ہے، شیر نے کہا اب مجھے مزید بھگاؤ یہاں سے۔

کسان نے کہا تم چپ رہو۔ میں چادر تمہارے اوپر ڈال دیتا ہوں۔ شیر سو گیا۔ اور کسان نے اس کے اوپر چادر ڈال دی پھر اس نے جواب دیا اے سوار میں نے شیر کے پاؤں کے نشان نہیں دیکھے سوار نے پوچھا وہ موٹی کالی چیز کیا پڑی ہوئی ہے شال کے نیچے۔

کسان نے کہا یہ لکڑی ہے۔ میں نے اسے حقہ جلانے کیلئے رکھا ہوا ہے۔

بیوی نے کہا اس کا کچھ حصہ مجھے کاٹ کر دے دو۔ میں بادشاہ کے لئے لے جاؤں گا۔ وہ بھی حقہ پیتا ہے۔

کسان نے شیر سے پوچھا اب کیا کروں۔

شیر نے کہا اب میرا کان کاٹ کر دے دو۔

کسان نے شیر کا کان کاٹ کر دے دیا۔

بیوی نے کہا اس سے ذرا بڑا ٹکڑا دے دو۔

شیر نے کہا اب دوسرا کان بھی کاٹ کر دے دو۔

کسان نے دوسرا کان بھی کاٹ کر دے دیا۔

بیوی نے غصے میں کہا اس سے بڑا ٹکڑا کیوں کاٹ کر نہیں دے دیتا اس لکڑی کے تنے سے۔

پھر شیر نے کہا اب میری دم کاٹ کر دے دو۔

دم بھی کاٹ کر دے دی۔

بیوی نے کہا تم تھوڑا سا کاٹتے ہو تم چھوڑ دو میں خود کاٹ لوں گی۔ یہ سنتے ہی شیر بھاگ کھڑا ہوا سامنے اس کے ایک گیدڑ آیا اس نے شیر سے پوچھا تمہارے کان بھی کٹے ہوئے ہیں اور دم بھی کٹی ہوئی ہے۔ خون بہہ رہا ہے اور تم بھاگ رہے ہو یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ شیر نے کہا کہ بادشاہ کی فوج نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔ میرے کان کاٹ دیئے ہیں اور دم بھی کاٹ دی ہے، بس خدا نے میری جان بچائی ہے۔

گیدڑ نے کہا اے بزدل تجھ کو ایک عورت نے ڈرایا ہے۔ نہ بادشاہ ہے نہ فوج ہے۔ ایک عورت نے تمہارے کان بھی کاٹ ڈالے اور دم

بھی ۔۔۔!

شیر نے کہا میں نے اپنی آنکھوں سے فوج اور وزیر دیکھا ہے۔ گیدڑ نے کہا، حضرت تم آؤ میں تمہیں دکھا دوں۔

شیر نے کہا تمہارے ساتھ چلتا ہوں ایک رسی تم اپنے گلے میں ڈالو اور اس کا ایک سرا میرے گلے میں بھی۔

پھر گیدڑ نے رسی اپنے گلے میں اور شیر کے بھی گلے میں ڈال اور دونوں ساتھ ساتھ چلے۔ سوار نے دیکھا کہ شیر کو گیدڑ کھینچتا ہوا لا رہا ہے۔ اس نے گیدڑ سے پوچھا کہ تم نے بادشاہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں چودہ شیر تمہارے پاس لاؤں گا۔ اب صرف ایک لے کر آ رہے ہو۔ وہ بھی کان کٹا۔

یہ سنتے ہی شیر بھاگ کھڑا ہوا اور گیدڑ کو گھسیٹتا چلا گیا۔ گیدڑ کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ ٹانگیں بھی ٹوٹ گئیں اور مر گیا، شیر اپنے کٹے ہوئے کان اور دم کے بغیر بھاگا۔

کسان اور اس بیوی جوار کے کھیت میں خوشی خوشی رہنے لگے۔

کاظم رضا

صبوحی کا ساتھی

صبوحی کا امتحان سر پر آگیا تھا اور اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

اس کی چھوٹی بہن شہلا اس سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ اس نے ساری کتابیں شروع سے آخر تک پڑھ ڈالی تھیں۔ انہیں دہرا بھی لیا تھا خاص خاص سوال تو اسے ازبر تھے مگر صبوحی کا ابھی سارا کام باقی تھا جب اسے خیال آتا تھا کہ چھوٹی بہن شہلا اس سے بہت آگے نکل گئی ہے تو اسے بڑی شرمندگی ہوتی تھی۔!

یہ بات نہیں تھی کہ صبوحی کو پڑھنے کا شوق نہ تھا اسے شوق تو بہت تھا مگر جب وہ رات کو پڑھنے کے لئے بیٹھتی تو نیند اسے اس بری طرح ستاتی تھی کہ کتاب کے صفحوں پر نگاہیں جمانا اس کے لئے دشوار ہو جاتا تھا۔ تھوڑی دیر وہ کوشش کر کے بیٹھی بھی رہتی تھی تو الفاظ گڈمڈ ہو کر ناچنے لگتے اور کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ ہاں اگر صبح سویرے اٹھ کر وہ پڑھنے بیٹھ جاتی تو بات دوسری تھی۔ اس وقت وہ جو سبق ایک بار پڑھ لیتی اسے ازبر ہو جاتا۔ اس لئے وہ صبح سویرے اٹھ کر پڑھنا زیادہ پسند کرتی تھی۔

مگر اب کچھ دنوں سے ہوتا یہ تھا کہ صبح کو اس کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ سورج نکل آتا اور وہ پڑی سوتی رہ جاتی۔ گھر میں سب اٹھ کر اپنے کام کاج میں لگ جاتے اور اسے جگانے کا کسی کو خیال ہی نہ آتا۔ جب اسکول کا وقت قریب آتا تو شہلا آکر اسے جگاتی: "اٹھو آپی اسکول کا وقت قریب ہو گیا ہے"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی مگر صحن میں پھیلی ہوئی دھوپ دیکھ کر اسے بہت افسوس ہوتا، پھر شہلا بھی بڑی شریر تھی۔ وہ اس کو چڑانے کے لئے کہتی۔ "آپی اس مرتبہ پاس ہونے سے رہیں۔ شہلا کی یہ بات سن کر یوں تو اسے بہت غصہ آتا مگر دل میں یہ سوچ کر کہ بات تو ٹھیک ہی ہے وہ خاموش ہو جاتی۔

وہ چاہتی تو شہلا سے کہہ سکتی تھی کہ صبح جب وہ اٹھا کرے۔ تو اسے بھی اٹھا دیا کرے مگر یہ بات اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔ دونوں بہنوں کی عمروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا، صبوحی شہلا سے صرف ڈیڑھ سال بڑی تھی اور اسکول میں اس سے صرف ایک سال آگے تھی۔ اس پر شہلا یہ شیخی بگھارتی رہتی تھی کہ وہ ایک سال میں دو امتحان پاس کر کے اس کی کلاس میں آجائے گی۔ ایسی صورت میں وہ شہلا کا احسان اٹھانا نہیں چاہتی تھی مگر صبح جلدی اٹھنے کی کوئی دوسری صورت بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا چلا جا رہا تھا اور اس کی پریشانی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

صبوحی نے ایک مرغا پال رکھا تھا۔ رنگین پروں والا خوبصورت اور موٹا تازہ مرغا۔ وہ اسے روزانہ اپنے ہاتھوں سے دانا کھلاتی اور ڈھیروں پیار کرتی۔ مرغا بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا اور جب ان کو کوئی دوسرا کام نہ ہوتا تو وہ دونوں بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ مرغا تھا بھی بہت ہی باتونی۔!

مگر اس روز صبوحی کو صبح سے شام تک مرغ کو دانا کھلانے کا خیال ہی نہ آیا۔ وہ بے چارہ دن بھر بھوکا پھرتا رہا۔ آخر شام کو وہ شکایت کرنے کے لئے صبوحی کے پاس آیا مگر صبوحی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ صبوحی کسی وجہ سے پریشان ہے۔ اس نے پوچھا "ایس صبوحی۔

کہا "آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔؟"

صبوحی کے خیالات کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ اس نے مرغ کی طرف دیکھا اور اس سے کہا "میرا امتحان سر پر آگیا ہے میاں مرغے مگر مجھے کچھ یاد ہی نہیں ہے اگر میں پڑھوں گی نہیں تو فیل ہو جاؤں گی"

"تو آپ پڑھتی کیوں نہیں ہیں۔؟" مرغ نے پوچھا "آپ تو کتابیں پڑھنے کی بہت شوقین ہیں"

"پڑھوں کیسے؟" اس نے بے بسی سے کہا "رات کو نیند آجاتی ہے۔ اس وقت مجھ سے کچھ پڑھا نہیں جاتا اور صبح آنکھ نہیں کھلتی۔ اگر مجھے کوئی صبح سویرے جگا دیا کرے تو میں جلدی جلدی اپنا سارا کورس ختم کرلوں"

"تو یہ کونسی مشکل بات ہے" مرغ نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میں بہت جلدی اٹھنے کا عادی ہوں میں آپ کو جگا دیا کروں گا"

صبوحی خوش ہوگئی۔ وہ بولی "بہت بہت شکریہ میرے اچھے مرغے، میں تمہارے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کروں گی اور ہمیشہ تمہارا بہت ہی زیادہ خیال رکھا کروں گی جس چیز کو تمہارا دل چاہا کرے گا۔ وہی کھلایا کروں گی"

مرغ نے اسے صبح سویرے اٹھانے کا وعدہ تو کر لیا مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ دن کی طرح رات کو اسے آزادی کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

صبح ہوئی تو اس نے زور زور سے چلا کر صبوحی کو پکارا۔

"صبوحی بی بی اٹھو صبح ہوگئی۔۔ اٹھو صبح ہوگئی۔ اب اپنی کتابیں لے کر بیٹھو جاؤ، صبح ہوگئی اٹھو۔ اب اٹھ بھی جاؤ صبح ہوگئی" مگر اس کا ڈربہ صبوحی کے کمرے سے بہت دور تھا وہاں سے اس کی آواز کمرے تک پہنچتی تو ضرور تھی مگر اتنی دھیمی کہ صبوحی کو جگا نہیں سکتی تھی۔ ڈربہ بند تھا۔ اس لئے باہر نکل کر صبوحی کے کمرے میں جانا اس کے بس میں نہ تھا۔ چیختے چیختے اس کی آواز بیٹھ گئی مگر صبوحی کی آنکھ نہیں کھلی اور جب آنکھ کھلی تو دھوپ سارے آنگن میں پھیل چکی تھی اور شہلا اپنا بستہ لئے سکول جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

صبوحی کو بہت غصہ آیا۔ وہ دوڑی دوڑی مرغ کے پاس گئی اور اس سے شکایت کرنے لگی "واہ میاں مرغے خوب جگایا تم نے۔ اچھی دوستی نباہی ایک دن بھی تم سے مجھے وقت پر نہ جگایا جا سکا"

مرغ کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے کڑکڑا کر کہا "صبوحی بی بی۔ آپ تو مجھ پر بے وجہ الزام رکھ رہی ہیں میں تو صبح سویرے ہی اٹھ گیا اور آپ کو جگانے کے لئے چیخ چیخ کر پکارتا رہا۔ پکارتے پکارتے مری آواز بیٹھ گئی مگر آپ نے کروٹ ہی نہ بدلی اب میں تو اس ڈربے میں بند ہونے کی وجہ سے مجبور تھا ورنہ آپ کو آپ کے کمرے میں جا کر کان پکڑ کر اٹھاتا"

صبوحی پھر سوچ میں پڑ گئی۔ مرغ کو کھلا چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ پڑوسیوں کی کالی بلی اس کی جان کی دشمن تھی، اگر وہ رات کو اس کو کھلا دیکھ لے گی تو اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ یوں تو وہ بڑا بہادر اور نڈر مرغ تھا مگر پھر بھی آخر مرغ ہی تھا نا۔ اس کا بلی سے بھلا کیا مقابلہ!

اس روز وہ بہت اداس تھی وہ اسکول بھی نہیں گئی اور اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر سوچتی رہی مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی بس اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب جی بھر کے رو لے۔ اب ان حالات میں اس کا فیل ہو جانا یقینی ہو چکا تھا اور اگر وہ فیل ہو جاتی ہے تو اسکا مذاق بنے گا۔ سب اسے برا بھلا کہیں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اس کی چھوٹی بہن شہلا اسکی کلاس میں آجائے گی یہ سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے۔

آنسو اس کے گالوں پر بہہ کر تکیے پر گرے کسی نے آہستہ سے اس سے کہا "ننھی صبوحی آج تم اتنی اداس کیوں ہو۔ تم رو کیوں رہی ہو؟"

صبوحی یہ آواز سن کر چونک گئی۔ اس نے اپنا سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے ایک دم سے ڈر لگنے لگا، وہ چاہتی تھی کہ چیخ مار کر سارے گھر والوں کو اپنے کمرے میں جمع کر لے کہ اسے وہی آواز پھر سنائی دی "ڈرو مت ننھی صبوحی تعجب ہے کہ تم مجھے پہچانتی نہیں ہو میں تو تمہارا بہت پرانا ساتھی ہوں۔ روز تمہارا سر اپنے سینے پر رکھ کر تمہیں میٹھے سپنوں کی دنیا میں پہنچا دیتا ہوں جہاں تم پریوں کے محلوں کی سیر کرتی ہو۔ میری طرف دیکھو میں تمہارا تکیہ ہوں"

اور صبوحی کو اپنی نادانی پر ہنسی آگئی۔

"او مجھے معاف کر دینا" اس نے ہنستے ہوئے کہا "مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ میں تمہارے سینے پر رکھے لیٹی ہوں۔ میں ناشکری ہرگز نہیں ہوں بس مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا اور پھر آج میں بہت پریشان بھی تو ہوں"

"کوئی بات نہیں ننھی صبوحی پریشانی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے مگر تم پریشان کیوں ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ہیں۔ مجھے کچھ بتاؤ شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔"

"اچھے مہربان تکئے۔" صبوحی نے کہنا شروع کیا۔ "تمہاری ہمدردی کا بہت بہت شکریہ۔ میں پریشان اس لئے ہوں کہ میرا امتحان سر پر آگیا ہے اور مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ رات کو پڑھا نہیں جاتا نیند آجاتی ہے۔ صبح کو آنکھ نہیں کھلتی۔ اس سال تو بس فیل ہو جاؤں گی" اور اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

"ہا ہا ہا۔" تکیہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے میں تمہیں سُلا ہی نہیں جگا بھی سکتا ہوں۔ تم صبح کس وقت اُٹھنا چاہتی ہو مجھے بتاؤ تو سہی۔ میں تمہیں اسی وقت جگا دوں گا۔"

صبوحی نے کہا۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ اگر تم میرا یہ کام کر دوگے تو میری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔"

"میرے لئے یہ کونسا مشکل کام ہے۔" تکئے نے کہا۔ "تم کس وقت اٹھنا چاہتی ہو؟"

"میں۔" صبوحی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "بس جس وقت فجر کی اذان ہوتی ہے اس وقت جگا دیا کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" تکیہ بولا۔ "میں ٹھیک اذان کے وقت تمہیں جگا دوں گا۔ بلکہ روز جگا دیا کروں گا مگر شرط یہ ہے کہ سونے سے پہلے مجھے روزانہ بتا کر سویا کرو کہ تم کس وقت اٹھنا چاہتی ہو۔"

اس روز صبوحی سونے کے لئے لیٹی تو اس نے تکئے سے کہا۔

"مہربان تکئے مجھے صبح فجر کی اذان کے وقت اٹھا دینا۔"

اور پھر وہ اطمینان سے سوگئی۔

صبوحی گہری نیند سو رہی تھی کہ کسی نے چپکے چپکے اس کے کان میں کہنا شروع کیا۔ "ننھی صبوحی اٹھو اذان کا وقت ہو گیا ہے۔ اب اٹھ جاؤ اذان کا وقت ہو گیا ہے۔"

پہلے تو اسے یہ خیال آیا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہی ہے مگر یہ آواز لمحہ بہ لمحہ اونچی ہوتی چلی گئی اور پھر آنکھیں بند رکھنا اس کے بس میں نہ رہا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ صحن میں دھوپ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تمام گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ اس کے پاس ہی دوسرے بیڈ پر اس کی چھوٹی بہن شہلا بے خبر لیٹی ہوئی تھی۔

"بہت بہت شکریہ! اچھے مہربان تکئے۔ تم نے میری بڑی مشکل آسان کر دی۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" صبوحی کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے مگر یہ پریشانی کے نہیں خوشی کے آنسو تھے۔

"شکریہ کس بات کا ننھی صبوحی!" تکئے نے کہا۔ "تمہاری کامیابی سے مجھے خوشی ہوگی اور تمہاری خوشی کے لئے میں ہر تکلیف اٹھانے کو تیار ہوں۔ دوسروں کو آرام پہنچانا ہی میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔"

"تم کتنے اچھے کتنے مہربان ہو۔" صبوحی نے کہا۔ پھر وہ ٹیبل لیمپ جلا کر پڑھنے کے لئے بیٹھ گئی۔ اس وقت اس نے جو کچھ پڑھا، سب اچھی طرح یاد ہو گیا۔

اب اس کا روزانہ معمول بن گیا تھا کہ سوتے وقت وہ تکئے سے کہہ دیتی: "اچھے مہربان تکئے مجھے اذان کے وقت جگا دینا۔" اور تکیہ اسے ٹھیک اذان کے وقت جگا دیتا۔ وہ اس وقت اٹھ کر جتنا پڑھنا ہوتا پڑھ لیتی اور جب شہلا کے اٹھنے کا وقت ہوتا لیمپ بجھا کر چپ چاپ اس طرح لیٹ جاتی جیسے ابھی تک سو رہی ہو۔

شہلا یہ سمجھ رہی تھی کہ صبوحی اس سال امتحان کی تیاری نہیں کر رہی ہے۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس سال ضرور صبوحی کے ساتھ آجائے گی مگر جب امتحان کا نتیجہ آیا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

صبوحی اپنی کلاس میں اوّل آئی تھی۔

نجم اکبر
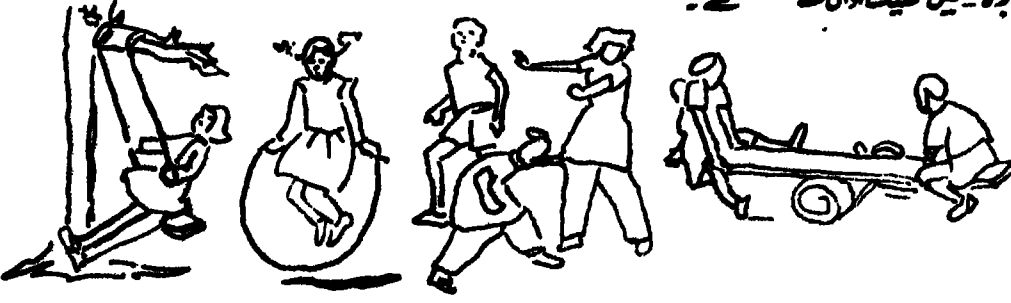
بچے اپنا حق مانگتے ہیں

یار۔ کیا واقعی نہیں ہے ؟

کیا ؟

تمہاری امی ؟

ٹھک ٹھک ـــــ دستک نے اُن دونوں کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ کمرے ابھی وسیم اور صفیہ کی محنت سے تازہ تازہ دُھلے تھے۔ دروازے تک کمروں سے نکالا ہوا پانی جمع تھا۔ وسیم نے دروازہ کھولا تو وہ دونوں کھڑے تھے۔ بہن بھائی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس۔ ہاتھ میں ڈول پکڑے "تم آواز نہیں لگا سکتے ہو ؟" "اس طرح تم دروازہ نہیں کھولتے ہو گھر بیٹھے جواب دے دیتے ہو اور پھر آواز کیسے دیں۔ دوسروں کے گھروں میں تو ہم آواز لگاتے ہیں۔ بلی بچی روٹی، تمہاری تو امی نہیں ہے۔ آواز کیسے دیں" "ٹھیک ہے پھر خیرات بھی نہیں ہے۔ بھاگ جاؤ" اور وہ منہ لٹکائے آگے چل پڑے۔ وہ ادھ کھلے دروازے سے انہیں دیکھتا رہا۔ گلی کی نکڑ پر پڑے کوڑے کے ڈھیر کے پاس رک کر بھائی نے آگے پیچھے دیکھا اور کسی محلے دار کی پھینکی ہوئی بوٹیاں اٹھانے لگا "یہ لوگ یہ بوٹیاں کیسے کھا لیتے ہیں ؟" وسیم نے زور سے تھوک دی اور دروازہ بند کر کے سوکھنے کے پاس کھلے آکر پھر اپنے دوست کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

ہاں۔ واقعی نہیں ہے ہماری امی ـــــ

کمال ہے۔ امی کے بغیر کوئی کیسے رہ سکتا ہے ؟ کہاں گئی ہیں وہ ؟

کہیں گئی ہوئی ہیں۔

کہاں

اللہ میاں کے پاس

کب ؟

جب ہم چھوٹے چھوٹے تھے۔ بالکل چھوٹے سے۔ منیبہ تو مجھ سے بھی چھوٹی تھی۔ بڑا رویا کرتی تھی۔ اس اُداس سیاہ رات میں امی اللہ میاں کے پاس چلی گئی تھیں تو اُسے دودھ پلانے والا بھی کوئی نہیں تھا پھر وہ خوب روئی۔ بھائی اُسے چپ کراتے رہے۔ پھر ہم نے اُسے بسکٹ دیئے۔ اس نے کھائے اور چپ ہو گئی۔

کتنی بڑی تھی یہ اُس وقت ؟

اتنی سی ! وسیم نے ہاتھ تھوڑے سے پھیلا کر کہا۔

کمال ہے۔ اتنا سا میرا چھوٹا بھائی ہے نا بسکٹ کو منہ بھی نہیں لگاتا۔ اچھا۔ بتاؤ تمہاری امی تھیں کیسی ؟

باریک سی، پتلی سی، بہت ہی باریک سی۔ وہ سارا دن کام کرتی تھیں، ناشتہ کرانا، فرش دھونا، کپڑے دھونا، کھانا پکانا، اور پھر شام کو ـــ ابو سے مار کھانا۔

کیوں مارتے تھے انہیں تمہارے ابو ـــــ

پتہ نہیں۔ ہم امی سے پوچھتے تھے تو وہ کہتی تھیں۔ ابو ایسے کیا کرتے ہیں۔ سارے ابو شام کو مارا کرتے ہیں۔

کمال ہے میرے ابو تو نہیں مارتے امی کو البتہ کبھی کبھی انہیں۔۔۔۔۔ خیر۔ تمہارے ابو کام کیا کرتے تھے ؟

پتہ نہیں۔ صبح کے گئے شام کو تھکے ہارے گھر آتے کبھی رات کو جاتے اور صبح آتے۔ اب میرے بھائی بھی ایسے ہی کرتے ہیں ـــــ !

سوال جواب ـــ جواب سوال ـــ وہ دونوں خاصی دیر سے گفتگو کے دائرے مکمل کر رہے ہیں۔ میں اس گھر میں خاصے عرصے سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہ گھر اور یہ پرانے ساتھی ہیں۔ یہ بچے میرے پرانے رفیق ہیں۔ جنم جنم کے ساتھی۔ لیکن پھر بھی ہم اک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ بچے ہمیشہ ہی اجنبی رہتے ہیں۔ ہر دم۔ ہر گھڑی ہر پل ساتھ رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی ہمارے درمیان اجنبیت کی ایک دیوار کھڑی رہتی ہے۔ ہم اس دیوار کو بارہا چاٹتے ہیں۔ لیکن اگلے ہی دن یہ دیوار پھر سے کھڑی نظر آتی ہے۔ اس دیوار میں شگاف ڈالنے کیلئے

اسے گرانے کے لئے ہم کتنی صدیوں سے ہاتھ مار رہے ہیں۔ مگر یہ گر ہی نہیں چکتی۔ میں بھی اس دیوار کو گرانے میں ناکام رہا اور اب اسی طرح اس دیوار میں سوراخ کر کے انہیں پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں چور دل کی طرح اُن کی باتیں سُنا کرتا ہوں۔ باتیں۔ جو شفاف اور معصوم ذہنوں سے ابلتی ہیں۔ باتیں۔ جو ابھی بن رہی ہیں۔ باتیں۔ جنہیں ابھی وقت کے سانچوں میں ڈھلنا ہے۔ باتیں ـــ جو سادہ ہیں۔ مگر جن میں وہ انجانی سی قوت ہے۔ جو مجھے اپنے ماحول سے کھینچ کر ان کی لاپروا زندگی سے وابستہ کر دیتی ہے۔ ہم ان باتوں کو سننے کیلئے ترستے ہیں۔ جب ان سے محروم کر دیئے جاتے ہیں تو اُداس شب و روز کا پل پل تلوار بن کر ہماری حیات کے رشتوں کو کاٹنے لگتا ہے۔ ہماری بنت کا خون ہیں۔ یہ رُک جائیں تو ہمارے جذبے اُدھورے رہ جاتے ہیں۔ ہماری امنگیں کمہلا جاتی ہیں۔ یہ باتیں سننے کیلئے یہ تو تلے پاپلے منہ برقرار رکھنے کے لئے میں صدیوں سے اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہوں۔ لیکن دیوار اونچی ہوتی جا رہی ہے اور اونچی ..... وہ اپنے دوستوں سے باتیں کر رہا ہے۔ سوال۔ جو صدیوں سے دھرائے جا رہے ہیں۔ جواب۔ جو صدیوں سے ایک سے ہیں! میری سوچ کے رشتے بھی انہی صدیوں سے ملتے ہیں اور اس وقت جب میں ایک رات بھر کی محنت اور رتجگے کے بعد ٹوٹتا ہوا بدن لے کر لیٹا ہوا یہ باتیں سوچ رہا ہوں۔ میں کتنا قدیم ہوں۔ میری سوچ کتنی پرانی ہے۔ دروازے پر دستک میری سوچ کے رابطے کاٹ دیتی ہے۔ کون آیا ہے؟ جمورا! کیا لینے آئے ہو؟ مرغیوں کو خوراک ڈالنے ـــ ڈال دی ہے ہم نے صرف پانی بدل دو اور دکان پر واپس چلے جاؤ ـــ وہ ننّا سا بچہ پھرتی سے پانی والے ڈبے نکالنے لگتا ہے۔ "تمہیں میں نے اپنے کپڑے دیئے تھے۔ پہنتے کیوں نہیں ہو۔ یہ پھٹے پُرانے کپڑے پہننا تمہیں اچھا لگتا ہے؟" "نہیں ـــ لیکن جی ـــ اگر میں یہ گھر لے جاؤں تو میرے بھائی مجھ سے چھین لیتے ہیں۔ میری ماں اُن کو کاٹ کر کچھ اور بنا لیتی ہے۔ اس لئے وہ چھپا کر رکھے ہیں۔ میں پہنوں گا عید کے دن ـــ" وہ ڈرتا ڈرتا جواب دیتا ہے۔ اور پھر پانی بدلنے میں جُت جاتا ہے "تمہارا باپ تمہیں رات کو کھانا نہیں دیتا۔ مجھے تمہارا چھوٹا بھائی بتا کر گیا ہے" ـــ "جی وہ ـــ وہ کہتا ہے ـــ تم خاصے بڑے ہو گئے ہو۔ پورے سات سال سات ماہ کے۔ تم کوئی بچے نہیں ہو۔ اپنا کھایا کمایا کرو۔ شام کو میں یہاں سے جلدی چلا جاتا ہوں۔ اگر دیر سے جاؤں تو ویران راستوں سے ڈر آتا ہے۔ مجھے بھوک زیادہ نہیں لگتی۔ میرے سارے بھائی شام کو بھوک نہیں لگواتے۔ انہیں بھی بھوک نہیں لگتی۔ ہم سب شام کو ایسے ہی سو جاتے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے" اور وہ پانی بدلتا ہے اور پھر دکان پر بھاگ جاتا ہے "مجھے برف لانی ہے۔ ڈاک خانے چائے لے کر جانا ہے برتن دھونا ہیں۔ صفائی کرنی ہے۔ مجھے جلدی ہے۔ میں جا رہا ہوں" اور وہ اپنی مخصوص آواز میں گاڑی کے ہارن کی نقل اُتارتا "ٹیں ٹیں" کرتا سرپٹ بھاگ جاتا ہے، میرا منجھلا بھائی اسے دکان کی دہلیز پر روک کر دو چپیڑ جڑ دیتا ہے "گھر اتنی دیر لگائی" اور وہ سر جھکا کر کام کرنے میں جُت جاتا ہے۔

"منیبہ کہاں ہے" میں وسیم سے پوچھتا ہوں اور وہ اندر داخل ہوتی ہے۔ اپنی سہیلی سے ملنے گئی تھی۔ وہ سیدھا باورچی خانے کا رخ کرتی ہے۔ "تم آج کل پڑھتے نہیں ہو بالکل" میری رات بھر کی جاگی ہوئی آنکھیں انہیں ڈانٹنا چاہتی ہیں۔ اور میرا بھوکا پیٹ جواب دیتا ہے "ہم کھانا پکا لیں۔ کھلا لیں۔ تھکے تھکے ہو گے تم لوگ۔ کیسے گھر کا کام کرو گے۔ ہم گھر سنبھال لیں۔ ہماری عمر تو سات سال سات ماہ سے بھی زیادہ ہے۔ اگر گھر نہ سنبھلے تو ہمارے جسم ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ یہ چھتیں گر جائیں گی۔ ہم انہیں سنبھال لیں پھر پڑھیں گے" ـــ میں ان کے چہرے دیکھتا ہوں۔ ویران۔ اُداس۔ گہری شام کے منظر! اور آنکھوں میں دکھ کی کالی راتیں! کہاں ہو ـــ ؟ اجنبیت کی دیوار کو گرا سکنے والے جذبو ـــ آؤ مجھے تمہاری ضرورت ہے" "بچے اپنا حق مانگتے ہیں" ـــ ریڈیو سے آواز آتی ہے۔ ایک معصوم سی آواز اُبھرتے اُبھرتے ریڈیو بند کر دیتی ہے "کس سے مانگتے ہیں بچے اپنا حق؟ یہ اُداسی کون سمیٹے گا۔ گہری شاموں، کالی راتوں کا چاند کون ہے؟ کون ہے؟

کبیر پچائی جتن سے
نگلہ ادب کا جائزہ

بچوں کا ادب ــــ کہانی
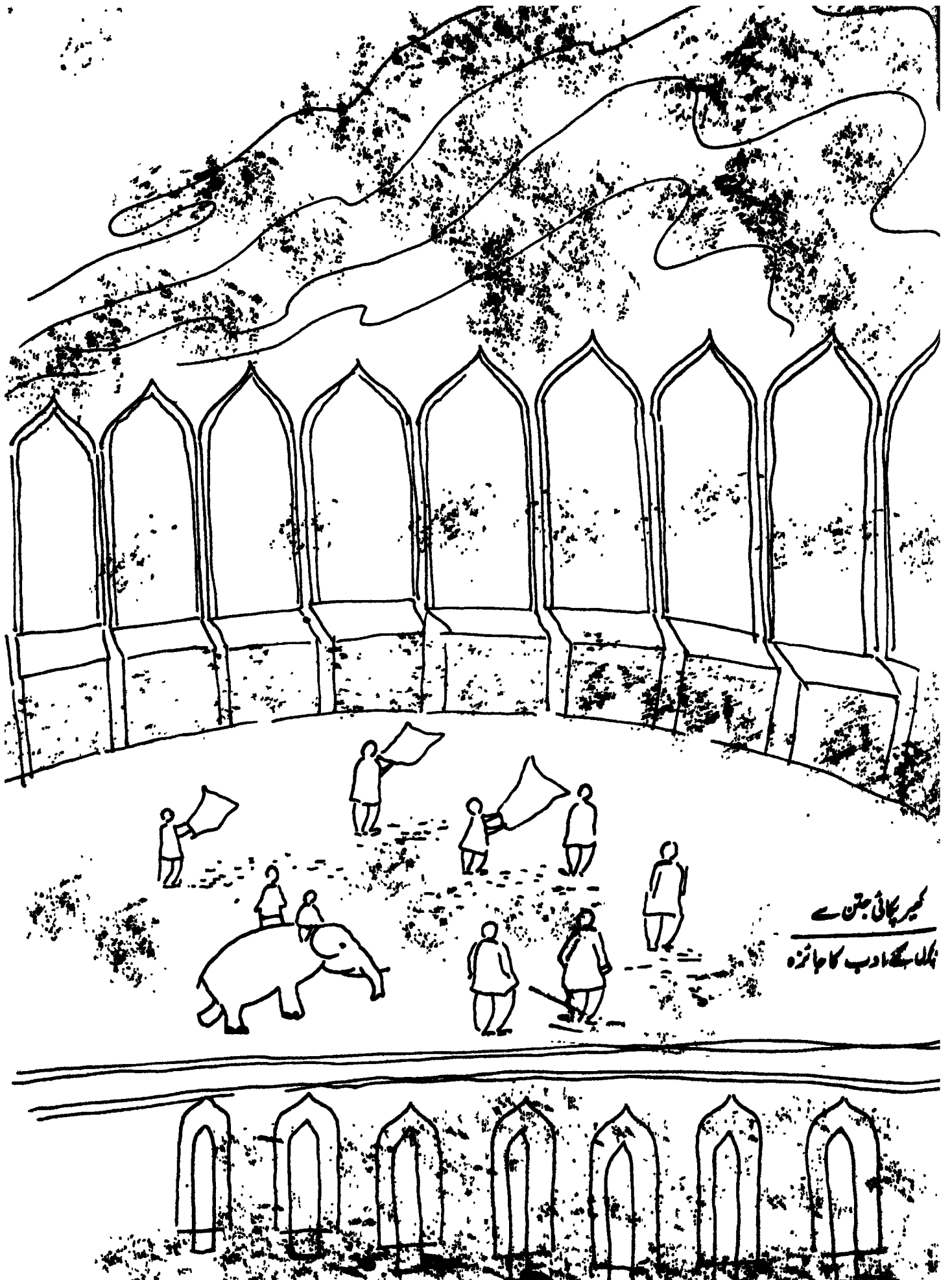
کہانی کہنا اور کہانی سننا ایک ایسا عمل ہے جس کا آغاز موسیقی اور رقص کے ساتھ ہی ہو گیا تھا بلکہ ایک نظریہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کہانی موسیقی اور رقص سے پیشتر ظہور پذیر ہوئی تھی اور جو محققین اس نظریے کے حامی ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب کرۂ ارض پر انسان نے مل جل کر رہنا شروع کیا تو اُس وقت مرد تو قوتِ لایموت کے حصول کی خاطر غاروں سے باہر نکل کر جانوروں کے شکار میں مصروف ہو جاتے تھے اور ان کی عورتیں دل بہلانے کی خاطر اپنے مردوں کے شکار کے واقعات سنایا کرتی تھیں۔ یہ واقعات وہ جس انداز سے، اپنے تخیل سے کام لے کر جس مبالغے سے اور آوازوں کے زیروبم کے علاوہ آنکھوں، ہاتھوں اور ٹانگوں کی حرکتوں کے ساتھ جس طور سے بیان کرتی تھیں ــــ اس سارے طریق کار کو کہانی کی ابتدائی صورت تصور کیا جاتا ہے۔

کہانی سے نسلِ انسانی کی دلچسپی ایک فطری امر ہے اور دنیا کا کوئی ایسا معاشرہ، ملک یا خطۂ ارض ایسا نہیں ہے جہاں کہانی کسی نہ کسی شکل میں موجود نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو قومیں ترقی کے مختلف مراحل سے گزر چکی ہیں۔ ان کی کہانیاں ان کے ادب کا ایک نمایاں حصہ بن گئی ہیں اور ہم ان میں سے اکثر کہانیوں کو اپنی اپنی زبان میں بھی پڑھ سکتے ہیں اور جو معاشرے نوشت و خواند کی صلاحیتوں سے ابھی تک محروم ہیں ان کی کہانیاں سینہ بہ سینہ سفر کرتی رہتی ہیں۔ اور اگر یہ کہانیاں ہم تک پہنچی بھی ہیں تو اُن لوگوں کی زبانی ہیں جن کا تعلق ان معاشروں سے نہیں ہے بلکہ سیاحوں، تذکرہ نویسوں، اور سفر نامہ نگاروں کے توسط سے۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ جو کہانیاں سنتے سناتے ہیں ہم سے کس قدر مختلف ہیں اور تہذیبی لوازم جن سے ہماری کہانیاں بہرہ ور ہیں ان سے ان کہانیوں کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

کہانی بڑوں کے لئے ہو یا چھوٹوں کے لئے ــ اس کا لازمی اور بنیادی تعلق اپنے معاشرے سے، اپنے عہد سے اور اپنے جغرافیائی کوائف سے ہوتا ہے۔ کردار تو خیر ہر قوم اور ہر ملک کے اپنے ہوتے ہی ہیں ان کے علاوہ ہر کہانی کی اپنی مقامیت ہوتی ہے جس سے اس کا تشخص واضح ہوتا ہے

اُردو ادب ــ جہاں تک کہانی کا واسطہ ہے دنیا کے کسی ادب سے بھی پیچھے نہیں ــ اس طرح جب ہم ان کہانیوں پر نظر ڈالتے ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہانیاں فنی خوبیوں کے لحاظ سے نہ سہی، مقدار اور تنوع کے اعتبار سے ایک گراں قدر ذخیرے کی حیثیت رکھتی ہیں ــ اور پچھلی پون صدی میں بچوں کے لئے جتنا ادب پیش کیا گیا ہے اس کا بہت بڑا حصہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔

اُردو میں انیسویں صدی کے ربع آخر میں ہمارے بزرگوں نے بچوں کے لئے جو کہانیاں لکھی تھیں وہ ایک متعین مقصد کے زیر اثر لکھی گئی تھیں۔ ان کے مصنف تھے۔ مولوی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی محمد حسین آزاد۔ راشد الخیری ــ انہوں نے جو کہانیاں لکھی تھیں وہ دلچسپ نہیں ہیں مگر یہ سب کی سب نصیحت آموز ہیں۔ اس زمانے میں بچوں کے لئے لکھنے والوں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ ان فنی صداقتوں [illegible] جن سے موجودہ ترقی یافتہ دور کے کہانی کار پوری طرح آگاہ ہیں۔

ان بزرگوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اگر نصیحت براہِ راست کی جائے تو اس کا وہ اثر نہیں ہو سکتا جو بالواسطہ نصیحت سے ہوتا ہے۔ اگر آپ

اس زمانے کے نصابوں پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ عام طور پر کہانی لکھنے والے صرف کہانی لکھ دینے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ کہانی کے اختتامی حصے میں یہ بھی بیان کر دیتے تھے۔ کہ اس کہانی سے یہ نتیجہ نکلا کہ لالچ بری بلا ہے وغیرہ وغیرہ۔

سید امتیاز علی تاج کے والد بزرگ سید ممتاز علی اور ان کی شریکِ حیات محمدی بیگم نے بچوں کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی تھی چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے بچوں کے لئے پھول کے نام سے ایک پرچے کا اجرا بھی کیا تھا جو مدت تک بڑی باقاعدگی سے اشاعت پذیر ہوتا رہا۔ اسی زمانے میں رنگ محل مشن ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر رگھوناتھ سہائے نے بھی "گلدستہ" کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا تھا۔ ان دونوں پرچوں میں زیادہ تر کہانیاں ہی چھپتی تھیں۔

یہ کہانیاں پہلی کہانیوں سے اس بنا پر کچھ الگ ڈھنگ محسوس ہوتی ہیں کہ ان کے لکھنے والوں نے ایک تو نصیحت کو براہِ راست اپنے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اتارنے کی کوشش نہیں کی اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ کہانیاں سپاٹ نہیں ہیں۔ پڑھنے اور سننے میں لطف دیتی ہیں۔ بچوں کی تربیت کا خیال ان کہانیاں لکھنے والوں کو بھی تھا مگر ان کا طریقہ کچھ سائنٹفک تھا ــــ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ اگر کونین کی گولی کو شہد میں لپیٹ کر دیا جائے تو یہ کام و دہن میں تلخی پیدا کئے بغیر حلق سے نیچے اتر جاتی ہے اور معدے میں جا کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر نصیحت کو ننگا وہ طریقہ اپنایا جائے جو انسانی فطرت سے کچھ مطابقت نہیں رکھتا تو بچے ان براہِ راست نصیحت والی کہانیوں کو دلچسپی سے نہیں پڑھتے اور جب دلچسپی سے پڑھتے ہی نہیں تو ان کا اثر کیا ہوگا!

بچوں کے لئے پچھلے تیس پینتیس برسوں میں جو کہانیاں لکھی گئی ہیں ان کو اگر ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو پوری ایک لائبریری بن سکتی ہے موضوعات کے اعتبار سے ان کہانیوں کو زیادہ تر کئی دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ــ ابتداءً ان کہانیوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو اردو، عربی، سنسکرت، فارسی اور دنیا کی دوسری کلاسیکی کتابوں سے لی گئی ہیں۔ اس کی کئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔

یہ کہانیاں براہ راست دوسری زبانوں سے نہیں لی گئیں۔ اور وہ کتابیں جن سے ان کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے کافی مدت پہلے اردو میں منتقل ہو گئی تھیں۔ مثلاً سنسکرت کی پنچ تنتر، عربی کی الف لیلیٰ، فارسی کی گلستان، بوستان اور باغ و بہار وغیرہ ... بچوں کے لئے لکھنے والوں نے ان کتابوں کی کہانیوں کو اخذ و ترمیم کے بعد آسان اور سلیس اردو میں لکھ دیا ہے ایک ایک کہانی کو کئی کئی مصنفین نے تحریر کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر کہانیاں ــ ان کے مرکزی کرداروں کے ناموں کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہیں۔ مثلاً حاتم طائی پہلا دوسرے، تیسرے اور چوتھے درویش کی الگ الگ کہانی، گل بکاؤلی، علی بابا چالیس چور، عمر عیار، ہرکلیز، اوڈیسس وغیرہ۔

اُردو کے داستانی ادب سے کہانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بچوں کے لئے موجود ہے ــ شیخ چلی کی کئی کہانیاں ہیں، سند باد جہازی کے کئی سفرنامے ہیں، علی بابا اور الہ دین چراغ کی کہانیاں ہیں رستم اور سہراب، امیر حمزہ، عمر عیار، ملکہ صبا، سکندرِ اعظم اور اس قسم کے دوسرے تاریخی اور غیر تاریخی کرداروں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ پنچ تنتر سنسکرت ادب کی بڑی مشہور اور پرانی کتاب ہے۔ شاید ہی دنیا کی کوئی ایسی زبان ہوگی جس میں اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ اسے اُردو زبان میں متعدد ناولوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انوارِ سہیلی سب سے مقبول ترجمہ ہے بچوں کے مصنفین نے عموماً اس ترجمے سے کہانیوں کا انتخاب کیا ہے۔

یہی حال الف لیلیٰ کا بھی ہے۔ سید ابوتمیم نے بچوں کی الف لیلیٰ کے نام سے پوری کتاب لکھی ہے داستانِ امیر حمزہ بھی بچوں کے ادب میں موجود ہے۔ قصۂ چار درویش بھی کتابی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔

ان کرداروں کو کلاسیکی داستانوں سے نکال کر موجودہ معاشرے میں بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کردار وہی رہتے ہیں مگر ان کے واقعات ماحول، فضا اور حالات موجودہ دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ عموماً ان کرداروں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ان کی روداد پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ یہ کردار اپنی دنیا سے نکل کر جب ہماری دنیا میں آتے ہیں تو مزاح اور طنز کا سامان بن کر رہ جاتے ہیں مثلاً یہ شیخ چلی کہانیوں کا ایک بہت مشہور کردار ہے، جس کی حماقت ــ، ہم جوئی اور انسان دوستی ایک مسلّمہ حقیقت بن چکی ہے۔ مگر جب اس کردار کو موجودہ معاشرے

میں لایا جاتا ہے تو اس سلسلے کی کام کی کہانیاں جانتے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ اس طرح کی کوشش میں اسے حمید اور ظاہر لا ہوری پیش پیش ہیں۔

الف لیلیٰ — جیسا کہ ظاہر ہے دنیا کے قصص کی بڑی مشہور کتاب ہے۔ کرشن چندر نے چڑیلوں کی الف لیلیٰ، دو حصوں میں لکھی ہے۔ جن میں قصے تو ہیں مگر الف لیلیٰ کے روایتی قصوں سے مختلف، چڑیلوں کی الف لیلیٰ انسانوں کی الف لیلیٰ تو ہو ہی نہیں سکتی۔ کرشن چندر کا مزاحیہ اور بیشتر طنزیہ رنگ غالب ہے۔ اس ضمن میں ان کرداروں کا ذکر بھی ضروری ہے جو تاریخی حیثیت نہیں رکھتے لیکن بڑے مقبول ہیں، مثلاً شیخ چلی، لال بجھکڑ، ملا نصیر الدین ان کے ساتھ جو کہانیاں وابستہ ہیں انہیں اردو میں بیان کر دیا گیا ہے اور بعض اوقات ان سے ایسی کہانیاں منسوب کر دی گئی ہیں جو پہلے موجود نہیں تھیں۔ صاف ظاہر ہے کہ لکھنے والوں نے یہ کہانیاں خود سوچی تھیں۔

آگے چلنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اردو اور دوسری کلاسیکی کتابوں میں سے جن اہل قلم نے کہانیوں کا انتخاب کر کے انہیں سلیقہ مندی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔ ان میں مقبول جہانگیر، ذوالفقار احمد تابش، اور محمد یونس حسرت کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔

دوسرے دائرے میں بچوں کے لئے لکھی جانے والی وہ کتابیں شامل کی جا سکتی ہیں جو اپنے موضوع کے لحاظ سے اسلامی ہیں۔ یہاں کچھ کہانیاں قرآن مجید سے لی گئی ہیں، کچھ اسلامی تاریخ سے اور کچھ بزرگوں کے حالات زندگی سے۔

کہانیوں کا یہ حصہ کافی پُر ثروت ہے۔

اسلامی تاریخی کہانیاں — اس نام سے محمد یونس حسرت نے کتاب لکھی ہے اس کے علاوہ چار ایسی کتابیں بھی ملتی ہیں جن کا نام ہے "اسلامی کہانیاں" ان کے مصنفین ہیں مقبول انور داؤدی، سلطان احمد رضوان، محمد یونس حسرت اور الیاس مجیب۔

تاریخ اسلام کی کہانیاں، اور تاریخ اسلام کی سچی کہانیاں — یہ دو الگ کتابیں ہیں۔ ایک اور کتاب بھی ہے سچی اسلامی کہانیاں۔ ان کہانیوں کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ ایک ہی نام سے چار چار مصنفوں نے کہانیاں لکھ دی ہے۔ بہتر صورت یہ تھی کہ ہر مصنف کتاب کی اشاعت سے پہلے یہ دیکھ لیتا کہ اس نام سے پہلے کتاب تو نہیں چھپ گئی۔ اس سے پڑھنے والوں کے لئے انتخاب کتاب میں آسانی رہتی۔

اسلامی کہانیوں کے مصنفین کے پیش نظر یہ واضح مقصد رہا ہے کہ وہ قوم کے بچوں کو اسلامی تاریخ کے ان واقعات اور ان کرداروں سے روشناس کرائیں جنہوں نے اخلاق فضائل پھیلانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ یہ مقصد ہر لحاظ سے قابل قدر ہے مگر رہ رہ کر اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ مقصد کی بلندی سے قطع نظر زیادہ کہانیاں ایسی ہیں جنہیں بچے دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکیں — کہانی تاریخی ہو یا معاشرتی — بہر حال کہانی ہوتی ہے اور اگر یہ پڑھنے والے کی توجہ پوری اپنی طرف کھینچ نہیں سکتی تو کہانی کی سطح سے نیچے آ کر محض ایک مضمون ہو جاتی ہے۔

اسلامی کہانیاں لکھنے والوں میں میاں ایم۔ اسلم، ظفر زیدی، مقبول انور داؤدی اور عبدالمجید بھٹی، کے علاوہ نعیم صہبائی کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

بچوں کے مصنفین نے دنیا کے اکثر ملکوں کی کہانیاں یا تو اردو میں ترجمہ کی ہیں یا ان کہانیوں کے واقعات اپنی زبان میں بیان کر دیئے ہیں — !

یہ کہانیاں تیسرے دائرے میں شامل ہوتی ہیں — !

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ دوسرے ملکوں کی کہانیوں کو یا تو مکمل طور پر اپنی زبان میں منتقل کر دیا گیا ہے یا انہیں اخذ و اقتباس کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ کہانیاں ان ملکوں کی لوک کہانیاں بھی ہیں اور جدید کہانیاں بھی۔

دوسرے ملکوں کی کہانیوں کی جو کتابیں ہمارے یہاں ملتی ہیں وہ تین قسم کی ہیں۔ بعض مجموعے ایسے ہیں جن میں صرف ایک ملک کی کہانیاں شریک کی گئی ہیں۔ مثلاً چینی کہانیاں، جاپانی کہانیاں، امریکی کہانیاں، فرانسیسی کہانیاں، ترکی کہانیاں، جرمنی کہانیاں۔

دوسری قسم کے مجموعے ان کہانیوں پر مشتمل ہیں جن میں صرف ایک ملک کی کہانیاں نہیں ہیں، بلکہ متعدد ملکوں کی کہانیاں ہیں — "ساری دنیا کے ساتھ ساتھ" — یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں دنیا کے

کے کئی ملکوں کی کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ ان کہانیوں کے مترجم عشرت رحمانی ہیں۔

"مکڑ بھیا اسٹوری کہانی" یہ بھی اس قسم کا مجموعہ ہے اور ان کہانیوں کو اُردو میں کشور ناہید نے منتقل کیا ہے۔

"ملک ملک کی کہانیاں" یہ ایسی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ہے جس کے مترجم ریاض جاوید ہیں۔

اس سلسلے میں کسی غیر ملکی ممتاز مصنف کی منتخب کہانیاں بھی چھپ گئی ہیں۔ ہینز کرسچن انڈرسن ڈنمارک کا مصنف ہے اور غالباً بچوں کا مقبول ترین مصنف ہے۔ اس کی کہانیاں دنیا کے بے شمار ملکوں میں ترجمہ ہو کر پہنچ چکی ہیں۔ اور ہر ملک کے بچے ان کہانیوں کو انتہائی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ہمارے ہاں انڈرسن کی بعض بہت مقبول کہانیوں کا ترجمہ ریاض جاوید نے کیا ہے — اور لوگوں نے بھی کیا ہے، مگر ریاض جاوید کی کہانیاں "انڈرسن کی کہانیاں" کے نام سے ایک مجموعے میں چھپ چکی ہیں جرمنی کے گرم برادرز کی کہانیاں بھی ایک مجموعے میں شامل ہیں اور اس مجموعے کا نام ہے "جرمنی کی کہانیاں"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس باب میں خاصا کام ہوا ہے لیکن ابھی کام کی بڑی گنجائش بھی ہے اور ضرورت بھی۔ ہم نے بیشتر یورپی اہلِ قلم کی کہانیوں سے اپنے ادب میں اضافہ کیا ہے — مشرقِ وسطیٰ، مشرقِ بعید اور افریقہ کے علاوہ اسلامی ملکوں کی کہانیوں کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کہانیوں کی معرفت یہی غرض و غایت نہیں کہ بچوں کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کریں بلکہ یہ بھی کہ یہ کہانیاں جن ملکوں کی ہیں ان سے بچوں کے ذہنی روابط قائم ہو جائیں۔ یہ ایک اہم مقصد ہے۔

کہانیوں میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہماری کوشش ہونی چاہئیے کہ دوسرے ملکوں کی پرانی کہانیوں پر ہی مطمئن ہو کر نہ رہ جائیں۔ ان ملکوں کی جدید کہانیوں کو بھی اُردو میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ چین کی پرانی کہانیوں کو ہم اپنی زبان میں لے آئے ہیں۔ یہ ایک مستحسن اقدام ہے — مگر ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ نئے چین کی ان کہانیوں کا بھی ترجمہ کریں جنہیں نئے چین کے بچے پڑھتے ہیں اور سنتے ہیں۔

کہانیوں کی ایک اور قسم بھی ہے اور یہ قسم ہے تخیلی کہانیوں کی — اور یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ہاں ان کہانیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

تخیلی کہانیوں کی بنیادی غرض و غایت یہ ہے اور یہی ہونی چاہئیے کہ ان کے مطالعے سے بچوں کے اندر تخیل کی وسعت اور گہرائی پیدا ہو۔ میں یہ بات ذرا وضاحت سے عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

بچہ اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھتا ہے وہ محدود ہوتا ہے۔ چند چہرے، اپنا گھر، چھت، دیواریں کھلونے، آنگن، اور اس قسم کی دوسری اشیاء رات کے وقت جب نانی، دادی، ماں یا باجی اسے پرستان کی پریوں، پہاڑوں، چاند، ستاروں، ندی، دریاؤں، چشموں کی کہانیاں سناتی ہے تو اسے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دنیا جس میں وہ رہتا ہے وہ کتنی وسیع ہے، اس میں کیسی کیسی چیزیں ہیں، کتنی شاندار، کتنی خوبصورت، کتنی پیاری۔ یہ کہانیاں اُس کے تخیل کو مہمیز و متحرک کرتی ہیں اور خوشی کا ایک انجانا احساس اس کے اندر جاگ اُٹھتا ہے۔ جب اُسے کسی بہادر شہزادے کی ایسی کہانی سنائی جاتی ہے جو کالے دیو یا کسی ایسی ہی ہستی کو شکست دے کر شہزادی کو اس کی قید سے نجات دلاتا ہے تو بچہ غیر شعوری طور پر خود کو ایک ایسا ہی شہزادہ تصور کرنے لگتا ہے۔ اس سے اس کے اندر بہادری اور جرأت کے جذبات کی پرورش ہونے لگتی ہے — جب کہانی اسے بتاتی ہے کہ شہزادے نے دیو پر فتح پائی تھی تو اُسے شروع ہی میں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں اچھے لوگ ہی نہیں بُرے لوگ بھی ہیں اور اچھے لوگ بُرے لوگوں کو شکست دے دیتے ہیں۔ یعنی نیکی بدی پر غالب آ کر رہتی ہے۔

بچے کا کائنات سے اولین رابطہ کہانیوں ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ پرندوں کی کہانیاں، پریوں کی کہانیاں، درختوں، پھولوں کی کہانیاں — یہ اور اس قسم کی اور کہانیاں اسے احساس دلاتی ہیں کہ اس کے ارد گرد کیا کچھ ہے۔ اور یہ سب کچھ کتنا پھیلا ہے۔

رات کو جب اُسے چاند کی کہانی سنائی جاتی ہے تو وہ جب سونے لگتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ خود چاند پر پہنچ گیا ہے۔ کہانیوں کے سارے کردار

اس کے تخیلات میں گھومتے پھرتے، حرکت کرتے رہتے ہیں۔

جیسے جیسے اُس کی عمر بڑھتی جاتی ہے ۔۔ اس کا تخیل وسیع ہوتا جاتا ہے ۔۔ ان کہانیوں کے اثرات اس کے ذہن پہ مرتسم ہوجاتے ہیں۔ یہ اثرات آہستہ آہستہ زندگی کے بارے میں اس کے رویوں کی تشکیل کرتے رہتے ہیں۔

شہزادوں کی کہانیاں ہوں، جنوں پریوں یا دیوؤں کی ۔۔ ان میں دہشت انگیز مناظر بھی بیان کئے جائیں گے۔ مگر یہاں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کہ اگر بچہ صرف دہشت کے اثرات قبول کرے تو یہ اثرات اس کی ذہنی نشوونما کے لئے ناخوشگوار ثابت ہوں گے۔ اپنے نتائج کے اعتبار سے۔ اس لئے مصنف کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ بہادری اور جرأت کے کارناموں کو خوف و دہشت والے مناظر پر اس طرح حاوی کردے کہ بچہ غیر شعوری طور پر اپنے اندر جرأت مندانہ اثرات قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرے، نہ صرف پیدا کرے بلکہ انہیں ترقی بھی دیتا ہے۔

بہادری، جرأت، مہم جوئی کے اثرات بچے میں اس طرح پیدا نہیں ہوتے کہ ہم اسے ایسی کہانیاں سنا دیں جن میں بہادری کے واقعات شامل ہوں۔ یہ مقصد سلیقہ مندی اور ہنرمندی کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ جو شخص یہ کہانیاں لکھ رہا ہو وہ بچے کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ بچہ کس حال میں کیا قبول کرتا ہے کس طرح قبول کرتا ہے اس کے تخیل کو کس طرح متحرک کیا جا سکتا ہے اس کے اندر بعض چیزیں قبول کرنے اور بعض چیزیں رد کرنے کی صلاحیت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے ۔۔ کہانی لکھنے والے کو ان باتوں کا علم ہونا چاہیئے۔ بغیر اس علم کے وہ اچھی کہانی نہیں لکھ سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہانی لکھنا غالباً دنیا کا سب سے سہل کام ہے چند واقعات کو ترتیب دے دیا جائے تو کہانی بن جاتی ہے اور بچہ ایسی کہانی کو شوق سے سن بھی سکتا ہے۔ پڑھ بھی سکتا ہے مگر کہانی ایک نہایت مشکل کام بھی ہے اور وہ اس بنا پر کہ مصنف کا یہ بھی فرض ہونا چاہیئے کہ وہ دیکھے اس کی کہانی بچے پر کیا اثر ڈالتی ہے۔ جب وہ اس طرف توجہ کرے گا تو لازماً وہ ایک نصب العین متعین کرکے کہانی لکھے گا۔ اور جب یہ نصب العین متعین ہوجائے گا تو وہ کوشش کرے گا کہ وہ سارے تقاضے پورے کرے جو اس نصب العین کے حصول میں مدد معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔

آج کل جو جاسوسی، مہماتی، تخیلی کہانیاں بے تحاشا لکھی جا رہی ہیں ان سے بچوں کے ادب میں تو یقیناً اضافہ ہو رہا ہے مگر یہ کہانیاں اپنے پڑھنے والوں کی ذہنی نشوونما پر نہایت مضر اثرات ڈال رہی ہیں۔ یہ کہانیاں فنی لحاظ سے بھی بہت کمزور ہوتی ہیں۔ بچوں کے ذہنوں میں شروع ہی سے یہ احساس پیدا ہوجاتا ہے کہ کہانی لکھنے والے نے گپ ہانکی ہے ۔۔ اس احساس کے ساتھ جب بچہ کہانی پڑھے گا تو اس کی اپنی ذہنی کیفیت کیا ہوگی وہ کہانی سے کیا اثر قبول کرے گا۔

کہانی لکھنے والے کو سب سے پہلے بچے کے دل میں یہ یقین پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ سچ بول رہا ہے ۔۔ اور جب بچے کو یہ یقین ہوجائے گا کہ وہ جھوٹ موٹ کے واقعات نہیں سُن رہا یا پڑھ رہا ہے تو اس کی کہانی میں جو کچھ بتایا جائیگا اس کے ذہن پر ضرور اثر چھوڑے گا ۔۔ مثلاً کہانی میں یہ بتایا گیا ہے کہ لڑکے نے جن یا دیو پر فتح پائی ہے ۔۔۔ تو بچے کے اپنے ذہن میں یہ یقین پیدا ہوجائے گا کہ جو لڑکا بھی بہادری دکھائے گا وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوجائے گا۔"

واقعات کی سچائیوں کا یقین دلانا مصنف کا فرض ہونا چاہیئے ۔۔ بچوں کے لئے جو بھی کہانی لکھی جائے یہ اس کی بنیادی شرط اور ضرورت ہونی چاہیئے!

تحیر خیزی کہانی کا جزو لاینفک ہونا چاہیئے مگر برائے تحیر ۔۔ صرف تحیر کی خاطر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ بچے کے اندر ولولہ انگیز لذت پیدا ہو۔ اُس کے سینے میں نئی نئی امنگیں جاگیں، اس کے ذہن میں ایک مہم جویانہ آرزو کروٹیں لینے لگے۔

جاسوسی، مہماتی، اور طلسماتی کہانیوں کا بھی اثر ہونا چاہیئے اور یہ اثر بچے پر اس وقت مرتب ہو سکتا ہے جب ان کہانیوں کا مصنف اپنے مقصد سے اچھی طرح واقف ہو اور اس بات سے بھی آگاہ ہو کہ یہ مقصد کس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے۔

کہانی بنیادی طور پر کہانی ہوتی ہے ۔۔ اور اسے

کہانی ہی ہونا چاہیئے اور کہانی وہی ہوتی ہے جسے دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے، دلچسپی کے ساتھ سنا جائے۔ دلچسپی اور مقصدیت کو آپس میں اس طرح مدغم ہونا چاہیئے کہ ان میں سے کسی کو الگ کرنا ناممکن امر ہو۔

کہانیوں کی ایک اور قسم بھی ہے جو حال ہی میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ یہ کہانی سائنس فکشن کے ذیل میں آتی ہے۔ جہاں تک میں مطالعہ کر سکا ہوں مجھے ان کہانیوں میں کوئی جان نظر نہیں آئی ــ اصل میں قصہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی سائنسی تجربا غالباً اولیں مرحلے سے بھی نہیں گذرے۔ نتیجتاً ایسا ماحول نہیں بنا جس میں سائنس فکشن عمومی دلچسپی کی چیز بن سکے۔ نقالی سے بات نہیں بنتی۔

ہمارے ہاں لطیفوں کی تو کمی نہیں ــ لیکن مزاحیہ کہانیاں بہت کم تعداد میں لکھی گئی ہیں ــ لے دے کے سعید لخت نے خوبصورت اور کامیاب مزاحیہ کہانیاں لکھی ہیں۔

آخر میں دو تین باتوں کی طرف اشارہ کرنا لازمی خیال کرتا ہوں۔

اردو میں بچوں کے لئے لاتعداد کہانیاں لکھی گئی ہیں ــ مگر ان میں بہت کم تعداد ایسی کہانیوں کی ہے جو دلچسپی کے لحاظ سے بھی کامیاب رہی اور مقصدیت کے اعتبار سے بھی انہیں قابلِ مطالعہ گردانا جائے اور یہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ لکھنے والوں نے فرض شناسی کا ثبوت نہیں دیا۔

کہانی لکھتے وقت بہر صورت ان امور کا خیال رکھنا چاہیئے۔

الف: کہانی دلچسپ ہونی چاہیئے ــ یہ چھوٹے بچوں کے لئے ہو یا بڑے بچوں کے لئے۔ آگے کیا ہوگا؟ یہ سوال دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔

ب: کہانی لکھتے وقت یہ سوچ لینا ضروری ہے کہ لکھنے والا کس عمر کے بچوں کے لئے کہانی لکھ رہا ہے۔ عمر میں تفاوت کا مسئلہ بچوں کی کہانی سننے، سمجھنے اور لطف اٹھانے کی ذہنی صلاحیت کا مسئلہ ہوتا ہے۔

ج: کہانی میں واقعات بیان کئے جائیں انہیں بچوں کے ذہنوں پر منفی اثر نہیں ڈالنا چاہیئے خصوصاً یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ کہانی میں دہشت انگیز عنصر کو اس قدر اہمیت دے دی جائے کہ پڑھنے والے دہشت زدہ ہو کر رہ جائیں۔

د: جب ہم کہتے ہیں کہ بچوں کی کہانی کو اصولاً بچوں کی کہانی ہونا چاہیئے ــ تو اس کا صرف یہ مقصد نہیں ہوتا کہ زبان آسان اور سلیس ہو بلکہ یہ بھی کہ کہانی میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ ان بچوں کی ذہنی صلاحیت سے فطری مطابقت رکھتا ہے جن کے لئے یہ کہانی لکھی جانی مطلوب ہے۔

ر: کہانی تخیلی ہو تو کوئی حرج نہیں ــ مگر لکھنے والے کو اسے اس انداز سے لکھنا چاہیئے کہ سننے پڑھنے والے بچے اسے جھوٹ موٹ نہ سمجھیں۔ کہانی میں حقیقت پسندی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مصنف سامنے کی بات لکھ دے یہ اندازِ فکر و نظر تخیل میں رفعت و وسعت پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ کہانی کار کا فن یا فنی کمال یہ ہے کہ وہ پڑھنے والوں یا سننے والوں میں یہ احساس جگا دے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے یا کہہ رہا ہے وہ سچائی ہے۔

س: ہمارا عہد تسخیرِ قمر کا عہد ہے ــ تسخیرِ کائنات کا عہد ہے۔ اس عہد میں بے سروپا اور تخیلاتی کہانیوں کی گنجائش نہیں ہے ــ ہمارا ملک ایک ترقی پذیر ملک ہے ــ تاہم اب ملکوں میں زیادہ فاصلے نہیں رہے ــ اس دور میں جو بچے سانس لے رہے ہیں وہ ذہناً پہلی نسلوں کے بچوں سے اگر بہت حد تک نہیں تو کافی حد تک ضرور مختلف ہیں۔

ش: اور آخری بات جو عرض کروں گا وہ یہ ہے کہ پاکستانی بچوں کے لئے پاکستانی کہانی ہونی چاہیئے ــ یہ جملہ وضاحت کا محتاج ہے پاکستانی کہانی سے میری مراد یہ ہے کہ اس کہانی میں اپنے ملک کی سرزمین کا ذکر ہونا چاہیئے ــ اپنی تاریخ اپنے جغرافیے کا ذکر ہونا چاہیئے ــ اپنے لوگوں اور اپنے کلچر کا ذکر ہونا چاہیئے ــ تخیلی کہانیوں کا زمانہ بیت گیا ہے۔

انتظار حسین

بچوں کی کتابوں کی زبان

بچوں کی کتابوں کا سوال میرے لئے کسی قدر اجنبی ہے۔ وہ اس لئے کہ میں نے اپنے بچپن میں کبھی بچوں کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ میں کہانیاں پڑھتا نہیں تھا، سنتا تھا، پھر جب میں پڑھنے کی منزل میں داخل ہوا تو اسی پیلے ورقوں والی بدنام کتاب الف لیلہ پر میں نے ڈاکہ ڈالا جو میرے بڑوں نے اپنے پڑھنے کے لئے خریدی تھی۔ مگر یہ کتاب بھی میں نے ایسے پڑھی جیسے پڑھ نہیں رہا ہوں بلکہ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ یہ پتہ مجھے بڑے ہو کر چلا کہ جس زمانے میں میں بڑوں کے لئے لکھی ہوئی الف لیلہ پڑھ رہا تھا۔ اسی زمانے میں لاہور سے بچوں کا رسالہ 'پھول' بھی نکلتا تھا اور بچوں کے لئے کہانیوں کی کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں۔ مگر پھر کیا ہو سکتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا، میں رسالہ پھول، پڑھے بغیر ہی بچے سے بڑا بن گیا تھا۔

اصل میں 'پھول'، کی اشاعت ہماری تہذیب کے ساتھ ایک حادثہ ہے۔ یہ حادثہ جس بڑے عالمگیر حادثے کی پیداوار ہے اسے ہم چھاپہ خانہ کہتے ہیں۔ نہ چھاپہ خانہ ہوتا نہ بچوں کے لئے کہانیاں لکھی جاتیں نہ رسالہ پھول شائع ہوتا۔ بچوں کا ادب اس سے پہلے اگر تھا تو کہنے سننے کی روایت میں تھا، لکھنے پڑھنے کی روایت میں نہیں تھا۔ اصل میں بچوں کا ادب الگ تھا ہی نہیں۔ فکشن یعنی قصہ کہانی کی وہی ایک مشترکہ روایت تھی۔ وہی الف لیلہ کی کہانیاں اور وہی شیخ سعدی کی حکایتیں جب نانیاں دادیاں یا کوئی بڑا بوڑھا بچوں کو سناتا تھا تو وہ بچوں کا ادب بن جاتا تھا۔ اس مشترکہ ادبی روایت میں رخنہ چھاپہ خانے نے پیدا کیا۔ یہاں میں وائٹ ہیڈ کا ایک بیان نقل کروں گا۔ انہوں نے اپنی کتاب AIMS OF EDUCATION. میں یہ لکھا ہے کہ 'ہملٹ' کو تو پڑھا ہی جا سکتا ہے۔ مگر 'اوڈیسی' کا مسئلہ یہ ہے کہ بچے پڑھنے کی منزل سے پہلے اپنی دادی کی طفیل اوڈیسی کے ساتھ ساتھ دیس دیس گھوم پھر چکے ہوتے ہیں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ مغربی دنیا میں دادی اماں کا انتقال کب ہوا اور کب یہ سوال پیدا ہوا کہ 'ایلیڈ' اور اوڈیسی کے قصوں کو آسان زبان میں بچوں کے لئے لکھا جائے۔ مگر ہماری دنیا میں 'پھول' کے وقت دادی اماں زندہ تھیں اور روز رات کو پوتوں پوتیوں کو جمع کر کے منہ سے پھول برساتی تھیں ـــــ اس کا ایک خوشگوار اثر دار الاشاعت پنجاب کی چھاپی ہوئی بچوں کی کتابوں پر بھی پڑا۔ اس وقت بچوں کے لئے جو کہانیاں لکھی گئیں ان میں یہ کوشش نظر آتی ہے کہ کہانی اس طرح لکھی جائے جیسے وہ سنائی جا رہی ہے اس سے پہلے یہ کوشش نظم اور نثر دونوں میدانوں میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی اور مولانا محمد حسین آزاد کر چکے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی نظم و نثر میں دادی اماں اور بڑے ابا کے لہجے زندہ ہیں۔

مگر اسمٰعیل میرٹھی اور مولانا محمد حسین آزاد کا زمانہ اور رسالہ پھول کا زمانہ، یہ دونوں زمانے گزر چکے ہیں۔ دادی اماں اللہ کو پیاری ہوئیں اب معصوم بچے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سنئے ناشروں کی زد میں ہیں۔

ان اداروں نے ایک موٹا سا اصول گرہ میں ضرور باندھا ہے کہ بچوں کے لئے جو کچھ لکھا جائے وہ آسان زبان میں لکھا جائے۔ یہ الگ

بات یہ ہے کہ ان کی شائع کی ہوئی یا نشر کی ہوئی تحریریں اس فقرے کو بھی پلٹا نہیں کرتیں۔ بہرحال آسان زبان کا کیا ہے وہ تو سر سید احمد خاں بھی لکھ لیتے تھے۔ آسان زبان ایسی بھی تو ہو سکتی ہے جو نری کتابی ہو۔ اور آج کل بچوں کے لئے کہانیوں کی کتابیں لکھی جا رہی ہیں ان کی کم و بیش یہی صورت ہے۔ ان کتابوں میں زبان قواعد کے اعتبار سے درست بھی ہوتی ہے اور آسان بھی ہوتی ہے۔ بس لفظ زندہ نہیں ہوتے۔ لکھنے والوں نے بچوں کے لئے لکھنے کے مسئلے کو بالعموم یوں سمجھا ہے کہ فقرے لمبے اور پیچیدہ نہ ہوں، فارسی عربی الفاظ کی بہتات نہ ہو۔ قواعد کی رو سے عبارت درست ہو۔ اور کہانی واضح طور پر بیان ہو جائے۔ مگر مسئلہ اصل میں اور ہے میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ میں نے الف لیلہ اس طرح پڑھی جیسے میں سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ کہانی کو واضح طور پر بیان کرنا نہ تو الف لیلیٰ کا مقصود ہے اور نہ دادی اماں کا مقصود تھا جو سیدھے سچے لفظوں میں کہانی سنایا کرتی تھیں۔ یہ پرانی کہانیاں بنی نوع انسان کی جہات ہیں۔ انسانی روح کی وارداتیں ہیں یہ وارداتیں جن استعاروں میں بیان ہوئی ہیں ان استعاروں میں کہانیاں لکھنے والوں اور بیان کرنے والوں کا ایمان تھا۔ لمبی سے لمبی کہانی چند گھنٹوں میں ختم ہو سکتی ہے۔ مگر میری نانی اماں جب کہانی سناتی تھیں تو راتیں گذر جاتی تھیں اور کہانی ختم نہیں ہوتی تھی۔ بات یہ تھی کہ وہ کہانی تو خود ان کے لئے بھی واردات تھی جب پرانے زمانے کی کوئی نانی دادی کہانی سناتی تھی تو وہ بھی احساس کی اسی سطح پر تحیّر اور تجسس کی اس منزل میں ہوتی تھی جس میں سننے والا بچہ ہوتا تھا اور سننے والا اور سنانے والا دونوں انسانی تخیّل میں ایمان رکھتے تھے۔ اور ایلیٹ نے نثر کی بحث میں ایک بات یہ کہی ہے کہ ایمان بغیر اچھی نثر نہیں لکھی جا سکتی۔ مولانا محمد حسین آزاد تو انسانی تخیّل میں بہت گہرا ایمان رکھتے تھے۔ جبھی تو انہوں نے اتنی اچھی تخیّلی نثر لکھی۔ اور جبھی ان کے لئے یہ ممکن ہوا کہ بچوں کے احساس کی سطح پر آ کر ان کے لئے اچھی نثر لکھیں۔ ہم تو ہیں عقل کا بندہ اور تخیّل اور اس سے جنم لینے والے عظیم استعاروں کو سمجھوں توہم پرستی اور لکھنے بیٹھ جاؤں بچوں کے لئے۔ الٰہ دین کے چراغ کا قصہ، تو کیا میں نثر لکھوں گا۔ اور کیا کہانی بیان کروں گا۔ تو اس زمانے میں ناشر کہانیوں کی جو کتابیں چھاپ رہے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ لکھنے والا ناشر کی فرمائش پر بچوں کے لئے آسان زبان میں کسی پرانی کہانی کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسے وہ نہ تو خود واردات کے طور پر قبول کرتا ہے۔ نہ اسے واردات کے طور پر بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اس طور پر لکھی ہوئی کہانی سے بچے کو سندباد جہازی کا قصہ تو معلوم ہو جاتا ہے مگر وہ سندباد جہازی کے ساتھ اجنبی جزیروں کا سفر نہیں کرتا۔

یہ تو ہوئی بنیادی بات۔ اب میں کچھ ضمنی باتیں کروں گا۔ ایک بات تو یہ ہے کہ بچوں کے لئے بیشک سلیس و سادہ زبان لکھنی چاہیئے مگر اس کا مطلب نہ تو استعاروں کا اخراج ہونا چاہیئے کہ بچوں کی لغت محدود اور مختصر رہ جائے بچوں کے ہاں فہم کا ذریعہ عقل سے زیادہ تخیّل ہوتا ہے اور تخیّل استعارے کی زبان زیادہ سمجھتا ہے۔

دوسری بات لہجے سے متعلق ہے۔ کہانی بچوں کے لئے ہو یا بڑوں کے لئے وہ جیتا جاگتا تجربہ تو اسی وقت بنتی ہے جب اس نے کتابی زبان سے چھٹکارا پا لیا ہو اور بول چال کے لہجوں کو اپنا لیا ہو۔ بول چال کے لہجوں کا معاملہ اُردو کے ساتھ تقسیم کے بعد کسی قدر مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے اس لئے کہ اُردو کے وہ لہجے جو دلّی اور لکھنؤ میں سبنے سنوسے تھے روز بروز متروک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مگر کچھ نئے لہجے بھی تو پیدا ہو رہے ہوں گے۔ کیا آج بچوں کی کہانی لکھنے والے کے لئے یہ سمجھنا ضروری نہ ہو گا کہ اب پنجابی یا کسی دوسری علاقائی زبان کے اثر سے کون سے نئے لہجے زبان میں در آئے ہیں۔ ہاں ایک بات میں اور کہوں گا۔ نئی اُردو پنجابی سے اتنی قریب نہیں ہے جتنی پرانی اُردو ہے۔ اُردو کی داستانیں پڑھتے ہوئے ہم ایسے بہت سے لفظوں سے روشناس ہوتے ہیں جو اب اُردو میں متروک ہیں۔ مگر پنجابی بول چال میں زندہ ہیں۔

ہم زبان کے بدلتے ہوئے لہجوں کو اور ساتھ میں پرانی اُردو کے اس پہلو کو نظر میں رکھیں تو کیا بچوں کے لئے ایسی زبان نہیں لکھ سکتے ہیں جو کتابی نہ ہو بلکہ آج کل کے روزمرہ سے بھی جس کا ربط ہو اور اُردو کی روایت سے بھی اس کا رشتہ استوار ہو۔

ادیبوں کا بچپن
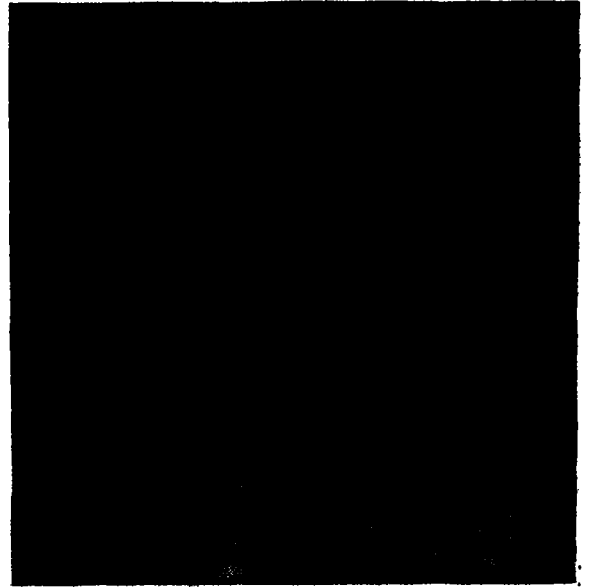
۱۔ ایملی برونٹے
۲۔ یوجین اونیل
۳۔ نوابوکوف اپنے بھائی کے ساتھ
۴۔ ارنسٹ ہیمنگوے

۱۔ رابرٹ فراسٹ
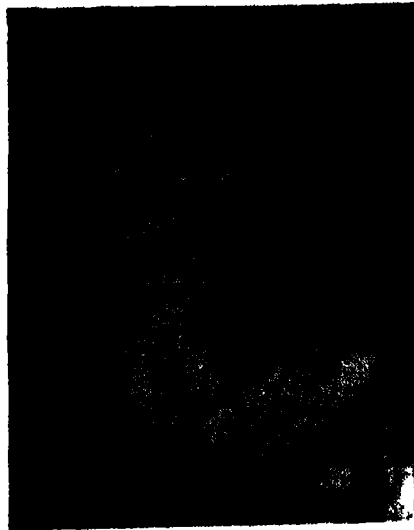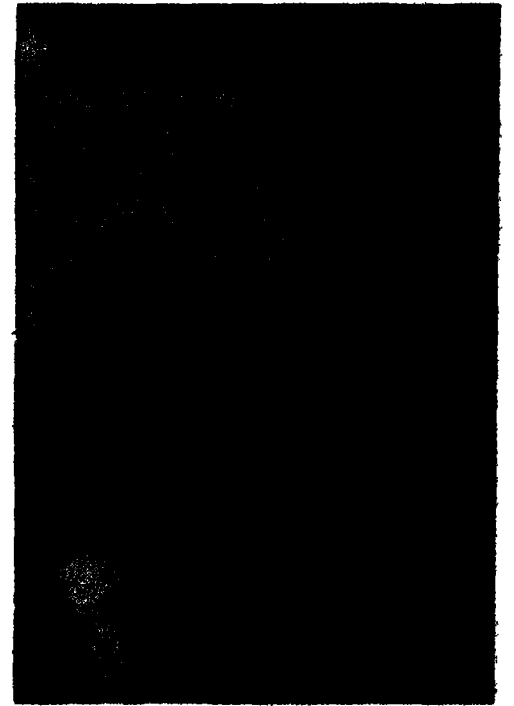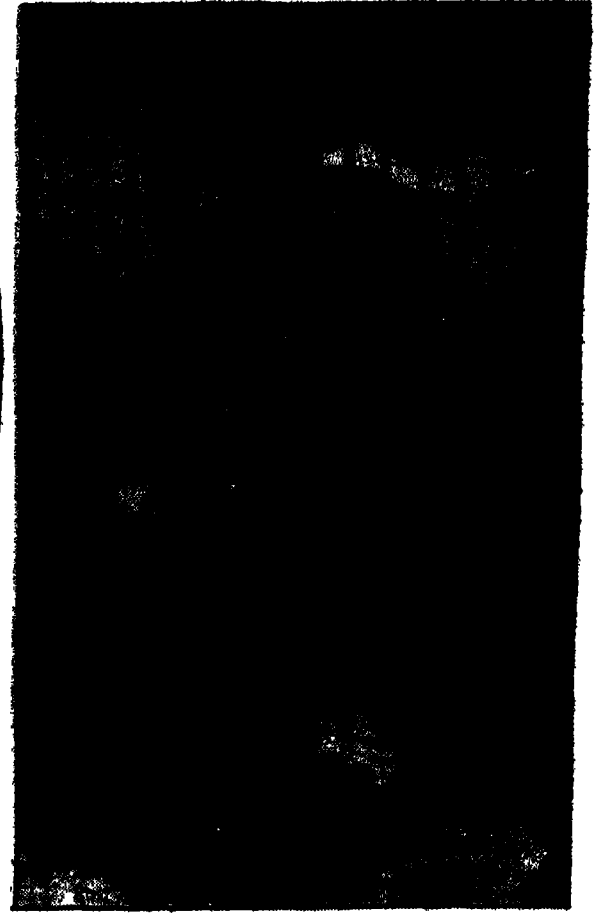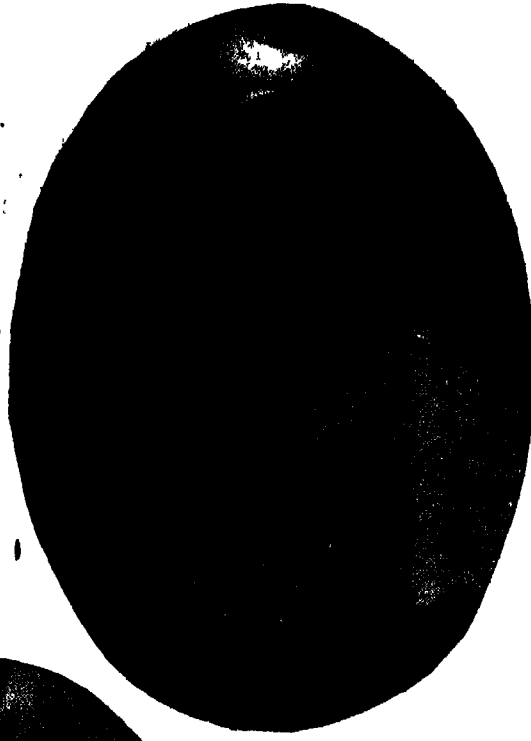
۲۔ آئی رچرڈز اپنی بہن مارگریٹ کے ساتھ

۳۔ سکوٹ فزگرالڈ

۴۔ عصمت چغتائی

۵۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ آڈن

ڈاکٹر سلیم اختر

بچہ اور کتاب

نفسیات کی روشنی میں

وہ "لا" سے اثبات پیدا کرتا ہے، نامعلوم کا سفر کرتا ہے اور وہاں سے کچھ نہ کچھ لے کر آتا ہے۔ وہ کاغذی پیرہن سجاتا ہے اور تخیل کی ایک دنیا آباد کرتا ہے اور الگ الگ غیر متعلق اور متضاد اشیاء کو لے کر انہیں نیا روپ دیتا اور نئے نام سے پکارتا ہے۔ عورت اور مچھلی کو لے کر جل پری بناتا ہے۔ خود اس کے وجود کو صحیح نہیں سمجھتا مگر دنیا کو اس پر یقین کرنے کو کہتا ہے۔ یہ تخلیق کار ہے۔

وہ بھی "لا" سے اثبات پیدا کرتا ہے، وہ بھی نامعلوم کا سفر کرتا اور وہاں سے کچھ نہ کچھ لے کر آتا ہے۔ وہ بھی کاغذی پیرہن سجاتا اور تخیل کی ایک دنیا آباد کرتا ہے مگر یہ تخیل مریضانہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں وہ رسی کو سانپ نہیں سمجھتا بلکہ وہاں سانپ دیکھتا ہے جہاں رسی بھی نہیں ہوتی۔ اس کا ذہن واہموں، نفسی خوف اور بے یقینی کی لرزاں پرچھائیوں میں گھرا رہتا ہے۔ وہ انہیں حقیقی سمجھتا ہے اور دنیا کو ان کی صداقت باور کرانے میں کوشاں رہتا ہے۔ یہ نیوراتی ہے۔

وہ بھی "لا" سے اثبات پیدا کرتا ہے اور تخیل کی ایک دنیا آباد کرتا ہے۔ الگ الگ چیزوں کو نئی شخصیت دے کر نئے نام سے پکارتا ہے۔ ٹانگوں میں لکڑی لے کر گھر بھر میں اسے گھوڑا بنائے دوڑائے پھرتا ہے۔ گڑیا کو سامنے بٹھا کر اس سے باتیں کی جاتی ہیں۔ تکیہ کو ماں سمجھ کر سینے سے لگایا جاتا ہے۔ یہ انہیں حقیقی سمجھتا ہے اور دنیا انہیں کیا سمجھتی ہے اس کی اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ بچہ ہے —— نارمل بچہ —— ہمارا آپ کا بچہ!

تخلیق کار، نیوراتی اور بچہ —— ان تینوں میں ایک قدرِ مشترک نظر آئے گی کہ یہ تینوں جہانِ حقیقت سے الگ ہوتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں رہتے تو ہیں مگر اس کے اصولِ حقیقت کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ تخلیق کار اس لئے کہ وہ تخیل سے اپنے لئے الگ دنیا آباد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نیوراتی اس لئے کہ حقیقت کے ادراک کے لئے اس کے ذہن کا فوکس بگڑ چکا ہے اور بچہ اس لئے کہ ابھی حقیقت اس کا مسئلہ نہیں بنی کہ وہ اپنی جداگانہ دنیا میں رہتا ہے۔ ایسی دنیا جس کا اصولِ حقیقت اس کا ساختہ ہے۔ ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر اس اشتراک کی اساس اس امر پہ استوار نظر آئے گی کہ

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اس مصرعہ کا نفسیاتی اصطلاح میں ترجمہ کرنا ہو تو اسے MAKE BELIEVE کہا جا سکتا ہے۔

تخلیق کار کے لئے MAKE BELIEVE اس کی تخلیقات میں رنگ بھرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور یہ وہی ذہنی عمل ہے جسے جان بوجھ کر حقیقت کے معطل کر دینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تخلیق کار اور نیوراتی دونوں کا ذہن اسی اصول پہ کام کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تخلیق کار کو MAKE BELIEVE کا فنی شعور ہوتا ہے اور اس فنی شعور کے ساتھ بعد میں قارئین اس کی تخلیقات کو پڑھ کر ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں ورنہ طلسماتی داستانوں، مہماتی قصوں، جاسوسی ناولوں اور اس نوع کی تحریروں کا وجود بھی نہ ہوتا۔ نیوراتی اس لئے نیوراتی ہے کہ اس کے ہاتھ سے شعور کی ڈور کا وہ گولا گر کر گم ہو چکا ہے جس کے سہارے اس نے لاشعور کے سایوں اور پرچھائیوں سے پُر بھول بھلیاں سے نکل کر شعور کے اجالے میں واپس آنا تھا جس کے نتیجہ میں یہ MAKE BELIEVE ہی اصولِ حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے اور اسی لئے وہ رسی کے بغیر بھی سانپ دیکھ کر اس سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا خوف حقیقی ہوتا ہے سانپ کے حقیقی نہ ہونے کے باوجود بھی۔

بچے کا ان سب کے مقابلے میں MAKE BELIEVE پر زیادہ انحصار ہوتا ہے اس لئے کہ جہانِ حقیقت قدم قدم پر اس سے متصادم ہوتا ہے۔ خواہشات کی تکمیل میں آڑے آتا ہے اور اس کی خوشیوں کے پیالے کو

بڑھنے سے پہلے ہی ہاتھ مار کر گرا دیتا ہے۔ اسے سائیکل نہیں مل سکتی لیکن وہ لوہے کے چھلے کو تو سائیکل بنا سکتا ہے۔ خالی ڈبیوں میں مٹی اور روڑے بھر کر دکان سجا سکتا ہے اور لکڑی کے ٹکڑے لے کر انہیں گھر میں تبدیل کر سکتا ہے۔

بچوں کی نفسی نشوونما میں یہ عمل اہم ترین کردار ادا کرتا ہے اور رہدِ طفلی میں جذباتی نوعیت کے جھٹکوں کے منفی اثرات کو دور کرنے میں یہ کبھی "کشن" کا کام کرتا ہے تو کبھی سیفٹی والو کا۔ بڑوں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ بچہ کتنا جذباتی ہوتا ہے۔ وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں سے سمجھ کا طالب ہوتا ہے۔ ایسی سمجھ جو اسے بچہ سمجھ کر بھیک کے طور پر نہ دی جائے بلکہ برابر کا اور ہم سطح سمجھتے ہوئے اس کا حق سمجھ کر اسے دی جائے۔ لیکن بڑے اپنا بچپن فراموش کر چکے ہوتے ہیں اس لئے وہ بچے کو محض بچہ سمجھتے ہیں۔ کبھی ٹافی دے دی کبھی دو چپت لگا دیئے۔

بالعموم بچے کو غم و فکر سے آزاد تصور کیا جاتا ہے اور دنیا کی پریشانیوں میں الجھا انسان بڑی حسرت سے بچپن کے سنہری زمانے کو یاد کرتا ہے۔ اگر بچہ کو اس بنا پر پریشانیوں سے آزاد سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ روزی کمانے کے چکر اور ذمہ داریوں سے آزاد ہے تو اس حد تک تو یہ درست ہے لیکن پھر بھی اپنے بزرگوں کی مانند "پریشانیاں" اور الجھنیں رکھتا ہے۔ یہ الجھنیں ذہنی ہوتی ہیں اور نوعیت کے لحاظ سے جذباتی و احساساتی!

بچے کا سب سے اہم نفسیاتی مسئلہ اس میں عدم تحفظ کا احساس ہے۔ یہ احساس کس قدر شدید ہوتا ہے، عام لوگوں کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا لیکن یہ اہم ترین اور تجربہ گاہوں میں ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ہر بچے میں، امیر اور ناز و نعم میں پلے بچوں کی بھی استثنٰی نہیں — یہ عدم تحفظ کے احساسات ہوتے ہیں۔ یہ احساسات کیسے جنم لیتے ہیں؟ ان کے محرکات کون سے ہیں؟ اور کیسے کیسے بچہ ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے؟ اس کا ہر انفرادی مثال کی صورت میں الگ الگ طور پر مظاہرہ ہوگا اور یہ سب موجودہ مضمون کی حدود سے خارج ہیں لیکن ایک عمومی اصول کے طور پر اس کی نفسیاتی اہمیت پر زور دینا بھی لازم ٹھہرا۔

بچے کا ایک اور اہم نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ وہ بڑوں کی توجہ اور محبت کا طالب ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے مداحوں کے حلقے میں مرکزِ توجہ بنا رہے۔ سب اسے سراہیں، اس کی واہ واہ ہو اور اس کی جے ہو۔ وہ جو کچھ بھی کرے اس پر اسے داد بلکہ بہت زیادہ داد ملنی چاہیئے۔

اگرچہ یہ میلان اپنے اظہار کے لئے الگ جداگانہ ذرائع اپناتا ہے لیکن دیکھا جائے تو یہ اس کی باقی شخصیت سے منقطع اور الگ نہیں ہوتا۔ اگرچہ بچوں میں اس کے ردِ عمل کی کئی صورتیں ملتی ہیں لیکن بیشتر صورتوں میں یہ عدمِ تحفظ کے احساس سے چھٹکارے کی ایک نارمل صورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سے محروم بچوں کی اکثریت شرارتوں، بدتمیزیوں، توڑ پھوڑ اور بعد میں چوری وغیرہ کی صورت میں مرکزِ نگاہ بننے کے جذبہ کی لاشعوری تسکین کرتی ہے۔

یہ سب نارمل انداز میں ہوتا رہے تو بڑا ہو کر بچہ ان میں سے بیشتر احساسات کو فراموش کر دیتا ہے اور اس کی شخصیت نارمل طور پر نشوونما پاتی رہتی ہے لیکن اگر بچپن میں محرومی زیادہ شدید رہی ہو اور اس میں خود کو مسترد کر دیئے جانے کے احساسات ایک کمپلیکس کی صورت اختیار کر لیں تو پھر صورتِ حال ابنارمل نتائج کو جنم دے سکتی ہے۔

احساسِ محرومی کے شکار بچوں کی اکثریت عام لوگوں سے کٹ کر اپنے آپ میں پناہ گزیں ہوتی ہے "لوگوں نے اسے مسترد کر دیا" یہ احساس اسے بچین بھی رکھتا ہے اور خوفزدہ بھی کر دیتا ہے۔ دوبارہ مسترد کئے جانے کا خوف اسے لوگوں سے دُور لئے جاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ دوسروں سے ابلاغ کے قابل بھی نہیں رہتا۔ ایسے بچوں کی اکثریت اگر ردِ عمل کی دوسری انتہا تک پہنچ کر بدتمیز اور دھینگا مشتی کرنے والوں میں تبدیل نہ ہو جائے تو پھر یہ دروں بین، خاموش، شرمیلے اور اعصابیت کے شکار بچوں کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایسے بچے جن کا اگر سب سے بڑا نہیں تو کم از کم سب سے اہم سہارا کھلی آنکھ کے سپنے ہوتے ہیں فینٹسی ہوتی ہے اور MAKE BELIEVE۔

ایسے بچے اپنی شخصیت میں جو خلا محسوس کرتے ہیں اسے پُر کرنے کے لئے وہ کئی طرح سے سعی کناں ہوتے ہیں جن میں خود لذتی سے لے کر مطالعۂ کتب تک خاصا تنوع ملتا ہے۔ ایسے بچوں کے لئے مطالعہ محض ایک کہانی ختم کرنے یا کتاب پڑھنے کے مترادف نہیں ہوتا بلکہ بچہ اپنی شخصیت کے تقاضوں کی مطابقت میں اس سے کئی طرح کے نفسی فوائد بھی حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ بڑوں کی دانست میں تو وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہوتا ہے لیکن بچے کے جو جب وقت کا صحیح اور بہترین

معصر ہی بچا ہے۔

مطالعہ کی نفسیات میں سب سے اہم بلکہ اہم ترین نفسیاتی نکتہ یہ ہے کہ بچہ کے لئے کتاب و درفرار وا کرنے کا مکمل جام جم ثابت ہوتی ہے۔ بڑوں نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ انہوں نے اس کے وجود کو اہمیت نہ دی تھی اور ان کے پاس اس کے لئے وقت نہ تھا۔ اچھی بات ہے میں بھی انہیں مسترد کرتا ہوں۔ میں بھی ان کے وجود کو اہمیت نہیں دیتا اور میرے پاس بھی ان کے لئے وقت نہیں ہے کیونکہ میں کتاب پڑھ رہا ہوں۔ جس طرح بعض مسترد کئے ہوئے بچے یا پیار کی بھوک کے مارے بچے پالتو جانوروں کو اپنی تمام محبت کا مرکز بنا کر اپنی محرومیوں کا مداوا اس کی محبت میں تلاش کرتے ہیں۔ بالکل اسی اصول پر مسترد کئے جانے کے احساسات سے زخم خوردہ بعض بچے کتاب کی محبت میں پناہ تلاش کر لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کتاب میں پناہ لینے کا یہ میلان اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ مطالعہ COMPULSION بن کر رہ جاتا ہے چنانچہ بلوغت کے بعد بھی یہ مطالعہ ایک نفسیاتی ضرورت بنا رہتا ہے۔

بچہ اپنی عمر اور جسم کی بنا پر تو کمزور و ناتواں ہوتا ہے لیکن دوسروں کا سلوک اس میں عدم تحفظ کے جن شدید احساسات کی آبیاری کرتا ہے وہ اس میں مزید ناتوانی کا احساس پیدا کرتے ہیں یوں کہ وہ خود کو بالکل ہی بے بس اور بے کار اور بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ ایسے میں کتاب اس کی ہمت بندھاتی ہے چنانچہ وہ کہانیوں کے کرداروں کے ساتھ اپنی نفسی تطبیق (IDENTIFICATION) کر لیتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ محض قاری سے بڑھ کر ہیرو بن جاتا ہے۔ ادب کی اثر پذیری میں تطبیق کی اپنی نفسیاتی اہمیت ہے اور یہ ذہنی عمل کوئی بچوں سے ہی مخصوص نہیں بلکہ ہر عمر کے قارئین اسی سے کسی نہ کسی حد تک اثرات اخذ کرتے ہیں۔ اسی سے پورنوگرافی میں مزا پیدا ہوتا ہے اور اسی کے باعث کنواریاں رومانی ناول پڑھ کر سپنوں میں کھو جاتی ہیں یا ہیروئن کے دردناک انجام پر تکیہ آنسوؤں سے بھگو دیتی ہیں۔ بچے اور بڑے میں فرق MAKE BELIEVE سے پیدا ہوتا ہے۔ بڑا سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ محض تحریر ہے اس لئے بعض اوقات ضرورت سے زیادہ متاثر ہونے پر وہ بعد میں زود پشیمانی کا ثبوت بھی دیتا ہے لیکن بچہ کہانی اور کرداروں کو حقیقی جان کر ان سے اپنی تطبیق کرتا ہے (خود کو "سکس ملین ڈالر مین" سمجھ کر اور اس کی طرح چھلانگ لگا کر ٹانگیں تڑانے والے بچوں کو بھی اسی تطبیق کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔)

مطالعہ کی نفسیات کے ان نکات کی روشنی میں اگر اپنے ہاں کے بچوں کے ادب، بچوں کے ادیبوں اور بچوں کے والدین کو دیکھیں تو آوے کا آوا بگڑا نظر آتا ہے۔ بچوں کے ادب کے بارے میں ایک کلیشے تو یہ ملتا ہے کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے لئے بچہ بن کر لکھنا چاہئے لیکن ایک بڈھے طوطے کے لئے بچہ بننا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کسی بچہ کا بڑا بننا۔ یہ عمر میں چند سال گھٹانے یا بڑھانے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ نفسیات سمجھنے کا مسئلہ ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی اس لئے ادیب حضرات پیارے بچو، پیارے بچو! کی رٹ لگا کر اپنی دانست میں خود بچہ بن جاتے ہیں۔ زیادہ بچہ بننا مقصود ہوا تو پیارے بچو کہہ دیا۔ اس نفسیات ناشناسی کے نتیجہ میں بچوں کا ادب عجیب ملغوبہ بن کر رہ گیا ہے۔ ایک طرف پرندوں، عام چرندوں یا مناظرِ فطرت پر لکھی وہ نظمیں ہیں جو اپنی زبان کی بنا پر نرسری رائم کے قریب قریب محسوس ہوتی ہیں تو دوسری طرف نثری معلوماتی مضامین، شخصیات کے احوال اور ہر نوع کی کہانیوں میں زبان کے کئی درجات ملتے ہیں کون سی تحریر کس عمر، کس مزاج اور کس تعلیمی استعداد کے حامل بچے کے لئے موزوں اور مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا شعور بچوں کے کسی ادیب کو نہیں۔

بچہ، بزرگوں سے جان چھڑا کر کتاب میں ڈوبا تھا لیکن بزرگ یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے ایک عام مگر بے حد غلط عقیدہ یہ ہے کہ کہانیوں کی کتابیں بچوں کو خراب کرتی ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ انہیں اس کا ادراک نہیں کہ یہ بچے کو کیسے خراب کر سکتی ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ نہیں ہوتے کہ کہانیاں بزرگوں سے زیادہ خراب کبھی بھی نہیں کر سکتیں۔ یہی نہیں بلکہ اس بات پر بھی غور نہیں کرتے کہ بچے سے اس کی پسندیدہ کتاب چھین کر وہ اس پر کتنا ظلم کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں آئے جو فرسٹریشن ہو گی وہ اس کی شخصیت کی صحت مندانہ نشوونما کے لئے کتنی مضر ثابت ہو سکتی ہے۔

بچہ مطالعہ سے صرف اسی صورت میں نفسیاتی فوائد حاصل کر سکتا ہے جب اسے انتخابِ کتب کی آزادی ہو۔ بعض والدین بچے کو مطالعہ سے تو منع نہیں کرتے لیکن انتخابِ کتب پر سنسر نافذ کر دیتے ہیں۔ وہ اسے بہتر آدمی بننے کے لئے عظیم شخصیات کی سوانح عمریاں یوں پڑھواتے ہیں گویا حلق سے جوشاندہ اتار رہے

ہوں حالانکہ بیشتر صورتوں میں تو خود والدین کو عظیم
شخصیات کی سوانح عمریوں کے مطالعہ اور پھر ان پر
عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔

والدین بچوں کو بھوت کے طلسمی قصے نہیں
پڑھنے دیتے۔ اس امر کے باوجود کہ بیشتر صورتوں میں
خود ان پر کسی نہ کسی صورت میں یقین رکھتے ہیں،
عام دلیل یہ دی جاتی ہے ان بے کار قصوں سے وقت
ضائع ہوتا ہے حالانکہ بچے کے لئے وقت کا صحیح مصرف
بس ایسی کتابوں کے مطالعہ کی صورت میں ہوتا ہے۔

دراصل یہ سارا طرزِ عمل اس لئے ہے کہ بڑوں نے
بچوں کے لئے پسند، ناپسند کا ایک معیار مقرر کر رکھا
ہوتا ہے اور اسی کی لاٹھی سے وہ بچوں کو ہانکتے ہیں
یہ جانے بغیر کہ یہ طرزِ عمل بچوں کے لئے کتنی نفسیاتی
پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے لہٰذا سب سے بہتر
طریقہ یہی ہے کہ بچہ کو انتخاب کتب میں ہر لحاظ سے
آزاد اور خود مختار ہونا چاہئے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ
جیسے جیسے ان میں ذہنی پختگی آتی جائے گی اس کے
مطالعہ کا انداز بھی بدلتا جائے گا اور یہ بھی ہوسکتا ہے
کہ وہ مطالعہ کی بجائے کوئی اور شوق پیدا کرلے اسلئے
بچہ کو کتاب کے معاملہ میں پابند نہ کرنا چاہئے۔ وہ بڑوں
سے بھاگ کر کتاب کی طرف آتا ہے۔ اس کی بیکسی کو
کتاب کے دلچسپ واقعات سے سہارا ملتا ہے اور
کہانیوں کے کردار اس کی شخصیت میں محرومیوں
کی تلخیوں کو کسی حد تک کم کرتے ہیں تو ایسے میں
اس کے ہاتھ سے کتاب چھین کر اس کی من پسند دنیا
سے نکال کر اپنی دنیا میں اسے جلاوطن کرنے کا
کیا فائدہ؟

خاطر غزنوی
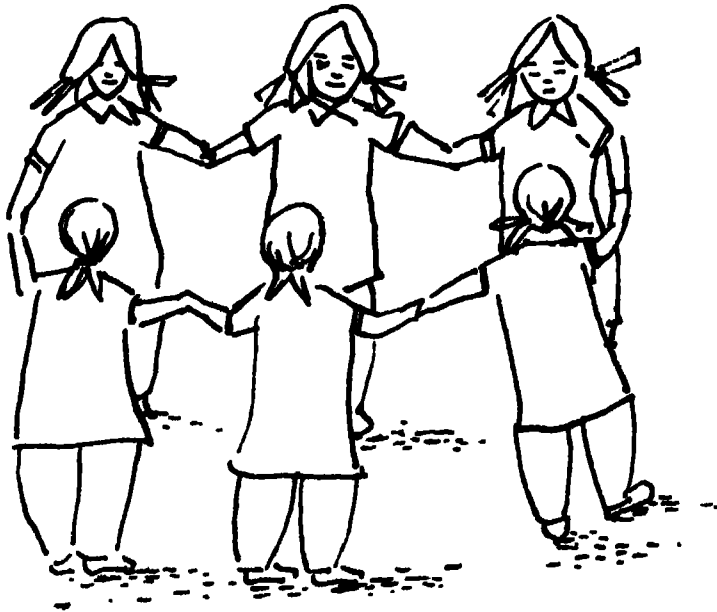
ریڈیو اور ٹیلی وژن کا ادب

کچھ زیادہ مدت کی بات نہیں جب ہمارے ہاں بچوں کی تفریح کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ بچوں کی تفریح غیر منظم تھی۔ سال کے سال عید، شب برات پر نئے کپڑے یا میلوں ٹھیلوں میں جھولوں، ہنڈولوں سے بچے لطف اندوز ہوتے تھے۔ والدین کا رویہ دوستانہ کم اور حاکمانہ زیادہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھار والد کے کوئی ہنس مکھ دوست گھر آجاتے تو ان کی دلچسپ باتیں، سفر کے حالات سے بھرپور مذاق بچوں کو تفریح بخش دیتے یا پھر شہر میں کسی تھیٹر منڈلی کے آ جانے سے بچے والدین سے چھپ چھپا کر منڈوے میں پہنچ جاتے۔ (یہ بات کرتے ہوئے میرے ذہن میں زیڈ اے بخاری اور پطرس بخاری کا پہلی مرتبہ والد سے چھپ کر تھیٹر جانے کا واقعہ محفوظ ہے جسے زیڈ اے بخاری نے اپنی سوانح کی کتاب سرگزشت میں لکھا ہے) پھر بچپن میں دادی یا نانی اماں کی کہانی کی لذتیں ہر بچے کو شام کی آمد کا انتظار کرنے پر مجبور کرتی تھیں۔ باقاعدہ طور پر تفریح کا سامان بچوں کے علاقائی کھیل ہوتے تھے اور ان کھیلوں کا مرکز شہر اور دیہات کی گلیاں، میدان اور میدانیاں تھیں۔ یہ مقامات بچوں کے شور شرابے، قہقہوں، رونے دھونے اور توڑ پھوڑ کے کئی اثاثت سے آباد رہتے۔

پہلے پہل بچوں کو تفریح بہم پہنچانے والے پروگراموں اور تفریح میں حصہ لینے کا باقاعدہ موقع بیڈن پاول کی سکاؤٹ تحریک کی وساطت سے ملا۔ پھر سکولوں میں ڈرامے سٹیج کیے جانے لگے۔ کتابیں چھپنے لگیں تو کہانی اور نظم کے ساتھ تصویروں نے بھی بچوں کو بہلایا۔ ملک میں ریڈیو کی نشریات میں بچوں کو حصہ ملا اور اب ٹیلی ویژن کی نشریات نے زیادہ سے زیادہ بچوں کو آپس میں چپک کر سکرین کے سامنے بیٹھنے کا موقع بخشا ہے۔ اب اپنے ہی بہن بھائیوں کو پروگرام پیش کرتے دیکھ کر بچوں میں خود بھی پروگراموں میں حصہ لینے کی خواہش جاگ اٹھی ہے اب ماؤں نے جھجک کے بجائے اپنے ننھے منوں کو نہلا دھلا، نئے کپڑے پہنا کر ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں میں بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ بچوں کو رخصت کر کے خود وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بچوں کے پروگرام کی نشریات پر آنکھیں مرکوز کر کے اپنے بچے کو تلاش کرنے کی زحمت اور بچے کی آواز سن کر تسکین کی لذت حاصل کرنے لگی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے کسی حد تک بچوں کو اپنے گرد جمع کرنا شروع کر دیا ہے لیکن ابھی بچوں کے پروگراموں کے اوقات ابھی گلیوں کے کھیل کے اوقات پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ اس لیے گلیاں آباد ہیں اور گلیوں کو آباد رہنا بھی چاہیے کہ اب تو آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں پارکوں کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ اس لیے بچوں کی جسمانی نشوونما کے لیے گلیوں کے کھیل ضروری ہیں اور بچوں کی صحت کے مقابلے میں بعض گھر والوں کی کھڑکیوں کے شیشوں کا ٹوٹنا کچھ مہنگا نہیں کہ ہم خود اپنے اور اپنے بچوں کے لیے پارک بنانے پہ پلازے بنانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ریڈیو، ٹی وی جہاں بچوں کی تفریح کا ایک ذریعہ ہیں وہاں یہ بچوں کی ذہنی نشوونما بھی کرتے ہیں اور شاید اسی لیے گلیوں کے کھیل کے اوقات کے بحران کا کام شروع ہو جاتا ہے۔

ریڈیو اور ٹی وی کے بچوں کے پروگراموں کی مقبولیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور اسی نسبت سے پروگراموں کے لکھنے والوں کی ضرورت اور اہمیت بھی زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔

ریڈیو اور ٹی وی کے بچوں کے پروگرام لکھنا آسان نہیں ہے لیکن مشکل بھی نہیں۔ اگر کوئی نوجوان ابلاغ

کے ان دونوں ذرائع کے لئے لکھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے صرف دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوگا

۱۔ بچوں کی بنیادی نفسیات کا علم۔

۲۔ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں کے لوازمات جن میں ضروریات اور مشکلات دونوں شامل ہیں۔ ہاں واقفیت

تفریح کے سلسلے میں بچوں کی نفسیات کا بنیادی نقطہ کھیل کود ہے۔

بالکل ہی معصوم بچے غیر شعوری طور پر ہر چیز کو اٹھا کر منہ میں ڈال لیتے ہیں یا پھینک دیتے ہیں۔ ان کیلئے دوسری کشش ابھی ہے اور اس کا تعلق رنگوں سے ہے پھر جھنجھوڑوں کے ہلکوروں کی لذت ہے۔

اس سے آگے بڑھیں تو کھلونے ہیں۔ کھلونوں میں بھی رنگ، شور اور دلچسپ شکلیں قابلِ لحاظ ہیں۔ ان میں جانوروں اور پرندوں کی طرف بچوں کا مائل ہونا قدرتی امر ہے۔ بچے ذرا اور بڑے ہو جائیں تو پھر جانور اور پرندے پالنے کا شوق ان کی تفریح کا ایک ذریعہ بنتا ہے۔ دراصل یہ ساری چیزیں حواسِ خمسہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ بچے کے لئے دنیا نئی ہوتی ہے اور وہ نئے رنگوں اور نئی چیزوں کے نظاروں، موسیقی، نئی آوازوں کی رنگارنگی، نرم و نازک پرندوں اور جانوروں کے دلکش لمس اور ذائقے کی نئی لذتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس عمر میں قوتِ شامّہ دوسرے حواس کے مقابلے میں کم کردار ادا کرتی ہے گویا بچوں کے جو حواس سب سے زیادہ کردار ادا کرتے ہیں وہ بصارت، سماعت اور لمس ہیں۔

بچوں کے لئے ریڈیو اور ٹی وی پروگرام لکھنے سے پیشتر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا کیا مقام ہے اور یہ اپنے فرائض سے کس حد تک عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ ریڈیو کی طرح ٹی وی بھی ناظرین کے ایک چھوٹے سے گروپ کے لئے ہوتا ہے۔ ٹی وی بھی ریڈیو کی طرح روزمرہ کا معمول بن گیا ہے لیکن ریڈیو کے برعکس ٹی وی پروگرام سٹوڈیو میں بھی ہوتے ہیں، سٹوڈیو سے باہر بھی اور دونوں طرح بھی۔

جس طرح فلم میں کیمروں کا استعمال ہوتا ہے اور عمل کو ایک لینس کے ذریعے فلمایا جاتا ہے اور سکرین پر دیکھا جاتا ہے اور یہ عمل بیک وقت آواز اور تصویر کے ذریعے سے تکمیل پذیر ہوتا ہے اسی طرح ٹی وی پروگرام بھی بعض تکنیکوں کے حامل ہیں۔ ان میں بعض فلم سے مماثلت رکھتے ہیں اور بعض فلم سے یکسر مختلف ہیں۔ تھیٹر کی طرح ٹی وی ایک زندہ ذریعہ ہے کہ یہاں بھی اداکار یا شرکاء ایک مسلسل عمل سے گزرتے ہیں۔ فلم کے برعکس یہاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں پروگرام ریکارڈ نہیں کیا جاتا لیکن ریڈیو کے پروگراموں کے برعکس ٹی وی میں بصری اور سمعی دونوں قسم کی ضروریات کے سامنے سرِ خم کرنا پڑتا ہے۔ سٹیج سے یہ اس لحاظ سے مختلف ہے کہ یہاں ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ پر جانے کے لئے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔

گویا ٹیلی ویژن، سٹیج، فلم اور ریڈیو سب سے الگ ایک خاص ذریعہ ہے لیکن ریڈیو کی طرح اس کا تعلق براہِ راست آپ کے ڈرائنگ روم بلکہ بعض اوقات بیڈ روم سے ہے۔ یہ بہت حد تک فلم سے ملتا جلتا ہے کہ یہ ریڈیو کی محض صوتی کارکردگی سے آگے ہے لیکن بہت حد تک ریڈیو اور تھیٹر کی خصوصیات کا حامل ہے کہ یہ فلم سے کمتر درجے کی شکل ہے، لیکن جہاں تک اس کی کارکردگی اور افادیت کا تعلق ہے ہر لحاظ سے اونچے درجے کی چیز ہے۔

اپنے طور پر یہ ایک نیا اور حیرت انگیز میڈیم ہے اس میں شبہ نہیں کہ تھیٹر اور فلم کا نعم البدل نہیں لیکن اس کی بہتر خصوصیات میں سے ایک اہم ترین یہ ہے کہ یہ دنیا ہی نہیں اب تو کائنات کا دریچہ بن گیا ہے آج کی دنیا کا جامِ جم ہے جس میں ہم تمام تازہ بتازہ نظارے دیکھ سکتے ہیں، آوازیں سن سکتے ہیں۔

یہ سینما سے اونچے درجے کی چیز اس لئے بھی ہے کہ سینما کو بھی اس نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے اور آج کے ٹیلی ویژن پروگرام اب ٹی وی کے سٹوڈیو کیمروں ہی سے نہیں فلم کے کیمروں، ٹیپ ریکارڈروں، وی سی آر، وی ٹی آر، ریڈیو ٹرانسمیٹروں، سٹلائٹ غرض ہر چیز سے منسلک و متعلق ہو گئے ہیں اور اسی لئے ٹی وی اب سارے ذرائع ابلاغ سے زیادہ مؤثر ذریعہ بن گیا ہے۔ اب صرف بچوں کو ہی گھروں میں پابند رکھنے کے لئے ٹی وی کی زنجیر کام میں نہیں لائی جاتی بلکہ بڑے آدمی بھی شام کی چہل قدمی، دوستوں کے گھر کی شام، کسی ادبی، ثقافتی یا سیاسی جلسے، سینما یا باغ میں جانے کے بجائے اپنے ٹی وی روم کی رونق بنے رہتے ہیں یہاں تک کہ اکثر اوقات مہمانوں کو بھی خوش آمدید کہتے ہوئے کوفت محسوس کرتے ہیں۔

ریڈیو پر بچوں کے پروگرام ایک عرصے سے نشر ہو رہے ہیں۔ ان پروگراموں میں بچے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہر عمر کے بچے۔ یہ پروگرام عام طور پر کسی خاص عمر کے بچوں کے لئے نہیں ہوتے بلکہ ہر عمر کے بچوں کے لئے ان پروگراموں میں کوئی نہ کوئی چیز مل ہی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ پروگرام ۷ سے ۱۲ سال تک کی عمر

کے بچوں کے لئے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار ننھے منے بچوں کے لئے کوئی نظم نشر ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ان وسائل کی کمی کے باعث مختلف عمروں کے بچوں کے لئے الگ الگ پروگرام نشر نہیں ہو سکتے۔ جب ٹرانسمیٹروں کی تعداد بڑھ جائے گی اور بچوں کو الگ چینل میسر آجائے گا تو ہر عمر کے بچوں کے الگ الگ پروگرام نشر ہونے لگیں گے۔ فی الحال یہ دیکھا گیا ہے کہ ٹی وی پر بڑی عمر کے بچوں کے لئے پروگرام زیادہ نشر ہوتے ہیں، حالانکہ ٹی وی ریڈیو کی نسبت چھوٹے بچوں کو اپنی طرف راغب کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے کہ اس میں بچوں کی بصری حس کی تسکین کے زیادہ سامان اور امکانات ہیں۔ صورت جو بھی ہو، نئے لکھنے والوں کے لئے ریڈیو اور ٹی وی پر لکھنے کی تکنیک سے آشنائی بنیادی بات ہے۔

ریڈیو، ٹی وی بچوں کے لئے جو پروگرام نشر کرتے ہیں ان میں بچوں کی نظمیں، موسیقی، کٹھ پتلیوں کا تماشا، ڈرامے، ذہنی آزمائش، سائنسی، جغرافیائی، تاریخی اور دوسری معلومات اور کھیل شامل ہیں۔

نظم کے لئے شاعر کا بچوں سے قرب، ان کی پسند اور ناپسند کی چیزوں کا علم، ان کی ذہنی تربیت کیلئے نئے نئے اور دلچسپ موضوعات کی تلاش، بچوں کی سمجھ کے مطابق ڈکشن کا استعمال ضروری ہے۔

ان نظموں کو ریڈیو پر نشر کرنا یا ٹی وی میں اسکے مطابق منظر نامہ بنانا پروڈیوسر کا کام ہے۔ ٹی وی کا پروڈیوسر نظم میں بچوں کی دلچسپی کے مطابق بصری رنگ بھرنے کا کام جانتا ہے۔ اصل چیز تکنیک کا علم نئے لکھنے والوں کے لئے ضروری ہے ـــــ بچوں کے ڈرامے لکھنے کے لئے سب سے پہلے موضوع کا مسئلہ آتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے بچوں کو پرندوں اور جانوروں سے بہت محبت ہوتی ہے اور اس لئے وہ ایسے پروگرام دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں جن میں یہ پالتو جانور دلچسپ حرکتوں سے ان کو رجھائیں۔ یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے ملک میں نہ بلیک بیوٹی کی طرح گھوڑے سدھانے کا ذوق ہے نہ سکن دی بُش کا گمرو جیسے باشعور کا گمرو پالنے کا چسکہ ہے نہ لیسی (LASSIE) جیسے کتے ملتے ہیں جو اپنے مالک کے تحفظ کے لئے اپنی جان لڑا دیں اور نہ ڈالفن جیسی وفادار مچھلیوں کے مہیا ہونے کا احتمال ہے۔ دراصل ہمارے ہاں والدین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو ایسے جانوروں سے صرف کتاب یا تصویروں کے ذریعے متعارف کرانے پر اکتفا کریں۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت سارے پاکستان میں صرف سوا دو چڑیا گھر ہیں۔ غیر ملکی ٹیلی ویژن کے ان پروگراموں کے مصنفین کو جانوروں کی صلاحیتوں کے مطابق کہانیوں کے موضوعات خود بخود مل جاتے ہیں لیکن ہمارے مصنفین کے پاس تو لے دے کے تاریخی یا سائنسی موضوعات رہ جاتے ہیں۔ بھلا ہو شاہد کاظمی کا کہ ان کی وجہ سے بچے سائنس کے جدید کارناموں کی اچھی بری نقل کو سکرین پر دیکھ تو لیتے ہیں جس کے سبب ان کا ذہن جدید دور کی ترقیات سے مانوس ہوتا جاتا ہے یا پھر کراچی سے دور رہنے والے بچے سمندر کی لہروں کا نظارہ کر لیتے ہیں۔

بہر صورت ایک سوچنے والے مصنف کے لئے موضوعات کی کوئی کمی نہیں۔ کہانی بننے کے لئے گھر ہے، جہاں امی ابو، بہن بھائی، ان کے مسئلے، ان کے جھگڑے، ان کی ایک دوسرے سے محبت، نفرت، گھر کی چیزیں اور گھر آنے والے مہمان موضوع بن سکتے ہیں، سکول ہے جہاں ہم جماعت، استاد، کلاس روم، پڑھاکو لڑکے، کام چور لڑکے، کتابوں کے کیڑے، شریر بچے، بے وقوف بچے، ذہین بچے، تاریخ کے قصے، ریاضی کے کمالات، جغرافیہ کی دوست، جیومیٹری کی شکلیں، سائنس کے تجربات، پرندوں کے گھونسلے، کھیل کا میدان، کھیل کے میدان کے ہیرو، سکول کے باہر مختلف آوازیں لگاتے ہوئے خوانچہ فروش، خوانچہ فروشوں کی خراب چیزیں کھانے والے بچوں کا حشر، سکول کی بس، سب سے پیچھے رہ جانے والے یا کلاس روم میں بند ہو جانے والے بچے کی مصیبت، کتابیں کھو جانے کا قضیہ، یا کسی طالب علم کی کتابیں بازیافتہ اور مالک تک پہنچانے کی جدوجہد ـــــ موضوعات کا ایک انبار ہے۔ پھر بازار بھی ہے۔ بازار کی ریل پیل، چہل پہل، ٹریفک، بد احتیاط بچے، محتاط بچے، بچوں کو اپنی طرف راغب کرنے والے سجی سجائی دکانوں کے شو کیس، شو کیسوں میں ترتیب سے رکھے ہوئے کھلونوں، کتابوں کی دکان۔ تصویروں کی کتابوں میں کھو کر ایلس کی طرح کہانیوں کی عجیب و غریب مملکت میں پہنچ جانے کے قصے۔ غرض موضوعات قدم قدم پر بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ تلاش شرط ہے۔

جہاں تک ریڈیو یا ٹی وی ڈرامے کا تعلق ہے یہ کہانی کی ترسیل کا ایک ذریعہ ہے جس میں داستان گو کی بجائے کردار خود بولتے ہیں۔ اس کے باوجود ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ڈرامے ایک دوسرے سے مختلف ہیں!؟

مناسب ہوگا کہ ان ذرائع ابلاغ کے حوالے سے

ڈرامے کی بحث ہو جائے:
ڈرامے کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ بصری یا صرف دیکھنے کے لئے یعنی خاموش ڈراما یا PANTOMIME۔

۲۔ بصری اور سمعی یا دیکھنے اور سننے کے لئے یعنی سٹیج ڈراما، فلم ڈراما اور ٹیلی ویژن ڈراما۔

۳۔ اور تیسری قسم ہے صرف سمعی یا سننے کے لئے یعنی ریڈیو ڈراما سننے اور محض سننے کی چیز ہے۔ اس کا آنکھوں سے کوئی تعلق نہیں۔

سٹیج، فلم اور ٹیلی ویژن ڈرامے میں بصری اور سمعی قوتیں ایک دوسرے کی معاون رہتی ہیں اور ہر شعبے کے خلا خود بخود پُر ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن ریڈیو ڈرامے میں پردے، پس منظر اور چہرے کے اتار چڑھاؤ نہیں ہوتے۔ یہاں مناظر، بہار، خزاں، آندھی، طوفان، گرمی، سردی، لباس، حسن اور بدصورتی غرض ہر چیز آواز کی مرہونِ منت ہے۔ صوتی اثرات اور کرداروں کے مکالمے سن کر ذہن ان کے تمام اجزا کی تصویریں بناتا اور مشاہدہ کرتا ہے۔ یہاں چہروں کی لکیریں جذبات کی زبان نہیں ہوا کرتیں بلکہ آواز کا زیروبم جذبات اور فاصلے کا پیمانہ بنتا ہے لیکن اداکار کی محض جذباتی اداکاری سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ اس کا انحصار مکالموں کی موسیقی، موزونیت اور تہہ کاری پر ہے اور اس لئے ریڈیو ڈراما سٹیج ڈرامے کی نسبت زیادہ کاوش، ذہانت اور تجربہ چاہتا ہے۔

ڈراما سٹیج کا ہو، ٹیلی ویژن کا، فلم کا یا ریڈیو کا۔ اپنے مخصوص دائرۂ عمل کے سبب بعض تکنیکی لوازمات کا مرہونِ منت ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ڈراما کوئی بھی ہو ادب اور ہنر کے امتزاج کا نام ہے اور اس لئے اکثر نقادوں نے اسے خالص ادب کے زمرے سے خارج کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ کسی حد تک یہ ایک حقیقت بھی ہے۔ ادبی تخلیق کے ساتھ ساتھ فنی لوازمات ڈرامے کا بنیادی عنصر ہیں اور اس لئے کوئی شخص بھی اگر سٹیج، فلم، ٹیلی ویژن یا ریڈیو کی ضروریات سے واقفیت نہیں رکھتا، وہ کہانی تو تخلیق کرے گا ڈراما نہیں لکھ سکے گا۔ ریڈیو ڈرامے میں بھی مصنف کے ساتھ پیش کار برابر کا شریک رہتا ہے اور اس لئے بعض ڈرامے جو مسودے کی حد تک نہایت غیر دلچسپ اور غیر ادبی ہوتے ہیں اچھی اداکاری اور اچھی پیش کش انہیں آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔ پھر بھی ڈراما نویس کی ذہنی صلاحیت اور تجربہ الگ الگ اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈراما نویس کی بھی بعض ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ریڈیو کے ایک سربرآوردہ نقاد اصغر بٹ لکھتے ہیں:

"ریڈیو ڈرامے میں جو سب سے اہم تجربہ شروع کیا گیا اور جو اب تک جاری ہے، وہ ہے انسانی آواز سے شخصیت کی عکاسی۔ شخصیت میں دو طرح کی چیزیں پیش کرنا نسبتاً آسان ہے۔ پہلی چیز ہے عمر۔ اس کے لئے بوڑھے، ادھیڑ، جوان اور بچے کی آوازیں بآسانی امتیاز پیدا کیا جا سکتا ہے اور دوسری چیز ہے ٹائپ۔ ٹائپ سے مراد ہے وہ خاص کردار جو اپنے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے مثلاً ایک فقیر جو فقیروں کی جانی پہچانی لجاجت سے بولے، ایک امیر جو امیرانہ رعونت سے بات کرے۔ ایک جذباتی عورت جو اپنے جذبات مکالموں میں تولہ اور بول میں ماشہ ہونے کی وضاحت کرے۔ لیکن مشکل کہاں آن پڑتی ہے جہاں ایک امیر آدمی مغرور نہیں ہے اور ایک بھکاری امیر آدمی کے انداز میں بولتا ہے۔ کردار کے سماجی مقام یا شخصیت کی نوعیت کے بارے میں مکالموں میں اشارے رکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ کمال ڈراما نویس کا ہے پیش کار کا نہیں اور اگر ڈراما نویس نے ایسے اشارے نہیں رکھے تو کردار کی صحیح عکاسی کی تمام تر ذمہ داری اداکار پہ آتی ہے۔ اداکار کردار کے گہرے نفسیاتی مطالعے سے استفادہ کر سکتا ہے اور سو میں سے ایک آدھ شخص شاید ایسا مل بھی جائے جو خداداد ذہانت سے ایسی اداکاری کرے مگر ریڈیو ڈرامے کو ایسے شخص روز روز نہیں مل سکتے۔"

ریڈیو ڈرامے کا فن عام ڈرامے کے فن سے مختلف نہیں یعنی اس کی بنیاد بھی کہانی، دلچسپی، مکالمہ، کردار اور کشمکش یا تصادم پر استوار ہوتی ہے۔ لیکن جو بات اسے ڈرامے کی دوسری قسموں سے جدا کرتی ہے وہ ہے ریڈیو ڈرامے کو قدیم یونانی ڈرامے کی تکنیک سے ہمکنار کر دیتی ہے یعنی آواز اور مکالموں کے ذریعے منظر اور کرداروں کی تشکیل۔ قدیم یونانی ڈراموں میں بھی سین سینریاں نہیں ہوتی تھیں جن سے موسم یا منظر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح یونانی ڈرامے کے کردار جذبات کی ترسیل کے لئے چہرے کے اتار چڑھاؤ کے رہین بھی نہ تھے بلکہ جنس کا پتہ دیتے تھے کورس (یعنی آواز) باقی ساری ضروریات پوری کرنے اور لوگوں کو [illegible]

چیزوں کو مجسم کرنے کے لئے تخیل کی مدد لینے کی ترغیب دیتے تھے۔ ریڈیو ڈرامے میں بھی شکل و صورت، عمر، جنس، منظر، موسم، لباس کے لئے آواز کے ذریعے تخیل کی کارفرمائی ممد ہوتی ہے اور تخیل کو مہمیز دینے کیلئے مصنف کے بعض چھوٹے چھوٹے ایسے مکالماتی اشارے کافی ہوتے ہیں جو برموقع، متعلق اور موزوں ہوں اور ڈرامے کو آگے بڑھانے میں ممد و معاون ہوں۔ ریڈیو ڈرامے کی تکنیک میں بعض امور نہایت اہم ہیں۔ پہلی چیز تو کرداروں کے ہجوم کا مسئلہ ہے۔ ریڈیو ڈرامے کی طوالت ۳۰ منٹ سے ایک گھنٹہ اور بچوں کے لئے ۱۵ منٹ ہوتی ہے اور اتنی کم مدت میں زیادہ کردار سننے والوں کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر یہاں یہ مشکل بھی پیدا ہوتی ہے کہ کرداروں کو یاد رکھنے یا پہچاننے کا ذریعہ صرف آواز ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی ڈرامے میں کرداروں کی افراط سے سارے کرداروں کو یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے تجربہ کار ڈرامانگار ریڈیو ڈراموں میں حتی الامکان کم سے کم کردار رکھتے ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن ڈرامے کا فرق دراصل ان دونوں ذریعوں کی تکنیک کے فرق پر منحصر ہے۔ اگرچہ ریڈیو اور ٹی وی ڈرامے ایک ہی انداز سے نشر ہوتے ہیں مگر ٹی وی میں بیک وقت دو مکمل نشریاتی طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک بصارت کے لئے اور دوسرا سماعت کے لئے جبکہ ریڈیو جیسا کہ آپ جانتے ہیں صرف سماعت کیلئے ہے۔ گویا ریڈیو ایک نامکمل ٹیلی ویژن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹیلی ویژن کو نفسیاتی، فنکارانہ اور تاریخی لحاظ سے غیر بصری ریڈیو کی ترقی یافتہ صورت نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ ہمارا احساس بصارت، احساس سماعت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بصارت اور سماعت الگ الگ بھی اپنے طور پر کام کرتے ہیں غیر بصری ریڈیو کے مقابلے میں پینٹو مائم PANTOMIME صرف بصارت والوں کی چیز ہے اور ٹیلی ویژن ریڈیو سے اسی لئے ایک الگ تشخص رکھتا ہے۔ ایک اچھا ٹی وی ڈراما وہی ہوتا ہے جو دوسرے کمرے میں سن کر پتہ نہ پڑے اور اگر ٹی وی ڈرامے میں صرف مکالمے ہی ہوں اور وہ دوسرے کمرے کے آدمی کی سمجھ میں آجائیں تو پھر وہ ریڈیو ڈراما ہے ٹی وی ڈراما نہیں۔ مجھے ٹی وی کا ایک ایسا ڈراما یاد ہے جس کی طوالت ۲۵ منٹ تھی اور اس میں صرف ایک مکالمہ تھا اور وہی مکالمہ ڈرامے کا نام بھی تھا۔ ان سارے مروجہ لوازمات کو سمجھنے کے لئے کہانی کو ڈرامے کی شکل دینے کا مرحلہ آتا ہے اس مقام پر مناظر کی مناسب تقسیم اور ترتیب، زمان و مکان کے تعین، مکالموں کی برجستگی، اور ڈرامے کے منطقی ارتقاء کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے ریڈیو کے مسودے میں زمان و مکان کا تعین مکالموں اور صوتی اثرات کے ذریعے کیا جاتا ہے لیکن ٹی وی میں زمان و مکان کا تعین کوئی ایسی مشکل بات نہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا ہمارا احساس بصارت، احساس سماعت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ ٹی وی ایک بصری ذریعۂ ابلاغ ہے اس لئے وقت کا اندازہ سورج کے طلوع و غروب، سٹوڈیو میں روشنیوں کی کمی بیشی سے، کمروں میں کلاک اور ٹائم پیس کی موجودگی اور کرداروں کے بالوں کی رنگت اور چہرے کی تبدیلیوں سے ہو جاتا ہے۔ بعض مقامات پر پروڈیوسر یا لکھنے والا اپنی طبیعت کی اُپج سے اڑتے ہوئے وقت کی تصویر کشی نئے نئے طریقوں سے پیش کرتا ہے۔ کہیں بجلی کے چلنے سے، کہیں پہیے کے گھومنے سے، کہیں کلاک کے پنڈولم کی حرکت وغیرہ

ٹی وی ڈرامے میں زمان و مکان کی پیش کش کی اچھی مثال سلیم احمد کا کھیل "تعبیر" ہے۔ اس کھیل کا بنیادی مسئلہ ہی زمان و مکان ہے۔ وقت کا انقلاب ہے۔ نئے لکھنے والے اس ڈرامے سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

ٹی وی پر ڈرائنگ روم، کھانے کا کمرہ، باورچی خانہ، آنگن، سونے کا کمرہ، جلسہ گاہ، بازار، ہوٹل، درسگاہ، دفتر، سمندر کا کنارہ، باغ، پہاڑ یہاں تک کہ چاند کی سطح تک کی تصویر بھی بآسانی پیش کی جاسکتی ہے۔

آج کے دور میں ٹی وی میں مختلف قسم کے سٹوڈیو کیمرے، میکانزموں اور مواصلاتی سیاروں کے ساتھ فلم کیمرہ بھی کام آتا ہے۔ اس لئے لکھنے والے کے لئے ٹی وی کے ابتدائی دور کی طرح مختصر مناظر اور کم سے کم سیٹوں کا ڈراما لکھنے کی پابندی کا مسئلہ نہیں رہا۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے اس لئے کہ فلم کے برعکس ٹی وی ڈراما بہت کم وقت میں تیار کیا جاتا ہے اور اسی لئے بہت سے ممکن وسائل سے تھوڑے وقت میں کام لینا ممکن نہیں ہوتا، نیز پاکستان میں ہر سٹیشن پر ہر پروڈکشن کی سہولتیں بھی میسر نہیں اس لئے کم سے کم سیٹ والی بات اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا یہ چاہے کہ وہ اپنے ڈرامے میں بے شمار مناظر شامل کر دے تو ان کو عملی جامہ پہنانا ٹی وی پروڈیوسر کے لئے ناممکن نہیں لیکن مجبوریوں، دشواریوں اور وسائل کی کمی کے باعث نئی الجھنوں میں مزید ڈال دیتا ہے۔ یوں بھی مناظر کی بھرمار ٹی وی کے مختصر دورانیے کے کھیل کے لئے کوئی خوش آئند

بات نہیں۔

ٹی وی سٹوڈیو ایک مختصر سا ہال ہوتا ہے اس میں زیادہ سے زیادہ تین سیٹ بیک وقت لگائے جا سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی توقع اس لئے بھی بے سود ہے کہ مطلوبہ سیٹوں کے علاوہ ایک سے زیادہ کیمروں، کیمرہ مینوں، ان کے تاروں، مائکروفون اور ان کو دائیں بائیں کرنے والوں اور ان کو حرکت میں رکھنے والوں، روشنیوں کو اوپر نیچے کرنے والوں، جلانے بجھانے والوں، فلور مینجر اور دوسرے فنی عملے کی توجہ کے لئے جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر کیمروں کی موٹی موٹی کیبلوں کے ساتھ کیمروں کی نقل و حرکت کے لئے صاف اور وسیع فرش بھی درکار ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد اپنی باری کا انتظار کرنے والے اداکار بھی سٹوڈیو میں اپنی کہانیوں کو روکے موجود رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ٹی وی کے ہر قسم کے ڈرامے کے پروڈیوسر لکھنے والے سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ کم سے کم مناظر میں ڈراما لکھے۔ یہاں ہر شخص زمان و مکان کے زیادہ الجھاوؤں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ لیکن بعض ڈرامے ایسے ہوتے ہیں کہ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہوتا چنانچہ ایسی صورت میں پروڈیوسر کو سٹوڈیو سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ وہ باغ و راغ، جنگل، خوبصورت کوٹھیوں، اصل بازاروں اور اصل گلیوں، حقیقی کھنڈروں اور وسیع کھیتوں اور فلم کیمروں، او بی یونٹ، ای این جی اور وی سی آر (V C R) کی مدد لیتا ہے۔ اس کے باوجود کم سے کم سیٹ ٹی وی ڈرامے کی بنیادی ضرورت ہے اور اس کے لئے ڈراما لکھنے سے پیشتر ایک مفصل پلان بنانا ضروری ہوتا ہے جس میں ڈرامے کے مسودے کے ہر منظر کا خلاصہ، اداکاروں کی تفصیل اور یوں ہر سیٹ کا خاکہ بنانا ضروری ہوتا ہے۔

اب مسئلہ اداکاروں کا پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ریڈیو ڈراموں کے ضمن میں عرض کیا گیا کہ زیادہ کرداروں کی بھیڑ سے اکثر اوقات آوازوں کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے ٹی وی ڈراموں میں زیادہ کرداروں کے ہجوم میں اصل کردار کے گم ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے تا آنکہ لکھنے والا کرداروں میں لباس اور گفتگو کی انفرادیت کی وجہ سے ان کو ESTABLISH نہ کر دے۔ بچوں کے کردار بچے ہی ہوتے ہیں۔ لکھنے والوں کو یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ فلم کے برعکس ٹیلی ویژن میں اداکاروں کو مکمل سمت زبانی یاد کرنے پڑتے ہیں۔ خصوصی طور پر بچوں کو طویل مناظر اور مکالمے یاد رکھنے میں دقت ہوتی ہے یوں طویل مکالمے بڑوں کے لئے بھی لکھنا کوئی اچھی بات نہیں۔ مختصر مکالمات سے ایک تو ڈرامے کی تعمیر پر مثبت اثر پڑتا ہے دوسرے یہ اداکاروں کے ساتھ تعاون کی ایک خوشگوار صورت بھی ہے۔

حیدر سندھی

سندھی میں بچوں کا ادب

دوسری جنگ عظیم کے بعد جہاں زندگی کے دیگر شعبہ جات متاثر ہوئے وہاں دنیا کے ادب میں بھی عالمگیر تبدیلی رونما ہوئی اور اس حوالے سے سندھی ادب میں بھی یہ واضح تبدیلی نظر آتی ہے کہ اس ادب نے بچوں کے ادب کی ترقی کی طرف خصوصی توجہ دینی شروع کی۔

بچے ہر معاشرے کے روشن مستقبل کی علامت ہوتے ہیں اور ہر معاشرہ بچوں کی جسمانی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت کا بھی خیال رکھتا ہے۔ اسی خیال کو مدِ نظر رکھا گیا اور سندھی اخبارات اور رسائل نے بچوں کے ادب کی ترویج و ترقی کی طرف توجہ کی اور ہر اخبار (چاہے یومیہ ہو یا ہفتہ وار) نے ایک صفحہ بچوں کی تحریروں کے لئے مخصوص کیا اور اخلاقی و اصلاحی مواد شائع کیا۔ اسی طرح سندھی رسائل نے بھی اپنی ہر اشاعت میں ایک حصہ بچوں کی تحریروں سے سجانا اپنے لئے لازم سمجھا۔

اس عمل نے بچوں میں نہ صرف لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کیا اور دلچسپی پیدا کی بلکہ پورے سندھ کے بچوں میں ایک ادبی تحریک نے جنم لیا اور بچوں کی بے شمار ادبی انجمنیں قائم ہونا شروع ہوگئیں۔ یہ انجمنیں بچوں کے میلے، نمائش، علمی بحث و مباحثے اور معلوماتِ عامہ کے مقابلے منعقد کراتی تھیں۔ اس قسم کی کاروائیاں بچے خود چلاتے اور ہر کاروائی کا مکمل ریکارڈ رکھتے تھے۔ اس طرح بچوں میں ادبی دلچسپی کا اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی شعور بھی بڑھنے لگا۔ اس عمل نے جس ادبی تحریک کو جنم دیا یہ اسی کا اثر تھا کہ بچوں کے ادب کی تخلیق ہونی شروع ہوئی اور ہر ایک سطح پر ادب کی بڑی تعداد موجود نظر آنے لگی۔

دراصل سندھی زبان میں بچوں کے لئے جو مواد شائع ہوتا تھا اس کی ابتدا ۱۸۶۰ء کے بعد ہوئی۔ ہر زبان کے ادب کی طرح اس کی ابتدا بھی ترجمے سے ہوئی۔ سب سے پہلے ہندوستان کی مشہور کتاب "طوطی نامہ" کو سندھی نام "طوطے نامو" سے ترجمہ کیا گیا۔

سندھ کے ضلع حیدرآباد کی تحصیل ٹنڈو محمد خان کو سندھی ادبی تاریخ میں دو وجوہ سے اہم مقام دیا جاتا ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اس تحصیل نے فارسی بحروں پر مشتمل عروضی شاعری کو سندھی شاعری میں نہ صرف رائج کیا بلکہ اس طرز کی شاعری کو عام کرنے کے لئے اس تحصیل کے جتنے مشہور شعراء گزرے ہیں ان کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سید میراں محمد شاہ اول (۱۸۲۹ - ۱۸۹۲ء) نے بچوں کے نصاب کیلئے جہاں دیگر موضوعات اور عنوانات کو سپردِ قلم کیا وہاں ایک مشکل ہندی کہانی کو بھی بچوں کے لئے سلیس سندھی میں ترجمہ کیا جو بڑی دلچسپ کتاب کی صورت میں موجود ہے۔

اس کہانی کا موضوع ایک غافل، سست اور نکمے بچے کا، دوسرے ایک محنتی، ذہین اور اچھے بچے کے ساتھ تقابل تھا اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ اول الذکر بڑا ہو کر دنیا میں ذلیل و خوار ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس دوسرا بچہ، جوان ہو کر ہر جگہ لائقِ عزت رہتا ہے۔

دراصل اس کتاب "سدھا تو رد نانیکر ما تو رد" کی کہانی، سندھی بچوں کے مزاج کے مطابق تھی۔ اس لئے اس کا ترجمہ ادب میں تخلیقی عمل کی طرف پیش رفت ثابت ہوا اور آئندہ کے لئے جو بھی بچوں

کے لئے کتاب لکھی گئی اس کا مخصوص نکتہ مذکورہ کہانی پہ مرکوز ہوتا تھا۔

بچوں کے ادب میں کتابوں کی اشاعت اسوقت اور بھی تیز ہو گئی جب وقت شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے سندھی ادب کا دامن وسیع کرنے کے لئے قلم اٹھایا۔ اس شخص نے ۴۰۰ کے قریب کتابیں سپردِ قلم کیں جن میں تراجم کے ساتھ ساتھ تخلیقی مواد بھی ہے یہ مواد ہر موضوع پہ ہے مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشاء پردازی، مضمون نویسی، باغبانی، سیاست اور تاریخ وغیرہ۔ اگر اس مواد کی مزید تقسیم کی جائے تو معاشرے کے ہر طبقے کو اس مواد میں شامل کیا گیا ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا جوان

اس طرح اس شخص نے بچوں کے لئے جو مواد تخلیق کیا اس میں بنیادی نقطہ یہی سامنے رکھا گیا ہے جو کہ عموماً ہر معاشرہ کا ادیب اپنے روشن مستقبل کی اعلیٰ ذہنی تربیت کے لئے سامنے رکھتا ہے۔

مرزا قلیچ بیگ نے مذکورہ موضوعات کو پیشِ نظر رکھ کر بیسیوں کتابیں بچوں کے ادب کی نذر کی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب دوسری کتاب سے زیادہ دلچسپ، معلوماتی اور با مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کتاب چھ چھ بار ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتی رہی ہے۔

مرزا قلیچ بیگ کی کتابوں کی مقبولیت کو دیکھ کر دیگر ادیبوں نے بھی اس طرف توجہ دی اور کئی ادیبوں کے نام محض بچوں کے ادب تخلیق کرنے کی وجہ سے مشہور ہوئے۔

یہی حال بچوں کے لوک ادب کا ہے۔ ہر معاشرے میں جو داستانیں اور قصے موجود ہیں ان کا مرکزی نکتہ بچوں کی ذہنی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ ہر خطے کی بچیاں گڈے گڈی کا کھیل رچا کر عملی زندگی کو کامیاب بنانے کی تربیت حاصل کرتی ہیں۔ جس میں رشتہ داروں سے تعلقات کو بحال رکھنے کے علاوہ گھریلو ماحول کو صاف ستھرا بنانے کا لاشعوری درس ملتا رہتا ہے اور اسی نسبت سے بچیوں کے ننھے منے فقروں پر مشتمل لوک گیت پروان چڑھتے رہتے ہیں۔

دوسری جانب بچے آپس میں جو کھیل کھیلتے رہتے ہیں ان کا مرکزی خیال بھی ذہنوں کی پرورش کرنا اور اپنے آپ کو مستقبل کا بوجھ اٹھانے کے لائق بنانا ہوتا ہے۔ ان کے کھیل کی نسبت سے لوک گیت ہوتے ہیں۔ یہ گیت سوچ سمجھ کر قلم کاغذ اٹھا کر نہیں بنائے جاتے بلکہ غیر ارادی طور پر ایک ہی تال کے فقرے جڑنے کے بعد مکمل ہوتے ہیں اور ان میں کوئی پیغام یا مقصد نہیں ہوتا سوائے تفریحی اور مزاحیہ کلمات کے۔ لیکن ان گیتوں کے توسط سے بچے اپنی زبان سیکھتے ہیں اور اپنے لفظی ذخیرے میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ صوتیات پر بھی عبور حاصل کر لیتے ہیں۔

سندھی زبان کے پاس اس قسم کے لوک گیتوں اور داستانوں کی بہت بڑی دولت موجود ہے جس کو سندھی ادبی بورڈ نے بچوں کے ایک ماہنامے "گل پھل" کے اجراء سے جمع کرنا شروع کیا تھا۔

اسی رسالے نے بچوں کو اتنا ادبی شعور بخشا کہ دوبارہ سینکڑوں ادبی انجمنیں وجود میں آگئیں جو کہ اپنے طور پہ بچوں کے اخبار، رسائل اور کتب شائع کرنے لگیں لیکن سرپرستی نہ ملنے کے باعث تھوڑا عرصہ چلنے کے بعد ختم ہو گئیں۔ اس کے علاوہ بھی بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہمیں بیسیوں ایسی انفرادی کوششیں ہوتی نظر آتی ہیں جو صرف بچوں کی لوک کہانیوں، لوک شاعری اور بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو یکجا کرنے پہ مرکوز رہی ہوں لیکن وہ بھی سرپرستی نہ ہونے کے سبب ختم ہو گئیں۔

اس سلسلہ میں قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی سالوں میں کوئی خاص کام نظر نہیں آتا۔ لیکن اسی صدی کے دوسرے نصف کے شروع ہوتے ہی سندھی ادب نے پانسا پلٹا تو بچوں کی ادبی سرگرمیوں کو پہلے سے زیادہ تیز پایا جاتا ہے اور بے شمار ایسی انجمنیں نظر آنے لگتی ہیں جن کے شب و روز بچوں کی بھلائی اور ان کی ادبی سرگرمیوں کو بڑھانے میں گزرتے ہیں۔

یہ انجمنیں صرف بچوں کو مستقبل کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل بنانے کے لئے ہمت، حشمت، مردانگی، ہوشیاری، مستقل مزاجی، لکھنے پڑھنے میں دلچسپی، اپنے پرائے میں تمیز، دوست دشمن کی پہچان کے ساتھ ساتھ محفل میں نشست و برخاست کے آداب اور اخلاقی تعمیر کے پہلوؤں کو فیچر، مقالے، ڈرامے، مضامین اور چھوٹی چھوٹی تاریخی و نیم تاریخی کہانیوں کی شکل میں مہیا کرتی تھیں۔

اس ماحول کے پیشِ نظر حیدرآباد، کراچی، لاڑکانہ اور سکھر جیسے سندھ کے بڑے بڑے شہروں نے تو دلچسپی لی ہی تھی مگر ٹنڈو محمد خان، بدین،

نواب شاہ، سکرنڈ، نوشہرو، ڈیپلو، ہالا، دادو، میرپور خاص، شکارپور اور کندھ کوٹ جیسے پسماندہ اور پست حال قصبوں سے بھی بچوں کے اخبار اور رسائل جاری ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ڈاکٹر شمل جیسی ایک عالمی شہرت کی حامل خاتون بھی یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ:

"سندھی ادب میں بچوں کے شائع شدہ مواد کی تعداد حیرت انگیز حد تک زیادہ موجود ہے۔"

یہ مواد ہر موضوع پر ہے جس میں نظم، نثر، مضامین، انشاپردازی، ڈرامہ، لوک کہانیاں اور لوک گیتوں کے علاوہ سائنسی موضوعات بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں گزشتہ دس پندرہ سالوں سے ماہنامہ "سائنس مخزن" سندھ یونیورسٹی نے جاری کیا ہے۔ اس کی کامیابی اس بات کا بیّنہ ثبوت ہے۔

علاوہ ازیں جب ریڈیو حیدرآباد نے بچوں کے لئے پروگرام مخصوص کیا تو پاکستان کے باقی تمام ریڈیو سٹیشنوں کی نسبت یہ واحد ریڈیو سٹیشن تھا جس کے کئی بچوں کے پروگرام زیادہ دلچسپ اور بڑوں خواہ بچوں میں یکساں مقبولیت کے حامل تھے۔ کئی بچوں کے ڈراموں، نظموں اور لوک گیتوں کو بچوں اور بڑوں کے اصرار پر بار بار نشر کیا گیا اور سٹیج پر پیش کیا گیا یا مجموعوں کی صورت میں شائع کیا گیا۔

لیکن ان پروگراموں کی مقبولیت ہی ایسے پروگراموں کے آڑے آئی اور بند کر دیئے گئے جن کو بار بار اور پُرزور مطالبوں کے باوجود دوبارہ شروع نہیں کیا گیا۔

یہی حال کراچی ٹی وی سٹیشن کا ہے جہاں سے نہایت ہی مختصر وقت کے سندھی میں بچوں کے پروگرام باقی سٹیشنوں کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت کے حامل تھے اور اسی مقبولیت سے ان کا حشر بھی وہی ریڈیو پروگراموں جیسا ہوا۔ لیکن سندھ کے بچے پُرامید ہیں کہ ایک نہ ایک دن ان کی خواہشات بھی پوری ہوں گی اور ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں ان کے لئے زیادہ وقت مخصوص کیا جائے گا۔

سندھی زبان پاکستان کی دیگر صوبائی زبانوں کی نسبت زیادہ معیاری، ترقی یافتہ اور ادب سے مالامال ہے۔ اسی بنیاد پر سندھی بچے ہر سال اخبارات، رسائل اور خطوط کے ذریعے مدارتی انعام میں سندھ کے بچوں کو شامل کرنے کا بھی مطالبہ کرتے رہتے ہیں مگر اب تک ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی ہے!

شہباز ملک

پنجابی لوک ادب اور بچے

پنجابی میں بچوں کے ادب کی نوعیت تین قسم کی ہے، پہلی قسم میں وہ ادب آتا ہے۔ جو بچوں کے بارے میں بھی بڑوں نے تخلیق کیا ہے۔ اس میں بچوں نے حصہ نہیں لیا۔ یہ بچوں کی معاشرے میں اہمیت وغیرہ کے بارے میں ہے۔ لیکن اس میں وہ ادب بھی شامل ہے۔ جو بچوں کے بارے میں بڑوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے یا وہ ادب جو بچوں کے لئے لکھا جاتا ہے اس میں ایک لحاظ سے بچے حصہ لیتے ہیں۔ اس ادب میں لوریاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تیسری قسم میں وہ ادب آتا ہے۔ جن کی تخلیق میں خود بچے حصہ لیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کو ادب کا درجہ دینے میں بڑے بھی خاص معاونت کرتے ہیں۔

پہلی قسم جو ادب بچوں کے بارے میں مذکور ہوا ہے اس میں پنجابی کے اکھان (کہاوت) اور مختلف لوک گیت آتے ہیں۔ یہ ادب ادبی لحاظ سے پختگی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ مثلاً کہاوتوں میں لوک دانش کا اظہار بڑے پُر اثر طریقے سے ہوتا ہے۔ چند کہاوتیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ بچے کے سر پر گھاس نہیں اُگتی۔ باقی سب کچھ ہو سکتا ہے

۲۔ اس ماں کا بچہ کھیل سکتا ہے جو پیسہ خرچے

۳۔ بچے کی ماں نہ مرے اور بوڑھے کی جورو

۴۔ لڑکے پیدا ہوتے ہی جوان ہوتے ہیں

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ادب بچوں کے بارے میں ہے، یہ وہ باتیں ہیں جو سینہ بہ سینہ بچوں کے بارے میں سچائیوں کے سیاق و سباق میں کہی گئی ہیں۔ اسی طرح ایک قسم لوک گیتوں کی ہے۔ جن میں بچوں کے بارے میں معاشرے کے دوسرے افراد کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

بچوں کی پیدائش پر خاص طور پر لڑکے کے جنم پر ہمارے ہاں بہت خوشی منائی جاتی ہے۔ اسی لئے ہمارے ہاں کی سب سے بڑی دعا "دودھیں نہائیں تے پُتیں پھلیں" ہے اس طرح بہن بھائی کا پیار بھی یہاں مثالی شے ہے، ایک بہن اپنے بھائی کے گھر لڑکا پیدا ہونے کی خبر سنتی ہے تو اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہے

باپ کے گھر کے صحن میں مہتاب اُبھرا اور بھائی کے گھر لڑکا پیدا ہوا

ایک بہن اپنے چھوٹے بھائی سے اس قدر محبت کرتی ہے کہ تمام عمر اس کو کھلاتے پہنے میں گذار دینا چاہتی ہے۔

چھوٹے بھائی کی نوکرانی بن کر اپنی ساری عمر گزار دوں

لوک ادب کے اس حصے کی یہ تھوڑی سی جھلک ہے جس کا موضوع بچے ہیں اب آئیے بچوں کے ادب کی طرف اس ادب کا ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق بچے کی اس عمر کے ساتھ ہے جب وہ خود بولنا نہیں سیکھتا اس ادب کی تخلیق میں بھی بڑے ہی حصہ لیتے ہیں لیکن اس کی سطح بچوں کی سوچ کی سطح سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہے، اس میں "لوریاں" اور "جھولنے" کے گیت قابلِ ذکر ہیں۔

"لوری" ایک ایسا دعائیہ گیت ہوتا ہے۔ جو دودھ پیتے بچے کو عموماً روتے کو چپ کرانے، بہلانے یا سُلانے کے لئے گایا جاتا ہے اس کے لئے "مدھم" بول عام فہم ہوتے ہیں۔ اس میں بچے کی بڑی عمر اچھی صحت اس کے سگے رشتہ داروں کی خیر کی دعا ہوتی ہے بعض لوریوں میں معاشرتی، حقیقتوں کا بیان بھی آجاتا ہے، لوریاں عام طور پر نانیاں، دادیاں مائیں، بڑی بہنیں وغیرہ گاتی ہیں بچے کو جھولے میں ڈال کر، گود میں لے کر یا چارپائی پر لٹا کر ہلکی ہلکی تھپکی سے لے، کا کام لیا جاتا ہے۔

تو ہی اللہ تو ہی والی ہے

تو نے ہی (بیٹا) دیا ہے تو ہی پالے گا
کتے دُور ہو جا۔ جا جنگل میں سو
جنگل میں کانے۔ بچے کے ماموں جیئیں
ماموں نے تہبند باندھ رکھی ہے۔ بچے کے چچا جیئیں
چچوں نے دعا دی ہے بچے کے بھائی جیئیں

جب بچہ تھوڑا سا بڑا ہوتا ہے، منہ سے آوازیں نکالنے لگتا ہے، گھٹنوں پر چل کر، ماں، دادی، نانی یا بہن کے پاس جاتا ہے کہ وہ اسے کھلائیں تو اس موقع پر "ہونٹے ماہیاں" کا اہتمام کیا جاتا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ چارپائی پر چت لیٹ کر ٹانگیں پیٹ کے ساتھ لگائی جاتی ہیں ان پر بچے کو بیٹھا کر اُوپر نیچے کیا جاتا ہے یہ ایک قسم کا جھولا بن جاتا ہے ساتھ ساتھ جو گیت گایا جاتا ہے اس کے بول یوں ہیں

جھولا جھلاؤں
پینگھ پر خربوزے جھولیں ڈھائی سیر ہو کر
آدھے کا میں نے نمک منگوایا اور آدھے کا میں نے تیل
بوڑھی اماں اپنے برتن وغیرہ سنبھال لینا
بارش کا ریلا آگیا ہے

"بارش کا ریلا آگیا ہے" کہتے ہوئے جھلاتے جھلاتے ٹانگیں بالکل اوپر کو سیدھی کر دی جاتی ہیں

بچے کو بہلانے اور خوش کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے اس کو "کتکتاریاں" (گدگدیاں) کہتے ہیں یہ "ہونٹے ماہیاں" لینے والے بچے کی عمر سے ذرا بڑی عمر کے بچے کے لئے ہوتی ہیں۔ اس عمر میں بچہ خود بھی "تُت تُت" کہنے لگتا ہے بچے کو سامنے بٹھا کر اس کا ایک بازو پکڑ لیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل بولی کہتے ہوئے پہلے ہاتھ پھر درمیان اور پھر بغل میں گدگدی کرتے ہیں سے

یہاں پر چوری بنائی
گھی ڈالا
چینی ملائی
بچے نے کہا
بچے نے چوری کھالی

ابتدائی عمر میں بچے جھولے کے بہت شوقین ہوتے ہیں، "لوری" کے وقت یا "ہونٹے ماہیاں" کے وقت، وہ یہ مزہ چکھ چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے جب ذرا کھیلنے کودنے کے لائق ہوتے ہیں تو جھولے کی طرف رجوع کرتے ہیں یہ جھولے لکڑی کی پٹڑیوں کے ایک گول چکر کی صورت میں اُوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں چلتا ہے جھولے والا جب جھولا لاتا ہے تو بچے کھنچے چلے جاتے ہیں۔ جھولے پر بیٹھ کر اسے زیادہ سے زیادہ تیز جھولا چلانے کے لئے کہتے ہیں۔

بھائی۔ بھائی
تیری تیل کی کڑاہی
تیرے نمک کا تماشہ
تیری بیوی کرے تماشہ
ہم مسکراتے ہیں۔ بھائی زور سے

اسی عمر میں بچے کا رجحان کھیل کود کی طرف بہت زیادہ ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ جھولے سے ملتا جلتا ایک کھیل "بھاں بھاں بلیاں" ہے جب اُسے جھولا میسر نہیں ہوتا تو یہ کھیل کھیلتا ہے یہ کھیل بچے مل کر کھیلتے ہیں طریقہ یہ ہے کہ بچہ اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر پھیلا لیتا ہے اور اپنے پاؤں پر ہی لٹو کی طرح گھومنا شروع کر دیتا ہے ساتھ ساتھ یہ گیت گاتا ہے،

بھاں بھاں بلیاں — مرغوں کی قطاریں
مرغ گیا جنگل
وہاں پائی زنجیر
زنجیر کی کڑیاں — بھوں بھوں لڑیں

یہ کھیل بچے مل کر بھی کھیلتے ہیں جب چکر چڑھ جاتے ہیں تو گرتے ہیں، ہنستے ہیں چکر اُترتے ہیں تو ایک بچہ کہتا ہے اب "نچھ" (کھیلیں)، سارے ایک دائرے میں کھڑے ہو جاتے ہیں ایک بچہ بول بولتا ہے۔

میری بھابھی نے مرچیں پیسیں
مجھ کو آئی چھینک۔ نچھ۔ نچھ

"نچھ" کے ساتھ سارے بچے، سچ مچ چھینک کی طرح کرتے ہیں یہ سلسلہ ان کے تھک جانے تک جاری رہتا ہے۔ دائرے میں کھیلے جانے والے کھیلوں میں ایک اور کھیل بھی ہے۔ دائرے میں، بچے کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں پھر دائیں یا بائیں چلنا شروع کر دیتے ہیں ساتھ ساتھ بول بولتے ہیں۔ آہستہ آہستہ رفتار تیز کرتے جاتے ہیں اور گیت کے آخری بول تک رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ گیت ملاحظہ کریں۔

ہمارے صحن میں پیپل تھا بھئی پیپل تھا
ایک پتہ توڑیں گے جو تمام پتے ہلیں گے
سارے ماموں آئیں گے۔ بڑھ چڑھ کے آئیں گے
ایک ماموں ترس گیا۔ اُس کو دی پیڑھی
نیچے سے کاٹ گئی چیونٹی
بھابھی بھبھری کا۔ دیکھ تماشا چیونٹی کا دیکھ تماشہ چیونٹی کا

گرم گرم پکے ہیں چاول
اوپر ڈالی چینی
بھائی میرے کی چھٹی آئی
سکوں ملا۔ کلیجہ کو۔ سکوں ملا۔ کلیجہ کا

پنگھوڑے سے جھولے تک آنے میں بچے کی عمر سوچ اور جسمانی حالت میں خاص فرق پڑ جاتا ہے اب بچہ خود کھیلنے کودنے اور کھیل کود میں نت نئی اختراعیں کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بلوغت تک پہنچنے تک اس کا یہ زمانہ کھیل کود اور لول لاری میں گزرتا ہے اس کے ابتدائی حصے کے کھیل کود اور پھر لاریاں لڑکیوں اور لڑکوں میں مشترک ہوتی ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ علیحدہ علیحدہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مشترکہ کھیلوں میں ذکر کیے۔ کھیل کھیلوں اور بولوں کے علاوہ آنکھ مچولی، کوٹلہ چھپاکی، اکڑ باندھا، وغیرہ شامل ہیں جبکہ علیحدہ کھیلوں بولوں میں کِکلی، ٹہناں تھال، گڈی گڈا۔ رستہ۔ گدا، بھنڈا، بھنڈاریا، وغیرہ لڑکیوں کے اور گیڈیاں، گلی ڈنڈا، پتنگ بازی کھدو کھنڈی۔ پکیاں کہ پکیاں۔ پھرن پھران اِن گئی۔ جوہ سپاہی وغیرہ لڑکوں کے کھیل ہیں۔ ان کے علاوہ لڑکیاں لڑکے بے ہنگم اچھل کود بھی کرتے ہیں اس میں "چھون چھپان" "برف دا بندہ" وغیرہ شامل ہیں ہمارے موضوع کے ساتھ ان کھیلوں کا تعلق ہے جن کے ساتھ بول بھی ہوتے ہیں کہ یہ بول ہی لوک ادب کا حصہ ہیں، بکھ کھیلوں میں "پگنا" پڑتا ہے۔ "پگنے" کے لئے جو بول موجود ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں۔

بڑے بڑے ساتھیوں
آپ کا ماں باپ جیئے
کوئی لے چن۔ کوئی لے تارا۔ تارا

"پگنے" کے بعد مختلف کھیل کھیلے جاتے ہیں۔

آنکھ مچولی جس کو پنجابی میں لکن میٹی کہا جاتا ہے اس میں صرف ایک بول استعمال ہوتا ہے۔

ٹک چھپ جانا۔ مکئی کا دانہ
راجے کی بیٹی آ گئی ہے۔ آجا

کِکلی، تھال، گدا، کوٹلہ چھپاکی، ٹہناں وغیرہ میں "پگنے" وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی یہ کھیل یونہی مل جل کر شروع کر دیئے جاتے ہیں ان کے ساتھ باقاعدہ بول موجود ہیں یہ کھیل صرف لڑکیاں کھیلتی ہیں۔ کِکلی کے بول ہیں۔

کِکلی کلیر دی
پگڑی میرے بھائی کی
دوپٹہ میری بھابھی کا
پھٹے منہ جوائی کا

"گدا" کے بچپن کے بول اور نوعیت الگ ہے۔ "بچپن کے گدا" کے بول جس میں زیادہ لڑکیاں شامل ہوتی ہیں۔

گدا کی ایک صورت دو لڑکیوں کا گدا بھی ہے جو صرف بچپن سے مخصوص ہے اس میں دو، دو لڑکیاں، دائرے یا قطاریں کھڑی ہو کر ایک دوسرے کے ہاتھ سے تالی بجاتی ہیں بول ملاحظہ ہو۔

توطیا دے توطیا
طوطا سکندر کا
پانی پیتے مندر کا
کام کرے دوپہروں کا
کاجل وٹالے قبروں کا
سفید چادر چاہیے گی
چھلیاں والے کاکے گی

کوٹلا چھپائی میں تمام لڑکیاں دائرے میں منہ اندر کی طرف کر کے بیٹھ جاتی ہیں ایک دوپٹہ کا کوٹلا بنا کر ان کے ارد گرد چکر لگاتی ہے اور گاتی ہے۔

کوٹلا چھپائی جمعرات آئی ہے
جو آگے پیچھے دیکھے اس کی شامت آئی ہے

کھیلنے کے لئے بلانے کے "سدا" کے بول بھی پنجابی بچوں میں رائج ہیں۔ صبح ہوتی ہے تو ایک طرف سے آواز آتی ہے۔

انگلا پلنگلا
بھائی تمہارا رنگلا
چڑیوں نے چوں چوں لگائی
اُٹھ فالتو اُٹھ
تیرے بھائی کا بیاہ ہے

"چڑیوں نے چوں چوں لگائی" کا مطلب ہے صبح ہو گئی ہے اُٹھو اور ہمارے ساتھ کھیلنے کیلئے آؤ، اگر کوئی بچہ بلانے پر نہیں آتا تو اسے بول مار کر تنگ کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

چاند کی چاننی۔ تارا گول مول
سارے بچے کھیلتے ہیں۔ شازی ماں کے پاس

کچھ کھیل ایسے ہوتے ہیں جو صرف بولوں تک محدود ہوتے ہیں۔ جیسے موسم کے لحاظ سے بارش مانگنا یا زیادہ بارش کے وقت دھوپ مانگنا، جیسے بارش مانگنے کے لئے کپڑے کا "گڈی گڈا" جلایا جاتا ہے۔ اور پھر گیت گاتے جاتے ہیں جو اس طرح کے ہوتے ہیں

برس میاں کالیا۔ میں نے گڈی گڈا جلا دیا ہے

برس میاں چھٹیا ۔ میں نے گڈی گڈا پھاڑ دیا ہے
سایاں اماں سالے روڑ ۔ بارش برسا زور سے
ایڑیاں گھسائیں گے ۔ بارش ہو گی نہائیں گے

بچے گنتی اور پہاڑوں کو یاد کرتے ہوئے بھی تفریح کا عنصر شامل کر لیتا ہے جیسے

یک دو تین ۔ باہے بوڑھے کی مشین ۔ بابا کم تولے ہے

تختی سکھاتے ہوئے گاتا ہے ۔

تختی خشک ہو جا
کالا چور آیا ہے
ڈنڈا لے کر آیا ہے
ڈنڈا گیا ٹوٹ
تختی خشک ہو گئی

یہ وہ تمام گیت اور بول ہیں ۔ جو پنجاب کے بچے بچے کی زبان پر آج بھی رقصاں ہیں شہر کی بات تو چھوڑیئے گاؤں جس میں تفریح کے سامان شہر کی نسبت بہت کم ہوتے ہیں ۔ ان گیتوں کے ذریعے بچے تفریح بھی حاصل کرتے ہیں اور معصوم سے بولوں کے ذریعے بہت کم ہوتے ہیں ۔ ان گیتوں کے ذریعے بچے تفریح بھی حاصل کرتے ہیں اور معصوم سے بولوں کے ذریعے بہت سی باتوں کا ان کے ننھے ننھے دماغوں میں اضافہ بھی ہوتا ہے ۔ ان گیتوں ، بولوں اور کھیلوں کے ذریعے یہ بچے اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کے ساتھ بھی جڑے رہتے ہیں ۔ اب چونکہ اپنے کلچر سے وابستگی دن بدن ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے ۔ اس لئے اب لوگ ان اپنی باتوں کو بھولتے جا رہے ہیں ۔ اور نئی تہذیب کی نقالی کر رہے ہیں ۔ وہ یہ بات بھول جانے کے موڈ میں دکھائی دیتے ہیں کہ اپنی لوک دانش میں اب زمانے کا ساتھ دینے کا دم خم نہیں ہے جو کہ ان کی شاید بھول ہے ۔ ذکر کئے گئے گیتوں ، بولوں اور کھیلوں کا اگر نفسیات کی رو سے جائزہ لیا جائے تو ان میں ہر ایک گیت اور کھیل جدید نفسیات کے اصولوں کے مطابق اس AGE GROUP کے لئے درست ثابت کیا جا سکتا ہے بہرحال ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اس لوک ورثہ کی اہمیت افادیت اور ضرورت کو سمجھیں ۔

ریاض صدیقی

پاکستان میں بچوں کا ادب اور مسائل

بیسویں صدی میں ہندوستان کی تقسیم کا عمل ایک ایسے مرحلے پر پایۂ تکمیل کو پہنچا جب ہند اسلامی تمدن اپنی عمر کے ایک ہزار سال مکمل کر کے تاریخ کی اٹل حقیقت بن چکا تھا۔ تشکیلِ پاکستان تو محض اس ہند اسلامی تمدن کی ایک کروٹ تھی۔ اس تہذیب کا پورا مزاج اور روایات کا تسلسل نظریۂ پاکستان کے جسم میں اعصابی جال کی طرح در آیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد رونما ہونے والے تمام نئے تقاضے اور مسائل اسی تناظر میں ابھرے۔ اسی پس منظر میں بچوں کی تعلیم و تربیت اور مستقبل کے لئے ان کی شخصیت کی تعمیر کا سوال بھی پیدا ہوا۔ مستقبل تو بہرصورت ایک ایسی نسل کا منتظر تھا۔ جس کی تربیت آزاد فضا میں یوں کی گئی ہو کہ ایک طرف دینی شعور۔ تہذیبی روایات اور قومی تشخص کا بھرپور اظہار ہو تو دوسری طرف صنعتی سائنسی تعمیر و تشکیل اور جدید جمہوری اقدار کے استحکام کے لئے ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں اپنا کردار ادا کریں۔ قدیم و جدید کے مابین بامعنی اور خوشگوار توازن۔ جدید اقدار کے منتخب اجزا سے مفاہمت اور تعلیم یافتہ طبقہ کو انگریزی زبان کے رعب و جلال سے رہائی دلانے کے لئے جس جد و جہد کی ضرورت آج محسوس ہو رہی ہے اس کا صحیح وقت قیامِ پاکستان کے بعد والا ہی عرصہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے ساتھ ساتھ ہی بعض نظریاتی اور سیاسی و سماجی حقیقتیں منظرِ عام پر آئیں۔ لیکن معاشرتی، علمی و فکری اور تمدنی سطح پر نئے معاشرے نے اس مجموعی ورثے ہی کو حاصل کیا جو صدیوں کے سفر کا نتیجہ تھا۔ بچوں کے ادب، ادیب اشاعتی اداروں اور ادبی رسائل کا ایک معتبر حلقہ جو متحدہ ہندوستان میں نصف صدی تک اس قلمرو کی آبیاری کر چکا تھا نئے ملک کے حصے میں آیا۔ گو ہمیں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک فعّال روایت ورثے میں ہاتھ آئی تھی۔ اولین دہائی میں اس روایت سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ اس دور کی کارکردگی پر نظر ڈالئے تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری سیاسی و فکری قیادت اور سرکاری تنظیم جو باہر سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھی اور اپنی اہلیت اور ذہانت میں یکتا تصور کی جاتی تھی۔ قومی۔ دینی اور تہذیبی تشخص کے زبانی دعوے ضرور کرتی رہی لیکن نو واردان کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی پائیدار قومی نظام نہ دے سکی۔ سرکاری سطح پر برٹش سول سروس اور فکری اور علمی سطح پر لارڈ میکالے کا تعلیمی طریقہ کار ہی سکہ رائج الوقت قرار دیئے گئے۔

یہی وہ قوتیں تھیں۔ جنہوں نے ابتدائی تشکیلی دور میں جمہوری اقدار، جدیدیت اور بین الاقوامی روابط کے نام پر ہمارے معاشرے میں مغربی تہذیب اور انگریزی زبان کو رائج کر دیا۔ اس دور نے ہمیں امرا سرکاری افسروں، جاگیردار سیاست دانوں اور نو دولتیوں کا وہ مضبوط طبقہ مہیا کیا ہے جو مغربی تمدن اور انگریزی زبان کو تحفظ دینے میں ڈھال کا کردار ادا کر رہا ہے۔

پاکستان میں بچوں کے ادب کی صورتِ حال اور اس روایت کے ارتقا پر کوئی گفتگو اس وقت تک کیونکر نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جب تک کہ روایت کو تاریخی ماضی کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔

برِصغیر کی تہذیبی اور معاشرتی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا نہ تو کوئی نظریاتی فلسفہ ہی وجود رکھتا تھا اور نہ کوئی جداگانہ یا منظم طریقۂ کار رائج تھا۔ برِصغیر کی سرزمین پر تشکیل پانے والی ہند اسلامی تہذیب پر یہ رجحان ایک بدنما داغ یوں ثابت ہوا کہ ظہورِ اسلام کے بعد خلافتِ راشدہ اور پھر اس کے بعد سائنسی اور فکری تحریکات کے ادوار میں بڑوں اور بچوں کی تعلیم و تربیت قومی زندگی کا نہایت اہم اور ضروری جز تھا۔ برِصغیر کے

مسلمان معاشرے میں بچوں کی تعلیم کا آغاز گھر کی چار دیواری سے ہوتا تھا اور پھر مساجد میں قائم مدرسوں پر ختم ہو جاتا تھا۔ یہ تعلیم محض دینی عقائد تک محدود ہوتی تھی۔ اس قسم کی محدود تعلیم کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے امیر خسروؒ نے "خالق باری" لکھی۔ بعد میں "خالق باری" کا ایک سلسلہ چل نکلا جو آخر تک جاری رہا۔ انیسویں صدی کے درمیانی عرصے تک تعلیم و تربیت کی یہی روایت نظر آتی ہے ان صدیوں میں تعلیم کا تصور امراء اعلیٰ طبقوں اور ان طبقوں کی پیروی کرنے والے متوسط طبقے تک محدود تھا۔ عوام کی غالب اکثریت پسماندہ اور جاہل ہونے کی بنا پر تعلیم سے یکسر ناآشنا تھی۔ حکمران طبقہ اور اس کے ہمنوا متوسط طبقے کے شرفا اپنے گرد و پیش کی اکثریت کو رذیل اور کمینہ کہا کرتے تھے۔ ہمارے یہاں ابھی تک یہی معاشرتی روایت زندہ ہے قدیم دور کے محدود تصورِ تعلیم کا تانا بانا خوف اور جبر سے تعمیر تھا۔ والدین اور اساتذہ معصوم بچوں پر سختی بھی کرتے تھے اور ان کے ذہنوں میں خوف اور وہم کا وہ زہر تحلیل کر دیتے تھے۔ جو بعد میں ان کی شخصیت کا لازمی جز بن جاتا تھا اور معاشرتی ارتقا کے سارے راستے بند ہو کر رہ جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سائنسی ایجادات اور نئی مصنوعات کو قبول کرنے سے قبل مسلمانوں میں خوف اور شک کا جو رجحان پیدا ہوا تھا۔ اس کا سبب متذکرہ تربیت ہی تھی۔ تعلیم و تربیت کا نہایت محدود سا تصور جس کا آغاز چودھویں صدی عیسوی سے ہوا تھا۔ غالبؔ کے "قادر نامہ" پر تمام ہوا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہزار سالہ تہذیبی۔ فکری، علمی اور معاشرتی اقدار کا پورا محل ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ انگریزوں کے زیر اثر فروغ پانے والی نئی روشنی سے استفادہ کرنے والوں نے پہلی بار بچوں کی تعلیم و تربیت اور مستقبل میں ان کے کردار کی اہمیت کو محسوس کر لیا۔ اس مرحلے پر جو نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا محمد حسین آزادؔ اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ ہیں۔ خوش قسمتی سے ان لوگوں نے دہلی کالج جیسے ادارے میں تعلیم حاصل کی تھی جو برِ صغیر کے روایتی اداروں سے یکسر مختلف تھا۔ حالیؔ اگرچہ اس کالج سے وابستہ ہونے کی خواہش رکھتے تھے۔ مگر کامیاب نہ ہوئے لیکن نئے اثرات کے پھیلاؤ سے انہوں نے بھی استفادہ کیا۔ جدید مغرب میں بھی بچوں کے ادب کی انفرادی حیثیت کا احساس انیسویں صدی میں عام ہوا چنانچہ مغرب میں جن دنوں "عجیب دنیا کی مہمات" ADVENTURES IN WONDERLAND کا شہرہ تھا۔ اسی دور میں ڈپٹی نذیر احمد اپنی بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے "مرآۃ العروس" لکھ چکے تھے۔ بچوں کے لئے سادہ زبان میں یہ پہلا اصلاحی ناول ہے جس کے کردار ان تمام معاشرتی برائیوں اور جہالت پر مبنی مروجہ رسومات کی نشاندہی کرتے ہیں جو صدیوں سے مسلمان معاشرے خصوصاً پردہ نشین خواتین میں عام تھے۔ دوسری اہم کتاب "چند پند" ہے۔ جو انہوں نے اپنے بیٹے بشیر کے لئے لکھی تھی۔ انہوں نے بچیوں کی تربیت کیلئے ۱۸۶۹ء میں "منتخب الحکایات" لکھی۔ بیسویں صدی میں شاید ہی کوئی مسلمان گھرانا ہو جہاں بچوں کو ڈپٹی نذیر احمد کی کتابیں مہیا نہ کی جاتی ہوں۔ اور آج بھی ان کتابوں کو قبولِ عام کا مرتبہ حاصل ہے۔ آزاد اور حالی کو بھی اس میدان میں نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ حالی کی نیچرل شاعری خصوصاً موضوعاتی نظمیں بچوں کے لئے ایک پیغام ہیں۔ آزاد نے پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات میجر فلر کے مشورے پر بچوں کے لئے درسی کتب مرتب کیں۔ اس کام کے دوران انہیں پہلی بار اس حقیقت کا احساس ہوا کہ بچوں کے لئے ایک متعین زبان لکھنا ایک سخت مسئلہ ہے اور یہ کہ بچوں کے لئے لکھنے والے کو خود بھی بچہ بننا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر جیسے سنجیدہ اور جدید علوم و افکار سے آگاہ نقاد نے آزادؔ کے اس خیال کو بے معنی قرار دیا ہے۔ غالباً یہ سلیم اختر کا ذاتی خیال ہے۔ نئے علوم اور نفسیات کے تازہ نظریات آزادؔ کے اصول کی نفی نہیں کرتے ہیں۔ آزادؔ کے ذہن میں یہ احساس بھی موجود تھا کہ بچوں کے لئے ہلکی شیریں زبان ہی نہیں بلکہ ایسے موضوعات بھی درکار ہیں۔ جو اطراف کے ماحول کی ترجمانی کرتے ہوں اور بچے اپنے وطن کے جانوروں پودوں۔ درختوں اور دوسری اشیا سے اچھی طرح واقف ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزادؔ نے بچوں کے ادب میں خاکوں اور تصاویر پر توجہ دی۔ اس معاملے میں انہوں نے لاہور آرٹس کالج کے پرنسپل اور معروف انگریزی ادیب روڈیارڈ کپلنگ کے فرزند جان لاک ووڈ سے بھی استفادہ کیا گویا صحیح معنوں میں ہمارے یہاں بچوں کے ادب کی روایت کو منظم کرنے کا ابتدائی معرکہ آزادؔ ہی نے سر کیا۔ بچوں کے لئے انہوں نے نصیحت کا کرن پھول۔ آئینہ عبرت اور قصص ہند

نگمیں آزاد کے ساتھ بچوں کے ادب پر کام کرنے والوں میں ماسٹر پیارے لال کا نام بھی آتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے قیام پاکستان تک کی مدت میں بچوں کے ادب پر جس قدر بھی کام ہوا وہ ڈپٹی نذیر احمد، سرسید، حالی اور آزاد ہی کی روایت کو منعکس کرتا ہے۔ بچوں کے لئے شعری ادب تخلیق کرنے والوں میں اسمٰعیل میرٹھی، حفیظ جالندھری، بے نظیر شاہ، سدرشن تارا اتی مہر، تلوک چند محروم، احسن مارہروی، تاجور نجیب آبادی، حامد اللہ افسر، صوفی تبسم، محشر بدایونی، راجہ مہدی علی اور اختر شیرانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بچوں کے لئے نثری نگارشات مہیا کرنے والوں میں مولوی ممتاز علی، محمدی بیگم، سید امتیاز علی تاج، رگھوناتھ سہائے، نذر سجاد حیدر، حفیظ، عبدالمجید سالک، عبدالمجید بھٹی، غلام عباس، مولانا چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر ذاکر حسین، فیاض حسین جامی، شفیع الدین نیر، الیاس حبیبی، مولانا عبدالواحد سندھی، خواجہ حسن نظامی اور مولانا عبدالحق کے نام تاریخ کا حوالہ ہیں۔

اشاعتی اداروں میں سب سے اہم کردار مولوی ممتاز علی کے دارالاشاعت پنجاب لاہور نے ادا کیا۔ اس ادارے نے اردو میں بچوں کے لئے نہایت معیاری اور بامعنی ادب کی اشاعت کو ممکن بنانے کے علاوہ اس دور کے بچوں کو معمولی سی قیمت پر عمدہ کتابیں فراہم کرنے کے لئے پیسہ لائبریری اسکیم کا آغاز کیا۔ جو بہت کامیاب اسکیم ثابت ہوئی۔ دوسرے نمائندہ اداروں میں فیروز سنز لاہور، شیخ غلام علی لاہور، مکتبہ جامعہ دہلی، تاج کمپنی لاہور، عصمت بکڈپو دہلی، خواجہ حسن نظامی کے اشاعتی منصوبے، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی اور اشاعت اردو دکن نے اچھے ادب کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا۔ اس پورے دور کا تحریری سرمایہ مطالعہ معیار کے اعتبار سے اتنا زیادہ عامیانہ اور بازاری نظر نہیں آتا ہے۔ جس قدر کہ اب دکھائی دیتا ہے اس دور کے اشاعتی اداروں نے بہر حال مالی مفادات اور تجارتی مقاصد کی تکمیل کو معیار و مواد پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

بیسویں صدی کے اس عرصے میں بچوں کے رسائل کی روایت کو بھی استحکام نصیب ہوا۔ مولوی ممتاز علی نے دارالاشاعت کے زیر اہتمام ۱۹۰۹ء میں "پھول" جاری کیا۔ پیسہ اخبار کے مولوی محبوب عالم نے بچوں کا ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ ان رسالوں کے علاوہ تاجور نجیب آبادی کا رسالہ پریم، رگھوناتھ سہائے کا گلدستہ، عبدالمجید بھٹی کا ہونہار، حکیم احمد شجاع کا نونہال، غنچہ لاہور، مکتبہ جامعہ دہلی کا پیام تعلیم، کھلونا دہلی، انتخاب لاجواب، تعلیم و تربیت اور ہدایت وغیرہ اس دور کے نمائندہ رسائل شمار ہوتے تھے۔

پاکستان اس اعتبار سے بڑا ہی خوش قسمت ملک تھا کہ یہاں بچوں کے موضوعات پر لکھنے والوں کا ایک معتبر ہجوم موجود تھا۔ حفیظ جالندھری، عبدالمجید بھٹی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا صلاح الدین احمد، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، حکیم محمد سعید، راجہ مہدی علی خاں، محشر بدایونی، شاعر لکھنوی، عبدالواحد سندھی، کمال احمد رضوی، غلام عباس، اے حمید، میرزا ادیب، ابن حسن نگار، سلطان احمد دجودی، غیاث اقبال، مائل خیرآبادی، مقبول جہانگیر، سید نظر زیدی، عشرت رحمانی، محمود الرحمٰن جو کبھی پرویز کاکوری کے نام سے لکھتے تھے، اے آر خاتون، ابن انشاء، ڈاکٹر معین الحق، حمید احمد خاں، سراج الدین نیم امروہوی، پروفیسر عبدالسلام خورشید، ندیم صہبائی، جبار توقیر، مسلم ضیائی اور یکتا امروہوی جیسے نام اس دور کے چراغ ہیں۔ سائنس کے شعبے میں علاؤالدین خالد، پروفیسر آفتاب حسن، علی ناصر زیدی، صلاح الدین احمد، اور قاسم محمود کے نام نمایاں ہیں۔ صاحبانِ فکر و نظر کا یہ قافلہ سرکاری اور قومی سطح پر ہر قسم کے تعاون سے محروم اپنی اپنی انفرادی کوششوں کو بروئے کار لایا۔ اسی دور میں انفرادی توجہ سے بچوں کے لئے رسائل جاری ہوئے۔ دارالاشاعت لاہور کے زیر نگرانی ۱۹۰۹ء سے شائع ہونے والے پھول نے تقسیم کے بعد نیا سفر شروع کیا لیکن عمر کے اڑتالیس سال پورے کر کے ۱۹۵۷ء میں بند ہو گیا۔ فیروز سنز نے مقبول انور داؤدی کے تعاون سے تعلیم و تربیت جاری کیا جو اب اپنی عمر کے تیس سال پورے کر رہا ہے اور باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ شیخ غلام علی کا خوبصورت معیاری رسالہ جگنو بھی پابندی سے نکل رہا ہے۔ ادارہ جنگ نے ایک رسالہ "بھائی جان" جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ اپنے معیار اور حسن و آرائش کے اعتبار سے مقبول ضرور ہوا مگر سفر جاری نہ رکھ سکا۔ حکیم محمد سعید کا ہمدرد نونہال اٹھائیس سال سے شائع ہو رہا ہے اور معیار کے اعتبار سے برابر ترقی کر رہا ہے۔ پھلواری، بچوں کا باغ اور بچوں کی دنیا لاہور سے شائع ہو رہے ہیں۔ کھلونا کچھ دن شائع ہو کر بند ہو چکا ہے۔ کمال فاروقی نے بڑی محنت اور

توجہ سے چھپ کر جاری کیا تھا لیکن کچھ عرصے کی شاندار اشاعت کے بعد یہ رسالہ بھی زندہ نہ رہ سکا۔ کراچی سے ہونہار اور نونہال ٹوٹ پھوٹ شائع ہو رہے ہیں۔ جامعہ تعلیم ملی کی طرف سے بچوں کا مقبول رسالہ ستارہ عبدالواحد سندھی کی نگرانی میں عرصہ دراز تک شائع ہوتا رہا۔ لیکن حکومت نے تعلیمی اداروں کو تحویل میں لینے کے بعد اس رسالے کی اشاعت کے لئے رقم فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کی بنا پر رسالہ کو بند کرنا پڑا۔ کچھ دنوں سے بچوں کے لئے ایک "کومک سیریل" شائع ہو رہا ہے جو دراصل مغربی تہذیب اور روایت کی نقل کا نمونہ ہے اور انگریزی کو پسند کرنے والے بچوں میں مقبول ہے۔ سندھی میں بچوں کے لئے واحد معیاری رسالہ "گل پھل" باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

تقسیم کے بعد ذرائع ابلاغ نے بچوں کے ادب اور ان کی تعلیم و تربیت جیسے مسئلے پر کسی پالیسی کے تحت توجہ نہیں دی۔ انگریزی اخباروں اور انگریزی ہفت روزہ اسٹار نے البتہ انگریزی سے واقفیت رکھنے والے بچوں پر کام کیا۔ پچھلی دہائی سے اُردو اور سندھی اخباروں نے باقاعدگی کے ساتھ بچوں کیلئے صفحات کا اہتمام کیا ہے اور یہ صفحات معیار کے اعتبار سے بتدریج خوب سے خوب تر کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ ادارۂ جنگ نے اب میر شکیل الرحمٰن کی نگرانی میں بچوں کے صفحات کو مزید دلچسپ اور دلآویز بنا دیا ہے۔ بچوں کے لئے ریڈیو کے مختلف مراکز سے نشر ہونے والے پروگراموں میں بتدریج نکھار پیدا ہوا ہے۔

فیروز سنز لاہور، شیخ غلام علی لاہور، تاج کمپنی لاہور، اور دارالاشاعت لاہور سے بچوں کیلئے پہلے ہی بہت کچھ شائع ہو چکا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد چند سالوں میں اُردو اکیڈمی سندھ کراچی، ترقی اُردو بورڈ، گلڈ اشاعت گھر، ادارۂ مطبوعات پاکستان، ہمدرد نیشنل اکیڈمی، مکتبۂ فرینکلن، مکتبۂ اُردو اور جامعہ تعلیم ملی جیسے نئے ادارے منظرِ عام پر آئے۔ ان اداروں کے سامنے بچوں کے ادب کو فروغ دینے کا ایک سنجیدہ پروگرام بھی تھا اور مقصد کے ساتھ خلوص بھی شاملِ حال تھا۔ چنانچہ انہوں نے اچھا ادب مہیا کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ فیروز سنز اور شیخ غلام علی نے پچاس پیسے اور ایک روپیہ والی کتابوں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا بہت مقبول ہوا۔ جامعہ تعلیم ملی ملیر نے قومی اور اسلامی شخصیات پر بچوں کے لئے کتابوں کا ایک سیٹ شائع کیا۔ ہمدرد اکیڈمی نے گزشتہ چند سالوں میں موضوعات، معیار و مقاصد اور آرائش و زیبائش کے اعتبار سے عمدہ کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔ مکتبہ فرینکلن نے بچوں کے سائنسی موضوعات پر اچھی کتابیں شائع کی ہیں۔ یہی وہ اشاعتی وسائل ہیں جنہوں نے حکومتی سرپرستی نہ ہونے اور تعلیمی تحریک کے فقدان کی فضا میں بچوں کے ادب کو منافع خوری اور تجارتی مفادات کی بے لگام یلغار سے بچائے رکھا لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد ہمارے شہروں خصوصاً تجارتی و صنعتی شہر کراچی میں منافع خوری کا رجحان اس شدت سے بڑھا کہ علم و ادب اور تہذیب و معاشرت کا کوئی بھی شعبہ اس کی ضرب سے بچ نہ سکا۔ نظامِ تعلیم اور علمی اداروں پر افسر شاہی کے تسلط نے ایسی افراتفری اور بے ترتیبی پیدا کر دی کہ معروف لکھنے والے بھی علم و ادب میں منفعت کے گوشے (COMMERCIAL VENTURE) تلاش کرنے لگے۔ ملک کے سب سے بڑے صنعتی اور تجارتی شہر سے سر اٹھانے والی وبا کے اثرات بتدریج پورے ملک پر چھا گئے۔ ان حالات میں ناشروں کی بن آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بازار لچر، عامیانہ سنسنی پیدا کرنے والے اور محیّر العقول قسم کے ادب سے بھرا ہوا نظر آنے لگا۔ ٹیلی ویژن فلموں میں ہیجانی فضا۔ انگریزی اقدار کی ہمت افزائی۔ اور اشتہاری فلموں نے ادب کے تاجروں کو نئی نئی راہیں بتائیں۔ ابن صفی کی جاسوسیات بچوں کی زبان میں لکھی جانے لگی۔ والدین۔ اساتذہ، تعلیمی ادارے اور صاحبانِ فکر و نظر سب ہی ان رجحانات کے فروغ پر خوش ہیں یہاں تک کہ تربیت یافتہ نسل منظرِ عام پر آئی جو ذہنی و فکری اعتبار سے دیوالیہ اور مغرب پرست ہے اور جس کے لئے ترقی کے معنی دیوپیکر عمارتوں، فائیو اسٹار ہوٹلوں، آراستہ و پیراستہ بازاروں کی تعمیر اور غیر ملکی مصنوعات کی فراوانی ہیں۔

اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کیلئے نیشنل بک کونسل اور فاؤنڈیشن جیسے اداروں کا قیام تاریکی میں ایک کرن ثابت ہوئے۔ ان اداروں نے پہلی بار بچوں کے ادب کی اہمیت اور تاجر پیشہ ناشروں کے نقطۂ نظر کو محسوس کیا۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے بچوں کے لئے معیاری اور جدید اسلوب سے

آسا ستہ کتابوں کی اشاعت کا ایک منصوبہ تشکیل
دیا اور کوشش کی کہ بچوں کے لئے ایسی کتب شائع
کریں جو یورپ اور جاپان کے معیار کا مقابلہ کر سکیں
ادارے نے قومی تقاضوں اور جدید رجحانات کا
خیال رکھتے ہوئے تصاویر، خاکوں اور سرورق کی
کی ڈیزائن اور رنگوں کے امتزاج پر توجہ دی۔
ان کتابوں کی قیمتیں بھی ممکنہ حد تک کم رکھی گئیں۔
ایک اعلیٰ منصوبے کو بروئے کار لانے میں ادارے
سے بعض کوتاہیاں بھی سرزد ہوئیں اور اس قسم کی
غلطیاں ہر ایسے ادارے کے متعلقین سے ہوتی ہیں
جو سرکاری تعاون سے کام کرتے ہیں۔ اس قسم کی
کوتاہیوں کی گرفت کم از کم اس قسم کے اداروں کیلئے
ضروری ہے۔ جن کے زیر نظر ایک متعین پالیسی اور
مقاصد ہوں اور جس کو حکومت کی سرپرستی حاصل
ہو۔ فاؤنڈیشن کی فہرست میں بعض ایسی کتب بھی
ملتی ہیں جن کا معیار پست ہے۔ "سرسوں اور
شاہدرا" نامی کتاب میں غالب تاثر "جرم" کا عنصر
ہے جو ذوق میں جرائم اور دیہاتی رسم سے انحراف
کے بجائے رغبت پیدا کرتا ہے۔ چند کتابوں میں
خاکوں۔ تصاویر اور سرورق ڈیزائن جیسے معاملے
میں مغربی روایت کی تقلید پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور
یوں اس مقامی ماحول اور مناظر و معنوی شعور کے
اثر و نفوذ کو راہ نہیں ملتی ہے جس کی ضرورت ہمارے
ملک کے بچوں کو ہے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن نے ان
کوتاہیوں کے باوجود بعض قابلِ قدر کتابیں بھی
مہیا کی ہیں۔ مثلاً مہر نگار مسرور کی کتابوں کا سلسلہ
حکایاتِ گلستان سعدی۔ نظیر اکبر آبادی کی نظموں
کا ایک منتخب مجموعہ "دنیا ایک تماشہ ہے" [illegible]
مصنفہ مرزا ادیب، سائنس کا آغاز مصنفہ اکرام قمر
اس ادارے کی فہرست میں کشور ناہید کا نام قابل
ذکر ہے اس ذکر کو مدبل مداحی پر محمول نہ کیجئے تو یہ
حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے ایشیائی لوک
کہانیوں کے ایک سلسلے کا جو انگریزی زبان میں شائع
ہو رہا ہے اور اپنے معیار کے اعتبار سے پوری دنیا
میں نمائندہ حیثیت رکھتا ہے کا ترجمہ بڑی چابکدستی
سے کیا ہے۔ یہ سلسلے اُردو میں ایک اضافہ ہیں۔
ضرورت ہے کہ اس سلسلے کی دوسری کتابیں بھی
شائع ہوں۔ عالمی بازار میں اس سلسلے کی پانچوں
جلد بھی شائع ہو کر فروخت ہو رہی ہے۔ ادارے
نے ایشیائی لوک کہانیوں کے دو سلسلوں کو یقیناً بڑے
اہتمام سے شائع کیا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے
موضوعات میں بچوں کے کھیل۔ سائنس۔ تصویری
کہانیاں۔ مقامی جغرافیائی اور حیاتیاتی عنوانات
مہماتی اور عام کہانیاں۔ غیر ملکی ادب کے تراجم
اخلاقی اور اسلامی کہانیاں اور پاکستان سے
متعلق کتب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ادارے کی طرف
سے اب تک تقریباً سو رنگا رنگ کتابیں شائع
ہوتی ہیں۔

نیشنل بک کونسل ۱۹۶۲ء میں قائم کی گئی تھی۔
اس ادارے نے بھی بچوں کے ادب پر بعض ایسے قابلِ
حوالہ تحقیقی جائزے مکمل کر کے شائع کئے ہیں۔
جنہوں نے کام کرنے والوں کو فعّال رہنمائی فراہم کی
ہے۔ ان جائزوں کی اہمیت کا اندازہ یوں ہوتا
ہے کہ اب ملک کے ماہنامہ "کتاب" لاہور نے بچوں کے
موضوع پر جس قدر بھی مواد اپنے خصوصی ایڈیشنوں
میں شائع کیا ہے، اس میں کونسل کے تحقیقی جائزوں
سے استفادے کا غالب رجحان نظر آتا ہے۔ نیشنل
بک کونسل نے تجربات اور بعض نظری منصوبوں
پر کام مکمل کر کے ان ذرائع و وسائل کو تلاش کیا ہے
جو بچوں میں عاداتِ مطالعہ کو فروغ دینے میں مؤثر
کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ادارہ
ہر سال پاکستان کے شہروں میں کتاب میلوں کا اہتمام
کرتا ہے ناشروں اور مصنفوں کو اعلیٰ کارکردگی پر
انعامات مہیا کرتا ہے۔ ادارے کی طرف سے گزشتہ
دہائیوں میں جو تحقیقی جائزے شائع ہوئے ہیں
ان کی فہرست میں بچوں کے ادب پر ابن انشا کا وہ
مقالہ ہے جو مرحوم نے یونیسکو کے تحت بچوں کیلئے
منعقدہ سیمینار میں بمقام تہران پڑھا تھا۔ بعد میں
بچوں کے ادب کا جائزہ لینے والوں نے اسی مقالے
کے اعداد و شمار اور حوالوں پر اکتفا کیا ہے۔ اس جائزے
کے علاوہ "بچوں میں عاداتِ مطالعہ"، "بچوں کے لئے
کیا اور کیسے لکھا جائے" اور "پاکستان میں شائع ہونے
والے بچوں کے ادب کی ایک جامع فہرست" قابلِ ذکر
ہیں۔ ان جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۷۳ء تک
بچوں کے لئے کم و بیش تین سو دو ناولیں۔ ایک ہزار
پچاس سے زائد کہانیوں کے مجموعے، پچاس ڈرامے
نظموں اور گیتوں کے تقریباً سو مجموعے، اسلامیات
کے موضوع پر تین سو ساٹھ کتابیں، قومی اور پاکستانی
موضوعات پر ساٹھ، لطائف، چٹکلے، پہیلیاں و معلوماتِ عامہ
پر ستر اور روز مرہ سائنس پر سو کتابیں شائع ہوئیں۔

اس طرح ۱۹۷۳ء تک شائع ہونے والی کتابوں کی مجموعی تعداد ۲۴۴۲ بنتی ہے۔ ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے اعداد و شمار کو فارمولا جان کر اگر ۱۹۷۸ء تک شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد کا اندازہ کیا جائے تو یہ تعداد کم و بیش چار ہزار ضرور ہوگی یہ بچوں کی عادات مطالعہ" اور "بچے کیا پڑھتے ہیں" جیسے تحقیقی جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان چار ہزار کتابوں میں اعلیٰ معیاری اور با مقصد ادب تخلیق کرنے والے معروف ادیبوں کی تصانیف صرف پچیس فیصد ہیں۔ ادارہ اپنے ماہانہ رسالے "کتاب" کے ذریعے عالمی سطح پر بروئے کار لائے جانے والے منصوبوں اور اقوام متحدہ کی کوششوں سے پاکستان کے صاحبانِ فکر و نظر کو آگاہی بھی فراہم کرتا ہے۔ ان دنوں نیشنل بک کونسل بچوں کے ادب پر جامع کتابیات مکمل کر رہی ہے۔ یہ کتابیات بچوں کے ادب پر کام کرنے والوں۔ تحقیقی اداروں اور اور بین الاقوامی حوالوں کے لئے ناگزیر ہوگی۔

بچوں کے ادب میں مقامی ماحول و مناظر تہذیبی پس منظر کو ابھارنے کی جو روایت ۱۹۴۰ء میں "ہیر رانجھا" اور "سوہنی مہینوال" شائع کر کے دارالاشاعت لاہور نے شروع کی تھی قیام پاکستان کے بعد توجہ سے محروم رہی۔ گذشتہ سالوں میں کامل القادری نے جو شروع ہی سے بلوچستان کی جغرافیہ، یہاں کے مناظر، یہاں کی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کا تحقیقی نقطۂ نظر سے مطالعہ کر رہے تھے اس اہم پہلو کو گرفت میں لیا اور بلوچستان کی پوری شخصیت کو اپنے ناولوں کا جزو بنا کر بچوں کے لئے "ہزار داستان" "بولان کا خزانہ" اور "خضدار کی مہم" جیسی ناولیں مہیا کیں۔ نیشنل بک کونسل کے زیر اہتمام ترتیب دیئے جانے والے بچوں کے عالمی سال کی تحریک پہ سلیم فاروقی شریف کمال عثمانی اور رئیس فروغ نے بچوں کے لئے اپنی نظموں کے مجموعوں کو شائع کیا ہے اس وقت ملک میں بچوں کا ادب شائع کرنے والے کم و بیش ڈیڑھ سو اشاعتی ادارے کام کر رہے ہیں۔ اٹھانوے فیصد اشاعتی ادارے نجی ہیں اور ان کا اصل مقصد حصولِ منافع ہے۔ نئے قائم ہونے والے اشاعتی اداروں میں رنگا رنگ بک کلب تیزی کے ساتھ ابھر کر منظر عام پر آیا ہے۔ رنگا رنگ بک کلب کے زیر اہتمام بعض معیاری کتابیں مثلاً خضدار کی مہم مصنفہ کامل القادری، بچوں کے قائد اعظم مصنفہ افضال احمد نیل ہرانی اور خرگوش کا سپنا مصنفہ کرشن چندر قابل ذکر ہیں۔

پاکستان میں بچوں کا ادب معیار اور مقاصد کے اعتبار سے کس سطح پر ہے اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ مجموعی سعیٔ بسیار کے باوجود حصولِ زر کی شدید خواہش۔ شرحِ منافع میں روز افزوں اضافہ اور معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر جانے والی تجارتی ذہنیت علم و ادب کی طرح بچوں کی علمی و ادبی دنیا پر بھی طفیلی (PARASITE) کی طرح حملہ آور ہو چکی ہے۔ اس صورتِ حال کے خلاف ہمارے معتبر اشاعتی اداروں کی مزاحمت اور سرکاری و نیم سرکاری سطح پر کی جانے والی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہو رہی ہیں، بچوں کے ادب جیسے موضوع پر گذشتہ سال نیشنل بک کونسل نے اظہارِ رائے کا ایک منصوبہ شروع کیا تھا جو توقع سے زیادہ مفید اور کامیاب ثابت ہوا ملک کے تقریباً تمام معروف ادیبوں نے اس گفتگو میں حصہ لیا ماہنامہ کتاب نے ۱۹۷۸ء اور جنوری ۱۹۷۹ء میں یہ مباحث و مقالات شائع کئے ہیں۔ کونسل کے سرکردہ رکن اور یونیسکو میں پاکستان کی نمائندگی کرنے والے ماہر ابراہیم سعد نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ روزنامہ ڈان مورخہ ۵ مئی ۱۹۷۸ء میں بچوں کے ادب کو درپیش مسائل کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ زیر نظر جائزہ اس خیال کی توسیع کرتا ہے کہ ہم نے بچوں کے عاداتِ مطالعہ اور ذوق کی تربیت کے لئے کوئی شعوری کوشش نہیں کی ہے، بچوں کے ادب کو درپیش مسائل پر ماہرانہ رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور علاء الدین خالد نے بعض اہم گوشوں کی نشاندہی کی ہے۔

ماضی میں بچوں کے نام پر جو کچھ شائع ہوتا رہا ہے۔ ناشرین نے اس سلسلے میں مجرمانہ غفلت سے کام لیا ہے ۔ قیام پاکستان کے بعد جو کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں ان کے مواد اور ان کے پروڈکشن کا جائزہ ثابت کرتا ہے کہ پاکستان میں بچوں کا ادب ابھی یورپ کے انیسویں صدی کے دور سے بھی نہیں نکل سکا۔

آج کل پریوں کی کہانیاں دیوتاؤں کے قصے

غیر حقیقی داستانیں، جاسوسی قسم کے گھٹیا ناول، مار پیٹ، جن بھوت کے قصوں کا عام رجحان ہے۔

بچوں کا ادب جن مسائل سے دوچار ہے اس کا صحیح اندازہ اس ماہرانہ تجزیاتی رپورٹ سے ہوتا ہے جو کامل القادری نے ۱۹۷۸ء میں نیشنل بک کونسل کے لئے تیار کی تھی۔ اس رپورٹ میں پاکستانی بچوں نے معاشرے پر جو الزامات عائد کئے تھے۔ ان کی فہرست ذیل میں درج ہے جو صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہیں۔

(الف) عموماً بچوں کی کتابوں کا معیار بہت زیادہ پست ہے۔ معلومات و اعداد و شمار کی غلطیاں عام ہیں۔ زبان کی سطح کو برقرار رکھنے کی بہت کم ہی کوشش کی گئی ہے۔ اکثر کتابوں کی عبارات ثقیل اور گنجلک ہیں۔

(ب) اب تک سرکاری، نیم سرکاری اداروں نے (GRADED VOCABUILARY) کی ترتیب و اشاعت پر توجہ نہیں دی ہے۔

(ج) اشاعتی ادارے املا کی یکسانیت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ عموماً کتابیں کاتب سے لکھوائی جاتی ہیں لیکن سرکاری ادارے اور نیشنل بک فاؤنڈیشن ٹائپ کو فروغ دے رہے ہیں اس قسم کی دو رنگی بچوں کے حق میں مضر ہو سکتی ہے۔

(د) ناشرین بلاشبہ حصولِ زر میں مصروف ہیں کتابیں معروف ادیبوں سے بہت کم لکھوائی جاتی ہیں۔ جبکہ ہمارے ناشر نو آموز لکھنے والوں سے یہ کام چلاتے ہیں۔

(ہ) بچوں کے لئے پبلک لائبریریوں کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔ سکولوں کی لائبریریوں میں کتب کی خریداری کا انتظام خراب ہے سڑکوں اور گلیوں کوچوں میں تاجرانہ ذہنیت رکھنے والوں نے لائبریریاں کھول رکھی ہیں۔ جہاں بچوں سے معاوضہ لے کر نہایت لچر اور غیر معیاری کتابیں مہیا کی جاتی ہیں۔ اس قسم کی محلہ لائبریریاں حشرات الارض کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں۔

(و) سرکاری سطح پر اب تک کوئی علیحدہ چلڈرن بک فاؤنڈیشن قائم نہیں کیا گیا ہے۔ اس قسم کے ادارے کی زیرِ نظر حالات میں سخت ضرورت ہے۔

(ز) سرکاری، نیم سرکاری اور قومی سطح پر بچوں کی تعلیم و تربیت سے عدم ترجیحی کا رجحان قیام پاکستان کے بعد سے ترقی کر رہا ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت وہ تحقیقی جائزہ ہے جس کی رو سے ۱۹۷۳ء تک پاکستان کے موضوع پر صرف بیس، اسلامیات کے موضوع پر کل سو اور قومی موضوعات پر کل پچاس کتابیں شائع ہوئی تھیں جبکہ ناولوں اور کہانیوں کی کل تعداد اس عرصے میں پندرہ سو تھی۔

نیشنل بک کونسل کی جانب سے مقرر کئے گئے ماہرین نے سن ۱۹۷۸ء کے عام اجلاس میں ان مسائل پر بحث کرتے ہوئے (الف) سے (ز) تک اٹھائے گئے تمام اعتراضات کے لئے کتابوں کے نمونے بطور سند پیش کئے تھے۔

ان دنوں نیشنل بک کونسل زیرِ نظر حالات اور بحرانی فضا میں بچوں کے عالمی سال کی تقریبات میں منہمک ہے۔ یہ تقریبات ساری دنیا میں جاری ہیں۔ پاکستان میں بچوں کے عالمی سال کی تقریبات بچوں کے ادب سے متعلق مسائل اور کتابوں کی طباعت و اشاعت جیسے معاملات میں اقوام متحدہ بھی تعاون کر رہا ہے۔ ٹیلی وژن کے علاوہ تمام ذرائع ابلاغ نیشنل بک کونسل کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ کونسل کا رسالہ "کتاب" بچوں کے ادب کی صورتِ حال اور مسائل و معاملات پر ۱۹۷۸ء سے مضمون جاری ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس ضمن میں ہونے والی پیش رفت کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے علاوہ دو خصوصی شمارے شائع کر چکا ہے۔ کونسل کے رکن ابراہیم سعد اور کتاب کے مدیر ذوالفقار تابش اور محمد بلال جلباغ نے اس کام میں انہماک، لگن اور خلوص کا مظاہرہ کیا ہے۔

صوفی گلزار احمد
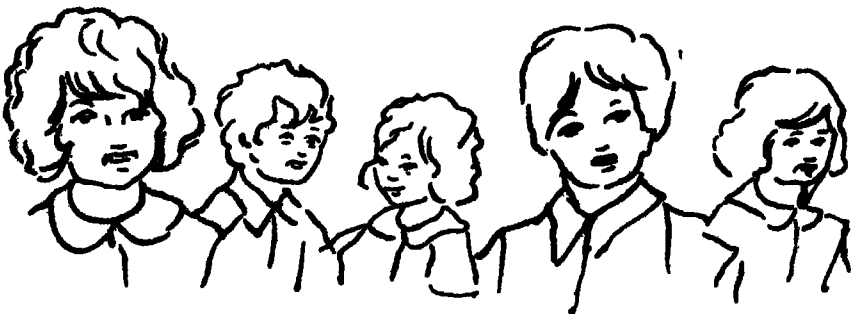
تعلیم اور تعلیمی نظریات

انسان زندگی کے دوران مختلف قسم کے تجربات سے روشناس ہوتا ہے۔ مختلف قسم کی اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے۔ وہ مختلف مہارتیں سیکھتا ہے اور نئے نئے علوم حاصل کرتا ہے۔ وہ مختلف قسم کے اشخاص سے ملتا اور ان کے خیالات سے استفادہ کرتا ہے۔ مختلف قسم کی چیزوں سے اسے واسطہ پڑتا ہے جو اس کے خیالات اور تجربات میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ دراصل انہی تجربات اور تاثرات پر اس کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کا دارومدار ہے اور نشوونما کے انہی تجربات کا نام تعلیم ہے۔

ہر زمانے میں ماہرین تعلیم اپنے نظریات پیش کرتے رہے ہیں چنانچہ یہ نظریات بچوں کی ذہنی، جسمانی، معاشرتی اور جذباتی نشوونما کی عکاسی کرتے ہیں۔ اہل یونان جن میں مشہور و معروف فلسفی اور حکما سقراط، افلاطون اور ارسطو شامل ہیں۔ اپنے زمانے کے مشہور ماہر تعلیم گزرے ہیں۔ انہوں نے جو تعلیمی نظریات پیش کئے وہ آج کل بھی اساتذہ کی رہنمائی کے لئے مشعل راہ ہیں۔

سقراط کا نظریۂ تعلیم

سقراط سوفسطوں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ سوفسطائی گشتی معلمین تھے جو ایتھنز کے گردونواح میں درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ سقراط علم و فضل میں بلند مقام رکھتا تھا۔ سقراط کو دنیا کا مشہور معلم مانا جاتا ہے۔ سقراط کہتا تھا کہ ہر شخص عرفان حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ وہ علم حاصل کرے۔ نیک کردار کی بنیاد سقراط نے علم پر رکھی ہے یعنی علم یا عرفان عمل صالح کا محرک ہے۔ عرفان نیکی ہے اور نیکی عرفان ہے سقراط دونوں کو ایک تصور کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر فرد حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو وہ اس پر عمل بھی کرے گا، اس طرح وہ علم حاصل کر کے نیک بن جائے گا۔

افلاطون کا نظریۂ تعلیم

افلاطون کہتا ہے کہ تعلیم کا مقصد افراد کی قدرتی صلاحیتوں کو دریافت کر کے ان کو نشوونما دینا ہے تاکہ ہر فرد کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق کام دیا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے افلاطون نے ایک جامع تعلیمی منصوبہ پیش کیا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتا ہے۔

۱۔ بچوں کو ابتدائی تعلیم پیدائش سے ۷ سال کی عمر تک گھر پر دی جائے۔ اعلیٰ اخلاقی کہانیاں سنائی جائیں تاکہ بچوں کے کان ان سے آشنا ہو جائیں۔

۲۔ ۷ سال کی عمر کے بچوں کو سکول بھیجا جائے، جہاں انھیں جسمانی ورزش اور موسیقی کی تعلیم دی جائے۔ تعلیم کا یہ سلسلہ ۱۸ سال کی عمر تک جاری رکھا جائے۔

۳۔ اٹھارہ سال کی عمر میں بچوں کی جانچ پرکھ کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کن طلباء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت ہے، صلاحیت رکھنے والے طلبہ کو مزید ۲ سال تک فوجی تربیت دی جائے۔ باقی طلبہ کو دستکاری اور دوسرے کاموں پر لگا دیا جائے۔

۴۔ جب بچے ۲۰ سال کی عمر کو پہنچیں تو ان کا پھر امتحان لیا جائے۔ مضبوط اور توانا لڑکے قومی خدمت پر مامور کئے جائیں۔ باقی کو ۱۰ سال تک اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ انھیں ریاضی، علم ہندسہ، موسیقی اور علم نجوم وغیرہ ان کی ذہنی تربیت کے لئے پڑھائے جائیں۔

۵۔ جن بچوں میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت نہ ہو انہیں حکومت کے چھوٹے عہدوں پر مامور کیا جائے۔ جن بچوں میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت ہو ان کو ۵ سال تک فلسفہ کی تعلیم دی جائے۔ اس تعلیم کو مکمل کرنے والے

فلسفی کہلائیں گے۔ ان لوگوں کے ہاتھ میں حکومت دے دی جائے۔

افلاطون عورتوں کی تعلیم پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدرت نے مرد اور عورت کو یکساں صفات عطا کی ہیں اس لئے مردوں کی طرح عورتوں کی تعلیم کا بھی نہایت مناسب بندوبست ہونا چاہئے۔

افلاطون کے نظریئے کے مطابق ہر فرد کو اسکی انفرادی صلاحیت کے مطابق معاشرے میں مقام ملنا چاہئے اور اس کی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے نظام تعلیم مرتب کیا جانا چاہئے۔

افلاطون جسمانی تعلیم کے لئے جمناسٹک اور ذہنی تعلیم کے لئے موسیقی تجویز کرتا ہے۔ افلاطون اس بات پر زور دیتا ہے کہ تعلیم حکومت کی ذمہداری ہونی چاہئے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر فرد کی تعلیم کا انتظام کرے۔ بچوں کو اخلاقی تعلیم دی جائے۔ ان میں ایثار، جرأت اور صداقت کے جوہر پیدا کئے جائیں۔ بچوں کو محبت و شفقت اور نرمی سے پڑھایا جائے۔ معلومات کو ان کے ذہنوں میں زبردستی نہ ٹھونسا جائے۔ نصاب میں وہی چیزیں شامل کی جائیں جو افراد کو نیک بنائیں۔ تعلیم کی ابتدا موسیقی پر ہو اور انتہا فلسفہ پر۔

افلاطون کے نظریات اور جمہوری معاشرہ

افلاطون ہمہ گیر تعلیم ـــ UNIVERSAL EDUCATION کے نظریئے کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر فرد کو بلا لحاظِ رنگ و نسل تعلیم ملنی چاہئے۔ لیکن اس کے خیال میں اعلیٰ تعلیم صرف انہی کو دی جانی چاہئے جو اس کے اہل ہوں جن کو فہم، ادراک یا عقل کی خصوصی حس ملی ہو۔

افلاطون کہتا ہے کہ ہر فرد کو اس کی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے تربیت دی جائے اور ان کو وہی کام تفویض کئے جائیں جن کو وہ بطریقِ احسن سرانجام دے سکیں۔ افلاطون تعلیم کو ریاست کے استحکام کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کا بھی حامی ہے اور انہیں مردوں کے مساوی درجہ دیتا ہے۔ یہ نظریہ بنیادی طور پر جمہوری ہے ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق تعلیم دینا اور کام تفویض کرنا بھی جمہوری طریقہ ہے۔ مختصر یہ کہ افلاطون کے نظریات جمہوری معاشرے کے قیام میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

ارسطو کے تعلیمی نظریات

ارسطو نے دو کتابیں "سیاسیات" اور "اخلاقیات" تصنیف کیں۔ ان کتابوں سے اس کے تعلیمی نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ سیاسیات میں فرد اور معاشرے کے تعلقات اور اخلاقیات میں انفرادی کردار کے اصولوں کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ مملکت کی اصلاح اور استحکام کے لئے تعلیم کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ روح دو طرح کی ہوتی ہے یعنی روحِ فعّال اور روحِ انفعالی معیاری تعلیم وہ ہے جو روحِ فعّال اور روحِ انفعالی دونوں کی تربیت کر سکے۔ روحِ فعّال کی تربیت کے لئے سائنس اور فلسفہ اور روحِ انفعالی کے لئے موسیقی، ادب اور اخلاقی تعلیم دی جائے، پہلے جسمانی تعلیم دینی ضروری ہے۔

اخلاق کی نگرانی حکومت اور والدین دونوں کا فرض ہے۔ ورزش اور موسیقی کی تعلیم کا مقصد بھی اخلاق کی تعمیر اور تکمیل ہے۔ بچوں کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آنا چاہئے۔ نصاب کو زندگی سے مربوط کیا جائے۔

عورتوں کے متعلق ارسطو کا خیال یہ تھا کہ عورتیں مردوں سے مختلف ہیں۔ ان کو اعلیٰ تعلیم دینا بیکار ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے علمِ ہندسہ، علم طبیعیات، علم نجوم، سائنس، منطق اور فلسفہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ مرد اعلیٰ تعلیم کا حق رکھتے ہیں۔ ارسطو، عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ دینے کے خلاف ہے۔

تعلیم، سیاست کی ایک شاخ ہے۔ چونکہ تعلیم کے ذریعے معاشرہ میں اتحاد اور فرد میں عمدہ اخلاق تعمیر کئے جا سکتے ہیں اس لئے تعلیم کا انتظام حکومت کے اختیار میں ہونا چاہئے۔ کچھ انسان فطرتاً آزاد ہوتے ہیں اور کچھ غلام ہوتے ہیں۔ تعلیم صرف آزاد شہریوں کا حق ہے۔ انسان کا پیشہ شہریت ہے۔ دستکاری اور زراعت وغیرہ غلاموں کے پیشے ہیں۔ ادنیٰ پیشے جسم کو بگاڑ دیتے ہیں اس لئے ان کو تعلیم میں شامل نہیں کرنا چاہئے۔ تعلیم صرف آزاد شہریوں کو دی جائے۔

آزاد شہریوں کا نظامِ تعلیم اور نصاب، بچوں کی فطرت کے مطابق ہونا چاہئے۔ بچوں کو کھیل کود، جسمانی ورزش اور کہانیوں کے ذریعے تعلیم دی جائے اور ان کے اخلاق کی نشوونما کی جائے۔

سنِ بلوغ سے ۲۱ سال تک کے نوجوانوں کو ذہنی تعلیم مثلاً ریاضی، علمِ ہندسہ، علمِ نجوم اور موسیقی کے ذریعہ دی جائے۔ ان کے علاوہ قواعدِ نظم، ادب، فنِ تقریر کے اصول، علمِ اخلاق اور علمِ سیاست بھی نصاب میں شامل کئے جائیں۔ ۲۱ سال کے بعد طبعیات، حیاتیات، نفسیات، منطق، فلسفہ، الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کی تعلیم دی جائے۔ علم کے حصول کے لئے تجرباتی اور استقرائی طریقے استعمال میں لائے جائیں۔

سپارٹا کے تعلیمی مقاصد ایتھنز کے تعلیمی مقاصد سے بالکل مختلف تھے۔ سپارٹا کی تعلیم کا بنیادی مقصد، شہریوں کو فوجی ریاست کے لئے تیار کرنا تھا۔ انہوں نے اپنی تمام توجہ فوجی تربیت پر مرکوز کر دی تھی تاکہ ملک و قوم کی حفاظت کر سکیں۔ حکومت ہر بچے کا معائنہ کرتی تھی۔ کمزور بچوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہ تھا۔ تندرست اور توانا بچوں میں بچپن ہی سے ایسی عادتیں پختہ کی جاتی تھیں جن سے وہ دلیر، جواں مرد اور بہادر بن سکتے تھے۔

قدیم رومی عہد کے ماہرینِ تعلیم

ایسقراط

(۳۳۸ء [illegible]) قدیم رومی عہد کا مشہور تعلیمی مفکر اور سیاستدان تھا۔ اس کے نزدیک تعلیم کا مقصد فرد کو اچھا مقرر بنانا تھا اس کے نزدیک خاندان تعلیم کا مؤثر ذریعہ ہے۔ وہ اس بات کا سختی سے قائل ہے کہ تعلیم گھریلو ماحول سے شروع ہونی چاہیئے۔ کردار کی پائیدار بنیادیں اسی سے قائم ہو سکتی ہیں۔ اس کے خیال میں تعلیم یافتہ شخص وہ نہیں جو محض اچھا مقرر ہو یا جس کو سائنس، فلسفہ پر عبور حاصل ہو بلکہ وہ شخص ہے جو انسانی ہمدردی سے معمور ہو۔

کوئنٹیلین

ایک معلم تھا۔ وہ مثالی اور تصوراتی [illegible] کی بجائے تعلیم کے حقیقی اور عملی پہلوؤں پر زور دیتا [illegible] تھا۔ ایسقراط کی مانند فنِ تقریر کا دلدادہ تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ میں شمار ہوتا تھا اور طلبہ میں بے حد مقبول تھا۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ امیروں کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دینی چاہیئے۔ اس نے ساری زندگی امراء کے درمیان گزاری اس لئے ان کے بچوں کے لئے طریقۂ تعلیم تجویز کرتا ہے۔ تعلیمی نظریات میں وہ ایسقراط کا پیروکار ہے۔ کوئنٹیلین کا نظریہ تھا کہ ہر معلم کو ہر طالب علم کی قابلیت اور رجحان معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اس طرح ان کے انفرادی رجحانات کے مطابق نصاب بنانا چاہیئے۔ اس نے بچوں کو تعلیم کے سلسلے میں مندرجۂ ذیل تجاویز پیش کیں:

۱۔ والدین اور چھوٹے بچوں کے اساتذہ اس بات کا خیال رکھیں کہ بچوں کے ساتھ دورانِ گفتگو میٹھی زبان اور نرم لب و لہجہ اختیار کریں۔ ان کے سامنے پسندیدہ حرکات اور شائستگی کا مظاہرہ کریں۔

۲۔ چھوٹے بچوں کو ان کی طرف سے زیادہ سخت کام کرنے کو نہ کہا جائے ورنہ وہ نفرت کا جذبہ پیدا کر لیں گے۔

۳۔ سوالات پوچھتے وقت ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۴۔ سکول میں حاصل کی ہوئی تعلیم گھر پر دی گئی تعلیم سے بہتر ہوتی ہے اس لئے بچوں کو سکولوں میں تعلیم دلائی جائے۔

۵۔ انفرادی توجہ کے بغیر بچے کی تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی اس لئے جماعت میں طلبہ کی تعداد کم ہونی چاہیئے۔

۶۔ گرامر، کمپوزیشن، الفاظ کا استعمال، قوتِ حافظہ کی تربیت، موسیقی، حساب کے علاوہ جسمانی تربیت کو نصاب میں جگہ دی جائے قانون اور فلسفہ کی تعلیم بھی نصاب میں شامل کی جائے۔

۷۔ اساتذہ کا رویہ طلبہ کے ساتھ سخت ہونا ضروری ہے۔ البتہ ظالمانہ نہیں ہونا چاہیئے، طلبہ سے اساتذہ کا گھل مل جانا بالکل مناسب نہیں۔ استاد کو چاہیئے کہ وہ اپنے مقام کی خبر رکھے اور طلبہ کے قریب نہ ہو۔ معلم کو چاہیئے کہ وہاں طلبا پر نظر رکھے جو اس کی نظروں سے بچنا چاہتے ہوں۔

کوئنٹیلین کے یہ نظریات نفسیات اور عملی تجربات پر مبنی نہیں ہیں۔

روسو کا نظریۂ تعلیم

روسو ایک عظیم ماہرِ تعلیم گزرا ہے۔ روسو کے تعلیمی نظریات عہدِ حاضرہ میں بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ روسو کا نظریۂ تعلیم یہ تھا کہ ہر بچہ اپنے اندر کچھ خاص صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے اور ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی ذمہ داری والدین اور اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ بچے کی یہ خصوصی صلاحیتیں اسی صورت میں پروان چڑھ سکتی ہیں جبکہ بچے کو ماحول میں ایسے آزادانہ مواقع فراہم کئے جائیں کہ وہ اپنی خصوصی صلاحیتوں کو بڑھنے پھولنے کے لئے بچے پر کوئی دباؤ نہیں ڈالنا چاہیئے بلکہ ایک ایسا ماحول فراہم کرنا ضروری ہے کہ بچہ ان صلاحیتوں اور استعدادوں کو بخوبی پروان چڑھا سکے اور معاشرے میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر سکے۔ روسو کے اس نظریۂ تعلیم نے عہدِ حاضر کے تعلیمی نظریات اور ان کا م پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اس سے کافی بہتر اور خوشگوار نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

جان ڈیوی کا نظریۂ تعلیم

مشہور و معروف ماہرِ تعلیم

جان ڈیوی جدید دور میں ایک جمہوری طرزِ فکر کا علمبردار خیال کیا جاتا ہے۔ جان ڈیوی نے تعلیم کے میدان میں جمہوری طرزِ فکر کی نشاندہی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جان ڈیوی کو تعلیم میں جمہوریت کا بانی مبانی خیال کیا جاتا ہے۔ جان ڈیوی کا نظریہ یہ تھا کہ ایک آزاد اور جمہوری معاشرے میں ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ تعلیم کے متعلق لکھتے ہوئے مزید رقمطراز ہے:

"ہر جمہوری اور آزاد معاشرے میں ہر فرد کو ایسے مواقع فراہم کرنے ضروری ہیں جن کی بدولت وہ آزادانہ طور پر اپنی استعداد اور خصوصی صلاحیتوں کے مطابق تعلیم حاصل کر سکے۔ کسی قسم کی سختی سے کام لینا اور دباؤ ڈالنا بچے کی ہمہ گیر نشوونما کے عین منافی ہے۔"

فروبل کا نظریۂ تعلیم

عہدِ حاضرہ میں کنڈر گارٹن کا نظریۂ تعلیم مشہور و معروف ماہرِ تعلیم فروبل کے تعلیمی نظریات کا مرہونِ منت ہے۔ کنڈر گارٹن کا مطلب ہے بچوں کا باغ۔ فروبل نے اپنے تعلیمی نظریات کی بدولت تعلیم میں عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ تعلیمی عمل جو نہایت مشکل اور کٹھن کام تھا وہ آسان کر دکھایا۔ بچوں کو کھیل کھیل میں تعلیم دی جانے لگی۔ موجودہ دور میں جو مدارس کنڈر گارٹن کی طرز پر چل رہے ہیں وہ بچوں کی تعلیم میں نہایت کامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔ بچوں کو کھیل کھیل میں تعلیم دینے کے لئے آلاتِ تعلیم مہیا کئے جاتے ہیں جن میں گنتی، حساب کتاب کے آلات، نقشے اور بلاک وغیرہ شامل ہیں۔ مزید برآں ایسا سامان بھی فراہم کیا جاتا ہے جس سے ان کی جسمانی، ذہنی اور روحانی نشوونما ہو سکے۔ الغرض بچے کی ہمہ گیر نشوونما پر زور دیا جاتا ہے اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ بچے کی فطری صلاحیتیں بخوبی پروان چڑھیں اور وہ تشنۂ تکمیل نہ رہیں۔ بچے کی نرم و نازک طبع کے پیشِ نظر اساتذہ پر یہ زور دیا جاتا ہے کہ وہ بچے کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آئیں اور اس کے ساتھ کسی قسم کی سختی روا نہ رکھیں۔

مانٹی سوری نظریۂ تعلیم

موجودہ دور میں مانٹی سوری نظریۂ تعلیم کو بھی اپنایا جا رہا ہے۔ مانٹی سوری نظریۂ تعلیم میریا مانٹی سوری ایک اطالوی ماہرِ تعلیم کا مرہونِ منت ہے۔ یہ خاتون ماہرِ تعلیم اٹلی میں پیدا ہوئیں اور انہوں نے اپنے تعلیمی افکار اور نظریات سے تعلیمی میدان میں ایک ہیجان برپا کر دیا۔ پاکستان بننے پر ۱۹۵۰ء میں کراچی تشریف لائیں اور اپنے تعلیمی نظریات کے بارے میں چند خطبات بھی دیئے۔ انکے مانٹی سوری نظریات نے موجودہ دور کے تعلیمی نظریات پر گہرا اثر ڈالا ہے اور بڑے دور رس اور مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

فروبل کے کنڈر گارٹن نظریۂ تعلیم کی طرح مانٹی سوری نظریۂ تعلیم بھی بچوں کی تعلیم میں "کھیل کھیل میں تعلیم" پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس طریقِ تعلیم میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ تعلیم بچے کے لئے معمہ نہ بن جائے۔ تعلیمی عمل کو آسان سے آسان بنا دیا جائے۔ بچے کو مجرد اشیاء کا علم فراہم کرنے کی بجائے ٹھوس اشیاء کا علم فراہم کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اشیاء اپنے روبرو دیکھ سکے اور ان سے کما حقہ واقفیت حاصل کر سکے۔ الغرض مانٹی سوری طریقِ تعلیم بچوں کی تعلیم و تربیت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسلامی نظریۂ تعلیم

اسلام میں علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اسلام نے عورتوں کو تعلیم دلانے کی تلقین کی ہے اور ہر زمانے میں ان کی تعلیم پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ البتہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا رواج کبھی نہیں تھا۔ تعلیم کا مقصد عورتوں کی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنا اور ایسی تربیت دینا ہے کہ وہ اچھی بیوی اور ماں ثابت ہو سکیں۔

اسلام کی آمد پر معلم اور متعلم کے درمیان بڑا مقدس اور پاکیزہ رشتہ قائم ہوا۔ ان کے تعلقات نہایت خوشگوار ہو گئے۔ معلمین اپنے تلامذہ سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آنے لگے اور شاگرد اپنے اساتذہ کی تعظیم کرنے لگے۔ شاگرد اپنے اساتذہ کو قابلِ احترام سمجھتے تھے اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ الغرض اساتذہ اور شاگردوں کے درمیان روحانی تعلق قائم ہو گیا۔

آغازِ اسلام کے بعد جب پیغمبرِ اسلام ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مسجدِ نبوی آپ کی تمام سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ گویا اسلام کا پہلا مدرسہ وہ مسجد تھی جہاں رسولِ خدا مسلمانوں کو نہ صرف مذہب بلکہ تمام دنیوی امور کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی پہلی درسی کتاب قرآنِ پاک تھی۔ مسجد تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے تمام دینی اور دنیوی سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی۔ اس کی حیثیت محض عبادت گاہ کی نہ تھی بلکہ اس مقام پر دنیا کے مسائل بھی حل کئے جاتے تھے۔ مساجد، عدالت کا کام بھی سرانجام دیتی تھیں۔ مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے۔ لوگ کتابیں مسجدوں کو بطور تحفہ دیا کرتے تھے جن سے خاص و عام استفادہ کر سکتے تھے۔

مسجد بطور مکتب

مسجد مسلمانوں کے ہر عہد میں علمی اور فکری کاوشوں کا مرکز بنی رہی۔ ابتدائی تعلیم کے

مکاتب مساجد میں قائم ہوتے تھے جہاں بچوں کو ارکان
اسلام کی پابندی کرانے اور قرآن پاک کی تعلیم کے علاوہ لکھنا
پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ اساتذہ اپنے عمل سے بچوں کو زندگی کے
ضروری آداب بھی سکھاتے تھے۔ اس طرح فرد معاشرہ کا ایک
کارآمد رکن بن جاتا تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کے عہد حکومت
میں ہر گاؤں کی مسجد مکتب کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ ان
مساجد میں بچوں کو دینی تعلیم کے علاوہ لکھنا پڑھنا اور حساب
سکھایا جاتا تھا۔

اب جبکہ پاکستان میں اسلامی نظام مکمل طور پر نافذ ہو
رہا ہے اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مساجد کی اہمیت بڑھ رہی
ہے۔ اللہ کرے کہ پاکستان کی مساجد میں مکتب قائم ہو جائیں
کیونکہ مساجد کا پاک اور مقدس ماحول بچوں کے ذہنوں پر
بڑا پاکیزہ اثر ڈالتا ہے۔

اسرار زیدی
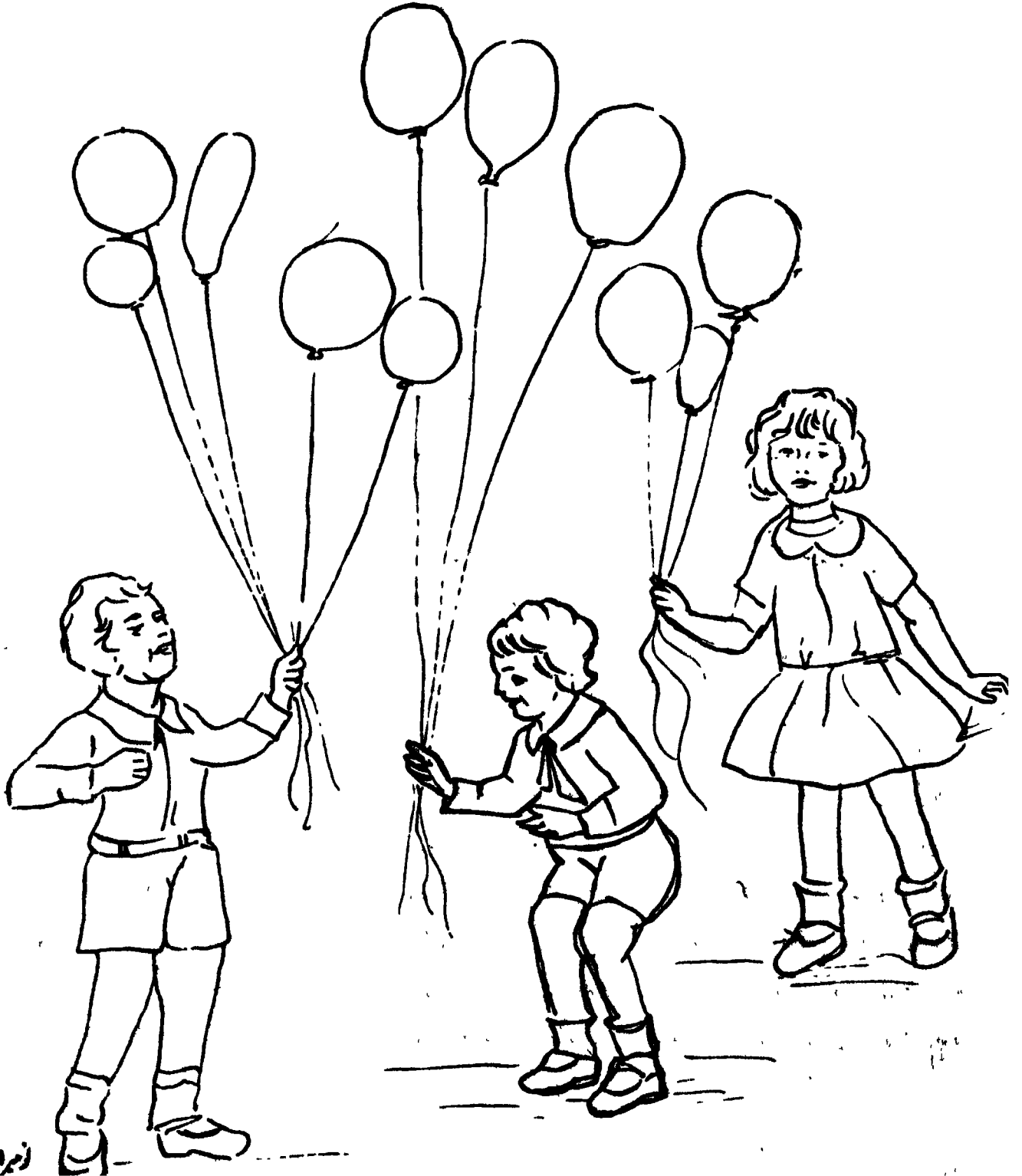
بچوں کے ادب کا مسئلہ

اب اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے ہاں بڑوں کے لئے ہی کونسا ادب تخلیق ہو رہا ہے جو بچوں کی فکر کی جائے تو شاید بہت سی جبینیں شکن آلود ہو جائیں اور ہر چہار جانب سے وہ یلغار ہو کہ ادب کی بات تو الگ رہی کچھ لکھنا لکھانا بھی ممکن نہ رہے کہ ہم تو یوں بھی کچھ بے حوصلہ لوگ ٹھہرے ہیں بے حوصلگی ہی تو ہے کہ دل کی بات زباں پر آتے آتے ایک نہیں سو تالے پڑ جاتے ہیں اور ان تالوں کا کھلنا جیسے کہ امکانات کی حدود میں نہیں۔ سو یہ سوال جو ایک عرصے سے گردش میں ہے کہ بچوں کے لئے کیا لکھا جانا چاہیئے اور کیسے ادب کی تخلیق لازم ہے؟ یہ سوال اسی وقت اہل قلم کے ذہنوں کو جھنجھوڑ سکتا ہے جبکہ وہ اس صورتحال سے مطمئن ہوں کہ بڑوں کے لئے جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اس کی افادیت اور اہمیت وہی ہے جو کہ ہونی چاہیئے۔

اس جملۂ معترضہ کے باوجود آج کے ادیب کے لئے یہ سوال یقیناً بے حد اہم ہے کہ بچوں کے لئے کیا لکھنا چاہیئے فی الواقع یہ سوال بنیادی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے تاہم اس سلسلے میں آغاز گفتگو سے قبل کسی حد تک اس امر کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ اردو ادب میں بچوں کیلئے جو کچھ لکھا گیا ہے یا لکھا جا رہا ہے اس کی نوعیت اور افادیت کیا ہے؟ بظاہر اس سوال کا جواب کچھ ایسا مشکل نہیں ہے اس لئے کہ بچوں کے ادب میں جنوں، بھوتوں، دیووں، پریوں، بادشاہوں، شہزادیوں اور شہزادوں کی مافوق الفطرت داستانیں اب تک قریب قریب ہر پڑھنے والے بچے کے لئے کشش انگیز اور دلچسپی کا باعث ہیں اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ان کرداروں پر ہی تکیہ کیا جاتا رہا ہے اور ان کے متبادل کردار تخلیق کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ درست ہے کہ بچوں کے لئے لکھنے والے حضرات موجودہ صورتِ حال میں بھی چاہتے تو جنوں، بھوتوں، بادشاہوں اور شہزادوں کے کرداروں کو بھی ...سب فضا اور ماحول کے حوالے سے مفید اور بامقصد کرداروں میں ڈھال سکتے تھے لیکن عملاً ایسا نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ کردار موجودہ صورتِ حال میں بچوں کیلئے کشش انگیز اور قابلِ قبول ہو سکتے تھے اور ان کو بامقصد اور تعمیری کرداروں میں ڈھالا جانا ممکن نہ تھا، بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ بچوں کے لئے لکھنے والے ادباء نے سنجیدگی کے ساتھ توجہ ہی نہیں کی اور جو کچھ لکھا محض ضرورت کے تحت لکھا، چنانچہ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ ان ادیبوں کی تخلیقات کی حیثیت زیادہ تر کاروباری ہی رہی ہیں یوں بھی نہیں کہ اس ضمن میں خالصتاً ناشر حضرات کا ہی عمل دخل رہا ہے اور جملہ اہل قلم کو ان کی مرضی کا تابع رہنا پڑا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے جو سماجی شعور، محنت اور لگن درکار تھی۔ اس کو بروئے کار لانے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی سعی نہیں کی گئی۔

بچوں کے لئے ہمارے ہاں بالعموم جو ادب تخلیق کیا گیا اس میں اس امر کو بہت کم درخورِ اعتنا سمجھا گیا کہ اس میں تفریح طبع اور دلچسپی کے ساتھ بچوں کی ذہنی اور نفسیاتی نشوونما کے لئے بامقصد اور تعمیری ادب درکار ہے آج کا دور سائنس اور استدلال کا دور ہے جنوں بھوتوں پریوں اور بادشاہوں کا عہد عملاً ختم ہو چکا

ہے۔ مافوق الفطرت اور بے مقصد داستانیں آج کے غیر معمولی طور پر ذہین اطفال بچوں کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں یہ جاننے کے باوجود اُن کو پڑھنے کے لئے جو مواد فراہم کیا جا رہا ہے۔ اُس کا بیشتر حصہ بے جواز اور مقصدیت سے عاری ہے اور مذکورہ تخیلی مافوق الفطرت کرداروں کو خواہ مخواہ پڑھنے والے بچوں کے ذہنوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

آج کے بچے جب موجودہ ناولوں اور کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو قدرتی طور پر اُن کے ذہن میں بے شمار سوال اُبھرتے ہیں چنانچہ وہ اپنے والدین معاشرے اور اہل خانہ سے یہ استفسار کئے بغیر نہیں رہتے کہ جن کیا ہوتا ہے؟ بھوت اور پریاں کیسی ہوتی ہیں کیا ان کا کوئی وجود بھی ہے اور ہے تو کہاں ہے؟ سوال بظاہر بے ضرر اور چھوٹے چھوٹے مگر بے حد اہم اور بنیادی سوالات کے جوابات انہیں بالعموم کچھ نہیں ملتے اور ملتے بھی ہیں تو اس سے اُن کی تشفی نہیں ہوتی۔ آج کی مائیں بچوں کو یہ دلاسا دے کر سُلا تو سکتی ہیں کہ صبح بیدار ہونے پر ان کے لئے پریاں بہت سی مٹھائی کھلونے لے کر آئیں گی لیکن بچے کا بیدار ہونے کے بعد اپنی ماں سے اوّلین سوال یہی ہوگا "پریاں جو مٹھائی کھلونے لائیں وہ کہاں ہیں" اس صورت میں ماں اپنے بچے کے لئے ممکن ہے کہ مٹھائی اور کھلونے تو فراہم کر دے تاہم اگر وہ پریوں کے وجود پر بضد ہوا تو ظاہر ہے ماں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔

اس کلیئے میں فی الواقع کسی مبالغے کی گنجائش نہیں کہ بچے ہماری قومی امانت ہیں اور اس امانت کا تحفظ قوم کے ہر ذمہ دار اور باشعور شخص کا فرض ہے۔ لیکن ان کا تحفظ اور پرورش محض اچھی غذا، عمدہ لباس اور قیمتی کھلونوں تک محدود نہیں بلکہ ان کے لئے جسمانی تربیت کے ساتھ ذہنی تربیت بھی ضروری ہے۔ بے شک اچھی غذا اور مناسب جسمانی تربیت کے باعث ایک بچہ بڑا ہو کر اچھا کھلاڑی اور اعلیٰ قسم کا تن ساز تو بن سکتا ہے لیکن مثبت قسم کی ذہنی تربیت کے بغیر وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا اہل نہیں ہو سکتا جو معاشرے اور قوم کی جانب سے اس پر عائد ہوتی ہیں — چنانچہ یہ امر ناقابل تردید ہے جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی تربیت بھی ضروری ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اُسے اوائل عمر ہی سے ادبی مواد فراہم کیا جائے جو تفریحی بھی ہو اور بامقصد بھی!

بچوں کے ادب کا اگر دیانتداری کے ساتھ اجتماعی طور پر جائزہ لیا جائے۔ تو اس میں سے کم و بیش پچانوے فیصدی کتب (جن میں ناول، کہانیاں اور معلوماتی تحریریں شامل ہیں) اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے مافوق الفطرت، داستانوں اور بے سر و پا قصوں پر محمول ہوں گی، ان میں ایک بڑی تعداد بادشاہوں، جنوں، دیووں اور پریوں کے ناقابل یقین کارناموں پر مبنی نظر آئے گی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ادب بچوں کے کردار کی تشکیل و تعمیر میں کوئی مثبت رول ادا کرنے کا اہل نہیں کہ اس میں بے شک بچوں کے لئے تفریح کا پہلو تو موجود ہوتا ہے جو اُن کے لئے کشش کا باعث بھی ہوتا ہے۔ لیکن عملاً اس میں افادیت کا پہلو کم ہی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود موجودہ حالات میں مذکورہ قسم کے ادب کو رد نہیں کیا جا سکتا تاہم اس کے متبادل بامقصد قسم کے لٹریچر کی فراہمی کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر جس قدر مشکل نظر آتا ہے اتنا مشکل نہیں ہے بشرطیکہ بچوں کے لئے لکھنے والے اہلِ قلم اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔ اور وہ خود ذہنی طور پر اُن تبدیلیوں کا شعور رکھتے ہوں جو عصرِ جدید سے عبارت ہیں۔ یہاں اس خیال کا اظہار کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ بچوں کے لئے لکھنا نسبتاً زیادہ مشکل مسئلہ ہے کہ اس کے لئے یہ اہتمام ناگزیر ہے کہ جو کچھ بھی لکھا جائے وہ پڑھنے والے بچوں کی ذہنی سطح سے کم از کم مطابقت ضرور رکھتا ہو۔ یہ دور حقیقت پسندی کا دور ہے جس میں مافوق الفطرت اور ہوائی باتوں کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں، اس کے باوجود جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ ماضی سے لے کر آج تک بچوں کے لئے جو ادب بالعموم تخلیق کیا گیا ہے اور اس میں جو کردار استعمال کئے گئے ہیں انہیں بوجوہ فوری طور پر مسترد کرنے کی بجائے ایک عبوری مدت کے

لیے نئے کرداروں کے ساتھ جنوں، بھوتوں اور پریوں کے کرداروں کو بھی استعمال تو کیا جا سکتا ہے مگر ان سے جو روایات وابستہ ہیں ان کو نئی معنویت اور امکانات میں ڈھالا جانا ضروری ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ بچوں کے لئے جو ادب تخلیق کیا جائے وہ ایک طے شدہ پروگرام اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کیا جائے. یہ درست ہے کہ عمر کے ابتدائی مرحلوں میں پڑھنے والے بچوں پر غیر ضروری بوجھ نہیں ڈالا جانا چاہیئے کہ آج کے انہی بچوں نے بڑے ہو کر پورے ملک قوم کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں لہٰذا ابتداء سے ہی ان کے کرداروں کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے کہ وہ مستقبل کی ذمہ داریوں کے اہل ثابت ہو سکیں اور ان کو بروئے کار لانے میں قباحت محسوس نہ کریں. اس ضمن میں جہاں اہلِ قلم پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہاں والدین اور دوسرے لواحقین کو بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہونا چاہیئے کہ انہیں بچوں کے لئے کس قسم کے ادب کا انتخاب کرنا ہے۔

بہرحال یہ بات تو برسبیلِ تذکرہ آگئی جبکہ اصل مسئلہ تو پڑھنے والے بچوں اور ان کے لئے ادب تخلیق کرنے والے اہلِ قلم کا ہے اور پیچ پوچھئے تو اس سلسلے کی سب سے زیادہ اور اہم ذمہ داری موخرالذکر طبقے پر عائد ہوتی ہے اب ایسے ادب کی تخلیق ضروری ہے اور اس کی جانب مناسب توجہ دینی چاہیئے جو عام بچوں کی ذہنی سطح سے مطابقت رکھتے ہوئے اُن کی تعلیم و تربیت کے ضمن میں بھی مفید اور مثبت کردار ادا کر سکے. اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ بچوں کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا. ان کے لئے جس قدر ہلکا پھلکا اور تفریحی مواد فراہم کرنا ضروری ہے اتنی ہی اہمیت اس امر کو ہونی چاہیئے کہ اس کا کچھ مقصد بھی ہو تاکہ وہ پڑھنے والے بچوں کی ذہنی نشوونما میں کارآمد ثابت ہو سکے بالفاظِ دیگر کھیل کھیل میں ہی کچھ ایسی باتیں ہو جائیں جو آسانی کے ساتھ بچوں کے ذہن نشین ہو سکیں اس کی بہترین مثال مغربی ادب ہے وہاں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے، اس کا بیشتر حصہ کسی نہ کسی طور پر بچوں کے بارے میں ہے وہاں تفریحی ادب سے لے کر عام معلومات جن میں تاریخی جغرافیائی سائنسی، تہذیبی، سماجی و معاشرتی اور دوسرے تکنیکی موضوعات شامل ہیں، ان پر ہر سال لاکھوں نہیں تو کم از کم ہزاروں کتب ضرور شائع ہوتی ہیں جن میں ہر عمر کے بچے کی ذہنی سطح اور معیار کے مطابق ہر طرح کا مواد شامل ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یورپ میں درسی کتب سے زیادہ مذکورہ بالا قسم کی کتب پر ہی زیادہ زور دیا جاتا ہے. اپنے پیرایۂ اظہار کے اعتبار سے یہ تصانیف اس قدر دلچسپ اور عام فہم ہوتی ہیں کہ بچے انہیں بڑے دلچسپی اور توجہ سے پڑھتے ہیں اور یہ امر طے ہے کہ وہ تخلیقات کا سب سے اہم اور بنیادی پہلو بچوں کی ذہنی تربیت ہوتا ہے۔

اب یہ سوال کہ بچوں کے لئے جو ادب لکھا جائے اس کیلئے ذریعۂ اظہار کس زبان کو بنایا جائے؟ اپنی جگہ خاصا اہم سوال ہے اُردو ظاہر ہے کہ ہماری قومی زبان ہے اور ملک کے چاروں صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن اسی بنیاد پر دوسرے صوبوں کی علاقائی زبانوں کو نظر انداز کرنا قطعی طور پر مناسب نہیں چنانچہ یہ طے ہے کہ جب تک اُردو کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے ادب دوسری علاقائی زبانوں میں بھی تخلیق نہیں کیا جاتا اس کی افادیت کا مسئلہ مشتبہ رہے گا. خصوصیت کے ساتھ اس صورت میں جبکہ علاقائی زبانوں میں بچوں کے لئے لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے. چنانچہ اُردو نہ سمجھنے والے ہزاروں بلکہ لاکھوں بچے اس کی افادیت سے محروم رہتے ہیں چنانچہ اس جانب خصوصی توجہ کی ضرورت ہے اور جب تک یہ نہ ہوگا بچوں کے لئے لکھے جانے والے ادب کی رفتار یقیناً مدھم رہے گی۔

رب نواز ملک

کس عمر کے بچوں کیلئے کیسا ادب لکھنا چاہئیے

بچوں کے ادب کا ان کی عمر سے گہرا تعلق ہے۔ بچہ فطری طور پر متجسس ہوتا ہے۔ آنکھ کھولتے ہی متحیرانہ انداز میں دنیا کو دیکھتا ہے کہ یہ اس کے لئے ایک نئی دنیا ہوتی ہے۔ پھر جوں جوں بڑا ہوتا ہے اس کی سوجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب وہ چلنے پھرنے اور باتیں کرنے لگتا ہے۔ دوسروں کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور ادھر اُدھر کی باتوں کے ساتھ ساتھ روزمرہ پیش آنے والے واقعات کا جائزہ لیتا ہے۔ یہی وقت ہے جب وہ اپنے ماحول اور بہن بھائیوں کے رہن سہن سے اپنے آپ کو سنوارنے کا ایک جذبہ پیدا کرتا ہے۔ پھر اس کے سامنے اس کے بہن بھائی کتابیں پڑھ کر اسے سناتے ہیں تو بے اختیار اس کا جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ بھی کتابیں پڑھے لیکن اسے تو پڑھنا آتا ہی نہیں۔ وہ کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے اور جہاں کہیں اسے تصویر نظر آتی ہے تو رک جاتا ہے۔ تصویر کو بغور دیکھتا ہے اور اس کے دل میں یہ خواہش جنم لیتی ہے کہ یہ تصویر کچھ بولے اور اگر تصویر پھر بھی خاموش رہے تو تصویر کو اپنے ماحول میں لانے کی کوشش کرتا ہے اس تصویر کو دیکھتے دیکھتے وہ اپنے گرد کہانی کا ایک خاکہ بنا لیتا ہے لیکن پڑھ نہیں پاتا۔ آخر اسے سکول داخل کرا دیا جاتا ہے۔ وہ شوق سے سکول جاتا ہے اور اسی تصویری عکس کی ترجمانی اسے بار بار مجبور کرتی ہے کہ سکول کے ماحول کو اپنا کر اپنی راہ متعین کرے۔ آخر کار وہ کتاب کا سہارا لیتا ہے۔ دو تین سال گزرنے کے بعد وہ تھوڑا بہت پڑھنے لگتا ہے کتابوں میں اس کی دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ تیسری چوتھی جماعت میں تو اسے اچھی بھلی اردو پڑھنی آجاتی ہے اور یہی وہ وقت ہے جب بچے کو اس کے اپنے ماحول اس کی اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کہانی کے انداز میں ادب فراہم کیا جاتا ہے۔ اس حیثیت سے ادب اس کے لئے ایک بنیادی کلاس کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے فارغ اوقات نہایت دلچسپ انداز میں گزارنا چاہتا ہے جبکہ اس کی تعلیمی استعداد بھی بڑھ رہی ہوتی ہے اور اپنے حلقہ کو سمجھنے کی پوری قوت رکھتا ہے۔

گویا بچوں کا ادب آٹھ سال کی عمر کے بچوں کے لئے ابتدائی ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ عمر ہے جب بچہ ادب سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے اور سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اسے باتصویر کہانی کے انداز میں اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کو دیں۔ جتنی خوبصورت انداز میں چھپی ہوئی رنگ دار تصویریں اور روزمرہ کے مشاہدات پر مبنی کہانیاں ہم اسے پڑھنے کو دیں گے وہ اتنا ہی ماحول سے قریب تر ہوتا جائے گا اور ان میں اور بھی دلچسپی لے گا۔ اس عمر میں بچہ ایک صاف ستھری کہانی سے جو تاثر لے گا وہی اس کی زندگی کیلئے ایک سنگ میل ثابت ہوگی۔ بچہ کا ذہن ایک آئینہ ہے جو عکس ہم اسے کہانی کے انداز میں دیں گے وہی نقش اس کے ذہن میں ابھرتے چلے جائیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم خوبصورت چھپی ہوئی چھوٹی چھوٹی باتصویر دلچسپ کہانیوں والی کتابوں سے اس کے ذہن کی آبیاری کریں۔ کتاب بینی کا یہی شوق آگے چل کر اسے اچھے ادب کا مطالعہ کرنے کا شعور بخشے گا۔ اپنے ماحول کو صاف ستھرا دیکھنا زیادہ پسند کرے گا اور ہر وہ چیز جو اسے دلکش اور آسان دکھائی دے گی وہ اسے فوراً قبول کرلے گا۔ بچے مشکل زبان و بیان اور الجھی ہوئی کہانیوں کو ہرگز پسند نہیں کرتے اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے پڑھنے کے لئے کیا اور کیسا ادب دیں؟

آسان اور قابل توجہ موضوعات کا انتخاب کچھ اتنا مشکل نہیں۔ روزمرہ زندگی میں بچہ جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے اگر ہم اسی ماحول کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنالیں تو بچہ اس میں کبھی بوریت محسوس نہیں کرتا۔ عام زندگی میں نظر آنے والے جانور، چرند، پرند، ہماری گھریلو زندگی، سکول کے واقعات، اچھے برے کی تمیز، عقل مندی، بے وقوفی کے واقعات، چستی چالاکی، بھاگ دوڑ، کھیل کود، یہ سب ایسے موضوع ہیں جنہیں ۱۰ سال کی عمر تک کے بچے فوراً قبول کرتے ہیں پہلے

موضوعات کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں تصویروں کے ساتھ بچہ کو دی جائیں تو وہ انہیں فوراً قبول کرتا ہے ہمارا فرض ہے کہ بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس حد تک دیدہ زیب کتابیں ادیبوں سے لکھوائیں اور خوبصورت انداز میں شائع کریں کہ بچہ کتاب سے زیادہ اسے ایک کھلونا تصور کرنے پر مجبور ہو جائے اور کھلونے کی طرح ہی اسے جان سے عزیز سمجھے اس کے ساتھ ساتھ قیمت بھی اس حد تک کم ہو کہ بچہ کسی سے مانگ کر کتاب پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے بلکہ خود خریدے۔ اس طرح بچہ کبھی بھی احساس کمتری کا شکار نہ ہوگا اور کتاب خرید کر پڑھنے کی اسے عادت پڑے گی۔ تجربہ کے طور پر ہم نے صرف ۲۴ صفحات کی چھوٹے جیبی سائز پر چھوٹی سی کہانی کو پوری کتاب کے انداز میں دو رنگوں میں کہانی کے ساتھ ساتھ خوبصورت تصویروں سے آراستہ کر کے شائع کیا اور ہم کافی حد تک کامیاب رہا۔ یہ اس لئے کہ پوری کتاب کی قیمت صرف ۲۰ پیسے رکھی گئی تاکہ بچہ کو روزانہ جیب خرچ کے لئے جو ملتا ہے اس میں سے کفایت شعاری کر کے خود کتاب خرید کر پڑھے اور جو مزا اسے کتاب خرید کر پڑھنے میں آتا ہے وہ مانگی ہوئی کتاب میں ہرگز نہیں۔ اس طرح سے ایک تو بچہ احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتا دوسرے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ صاف ستھری اور اچھی کہانی ہی بچہ کو روشن مستقبل کی طرف لے جاتی ہے اور ہم نے دیکھا یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو کر فروخت ہوئیں۔

ابتدائی عمر کے بعد اب بچہ کی ایسی سٹیج آجاتی ہے جب وہ ہر بات میں گھو جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عمر میں وہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو پسند نہیں کرتا بلکہ عام موضوعات بھی اسے اپنی طرف راغب نہیں کر سکتے جب تک کہ اسے کوئی عجیب سی بات نظر نہ آئے۔ اس عمر کے بچے ہمیں کہانی کے موضوع پہلے کی نسبت قدرے مختلف دینے ہوں گے۔ مثلاً ملکی معاملات، قوم اور ملک کی باتیں، دوسرے ملکوں سے تعلقات، آپس کے لڑائی جھگڑے اور ان کی بنیاد، ایک ملک کا دوسرے ملک پر حملہ کرنے کے واقعات، بہادروں کے کارنامے، بچوں کو ہیرو کے طور پر روشناس کرانے کے واقعات، ایسے واقعات کو ذرا لمبی کہانی اور واقعات کی شکل میں بچہ زیادہ شوق سے پڑھتا ہے۔ اس سے بچے کے ذہن میں ملک اور قوم کے لئے قربانی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اچھے برے کی تمیز پیدا ہوتی ہے اور اپنے گرد کے ماحول کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور ایسے جذبات بچے کے ذہن میں جڑ پکڑ جاتے ہیں۔ لیکن اس عمر کے بچے کے لئے بھی کتاب کی قیمت زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ اگر قیمت مناسب ہوگی تو بچہ پہلے کی طرح اس عمر میں بھی اپنی جیب خرچ سے رقم بچا کر کتاب خریدے گا اور شوق سے پڑھے گا۔ کتاب کو خرید کر پڑھنے کا جذبہ اور مطالعہ کا شوق اور پروان چڑھے گا۔ بچہ پھر جوں جوں بڑا ہوتا جائے گا اسے عادت پڑ چکی ہو گی کہ اچھی کتاب کا مطالعہ کتاب خرید کر کرے۔ یہاں بھی اسے یہی جذبہ کتاب خرید کر پڑھنے پر مجبور کرے گا جو ہم نے ابتداء سے اس کے ذہن میں منعکس کیا تھا۔

اب بچہ تیسری سٹیج میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں اس کی عمر اب ۱۴ سے ۱۵ سال کی ہے۔ ابتداء سے ہی مطالعہ کی بنا پر اس کا شعور بہت پختہ ہوتا ہے لیکن تذبذب کی حالت بڑھتی ہے۔ اس لئے کہ ابتدائی عمر کے بچوں میں اگر بیٹھتا ہے تو چھوٹے بچے اسے بڑا سمجھ کر پاس بیٹھنے نہیں دیتے۔ پھر اس کی کوشش ہوتی ہے کہ بڑوں کی محفل میں بیٹھے مگر وہاں جانے سے ویسے ہی گھبراتا ہے۔ اب اس کے تحت الشعور کو پروان چڑھانے میں ایک کتاب کا سہارا رہ جاتا ہے جو اسے بڑوں کی محفل میں بیٹھنے کے آداب اور شعور سے روشناس کراتی ہے اور آہستہ آہستہ دنیا کے آثار چڑھاؤ سے واقف کراتی ہے۔ ایسی عمر میں بچہ چونکا دینے والے موضوعات پر خاص توجہ دیتا ہے۔ اسی لئے اس عمر کا بچہ بین الاقوامی معاملات، سائنس فکشن، شکاریات، مہماتی کہانیاں، جاسوسی ادب اور سمندر کی تہوں کی کہانیاں جیسے موضوعات تلاش کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اچھی لکھائی چھپائی اور خوبصورت گٹ اپ کی تمیز بھی اس میں بدرجۂ اتم پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ابتدائی عمر سے اس عمر تک پہنچنے میں اچھی کہانی، اچھے ادب اور عمدہ چھپی ہوئی کتاب نے اب اس کی راہ متعین کر دی ہے۔ یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم ابتدائی عمر سے سنِ بلوغ تک کے بچے کو اس کے ماحول اور اس کی سوچ کے مطابق اسے اچھا اور سلجھا ہوا ادب دے سکیں۔ یہ کام والدین، اساتذہ، ادیبوں اور ناشران کا ہے کہ وہ اس پودے کی آبیاری مل جل کر ساتھ دیں۔ لہٰذا ہم سب کا فرض ہے کہ بچہ کی ابتدائی عمر سے سنِ بلوغ تک اس کو اپنے ماحول، دنیا کے حالات اور اچھے برے کی تمیز سے روشناس کرانے کے لئے سب مل جل کر اسے صاف ستھرے اور اچھے ادب سے روشناس کرائیں تاکہ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے ایک باشعور شہری جیسی زندگی بسر کرے اور روشن مستقبل میں ایک تابناک زندگی گزارے!!

ایک لڑکی بگھارتی تھی دال
بچوں کا منتخب ادب

عجیب چڑیا

چڑیا ہم نے عجیب پالی
زنجیر اس کے گلے میں ڈالی
دن رات ہو شام یا سویرا
لیتی ہے وہ جیب میں بسیرا
چڑیا سے بھی قد ہے اُس کا چھوٹا
ہے اس کا بدن تمام کھوٹا
پوشاک پہ جو غور سے نظر کی
پوٹا نہیں پوٹ ہے ہنر کی
گویا ہے، اگرچہ بے زباں ہے
ناداں ہے مگر حساب داں ہے
دانہ پانی نہیں وہ کھاتی
ہر دم ہے خوشی سے چہچہاتی
دن رات میں چھیڑ دو کسی کا
یہ چھیڑ ہے اس کے جسم کی جان
جب تک جیتی ہے جاگتی ہے
وہ کام تو چیز کام کی ہے
کہتی ہے کہ وقت کی خبر لو
جو کچھ کرنا ہے جلد کر لو
غفلت کیجئے تو ٹوکتی ہے
عجلت کیجئے تو روکتی ہے

اس طور سے کرتی ہے گزارہ
انڈے دیتی ہے دن میں بارہ
پھر اتنے ہی رات کو ہے دیتی
دیتے ہی ہر ایک کو ہے سیتی
انڈے ہیں تمام اس کے سچے
ایک ایک سے نکلے ساٹھ بچے
ہر بچے نے اگلے ساٹھ دانے
ہر دانے میں ہیں بھرے خزانے
جو دانہ گرا سو ہو گیا گم
ڈھونڈا کرو پھر نہ پاؤ گے تم
دانے کی بتاؤں کیا میں قیمت
دانا سمجھیں اسے غنیمت
جس نے اسے پالیا کہا واہ!
کیا بات ہے تیری بارک اللہ!
سچ پوچھو تو لعل بے بہا ہے
گویا ہر درد کی دوا ہے
القصہ ہے وہ عجیب پرندہ
مردہ اسے کہہ سکیں نہ زندہ

ہماری گائے

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
خاک کو اس نے سبزہ بنایا
سبزہ کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس چری تھی بن میں
دودھ بنی اب گائے کے تھن میں
سبحان اللہ دودھ ہے کیسا
تازہ گرم سفید اور میٹھا
دودھ میں بھیگی روٹی میری
اس کے کرم نے بخشی سیری
دودھ دہی اور میٹھا مسکا
دے نہ خدا تو کس کے بس کا
گائے کو دی کیا اچھی صورت
خوبی کی ہے گویا مورت
دانہ دنکا بھوسی چوکر
کھا لیتی ہے سب خوش ہوکر

کھا کر تنکے اور تھوتھے
دودھ ہے دیتی شام سویرے
کیا ہی غریب اور کیسی پیاری
صبح ہوئی جنگل کو سدھاری
سبزہ سے میدان ہرا ہے
جھیل میں پانی صاف بھرا ہے
پانی موجیں مار رہا ہے
چرواہا چمکار رہا ہے
پانی پی کر چارہ چر کر
شام کو آئی اپنے گھر پر
دوری میں جو دن ہے کاٹا
بچہ کو کس پیار سے چاٹا
گائے ہمارے حق میں ہے نعمت
دودھ ہے دیتی کھاکے بنسپت
بچھڑے اس کے بیل بنائے
جو کھیتی کے کام میں آئے
رب کی حمد و ثنا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

اونٹ

اونٹ تو ہے بس حلیم و خوش خصال
تربیت میں چھوٹوں بچوں کی مثال
تیری پیدائش رفاہِ عام ہے
آدمی کے حق میں ایک انعام ہے
کھانے کپڑے کا بھی تجھ پر ہے مدار
تو نے دی ہے اس کو تیزی مستعار
لق و دق صحرا میں یا میدان میں
یا عرب کے گرم ریگستان میں
سایہ افگن ہے نہ واں کوئی چٹان
سرد پانی کا نہ دریا کا نشان
چلچلاتی دھوپ ہے اور چُپ ہوا
واں پرندہ بھی نہیں پر مارتا
تو وہاں کے مرحلے کرتا ہے طے
دن بہ دن اور ہفتہ ہفتہ پے بہ پے
قیمتی اشیا ہیں تیری پشت پر
تاجروں کا ریشم اور شاہوں کا زر
تودہ تودہ تیرے اوپر لد رہا
ہے بھرا گویا جہازِ پُر بہا
چند ہفتے جب کہ جاتے ہیں گزر
اور تھکا دیتا ہے راکب کو سفر
اونٹ، گھبراتا نہیں تو بار سے
دیکھتا ہے اس کی جانب پیار سے
گویا کہتا ہے کہ اے میرے سوار
ایک دن تو اور بھی ہمت نہ ہار
ہاں نہ بیدل ہو نہ رستے میں ٹھٹک
صاف سرچشمہ ہے آگے دھر لپک
مجھ کو آتی ہے ہوا سے بوئے آب
نا امیدی سے نہ کر تو اضطراب
اونٹ تو کرتا ہے اس کی رہبری
یوں بنا دیتی ہے راکب کو جری
آخرش منزل پہ پہنچاتا ہے تو
اور سوکھے خار و خس کھاتا ہے تو
صبر سے کرتا ہے طے راہِ دراز
سچ کہا ہے تو ہے خشکی کا جہاز
الغرض تو ہے حلیم و خوش خصال
تربیت میں چھوٹے بچوں کی مثال

صبح کی آمد

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں
اُجالا زمانے میں پھیلا رہی ہوں
بہار اپنی مشرق سے دکھلا رہی ہوں
پکارے گلے صاف چلّا رہی ہوں
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

میں سب کار بہوار کے ساتھ آئی
میں رفتار و گفتار کے ساتھ آئی
میں باجوں کی جھنکار کے ساتھ آئی
میں چڑیوں کی چہکار کے ساتھ آئی
اُٹھو سوٗنے والو کہ میں آرہی ہوں

اذاں پر اذاں مُرغ دینے لگا ہے
خوشی سے ہر اک جانور بولتا ہے
درختوں کے اوپر عجب چہچہا ہے
سہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

یہ چڑیاں جو پیڑوں پر ہیں غُل مچاتی
اِدھر سے اُدھر اُڑ کے ہیں آتی جاتی
دُموں کو ہلاتی پروں کو پھلاتی
مری آمد آمد کے ہیں گیت گاتی
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

جو طوطے نے باغوں میں ٹیں ٹیں مچائی
تو بلبل بھی گلشن میں ہے چہچہائی
اور اونچی منڈیروں پہ شاما بھی گائی
میں سو سو طرح دے رہی ہوں دہائی
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہر اک باغ کو میں نے مہکا دیا ہے
نسیم اور صبا کو بھی لہکا دیا ہے
چمن سُرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے
مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہوئی مجھ سے رونق پہاڑ اور بن میں
ہر اک ملک میں دیس میں ہر وطن میں
کھلاتی ہوئی پھول آئی چمن میں
بجھاتی چلی شمع کو انجمن میں
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

جو اس وقت جنگل میں بوٹی جڑی ہے
سو وہ نولکھا ہار پہنے کھڑی ہے
کہ پچھلے کی ٹھنڈک سے شبنم پڑی ہے
عجب یہ سماں ہے عجب یہ گھڑی ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہرن چوکڑی بھر رہے ہیں
کلولیں ہرے کھیت میں کر رہے ہیں
ندی کے کنارے کھڑے چر رہے ہیں
غرض میرے جلوے پہ سب مر رہے ہیں
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

میں تاروں کی چھاں آن پہنچی یہاں تک
زمیں سے ہے جلوہ مرا آسماں تک
مجھے پاؤ گے دیکھتے ہو جہاں تک
کروگے بھلا کاہلی تم کہاں تک
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

پجاری کو مندر کے میں نے جگایا
مؤذن کو مسجد کے میں نے جگایا
بھٹکتے مسافر کو رستہ بتایا
اندھیرا گھٹایا، اجالا بڑھایا
اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

لدے قافلوں کے بھی منزل میں ڈیرے
کسانوں کے ہل چل پڑے منہ اندھیرے
چلے جال کندھے پہ لے کر مچھیرے
دلدّر ہوئے دور آنے سے میرے
اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

بگل اور طنبور سنکھ اور نوبت
بجانے لگے اپنی اپنی سبھی گت
چلی توپ بھی دن سے حضرت سلامت
نہیں خوب غفلت، نہیں خوب غفلت
اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

لو ہشیار ہو جاؤ اور آنکھ کھولو
نہ لو کروٹیں اور نہ بستر ٹٹولو
خدا کو کرو یاد اور منہ سے بولو
بس اب خیر سے اُٹھ کے منہ ہاتھ دھولو
اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

بڑی دھوم سے آئی میری سواری
جہاں میں ہوا اب مرا حکم جاری
ستارے چھپے رات اندھیری سدھاری
دکھائی دیئے باغ اور کھیت کیاری
اٹھو سونے والوں کہ میں آرہی ہوں

میں پورب سے پچھم پہ کرتی ہوں دھاوا
زمیں کے کرہ پر لگاتی ہوں کاوا
میں طے کرکے آئی ہوں چین اور جاوہ
نہیں کہتی کچھ تم سے اس کے علاوہ
اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

پن چکی

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکی
بیٹھتی تو نہیں کبھی تھک کر
تیرے پہیئے کو ہے سدا چکر
پیسنے میں لگی نہیں کچھ دیر
تونے جھٹ پٹ لگا دیا اک ڈھیر
لوگ لے جائیں گے سمیٹ سمیٹ
تیرا آٹا بھرے گا کتنے پیٹ
بھر کے لاتے ہیں گاڑیوں میں اناج
شہر کے شہر ہیں ترے محتاج
تو بڑے کام کی ہے اے چکی!
کام کو کر رہی ہے طے چکی
ختم تیرا سفر نہیں ہوتا
نہیں ہوتا مگر نہیں ہوتا
پانی ہر وقت بہتا ہے ڈھل ڈھل
جو گھماتا ہے آکے تیری کل

کیا تجھے چین ہی نہیں آتا
کام جب تک نبڑ نہیں جاتا
مینہ برستا ہو یا چلے آندھی
تونے چلنے کی شرط ہے باندھی
تو بڑے کام کی ہے اے چکی
مجھ کو بھاتی ہے تیری لے چکی
علم سیکھو! سبق پڑھو بچو!
اور آگے چلو، بڑھو بچو!
کھیلنے کودنے کا مت لو نام
کام جب تک کہ ہو نہ جائے تمام
جب نبڑ جائے کام تب ہے مزا
کھیلنے کھانے اور سونے کا
دل سے محنت کرو خوشی کے ساتھ
نہ کہ اکتا کے خامشی کے ساتھ
دیکھ لو چل رہی ہے پن چکی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکی

دال کی فریاد

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال
دال کرتی ہے عرض یوں احوال
ایک دن تھا ہری بھری تھی میں
ساری آفات سے بری تھی میں
تھا ہرا کھیت میرا گہوارہ
وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا
پانی پی پی کے تھی میں لہراتی
دھوپ لیتی کبھی ہوا کھاتی
مینہ برستا تھا، جھونکے آتے تھے
گودیوں میں مجھے کھلاتے تھے
یہی سورج زمیں تھے ماں باوا
مجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا
جب کیا مجھ کو پال پوس بڑا
آہ ظالم کسان آن پڑا
گئی تقدیر یک بیک جو پلٹ
کھیت کا کھیت کر دیا تلپٹ
خوب لوٹا دھڑی دھڑی کرکے
مجھ کو گونوں میں لے گئے بھرکے
ہوگئی دم کے دم میں بربادی
چھن گئی ہائے میری آزادی

کیا بتاؤں کہاں کہاں کھینچا
دال منڈی میں مجھ کو جا بیچا
ایک ظالم سے واں پڑا پالا
جس نے چکی میں مجھ کو دل ڈالا
ہوا تقدیر کا لکھا پورا
دونوں پاٹوں نے کر دیا چورا
نہ سنی میری آہ اور زاری
خوب بنئے نے کی خریداری
چھانا چھلنی میں، چھاج میں پھٹکا
قید خانہ میرا بنا مٹکا
پھر مقدر مجھے یہاں لایا
تم نے تو اور بھی غضب ڈھایا
کھال کھینچی الگ کئے چھلکے
زخم کیوں کر ہرے نہ ہوں دل کے
ڈالیں مرچیں نمک لگایا خوب
رکھ کے چولہے پہ جی جلایا خوب
اس پہ کفگیر کے ٹھوکے ہیں
اور ناخن کے بھی کچوکے ہیں
میرے گلنے کی لے رہی ہو خبر
دانت ہے آپ کا مرے اوپر

گرم گھی کرکے مجھ کو داغ دیا
ہائے تم نے بھی کچھ نہ رحم کیا
ہاتھ دھو کر پڑی ہو پیچھے تم
جان پہ آبنی حواس ہیں گم
اچھی بی بی تمہیں کرو انصاف
ظلم ہے یا نہیں (قصور معاف)

لڑکی کا جواب

کہا لڑکی نے میری پیاری دال
مجھ کو معلوم ہے ترا سب حال
تو اگر کھیت سے نہیں آتی
خاک میں مل کے خاک ہو جاتی
یا کوئی گائے بھینس چر لیتی
پیٹ میں اپنے تجھ کو بھر لیتی
میں تو رتبہ ترا بڑھاتی ہوں
اب چپاتی سے تجھ کو کھاتی ہوں
نہ ستانا نہ جی جلانا تھا
لیل تجھے آدمی بنانا تھا
اگلی بیتی کا تو نہ کر کچھ غم
مہربانی تھی سب، نہ تھا یہ ستم

گاہے گاہے باز خواں

مولانا محمد حسین آزاد کی ابتدائی درسی کتب سے ایک انتخاب

کھانا پک رہا ہے

دیکھنا! بیوی مغلانی پکا رہی ہے، ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے دھوئے دھائے برتن صندوق پر چنے ہیں ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں کسی میں دال ہے، کسی میں آٹا، کسی میں چاول، چھلنی، دیچنا اور پانی کا لوٹا پاس ہے آٹا گندھا رکھا ہے، چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولہے پر چڑھی ہے نیچے آنچ ہو رہی ہے۔ آپ پاس بیٹھی ہے کہ آگ نہ بجھ جائے یا دال نہ جل جائے، اب چمچہ اٹھائی ہے دال دیکھ رہی ہے کہ گل گئی ہو تو نیچے اتار کر رکھے، کڑچھے میں گھی گرم کرے، کتر کر پیاز ڈالے جب لال ہو جائے تو دال کو بگھارے پھر توا چڑھائے، روٹی پکائے۔ میاں جب آتا ہے تو کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے۔ کھا چکتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے کھانے پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے، کبھی چرخا کاتنے لگتی ہے کیوں نہ ہو؟ بڑی سلیقے والی ہے۔ ماں بہنوں کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں۔ آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو گھر کا کام کیوں کر چلے۔

لڑکا مدرسے جاتا ہے

دیکھنا! کیا جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہے کیسے شوق سے چلا جاتا ہے! کہ وقت پر پہنچ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔ ہاتھ میں جزدان ہے۔ دل میں یہی دھیان ہے کہ کل کا سبق خوب سنائے، جو پوچھیں سب بتائے، لڑکوں میں نام پائے استاد بھی اسے شوقین جانتا ہے۔ بڑی خوشی سے پڑھاتا ہے، یہ جماعت میں اوّل رہتا ہے۔ امتحان میں سب سے زیادہ نمبر پاتا ہے استاد کا بڑا ادب کرتا ہے، بے اجازت باہر نہیں جاتا۔ شریر لڑکے لڑتے جھگڑتے ہیں یہ اُن سے الگ رہتا ہے جو بات پوچھو سچ سچ کہہ دیتا ہے۔ انہیں عادتوں سے لوگوں میں تعریفیں ہوتی ہیں۔ ماں باپ بھی اس کی خوشی چاہتے ہیں۔ وقت پر کھیلنے کودنے سے نہیں روکتے ہاں! محنت کے بعد کھیلنا بھی اچھا ہے ہاتھ پاؤں چالاک ہوتے ہیں جی خوش رہتا ہے۔ بے شک یہ لڑکا ہونہار نظر آتا ہے۔ تھوڑی مدت میں علم حاصل کرے گا۔ بڑی عزت پائے گا باپ دادا کا نام روشن کرے گا۔

لڑکے کھیل رہے ہیں

ایک نہ ایک وقت کھیلنا بھی ضرور چاہیئے اس سے جی خوش ہوتا ہے ہاتھ پاؤں کھلتے ہیں۔ بدن میں چستی آتی ہے۔ دیکھنا! لڑکے مدرسے سے پڑھ کر نکلے ہیں میدان میں کھیل رہے ہیں۔ کیا خوش ہیں کیسے بے فکر ہیں ان کے چہرے کیا تر و تازہ ہیں ماں باپ کے پیارے ہیں گھر کے لاڈلے ہیں، اچھلتے ہیں۔ کودتے ہیں۔ دوڑتے ہیں گیند بلا کھیلتے ہیں اسے دیکھو! الٹن پر پاؤں نہیں ٹکاتا۔ وہ لڑکا بڑا چالاک ہے۔ یہ تو بیٹھا ہے خوب دوڑ نہیں سکتا پھر بھی دوڑتا پھرتا ہے۔ اسے لو! وہ گر پڑا، کیا ہوا۔ پھر اٹھ کر دوڑنے لگا تندرستی عجیب نعمت ہے۔

اچھا میاں! کھیلو، کودو، اچھلو، دوڑو مگر ایسے دن کھیل ہی کے دھیان میں نہ رہو جو لڑکے دن بھر کھیل کے دھیان میں رہتے ہیں، جب اُستاد کے سامنے سبق سنانے آتے ہیں تو منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اُستاد خفا ہوتا ہے، ماں باپ پیار نہیں کرتے۔ علم بڑی دولت ہے اس سے بے نصیب رہتے ہیں۔

نیزہ بازی

یہاں کیا ہو رہا ہے؟ اتنی خلقت کیوں جمع ہے؟ آہا! نیزہ بازی کے سامان ہیں۔ جبھی لوگ قطار باندھے کھڑے ہیں! آؤ تماشا دیکھیں بھائی قطار سے آگے نہ بڑھنا ایسا نہ ہو گھوڑے کی جھپٹ میں آ جاؤ۔ دیکھنا! وہ سوار نیزہ تانے گھوڑا اُڑائے چلا آتا ہے۔ کیسا سرپٹ دوڑایا ہے! سوار بھی پورا سوار ہے۔ کیا جما بیٹھا

ہے! فدا خوں بلکہ گھوڑا بھی نہایت تیز ہے۔ کیا تیر سا چلا آتا ہے دیکھو اب تختے کے قریب آیا۔ کس طرح پھاٹا ہے، گویا پیٹ زمین سے لگ گیا ہے اب سوار ایسا تاک کر نیزہ لگائے گا کہ تختہ صاف اکھڑ کر لے جائے گا سب میں واہ واہ کا غل مچ جائے گا۔

گاڑی کے سامنے وردی پہنے ایک صاحب بیٹھے ہیں یہ رسالے کے افسر ہیں ان کے ہاتھ میں کتاب ہے، نام لکھ رہے ہیں۔ جو سوار جیتیں گے، انہیں انعام ملے گا۔ نیزہ بازی سپاہ گری کا ایک فن ہے۔ اس میں دونوں باتیں ہیں، کھیل کا کھیل، ورزش کی ورزش۔ یہ کرتب سواروں میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ کیوں نہ ہو انہیں باتوں سے سپاہیوں کی پھرتی چالاکی بڑھتی ہے، اور وقت پر کام آتی ہے۔

دھوبی کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو بھٹی چڑھاتا ہے۔ صبح بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے۔

دیکھو! دوپہر ہونے کو آئی، اب تک پانی میں کھڑا ہے۔ کپڑے چھانٹ رہا ہے۔ چھوا چھو برابر کر رہا ہے۔ دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے بڑا لڑکا بھوکا ہے ماں سے روٹی مانگ رہا ہے۔ چھوٹا کھنڈرا ہے۔ بھوک کی پروا نہیں۔ بکھی کوا اڑا رہا ہے۔

میاں دھوبی جی! تمہارا گھر کہاں ہے؟

صاحب! وہ سامنے گاؤں نظر آتا ہے وہاں رہتا ہوں۔

وہ تمہارا بیل ہے؟

ہاں!

کتنے کو لیا؟

پندرہ روپے کو!

دیکھنا کتنا تاک لگائے بیٹھا ہے کہیں روٹی نہ اٹھا لے جائے۔

صاحب یہ چوٹا نہیں یہ تو ہمارا چوکیدار ہے دیکھئے امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں۔ کیا مجال، کوئی پاس تو آجائے۔

میاں دھوبی! تمہارا کام تو بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو اجلے کپڑے پہناتے ہو۔

صبح کی ہوا خوری

صبح کا وقت ہے۔ جی خوش ہے آؤ! ذرا باغ چلیں۔ ہوا کھائیں۔ آہا! کیا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں۔ باغ مہک رہا ہے۔ آتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ ذرا ہریاول کو دیکھنا۔ کیا آنکھوں میں طراوت آتی ہے! ہری ہری گھاس کیا ہے؟ سبز مخمل کا فرش بچھ رہا ہے۔ اس پر اوس کے قطرے پڑے ہیں۔ گویا مخمل پر موتی جڑے ہیں۔ درختوں پر کچھ اور ہی بہار ہے۔ کسی میں پھل لگا ہے۔ ڈالیاں جھوم رہی ہیں۔ کنواں چل رہا ہے ایک چھوٹا سا لڑکا بھی پاس کھڑا ہے۔ تماشا دیکھ رہا ہے دوسرا بڑا شوقین ہے۔ ہاتھ میں کتاب ہے سبق یاد کر رہا ہے۔ یہ مالی کیا کرتا ہے؟ پودا لگاتا ہے چلو! سیر دیکھیں۔

بڑے میاں! یہ پودا کہاں سے لائے ہو؟

صاحبزادے! بادشاہی باغ سے لایا ہوں۔

کتنے دنوں میں جم جائے گا؟

جلدی پھوٹ آئے گا۔

گڑھے میں کیا ہے؟

پانی ہے۔

کیا کرو گے؟

پودے میں دوں گا۔ اس سے جلدی ہرا بھرا ہو جائے گا۔

مرغ

مرغا مرغی بہت مشہور ہیں زیادہ اتا پتا بتانے کی ضرورت نہیں۔ جس ملک میں جاؤ وہیں پالتو نظر آتے ہیں۔ کتے، بلی، گھوڑے، بیل کی طرح جہاں آدمی رہ سکتا ہے وہاں یہ بھی ملتے ہیں۔ پرندوں میں سب سے زیادہ فائدے اس جانور سے ہیں۔

مرغ بڑا بہادر اور خوبصورت ہے جب وہ اپنی مرغیوں کے جھگڑے کو لئے تنا ہوا چلتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ بھی خوب سمجھتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ اور کس آن بان سے چلے جاتے ہیں۔ کسی دیوار یا پتھر یا ٹیلے پر بیٹھتا ہے تو تیس مار خاں معلوم ہوتا ہے۔ گلا پھلاتا ہے۔ چھاتی ابھارتا ہے اور سارے بدن کا زور لگا کر چلاتا ہے۔ ککڑوں کوں۔ گویا ساری دنیا کو سناتا ہے کہ دیکھو ہم کیسے بانکے اور سورما ہیں۔ یہ لڑائی پر تلتا ہے اس کی ٹانگوں کے اندر کی طرف تیز کانٹے ہوتے ہیں۔ ان سے اپنے دشمن کو بڑا نقصان پہنچاتا ہے۔ کبھی کبھی بے رحم لوگ اس کی جنگی عادت سے اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ وہ اس کے اصلی ہتھیاروں یعنی کانٹوں پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ ان پر تیز لوہا چڑھاتے ہیں اور اسے دشمن کے سامنے چھوڑتے ہیں کہ وہ بھی اسی طرح تیار ہوتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ جب وحشیانہ لڑائی ہوتی ہے تو بعض آدمی اس بے رحمی کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ جو آدمی جواں مرد یا لڑکا بہادر ہوگا۔

رونے کا مطلب خوشی سے کسی شکل نہ ہوگا۔

مُرغی بہت انڈے دیتی ہے۔ کئی نے بیچے مزیدار ہوتے ہیں۔ بچہ نکالنا ہے تو بڑے صبر سے اکیس دن تک بیٹھی انڈے سکتی ہے۔ یہ اپنے بچوں کو بڑی دلیری سے بچاتی ہے۔ کُتے۔ بلی اس کے ڈیرے کے پاس جائیں تو پروں کو پُھلا کر کڑکڑاتی ہوئی دوڑتی ہے۔ اس کی ڈراؤنی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے مارنے کو تیار ہے۔ اس وقت دل جلے ہی جانور کا کام ہے کہ اس کا سامنا کر سکے۔

چیل اُس کے بچوں پر منڈلاتی ہوئی آتی ہے، تو جھٹ اُن کو پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔ اُس کے بچے بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ گلابی ٹانگیں، گول گول کالی آنکھیں، تارا سی چمکتی ہوئی۔ زرد، سفید، نرم نرم روئیں کمال کا کُرتہ پہنے چوں چوں کرتے پھرتے ہیں۔

مُرغے، مرغیاں کرم وغیرہ کھاتے ہیں۔ کھیتوں، گھروں اور رستے پر دانے دُنکے چُگ لیتے ہیں۔ یہ اپنی خوراک اکثر زمین کرید کر نکالتے ہیں۔ اس لئے خدا نے اُن کی ٹانگیں مضبوط بنائی ہیں۔ پنجے چوڑے چوڑے، ناخن خمدار، مور، ہیرو یعنی فیل مُرغ، چکور، تیتر، بٹیر سب اسی طرح کے کریدنے والے جانور ہیں۔

کوّا

دیکھنا ایک چھوٹی سی لڑکی بیٹھی ہے۔ روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں ہے۔ کوّوں نے بچہ دیکھ کر آن گھیرا ہے بیچاری کا ٹکڑا چھینے لیتے ہیں۔ کوئی پَر پھیلا کر آیا ہے۔ کوئی تاک لگائے بیٹھا ہے۔ کوئی گردن موڑے دیکھ رہا ہے۔ غرض جو ہے اس تاک میں ہے کہ داؤں لگے تو ٹکڑا ہاتھ سے چھین لے۔ بیچاری حیران ہے۔ ننھی سی جان ہے۔ کیا کرے، جس ہاتھ میں ٹکڑا ہے اس سے جھکائے تو ٹکڑا اُچک لے جانے کا ڈر ہے۔ دوسرے ہاتھ سے ہٹائے تو ٹکڑا اونے میں پڑ ٹکا ہوا ہے۔ اس کے سہارے بیٹھی ہے۔ گر پڑنے کا خوف ہے۔ ناچار ٹکڑا چھاتی سے لگا لیا ہے۔

یہ بڑا ڈھیٹ جانور ہے۔ چال بھی سب سے نرالی ہے۔ جہاں تہاں ایسا کودتا پھرتا ہے۔ گویا ساری زمین اس کے باپ دادا کی جاگیر ہے۔ انگنائی سے اُڑا یا دیوار پر جا بیٹھا۔ دیوار سے اُڑایا مُنڈیر پہ جا بیٹھا جہاں پیٹھ موڑی پھر انگنائی میں موجود ہے۔ سیانا بڑا ہے۔ ذرا سے اشارے کو تاڑ جاتا ہے اور جھٹ اُڑ جاتا ہے۔ مگر وہاں سے ہٹ کر پھر سامنے آ بیٹھتا ہے۔ اور اس طرح کائیں کائیں کرتا ہے گویا لڑتا ہے۔

کوئی جگہ اس سے خالی نہیں۔ آبادی ہو یا ویرانہ جنگل ہو یا پہاڑ جہاں جاؤ کوّا موجود ہے۔ وہی اس کی کالی وردی ہے وہی اس کی کائیں کائیں۔ چوری اس کی ذات میں ہے۔ جو چیز پاتا ہے اُٹھائے جاتا ہے! اس کے کام کی ہو یا نہ ہو اس کی نظر بہت تیز ہے۔ دُور سے دیکھتا ہے اور چلاتا ہوا دوڑتا ہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے پرندوں کو بہت ستاتا ہے۔ انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ جہاں یہ موذی آیا اور ان کے ہوش اُڑے۔ یا تو فوراً اُڑ جاتے ہیں یا بیچارے چلاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ظالم کی فریاد کرتا ہے۔

بیچاری چڑیا کی تو جان کا دشمن ہے۔ جہاں اس کے انڈے بچے ہوں ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ اور موقع پاتا ہے تو جھٹ انہیں چونچ میں دبا کر اُڑ جاتا ہے۔ وہ بیچارے چیں چیں کرتے رہ جاتے ہیں۔

صبح ہوئی اور اس نے کائیں کائیں شروع کی۔ میٹھی نیند میں وہ آواز کیسی کڑوی لگتی ہے۔ مگر اُسے سارا دن ہے اور پیٹ کا دھندا ہے۔ پہلے تو جو پاس پڑوس میں نظر آیا وہ اُٹھایا پھر گھروں کے آگے مُردار پر داؤں لگایا۔ باغ میں جا کر دو چار پھل چکھ کھائے کھیتوں پر جا کر کرم چُگے۔ وہاں کچھ بویا ہوا ہے تو اُسے خراب کیا۔ درختوں پر کسی کے انڈے بچے چٹ کئے۔ پھرتے پھرتے شام ہو گئی اور تھک گیا تو وہاں سے اُٹھا اور اپنے ٹھکانے ہی پر جا کر دم لیا۔

کوّوں کا ایکا تعریف کے قابل ہے۔ ایک آواز دیتا ہے تو بیسیوں کوّے کائیں کائیں کرتے آن موجود ہوتے ہیں۔ یہ ہمیشہ بڑے بڑے درختوں پر گھونسلا بناتا ہے اور اُونچی ٹہنیوں پہ رہتا ہے۔ کوّے اور کوّی میں بہت محبت ہوتی ہے۔ یہ گرمی میں انڈے دیتی ہے۔ ایک چرنے چُگنے کو جاتا ہے ایک گھونسلے پہ رہتا ہے۔ مگر جب دیکھتا ہے کہ کسی کا ارادہ گھونسلے پر ہے تو کائیں کائیں کرنے لگتا ہے۔ آس پاس کے کوّے جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ غُل مچاتے ہیں۔ جھپٹ جھپٹ کر آتے ہیں اور موقع پاتے ہیں تو ٹھونگ بھی مار جاتے ہیں۔

گلہری

یہ عجیب چلبلی اور چنچل ہے۔ ہندوستان میں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ ہر قسم کا قد اور رنگ الگ الگ ہے۔ مگر خاکستری رنگ کی چھوٹی گلہری اکثر جگہ دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کی پیٹھ پہ سیاہی مائل دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس کی ترت پھرت دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ وہ بڑی شوخ اور چالاک ہے۔ نہایت نڈر اور بے پروا دیکھتی ہے کہ کتا گھات لگائے آتا ہے مگر انجان بن جاتی ہے۔

جب سر پر آ پہنچتا ہے تو چلاتی بھاگتی ہے۔ اِدھر اُدھر کسی درخت پر لپک کر چڑھ جاتی ہے۔ اور سب سے اونچی ٹہنی کی طرف مُڑ کر دیکھتی جاتی ہے۔ گویا کھجائے کو منہ چڑھاتی ہے۔

جب کسی درخت کی ٹہنی پر اکڑوں بیٹھتی ہے۔ اور ننھے ننھے پنجوں میں کوئی سخت میوہ لئے ہوتی ہے، تو دیکھو لمبے تیز دانتوں سے اس کے سخت چھلکے کو کیونکر کترتی ہے۔ اس کے کترے ہوئے پھل یا کسی دانے کو اٹھاؤ دیکھو جن دانتوں سے کترا ہے کیسے ان کے نشان معلوم ہوتے ہیں۔ تمہیں خرگوش کا بیان یاد ہے۔ یہ بھی خرگوش چوہے اور چوہیا کی طرح کترنے والے جانوروں میں سے ہے۔ کیسی ہی سخت چیزیں ہوں مگر ایسی کم ہوں گی جن میں اس کے چھینی سے تیز دانت بیٹھ نہ جائیں۔

تم ضرور کہو گے کہ جب گلہری اور کترنے والے جانوروں کی طرح ہمیشہ دانت چلائے جاتی ہے اور سب طرح کی سخت چیزوں کو کترتی رہتی ہے تو وہ گھس کر کُند کیوں نہیں ہو جاتے۔

جو مستری اپنی چھینی کو ہمیشہ سان پر تیز کرتا ہے، اور جو تیز دھار والا اوزار ہے۔ گھستے گھستے کُند ہو جاتا ہے۔ گلہری تو اپنے دانتوں کو کبھی تیز نہیں کرتی۔ ہاں وہ نہیں کرتی۔ خدا نے اس کے دانت عجب حکمت سے بنائے ہیں۔ ان کے باہر کا رُخ بہت سخت ہے اس لئے کم گھستا ہے۔ اندر کی طرف نرم ہے۔ وہ جوں جوں گھستی ہے۔ دانت سلامی ہوتے جاتے ہیں۔ اور سامنے کی طرف دھار تیز رہتی ہے۔

جب تم ہندوستانی قلم بناتے ہو تو دیکھو ایک پہلو سے چھیلتے جاتے ہو۔ دوسری طرف تیز اور پتلی ہوتی جاتی ہے۔ پھر تم کہو گے کہ جب گھستے ہیں تو رفتہ رفتہ چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ بے شک یہی ہوتا۔ مگر کترنے والے جانور جب تک جیتے ہیں دانت بڑھتے رہتے ہیں۔ اور جانوروں کے دانت جو نکلنے ہوتے ہیں ایک ہی دفعہ نکل چکتے ہیں۔

گلہری زیادہ تر درختوں ہی پر رہتی ہے۔ گھاس اون روئی گودڑ وغیرہ سے گھونسلا بنا لیتی ہے۔ اکثر درخت کے کھوکھے میں، کبھی چھجوں میں یا چھپر میں یا چھت کی کڑیوں میں گھر بناتی ہے۔ کلیاں، کونپلیں، میوہ کھا کر گزارا کرتی ہے۔ اکثر روٹی کے ٹکڑے اناج کے دانے چننے کو گھروں میں بھی آ جاتی ہے۔ خوراک کی تلاش میں زمین پر اُتر آتی ہے۔

اس وقت کبھی کبھی شکاری پھندے سے چپت کر لے جاتے ہیں۔ اس کے بچے چھوٹے چھوٹے لڑکے پکڑ کر خوب ہلا لیتے ہیں۔ وہ دودھ پلاتے ہیں چھوہارے کھلاتے ہیں۔ سنہری، روپہلی روئی اور بسکٹ کے پتے سی کر گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ ریشمی کلابتونی ڈوری اس میں باندھتے ہیں۔ اور ہاتھوں پر نچاتے ہیں۔ اس لاڈلے کو نرالا کھیل اور نیا تماشا جانتے ہیں۔ یہاں کے مصور اس کی دُم کے بالوں کی قلم بناتے ہیں۔ عجب عجب تصویریں کھینچتے ہیں۔ یہ لوگ اس کی دُم کی بدولت کما کھاتے ہیں

علامہ اقبال

بچے کی دعا

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری	زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے	ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت

جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب	علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا	دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو

نیک جو راہ ہو اس راہ پہ چلانا مجھ کو

ہمدردی

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا — بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی — اڑنے چگنے میں دن گزارا

پہنچوں کس طرح آشیاں تک — ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

سن کر بلبل کی آہ و زاری — جگنو کوئی پاس ہی سے بولا

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے — کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا

کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — میں راہ میں روشنی کروں گا

اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل — چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے

آتے ہیں جو کام دوسرے کے

پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ — وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی — اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہے چوٹ دل پر، آتا ہے یاد جس دم — شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت، وہ کامنی سی مورت — آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں — ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں — ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں — میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں — ڈر ہے یہیں قفس میں، میں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے — دل غم کو کھا رہا ہے، غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے — دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

نومبر ۱۹۰۹ء

ایک گائے اور بکری

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں
تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اُس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت
اور پیپل کے سایہ دار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
طائروں کی صدائیں آتی تھیں
کسی ندی کے پاس اک بکری
چرتے چرتے کہیں سے آ نکلی
جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا
پاس اِک گائے کو کھڑا پایا
پہلے جھک کر اُسے سلام کیا
پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں
گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں
کٹ رہی بُری بھلی اپنی
ہے مصیبت میں زندگی اپنی
جان پر آ بنی ہے، کیا کہیے
اپنی قسمت بُری ہے، کیا کہیے

دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں
رو رہی ہوں بُروں کی جان کو میں
زور چلتا نہیں غریبوں کا
پیش آیا لکھا نصیبوں کا
آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے
اس سے پالا پڑے خدا نہ کرے
دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے
ہوں جو دبلی تو بیچ کھاتا ہے
ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے
کن فریبوں سے رام کرتا ہے
اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں
دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
بدلے نیکی کے یہ برائی ہے
میرے اللہ، تیری دہائی ہے
سن کے بکری یہ ماجرا سارا
بولی ایسا گلہ نہیں اچھا
بات سچی ہے بے مزا لگتی
میں کہوں گی مگر خدا لگتی
یہ چراگاہ۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
یہ ہری گھاس اور یہ سایا

ایسی خوشیاں، ہمیں نصیب کہاں
یہ کہاں، بے زباں غریب کہاں
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں
لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی
قید ہم کو بھلی، کہ آزادی؟
سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا
واں کی گزران سے بچائے خدا
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا
ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا
قدر آرام کی اگر سمجھو
آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو
گائے سُن کر یہ بات شرمائی
آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا بُرا اس نے
اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

انتظاریہ

محمد خالد اختر

پگلوں کی چائے پارٹی

محمد خالد اختر، طنز و مزاح میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔ بہت کم مگر بہت شگفتہ لکھنے والے اس مصنف نے ایک بہت مشکل ترجمے کی جانب اپنے قلم کو حرکت دی ہے اور وہ ہے۔ ALICE IN WONDERLAND کا ترجمہ۔
ایک باب بچوں کے اس سال میں اس سے بہتر تحفہ خالد اختر کے پاس نہیں تھا۔!

گھر کے سامنے ایک درخت تلے ایک میز لگی تھی۔ اور جھلا خرگوش اور ٹوپ والا اس پر چائے پی رہے تھے۔ ایک باگڑ بچہ ان کے بیچ میں بیٹھا تھا نیند میں مدہوش اور دوسرے حضرات اس پر اپنی اپنی کہنی ٹیکے اور اس کے سر کے اوپر سے تبادلہ خیالات کرتے، اسے گویا ایک گھر کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

"باگڑ بچہ بے چارے کے لئے یہ اچھی خاصی بے آرامی ہے۔" ایلس سوچنے لگی۔ "شاید گھوگھو سویا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ کوئی احتجاج نہیں کر رہا۔"

میز اچھی لمبی چوڑی تھی، مگر تینوں اس کے ایک گوشے میں ایک دوسرے سے گندھے بیٹھے تھے۔

"کوئی جگہ نہیں۔ کوئی جگہ نہیں!" ایلس کو آتے دیکھ کر وہ واویلا کرنے لگے۔

"جگہ تو بہت ساری ہے۔" ایلس نے جھلا کر کہا اور میز کے آخر پر ایک بڑی آرام کرسی میں دراز ہو گئی۔

"انگور کا شربت وربت پیو گی!" جھلے خرگوش نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

ایلس نے میز پر ہر جانب نظر دوڑائی۔ لیکن اس پر سوائے چائے کے اور کوئی شے نہ تھی۔

"مجھے تو شربت کہیں دکھائی نہیں دیتا۔" اس نے کہا۔

"ہے ہی نہیں!" جھلے خرگوش نے کہا۔

"جب شربت نہیں ہے۔" ایلس بولی۔ "تو مجھے اس کی دعوت دینا کہاں کی شرافت ہے؟"

"تم کو بیٹھنے کو کس نے کہا؟" جھلے خرگوش نے کہا۔ "بن بلائے یوں آ بیٹھنا کہاں شرافت ہے؟"

"مجھے کیا پتہ کہ یہ تمہاری میز ہے۔" ایلس نے کہا "یہ تو تین سے بہت زیادہ آدمیوں کے لئے لگائی گئی ہے۔"

"تمہارے بالوں کو ترشوانے کی ضرورت ہے۔" ٹوپ والا بولا۔ وہ ایلس کو دیر سے بڑے تجسس کی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور یہ اس کی پہلی تقریر تھی۔ (گفتگو)

"تم کو لوگوں کی ذات کے بارے میں باتیں کرنے سے گریز کرنا چاہیئے۔" ایلس نے کچھ سختی سے کہا۔ "یہ نہایت بدتمیزی ہے۔"

ٹوپ والے نے یہ سنا تو اپنے دیدے چوڑے کھول کر اسے دیکھا۔ مگر اس نے صرف یہ کہا "بھلا ڈھوڈل کوا ایک لکھنے کی میز کی مانند کیوں ہوتا ہے؟"

"چلو!" ایلس نے سوچا "اب کچھ مزا آئے گا۔ میں خوش ہوں کہ انہوں نے بجھارتیں ڈالنا شروع کر دیا ہے۔" "میرا خیال ہے یہ بجھارت تو میں بوجھ ہی لوں گی۔" اس نے اونچی آواز سے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تم سمجھتی ہو تم اس کا جواب بتا سکتی ہو؟" جھلے خرگوش نے کہا۔

"ہاں بالکل یہی!" ایلس نے کہا۔

"پھر جو تم کہنا چاہتی ہو۔" جھلا خرگوش گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"میں کرتی ہوں" ایلس نے کہا۔ "کم از کم میں جو کہنا چاہتی ہوں۔ وہ کہتی ہوں۔" "تم جانو! یہ ایک ہی چیز ہے۔"

"ذرہ برابر بھی ایک چیز نہیں۔" ٹوپ والے نے کہا۔ "یوں تو تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ "میں جو کھاتی ہوں

اسے دیکھتی ہوں وہی چیز ہے جیسے 'میں جو دیکھتی اسے کھاتی ہوں'۔"

"اس طرح تو تم یہ بھی کہہ سکتی ہو" جھلّے خرگوش نے نے اضافہ کیا "کہ جو کچھ مجھے ملتا ہے میں اسے پسند کرتی ہوں۔ وہی چیز ہے جیسے جو کچھ میں پسند کرتی ہوں مجھ کو مل جاتا ہے۔"

"اس طرح تو تم یہ بھی کہہ سکتی ہو" بالگر چوہے نے کہا۔ وہ سوتے میں بولتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ "کہ جب میں سوتی ہوں۔ تو سانس لیتی ہوں، وہی چیز ہے جو میں سانس لیتی ہوں تو سوتی ہوں۔"

"تمہارے ساتھ تو وہی چیز ہے" ٹوپ والے نے کہا اور یہاں گفتگو ختم سی ہو گئی۔ اور سب منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ اس دوران میں ایلس ڈھوڈلی کوؤں اور لکھنے کی میزوں کے متعلق جتنی باتیں یاد کر سکتی تھی۔ ان کو سوچنے لگی۔

ٹوپ والے نے سب سے پہلے خاموشی کو توڑا "آج مہینے کا کونسا دن ہے" اس نے ایلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی گھڑی اپنی جیب میں سے نکال لی تھی۔ اور اسے بے سکونی سے گھور رہا تھا۔ گھورتے ہوئے وہ اسے وقتاً فوقتاً زور سے کھڑکاتا اور اپنے کان سے لگا کر اس کی ٹک ٹک سننے کی کوشش کرتا۔

ایلس نے تھوڑے سے غور کے بعد کہا "چوتھا"

"دو دن غلط" ٹوپ والے نے آہ بھری "میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ مکھن پرزوں کے لئے ٹھیک نہیں رہے گا" اس نے سخت غصے سے جھلّے خرگوش کی طرف دیکھا۔

"یہ بہترین مکھن تھا" جھلّے خرگوش نے نہایت عاجزی سے جواب دیا۔

"درست، مگر کچھ تو اس کے بھورے بھی پرزوں میں چلے گئے ہوں گے" ٹوپ والا بڑبڑایا۔ "تمہیں مکھن کو روٹی والی چھری سے گھڑی میں نہیں ڈالنا چاہئیے تھا۔"

جھلّے خرگوش نے گھڑی لے لی اور اسے بڑی یاس سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اسے اپنی چائے کی پیالی میں ڈبکی دی۔ اور دوبارہ اس کو دیکھا۔ لیکن اس نے پہلے جو کچھ کہا تھا۔ اس سے زیادہ معقول وجہ اس کو نہ سوجھ سکی۔ "اس نے وہی پہلا فقرہ دہرایا۔ "تم جانو یہ بہترین مکھن تھا۔"

ایلس اس کے کندھے کے اوپر سے کچھ اچنبھے سے دیکھتی رہی تھی۔

"کیسی عجیب گھڑی ہے!" وہ بول اٹھی "یہ مہینے کا دن تو بتاتی ہے۔ یہ نہیں بتاتی ہے۔ یہ نہیں بتاتی کہ کتنے بجے ہیں۔"

"کیوں بتلائے" ٹوپ والا بڑبڑایا "کیا تمہاری گھڑی تمہیں بتاتی ہے کہ سال کونسا جا رہا ہے۔"

"ہاں نہیں بتاتی" ایلس نے فوراً جواب دیا، پر اس کی وجہ تو یہ ہے کہ اتنا لمبا عرصہ ایک ہی سال رہتا ہے۔"

"میری گھڑی کے ساتھ بھی یہی صورت ہے" ٹوپ والے نے کہا۔

ایلس بے حد چکرائی۔ ٹوپ والے نے جو کہا تھا اس میں اسے کوئی معنی نظر نہ آئے تاہم زبان بالکل صاف تھی۔

"میں تمہیں پوری طرح نہیں سمجھ پائی" اس نے انتہائی شائستگی سے کہا جتنی موقع کے لحاظ سے موزوں تھی

"بالگر چوہا پھر سو گیا ہے" ٹوپ والے نے کہا، اور اس نے تھوڑی سی گرم چائے اس کے ناک پر انڈیل دی۔

بالگر چوہے نے اپنا سر جھلاہٹ میں ادھر اُدھر کیا۔ اور اپنی آنکھیں کھولے بغیر کہا "بالکل بالکل میں بھی یہی بات کہنے والا تھا۔"

"کیا تم نے بجھارت بوجھ لی ہے؟" ٹوپ والا پھر ایلس کی طرف متوجہ ہوا۔

"لیکن میں نے ہار مان لی" ایلس نے جواب دیا "تم جواب بتا دو۔"

"مجھے کیا معلوم!" ٹوپ والا بولا "مجھ کو تو بالکل نہیں آتا۔"

"مجھ کو بھی نہیں" جھلّے خرگوش نے کہا۔

ایلس نے تھکاوٹ سے ایک ٹھنڈی سانس لی "میں سمجھتی ہوں کہ تم کو وقت گزارنے کا کوئی بہتر طریقہ سوچنا چاہئیے۔ بجائے اس کے کہ ایسی بجھارتیں بجھوا کر اسے ضائع کرو۔ جن کا کوئی جواب ہے ہی نہیں۔"

"اگر تم وقت کو اتنی اچھی طرح جانتیں جتنا میں" ٹوپ والے نے کہا "تو تم اس کو ضائع کرنے کی بات نہ کرتیں۔ دیکھو وہ رہا وقت۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"سمجھ کیوں آنے لگا" ٹوپ والے نے حقارت سے اپنا سر اچھالا۔ "میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ تم

کبھی وقت سے بات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا؟"

"شاید نہیں۔" ایلس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ "مگر میں یہ جانتی ہوں کہ وقت آن پہنچتا ہے اور وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔"

"ہوا ہوا!" ٹوپ والا ہنسا "اب پتہ چل گیا، یہی ساری وجہ ہے۔ وقت یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اسے انتظار کرایا جائے۔ اب اگر تم اس سے مروت ولحاظ برتتیں تو گھڑی گھڑیال کے ساتھ جو چاہتیں، وقت تمہیں کرنے دیتا۔"

"مثال کے طور پر فرض کرو صبح کے نو بجے ہیں جو کتاب لے بیٹھنے کا وقت ہے۔ تم صرف چپکے سے وقت کے کان میں دل کی بات کہہ دو۔ اور پلک جھپکنے میں گھڑی کی سوئی گھوم کر ڈیڑھ بجے پر آ جائے گی، ڈیڑھ بجے! کھانے کا وقت۔"

("کاش اب ڈیڑھ بجے ہوتے۔" چھوٹے خرگوش نے اپنے آپ سے سرگوشی میں کہا)۔

"یہ تو واقعی خوب شاندار بات ہوگی۔" ایلس بولی "لیکن پھر تم جانو! مجھ کو بھوک تو نہیں ہوگی۔"

"فوراً تو شاید نہیں۔" ٹوپ والے نے کہا "لیکن تم جب تک چاہو اسے ڈیڑھ بجے تک رکھ تو سکتی ہو —!"

"کیا تم نے بھی یہی طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔" ایلس نے پوچھا۔

ٹوپ والے نے ماتمی انداز میں سر دائیں بائیں ہلایا۔

"میں نے — لاحول ولا قوۃ!" اس نے جواب دیا "یہ مارچ جو گذرا ہے۔ اس میں ہم کس بات پر لڑ پڑے — میں اور چھوٹا خرگوش — یہ چھوٹے خرگوش کے بالکل پاگل ہونے سے ایک دو دن پہلے کی بات ہے —" (چائے کی چمچی سے چھوٹے خرگوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "یہ موقع تھا جب حکم کی بیگم نے ایک عالیشان ناچ رچایا۔ جس پر مجھے یہ گیت گانا تھا۔

تم آسمان کی طرف نہ دیکھو
یہ شکرے، چیلیں اور پرندے
یوں ہی اُڑتے رہیں گے سارے
تم آسمان کی طرف نہ دیکھو

"غالباً تم کو یہ گیت آتا ہوگا؟"

"میں نے اس قسم کا گیت سنا تو ہے۔" ایلس نے تسلیم کیا۔

"آگے یہ گیت" ٹوپ والا نے مزید کہا۔ اس طور پر ہے۔

اُڑو چیلو اُڑو پرندو
اُڑو چرندو اُڑو درندو
تم آسمان کی طرف نہ دیکھو

یہاں بالکل چوہے نے جھرجھری لی اور اپنی نیند ہی میں گانے لگا "چرندو۔ پرندو۔ درندو۔ فرندو۔ گرندو" اور اتنی دیر تک جاری رکھا کہ انہیں اسے چپ کرانے کیلئے اس کی گردن میں چٹکی لینا پڑی۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا" ٹوپ والے نے کہا۔ "میں بمشکل گیت کا پہلا مصرعہ ہی ختم کیا تھا کہ ملکہ نے واویلا کر دیا۔ یہ وقت کا خون کر رہا ہے اس کی گردن اڑا دو!"

"کیا وحشیانہ بات ہے، اُف توبہ!" ایلس نے زور سے کہا۔

"...... اور اس وقت سے" ٹوپ والا اسی ماتمی لہجے میں بولتا گیا "یہ (اس نے چھوٹے خرگوش کی طرف دیکھا)، میری بات کی پرواہ نہیں کرتا۔ جو میں اسے کہتا ہوں۔ یہ ہمیشہ اس کے الٹ کرتا ہے۔ اسی لئے یہاں اب ہمیشہ چھ بجے کا وقت رہتا ہے۔"

"ایلس کے ذہن میں ایک چٹکیلا خیال آیا "کیا اسی وجہ سے اتنی ساری چائے کی چیزیں یہاں میز پر لگی ہوئی ہیں؟"

"ہاں یہی وجہ ہے۔" ٹوپ والے نے آہ بھرتے ہوئے کہا "یہاں ہمیشہ چائے کا وقت رہتا ہے اور ہمیں درمیان میں پرچ پیالیوں کو دھونے کا وقت بھی نہیں ملتا۔"

"پھر تم میز کے گرد چکر لگاتے رہتے ہو گے۔" ایلس نے کہا۔

"بالکل۔ بالکل۔" ٹوپ والے نے کہا "جوں جوں پرچ پیالیاں استعمال ہوتی جاتی ہیں۔ ہم میز کے گرد تین کرسیاں آگے بڑھتے جاتے ہیں۔"

"لیکن جب تم پھر اسی جگہ پر آ جاتے ہو جہاں سے شروع ہوئے تھے؟" ایلس نے دریافت کرنے کی ہمت کی۔

"تو پھر کیا ہوتا ہے۔

"کیا خیال ہے۔ صاحبان۔ موضوع کو بدل دیا جائے۔" چھوٹے خرگوش نے جمائی لیتے ہوئے دخل در معقولات کیا "میں اس سے اکتا سا گیا ہوں۔ میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ ہم اس چھوٹی لڑکی سے کوئی کہانی سنیں؟"

"مجھے ڈر ہے کہ مجھے تو کوئی کہانی نہیں آتی۔" ایلس

جھلّے خرگوش کی تجویز پر گھبرا کر بولی۔

"پھر باگھڑ چوہا ہنسنے لگا" وہ دونوں چلائے "اٹھ باگھڑ چوہے۔" کافی سو لیا۔ اور انہوں نے دونوں طرف اس کی چٹکی لی۔

باگھڑ چوہے نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھولیں "میں سو یا ہوا کہاں تھا" اس نے ایک بھاری کمزور آواز میں کہا "تم لوگوں میں جو باتیں ہو رہی تھیں میں نے اس کا ایک ایک لفظ سنا ہے۔"

"ہمیں کہانی سناؤ" جھلّے خرگوش نے کہا۔

"ہاں بھئی سناؤ نو، ایلس نے بھی باگھڑ چوہے کی منت خوشامد کی۔

"اور ذرا جلدی سنانے کی کرو" ٹوپ والے نے اضافہ کیا "ورنہ اس کے ختم ہونے سے پہلے تم پھر سو جاؤ گے۔"

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ تین چھوٹی بہنیں تھیں" باگھڑ چوہے نے بڑی جلدی جلدی اپنی کہانی شروع کر دی۔ "اور ان کے نام ایلسی۔ لیسی، اور ٹلی تھے۔ اور وہ ایک کنوئیں کی تہہ میں رہتی تھیں۔"

"وہ کھاتی پیتی کیا تھیں" ایلس نے پوچھا چونکہ اسے کھانے پینے کی باتوں سے بڑی دلچسپی تھی۔

"وہ گڑ کا شیرہ کھاتی تھیں" باگھڑ چوہے نے ایک دو لمحہ سوچ کر کہا۔

"تم جانو، بھلا وہ ایسا کیونکر کر سکتی تھیں" ایلس نرمی سے بولی "گڑ کا شیرہ کھا کھا کر تو وہ بیمار پڑ جاتیں"

"بیمار تو وہ پڑ گئیں — یہی تو میں بتانے والا تھا" باگھڑ چوہے نے کہا "بڑی سخت بیمار .... بلکہ علیل کہو۔"

ایلس نے یہ تصوّر باندھنے کی تھوڑی سی کوشش کی اس قسم کے جینے کا غیر معمولی ڈھنگ کیسا ہوتا ہوگا۔ لیکن اس کا سر اس سوچ سے چکرانے لگا۔ اس لئے وہ آگے بولی۔

"مگر باگھڑ چوہے! یہ بتاؤ۔ وہ کنوئیں کی تہہ میں کیوں رہتی تھیں؟"

"کچھ اور چائے لو" ٹوپ والے نے بڑی متانت سے ایلس سے کہا۔

"ابھی تک میں نے چائے پی ہی نہیں" ایلس نے رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "اس لئے کچھ اور میں کیسے پی سکتی ہوں؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم کچھ کم چائے نہیں پی سکتیں" ٹوپ والے نے کہا "کچھ نہیں' سے کچھ اور پینا بڑا آسان ہے۔"

"کسی نے تمہاری رائے نہیں پوچھی" ایلس نے کہا۔

"ہو! ہو! اب ذاتی باتیں کون کر رہا ہے۔" ٹوپ والے نے فاتحانہ انداز میں پوچھا۔

ایلس کو کچھ نہ کچھ سوجھا کہ اس کا جواب دے اس لئے اس نے چائے اور مکھن توس کو کچھ توجہ دی پھر باگھڑ چوہے کی طرف پلٹ کر اپنے سوال کو دہرایا "وہ کنوئیں کی تہہ میں کیوں رہتی تھیں؟"

باگھڑ چوہے نے اس بارے میں ایک دو لمحے سوچا اور بولا "یہ گڑ کے شیرے کا کنواں تھا۔"

"ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی" ایلس بڑے غصے سے کہنے لگی تھی۔ مگر ٹوپ والے اور جھلّے خرگوش نے "شی۔ شی" کرتے ہوئے اسے روک دیا۔ اور باگھڑ چوہے نے روٹھے لہجے میں کہا "اگر تم شائستہ نہیں ہو سکتیں۔ تو بہتر ہوگا کہانی کو خود ختم کر لو۔"

"نہیں۔ پلیز۔ سناتے چلو" ایلس نے بڑی مسکین بن کر کہا "میں پھر تم کو نہیں ٹوکوں گی.... ہاں شیرے کا کنواں ضرور ہوتا ہوگا!"

"ہوتا ہوگا!" باگھڑ چوہے نے شدید خفگی سے کہا۔ پر وہ کہانی جاری رکھنے پر رضامند ہو گیا "اور پھر یہ تین چھوٹی بہنیں — تم جانو — وہ کھینچنا سیکھ رہی تھیں۔"

"وہ کیا کھینچتی تھیں" ایلس اپنا وعدہ بھول کر پوچھ بیٹھی۔

"گڑ کا شیرا" باگھڑ چوہے نے اس بار غور کرنے کے بغیر جواب دیا۔

"مجھے ایک صاف پیالی درکار ہے" ٹوپ والے نے کہا "آؤ۔ ایک ایک کرسی آگے ہو جائیں" یہ کہہ کر وہ ایک ساتھ کی خالی کرسی پر ہو بیٹھا۔ اور باگھڑ چوہے نے بھی لپٹن ڈوری میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ جھلّا خرگوش باگھڑ چوہے کی جگہ میں آگیا۔ اور ایلس نے کچھ رضامندی نارضامندی سے جھلّے خرگوش کی جگہ لے لی۔ اس تبدیلی سے صرف ٹوپ والے کو ہی فائدہ ہوا۔ اور ایلس تو پہلے سے بڑی بری صورت میں تھی۔ کیونکہ جھلّے خرگوش نے جاتے ہوئے دودھ دان کو اپنی پرچ میں گرا دیا تھا۔

ایلس دوبارہ باگھڑ چوہے کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے بڑے محتاط انداز میں بات شروع کی۔

"وہ اپنا گڑ کا شیرا آخر کھینچتی کہاں سے تھیں؟"

"تم پانی کے کنوئیں سے پانی کھینچ سکتی ہو کہ نہیں؟" ٹوپ والے نے ذرا جھڑکنے کے انداز میں کہا "اس

...میں سمجھتا ہوں کہ گڑ کے شیرے کے کنوئیں سے گڑ کا شیرا بھی کھینچا جا سکتا ہے۔ ــــ کم عقل!"

"لیکن وہ تو کنوئیں کی تہ میں رہتی تھیں" ایلس نے ٹوپ والے کے آخری لفظ کو کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے باگڑ چوہے سے کہا۔

"ہاں میں نے کب کہا ہے کہ وہ نہیں رہتی تھیں" باگڑ چوہا بولا "وہ بالکل کنوئیں کے اندر تھیں" اس جواب سے غریب ایلس اتنی شپٹائی کہ اس نے تھوڑی دیر باگڑ چوہے کو اپنی کہانی جاری رکھنے دی۔ اور بیچ میں کچھ نہ بولی۔

"وہ کھینچنا سیکھ رہی تھیں" باگڑ چوہا کہتا گیا۔ اسے اب جمائیاں آنے لگی تھی۔ اور وہ اپنی آنکھوں کو مل رہا تھا۔ کیونکہ اسے بڑی اونگھ آ رہی تھی "اور وہ ہر قسم کی چیزیں کھینچا کرتی تھیں۔ ہر وہ چیز جو م سے شروع ہوتی ہے..."

"م والی کیوں؟" ایلس نے کہا

"کیوں نہیں؟" جھلے خرگوش نے کہا

ایلس چپ ہو گئی۔

باگڑ چوہے نے اس وقت تک اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور نیند کی جھپکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ مگر ٹوپ والے نے اسے چٹکی بھری تو وہ ایک چھوٹی سی 'چیں' کے ساتھ پھر جاگ گیا۔ اور بولتا گیا "ــــ جو م سے شروع ہوتی ہے... مثلاً مچھلیاں۔ مینڈے۔ میزیں۔ مکوڑے۔ مرتبان۔ مرغا اور منع کرنا ــــ تم جانو۔ ہم کہتے ہیں نا۔ منع نہ کرو۔ وہ منع کرتا ہے۔ وہ منع کرتی ہے۔ اس نے منع کیا ــــ کیا تم نے کبھی "منع کرنا" کے کھینچنے کا سنا ہے؟"

"سچ مچ! اب جو تم نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے" ایلس نے قطعی چکرا کر کہا "میں نہیں سمجھتی کہ... ..."

"پھر تمہیں خواہ مخواہ بولنا نہیں چاہیئے" ٹوپ والا بولا۔

ٹوپ والے کی یہ بدتمیزی ایلس کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ بڑی برہمی میں ناک بھوں چڑھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور وہ چل دی۔ باگڑ چوہا تو فوراً سو گیا۔ اور دوسروں نے اس کے جانے کو ذرہ بھر بھی توجہ نہ دی۔ ایلس نے ایک دو بار پیچھے مڑ کر دیکھا بھی کچھ کچھ اس امید سے کہ وہ اس کو پلٹ آنے کے لئے کہیں گے۔ آخری بار جب اس نے انہیں دیکھا۔ تو وہ باگڑ چوہے کو چائے دانی میں داخل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"خیر۔ جو بھی ہو۔ میں اب یہاں کبھی نہیں آؤں گی" ایلس نے جنگل میں سے اپنا راستہ ڈھونڈتے ہوئے کہا۔ "اتنی سخت بے ہودہ چائے پارٹی تو میں نے ساری زندگی نہیں دیکھی"

وہ یہ کہہ ہی رہی تھی کہ اسے ایک درخت نظر آیا جس کے تنے میں ایک دروازہ جڑا ہوا تھا۔

"یہ تو بڑی اچنبھے کی بات ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ "لیکن آج کونسی چیز ہے جو اچنبھے کی نہیں۔ اب سوچا کیا۔ کیوں نہ اندر چلی جاؤں؟" اور وہ دروازے میں سے اندر داخل ہو گئی۔

ایک دفعہ پھر اس نے خود کو اسی لمبے ہال کمرے میں پایا۔ اور بالکل چھوٹی بلور کی میز کے پاس!

"اب اس دفعہ میں پہلے سے تو زیادہ عقل برتوں گی" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے اپنے منصوبے پر عمل کی ابتدا ننھی سنہری چابی اٹھا کر اس دروازے کو کھولنے سے کی۔ جس میں سے راستہ باغیچے میں جاتا تھا۔ پھر وہ سانپ چھتری کو کترنے لگی۔ (اس نے اس کا ایک ٹکڑا اپنی جیب میں رکھ لیا تھا) اس کے کترنے سے جب وہ ایک فٹ قد کی ہو گئی۔ تو وہ چھوٹے راستے پر چل پڑی۔ اور پھر اس نے آخکار خود کو خوبصورت باغیچے میں پایا۔ ہر طرف چمکدار پھولوں کے تختے تھے۔ اور ٹھنڈے فوارے!

یونس جاوید

صبح کا بھولا

گھر سے اسکول جاتے جاتے اچانک حامد کے دل میں خیال آیا کہ آج چھٹی ہی کیوں نہ کی جائے۔ تمام دن سڑکوں پہ گھوما پھرا جائے۔ باغ کی سیر کی جائے۔ تتلیاں پکڑی جائیں اور درختوں کے نیچے بیٹھ کر ٹھنڈی چھاؤں اور مزے دار کہانیوں کا لطف اٹھایا جائے۔ شاید یہ بات

جائے۔ یہ بات شاید اس لئے اس کے دل میں آگئی تھی کہ آسمان پر اُجلے بادل چھائے ہوئے تھے۔ شروع گرمیوں کا موسم تھا اور گھر سے نکلتے ہی جو ٹھنڈی خوشگوار ہوا حامد کے سینے میں بھری تو اس نے اسکول جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔

"گھر والوں کو پتا نہ چل جائے؟" اس کے دل میں خیال آیا۔

"تو ـــ بھلا گھر والوں کو کس طرح علم ہو سکتا ہے۔ میں گھر عین وقت پر جاؤں گا جس طرح ہر روز اسکول سے واپس جاتا ہوں۔" حامد نے اپنے دل میں کہتے ہوئے خیال کو جھٹک دیا اور اسکول جانے والے راستے سے ہٹ کر دوسری سڑک پر ہو لیا۔

یہ سڑک ایک باغ میں جا نکلی تھی۔ باغ کے بالکل ساتھ چڑیا گھر بھی تھا جس میں مور، راج ہنس، شیر، چیتا، ریچھ، ہرن سبھی جانور تھے۔ مگر حامد کا خیال تھا کہ پہلے باغ کی سیر کی جائے۔ سو وہ تیز تیز چلتا ہوا باغ میں آگیا۔ اُسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باغ میں اس وقت رونق یا بھیڑ بھاڑ نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ میری طرح بہت سے اور لڑکے بھی سکول سے بھاگ کر آئے ہوں گے، مگر یہاں تو باغ کے مالیوں کے سوا اور کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ کچھ سوچتا ہوا ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اور ایک کونے میں رکھے ہوئے خوبصورت بنچ پر آ بیٹھا۔ یہاں تک آتے ہوئے وہ تھک سا گیا اور ابھی تک خاک بھی لطف نہ آیا تھا۔ بستہ زمین پر رکھ کر وہ بنچ پر لیٹ جانا چاہتا تھا کہ اُسے دو تین رنگ برنگی تتلیاں نظر آئیں۔ اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ کتنی خوبصورت ہیں یہ تتلیاں۔ وہ بستہ بنچ کے نیچے رکھ کر ان کے پیچھے دوڑا۔ تتلیاں اُدھر سے اِدھر، اِدھر سے اُدھر اڑ رہی تھیں۔ جب حامد اُن کے قریب پہنچا تو وہ پھر سے اڑ کر دور جا بیٹھتیں۔ اس بھاگ دوڑ میں وہ پہاڑی کے دوسرے کنارے تک چلا گیا۔ یہاں تین چار تتلیاں ایک ساتھ بیٹھی تھیں۔ اُس نے رومال پھینک کر دو پکڑ لیں۔ انہیں رومال میں باندھ لیا۔ باقی اُڑ کر پیچھے کی طرف جا رہی تھیں۔ اور اُن کے پیچھے پیچھے دُور تک چلا گیا اور بڑی تگ و دو کے بعد ایک تتلی اور پکڑ سکا۔ وہ اس وقت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ آخر تتلی کو جیب میں ڈال کر وہ رومال میں بندھی تتلیوں کو تلاش کرنے لگا، جنہیں وہ ایک درخت کے نیچے رکھ گیا تھا۔ مگر اُسے سخت افسوس ہوا۔ دو تتلیوں میں ایک اڑ چکی تھی۔

ناچار اُس نے دونوں کو رومال میں باندھ لیا اور بستے کو تلاش کرنے لگا۔ سامنے ہی بنچ تھا۔ وہ دوڑ کر قریب آیا تو اُس کے نیچے بستہ نہیں تھا۔ وہ بڑا حیران ہوا۔ جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا اُسے کوئی نہ کوئی بنچ دکھائی دیتا۔ لیکن اُن کے نیچے بستہ نظر نہ آتا تھا۔ شاید وہ یہ بھول چکا تھا کہ اس نے کس بنچ کے نیچے رکھا ہے۔ ایک گھنٹے تک وہ مارا مارا پھرتا رہا۔ اُسے پیاس بھی لگ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ سامنے ایک اور بنچ تھا۔ اِس کے نیچے اس کا بستہ رکھا تھا۔ وہ بھاگ کر قریب پہنچا اور بستے کو اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اُس کی چیخ نکل گئی۔ وہ جنگلی بلا تھا جو سو رہا تھا۔ وہ پہلے تو غرایا

اور پھر اُس نے زور سے چھلانگ لگائی کہ حامد پہاڑی پر سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

وہ مایوس ہو کر سہما سہما مُڑا تو اُس کے پاؤں کے بالکل قریب سے ایک مینڈک اُچھل پڑا۔ وہ مینڈک سے ڈرتا تو نہیں تھا۔ مگر اچانک اُس کے اُچھلنے سے ڈر گیا تھا۔

اُسے یاد آیا کہ اس جگہ سانپ سے بھی سامنا ہو سکتا ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اُس کے سامنے کالے سیاہ اور زرد زرد سانپ رینگنے لگے۔ اُس نے ایک منٹ تک آنکھیں بند رکھیں اور پھر گویا سامنہ بنا کر پہاڑی سے اترنے لگا۔

سڑک پر آکر اُسے دل سے ایک بوجھ اُترتا ہوا محسوس ہوا۔ ابھی اُس نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا اور چلنے ہی والا تھا کہ خیال آیا کہ بستہ تو پہاڑی پر رہ گیا ہے۔ وہ اس خیال سے اُداس ہو گیا۔ دوبارہ پہاڑی پر چڑھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ بغیر سوچے سمجھے سڑک پر چلنے لگا۔ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ وہ بستہ لئے بغیر گھر کیوں کر جا سکتا ہے۔ یوں تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور شاید پھر اُس پر اعتماد نہ کیا جائے اور اسکول کے لڑکے بھی اُسے آوارہ سمجھیں اور ماسٹر صاحب بھی اُسے نالائق لڑکوں کی فہرست میں جگہ دیں ___ ہائے! وہ کیوں اسکول نہ چلا گیا؟

اب چڑیا گھر کی دیوار شروع ہو گئی تھی دیوار کیا تھی ___ جنگلہ سا تھا جس میں سے اکثر جانور دکھائی دے رہے تھے۔

وہ جنگلے کے پاس کھڑا ہو کر اُس ہرن کو دیکھنے لگا جو گھاس کھا رہا تھا۔ اُس کے دائیں طرف پانی کے چھوٹے سے حوض میں راج ہنس تیر رہے تھے اور دور سے شیر کے دھاڑنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ وہ ایک منٹ کے لئے بستے کو بھول گیا اور جانور دیکھنے لگا۔ بہت سے لوگ بھی پنجروں سے کچھ دور کھڑے جانور دیکھ رہے تھے اور انہیں چنے وغیرہ بھی کھلا رہے تھے۔ یکایک اُسے طاہر نظر آیا۔

طاہر اُس کا خالہ زاد بھائی تھا اور اُس سے دو برس بڑا بھی تھا۔ اُس نے سوچا اگر طاہر مان جائے تو بستہ تلاش کیا جا سکتا ہے اور.... یہی کچھ سوچ کر اُس نے فوراً طاہر کو آواز دی مگر طاہر تک یہ آواز نہ پہنچ سکی۔ طاہر وہاں سے ہٹ کر بندر دیکھنے آگے نکل گیا۔

حامد اُس وقت بڑا بے چین تھا۔ اُسے بستہ تلاش کر لینے کا ایک راستہ دکھائی دیا تو تھا مگر اب چڑیا گھر کے ٹکٹ کی مجبوری تھی اور جیب میں صرف دس پیسے تھے۔

اچانک اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ اُس کے سامنے ایک جگہ سے جنگلا ٹوٹا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے قدم آگے بڑھائے اور چاہتا تھا کہ اندر کود جائے مگر سڑک پر دو راہگیروں کے آجانے سے وہ رُک گیا۔ وہ لوگ گزر گئے تو اُس نے دوبارہ ہمت باندھی اور ڈرتے ہوئے جنگلے سے اندر قدم رکھ دیا۔ ایک لمحے میں وہ چڑیا گھر کے اندر تھا۔

وہ خوش تو اندر پہنچ گیا تھا مگر ٹوٹے ہوئے جنگلے کی ایک کیل میں اُس کا قمیض بُری طرح پھنس گیا تھا جسے چھڑانے کے لئے اُسے دو منٹ تک رُکنا پڑا۔ کوشش کے باوجود قمیض تار میں الجھا رہا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے قمیض علیحدہ کیا تو وہ اُوپر تک پھٹ گیا۔

وہ ابھی اپنا پھٹا ہوا قمیض دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک خاکی وردی والے چڑیا گھر کے نگران نے اُسے گردن سے آدبوچا۔ اُس کی چیخ تک نہ نکل سکی۔ اُس نے ہاتھ پاؤں مار کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ ناچار وہ ہانپ کر رہ گیا۔

"مجھے چھوڑ دو" اُس نے ہانپ کر کہا۔

"کیوں چھوڑ دوں؟ تم بغیر ٹکٹ اور غلط راستے سے اندر آئے۔ تمہیں اب پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔"

پولیس کا نام سُن کر تو حامد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور حلق سوکھنے لگا۔ وہ آدمی حامد کو اپنے دفتر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ حامد پھُس پھُس کر کے رونے لگا تھا۔ اس نے لاکھ منتیں کیں مگر اُس آدمی نے اُسے نہ چھوڑا اپنے افسر کے پاس لے گیا۔

یہ ایک بڑی بڑی مونچھوں والا سیاہ رنگ کا موٹا سا آدمی تھا۔ حامد اُسے دیکھ کر ہی ڈر گیا۔ مگر وہ آدمی قدرے رحم دل نکلا۔ اس نے حامد سے سب حالات پوچھے۔ حامد نے اُسے سب کچھ بتایا اور پھر رونے لگا۔ اس بڑے افسر نے اسے تسلی دی اور کہا "تمہیں بہت تھوڑی سزا ملے گی۔ صرف آج

کہ آج شام تک تمہیں اس چھوٹے سے کمرے میں بند رہنا پڑے گا۔" اس نے یہ کہہ کر چپڑاسی کو اشارہ کیا تو واقعی چپڑاسی نے اسے چھوٹے سے تاریک کمرے میں بند کر دیا۔

اس کمرے میں حامد کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کا جی پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ کاش وہ اسکول سے چھٹی نہ کرتا۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر سسکنے لگا اور دیر تک سسکتا سبکتا رہا۔ حتیٰ کہ اس افسر نے خود دروازہ کھولا اور اس شرط پر رہا کر دیا کہ آئندہ کبھی وہ اسکول سے نہیں بھاگے گا۔ حامد نے وعدہ کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ چپڑاسی اسے چڑیا گھر کے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔

وہ اس وقت بے حد غمگین تھا۔ اتنا غمگین کہ اسے بہت دیر تک چلنے کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ اُس کا ایک جوتا غائب ہے۔

ایک جوتا ایک پاؤں میں تھا، دوسرا جانے اس افراتفری میں کہاں گم ہو گیا تھا۔ اس کے دکھ میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

وہ پھٹا ہوا قمیص، ایک جوتا ہاتھ میں پکڑے بغیر رستے کے روتا بسورتا جب گھر میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ اس کے ابا جان برآمدے میں کرسی پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے حامد کو اس حالت میں دیکھا تو انہیں بہت غصہ آیا۔

حامد کچھ کہنے کے بجائے رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر امی دوڑتی آئیں۔ اور بیٹے کی بلائیں لینے لگیں۔ حال پوچھا تو حامد نے شروع سے آخر تک سچ سچ بتا دیا۔ اس پر اس کے ابا جان کو اور بھی غصہ آیا مگر حامد نے فوراً کہا "ان سب چیزوں کے باوجود میں نے آج کا سبق اچھی طرح یاد کیا ہے ابا جان!"

"وہ کیا ــــ ؟" اس کے ابا ذرا نرم ہو کر بولے

"یہ کہ اسکول سے نہیں بھاگنا چاہیے۔ تتلیوں کو یا کسی بھی پرندے یا جانور کو قید نہیں کرنا چاہیے۔ بلا ٹکٹ چڑیا گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔" یہ کہتے کہتے حامد نے رومال سے دونوں تتلیوں کو نکالا اور اچھال دیا۔ وہ ہوا میں اُڑنے لگیں اور سامنے درخت پر جا بیٹھیں۔

"خوب! ــــ" اس کے ابا بولے۔ "اگر واقعی تم نے ان تکلیفوں کے بعد یہ سبق سیکھا ہے تو پھر تم بڑے خوش قسمت ہو۔ لہٰذا تمہارا قصور معاف۔"

حامد مارے خوشی کے ماں سے لپٹ گیا۔ اس کے ابا بھی پاس کھڑے مسکرا رہے تھے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

شان الحق حقی

شہرت بخاری

ماہِ نو

کتنے خوش رنگ حسیں خواب دکھائے ہیں تمہیں
چاند تاروں کے سفر میں نے کرائے ہیں تمہیں
آج تم مجھ کو وہی خواب دکھاؤ
آؤ
آؤ بچو! آؤ

یاد ہے کتنی تمہیں لوریاں میں نے دی ہیں
گود میں لے کے تمہیں پیار کی باتیں کی ہیں
گود میں اپنی مجھے آج بٹھاؤ
آؤ
آؤ بچو! آؤ

بچوں کے لئے بچوں کے شاعر صوفی تبسم کی آخری نظم

ماہِ نو
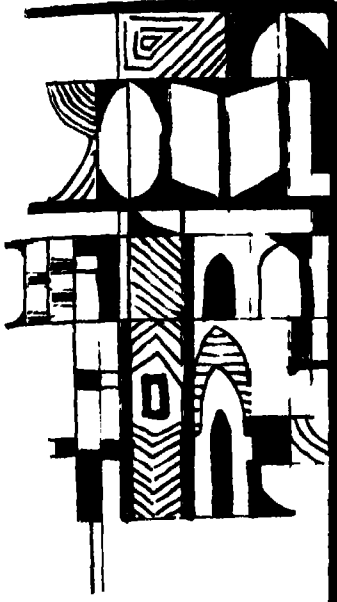
احمد پرویز، مریم حبیب، صادقین، معین نجمی، اسحاق شور

احمد پرویز

دسمبر ۱۹۷۹ء

صدر مجلس ادارت
سید امجد علی

چیف ایڈیٹر
کشور ناہید

ایڈیٹر ۔ علی محمود حسینی
جائنٹ ایڈیٹر ۔ قائم نقوی

ترتیب

مضامین

نظمیں

افسانے

فن اور فنکار

سلام

غزلیں

اس ماہ کی کتابیں

سرورق ——— احمد پرویز

آئندہ شمارے کی جھلکیاں

"عزیز احمد، سلیم احمد، راغب مرادآبادی، رفعت سلطان، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، الطاف پرواز ڈاکٹر سلیم اختر، خالدہ حسین، جابر علی سید، نسیم نیشوفوز، محمود شام، سلیم کوثر، جمال احسانی اختر ہوشیارپوری، جاذب قریشی، سائرہ ہاشمی، فردوس حیدر، امراؤ طارق، تاجور سامری، طاہرہ بلوچ، کہکشاں ملک، کرنل غلام سرور، خالد شیرازی، ستار سید، سرور اقبال"

رجسٹرڈ ایل نمبر ۸۱۱۸ — جلد نمبر ۳۲ ——— شمارہ نمبر ۱۲ — طلباء کیلئے بمع رجسٹری فیس ۲۰ روپے
قیمت ۲ روپے — سالانہ چندہ مع رجسٹری فیس ۳۰ روپے

مطبوعات پاکستان نے دین محمدی پریس بل روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہِ نو ۳۲ رائے حبیب اللہ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

امیر حمزہ خان شنواری

اقبال ـ خودی اور تصوف

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال مرحوم کائنات کی ہر شے کو ایک "انا" سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ خداوند تعالیٰ "انائے اکبر" ہے اور یہ نمو پذیر کائنات اُسی عظیم و برتر "انا" سے صادر ہو رہی ہے اور چونکہ انائے اکبر سے صرف "انائیتوں" ہی کا صدور ہو سکتا ہے۔ اس لئے کائنات کی ہر شے چھوٹی ہو یا بڑی اپنی ماہیت میں ایک انا ہے۔ علامہ مرحوم نے اپنے مشہور خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں انائے مقید یعنی انسانی خودی کے متعلق سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اگر آپ نے ملاحظہ فرمایا تو معلوم ہوا ہو گا کہ حضرت علامہ نے زیادہ تر توحیدِ وجودی کے نقطۂ نظر سے فلسفۂ خودی کو آگے بڑھایا ہے۔ اور چونکہ توحیدِ وجودی کی رو سے کائنات خارج میں نہیں بلکہ علمِ خداوندی میں موجود ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ کے خارج اور داخل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور علامہ اقبال بھی لکھتے ہیں کہ جو ذات محیط ہے کوئی شے اُس کے لئے غیر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے علامہ مرحوم نے بھی مشہور صوفی بزرگ حضرت بایزید بسطامی سے متعلق ایک مثال پیش کی ہے اور وہ یوں ہے کہ ایک دفعہ بایزید کی مجلس میں ایک صوفی نے ہمارے عام نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ ذاتِ باری کے سوا کوئی شے موجود نہ تھی اور کائنات اس کے علم میں تھی۔ مگر اس کے جواب میں بایزید نے جو کچھ فرمایا تھا وہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز تھا۔ فرمایا کہ اب کیا ہے۔ اب بھی اس کے علم میں ہی ہے لہٰذا اقبال لکھتے ہیں کہ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ کائنات حق تعالیٰ کے مقابل ایک وجود زائد کی صورت میں موجود ہے اور حق تعالیٰ و کائنات میں کچھ بُعدِ مکانی حائل ہے۔ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو وہ صحیح نہیں۔ اس سے تو حق تعالیٰ محدود ثابت ہو گا۔

مشہور صوفی اور محدث شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے سب سے پیشتر ابداعی طور پر نفسِ کلیہ کو ظاہر فرمایا۔ جسے دیگر صوفیا نے حقیقتِ انسانیہ سے تعبیر کیا۔ ابداع بغیر کسی مادّے کے کسی شے کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اور تخلیق مادّے سے کی جاتی ہے۔ صوفیاء اس پر تو ابداعی یا حقیقتِ محمدیہ کو کثرتِ اشیاء کی علت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ نقطہ ہے جس نے متحرک ہو کر دائرے سے کائنات کی صورت اختیار کی۔ یا یوں کہیئے کہ یہی وہ دانۂ تخم تھا جس سے کائنات کا یہ عظیم درخت معرضِ شہود میں آیا اور ظاہر ہے کہ جب ایک درخت نشوونما کے مراحل میں ہو تو وہ دانۂ تخم بظاہر مفقود ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں وہ نموئے شجر کے ساتھ ہی ساتھ ہر مرحلے میں موجود رہتا ہے اور درخت کی تکمیل کے بعد وہی دانۂ تخم ہزار ہا دانہ ہائے تخم کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی نفسِ کلیہ، حقیقتِ محمدیہ یا سرچشمۂ انسانیت ہی محمدی اور بنیادی خودی سے عبارت ہے۔ پھر اس درخت کا ہر دانۂ تخم بھی اپنے اندر ایک عظیم درخت لئے ہوئے ہے۔ جیسے کہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔

اتزعم انک جرم صغیر وفیک انطوی عالم الاکبر

یعنی کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ایک جرثومۂ صغیر ہو۔ حالانکہ یہ عالم اکبر تمہارے اندر مندرج ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالسلام رامپوری نے جب اقبال و برگساں کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا تھا۔ اُس میں صاف طور سے لکھ دیا تھا کہ چونکہ فعلیتِ مطلقہ صرف ایک ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ مرتبۂ اجمال میں حق۔ اور تفصیل میں کائنات ہے: اور یہی نظریہ

علامہ اقبال نے اپنی کتاب جاوید نامہ میں پیش فرمایا ہے۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب حضرت علامہ اپنے روحانی استاد حضرت مولانائے روم کی معیت میں زندہ رود کے نام سے آسمانِ اول پر جہاں دوست سے ملاقات کرتے ہیں۔ اور جہاں دوست رومی سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے رفیق یعنی زندہ رود علم سے بھی کچھ بہرہ رکھتے ہیں۔ تو رومی جواب دیتے ہیں کہ آپ ان سے پوچھ لیجئے۔ چنانچہ جہاں دوست زندہ رود سے جو سوالات سامنے لاتے ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کائنات کیا شے ہے۔ زندہ رود جواب دیتے ہیں کہ حق خود ظاہر ہوگیا ہے۔

علامہ اقبال کائنات کی کسی شے کو اگر حقیقی سمجھتے ہیں تو وہ انائے انسانی ہی ہے۔ فرماتے ہیں "میں سوچتا ہوں۔ میں فکر کرتا ہوں" ثابت ہوا کہ میں موجود ہوں۔ علامہ مرحوم کے نزدیک انائے انسانی غیر فانی اور غیر متبدل ہے۔ کیونکہ وہ انائے اکبر ہی کی ایک کرن ہے۔ اور اگر بعض فلاسفہ کے خیال کے مطابق انائے انسانی مادی یعنی فانی ہوتی، تو ہم اپنے تمام علوم و فنون و اخلاقِ انسانی سے محروم ہو جاتے۔ وجہ ظاہر ہے کہ مادۂ عالم ہر لحظہ معرضِ تحول و تغیر میں ہے، اور اگر انائے انسانی بقول ان فلاسفہ کے صرف وجودِ مادی کے قوائے متعددہ کے افعالِ مجموعی کا مظہر ہو۔ تو جسمِ انسانی کے تغیر پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بھی متغیر ہوگی، اور چونکہ انسانی حافظہ بھی بقول ان کے مادی ہی ہوگا۔ اس لئے وہ بھی متغیر و متبدل ہوگا

چنانچہ ان حالات میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے تمام حاصل شدہ علوم بھی فنا نہ ہونگے یقیناً محو ہوں گے اور سائنسی نظریہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ موجودہ سائنسی تحقیق کے بموجب تیس برس کے عرصے میں ایک انسان کا جسم مکمل طور پر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی بجائے نیا جسم بن جاتا ہے، ظاہر ہے کہ جسم کے اس مسلسل تغیر و تبدل کی وجہ سے انسانی ذہن بھی تبدیل ہوگا اور حافظہ بھی اپنے تمام نقوش کھو دے گا۔ لہٰذا ہمیں نئے سرے سے علوم کے حصول کی ضرورت درپیش ہوگی لیکن خود راقم الحروف کو پہلی جنگِ عظیم کے وہ واقعات ابھی تک یاد ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً روزنامہ زمیندار میں آیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس عرصے میں راقم الحروف کا جسم سائنسی نظریہ کے مطابق دو بار نیا بن چکا ہے۔ آخر وجودِ انسانی میں وہ کیا شے ہے جو ہمارے حاصل شدہ علوم کو محفوظ رکھتی ہے یہی تو ہماری انا یا خودی ہے جو ایک عظیم و برتر خودی سے صادر ہوئی ہے۔ اگر یہ مادی اور مادے کی مانند ہر لحظہ معرضِ تحول میں ہوتی تو نوعِ بشر آج تک حیوانیت ہی میں گھری رہتی۔ لہٰذا خودی غیر مادی ہے اس لئے غیر فانی ہے۔ مگر جسمِ انسانی سے متعلق ہونے کے بعد مادیت نے اس کا آئینہ گرد آلود کر رکھا ہے اور صوفیا کے مجاہدے صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ اپنی خودی کے آئینے سے مادیت کی گرد چھانٹ کر اسے مجلّا بنا دیا جائے۔ تاکہ وہ اس قابل ہو کر پرتوِ کو مجوبی منعکس کر سکے۔

میں سمجھتا ہوں کہ وجودِ انسانی عناصر سہ گانہ سے عبارت ہے۔ حیوانیت، انسانیت اور ملکیت۔ ان عناصرِ سہ گانہ میں صرف انسانیت ہی انسانی شخصیت کی حقیقی بنیاد ہے، حیوانیت اور ملکیت بطور بدرقہ شامل کر دی گئی ہیں اس لئے کہ حیوانیت کے ذریعے کائناتِ مادی سے آشنا ہو کر اس کا علم حاصل کر سکے۔ اور کائنات میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے پر قادر ہو سکے۔ کیونکہ تصرف علم کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ تاکہ انسان اس قابل ہو سکے کہ تسخیرِ کائنات کے فریضے سے بخوبی عہدہ برآ ہو، کیونکہ ایک خلیفہ اور نائبِ حق کی حیثیت سے اس کا یہی مقام ہے، چنانچہ اس حقیقت کی طرف علامہ مرحوم نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اور فرمایا:

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

اور عنصرِ ملکی اس لئے بطور بدرقہ شامل کیا گیا کہ انسان اس کے ذریعے حق تعالیٰ سے اپنا تعلق جاری رکھ سکے، جس سے عنصرِ انسانی صادر ہوا ہے اور وجودِ انسانی حصولِ علم کے لئے اسی سرچشمے کا محتاج ہے۔ چنانچہ حیوانیت سے شعورِ محض کے علاوہ کوئی شے صادر نہیں ہو سکتی۔ تمام حیوانات بشمول گرمی سردی بھوک پیاس اور شہوت وغیرہ اس کا شعور و احساس رکھتے ہیں۔ اپنی زندگی کی حفاظت

کستے ہیں اور اس عشق میں کسی ضابطۂ اخلاق کے پابند نہیں۔ اور ملکیت سے صرف عشق ہی پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے فکر و توجہ کا مرکز ذاتِ باری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ــــ انسانیت محلِ عقل و ہوش ہے اور اسی لئے اُسے مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ انسان کی شخصیت جامعیت کی حامل ہے۔ وہ بیک وقت شعور، عقل اور عشق سے بہرہ ور ہے۔ وہ طبعی نفسی اور روحانی بھی ہے۔ اس لئے نیابتِ الٰہیہ کا بار اس کے کاندھوں پر رکھا گیا ہے ــ اور انسان ہی نیابتِ خداوندی کی اہلیت رکھتا ہے چنانچہ حق تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ انسان نہ تو حیوان بنے اور نہ فرشتہ بلکہ انسان بنے اور جب تک اُس کی انسانیت آزاد اور مکمل نہ ہو۔ وہ خلافت و نیابتِ الٰہیہ کے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

اگر انسانیت یا انسانی "انا" غلبۂ حیوانیت کے تحت آ جائے تو دنیا سے امن و امان رخصت ہو جائے انسان انسان کا استحصال کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرے گا۔ چنانچہ انسان اگر ڈارون کا نظریۂ تنازع للبقا کو عملی جامہ پہناتا تو یہی حالات پیش آتے۔ اگرچہ اب بھی انسانیت پر حیوانیت کا غلبہ صاف نظر آتا ہے۔ لیکن انسانیت مغلوب ہونے کے باوجود بھی اس کے خلاف مسلسل احتجاج کرتی ہے۔ جس کے نتیجے میں دنیا کی حکومتوں نے ڈارون کے حیوانی نظریے سے متاثر ہونے کے باوجود امن و امان قائم رکھنے کے لئے کچھ قوانین وضع کئے ہیں۔ مگر عمل طور پر وہی کچھ ہو رہا ہے جسے ڈارون نظامِ تغیروں میں بتا دیا ہے۔ البتہ اب قوموں کا استحصال کسی حد تک مہذب طریقوں سے ہوتا ہے۔ طاقتور اقوام کمزور اقوام کو غلام بنانے کے لئے مختلف قسم کے بہانے تراشتی ہیں، اور زیادہ تر اقتصادیات کے حربوں سے کام لیتی ہیں۔

اور اگر اَنائے انسانی پر ملکی عنصر غالب آ جائے تو شدتِ عشق اُسے مجذوب اور تارک الدنیا بنا کر کسی گوشہ میں جا بٹھائے اور اس سے نیابتِ الٰہیہ کا فریضہ فوت ہو جائے۔ جو سراسر منشائے ایزدی کے خلاف ہے اس لئے لازم ہے کہ انسان بن کر رہے چنانچہ اس عنصرِ انسانیت یا اَنائے انسانی کی خودارادیت اور حریت ہی ایک کامیاب زندگی کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ انسان کی خودی نہ تو حیوانیت ہے اور نہ ملکیت بلکہ انسانیت اور صرف انسانیت ہے۔

مجاہدۂ سلوک و تصوف جس میں فنا کو لازمی خیال کیا جاتا ہے ابتدا میں حضرت علامہ اس کے مخالف رہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جب نام نہاد صوفیا نے اپنے سلوک کے اندر ویدک یا قدیم ایرانی تصوف کو راہ دی، تو ان کے اندر ترکِ دنیا اور رہبانیت کا رجحان پیدا ہوا لیکن جہاں تک اسلامی تصوف کا تعلق ہے، اُس میں ترکِ دنیا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــ اس لئے کہ اسلام نے رہبانیت کی شدید نفی کی ہے، اور کوئی سچا مسلمان صوفی رہبانیت کا خیال تک نہیں کر سکتا بلکہ مسلم صوفی تو مجاہد ہوتا ہے۔ وہ خارج کی تسخیر سے قبل ہی اپنے داخلی تسخیر سے فارغ ہو چکا ہوتا وہ اس حد تک ضبطِ نفس کا حامل ہوتا ہے کہ فطری و جبلی تحریکات کو بھی لگام دے لیتا ہے۔

سائنس کی تحقیق کی رو سے اب تک کائناتِ مادی میں جن عناصر کا انکشاف ہوا ہے۔ ان کی تعداد ایک سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اور اسی تحقیق کی رو سے یہ جملہ عناصر تمام کے تمام وجودِ انسانی میں ایک خاص تناسب سے موجود ہیں۔ اور ان کے سوا دوسری کوئی ایسی شے موجود نہیں جس کے اجزائے وجودی میں یہ تمام کے تمام عناصر شامل ہوں اور اس سے انسان کی نیابتِ الٰہیہ اور خلافت کا ثبوت ملتا ہے، یہی انسان کائنات کا حاکم اور منتظم ہے انسان جس قدر نظامِ طبعی کی تحقیق میں پیش رفت کرتا ہے۔ اُسی قدر وہ تسخیرِ کائنات کے سلسلے میں بھی آگے بڑھتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کی مجوزہ ترقی کا محور حیوانیت ہے یا انسانیت۔ عقل تو بقول حکیم الامت۔

چراغِ راہ ہے رہبر نہیں ہے

چراغ کسی کے بھی ہاتھ میں ہو اُس کا کام تو روشنی دینا ہے۔ نیک و بد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تو موجودہ ترقی اگر محورِ حیوانیت کے گرد گھومتی ہو۔ تو ظاہر ہے انسانیت کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور اگر انسان عنصرِ انسانیت کے تحت راہِ ترقی پر گامزن ہو تو ظاہر ہے دنیا امن و امان و مسرت کی جنت بن جائے گی۔ نوعِ بشر جو عنصرِ انسانیت میں باہم مشترک ہے۔ وہ کسی طور انسان کا استحصال مستحق نہ سمجھے گا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہی انسان اپنے ہم نوع کی تباہی کیلئے مختلف اقسام کے جنگ

ہتھیار فراہم [illegible] میں مصروف ہے اور ہمیشہ کردار و سہارا انسانوں کے استحصال کے لئے مستعد رہتا ہے چنانچہ انہیں حیوانی تحریکات کو ضابطے میں لانے کے لئے صوفی مجاہدہ کرتے ہیں۔ اور حیوانیت کے اُن تمام تقاضوں کو زیرِ ضابطہ لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو انائے انسانی اور خودی کی آزادی اور خود ارادیت کی راہ میں حائل ہوتی ہیں، فنا اسی کو کہتے ہیں۔ صوفی ہمیشہ محاسبۂ نفس میں مصروف رہتا ہے۔ اور ہر لحظہ یہ مشاہدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ حیوانی اور جبلی تحریکات نے ان کی خودی کو کہاں تک گرد آلود کر رکھا ہے۔ لیکن اس نوع کا مجاہدہ صرف صوفی ہی کا کام نہیں۔ بلکہ ہر مسلمان جسے یہ یقین ہو کر مرنے کے بعد اس سے اس کے اعمال کے بارے میں پوچھا جانا ناگزیر ہے ہمیشہ محاسبۂ نفس کا خیال رکھتا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی حضرات کے بارے میں علامہ مرحوم فرماتے ہیں

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

احتسابِ نفس کی افادیت ظاہر ہے اس کے نتیجہ میں انائے انسانی آزادی کے ساتھ اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار پر قادر ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انائے انسانی سے حقیقی علم افاضہ ہوتا ہے لیکن انسان کی خودی اگر غلبہ حیوانیت کے تحت ہو تو اس کے علوم ظاہر ہونے کے بعد حیوانیت کے تسلط میں چلے جاتے ہیں جنہیں حیوانیت اپنے قالب میں ڈھال لیتی ہے اور جن سے عالمِ بشر کو فائدے کی بجائے نقصان ہی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہم اس کے ثبوت میں ایٹمی قوت کو پیش کر سکتے ہیں۔ جو اگر انائے انسانی کو حاصل ہوتی وہ صرف نوعِ بشر کی خوشحالی اور سعادت پر ہی صرف ہوگی۔ اس طرح اگر انسانی خودی پر ملکیت چھا جائے تو انائے انسانی کے علوم ملکیت ہی کے قالب میں ڈھل جائیں گے جن کا تعلق کائناتِ مادّی سے نہ ہوگا۔ اور نتیجہ کے طور پر انسان ارتقائے حقیقی سے محروم رہے گا۔ حیوانیت و ملکیت انائیت کے خادم ہوں گے۔ تب اعتدال پیدا ہوگا اور خودی کامیاب زندگی کی انگڑائی لے کر بیدار ہوگی۔

نوعِ انسان میں ان لوگوں کو عظیم اکثریت حاصل ہے جنہیں ابن الوقت کہا جاتا ہے۔ لیکن جن افراد کو ابوالوقت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی نابغہ افراد کے بارے میں حکیم الامت نے فرمایا تھا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور خود حکیم الامت نے اپنے بارے میں کیا ہی خوب فرمایا تھا۔

سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

ابن الوقت کی زندگی بدلتے ہوئے وقت سے مطابقت کرنے میں گزرتی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

ابن الوقت کو یہ ہمت میسر نہیں کہ گزرتے اور بدلتے ہوئے وقت کا گریبان پکڑ کے، اور پھر اسے اپنے منشا کے مطابق آگے بڑھنے کی اجازت دے۔ یہ صرف ابوالوقت ہی کی شخصیت ہوتی ہے جو ماحول سے بھی خراج وصول کئے بغیر نہیں رہتی چنانچہ اکثر فلاسفر اس خیال میں کہ انسان اور اس کی شخصیت اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول و محیط کے مقتضیات سے اپنا دامن چھڑا لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، اور ایک حد تک ان کی یہ رائے صحیح بھی ہے۔ لیکن اُن افراد کے حق میں جنہیں ہم نے ابوالوقت سے موسوم کیا ہے تو جہاں تک ابوالوقت کی شخصیت کا سوال ہے۔ وہ اپنے ماحول و محیط کی پیداوار ہونے کے باوجود اس کے جبر سے آزاد و بالاتر ہوتا ہے۔ اُسے اپنا ماحول متاثر نہیں کر سکتا بلکہ وہ خود اپنے ماحول پر موثر ہوتا ہے۔ وہ ماحول کو اپنے ہر منشا کے قالب میں ڈھال لینے کی طاقت رکھتا ہے، چنانچہ اس پر راقم الحروف کا ایک پشتو شعر ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ

"اگر انسان کی تعمیرِ شخصیت میں تمام و کمال اپنے ماحول و محیط ہی کا ہاتھ ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ ختم الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیرِ شخصیت میں کس کا ہاتھ تھا؟"

علامہ مرحوم اس رمز کو پا گئے تھے، جبھی ارشاد فرمایا:

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اقبال کا مردِ مومن قلندرانہ روش ونیز حیوانیت کی دسترس سے بالاتر ہے۔ اس کی خودی حیوانیت

ملکیت کی مرکب نہیں۔ بلکہ وہ خود اس کا راکب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

ہاں۔ قلندر ابو الوقت ہے۔ وہ ایام کا مرکب کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ زمانے کے مقتضیات کو سلب کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ خود زمانہ ہے جس پر صدائے انا الدھر شاہد ہے۔ "انا قرآنٌ ناطقٌ" کا نعرہ اس کا ثبوت ہے۔ علامہ اقبال کے آثار کا مطالعہ کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ علامہ مرحوم نے جیسا کہ عرض کیا گیا — اپنے مثالی انسان کو مردِ مومن، درویش، قلندر اور فقیر کہہ کر پکارا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

حکیم الامت حیوانیت اور ملکیت کے اسرار سے بخوبی روشناس ہیں۔ فرماتے ہیں۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

جاوید نامہ میں اقبال نے مردِ مومن کو شمس نصف النہار سے تشبیہہ دی ہے۔ کیونکہ اُس وقت سورج نہ شرقی ہوتا تھا اور نہ غربی بلکہ آفاقی ہوتا ہے اور یہاں خودی کے راز سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان کا مردِ مومن عوام کی مانند آفاق میں گم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ آفاق اس میں گم ہو جاتا ہے۔ علامہ نے تکمیلِ خودی کے لئے جن مجاہدانہ کاوشوں کی نشاندہی کی ہے وہ ذیل کے اشعار سے بخوبی مترشح ہیں۔ فرماتے ہیں۔

یہ عالم یہ ہنگامۂ مرگ و زیست
یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی ہے یہ منزلِ اوّلیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تیری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تیری سرگزشت

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال کا مردِ مومن نطشے کے فوق البشر سے مستعار ہے لیکن نطشے کا فوق البشر تناسخ والوں کے لاکھوں جون بدلنے کے بعد متصور ہوتا ہے اور تناسخ کا یہ چکر نطشے کے فوق البشر کو آخرکار خدا بنا دیتا ہے لیکن جب نطشے سے پوچھا گیا کہ انسان مسلسل پیدا و فنا کے چکر میں کیوں گرفتار ہے تو جواب دیا۔ کہ وہ فوق البشر میں تبدیل ہونے کے لئے مسلسل پیدا اور فنا ہو رہا ہے۔ گویا نطشے کا طائرِ فکر صرف تناسخ تک ہی پہنچ پایا تھا۔ وہ نہ سمجھ سکا کہ پیدا ہو کر فنا ہو جانا کیا انسان کے اپنے اختیار میں ہے؟ شاید اسی کے متعلق حکیم الامت نے فرمایا تھا۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

لیکن اقبال کا مردِ مومن خدا نہیں بن جاتا بلکہ اخلاقِ خداوندی سے متصف ہو جاتا ہے اور خلافت و نیابتِ خداوندی سے نوازا جاتا ہے۔ اس کی خودی اضافات کا گرد و غبار چھانٹ کر چمک اٹھتی ہے اور اسی لئے حضرت علامہ خودی کی حفاظت اور اس کی خود ارادیت پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

اقبال کا مردِ مومن آئینے کی مانند صاف صاف منہ پر ہی کہہ دیا کرتا ہے۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ظاہر ہے کہ عزتِ نفس کے عوض سروری کا حصول انائے انسانی کے لئے غلامی کے مترادف ہے۔ فرماتے ہیں۔

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

علامہ اقبال کا مردِ مومن مردِ حُر ہے۔

مردِ حُر از لا الہٰ روشن ضمیر
می نہ گردد بندۂ سلطان و میر

چنانچہ مردِ حر کی شان میں فرماتے ہیں۔

مردِ آزادے چو آید در سجود
در طوافش گرم او چرخِ کبود

اور فرمایا

آزاد کا ہر لمحہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

چنانچہ خودی کی تکمیل کے بعد حضرت علامہ انائے انسانی کی ماہیت یوں پیش کرتے ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اُسکا دل بے نیاز
اُس کی اُمیدیں قلیل، اُسکے مقاصد جلیل
اُسکی ادا دلفریب اُسکی ادا دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

حضرت علامہ نے اشعارِ بالا میں آیۂ مبارکہ وما رمیت اذ رمیت ولاکن اللہ رمیٰ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ حدیث نوافل اس پر شاہد ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ انسان صرف نفسِ کلیہ تک ہی رسائی حاصل کر سکتا ہے اُس کی اصل ہے، یہی حقیقتِ محمدیہ ہے جسے صوفیا برزخِ کبریٰ سے تعبیر کرتے ہیں، یہی وہ عظیم تنا ہے۔ جس نے کائناتِ عالم کو تابانیوں کو شرفِ وجود بخشا ہے، چونکہ انائے اکبر وراء الوراء ہے جس کا کوئی مثل نہیں۔ اس لئے جب تک برزخِ کبریٰ تک رسائی نہ ہو، معرفتِ خداوندی ناممکن ہے۔ اور یہی معنی ہیں من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے۔ کیونکہ نفسِ انسانی اُسی نفسِ کلیہ سے صادر ہوا ہے اس لئے حقیقت میں وہ نفسِ کلیہ ہی ہے، اور اس کی معرفت ہی معرفتِ خداوندی کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ صوفی یا کوئی بھی انسان اگر نفسِ کلیہ تک رسائی حاصل کرنے کے بعد آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو خلا ہی خلا محسوس کرتا ہے اور اگر کوئی مردِ مومن اس کی رہبری نہ کرے تو اس مرحلے پر الحاد کا شکار ہو جاتا ہے لیکن رہبر کامل کی نگرانی میں رہ کر وہ نفسِ کلیہ یا حقیقتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھل کر اخلاقِ محمدی سے متصف ہو جاتا ہے اور تب ہی وہ اپنی عین استعداد کے مطابق حق تعالیٰ کی حقیقی معرفت سے مشرف ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت اقبال کا عشقِ رسول اسی نکتۂ عالیہ کا رہین تھا۔ چنانچہ فرمایا:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یاسیں وہی طٰہٰ

اور جب حقیقتِ محمدیہ کا قرب و وصل حاصل ہو جاتا ہے تو خودی کی تکمیل ہو جاتی ہے اور وہ پکار اُٹھتا ہے

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

اور جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حبیبِ خدا تھے۔ مردِ مومن بھی خلعتِ محبوبیت سے مشرف ہو جاتا ہے، اور جیسے کہ آنحضرت کی خواہش تھی کہ بیت المقدس کی بجائے آپ کے باپ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا گھر بحیثیتِ کعبہ متعین ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی خواہش کے مطابق مسجدِ حرام کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اسی طرح اقبال کے مردِ مومن کی محبوبیت کی بھی یہ شان ہے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ڈاکٹر محمد معروف

قائدِ اعظم کا نظریۂ قومیت

ابتدا ہی سے قائدِ اعظم کے ذہن میں مسلمان قوم کا ایک واضح تصور موجود تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ لکھنؤ سے لے کر ۱۹۳۰ء کے اجلاسِ لکھنؤ تک ان کی ہندو مسلم اتحاد کے لئے تمام تر کاوشیں اس ایمان پر مبنی تھیں کہ ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں، جنہیں خلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ان تھک کوشش کی کہ ہندوستان کی یہ دو بڑی قومیں باہمی اشتراک اور معاونت سے زندگی گذار سکیں اور اس برِ صغیر پر مل جل کر حکومت کر سکیں۔ ان کی ان کوششوں کے نتیجے کے طور پر متعصب سے متعصب کانگرسی بھی ان کے خلوصِ دل کا اقرار کرتا تھا۔ اور انہیں ۱۹۳۶ء تک "ہندو مسلم اتحاد کے سفیر" کا نام دیا جاتا تھا۔ لیکن اس تمام عرصہ میں مسلمان قوم کی جداگانہ حیثیت و اہمیت ان کے دل سے کبھی محو نہ ہوئی چنانچہ ان کی زیادہ تر محنت اس کوشش میں صرف ہوئی کہ مذکورہ بالا دو اقوام کے باہمی اختلافات سے جو فرقہ وارانہ فسادات منتج ہوتے تھے۔ انہیں کیونکر ختم کیا جائے تاکہ یہ ہر دو قومیں امن و آشتی کے ساتھ اکٹھی رہ سکیں۔ چنانچہ اپنے ۱۹۱۶ء کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے اس امر پر انتہائی مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا کہ آخرکار انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے درمیان ان ہر دو اقوام کے باہمی مسائل پر مشترک لکھنؤ کانفرنس میں کوئی خاطر خواہ معاہدہ تو ہوا۔

M.RAFIQUE AFZAL,(Ed) SELECTED SPEECHES ANDSTATEMENTS OF THE QUAID-I-AZAM MOHAMMAD ALI JINNAH: 1973) PAGE 57).

اسی خطبہ میں آگے چل کر قائداعظم نے کہا۔

"مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ عزتِ نفس سیکھیں ہمیں اس چیز کی اشد ضرورت ہے کہ ہم بحیثیت ایک قوم کے اپنے اندر اپنی خصوصیات پیدا کرنے اور IDEALS حاصل کرنے کے لئے ایک صحت مند اور جائز جذبہ اور جوش پیدا کریں۔ اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس جذبہ کو قبول کرنے۔ جہاں تک ہندو قوم کا تعلق ہے۔ تو ہمارا رویہ ان کی طرف خیر سگالی اور بھائی چارے کے احساسات پر مبنی ہونا چاہیئے۔ ہمارا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے مادرِ وطن کی خاطر ہر تعاون کے لئے تیار ہوں۔ ہندوستان کی حقیقی ترقی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ ہندو اور مسلمان ہر دو برادر اقوام کے مابین صحیح مفاہمت اور یکجہتی قائم ہو سکے"

(ایضاً ص ۶۲) اسی خطبے میں انہوں نے نظامِ حیدرآباد کی ان کوششوں کو سراہا جو ریاست میں ان دو اقوام میں مفاہمت پیدا کرنے میں کامیاب ثابت ہوئیں۔ اور تجویز پیش کی کہ کیوں نہ دو قومیں باقی ہندوستان میں بھی اسی طریقہ کار کو اپنائیں

(ایضاً۔ ص ۶۳)

تقریباً بیس برس بعد اپنے ۱۹۳۷ء کے خطبۂ صدارت میں قائداعظم نے انہی افکار و جذبات کا اعادہ کیا۔ اور پھر سے دستِ معاونت کانگرس کی جانب بڑھایا۔ لیکن اس ثنا میں آپ کانگرس کے رویے سے بہت بدظن ہو چکے تھے۔ واقعہ یوں ہوا کہ قائد کی کوششوں کے نتیجے کے طور پر ۱۹۳۶ء میں یو۔پی میں مسلم لیگ اور کانگرس میں غیر رسمی مفاہمت کے نتیجے میں طے پایا کہ ہر دو پارٹیاں الیکشن میں ایک دوسرے کی مدد کریں گی۔ اور وزارتیں بنانے کی صورت میں کانگرس مسلم لیگ سے تعاون کے لئے تیار تھی۔ لیکن جونہی

۱۹۳۷ء میں الیکشن کے نتائج برآمد ہوئے اور کانگرس کو خلافِ توقع چھ صوبوں میں بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔ وہ تمام معاہدے اور مفاہمت چھوڑ چھاڑ الگ تھلگ حکومتیں بنانے کے خواب دیکھنے لگی۔ اور یوں قائد کی تمام کوششیں بُری طرح سے ناکام ہوگئیں (عاشق حسین بٹالوی۔ اقبال کے آخری دو سال۔ ص۔ ۴۲۴۔ ۲۶) چنانچہ ان حالات کے پیشِ نظر قائدِ اعظم کو اپنی تمام تر توجہ مسلمان قوم کی تنظیمِ نو کی طرف مبذول کرنی پڑی۔ ان کے سامنے سب سے ناقابلِ برداشت چیز فرقہ وارانہ فسادات تھے جو روز افزوں اور سنگین تھے۔ اور ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کے واقعے نے تو پنجاب میں مسلمانوں اور سکھوں (جو کہ ہندوؤں کا ایک ذیلی طبقہ ہے) میں منافرت کی ایک گہری خلیج حائل کردی۔ علاوہ ازیں۔ کانگرس مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جس میں کانگرسی مسلمان ان کے ممد و معاون تھے۔ دریں حالات قائد نے اپنی توجہ ملتِ اسلامیہ کے بکھرتے ہوئے شیرازے کی جانب مبذول کی۔ اس سلسلے میں سکندر جناح پیکٹ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ صرف مسلم اتحاد کے حصول کی خاطر قائد نے سر سکندر کی تمام شرائط مان لیں۔ حالانکہ ان کے اپنے رفقاء ملک برکت علی۔ غلام رسول خان وغیرہ اس پیکٹ سے بہت جز بز تھے۔ دراصل قائدِ اعظم کے پیشِ نظر مسلمانوں کا اتحاد باقی ہر شے سے زیادہ عزیز تھا۔ پس ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء تک کا زمانہ برِّصغیر کے مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ثابت ہوا کہ اس میں مسلمان لیڈروں کو احساس ہوا کہ ہندو مسلم مفاہمت سے زیادہ انہیں اپنی تنظیمِ نو کی طرف دھیان دینا چاہیئے اگرچہ قائد نے مفاہمت کی کوششیں پھر بھی جاری رکھیں۔ تاہم ۱۹۴۰ء تک وہ بھی علامہ اقبال سے متفق ہوگئے کہ برِصغیر میں واحد قابلِ قبول حل تقسیم کے سوائے کچھ نہیں۔ چنانچہ قائد کا ۱۹۳۷ء کا خطبۂ صدارت (بمقام لکھنؤ) اس ضمن میں بہت اہم ہے[1]۔ قائد کے الفاظ ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ مسلمان خود اعتمادی پیدا کریں۔ اور اپنی قسمت کے خود معمار بنیں۔ ہمیں ایسے با اعتماد اور ایماندار لوگوں کی ضرورت ہے۔ جن میں ہمت جرأت اور پختگی ارادہ ہو۔ اور جو اپنے ایمان و ایقان کی خاطر بلاشرکت غیرے جہاد کر سکیں۔ خواہ سرِدست ساری دنیا ان کے مدِّمقابل کیوں نہ کھڑی ہو۔ ہمیں اتنی ہمت اور طاقت پیدا کرنی ہے حتیٰ کہ مسلمان پورے طور پر متحد و منظم ہو جائیں۔ اور اتحاد و اخوت سے بحیثیت قوم مضبوط اور قوی ہو جائیں" (JAMIL-UDDIN AHMAD SPEECHES AND WRITINGS OF MR JINNAH 1968, P. 31.

آپ نے بارہا مسلمانوں کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی کہ کانگرس نہایت ہوشیاری سے ایک سوچی سمجھی چال کے تحت مسلمانوں کو تقسیم کرکے کمزور بنانا چاہتی ہے۔ اور انہیں ان کے حقیقی قائدین سے دور لے جانا چاہتی ہے۔ چنانچہ قائد نے اپنے خطبے میں اس ضرورت پر زور دیا کہ "مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنی حقیقی روح کو پہچانیں اور اپنے عظیم عقائد اور اصولوں پر عمل پیرا ہوں تاکہ ان میں اتحاد پیدا ہو سکے۔ اور وہ ایک قوم کی حیثیت اختیار کرسکیں" (ایضاً۔ ص ۳۲) قائد نے مسلمانوں کو نصیحت کی کہ "ہندوستان کے ہر صوبے میں۔ ہر ضلع میں۔ ہر تحصیل اور ہر قصبے میں آپ کا اولین فرض ہے کہ ایک تعمیری پروگرام لوگوں کی بہبود کے پیشِ نظر وضع کریں۔ اور مسلمان قوم کی سماجی۔ معاشی اور سیاسی بہبود و ترقی کے لئے ذرائع اور طریقۂ کار بنائیں" (ص۔ ۳۸)
انہوں نے مسلمان قوم کو پُرزور تاکید کی کہ "خود کو متحد کرو۔ اور اپنے اندر اخوت اور مکمل اتحاد پیدا کرو۔ آپ میں سے ہر ایک تربیت یافتہ اور منظم سپاہی ہونا چاہیے۔ یکجہتی کی روح پیدا کریں۔ اور ایمانداری سے اپنے ملک و ملت کے لئے کام کریں" (ایضاً)

قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ قائدِ اعظم نے اپنی ہر تقریر میں ہندوستان کے مسلمانوں میں یکجہتی، یگانگت اور اخوت پیدا کرنے کے لئے بارہا تلقین کی ہے اور انہیں ہندوؤں اور کانگرس کے ہتھکنڈوں سے خبردار کیا ہے جو ان کا شیرازہ بکھیرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ درحقیقت اس زمانے میں بیشتر مسلمان ہندوؤں کی چالوں میں آکر اپنی قوم کو دانستہ و نادانستہ طور پر نقصان پہنچا رہے تھے۔ چنانچہ یونینسٹ اور نیشنلسٹ مسلمان، علماء، مجلسِ احرار۔ اور کانگرسی مسلمان خود اپنی قوم میں پھوٹ ڈال رہے تھے۔ اور مسلم لیگ کی جو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی، مخالفت پر کمربستہ تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے

[1] ۱۹۳۷ء دہلی میں قائد کا راجندر پرشاد کو جواب بھی اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے۔

جب کانگریسی لیڈر مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ چنانچہ اپنی "سوانح حیات" میں پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمان قوم کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا: "ہندوستان میں مسلم قوم۔ جو کہ درحقیقت ہندوستانی قوم کا محض ایک حصہ ہے متحد یا یکجا (COMPACT) حیثیت نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ ایک غیر واضح پراگندہ اور غیر متعین عنصر ہے۔ جو سیاسی اعتبار سے بے وجہ معاشی طور پر قابل فہم اور غالباً قابل ذکر نہیں ہے۔ پس ایک مسلم قوم کا تصور کسی قوم کا نام نہیں بلکہ محض ایک مذہبی گروہ ہے۔ انجام کار اس سے مراد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلم قوم ایک جذباتی حالت کا نام ہے جس میں ارادی یا غیر ارادی طور پر حقائق کا مقابلہ (خصوصاً معاشی حقائق) نہ کرنے کی ایک تمنا یا خواہش پنہاں ہے" AUTOBIOGRAPHY. P.469. اس قسم کے بیانات اور تحریروں کے بارے میں قائد اعظم نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ یہ ان میں احساس کمتری پیدا کرنے کی کوشش کے مترادف ہے۔ درحقیقت پنڈت نہرو اور ان کے رفقاء کے سامنے قومیت کا محض علاقائی تصور موجود تھا۔ اور وہ لوگ اس کے نظریاتی (IDEOLOGICAL) معنوں سے بالکل بے بہرہ تھے۔

قائد اعظم نے جو قومیت کا تصور پیش کیا۔ وہ سراسر نظریاتی اور غیر علاقائی تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے مخلوط انتخاب کی مخالفت کی تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ان کے ذہن میں مسلمانوں کا وجود بحیثیت ایک نظریاتی قوم کے موجود تھا۔ اور انہیں ڈر تھا کہ اس مغربی طریقۂ انتخاب سے ہندو اکثریت ہندوستان میں مسلمان اقلیت (جو کہ ایک مؤثر اقلیت تھی) کو ہمیشہ کے لئے زیر کر لے گی۔ اور یوں اس عظیم نظریاتی قوم کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے بارہا [illegible] مسلمانوں کے تحفظ کا ذکر کیا ہے۔ یہ تحفظ انہوں نے انگریز حکمرانوں اور ہندو اکثریت دونوں سے مانگا ہے۔ آپ نے ہندوستانی مسلمانوں سے کہا: "آٹھ کروڑ مسلمانوں کو ہندوستان میں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں وہ اپنی قسمت کے خود مختار ہیں اور بحیثیت ایک منظم اور متحد قوت کے بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور اپنی خواہشات کے مطابق بڑی سے بڑی حزب مخالف سے نمٹ سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھ میں بہت بڑی طاقت ہے۔ بشرطیکہ وہ متحد ہو جائیں" (ص۔ ۳۹) یہی وجہ ہے کہ آپ نے بارہا اس بات پر زور دیا کہ تمام مسلمانوں کو چاہئیے وہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جو کہ ان کی واحد نمائندہ جماعت ہے متحد ہو کر حزب مخالف کا مقابلہ کریں۔ آپ نے فرمایا: "انگریز حکمران یا ہندو اکثریت آپ کے بارے میں نہیں سوچے گی جب تک آپ خود اپنے بارے میں نہیں سوچیں گے" مسئلہ فلسطین کا ذکر کرتے ہوئے قائد اعظم نے اہل یورپ کو تنبیہ کی کہ اگر انہوں نے اسے منصفانہ طور پر حل نہ کیا تو "یہ برطانوی حکومت کی تاریخ میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا باعث بنے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں صرف ہندی مسلمانوں کا نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ عظیم برطانیہ خود اپنی موت کو دعوت دے گا۔ اگر انہوں نے اپنے عہد اور وعدے ایفا نہ کئے" (ص ۔ ۳۸) یہاں قائد اعظم نے یقیناً اس نظریاتی تصور قوم کا ذکر کیا ہے جو علاقائی قید و بند سے آزاد دنیا کے ہر خطے میں بحیثیت مسلمان قوم کے آباد ہے۔ یہ وہ قوم ہے جسے علاقائی حدود نہیں بلکہ نظریاتی اور جذباتی ہم آہنگی آپس میں مربوط و منسلک کئے ہوئے ہے۔ یہ قوم آج ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر پراگندہ حالت میں ہے لیکن اگر یہ ایک مرتبہ متحد و منظم ہو جائے تو یہ دنیا کی عظیم قوم ہے یہ قوم محض ایک مذہبی گروہ نہیں (جیسا کہ پنڈت نہرو کا خیال تھا) بلکہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو عظیم برطانیہ کے لئے بہت بڑا خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔

پس قائد اعظم نے مسلمان قوم کو اس یقین کے ساتھ مخاطب کیا کہ ان میں اب بھی بحیثیت قوم وہ مخفی طاقت موجود ہے جو متحد ہونے کے بعد جوہر دکھا سکتی ہے۔ اور ساری دنیا سے آج بھی اپنی عظمت منوا سکتی ہے۔ پس قائد اعظم اس لئے مسلمان قوم سے گویا تھے اور کوشاں تھے کہ یہ قوم متحد ہو جائے چنانچہ ہندوستان میں اس قوم کو متحد کر کے اور پاکستان حاصل کر کے انہوں نے اپنے اس دعوے کو سچا ثابت کر دکھایا کہ اگر متحد ہو جائے تو یہ قوم کتنی عظیم ہے۔ اسی حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے

اگر نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

چنانچہ قائد اعظم نے مسلمان قوم کو اتحاد، تنظیم اور

ایمان کا سبق دیا اور کہا کہ ان تین اصولوں پر چل کر
یہ قوم شادماں و کامران ہو سکتی ہے۔ اور دنیا بھر
میں حکمرانی کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حصول
پاکستان کو دنیائے اسلام میں خاص اہمیت سے
دیکھا جاتا ہے۔ دراصل یہ صرف ایک خطۂ زمین
کا حصول ہی نہیں بلکہ پوری مسلمان قوم کے لئے
راہِ نجات کی نشاندہی اس میں مضمر ہے۔ اس
میں ہمیں مسلمان قوم کے اتحاد کا سبق ملتا ہے۔

قومیت کا ایک اور تصور قائد کی ان تقاریر میں
ابھرتا ہے جو انہوں نے ۱۹۴۷ء میں یا اس کے
بعد کیں۔ آپ نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو دستور ساز
اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا "اگر آپ اپنا ماضی
بدل کر رکھ دیں۔ اور اگر اس جذبہ کے ساتھ مل جل
کر کام کریں کہ آپ میں سے ہر ایک خواہ وہ کسی قوم
سے تعلق رکھتا ہو۔ قطع نظر اس کے کہ ماضی میں
اس سے آپ کے تعلقات کیسے تھے۔ اور نسلی،
مذہبی۔ اور برادری کے اختلافات کے باوجود اوّل
تا آخر لازمی اس مملکت کا شہری ہے۔ جو
مساوی حقوق۔ مفادات اور فرائض کا حامل ہے۔
تو اس ملک کی ترقی میں کمی کی حاجت نہیں ہو گی"
آج ہم اس دور میں زندگی شروع کر رہے ہیں۔
جس میں ہر قسم کے تفرقات۔ ذاتی۔ نسلی اور مذہبی
اختلافات وغیرہ ختم ہو چکے ہیں۔ آج ہم اس بنیادی
اصول کے ساتھ زندگی شروع کر رہے ہیں کہ ہم
سب شہری ہیں بلکہ ایک ہی مملکت کے مساوی شہری
ہیں۔۔۔۔ اب میرے خیال میں آپ کے روبرو
یہ منتہا ہونا چاہیئے اور آپ دیکھیں گے کہ جوں جوں
وقت گذرے گا۔ ہندو ہندو نہیں رہے گا۔ اور
مسلمان مسلمان نہیں رہے گا۔ مذہبی معنوں میں نہیں
کیونکہ یہ ہر فرد کا ذاتی اور انفرادی عقیدہ ہے بلکہ
سیاسی معنوں میں اس مملکتِ واحدہ کے شہریوں
کی حیثیت میں۔۔۔"

پھر ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو چاٹگام میں ایک
جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے قائد نے کہا کہ
"پاکستان کی بنیاد سماجی مساوات اور اسلامی
اشتراکیت پر رکھی ہونی چاہیئے۔ جس میں انسانی
اخوت اور مساوات پر زور دیا جائے"

مندرجہ بالا اقتباسات میں قائد نے تمام تر زور
پاکستانی قومیت پر دیا ہے۔ جس کے عناصر مسلم، ہندو
عیسائی اور پارسی سب پر مشتمل ہیں۔

پس قائد نے اپنی تقاریر اور تحاریر کے
ذریعے قومیت کے تین تصورات پیش کئے ہیں۔
(ا) برِصغیر ہندو پاک کے تناظر میں قائد کے پیش نظر
انڈین مسلم قومیت کا تصور تھا۔ (ب) عالمی تناظر
میں مسئلہ فلسطین کے پیش نظر قومیت سے مراد جغرافیائی
حدود سے آزاد مسلمان قوم کا تصور تھا جسے ملتِ اسلامیہ
کہتے ہیں۔ (ج) قیام پاکستان کے بعد اس نئی مملکت
کے پس منظر میں قومیت سے مراد وہ پاکستانی قوم
تھی جو بلا لحاظ مذہب و نسل پاکستانی شہریوں پر مشتمل
ہے۔

معافی مانگنا

معاف کرنا ایک شعوری فعل ہے مگر معافی مانگنا ایک فطری عمل ہے۔ معاف کرنے والا ہونٹوں کے معنی خیز تبسم یا ابرو کے جھکنے سے اشارے سے معاف کر دینے کا قائل نہیں ___ وہ تو اس بات کا قائل ہے کہ ڈھول تاشوں کے ساتھ سٹیج پر آئے اور وہاں قمیص اتار کر پہلے تو اُن چرکوں کی نمائش کرے جو فریقِ مخالف نے اس کے بدن اور روح پر لگائے تھے اور پھر ببانگِ دہل اس بات کا اعلان کرے کہ ہر چند فریقِ مخالف کے مظالم ناگفتہ اور ناقابلِ معافی ہیں ___ لیکن میرے دل کی کشادگی دیکھو کہ معاف کر رہا ہوں۔ کتنا عظیم ہوں میں ___! معاف کرنے میں نہ زیاں یا احساسِ زیاں کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ___ اُلٹا اس بات کا احتمال ہے کہ عزیز رشتہ دار، دوست احباب، اپنے پرائے سب آپ کے شانوں کو تھپک کر شاباش دیں گے کہ آپ نے عالی ظرفی کا ثبوت دیا، بزرگوں کی روایت کو آگے بڑھایا، محبت، اخوت اور بھائی چارے کا سنگِ بنیاد رکھا، سماجی اور اخلاقی قدروں کو تقویت دی اور یوں جریدۂ عالم پر آپ کا ثبوتِ دوام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہوا ___ مگر کیا واقعی؟

کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ معاف کرنا رعونت اور خود پسندی کی ایک مثال فراہم کرنا ہے مجھے معاف کرنے والے کے سرِ پُرغرور سے نفرت ہے میں معاف کرنے والے کو بھی کبھی معاف نہیں کر سکتا کیونکہ وہ معاف دینے کے بعد ایک ایسی مخلوق بن جاتا ہے جو زمین پر رہنے کے بجائے ہمیشہ ہمالیہ یا اولمپس کی بلندیوں پر رہنا پسند کرتی ہے وہ خود کو آدمی کی سطح سے اوپر اٹھا کر دیوتا کی سطح پر لے آتا ہے یا کم از کم اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی غیر ارضی مخلوق ہے معاف کرنے والا اپنے اور اپنے مدِ مقابل کے درمیان ایک کشادہ خلیج پیدا کرتا ہے، وہ خلقِ خدا کو دو واضح جماعتوں میں تقسیم کر کے خوش ہوتا ہے ___ ایک وہ جماعت جو معاف کرنے کے جملہ آداب سے واقف ہے۔ دوسری وہ جو معافی مانگنے کے ہنر سے بہرہ ور ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ کوئی برہمن ہے جس کے قدموں میں گرا ہوا شودر اس سے اپنی ہزار ہا نسلوں کی ناعاقبت اندیشیوں کی معافی مانگ رہا ہو اور وہ خود اُسے رحم کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہے ___ بَلیّنط! بیٹھ جنتو! جا تجھے معاف کیا ___ درگزر تو کر انسانیت کے چہرے پر ایک بدنما دھبہ ہے، تجھے کیسے معاف کیا جا سکتا ہے!

مگر میں کہتا ہوں کہ معاف کرنے والا تو تہذیبی اعتبار سے ایک قطعاً ناتراشیدہ کردار ہے کیونکہ دشمن کی کھال ادھیڑ کر قہقہہ لگانے اور دشمن کو ہنس کر معاف کر دینے میں مزاجاً کوئی خاص فرق نہیں۔ دونوں احساسِ برتری کے مظاہرے ہیں۔ دونوں صورتوں میں شخصِ مذکور دشمن کو بنظرِ تحقیر دیکھتا اور اپنی کارکردگی پر نازاں ہوتا ہے۔ سو معاف کرنے والا بھی درحقیقت اندر سے وہی نیم وحشی انسان ہے جو دوسروں کی شکست میں اپنی انا اور شخصیت کی فتح دیکھتا ہے۔ دوسری طرف معافی مانگنے والا ایک ایسا دیدہ ور ہے جو کہیں ہزاروں برس کی تہذیبی بے نوری کے بعد جنم لیتا ہے۔ معافی مانگنے میں اپنی شخصیت کی نفی کرنے کا وصفِ خاص پنہاں ہے جو طویل ریاضت کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے معافی کا طالب اپنی شخصیت کے ذرہ بکھر کو

جسم سے الگ کر کے اپنے فطری حسن کی نمائش کرتا ہے اور تہذیب کے سلاسل سے آزاد ہو کر واپس فطرت کی گرم و گداز آغوش میں چلا جاتا ہے۔ غور کیجئے کیا زندگی کی ہموار سطح پر شخصیت ایک پھوڑے کی طرح نہیں ہے۔۔۔؟ جب خون کی ساری غلاظت ایک جگہ جمع ہوتی ہے تو جسم پر ابھار سا نمودار ہو جاتا ہے۔ جب انا پھولتی اور تکبر پھلتا ہے اور پھر مادیگ شخصیت کا احساس انسان کے سر پر بھاری عمامہ اور جسم پر لباسِ فاخرہ بن جاتا ہے تو شخصیت بھی انسانیت کے بدن پر ایک پھوڑے کی طرح نظر آنے لگتی ہے۔ پھر جب شخصیت کے پھوڑے کو ناخن کا نشتر چھیڑتا ہے تو گلتے ہوئے ناسور سے بہتی ہوئی پیپ سارے ماحول کو متعفن کرنے لگتی ہے۔ مگر معافی مانگنے والے شخص کے خون میں کوئی ایسا اینٹی بائیوٹک پیدا ہو جاتا ہے جو اندر ہی سے پھوڑے کے سارے مواد کو خشک کر دیتا ہے۔ لہٰذا نشتر کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور سارا بدن شیشے کی طرح ہموار اور شفاف ہو جاتا ہے۔ تاریخ ان جابر سلاطین کا نام تو بھول گئی جو زندگی بھر چھوٹی بڑی سلطنت کو تہ تیغ کرنے کے ضروری کام پر مامور رہے۔ مگر ان بادشاہوں کو نہ بھلا سکی جنہوں نے اپنی شکست کو انا کا مسئلہ نہ بنایا بلکہ تقاضے کے مطابق دانتوں میں تنکے دبائے فاتح کے حضور پہنچے اور اپنی شخصیت منہدم کر کے فاتح کو ذلیل و رسوا کر گئے۔ سکندرِ اعظم ایسا فاتح معافی مانگتے ہوئے پورس کے سامنے محض ایک موہوم سا نقطہ بن کر رہ گیا اور اس کی ساری شخصیت قطرۂ بے آب ہو کر رہ گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ستلج کے کنارے پہنچ کر سکندر کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا مگر کوئی نہیں جانتا کہ انہوں نے کیوں انکار کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ پورس نے معافی مانگ کر سکندر کی ساری بھاری بھرکم شخصیت کو تار تار کر دیا تھا اور اب اس کے فوجی بھی اس کی قیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے تھے۔

چند روز ہوئے میرے ایک دوست نے مجھے اپنے ایک بہت پرانے ملازم کا قصہ سنایا یہ ملازم اپنی حماقتوں سے خاصی توڑ پھوڑ کرتا رہتا تھا۔ ایک روز جب اس نے کچھ زیادہ ہی تخریبی کاروائی کی تو میرے دوست نے انتہائی برہمی کی حالت میں اسے ملازمت سے برطرف کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ فوراً کہیں چلا جائے مگر ملازم کی کئی نسلیں اس گھر کو ترو بالا کرتی آئی تھیں لہٰذا اس نے نقلِ مکانی سے صاف انکار کر دیا۔ پھر جب نمک حلال کے اس غیرت پہ بھی مالک کے غصے کا پارہ نہ اترا تو وہ میرے دوست کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر معافی کا خواستگار ہوا میرے دوست نے معافی دینے سے انکار کیا، مگر ملازم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں، ہاتھ جوڑ دیئے اور "معافی! معافی! معافی!" کا ورد کرتا چلا گیا۔ میرا دوست کہتا ہے کہ اس کی یہ حالت دیکھ کر پہلے تو میرا غصہ فرو ہوا، پھر میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی جو جلد ہی احساسِ ندامت میں تبدیل ہو گئی پھر یوں ہوا کہ میری ساری شخصیت "اندر" سے ٹوٹ پھوٹ گئی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہوں۔ دوسری طرف ملازم کے چہرے پر ایک عجیب سا جلال تھا جو اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے بعد ہی نمودار ہوتا ہے اس کے اندر کوئی ایسی پُراسرار قوت پیدا ہو گئی تھی جس کا سامنا کرنا ہی مشکل تھا میرا دوست کہتا ہے کہ مجھے اس شخص سے ڈر آنے لگا۔

جو شخص اپنی انا اپنی پوری شخصیت اور وجود کی نفی کر دے اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟

آج جب میں نے معافی مانگنے والے کی اس غیر مرئی قوت کا ذکر اپنے دوست م۔م سے کیا تو ان کی مرنجان مرنج طبیعت جولانی پر آ گئی۔ عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولے،

"کبھی آپ نے رسہ کشی کا منظر دیکھا ہے۔ اسے بھی وہی "TUB OF WAR"

"میں نے کہا "ہاں جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو ایک بار"

کہنے لگے:

"ٹھیک ہے اب سوچئے کہ دونوں طرف سے زور آزمائی ہو رہی ہے۔ سانس پھول رہے ہیں اور پسینے چھوٹ رہے ہیں اور پھر اچانک ایک طرف پہلوان کھلاڑی رسے کو ڈھیلا چھوڑ دیتے

ہیں۔ جانتے ہیں ایسے میں کیا ہوگا؟"
میں نے کہا۔
"ہوگا کیا؟ یہی کہ دوسری طرف کے پہلوان پہلو
شانے چت ایک دوسرے پر جا گریں گے۔"
کہا،
"بس یہی حالت اس شخص کی ہوتی ہے جس کا
مدِمقابل اچانک معافی مانگ لے۔ وہ شخص تو بکھر
تباہ ہوگیا، برباد ہوگیا، چاروں شانے چت
ہوگیا کیونکہ اس نے فریقِ مخالف کا مقابلہ کرنے
کے لئے جو قوت جسم کے سب حصوں اور
نسل کے سارے گوداموں سے ایک جگہ اکٹھی
کی تھی اس کا تو کوئی مصرف ہی باقی نہ رہا۔
اب یہ قوت خود اس شخص کو تہہ تیغ نہیں کرے
گی تو کیا کرے گی؟"
بات میری سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ میں نے
مہم تم سے کہا کہ یہ تو پیر صاحب والی بات ہوئی
کہ انہوں نے چلّہ کاٹ کر جن تو طلب کر لئے
مگر جس شخص کو زک پہنچانے کے لئے انہیں
بلایا گیا تھا وہ جنوں کا انتظار کئے بغیر ہی راہیٔ
ملکِ عدم ہوگیا۔ اب ظاہر ہے کہ جن صاحبان پیر صاحب
پر ہی اپنی قوت آزمائیں گے۔
ذہانت کے اس مظاہرے پر مہم تم خوش
ہوئے اور خوشی خوشی چلے گئے مگر تا دیر سوچتا
رہا کہ جن شاید معاف کرنے والے کی تحویل میں
نہیں ہوتا۔ بلکہ معافی مانگنے والے کی گرفت میں
ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ معافی مانگنے
کے عمل ہی سے پیدا ہوتا ہے اور پھر معافی مانگنے
والے کو تو کچھ نہیں کہتا البتہ معاف کرنے والے
کو تہہ تیغ کر دیتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جب
کوئی شخص معافی کا طلبگار ہوتا ہے تو اپنی ذات
کی کسی مخفی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دوسرے
لفظوں میں وہ شخصیت کی پتھریلی زمین میں
ذات کے مخفی چشمے کو باہر نکلنے کا راستہ سجھاتا
ہے پھر وہ زندگی کے بدن پر پھوڑے کی
طرح ابھرا ہوا نہیں رہتا بلکہ لہو بن کر بدن کی
رگوں میں دوڑنے لگتا ہے یا ہوا پانی اور آگ
ایسے عناصر میں ڈھل کر واپس فطرت کے بے نام
جسم کا حصہ بن جاتا ہے۔ معافی مانگنے والا
فطرت کا ایک حصہ ہے بلکہ وہ تو خود فطرت ہے
اور فطرت ہمہ وقت عفو و درگذر کی طالب
ہوتی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ
معافی مانگنے کے عمل کو معاف کرنے کے عمل
پر فوقیت دی ہے کہ ایسا کرنے سے انسان
حدود کو عبور کر کے لامحدود کے آستانے
تک پہنچ جاتا ہے۔

سعدیہ نسیم

مکتوبِ جوہر بنام مولانا فرنگی محلی

مولانا محمد علی جوہر نے اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنؤ کے نام جو خطوط لکھے وہ اس زمانے کے سیاسی حالات کے عکاس ہیں۔ ان سے ایک جانب مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسری جانب ہندوستان کی مختلف اقوام کی باہمی آویزش اور کشمکش کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ عالمِ اسلام میں اس وقت جو انتشار اور خلفشار برپا تھا نمایاں ہوجاتا ہے اور حکمران قوم کی ذہنیت "لڑاؤ اور حکومت کرو" بھی کھل کر واضح ہوجاتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ان تمام خطوط پر تبصرہ اور ان میں پنہاں مختلف النوع مسائل کی وضاحت ممکن نہیں البتہ صرف ایک خط[1] کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی زندگی کے اس پہلو کا تعارف کرانا مقصود ہے جو صحافت سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں ان کی گوناگوں پریشانیوں دشواریوں اور تلخ کامیوں پر دال ہے۔

محمد علی جوہر، مدبر سیاستدان اور آتش نوا مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پُرعزم اور باہمت صحافی بھی تھے تعلیمی قابلیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کیا لیکن علمی استعداد اور علمی اعتبار سے ان کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر بہت واضح ہے کہ مولانا گویا معلومات کا ایک بحرِ ذخار تھے۔ ذہانت اور عزم و ہمت کے ساتھ قدرت نے حافظہ بھی اس بلا کا عطا کیا تھا کہ سینکڑوں حوالہ جات اور علمی و قانونی نکات یادداشت کا گویا جزو تھے۔ قرآن و احادیث پر ایسی دسترس رکھتے تھے کہ تحریر و تقریر کے دوران آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ بڑی روانی سے دیا کرتے جس سے گفتگو یا عبارت کا حسن دوبالا ہوجاتا اور بات وزنی، مدلل اور مستند ہوجاتی۔ سیاسی معاملات پر زبردست گرفت رکھتے تھے اور پوری بے باکی اور صاف گوئی کے ساتھ اظہارِ رائے کرتے اور حکومتِ وقت کے ارادوں کو بے نقاب کرنے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ جیسا کہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام ایک خط میں حاجیوں اور زائرین سے متعلق ایک سرکاری اعلان کے پس پردہ حکومت کی نیت کی وضاحت کی ہے:

"۴ نومبر کے اخبارات میں حرمین شریفین کی حفاظت کے متعلق سرکاری اعلان شائع ہوا تھا.... اب غور سے دیکھا تو اس اعلان کے الفاظ اس قدر مبہم معلوم ہوتے ہیں جن سے تشفی ہونا کیا معنی ایک قسم کا اندیشہ ہوتا ہے یعنی "یہ مقاماتِ مقدسہ برطانیہ کی بری و بحری فوجوں کے حملوں اور کارروائیوں سے مامون و مصئون رہیں گے تاوقتیکہ ان مقامات و مزارات کے ہندوستانی زائرین سے تعرض نہ کیا جائے"[2]

پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، اس قسم کا تعرض کیا جانا لازمی تھا، اس تعرض کا بہانہ بنا کر حکومت بآسانی اپنی مطلب براری کرسکتی تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اسی خط میں لکھتے ہیں:

"اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ جنگ چھ سال تک جاری رہے گی تو کیا دورانِ جنگ میں ترک، ہندوستانی زائرین کو بربنائے مصلحتِ جنگی، عرب میں آنے سے روکیں گے۔ جنگ نے اگر طوالت پکڑی تو یقیناً ایسا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ زائرین کے پردے میں دوست دشمن کی

---

[1] مکتوبِ جوہر بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ ماہِ نو مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۲۵ء دہلی

[2] مکتوبِ جوہر بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۴ء دہلی

کیا تعجب ہو سکتا ہے اور جیسا کہ سلطنت جنگ کی حالت میں کرتی ہے اس کو اس امر کی سخت احتیاط کرنا ہوگی کہ ہندوستان سے جاسوس نہ نکلنے پائیں جیسا کہ انکے سے سمجھا تعرض کیا جانے گا تو کیا اعلان مندرجہ کے بموجب برطانوی افواج قاہرہ کے لئے راستہ صاف کریں گے۔

حکومت وقت کے ارادوں کو پوری طرح سامنے لانے کے لئے انہوں نے صوبجات متحدہ کے مشہور ڈپٹی کلکٹر خان بہادر عزیز الدین کے شائع کردہ ایک پمفلٹ بعنوان "ترکوں کی حماقت" کا حوالہ بھی دیا۔ اس پمفلٹ میں یہ تحریک کی گئی تھی کہ ہند کے مسلمان متفقہ طور پر حکومت سے درخواست کریں کہ وہ خادم حرمین شریفین ہو جائے اور ارض پاک پر اپنی سلطنت قائم کر دے۔

حکومت کے یہ ارادے، مسلمانوں کے مذہبی جذبات پر ضرب لگانے کے مترادف تھے۔ اسے مسلمان کسی طور پر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ خود مولانا جوہر نے اس اہم نکتے کی بارہا وضاحت کی کہ "ہماری زندگی کا سب سے اہم سوال مذہبی ہے، اور جہاں مذہب کا تعلق ہے وہاں ہم پر کسی دوسری طاقت کا اثر نہیں ہو سکتا۔"

مولانا محمد علی جوہر ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اسلام کی سربلندی کے لئے اللہ کے نام پر کٹ مرنے کا جذبہ ان کی رگ و پے میں جاری و ساری تھا۔ انہوں نے اپنی تمام فکری اور عملی صلاحیتیں اسی کام کے لئے وقف کر دیں۔ انگریزی زبان پر بھی مولانا کو ایسا عبور حاصل تھا کہ خود اہل زبان ان کی قابلیت اور زباندانی کے معترف تھے۔ وقت کے اہم تقاضے کے پیش نظر مولانا جوہر نے ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کیا جائے۔ انہیں ملک کے سیاسی اور عالم اسلام پر گزرنے والے سیاسی مصائب سے پوری طرح آگاہ کیا جائے۔ ان کی عملی صلاحیتوں کو بیدار کر کے ایک ایسے سیاسی نصب العین کے حصول پر کمربستہ کر دیا جائے جس کی بنیاد "مذہب" ہے۔ بڑے پیمانے پر اپنے خیالات و نظریات کی ترویج و اشاعت کے لئے انہوں نے اخبارات کے اجرا کی ضرورت محسوس کی چنانچہ اول کلکتہ سے انگریزی زبان میں ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" جاری کیا۔ علمی پائے کے اعتبار سے یہ اخبار بالخصوص طبقۂ خواص کا اخبار تھا جو ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو جاری ہوا اور ۱۹۱۲ء میں سرکاری دفاتر کی دہلی منتقلی کے ساتھ مولانا اسے دہلی لے آئے یہاں ۱۹۱۳ء میں انہوں نے اردو زبان کا اخبار "ہمدرد" بھی جاری کیا۔

دو اخباروں کو بیک وقت جاری رکھنا ایک صبر آزما مرحلہ ہے لیکن مولانا جوہر کے سامنے ایک مقصد تھا۔ ایک واضح نصب العین تھا۔ یہ مقصد اتنا جاندار تھا اور اس کی حقانیت پر انہیں ایسا کامل یقین تھا کہ اس کے ساتھ ان کی شیفتگی کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ ان کی نظر میں امید افزا اور خوشگوار مستقبل پر بھی جمی تھیں جس کے سامنے ان کی موجودہ تلخ کامیاں اور مصائب ہیچ تھے۔ وہ نہایت خندہ پیشانی سے ان مصائب کو جھیلتے رہے اور قدم قدم پر ایثار و قربانی کی نظیر قائم کی۔

"کامریڈ" اور "ہمدرد" ان کے اور عوام و حکومت کے درمیان اہم رابطہ تھے۔ سیاسی حالات اور اپنے مطالبات کے سلسلے میں اپنے نظریات کا اظہار وہ خود ہی بہتر طور پر کر سکتے تھے اور کرنا چاہتے تھے لیکن چونکہ مضمون لکھنے کے علاوہ بھی بہت سی ذمہ داریاں انہوں نے اپنے سر لی ہوئی تھیں مثلاً اخبارات کے انتظامی امور سنبھالنا، اخبار کے لئے روپے کی فراہمی، سیاسی پلیٹ فارم پر عملی رہنمائی وغیرہ لہٰذا مضامین لکھنے کا وقت کم ہی ملتا۔

حکومت کی زبان انگریزی تھی۔ مولانا نے اول کوشش کی کہ کچھ اچھے انگریزی لکھنے والے میسر آ جائیں جو ان کے خیالات و نظریات کو عمدہ اور بامحاورہ انداز میں پُر تاثیر مضمون کی صورت میں مرتب کر سکیں۔ لیکن ان کی یہ تگ و دو بار ور نہ ہو سکی۔ کیونکہ اول تو مسلمان انگریزی تعلیم کے اس درجہ شائق نہ تھے اور جو اس قابل تھے انہوں نے سرکاری ملازمتوں کو ترجیح دی۔ اس لئے "کامریڈ" کے لئے مولانا جوہر خاص طور پر خود ہی مضامین لکھتے۔ یہ مضامین ایسے جوشیلے، بے باک اور پُر تاثیر ہوتے کہ خود اعلیٰ سرکاری حکام

مکتوب جوہر بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۳ء دہلی۔

مکتوب جوہر بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۳ء، نقوش خطوط نمبر جلد دوم ص

دسمبر ۱۹۷۹ء

تک ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہتے۔ جس کے نتیجے میں مولانا سے باز پرس ہوتی جو کبھی تو نظر بندی پر منتج ہوتی۔ باوجود اس کے ان کے قلم کی کاٹ کم نہ ہو سکی۔ اس میں زور اور شدت ہی پیدا ہوتی گئی۔

کامریڈ کے مضامین نہایت اہم ہوتے اور ان کی تیاری پر مولانا خصوصی توجہ صرف کرتے۔ اس کے بعد اتنا وقت نہ نکلتا تھا کہ ہمدرد کے لئے بھی الگ سے مضامین لکھ سکیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے کوشش کی کم از کم کوئی شخص ایسا مل جائے جو "کامریڈ" میں شائع ہونے والے مضامین کا مفہوم اردو میں ادا کر سکے تاکہ "ہمدرد" میں شائع کر دیئے جائیں لیکن اس معاملے میں بھی انہیں وہی پہلی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل تو حسبِ منشا افراد نہ مل سکے اور جو ملے بھی، ان کی علمی استعداد سے مولانا مطمئن نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں اپنی پے در پے پریشانیوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:—

"اگر کہیں کامریڈ کے مضامین دے کر عملہ والوں سے کہا کہ ان خیالات کو اردو میں ادا کر دو تو یا تو مجھے خود ان کے لکھے ہوئے مضمون کو اس طرح دیکھنا پڑتا تھا کہ گھنٹوں درست کرنے میں لگ جاتے تھے اور پھر بھی تسلی نہ ہوتی تھی ..... یا سارا مضمون مہمل ہو جاتا تھا۔ دو مہینے تک اشتہار دیا تب کہیں جا کر ایک صاحب ایسے ملے ہیں جو اچھی حد تک میرا مفہوم غالباً ادا کر سکیں، انگریزی وہ بھی کافی نہیں جانتے اس لئے کہیں کہیں کامریڈ کی عبارت کو نہیں سمجھتے اور مجھے ان کی عبارت دیکھنے کی ضرورت باقی رہتی ہے..... جس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ کوئی انگریزی کا لکھنے والا مل جاتا تو آدھا وقت میرا بچ جاتا، اور میں خود اُردو میں ہفتہ میں ایک دو مضامین ہمدرد کے لئے لکھ دیا کرتا — مگر افسوس کہ مسلمان باوجود ایک جہان سے اعلانِ جنگ کرنے کے نہ صرف عربی میں قابلیت نہیں رکھتے جس کا جاننا مذہب کے خیال سے مقدم تھا بلکہ وہ انگریزی بھی جس کا پڑھنا انہوں نے مقدم سمجھا نہیں جانتے۔ جو جانتے ہیں وہ سرکاری نوکریوں میں گرفتار ہیں یا دو چار بیرسٹری اور وکالت کی نذر ہو گئے ..... جو ملتے ہیں وہ اس قدر نالائق ہوتے ہیں کہ ہندوؤں کے مقابلے کے خیال سے بھی شرم آتی ہے"[1]

یہ زمانہ ہر لحاظ سے کشمکش و آویزش کا زمانہ تھا۔ سیاسی اور سماجی اعتبار سے نہ صرف حکومت اور عوام میں رسہ کشی جاری تھی۔ بلکہ ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بھی کشمکش روز بروز بڑھ رہی تھی۔ سرکاری زبان انگریزی تھی اور اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ہندوؤں نے بڑے ذوق و شوق سے اس کے حصول کی کوشش کی اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور حکومت کے مقرب بن بیٹھے مسلمانوں نے اس جانب زیادہ توجہ نہ دی جس کی وجہ سے وہ حکومت کے ارادوں، سیاسی چالوں اور اپنے خلاف ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے، اور لائقِ عتاب ٹھہرے۔ جبکہ ہندوؤں نے حکومت کی جانب سے پشت پناہی حاصل ہونے کی بنا پر خود کو برتر اور مسلمانوں کو کم تر سمجھنا شروع کر دیا اور رام راج کے خواب دیکھنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ ہندو پریس بھی بڑے شدّ و مد سے اپنے عزائم کا پرچار کر رہا تھا اور مسلمانوں پر اعتراض اُٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا — گویا صحافت کے میدان میں ایک جنگ جاری تھی۔

تکلیف دہ حقیقت یہ تھی کہ مسلمان جہاں بعض اور باتوں میں متحد نہیں تھے وہیں صحافتی میدان میں بھی عدمِ اتحاد کا مظاہرہ جاری تھا۔ بیسیوں اخبارات مسلمان نکال رہے تھے۔ ہر فریق اپنی ہی بات پر اڑا ہوا تھا اور اسے صحیح ثابت کرنے پر پورا زورِ قلم صرف کرتا اس صورتحال سے بہتر طور پر نبرد آزما ہونے کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان، ہندو پریس کے مقابلے پر متحد اور یکجہت ہو جائیں۔ لیکن اس وقت یہ عرفان کی فہم سے بالاتر تھا کہ صرف اتحاد اور باہمی اتحاد ہی ان کے لئے ترقیوں اور کامرانیوں کا زینہ

---

[1] مکتوبِ جوہر بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی — نقوش خطوط نمبر جلد دوم ص ۲۰-۲۱ مورخہ ۲۵

بن سکتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی دوررس اور باریک بین نگاہوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں وسعتِ فکر اور وحدتِ عمل پیدا کی جائے تاکہ وہ ایک متحدہ اور ناقابلِ شکست قوت میں ڈھل جائیں۔ لیکن افسوس مسلمانوں میں یہ جذبہ مفقود تھا اور وہ اس کی اہمیت سے تغافل برت رہے تھے۔ اپنے خط میں انہوں نے اس جانب اشارہ کیا ہے؛

> خود اُردو کی یہ کیفیت ہے کہ حشرات الارض کی طرح متعدد رسالے نکلتے ہیں اور جلد پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں ایک رسالہ بھی کامیابی کے ساتھ مسلمانوں سے نہ چل سکا۔ اگر اتنے رسالے نکالنے والے متحد ہو کر دو تین رسالے نکالتے تو اچھے خاصے ہوتے لیکن ہر ایک کو "عمارتِ نوساخت"، کی فکر ہے۔ اتحادِ عمل اور اشتراک مفقود ہے۔ روزانہ اخبارات کی بھی یہی حالت ہے۔ معاصرانہ چشمک اس درجے تک پہنچ گئی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا انجام ہوگا۔[1]

معاصرانہ چشمکوں سے قطع نظر مولانا جوہر خود ہندو پریس کے مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھے صحافت ان کا پیشہ نہ تھی، نہ انہوں نے اسے صحافت کے لئے اپنایا تھا۔ یہ محض ان کے قومی مشن کی ایک کڑی تھی اس کے لئے وہ تمام ممکنہ وسائل کو کام میں لاتے رہے۔ اس مشن کی راہ میں حائل طاقتوں کا انہوں نے خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے اور ذاتی مفاد کو ہمیشہ قومی مفاد پر قربان کرتے رہے یہ اسی خلوصِ نیت اور ایثار و قربانی کا نتیجہ تھا کہ ان کے پرچوں خصوصاً کامریڈ کو برصغیر پاک و ہند کی تاریخِ صحافت میں ایک خاص مقام حاصل ہوا۔ حکومتِ وقت کے اہم کارکنان بھی اسی کی اشاعت کے منتظر رہتے۔ کامریڈ نے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو جلا بخشی اور انہیں عملی سیاست میں حصہ لینے کی تحریک دی۔ کامریڈ میں برصغیر کے مسلمانوں کے معاملات اور مطالبات کو واضح طور پر پیش کیا جاتا۔ عالمِ اسلام کی بے چینی اور ان کے مسائل کو زیرِ بحث لایا جاتا۔ حکومت کی زیادتیوں اور مختلف موقعوں پر ان کے ظالمانہ رویے (مثلاً مسجد کانپور، اور جلیانوالہ باغ کا معاملہ وغیرہ) کی طرف متوجہ کرایا جاتا۔ نیز ہندو پریس کی طرف سے مسلمانوں پر جو اعتراضات کئے جاتے تھے ان کا بھی مدلل جواب دیا جاتا۔ ۱۹۱۳ء میں حالات ایسی شکل اختیار کر چکے تھے کہ مولانا محمد علی جوہر جو ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے یہ جان گئے کہ یہ اتحاد مسلمانوں کے حق میں نقصان رساں ہے اور یہ کہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا قیام ناگزیر ہے مولانا نے اپنے ان خیالات کو اپنے مخصوص مدلل انداز میں اپنے مضامین کے ذریعے پیش کیا۔ مولانا اس وقت کانگریس کے سرگرم رکن اور معتمد رہنما بھی تھے ان کے اس قسم کے مضامین نے کانگریسی ہندوؤں میں کھلبلی مچا دی۔ ہندو پریس نے ان کے خلاف مضامین لکھے۔ لیکن زبردست مخالفت بھی انہیں اپنے موقف سے نہ ہٹا سکی اور وہ نہایت بے خوفی کے ساتھ اپنے مضامین کے ذریعے اس حقیقت کی پُرزور وضاحت کرتے رہے کہ حقائق سے چشم پوشی ممکن نہیں ۔ برصغیر میں مسلمانوں کی جداگانہ ریاست کے قیام کے بغیر ہندو مسلم مناقشات کا حل ممکن نہیں۔

ان کی حق گو اور بے باک صحافت کا ہدف ایک طرف ہندو پریس تھا تو دوسری جانب خود حکومت۔ حق بات کہنے میں وہ کسی رو رعایت سے کام نہ لیتے۔ ۱۹۱۴ء میں لندن ٹائمز نے ایک اشتعال انگیز مقالہ "چوائس آف دی ٹرک" کے نام سے شائع کیا، جس میں ترکوں کو اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ مولانا نے اس کے جواب میں ایک مضمون قلمبند کرتے ہوئے برطانوی حکومت کی ان زیادتیوں کی نشاندہی کی جو ترکوں کے خلاف روا رکھی گئی تھیں حکومتِ وقت کے اعمال و افعال پر نکتہ چینی یقیناً خطرناک اقدام تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے، کہا، پورے زور اور قدرت کے ساتھ کہا۔ احباب نے جب اس مضمون کی اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کی، تو فرمایا "میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کئے ہیں مگر اب میں اپنی رائے قائم کر چکا ہوں جو ہونا تھا وہ ہو چکا

---

[1] مکتوب محولہ بالا صفحہ

اب [illegible] ہو سکتا۔ چنانچہ ۲۰ دسمبر ۱۹۱۴ء کو مضمون شائع ہوا حکومت نے ایکشن لیا۔ کامریڈ کی ضمانت ضبط ہو گئی اور مولانا جوہر نظر بند کر دیئے گئے۔ یہ نظر بندی مئی ۱۹۱۵ء سے دسمبر ۱۹۱۹ء تک جاری رہی۔ لیکن یہ طویل قید و بند بھی مولانا کی طبیعت کو پابندِ مصلحت نہ کر سکی وہ بدستور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے جس بات کو سچ سمجھتے رہے کہتے اور لکھتے رہے اس حق گوئی اور بے باکی کے صلے میں ۱۹۲۱ء میں پھر دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد اس مردِ آہن کی روش بدستور قائم تھی۔ مسلسل صعوبتیں اور پیہم عتاب بھی ان کے جذبات کی شدت اور خلوص کی حدت کو کم نہ کر سکا جیل کی سختیاں ان کے عزم کو مہمیز لگاتی رہیں اور یہ سفر جاری رہا۔

ایک طرف حالات یہ تھے اور دوسری جانب معاش و وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ اخبارات کو جاری رکھنے کے لئے مولانا جوہر نے صرف اپنی ذات کو پوری طرح وقف کر دیا تھا بلکہ اپنے اہل خانہ کو بھی اس میں شریک کر لیا تھا۔ ان اخبارات کو چلانے کے لئے اوّل انہوں نے اپنی جائیداد فروخت کی۔ اس کے بعد بیگم کے زیورات اور گھر کا اثاثہ کام آتا رہا۔ یہ ذریعہ تمام ہوا تو دوست احباب اور دردمندانِ قوم کی مالی اعانت سے کام چلاتے رہے۔ لیکن یہ امداد و تعاون کوئی مستقل ذریعہ آمد تو نہ تھا۔ لیکن پھر بھی مولانا کا اپنے مقصد کے ساتھ عشق جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا چنانچہ ایک وقت وہ بھی آیا کہ اہل و عیال کے لئے گزر اوقات کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ نوبت فاقوں تک جا پہنچی۔ بعض بہی خواہ مالی اعانت کرتے تاکہ گھریلو زندگی کی یہ مشکلات ان کے مشن کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں لیکن مولانا جوہر اس رقم کو بھی اپنے اخبارات پر صرف کر دیتے تھے۔ ان کٹھن حالات کو اپنے اور اہل خانہ کے لئے قدرت کی جانب سے آزمائش قرار دیتے۔ مالی وسائل کی کمی اور انتظامی امور میں ناتجربہ کاری کے باعث حالات دن بدن ان کے قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ اس کا اظہار کرتے ہوئے، مولانا عبدالباری کو لکھتے ہیں:

"ایک مدت سے عریضہ لکھنے کا ارادہ تھا مگر اس غلامی کا بھلا ہو جس میں دو اخباروں نے مجھے مبتلا کر دیا۔ مگر اس خیال سے کہ اس طرح تو شاید کبھی بھی فرصت نہ ملے اور کاموں کو چھوڑ کر یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ پریس کے کمپوزیٹر جن کی تنخواہیں اور زیادہ وقت کی اُجرت نے دیوالہ نکال دیا ہے، گھنٹہ بھر بعد سر پر سوار ہوں گے کہ مضمون لاؤ اور یہاں صرف ابھی ورق سادہ ہی ہے۔۔۔۔ گذشتہ ڈھائی ماہ میں ساڑھے چھ ہزار باہر سے لا کر بھر چکا ہوں اور اس مہینے میں تنخواہیں تک نہیں دے سکا۔ لوگوں کی بلیں چکانا تو درکنار۔۔۔۔ اب تک یہ ہوا ہے کہ جس کسی نے میرے اہل و عیال کے لئے کچھ دیا وہ سب ہمدرد اخباروں میں لگا دیا۔ لیکن یہ کب تک ہو سکتا ہے اب کہیں سے کچھ آنے کی بھی سال بھر تک امید نہیں ہے۔۔۔۔ غالباً صاحب گورکھپوری ایک ہزار روپیہ لے کر چل دیئے ۔۔ اور ایک دیوالیہ کا اور بھی دیوالہ نکال دیا۔"[1]

صورت حال مایوس کن حد تک بگڑ چکی تھی قلمی معاونین حسب منشا نہ مل رہے تھے۔ خریداروں کی تعداد انتہائی کم تھی۔ مالی وسائل نہ ہونے کے برابر رہ گئے تو وہ شخص جو بدترین حالات میں بھی مایوس ہونا نہ جانتا تھا یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:

"یہ کام تو اسی طرح چل سکتا ہے کہ ہمدرد کے خریدار پیدا ہوں۔ عام مذاق کے مطابق گالی گلوچ قوم کے لئے مضر ہے۔ اس لئے وہ راستہ حصولِ زر کا میرے لئے بند ہے۔۔۔۔ اگر تین چار ہزار خریدار نہ ملے تو یا تو کامریڈ کو بند کر دوں اور صرف ہمدرد کو عام قومی اصلاح کے خیال سے نکالوں۔ یا ہمدرد کو بند کر دوں اور کامریڈ کو خواص کی اصلاح کی نیت سے نکالتا رہوں۔ یا پھر دونوں کو بند کر دوں۔"

یہ خط ۲۵ مئی ۱۹۲۵ء کو لکھا گیا۔ اور صرف چند سال کے اندر انہیں اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانا

---

[1] مکتوب جوہر بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ ۲۵ مئی ۱۹۲۵ء

پڑا۔

مولانا محمد علی جوہر نے دشتِ صحافت میں اپنے سفر کی ابتدا ۱۹۰۴ء سے کی۔ اس زمانے میں انہوں نے چھوٹی تقطیع کا ایک رسالہ "گپ" جاری کیا۔ اس کے دو شمارے شائع ہوئے۔ اس دوران وہ مختلف اخبارات میں ملکی معاملات پر مضامین لکھتے رہے۔ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے "ٹائمز آف انڈیا" بمبئی میں مضامین لکھنے کا ایک سلسلہ شروع کیا جو اسی سال بعنوان THOUGHTS ON PRESENT DISCONTENT. کتابی صورت میں شائع ہوئے ۱۹۱۱ء میں کامریڈ اور ۱۹۱۳ء میں ہمدرد جاری کیا۔ اس کے ساتھ عملی طور پر سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں۔ کانگریس و مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت، ترکِ موالات، تحریکِ خلافت، ترکی کے لئے چندہ فراہم کرنے کی مہم، اور قلمی سرگرمیاں جاری رہیں۔ بے باک صحافی اور سرگرم رہنما پر مقدمات چلائے جاتے رہے۔ قید و بند کی تکالیف گزرتی رہیں اس دوران کامریڈ اور ہمدرد کو ایک بار بند بھی کرنا پڑا، ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں کامریڈ دوبارہ جاری کیا، ۱۸ نومبر ۱۹۲۴ء میں ہمدرد کا دوبارہ اجرا ہوا۔ اس زمانے میں محمد علی جوہر کو دو جانکاہ صدمات جھیلنے پڑے۔ چہیتی بیٹی آمنہ اور والدہ محترمہ "بی اماں" کی مفارقت۔ یہ پرعزم اور بے باک صحافی ناسازگار حالات کے پے در پے حملوں سے انتہائی شکستہ ہو چکا تھا گو حوصلے اب بھی پست نہ ہوئے تھے لیکن عملی قوتیں مضمحل ہوتی جا رہی تھیں۔ مشکل ترین حالات میں سینہ سپر رہنے والا صحافی نڈھال ہو چکا تھا اور مزید مقابلے کی ہمت اپنے اندر نہ پاتا تھا۔ صحت بھی جواب دینی جا رہی تھی بمجبوراً ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۷ء میں علی الترتیب کامریڈ اور ہمدرد کی غلامی سے آزاد ہو گئے، اور ۱۹۲۸ء میں علاج کیلئے لندن روانہ ہو گئے، ۱۹۲۹ء میں ان کی دوسری بیٹی حمیدہ بھی ہمیشہ کے لئے ان سے رخصت ہو گئی۔

محمد علی جوہر کی علالت کی شدت نے انہیں صاحبِ فراش کر دیا۔

آخر عمر میں قویٰ مضمحل ہو گئے تھے لیکن اس متوکل اور مستغنی شخص کی بے باکی اور بے خوفی جو ان کے مضامین کی جان تھی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ شدید علالت کے باوجود گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے۔ اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے انہوں نے اپنی جان پر اتنی سختیاں جھیلی تھیں اور اپنا سب کچھ نثار کر دیا تھا اور اب وہ جلد از جلد اپنے مقصد کا حصول چاہتے تھے۔ وہ صرف ایک چیز کے خواہاں تھے "آزادی یا موت" ان کی اس آرزو میں ایسی شدت اور خلوص تھا کہ ان کے آخری الفاظ یادگار رہ گئے، ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس کے موقع پر انہوں نے فرمایا:

"I WANT TO GO BACK TO MY COUNTRY IF I CAN GO BACK WITH THE SUBSTANCE OF FREEDOM IN MY HAND. OTHERWISE I WILL NOT GO BACK TO A SLAVE COUNTRY I WOULD EVEN PREFER TO DIE IN A FOREIGN COUNTRY SO LONG AS IT IS A FREE COUNTRY, AND IF YOU DO NOT GIVE US FREEDOM IN INDIA, YOU WILL HAVE TO GIVE ME A GRAVE HERE."

صبر و تحمل، تسلیم و رضا اور توکل و استغنا کی یہ وہ منزل تھی جب بندہ کچھ نہیں کہتا سوا اس کے جو اس کا خالقِ حقیقی اس سے کہلوانا چاہتا ہے چنانچہ کل عالم نے دیکھ لیا کہ اس بے باک صحافی اس مردِ مومن نے جس جوش و جذبے اور اعتماد کے ساتھ یہ الفاظ ادا کئے تھے خدا نے اس کی لاج رکھ لی اور وہی کر دکھایا جو اس کے بندے نے چاہا تھا۔ خالقِ حقیقی نے ان کی زندگی کی نذر قبول کر کے انہیں حیاتِ جاوداں بخش دی۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

انشائیہ

منصور قیصر

کہاں دیکھئے تھمے

بچپن میں جب ہم ایسی کہاوتیں پڑھتے تھے کہ کسی چوہے کو ہلدی کی گانٹھ ملی تو وہ پنساری بن بیٹھا یا کسی لال بجھکڑ کو رستے میں پڑی نعل ملی تو وہ اپنے آپ کو گھوڑے تانگے کا مالک سمجھنے لگا تو ہم اس لئے ہنس دیتے تھے کہ ہمیں ایسی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا لیکن اب ایسی ہر بات پر یقین آجاتا ہے۔ بلکہ تعجب اس وقت ہوتا ہے جب ہلدی کی ایک گانٹھ سے پنساری کی دوکان نہیں کھلتی یا کوئی نعل پھیل کر گھوڑے تانگے میں تبدیل نہیں ہوتی۔ اب تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کچھ لوگ مٹی کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ سونا بن جاتی ہے یہ الگ بات کہ وہ سونا اپنے گھر لے جاتے ہیں اور مٹی کو ہم اور آپ ہنڈیا میں پکا کر کھاتے ہیں آخر پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کھانا ہی پڑتا ہے۔ ویسے ہم سب کچھ کھاتے ہیں۔ صرف غیرت نہیں کھاتے کہ یہ چیز آج کے زمانے میں بڑی کڑوی کسیلی اور غیر زود ہضم ہے۔

صاحبو! وقت وقت کی بات ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں قناعت اور تقوے کا سکہ چلتا تھا لوگ بات پیچھے کرتے تھے اور الحمد اللہ پہلے کہتے تھے۔ لیکن یہ تو پرانے زمانے کی بات ہے جسے جدید لوگ غیر سائنسی زمانہ کہتے ہیں۔ یہ زمانہ تو سائنس کا زمانہ ہے اس زمانے میں اگر انسان مشین کی رفتار سے نہ چلے تو اسے بیکار سمجھ کر کسی کباڑی کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب انسان کا دل پلاسٹک کا اور اس کا دماغ سٹین لیس سٹیل کا بنا ہوا برقی پرزہ بن جائے تو پھر اسے اپنے وجود کو ٹکسال بنانے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں قناعت اور تقویٰ کے پرانے سکے تو اصحاب کہف کے کیسوں سے برآمد ہونے والے سکے ہی ثابت ہوتے ہیں!

ہم سائنس کے مخالف نہیں کہ اسی سائنسی ایجاد کے ذریعے ہی ہم آپ سے ہم کلام ہو رہے ہیں۔ گھپلا صرف یہ ہوگیا ہے کہ انسان نے اپنی فلاح و بہبود کے لئے جو سائنسی ایجادات کی تھیں وہی اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہیں۔ اب سائنس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ انسان اپنے جیسے انسانوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے مہلک ہتھیار بھی ایجاد کر لے۔ خیر ہم جیسے لوگوں کو تو مہلک ہتھیاروں کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم تو ایک کے بعد دوسرا بنگلہ اور دوسرے کے بعد تیسرا بنگلہ بنانے کے لئے بڑی معصومیت سے ملاوٹ کے زہر اور چور بازاری کی چھری سے دوسروں کے گلے کاٹ لیتے ہیں۔ اور اس مشینی زندگی میں ہمارے پاس اتنا سوچنے کی بھی فرصت نہیں ہے کہ سکندر اعظم جب دنیا سے گیا تھا تو اس کے دونوں خالی ہاتھ کفن سے باہر تھے۔

ہمارے ایک چچازاد بھائی ہیں۔ جنہیں ہم سب بھائی جان کہتے ہیں۔ وہ آج کل ہمارے لئے قابلِ رشک ہی نہیں قابل حسد بھی ہیں کم از کم ہماری زوجہ محترمہ ۱۰۹ درجے حسدی بخار میں ضرور مبتلا ہوگئی ہیں اور جب یہ بخار ان کے سر کی طرف چڑھتا ہے تو پھر وہ اپنی واہی تباہی سے ہماری تباہی پھیر دیتی ہیں اور ہمارے منہ سے صرف واہ واہ نکلتا رہ جاتا ہے۔ موصوفہ کی تقریر دل پذیر سے ہی ہمیں اس امر کی آگاہی ہوتی ہے کہ ہماری شرافت اور ایمانداری کوڑیوں کے بھاؤ بھی نہیں ہے۔ غالباً کسی کلاسیک شاعر نے ایک مصرعہ خاص طور پر زوجگان کیلئے لکھا کہ وہ ہم ایسے گاجر مولی نما "شوہران" کو سناتی رہیں کہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ذکر ہم اپنے بھائی جان کا کر رہے تھے کہ وہ ہمارے لئے قابلِ رشک ہی نہیں قابلِ حسد بھی ہیں وہ ہمارے ہمسائے بھی رہے ہیں۔ یعنی ہم دونوں کے دو کمری فلیٹ ساتھ ساتھ تھے۔ ایک روز ہمارے بھائی جان کسی نیلامی سے ساگوان کا بنا ہوا ایک چوڑا سا شیلف خرید لائے۔ پھر وہ شیلف کے خالی پیٹ کو بھرنے کے لئے کئی روز تک تگ ودو میں مصروف رہے آخر انہوں نے شیلف کے نچلے خانوں کو یوں سجا کر ایک طرف فوک آرٹ کے قیمتی نمونے رکھے دوسری طرف ریڈیو ٹیپ ریکارڈر رچایا اور ڈھیر ساری دیدہ زیب سرورق والی ایسی کتابیں رکھیں جنہیں بھارتن کے فرشتے بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ شیلف کا سب سے اوپر والا حصہ خالی رہا جس کی ویرانی انہیں بے چین کئے رہی۔ پھر ہم نے ایک روز دیکھا کہ شیلف کا خالی حصہ ایک ۲۶ انچ کے کلرڈ ٹیلی ویژن سے پُر ہو گیا ہے۔ یہ ہمارے لئے وہ یومِ حساب تھا۔ جب ہماری پیاری مگر بے صبر زوجہ نے ہمیں فقیر فقراء جو سنے کے طعنے دے دیئے! جب کلرڈ ٹیلی ویژن لگ گیا تو ہماری بھابی کو کمرے میں پڑی ہوئی پرانے زمانے کی کرسیوں، اپنے جہیز میں لائے ہوئے نواری پلنگوں، بوسیدہ پردوں اور دیواروں پر پھیری ہوئی چونا قلعی کو دیکھ کر تے سی آنے لگی۔ نتیجتاً ہمارے بھائی جان کے پاس اس کے سوا اور کوئی راہ نہ تھی کہ وہ رنگدار ٹیلی ویژن کے شایانِ شان فوم کے صوفہ سیٹ فوم کے پلنگ اور سلک کے پردے خریدتے اور دیواروں پر میچنگ کلر میں پینٹ کرواتے۔

ہماری زوجہ نے ہمیں بڑی غیرت وغیرہ دلائی کہ دیکھو اگر دیکھا جائے تو آمدن کے لحاظ سے تم اپنے بھائی جان کے بڑے بھائی ہو لیکن کیا وجہ ہے کہ خوشحالی، بلڈنگ کی سیڑھیاں تو اکثر چڑھتی ہے۔ لیکن بھائی جان کے دروازے پر پہنچ کر راستہ بھول جاتی ہے۔ اب ہم محترمہ کو کیسے سمجھاتے کہ ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

پہلے صرف لوہا لوہے کو کاٹا کرتا تھا مگر اب کاغذی نوٹ آہنی اصولوں کو کاٹنے لگے ہیں۔ ہمارے بھائی جان جو بوتے ہیں اور گندم کاٹتے ہیں لہٰذا ہماری قسمت میں صرف توکل کا کشٹ کاٹنا ہے! ایک شام بھائی جان ہمارے ہاں آئے اور فرمانے لگے کہ "تنگ داماں کمرے میں لگ سائز ٹیلیویژن کی وجہ سے ہم سب کی بینائی پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ لہٰذا ہم کل اپنی کوٹھی میں منتقل ہو رہے ہیں۔"

"اپنی کوٹھی میں؟" ہم نے اپنی چشم بینا کو ہتھیلی سے ملتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟" وہ بولے "بھئی دنیاداری بھی تو نبھانی ہوتی ہے۔"

"لیکن بھائی جان یہ مَن کہاں سے برسا ہے۔ اور یہ چھپر کس نے پھاڑا ہے۔"

ہمارے اس سوال پر انہوں نے دائیں آنکھ میچ کر اور ہمارے بائیں کندھے کو زور سے دبا کر طنزیہ مسکراہٹ سے جواب دیا "تم ابھی بچے ہو ایسی باتیں نہیں پوچھا کرتے۔" ہمیں پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا جانتے ہیں اور ہم تر دامنی کے ڈر سے کنارے سے پرے ہی کھڑے رہتے ہیں۔

ہمارے بھائی جان کی نقل مکانی بلکہ نقلِ کوٹھی کے بعد جب ہمارے بیوی بچے فوم کے صوفہ سیٹ پر بیٹھ کر کلرڈ ٹیلی ویژن دیکھنے سے محروم ہو گئے تو انہوں نے دیکھنے کے لئے ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ہمیں من وعن انہی نظروں سے دیکھتے جن نظروں سے رومنوں کے عہد میں بھوکے شیر مظلوم قیدیوں کو دیکھا کرتے تھے۔ ہم بڑی خندہ پیشانی سے ہر ستم صرف اس لئے بھی سہہ لیتے کہ ہمیں اپنے آپ کو ایسا کاغذی شیر بنانے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ جن کے ماتھے پر سٹیٹ بنک کی مہر لگی ہوئی ہو۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ہم رات کو اتنے سکون اور آرام سے سویا کرتے کہ گھوڑے بیچ کر سونے والا بھی کیا سوتا ہوگا۔ دورانِ خوابیدگی ہم تو ایسے خواب بھی نہیں دیکھا کرتے تھے کہ جنہیں وقتِ بیداری یاد کر کے ہوس کی بدہضمی ہو جائے۔

سکھ چین کی نیند سے یاد آیا کہ بھائی جان کی نئی کوٹھی میں ہاؤس وارمنگ پارٹی (HOUSE WARMING PARTY) بھی ہوئی لیکن ہم شریک نہ ہو سکے کہ فیشن کے مطابق ہم تحفہ دینے سے معذور تھے! اگر خالی ہاتھ جاتے تو خواہ مخواہ کی جگ ہنسائی ہوتی اور بھائی جان اُلٹا ہمیں ہاتھ دکھاتے۔ ایک عرصے تک بھائی جان سے ملاقات نہ ہو سکی کہ ان کی لمبی کار ہماری گلی میں آنے سے شرماتی تھی اور ہمارے سائیکل کی رسائی ان کے بنگلے تک نہیں تھی۔

ایک روز ان کا چھوٹا بھائی جسے بھائی جان نے

پکڑ چلا کر ملک سے باہر بھجا دیا تھا، ہمارے ہاں آیا
انہوں نے اضطراب سے بولا کہ بھائی جان کو بے خوابی کی بلا
شدید شکایت ہو گئی ہے ! نیند آور گولیوں کو چنوں
کی طرح پھانکنے کے باوجود بھی انہیں نیند نہیں آتی۔
بہت ہی پریشان ہیں اور حالت روز بروز بگڑتی ہی
جا رہی ہے۔" ہمیں بھی تشویش ہوئی پوچھا "کوئی
علاج معالجہ بھی کروایا" کہنے لگا "ایک بھی ایکسپرٹ ڈاکٹر
نہیں چھوڑا ! یہاں تک کہ بے ہوشی کے انجکشن بھی
لگوا کر دیکھ لئے ہیں۔ بھائی جان بے ہوش تو ہو جاتے
ہیں۔ لیکن آنکھیں کھول کر بڑبڑ دیکھتے رہتے ہیں۔"
"پھر کیا سوچا ہے ؟" ہم نے پوچھا
وہ بولا "یہی سوچا ہے کہ چچا جان کو بذریعہ تار
بلوا لیا جائے" چچا جان کا مطلب ہمارے والد گرامی
تھے جو نہ صرف اعلیٰ پائے کے طبیب تھے بلکہ ایک
خدا ترس حکیم بھی تھے۔ اور مریضوں کا زیادہ تر علاج
ادویات کی بجائے حکمت سے کیا کرتے تھے۔ ہم نے
ابا جان کو ٹیلی گرام دے کر بلوا لیا۔ انہوں نے بھائی جان
کا معائنہ کرنے کے بعد تشخیص کی کہ اسے کوئی جسمانی
تکلیف نہیں وہ صرف ایک ہی عارضہ میں مبتلا ہے
جسے مفسرین علم الاخلاق ہوس زر کا نام دیتے ہیں۔
یہ بے خوابی کا شکار صرف اس لئے ہوا ہے کہ یہ
چاہتا ہے کہ دن کی طرح رات کو بھی دولت اکٹھی
کرتا رہے۔

یہ تشخیص سن کر معلوم نہیں کیوں ہمیں اپنی گلی
کے ماشکی کا وہ کتا یاد آ گیا۔ جس کا اگر پیٹ بھرا ہو
تو وہ اپنی مرغوب غذا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں
دیکھتا۔

مشترک

پھری ہماری روٹی کو
مساوی حصوں میں کاٹتی ہے
جہاں تیرے ہونٹ، جام کو چھوئیں
میں وہیں سے، دوسرا گھونٹ پیتا ہوں
تو میری پاپوش میں چل!
جب جاڑا آئے
تو تیری پوشاک، مجھے گرم رکھتی ہے
ہم دونوں، ایک ہی آنکھ سے اشک بہاتے ہیں
اور سرِ شام، دروازے کو بند کر دیتے ہیں
تنہائی کی خاطر
نیند میں، تیرے سپنے
میری خوابوں میں ڈھل جاتے ہیں

سحر کے وقت

سحر کے وقت
میں اکثر اداس رہتا ہوں
صبح ہو جائے جب
تو دل سے مرے
ہے نکلتی
صدائے ہو الحق

بن کے خانہ بدوش
مثلِ صدف
وقت کے ندیاں
رواں دواں
میں جہاں تھا
وہیں پہ رہتا ہوں

سادہ جملے

میں جو اُٹھوں
تو خدا یہ کرتا ہے
صبحدم، آفتاب یوں اپنی
پہلی تصویر کو بناتا ہے
کھلنا غنچے کا، جان کی ہے بازی
پر میں خوش ہو کے، کرتا ہوں اعلان
دوستو، جی رہا ہوں میں!

اے جھینگر، تو گا!

اے جھینگر، تو گا!
رات بہت طویل ہے
نہیں معلوم، میں زندہ بھی رہوں
تیرے گیت کے ختم ہونے تک

دریچے کھلے پڑے ہیں
نہیں معلوم، نظارہ دیکھ بھی سکوں
اس رات کے آخر تک

اے جھینگر، تو گا!
جی کھول کر گا!
مسرت پا بہ رکاب ہے
غم بیدار ہوا چاہتا ہے
اور مسرت میں غم ——
اس کے سوا، کچھ نہ لائے گی
یہ طولانی رات

جرمن سے ترجمہ: محمد اسحاق میر

مکالمہ

بتاؤ، میں کیا ہوں اور میں کیا ہو جاؤں گا؟
مٹی!
بتاؤ، میں نے سوچا کیا تھا اور میں نے کیا کیا ہے؟
حماقت!
بتاؤ، اب دھوپ کے علاوہ میرے پاس کیا بچا ہے؟
خاک!
بتاؤ، پھر میں کس چیز کی خاطر زندہ رہا؟
غم اٹھانے، خوابیں دیکھنے اور ایثار کرنے کے لئے!

میں اور تو

ہم ایک دوسرے کی خوابیں دیکھ رہے تھے
لیکن ہم اس خواب سے بیدار ہو چکے ہیں
ہم جی رہے ہیں، با ہمی الفت کے لئے
اور ہم دوبارہ، رات میں ڈوب جائیں گے

تو میری خوابوں سے باہر نکلی
میں بھی تیری خوابوں میں نہ رہا
اب اگر ایک ـ دوسرے میں جذب ہوا
تو یہ ہماری موت ہوگی

سوسن کے اک پھول پر
دو اُجلے، گول، لرزتے قطرے
بہہ کر ایک ہوئے اور ڈھلک کر
کٹوری کی تہ میں ڈوب گئے

شبنم رومانی

گنبد

روشنی بھی برق پا
اور وقت بھی گرمِ سفر
اور خوشبو کا پرندہ بھی سدا
پھڑپھڑاتا ہے فضا میں اپنے پر
موسموں کے قافلے بھی
اپنا پرچم اپنے شانوں پر اٹھائے،
چھوڑ جاتے ہیں غبارِ رہگزر

اور سمندر
کھُردرا، نیلا سمندر
جس کے گہرے، تیز، برہم پانیوں میں بھی رواں ہے
سانس لیتی،
اور بقا کی جنگ لڑتی،
ایک دنیائے دگر
زندگی ———
تالاب کا ٹھہرا ہوا پانی؟
میں

اس کا منصب ———
خواب ارزانی؟
نہیں!
زندگی ہے کارگاہِ جسم و جاں
شہکارِ خلاقِ جہاں
آتی جاتی سانس
وہ آری ہے
جس سے لمحہ لمحہ کٹ رہا ہے عمر کا کوہِ گراں
زندگی کی نغمگی میں
اک صدائے تیشۂ خوں رنگ ہے
ایک پیہم ضرب کا آہنگ ہے

زندگی ہے
وہ طلسمی گنبدِ آفاق گیر
جس کی جو ہر کار قوت کے اسیر
آسمانوں کے عجائب، کہکشاؤں کے ضمیر
جس کا پُر اسرار، پیچیدہ جال
کل بھی تھا اک حرفِ حیرت،
آج بھی ہے اک سوال؟

احسن زیدی

ایک خواہش

ہمارے مالک!
زمین اور آسمان کے خالق!
ہمیں یہ توفیق دے کہ جب تک
زمین محور کے گرد گھومے
سلاسلِ کوہ کی جبینوں پہ برف و ستار جگمگائے
سحاب کا سائبان
سورج کی آگ سے سبز کونپلوں کو پناہ بخشے
ہوائیں
نیلے، سنہرے، سرخ اور سبز رنگوں کے
خوش گلو۔ بولتے پرندے کے
قافلے اپنے ساتھ لائیں
زمیں کے سینے میں آبِ دریا کے ہاتھ زنجیریاں بکھیریں
بطیں یونہی نیل رنگ جھیلوں کے ساحلوں کو
سفید نقطوں کی دلکشی دیں

ہمارے مالک:
فلک کا جب تک چراغ روشن ہے
ہم کو توفیق دے کہ ہم
شاہِ انبیاءؐ پر
درود بھیجیں۔ سلام بھیجیں
جو فن کی دولت ہمیں ملی ہے
ان کے قدموں کی دھول پر سب نثار کر دیں

انیچ پروڈلشو (گھانا) — ترجمہ :- امجد اسلام امجد

پیاری بارش

اگر یہ بارش جو چاروں طرف برس رہی ہے دلوں کو دھو سکتی!
اگر یہ بارش جو خوشی کے گیت گا رہی ہے بغض اور کینے کو جڑ سے اکھیڑ سکتی!
اگر یہ بارش جو پتوں پر رقص کر رہی ہے شعلوں کو سرد کر سکتی!
اگر یہ بارش جو کھڑکی کے شیشوں پر جل ترنگ بجا رہی ہے کسی تسلسل کو جنم دے سکتی
اگر یہ بارش جو فٹ پاتھوں پر بہتی ہے شہد بن سکتی
تو میں اس دنیا میں کس قدر مسرور اور شادمان رہتا
اس کھوٹ اور باس بے سمتی کے درمیان میں کیسی خوش نصیبی کو گلے سے لگاتا!
خوش قسمتی جو "اُمید" کے سویرے میں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی ہے
مگر افسوس پیاری بارش
تمہاری تمام تر کوششوں اور خلوص کے باوجود
"ویت نام" میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں
"سیناق" میں بم پھٹ رہے ہیں
اور "آدیری" میں زمین شعلہ زن ہے
تمہاری تمام تر نرمی کے باوجود اے گاتی اور رقص کرتی ہوئی معصوم بارش
میرا بھائی تلوار گھما رہا ہے
اور میری بہن نفرت بُن رہی ہے
پیاری دوست ان سب باتوں کے لئے اتنی دور نہ بھاگ نہ کر
آہستہ آہستہ بغیر جھکے بہتی جا۔ ان چالاک اور دھوکے باز شکلوں کو
آگ کی ان زبانوں کو نگل جا
تاکہ تیرے جانے کے بعد دنیا میں صرف محبت امن خوشی اور مسرت باقی رہیں
اے میری پیاری بارش
دنیا کے لئے امید کا پیغام بن جا ــــ!!

گیدونہ مولا (انگولا)

موت ہم جڑواں بھائی ہیں

موت ہمیں تمہیں خوف میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتا
کیونکہ ہم دونوں میں خون کا رشتہ ہے
پلدرے نوجوانو،
ہم نے تنہائی میں
ایک ہی گھر کی دیواروں میں رہ کر کاٹے ہیں
اور ہنسی خوشی ایک ہی پیالے سے
کھاتے اور پیتے رہے ہیں
یہاں تک کہ موت کے لمحے نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا
لیکن تم، میرے ساتھی اور جڑواں بھائی کی طرح
ایک پرجوش ہم آغوشی کے انداز میں
ہمیشہ میرے وجود سے چمٹی رہی ہو!
جیسے کسی شاعر نے کہا ہے
"موت تمہاری چادر کے دامن میں پرورش پاتی ہے"

ماریو انتونیو (انگولا)

محبت اور مستقبل

مجھے اس پرانی زبان میں گفتگو بند کر دینی چاہیئے
جسے تم سمجھ نہیں سکتے
(اس لئے کہ تم بڑھتے ہوئے پھلدار درخت کی طرح فطرتاً "آئندہ" سے تعلق رکھنے والے ہو)
مجھے چاہیئے کہ میں تم سے مستقبل کے نئے لحن میں کلام کروں
جو پھولوں سے لدا ہوا ہے
مجھے ماضی کی اُن یادوں کو ترک کر دینا چاہیئے جو گوروں کے ہاتھوں اور سیاہ فام
غلاموں نے مجھے بخشی تھیں
سیاہ فام غلام جہازوں کو
بحری جہازوں کے تہہ خانوں میں چاند کے خواب دیکھا کرتے تھے
مجھے ان صدیوں پرانے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں خشک کر لینا چاہیئے۔
جن پر وقت نے طرح طرح کے پردے تانے ہوئے ہیں
تمہاری والہانہ سپردگی اور یہ اذیت ناک دباؤ ہمہ وقت میرے وجود پر محیط رہتا ہے

تمہارے رخسار میرے سینے پر ہیں اور تمہارا ہاتھ میرے ہاتھوں میں
تمہاری باہنوں کی گرمی اور تمہاری آنکھوں کی گرم جوشی مجھ پر سایہ کئے ہوئے ہیں
مجھے یہ سب باتیں تم سے نہیں کرنی چاہئیں
(اس لئے کہ تم بڑھتے ہوئے پھلدار درخت کی طرح فطرتاً "آئندہ" سے تعلق رکھتے ہو)
مجھے کوئی نیا نغمہ الاپنے کی کوشش کرنی چاہیئے
ایسا نغمہ جس میں آرزو حقیقت کا روپ دھار لے
مجھے یہ نغمہ تمہارے حضور پیش کرنا چاہیئے
اے میرے پھلدار درخت
کہ تمہاری شاخوں پر میرے آئندہ کے تمام پھول کھلنے والے ہیں
اے میری زندگی کو روشن کرنے والے سورج
یہ دن میری آنکھ کو تو نے ہی ودیعت کیا ہے :

پال اوبین (سارا لوک)

زندگی کے ہاتھوں مر چلے

میں مر رہا ہوں
ہو سکتا ہے میری شکل سے اس کا اندازہ نہ ہوتا ہو
لیکن کیا ہم میں سے کسی کی بھی شکل سے یہ اندازہ ہوتا ہے ؟
اس کے باوجود ہم سب مر رہے ہیں
کچھ بیماری سے کچھ بھوک سے اور کچھ ماتم گساری سے
لیکن ہم میں سے زیادہ تر اس زندگی کے ہاتھوں مر رہے ہیں
کیونکہ ہم مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں
ہم میں سے کچھ جنت کے لئے مرتے ہیں اور کچھ جہنم کے لئے
اور کچھ گوشۂ گمنامی کے لئے
لیکن چونکہ موت ہم سب کی قدرِ مشترک ہے اس لئے ہم مسلسل مر رہے ہیں
وہ جو بیماری بھوک اور ماتم گساری سے مرتے ہیں
اگرچہ تیزی سے مرتے ہیں مگر صحیح وقت پر مرتے ہیں
اور وہ جو زندگی کے ہاتھوں مر رہے ہیں
اگرچہ آہستہ آہستہ مر رہے ہیں لیکن یقیناً اپنے صحیح
وقت پر مرتے ہیں
کچھ جنت کے لئے، کچھ جہنم کے لئے اور کچھ گوشۂ گمنامی کے لئے

ثروت حسین

پھر وہی آگ .....

پھر وہی آگ
دہرائی گئی اُس شام
پتھر سے تراشی ہوئی میز کے گرد
وہ شعلوں کے بدلتے ہوئے رنگ میں بھی خاموش تھے
اور ہم سے کوئی بھید چھپا نہ سکے
"اندھیری کوٹھڑیوں میں
روشن دان نہیں بنائے
کہ ستارے سستانے کو آبیٹھتے ہیں
دکھی ہوئی پوروں کے لئے
آوازوں کے نیچے ہوتے پنکھ بہت"

تالیوں اور جھنڈیوں کے دوسرے کنارے
گھوڑوں کے بجتے سُم
اور چابکوں کے تیز جھکڑ
آرائشی محرابوں کو بہا لے گئے
چوتھی دستک پر
دروازہ کھولنے والے سہم گئے
درزوں اور دراڑوں سے
خبریں چھن چھن کر آتی ہیں
دور اندیش درختوں کی خلعت
چھیننے والے
گلی گلی ہیں
دھول بھرے پہناوے باشندے ہیں

صدی کے چوتھائی ٹکڑے پر .....

صدی کے چوتھائی ٹکڑے پر بیٹھنے والے ہزاروں
چاند اور سورج یا صرف ایک دن گرم پرشور نمازوں
اور لڑکیوں کے جھنڈ میں راستہ بناتا ہوا .....
ہوائیں ، برآمدے اور احاطے ، گھی لگی روٹیوں
سے آگے کتابوں میں رینگتی ہوئی تہذیب .....
پانی کی زندگی یا پانی کی موت ..... لڑکیوں کی ہنسی
پانی کے سانپ کی طرح سفید بے زہر، دونوں پتواروں
نے ایک ہی کشتی سے چاند کو گلابی ہوتے ہوئے دیکھا
اور پانی پر پہلا پیوند لگایا.....

ایشی کاواتاکوبوکو

ترجمہ:۔ محمد امین

اپنی جوانی کا گیت

ایک پتھر کی طرح جو پہاڑی سے نیچے لڑھکتا ہے
میں اس دن تک پہنچا ہوں
میری چودھویں بہار کو واپسی کا کوئی رستہ نہیں
جب میں اپنا نام لے کر رونے لگتا تھا
سوتے میں بھی سیٹی بجاتا تھا
اور سیٹی بجانا میرے پندرھویں سال کا گیت تھا
جوان اور پریشان آنکھوں کے ساتھ میں اُڑتے پرندوں پر رشک کرتا تھا
اُڑتے پرندے جو اُڑتے ہوئے گاتے تھے
کلاس روم کی کھڑکی سے بھاگ کر میں اکیلا قلعے کے ملبے پر لیٹتا تھا
اس خوشی کے ساتھ جو دیر سے بچھڑے ہوئے دوست سے مل کر ہوتی ہے
میں پانی کی آواز کو سنتا تھا
خواب سے بیدار ہو کر
مجھے افسوس ہے کہ میری نیند اتنی پُرسکون نہیں جتنی پہلے تھی
کٹی ہوئی پتنگ کی طرح
آہستہ سے میری جوان رُوح پرواز کر چکی ہے

ایشی کاواتاکوبوکو

محمد امین

اُداس کھلونے

آج میں کچھ مطمئن ہوں
جس طرح ہم گندے ہاتھ دھو کر مطمئن ہوتے ہیں
یہ سال تو کچھ نہ کچھ اچھا گزرے گا
آج کی صبح آسمان صاف ہے۔ اور ہوا بھی نہیں چلتی
جس طرح جلتی شمعیں آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں
اسی طرح رات آنے والی ہے۔ یہ آخری دن کیسا ہے
صبح ضرور کوئی نہ کوئی اچھائی ہو گی
تنہائی دل کو کوستے ہوئے سو جاؤں
اس بچے کے چہرے سے محبت کرتا ہوں
جو بلّی کے کان مروڑتا ہے۔ اور بلّی کے چلّانے پر حیران ہو کر خوش ہوتا ہے
نبض دیکھنے والی نرس کی گرمجوشی کیسی ہے
کبھی ہاتھ سرد ہوتا ہے۔ اور کسی دن سخت
گھر واپسی کا وقت ہوا (میں نے سوچا) میرا کوئی بھی منتظر نہیں
(اس لئے) میں سارا دن کام کرتا رہا
مجھے شک ہوا۔ کہیں قسمت مجھے بستر پر نہ آ لے
آدھی رات کے وقت احساسِ جرم سے میری رضائی بھاری ہو گئی

محمد انور خالد

ہونا سب سے بڑا الجھاوا ہے

ہونا سب سے بڑا الجھاوا ہے
شاخِ صنوبر چاند کی آس میں جاگتی ہے
اور دن بھر سونے والے گھر کی دہلیزوں پر آ کر بیٹھتے ہیں
اور خواہش و خواب کے اندیشوں میں رات
سمٹتے پیراہن کی لذت بن کر روزن در سے جھانکتی ہے
بچے ماؤں کی گردن میں بانہیں ڈالے ہوتے ہیں
خواب ہماری مائیں ہیں
خواب ہماری مائیں ہیں
اور راہ کنارے بیٹھے لڑکے گھر کو جانے والا سب سے لمبا رستہ چنتے ہیں

شادابی اس شہر میں ایک دن آئی تھی
شادابی ہر شہر میں اک دن آتی ہے
اور ہر شہر کے ایک گوشے میں سناٹے کی چادر تانے
ایک اکیلا گھر ہوتا ہے
باری باری ایک ایک آنے والا
ایک نہ ایک دن اس گھر تک آتا ہے

شادابی اس شہر میں ایک دن آئی تھی
اس دن شہر پناہ میں سب سے پہلا آنے والا میں تھا
اور چاند سمان جھلاجھل چہرے فانوسوں کا سوت بنے تھے
چاند اکیلا گھر
سو ایک دن میں جانے والا اس گھر میں جاتا ہے
مائیں اپنے بچوں کو اس گھر میں جا کر جنتی ہیں
بہنیں ڈھول سہاگ الاپ کے روتی ہیں
اور بیٹے
ساز سجائے میدانوں میں گھوڑا دوڑاتے ہیں
خیموں میں ہر رات الاؤ جلائے جاتے ہیں
اور زخمی جسم کو دفنایا جاتا ہے
اور مرنے والوں کی فہرست بنائی جاتی ہے
خواہش خواب اندیشے خوف
کبھی نہ تھکنے والے پیادے
ہم میدانی لوگ
سو ایک دن مر جانے والا اس گھر میں جاتا ہے
اس کے بعد جو ہے وہ شہر پناہ میں آنے کا پچھتاوا ہے
ہونا سب سے بڑا الجھاوا ہے

شاہین مفتی

وارث

کتابِ جاں پر
قضا کے ہاتھوں
وہ اک حکایت
رقم ہوئی ہے
کہ جس کا ہر لفظ معتبر ہے
تمہارے حصے کے جتنے غم تھے
وہ میری میراث بن گئے ہیں
دکھوں کے سب
تند خو سفینے
مری رگوں میں ہی
تیرتے ہیں
کہ اِن کو اِس
بحرِ احمریں کی
گلاب آسا حدوں سے باہر
کہیں بھی اذنِ سفر نہیں ہے
بہت دنوں سے
مرے لبوں پر
جو ایک
شاداب سی دعا تھی
وہ اسمِ اعظم میں ڈھل گئی ہے
کہ میری دنیا بدل گئی ہے

شکیلہ منظر

جواں نسل کا دُکھ

میری سوچیں، جیسے صحرا میں سراب
آندھیوں پر شکستہ، طائرِ زخمی کی صورت بے قرار
بکھرے بکھرے خواب، بے زاری، مسلسل اُلجھنیں
جاگتی آنکھوں ہزاروں خواب دیکھوں
کانپ اُٹھوں
اپنے جذبوں کی صداقت
اپنے لفظوں کا بھرم
اور عذابِ آگہی، میں کیا کروں؟
آگ برساتی ہوئی نامہرباں ساون کی رُت
اور رات کا پچھلا پہر
سسکیاں بھرتی ہوا ــــ مجھ بے لبِ برگ و بار
نیند کوسوں دور
اندھیرے یوں رگ و پے میں سرایت کر رہے ہیں
جس طرح زہرِ کُپ
دل کی دھڑکنوں کو تھام لے
آنکھیں بجھا دے
جسم کو انفاس سے آزاد کر دے
روح میں ناقوس پھونکے
پھر وہی ہے کیف موسم پھر وہی پاگل ہوا
میں تو اک مجموعۂ اضداد ہوں۔ میں کیا کروں؟

ماہ طلعت

کم سن دوست سے

تمہاری آنکھوں میں
سبز موسم اتر رہے ہیں
جوان جذبوں کی دھوپ تم کو
بھلی لگی ہے
تمہارے دل سے تمہارے لب تک
گلاب راہوں کے سلسلے ہیں
کہ چوڑیوں کی کھنک میں تم ریشمی زبانوں کو سن رہی ہو
کہ تم ابھی آشنائے وہم و گماں نہیں ہو
کہ تم رُتوں کے سحر سے پہلے پہل ملی ہو ــــ!

مری زندگی کا بہاؤ، روشن ہے

مرے خواب کی فصل پر
موسموں کے پرندے اُڑانوں میں مصروف ہیں
میری آنکھوں پہ نیندوں سے مدہوش راتوں کی شبنم
بھی ہے
بدن میرا ٹھنڈی ہواؤں کے لمسِ گریزاں کی آہٹ
پہ، لہروں میں بٹتا، فضا میں بکھرتا ہے
اور میری سوچوں پہ گریز لمحوں کی بارش
اُترتی ہے ــــ
لمحے کہ جن سے میں مرتی ہوں، جیتی ہوں
سوچیں جو میری طرح بانکپن کا ابد ڈھونڈتی ہیں
ــــ جو یادوں کی مٹی سے نم مانگتی ہیں
اپنی رس بھرے، ڈوبتے اور اُبھرتے
دنوں کے اُجالوں کی مقروض ہیں ــــ!

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر کرار حسین
ڈاکٹر خلیق انجم، بیگم خلیق انجم، امراؤ طارق

جاذب قریشی
شوکت زریں چغتائی
اختر انصاری اکبر آبادی
سلیم احمد، الیاس عشقی
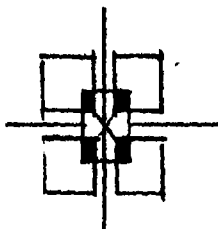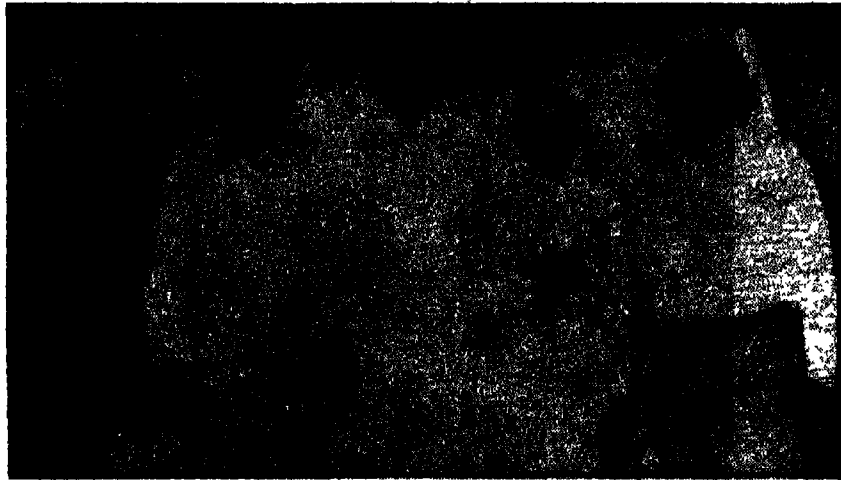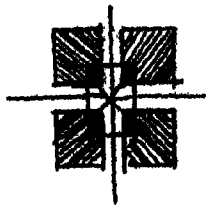
منور سلطانہ، جمیلہ ہاشمی
صائرہ ہاشمی، ناہید صدیقی
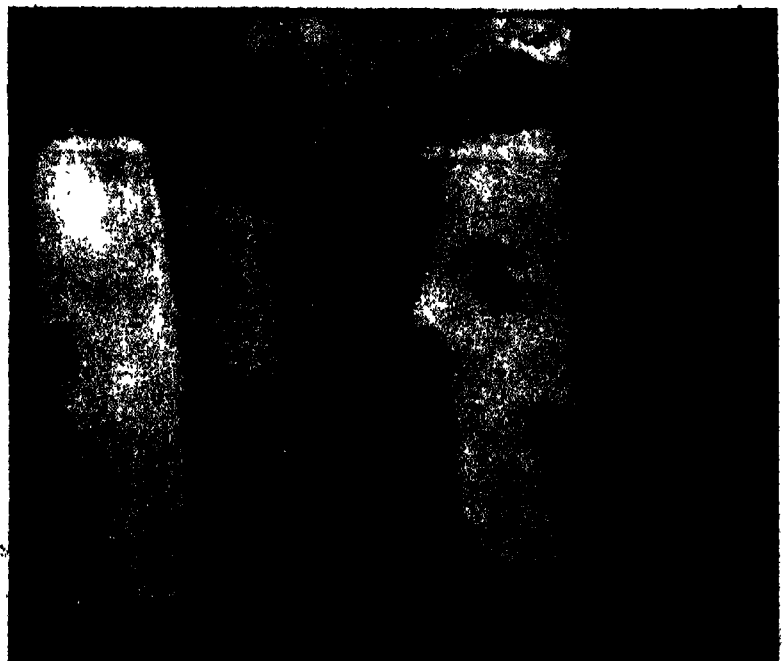
بیگم ثریا شوکت ، جیلانی بانو ، ہاجرہ مسرور
ڈاکٹر انور معظم ، شبنم رومانی

امین صدیقی ، حفیظ صدیقی
جلیل صدیقی ، عبدالعزیز خالد
شمس الدین قریشی ، محمد طفیل

فردوس حیدر ، مختار زمن
فاطمہ حسن ، اسلم فرخی
انجم اعظمی ، امراؤ طارق

اے حمید

میرے کولمبو کے دوست !

میرے کولمبو کے دوست !

مجھے تمہارا خط ملے دو تین ہفتے ہو گئے ہیں۔ جواب اس لئے نہ لکھا کہ تم جانتے ہو میں خطوں کے جواب نہیں دیا کرتا۔ میں کبھی کبھی خط ضرور لکھ لیتا ہوں لیکن خط کا جواب نہیں لکھا کرتا۔ اصل میں کوئی خط سوائے کسی لڑکی کے محبت بھرے خط کے، اس لائق نہیں ہوتا کہ اس کا جواب دیا جائے۔ اگر تم نے اپنے خط میں انا پُورنا کا ذکر نہ کیا ہوتا تو میں تمہارے خط کا بھی جواب نہ دیتا۔ مگر انا پُورنا کے ذکر نے مجھے مجبور کر دیا کہ اس ستاروں بھری رات کو سبز چائے کی پیالی سامنے رکھ کر بہترین سگریٹ سلگا کر تمہیں خط لکھوں۔ انا پُورنا کا نام تمہارے خط کے صحرا میں ایک نخلستان کی طرح تھا، جہاں جہاں تم نے اس کا نام لکھا ہے۔ وہاں وہاں تمہارے خط میں روشنی ہو گئی ہے۔ اس روشنی کو تم نے نہیں دیکھا ہوگا۔ تم دیکھ بھی نہیں سکتے۔ لیکن مجھے اس روشنی نے یکبار پھر روشن کر دیا ہے۔

تمہارے خط میں انا پُورنا کے نام کے زرد چاند کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی ستاروں بھری رات کی خوشی میں سبز چائے کے تلخ گھونٹ پی کر اور تمہارے اعلیٰ خاندانی سگریٹ سلگا کر خط کا جواب لکھوں گا۔ چنانچہ آج وہ رات آ گئی ہے۔ اور میں تم سے انا پُورنا کی باتیں کر رہا ہوں۔ تم نے میرا یہ گھر نہیں دیکھا۔ میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر یوکلپٹس کا ایک درخت ہے۔ اس درخت کو میں نے بدلتے موسموں۔ چاندنی راتوں، چمکیلی صبحوں اور ساون کی بارشوں میں مختلف موڈ میں دیکھا ہے۔ یہ درخت میرا دوست ہے۔ میں جب کبھی اس کے تنے پر ہاتھ رکھتا ہوں تو مجھے اس کے دل کی دھڑکن محسوس ہوتی ہے، جس طرح فضاؤں میں بے شمار حسین عورتیں محوِ خرام رہتی ہیں مگر ہم اس عورت کو دیکھتے ہیں جو ہمیں نظر آتی ہے اور نظر وہی آتی ہے جس کا جسم ہوتا ہے۔ اسی طرح فضاؤں میں ہزاروں یوکلپٹس لہرا رہے ہیں لیکن ہمیں وہی درخت دکھائی دیتا ہے جس کا جسم ہوتا ہے۔ مجھے اس یوکلپٹس کے درخت سے بڑا پیار ہے۔

میں یہ نیت کر کے سویا تھا کہ آج رات تمہیں خط ضرور لکھوں گا۔ شاید اس لئے آدھی رات کو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سبز چائے کی پیالی بنا کر اپنے پاس رکھ لی۔ ٹیبل لیمپ روشن تھا، میں نے اسے بجھا دیا۔ میں کھڑکی کے باہر رات کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اندھیرا ہو جانے سے کھڑکی کے باہر رات کا منظر صاف ہو گیا۔ نیلے آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ کچھ بُرج موتیوں کے میناروں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ مریخ ستارہ لَو دے رہا تھا۔ یوکلپٹس کا پیڑ اپنی شاخیں جھکائے خاموش تھا۔ کھڑکی میں سے رات کی رانی کی میٹھی خوشبو آ رہی تھی۔

میں نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ سبز چائے کا تلخ گھونٹ پیا۔ میرے سارے بدن میں بانس اور دارچینی کے جنگلوں کی خوشبو پھیل گئی۔ میں نے اس میں ڈن ہل کے سگریٹ کی خوشبو کو ملایا اور کورے کاغذ کے پیڈ پر تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ آنا پُورنا ملے تو اسے کہنا کہ اس خط کو اپنے ہونٹوں کے پاس لے جائے اسے میرے خط کے لفظوں میں سے اُن کی خوشبو آئے گی۔ میں خود اپنے لفظوں کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میں گلاب کی ٹہنی سے خط لکھ رہا ہوں اور خط کی آخری سطر تک پہنچتے پہنچتے اس شاخ پر گلاب کے شگوفے پھوٹ پڑیں گے۔

تم نے لکھا ہے کہ انا پُورنا کولمبو یونیورسٹی میں انگریزی پڑھانے لگی ہے اور اس کے سیاہ بالوں کی

سیدھی مانگ میں سے ایک سفید بالوں کی پتلی سی لکیر نکل کر پیچھے کو چلی گئی ہے۔ سفید بالوں کی لٹ ہمیشہ پیچھے کو جاتی ہے ہمیں پیچھے کو لے جاتی ہے پرانی یادوں کے ان ویران مندروں میں جہاں ہمارے بیتے دنوں کی خوبصورت دیوداسیوں کے پاؤں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

اَناپُورنا کے گہرے سیاہ بادلوں کو دیکھ کر کبھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ ان میں سفید بالوں کی لٹ بھی ابھر سکتی ہے۔ یقیناً اب وہ زیادہ گریس فل ہو گئی ہوگی، میرا جی چاہتا ہے کہ وہ یونیورسٹی میں کلاس لے رہی ہو اور میں چپکے سے آ کر اُسے دیکھوں، وہ بھی میرے گہرے بالوں کو دیکھ کر خوش ہوگی۔ گہرے بال اُسے پسند ہیں۔ یاد ہے۔ ایک روز ہم تینوں بوریلا جکشن والے جاکشی کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ اَناپُورنا کے کانوں میں اُس روز سبز پتھر تھے۔ وہ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ اُس کی براؤن آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ اُس نے کہا تھا۔

"میں چاہتی ہوں میرے بالوں میں ایک سفید لٹ آ جائے۔"

اب یقیناً وہ خوش ہوگی۔ اُس کے سیاہ بالوں کی رات میں سفید لٹ کی کہکشاں بکھر گئی ہے۔ تخیل کی فضاؤں میں رہنے والی یہ خیال پرست سانولی لڑکی اب بڑی خوبصورت لگتی ہوگی۔ یہ خط پڑھ کر اَناپُورنا کے پاس یونیورسٹی جانا اور اُسے میری طرف سے دیکھنا۔ اور ہاں۔ سفید لٹ کی خوشی میں اُسے میری طرف سے رجنی گندھا کے پھول خرید دینا!

رجنی گندھا، عجیب خوشبو کتنی پراسرار ہوتی ہے!

یہ خالص ٹراپیکل خوشبو ہے، جنوبی ایشیا کی خوشبو ہے۔ یہ پھول ضرور کسی جنم میں دیوداسی رہ چکا ہے جو لنکا کے ہزار سالہ پُرانے مندروں میں رقص کیا کرتی تھی۔ ایک روز میں نے لاہور میں رجنی گندھا کے پھول دیکھے تو وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔

میری دیوداسی! تو اِدھر کہاں نکل آئی؟

ریگل سینما کے باہر پھول والا رجنی گندھا کے پھولوں کو مٹی کے گلدان میں لئے بیٹھا تھا۔ اُسے اس پھول کا نام معلوم نہیں تھا۔ میں انہیں خرید کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ ایک ہفتے تک میں نے اپنے گلدان میں انہیں کھلائے رکھا۔ آخر رجنی گندھا مرجھا گئے۔ ان کی سوکھی پتیاں آج بھی میری ایک کتاب میں سو رہی ہیں۔ میری کتابوں میں بڑے پھول ہیں سوکھے خشک۔ طرح طرح کے رنگوں کے پھول۔ اب تو میں کتاب کھول کر اُسے پڑھنے کی بجائے ان سوکھے پھولوں کو ہی دیکھتا رہتا ہوں، جی چاہتا ہے۔ کسی روز ان سارے خشک پھولوں کا ایک پارسل بناؤں اور اَناپُورنا کو پوسٹ کر دوں مجھے یقین ہے اُس کا ہاتھ لگتے ہی سارے کے سارے پھول دوبارہ کھل اٹھیں گے۔

پچھلے دنوں میں نے لاہور میں ایک عورت کو سفید ساڑھی میں دیکھا تو مجھے بے اختیار اناپورنا یاد آ گئی۔ اناپورنا کو ساڑھی میں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اُس نے کوئی رنگین آبشار پہن رکھی ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ساڑھی اناپورنا پر [illegible] نازل ہو رہی ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ساڑھی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور اناپورنا کہاں سے ابھار ہے

ہاں چونکہ یہ ایک اجنبی پہناوا ہے اسلئے خواتین اسے پوری گریس اور فال کے ساتھ نہیں پہن سکتیں۔ لیکن پچھلے دنوں جو خاتون سفید ساڑھی میں ملبوس مجھے برٹش لائبریری میں ملی اس کے سٹائل میں گریس بھی تھی اور ساڑھی کی فال بھی اپنے تمام خطوط اور دائروں کے ساتھ مطابقت رکھتی تھی۔ اس سے بات کرنے اور اُس کی باتیں سننے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ نہایت شائستہ، بااخلاق اور ذہین خاتون ہے دماغ بڑا منطقی اور بات کی تہہ تک پہنچنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ حیران ہوا کہ اس کے باوجود وہ حسین بھی ہے اور مشرقی روایات کی پابند۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کی خاطر بے حد ایثار کرنے والی۔ اپنی ہر خوشی اُن پر قربان کر دینے والی۔ عزتِ نفس اور بلندئ کردار کی پاسبانی کرنے والی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شعور، تحت الشعور، لاشعور، فوق الشعور اور نظامِ شمسی، اور پھر کروڑوں نظام ہائے شمسی اور اربوں کائناتیں، کہکشائیں جو ہر لمحے ہر پل ان گنت کائناتوں کو جنم دے رہی ہیں اور برٹش لائبریری میں بیٹھے ہوئے انسان کے ذہن کے سلسلے ان تمام عوامل سے مربوط ہیں۔ ایک خوبصورت سڈول بازو ہے اور کروڑوں جوہری مرکزے ہیں اور کبھی شمار میں نہ آنے والے الیکٹرون ہیں پروٹون ہیں۔ ایٹموں کے فاصلے ہیں۔ اُن کا ملاپ ہے۔ ان کی جدائی ہے کیا آئن سٹائن سچا تھا؟ کیا یہ سب کچھ اضافی ہے وہم ہے؟ گمان ہے؟ اعتبار ہے؟ میرے ہونٹوں پر آئے ہوئے پسینے کے موتی۔ ان کے نیوکلس

کہاں ہیں؟ ان کے مرکزوں کے گرد کتنے الیکٹرون
گردش کر رہے ہیں؟ جب یہ جونٹ تھر کی لمحہ
میں خاموش ہو جائیں گے قرآن کے پیدو ٹون کلانٹ
کے کس گوشے میں گردش کر رہے ہوں گے؟
کس نیوکلس کے گرد گردش کر رہے ہوں گے؟
لیکن آئن سٹائن نے تو ایک سے زیادہ خدائیاں
کی تھیں۔ وہ عورت کے نیوکلس کا راز پا گیا تھا۔
اُس نے اپنے لئے گیان حاصل کر لیا تھا۔ بڑا خود غرض
گوتم بدھ تھا یہ ایٹم کا راز داں!

میرے کولمبو کے دوست! ذرا ٹھہرو۔ میں
سبز چائے کے دو چار تلخ گھونٹ پی لوں اور۔۔
اور میرا سگریٹ بھی بجھ گیا ہے۔ چائے۔ سگریٹ،
سفید ساڑھی۔ سرخ گلاب کے پھول اور پرفیوم۔
مجھے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے؟ اور اس سے
زیادہ اس کائنات میں، ان کروڑوں اربوں،
کائناتوں میں اور رکھا بھی کیا ہے؟

تم ریڈیو سیلون کی مس ٹمپل کو تو جانتے ہو گے۔
جن دنوں میں کولمبو کے ریڈیو سیلون پر "گیت مالا"
کا پروگرام کیا کرتا تھا اور اناپورنا میری کمپیئر تھی تو تم
ان دنوں یہاں آیا کرتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ
ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ ۱۹۴۶ء کا سن تھا، ہم ریڈیو
سیلون سے جنوب مشرقی ایشیا میں مقیم اتحادی فوجوں
کے لئے پروگرام کیا کرتے تھے، میری عمر پندرہ سولہ
سال کی تھی۔ اناپورنا مجھ سے بڑی تھی اور مس ٹمپل
اُس کی ہم عمر تھی۔ یہ ڈچ اناؤنسر بڑی ہنس مکھ اور
با اخلاق تھی۔ اُس کی آنکھیں سبز تھیں میں نے
پہلی بار اس قسم کی متنا جیسی سبز آنکھیں دیکھی تھیں،

مجھے یاد ہے کہ مس ٹمپل کی آنکھیں دیکھ کر مجھے سبز
انگور یاد آ گئے تھے۔ ریڈیو سیلون کی یہ اناؤنسر
تھی تو ہالینڈ کی مگر انگریزی خالص آکسفورڈین لہجہ
میں بولتی تھی۔ وہ مجھے پیار "ایلیفنٹ بوائے" کہا
کہا کرتی تھی، میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اُس سے بات
کیا کرتا تھا۔

تمہیں کولمبو کے ساحل سمندر والا کافی ہاؤس
یاد ہے نا؟ تم اب بھی وہاں ضرور جا کر کافی پیتے
ہو گے۔ سارے کا سارا بانس کا بنا ہوا کافی ہاؤس
اور اُس کی بالکونی میں لٹکتے ہوئے ٹراپیکل فلاورز
کے گملے۔ سامنے لنکا کا کھلا سمندر اور سمندر
سے آتی مرطوب ہوا اور لہروں کا ہلکا ہلکا شور اور
ساحل ریت پر بکھرے ہوئے مونگے، سیپیاں
اور سیر کرتی سیلونی لڑکیاں اور سمندر کی ہوائیں ان
کی ساڑھیوں کے اڑتے رنگ برنگے آنچل ۔۔
یہاں ایک عجیب سی مسحور کن ٹھنڈی خوشبو پھیل
رہتی تھی۔

اناپورنا جب میرے سامنے بیٹھی کافی پی
رہی ہوتی تو اس ٹھنڈی ساحلِ سمندر کی خوشبو میں
ایک نئی خوشبو جنم لیتی تھی۔ یہ اناپورنا کی اپنی خوشبو
تھی۔ اس خوشبو کی شکل اناپورنا کی آنکھوں جیسی
تھی۔ یہ خوشبو مجھے اپنی طرف دیکھتی محسوس ہوتی۔
تیز ہوائیں درختوں سے ناریل ٹوٹ کر گرتے تو بچے
ان کی طرف بھاگتے۔ دُور گال فیس ہوٹل کی طرف عورتیں
بیدنگ کاسٹیوم میں نہاتی دکھائی دیتیں۔

سیلون میں خوشبودار تلخ اور خیال انگیز کافی پھر میں نے
کہیں نہیں پی اور پھر اناپورنا بھی تو پھر نہیں ملی۔ اناپورنا

پرنٹری نثر سے خوبصورت انداز میں پڑھا کرتی ہوگی۔ مگر وہ تو
بادلیئر کی عاشق تھی اور ظاہر ہے بادلیئر ٹیکسٹ شاعر
نہیں ہے۔ کم از کم لنکا میں نہیں ہوگا۔ ساحل کافی ہاؤس
میں اُس نے ایک روز مجھے اس ضدی، اپنی مرضی
کے مالک فرانسیسی شاعر کی ایک نظم کا انگریزی ترجمہ
سنایا تھا۔ نظم بھول گیا ہوں۔ ایک لائن یاد رہ
گئی ہے۔ وہ تھی ۔ کیا تھی وہ!

بھول گیا ۔ اب تو صرف آنکھیں یاد رہ گئی ہیں۔
جادو بھری سیاہ آنکھیں ۔ براؤن آنکھیں ۔ لنکا کی
آنکھیں، لاہور کی آنکھیں، سمندر کی آنکھیں ۔ آنکھیں
جو کچھ دیکھتی ہیں اس سے کہیں زیادہ بیان کرتی
ہیں، کبھی آنکھوں کو سنو۔

کبھی مس پول سے بھی ملاقات ہوئی؟ اب تو
وہ مسز ہو گئی ہوگی۔ اس سے میری آخری ملاقات
پلاڈیم سینما میں ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے وہاں فلم
REAP THE WILD WIND لگی تھی۔
مس پول نے اپنے منگیتر سے میرا تعارف کروایا۔
جب میں نے اُسے بتایا کہ میں صبح انڈیا جا رہا
ہوں تو اس نے اپنی گرے آنکھیں پوری کھول کر
حیرانی سے کہا۔

"REALY"

اناپورنا سے میری آخری ملاقات کولمبو کے فورٹ
ریلوے سٹیشن پر ہی ہوئی تھی۔ تم کینڈی گئے ہوئے
تھے اس لئے مجھے الوداع کہنے نہ آ سکے۔ اناپورنا
اُداس اُداس تھی۔ بہت دن ساتھ ساتھ رہے
تھے۔ اداس تو ہونا ہی تھا۔ میں بھی اداس تھا۔
کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے کہ ہماری زمین سے اوپر

خلا میں اُداسی کا ایک بیکراں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ کم از کم اس روز تو مجھے کولمبو کا سارے کا سارا جگمگاتا، چمکتا ریلوے سٹیشن اُداس دکھائی دے رہا تھا۔

اناپورنا اپنے ساتھ میرے لئے زجینی گندھا کے پھول لائی تھی۔ اس کی ساڑھی کتھئی رنگ کی تھی اور سیاہ، بالوں میں سیوتی کے سفید پھول تھے کانوں میں سُرخ پتھر تھے اور آنکھوں میں گہرے تاریک جنگلوں کی چپ چاپ۔ ہم نے بھلا کب ایک دوسرے سے اظہارِ محبت کیا تھا جو وہ اداس تھی ہم نے کب ایک دوسرے کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر زندگی بھر ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان کئے تھے؟ زندگی کا کارواں تو اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ میں کولمبو گیا۔ اناپورنا سے ملاقات ہوئی۔ میں واپس آگیا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے رخصت ہو گئی۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اپنے مرکز سے ٹوٹ کر بچھڑا ہوا پروانہ بھلا پھر کہاں واپس آتا ہے۔

شاید اناپورنا کو معلوم تھا کہ ہم پھر کبھی نہیں ملیں گے۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہیں۔ اُس کی آنکھوں کی ویران چپ چاپ صاف بتا رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ کولمبو کا یہ ریلوے جنکشن روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم تھا لیکن مجھے سوائے اناپورنا کی براؤن آنکھوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے سوائے اس کی آنکھوں کے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع!

ساری زندگی کے لئے خدا حافظ!

اب پھر کبھی ملاقات نہ ہوگی ....."

گارڈ نے سیٹی بجائی۔ اناپورنا نے رجنی گندھا کے پھول میری طرف بڑھائے۔ میں نے پھول لے کر انہیں آنکھوں سے لگایا اور میرا خیال ہے کہ۔ چلو چھوڑو۔ اب ان باتوں کے ذکر سے کیا فائدہ۔ ؟ لاہور میں بھی ایک ساڑھی ہے۔

میرا یہ فقرہ سُن کر وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکی کہ

"فائدہ کیا ہوتا ہے؟ یہ آپ ہر بات میں فائدہ کیوں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ محبت تو ایک احساس ہے۔ جذبہ۔"

چلو اس کو بھی چھوڑو۔ میں اناپورنا سے آخری ملاقات کی بات کر رہا تھا۔ کولمبو ریلوے اسٹیشن کی وہ آخری ملاقات آج بھی میری یادوں کے البم کی سب سے پہلی اور سب سے آخری تصویر ہے۔ اس تصویر پر ایک دُھندسی چھائی ہوئی ہے۔ خواب ایسی دُھند۔

گارڈ نے دوسری سیٹی دی اور اس کے ساتھ ہی انجن چیخ اٹھا میں ڈبے میں سوار ہو کر دروازے میں کھڑا ہو گیا، پلیٹ فارم پیچھے جا رہا تھا۔ اناپورنا پیچھے جا رہی تھی۔ مونالیزا ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

ایک مونالیزا لاہور میں بھی ہے۔ وہ ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر میرے سامنے آئی اور اب مستقبل اُسے مجھ سے جدا کر رہا ہے۔ ویسے یہ ملاپ بھی عجیب ہے اور جدائی بھی عجیب ہے۔ ملاپ میری طرف سے تھا اور جدائی اس کی طرف سے ہو رہی ہے۔ کوئی عہد و پیماں درمیاں میں نہیں، اُدھر ایک چُپ ہے میرے ہزاروں سوالوں کے جواب میں۔ اِدھر دل ہے، اُدھر دماغ ہے۔ اگر دل ہے بھی تو اس پر دماغ کا گرہن لگا ہے کیسے کیسے خوبصورت خیالوں ایسے جسم وقت کی گردش میں حالات کی تیز دھوپ میں مرجھا کر رہ گئے۔ برٹش لائبریری میں یہ مونالیزا کھڑکی کی طرف منہ کرکے کھڑی تھی۔ کھڑکی میں سے روشنی کا غبار اس کے جسم کو چاندی کی طرح چمکا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ کے سائے اس روشنی میں بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ روشنی کے پیچھے، بہت پیچھے شاید اندھیروں کے اس سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے طوفانوں سے وہ نکل کر آئی تھی۔ یہ اس کی ایک اُداس تصویر تھی۔ اس مونالیزا کی کئی پینٹنگز ہیں۔ ہر تصویر میں وہ ایک نئے انداز میں نظر آتی ہے۔ ناصر کاظمی نے شاید اسی مونالیزا کے لئے کہا تھا۔

حُسن اور حُسن کا احساس بھی کیا ہوتا ہے
جب بھی دیکھو اُسے وہ شخص نیا ہوتا ہے

اس کی ڈائری میں بھی سوکھے پھول رکھے رہتے ہیں۔ اُسے دیکھ کر کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ بھی وقت کی کتاب میں رکھا ہوا گلاب کا پھول ہے اُس کا رنگ اور خوشبو وقت کے اوراق اپنے اندر جذب کر رہے ہیں۔ کسی وقت دل چاہتا ہے کہ اسے کتاب سے نکال کر پھر سے ٹہنی لگا دوں لیکن ایسا نہیں کر سکتا۔

میرے کولمبو کے دوست! تم دو سمندروں کے درمیان ایک خوبصورت جزیرے میں بیٹھے ہو

تمہیں کیا معلوم کہ جب تخیل کے افق پر چندن کا سورج غروب ہو جاتا ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے اور جب کوئی ہمیشہ کے لئے الوداع کہنے آتا ہے تو موت کتنی حسین لگنے لگتی ہے گاڑی کولمبو کے اسٹیشن سے باہر آگئی۔

اناپورنا کی شکل میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہ گئے اور ہمارے درمیان ایک گہرا بیکراں سمندر حائل ہو گیا، سورج تو پہلے ہی غروب ہو چکا تھا۔ اناپورنا سے جدا ہوتے ہی شام بھی ڈوب گئی اور ٹرین کولمبو سے دور لنکا کے گھنے جنگلوں میں چیختی دھاڑتی گزرنے لگی۔ میں کھڑکی کے شیشے سے لگا باہر جنگل کے اندھیرے میں اُن تاریک روتے، بین کرتے ذوگر درختوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ باہر ایک شکل تھی، جس کے سیاہ بالوں میں سیوتی کے پھول تھے اور ماتھے کی سُرخ بندیا کا شعلہ تھا اور براؤن آنکھوں کے غروب ہوتے سورج تھے۔ رجنی گندھا کے پھولوں کی ڈالیاں میرے دل کے ساتھ لگی تھیں، اُن میں سے اناپورنا کی محبت کی اُداس خوشبو آ رہی تھی۔

یہ خوشبو آج بھی میرے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے۔ اناپورنا کے بالوں میں سفید لٹ آگئی ہے۔ مگر رجنی گندھا کے پھول اُسی طرح ہیں۔ اس کی خوشبو کے سُرخ ہونٹ پہلے روز کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ ہیں۔ دیوداس نے پاربتی سے جدا ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"پاربتی مرنے سے پہلے ایک بار تمہیں
ملنے ضرور آؤں گا"

اور پھر ایک رات جب دیوداس چپکے سے گاڑی میں بیٹھا اور بردوان کی طرف روانہ ہو گیا۔ صبح پاربتی کے گھر کے سامنے سنبل کے درخت تلے دیوداس کی لاش پڑی تھی۔ کیا میں بھی اسی طرح ایک روز اناپورنا سے ملنے جاؤں گا مگر میری تو کوئی پاربتی نہیں ہے۔ پھر میں کس کا دیوداس ہوں؟ یہ کس کی محبت کا نیزہ اپنے سینے میں اتارے صحرائے جنگ میں دم توڑ رہا ہوں! میں کس کا نیوکلس ہوں؟ جب میں قبر کی تاریکی میں خاموش پڑا ہوں گا تو میرے الیکٹرون کائنات کے کس گوشے میں جا کر کس کو تلاش کرتے پھریں گے؟

VANITY OF VANITIES

ALL IS BUT VANITY

محبت کی خوشبوؤ! محبت کی مسکراہٹو!
اے سورج کے جلال! اے تاروں بھری رات کے جمال!
لنکا کی دیوداسیو! سارتھ کے تاڑ کے درختو!
ان درختوں میں ہوا کے گیتو!
میں تمہیں ہمیشہ کے لئے الوداع کہتا ہوں!

ماہِ نو کے لئے
مختلف شہروں میں
فروغِ ادب کے
نمائندے

ریاض الحسن صاحب
اتحاد نیوز ایجنسی ایبٹ آباد

شمیم نیوز ایجنٹ
ڈیرہ غازیخاں

سید اختر شاہ صاحب
اختر نیوز ایجنسی نوشہرہ ضلع پشاور

فیصل جنرل سٹور اینڈ بک سٹال
ہائی بازار۔ ٹنڈو محمد خاں
ضلع حیدر آباد

میسرز کاروان بک سنٹرز
خان کینٹ

امانت نعیم صاحب
یوسف بک ڈپو کشمیری بازار راولپنڈی

پیٹرک وائٹ
ترجمہ: ستار طاہر

اپنا گھر

"پیٹرک وائٹ آسٹریلیا کے لکھنے والے ہیں ۱۹۷۳ء میں انہیں ادب کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔ ان کی ایک خوبصورت کہانی کو میں نے ADOPT کیا ہے۔ مگر اس طرح کہ صرف ناموں کی تبدیلی کی ہے۔ اور یوں کہانی بالکل اپنے دیس کی بن گئی ہے۔ یہی آفاقی ادب کی پہچان ہوتی ہے۔
میں نے گرجے کو مسجد، پادری کو مولوی، کرسمس کو میلے میں تبدیل کر کے پیٹرک وائٹ کی کہانی کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک خوبصورت کہانی ہے نازک انسانی احساسات کی کہانی ہے اور یہ احساسات وہ ہیں جو ساری دنیا کے انسانوں میں یکساں طور پر بانٹے جاتے ہیں۔ یوں اردو میں ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے"

سید پور کی نوری کا انتخاب کرمو نے کیا تھا ایک بار اُس نے اُسے میلے میں دیکھا تھا۔ اور خود بخود اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ نوری سے شادی کرے گا کرمو کی طرح نوری کا بھی آگے پیچھے کوئی نہ تھا اس لئے کسی کو اس شادی پر اعتراض نہ ہوا اور جب شادی پر اعتراض نہ ہو تو پھر دیر کیوں؟ سو شادی کا دن آ گیا۔ سید پور گاؤں کی مسجد گارے اور مٹی کی بنی ہوئی ہے اور اس کے پاس ہی مولوی صاحب کا گھر ہے۔ یہیں نوری اور کرمو کی شادی ہوئی۔
شادی کیا تھی؟ بس رسم ادا [illegible] دی گئی۔ نہ نوری کے ہاتھوں پہ مہندی رچی نہ سہیلیوں نے شادی کے گیت گائے ڈھولک بجی نہ لڑکیاں ناچیں۔ گئے ناچیں۔ شادی دودھ کے پیالے پر ردی گئی۔ نہ باجا نہ گاجا نہ برات۔ نہ ڈھول، ڈھمکا۔ نہ پلاؤ نہ شوربہ بس دودھ کا پیالہ۔ نوری بیچاری تیرے میرے ٹکڑوں پر پلی تھی دور پار کا چچا تھا جس نے یتیم بچی کو پناہ دی تھی اور بد مزاج چچی نے اُسے کبھی چین کا سانس نہیں لینے دیا تھا۔ خود بچے پر بچہ پیدا کئے جا رہی تھی۔ مگر نوری جیسی بچی کے لئے اُس کے دل میں کبھی محبت نہ پیدا ہوئی تھی۔ یہ تو تھی دلہن کی بات۔ دولہا میاں کرمو کا بھی کوئی نہ تھا ۔ اُس کے ساتھ اُس کا دور کا ایک رشتہ دار آیا تھا۔
سید پور کے مولوی کی بیوی بڑی نیک دل تھی اور اس کی شادی پہ بے حد مسرور۔ اُس نے دودھ ایک کرتی دی تھی جو یقیناً نوری کے لئے تنگ تھی۔ ایک آدھ اور چھوٹا موٹا تحفہ جو خود مولانی کی اپنی شادی کی نشانی تھی مولوی صاحب نے نوری کو قرآن پاک دیا تھا۔
کرمو اپنا چھکڑا ساتھ لے کر آیا تھا ہنسوں میں اس پر دلہن کے جہیز کا گنا چنا سامان رکھ دیا گیا۔ رخصت کا وقت آ چکا تھا۔ یہ ایک عمدہ نیم سرد دن تھا نوری نے اپنی چیزیں ترتیب سے رکھیں اُس کے چچا نے کہا "اچھا بیٹی خدا حافظ" ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے اُس کے چچا کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور آنکھوں کے گوشے سرخ ہو گئے سے وزن گم گم تھی۔

گاؤں کا جولاہا جس نے دلہن کو کئی گز ململ تحفہ
میں دی تھی دولہا کو نصیحت کر رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو
خوش رکھے محنت کرے گھر بسائے۔ دولہا بڑے
ادب سے ہر بات سن کر سر ہلا رہا تھا۔

اس الڑھی شادی اور رخصتی کو دیکھنے کے لئے
وہاں کے بچے اکٹھے ہو چکے تھے ادھر کسی نے مٹھی بھر
پیسے بچوں کی طرف اچھالے ادھر کرمو نے گھوڑے
کو چابک دکھائی اور چھکڑا مسجد کے پاس سے
چلنے لگا ایک زندگی ختم ہو چکی تھی دوسری شروع
ہو رہی تھی، چھکڑا گاؤں کی گلیوں سے گزرتا چلا
گیا، گھوڑے کے قدموں سے دھول اڑ رہی تھی۔

کرمو نے ہنستے ہوئے اپنی خوشگوار آواز میں
کہا "ذرا لمبا سفر ہے تھک تو نہ جائے گی؟"

"نہیں ـــ میں کیوں تھکوں گی؟" نوری نے
مسکراتے اور اس پاس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب
دیا ـــ!

ان کے جسم ایک دوسرے کے قریب تھے۔
چھکڑے کے ہچکولوں سے ٹکرا جاتے، چند منٹ
پہلے وہ اجنبی تھے مگر شادی کے بعد وہ ایک رشتے
میں منسلک ہو گئے تھے اب وہ دونوں ایک تھے،
اس لئے دونوں بغیر کسی کوشش اور جھجک کے ایک
دوسرے کی آنکھوں میں جھانک سکتے تھے۔

جونہی چھکڑا گاؤں سے باہر نکلا اور گاؤں کی حدود
ختم ہوئیں، نوری کا جی بھاری ہونے لگا۔ سید پور میں
اس کا کوئی نہیں تھا اس گاؤں کے ساتھ اسے کوئی
لگاؤ بھی نہ تھا اور اب جو وہ وہاں سے رخصت
ہو رہی تھی تو کسی نے اس کی جدائی پر آنسو نہ بہائے
تھے اس گاؤں میں رہتے ہوئے وہ خود بھی کسی
کے لئے نہ روئی تھی مگر اب اچانک وہ اداس ہو گئی۔
چھکڑے کے چکر کاٹتے ہوئے پہیے، آگے بڑھتے
ہوئے پہیے، جوں جوں اسے سید پور سے دور لیے
جا رہے تھے اس کے دل میں سید پور سے دوری
کا غم بڑھنے لگا تھا، چھکڑا جوں جوں آگے بڑھتا گیا۔
اسے چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتیں یاد آنے لگیں وہ،
چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتیں جو اس نے کبھی محسوس
تک نہ کی تھیں اب اس کے دل کو رلانے لگی تھیں۔
یادیں ـــ ایک لہر کی صورت میں اس کے دل میں اٹھ
رہی تھیں اور اسے اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہی
تھیں۔ اسے اس مردہ گائے کی ہڈیاں یاد آئیں،
جنہیں دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی سرسبز کھیتوں میں بھاگنے
والے سفید سفید خرگوش یاد آئے اور جانے کتنی
باتیں، جو بچپن کی اوس کے نیچے چھپی ہوئی تھیں۔ اور
بھاپ بن کر اس کے ذہن میں اٹھنے لگی تھیں۔
لچی اور چٹ پٹی کیریوں کا مزہ اس کے ہونٹوں پر
آ گیا تھا سید پور کے گوالے یاد آئے۔ جو ٹین کے
بڑے کنستروں میں دودھ بھر کر شہر جاتے تھے اور
پھر وہ بچے جو چھکڑوں کے پیچھے شور مچاتے بھاگتے
تھے صبح اور شام کے سب منظر ـ ایک کر کے اس
کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے، صبح کے وقت
چھوٹے گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں دوپہر کی دھوپ
اور شام کو گرد سے اٹے ہوئے کسانوں کی کھیتوں
سے واپسی کسانوں کی عورتوں کی آپس میں لڑائیاں
اور جانے کیا کچھ ـــ؟ اس نے مڑ کر سید پور کی طرف
دیکھا۔ گاؤں کے مکان اب چھوٹے چھوٹے اور
دھندلے نظر آ رہے تھے اس کی آنکھوں میں آنسو
بھر آئے۔

کرمو گھوڑے کو چابک دکھاتے ہوئے "ٹخ ٹخ"
کئے جا رہا تھا مڑ کر بولا "اداس ہو رہی ہو۔!"

"سید پور میں میرا کون تھا کہ میں اداس ہوتی؟"
یہ کہہ کر اس نے اپنی ناک صاف کی اور پھر اس کے دل
میں ایک عجیب بات آئی کہ واقعی سید پور میں اس
کا کوئی نہ تھا۔ مگر اس کا بچپن سید پور میں گزرا تھا۔
وہ اپنا بچپن سید پور میں چھوڑ آئی تھی۔

وہ اپنے دولہا کے پاس بیٹھی رہی، چھکڑا چلتا
رہا اور کچھ اداسیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو کوئی دوسرا
شخص نہ تو کم کر سکتا ہے نہ بٹا سکتا ہے مگر کرمو جانتا
تھا کہ اگرچہ اس کی بیوی کا جسم رونے سے ہلکورے
کھا رہا ہے۔ تب بھی وہ خود سے خوش ہے اور
یہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے دہقان محسوس تو کر
سکتا ہے۔ بیان نہیں کر سکتا۔

لمبا سفر تھا چھکڑا بھاگتا رہا اب وہ سید پور
سے بہت دور نکل آئے تھے۔ راستہ کچا تھا اور دونوں
طرف جھاڑیاں تھیں کرمو چاہتا تھا کہ اپنی بیوی کو بتائے
کہ اب ہم یہاں ہیں۔ یہاں سے گزر رہے ہیں
اتنے میل آ چکے ہیں اور اتنے میل سفر باقی رہ گیا ہے
مگر وہ چپ رہا۔ باتیں کرنے کے لئے ساری زندگی
پڑی تھی۔ نوری کی نظریں راستے پر گڑی ہوئی تھیں۔
آنسو خشک ہو چکے تھے اور اب وہ اور باتیں سوچ
رہی تھی ـ اہم باتیں ـــ اب اس کی شادی ہو گئی تھی
وہ کسی کی بیوی تھی اسے زندگی کا کوئی تجربہ نہ تھا اب
تک۔ اس کی ساری زندگی افلاس میں کٹی تھی اور

اب ایک نئی اور نئی زندگی اس کے سامنے تھی۔

اچانک اس نے چھپاک کی آواز سنی۔ چھکڑا پانی سے گزر رہا تھا۔ کرمو نے کہا "یہاں کبھی جوہڑ تھا اب خشک ہو چکا ہے بس یہ تھوڑا سا پانی یہاں ہر وقت جمع رہتا ہے" ــــ چھکڑا بھاگتا رہا تھا۔ پسینے میں شرابور گھوڑے کے جسم سے چھو کر آنے والی ہوا اُن کے چہروں کو چھوتی تو گرمی کا احساس ہوتا۔ گیلے چمڑے کی عجیب سی مہک۔ درختوں سے گرنے والے پتوں کی باس میں شامل ہو کر عجیب بو دے رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے تھے مرد اور عورت۔ شاخ اور پتہ۔ گھوڑے کی ایال ہوا اور تیز رفتاری سے اوپر اُٹھ رہی تھی۔ آمنے سامنے سرسبز کھیت تھے تیز ہوا چلنے لگی تھی راستے کے دونوں طرف درختوں کا سایہ تھا۔ ڈالیاں اور شاخیں نیچے جھکی ہوئیں تھیں۔

نوری نے ہنس کر کہا "کیا یہاں ہمیشہ ایسی ٹھنڈی اور تیز ہوا چلتی رہتی ہے؟"

کرمو نے جواب میں جو کچھ کہا وہ اسے نہ سن سکی۔ ہر لفظ اُڑ اُڑ کر دور لے جا رہی تھی نوری جھنجھلانے لگی۔ اُسے تیز ہوا لمبے راستے اور درختوں میں گھری ہوئی کچی تنگ سڑک سے نفرت ہونے لگی۔ اور پھر اچانک ایک تیز خشک سیاہ جھکی ہوئی شاخ نوری کے رخسار سے ٹکرائی، کچھ اس طرح جیسے شاخ رخسار پر طمانچہ مار رہی ہو۔ وہ خوفزدہ ہو گئی اور "ہائے" کہہ کر چیخنے لگی۔ کرمو نے تیزی سے بھاگتے ہوئے گھوڑے کی راسیں کھینچ کر کھڑا کیا اور کرمو اپنی بیوی کے رخسار پر خراش کا نشان دیکھ کر اداس ہو گیا یہ اس دبلی پتلی لڑکی کا رخسار تھا۔ جسے اُس نے میلے میں دیکھا تھا۔ پسند کیا تھا اور اب وہ خدا کا شکرگزار رہا تھا کہ اس کی شادی ہو گئی تھی۔ وہ ماؤف پر جھکا جاتا تھا اس کے سخت جسم کا لمس نوری نے محسوس کیا۔ دونوں کی جلدیں سراپا پیاس تھیں۔ ایک غیر مانوس ملائمت اور نرمی جس کا مزہ انہوں نے کبھی نہیں چکھا تھا۔ اُن کی شادی ہو چکی تھی۔ مگر ابھی تک انہوں نے ایک دوسرے کو چوما تک نہ تھا۔ وہ اُس کے رخسار کی نرم ہڈیاں دیکھتا رہا۔ اُس کی گردن کو، جو شفاف اور ملائم تھی۔ وہ اُس کے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی۔ بھرے بھرے، اکھڑے پھر کرمو جھکا اور اس نے اپنے ہونٹ اُس کے رخسار پر رکھ دیئے نوری نے دیکھا اُس کے ہونٹ پر خون کے قطرے چمک رہے ہیں۔ خون جو خراش پیدا ہونے سے نکل آیا تھا۔

اُن دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس ایک لمحے میں اُن دونوں کی روحوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا پھر بڑی خاموشی سے وہ ایک دوسرے سے تھوڑا تھوڑا دور ہٹ گئے اور کرمو نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور چھکڑا چلنے لگا۔ اس کے بعد دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ گھوڑا دوڑتا رہا چھکڑا ہچکولے کھاتا رہا اور پھر ایک کچے، بے ڈھنگے مکان کے سامنے کرمو نے گھوڑے کی راسیں کھینچیں۔ گھوڑا رُکا اور ایک گوشے سے اچانک ایک کتا اُچھل کر سامنے آیا اور اُس کے بھونکنے سے ساری خاموش فضا مرتعش ہو گئی۔

"یہ ہے گھر" کرمو نے چھکڑے سے اترتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو یہ گھر ہے جو تو نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے؟"

نوری یہ گھر دیکھ کر خاصی مایوس ہوئی یہ گھر اُس کے چچا کے مویشیوں کے باڑے سے بھی چھوٹا تھا مگر وہ چپ رہی۔ اب یہ اُس کا اپنا گھر تھا۔ کرمو خود ہی بولا "جیسا بھی ہے یہ گھر تیرے سامنے ہے"۔ اب نوری کے لئے کچھ نہ کچھ بولنا ضروری ہو گیا تھا۔ اُس نے خواب آلود لہجے میں کہا "ایک بار میں نے ایک گھر دیکھا تھا، جس کی دیواروں اور چھت پر سفید پھولوں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ تب میں نے سوچا تھا کہ جب میرا اپنا گھر ہوگا تو میں بھی اُس کو سفید پھولوں کی بیل سے سجاؤں گی۔"

"اچھا" کرمو نے ہنستے ہوئے کہا "تو پھر تجھے گھر تو مل گیا اب نیچے اُتر آ۔"

"ہاں گھر تو مجھے مل گیا" یہ کہہ کر وہ چھکڑے سے نیچے اُتر آئی۔ نیچے اُتری تو کتا اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ کتے کی پسلیاں لرز رہی تھیں۔

"اس کا کیا نام ہے؟"

"اس کا کوئی نام نہیں۔ بس کتا ہے میں نے رکھ چھوڑا ہے" یہ کہہ کر کرمو چھکڑے سے سامان اُٹھا کر گھر کی طرف چل پڑا، کچھ چیزیں نوری نے اُٹھا لیں اور پھر ایک کمرے کے اندر جا کر چیزیں ترتیب سے رکھنے لگی۔ وہ گھر کے اندر کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی جبکہ دیکھا کرمو موجود نہ تھا۔ اُسی لمحے پانی کی بالٹی اُٹھائے ہوئے کرمو اندر داخل ہوا اور بولا "یہ لے پانی۔"

بالٹی رکھ کر وہ پھر باہر چلا گیا۔

نوری کمرے میں اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔ ایک ایک چیز کو دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے کلہاڑا چلنے کی آواز سُنی۔ کرمو باہر لکڑی کے ایک بڑے کندے کو پھاڑ پھاڑ کر لکڑیاں چیر رہا تھا کھڑکی میں کھڑی ہو کر نوری نے باہر کا جائزہ لیا اور اُس جگہ کا انتخاب بھی کر لیا جہاں سفید پھولوں والی بیل کا پودا لگانا تھا۔ پھر اُس نے زور سے آواز دی "آٹا کہاں ہے؟ اور نمک بھی مجھے دکھائی نہیں دے رہا۔ روٹی کیسے پکے گی۔"

کرمو نے باہر سے جواب دیا "ابھی آ کر تجھے بتاتا ہوں آٹا کہاں رکھا ہے۔" پھر وہ اپنے بازوؤں پر چِری ہوئی لکڑیاں رکھے اندر داخل ہوا اور پھر چولہے کے پاس لکڑیاں رکھتے ہوئے بولا۔ "جب صبح گوشت خرید کر رکھ گیا تھا سلے یہ پڑا ہے۔ وہ رہا آٹے کا کنستر اور وہ سامنے نمک دان پڑا ہے۔"

وہ مسکرانے لگی اس گھر میں دونوں کی یہ معمولی مصروفیات بے حد اہمیت رکھتی تھیں اور بغیر کسی شیخ کے ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہے تھے۔ اُن کے راستے ایک تھے، منزل بھی ایک ۔۔ اسی لئے وہ چپ تھے اور یہ پُراسرار خاموشی دلوں کی زبان بن گئی تھی چولہے میں آگ روشن ہو گئی۔ شام ہنوز ہری تھی۔ بادل پھٹ گئے تھے اندھیرا آس پاس منڈلانے لگا تھا گوشت بھوننے کے بعد وہ آٹا گوندھنے لگی۔ کرمو چپ چاپ اُسے دیکھتا جا رہا تھا، اُس کے دل میں شبہ تھا کہ جب وہ نوری کو بیاہ کر لائے گا تو اُسے یہ گھر پسند نہیں آئے گا مگر وہ تو بڑے انہماک سے آٹا گوندھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسرت دکھائی دے رہی تھی۔ نوری نے مسکراتے ہوئے کرمو سے کہا۔

"میں نے وہ جگہ دیکھ لی ہے جہاں میں سفید پھولوں والی بیل کا پودا لگاؤں گی۔" وہ سفید پھول جس سے وہ اپنے گھر کی دیواروں کو سجانا چاہتے تھے اس پھول کے پودے کی جڑیں ان کے دل میں مضبوط ہو چکی تھیں پھول کھل اُٹھے تھے، کھڑکی کے راستے سے کمرے کے اندر جھانک رہے تھے کچھ فرش پر گر رہے تھے چاروں طرف ان کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔

کرمو بچپن ہی سے خاموش طبع تھا اس کے پاؤں کھردرے تھے مگر دل کے اندر گہری دانائی اور شاعری تھی اتنی گہری کہ آج تک اوپر کی سطح پر نظر نہ آئی تھی۔ مگر اب اس کے اندر حسن اور شاعری کا چشمہ اُبل اُبل کر کناروں تک آ گیا تھا۔

گوشت اور روٹی ۔۔ یہی دو چیزیں اُن کے دسترخوان کی کل کائنات تھیں مگر ایسا لذیذ کھانا اُن دونوں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہ کھایا تھا

کھانا ختم ہو گیا:

نرم اور نازک گفتگو کرنے کی بجائے کرمو نے نوری کا ہاتھ اپنے کھردرے ہاتھ میں لے لیا یوں اُس نے اپنے اندر چھپی ہوئی شعریت کا اظہار کر دیا تھا۔ اُس کا وہ کھردرا ہاتھ ۔ جو پتھر اور لوہے کے لمس سے آشنا تھا جو لکڑی کے کھردرے پن کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ پہلی بار ایک نرم اور کومل ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے جسم کی زبان کو محسوس کر کے لرزنے لگا۔

ساری رات شہد اور چاندنی جیسی میٹھی شاعری کی طرح تھی بھرا بھرا پورا چاند جو پہلے قدرے بدنما معلوم ہو رہا تھا آہستہ آہستہ اسے اپنے جسم سے ایک ایک پرت اُتارتا چلا گیا اور پھر کاغذ کی طرح حسین اور مختصر ہو کر رہ گیا اور یوں اُس دُبلی پتلی لڑکی نے ..... پہلے وہ جوتے اُتارے جو زندگی میں اُس نے پہلی بار پہنے تھے اور پھر چاند کو دیکھ کر اُس میں حوصلہ پیدا ہوا اور پرت در پرت اُس کا جسم نمایاں ہوتا چلا گیا۔

مٹی کے سینے سے اناج اُگانے والے کرمو نے نوری کو بے خوف بنا دیا۔ نوری کا منہ کرمو کی پلکوں پر تھا اور اُس کے دل کی گہرائیوں سے محبت کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ مرد انا تھا اور قوت۔ عورت سپردگی تھی اور مرد کے تحفظ کے لئے والہانہ تھرتھری۔ موانست محبت اور پھر جذب۔ گہری نیند پُرسکون نیند۔

اور پھر جب رات سرد ہو گئی اور کاغذی چاند درختوں کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ گیا تو نوری نے اپنے سوئے ہوئے کرمو کو دیکھا اور پھر عجیب ملائمت کے ساتھ اُس نے اپنا ہاتھ کرمو کے سر پر رکھا اور مسکراتے مسکراتے سو گئی۔

سندھی کہانی

[illegible]
ترجمہ:- [illegible]

مفرور

میں نے روپوش ہونے والوں کی لسٹ پر نظر دوڑائی، لسٹ پر دو سو سے بھی زیادہ نام تھے میرا پارہ چڑھنے لگا۔ جس ضلعے میں دو سو روپوش ہوں اس ضلعے کا پولیس افسر یا تو رشوت لینے والا ہو گیا پھر نااہل۔ میں لسٹ کو تھامے اٹھا اور کانفرنس روم کی طرف چلنے لگا۔ میرے قدم تیز تھے اس لئے اردلی تقریباً دوڑتا ہوا میرے آگے آگے چلنے لگا۔

کانفرنس کا دروازہ اردلی نے بڑی تیزی سے کھولا اور دروازے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے تمام صوبے داروں پر حقارانہ نظر ڈالی جو کہ مجھے دیکھتے ہی اپنی اپنی کرسیوں سے ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر صوبے داروں سے "سیٹ ڈاؤن" کہا۔ سب کے سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے لسٹ میز پر رکھ کر اس پر میں نے اپنا ہاتھ رکھ لیا اور صوبیداروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دوسری باتوں پر میں کسی دوسری میٹنگ میں بات کروں گا۔ اس لسٹ میں میرے پاس ان روپوشوں کے نام ہیں جو ضلع حیدرآباد کے مختلف جرائم کے مقدموں میں مطلوب ہیں۔ اس لسٹ میں دو سو نام ہیں۔ دو سو نام کم نہیں ہیں۔ بہت زیادہ ہیں جس ضلعے میں دو سو ایبسکانڈرز ہوں اس ضلعے کے پولیس افسر یا تو رشوتی ہیں یا پھر نااہل۔ اگر آپ لوگ رشوتی بھی نہیں ہیں اور نااہل بھی نہیں ہیں تو پھر یہ دو سو روپوشوں کی لسٹ کیسی ہے؟ یہ ایبسکانڈرز کی لسٹ ہر تھانے میں ہوگی ہر تھانے میں ان ایبسکانڈرز کے فوٹو لگے ہوں گے۔ میں براہِ راست ایس پی بھرتی ہو کر نہیں آیا ہوں۔ میں صوبے دار بننے کے بعد ایس پی بن کر آیا ہوں مجھے خوب معلوم ہے کہ صوبے داروں کو علم ہوتا ہے کہ کاغذات میں کون روپوش رہتا ہے اور کیا کرتا ہے میں کوئی (EXPLANATION) سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں خود بھی رشوت نہیں لیتا میں چاہتا ہوں کہ میرا ایڈمنسٹریشن پاک صاف ہو۔ روپوشوں کی پشت پناہی بند کرو۔ روپوشوں سے جو بھی بھتہ وصول کرتے ہو سو بند کرو۔ اس لسٹ پر جتنے آدمی ہیں وہ سب ایک ماہ کے اندر اندر گرفتار ہو جانے چاہئیں۔ یہ لسٹ میری اور تمہاری دونوں کی افسری پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ آئندہ ماہ جو میٹنگ ہوگی میں اس میں پھر اس لسٹ کو دیکھوں گا کوئی بھی ایبسکانڈر آزاد نہ رہے، ہر ایک روپوش کو گرفتار کر لیا جانا چاہیے۔ آئندہ ماہ کی میٹنگ سے پہلے ہی یہ لسٹ ختم ہو جانی چاہیے۔ ہر ایک اپنے تھانے کی حدود میں بسنے والے روپوش کو لاک اپ میں بند کر دے، کوتاہی کرنے والے کو میں نہ صرف معطل کردوں گا بلکہ سسپنڈ بھی کردوں گا۔ آج میں کسی اور کام کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا بس آئندہ ماہ کی میٹنگ سے پہلے ہی ایبسکانڈرز لسٹ ختم ہو جانی چاہیے۔

لسٹ ہاتھ میں لئے میں اپنے دفتر میں واپس آگیا۔ اب میرا پارہ آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ خود کو مطمئن کرنے اور کچھ نہ کرنے کے بہانے، میں نے لسٹ پر نظر دوڑائی۔ روپوشوں کی لسٹ میں سب سے پہلے نمبر پر ٹنڈو جام تھانے کے بیس سال پرانے روپوش اللہ ڈنو کا نام تھا۔ "اللہ ڈنو ولد رحیم ڈنو ہکڑو، بیس سال سے روپوش۔ ٹنڈو جام تھانے کی ایف آئی آر نمبر ۱۹۳۰/۳۲۲ اور ۱۹۳۰/۴۰۱ میں مطلوب" یہ وہی اللہ ڈنو تھا جس کا نام بیس سال پہلے بھی ایبسکانڈرز لسٹ میں پڑا ہوا تھا۔

بیس سال پہلے میں ٹنڈو جام تھانے پر صوبیدار تھا جہاں کچھ لوگ اللہ ڈنو ہکڑو کو پکڑ لائے تھے اور

ہمارے حوالے کر دیا تھا اور یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ اللہ ڈنو نکڑیا اور اس کا ایک ساتھی کسی کے گھر میں نقب لگا رہے تھے کہ گھر والے جاگ اٹھے اس کا ساتھی تو بھاگ گیا۔ لیکن اللہ ڈنو پکڑا گیا ہو فریادی نے ایف آئی آر رجسٹر میں درج کی پھر لگا اللہ ڈنو پر محنت کرنے کہ وہ اپنے ساتھی کا نام بتا دے پہلے تو میں نے اللہ ڈنو کو پھانسہ دیا۔ لیکن اللہ ڈنو نے اپنے ساتھی کا نام نہیں بتایا اس کے بعد میں نے اللہ ڈنو سے وعدہ کیا کہ میں اسے اس کیس سے نجات دلوا دوں گا لیکن وہ اپنی ہٹ پر اڑا رہا پھر میں نے اس کی لاتوں اور گھونسوں سے تواضع کی پھر میں نے ایک اور طریقہ اپنایا اسے جادو بوچا۔ وہ بوٹ کے ٹھڈے اور لاتیں برداشت کر گیا۔ لاٹھی اور چابک بھی وہ سہہ گیا لیکن اس نے اپنے ساتھی کا نام بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ میں بھی ضدی تھا۔ اس لئے تین دن تک، صبح و شام، دن رات مسلسل مارتا رہا لیکن اس نے اپنے ساتھی کا نام نہیں بتایا اور خود بھی اچانک مر گیا۔ میری مار مشہور تھی۔ لیکن یہ پہلا اتفاق تھا کہ میرے تھانے میں میری مار کی تاب نہ لا کر کسی قیدی نے حوالات میں دم توڑ دیا ہو۔ پورا دن اس کی لاش لاک اپ میں پڑی رہی اور میں تھانے میں بیٹھا رہا۔ شام آئی، رات ہوئی، اس کے بعد صبح ہوئی پھر رات کے اندھیرے میں میں نے اور میرے ماتحت عملے نے اللہ ڈنو کی لاش تھانے کے پچھواڑے گڑھا کھود کر دفنا دی۔

صبح سویرے میرا جمعدار دو ایک سپاہیوں کو ساتھ لے کر سامنے والے ہوٹل میں جا بیٹھا اور ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے لوگوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ایک شوشہ چھوڑ آیا کہ شام کو جواب دار اللہ ڈنو کو حیدرآباد لے جایا جائے گا جہاں دوسرے دن صبح کورٹ میں اس کی پیشی ہوگی۔ بیس سال پہلے ٹنڈو جام ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جہاں صرف ایک یا دو چھوٹے چھوٹے ہوٹل تھے۔ جمعدار کا اتنا شوشہ کافی تھا۔ شام تک یہ بات عام ہو گئی کہ آج اللہ ڈنو کو حیدرآباد لے جایا جائے گا۔

شام کا سورج ڈھلنے سے آدھا پونا گھنٹہ پہلے چار پانچ سپاہی وردیوں میں گھوڑوں پر سوار ہوئے ان کے درمیان ایک گھوڑے پر ایک سپاہی اپنا منہ اجرک سے چھپائے بیٹھ گیا۔ تاکہ دیکھنے والے لوگ یہ سمجھیں کہ اللہ ڈنو کو حیدرآباد لے جایا جا رہا ہے یہ گھوڑوں پر سوار پولیس والے تھانے سے نکل کر راستے پر آئے اس وقت سامنے والے ہوٹل میں ہمارے ایک سپاہی اور دوسرے لوگوں نے گھوڑوں پر آنے والے لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ پولیس اللہ ڈنو کا عدالت میں چالان پیش کرنے کے لئے حیدرآباد لے جا رہی ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد اجرک والے سپاہی نے ایڑ لگا کر گھوڑے کو تیز کیا۔ گھوڑا تیز دوڑ کر آگے نکل گیا۔ دوسرے سپاہیوں نے "اللہ ڈنو بھاگ رہا ہے پکڑو" کہہ کر اپنے گھوڑے اس کے پیچھے دوڑائے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے یہ سمجھا کہ اللہ ڈنو بچ کر نکل بھاگا ہے اور وہ لوگوں کو بلانے لگے کہ اللہ ڈنو کو پکڑنے میں پولیس کی مدد کریں۔

اجرک والے سپاہی نے اجرک اتار کر گھوڑے کی زین کے نیچے چھپا دی اور خود بھی اللہ ڈنو کو تلاش کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے سپاہی واپس تھانے آ گئے اور میں نے ایف آئی آر رجسٹر میں درج کی کہ کس طرح جواب دار اللہ ڈنو پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا اور اس طرح اللہ ڈنو کا نام ایبسکانڈنڈ لسٹ پر آ گیا اور پھر ہر سال جب نئی لسٹ تیار کی جاتی رہی اس میں اس کا نام آہستہ آہستہ اوپر بڑھتا رہا۔

یہ وہ اللہ ڈنو تھا جس کا نام میرے سامنے پڑی ہوئی لسٹ پر پہلے نمبر پر تھا۔ میں نے سرخ سیاہی والے قلم سے لسٹ میں لکھے اللہ ڈنو کا نام کاٹ کر اپنے دستخط کر دیئے اس کے بعد آئندہ میٹنگوں میں یا کسی بھی میٹنگ میں میں نے کبھی ایبسکانڈنڈ لسٹ کا نام نہیں لیا۔ میں کس طرح اعتبار کر سکتا تھا کہ اس ایبسکانڈنڈ لسٹ میں کوئی ایک روپوش بھی زندہ سلامت ہوگا!

دریافت کا سفر

اتنے زور کا طوفان تھا کہ کوئی چیز بھی پہلی جیسی نہیں رہی ۔۔۔ سب کچھ بدل گیا۔ سوائے اس شخص کے ۔۔۔ مگر وہ خود بھی کہاں بدلی ہے۔ اس کے اندر سناٹوں کا وہی عالم ہے ۔۔۔ پھر شاید یہ اس کا وہم ہی ہے کہ ہر شے تبدیل ہو گئی ۔۔۔ کیا اسے بھی عینک لگانی ہوگی؟ اس نے اپنی جلتی آنکھوں پر ٹھنڈی انگلیاں رکھ دیں مگر دوسرے ہی لمحے اس نے گھبرا کر اس طرح آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹائے جیسے بجلی کے تاروں سے چھو گئے ہوں "اتنے ٹھنڈے ہاتھ ۔۔۔ لاؤ گرم کر دوں ۔۔۔" اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ گھبرا کر اب اس نے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کے کانوں تک یہ آواز پہنچ گئی تو ان کی زبانیں باہر نکل آئیں گی ۔۔۔ ڈر کے مارے اس کا برا حال ہو گیا ۔۔۔

میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور زور سے اپنی ہتھیلی کو رگڑ ڈالا ۔۔۔ خود ہی تو اس نے ہاتھ بڑھایا تھا۔ پھر یہ لکیر ۔۔۔ مگر یہ کوئی اتنا بڑا جرم تو نہیں تھا ۔۔۔!

"کیا ہماری تقدیر دوسرے ہاتھوں کی لکیروں کو متاثر کرتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ لکیر پہلے تو اس ہاتھ میں نہیں تھی ۔۔۔"

"جب دوسری آنکھوں کے خواب ہماری نیندیں خراب کرنے لگیں ۔۔۔ تو ......"

"......تو کیا ۔۔۔؟"

"کچھ نہیں ۔۔۔ آؤ اس پہاڑی پر چڑھیں"

ایک خطرناک لمحہ کتنی آسانی سے ٹل گیا ۔۔۔

اس نے پتھر پر پاؤں رکھا اور ہاتھ میری طرف بڑھا دیا ۔۔۔

"آؤ نا ۔۔۔ بے وقوف یہاں سے دیکھو منظر کتنا خوبصورت نظر آتا ہے ۔۔۔" اس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔

میں خاموش کھڑی سوچتی رہی ۔۔۔ یہاں سے بھی تو ہر چیز خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ پتہ نہیں پھر وہ پہاڑی پر کیوں چڑھ رہا ہے؟

یہاں ایک دم اتنا سناٹا کیوں ہو گیا؟ مجھے اس سے پوچھنا تو چاہیئے ۔۔۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ اسے مذاق اڑانے کا ایک موقع مل جائے گا۔

تمہاری آنکھوں کا قصور ہے عینک لگاؤ مجھیں وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے اور میں اس سے یہ نہیں کہہ پاتی۔

"تم نے تو عینک لگا رکھی ہے ۔۔۔ کونسا فرق پڑ گیا؟ اس سے تو اچھا ہے آدمی ٹٹول کر راستے کر لے"

"تمہارا پڑھا لکھا تو سارا ضائع ہوا" اس نے نیچے جھک کر سر ہلایا۔

"میں جانتا ہوں تم اوپر آنے سے کیوں ڈر رہی ہو۔ کسی بڑی بوڑھی نے کبھی کہہ دیا ہوگا۔ مغرب کے بعد بال کھول کر لڑکیوں کو اوپر نہیں چڑھنا چاہیئے" اس نے قہقہہ لگایا۔

میں نے جلدی سے بالوں کو سمیٹا اور دوپٹے کو اچھی طرح سر پر منڈھ لیا ۔۔۔ اماں تو ابھی تک پھول نہیں پہننے دیتیں۔ حالانکہ بالوں میں پھول لگانا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ لڑکیاں خوشبو لگا کر اور پھول پہن کر چھت پر چلی جائیں۔ تو جن کا سایہ ہو جاتا ہے"

لاحول ولا قوۃ ۔۔۔" اس نے منہ بنایا۔ جن کا سایہ ۔۔۔ بھلا جن کے عاشق ہونے میں کیا برائی ہے ۔۔۔" اماں نے کان پکڑ لئے تھے۔ توبہ توبہ یہ کیسی بات منہ سے نکال دی۔ کوئی سن لے تو کیا کہے گا" اور میں سوچتی رہ گئی تھی۔ میں نے کیسی بات منہ سے نکال دی تھی کوئی سن لیتا تو کیا کہتا ۔۔۔ اماں بھی عجیب باتیں کرتی ہیں ۔۔۔ کوئی

جن ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ اور پھر آج اداس لڑکی دیکھو کتنا اچھا موسم ہے کچھ دیر بیٹھیں گے — میں چونک پڑی۔

"اچھا موسم — ہاں طوفان گذر گیا ہے۔ فضا میں عجیب سا ٹھہراؤ ہے — یہ ٹھہراؤ طوفان سے زیادہ ہولناک ہوتا ہے مجھے — مگر تم کہاں سمجھو گے تم جس آگ میں ڈالے گئے وہ گلزار بن گئی — مشکل تو میرے لئے ہے نا — اور میں — لیکن مجھے کس کا انتظار ہے۔ میرے کان کس چاپ پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ کھویا ہوا لمحہ مجھے مل بھی گیا تو کیا ہوگا؟

"سنو میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں —"

"کہو —" اس نے لاپرواہی سے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"زندگی دُور دُور بین — سے دیکھنے کی چیز نہیں۔ وہ بڑے ظالمانہ انداز میں اپنا اثبات چاہتی ہے —"

"پھر — یہ تم نے کوئی فلسفہ کی بات کی ہے"

اس نے قہقہہ لگایا۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں جانتی تھی۔ اس نے میری بات نہیں سنی۔ وہ کبھی میری بات نہیں سنتا — پھر بھی میں اس سے بہت سی باتیں کرتی ہوں —

ویسے میں جانتی ہوں کہ ہر بات کی طرح وہ یہ بات بھی جانتا ہے کہ اس کے دل میں میرے لئے کیا ہے میں یہ بات جان گئی ہوں —

مشکل صرف اس میں ہے کہ وہ نگاہ ادھر نہیں ہوتی۔

"تم ہنستی رہا کرو اچھا — تم ہنستی ہو تو مجھے اپنے دکھ یاد بھی نہیں رہتے — یہی تو ایک سہارا ہے جو میری صبح کو شام کرتا ہے"

وہ چاہتا ہے میں ان باتوں پر یقین کر لوں اور اپنے پاؤں کے نیچے سے یہ زمین بھی کھو دوں — کس زمین کی بات کر رہی ہو تم — قدموں تلے سرکتی ہوئی ریت تمہیں کبھی محسوس نہیں ہوئی —؟ مان کیوں نہیں لیتیں۔ اس یقین ہی نے تمہارے پاؤں پکڑے ہیں — یہ بات کس نے کہی تھی — جھوٹ اگر زندگی کے لئے بولا جائے تو سچ ہو جاتا ہے"

مگر یہاں کس کی زندگی کا سوال ہے؟ پھر میں کیوں چاہتی ہوں کہ وہ اتنا بڑا جھوٹ بول دے۔

"دیکھو تمہارے سوا تو میں یہ باتیں کسی سے نہیں کہتا"

"مجھ سے کیوں کہتے ہو؟" یہ سوال ضروری تھا۔

"پتہ نہیں — مجبوری سمجھ لو!" اس نے پہلو بدلا

"بس — ؟"

"ہاں بس — اور کیا" وہ کھلکھلا کر ہنسا میں بھی ہنس دی۔

"میں نے تو مذاق کیا تھا! بھلا تمہارے بارے میں کوئی اور بات سوچی جا سکتی ہے!؟" میرا لہجہ نارمل ہو چکا تھا —

اس نے ناراض ہو کر ٹیلی فون بند کر دیا —

تمہارے بارے میں کسی نے غلط کہا تھا کہ ان کہی باتیں بھی تم تک پہنچ جاتی ہیں —

میں خواہ مخواہ ہی اتنی دیر سے یہاں کھڑی ہوں۔ یہ بھی اچھا ہے کہ کسی نے ابھی تک نوٹ نہیں کیا کہ میں غلط جگہ کھڑی ہوں۔ ورنہ بڑی شرمندگی ہوتی۔ اسے تو پتہ بھی نہ چلتا — ہجوم کا یہی تو ایک فائدہ ہے کہ انسان آسانی سے اپنی پہچان کھو دیتا ہے — اپنے آپ کو دریافت کرنے کا عمل بھی خوب ہے ہونے کے کیسے کیسے عالم اور نہ ہونے کے کیا کیا تجربے ہوتے ہیں — مشکل تو یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو جس اندھے کنوئیں میں قید کیا ہے وہاں تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ بھی تو کھلا نہیں چھوڑا کہ اسے کچھ بتایا جا سکے —

اور میں یہاں اتنی دیر سے کھڑی ہوں —

"ایک بات بتاؤ۔ باریک سی جھری سے چھنتی ہوئی روشنی میں تحلیل کر لینے کی قوت ہوتی ہے؟"

"کیوں — یہ سوال تم نے کیوں کیا —؟"

"یونہی — !"

حالانکہ وہ بھی جانتا ہے کہ یہ سوال اس نے یونہی نہیں کیا — روشنی میں تحلیل ہو جانے کی بات ایک بار اس نے پہلے بھی کی تھی۔ وہ خوب جانتا ہے۔ ایسی باتیں وہ کیوں کرتی ہے — مگر وہ اس سے یہ نہیں کہتا — کہ آخر وہ اسے کیوں مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہے۔ یہ باریک سی جھری تو اس نے تازہ ہوا کے لئے کھلی چھوڑی ہے — روشنی کی اسے اتنی زیادہ ضرورت نہیں — کہ وہ اندھیرے میں دیکھ سکتا ہے۔ ضرورت ہو تو جیب میں پڑی ہوئی موم بتی جلا سکتا ہے۔

اب میں سنبھل کر کھڑی ہو گئی ہوں۔

تم نہ جانے کیا چاہتے ہو — یہ خیال مجھے ہمیشہ نروس کر دیتا ہے۔

"کھڑی کیوں ہو گئیں۔ بیٹھو نا — تم نے میری طرف غور سے دیکھا — میں جلدی سے اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی ہوں۔ پانی شفاف ہے۔ کہیں زمین میں دھنسے ہوئے میرے پیر تمہیں نظر آجاتیں — تم ایک دم اپنی جگہ سے کھڑے نہ ہو

جاؤ۔ پھر تم وہ بات جان جاؤ گے جو میں نہیں چاہتی کہ تمہیں معلوم ہو۔

مگر اب تم اڑتی ہوئی اس چڑیا کو دلچسپی سے دیکھ رہے ہو جو دور ہوتی جا رہی ہے۔ تمہاری نظریں اس طرف نہیں ہیں۔ تمہارے علم میں لائے بغیر میں تمہارے پیروں کی طرف دیکھ سکتی ہوں۔ اور میں دیکھ بھی لیتی ہوں۔ لیکن آس پاس پانی گدلا ہے کچھ نظر نہیں آتا ــــ

میں اطمینان کا سانس لیتی ہوں ــــ تم وہ بات نہیں جان سکو گے ــــ

پھر میں کیا کروں ــــ میں نے اپنی جلتی ہوئی سوچ پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔

"اتنے ٹھنڈے ہاتھ ــــ لاؤ گرم کر دوں۔"

میں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا ــــ کوئی نہیں تھا۔ ایک عجیب سا شور میرے اندر گھس گیا ہے کہ دل کی الٹ پلٹ دھڑکنیں بھی اب سنائی نہیں دے رہی ہیں۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے پیروں کے نیچے رکھ دیئے ہیں ــــ تاکہ نیچے سے پھسلتی ہوئی ریت اور نوکیلی کنکریوں کی رگڑ اسے بے آرام نہ کر سکے۔ مگر خود میں پریشان ہو گئی ہوں۔

آج مجھے احساس ہوا ہے کہ میرے ہاتھ بہت چھوٹے ہیں۔ فضول بات ــــ میں نے بے بسی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ اماں کہتی ہیں انسان کو شکر کرنا چاہیئے کہ ہاتھ پاؤں سلامت تو ہیں ــــ مگر انہیں کون سمجھائے۔ چھوٹے ہاتھ ہوں تو کتنی اذیت ہوتی ہے۔ لوگوں کے تو پاؤں بھی اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ تمام راستے اور ساری منزلیں اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔ مجھے اس سے کہنا چاہیئے ــــ یہ بات بتا دینی چاہیئے ــــ!! کیا میں اسے بھی پریشان کرنا چاہتی ہوں ــــ؟ میں ہی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہوں ــــ توازن کا احساس وہ کھو بیٹھا تو کیا ہوگا ــــ مگر نہیں ــــ اس نے بھی تو زندگی سے نارمل رہنے کا ہنر سیکھا ہے مجھے ڈرنا نہیں چاہیئے ــــ

"سنو کبھی سمندر کے کنارے تم نے پانی میں کھڑے ہو کر دیکھا ہے؟"

"ہاں۔ کیوں ــــ" اس نے حسبِ عادت لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ مجھے غصہ نہیں آیا۔ کیونکہ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔

"لگتا ہے جیسے پاؤں تلے سے کوئی زمین کھینچ رہا ہے ــــ ریت اس تیزی سے پھسلتی ہے کہ ذرا دیر پاؤں جما کر کھڑا ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔" میں اسے اپنی دانست میں نئی بات بتا رہی ہوں۔

"ہاں ایسا ہوتا ہے ــــ" لہجے کی لاپرواہی اسی طرح برقرار ہے۔

"جی چاہتا ہے کوئی زمین کو پکڑ لے ــــ" میں بولے جا رہی ہوں۔ اس نے میری بات کاٹی ــــ

"ہاں ــــ یا کوئی اپنے ہاتھوں کو ہمارے پیروں کے نیچے رکھ دے۔" اس کے لہجے میں اچانک ایک نیا پن تھا ــــ

"کیا ــــ! ہاتھ پیروں کے نیچے رکھ دے!!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ــــ کہیں اسے معلوم تو نہیں ہو گیا کہ اس کے پیروں کے نیچے ریت کیوں جم گئی ہے۔؟ اس کا لہجہ نیا نیا سا کیوں ہے؟

مگر وہ بڑی بے نیازی سے چٹان پر پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ پتلون کے پائنچے اوپر تک چڑھے ہوئے ہیں۔ اور پانی شفاف نہیں ہے ــــ کیا وہ نیچے دیکھے گا ــــ؟ گدلے پانی میں اسے اپنے پاؤں بھی نظر نہیں آئیں گے۔ میرے ہاتھ کہاں سے دیکھ لے گا ــــ چلو ایک مشکل تو آسان ہوئی۔

میں سکون کا سانس لیتی ہوں اور سیدھی ہو کر بیٹھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مگر ہاتھوں کو جنبش دیئے بغیر یہ ممکن نہیں ــــ مجھے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینی چاہیئے۔ ورنہ رکھے رکھے سن ہو جائیں گے ــــ

پتہ نہیں ابھی وہ اور کتنی دیر اسی طرح بیٹھا رہے گا۔ یہ تو مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ وہ اپنے پیروں کی طرف کبھی نہیں دیکھے گا ــــ پھر وہ یہاں سے اٹھتا کیوں نہیں؟ اس نے اتنی دیر سے اپنی ٹانگوں کو حرکت بھی نہیں دی۔

کہیں ایسا تو نہیں ایک ہی طرح رکھے رکھے اس کے پاؤں سن ہو گئے ہوں ــــ یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندتا ہے۔ میں کانپ جاتی ہوں۔ آہستہ سے اپنے بائیں ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ ایک لہر سی اٹھتی ہے۔ اور کندھے تک سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔ اُسے کچھ پتہ نہیں چلتا ــــ میں دائیں ہاتھ کو ذرا زور سے جھٹکا دیتی ہوں۔ وہ ایک دم چونک کر نیچے دیکھتا ہے۔

"کیا ہوا ــــ کیا بات ہے ــــ!" پانی گدلا ہے اسے کچھ نظر نہیں آتا ــــ

مگر میری دریافت کا سفر اچانک ختم ہو گیا۔ میں نے دیکھ لیا ہے اس کے پاؤں بالکل ٹھیک ہیں لیکن میرے ہاتھ سن ہوتے جا رہے ہیں ــــ

انوار احمد زئی

گوشۂ عافیت

تاریخ کے پروفیسر نے عینک اُتارتے ہوئے لیکچر کا آخری جملہ ادا کیا۔۔۔"اور اس طرح ثابت ہوا کہ انسان طاقتور ترین تخلیق ہے جسے دنیا کی ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔" انہوں نے گھڑی دیکھی اور عادتاً کہا "کوئی سوال؟" اور پھر معمول کے مطابق کلاس کو خاموش پاکر رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ پینتالیس منٹ تک خموشی برداشت کرنے والی کلاس میں آوازوں کا شور در آیا۔ ابھی پروفیسر کاریڈور سے گزر کر زینے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ناظم نے جالیا۔

"مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے سر" اُس نے ہانپ کر کہا۔!

"لیکچر کے بارے میں" پروفیسر نے ٹھٹکتے ہوئے پوچھا۔!

"جی ہاں"

"تو کل کلاس میں کیجیے۔" انہوں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"کلاس میں تو زندگی بھر نہیں کر سکوں گا۔" ناظم نے برملا کہا۔

کیوں؟ پروفیسر چونکے۔

"اس لئے کہ میں کن انسانوں میں سے نہیں ہوں جنہیں دنیا کی ہر شے پر قدرت حاصل ہوتی ہے مجھے اپنے آپ پر قدرت نہیں ہے سر۔" اس نے ایک سانس میں سب کچھ کہہ دیا "خوب" پروفیسر نے جیسے مرض پہچان لیا ہو۔ "تو یوں کرو، تم میرے کمرے میں پہنچو، اوپر چابی، میں ذرا ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔ ٹھیک ہے۔" اور پھر وہ بغیر جواب سُنے ایک طرف مڑ گئے۔

کرسی میں دھنستے ہوئے پروفیسر نے اطمینان سے کہا۔ "ہاں اب بتاؤ کیا سوال ہے تمہارا؟"

"سر! آپ نے کہا تھا نا کہ انسان طاقتور ترین مخلوق ہے۔"

"ہاں تمہیں اس میں شک ہے یا اعتراض؟"

"شاید شک یا شاید اعتراض"

"مگر کیوں؟"

"سر! دیکھئے نا۔" انسان کو تاریخ کی فتوحات کے آئینے میں طاقتور بتانا کہاں کا انصاف ہے جبکہ ہم اپنے عہد میں انسان کی بے چارگی کے عجیب منظر دیکھتے ہیں اور منہ پھیر کر گزر جاتے ہیں اس لئے کہ ہم خود ہم اس کی مشکل کا حل تلاش کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔"

"ہوں" پروفیسر نے پائپ جلایا اور بولے۔ "تو تمہارے خیال میں انسان کی عظیم فتوحات، سائنسی ایجادات ایٹمی معرکہ آرائیاں، یہ سب اُسے طاقتور ثابت نہیں کرتیں؟"

"جی ہاں سر۔ میرے خیال میں اس طرح انسان نہیں وہ حالات عظیم ہوتے ہیں۔ وہ حالات اور وہ ماحول طاقتور ہوتا ہے جو انسان کو کامران بنا کر اُسے تاریخ کا شہکار کہلواتا ہے۔ ورنہ سر دیکھئے نا جب بابر نے ہند پہ حملہ کیا تو اس کی تنہا فتح ہوئی جبکہ اس کی تلوار سے کٹ جانے والے سر مجبور انسانوں ہی کے سر تھے۔ اسی طرح جنگِ عظیم دوم میں انسانوں کی سائنسی فتح مندی کی سند دینے والے ایٹم بم کی کامرانی میں لاکھوں انسانوں کے خون کا سمندر اور گوشت کے صحرا شامل تھے۔ آخر ان بے چاروں کی بے طاقتی کس زمرے میں آئے گی؟"

"ہوں" لمبا سا کش لے کر پروفیسر نے نتھنوں سے دھواں اور آواز ایک ساتھ نکالی۔

"تو تم سمجھتے ہو کہ حالات انسان کو کامران کرتے ہیں۔"

"جی ہاں سر"

"مگر یہ حالات کس کے تابع ہیں"

"فطرت کے یا اتفاقات کے۔"

"نہیں تمہارا نقطۂ نظر غیر منطقی اور کسی حد تک قدامت پرستانہ ہے۔"

"آپ اسے کوئی نام دے لیں سر۔ لیکن یہ تسلیم کریں کہ حالات نے ہمایوں کو بے بس کیا اور اتفاقات نے پھر بادشاہ بنایا..... حالات سازگار رہے تو اکبر نصف صدی تک حکومت کرتا رہا اور حالات بگڑے تو دارا شکوہ کے سر کا تاج اورنگ زیب کی پیشانی کی زینت بن گیا.... البتہ حالات اور اتفاقات کے تیز رفتار پہیہ کے درمیان آنے والوں کے پرخچے اُڑ گئے اور آج تاریخ انہیں عظیم نہیں عجیب لوگوں کے نام سے یاد کرتی ہے.... سر میں سمجھتا ہوں، انسان اُس روز عظیم ہوگا۔ جب وہ وقت کو اپنا تابع بنا لے گا، گذرتے ہوئے لمحوں کو اپنی دسترس میں لے آئے گا تاکہ کسی انسان کے طاقتور حالات دوسرے انسان کے کمزور ماحول پر اثر انداز نہ ہوں۔"

پروفیسر نے مشفقانہ مسکراہٹ کو گہرا کرتے ہوئے کہا: "اور شاید یہ کبھی ممکن نہ ہو سکے۔"

"ممکن ہے یہ کبھی ممکن نہ ہو مگر اس وقت تک انسان کی عظمت بھی مشتبہ رہے گی سر۔"

"ہنہ۔ اچھا!" پروفیسر ناظم کے استدلال کے سامنے کچھ سوچ رہے تھے

اس نے پھر حملہ کیا۔

"سر جس انسان کو نہ تو اپنی خواہشات پر قابو ہو اور نہ انہیں پورا کرنے کا یارا.... وہ بھلا کیسے عظیم ہو سکتا ہے؟"

پروفیسر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "ناظم میرے اگلے پیریڈ کا وقت ہو گیا ہے۔ فائنل کی کلاس میں میرا ENGAGEMENT نہ ہوتا تو میں تمہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا، تاہم تم ایسا کرو کہ لائبریری سے EDGAR VICTOR کی کتاب "THE GLOBE BENEATH YOUR FEET" لے کر پڑھ ڈالو۔"

"سر میں نے اُسے پڑھا ہے مگر عجب ہے کہ وکٹر نے انسان کے ارتقا پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ کیوں نہیں بتایا کہ اُس نے نقطۂ عروج سے واپس آنے کا سفر شروع کر دیا ہے۔"

اب پروفیسر کو یقین ہو چلا تھا کہ ناظم نہ ہار ماننے والوں میں سے ہے اور نہ صرف بحث کے عادی طالب علموں میں سے، بلکہ وہ اپنے کشادہ مطالعے اور گہرے مشاہدے کے بل پر اپنا ایک واضح نقطۂ نظر بنا چکا ہے۔ پھر بھی پروفیسر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"لیکن کوئی مثال"

"مثال یہ سر کہ کل کا انسان صحت مندی سے لے کر ذراست و ہوش مندی تک ہر چیز میں اس طرح آگے تھا کہ آج کا انسان صدیوں پرانے ان انسانوں کی تقلید کرتے ہوئے زندگی کا سفر طے کر رہا ہے پھر یہ کہنا کہ بتدریج ارتقائی منازل میں ہے سراسر جھوٹ ہوا نا۔"

"اور اس خلائی تسخیر کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا۔"

"سر! ابھی بیسویں صدی کے انسان نے محض چاند پر قدم رکھا ہے، مریخ، زحل اور دوسرے سیارے اس کی دسترس سے بہت دور ہیں اور ان تک اس کی رسائی صرف خواب سے زیادہ نہیں جبکہ چھٹی صدی اور ساتویں صدی کا ایک انسان کرۂ ارض سے اُٹھ کر رفعت جنت آسمان تک ہو آیا تھا.... پھر...."

"تو تم نے تسلیم کیا نا کہ انسان عظیم ہے۔"

"ایک مخصوص انسان کی بات ہے تو مجھے تسلیم ہے اور یوں بھی اس برگزیدہ شخص کے اس سفر کا تعلق ان حالات سے تھا جو انسانی قبضۂ قدرت سے ماورا ہیں۔"

ٹھیک ہے تم سے گفتگو رہے گی، اس وقت میں پیریڈ لے لوں۔"

"معاف کیجئے گا سر، آپ کا بہت وقت لیا، اس لئے اب اجازت دیجئے۔"

"خدا حافظ" پروفیسر نے ہاتھ ملاتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔

پروفیسر اپنے کمرے سے نکلے تو ایک دوسرے لڑکے نے پوچھا "سر یہ خبطی کیا کہہ رہا تھا؟"

"ہنہ؟" پروفیسر نے کہا "بڑی بات ہے ایسے ذہین لڑکے کو خبطی کہنا تخلیقی سوچ کی توہین ہے۔"

"سوری سر! ویسے اس کی ماں جب سے مری ہے یہ اس طرح بہکی بہکی باتیں کرتا ہے"

"اچھا۔؟ مگر اس کی ماں کب مری۔"

"ایک مہینے سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا۔ کہتا ہے

وہ کسی اذیت ناک لاعلاج مرض میں مبتلا رہ کر عرصے تک کرب جھیلتی رہی اور پھر مر گئی۔"

"اوہو، جب ہی اس کی سوچ میں قنوطیت اگئی ہے۔" مگر پھر پروفیسر نے بی اے فائنل تک کی کلاس کا راستہ طے کرتے ہوئے سوچا کہ کیا قنوطیت کی چھاپ لگا کر حقیقی مسائل کو نظر انداز کر دینا رجائیت ہے.....

اس دن کے بعد سے ناظم کو کلاس میں نہ دیکھا گیا۔ پروفیسر روز حاضری لیتے ہوئے رول نمبر ۲۷ پر رکتے اور ایک نظر کلاس میں دوڑاتے ہوئے ناظم کے بارے میں سوال کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے اُسے بھلا دیا۔ ایک سال گذر گیا۔ بارہ مہینوں پر محیط ایک سال۔

ایک دن پروفیسر کتابوں کی دکان سے نیچے اُتر رہا تھا کہ اُسے برف بیچتا ہوا برف جیسا سفید مگر شناسا چہرہ دکھائی دیا.... وہ چونکا اور دوسرے ہی لمحے پہچانتے ہوئے کہا۔

"ناظم تم۔؟ یہ کیا کر رہے ہو، تم نے کالج آنا کیوں چھوڑ دیا؟"

"سر، بس یوں ہی حالات نے شکنجہ تنگ کر دیا ہے۔"

"پھر بھی کیا بات ہے؟"

ابا جان سخت بیمار ہیں، گھر میں کوئی اور نہیں۔ ان کی خدمت اور دوا دارو سے زیادہ کتابی علم مقدم نہیں اس لئے سوچا دھندا کر لوں تو لیں یہ پانی بیچنے لگا، اسے بھی حالات نے جما کر رکھ دیا ہے میری طرح۔ یخ بستہ!

پروفیسر نے کہا "مگر پڑھائی؟"

"چھوڑیئے صاحب" اس نے بالکل برف بیچنے والوں کی طرح کہا "کیا رکھا ہے پڑھائی میں۔" پڑھائی کہتی ہے انسان عظیم اور طاقتور ہے مگر میرے ابا کی بیماری کہتی ہے انسان بے بس اور مجبور ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں گرم پانی کے آئینے ناچ گئے۔

مگر تمہارے وظیفے کی کوشش بھی کی جا سکتی ہے"

"نہیں سر! مجھے حالات سے بردآزما دار اشکوہ رہنے دیں میں اتفاقات کا پروردہ وظیفہ خوار بہادر شاہ ظفر بننا نہیں چاہتا" اس نے ذرا سا رُک کر تلخی سے کہا۔

"سر! کل آپ کے پاس وقت نہیں تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے، برف بیچنا ہے.... ہم دونوں کا مرکزِ نگاہ پیٹ تھا اور پیٹ ہے۔ ذرا دیر ہو گئی تو برف پانی ہو جائے گی بالکل انسان کی طرح حالات کی گرمی سے پگھل جانے والی شے۔ اس لئے بحث پھر کبھی اگر وقت نے اجازت دی" اور پھر وہ نہایت بے باکانہ برف بیچنے کی مخصوص آواز لگانے لگا۔

بازار سے کالج تک کا سفر صدیوں پر محیط ہو گیا اور پروفیسر کے قدم خود اپنے بوجھ سے شل ہو گئے یوں لگتا تھا کہ آج یا تو پروفیسر کا جسم کسی بوجھ تلے دب کر بھاری ہو گیا ہے یا ٹانگیں بہت کمزور، پیٹ اور جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوا اور ناظم کے لئے اسکالرشپ کی بات شروع کر دی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروفیسر کی چڑچڑاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اُسے کبھی ناظم پر غصہ آتا ہے اور کبھی اپنے آپ پر۔ کبھی سوچتا وہ لڑکا کسی ناآسودہ انسان کی بے چین روح تو نہیں جو پلک جھپکتے غائب ہو جاتی ہے اور پھر نہیں ملتی؟ اسکالرشپ منظور کرانے کے بعد سے ناظم کا کہیں پتہ نہ تھا۔

موسم گرما کی تعطیلات گزارنے کالج مری آیا ہوا تھا۔ پروفیسر نے شہر کی پُرشور فضا اور گرم موسم سے نجات پا کر مری کے خنک ماحول کو سب بھی کے لئے غنیمت جانا۔ وہ دن دن بھر اپنے ہوٹل کے یخ بستہ کمرے میں اجرک اوڑھے کتابیں پڑھتا رہتا اور لڑکے نشیب و فراز کی وسعتیں ناپتے پھرتے۔ ایک دن لڑکوں میں سے کسی نے اُس سے پوچھا۔

"سر! فقیر کی دعا کی تاثیر کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"دعا فقیر کی ہو یا امیر کی۔ دل کی جس قدر گہرائی سے کی جائے اثر کی اسی قدر بلندی پر جاتی ہے۔ مگر تم نے یہ سوال کیوں کیا؟" پروفیسر نے کتاب سے سر اٹھا کر پوچھا تب لڑکوں کے گروہ نے ویران گھاٹیوں میں غیر آباد ڈھلوان پر زندگی گزارنے والے اُس مجذوب سے منسوب بہت سے قصے سنائے جو بھیک کے ٹکڑوں پر گزارا کرنے کے باوجود لوگوں کو تاثیرِ دعا کی بے کراں دولت سے نوازتا ہے۔

پروفیسر تجربے، مشاہدے اور علم کے اضافے کی غرض سے اپنے کمرے سے نکلے اور طلباء کے ساتھ ہوئے ویران ڈھلوان کی طرف چل دیئے پیچھے پیچھے

کپڑوں میں ملبوس بے حال اور کمزور ہڈیوں والے اور دھنسی ہوئی آنکھوں والے چہرے پر نظر ڈالتے ہی پہچان گئے۔ بے ہنگم اور اُلجھی ہوئی داڑھی کو نگاہوں سے صاف کیا تو ناظم کا کمزور چہرہ ان کے سامنے تھا۔ بے ساختہ انہوں نے کہا "کیا تم جانتے ہو۔ وقت سے بہت پہلے بوڑھے ہو جانے والے ناظم نے بھی پہچانتے ہوئے کہا "سر، جوان تو بہت بااختیار اور طاقتور ہوتے ہیں، میں تو ایک کمزور اور مجبور انسان ہوں۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں کے سامنے بے بس ولاچار انسان۔ پروفیسر نے جھلاتے ہوئے سر کو جنبش دی اور کہا "مگر کیوں۔ کیوں بے بس ہو جاتے ہو تم حالات کے سامنے۔ تم چلے کہاں گئے تھے۔ اس دن کے بعد سے میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا؟"

"اس دن کے بعد" ناظم نے میل اور مٹی سے اٹے ہوئے ہاتھوں سے الجھی ہوئی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا "اس دن کے بعد سر۔ حالات نے مجھے دھوبی کے کپڑوں کی طرح پتھر پر دے مارا، ... سر اس دن میرے والد کی طبیعت خراب ہوئی اور میں انہیں ڈاکٹر کے مشورے پر پہاڑ پر لے گیا۔ مکان بیچ کر ساحلی سینی ٹوریم میں داخل کرا، بلکہ پھر بھی وہ مر گئے ... تب سے یہیں ہوں ..." اس نے ایک ہی سانس میں کہانی سنا دی۔

"اس حال میں؟"

"مجبوری ہے۔"

"کیا مجبوری ہے۔ تم نے خود کو حالات کے دھارے پر ڈال دیا ہے، اپنی کم ہمتی کو مجبوری کا نام دیتے ہو۔" پروفیسر ناظم کی حالت دیکھ کر تقریباً رو دیئے تھے، لیکن ناظم نے اسی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"جی سر۔ آپ شاید ٹھیک کہتے ہیں... مگر میں یہاں سے چل نہیں سکتا ورنہ شاید آپ انسان کی بےچارگی کا روپ دیکھ کر پریشان نہ ہوتے۔ مگر سر میں نے ہار کہاں مانی ہے... کبھی مجھے خود پر بھی اختیار نہیں تھا اب اپنے سوا کسی اور چیز پر لینا نہیں۔ یہ الگ بات کہ میں آج بھی وقت سے لڑ رہا ہوں اور ان اتفاقات کا منتظر ہوں جو مجھے سکندرِ اعظم بنا دیں.... اگر کبھی منہ زور وقت میرے اتفاق کے بس میں آگیا تو آپ دیکھئے گا میں اس کی کلائی موڑ کر اپنے قبضے میں کر لوں گا۔ تب یہ میرے حکم سے چلے گا اور میرے حکم سے ٹھہرے گا، بس میرا وظیفہ پورا ہو لینے دیجئے، ایک آنچ کی کسر ہے۔"

"گویا تم اب وظائف اور دعاؤں کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہو؟"

"میں نہیں سر۔ یہ آپ کے طاقتور اور عظیم انسان ان کے سہارے جینا چاہتے ہیں یہ شاندار کوٹھیوں اور لمبی چمکیلی کاروں والے سرمایہ دار، تعلیم یافتہ انسان جو حالات کے آگے بے بس اور وقت کے سامنے لاچار ہیں، اپنی غمزدہ داستانیں، اپنی شکستگی کی کہانیاں، اپنے اندر کے ٹوٹے ہوئے انسان کے ایسے نمیے سنانے آتے ہیں اور ان کی آپ بیتیاں سُن کر دل ہی دل میں ہنستا ہوں، چہرے پر بھی بے بس آنکھوں سے روتا ہوں اور زیرِ لب انسان کا مرثیہ پڑھتا ہوں تو یہ لوگ اُسے اپنے حق میں دعا سمجھ کر میرے جینے کا آسرا بن جاتے ہیں.... ایک مجبور دوسرے مجبور کی مدد اس طرح کر سکتا ہے۔"

اب پروفیسر کا غصہ نقطۂ عروج پر تھا اس نے تیز لہجے میں کہا۔

"سب بکواس ہے۔ تم نے خود فریبی کے لئے پناہیں ڈھونڈ لی ہیں میں کہتا ہوں اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔"

بہت دیر سے خاموش تماشائی بنا اس کا معتقد یہ سب دیکھ اور سُن رہا تھا مگر اب شاید اس کا خاموش رہنا ممکن نہ تھا اس لئے اس نے اسی ترشی سے جواب دیا۔

"بابا کیا بکواس ہے، تم کیوں ہمارے بابا کو تنگ کرتا ہے۔ جاؤ یہاں سے" اور پھر بڑبڑاتے ہوئے بولا "کہتا ہے اٹھو میرے ساتھ چلو، اندھا کہیں کا دیکھتا نہیں ہے۔ بابا کے دونوں ٹانگوں پر فالج گرا پڑا ہے .... وہ چلے گا کیسے۔"

اور اس کے آگے پروفیسر کچھ نہ سُن سکا۔ ناظم سے آنکھ ملائے بغیر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ آج اس نے کوئی کتاب نہ کھولی۔ نہ کھانا کھایا نہ کافی پی۔ بس کھڑکی سے باہر جھانکتا پہاڑوں سے بلند کبھی آسمانی رفعتوں میں اور کبھی پہاڑ کے دامن میں پھیلی تاحدِ نگاہ گہرائیوں میں۔ رات یونہی بیت گئی۔ صبح ہوتے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ناظم کو ساتھ لے کر شہر چلا جائے گا اور خود اس کا علاج کراتے رہے گا۔

صبح ہوئی، اس نے دو لڑکوں کو ساتھ لیا اور ڈھلوان میں اتر گیا، ناظم کا ڈیرہ ویران تھا۔ روئی کے چند گلے، مٹی کی ٹوٹی ہوئی ایک پیالی اور

حالات حسب معمول مل جل کر اس کا مذاق اڑا رہے تھے، دور تک پھیلی ہوئی خاموشی سے کچھ پوچھنا بیکار تھا حیرتوں کے سلسلے، پروفیسر کے دل و نظر سے لے کر پہاڑ کی بلندیوں تک پھیل گئے تھے۔ پروفیسر دونوں شاگردوں کے ساتھ تھکے ہوئے اور ہارے ہوئے جواری کی طرح آبادی کی طرف چلنے لگا۔ اس نے پھر سوچا ناظم کس نا آسودہ انسان کی بے چین روح کا نام ہے کاش وہ اس روح کو کل ہی بوتل میں اتار لیتا۔

جب تک پروفیسر پہاڑ پر رہے انہوں نے کتابوں سے ربط توڑے رکھا وہ دن بھر پہاڑی کے نشیب و فراز میں نا آسودہ روح کو تلاش کرتے ہوئے سوچنے لگتے کہ ناظم کا ہیولیٰ حقیقت ہے یا وہم، خواب یا دھوکہ — یا محض یہ حقیقت ہے کہ وہ اب وہاں نہیں ہے یا شاید وہ وہاں کبھی بھی نہیں تھا۔

اس سال کے بعد پروفیسر نے کالج ٹیم کے ساتھ نہ آنے کی قسم کھائی اور یوں ہر سال کوئی اور پروفیسر کالج کے بے فکر طلبہ کو پہاڑ پر لاتا رہا۔ کالج میں بین الاقوامی تاریخ کانفرنس کے چرچے تھے ملک اور بیرون ملک کے جید اور مستند تاریخ داں [illegible] پر بڑے بڑے مقالے پڑھنے آئے تھے آخری سیشن میں پروفیسر نے جو مقالہ پڑھا اس پر تاریخ کے ماہرین نے شدید تنقید کی اکثر نے یہ اعتراض کیا کہ مقالہ تضادات افکار کا شکار ہے۔ انسان کو تاریخ کے آئینے میں عظیم ثابت کرنے کے باوجود پروفیسر نے داخلی جذبات اور غیر تاریخی شواہد کی بے ربط تکرار سے انسان کو مجبور و لاچار بتایا ہے — تاریخ کے آئینے کو داخلی تصورات کی عکس ریزی سے چور کرنے پر پروفیسر کو شرمندہ ہونا پڑا... مگر وہ حالات سے سمجھوتے کا اب عادی ہو چکا تھا۔

دوسرے دن مندوبین کو شہر دکھانے کا ناخوشگوار فریضہ بھی اُسے سونپا گیا، اور وہ کالج بس کو شہر کی پر رونق سڑکوں، تاریخی عمارتوں، قدیم بستیوں اور شکستہ آثاروں سے گزارتا ہوا، پروگرام کے آخری مرحلے پر پاگل خانے کے سامنے رک گیا۔ حسبِ معمول اس عمارت کا ہلکا سا تعارف اور تاریخی پس منظر بتانے کے بعد مندوبین کو اندر چلنے کی دعوت دی انسانوں کے اس عجائب گھر میں تاریخ کے ماہرین فاتح شہنشاہوں کی طرح داخل ہوئے مگر جلد ہی خود فراموشی کے پرسکون سمندر میں غوطہ زن انسانوں کے اجاڑ اور بے تحریر چہرے دیکھ کر یہ سب لوگ فاتح حکمرانوں کے سنگھاسن سے اتر کر مفتوح اجسام کے بے ہیچ کھنڈرات میں اُتر آئے۔

پروفیسر ان سب سے ذرا آگے چل رہا تھا... یکایک اس کے قدم سلاخوں کے پیچھے ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے ننگ دھڑنگ شخص کے مطمئن چہرے کو بے طرح ہنستا اور مسلسل بولتا ہوا دیکھ کر ساکت ہو گئے — ناظم کی آواز مسلسل بولنے سے بیٹھ گئی تھی۔ پاگل خانے کے ڈاکٹر نے تاریخ کے جھروکوں میں جھانکنے والے ان معتبر لوگوں کو بتایا کہ اس نوجوان کا یہی ایک مشغلہ ہے... وہ بولتا رہتا ہے، یہی رٹے رٹائے جملے تاوقتیکہ اسے انجکشن لگا کر سلا نہ دیا جائے یہ کہہ کر ڈاکٹر نوجوان کو خاموش کرنے کے لئے سرنج لئے آگے بڑھنے لگا تو پروفیسر نے اُسے روک دیا... وہ شاید ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اُسے سننا چاہتا تھا۔ ناظم بے تکان بول رہا تھا۔

"پروفیسر! پروفیسر! پتہ نہیں تم کہاں ہو.... آؤ اندر دیکھو میں نے وقت پر قابو پا لیا ہے، اب یہ میرے حکم سے چلتا ہے اور میرے حکم سے ٹھہرتا ہے — میں اب سکندرِ اعظم بن گیا ہوں، اکبرِ اعظم، کیکاؤس اعظم... پروفیسر... دیکھ لو میں ہوں طاقتور انسان، وہ عظیم انسان، وقت جس کے قدموں کی گرد اور حالات جس کے پاؤں کی دھول بن گئے ہیں.... پروفیسر! آؤ تم بھی یہیں آجاؤ بڑی عافیت ہے یہاں ...."

آصف اسلم

نیند

دن بھر کی کلفت رگوں میں گھلنے لگی اعصاب سارے دن کے تناؤ کے بعد ڈھیلے پڑ گئے۔ انگڑائیوں کے ساتھ سُستی چڑھنا شروع ہوئی نرم ہڈیاں تک کڑکڑا اٹھیں۔ سارے بدن میں ہلکی ہلکی سنسناہٹ پھیل گئی جیسے کان میں سے تیر نکل جانے کے بعد خفیف سی لرزش اور جھنجھناہٹ اٹھتی ہے۔ پور پور پانی ہو جانے کو تھی۔ لگتا تھا کہ بدن کے سارے ریشے اور ہڈیوں کا گودا تک دریا کے کنارے کی چٹانوں کی طرح، جو ہوا اور پانی کے کٹاؤ سے رفتہ رفتہ ٹوٹ جاتی ہیں، خون میں گھل کر بہہ جائیں گے۔ نیند آنکھوں میں یوں اتری جیسے خشک بالو اور بجری کے ڈھیر میں پانی کی بوند۔

"رات ڈھل چلی، سو جانا چاہیے۔"

بستر شفاف اور بے شکن پڑا تھا۔ کوری سفید چادر اپنی طرف بلا رہی تھی کہ اپنے تھکے ماندے جسم میرے حوالے کر دو، ساری تھکنیں سلوٹوں کی طرح دور ہو جائیں گی۔ نائٹ سوٹ کا پائینچہ پکڑ کر اپنی ٹانگ کھجلاتا ہوا وہ بستر میں اترا، اور اپنی آمد سے پڑنے والی سلوٹوں کو دیکھنے لگا۔ چاند جب تالاب میں اترتا ہے تب بھی ایسی ہی سلوٹیں پڑتی ہیں۔ تالاب میں پانی کی چادر اسی طرح لہراتی ہے۔ اس نے سوچا۔ بستر سے پیٹھ لگی تو محسوس ہوا کہ کسی بھاری مقناطیسی قوت نے اندر کی طرف کھینچ لیا ہو۔ خود بخود پیٹھ میں کبُو سا نکل آیا اور گھٹنے پیٹ کی طرف مڑ گئے اور پپوٹے مضبوطی سے بند ہو گئے۔ ادھر آنکھ بند ہوئی ادھر اوٹ پٹانگ ہیولے دھاچوکڑی مچانے لگے۔ ایک کے بعد ایک، نامحسوس خیالات، بالکل بیکار اور مبہم تصورات ایک کے پیچھے ایک بھاگنے لگے ان کی اٹھا پٹخ سے دماغ کا حلیہ اس کمرے جیسا ہو گیا جہاں سے بدتمیز بچے ادھم مچا کر گئے ہوں .... جاہل .... مچھر .... کمبل .... کمال پر پٹنے والے ٹرخ ٹرخ دو دوڑے .... صبح جلدی اٹھنا ہے .... وقت قیمتی ہے .... بینک سے پیسے نکلوانے ہیں .... کب جاؤں .... قیمے میں مرچیں زیادہ تھیں .... رابعہ سے فون .... کیوں نہیں کیا .... گھنٹی .... روپے اُسے پانی ... میلے پاجامے .... چہرے .... سونا .... کرکٹ .... بلا .... لمبا بلا اور گول گیند .... بال۔ .... دفعتاً ایک گھنٹی سی بجنے لگی جیسے آگے سارے ہیولے بھاگ گئے۔ مستقل بجنے والی گھنٹی کی طرح بار بار خیال آتا کہ رات کو ٹھنڈ ہوگی، پیروں پر کچھ ڈال لوں۔ بہت آلکسی کے بعد وہ نیند میں مست اٹھا اور پیروں پر ہلکی رضائی ڈال لی۔ پھر اسی لذت کے ساتھ اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑا اور بستر کے سپرد کر دیا۔ پھر ہیولے لپکنے لگے۔ کسی کو کیا خبر کہ غنودگی سے بند آنکھوں کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ سوتے جاگتے ادھورے، ادھ کچرے خیال پھر کھد بد کرنے لگے۔ جیسے اسکول کے بچے استاد کے باہر چلے جانے پر شور مچانے لگتے ہیں دریا بہتے بہتے ایک چٹان کے آگے رک گیا، گاڑی دھچکے کے ساتھ رک گئی اور خیالات یوں خاموش ہو گئے جیسے استاد کے واپس آجانے کے بعد بچے ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتے ہیں۔ چار دانگ میں یہ خیال گھوم گیا کہ اصل میں یہ تکیہ بہت سخت ہے، دوسرے تکیے پر زیادہ اچھی نیند آئے گی۔ آنکھیں پٹ سے کھل گئیں جیسے سوئچ دبانے پر روشنی۔ دوسرا تکیہ لایا گیا۔ سر اس پر رکھا اور پھر وہی بھاگم دوڑی ہونے لگی۔ وہی طوفانِ بدتمیزی جو نیم بیداری کی

خاموشی وقت کی آواز ہے، وقت کی راگنی ہے میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ اُف خدایا۔ نیند کا ایک ریلا آیا اور اسے بہا کر لے گیا۔

سو جانے پر بھی اسے چین نہ آیا۔ دن بھر جو سائے اور عکس اس کے دماغ میں جمع ہوتے رہے وہ اب ہلچل مچا رہے تھے۔ اس کا دل بدستور دھڑک رہا تھا اور دماغ سو یا نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ دماغ کبھی نہیں سوتا۔ چوبیس گھنٹے چوکنا رہتا ہے بلکہ جب آدمی کے قویٰ سو جاتے ہیں تو دماغ کا ایک حصہ اس وقت جاگتا رہتا ہے، کام کرتا رہتا ہے۔ جس طرح چوکی باور کے سامنے سامان رکھا جاتا ہے اور وہ اس کو پرکھتا ہے اسی طرح تاثرات کا تانتا بندھا رہتا ہے اور سارا سلسلہ دماغ کے سامنے سے گزرتا ہے جو ان کو پرکھتا ہے، معنی بخشتا ہے۔

جب وہ سو گیا تو اس کا ذہن جاگ رہا تھا۔ کوئی چیز کھٹ سے بولی، کچھ کھلا، کچھ بیدار ہوا، کچھ شروع ہوا۔ عجیب و غریب خواب شاخوں سے ٹپکنا شروع ہوئے۔ ادھورے خواب اسے مبہم راستوں پر ساتھ لے کر چل نکلے، گھنے تاریک جنگل جن میں درخت اور بیلیں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ روشنی نہیں آتی، اور وہ اپنی مرضی کے برخلاف ان خوابوں کے ساتھ [illegible] اور نادانستہ ان کا ناظر بنا رہا۔ پہلے ایک دم دار تارہ نظر آیا، پھر کسی نے تھالی گھمائی تھالی تیزی سے گھومتی ہوئی آئی، کبھی اس کا پیندا آگے ہو جاتا اور کبھی سامنے کا حصہ جیسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک سرا کہاں ختم ہوا اور دوسرا کہاں شروع ہوا۔ دیکھنے والے کو تانبے کی چمک کے سوا کچھ نظر نہ آتا کہ ابتدا کہاں ہے اور انتہا کہاں۔ تھالی لمحہ بھر کو ٹھٹکی اور اس کے اندر ایک شبیہ تشکیل پانے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کے نقوش ابھرے اور وہ اٹھ کر تھالی کے باہر آئی، ہاتھ اٹھائے اور ناچنے لگی۔ خواب میں وہ دیر تک تھرکتے بھاؤ دیکھتا رہا.... واہ دیوی جی.... میں تو چھ لون میں کیا ری.... ملکہ لیڈی ڈانس۔ کبھی ہاتھ اٹھتے ہوئے نظر آتے اور کبھی پیر تھرکتے ہوئے۔ ناچنے والی جوں جوں تھالی کو دیکھتی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی جاتی۔ وہ رکی اور تھالی کو اٹھا کر اس میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ اس نے جیسے ہی تھالی پر نظر ڈالی، تھالی اس کے ہاتھ سے اڑ چلی اور دھماکے کے ساتھ دور جا گری۔ دیر تک دھواں اٹھتا رہا، دھوئیں کے مرغولے پھیلنے لگے۔ ان میں عجیب و غریب وضع قطع کی شکلیں اور انوکھے رنگ نظر آنے لگے۔ کوئی سرمئی بادل سا پھیلنے لگا اور پھیل کر مور کی دم بن گیا پھر ایک لال بادل اس پر چھا گیا کہیں سے چرچے سی بنی ہوئی معلوم ہوتی اور کہیں آنتا رکھا ہوا معلوم ہوتا۔ دھواں جس تیزی سے پھیلا۔ اسی تیزی سے غائب ہو گیا۔ دھواں چھٹا تو منظر تیزی سے بدلنے لگے۔ دھوئیں کا مرغولہ جاتے جاتے گھومنے اور چکر کھانے لگا جیسے سپیرے کی بین کے آگے ناگ جھومنے لگتے ہیں۔ اچانک روشنی ہوئی اور دھوئیں کا وہ بادل، جس کے پیر [illegible] جھومنے لگے تھے۔ غائب ہو گیا روشنی میں تصویر پر تصویر ابھرنے لگی پہلی تصویر میں دریا پہاڑوں کے دامن سے بل کھاتا اتر رہا تھا اور اس طرح پتھروں کی چٹانوں پر راستہ ٹٹول رہا تھا جیسے بوڑھے لوگ چیزوں کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے چلتے ہیں۔ تصویر میں اتنا سکوت تھا کہ اس کی تنہائی اور وحشت خواب میں بے خبر سونے والے کے دل میں اتر گئی اور وہ کسمسا کر کروٹ بدلنے لگا۔ کروٹ کے ساتھ سکوت ٹوٹا اور تصویر بدل گئی۔ اس منظر میں شور ہی شور تھا۔ انسان نما بندر اور بندر نما انسان ہر طرف اچھلتے پھر رہے تھے۔ ان کے شور سے گھبرا کر چڑیوں کا ایک غول آسمان کی طرف بلند ہوا اور ان چڑیوں کے پروں کے ساتھ روشنی کی چادریں اڑنے لگی۔ چڑیاں جیسے ہی غائب ہوئیں ہر طرف اندھیرا چھا گیا سرخ و سیاہ رنگ کے دھبے آپس میں برسرپیکار ہر طرف رینگنے لگے۔ اندھیرا ہر طرف حاوی ہونے لگا، ہر چیز کو اپنے اندر سمیٹنے لگا۔ سونے والے کو سینے پر بوجھ سا محسوس ہونے لگا، وہ ہڑبڑا کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھ کھول کر ادھر ادھر دیکھا، کمرے کا مانوس ماحول اور لالٹین کی روشنی نے اسے اطمینان دلا دیا تو اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی دیواریں، کمرے کی میز، کرسی، دیوار پر لگی اس کے بیوی بچوں کی تصویر ہوا تا ہو ہوا تاکہ و

پھر غائب ہونے لگا۔ جیسے کے جسم کو اسے
پھر اڑا لے گئے اسے محسوس ہوا کہ وہ ہلکا پھلکا
ہو کر غبارے کی طرح اوپر اٹھ رہا ہے اور
اس کے اندر خون کی جگہ گیس بھر گئی ہے ہوا
کے تموج سے گدگدی ہونے لگی اور وہ ہنس
پڑا۔ لیکن اس کی ہنسی سارے ماحول کے سکوت
کو درہم برہم کر گئی۔ اس کا سر بھاری لگنے
لگا۔ اپنی بے موقع ہنسی کے بے تکے پن پر وہ
شرمندہ ہو کر خود ہی خاموش ہو گیا، چٹانیں
بادل، سورج اور دریا سبھی خاموش تھے۔
سکوت آسمان سے برس رہا تھا۔ لمحہ لمحہ بڑھتا
چلا جا رہا تھا۔ ہوتے ہوتے سکوت اتنا
بڑھا جیسے نم بادلوں نے ہر چیز کو ڈھک لیا
ہو۔ اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ گھبرا کر چیخا مگر
اس کی چیخ بادلوں میں کھو گئی۔ اس کے پھیپھڑے
ہوا کے دباؤ سے پھٹنے لگے، دل ڈوب چلا، معدہ
بھاری پتھر ہونے لگا، سینے کے اعصاب پیٹ
کو دبانے لگے۔ پیٹ دب گیا، چیخ حلق میں
اٹکنے لگی۔ آنتیں سانپ کی طرح بل کھانے لگیں
اس کی آواز کے اثر سے بادلوں میں سرسراہٹ
ہونے لگی، چپکیلی آنکھیں اسے گھورنے لگیں
ان جانی سرگوشیاں اس کی روح میں مچل جانے
لگیں۔ اس کو کچھ ڈھارس بندھی لیکن وہ آنکھیں
رحم دل آنکھیں، پھیلنے لگیں اور بادلوں کی دبیز تہہ
میں روشنی کی لکیر میں چمکنے لگیں۔ اسے یوں محسوس
ہوا کہ جیسے سانس نے بادل اس کی کمر کے نیچے
لگ گئے ہوں اور ان کی تہہ ایسی تھی جیسے وہ نرم
نرم گدیوں پر لیٹا ہوا ہے۔ بادل اسے اٹھائے
گھوم رہے ہیں۔ سونے والے نے دیکھا کہ اس
کا جسم سوتے سوتے جاگا، اٹھا اور بادلوں
میں جا کر [illegible] ہوتے ہوتے ستارے کی
طرح ننھا سا ہو گیا۔ وہ خود یہاں نیچے تاریکی اور
افسردگی میں پڑا تھا اور اس کی زندگی دور آسماں
میں چمک رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر کسی نے اس
ستارے کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا، اور میٹھی آواز
بولی "تو آ گیا؟ تجھے آنا ہی تھا۔ دیکھ لی تو نے
دنیا جہاں بھیجا گیا تجھ کو؟"

اس کے پژمردہ جسم سے آواز نکلی "آپ
کون ہیں؟" اس کے جواب میں خود اس کے ہی آنکھ
ناک ہاتھ اور کان بولنے لگے "تو اس وقت اس
کی بارگاہ میں کھڑا ہے جو موجود ہے جو تھی اور
جو ہو گی۔" "اچھا تو میں یہاں تک پہنچ ہی گیا" اس
کے جسم نے اطمینان کا سانس لیا مگر اس واقفیت
کے بوجھ سے اس کا سر جھکنے لگا، سریلی بانسری
جیسی آواز آئی "ٹھہر، تجھے ابھی اور بھی کچھ دیکھنا
باقی ہے۔" لفظ کے سحر سے پیڑ پودے اگنے
لگے، چٹانیں گھاس اور کائی سے ڈھک گئیں،
چشمے ابلنے لگے۔ کہیں دور سے بھیڑوں کا گلہ
گھاس چرنے آ گیا اور کمسن چرواہا جس کے
پیر حیرت انگیز طور پر بکری کے کھروں سے مشابہ
تھے، بانسری بجانے لگا۔ وہ اس وادی میں اترا
تو چند چھوٹے چھوٹے بچے اس سے کھیلنے
کے لئے آ گئے۔ وہ سب اپنے قد سے اونچے
سورج مکھی کے پھولوں کے درمیان تتلیوں
کے پیچھے بھاگنے لگے۔ دیر تک وہ گھاس اور
پھولوں کے تختے میں کھیلتے رہے۔ کسی کو پیاس
لگتی تو سب کے سب ساتھ جاتے اور
ہتھیلیوں میں پانی بھر کے اوک سے پیتے اور
ایک دوسرے کو دیتے کہ لو پانی پی لو۔ وہ کھیل
ہی رہا تھا کہ دور سے اسے اپنے ابو آتے ہوئے
دکھائی دیئے ویسے ہی جیسے وہ پچیس برس
پہلے تھے، وہی طمانیت جھڑتے وقت ان کی
لاش تھی۔ "ابو آ گئے!" وہ دوڑ کر ان کی ٹانگوں
سے لپٹ گیا۔ اس کے ابو اس کی انگلی پکڑ
کر اس کو سیر کرانے لے گئے، جدھر گوالے کا
چھوٹا، کالا سا، ایک گوری لڑکی کے سنگ
کھیل رہا تھا۔ "دیکھو میرے بچے وہ سامنے
پیڑ کے نیچے وہ صاحبہ تمہیں بلا رہی ہیں۔" وہ
وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ یہ وہی مہربان
چہرہ تھا جس نے اس کا ستارہ مٹھی میں کر لیا
تھا وہ اس کے سامنے دو زانو ہو جانا
چاہتا تھا مگر انہوں نے اس کو اوپر اٹھا لیا
بے اختیار اس نے اپنے ہونٹ ان کی طرف
بڑھا دیئے اور ان کی طرف جھکنے لگا۔ یکلخت
الارم گھڑی کی کوک جیسی آواز نے اسے جھنجھوڑ
کر رکھ دیا: "اٹھئے نا، دیر ہو رہی ہے دفتر
نہیں جائیں گے کیا؟ کب سے سو رہے ہیں۔"
اس کی بیوی اسے جگا رہی تھی۔ ہڑبڑا کر اس کی
آنکھ کھل گئی۔ کچی نیند سے اٹھ جانے کی وجہ
سے اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل اور سرخ ہو
رہی تھیں۔ وہ عجیب بھرتہ سا تھا مگر خواب سے

جاگنے کے بعد اسے سب اوقات عرصے کا احساس
ہو رہا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے تھوڑا وقت گزرا ہو
پیالہ ہاتھ کے لگنے کے بعد اس نے ٹھنڈے پانی
منہ لگایا ہوا اور اس کا سارا بدن بشاش ہو گیا
تھا اسے اپنا ذہن کھلا کھلا محسوس ہوا جیسے
دھند چھٹ گئی ہو اور ہر چیز واضح ہو گئی ہو
اس کے جسم میں بے پناہ مسرت کا احساس
دوڑ گیا۔ اس نے مسکرا کر الحمدللہ کہا اور پورے
اعتماد سے دل میں دہرایا "ہاں مجھے اب
سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔ سب معلوم ہو گیا
ہے۔ وہ بستر پر بیٹھا جماہیاں لے رہا تھا۔
جماہیوں کے درمیان اسے خیال آیا کہ اس
وقت دنیا کا سب سے پہلین کے انتظار میں بیٹھا
ہوا اصل تک رہا ہے جو ہمیشہ چھپا رہنے
آنکھیں مندے بیدار رہتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی
دیر بعد بیچ میں کھول کر جماہی لیتا ہے، غیض جب
کرتا ہے، پھر کھاتا ہے اور پھر مراقبے میں غرق
ہو جاتا ہے۔ میں بھی کس قدر کاہل ہوں، اس
نے سوچا اور ہنس پڑا۔ اٹھنے میں اس قدر
آلکسی ہوتی ہے، بستر چھوڑنے کو جی نہیں
چاہتا۔ حاصل سب کچھ اپنے پلے میں بھر
لیتا ہے اور ایک آدمی کی روح میں بہت سمائی
ہوتی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اب تو اس دنیا
اس کائنات میں جو کچھ ہوا ہے اور اس کے
جو کچھ موجودات میں وہ تمام کے تمام ایک ہی
آدمی کے اندر واقع ہیں مگر اب دیر ہو گئی ہے
اٹھ جاؤ، اس دن کا کیا بھروسہ، نیند میں تو سب
کچھ حاصل ہو جاتا ہے، جاگنے میں کچھ نہ
ملے وہ، الا اللہ کہہ کر ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔

انور سجاد

امیر احمد پرویز

پاکستان واپس آئے اسے ایک دہائی سے
زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔
اس کا کوئی گھر نہیں۔
کراچی میں فیضان پیرزادہ کے گھر اور لاہور میں
ریاض قادر کے ہاں تصویریں بناتا ہے۔
ہوش، مدہوشی، صحت، بیماری، حالت چاہے
کوئی بھی ہو۔ مصوری کا وقت باقاعدگی کے ساتھ فجر
سے گیارہ بجے قبل از دوپہر، بلاناغہ۔ گیارہ بجے کے
بعد بھڑکتی، بے چین روح اور جسم میں جلتی آگ
کو بجھانے کے لئے مناسب پانی کی تلاش۔
پانی کی تلاش بے سود۔
آگ، اس کا دھواں، راکھ، کسی بھی شے کی جستجو
جو آگ بجھا دے، سامان ملتا تو ہے پر چوربازاری
سب نے مل کر اسے ہی بجھا دیا، مار دیا، ہم
سب ہی نے مل کر۔
آہ، مینڈریکس۔
احمد پرویز کے فن میں مشرقی جہت مسلمان
ہونے کے ناطے سے قدرتی طور پر در آتی ہے۔ وہ
مسلمان ہے اور بیشتر مسلم مصوروں کی طرح اس کے
فن میں ایجاد کا عنصر نسبتاً کم ہے۔ لیکن مسلم مصوری
ہی کی طرح اس کے فن کا پرت در پرت کھلنا ہی
اس کی عظمت اور شان و شوکت کی گواہی ہے ایک
کے بعد دوسرا اصل، بلاشکل وہ رنگوں میں بھڑکتی
آگ سے جواہرات پر جواہرات تراشتا چلا جاتا
ہے۔ مانچسٹر گارڈین۔
احمد پرویز:- میری کوئی بھی آبی تصویر مغل منیئچر
ہوسکتی ہے، اس میں تمام جزئیات موجود ہیں۔
دن ہو یا رات، نیند اچاٹ ہے تو باغ میں
گھاس کا بستر۔
رات، کلفٹن کا ساحل، باغ
نیند کے اندھیرے میں فالج اُسے آن لیتا ہے۔
فالج دلچسپ مرض ہے۔ بائیں گرے تو قوت گویائی
بھی سلب۔ دائیں سے زیادہ مہلک کہ اس میں
زندگی کے اہم مراکز شدت سے متأثر ہوتے
ہیں۔ مسلسل نیند، گہری بے ہوشی اور گہری۔
لاہور کے دوست اس کے علاج کے لیے بلاواسطہ
چندہ جمع کرنے کے بجائے اپنی ایک ایک تصویر اس کے
صدقے بیچنا چاہتے ہیں۔
گہری بے ہوشی اور گہری موت
کراچی کے دوستوں کو لاہور سے لنک کی ضرورت
ہی نہیں پڑتی۔
اور قومی، صوبائی، مقامی آرٹس کونسلیں اسکوت
دوستوں، مداحوں کے قدموں کی چاپ۔
علی امام، کمال احمد رضوی۔
کندھا دینے والے اور بھی بہت ہیں لیکن ان
سب سے جھگڑنے، پیار کرنے والا، مارکیٹنگ کرکے
چوم لینے والا آگے آگے چارپائی پر ساکت ہے۔
اس سکوت سے دو ایک ہفتے پہلے وہ کراچی سے
لاہور آتا ہے۔ کسی نے پی آئی اے سے فون کیا ہے
بیرون ملک جانے کے لئے اس کا ٹکٹ لاہور میں
ہے۔ معین نجمی کی سمجھ میں یہ تک نہیں آتی۔ کراچی ہی
سے جا سکتا تھا وہ۔ نہیں۔ لاہور سے اسلام آباد
اور وہاں سے— نہیں— معمہ حل نہیں ہوتا۔ وہ
حنیف رامے (کالعدم مصور) کو فون کرتا ہے۔ معین
کو بتاتا ہے کہ حنیف نے اسے بلایا ہے۔ کراچی واپسی
کا بندوبست ہو جائے گا۔ اب معین یا تو اسے حنیف
کے گھر تک اپنی کار میں لفٹ دے یا بیس روپے۔
معین بیس روپے دینے کو ترجیح دیتا ہے کہ اگر وہ
اسے حنیف رامے کے ہاں لے بھی گیا تو اسے بیس روپے
دینے ہی پڑیں گے۔ اور پھر اسے بچوں کو سکول سے لانا بھی
ہے۔ احمد پرویز بیس روپے لیتا ہے۔ رات میں
باغ میں سویا ہے وہ بتاتا ہے۔ ریاض قادر پہلے ہی
مر چکا ہے، یار، ہاتھ پاؤں سُن ہو جاتے ہیں، فالج

خارج از امکان نہیں ؟

جمیمہ اشرف ۔ لیکن وہ مشرقی تعلیم کو اپنے سے چپٹا نہیں لیتا۔ تیل میں رچی دولت مند عرب دنیا میں جاکر مادی فوائد حاصل کرنے کے بجائے وہ ہمیشہ احمد پرویز ہی رہے گا، جو اپنے آپ کے ساتھ دیانتدار ہے۔

معین نجمی مجھے فون پر بتاتا ہے کہ احمد پرویز کل مر گیا ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں۔ ریڈیو ٹی وی پر کوئی خبر نہیں؟ معین مجھے اخبار دوبارہ دیکھنے کا مشورہ دیتا ہے ۔ مصور کی عظمت کے عین برعکس تناسب سے چھوٹی سی اطلاع جو پہلے میری نظر میں نہیں آئی تھی، پچیس برس میں دنیا جہان میں پچاس نمائشیں کرکے مصوری کی دنیا میں تہلکا مچا دینے والے کے لئے پچیس الفاظ کی بھی خبر نہیں۔

مجھے افسوس نہیں ہوتا۔ ہم سب مفلوج ہیں اب ہم شاید موت کے منتظر ہیں کہ فالج دائیں بائیں دونوں طرف ہو جائے تو آکسیجن زندگی موت سے بھی بدتر ہے، مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ میں بے حس ہو چکا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ بے حسی بھی چھوت کی بیماری ہے، جو بے حس کے MILIEU میں رہے گا اسے یہ مرض جلد یا بدیر آن ہی لیتا ہے

۱۹۸۸ء حکومتی سطح پر اس کے فن کی عظمت کا اقرار، صدارتی ایوارڈ کی صورت۔ جس کیلئے وہ دس برس سے بیقرار تھا کہ اس کا حقدار تھا۔ دنیا تو خیر اعتراف کرتی ہی ہے لیکن اپنے وطن سے حکومت سے اپنے فن کا اعتراف کرانے میں شاید اور ہی لذت ہے۔ دس سال بعد بہت دیر میں آیا۔

صاف و شفاف، نہایا دھویا، اجلا اجلا نکھرا نکھرا، سر کا گنجا پن چھپانے کے لئے ریاض قادر سٹائل میں سر کے پچھلے بال آگے کو لاکر چندیا پر جمائے ہوئے، فقرے بازی، جھگڑے، جذبات کی شدت عروج پر۔

فلیٹ سے لیا گیا ہے۔ زبردست قیمتی آرائش صدارتی ایوارڈ دس ہزار روپے + نمائش کی تصاویر سے سترہ ہزار روپے ۔ ستائیس ہزار روپے لیکن کب تک؟ رفتہ رفتہ فلیٹ کی چیزیں بکتی ہیں پھر فلیٹ چھٹ جاتا ہے۔ کسی دوست کے ہاں ایک کمرہ سٹوڈیو، گھاس کا بستر۔

مصوری کا عشق؟ نہیں؟ ساغر صدیقی؟ نہیں؟ ریاض قادر؟ نہیں؟ سب اس سے پہلے مر کے مرخرو ہوئے۔ مصوروں کو ادیبوں شاعروں، موسیقاروں وغیرہ پر ایک سبقت ہوتی ہے۔ سنا ہے، چھوٹے سے چھوٹا مصور بھی بہت بڑا سناب ہوتا ہے اچھا، تو پھر کم از کم ڈاکٹر سلیم واحد سلیم، پرسی کیورشن مینیا کے حوالے سے۔ ہر اجنبی، آشنا سا، دشمن سی آئی ڈی والا۔ مال روڈ پر کسی دکان پر "بنام راجہ صاحب" کے اشتہار لکھے ہیں، احمد پرویز یہاں نیر حسین نجمی سے کہتا ہے کہ یہ یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ معین ہنستا ہے۔ پوچھتا ہے احمد پرویز بتاتا ہے۔ دیواروں پر جگہ جگہ راجہ صاحب لکھا ہے۔ راولپنڈی میں لوگ اسے راجہ صاحب کہتے ہیں۔

اس کی سوچ، اس کی زندگی میں دیوانگی کا عنصر غالباً خود پر طاری کیا ہوا نہیں۔ قدرتی، نابغوں کی دیوانگی۔ خاندان میں نابغوں کی کمی نہیں۔ تاز بہنی انگریزی کی بہترین شاعر۔

پہلی بیوی ۔ تین بچے۔

دوسری بیوی جاپانی ۔ ایک بچہ

تیسری بیوی ۔ تب فوج میں کرنل تھیں، جنہوں نے شادی کے ماہ ڈیڑھ ماہ بعد ہی اپنے گھر کے دروازے پر احمد پرویز کے لئے "آؤٹ آف باؤنڈز" کی تختی آویزاں کر دی۔

لمبا قد، جسم کی مسافت جیسے فاقہ زدگی کا متوقع چھوٹی چھوٹی زیرک آنکھیں، ناک اور اوپر کے ہونٹ کے عین وسط میں سیاہ مسّا جس میں دو تین بال۔ شرارتی، پُر اسرار، بہت خوبصورت ریاض قادرانہ مسکراہٹ۔

غصیلا، تشدد پسند، جھگڑالو، بہت پُر خلوص، بہت پیار کرنے والا۔ پاکستان کا واحد بوہیمین، دیوجانس۔ بے چین روح۔ بیکراں انرجی۔ وہ اپنا دل، اپنی روح، اپنی تمام متحرک ناچتی انرجی تصویروں میں منتقل کر دیتا ہے۔

اپنی آرٹ گیلری کے بشیر مرزا، احمد پرویز کی تصاویر کی نمائش کے لئے اگر سات سو دعوت نامے بھیجتا ہوں تو لوگ اس سے زیادہ تعداد میں آتے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں احمد پرویز کی تصاویر کی نمائش کرتا ہوں۔ وہ اپنے فن کے ساتھ مخلص اور دیانتدار ہے۔ وہ یکدم خیالی میں خود غرض نہیں ہو سکتا یعنی اس لئے کہ اس میں کاؤ بہت ہے؟

پاکستانی آرٹ مارکیٹ اس کی تصاویر سے سیچوریٹ ہو چکی ہے۔ وجہ؟ اس کی تصاویر کی قیمت یکساں ہے۔ پانچ سو روپے۔ اگر رقم کی ضرورت

ہے تو پچاس روپے میں بھی تصویر فروخت کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے اسے اپنی تصویروں کی بلیک کرنی چاہئیے۔ وہ کہتا ہے "بیرونی ممالک میں میری تصاویر کی قیمت بہت پڑتی ہے۔ شاید مجھے یہاں بھی قیمت بڑھا دینی چاہیئے"

مقامی نقادوں، بعض ہمعصروں، کئی نئے مصوّروں کے نزدیک احمد پرویز کا فن باسی ہو گیا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"تبدیلی؟ کوئی تبدیلی نہیں میرے ہاں صرف ارتقاء ہے۔ نشوونما ہے، پختگی میں یقین رکھتا ہوں۔ جانے لوگ ہمیشہ کیوں تبدیلی چاہتے ہیں۔ لوگوں کو مصوّر سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے اسلوب ہی کو بدل دے۔ اپنے مخصوص محسوسات، لکیروں کی حسیات رنگ، فارم، محض اس لئے تبدیل ہونے چاہئیں کہ لوگ تبدیلی چاہتے ہیں! نہیں، کبھی نہیں۔ لوگ سیزان سے بور ہو گئے تھے۔ آج دنیا میں کتنے ہیں جو ایک بھی سیزان خرید سکتے ہیں؟"

دنیا جہان کے نقادوں نے اس کے رنگوں کے استعمال کو، ڈیزائن کو، حساس لکیروں کو بیان کیا ہے کبھی وجدان کی سطح پر ادراک، شاعری، مابعد الطبیعات جواہرات سے نکلتی شعاعیں، پھٹے ہوئے نازک پھول، تازہ حنظل۔ پل پل کی روح، کلی ہی کی طرح انتہائی منفرد ذاتی اسلوب اس کی فارم محض تجرد ہے یا تخفیف نہیں بلکہ نئے انداز سے ترتیب پاتی ہیں۔ پیسٹل یعنی چاک اور آبی رنگوں پر اسے پوری قدرت حاصل ہے، لیکن تیل کا میڈیم پوری طرح اس کے قابو میں نہ تھا اس کا ہاتھ استادانہ، دماغ شاعرانہ، ہر سٹروک ہر ترہ میں تھرتھراتا، رقصاں، پھول جھڑیاں، اسے پھول بہت پسند ہیں۔

"میں پھول شوق نہیں بناتا"

"جو لاہور میں رہتا ہے وہ کس طرح یہ برداشت کر سکتا ہے کہ موسم بہار گزر جائے اور وہ باغ جناح میں نہ جائے؟"

احمد پرویز تھکا نہیں، بوڑھا نہیں ہوا مگر شستہ جوش خروش نوجوان غصیلا پھر ادھیڑ عمر غصیلا، بوڑھا غصیلا ہونے کی مہلت نہیں ملی۔ دل، بچے کا پکاسو کی طرح معصومیت، سادگی تحیر۔

پکاسو نوّے برس کی عمر میں بچوں کی طرح پینٹ کرنا چاہتا تھا۔ میں اسی روح سے تصویر بناتا ہوں۔ میں نے خود کو اب دریافت کیا ہے میرا بہترین دور ہے۔"

میں بچہ ہوں
مجھے پھول بہت پسند ہیں
باغ میں گھاس میرا بستر ہے
باغ، کلفٹن کا ساحل، رات
نیند کا اندھیرا، فالج، ابدی
کیا فقیری ہے!

مصوّری میں اب فقیر کی گنجائش نہیں۔ اس منصب پر قیام ہو چکا ہے لیکن امیری؟ اگر کسی کو اعتراض نہ ہو تو احمد پرویز کو امیری کا منصب عطا کر دیں؟ چلئے بعد از مرگ ہی سہی۔ ٹھیک؟

وکر مسگریو، بے شک احمد پرویز پاکستان کا بہترین مصوّر ہے، جس نے انگریز مصوری دنیا پر اپنا گہرا تاثر چھوڑا ہے۔ اپنے فن میں مضمر اسلامی فن کے آئیڈئیلز کو اپنے فن کے ذریعے مغرب سے آشنا کر دینا ایک انتہائی اہم اور یکتا کام ہے۔

امیر احمد پرویز NOW RISE

سلام

پھر اس ادا سے حسینؑ حسیں حجاز آئے
کہ رنگ و نور وہاں کی فضا میں لہرائے

دکھا جو پاؤں زمیں پر برس پڑے جلوے
زمیں نے بھی تو عقیدت کے پھول برسائے

زخموں سے پھوٹ پڑے حسن و نور کے دھارے
شجاعتوں نے عجب ان کی رنگ دکھلائے

پہنچ کے منزلِ مقصد پہ رک گیا غازی
ردائے حضرتِ زینب کے چھا گئے سائے

ہیں ساتھ پھول بھی کلیاں بھی اور غنچے بھی
وہ ان کے چہروں کی ضو جن سے ماہ شرمائے

زمینِ کرب و بلا تجھ کو کیسے چاند لگے
خدا کے عرش کے تارے تری طرف آئے

خدا کا نامہ و پیغام لاتے ہیں جبریل
خدا کے اِن پہ درود و سلام بھی آئے

حسینؑ کونسا دکھ تھا سہا نہ جو تم نے
تمہارے ہاتھوں پہ اصغر نے تیر بھی کھائے

نکالنا پڑی اکبر کے سینے سے برچھی
خدا کی راہ میں ایسے بھی مرحلے آئے

شکن جبیں پہ نہ آئی تمہارے واہ حسینؑ
تمہارے عزم نے کچھ ایسے حوصلے پائے

شہید ایسا نہ گزرا کوئی زمانے میں
خدا بھی جس کی شہادت پہ ناز فرمائے

تمہارے ہونٹوں کے بوسے لئے محمدؐ نے
وہ خشک ہونٹ نہ پانی سے تر ہوتے پائے

غمِ حسینؑ نہاں ہو سکا نہ دل میں نہاںؔ
مثالِ ابر ان آنکھوں نے اشک برسائے

رئیس امروہوی

یہ فقط شورشِ ہوا تو نہیں
کوئی مجھ کو پکارتا تو نہیں

بول اے اخترِ غنودۂ صبح!
کوئی راتوں کو جاگتا تو نہیں

سُن کہ یہ مدّ و جزرِ موجۂ بحر
ماجراؤں کا ماجرا تو نہیں

ذہن پر ایک کُہرودی سی لکیر
کنکھجورے کا راستا تو نہیں

ریت پر چڑھ رہی ہے ریت کی تہہ
بابل و مصر و نینوا تو نہیں

اے مری جانِ مبتلا کے سکوں
تو کوئی جانِ مبتلا تو نہیں

جمیل ملک

میں تو تنہا تھا مگر تجھ کو بھی تنہا دیکھا
اپنی تصویر کے پیچھے ترا چہرہ دیکھا

جس کی خوشبو سے مہک جاتے شبستانِ وصال
دوستو تم نے کبھی وہ گلِ صحرا دیکھا

اجنبی بن کے ملے، دل میں اتر آ جاتے
شہر میں کوئی بھی تجھ سا نہ شناسا دیکھا

اب تو بس ایک ہی خواہش ہے کہ تجھ کو دیکھیں
ساری دنیا میں پھرے اور مزہ کیا دیکھا

کوئی صورت بھی شناسا نظر آئی نہ ہمیں
گھر سے نکلے تو عجب شہر کا نقشا دیکھا

اس قدر دھوپ تھی سنولا گئے رخشاں چہرے
جلتے سورج کا مگر رنگ بھی پیلا دیکھا

پیڑ کا دکھ تو کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا
اپنی ہی آگ میں جلتا ہوا سایا دیکھا

قلزمِ ذات میں ڈوبے کبھی ابھرے برسوں
خضر دیکھا نہ کوئی ہم نے مسیحا دیکھا

تھے اندھیروں کے تعاقب میں اجالے کیا کیا
خود تماشا تھے جمیلؔ اور تماشا دیکھا

شہزاد احمد

لوٹ آئیں ترے لمس سے مہکی ہوئی شامیں
پھر آگ لگا دی تیری سانسوں نے ہوا میں

رقصاں ہیں اس لیے یہ ستارے ہوں کہ شبنم
کیا سحر ہے اس دل کے دھڑکنے کی صدا میں

اک نور کا سیلاب ہے بند آنکھوں کے اندر
لپٹے ہوئے چہرے ہیں اندھیرے کی ردا میں

کس آگ نے رکھا ہے قدم دل کی زمیں پر
سورج سے دہکتے ہیں نشانِ کفِ پا میں

اس خوف سے اک عمر ہمیں نیند نہ آئی
اک چور چھپا بیٹھا ہے سینے کی گپھا میں

اس دل کو نہیں صحنِ گلستاں کی ضرورت
یہ پھول مہکتا ہے کسی اور ہوا میں

جاگ اٹھا ہے دل میں کوئی سویا ہوا وحشی
ہم گھر میں ہیں شہزادؔ کہ جنگل کی فضا میں

دسمبر ۱۹۶۹ء

عالمتاب تشنہ

میری ایذا طلبی کا یہی خمیازہ ہے
دل کی ہر چوٹ ہری زخم تر و تازہ ہے

عرصۂ جاں میں کہاں تک میں سمیٹوں تجھ کو
زندگی تیرا تو بکھرا ہوا شیرازہ ہے

ڈوب جاؤگے تو پھر پاؤگے ساحل نہ کبھی
مجھ کو ان آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ ہے

گردِ آشوبِ خزاں اور شہر جا کچھ روز
عارضِ گل پہ بہاروں کا ابھی غازہ ہے

میرے لوگوں کو تعجب ہے یقیں سے بڑھ کر
شاخ سے ٹوٹ کے اب تک یہ ثمر تازہ ہے

کٹ گئی عمرِ وفا زیرِ فصیلِ ایام
بند مدت سے ترے شہر کا دروازہ ہے

ہو گیا جس سے مرا حسنِ سماعت پتھر
گنبدِ جاں میں وہ میرا ہی تو آوازہ ہے

تو ہی تھا جو نہیں سکتا وہ ہوا کا جھونکا
تیری آہٹ کا بخوبی مجھے اندازہ ہے

پھول توڑا ہے ابھی دستِ صبا نے تشنہ
شاخِ لالہ پہ ابھی زخم نو تازہ ہے

روشن نگینوی

فراغ کب تھا ہمیں ہجرِ یار سے! پہلے
ہزار غم تھے غمِ روزگار سے پہلے

خزاں کا نام "نویدِ بہار" پڑ جائے:
اگر چمن میں وہ آئے بہار سے پہلے

وہ آ گئے تو مجھے اپنا انتظار رہا!
بجی تھی بزمِ طلب انتظار سے پہلے

مرے شباب، مری آرزو کا حاصل تھے
وہ اضطراب کے لمحے، قرار سے پہلے

ہزار منزلِ وہم و گماں سے گزرا ہوں
کسی کے قول کے بعد، اعتبار سے پہلے

متاعِ لذتِ غم سے کیا مجھے محروم!!
یہ حال دل کا نہ تھا غمگسار سے پہلے

اب اپنے پھول ہیں، اپنا چمن ہے، اپنی بہار
سہے ہیں جبر بہت اختیار سے پہلے

ضمیرِ سنگ میں صدیوں کا کرب ہے۔ روشن
صدائے درد سنی ہے، شرار سے پہلے

ضیاء شبنمی

دئیے سے یوں دیا جلنے نہ دے گی
ہوا اک پھول بھی کھلنے نہ دے گی

یہ برفانی رُتوں کی سرد مہری
شجر کو پھولنے پھلنے نہ دے گی

انا کی سرکشی جب تک ہے خوں میں
تیرے پیچھے مجھے چلنے نہ دے گی

ہوا میں بانجھ خاموشی ہے جب تک
گہر کو سیپ میں پلنے نہ دے گی

شراکت دھوپ اور ٹھنڈی ہوا کی
رتوں کے حسن کو ڈھلنے نہ دے گی

یہ دنیا جس میں ہم تم جی رہے ہیں
ہمیں بے ساختہ ملنے نہ دے گی

مری ماں کی دعا مجھ کو یقیناً
برائی کی طرف چلنے نہ دے گی

انور شعور

ذہن میرا جلا کے رُخ پر ہے
یہ دریچہ ہوا کے رُخ پر ہے

تل محبت کا اک مرے دل میں
اک مرے دل رُبا کے رُخ پر ہے

دیکھ لودھیان سے سَروں کا جلوس
قافلہ یہ، فنا کے رُخ پر ہے

ایک بیگانگی و بے خبری
آشنا آشنا کے رُخ پر ہے

حُسن ہے بھی اگر زمانے میں
ایک اس خوش نُما کے رُخ پر ہے۔

کیوں نہ پھولی سمائے آئینہ
تجھ سے روشن ادا کے رُخ پر ہے

صبح ہوتی ہے یا نہیں ہوتی
منحصر سب صبا کے رُخ پر ہے

ہو چلی ہے اُمید مرنے کی
اب طبیعت شفا کے رُخ پر ہے

باوفاؤں کے خون کی سُرخی
بے وفا بے وفا کے رُخ پر ہے

حسن ہے صرف سادگی میں اور
سادگی بے ریا کے رُخ پر ہے

چشم حیران تمام محفل کی
ایک رنگیں قبا کے رُخ پر ہے

عطر مَل کر چلے شعور کہاں
کیا شمیم، سبا کے رُخ پر ہے

ہمارے ساتھ وجد میں ہما لیا و طور ہیں
چہک رہی ہیں لڑکیاں کہ نغمہ زن طیور ہیں

گھروں میں جھانک لے گلی تو چیخ اُٹھے کہ شکر ہے
مکان جتنے پاس ہیں مکین اتنے دُور ہیں

کثافتیں خباثتیں، ہیں ذہن میں کہ جسم میں؟
تمام ذہن مادہ، تمام جسم نُور ہیں

یہیں کے تم یہیں کے ہم یہ شہر ہے یہ دہر ہے
یہاں نہ تم ہو بے خطا نہ ہم ہی بے قصور ہیں

نظر اُٹھا کے چل مگر کبھی نہ سر اُٹھا کے چل
جو تاج ٹھوکروں میں ہیں بہ لغزش غرور ہیں

بجا ہے، قصرِ زمیں جو بر سرِ زمیں رہے
نہ میں کہیں کا جنتی، نہ آپ کوئی حور ہیں

جہاں سے آرہے ہیں ہم وہاں کا حال کیا کہیں
خبر تو کوئی ہے نہیں، کہانیاں ضرور ہیں

بہک رہے ہیں صبح سے اور اب یہ وقت آگیا
چلو، نہ جانے کون سی گپھا میں گم شعور ہیں

دسمبر ۱۹۷۹ء

اقبال ساجد

ختم راتوں رات اس گلُ کی کہانی ہو گئی
رنگ بوسیدہ ہوئے خوشبو پرانی ہو گئی

جس سے روشن تھا مقدر وہ ستارہ کھو گیا
ظلمتوں کی نذر آخر زندگانی ہو گئی

کل اُجالوں کے نگر میں حادثہ ایسا ہوا
چڑھتے سورج پر دیئے کی حکمرانی ہو گئی

رہ گئی تھی لعل بننے میں کمی اک آنچ کی
آنکھ سے گر کر لہو کی بوند پانی ہو گئی

چلّۂ جاں پر چڑھا کر آخری سانسوں کے تیر
موت کی سرحد میں داخل زندگانی ہو گئی

خوف اب آتا نہیں ہے سیپیاں چنتے ہوئے
دوستی اپنی سمندر سے پرانی ہو گئی

کس جگہ آیا ہے تو آنکھوں کے نیلم بھول کر
گم کہاں اقبال ساجد کی نشانی ہو گئی

درِ قفس جو کھلا، آسمان بھول گئے
رہا ہوئے تو پرندے اُڑان بھول گئے

یہ سانحہ بھی ہوا تو مری زمین پہ ہوا
لہو سے فصل اُگاتا کسان بھول گئے

ہوئی جو شام تو لوگوں سے بھر گئی چوپاں
جلا الاؤ تو ہم داستان بھول گئے

سفر سے لوٹ کے رکھا تھا گھر میں پہلا قدم
ہنسے جو پھول سے بچے تھکان بھول گئے

وہاں بھی جھوٹ نہ بولا جہاں ضرورت تھی
ہمیں پہ حرف، کہ حق کی زبان بھول گئے

شکار گاہ میں ساجد انہیں خیال آیا
وہ گھر سے تیر تو لائے کمان بھول گئے

رحمان خاور

نہ ہو گر درمیاں میں چہرہ کسی کا
بہت مشکل سفر ہے زندگی کا

گلی کوچے بہت روشن ہیں لیکن
گھروں میں مسئلہ ہے روشنی کا

چنوں پلکوں سے کب تک سنگریزے
خداوندا کوئی آنسو خوشی کا!

زمیں صدیوں پرانی ہو چکی ہے
سہے گی بوجھ کب تک آدمی کا

نجانے اور کتنا فاصلہ ہے
ہماری زندگی سے زندگی کا

کوئی خود سے مجھے کم تر سمجھ لے
یہ مطلب بھی نہیں ہے عاجزی کا

فرشتہ تو نہیں میں کوئی خاور
مجھے احساس ہے اپنی کمی کا

سعید احمد اختر

دل بُرا اپنے رقیبوں سے بھی کب کرتے ہیں؟
ہم تو ہر چاہنے والے کا ادب کرتے ہیں

پھر گلہ ان کی جفا کا بھی ہو شاید، ورنہ
گریہ ہم اپنی وفاؤں کے سبب کرتے ہیں

پھول تو چاک گریباں ہیں ترے عارض سے
حال کیا دیکھیں کلی کا ترے لب کرتے ہیں

بات کوئی تو ہے وہ مجھ پہ بگڑتے ہیں بہت
ورنہ محفل میں انہیں پیار تو سب کرتے ہیں

بھول جاتے ہیں وہ اختر ہمیں اکثر ورنہ
یاد کرتے ہیں بڑے پیار سے جب کرتے ہیں

روحی کنجاہی

کسی کا تذکرہ ہے، روشنی کی باتیں ہیں
مری زباں پہ ابھی تک اُسی کی باتیں ہیں

تمہارے شہر کے اہلِ ہنر کا ذکر ہی کیا
کسی کا کام نمایاں، کسی کی باتیں ہیں

ملاحظہ کرو خود اپنی باتیں اور کہو
یہ دوستی کی ہیں یا دشمنی کی باتیں ہیں!

عجیب وقت مرے قاتلوں پہ آیا ہے
لبوں پہ اُن کے مری بہتری کی باتیں ہیں

تمہاری بات بھلا کیسے مان لوں روحی
تمہارے سامنے بس شاعری کی باتیں ہیں!

اسد مفتی

تو جو مانگے، کہاں سے لاؤں میں
دل کو کیوں آئینہ دکھاؤں میں

دائرہ ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں
خود سے نکلوں تو تجھ کو پاؤں میں

خون میرا ہے میرے دامن پر
کون قاتل ہے کیا بتاؤں میں

تجھ کو دیکھوں تو منزلوں سے پرے
تجھ کو سوچوں تو پاس پاؤں میں

تم بھی ہنس دوگے داستاں سن کے
قصۂ درد کیا سناؤں میں

گھر کو مقتل بنا لیا میں نے
اب کہاں تک اسے سجاؤں میں

قائم کیا ہے شاعر کی ذات درد کا صحرا اور جاناں
موج میں آیا ہوا دریا بھی ہے، لیکن اب وہ مفقود
نہیں رہا کہ حسن کی جفا کاریوں اور ظلم و ستم کے باوجود
ایمان و جاں اس پر نثار کئے جائیں۔ اب تو وہ
عہد ہے کہ دونوں ہی اس درد کی کسک کو محسوس
کرتے ہیں۔ شاعر ہی سر بہ گریباں اور آشفتہ مو
نہیں ہے۔ بلکہ محبوب کی آنکھیں بھی نم ہیں۔

اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

انہیں حالات نے اسے کم سخن بنا دیا ہے
جبکہ فراز صرف کہتا ہی نہیں، سننا بھی چاہتا ہے
لیکن انہیں اس کی کم سخنی کا گلہ بھی نہیں ہے کیونکہ

شکوت میں بھی اس کے اک ادائے دلنواز تھی
وہ یار کم سخن کئی حکایتیں سنا گیا

اب محبوب شاعر کو تکلیف میں دیکھ کر
خود بھی رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن شاعر کے
لئے یہ بات بھی باعثِ اذیت ہے کہ اس
وجہ سے کوئی پریشان ہو ؎

کیا دل کا بھروسہ ہے سنبھلے کہ نہ سنبھلے
کیوں خود کو پریشان مرا غمخوار کرے ہے

ان تمام اذیتوں میں سب سے صبر آزما
اذیت یہ ہے کہ جب معاشرے کے رسوم
قیود اور روزگار کے غم دونوں کے درمیان
فاصلے بڑھا دیتے ہیں۔ یہ کدورتیں اور جدائیاں
جہاں محبت بڑھانے میں مدد دیتی ہیں وہیں ان
کی زیادتی اور شدت دل آزاری کا سبب بن جاتی
ہے۔ جدائیوں میں وسوسے اور اندیشے بھی مار
مارے ڈالتے ہیں ؎

یوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے کئی بار جدا
لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا

یہ خوف بے جا نہیں۔ کیونکہ فاصلے اس قدر
بڑھ گئے ہیں کہ ان کا عبور کرنا ممکن نہیں رہا۔
جدائیاں مستقل ہو گئی ہیں اور اس وجہ سے
اتنی زیادہ بے حسی طاری ہو گئی کہ کچھ ہوش باقی
نہیں رہا ؎

تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے
پھر جو بھی در ملا ہے اسی در کے ہو گئے
اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتھر کے ہو گئے

احمد فراز کے ہاں جذبہ و فکر، رومان و
واقعیت، انفرادی و اجتماعی موضوعات نظر
آتے ہیں۔ فراز جہاں "تنہا تنہا"، "خواب مرتے
نہیں"، "خنک ناچ"، "ملبہ" ، "اشتہد کے نام" اور
"کہا نہیں تھا" جیسی نظموں میں زندگی کی حقیقتیں
بیان کرتے ہیں۔ ایسے حقائق کہ جن کا تعلق ہر
فرد سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فراز اپنی
مخصوص قلبی کیفیات اور واردات کا
کا پیکر عطا کرتے ہیں۔ "جاناں جاناں"
"یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں" جیسی
کا انتساب معلوم ہوتا ہے ان کی
اس ذرخ کو بڑی خوبصورتی سے پیش
جس میں محبوب کی مہربانیوں کا تذکرہ بھی ہے
اور اس کی کج ادائیوں کا شکوہ بھی۔ دکھ کے
نوحے اور شکوے کے نغمے سبھی کا بیان
تو بہتر ہے ہی، عید کارڈ، لے میرے
وغیرہ فراز کے دلی معاملات کی آئینہ

حرفِ آخر یہ کہ "جاناں جاناں" ایک
شعری مجموعہ کہ جس میں لب و لہجہ کی فضا
تازگی توانائی اور برتری کا احساس
غمِ جاناں اور گردشِ دوراں کے
اس کتاب کی سب سے مستحسن
آج کے دور میں جبکہ بیشتر شعرا کے
مخصوص شعری زبان کے استعمال
ہیں "جاناں جاناں" میں نرم و شیریں، سلیس
خوشگوار، مدھم و رسیلے الفاظ و تشبیہات
استعمال بڑی خوبی سے کیا گیا ہے، جو عہد
کی تخلیق ہوتے ہوئے بھی اسے قدیم
روایت سے مربوط رکھتا ہے۔

… کو اپ اپنی نظروں میں حقیر کر دیا۔ فراز پر
… کا اثر چھایا ہو کے "سوچا" میں کہتے ہیں۔

… نے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
… اپنی ہی تحقیر ہو گیا ہوں
… ہم تصغیر ہو گیا ہوں
… اکو حا بدن لئے کس طرف کو جاؤں
… کھاؤں

… سن کا جشن مناتے ہو، بھی اسی دکھ کی
… خواب کا تذکرہ ہے جو ریزہ ریزہ ہو کر
… وں میں بکھر گیا ہے۔
… ساقی کے لئے، جانان جاناں کو بھی
… وں میں تقسیم کر دیا ہے، یعنی غمِ دوراں
… ۔ جبکہ فراز کا خیال ہے کہ غمِ دوراں
… یسے جذبے نہیں ہیں کہ جن کی
… جا سکے۔ جب دونوں غم ہی ٹھہرے تو
پھر ان میں تفاوت پیدا کرنا کیا ضروری ہے۔

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے الگ ہے غمِ جاناں جاناں

… یہ تو دونوں یکساں میں فرق صرف اتنا ہے کہ غمِ جاناں
ہے جو ذہن و دل میں ہر وقت کھٹکتا رہتا
… ہوا الجھن و پریشانی کا باعث ہوتی
… تی ہے کہ جلد از جلد اس کانٹے
… اور سکون کا سانس لیا جائے
… دیکھا، مدھم غم ہے جس کی
… ہے۔ لیکن اس سے نجات
… ہو جاتا۔ بلکہ اس درد

کی شدت کی خواہش کی جاتی ہے۔ اس اذیت
میں ہی تمام آسائشوں کا الم ہے اس کو نازپسندی
SADISM میں ہی لطف ہے

اب کے وہ درد دے کہ میں روؤں تمام عمر
اب کے لگا وہ زخم کہ جینا محال ہو

ایسے زخموں کی خواہش جو زندہ تو رکھیں لیکن
جینا محال کر دیں، بظاہر تو بڑی ہی اذیت ناک
صورت ہے لیکن فراز ایسی زندگی میں رہتے ہوئے
خوشبوؤں سے لطف بھی اٹھاتے ہیں اور خواب بھی
دیکھتے ہیں۔ ان خوابوں کا تعلق DAY DREAMING
سے بھی ہو سکتا ہے اور UNCONSCIOUS
خوابوں سے بھی۔ کیونکہ شعوری و غیر شعوری طور پر
آنکھیں وہی خواب دیکھتی ہیں جو دل میں بسا ہو

تجھ کو کہاں چھپائیں کہ دل پر گرفت ہو
آنکھوں کو کیا کریں کہ وہی خواب دیکھنا

آنکھوں کا تو کام خواب دیکھنا ٹھہرا۔ انسان
خواب میں کتنی ہی حاصل تمناؤں کو پورا کر لیتا ہے
لیکن جب آنکھ کھلتی ہے خواب کی تعبیر سامنے
آتی ہے تو اسے سخت اذیت سے گزرنا پڑتا
ہے ـــ

ہر خواب عذاب ہو چکا ہے
اور تو بھی تو خواب ہو چکا ہے

اب دیکھ یہ حسرت بھری اجڑی ہوئی آنکھیں
دنیا ترے بارے میں میرے خواب بنتے

تعبیر کتنی ہی بھیانک کیوں نہ ہو، خواب تو
ہر دلکش ہوتے ہیں۔ اتنے خوبصورت کہ خوابوں

میں، خوشبوؤں میں اور جاناں میں کوئی فرق ہی باقی
نہیں رہ جاتا۔

یہ خواب ہے خوشبو ہے کہ جھونکا ہے کہ پل ہے
یہ دھند ہے بادل ہے کہ سایہ ہے کہ تم ہو

"جاناں جاناں" کے مختلف شعروں کے
ذریعے ہم جاناں کے پیکر اس کی شکل و صورت اس
کے عادات و اطوار سے بخوبی شناسا ہو جاتے ہیں
فراز خود بھی اس کا تعارف کرواتے تو ہیں لیکن پردے
کی اوٹ سے۔

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

اس دلربا سے شخص کی تصویر شعروں میں
کچھ واضح کچھ پوشیدہ سی نظر آتی ہے

ابرو کچھ کھچے کھچے، آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رکی رکی سی لہجہ تھکا تھکا سا
تیور تھے بے رخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا

اس اجنبی آشنا کی شخصیت اس قدر اثر پذیر
ہے کہ ہر شے میں اسی کا وجود جھلکتا دکھائی دیتا ہے

جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
اے جان جہاں یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو

شاعر میں اور جاناں میں ایک واضح فرق
یہ ہے کہ

اک درد کا پھیلا ہوا صحرا ہے کہ میں ہوں
اک موج میں آیا ہوا دریا ہے کہ تم ہو

یہ بات قابلِ غور ہے کہ عہدِ حاضر کی حقیقت پسندی
نے محبت اور حسن کے بارے میں بھی نیا تصور

جاناں جاناں[1]

جاناں جاناں، غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ اس مرقع میں دو رنگ نمایاں ہیں جو ایک ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

احمد فراز اپنے عہد کے حالات کی عکاسی کرنا چاہتے ہیں اس عہد کی کہ جس میں طبقاتی تقسیم، معاشی ناہمواری سماجی تفاوت، اخلاقی پستی، سیاسی اُتار چڑھاؤ اسی قسم کی سینکڑوں دل آزار کیفیات پائی جاتی ہیں ستم تو یہ ہے کہ ان کا حل بھی کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ خاموشی مسائل کا حل نہیں ہوا کرتی، جبکہ ایسے میں یہی ہو سکتا ہے کہ انسان آنکھیں بند کر لے ذہن کو سلا دے، خود پر ایک بے حسی کی کیفیت طاری کر لے اور سب کچھ حالات کے دھارے پر چھوڑ کر زندگی کے بہتے دریا میں ایک روز خود بھی ڈوب جائے۔ لیکن انسان کا ضمیر اسے گوارا نہیں کرتا کیونکہ خاموش اور بے حس رہ کر تو انسان ظلم و ستم میں خود بھی برابر کا شریک ہو جاتا ہے احمد فراز میں یہ احساس جاگتا ہے کہ وہ معاشرے میں ایک فعال شخص کی مانند زندہ ہے، وہ فعال شخص کہ جو محسوس کرتا ہے اور احساس کو بیان کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ احساس کہ لب دو دہن کے ہوتے ہوئے بھی

دل پر گزرنے والے صدمے کہہ نہیں سکتے، اس لئے وہ اپنے مجرم ہیں۔ اپنے ساتھیوں کے مجرم ہیں ظاہر ہے کسی شخص کیلئے اس سے زیادہ اذیت ناک صورتِ حال اور نہیں ہوگی کہ جو کچھ وہ کہنا چاہے، کہہ نہ سکے۔

لب و دہن بھی ملا، گفتگو کا فن بھی ملا
مگر جو دل پہ گزرتی ہے، کہہ سکوں بھی نہیں

جاناں جاناں کی غزلوں نظموں سے ان کی جرأتِ اظہار ہویدا ہے۔ اس عہد کے انسان کی محرومی، یاسیت اور حرماں نصیبی اب زندگی کا روشن پہلو دیکھنا چاہتی ہیں، جو بغیر کسی انقلاب کے ممکن نہیں۔ یہ صورتِ حال جرأتِ فکر کی متقاضی ہے لہٰذا جرأتِ فکر سے ہی فراز کے لہجے میں اعتماد پیدا ہوا ہے۔ اسی اعتماد کی بنا پر وہ بے خوف ہو کر حقیقتِ حال کا اظہار کر جاتے ہیں ؎

یہ رعونت تا بکے اسے دلِ فگاراں دیکھنا
اب گرے گا طرّۂ سلطاں سرِ سلطاں سمیت

ان کی خوبصورت نظم "قلم سرخرو ہے" میں وہ اپنے فرائض پورے کرنے کے باعث پرسکون ہیں۔ وہ اور ان کا قلم سرخرو ہے کہ اس نے وہی کچھ لکھا جو دیکھا۔ مصلحت کے پردے میں چھپا نہیں دیا۔ بلکہ حق و باطل کے سامنے پورے [illegible] اپنا فرض ادا کیا۔

وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے [illegible] کی طرح فراز بھی اس جذبے سے سرشار ہیں۔ لیکن [illegible] یہ بات محسوس کی ہے کہ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کے لئے جو کچھ کیا۔ محبت کے [illegible] اس کا جواب ہمیشہ محبت سے نہیں ملا [illegible] کے برعکس ہوا ہے ؎

تھی افق تا بہ افق یوں تو مری خاک [illegible]
کس قدر تنگ مگر مجھ پہ وطن میرا تھا

لیکن وطن سے محبت ان معمولی باتوں کی پرسش نہیں جایا کرتی۔ جاناں جاناں میں کچھ نظمیں [illegible] ہیں جو انہوں نے وطن سے دور رہ کر بے [illegible] آرام و آسائش میں رہتے ہوئے لکھیں وطن کی خاک ہی عزیز ہے۔ اس کی تاریکی [illegible] غربت کے ٹمٹماتے چراغ غیر ملکی اجالوں سے [illegible] ہیں۔ کیونکہ یہ اپنی ہیں۔ ان کی اس سوچ [illegible] "مت سوچو" اور "امریکا" وغیرہ سے بخوبی [illegible]

ہر محبِ وطن پر سقوطِ مشرقی پاکستان [illegible] ایک ذاتی سانحے کی صورت [illegible]

---

[1] احمد فراز کا شعری مجموعہ

اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں کچھ نہ کچھ غور کیا ہے مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں اس تحریک کے تضادات کو رفع کرنے پر قادر نہ ہو سکا تھا۔ لیکن انور سدید نے اس کے متعلق مختلف موقعوں پر جو کچھ لکھا ہے اور جس انتقادی بصیرت کے ساتھ لکھا ہے اس سے میری یہ الجھن دور ہو گئی ہے کہ سرسید اور ان کے رفقا نے ضرورت و مزاجِ زمانہ کے مطابق، عقلیت اور رومانی انداز کی [illegible] پسندی کو باہم ملا لیا تھا۔ لہٰذا میری دانست [illegible] سرسید کی تحریک کو ایک ایسی حقیقت پسندانہ [illegible] پسندانہ تحریک قرار دینا چاہیے جس کو مؤثر بنانے کے لئے عقلی سائنسی دلیلوں سے خطابت اور بلاغتی جوش انگیزی سے کام لیا گیا۔ سرسید خود اعلیٰ درجے کے خطیب تھے۔ لیکن ان کے رفقا [illegible] شبلی، حالی، نذیر احمد، محسن الملک اور وقار الملک [illegible] اویب و خطیب شریک رہے۔

سرسید کی تحریک نتائجیت PRAGMATISM [illegible] پسندی اور فطرت پسندی کی علمبردار تھی۔ لیکن ان [illegible] مقاصد کے لئے انہوں نے اور ان کے رفقا نے روحانی حربے استعمال کئے۔

یہ طریقِ کار یقیناً مفید ثابت ہوا۔ انور سدید نے [illegible] مخزن کی رومانیت کا ذکر کیا ہے اور بجا طور سے [illegible] ہے کہ مخزن نے خصوصاً شعر و ادب میں ادب [illegible] اس منفعت مقصدیت سے آزاد کرایا جو سرسید [illegible] کے پیشِ نظر تھا۔

انور سدید نے بجا لکھا ہے کہ مخزن نے ادب کو قید سے رہا کرایا اور یہ ثابت کیا کہ ادب ایک آزاد وسیلہ ہے جسے اوّلیت ملنی چاہیے۔ پھر اس کے توسط سے مقاصدِ مطلوبہ کی طرف پیش قدمی بے ساختہ طور سے ہو جاتی ہے ــــ ادب کو غلام بنانے کی روش کبھی بابرکت ثابت نہیں ہوئی۔

انور سدید کی کتاب کے یہ مباحث واقعی فکر انگیز ہیں۔ بلکہ میری سفارش تو یہ ہے کہ مصنف مذکورہ مباحث کو پھیلا کر ایک مستقل کتاب علی گڑھ تحریک کے متعلق لکھے تاکہ شیخ محمد اکرام کی جانبدارانہ روش کی کچھ تلافی ہو سکے۔

ایک بڑا نزاعی سوال ہمارے یہاں ان غزلیات کے بارے میں موضوعِ بحث ہے جو اقبال نے مجبوری زمانے میں لکھیں (جب وہ داغ، امیر اکبر وغیرہ کی پیروی میں لکھا کرتے تھے یا مشاعروں کے لئے لکھیں) اس نزاع کے بارے میں انور سدید نے ہمیں اپنا قطعی فیصلہ سنا دیا ہے اور وہ یہ کہ داغ و امیر سے متاثر ہونے کے باوجود اور ان کے انداز میں لکھنے کے باوجود

"اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اقبال کو
اس وقت اس بات کا احساس نہ تھا کہ
ان کی غزل رسمی پابندیوں کے سلاسل
میں گرفتار ہے اور وہ تقلید کا شکار
ہو رہے ہیں۔"

در اصل یہ مجبوری دور تھا اور اقبال ذہنی و تخلیقی ارتقا کی منزلیں طے کر رہے تھے ــــ اقبال کا معاملہ جدا ہے اور خاص طور پر بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی غزلیات پر بھی یہی بات صادق آتی ہے لیکن ساری بات اصولی تنقید کی ہے۔ اگر یہ بات اصول بن جائے کہ غزل (بہ لحاظ اسلوب، معانی و ہیئت) صرف اسی طرح لکھی جائے گی جس طرح میر اور سودا لکھ گئے یا بعد میں داغ و امیر، اور نسیم وغیرہ لکھ گئے تو بلاشبہ کلامِ اقبال کے اس حصے کے ساتھ جیسا سلوک کوئی چاہے کرے لیکن اگر اصول یہ نہیں اور جدت کی بھی گنجائش ہے ــــ اور تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں تو پھر اقبال کی مجبوری غزل بھی ارتقائی مرحلے کے لحاظ سے مستند ہے ــــ اور انور سدید کا فیصلہ درست ہے۔

کلاسیکی نقوش پر میرا تبصرہ خاصا طویل ہو چلا ہے میں اسے زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ ورنہ میری آرزو تھی کہ میں کم از کم اقبال کے تصورِ حیات و مرگ کے بارے میں ضرور کچھ لکھوں۔

موضوع بڑا سنگلاخ ہے۔ خصوصاً فکرِ اقبال میں پہنچ کر خودی کے ارتقا ــــ اور زندگی کی شکست و ریخت ــــ اور بعث کے عمل جیسے موضوعات ــــ اور حیات کے دوری و مستقیمی عمل جیسی بحثوں میں الجھنا پڑے گا ــــ اور سچ یہ ہے کہ ان میں سے بعض سے الجھنے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں لہٰذا یہاں صرف یہی کہنا کافی سمجھوں گا کہ انور سدید اس طوفانِ شور افزا میں بھی مردانہ آئے ہیں اور کامیاب ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

اقبال کے کلاسیکی نقوش[1]

ڈاکٹر انور سدید کی کتاب "اقبال کے کلاسیکی [نقوش]" پر بہت دیر سے قلم اٹھا رہا ہوں۔ [illegible] کہ انور سدید میرا پیارا دوست ہے اور دوستوں کی یہ محرومی ہر کسی کو معلوم ہے کہ [illegible] خسارے میں رہا کرتے ہیں۔ ناقد کی تکلیف [illegible] کہ اسے اس طعنے سے بچنے کے لئے [illegible] کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔ رہوار قلم کو احتیاط سے چلانا پڑتا ہے اور دوسری [illegible] لحاظ بھی ہوتا ہے کہ غیر جانبداری کی [illegible] میں کہیں کتاب کی قدر و قیمت ہی کا حق [illegible] نہ ہو جائے۔

اس قسم کے وساوس کے تحت میں انور سدید [illegible] کتاب پر کچھ لکھنے کی آرزو کو ٹالتا رہا تا آنکہ [illegible] روز اقبال کی کلاسیکیت کے متعلق کچھ جاننے کی ضرورت پڑی۔ تب میرا ذہن [illegible] کی کتاب اور اس کے ایک مضمون "اقبال [illegible] نقوش" کی طرف متوجہ ہوا۔

[illegible] ردّ الصدر مقالہ اس سے قبل بھی [illegible] مرتبہ میں نے مطالب پر زیادہ غور ڈالی اور یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کلام اقبال کی کلاسیکیت کی حقیقی نوعیت کیا ہے؟

اس موضوع پر انور سدید نے جو مقالہ لکھا ہے اس کے دو واضح حصے ہیں۔ پہلا حصہ اصولی و نظری ہے۔ جس میں کلاسیکیت اور رومانیت کے خصائص اور تقاضوں کی عالمانہ بحث ہے۔ دوسرے حصے میں براہ راست علامہ اقبال کے کلام کے کلاسیکی نقوش کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اب لیجئے سب سے پہلے، دوستی کا بُت ٹوٹتا ہے کیا اچھا ہوتا، انور سدید میرا دوست نہ ہوتا، مجھے اس کے بعض خیالات سے اختلاف کرنے اور بعض کی شکست و ریخت میں بڑا مزا آتا ــــــ مزا تو اب بھی آرہا ہے لیکن قلبی محبت کی خلش کچھ رستا بھی رہی ہے۔

اب مجھے اختلاف اس امر میں ہے کہ اقبال جیسے آفاقی اور لازمانی شاعر کو کلاسیکی اور رومانی کی حدود میں مقید کرنا اس لئے درست نہیں کہ دنیا کے عظیم ترین شعرا بیک وقت بہت کچھ (بلکہ سب کچھ) ہوا کرتے ہیں۔ اور اگر ہم کلاسیکی اور رومانی جیسی اصطلاحات کے استعمال پر اصرار کو لازم سمجھ بھی لیں تب بھی واقعہ یہ ہے کہ ایسے شعراء کے کلام میں کلاسیکی اور رومانوی عناصر کی الگ الگ سراغ رسانی کے بجائے یوں کہنا شاید زیادہ مفید مطلب ہوگا کہ یہ شاعرانہ کلاسیکی ہے نہ رومانوی ہے بلکہ ایک پختہ ترین ادبی تہذیب کا وہ خوبصورت [illegible] پھول ہے۔ جس میں صدیوں کی شائستگی کی خوشبو اور لطافتوں کے رنگ اس طرح سے نمودار ہیں کہ جدید ترین ذوق و ذائقہ اسے بالکل اپنے عصر کی شے سمجھنے کے باوجود یوں محسوس کرتا ہے گویا اس میں معاملہ محسوسات و مدرکات سے کچھ زیادہ (بہت زیادہ) احساساتی و معنوی ثروت موجود ہے۔

ایسے شاعرانہ رومانیت کی تعریف میں سما سکتے ہیں نہ کلاسیکیت کی قید میں مقید کئے جا سکتے ہیں۔ نہ انہیں قدیم کہا جا سکتا ہے۔ نہ جدید۔ بقول اقبال ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری، قصۂ قدیم و جدید

اس معاملے میں، ہم گوئٹے کی مثال پیش

[1] ڈاکٹر انور سدید کی کتاب

عکسِ معلوم

نوشابہ نرگس

سعید احمد اختر

انوار احمد زئی

صابر ظفر

ماہِ نو

"اے حمید کا فن تخلیقی حسن کے تما
پہلوؤں کا مکمل امتزاج ہے۔ یہاں فن کی
تمام جمالیاتی قدریں ایک دوسرے میں
پیوست ہو کر ایک وحدت بن جاتی ہیں
اے حمید نہ خوابوں کی باتیں کرتا ہے، ن
خواب میں باتیں کرتا ہے۔ اگر اس کی
تحریر میں شعر کی رنگینی اور نغمے کی موسیقی
ہے تو یہ زندگی کی لطافتوں اور شگفتگیوں
کے اعتراف کی ایک صورت ہے۔"

احمد ندیم قاسمی